

اردو افسانے کا انسائیکلو پیڈیا

اردو افسانے کی روایت

۱۹۰۳ء — ۲۰۰۹ء

مرزا حامد یگ



اُردو افسانے کی روایت

۱۹۰۳ء — ۲۰۰۹ء

(اُردو افسانے کی تاریخ مع انتخاب)

مرزا حامد بیگ

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد - لاہور - کراچی

شیخ ابو عبد اللہ محمد

۹۰۰۹۰ — ۹۰۰۹۰

۹۰۰۹۰ — ۹۰۰۹۰

۹۰۰۹۰ — ۹۰۰۹۰

۹۰۰۹۰ — ۹۰۰۹۰

۹۰۰۹۰ — ۹۰۰۹۰

۹۰۰۹۰ — ۹۰۰۹۰

ضابطہ

ISBN: 978-969-496-387-7

کتاب	:	آرہ افسانے کی روایت
مرتب	:	مرزا حاد یگ
موسم اشاعت	:	2010
سر ادبی	:	خالد رشید
مطبع	:	دار المصنف اسلام آباد
قیمت	:	1750.00 روپے

دوست پبلی کیشنز، پلاٹ ۱۱۸، فریج ۱۵، ۱۰۰۲، پوسٹ کمر لبر 3998، اسلام آباد

فون: 351-4102754-5 E-mail: dostpubl@comcast.com.pk

اُردو کے پہلے افسانہ نگار
راشد الخیری کے نام

ترتیب

- 13 عرض باثر
- 15 ابتدائیہ مرزا صاحب
- 25 داستان نگاری کی روایت اور اُردو افسانہ
میر تقی داستان کہ عشرت گیسوی اور خواجہ ناصر علی فراق سے اگلا قدم
- 33 اُردو کا پہلا افسانہ: ایک تعارف
تحقیق کی سطح پر نڈا فیض کا ازالہ
- 41 اُردو کے اولین افسانہ نگار
راشد الفخری، علی محمود، درد و صدا، اکبر آبادی، وزارت علی اور بی، حکیم یحییٰ حسن، سجاد حیدر، یحیٰ دم، سلطان حیدر، جوش
یحییٰ حیدر، علی رودلو، خواجہ حسن نظامی، نیاز فتح پوری، مصباح شاد، رشید قاضی، عبدالغفار
- 65 لغتِ لغت آوازیں: بازگشت، بازوید
عابد اللہ، اسرار علی، مہاسین، اختر اور نیوی، اعظم کریم، یحییٰ، محمد حبیب، بلبل قہرانی، نادر، رحمان، ملک
عیات اللہ، انصاری، اختر انصاری، بلوی، سکیل، حکیم آبادی اور اشرف صہبائی، بلوی
- 72 نروال، دو جان پسندی کی لہر
جنوں، گو کہ پوری، مسز عبداللہ اور جناب، انبیاء علی اور میرزا انور

- 79 "انکارے گروپ" کا باغیانہ ٹھن
سچا دلگیر و رشید جہاں دامن علی اور محمود الطغر
- 83 ترقی پسند تحریک
حکمران آغا دہریہ چودھری، خواجہ احمد عباس، اختر حسین داسے پوری، کرشن چندر، عزیز احمد
عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، بشیر گلزار اور بلونت سنگھ
- 93 انصاف کا دروازہ
سعادت حسن منٹو، حسن عسکری، ممتاز علی، سید فیاض محمود، آغا پیر، رحمان مذہب
ابوالفضل صدیقی، عثمان افضل الرحمن اور سید رفیع حسینی
- 102 تخت لغت آوازیں
نکاح عباس، کوثر چاند پوری، شتیق الرحمن اور قدس اللہ شہاب
- 105 آردو افسانہ آزادوی کے بعد
کریم گلزار، گل، اشتیاق احمد قرۃ العین، حیدر محمد خالد اختر، دہریہ داس، انصار حسین، بانو قدسیہ
- 112 آردو افسانے کا تالیف
سرچند پرکاش، جوگندر پال، انیسٹ احمد گڈی، انور سہا، طہران عین، رانا خالدہ حسین، انشلا پور،
رشید امجد، طہران کوئل، اسد محمد خاں اور مرزا حامد بیگ
- 124 آردو افسانہ: نیس منظر، ردو اس، نیس منظر اور پیش منظر
گل، آج اور آتے والے گل کے افسانہ نگاروں کا جائزہ
- 177 آردو افسانے کے سالیب بیان
دماستان سے افسانے تک کا عبوری دور: انتخاب
- 195 اہل قلعہ کی ایک جھلک
خلیلہ ناصرینہ برفراق، بلوی (۱۸۶۵ء-۱۹۳۳ء)
- 197 دیکھوں کی پھیل چھاڑ
خلیلہ ناصرینہ برفراق، بلوی
- 202 گھنٹہ بیگ
خلیلہ عبدالہق عشرت کھٹوی (پ: ۱۸۶۸ء)
- 208 دربار دہلی کی کنکواہاری
خلیلہ عبدالہق عشرت کھٹوی

211	میرزا قریظی رامستان کو (پ: ۱۸۶۹ء)	فقیر کا حکم
214	آفتاب احمد (مطبوعہ: ۱۹۰۳ء)	ایک چاندنی راست کا نگار: بہادر خیر میں
217	(۱۹۰۳ء-۱۹۱۳ء)	آرورو کے اولین افسانے: انتخاب
219	راشد الخیری	نصیر اور غدیج (خزون لاہور دسمبر ۱۹۰۳ء)
222	درد مند اکبر آبادی	تصورِ فلم (خزون لاہور فروری ۱۹۰۴ء)
224	علی محمود	ایک پرانی ریمار (خزون لاہور اپریل ۱۹۰۴ء)
227	راشد الخیری	جانشین کا لال (خزون لاہور اگست ۱۹۰۵ء)
231	سجاد حیدر علیہ دم	غربت و وطن (آرورو نے صفحہ پہلی نثر، اکتوبر ۱۹۰۶ء)
233	سجاد حیدر علیہ دم	دوست کا خط (خزون لاہور اکتوبر ۱۹۰۶ء)
236	سلطان حیدر جوش	ناؤ کا بیوی (خزون لاہور دسمبر ۱۹۰۷ء)
238	پریم چند	حلقہ دنیا اور شب و وطن (زمانہ کاغذ، اپریل ۱۹۰۸ء)
245	پریم چند	دنیا کا سب سے اصول: رتن (شعور، سوز و وطن، جون ۱۹۰۸ء)
250	محمد علی اردو لوی	گناہ کا طوف (تحریر: ایک ہنگ ۱۹۰۹ء)
254	علی محمود	مینی ٹال (ادب، مال، باور، جولائی ۱۹۱۰ء)
257	خدیج حسن نظامی	بہر آشکارا (نیا جیل، لاہور، جنوری ۱۹۱۳ء)
258	نیا راج پوری	ایک پادری و شیزو کو کچھ کر (توق، وطن، جنوری ۱۹۱۳ء)
261	مہاشیہ رتن	پھول (خزون لاہور، جنوری ۱۹۱۴ء)
267		آرورو افسانے کے سو سال: انتخاب
269		(ترمیم میں: تقدیم کی بنیاد افسانہ نگار کا اولین مطبوعہ افسانہ ہے)
280	راشد الخیری	راشد الخیری (۱۸۶۸ء-۱۹۳۶ء)
282		سجاد حیدر علیہ دم (۱۸۸۰ء-۱۹۲۳ء)
286	سجاد حیدر علیہ دم	چراغ سے کی کہانی
291		سلطان حیدر جوش (۱۸۸۶ء-۱۹۵۳ء)
295	سلطان حیدر جوش	طوق آدم

303	پہلے چتر (۱۸۸۰ء۔ ۱۹۳۶ء)
314	کفن پہلے چتر
320	محمد علی رودلوی (۱۸۸۶ء۔ ۱۹۵۳ء)
323	تیسری جنس محمد علی رودلوی
329	خواب حسن نگاری (۱۸۷۹ء۔ ۱۹۵۵ء)
340	شہزادی کی چچ خواب حسن نگاری
342	نیا ترچہ پوری (۱۸۸۳ء۔ ۱۹۶۶ء)
347	کیچہ و ساگی نیا ترچہ پوری
369	مہاشہ دشمن (۱۸۹۵ء۔ ۱۹۶۷ء)
373	دلبرہ راسخ مہاشہ دشمن
376	اعظم کریمی (۱۸۹۸ء۔ ۱۹۵۳ء)
379	امچوت اعظم کریمی
383	حامد اللہ اسر (۱۸۹۵ء۔ ۱۹۷۳ء)
386	میرا فرش حامد اللہ اسر
389	سبز عید القادر (۱۸۹۸ء۔ ۱۹۷۶ء)
392	یادے ناگہاس سبز عید القادر
399	جلیل قدوائی (۱۹۰۳ء۔ ۱۹۶۶ء)
403	چٹے جلیل قدوائی
407	بھجوں گور کچہ پوری (۱۹۰۳ء۔ ۱۹۸۸ء)
411	سکنا پاش بھجوں گور کچہ پوری
421	علی مہاس حسینی (۱۸۹۷ء۔ ۱۹۶۶ء)
425	سیڈہ گوشتی علی مہاس حسینی
429	محمد حبیب (۱۹۰۴ء۔ ۱۹۸۵ء)
434	کیہا کر محمد حبیب
441	اوچدرا تھانک (۱۹۱۰ء۔ ۱۹۶۶ء)
447	چنگ اوچدرا تھانک
457	اشرف سبزی دہلوی (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۹۰ء)

463	اشرف سہیلی دہلوی	موسے آکا
470		رشید جہاں (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۵۴ء)
473	رشید جہاں	نئی بک کے سلاہیب
476		غلام عباس (۱۹۰۹ء۔ ۱۹۸۴ء)
481	غلام عباس	آندھی
491		عزیز احمد (۱۹۱۳ء۔ ۱۹۷۸ء)
504	عزیز احمد	آپ حیات
518		سید فیاض محمود (۱۹۰۶ء۔ ۱۹۹۵ء)
520	سید فیاض محمود	کام چور
526		حیات اللہ انصاری (۱۹۱۴ء۔ ۱۹۹۹ء)
529	حیات اللہ انصاری	آخری کوشش
546		احمد علی (۱۹۱۰ء۔ ۱۹۹۳ء)
551	احمد علی	کٹاری لگی
561		راجندر سنگھ بیدی (۱۹۱۵ء۔ ۱۹۸۳ء)
566	راجندر سنگھ بیدی	لاہوتی
575		جباب امتیاز علی (۱۹۰۸ء۔ ۱۹۹۹ء)
579	جباب امتیاز علی	صنوبر کے سائے
585		اختر اورینٹی (۱۹۱۰ء۔ ۱۹۷۷ء)
588	اختر اورینٹی	کلیاں اور کانٹے
610		سعادت حسن منٹو (۱۹۱۴ء۔ ۱۹۵۵ء)
618	سعادت حسن منٹو	نیا جاتوں
626		اختر حسین رائے پوری (۱۹۱۴ء۔ ۱۹۹۴ء)
630	اختر حسین رائے پوری	حاشا کم شد
634		اختر انصاری دہلوی (۱۹۰۹ء۔ ۱۹۸۸ء)
639	اختر انصاری دہلوی	لو ایک قصہ سنا
652		ایم افضل صدیقی (۱۹۰۸ء۔ ۱۹۸۷ء)
655	ایم افضل صدیقی	جوان کو

665	ملک راج آنند (۱۹۰۵ء۔ ۲۰۰۳ء)	
669	ملک راج آنند	فطرت کا دل
674		امجد علی قاسمی (۱۹۱۶ء۔ ۲۰۰۳ء)
682	امجد علی قاسمی	ادرس آف تعلیم
690		کرشن چندر (۱۹۱۳ء۔ ۱۹۷۷ء)
697	کرشن چندر	کاوی و عقل
707		ممتاز مطلق (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۹۵ء)
712	ممتاز مطلق	آپا
720		کوثر چاند پوری (۱۹۰۸ء۔ ۱۹۹۰ء)
724	کوثر چاند پوری	میرا پیشہ
731		میرزا ادیب (۱۹۱۳ء۔ ۱۹۹۹ء)
738	میرزا ادیب	نکاح و جنوں
765		غولام احمد عباس (۱۹۱۳ء۔ ۱۹۷۸ء)
770	غولام احمد عباس	پیری لین کی پتلون
784		عصمت چغتائی (۱۹۱۵ء۔ ۱۹۹۱ء)
788	عصمت چغتائی	مطلح چہ
793		قدرت اللہ شہاب (۱۹۱۷ء۔ ۱۹۸۹ء)
796	قدرت اللہ شہاب	ماں جی
804		سید رفیع حسین (۱۹۲۶ء۔ ۱۹۹۳ء)
806	سید رفیع حسین	گوری ہو گوری
812		دعید مستی قریشی (۱۹۰۹ء۔ ۲۰۰۳ء)
815	دعید مستی قریشی	راؤنگر
832		شفیق الرحمن (۱۹۲۰ء۔ ۲۰۰۰ء)
838	شفیق الرحمن	نانا نونے نائے آؤٹ
854		محمد حسن عسکری (۱۹۱۹ء۔ ۱۹۷۸ء)
858	محمد حسن عسکری	جائے کی بجائی
879		بلونت سنگھ (۱۹۲۰ء۔ ۱۹۸۹ء)

883	بیروت سٹور	۱۶
897		کرتار سنگھ دیگل (۱۹۱۸ء۔)
903	کرتار سنگھ دیگل	پہول توڑنا مسیح ہے
908		ششیر سنگھ زردا (۱۹۱۵ء۔)
911	ششیر سنگھ زردا	مکڑو چٹا
919		اشفاق احمد (۱۹۲۵ء۔ ۲۰۰۳ء)
923	اشفاق احمد	مکڑو پا
949		قرۃ العین حیدر (۱۹۲۶ء۔ ۲۰۰۷ء)
954	قرۃ العین حیدر	فونو کرہنر
959		آغا پامر (۱۹۳۳ء۔ ۱۹۹۸ء)
962	آغا پامر	کتاب دین چٹھی رساں
978		محمد خالد اختر (۱۹۱۹ء۔ ۲۰۰۳ء)
981	محمد خالد اختر	الائین
1000		رحمان مذہب (۱۹۱۵ء۔ ۲۰۰۰ء)
1004	رحمان مذہب	ننگل جان
1017		نسر حیدر پرکاش (۱۹۳۰ء۔ ۲۰۰۳ء)
1020	نسر حیدر پرکاش	روسنے کی آواز
1024		جوگندر پال (۱۹۲۵ء۔)
1028	جوگندر پال	باہر کا آدمی
1033		فیاض احمد گدی (۱۹۲۸ء۔ ۱۹۸۶ء)
1035	فیاض احمد گدی	سائے اور سائے
1057		دعید احمد (۱۹۲۸ء۔)
1061	دعید احمد	نور دہ گھر
1067		انتظار حسین (۱۹۲۳ء۔)
1072	انتظار حسین	آخری آدمی
1077		انور سجاد (۱۹۳۳ء۔)
1080	انور سجاد	گائے

1085	بانو قدسیہ (۱۹۲۸ء۔)
1088	انتر ہوسٹ آدای بانو قدسیہ
1102	بلراج مین دا (۱۹۳۵ء۔)
1105	بلراج مین دا
1111	خان فضل الرحمن (۱۹۶۳ء۔ ۱۹۹۵ء)
1114	خان فضل الرحمن زبکی
1119	خالدہ حسین (۱۹۳۸ء۔)
1121	خالدہ حسین پرندہ
1127	غظنیاد (۱۹۴۷ء۔)
1130	غظنیاد راستے بند ہیں
1135	رشید امجد (۱۹۳۵ء۔)
1139	رشید امجد ذوقی بچکان
1143	بلراج کوئل (۱۹۲۸ء۔)
1146	بلراج کوئل سکھوں
1152	اسد گلہ خاں (۱۹۳۲ء۔)
1155	اسد گلہ خاں ترو بچن
1158	مرزا حامد بیگ (۱۹۳۹ء۔)
1162	مرزا حامد بیگ مغل سرائے
1166	افسان نگار اور اُن کے افسانوی مجموعے مرزا حامد بیگ
1177	قصہ ہر بکھرے تفریہ ڈاکر اف قصہ ہر بکھرے تفریہ ڈاکر اف

عرض ناشر

ممتاز افسانہ نگار اور صاحب نظر نثر نگار احمد بیگ کی کتاب ”اُردو افسانے کی روایت“ (۱۹۸۳ء۔ ۲۰۰۹ء) اُردو افسانے کا صد سالہ افسانہ نگاری کا پتہ ہے۔ اُردو افسانے کی ایک ایسی جامع تاریخ، جس میں اُردو کے پہلے افسانے کی واضح مختصر سی کرتے اور اُردو کے اولین افسانہ نگاروں کا جامع خاکہ کر دینے کے ساتھ ساتھ ہی اور ان کی تحقیق و تنقید کی آڑی ہوئی گروہ کو صاف کر کے بہت سے بیوقوف افسانہ نگاروں کی بچان ممکن بنائی گئی ہے۔

داستان اور قصوں سے افسانے تک کے عیدری دور سے مطلق خوبصورت نثر پر فراق، دہلوی، مولوی عبد الرؤف، عشرت کشمیری، میر تقی علی داستان گو، آغا علی، امجد علی کی سوانحی کی وادی گئی ہے۔ نیز ان کی تمام ایک اور موضوعی حوالوں سے مختلف ادوار کا تم کر کے افسانوں کے جانور کے ساتھ شامل انتخاب افسانہ نگاروں کی سینیاری کا تحقیق و تنقید کے اولین مطلوبہ افسانوں کے سال شامت کے حوالے سے کر دیا گیا ہے۔

شامل انتخاب افسانہ نگاروں کے سوانحی خاکوں میں صدقہ تاریخ پر اہل و فیات ناموں، تعلیمی کوائف، اولین تجربوں اور اولین مطلوبہ افسانوں کی مختصر سی، اعزازات کی تفصیل، تصاویر، عکس، تقریر، آؤ کراف اور نظریہ فن کی شمولیت نے ”اُردو افسانے کی روایت“ کو افسانہ نگاری کی دنیا کا سب سے ہم کنار کر دیا ہے۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دسمبر ۱۹۹۹ء میں اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد نے شائع کیا تھا۔ گزشتہ افکار و برس میں کئی افسانہ نگار رخصت ہوئے، ان کی ایک نے اپنی شامت منظم کی اور ان کا نیا کام سامنے آیا۔ یوں بہت سے اضافہ جات کے ساتھ اب اس کتاب کا Revised ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے، اس اسباب افکار کے ساتھ کہ اس کتاب میں شامل افسانہ نگاروں سے مطلق کوائف افسانہ نگاروں سے براہ راست یا افسانہ نگاروں کے مطلقین سے حاصل کر دیا ہے۔ نیز ان حاصل کردہ معلومات کو دستاویزی سطح پر بھی جانپان اور پکا گیا ہے۔ سبب ہے کہ اُردو افسانہ نگاروں اور افسانہ نگاروں سے مطلق پوری دنیا میں ریسرچ اسکالرز اور ناقدین اس حوالہ جاتی دستاویز میں فراہم کردہ معلومات پر غور و فکر کرتے ہیں۔

ابتدائی

آرودا افسانے کی زوال پذیری کی اولین نشاندہی اچھ حسن عسکری نے اس وقت کی جب وہ خود پریم چند اور ان کے مرہب اخلاقی اقدار کے سلسلے میں، اس عقیدہ ہونے پر ضرب کا رسی لگا چکے تھے، پھر انظار حسین نے کہہ کر آرودا افسانے کا زوال تو پریم چند سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ جب جڑوں کی تلاش شروع ہوئی تو آرودا افسانہ ایک بار پھر مستحب نظر اور پھر وقت تھا جب آرودا افسانہ ہندی اور متونک سطرے کر چکے کے بعد بھی رائج الوقت سماجی اقدار اور مروج اخلاقیات کی پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا اور غرض ہمارے ترقی پسند افسانہ نگاروں کا الگ شعور طوفا۔ یہ گمراہ کیوں کر کھلے، کہ آرودا کا ناقد تو حسب معمول افسانے کے بارے میں خاموش ہے اور غم سے ہمارے سالانہ ادبی جائزہ لکھنے والے کاظم نگاروں اور بیسٹ زدہ پروڈیوسروں کو باقاعدہ ناقدان لیا گیا ہے۔ اللہ اعلم۔

راشدہ انٹیری، پلیدہ اور پریم چند سے ہوتا ہوا آرودا افسانہ اصطلاح پسندی، رومان، حب الوطنی اور لیسن کی ہموائی کے بعد مشوار و ہندی کے اہم تنک میل گز اور کر تفسیر کی اڑائی ہوئی دھول کے چھ جانے کے بعد رواں چلے منظر کے کھل پسند افسانہ نگاروں کی افسانہ رچ و رنگ تک آ پہنچا، تب بھی خدا نے جھر جھری نہیں لی۔ ایسے میں انظار حسین اور قرۃ العین حیدر بولے تھے۔ انہوں نے تہذیب ہوتے ہوئے منظرے سے اور جی نفسی کیفیات کا مسئلہ اٹھایا تو لیکن مست نہائی نہیں کی، اس وقت تک ”تہذیبیت“ کی اصطلاح رائج نہیں ہوئی تھی۔ کاش ایسے میں کلیم اللہ رحیم احمد اچھ حسن عسکری، ممتاز حسین اور سلیم محمد اس طرف متوجہ ہوتے۔ پھر طرز اوقات گزر گیا۔

سعادت حسن منٹو نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ ”پریم چند سے ہم کچھ بھی نہیں سیکھ سکتے۔“ ”چونکہ انہیں پندار نہ تھا، لیکن کچھ تو تھا، جس کا یہ رد عمل تھا۔ پھر یہ کہ Back to nature کے رویے نے سنبھالا لیا، اس لیے کہ رومان پسندی کا چلن نیا نیا تھا۔ میں تو کبھی کا کہہ کر ”ترقی پسندی سے رومان پسندی“ کو ملہا کر دیا جائے تو بڑے بڑے بت قدموں آ رہیں۔

”یہ بدانی ترقی پسند“ چلن بدروستائی اور یوں میں۔ پھیل چائی کی طرح عام ہوا، نتیجہ میں ہمارے افسانے کی طبعی اشروادنا ممکن نہ ہو سکی۔ داستان سے رشتہ کیا تو ناہم ابتدائی دور کے ناچست افسانہ نگار پریم چند کو ہی آرودا افسانے کا شہسباز مان لیا کہ۔ محمد علی درویشی کو ردولی کی تعقد داری نے مار کھا اور یوں آج کا بدترقی پسند اقدار کی باہمی چم۔ چائی کے سب آرودا افسانے کے منظرے سے بے بارہ پھر باہر کر دیا گیا۔

اسے بھی محض اخلاقی نہیں کہنا چاہیے کہ اُردو افسانے کا دوسرا اٹھائیں بھی ترقی پسندوں میں سے ہی چڑ گیا اور وہ تو کرشن چندر۔ غلام عباس یا راہندر سنگھ بیدی کیوں نہیں؟ بہت زور مارا گیا۔ ”نقوش“ لاہور (السانہ لبرس) اور ”انکاز“ کراچی (السانہ لبرس ۱۹۶۳ء) میں باقاعدہ ادبیات درج دیئے گئے، لیکن انھیں کرشن چندر کے ادبی لحاظ سے اچھے ہی حال ہو گئے کہ افسانے کی زندہ روایت پر بات کرتے ہوئے ذہن پروردہ ال کرشن چندر کو یاد کیا جاتا ہے۔ انھیں کرشن چندر کو درالسانہ لبرس تھا۔ لیکن اسے تو ارا بہت کیا۔

اس اٹھائیں ”السانہ پن“ کا گھنگھونا کیا اور غور بہاری نے بعض بہت اچھے افسانہ نگاروں کو کٹاری سے محروم کر دیا جن کے کام کو سمجھنے اور پکھنے کا ادنیٰ ہی پیدا نہیں ہونے دیا تھا۔ سید رفیق حسین، سید فیض محمود، ابی الفضل صدیقی، خان فضل الرحمن، احمد خالد اختر کسی کسی کے نام گواہ ہیں؟ لیکن شخصیں رہیں، آئندہ کا سنجیدہ طالب علم انھیں ایک بار پھر دھڑکا لے گا۔ اس کتاب میں اسی آئندہ کے لیے Space work کیا گیا ہے۔ مثلاً کوثر ترقی پسند تحریک سے خارج کر دیجئے سے کیا فرق پڑا؟

پھر مثلاً کوثر بعض ادبیات Own بھی کیا گیا، لیکن قراء انھیں حیدر کے ساتھ ایک زمانے تک وارد اسلوب قرار دیا گیا۔ یہ الگ کہانی ہے کہ کس طرح قراء انھیں حیدر کے Unique کام نہ ہونے سے بڑے جلاوریوں کے بیچے سے مستثنیٰ سمجھ گئی ہیں۔

ترقی پسند ہندوین نے دم لیا تو اُردو افسانے کو ”بے“ اور ”بد“ افسانہ نگاروں نے آگھرا کر بے ہوشی کا مشر ہو اس کا ایسے میں ہم نے ذہول افسانہ نگاروں کی بازیافت کی کہ ”ق“ ”بد“ ”بے“ ان میں کیڑے نکالنے پر جھٹ گئے۔ یہاں تک کہ بے توگوں میں سے سرچرہ پر کاش کو ”کوثر ترقی پسندوں“ نے اس وقت مانا جب اس نے افسانہ ”کا کا“ لکھ کر پہلی بار ہند کے سامنے کھلے ٹیک دیئے۔

لے دے کہ افسانے میں ہند سے اور ترقی پسندی کا ڈاکا کا ضرورت ظہور اسو پشتر افسانہ نگاروں نے اسی فارمولے کو برتا۔ اب ایک بار پھر کہانی پر آزادیت ہے اور ناقدین ”نئے“ ”بد“ ”بے“ اور ”بد“ ”ترینا“ افسانے اور سادہ جانیے کو آشیر داد دیتے ہوئے بڑی روٹھائی رہا پچھے ہیں۔ چھبہ ادبی رسائی کی طویل فہرستوں میں شیر اور کبریٰ جڑواں دکھائی دیتے ہیں۔ نہ بے کھلے میں غدار کوئی کرے گا؟

آج شرقی اور مغربی کی طرز اسے فکر کا پانے دیا نہ پانے کے داد جو قریب کا سامنا ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا الگ لسانی ہو اس اور الگ الگ ادبی روایات کے امتیازات بھی مت گئے؟

اصل شخص یہ ہے کہ افسانہ نگار کو زندہ روایت کا شعور ہی نہیں ہے۔ خود مجھے ”کہانی پن“ اور ”بد“ ”بے“ طرز کی اصل واصلی ادبیاتی اصطلاحوں سے چڑ ہے۔ کیا افسانے میں افسانہ کو کاش نہیں کرنا چاہیے؟ لیکن سادہ جانیے کی بدصورتی ثابت کر کے نہیں۔

افسانے میں افسانہ پن کی کٹائی کوئی کرے گا؟ ہمارا ناقد تو ای۔ ایچ۔ ایل۔ اے کی طرح دھلا دھلا اور بد زبان نہیں ہے، تخلیق ہے۔ ایف۔ آ۔ ایس کی طرح شارح بننا پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے کے رد میں لکھے جاتے ہیں، پلے جاتے ہیں، مہرے میں نہیں آتے۔

ادب میں جب اس نوع کی صورت احوال ہو تو میرے خیال میں ناقد پر دو جبری ذمہ داری عائد ہوتی ہے یعنی اول تو اسے ”اصلی“ اور ”ادبی“ تحریروں کی پہچان لیکن یہاں ہے اور ناقدانہ Working Artistic کی شرح کرتی ہے؟ اور اگر ایسے میں ناقد تخلیق کار کی راہنمائی کر سکے تو یہ اس کی اضافی عطا ہے۔

یوں پہلی سطح پر تو وہ تخلیق کار کے تخلیق حربے کا فہم کرے گا اور اچھے اور غریب میں حد فاصل قائم کرتے ہوئے کاغذ کھار کے جاری میں

سے نرول تھیتے تھے کہ علیحدہ کر کے بحث اور لفظ کے تخلیقی استعمال کی وضاحت کرے گا جبکہ دوسری سطح پر اسے ادب کے قاری کی تربیت کا فریضہ بھی انجام دینا ہے۔ تاکہ سب پر ایک کام اپنے امکانات تکمل کر سکے اور نئے ہونے اسالیب انکھار اور بہت کی سطح پر احساسات کے عینی اور مجسمہ شکن کی قاری تک رسائی ممکن ہو سکے جبکہ ہمارے اس زیادہ تر مضمّن Sweep کرنے کے انداز میں غلوے بازی کو تشدید کا نام نہ دے دیا گیا ہے۔

لہذا بھلا کرے "نئے ادب" "جدید" "نور" "جدید ترین" "لفظانہ نگار" جس نے یہ سوانح ایک پارلر فرام کیا ہے۔ ان نجات دہندوں نے اردو افسانے کو کچھ سے کچھ بنا دیا حتیٰ کہ "افسانہ بین" سے ہی نجات دلا دی۔ Modernism اور Modernity کو باہم غلط ملط کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۵ء تک کا زمانہ "نئے ادب" اور "جدید فن" کے تصور کا زمانہ ہے۔ دیکھا جائے تو یہی زمانہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے آخری سانس لینے کا زمانہ بھی بنتا ہے۔ سو "نئے ادب" "ناولوں کے نزدیک ترقی پسندوں کی لائٹ کی لائٹ ہوا اپنے مہدمیں "بہت بڑی" کہلائی، ۱۹۵۵ء تک آئے آئے "پرانی" ہو گئی۔ ادب دیکھنا چاہیے کہ آئے والے نکل میں سانس اور جینکا لونی کی ترقی اور آئے والی شخصیات آج کے "نئے" "جدید" "نور" "جدید ترین" کہانی افسانے کا کیا مشتر سائنے لاتی ہیں۔

ہمارے ہاں جاگیردارانہ نظام کی شکست کے بعد اس کی جگہ نیچے ہونے سے مراد برادری کا متبادل وجودیت اور جدلیاتی روایت کی باہم آمیزش بن سکتی ہے (جس میں مراد اور سماج کی بھڑکی بھی ممکن ہے) لیکن ابھی ایسا ہوا نہیں۔ جبکہ "جدید ترین" افسانہ نگار نے یہ ایک ایسا تصور کر لیا۔ اس طرح "جدید ترین" افسانے (اس سے میری مراد پیش منظر کا تخلیقی افسانہ تھا نہیں) میں سائنسی اور صنعتی تہذیب کے جذبہ میں پیدا ہونے والی جدید ہندوئی کا جو خاکہ برقی شعلہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس کی بنیاد برادریاں است تجربہ اور مطالعہ سے پرانی نہیں تھیں کہ سن سنائی، اندھی تقلید اور مصنوعی خام تر ہے پر ہے۔

آج مشرق اور مغرب کو (برادریاں طرف کے چاہنے، بانٹ چاہنے کے باوجود) قربت نصیب ہوئی لیکن اپنی اپنی مخصوص زندہ روایات کے سبب خارج اور داخل میں کچھ امتیازات بہر حال قائم رہے جن کے شعور کا فقدان "جدید ترین" افسانہ نگاروں کے رعب و زکو تخلیقہ محض کی اندھی کھائی تک لے آیا ہے۔ نتیجتاً جدید ترین افسانے کی ایک معقول تعداد میں سے زمین کی رو باں ہوا ہوئی اور کردار اس حد تک بے چہرہ ہونے کہ خود اپنے چہرے کی پہچان مشکل ہو گئی۔ "بیشتر" "نئے" "نور" "جدید ترین" افسانے میں جن سانس کا یہاں بڑے زور و شور سے ہوا، ان میں اقدار کی شکست اور منظم نظریات کی ناسودگی نے کئی بڑا مصفاہ گھیرے، جبکہ مچاگی انداز میں جذباتی سطح پر فرد کے کھوکھلے پن کی عکاسی ہوئی۔ یوں "صنعتی معاشرت" کے ادب "کی اندھی تقلید میں نئے افسانہ نگاروں کی ایک معقول تعداد اپنے آپ کو جذبات سے ماری، دنیاوی معاشرے میں رکھ کر خود ترمیمی کا تصور ہوئی اور اپنے افسانہ نگاروں کے ہاں بے ست جملی محسوسات اور بے چارگی نے راہ پائی۔ اس کے برعکس پیش منظر کے تخلیقی افسانے میں اقدار کی شکست اور منظم نظریات کی ناسودگی کے نتیجہ میں بھائی کی کوئل بھولی، ایسے افسانہ نگاروں کے ہاں معاشرے کے گولے پن سے مفاہمت کی بجائے ایک خاص قسم کے اکیلے پن نے چہرہ نمائی کی، یا شاید یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ریست کی ناقابل برداشت بھڑکوں بندوں میں رہتے ہوئے باقی کی مراد ریست نے زندگی کرنے کا ایک نیا رنگ وضع کیا۔ اس نوع کے تخلیقی افسانے میں جذبات سے ماری دنیاوی معاشرے کا وہ روپ ظاہر نہیں ہوا، جس کا سبب صنعتی آشوب ہے، بلکہ اس میں تیسری دنیا کے شعلہ عوسم ہیں اور مسائل۔ یہاں بھائی، احتجاج، افسردگی اور بے سنی کے خصوصی محسوسات کے اسچہ سچے ہیں۔

میں "زندہ روایت" کا قائل ہوں، مراد فریقوں کے سانس نہیں گن سکنا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر گز پر اپنی کمی نہ کسی جہت میں روایت

سے ضرور مراد رہتا ہے لیکن ہر تہلیل ہوتے ہوئے عہد میں نزولِ تخلیق کا رد و ایت کی توسیع بھی جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے پیشِ حشر کے افسانے سے چراغِ اہم کا مددِ صحت آگیا۔ آج، گزرتے ہوئے کل سے ایک قدم آگے ہے، افسانے کے بدلے ہوئے موضوعات اور نئے مسائلِ زندگی کے شعور کے ساتھ ساتھ، روایتی ہیئت اور جان کے سربراہ اصول و قواعد بھی حائل ہوئے اور یہ ضروری بھی تھا۔ ”آج“ اہم نے جس طرح اور جیسے، نئے منظر نامہ کو محسوس کیا۔ اس کا جان بھی اس سے میل کھاتے ہوئے رنگوں کے چٹوڑے ساتھ اور ”آج“ کے مزاج سے قریب تر کر کے، یہ تمام اہم ایسا کرنے کی خواہش کی، لیکن جہاں ”تہذیب“ افسانے کی، بجز حال میں برغز و غلطیٰ قہر پر اسے قہر کا کلن اہم وہاں روایت کے شعور نے اطرشی سانس لیے۔

ایسے میں بہت سے ”تے“ اور ”تہذیب“ افسانہ نگار روایتی شہرت کیلئے میں ضرور کامیاب ہو گئے، لیکن ان کا ایہام معلوم ؟ یہ ہم خود ”نو ترقی پسند“ افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد اپنے آپ کو ایک ہی امام کے ”چیلے“ بننے سے منکر ہے اور ان کا اصرار یہی ہے کہ ان کے لگاتار ہوئے انکسوں کے ذخیرہ سران کے ذاتی تجربات کے عکاس ہیں۔ لیکن کیا کیا ہائے کہ خطبات کی یک رنگی، ایذا کیلپ کی محدودیت اور ایک ہی طرح کی تشبیہات کا اجتماع انھیں ایک محدود مطلقے کا کرکھڑا کر چھوڑتا ہے۔ اگر ”نیا“ اور ”تہذیب“ افسانہ نگار بھی کہتے تو ہمیں چاہیے کہ جب ہم آج کے افسانے کی بات کریں تو مختصر افسانے کی موت سے اپنی بحث کا آغاز کریں۔

لیکن پتہ تک ایسا نہیں ہے، اور نئے منظر نامے میں تحقیقی افسانہ بھی اپنا پتہ دیتا ہے تو کیوں نزولِ تخلیق کی جڑوں کی تلاش کی جائے، نیز نزولِ تخلیق کا مدد کی کچھ آسان جاتی جائے۔

اب جہاں تک زبان کے مزاج اور موضوع اور روایتی ہیئت کی بانی نسل کا سوال ہے تو سوچنا چاہیے کہ اسے کس خانے میں رکھا جائے گا۔ یہ سوال نہایت اہم ہے اور پھر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اس سے پہلے طے شدہ اہم و ادب کا نظام موقوف تو نہیں ہو جائے گا؟ اس سوال کا جواب ہمارے ناقدین نے اہم فراموش کر دیا ہے۔ اس لیے کہ جہر جو اس کو اپنے خیالات کے جنگل کی مہاز بھٹکا بھی مزید تھی۔ ہمارے آدھلے نے ”۱۹۸۳ء“ قبل از وقت کھلی اور اسے اس دور میں وہ پتہ پرانی نصیب نہ ہوئی جو آج اس کا حصہ ہے۔ اسی طرح ایچ کر این پور نے ۱۹ویں صدی کی ابتدا میں Fantasy رقم کی، خود اپنے ہی مرادِ افرات اندیک نے نعلِ صمدی قلم ”کل کا کھڑا“ بھی سانس کشش کھس دیا ”پہاڑ“ اور ”سناہارو“ کا خواب ٹھکے نہیں دیکھا کیا تھا اور سب سے زیادہ کہ چہ کہ ناقدین کیا ہوتے، جو ان حذر کہہ بالا ناموں کو بڑی شدت سے رد کیا کرتے تھے؟ کہو یہی سبب ہے کہ کوئی المال میرے نزدیک، یہ بات زیادہ اہم نہیں کہ اہم و ادب کا ناقد تخلیق کار کے غنڈے (Intention) تک نہ نصد پہنچا یا نہیں۔ اس لیے کہ میرے نزدیک اہمیت ”انہماک“ کو حاصل ہے ”سو فیصد ابداع“ کو نہیں۔ اس لیے کہ بانی تخلیق قلم پہلے ”اعتماد“ ہے اور اس کے بعد ابداع۔

یہ اگرچہ ممکن ہے تو اسے ممکن بنانے کے لیے سہو جس ناقد فراموش کرے گا اور داری اگر ابداع کا خواہش حصہ ہے تو تخلیق کار کی جانب پیش قدمی کرے گا۔ فی زمانہ تو یہی دیکھنے میں آجیے کہ شاعر، شاعر، شاعر اور غزلت چند بات اظہار چاہتے ہیں اور غزلت زدہ لوگ استعارے سے خوف زدہ ہیں اور ابداع کا دھویا کر رہے ہیں۔ اب جو لوگ لفظ کو اہم مانتے ہیں، وہ سو فیصد ابداع چاہیں تو چاہیں، میں تو تحقیقی قلم کو یہ تپاتی ضرورت رکھنے والوں میں سے ہوں اور لفظ کے دہارے کو مقصود بالذات سمجھتا ہوں۔ جہاں تک طے شدہ علامات برتنے کا معاملہ ہے تو ہاں ایہام پیدا نہیں ہوتا، البتہ غیر متعین علامات کا استعمال ایہام کا باعث بنتا ہے۔ اس لیے کہ طے شدہ علامات کی چٹائی لائن تو ہماری داستانِ ادب و ادب،

شعوظات اور حکایات سے ہے جبکہ غیر متعین یا خالصتاً فنی احساسات سے متعلق علامات برتتے ہوئے محض اپنی تدویر کاری سے کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے لیکن یہ سب کے بس کی بات نہیں۔

اوردافسانے کو بڑھادارینے کے سلسلے میں اردو میں لکھے گئے افسانوں کی انتخاولیہ حمار سے اس شائع ہوتی رہی تھی اور یہ سلسلہ جاری رہے گا لیکن اب تک جو انتخابات کتابی صورت میں چھپ کر سامنے آئے ہیں ان کے مرتبین عام نوع کی افراط و تفریط کا شکار دکائی دیتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ کہ ”پندرہ اپنی اپنی، خیال اپنا“چ“ لیکن افسانوں کے انتخاب کا کام اکمل اس کہاوت سے اوپر اٹھتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ یہ اس کے باوجود ہوا کہ انتخاب کرنے والوں میں ہر دور کے اہم نام بھی دکھائی دیتے ہیں۔

اب تک شائع شدہ اوردوافسانوں کی اکمل انتخاولیہ ایک سرسری نظر ڈالنے پر ہی اس بات کا ثبوت خود فراہم کر دیتی ہیں کہ مرتبین افسانہ نگاروں کا چناؤ کرتے وقت اپنی مخصوص کردہ پندروں، مخصوص نظریات اور افسانہ نگاروں سے قربت کے برچھو کہ بہار کے۔ مثلاً اردو افسانے کی اولین انتخاولیہ ”اٹھارہ“ مرتب احمد علی (مطبوعہ ۱۹۳۲ء) میں محمود اظہر کی شمولیت، انگریزی میں شائع ہونے والی ہندوستانی افسانوں کی اولین انتخاولیہ ”Indian Short Stories“ مرتب ڈاکٹر ملک راج آند (مطبوعہ ۱۹۳۶ء) میں علیہ صیب اند کی شمولیت، انگریزی کی مرتب کردہ انتخاولیہ ”میرا پندہ، افسانہ“ میں دیوانہ مصطفیٰ آبادی اور شیا میر کی شمولیت محض مخصوص نظریات اور کردہ بندی کا شکار ہے اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔ یوں دیکھا جائے تو بیشتر انتخاولیہ میں جہاں بھر پورا انتخاب کا عمل دکائی نہیں دیتا اور جاری مخصوص صورت زدگی آتی ہے وہیں افسانہ نگاری کے تقریباً ہر دور کی کیفیت سے کسی قدر آگاہی ضرور ہوتی ہے۔ ان شائع شدہ انتخاولیہ کی تاریخی حیثیت ہر طور سے اوردافسانوں کے یہ انتخاب اپنے اپنے مخصوص دور کے کاغذ بہرہ سمیت اچھی تجلیات کو اپنی اندر سینے ہوئے دکائی دیتے ہیں۔ اپنے میں وہ انتخاولیہ میں نے بھی مرتب کیں، ان پر ابھی ایک نظر ڈال لیجیے تفصیل ملاحظہ ہو۔

۱۔ ”اٹھارہ“ مرتب احمد علی، مطبوعہ۔ لکھائی پریس، دکنو، پراستریٹ، لکھنؤ، طبع اڈال۔ دسمبر ۱۹۳۲ء، کل صفحات ۱۳۳۔

اس مجموعے میں کل چار افسانہ نگاروں کے نو افسانے اور ایک ڈراما ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔ ”خندہ نہیں آتی“، ”جنت کی پٹارت“، ”گرمیوں کی ایک رات“، ”دلاری“، ”دور“، ”بھریہ بھارہ“ (از سید سجاد ظہیر)، ”بادل نہیں آتے“، ”دور“، ”مہمانوں کی رات“ (از احمد علی)، ”دلی کی سیر“ اور ”پردے کے چھپے“ (از رامانند رشید جہاں اور ”بھانرونی“ (از محمود اظہر۔ آخر اڈالہ کہ افسانہ انگریزی میں لکھا گیا تھا جسے سید سجاد ظہیر نے اردو میں ترجمہ کیا۔

۲۔ ”Indian Short Stories“ مرتب۔ ڈاکٹر ملک راج آند وادقیال، لکھنؤ، مطبوعہ۔ دلی نواطی پبلیشنگ کمپنی اینڈ بھرے اردنگ سٹریٹ، لندن، طبع اڈال۔ ۱۹۳۶ء، کل صفحات ۱۹۳۔

اس مجموعے میں سول افسانہ نگاروں کا ایک ایک افسانہ شامل ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

”Castaway“ از ڈاکٹر راجندر راجہ ٹیکور، ”Drought“ از سر جتندر جی، ”Resignation“ از پریم چند، ”Javni“

از راجا راجندر، ”A Kashmir Idyl“ از ڈاکٹر ملک راج آند، ”Coachman And The New

Constitution“ از سجاد حسن منٹو، ”Our Lane“ از احمد علی، ”Fellow Feeling“ از آرم کے راجہ، ”Little

Mother“ از مصمت پٹائی، ”The Mathematician“ از ڈاکٹر سراجیم، ”One Day“ از بنگل کشور خٹا، ”The

- ۳۔ "Parrot in the Cage" از علیہ صییب اللہ، "Swallows" از علویہ احمد عباس، "The Stars" از راجا دتتم، "When One is In It" از اقبال نگہ اور "Boatman Tarini" از نیر اشکر یونی۔
- ۴۔ "کامیاب افسانے" "مرحبہ" وزارت اخباری، سوال ایجنٹ، صدیقی بک ڈپلکھٹو مطبوعہ حیدر آباد کن، طبع اول ۱۹۳۳ء، میں علی عباس مصنیٰ، بھنوں گو کچھوری، پانچوڑی، پری مایم، اسلم اور ظفر قریشی کے علاوہ متعدد افسانہ نگاروں کے افسانے شامل کتاب ہیں۔
- ۵۔ "صدیقی افسانے" "مرحبہ" اور الاثر حقیقہ جالندھری (مصنفین اور مترجمین کے نام درج نہیں) مطبوعہ مجلس "آرڈو" "کتاب خانہ حقیقہ" آرڈو بازار راجا پوٹیل کلاں۔ ۱۹۳۳ء۔
- ۶۔ "سات تارے" "مرحبہ" سید وحی اشرف دہلوی، سوال ایجنٹ صدیقی بک ڈپلکھٹو طبع اول ۱۹۳۹ء سے قبل۔ قیس راجپوری، اکیلم اسلم، شاہ احمد جوی، انصار سامری، فضل حق قریشی دہلوی، عاشق صیدی اور سیدنا طاہر کے افسانے شامل کتاب ہیں۔
- ۷۔ "خامکار افسانے" میں صدیق حسن، علی عباس مصنیٰ، ایم اسلم، عابد علی اور اسلم کریمی کے افسانے شامل کتاب ہیں۔ "مرحبہ" بھراؤوری، سوال ایجنٹ صدیقی بک ڈپلکھٹو طبع اول ۱۹۳۹ء سے قبل۔
- ۸۔ "بھریں افسانے" "مرحبہ" علی احمد مطبوعہ دفتر رسالہ احسان گو حیدر آباد کن، طبع اول ۱۹۳۹ء سے قبل۔
- ۹۔ "نگارستان" "مرحبہ" اختر شیرانی، مطبوعہ لاہور۔
- ۱۰۔ "روز و رات" "مرحبہ" شاہ احمد دہلوی، مطبوعہ ساقی بک ڈپلکھٹو، طبع دوم ۱۹۳۳ء، رسالہ "ساقی" دہلی میں ۱۹۳۳ء تک شائع ہونے والے ۵۰ افسانوں کا انتخاب۔
- ۱۱۔ "سیرا بھریں افسانہ" "مرحبہ" محمد حسن عسکری، مطبوعہ ساقی بک ڈپلکھٹو، دہلی، طبع اول ۱۹۳۳ء، کتاب میں محمد حسن عسکری کے دواچہ پر ۳۰ جملائی ۱۹۳۳ء کی تاریخ درج ہے۔
- ۱۲۔ اس کتاب میں علی چودہ افسانے شامل ہیں۔ آخر میں افسانہ نگاروں کے حالات زندگی اور فن سے متعلق ان کی اپنی تحریریں شامل ہیں افسانوں کی تفصیل "بچپن کا چم" "آزاد چودہ" "تھو اٹک" "ناما رنگ اور بھول بھلیاں" "آزاد اختر اور بڈی"، "مجھے جانے دو" "آزاد اختر حسین رائے پوری"، "تیسری ہنس"، "آزاد پوری اور علی رود علی"، "کنگ پاش"، "آزاد محمد رستگار قری"، "دس منٹ پاش میں"، "آزاد چند سنگھ بیدی"، "نئی سیمینٹیں"، "آزاد رشید جہاں"، "پارہیت"، "دہلی عباس مصنیٰ"، "آزاد ندی"، "ازلام عباس"، "بھیل سے پہلے بھیل کے بعد"، "آزاد کرن چند"، "ماتھے کاٹی"، "آزاد ممتاز دھنی"، "آزاد محمد ہادی"، "آزاد محمد حسن عسکری"۔
- ۱۳۔ "منتخب افسانے" "مرحبہ" قمر حسین، مقدمہ از مولانا حبیب الدین، سلیم مطبوعہ عالمگیر بک ڈپلکھٹو مطابا بازار لاہور، طبع اول ۱۹۳۳ء سے قبل۔
- ۱۴۔ "نئی راہیں" "مرحبہ" قمر حسین، مطبوعہ عالمگیر بک ڈپلکھٹو مطابا بازار لاہور سر کٹواں چرکس، طبع اول ۱۹۳۳ء۔
- ۱۵۔ "نئی راہیں" "مرحبہ" قمر حسین، مطبوعہ عالمگیر بک ڈپلکھٹو مطابا بازار لاہور، طبع اول ۱۹۳۳ء۔
- ۱۶۔ "نئی افسانے" "مرحبہ" قمر حسین، مطبوعہ عالمگیر بک ڈپلکھٹو مطابا بازار لاہور، طبع اول ۱۹۳۳ء۔
- ۱۷۔ "نئی افسانے" "مرحبہ" قمر حسین، مطبوعہ عالمگیر بک ڈپلکھٹو مطابا بازار لاہور، طبع اول ۱۹۳۳ء۔
- ۱۸۔ "نئی افسانے" "مرحبہ" قمر حسین، مطبوعہ عالمگیر بک ڈپلکھٹو مطابا بازار لاہور، طبع اول ۱۹۳۳ء۔
- ۱۹۔ "نئی افسانے" "مرحبہ" قمر حسین، مطبوعہ عالمگیر بک ڈپلکھٹو مطابا بازار لاہور، طبع اول ۱۹۳۳ء۔
- ۲۰۔ "نئی افسانے" "مرحبہ" قمر حسین، مطبوعہ عالمگیر بک ڈپلکھٹو مطابا بازار لاہور، طبع اول ۱۹۳۳ء۔
- ۲۱۔ "منتخب افسانے" "مرحبہ" قمر حسین، مطبوعہ عالمگیر بک ڈپلکھٹو مطابا بازار لاہور، طبع اول ۱۹۳۳ء۔

۱۷۔ ”انگو پاپ“ مرتبہ: احمد عظیم قاسمی، مطبوعہ: اردو دانش صفا اردو میڈیا پبلیکیشن، طبع اول، ۱۹۳۳ء

۱۸۔ ”نقاش طیف“ مرتبہ: احمد عظیم قاسمی، مطبوعہ: اردو دانش اردو، لاہور، طبع اول، ۱۹۳۳ء

(چوتھا نمبر، افسانوں کا انتخاب ہے)

۱۹۔ ”نئے نئے“ مرتبہ: عبدالرحیم شفیق (بی۔ کام)، مطبوعہ: بیسویں صدی، بی۔ بی۔ ان شاہ عالمی اردو، لاہور، طبع اول، ۱۹۳۵ء

کرشن چندر، ممتاز ذوق، سید فیاض محمود، اختر حسین رائے پوری، مراد حسن، جیدی، میرزا ادیب، شفیق الرحمان، سید احسان علی شاہ، ہاجرہ سرور، سکیل عظیم آبادی، منیر علی مستور، جمیل ملک، ناصر شہزاد، پاشا گلبرہ، آسن ڈار اور پرتھوی ناتھ شرما کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۲۰۔ ”ستاروں کی محفل“ مرتبہ: بشیر ہندی، مطبوعہ: ہاشمی بک ڈپو، لاہور، طبع اول، یکم ۱۹۳۶ء

۲۱۔ ”ستاروں کے کھیل“ مرتبہ: بشیر ہندی، مطبوعہ: ہاشمی بک ڈپو، لاہور، سنہ ۱۹۳۷ء

۲۲۔ ”پامیوینا“ مرتبہ: حکیم یوسف حسن، مطبوعہ: مکتبہ ادب، دہلی، طبع اول، سن

عبدالحمید سالک، سلطان حیدر جوش، حکیم چند، سید نصیر احمد (ڈپٹی کلکٹر)، حسن کھانی، سدرتن، نذیر شاہ حیدر، علی الدین سالک، ایم۔ اسلم، حامد انصاری، بھیس ناتھ اور حکیم یوسف حسن کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۲۳۔ ”کھا کے افسانے“ مرتبہ: ڈاکٹر اختر حسین

۲۴۔ ”سات سترے“ مرتبہ: شاہد احمد بلوی، مطبوعہ: ساقی بک ڈپو، دہلی۔

۲۵۔ ”ظہور و غروب“ مرتبہ: جمیل احمد

۲۶۔ ”اس بات کو سنو“ مرتبہ: قاضی زبیر علی، مطبوعہ: لاہور۔

۲۷۔ ”چاند کا گناہ“ مرتبہ: راجہ سیدی علی خان

۲۸۔ ”نکیت، ناک افسانے“ مرتبہ: اعتبار علی، تاج، مطبوعہ: اردو دانش صفا، لاہور۔

۲۹۔ ”گروہ افق“ مرتبہ: اکرام اختر

۳۰۔ ”تجہ“ مرتبہ: سافرخ کھانی، ”رسائل انشیاہ“، میرٹھ (۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء) سے افسانوں کا انتخاب

۳۱۔ ”نئے نئے“ (دو حصے ہیں) مرتبہ: کرشن چندر

۳۲۔ ”میں کے سامنے میں“ مرتبہ: کرشن چندر، مکتبہ سلطان، دہلی، طبع اول، ۱۹۳۹ء

۳۳۔ ”نئے کھانیک“ مرتبہ: آر پی ناتھ (صدر قلمی)، قاضی سلیم (نویسٹر)، جگمند پال، بشیر نواز، بھگونت رائے، ڈاکٹر نعیم

الدین، ڈاکٹر مفتی الدین صدیقی، ڈاکٹر بی بی انجی راجدر، کرشن چندر، ڈاکٹر مبین شاہ کر۔ مطبوعہ: مرزا نذیر احمد، لاہور، دہلی، اور ممبئی، ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔

۱۹۴۳ء۔

جیدی، قمر الحسنی، حیدر، کرشن چندر، منظور، اقبال مجید، اقبال حسین، جیلانی، بانو، قاضی عبدالستار، جگمند پال، حکیم حیدری، انور عظیم، ماسم علی، سرتن

گلبرہ، مرشد علی کاش، شران کمار، انجلیات احمد گدی، سراج حسین، احمد یوسف، آغا یونس اور ظفر اکاؤٹی کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۳۴۔ ”میرا ہندیہ افسانے“ مرتبہ: بشیر ہندی، مطبوعہ: اردو گل، ۲۵ سکیل روڈ، لاہور، سنہ ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔

۳۵۔ ”محب اور سحر“ مرتبہ نگار پاشی مطبوعہ سطور پبلی کیشنز، دہلی طبع اول ۸۰ء۔ ۷۷۷ء

قرۃ العین حیدر، غیاث احمد گدئی، طراج عین راسرید پرکاش، جوگندہ پال، اقبال حسین، دین سنگھ، اقبال مجید، دوجہ داس، شرون کمار و دیگر نگار پاشی، طراج کول اور راج کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۳۶۔ ”بھرتی کی کہانیاں“ مرتبہ انوار ہادی، احمد ذوق مطبوعہ دوجہ پبلی کیشنز، دہلی طبع اول ۸۰ء۔ ۷۸۰ء

”کشتہ ایک رات کا“ از انور ظہیم، ”رات“ از انکار حسین، ”پاتال“ از جوگندہ پال، ”لا“ از کلام حیدری، ”ذوب جانے والا سورج“ از غیاث احمد گدئی، ”شرمندگی“ از اقبال مجید، ”نئی بھارت“ از منصور قیصر، ”مقتل“ از طراج عین راسرید، ”مختار مرزا“ از سرید پرکاش، ”کارشیش گراہوا ٹھم“ از امجد بخش، ”پرندہ“ از خالدہ حسین، ”کینسر“ از انور سجاد، ”گلے میں آگاہ ہوا شہر“ از رشید احمد، ”بارہ ماہ“ از عظیم الاسلام، ”پیلے آسمان کا زوال“ از نگار پاشی، ”سوئے کی صبر“ از مرزا حامد بیگ، ”نور سانس کی رات“ از سچ آہجہ، ”خلیلا“ از مسافر راجدی، ”پیدا پاگل“ از حمید سرور دی، ”سچ کا چہرہ“ از قمر عباس ندیم، ”اندک کا جنم“ از علی حیدر بیگ، ”سیر علی“ از رضوان احمد، ”غائب گھر قیصر“ از احمد ذوق و ”یالی“ از انوار ہادی شامل کتاب ہیں۔

۳۷۔ ”صعربندی بھرتی کی کہانیاں“ مرتبہ امجد بخش مطبوعہ الدبا قریہ پبلی کیشنز، کراچی۔

۳۸۔ ”آزاد کے تیرہ افسانے“ مرتبہ ڈاکٹر الطیر دوجہ مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، مطبعہ نذر علی مارکیٹ، دہلی گڑھ طبع اول ۸۰ء۔ ۷۸۰ء

۳۹۔ ”کھارے پندہ افسانے“ مرتبہ ڈاکٹر الطیر دوجہ مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، دہلی گڑھ طبع اول ۸۲ء۔ ۷۸۲ء

۴۰۔ ”آزاد افسانہ نگاران کا ر“ مرتبہ ڈاکٹر فران سچ پوری مطبوعہ ”کتبہ ہندو لٹریچر“ دہلی۔

(۳۵ افسانہ نگاروں کے احوال و آثار کے ساتھ ان کے اولین افسانوں کا مجموعہ)

۴۱۔ ”اتحاد افسانہ“ مرتبہ ڈاکٹر سید محمد عقیل مطبوعہ اتر پردیش آزاد کینیڈا طبع اول ۸۰ء۔ ۷۷۷ء

پریم چند، جی اے اے، شمس، کرشن چندر، منو، جیدی، صصت چٹائی، نظام عباس، خواجہ احمد عباس، قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالستار، اقبال مجید، امل حق سنگھ، جیلانی، نو، کلام حیدری اور دیگر سبیل کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۴۲۔ ”بھرتی کی کہانیاں“ مرتبہ ڈاکٹر علی احمد عالمی مطبوعہ کتابستان ۳۰، پک ۱۰، دہلی گڑھ طبع اول ۸۰ء۔ ۷۷۷ء

۱۹۷۰ء کے بعد بھارت میں لکھے جانے والے افسانوں کا انتخاب۔ قاضی عبدالستار، انور سجاد، انسوارہ، حامد سبیل، خالدہ حسین، غیاث احمد گدئی، جوگندہ پال، سرید پرکاش اور شفق کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

۴۳۔ ”پریم چند صدی کے افسانے“ مرتبہ اتر پردیش آزاد کینیڈا مطبوعہ اتر پردیش آزاد کینیڈا بھرتی طبع اول ۸۳ء۔ ۷۸۳ء

یہ دسمبر ۱۹۸۰ء میں پریم چند صدی کے سلسلے میں منعقد اور روزہ سیمینار میں چمے جانے والے افسانوں کا انتخاب ہے۔ خواجہ احمد عباس، صصت چٹائی، قرۃ العین حیدر، سام گل، غیاث احمد گدئی، جوگندہ پال، جیلانی، نو، سچ آہجہ، رضوی، بھیش پرکاش، حامد سبیل، طراج چندری، امرت لال، ناگر، رضوان احمد، مانو، سرور دی اور دیگر افسانے شامل کتاب ہیں۔

۴۴۔ ”نسوانی آوازیں“ مرتبہ مرزا حامد بیگ مطبوعہ سانس پبلی کیشنز، دہلی گڑھ طبع اول ۸۶ء۔ ۷۸۶ء

یہ خواجہ افسانہ نگاروں کا انتخاب ہے۔ کتاب انتہائی اعلیٰ، صالحہ حامد حسین، سر محمد انوار، رشید عباس، صصت چٹائی، بلکلیا اختر، انیم ظہیم

پستادری، صدر حق، حکیم سید ہادی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، قرۃ العین عید، رحیمہ ہزار گلیم، ممتاز شیریں، دیپالی بانو، واجدہ نجم، جمیلہ ہاشمی، انورہ سید، الطاف فاطمہ، آمنہ ہیرا لکھن، معراج بخاری، ذریعہ، سجاد، علیہ سید اور حکیم احمد شیر کے افسانے شامل انتخاب ہیں۔

۳۵۔ ”پاکستان کے شاہکار اردو افسانے“ مرتبہ: مرزا حامد بیگ، مطبوعہ انجمن تلمیذ، اسلام آباد، مئی ۱۹۷۷ء۔

غریب ہاجرہ، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور، انتصار حسین، اے۔ عید، الطاف فاطمہ، اسد محمد خان، جناب اشتیاق علی، ممتاز مفتی، شاکست صدیقی، صادق حسین، اشفاق احمد، محمد خالد اختر، خان فضل الرحمن، جمیلہ ہاشمی، محمد عمر حسین، معراج بخاری، تقی حسین خسرو، طارق محمود، حمیر الدین احمد، غلام عباس، محمد احسن فاروقی، ضمیمہ الدین احمد، رحمان غنی، قدس اللہ شاہ، آغا ہاجرہ، احمد شریف، محمد سعید شیخ، ہاجرہ مسرور، حسن منٹو، سید باقر سلیم، انور سجاد، محمد سلیم الرحمن، محمود احمد قاضی، مسعود اشعر، مسعود مفتی، خالدہ حسین، رشید احمد، شکاریان، محبوب الرحمن شیخ، ذکا، الرحمن، مشرف احمد، احمد داؤد، احمد ہادی علی، مجاہد، اسلم سراج الدین، یوسف چودھری، آصف قرنی، احمد فضل اور مرزا حامد بیگ کے افسانے شامل کتاب ہیں۔

”اردو افسانے کی روایت“ میں۔ میں نے اردو افسانے کی ذمہ دار روایت سے تحقیق اپنے معیہ Thesis سے مزیدہ رکھنے والے افسانہ نگاروں اور ان کے تراجم، افسانوں کا مجموعہ لگانے کے ساتھ منتخب افسانہ نگاروں کے احوال و آثار تکم کرنے کا چاہیہ بھی کیا ہے تاکہ کتاب کے مزیدہ قاری اور ناقد کو اردو افسانے کی چھان چنگ میں کسی نوع کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ افسانوں کے اس انتخاب کو ترتیب دیتے وقت کوشش کی گئی ہے کہ یہ انتخاب ان اردو افسانے کی صد سالہ ذمہ دار روایت کی جملہ کرداروں کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ ایک مربوط تاریخ کا تاثر بھی دے۔ تاکہ آج پورا آنے والے نکل کے ناقد اور افسانہ نگار کو نہایت پسندی اور ترقی مطرب زندگی سے نجات حاصل کرنے میں آسانی ہو اور بخاری فسانہ طرازی کے س کھوئے ہوئے مشرقی فن کی بازیافت کا عمل ممکن ہو سکے۔ جس کے بغیر یہ لی ادبی منظر تارے پر بخاری شاکست ملی ہوئی ہے۔



”اردو افسانے کی روایت“ کے اس نظر جانی اینڈ لٹری میں چند نظری مہاسف، اردو کے اولین افسانہ نگاروں سے تحقیق ایک گوشہ اور اردو افسانے کا صد سالہ اسلو جاتی پر نرہ لگی چیزیں ہیں۔ پہلے سے شامل کردہ افسانہ نگاروں کے کوائف میں اضافہ ہاتھ نہ رہی تھے۔ افسانوں کے انتخاب کی سطح پر چند سبب نام اس اینڈ لٹری سے مخصوص ہیں البتہ اب بھی اردو افسانے کی ایک چیدہ افسانہ نگار ایسے ہیں جن کے افسانے ”اردو افسانے کی روایت“ میں زیر بحث تو آئے ہیں لیکن افسانہ نگاروں کے کوائف اور افسانے اس انتخاب کو کا حصہ نہیں بن پائے۔ وجہ اس کتاب کی خلافت بھی ہے اور میری ہی غریب کردہ دور و دور اٹھا لکھو بھی۔ میں نے ”نسوانی آواز“ اور ”شاہکار اردو افسانے“ میں ان افسانہ نگاروں کے کوائف اور افسانے لکھا کر نے میں اپنے تئیں حق کی ہے۔

مرزا حامد بیگ
دسمبر ۲۰۰۹ء

صدر شعبہ اردو، ذی آف آرٹس
گورنمنٹ اسلامیہ کالج، لاہور

داستان نگاری کی روایت اور اُردو افسانہ

”ہم سب گوگل کے آؤر کوٹ میں سے برآمد ہوئے ہیں۔“ یہ جملہ دوستوں کی گفتگو کا حصہ تھا اور اگرچہ اس کا ذمہ غنی زوی افسانہ نگاروں کی طرف تھا لیکن یہ قول زوی اور غیر متعلقہ ہندوستان کی اُردو دنیا پر بھی صادق آتا ہے لیکن جزوی طور پر۔ گوگل نے دنیا کا پہلا افسانہ ”آؤر کوٹ“ ۱۸۴۳ء میں لکھا تھا مگر افسانے سے متعلق بخیر کوئی نظریہ سازی کیے بغیر اسی سال ایڈگریٹن جی نے مختصر افسانے کے علمی اصول وضع کیے۔ یوں ہمارے پاس مختصر افسانے کی ابتدا نہ تو سراسر گوگل کے ذریعہ ہوئی اور نہ ایٹن ایڈگریٹن کے وضع کردہ اصول و ضوابط کے تحت۔ ۱۹ویں صدی عیسوی کے آخری دہے میں انصاری ضرور بات کے تحت محمد حسین آزاد اور پیارے لال آشوب کی تاریخی نگاری، رنگ و بو، لہجہ، طنز، محزون، زمانہ ماضی، گزشتہ، المناظر، انتخاب، لاجواب، بارہوئے ماضی، روزِ ہند، زمیندار، مصمت، تہان اور مصمت کی محدود خدمات کی تجویز کے تحت عبدالعلیم شرر، فیض الحسن، شیخ بہت لال، درمن، خواجہ ناصر علی، فراق، دہوی، طلوع، عبدالرؤف، مشرت، لکھنوی اور میر باقر علی داستان گو کے خاکہ پر مختصر قصوں اور دیگر لہجوں سے تراجم نے اُردو افسانے کے لیے راہ ہموار کی۔ جب کہ داستانوں سے مخصوص جہتِ ذہنیت کا حامل مختصر قصہ ”ایک چاندنی رات کا منظر“ (۱۹۰۴ء) اور ”قرب احمد“ (۱۹۰۴ء) اُردو افسانے کا احاطہ نامہ ہے۔ ابتدا میں شرک افسانہ نگاروں نے سچا سچہ زندگی کی راہنمائی کی اور راشد الخیری کی معرفت اُردو افسانے کے لیے ابتدائی ماڈل کو لیے لیے فراہم کیا، سلطان حیدر جوش نے افسانہ نگاروں کو اور سرسٹ نامہ کو راہنما بنایا، چودھری محمد علی دہلوی نے اُردو داستان سے قصہ گوئی کی بھی لکھی آسکر و اللہ اور برنارڈ شا بھی ان کے جوش نظر پر جب کہ ہم چند کی معرفت جس افسانے کا بھلے نامہ ہمارے گوگل اور ایڈگریٹن جی کے شاخ اثرات سمیٹے ہوئے تھا۔

ہمارے فاضل محققین اور ناقدین (جن میں پرویز حسرت، عظیم جیش جیش تھے) نے اس آخری تاثر کو کچھ اس شدت کے ساتھ مسموٰی کر دیا کہ ہم داستان پر ہم چند کو اُردو افسانے کا بانی قرار کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ عالمی افسانے کی تاریخ میں گوگل اور جی کے حوالے سے ۱۸۴۳ء کا سال اہمیت کا حامل ضرور رہا ہے لیکن جہاں تک اُردو افسانے کی ابتدا کا تعلق ہے، یہ سترہ سال ہمارے لیے جہاں اہمیت کے حامل نہ تھے۔ اس وقت کا ہندوستان قریبی اظہار آزادی کی جنگ لڑنے کی تیاریاں کر رہا تھا، سلطان حیدر جوش۔

”حقیقت یہ ہے کہ میری عمر ۱۸۵۷ء میں شروع ہو کر ۱۸۵۹ء میں زوال اور پھر ۱۸۶۰ء میں ختم ہوئی۔ جب انگریزوں نے پنجاب سے لے کر

پگال تک کی فوجیں فتح کر کے حکومت پر چڑھائی کی اور ذوال کھٹو کے وقت ہمارے شاہ ہے کہ اگرچہ فوجیں کھٹو کی گلی گلی اور دروازہ دروازہ پر سے وطن پرستوں کی لاشوں پر سے گزر کر جوتھیں اور فوجی کا قوس لہم و مسلمان مرداروں کو اس وقت اتفاقات میں قائم کیا کہ کسی پرانے نقطہ کے بعد خطرے کے نوازا تے پیش کر رہا تھا اور نہایت شہت آلود میں۔"

یہاں سلطان حیدر جوش نے گوالیار پر کے زیر اثر ڈھیلے ڈھالے مغربی افسانے کے پروردہ افسانہ نگار پریم چند پر اس کے ایک مشہور افسانے "خطرے کی بازی" کے حوالے سے چھپے کی ہے، جسے خالی شربت یا نندہ دایت کا دار اور پروڈیجر سرتیہ جیت، رے "خطرے کے کھلاڑی" کے نام سے لکھا ہے۔ ویسے دیکھا جاسکے کہ اس دور کے ہندوستان کو کس نوعیت کے تہذیبی، سیاسی اور اقتصادی حالات کا سامنا تھا اور ہمارا کہانی کار داستان پروردہ، ماحول سے جوا وطن کے بعد کس کچھ پر آ کے بڑھنے کی سوچ رہا تھا۔

فاضل جید میں ڈاکٹر جہان نگر سٹ نے ۱۹۶۷ء میں دیکھ فیکسیٹر کے دو راہوں "مسلک" اور "ہلری ہضم" کے چیدہ اقتصادات کا ترجمہ کر کے ہندوستانی ادیب کو جو روٹھائی تھی "اور فاضل قریب میں ہمارے حزمین نے ۱۹ویں صدی کے خاتمے تک درج ذیل مطلوبہ کام یا کار پھوڑا تھا

۱۔ "تھکر کہاں" از حیدر علی حیدری مرتب، حمایت بریلوی، مطلوبہ، آندونیا، کراچی، طبع اول: ۱۸۶۱ء

۲۔ "تواریخ و سلسلہ شہزادہ جوش کی" از ڈاکٹر سونگ جانش اسید محمد میر کھٹو، المعروف کمال الدین حیدر مطلوبہ، گرین وے پریس، آگرہ، طبع اول: ۱۸۳۹ء

۳۔ "نکایات قصان" از حکیم نقان، انکھام الدین، مطلوبہ، بھتی، نام مطبعی دار اور طبع اول: ۱۸۴۳ء

۴۔ "ہنری آف سینڈ فورڈ اور مرہٹوں کا نام" از ڈاکٹر سونگ جانش، مطلوبہ، دار نام مطبعی دار اور طبع اول: ۱۸۵۵ء

۵۔ "قصہ بزرگہ جانش کروڑ" از ڈاکٹر سونگ جانش، نام مطبعی دار اور طبع اول: ۱۸۶۲ء

۶۔ "دادو یا" از ڈاکٹر سونگ جانش، نام مطبعی دار اور طبع اول: ۱۸۷۱ء

۷۔ "اعمال نامہ دوس" از ڈاکٹر داس، نام مطبعی دار اور طبع اول: ۱۸۷۸ء

۸۔ "ہلری" از جوش، نام مطبعی دار اور طبع اول: ۱۹۰۰ء

یاد رہے کہ ۱۸۵۵ء کی ناکام جنگ آزادی کے احوال و آثار نے (ذوال اور ۱۸۵۹ء سے ۲۰ویں صدی کے آغاز تک) تقریباً چھ برس کی مدت ہمارے افسانہ نگار صاحب نے لی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب داستان کی روایتی لغات سے حقیقت سے ٹکست کھائی اور سرسید احمد خان کی عقل حقیقت پسندی نے ہماری تہذیب کی وہ سرری شعریات، عقلت عقل کر کے رکھ دی، جو سرسید سے پہلے کی تہذیب کا طرہ امتیاز سمجھی جاتی تھی۔

داراشکوہ کی شکست اور ۱۸۵۷ء کا بنگالہ مس، جہاں داستان کی روایتی فضا کو مٹا دیا، یہاں داستان کی معنویت سے بھی ہم کو سوں دور ہمارے جوا دارے فاضل کی آئینہ دار تھی اور جہاں انسان کی حیثیت محض نام کی ہے۔

داستانوں کا اجتماعی مطالعہ کرنے والوں میں سوشلائزمی کے ماہرین داستان کو انسانی معاشرے کے خاص دور سے متعلق بتاتے ہیں اور نفسیات، اس نفسی الجھنوں کی طرف لے جاتے ہے البتہ سنگھنڈ لڑ پھیل، المارڈا، اناروشت جوت اور آؤر ایک سے آگے نکل کر فاضل کے

انسان کی سوچ کے قصص کے سلسلے میں کارل یونگ نے دیج بالا اور مذہب کے مطالعے سے اجتماعی لاشعور کی چھان بھنگ کرتے ہوئے تاریک گوشوں تک رسائی حاصل کی ہے۔

کارل یونگ کی اس آری کی اپیل (Archetypal) تہذیب کے مطالعے میں تھور فریڈر (معصوم "Golden Bough") اور اس کے مقلدین، داستان کا مطالعہ اجتماعی لاشعور کے ساتھ لطرت کے عمالی کی روشنی میں کرتے ہیں۔ جب کہ طبعی زمر اور جوزف کیمبل نے باہر تہذیب ہماری دو داستانوں "سے تالی بھیجی" اور "الف لیلی" کا مطالعہ مشرق کے دیج بالا کی سانچوں کی روشنی میں کیا ہے۔ کاش ہمارے ہاتھ میں اور اہل علم طرہ بازی کے دیو سے ہماروں کو یہ فیض ملے کہ داستانوں میں رواں مشرق کی اس خاص خوشبو کی چھان نہ لے سکتے۔ اب بھی کئے وقت گزراؤ، لادری جا سکتے ہیں۔ دیکھنا ہے کہ داستان، جو ہمارے قلم بھید کا مال کے نام پیغام ہیں، ہم سے کتنی کیا ہے؟ (گو اس سلسلے میں بھی اختلاف رائے موجود ہے۔ کارل، ایک خیالی قوی بنایا جاتا ہے کہ داستان انسانی شخصیت کے مختلف امکانات کو سامنے لاتی ہے۔ یعنی لطرت کے ساتھ انسانی انا کا تصادم اور یہ کہ تفسیر کا نکتہ حاصل آج بھی جاری و ساری ہے۔

دوسرے مرکزی کردار کا خود اپنی ذات میں اور ذات سے باہر سفر ضروری ہے۔ "سفر کے لیے محرک جذبہ حقیقی کا ہے اور اس سفر میں کامیابی خدا کی طرف سے تو فیض ملے پہنچی ہے یعنی کامیابی کے لیے تائید بھی ضروری ہے گو یہ مشورہ اپنی ذات میں کم ہو کر حاصل نہیں ہوتا اس کے لیے یہ شرط پر لکھا از م ہے، بلکہ تائید نہیں سے مراد کا نکتہ کی اصل توحش ہیں، جو غیر طلب ہیں۔ ہماری داستانوں میں مشرقی داخل اور مصروف طرز احساس کی یہ خصوصیت ایک اتنی کم قیمت دینی جتنا ہم نے خیال کیا۔

مختصر یہ کہ داستان ہماری آزاد خیال معاشرت کی خوشیوں، خوابوں، امیدوں اور وسوسوں کا علاقہ اتحاد ہے، دار الحکومت کی بھگت بھر ۱۸۵۵ء کے ہنگام کے بعد کی کہ تاریک کی متعلق حقیقت پسندی اور معاشرت سے دور جگہوں نے جو ضعف پہنچایا اس سے ہم کو اپنی آگاہ ہیں۔ ہماری داستان ہماری کی روایت کے آخری ذمے نام بھر باقر علی داستان کو نے خاصا مسلم حوالوں سے "داستان امیر جزء" لکھ کر داستانوںی افواہ کی بازیافت چاہی تو نام کامر ہے اور آخر کار ہم بھی جوہر کی کور پر اٹل تحریک کی ہم آئی میں "کارٹے خاں کا کفر" اور "مطلح جان کی طلاق" "اڈا اڈم" اور "معدہ ہاشمی" جیسے رسالوں یا دیگر نمونے۔

خواجہ عبدالرحیم شہر تہذیب، طبعی، صوفی، صوفیہ، عرفانی، ادبی اور آفتاب احمد نے بھر باقر علی کے تجربے کو دیرانے کی بجائے مختصر فریسی کو شہر کیا لیکن ان کے پاس تجربہ کورہ اہمیت، حاصل نہیں رہی جان کے بعد آئے والوں خصوصاً دانشور الخیری، علی محمود، وزارت علی اور بی۔ عکیم یوسف حسن، بہادر حیدر، عیدم، پریم چند، سلطان حیدر، جوش، اور محمد علی بدوئی کے پاس دیکھنے کو ملتی ہے۔ طبعی صاحب کا سارا اور باطنی قریب کے جیسے تجربے (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء) کو صوفی سانچے پہنچنے میں صرف ہو گیا۔ لے اے کہ ان کی تحریروں سے دینی کی مسلم معاشرت، رسوم و رواج، لال قلعہ کی زندگی، امراء کے مٹ غل، بددینی کے سیلوں اور چہاروں کا احوال معلوم ہوتا ہے۔

طبعی، صوفیہ، عرفانی کی مشہور تصنیف "لال قلعہ کی ایک بھگت" "نظمی خانم المعروف بی دکن کی سانی کی کہانیاں" پہنچی ہے۔ نظمی خانم، جنہوں نے لال قلعہ کی زندگی دیکھی تھی اور خود انہیں طبعی صاحب نے ۱۹۴۳ء بمطابق ۱۹۵۷ء میں پہلی بار دیکھا اور سنا۔ یہ کتاب اقبال فرات، مرحوم، کے مکتوبات ہیں اور انہیں جمع کرنے کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ نظریں اسے چاہے کہ ہر جہت حاصل کریں۔ فرات نے باقی کتابیں "تیکوں کی چھپر چھاؤ"، "دکن کی پری"، "دلی کا چراغ لال قلعہ"، "سات انگوٹوں کی کہانیاں"، "طوبی صورت بھگتا"، "دو چہشتان"، "چار

چاند اور تولی کا آخری دوچار" بھی اسی غرض و عایت کے تحت لکھی ہیں۔

غرض نامہ سرخ پر فراہم کی کتاب "لال قلم کی ایک جھلک" کا اختتام دہلی کی ایک قدیم رسم توہ بندی سے حلقہٴ وضاحت پر ہوتا ہے۔ لکھے ہیں۔

"ہاتھوں کے حلقہٴ مشہور ہے، عمرو و دوریا میں جانے یا بھٹت میں، انہیں اپنے طوے، طے سے کام۔ یہ معمولی توہ ہے۔ ورنہ بادشاہوں کے توہ بزاروں خستوں کے سونے چاندی اور چھنی کے برتنوں میں بھی ہوتے تھے، اس رسم کو بادشاہوں سے دہلی والوں نے بھی سیکھ لیا تھا اور شہر میں بھی توہ بندی ہوتی تھی۔ مگر ٹھہرے ۱۸۵۷ء کے کچھ دن بعد سے موقوف ہے۔ اب تولی پارٹی کی گرما گرمی ہے۔"

آرڈر کیشن کی سطح پر بھی سیکھ بھرا داستان کی توہ بندی موقوف ہوئی اور اس کی جگہ "نئی پارٹی" نے لے لی۔ کاش میر باقر علی داستان گو اور خوب نامہ سرخ پر فراہم کی افسانوی تحریروں کو اردو افسانے کے لیے کسی نوع کا باطل تصور کیا جاتا تو آج ہمارا ادب اپنی داستانوی روایت سے اس طور نوا ہوتا ہوتا۔ اس مخصوص میں ایک مثال "ایک چاندنی رات کا کھنڈہ بھار کھیمبر میں" از آفتاب احمد، ملبورہ "مظن" کا ہے۔ جنوری ۱۹۰۴ء داستان سے افسانے تک کے محدود دور سے حلقہٴ انتخاب میں رکھ لی ہے، ملاحظہ کیجئے۔

درحقیقت ہم نے اپنی داستانوں سے لفظ کے طعم کے ہاتھوں شکست کھائی ہے، اس طعم کو تو ذکر اندر کے چھپے ہوئے معانی کی تلاش نہیں کی۔ داستان ہمارے افسانے کے لیے ایک ایسی سپاہی لاکھ بن گئی تھی، جس کا شعور، روایت کے ساتھ ہمارا رشتہ محکم کرتا اور ہم افسانہ نگاری کی اس ذمہ دار روایت سے رشتہ قائم رکھتے ہوئے آج خوش نظر کو مزید تپ ناک بنا سکتے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ کہ داستان کی طاقتور شرقی سپاہی لاکھ سے ہم بے یکتا جدا نہیں ہوئے، انارے اولین افسانہ نگاروں کے ابتدائی افسانے اس روایت کے تسلسل میں سامنے آئے ہیں۔

۱۔ راجندر لکھری، حکیم یوسف حسن اور سلطان حیدر جوش کے افسانوی اور معاشرتی افسانوں میں مخصوص شرقی روایات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے والوں کو مطمئن و سرور کرنے کی کوشش غرضتوں میں شعریت کی بازیافت اسی روایت کا نقش ہے۔

۲۔ علی محمود، وزارت علی اور بی اور سہار حیدر حیدر کے افسانوں میں معاشر فطرت کی بہار آفرینیوں اور تجنیبیوں کو جذبہ محبت کا پس منظر بنانے اور انسانی جذبات کی حیران فطرت سے ہم آہنگی دکھانے کا رجحان، نیز یاز چہ پوری کا کردار نگاری میں نہ جوش و دماغی عمل سے رجحان تک کی افسانوی فینکس داستان کے نکتہ نگار اور تکنیکی اسلوب سے ہم آہنگ ہے۔ جبکہ مسز سہار حیدر نے فطرت کی جھلک میں بھی داستان سے ہی راہ چولی کیا۔

۳۔ غور پر نام چند کے اولین افسانوں "دنیا کا سب سے اچھا رتن"، "شیخ محمود" اور "میر دردیش" "مظن" "شب وطن کے قلم سے معروف ہے۔ سولہ وطن و سرور میں "دنیا کا سب سے اچھا رتن" اور افسانے کے انہام میں حق کی نگہ داستان سے ہی مستعار ہے۔

۴۔ یو جی جی جی و دہلوی نے شرقی دانش کے جان کے لیے داستان سے گہرا استفادہ کیا اور داستان کو کھلانے پر نظر کیا۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں افسانے کی صنف نے چار کھربہ اگانہ نظر کے حامل افسانہ نگاروں کے زیر اثر اپنے سطر آغاز کیا اور اردو افسانے کے ایک دوسرے سے یک سرختار رنگ و بھر داستان کی کرد میں ملتی ہوئی سیاسی اور سماجی زندگی، انڈیا افسانہ نگاروں کی ذات اور

اسلوبِ تحریر سے بچھلے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اداسے افسانے نے داستان کے ذریعہ اپنا سفر آغاز کیا اور آگے چل کر فنِ افسانے سے تعلقیت لگی نظر یہ سباز کی قہقہہ اپنی مشرقی چٹائی لائی (داستان، قشیش اور لوک قصے) سے دور ہوتا چلا گیا۔

دہادی افسانوی روایت کے سرسری جائزہ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ داستان کے حوالے سے علامتی طریقہ کار کا قریب اردو افسانے کی ابتداء میں ہی ہوا لیکن اس کا چلن ٹھس نہ ہوا۔ نمایاں مثالوں میں راشد الخیری کا افسانہ ”چہار عالم“، یزدی کا ”چنایا چن“، بی بی کھٹی کی ”پریم چنڈا کا“، ”گل داغ“، محمود رندولی کا ”دھکا“، اختر حسین داسے پوری کا ”قبر کے اندر“، میرزا ادیب کے دو افسانے ”دروازہ تیرگی“ اور ”دلِ ناقوس“، حیات احمد افسانہ کی ”چنایا چن“، اختر اور بخاری کا ”کچلیاں اور ہال تھریٹ“، علویہ احمد عباس کا ”تین عورتیں“، کرشن چندر کا ”فالچھ“ اور سرورج الدین ظفر کا ”تازہ“ ہیں۔

رواں میں مختصر میں تاریکی کا ایک انوکھا احساس ایسی روایت کے رواں میں خطر میں برآمد است انداز بیان کے باعث اسلوب اور موضوع کی اہم آہنگی سے بچا ہوا، رواں میں مختصر کے جن افسانہ نگاروں کے ہاں موضوع کا شعور ٹھنک کے ساتھ نمایاں ہو کر سامنے آیا ان میں سے ہر ایک کے پاس علامتی، استعاراتی اور تجریدی تہذیب کا ادبی کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر غلام عباس کا ”آندری“، کرشن چندر کے افسانے ”گڑھا“، ”فالچھ“، ”بہت جگہ تھے“، ”ہاتھ کی چوری“، ”نگلی کی گولیاں“، ”مرد مسترد“ اور غلام احمد عباس کے ”تین عورتیں“ اور ”از جبر“، ”بالا“ وغیرہ۔

یہاں یہ سوال اہمیت کا حامل ہے کہ آج کا افسانہ کس حد تک داستان اور لوک قصے سے کہلی کافی تکے سکتا ہے اور اس طور کا دوبارہ آج کے افسانوی پیش پیش میں کیا معنی رکھتا ہے؟

اس سوال کی سمجھائی اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ اردو افسانے کو مختلف اخلاقی، فنی، موضوعات، صورت حال اور جاہگیرانہ اخلاقیات سے مذہبی اور جنسی حقیقت نگاری، ”انکار“، ”مقلد“ اور ترقی پسند تحریک کی طرف آنا چاہیہ۔ تنجید یعنی حاکم کے لکری اور اسلوب جاتی عوامل سے کٹ جانے کے سبب کہانی کی روایت کا تسلسلہ شروع ہو اور افسانہ نگار دانش سے تنجید دست ہو گیا۔

انکار حسین اس ضمن میں جامع یوں ہے کہ اس نے داستان کی بازآفتابی اور لوک افسانے کی تنجید کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا ”افسانے کی اصل روایت داستانوں اور قصہ کہانوں کی روایت ہے۔“

نور احمد حسین نے سبب اسالیب کی تنجید کو اپنی تنجید سے ایمان اٹھ جانے کے حروف جانا، اس پر خاصی لے دے ہوئی۔ ناقدین کی افسانہ نگاری جگہ جگہ انھوں نے انکار حسین سے نقل کیے جانے والے افسانے میں داستان اور قصہ گوئی سے دبا جھنڈ کی صورتیں تلاش کی ہیں کہیں اور بعد ازاں اس حوالے سے سارا کر پلے انکار حسین کو سہ دیا۔

اب ڈراما نگار چاہیے کہ اس کوئی کوئی اسلوب جاتی چٹائی لائی کی تنجید انکار حسین سے پہلے کہاں تک ہوئی۔ اس ضمن میں دلین مثال تو خود پریم چند کے دو افسانے ”دُنیا کا سب سے افسانہ دتن“ اور ”شیخ محمود“ ہیں۔

اکا دکا نمایاں مثالوں میں میرزا ادیب کا افسانہ ”محمود“، ”سحر اور دھوکے شیطاں“، ”بھولن گور کچھری کے طویل افسانے“، ”سجائی“، ”سمن پاش“، ”مور“، ”غراب و خنایا“، ”بلی مہاس“، ”میں نے افسانے“، ”زمین بیا“ اور ”بلی پری“، ”میں نے افسانے“، ”قصہ پریم پری“، ”دُنیا کا“ اور سرورج الدین ظفر کا ”الف لیلیٰ کا ایک باب“، جن کی خطابتی اور افسانوی تہذیب کا ادبی توجہ طلب ہے۔ عزیز احمد کا افسانہ ”آب حیات“، ”ایک اور نمایاں مثال ہے

لیکن داستان کے وسیع تر دائرہ کی افسانے میں کامیاب ترین باز یافت مزاج احمد کے طویل افسانے ”جب آنکھیں آہن پاش ہوئیں“ میں ہوئی۔ اس افسانے میں گزشتہ تاریخ کی کامیاب ترین لطافتی اور لطیفی حوالوں سے مطابقت رکھنے والے کرداروں (جیورنگ کے حوالے سے) کی پیشکش ہوئی کا سیاسی ہے جس کا باعث مزاج احمد کا سچا مطالعہ اور پھر بنیاد پرستی شعور بنا۔

اس روایت میں ایسا اظہار حسین کی اہمیت میں ہے کہ اس نے داستانوں کی لطافت میں کی کردار نگاری اور مسایب کا بڑے عصری تقاضوں کے تحت برتاؤ کرنا چاہا ہے (مثلاً ”کایا کھپ“، ”بل گرے“، ”گھوڑے کی نما“) لیکن اس سے ہوا یہ کہ حیرت کا کارہا آیا جس نے آج کے جدید قاری کے پاؤں اکھاڑ دیے ہیں۔ یہ کام اظہار حسین کے ”سرکٹے“ نے انجام دیا۔ ”دو بونگوئے گئے“ کی ساخت صورت حالات جو حقیقت سے بہت فاصلے پر ہے۔ یہاں حقیقی اور Ethereal کرداروں سے ”آٹری آدی“ کے کردار زیادہ اہم ہیں اور Ethereal افسانے کی سب سے اچھی مثال ”درد کتا“ ہے۔

سو کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے افسانہ پردازوں کو داستان، حقیقی اور نوک قصے سے باطلہ لے کے بعد درے میں جو روایات تھیں، وہ انہیں افسانوی ادب کی روایات نہ تھیں بلکہ سرحد معاصرے کی جذباتی اور فانی زندگی کی پھٹکیاں تھیں۔ چاہے سبب ہے کہ ہمارے داستان نگاروں کی انہیں نفس تشکیلی قصوں کی حد تک روکے۔ کشش میں تو یہ احمد دہلوی اس کی رکاوٹ خاص تھے۔ ان کے نرائیاں کردار بھیم، اکبری اور اسٹریٹس ٹھنڈے نظر کو واضح کرنے کا وسیع ہیں اور موضوع کا کردار Complex نظر نہیں آتا۔ اس نے باطنی کی تمام سطح کوچہ چور ہے جس آگ بگنی اور انقلاب حسین حالی نے فروئی مغرب کی تخلیق کی۔ اس بگنی اور مقام ہے جہاں سے شاعری میں مغرب کی بیرونی کو شعرا کا گیا اور کشش میں داستان تشکیلی اور نوک قصے کو قابل اظہار ہونے سے انکار کیا گیا۔ ایسے میں ہمارا افسانہ خدا شدہ الخیری اور پلہ دم کی تعلیم نسواں اور اصلاح پسندی یا پریم چند کی راجوت نسل پرستی اور زمانے کے تلخ اثرات جہاں سے بھٹ آگے آیا تو خوب حسن نگاری کے افسانے ”بہرا ہنزا اور“ تک آ گیا۔ دراصل ہماری مغرب زدگی نے اردو افسانے کی صف کو یہاں کی خفا میں رہنے بسنے کا موقع ہی نہیں دیا اور آئے والے افسانہ نگاروں نے جہاں روایت پرور ماحول اور مافوق کے عمل دخل کو رد کیا وہیں افسانہ پرداز کی کے مشرقی فن کو بھی طے پا کر کہا۔ قدم قدم سے کوئی اور نئی افسانہ پرداز کی کا کسی مقام پر کوئی سمجھتا ہی نہیں ہونے دیا گیا یہاں تک کہ جب ہمارے اولین افسانہ نگاروں نے عموماً اور محمد علی رودلوی نے خصوصاً اردو افسانے کا رشتہ داری داستانوں اور قصوں سے جوڑنے کا جتن کیا تو ہمارے ناقدین نے اس کام کو بے ادبی مہترے سے سے بازو پھر باہر کر دیا۔ لیکن اب اس مسئلہ حقیقت سے انکا مشکل ہے کہ اگر ہمارا افسانہ مشرقی روایات کی پاسداری کرتا تو آج اور آئے والے نکل میں ہمارا افسانہ مختصر افسانے کی عالمی روایت میں ایک طاقتور مشرقی فن کے ساتھ نرائیاں دکھائی دے گا اور یہ بالکل اسی نوع کا کام ہوتا، جس کا سہرا بنگ کشش اور شاعری کے حوالے سے ایک نیا نیا چہرہ نگار کے سر ہے یا سپاہ کے جاویدی حقیقت نگار رانیکھ کے سر۔ اب بھی وقت کی ڈور کا سرا ہمارے افسانہ نگاروں کے ہاتھ میں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے افسانوی ادب کی زعمہ روایت کو سمجھنے سمجھانے کا جتن کریں اور اس مشرقی فن کو تازہ کریں جو جاری نزول پہچان ہے۔

- ۱۔ بحوالہ ”کلی کری کے حضور“ از ابو الفتح صدیقی، مطبوعہ ”پیپ“ کراچی ۱۹۷۷ء۔
 - ۲۔ حشون ”بہرہ جلی زبان کے قیام“ مطبوعہ گلشن طبع اولیٰ ۱۹۶۷ء۔
 - ۳۔ جہانگیر کھلے ”سیر کے بڑا چرسے“ ”بہرہ جلی“ سیر کے کردار پر مضمون پیش کرتی ہے۔
 - ۴۔ اس وقت قریب ساہب کی عمر چھ ساڑھے نو کی تھی۔ بحوالہ مقدمہ ”بال تھو کی ایک جھلک“ مطبوعہ سالی یک، ایچ، دہلی۔ ۱۹۶۶ء۔
 - ۵۔ ”میکانی انجینئرنگ“ پبلشنگ کمپنی، لاہور، ۱۹۶۶ء۔
- داخیل رہے کہ یہ گلوہ کچل ہار ”سوزِ وطن“ کے دس سے زائد پبلشنگ کمپنیوں سے جون ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا تھا اس وقت اس مجموعہ میں ”ایمان“ ”سیر و سخی“ ”شمال“ ”قلم“ ”یہ ایمان“ ”زمانہ“ ”کالیڈر“ ”بیت“ ”پریل“ ”مچھ“ ”جون“ ”جڑوا کی“ ”۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ بعد ازاں ۱۹۷۸ء میں جب گیلانی، انجینئرنگ پبلشنگ کمپنی، لاہور نے ”انجمن“ ”وطن“ کے لئے صرف پورا وطن دسویں ورہ لکھی ”شائع کی تو یہ ایسا داس کتاب ہے شمالی تھو۔

اُردو کا پہلا افسانہ: ایک تعارف

ہمارے پاس اُردو افسانے کی جڑوں کی تلاش کا مکمل قدرے تاخیر سے شروع ہوا۔ محققین کو قدیم اُردو شاعری کی چوہان پی سے فرصت نہ ملی تو نقد میں نے یہ فریضہ سنبھالا اور اس ضمن میں پہلا قدم ہی غلط چلا۔

۱۹۵۵ء میں پروفیسر وقار عظیم نے پریم چند کو اُردو کا پہلا افسانہ نگار قرار کرتے ہوئے کہا: ”ہندوؤں کا زور یہ نظر نہ اُٹھایا ہی تھا“ [مثلاً] پریم چند کا پہلا افسانہ ”دو دنیا کا سب سے افسانہ رتن“ اس سیاسی رجحان کا حال ہے۔^۱ دوسری طرف (۱۹۶۱ء میں پروفیسر اشتیاق حسین نے سجاد حیدر جلد دم کو اُردو کا پہلا اور پریم چند کو دوسرا افسانہ نگار کہا:

”ہم کو جواہر لال افسانہ نگار ملتے ہیں، ان میں دو نام لڑیاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ایک سجاد حیدر جلد دم کا، دوسرا پریم چند کا۔ دونوں کی افسانہ نویسگی کی ابتداء کم و بیش ایک ہی زمانے سے ہوئی ہے۔ پریم چند کا پہلا افسانہ بلا ہے جو ۱۹۰۵ء کا لکھا ہے عنوان ہے ”دو دنیا کا سب سے افسانہ رتن۔“^۲

یاد رہے کہ اس سے قبل پروفیسر وقار عظیم افسانے سے محقق اپنے اولین مضامین میں سلطان حیدر جوش اور نیاز فتح پوری کو اُردو کے اولین افسانہ نگار بتا چکے تھے۔ جب کہ پریم چند کو اُردو کا پہلا افسانہ نگار شمار کرنے والے باقاعدہ محققین میں ڈاکٹر قرین کس کا نام بہت نمایاں ہے۔

پریم چند اُردو کے اولین افسانہ نگار کیوں کر مانے گئے، اس کی تحصیل بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ۱۹۳۴ء میں پریم چند نے اپنے بھائی اوبلی کوٹلے ”خس“ (ہمارے ”آتم کشا نمبر“ کے لئے) ”تھو نہ نہ“ کے عنوان سے اپنی قلم کاری کی روداد لکھی، جس میں انہوں نے اپنے افسانے ”دو دنیا کا سب سے افسانہ رتن“ کو نہ صرف ۱۹۰۷ء کی تخلیق قرار دیا بلکہ اس کی اشاعت رسالہ ”زمانہ“ کا نمبر ۱۹۰۷ء میں بتائی۔ پریم چند کے اس بیان کا اُردو ترجمہ پہلی بار رسالہ ”زمانہ“ کا نمبر (مترجمہ ادبی نرائی گھر) کے ”پریم چند نمبر“ ستمبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ پریم چند لکھتے ہیں:

”میری سب سے پہلی کہانی کا نام تھا ”دو دنیا کا سب سے افسانہ رتن“ وہ ۱۹۰۷ء میں رسالہ ”زمانہ“ (کاچنور) میں لکھی۔“^۳

پریم چند کے اس بیان پر ہمارے محققین نے آسانہ صحت کا کیا اور بھر پور سوجن، جملہ مضامین اور انصافی کتب میں پریم چند کو اُردو کا پہلا

سر سید احمد خان

برس کی ان خبرات کو ایک بڑے حال اپنے اندر سے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ رات بھی ڈرافانی اور اندھیری ہے۔ گھٹا چھا رہی ہے۔ بجی تڑپ تڑپ کر کڑک رہی ہے۔ آدھی رات سے ڈور سے ملتی ہے۔ دل کا پٹا ہے اور دم گھبراتا ہے۔ بڑے سناہتات فٹکین ہے مگر اس کاظم شاعر میرے گھر ہے۔ خدا کیسے پچہ ہا اور شاعر میری رات اور بجی کی کڑک اور آدھی کی گونج پر اور نہ رات کی آخر رات پر وہ اپنے جیسے زمانے کو یاد کرتا ہے۔ اور جتنا زیادہ یاد آتا ہے۔ تاکہ ہی زیادہ اس کاظم بڑھتا ہے۔ ہاتھوں سے ڈٹکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے آنسو بھی بہے پلے جاتے ہیں۔

پچھلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے۔ چپ کہ اس کو کسی چڑ کاظم اور کسی بات کی گھڑل میں نہ تھی۔ وہ بچہ اثرنی کے بدلے پر بڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر اس باپ۔ بھائی بہن اس کو یاد کرتے تھے۔ چڑھنے کے لیے بھٹی کا وقت جلد آنے کی طوفی میں کتا میں بھل میں لے کتب میں چلا جاتا تھا۔ کتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم کتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ فٹکین ہوتا تھا اور بے اختیار چڑھتا تھا۔ "ہائے وقت۔ ہائے وقت۔ اگڑے ہوئے زمانے" "اٹھو اس کو میں نے تمہیں بہت دیر میں یاد کیا۔"

پھر وہ اپنی جوانی یاد کرتا تھا۔ اپنا سرخ سفید چہرہ۔ سفید دل۔ بھرا بھرا بدن۔ سسلی آنکھیں۔ موتی کی بڑی سے رات۔ ایک میں بھرا ہوا دل۔ جذبات انسانی کے جوش کی طوفی اسے یاد آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے ہوئے زمانے میں۔ ماں باپ جو طبیعت کرتے تھے اور بجی اور خدا پرستی کی بات قاتے تھے اور یہ کہتا تھا کہ "اور ابھی بہت وقت ہے" اور بڑھاپے کے آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا اور اٹھو اس کو یاد کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور تنگنا سے اپنے دل کو سوتا رہتا اور موت کے لیے تیار ہوتا۔ آدھ وقت گزر گیا اب بچھٹانے کیا ہوتا ہے۔ اٹھو اس میں نے آپ اپنے تئیں بھٹا یہ کہہ کر یاد کیا کہ "ابھی وقت بہت ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ اور نزل نزل کر کڑک کی تک آ گیا۔ کڑی کھولی۔ دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈرافانی ہے۔ اندھیری گھٹ چھا رہی ہے۔ بجی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے۔ ہولناک آدھی بجل رہی ہے۔ اور فٹن کے چٹے اڑتے ہیں اور نیچے فوٹتے ہیں۔ اب وہ بیٹا کر بولا "ہائے ہائے میری گزری ہوئی زندگی ابھی ایسی ہی ڈرافانی ہے جیسی یہ رات۔" یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اٹھو اس کو اپنے ماں باپ۔ بھائی بہن۔ دوست آٹھ یاد آئے ہیں کہ بنڈیاں قبروں میں گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں کو یا صحت سے اس کو چھاتی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کڑی ہے۔ یہ کہتی ہوئی کہ ہائے جیسا وقت گزر گیا۔ باپ کا نوادہ ہی چہرہ اس کے سامنے ہے اور اس میں بڑا ڈرافتی ہے کہ کیوں بیٹا ہم تہارے ہی بھلے کے لیے نہ کہتے تھے۔ بھائی بہن دعوں میں ابھی دپے ہوئے خاموش ہیں اور ان کی آنکھوں سے "سوڈاں کی لڑی بہا رہی ہے۔ دوست آٹھ فٹکین کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔

ابھی حاصت میں اس کو اپنی وہاں میں یاد آتی تھیں جہاں اس نے نہایت بڑے پردائی اور بڑے مروتی اور کج تھی سے اپنے ماں باپ۔ بھائی بہن۔ دوست آٹھ کے ساتھ رہتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا۔ باپ کو ناراض کرنا۔ بھائی بہن سے بے مروت رہنا۔ دوست آٹھ کے ساتھ بے مروتی

خبر کیا یاد آتا تھا اور اس پر اس ان گلی بندیاں میں سے ایسی بہت کار کھینا اس کے دل کو پاش پاش کرتا تھا۔ اس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا اور یہ کہہ کر پناہ لیتا تھا کہ ہائے وقت نکل گیا۔ ہائے وقت نکل گیا۔ اب کیوں کر اس کا بدلہ ہوا۔
 وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا اور گھرا تا لاکھڑا کھڑکی تک پہنچا۔ اس کو کھولا اور دیکھا کہ ہوا ایک ٹھنڈی ہے اور بجلی کی کڑک کچھ بھی ہے پر رات وہ ٹھیک سے اٹھ چھری ہے۔ اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی اور بھرا پنی جگہ آ بیٹھا۔

اسے میں اس کو پناہ دے دوں گا اور وہ جیسا کہ وہ چاہی رہی تھی اور شدہ جوتی کا جوڑ بن۔ شدہ دل رہا تھا اور دل کے دلوں کا جوش۔
 اس نے اپنی اس جتنی کے زمانے کو یاد کیا جس میں وہ بہ نسبت جی کے تنگی کی طرف زیادہ جاکر تھا۔ وہ اپنا روزہ دینا مٹا دیا جس چٹنی، راج کرتا۔
 ذکاوت، جی، بہکوں کو کھانا، مسجید میں اور کونیں جلاتا یاد کر کر اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو کھانے کی خدمت کی تھی، اپنے پیروں کی جس سے جوت کی تھی اپنی مدد کو پکارتا تھا۔ بگرد کی دقتاری نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے ذاتی احوال کا اسی تک خاصہ ہے۔ جو کہ بھر و پیسے ہی بھر کے ہیں، مسجید میں فوٹ کر پاتا کھنڈر ہیں اور یاد بھر دے یہی جنگل ہیں۔ کھوئیے اٹھ سے بنے ہیں۔ سبھی اور نہ فقیر کوئی اس کی آواز نہیں سنتا، اور نہ کہتا ہے۔ اس کا دل بھر گھبراتا ہے اور سوچتا ہے کہ میں نے کیا کیا۔ جو تمام فانی چیزوں میں بدل نکلیا۔ یہ کچھل کچھ پھلے ہی کھول نہ سکیں اب۔ کچھ کس نہیں چلا اور بھر یہ کہہ کر پناہ لیا۔ "ہائے وقت، ہائے وقت" میں نے تم کو کیوں نہ کہہ دیا؟"

وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس کے ہاتھ کھلے تو دیکھ کر آسمان صاف ہے، آغوشی ختم تھی ہے، کھنکھناتی ہے، ہمارے نکل آئے ہیں، امن کی چٹک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ اہل بھلانے کے لیے تاروں بھری رات کو کچھ دھکا دیا تھا کہ پکا یک اس کو آسمان کے جگ میں ایک روشنی دکھائی دی اور اس میں ایک خاص صورت لیکن ٹھنڈی تھی۔ اس نے جھنگلی ہاتھ کر اسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اسے دیکھتا تھا وہ قریب ہوتی جاتی تھی، یہاں تک کہ وہ اس کے بہت پاس آئی۔ وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہو گیا اور نہایت پاک سا اور بہت کے لیے سے چ چھا کر تم کوں ہوا اور وہی کہیں ہمیشہ زندہ رہنے والی تنگی ہوں۔ اس نے چ چھا کر تھہری تھہر کا بھی کوئی مل ہے۔ وہ وہی ہاں ہے، نہایت آسمان پر بہت مشکل۔ جو کوئی خدا کے فرض، اس بدوی کی طرح جس نے کہا کہ "واللہ لا ازیف ولا انقص" ادا کر کہ انسان کی بھلائی اور اس کی بھری میں سہی کرے۔ اس کی میں سحر ہوتی ہوں۔ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے، انسان ہی ایسی چیز ہے جو خیر تک رہے گا، پس جو بھلائی کہ انسان کی بھری کے لیے کی جاتی ہے وہی نسل در نسل آ خیر تک چلی آتی ہے۔ نماز، روزہ، حج، ذکاوت، اسی تک ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی موت ان سب چیزوں کو ختم کر دیتی ہے۔ وہی چیزیں بھی چند روز میں فنا ہو جاتی ہیں، مگر انسان کی بھلائی آ خیر تک جاری رہتی ہے۔ میں تمام انسانوں کی مدد میں ہوں، جو کچھ کو تعمیر کرتا چاہے انسان کی بھلائی میں کوشش کرے۔ کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں دل و جان دیاں سے ساری ہوں۔ یہ کہہ کر وہ لیکن غائب ہوئی اور پتہ چا بھرا پنی جگہ آ بیٹھا۔

اب مگر اس نے اپنا پچھلا زمانہ یاد کیا اور دیکھا کہ اس نے اپنی بچپن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی اور کم سے کم اپنی قومی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔ اس کے تمام کام ذاتی غرض پہنکی تھے۔ نیک کام جو کہچے تھے وہ اب کے لالچ اور گویا طرہ اور شہوت دینے کی نظر سے کیے تھے۔ خاص قوی بھلائی کی خاص نیت سے کیا بھی نہیں کیا تھا۔

اپنا حال سوچ کر وہ اس قدر غریب لہجہ کے ملے سے بایں ہوا۔ اپنا طرز زبانتو کچھ کرنا سمجھ کر نے کی گئی کچھ امید نہ پائی۔ تب تو نہایت باہوشی کی حالت میں بے قرار ہو کر پناہ لیا۔ "ہائے وقت، ہائے وقت، کیا بھر گئے ہیں جاکھنکھوں؟ ہائے میں دس جزا درویشاں میں رہتا اگر وقت

بکرتا تا اور میں جوان ہوسکتا۔" چہ کہہ کر اس نے ایک آسرو دھری اور بے ہوش ہو گیا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اس کے کانوں میں ٹھٹھکی ٹھٹھکی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اس کی پیادری ماں اس کے پاس آکھڑی ہوئی، اس کو کھٹکے لگا کر اس کی جی لی۔ اس کا باپ اس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بھین اس کے سر کو آکھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا بیٹا کیوں برس کے برس دیں رہتا ہے؟ کس تو بے قرار ہے؟ کس لیے جیڑی لگی بندھ گئی ہے؟ انھوں نے ہاتھ دھو، کپڑے پہن، آواز کی خوشامیاد، میرے بھائی بھین میرے ہتھکڑے ہیں۔ تب وہ لاٹکا جاگا اور گھما کر میں نے خواب دیکھا اور خواب میں بڑے عجب ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا سارا طوطا اپنی ماں سے کہا۔ اس نے سن کر اس کو خواب دیا کہ چنانچہ تو ایسا مت کر جیسا کہ چیمان بڑے سے کیا، بلکہ ایسا کر جیسا میری ماں نے تو میرے لیے کیا۔

چہ سن کر وہ لڑکا چنگ پر سے کود چلا اور نہایت خوشی سے لپکا کہ اوہی میری زندگی کا پیٹہ دن ہے۔ میں ابھی اس بڑے سے کی طرح نہ پہچانتا ہوں تا کہ وہ ضرور اس دیکھ کر کوہا ہوں گا۔ جس نے ایسا خوبصورت اپنا چہرہ مجھ کو دکھایا اور ہمیشہ زخم و رے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔ اوہنا، اوہنا، تو میری ہوا کر۔ آمین۔

میں اسے میرے پیارے نوجوان ہم وطن! اور اسے میری قوم کے بچہ ماہی قوم کی بھلائی پر کوشش کرو تا کہ آج خیریت میں اس بڑے سے کی طرح نہ پہچانتاؤ۔ ہمارا زمانہ تو آٹھ ہے۔ اب لہذا اسے یہ دعا ہے کہ کوئی نوجوان اٹھے اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔ آمین۔



مرسید احمد خان کی یہ تحریر اپنے آغاز میں یقیناً افساد کہلانے کی منتہی ہے لیکن اس تحریر کا وسط اور اختتام اسے واضح طور پر ایک اصلاحی مضمون عطا دیتا ہے۔ آغاز تشبیلی رنگ لیے ہوئے ہے۔ بیٹھ زخم و رے والی نیکی کے ظاہر ہوتے ہی مرسید احمد خان کی اصناف پندہی اس افساوی آغاز کا اصلاحی مضمون کی طرف کھینچ لے جاتی ہے۔ جبکہ تحریر کا اختتام تو ہے ہی اصلاحی مضمون کا۔ اور سب سے زیادہ کہہ کہ مرسید احمد خان کی جملہ تحریروں میں ان افساد کی طرف بھٹن قادی دکھائی نہیں دیتی۔ زیادہ سے زیادہ تشبیلی یا مکاتبت کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان "گنہگار ہوا زمانہ" ان کی اور تحریروں سے جو افساد بنتے بنتے رہ گئی۔

در اصل یہ تحریر اس زمانے کی ہے جب ہمارے ہاں کشن کے طواف باقاہد ایک راجل کی صورت دکھائی دی۔ علی گڑھ تحریک کے نمائندہ "جنید ابلاغی" علی گڑھ میں کشن کے لیے کوئی گوشہ خلوص نہ تھا۔ مولانا غلام احمد دہلوی کشن کی طرف آئے بھی تو اصلاحی جذبے کے تحت ہول کی بجائے تشبیلی قصے کی طرف غل گئے اور مولانا محمد حسین آزاد کے "تیرنگ خیال" (مصدر اول) کے دیباچے میں لکھا

"اب وہ زمانہ بھی نہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو ایک کہانی طوعے پائنا کی زبان سنائیں۔ ترقی کریں تو چار فقیر لکھتے ہندہ کر بیٹھ جائیں یا یہ اداں اڑائیں اور بھٹائیں اور ساری امت ان کی باتوں میں گھوٹائیں۔ اب کھٹکھٹا وقت ہے اور اس واسطے ہمیں بھی کھٹکھٹا کرنا چاہیے۔"

محمد حسین آزاد کی اداں کا نتیجہ نہیں بلکہ افساد نگار کہلانے کا بیٹہ۔ "مغز" کا مورخ، ممبر ۱۹۰۱ء میں مطلق غلام جیلر کی ایک افساد نگار تحریر: "دور راستے" کے عنوان سے شائع ہوئی جسے مرسید کے "گنہگار ہوا زمانہ" سے بالکل تحقیق اور کاپیٹا افساد قرار دے سکتے ہیں۔ جب کہ "دور

یاد رہے کہ یدرم کا افسانہ "نشری بھلی رنگ" مجموعہ "معارف" علی گڑھ شمارہ نمبر ۳۳ جولائی ۱۹۷۰ء، طویل روشنی کے ترکیبی افسانے کا ترجمہ ہے، طبع دارالافغانیہ تھیں۔ یدرم نے ترجمہ کرنے کے لیے طویل روشنی کے اس افسانے کو کچھ "ثروت ٹوان" سے منسوب کیا تھا اور جس سے یدرم کی ترجمہ نگاری کا آغاز ہوا جب کہ پلٹن بھاری "دا کٹر مبینہ ارضی" اور قرآن مبینہ جہد "نے یدرم کے کام کو Glonty کرتے ہوئے ان کے افسانوی تراجم "کالمہ ہائیز"، "صحت نامہ"، اور "خارجین و کائنات" کو بھی طبع و نشر دیا اور ان اس خاصۃ تحقیقی مطالعے کو تدریس کوئی میں ڈالے رکھا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر ایرگن ترکمان (صدر شعبہ فلسفہ شرقی، مملوک پونڈریونی قومیہ۔ ترکی) نے اصل متن سے نقلی جانچہ کے بعد ان میں تحریریں کو ترکی افسانوں کے تراجم کا ہی نہ کہ "۔"

”مصلحت کراچی“ (راشد الخیری فہر) کے مطابق راشد الخیری کو افسانہ ”نصیر اور غدیجہ“ لکھنے کی تحریک ابن کی والدہ رشیدہ الخاں بیگم کی سہلی ہوئی دو چیر لڑکیوں کی کہانی سے ہوئی۔ جن کے ناموں نے ابن کی طرف سے اپنا دھنکی برتی۔ اس افسانے کو سر شیخ عبدالقادر نے ”مظفر“ کا نام دیا۔ ۱۶ جنوری ۱۹۰۳ء میں شائع کرتے وقت بلوچہ راکے خٹم ٹوٹ سے حریف خاں نے ابن کراچی۔ مہاراجہ راجہ ذیل ہے:

”یہ مضمون مدت کے ساتھ مضمون کے بعد ہمیں اپنے دوست مولوی محمد امجد اراشد صاحب، مترجم ہدایت بخدا، است سے ملا ہے۔ صاحب موصوف، مجلس اعلیٰ، مولانا حافظ خیر احمد کے علاجوں میں ہیں اور ذرا ان پر خوب قدرت رکھتے ہیں، خصوصاً مستورات کی زبان بے تکلف لکھتے ہیں۔ چنانچہ مولوی خیر احمد صاحب کی لا جواب کتابوں کے بعد مولوی امجد اراشد صاحب کی کتاب ”منازل النساء“ اپنے قسم کی ایک لا جواب کتاب ہے جس میں مستورات کی زبان انہیں نہایت خوبی سے لکھی ہے۔ اس مضمون میں بڑی بہن ”طہیحہ“ اپنے بھائی نصیر کو لکھتی ہے اور دوسری سہری ہوئی بہن کے بچوں کی لڑائی کی طرف اس کی توجہ داتی ہے۔ افسوس ہے ساختہ پن سے لکھا گیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کوئی چاہتا ہے۔“

دامخبر رہے کہ اراشد الخیری (اصل نام محمد امجد اراشد) کے اردنی افسانے (”ختم نصیر اور طہیحہ“ اور ”نوحیوب کا دل“) بالترتیب ”محمد امجد الرشید“ اور ”محمد امجد اراشد“ کے قلمی نام سے شائع ہوئے۔ بعد میں انہوں نے اراشد الخیری کے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا۔

افسانہ ”نصیر اور طہیحہ“ اراشد الخیری کا منظر کرنے کے لیے دیکھیے گوشت ”امروز کے اولین افسانے“

داخیج رہے کہ راشد الخیری (اصل نام محمد عبدالرشید) کے والدین افسانے (قصہ طیسیہ اور خدیجہ اور "خدیجہ کا مال" بالترتیب) محمد عبدالرشید "کوز" محمد عبدالرشید کے قلمی نام سے شائع ہوئے۔ بعد میں انہوں نے راشد الخیری کے قلمی نام سے کھانا شروع کیا۔

افسانہ "نصیر اور رند بچہ" از راشد الفیہری ملاحظہ کرنے کے لیے دیکھیے گوگل "اسرو کے افسانے"



راشدہ الخیری کا اور آئندہ ان کا پہلا افسانہ ”قصیر اور طہ“ خط کی محنت میں لکھا گیا ہے اور یہ محنت اس دور کے کشش کی مقبول ترین محنت کہی جاسکتی ہے۔ انگریز کی ادب میں پہلی بار سکرین رچرڈسن (۱۶۸۹ء تا ۱۷۶۱ء) نے اس محنت کو اپنے تخلیقی قہے ”پامپلا“ میں دیا اور پھر اس نے اس محنت میں آخر خطوط پر مطلق پایا افسانہ ”آئینہ“ مکمل کیا۔^{۱۵}

راشدہ اختیاری مالی سطح پر اس ٹھیکے کو برقرار رکھنے کے لیے جس سے تعلق کار ہیں۔ انہوں نے "تصمیم برائے بیج" (مطبوعہ ۱۹۰۳ء) کے بعد یہ ٹھیکے اپنے اس دیگر افسانوں میں برقی۔ ان کا تیسرا طبع زوہا فسانہ "حصصہ حسن" (مطبوعہ "فنون" لاہور ۱۹۰۶ء) "کھڑے اتر اتران" (مطبوعہ "فنون" لاہور ۱۹۰۶ء)، "تند کا عطا بھاریج کے نام" (مطبوعہ "حصصہ حسن" دہلی جون ۱۹۰۶ء) اور افسانوی مجموعہ "سلی ہوئی چٹان" (طبع اول: ۱۹۳۳ء) میں شامل کلی کہہ رہا ہے۔ انہوں نے "زمانہ تعلق ۱۹۰۰-۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۱ء) کی ٹھیک کے سال ہیں۔ بعد ازاں اردو کے دوسرے

افسانہ نگار علی محمود نے بھی "پختی جال" (مطبوعہ ۱۹۱۰ء) ایسی ٹھیکے میں لکھا کہ یہی صورت امرتسر کے چھپے افسانہ نگار سجاد حیدر علی دم کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ جنہوں نے "دوست کا خط" نامی افسانہ ۱۹۰۶ء میں قلم بند کیا اور وہ افسانہ "خزان" کا پورا باب آکٹوبر ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔

ترک افسانہ نگار احمد حسن علی (پلو ۱۸۷۰ء - ۱۹۲۷ء) نے لگ بھگ ۱۹۰۵ء میں اس ٹھیکے کو پڑھا اور سجاد حیدر علی دم اس کے ایک افسانے ("صحبت کا پیش" "مطبوعہ" "خزان" لاہور فروری ۱۹۰۶ء) کو ترجمہ کرتے ہوئے مکمل بار اس ٹھیکے سے متعارف ہوئے، مگر یہ ٹھیکے انہیں اس قدر بھائی کہ اپنے طبع زاد افسانوں "دوست کا خط" "مطبوعہ" "خزان" لاہور اکتوبر ۱۹۰۶ء) اور "گناہم غلطو" ("مضمون، "دکانات و اعتبارات" "مطبوعہ ۱۹۲۶ء) کو اسی ٹھیکے میں نقل کیا۔ یہاں تک کہ انارے ہاں یہ سلسلہ قاضی عبدالغفار کے "خلی کے غلطو" اور میرزا ادیب کے "محر افروغ کے غلطو" تک پہنچا جو بلاشبہ اس ٹھیکے کے دو بار سے کا نام عروج ہے۔



حوالہ:

- ۱۔ سجاد "افسانے میں روایت اور ترجمے" انشراح سوانح میں منظرہ اور تعلیم اور فہم کا مکی، مہاراجہ برہانی، انارکیت حدی، دہلی، سرور احمد انشراح، انشراح میں درجہ اول، مضمون "افسانے میں روایت اور ترجمے" اسطو ۱۹۵۷ء، سجاد حیدر علی دم، ۱۹۵۵ء۔
- ۲۔ اردو افسانہ پر ایک سیریز سجاد حیدر علی دم، ۱۹۶۱ء، مضمون "افسانہ نگار اور افسانہ میں" "مطبوعہ" کتاب پبلیشرز انشراح، علی دم، ۱۹۶۵ء، صفحہ ۱۳۸۔
- ۳۔ محاور "گناہم غلطو" کا پندرہ مروجہ دہلی نامی، گم، پبلیشرز انشراح، ۱۹۳۷ء، صفحہ ۸۔
- ۴۔ محاور "پختی جال" کے مضمون "افسانہ نگار علی دم" "مطبوعہ" "سپ" گراپی ۱۹۵۸ء۔
- ۵۔ "کتاب افسانے کے قلم نگاروں" یہ سجاد علی دم، پبلیشرز انشراح، "مطبوعہ" گراپی، انشراح، ۱۹۳۹ء، صفحہ ۱۷۵۔
- ۶۔ محاور "افسانہ نگار علی دم" "افسانہ نگار علی دم" "مطبوعہ" "خزان" لاہور، مہاراجہ، ۱۹۰۶ء۔
- ۷۔ "پختی جال" لاہور، لاہور، "مطبوعہ" علی دم، علی دم، ۱۸۸۰ء۔
- ۸۔ محاور "افسانے نگار علی دم" "مطبوعہ" علی دم، علی دم، ۱۹۳۹ء، صفحہ ۱۷۵۔
- ۹۔ "افسانے نگار علی دم" "مطبوعہ" علی دم، علی دم، ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱۷۵۔
- ۱۰۔ "پختی جال" "مطبوعہ" علی دم، علی دم، ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱۷۵۔
- ۱۱۔ "افسانہ نگار علی دم" "مطبوعہ" علی دم، علی دم، ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱۷۵۔
- ۱۲۔ "افسانہ نگار علی دم" "مطبوعہ" علی دم، علی دم، ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱۷۵۔
- ۱۳۔ "افسانہ نگار علی دم" "مطبوعہ" علی دم، علی دم، ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱۷۵۔
- ۱۴۔ "افسانہ نگار علی دم" "مطبوعہ" علی دم، علی دم، ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱۷۵۔
- ۱۵۔ "افسانہ نگار علی دم" "مطبوعہ" علی دم، علی دم، ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱۷۵۔

اُردو کے اولین افسانہ نگار

(راشد الغیری، علی محمود، درویند اکبر آبادی، دہلوت علی اور بی، نسیم ہسٹ حسن، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، پریم چند، چودھری محمد علی دروہلو، خولہ حسن نقاشی، نیاز فتح پوری، مہاشینہ دشن اور قاضی حیدر اعظمی)

۲۰ ویں صدی کا آغاز سوشل ازم، ایتھنک ازم (Aestheticism) اور انجیئر مل ازم کے زور و شور کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس دور کے ہندوستان میں اہم تہذیبیاں رہنا ہو رہی تھیں۔ صدیوں کے غبرے ہونے پانی میں پلنگت کا طعم پیدا ہوا تھا۔ مہاجنوں اور چاکیرداروں کی بے رحم گرفت سے نہتے حاصل کرنے کے لیے کسان اٹھ کھڑا ہوا تھا اور فرسودہ رسم و رواج اور تقضبات کی بجلی میں پے ہوئے انسان نے نہات کی راہیں تلاش کرنے کا جتن کیا تھا۔ خصوصاً ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء کے ہندوستان کی عوامی تحریکوں نے اس قدر شدت اختیار کر لی تھی کہ لکڑوں میل دور دوس میں لٹھیں نے کہا تھا

”ہندوستان کے مزدور بھی بیدار ہو گئے ہیں، ان کی یہ جنگ اجتماعی سیاسی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔“

اس وقت کی مشینی زندگی نے نئے طبقات کو جنم دیا تھا اور مغربی تہذیب نے سوچنے بیزدکن مکن کے نئے انداز وضع کیے تھے اور ہندوستان کی ایک آنکھ مغرب کی سمت کھلی ہوئی تھی۔ روزیادہ کہانک کی تحریر اجتماعی برطانوی راج کی خبر دیتی تھی اور برطانوی راج کی لٹریچر سوسائٹی اشتراکیت کے پرچار میں جتنی ہوتی تھی۔ آسکر ویلڈ، ہالیباٹ کی موٹا گلوں میں مصروف تھا اور ویلڈ۔ بی ٹھیس نے آئرلینڈ کی امرالہ پندی، آئرلینڈ تو پرانی اور مخصوص تہذیب کی یادداشت چاہی تھی۔ چیلڈ وڈ میں مہد تھا، سیاسیات اور سماجیات کے ساتھ ادب میں بھی جب طرح کی گہما گہمی تھی۔

یہ زمانہ ہندوستان کی ادبی، سیاسی، تہذیبی اور سماجی زندگی کو کئی کروڑوں سے دہا تھا اور یہ تہذیبی ایک تجربے کی نوآبادیانی حکومت کے مفادات، اثر پڑھائی اور دیشہ واندوں کے سبب کچھ پیچیدہ گہمی تھی اور ایک جھک معنوی بھی۔ معنوی اس اعتبار سے کہ قومیت اور قومی کلچر کے جن نئے قصہ رات نے یہ سب کے مصنفی سماج میں جنم لیا تھا اسے کوئی سچ پر ہندوستان میں پہنچنے سے دوچار ہوا تھا۔ ہندوستانی نظم کاروں کی تحریروں پر کوئی غور نہ کرنا تھی سے ٹھننے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور یوں جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے بعد برطانوی حکومت کی پوری کوشش تھی کہ

ان کی جھڑپوں کی دھماکے اور وسیع تر قومی مفاد کے مشترک احساس شعور سے بیکار ہے۔

ان رسالت میں ایک طرف تو مسلم علماء اور آ رہے تھے اور دوسرے طرف ایک "نوشہ خیزان" جو سراسر طبقہ تھا جو نئے نظام تعلیم کا پروردہ ہونے کے سبب مغربی تہذیب و تمدن کے گن گار رہا تھا۔ دایوشہ پر شاہ کے وزیر اثر مندوں میں "امیانس" دانش کا جوش افشا تو مسلمانوں نے بھی اپنی جد اکابر قبیلہ جلی پالیسی مرتب کرنی شروع کی، یہاں تک کہ سید احمد خان نے قہم مدارس کے دوران اپنے دانشور ملک و محل پر نظر پڑی کی اور تو یہ کہ لفظ صرف مسلم جماعت کے لیے استعمال کرنے لگے۔ یہ الگ قصہ ہے کہ آگے چل کر برطانوی راج میں دایوشہ پر شاہ "ستارہ ہند" کہلائے، سید احمد خان کو "سز" کا خطاب ملا اور ان کے پیچتر راجی "مجلس العلماء" افراد بن گئے۔ ان تحریکوں کے اثرات اردو کے اولین افسانہ نگاروں کی تحریروں میں بہت نمایاں ہیں۔



اردو کے اولین افسانے: ۱۹۰۳ء۔ ۱۹۱۳ء

- ۱۔ "انصیر اور غدیجہ" راشد الخیری، مطبوعہ "نخون" لاہور دسمبر ۱۹۰۳ء
- ۲۔ "چھپاؤں" علی محمود مطبوعہ "نخون" لاہور جنوری ۱۹۰۴ء
- ۳۔ "مختصر غم" درویش اکبر آبادی، مطبوعہ "نخون" لاہور فروری ۱۹۰۴ء
- ۴۔ "ایک بانی و جہاز" علی محمود مطبوعہ "نخون" لاہور اپریل ۱۹۰۴ء
- ۵۔ "مغرب محبوب" وزارت علی اور بی، مطبوعہ "اردوئے معلیٰ" علی گڑھ جون ۱۹۰۵ء
- ۶۔ "بدلیب کالانی" راشد الخیری، مطبوعہ "نخون" لاہور اگست ۱۹۰۵ء
- ۷۔ "پراسرار لغات" حکیم یوسف حسن، مطبوعہ "انتخاب لا جواب" لاہور ۱۹۰۵ء
- ۸۔ "مہمیز" سجاد سعید یلدرم، مطبوعہ "علی گڑھ مشتعل" علی گڑھ مئی ۱۹۰۶ء
- ۹۔ "دارالفرود" راشد الخیری، مطبوعہ "نخون" لاہور جون ۱۹۰۶ء
- ۱۰۔ "غریب و وطن" سجاد سعید یلدرم، مطبوعہ "اردوئے معلیٰ" علی گڑھ اکتوبر ۱۹۰۶ء
- ۱۱۔ "دوست کا خط" سجاد سعید یلدرم، مطبوعہ "نخون" لاہور اکتوبر ۱۹۰۶ء
- ۱۲۔ "چراغ چہرے کی کہانی" سجاد سعید یلدرم، مطبوعہ "نخون" لاہور اپریل ۱۹۰۷ء
- ۱۳۔ "مست حسن" (دو اقساط) راشد الخیری، مطبوعہ "نخون" لاہور اپریل، مئی ۱۹۰۷ء
- ۱۴۔ "دو بے قصود" راشد الخیری، مطبوعہ "نخون" لاہور اکتوبر ۱۹۰۷ء
- ۱۵۔ "شادی و راج" راشد الخیری، مطبوعہ "نخون" دہلی (پہلی قسط) فروری ۱۹۰۸ء

- ۱۶۔ ”کاپی پختی مجھوں“ (آتش اقبال) سجاد حیدر مدظلہ ”عقرون“، دہلی
- ۱۷۔ ”کاپی پختی“ سلطان حیدر بخش مدظلہ ”عقرون“، دہلی
- ۱۸۔ ”عشق و نیاز و لب و لہن“ پریم چند، مدظلہ ”زمانہ“، کانپور
- ۱۹۔ ”شہ کا خط بھاون کے نام“ راشد الخیری، مدظلہ ”عصمت“، زلی
- ۲۰۔ ”کفر سے ازدواج“ راشد الخیری، مدظلہ ”عقرون“، زلی
- ۲۱۔ ”زینا کا سب سے منسوب رشتہ“ پریم چند، مدظلہ ”سوز و غم“، زمانہ پریس، کانپور
- ۲۲۔ ”شیخ محمود“ پریم چند، مدظلہ ”سوز و غم“، زمانہ پریس، کانپور
- ۲۳۔ ”بچی سر اور غم ہے“ پریم چند، مدظلہ ”سوز و غم“، زمانہ پریس، کانپور
- ۲۴۔ ”بیلہ نام“ پریم چند، مدظلہ ”سوز و غم“، زمانہ پریس، کانپور
- ۲۵۔ ”شاہین و زوراج“ راشد الخیری، مدظلہ ”عقرون“، زلی (دوسری قسط)
- ۲۶۔ ”انکسار“ (پرو اقبال) سلطان حیدر بخش مدظلہ ”عقرون“، دہلی
- ۲۷۔ ”سارس کی چارک لالہ“ (دو اقبال) راشد الخیری، مدظلہ ”عقرون“، دہلی
- ۲۸۔ ”غمن کا خوف“ چودھری محمد علی زوراجی، گجرات، گجرات
- ۲۹۔ ”بہد خانوں کا صبر“ راشد الخیری، مدظلہ ”عصمت“، زلی
- ۳۰۔ ”کتابوں کا آگے بڑھنا“ پریم چند، مدظلہ ”زمانہ“، کانپور
- ۳۱۔ ”سیر و مشق“ (دو اقبال) پریم چند، مدظلہ ”زمانہ“، کانپور
- ۳۲۔ ”شکار“ پریم چند، مدظلہ ”زمانہ“، کانپور
- ۳۳۔ ”اول کی تلاش“ (دو اقبال) راشد الخیری، مدظلہ ”عصمت“، زلی
- ۳۴۔ ”بچی ہال“ علی محمود، مدظلہ ”ادب“، آغا باد
- ۳۵۔ ”رائی سارنہ“ پریم چند، مدظلہ ”زمانہ“، کانپور
- ۳۶۔ ”بے غرض محسن“ پریم چند، مدظلہ ”ادب“، آغا باد
- ۳۷۔ ”بڑے گھر کی بچی“ پریم چند، مدظلہ ”زمانہ“، کانپور
- ۳۸۔ ”سدا کی چڑیاں“ راشد الخیری، مدظلہ ”عصمت“، زلی
- ۳۹۔ ”دو گھر کی کاشت“ پریم چند، مدظلہ ”زمانہ“، کانپور
- ۴۰۔ ”دلبر بردار“ پریم چند، مدظلہ ”زمانہ“، کانپور
- ۴۱۔ ”خداستان کی پری“ راشد الخیری، مدظلہ ”عصمت“، زلی

- ۳۲۔ ”مظلوم کی فریاد“ راشد الخیری مطبوعہ ”محسنت“ دہلی ۱۹۱۱ء
- ۳۳۔ ”ماہنامہ نوجوان عہدہ“ راشد الخیری مطبوعہ ”تھمن“ دہلی ۱۹۱۱ء
- ۳۴۔ ”مسٹر ایٹکس“ سلطان حیدر جوش مطبوعہ ”نخلوں“ لاہور جولائی ۱۹۱۱ء
- ۳۵۔ ”کامیہ ٹیپی“ سلطان حیدر جوش مطبوعہ ”نخلوں“ لاہور ستمبر ۱۹۱۱ء
- ۳۶۔ ”چاندنی چترک کا جنازہ“ راشد الخیری مطبوعہ ”کپکپاشاں“ دہلی ۱۹۱۱ء
- ۳۷۔ ”مساوات“ سلطان حیدر جوش مطبوعہ ”الماطر“ کھنکوٹہ مئی ۱۹۱۲ء
- ۳۸۔ ”دعوتِ بھارت کی خط کتابت“ راشد الخیری مطبوعہ ”تھمن“ دہلی ۱۹۱۲ء
- ۳۹۔ ”عرب شہید کا گھر“ طویل حسن نگاہی مطبوعہ ”روزنامہ زمیندار“ لاہور ۱۹۱۲ء
- ۴۰۔ ”بہارِ افروادہ“ خواجہ حسن نگاہی مطبوعہ ”نوجوان“ لاہور جنوری ۱۹۱۳ء
- ۴۱۔ ”ایک پارسی دو شیرہ کو کیڑے کر“ نیاز فتح پوری مطبوعہ ”تھمن“ دہلی جنوری ۱۹۱۳ء
- ۴۲۔ ”ایک شاعر کا لہجہ“ نیاز فتح پوری، مشمول ”ایک شاعر کا لہجہ“ مساوات پریس، لاہور: ۱۹۱۳ء
- ۴۳۔ ”بھگت سچو“ سلطان حیدر جوش مطبوعہ ”الماطر“ کھنکوٹہ اپریل ۱۹۱۳ء
- ۴۴۔ ”پھول“ مہاشیہ مدثر مطبوعہ ”نخلوں“ لاہور جنوری ۱۹۱۴ء
- ۴۵۔ ”طلوعِ آسمان“ سلطان حیدر جوش مطبوعہ ”الماطر“ کھنکوٹہ مارچ ۱۹۱۳ء
- ۴۶۔ ”پہلے کی گونج“ اعظم کریم دی مطبوعہ ”طوفان“ لاہور ۱۹۱۳ء
- ۴۷۔ ”آکا قاتل زان“ سلطان حیدر جوش مطبوعہ ”الماطر“ کھنکوٹہ جون ۱۹۱۳ء
- ۴۸۔ ”چکات کے آئینہ“ (مجموعہ) خواجہ حسن نگاہی مطبوعہ اجازت تو حیدر جوش طبع اڈل ۱۹۱۳ء
- ۴۹۔ ”حیاتِ انسانی پر وہ پندوں کی بھٹ“ راشد الخیری مطبوعہ ”تھمن“ دہلی ۱۹۱۳ء



۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۳ء کے گیارہ سالوں میں اردو کے داستانِ افسانوں میں اگر خواجہ حسن نگاہی کے مجموعہ ”چکات کے آئینہ“ طبع اول: ۱۹۱۳ء میں شامل تمام افسانوں پر کم سے کم نو روٹی الوقت، نایاب، اعلیٰ درجہ کی کتابت میں شائع شدہ افسانوں کو بھی شمار کریں تو بھی طبعِ زاہد افسانوں کی تعداد کسی سو سے کم نہیں رہتی۔ درج بالا فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ہی پتا چل جاتا ہے کہ راشد الخیری (۱۹۰۳ء) کے فوراً بعد جنوری ۱۹۰۳ء میں سامنے آنے والے اردو کے دوسرے افسانہ نگار علی گھوڑے گھنٹے تین افسانے یادگار چھوڑے جب کہ اردو کے تیسرے اور چوتھے افسانہ نگار، درمندا اکبر آبادی (فروری ۱۹۰۳ء) اور وزارت علی گھوڑے (جون ۱۹۰۵ء) صرف ایک ایک افسانہ نگار کر ادبی آفتی سے ناکب ہو گئے۔ بہت ممکن ہے ان دونوں افسانہ نگاروں کے دو ایک افسانے اور کئی الگ ہائیں بھی جو ملے ہے کہ علی گھوڑے درمندا اکبر

آبادی اور وزارت علی اور بی آئردہ افسانہ کی منسلک (یعنی "عقلمانی" جیسے اہم جڑ سے جس کا نام "مضمون" یا "مضمون" کہا جاتا ہے) کے امکانات سے واقف تھے یا شاید انہیں اپنی گفتگو میں ملا جملوں کا اندازہ ہی نہ تھا۔ اس لیے آئے اور چل گئے۔ ان تینوں میں سے علی محمود امکا ناس سے بڑے تھے، جس کا بیٹا افسانہ "یعنی تالی" "مطلوبہ" اور "آپ" جولائی ۱۹۱۰ء ہے۔ لیکن افسانوں کی وہ بھی دور مند اور وزارت علی اور بی کی طرح اپنی اہمیت سے مراد شاید انگریزی، سلطان حیدر جوش اور پریم چند کی طرح ہر کام نہ کر سکے اور محدود ہو گئے۔ لہذا کے کرشمہ یا سب سے پہلے لیکن آئردہ کا یہ پانچواں افسانہ نگار ادبی افق پر چادر ہر تحریر کے لیے کافی اور دور دورہ پیکان نہ تھا اسکا جوش انگریزی، جوش، یلدرم اور پریم چند کے لیے میں آئی اور ان ابتدائی بڑے ناموں کے بعد چودھری محمد علی ردو لوی، خواجہ حسن نظامی، نیاز فتح پوری اور مہاشینہ رشیدی تو باقاعدہ افسانہ نگار تھے اور انہوں نے خود کو منوایا بھی۔

یہاں یہ وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ ایک زمانے میں پریم چند کے جس افسانے ("یا کا سب سے اصول" حق) کو آئردہ کا پہلا افسانہ قرار کیا جاتا ہے، تاریخی اعتبار سے آئردہ کے طبع کے افسانوں میں اس کا ایک سو انیس نمبر ہے اور جس افسانے کو اکثر اب الیٹ صدیقی آئردہ کا پہلا افسانہ قرار دیتے رہے، یعنی خواجہ حسن نظامی کا "بہراشتوار" اس افسانے کا آئردہ کے طبع کے افسانوں میں پچاسواں نمبر ہے۔ نیاز فتح پوری کا پہلا افسانہ کا انیس نمبر ہے اور مہاشینہ رشیدی کا پہلا افسانہ چالیس نمبر ہے۔ اب صرف ایک نام یاد دہانی کا ہے اور وہ جس چودھری محمد علی ردو لوی۔ انہوں نے بلاشبہ افسانہ نگاری کا آغاز یلدرم اور پریم چند کے ساتھ کیا لیکن ادبی حرائر رسائی تک نہ ہونے کے سبب ان کے افسانوں کی اشاعت میں تاخیر ہوئی۔ اس تاریخی کی وجہ ان کا تعلق دارو تھا۔ ان کی پہلی شیعہ، ارسا کی کے مدبران کو افسانہ برائے اشاعت بھجوانے سے روکتی رہی۔ بہت افسانوں نے اپنی گریبوں کی اشاعت کا ختام خود سے کیا۔

ایک اور اہم بات کہ درج بالا فہرست میں شامل افسانوں کے باہمی موازنہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابتدا سے ہی پریم چند اپنے دیگر معاصرین سے بہتر افسانہ نگار تھے۔ زبان و بیان کے حوالے سے راشد انگریزی، چودھری محمد علی ردو لوی اور خواجہ حسن نظامی بہت نمایاں اور قابل توجہ ہیں، سلطان حیدر جوش کے ہاں تخلیق کا شعور سب سے بڑا ہے۔ ردو لوی افسانہ نگاری میں علی محمود امکا و حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری قدرے نمایاں ہیں لیکن سب سے مضبوط جانیو چودھری محمد علی ردو لوی کا ہے جب کہ داستان سے بڑے پریم چند کے افسانوں کا خاصہ اور قصہ گوئی کا جانیو چودھری محمد علی ردو لوی اور حسن نظامی کے ہاں ملتا ہے، اور یہ بھی نئے شیعہ حقیقت ہے کہ آگے چل کر پریم چند نے اپنے بہتر ڈون کے سبب دیگر قریبی معاصرین پر واضح برتری حاصل کر لی۔

۱۔ راشد انگریزی، بیگم یوسف حسن، سلطان حیدر جوش، پریم چند اور مہاشینہ رشیدی۔

بندو مسلم سوانحی کی فرسودہ درواج مہاشینوں اور چامیرادوں کی سیدہ دم گرفت کے خلاف حراست، قوم پرستی اور اصلاح نسوانی کی اداعت۔

۲۔ چودھری محمد علی ردو لوی اور خواجہ حسن نظامی

فمن برائے فن کے حوالے سے داستانوی اداعت کی بنا زبانت کا قائل اور ماضی میں چارو صوط نے کاروبہ۔

۳۔ علی محمود اور محمد اکبر آبادی، وزارت علی اور بی، مہاشینہ یلدرم، نیاز فتح پوری اور کاظمی عبد الغفار۔

زبان اور اصلاح پسندی کی اداعت

۱۔ اردو کے سچے افسانہ نگار راشد الخیری سرسید تحریک کے پیرو تھے اور مسلم حوصلہ کی معاشرت کے ہر پہلو کے شہساز۔ اس سوسائٹی میں کاظم جیسے دین دار اور پرجن گار بزرگ بھی تھے اور صالحہ بھی جیسا کہ اردو خود ازل کیا اس بھی۔ راشد الخیری کے دل پر ان دو کرداروں کا نقش ملتا تھا۔ مگر ان کے دیکھتے دیکھتے ان کی معاشر معاشرت کی فضا مسموم ہو گئی اور راشد الخیری نے اردو کا پہلا افسانہ "نصیر اور شہزادہ" (اسٹوڈیو "نقارن" لاہور، دسمبر ۱۹۰۳ء) رقم کیا۔ یہ افسانہ ایک بہن کی طرف سے بھائی کے نام ایک خط کی صورت میں ہے اور افسانہ نگاری کے جملہ لوازم پر پورا تر ہے۔ مغربی دنیا میں یو جیسے نے کبھی بار اس تکنیک کو بڑھا تھا اور آخر خطوط پر مشتمل ایک افسانہ لکھ کر اس تکنیک کو حاد کر دیا تھا۔

راشد الخیری نے جوں پر ہم چند "انفرادی غصے نہ پائی تھی۔ ان کی غصے کا رنگ اجتماعی تھا۔ صالحہ اور کاظم کی حیثیت افراد کی ہے۔ وہ اپنے طبقے کے لٹاکھ سے ہیں انھیں کے ذریعہ مولانا راشد سوسائٹی کی اصلاح کرنی چاہتے ہیں۔

سوسائٹی رسوم کی زنجیروں میں بکڑی ہوئی ہے۔ تو بات اس کے گلے کا پار ہو رہے ہیں۔ بیویوں اور مردوں نے اسے سخت متعلق بنا رکھا ہے۔ شرک نے مذہب کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اسراف ایک خراب ہو گیا ہے اور اگر پرانی تہذیب اپنی لٹاکھوں اور طریقوں کے ساتھ سوسائٹی کے متعلق اجزاء کو مستحضر کرتی چاہی ہے۔ مرد واری کا خاص ہوتا جاتا ہے۔ کچھ پردہ پر مٹا ہوئی ہے۔ خود طریقے یا باقی چاہی ہیں۔ لٹاکھیت کا رنگ غالب ہے۔ روحانیت معدوم ہو رہی ہے۔ عورت مظلوم ہے۔ اسے اس کے حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس پر ہمسائی اور رومانی قیدیں اس کھڑت سے عائد کر دی گئی ہیں کہ وہ مظلوم ہو گئی ہے۔ وہ اپنے شوہر کی رفیقہ حیات نہ ہو کر محض اس کی تفریح کی چیز بن گئی ہے۔ اس کی اہمیت اور باقی کی مثالیں آئے دن ان کے گرجے میں آتی ہوں گی اور کوئی تہذیب نہیں کران کا دور معدول اس زبوں حالی پر دو اہمیت تھا اور اس کی اصلاح کے لیے چاہا جاتا تھا۔ ان کے افسانے اور ناولی دھم دھم والے کے نالے ہیں جن میں تاثر کی عظمت کثرت کثرت کر بھری ہوئی ہے۔"

۲۔ "غیر مسلموں کو اگر کوئی شکایت ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے مسلمانوں کے لیے لکھا ہے، جس طبقہ کو اٹھا چاہتے ہیں وہ مسلمانوں کا طبقہ ہے، اجتماعی نہیں، کچھ نہیں تو آپ کے افسانے مذہبی تفریح کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔"

ہم چند نے جو راشد الخیری سے اپنے گھر پر مضمون کے اظہار میں کیا ہے، اس پر مفصل گفتگو کا موقع آ کے آئے گا۔ راشد الخیری نے تو علی گڑھ تحریک کے ذریعہ اردو افسانے میں معاشرتی اصلاح پسندی کی داغ بیل ڈالی تھی اور مسلم تنظیم یا فخریوں کی اجتماعی زبوں حالی اور معاشرتی انحطاط کو اجاگر موضوع بنایا تھا اور یوں راشد الخیری نے جو روش "نصیر اور شہزادہ" میں اختیار کی تھی اور موضوعات کا جو دھارا پکڑا تھا تاہم آخر اسے نہیں چھوڑا۔ اس اعتبار سے ان کے بیشتر افسانوں میں یکسانیت کا احساس ہوتا ہے۔ بہر طور راشد الخیری کا نام اصلاح معاشرت اور ترقی نسواں کے لیے جدوجہد کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ راشد الخیری کے ہاں حوصلہ طبقے کی پینچش میں عورت موضوع خاص ہے اور آزادی نسواں مفہوم خاص، جس کے حصول کے لیے عورت کی مظلومیت کو اجاگر کرنا اور معدنی کے ساتھ سامنے لانے (مثال۔ مفدا میں اور افسانوں کا مجموعہ "تقرات الخک") اکثر اوقات افسانے میں رواں جذباتیت کے دھارے نے افسانے کے وحدت تاثر کو محروم کیا

ہے۔ سنی آموز اصلاحی اہل انوس میں "چهار عالم" کہی انوکھی تدبیر کاری کے سبب نمایاں ہے جس میں کہانی کی ابتدا سناڑ کے درخت پر بیٹے کے گھونٹے سے ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ ساری کا خاکت پر پھیل جاتا ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ کارا پہلا افسانہ لکھ دھرف مسلم سوسائٹی کی اصلاح ہی نہیں، چاہتا تھا بلکہ اس کے فاض نظر عالمی سیاسی مظر نامہ بھی تھا اور ہندوستان کی آزادی کا حصول بھی ایک نمایاں اور فوری مقصد تھا۔ یہ Complex صورت حالات تھی اور راشدا الخیری سے حلقہ ہمارے ناقدین کا سہل پسند رویہ جس کے سبب راشدا الخیری کو "مصور فلم" اور اصلاح پسوں کا ہر چارک خطاب کیا گیا۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ راشدا الخیری اور سلطان میندر جوش نے ہر یک چند سے بہت پہلے حب الوطنی اور انگریز دشمنی کو اپنا موضوع خاص بنایا۔ اس حوالے سے راشدا الخیری کا افسانہ "سناہ وراغ" (شعور، شہید مغرب) قصویٰ تھا کہ طالب ہے۔ "سناہ وراغ" واضح طور پر جہانوالہ باغ کے عظیم سانحہ سے حلقہ المائد ہے جس میں ہندوستان کی آزادی کا خواب دیکھا اور دکھایا گیا ہے۔

"نہال دھرم شرکی چار دوج اوری سے کوسوں دور بھاگ چکا تھا، مسخ دوستوں نے گولیوں کی بوچھاڑ شروع کی۔ اہل اس آباد کا دلہا، بیوہ کا دل، جو رورو کر رہا تھا، ہم کو گھٹیں کھینے مغلطہ ہارے تھے حوالے کر دو۔ وہ اپنی درخواست کے جواب میں فیر کی آواز سکتا ہے اور دیکھتا ہے کہ چر سے سے طنز پہنچے گا۔ صداقت کا چٹکا اور اسلام کا عاشق وطن کا شہداء دم دیکھے نہیں جانا تا اور کہتا ہے کہ اس خون کے ہر قطرے سے وطن پرست جماعت پیدا ہوگی۔ یہ خون ضائع نہ جانے گا اور مقرب دولت آئے گا جب تک اس خون پر غور کرنا ہوگا۔"

("سناہ وراغ" شعور، شہید مغرب) اور راشدا الخیری سے اقتباس

راشدا الخیری نے عالمی سیاسی مظر نامے کو دیکھتے ہوئے اپنے عین افسانوں "شہید مغرب"، "طرابلس سے ایک صدا" اور "دو لہجوں دہانوں کی" میں طرابلس پر اٹالوی حملے کے خلاف آواز احتجاج بلند کی ہے بلکہ خالص ہندوستان کے سنی اور سنی مظر نامے کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ راشدا الخیری ہندو مسلم اتحاد کے خواہاں تھے اور انگریز کے خلاف انہیں حمہ و منظم دیکھنا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے ان کا افسانہ "کلونچیاں" ہندو مسلم کشیدگی اور فرقہ واریت پر آزدگی کا کھلا اور بر ملا اظہار ہے۔

آزد ہا افسانے میں اصلاح پسندی اور قوم پرستی کے حوالے سے دھرا بنانا ام سلطان میندر جوش کا ہے۔ جوش کے ہاں البتہ دایہ شو پر شمار کے ذریعہ ہندو اور کشمیری ہند اور ہندو قوم پرستی کا رد عمل بہت واضح دکھائی دیتا ہے، جسے راجپال کی "دھیکلا رسول" دیا سندرسوئی کی "ستیز دھو پرکاش" اور چتر سین شاستری کی "اسلام کا دل دور کش" بھی کتابوں کی اشاعت نے اور بھڑکایا۔

نحیم یوسف مسن بھی افسانے میں اصلاح پسندی کی اسی روایت کا ادائی نام ہے البتہ ان کے ہاں موضوعاتی تنوع ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے "سوسائٹی" میں مظلوم کرداروں کے اصول کا بیان کیا ہے نیز انقلاب کی کوخ ان کے ہاں ہر یک چند سے بھی پہلے خائی دیتی ہے۔

جوش کے افسانوں کا لینڈ اسکیپ دایوں اور اس کا مضاماتی علاقہ ہے جس میں مسلم سوسائٹی کے محبوب کی حاشی کی گئی ہے اور اس کی اصلاح مقصود ہے۔ اس اصلاح پسندی کی شدت نے جوش کے افسانوں میں طرکی صورت اختیار کی اور یوں سلطان میندر جوش نے اپنے مخصوص لینڈ اسکیپ اور طرے لکھ کے سبب اپنا یک مخصوص رنگ پیدا کر لیا۔

جوش اور بحیرہ صفت حسن نے سنا شرقی سطح پر مغرب کی تکلیف ہے بے پاک تنقید کی۔ جس کے اثرات وہ اصل کے طور پر "انکار سے" (مترجم احمد علی) "شعلے" (از احمد علی) اور "عورت" (از رشید جہاں) تک بہت نمایاں ہیں۔

دور مشققت جوش کے ہاں یہ سب حدود اور تنجیلی ہند ہے کا انجانی دکھار اور دراصل تھا جو بعض مقامات پر ان کے افسانوں کو افسانہ تحریر بنا گیا۔ اسلوب حقیقی سطح پر بھی راشد الخیری اور جوش دو مختلف انتخابوں پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

راشد الخیری کی تحریر میں روانی اور سلاست ہے اور وہ فی کی نگار کی زبان تکلف سے دو اپنا کافی نہیں رکھتے۔ ضرب الامثال کو ان کے پاس نہ قسم ہونے والا ایک خزانہ ہے جو وہ دھاک مٹا کر کی تصویر کشی میں کام آیا جبکہ جوش نے دودھ کا پھل رو پیو کر کے اور پھر میں طرفت کا بیج غدا کا کر اپنا ایک اسلوب وضع کیا۔ لیکن جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، سلطان حمید جوش کا تیشی ہند بان کے افسانوں کی گفتنی فضا بندی کے لیے مضمر بہت ہوا۔ جوش خود اپنے افسانہ نگاری سے متعلق کہتے ہیں

۱۔ "میں اس پر وہ کا حای ہوں جس کا حکم قد سب سے دیا گیا ہے۔ ہمارے ادبی کی قید کو میں پر دہ نہیں کہہ سکتا بلکہ ہمارے علم کہتا ہوں۔ البتہ شرقی پر وہ کا حای ہوں۔"

۲۔ "پچھلے دور کا لے کئے کو نفس اور ذلیل جانتا تھا اب کا لے آؤں کو اس سے بھی زیادہ ذلیل سمجھا ہے۔"

(”خواب و خیال“ سے اقتباس)

۳۔ "ہندوستان کے یہاں قومیت نے ہمارے ہندو کی طرح مختلف جسام میں مل کرنا گوں کا اظہار اس وجہ کیا ہے کہ مسٹر بائیکو سے لے کر مر وانگل اور انرنگ ہر سرٹ و سلیو ہستی "تھم ہندواں" یا "ششیر کیف" نظر آتی ہے۔"

(”ایڈ“ سے اقتباس)

قوم پرستی اور اصناف پندہ کی روایت میں ہندوانہ فکر کے حامل ابتدائی نام پریم چند اور مہاشی سدرشن کے ہیں۔ دھندہ داسے، داپنام پریم چند، جن کی اولین تحریر ایک مزاحیہ ڈرامہ تھی، پتھر اور سرشار کو پڑھتے پڑھتے اپنے افسانوں میں پلکھت قوم پرستی، حب الوطنی اور اصلاح پندہ کی طرف تھیں آئے بلکہ ہندو ان احساس کا خاکہ جا کر کرنے اور مطلب دور حکومت کے افسانہ پائی اثرات زائل کرنے کے سلسلے میں ان کی پہلی طبعی زوہ تحریر "پر تاپ چند" ایک مضمون ہے جو ۱۹۰۱ء میں لکھا گیا لیکن شائع نہیں ہوا۔ داپنام سے متعلق یہ مضمون "زمانہ" کا پندرہ ماہ نومبر ۱۹۰۶ء میں سامنے آیا۔ ۱۹۰۵ء، ۱۹۰۶ء، ۱۹۰۷ء کا زمانہ پریم چند نے کا پورہ میں گزارا تھا اور پل گڑھ چنگ کی تحریک آزادی کی لہم میں شامل رہے۔ پریم چند پر اثرات تنگ کے، گوکھلے کے ہیں جس کا نتیجہ نومبر دسمبر ۱۹۰۵ء کے رسالہ "زمانہ" میں گوکھلے پر ایک مضمون کی صورت میں بھی ظاہر ہوا۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں "راہا جان سنگھ" پر رسالہ "زمانہ" کا پندرہ میں ایک مضمون کے بعد مئی ۱۹۰۸ء میں "سوا دیو پکا نند" (مضمون) "زمانہ" کا پندرہ میں شائع ہوا اور "زنجیت سنگھ" کا مئی ۱۹۱۱ء میں۔ مضامین کے ساتھ ساتھ پریم چند نے اپنے انجی خیالات کا اظہار طبعی زوہ افسانوں میں بھی کیا، اس ضمن میں "گنگا کا آگے کھڑ" (مارچ ۱۹۱۰ء)، "دانی سارنہ دھ" (ستمبر ۱۹۱۰ء)، "دکھار دھ کا تیش" (جنوری ۱۹۱۱ء)، "راہ ہر دلی" (اپریل ۱۹۱۱ء) اور "آلہا" (جنوری ۱۹۱۲ء) خاص طور پر ہندو قوم پرستی کے حوالے سے بہت نمایاں ہیں۔

پر ہم چند نئے سن افسانوں کی ابتدا انواب داد کے لکھی نام سے کی تھی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پر ہم چند جہاں پہ لکھی نام کی آ میں پر جوش مسلط مبلغ افسانہ نگار سلطان مہر جوش کی قلمروں کا قور کرنا چاہتے تھے، جس حب الوطنی کے جلانے سے، مرکاری ملازمت پر جے ہوئے اگر بے راج کی کالکت بھی کر رہے تھے۔ یہاں اس دور کے پر ہم چند کے چند نمایاں افسانوں کے اقتباسات دیکھتے ہیں۔

- ۱۔ "چہاں دلہ، آداب جنگ کے کنگی ہاتھ سے ضد چا تھا، اس کی صحت مانی، اسے نکور، پہ نر اور مستعد قسمی پرہا کر نے کی اہاز نہ دیتی تھی۔ اس معاملے میں اگر وہ صحت آئیں، کالکتی تھی سے پانچ نہ ہوتا تو شہاب الدین کے ہاتھوں اسے دزد چہاں دزد یکتا نہ ہوتا۔"
- ۲۔ "زنجیت سنگھ، سادات و شجاعت اور نرم و انصاف میں اپنے وقت کے دکر ادا تھے۔ اس مفرور کابل کا غور، جس نے صمدی بن تک ہندوستان کو سر نہیں اٹھانے دیا تھا، خاک میں ملا کر لایا اور جاتے تھے۔"

(پر ہم لکھی "مسلط ۱۸۵۲ء تا ۱۸۵۳ء سے اقتباسات)

ان دو نگوں کو دیکھیں تو واضح طور پر پیدا کرنا قوم پرست ہندو دین کا خاکس ہے لیکن، دوسرے نگو سے میں روحنی کے نوانے سے پر ہم چند کی بات کر رہے ہیں جو آج کے مسلم پنجاب کے پنجابی اور مسلم سندھ کے سندھی کی آواز ہے، مرقہ اور مرقہ ہاں دلہ پر دس کے مقابلے میں سکندر پر مانی زیادہ مخر م ہے اور انارابہ مشہور حلقہ سکندر اعظم کے ہاتھوں پارت کی شکست پر بھٹک گیا تھا۔

اس ضمن میں ابراہیم الفضل مسرتی کی معرفت پر ہم چند سے متعلق، سلطان مہر جوش کا ایک بیان ملاحظہ ہو۔

"مثنوی جی نے مسلمان دشمنی کی ترنگ میں ایک تاریخی کہانی نام کی لفظ جانے کون سی دورانی جاری کتاب سے نکال کر "رانی سارہ صاحب" اپنے نام سے سنائی، اہلا اور نگہ زیب شہنشاہ نہوار نجیت سنگھ ہوا، جس نے ایک ٹھوس کی خاطر ایک ملک پر چڑھائی کر دی تھی، اور اور نگر سے بے بھی تین چار صدی قبل انی نگر کی مقامی آزادی جو کہانی تو قلم کی لکھی بکڑ سے لکھی، ماسم پر پانچ سے، اور اپنے ذرہ سے، دلہ دہر کی دونوں انٹیوں کی آمدور پر کی کرانی، اور ان دونوں میں ہی آخر تاریخ ہندوستان ہستیوں کے اسلے گرائی کے ساتھ ہندوستان کے مسلمان حضرت اور طیارہ کے ساتھ آئے، لکھ کر کر کرتے ہیں اور یہ دونوں مسلمان اچھا مہکناں مثنوی پر مکی "پر ہم لکھی" کے ذریعہ شکار ہیں، اور میاں خواہ اور یہ ایک جو آپ نے بات کہی تو دیا سندھ سوتی کی ستر رتھ پر پاش اور احوال واقعات، کتاب لکھ کرانی لکھنا انا حکم بدین راجپال کی "نگینا لارسل" بھی تو نوروں میں ہیں۔ یہاں، اپنی تو بھٹی کا فرق تو دور مثنوی میں ہوں، اور یہاں لارسل سوتی یا راجپال یا قصور، کون کون سب کا ہاتھ اور اندوہا ایک تھا، اور اور تو ذریعہ اختیار تھا اور زیادہ سے زیادہ ان لوگوں نے مسلمانوں کی دل آزاری اور مظلومیت کے لیے دشمنی کے ساتھ اختیار کیا، اور حالت کبھی کسی ستر سے نہ کی، مثنوی جی کی ہاتھ لکھائی دور کی کہانیاں سوار ہاتھ کے سرت کٹوں پر چن کر مرقہ کے ہیرہ ایشیا کے مسلمان ہیں اور ان پر یہ کے یہ سائی، حتی کہ اپنے ملک پر مسلط مگر بدوں کو بھی نہیں بھٹتے، جو سوار کے زمانے میں ہاں جو حکم کا کام تھا، جب کہ مثنوی جی کے ہیرہ ہندوستان کے بعد راجپوت اور ان مسلمان ملتے ہیں، اور خلف یہ کہ کالکتی جی کی ٹھیک ٹھیک پالیسی کے مطابق گور سے آقاؤں کے ذکر سے نہایت مہوٹ سے پن کے ساتھ پہلو جی کرتے نظر آتے ہیں، ویسے کا مگر جس کے مجلس بد سے دوزخ سے نکلاتے ہیں۔ اپنے مہول کے مہول افسانوں میں پہلے تو مصائب خاص ہیں کہیں کر دہا ہندوستانی مسلمان مرمہ، دی میں مسلمانوں کے کردار ہی خال خال پیش کئے ہیں، اور جو مسلمان مثنوی کے قلم کو دھوٹ ملا، دھر، قلم مذکور نے حق کا مخر، مخر دس لکھی، مالکا پٹھا اور قور کر داسا کرنے

کا بھڑکا سلیقہ لگا دیکھئے۔ حقیقت ہو چکی کہ معرکہ پانچواں اگرچہ فدر ۱۸۵۵ء میں شروع ہو کر ۱۸۵۹ء میں زوال وودھ پر ختم ہوا۔ جب انگریز نے ہاجاپ سے لے کر پٹنالی تک کی فوجیں جمع کر کے وودھ پر چڑھائی کی اور زوال لکھنؤ کے وقت تاریخ شاہ ہے کہ انگریز فوجیں لکھنؤ کی گلی گلی اور دروازہ دروازہ پرستوں و ملین کی آوازیں پر سے گزر کر پانچواں تک پہنچیں اور غشی بی کا توں قہم دو مسلمان سرداروں کو اس وقت مشافقت میں عالم کہا کر کسی پرانے لکھنؤ کے اندر دھڑکے سے قتل فرماتے چلی کرہ ہاتھ اور نہایت خستہ آلود ہیں۔ تو وہاں ہندوستان کی نہیں شاید غشی بی کی عیار سے نئے کبھی ساحل پر دور سے پانی کا جہاز کھڑا بھی نہ دیکھا تھا۔ مگر تمام کی مسلمان دشمنی میں پہتے سات سمندر پار چاہے اور سات صدیوں پیچھے اٹلی لٹا داری کہا تے اموی دور کے اخیرین میں جا کر لے اور ہسپانوی عیسائی رعایا پر مسلمان کا طریقوں کے وودھ نصیب امن سوز مظالم چلنے کے قاری کا کھیر بنا دیا دیا پانچواں قہم اور تاریخ کی کھڑو ذکر رکھ دی، اور مسلمان قوم کی صورت سچ کر دی، اور پھر ہدی قوم کو بھر پیٹے مصلحتوں کر کے کسی ایک فرد مسلمان کے منہ سے اپنے بیٹے کے قاتل کو ایک جملہ میں صاف کر کے افسانہ نگاری کے ہاتھ کا گویا حق ادا کر دیا۔ جس کے جواز کا تختہ کچھ اور متین پورے افسانہ میں کہیں سراغ نہیں، صرف ”غزوہ افسانہ سے یہ کردار مطلق ہے۔ اب قاتل یہ لکھنؤ گاری ہوئی یا افسانہ نگاری۔ مگر اپنی قوم کی مٹ پر ہر طرح سے ہیں کہ کیا ہاں کہا کر بھی بدعنوان ہوئی۔ اور غشی بی کی خستہ نگاری کے حسین ہاں میں ایسی کھنسی پڑی ہے کہ غلو غشی بی کی قواس توڑ بھاگے گریڈ سے گواہ چسپے، تمام تر لسانی، سماجی، ادبی، سیاسی روگردانوں کے باوجود غشی بی کو صاف کئے پڑی ہے جب کہ بابائے اردو نور اختر حسین رائے پوری انھیں کوششوں کے باوجود نہ امید ہو کر بخیر ہے، اور اس قلمی تجویز پر پچھنے کہ انگریزوں کے ساتھ زبان کے مسئلہ پر کوئی تہنیل مصالحت کی نہیں۔ اور تو اور غشی بی مسلمان قوم کو ہاتھوں میں چو پٹ بگٹے ہیں، گانہ گئی کے لہر سوز و سیاہی اسلٹ ”لہو مسلم اتحاد“ کی تائید میں ساتھ کر بارہ قدم اٹھا دیا یہ بھوک کر اس مسئلہ پر مسلمانوں کے تمام فرقتے، جذباتی اور عقلی انتساب ہیں۔ یہ کھنسی کہاں سے زمین کی زمین آسمان پر قواس کا کہیں یہ کھنسی قلعہ سے لے کر دیکھئے معرکہ کر بلا میں سات ہندو راجپوت برادران راجہ ساس رائے نال کر دیکھے، گھوڑوں پر سوار، تھپڑا رہا ہے، ”تمام مانی مقام“ کے حضور رنہ ران ہاں لیے حاضر ہوتے ہیں اور ”اشکوار“ سے مبارزت ملٹی کی سب سے پہلے اہزت چاہتے ہیں، اور پھر ایک ایک کر کے ”نہیں نہیں“ کی فوج پر، غشی بی جو ان راجپوت ساتوں کو مسرا وودھ کھاتے ہیں تو شیخ ہندی اور چور شیخ لہستہ پر پورا انداز رہا جاتے ہیں۔ خبر نہیں کہس نہیں فرمایا کہ تاریخ پر جہان بانڈہ کر دیا جاتے، حضرت امام حسین کی ذات پاک کو بھی شریک ایکٹنگ کیا، اور ان کی زبان مبارک سے نکال لکھاری کی خاک میں ان ساتوں کو کر بلا کے شہید و لہیں کہلو اور جب ان کی قہیرو غشیوں کا سوال یہ ادا تو خاکم ہوا کہ ”تمام مانی مقام“ نے طریقاً نہیں نہیں یہ جود ہیں انہیں، انہیں نہیں کیا جانے کا نہیں جہاں آتش کیا جاے گا۔“ اور ان کی چٹائیں علیہ کرانی نہیں اور آگ بدھن غشی بی، تاکہ بدھن ان چٹائوں میں ”تمام مانی مقام“ نے جہاں خود اپنے ساتھ سے حقیقت لکھا۔

”معاذ اللہ“ لاجل و لا قوا۔“

یہ بلاشبہ ایک ایسا پہلہ ان بیان ہے، ایک خاص طرح کی کڑھن کا نتیجہ، نیز سلطان حمید جوش کے نکتہ نظر سے چشمہ ستارہ پر اختلاف ممکن ہے لیکن اس بیان سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس بحرانی دور میں ہمارے لوگ لکھنؤ افسانہ نگاروں کے پیش نظر ہندوستان کے سیاسی اور سماجی حالات و واقعات تھے اور وہ اصل افسانہ نگاروں کو رہے تھے بلکہ اپنے اپنے طبقے کی نمائندگی بھی کر رہے تھے اور اگر آپ کی نگاہ پر یہ

صورت حالات تھی تو اسکی سطح پر کیا نہ کہ نہیں ہوا اور گاہر بعد میں سیاسی سطح پر دو قسمی نظریہ کی بنیاد بنی۔

پہلے چند کے ابتدائی افسانوں "دانی سارو جھا" اور "گنگا کا اکھن کٹھ" (۱۹۱۰ء) "نکر بانجیہ کا تینا" (۱۹۱۱ء) اور "آٹھ" (۱۹۱۴ء) سے متعلق سلطان حیدر جوش کا نظریہ تھا کہ آپ نے ملاحظہ کیا۔ لیکن اب دیکھا تو پتہ ہے کہ پہلے چند کو کوئی جھوٹ بھی لگتی ہے یا نہیں؟ میرے خیال میں بالکل جاتی ہے۔

۱۔ پہلے چند کا افسانہ "نیائے" ظہیر اسلام اور مصباح کرام کے مثالی کردار کو پیش کرتا ہے۔ جس پر جوش نے کوئی بات نہیں کی۔

۲۔ پہلے چند کا افسانہ "نہ" مسلمانوں کی ابتدائی فوجیات (خصوصاً پنج اکھین) کے حوالے سے مسلمانوں کے اخلاقی اوصاف آپ کو گر کرتا ہے۔ لیکن سلطان حیدر جوش اس افسانے سے بھی خوش نہیں۔ مسلمان اگر عملاً اور حقے تو حقے۔ یا ایک تاریخی حقیقت ہے۔

۳۔ پہلے چند کا ڈرامہ "کرلا" (پانچ ایکٹ کا ڈرامہ) حضرت امام حسین کے حضور رکھا اعتبار عقیدت ہے۔ جس میں رامیں رانا کی سربراہی میں ایک ہندو جماعت نے امام حسین اور ان کے بھتر ساتھیوں کے ساتھ لڑ کر چینی لشکر کا مقابلہ کیا اور عظیم دستہ کے مقابلے میں ہندو مسلم اتحاد کی اولین مثال پیش کرتے ہوئے کرلا کی خاک کا بیج بکھری گئی۔ جس کی داغ بوش نے "معاذ اللہ" کہہ کر دی۔ یہ افسانہ ہے۔

۴۔ ۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۴ء میں لکھے گئے خاندان افسانوں اور اکتوبر ۱۹۰۵ء تا مئی ۱۹۰۸ء میں تحریر کردہ پہلے چند کے فرقہ دارانہ مضامین (اگر قسم "دلیہ مان گنگا"، "دلیہ گنگا"، "دلیہ گنگا"، "دلیہ گنگا" اور "سواوی دلیہ گنگا" مطلوبہ "زبانہ" کا پتہ) کی اشاعت پر پہلے چند کا ساری زندگی افسوس رہا۔ جبکہ "خاک پر دانہ" (۱۹۲۹ء) میں شامل افسانوں میں تو انہوں نے اصل مسئلہ کی جڑ تک پہنچ کر طبقاتی کشش کے نتیجہ میں ہندو مت کے چیل چیل پر روشنی بھی کی۔

جہاں تک "پہلے کھنسی"، "شہر گج کی ہادی"، "اور" اور "تور" کا تعلق ہے تو "پہلے کھنسی" اور "تور" سو فیصد ایسے افسانے ہیں جن میں ہست ہست مسلمان ظہور و کان ہیں نہ کہ ہندو مسلمان۔ البتہ "شہر گج کی ہادی" میں معاذ اللہ حد تک سلطان حیدر جوش کے کہے کے مطابق دکھائی دیتا ہے لیکن کیا اس افسانے میں بھی ہندوستانی طبعیت کو نہیں دکھایا گیا؟ اور ہندوستانی؟ ہندو، مسلم، سکھ ہے۔

اب جہاں تک "گج اکبر"، "مید گاد"، "پنساچہ سورم"، "سندھ"، "فاخر" اور "اوچ" کی حرات "چھٹے افسانوں کا تعلق ہے تو سیکولرزم کے لوگ کہیں گے کہ یہ ہندوستانی مسلمان کی روزمرہ زندگی کی عکاسی ہے جبکہ سلطان حیدر جوش کے ہوا "میں کھلی اسلام دشمنی دکھائی دے گی۔ یہاں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے چند کے عملاً نظروں کو دیگر خزانوں کے ساتھ بھی پکھا جائے۔

پہلے چند اپنے ایک ہندوئی مضمون میں لکھتے ہیں،

"فرقہ داریت ہمیشہ تہذیب کی روپائی دیا کرتی ہے۔ اسے اپنے اصلی روپ میں لکھتے شاید شرم آتی ہے۔ اس لیے وہ (ان) کو دھمکی طرح سے جو شیر کی کھال اڑا کر جنگ کے جانوروں پر دھب دھاتا نظر آتا ہے۔ فرقہ داریت تہذیب کا خول پہن کر آتی ہے۔ ہندو اپنی تہذیب کو قیامت تک محفوظ رکھنا چاہتا ہے، مسلمان اپنی تہذیب کو۔ دونوں ہی داہمی تک اپنی اپنی تہذیب کو اچھوتی سمجھ رہے ہیں۔ یہ بھول کے جو کہ اب نہ کہیں مسلم تہذیب ہے نہ ہندو تہذیب، نہ ان کوئی دوسری تہذیب۔ اب دلیہ میں صرف ایک تہذیب ہے اور وہ ہے اچھوتی تہذیب۔"

(بحوالہ پہلے چند "قلم کو ساقی" صفحہ ۵۲۸)

صرف یہی نہیں پر ہم چند نے مستقل کے ہندوستان کو آزاد خیال اور نرہ اس دیکھنے کے لیے مروجہ کے نسلی تقاضا کو ختم کرنے کے لیے معاشرتی آواز بننے میں موجود خرابیوں کی چھوڑائی کرنے کے لیے افسانہ ”لہات“ (۱۹۳۳ء) لکھ کر یہ اعزاز اپنے سر لیا کہ وہ اعلیٰ نسل کے ہندوؤں کے خلاف نفرت کا پرچار کرتے ہیں۔

۱۹۳۳ء میں جب آریہ سماج والوں نے شادی شریک کا آزاد کیا تو پریم چند نے دیارِ افسانہ ”روانہ“ (کاچہر) لکھا۔ ”شادی“ پر ایک مختصر مضمون لکھ کر ہوں۔ مجھے اس شریک سے سخت اختلاف ہے۔“

(”پریم چند شخصیت اور کارنامے“ صفحہ ۱۷۵ء)

فروری ۱۹۳۳ء کے ”زمانہ“ کا پتہ میں یہ مضمون ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اس مضمون میں شادی شریک کی مخالفت کے ساتھ پینٹل کا گھر میں کی پالیسی پر بھی ردی کا اظہار کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں

”افسوس کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ کراکھریں نے بھی انتہائی طور پر اس شریک سے الگ تھلک رہنے کے باوجود اخلاقی طور پر اس میں شامل ہونے میں ہرگز ہمت نہیں رکھا۔ انتہائی نہیں، ایک بھی قوم دار کا گھر کسی جیسے اعلان کر کے ان فکرگوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا قصور نہیں کیا۔“

(”لکھنؤ ارجن پرنس پریم چند مصلوبہ“ ”زمانہ“ کا پتہ فروری ۱۹۳۳ء)

۱۹۳۳ء میں چتر سین شاستری کی کتاب ”اسلام کا زہریلا درخت“ (ہندی نام ”اسلام کا دوش درخت“) کا شائع ہونے پر ہم چند نے ہندی ادیب بھاری داس چتر دیوی لکھا

”مغرب پرستی کا پلانے کی یہ نہایت شرنگیز اور سستی کا نقش ہے جس کا اصل گھوٹا ضروری ہے۔ میں خود یہ سوچ رہا تھا کہ اس کتاب کو چھٹنے کے بعد اس کے بارے میں لکھوں گا اور اب جب کہ آپ نے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، میں دل و جان سے آپ کے ساتھ ہوں۔ ہم اقلیت میں ضرور جیتا لیکن ہمیں اس کی پروا نہ کرنی چاہیے۔ ہمارا مقصد مصلوبہ ہے۔ میں آپ کا نوٹ ”جاگرن“ میں شائع کر رہا ہوں۔“

(”پریم چند کے خطوط“ صفحہ ۲۶۵)

چتر دیوی صاحب کا یہ انتہائی نوٹ پریم چند نے اپنے پرچے ”جاگرن“ میں شائع کیا اور اس ضمن میں ”جاگرن“ اور ”فیس“ ”مرجہ“ پریم چند کے مصلوبہ پرچے اس چیز کا کٹاواٹ ہیں کہ پریم چند نے اس شرانگیزی کی کل کٹاواٹ کی۔ اس طرح چھ درکار ہیں کہ لکھتے ہیں

”ابن چتر سین کو کیا ہو گیا ہے کہ ”اسلام کا دوش درخت“ لکھ ڈالا۔ اس کی تنقید تم لکھو اور وہ کتاب میرے پاس بھجیے۔ اس کی کاپی پر دیکھو لکھنے سے کارندوں سے متاثر نہ کرنا ہوگا۔“

(”پریم چند کے خطوط“ سے اقتباس)

حب الوطنی کے حوالے سے دیکھیں تو پریم چند کا پہلا طبع زہریلا مصلوبہ افسانہ ”مصلوبہ دینا اور حب وطن“ ”اس مصلوبہ کا نقش ازل ہے اور انگریزوں کے خلاف اس کی جھڑپیں اور جیش کا افسانہ اس جھلکت سے لکھا جاسکتا ہے کہ جس جھڑپ سے ”سوز وطن“ ”میں یہ افسانہ شامل کیا گیا اسے اشتعال انگیز قرار دے کر کتاب کی کئی کاپی تین سو کاپیاں چھوڑ کر جیتے سات سو کاپیاں ضبط کر کے جلا دی گئیں۔ اردو ادیب میں وطن پرستی

کے حوالے سے پڑھ لیں امر پورا آواز تھی۔ پریم چند نے ”سوز و گم“ کے دیباچے میں لکھا تھا

”ہمارے ملک کو ایسی کنہوں کی اشد ضرورت ہے جو اپنی نسل کے فکر پر غلبہ وطن کا نقش بنائیں۔“

کتاب کی فضیلت کے موقع پر اتر پردیش کے جنرل ملائے میجر پر کے ڈپٹی کلکٹر نے پریم چند سے کہا تھا۔ ”تمہاری کہانوں میں سینے بطنی
 برابرا ہے۔ اپنی فکر پر خوش ہو کر انگریزی مصلحتی اور بی معطلوں کا دان کاٹا تو تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے جاتے۔ تمہاری کہانیاں ایک
 طرف ہیں۔ تم نے انگریز کی سرکار کی تعریف کی ہے۔“

اور حقیقت اس دور کا پریم چند ہندوستان کی آزادی کا نقیب تھا اور اس کے ان اف نون میں انھیں ب کے قدموں کی چوہ اور دم
 توڑتے ہوئے عہدیداروں کی لٹکا رسالہ جاتی دیتی ہے۔

”ہمسوں نے کہتے ہیں کہ ایسے وقت آیا جب ہم جیڑی مہاس نواری کرنے کے قابل نہیں۔ ہمارے بابا دادا کا دس آج ہمارے ہاتھ
 سے نکل گیا اور اس وقت ہم بے وطن ہیں۔ مگر (پہلو بدل کر) ہم نے حملہ آور نہیں کوٹا دیا کہ اچھٹ اپنے دس کے لیے کبھی بے بگری سے
 جان دیتا ہے۔ بیاں پاس جو لاشیں تو دیکھ رہا ہے یہ ان لوگوں کی ہیں جو اس توار کے گھاٹ اترے ہیں (منکر کر) اور لوگ کہیں بے وطن ہوں
 مگر قسمت ہے کہ حریف کے ہتھے میں مر رہا ہوں (چپے کے قدم سے جھٹکا نکال کر) کہ تو نے یہ سر ہم کو دکھایا۔ خون ننگے داسے دنگے سے کیا
 فائدہ؟ میں اپنے ہی وطن میں غلامی کرنے کے لیے زندہ رہا ہوں، نہیں ایسی زندگی سے مر رہا تھا۔ اس سے بڑھتے گلن نہیں۔“

(دوپا کا سب سے اہم دل رتن)

اٹھانے کا اختتام یوں ہوتا ہے ”وہ آفری قند خون جو وطن کی حالت میں گرے دیا کی سب سے پیش قیمت شے ہے۔“ اٹھانے
 کا مرکزی کردار اہل کار محبت میں امتحان سے گزرتا ہے اور محبوب (دلریب) کے حضور یہی پیش قیمت شے اسے نذر گزارتا ہے۔

پریم چند کے اٹھانوں میں سماجی دور تک آئے آئے قریب ہم تھاوان، اٹھانے کی قریب، کسان مزدور قریب، ستہ کر اور سولی
 باغیانی کی قریبیں اپنے عروج تک پہنچتی ہیں اور اٹھانے میں بھول آئی اور سرور، پریم چند جھنڈا لٹکان بن گیا۔ اس نے تاری ظلوں اور چٹا
 گاؤں میں گھس کر ہمارے دلوں پر کچھ کے لگائے۔ اس نے انگریز اور سرمایہ دار، پ گیارہ سے دو طرفی جنگ لڑی۔ (مثال سر بڑا ترا) یہ
 اٹھانے ہندوستان کے گھری قریبوں کے نقیب ہیں جب کہ پریم چند کے کرداروں کی حیثیت ہمیشہ باعث خراج رہی ہے۔ لیکن کیا کیا جئے کہ
 اٹھانے ”کپتان“ میں جگت سنگھ مثالی باپ کی تمام خصوصیات پریم چند کے والد کی مثالی باقی خصوصیات ہیں اور ”مستعد گزنی“ کی دیکھ پریم چند
 کی کھلی بیوی کا گھس ہے۔ اس ضمن میں پریم چند کے ایک بڑا نونی فائدہ گورڈن سی۔ روڈائل (Gordon C. Rodsmell) لکھتے ہیں¹⁵

”Critics have charged that Premchand did not understand the middle upperclasses as he did the peasants and this may be true but such a Judgment must be weighed in terms of his literary intentions“

پریم چند کے کرداروں کا زندگی کی خوشیاں چھوڑ کر دیا کو چنگ دینے کا رویہ، چھٹا دینے کی حد تک ان کی جنسی کمزوری اور پیچھے رہنا
 کی نسبت زندگی کا گہرا استاد ہونا وہ قابل توجہ ہے اور اگر یہ بھی کہا جائے کہ اس نے گھل کسان کو اس کی تمام سچائیوں کے ساتھ موضوع بنایا تو یہ

کیا کم ہے؟ اصل روئے، سزا کا کل اور جین آسٹن نے زندگی کے محض ایک ایک گوشے کی عورتوں کا رویہ کیا ہے۔ یہ ہم چند کے نمائندہ افسانوں میں "یوے ٹرک کی چٹی"، "ڈھنل"، "گلی ڈاڑا" اور "کٹن" بہت نمایاں ہیں اور ای نوع کے افسانوں کے حوالے سے یہ ہم چند کے ایک اور برطانوی ناقد ڈی۔اے۔روبن (David Robin) لکھتے ہیں۔"

"Blurred by Dickens, Tolstoy and impressed by Marx Premchand very early directed his fiction toward social reform"

دکھتے ہیں، یوٹائیٹ اور دھن روٹاں سے متاثر ہونے کا اثر خود پر ہم چند نے بھی کیا ہے لیکن اپنے ہاں ہندوستان میں ایک آواز ابتداء میں بہت متاثر کن رہی ہے اور وہ ہے مہاتما گاندھی کی آواز۔ برطانوی افسانوں کو ایک، گاندھی ہندوستان میں نائنٹی کے طے کاات کو کروڑوں افسانوں کی محلی زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن یہ ساتھ بہت قوی مدت تک رہا۔ گاندھی جی کی عدم تشدد کی پالیسی پر ہم چند کے لیے ہوا ان روح میں لگی اور بکال کے ہمارے نے ملتی پر کل کا کام کیا۔ تب یہ ہم چند نے افسانہ "پیم آشرم" لکھا، جس کا یہ ویراج، روس کے کسانوں کی طرح اٹھاب برپا کرنا چاہتا ہے۔ ان کے افسانے "قافلہ کی باں" کو یہ ہم چند کے تشدد کی طرف جھکاؤ کا نمائندہ کہا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد یہ ہم چند صرف افسانہ نگاری میں ایک تحریک بن چکا تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اوپر میں اور انش مندوں کو اس کے دکھ درد میں ہاتھ ڈالنا ہی ہوگا۔ اس کے بعد ہی وہ امن اور کمرانی کی تلاش کر سکتے ہیں۔"

یہ ہم چند کا یہ حوالہ انہی فی کثر سے ہے اور جب جب تحریک آزادی کا مطالعہ کیا جائے گا تو سیاسی تحریکوں اور سیاسی رہائشوں کی پالیسیوں کے ساتھ یہ ہم چند کے افسانوں کا مطالعہ بھی ناگزیر ہوگا۔

توس پر ترقی اور تشددیت کی اس روایت میں ہندو افسانہ نگاروں نے خود افسانے میں اصلاح پسندی کا آغاز کیا تھا وہاں سدرشن ہے۔ سدرشن نے اس نوع کے افسانوں میں وہ بھی آزادی کا منظر نامہ چتا اور سیاسی اور سماجی حوالوں کے ساتھ ہندو طبقے کے عمومی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

بالخصوص افسانے کے زیر اثر غم لینے والی سماجی رائجوں اور نا افسانوں کو موضوع بناتے ہوئے سدرشن نے جھوٹ پھات، چھوٹی مہر کی شادی، ہندو دیوانوں کے مسائل اور وہی علاقہ جات میں تہذیب ناگہانی پر ہندو افسانہ نگاروں کے ساتھ غم اٹھایا۔ ہندو دیوانوں کے خاندان سے متعلق ہونے کے سبب سدرشن کے افسانوں میں اس تہذیبی رجحان کی ایک پہلی بارہ دیکھنے کو ملی، جس نے راجندر سنگھ بیدی کے ہاں اساطیر کی پڑائی لکھنے کے سبب "مہن" اور "مگر ہن" جیسے افسانوں کو جنم دیا۔

مہاتما سدرشن کی نمایاں پہچان دیشا کا گاندھی کے دکھ کا یہ چار اور ٹھیک سیل پر مخصوص نوع کی اصلاح پسندی ہے، جس کی مثال سدرشن سے پہلے محض چند رہے یہ ہم چند کے ہاں دکھائی دی تھی۔ شاید اسی لیے سدرشن کو یہ ہم چند کا تشدد کہا جاتا ہے جبکہ ان دنوں کا فرق بہت ہے۔ سدرشن لہجہ کے تشدد سے روایتی ہیں اور ان کا اظہار شاعرانہ تہذیبیات سے انسانی جذبات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ افسانوی تدبیر کاری کے اختیار سے سدرشن نے خود افسانے میں نفسیاتی تجربہ کی فضا اور کئی اور مدلی بھی بنائی لیکن ان پر سے پردہ اٹھائے۔ یہاں ہمیت کے قافل

بات یہ ہے کہ سدرشن کے کردار طے شدہ انفعیات کے حامل نہیں ہیں اور اگر کا تھوڑا مل جاتا تو اس کی شخصیت سادی کرتا ہے۔

سدرشن کے افسانوں کا خصوصی موضوع شہر کا بعد و مفید پیش طبقہ ہے اور اس کی زندگی کا تفصیلی مطالعہ۔ (مثال) "اپنی طرف" و "کچرا" "بعد اے بکر خراش" اور "خانہ داری حقیق" کو یہ بات کی سیاسی بیداری دوسرا موضوع ہے جو سراسر پریم چند کے تتبع میں آیا۔

مہاش سدرشن کا زندگی کے بارے میں نکتہ نظر محدود ہے۔ ان کے کردار زندگی کا گنج تجربہ کر کے لوہو لالچ سے دور بچتے چلتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ قاتل پتھری کی انتہائی حدوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثالیں افسانوی مجموعوں "چھدن"، "بہار چھان"، "خانہ خیال" اور "سدا بہار بھول" میں پایا جاتا ہے۔

سدرشن المیہ کا اثر کا افسانہ کبھی نہیں ایک منفرد اسکول کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے ثانویہ فیصلہ افسانے اسی تاثر کے حامل ہیں جنھں ایک مثال پھر وہ افسانوں کے مجموعے "خشم و چراغ" کی لیں، مسات افسانوں کا اختتام مرکزی کرداروں کی موت پر ہوتا ہے، جبکہ "آخرے سکھنے" کا مرکزی کردار آخر میں غائب ہو جاتا ہے۔

مہاش سدرشن کے افسانے عموماً شاعری کے یا اسی شکل کی ابتدائی مثالوں میں شمار ہوں گے، خصوصاً افسانہ "شاعر" کا مایاب ترین کوشش ہے۔ البتہ ایک خامی جس کا شکار عام طور پر سدرشن کے افسانے ہوئے وہ افسانے کے اختتام سے پہلے صلیب کی آنکھ ہو جاتا ہے اور اس سے ضرور تاثر میں کمی واقع ہوتی ہے جبکہ سدرشن کے بہترین افسانوں میں "دو بھرت" "پانچاڑ" اور "آزہ" نکل "بہشت یا دکار" رچیں گے۔

۵۔ اور وہ افسانہ اپنے ابتدائی چند برسوں میں جہاں بعد و چھان کی سیاسی اور سماجی دھڑکوں کو اپنے اندر سمور ہاتھو چڑھائی ہوئی، وہ دہائی افسانے کا رشتہ نامی داستانوں سے جوڑنے کا جتن کر رہے تھے۔ چوہدری محمد علی دہلوی ہماری افسانوی روایت کا اولین استاد تھے افسانہ نگار ہے، بقول پادشہ:

"وہ اردو لکھتے ہیں تو اس میں دو لوج اور لطیف طرز اور گفتن ہوتا ہے، جس سے پرانے لکھنؤ کی ہیک آتی ہے لیکن باقی کرنے پر آتے ہیں تو ہنسیات اور انفعیات کے ماہرین فرانتز اور یوگاک ایش دوسری طرف ان کی زد میں ہوتے ہیں۔ بزرگوں اور بڑوں کے درمیان ہوتے ہیں تو ان سے آخرت، ہانڈ اور اوراد کا تذکرہ کریں گے اور نو جوانوں میں ہوں گے تو ہنسیات کے مسائل پر ایسی محققانہ گفتگو کریں گے کہ بڑے بڑے سنگین حواہیوں کی آنکھیں کھل جائیں۔ نو جوان ترقی پسندوں کو وہ شفقت اور ہمدردی سے دیکھتے ہیں۔"

(سدرشن کی "از سدا بھیر سے افسانے")

انور دیکھا جائے تو سدا بھیر نے جتنے موضوعات گھمائے، ان پر محمد علی دہلوی نے جنھں گفتگو ہی نہیں کی، انھیں اپنے افسانوں میں بھی سمیٹنے کا جتن کیا ہے۔ صوبہ جات متحدہ کی ہمد گھیر ترقی انفعالی ان کے افسانوں کا وصف خاص ہے اور اس میں بھی خصوصیت کے ساتھ صلیب بارہ بھل (اور د) کی قصباتی فضا، داس کی غمزدہ زندگی کی شکل خاص خصوصیت کی جانب ہے۔ جبکہ یہ سب جنسی افسانہ لکھنے و نوس میں ان کا کوئی ہمد نہیں بقول مولانا مصلح احمد:

"محمد علی کی سب سے بڑی جیت یہ ہے کہ وہ زندگی کو ایک وقت جاری اور دائمی دونوں زاویوں سے دیکھتا ہے اور مقابل کی یہ

خصوصیات ایک واحد فن کار میں بہت کم جمع ہوتی ہیں۔ وہ اپنے خارجی خصوصیات کو اپنے اندکار کا لباس ایسی خوبی سے پہنا دیتا ہے کہ دیگر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ہمارے ایک ہی صنم فرد ہو کر کے لیے چار کیا گیا ہے۔ وہ خارجی دنیا کی معمولی سے معمولی بات کو اپنے احساسات میں سمو کر انہیں ایک نئی زندگی اور ایک نئے معانی عطا کر دیتا ہے اور جب یہ عمل مکمل ہو جاتا ہے تو ہم نہیں معلوم کر سکتے کہ ان میں حرکت کون تھا اور حرکت کس نے پائی۔ مثلاً وہ ایک گریس کی گت میں نسیم کی آجندہ کی اور اس کی روحانی میں ایک بڑی بی بی کی منہا بہت خوبی کا ذکر کرتا ہے۔ حقیقت کا یہ مطالعہ جہان سے خود بغایت درجہ حرارت نچر ہے۔ لیکن جب وہ اس تاثر سے کہ وہ اوزیر نظر کے ایک عمل کی لمبیاتی تعبیر کی طرف لپکتا ہے اور پکنتے ہی تاثر کو مکمل بھی کر لیتا ہے تو حیرت انگیز اپنی انسانی حواسوں سے دبانے کو جاتی ہے۔^{۱۸}

ایک طرف آزادی تنہا کی تحریک عمل دی تھی اور چوہدری محمد علی آزادوی نے کہا تھا۔

”حیرت بد صورت ہوئی نہیں سکتی۔“

اس قول کے پیچھے وہ اپنی اعتراضات بھی لکھایاں ہیں لیکن دراصل اس کا باعث

”راحمہ الطریف انانیت کا افکار، ہادو اور مستفاد کے بھی انانیت کے افکار ہی رہتا ہے۔“ میں^{۱۹} کے استعمال سے پریشان ہے مگر ”میں“ اس

کا کوئی نہیں چھوڑتا۔“ (محمد علی آزادوی، ”سیرت مذہب“، مطبوعہ ۱۹۳۸ء)

صاحب مطالعہ آتی تھے۔ کھنڈ کی نکتہ خاں تجلی زندگی یا انھوں نے جنسی معرکے یا رانجوں کے شادی ہی نہیں شریک بھی تھے، جس کا ثبوت الفاظ ”کہاں کا طرف“ ہے۔ محفل آرائی اور پیرائے میں خالق، ذریعہ تجلی کے مالک تھے۔ یہی سبب ہے کہ جب ان کے پاس جنسی کیمیل میں حزن و حال کی کیفیت ابھرتی ہے تو ہماری فضا کو سوا گوار بنا دیتی ہے۔ یہ حقیقت اپنی تیکہ کہ جنس نگاری سب سے پہلے انہوں نے کی اور ہم جنس کے موضوع پر پہلا اثرات لکھنا (مثال ”تیسری جنس“)۔

محمد علی آزادوی کے دیگر معاصرین خصوصاً راشد فیاضی، سلطان حیدر جوشی، مولیٰ حسن نکھای اور مہاشہ سدرتنی خارج سے داخل کی طرف باصومہ رجوع نہیں کرتے بلکہ محمد علی آزادوی نے اپنے الفاظوں کی بنیاد و خصوصیات خارجی پر بھی ہے اور انہوں نے جو کچھ کہی آکھ سے لکھا ہے اسے باطنی حوالوں کے ساتھ دکھانے کا جتن کیا ہے۔ ان کی اپنے موضوع کی طرف توجہ قدرتی خاصیت داخلی اور نفسیاتی حوالوں سے ہوتی ہے اور میں محمد علی آزادوی حقیقت پسندی اور خیال آفرینی نیز انسان کی داخلی آوازوں کا ایک ایسا بے رحمانہ و احزان متکفل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو ماحولی منظر نامے پر صرف اور صرف ”گریٹ ماسٹر“ کا خاصہ رہا ہے۔ انہوں نے زبان و جان کے معاملے میں مشق کو اپنا یاد اس طریق کار میں کامیابی صرف اور صرف زبان کے علاوہ استعمال سے ہی ممکن ہے۔ بقول صلاح اللہ علی احمد۔

”اس نے طویل مشق سے اور تجربے کی بنا پر وہ زندگی کی مختلف کیفیتوں سے منہمک حاکم کا استخراج کرتا ہے ان صورتوں اور ان حاکم کو وہ ایک نہایت لطیف و طبعی اسے میں کہ سادہ و درخشنی سے۔ ایک وقت متصف ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے دکھ دیتا ہے اور پھر اس بات سے لکھا ہے۔ یہ نیا ہو جاتا ہے کہ ہم اس چٹکیش سے کس طرح متاثر ہوتے ہیں۔ وہ ایک خاص آدرش ہے اور اسے اپنی تخلیقات سے بھیجے بلکہ مرد کار ہے کہ وہ اس کے کہاں نہ خصوصیات سے نکل کر انہیں اعتماد دین لیں۔ رہا ہے کہ ایمان کے جمال جہاں آرا سے کہا اثر قبول کرتے ہیں اس سے اسے کوئی غلط نہیں۔ اس کا یہ انداز نظر اپنے موضوعات تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ اس کے ذریعہ اعتبار یعنی زبان اور الفاظ کی نسبت بھی ایک انداز ہی بلکہ دوسرا انداز دیتا ہے۔ درحقیقت ہے۔ وہ اس بارے میں کبھی سمجھنے کا بھی قائل نہیں اور وہ ایک مخصوص ذہنی کیفیت کو میں وہی الفاظ دینے پر

اصرا کرتا ہے جن میں وہ اس پر آمادہ ہوئی اور اگر آپ قبولی عام یا رواج ادب یا غوثِ مکتب کے پیش نظر اسے کسی قتالِ لفظ یا ترکیب کی طرف متوجہ کریں تو وہ اسے سوچیں گے کہ صورتوں میں رو کر دے گا۔“^{۱۹}

قتالِ لفظ کا خطرہ

۱۹ "اعذر اللہ! سنو بی بی! تم اور صفیر پر اسے سے ملے گا۔ میں باقی کیا کرتے ہو۔ اور جو کوئی جگہ کہہ رہا ہے؟

۲۰ جہاں ہے جو کوئی جگہ کہہ دے۔ کہتے نہیں تو ڈر کس کا۔ بھلا جھوٹے؟ تو برس چھوٹا اور دیگر وہ تو بھوکو چچی کہتا ہے۔

۲۱ "اعذر اللہ! یہ تو ٹھیک ہے مگر تم جب دیکھو اس کی بی بی کا ذکر کیوں کرتی ہو؟

۲۲ جہاں میں رہتی کیا ہے۔ اگر میرے خیال میں دوسرے ہو جے تو اس کی بی بی گوزلی کا ذکر کیوں آتا۔

۲۳ "اعذر اللہ! تم ہنسنا چاہو گی اور؟

۲۴ "ہنسی آتی ہے تو کوئی کیا کرے؟

۲۵ "اعذر اللہ! پہلے کیوں نہیں بستی تھیں۔ ہنسی تو بستی، پرانی شغل۔

۲۶ جہاں میں اس کے شغل اپنے بازو سے پر سے ہزار چران صدقے اتارے ہیں۔ خیر اب اس کا ذکر ہی کیا۔ جب جوفانی میں اس طرح کے

خیال نہیں آئے تو اب یہ حجابے میں اس کا ذکر کیا ہے۔

۲۷ "اعذر اللہ! بڑھی تو تم انکل نہیں ہو۔ اس کو تم بھی سمجھتی ہو۔

۲۸ جہاں میں بڑے تو ایک ڈر کا ہوا بھی ہے۔ اس کی بی بی تو وہ کسی ہی بھیا ہے۔

۲۹ "اعذر اللہ! مگر وہ صورت میں تو تمہارے تلوں کے برابر نہیں ہے۔

۳۰ جہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر اس سے حجاب تو ڈھکی ہوئے کو ہے۔

۳۱ "اعذر اللہ! اور جو ہو جائے"

۳۲ جہاں ہو جائے تو ہماری جوتی سے ملو سے سے پاپوش سے، مگر نہ ہوتا تو اچھا تھا۔

۳۳ "اعذر اللہ! یہ دیکھو نکلا۔ اب بھی تو میں کہتا ہوں۔

۳۴ جہاں ہو گا بھی ہم کیا کریں، فیض نہیں آتی تو یہی سوچتے گئے ہیں۔ کوئی نہ کوئی خیال آئے گا ضرور۔

۳۵ "اعذر اللہ! اور اسی کو سوچتے سوچتے سوچتی تو ہوتی ہو۔

۳۶ جہاں اس س جاتے ہیں، اب نہیں تو اب س جاتے ہیں۔ منحصر صاحب تو ہیں نہیں۔ ہمیں ڈر کس کا چڑا ہے، کرسی نہیں تو ہمارا کوئی کیا

کرے گا۔

۳۷ "اعذر اللہ! ہاں اب ٹھیک راستے پر آ گئیں، ابھی تو میں کہتا تھا کہ جو کہہ کر وہم سے صلاح معلوم لے کر کرو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ واقعی اگر

صفیر کے ساتھ ہو جائے تو چاہیں۔ گناہ سب باتوں کا آرام، ہاں مگر ہم ہی کوئی ترس گیا۔"

۳۸ "ہاں میں نے ابھی کہانی جس سوز سے گزرتی ہے ہمیں اس وقت اس سے غرض نہیں لگتی گے ہاتھوں اس افراتفری کی بھی ایک جھلک

دیکھتے پہلے جو صفیر کے اصرار ہونے کے بعد اس کے دل میں ایسی اندر والے نے پائی۔

صغیر اٹھنے یا تھک کر کی جھٹک چکی تھی اور نہ ہی کوئی ہوگی۔ اب ہمارا اور کچھا۔ وہ صورت شکل، وہ دھب، جس، وہ تاج، وہ اعضا، وہ مزاج کی تشکیل اور یہ طرز سے مجھ کے بچائی، آنکھوں میں چہ بی چھائی ہوئی، سماں کے اندر کے کوہراں ہر اسو جھٹا ہے۔ ایسے میں میں کا قریب کس کو دکھائی دیتا ہے۔ ہاتھ دو چار برس کے بعد جگہ جگہ کو فرق معلوم ہونے لگا۔

صغیر: "اکی یا مری چڑھ لگا رہے، تو آگئی ہے۔ ہاتھ پاؤں کے گوشت میں اونچائی نہیں ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے اور کسی ہاتھ میں بڑھاپا نہیں ہے۔"

اندروالا: "بڑھاپا تو نہیں ہے مگر وہ پنڈے کا سہاؤ کہاں ہے؟"

صغیر: "اکی محبت اصل چیز ہے۔ پنڈا کو تو آکھاں رہتا ہے۔"

اندروالا: "محبت الگ چیز ہے، جوانی الگ ہے۔ ان دونوں کو ملنے کیس ہو؟"

صغیر: "جوانی کے ان کی ہے، محبت تو ہمیشہ کی چیز ہے۔"

اندروالا: "پتہ تو ہمیشہ کی۔ مگر جوانی میں بھی ملتا نہیں کا اثر ہے۔"

صغیر: "محبت کا ٹوہڑا ہوتا نہیں کوئی ہوتا۔"

اندروالا: "اس سے کس کا تار تو کھٹکا ہے۔ محبت جیسے چاند اور جوانی جیسے تیش روئی۔ ہم مانتے ہیں کہ پلاؤ پلاؤ ہی ہے اور تیش تیش ہی ہے۔ مگر کیا درد روز پلاؤ کا کھا کر کبھی کبھی تیش کوئی نہیں پاتا۔"

("صحر" اور "محل" روئی سے اتھکاس)

اس شخص میں انسانیات کے حوالے سے "سہاؤ کا خوف"، "آنکھوں کی زبان" اور "تیسری جہن" ان کے قصائد افسانے ہیں اور افسانے "تیسری کی" اور "اکی کی تیش ہوئی شرافت کا وردہ" مکتبہ ہے۔

محل روئی کے ہیں یہ قری حوالہ ملی ہوئی تہذیبی قدر ہے جسے میں اسی زمانے میں خوبہ سن لکھائی نے کلی طور پر اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ خوبہ صاحب نے اپنے بنگا مریز مہدی کی لکھی کو ایک الگ زاویے سے دیکھا اور ملی ہوئی تہذیب کا لوح رقم کیا۔ یہ ایک طرح موجود سے باطن کی طرف فرار کا وہ پتہ لیکن جو کام میر باقر ملی داستان کو، سید نصر علی برفراق اور خوبہ عبداللہ عرف تھلونی سے ملحق ملتان میں اور نانا کوں کی سطح تک جو کا خوبہ سن لکھائی اسے اپنے افسانوں میں سینہ پائے۔

۱۹۹۳ء میں خوبہ سن لکھائی نے "تیش کی سطح پر اس سواد کا تلفظ طریقہ ہائے کار میں بڑا خلا" "دہلوی تاجدار کے ایک کہنہ کا فسانہ"، "شیراوی کی چٹا" اور "بخت بہار شاہ" آپ جی کے انداز میں لکھے جبکہ بیشتر افسانوں میں واقعات کا انتخاب اور چلانے کی تعمیر کا کام اپنے ہاتھ میں لے کر چھل کی مدد سے راہنما کی کلیات ہیں، انکس خصوصاً اس حوالے سے "بہار شیراوی"، "بجادی شیراوی کا خانی مجھ کہتے"، "تیم شیراوی کی خور کرین" "مرد" "تیم شیراوی کی عید" "بڈا کا راضا لے ہیں۔ ان کے چند افسانوں کی ابتدا کسی محل شیراوی یا محل شیراوی سے کی ابتدائی زندگی کے منظر ہائے کے ساتھ ہوتی ہے اور اس کے بعد وقت کا پہلے زمانہ سال کی طرف مڑ جاتا ہے اور یہ مختلف کلیات الیہ تاثر کا باعث بنتی ہیں۔ "شیراوی کی مصیبت"، "تھری نہ پتہ"، "تھری کی سیدانی" اور "تھری کی خالہ فہیمہ" سراسر مغلیہ تاریخ کے اوراق پارید ہیں اور ہمارے سامنے ان حقیقی

کرداروں کی بہت بھرپور طرح حسن نگاہی کی معرفت لیکن ہوتی ہے البتہ اکثر افسانوں میں ایک ہی نوع کے کرداروں اور واقعات کے دوہرائے ہانے سے دل اڑھ جاتا ہے۔

”جب انگریز کی قوتوں نے کرچوں اور گلیچوں نے، انیسواں ہزار توڑ کے تختے پر قبضہ کر لیا، اس وقت میں نے بھی اپنی بڑی والدہ، کسمن بھن اور مددچی کو ساتھ لے کر اورا جڑ سے قلعہ کا سارا رہن کر گھر سے کوچ کیا۔“

ہم لوگ دو دھنوں میں سوار سپہ سے غازی آباد کا رخ کیا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ راستہ انگریز کی فٹکری جڑاں گاؤں کا ہوا ہے۔ اس لیے شاہدہ سے واپس ہو کر قلعہ صاحب چلے اور وہاں پہنچ کر تمام راست آرام کیا۔ اس کے بعد صبح آگے روانہ ہوئے۔ پھلجور کے قریب گوہر دس نے حمل کیا اور سب ماہان لوٹ لیا مگر اتنی صبرانی کی کہ ہم کو زندہ چھوڑ دیا یعنی دو تین جنگل میں غریبوں کا ساتھ اور عورتیں بھی کہیں۔“

(”دہلی تاجدار کے ایک کتبہ کا افسانہ از غریب حسن نگاہی سے اقتباس“)

مصدقہ والا اقتباس کو افسانہ ”بنت بہادر شاہ“ میں مکتوم زبان کی نظم کے ازالہ قصہ سے حیدر آباد (دکن) تک کے سفر کے ساتھ ماکر دکھیں تو ایک ہی طرح کی صورت حالات دکھائی دیتی ہے۔ اس اقتباس سے غریب حسن نگاہی کے وہ افسانے زیادہ پُر اثر دکھائی دیتے ہیں جن کے پائنت کی تعمیر انہوں نے طواری اور تجسس کی مدد سے دارمائی کیلئے اور الیہ تاثر پیدا کیا، اس اقتباس سے ”بہر افشاں“ اور ”پھارنی شہزادی کی خالی ہاجیر گھٹ“ بھر پور تاثر کے حامل افسانے ہیں۔

زبان کے اعتبار سے البتہ غریب صاحب کے تاریخی و ادبی اپ جی کی طرز پر لکھے گئے افسانے کبھی زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی نوع کے افسانوں میں طوہ حسن نگاہی کا بھر پور ازالہ کے حوالے سے شکوہ الفاظ اور خاص نوع کی بردباری کا حال ہے، جب کہ دیگر افسانوں میں دلی کا بولی ٹھوٹی کا لنگہ بھنی روپے قائل تاج ہے۔

۳۔ ایک طرف تو اردو افسانے میں حب الوطنی، اصلاح نسواں، قوم پرستی، سماجی اصلاح پسندی، دانشمندی، روحانی روحانیت، ماضی میں پتہ لینے کا رویہ اور داستان طرزی کی یہ ملی صورتیں ظاہر ہوتی تھیں۔ مذکورہ دوسنے اکبر آباد (آگرہ) اور علی گڑھ و دہلی کے علمی اور ادبی (جن کا تعلق صوبہ بہار سے تھا) نے اپنے دیکھے بھالے سفر نامے پر ویسی زندگی کی روایت پر رد حکایت کی۔ یہ تینوں افسانہ نگار اگر مسلسل کے ساتھ افسانہ نگاری جاری رکھتے اور تحقیقی توانائی بھی نصیب ہوتی تو جو اہمیت سماجیہ و عہد پروردہ کو ملی، دودھن کے جھمے میں آتی لیکن ایسا ہوا نہیں اور اردو افسانے میں ہر کی تمام کی معرفت سماجیہ و عہد پروردہ کی روشنی کی روایت لے کر دہرہ ہوئے۔ اس سے قبل ہمارے ہاں کی روایت کا شریک الگ تھا، جسے روحانی رویہ کہتے تھے اور وہ سب معلوم ہوتا ہے لیکن اب سماجیہ و عہد نے مروج اردو افسانے سے محض اصلاح نسواں اور سماجی اصلاح پسندی کو موضوع کی سطح پر جن کر دیا، ذات کے حوالے سے معاشرے میں انکسار اور انتکاب پر برپا کرنے کی خفائی۔

سماج پروردہ عہد کا اردو افسانے میں ورود مسعود ہمارے ادب میں اس اصطلاحی و عثمان کی رخصت کا اظہار تھا، جسے ملی گڑھ قریب اور خصوصاً نیر احمد طواری کی معرفت تقویت نصیب ہوئی تھی۔

اب اردو افسانے پر کلام کی پندرہ انجلی اور طواری کی ششدرجہ کی جگہ انسانی بلوں کی آوازوں نے لے لی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کھلی ہار مرید احمد خان کی تڑکوتنگ، بے جان اور بے حرکہ کہا گیا۔

سجاد حیدر یلدرم نے ترکی زبان سے قلیل دہائی کا ایک افسانہ "انٹری ہوئی ترکی" "ترجمہ کرنے کے بعد ٹھیک چھ برس تک اس ترجمے کے اثرات کے درجے نوٹ کیے اور ۱۹۰۶ء میں "صہبت ناغہ" اور "خارستان و گلستان" جیسے ترکی افسانوں کے ترجموں کے ساتھ ساتھ اسی روایتی روایت کے حامل طبع زاد افسانے "غربت وطن" "اور" دوست کا عطا" بھی لکھے۔

اس طرح کے مفتی اوطار کے ترکی افسانے کا ترجمہ "خارستان و گلستان" ایک ڈراما خواب تھا، جہاں خدا کا سر پرست بڑا عجیب کا مفہوم جاتے ہوئے کہتا ہے

"پریم"

"پریم کیا ہے؟"

"عورت"

یہ روایت تھی جسے کرویسے نے کلاسیک کی نہیں، حقیقت پسندی کی ضد کیا، واقعیت اس کا وصف خاص ہے۔ یلدرم کے ہاں "عورت" کا ظہور جنسی کشش کا کھلا اعتراف تھا جو "خارستان و گلستان" اور "چڑیا چڑے کی کہانی" میں ملتا ہے۔ یہ نادر جان تھا اپنے زمانے کی انقلابی فکر اور اس کی بکھرے ہوئے کے خلاف ایک روایت پسندی کی بھارت۔ یلدرم کی آنچل عورت ترکی کی باقی تھی، اس نے اسے روا کر لیا۔

یلدرم کے ہاں زبان کے دور رس کے پیچھے عربی، فارسی ترکی اور انگریزی ادبیات کی جامع رہنمائی لائی تھی۔ کچھ بھی سبب ہے کہ اس کے ہاں نگار کے برعکس صوفی اثرات پر خصوصی توجہ اور محنت دکھائی دیتی ہے البتہ بعض مقامات پر ان کے ہاں غریب لہجے کا سبب اصلاح نسواں اور جنسی اصلاح پسندی کی مقصدیت ہے۔ اس باب میں قرۃ العین بیگم لکھتی ہیں

"یلدرم کی روایت خاص طور پر انسانی عورت نے عورت کا اس انداز سے کیا کتاب وہ عین کے پیچھے جھانکنے والی سرشار کی ہے۔ (انہی) یہ عورت کو اپنے سر اوپر براہ راست دیکھتے ہوئے عورتوں میں، جو عورتوں میں، انہیں نے اپنے قصوں کی لڑکیوں کو لکھنا اور ان کی حوصلوں کی پوری عورتوں سے کمال ترستی کی چہ پائی پر کھلی ہوا میں سانس لیتا دیکھنے کی تھی۔ اس لیے انہوں نے عورتوں سے باہر ترکی کو آج آج تک نہ دیکھا۔ اس وقت انہوں نے مصر بہت ہی پس ماندہ تھے۔ ترکی میں عورتیں ہیں الاقوام کے قرب کی وجہ سے ان کی کی عمر زیادہ تیز ہو چکی تھی۔"

کچھ بھی سبب ہے کہ قرۃ العین بیگم لکھتی ہیں

"عورت اس کے یہاں عیسائی اور گناہ کا مظہر نہیں، اخلاقی اور مذہبی کے صحت مند تصور کی علامت ہے۔"

("اوراداب میں روایتی ترکی" سے اقتباس)

یلدرم کا نگار اول و آخر وہی ہے لیکن اس دور میں وہ دستی جذبہ تہمت کا کارم ہی ہوتے ہیں۔ ان کے شیع زاد افسانوں پر معاشرتی اقتدار و اخلاقی توجہ دینے کا کام نہ ہو سکتا بلکہ انہوں نے تو یہاں تک کیا کہ ترکی طبائوں کے آواز تمام میں بھی مقامات اور طبقات کا خصوصی اجتماع کیا تھا "سورائے گلشن" اور "از و دین صہبت" کی جڑی تھیلیات لکھنا اور مسیحی سے متعلق ہیں۔ یلدرم نے ان مقامات کو اس

لیے برتا کہ بچہ اپنی اور پنجاب میں قدامت پسندی زیادہ تھی اس طرح ”سودائے سنگین“ میں بھی کے پارسیوں کو پیش کیا جن کے پاس اس قدامت پسند مہم میں بھی مطلق اور محبت پر کھولیں پابندی نہیں۔ ”چڑا چڑے کی کہانی“ لکھتے ہوئے اپنے روحانی نکتہ نظر کو واضح بھی کر گئے اور انھیں سے انجلی بھی نہ اٹھی مادہ گرایی یا تیں وہ مینڈ واحد حکم میں کہتے تو قابل ”عرفت قرار پاتے۔

پطرس بھاری کا یہ قیاس درست نہیں کہ یدوم نے ترے کو اڑھایا۔ آج وقت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یدوم نے اپنی جتنی بیچوں کو تر جہر یا خودکشی یا خود اقتلا تر جہر یا باطلوڑ ہیں۔

یدوم کے افسانے تھیں واضح راجا نات کے حامل دکھائی دیتے ہیں:

- ۱۔ مرد اور عورت کا رشتہ بھاری ہے اسے تاجا تو قصور نہ کیا ہائے۔
 - ۲۔ اس بھاری مطلق میں جی محبت کا اصل ہو گیا ہے۔
 - ۳۔ جی محبت کی راہ میں جو چیزیں سارے ہوں انھیں دور کرنے کا جن کرنا چاہیے۔
- پہلے سلطان کی ایک مثال تر جہر ”خارستان و گلستان“ بھی ہے۔ لکھتے ہیں۔
- ”عورت میں صمن نہ ہوتا تو مرد میں جرأت اور انسانی حوصلگی نہ ہوتی۔ مرد میں، عامل حوصلگی نہ ہوتی تو عورت کی خوبصورتی اور دلبری رانچاں جاتی۔“

دوسرے روحانی کا اظہار ”حکایت علی و مجنوں“ اور تر جہر ”ازواج محبت“ میں ہوا ہے جبکہ تیسرے سلطان کی بہت نمایاں مثال تر جہر ”محبت نامیں“ ہے۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ ان کا نکتہ نظر روحانی ہے لیکن مقصدی اشاروں سے خالی نہیں اور یوں یدوم سہم و دوسرے مسیح کے عالم میں بھی مطلق کا دامن تھا۔ یہ حال اور ہمدان کے ساتھ معاشی اور معاشرتی عوامل اور سماجی معاملات کی سنگینوں کرتے ہاتے ہیں۔ مقصد یہ کہ اس لہر نے بعض مقامات پر انھیں براہ راست مخاطب یا اسکا ہیہ جس کے اذنی تہجہ کے طور پر یا تہجہ لہجہ خطاب نہ کیا ہے۔ مثلاً ”معاذ یکجے میں اب کچھ نہیں کھو سکتا۔ اس نکتہ کے آتے ہی دل دھڑکتے دکھ۔“ وغیرہ جیسے تحریر کی کھلی کو کھرا کرتے ہیں۔ زبان کی سطح پر ترکی گفتن کے اثرات کے تحت ان کے پاس شعریت لہجہ ہے۔

روحان اور اصناف پسندانی کی روایت میں یدوم کے بعد ناز علی پوری اور تاجی مہاراجا نمایاں ہیں۔

آرڈو افسانے میں روحانیت کے پانچ ادبی افسانہ سے مزاج کے اعتبار سے روحانی روایت دیکھتے تھے لہذا پہلے صفحے کے سب میں انفرادی سطح پر وہاں (۱۹ویں صدی کا ادب) روحانی تحریک سے اثر پذیر ہونے کی مثال دیکھتے تھے۔ آسکرہ اند کی مثال پرستی، چنگی کی حضور خدا اور شاعرانہ جز و رذت و گنہ کی فطرت پرستی اور رانیہ زینک اور مرخام کے جائزہ اثرات ان افسانہ نگاروں کے پاس ”روحانی غزلیت“ کے جائزہ اثرات ان کا باعث بنے۔

ناز علی پوری نے اپنا اولین افسانہ ”چمن“ ایک پارسی دو شیزہ گو کہ ”۱۹۰۰ء میں لکھا جو یک وقت جنوری ۱۹۱۳ء کے ”نقاد اور“ ”چمن“ میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوں میں مطلق کی روحی اور صمن کی توصیف کا اثر انا سمجھ کا حامل ہے۔ اس کے لیے ناز نے قصوبھی طور پر طوائف کے طبقے سے کردار اپنے اور اس طرح پریم چند کے Camp Followers^{۱۲} کے طراز کی روحانی رد و بدل بھی۔

ناز علی پوری کے افسانوں کی ایک قسم اپنے موضوعات کے اعتبار سے مذہب، رنگ اور فصل سے اوپر اٹھ کر انسانییت کے وسیع تر

داڑے کی تشکیل کا چاقی ہے۔ اس ضمن میں تین افسانوں کا مجموعہ "غلاب اٹھ جانے کے بعد" اہمیت رکھتا ہے ان تینوں افسانوں کے مرکزی کرداروں (سورنا داور، ملی کالگی، قادری، غریب، سرور، شاہ، بھائی، بھولوی، یحیٰ، عالم، صاحب، عالم، عظیم خانہ) کا شمار ہندوستان کے جدید علماء کرام اور بادیان طریقت میں ہوتا ہے۔ برہمن اصحاب کی نفی اور اجتماعی زندگی کی نظر میں ان افسانوں میں بھارت کی تگی ہیں۔ اس ضمن میں ادبی مقالات کے مجموعوں "نکارستان"، "کود"، "ہندستان" میں شامل افسانے بھی اہم ہیں جن میں اجتماعی معاشرتی سوالات اٹھا کر سماج کے مسائل کی جانب بھی اثر سے کیے گئے۔ دو ذاتی رویے کے سبب نواز کے ان افسانوں میں زیریں اور مذہبی کو کھیلے ہیں اور انچاپندی کے خلاف لڑتے کی ہے۔ مجموعہ "مصلحتان کا قلعہ" کوہرچ اور دوسرے افسانے "جس میں" تو نیکا اور لیکن بت سا"، "زبرد کا ایک پھاری"، "اور" قربان کا وطن" شامل ہیں، جو اپنی خاص، روایت اور اسلوب بیان کے باعث اہم ہے۔

دارفانہ نوانی کا شاہ کار طویل افسانہ "ایک شاعر کا اجتماع" (مطبوعہ ۱۹۱۳ء) بھی اسی ذیل میں نمایاں مثال ہے جو دسمبر ۱۹۱۲ء کی تحقیق ہے۔ نواز نے دو ذاتی بیان کے لیے قدیم روایتی قصوں کو بھی چننا ہے (مثلاً "کیوڑہ اور سانگی"، "زرازمیت کوز"، "مرا کا گلاب") اسی طرح افسانوی مجموعہ "صحن کی چار پائیاں" تاریخ کے گم شدہ اور اسی سے رومان اور حقائق کی بازیافت ہے۔ درحقیقت نواز کا فطری میلان عوامی مسائل کی طرف ہے جس کی سب سے خوبصورت مثال افسانہ "کیوڑہ و سانگی" ہے جو "توہن" دلی ہاؤس نومبر۔ دسمبر ۱۹۱۵ء میں دو سطحوں میں شائع ہوا۔ اس افسانے سے پہلے نواز نے قصید کی صنف بھی لکھا ہے جس میں فرماتے ہیں:

"ناٹھاس سے گئی کو انکار نہ ہو گا کہ حضرت کا مطالعہ میرا پس فرما افسانی ہے اور اس لیے اگر ہم چنیں کرتے تو کہا جا سکتا ہے کہ ہم اپنے وجود سے دو کا نہیں لیتے جس کے لیے ہم وضع کیے تھے ہیں۔"

(قصیدہ "کیوڑہ و سانگی" مطبوعہ مہر پوری پریس بکسٹو ۱۹۱۸ء منتخب تاجی)

خود نواز، قح پوری کے مطابق انسان انہوں نے عمل مشغلہ طوط کچھ کر خود افسانے کے لیے لکھا

"لوگ کہتے ہیں کہ مرغانی ہے اور تیرا قسم اور زیادہ مرغان مگر وہ نہیں جانتے کہ ہر صنعت کی تشکیل مرغانی پر ہوتی ہے۔"

(انسان "رستم" سے اقتباس)

عورت کا تصور نواز کی روایت کا مرکز و محور ہے لیکن ان کے افسانوں میں جذبات و قصرات کی مطلق انسانی دکھائی نہیں دیتی بلکہ اس کی جگہ تعلیمات کے صحیحہ و معطلات کی اہمیت ہے۔ دو ذاتی افسانہ پندی کی اس روایت کے تیسرے جوئے نام قاضی عبد الغفار سے مصنف ایک علامہ جس کا نام بطور ضروری ہے اور وہ یہ کہ ان کا لہجہ دو ذاتی ہے لیکن وہ یہ کہ اعتبار سے "ملتی کے خطوط" دو ذاتی ہیں شمار ہوں گے۔ اس کتاب کی حد تک قاضی عبد الغفار افسانہ پندی اور جذباتیت کے تجزیہ صاروں میں ان افسانوں کو دل سے دور آگے بل کر اپنے افسانوں میں وحدت ناظر برقرار رکھنے کے لیے ایک وقت داستان اور کشش کی نفی قاری کا بھی ادغام سامنے لائے۔

قاضی عبد الغفار کا افسانوی مجموعہ "جیب" اس کی مثال ہے۔ مجموعے میں جہاں گرد (چاہ لغیب) بھر صاحب (روپائے صادق) سمرا (کھسٹیا) اور رانہ بھر صاحب (ہر پائی) کے فرضی ناموں سے لکھا گیا ہے

"کاش مرد جو ہم و فضل کا سب سے زیادہ کم فہم ذاتی ہے۔ چند ایک لمحے عورت کی نفسیات کا مطالعہ کرنے میں گزارے۔ صرف چند

ہے جو مصنف اعلیٰ کے قدیم تقاضات سے پاک ہوں۔“

(”الحلی کے خطوط“ سے اقتباس)

”الحلی کے خطوط“ میں اصلاح پسندی اور مقصدیت اس وجہ غالب ہے کہ قاضی عبدالغفار ان خطوط کو بنالیا افسانہ تک کہلا تاہند نہیں کرتے، ان کے خیال میں یہ خطرات اپنی شرح خود ہیں۔ ”ایک چھوٹا سا آئینہ جو بعد پاک کے نام لہا و مصطلحین قوم اور مذہبی رہنماؤں کے سامنے دکھایا گیا ہے کہ وہ اس میں حورے کے متعلق اپنی غلط شعاریوں کا کمرہ وچرہ دیکھ سکیں۔“

ان خطوط میں حلی ہوتی امیدیں اور غرضائیں، کھگے ہوئے ارادے اور حوصلے، کھگے ہوئے خیالات، جلی ہوئی محبت، کھگے ہوئے بوسے، تنکا ہوا غم غرض کہ ساری زندگی حلیوں سے چل رہے۔ یہ نہ تو وہ بننے کی خواہش ہے جو خود بخود کرنے والے کی آنکھوں میں ”ہم آفرمیراتی“ ہے۔ ان خطوط پر گویے کہ دھڑکی داستان غم کا کمرہ اڑ رہے۔

مجموعہ ”تین پیسے کی چھوٹ کر“ میں افسانہ ”فی بی صاحب کا کتا“ اور ”سراغ رساں“ میں طرکی کاٹ بہت نمایاں ہے، اور اس پر قاضی عبدالغفار کا رد ہوتی بوجہ کمال کی حدوں کو چھوٹا ہوا۔ ”الحلی کے خطوط“ کی داستانوی تدوین کاری کے تسلسل میں ”قیس“ اور ”محمود“ جیسے اہم افسانے لکھے گئے ہیں۔

قاضی عبدالغفار کے افسانوں کی امتیازی خصوصیت احساس جمالی کی تسکین کے ساتھ علم و حکمت کی کھجور آفرینی ہے جو اصلاح پسندی کی اس روایت میں ایک انوکھا اور دل موہ لینے والا نمونہ ہے۔

”ارادے خود بخود بدل جایا کرتے ہیں۔ منہ مشرق کی طرف ہوتا ہے اور انسان مغرب کی طرف چلتا ہے۔ اس کارخانے میں جس کو دنیا کہتے ہیں ہم نے اپنے ارادوں کے فرعون کے نکاحوں سے بھی بدتر ہیں۔ وہ سناں تارے گلوں میں ہیں اور کوئی تارے جیسے ہے۔ چاکلک بہ دست انیس کے تازیانے کی ضرورت سوچتے اور کھینے کی مہلت ہی کب دیتی ہیں۔ یہ کام کیا جانیں کہ کدھر آئے ہیں اور کدھر جانا ہے۔“

(”چاند گلاب“ اور قاضی عبدالغفار سے اقتباس)



حوالہ:

- ۱۔ لیجے کے افسانے سے خیال مستعار کے کرب۔ م۔ افضل نے ”آئینہ“ کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا تھا جو ”تاجین“ کا دور، مارچ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔
- ۲۔ ۱۹۳۶ء میں ان کے شمارے میں کرشن چندر نے بھی اس ٹائپ کو لکھا۔ قاضی عبدالغفار میرزا، ادیب، دانشور ہیں، کتاب امتیازی اور اسے میدانے بھی اس ٹائپ کو کامیابی سے رہا ہے۔

۳۔ ”کتاب انشا النوری کے نوحی افسانے“ گزشتہ پندرہ سالوں سے ”صحفہ“ کراچی میں شائع ہوا۔

۴۔ اپنا

- ۴۔ جوائے کے ایک افسانے کا عنوان مشہور "اٹلانٹ جوائے" مطبوعہ اٹلانٹک پریس کینٹن ۱۹۵۷ء
- ۵۔ مشہور "جوائے ٹور" اسٹریٹ ٹریٹ پریس، اٹلانٹک سٹی، نیو جرسی
- ۶۔ ناول پرکھ چلا "نقوش" آپ جے جی پبلشرز ملے ۱۹۶۰ء
- ۷۔ ایسا مشہور ہے ۱۹۶۰ء
- ۸۔ ناول "رمان" کا چودہویں کیمپڈ ٹیسٹ ۱۹۶۳ء "سکیل" "کلیا" (کیمپڈ ٹیسٹ) انگریزی ناول ۱۹۶۸ء
- ۹۔ نواب دانے کے لکھی نام سے ۱۹۷۰ء ایک فلم کاری کی، انشاد "ڈی کے گری" "جوائے" کی پہلی تقریب ہے ہر کچھ کے لکھی نام سے شائع ہوئی، دیکھئے "ڈیڈ" کا پندرہ ہفتہ دسمبر ۱۹۶۰ء
- ۱۰۔ "سکیل" کری کے حضور ۱۹۷۰ء (لکھنؤ صدر جے جے مطبوعہ "میپ" "کراچی" ہفتہ ۱۹۶۹ء
- ۱۱۔ ہندی شمس بڑا رام بکلی، بارانگہ پبلک مارکسٹ نے ۱۹۷۳ء شمس شائع کیا، آرڈو شمس "نقوش" کا سہ ہجرتی ۱۹۷۲ء ۱۹۷۸ء ہفتہ وار شائع ہوا۔
- ۱۲۔ مطبوعہ "ڈیڈ" کا پندرہ ہفتہ ۱۹۷۰ء شمس بڑا رام نواب دانے کے لکھی نام سے نکلا گیا تھا۔
- ۱۳۔ "سوز و غم" مطبوعہ ڈی پریس کا پندرہ ہفتہ ۱۹۷۰ء شمس بڑا رام نواب دانے کے لکھی نام سے شائع ہوا تھا۔
- ۱۴۔ ناول پرکھ چلا ایک نیا مشہور "ڈیڈ" ہندی شمس "ڈیڈ" ہندی شمس "ڈیڈ" ہندی شمس
- ۱۵۔ "The Gift of Cow" "ڈیڈ" ڈیڈ ہندی شمس "ڈیڈ" ہندی شمس "ڈیڈ" ہندی شمس
- ۱۶۔ "The World of Premchand" "ڈیڈ" ڈیڈ ہندی شمس "ڈیڈ" ہندی شمس "ڈیڈ" ہندی شمس
- ۱۷۔ ناول پرکھ چلا ایک مشہور "ڈیڈ" ڈیڈ ہندی شمس "ڈیڈ" ہندی شمس "ڈیڈ" ہندی شمس
- ۱۸۔ "نقوش" ہندی "ڈیڈ" ڈیڈ ہندی شمس "ڈیڈ" ہندی شمس "ڈیڈ" ہندی شمس
- ۱۹۔ "نقوش" ہندی "ڈیڈ" ڈیڈ ہندی شمس "ڈیڈ" ہندی شمس "ڈیڈ" ہندی شمس
- ۲۰۔ نواب شمس لکھی کے انشاد "سوز و غم" کی دسویں شمس کے افسانے "A Clear Well Lighted Place" سے "سوز و غم" ایک نیا مشہور ہے
- ۲۱۔ مطبوعہ "سوز و غم" کی دسویں شمس کے افسانے "A Clear Well Lighted Place" سے "سوز و غم" ایک نیا مشہور ہے
- ۲۲۔ مطبوعہ "سوز و غم" کی دسویں شمس کے افسانے "A Clear Well Lighted Place" سے "سوز و غم" ایک نیا مشہور ہے
- ۲۳۔ مطبوعہ "سوز و غم" کی دسویں شمس کے افسانے "A Clear Well Lighted Place" سے "سوز و غم" ایک نیا مشہور ہے
- ۲۴۔ مطبوعہ "سوز و غم" کی دسویں شمس کے افسانے "A Clear Well Lighted Place" سے "سوز و غم" ایک نیا مشہور ہے
- ۲۵۔ سکیل "سوز و غم" کی دسویں شمس کے افسانے "A Clear Well Lighted Place" سے "سوز و غم" ایک نیا مشہور ہے

علی ماہاں جتنی کے افسانوں کی ابتدا اغانا اعتقاد مایہ نور شاعرانہ انداز نگارش سے ہوئی۔ جس کی مثالیں ”جذب کمال“ (اولین افسانہ تخلیق دیا گیا ۱۹۷۱ء) اور ”پرمرد و گویاں“ ہیں۔ ”جذب کمال“ رسالہ ”زمانہ“ کا نمبر ۱۹۷۲ء میں چھپا۔

علی ماہاں جتنی کے افسانے طبیعتوں اور بے ہاک حقیقت نگاری کی مثالیں بھی سامنے لاتے ہیں (مثال۔ مجموعہ ”ہاں پھول“)۔ جبکہ نفسیاتی تجربہ کا باعث ان کی طبیعتوں پر رفتاری۔ جتنی نے ہندوستان کے شہر اور دیہات کی اجتماعی قیامت کو موضوع بنایا (مثالیں ”ونیکل اور مٹی“، ”مور“، ”میتاؤ“)۔ جبکہ نفسیات کے گھر پر ادراک کی مثالوں میں افسانہ ”بوز سہالا“ اور ”بھو کی ہنسی“ ہیں۔ جتنی کے ان کرداروں کا تصور قابلِ لحاظ ہے خصوصاً ”مٹی“ کی انگور اور چن لڑکی، ”بدلہ“ کی انگریز خاتون، ”صنم روگز“ کی مظلوم محبوبہ، ”سیلاب کی راتیں“ کا سرد مرکزی کردار اور ”میرے دائرہ“ کے شہریتہ ادراک کی کردار نگاری۔

علی ماہاں جتنی کے بہترین افسانوں میں ”غرض قسمت لاکھا“ (۱۹۳۹ء) ”میلہ گھوٹنی“ اور ”سیلاب کی راتیں“ نمایاں ہیں۔ اختر اور بخاری کا اولین افسانہ ”یگانہ“ اور دوسرا ”زور پٹیلانی“ تھا۔ یہ دونوں افسانے ”ہمیں“ ہفتہ (۱۹۳۱ء) میں شائع ہوئے البتہ ”یگانہ“ ”سلطون“، ”باز“، ”گھنٹہ“ (۱۹۳۶ء) کی اشاعت سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا۔

اختر اور بخاری کے افسانوں کا لینڈ اسکیپ بہار کے دیہات، رہے ہیں اور یوں وہ بہار کی مخصوص فضاؤں میں کامیاب ہوئے۔ ”گازوں کے اکٹھے کھیتوں میں سے دلچ کی فصل کٹے پھٹے کے بعد اگل کی سیاہ کھال مٹی بہت سی لڑیاں مظلوم ہو رہی تھی۔ لیکن ابھی تک وہاں کیہوں اور بات کے سہرے کبھی شام کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔“ چھوٹی اہل رسی تھی جس کی گردن میں کیہوں کے خروشے اور لوٹ کی چھوٹی اور گداز دھیریاں بھول رہی تھیں۔ ہوا میں بخور گئی تھی، گاؤں کے قریب بھینٹ کی قسم کے کیتوں میں ترکاریوں کی لیٹن اور چوڑے اپنی ہریا دل سے دل انگیز کوکرت اور گھنٹیں کلل رہے تھے۔ ان بڑا شاداب کھیتوں کے درمیان کوڑی پر لگے ہوئے، جو اکٹھے مل رہے تھے۔“

(”گھنٹیں سرست“ سے اقتباس)

اس معامل میں ڈاکٹر اور عمار کی گفتگوں اختر اور بخاری کا پندرہ موضوع ہے۔ اختر اور بخاری نے آگے آ کر جب شہر کو موضوع بنایا تو کچھ ہوئے ضرور پیش افراد کی زندگی جتنی کی جس کی خصوصیت مثالیں ”گھنٹے اڑے“، ”جو نیخڑ“، ”اپ“ اور ”بے بس“ تھے افسانے ہیں البتہ دیہات اور شہر کے نچلے طبقے کی زندگی کی گفتگوں میں اختر اور بخاری خاص طرح کی جذبہ جیت کا شکار ہوئے ہیں، جس کی مثالیں ”مردوں کی سحر“ میں نکلتے سے ملتی ہیں۔ نمایاں مثالوں میں ”کل گاڑی“ اور ”گھنٹیں سرست“ ہیں۔ ان افسانوں میں ڈاکٹر ازم کا پرچار پختہ ہوا ہی نہیں تھا۔

”گھنٹے اڑے“ اور ”کل گاڑی“ آگ سے چمک رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ ان سارے جھگڑے اور گھنٹوں کے دہنے والوں کے سر پر دنیا بھر کے گھنٹے اڑے اور چمکے۔“

(”گھنٹے اڑے“)

”گھنٹیں سرست“ میں لیڈا پردہاری اور ضمیر افسانہ ہے اور تواریں کی اہلی ترین مثال افسانہ ”گھنٹیاں اور بال جبریل“ ہے۔ اختر اور

نوی نے زندگی کی قصورانی ترجمانی اس طرح کی ہے کہ زندگی کی یہ کئی اور آکٹا مت میں سے زندگی کی اسٹاک کی حاشی ممکن ہو سکے۔

اعظم کریم کی کامیابی پر مبنی خلائے طلیح کا ذی چور (عربی) کی کردار نگاری کے ضمن میں نمایاں ہے اور مغز و انداز یہ کہ اعظم کریم اپنے افسانوی کرداروں کو ہر طرح کی جھوٹ میں ڈال کر انسانی کردار کا انسانی مطالعہ کرتے ہیں۔

کریم کی کردار نگاری کا نمایاں حصہ کردار کی جی پیکشیں ہے اور اسی کے باعث افسانہ نگار ہند ہے کی شدت سے قائم کیا۔ نتیجہ انسانی ہند بات کی کھری تصویر نکلی ممکن ہوئی۔

اعظم کریم کے ہاں زبان کا دور چار خصوصیت کا حامل ہے۔ ان کے ہاں فارسی اور ہندی کے قطعی کے درمیان ایک سٹے لکے کی دریافت ہوئی جو ان کے مخصوص دیہاتی لینڈ اسکپ کے لیے سے قرب تر تھا۔ دیہات کی سادگی میں انسانی زندگی اور اس کے معاشی پہلو کو کریم کے ہاں مخصوص موضوع بنایا گیا ہے۔

اعظم کریم کے افسانوں کا لینڈ اسکپ موضوع پارہ طلیح کا ذی چور (عربی) سوا کرتا ہے۔ معاشی کشش یہاں بھی ایسے رکھتی ہے۔ البتہ نظریات کی حامل دور باں ہے جو اعظم کریم نے دیہاتی کرداروں کی پیکشیں میں برتی ہے۔

اعظم کریم کی زندگی کا کھرا تر بیان ہے لیکن نفسیاتی تجزیہ کی گرائیوں اور پریم ہند کے "کفن" عیسیٰ ایمیت سے منکر ہوا ان کے ہاں دیہات کا رد مانی قصور ہوتا ہے نیز انہوں نے شعوری کوشش کی ہے کہ دیہات کے موسم مناظر فطرت، رہن جمن طور اطور لباس اور بدلے ہوئے موسموں کی کیفیات کے مطابق گیتوں کو جہاں تک ممکن ہو اپنے افسانوں میں سمیت لیں۔

دو زبان کے درجہ کے افسانہ نگار سے ہمارے ابتدائی دیہات نگاروں میں سب سے مشہور ان کے نامک ہیں۔ جس کا سب سے بڑا سبب حالی اور بات کا مطالعہ اور ترجمے کی روایت سے متعلق ہوتا ہے۔

خلیل قہرانی کا دہلیخ افسانہ ۱۹۱۹ء میں طبع ہوا تھا جو اس کے بعد "سیرنگ" اور "اسنام طیلانی" کے مترجم سے جو دو افسانوی مجموعے طبع ہوئے ان میں طلیح اور اورو ترجمہ کردہ افسانوں کو نکال کر ان سے خلیل قہرانی کا شمار پیش سے ترجمہ کرنے والوں میں ہوتا ہے۔

خلیل قہرانی کی اس پہچان کو اعظم ہمارے ناقدین نے کیا جن سے انکا انور کا کہ ان دو افسانوی مجموعوں کی گرد جھلا چلتے۔ دوسری طرف خلیل قہرانی کی اس تقریر پر جنہیں خاکہ شمار کیا گیا، دو اور حقیقت اس نے ہیں۔ آج سے نصف صدی قبل کے ادوار کے تبدیل ہوتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات کی عکاسی خلیل قہرانی کا موضوع خاص رہا ہے۔ پروفیسر محمد عیسیٰ نے "اسنام طیلانی" کے مقدمہ میں خلیل قہرانی کی حقیقت نگاری اور انداز سے اسے خصوصیت شفق کو موضوع بناتے ہوئے یہاں پر لکھا ہے کہ "اس مجموعے میں ایک بھی افسانہ ایسا نہیں ہے، جس سے نقد دل بہلا دیا جائے لیکن کو کچھ نا مقصود ہو اور ایک منظر بھی جو محض زیب داستان کے لیے نہ بنائی گئی ہو۔ ہر تصویر کسی حقیقت کا عکس معلوم ہوتی ہے اور ہر حقیقت کسی اور بڑی حقیقت کی طرف رہبری کرتی ہے۔"

خلیل قہرانی کے افسانوں میں یہ سب کہتا ہے لیکن سب سے بڑا کہ ان کے ہاں زبان کا دور چار دیوان ہے جو دل کی گمانی کا پاکیزہ روپ ہے۔

محمد عیسیٰ نے ۱۹۳۸ء کے ایک جگہ افسانہ نگاری کا آغاز کیا تھا لیکن اردو دنیا میں ان کی دھماکہ خیز آمد افسانوی مجموعے "کیسا گر اور دوسرے افسانے" (مطبوعہ ۱۹۳۴ء) کے ساتھ ہوئی۔ ان کے طلیح اور افسانوں کے علاوہ ایک ایسے ان کے تراجم کے سبب بھی ہے۔ محمد عیسیٰ

نے مخصوص طور پر رومی افسانہ نگاروں خصوصاً جیگراف کو نہ صرف اردو دنیا سے حراف کردیا بلکہ اپنے طبع زاد افسانوں کے ذریعے رومی نگاروں کے افسانہ نگاروں کو روایا۔

مجموعہ ”کیسا کر“ میں شامل افسانے میں بھی اور سحرانی جگہ بندہ یوں سے کل ہوا کہ کا اذہین اعلان ہے۔ یہ افسانے تو طبعی کے ذریعہ اذہن کو وہ چٹیل میں گھر سے جوڑا اور یہ میں کرداروں اور کل ہوا کی نفسی کیفیات کے کمرے میں ہیں جہے تقریباً سب کے سب افسانوں میں وہیں ذریعہ ہمارے اذہن کی تھی۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ رومی کے افسانوں نے ایک حد تک ”اکادہ“ (عربی اصطلاح) کے لیے زمین ہوا کی۔

اوپر دیا جو افسانہ کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ ”یادیں وہ دن“ (مطبوعہ ۱۹۴۹ء) سے ہوا۔ ایک زمانے میں وہ ہم چھٹی طرح صرف ہندی ہی ہو کر رہ گئے تھے اس کے بعد اردو کی طرف مراجعت بھی کی۔ اردو میں کم و بیش ڈیڑھ سو افسانے لکھے جن میں ”کوئٹہ“، ”واپسی“، ”ناسور“، ”بچن کا یہاں“، ”چنگ“، ”اسپاہل“، ”کھسبہ“، ”گورد“، ”کڑاں کا تلی“ جیسے شایعہ افسانے بھی ہیں۔ افسانہ کا اذہین افسانوی مجموعہ ”نورجی“ (۱۹۳۰ء) میں شائع ہوا تھا اور یوں افسانہ منزل پہ منزل افسانے کی جھلکی اور موضوعاتی تدبیر کاری کی تہہ کاری ان کا آئے ہیں۔

اوپر دیا جو افسانہ کے ابتدائی افسانوں میں اصلاً ہندی کا جذبہ جو بڑا دکھائی دیتا ہے جبکہ اس کے فورا بعد افسانوی تدبیر کاری ان کا مکمل طور پر لاپتہ ہو گیا۔

”بات یوں ہوئی کہ وہ اس کا افسانہ میں ہر کہہ کر وہ اپنے مالک اور مالکین کی باتیں سننے میں محو ہو گیا تھا۔ اگرچہ ان کا کافی بڑا تھا اور چھان لے وہ پیر کے کمرے کے لیے آتا تھا گوند کا تھا لیکن وہ دونوں ابھی بستر ہی میں تھے اور بکھری ہوئے تھے اس کے مالک لے دیں سے چھان کو جانے جانے کا حکم دیا تھا۔

اس نے وہ دھڑکی بٹنی کا افسانہ میں رکھ دیا تھا اور وہ اس کی طرف کان لگائے اپنے مالک اور مالکین کی باتیں سننے لگا تھا۔ جب سے اس کے مالک کی شادی ہوئی تھی وہ اس سے الگ تھا۔ اس سے پہلے وہ علی الصبح اٹھنے کا ادھی تھا اور اس کے ذہن کے اذہن کو اٹھاتا تھا۔ اس کو اس کا اور دل تھا۔ ہر بار یہ کہ بھی جاتا لیکن اب وہ اپنی ہی جی کے ساتھ ان چیز سے تنگ ہو رہا تھا۔ اور جب ہا آتا تو وہیں لینے لینے چھان کو جانے جانے کا حکم دے کہ باتوں میں مشغول ہو جاتا۔ غصی ہو کر ہی باتیں۔ چھان کو ان باتوں میں اس نے لگا تھا۔ وہ بستر پر لیٹے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ وہ بیٹا نہیں سننے کی کوشش کیا کرتا۔

آج کی جیوی کے باعث وہ دھڑکی میں بے طرح ہی کھار ہا تھا اور چھان اس طرف سے بے خبر ہوتی کوشش اپنے مالک اور مالکین کی باتیں سننے کی کوشش میں مصروف تھا۔

”میں مجبور ہوا تھا ہوں تمہارے کال ہی دیے ہیں۔“

”آپ کے ہاتھوں کا تو کوئی قصور نہیں۔“

”اسے اٹھنے میں تمہارے کال کر۔“

”جتنے گئے ہیں آپ کی چھوڑ سے۔“

”لو میں خضر اگر چاہوں۔“

اور چندن کو یہ مخصوص ہوا تھے کوئی غم و نازک چھوٹ ریشم کے فرش پر بچا ہوا۔ تصویریں تصویریں اس نے دیکھا کہ اس کے مالک نے اپنے دوست اپنی بیوی کے کانوں سے چپکا دیے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کا جسم گرم ہونے لگا۔ اس کے اعصاب دھن گئے اور تصویریں تصویریں اپنے مالک کی جگہ اس نے لے لی۔ (”افسانہ“، ”کمالی“ سے اقتباس۔)

اوپر دیا تھا شک کہ افسانوی مجموعہ ”ڈالچی“ انھیں اسلام آباد پبلشوں کے گروہ میں شامل کر دیتا ہے۔ البتہ ان افسانوں میں ہندوستان کی سیاسی ویداری کا بھڑکنا شعور ان افسانوں کی اہمیت کا ہے۔

شک کی رد بیان پسندی مجموعہ ”ناسور“ میں ظاہر ہوئی البتہ ان افسانوں کی تخلیقیاتی فضا کے باوجود اصلاح پسندی کا جذبہ انھیں سلطان حیدر جوش کی طرف لے گیا۔ اس سے پہلے اوپر دیا تھا شک کا شجرہ اصلاح پر ہم چند کے کپ قورڈ میں ہوتا رہا ہے اور اس کی مثالیں ”نورجی“ اور ”عورت کی فطرت“ (ستمبر ۱۹۳۳ء) تک ملتی ہیں۔

لفظ کے مثالی استعمال استعمال کی طرف حیات اللہ انصاری کی طرف اوپر دیا تھا شک نے بہت پہلے توجہ کی۔ اوپر دیا تھا شک کے دیگر افسانوی مجموعوں ”کوئیل“، ”ڈالچی“، ”فلکس“، ”چہان“ اور ”چنگ“ کے خصوصی موضوعات دو ہیں، عورت اور ہندوؤں کے حوصلہ گھرانے کی ذہنیت، مروجہ روایات اور زندگی گزارنے کے رویے۔ ایسے میں شک نے زندگی کی نفسیاتی حقیقت جی ٹوبہ کی ہے۔

حیات اللہ انصاری کا اولین افسانہ ”بے حواس دوخوار“ ماہ ستمبر ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا اور پہلا افسانوی مجموعہ ”انوکھی مصیبت“ ۱۹۳۸ء میں۔ حیات اللہ انصاری زندگی کے مفرد میں اور حقیقت نگاری کی روایت سے چاری طرفں جڑے ہوئے لیکن طبع کی نرا انکوں کو کبھی بائیں پشت نہیں ۱۳۱۱۔ ان کا افسانہ ”چہان“ ”شعور کی رو کی تدبیر کاری کا شاہکار ہے جبکہ زندگی سے جڑے ہوئے کا ثبوت ان کا افسانہ ”شکر گزار آکھیں“ ہے جس میں ۱۹۳۷ء کے حوالے سے وسیع تر انسانی ہول کی حد سے خود افکار دکھائی دیتی ہے۔

حیات اللہ انصاری کے ہاں موضوعات کا تنوع، تاریک، غمی اور زبان کے دربارے میں شمس پوجہ خصوصیت کا حامل ہے (نمایاں مثالیں ”پرواز“، ”آخری کوشش“) حیات اللہ انصاری کے طویل افسانوں میں فارم ہمیشہ قائل توجہ دہی ہے اور حیات اللہ انصاری کا مضمون افسانہ نگاری میں روایتی قواعد و ضوابط کی کڑی کسوٹی۔ ”شکستہ کنگورے“، ”ان کا خاکہ افسانہ ہے۔ اصلاح پسندی کی اس روایت میں حیات اللہ طبر سے کام لیتے ہیں اور یہ طہران کی افسانوی تدبیر کاری میں بہت کم جگہ صنف کا باعث بنا ہے۔ زبان ”فلکس“، ”داس“ اور طہر کی کاٹ لیے ہوئے ہے (مثالیں مجموعہ ”انوکھی مصیبت“ کے بیشتر افسانے ہیں)۔

حیات اللہ انصاری بنیادی طور پر ہول کے ڈھن کے ساتھ فرد افسانے کی دنیا میں آئے تھے۔ کچھ عجیب ہے کہ مختصر افسانے کی حدود و قیود انھیں عام داس نہیں آئیں اور وہ ہول نگاری کی طرف نکل گئے۔ لیکن ان کے چار افسانے آخری کوشش، شکستہ کنگورے، چہان، ”اور“ ”شکر گزار آکھیں“ مختصر افسانے کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار ہیں گے۔ اگر حیات اللہ انصاری اپنے وسیع ڈھن سے مطابقت رکھنے والی کردار نگاری اور مختصر افسانے کی تکنیکی تدبیر کاری میں کامیاب ہو جاتے تو فرد افسانے کے کمیوں پر آج ایک نیا جہان آباد رکھائی دیتا اور حیات اللہ انصاری کے افسانوں کی پیدا کردہ طوفان و صوفی کا نکتہ اپنے سر بہت راز افشا کرنے کا باعث بنتی اور یہ شاہد فرد افسانے کا ایک

اختر انصاری دہلوی کے ہاں سماجی حقیقتیں، انسانی الجھنیں اور معاشرتی ناموساریاں ان کے منظرِ ذہنیہ فکر کے تحت انسانوں میں داخل رہی ہیں جبکہ موضوعات کا مجموعہ اور اس کی مناسبت کے ساتھ اسالیب، اعتبار کی نکتائی گردنیں خصوصی طور پر قابلِ توجہ ہیں۔

اختر انصاری کے انسانوں کا آغاز زندگی سے ہوتا ہے۔ حقیقت ہوا۔ انسانوں کا مجموعہ "انڈی، نیا" میں انسان نگار ساری کائنات کو اپنی منہلی میں سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ "ناز" کے انسانوں میں یہ جذباتی اجارہ چھوڑا احتیاط کی سمت آیا ہے جبکہ تیسرا مجموعہ "مغربی" توازن کی مثال ہے، اور مجموعہ "پیر زندگی" ان کے قلمی تصور انسانوں کا مجموعہ کائنات کو منہلی میں سمیٹنے کی کوشش ہے، آخر آخر خلقِ درخشاں کی کائنات میں سے زندگی کی اس جگہ حتمی کرنے پر غور ہے۔

اختر انصاری کی خوش طبعی، ہمدردی اور خاصیت پندری ان کے ہاں موضوعات کے مجموعہ کے ساتھ بچان بنی۔ انسان نگار کے ہاتھ ہونے لگے اور اسالیب کی نگاہیں موضوعات کے مجموعہ میں لگی۔ اس کی مثالیں اختر انصاری کے دو آخری دور کے افسانے "ازلی بدھیب" اور "غیر مرنی انسان" (لا مبطوہ نقوش) ہیں۔ دونوں افسانوں کا آغاز قاری کو ابتدا میں ہی اپنی مضبوط گرفت میں لیتا ہے۔ یہ چوکھڑے والی صورتِ دل انسانوں کے اختتام کے بارے میں شدید مگر اکن ہے۔ "ازلی بدھیب" ازل کے نگار کے افسانے کا استعارہ ہے جس کی خواہش ہے کہ وہ سب بچھاپنے زور بازو سے کر گزرتے۔ اس کی مسئلہ نام کا سماجی ایک کامیابی کی صورت اس وقت اختیار کرنے لگی ہے جب اس کی لازمی شکل آتی ہے۔ لیکن وہ تو ہاتھ کھاتے زور بازو سے کر گزرتے۔ یہ کامیابی دراصل اس کی زندگی میں سب سے بڑی ناکامی کی صورت ہے۔

"غیر مرنی انسان" کا ہیرو برائت جو دوسری جنگ عظیم میں شہید ہو کر مرنے لگا، ہو کر مرنے لگا اس لیے زندہ ہے کہ کچھ نیا بھری کی خبریں ہائے کس حال میں ہے لیکن جنگ اپنے شباب پر ہے، کئی کئی کی خبریں اور بھٹے دراصل مرنا چاہیے اور زندہ ہے۔

سبیل عظیم آبادی کے افسانے بہار سے متعلق رہے ہیں۔ جن میں بہار کی زندگی بھر دیہاتی اور شہری احوال کی خصوصیات جو اس ان کی نمایاں پہچان ہے۔ سبیل عظیم آبادی کی سب سے بڑی مشکل یہ رہی ہے کہ بہار کی زندگی پر ان کے ایک پیش رو اختر انصاری اس خصوصیت لینڈ ایکسپ سے متعلق بھرپور افسانے قلم بند کر چکے تھے اور کوئی طرزِ خاص ہی سبیل عظیم آبادی کو اپنا مقام دلوں کا تھا۔ اس طرزِ خاص کی جستجو میں سبیل عظیم آبادی نے اختر انصاری کی گرفت حقیقت نگاری کے برعکس بہار لینڈ ایکسپ کے سکون، چھوٹا اور لوگ گلیوں کی فضا بندی پر توجہ صرف کی اور انسانی اس کا اسلوب خاص چھوڑا۔

سبیل عظیم آبادی نے اپنے انسانوں میں بہار کے دیہات اور شہری فضا کو نکال کر کے بھی دکھایا ہے اور ایسے میں معاشرتی اور معاشی نا انصافیاں موضوع خاص ہیں۔ یہ صورت حال تازہ ترین انسانی مجموعہ "عین تصویریں" تک پہنچی آئی ہے۔ سبیل عظیم آبادی کے انسانوں کی تخلیق خصوصی معاشی کا جانب ہے جبکہ ان کے ہاں پہلی بار انسان جان کرنے کے دروہی انداز کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ یہ خلاف ایک طرف قیادت کی سطح ہے اور دوسری طرف کہانی کی اداکار، ارتقا اور حسیات کی پیش کاری ہیں۔ سبیل کے انسانوں سے متعلق نئی کچھ بڑا ہے لیکن ہوتے ہیں ان کی نمایاں مثال مجموعہ "انڈی" کے افسانے ہیں۔

اشرف صہبائی دہلوی کے افسانوں سے خصوصاً کردار نگاری کی جزئیات اور وہی کی نکالی زبان کا پکا کینز روپ ہے جس ہے۔

”میں خود ذات پر سے کی بیٹھے دہلی غمیری اور آواز کر گیا۔ تقویم سے جس کے پتے بندھی اور بھی ایسے کر گئے تھے کہ باز جانے کے نام سے دشمنوں کا برا حال ہو جاتا ہے۔ دس برس سے جائے نہیں رہنے کے کرتے تھے۔ صاحب نے کہیں پھر بدلی کر دی۔ میں بارگاہی تھا، دفتر سے جو آئے تو بھلا چھوڑ آیا۔“

(”مقررہ کار“ سے اقتباس)

”آ“ کا کی ضروری اور کشتی کی عام طور پر شہرے ایک اتفاق واقعہ سے ہوئی۔ ان دنوں شاہی لاکے بن کا ترپا ساڑوں کا آٹھ ڈو تھا۔ تیسرے چھ روز ضرور ایک آدھ گھنٹی ہو جاتی۔ سیالوں کے ٹھونک پڑے۔ آس میں بھی بھگ بھگ دوز میں لوگوں کے چہرے لگ جاتے تھے مگر یہ بھی ایک برحق ہے۔“

(”سوئے آ“ کا“ سے اقتباس)

نرول رومان پسندی کی لہر

(بھٹوں گورکھپوری، مسز عبد القادر، جناب امتیاز علی، لاہور، ۱۱ اگست ۱۹۳۰ء)

بھٹوں گورکھپوری اپنے دور کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں

”۱۹۲۰ء کے بعد ادب لطیف کا زور تھا۔ ناول اور افسانے میں یا تو اصنافی میلان تھا جس کی وجہ سے لکھنے والے پر ہم چند کر رہے تھے یا وہی رومانی میلان تھا جو ادب لطیف کی مداح رداں تھا اور جس کے لکھنے والے کا وجود بلند دم اور نیاز مند چاندی کی سرکرائی میں اکثریت میں تھا، میرے دواہل اور افسانے اسی سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔“

بھٹوں گورکھپوری نے مراد اور ت کی محبت کو معاشرتی بگڑندوں سے آزاد رکھا ہے اور اسی تصور سے نرول رومان پسندی کی ایک نئی لہر چلی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں رومان اور حقیقت کا استخراج پیش کیا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ”طراپ و نیال“ شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں پر بات کرتے ہوئے سید سہاسی لکھتے ہیں

”ان میں حقیقت اور رومان کا ایسا انگلیس استخراج ہوا تھا کہ حقیقی جزایاں جذبات کے طوفان میں بہے گئی تھیں۔ ان کہانوں کے کردار اور ماحول عموماً دیہاتی ہوتے اور جن لوگوں نے پہلی گورکھپوری لکھی ہے۔ اپنی کے دیہات دیکھے ہیں وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ بھٹوں صاحب نے وہاں کے درمیان طبقے کے درمیان کتنے اور مسائل زندگی کی بڑی جتنی تصویر کشی کی ہے۔ انھوں نے کہہ دیا ہے کہ وہاں کی زندگی بھی۔ بھٹوں صاحب کی برکھنی اپنے دماغ، اپنے کاغذ پر اپنے کمر کی کہانی ظہور آتی۔ اس وقت تک عشق کا لائق تجربہ نہیں ہوا تھا لیکن ان کہانوں کو پڑھ کر دل میں کس ضرور اچھی تھی اور جی چاہتا تھا کہ کاش ہم کو بھی عشق ہو جائے۔“

بھٹوں کے ان افسانوں میں خاص پارڈی کا گہرا نقش چھلکتا ہے اور بھٹوں کے کردار ادب اور طبقاتی اختلاف اور اونچ نیچ سے بے پروا ہو کر عشق کرتے، کھاتی، دیتے ہیں اور بااثران کی محبت کا اہتمام و دلال باپے بھی کی موت ہوتا ہے۔ اس کی سب سے خوبصورت مثال افسانہ ”سمی پاشی“ ہے، جسے پڑھ کر بریلی کے ایک نوجوان شفیقت نے خودکشی کر لی۔“

بھٹوں گورکھپوری کے ان افسانوں سے محقق ہدیہ خیرا احتیاج حسین کی رائے اچھائی واقع ہے، لکھتے ہیں:

”محبت میں جو غم اور تنگی ہے، تنگی اور دکاوی ہے، وہ ان کا بنیادی موضوع ہے۔ اس کے افسانے کسی طرح بھی آج کی خطا میں عام سماج سے ہم آہنگ نہیں معلوم ہوتے، لیکن اس وقت کسی نہ کسی حد تک یہ صورت ضرورتی کی گھڑوں کے انداز کے اور کیا ان ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، غریب توڑتے تھے، اور حق کا شکار ہوتے تھے اور ان کو سوائے اس کے اور کوئی راستہ دکھائی دیتا تھا کہ وہ اپنے غم کو چھپانے ہوئے دیا جاتے گزر جائیں۔“

بھٹوں گورکھپوری کے افسانوں کی روایتی انداز خصوصاً نفسیاتی اور فلسفیانہ نگاہ کے تحت ہے، خصوصاً نامس پارڈی اور رنگل کے اثرات لگایاں ہیں۔ بھٹوں گورکھپوری کا خاص موضوع محبت اور اس کے حلقہات ہیں جنہیں روحانیت سے دیکر ان کی سطحیت دے دی گئی ہے۔ یہاں محبت کا الیہ انبیاء مہم ہے اور نفسیاتی انفرادیت لگایاں نہیں وصف۔

بھٹوں گورکھپوری کے افسانوں میں بچہ پن کے سفید پوش طبقے اور بڑے روزگار فاضلوی کردار سامنے آئے ہیں۔ یہ قطعی طور پر زندگی کرنے کی وسیع معلومات کے حامل افراد ہیں۔ واضح رہے کہ فلسفی، ماسچر، پری کا نام ہی اس روایت کی گڑی ہے بھٹوں کی رومان پسندی اور کردار کی سطح پر جرحانیت میں طبعی بحث مباحثہ کے ساتھ شعر کا لہجہ لے ہوئے ہے (مثال ”تھکتے ہے صدا“ اور ”سمن پوش“) بعض اوقات افسانے میں رواں فلسفیانہ بحثیں اصل کہانی سے لگی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور محفل علم کا اعتبار رہ جاتا ہے۔

”سب سے پہلے یہ قانون ضروری سمجھتے ہوں کہ میرے دماغ میں کوئی ٹوڑ نہیں ہے، پورے دماغ پرست ہوں جیسا کہ اکثر ناظرین کو شبہ پیدا ہوا جائے گا میں شکایت کا باہر نکھڑا جاتا ہوں۔ میں نے تو اسے انسانی اور ان کے افعال کا پرامن مطالعہ کیا ہے۔ میں خدا اور مطلق کی تکمیل کر چکا ہوں۔ جی نہیں بلکہ سچکوں کہ ان علوم میں حقیقت سے بچا ہوں یعنی مدتوں سے پروہی فکری کردار ہوں البتہ میں صرف علمی اصطلاحوں میں نہیں الجھتا۔“

(افسانہ ”تم میرے ہو“ سے اقتباس)

”سمن پوش“ بھٹوں کے لٹریچر افسانے ہیں۔ ان افسانوں کی تکنیک ایک زمانے تک کاغذی قیود ہی ہے اور افسانوں میں باطنیت کا موضوع بھی۔ چاہے انداز میں بھٹوں کا یہ اضافہ کھانے کا کہ ان کے افسانوں کی ابتداء اور اصل کہانی کی انتہائی ہے اور سارا افسانہ تو تکنیک رویہ کا آغاز ہوتے ہوئے اپنے اختتام پر انسانک مظهر کی گویا دہائی صورت حال سے دور چار کرتا ہے جسے الیہ کا مطلق انجام کہنا چاہیے۔

خالص رومان پسندی کی اس روایت میں مسز عبد اللہ کا نام فقیر، خوف اور غریب آٹاشی کی تکنیک کے حوالے سے بہت لگایاں ہے۔ مسز عبد اللہ نے اپنے کردار میں بچے کے گہرے اثرات کے تحت افسانہ نگاری کا آغاز کیا لیکن اس باب میں ان کی اپنی خصوصیات الفاطنی اور نفسی کیفیت کو ہمیں پشت نہیں ڈالنا چاہیگا۔

مسز عبد اللہ اور ادب کی جوانی سے لے کر اسراریت کے زیر اثر رہی ہیں۔ اس خاص نوع کی نفسی کیفیت سے باہر نکلنے کی انہیں صرف پھر وہ برس تک سہولت ملی، جب ان کی شادی ہوئی۔ پھر مسز عبد اللہ ”جب میرے شوہر کا انتقال ہوا تو مجھے پرانی سوچیں بھرا آئے لیکن پھر میں نے سیاست شروع کی تقریباً تمام دنیا کو بھی تمام پرانی سماج کی سیاست کی اور تمام اسلامی سماج کی بھی۔ بعد ازاں چیزیں بہت دیکھیں ان چیزوں کو دیکھ کر مجھے سکون ملا۔ سیاست کے دوران میں نے انجیل، تورات، زبور اور قرآن مجید کا تحقیق مطالعہ کیا۔ اس تمام مطالعہ کا نتیجہ یہ اثر ہوا کہ

میرا لطف آدھا گھس پر پھینچا ہوا گیا اور مجھے یہ خیال آنے لگے کہ میرا دوسرا ختم ہے اور اس لیے میرا اس دنیا میں دل نہیں لگتا۔ لیکن یہ اتفاقاً دوسرا عقیدے کی وجہ سے نہیں ہوا کیونکہ مجھے دھندوں سے بہت غارت ہے بلکہ میرا یہ عقائد معاملہ سے اور اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر ہوا کیونکہ بعض دلوں کا یہ ہوتا کہ جب میں کسی چیز کو سمجھتی تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میں اس چیز کو پہچانتی تھی اور مجھے یوں لگتا کہ یہ یاد آتا کہ یہ چیز پہلے کہاں دیکھی تھی۔

اس بات کو میں برس ہوئے کہ مجھے ایک خواب آیا کہ میں ایک سونے کے بچے ہوئے شہر میں لٹکی گئی ہوں۔ جہاں کی ہر چیز سونے کی بنی ہوئی ہے۔ میں نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون سا شہر ہے تو کسی نے مجھ سے کہا کہ یہ ایسا جہاں ہے تو میں نے کہا کہ یہ کون سا جگہ جہاں ہے جو اتنا مستان ہے۔ یہ سوچتے ہوئے میں ایک مکان میں داخل ہوئی ہوں۔ یہ مکان بھی سونے کا بنا ہوا ہے اور اندر موصوفے بچے ہوئے ہیں۔ کمرے کے ایک طرف دروازہ لگے ہوئے ہیں۔ میرے پاؤں چمچے پر تپاؤ کہ یہ تو جتنے ہیں جو دنیا میں کوئی شخص کام کرتا ہے اس کے اعمال ان میں کیے جاتے ہیں اور مجھے کہنے لگے کہ چڑھ لو لیکن میں نے اس خوشنودی کو بڑبڑاتے سے انکار کر دیا اور کمرے سے باہر آ گئی تو میں نے دیکھا کہ صحن میں دو بچیاں لٹکی ہوئی ہیں۔ میں اس پر چیخ مچی۔ ایک عورت جس کی چاندنی چیشائی تھی سلیڈ لہاس میں جس پر چاند ستارے بنے ہوئے تھے، میں نے آتے ہوئے دیکھی۔ جب وہ میرے پاس پہنچی تو میں نے دیکھا کہ وہ میری کتلی کی جتنی تھی جو سر کی ہوئی تھی تو وہ لڑکی کہنے لگی میں یہاں اکیلے رہتی ہوں لیکن چند دنوں تک میرا ایک ساتھی آ جاتے گا۔ مگر وہ مجھے کہنے لگی کہ میرے کمرے کے۔ اس کے کمرے میں کتلی ایسی تھی جو بدن کو چھتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ یہاں تو بہت ساری بچیاں تو سونے کی تھیں میں نے ان کی جس میں ایک ایک کو ٹکڑے کر دیا تھا لیکن مجھے سوائی محسوس ہوئے تھی تو میں نے اس سے کہا کہ میں تو دیکھیں جا رہی ہوں۔ جب میری تھک چکی تو میں اپنے بستر پر تھی۔ میں نے فوراً اپنے بیسے سرائے میں نظر کو اپنی کتلی کے کمرے پر پڑا تو وہ جہاں اس کی بہت غارت ہو گئی ہے۔

میں تلخ سے دلچسپی پر کڑھی کے ذاک ہنگے میں غصہ تو سہ میری بھانجی اور اس کا خاندان بٹیر بھی تھے۔ رات کو میں سو گئی تو میں نے دیکھا کہ میں ایک جگہ جا رہی ہوں اور سامنے کوٹری کو پار سے کھڑی تھی ہوئی ہے امداد سے سورۃ فہمیں کے بڑے کی آواز آ رہی ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ آواز میاں گھر (جنہوں نے سیلف اسٹوڈیو لکھی ہے) کی ہے۔ میں نے ان سے دعا کاٹ کر لی تھی۔ مجھے کسی نے کہا کہ وہ اپنی منزل سے فارغ نہیں ہوئے تو میں وہیں باغیچے میں بیٹھنے لگی۔"

کچھ عرصے پہلے کہ سوسائٹی کے ایک شخص نے ایک کتاب لکھی کہ اس کی طرح ہر کام کی پر کار ہے۔ ان کا اولین افسانہ لوی محمود "اشوں کا شہر" اور دوسرے افسانے "۱۹۶۲ء میں شائع ہوا اور "صدائے جرس" ۱۹۶۴ء ایک کے افسانوں پر مشتمل ہے۔

"اشوں کا شہر" سے "صدائے جرس" تک کے افسانوں پر ایک گراڈیٹن کے گھر سے اثرات نظر آتے ہیں خصوصاً افسانہ "بلائے ناگہاں" اور پھر کے "The Black Cat" کی مماثلت تو یہ طلب ہے۔"

پھر کے افسانے میں مکان میں کیا لیکن دھار پر جس میں قہر و غضب کے عالم میں جلی کو کھنکھایا تھا، جلی کی شبیہ انحراف کی، یہ مجھ پر مشہور حیوان کا اظہار تھا، جبکہ "بلائے ناگہاں" میں دھار سے شیر کی تصویر غائب ہو جاتی ہے اور لیکن اس وقت ایک دردناک اپنی خوان آٹھامیوں کی ابتدا کرتا ہے۔

"اولی قاف" کے افسانے مناظر غمگین اور "راہبہ" کے افسانے دنیا کی گم نام سیاحت گاہوں کے خوالے سے اسی طرح کے حامل

ہیں۔ ان افسانوں میں قہار طاقت اور انسانی زندگی کی حدود پر خصوصی موضوع رہا ہے۔

”اس کا بدن بخار سے جھلکا، ہاتھ اس کی آنکھیں مال نکال رہی تھیں۔ اور وہ سر جھٹکا تو اور“ ”مجھے چاہیہ تھا“ کہ کر تھر تھرائی گئیں مارتا، کبھی کہا ”ہائے جی جی جی کہ تم مسافروں سے میرا بدن داغ رہی ہے۔“ کبھی کہا ”رہے گئے“ گئیں بھلائیات مارو۔ ہائے مجھے دوزخ کا فرشتے پا بھراں کر کے لے چلے ہیں، مجھے بھڑاؤ۔“

غرض کہ اسی طرح چلتا چلتا صبح کے وقت سر کیا۔ اور طوفان بھی ختم کیا تھا۔

(”طمانہ“ پاداش محل” سے اقتباس)

سرمہدا تھا تو کہ افسانے نہ صرف موسیقی سے محظوظ ہیں بلکہ اسلوبیاتی سطح پر بھی ایک ذائقہ کے حامل ہیں۔ تھیر تھری اور دہشت ناک کی جھنجھٹ کے ساتھ ان کا روایتی روایہ انھیں اردو کے بڑے روایتی تخلیق کاروں میں اہم مقام عطا کرتا ہے اور ان کے ناکندہ افسانوں میں ”ہائے“ ”کہاں“ ”کاسر“ ”راہب“ ”ناگ“ ”پوتا نو“ ”والی جانی“ ”اور“ ”پاداش محل“ ”خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

کتاب ”اسٹائل“ (یا کتاب اقتیادہ) کا نام روایتی کردار نگاری اور فضا سازی کے اعتبار سے روایتی افسانے کا نقطہ عروج ہے۔ انجینیت کا احساس پہلی بار پنجپ کے افسانوں میں ظاہر ہوا اس پر مستزاد پنجپ کے افسانوں کا رد بیان پرورد اور سر آفریں ماحول تھا۔

بندوستان کے جنوب میں قلعہ میں قلعہ کرشنا اور پائے گودھری کے کنارے فرما چار کے مضامینات پنجپ کے افسانوں کے لیے لینڈ اسکیپ مریا کرتے ہیں۔ جہاں کول کے پچھتے پھولوں سے لہرے تالاب اور دھان کے گہرے سبز گیت اٹھاتے۔ کیڑے کے جنگل، تار کے لڑاواں درخت اور ظہرے ہوئے پانی میں گہرے کھادی پر دی والی آقا آدم خالصیں، جو سارا سامان ایک ڈاک پر سرگرم کڑی رہتی تھیں، کال گچیاں اور کالی سنگھاپری جتنا تھیں اور اس پر کافی راتوں میں دیا کے دونوں کناروں پر اٹھایا تھیل کی جھپٹ ناک۔ پنجپ نے پہلی بار مری روایت کا تجربہ کیا۔ ایسے شرملا ہاراشا لکھری کی الشاک اور ناز کی روایتی کہانوں کے اثرات کا نتیجہ ”واختر کار“، ”پچا لوٹ“ اور ”والی زبہ“ جیسے پراسرار اور دہشت مندی، مہوئی، صوفی اور پرتی جیسے روایتی لسانی کرداروں کی صورت ظاہر ہوا۔

پنجپ اقتیادہ کے افسانوں کی فلسفاتی فضا اور گہری روایت میں ڈوبے ہوئے کرداروں کی عقل و حرکت حدود پر اسرار ہونے کے باوجود حیرت ناک کی حدود میں داخل نہیں ہوتی اس کی سب سے بڑی مہم کا استخراج ہے۔ پنجپ کے افسانوں میں نفسیات، تاریخ، کائنات اور مین اتھو کی ادب، سائنس، مذہب، عالم کا کھلی مطالعہ اور طبع و مزاج پنی چھپ چھپ کھاتے ہیں اور لفظی ادب کو بھی بھڑائیے کا پناہ نہیں دیتا۔

پنجپ اقتیادہ میں اردو افسانے کے ان کئے چنے افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے انارے طوائف ادب کو بھی زندہ بنا دیا کہ وہ عطا کے ہیں اور ان کرداروں میں خصوصیت کے ساتھ روایتی زبہ، جسوتی، سر جھڑا لٹا لوٹ ڈاکٹر کا روایتی لٹریچر و دانش بہت نمایاں ہیں۔

روایتی زبہ و ایک ویلے کل باوا کا رفاقتوں میں جو پناہ عم ہونے میں خاص نوع کی لذت محسوس کرتی ہیں اور انھیں اپنے جانا سنگھار کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہی ہے۔ سر جھڑا اور ڈاکٹر کا رفاقت کے وسیع رنگ و خاص ہیں، جس خاندان کے سربراہ و پچا لوٹ ہیں، جبکہ روایتی جسوتی، جسوتی اور روایتی مہم کرنے والے دل ہیں۔ ہمیشہ سدا بہار اور دھم دھم جاتی کی سنگھوں سے لہرے ہوئے اور ان کرداروں کے سربراہ ایک پوزی اور بھڑی بھڑی ٹیڈر و دانش ہے جو انتظامی صلاحیتوں میں جملہ ملازمتوں میں سب سے بڑھ کر ہے۔

ہر سب کردار چاہے اقدارِ اعلیٰ کے افسانوں کے نگارِ تکامل میں بیٹے ہیں۔ یہ وہ جہاں ہے جہاں مشرقی اور مغربی نگار رہے ہیں۔ یہ چاہے کی خیالی، ریاضتوں کی اس اور خشکی کے ہاشمہ ہے جس۔ یہ سب کردار آپ کو کبھی تو یاد آئے ہوں گے کہ اس کے ساحلِ سمندر پر کچکا میں گئے اور کبھی وہ اپنے ہاشمہ کے کناروں سے ہوتے ہوئے ہاشمہ کے جنگلوں میں۔ یہی نہیں چاہے کے افسانوں میں خیالی نگارِ قصر آرائیں، قصرِ عرش اور قصرِ سرسبز کی دنیا کی دنیا ہیں، جزیرہ، ماس، بحرِ معلوس، کوہِ فیروز دار کوہ، الماس کا مغرورِ ماحول ہے۔

چاہے تہا اعلیٰ نے اپنی اس شخصوں اور مغرور اقدارِ اعلیٰ سے حقائقِ تفصیل کے ساتھ راہنمائی کی ہے کھینچی ہیں

”جمہری دلی زندگی کا گہرا اقلیت میرے لیکن کی چیزوں سے ہے۔ فضا، ماحول اور حالات۔ میرے لیکن کا ابتدائی زمانہ جنوب میں دریائے گوداوری کے ہوشیاں کناروں پر گزارا، ان کناروں کو میں نے ہوشیاں کہا ہے میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے یہ بتاتی ہوں کہ مجھے وہاں رہنے کا اطلاق کن حالات میں ہوا، ایک زمانے میں موسمِ سرما میں موہا میدا آباد کو میں طاعون کی وبا ایسے ہونا کہ طریق پر تکمیل پائی تھی کہ دلوں میں بھگڑاؤں اور اختوں میں بڑاؤں، خاندانِ موت کے گناہ اتر جاتے تھے۔ ایک عرصے کے لیے گمراہ چھوڑ کر کسی نئی جگہ جا کر جتنا ایک مرحلہ ہی گیا تھا۔ چنانچہ میرے والد مرحوم کو اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ کچھ عرصے کے لیے جنوبی ساحل پر اقامت پانے ہو جائیں۔ اس طرح مجھے ایک مدت تک اپنے خوابوں کے جزیرے میں رہنا پڑا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں کے زمین و آسمان کے درمیان حسن و شاعری کا ایک بڑی چشمہ بہا رہا تھا، ایک طرف کنول کے پھولوں کے چمکنے ہوئے چاہے دور تک فردوس نظر پڑے تھے تو دوسری طرف دھواں کے گہرے سبز بھارت ہوئے کھیت صاحب نظر کو دعوت نکلا رہا دیتے تھے۔ اس میں کہیں کیڑے کے مطربین بھگت کھڑے تھے جن کی ہوشیاں نکھیں سے دھڑکتے ہو کر چاندنی راتوں میں سیاہ بگینا دے لے تاک اپنے اپنے گھٹاؤں سے چھایاں باہر نکلتے آتے تھے تو کہیں تازہ کے دیقہ درختوں پر بھگڑاؤں کے ستارے کوکے تازی کی شراب پی کر بدمست ہو جاتے اور شور مچا کر کرتے تھے۔ کنول کے مطربین انہوں اور چاول کے سبز پردوں میں چہ نہیں گھٹے گھٹنوں گھٹنوں پائی کھڑا ہوتا تھا جن کے وقت آفتاب کی شعاعوں میں چھائی اور شب، او میں نہاتاب کی کڑوں سے لڑتی رنگ میں دھنک رہا تھا اور ہر سمندر کی حواسیں۔“ (گمراہ نگار پڑوں والی قد آدم حواسیں تمام ناموں ایک عالم پر سرنگوں کڑی، یہی نہیں جنتیں دیکھ کر یہاں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی دھنک کا کافی منگے پر نور کر رہی ہیں۔ ہر گھٹاں بچھاں جس اور کافی کافی گھٹا چھائی جہاں جن کی نگار سرائیوں سے فضا کو کھڑا کھینچی تھی۔ دیکھنے پتہ کھینکے کہ اس وقت میں آپ کو اپنی کئی کہانی کا ایک باب چھو کر بتا رہی ہوں۔ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ شاعری نہیں بلکہ افسانہ حقیقت ہے۔ یہ یقین نہ آئے تو آپ ہی جا کر میرے لیکن کے اس پر جان کی سیر کر آئے۔ وہ مطلع کرنا میں ساحل گوداوری پر واقع ہے اور اس کا نام فرسپور ہے۔ لیکن وہ مقام ہے جہاں میں نے خزاؤں اور بہاؤں میں دنیا ذکر کیا کھینکا۔

میں نے ابھی ابھی ان ساحلوں کو ہوشیاں کہا تھا اور اس کی وجہ بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ گھراس کی بہرِ خوشی کا ہے شاید آپ منہا پتہ نہ کریں۔ اس لیے میں اسے چھوڑ دیتی لیکن چونکہ کہ بھگت ہوں کہ میں گوداوری کے کناروں کی خوشی کا ہوشیاں سمیت کی تفصیل بتاؤں گی اس لیے اب مجھے بتانا ہی چاہئے گا۔ ہوتا ہے تھا کہ کافی اندھیری راتوں میں گوداوری کے نشان کناروں پر بندھوں کی لائیں چلائی جاتی تھیں۔ چلانے کے دوران بنڈیاں اور مسراں قدر دارانے شور کے ساتھ چمکنے تھے کہ انہیں سن کر ہوش اڑ جاتے تھے۔ اس سرزمین پر گوشت پرست سے عاری انسانی و حاشیہ اور بنڈیاں جگہ جگہ دی رہتی تھیں اور بیچ بیچ کر انشان کے غانی ہونے کا یقین دلا کر کرتی تھیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جب ان ساحلوں پر رات چلتی تو بنڈیاں کا فاسوس اندھیرے میں اٹھتا تھا اور مہلوں کا میلے سے غول چلا پائی کی طرح ان دریاؤں میں روکھناں

انسان نظر آتی تھیں۔ یہ ادبیت خیر مضر حیثیت تک کہاٹوں کے گھنٹے کی ترغیب دیتا تھا۔ فرض ان کا حسن اور بات کی ٹوٹا کی۔ یہ بھی فضا۔ ایسی فضا میں جو شخص بھی پہلے اور بڑا سے اس میں تھوڑی بہت ادبیت و شعریت اور ادبیت نہ پیدا ہوتا اور کیا ہو۔

تیسری بات حالات کی تھی۔ جنہوں نے مجھے کتاب و قلم کی تجربے میں مدد کی۔ مددوں کا فضا میں نے اس لیے استعمال کیا کہ اگر میں نے اس زمانے میں اپنے آپ کو ادبی مداخل میں ملنے نہ کر دیا ہوتا تو میں کبھی کی قطع ہو جاتی ہوتی۔ وہ زمانہ مرے لیے بے حد عزت و محال تھا۔ مری والدہ ابھی جاں سال ہی تھیں کہ ان کا کو بیاری ہو گئیں ان کی موت مرے طرے میں پہلی بن کر گری۔ اس زمانے میں میرا کوئی قوا زن درست نہ تھا۔ ان کو نہیں تھا، اس پر شہر و قلاتی دھچکاں کی موت کا تھا۔ ان دونوں نے مل کر مجھے احمسانی بنا دیا تھا۔ +

بکہ یہی سب ہے کہ چاب اختیار علی کے افسانوں میں دروازہ دروازہ سکروں کھلا اور نیکو کے ساتھ ان کے گھر کا دروازہ زید و وارہ بچے کوٹ بھی چیتے چائے کر رہا ہیں۔ ان شفقت اور محبت نکاتے ہوئے کرداروں کے ساتھ ریحانی و صوبائی مصوفی اور روحانی زندگی کی لہروں میں ہمارے لہروں پر وہاں چاب اختیار علی آ کے اور آ کے پہلی جاتی ہیں۔

چاب اختیار علی کے منظر و روایتی انداز نگارشی میں تراشی ہوئی تشبیہوں، استعاروں اور تراکیب کا اور تیار کا قائل لگا ہوا ہے۔ چاب نے اپنے تازہ افسانوں میں زندگی کے عجیب و غریب حقائق کا اظہار بھی کیا ہے۔ (مثلاً میں "پہا لنگ گیسٹ" اور "عنا سر میں غیور تر چپ") لیکن ان کے افسانوں کی بڑی اسرار و غمگی فضا کا نم و دائم ہے۔

نور الدین نے میں میرزا ادیب سے ۱۹۳۶ء میں "افسانہ خواہین" کٹر ایک دو ماہانہ نگار کی حیثیت سے قدم رکھا۔ ۱۹۳۳ء تک ان کے اور ادبی مجموعے "میرزا ادیب کے خطوط" اور "میرزا ادیب کے دو ماہانہ" شائع ہو کر حقیقی عوام ہو چکے تھے لیکن یہاں اس خط و خطی کا ان ضروری ہے کہ میرزا ادیب اولی و آخر روایتی افسانہ نگار نہیں۔ "میرزا ادیب کے خطوط" اور "میرزا ادیب کے دو ماہانہ" اہمیت کے اعتبار سے روایتی کہانیاں تھیں اور میرزا ادیب کی یاد لیکن بچان بھی ہے۔

میرزا ادیب کا "میرزا ادیب کے خطوط" سے "میرزا ادیب کے دو ماہانہ" تک کا سفر داستان کے بنیادی عناصر سے اپنے تعلق و فو تو کوڑنے کا سفر ہے۔ ان افسانوں کی قیر آفرینی کہانی کہنے کی روایت میں خاص مستوی کی حالت ہے اور میرزا ادیب کے یہ افسانے اپنے عہد کے دو مقادیر و ادیبوں (کھری روایت اور حقیقت پسندی) میں توازن کی مثال ہیں۔

"کل سچ جب کہ قلب کی جلی کرن رگ سحر کی چوٹانی کو چوم دی تھی۔ میں ایک دہلی کے ذریعہ حبشے کے کنارے ٹھہر گیا، خیر لکھا اور اور حرا دھر بھرے گا، چاک میری نگر وادی میں ایک تنگ مرمی کی تربت پر چڑی۔" (افسانہ "خوشی" سے اقتباس)

لی دلی حرا دھر باہل اور نیچا کی قلم گرہوں کی مائوس روایتی فضا اور عشقے قفسے کے سبب یہ افسانے کھری روایت کے کھاتے میں ڈالے گئے۔ حتیٰ کہ انہیں داستانیں تک کہا گیا، حالانکہ "ہائپ" انہیں کردار اور کھرا بھی ماحول کی واحد مثال افسانہ "ہائپ کا قیدی" ہے۔ جبکہ دیگر افسانوں خصوصاً "مخلی حوائط" اور "حکایت جنوں" میں سروس اور بار کا ٹھکانہ اس حد تک نہیں بڑھا کہ وہ داستان کہلاتے۔

روایت پسندی کی اس روایت میں شمولیت سے مصنف میرزا ادیب خود کہتے ہیں:

"خبریں دوکان سادہ تھا کون ہی تاریخ تھی کون سامعیت تھا۔ میں اس زمانے میں لمبی پیر کا عادی تھا۔ ایک سچ منظر پارک کے قریب مجھے سے گزرتا ہوا سنی گیت سے ہو کر اس کچھ بچا گیا جو ۱۹۱۹ء کے شاہی قلعے کی میز چوں کے آگے لکلی ہوئی ہے۔ یہ پیر میں پہلے نہیں

”انگارے گروپ“ کا باغیانہ لہجہ

(سجاد عظیم، رشید جہاں، احمد علی اور محمود ظفر)

۱۹۳۲ء میں پروفیسر محمد حبیب کا افسانوی مجموعہ ”کیا گرا اور دوسرے افسانے“ نورد افسانے کو ایک نئی کڑت دینے کے لیے بنیادیں فراہم کر گیا۔ وہی افسانہ نگاروں کے زیر اثر لکھے گئے نوافسانوں کا یہ مجموعہ مذہبی اور معاشرتی بکڑ بندوں سے بغاوت کا اولین اعلان تھا۔ اس روایت میں تو سب ”انگارے“ مرید احمد علی (مطبوعہ ۱۹۳۲ء) کی اثنا عشر اور ضلّی ہے۔ یہ نوافسانوں کا مجموعہ تھا۔ پانچ جلد قلم کے، ایک رشید جہاں اور احمد علی اور ایک محمود ظفر کا۔ یہ تمام افسانے فرانچیز کے ساتھ فرانسیسی فطرت نگاروں اور مارکس ازم کے اثرات کے تحت لکھے گئے تھے۔ بکڑیوں کو چاہیے کہ ”انگارے“ کے افسانے تہذیب کاری کے اعتبار سے ایما کی ذوالا منور ہوئیں، مایا انکلا لائیں اور غلاموں کو موضوعاتی سطح پر سنگین فرانچیز اور فطرت نگاری اعتبار سے مارکس اور اننگلز کے زیر اثر تھے اور مذہب پر جسے شدید پابندیوں کا شدید رد عمل تھا۔

”انگارے“ کی اثنا عشر کے خلاف بھی احتجاجی شدید رد عمل دیکھنے میں آیا۔ لوگوں نے ”انگارے“ کی کاپیاں بک اجالوں سے اٹھا کر مختلف شہروں میں تہہ آتش کیں۔ ”انگارے“ کے جملہ افسانہ نگاروں کو Iconoclast کہا گیا اور مشرقی روایات کے ان باغیوں کا سماجی باغیات بھی کیا گیا۔ احمد علی جہاں عظیم:

”انگارے اور اس کے مصنفین کے خلاف بد اخلاقی پر اپنی گٹھ کیا گیا، حسب دستور مسجدوں میں، راجہ لیڈن پاس ہوئے۔ عبدالماجد اور چادری غم فوجیک کہ تارے خلاف انکو ذمے میں آئے، ہمیں قتل کرنے کی دھمکی دی گئی اور بالآخر سوچ سمجھ کر حکومت سے اس کتاب کو ضبط کر دیا گیا۔“

(”دہشتانی“ سے اقتباس)

اس مجموعے کی ضلّی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ساری جدوجہد اور سماجی بکڑ بندوں کے خلاف اندری اندر چلنے والی تحریک ایک نئے لے مرے تک آن پہنچی تھی۔ یہ مرحلہ طبقاتی تضاد کے شعور کا مرحلہ بھی تھا۔ یوں ”انگارے“ کی اثنا عشر سے حقیقت پندانہ نقطہ نظر کو رد و ناجلی۔

اس سے قبل سجاد عظیم، یلدرم نے جذبے اور شعریت کی دانوائت چاہی اور پریم چند نے ”عقلمیت پسندی“ اور ”مستعدیت“ میں

قوسید کا تصور شامل کر دیا۔ یوں آدنی حقیقت پسندی (راشدہ انگریزی اور سلطان حیدر جوش) اور ”رومانی مثالییت“ (نپالہنچ پیری) کی درالک الگ دھارا نہیں پہنچے تھیں۔

ترجمہ نگاروں کی معرفت مالی ادنی مضمرات سے کم تر اثر موضوعات اور ترجمہ کاری کے نئے آفتی سامنے آئے اور اہل سادہ نگاری سے حلقہ فکریہ سازی نے اہمیت حاصل کی۔

پروفیسر محمد عیوب کا افسانوی مجموعہ ”کیا گزرا“ اور ”انکارے“ (مترجمہ احمد علی) کی روایت۔ نفسیات کا دور دورہ، فرائیڈ، ڈی۔ ایچ۔ لافنس اور ٹیگنیک کا مجموعہ۔ طبقاتی تضاد کا شعور۔ سیاسی اور سماجی سطح پر جدوجہد کا نامرمل۔

”قیامت کے دن میں جانتا ہوں کیا ہوگا۔ یہ عورتیں وہاں چچا و چاچا رکھیں گی، وہ غمزے کریں گی، وہ آنکھیں ماریں گی کہ اٹھ میاں بچا رہے۔“

(”نہیں نہیں آتی“ از سجاد ظہیر سے اقتباس)

سجاد ظہیر، احمد علی اور رشید جہنم کے ان افسانوں میں زیریں لوہے کی نو م کی ہے اور روحانی اعتقادات پر کاری ضربیں لگائی گئی ہیں۔

۱۔ ”سوت یا آدنی؟“

”مجھے سوت پہننا آدنی کوئی میرا ہیبت بھر دے۔“

۲۔ ”انگلی سونے کی چڑیا اور گدی دم ہاتھ میں۔ اب چاہتے ہیں کہ ڈم بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ ڈم نہ بھرنے پائے۔“

”ٹاپا ہل ہے میرے پہلو ان انکارے کا زور اور ڈم بھرت گئی تو عزت گئی۔“

”کیا کہا عزت؟ عزت لے کے چلا ہے۔ سوچی روٹی اور کھک کہ کر کیا باکلا جسم نکل آیا ہے۔ فاقہ ہو تو ہو بھر کیا کہنا اور اچھا ہے،

بھر تو عزت ہے اور عزت کے اوپر لدا اور چاک۔“

(”نہیں نہیں آتی“ از سجاد ظہیر سے اقتباسات)

۱۔ ”جب اور اس درس میں خیر کا غلبہ ہوتا ہے تو غالب غم سمجھتے تھے کہ مولانا پر ایک روحانی طاری ہے۔“

۲۔ ”ان کے لیے گرتے اور قبا نہیں، ان کی تکفیر اور سلیم، ان کی دوپٹی نوچیں، ان کا گھٹنا ہوا سرا اور ان کی جھبرک داڑھیاں جن کے ایک ایک بال کو کھریں اپنی آنکھوں سے نہیں کی۔“

(”جنت کی بڑھت“ از سجاد ظہیر سے اقتباسات)

”سرکاری کچھ کیوں نہیں کرتی؟ اور نہیں تو سب کو براہ روپیہ دیا دے اور اگر انکا نہیں تو صرف آدنی ہی ہم کو مل جائے لیکن سرکاری

جوتی کو یہ غرض پڑی جو اپنی جان بچان کرے اس کے خزانے پر ہیں۔“

(”سہاڑوں کی رات“ از احمد علی سے اقتباس)

”انکارے گروپ“ کے افسانہ نگاروں میں سجاد ظہیر سب سے نمایاں تھے۔ ۱۳۴ اصطلاحات کے مجموعے میں ان کے پانچ اہل سادہ

باتر حبيب ”خيزه نيس آتی“، ”جنيت کی بشارت“، ”مريمیوں کی ايک رات“، ”دلاوری“ اور ”مکرمیہ بگاڑ“ نے اصطلاح سمجھے ہوئے ہیں۔
 ”انگارے گروپ“ کے علاوہ کاروکیوا کے مطابق ”انگارے“ کی مثلی کا فوری سبب چار طبقوں کا افسانہ ”جنيت کی بشارت“ تھا جبکہ
 سارے شوبداں بات کے خلاف جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقيقت ہے کہ ”انگارے“ کا سب سے فوری ک افسانہ ”خيزه نيس آتی“ (”سہا نسيم“)
 ہی کا تھا۔

سيد هما حبيب کے افسانوں میں شعور کی رو کے ور پنے داخل خودکشی، سر ريلزم اور دلازم کے دو بے غالب دکھائی دیتے ہیں جبکہ
 موضوع کے مطابق چاروں خصوصیات صرف کی گئی ہے۔

رشيد جہاں کا نام ”انگارے گروپ“ کا دوسرا بڑا نام ہے لیکن اس مجموعے میں ان کا صرف ايک افسانہ ”عنوان“ اولی کی سر ”مثالی“ ہے
 جسے اس کتاب کا سب سے بے ضرر افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ غریب بھی حقيقت ہے کہ رشيد جہاں کی جو شہرت آتی ہے اس کا ”انگارے“ میں مثالی
 تحریر اس سے کوئی تعلق نہیں۔

رشيد جہاں نے اکل افسانے لکھے ہیں جو ”موريت اور مگر افسانے“ اور ”شعور بول“ نامی مجموعوں کے علاوہ ”انگارے“ (”مروجہ
 ادبی“ اور ”میرے بہترین افسانے“ (”لامرچہ حسن معمری“) میں شائع کیے گئے۔

رشيد جہاں نے ہندوستان کی پہلی ترقی پسند خاتون ہونے کے علاوہ اپنے افسانوں میں جرأت فکر اور جرأت بیان کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ
 یہ کہتا ہے اس دور میں ”سور“ (”شعور“ ”موريت“) جیسے افسانہ لکھنا سارے افسانہ نگاروں کے لیے کی بات تھی۔ رشيد جہاں کے افسانوں میں
 جو کہ گانے اور پوٹ کرنے کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ اسے اس دور کی عورتی فضا پر چھائی ہوئی رومانیت کا شہدہ در عمل بھی کہا جا سکتا ہے لیکن
 بقول قرآن ”میں سیدہ“:

”۱۹۳۸ء تک پہنچتے پہنچتے وہ بادل جھکی تھی۔ گمراہ گئی وہی تھی مگر باہر کی دنیا میں آنسو میں جل رہی تھیں۔ دلچ زبیدی پر لگے ہوئے
 ناٹ کے ٹکڑے اور گل ہواؤں اور کونوں کے ذرا رنگ و روخ کے چھپیں پردے، سب کے سب اس آنسو میں چھپنے لگے تھے اور ان سے
 اگلے سے اندر کی ايک باہل گئی اور پھر واقعہ جھک دکھائی دے گی تھی۔“ ۲

”ادبی“ نے ”انگارے“ کے مرتب ہونے کی حیثیت سے انگارے گروپ کے افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ شہرت پائی اور اس
 شہرت کو احکام ن کے افسانوی مجموعوں ”باتر حبيب“ (”شعور“ ۱۹۳۶ء)، ”دلاوری“ (”۱۹۳۳ء“)، ”قید خانہ“ (”۱۹۳۳ء“) ”موت سے پہلے“
 (”۱۹۳۵ء“) اور سب سے بڑا کران کے ناول ”دلی کی شام“ سے ملتا ہے۔

تحلیک کے سید ان میں ”ادبی افسانے“ کا باعث بنے، انہوں نے افسانے کا ابتدائی کاموں میں ہی سر پستہ اعزاز سے حروف کر دیا
 (مثال ”موت سے پہلے“) اور آزاد دلازمہ خیال میں دلہن اور جو اس کی تدویر کاری کے تحت اپنا اولین افسانہ ”مہا دلی کی رات“ (”مطبوعہ
 دلی ۱۹۳۳ء“) تخلیق کیا اور بعد میں اسی تدویر کاری کے تحت ”دلی کی رات“ ”دلی کی رات“ ”گھڑا کر آزاد دلازمہ خیال کی تحلیک کا سہارا قائم کر دیا۔

”اے کاش ایہ ہوتے ۱۰۰ جاتیں، ايک سر ہنر ورشتہ، گوشہ اور بڑی اور گوند کا اس کا دل خون سے زیادہ گرم اور اس کی کھال
 گوشہ سے زیادہ نرم، ايک تاج اور مضبوط اور دراز اٹلی اور ايک تاج، ايک دوسرے میں بیچ نہ، ايک دوسرے سے بچنے ہوئی، ايک دوسرے
 میں ايک جیسری روح کی امید، ايک چری زندگی کا خزانہ، ايک لمحہ کا سرمایہ، پر بھتی میں بھتی کی طاقت۔ آواہ و آواہیں، اور ناگ لکھائے

ترقی پسند تحریک

(عزیز احمد راجندر سنگھ بیدی، اختر حسین رائے پوری، ملک راج آنند، احمد نغم کاشی،
کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، بصیرت چغتائی، درویش دستگیر جتوئی، بلونت سنگھ، بشیر سنگھ گزدار)

سہ ماہیہ اور اہم ماہیہ نے ۱۹۳۲ء میں کلکتہ میں ہندوؤں کی بھرپور کے ایک گھوٹے میں انجمن ترقی پسند مصطفیٰ کا افتتاح کی گئی۔ اس کا مقصد ترقی پسندوں کو اکٹھا کرنا تھا۔ (برطانوی اہم ماہیہ کا شروع از سر انصاری ۶۹-۱۹۷۰ء، کراچی)

اہم ماہیہ نے ایک مضمون ”تحریک ترقی پسند مصطفیٰ اور گھوٹا پی مصطفیٰ“ (مصطفیٰ ”سیپ“ شمارہ ۴۰) میں لکھا تھا۔

”گھوٹا پی مصطفیٰ نے میرے اور رشید جہاں کے طور پر ۱۹۳۳ء میں انجمن ترقی پسند مصطفیٰ کے قیام کا اعلان کیا اور چونکہ سہ ماہیہ اس وقت لندن میں تھے، ان کی دشمنی کا قیام دیکھ کر رشید جہاں نے خود بذریعہ انگریزی دی۔ چنانچہ ۳۳-۱۹۳۴ء میں اس کے باقی ماندوں کے سامنے جو مقصد تھا وہ بالکل ادنیٰ تھا اور اس میں سیاسی رجحانات اس سے زیادہ نہ تھے کہ

”ہم ان تمام اہم مسائل کو لے کر آزادی رائے اور ترقی پسندی پر مبنی ہیں جو انسانی کی باوجود اور برصغیر کے لوگوں کو بالخصوص

درپیش ہیں۔“^۱

اسی زمانے میں لیکن اس اعلان کے بعد برصغیر کے ادیبوں کا ایک ہلسلہ لندن میں بھی منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر ملک راج آنند، راجا

راجندر سنگھ اور سہ ماہیہ کے علاوہ دیگر حضرات بھی شامل تھے۔ جنہوں نے اس سے ملنے ملنے خط و کتابت کا اظہار کیا۔

جب ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصطفیٰ کا دستور العمل زیر غور تھا، ان دنوں، ملک راج آنند، سہ ماہیہ، رشید

جہاں، ڈاکٹر نثار، ڈاکٹر عبدالعظیم بانی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، بھٹو، گورکھ پوری، ڈاکٹر اچانتر حسین اور دھوپتی سہاے فراق گورکھ پوری

انجمن کے خطاب سے متعلق بحث مباحثوں میں سرگرمی سے حصہ لینے والے اہم نام تھے۔ واضح رہے کہ ان میں سے بیشتر اصحاب اظہار

کیہ نسبت پادری کے، رکن نہیں رہے اور نہ ہی اشتراکی نظام سے سرگرم دلچسپی رکھتے تھے۔ خصوصاً بھٹو گورکھ پوری، دھوپتی سہاے فراق، اچانتر

حسین اور اختر حسین رائے پوری وغیرہ۔

اقبال ٹھکانے پر افسانہ "When one is in" اور ڈاکٹر ملک راج آنند نے "مہر غزلار"، "قطرے کا دل"، "A Kashmir Idyl" "کڑکڑتی پندران افسانہ کہنے کا عرصہ سلا وضع کیا۔ ملک راج آنند نے دیباچہ نگاری کو ترقی پسندی کا نثر کا نیا۔
 "دونوں مضمین صاف و باقاعہ، لیکن شام ڈھلنے ہی پائی گھر آئے تھے اور بادش کے آثار پچھلے ہو گئے تھے۔ دورہ کرکلی چمک رہی تھی اور
 ہاؤس کی وحشت، ایک گڑبگڑا ہوا دی میں گونج اٹھی اور کسانوں کی لڑکیاں صرفی کے چھڑوں کی مانند سم کر اپنی اپنی پھوس کی بھونچڑ میں
 دھبے لگیں۔"

("قطرے کا دل" سے اقتباس)

اس ضمن میں اقبال ٹھکانے کے افسانے کا یہ روزگار مرد اور عورتوں کا عرصہ "کھپا، پھنسا، پھنسا، پھنسا" طرز کا کارخانہ، دیباچہ ہوا خون اور دل
 کے ٹیٹنگ ڈائریکٹر کا کردار ہی مطالعہ کرتے ہوئے جاتی موضوعات پر نظر پاتی تھی یہ بہت اہم ہے اور یوں یہ فارمولہ یہ کم چند کے "زال" کا
 قیدی "سے ہوتا آج کے نو ترقی پسند افسانہ نگار تک پہنچا۔

شروع سے ترقی پسند افسانے میں یہ گنہگار کا نظریہ اور اجتماعی طور پر پارٹی کے مزید مطالعہ کو پار بار و ہرایا گئے اور وہ بھی اسی
 صورت میں کو ترقی پسند افسانوں سے دور رہا اور وہ گردانی نہ ہونے پائے۔ اس سے یہ تو ہوا کہ ترقی پسند جی فیسو کی پابندی ضمن طریق پر
 ہوئی لیکن ادب کا باقاعدہ نگاری بہار بیکر پہنچنے کے اس نسل سے بچ رہی ہو۔ البتہ ترقی پسند افسانہ پچھلے مطالعہ کی گئے ہر جہہ فکر کے لوگوں
 تک پہنچانے کی فکر میں تھے موضوعات کی دلچسپی کے امکانات بعد میں آنے والوں کے لیے ایک حد تک ختم کر گیا۔ افسانے کی لامرہ مدھ
 کاری اور زبان کے دربار سے کی سطح پر ترقی پسند نظریات کا حامل افسانہ نگار آتا ہے اور ایسے ترقی پسند افسانہ نگاروں کے ہاؤس کی
 گہرست غریب ہے جن کے افسانے ترقی پسند ملی فیسو کے تحت خارجیت، احتیاجات نگاری اور تصدیق کی حسیات کا نگار ہوئے۔ اس کے
 باوجود ترقی پسند تحریک نے اردو افسانے کو متحدہ چاند آواز میں نکلیں۔ ایسے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر ملک راج آنند، دلیچھ
 ستیہ راجی، غولیا احمد عباس، اختر حسین، رائے پوری، کرشن چندر، عزیز احمد، حسرت پھنائی، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، شمشیر گلہ نرولا اور
 بلونت سنگھ کے نام بہت لگائے ہیں۔

جیسا کہ یوں ذکر ہوا ڈاکٹر ملک راج آنند ترقی پسند تحریک کے نظریے ساز و کار مولد افسانہ نگار تھے اور یہ کہنے میں کوئی الجھ نہیں کہ
 انہوں نے ترقی پسند افسانہ تراشتے میں پہلی کی ایک ایسا افسانہ جو ترقی پسند ملی فیسو کے ضمن مطابق ہو اور جس کے ذریعہ طبقاتی شعور بھا کر گیا
 جائے۔

ملک راج آنند نے ایک جتنا گہری اور اندیشہ نگار مانی سطح پر شہرت پائی۔ گہری جی میں ان کے افسانوں "The Untouchable"،
 "Sword and the Sickle"، "Coolie"، اور "The big Heart" "بہت مشہور ہوئے۔ آپ کا تعلق دلچاپ سے تھا اور بچہ اپنی
 سرحد کی یادداشت اور کاندھوستان کا قابل برداشت ہلکا آری اور معاشرتی بنات کا نگار تھا۔ آپ نے کچھ ہوئے لوگوں کی نفسی کیفیت کو
 "A Kashmir Idyl"، "مہر غزلار"، "قطرے کا دل"، اور "دھرتی کا پھل" جیسے افسانے نگار کرکمال ہوشیاری کا مظاہرہ کیا۔ افسانوں میں

سامی موضوعات کی سطح پر لفظاتی تاؤ اور توجہ کاری کی سطح پر لفظاتی تجزیہ ان کے میں پسند موضوع رہے ہیں لیکن کچھ اس طرح کی بارگ کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ان کے افسانوں کا لینڈ اسکیپ زیادہ تر خمیر اور آسام کا علاقہ رہا ہے۔

”دھرتی کا لہلہ جانا ہے“

اور صحت کا رنگ کڑوا ہے

گنگو اس گیت کو بے خودی ملم طوطی اور بانڈی کی حالت میں گائے ہار ہاتھ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے چھاؤڑے سے زمین کا سینہ پاک کئے جا رہا تھا۔ اس کے وہ تل بھی تھے موتی اور وہ لیکن اس ملک میں آنے سے پہلے وہ انہیں بچ آچھا اور آج کی نگاہ سے اسے وہ تل واد آ رہے تھے۔ موتی اور بچ!

اس کا ایک دوست تھا بونا۔ وہ اسے بچوں ہی سہہ داغ دکھا کر آسام میں لے آیا۔ چونکہ بونا منگلورن وطنیت میں طازم تھا۔ اس لیے کشکو کو بھی اس کی باتوں کا یقین آ گیا۔ اسے یہ کہنا تھا تھا کہ تمہیں پندرہ روپے باہور میں کے چائے کے کھٹوں میں کام کرنا ہوگا اور ساتھ ہی زمین کا ایک ٹکڑا بھی مل جائے گا۔ جس میں وہ چاول اور لہیرو رو سکے گا۔ یہاں بچلی کر ایک مدت تک اسے زمین کا ٹکڑا مل گیا۔ آخر ایک دن اس کی بیوی سنا بچلی لہیرا سے مرگئی۔ جو اکثر اسے دیکھنے آچھا تھا اس نے کشکو کی حالت پر ترس کھایا۔ لیبر صاحب کو بھی ڈانٹ پائی تو اسے زمین کا ٹکڑا ملا۔

”دھرتی کا لہلہ کر لہلہ کر آسمان آسمان سے اقباس“

دیو بند ستیا جی کی نمایاں پہچان ترقی پسندی اور وطن پرستی ہے۔ ان کے افسانوں میں دیکی فضا کو گرفت میں لینے کے ضمن میں رنگوں اور گیتوں کی خاص اہمیت ہے۔ انڈیا میں ستیا جی نے سن کی ہر ہر جگہ اور خشکی کو ازات کا کا کا لیل میں رکھا جس قدر کہ لینڈ اسکیپ اور لوک گیتوں کے حوالے سے کردار سازی پر توجہ صرف کی۔ لیکن رات و دن ان کے ہاں خشکی کو اہمیت حاصل کرتا تھا اور ہوں ان کے کامیاب افسانوں میں خشکی مہارت اور دھرتی کی بوجھ کی بوجھ کا انوکھا حال میل اور دار بند رہا تو ٹیکو کے طرزی کردار نگاری ایک انوکھے تجربے میں حاصل کی۔

دیو بند ستیا جی کے افسانوں کا ایک نمایاں وصف انکس پر رازی کا عکس میں رنگ۔ ہاتھ کا کامیاب ترین انتخاب اور بچوں کا خمیراؤ ہے۔ دیو بند ستیا جی کے افسانوں کا ہر لکھ جو مل ہوتا ہوا یہ لیلی لینڈ اسکیپ ہمیشہ قابل توجہ رہا تھا۔ بعض اوقات ستیا جی کے افسانوں میں دیہات، شہر اور جنگ اپنے باہمی سمیت باہم ایک ہو کر جے اور اس فی ترتیب کی ہر چہرے ہندوستان کی مٹی کی خوشبو اور گیتوں کی مدد سے اظہار پاتی ہے۔ دیو بند ستیا جی کے ہاں غنسی، لکھنئیں، ممبئی یا بھارہاں اور ”خورد“ نمایا دی موضوعات رہے ہیں۔ ایسے میں ”بانی کھانا“ غنسی کا کامیاب کردار نگاری ستیا جی کا ہی حصہ ہے۔

خواجہ احمد عباس نے اپنے افسانوں میں توجہ کاری کی سطح پر کیمرو ٹھیک اور بچوں کی سطح پر صحافیانہ شہر وچ سے کام لیا، جس کے سبب ان کے افسانوں میں بھی بعض تصنیف کی لکھا محسوس ہوتی اور ابھی انہی کی صاف گوئی اور بے باکی کھلتی تھی۔ ان پر وہ طرح کی نمایاں یا خدیوں کے ضمن میں خواجہ احمد عباس کو کرشن چندر کا پیش رو کہنا چاہیے۔ اسی طرح خواجہ احمد عباس کا نام اپنے اسلوب کے اعتبار سے کرشن چندر کی

روایت سے متعلق ہے لیکن موضوعات کی سطح پر خوب احمد عباس خود کرشن چندر اور اختر ترقی پسند افسانہ نگاروں اور افسانہ نگاروں اور ان کے ہم عصروں کی صدیقی کے لیے راہ نما ثابت ہوا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں خوب احمد عباس سب سے پہلے بطور موضوع شہری کی مصروف زندگی اور کاروباری ذہنیت کو گرفت میں لیتے ہوئے نظر آئے ہیں۔ احمد عباس سے پہلے اردو افسانے میں شہری کی خام تصویر کاری، پریم چند، مہاشی سہرشی، اعلیٰ عباس جسنی اور رشید جہاں کے ہاں بہت ہے۔

خوب احمد عباس کے افسانوں میں مصروف کاروباری شہر اپنے حق مشر اور غیر سمیت مخالفت کے دینے والے اپنی اصل ذہنیت کے ساتھ ظاہر ہوا۔ اس شہر کے رنگا رنگ اور حالات نے افسانے کو ناقص نظر کرنے پر مجبور کیا۔

خوب احمد عباس کے افسانوی مجموعے ”زعفران کے پھول“ کے تینوں طویل افسانے انہاری۔ چور کا طریقہ کار لیے ہوئے ہیں۔ زعفران کے ٹکٹ میں کڑی بڑھاپا کا شہری بابو سے نکال کر دھوکہ دہائی میں ڈوب جاتا ہے اور شہری جانب گیری سے جاتی مل کھاتی ہوئی ناک بر افسانہ نگاروں اور اس ہے۔ ”زعفران کے پھول“، ”گیتا“ اور ”اندھیرا اجالا“ بالترتیب شہری عقیدہ رستہ میں کرشن چندر، اعلیٰ سہرشی، جعفری اور جعفری راج پور کے نام کے لیے لکھے ہیں۔ یہاں افسانہ نگار کے حوالے سے لکھے گئے کرشن چندر کے افسانوں کا انداز لیے ہوئے ہے جبکہ ”گیتا“ سردار جعفری کے باطنیانہ مزاج سے متاثر ہے۔ جعفری راج کے نام ”اندھیرا اجالا“ کیا گیا ہے جس میں افسانہ نگار قاصداً علم کی تکنیک کا ماحول سے برقی گئی ہے۔ موضوعاتی سطح پر تینوں افسانے شہر کے گھر کھلے ہیں کی حکایت کرتے ہیں۔ ”اندھیرا اجالا“ کی ابتداء بیرونی توفان سے ہوتی ہے بیرونی ہے، بیرونی امید کے شہر کا تہہ پہاڑی بیرونی کا بیرونی کھنڈر کی طرف جھکاؤ، بیرونی کا شہریت کھدواؤ، گڑھی کی پے وقت۔ وقت کے بعد بیرونی دانہ کی قربت، بیرونی ہوائی سلطون غزل گانے کے انقلابی نغمہ بلند کرتی ہے۔ زہر حلقی گھرا جائے ثابت ہوا ہے، شہری کی بیماری آخر کار مرنے والی ہے۔

اس افسانے میں لکھنویک کا کامیاب برتاؤ ہوئی بار کیا گیا ہے جب کہ اسی تصویر کاری کے تحت ”بھٹی رات کی بانہوں میں“ شایع ہوئے۔

خوب احمد عباس کے ہاں ایک طرف تو ”پاکیت اور وقت“ جیسے کوئی افسانے میں اور دوسری طرف ”چندرا“ جیسے چندرا دینے والے کرشمہ تھا کہ اپنی افسانے جن میں سٹ بازار اور دام کڈ کا چتر پائی، نند پارک کالنی۔ لاہور، گلزار و قلم پور اور سب ایک ہو گئے ہیں۔

خوب احمد عباس کا بطور افسانہ نگار سب سے زیادہ برن کے مخصوص کو نظر میں پائیدار ہے۔ وہ شہر کے قلم پرست واقع ہوئے ہیں اور ان کی یہ قلم پرستی پاکستان کے کھڑے کھڑے ادبی معیار میں ناگوار نظر رہی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ کیا کہتے ہیں اور اس کا رد کیا ہوتا ہے، اردو افسانے کی تاریخ میں خوب احمد عباس ایک واضح اور دو ٹوک کو نظر کے حامل افسانہ نگار کے طور پر بیحد باعث نزاع بھی رہیں گے اور یاد بھی رکھنے جائیں گے۔ بہت بڑا بڑا بھی یاد رکھنے کی ہے کہ کھڑی سطح پر خوب احمد صاحب کے لکھی تمام کے سائنٹیفک تجربے کی ضرورت بھی بیحد محسوس کی جاتی رہے گی۔

خوب احمد عباس کی طرف کرشن چندر کے ہاں شہریں روزمرہ ضرورت کے تحت تبدیل ہوتا ہوا انسانی رجحان و معاشرت اور جسم کی عجیب و غریب تصویریں سامنے آتا ہے۔ احمد عباس کے سنگو (لکھنوی کی چٹان) اور کرشن چندر کے چندر (چندرو کی دنیا) کی ایک ہی کائنات ہے، ایک ہی مصوٰفہ تھا اعلیٰ اور ان کے چہارہ جانب مخالفت کا کار بار اس ہے۔ ”لکھنوی لکھنوی کی چٹان“ میں افسانہ نگار رجحان و تکرار کو کھدوا رہا ہے، اس

منصب پر "سمجھتی رات کی ہانوں میں" کا پس پردہ "کرمجن" بھی فخر ہے۔ اور جن جس نے زندگی کے پہلے ڈسے بھاگ کر چھوڑ گئیاں محبوب کی ہانوں میں گزرائی چاہی ہیں۔ بڑے شریک اور انڈیجینت کس طرح انسانی اقدار کی صورتیں سمجھ کرتی ہے اور کرم کرداروں کے ساتھ خیر پانے والے کردار کیسے ہیں جو شکر اور پاکیزگی کے خواب دیکھتے ہیں؟ ان سب کی تصویر کاری طولیہ احمد ماس اور کرشن چندر کے بعد عجیبی ال ڈاکر کے افسانوں میں ایک معیار قائم کرتی ہے۔

۱۹۳۶ء میں جب کرشن چندر کا "بھائی قتلے" (انٹائے لطیف برسالت "ہانیوں" میں شائع ہوا تو دیر ہایں مہیاں شیر احمد نے اسے مصنفہ علیہ السلام میں سراہا تھا:

"سن کر کرشن چندر کا شمار اردو کے موجودہ ادباء کی صف اول میں ہو سکتا ہے۔ اس نوجوان ادیب کی شخص اور ذہن و زبان، سیر حاصل اور عقیم تخیل اور کہ انسانی مطالعہ اس بات کا شاخص ہے کہ یہ شخص ہماری زبان کا ایک زبردست ادیب ثابت ہوگا۔"

اُسے بل کر کرشن چندر نے اپنے افسانوں کے ارد سے موضوعی سطح پر اس روایت کو آگے بڑھایا جو پریم چند سے ہوتی ہوئی کرشن چندر کے سینکڑوں مصرعوں میں ٹھکنے تک پہنچی تھی اور جس میں سمجھتی نے دلکش تنہا کی کا اضافہ کر دیا تھا۔ کرشن چندر نے اپنے بہترین افسانوں خصوصاً "مہا کھلی کا پل"، "بس کا ٹوٹ"، "جوتا" اور "چندو کی دنیا" میں اردو افسانے کی اس پہلی پہلوتی ہوئی روایت کو اپنی ٹھکنے مہارت اور شرفی جان سے مزین سوارا۔

اس روایت میں کرشن چندر کی ایک منفرد خوبی اس کی جرأت تھر ہے، کہو یہ سب ہے کہ اس کے افسانے تقریباً عقیدتیں اس پر مبنی معاشرتی اور سیاسی کرداروں کے ترجمان بن گئے۔

آخر صمیمین رائے پر دی کی اولین شہرت ترقی پسند ادب کے نفاذ کی ہے اور ان کا "ضمون" ادب اور انتخاب "اردو میں ترقی پسند تہذیب کی بنیاد ہے۔" بطور افسانہ نگار آخر صمیمین رائے پر دی کی پہلی اور آخری پہچان افسانوی مجموعہ "محبت اور نفرت" کے افسانے ہیں۔ یہ ایک قصہ ہے کہ انہوں نے اس پہچان کے حصار کو طویل سطر اختیار کر کے توڑنے کی سعی کی اور بے ۱۹۴۳ء کے نظام سے بہت پہلے مسافرت کے دوران لکھے گئے لہذا وسیع مقررے سے حصص افسانوں کا مجموعہ "زندگی کا میلہ" ترتیب دے لیا تھا لیکن یہ مجموعہ بہت بعد میں ہا کر شائع ہوا اور "محبت کا نفرت" کی شہرت جس کی توسیع رہی۔

"زندگی کا میلہ" میں شامل افسانوں کو خود انہوں نے "ایک پہلی ہوئی روح کا سفر کا بہت جلد احوال" اور "افسانیت کے پڑھنا لیکھنا" قائم کر دیا ہے۔ اس افسانوں میں شہید ہے نزاری، بھٹی اور بے تابی کا مقررہ پایا ہے۔

آخر صمیمین رائے پر دی کی افسانہ نگاری کا آغاز افسانہ "زبان بے زبانی" "میلو" "کھڑ" "کھنکھ" مارچ ۱۹۳۳ء سے ہوا اور انہوں نے اپنے افسانوں میں روانہ اور حقیقت پسندی کا ایک انوکھا اظہار پیش کیا۔ اس ضمن میں دو خود رقم طراز ہیں:

"رومان بھی زندگی کی ایک حلقہ حقیقت ہے اور کوئی شخص کہ اس کی گفتگو کو چھپایا جائے۔ میں ایمان نہیں چاہتا جس کی کوئی رات نہ ہو اور اس نیند کا ناکل ہوں جس میں چھٹے شخص دکھائی دیتے۔"

(دو چاند "محبت اور نفرت" سے اقتباس)

آخر حسین رائے پوری نے شہریت، ہندی، بنگالی، انگریزی اور فرانسیسی کھشن کے وسیع مطالعے سے اپنے اس مخصوص اسلوب کی لوک پکھ ستواری ہے۔ تقریباً سب رواں پندوں نے رواں کو کا حکمت کی جنس حقیقت پندی کی طوخیال کیا ہے۔ بلکہ آخر حسین رائے پوری رواں اور حقیقت پندی دونوں کی جانب بات دوپھیلائے ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے میں نے آخر رائے پوری کو رواں پندوں میں شمار نہیں کیا۔

آخر حسین رائے پوری نے اپنے افسانوی مجموعے "محبت اور نفرت" میں اپنے افسانوں کو یہی دو عنوانات دیے۔ "محبت" کے افسانے روئی ہوئے کے ساتھ ساتھ نثر میں شعریت کی جستجو کرتے ہیں بلکہ "نفرت" کے افسانے حقیقت پندی کی مثال ہیں۔ افسانوی تدویر کاری کی یہی دوہا نہیں مجموعہ "زندگی کا میلہ" میں بھی نمایاں ہیں۔ جنسی اور اخلاقی پستی پر آخر حسین رائے پوری کا طوہیت کو اپنے اور زندگی کا میلہ کے افسانے اپنے کرداروں کی سیما صفتی سطح کلائی اور گرد و پیش کی صورت حال سے شدید بیزاری کے مظہر ہیں۔

آخر حسین کے افسانوں میں لینڈ اسکپ کا قرک خصوصی طور پر توجہ طلب ہے۔ ایک طرف افسانہ "کافرستان کی شہزادی" پتال کی وادی بحریت سے حقیقت ہے اور دوسری طرف "دل کا اندھیر" بنگلہ عظیم کے نور اجد کے چوں کی جنگش۔ آخر حسین رائے پوری کی دوا اونی رو میں داستانوں کی انداز بہت نمایاں ہے

"کافرستان کی شہزادی کا جسمنا زمین ایک صندوق میں بند کر کے کسی پہاڑ پر رکھ دیا۔ اسلیانے کسی سے شادی کرنی اور یوں کے کسی رشتہ دارن میں اس روز ایک دوسرے کو کچھ کر بھی نہ پہچان سکے۔ نو جوانی میں رگہ کے چڑ کی پھری پر ہشتے تھے اور نہ ہاتھ تھے کس کسی کی صدائے ہارفت آج نہیں کے۔"

("زندگی کا میلہ" سے اقتباس)

عزیز احمد خیادی طور پر جائید کے آدمی ہیں اور افسانے میں حقیقت واقعہ سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہوئے کہانی کا پلاٹ ہانے سے انتحاب کرتے ہیں۔ انہوں نے چان کے لیے پیش تاریخ اور کہانی کو ہم اصل خیال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے خصوصاً "شعلہ زراعت" ("مطبوعہ" "نور" نومبر ۱۹۳۰ء)، "میرادخس میرا بھائی" ("مطبوعہ" "نفرت" شمارہ اول)، "کوڑیں تاج" اور "آب حیات" ("مطبوعہ" "سور" شمارہ ۱۱) تاریخ سے غم لیتے ہیں۔ لیکن یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ تاریخ سے حقیقت ان افسانوں کو سرکاری رہداری یا جاتی نوعیت کے کام سے الگ کر کے دکھانے کا واسطہ ہے کہ عزیز احمد تاریخ سے حقیقت اپنے ایک خصوصی فلسفہ نظر رکھتے تھے۔ یوں یہ کہنے میں قصہ کوئی الجھاپہ نہیں محسوس ہوتی کہ قرادخس میرا بھائی کا دل "آگ کا دریا" محمد حسن فاروقی کا "عظیم" "میدان حسین" کا "اواس فیلس" محمد سلطان زحدری کا "نقد نقاش چلدرن" عزیز احمد کی ارداداب میں پیدا کردہ وراثت کی چیزیں ہیں۔

عزیز احمد کے افسانوں میں تخیل کے زیر اثر عاشق اور محبوب پہلی دوسری ملاقات میں ہی کھیل کھیتے ہیں۔ ان افسانوں میں ہمارے پیشہ داستانوں کی کرداروں کی طرح بقیق کا کردار دوپہ خیال اور محبوب اختیار ہے خاص واقعہ ہے۔

عزیز احمد نے ترقی پندہ دوسرے کے تحت لکھے جانے والے افسانوں کی پیدا کردہ یکسانیت کے نکل حصہ کو تخیل داستان اور اساطیر کی زینت سے توڑنے کا حقن کیا ہے۔ میری اس بات کو مان لینے میں اس لیے بھی الجھاپہ کا مظاہرہ نہیں کرتا چاہے کہ عزیز احمد "آدش

حقیقت کار اور "ترقی پسند ادب" ہونے کے باوجود کہیں کثرتِ مثنوی قصو کے پابند نگہ کر کے نظیر بھی نہیں رہے۔ بقول مزین احمد
 "اشتراکی ملک کے رہنے والا "نہا انسان" بھی جب عام مدعا کی مسئلے حل کر چکے گا تو وہ ایک باطنی اندرونی نگار محسوس کرے گا۔ جس
 کے لیے وہ ذاتی احساس کی ضرورت ہوگی۔"

("ترقی پسند ادب" سے اقتباس)

مزین احمد اپنے المانوں میں رہائی و ہدائی احساس کی باز یافت کے لیے کوشاں رہے۔
 مصمت چغتائی کی افسانہ نگاری کا آغاز لگ بھگ ۱۹۳۵ء میں اس دور کے بڑے دو اہم پسندوں خصوصاً نواز فتح پوری، جنھوں
 کو رچھپوری اور چاہب قتیباہی کے ذرا اثر ہوا لیکن ۱۹۳۸ء تک آتے آتے مصمت چغتائی کی تحریر اشتراکی سوچ کی آماجگاہ بن گئی جس کی اولین
 مثال افسانہ "نیر" ("مطبوعہ" "ساتی" جون ۱۹۳۹ء) ہے۔ اس تسلسل میں مصمت چغتائی نے اپنے محدود شمار پکار افسانے تخلیق کیے جس میں
 "گلاف"، "سف یہ بچے"، "سرس"، "سہوٹی سوئی"، "ننگیز"، "مغل بچہ"، "چا پڑے"، "ایک بات"، "پتھری کا جواڑا"، "جوس"، "مغلی ہاش"
 اور "مغلی کی مانی" کا ایسے زوال افسانے ہیں جن کی کوئی اور دوا افسانے کے اچان میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ ان افسانوں کی سب سے بڑی خوبی
 برائت فکر اور جرأت اظہار ہے جس کے ذریعے مصمت چغتائی نے ہرے کے پیچھے بسورتی ہوئی ہندوستانی عورت کو باہر کھینچا ۱۹۵۰ء اور چاہب
 قتیباہی کی روان پسندی کے برعکس گہرے ہندوستانی عورت کی دنیا پر توجہ صرف کی۔

مصمت چغتائی نے عورت کے جہان کی معاشرتی وجہیں گوں اور نکلیں کے احساس کو یکساں طرح پیش کیا کہ مراد افسانہ نگار نہ تھے وہ
 تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ مصمت کے ہاں مرد کی جبریت کا رد عمل کسی حد تک اظہار شدہ یا خفا نہ کیے میں بھی داخل کیا تاہم مصمت چغتائی کی
 زبان دیوان پر کمال گرفت نے انھیں وہاں بھی سہارا دیا اور یوں بقول پطرس بھاری "انھوں نے بعض ایسی پرانی نصیحتوں میں نئے زوال دیے
 ہیں کہ جب تک وہ کڑی تھیں، کئی رستے آنکھوں سے اوجھل گئے۔"

مصمت چغتائی کو ہمارے ادبی واقعہ میں ایک زمانے تک مان کر نہیں دیکھ۔ ان کے اولین افسانے "بچپن" اور "کافر"
 ("مطبوعہ" "ساتی" ۱۹۳۸ء) کی اشاعت کے بعد کچھ بعد دیگرے "خدمت کار" اور "لاصیت" جیسے شرعاً و فحاً افسانے ۱۹۳۹ء کے ہی سال
 میں سامنے آئے تو ادبی دنیا میں کھلبلی مچ گئی اور کسی کو یقین بھی نہ آیا کہ یہ مصمت چغتائی کے ہی افسانے ہیں۔ یہاں تک کہ مصمت کا اولین
 افسانوی مجموعہ "نکلیاں" ("مطبوعہ" ۱۹۳۰ء) منسوب کر آ گیا اور "ادبی دنیا" کے مدیر مولانا صلاح الدین احمد نے "گلاف" پر ذکر کیا کہ

"مصمت کے فن کی غائب سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی بصیرت کی ایک لہارت ہے باک اور صداقت شعار ہے جہاں ہیں
 اور اگرچہ ان کی یہ تر جاتی ان کی نگارش کی پرکاری کا گلاب اور ہے۔ سچی ہے لیکن از رنگ و ادب ہندوستانی عورت ہیں۔ اس لیے اس نیم پخت
 دور میں انھیں اپنی جرأت کی دوا انھیں مل سکتی تھی جو ان کا حق ہے۔ داد تو ایک طرف اگر وہ اس بے ادب سے بچ جائیں، جس کی اندازنی میں معترضوں
 کے دل ان کی زبانوں کا ساتھ نہیں دیتے تو یہاں تکھمت ہے۔"

یہاں تک کہ "چا پڑے"، "مغل بچہ" اور "نکلیاں" تک آتے آتے مصمت چغتائی کے المانوں کے نظروں، کتابوں، آوازوں،
 اشاروں، کرداروں، احساسات اور جذبات کے بلاغیر بھاڑنے تو صیقل و تنقید سے بے نیاز رہ کر اپنا ایک الگ جہان خلق کیا ہے۔ جس کی نیکیں

صحت سب سے اگلی اور ضروری مقام پر رکھائی جاتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی جیسے افسانہ نگار کسی زبان میں کم کم پیدا ہوتے ہیں۔ ترقی پسند تفریک کی یہ سب سے بڑی عطا ہے کہ نورو افسانے کو بیدی جیسا افسانہ نگار بنا۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں خارجی زندگی کی شکست کے دور میں انسانی شخصیت کے داخلی عناصر اس قدر چپکے سے شامل ہو جاتے ہیں کہ محسوس تک نہیں ہوتا اور بیدی خارجی اور داخل کا ایک ایسا موزون بننے میں کامیاب ہو جاتا ہے جسے زندگی کہتے ہیں۔ بیدی کے افسانوں میں سب سے بڑا محرک ان کی جذباتیت کی ذمہ داری ہے جو قاری پر نامحسوس طور پر اثر انداز ہوتی ہے اور زبان و بیان کی کمزوریوں کو بیدی کی سب سے بڑی طاقت بنا دیتی ہے۔ اس منفرد محرک کوئی کا اظہار ”صرف ایک سکرینٹ“، ”ایک روز اطمینان چاہتے کے پاس کیا ہو؟“، ”گرم کوٹ“ اور ”بولو“ جیسے افسانوں میں مداحہ کیا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف بیدی کے ہاں موضوعات پر انداز کے سبب تنوع کی کمی کے باوجود اہم ترین چیز ہندی اساطیر کے ساتھ گہری پیچیدگی ہے جس نے نورو ادب کو ”گرہین“، ”لو جوتی“، ”لمبی لڑکی“، ”بھلی“، ”سولہواں“، ”جہنم کیا“ اور ”مخمسین“ جیسے شکار بنائے ہیں جو کچھ اس نوع کے درجہ اول کے حامل افسانے ہیں جس کی مثال عالمی ادب میں بھی خال خال دکھائی دیتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے فلمی پردے پر ۱۹۵۶ء میں بڑے بچے کی بات کی فلمی کہانی کے افسانوں میں تعمیر اور تحلیل کا جو سب افسانہ نگاروں سے بڑھ کر ہے اور بیدی کی قوت تعمیر اپنی سب سے بڑی کے لحاظ سے ناول نگاری کے لیے نہایت موزوں ہے۔

یاد رہے کہ اس وقت تک بیدی کا ناول ”آگ چار اور بلی سی“ شائع نہیں ہوا تھا اور اس کے بعد بیدی کے آخری افسانہ ”بولو“ کی تحلیل تک دو کوئی ناول نہیں لکھ پائے۔ اسے کافی ایسا محسوس ہوتا۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ نے اپنے افسانوں کے ذریعے دیہات کی چہرہ دلانی کی۔ ان دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں دیہاتی افسانہ بندی اور روایتی کردار نگاری کا رنگ غالب ہے لیکن شاید اس کی ایک وجہ ان دونوں کا پنجاب سے تعلق ہونا اور پنجاب کے دیہات کا بلند و بالا کے دیگر دیہاتی علاقوں کی نسبت زیادہ دیہاتی پرور ہونا ہے۔

اس ٹھنڈی دیہاتی نگاری میں ندیم اور بلونت سنگھ کا فرق یہ کہو ایسا ہی ہے جیسے ولیم وورڈز ورتھ اور کیرج کی دیہاتی شاعری کا فرق۔ یعنی نثر مصحوم فطرت کو چھتے ہیں اور بلونت قہار فطرت کو۔ دوسری طرف بلونت سنگھ نے پنجاب کے سنگھ قبیلے کی تریہانی کی اور ندیم نے مسلم معاشرت کی۔

”احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ اپنے اولین مجموعوں ”بہ پال“ اور ”چکا“ کے بعد حقیقت نگاری کی طرف آئے اور جہاں جہاں حقیقت اور دیہات میں توازن قائم کر پائے وہاں شاعرانہ افسانوں نے غلبہ لیا جیسے ”ندیم کا“، ”پیشتر سنگھ“، ”کھری“، ”کھنڈ اسہ“ اور ”لا رفس آف صلیبیا“ یا بلونت سنگھ کا ”امراس“ اور ”کالی تیزی“۔

جس طرح سعادت حسن منٹو نے غمزدگی کی کوکھ میں گھل جھل اور جرأت اظہار سے ہائے کی کوشش کی جیہندیم اور بلونت سنگھ نے اس کی کو اپنے اپنے مخصوص لینڈ اسکیپ اور مخصوص کردار نگاری پر توجہ مرکوز کر کے اپنی افروختہ کو کھلایا۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا لینڈ اسکیپ شمال مغربی پنجاب کی سٹارٹرٹھ اور مغربی پنجاب کے قصبہ کا علاقہ ہے اور بلونت سنگھ کے

افسانوں کی وہاں مشرقی پنجاب خصوصاً مجھے کے علاقے سے متعلق ہے۔

دیہات کے اولین کہانی کاروں پر کم چند اور سلطان حیدر جوش نے کہانی کہنے کا فن نگاہی کے تجربے میں چند کرناوردیہات میں زندگی کر کے سیکھا تھا لیکن دیہات کی اس عداوت کا شکر یہ انہوں نے سماجی سطح پر آوجش اور اطلاقیات کی تخلیق کر کے ہوا تھا۔ مگر ترقی پسند تحریک کا غلط ہوا تو مجبوراً احمد ندیم قاسمی نے دیہات میں غریب اور افلاس کی تلاش کی اور طبقاتی آوجش کو موضوع بنایا جس کی مثالیں ”زنجیں خانہ“ اور ”کادوس آف صلیب“ ہیں۔ دوسری طرف بلونت سنگھ نے مشرقی پنجاب کی مخصوص سماجی اور اس کے انفرادی جذموں (فعل) عمارت گری، افواہ اور آبرو ریزی) کی تشکیل میں اکڑے ہوئے لہجوں کو گرفت میں لیا ہے۔ جذموں کی شدت کے باعث ٹپلے اور جڑے اور کھرہ رے ہیں (لہجیاں مثال ”ناگ پھٹی“) اس افسانے میں بھر، ٹنگ زمین کے تیز نوکیلے کانٹوں والے خوردہ پودے ”Cactus“ کی طرح ایک کردار کو ایسا کر اس کے کرحے لکھتے ہیں۔ ناٹ صورت حال کو بظاہر ہی کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ بلونت سنگھ نے پنجاب کی سرزمین کی مست ہو کو پیشنے کا حق کیا ہے۔

اس کے ٹپلے اور انا پرست کردار جراتی کے ٹپلے میں دلیر زبان بولتے ہیں۔ کرداروں کا تھکا تھکا چہرہ اور اکڑا ہوا ابھ بلونت سنگھ کے اسلوب اظہار کو اکثر ادیت سے ہٹا کر کر گیا ہے

”جہاز جیسے ڈبل ڈال والے در لکھ کور سے ہی کچھ کر پچھان لینا اس کے لیے مشکل نہ تھا، اسے ڈال کا نہ قہب ہوا۔ اس کا قہب کرنے والا محض وہی ایک جوان تو نہیں تھا۔

چند قدم کے فاصلے سے در لکھ سنگھ نے کھٹکھا کر ڈالار سے پوچھا ”چک بھرا ہار ہی ہو گیا؟“

جواب میں بھٹکی نے دیت کی موٹی جھ میں ٹھوکر لگا کر تو دھول کا چھوٹا سا باد بلیا کر اوپر کھٹا اور ہی ہوئی ہوا میں معلق رہ گیا۔“

(”اور اس“ اور بلونت سنگھ سے اقامت)

احمد ندیم قاسمی کے پاس بہت سب موضوعات کے تصور کی خوب ہائی تو انہوں نے شہری زندگی کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ اس قبیل کے افسانوں میں ”گھر سے گھر تک“ کن کا شاہکار ہے۔ جب انجان ہے کہ بلونت سنگھ کا دیر اس طرف مٹھ آئے اور ”چکا“ یا ”کانی تھری“ ان کی پہچان سے رہے یہاں تک کہ بلونت سنگھ نے اپنی سوانح سے متعلق افسانہ ”عہد نو میں ملازمت کے تئیں مٹھے“ لکھ۔ بلاشبہ شہری زندگی سے متعلق یہی آں ہاں کا افسانہ ہے جو بلونت سنگھ سے مخصوص رہی۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں آخری بڑا نام شمشیر سنگھ تھراوا کا ہے اور وہ ترقی پسند تحریک کے نظریہ سازوں میں نمایاں ترقی۔ خود لا حقیقت پسند ہونے کے باوجود کسی بہت بڑے دعوے کے ساتھ ادب کی طرف نہیں آئے، ”مستاروں کی مٹھل“ (محررہ) بشیر ہمدانی کے لیے افسانہ نگاروں کے وقت انہوں نے اپنی افسانہ نگاری سے متعلق لکھا تھا

”ترقی پسند ہوں لیکن میرا پسند نہیں جنسی یا جسمانی بھوک، بیکاری یا کسی عزیز کی صحت کی وجہ سے ادیب نہیں بنانا۔ ادیب کے ذریعے اپنے قوی و انسانی فرائض سر اظہار ہو چکا ہوتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ ہم دھوں کو جھٹھونے کا ذریعہ ہے۔ مجھے وہ اس کے لیے لادھانی ادب لکھنے کی طرازی نہیں۔ میں اسی ایک تالیف کے لیے اپنے دھن عزیز کے اسی فیصلہ کن کادھ کے لیے لکھ رہا ہوں۔ دھن کالی اور دھن صحت ہے اور ادب اسی کے لکھ کا ایک ذریعہ۔“

شعبہ نگار نرالا سے آدرہ میں دو افسانوی مجموعے بعنوان ”جائے گھر“ بے زبان“ یا نگار ہیں۔ اس کے علاوہ ہندی اور انگریزی کی طرف چلے گئے اور زیادہ تر ناول نگاری کی۔ نرالا کی جڑیں اساطیر سے بڑی طرح جڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جس کے سبب افسانوی حقیقت احوال محض یک دلی حقیقت نگاری میں جلوہ گر نہیں ہوتا، اس میں علاقائی ایمان پیدا ہو جاتے ہیں۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ نرالا کی افسانوی تدبیر کاری کا جوہر ان کے مخصوص اسلوب سے درست ہے۔ انسانیت سے ہمدردی اور مطیع طبعانہ ان کی تحریروں کی پہچان ہے۔

نرالا کے افسانوں میں مضمونی تنوع اور بھائی چارے کی فضا بخدی خصوصیت تو چرخی حاصل ہے۔ ان کے شاہکار افسانے ”مکو بھیا“ اور ”بے زبان“ کے بیشتر افسانوں میں ان کرنے کا جذبہ بقوی یک جہتی کے احساس کے تحت رنگ و فعل نیز نظریے کے تقادس کو کم کرتا ہے۔ یوں شعبہ نگار نرالا کے افسانوی کردار بعد احسان کے بیشتر کہ قوی درشتے کے ہوشیار جاننا دکھائی دیتے ہیں۔



حوالہ

- ۱۔ ”لہذا“ ان، صد ۱۵ اپریل ۱۹۴۳ء
- ۲۔ ”نرالا کا سلیط“ طبع دوم مئی ۱۹۵۶ء

نفسیات کا ورود

(سینئر فاضل محمود، سعادۃ حسن منگول، پروفیسر افضل صدیقی، ممتاز مفتی، سینئر فاضل حسین،
محمد حسن مسکری، آغا بابہ رحمان، مذہب، دھان، فضل الرحمن)

"انکارے" کی اثنا عشر سے حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کو ترجیح ملی۔ احمد علی کا افسانوی مجموعہ "ٹھٹھے" ۱۹۳۳ء میں چھپ کر سامنے آیا، جس طرح جنس کے دائرہ کو انفرادی سطح سے اٹھا کر پورے سماج تک پھیلا دیا گیا۔ رشید جہاں کا افسانوی مجموعہ "عورت" اور احمد علی کا "ناری گلی" سامنے آئے۔ "انکارے" اور "ٹھٹھے" کے افسانے ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور مذہبی زندگی کے عجیب الغلظت شخصیات کو اس قدر چلی کیلیٹوں کو پیش کرتے ہیں۔

"پھر حصہ ہے کہ تم میرا ہوا کرواؤ۔" شرع میں چار بیویاں جائز ہیں۔"

("پدے کے چچھے" اور رشید جہاں افسانوں)

"صاحب اور سیم کو براہ دلی انٹینشن پر اسنے چیا کہ کھنے نہیں ہاتے۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گت منہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہارے ہندوستانی بھائی بھی آٹھیں چاڑھا کر کھتے رہتے ہیں کم بختوں کی آنکھیں نہیں پھوٹ جاتیں۔ ایک میرے سے کہنے لگا

"ڈرامہ بھی دکھاؤ" میں نے فوراً

"تو تم نے کیا نہیں دکھایا؟" کسی نے جھپٹا۔

"اٹھ اٹھ کر دو" میں اس سوؤں کو منہ دکھانے لگی تھی۔ "دلی بیوں! چھپنے لگا (تیرا دل کر)

"منہ ہے تو کچھ میں نہ تو کو"۔ ایک دم خاموشی چھا گئی۔

("دلی کی سیر" اور رشید جہاں سے افسانوں)

"انکارے" اور "ٹھٹھے" سے پہلے کا فرد انسان رفتہ رفتہ فکراور چننے کو Elevator کرنے کی طرف قدم بڑھا رہا تھا کہ احمد علی، محمود ظہیر، رشید جہاں اور محمود غفلت کے انسانوں نے مسلمانی فحری کی طرح ڈال دی۔ قدیم مسلمانی فحری داستانوں کا تریخ پانچواں حصہ اسے قبول کرنے کو

چند ہی جہتوں سے فلسفہ کی تعریف کا شرف حاصل ہوا۔ جس کے نتیجے میں منظر کے ہاں انسان کے انتظام پر حاکم اور جتنا ازمنہ سے ترقی یافتہ ہو، تب تک انسان کے انتظام پر ان کی صورت حالات سامنے لانے لگا۔

تنگنہ فراہم کے اثرات سواد اور ٹھیک روٹی میں عرصہ کا پٹ بنے۔ طبیعتی الجھنوں کے ضمن میں ابتدائی عام اہل علی، محمد صلی
عسکری، منلو، شیر و خفا، و غیرہ احمد، بصیرت چھٹی اور متعلق کے ہیں۔

جہری جنمو نے کہا تھا "تو جہاں کھواری لڑکوں کے لیے آدمی زندہ کی بند کتاب ہے۔" جب کہ اسی ایچ اے اے نے سنگھنے فراغیہ کے Spade work پر اتنا بن کو نکل جیسی حرکت کا ایک کرشمہ دکھا کر صورت اور مرد کی باہمی کلکشن کو خفا میں اندھا فرام کر دیا اور ادوا افسانے میں پہلی بار ہم جیسی کے موضوع پر صحت کا "خالف" اور عسکری کا "کاسٹن" سامنے آئے۔ "خالف" اور "خوف" (سجاعت حسن مفلو) "Ban" "کر دینے کے اور متاثر مفلو نے اس تسلسل میں کلی افسانے لکھے۔ "تو قی پند ادب" میں عزیز احمد نے کڑی تنقیدی اور انکرا والا دھرمین نے مفلو کا "لذت گیر الجھنیں" چھو کر نے والا کہا اور علی سردار جعفری نے "اسات" تو "کو ناماسب موضوع قرار دیا۔

۱۹۳۵ء کے حیدرآباد کونسل میں ایسے مجلس ائمہ کے خلاف قرارداد پیش کی گئی جس کی خود صاحبِ مدارت، حضرت مولائی اور کاشی بہادر انصاری نے شدید مخالفت کی۔ قرارداد پر نوبت سے بحث مباحثے کے بعد ترقی پسند مصلحین نے اپنے طور پر یہ فیصلہ دیا کہ عصمت چغتائی، منوچھر حسن عسکری اور قمر جاوید مجتہد رجعت پسند ہیں۔ اس لیے ان کا بائیکاٹ کیا جائے۔ بعد میں اس فہرست میں عزیز احمد کا نام بھی شامل ہو گیا۔ بعد میں انہوں نے صبر ۱۱۰ باب ("خیالات" کا دور، مملوہ کتب خانہ) ۱۹۳۸ء میں ترقی پسند مصلحین کی کانفرنس کے موقع پر ان پر دوبارہ ڈالا گیا کہ وہ متحدہ رہا لاء افسانہ نگاروں کے خلاف قرارداد پیش کریں اس وقت انہیں کے ٹیکر ٹری اتھرائل احمد نعیم قاسمی تھے۔ صبر ۱۱۰ باب نے خود اس قرارداد کی مخالفت کی، قرارداد کی حمایت کرنے والوں میں سرکردہ نام احمد نعیم قاسمی کا تھا۔ احمد نعیم قاسمی نے رسالہ "سیر" میں اپنے مضمون سے اور طرزِ اعتبار کو رد کیا اور ان افسانوں کے بارے میں لکھا کہ یہ ٹی ٹی کو ترجیح دیتے ہیں۔ احمد نعیم قاسمی نے مجلہ "نون" میں بھی جس سے حلقہ افسانوں کو خارج کرنے سے بھڑک کر ج کہا۔

اور انہیں اور ملا جلا خبر پر الگیاں اچھی قمیص اور منہ اور عصمت پر مقصد سے چلے۔ منہ کے "لوت رنگ" میں ایسے افسانے لکھا ہیں جن پر قلم نگاری کے اثر میں مزید ۱۹۹۲ مقدمات قائم کیے گئے۔

مقول ہے کہ "ہر شے اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔" محمد حسن منگدری نے تالا کہ ابن العربی سے متعلق فرامیڈ نے نظریہ سازی کرتے وقت اس مقولہ کو بنیاد بنایا ہے۔ ابن العربی نے کہا "ہر جز اپنی کل کی طرف لوٹتا ہے" خدا نے آدم کو تخلیق کیا، آدم نے حوا کو اپنی اصل سے جدا کر کے، پھر حوا اس کی طرف راغب ہو گیا۔ یہ اس کی "کل" کی طرف۔ ابھی تھی، واضح ہوا کہ ابھی کا راستہ جس کے شواہد اب غلطے سے ہو کر لگتا ہے۔

ابن العربی نے معرفت حق کے خاوار کے حوالے سے حضرت اور یس کی مثال دی۔ کہ وہ بستان پہنا اور آفتاب کی گھوڑا پر آ رہا ہوا۔ حضرت اور یس اس پر سوار ہوئے، یہ ایسا عمل تھا جس سے ان کی خواہشات نفسانی اپنے اعتقاد کو کونچیں۔ ابن العربی نے کہا یہ معرفت حق میں زوال کی گھڑی تھی، وہ جو کہ خواہشات فطم ہو جانے سے معرفت حق میں کمی واقع ہو گئی۔ چنا کہ ہم اپنی نفسانی خواہشات کے حوالے سے بھی اپنی استقامت کے "تور" نکال کے قابل بن سکتے ہیں۔

اوپر کا دوسرا (مختل اور مشورہ) کا نکات کو سمجھنے کی صلاحیت، اور نیچا دوسرا (جنس کے متعلقہ) اور دونوں فعال حالتوں میں اہم ایک ہو کر

”پورے آدمی“ کو تکمیل دیتے ہیں۔ یہ ”پورا آدمی“ حقیقت کی ضرورت ہے۔ بقول سیم احمد عورت بھی پورا آدمی بنتی ہے اور خوش منظر کا فن پارا بھی۔ یعنی معاشرہ اس کے انسانوں میں ”پورا آدمی“، خال خال ہی نظر آتا ہے کبھی کبھی اس کا دھڑل حال ملاحظہ میں ہے اور کبھی کبھی بچلے بچلے جذباتی کرشمہ سازیاں۔ منگو جیسے کامیاب غرض نگار کے پاس اس تفرقے کے کئی درج ہیں ایک طرف تو اس کے پاس غرضی سرخوشی کا شکار و فساد گنہ گری اور گناہ میں ڈوبا ہوا ہے۔ (مثال اس کے کرداروں میں دال، ہدکا، عورتیں مرد کو دوسری طرف ایڑھ تلک کا یا لٹھ ہیں) (مثالیں خطا گوشت۔ ہالچو) یا فطری طور پر بھی خال خال نہیں اور اس کی وہ معاشرے کی بکھر رہی ہیں۔ مثال ”ڈرپنگ“۔

پورا آدمی جہاں جہاں ظاہر ہوا ہے وہاں قردوں بھی لازوال انسانوں نے جنم لیا ہے۔ اس ڈیل میں سعادت سن منگو کے افسانے ”کھول دو“، ”لو“، ”دھوس“، ”کالی شلوار“، ”مٹاؤ مٹتی کے“، ”بھلی بھلی آنکھیں“ اور ”ماٹھے کا تلی“ چاروں فنکاروں کے ”نرینی“ اور ”ہالچو“۔ صحت چٹائی کا ”مٹل“ بچہ اور رحمان غائب کا ”تلی چان“ مثالی اور افسانے ہیں۔

”انکارے“، ”شٹے“، ”کوز“، ”عورت“ سے ہوتا ہوا انکار افسانہ نگاری کے برابر شے میں جنس کی کرشمہ سازیاں کا جائزہ پیش کر رہا ہے۔ محمد حسن عسکری صحت اور بیدی نے عورت کے جنسی جذبہ کی اطمینان اور ہاتھ پیچ کر بچیں۔ مسلمانہ ہندو معاشرے میں جنسی تحن کو نمایاں کیا۔ منگو نے بیانی جذبات کی تصویر نگاری کی اور مو پاساں کی طرف اس کا پندہ، موضوع ”عورت کی تنہا“ ”رہاؤ عواطف میں“ مٹاؤ اور نہایت کی تلاش۔ عسکری اور مٹتی نے براہ راست جنسی غنیمت کی طرف رجوع کر کے جنسی کرداروں کے اداکاری کی حرکات کا غنوں غنوں نظر سے جائزہ لیا اور مزید احمد نے غنہ بیزی کی طرز نگارش میں جنس کے تحریری پردوں کو اٹھا (مثالیں ”غیر ناک“ ”گڈ ڈی“ ”کوز“ ”موتی“ ”اور“ ”موتی“ احمد کے پاس جنسی لذت کوئی کاغذین اعزاز اور بیان کی ایمانیت قابل توجہ ہے۔

جس طرح عسکری، منگو، مٹتی، صحت اور رحمان فضل الرحمن کے پاس انسان کی جنسی حیثیت بنیادی اہمیت کی حامل ہے، چپا آنہ بار اور رحمان غائب کے پاس انسانی جنس کے حوالے سے معاشرت کا مطالعہ خصوصاً اجتماعی نگاہ ہے۔

محمد حسن عسکری نے لے لے لے کن بات کہہ دی تھی کہ

”گندی سے گندی بات اچھا ادب سن سکتی ہے مگر جلیست سے منسوب ہو کر بڑا ادب بھی انہیں کہہ سکتا۔“

نور احمد افسانے پر مو پاساں اور مختلف کے اثرات اور جامعہ درجانات کی صورت میں ظاہر ہوئے اور افسانے کی بلوغت کے ابتدائی چند سالوں میں ہی منگو اور احمد عسکری کی صورت دہلایاں دیوں میں ڈھل گئے۔ مو پاساں کے کردار عروج بندشوں کے خوف لڑنے والے گھسٹ کھائے ہوئے کردار ہیں۔ یہ دور سے مختص، برا بھلا، غمناک اور دھم دھم ادب ہوئے اور غنوں کے انہوں نے بیانی جذبات کا اظہار کیا۔ اس ضمن میں Irony کی طرز صورت مثال Necklace ہے اور اس ریتا کی مثال منگو کا ”المانڈ“ ”ہنگ“۔

سعادت حسن منٹو اپنی اجداد اور اقدار اور کثیر الجمہات تجربے کے باعث اپنے بعد آنے والوں خصوصاً بانیہ سے تحقیق انسان نگاروں کے لیے موضوع اور تہذیب نگاری کی سطح پر اسکا گاتہ قلم کر گیا۔ جہاں تک اس کا اپنا معاملہ ہے تو اس نے جنس نگاری کے حوالے سے اپنی دنیا محدود تر کر لی تھی اور اس میدان میں بھی اس کے پاس عالمی سطح کے بڑے جنس نگاروں کی طرز کا گہرا غنہ اور ایک خال خال جھک دکھاتا ہے۔

منگو نے اپنی اس کی کو چوب ڈھائی کے چٹارے کے ذریعے پر کرنے کی کوشش کی۔ جس سے بات گہری رحمت کو سچنے کی بجائے پنکھوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس ضمن میں منگو کا اپنا بیان ملاحظہ ہو

”محقق و محنت کے متعلق سوچنا ہوں تو صرف شہوانیت ہی نظر آتی ہے۔ عورت کو شہوت سے الگ کر کے میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ بھڑکی ایک صورت رہ جاتی ہے۔ مگر یہ ٹھیک بات نہیں۔ میں جانتا ہوں، نہیں میں جانتا چاہتا ہوں کہ بھڑا خرکیا ہے؟ کیا ہونا چاہیے؟ اگر یہ نہیں تو بھڑا اور کیا ہوگا۔ لیکن میں عورتوں کے بارے میں واقف سے کہہ کر بھی تو نہیں سکتا۔ مجھے ان سے ملنے کا اتفاق ہی کہاں ہوا ہے۔ عورت کا وہ تصور جو ہم لوگ، بچے، بالغ میں قائم کرتے ہیں ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ کس قدر افسوس ناک چیز ہے کہ عورتوں کے مسائل سے ہو کر بھی ہم ان کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ محنت سے اپنے جگہ پر عورتوں کو ہم سے ملنے کے لیے روکے؟“

(”منظر کے خطوط“، حامد احمد علی قاسمی، عرب، احمد علی قاسمی سے انجمن اس)

منظر کے ہاں موضوعات کے تنوع کے باوجود بھیجی کی شہری فضا سے متعلق ”موذیل“ اور ”باؤگرونی ناٹھو“، چپکے سے متعلق ”کالی شلوار“، ٹھیک آدھی سے متعلق ”چاقا قانون“، تقسیم سے متعلق ”خوبیہ ٹیک سٹو“ اور ”مکمل اوز“ اور ساتھ ساتھ سے متعلق ”خضرا گوشت“، مکمل سات ساتھ کار افسانے لکھتے ہیں۔ منظر کی اس ناکامی کا باعث ہمارے سماجی اور اخلاقی ماحول سے متعلق ان کا انتہائی دور ہے کہ چونکاؤ سے واقف رہے۔ (مثلاً لیں ”سرمد“ اور ”مسواک“) جو بعض اوقات پختہ اختراعات کے قاری Shock پتیا ہے۔ جس کے نتیجے میں قاری منظر کی تخلیق کردہ ناقابل یقین عناصر سے پیدا کردہ نفسی گورہ کر دیتا ہے اور چونکہ منظر Shock پتیا نے لے پر ہے اس لیے تدبیر کاری اور یوں پر گرفت آتی مضبوط اندر نہ کی جڑیں دال کے افسانہ نگار سے متعلق ہوتی ہے۔ یوں منظر بعض بغامت پستہ و پندش پر پختہ ہند کی مثال ہے۔

محمد حسن عسکری اول و آخر افسانہ نگار تھے، یہاں تک کہ ان کے تنقیدی عمل میں بھی افسانہ نگار عسکری کا چرچہ لکھے اور چونکہ وہ اعلیٰ ایک ذریعہ لیکن طاقت و اثر کی طرح جاری و ساری رہا۔ افسانوں کا افسانہ نگار عسکری نے کبھی کر دیا۔ یہ انداز دینا کا سب سے بڑا اثراتی عمل ہے۔

محمد حسن عسکری نے مکمل دو افسانوی مجموعے ”تراجم“ اور ”قیامت ہرکات آئے خدائے“ یادگار چھوڑے ہیں اور ان کے تقریباً تمام افسانوی کردار اپنے کردار پیش سے خاص طرح کی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ بے ادبی ہر کے قصصوں، جذباتی یا فکری اختلافات سے کہیں بڑھ کر لکھ پاتی الجھنوں کے باعث ہے اور اس نوع میں خاص طرح کی نفس کیفیت محمد حسن عسکری کے افسانوں کا موضوعاتی اور یوں افسانوی تدبیر کاری کے اعتبار سے محمد حسن عسکری شعور کی رو کا ایک ہی کوہ سے آشا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس نوع میں وہ جو اس کی طرح نمایاں ہیں جبکہ ہر اس کی نسبت عسکری کی تدبیر کاری مختلف ہے۔ محمد حسن عسکری نے عقلیت اور عقلیت کی مطیع شعور کی رو رہتی ہے۔ (مثلاً لیں ”مغربی ہادی“، ”مطبوعہ 1941ء“، ”جائے کی چٹائی“، ”مطبوعہ مارچ 1942ء“، ”اولیٰ دنیا“)۔

شعور کی رو اور عقلیت کی چھ پرکاری کے عقل عسکری کے ہاں اپنی وضع کی کردار نگاری نے غم لیا، جس کی مثالیں ”کالچ سے گھر تک“، ”پچھلن“، ”جائے کی چٹائی“ اور ”قیامت ہرکات آئے خدائے“ کے کردار ہیں۔

بلند شعور کا لینڈ اسکیپ عسکری کے ہاں بالکل انجمن حلوں سے آیا ہے جیسے صحت پختائی کے ہاں کھنڈا ہل کر دھو کر گھر آ گئے۔ عمل طور پر کہا جاسکتا ہے کہ محمد حسن عسکری کی تخلیق اور لینڈ اسکیپ ان کے عقلی عکس افسانوں کے لیے زیادہ سوہ مند ثابت ہوئے جبکہ سماجی شعور کے حوالے سے ان کے عکس افسانے بھی خاصے کی چیز ہیں۔

محرمی محرمی کے افسانوی گھوڑوں "آزیر" اور "قیامت ہرکاپ آئے نہ آئے" کے افسانوں کو ترقی یافتہ ناقدین نے فحش طور پر لکھنے کا اعتراف کیا۔ خوف اور ڈاکے احساس کو افسانوں کی بنیادی روح کیا اور سب کو فحش سمجھتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسا محرمی کے موضوعات اور توجہ کاری بھی ہے۔ کیا یہی تھا کہ افسانے کے بارے میں دیا جاسکتا ہے؟

ممتاز مفتی نے سنگھنہ قراڑا، اکثر سٹیکل کوئی تھپیاتی، الجھنوں کے ساتھ ملا کر قراڑا کیا اور اپنے افسانوں کو شعوری، حقائق اور توجہ کی بنیاد پر لکھنے کے اعتراف کا ویلہ دیا اور جس میں بعض اوقات ممتاز مفتی کا طنز اور سخی دھڑکنے کے ساتھ اور غیر محرمی کے ساتھ اور محرمی کی طرح حقیقی نفس کا تجربہ ہی کیا، لیکن وہ تو بالی سٹیج پر شہرہ مند نگار کے ہیں بھی اور حلائی۔ ایچ۔ آر۔ نے اور "گستاخا کچھ" میں اس فرائیڈ کے Spade Work پر انہیں کو اکثر حقائق پر محض نفسی محرک کا ایک کرشمہ ثابت کیا گیا۔ زندگی کی "قریب" اور "پناہ" میں اس طرح کی حقیقی آسانی سے حقائق کی جانکتی ہیں اور ممتاز مفتی کے اس نوع کے افسانے "گستاخ" کے الجھانے "بچے" کے دلی تجربے ہیں۔

ممتاز مفتی کے بیشتر افسانے کردار ہیں اور محرمی یا صحت چھائی کے شعور افسانوں کی طرح ان کے افسانوں کی بنیاد کوئی نہ کوئی نفسیاتی الجھاوا ہے جبکہ اس خصوص میں ممتاز مفتی کی الگ پہچان، نوجوان پنہلوں کی پینٹل ہے۔

ممتاز مفتی کے افسانوں میں دو طرح کے کردار ہیں، ایک تو وہ جو مفتی کے ایام جوانی کی یاد تازہ کرتے ہیں جیسے "آپ" اور "اسرار" کے کردار اور دوسرے وہ جو آج کے عہد سے حقیقی ہیں جیسے "روشنی پتلے" اور "آدھے چہرے" کے کردار۔ جبکہ آخری دور کے افسانوں میں مفتی نے اردو میں ہندی کی آمیزش والے دور میں ہر افسانوں میں سطحوں کی متابعت سے بچتے زبانوں کے عجب کرداروں کو بھی اپنے افسانوں میں جکھڑی ہے۔

ممتاز مفتی نے اپنے ابتدائی افسانوں میں سماجی تجزیہ نگاری کی بنا کر کردار سٹیج پر لا شعور اور حقیقی نفس کا طریق کار پر توجہ دینی سبب ہے کہ وہ اسے اچھال یا فحش کے کردار سنگھنہ قراڑا کی کہیں ستر پر کی طرح لا شعور کی بھولی بھولی میں بٹکتے ہوئے سر میں رکھتی رہے۔ جبکہ نگار ایسا نہیں ہوا۔ ممتاز مفتی نے زیادہ اترا اکثر سٹیکل سے لیا، نیز ممتاز مفتی نے اپنے طویل حقیقی سفر میں تبدیل ہوتے ہوئے حالات کا تجربہ، چہ نہ وہ کیا اور سماجی محرکات کے شعور کا ثبوت فراہم کیا۔ انہوں نے اس وقت کے ناقدین نے مفتی سے حقیقی رائے قائم کرنے میں صرف "بھلی بھلی آنکھیں" سے "آپ" تک کے مطالعہ کو بنیاد دیا۔

ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری کا دوسرا دور "روشنی پتلے" سے "آدھے چہرے" تک کا دور ہے، جس میں اس نوع کی سماجی حقیقت نگاری مفتی نے بے تحاشہ کے بغیر ترقی پسند مطالعات نگاروں کا مقصد بھی نہیں رہی۔ جبکہ ممتاز مفتی کے بیشتر دور کے افسانے خصوصاً "اسرار" "پنکٹ" کاڑی، "نوکھلا ہوا موسم مفتی"، "گندہ بلی مفتی" "ان پورنی" اور "ایمان آپ میں آپ" بیکسے ان کے حال افسانے ہیں۔

ممتاز مفتی بنیادی طور پر حیا کے آدمی ہیں اور زبان کے جادو سحر کا اجماع مفتی کے ہاں شروع سے ہی رکھائی دیتا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ جلد ستر بیدی کی طرح ممتاز مفتی کو بھی اردو زبان کہنے کا مادہ نہیں تھا، سو شعوری کوشش کرنا پڑی۔ کامل مفتی اس شعوری کوشش میں حیا کے بھولے یا غور نہ کھتے اور ایک بھولے نہ کھتے۔

ممتاز مفتی کے آخری دور کے افسانوں کی مثال باگل دینی ہی ہے جیسے ہر گز چاند بھڑکی کی جانب سفر اور اپنے ہر راہگیر اور کردار کی کہنے کے لیے کیوں کو پھیلانے کا جن (بادل کی طرف) راہ راہ چاند ستر بیدی کا مجموعہ "اپنے دکھ بچھو دے" اور "کوشش چندرا" "پناہ از مر"

قرہ اےلمیں عید کے دن ترکی اب کے متقی محلے کے ساتھ اچھی چڑوں کی ٹائلز اور مین مینٹری کی 35 سالہ بی تہائی کا احداثہ انور علی عورت اور خدیجہ، اکتاہہ جومر کی کی فلفلفہ اور سہرکاشن کی کامیاب مثالیں ہیں۔

سید فیاض محمود نے بیگزراف اور ذہنی معائنہ کے طرز پر کار کا ایک نئی تجربہ کارنی میں دیا حالانکہ وہ چاروں مجید و مقہور افسانہ کی نفسی نگاہ سے ایک ناکام عمل تھا۔ ان کی کہانیوں کو سبکی ماننا ہے جو روت کے اندر ہی اندر چھپی ہیں اور ان کی قلم میں داخل جاتی ہیں۔ اس کی ناکامیوں میں فیاض محمود کے در افسانے "کام چہ" اور "انٹ کے ایک بندے" نمایاں ہیں۔ انکے اس تجربہ کارنی کا نقشہ اول سید فیاض محمود کا اولین افسانہ "زیر بیدار" (مطبوعہ "نوائس" 1933ء) ہے۔

[illegible]

آدابہر کے افسانوں میں خدائی کیفیت اور مخصوص طور پر فنی و طریقت کو مخصوص لایمیت حاصل ہے اور ان قصوں میں بھی ادب اور فنی کے عناصر سے معاشرت کا مطالعہ آدابہر کی پہچان بنا۔

1947ء کے قرارداد سے متعلق اپنا مشہور افسانہ ”کنوا“ قلمیے کے بعد آغا جابر کی معتبر پہچان اور پھر عمر مرحوم کی نفسی کیفیت کا بیان ہے۔ جس کو مشہور شاعر ”باقی“ ایچا اور ”خالد“ بیچیا لکھتے ہیں۔ چٹائی کی زندگی اور تیسری جنس کے حوالے سے انہوں نے زندگی کے ناچنے والے کو بے حد تپ تپا ہے جو پہچانو سے فیصلہ انگوٹوں کی نگاہوں سے اور کھل سی رہتے ہیں اور اس حوالے سے ”کتاب دین“ چٹائی میں ان ”کنوا“ کے نکلنے کا اظہار کر رہے ہیں۔ آغا جابر سے متعلق یہ بات یقیناً حیران کن سی رہتی ہے کہ اتنے وسیع تجربات رکھنے اور پختہ زندگی گزارنے کے باوجود آغا جابر کی انسانی لکھائی کا مرکز نگار و بیٹھ بیٹھ اور متفرق مشغلہ اور سماج کا محدود ترین طبقہ۔ ان لکھن اس میں قلم نہیں کھتا آغا جابر نے اس قدر Selective کرنے کا حق نہیں ادا کیا۔

نصیحت کے متعلق اللہ نے انھوں میں روحانی لحاظ کی نمایاں پہچان تیسری جنس اور جنسی ہے، دایرہ کی سے متعلق اللہ نے طرازی ہے۔
 انہوں نے اپنے انسانوں کو پیش قدمی کے امور کے لیے ہی قصور سے متعلق آہدہ میں، خصوصاً سوانح حیات کے متعلق جبرور کی دلچسپی، نگاہوں کی
 فی (کی) کو دیکھ کر انھوں نے ان کے بار بار دہرے سے نوازی کے متعلق ماحول سے چٹا ہے۔

انسانِ مذہب کے لئے لوگوں میں جتنے بھی جہاد ہے اور چلا دیا جائے ہے، وہ سب کے سب ان کے دوسرے مشاہدے میں رہتے ہیں اور اس کا شہر بھی ان کی ہی رائے کی نظر رکھتا ہے۔ یہ سب کی سب کی چیزوں سے ہی ان کی نظر میں ان کی رائے میں ان کی رائے سے ہے۔ ان کے لئے ان کی رائے کی نظر رکھنا ہے۔ ان کے لئے ان کی رائے کی نظر رکھنا ہے۔ ان کے لئے ان کی رائے کی نظر رکھنا ہے۔

رحمان خذیب کا مکمل چہرہ کاتبوں نے تیسری جنس، اچھے کرانے والی عورت اور شہوت میں بھٹکتے ہوئے اطراؤ کی نفسی کھلیات کو تھامتہر جڑی ت اور پچھلی پس منظر کے ساتھ اپنے افسانوں میں کشیدہ کا جتن کیا ہے۔ اطراؤ اسیان طراں، رحمان خذیب اپنے پسندیدہ لینڈ اسکیپ (خصوصاً لکھنؤ کی ریختب انچنگل) پر بھونٹا بھیل نہیں کیلتے۔ بڑی بازی دکاتے ہیں جس کے طفیل ان کا تھارن دکھوے۔ طراں تک اور تھامشیں کے علاوہ لکھنؤ، پانچ تھیت، جیسے تھارش، وٹے اور سلیڈ کچن وٹس میں ان لکھنؤ کے کارندوں کی حقیقت تک پہنچتا ہے۔ اس خصوص میں رحمان خذیب کے

سانس لینے ہوئے جنگل کی ایک جھلک ملاحظہ کیجئے

”تو کہاں آں جہ“ آواز بھرتا کی۔

دھکیانے ”بیرے رام گوری بولے۔“ کہتے ہوئے چاروں طرف دیکھ۔ گائے دکھائی تو دی نہیں لیکن رام کیانے اپنی چری طاقت سے پکارا ”گوری ہو گوری۔“

جواب آیا ”تو کہاں آں جہ“

اور پھر بارش سے تیرتی ہوئی گائے نکلی۔ رام کیانے پھر پکارا وہ اس کی طرف بڑھتی ہوئی جاگتی لیکن وہرے سے ایک اور آواز آئی۔

”اوماں آں جہ“

بارش کی آواز سے چھڑنے کی آواز تھی۔ گائے اس کی آواز کی طرف محو مچ گئی۔ دھکیا کا کھنسا سہلی چیلنے لگا۔ وہ رات گھر رونے اور بچکیاں لینے سے جھک چکی تھی۔ پھر بھی اپنی سکت بھر چاتی۔

”گوری ہو گوری۔“

”ارے گوری ارے آئے جا۔“

”اسنے دے مہا تا چیں آوے۔“

”گوری ہو گوری۔“

”گوری مہا آئے جاری۔“

لیکن گوری نے دشا نہ دیا۔ البتہ وہ چار دھند سرگھا کر دم کیپا کی طرف دیکھا۔ ارا کر بولی اور دھری تیرتی چلی گئی بدھرے چھڑنے کی آواز آ رہی تھی۔“

(”گوری ہو گوری“ سے اکتھاس)

سید رفیق حسینی کے ان راجھوتانہ کے دیگر ارے مخلص انسانوں میں جنگل سانس لینا ہوا محسوس ہوتا ہے اور جانوروں کی انسیات سے حلقہ یی انسانے اردو ادب میں ایک انوکھا تجربہ شمار ہوتے ہیں۔

سید رفیق حسینی نے جنگل کے قانون کا بھرپور مطالعہ کیا ہے اور خود جنگل کی زندگی کو سہا ہے۔ سبکی وہرے کہ وہ جنگلی جانوروں (شیرلی، کتے، نسل نسل، اگلی، بدھ، گھوڑی اور ہاشمی) کی سیرت کو اس حسن اور خوبی کے ساتھ رقم کر پائے ہیں جو محفل شکار یا تہہ پہ گھسنے والوں کے نصیب میں نہیں۔

مفتوحہ بینڈ انکیپ کے انسانوں میں ایوان فضل صدیقی اور ذہان فضل الرحمن نے بالخصوص ہاگمیر وارانہ لکھیا ہے اور تھان کی عکاسی کی ہے اور اس ان دونوں انسان نگاروں کے انسانوں میں قرن ہاقون کی سماجی عوامل سے مرعوب شدہ متہذیبی اقتدار کی باز پخت اردو انسانے میں ایک Unique Approach ہے۔

ذہان فضل الرحمن اور ایوان فضل صدیقی کے پاس سبہ اختیار ہندوؤں (شد پھتھن اور شد پھتھن) کی عکاسی کے باوجود تھیں۔ بیانیہ

لخت لخت آوازیں

(نعام مہاس، کویتر، چاند پری، قندرت احمد شاہ، شکیل الرحمن)

روشنی نے جس نقشہ کشی کی کہ ان لوگوں میں سلطان میراجوش کے تین افسانے "طوب وخیال"، "پانچویں" اور "عشق آواز" ہیں۔
انے بعد افسانہ نگاری کا "راز" سمجھا "سوتے آواز" اور "نفس حق تو جنتی کے بیشتر افسانوں میں نقش کشی کی کرداروں کو ٹی دی۔ لیکن یہاں تک
کے افسانوں میں حراف سے زیادہ نظر لگایا ہے۔

اور وہ آپ میں کلی دلا، موزی، عظیم جیک چٹائی اور شکستہ نوئی نے۔ لیکن کی طرف سے آپ پر قبضہ لگانے کا عرصہ یہ آگیا اور
یہاں سے وہ صحت مند لے گئے۔

یہ قبضہ اسکی کائنات میں امن کی جتنی کا نہیں رہا ہے۔ عظیم جیک دلا موزی اور شکستہ قنادی کے ہیں یہ قبضہ اس وقت سے کمر
توجہ دیتا۔ تاہم جب وہ اس کی بنیاد پر نہ لگی زندگی سے اٹھتے ہیں۔ ان تینوں افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں جوی ہے، بھائی بھائی
اور پرتا شاکر کی گوار کی دعا پر ہیں۔

عظیم جیک چٹائی نے زندگی کی تاحیروں سے علامتوں کی طرح آواز لی تھی۔ اس کی طراوت، خصوصیت طرح کی فضا بندی، تیز واقعاتی
استوار سے جیت کی حامل ہے۔ شاید "فسانہ" (نورجی کی مصیبت) کی مقبولیت نے عظیم جیک کو یہ دیکھ لیا اور اس افسانوں کے پانچ مجموعے
اس سلسلے میں آئے۔ "آواز" "نغمہ کوکار" "روح غمراہ" "علاقہ" اور "مضامین چٹائی" (جس میں 32 مضامین کے علاوہ افسانے
بھی شامل تھے) عظیم جیک کا نثریہ افسانہ "مہارانی کا طوب" ہے۔ مگر کی بے شک فضا کی تخلیق میں تو ان کو چنے کی مثال دلا موزی کی
تحریر میں خوب دینی اور رفتہ رفتہ طراوت پر پہنچنے کے کاروبار کر دیتا کو کھلی۔ زبان کے دور سے کے سلسلے میں شکستہ قنادی نے دلا
موزی اور عظیم جیک چٹائی کی آوازیت کوئی ترکیب جیتا۔ اسے کویتر کی کے مخصوص لگوں سے آواز کر دیا۔ شکستہ قنادی کا اولین افسانہ "مضامین
چٹائی" تھا اور نثریہ افسانے "افسانہ"، "آواز" اور "پانچویں"۔ "شکیل الرحمن" کے افسانوں کی تخلیق چلا پرتا اور "آواز" چٹائی
لغت افسانوں کی روایت میں ایک مثال ہے۔

اُردو افسانہ آ زادی کے بعد

(گزشتہ صفحہ پر شایع احمد قرطبی، امین حیدر، محمد خالد اختر، ایچ کدرا، اختر، انشکار، حسین اور بانو قدسیہ)

انسانی ہول کی تصویر کاری نے عالمی ادب کو بے پناہ شہ کا روپ دے دیا۔ اُردو افسانے کا ایک اہم سوز ۱۹۴۷ء کے فسادات ہیں جنہیں اس حد پہلا زندگی کی طو زحی، درد کی اور گناہ کی برص کی محسوس تھ اصل انہاری پر رنگ سے زیادہ دیکھیں۔ گج گوس میں لی گئی تصویر کا نام افسانہ نہیں، سہارا کھیل تخلیق عمل کی پھیل کا ہے۔ پھر فسادات کے بارے "ترقی پسند فارمولہ" بدلتی اور سطحی افسانوں میں افسانے کا باعث بنا۔ اس مصلحت کوئی کی مثالیں۔

گرمی چند (چندورا یکہ چرلیں)، احمد شمیم قاسمی (چرلی)، فرید احمد عباس (انجام) اور ممتاز مطلق (گھوڑا نہ صرا) جیسے قزیاں ناموں کے ادا نگار مل جاتی ہیں۔

۱۹۴۷ء کے فسادات اور زوال (حاکم) (۱۹۷۱ء) سے مطلق دو طرح کے افسانے بنے ہیں۔ پہلی قسم وہ جہاں "ڈاکٹر ڈوڈا" کی طرح فرد بھیا تک ہول میں گھرا ہوا ہے، اس کا کوئی عمل اپنا نہیں۔ حالات کا ربط اسے جہاں چاہے سمجھتا ہوا اپنے ساتھ بھالے جائے۔ وسیع تر انسانی ہول کی شدت خود ہی رہے۔ منٹو کے "افسانے" "خط کوشت" اور "شرطیں" احمد شمیم قاسمی (چمچر گتھ) (اشفاق احمد) (گڈرہا) (بیات) اور انصاری (شکر گزرا) تھیں۔ (منٹو کے چلے پاؤں) کے افسانے اس اعلیٰ میں نمایاں ہیں۔

برص کے خاتمے پر متحرقہ افراد کی کہانیاں سامنے آئیں۔ یہ تمام کردار اپنے اپنے طور پر بچے ہیں لیکن حالات اور وقت نے انہیں جھوٹا ثابت کر دیا ہے۔ منٹو کا "کھول دو" اور "تھوڑے تھوڑے" چند رنگ بھو کا "گوجلی" اور قدوس اللہ شہاب کا "اور عائشہ آگیا" اس اعلیٰ میں محدود مثالیں ہیں۔ بالآخر فسادات کرداروں کی پھیل میں اکثر افسانہ نگار ہتھ پا تھ کا شکار ہوئے اور آخر میں آتے آتے افسانے کے ایسے انجام کی نسبت صحت چھٹائی (گوراما "دھانی پانگھیں") کی Wishful Thinking ظاہر ہوتی اور افسانہ بگڑ گیا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کے اثراتی دور کے خاتمے کے بعد بہت حد تک فسادات افسانے کا سوسٹرا بنے رہے۔ افسانہ کے اس رواں میں منظر میں انکار حسین کا نام سب سے اہم ہے، جس کی پھیل مثال افسانہ "ہندوستان سے ایک خط" ہے۔ انکار حسین کے اس نوع کے

میں قردار میں حیدر، اشتقاق احمد، محمد خالد اختر، نگر نگر، دکن، ہاؤزنگ، اور پھر دارم جیسے سات اچھے فنکار مصروف تھے۔

اس سلسلے سے ان میں سب سے نمایاں نام انکار حسین کا ہے جسے ”بلی جلا وطن“ کہا گیا۔ اور عظیم کے خیال کے مطابق یہ جلا وطن اس ”میں“ کو تلاش کرتے ہیں، شہر میں ہے جو تھوڑے عرصے میں، ماضی کی کسی اندھی گلی میں نمودار کیا۔

انکار حسین کی یہ جھلک جھگوڑوں ”نکری“ اور ”گلی کوپے“ سے ہوتی ہوئی ”ظہر افسوس“ اور ”بکھوے“ کے اہل لوگوں، یہاں تک کہ تازہ ترین افسانے ”بلی جلا وطن“ تک چلی آئی ہے۔

برصغیر کے مسافر لوگوں کو زوال، سماج کے ساتھ دوسری بار ہجرت کا سامنا کرنا پڑا جب انکار حسین نے اسی تخیل میں چہرہ اترتے ہوئے اپنے کئی پہلے افسانوں کو ”ظہر افسوس“ میں یکجا کیا اور انہیں نئے معانی سے دوچار کر دیا۔ ہجرت کے خالے سے انکار حسین کے ہاں نرملہ نہایت ہی آسانی سے آسانی ہے۔ انکار حسین نے ایک زمانے میں اس سے پہلے رام محل، گڑھ چاقو، اور رونا رونا ”آفری آفری“ کی سب سے اچھی اور ترقی کی کی طرف آئے تھے لیکن اب وہاں سے واپس بڑی شہرہ کے ساتھ ہوئی ہے جس کی مثالیں ”ظہر افسوس“ کے افسانوں کے ہر ”بکھوے“ اور ”آہنی“ جیسے تازہ ترین افسانے ہیں۔

انکار حسین کے چند افسانے ابتداً قلم طرز احساس سے جاری ناکوں سے لیے، اور اب یہ نہیں۔ کچھ ماضی قویہ کے اوجھل ہیں۔ ”بکھوے“ شاید انکار حسین افسانے ہزار گشت کا اس جگہ سے نہیں ”ہاں“ میں تصوف کے پاپا اور جی جی مشہور و معروف، مستقبل کی پاپا افسانہ سے خصوصاً اہمیت کے حامل ہیں۔ اس لیے جس سے خیال میں شاید انکار حسین کے بارے میں سب سے بڑے آدمی کا بیان مستقر ہے۔

محمد باقی نے اس ”بلی جلا وطن“ کو تاریخ کے دھارے سے خود کو کاٹ لینے کا جتن کیا ہے۔ لیکن ابھی اچانک جی نے اس کی ہوتی میں جس سے انکار حسین کتنے ہی سزاؤں کو کٹش کے بارے میں انہیں کہتے۔ نہیں، تاریخ کی طرف بچے کوٹ کر ہانچتا ہے، اور انکار حسین کو کہہ دیتی ہیں کہ وہ کچھ کچھ کرتے ہیں۔

انکار حسین نے بہت پہلے سوال اٹھایا تھا ”ادبی جزیں کہاں ہیں؟“ اس زمیں کے ساتھ یہ اڑیٹو کہا ہے۔

”ظہر افسوس“ اور بعد کے افسانوں میں یہی سوال دہرایا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انکار حسین ماضی اور حال میں جو اختیار کیا ہے مختلف حوالے نہیں کرتا۔ انکار حسین چوری چوری نہ ماضی کا ہے، بلکہ ماضی کو لوگوں کے لیے ماضی ہوتا ہے، اور اسے حاضر ماضی کا ہے۔ ”وٹے“ حال اور ماضی میں فرق کے حافضے سے مراد ہوتے ہیں، لیکن ماضی کا تو ہمیشہ ہٹنے کی تلاش میں ہے۔ اسے زندگی کی رو سے کوئی خاص جگہ نہیں ملتی، بلکہ ماضی میں جو دردیں جاتی ہیں ان کا خیال ضرور کرتا ہے۔ یہی ماضی کی غور زنی اور اسطوریاتی تصور انکار حسین کی ہی ہے۔ اس کے ہاں اسطوریاتی تصور کے معرظ کے ساتھ ماضی کی غور زنی کو نکری اور نکری پس منظر کی کام بھی دیا گیا ہے۔ انکار حسین کے افسانے ہر سہ ماہی کے ادبی آسانی سے انہیں کیا جاسکتے ہیں۔ یہ ماضی کا سب سے اہم حصہ انکار حسین کے افسانے سے نہیں زیادہ اہم افسانے کے لئے ہیں۔ یہ بھی درست کہ افسانہ اور ماضی کے ماضی میں قدر، ڈھنگ اور زبان میں تبدیلی ہو کر سامنے آئے افسانے ماضی، اور انکار حسین انکار حسین میں اس قدر تبدیلی نہیں آئی تھی، لیکن انکار حسین ان تبدیلیوں کا عمل شعور رکھتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انکار حسین

بر زمانے میں موجود معروضی صورت حال کا تجزیہ کرنا چاہا آیا ہے۔ افسانہ ”دوسرا راستہ“ ایوب خانی عہد کے سیاسی تجربہ اور پستی کے احساسات کو لے کر لکھا گیا ہے، ”شہزادہ الحرم“ عرب امرائیں حوالے سے خاناں ہے اور ”خیمہ“ نواب زادہ کا ایک طویل صورت حال کا۔

انتظار حسین نے ”دوسرا راستہ“ کے معاشرتی حوالے سے افسانے کے سوا سلاطین، سیاسی پھیلاؤ کے سپرد کر دیے ہیں۔ معروضاتی اور اسلوبیاتی سطح پر بھی وہ مقام ہے جہاں سے انتظار حسین اور افسانے کے پیش منظر میں داخل ہوتے ہیں۔

”لگتا ہے کوئی جھوٹ ہے“ لکھ کر لڑنے اعلان کیا۔

”بادشاہ! اپنے اپنے سرانجام کر لو۔“

جو جو آدمی گردن کاٹے یا بددیکھ رہا تھا۔ اس نے گردن اندر کر لی۔ سب اس طرح سڑکست لگے جیسے پہلی جن لگے ہیں۔

(”دوسرا راستہ“ اور انتظار حسین سے اقتباس)

اس کی علامت یہاں تاریخی اجتماعی زندگی کا رنگ اور قدرت حسین کرتی ہے اور انسانی عمل جیتے جاگتے سماج سے آنکھیں نیچا لینے کا ”خیمہ پش“ اعلان۔ انتظار حسین نے ایسے میں ملوث کی آخری سچائی پر افسانوی جدوجہد کو پہنچا کر ادا کیا ہے۔ مثلاً ”خیمہ پش“ اور ”آخری آدمی“ جیسے افسانے ہیں۔ جس انتظار حسین کے ہاں بھی قومی تشخص سوائے عروسی کے احساس کے ہرگز نہیں رہا۔ اس نکتے پر انتظار حسین اور غرض منظر کے تہہ افسانہ کا ایک ہی نتیجہ پر پہنچا رہے ہیں۔

قرآن مجید کے اولین نمونے ”ستاروں سے آگے“ میں خصوصاً بورڈا طبقے کی نوخیز لڑکی کے خواب بچے کے ہیں، اے معنی منظمیں اور اے معنی مصروفیات۔ ”شیشے کے گھر میں“ میں بھی لڑکی بچہ کوئی تک پہنچتی ہے۔ ”ستاروں سے آگے“ کے افسانوں میں اس زمانے کا بعدوستان اور پھل کا قتلہ کوئی نہیں دیتا۔ اس لیے کہ ان افسانوں میں موضوع کی سطح پر بالائی طبقے کی مظلوموں میں بالکل اخلو موضوع بحث ہے۔ اور اس اور آسکر اندلڈ کی محوم ہے۔ اور درمیان کھلنے والی اور بڑی کی مظلوموں میں اگلے ہوتے بورڈا کی کردار۔ یہاں کی اپنی پیشکش ہے

نواب زادہ کا اس اور نڈل کھان کی عورت کی پیشکش کے برعکس یہ قرآن مجید کی خاص صفا ہے۔ ان کا افسانہ ”کاویں“ نڈل اور بورڈا وائس کی کرداروں کا کامیاب ترین عکاس کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید کا ایک اہم مفروضہ انداز تصور ہے اور تاریخ کے گہرے مطالعے نے ان کے فکری افق کو کھلا بخشی ہے۔ یوں مشرقی تہذیب کا دھار اور وسطی تمدن کا کھلے ان کے افقوں میں بہاؤں طرح تغلیظ کیا جاتا ہے۔ ایک کو دوسرے رنگ سے جدا کر کے دیکھا جاتا نہیں جاسکتا۔ رنگوں کے اس المیہ کے اوج سے حسیاتی تاثر کی وسعت نے علم لیا ہے اور جس کی خواہش صورت قرآن مجید میں ”فصل گل آئی یا جل آئی“، ”یہ داغ داغ کہاں“ اور افسانہ ”سر رہا ہے“ کا آغاز ہے۔ جہز جی اور تاریخی شعور کی ابتداء کی مثالوں میں ”جب عرواق گزر دیا“ اور آپ بیتی کے رنگ میں ”وہ چہ چہ چہ چہ چہ“ اور ”کشمکش لینڈ“ بہت نمایاں ہیں۔

اشفاق احمد کے افسانوں کا موضوع خاص جذباتی سطح پر انسان کی تکیہ و ہیبت ہے۔ جس کا سب سے بڑا اسباب جذبی ہیبت یا جذبی نفرت کے تصورات ہیں۔ چاہے جانے کے جذبات کا تصور (خصوصاً حسیاتی سطح پر اس جذبات کی موضوع صورتیں) اشفاق احمد کے ہاں اس کے لکھنے

افسانوں خصوصاً ”گمزدیا“ ”اچلے پھول“ اور ”قصہ غلہ بختی“ میں ظاہر ہوا ہے۔ بجز ایک واقعہ کا حوالہ (افسانہ ”حقیقت بخت“) اور قصوں کی جانب میلان (افسانہ ”بائوس بختی“ اور ”قصہ غلہ“) اصطلاحی امور کے ہاں پائیز کی اور فخر کی نشاندہی کرتا ہے۔ دوسری طرف اخلاقی امور نے ”روحیت“ جیسے شہید جنسی حیثیت کے افسانے بھی رقم بند کیے ہیں۔ ان کے نظریہ اور مزاجیہ افسانوں میں خاص نوع کی گہرائی پائی جاتی ہے (مثلاً ”سپا سام کے دلہن میں“ اور ”بند روگ“)۔ ان افسانوں میں مصنف احمد نے تیسری دنیا کی سیاسی اور سماجی کی روشنیوں سے مکمل کرکے دیکھ دیا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات سے متعلق اصطلاحی امور کا افسانہ ”گمزدیا“ اردو کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔

محمد خالد اختر کا نام ان کے دور افسانوی کرداروں میں مبداء الہامی اور بچھے بچھاری کی معرفت اردو افسانے کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔ فطرتی اثرات کے مستفاد ہونے کے بعد اردو افسانہ ایک خاص نوع کی استقامت کا مظاہر ہو چکا تھا اور یہی اس مرحلے پر محمد خالد اختر نے اسے نہ صرف سنبھالا دیا بلکہ اس کی افواہ میں گھسیں سے گھسیں بکھپا دیا۔

ان کے بیشتر افسانے کرداری ہیں اور ان کرداروں کی شخصی اور اجتماعی زندگی کا مضمون سامنے آتے ہیں۔ محمد خالد اختر نے اپنے ان کرداری افسانوں کی معرفت انسانی ذات کی گہرائی میں گھسی ہوئی مسئلہ فیزی کا مکمل بحر صحتی کے ساتھ بے نقاب کیا ہے اور اس ضمن میں بچا مبداء الہامی اور بچھے بچھاری سے افسانوں کے علاوہ افسانہ ”لاٹھیں“ کے مسما کی سبب دینی بکھپا دیا۔ ”گمزدیا“ کے کردار اور ”تھیں“ کے کردار غریب محمد کی کردار نگاری اور جواب کی جاسکتی ہے۔

محمد خالد اختر کے اس منفرد طرز اختیار کی سبائی لائن ایک دھت مشرق اور مغرب کے بہترین ادیب سے جڑی ہوئی ہے۔ جس کے نتیجہ میں محمد خالد اختر اپنے آدھ کو افسانے کے فنی سے مقصود ہونے کا موقع فراہم نہیں کرتے بلکہ افسانے کے جڑا حکم اور میں ہر جہتی مصروف رہتے ہیں۔

کرنا رنگ دھنک نے اردو افسانے کو خیال اور طرز اختیار خصوصاً بات کرنے کے چھکے انداز سے چڑکی اور نہانیں دیا۔ دھنک کے افسانوں میں علامت اور استعارے کے دربارے کے باوجود ابلاغ کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا اور یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں۔

کرنا رنگ دھنک کے افسانوں کی امتیازی خصوصیت کردار کے بجائے پائے کی تصویر پر خصوصی توجہ کا رہا۔ ان سے دیکھ ان کے چہرہ موضوعات کی نوعیت کرداری شخصی کیفیات کی عکاسی کی متقاضی ہے اور دھنک اس کیفیت کو اپنا کر کرنے کے لیے واقعہ کی مختلف النوع تزیین کی جو تیز و تہجد صرف کر کے مظلوم پائے کا حاصل کر لیتے ہیں۔

معمول کے دنوں میں رنگت غیر معمولی کمزوریاں فرد کی زندگی کا حکام ٹپک کر دیتے ہیں۔ یہ انسانی دانشور اور ادبی دانشور کا کیا دھرا ہے۔ بعض اوقات ہم یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ ماضی قریب سے بیٹے ہوئے حالات میں خود کرداری غیر معمولی حرکات کے محرکات کیا تھا۔ کرنا رنگ دھنک کے ہاں ایسی کیفیات کا بیان کرتے ہوئے محرکات کے طور پر نتائج کا حوالہ اور دھنک کا سنا ایک یا منفرد آجک وضع کرتا ہے۔

”بھری عادت ہے سڑک پر پلٹے وقت میں آنکھیں میچے کے چل ہوں۔ اس روز نہ معلوم کیا ہو؟“ میں یاد کرنے کے بعد کوئے والے مکان کے قریب سے گزرتے ہوئے غیر ارادی طور پر بھری نظر سامنے گیت پر جا چکی۔ گیت سے شین بچوں والی سانگل چلا تا ہوا ایک بچہ نکلا۔ نیلی آنکھیں، سٹروے بال۔ بچہ ہوا نکلا اور کسی کے ہاتھ آئے جو کہ گیت بند کرنے لگے اور گیت دہیے گا دیا دیا دیا ہی نکلا رہ گیا۔ فطرتی

ہوتی، لکھیں، کوئی کوئی، سرخ سر میں مسکراہٹ، دھن نہیں چوسے ہر دانت مچھتا کے دانے، بچکے بچکے لڑتے ہوئے گویا ایک لمبے کے لمبے، رک ہائے کو کہہ رہے ہیں۔“

(”اسٹارڈاز کرکارنگنگل سے اقتباس“)

یہ معمول کے دلوں میں لیے معمولی کلمات ہیں۔ ان کے بعد بگڑت، ساری، نکات جیسے اس ایک لمبے کے زیر اثر چلی جاتی ہے۔ افسانے میں اعلیٰ نے ان کلمات کو ایک موزوں کرتی صورت حال میں بھی غیر معمولی گزراں Recall کرتی ہیں اور یوں افسانہ بچہ دانا، بکس کرتے ہوئے ایک نہ تھوہوئے والی کہانی بن جاتا ہے۔ جس کے کردار بدل سکتے ہیں، معاشرتی اور معاشی صورتحال بدل سکتی ہے، لیکن وہ غیر معمولی گزراں اپنی تبدیلیوں کی قوت رکھتی ہے۔ ”سٹارڈاز کرکارنگل کے ہر اس نغمہ کی مثالیں ان کے مشہور افسانوی مجموعہ ”کک کرن پائرنی کی“ میں پتہ لگانا مشکل نہ رہتی ہیں۔

یہ نقطہ یہی شہرت کا آغاز ان کے مشہور افسانہ ”تھو“ سے ہوا اور جب سے اب تک ان کے افسانوں میں مرد اور عورت کے معاشرتی، روحانی و جسمانی روابط نہ کی کر دیکھ لینے آئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے عورت کی آدھی دنیا کو جس طرح اپنے افسانوں میں سمیٹا ہے یہ انہی کا حق ہے۔

یہ نقطہ یہ کہ افسانوں میں ان کی اور اپنی اقتدار کا تضاد اور رسوم و رواج کی پھڑپھڑاؤں، ازدواجی زندگی کی پیچیدگیوں کے ساتھ کچھ اس طرح مرد اور عورت ہیں کہ انہیں ایک ایسے خانوں میں دانت کرکٹیں، ایک جاگلن۔ اس ضمن میں ان کا شاہکار افسانہ ”عزیزت اداسی“ ہے۔

دعوتِ آخر کی افسانوی ترقی بھری میں ”شعور کی دھڑ“ کا استثنائی طور خاص قیاس طلب ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ ”سیت اور اٹا“ ہے۔ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں میں تنقید اور مصلحت کی سطح شعور کی روایتی قہمی، جس کی زد میں اولین مثال محمد حسن ثکری کے ”افسانوں“ ”عمر بہانی“ (۱۹۶۱ء) اور ”پہلے کی بچائی“ (۱۹۶۲ء) میں دیکھنے کو ملتی تھیں۔ ”دعوتِ آخر“ کے ”افسانوں“ ”عمر و گھر“ اور ”کالیٹی“ نے شہرت پائی۔



”دعوتِ آخر“ کے ”گھر و گھر“ ایک یہاں تک پہنچا کہ ۱۹۶۷ء میں ایک مجدد نامہ ہوا اور دوسرے مجدد نے ختم کیا لیکن 8 جنوری ۱۹۶۵ء، جب فیصلہ مخصوصاً پاکستانی افسانہ نگاروں کے لیے یہ مسند چڑا تھا کہ ان کے ”پاکستان“ کہتے ہیں، کیسے نہ کیوں کر اپنے شعور کا حصہ بنائیں، شاہ جہاں انھار حسین پر درایت دہی قہمی اور ہر چھوٹے تھے۔ پاکستان کی صورت میں ختم لکھی والی سہ ماہی سے ہماری لیٹی لکھی دیکھو، اداسی قہمی شاہ جہاں کے لیے ۶ جنوری ۱۹۶۵ء تک کے اردو ادب نے جس اس مرقی کی جگہ، بالغ نہ ہو پائی۔

اس کے باوجود، افسانہ نگاروں کا افسانوی مجموعہ ”دھن“ ”کک کرن پائرنی“ کا افسانوی مجموعہ ”تھو اور اٹا“ ”عمر و گھر“ میں ”دعوتِ آخر“ کی ”کک کرن پائرنی“ اور ”اسٹارڈاز کرکارنگل“ کا ”آخری خدائی“ اس روحانی، ارادت کے کوہِ خضر ہے۔

مجھے وہ زمانہ ہے جب جیشِ براء اعلیٰ امام، مسعود اشعر اور ذیہ العابدین اپنے افغانوں میں بنگالی کے ہاتھوں کا علاج چاہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ محسوس کے رنگ، برصِ احمقان کے درجے اور ہوس کی سرگوشیوں کا کچھ رہے تھے۔ اپنے میں شتم اور ستم نے کڑی ہوئی صورتِ صاف کا تجزیہ دینی دشتوں اور معاشی نامواریوں کے حوالے سے کیا تھا جبکہ افسانہ "چلوچھا" تکہ آتے آتے اس میں بود شرفی یا ستم کی آواز نے والی نسلوں کے بہت مستقبل کی تلاش میں چمکتے ہوئے قلم اور سحر اور شہاد کا سرانی کے سر اور اپنے ہی ملک میں جہاد وطن کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ افسانہ دار نے اس صورتِ حالات کی غنیمت اذنی قلمی افسانہ "یہ کتاب کنای" جیسے افسانے تھوڑی اور طریق میں پھر پھر پھا کی جی سوت کا انداز و ادب ڈھاکا کا سبب بنا۔

ان سب افسانہ نگاروں کے کام کو دیکھیں تو ان میں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سب لوگ انگار زمین کے بے Seed Work کر رہے تھے۔ انگار زمین کے "کوہ جو کھوئے گئے"، "نہید" اور "شہر انیسویں" تھوڑے ہی میدان میں بنا گیا۔

پاکستانی افسانے کی سطح پر نروال ڈھاکا تک آتے آتے ہماری جگہ میں کچھ نہیں آیا کہ مرزا مین یا ستان یا جہاد ستان، ان کی مختلف طرح قوتیں اور پہلی مساکل پر اپنے شعور کی گرفت کیسے مضبوط کریں۔ اس نے نہ تو خود سے ساتھ پاکستان میں از سر نو اپنی ریلنگ کے سوال نے سر اٹھایا۔ اپنی جڑوں کی تلاش شروع ہوئی۔

"زمین سے ہمارا رشتہ" یا ہے "بہت پہلے انگار زمین اور قدامتین میں رہنے پر سوال اٹھا رہا تھا۔ اب نے ہم سے اس سوال کا جواب بہت آسان ہی نہیں مسئلہ یہ درجی تھا کہ خدا سے میں کب کون سے کچھ روحانی نوعیت کے سوا رہے تھے۔ پرانے افکار اور نظریات کی بنیادیں مل رہی تھیں۔

یہ اسکی روحانی وادارہ ہے جو جیشِ بھڑکے افسانہ نگار کو ہوتا ہوا میرت تک نے آئی۔

پچھلے حوالہ دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ گزشتہ ایک صدی میں اردو افسانہ نگار "صوفیوں اور مجاہدین کے درمیان کھینچا دانی میں جد جہد سے اس" گیا۔ سماجی سطح پر "صوفیوں نے دور دورہ اور سیاسی معاشی ہندو جہد کے تحت مجاہدین بنے۔ یہ بہت لمبا اور صعبے میں میں افسانہ نگار "صوفی و دشمن" دشمن "جنس اور افسانہ نگار "صوفی و دشمن" مخالف عداوتی میں مصروف رہا۔ بیسویں صدی عیسوی میں سامانہ اور سفر کے دونوں کا افسانہ نگار ہوتا ہوا میرت سے ہوا اور اپنی افسانہ کے سفر پر نگار "صوفی و دشمن" میں اپنے مطالعہ سے تھے اور اپنے خواب۔ افسانوی قلمی سفر میں نے رہنا افسانہ نگار کی ترقی کا رہی۔ اس طرح جی سطح پر جہاد اور انگار کا افسانہ نگار اس عظیم تر روحانی اور فکری وادارہ کا نتیجہ ہے جو اس کا جس منظر میں ہی اور سو شرفی مساکل کا افسانہ نگار بنے۔



حوالہ

۱۔ "مومن" "کھلی گات" "کراچی" "ماہنامہ جی۔ پی۔ پی۔

اُردو افسانے کا نیا لحن

انسر بھدر پرکاش، جو گندہ پال، طرہاٹ احمد کڈی، انور بھلا، بطراج حسن، راہ خاندہ حسین،
غٹا پلا، رشید احمد، بطراج کول، اسد محمد خاں، سر لا خاندہ بیگم)

1958ء تک کا اُردو افسانہ مختلف النوع سیاسی، سماجی، لبرل اور آخر نیکوں کے اثر و اثر و بالبع میں اس کے بعد یہ کئی خاص رجحان یا تحریک کا پابند کھائی نہیں دیتا۔ اب افسانہ نگاروں کے اندر انوکھی کام کو اہمیت حاصل ہوئی۔

وجودیت، ہمارے اعلیٰ عہد کا فلسفہ ہے، جسے اختیار کی فکر بورژوا سوسائٹی کی عطا کہنا چاہیے۔ باطنی میں پائلن نے سائنس کے بارے میں جتنا غمناک شاعری لکھی، کیا تو وہ اب سچ ثابت ہونے لگے تھے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے جہاں انسان کو مختلف سوچیں بخشیں، وہیں انسان کو خوار و مجبور ہونے کے باوجود پہچانی اور محسوساتی سطح پر وفا کی کرب کا سرخیل بھی بنا دیا۔ فرد تنہا رہ گیا۔

یہ تھا انسان اپنے امکانات اور روحانی دنیا کے درمیان گم سم ہے۔ مستقبل غیر واضح ہے اس سے سوال جنم لیتا ہے۔ یہ بالکل ویدائی تھیں یہ ہیراناگاب کے ہاں آخر آتا ہے۔ ایک جذبہ کی شکست کے بعد ہی صورتحال کو دیکھ کر سوال کا سیدہ والی بنات۔ نے بھی ظہور کیا۔
نئی رگیں اور مجدد تھیں افسانہ جس کی تمنا تھی، اندر انوکھی سطح پر بھی ہے اور اندہ میں بھی۔ یہ عجیبائی جذبہ باقی اور فکری دونوں سطحوں پر ہے۔

اس اہم سوز پر افسانوی اکیلا سر بھدر پرکاش، انور بھلا، جو گندہ پال، طرہاٹ احمد کڈی، بطراج حسن، راہ خاندہ حسین، غٹا پلا، رشید احمد اور اسد محمد خاں کی معرفت، حاست، سرخیل ازم، تجربہ اور استعداد سازی کے حوالے سے تکنیکی سطح پر علامتی بھلا اور سے دہائی سے متبادل ہو۔

یوں پیش منظر کے افسانے میں بھرپور اظہار کی خاطر "میں" اور ہے نام کردار Persona کے طور پر ابھر کر رہی نظر اور وہ اس میں منظر کے افسانے سے الگ، اعتباری سطح پر اپنی پہچان کرنا ہے۔ "میں" اندر انوکھی اظہار کا کاروبار ہے اس طرح آج کا افسانہ منظر کے اندر انوکھی پہلے دیکھنے سے مختلف اعتباری صورتوں سے سامنے آتا ہے۔ یہ صورت حال ہے جہاں کہیں اس وقت میں جاتی ہے وہ منظر کے چند افسانہ نگار اپنے طور پر کھینچتے کسی سیاسی فکر ہے سے اور انسانی کے باوجود افسانہ کیسے وقت اس اندر ہے کا فکر نہیں ہوتے۔ ان کی بہترین تخلیقات میں ان کا

سیاسی عقیدہ ایک زہریلی لہری صورت ہر دم رواں رہتا ہے اور یہ لوگ کمال احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے قادر مولا خدایہ کا رویہ سے بچی جاتے ہیں۔ بہت سے ممکن ہے یہ ترقی پسند تحریک کے دہلے کی پیدا کردہ صورت حال ہے جو سیاسی سطح پر جبری مطاع لگن ہوتا ہے کہ آج کے افسانہ نگار کا زاد یہ نظر اور اسلوب، خود بخود ان فضا میں ضرور تجر بات کا اظہار بنا ہے۔

پیش منظر کا افسانہ Economy of Expression کا افسانہ ہے جو انسانی اظہارات کے درمیانی ناپ کر داروں خصوصاً چمکرو اور، کسان، مریاں، محروم، دکھائیں، بین اور خواہش سے اوپر اٹھ کر فطری وجود کے ساتھ انسانی باطن کا نزول اظہار ہے۔

سرچند پرکاش کی افسانہ کا آغاز ۱۹۴۴ء میں افسانہ "دو پتا" کی تخلیق کے ساتھ ہوا، لیکن ان کی مستقل پہچان ۱۹۵۵ء اور ۱۹۷۰ء کے عشرے میں "ادب لطیف" کا دور، "مسات رنگ" "ذرا بڑی اور" "شب خون"، "ان آیاد میں شائع ہونے والے افسانوں سے بنی۔ سرچند پرکاش کے اجتماعی فلسفہ کے حوالے سے لکھے گئے افسانے ہندوستانی کلچر اور اجتماعی انسانی ذہنیت کی تشکیل اور تعمیر کے باب میں خصوصی طور پر توجہ طلب ہیں۔ جبکہ سرچند پرکاش کا بنیادی موضوع انسانی باطن کا اندرونی اجازتیں اور وراثی کا شوق احساس ہے۔ یہ بنیادی احساس سرچند پرکاش کے کرداروں کو چاہے چاہے محفوظ بننے میں سرگرداں رکھتا ہے۔ اس کیفیت کے اظہار کے لیے سرچند پرکاش کے موسم شوق ہیں، انداز ہوا نہیں اور بے کنار پانی کی جھلریں۔ جائے حافیت کے طور پر آسب زدہ گھر اٹھتا ہے جس میں چمکیرا ہے اور آتش دان میں ملتی ہوئی ککڑیاں۔ سرچند پرکاش نے اپنے ہونے وقت کے حوالے کو تجزیہ کی تدبیر کا رویہ کے تحت اپنے بس میں کر لیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا تہذیبی اور تاریخی شعور انگریزی اور آوازوں کے Disturb ہونے پر بھی ایک خاص قسم کی باورانی کیفیت پر قرار دیتا ہے۔ مثال کے طور پر افسانہ "ہموڑ اہوا خیر" کے ربط سے ان شخصیات کی Grad سرخوش صورت حال اور بیخوابی میں سرخوشی اور اجتماعی لاشوں کا پھیلنا زیادہ اہم ایک ہو کر بھی اعلیت کو قائم نہیں دیتے۔ "دوسرے آدمی کا ذرا تنگ دہم گور" "ہنگل سے کافی ہوئی ککڑیاں" "میں عدلی کی علامت انسانی زندگی کی علامت ہے جو قوتوں سے رواں رواں ہے۔

"یہ بے پائیا ہے کہ کئی کتا کہتے ہیں کہ میں گھر میں رہتا ہوں اس کے بڑے چڑا ہے پر گھٹے مصلوب کر دیا جائے اور میری لاش کو ہی تابوت میں رکھ کر اس پر میرا ایم دلا دت لکھ کر کدی میں پھینک دیا جائے تاکہ کتہ وہ چمکیرا جبری ضرورت چنے سے اس وقت کے لوگ مجھے سب فو اہل مصلوب کر لیں۔"

وہوں افسانے یقین اور حافیت کی اجتماعی زہری لہروں سے تشکیل پاتے ہیں اور ان میں اور انیت کا احساس سرچند پرکاش کے پائندہ تہذیبی اور تاریخی شعور کا پیرا کر رہا ہے۔

سرچند پرکاش کے افسانوں میں انھوں کی سب سے شہرہ منسوبیت کے پیچھے ایک اور جہان سانس لے رہا ہے جس میں داستان کی ہی واقعیت اور قصے کہانی کی ہی کشش ہے۔ افسانہ "تپتی ڈال" بھابھہ اہم کے غم روشن اور نیم تاریک جھل جھل دھندلے میں لینا ہوا ہے لیکن اس علامت کی جڑیں بہت دور تک نکلی ہوئی ہیں۔ "تپتی ڈال" کی علامت بھولک حالت کے "Waiting For Godol" کے مرکزی کردار "گورڈ" کی یاد دلاتی ہے۔ اسی طرح سرچند پرکاش کا افسانہ "دوسرے آدمی کا ذرا تنگ دہم گورڈ" کے اندرونی اجازتیں، وراثی اور ضعف کا زندہ استعارہ ہے۔

سرچند پرکاش کے دیگر نامکندہ افسانوں میں "نکولا"، "بازگشتی"، "روئے کی آواز" اور "مظہورہ المرحوم" سب سے افسانوں میں

ماہرین کا ایک مکمل گٹھا۔ ماہر فرما رہے ہیں کہ قہر فراہمی اپنا حقیقی معنیٰ ہی نہیں رکھتا ہے۔

جو گنہگار پانی کی اولین شہرست افسانوی مجموعہ ”حشری کا کال“ سے حلقہ دے رہی ہے جس میں قہر کا روی کی سطح پر، اعلیٰ خود نگاہی کا طریقہ کار اپنی مکمل جھلک دکھاتا ہے۔ رفتہ رفتہ قہر کا روی ان کی نمایاں پیچیدگی کی (تمایاں مثلاً ”پاتال“ اور ”پاہر کا آ دی“) اور جو گنہگار پانی کے افسانوں کا مرکزی کردار ”میں“ موضوع افسانوی بینک وائن سے مختلف اظہاری صورت کے ساتھ لایا۔ ایسے میں افسانوی کی عمومی تعداد ہی، تناسل کا مسئلہ اور یکسر ہوا کا زمین جو گنہگار پانی کے کا درگاہ اختیار رہے ہیں، جبکہ ”Other Self“ اور ”Self“ کے بارے میں فکری ارتکاز جو گنہگار پانی کا موضوع خاص ہے۔

جو گنہگار پانی کردار کو درخت کے گہرے گہری نفسیاتی بصیرت کے ساتھ سماجی اور ثقافتی مسائل کے الجھناؤ۔ فلسفیانہ سطح پر درخ کرتا ہے۔ نتیجہ۔ میں کرتے ہوئے فرد کا نفسی اور اخلاقی تجزیہ ”روحانی پناہ“ ہے۔ لیکن ایسے افسانے کھینچتے وقت جو گنہگار پانی نے ہیئت ابداع کے مسئلہ کو سراٹھاتے ہوئے محسوس کیا۔ انھیں اپنی روش کھینچتے ہوئے بھی غیر ترتیب یافتہ قاری کی الجھنوں کا احساس جتنا جا رہا ہے۔

مکمل ایک افسانے ”پادریست“ کی ایک طویل بریکٹ ملاحظہ ہو،

”میں اپنے آپ سے دھڑکے کھینچنے بیٹھا ہوں کہ میری یہ کہانی بڑی شریف ہوگی، اتنی شریف کہ ہر ایک کی سمجھ میں ہوں آسانی سے آ جائے جیسے کوئی غیر شریف (عورت؟) کہا، جھجک کر کسی کے پرانے بیٹ اور میں، کہ گنہگار جو ہر کسی کا الجھنا پناہ میں جا رہی ہے۔“

افسانہ کھینچتے ہوئے یہ بے تکلفی کسی دوسرے افسانہ نگار کے ہاں نہیں ملتی۔ مثال دیکھیے

”کچھ جناب۔۔۔ جناب! کہانی کا رنگ وہی خوب گھبراہٹ ہے اور اپنے ٹکس کے میں مطابق دکھائی دینے لگی ہے۔ عورت کا عورت پناہ کہانی کا کہانی پناہ۔۔۔ میری اس بھولی بھائی کہانی نے میری اواز کو زور دیا ہے کہ میری نظروں سے بڑی ہے۔ یا کوئی منجلا دے دیکھنے پر گل ہی جائے تو آٹھ گھنٹیں بد کر کے اپنی تو جی کی جھلک سے دیکھ سکے۔“

اس خصوص میں ”لیکھیں“ ”پادریست“ اور ”پناہ“ کے افسانے خصوصی طور پر بہت نمایاں ہیں۔

جو گنہگار پانی نے افسانہ ”رہائی“ کے ایک داخلی موڑ کو گہرے میں اظہار کی پائیداری اور اسلوب کے گنجینوں کو موضوع بنا دیا۔

”سنو افسانہ، سنو خیالات زندگی کے سوائے سب کی راجیں ہم پر کیاں بند کر دی ہیں۔ ہم نے اپنی اپنی جان کی چڑی کھیل کر اپنی رہائی کا یہ اقتدار کیا ہے۔ آؤ اس کنز کی دلو سے نکل جائیں، آؤ جلدی کرو۔ پائیداری زندگی ہمارا انتخاب کر رہی ہے۔“

(”رہائی“ سے اقتباس)

اور اس کے بعد جو گنہگار پانی نے اپنی بیگانہ کے تمام حوالے یکسر بھلا کر اسلوب اور موضوع میں سے موضوع کا چٹا کیا۔ سب سے اب تک جو گنہگار پانی کے ہاں موضوع کو ادبیت حاصل ہے اور انہوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ ہر موضوع اپنا طرز اظہار ساتھ لے کر وارد ہوتا ہے۔

”سلوٹس“ کے افسانے ہی بولڈ اقدام کے طور پر ہیں۔

غیاث احمد گدڑی کی اولین بیگانہ افسانہ ”سائے اور سائے“ (”مطبوعہ“ ”سویا“ لاہور) ہے۔ آ کے چلی کر اس نوع کے افسانوں میں لادہ ماس اور سیہ فیہ شخص گدڑ کے لئے بنے اثرات نے غیاث احمد گدڑی کے ہاں اسلوب اپنی سطح پر ایک خوبصورت توازن قائم کیا۔

”ہائوگ“ میں شامل پانچ افسانوں ”ہائوگ“، ”ڈورجی جون سین“، ”بصورت سیاہ صلیب“، ”بیای چڑیا“ اور ”صبح کا دامن“ کا تعلق انگریز ادیبین معاشرت سے ہے۔ شاہد اسی لیے جو نگار ہال نے لکھا ہے کہ ”ہائوگ“ کا مصنف ایک طویل مدت تک آرٹوں کے سامنے میں آنکھیں موندنے اپنی عبادت میں تھیں رہا اور پھر آرٹوں کی دوجہ راہ چلے گئے کہ اس پر آگرمی اور وہ اپنا کچھ کرانچ کرانچ کرانچ اور اس کا ذہن ”ناراضی“ کی سہ گائی سے چھپکے گا، جھک رہا ہے۔ افسانہ ”ناراضی“ غیبت احمد گدی کے فنی سڑکا پنا موڑ تھا اس کی یہ چھپاس دوسرے افسانوی گھوٹے ”پرندے بکونے والی گاڑی“ سے واضح ہوئی۔ اس کتاب میں شامل افسانوں خصوصاً ”پرندہ بکونے والی گاڑی“، ”ناراضی“، ”سین پانچ“ اور ”ناراضی“ میں سماجی حقیقت نگاری، نفسیاتی وجہ گہوں اور فکری دہراؤوں کا یہ سن خصوصاً طور پر قویہ طلب ہے اور افسانہ کے خلاف باطلان فکری گدی کے بانیہ کا انکار قائم

”دراصل اس روز ہم دونوں چپے ہوئے تھے۔ بکھرے معمول سے کچھ زیادہ سی پٹی گئے تھے۔ سبکی ہر چہ کی تھوڑے قدموں میں لرزوں، ہماری حرکات لحاظ سے ہوتی تھیں اور ہم باقی کر رہے تھے۔ چنانچہ شہر سے دور، آسٹین جانے والی راک کی ڈھلان بھی سی آئی، میرا دوست چارو، ہارڈ کراس گپتے اپنے پاؤں کے پاس پڑے ہوئے ڈھیلے کو اٹھایا اور سامنے بچ کی شاخ پر چھوٹے ہوئے امرو کا ٹکڑا لگا کر زور سے ڈھیلے کو پھینکا۔ زور دوں کی آواز اور جڑا سے امرو، ڈھیلے کی زد میں آ کر اڑ گیا۔

”کہاں گیا، اس کی ب“

”دیکھ، اس کی ب“ اس نے اڑا کر مجھے کے سامنے لایا۔ ”ناراضی“ سے قہقہہ لگا کر بٹھنے لگا۔

مجھ سے کہا ”بٹھ جاؤ۔“

میں نے کہا ”کہاں چلوں۔ بچے زمین ہی نہیں ہے۔“

(”ناراضی“ از غیبت احمد گدی سے اقتباس)

غیبت احمد گدی کے ہاں ایسی کہلیات کا جان کرتے ہوئے حرکات کے طور پر خارج کا ماحول اور باطن کا حلقہ ایک نیا اور مضمر آہنگ وضع کرتا ہے۔

انور سہا نے اپنے افسانوں میں، ہر سوئے گاتے ہوئے شری پر مہمانی کی ہے۔ سیاہی جڑ، مٹائی، مٹاؤاری کا احساس اور معاشرتی سطح پر زندگی کی حقیقت جہ خاص موضوعات ہیں، لیکن افسانوی تدبیر کاری کی سطح پر انور سہا اور طرانت میں مایوس ہی فرق ہے جو Elevation اور Sublime کرنے کا ہے۔

انور سہا کے لکھے کی کرنگلی ہوں پورن کی چیز ایچ سے ملتی ملتی ہے اور زبان کا اور سہا سہا کہ جیسے کوڑے برس رہے ہوں اور کمال اسز رہی ہو۔ یہ کیفیت اس نے ادب نگاری سے پیدا کی ہے۔ لیکن آخر اور خط کے ساتھ فانی ہے پناہ ایہ ادب کا استعمال انور سہا کی نگاہ کی نمایاں جگان ہے۔

پس تو انور سہا جتنی پختہ نگار کے افسانہ نگار ہیں لیکن ان کے بعض افسانوں میں لامعیت کا عطف ایک ذریعہ تحریر کی طرح رواں دھانی کی وجہ ہے، افسانہ ”سفر بھلا“ اس ذیل میں بہت نمایاں ہے۔ ہجرت کے شہرہ احساس کے تحت انور سہا کے افسانوی کردار زندگی کے مظاہر میں ملتا

کردہ اجزا کو کم اہم نہیں۔

طرائق میں را کے افسانوں بالخصوص "اعتروریت" کا اپنی ہی زمین میں سرگرداں، دوپٹا خوردہ خانے کھیلڑوں سے بھرا لاتعلقی مرکزی کردار زندگی سے اتنی مضبوطی کے ساتھ جڑا ہوا ہے کہ جب اس کی زندگی سے جرات کی کاغذخوات کے ہاتھوں اسٹیل چٹی ہے تو ایک عالم برپا ہو جاتا ہے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ کہ میں را کے کی افسانے موضوعاتی سطح پر یکساہیت کے حامل دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کا پلاٹ اسٹریکچر مختلف ہے۔ جیسے "دو" اور "مٹل"۔ پھر یہ کہ میں را کے کی افسانے اک ذوق کی قلم ہیں، جیسے "اعتروریت" اور "پروریت"۔ کپور بھٹی میریز کے افسانوں کو چھوڑ کر دیگر افسانوں میں کوئی یزید نہیں۔ عام قاری بھی ان کی قرأت سے جھکاؤں سکتا ہے جبکہ تربیت یافتہ قاری کے لیے ان افسانوں میں اس کے سوا بھی بہت کچھ ہے، جو تہہ در تہہ مٹوئی ایجاد کی پرسش کھنسنے سے ہی ہاتھ آئے گا۔

طرائق میں را کے افسانوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے قرأت کی سطح پر لطف اندوزی کے محدود اور درجہ منہم کو بچ دینا ضروری ہے۔ بطور خاص پیچیدہ تراشی کے حوالے سے میں را کا چنانچہ وہ نہیں جو ان کے پیش رو روحانی اور ترقی پسند افسانے کے زیر اثر وجود میں آیا، یزید میں را کے کپور کردار، جملوں کی تشکیل میں لفظوں کی افست ویرجناست ویرجناست ہوا گانہ ہے

"اور پھر میں نے دیکھا۔ میری جتنی ہوئی گمراہی میں ایک بچہ رہا تھا۔

اس کا نور و رنگ کوئی نشان نہ تھا۔

میں تھا، صوبہ قحطی، سرک قحطی اور بنگلی کا کھمبا تھا اور زندگی کے اس سوز پر اس لئے مجھے اٹھ کر نہ تھا۔ میں اٹھ کر نہ تھا۔"

("اس انساپ" سے اقتباس)

عورت کی دنیا کے ضمن میں بطور بنیادی لے کہا تھا کہ یہ خواتین کا وصف خاص ہے کہ ان کی ہڈیاتی دنیا نفسی اور ذاتی ماحول تک ہی محدود رہتی ہے اور ان نفسی اور ذاتی ماحولوں کا سلجھاوا بھی اپنے پھیلاؤ میں معرکے کی چیز ہے۔ لیکن پیش منظر کے افسانے میں یہ معرکہ کون ہا رہے گا؟ قراہمین معرکے بعد نئے منظر نامے میں یک وقت خاندان، حسین کا نام ہے۔

خاندان حسین کے ہاں صنف، نازک کا احساس عدم تحفظ بنیادی موضوع ہے جبکہ خوف، نفرت، لاپرواہی اور تکلیف عورت کا ازالہ سے مقدر۔

عالمی چنانچاں ایک کے بعد ایک، رو ہوئی پہلی جاتی ہیں، زندگی روتہ روتہ گزشتہ اقدار سے خالی ہوا جاتی ہے۔ عدم تحفظ کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے اور یہی خاندان حسین کے افسانوں کا بنیادی طرز احساس ہے۔ خاندان حسین کے ہاں خوف، نفرت، لاپرواہی اور تکلیف سر اٹھاتے ہیں۔ یہ سب اس کے باوجود ہے کہ خاندان حسین کے بیشتر افسانوں کا منظر نامہ درمیانے درجے کے گھریلو ماحول سے ترجیح پاتا ہے۔ جانے بچانے کے کردار، نازک اور تہہ کاری کے صیب تجربہ کی اور باورانی قضا بندی کرتے ہوئے (مثال، "سودا"، "ایک دیر رہا تو"، "پچھن" کا زندگی کے وسیع تر ماحول میں سوائے یزید میں را کے کی گھمبیل جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال باورانی کیفیت سے سرشار ہوتے وقت کے وسیع تر ماحول میں "ایک دیر رہا تو" ماحول کا استعارہ ہے۔ افسانے میں دھرتی کی جبرانی نے نیم کی جلی ہی کو لکھے جسم میں کڑھے ڈال

دیے ہیں۔ یہ افسانہ جھڑت کے تجربے، جبر کی انتہائی صورتوں اور آواز کی دواں مزلت کی تین برقیں لیے ہوئے ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ خالد، حسین کے دراصل سے مطلق افسانوں میں "سواری" کے بعد "ایک رہتا تھا" ان کا ناکندہ افسانہ ہے۔

"مجھے چاہیے دو۔" میں چارپائی سے اتر کر یہی کے قریب آن بیٹھا۔ وہاں بچے بکوا لگ رہے کر بیٹھ گئے۔ میں نے غور سے دیکھا۔ ان کے چہرے چھوٹے ہو سکے تھے اور انھیں جی۔ جی ہری لڑکی کی پشت پھری طرف تھی اور اس کے بال کر تک آئے تھے اس کی پشت بالوں پھری پھری کی کئی تھی۔"

("ایک رہتا تھا" سے اقتباس)

نوی محراب سے سے تقریباً پندرہ برس الگ رہنے کے بعد خالد، حسین کہیں زیادہ طاقت کے ساتھ دوبارہ ظاہر ہوئیں اور یکے بعد دیگرے "انڈی لینڈ" "پندرہ" "س" "پندرہ" "تکڑی" "بھیسے افسانے لکھ کر ایک بار پھر اردو افسانے کی پہلی نگار میں نمایاں ترقی کاٹی دیے انھیں۔ اب ان کے افسانوں میں تصوف کا رچا ہوا اور باغ صبری شعور ایک انوکھے فن میں داخل کیا ہے جس میں خدو راج افسانے کی مضمحل ہوتے ہے اور نہ شدت۔ زندگی کی پیچیدگیوں اور اس میں رونے سے جانے والی نفسی کیفیات پر خالد، حسین کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ قراء انھیں مید کے بعد پھر غریب کسی خاتون افسانہ نگار کے ہمنام نہیں آتی۔

خالد، حسین جی محراب کے افسانوں میں، وہاں فکری اور فطریاتی محاذ آرائی کی انتہائی صورتوں یا غلط فہمیاں جھڑت سے متعلقے میں ظاہر، سرکوشی، اور اردو کو مشکل پر زیادہ توجہ دی ہے۔ کچھ کچھ سب سے کہ اس کے پس کردہ ہی سب پر گہری بحث چھٹنے اور نگار کے کی تاب نہ لاتے ہوئے مضمحل ہو کر دوبارہ انھیں سچ لینے کی مصروف غرض اور کوشش دکھائی دیتی ہے (مثلاً "دھوپ دھوپ دھوپ"، "کھانا"، "راستے بند ہیں"، اور "پانی میں گمراہ پانی")۔

خالد، حسین کی افسانہ نگاری کا آغاز سیدھے سادے جیسا افسانے سے ہوا اور 1970ء کے آگے بڑھتے بڑھتے غلط فہمیاں، طاقت کی اور ترقی کا رویے کے تحت ان کے پس کردہ کے آشوب نے موضوعی سطح پر اہمیت حاصل کی۔ ان کے مضمحل افسانوی مجموعے "ہندوستانی میں جھڑت" (1975ء) کے اس افسانے خصوصاً "سواری کی تلاش"، "سناپ اور خوشبو" اور "تیر ہواں کھپا" اسی دور کی یادگار ہیں۔

1975ء کے بعد شاید ہونے والے افسانوی مجموعوں "ناس اور مٹی"، "خدا اللہ دعا" اور "وقت مسدود" میں خدو راج علامت نگاری سے متعلق اپنا ایک رنگ وضع کرنے میں کامیاب ہوئے۔ "راستے بند ہیں"، "ناس اور مٹی"، "پانی میں گمراہ پانی"، "بکری پکی قبریں" اور "کھانا" جیسے ناکندہ افسانوں میں ان کا خدو راج محراب عام دیہات سے مضمحل رہا ہے۔ اسی محراب سے سے چھٹے گئے کردار خصوصاً کڈو فقیر، مہارانی، سدا و شید و مہارانی، سدا و شید و مہارانی اور گاؤں کی مزارعوں پر چھٹے کاک کی بکھ جی کو خدو راج نے "بڑھتی" کا لایا ہے

"پھری اس کی دھنسی بھی تو کہانی ہی کی بدلت ہوئی تھی۔

میں جی نے بتایا تھا کہ ایک روز اس نے چڑیا کے ساتھ مل کر گھوم پکایا۔

چڑیا دھال کا دانہ لانی دھال کا۔ چڑیا کھانسی کو چڑیا نے اسے کونہیں سے پانی لانے کے لیے بھیجا دیا۔ وہ پانی لے کر کھانا تو اس اور ان میں چڑیا پھری ہڈی پٹ کر کے بک کے لیے چھپ گئی۔ پھر جب اس نے کھانا چڑیا کو چھٹے چلا لے گی۔" "ہائے ہائے میرا کڈو مسز۔"

کیوں پر لیا کچھ کھا ہوا۔

ماں کی کہانی سنا جس کو میں چڑیا کی چھین بن کر زور زور سے ہنستا ہوں گناہ نے والوں کا بھی الجھام ہوتا ہے۔

("اپنا اپنا کلمہ" از فکرا پور سے اقتباس)

جنگاب کے دیکھی منظر نامے سے مطابقت رکھنے کے سبب زبان کے دور ہمارے کی سطح پر فکرا پور نے وہاں کی الفاظ کو موقع کی مناسبت سے برتا ہے۔ اس ضمن میں اسانا ہمارے سے خصوصی شغف رکھنے والے ہاتھ پر کیا فیصلہ ہر کرتے ہیں۔ اس کی فکرا پور کو پرہیزگیاں ہنسنے چاہے ہیں اور اپنے آپ میں تنگی اپنے افسانوی کرداروں کی زندگی سننے کے جن میں جلتا ہیں۔

رشید امجد نے افسانویاتی سطح پر اپنے افسانوں کی بنیاد سادہ سادہ کے اندام پر رکھی۔ یہ افسانوی تدریج کاری کے مرتبہ ریٹین سے ہوتا ہے۔ اسے موضوعات کی تلاش اور سنجیدگی پر مبنی۔ فرسودہ افسانوی پلاٹ اور روایتی بیانیہ سے پرکھتے اس "کے" افسانہ نگار نے "نیمہ" کثیر میں کھوئے "میں" کی تلاش۔ بے حس کی لپیٹ میں آئے ہوئے معاشرے کے آشوب اور قوی شخص کے حقوق مساوی کو موضوع بناتے ہوئے افسانویاتی سطح پر ایک انوکھا تفسیراتی نظام وضع کیا۔ جس کا چلن ان کے قریبی معاصرین (الچی زراعی، جمید سم وردی، مظہر علی، سلاطین، احمد داؤد اور عامر نقوی) کے ہاں بھی دیکھنے کو ملے۔ اس اساتے بہت سے کھپ کا لہر زکاں جاتا، رشید امجد کو پختہ منظر کے افسانے میں فراہم کر دینے کے لئے کافی تھا لیکن رشید امجد نے اس پر قاعدہ نہیں کی۔ وہ مسلسل سرگرم عمل ہیں۔ ان کے اولین افسانوی مجموعے "بیر اور آدم کے بیٹے" (1974ء) میں شامل افسانہ "مسند و قنقرہ، مسند" ان کے افسانوی سفر کا پہلا اہم گنجل تھا جب کہ افسانوی مجموعہ "ریت پر گرفت" (1978ء) زوال و احسا کے بعد اٹھنے والے قوی تر جمعیت کے سواات اور عالمی طاقتوں کے ہمارے سیاسی اور معاشرتی معاملات میں بڑھتے ہوئے عمل و عمل کے حوالے سے چڑھ کر آدم کے چٹائی کی چڑاوی کا قوس جوا و فراہم کرتا ہے۔ ہوا اور پا اور زمانہ۔ یہ نئی زور اور رشید امجد کے افسانوی آفاق کی تعمیر کرتے ہیں۔

"شام کی نیم چار بجی میں ڈور سے آتے گھوڑوں کی پاپ اور غبار نے وقت کی گھٹی کو آنت پلٹ کر دیا۔" ("آدم سے نکلا دھن")

"ہوا اور پا اور زمانہ" چھین گورگن ہیں

اور ہم جو مسافروں کے قماروں سے

اس بے کھار ہے گنت مسند میں

اپنے وجود کی کشتیاں کھڑے ہیں

ماترں سے

بے اور نہیں کی بھول بھیجیوں میں اٹھتے ہوئے ہیں

اپنے ہونے کے احساس کا گڑھا بھل کھار ہے ہیں

("نارنگائی کی مٹیوں میں")

افسانہ "آدمی بیگانہ" رشید امجد کے تخلیق کردہ پہلی روای حصار کو توڑ کر بین الاقوامیت کی ایک نئی قوس بنا رہا ہے۔ جس میں جھڑپائی

عدنیاتی جادوی ہیں۔ اس کے بعد شیدائہ کے افسانے گھوٹل دلچ کے مصری آشوب کے نکاس بن گئے۔

پچھلے مرکز دیکھیں تو افسانوی مجموعہ ”سہ پہر کی خزاں“ (1980ء) کا ایک الگ فن تھا۔ اسرار اور غم منگنی سحرانگیز مصری مطلق سے برآمد ہونے والی افسانہ جس میں ماحول اور گناہ کا نکاس مصری مطلقوں کے تحت اگلتے سوالات میں ڈھل جاتا ہے۔

”ب“ چپ چاپ اُسے جانے دیتے دیکھتا رہا۔

اُس نے بیانی میز پر رکھ دی اور ذوقی ہوئی آواز میں بولا ”اُس کے بعد ہم چپ چاپ اٹھے، خاموشی سے باہر آئے اور کچھ کے بغیر اپنے راستوں پر چلے۔“

ب۔ اب بھی چپ رہا۔

”میں کیا کروں؟“

ب کے ہوت اُس کے چہرے میں دفن ہو گئے۔

”میں کیا کروں؟“

گہری ایک خاموشی۔

اُس نے ب کو کندھوں سے ہکا کر چھوڑا۔

ب۔ اُٹھی کے کھولنے کی طرف منہ کر رہی تھی۔

سناں، دوہاں مرکز پر اُحد چپ چاپ قدم قدم چل رہی ہے۔“

(”سہ پہر کی خزاں“)

یوں دل دکھانے والی تنہا کردہ شیدائہ کی لگتی روش ہی کہیں گے۔

جس مصر کے افسانے میں طراج کوئل موضوعی سطح پر طراج کی ایک مثال ہے اور یہ طراج تنہا کا بھی ہے اور اسلوب کا بھی۔ جب کہ اس تنہا طراج میں طراج کوئل کا کیا یہ کہیں زیادہ طاقتور کہانی دیتا ہے (مثلاً ”سناں“، ”سناں“، ”سناں“ اور ”تیسرا آواز“)۔ اس مخصوص طراج کوئل نے خوف، دہشت اور اسرار کی کیفیات سے پرستار ناموں کا انتخاب کیا اور کوئل ہر ممدی سے طاقتی ایجاد پیدا کرتے ہیں۔

کامیاب ہو گئے، جس کی خوبصورت ترین مثالیں ”سناں“، ”سناں“، ”سناں“ اور ”تیسرا آواز“ ہیں۔

طراج کوئل کے افسانوی کرداروں کی مشترک خصوصیت ان کا بے پناہ بھولپن اور مصیبت ہے اور ان کی بھی خصلت انہیں مطلق اور سب پر ہجوم میں گھٹیں ہونے والی۔ طراج کوئل کے ان کرداروں کی ان نفسیاتی الجھنوں کو اپنا موضوع بنایا ہے بلکہ اور غرت جیسے طاقتور ہڈیوں سے ختم ہوتی ہیں، اس کی مثال افسانہ ”سناں“ اور ”سناں کے باطن“ ہیں۔ ”سناں“ بھلا گئے کا ماہر و فکر، خود بخود چاہتے والے تو جو ان کے چنگ لہجہ کے دوران ہمدردی اور عاطفاتی کے درمیان دیر تک جھولتا رہتا ہے۔ اور فیصلہ اس کا جسم تو ہیں بے گزرتے ہوئے تو سب کر رہا ہے۔ جب خود بخود چاہتے والے تو جو ان کا فوری رد عمل دہی ہوتا ہے جو خود فکر چاہتا تھا۔ جبکہ طراج کوئل نے افسانہ ”تیسرا آواز“ میں بھید و کاز خانے کے حامل میں سری تو اس اور کار تک کے کرداروں کا مکالمہ کیا ہے۔ اول الذکر کاز خانے کا ایک ہے اور کار تک پہلے ہوئے کا وہ کاز خانہ طراج۔ اس مکالمے سے ہوتے ہوئے طراج کوئل نے افسانے کے آخری ہی اگراف میں لہجہ چاہی کدنی کے ساتھ

الہامیے کو ماریائی کیفیت سے دو چار کر دیا ہے

”کارنگ نے اپنی نظریں قصوں سے ہٹا کر سری خواں کے منجد چہرے پر گاڑ دیں اور تھوڑی دیر کے لیے طواریکی منجد ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی آنکھوں سے کرتے ہوئے آنسو قصوں کے نقشے پر چھوٹی چھوٹی عریں کی صورت میں بہنے لگے۔“

اس مقام پر دونوں کردار دیکھیں پہلی قصوں کے قیدی بن کر سامنے آتے ہیں۔ ان کا وجود جھٹیل ہو گیا ہے۔ اب وہاں محض یوسید، کہاؤ خان ہے اور قصوں کے نقشے پر عریں کی صورت میں بہنے والے آنسو وہاں ہیں۔

اسد مہ خاں کی افسانہ نگاری کا آغاز ”پاسوے کی مریم“ اور ”بے لٹا ملا“ نکل کر ایک جلتے جلاؤ اور غصے کی انتہائی صورتوں کے اظہار سے ہوا۔ ”پاسوے کی مریم“ ”دوسے لگی“ یہ کہتے ہوئے کہ ”بٹی دی، مرکا رہیں آتی ضرور مگر میرا حدود انسانی لگاؤ میرے سب پیسے خرچ کر دیتے۔“ ”بپ ک“ ”بے لٹا ملا“ میں روٹی کا جان ہے ”استاد عاشق علی خاں مر گیا اور کرے کی آواز دلا ایم ایف رجم زندہ ہے۔ اور آگہ ہارنے والی سٹوٹی اور جٹے کی بٹروٹی، یہاں سے والا آ کر سولہ لاکھ اور حورم چہرے والا ہو کر کچھ کل پر دو چہرے اور چالیس ہزار نیم مردہ بیرو کر کش زندہ ہیں۔“

”پٹھے کی ٹیٹھل“ (1977ء) کاغذ سے پہلے اسد مہ خاں نے ”تروجن“ اور ”مٹی دانا“ جیسے دو شاپکار افسانے نکلے لیے تھے، جن میں جلاؤ اور طس یک انوکھی سیتہ ترنگی میں داخل چکا تھا۔ ان دونوں افسانوں میں معاشرتی ناہمواریوں کے حوالے سے کثرت معروضی صورت احوال کی پیشکش میں طنز، ہمد، جدوجہد اور دشت لب و لہجہ موجود ہے لیکن غارت گری نام کو گھسی۔ ”سرکس کی سادہ دی کہانی“ میں سیاست کی طرب کار عریں کا پردہ چاک کیا گیا ہے لیکن غور و فکر نہیں۔ اسی طرح ”مردہ گھر میں سا جھ“، ”دکھا جی نگار“ اور ”تھس وٹھیا“ میں موت کا موضوع پوری سفاکی کے ساتھ موجود ہے لیکن ہولناکی نام کو گھسی۔

اسد مہ خاں کے طواریکوں سے متعلق افسانے پھرے کی محافل میں غور اور ٹھکا لگانے والی ہے کسی کی قصوں میں اور جھبہ چار یک کوٹوں میں رات دن بے رحمان، ہسانی مشقت چھیلنے والی ہے اس صورتوں کے ذکر سے خالی ہونے کے سبب سنو اور رحمان غلب کے افسانوں کے مقابلے میں مختلف لٹاکے حامل ہیں۔ درحقیقت اسد مہ خاں کے افسانوں کا جاوہر جو سرچڑھ کر ہلا ہے، عطا ہے ان کی بے پناہ زبان والی کی۔ پھر یہ کہ ان کے افسانوں کے سادہ کی زبان میں ایک آہلانی پن ہے۔ مرد و عورت کی زندگی سے پیدا شدہ کردار کی خصیلتوں سے ایک بکسر ہوا گاہ۔

”ایک بہرہ رات باقی تھی کہ وہ اپنے کمرے پر آؤ اور یہ دیکھا کہ کمرے کا لٹا ٹوٹا ہوا ہے اور اس کی بجلی اور بجی چڑی ہے۔ کوئی گھنے کا ٹوٹے اس کی گھر سے چا کر لے گیا تھا۔“ (”تروجن“)

”میں نے آنکھیں رادہ سے اس نیچے کا ذکر کیا ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے پہلی کسی عریں ازل گریھا بھان کے گھوڑے نے اُسے چرا لیا۔“ (”مٹی دانا“)

اسد مہ خاں نے جنوبی ایشیاء کی تاریخ سے جکوا ایسا سوا دینے جس کے ڈاڑھے کردار کی سطح پر نقلی انکار سے بھی جڑے ہوئے ہیں، جیسے افسانہ ”موم کپڑ“ میں اہل بیرو سے نسبت، محفلوں کے مقابلے میں شیر شاہ سوری کی چڑھت۔ یہ بھی بے شدہ حقیقت ہے کہ اسد مہ خاں کو کھ ملائیت سے چڑ ہے۔ بیرو کرنگی اور ہیئت حاکم سے خاص طرح کی کھ۔ اس سادہ سے ایک انوکھا ڈراما تشکیل پاتا ہے۔ جو اسد مہ خاں کے

افسانوں کی پہچان ہے۔

فطریل جعفری لکھتے ہیں

”مرزا باد جگ کے نام میں معاشرتی، سیاسی و سماجی میں انسانی لاشعور کو نہیں بلکہ اس کے شعور کو کھرپنے اور اس سے منسلک داخلی رد و جان اور سوچ کی گہرائی کو پیچنے کی کوشش کی ہے۔ پہچان کے ان حلیوں میں تنہائی زندگی کا وہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ افسانہ نگار نے یہ دکھایا ہے کہ ’’زردے ہوئے زمانے اور گڑے ہوئے لوگ عصری شعور پر اپنی گرفت رکھتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو دہراتے اور یاد دلاتے رہتے ہیں۔“

حادثہ جگ نے جاپے میں عمل پر دستا کم اور حرکات پر زیادہ زور دیا ہے۔ حسد، ہوس، طبقاتی امتیازات، جھوٹے اعزازات، مصنوعی شہین و حکمت اور خاندانی دیباہت، طبع کو مصنف نے چھوٹی افسانوی تکنیکوں کے فوری محرکات کے طور پر برتا ہے۔ انہوں نے اپنے کئی افسانوں مثلاً ”مضمرائے“، ”مٹھی گھوڑوں“، ”ولی کھلی کا بھیرا“، ”تینڈے میں چلنے والا لاکا“ اور ”گمشدہ نگارے“ وغیرہ میں ماضی بعید سے حقیقی واقعات، تجربات اور رسومات کو بہرہ استفاداتی اور سماجی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ کہانیاں یاد و سال کی حدود کو توڑ کر ان زمانوں اور ماضی افسانوں تک پہنچتی ہیں جو ظاہر ہے کہ اب نہیں رہے لیکن جب جن سے (رد و قبول سے قطع نظر) افسانہ نگار کو بہر حال ایک طرح کی جذباتی اور اخلاقی جھڑپ ہو رہی ہے۔ جنہیں سے ان افسانوں میں موضوع کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

جہاں تک حادثہ جگ کے جذبہ اور رویے و استفاداتی اسلوب کا تعلق ہے یہ واضح کر دوں گا کہ اس اسلوب کا تعلق تجربی مضمرات سے نہ کہ تجرباتی مضمرات سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں عقلی ابہام کے بجائے معنوی ابہام نظر آتا ہے۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے حیلوں، منتخب اور منظر افشانیات اور خوب صورت استعاروں کی مدد سے اپنے لیے ایک ایسا تعلیقی اسلوب وضع کیا ہے جو ان افسانوں کو جنہے اور چہ کی طرح الف انداز ہونے کے لیے قاری سے بھی کم از کم تعلیقی اور انسانی سطح پر تعلق ہونے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ان کا اثری اسلوب بنیادی طور پر لہجہ ہے ہی نہ لہجہ، غم اور درد کم ہے۔ اسی لیے ان کے افسانوں میں غور و اندیشہ نہایت کا اعتبار بھی نرم، غیر جذباتی لیکن مؤثر انداز میں ہوتا ہے۔ ان کے کئی افسانے جن میں درد بلیا قسم ہوتے ہیں۔

(الف) شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے اور وہ دونوں گلیے اندھیرے میں اچھلائے ہوئے متحرک دھبوں کی طرح چپ چاپ بڑھے چلے جاتے ہیں۔

(مضمرائے)

(ب) وہ ایک ایسی ہی تنگ شام تھی اور میرے ارد گرد بڑے بڑے گہرے چائے کے ڈبیر لگ رہے تھے۔

(جھپ کاچھو)

(ج) یادوں کے گلیں بڑے شگاف نیچے آجھان پر پڑ رہے تھے۔ صبح کا وقت ہو چلا تھا اور دور یا ایک حد تک بڑھکوں تھا۔

(گمشدہ نگارے)

واضح رہے کہ مظاہر فطرت کی طرف حادثہ جگ کا رویہ سائنسی یا آرائشی نہ ہو کر حیاتی اور فنی کا رانہ رہتا ہے۔ بسا اوقات جاپے اور

مناظرہ حوازی دھاروں کی طرح ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ بنیاد پر دھاروں کے حالات اور ان کے جاری احوال کا مطالعہ کرتا ہے جب کہ منظر کا تعلق ان کے احساسات و شعور، الاشعار اور احوال سے ہوتا ہے۔ دونوں ال کر تاریکی وحدت کی تشکیل اور تحلیل کرتے ہیں۔ " "



حوالہ:

- ۱۔ "اگرچہ قلمی نام غالب، افسر
- ۲۔ "اگرچہ ریختہ و مسطورہ" سہ ماہی "اگرچہ غالب و اقبال کے قلمی نام سے لکھا گیا۔
- ۳۔ "چاند" "نوائے" ۱۵ دسمبر ۱۹۸۴ء تا ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۴ء تا اگست ۱۹۸۵ء،

پس منظر، رواں پس منظر اور پیش منظر

(صادق الخیری، احمد شہزاد، نجیم یوسف حسن، حامد اظہر، راجہ چند، راجہ امجد علی، احمد اکبر آبادی،
عظیم چک چٹائی، بھٹو گوہر گوہر، امجد الرحمن چٹائی اور عزیز ملک)

پس منظر:

ہمارے پہلے افسانہ نگار راشد الخیری کی روایت کے تسلسل میں، صادق الخیری کا نیا پن نے قاضیوں سے راہ ورسم پیدا کرنے کی ایک کوشش ہے اور عورت کا ان کی اپنی سٹاڈ (مثالی، "اور جلد" اور "خیر ہنس") شرعی معاشرت اور عورت کے زندگی کرنے کا جتن، صادق الخیری کا موضوع خاص، یہاں اصلاح پسندی اور آزادی نسوان کی تحریک کا اثر معاشرت کی بکھرندہ بچوں پر مٹھ کر صورت ظاہر ہوتا ہے۔ ایک مثال، "بھینس"۔

مجموعہ "بھینس" کے تیسرا افسانہ اور "شیخ ابھینس" کے افسانوں کی ایک معقول تعداد راشد الخیری کے کمرے اثرات لیے ہوئے ہے۔ جبکہ "شیخ ابھینس" سے "دھنک" کے افسانوں تک آتے آتے صادق الخیری کی شخصیت اپنے منظر و رنگوں کے ساتھ اظہار پانے لگی۔

بھینس کے قرب و دہر میں پہلے بڑوں کا روایتی، ماحول صادق الخیری کے افسانوں کی تضاد کی کرتا ہے، جبکہ کروڑوں کی جھجک و بلی کے سفید پاش گھر ان کی طرف سے ہے۔ اہل اکو کا افسانے (مثال "گھر خاندان") شرعی مصروف زندگی کی فساد کی بھی کرتے ہیں جہاں سرمایہ اور مزدور کی کشاکش روایتی اثرات کو زائل کرتی ہے۔ دلی کی کشاکش زبان کا مروجہ صادق الخیری کے افسانوں کا خاصہ ہے۔

علی محمود، وزارت علی، نجیم احمد شہزاد اور نجیم یوسف حسن کے تیسرا افسانے اصلاح پسندی کی اسی روایت کا حصہ ہیں جبکہ احمد شہزاد، نجیم یوسف حسن اور حامد اظہر کے افسانے کردار کی سطح پر خاص طرح کے سیار کی جستجو کرتے ہیں۔ حامد اظہر کا افسانہ "گھوڑی کا روپ" اور احمد شہزاد کا "اندھا دھاتا" اس کی مثالیں ہیں۔ البتہ نجیم یوسف حسن (مجموعہ "سوسائٹی کے گناہ" مسطورہ 1943ء) کے ہاں سماج میں مظلوم کے حال اور محرومی کے ساتھ اظہار کی کوئی بھی مثال ملے گی ہے۔

ملی خاں۔ جہاں پہنچا برقی، خوبصورت عجل ورمی اور گوری (شکرال اختر) لوشان (پنیر ارج راجہ) فطیل جبران (پنیر ہندی۔ ایو اعلا چشتی اور صوبہ اشقر) سو پاس (نور قادری اور سید کام محمود) ہاراک اور ڈی۔ ایچ۔ ارفس (سید نسیم ہدائی) کے نام نہاں ہیں۔ (یہ فہرست قطعاً نامکمل ہے) یوں دیا ہر کار افسانہ آردو میں بخش ہوا اور آردو افسانے کی روایت میں نئے موضوعات کی تشکیل کے ساتھ تخلیق کے حوج کا باعث بنا۔

ل۔ احمد اکبر آبادی اور فطیل قدوائی بعض اوقات ترجمہ اور طبع ذرا افسانے کی فنی عملی تفکیک سامنے لاتے ہیں۔ دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں یہ بات خصوصیت کے ساتھ دی افسانہ نگاری کے حوالے سے سامنے آتی ہے۔ ایک مثال ل۔ احمد کا افسانہ ”یہی“ (”مطبوعہ“ ”نقوش“) ہے۔ یہ کھڑی افسانہ دی افسانہ نگار P. Romanov سے تھیلے و اضافہ مستعار ہے۔ افسانہ ل۔ احمد اور فطیل قدوائی (مجموعہ ”اعتنا طیلانی“) نے اس کی کئی کاپیاں کرتے وقت اپنے مزاج سے مطابقت کا ضرر خیال رکھا ہے۔ مثلاً P. Romanov کے قلم کی کات اور نظر پر اعتدال ل۔ احمد کو بھی مرغوب ہے۔ نیز افسانوں میں اسی صمد کے دوسرے افسانہ نگاروں مثلاً کوثر چاچہ پوری (ابتدائی دور کے افسانے) اور غالب بالچلی کی طرح زندگی تک حقیقت پسندانہ سائنسی کو تلاش، روانی انگ لیے ہوئے ہے۔ یوں افسانوں کی بحث میں خاص طرح کامیابی انداز بھی دیا ہے۔ ان افسانہ نگاروں کا پسندیدہ موضوع معاشرتی سطح پر طبقاتی کشمکش رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض افسانے جذبات سے مغلوب صورت حال سے پیش کرتے ہیں، جس سے افسانے کی تعمیر کا توازن جھڑ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔



(راشد الفیری، سلطان حیدر بخش، پیمپ چند علی مہاس سبکی، جتوں گورو کو پوری، اعظم کرپوری، نجیم احمد شجاع، قاضی عبدالغفار، عجاب احمد علی، ارشد جہاں، اصمت چغتائی اور قرآن امین حیدر)

ادری تمام زبیت سے لے کر موجودہ تک اور موضوع ”عورت“ مرہت راز چلی آتی ہے۔ سو اس موضوع کے ادبی فیوضیت کے سوالات کو حل کرنے کے لیے بھی بہر طور خاتون افسانہ نگاری کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی۔ دونوں کا کہا کہ عورت کا موضوع سو پاس اور منیر کے ہاں بعض پہاڑی جذبات کی تصویر کاری بھی سامنے لائے گا اور عورت کی تخلیق بھی اور یہ کام منیر کے ہاں نظر آئے گا جس نے اس موضوع کو بہت فنی کام سمجھا۔ رزق صاحب ڈال نگار منیر کا کھینچ اپنی تخلیقات میں عورت کا ذکر کھینچ اس لیے نہیں کرتا کہ عورت کے کردار کی تشکیل کہانی کا کچھ محدود کرتی ہے اور دوسری طرف بحری منیر نے کہا اور شاید ٹھیک ہی کہا کہ کشمکش کہنے خاتون کے کس کارنگ ہی نہیں۔

گوری لڑکی آدھی بند کتاب ہے اور دیکھا جائے تو باقی زندگی میں عورت جس قدر اپنے آپ کو کشمکش تخلیق کرنے کے قابل دکھاتی ہے، اس کے مقابلے میں جنس مخالف یا صنف کرہت کھینچ پھاڑ کر لیتی ہے۔ موضوع سے تھیلے و اضافہ و اسلوب اور نفس کی دریافت تک۔ اس طرح تخلیقی اعتبار سے پوری عورت چنے تک کا وہ عورت کے فنی موضوعات اور محسوسات کی فنی نگارنی تصویر بنایا ہے اور بعد کی زندگی میں موضوعات کی سمجھ بوجھ کا تخلیق کار خاتون اس کی مثالیاں شاب فریٹ صنف (Treatment) نہیں دے پائی۔ نتیجہ کے طور پر ادھوری تخلیقات کے اہلہ تھے ہیں۔ آردو افسانے میں بھی کموشش بھی صورت حال ہے یعنی ان موضوعات کا محدود دائرہ کار۔ جانا موضوعاتی دائرہ کاری کی یکسانیت

صحیح تخلیقی شعور سے شدہ ہر کی حد تک دو ایلا اور چارٹا موضوعاتی دائرہ کار کی وسعت کے مقابل محدود قیاس کاری۔ منظر و اسلوبیاتی سطح تک رسائی تو بعد کی منزل ہے۔ ایسی منزل جس تک پہنچے کم خواہیں تخلیق کاروں کی رسائی ممکن ہوئی۔

ہوا میں کس آواز و فضا بنائی ابتدا میں ہی غلط نساں کی آزادی اور اصلاح و سبھو کی راہ پر اٹھائی دودھندی کے ساتھ نکل چلا۔ "عورت" کا موضوع راجندر الخیری اور سلطان عید جوش کے ہاں غور احمد کی جائزہ جانشینی اور دواویوں کے ہاں دواوی حثایت کے ساتھ خاہر ہوا۔ عورت کا تصور بعد دم کے ہاں زندگی کا محور اور پریم چند کے ہاں سرسروانا سے مہارت تھا۔ نیاز کے ہاں عورت کا تصور کتاب لذت کا باعث ہے جب کہ ملی عباسی کے ہاں بھی تصور محفل کہانی میں اسیہ تاثیر پیدا کرنے کا ذریعہ۔ بھٹو گورکھپوری اپنی جائزہات پرداری اور عورت سے محو کی تصور کے درمیان ڈالواں اول رہے جبکہ عظیم کریمی نے عورت کے تصور کے نام دیجات کا سارا دواں احتساب کیا۔ ایک طرف آزادی نساں کی تحریک چل رہی تھی اور چودھری محمد علی دودھوی نے کہا تھا "عورت بد صورت ہو ہی نہیں سکتی۔"

اس قول کے پیچھے دواں اثرات بھی نمایاں ہیں لیکن دراصل اس کا باعث "راقم الحروف" انیسیت کا فنکار، ہادرجا مستحضر کے کی انیسیت کا فنکاری رہتا ہے۔ "میں" کے استعمال سے پریشان ہے مگر "میں" اس کا چہ نہیں چھوڑتا۔

(محمد علی دودھوی "میراثہ" مطبوعہ 1938ء)

یہی موضوع الہا نے میں خوب لطیف اور دواویوں کے لئے نثری آہنگ کا باعث بھی ہے۔ نیاز فتح پوری نے لکھا "کیا ہے کہ جو لوگ نثر میں شاعری کرنا چاہتے ہیں اس حسن کے ذکر سے تائب ہو جائیں۔"

(مقدمہ کیونے ساگی)

ادب شایع نے قادی موضوع کی تشکیل کے لیے مصور اور شاعر ہونے کی آمز و کی لیکن آزادی نساں کی تحریک اور اصلاح ہندی کے ہند ہے جسے اس کی شاعرانہ نثر کرادہ گئی۔ جانی عبد الغفار نے "لیلی کے خطوط" لکھ کر اصلاح ہندی اور دواں کو نکھایا اور بعد میں کمری حقیقت ہندی کے تحت جی بکڑ بندوں سے لڑاوت کا اعلان "تین بیسے کی چھو کری" میں کر دیا۔ اس سے آگے الہا نے میں سنگھنڈ فرائیڈ، لافس اور لٹکیر کا دائرہ کار تھا۔ چاب انشا زلی دودھانی تنقظ نظر اور ڈاکٹر رشید جہاں لاء میں انقلابی افکار نے کرنا خیر ہو گئی تو دواں حثایت کے متوازی دوسری مد رشید جہاں اور مصمت چٹائی کے حوالے سے چلی گئی۔ تب سے اب تک خواہیں لکھنے والیوں کا ایک سرورج جزا دواں ہے جو اسید و نسیم کی پوجا بند حثیت تک چلا آ رہا ہے اور دوسری مقبول ترین راہ مصمت کے بعد وادہ جمہ نے نکالی ہے۔

زلی دواں کے ساتھ عورت کے احساسات اور جذبات کی اداں پر مصمت چٹائی کی لکراں کا لکھ کمری تصور کھچی کر پائی ہے اور دوسرا "مترقہ الامین عید رکا ہے۔"

رواں پس منظر:

اس روایت کے رواں پس منظر میں زمانہ ادب، ہادرجا سرور وادہ و نسیم اور قدیم دستور کا پسند و موضوع سماجی انساںوں میں

گمراہی ہوئی صورت ہے۔ رحمان خذیب کے ہاں طوائف کے گرد و پیش کے ماحول کی جذباتی توجہ جلب ہیں۔ ("گمراہی گمراہی" "نہ نال چو بارہ" "پنہ سنا سورج" "پاس کئی") گھٹکی اعتبار سے ان چاروں افسانہ نگاروں کا ہندوستانی صحت چٹائی کی طرح جزئیات نگاری کے جب خاموشی کے ساتھ رنڈو رنڈو پہلا ہے اور آخر میں منہ کے افسانوں کی طرح بالآخر سکڑ کر پائی تو جتنی ہیئت اختیار کر کے چٹکا دیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہمارے درخشاں کے افسانوں کی مقصدیت احتجاج سے بے نیاز نکلتی آ جاتی ہے۔

قسیم سلیم چٹاری اور رضیہ فصیح احمد کی افراہیت ان کے لسانی کرداروں کی Isolation اور معروضیت میں ہے۔ یہ سلیڈ پرش طبقے کے سماجی اور نفسیاتی مسائل میں سے گزرتی ہوئی صورت کی بچی تصویر کشی ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے کچھ افسانے خارجیت اور معروضیت میں قرار ان کی مثالیں سامنے لاتے ہیں۔ مثال کے طور پر چٹاری کا "کاش" اور رضیہ فصیح احمد کا "سوز" اور عمر غوثی کے ایسے کردار سامنے لاتے ہیں جو زندگی کی بارگاہ سادہ رہی ہیں۔ ان افسانوں میں ظلم کا جذبہ اور گریو روزمرہ زندگی کی مصداقیں خاصے کی چیز ہے جبکہ رضیہ فصیح احمد کا افسانہ "سرخ چنگ پرش کی رات" صورت کے ان جذبات کا مظہر ہے جن کی بے شکس مرد بھی نہیں کر پاتے گا۔

جیلہ دہلی، گھٹکی اختر، جیلانی بانو، صدیقہ ٹیکم سید، الطاف طاہر اور نکیت حسن کے ہاں یہ موضوع معاشرتی اقتدار کی جدلی کے احساس کے ساتھ اس صورت کی جانب مڑ گیا ہے جو داستانوی اسلوب کی بنیاد لوک دافق کا نام ہے۔ جیلہ دہلی کے ہاں کمری سکھ معاشرت کا جادو سرچھ کر دیا ہے جبکہ گھٹکی اختر اور جیلانی بانو کے افسانوں میں صورت کی اچانک لہجیات کا لائق نظر کے ساتھ مطالعہ کیا گیا ہے۔ صدیقہ ٹیکم کے بیان کی کشش اور ہندی کہت کی خاص افسانوی ہیئت یاد رکھی جائے گی۔

الطاف طاہر کی باقاعدہ زبان اور ملازمت پر مشتمل لسانی کردار نگاری خصوصاً صورت کے تجزیہ کی زدگی کا تجربہ ہے مثال ہے (مثال بھگت دھرم، گھٹکی اختر، جیلانی بانو اور الطاف طاہر کے افسانوں کو ان کے جذبہ بانی کیلئے نے نقصان پہنچایا۔ اس کی ایک وجہ اس کا شہرہ جذبہ ہے جس کی مثالیں گھٹکی اختر کے "آشا"، جیلانی بانو کے "کوہری بات"، "اکھلا" اور الطاف طاہر کے "اکھیا چال" سے ملتی ہیں جب کے بعض افسانوں میں بچوں کی صورت میں آسودگی حاصل کرنے کی خواہش دورانی ہے۔

رضیہ ہادغیر، اختر جمال اور امتیاز الحسن کے افسانوں کا خصوصی موضوع متوسط گھرانوں کی روزمرہ زندگی سے مہارت ہے جس میں بچہ ایک نمودار ہونے والے ان ہونے واقعات فرد کی زندگی کو لپکت کر رہے ہیں۔ لہذا انہوں نے ان میں رضیہ ہادغیر کا افسانہ "نی لونی"، اختر جمال کا "بچن کا کھڑ" اور امتیاز الحسن کا "ستون" ہیں۔ افسانہ "ستون" کی داخلی لڑکی خیر کا کردار ان تینوں افسانہ نگاروں کے ہاں بندھے کے روایتی حالات کو کوٹ دینے کا باعث بننا ہے۔

امرتا پریم کے افسانوں میں پنجاب کی دھل اور افسانوں میں امرتا پریم کے اپنے کردار کی جلوہ افراہی پیش کا قیود رہی ہے۔ اس کی ایک مثال افسانہ "زندگی کا پانی" ہے، جس میں شرعی روایت کی وجہ سے چٹا کٹاری اور امرتا پریم ایک ہی کردار میں داخل رہی ہیں اور یہی امرتا پریم کا جامع اظہار ہے۔ اور "فطرتی راج" اور اصل ساحلہ صیغہ ہے۔ اب جبکہ "زمینی گھٹ" میں خود امرتا پریم نے اس پرانی محبت اور مصیبت کا پیرا اختیار کر دیا ہے تو اس افسانے میں رواں دواں اور باخوبی افسانہ کا شہرہ چٹو گیا ہے۔

طوائف افسانہ نگاروں نے عادتاً نسوانی احساسات کا ایک وسیع چوہا رنڈا ترتیب دیا ہے جو افراہی رخ کے احساسات سے کبے دور رہ کر خاندان سے لگن کر چری لسانی کردار کی (یا بہتا ہے) گھٹکی یا گزرو گھٹکی کیا ہے۔

رداں نہیں مقرر میں مگر احسن فاروقی، آغا جاوید، رام لعل اور راجندر سنگھ بیدی نے خاص طور پر جنس مخالف کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس ذیلی میں جنس بیدی کے افسانوں سے مثالیں دیکھیے، لمبی لڑکی، لڑکیوں سے پرے، جو گیا، نکل، سمن، دلچالہ، لاجپتی، گرمن، اٹوار، وہ بڑھا اور حادثات، حدود معاشرت میں عورت کے ہر بڑا اوپن کے حاکم ہیں

”وہ اور اس تھا، اور یوں ہی اور ہر جگہ رہا تھا،“

وہ اکیلے تھی اور پارک کے پاس سوکھی زمین پر بیٹھی تھی اور سامنے کی سچے کھیل رہے تھے۔

وہ چاہتی تھی کوئی راہبرد سے جائے، اور اس سے باتیں کرے۔ خود جانے کی انہی صحت تھی۔ وہ لڑکی تھی۔

لوگ آ رہے تھے، جا رہے تھے اور پھر یہاں کہ ہمیشہ ہوتا ہے

”پہ لڑکی یہاں، اکیلے بیٹھی ہے؟“

گو یا سرد کے لیے اکیلے ہونے کا تصور بند ہو سکتا ہے، عورت کا جنس شاید چونکے ہی ہے، کیوں کہ وہ اپنے آپ کو کیڑا پاتے ہی دو ہوجانے کی کوشش کرتا ہے

اور اس لڑکا بھٹکا ہوا ہاں آ نکلا اور بھروسہ

”پہ لڑکی یہاں، اکیلے کھڑی بیٹھی ہے؟“

پھر اس نے حاکم، بیکھا لڑکی نے اپنی نگاہیں چلی کر لیں اور اپنی ہی اندرون، اپنی جگہوں کے سماجوں میں بیٹھی مسکراتی رہی۔ ”ہوئی؟“

لڑکے نے سوچا، اور چلا گیا

یہ تھی ہوئی دھرتی سودا پر کا کھڑا،

اور یہ عواطف کی ہوا

کچھ وہ دھا کر لڑکے نے سوچا

”مگر وہ اکیلے کیوں بیٹھی تھی۔“

اور وہ لوٹ آیا

لڑکی کی بیٹھائی پر چہرہ تھے

لڑکے نے اسے ایک حاسم مدح لڑکی سمجھا، اور چلا گیا

بات صرف اتنی ہی،

تم نے پہلے کیوں نہ لکھے ہاں؟“

یہ نازل سے اکیلے وہ ادھرتک اور اس

اور سامنے کی بچے کھینچ رہے۔

(کھل اٹاٹے "جادو" بیدی)

اب شوقی زبان کے حوالے سے چند نام:

"تیل اور مٹی" پطرس بھاری کا واحد مضمون ہے جسے افسانہ تسلیم کر لیا گیا۔ البتہ "مطلق کی خود کھلی" البتہ اور میں ہی کا کادھہ اٹھانے کے طور پر شائع ہوا۔ پطرس بھاری کا کادھہ، کردار نگاری کے نقطہ ان کے باعث پطرس کی ہالی تحریر میں بھی مضمون کہلائیں اور انکی افکار اپنے، جب کہ میں "پاتل میں چڑھا" "سور سے جو کھل آگے بھری کھلی" اور "میری چار کاوی" کو افسانہ ہی سمجھتا ہوں، مگر چہ یہ مسئلہ ہمیشہ باعث نزاع رہا ہے اور شاید مزید کھجھڑتا رہے۔

"میں اور میں" میں پطرس نے کادھہ یا مٹی، اصلیت اور امر واقعہ کے تضاد سے زندگی کے صہک پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے اور بھی پطرس کی تحریر کا وصف خاص ہے۔ بلا حوا، نہ کہ فنی اور موضوعات کا ارتداد اور۔

شاید احمد انوی کا "تھکے شباب" نظر قریبی دہائی کے افسانوں کے میں مجموعے "نئے نکل"، "نورنگہ خیال" اور "در بچے" اور مراج اندر نئے نکل کا افسانوی مجموعہ "آپٹے" (مطبوعہ 1943ء) اپنے طور پر ("مسواہ"، "جنس برابری کی") اور مزاحیہ افسانوں ("راکھٹش"، "اف بلی" "ایک باب") کے سبب یادگار ہیں۔ اسی ذیل میں کرشن چندر کا افسانوی مجموعہ "گھمکت میں گوری ہے" اور افتاد علی جانی کی "حادیہ سرور بھاری" (خصوصاً سچے چنگن) آتی ہے۔ فواد احمد عباس کا افسانوی مجموعہ "کچھت میں جس کو مطلق" "روانی ادب پر شاد ہے مگر کے سبب یادگار ہے۔ اس "دایہ کے دریاں" میں مظهر میں مسد پر کاش مگر ("میں جانا میں ہیں اور")، "افغانی احمد" ("چھاسم کے دل میں")، "ماہاز حسین نہ لوی" ("سروخانہ") اور "میں قی کر" ("سکھوں میں گرا اور آوی") نمایاں ہیں۔

آر دو افسانے کے دوسرے دور میں جس طرح "مکمل مطلق" بصورت اور شیر محمد اختر کے ہاں انسان کی جسمی پہلے بنیادی اہمیت کی مثال ہے اسی طرح آغا جاد (مجموعہ "میں سے اڑن مٹھریاں، ہاک گریباں اور لب گویا" میرزا ریاض (مجموعہ "آندگی میں صدا) سید احمد الطاف (مجموعہ "بچے دھاتے") اور ضمیر الدین احمد (مجموعہ "سو کے سوان") انکشاف میں کے حوالے سے معاشرہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔

بہت کہ ہم اختر کے ہاں مردانہ اور زنانہ ہم جنسی کے میلان کا مطالعہ (مثلاً "پابندی وقت") اور جنسی کج رویوں کے مکر کا کھانہ کی تلاش ملتی ہے۔ مثلاً "بچے پاؤں کی بی" "انکری" اور "پاؤں کی جنت" "سلیم اختر کے ہاں بی، پاؤں اور کندھے پانی کی موری کی مٹی ملاتا توجہ طلب ہیں۔

یہ بے شک کی جہاز اور جنت "س طرح افسانہ کی صورت میں مسج کرتی ہیں اور معلوم کرداروں کے ساتھ طرح پانچے والے کردار کیسے ہیں جو کھلی اور کچھائی کے خواب دیکھتے ہیں؟ ان سب کی تصویر کاری احمد عباس اور کرشن چندر سے بعد کوڑ چاند چوری "حیات افسانہ انصاری" اختر اور بنی۔ سید فیض محمود، عبد الرحمن چغتائی، اوچدرا احمد الہ، کٹھیری اول ڈاکٹر اور چند راجھ کے افسانوں میں ایک معیار قائم کرتی ہے۔

میں طرح نہ نگاروں نے شوقی کی جانب آہادی (مجموعہ اور علی جنت) کی سرفروں مہر دیوں اور گراؤں کو اپنا سوسوسہ بنایا اس ذیل میں "حیات افسانہ انصاری کا کھانہ" "آگری کو کھش" "کوڑ چاند چوری کا" "میرا چھٹا کوڑ" "پانہ کی کاسر" "اختر اور بنی کا" "بہ نکر" "سید فیاض محمود کا" کام

شہر سے لگی جاتے جڑھتی ہوئی پاروں اطراف میں بھٹکتی سڑک ان دیکھے اور ان چھوٹے نیچا ٹیم تار یک دھوم و دھج اور روایات تک گھر کر گئی ہے۔

دعہ خور جیٹا جی "گھرنی گھرنی" لیے بھرے اور یہ غصہ بدوشی کی روایت ایک چال تک آتی ہے۔ (مجموعہ "جیٹا جی") ایک چال کے پاس مصر کے ابراہیم اور مغرب کے جنگل جوں اور ہلاک کی سڑکوں کے شور میں لے جتے ہیں۔

سنگو معاشرت کی پیشکش جینے دہشی (سرخ آدھی۔ بن پاس) اور سراج۔ غریب احمد عباس ("کرشن چندر کی محبوبہ") مسلم معاشرت، مسرت چٹائی (چوچی کا جوتا) کرہیں معاشرت، یہ ہم چند (مطلق دیا اور سیر ہوئی، نزلہ ان کا متعلقاتی طاق) اور حسن مسکری (بیشتر انسانوں کی کردار سراج) سوسائٹ کے بعد۔ خطبہ کی سوسائٹ (امام حسین جالوی (سردار خان) قصور دہشی (مجموعہ "عرف کے آنسو" کے بیشتر انسانے) اخیر اللہ بن احمد اور خالد احمد کے پاس لٹایاں ہوئی ہے۔ جب کہ سرحدی اور قبائلی علاقوں کے قیسے فیسے، اختر، مسعود مطلق اور سید وحنا نے کھسے، اختر، "شہزادہ"، "راضی نامہ" اور "سچے ہاں لڑکی"۔

شملہ کی بچی تصویر اشتیاقی احمد ("بندہ ٹوٹ") بلوچستان اور سندھ کی سی اور معاشرتی صورت گری، غلام الحسن رضوی (چرواں کے پیر، سادہ جلد میں لکھی) سون بیکس کی جھٹک احمد غلام کاکی (الہود، بچس خانہ) کے پاس لکھی ہے۔

رام اہل اور فیضی احمد کے پاس سراج سے اور پٹاڑی محبوب چھڑاں اور غروالی رنگ سے ہوئے ہے۔

ہ چان چال کے پاس یادوں کے حوالے سے سہاگرنی کا لینڈ اسکیپ اور سید انور کے پاس سندھ کا سطر (بکر ہے پایاب کھسے، محمود ہندو گاؤں کے دوہائی وقوعہ جات کے ساتھ احمد وینال جلاوگر ہوا ہے۔ سید انور کو ایک شعل، ایک طوقان اور ایک ڈال کہا جا رہا ہے۔ بکری سطر کے حوالے سے اس نے ہر طرف تھکتی ہوئی معاشرت میں چھڑا کر لیا ہے۔ مثال۔ مجموعہ "آگ کی آغوش میں" کے انسانے۔

اسے سید کے انسانے جذبہ محبت اور فطرت کی خواہشوں کی گواہی ایک کر کے بارانی افکار تحریک دیتے ہیں۔ (دو گیت۔ چاندنی راستہ میں سطر) خود پر دہی کے لئے میں میراث دار انسان "یو داس"۔ "کتاب اور دہا" کے کردار اپنی نوع میں بہت معتبر ہیں۔ اور اس کے انسانوں کی سرانجیز فضاؤں میں اور میری، نا کام محظوظ کی دھمکریں اور دہائی یادیں۔ اس کی ایک مثال انسان "گڑاں کا گیت" ہے۔

"دہلی کے گھداں میں کئی پگھلیں کی نینوں کو سوسہتی کے قریب کر دوا دھج میں کا سکریت سکا کر نہیں لپٹ بچا دوا اور بکر کھسے ہوا کہ پگھلیں کی گھنٹن نینوں سے پاس سوسہتی کو درشن دیکر کر نہیں یوں کھسے گتا کھسے کرتی برف میں آغل دان کے پاس بیٹھے کسی قدیم اندلی موسیقار سے بچھن کا سکر۔ ریت میں رہے ہوا میں کئی گھنٹن بچھن کا ایک سکر اور گیت سنا دیا جاتا ہوں۔ یہ گیت سرحدیوں کی ایک خطرناک سہانگی سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں ایک پرانے کھسے والے مکان کی کوزی میں بچک کے چھپے کھسے کی مثال میں لپٹا ہوا چروا بچا رہا ہے۔ سوادری آنکھوں تاک میں سرخ کھیل اور برادان ہونٹوں والا گرم چروا۔"

("پادشہ میں پگھلیں کا دھج" از اسے سید)

محمد حسن فاروقی میر احمد شریف کے پاس کرکٹ تھاکی کے علاوہ کردار کی سلیج میں عجیب طرح کی غیر متوازن صورت حال قابل توجہ ہے۔ "نہایت مسوئی چروا ہندو معمول سے لگی کر دوا دھجی کپتیاں۔ چوٹی آنکھیں کال بھولے ہوئے تاک کپتی تو نہیں مگر بہت چوٹی۔" یہ حسن فاروقی کے انسانے "بکر" کی بچہ دہلی کا کاکا کھسے ہے جو غمزدگی کی رویداد کے ساتھ احمد شریف اور حسن فاروقی کے بیشتر

نصوبائی مرکزی کرداروں کی پہچان ہے۔ چاہئے والوں اور چاہے جانے کی خواہش کرنے والوں سے جاتی مرتبے اور محرک کا تھوڑے دنوں انسان نگاروں کے ہاں عجیب و غریب صورتیں سامنے لاتا ہے۔ احمد شریف کے ہاں اس کی مثالیں "گھر میں بچہ" اور "پہنچاؤ گاڑی" اور حسن ظہورتی کے ہاں "بھتیجی لقی ہے" میں ہیں۔ ایسے مرکزی کرداروں کی تشکیل افسانوی کرداروں کی سطح پر روایت کی توسیع ہے۔ افسانہ حسن ظہورتی نے غشی تعلیقات کے حوالے سے محبت اور بوالہوی کے دوسرے نکتہ نگار کا منظر ہمت ناک کامیابی کے ساتھ طے کیا ہے۔ اور وہ جو سارتر کے مجموعے "Intimacy" کے بارے میں کہا جاتا ہے

"محبت میں بوالہوی کا: جن ماحول قوی بات افسانہ حسن ظہورتی کے افسانوی مجموعے "افسانہ کردار" پر پوری غلطی ہے۔ حسن ظہورتی کے افسانوں میں نئی ہوئی تہذیب کے گم شدہ مناظر اور فرسودہ گراہیوں کے خاص طرح کے ہاں جو سماجی انصاف کی خواہش اور منظر غشی کی کاغذ ہو گئے اور اجماع میں اور طرکات صدیقی کے طے کرنے زبان اور تخلیق کے حوالے کے ہاں جو سماجی انصاف کی خواہش اور منظر غشی کی کاغذ ہو گئے

ہیں۔ اس روایت میں شرکت صدیقی کی منظر و مریض اور مجرم کردار نگاری ("راقول کا شہر" اور "ظلیفہ") قابل ملاحظہ اس لیے نہیں رہتی کہ ان کے ہاں سماجی انصاف کی شدت طواغیل، ان کے افسانوں کو سہانے کی حدود تک لے جاتی ہے۔ شرکت صدیقی کے بعض افسانے تو سوشلسٹ افکار کے منظر کی سرکل کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مثال دیکھئے "ابو الہول کا سایہ" کی ابتدا لیکن کے قول سے ہوتی ہے

"انقلابی قوتوں کو جب پوری طرح ابھرنے کا موقع نہیں ملتا تو وہ زندگی کے لیے زہر اب بن جاتی ہیں۔" یہ افسانہ اس قول کی تخریج ہے۔ بھوکے زندگی سے ہارے ہوئے ذہنی سپاہی کا دن اصل رہا ہے۔ "گھر آؤ راز کی رات" میں سی کی آخری ٹپکیاں اس افسانے کا موضوع بنتی ہیں۔ ایسے جذباتی مقامات پر شرکت صدیقی کے حوالے دہرائی کے ان کے افسانوں کو ضعف پہنچا۔

مست پر کاٹ کر بھی اسی نسل سے تعلق ہے۔ اس کے ہاں یہ یاد رکھنا ہے کہ طے نگار اپنی حاضر جوابی اور دائرہ رسد اور طبیعت کی تشکیلی سے ایک لمبے گچھا پہلڑا اس طرح افسانہ نگاری کی فہم لگائی سطح پر مرکزی رات کے مقابل اس کا افسانہ عجیب میں اترا چلا گیا۔ اس طرح "میرا افسانہ" اور "میرا بیان میں ہیں" جیسے قصہ و افسانوں کی خاص دستاویزی جملہ بندی اور تشکیلی بیان میں دب کر رہ گئی۔

راج کے افسانوں میں کرکس کی تعلیمات اور گرے کا ماحول اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے بعض افسانے گرے کے اثرات سے بہت دور نکل کر بھی لکھے جو غیر معمولی لحاظ کی روداد ہیں اور محبت کے حقیقتات اور تعلیمی الجھنوں کے اجتماعی مسئلے۔ راج کے افسانوں کی زندگی ملی جلی معاشرت کی ہے جس کے لیے اس نے گہرا تحلیلی کا ہوتاؤ کی ہے اور اپنے افسانوی کرداروں کو جو میں سے جانی کرکس کے پس منظر میں دکھا کر دیکھتے ہیں۔ ایسے راج کے موضوعات کا لکھنا اور اسلوب کی عمدت اہمیت کی حامل ہے۔

عنایت اللہ اور میرزا ریاض کے اکثر افسانے کردار کی ہیں اور ان افسانہ نگاروں کی جزئیات نگاری قابل توجہ ہے۔ عنایت اللہ اپنے کرداروں کے گرد بچلی ہوئی واقعات زندگی اور اشیاء میں سے حقی کی تلاش کرتا ہے۔ (نما تہذیب، دھوری کہانی) عنایت کے دونوں افسانوی مجموعوں "منزل منزل دل بچنے کا" اور "سوز حقیقی جاگ" کے بیشتر افسانے واقعات میں حقیقی کی تلاش سے تعلق ہیں۔ ایضاً یہی طریقہ کار میرزا ریاض اس وقت اختیار کر لیتا ہے جب وہ ارد گرد کی پوری صورت حال کو بصر کردار نگاری کا حقیقی گواہ بناتا ہے۔ اس کے افسانوی مجموعے "آدھی میں صدا" کے بیشتر افسانے اس کی مثال ہیں اور افسانوں میں انہماک غشی تعلیقات کا مطالعہ اور آپس میں الجھنے ہوئے شر اور معاشرتی کرداروں میں خیر کی جستجو اہمیت کی حامل ہے۔ ایک مثال "پہنچاؤ"

اس روایت میں عاشق حسین خانوی (مجموعہ "سوزِ اتمام") اور شمس آغا (مجموعہ "اندھیرے کے جگنو") نے حسن و عشق کی تھمسی اپنی روائی فارسیا کہیں کو کوئی تہذیب کاری کے تحت چھپا دینے کی حد تک قابلِ توجہ بنا دی ہے۔ عاشق حسین خانوی اور شمس آغا کے ہاں ظہورِ اہم کی ابتدا بالترتیب صورت کی ہے وفاقاً اور جہاں جذبیوں کی افواہ (اور ان کی مصمصیت) کے حوالے سے توجہ طلب ہے۔

دورانِ مجلسِ معطر میں عرقِ صدیقی، درامِ لعل، احمد سہب، سکھو حسین، قمر حسن، عہدِ اصد، شکتِ حیات، انورِ زمان، اور محمد عالم بے رحمیت کے ہاں موضوعات کا تنوع اور ان کی مٹا سہب کے ساتھ اسالیبِ اظہار کی نکتہ بینی کو پیشِ قابلِ توجہ ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں سماجی حقیقتیں، ناپائی، انجینس اور معاشاتی دہشتیں ان کے منفرد زاویہ نظر کے تحت افسانوں میں دھنکی رہی ہیں۔

درامِ لعل کے افسانوں میں مرد اور عورت کا جنس مخالف کے داخل سے آگہی حاصل کرنے کا عمل اتنی بھراور میں اس وقت داخل ہے جب درامِ لعل اس دنیا کے چل چلاؤ میں فرو کو نہ سہائی طور پر بھی مسلط بنا دیتے ہیں (مثلاً "تیرے ذرا دکا"، "اکڑے ہوئے لوگ")۔ درامِ لعل کے ہاں یہ سہائی داخلِ مصمصیت کا استعارہ ہے۔ ایسا سطرانہ افسانے کے داخل اور سفارح دونوں سطحوں پر یکساں طور پر جاری و ساری ہے۔

احمد سہب اور عرشِ صدیقی نے متنوع موضوعات کے برتاؤ کے ساتھ روائی طرزِ اظہار سے علامت اور تجربے کے معقول و درجہ سے نکتہ سنا کیا ہے۔ ان افسانہ نگاروں کا افسانہ نگاری سے گہرا شغف اور بیان میں تشکیلی کا عنصر قابلِ لحاظ ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں تیسری صحت کی تلاش بھرپور مصمصیت کی حامل ہے۔ قمر حسن، انورِ زمان، سکھو حسین، عہدِ اصد، شکتِ حیات اور محمد عالم بے رحمیت کے افسانے اس روایت میں آہستہ آہستہ بنتے ہیں۔ یہ نکتہ بینی کے ساتھ نکتہ بینی کے موضوعوں اور لوگوں کی مطالعہ ہے۔

انورِ عظیم اور قابلِ حسین، عرشِ صدیق، سیدہ باقی، محمد، برج، چاند اور ضمیر احمد شمس نے افسانوں میں افسانہ نگاری کے سوا افسانے۔ ان افسانہ نگاروں کے اجتماعی افسانے کے حوالے سے کچھ نئے افسانے، کچھ اور سماجی زندگی کی تشکیل اور ضمیر کے باب میں توجہ طلب ہیں۔

انورِ عظیم زندگی کی بے مصلحت کو کس طرح جاری سماج کے دور پر کھڑا کرتا ہے۔ اس کے افسانے "تیرے ذرا دکا" سے مثال لے سکتے ہیں۔

"ہر طرف اندھیرا تھا۔ کتے لٹے اور کتوں کے سارے تھے اور بچہ ران کی جھکڑ تھی۔ سب کا رنگ ایک تھا، سب بھی ایک تھی، ایک ایک ہوا کے ذریعہ ہاتھوں سے کتوں کے چروان سے کتا میں ٹوٹ لیں۔ سارے کتے بے چہرہ تھے، جن کے ہاتھوں میں کتوں کی ڈنچیں تھیں، دو بچی بے چہرہ تھے۔ بے چہرہ کا لہجہ ایک ہی صحت کل، ہاتھ، اپنے گدگد کی تلاش میں ہر طرف ان کے اندر تھا، چہرہ درجہ درجہ کی طرف بڑھ کر بے چہرہ بنے۔"

اقبال حسین کے ہاں اس روایت میں شاعری زندگی اور ان کی مٹا سہب کے ساتھ اہم ہوتی کردار نگاری قابلِ توجہ ہے "بھڑک پر بیٹھے ہوئے اپنے انوکھے چہرے شادی کی عادت کے منظر ہیں اور انکار، بچ پر پھینچے تو ہم کرشمیں نکتے بکھڑکائی اور وقت نے سازش کر کے ہمیں ایک ایسے موڑ پر کھڑا کر دیا ہے جہاں ہر حال کسی کا انتظار ہے۔ دراصل یہ انتظار اسید و ہم کے دور ہے پروخت کی کسی سازش کا دوسرا نام ہے اور سب یہ سازش کھل کر لے لی، جب وہ عادت و توقع نہ رہی ہو گا تو لوگوں کو جانے کہ جب بھی ہو گا انہیں۔"

(آگہی کے دہانے)

غرض سعید کے افسانوں (مجموعہ رات و آغوش) میں انسان کی داخلی کیفیات اپنی معروضی صورتحال کے منظر نامے میں قویہ طلب ہیں۔ غرض سعید کا خاص موضوع انسانی ذات کا اس کی تمام جہتوں میں مطالعہ اور مطالعہ ہے اور اس حوالے سے ”ہلا وطن“ اور ”سرد و گازی“ انما کردہ افسانے ہیں۔

اقبال مجید کی افسانوی تہذیب کی روایت اور جدت کا قزاقانہ سامنے لائی ہے۔ تہذیبی اقتدار کی شکست و ریخت کا مطالعہ و مطالعہ اقبال کا موضوع خاص ہے۔ نمایاں مثالوں میں ”ایسے کچھ کا کچھ“ اور ”دیکھتے ہوئے لوگ“ ہیں۔

برجسٹ ہاؤس کے افسانوی مجموعے ”نکس آئینے کے“ کا پس منظر مصنف کی تقسیم کیر اور اس کے تمام حوالے ہیں۔ ان افسانوں کا لینڈ ایکسپ سہانوالی، کیسبل پر اور سرحد کی طرف دریا پار کے علاقے خصوصاً شہر ہڈنٹیل اور تھیل کا حلقہ ہے۔ اس پوائنٹ کو لے کر افسانوں کے طویل سلسلے ہیں اور اقتدار کی شکست و ریخت پر فلسفیانہ ذوق و فکر۔ ان افسانوں میں دو قوموں و خصوصاً ایسے حاصل ہے اور اس کی بنیاد غیر متقسم بعد و مکان کی یادیں پر ہے۔ نمایاں مثالوں میں ”بند و بصرے نام کی“ اور ”چاہی گھوٹاں“ اور مجموعہ ”ریت سمندر اور مچھلی“ کی کہانیاں ہیں۔

”لکھنے میں اگلی رک کر تانے کے لیے میں اسے پاکستان کا نام دے رہا ہوں۔ ورنہ میری ماں کے پاس سن بچپن کا نام نہ بندوستان اور نہ ہی پاکستان رکھیں۔ کچھ شہر ہڈنٹیل اور سہانوالی تک محدود ہے۔ وہاں کے کسی بھی ڈاکٹر سے پہلے دوسرے ہاتھ دھو کر نہ دیکھتے ہائے رات کو نہ کیا کرو یا۔“

(”نکس کے آئینے“ سے اقتباس)

میں احمد شیخ کے ہاں پاکستانیت کا حوالہ قویہ طلب بھی ہے اور بحث طلب بھی۔ افسانوں کی نمایاں مثالوں ”نی۔ نی۔ نی۔ نی۔ نی۔ 538“ اور ”پاکو میں“ ہیں اور مجموعہ ”لکے کی بات“ کے بیشتر افسانے۔

اسی روایت میں خیر اور شر کے تضاد کے حوالے سے عزیز ملک، سعید انور، اختر جمال بکیت حسن، ناصر بلواری اور علی حیدر ملک نے آدوش حقیقت نگاری کی ہے۔ نمایاں مثالوں میں عزیز ملک کے ”آپ میں آپ ناچ رہی“، ”پاترا“ اور ”امچھری“ ”سہانوار کا“ ”شری طور کشتی“ ”اختر جمال کا“ ”ناکیر“ ”بکیت حسن کا“ ”زبان“ ”ناصر بلواری کا“ ”وصال کا موسم“ اور علی حیدر ملک کے ”دو افسانے“ ”میسری آگھ“ اور ”بے زمین آسان“ ہیں۔ ان افسانوں میں قلم کے اعتبار سے داستان اور فضیلت کا لہجہ اور خیر طبعی ایک نئی کچھ دیکھتے ہیں۔ اسی ہے عظیم عزیز ملک کے ہاں مذہبی، اختر جمال اور بکیت حسن کے ہاں تہذیبی اور سعید انور اور علی حیدر ملک کے ہاں تاریخی نقطہ نظر کی تفسیر متنازعہ و حوالہ دہی ہیں۔



پیش منظر:

مارچ 1978ء میں شائع ہونے والا چھپانے صفات پر مشتمل چودہ افسانوں کا مجموعہ ”گواہی“ عربی، انگریزی اور فارسی نثری حوالی دارا شامیت، کراچی خاص طور پر یادگار ہے۔ ”گواہی“ کے افسانے کھانا زلیخا اور اس کی حیرت کے خلاف شعور و احتجاج کی حیثیت

رکتے ہیں۔ ”گہائی“ کے ارتدادیہ میں اٹھارہویں لکھتا ہے

”طنی اور اس کی قدریں زمینی اور مکانی صورتوں سے جڑیں ہوتی ہیں۔ اگر معصوم جسموں پر پڑنے والے گولڑوں کی کالامات آواز میں اورپ کے احساسات کو گہروں میں نہیں کرشم تو اورپ خبر سے ہونے لگتا ہے پانی کے کافی ذروں جو بڑے سے بڑے ہے۔ (خس سے کتابیں پانی ہوتا پسند نہیں کرتا) میں یہ بات واضح کر دوں کہ اورپ کو سلطان یا سلطنت سے کوئی ذاتی عداوت نہیں ہوتا لیکن یہ اس سے یہ خاموشی و عداوتی نظام کی چاب اس کے جذبات و احساسات پر قطرہ قطرہ نیز اب کی طرح کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ اس کے قلم سے نظام کی جبریت کے خلاف احتجاج قلم لینے لگتا ہے۔“ (ابتدائیہ و اواخر ۱۹ء)

اس مجموعے میں انور احمد، منکلا، اور شہزاد احمد، مرزا احمد، بیگ، مظہر الاسلام، احمد، داکو، احمد جاوید، اعظم، یوسف، ابو ہریرہ، جہان شاہ، عزیز، فرید، وحید، منصور، قصیر، قسیم، آدوی اور اظہار علی کے افسانے شامل تھے۔

ان افسانوں میں مادرشادی کی جبریت کے خلاف طرقت کا مستند موضوع دی ہے۔ ہر برقعہ کے دربار سے میں شدید عداوت رکھتی ہوئی ہے۔ پھر ت اور بھلائی است انسانی باتوں کی پھولی ہوئی نسوں اور پھولی آنکھوں کے ساتھ تخلیق کار کے اعتماد میں اپنی واضح پہچان کر داتی ہے۔

”میں زور سے چندا۔“ قوی سلاستی۔ یہ بھی طوب چیز ہے۔“

اس نے پلٹ کر لکھ دیا اور لکھا

”عصمت فرشتہ عورت کی آواز کو بکھڑا جاتے تو عصمت دہی کے الزام میں بکھڑاتی ہے۔ جاری قوی سلاستی بھی اسی قسم کی چیز ہے۔“

(”دائلی اور پرے سے کا گوشت“)

اسی طرح مستشرق حسین جاز نے اپنے افسانوں میں فکری اور نظریاتی محاذ آرائی میں طاقتوں کے خلاف کی ہے جو اثری پڑے ہر ملک میں اپنے اقتدار کے دالے پہ لے گا۔ بے ہوشی میں اٹھالی۔ ”کتابوں میں“ اور ”بابا انگلیں۔“

یوں جیسی سحر کے افسانے میں ایک طرف تو فکری و نظریاتی محاذ آرائی کی انتہائی صورت میں یہ فلسفیانہ توجہات اور دوسری طرف کتاب اور کوئی ہے۔ لیکن یہی معروف و مشہور افسانہ خاں (افسانہ ”بے لفظ لفظ“) کے پاس شدید طور پر درشت لکھے کا باعث بنی ہے۔ اس سائنس کی صورتوں کو سدھ خاں نے بیرونی اجتماعی لاشعور کے حوالے سے نئی معنویت سے دوچار کر دیا ہے۔ خصوصاً افسانہ ”مجموعہ کچھ“ افسانہ کا مرکزی کردار امرائیل کی سرزمین سے چل کر ہندوستان تک آیا ہے۔ موضوع سے مطابقت رکھنے والا ایک منظر و اسلوب یہاں قلم نے کا جب چوٹی زبان کے لیے ہے جیسے ہشتاور ہندی سے اردو تک کا سفر ہوگا (افسانوں کے حلقوں میں ہے کہ وہ بیرونی افسانہ میں ہندو متا بعد الطبیعات کا بیان بہت نیا نہیں رہا۔ اس ضمن میں پولینڈ کا آئزاک بائبلڈ سنگر عالمی شہرت کا حامل افسانہ نگار، ناول نگار ہے۔ اس کے نامہ اندہ افسانے ”کچھ آواز“ کا یہی موضوع ہے جو ”کچھ کچھ“ میں اسد خاں نے بھی رہا۔ مرے اس طرح، دے اور گریہ اور مصائب کا بیان، لیکن افسانے کا افسانہ یہ سنگر کے ہیں ہاؤ آواز زبانی ہی جاتا ہے۔

اس دوسری افسانہ جاتی (مجموعہ ”نیکسی“) کے افسانوں کا داخلی رویہ باورائیت کے احساس کا باعث ہے اور اس احساس کا عظم انتخابی کرشمہ معروف و مشہور افسانہ میں ہوتا ہے۔ (مثلاً ”اور بچے میں گرا ہوا قلم“) ذکا، ارضی اور انوار احمد کے پاس عن چور نے موضوعات اور بہت

ابھی ہوئی نفسی کیفیتیں متروک رہیں اور زندگی کے سبب فریب معاشرت کا باعث بنی ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ اور مشرقی ممالک اپنے اپنے طور پر نئے ممالک میں مگر گئے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے جو مسائل کئے انہوں نے انسان کو فرائض پر قادر ہونے کے باوجود جذباتی اور محسوساتی سطح پر فاعلی کرب کا مرکز بنیاد دی۔ فرد تنہا رہ گیا۔ تین انسان اپنے اقتصاد اور دشمن طبعی کے درمیان گم م ہے۔ مستقل فیروار خ ہے اس لیے سوال ختم ہوتا ہے۔ بالکل وہی نفس ہے جیسا طالب کے پاس نظر آتا ہے۔ ایک تہذیب کی شکست کے بعد نئی صورت حال کو کیج کر سوال۔ انیسویں صدی والی ہیئت نے بھی ظہور کیا۔ مختار کل اور مجبور محض انسان جس کی حیثی، انفرادی سطح پر بھی ہے اور انیسویں صدی میں بھی ہے۔ چنانچہ جذباتی اور فکری دونوں سطحوں پر ہے۔ انفرادی عینائی کی مثال کامیو کی ناول "The out Sider" جس کا مرکزی کردار سوچتا ہے۔ "میری ہر کل مرگئی، یا ممکن ہے پر سوں، مجھے بکھر پاشیں" یہ عجیب و غریب خواہش کی حالت میں گل کا مرکز ہوا ہے۔ لیکن قتل کرنے کی وجہ سے نہیں مستطوم۔ اس لڑکی Alienation کی دوسری بڑی مثال فرائز کا نکا کا Land Surveyor ہے کامیو کے ناول۔ "The Plague" میں اپنی ہی حیثی ملاحظہ ہو طبعی شہر میں چھوٹی کی موت سے انسانوں کی موت تک شہر کا رابطہ دیگر تھیلوں سے کاٹ دیا گیا ہے۔ اس فانی اور نفسیاتی فتنہ کا اولین قرب۔ یورپ کے ان ممالک کو ہوا جو صنعتی انقلاب میں پیش پیش تھے۔ پھر نفسیاتی الجھنیں سماجی حوزہ بند پاں اور مادی ممالک انسان کا مقدمہ بن گئے۔ صنعتی سرمایہ کاری سے، اپنی سرمایہ داری تک کے سڑکی مطلق انسان انسان کے خلاف خود قاتل ہے۔ سرمایہ دارانہ جبر کا شکار فرد اپنے خیر اور اپنے گھر میں اپنی ہے۔ مصلحت اسے کا کرواق دہندہ اور کیڑا مانا رہی ہے۔ اس کے سر پر کالوں کا آٹا ہے۔ یہ فرد فطرتی طرح ہے بخائی پنا کے لیے اپنی گھر میں خود مراعہ کرتا ہے یا مسیحا کی طرح ہے، جس نے اپنی صلیب اپنے کاموں پر اٹھا رکھی ہے۔

بگڑی کی طرح اپنے سر سے ہرے نرم کا نخل کا دانہ، اپنے دوسرے دن پر دانوئی رنگ کا ٹاٹ اوڑھ لے، وہی اس سے ملو کی بند لہاں پانہ سے ہانڈاؤ کی لمبی صلیب گھسیٹ کر ہوا اب جو اپنے گھر سے نکلا ہے تو ایک ایک دفعی کے دہانہ پر دھک دیتا ہوا جانے کا کام دفعی اس اسدا اپنے مکان سے باہر آ اور اس شیم عید اٹھ کا کھنڈم میرے ساتھ مل ہوا اسے علی اطیر نہیں اسے کشا اور مل دفعی میری پیچنی کو سوسے اور اسے جان برادر اور اس کہ اور دوا کر کہ میں اپنی صلیب اٹھا لے اپنے قتل کو جانتا ہوں (برادر اور۔ اسدا گھ خان)

یہ ملاحظہ انسان مجموعی طور پر اپنی ہی ترقی کی رادشہ، مانگ فطرت کے مطابق بھی رازم آ رہا ہے۔ یہ وہی جنگ بین الاقوامی سطح پر جاری ہے۔ بچے بگڑتے اقتصاد، سیاسی اور مذہبی تصورات کی نئی صورتوں میں صورت پذیر ہو رہے ہیں۔ آج کی نئی ضرورتیں اپنی کھانوں کو تھکا رہی ہیں۔ آج کا مہر فرد کامیاب ہے جو اس کی کھانہ میں ہفتوں، گھروں، سڑکوں، لکھاؤں میں گزر تک چلا ہے۔ نگہ کے حضور پوش کی لڑکی اور حیدم ہوتی غلامشیں آج کے انسانوں کی کردار کی ڈھنسی ہوئی ہوں کی دیوار ہیں۔ چنی نے ہماروں کو کھنٹ انسان کا گھر رکھا ہے۔

مثلیں احمد یوسف کا "اوہی لوہی غلامشیں"، اور ہاد کا "پھمی کاون"، نیز مسعود کا "تھک کاون"، رشید احمد کا "تھرا سندھ نظر"، احمد داؤد کا "سانپ کی سرگزشت"، شران کمار داؤد کا "لب یا کا"، بھراکسن، رضوی کا "انگو بیڑ" اور عرض صدیقی کا "بابر کنن سے پانے۔"

فرد اپنی جھگڑات کا اسیر، مشینوں کا قلام خود کو پیچ رہی گیا ہے۔ مشین کے شر میں فرد کی دلی ہوئی آواز کی مثلیں ڈاکٹر ڈاکو کا "آٹری قلام کا سفر ہے۔ اسی لیے Absurd Theater نے ظہور کیا۔

"Waiting For Godot" کا افسانہ انکار کرتے ہوئے دلوں دوست لکھا جاتے ہیں۔ پہلا دور میرے کو لکھا ہے۔

Go" اور اجاب میں کہہ ہے "Yes, Let us Go" اور جگہ نے آخر میں لکھا ہے کہ وہ دونوں حرکت نہیں کرتے دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ ایک بار دونوں کی چیخوں سے اٹھتے ہوئے دو عورتیں اور چنگڑاتی سڑکوں سے ہر گھبرائی ہوئی لڑکیاں، جگہ میں گیا۔

یادوں اطراف کچھ بھی زندگی کی شور مچاتی تو مجزاتی مشین کا ادنیٰ سا پڑھکن جانتے کا احساس آگئی ہے۔ جموٹ بکر فریب سیاستاء معیشت اور اتحادی اتحاد ایسے سوالیہ نشان ہیں جن کی گرفت سخت ہے۔ فروغ قریہ قریہ ملاحق آزادی، فساد، خوف، فقر، تعصب، سکون کا سوال ہے وہاں۔

چہ کہب کا احسان، انگہار سے مطابقت رکھنے والے سچے رائے کا غالب ہے۔ افسانہ نگار جانتا ہے کہ کہ خورہ، ہونوں، ذاتی مراضوں اور عاموں کی یہ گمنام زلی، یہ جنس قدر کمزور اور ناقابل قبول ہے اسی قدر ناقابل انکار حقیقت بھی ہے۔

”نامور، یہ بھی تو سوچ کر صرف اس ماں کے خشم کے ساتھ کا پھکا رتا ہوا ساپ ہی کھول کر دیتا ہے۔ دو کیوں نہیں کرتے جو دھن سے جاتا تھا، ابہ اور جس کے حوالے سے کچھ افسانہ ہے۔ رقیقیت اسے نکرتا ہے، اس قسم حرام کی خبروں، دوسرا کچھ یہاں کیسے آ گیا۔“

لغات کی آنگوٹوں کے شہر روشن ہو گئے اور نور جوان بھارت ہا رہا تھا اور اس کے پیچھے رنگینے، سنے اور ہانے کون کون؟ ”اک منظر سامنے کا، نور اور یہ سب، اپو جہ کے خلاف پہلی آواز اٹھتی جو سب کے کے اٹھتی تھی اور پھر ایک صورتحال الٹ گئی۔“ سبھی آہستہ آہستہ ”لوٹو“

”لوٹو“ ڈھن بھرتی دیکر جھٹکتے سامنے آتا ہے۔

نور و ادب میں آج تک انحرافیت کا دور دورہ رہا ہے۔ انفرادی ادب اور ترقی پسند تحریک میں انحرافیت کے مقابلے میں انحرافیت پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ ادب میں طرح طرح انحرافیت سے انحرافیت کی طرف جھکاؤ ہو چکا ہے پہلے انسانے کی سی انحرافی انحرافی و انتہائی بھی انحرافیت آتی۔ آج انسانے کی اس کل فضا میں صورتحال کا تجزیہ انفرادی سطح پر ہوتا ہے۔

بہارِ مشرق اور پاکستان کی عقلی نفس کے سامنے بہت سے سوالات ہیں، جواب کوئی نہیں۔ موجودہ معنویت کی عقلی اکتائت فرد کی تنہائی میں خود اپنی کلیمیں اور اختراعات کی تلاش ہے۔ یہ ادھوی کی معنویت بھی ہے جو کچھ نر کے اس عہد میں جوایت حاصل کرتی ہے۔ اپنی بچپن میں لگا ہوا تجزیہ فرد ہر گھر پر ڈال دیتا ہے۔ اس ڈنگا تے فرد کے Inner Self کے شعور کی گھیب و فریب صورت کی مثالیں دے لیا کہ یہ ذہنیت کے سامنے ہے یہ سن جاں جوان لڑکی کی کہانی، خالدہ حسین کا "بچی بھیل"۔ آج کے مصروف دور کے بڑی کا کارآمد فرد پر کاش کا "دنے کی آواز" اور "عیر"۔

بے حس، تشنیت، التورقہ کا "پورا ہے پر تلے ہو آؤںی" آج کا ہر عاصی دھوئیں کی کچی سڑھیں ابھی چڑھتی ہیں، دایم رہا ہے۔
 دنیا الرضی کا "وہ ایک بچہ شخص" امام غزالی کا "دھوئیں بہت ہے، طرائق کول کا" "تیسرا کتا" "دھواؤں مولیٰ کا" "فلانوں کے بھارت" اہل انام کا
 "آگ اپنے اندر ہی" ہیں۔ یہ فرد اپنے Pigeon Holes میں سامنے لیے ہو ایک گائپ ہی گیا ہے۔ یہ بھارت کبھی کا ایک تھوڑے کے بھارتی
 تھوڑے افسانے ٹھہر کر بجائے ڈاکٹر بھارت کی حیثیت سے کھڑے ہیں۔ ابھی بھارتی کھڑے کھڑے آئے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ آج کا

یہ فرد Aspidistra کہہ دیا ہے جو گھوٹا برطانوی کے لڑائی کا اس گھرانے کے دروازے پر تاپنے کے جگہ اور چان میں سجا رہا ہے۔ جارج آر ویل کے ناول Keep The Aspidistra میں یہ آج کا فرد اپنی برجستہ اور برہنہ ہمت سے منظر پر ہے۔

دنیا ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی کے ہاتھوں جبر کا پتہ پر پائی تھا اور کوٹھکست ہوئی ہے۔ خود تدار سے یہاں بھی صورتحال ہے لیکن یہاں کے مٹا کر دھڑا جب ابھی تک زندگی پر فوج رکھتے ہیں۔ کوٹھک کے لئے جاب چاہئے یا پناہ ڈھکیا ہے لیکن یہ سب اندر ہی اندر ہے ابھی سچ چہرہ ہے میں سوالات نہیں اٹھائے جاسکتے فوراً ٹھہر ہونے کا کوئی گنگہ گا۔ آج وہ صورت حال ہے جو انیسویں صدی کے آخر میں یورپ کی تھی وہاں مذہب اور عقیدے کی جگہ نہ کرنے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی نے ہمارے پچاس سال لیے۔ ہمارے پاس ابھی عقائد کے قتال کی تلاش کا ٹھل جاتی ہے۔ نیا سائنسی طرز فکر اپنانے میں ابھی عرصہ مدت درکار ہے۔ قدیم صدائیں آج تک کی ٹکڑے دیکھ رہی ہیں۔ آج کا عالم یہ ہے کہ یہ اپنی صدائیں اپنے معانی کو کھینچ رہی ہیں اور ان کا متبادل ہمیں نہیں مل رہا۔ ایسی ہی صورتحال میں یورپ کی آواز تھی۔

"One World is Dead While The Other is Struggling to Take Birth"

ہمیں اس تکلیف دہ صورتحال کا آج سامنا ہے لیکن افسانے میں یہ ناز کی صورتحال مستقبل قریب میں وجودیت کا Pattern اختیار کرتی نظر آتی ہے۔

اب وجودیت ہی ایہ غلطہ رو گیا ہے جس نے دوسری جنگ عظیم کے بارے ہوئے انسان کو کھینچنے کی کوشش کی ہے یہ غلطہ جیٹ منظر کے انسان کی ڈھارس میں ملتا ہے۔ وجودیت نے کائنات کو دھاریوں کی دنیا سے نکال کر کائنات میں مسلسل برسرِ کار انسان کے جسمانی اور فطری وجود کی صفویہ کی تلاش کی ہے گو اب تک ہمارے ادب پر اس فیلے کا رولہ راست اثر ہونے کے برابر چاہے لیکن یہ اس زمانے کی بھڑکی دنیا جا رہا ہے۔ ہماری فکر میں وجودیت کے عناصر بالواسطہ اور غیر شعوری طور پر خود بخود شامل ہو رہے ہیں۔ وجودیت کے لیے جدائی کا مادیت (مادریک طریقہ کار ہے کوئی چاند اور اشکاف کائنات نہیں) راہِ نشین کرتی ہے۔ ہمارے ہاں پانچویں صدی کی عقلیت کے بعد اس کی تجدید ہے جو سہرہ باری داری کا متبادل وجودیت اور جدائی کا مادیت کی بدولت ہے جس میں فرد اور سماج کی جدائی بھڑکی ہوئی ہے۔

پیش منظر میں لازموں و مہر و دور صورت کے معاشرتی رد و بدلہ ابھی نئی کر دے رہے ہیں۔ اس نئی مشکل چال ڈھال کے بارے میں تیز شاہین (نئی صورت اور آراء و افسانہ۔ ادب لطیف) نے انسان نگاروں سے توقع پانچویں صدی کی صورت کی تلاش اور تربیت کا کام سہرا لیا ہے وہی گے جو داستانوی صورت اور قدامتیں جدید کی عقلی شکل صورت کے دو میان کی کڑی ہے۔ جس کی روح کے مسائل کے ساتھ جسمانی مسائل بھی ہیں۔

پیش منظر کے افسانے کی صورت کا گھر سے باہر قدم نہ کرنے کے لئے ہمارے چار پہلا قدم ہے اور وہ خواہ مخواہ کی بنی کو سمجھتی اپنے لیف بلجر کے ساتھ ذاتی پہنچتی سڑک کرتی ہے۔ تو اسی قائم کرنے کے لیے اس نے دونوں بازو پوری طرح پھیلا رکھے ہیں۔ علی امام کا افسانہ "زیرِ پست" ایک کھلے پھٹنے والی کے کردار کا مطالعہ ہے۔ جو وجودوں کے ذیل سے تعزیرات جسموں کے تعریف میں ہے۔ انسان نگاری نگراں آکھ سب بکھر چکی ہے، اس کو کھلے پھٹنے والی کے لیے "معاشرتی ٹھیلہ" منہ لے کر بڑھتا ہے۔ لیکن جب تک وہ نہ ہر گھٹتی ہے، یہ ہم تخلیقیتوں کی سہ ماہی ہے۔

زہد و مٹا کے افسانوں میں آج کی عقلی شکل صورت کا تجربہ ہے جس کے نزدیک دھاری عقائد ہی ہے جس کے اندر کوئی رہ نہ نہیں۔

جہازی مفہوم کے قیضے میں محدود ہے۔ لیکن اگر کوئی استعارہ نکھرتے سے اور بار بار استعمال کیا جائے گا تو ہم مخصوص لفظ کے استعارہ کی مفہوم کو القوی معنوں میں سمجھنے لگیں گے۔ مثلاً جہازی معنوں میں مستقل ہونے کے باعث اس کے معانی میں ایک قسم کی عرصیت پڑا ہو جائے گی، غلط و دیگر نے ایسے الفاظ کو سرسرایا ہوا استعارہ کہا ہے۔ جہازی لفظ کو جان کر سمجھائے ہوئے استعاروں کا انجرو ہے۔ استعارہ تجریدی مقابلہ سے کام لے کر جنم لیتا ہے۔ یہ عقلی عناصر کو استعمال کرنے کی قوت ہے۔ ہر لفظ کو۔ یا نیا تصور سب سے پہلے استعارہ سے کار پڑھاتا ہے۔ پھر سرسرایا ہوا القوی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ اس طرح یہ زبان کی زندگی کا قانون ہے۔

آج کے گھر جے ہوئے فرد کے لیے لاشعیت میں مذاہم پنہاں ہیں۔ وہ کسی ایک مخصوص خطہ ارض پر زندہ نہیں اس لیے کہ وہ دروازہ کے رہنے والے براہ راست نہ کسی اس پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اب بین الاقوامی فرد کے اعتبار کے اسالیب سے ہیں کہ وہ استعماریوں میں سچا ہے۔ ایک مثال اور سماج کے افسانے "سنو بلیا" کی ہے جس کی کہ استعمار ہے جو سماج اور شعلت سے غالی ہو گیا کی جیسا کہ طب کثرتی ہے۔ جیسا کہ افسانے میں شعور کی رو کے تحت علامت اور استعمار سے کی کار فرمائی نے مزید جوہر رکھتے ہیں۔ اس خصوص میں صحنہ الحق، مسعود اشعر کہ حیات، شمس غزنائی، علی نقی احمد و آفراسین، غفر اور یوسف چوہدری کے متعدد افسانے خصوصاً کچھ کے طالب ہیں۔

شعور کی روداد Stream of Consciousness فراغی کے طور پر لاشعور کی عطا ہے کہ شعور کی روداد، جہاں پر ہر لمحہ و راتوں کا باعث بنی اور سر بلکہ کو شہرہ نصیب ہوئی۔ یہ موضوع سے زیادہ Methodism سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں دماغ میں آئے ہوئے ہر لمحہ امور کو لکھی ترتیب دی جاتی ہے۔ اس میں احساس اور نگار کی اہمیت ہے۔ جہاں کی بجائے اشارہ اور فکر کی جگہ جملے سے کام لیا جاتا ہے۔ شعور کی روداد کی تصویروں میں ریلکسی منطق و استدلال کی جگہ سے نہیں بلکہ ہر لمحہ و لمحہ کی پائی ہوئی کیفیت کے باعث ہے۔ اس طرح قصودات اور خیالات کا خلاصہ اور یادداشتیں، تاریخی واقعات سب ایک ہی روداد میں سامنے آتے ہیں۔ جہاں شعور کے مرکز کی طرف توجہ دلائی۔ اس طرح وحدت کی وہ لکھی گرفت سامنے آتی جو اس بحث کی جہاں ہے۔ شعور کی روداد کا شعری طور پر اثر سب سے پہلے ڈی ایچ لارنس (D.H. Lawrence) (Son And Lovers) مطبوعہ 1913ء کے ہاں نظر آتا ہے۔ بلکہ درحقیقت وہ ڈی ایچ لارنس نے 1918ء میں لکھی "A Portrait of the Artist as a Young man" مکمل کیا۔ درحقیقت وہ لکھی کی "To the Light House" کا سال

شعور کے ساتھ زندگی اور جتنی دماغ اور ماضی پرست کے ہیں انسانی فکر اور عمل کی کاروبار رکھتے ہیں، اس طرے پر انسانی شعور کی گہری زندگی کا اندازہ رکھیں۔ شعور کے حلقے میں حیاتیاتی تاثر داخل ہو گا اور داخلی گہرائی کی مختلف خاصیتوں سے ملے گی۔

حیاتیاتی تاثر (Sensory Impression) میں انکارا، داخلی زبان پر تاثر ہے جو ضروری نہیں کہ مرعوبہ لسانی ہو انہوں سے ہمہ تن جنگ بھی ہو اس میں شاعری اور موسیقی کے اثرات نمایاں رہتے ہیں، لسانی زبان پرستے کا تجربہ پہلی بار "بولی بیگز" میں کیا گیا۔ گھوڑے اور ان کی زبان سمجھ میں نہیں آتی، لیکن اس کا مخصوص آہنگ ذہن میں خاص قسم کی کیفیت پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ ہمارے ان قراء اچھن مفید ہیں جو حیاتیاتی تاثر کی موضوعات بھی رکھتے ہیں۔

[illegible]

داعلیٰ خودکامی (داخلی منہ واک) میں افسانوی کرداروں کے تصور میں بننے والے خیال کے حقیقی بھاء کو پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دراصل یہ بات کی گزشت میں آنے سے پہلے افقی تصورات کی کلیت ہے جسے تاریکی نسبت شامری میں زیادہ کامیابی سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس ٹھیک کو برتنے والے افسانہ نگار شامراہ وژن کے حامل ہوتے ہیں۔ اقول جان گراس، بی بی جنری کی خود کشا میاں اگرچہ گھرواری اور بالکل ہی ہیں لیکن ان کا سانچہ نہایت اختیار کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ جو اس کا آخری نال Finnegans Wake بھی اس کی مثال ہے۔ داخلی خودکامی کی خوبصورت ترین مثال "ہمکنوے کا دال Oldman and the Sea" ہے۔ اردو میں اسے محمد کی "شہر اور گھیاں" کے مضمّن سے دو تقرہ ایمین میدر کے افسانوی مجموعے "شخصے کے گھر" کے افسانے خصوصیت کے ساتھ "یہاں دال اچھا" اس کی مثال ہیں۔ "داعلیٰ تجربہ" میں کردار کے تجربہ اور تاثر کا خلاصہ تخلیق کار اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اس طرح افسانوی کردار کی سوچ تک فنکار کی جڑوں میں رہتی ہے۔ اس میں افسانہ کی اس کلیت کا اختیار کیا جاتا ہے جسے فرانز نے قلم از شعور کا نام دیا تھا۔ شامری میں اس کی مثال براڈ بک کی "فلم" "Fralippo-Lippi" ہے۔ اس میں افسانے کے ایک قدیم تصور اگر ہا میں مقدس قصا میں بدلنے پر مامور کیا گیا ہے لیکن وہ اپنے داخلی اختیار سے نیچر جو کر Nudes بنائے گا۔ اس قلم کا موضوع تصور کے داخلی اختیار اور پاروں کے امکانات کے درمیان کشش ہے۔ بھری خود اور دال پر دست نے اس ٹھیک کو بھری سے برتا ہے۔ اردو افسانے میں اس کی خوبصورت مثال امجد الطال کے دو افسانے "پونے کی گھیا" اور "آٹیت" ہیں۔

"تخلیق کا ر" کا مفہم طرح کرنا نہیں بلکہ کھل اشیا کے آدنگ سے سرست حاصل کرتا ہے۔ تجربہ کے بانی تصور مونسے کا یہ قول تجربہ کاری کی عمل ترین شرح ہے۔ اردو افسانے کے پیش منظر میں کارفرما مصوری کی اصطلاح تجربہ کا واحد تحریک کی صورت اختیار صرف اشعور براس پہلے کا قصہ ہے۔ جب یورپ میں فطرت سے قریب مصوری نے آخری سانس لیے۔ یہ تحریک کا ایک Cubism اور Expressionism کے بھری زمانے میں مصوری کی نئی گروتھی۔ اسے فن برائے فن کی خوبصورت مثال کہہ سکتے ہیں۔ Cubism میں بھری اشکال کو اہمیت حاصل تھی لیکن تعب لہذاں اور متوازی خطوط وغیرہ۔ وہایت سے اس شہیہ بھکات کا مضمّن بہر طور فطرت سے ضرور تھا۔ تجربہ Cubism سے آگے کا قدم ہے۔ اس میں فطرت سے رابطہ توڑ دیا گیا۔ اب آنکھ کی جگہ چہرے پر جس "دی" بدن کے کسی حساس حصے پر آگ نکلتی ہے۔

مضمون یہاں سے جب اس تحریک کا جوڑ سمجھا گیا کہ "تجربہ حقیقت کی عکاسی نہیں ہے بلکہ ایک نئی حقیقی مضمّن کی مد سے اپنی حقیقت خود تخلیق کرتی ہے۔" تو ہر اہم سے فہم نے اس کام کا سہل جانا اور تصور کو گور کہ معتد ادا دیا۔ اس سلسلے میں دو گروہ کی کامیابی کا اعتراف کیا سونے Living Museum کے ایک اعتراف (1966ء) میں کیا ہے۔ تصور کاری سے تجربہ اب تک پہنچی۔ اور سے ہاں تجربہ بیت کی تحریک کا اثر براہ راست کم چاہے لیکن ہمارے طریق اور کار میں بھی وہاں صر تجربہ بیت کی تحلیل کرتے ہیں۔ بالواسطہ اور غیر شعوری طور پر خود کو شامل ہو رہے ہیں۔ یورپ کے اب سے تجربہ کی مثال پیش کرتے وقت ہر طور پر فراز کا کٹکا کام لیا جاتا ہے جس کا طریقہ کار سر تک ہے۔ یعنی تجربہ اور سربلزم میں ہم فرقی نہیں کرتے۔ سربلزم کو اب اور حقیقت کا نظم کہہ لیجئے۔ جس کا مضمّن تحت اشعور سے ہے، لیکن شعور اور شعور کا مقام اتصال اس سرحد (تحت اشعور) پر تخلیق کار شعوری کرداروں سے تحقیق کا مواد ادا کرتا ہے یہ نہایت نازک مرحلہ ہے۔ اس میں کوشش کی جاتی ہے کہ خارجی دنیا سے تشکیل شعور کا نظم نہ چنے نہ پائے۔ سربلزم فن کار ایک تو سامنے کی دنیا کی تصویر بناتا ہے اور ساتھ ہی دوسری دنیا کی تصویر بھی جو خارج حقیقت سے بالاتر ہے۔ کٹکا کا اعلیٰ سرحدی ہے۔ اس لیے اس کے دالوں میں دور کہانوں میں ہر قصہ چلات ہے اور واضح

اُسے جس ہم پر غم نہیں لگا سکتے۔

وٹس مٹر کا افسانہ اپنے مسوئو جات، ٹھنک اور اسالیب کے اعتبار سے غیر معمولی حد تک انوکھا اور تھرا دیتی ہے۔ یہ آن کی زندگی کے سلیٹن سے جنم لینے والے تھیراٹ کی کہانیاں ہیں۔ ان کہانوں کا کوئی مخصوص مغزاف نہیں یہ سچھو کا کل رواں ہے۔

وٹس مٹر کے افسانے میں گزشتہ سے جیسا کہ میں اسوں سے اشتاف کے پہلو میں مانتے آتے ہیں، اس لیے کہ افسانے کا مظر ہمارے تھیل ہو گیا ہے۔ روایت سے یہ اطراف روایت کی توسیع بن گیا ہے۔ اب جانیے کے یکہ ذے انداز کی یکہ صمت اور استدار سے نے تھیرا ہی اور سر ہست و دیا سے نے لے لی ہے۔ وٹس مٹر کے افسانے میں برتا گیا افسانہ اپنے معانی کے بلوں سے جنم لیتا ہے۔ اکثر انتہائی اعتبار کے لیے ہڈی کی جوشست، برخواست ضروری تھی وہی برتی گئی ہے۔ اس طرح متفرع، وجیہ اور در حالی کے اعتبار سے دور رس وادرات کا بیان دیکھنے والی آنچھ کے ذہن کے مطابق اپنی صورت بدلتا رہتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے لیے قلم نگار نے دعویٰ کیا تھا کہ ایک خیال کو ادا کرنے کے لیے مخصوص الفاظ کی مخصوص نشست و برخواست ملتی ہے۔ یہاں افسانہ کا جو ہر متفرع Dimensions میں مظر کرتا ہے، جو حال صوری صوری جیسوی کے چھتے اور ساتویں دہائی سے حلقہ لعل افسانہ نگاروں کی پہچان ہے۔

یہ بھی ایک نئے شہ، حقیقت ہے کہ وٹس مٹر کے بیشتر افسانے میں ہمارا اور اپنی تھذیبی پس منظر غائب ہے، جس کی وجہ سے افسانے کے قدیم ترینیت یافتہ قاری کے لیے افسانے کی تھیم کو آسان اور قابل قبول بنا سکتی تھی۔ یا پھر کم از کم اگر ہمارے ہاں تھذیبی یکسانیت ہوتی تو بھی بات بن جاتی۔ واضح ہیں ہر تھذیبی یکسانیت کی بنیادیں تصوف نے لڑا ہم کی تھیں، لیکن داما شکو کی شکست کے بعد اب بھی ہر ہاں آج کل مفسد اور مارکوس کے حوالوں سے مذہب پر جس قدر دہاؤ دیکھا جاتا ہے چاہا بات پر دال ہے کہ آج ہم مذہبی حقائق سے کس قدر دوزخ و نکل آتے ہیں۔

تھذیبی یکسانیت کا فقدان اور ادوار و اقسام کی نظریہ سازی نے اس صورت حال کو طے و چھپو دیا۔ کم از کم مجھے اس بات پر اعتراض نہیں ہے کہ کھنن سبارا اور افسانے کی تھیم کی خاطر کوئی سیارہ یا پینٹ فورم قسم کی چیز مہیا کر دی جائے تو کیا اٹھیں دیاں کامل نکل آئے گا؟ میں سے یہ نہیں ہے، یہاں کہہ سکیں۔ لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ میرے معرشتین کی ایک بڑی تعداد میرے نہیں ہے پاکستان کی بیشتر Intellect کی طرہ نگار اور تھذیب کے ناموں پر ہی سر پائل میں مصروف ہوا اور پاکستانی گزری حواش میں نکل کر تھل تلاش کرنے والی کھننوں کی طرہ تھیبہ مظر مانتے لائیں۔

ہمارے افسانوی وٹس مٹر کا حال اہلیت کی اس شہری دلا ہے (خصوصاً غریب کے حوالوں کے ساتھ) جس کا پیغام ہم تک نہیں پہنچا۔ دہا بات دیکھی ہیں۔ اہلیت کے عہد کی تھذیبی یکسانیت کا فقدان اور نہت ٹی ٹھریہ سازی۔ Graham Hough اہلیت سے حلقہ "Vision of doctrm in four quartets" لکھتے وقت اہلیت کے بار بار گزرت سے نکل جانے کا ذکر کرتا ہے۔ اہلیت انگلیاں اٹھا کر خود غم خانگیں کرتا اس لیے کہ Graham Hough نے افسانہ قاری کی نسبت اپنی تھذیبی روایت سے قریب ہے۔ سواہلیت کو کہتا ہوا یا ہمارے افسانوی وٹس مٹر کو، کامیابی اسی صورت ممکن ہوگی، جب ہم وٹس مٹر جہاں میں مظر کرتی تھذیب پر نظر لیکن کے اور ساتھ ہی مختلف انواع نظریہ سازی کو ادا کرنے کے لیے آپ نہیں کے کہ پہلا کام نہ تھا آسمان ہے جبکہ ہر دس سال بعد "نیا ادب" یا "جدید ادب" یا "جدید ترین ادب" کا نعرہ دیکھنے والوں کی نظریہ سازی کہتا سمجھا تا مشکل ہے چاہا لیکن اسے لگا دیا۔ آپ اگر ایسا ہی سوچتے ہیں تو آپ حق عیاب ہیں اور میں داتا

ہوں کہ صورت حال کو بگاڑنے میں اس قاری کی طرف جو ہمارا دوست نواٹمن ہے، ایسے نظریے سازوں نے زیادہ مصیبت کھڑی کی ہے جو یہ نہیں ہاسنے کہ وہ کہہ سکا ہے ہیں۔ اس کو پیش آنے والے غیر معمولی اور معمولی حالات و واقعات ان کی نظریہ سازی پر اثر انداز ہوتے رہے۔ یہاں شکت کے طور پر افسانے کے فنی خطرہ پر غور کیا گیا ہے کہ ان کی تحریروں کا ہاتھ لکھتے ہوئے آج جسے "نیا افسانہ" کہتے ہیں۔ کل اسے ڈاکٹر نے نظر آتے ہیں اور کل اس سے بڑھ کر Vague ہے۔

افسانے کے اس کے خطرے سے پہلے اب میں دو بڑی اور بہت واضح نظریاتی کردہ بندیاں موجود ہیں۔

۱۔ ترقی پسندی کا چلن زیادہ جگہ فیشن کی حد تک، اور

۲۔ کلاسیک انداز نظر، روایت کے صحیح مفہوم سے نا آشنا

ترقی پسندوں کے نزدیک اولی نظریات کے ساتھ ساتھ مخصوص سماجی، معاشی اور سیاسی خطرہ بھی اہمیت کا حامل تھا۔ اس انداز نظر کا نتیجہ آدھ حقیقت نگاری تھی جو ترقی پسند افسانہ نگاروں کے قلم کا نمونہ کی جگہ کا بنی تھی۔

دوسری طرف کلاسیک انداز نظر رکھنے والے افسانہ نگاروں کے ہاں سیاسی، معاشی اور معاشرتی حقائق کے ساتھ نظر پر مبنی تھی۔ لہذا دوسری طرف کلاسیک انداز نظر رکھنے والے افسانہ نگاروں نے حقائق کو تیار اور وہ قلمی نقطہ نظر اس سے متعلق مباحثات کی نگاہ تاریک راہروی۔ لہذا اس کی جگہ کے لیے صرف اور صرف تکنیکی اور بے جتنی روایتی نہ صرف موضوعاتی سطح پر بلکہ افسانوی تدویر نگاری کے اعتبار سے بھی۔ یہ نہیں بلکہ خطر کے گہرے اثرات کے ذریعہ افسانہ نگاروں کے ہاں خطرہ "دہاں میں خطر" تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ تیسری دہائی میں درست کا یہ خطرہ نامہ پانی بچاؤ کو ختم کر دیا تھا، اور دہاں میں خطر کی نہیں حیران تھی کہ ابھی کچھ عرصہ پہلے تو یہ کہا اور مانا جاتا تھا کہ:

"The system works, with reservations."

لیکن اب کہا جا رہا تھا "The system does not work, but used to"۔ مقابله کا نشان اپنے معانی بدل چکا تھا۔ اس لیے کہ "سخت" "بہترین نتائج سامنے نہیں لاد رہی تھی۔ کام اپنے طور پر ایک اہم قدر نہیں رہ گئی تھی۔ ماضی سے آزاد آتی تھی "آزادی روپے پیسے کی دین ہے۔ جس قدر روپے ای قدر آزادی اور بے لگاری۔" لیکن اب سچائی تھی کہ:

"Freedom is a state of mind, it requires only minimum money, hunting after money and success curtail freedom."

اور اس طرح نئی سنگڑوں۔ لیکن کیا اب ایک ایک کر کے بے گناہ ہو چکی ہیں۔

نتیجہ یہ تھا کہ اس صورت حال کو سمجھنے کی بجائے افسانے میں انھیں اہمیت اور ماضی پرستی نے راہ پائی بلکہ ایک حد تک یہاں کی جہالت کی عکاسی بھی ہوئی۔ دیگر کاغذ کا زکوٰۃ چھوڑنے پر قرآن مجید اس سے تعلق نہیں اور جس نے اس طرف اشارہ کیا وہ انتظام حسین تھے۔ اور پھر انتظام حسین بھی دلتہ دلتہ ماضی کے اسیر ہوئے۔ سوائے دو افسانوں کے۔ یہاں پھر انتہاء "دوسرا راستہ" اور "بھگت کے خوش نصیب" کی طرف ہے۔

انتظام حسین کے سفر کی ایک جہت اہمیت یہی ہے جو ان کے ہاں کو "کھانا" سے قریب رکھتی ہے خصوصاً "سپر" "سونا" اور "گھوڑے کی غذا" جیسے افسانے۔ "کچھوٹے" انتظامی افسانہ نگاری میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی اعتبار سے نمایاں سوزناہت ہونے کے ساتھ

ساتھ بھاری اعتراضات کی گھاٹلی بھی پیرا کر گیا۔ پہلا اعتراض یہ کہ اب انتظار حسین نے جان بوجھ کر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہائیڈروجنی کے حوالے سے لکھنا چاہا ہے اور یہ شعوبی کوشش کا کلی قول نہیں۔

ایک نظر انتظار حسین کے افسانہ ”کھوے“ پر ڈال لیجئے

”وہ ساگر چپ ہو گیا تھا۔ اس نے ہلکھوڑاں کو دلہنی آواز سے بولتے سنا لڑتے دیکھا۔ اور چپ ہو گیا۔ سنتا رہا دیکھتا رہا اور چپ رہا۔ نہ ان کے سچ سے آغا اور مگر سے باہر یا سبوں سے دور ایک مثال کے چڑ کے چپے ناوگی کا کر چڑ گیا، اور کھول کے ایک بھول پر نظر میں سما گئی جو بھول، مسکا اور مرجھا گیا۔ ایک بھول کے بعد دوسرا بھول، دوسرے کے بعد تیسرا بھول۔ جس بھول پر وہ درشتی بنا تا وہ بھول، مسکا جاوہ مرجھا جاتا۔ یہ دیکھ کر اس نے شوک کیا اور آنکھیں موند لیں۔ اس دن آنکھیں موندے بیٹھا رہا۔“

افسانہ ”کھوے“ اور ”ناگہنی“ چانچ کہانوں سے مرصع ایک ایسی زد ہے جو حد تک شوڑاں کے تجربات سے بہت قریب ہے اور بعضی زبان کا دربار اس کی ایک اضافی خوبی۔

میں تو یہ سارے کام کوڑوں کی عیاشی ہی گردانتا ہوں اور حال کے لئے میں خبر سے انتظار حسین کے بعضی کے حوالے سے مستقبل کی جانب روشنی اندر ہے۔

سہ ماہی چلی تھی، مٹی پتی سے اور یوں قرۃ العین حیدر کے ساتھ انتظار حسین اور فاضلوی تدویر کاری زیر بحث آگئی۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، افسانے کے قلم نگار میں داستانوں کی تدویر کاری یا Allegorical Treatment کا معاملہ ہے تو اردو افسانے کے لئے نام کار پاشی، احمہ چاچ، شعلی، اسلام بی رزاق، مسلم لازار اور علی حیدر تک اس دلوپ پہنچے ہیں۔

”کمر چمکا پھا، اور بہت صاف اور جتنی قرار شد یہ تکلیف سے ان کے کہو شہ کر ہیں جا گئیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ غصہ، ذہن اور حماست نے ان کی الجیب کلیتہً کرا دی تھی۔ انہیں لگ رہا تھا کوئی انہیں دیہی کی طرح جتا رہا، ہاں مگر وہ کیا کر سکتے تھے کہ ان کے پاس نہ سہلپ کا سا بچہ تھا، نہ چاندو کا لکڑی کا ہاتھ، نہ چٹا سکتے تھے کہ اب ان کی پچاسی ان کے دھوڑ کی کو اسی بن گئی تھی۔“

(”عنی“ از اسلام بی رزاق)

دوسری مثال مسلم سلازاک ”گور کن“ ہے۔ اس روایت میں کمار پاشی کے افسانے نقوش احوال کی حیثیت رکھتے ہیں اور تقریباً تمام تر اہل نے اس تدویر کاری کی مثال لیکن کمار پاشی کے اس نقوش نگاری میں حماست ساری کا یہ جزو غلط خاصا دکھاتا ہے۔

یورپ کے افسانوی روپ میں آرمینی کا Animal Form اور Brave New World جیسے کتاباں ناول داستانوں کی فضا کے حامل ہیں۔ اسی طرح آئرس مینے وک کے دو ناول ”Unicorn“ اور ”Sword Head“ داستانوں کی تدویر کاری کے اعتبار سے اور ”Belf“ فٹلسٹی سے قریب تر ہونے کے سبب بہت نمایاں ہے، مگر گورنگ کے Lord of Flies کی فضا تک اپنا دھننے تو یورپ میں قبول ہو گا اور یہ حاصل کیا۔ Lord of Flies میں مصوم بچوں کی موجودگی اور خرابا کا ہوا سرچہ راہ کے سچ لکھتے ہونے میں طرح بھلی سزا کا سر نہیں، چنانچہ اتحاد و اختلاف میں بٹ پاتا ہے بالکل اسی طرح اردو افسانے کے لئے منظرے سے میں یہ تدویر کاری، مٹی، مٹی کی امیری قرار نہیں پاتی۔ میں تو اسے مصلحتی دور کا احوال تدویر قرار دوں گا۔ یہ مصلحت کا بھی کیا دھرا ہے کہ ہر کوئی ”Mind your own business“ کا مانگ لاپتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر داستانوں کی تدویر کاری اور Allegorical طریقے کار مصلحتی دور کے شعور کے خلاف لا شعور کی بلات میں کر اٹھتے ہیں۔

سرحد پر کاش کا افشاں باز گونی، ماس صنعتی دور کی ذہنی اور سیاسی روش کے خلاف باطنی اندر دل کا طرصورہ ترین عکاس ہے۔ میں تو کبھی کا کہیں افشاں لوگوں کا اس قویٰ خلقی شے کی بات ہے اور اس کا انحصار کسی حد تک حلق کار کے اندرونی جوار بھالنے پر بھی ہے۔ یہ ایک ایسے حسی نظام کی عکاس ہے، جس کا واسطہ فعل و دیا کے بارے میں علم اکٹھا کرنا نہیں۔ یہ خصوصی حسی نظام زندگی گزارتا نہیں کرتا کھاتا ہے۔

زندگی کر کے اور زندگی گزارنے میں جو فرق ہے وہ حلقی سطح پر زرخیز ہے اور عام انسانی سطح پر یہ اور کرتا دہی زندگی سہرا کر اور دیتے اور باقی زندگی مع فرحت و سعادت ختم کر کے کی حیثیت سے دن پر سے کرنے میں ہے۔ بہت ہوا تو کچھ لوگ چارے کی چالیوں پر چاگ کپ کی خاطر اپنے سامنے کے مشاہدات پر غور کر لیتے ہیں۔ یہاں Robert E. Ornstein نے سوال اٹھایا ہے کہ کیا ہمارے حسی نظام کا واسطہ فعل و دیا کے بارے میں عمومی معلومات اکٹھی کرتا ہی ہے؟ ایسا یقیناً نہیں ہے، یہ انا کہ ہم آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں اور اس سے بھی انکار نہیں کہ دیا کے بارے میں علم اکٹھا کرنا جسم کے حسی نظریے اور حسیات کا عمل و فعل اس کام میں سب سے زیادہ ہے۔ لیکن تھران کن بات یہ ہے کہ ہمارا حسی نظام اپنے روزمرہ کے باہر برعکس بھی عمل پذیر ہوتا ہے اور اس کا علم سامنے کے مشاہدات پر غور کرنے والوں کو نہیں۔ بلکہ وہ ہے کہ ان کے نزدیک انکار حسین کے "الہا قصہ سرحد پر کاش کے زدنے کی آواز" خاندہ حسین کے "سایہ" اور خود میرے افشاں "سوئے کی سر" کے کوئی معنی نہیں اس لئے کہ ان کے نزدیک ہمارے اندرونی جوار بھالنے کے کوئی معنی نہیں۔ دوسری طرف سیدھی سادہی کو مت صحت کے افشاں نے انہیں کچھ نہیں آتے اس لئے کہ ان کے اندر حوں نے کبھی کو مت صحت کا وہ چہ نہیں بہا۔

دیا کے بارے میں ہمارا عام تصور انتہائی بھی ہے اور نظام حسی کی اپنی خصوصیات کے تحت محدود بھی۔ یہ بات پہلے بھی کہی جاتی رہی ہے لیکن واضح قریب میں اس کے صحیح مفروضاتی ثبوت بھی بھرا آگئے۔ Broadhurst اور Huxley نے برکس Bergenon کے "عمومی نظریے شعور" کی وضاحت کی ہے (برکس اس کے نزدیک ذہن ایک سکر نے سکر نے سکر نے آؤ" ہے)۔ کھیلنے نے "The doors of reception of heaven and hell" میں کھیرج کے ذی۔ سی براڈ کھول دیتے ہوئے لکھا ہے

"دماغ اور نظام حسی کا کام ہمیں ظم کے اس بڑے (خبرے سے غور کردہ اور پریشان ہونے سے بچانا ہے۔ جو زیادہ تر زانیہ اور غیر موزوں ہوتا ہے۔ اکثر باتوں کو ہمارے ادراک اور حلقے کا مستقل حصہ بننے سے روک دیتا اور صرف اس بہت قہورے سے خصوصی انتخاب کو اجازت دیتا جو کبھی طور پر منہ پر ہوتا ہے۔"

یہاں دماغ اور نظام حسی کی کارکردگی کی وضاحت کے ساتھ ساتھ زانیہ اور غور طلب بات وہ زائد اور غیر موزوں خصوصیات ہیں۔ جن کی ضرورت انسان کو عام معاشی سطح کی زندگی گزارنے میں کبھی محسوس نہیں ہوتی بلکہ ہوتی چاہیے اس لیے کہ چارے کی چالی پر چاگ کپ پانی ہا کر آدھی زندگی سہرا کر اور اپنی کھانے پینے اور گزار جانے کی صورت میں دینا سے عمل (راجی سی) ضرورت کے مطابق) آگے کافی ہے، باقی اس کے لیے زانیہ اور غیر موزوں۔

براہ سے حلقی تجربہ کرتے ہوئے کھیلے لکھتا ہے۔ "اس نظریے کے مطابق ہم میں سے ہر شخص شکلات کی حد تک "Mind at large" ہے۔ لیکن جہاں تک ہم جہاں ہیں، ہمارا مقصد ہر طرح سے یہ ہے کہ ہر طرح سے زائد ہیں۔ معاشیاتی چارے کو ٹھن جانے کے لیے ضروری ہے کہ اس ذہن و سطح کو دماغ اور نظام حسی کے "Reducing Valve" میں سے گزرا جائے۔ اس عمل میں سے گزرنے کے بعد دوسرے سرے پر جو کچھ باقی قی Qہ ہے، وہ انما فقرہ ہے، جسے ہم شعور کا "Qہ" کہتے ہیں۔ جو میں اس مخصوص سیارے پر زندگی کرنے میں مدد دیتا ہے۔

سارتر کے فلسفے کا مرکزی نکتہ ہی یہ شعور ہے "جیسے اس نے حدیث "کا مادی"۔ سارتر کے نزدیک وجود و سائنس و جہاد کا نکتہ ہے اور شعور اس ہے جان و سب شعور جو زندگی ہے۔ یہ وجود و سائنس و جہاد کا نکتہ ہے اور شعور اس ہے جان و سب شعور جو زندگی ہے۔ یہ وہ مظاہر ہے جو سائنس و جہاد کا نکتہ میں پیدا ہو کر "جہان میں حق" خلق کرتا ہے۔ یہ کسی لمحے بھی مکمل نہیں کہا جاسکتا۔ اس کا مگر تحلیل و دراصل اس کی حدیث کی دلیل ہے "اگر یہ دنیا وجود لگاتی ہے (انسانی شعور یا خود انسان) بھی بذات ہے جان و سب شعور جو زندگی ہے جو جانے۔ شعور و ارادے، اختیار اور آزادی کا مظہر ہے بلکہ جسم اختیار ہے۔ ایذا نگہ کے نزدیک شعور ذات حیات کے ذریعے حاصل ہوتا ہے جبکہ سارتر کے نزدیک کرب سے گزار کر یہی "کرب" سارتر کی مراد وجود و زندگی صورت میں اپنے مستقبل کے ہونے کا شعور ہے۔

سب شعور جو جسم زندگی گزارنے میں مدد دیتا ہے، وہ تکلیف شدہ آگئی ہی ہے۔ جس کے اجزاء کا کچھ طور پر جان اور اس کا اظہار کرنے کے ہے انہ ان نے اشاروں اور کلام کا وہ نظام وضع کیا جس کی تفصیلات پانچ غزواتوں کی صورت میں ظاہر ہوئیں۔

یہ تو وہ فی الواقع ہر شخص اس انسانی روایت کا جس میں کہ وہ پیدا ہوا ایک وقت Victim اور Beneficiary ہے۔ جہاں زبان اسے دوسرے لوگوں (جہاں انسانی برادری) کے تجربات کے منبع شدہ ذخیرے میں شریک بناتی ہے وہاں اس کا یہ یقین بھی پختہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ تکلیف شدہ آگئی ہی سب کچھ ہے۔ اس طرح ہر فرد انسانی روایت کا جو اس طرح دکھا رہوتا ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنے محدود تھکات کو سب کچھ سمجھ رہا ہے اور دوسری طرف لفظ کا شہنشاہ "بند ہے" کے قہر میں خیال کرتا ہے۔

"تیسری دنیا" (کرب و عذاب) کے ساتھ وہ سماج (جن میں لائیں امریکہ، ایشیا اور افریقہ کی حکومتیں اور ہلکی ہوئی آبادیاں شامل ہیں) میں اس انسانی روایت کو انسانی زندگیوں پر اثر انداز ہوتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے، اور اس حکومتیں ہوئی آبادیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے خود ہمارے شے سے بھی اس کی مثالیں ایک (عوضے پر اترتی ہیں۔ ان محدود تھکات کے اسیروں اور لفظ کو "شے" یا "بند ہے" کا قہر لگنے والوں کی مثالیں ایک جھک دیکھنے کے لیے بھی نکالیں صفات و کارہوں کے۔

پتا چلا کہ "شے" یا "بند ہے" کے ذمہ دہل پڑتے ہیں روایت میں تو سب ممکن نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ "شے" انسان نگاروں نے اپنے کردار میں کی حکایت بہت اچھی طرح کی ہو، لیکن سال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے حکومتیں ہوئی آبادیوں کی نفسی کیفیت کو کچھ پرکھ کر کوئی پانچ سو سال کی کوشش کیوں نہیں کی کہ وہ دھڑکی نہ اٹھیں ان کا بیٹا بھی آسان نہ ہو جاتا وہ زندگی کو "خود" نہیں، "کرتا" سمیٹتے مڑول گفتگو میں سے گزارتے۔ سال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کیوں نہ ممکن ہو سکے۔

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ قلم کار کے محدود تھکات ہیں اور دوسری وجہ یہ کہ وہ لفظ کو بند ہے کا قہر میں خیال کرتے رہے یا پھر اس لیے کہ مٹی فتنوں کے پابند ترقی پسندوں اور انسان کے دواں میں حشر کے بیشتر انسان نگاروں نے وہ زبان برتی جو لفظ کی پابند زبان تھی اس طرح یہ مردانہ گفتگو میں کا قدر ہوئی اور کسی جگہ بات ہے کہ اس عمل قحط سے گزارنے کا واحد سبب "ابہام" کے پیدا ہونے کا طوفان تھا۔ یہ شے نہ سب کی زبان میں "بند ہے" کہتے ہیں تکلیف شدہ آگئی کی کائنات ہی رہی جس کا اظہار زبان کے ذریعے کیا گیا اور جسے زبان نے ہی محدود کر کے رکھ دیا۔ جبکہ "دوسری دنیا میں" (جن میں نئی نوع انسان اپنے محدود وسائل کے سبب جگہ اور بے انتہام طریقے سے رابطہ قائم کرنے میں جانا ہوا ہے) کا خاص طرح کی معنویت کی حامل ہیں۔ یہ دراصل اس آگئی کے نکل کے ہی ایسا اجزاء ہیں جس کا تعلق نفس و سنجے سے ہے۔ بیشتر وقت بعض اوقات عقل وہی کچھ جانتے ہیں جو کچھ کہ انہیں "کامن" کے عقلی دماغ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور جسے خصوصاً ہمارے دماغ کی

ملا کافی زبان خاص اور اصلی ہونے کا حق سب بخشتی ہے۔

اس گری پڑی دنیا کے توالی غفلت کار ایسی اضافی مساحیت کے مالک ہوتے آئے ہیں جو زمیں کے اس "جھٹکلی والا" کو چنگ و پتہ کھینچے ہیں اور اس کے قہقہہ میں ان کا اظہار ان کے ہاں ایسی زبان کا اور چار ساٹھ لانا ہے جو سراسر قہقہہ نقل و حرکت کی حدود میں قید و کھنڈی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ قصور و احسانات کی ایسی پیشکش ٹھہر پاتی ہے جس کا منتقلی ہی افرح مشکل ہوتا ہے لیکن جو اپنے سامع اور قاری کے حقائق کو محدود سے محدود کی راہ دکھاتی ہے اس کی دہرائی مثالیں اگر اسی طے کی قدر یہ قہقہہ جی روایت سے حاشا کی جانیں تو مصنفیہ کا یاں اس کی ایک خوبصورت ترین شکل دہلا ہے۔

شبہتہ اور رنگ زیب کی مانند کروہ پکڑ پکڑیاں اسی "جھٹکلی والا" کی دوسری شکل ہیں اور دراصل وہ اس "جھٹکلی والا" کو چنگ و پتہ دینے کی اضافی مساحیت کا سبب۔ جلی مفر کے المانے سے اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

"میں نے دیکھا وہاں تم کڑی قمیص تم اور تم کھتی ہو تم وہاں بھی نہیں تھیں۔"

"میں کڑی قمی؟" وہ صغریٰ حیرت سے بولی۔

"ہاں تم اور بھر پاتی ہو سب سے بڑا صغریٰ وہ تھا جب تم نے مجھے دیکھنے کے باوجود دیکھ کر چپکے سے آنیں، ہجرہ کا خلاف اٹھایا، مگر تمہارے حسد سے جب حشرات اور کراہت سے لہری آواز اٹھی۔" "اؤں ہوں۔" تم نے اگلی اور اگلے کھٹے کے درمیان اسے کٹھ سے اٹھایا۔

"اؤں ہوں سب کا سب کیڑوں سے گرا ہے۔" تم نے جھگڑے کا دروازہ کھول کر اسے در سے باہر پانی میں لٹا دیا۔ اس کو جو اس کے اندر تھا اس کے گرنے کی آواز آئی۔ میں آگے بڑھا کر دیکھوں اسے دیکھوں مگر تم راستے میں کڑی قمیص اور مجھے اس خوف نے آدھا کیا کہ کبھی چاس بچے لے گا آواز نہ ہو اور میں رک گیا۔ چلا آیا۔ چلا آیا۔ بھاگتا ہوا۔ دیکھو میرے پاؤں میں چھالے چھالے ہیں۔"

("ہجرہ" از خالدہ صبیحہ)

"وہ اس قہقہے میں یوں نمودار ہوتا ہے جیسے کاکا تہ میں کوئی پناہ دیتی نظر نمودار ہوتا ہے۔ چپ چاپ اور ہلکے سے لے لے رہے۔ صغریٰ۔ بے اطلاع اور وہ جب کھٹا ہے تو اسے چامچ مسجد کا چٹائی نام۔" شیطان درخیم" قرار دیتا ہے۔ جبکہ سروانے کے لڑبے، کٹ کی جی اس کی طرف سے چٹائی کی ہوئی چھوٹی سی کڑی کی منتقلی پر کبھی کبھار میں اپنا پیرہہ کھینچتا ہے۔ اپنے تمام بچے ہونے زبانوں کو نکھاتی ہے۔ یہ مشتق کرتے ہوئے لوگ ساری زندگی اپنی فرصت بھی نہیں پاسے کہ یہ جان سکیں کہ کھڑکیا ہے اور کیا نہیں؟"

("صورت گروہ من" از کاہا وطنی)

اس خواہش سے غیر مسود کے المانوں میں حیات کا عمل قابل قوی ہے۔ دیکھنے سے زیادہ سو گھنے، سنے اور چھونے کے ذریعے اس روپہ زوال دہ کو یاد کر گھم سے وجود میں لانے کی خواہش اور کچھ المانوں میں اس سے الگ صورت حال بھی ہے۔ یعنی موجود کو لا موجود بنانے کی خواہش۔

"یہ ممکن ہے کہ کافور باقی رہے اور اس کی خوشبو اڑ جائے۔ یہ البتہ ممکن ہے کہ کافور اڑ چکا ہو مگر اس کی خوشبو باقی ہو۔ اس دہرائی میں

کہہ رکھائی دینا اب صرف افسانہ کا طرز کے سہجئے پر موقوف ہے۔"

("اسطر کا فوراً" ذخیرہ مسطور)

"شیش گمانت" "سیما" "نور" "ساراسی جہلم" جیسے افسانوں میں ٹھیل اور اچھے کی مدد سے اس "تختی والو" کو چکر دے کر ایک ایسا جہان قیصر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو کائناتی طرز کا ہے۔

دوسری طرف Mediocre کے پاس یہ ماضی By Pass یا قحط لاتی طور پر یا اردنی کوششوں اور تحریک کے ذریعے یا پھر غفلت کی مدد سے ممکن ہوتا ہے۔ اولین گروہ کے نرالی تخلیق کاروں کے پاس مستقل طور دوسری صورتوں میں ان ماضی By Passes میں سے ادراک کا ایسا سامنا ہوتا ہے جو کائنات میں ہر چاہا توغ پڑے ہوئے والی برٹے کا ادراک تو نہیں (کیونکہ By Pass تخلیقی اور ادراک جو کہ کبھی تک نفس و سنج کے کل اثر ادراک دیا ہوتا ہے، بالکل ختم کر کے نہیں رکھ دیتا) لیکن جتنا طوائف اور طریقوں سے منتخب کیے گئے کسی مادی کے پختے ہوئے مفید اور انحصار (جسے انحصار اور افسانوی زمین حقیقت کی ایک مکمل تصویر سمجھا ہے) سے کہیں زیادہ اور بہت مختلف ہوتا ہے۔

اپنے خصوصیات سے زیادہ مہذب لوگوں کی ایک تصویر دیکھئے

طوائف، غفلت، زور، مغرب کے ادراک، سیکائی، سفید پڑتی ہوئی آنکھوں والے، جو قدرتی روشنی کو ترستے ہیں۔ عقل جن پر عالم حکمران کی حیثیت سے حکومت کرتی ہے۔ احساسات سے کئے ہوئے، رنج و رنج، لوگ، مختلف فنون میں ماہر اپنے گرد کھینچے ہوئے حصار میں قید، مکمل فتنہ میں سانس لینے کو بچاؤ پ لوگ۔

"Tomorrow Never Knows" "میں یہ لوگ مشہور فلمی نرادر، "Beatles" کا موضوع ہیں

"اپنے ذہن کو بند کر لیں، سوچیں، رہنے والی

جسم دھیرا چھوڑ دیں، اور پانی کے بہاؤ پر بہ جائیں

یہ موت نہیں ہے

چھوڑ دیں، سوچنے چھوڑ دیں

اور اپنے آپ کو مسخوں کے حوالے کر دیں

تاکہ آپ اپنے آپ کو جان سکیں، دیکھ سکیں

جوتا ہاں ہے، اور "ن"

ان ماضی By Passes کی خواہش کرنے والوں کی بھی کمی نہیں، یہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ ایسی کوششیں جو مادی کی ساخت آگہی کی خاص کیفیت کے حصول کے لیے ہوتی ہیں، احماتی ہوتی ہیں اور ان میں بھی کامیابی معلوم ہو کر پھر ایسی کامیابیوں میں بھی رشتہ رشتہ قائم ہو جاتی ہیں۔ جس طرز کا ماضی مستقل ذوالی پڑے ہوئے ہمیں پہانہ سے آواز ہی چاہیے۔

مستقل ذوالی پڑے ہوئے پہانہ سے آواز ہوئے افسانہ کاروں میں سے جس ایک کی مثال دیکھئے

”بھری دانی مجھے ایک ہوئی تھی کھائے تو نہیں دیتی۔“

”میں بڑے دھیان سے کئی اور لی رستوں کو دیکھتا ہوں۔“

”میں ان کی طرف سے آنکھیں پٹاتا ہوں تو اچانک مجھے اس کی آنکھیں دکھائی دیتی ہیں۔ دانی آنکھوں میں کچھ برقی ہوئی سیاد چٹیاں اب سر سے غائب ہو چکی ہیں اور ان میں چاروں طرف دودھیں سفیدی پھیل رہی ہے۔ یہاں تک کہ وہ پھیل پھیل کر اس کے چہرے پر اترے گی ہے۔ چہرے سے گردن تک آگئی، چھاتوں سے تاگوں تک پہلے ہی ایک سفید چادر چڑی ہوئی ہے۔ ہذا سفیدی نردن سے آڑ کر دانی کی چار پائی ہڈی تک گئی ہے۔ اس نے ہٹوں میں چڑے ہوئے سفیدوں کو سفید کر دیا۔ ایک مٹی کے پتی میں دنگے تو مٹھوں کے سیاہی، گل ہٹے ہوئے ٹھکروں پر سفیدی پھیل گئی ہے۔“

”اب مجھے یہ سحر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔“

”اب پانیہ نہیں تھی تو کسی کی موت، خدا کی انسان لڑا پانچ مرضی ہوگی۔ اب احساس کا مسئلہ یوں حل ہو گیا ہے کہ موت ضرورت سے قتل ہی پانیہ لڑن کرتی ہے۔“

”مٹھوں موت ہی باخبر ہے۔“

”اگر موت یہ کہے کہ وہ ہندوستان کا سیاسی نظام ہے تو خدا کو اپنے سحر و اختیار پر حیرت ہو سکتی ہے۔“

”19 سال کے پیرام کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ خدا کی مرضی اتنی طویل ہو سکتی ہے تو اس کا ایک مطلب ہے کہ 19 سال سے اب تک پتلا می مسلسل ہے۔ ہٹاوی کیوں کہ پاتا ہے کہ اسے کسی نے گولی ماری تھی اس کا پارت ٹل ہو گیا تھا بلکہ وہ تو خدا سے دارا آج تک دائیں ہاتھ میں سرخا کیلے سے سڈھکا ہوا گوند لے بھر رہا ہے۔“

”دع دالمیں کوئی دینا بہار یوں سے پور نہیں ہوتا بلکہ نہیں بچک مانگنے کے انوکھے رنگ بتا ہے۔“

”تو دوسری تو مٹھوں را کھسوں میں ہے۔“

”میں انکو خواب میں را کھسوں کو چلاتے دیکھتا ہوں۔ وہ ہندوستانی حکمت سے واقف نہیں۔ ہاتھ پیر کرنا انھیں کر سکتے اور نابا اسی لئے انھوں نے ”ایڑاڑا“ کے طریقہ رنگ کو دھیان سے دیکھا نہیں۔“

یہ تقریر آپ نے کیا رد و تحکوں میں دیکھی۔ کیا آپ کو یقین آئے گا کہ یہ آپ ہی افسانے کا طویل اقتباس ہے؟ لیکن یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ افسانہ تو ”سبھی“ اور لکھنے والے امور میں اس خیال کے اعتبار اور فیصلہ جبران کے گھسے پے طرز میں ”لوک واقف“ اور ”سبھا جا“ کو افسانے کے نام پر سکا کر کے قلم کار کا گرد و بھی پنا ہے تو اس کا کیا کیا جائے؟

جدید تفکیرات میں اس عمومی نظریے کی حمایت کرنے کا دھقان پایا جاتا ہے کہ عام آگمی ایک Personal Construction ہے نہ کہ خارجی دنیا کا کار کا ڈاکٹر کہ ”سو تو میں کے کہے چاروں کے اتصال“ اور ”تھی فکھوں کی بندھت“ (لڑاؤ فکھوں) کو یقیناً سامنے لہا سکتا ہے۔

”اس نے کمز کی میں اندر چہرے اور ٹیکوں سے آنکھیں چھڑا کر زمین کو دیکھا۔

”ہوں بھر دانی ٹنگ ہے۔“

اس نے اٹھتے ہوئے گو جسے کو پا لگا۔ ”آؤ بھر دیا کو بھیں کہ پانی ہی پانی کے آسمان پر چلا گیا ہے۔ آؤ کہ ہم اس دانی عمل کا صف

ہیں۔ یہی ہمارا انعام ہے۔ یہی ہماری سزا ہے کہ یہ ہمارا اپنا فیصلہ ہے کہ ہم زندہ رہیں گے۔ ہماری عقل کا ٹکڑا ہماری خواہش کا تسلسل ہے۔ اس نے گندھے پر بالیاں لادیں اور مضبوط قدم اٹھاتا ہوا اور بڑا کچل دیا۔“

(”تھکر“ از انور سجاد)

”سب برف پچھلے گی اور کب بھر سے بازو مجھے ملیں گے؟“

تین یقین ہوا ایک دن ایسا ہوا کہ ضرور ”اور ہم سب پھر گلیوں کی طرح اس سندھ کی بے کراہی میں تیرتے پھریں گے“ جب تک سب کے بازو کٹ چکے ہوں گے کہ گلیوں کے بازو نہیں ہوتے!“

(”برف پر نکال“ از سرمد پر کاشی)

واضع رہے کہ ایک زمانے تک براہ راست تصادم کی حالتوں کا بیان کرتے ہوئے محض خارجی دنیا کا کارہاڑا مرتب کیا گیا، جبکہ ان دونوں مثالوں میں اسٹیلٹھمٹ کے ساتھ رہو اور اسے کوئی ٹکراؤ نہیں دتہ۔ بس دو جگہ کشوں کا ایک فیصلے تک پہنچنا ہے کہ ”ہم نے زندہ رہنا ہے“ اور بس یہ فیصلہ ہی اجتماعی طاقتوں کے خلاف بڑی جرات ہے۔ ایسی استعاراتی اور تشبیلی عقلیں اس سے پہلے رواجی طریقہ کار میں شکن عی نہیں تھی۔ اس لیے کہ وہاں ”ابہام“ پیدا ہو جانے کا خوف تھا اور یوں ناواقفیت میں قاری کی آگہی کی بظاہر خارجی دنیا کی Registration پر رکھی جا رہی ہے۔

تلفظی لحاظ سے اور جلی حواس کو چھوڑ کر خاص طور پر ہمارے ہاں عام غلط فہمی یہ ہے کہ ہمیں اس شے یا وقت کا تجربہ ہوتا ہے جو موجود ہو، اور یہ کہ خارجی دنیا مکمل طور پر داخلی فہمی تجربے میں منعکس ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم ان مختلف النوع قسم کی حالتوں پر غور کریں تو کوئی بھی ایک لمحے میں ایک وقت ہم پر اپنے اثرات چھوڑ رہی ہوتی ہیں تو یہ خیال ایک بہت سی سادہ طور پر باری ہو رہے ہیں تو یہ بھی قائم رکھنا چاہیے کہ۔ برقی قوت، آواز، روشنی کی شعاعیں، بخار، سردی، اندر کی کیمیائی اور برقی ردائیں، حیوانیت، حیوانیت، اندرونی مصداقی حساسات اور بہت کچھ مستقل طور پر کس صاحب سے ہمیں اپنے حصار میں لیے رہتے ہیں اس کی عقلیت پسندانہ اور اس میں منظر کے افسانے میں محض ”تکین“ اور ”اشارے“ کے ذریعے محض عی نہیں۔ اس لیے جو کچھ چھوڑ دیکھا جا۔ کاس کا بیان ہوا۔ آج پیش منظر کے افسانے میں یہ جانکوں کو لکھنے والے کا کام استعارے، علامات، تشبیل اور اسطوری مبالغہ کا کیا حرا ہے۔

نیم سو صدی کے سابقین وہ بے حد حسین الحق شخصیات، عبدالصمد اور علی امامت خیر اس حوالے سے اپنی پیچھے رہ چکے لیکن آگے چل کر افسانے کے وہ میں سید محمد اعظمی (کھڑکھا میرزا)، مختصر (افسانہ)، کنوڈا قتل اور دسویں صدی کے افسانہ پر ابھر کر سامنے آنے والے نادر ہادی (افسانے) ”پیتھ کی طرف سے“ ہوئے گئے“ اور ”گوڈ“ نے بھی جاننے کے دھوم دھڑ کے کی گونج دیا تھا جن کے سادہ بیان پر صدقے داری جانے سے بے پروا کردہ علامت اور استعارے کا تخلیقی استعمال کیا۔

سادہ بیان کے کمال چھپانے والے قادرین آخر کیوں نہیں جانتے کہ سادہ بیان ایک تھکی پٹی راہ ہے اور تجلّاتی اثر ایک جہاں صلی ساتھ بے کرا کے بڑھتی ہے۔

”اپنا کھنکھرا کر پھر ابھرا مجمع نظر آیا۔ اس نے پہلے ہوئے ہاتھوں کو سینے کے پیشے کے دونوں پیشوں کو صاف کیا۔ دو بال سے پیوند

تھپتھا کر فٹ پاتھ پر آیا اور ہاری ہاری سب کو دیکھنے لگا۔ اچھی جھلک کر شہریت کی راکھ کرائی۔ زور سے لمبی لمبی سانس لیجی تھی تو کچھ جیسے گلے میں دھوئیں کی دلی تھی گئی ہو۔ اُس نے جلدی سے ہتھیں بٹھکی لیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور سانس ڈکے گئی۔ اس نے چہرے کے ٹھٹھے صاف کرتا چاہے تو ہاتھ اودا تھیں کہ اپنے نگلیں اور چاروں طرف بے پناہ غور کیجئے گا۔ ساری آواز میں جیڑی سے گھڑا ہوئے نگلیں۔ پھر پھٹ کی آواز کے ساتھ ہی تمام آوازوں سے اس کا رٹھو منقطع ہو گیا۔ شور کے معدوم ہوتے ہی سردا مٹھرا دھپنے لگا اور آواز میں دھڑکنے چھوٹنے چھوٹنے میں بدلتے نگلیں۔ پھر وہ بچہ آسمان پہنچا۔

(”تمہیں کاب آوازوں“ از طرہ حسن)

”ظاہر ہے بہت کچھ درج کیاں ہو کر اس بات تک پہنچا جاسکتا تھا۔ جس کی جڑاں نکھیں، جڑاں پاتھ، ڈار پاؤں اور اس کی کان تھے اور جڑاں مٹھکھڑکی کہ کتنی صدیاں گزر گئیں، لیکن سورج بھی اس کا بکھڑا ہوا ڈاکہ کے قہقہے سے بھی اسے گلے نہ کر سکتا۔ نے اُسے مہدم کیا، نہ ہی اس کے پھاروں میں کئی آئی وہ سب کا دشمن تھا اور انفرادی طور پر سب اس کے دشمن تھے۔“

(”سہوینہ“ شفقت)

پٹن مٹر کے المانے سے چٹھلی ٹرکس طرح اپنے ارد گرد کی دھندلی اور بے لاییت دنیا کو باطنی دماغ نے کاچن کرتی ہے۔ ہر ذرہ ایک گھل دھڑکتا ہے، ایک تو یہ کہ تخلیق کار اپنے مخصوص جسمی نظام کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے ارد گرد کے سارے کوسیت کو سادہ داتا ہے اور اس میں سے چند ایک خصوصیتوں کو آگے بڑھاتے ہیں کہ تخلیق کی اجازت دیتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ان نہایت محدود ذرائع (خصوصیات جسم) سے جو کوسیت داتا ہے اس کی کھرباہت کرتے ہوئے اسے ایک خاص پیلے سے دھار کرتا ہے جبکہ باقی مادہ موزوں میں سے آگے کوچہ کرنے کا کام لیتا ہے۔ اب اس سے دھار کا قہر کرتا ہے اس کا خضار مصحف کے شاکی اور اس کے آگے پہلی سطر ہے۔

عام زندگی گزارنے کی حد تک ہماری برعکاس کا حیاتی نظام صرف مخصوص مادہ کے اندر اطلاع موصول کرنے کے لیے منصوبائی طور پر رکھا ہوتا ہے مثلاً آنکھوں سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ آدگیں کے پلے پلے ٹوٹ کے لیے داخل خام کریں۔ کان سے بات نہ کی جاتی کہ دائرہ معلوم نہیں کیا جاتا۔ لیکن تھیری دھار کے تخلیق کار سے یہ ممکن کو ممکن بنانے کی توقع محض اس لیے باغی جانے کی کہ اسے لاجورد کا سامنا ہے۔ اس نے چھپے ہوئے ہاتھوں کے نیچے کونسا بھی ہے اور کونسا بھی۔

”کوہے ہن بھل رہے تھے نگلیں، بازار، پونڈر سٹاپس، کھیت کھلیاں، تھی ڈالے، پھاڑیاں، ہاڈل سب ایک سٹکٹا غرہ تھے۔ لفظ معنی آگہ جو کچھ کچھ کئی تھی، معنی تھے۔

ہر جس ایک معنی میں گئی۔

کتابیں حوصلہ کھوپڑیاں، غم، ہم، ہاتھ رکھیں، پھاڑیاں پناہ گاہیں۔“

(”آٹری کچھ زلفی“ طراج میں دا)

اچھی کھوپڑیاں، پھوڑا ہوا اپنے سروں سے چادریں تو جی بھٹک کر چادر اور ہری کے حصار کو تو ذکر مستحق کو ختم دینے کی خواہش میں باہر نہیں نکلیں۔ اچھی بستی کے جوانوں کا بوجھ کی جڑوں میں چھتا ہوا ان کی آنکھوں میں قوت کہاں ہے کہ وہ اپنی کھوپڑیوں کی صورت ان کے گلیں

میں نہیں جانتا کہ انہیں ابھی چارہ چارچوں میں محسوس آجے کر کے کا ختم پر مبنی ہیں

(”کی کوٹل“ اور سہارا)

یہاں شعبہ برائے ایٹمی خطرہ کی دقتی (Cognitive) تصویر کی مثال بھی موجود ہے کی اس لیے کہ اس کی بنیادیں بھی ذہن کی تاریک دھند، گہرائی (Black Box) سے ہی ہیں (S) یا محرک کا کام قریب پیدا کرنا ہے جبکہ ذہن (Black Box) ایک دھند و صورت حال کا جائزہ لیتا اور اس کا حکم کرتے ہوئے رد عمل پیش کرتا ہے۔ یہ حکم کارروائی سے گزشتہ تجربات اور انداز پر شخص کی انفرادی شخصیت کے رد قوی گھنٹوں میں چھاننے سے ہوتا ہے۔ جب ہم اپنے مخصوص رد عمل کا پر کرتے ہیں۔ یہ رد عمل ہماری مختلف النوع طبقاتی حیثیتوں کے حوالے سے ہو گا۔ مثال کے طور پر ایک دہشت گرد کا رد عمل ہے۔ جھکست پر پانی بھرتی ہوئی جھان لڑکیاں۔ یہ دیکھ کر کسی کسان کا رد عمل کسی بھی سرمایہ دار یا جاگیردار کے رد عمل سے بالکل مختلف ہو گا۔ سرمایہ دار یا جاگیردار کا ذہن۔ ان کی رد قوی زندگی کے سبب۔ یہ مفہوم دیکھ کر بہت ممکن ہے عوامی کی طرف جائے۔ تیسری دنیا میں رد عمل کا یہ فرق زیادہ شدید خصوصیات کا حامل اس لیے بھی ہے کہ طبقاتی حیثیت کا فرق اپنی انتہائی حدود پر ہے۔ منسلک آدمی مسلسل رد عمل پذیر ہے، جبکہ دولت مند آدمی بہت سے اپنے ذاتی مرتبہ میں عروج کی طرف گامزن۔

موجودہ شعر کے الفاظوں ”ذاب اور بھڑکی طوطی پر گل“، ”طوائف رے جلودی جلودی“، ”دکھ جھٹی لے دئے“ اور ”اپنی اپنی جہانیں“ کی اس توصیف کی انسانی صورت حال اپنی انتہائی پرکھتی کرداروں اور حاکم کا جھڑپائی۔ ”طوائف رے جلودی جلودی“ کہتے ہوئے بنگال کی ایک ادیب لکھنا ہے جو صرف انہوں کے مسئلے کے لیے ہے۔ ایک ایسی پاکیزہ جس کی پہچان ہے انسانی جذبوں سے ہی ممکن ہے۔

”سامراجی ختم ہو گئی ہے کہ میری بیٹی دودھ پی نہیں تھی۔“ یہ ”اپنی اپنی جہانیں“ میں بنگال کی ایک ماں کا بیان ہے اور اس ادیبی کردار نے والد صورت حال کی تحصیل ”طوائف رے جلودی جلودی“ کے پاگل بڑے کی زبان سنائی دیتی ہے۔ اس سطرے دیس میں جہاں مغربی پاکستان کے سرمایہ داروں کے لیے سکھ بھگت ہے اور عوامی کا تصور، وہاں کوڑوں کے مول کہتے ہوئے انسان کے احساسات کی ہے؟ مجبور اور بے بس لوگوں کو شہر یا اختیار کیا گیا صورت میں سامنے لاتی ہے۔ اس کی مثالیں مسعود احمد کے ان افسانوں میں جہاں بھڑکی ہوئی ہیں۔

ہماری روزمرہ زندگی سے ایسی کی مثالیں یہ واضح کرتی ہیں کہ کبھی کسی شہر یا اختیار کی حالت میں ہم زیادہ حساس ہو جاتے ہیں۔ ہر کی حالت میں ہمیں محسوس کہ ان کی خوشبو کا صحیح ادراک ہوتا ہے۔ جو کہ کوہا نہ بھی روٹی دکھائی دیتا ہے۔

12

A 13 C

14

تصور کے درمیان میں دئے ہوئے حروف یا ہندسے اوپر سے لے جائیں گے اور انہیں دیکھتے ہیں یا حروف ہیں یا ہندسے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم اسے کس حوالے سے دیکھ رہے ہیں۔ اس تصور کا اگر ہم رے (الطراح کوئل کے افسانے ”دلہا تو اس“ کا مرکزی کردار) دیکھ رہے ہیں تو A سے مراد پاٹل رو ہے جن 13 قیدیوں کو گ۔ C کی طرف تو وہ دیکھے گا بھی نہیں۔ اس کے پاس وقت کہاں ہے۔ پہلے روٹی کی طرف یا تو کبھی نہیں جڑ جائے گا؟ اور اگر 12 کا نمبر پاٹل رو ہے تو وہ پر سے لے گئے وقت وہ 12 سے 13 اور پھر 14 نمبر نہیں

مکے گا، 13 کا نمبر آئے روٹی ہی نظر آئے گا اس لیے کہ وہ پاؤں مار دے بھوکا ہے۔ اُسے تو بخیرے میں دعا کرتے اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے شیر تک نظر نہیں آ رہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ طراج کوئل کے شعور نے (دلی نا قوس) اور غلط یاد کا "دو" (راستے بند ہیں) اپنے غمگین عمل میں اس قدر محدود کیوں ہیں؟ مارگس نے اس سوال کا جواب دیا۔

"انسان کا سانی سرچہ ہی اس کے سانی شعور کا قصین کرتا ہے۔"

دوسری طرف یہ سادہ داکا نظریہ یہ ہے کہ "سانی شعور فرد کے سانی سرچے کا قصین کرتا ہے۔"

سربا یہ داریہ بات اس لیے کہتا ہے کہ اس کے سانی سرچے کا بہت بہتر قصین ہو چکا ہے اور اس کے بہت بہتر وسائل ہی اس کے سانی شعور کو وسعت بخشتے رہے ہیں۔ طراج کوئل کے فسانے "دلی نا قوس" اور غلط یاد کے "راستے بند ہیں" میں ظاہری سطح پر کوئی ایسا نظر نہیں آتا اس لیے کہ بہتر وسائل کے حامل افراد کے بہت بہتر سانی شعور کے مقابلے میں "شعور نے" اور "راستے بند ہیں" کے بہتر دیکھنے پر عمل مستحضر غریب نظر آئے گا۔ 'شعور نے' نے اپنے قصین خود کئی کا ٹیبلہ بہت سوچا چار کے بعد کیا ہے اور غلط یاد کے بھولے سرچے نے اپنے آپ کو بہتر سانی شعور والے، 'سربا دسانی' کے ہاتھوں میں کھینچا ہوا ہے۔ لیکن دونوں کو اب سامنا ہے بہت بڑی دستوں کا، تجلیش دونوں سمیت کرانگی ہار چلتے ہیں۔

"اس کی داتا قصین میں سے اس کے کھڑا جسم کی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ بھٹکنی قدم اٹھائی سکا تھا۔ بھوک اور غنا بہت اور ملحق میں کودنے اور پیرنگے کے عمل سے وہ بھٹکنی طور پر پکڑا گیا تھا۔ سب کی حال سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ طور و عمل سے غافل تھا اور ہوش و حواس کی حدود سے بے کسی اور عالم کا معلوم میں تیر رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف لوگوں کے قصیموں، دالیوں، بٹیوں کا طوفان تھا۔ پکا یکے سے دے کی حال زیادہ طیر مستوازن ہو گئی اور پھر وہ پکا یکے کو کھڑا کر کر چلا۔"

بارودی ضرور چڑچا گھر کے دروازوں کو سنبھالنے کے لیے دوڑے، غما سو میں بے سالتہ کہہ اٹھا، "پتہ تو مر گیا۔"

شعور نے بلا شہر مر چکا تھا۔

پاؤں روپے کا دھوٹے جو اس نے چند لمبے پہلے زندگی کی پہلی داکا حاصل کیا تھا اس کی پہلی ہوتی بیب میں سے بھاگ کر ہاتھ مارا۔

("دلی نا قوس" طراج کوئل)

ہم باری باری ایک دوسرے کی اگلی پکڑ سے چلتے گتے ہیں۔ ایک جگہ بہت سے لوگ بچا ہیں۔

"کیا بات ہے بھائی؟" "دو چ پھتا ہے۔"

"مارگس ہو گیا ہے۔ آدمی ڈاک کے لیے آ کر کھلا گیا۔" "وہ پریشان ہو کر میری طرف دیکھتا ہے۔ بھرا کہتا ہے:

"ڈاک۔ میرے اوپر سے ڈاک گزرا رہا ہے۔"

"بھئیوں" میں چکا رہا ہوں۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں بکھاروں، کوئی دوسرا اس سے پیچ کر جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے غصہ ہو رہا ہے۔"

("راستے بند ہیں" غلط یاد)

ہمارے ذہن کی موضوعات منتخب کرنے کی اہلیت ہمیں مطلوب حالت سے باہر لے جانے کا جتن کرتی ہے اور روانگی میں ہم عمران ٹولے کے قلبیاتی مسئلہ کا کاروبار نہاتے ہیں۔ وہ زندگی کی تھوڑی بہت اسٹاک اور کیا کرے۔ اُن کے دلچسپ ہوئے غوروں میں آواز ملنے لگتی ہے۔ "تفصیلی میں کہہ رہا ہوں کہ پاکستان" "تفصیلی" تفصیلی مسلمانوں کا کیوں نہیں رہے گا؟ یہ ہم کبھی نہیں سوچتے۔ آج پیش منظر کا انسان کاروبار کی اس آواز کو سنتے ہے جو اسے Habrution کا کاروبار چاہتی ہے اور آواز کو گونے اور جھانکنے والی طاقتوں کو بھی جانے چاہئے کی کوشش کرتا ہے۔ اس موضوعی نوع کی اہلیت کے پھر کرنے میں ہماری نسلوں کی محققیت اور صدیوں کی چڑی ہوئی عادت کو دخل ہے۔ معتبر سائنس میں اس حیاتیاتی سطح کی مثالیں ادب میں خال خال ہی نظر آئیں گی، لیکن ہمارے ہاں پیش منظر کے افسانے میں اس کی پچان مشکل نہیں۔ اس کی چند خوبصورت مثالیں "ہمارا کوئی"، "سر بلند پہاڑ"، "کی کوئیں"، "پلی ایل" "فرار بنی" (انور سجاد)، "آخری کپور راشن" (طارق میں راہور) "جنگل و گھر چاند" (آکا، ارضی) ہیں۔

ہمارے ہاں لوگوں کے عمومی حراج میں بے بسی اور حاشیائی کے جوہر صبر نہایاں ہوئے ہیں۔ وہ انسانیات کی انہی وجہ سے گہری ڈال ہیں۔

دیکھ جانے تو گزشتہ چند برسوں میں یہ صورت حال بہت واضح ہو کر سامنے آئی ہے۔ اس کی دیگر وجوہات ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے گزشتہ چند برسوں میں ظاہر ہونے والی عام آگہی کی Interactive اور Constructive فطرت کو کھینچنے کی کوشش کریں۔ جہم بردہ نے انسانی اور ایک کی سطح پر پیدا ہونے والی خاص طرح کی جماعت بردیوں کا جائزہ خوب لیا ہے۔ اُس کے نزدیک "ہمارے ساتھ لیسن دینے کرنے میں ہم اپنے تجربات کو دہرانے کا راز لے رہے ہیں اس کے علاوہ ہم صیاتی سطح پر موصول ہونے والی اطلاعات کے ذخیرہ میں سے اپنی پسند اور ناپسند کا اختیار بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہ چناؤ کرتے وقت ہم جو فہرستیں بناتے ہیں وہ موصول ہونے والے ذخیرے کی نسبت کم تر اور محدود تر رہتے ہوئے نہیں آگہی۔" سماجی سطح پر اس کی ایک مثال تو یہ ہے کہ اگر ہم کسی شخص کو ہمارے ساتھ پسند رکھتے تھے تو ہم اس کے تمام تر افعال کو اسی خاص جماعت بندی یا کھینچ کر کے قہقہہ یا پھینک دیتے ہیں۔ اشیاء اور واقعات کے ساتھ ہمارا گزشتہ تجربہ ہمارے اس جماعت بندی والے نظام کو مزید تقویت بخشتا ہے۔ سوائی جماعت کے تحت ہمارے ہاں جمہوریت سے ایک خاص قسم کی ہلچل بازی اور سیاست سے جموٹ واپس انداز اور ناپسند کے گھٹوے اور پیر و در شپ ہی مراد لیتے ہیں۔ بورڈر کے خیال میں ہمارا یہ تجربہ واصل ایک خاص طرح کی جماعت بندی کا تجربہ ہو رہا ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون "On Perceptual Readiness" میں لکھتا ہے کہ کھینچ اور رکھ کر لیا جانے کا اس کا معاملہ نہیں بٹھا کر سمونہ جانے کا ہے۔

اس کھینچ کر لیا جانے کی کھڑکیاں اور دریاں ابھی ہیں اور بے شمار ہیں لیکن جب تک ہمارے ہاں یہ انداز نظر ہی نہ ہو تھا، تصویر دنیا میں سیاست کی اچھل کود، کھوکھلی غروب بازی اور مختلف جڑ سے بنیادیں باقاعدہ سلیب کی کے ساتھ جھٹ مہاتے کا موضوع رہیں، پھر رفتہ رفتہ اس انداز نظر کے عقلی پتہ چانچا کہ اسلام کے نام پر "اسلامی کانفرنس" "توقین" ہے لیکن ابھر مسلم ممالک اپنے طریب مسلم ممالکوں کے ساتھ سرحدی حد بندیاں قائم نہیں کر سکتے۔ بیان کی حد تک "انتہائی روایتی" کماؤں کے لیکن مجبور کی پھر مجبوری ہے۔ اور یہ بھی کہ ہمارے میں انداز گاندھی اور پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کا سوشلزم اسی قدر ہے جس قدر امریکا چارلز دیتا ہے۔ اب ہوا کیا کہ عوام کی سطح پر ماضی کے بڑے سے بڑے قوت پند رخص ہو گئے، عوام نے اس خاص طرح کے کھینچ کر لیا جانے کے تحت اپنے آپ کو اور اپنی سوچ چار کو ذوالفقار علی بھٹو دیتے وقت جس

طرح سے بہت کی غلطی بھراچی ”کچا زبان“ کی کہنے گری کی مدد سے گھج کر لیتے ہیں اسی طرح ہر اخباری بیان اور حکومتی ذرائع و ابلاغ کی اطلاعات تک ہماری پہنچ خود ہمارے وسیع کردہ طور طریقوں سے ہوتی۔

اب ڈیڑھ گندہ پال کا افسانہ ”ہیر کا آدمی“ دیکھتے نہیں۔ اس کردار کی کہانی میں مرکز توچہ ”چیلے والا“ ہے۔ جو لوگوں کی مثال بہن میں ایک خاص طرح کی غوثی سے سرشار ہر طرف گھم گیا ہے۔ بظاہر اس افسانہ میں اور تو فی کا سبب صرف یہ ہے کہ لوگ اس کی دی ہوئی چیزوں کو ٹھکرائیں نہ ہر اوس کی ذات سے اعتبار نہ کرتیں۔ اس کے کندھے سے لگا قتیلا ہر طرح کی خیرات کی اشیاء سے بھرا پڑا ہے، بچوں کے لیے پرفیسٹ، خوردوں کے لیے پھول، پیاروں کے لیے دو اکھیں اور باہل اور بغیر شرابیوں کے لیے۔ افسانے کا دوسرا کردار ڈیڑھ افسانہ نگار کا ہے جس کی آنکھیں دو سپاہیوں کی مانند چیلے والے کے تعاقب میں ہیں اور تیسرا کون ہے؟ مٹھن ایک خیال، جو چیلے والے کی ذات کا سفر بازیخ ہے۔ افسانہ نگار دہوتا ہے ”نو خیر کوئی ایسا نہیں، اعتدا کرتا ہے“ اور اسی خیال کے تحت اس کی آنکھیں چیلے والے کی نگاہ ہیں۔

اس افسانے میں انسانی نفسیت کے بچہ در بچہ کھیلنے، رہنے سے ایک ایسی فضا بنی ہوئی ہے جس میں الاعتدالوں پر (پارک کے ڈالانگ لوگوں کی سوچ، افسانہ نگار کی سوچ، جس کی تہیں جیتیں تو بہت نمایاں ہیں، پھر چیلے والا خود) دو سطحوں پر، اس کی نگاہیں آنکھیں، پوچھیں تو جس حد بہت کچھ انسانی نفسیات کے کہنے گری سسٹم کی کمرہ سازیں نمایاں ہو سکتی ہیں۔

AMES نے عام آج کی فطرت میں رد و قبول کرنے والی حیات اور کرد و پیش کے حالات کے درمیان ایک باہمی لین دین کے رشتے کی نگاہ دی کی ہے لیکن بعض اوقات ہوتا ہے کہ تخلیق کار کی حیات اپنے کرد و پیش کی اطلاعات کے اندر سے سیلاب کے پھر سونے کے یاد جو موزوں ترین مواد (content) کے چٹاؤ میں لاکھم رہتی ہیں۔ یہاں موزوں ترین سے میری مراد ایسے مواد سے ہے جس کی مادی سہولتی ضرور ہو۔ ایسا پیش چلتی سفر جس کی دوزخ اندہ چیز حیاں (پانچویں اور چھٹی) اہلوں کی گواہیاں اور ذات کے ذہور دانا علاقوں تک بھی رسائی پا نہیں جتنے مٹھن پارستوں میں عدل کا پھیلاؤ صرف دوزخی تصور کا رسی کی دلیل میں آئے گا اور باہل کا ٹھکانہ جوئی کار سے تو ٹھکن ہوئی نہ سکا قاری کی رسائی سے بھی باہر رہے گا۔ یہ بھی عجیب قصہ ہے کہ Tin-Dimensionality کا قصہ ہم پر ہمارے نہیں کیا جا سکتا۔

خانہء حسین کے افسانے ”سایہ“ میں بڑے آدمی کی خود کشی اس کی خواہشات مثال ہے۔ یہ فطرت کو رد و قبول کرنے والی حیات اور کرد و پیش کے درمیان باہمی لین دین کی اعلیٰ ترین صورتوں کا اظہار ہے۔ اس طرح کی انکسلی کی گہرائی خواہش اور مٹھن کے افسانے ”میری لین کی چٹان“ ”کرشن چندر“ کے ”ذہنی“ ”مورا محمد علم کا مکی“ ”کالو“ میں ”سایہ“ (از خانہء حسین) کی نسبت کہیں زیادہ جھکی لیکن جتنوں افسانہ نگاروں سے ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ ”سایہ“ کی طرح دیگر کامیاب مثالوں میں ”کینٹر“ ”کوڑ“ ”پوچھیں“ ”خود ہوا“ ”سودا“ ”آخری سمت“ ”نور“ ”خیر“ (خانہء حسین) ”کہو ناٹھن“ ”دو“ ”طرح میں را“ ”صورت کرکن“ (از کارلین) ہیں۔

George Kelly نے نام شعوری تجربے کی اہلیات اور طبی افسانے میں ملے ملے تجربات کے۔ اس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ہر شخص اپنے ذاتی راہلوں کی بنا پر اپنی ذاتی دنیا خلق کرتا ہے۔ یہ گزشتہ تجربات پر مبنی ایک نئی کوشش ہے جو ممکنہ حد تک نئے تجربات پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر فرد کے خاص ذاتی مسائل کی بنی تعداد، اس کے ماحول کے برخلاف اس کے تعداد راہلوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، اس مسائل کے حل کیلئے نئے، نئے طریقے جاننے کی ضرورت پیش آئے گی، جیسے طرح کوئی کے ”گولڈر“ ”سواں“ ”میں را کے“ ”اعز ورت“ اور سرچرہ پرکاش کے تھائی میں دھارنیاں، ہمارا کرد و پیش والے (روئے کی آواز) اور فطرت اور گہری کا افسانہ نگار کرد و (پہلو بکرنے والی گاڑی)۔

لیکن نئے رابطے قائم کرنے کے لیے جس خاص طرح کی منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے اس کی ہم موجودگی پہلی شخص صورت حال سے کہیں زیادہ خطرناک موز کا قحی ہے اس کی ایک خوب صورت مثال طراج کول کے افسانے "انٹھیں اور پاؤں" کا مرکزی کردار "ستیرجی" ہے جو سیاتی شعور سے جلی اٹھتا ہے اور کچھ دھار سے پرکھنے کی صورت میں، سنبھلا لٹا کر انہما کو پہنچاتا ہے۔

آپ یہ بات تو واضح ہے کہ ہم اپنے آپ کو اپنی ضروریات، ماضی کے تجربات اور مستقبل کے بارے میں توقعات اور خدشات کی باج Tune کرتے رہتے ہیں لیکن Carlini اور Hastori نے اس سے آگے بڑھ کر یہ کہا کہ ہم ایک انتہائی وسیع وقوع کے کل بوتے پر بھی اپنے اور ایک کو Tune کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ وہ دھار ب طاقتوں میں سے کسی ایک کی ہم طرفداری کرنے لگتے ہیں اور ہمارے اسی متعصب رویے کی وجہ سے ہمارا اور ایک متضاد ہونے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر طراج میں راکے الماس نے "واردات" کو یاد رکھتے ہیں۔ اس میں سیٹ پر نیم فلوڈ کی حالت میں تھا کہ انو جواں لڑکا فوری طور پر ہماری حدود یاں کو نہیں چھتا، بلکہ وقت لیتا ہے، لیکن میں اس لیے جب اس کا سر ایک ٹھکے کے ساتھ لڑکی کے شانوں سے ٹکراتا ہے اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے لڑکی ابھی اس کے بارے کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی لیکن ہم اس وقت تک اس نو جوان کے اپنی دشمنی میں پکے ہوئے ہیں۔ ہر ایک وقت ایسا ہی آتا ہے کہ لڑکی کی سوشل اور لڑکے سے ہماری حدود یاں جھکا اس طرح غلط ملط ہونے لگتی ہیں کہ فریض تک پہنچنے سے پہلے ہی ہم اس لڑکی کو اس دشمنی پر بیان حال نو جوان کا خدمت گار دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ خواہش ہی واقعی ہے کہ کاش ہم اس لڑکی کو یہ تاکید کر سکتے کہ اس نو جوان کا بہت خیال رکھئے۔

Spinelli اور Problem کے لیے ہماری تجربات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ دماغ کا محرک نظام دماغ کے حسی نظام پر اثر انداز ہوتا ہے یعنی دماغ اپنی "ورڈ" کا اپنی پسند کے مطابق انتخاب کرتا ہوا بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہ دو جان کہ دماغ کی Output ہاری آگئی کے اجزاء کے تھیں میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے، اور ایک کی قسمی مضمرات کے میں اس میں ہکوی حری سے ظاہر ہوا ہے، جبکہ بعض نفسیات دان تو اب اس امی کا کوئی گئے ہیں کہ "صرف دماغ کی Output ہی پر شعور کا انعقاد ہے۔" اس طرح اگر ہم حقیقتات کو "کچھ گری سنم" کے ساتھ طر دیکھا ہے تو زیادہ بھر دماغ کی توقع کی جاسکتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ ہماری آنکھیں مغل اپنے اندر کی طرف نہیں کھلی ہوئیں اور ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ اپنی ضرورتوں میں انہیں کے لیے اور کھینے کا ہم صحیح تجربہ کر سکتے کے اہل بھی ہوں۔ انور سجاد کا الماس "لی۔ ایل نورانی" حقیقت تک رسائی کی ایک ایسی ہی کامیاب کوشش ہے۔

عام آگئی کے بارے میں اس سے پہلے جہاں تجربہ اور دماغی انداز کرنے کا رحمان مستر ہر ایک کے آپ میں بھی نظر آتا ہے۔ Lawrence Durrell کے پاراڈل "Alexandria Quartet" داغی طور پر آگئی کی Interactive نظریات کی تحقیق ہیں۔ Durrell ان ایک ہی قسم کے واقعات کا مطالعہ پیش کرتا ہے اور اس میں انداز نظر کا فرق اس کے مطالعے کو بنیادی فراہم کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ اہم نہیں کہ واقعہ پیش کیے آ یا، بلکہ یہ کہ تو کیا اور ایک کہا ہوا ہے۔ Durrell کے دال دعو کی کے متضاد تجربا اور حسی وجہ گوں کے ماس ہیں۔

دہم ٹھرنے ("نفسیات کے اصول" TC) آگئی کو ایک ایسی غوی کہا ہے جو مسلسل بہہ رہی ہے اور مسلسل سے تبدیل کرتی جا رہی ہے۔ جہاں جتھر شعور رکھوں میں بنا ہوا نظر نہیں آتا جیسے دلچسپ رائے یا ڈی کے ڈبے۔ یہ کوئی باہم جزی ہوئی شے نہیں، یہ بہہ میں ہے، اس لیے ایک غوی کا استودی اس کی اصل سے قریب تر ہے، اس لیے کیوں اسے Subjective Life کی دہاں غوی کہیں۔

ہمارے خیالات میں مسلسل دو بدل ہوتا رہتا ہے۔ آگئی ہمارے اور گرد کے ماحولات کے ایک پہلو سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی

رہتی ہے۔ ماضی کے کسی فیصلے کی طرف تو کبھی جسمانی نفس کی طرف کبھی کسی منصوبے پر، کبھی آگے کبھی پیچھے۔ یہی خود اپنا چارہ راست جاتی رہتی ہے۔ منجر کے نزدیک آگئی ایک Construction اور Simplification ہے۔ اس نے لکھا۔

”اچھی برہم رہنے پر مختلف انواع ممکنات کے لیے پیٹ فارم ثابت ہوتا ہے۔ ہمارا شعور ان متنوع ممکنات میں سے رد و قبول کرتا رہتا ہے۔ ہمارا ذہن ایک وسیع جوش محرم میں ہے کچھ انتخاب کرتا ہے کچھ مختلف مرسوں پر وہ انتخاب و انتخاب ہوتے احساسات و افکار جاری رہتی ہیں ادارے کے لیے فیصلوں کا کام کرتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ ایک بہت بڑی چٹان میں سے سبک تراش ایک چکر تر اٹھا ہے اور باقی چٹان کو رد کر دیتا ہے۔ وہ چکر تو اس چٹان میں پیسنے سے موجود تھا سبک تراش نے تو اس سے خاصہ کر دیباہ نظر دینی طور پر اس کا نکات کے بارے میں خواہ کتنے ہی مختلف نظریات ہوں لیکن وہ خام مواد جن سے ہم سب نے اپنے اپنے لیے چکر تراشتے ہیں اس کی اصل ایک ہے۔ یہ ایک بات ہے کہ ہم افراطی سطح پر کچھ دوسرے کے مختلف ہی سمجھتے ہیں۔

اگر ہم چاہیں تو اپنے اعتقاد کی بنا پر اپنے افراطی کا رخ ماضی کی طرف واپس موڑ سکتے ہیں اور غلامی ایٹم کے بھوم کی واحد تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمارے محسوسات کی اس موجودہ چٹان تک قید ہم افراطی سے ہم نسل و نسل اپنے لیے چکر تراشتے آئے ہیں۔ خام مواد ایک ہی قہر بردار نے ملے آنے والے اپنی مہاسوس کے رنگ روپ تراشتے رہے۔ بنیاد وہی گھسا پٹا خام مواد ہے، جس کا غلم بگاڑے اور بے ترتیبی سے ہے۔ میری نکات، میری طرح کے لاکھوں افراد کی اپنے ڈھنگ کی تباہی کا نکات ہے۔ حقیقی مختلف، لاکھوں میں ایک۔ کتنا مختلف ہوگا محضرات الافراطی کا تصور، نکات کے بارے میں؟ میں سوچتا ہوں۔“

آگئی کی جگہ اس سے حق باقی تعریف انہی چکر کی وجہ کا خدو نے کی ہے وہ خام آگئی کی مثال ایک شراب کے نشے میں غور بند رہے دیتا ہے۔ کاپیال، ماضی کی یاد، سال کے کسی پہلو کی جھلک، مستقبل کی فکر ایسی کام کا ارادہ۔ ایک بند کی طرح مسلسل ایک جگہ سے دوسری پر پھلا گئیں لگاتے رہتا۔

کئی علوم میں جدید نظریات سے ملتے جلتے انداز میں شعور آگئی کی وضاحت میں اولین مثالیں صوفیاء کے پاس ملتی ہیں۔ صوفیاء کی چند نسلوں سے مشرقی عقیدوں کے ان لوگوں سے حلقوں تھیں جو بے حد ذہنی مصروفیات کی وجہ سے کبھی کی بات پر دھیان نہیں دے سکتے۔ ڈالہی ہے یا تو خفیات کی جاہر جہالت کی غلط فہمی کر کے رہے ایسا دیکھ جائے کہ ان کے سامنے کیا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ان کے Conducta کی نوعیت کمزور فیصلوں پر محدود تھی۔ دیکھا جائے تو صوفیاء کا مل و مل خواہ جس قدر دھبی رہا ہو (کم یا زیادہ) لیکن وہ ملواتر تبدیل ہونے والے ان قضیہات پر زور دیتے رہے جو ہماری خام آگئی کی قید کرتے ہیں۔ ”آپ کو روٹی کا کھن کھناتھرا آتا ہے؟ اس بات کا بارود ہمارا اس بات پر ہے کہ آواز آپ بھوکے ہیں یا نہیں۔“ (جلال الدین رومی)

صوفیاء ہمارے کچھ ترقی سلم کے آگئی پر مرتب ہونے والے اثرات کے بارے میں شبہ و شک کا غلط فہم نہیں آتے اس لیے کہ آگئی کے بارے میں صوفیاء کی کئی وضاحتیں آج Bruner کے کچھ گری سلم کے جان کا خاصہ دکھائی دیتی ہیں۔ صوفیاء کے اقوال میں سے ایسی کئی مثالیں Osmen نے سماشیں، ان میں سے ایک دیکھئے

”کہہ دے کہ سلا و جیل کیا ہائے تو وہ پوچھتے گا، یہ کس قسم کا بھروسہ ہے۔“ (ایک صوفی کا قول)

صوفیاء اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ آگئی صرف ان اشیاء کی ہی ممکن ہے جن کی موجودگی کا ہمارے ذہن میں تصور ہوتا ہے اور

وہ جن کی اطلاع ہمیں تجسس کے ذریعے ملتی ہے۔ صورثانہ افکار اور قصبات کے ذریعہ اثر جم لینے والی ہمارے ہاں کی چشمہ راہیات اس بات پر بحث سہانہ کی گئی ہے۔ اگر قی رسی ہیں کہ آگہی کی انتظامی اور سہو و افطرت ایک الگیا رکاوٹ ہے جس پر قابو پاؤ جانا چاہیے اور یہ کہ دوسری گئی روحانی اور جسمانی مشقوں کے علاوہ سہا سہنے کا عمل ایک ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعے ان پانچوں اور کاؤں کو کر لیا جاسکتا ہے جو عام طور پر آگہی کو محدود کرتی ہیں۔ یہاں مراد ”فکر محقق“ کے ذریعے اپنے کردہ مشق کے طرز کا حصول اور نگاہیں اور باطن کی چھان بھنگ ہے۔

”یہ ایک الگیا پڑا سہارا رکھتی ہے جس کے اندر دھند ”چھائی“ شامل ہے۔ ہم اس ایک سہارہ والی اور تاہاں ملتے ہیں اس قدر آدب جاتے ہیں کہ پھر ہم اس سے سہو و افراط نہیں رہتے۔ اس کا ہم مذہم ہو جاتے ہیں دلی کا احساس ہا تا رہتا ہے۔“ [Augustine]

جب عمل کرنے والے اپنے آپ میں دیکھیں آتا ہے اپنے آپ کو زیادہ واضح و طبع سے قربت تر زیادہ تاہاں اور زیادہ کامل پاتا ہے۔ بعد فتنے کے مطابق عام آگہی ”مذہبی ہند“ ہے جو صرف انشاس Constructs کی دنیا میں رہتا ہے۔ سبھی مذہب میں انسان کی ”گروٹ“ کا ذکر بھی انہی حوالوں کے ساتھ آتا ہے۔ ”سین الحق کے پکارا مشاغل میں نہ لگا، واقفوں کا ایک ہدا کا رنگ ہے۔

مرا تے اور اس سے ملتی جلتی راہانی اور جسمانی مشقیوں کرنے کا ایک مقصد ”اندھے ہیں“ اور ”التماس“ کو فتح کرنا ہے۔ جیسے ہندو مت میں تیسری آگ کے کھولنے کا ذکر ہا پار ہوا ہے، پھر یہی کرنے کے لیے ایک نئے انداز اور نئے مقام سے اپنے کردہ مشق کا پانچو لینے کے لیے جیسری آگ کو

”سہو و فبات کے راستے پر روانہ ہوتے اور رات کا سفر شروع کیا، وہ پیر، اور اس شخص نے انکس کھیں اور سہا سہی کو آستان پر دیکھا اور رات کا اعجاز کیا اور پھر جب اپنے ضم پر نظر ڈالی تو جہاں ہوا مگر جب لوگوں کو دیکھا تو راہ جرت نہ ہوئی کہ اب وہاں یکہ نہ تھا سوائے ان ہند آگھوں کے کہ جو دیکھنے لگتی تھیں مگر کسی دیکھنے والی کی گم گم تھی یکہ نہ تھا۔ مگر انھیں کہ جواب بھی ملتی تھیں، کائنات کی طرف سے مگر نہ جس شہر کی طرف سے۔“

(”ایک گمشدہ شہر کی راہ چلنا“ کو احمد جلاؤ)

احمد جلاؤ کے اس افسانے میں شروع سے آخر تک اس حالت ”Satori“ کو پالنے کی خفاصل کا انکشاف ہوتا ہے جو ہندو مت سے ”ZEN“ فرقے کے نزدیک اصل، بھاری اور اصل آگہی کی حالت ہے۔ اس افسانے میں ایک مشق کے حوالے سے اس پر سے ٹپکی انسانی نفسیات، انسان کی گروٹ اور سیاسی اور سماجی عوامل اور مسلسل جہود کی حالت کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس الجھاؤں کو سمجھانے کے لیے بیٹھ ”فکر محقق“ کی ضرورت محسوس کی جاتی رہتی۔ دیکھو ایک نے کہا تھا اگر اور اک کے دو راؤں کی صفائی کی جائے تو ان کو بر شے لامحدود رکھ دے گی۔ ”سب سے بڑی بات تو یہ کہ کھائی دے گی، دوسری بات یہ کہ پھرات سمجھا سمجھا، لیکن ہے۔

ہم صرف نفسیات اور عقلی علوم کی کچھ شقیں بعض اوقات ایک دوسرے سے جدا رہتی دکھائی دیتی ہیں مثال کے طور پر جیسے یہ نفسیات میں یہ مان لیا گیا کہ انسان Input کو اپنے میں میں کرنے کی سعی کرتا ہے، ڈال داتا ہے اور خارجی ماحول کے لیے خود کار و عمل سامنے آتا ہے جبکہ عقلی علوم کے نزدیک یہ عمل ماحول کے بارے میں انسان کی آگہی کو سمجھنا ہوتا ہے ”اے“ ”مذہب“ ”ایب“ ”مذہب“ ”جو داری ترقی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے جبکہ اس کے رکنس مرا تے کی مشق ہمیں اس قابل بناتی ہے کہ اپنے فکری دھارے کو تھوڑی دیر

کے لیے روک کر ہم غارتی ڈنکا کے ساتھ اپنے گھسے پنے راجوں کو توڑ لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ میں غارتی ڈنکا کے ساتھ وہ پارہ جڑنے سے گرو چٹن نیا تاج اور مختلف دکھائی دیتا ہے۔ ہماری آگئی De Automated ہو جاتی ہے۔

ہی کے لیے "ZEN" میں یہ چاہت کی ہائی ہے کہ ہماری کی حالت میں فکر کرنا چھوڑ دیا جائے۔ لوگ میں مقصد یہ ہوتا ہے کہ "اتھاس" کو ترک کر دیا جائے اور غارتی ڈنکا کو اپنے ذہن سے مٹا لیں۔ اس کے برعکس لوگ کا جس قدر سامنا تیسری دنیا کے فرد نے کیا اس کی مثال لیں اور میں ملتی۔

اب دیکھتا ہے کہ کون سا بھر کے تخلیق کاروں نے اسے کیا پایا۔ اس کو کئی نثر نگاروں اور شعراء نے ایسے مراقباتی تجربات اور طور طریقوں کے بارے میں براہ راست لکھا ہے مثلاً ولیم جیک، ہیرمن سپے، یکسے اورٹی۔ ایس ایلیٹ وغیرہ نے۔ لیکن Robert E. Ornstein کی طرح میں بھی مناسب بھی خیال کرتا ہوں کہ یہاں ایک ایسے مصنف کا ذکر کیا جائے جس کا کام مختلف ہو اور جسے ذہن بحث موضوع سے باہر متعلق نہ سمجھا جائے۔ وہ مصنف ہے جیفری ملر جسے دنیا ایک جنس نگار کی حیثیت سے جانتی ہے اور جو بظاہر مرا لے کی حالتوں اور ہماری آرٹ کے نظریات اور قدیم رسومات کے بارے میں زیادہ غور نہیں دیکھتا جتنا کہ کھیلے یا ایلیٹ وغیرہ دیکھتے تھے۔

جیفری ملر کا قول ہے "لوگ اللہ سے ہیں اور انھیں بھارت کے حصول کی ضرورت ہے۔" اس کے خیال میں "دنیا کو بڑے مغرب اور منظر کرنے کی ضرورت نہیں، وہ تو ازل سے ہی ترحیب میں ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ اپنے آپ کو اس نظام کی ترحیب سے ہمراہ چنگ کریں۔ یہ بائیں کونڈیالیا کو نکال دیا گیا ہے۔ یہ یقیناً ان نظاموں سے مختلف ہے جو ہم لوہا ایک دوسرے پر چھوڑنے کی کوشش کرتے آئے ہیں۔ وہ طاقت جسے حاصل کرنے کی ہم میں خواہش ہوتی ہے تاکہ کنگی، حق اور خواہشوں کو قائم کرنے کی کوشش کی جائے، ہماری جی کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم بے طاقت ہیں۔ سب سے پہلے تو ہمیں بصیرت کی ضرورت ہے، بزرگ عظیم اور یقیناً کمال کی۔ جب تک ہم میں اپنے گروہ ویش سے بہت آگے کی بصیرت نہ ہوگی اور جب تک کہ ہم میں عظیم قوتوں (اور عظیم ترنگر) پر یقین کمال نہ ہو گا تو اللہ سے ہی انہوں کو روا دکھاتے رہیں گے۔"

"World of Sex" میں جیفری ملر ایک ایسے نقطے کو بیان کرتا ہے جسے جنرل Ornstein کوئی بھی نہ ماب ہی جان سکتے کمال ہو سکتا ہے

"عام مصروفیات بھی کمال قوت کی مدد سے ترقی کی طرف لے جاتی ہیں۔" یہاں اس نے اس کا بھی حوالہ دیا کہ "دھم، غیر عقلی عقلی فرقے اور شہیدیت، بیچوں بیچوں اور انڈیا قوت کی ایسی قوت مٹا کرتے ہیں جو ہمیں کسی ایسے ہی قصد کی طرف لے جاتی ہے۔"

زندگی تو ہماری آسودہ ہے، خواہ ہم بزدل بن کر یا بیرونی قوتوں کے قائل کریں۔ اگر ہم اس کا سامنا بھی احساس دیکھتے ہیں تو اپنے کچھ کا زندگی کے پاس کوئی اور مذہب اور نظام ایسا نہیں جو زندگی ہم پر چھوڑے۔ اس کا کہہ زندگی کو بغیر تجھ کے قبول کر لیں۔ ہر وہ شخص جس کے لیے ہم آگھیب بند کر لیں، ہر شے جس سے ہم دور رہیں گے، ہر شے جس کا ہم انکار کریں یا اس سے نفرت کریں۔ ہر وہ شخص جس کا باعث بنتی ہے۔ قابل نفرت، غرض اور دوری سے بری شے بھی ہمارے لیے حسن، خوشی اور قوت کا باعث بن سکتی ہے اگر کھیلے زمین اور وسیع اطراف سے اس کا سامنا کیا جائے۔

اگر ہم میں احوال کو پہچاننے کی بصیرت ہو تو ہر لمبہ سہری لمبہ میں سکتا ہے۔ خواہ وہ دنیا سمیت کے دبانے پر ہو، ہر لمبہ زندگی میں سکتا ہے۔ موت

تو صرف زندگی کی خدمت گزار بن کر ہی کامیاب و کامران کہلاتی ہے۔



سفر کی دہائی کا افسانہ:

معاذ فرخ، چھٹی ہونی نظری، ہر اہم موز شکوک و شبہات کو ختم کر دیتا ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم میں لازیب جبہ کو آغاز میں جگہ ملی۔
تسوف، تجلیات، پارانی نفسیات (Parapsychology)، نیلی مشقی اور ہون مہی اوراک میں Wiling Suspension of Disbelife پر زور دیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے زردانی شہر اور رانا تھہ کو راج نے حضور دیا تھا کہ ایسے میں نظری اُجھادوں کی سطح پر ہمیں تدبیر اختیار کر کے اپنے شکوک و شبہات کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔ پس اردو افسانے کے حوالے سے سفر کی دہائی واضح طور پر ایک چرناک دہانہ والا سوڈ اور اردو شادیت گلشن کا رنگہ شیرازہ مانا جاتا ہے اور رانا تھہ اس سطح پر تدبیر مطلقا۔

بطور افسانہ نگار میر تقی میر انھیں سو سفر کی اُسی مقبوضہ و مردود دہائی سے ہے۔ جب میں نے بار بار سوچا تھا کہاں بھی بقدرجہ کی نسبت وسط، جس نے نظری اُجھادوں اور سنے پرانے کا جھگڑا مٹاتا تھا؟

اردو شادیت گلشن کے حوالے سے سو سو برس صدی عیسوی کے اُسی ساتویں دہے میں اس فقیر نے ہی نہیں غلامیاد و رشید امجد، خیر مسعود، اسد اللہ خاں، مسیح آج ہوا، الیور اعلیٰ شیخ، ستر سرحدی، ذکا مارٹن، انجیل راسی، خاندانِ اہم، قرآن حسن، سلام علی رزاق، مظہر الاسلام، شمس علی خاں، علی گھا، احمد داد، احمد جاوید، عسین الحق، شوکت حیات، انور احمد، طارق محمود، اسلم سراج الدین، فیروز عابد علی، اسامہ علی، میر ملک، حمید مسعودی، ممتاز رحیم، سہیل، ساجد رشید، انور قرناظ، عطا، انور دین، رائے، اسلم سلار، مظہر اسلم، احمد عثمانی، احمد شہزاد، اسلم جہان، بدیع الزماں، کمال مصطفیٰ، طاہر نقوی، طاہر مسعود اور نسیم سولت نے بھی دیکھا کہ جدہ انسان، آئینہ کو کے پاس گیند سے اور فرات کا کلا کے ہاں کا کرناج میں وصل پہنچا تو ہمارے ہاں انھار مسین کے طمانہ "کا یا کلپ" میں اردو کی داستانوں کی گلشن کے پیر و فقیر اور آزاد بخت کو کبھی اور "آخری آدمی" میں الہ سلف کو بند کی جوں مٹا ہوئی خود حقیقت تمام مہاس، مٹو، بیوی، احمد علی، قادی، مصمت اور کرشن چندر کی گھٹی چھ داس سے باہر لگنے کے جن میں داستان سے نوازا ہوا رشتہ جوڑنے کی ایک کوشش تھی اور اس قلمبہایت کے بعد اردو شادیت گلشن کے تسلسلے میں آگے کے نکلے ہدیہ انسان کے لیے اپنی جہن میں چٹا گلشن نہیں رہا تھا۔ مغرب میں تو ہر ہوا سو ہوا، ہمارے ہاں شاہ اس کا ایک سبب تقسیم کیر 1947ء کا پاک بھارت جنگ 1965ء تک کے افسانوی ادب میں ایک اہتری (Chaos) کی صورت تھی، یا شاید چھٹی سطح پر سے تجربات اور نفسی کیفیات کے مثبت اور منفی اثرات کا حقیقت پہنچا اور تو اذی مفقود تھا۔ جس کے نتیجہ میں اس دور کے اہم افسانہ نگاروں بالخصوص احمد علی کا آزاد بخت، خیال اور سرحد ملک، اہوج، احمد علی، قادی اور اختر مسین، رائے، پوری کی لینڈ اسکیپ کے ٹوک کو سینے کی استعداد، ممتاز وطن، مصمت چٹائی، آغا عابد، رحمان، ذہب اور شہزادہ اختر کا جسمی تجربہ، مہسن، مہسن اور ممتاز شیریں کی حقیقت اور مطلقیت کی مطلع شعور کی اور رشتہ فیض محمود کا جہانیت نگاری سے صریح بیان، اس غلطی میں پہنچ جانے پر ہونے والی نظری، سماجی اور سیاسی اُجھاد چھل کو سینے میں کا کام رہا۔

اس اہتری اور ناکامی کا ایک سبب مشترک وطنیت کا وہ تصور بھی تھا، جو سیاسی سطح پر ہونے والے انہدام میں پختہ پور ہو کر تادم سے

پیشہ علم نگاروں کے پاس تصفیحات کی صورت اختیار کر گیا۔ اشفاق احمد "مکدربا" سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ پائے اسے۔ حمید گزشتہ امرتسر کے آسیر ہو کر وہ گئے اور خیر الدین احمد نے "گجگھر سے بھلی پروا" ایک ایسی افسانہ عظیم کائنات سے تھیں ہار گئیں۔

بہنیں جنہیں ان کے بعد انھوں نے لکھی اور جانیے سے متعلق بہت سے افسانہ نگار معاشرے کی بدلی ہوئی اقدار پر کمال گرفت سے کام لے رہے ہیں اور عظیم، مسعود علی اور خیر الدین احمد جیسے تجزیاتی اذہان بھی خاصی کے لاکھ شدہ حقیقت پسند سوانحی و تاریخی پسند Camps میں چار گزیں ہوئے۔

اس سے قبل قرآن الہمیں جہود نے سوال اٹھایا تھا کہ میں سے ہمارا رشتہ کیا ہے؟

یوں تو اس سوال کا جواب محدود تھا، لیکن جواب دینے کو؟ آزاد خیالی اور فردی مفقود تھی اور روحانی نوعیت کے لاکھ اور سو سالہ، جن کا جواب کھوئے ہوئے قرآن الہمیں جہود بھارت پہنچ گئیں اور حاصل کر دیں گے گناہ کا بدلہ تو خیر میں لانے کے معاملہ میں مختصر افسانہ نگار کافی تصور کر کے تبادلہ نگاری کی راہ لی۔

ادھر پاکستان میں دیکھنے اور محسوس کرنے کو بہت کچھ تھا، یعنی سکھوں کا قانون دان اور قائد محمد علی جناح کا ۱۹۴۷ء اگست ۱۹۴۷ء میں فراہم کردہ دستوری خاکہ ان کی رحلت (۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء) کے بعد سرور خانے کی نذر ہو گیا اور ۱۹۴۹ء میں "پاکستانی دستور کی تفسیر" مرتب کرتے ہوئے سکھوں کی حیثیت کا ذریعہ تفسیر کر سکی کی جانب مڑ دیا گیا۔

پاکستان میں شاید یہ ضرورت تھی اس دور کے ادارے مسلم لیگی اتحاد میں کی کہ دستور سازی ہو اور انیشن نئے رہیں۔ اور بے ہاں ۱۹۵۶ء میں دستور بن گیا لیکن ایک ان کے لیے بھی اسے اگوا کیا جاسکا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہندوستان ایک شہنشاہی تھی، جس پر بے جلدی میں اترتے ہوئے مسلم باگبازوں اور ہندو سربراہوں نے اس خٹلے کے نئے قیصری خاکہ پر سربراہ کاری کی اور اب وہ اقتدار کو اپنے ہاتھوں سے کھینچے ہوئے ٹکس دیکھ سکتے تھے۔ کراچی تاریخی اور دلی تاجدار کوام کو دو جڑی جالی حاکموں کو ابھی کشمکش میں آکر ان کے طور پر برتا گیا۔ پھر جہود کو کہیں کا گھناؤنا کردار، ہندو مسلم اور عیسائی مسلمانوں کے درمیان سرحد کا ٹوٹنا، ہندو، مشرقی بنگال میں قومی آکیشن، بلوچستان اور سرحد میں سیاسی قافلوں، ایسے میں خاتمہ، مسعود اشعر، شاہد کامرائی، نور احمد سی، وزیر علی العابدین، ام محمد اور دشت اور (جو بنگال کے پانچوں کے حواشی دان تھے) کے افسانوں میں روایت نظر آئے گا اور سنائی دیا۔ پھر ہم سب نے مشرقی ہندوستان سے انکسار کے ساتھ اٹھ کر آنے والے شیخ عیوب الرحمن کو مسلمانوں کے پیچھے دیکھا اور اس کا نتیجہ والہ حاکم کی صورت نکھر ہوا۔ سب سے بڑا کہ یہ کہہ سکتے تھے کہ ہندو نظریات کی جو ٹیکس مل گئی تھیں۔ بعد ازاں طاری نمود نے اس آنکھیں دیکھی اور اسے کو اپنے افسانوں "آئی لینڈ" اور "کول داغ" کا موضوع بنا دیا۔

یہ ایک ایسی روحانی وادعہ تھی، جو سحر کی دہائی کے افسانہ نگار کو مقام حیرت تک لے آئی تھی۔ اب ہم لوگوں کے سامنے دو ہی درجے تھے، لیکن باقی ہم اپنے ہتھیار کے خنجر میں گھسے اور ان کے Camp Followers شمار کیے جاتے اور باہر یہ صورت تھی کہ ۱۹۵۰-۵۵ء تک لکھے گئے اردو افسانے کے گھسے پٹے ستر کھل کر سامنے لاکھ اٹھام کر رہے۔

سورجیم لوگوں نے یہی دوسری راہ اپنائی۔ یہ ایک ایسا طریقہ، جس میں ذہل مقابلہ تھا اور ذہل خواب۔ سحر کی دہائی کے ہتھیار افسانہ نگار ہندوئی تسلط سے بچتا رہے کے بعد شعور کی منزل تک پہنچے تھے۔ ہم لوگوں نے عظیم کیر (۱۹۴۷ء) کے نتیجہ میں لے پے مہاجرین کی

آباد کاری کے معاملہ پر رسائی اچھی دس کر بیچنے کی آگاہ سے دیکھا۔ لڑکیوں میں "آندھ بھیری" میں مستحب سرخ اٹھائی، علم تاریخی اور اردو دینی ناولوں کے سہارے طویل دو پہروں کو کات کر بیٹھی، کیکڑ، انکھن اغریٹھلی اور راج کپور پر دو کھنڈے کے ذریعہ دینی خواہوں کے ساتھ رو کر چاہے تو اپنے کردار کے سیاہی اور تاریک مغرب سے گوند وچہ نہ آشوب پایا۔ پاکستان ایئر پورٹ پائی کے دور حکومت میں 1972ء، 1977ء، مغربی اور اعلیٰ سطح پر ایک کھلا پن (Open News) اور اس کے بعد جنرل ضیا الحق کے دور میں زبان بندی کھلی۔ رجعت پسند حزاب کا اتحاد، عسائی جمہوریت کے لیے غور و خوض کی تقریک اور 4 اپریل 1979ء کو ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی۔ یہ مظلوم اور زوہان کا ایک اتنا عالم تھا۔ اس مغرب سے کوپینتھ کے لیے کی تحریر کاری، اسطو جاتی سطح پر نئے قربات اور لفظ کا یاد داتا راہناری اہم ضرورتیں تھیں۔

ضرورت اس لیے کہ ہم نے ایجوکیشن کی دھمکیل اور تحقیقی پنکھ زنی ذریعہ اس پر کمر سے رو کر طویل اٹھارہ کھینچا تھا کہ شاید حقیقت پسند اور جیسا افسانے میں سے اس سے طرز احساس کے لیے حقیقی سطح پر کوئی راہ نکلتے۔ اس نکتہ پر رنگوں اور ذہنوں سے بڑے نظام ہائے زندگی کے نیاب کے بیچ اپنی مسافروں کی ذمہ داری سے اٹھتے اور بھاری باتوں سے کھلے جانے والے کھلی اور بند کی زبان میں مصطب انسان کی کوئی صورت ظاہر ہو۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

تاریکی، سیاہی، تاریکی اور عسائی، سرخ پر نفسی کیفیت ذہنی حسی اور شہید پر مبنی۔ لہذا ہم سے جوانی چڑا کھلا۔ یہ کھشت، تاریکی، تاریکی حسی اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے افسانے سے کرنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوا اور ہمارے غریب حقیقی کام کو ختم اور تاریک (Obscure) گہ کر دیا گیا ہوتا رہا۔

میں جانتا ہوں کہ ہمارا تخلیق کردہ مضامین تاریک ہی تھا اور مبہم بھی، لیکن اس سے بڑا بھی کھٹا تھا۔ ہم سب کے سب پوسٹ مدرنیٹ نے یا شاید پری مدرنیٹ کی اور بیگنے میں لگے تھے۔ ستر کی دہائی میں کھٹے کھٹے افسانے کی بڑی بچان اور قوت ہی یہ ہے کہ اس نے تاریکی کے تضادات کو بکھیر دیا۔ نظری سطح پر بھی اور حقیقی سطح پر بھی، اس افسانوں میں نشان سے پیچھے ہٹ کر تخیل، علامت اور استعارے کے ذریعہ سے ساتھ ساتھ آواز کا نوازہ خیال، سرحد شکست اپہ دھج اور تجریدی حوالے دی دیکھنے کو اٹھیں گے اور غصوں بکھینچیں گی۔ لیکن ہمارے سبیل پسند تاریکی اور غلبہ اور اس نظام نے اس طبقہ الموعہ تحریر کاری کو کھل ایک نام دیا "علامتی افسانہ"۔ جب کہ یہ کھل علامت تاریکی کہاں تھی؟ غصے اس فیکری کمر کا بڑا حصہ اسی نوع کی بنی امر اہمیت کو رد کرنے میں صرف ہو گیا۔ جس کی یادگار "افسانے کا مغرب نامہ" (1980ء)، "تیسری دنیا کا افسانہ" (1983ء) اور "آرڈو افسانے کی روایت" (1981ء) ہیں۔ ستر کے دہے میں ہماری مشکل کو تھامی، ہم نے ایک وقت تھیں کہ انہوں کو ایک کہانی کی صورت رقم کیا۔ جن میں سے ایک بڑی انسانی مہریت کے نتیجہ میں جنم لیتی زندگی کے تال میل کی کہانی تھی۔ دوسری تہذیبی اور ذہنی حسی فہمیت کی اور تیسری ایسے پیچہ والے گہم شدہ آدمی کی شہادت کی کہانی۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح جدید و صورت حالات تاریکی ہے نام زندگی کے مظاہر کو کوئی شاکوئی نام دینے کے لیے جھوٹے انش اور علم نہ کرنا کٹھن اور سبک کھٹ کو رد میں ہی تضادات وضع کرنا پڑی اور ان کے لیے جدید و تکنیک کا استعمال نہ کر ہو گیا، ہانک دیکھی صورت حالات میں پیش آئی۔ تب ہا کر مظلوم ہوا کہ حقیقی تجربے کی شدت کہا ہوتی ہے اور ہمارے ہاں راجد رنگہ بھٹی اگر وہیہ وتر بکھینچو کی جیٹی کھل میں زبان وچان کی غلطیاں کرتا ہے تو اس کے سلی کیا ہیں اور اس کے جہان میں کسا اٹھا چھپا ہے۔ محض زبان دانوں کے ڈھم میں یہ کہہ دینا آسان ہے کہ یہی نے زبان کے استعمال میں خمر کر کھائی۔ جب کہ جہان کی سطح پر بیدی کی کامیابیوں کی قصیں انسانی مشکل کام ہے۔ جو ہم پر

آج کن ایذا کی وار ہے، جو کہے کہ مگر جو اس کے ہاں "پولی سز" کے آٹری مٹر میں ہاں کی میرا کن فوٹی لوم، ذہنی کی ہادی ہارتے ہوئے ستر پر لیئے لیئے جب اپنی اہل خود کا سب میں میں میں شریک کا موقع دیتی ہے تو اس کی اکثریتی ہوئی سانوں کے تحت اس کے ادا کردہ نکالے اگر مگر کے اصولوں کے خلاف ہاتے ہیں؟ واجب ہیناں میں ستر مرگ پر نامہ لگی اپنی آٹری فز ل کہتا ہے۔

۱۱ ساطوں ۲ گانے دانے کیا ہوتے

تو کوئی کہے کہ اس نے بھی ہے وزن شعر کیا۔ بھی نہیں۔ لیکن پھر کی آٹری فز ل کہم کہم فہوں کو ہے وزن محسوس ہوتی ہے۔ جب کہ ہمارا لگی نے تو اس فز ل کے ہر شعر میں آواز دکن، مگر اگر کہیں ہارت کے ساتھ اپنی فوٹی ہوئی سانوں کی بھی آٹری فز ل میں سودیا۔ ہم نے بھی ایسا کیوں کیا لیکن ہر لوگ ہ نام بہت ہیں اور بہت سے ہے ہلکا اذاعات کا سامنا بھی کرتے رہے ہیں۔ ایسا ہر گز نہیں کہ ہر ہارتے تحت فہوں کے تحت لیکن دانے "شز شز" کی پور گروپ" کی طرح کسی ایک دن میں بیٹھ کر پڑے کرتے ہیں کہ مضمونی کردہ کریں گے اور فز ل مٹر کو گرفت میں لینے کے لیے کیا انداز نظر اپنا نہیں گے۔ یہ سارا بھی، ج ۱۹۷۰ء کے فوراً بعد سامنے آیا، کسی مضمون پر ہندی کا نتیجہ نہیں تھا اور ہ انسان نکالنا اپنے گناہ اور فوٹو اب کا خود مدوار ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ کسی نوع کی فٹری تحریک بھی نہیں تھی اور اس کا کوئی جینی فیسٹو بھی نہیں، ہا تو یہ اتنے بہت سے نام نہانے فٹری اور فنی اذاعات کے انہدام پر کیوں اتار آئے؟ اس Zero Time کا تجویز اور ضروری ہے۔ اور یہ وہ کام ہے، جس کی طرف ہمارے بھرتے کی توجہ نہیں دی۔

یاد رہے کہ کچھ انسان نکالنا اپنے بھی تھے، جیسے انور سہا، سر پندر پر کاش اور خالدہ حسین، ج ۱۹۷۰ء سے لے لاپنی بچان ہا بچے تھے دان انسان نکالوں کی پھر بھی میں پھر تھی۔ پکارا یہ کیا ہائے کہ ان تین انسان نکالوں نے مٹر کے دے میں اپنے جھگڑتی کام کو فٹنگ پھر دینے تو ہے ہارت ہوگا۔ انور سہا کی ترقی پسند انداز نے "پور دے" ("طبع اول: ۱۹۶۴ء) سے "استبداد" ("طبع اول: ۱۹۷۰ء) تک کے فنی مٹر کا ایک اور اہم سوز کا ناواراں کے انسانوں مجموعے "آج" ("طبع اول: ۱۹۶۳ء) میں شامل چار انسانوں ("دی آنیز آف مارچ"، "نی کوئٹل"، "دوڑیاں بیٹا" کا پربت، جیسا سیاسی حیر کے طواف ایک قمر آکر چچ کا وہ پدہ کہتا ہے، "و میں ان کے دیگر انسانوں میں حالات سے ہے زاری کے نتیجہ میں ہا بعض کا غلط بھی ایک ذریعہ کی صورت وہاں دکھائی دیتا ہے۔ جب کہ سر پندر پر کاش نے آئی دور میں "بھولا" لکھا۔ یوں "دوسرے آئی کا ۱۹۷۰ء راتھ، "دو"، "دو"، "دو" کے خالق کی تحریک کردہ کہانی کا جو ہر جلی ہوئی صورت میں دکھائی دیا اور ان کی لڑائی وارادت، اجتماعی واردات میں دھس گئی۔ اسی طرح خالدہ حسین نے اپنے لڑیاں انسانوں "سواروں" اور "ایک رچرٹا" ("مطبعہ: "سوریا" ۱۹۶۵ء) کے بعد شری دہائی میں لگ بھگ چندہ برس کی خاموشی کا حصار تو ذکر "پرندہ" اور "ڈی لیز" کی صورت نسوانی اساس پر ہم جھگڑا، خوف، مذہب اور تعلیم سے ایک قدم آگے نہ جایا اور اپنے انسانوں میں عصری شعور اور حقوق کے رچا آکر چک دی۔

یہ جھگڑتی سطر پر با بھی لیکن دین کا معاملہ ہے، جسے ایشیت نے ذمہ داریت کا شعور کیا تھا۔

اب آئیے ان انسان نکالوں کی جانب، لیکن کا پیرہ جھگڑتی کا منہا ہری ۱۹۷۰ء کے بعد ہوا۔

رشید احمد افغانوی مجموعہ "پڑا، آرم کے بیٹے" ("طبع اول: ۱۹۷۴ء)، اچا راعی، افغانوی مجموعہ "خیری بھرت" ("طبع اول:

1973ء کا اور احمد داؤد، افسانوی مجموعہ ”مفتوح ہوا گھم“ (”فتحِ اول: 1980ء“) نے اردک تخیلیاتی اسلوب اپنایا اور چائی کی گردن مردِ کر شعر اور سڑکی حد بندیوں کو ذکر رکھ دیں۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں ہے نام گرداویں کے حوالے سے زندگی کی بے مضبوطیت، یا سیت اور بے کسی کی بطور موضوع پیشکش۔ نیز سیاسی اور سماجی ناخوشگوار فکریہ طلب ہے۔

خطایا، کے ابتدائی افسانے بھی اسی تخیلیاتی اسلوب میں سامنے آئے، خصوصاً اولین افسانوی مجموعہ ”بند کھلی میں بکنا“ (”فتحِ اول: 1975ء“) کا واقعہ حسبہ، لیکن ”اس ہوشی“ (”فتحِ اول: 1980ء“) تک آتے آتے خطایا اور بھی سہلے سے کچھ اس طرح جڑے کردار کا آشوب و فساد وہاں سے بچانے کے ارادوں میں داخل کیا اور قریب کی جگہ غلوں واقفیت اور صحیح کی ہلک طاقت نے سہی۔

میرا پہلا افسانوی مجموعہ ”کشیدہ کھات“ (نومبر 1981ء میں نکلا تھا اور ”تار پیلے والی“ (1984ء) تک میں نے سفر کے وہ بے میں لکھے ہوئے اپنے سارے افسانے دو مجموعوں میں سمیت دیے تھے۔ وہ سڑکی واپسی میں ایک طرف تو فکری اور نظریاتی کھلا رانی کی انتہائی صورتیں دکھائی دیتی ہیں اور دوسری طرف فلسفاتی تو جیہات یا کتاب اور سرگوشی ہے۔ جس کی مثالیں علی امام، بطور اہل حق اور اسمبر سراج الدین کے ہیں، افسانوں میں دیکھئے کوئیں۔ اسی طرح جبر کے مقابلہ میں ان فطرت کی طرف جھکاؤ کی صورت میں اسرار اور کم تکنیکی مثالیں مظہر الاسلام کے اولین افسانوی مجموعہ ”گھوڑوں کے شعر میں اکیلا آدمی“ (”فتحِ اول: 1981ء اور انور حسن رائے کے ہاں دیکھئے کوئیں۔ مظہر اسلام اور انور حسن رائے کے افسانوں میں استاد سے ترشے کامل، موضوعاتی سطح پر مضمون فطرت کا چناؤ اور تکنیکی سطح پر بھرپور تجسیم، نیز مسم کو بھر دینا و حال دینے کا کامل دکھائی دیتا ہے۔

اسد گل خان کے پہلے افسانوی مجموعہ ”کھڑکی بھر آسان“ (”فتحِ اول: 1982ء کے افسانوں میں نفسیاتی الجھنوں اور معاشرتی ناہمواریوں کے خدائے سے گرفت معروضی صورت احوال شدہ ظہور و درشت لکھ کا باعث بنی۔ ایسے میں ان کے ہاں ادوار اور پرانی سورہ والا مخصوص زاویہ نظر خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہے۔

”فتحِ آہوا کے پہلے افسانوی مجموعے ”جہنم“ میں“ (”فتحِ اول: 1982ء) میں شامل 1971، 1979ء کے درمیان دور میں تخلیق کردہ کیا وہ افسانے، ہماری بوج میں اتھوڑی سماجی، سیاسی اور تاریخی تاریخ کے کمرے گھر ہے ہیں اور موضوعاتی اشارہ سے بچا شدہ سمجھ بوجھ اور کھردرے سڑکی اسلوب اور تکنیک کے قابلِ ملاحظہ ہے۔ اسی طرح رشید احمد، احمد داؤد اور حسین الحق کے افسانے اپنے محدود دائروں کو کرہ تے ہوئے فکری اور فکری کھلاؤ پر اس ناچ و دشمن سے بھی لڑے ہیں جس کی انگلیوں سے سیاسی کھیلوں کی ڈور بندھی ہے۔

انور قمر قرہ حسن، سہم ہی مدنی، شوکت سیات، مذاکرا مریض، اور علی تہا کے افسانوں کی سب سے بڑی پہچان ان کا ماحول ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے کردار نگاری کرتے ہوئے دلچسپی ہوئی نفسی کیفیتوں سے متعلق ملاحظات تراشتے ہوئے چاہئے کہ شعور کی زد کے تحت ان کی جہتوں سے آشکار کیا۔ افسانہ نگاروں کی اسی تکنیکی میں زہدہ حنیٰ نسوانی Feminine اپنا راج و دیکھئے کوئیں ہے۔ انہوں نے ہمارے عہد کے مطلب انسانی جو حکم کے سچ صورت اور مرد کے ادنیٰ جائزہ کو ابھارا، زہدہ حنیٰ کے پہلے افسانوی مجموعہ ”تجدیدی سانس لیتا ہے“ (”فتحِ اول: 1983ء) کے افسانوں میں اسی انسانی قضا کا ماحول معائنہ دل اور بدنی تھاغصوں کے سچ حق ہوئی درمی کے وہ فانی مردوں سے کیا گیا ہے۔

احمد جامی نے اپنے اولین افسانوی مجموعہ ”غیر ماحولی کہانی“ (”فتحِ اول: 1983ء) اور علی حیدر گل کے افسانوی مجموعہ ”بے زمین، بے آسمان“ (”فتحِ اول: 1988ء) میں برصغیر کی تاریخ کا تجزیہ جدید لسانی اصولوں کے تحت کیا۔ ان کے ہاں تاریخ کا مظاہر و ان کی سطح

ہے یہ لہذا کبھی تو وہ حال کی کہانی یہاں کرتے ہوئے ماضی میں نکل جاتے ہیں اور کبھی ماضی کو کریمتے ہوئے عصری حقائق تک آگئے ہوتے ہیں۔ ایسے میں کنارہ پاشی، شعل اور اسلم سے زار و راستہ فونی الگ اور فضیل سے قریب رہنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ انوار احمد علامت سازی کرتے ہیں۔

جہاں تک واقعہ نگاری اور جاننے کا معاملہ ہے تو گزشتہ کچیس برسوں میں لائینٹن افسانوں میں اسے بری طرح رد کیا گیا یا ناقابلِ توجہ تصور کیا گیا جبکہ اس حوالے سے سٹر کے دہے میں جاننے افسانے سے متعلق احمد یوسف، قلام احمد، کبھت من، نقی حسین خسرو، مشرف احمد، حسین الحق اور ساجد رشید کا کام توجہ طلب ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں سماجی حقیقتیں، نفسی الجھنیں اور معاشرتی ناہمواریاں ان سے مخصوص زاویہ نظر کے تحت جاننے کی انتہائی صورتوں میں اظہار پاتی ہیں۔ غیر مصدوم کا جاننے کا کلا سے قریب ہے اور ساجد رشید کھر سے حقیقت نگار۔

دیکھیے بہت قرآن، اجسام تراشنا ہے مصور اور خطاط انہی اجسام کا فطرت کے ساتھ تعلق واضح کرتا ہے۔ مصوہقا انسان کی داخلی کلیات کو جذبے کی سطح تک اوپر اٹھاتا ہے اور کہانی کار اس وسیع و عریض کائنات میں انسانی Existence کی ڈور واد جان کرتا ہے۔ خطے کا فن، جملہ ٹون کا مونت ہے اور اس کی اثر پذیریری سب سے زیادہ کر۔ عجب اتفاق ہے کہ سٹر کے دہے میں جملہ ٹون لطیف کے پرانے نگری اور سٹر کیرل (ساحلے میں دراز پیدال کر ایک خطے ترتیب پاکھی۔ راولپنڈی کے مصوہجد ساطر اور گراچی کی مصوہجنتی لطیف نے موہم سے فطرت اور انسان کی اعلیٰ انسانی معنویت کو ابھارا تو ہمارے اعرت قریح ملی اور بھارت کی پرودین سلطان نے اس سادے سطر کے کو پلو کی ایک انوکھی نثر سے سنو اور۔ یہ سب لوگ سٹر کے دہے میں ہمارے ساتھ سامنے آئے تھے۔ یوں ہم لوگوں نے الگ الگ اور مل کر انسانی Existence کی کہانی کو کھانا کھا کھ میں رقم کرنے کی سعی کی۔ مصوری اور موسیقی کے تال میل سے ایک انسانی معنویت نکلا گیا۔ یہ سادہ کچھ یوں بھی ہوا کہ مصوری میں رنگ اور جھنک موہم، موسیقی میں سوار کشش میں زبان یا اعتباری صنف کی حد اور ایک حد تک حسین ہیں اور حقیقی تصویر کی دکائی کے لیے کافی۔ اسی لیے بعض اوقات ٹن کا کارٹائی اعتبار کے لیے رنگوں اور لفظوں میں لے کی تلاش کرتا ہے نثر میں رنگ بھرتا ہے اور الفاظ کو محض نکلے لانے کی چیز ہی نہیں، بلکہ بھونے اور پھینکنے کی چیز بھی بنادیا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب تو فنی رہتی پر محصر۔

بھریہ بات بھی لائے ہے کہ جب بھی فنکارانہ پاکدتی کے پھیر اپنی حد و کوثر ڈال جائے گا تو اعتباری سطح پر تنجیم کی واقع ہوگی اور وسیلی معنی کا ایسا سامنے آئے گا۔ یقیناً سٹر کی روپائی میں بھی محض جدت برائے جدت اور نئے پنی کی آرزو میں کھنڈہ انوں کے ہاں ایسا کچھ ہوا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ نثر پر، شعور کی ترو، علامت، استعارہ اور فضیل سے بنی ہوئی عک و ہار یک سرگک میں سے ہے نثری میں گزرنے والے افسانہ نگاروں میں سے کسی کا سرچک گیا اور کسی کی پہلی ٹوٹ گئی تاکہ نہ اترا گیا اسی نوع کی کسی ماعلوم کھٹ کے نتیجہ میں شخص افسانہ، فیروز عابدہ اکرام، پاک، سارگر سہدی، سکال مصطفیٰ، خالدہ ابراہیم، مظہر اسلم، سطر امام، طاہر مصوہ، گاجا زراعی، حمید سہروردی، ذکا ہارنسی، احمد علی، ممتاز یوسف، صادق موہنی، قمر اسمن، انور کن رانے، انوار احمد، اسلم یوسف، بدیع الزماں، درخشاں صولت اور احمد شوہر ایک مدت سے خاموش دیکھے گئے۔

مصوفیانہ اصطلاح میں ہمت کریم تو ہمدانیت کی بہرے کے ہارے میں لپی کہا جاتا ہے کہ پاکدات کے ذریعے عرفان حاصل کیا جائے، سو سٹر کی روپائی میں بھی کچھ افسانہ نگاروں کے ہاں بھونے کی کی ضرور کھنک اور یوں ہمارے کچھ ساتھی افسانہ نگاروں نے اعصاب کوثر

نہر کو دینے والی الجھنوں کا بیان پرفٹ باڈی اور چٹل جیسے حصوں سے برساتے والے انداز میں بھی کیا۔ یقیناً بڑے فرقان کو سمجھنا بھی ایک مشکل کام ہے۔

ای طرح ہمارے دیگر ساقی افسانہ نگاروں نے زبان و بیان کی سطح پر بھی یقیناً غور کریں گا کہیں۔ اب یہ فریضہ ہمارے ہاتھ میں کا ہے کہ وہ اس بات کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ برتے گئے لفظ کے معنی خواہ بہت ہی ہوں، انھیں برستے وقت لکھنے والوں کی تخیل کیا تھی اور کہاں کہاں زبان و بیان کی لغزشیں قابل گرفت ہیں اور کہاں ہیں۔

سفر کے وہ ہیں جس تک ترسیل کی ناکامی اور عدم ابلاغ کا معاملہ ہے تو میں عرض کروں کہ مسعود اور نرول، کجھیل راستہ کی دو کبھی کبھتیں اور سلیم ہیں۔ اس بحث میں مسعود کی معرفت پا کر ملی، مقرب، غوث اور ابدال کے درجوں تک اور اعلیٰ کجھیل کجھیل آسان نہیں، لیکن نرول اس سے بھی مشکل کام ہے۔ یوں نرول تخلیق کار کے لیے عام قاری کی سطح تک پہنچے اترنا بڑا بڑا سہم ہے۔ لیکن ہمارے ہاتھ میں اور غیر تربیت یافتہ قاری نے ہم سے وہاں سطحوں تک رسائی کی توقع کی۔ یہ نہ جانے ہوئے کہ ہر دو سطحوں تک پہنچے صرف دنیا کا حصہ ہے، جو اپنے گہا بے کی معرفت نہیں، بلکہ وہی مغل اور توپقی رسی کے سب آقا رسیں (سودا) اٹھنے ہیں اور جب پہنچے (نرول) اترتے ہیں تو ایک عام بدو کے ہاتھ میں سے لگی اپنا ہاتھ اس وقت تک نہیں چھڑاتے، جب تک کہ وہ غلوں چھڑا دے۔ ہم سے جو میں پڑا سو کیا لیکن اور سے ساتھ تو یہ مشکل بھی رہی کہ اگر مسعود سے نرول میں آئے تو وہ نہ ہمارا ہاتھ ہی نہیں تھا۔ اب بدو کو کون سمجھائے کہ ہر پانچ گھنٹے عمل پہلے اعتبار ہے اور بعد میں ابلاغ۔ یہ لازم ہے کہ ہر تخلیقی عہد کے قاری کا ذہنی رویہ بھی وہی ہونا چاہیے جو نوفا رکا ہے۔ یوں قاری کے لیے تخلیق کار کی جانب پیش قدمی شرط ہے۔

جمل طور پر دیکھیں تو محض ناکامیاں ہی ہمارا حقد نہیں ہیں۔ ہم نے اپنے تئیں لفظ کے پہلے سے تعمیری، ہائیکے اصحاب، تکن، ماحول کے ایسے ہی چھوٹے مخطوط کو بخیر کرنے کی سعی کی، جو قد سے مختلف جہات سے محسوس کیے گئے طاقے ہیں۔ یوں اس دور کے تحریک بخیر افسانہ نگاروں بالخصوص احمد ندیم قاسمی، ممتاز مغل، صمدت چغتائی، رحمان خٹب، اشفاق احمد اور بانو فدیہ کو تجزیہ کار اور علامت نگار افسانہ نگاروں کی تازہ دم کہیں کا سامنا کرنا چاہتا اور ان میں سے ہر ایک کا رد عمل اک دو ہے سے مختلف تھا۔ احمد ندیم قاسمی نے ایک طرف تو ہم لوگوں کو رد کیا، نیز سب سے سادہ زبان افسانوں کی تعریف تو صیغہ میں حد سے گزر گئے اور دوسری طرف خود علامتی افسانہ لکھنے کی کوشش کی۔ اشفاق "پہاڑ" اور احمد ندیم قاسمی "آبی دور کی یادگار" ہے۔ صمدت چغتائی نے سفر کے وہ بے کے افسانہ نگاروں کا ہتھکڑا اڑانے کے لیے افسانہ "سانپ کے کوسے" لکھا اور بیان باڈی کی سطح پر خطر کے حیر برساتے۔ پھر بھی کام ممتاز مغل نے بھی کیا۔ انھوں نے "راہوں پڑی گروپ" کے تجزیہ کار، استعداتی تخیل سہائی اور علامتی افسانوں میں سے نکلے نہیں کر ایک افسانہ تو چھپ دیا، اگلے سال وہ اب ذوق، اسلام آباد کے ایک تنہائی اجلاس میں چھ بھی دیا، ہم بھی لوگوں کی موجودگی میں۔ لیکن ان کا دیکھنا اٹک گیا۔ بڑی ہوئی ان کے ساتھ، اس اجلاس میں۔ اس کے بعد انھوں نے دوسری راہ پائی، "چو پا"، "دو فنی پتے" اور "پکٹ گاڑی" جو کچھ ہوا اور موسم ہی کے حوالہ سے تین علامتی و تجزیہ کار افسانے لکھیں۔ اسی دور میں اشفاق احمد نے "بند رنگ" اور رحمان خٹب نے "خوشیور اور جوتی" اور بانو فدیہ نے "استر ہوت اداسی" کے حوالہ سے علامتی اور تجزیہ کار افسانہ لکھنے کا تجربہ کیا۔

20ء میں صدی، مٹو کی دہائی کے افسانہ نگاروں کے کام کو کہتے کے اہم حوالے "شب خون"، "ظلم پادہ"، "اوراقی" کا بعد، "ہوا" نامی

گاہکس، "اسلوب"، "گیم"، "سٹیپ" "کراچی اور "نئی شیلیں" "کراچی ہیں۔ صرف ایک ہاتھ دلا۔ مہدی جعفر۔ یاد اوت طوی اور فطیل جعفری
 تھے۔ انہوں نے قہر کی نظر سے دیکھا۔ جب کہ ہم اپنے ہاتھ دینا سے ہلکس اور ایلے۔ آریوس کی سطح کی شرح اور تنہدی سیدار کی توقع کر رہے
 تھے۔ کیا تھا تاہم کہ ہاتھ دین کی مصیبت آمیز خاموشی کے حصار کو توڑتے ہوئے طس الرضن فاروقی نے "افسانے کی حمایت میں" نگہ کرکھو طبع
 سے کام لیا اور طس ہاتھ دینے چہ تھے اور پے کھے طیردار سے اس جتن کو ایک بے جا دکھیزا قرار دے دیا۔ یوں جس قسم کی مستحکم خبر صورت
 حالات کا سامنا ہم نے کیا، اُس کا اندازہ دسویں صدی کی آٹھویں اور آٹھری دہائی کے سید محمد اشرف اور خالد جاوید کو نہیں ہو سکتا۔ لیکن اچھا ہے
 کہ تاریخ ایسا اقل رہے اور وہ اپنے کام میں نکل رہیں۔



اُردو افسانے کے اسالیب بیان

نارسے افسانوی ادب کی پیشکش زبان کے دربارے کی سطح پر چھ ذریعہ روایات کی نشاندہی کرتی ہے۔ اول اول جب نر سحر و جادو کی مقصدی حقیقت نگاری نے افسانہ طرازی کی داستانوں کی روایت کو اس کے تخلیق اہام تک پہنچا دیا تو چنپہ اور شریعت کی اپنا ملت کے ساتھ روایتی مثالیت کو رائج ملا۔ اس کی اولین مثال اردو کے پہلے افسانہ نگار راشد الخیری کے افسانے ہیں

”بادشاہی باغ میں نے صاحبزادہ کی جیسے بیکمل اللہ شہنشاہ سے لے کر بے چارے بہادر شاہ ظفر تک کے بلوں اپنی آنکھ سے دیکھے تھے، خواجہ صاحب کے قدم اپنے سر آتھوں پر رکھے۔ دلی سے چار میل مشہورہ انٹیشن کے قریب واقع ہے۔ سحر آخر باغی سار سے باغی صدی تک بادشاہی باغ نے جو پیش کئے ہیں ان کی نظیر یہود دنیا پر مشکل سے ملے گی۔ درسات کے موسم میں باغ کا اندھیری صدا ایک جھلک دکھاتا تھا۔ آم اور چائیں کے درخت زمین میں اس طرح جھول رہے تھے کہ مانی اور باغ بان تو درگاہ و بھرت سے ہر متاع رنگ دہاتے تھے۔ زمینی تھیں طرح درختوں کی یہ درود یہ تھا اس طور پر چھائی ہوئی تھی کہ چھ جوں پانی چھانے تک ایک فکرہ زمین پر نہ پہنچے مانہ جی صدا کی مشرقی سمت پر جتنا بڑی لگتی تھی۔ سادہ بھادوں کی اکثر راتیں اور بیشتر دن محل بادشاہوں نے اس باغ میں بسر کئے۔ جب لودی اور سیاہ گھٹا نہیں آسمان پر چھائی تھیں، بجلی کو تھنی تھی، ہلال گر جاتا تو یہ میر کے رہا جھولوں کا لطف اٹھاتے تھے، گنگا جمنی اور یوں میں روٹیلی ستری چڑیاں پانی پانی تھیں، ٹھنڈی مٹی کی پڑیاں لال سبز جوڑے، مین پیشیں جو صافی تھیں، جھولنے والوں کی مسیری آوازیں زمین سے اٹھ کر آگلی کی آواز اور چھپکے کی صدا سے گراتی تھیں۔ شیش آفتاب جھلکا جھلکا کر دم توڑی تھی۔ روز روشن کا جتنا زور دینے کرنے کے قریب تھا اور بادشاہی باغ کے درخت جو قبروں میں پاؤں نکالنے کھڑے تھے، اپنے دور شباب کا سر پہنچا رہے تھے۔ چائیں کی موسیقی اور چنپہ کی نظر شام کا گھر بہار باغ کا غیر وہ اپنے بچے لڑکے کے بائیں آجلی کو کھڑے سے ڈالنی ہوئی جھوپڑی سے باہر تھی۔ اس کی کلیا مصنوعی دنیا کے جھولنے تلکھات اور ان سامانوں سے جو ہر زندگی کا جز ہو گئے ہیں پاک تھی۔ گھر اہل خانہ کی تپ خاموشی سرست کس بھرنس کے اس دھیر پر برس رہی تھی۔“

(”بھرنس کی اور بھرنس“ از راشد الخیری سے اقتباس)

بھرنس کی کشش میں رومان کا دایا میڈیا را بندہ راتھ نیگور تھا۔ اس کے دونوں ابتدائی افسانوی مجموعوں ”Hungry Stones“ اور

"Mashi" کے اثرات اردو افسانے میں نمایاں ہوئے اور نیکو کی دودھس جبریت پر مبنی محدود ستانی نگارش پر چھا گئی۔

اردو کے پہلے افسانہ نگار راشد الخیری کو چار اعراز ان کے طبع کے آزاد افسانوں کے سبب حاصل ہوا اور گزشتہ مانی افسانہ سے ہمدردی پر مبنی مردم کے تراجم خصوصاً "کالمٹ" یا الخیری "صحبت" یا جنس "خارستان" یا گشت "طعرت" یا انفرادی "کلام جانی" "سورائے سخنیں" اور "نقشہ کی پہلی رنگ" راشد الخیری کے اس نوع کے افسانوں سے پہلے شائع ہوئے۔

راشد الخیری کے تسلسل میں زبان کے دور سے کی سچ پر پہلی عمر ہمدردی پر مبنی، نواز فتح پوری، قحسی رام پوری، حجاب احتیاطی، مینوں گورکھ پوری، مسز مہا اقبال اور قاضی عبدالغفار کی جذباتیت، شعریات، قصوریات اور نفسی سے مملو نثری روایت ہے، جو اسے حیدرنگ جلی آئی ہے۔

۱۔ "آسان پر قوس قزح" یا قحسی رام پوری جس کے کارے سند سے آکر ملے معلوم ہوتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قوس قزح کی ٹکڑے کی ٹکڑے کا یہ حکم ہے کہ جسے رنگ کی کھانٹ سے لگاؤ نہ ہو وہ یہاں نہ رہے۔

۲۔ "خیر ایک ہوا چاک مر مر مر" سے اس کی طرف گیا اور گردان میں گھسا تھا۔

۳۔ "اس کے دل میں ایک نیا نیا فرد تھا۔ جس کی قمار بیٹے کدائی سے گویا بے قفس کے بچے نکل رہے تھے۔"

۴۔ "اس کی سیاہ آنکھیں اندھیناں تھیں، اپنے بازوؤں کو جس کی گوشت کی ہڈی کو جس نے ہر وقت ایک عجیب خوف سے دیکھا تھا اس نے کبھی نہ گرا دیا۔"

(ہمدرد کی نظر سے چند اہم سہا)

۱۔ "عورت کا حسن ہی کے نزدیک صرف دیکھنے کے لیے آواز ہو رہا۔ آغوش سے دور۔"

("ایک دکان سے" از نواز)

۲۔ "عورت ایک لذت ہے جسم، ایک تسکین ہے عقل۔ ایک سحر ہے مری۔ ایک نور ہے ادبی۔"

("عورت" از نواز)

۳۔ "ایک عین عورت کی جو عزت ہے وہ ایک نطق کو پہنچتی ہے جس کا ساز و نساجت اور صرف نساجت ہے۔ وہ ہاتھ دلاتی ہے تو گویا ہوا میں نقش تر صفحہ جی ہے۔ وہ چلتی ہے اور اپنے جیوں سے زمین پر نکلتی ہوئی چلتی جاتی ہے۔"

("چند دن بکلی میں" از نواز)

ہمدرد، نواز، مینوں گورکھ پوری، قحسی رام پوری اور قاضی عبدالغفار کے ہاں قاری کی مفاسد اور عداوت کے ساتھ مری کی خصائص نمایاں ہے۔ اس روایت میں پہلا نوا کی خاصیت کو بکلی قحسی جس سے بعد میں قحسی رام پوری اور قاضی عبدالغفار نے لاکھ دیا تھا۔

نواز فتح پوری کے ہاں جو کیرانی بعد میں پیدا ہوئی، اس کا باعث اس نثری روایت میں فراہم کا بعد راج کم ہوتا تھا، جو عریض کے طلب سے پیدا ہوئی تھی۔ اس نثر میں ان کے تھے افسانے "دو کالہ لہجہ بہت سادہ"، "نور کا پانی ادبی"، "موز" قرآن کا حسن، "خصوصی جذبہ کے متعلق ہیں۔

"اسے قلم کہہ دو جس وقت میں روایاں کو تیسری یا چوتھی بار اپنی علامت جھیل کے ساتھ انجام دے۔"

یہ کہہ کر اپنا سر اٹکے پر رکھ دیا۔ شہزادہ نے سر رکھتے ہی اپنے رومال کو پہلی بار چٹختش دی اور جلا مسٹھ کھڑا ہو گیا جب شہزادہ نے وہ اثرار کیا تو اس نے خود اسٹھ لی، اور اس کے بعد ہی جسے اثرار سے پر ہوا میں شہزادہ کے سر پر ایک چمک سی پیدا ہوئی اور تو اس کی گردن میں بچہ سے ہو گئی۔ جہوم میں ایک شور پیدا ہوا اور کھینچنے والوں کے چہرے خمیر ہو گئے اور دلوں پر صرست دھاسف کا ایک گہرا سکوت مستولی ہو گیا۔ مرا تھہ یہ ہوش خمی۔“

(”قربان گاہ حسن“ از بیاد سے اقتباس)

بھوں گور کچھوری کے افسانوں کی روایتی قصا ان کے قریب کردہ مخصوص لفظاتی اور لفظیات نظام کے باقیت ہے جو ہر اہمیت کے ساتھ شعر کا لہجے لیے ہوئے ہے۔

”لگے چمک پر تھ کر اس نے چراغ ہلا دیا اور خود زمین پر میرے قریب بیٹ گیا۔ میں نے بھی زمین پر چٹخا ہا ہا کر اس نے صرف ایک نگاہ سے لکھ کر رک دیا۔“

”ہاں تو میں تمہارا انتکار کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم میری باتوں کو لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہو“ حسن شاہ نے کچھ روچھ روچنے کے بعد ہند اس کے چہرہ کی لب کھینچتے تھے۔ میں چراغ کی دھند لی روشنی میں دیکھ رہا تھا کہ کبھی وہ آگ کی طرح سرٹ ہو جاتا ہے اور کبھی اس وسیع دہنے کی طرح زرد۔ وہ کسی شہید آتماثل سے گزر رہا تھا، کسی یا لکھ تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاہ اس پر ہوش دھواس اپنا شبہ کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا

”کچھ حسن شاہ! تم کس عالم میں رہا کرتے ہو اور تم پر کیا گزرا کرتی ہے؟ تم نے مجھ سے کون سا قصہ بیان کر کے کہنا کہ تھا؟“

(”حسن شاہ“ از بھوں سے اقتباس)

مسز عبدالقادر نے رومان پندی کی اس روایت میں صیبت ناکی کا عنصر شامل کر کے اپنا ایک الگ لہجہ دیا اور چاہے ابتدا میں نے حسن و لطافت، شعر و نفا اور رنگ و رو باں سے مصور ایک ایسی انصاف پیش کی جس میں محو ہو کر نا رہی و پلا دالینا سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔ اسلوب لفظی سلیا پر ان دونوں خواہشیں افسانہ نگاروں کے ہاں عربی اور فارسی کا مکمل عمل نہ ہونے کے برابر ہے۔

”باز کا یہ اختیاری کون یا لکھ لکھ اور یہ ان چراغا۔ ہر طرف سوکے چھس کے ذخیرے تھے۔ جن پر کچھ سال اور ڈراؤنے درختوں نے اپنا تار یک سایہ اہل رکھا تھا۔ ان درختوں کے قریب اور ان گت سے اس بے ڈھنگے پتے تک رہے تھے جیسے وہاں سے کلا حلاچے اور بکھر۔ اس نو نے اور متحش ہوا میں جب کسی گھری کی کو پھانڈا کسی نو نے کی و حشاد دوسے گھبرا کر دم بھکی کی مشق کرنے والا کوشٹ لٹھیں انہ اپنے ہاں کو پھانڈا لٹھیاں لگتا تو اس شبہ سے کہ شاہ ان بکھرنا حشوں میں جان چڑنے لگی ہے، دل دہل جاتا۔“

(”راہبہ“ از مسز عبدالقادر سے اقتباس)

”وہ بہار کی قمری شام تھی۔ والدہ ندی کی میر کے لیے مٹھی بے چلے گئے تھے۔ دہلی جان بچے کر ملاقات میں لوگوں سے ملاقات کر رہی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں رہنے کے پاس کوئی پر لٹھ ہوئی یا ہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔ کھینچنے ندی میں چہرہ تھی۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا۔“

(”میری اقامت“ از بیاد سے اقتباس)

1838ء سے قبل اس روایتی روايت کا آخری بڑا نام قاضی عبدالغفار کا ہے، جنہوں نے اس اسلوب بانی ہر میں احساس جمال کو تسکین پہنچانے کے ساتھ ہم وسعت کی نگاہ فرنی کو یکساں طرح شامل کیا کہ محلوں گورکھدوی کی انفرادیت اور قاضی عبدالغفار کی محنت نئی وسیع آفرینی کی ایک پہچان ممکن ہوئی۔

”سانپ کے زہر میں ہلاکت کے جن اجزاء کو شامل سمجھتے ہو وہ اس زہر کے اندر موجود ہی نہیں۔ وہ خود جہاد سے اندر ہیں، اپنے اندرون کو ان اجزاء سے پاک کر لو، پھر سانپ کے منہ میں انہی ڈال دو۔ دیکھتے ہی محفوظ رہو گے جیسا کہ میں ہوں۔“
(”کھلیا“ نثر قاضی عبدالغفار سے اقتباس)

اُردو میں اسالیب کی سطح پر دوسری تہرجہ روايت کی پہلانی انکم امر میں تھی، جس کی افغان ہندوستان کی عوامی بولیوں سے ہوئی۔ دراصل یہ ہندوستان کے شریفہ تہ (Noble Savage) کی زبان تھی۔

اُردو افسانے میں اس کی دوسروں نے اظہار پایا۔ پہلی صورت زبان کے رد و مزہ کے حواس سے سامنے آئی۔ یہ صاف اور سادہ زبان تھی جس میں آخر آخر (پہلے پندرہ برس) سنسکرت آویز بندی کے اثرات نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس زبان کا ابتدائی رنگ ملاحظہ ہو۔
”وہ چاندنی نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں۔ بچپن کی جگہ دل دکھا ہوا تھا۔“

(افسانہ ”سیر و دلش“ نثر پریم چند سے اقتباس)

اس کی دیگر خوبصورت مثالیں علی عباس مسیحی اور اعظم کریمی کے ہاں ملتی ہیں۔ علی عباس مسیحی کے تین افسانے ”سکھ“، ”سو گھٹے“ اور ”سیلاب کی راتیں“ گورا اعظم کریمی کے سوشل پارہ فیلڈ مادی پر (ج۔ پی) کے لینڈ اسکپ سے متعلق افسانے اس کی مثالیں ہیں۔
حق زح کی حقیقت پندی اور بڑے ہر امر کی مقصدی حقیقت نگاری کی علامت اس دور سے کی روایت پر قائم ہے۔ پہلے پندرہ برس میں ”قومیت“ کا افسانہ کیا تو جہد حقیقت راہ لگائی،

”اسد دہات یاد آگئی۔“ آدیہ دھو کر بولی۔

”میرے لیے بھی کھلا گئی؟“

میں ”ہاں ایک بہت اچھی چیز لاتی ہوں۔“

وہ دھری ”کیا ہے۔“ دیکھوں۔“

میں ”پہلے بھجھاؤ۔“

وہ دھری ”سہاگ کی غادی ہوگی۔“

میں ”جیسا اُس سے اچھی۔“

وہ ”اٹھا کر پی کی ٹورٹی؟“

میں ”جیسا اُس سے اچھی۔“

وہ ”میرے پرانے آدھار کی کھوکھر۔“

میں۔ ”نہیں اُس سے بھی اچھی۔“

دوڑا ”تو کیا وہ باہر کھڑے ہیں؟“

یہ کہہ کر وہ چتا نہ ہوش سے اُٹھی کہ وہ دروازہ پر جا کر پڑے گی کاغذی مقدمہ کرے، مگر ضعف نے دل کی آواز کو نہ سمجھنے دی، تین بار منہ بلی اور تین بار گر کر، صبح میں نے اُس کا سراپہ زانو پر رکھ لیا اور آجیل سے ہوا کرنے لگی۔“

(”سیرور ویش“ از پریم چند سے اقتباس)

”گوشتاخن پور کے مصلحات شروع ہوئے۔ ہندو مکانات، سرہنگ، گڑھیں، دکانیں دینے لگیں۔ شہر کے چھانک سے ملے ہوئے آسموں کے درخت کے قریب ایک اندھا فقیر بیٹھا تھا۔“

”ایک چور، پاؤ بھرا ڈال، ایک چور، پاؤ بھرا ڈال، اندھے فقیر کا سوال“ کی رسم لگی تھی اس کے ذرا دور دروازہ دکھائی دیتے تھے۔ اس کی منہ بلی رازمی کے بال لکھے ہوئے تھے۔ اس نے پاؤں کی چاپ سننے ہی ان کی طرف رخ کیا، اپنا سونکا ہوا زرد پاتھ پھیلا دیا۔ ”بابا بھلا ہو گا۔ اندھے کا سوال، ایک چور، پاؤ بھرا ڈال۔“

(”غزل قسمت لڑکا“ از علی محمد حسن صبحی سے اقتباس)

”اس نے پس بچہ نہ کی۔ بھری دو چہر میں اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔“ ”بڑے بھری ہی وہ سے گمراہ اندھ اور روٹھیں ہو جا۔ میں گمراہی پاؤں۔“

وہ سنیں پوندھر پائی بھی نڈال بھی۔ اس رات اسے بہت زور کا بخار چڑھا یا۔ اس سے پیار سے لال کی پاؤں کی چوٹ نہ کی گئی۔ وہ اس بخار میں تین دن بے مدد چڑی رہی۔ چوتھے دن اسے کچھ ہوش آیا تو اس نے پیار سے لال کو پکار کر کہا۔ ”جیادارے“ اپنے بچے کو بھری چھاتی پر رکھا۔ یہ بچہ کو بھی بلا لے۔ آج صبح سے پاس ٹھوڑی دیر کے لیے جوتہ ہا۔ میں چلتے، دھتے تو ہی بھر کر رقم سب کو دیکھوں۔“

(”سناں اور بچہ“ از اعظم کرپوری سے اقتباس)

”ایک دن ڈال کی ایک کھلی گور اس سے ملے آئی تو اس نے کہا۔

”تنگل پر جیادارے کب کر دی؟ تو کی بہت سیانی ہو گئی ہے اس کو کھوری ملنا رکھنا بڑی شرم کی بات ہے۔ گاؤں بھر میں شہادی بڑی بدنامی ہو رہی ہے۔“

ڈال نے غصے سے سانس بھر کر کہا۔ ”میں کیا بتاؤں بہت حاشا کرنے پر بھی اب تک کوئی بری نہیں ملا۔“

گورا۔ ”چوتھے بھی مسموم ہے لیکن خاصوش رہنے سے تو کامند بچے کا سہرے خیال میں تم کو اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

ڈال۔ ”لیکن قصیں پر جیادارے کھسکے لے لگاؤ بڑی کر پا ہوگی۔“

گورائے کہا۔ ”اچھا میں دیکھوں گی۔“ یہ کہہ کر گورا بھی چلی۔ دو چار دن بعد وہ پھرتی آئی۔ اس نے آتے ہی ڈال سے کہا۔ ”جنگلی مصلحتی

کھلاؤ، جس نے پر کے لیے راز مسموم لیا ہے۔“ ڈال نے خوش ہو کر کہا۔ ”کہاں؟“

”گورا“ میرا راج خفیہ دھر کو تو جانتی ہو۔“

دوگا ”ہاں ہاں وہی وہی۔“

دوگا ”اس کی تو عمر بہت زیادہ ہے وہ اب شادی کیوں کر رہے ہیں؟“

گورا ”عمر ضرور زیادہ ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ مرد ہیں ان کی عمر کا کون خیال کرتا ہے۔ اس کی جتنی عمر ہے اس عمر میں تو بہت سے ٹوٹ جاتا کرتے ہیں اور جتنی برآمدہ ان کو کبھی ضروری لڑائی بھی بہت سیاتی ہے۔ یہ بالکل چھوٹا کر ہونے سے بھی تو کام نہیں چلے گا۔ میرا کہنا نا انو تم اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ بڑے امیر ہیں۔ میں تجھیں کھٹے مردوں کی کاشکاری ہے۔“ الاب ”ابغ سب ہی دیکھتے تھے اور سب سے زیادہ انہیں بات تو یہ ہے کہ وہ کچھ دن دیر بھی نہ لیں گے۔“ کو حضور ہے کہ نہیں۔“

دوگا خفیہ دھر کے ساتھ پر گیا کا بیڑا کرنے کے لیے بھی راضی نہ ہوتی لیکن وہ اس نے سنا کہ ان دیر بھی نہ دیتا چاہے گا تو وہ بخوراز راضی ہو گئی۔

گورا ”آپ بات اور ہے۔ وہ یہ کہ کل دیکھ کر میں میرا راج خفیہ دھر کے یہاں سے پر گیا کو دیکھنے آئیں گی۔“

دوگا ”لیکن ایسا تو میرے یہاں بھی نہیں اور میرے یہاں کھا گائیں ہے۔ وہاں جب تک یہاں نہیں ہو لیا سسرال والے لڑائی کو نہیں دیکھ سکتے۔“

گورا ”طریقہ ایک کام کر دو۔ کل سویرے پر ہم کو لہا آ کر صاف کپڑے پہناؤ بنا۔ امیر چہ سے جب جو ریش میرے یہاں آئیں گی۔ میں کسی بہانے سے پر گیا کو اپنے کمرے کے جاؤں گی۔ اس طرح وہ پر گیا کو دیکھ لیں گی۔ اس میں کوئی حرج نہ ہوگا“ دوگا نے خوش ہو کر کہا ”ہاں یہ ترکیب تو ٹھیک ہے۔“

(”پریم کی چارلیاں“ از اعظم کریم علی سے اقتباس)

ترقی پسند انسان کا ادب کی اکثریت کو اپنے ”مخفی فسطو“ کی پابندی کے باعث یہ اسلوب نگار مناسب معلوم ہوا۔ پریم چند اور اس کے Gamers Followers کے قلم راز بعد اس زبان کے فوری چناؤ کی مثالیں اقبال سنگھ، ملک راج آزاد، سجاد ظہیر، بنگلہ کشور سنگھ، اختر انصاری، اوچند ناگھانک اور یوگندر جی پریترتی کے ہاں مل جاتی ہیں۔

زبان کی اس اسو جاتی روایت کی دوسری پرست (سرست چند چیز تھی کے حوالے سے) روایتی جذباتیت کی روایت کے ٹوٹنے سے سامنے آئی۔ سرست چند چیز تھی سے بنگال کے شہری زبان کی پھیلش Draught میں اسی زبان کو بنیاد دیا۔

آرورو اٹھانے میں شامل خان پھیلش قدرتی، سعادت حسن مہتمم چٹائی اور احمد نجم کاکی اس روایت کے نمایاں نام ہیں۔ اس اسلوب جاتی پرست کی بنیاد بھی اسی زبان کی تھی۔ لیکن یہاں Noble Savage کے تصور پرین اور رومانی جذباتیت کی بجائے خار بیت کا عنصر غالب ہے۔ اس کا شہری لیے مختصر اختصار ہے اور اختصار اس کی نمایاں خوبی۔ اس اسلوب جاتی روایت میں مختصر افسانہ لکھنے کے قریب ہاتھ ارتق سنگھ اور کریم سنگھ نے بھی کیے۔

د۔ ”یہ تک بڑگی عورتیں مکانوں میں کچے ہوئے بھلوں کی مانند تھیں، رہتی ہیں۔ آپ بچے سے اسیبہ اور چرمہا کر انہیں گراکتے ہیں۔“

(”بچکان“ از سمنو سے اقتباس)

۲۔ "مہرِ سر سے چٹائی لڑیں دو پیر کے وہ پہلے چلی اور آٹھ گھنٹوں کے بعد مغلیہ رہ چکی۔ راستے میں گی آوی مارے گئے متعدد زخمی ہوئے اور ہاتھ اور اعضاء ہلک گئے۔"

نتیجہ اس پہلے کیسپ کی خفنی دشمنی پر جب سراج الدین نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف مردوں اور بچوں کا حلالہ سمندر دیکھا تو اس کی سوتے گھٹنے کی قوتیں اور بھی ضعیف ہو گئیں۔ وہ دیر تک گولے آسمان کو تلکی ہاتھ سے دیکھتا رہا۔ اس کیسپ میں ہر طرف شور برپا تھا۔ لیکن یوز سے سراج الدین کے کان جیسے بند تھے۔ اسے کچھ سنا نہیں دیتا تھا۔ کوئی اسے دیکھتا تو یہی خیال کرتا کہ وہ کسی گہری فکر میں غرق ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ اس کے ہوش و حواس شل تھے۔ اس کا سارا وجود طامش معلق تھا۔

گولے آسمان کی طرف، بغیر کسی ارادے کے، دیکھتے دیکھتے سراج الدین کی نگاہیں سورج سے گرا گئیں۔ تیز روشنی اس کے وجود کے سارے رشتوں میں اتر گئی اور وہ ہانک اٹھا۔ وہ پہلے اس سے دماغ پر کی تصویر پر اور گئیں۔ نوٹ: آگ، دھواں، گولیاں، اداات اور تیکن سراج الدین ایک دہکڑا ہو گیا اور بالکل کی طرف اس نے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے آفتابوں کے سمندر کو کھنگالنا شروع کیا۔

پارے تھیں گھٹے وہ یکدم یکدم اپنا رنگ کی نہ کہ چھانٹا رہا مگر اسے اپنی جہاں بالکونی میں کا کوئی پتہ نہیں تھا۔

("کھول دو" اذیتوں سے اقتباس)

عام طور پر اس زبان میں ایسی تھیں بات جن میں چٹا کر کوئی تباہی نہ ہو قابلِ قہم نہیں رہتیں لیکن مغر، بلونت، غلہ داروں، بھارتی اور صحت چٹائی کے داروں سمیت دے سوزوں تریں مگر ان میں اور مشائش تلاش کر کے غلوں کو ملوہ اور تاجر پہ کی گہرائی تلاش دی۔

"لو اب غلہ مردانہ لاپ اور وہاں سے کاموں تھا۔ اس کے قد و قامت، ذلیل اول اور تیز دیکھ کر اسے جوں کا بہ پانی ہو م تا تھا۔ رنگ ہے شک کہ دم کوں تھا وہ چہ سے کھی خفشات کے آغا مار ہوئے تھے۔ ہر ایک وہ عجوبی مشیت سے نامہ مال شخص آخر آتا تھا۔ اس کے رب داب کی تو مدی نہیں تھی۔ ملائے ہر کفر جو ان لارنگز سے دل خفوں کے دل دل کر رہا ہے تھے اور اس کے ایک ہی جہاز سے خون جو کے کتے تھے۔"

("ہمارے اور گند" از بلونت غلہ سے اقتباس)

"جب فیض کی خون آلود انگلیوں نے ایک دہائی میں اس کی حنائی انگلیوں میں جمادی تو آخر گہرا گہرا ہو گیا۔ سترے مانہ چ گئے۔ لڑکیاں اور سترگر چلے اور طامخ دیکھے ہوئے، دیکھتے ہوئے گال ایک دم غم و درد و چوڑی چھاتی پر بہت دیر تک چہ سے سحر کتے رہے۔"

("ملائی سر" از احمد عظیم قاسمی سے اقتباس)

"سیرانی چہ ہا کہ اس کا منہ لڑکیوں کی کہنے، بولی کے قوے۔ یہ سزا ان باتوں نے دیا ہے جو بچتے جاتے لہام ہیں۔ اس کے ایک ایک پسند سے میں کسی نصیبوں کی کہ رانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں۔ یہاں باتوں کا دہا ہے جو نئے پگڑائے جملانے کے لیے دانت کے ہیں۔"

("پہنچتی کا جڑ" از صحت چٹائی سے اقتباس)

زبان کے دوتا رس کی ایک طرح پر روایت نے چہ بعد کی رد وادی کی افسانوں میں ختم کیا۔ بیشیت اس کا تھلے لہلہ رد وادی کا نام

یہ دم اور پریم چند کے بعد سب سے لڑا ہوا ہے۔ رد وادی کے ہاں قہم و روایت سے ہندوستانی کا دور چٹائی کا انگلی ایک منفرد نظری آجک ہے۔

اصل کے ہیں۔ یہ داستان کی ٹھری روایت کی بازیافت ہے جس میں محمد علی مدظلہ نے اپنی انفرادیت زبان کے برجستہ استعمال کے ساتھ ساتھ قلم کے شرف و شک Stroke اور حیران کے ہنچن سے یہ لکھی ہے۔ محمد علی مدظلہ Paradoxes کا، دہش ہے

”مجھے صاحبِ ملک کہانی کہتا نہیں ہوں، کہانی کہہ ہوں، ابھی معلوم ہوتا تھا کہ ہے۔“

اندر اس مشعلی و حقیر صلی علیہ وسلم سے ملے گئے اور باقی کے لئے ہمارا کوئی حکم نہیں ہے۔“

میرا دل ہے جھوٹی بات کہتا ہے۔ کرتے نہیں تو اس کی بات کہتا ہوں۔ آٹھ سال پہلے اور پھر دوتے مجھے چنگی کہتا ہے۔

تم نے کیا کیا

”جو بھی آتا ہے پکڑ لے۔“

CPD (Continuing Professional Development)

”راستے میں چھوٹا پھول نکلا تھا کہ مسافروں کو دیکھے گا۔ گھر جاتا ہوں اس کو چھوٹے۔“

(مقررہ وقت کے مطابق)

آگے چل کر زبان سے دہرایا کہ اس روایت میں ابو الفضل صدیقی، ابان، فضل الرحمن، سید رفیع حسین اور قاضی عبدالستار کے نام

میرزا حسن نے جنگ کاس کے تمام کون سمیت اس اسلحہ کا حصول اور قرضہ منگوانے کی فکر کی۔ لیکن اس

Paradox کی لفظی تفسیر کے ساتھ ساتھ اس کے معنی بھی درج ہیں۔

”ابلیس کی آہ نے سنا نہیں کہ مار کے آئے مجھ سے بھاگتے ہیں۔ مجھ تو دیکھ رہے کہ وہ کھانا استاد خاں نے کیا اور

”مجھے ہے غم جو کہ کجا کہ“ آپ لکھیں تھیں، دوا سے فراہم کیجئے جو بخاری سے نقل کیے ہوئے ہیں۔ یہ انشاء کرنا۔ صحت میں بہتر ہے۔“

”برخاسته از این افضل مرتبه است که

[illegible]

میں نے کہا: "میں نے یہ سب سنا ہے، لیکن میں نے یہ نہیں سنا ہے کہ آپ نے یہ سب کیا ہے۔"

تک کیسا ملازمتی تھی؟" (لوگ اچھے تو بہت کیے گا جو ہے۔"

Conducting

$$f_1, f_2, \dots, f_n \in C(\mathbb{R}^n, \mathbb{R}) \text{ and } f_1, f_2, \dots, f_n \in C(\mathbb{R}^n, \mathbb{R})$$

میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں نے اس کو اپنے دل سے نکال دیا ہے۔

44. *Journal of the American Medical Association*, 2000; 283: 2689-2692

— $\frac{1}{2}$ — $\frac{1}{4}$ — $\frac{1}{8}$ — $\frac{1}{16}$ — $\frac{1}{32}$ — $\frac{1}{64}$ — $\frac{1}{128}$ — $\frac{1}{256}$ — $\frac{1}{512}$ — $\frac{1}{1024}$ — $\frac{1}{2048}$ — $\frac{1}{4096}$ — $\frac{1}{8192}$ — $\frac{1}{16384}$ — $\frac{1}{32768}$ — $\frac{1}{65536}$ — $\frac{1}{131072}$ — $\frac{1}{262144}$ — $\frac{1}{524288}$ — $\frac{1}{1048576}$ — $\frac{1}{2097152}$ — $\frac{1}{4194304}$ — $\frac{1}{8388608}$ — $\frac{1}{16777216}$ — $\frac{1}{33554432}$ — $\frac{1}{67108864}$ — $\frac{1}{134217728}$ — $\frac{1}{268435456}$ — $\frac{1}{536870912}$ — $\frac{1}{1073741824}$ — $\frac{1}{2147483648}$ — $\frac{1}{4294967296}$ — $\frac{1}{8589934592}$ — $\frac{1}{17179869184}$ — $\frac{1}{34359738368}$ — $\frac{1}{68719476736}$ — $\frac{1}{137438953472}$ — $\frac{1}{274877906944}$ — $\frac{1}{549755813888}$ — $\frac{1}{1099511627776}$ — $\frac{1}{2199023255552}$ — $\frac{1}{4398046511104}$ — $\frac{1}{8796093022208}$ — $\frac{1}{17592186044416}$ — $\frac{1}{35184372088832}$ — $\frac{1}{70368744177664}$ — $\frac{1}{140737488355328}$ — $\frac{1}{281474976710656}$ — $\frac{1}{562949953421312}$ — $\frac{1}{1125899906842624}$ — $\frac{1}{2251799813685248}$ — $\frac{1}{4503599627370496}$ — $\frac{1}{9007199254740992}$ — $\frac{1}{18014398509481984}$ — $\frac{1}{36028797018963968}$ — $\frac{1}{72057594037927936}$ — $\frac{1}{144115188075855872}$ — $\frac{1}{288230376151711744}$ — $\frac{1}{576460752303423488}$ — $\frac{1}{1152921504606846976}$ — $\frac{1}{2305843009213693952}$ — $\frac{1}{4611686018427387904}$ — $\frac{1}{9223372036854775808}$ — $\frac{1}{18446744073709551616}$ — $\frac{1}{36893488147419103232}$ — $\frac{1}{73786976294838206464}$ — $\frac{1}{147573952589676412928}$ — $\frac{1}{295147905179352825856}$ — $\frac{1}{590295810358705651712}$ — $\frac{1}{1180591620717411303424}$ — $\frac{1}{2361183241434822606848}$ — $\frac{1}{4722366482869645213696}$ — $\frac{1}{9444732965739290427392}$ — $\frac{1}{18889465931478580854784}$ — $\frac{1}{37778931862957161709568}$ — $\frac{1}{75557863725914323419136}$ — $\frac{1}{151115727451828646838272}$ — $\frac{1}{302231454903657293676544}$ — $\frac{1}{604462909807314587353088}$ — $\frac{1}{1208925819614629174706176}$ — $\frac{1}{2417851639229258349412352}$ — $\frac{1}{4835703278458516698824704}$ — $\frac{1}{9671406556917033397649408}$ — $\frac{1}{19342813113834066795298816}$ — $\frac{1}{38685626227668133590597632}$ — $\frac{1}{77371252455336267181195264}$ — $\frac{1}{154742504910672534362390528}$ — $\frac{1}{309485009821345068724781056}$ — $\frac{1}{618970019642690137449562112}$ — $\frac{1}{1237940039285380274899124224}$ — $\frac{1}{2475880078570760549798248448}$ — $\frac{1}{4951760157141521099596496896}$ — $\frac{1}{9903520314283042199192993792}$ — $\frac{1}{19807040628566084398385987584}$ — $\frac{1}{39614081257132168796771975168}$ — $\frac{1}{79228162514264337593543950336}$ — $\frac{1}{158456325028528675187087900672}$ — $\frac{1}{316912650057057350374175801344}$ — $\frac{1}{633825300114114700748351602688}$ — $\frac{1}{1267650600228229401496703205376}$ — $\frac{1}{2535301200456458802993406410752}$ — $\frac{1}{5070602400912917605986812821504}$ — $\frac{1}{10141204801825835211973625643008}$ — $\frac{1}{20282409603651670423947251286016}$ — $\frac{1}{40564819207303340847894502572032}$ — $\frac{1}{81129638414606681695789005144064}$ — $\frac{1}{162259276829213363391578010288128}$ — $\frac{1}{324518553658426726783156020576256}$ — $\frac{1}{649037107316853453566312041152512}$ — $\frac{1}{1298074214633706907132624082305024}$ — $\frac{1}{2596148429267413814265248164610048}$ — $\frac{1}{5192296858534827628530496329220096}$ — $\frac{1}{10384593717069655257060992658440192}$ — $\frac{1}{20769187434139310514121985316880384}$ — $\frac{1}{41538374868278621028243970633760768}$ — $\frac{1}{83076749736557242056487941267521536}$ — $\frac{1}{166153499473114484112975882535043072}$ — $\frac{1}{332306998946228968225951765070086144}$ — $\frac{1}{664613997892457936451903530140172288}$ — $\frac{1}{1329227995784915872903807060280344576}$ — $\frac{1}{2658455991569831745807614120560689152}$ — $\frac{1}{5316911983139663491615228241121378304}$ — $\frac{1}{10633823966279326983230456482242756608}$ — $\frac{1}{21267647932558653966460912964485513216}$ — $\frac{1}{42535295865117307932921825928971026432}$ — $\frac{1}{85070591730234615865843651857942052864}$ — $\frac{1}{170141183460469231731687303715884105728}$ — $\frac{1}{340282366920938463463374607431768211456}$ — $\frac{1}{680564733841876926926749214863536422912}$ — $\frac{1}{1361129467683753853853498429727072845824}$ — $\frac{1}{272225893536750770770699685$

۱) قضاۃ الشہادتین بنی عامہ

”نہ ہولی، جہاں سے بیچم، کے لیے مجھے کس لٹی ابھی دور تھا، میں اپنے طیاروں

”میاں اٹی شاوی، بحصول کے ساتھ کار چیں، ان کے یکے کا نمونہ گواہ ہے۔ آپ رات کو تو اتنی جگہ چاہیں۔“

میری اہانت پر کراس نے شاہائی کو آواز دی۔ شاوی رہنمائی کرتا اور مبینہ دعویٰ پہنے آنے اور میرے برابر جگہ گئے اور، یکے والے نے میرے اور ان کے سامنے ”تھیل کا گھنٹہ“ دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر رکھ دیا۔ کھٹکے کے پیٹ میں سوکری کی چھت کا ٹکڑا بنا تھا۔ وہ انگل کے چاٹے پر سودا میں سویت کی رہی چلی تھی۔ اس کے سامنے کاغذی انعام مبین آف بحصول اسٹیٹ کا پائدار ستارے کا سونو گرہم بنا ہوا تھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا اور شاوی مجھے دیکھ رہے تھے اور کھٹکے والا ہمدردوں کو کچھ ہاتھ۔ یکے والے سے پتا گیا کہ اس نے پوچھ ہی لیا ”کا شاوی گھنٹہ بھی خرچہ لا جو۔“

ہاں انگل شام کو مظلوم بنائی، گھنٹہ چڑا ہے پیاس پر کہ گھنٹہ سے دسین دالے کے۔ الی۔۔۔

”ہاں وقت وقت کی بات۔ شاوی، اچھی تو اتنی گھنٹہ اسے گھوڑے کی دھڑا سوا کچھ کے چل۔“

یہ کہ کراس نے چاہک بھانجا۔

میں: ”میاں کا ہر وقت“ چوروں کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے مضبوط ہوا کہ یہ چاہک گھوڑے کے ٹیسٹ میری پیٹھ پر چڑا ہے۔“

(”تھیل کا گھنٹہ“ کاغذی مہیا ستارے اقسام)

زبان کی چانچیں دو بندرم اور پریم چند کے Camp Followers نے تشکیل کی۔ یہ آدش حقیقت نگاری اور مدد ملی لکچے کی باہم آمیزش تھی۔ اس کی ایک ابتدائی مثال طلوع حسن نگاری کے ہاں (افسانہ ”بہراشواہ“) کا ظاہر ہوئی تھی۔ اس روایت میں حسن نگاری کا لہجہ مغل زوال کے حوالے سے شکوہ، الفاظ اور پردہ بازی کا حامل تھا۔

زبان کے دربارے کی سطح پر، زبان اور حقیقت پسندی کا یہ ملاپ جب رائج آتھا سے ہوتا تھا کہ شہنشاہ چند کے ہاں ظاہر ہوا اور مدد عام کر گیا۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں آدش حقیقت نگاری اور روایت کے زیر اثر شعریات اور فلسفگی کی دریافت کرتی ہے۔

”رنگی بھٹے سے شادی کر دی۔“

چلتی ہوئی فاسٹ لوکل کا طوفانی شور۔ پہلے صیبت آواز نکھلتا ہے ہونے۔ ان آوازوں کی صیبت تک کوئی میں ایک ننگے کی طرح کھسی کی آرزو محسوس میں پکڑ کھاتی ہوئی، بھرپور قہم کیا۔ گاڑی پہلی گئی۔ چاہک سنا بہت جلد کیا۔

رنگی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ریل کی بڑی پار کرنے لگی۔ ریل کی بڑی پار کر کے، دوسری طرف چلے گئے۔ ایک چھوٹی سی چٹھڑی ایک مائی ٹیسی زمین سے گزر کر انٹیشن جانے والی سڑک سے مل جاتی تھی۔

رنگی نے وہ چھوٹی سی چٹھڑی بھی پار کر لی۔ اب وہ سڑک پر آ گئی پھر بھی وہ کچھ نہ بولی۔ کھسی ایک بھڑم کی طرح سر ہلکانے اس کے ساتھ ساتھ چلے۔ اب، باہم کا انٹیشن قریب آ رہا تھا۔

(”رنگی“ کا کرشن چندر سے اقتباس)

کرشن چندر کے حوالے سے اس اسلوبیاتی روایت کا اثر قبول کرنے والوں میں وہاں پس منظر کے نو ترقی پسند طبقات نگاروں کی بڑی تعداد ہے۔

زبان کی کھسی بھرچر اسلوبیاتی روایت نے مختلف کے عالمگیر اثرات کے تحت اردو افسانے میں جنم لیا۔ یہ زبان کے گفتگوئی امکانات کی

دریافت کرنے کی روایت ہے۔ یہ اسلوب ظاہر میں باطن کو دیکھنے اور دکھانے کے تخلیقی عمل کی ضرورت تھی۔ اس میں نثر کی موسیقی و موسومات کے ساتھ نیا اور نیا مواد ملوں کو چھونے لگ جاتی ہے۔ اس اسلوبیاتی روایت کی داغ بیل ہندوستانی نگاروں میں راجا راؤ سے چڑھ کر "She was nervous and Trembled over and say Between Her Sobs "Oh mother " The Cartman asked me to get in. I jumped into the cart with a heavy hart. "Hoi-Hoi." Cried the cartman and the bullocks stepped into the river Till we were on the other bank, I could see Javni sitting on a rock and looking towards us. In my soul, I still seemed to hear her sobs A huge peepal rose behind her 'and across the blue waters of the river and the vast sky above her' she seemed so small So-insignificant." ("Javni"- Raja Rao)

اردو افسانے میں زبان کے اس دور کا سب سے ابتدائی مثالیں راجندر سنگھ بیدی، نظام مہاس اور سید فیاض محمود کے ہاں ظاہر ہو سکتی ہیں۔ افسانہ نگاروں کے ہاں تصویر کے ظاہر میں باطن کی جھلک دیکھنے اور دکھانے کا تخلیقی عمل، تخلیقی امکانات کو روشن کرتا چلا گیا ہے البتہ زندگی اور اس اور ہندوستانی اساطیر کی آئینہ چلائی گئی اس میں بیدی کی انفرادیت ہے۔ اس روایت میں استعاراتی تھوڑی کاری کی مثالیں "گرہن" (بیدی) اور "آسمانی" (نظام مہاس) "کام چڑا" (سید فیاض محمود) ہیں۔ اس اسلوب کی نرم و لطیف مزنی اور پامنا مکتی راہوں میں جھلکیاں مل کے دوران روایت بخود ہی لگتی ہے۔ (بیدی) "شاگلی" (نظام مہاس) اور عطاوات (سید فیاض محمود) کو نگہ دہی ہیں جہاں افسانہ نگاروں کی انفرادیت تھی۔ "پھر کچھ بچے لگے۔ اس وقت سرائے میں سے کوئی عورت نکل کر میری سر پہ بخت دو کرتی تھی، بھاگتی تھی، پیٹ پکڑ کر دھو جاتی، دھو بیچ اور دے لگتی اس وقت آسمان پر چاند پر گاہا تھا۔ راجا اور کیتے کی لڑکھڑاہٹ واصل کیا تھا۔ دو دھندلے سے سامنے اس عورت کی حد کے لیے سراسیمہ اور حیران ہو رہے تھے۔ ہاتھوں طرف اندھیرا تھا اور دورا سا دھندلے سے لگی لگی آواز میں آ رہی تھی دان کا وقت ہے

چھوڑو چھوڑو چھوڑو

یہ بھول بھول سے آواز آتی پکڑو پکڑو پکڑو

چھوڑو دان کا وقت ہے پکڑو چھوڑو!!"

("گرہن" اور راجندر سنگھ بیدی سے اقتباس)

آ کے بل کر طرابع میں دھور دھندلہ جسمیں نے اسلوب جان کی اس روایت کی پہچان کو چھو لیا۔

اردو افسانے میں وہاں زبان کی ان گہرے اسلوبیاتی روایات کے علاوہ لگی سے امکانات کی تلاش جاری رہی۔ البتہ مثنوی کا استعاراتی افسانہ "چندے" کرشن چندر ("کالیج"، "اندھ دست"، "تجھ کی چھری"، "گڑھا"، "یت جاگتے ہیں"، "ننگی کی گولیاں" اور "بڑا خوب" ("دل و تاروں"، "دورانِ حیرت") کے مطلق افسانے۔ "آہ و سوخت" (قرۃ العین سید)، اور "مردودہ سندھ" (کرشن چندر) جیسے کامیاب تجربی افسانے، پھر یہ اسلوبیاتی روایات کی داغ بیل ڈالتے ہیں کامرہ ہے۔ اسی طرح اختر اور غنی کے "کچلیاں اور بال جبریل" کی

اساطیری اثار بیت، مزاج احمد کا "قصہ شیخ" اور انتصار حسین کا "زور کتا"، اپنے طوطائی لہجہ کی چلن نہ کرا سکے۔ مزاج احمد اور انتصار حسین داستان نوی اسلوب کے Revival میں ناکام ہوئے۔

"میں صورت ذات پر دے کی بیٹھنے والی فیضی، میرا تو ذکر کیا۔ تنقیر سے جس کے پلے بندگی، دوہمگی دینے مگر گھنٹے ہیں کہ باہر جانے کے نام سے شاعروں کا یہ حال ہو جاتا ہے۔ اس برس سے خاصے تئیں روپ کے کوکر تھے۔ صاحب نے نگین باہری بدلی کر دی۔ بس نگار کیا تھا دفتر سے جو آئے تو بخار چڑھ آتا۔ دست چھوٹ گئے۔ اس جان نے جو ستا تو سدا گھر پر، اٹھ لیا جھلسا لگے لیکن نوکری کو، صدقہ کچے تھے چے تئیں روٹی۔ یہ اتنا مارگ پر دیکھ بیٹھنے والا آتا۔ اس ہندی کا آئینہ پھونکنا ہے۔ تاہا ہا اٹھسا پنے پنے کی جان باری ہے، دروازہ بچا رہا نہیں۔"

("سفر میل کا" انوار شرف صوبی سے اقتباس)

داستان الخیری، ختمہ حسن بھائی اور اشرف صوبی، دہلی کے طباقوں میں دلی کی کسالی زبان کا پکڑنے والے روپ صادق الخیری اور داستان جرنلی کے ہاں نوک احباب کے قصہ رو کا معشوقہ نگین کسالی کی تمام ستائش اور پاکیزگی کو برقرار رکھتے ہوئے بھی افسانے میں کسی زور و زبانت کا مظہر نہ رہا۔

زبان کے دربار۔ کی سب پر اس آفرانہ کرنا کامیوں کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ زبان کو اس کی باطنی اور نامیاتی نشوونما کے بغیر بدلنے کی کوشش کی گئی اور یہ حرکت اس جلتے سرزد ہوتی ہے جب اسالیب میں بنیادی نوعیت کی ترامیم اور اصلاح کرنے سے پہلے زبان کی روایت کو نہیں سمجھا جاتا اور پیش رو دیکھا جاتا کہ ان لسانی تقطیع کی، ضعی کے اجتنابی تجربے اور ارجحی شخصی سے کوئی نسبت ہے بھی یا نہیں۔

ہندوستان میں تنقید کی پانچواں لہری بنیادی ہونے کے باوجود دارالعلوم کی شکست سے یہ صورت حالات سامنے آئی۔ "سب دس" کی صوفیانہ عقل خود ہندوستان کے ایک بہت بڑے طبقے کے لیے "نارائیک" بن گئی۔ قاری تنقید کی اصطلاحوں اور دارالعلوم سے دور ہونے کے سبب "حسن کی ہمزاد"، "وصال کا جھبی" "حسن کی ٹکٹوٹی" سے جو کچھ مروا نہ لے سکا، اسے واقعات کی صوفیانہ تکرر یا ضرورت عقلی آئی۔ دوسری طرف علمی اور اسلوبیاتی سب پر اس کے دوسرے اثرات صراحت کے علاوہ پڑنے دو سال بعد سے دلی افسانہ "افسانہ زور" شکستہ نظر آتے ہیں۔

دوسری طرف زبان کے ارتقا سے کی سب پر حقیقت ہندی کا اظہار یوں ہوا کہ جذبہ کی آبیروش کے بغیر خارجی کی اشیاء کی طرست سازی عمل میں آئی یا اس لیے کہ شے کی جزوی تفصیلات سمجھ بیٹھا گئی تھیں، جبکہ دوسری لہری جذبہ کے زیر اثر لفظ کے برتاؤ کی قحی۔ ایسا بہت کم ہوا کہ لفظ کے حوالوں سے تجربہ کرنے کی کوشش کی گئی ہو، جس کی ایک مثال راہچر سگھ دیلی کے افسانہ "جو کچھ" سے ملتی ہے۔ جس لفظ اور رنگ ہیں اور رنگ جذبات کی چہرہ نمائی کرتے ہیں۔ حقیقت یہندی کے تحت جملاتی استعاروں کا کمال چلا اور لفظ کا برتاؤ نشان کی حدود سے آگے نہ اگل سکا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ تئیں بیان کو مد سے زیادہ اہمیت دی گئی یا جذبہ کے برتاؤ کے سطح میں افسانہ نگار دہلی سب سے زیادہ راہچر سگھ تھا۔ خیال بھی کی تئیں کیسے وجود میں آئے؟ اردو میں گورکی، کائنات اور راجگور کا ترجمہ تو ممکن ہے۔ مازیل پر دست یا استار دال (عسکری صاحب کی ایک مثال کے علاوہ) کا ترجمہ ممکن نہیں۔ اس لیے کہ ہر دو جذبات کا تجربہ غرض کی زبان میں کرتے ہیں جب کہ ہمارے ہاں آج تک غرض کی زبان کی کوئی روایت نہ ہوئی تھی۔ ہم نے شت شت کی جھڑکی ہے، دلی شت جھڑکی ہر برت رہی، "میں بیٹھ رہے تھے تھی کا۔"

محمد حسین آ زاد کے ہاں نرد و زبان کی تھک دہائی قوت مدد کی تسکین نہیں کر پائی، عقل کا زور اور دہریت قابل حاد ہے جس کے سبب علم لطافت کی کیفیت کا اظہار حدود کمال تک پہنچ گیا اور اب الکلام آ زاد ہیں جن کے لہجے کی کھک نیاز کے ہاں نرد و زبان میں اضمحل گئی ہے۔

زبان کے دربارے کی سطح پر مل جا کر یہی سمجھو رہا گیا۔

رہا آج کے افسانوں میں زبان کے دربارے کا سوال، تو اس کا تھم تھام سے آج کے طرز احساس سے ہو گا۔ ایسی زبان جو لکری اور تہذیبی سطح پر بات کی تہذیبوں کو اپنے اندر گھسانے کی کچھ سمجھی ہو۔

ویش منظر کے افسانہ نگاروں کا طرز احساس کی تہذیبوں میں مل جانے کی اور پھر پانے جذباتی نگاہ کو دنیا پر آنے کی ضرورت بھی پیش آئے گی۔ ویش منظر کا افسانہ نگار ان سوجھو اسلوبیاتی روایات کی حدود سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس لیے آج کے ویش منظر کا جتن کرنا اردو اس منظر کو روکنا ہے تاکہ اردو روایت میں پھیلنا کی گنجائش نکلے۔ یہی روایت سے اطراف کل روایت کی توسیع ضرور ہے۔

یہ منظر اور ویش منظر کے افسانے کا واضح فرق اسلوبیاتی سطح پر یکے دوسرے افسانے اور ہم جیسے افسانوی تہذیب کا یہ ہے۔ عقیدے اور نشان پر مشتمل، یہ منظر کے اعتبار کا وسیلہ ہیں اور استعارہ ویش منظر کے اعتبار کا وسیلہ۔ جبکہ عقیدے یا اشاروں کی معنوی درجہ استعارے کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

ڈی۔ ایچ۔ لادنس کا "ایڈمیٹڈ لیز لوڈ" اور یو۔ برٹ سلی کا "کاسٹ نو بروگلز" ایک معاشرت کی نوٹ پھٹ اور ان کی طرز زندگی کے تھم لینے کے درمیانی مرحلے کی عکاسی ہیں۔ (ان دونوں کی ایک اہمیت یہ ہے کہ وہ معاشرتی ٹھکراؤ میں اضافے کا باعث ہے، ان کا اگلے اسی طرح ویش منظر کے افسانے میں مقابلہ حرام کار، آبرو داغ، حریص اور نفس کر دار آج کے افسانہ نگار کے سامنے سوالیہ نشان بن چکا ہے۔ یہ بہت ہیج حاکم دار ہے اور اس کی محصلتیں روایتی اسالیب اعتبار سے باہر مقرر ہو رہی ہیں۔ اس کر دار کی پختگی کے لیے افسانے کی قدام اور زبان کے اعتبار سے کی سطح پر تہذیبوں کی ضرورت ہے اور یہی طریقہ کار ہو گا جو ڈی۔ ایچ۔ لادنس اور یو۔ برٹ سلی نے اختیار کیا یعنی اپنے عہد کے نئے ہیں، اوطاق، ذہن، کبریٰ اور کینٹن کی گرفت میں لینے کے لیے معاشرتی تہذیب کا کوئی ہار نہ کیا۔

آج ماں میں منظر کے افسانہ نگاروں اور نئے لوگوں کے ہاں زبان کے دربارے کا واضح اختلاف باطنی تا حالی سطحوں کے تاریکی اور باطنی تجربے کا اختلاف ہے۔ یہ منظر اور ماں میں منظر کا زیادہ تر افسانہ نگار تخلیق، جب کہ ویش منظر کا افسانہ نگار تخلیق سے اختلاف کی صورت ہے۔



اس سچ منظر میں سوال یہ ہوتا ہے کہ اردو افسانے کے سفر پر کوئی پر بٹھاتے ہوئے کیا حقیقت دیکھ کر دار نگاری، ناہیت اور اسلوب جان کیسا اہم ہیں یا ان میں سے کوئی ایک؟

اس سوال پر غور کیے بغیر ہمارے ہاں عمومی طور پر اردو افسانے سے متعلق جتنی بھی مباحث میں حقیقت واقعہ اور کردار نگاری کے مقابلے میں اسلوب جان بہت کم کر رہی بٹھ آئے ہے۔ جبکہ فن پارے کے باہم سمجھے اور دے ہوئے سے حاضر تہذیب کا کمال قوی اسلوب جان کوئی پر بٹھ اٹے بغیر نہیں۔ لہذا اچھے نوکر کو دیکھنا ہو گا۔ اس لیے بھی کہ اردو کے پہلے افسانہ نگار "نصیر اور علی" "ازراشد الخیری" "ملوہ" "عزیز" "مہر" 1903ء میں کے دور میں یہ متعلق اردو افسانے کے ایک سچا سچ سفر میں ہونے کا راز ہے جانے والے اسالیب جان کا جائزہ ہمیں آنے والے کل کے لیے اس سفر میں کا پتہ ڈالنے کے قابل بن سکتا ہے، جس کی خواہش ہمیشہ کی جاتی ہے۔

آج اس شخص میں کام کرنے کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ گزشتہ صدی کے سڑے سانچے اور سڑے سطر کے افسانہ نگار کا حریف موجود ہے۔ یہ سڑے کا طاق بھی رہا ہے۔ یوں موجود اور واضح کے مقابل غیر واضح شعور کے مقابل واضح شعور اور اجتماعی شعور، حقیقت اور وہانیت کے مقابل شک اور گمراہیت کے مقابل داخلی انکھیج، وہاں نے اہمیت اختیار کر لی اور حقیقت، واقعہ، جسے افسانے کا جھرپور اور توانائی کا سرگز، تصور کیا جاتا تھا کی اہمیت ہندجہ دم ہو کر رہ گئی۔ جس کے نتیجہ میں آدھ رنگ، یعنی فکسٹو کے پائندہ اور دوامی یکڑے پڑتے ہیں یہ کی جگہ حلاجی، استہراقی، تجربی اور گھومک اظہار بیان نے اہمیت حاصل کی۔

یہ سڑے کہ 20 ویں صدی کا آغاز بہت بڑی آنکھوں کھچا دے ہوئے تھے لیکن، امپریل ازم، سوشل ازم اور احمک ازم کے ریلوں اور عرب کی انتہائی تحریک کے اثرات نے ہمارے افسانوی بیان کو محدود و محاذ کیا۔ یہ فلک، کسی بھی نوع کی بڑی انجیل کا پہلا غیر ایسے ہی محارب میلانات سے ظہور پاتا ہے۔

علی گڑھ تحریک کی ادراک پسندی اور لپٹی نڈر احم کا مقصدیت کے مقابل کہانی کے سادہ بیان، فکشی فن اور داستانوی بیان کی شعریات نے وہ تھوڑا دیا تو اردو کے پہلے افسانہ نگار راشد الفخیری کی معرفت لپٹی نڈر احم کے فکشی قصوں سے مخصوص زبان کا ردی ایک کردہ مختصر افسانے کے فریم میں فکشی ہو گیا اور اس سلوب اظہار میں مختلف طاقیات اور تہذیبی مراکز کے مٹا دے اور دوسرے کے اضافہ یافتہ دیکھنے کوئے۔ جیسے عباسی شکم (والدہ، حجاب، امتیاز علی) کے ہاں جنوبی ہند کے شطیع کرشنا اور فرساج رکا طاقانی ایک اور دوسرے کا استعمال، خذ سہل سید (والدہ و قرآن) (امین سید) کا آثر بدیش سے متعلق مخصوص لہجہ، آمد نازی کا ردی ہمارے اور افسانے الہی کے ہاں، چٹانی زبان کی آمیزش سے پیدا ہونے والا مخصوص آہنگ سوانہائی اور شک حقیقت نگاری اور دہان نگاری سے مخصوص رہا جس میں آئے جمل کر صدف شکم سید باروی، چٹانی بانو، جمیل ہاشمی اور ہالو قد سہ نے اپنے اپنے طاقانی اثرات کے تحت نئے لکھے تراشے۔

اردو کے دیگر دو ابتدائی افسانہ نگاروں علی محمود اور ذراست علی اور بی نے 1904ء و 1906ء کی مختصر دو میانیت سے طاق بہار سے مخصوص ہندوستانی Noble Savage کی سادہ زبان کا چلنی عام کر دیا۔ مثال کے طور پر علی محمود کے ہاں سوکھے درخت کی بجائے "ٹھوٹھے درخت"، اکیلا کی بجائے "اکھا"، کارنس کی بجائے "لنگھی"، اور سناٹا کی بجائے "سٹنی" ہاں کی چور، بہار سے مخصوص خطیات دیکھنے کو ملتی ہے۔ جب کہ ذراست علی اور بی کے ہاں بہار کے مضامقات سے مخصوص خطیات کم بہت ہی کم ہے۔

"میں نے سفوری کاٹو چھاؤں سے سیکھ، جن جڑوں میں دیکھ کر نہ تھکتے سارے تھن کو بڑی داخلی طرح چھایا۔ گھٹن کی چھاؤں، صبر اور سڑک کے کنارے کے درختوں کی چھاؤں، قبرستان کی چھاؤں۔ کیا قہ نے اپنے ہندو گار پر نظر نہیں کی کہ اس نے کیوں کر چھاؤں کو چھایا رکھا ہے اور اگر چاہتا تو اس کو خیر اہوا کر دیتا۔ مگر ہم نے آفتاب کو اس سب خیر اہوا ہے۔ لہذا اسے ہماری طرف آہستہ آہستہ سمٹ لیتے ہیں۔"

("چھاؤں" از ذراست علی اور بی، "تھون" کا دور، جنوری 1904ء، ص 31-35)

بعد ازاں سبیل عظیم آبادی، اعظم کرچی، اختر اور بخاری، تھکیلہ اختر، انور عظیم، احمد یوسف، اسماعیل، حسین الحق، عبدالصمد، علی امام، شکت حیات اور شکیل احمد کے افسانوں میں اس بھاری ایک کی گھلا دے اور اکثر بین کے متعلق روپ ظاہر ہوئے۔

1906ء سے سہاد سید علی دہرہ کی صرفت اردو نثر میں رو مانئی مثالیت نے رواج پایا۔ یہ کلاسیکیت کی تھیں، مقصدی حقیقت پسندی کا ردی تھا۔ داخلیت، جس کا وصف خاص ہے۔ جب کہ نیاز علی چندی کی روانیت کی لاپاس بچکان وارفتہ نوعی ہے جس کے اظہارے بعض اوقات

گہری حقیقت پسندی سے بھی جڑ جاتے ہیں۔ ایسے میں جھٹوں گورکھپوری کی روایتی انفرادیت اور حجب احتیاطی کے ہاں پایا جانے والا احساسِ انجلیت و دلگذاڑا نظر آتا ہے۔

یہ بھی بے گناہ ہے کہ اس دور کی نگہیں میں وہاں کا اداسیٹہ یا راندہ ناتھ دیکھ رہے۔ لیکن اسے ابتدائی انسانوں میں پائی جانے والی ذہنی ہجرت اور شاعرانہ فن سے ہمارے اولین ادیبانہ نگار متاثر دکھائی دے سکتے ہیں آگے چل کر جازم چوری، کاظمی عبدالغفار، بھٹوں گورکھپوری اور کباب کے ہاں آسکر وائٹ کی ردول بحال پرستی، لیکن کی نفسی نشاندہی، ٹیڈ رائٹز دیکھو اور مہر شام کی روایتی انفرادیت کے اثرات بھی محسوس کیے گئے جب کہ سر محمد اللہ اور صرف بھٹوں دینے گراؤ میں چکی تیار وہاں سے متاثر دکھائی دیں۔

پدم اور نیاز کے ہاں غار کی مٹھاس اور عداوت ان کے اسلوب بیان کا موجب خاص ہے۔ زبان و بیان کی اسی روایت میں کباب کے ہاں جو کھارہ کھینے کو ملتا ہے اس کا باعث غریبیت کا بندہ تاج کم ہونا تھا، جو عمری کے شب سے پیدا ہوتی تھی۔ آگے چل کر یہ اسلوبیاتی روایت قرابلیں مہد کے ہاں ایک معیار میں داخل گئی۔

1908ء تک آتے آتے علی گڑھ تحریک کی اور اکا پسندی اور ڈیڑھ پتی نثر پر اجماع کی مقصدیت کے باقی ادغام کی صورت پر ہم چند، سلطان مہد، جوش اور سدھن کے افسانوں میں ظاہر ہوئی، یہ روزمرہ کے حوالے سے صاف اور سادہ زبان تھی جسے ہم چند کے ہاں چندہ توصیت لے کر دے چکا تھا، یاد یا اور سلطان مہد جوش کے ہاں طہری کاٹ دیکھئے کوئی۔ بعد ازاں علی مہاس جھیلی نے بھی یہی زبان برتی لیکن اس فرق کے ساتھ کہ ہم چند اور سدھن کے ہاں ہندی انشائیات کی کڑھ ہے۔

1936ء میں ترقی پسند افسانہ نگاروں کی اکثریت کو اپنی فنیوں کی پسندی کے باعث بھی اسلوب اظہار مناسب معلوم ہوا، البتہ ہندی الفاظ کا استعمال رفتہ رفتہ گھٹتا چلا گیا۔ اس اسلوب اظہار کے فوری پتہ کی مثال ملک راج آند اور بھل کشور دھکا کے ہاں مل جاتی ہیں۔ بعد ازاں ابراہیم علیخاں اور شوکت صدیقی نے یہی زبان برتی۔

یاد رہے کہ ہم چند کے شاہکار افسانہ ”نگہیں“ کی تخلیق (1935ء) سے قبل 1932ء میں محمد حبیب کے افسانوی مجموعہ ”کیا جاگ“ اور ”الکھارے“ عرب اعلیٰ میں شگفتہ فرانزا اور ڈی ایچ اے دس کے ملے جلے اثرات کے تحت متروک علمی کیفیتوں سے مطابقت کے تحت تخلیق کا شروع، اظہار بیان کے بے اسلوب کے ساتھ متعادل کر دیا گیا، جس کا درجہ تاریخی پسند تحریک کے ہنگام کے سبب تاہم وہ بارہ دیکھئے کو نہیں ملتا۔

”الکھارے“ گروپ کے افسانہ نگاروں میں سہاؤ ٹھہر اور رشید جہاں کے ہاں بھی ہوئی زبان میں عوامی روزمرہ طہری کاٹ لیے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ اس اسلوب بیان کی نمایاں خوبی اوقاف نگاری کا قریب بھی ہے جو ان سے قبل سوائے راشد الخیری، سلطان مہد جوش اور چوہدری محمد علی ردولی کے کسی اور افسانہ نگار کے ہاں دیکھئے کو نہیں ملتا۔

”الکھارے“ گروپ کے افسانہ نگاروں میں سہاؤ ٹھہر اور رشید جہاں کے ہاں بھی ہوئی زبان میں عوامی روزمرہ طہری کاٹ لیے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ اس اسلوب بیان کی نمایاں خوبی اوقاف نگاری کا قریب بھی ہے جو ان سے قبل سوائے راشد الخیری، سلطان مہد جوش اور چوہدری محمد علی ردولی کے کسی اور افسانہ نگار کے ہاں دیکھئے کو نہیں ملتا۔

”ان کے لیے کرتے اور ہمارے“ ان کے نگہیں، دلچیز، ان کی ادبی نوچیں، ان کا گھٹا ہوا سر اور ان کی جھمکے داڑھیوں، جن کے

ایک ایک بال کو دھریں اپنی آنکھوں سے نہیں کی۔“

(”جنت کی بنیاد“ از سجاد ظہیر سے اقتباس)

اسی کے ہاں یادوں کے دھارے سے مطابقت دیکھنے والی سرسبز رنگ تصویر کاری اور آواز کا زمرے خیال سے ختم پٹنے والے ذرا مائی مولو لاک سے مخصوص ماحولی نے ایک خطرناک سلوب کا باعث بنی۔

”اب کاش اور ہوتے۔۔۔ ناگھیں، ایک سرسبز درخت، گوشت اور گودے کا۔ اس کا رس خون سے زیادہ گرم اور اس کی کھال گوشت سے زیادہ نرم، ایک دوسرے سے چٹائی ہوئی۔ ایک دوسرے میں، ایک تیسرے کی امید، ایک چوڑی زندگی کا لڑاؤ، ایک لمبے کا سرمایہ۔“

(”مہمانوں کی رات“ از اسحاق علی سے اقتباس)

اردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں سے ایک چودھری محمد علی اردو ادبی نے داستانوں کی زبان کو تو رے مختلف انداز سے برت کر ایک نیا لہجہ تراشا تھا۔ زبان کے دھارے کی اس روایت میں کاشی مہدائے کا نام یاد کرنا ضروری ہے اور اس خصوص میں جملہ امکانات کھل کر رہے۔ قاضی عبدالستار کا ”نقل کا گھنٹہ“ اس سلوب کا نام مروج ہے۔

پرچم چلنے کے اولین افسانوی مجموعے ”سوز وطن“ میں شامل داستانوں کی سبب افسانوں کے بعد عروج اس نے حقیقت و واقعہ کو افسانے کا جوہر اور قہائی کا سرگزشت خیال کرتے ہوئے ”زوریں تاج“، ”خطرہ دار الفت“، ”میرا وطن میرا بھائی“، ”ان دن بٹا اور صدیاں“ نیز ”آب حیات“ جیسے تاریخ سے متعلق افسانے لکھتے ہوئے داستانوں کی سبب برتا تھا۔ تصور حتم بند کرتے ہوئے لطیف و نازک خیال و نگار اختیار کیا۔ ان افسانوں کی حیثیت اپنی ہر نگار داستانوں اور تاریخی اسالیب انہماک کا چلنے اور ان کے مختصر افسانے میں جامع ہو سکا۔ انتقاد میں ”آغری آدنی“ اور ”نور و صفا“ اسی روایت میں لکھے گئے افسانے ہیں۔

ایک سر پر اسلوبیاتی روایت، مختلف اور اس میں نثر ایک کے ساتھ اثرات کے تحت اردو افسانے میں جنم لیا اور خوب چلی پھری۔ یہ زبان کے تخلیقی امکانات اور بیان میں خلائی اجماع پیدا کرنے کی روایت ہے۔ جس میں راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس اور سید فیض محمود نے افسانے لکھے۔

یاد رہے کہ اردو افسانے کے ابتدائی دور میں دہلی کی کھائی زبان میں آؤر شک حقیقت نگاری اور روایتی فن کی آمیزش سے واضح الجھری، خود پسندی، اشرف صوبی نے شمع اور مسطور زبان لکھنے کا تجربہ کیا تھا۔ مضمونی سطح پر مفید و دل سے مناسبت کے حوالے سے یہ تسلیم و رضا کی زبان تھی۔ بعد ازاں صادق الجھری، آصف زئی اور لطیف طاہر نے اسی زبان کو برتا۔ دہلی سے مخصوص کھائی کی اس اسلوبیاتی روایت کے علاوہ تو رے بے عیب زبان لکھنے کے حوالے سے چند دیگر افسانہ نگار بھی نمایاں دکھائی دیے جیسے عروج ملک، آغا پور و راجہ زمین شاہی کے افسانوں سے مخصوص ہوشیار پور اور بڈلوی لوک ایمانیات سے سرچر زبان یا محمد حسن عسکری اور انتقاد میں کے افسانوں میں میراجہ کے نازی علاقہ جات سے مخصوص نظریات کی شمولیت۔ یہ جامع سبھ، دہلی کی تیز جھول سے مخصوص کھائی کی طرح بے عیب زبان پر گزرتی ہیں۔ البتہ اس کی ایک اپنی چاشنی ہے۔

اردو افسانے میں زبان و بیان کی سطح پر جو اسلوب چاہیے میں سب سے زیادہ کامیابی سے برتا گیا وہ عوامی روزمرہ سے متعلق ہے۔

کرفن چند اور خوب احمد عباس نے اس میں شعریت اور فلسفگی کے اضافہ بات کے ساتھ اسے اپنایا۔ کرفن چند اور علامہ احمد عباس اسی اسلوب اختیار کے سبب بد بات کی Sublime صورتوں پر قادر تھے۔ ٹھیکے والوں کی ایک بڑی کیپ دکھائی دیتی ہے لیکن ان میں سے جو نام بیشب یاد رکھے جائیں گے ان میں اسے جمید خیالات احمد گوی، ناصر شریف، فیض الدین احمد اور بلراج کوشل نمایاں ہیں۔

جب کہ زبان و بیان کے حوالے سے ایک لمبی فکر سلویاتی روایت کو ترجیح ملی۔ سادات حسن منٹو، ممتاز مطلق اور مصمت چٹائی کے افسانوں سے۔ اس سلویاتی روایت کی متعدد صورتیں ہیں، ہر ایک بنیاد ملاقاتی زبان میں اور عوامی بولچس ہیں۔ ہر ایک صورت میں شعری لہجہ شعرا سحر اچھا اور احمد عباس کی نمایاں خوبی۔ مثال کے طور پر پنجابی کی آمیزش کے ساتھ جس سلویاتی روایت نے منٹو اور ممتاز مطلق کے افسانوں سے ترویج پائی، اسے بعد اس مطلق احمد منٹو، یاد، برج، چن، چند اور احمد داؤد نے برتا لیکن اصل زبان کے لیے پنجابیت کا گہرا غامری رہتی ہے۔

اس نوع کے بیان میں ایسی تھیں بات جن میں بد کوئی نمایاں نہ ہو، قابل توجہ نہیں ٹھہریں، لیکن ان افسانہ نگاروں کے ذہن میں تخلیق نے موزوں ترین نمائندگی اور مثلاً، ہمیشہ حقیقی کے ٹھیکے کو مضمون اور تصویر کے لیے قربانی کی گوارا ہم کر دی نیز ان کے افسانوں میں حقیقت و افسانہ کا پتہ دلچسپ ہے کہ زبان و بیان کی خامیاں قاری کی نظروں سے بالکل رہتی ہیں۔

زبان و بیان کی اس روایت میں راجندر سنگھ بیدی اور بلونت سنگھ و ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے ہاں تہذیبی رجحان اور مظہر ناموں کی مزاحمت سے پنجابی اور ہندی ثقافت کی شمولیت کا باقاعدہ و منطقی جواز دکھائی دیتا ہے۔ ان کے اسلوب بیان پر انتظار حسین سمیت، ناک بھونچہ حوالے سے افسانہ نگاروں کے منطقی و تاریخی کے اسی سے بعد اہمیت سے اہمیت رہتی ہیں۔

اس خصوص میں اور افضل صدیقی کے ہاں اور انگلیہ کی اشرافیہ سے مخصوص زبان اور خان فضل الرحمن کے ہاں تنگدلی کی تعلیمات کا دور کار نکھرے اسلوب بیان کا باعث بنا۔

یوں اور افضل صدیقی اور خان فضل الرحمن ان اسلوب بیان کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ جب کہ اسی روایت میں دہریہ و سحر جاتی کے ہاں ہندوستان کے قریب قریب سے پہلے کے کتبوں کی بدولت اس دور وادہ جسم کے جمید بادی انگ کا ایک ڈالکھ ہے۔

برصغیر کو diglossia Society بھی کہا جاتا ہے۔ اس نئی انگل سوسائٹی کا اسانی جائزہ لینے ہوئے فرنگوں نے برصغیر کو زبانوں کا مختلف قرار دیا تھا۔ یہاں بڑی زبانوں کے علاوہ اور لڑائی، آریائی اور تہائی زبانوں کے کئی سلسلے ہیں۔ مختلف ملاقاتی زبانوں اور بولیوں سے مخصوص تعلیمات کے اردو میں آنے کے علاوہ مختلف معنی اور کراہتی کی بدولت ہاں اور بڑے شعروں میں جنم لینے والا حالی اور غیر مہذب لہجہ لہجہ زبان پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ خاص طور پر ہمارے میں کچھ عرصہ قبل ہندی کو موی بول چال جانے کے حوالے ہو چکا اور اسے ہندی نے مستعار لیا تھا۔ اب ہندی اسی کو کھڑے رکھ کر ہے جو نئے ثقافت اور ثقافت الما کے ساتھ اردو کو کھاری ہے۔ یہ ایک تاریخی آغاز ہے جو نئے ہمارا افسانہ نگاروں کی زبان و بیان پر چڑی۔ خود ہمارے ہاں پاکستان میں، پنجابی، بلوچی، سندھی، سرائیکی، پنجابواری، شہ، ہندو اور پشتو تعلیمات کاتن آسان افسانہ نگار جاکسی منطقی جواز کے بے دریغ بہت رہے ہیں۔ جب کہ اس نوع کی زبان اور ادب دیکھنے کا دور کار کردار نگاری سے تعلیمات کے حوالے سے مکالماتی سطح پر جاتا ہے جیسا کہ مبینی کے ساجد شید کے ہاں، کمالی دیتا ہے لیکن اگر افسانہ نگار کا یہ بھی اس عالی تعلیمات اور لہجہ سے آلودہ ہونے کے لیے تو یہ ایک کھنکھریہ ضرور ہے۔ میں یہ بات سمجھتی، ٹھیک، کراہتی، بہار، علاقہ سرحد، بلوچستان اور سرائیکی خطے سے متعلق بہت سے افسانہ نگاروں کا نام لیے بغیر کر رہا ہوں۔

دیکھئے۔ یہ جو کیا جاتا ہے کہ قدیم لکھنؤ، ماضی کے اُس انسان کی آئینہ دار تھی جس کی حقیقت محض ناپ کی ہے تو کچھ غلط نہیں کہا جاتا۔ انسان کا یہ قدیمی ناپ کردار، جنگل کے اُس کچلے درخت کی مانند تھا جو اپنی اطراف سے جنگل میں ضم کر دیتا ہے۔ لیکن آج وہ چاروں اہل تھا اور آج عہد حاضر کے تصورات کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ جنہیں اُس طرح Share نہیں کیا جاسکتا۔ اب انسان کا کھنٹا اپنے اوپر وار و شدہ، ہیکر جدا گانہ خود مافیہ فیض اپنی وار و شدہ سی رقبہ نہیں کرتا بلکہ اپنے عہد کی بے رنگی کو بھی مہینتا ہے۔ اس جو حکم کا سامنا سناٹا ساٹھ کے دہے میں نر پندرہ پرکاش، انور سجاد، بطریق بن، انور خالدہ، حسین نے بھی کیا اور سفر کے دہے میں میر سے ساتھی افسانہ نگاروں نے بھی۔ یوں ساٹھ اور سفر کے دہوں کے پندرہ افسانہ نگاروں کا اسلوب نئی نوع آج نئے افسانہ نگاری کی قیود کا جواب ہے۔

نر پندرہ پرکاش کے افسانے چینی اور جاپانی کی انتہائی ذریعہ لہروں سے تشکیل پاتے ہیں اور ان میں اور انتہیت کا احساس پختہ تہذیبی اور تاریخی شعور کا پیکر اُکڑو ہے۔ یہ ان کے اسلوب بیان کی خوبی ہے کہ وہ تہذیبی اور تاریخی شعور یا بحری اور آوازوں کے Distort ہو جانے پر بھی اُس خاص نوع کی مادیائی کیفیت کو برقرار رکھتا ہے۔ انور سجاد اور بطریق بن دے بہ سو دھناتے ہوئے شہر کی چہرہ نمائی اُس فرق کے ساتھ کی جو Sublimation اور Elevation کا فرق ہے۔ انور سجاد کے لہجے کی کڑھکی اسی دوران کے "Look Back in Anger" سے ملتی جلتی ہے۔ جب کہ بطریق بن داکے ہاں ایک خاص نوع کی کوتاہی جو اُس کی Ethereal کردار نگاری سے مطابقت رکھتی ہے۔

خالدہ، حسین کے افسانوں میں پایا جانے والا احساس عدم حقیقت، ان سے مخصوص نمونی اسلوب بیان کے سبب غول، غارت، الہیت اور تفکیم کی چہرہ نمائی کرتا ہے اور یوں خالدہ، حسین کے ہاں جانے پہچانے کردار نثری اور مادیاتی تضامیں سامنے آتے ہوئے زندگی کے وسیع تر کاظم میں حوالہ بخان بن جاتے ہیں۔

رشید احمد نے سادہ بیان کی گردن مردوز کر شعور اور ترکیب بد بھڑاس توڑ دینے والا ایسا رنگ تنقیدی اور علاقائی اسلوب وضع کیا جو سفر کے دہے میں محدود پھیلاؤ ہوا۔ بعد ازاں یہی اسلوب غنایہ و دلچسپی راہی، سادہ اور انوکھا سرور و سوزی کے ابتدائی اہل نوں میں اپنی پہچان کر دیتا ہے۔ البتہ بہت جلد غنایہ اور افسانہ نگاروں کے ہاں تنقید کی جگہ مہمت اور تجرید کی جگہ احساسِ واقعیت نے لے لی۔

اسد اللہ خان کے ہاں نفسیاتی الجھاؤں اور کثرتِ صراحتی صورتِ حالات کا علاقائی انجیلہ کہیں تو شدہ، طرز اور درشت لب و لہجہ کا طالب ہوا اور انہیں اسلوبِ بیان کی سطح پر بھی تجسیم اور مجسم کو نگر وں ڈھانچے کی صورتیں دکھائی دیں۔ علیحدتِ معیاری زبان کا گراف کرنے نہیں پایا۔ بلکہ کار باقی، اُلم سلاز اور مٹی جید رنگ، شفق اور ابر جاوید ہیں جنہوں نے معاصر صورتِ حال کا ساتھ ساتھ باریجے کا ظہر میں کرتے ہوئے تشبیل نگاری کی انتہا ان کے ہاں زبان کا دور کار مختلف ہے اور زبان کا وسیلہ بھی یکساں نہیں۔

قرآنِ حسن، سلام بن مذاق، مذاکرہ، طنز، مل جل جملہ، انوار احمد اور نورین رائے نے انجلی ہوئی غمی کیفیتوں کے اعتبار کے لیے کہیں جواب اور سرکشی سے کام لیا اور کہیں بیانیہ شعری ترو کے تحت اپنے اپنے طور پر بہت کرکاک ڈوبے سے ہیکر ایک اسالیب تراشے، بلکہ مسودہ کا کاغذ کی تختی اسی کے علاوہ ہے۔ لیکن یہ سارا کام سادہ بیانیہ کو ترک کر کے ہی کیا گیا، جس سے ہوائیہ گزشتہ چار دہائیوں کے نگاروں میں سب سے پہلے چہرہ انسان کی داخلی پیمروگی اور احساساتی جھڑکوں اور انسانی ہمتی میں جھلکی۔ لیکن ترکیب کی سطح پر تین آسان قاری کی اپنی ملاحظہ تھیں۔ جب ایک شخص میں کام کیا ہوا تھا تو انھوں نے قاری کی تربیت بھی ہوتی چلی گئی۔ سب ٹھیک ہوا تھا کہ سنہ 80 کے اوائل میں چند قلم اور پورے واقعہ بن کے افسانے سے مدافعی کہانی پرنے کے افرار کچھ اس شد و سہ دیا کہ نئے افسانہ نگاری کی راہ کوئی کر گیا۔

داستان سے افسانے تک کا عبوری دور: انتخاب

لال قلعہ کی ایک جھلک

غوثیہ ناصر نزدیقا رفاق دہلوی

ہذا قلعہ کو کبھی دل بہلوں سے کام نہیں
جو آگ میں نہ لگے دوں تو داغ نام نہیں

جمادی الاولیٰ 1003ء میں ستر سو سال شاہجہاں کے پہلوں کا دھوم دھام سے ختم ہوا تو جہاں آرا دیکھ صاحب جنہیں بادشاہ عظیم بھی کہتے تھے ان کی سائیکہ کا جشن شروع ہوا۔ لال قلعہ میں گلے مرائے سے لے کر دھواں عام، دریا ان خاص تک رات کے وقت جھاز فافوس، کھولی وقت غنوں کی روشنی تھی۔ شمع چر پی سوی تیاں مل رہی تھیں۔ موقع موقع سے فیس سوز چاندی سونے کے کھوپڑے اور زین کے تیل کی روٹی کی سوئی سوئی فصوں کی روشنی سے جھلکا رہے تھے۔ لال قلعہ کے اگلی دروازے سے شہر پناہ کے اگلی دروازے تک اور لال قلعہ کے دلی دروازے سے شہر پناہ کے دلی دروازے تک اور تمام خاص بازار میں جامع مسجد کی بیڑیوں تک دوطرفہ طرفہ روشنی تھی اور ان پر کڑے تیل کے چراغ مل رہے تھے اور رات کا ان ہو گیا تھا۔ جہاں آرا دیکھ کو صدر والاں میں گلے کی مشاطہ دیکھ جا رہی تھیں، لباس ہزاروں کا تو زہرہ لاکھوں کا۔ صدر والاں کے سامنے گن چوڑے کے نیچے اور تک ونگن کی میں دلی چاندی کا فرش تھا اور فرش پر دست چھ کا چھوڑ کر دودھ پتھر مرد لگیوں کی۔ مرد لگیاں بلور کی بھی تھیں اور سفید کالج کی بھی۔ سب میں شمع روشن تھی۔ جب لنگھو عورتوں نے اچھی طرح دیکھ کر ہنسنا لیا تو خاندان کی بڑی بوڑھیاں انہیں پکڑ کر ہم ہڈ کرتی ہوئی انہوں میں پہچانے پھیں۔ جہاں تک یعنی فواد کی ترانہ کڑی تھی، تک کے دونوں بلوں میں چلی گئے نیچے ہوئے تھے، پاس ہی سونے چاندی کی اینٹوں کا ڈھیر لگ رہا تھا تاکہ دیکھ کر ایک بار چاندی کے صندوق توال کر سوں سونا اور منوں پر نہ ہی خیرات کر دی ہوئے، داؤتی اپنی عورتوں سے گھن کھا کچھ بھر رہا تھا اور سب کی نگاہیں اس طرف تھیں، نیم کے پاؤں میں کھینچ جاتی تھیں جس کا علا بہت بکنا تھا۔ گن چوڑے کی بیڑی سے اترنے میں پاؤں پھسلا کر بکنا دیکھنے والوں نے دیکھ کر سنبھال لیا اس پر بھی جھکا پڑے سیدھے ہاتھ کو چھیں اور چھٹے کے ساتھ دو پنکھا آبلال کوئی بال بھر اس شمع پر گرا جو بیڑی کے پاس مرادگی میں کڑی

جل۔ جی تھی۔ وہ بچہ بہت چلی یک کا تھا آنکھیں نے آگ لے لی اور وہ بچہ بھر بھر ہوتا ہوا ٹھنڈا کو سرا اور چوٹی تک لے پہنچا اور دھکم کے عورتوں سے کہا کہ اس کے لیے مجھے بھروسہ۔ وہ ایک بھڑی چلی گئی۔ سنبھالے والوں نے دھکم کو پھونکا تو آگ کے قہقہے کے گرد بان کو کھینچ کر یہ دھکم پھٹکی اور سینے کو ہلا کر شلو اور میں بچتی گئی۔ دھکم بڑپ کر فرش پر گر گیا اور حوٹلی میں شور مچا مست ہر پا ہوا۔ جزاروں اور جس دھکم کے پکڑوں کی آگ کے بجھاتی تھیں مگر آگ نہ بجھتی تھی۔ دھکم کی چاروں طرف دو لوٹوں نے کسے کسے کا حق ہوا کیا دھکم کو پست کر آگ بجھا دی۔ مگر دھکم کے پکڑوں کی آگ ان کے پکڑوں میں لگی۔ دونوں آگ کی چلی کی تاب نہ لائیں اور قربانیت شوم قربانیت شوم کہتی ہوئی اپنی دھکم پر سے لگا رہ گئیں۔ حضرت بادشاہ اور مولہ سر اور عورتوں کے چل کوس کر گئی میں آئے اور دھکم کو اور دو پرستانہ کوڑھیں پر تو بچے اور دو لوٹوں کو سر وہ پایا۔ یہ جزار وقت دھکم کو کھانگری پر ڈالا مگر وہ میں پہنچایا۔ دھکم پر رہنے بھی دے گئے جاتی تھیں۔ غریب دانی اور عیسوں، وہیوں، جزاروں، سہالوں سے مل کر بھر گیا اور تو بھول رو رہا

کیا دل کے دالوں نے سرو جہانوں
بھی تم نے آ کر جھٹکا دیکھا

دھکم ہر سے پاؤں تک چلی تھیں مگر آگ نے سیدھا روایت کو بھرتہ کر دیا تھا۔ یہ کیا لکھا ہائے کہ دھکم کے آبلوں اور پھولوں پر چارہ گردوں نے کیا کیا دھکم لگائیں۔ تھوڑے روز قلب کے واسطے کیا کیا عرق پلائے۔ نظر اور جس غیرات اور تصدق میں دینے لگے۔ بادشاہ کی آنکھوں سے آنسو ریزا کی طرف رواں گردوں سے الگ نہ کرتے تھے کوڑھی بیٹی زیادہ گھبرائے گی۔ دھکم کی چلی بھٹنیں زادہ وقتا رو دتی تھیں اور کھتی تھیں۔ آپ کو نظر نہ لگی اس ہارے ساتھ وہ کی دھکم بھی ایک بیٹی تھیں کہ جسے کی حوریں اور پرستانہ کی پر پاں قربان تھیں، یہ عورتیں خیر آنا نا سارے شہر میں اڑ گئی ساری رعایا پاہنٹے گئے گی۔ جتنی کی رات شب شہادت نہی گئی۔ شاہجہاں نے صفحہ بانی کہ جب دھکم جس صحت کر لیں گی اور سڑ کے قابل ہیں میں طاقت آجائے گی تو خواہد فریب فوٹا کے آستانہ پر امیر شریف ہر صفر کوں گا۔

میں دیکھا کہ رات صبحیت کا چھان بین کر لگی اور صبح اپنا صراہم کا طور لے کر دھکم کی حراج پر ہی کے لیے مشرق کے دارالافتا سے سے لال ٹھکانہ میں ہر صفر ہوئی، بادشاہ سلامت ابھی صبح کی نماز پڑھ کر صحن سے عمارتے تھے کہ غریب کے ٹھکانے سے ایک گناہم عرضی پہنچی کہ دھکم نے اپنی چاہ گیری کی سب کچھ رعایا پر ڈال دیا تو ذرا ہے۔ ان کی گرم آہیں شمع کے قالب میں داخل گئیں اور دھکم ان سے جل گئیں۔ جب تک مظلوم رعایا کے دل ٹھنڈے نہ ہوں، مظلوموں کی آگ نہ ٹھنڈی۔ دھکم کو کیا دلا جائے کہ آپ نے ایک خطا اور بندے کے پیارے میں سناپ چھڑوا دیا تھا، جس نے اس خطا کو وار کو ہانکا کا اور وہ سر گیا۔

اور ان ہا چہ باد صبرا گمداشت
تھی و لوشی و زشت و زیا گمداشت
پداشت سنگر کہ چنہ برسی کرد
ہر گردن او برآمد از گمداشت

ہر چند کہ وہ خطا وار تھا مگر اس قدر کہ سزاوارت تھا کہ سناپ سے اسے ڈسویا جائے، ابھی تو دنیا کی آگ نے جلایا ہے، آگے قبر کے سناپ اور دوزخ کی آگ اباتی ہے۔

اس بھر تک مصلوں کو بچا کر بادشاہ نے ایک بیچ باری اور دیر کو بچا کر حکم دیا کہ باری تھرو میں بیٹے بھاری تھرم میں بڑی ٹانوں سے آزاد کرو دیے، انہیں اور سات لاکھ دہ پیسے میں شمال شامی سے لے کر ان پر تقسیم کر دیا جائے تاکہ وہ اپنی حافی ذات کریں اور اس سات لاکھ کے علاوہ جو حکم کے مطابق اور ان کے لوہے سے صندوق کے محل میں روپے صرف ہوا اس کی تفصیل میں آئے تھوں کا سب تو میں پہنکتا ہوں کہ کسی طریب یا حکم کے علاج سے حکم کو تدریجی فیصلہ نہ ہوئی تو بادشاہ نے فرمایا کہ ضرورت سے فرنگی حکم دیا جائے۔ بخیر صورت سے شاہجہاں آباد تک لاک لگائی جائے اور دواغیسوں میں سوار ہو کر چلدا آئے۔ چنانچہ انکو فرنگی آیا اور اس نے علاج کیا لاکھ روپے سے اوپر دے کر چلا ہوا اور حکم پر دستور سترض میں چڑی رہی اور اس طرح چھ سات مہینے گئے۔ طریب باقی بار بھی کہے جاتے تھے کہ مریش کی جانوری مشکل سے ہوگی۔ کچھ ٹھونک پیسے بن کر دیں سے نکلا جاتا ہے۔ بادشاہ دواغیس پیر بار چاہتا رہا کہ فرنگی لڑائی کی شکا کے لیے دعا کرتے تھے۔ ایک روز جارف نام حکم کے چیلے نے بادشاہ کے حضور میں عرض کی کہ فدوی کو پھلے ہوئے کے لیے ایک مریخ آتا ہے اسے لگا کر مریخ اچھا ہو جاتا ہے فدوی کے بڑا بار سے کم قہر ہے میں نہیں آتا ہے۔ مگر لکھا نہیں کی، بادشاہ علاج کرتے کرتے ٹھک ہو گئے تھے مرنا کہا نہ کرتا۔ حکم دیا کہ فوراً بھاگ مریخ تیار ہو اور حکم کے دھمکوں پہ لگا لیا گیا اور زخم اٹھنے کو شروع ہوئے اور زندگی کی توقع پیدا ہونے لگی۔

حکیم کچھ پھل بھرے نگینے جشن ساگر دہی دوبارہ تیار کی گئی اور جارف جیسے کو پانی عیسیٰ تو را۔ طلعت اور انھوں میں ایک دیا۔ کچھ پتھر زرد نقاس خوشی میں بھیجا گیا اس کے علاوہ میں لاکھ روپے خرچ ہوا۔ حکیم دواغیس کو ایک بھر اور ایک روپے پانچ سو روپے سونے اور پانی مع طلعت اور منصب دواغی دواغیس سوار سب دھنلے تھے۔ حکیم سو منا دوسرے چارہ کر گھنیں ہزار روپے سالانہ اور منصب دواغیس سوار سب دھنلے عطا ہوئے۔ اور تمام فقراء و عساکر اور ارباب طریب فیضیاب ہو گئے۔ چار لاکھ شریف تک اور ایک لاکھ روپے حرمین کے مصلیوں کے لیے احمد سعید معتمد کے ساتھ بھیجا دیا گیا۔ بادشاہ اور بیگمات نے بادشاہ بڑائی صاحب کے سر پہ سے خوا کھڑے ہو کر جوابرات اور سونے چاندی کے بھول چھل اور کئے۔ دوسرے دن حکم بادشاہ کی خدمت میں تسلیم کے لیے حاضر ہوئی تو حضور دلائے ان کی کھائی میں ایک سو تیس موٹیوں کی سران اپنے ہاتھ سے دیا کہ دواغی۔

بھر بھار آئی جن میں دھم گل آئے ہوئے
بھر مرے دواغیوں آتش کے پکالے ہوئے

جہاں بنانے چاہا کہ حکم کو صاف چاری کرنے کے واسطے بھیر شریف لے جائیں اس نے شاہجہاں آباد سے روانہ ہو کر اکبر آباد تک یہ حاجتی پہنچ گئے تھے جو حکم کے بھر۔ بھر۔ گناہ کا انکو پھٹ گیا اور عہدے نے کہا ابھی سطر ابھیر کا منتوی کیا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ راست کی ٹھان سے حرارت پیدا ہو کر بنا کھ کا باعث ہو۔ اس لحاظ سے جتنا میں کشتیوں سے شاہجہاں کی واپس ہوئی، آگرہ سے سطر اچا را دن میں بحر سے پہنچے، سطر اسکو چہار نے حاضر ہو کر شہنشاہ کی خدمت میں گزارش کی، اس شہر میں مامون نام ایک بہادر فقیر بناتا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ

”چاند کا پتہ“ مسطورہ ”نقون“ اکابر، مارچ 1914ء

”گھنٹن کا پتہ“ مسطورہ ”نقون“ اکابر، اپریل 1914ء

”سیدنی سرگت“ مسطورہ ”نقون“ اکابر، اپریل 1914ء

”کشی کی یاد“ مسطورہ ”نقون“ اکابر، دسمبر 1915ء

”جھیل پانی“ مسطورہ ”نقون“ اکابر، اگست 1916ء

”پہنا کی 33“ مسطورہ ”نقون“ اکابر، اکتوبر 1916ء

”اباں باہر دے، اکر باہر دے“ مسطورہ ”نقون“ اکابر، اکتوبر 1916ء

”سیرگاہ فراق“ (آلہ دار) مسطورہ ”نقون“ اکابر، جنوری 1916ء تا فروری 1919ء

”زلی کی ایک یاد“ ادبی مسطورہ ”نقون“ اکابر، ستمبر 1919ء

”راوند ادبی“ مسطورہ ”نقون“ اکابر، اگست 1915ء

”دوست دشمن کوڑے“ آکھارا مسطورہ ”نقون“ ادبی، اگست 1920ء

نومبر 1914ء تا جنوری 1917ء کے ”نقون“ اکابر میں مجموعہ ”صربانہ فراق“ دہلی کے گھر کا پتہ چلی درج ہے مکان میں اس قریب ۱۰۰۰ سے ۱۰۰۰۰ سے متعلق ہے۔
مظاہرہ ”نقون“ ادبی شریہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ میرزا دکی پادہ دلی سے اس کرائے کے مکان میں نقل ہو گئے تھے۔ 12 فروری 1933ء کو پادہ دلی کا پتہ انتقال کیا۔

بیگم کی چھپر چھاڑ

خواجہ نامہ صریحاً ہر قراق و ہلوی

ایک ہی کالے گل سے مہمان آئی تھیں۔ ان کا نام تھا "حضرت نجم" وہ بڑی مکمل کھری اور حراج کی بڑی کڑوی تھیں۔ صحن جہاں بی تھیں میں نے کہ بہت کھٹی تھیں اور بھلی، کچھ مٹی سند میں بڑا دیا کرتی تھیں۔ بی دوقی اپنے جے میں آپ ہی آپ کھولتی، کسانا بیٹا، چھایہ، درود، بھٹی، بھٹی، ہمارا مرہ، مٹھائی، ناشتہ سب کچھ صحن جہاں کے تحت میں تھا۔ بچے کچھ خالہ جان نے انھیں کل کلاس کا ٹاچ کر دیا تھا۔ اس بار سے انھیں بے دوقی میں ان سے اور کھسائی تھیں ایک دن حضرت نجم اور صحن جہاں نجم کی طرف سے تعلق کا بھارتی ہوا تھا۔ انھیں دیکھ کر ایک ہی سے کہنے لگیں۔ "اے ہمارے سلطان غنی بھی ہو۔ قلندر کی بیٹھیں ملی کو کھٹی کہا کرتی تھیں۔ یہ چھوٹی ناک بھی کیا بڑی معلوم ہوتی ہے۔ کم بخت ہیں ہمارے اور مجھ سے تو زیادہ گوری رنگت سے بھی نرست ہے۔ جیسے بچہ ٹالہ ہے۔"

حسن جہاں کی ناک بھی چھوٹی تھی اور رنگ بھی ان کا پتلا نہ تھا کچھ گھٹے کی چمکتی چھو پر ہی اڑھائی گئی ہے۔ وہ بھلا کب چہ کئے والی تھیں۔ کہنے لگیں۔ ”پہلے خاتم تھا کہ کچھ پڑے سے تو ہر طرح چھا ہے اور مجھے بڑی ناک دیکر گھٹن آتی ہے۔ یہ معصوم ہوتا ہے بل کاہ کسی نے چہرے پر دھرا دیا ہے۔ اونچی ناک سو مجھے کیا ناک۔ چھوٹی ناک سہاگ کاچ اونچی ناک گولہ دھرا ہے۔ میں تو تم نے سنی ہوگی۔“ معصرتہ جھکری گھٹ گئی کھلی جھٹ تھی اور ناک بھی ان کی ہے تو اول اونچی تھی حسن جہاں کے اس کہنے پر سب وہاں آنکھیں بندیں اور پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر تھکیں۔ انھی میں کسی ہونگی اور پی حسن جہاں کی اور ان کی خوب جگہ رنگ ہوئی۔

حضرت یحیٰ: ”امرونی کائنات کی ظہیری، کفر، حق، چوری، دہرہ کی دال، لٹکھ کھانے والی، اہل سانسے سے بڑھ کر باتیں کرتی ہے۔ جو اور“

میں نے کہا: ”میں پھر بھی ہوں تو تم بچاؤں ہو۔ کھینٹو والے بارہری والی کے ساتھ شکر کھا جے ہیں۔ تو بچاؤں کو دھمکی دیتی ہے۔“

حضرت یحکمہ : "اے نبی! میں نے کہا کہ یہ ہے دلی کا ہمارا مدد سنبھال کر لینا۔ دلی ہائیکس غلامی کی چوکت کہلاتی ہے۔ اجڑیں اس کے دشمن وہ کیوں اجڑے گی جتنی۔ وہ تو اب بھی غلامی کی لعل ہے۔ باقی لینے کا بھی تو سوا کہہ کا کہلائے گا۔ تمہارے بہڑے کھٹے کھٹے سے اجڑی دھڑکی بھی دراز ہو جا اچھی ہے۔ تمہیں خبر نہیں بادشاہ سلامت سات سندرہ لاکھ کر دلی شریف لائے اور بادشاہ یحکمہ کو بھی ساتھ لائے۔ تختہ پر بیٹھے دربار کیا۔ انھیں مردے اور سداوتے وقت دلی کو سارے ہندوستان کا سر تاج عطا کئے۔ پھر کے سے بسے کا حکم دے گئے۔ چلنے والے چلے۔ دراز خدایاں کر کے بیٹے، دلی کے پاپوں سے بھی پاموشے مگر ایک بھی نہ چلی۔ دیکھنا کوئی دلی میں کسی کھینچل بھاری ہے اور کیا بھارتی ہے۔ لیکن بے کی دشمن ہری لاکھوں پر کو نہیں گئے۔"

”میں نے تو آپ کی بات کا جواب دیا تھا۔ ٹھیک تو میں طوروں پر جان دیتی ہوں۔ کیا کہ میری تفسیہال ہے۔ دوسرے حضرت شاہ مراد کی درگاہ کی میں ہے۔ انھوں نے مجھے خفاک دئی۔ جرم مجھ پر ہے اور بچنے والے علیا ہیست ہوں۔“

اس عظیم حق کو کس طرح جان بوجھ کر دھڑائی ہوئی آئیں اور حضرت عیسیٰ کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہیں گئیں۔ "خدا کے واسطے آپ بزرگ ہیں۔ اس چھوڑ کر کے منہ لگیں۔" حضرت عیسیٰ کہنے لگیں۔ "میں سے چھوڑ کر کیوں کہے؟ تو چاہی خاص واسطہ ہے۔ اللہ کی تعظیم کی طرح تو جان پہنچی ہے۔" "میں جہاں نے کہا۔" "خیر واسطہ کج نہت کالی بیٹیس سے تو اچھا ہوتا ہے۔" "خا۔ جان نے دیکھا کہ حضرت عیسیٰ لڑائی پر ترقی ہوئی ہیں تو حسن جہاں کا ہاتھ کا کر دوسری طرف لے گئیں۔ دوسرا نہیں سمجھانے لگیں۔ کہ "خدا را علیٰ حق کو کہہ۔" "موسس کا کہتی ہیں۔" "خا ماں آپ کے سر کی قسم ہو میں نے انہیں بچہ بھی کہا ہے وہ مجھے پہچانی بکری اور اٹھ اٹھ لے آیا کہا کہ۔ عیسیٰ جی۔ عیسیٰ کا کا کا کا کا کہتے چلتے گئیں۔ میرے بچے کا بار ہو گئیں بے بات۔ مگر میں ان کے کہنے کا برا تصور اسی مانتی ہوں۔" "اور تو یہ تو کا چکی ہو رہی تھی۔ اور صبر و ایمان میں ڈوبیوں کا تاج ہو رہا تھا۔ ظل پر نقل پر رہی تھی۔ ان دو چیزوں سے تو کہتے۔" "تھو صبر و ایمان سے آ کر اچھا کاتے بجاتے ہیں۔"

رات کے بارہ بجے رات آئی۔ سوئیں ہوئے خانہ کے ساتھ اتریں۔ کوٹاب، قوری، بولی، چوہ کی تہہ پوشیاں، چپکے چپکے کرتے۔
 حارے بھین میں کوئی بی کرکھ پینے جایا کرتی تھی تو اس پر تین ٹھوس پستیاں اڑا کرتی تھیں۔ یا اب ساری بنگلوں نے بھی وضع طرے لے لی
 ہے گا ہے۔ "بھگی کے دن ہوئے بھگی کی رات۔" سوئیں ہوئے ٹھوس کے ساتھ مسد پر گاؤ بھگے سے لگ کر تھیں۔ شربت پلانے کے لئے بھگی بنگلی
 بست۔ وہی حسن جہاں اور لاکھ مبارک خانا کے ہاتھ میں چاندنی کی کشتی، اور اس میں شربت کا شیشہ بلور کی پیالی اور پی میں جہاں کے ہاتھ میں
 رشم کا رد مال حد پر لپکے کے لئے، اللہ کی بڑی رونال کا کھٹا اس زور سے اور تھی کھٹ شربت پینے والی ہلک کر جاتی تھی۔ حد اور باغیں چل کر
 والی ہو جاتی تھیں۔ بعض جاتوں کہہ دیتی تھیں۔ "اے بھنگا، رہند پر چھٹی ہو کر بھگی کا کوڑا لگائی ہو؟"

آغا کی دیکھ دہا کی بہن کا جو سر پہ چھپا تو رگڑے کے ساتھ ان کی ناک کی ٹیکل اٹھ کر ناک میں سے نکل گئی۔ "شہنشاہی ہوا شہنشاہی۔۔۔ دیکھتے کی تو حق کا سنی ہو، مگر ہاتھ تو بٹا، اللہ لو ہے کی پٹھنیں ہیں۔ دیکھو میری ناک کی ٹیکل تمہارے دہال میں اٹھ کر پھل گئی ہے۔"

میں جہاں۔۔۔ کچھ ادا کیلی میں سر دھڑکا دھکیلوں سے کیوں ڈرتی ہو۔ خدا رکے بھائی کو بچائے آئی ہو نیک جگہ کے رہنے والے اور سارے تمہارے تعلق میں ہائیں گے۔ وہ میں بڑا خاص ہے۔ ابھی تو منہ ہی کھولنے میں ہو گئیں۔ جب دو بیٹیوں کی موتی موتی کانیاں کھاؤ گی اس وقتے مظلوم بھوکا کے قصے کا ساتھ ہوتا ہے اور بھاناک کی ٹیکل تو ہم نے دیکھی ابھی نہیں۔ کچھ کانچا نہیں مگر سے بہن کر بھی آئی قصے یا ملت خدا میں مجھے لئے مرنے ہو۔"

”رویل ہمارا تو اس میں سے کیل نہ لگی۔“

آغا کی ہنک۔ ”بھئی اللہ جانتا ہے، ہماری کیل فسطوح داس میں ترقی جڑی ہوئی ہے۔“

حسن جہاں ”بھئی آغا کی جگہ تم کیل کے مارے کیوں اٹھ جاتی ہو۔ مانگے کی تو بچھن کر نہیں آئی تھیں۔ تمہاری خدشے کی تو میں اپنی بھرے کی کیل تمہیں دے دوں گی۔ ذرا چھری سکھادو لو۔“

غافل کی ہاتھ کیل آغا کی جگہ کی گود میں جا چکی تھی۔ جب مل گئی تو حسن جہاں کی چٹوئی۔

”اوارو داخل میں اچھے شہر میں دھنڈورا۔ کیل تو آپ چراگے ٹٹھی ہیں اور لوگوں کے کھانے پر دڑے پکڑتی ہیں۔“



گھنٹہ بیک

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

سلطنت اودھ کی نفل فرخ میں ایک مغل مرزا اعجاز علی بیگ بھی تھے، جو سالے میں ملازم تھے۔ بہایت قد آور جوان، عجم خیم کردے چلے۔ اس زمانے میں سواروں کی تحفہ نگین ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ تین دوپے بیٹے کا سائیں گھوڑے کا دانہ گھاس وغیرہ سب کا ان کو اٹھام کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے سواروں سے پیدل اٹھتے رہتے تھے۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ مرزا اس قدر دوزنی تھے کہ کوئی گھوڑا سواروں میں دو بیٹے سے زائد قلم نہ دے دیتا تھا۔ اول تو خود بھی گراں باریں تھے۔ دوسرے فوجی اسلحہ، جن کا زین بہت کرنا لازمی تھا۔ خود پہنچانا، چار آہنیہ، زور و کھتر، گوارا، مصالح، کھڑا قرائین، بندہ والی، ولیم، دو دن کا بوجہ یہ بھی ہو جاتا تھا۔

مرزا صاحب خوش طورا کہ تھے۔ مغلے کی طرف جب بھی تہذبات کے جانتے جانتے ہو جاتے تھے تو کھانا پکوانی ہو جاتی تھی۔ لیکن چارے پیدل جاتے تھے۔ ایک دفعہ دن کو اس کا سڑ کر کے کسی مرا میں داخل ہوئے۔ تو بھڑائی سے کہا کہ اٹھائی پیر کی روٹی، آدھیر کوشت، چھنک بھر گھی کے کر کھانا پکاؤ۔ اس نے پوچھا آپ کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟ کہنے لگے۔ آٹھ آدمی اور آتے ہیں۔ جب وہ کھانا پکا کر لائی۔ مرزا صاحب نے اکیلے بیٹہ کرنا شروع کر لیا۔ بھڑائی دیکھ کر حیران ہو گئی۔ آپ نے اسے بلا کر چپکے سے کہا کہ "بھڑائی کسی سے کھان نہیں میں آدمی نہیں ہوں۔ جن ہوں، جو کھوٹ کھوٹی میں تمہارا کام چھوڑا کروں گا۔ پتہ کھانا پکوانی ہوئے آدمی۔" اس نے ڈرتے ڈرتے جو کچھ کھانا مسافروں سے ملتا ہو، کچھ گھر میں چاہتا۔ سب ان کے آکر کھو پڑا۔ مرزا صاحب سب خوش جان کر گئے۔

صیغہ اللہ علی حیدر بادشاہ کے زمانے میں ایک مرتبہ کسی گڑھی کے کنارے دو برس سرکاری مالکداروں اور مضبوط قلعہ بنوا کر فضیل میں چاروں طرف دوزن رکھوائے اور بندہ و قیس ولیمہ و کھتر سے طرح طرح کی فریب کاری۔ جب بادشاہی فوج اس جگہ کے قلعہ کو گرفتار کرنے گئی تو اس نے قلعہ کا بھاگ بھاگ کر لیا۔ اور دوزنوں سے کوکھیں برساتا شروع کیں۔ دو بیٹے تک ساری فوج قلعہ گھر سے دی۔ مگر کسی طرح قلعہ فتح نہ ہوا۔ مجبور ہو کر فوج وادیں پھل آئی لیکن اس کے پاس سواروں ہنگ میں کام آئے۔

اور انہیں سلطنت اس تشویش کی حالت میں مختلف گوجروں پر غور کر رہے تھے۔ بادشاہ کو بھی بہت غصہ تھا۔ فوج کے خزانہ دار مسالہ اور سپ

سلاور سب ہم کو دوسرے ملے۔ مرزا کا یہ حال تھا۔ ایک بھی موجود تھا۔ ہاتھ باندھ کر غرض کی۔ "اگر حضور لدھی کو تھوڑی فوج عسارت کریں تو حضور کے اقبال سے اس دن میں کھوس جی کر کے مار دو کھینچ کر کے لے آؤں۔" اس بات پر راکھیں ہٹنے لگیں بادشاہ نے ٹھنکے کی حالت میں فرمایا "اگر تم بھی لاکھا آئے تو مرزا کا دل چاہے گا۔" مرزا نے کہا "حضور میں نے اپنا خون معاف کیا۔ اسی وقت تو پدم کو ادھیجے گا۔"

دل دربار مرزا کی حالت پر ہنسنے لگا۔ حضور کہتے تھے کہ اس روز اقتدار بادشاہ کی موت آئی ہے۔ ہاتھ بادشاہ نے عظیم پاکستان کی سرگردی میں فوج روانہ کی جائے۔ مرزا نے اپنے ساتھ دو ہتھیار بلائیے اور فوج کے سپہ سالاروں کو روانہ ہوئے۔ قریب شام کے قلعہ سے دو تھکی مکمل کے فاسے پر فوج کو ایک جنگل میں پھینکا۔ انارو۔ اور آپ نے رات کو دونوں بلاجوں سے کہا کہ "اس کے دونوں پتہ آ رہے سے کات ڈالو۔" انہی پر بھی نہ پہنے پانی تھی کہ چھانک کے دونوں پتہ کٹ گئے۔ سب سے پہلے پتہ چڑھ کر آپ تھکا تھکے میں داخل ہوئے۔ اہل قلعہ اس آفت سے بے خبر پاؤں پھیلنے لگے۔ سورج تھے۔ مرزا نے جاتے ہی راجہ کو روک لیا اور اس کے سپاہیوں سے کہا۔ "اگر میرے پاس کوئی آٹا یا دھوہہ کسی نے دار کرنے کا قصد کیا تو راجہ کی جان کی تحریضیں۔ اہل قلعہ اس درجہ صورت انسان کو کچھ کر ڈر گئے۔ اسے میں مرزا کی فوج بھی قلعے میں داخل ہو گئی۔ قلعے والے کچھ بھاگ گئے۔ کچھ گرفتار ہوئے۔ فوج نے قلعہ کو لے لیا اور راجہ کو گرفتار کر کے بادشاہ کے حضور میں لائے۔ راجہ نے بادشاہ سے معافی مانگی اور افسوس مناجاد کیا۔

بادشاہ نے اس خدمت کے صلے میں مرزا کو ایک ہاتھی مرحمت فرمایا۔ اور ہاتھی کی خوراک اور فیلیان کی تھوڑا سا اپنے عزیزا مارو کے ڈسے لی۔ مرزا اسے چارے سے فریاد آ رہی تھی۔ ان کے گھر میں ہاتھی باندھنے کی جگہ نہ تھی۔ مشکل سے گزرا کرتے تھے۔ طوفا کو ہاتھی تو لے آئے مگر دوسرے دن اسے تین فرسارو پہ کالچ کر اور فیلیان کو بھی ہاتھی کے ساتھ روانہ کر کے آپ اپنی ذات پر روپہ اڑانے لگے۔ البتہ صرف ہاتھی کا ٹکڑا جاس کے گئے میں چاہو اتھا کار کھا۔

پہلے دو مہینے کے بعد بادشاہ کو یہ چہ گزرا کہ مرزا نے ہاتھی کالچ ڈالا۔ چنانچہ بادشاہ نے انتظار حال کے لئے ان کو طلب فرمایا۔ آپ نے ہاتھی کا ٹکڑا چنے لگے میں باندھ لیا۔ اور اسی حالت سے شامی دربار میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے پوچھا۔ "مرزا یہ آج غلاف انسانیت آپ کے گلے میں ہاتھی کا ٹکڑا کیوں چڑھا ہوا ہے۔ اور ہاتھی کہاں ہے؟" دست بہ عرض کی کہ "حضور ہاتھی میں طوطا ہوں۔ جس کے دم کے ساتھ ایک کنبے کا خرنک لگا ہوا ہے۔ پھر دو دو ہاتھی باندھ کر کیا کرتا۔ امیدوار ہوں کہ ہاتھی کا راتب اور فیلیان کی تھوڑا لدھی یہ ہماری رہے کہ اپنے کنبے کی بدوش کر سکیں۔

بادشاہ نے عظیم پاکستان کا "چند دوسرا آٹا اور سر بھر تھی روزانہ کے حساب سے مرزا کو ہاتھی کی خوراک کی بجائے ملا کرے۔" مرزا نے بھی اپنی بدوش کو سرے دم تک چھوڑ دیا۔ تھوڑی دکانی بھران کے گلے میں ہاتھی کا ٹکڑا چڑھا رہا۔ اسی وجہ سے لوگوں نے ان کا کام عسارت ملے ایک کی بجائے ٹکڑے ایک رکھ لیا۔ اور گلے والے مرزا کا ٹکڑا ایک کہنے لگے۔

مرزا کا مکان حضرت مہر کی درگاہ کے پشت کی طرف زبانی درگاہ کے پاس ایک میدان میں تھا۔ اور وہیں کچھ کچھ ہونے مکان اور بھی بنوائے تھے۔ جو دور رہے باہر پر اور بعض ایک دو پید باہر پر اللہ دیئے تھے۔ حسن اتفاق سے ایک مروج ہاتھی اس کھڑت سے ہونے کا شہر کے تمام کچھ مکان گر گئے۔ مرزا کے مکان کو بھی چھانڈا لی ہوئی۔ اور سب مکان خاک سیاہ ہو گئے آپ نے اس کی تھوڑی قدرت کر ڈالی اور مثلی ہر آدنی کو آئے۔ وہاں پر بادشاہ کی۔ یعنی جس کو ضرورت ہو مرزا صاحب کو آدنا دے کر ہتھی ملی لے جائے۔ گلے میں جن لوگوں

در بارہ دہلی کی کنکوا بازی

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

لکھنؤ میں یہ خبر سہم ہوئی کہ دہلی میں بادشاہ کا دربار ہو گا۔ بادشاہ سلامت تخت پر جلوہ فرمائیں گے۔ تمام ہندوستان کے راجہ مہاراجہ خوشامی کوآئے گئے۔ تمام ہندوستان میں اس بات کی خوشی تھی کہ شہنشاہ اپنے دربار معظم دہلی میں رونق افروز ہوں گے۔

لوگ اس تماشا کو دیکھنے کے واسطے دور دور سے آ رہے تھے۔ برفن کے اہل کمال جمع ہو رہے تھے۔ فوجیں جنگ کا نمونہ دکھانے کے واسطے جاتی تھیں۔ مرغ بازار کی ٹرامی، شیر بازار نام ملائے گئے۔ ننداک صاحب زبانی کھنڈر نے کھنڈر میں سیٹ ڈالیں صاحب کانکھو کے کنکوا بازوں میں انتخاب کیا اور باز کر کہا کہ کچھ آپ نے سنا بھی ہے۔ دہلی میں دربار ہونے والا ہے۔ تمام دنیا کے لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ تمام بازاروں کے کھلاڑی، شاہی مہمان ہوں گے۔ آپ اپنے فنی میں یکجا ہیں۔ ہم آپ کو چٹکی دیں گے۔ آپ شاہی ٹیپے میں شاہی مہمان ہوں گے۔ اس سے بڑھ کر آپ کی عزت نہیں ہو سکتی۔

آغا صاحب سوچتے گئے کہ ہاں! یاد ہاں! دوست اصحاب سے مشورہ لیا۔ سب نے یکے زبان ہو کر کہا کہ آغا صاحب ایسا اچھا موقع آپ کو ہر منصب نہیں ہو سکتا۔ ایک تو ہندوستان بھر میں عزت دوسرے امید بیہودی یعنی اگر بادشاہ کوآپ کی کنکوا بازی پسند آگئی تو کچھ ہائیڈراگور فٹ سے انعام میں مل جائے گی۔ ہر بھر جتن کیجئے گا یا تم سے کم کچھ اور جتن بھاتا مہیات مقرر ہو جائے گی۔ سب سے عزت کی بات یہ ہے کہ خود اپنی کھنڈر آپ کو اپنی طرف سے بھیجے ہیں۔ شاہی ٹیپوں میں آپ فردکش ہوں گے اور شاہی مہمان تصور کئے جائیں گے اور بھر میرا بھی انکی دیکھنے میں آئے گی جس کے واسطے لوگ جزاروں روپے فریج کر کے قمار دیکھتے ہیں کہ دہلی میں قدم رکھنے کی جگہ مل جائے۔ لوگ تو اسی صبر سے ہیں۔ جتے ہیں۔ یہ دن کس کو نصیب ہوتا ہے۔ تو اب سب صاحب نے فرمایا ”ہم آپ کے ساتھ چلیں گے۔ آپ کو کسی بات کی تکلیف نہ ہوگی۔ لاٹ صاحب سے اگر جہاز میں گھٹک کر کے ایک خیمہ ڈال دیں گے۔ اسی میں ہم آپ سب رہیں گے۔“ تنھو صاحب سوز خواں نے کہا ”آپ بکھانا دینا کیجئے ہم آپ کے ساتھ چلیں گے۔ آپ زبانی کھنڈر سے ہا کر تھپی تو کھولا دینے۔“

آخر یہ چارہ آغا صاحب سب کی اشتعالک سے زبانی کھنڈر کے پاس گئے۔ چٹکی کھسکا کر لائے۔ انکے کاربجروں سے حمہ کنکوی

جوانے۔ بادشاہ استیلا ایک اڑھتار سے پ ”وہ حکم“ خوا کر کہا یہ بادشاہ کے خیمہ میں گرہیں گے۔ کنگھوں کو کھانے پانے کے چھٹیوں پر ساری اور ہاتھ پاؤں ہا کر ان پر خلاف اظہار کے چڑھائے۔ چٹائیں نہیں خوا کر کنگھوں میں رکھیں اور بہت سی امیدیں، بہت سے ارمان لے کر ہر راہ نواب نے صاحب، تنخواہ صاحب، سوز خواں، دہلی کا کلکتے لے کر سوار ہوئے، دیکھا تو پہلی دہلی کھانچا آدیموں سے لہری ہے اور دہلی میں جہاں شاہی عیموں کا جنگل ہے، وہی پھر سے موجود ہیں۔ آدیموں کو رستہ نہیں ملتا۔ میدان حشر مسطوم ہوتا ہے۔ کوئی کسی کو نہیں سنتا۔ بہت مشکل سے بے صاحب اور ہم عیموں تک پہنچے۔ وہاں کبھی کوڑی کشتہ کا ٹھکانا تھا۔ انہوں نے بہت فزت کی۔ ایک خیمہ آقا حسین صاحب کو دیا اور اس پر کھدوں کا پھر مقرر کر دیا۔ یہ مقام شہر سے بہت دور تھا۔ آپ آقا صاحب کو کھانے کی فکر ہوئی۔ یہ سمجھے تھے شاہی مہمان ہیں، کھانے کے خواں آتے ہوں گے۔ مگر جب کھانے کو کسی نے نہ پہنچا تو یہ خیال ہوا کہ کسی ہوٹل سے کھانا منگوا دیا جائے مگر یہاں سرکاری عیموں میں ہوتوں کا ذکر کیا۔ کھانے کی وہاں پر کھدوں کا پھر تھا اور کارٹونیشن ہوٹل شہر سے دو کس کے قاصیل پر تھا۔ آخر جب سب لوگ خیمہ چھوڑ کر ہوٹل میں مقیم ہوئے مگر دن گھریموں میں رہتے ہیں۔ سرکاری کھیل نے عیم دیا کہ آقا صاحب آج کنگھوں لڑائیں۔ دہلی کے ہائی کنگھوں لڑانے سے کنگھوں لڑائیں گے۔ آقا صاحب نے چاہا کہ پہلا کنگھوں ہا کر بادشاہی گل میں ادا ہو تاکہ بادشاہ کے ملاحظے گزے کیونکہ اس پر وہ حکم لکھا ہوا تھا۔ مگر ہوا خلاف تھی، مجبور ہو کر خاموش رہا اور اس ناکامی پر صحت قہم کیا۔

سورہ کو آقا صاحب نے کنگھوں لڑایا۔ دہلی والوں نے بھی کنگھوں لڑایا۔ شام تک کنگھوں لڑایا گئے اور بارہ بیچ زائد ہوئے۔ شام کو کھیل میں بلائے گئے۔ وہاں مسٹر داس صاحب ٹیکر ٹری کھیل لے کیا کہ آج آپ کے بارہ بیچ زیادہ ہوئے مگر دہلی کے لوگوں نے ہم سے کہا کہ یہ دہلی کے اچھے کنگھوں لڑیں تھے اور انہوں نے درخواست کی ہے کہ ہر ایک دن ہم کو دیا جائے تاکہ ہم اچھے اچھے لوگوں کو پیش کریں جو کنگھوں لڑی میں اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ اس لئے آپ کل ہر کنگھوں لڑائے۔

دوسرے دن ہر دہلی والوں سے لڑے 20 بیچ زائد ہوئے۔ شام کو ہر کھیل میں گئے تو ٹیکر ٹری صاحب نے کہا۔ آج تو آپ کے بیس بیچ زائد ہوئے۔ اور سب لوگوں نے آقا صاحب کی تعریف کی اور کہا کل آپ میرے خود لوگوں سے کنگھوں لڑائے۔

تیسرے روز آقا صاحب نے میرے خود لوگوں سے کنگھوں لڑایا اور ان سے بھی 52 بیچ زائد ہے۔ کھیل نے شام کو آقا صاحب کو ہلا کر کہا کہ سارا اور ہر آپ کی تعریف کرتا ہے کہ آپ سے بہتر کنگھوں لڑانے والا کسی شہر میں نہیں ہے۔ آج آپ کے 52 بیچ زائد ہے۔ آقا صاحب کی خوشی کو بہت نہ پہنچے۔ ہاتھوں دل دھکا اور کہنے لگا کہ تو ضرور کوئی علاقہ سرکار سے لئے گا اور زندگی بھر پیش کریں گے۔

چھ روز بریلی والوں نے کنگھوں لڑایا اور وہاں بھی آقا صاحب کو کامیابی ہوئی اور شام تک 22 بیچ کا لئے۔

پانچواں کنگھوں لڑایا اور ہر روز کا لئے۔ تیس بیچ کا لئے۔ شام کو پھر بارہ بیس بلائے گئے اور لڑات صاحب کی ہم صاب نے اور بڑے ٹیلن القدر انگریزوں نے آقا صاحب کی تعریف کی اور کہا تمام ہندوستان میں آپ سے بڑھ کر کوئی کنگھوں نہیں لڑا سکتا۔ ہر طرف سے تعریف ہو رہی تھی اور آقا صاحب دل میں خوش تھے کہ آج بادشاہ کی طرف سے کسی بڑے انعام کا اعلان لائے صاحب کریں گے۔ سب انگریزوں نے ان سے ہاتھ ملایا۔ اسے میں ہم صاب نے آقا صاحب کو ایک کرسی پر کھڑا کیا اور ایک روپے سے بڑا انگل کا ٹاپا ہر ایک قسطہ بیٹ پر آویزاں کیا اور سب لوگوں نے جیر زویدہ سرکاری فرماں بھی تہایت خوشی سے پیش کیا۔

چند کچھ آقا صاحب کو جیتنے کی مرگے ضبط نہ ہو سکا، آخر بے اختیار ہو کر رول اٹھے۔

”مہم سبب ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ہم بادشاہ کے دربار میں آئے ہیں اور پانچ سو روپے ہمارا صرف ہو چکا۔ خیال تھا کہ بادشاہ کی طرف سے ہماری فہمن مقررہ کی جائے گی یا کوئی علاقہ انعام میں عطا ہوگا کہ اپنے عرش و آرام سے کھائے۔ آپ نے اس سبب خدمت کے بدلے ایک روپیہ ہمارے چپے سے نکالا یا اور ایک کاغذ ہم کو دیا جسے ہم نے کر کیا کریں گے؟ ہمارے کسی کام کا؟ یہ تو ہمارے دربار کا علاج نہیں ہے۔“

مہم سبب نے کہا۔ ”آغا صاحب یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ یہ تو بڑی عزت کی چیز آپ کو دی جاتی ہے ہر فوجی اطروا کو جنگ کی کامیابی پر بادشاہ دیتا ہے۔ اسی کے سبب سے آپ ہر ایک دربار میں جا سکتے ہیں اور ہر سرکاری جلسہ میں آپ کو پگھادی جاسکتی ہے۔ ہر فوجی مقرر کے پاس یہی نقشہ ہوتا ہے جس سے اس کی عزت کی جاتی ہے۔ یہ بہت عزت کی چیز ہے۔ آپ کو بادشاہ کا شکر یہ ادا کرنا چاہیے کہ آپ کو اتنی بڑی عزت عطا ہوئی اور شاہی فرمان کے کاغذ میں آپ کو کامیابی کی ہمارا کہادی گئی ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ بادشاہ نے آپ کی بہت قدر کی۔“

آغا صاحب کا چہرہ اتر گیا اور بال بال خواست اپنے اوپر ہزاروں طرحیں کرتے ہوئے گھر واپس آئے اور کہنے لگے۔

جی دستان قسمت راجہ سود از رہبر کامل
کہ شعر آب میوں شکستہ ی آرد سکھورا

کہنے لگے کہ شکوہ ہزاروں جگہ لڑانے لگے مگر چہ سوختی کبھی نہیں ہوئی۔ اور اس کے بعد شکوہ بازی سے توبہ کرنی۔

فقیر کا تکیہ

میر باقر علی داستان گو

شام۔ تھوڑا سا دھندلا ہوا تھا۔ سورج۔ رات کے دھندوں طرف کھنکھراتا، ابلتا، بجتا، چمکتا، مٹی کے ڈھیر، غور و جہاز سے ڈھکے ہوئے، زمین پر کھڑے سورج کی شعاعیں، پڑ کر اپنی رسی ہیں۔ کہیں دیر کا کچھ حصہ جو باقی رہ گیا ہے، اس کی ٹنگلی پر شام بول رہی ہے۔ دور کسی اہل کے درخت کی پہلک پر بیٹھا ہوا بچہ، چھپا رہا ہے۔ مغرب کی طرف پھٹے پھٹے پادل کا سلسلہ جو مساوی انگلیں ہوا میں رکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اسے بجلی السیر ہیں، کہ نظر ان کی حرکت محسوس نہیں کر سکتی۔ آفتاب کی کرنوں نے ان کو تاریخی رنگ دیا ہے۔ ان پادلوں کے نیچے ہاتھیلیں جھومت کھا کر بیٹے راگ کا رہی ہیں، بار ہو اس سے پر لئے ہوئے آگے بڑھ رہی ہیں۔ دور کچھ ہاتھیلیں جو پتھر کا تے وقت ٹکڑی سے پیچھے رہ جاتی ہیں تو پھر وہ اپنی تہن کریمو میں آ جاتی ہیں۔

آٹا ر منادیا۔ کہیں دروازہ کی خراب، جو کبھی جگہ سے کھل گئی ہے اور فلک کی سردھری نے سیاہ کر دیا ہے۔ لوہہ دو ٹھیک ٹکڑے باقی ہیں جن پر تھیل کوڑاں کی جگہ کے سفید سفید نشان۔ کہیں دھالان کی ٹنگڑیہ اور کچھ حصہ۔ کہیں حیرت انگیز کی کری۔ کہیں چوڑے کا نشان۔ کسی جگہ دو تین جڑیاں، کہیں لداؤ کی چھت کا کوٹ۔ کہیں حوض کا کنارہ۔ کہیں حلق کا پودہ۔ کہیں دیوار میں انگوٹھے کی علامت۔ کہیں کانٹا کا کھرا۔ کسی جگہ نئے نئے نقش و نگار۔ کہیں بھول۔ گو کھودا ہے۔ کسی دیوار میں تھپہ بے ہوئے۔ فرض دیکھو نگار میں اپنی فونی پھوٹی زبان حال سے اگلے زمانہ کی صنعت اور کار ٹھیکری، گو یا زبان حال سے اعلیٰ کار کردہ ہیں۔

از قتل و تار و د و دہار قتل
آہر پہ سے منادیا علم را

تکیہ۔ الفقیر میں اور شہر کے تہا ثانی جو میل کر کے آ رہے ہیں۔ ولی دروازے سے ایک میل کے فاصلہ پر سائیں گے شاہ کا تکیہ ہے۔ گھگھ
شاہ کو از شاہ کے سرے اور دھڑ دشاہ آپ کے دادا ہیں اور گھگھ شاہ کے دھڑے ہیں۔ لیا شاہ اور چھٹی شاہ گویا بے نام کے غلام ہیں۔ میں تکیہ کے

قریب آیا تو دیکھا کہ سڑک کے کنارے پر دو چٹائی اور تخت بڑا اور ٹھیل کے بلکہ سڑک کے دونوں طرف سایہ دار اور لب سڑک مسجد کا ایک چھوٹا در، جس کے قریب شاہ صاحب کا کچا احباب، جس کی دیواروں کی ٹلی ہارن سے وصل گئی ہے اور سڑک پر دو پرنگ شکر پاں لگی ہیں۔ اس احباب کی پشت کی طرف اس پار گڑھا گڑھی کا پر تال جس کو بان سے باغداد کے سڑک سے اٹھا رکھا ہے۔ پر تال کے دونوں طرف جو اچھل اچھل کر برساتی پانی بہا ہے اس نے فنی کھڑا کے سڑک پر سے ہڈی تک لبا گھونٹا کر لیا ہے۔ اندر کوٹری کے جسم اس اپنے، بلکہ جنگل کے چنے ہوئے اور رنے ٹکڑے کے خادار اور جھانکڑا لگی ہوئی کئی جہاز کی جڑیں، بلکہ پیسہ، چھپر کا پھولس گیتے پڑا ہے اور اس ڈیجر کے قریب ایک بکری اور دو اس کے بچے بندھے ہوئے۔ موت اور بھینٹوں سے چونک کر رسات ہے ایک مڑا ہوا بھگا ٹھل رہا ہے۔ احباب کی سڑک پر دوں پر ہانے ٹیلے کے پودے کے ٹکڑے پڑے ہیں اور ان کی حفاظت کے واسطے ہانے بان کے توڑوں میں، کہیں ٹنگے کا ٹکا بندھا ہوا ہے۔ کسی طرف اینٹ باغداد کر لگا دی ہے۔ کوٹری کے دروازے کے قریب ایک مٹکا جس کا کوئی لگ کر لگا ہوا ہے۔ کائی کے ٹکڑے جو جنگل ہو کر قحط گئے ہیں، ٹنگے کے چاروں طرف لپٹے ہوئے۔ پانی ٹنگے کے پینے میں ٹھلی آ اور دیکھا ہے اور بڑا ہوا کیڑے اس میں بچتا رہے ہیں۔ بھٹی کی ہڈی ٹیلے کا ٹوکھا ٹوکھا ہوا ہے اور پر اس کے ایک دو دو کا ٹھنڈا کنارہ ہوا ہے، پانی پینے کے ٹھیکرے میں لٹکا ہوا ہے۔ چھکٹ میں اندر کی طرف ایک گڈڑی چھٹی ہوئی، اس پر سائیں لگے ٹھوٹے۔ جیسے بچپن میں کس کا من ٹپکی گڑبڑی ڈال دیتی تھی۔ خود میں جہاں ایک کے وقت ہی ہے، اس سے ڈال دیتی کے بال چپک کر تھیں کی بندھ گئی ہیں، سر پر ایک گاڑھے کا میلا پڑا کچھڑا لپٹا ہوا کان کی لٹاؤں میں بھٹکی کی دو دیاں، ٹنگے میں گڑی کی دو جہری کمری، جس کا اہر اچھٹ گیا ہے اور تختہ استرا ہتی رہا گیا ہے، ایک آستین لٹکی ہے لگی ہوئی دوسرے شانے پر سے ٹھارہ۔ کوٹری میں کوڑی کے قریب ایک بیب، جس میں تبا کوئی چڑے کی قھیلی جس کے منہ پر لٹا رہا ہوا اور دور سے سے کمرے پر ایک ٹوٹی ہوئی چھٹی کوڑی بندھی ہوئی۔ برسات کی پٹن بکری ہوا ہے جو تبا کوئی گڑھا ہے تو باہشت بھرک ہے نہیں معلوم ہوتا کہ کمری یہاں سے ہے کس پکڑے کی۔

ناگن میں چلا نکلا جس پر پید آ کر جو جنگل وہاں ہے تو جس طرح کسی قطع پر موش دغاں داتے ہیں، پید کے خود بیت سے ایک سفید جال سا ان کیا ہے۔ پاؤں میں ایک مٹکا، من کوڑا کہتے ہیں ٹنگے کے قریب اور سے سے بندھا ہوا آگے نوٹے ہوئے مٹکا کا ایک کڑیل دھڑیل سے کالا۔ راکو بکری ہوئی اور کڑیل کے گرد بھٹیں جھانکی گئی ہیں تو کھلی تبا کو کے چلے ہوئے چاروں طرف پڑے ہیں۔ راکو میں ایک صبا اس ایلہ دیا ہوا، کنارے پر اپنے کے قھوڑی سی آگ اور اس پر کچھ کرپاں رنگی، شاہ صاحب لگی کا آٹھل دوٹوں ہاتھوں سے پکڑے۔ چل رہے ہیں۔ کنگ من سے پھونکتے ہیں، چہرے کا رنگ الال ہو گیا ہے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے۔ کڑیل کے قریب ایک فنی کا ہار پر حق جس پر نزل کچھ۔ چپے پر جو کھلی چھٹی لپٹی ہیں وہ من کر ایک جگہ بیٹھ گئی ہیں اور پٹنا ہوا پچھل لگی آ رہا ہے، مٹکا سڑک پر چپک پیدا کر لایا ہے اور حق پینے والوں نے جو کھانڈا پار کیا ہے، گتے کے دونوں طرف گڑھے بن گئے ہیں۔ آپ نے کاسرا، جس کو کھرو کہتے ہیں چلا ہوا اس پر لٹا دی اور کنارہ فنی چلم لگی ہے اور شاہ صاحب کا سامان فقیری۔ سونکا، مٹکا، کھلی، تاش، کشما، جھولی، لٹا، تاجا سا، مسترد، مٹھا، تھنج، اٹھا، اٹھنا، سوہج، کوڑی، کھٹی کھلی، کھٹا، کھلی، ۱۰، بنداز، چھری، گڑا، اس، ٹنگ، جہ، چار، فرق، صاف، ہاتھوں میں تانبے بھٹک لو کے کے کڑے پڑے۔ گڈڑی پر بیٹھے، بھٹک کے نشے سے ہونٹ جنگ، آنکھیں لٹکی ہوئی الال لال۔ بار بار ہونٹ جنگ ہونے کی وجہ سے زبان ہونٹوں پر پھیر لیتے ہیں۔ میر سے اوپر جو شاہ صاحب کی ٹھکر پڑی تو پاؤں بندھ گیا میر صاحب، ادا حق پینے ہاؤ۔ میں نے صاحب سلامت کی اور شاہ صاحب نے گھبراہٹ کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ شاہ صاحب نے اپنے چیلے کو آواز دی۔ خیالہ شاہ چلم بھرو۔ لیکن آگ جھار کر اور دھو کر نکلا۔

جتنی حق تازہ کروادورو جھکاؤ کا تنکا چاہے آپ نے میں دیکھ لو۔ چنانچہ میر صاحب داستان گو ہیں۔ بڑے اہل کی سنت لڑاتے ہیں۔ پامیروں کے کھلنے ہیں۔ ان کے تو دیواری مشکل سے ہوتے ہیں۔ یہاں میر صاحب آپ تو ہندو اور سنگل کو اپنے مکان پر داستان کہتے ہیں نکت کا کر۔ میں ان دونوں کو داستان میں سمجھوں گا۔

آپ داستان میں مرشد کا ادب۔ میر دھما مٹ کی خوبیاں۔ دیوہو کے نام۔ شمس کشی کے طریقے، ان کو سنا دیا۔ آپ تو ہر قسم کے مفید عام مضمون بیان کرتے ہیں۔ میں تو ان دونوں کو کھاتے کھاتے ٹھک آ گیا یا پھر پھر ہیں کہ گھٹتی ہی نہیں۔



حوالہ:

- ۱۔ میر تقی داستان گو (دہلی) اور داستان نگاری کے آفریڈ سے نام۔ خاکسار مسلم خواجہ سے "داستان امیر خروہ" لکھی۔ آفریڈ میر تقی خروہ کی کھڑپاشی فریب میں ملائی اور "کازمے خان کا کھڑپاشی" میں کی علاقہ "۱۳۱۰ و ۱۳۱۱" اور "معد باقی" چھ سال یادگار ہیں۔

ایک چاندنی رات کا نظارہ: بہار کشمیر میں

آفتاب احمد

مطبوعہ ”عقلم“ کراچی، 1902ء

رات کا ایک عجب ہے، لوگ اپنے اپنے گھروں میں چڑے بے نعل و نعل سو رہے ہیں۔ چند چراگاہوں میں گردن جھکائے آنکھیں نوٹنے آ رہا کر رہے ہیں۔ پرند شاخوں پر چروں میں سرو بے ہوئے لیٹے لیٹے ہیں۔ کیا انسان کیا جانور ہر ایک گہری خند لے رہا ہے اور اپنے حال سے بے خبر ہے۔ آسمان پر مہتاب مع انجم کی سپر کے نکلا ہوا ہے اور خلق خدا کا پاساں ہے۔ تاروں کی فوج میں بعض سوار ہیں بعض پیادہ لیکن سب اپنے اپنے قریب سے استحباب ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ بڑے بڑے اگر کوئی عجم بھی بنا جا رہا ہے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں ہر طرف بچھایا جاتا ہے۔ جانب مشرق ایک باغ ہے۔ دائیں بائیں نیپ، ڈھپائی، لکاس، کے گچھے ہیں۔ سبزانی چمن نور کی چادر اوڑھے، کرن بھول نکلے پہنے، بندے نکالے، اصرار مانتے لہاتے عجیب انداز سے کھڑے ہیں۔ وسط میں ایک وسیع مکان ہے جس کے در پہنے ہوئی آدھ رشت کے لیے کھلے ہیں۔ اندر عیش و روشنی ہیں اور ہر قسم کا سامان آسائش اور آرائش موجود ہے۔ قد آدم کینے دو چاندوں پر آویزاں ہیں۔ ان کے پیچھے دو تین جوان گچھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بیک ایک اُس مکان کا دروازہ کھلا اور وہ ہاتھوں پاؤں جھکے جاتے ہیں۔ ان کے قدم آگے ہل کر چھبر گئے اور ہر ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ صاحب خانہ وہاں بھرا اور دوسرا نو جوان بیٹی میں وقت کی راگنی نکالنا، پھرتی جاتا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ چوڑی اوپر میں ایک جمیل کے کنارے پر جا کھڑا جہاں ایک شکاری آدھ رشت سے بندھی ہوئی تھی۔ کشتی کھول اس میں سوار ہوا اور کچھ جگہ کی طرف چلا۔ جمیل کے کنارے کنارے قدرت نے غیر معمولی رو یا دلی سے قسم قسم کے پھول نکالے ہیں۔ جن کی خوشبو سے دماغ معطر ہوا جاتا ہے۔ باوجود سرکشی ان سے اڑ کر چلتی ہے۔ کچھ بانی پر جا کر لہروں کی اچھیلی چال کی تحریف میں زبان تر کرتی ہے۔ دنگی پر مایجان لڑا تھیں غنی ہیں اور پانی پر چند کشتیاں بھی تکی کھڑی ہیں۔ چاہا شمس و روشنی ہیں جس سے گمان ہوتا ہے کہ بعض بعض نہیں اور اچھیلی جاتے ہیں۔ لیکن قریب سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنی قیاں چھوڑ کر سو گئے ہیں۔ پانی میں قدرت کا کچھ اور ہی نقاشا دکھائی دیتا ہے۔ سونے کے جھنگ جھنگ کرتے ہوئے گل کا پتہ ہوئے ستونوں پر استوار ہیں۔ سبزانی شمس کا سمت آپ رواں کی چادر اوڑھے کھڑے ہیں۔

تار سے متحرک پانی میں کھینچے پڑتے ہیں اور چراغان کی کیفیت پیش نظر کرتے ہیں۔ ان سب چیزوں نے مل کر اس فوجان کو ہوا ٹھوکر ت کر دیا کہ وہ اپنی خودی کو بھول گیا۔ چہ گو میں دکھانے کے گھوڑے دور اور زور یک دوزا لے گا۔ ناگہا قریب ہی پانی میں اس کا ایک ٹھٹھ میں صورت نظر پڑا۔ اس فوجان نے اس سے مخاطب ہو کر چہا کر اس آبادی کا کیا نام ہے۔ پھر قلعہ کھلات اور مشرف بارہ دریاں کن لوگوں کی رہائش کے لیے بنائی گئی ہیں اور یہ باغات اور چمنستان کن کی طرح کا ہیں ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اس پر فضا مقام کی سیر کروں۔ تو بھوکا اپنے ساتھ لے چل اور دریا کی ڈامیر کرا۔ اس ٹھٹھ نے جواب دیا۔ ”دیکھو کیے ہرگز قدم نہ رکھنا۔ ورنہ یہاں ٹھٹھ کی بجائے ہائے کی۔ میں ٹھٹھ میں یہ آپ دم کی دم میں مسموم کر دیا جاؤں گا اور تم بھی شہرہ میں پڑ جاؤ گے۔ یہاں پر پتہ پر ٹھٹھ مار سکتا۔ بھلا کسی غیر ٹھٹھ کا تو کیا خاکہ کر ہے۔ تم وہیں بیٹھے رہو۔ میں تم کو اس جگہ کا ٹھٹھ حال سنائے دیتا ہوں۔ ٹھٹھ اس مقام کو ٹھٹھ جان سکتے ہیں۔ یہاں کی آبادی لاگوں کی پر پختی ہے۔ یہ لوگ مختلف وقتوں میں ہر لوگ سے آ کر آباد ہوئے ہیں۔ سینکڑوں بچے ہیں جو گناہی فریض پر بیٹھے کھیتے ہیں۔ ہزاروں فوجان ہر ادوں اور آرزوؤں کو آفریں میں لے بھیج کر رہے ہیں۔ یہاں ایک بھٹی سوراہا پانیوں کی ہے جن کی تلواریں چمک نے بھی تمہارے ملک میں بجلی کو کھادی تھی۔ جن کے ہر دھنک نے کسی زمانہ میں پہاڑوں کے چٹے پھٹیل کر دیئے تھے اور جن کی بندھنوں کی گرج نے ایک وقت میں کھائیوں کو گولہا دیا تھا۔ لیکن جب سے یہ لوگ یہاں آئے ہیں ان کے اسٹیل پکاری کے باعث رنگ ٹورہ چرے ہیں۔ کیونکہ یہاں کے ٹھٹھ و فحش میں تلواریں اور ٹھٹھ کو داخل نہیں۔ ایک مشرقی صراط حق کا ہے جن پر بیٹھ آقا نے زمانہ کی بوجھ اور ہی اور کوئی ایسی باوجود ٹھٹھ نہیں بجلی جس نے ان کو چرے کی چھی کی دھنکی نہ دی ہو۔ ناخبر تک ہو کر یہ بھی اس ماسن میں چلے آئے اور مدت کی ٹھٹھ کے بعد اب ٹھٹھ چرے سے بیٹھے ہیں۔“

بات ٹھٹھ کرنے کے بعد اس ٹھٹھ نے اجازت چاہی اور اپنی جگہ سے ہلا۔ تارے لو جو اس نے چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر ٹھٹھ لے۔ پانی ہلا اور وہ غائب۔ پھر تو یہ ہوش میں آ پھرا۔ اپنے ٹھٹھ کی خود ہی آجب کرنے کا۔ ٹھٹھ کی ہر چیز چائی شروع کی اور تمام سامت کے بعد اس کو اپنے مکان کے کھڑا کمرے پر جا کا گیا۔ ٹھٹھ کی وراثت کے ساتھ ہی سے ہاتھ دی اور آپ قریب کے نیلے کی طرف چلا جہاں ایک پختہ مکان چاہا تھا۔ کمرے روشن تھے اور دروازہ نیم کھلا تھا۔ دروازہ پر پہنچ کر بند کرنے سے پیشتر اس فوجان نے سامنے کے میدان اور ٹھٹھ کی ایک دھانی ٹھٹھ دی۔ پھر اندر جا کر چراغ لگایا اور سر پہ۔ صبح بھر آگ لگی تو سورج کا گل پالا۔



حوالہ:

- ۱۔ آقا جہ سے حق ”تو ان ۱۳ اور کے کھلات غاصب ہیں۔ میں کی اس قور کی کئی اور قور نہ“ ”تو ان میں اور نہ ہی ”تو مانا“ کا پیر۔ ”تو نے سلی“ علی گڑھ۔ ”تو جہ ۱۳ اور کی اور صاحب پر وہ میں دکھائی دی۔
- ۲۔ آلو چکی ختم کا ایک ٹھٹھ۔ دیکھنے میں سرگ اور ڈاکٹھ میں لے۔
- ۳۔ بھولی ٹھٹھ۔ ”تو نہ“ میں کہا ہا۔

اُردو کے اوّلین افسانے
انتخاب (1903ء-1914ء)

نصیر اور خدیجہ

راشد الخیری^۱

آئندہ کا پہلا افسانہ، مطلوبہ، "مخزن" اگست ۱۹۹۳ء

شاہنشاہ بھائی نصیر شاہنشاہ! بھولی بہن سر کے پھوٹی۔ بڑی بہن کو بچتے پھوڑا۔ غضب خدا کا تھو گئیں جاں چار میسے گزر جائیں اور تم کو درد
حرف لکھنے کی تو یقین نہ ہو۔ حقیقت کے نکاح میں وہ بھی جچی جان کی زبانیں معلوم ہوا تھا کہ کھان کی بدلی ہو گئی۔ وہ دن اور آج کا دن غیر صلاح
کبھی یہ بھی طر نہیں کہنا ہو جس میں ہو یا کھان میں۔ نصیر یہاں، بہن بھائیوں کا رشتہ تو بڑی محبت کا ہوتا ہے۔ انکی کوئی سی پانچ سات بھینس بھینس ہیں
جودل بھر گیا۔ درد کیوں جاؤں، بھائی سلیم ہی کو کچھ لو ایک چھوڑ دو بھینس ساتھ ہیں اور کس طرح؟ گھبراہٹ کی غلط، اندر دہری کا ملک، سیاہ کریں
چاہے، مطہ۔ نہ بھائی کی اتنی مہال کہ ہم مار سکتے نہ بھائی کی اتنی طاقت کہ انوں کر سکتے۔ کسی کو کچھ کرنا سیکھ کر دو۔ ایک وہ بھائی، بھینس کو
آنکھوں پر اٹھایا، بھائی بھائی کی شادی نہیں، بھائیوں کو چڑھا کھسا کر تو کر کر لیا۔ ایک تم بھائی ہو، کس کا بھائی اور کبھی نہیں۔ چاہے کوئی مرے یا
بچے تمہاری جا سے۔ خدا کا شکر ہے، میں تو تمہاری روپیہ ہے۔ کی بھی بھولی نہیں خانی محبت اور شیشی زبان کی خواہگار ہوں۔ جو کہیں خدا خواست
تمہارے در پر آ کر پڑتی تو کتنے کے شکریے میں پانی پلا دیتے۔ آخر میں بھی تو سنوں خدا قصور ہے سب۔ کچھ تو تازہ ایسی لاپرواہی بھی کس کام کی
اپنے سے فرض نہ کرے سے مطلب۔ بہن کے تم نہیں بھائی کے تم نہیں۔ سادہ مگر مرے مرگی اور تمہاری صورت، دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ اس
رجس نہیں، ابلا اور پلے گئے میں اس کا دل نہیں، بڑے بھائی اس لاکھ نہیں۔ اب تمہارا دل میں کون بیٹھا ہے جس کو خدا کھنکھو تم تو خدا سے چاہے
تجے کو کوئی موندے طے تو ایک سرے سے سب ہی کو حاق کر دوں۔ اہا کاج کو ہا ناو کتنے کو ٹھپٹے کا بہانہ ہو گیا۔ بہن اور بھائی، ماسوں اور مہائی سب
کو ہانے حاق، نکلا۔ چلا پڑا، جچی خدا اور۔ بھائی خود غرض، بہن کھار غرض کئے کا کہہ اور خدا خاں کا خدا خاں چھوٹے اور بڑے، بڑے اور
جوان، مرد اور عورت، بچہ اور بچہ، ایک بھی اچھا نہیں، محبت نہیں مراد ہی سہی۔ ہاں بچوں کا ساتھ رکھنا گناہ نہیں ہے، دونا جہاں میں ہوتی
آئی ہے۔ مگر یہ اندھیر کس نہیں، دیکھ کر انگ گھر کرتے ہی سب کو، محتاطی۔ اس کا مرنا اداری تو سنی چاہی ہوئی محرم کو معیہ ہو گئی۔ شفقت محبت

پہلے ہی رخصت ہو چکی تھی۔ جو کہ توڑا بہت ملا تھا وہ بھی کیا گزرا ہوا! اللہ تم کو بیٹھ خوش و غم رکھے! اگلی تہوار سے بچوں کو بڑی عمر ہو۔ اپنے دل پر ہاتھ دیکھ کر کہ گویا اب سے دور اگلے برس دارالعلوم کو نکال دیا گیا تھا۔ کیسے گھبرائے گھبرائے مارتے تھے۔ تم کو آٹھ برس کے بچے کی یہ کچھ بات تھی۔ اما گویا رہائی تھی ہوگی؟ نصیر مہمان دنیا کے منگڑے تو بیٹھ ہی رہیں گے، ہاں بچے شادی ویاہب ہی کچھ ہوگا۔ اب اس تہوار کی صورت دیکھنے نہیں آئی تھی۔

صادق کے بچوں کو اس اپنی زندگی تک کلیجہ سے لگائے رہیں ان کا سر ہاتھ کھینچوں کی مٹی دی وہ امن ہوگی۔ پوسوں دونوں لڑکے بم لگا کر اٹھ کر آئے تھے میں باہر کی چار پانی پر بیٹھی ہوئی رضائی ٹاک رہی تھی۔ چھوٹا آکر کھلے سے لپٹ گیا بیگم طون کا جوش تھا کہ اس کی صورت دیکھتے ہی میری طبیعت بھر آئی۔ ملاسوں کی بھی حالت اچھی ہوگی بیسی ان بچوں کی تھی۔ پہلا ہوا کہ نہ ٹوٹی ہوئی جوتی، پاؤں نہ ٹکٹ، ٹوٹی چوہا، برس پر سرور ملے، آنکھوں میں آنسوؤں چھینچھ، ان بچوں کو کچھ کچھ کوہ و دن یاد آ گیا کہ جب تک دونوں کی اگلی تعین نہ آ گئیں۔ صادق راہجو کی چوتھی میں نہ گئی۔ دیکھ لو تین چار ہی برس کے اندر اندر کیا کیا ہو گیا۔ رات کا نام تو قیامت تک بھی اپنے بچوں کو اس طرح نہ پاؤ گے جس طرح صادق اپنے بچوں کو پال گئی۔ خدا کی قسم بھری ہوئی عطر کی شیشیاں کمرے سے کمرے سے سعید نے غارت کی ہیں۔ نقدیر کی خبر نہ تھی کہ صادق کی اولاد میں بر باد ہو گئی۔ میں نے دیکھا نہیں مگر وہاں جان ذکر کیا کرتے تھے کہ خود سے پہلے اس مکان پر پہنچی بھوسا تھا۔ آج ہا کر دیکھو بے کڑی کا ایک کواڑ جز ماہو اسے اور پچھلی مٹی کی ایک دیوار بھی ہوئی ہے۔ بڑے نواب کی آنکھ کا بند ہوا تھا کہ گھر بھر میں جھاز دہرائی۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ مسعود کے ہاؤس میں صادق کی سب کو کھانا جنسی چھپے چھپے چارے تھے۔ لونڈیاں اور ماہیاں گوندنی کی طرح زہر میں لدی ہوئی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ کیا زمانہ چلا کہ آج پانی پینے کا کوہو بھی نہ رہا۔ نئے میں آ کر کہتے، اچھی میں کپڑے لگا کر کام۔ دن میں طاقت نہیں، ہاتھ پاؤں میں سخت نہیں، چپٹے مہرے سے مسعود۔ آنکھیں نہیں تو ایک آہ کر کہتے وہ ایک نوجوان کر کر اگلی تھیں۔ اب اگلی بھی نہیں، پوس کا حق بھروسہ کا خوف ہاں۔ ہاتھ پاؤں کی خیرات کہو بچی جان تھیں وہ پیہ پیہ دیتی ہیں۔ اسی چنگ کا نکات ہے۔ اس میں کیا آپ کھائیں کیا پیاں کو کھائیں تھیں وہ پیہ چاروں ایک لڑکی کا ساتھ کیا کریں کیا نہ کریں۔ تھیں وہ پیہ پیہ کا تو سو کھا تاج چاہیے۔ جو جو کچھ کھا تھا سب ہی کچھ کر گئیں۔ چکیاں دیشیں، مسالیں کیس، ہاں اگلی بات، اگلی کدور ہاتھ نہیں بچا ہا۔

صادق کے بچے کسی فیر کے بچے نہیں ہیں۔ مری ہوئی بہن کی نکالی ہیں۔ شاہاں تہوار کی امت پر تم پر دیکھ میں بیٹھے راج کر وہ اور صادق کے بچے دور و اسے نکالتے ہوں۔ ولی میں آ کر دیکھو شہر میں کیا کام بدنام ہو رہا ہے۔ آخر برس میں وہ برس میں اپنے ہاں کی نہیں سسرال کی شادیوں میں تو آؤ گے۔ سب کو ہا دے کہ اندر کھانسی کا چاوس پر آ رہا ہے یا یہ بھی وہیں کر لو گے؟ اپنے چراتے، کچھ، مختلف، میل ملاپی جان بچکان کام، دنیا میں تم کو دے دی ہے۔ کس کس کا نہ کیلو گے؟

بڑے بھائی اس واقعے سے کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ چھوڑے آپ ہی اپنی پر بیٹھوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ تو کمری بھولی، چندی ہوئی۔ مقدمہ ہارے چار روپیہ مکان کے آتے تھے وہ بھی نہ رہے۔ اندر کا دکان ہوا اسوی رہا تھا ایک ہی چھیننے میں آزا آزا کر کے آن جاں اس کے ساتھ ہی لمبی کوٹھڑی بھی چڑھی گئی۔ اتنا بھی پاس نہیں کہ داخل اور ملے تو ہزار دیں۔ چار سو روپیہ کے قرض ملے اور بیٹھے ہیں۔

ایک لے دے کہ ٹھیک خانہ، دیکھیں وہاں کیا کیا کیا کریں۔ صادق کے بچوں کو پالیں، بڑی بھو کی بھل کریں، اپنے گھر کو دیکھیں۔ جس کا ذکر ہے اسی سے بری، وہ پیہ پیہ کے قائل نہیں، ہاتھ پاؤں سے باہر نہیں، جس کے ہاں ضرورت دیکھتی ہیں آسودہ ہوئی ہیں۔ کیسے کوس کوس کا جو

کی جا ہے کہ لائق کا مطلق قہر می بند ہو سکتا ہے۔

ماسوں اور باپ میں فرق نہیں ہوتا۔ مگر سمجھو۔ نہ سمجھو بھابھا بھائی تو خیر، اپنی اولاد بھی خیر ہے۔ خدا گناہ ہے مہری تو اگر جہاں تک کام آجائے تو دریغ نہیں اپنے بچے کم اور صادق کے بچے زیادہ۔ مگر راجھل سے کام لوساری دنیا میں بدنام ہوں، مہری ہوئی دنیا میں اکثر دھکس، اما باوا کی ناک کنواؤں، دواہی دواہک کو پڑاؤں، جب ان کو ساتھ رکھنے کا نام لوں، میں خود پرانے بس میں ہوں، شہر کا معاملہ، مسرال کی بات، ماس اندوں کا ساتھ ہر وقت کی جھک، جھک دراست دن کی پٹ پٹ، کتے بھر میں ذلیل ہونا، عمر بھر کے لئے مٹی پلید کرنی، گھر دس میں لڑائیاں لڑانی، دلوں میں فرق ڈالنے کی خدا نے بتائے ہیں۔ اماں جان تو پہلے ہی فراتی ہیں کہ بچے کا بھرتا بھرتی ہے۔ بچاں کو کھانوں تو زندگی ہی دو بھر ہو جائے۔ تم کو، شاد اللہ اسی روپیہ ملے ہیں۔ دو مہیاں، کھادی دو بچے گل چار دم ساسی روپیہ کیا کم ہیں۔ براہ تو یا بھلا جس طرح اس کے صادق کے بچاں کو پانچ روپیہ مینے دو۔ چار روپیہ رانچاں نہیں چانچا۔ یہاں تک نام دہاں سرخرو۔ نصیر مہیاں حق داوراں کا حق سمجھو، اللہ برکت دے گا بھو کے پھولو گے۔ دنیا کی ہمارے سمجھو گے۔ روزگار میں قرتی ہوگی۔ ان بچاں کو خیر نہ سمجھو نصیر اور حمید میں فرق نہیں ہے۔ بھائی بھن کی اولاد ایک ہوتی ہے۔ یہ بچاں نے بھی کیا یاد کریں گے کہ کوئی ماسوں تھا۔

دھن تکم کو بہت بہت دعا۔ بچاں کو چار۔ اب تو شاد اللہ اپنی پاؤں پاؤں پٹتی ہوگی۔ اچھا خدا حافظ۔

خدا بچہ

روز بھر



حوالہ:

۱۔ راجھل انجیری کتے شاد اللہ محمد عبداللہ احمد کے نام سے شائع ہوا تھا۔

تصویرِ غم

ورد و مند اکبر آبادی^{۱۱}

تاریخی اقدار سے اردو کا دوسرا افسانہ ”مخزن“ کا پورا پورا فردری 1904ء

لیجئے۔ سیاد اور باریک ہاتھوں کی لبت اس کے رخسار پر جس میں آج زردی سرفی پر غالب ہے، چڑی ہوئی تھی۔ ہونٹ کسی قدر خشک تھے۔ چہرہ اس سا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بڑبڑاتے ہوئے۔ میں دیکھتے ہی ٹو جھرت ہو گیا۔ چالائی یہ کیا سرا ہے۔ یہ چہرہ تو رنج سے آشنایا تھا۔ ان ہونٹوں کو تو میں نے بھٹو سکتا ہوں دیکھا۔ یہ آنکھیں اور آنسو۔ میں نے سلا کیا۔ جواب میں چشم بڑا آپ نے جکوں سے اشارہ کیا کہ چند ہاؤں۔ پاس ہی ایک کونے میں دیک کر بیٹھا گیا۔ قریب ہی ایک سبز چٹے تھے۔ گرد و بھی سر جھکائے ہوئے کچھ لمبوں کی صورت بنائے۔ کچھ دیر تک سکوت رہا۔ آخر میں نے آہٹگی سے پوچھا ”نرمائے حراج کیا ہے۔ خیر تو ہے؟“ جواب میں نہایت دھیمی سی آواز آئی۔ ”اچھی ہوں۔“ اور ساتھ ہی ایک آہ سرد بے اختیار لب سے نکلی اور آنکھیں تیز دانا جھٹ کی طرف اٹھ گئیں۔ ہاتھ کر کی طرف گیا۔ بیٹائی پر لیکن کے نمودار ہوئے نے درد و پنہاں کا پادیا اور ایسا معلوم ہوا۔ جیسے ایک ہوک کی ٹکلی ہے۔ نہیں نے دانا سوال کیا۔ ”کچھ حال تو کیسے۔“ آنکھوں نے جواب میں حائل اشک کو دانا کیا۔ آنسو لب کرنے لگے۔ جو صاحب پاس بیٹھے تھے وہ بولے کہ آج انہیں لیکن کے اقبال کی خبر ملی ہے۔ وہ اسی شہر میں تھیں۔ نگران کے شوہر اور ان کی والدہ میں کچھ لکسی دارا تھی ہو چکی ہے اور خاندانی تکلیف کچھ اس قسم کے چڑے ہیں کہ آہ و دلت ملنا جتنا قسطنطنیہ ہے۔ نہ چادری میں یہاں سے کوئی خبر لینے کیا اور نہ دھر سے کوئی پیام آیا۔ یہ سٹلے میں آیا ہے کہ مرے والی آخر دم تک گوش برآ دنا دہری کر آج کوئی جیسے سے آتا ہے۔ کبھی تھی بلا سے اگر ماں نے دل چھر کر لیا ہے تو لیکن بھائی ہی آ کر مسافر دم کو رخصت کر جاتے۔ مگر سمیت یہ تھی کہ دھر قرآن کی والدہ یہ نہیں مانتی تھیں کہ یہ چائیں اور دھران کے شوہر دانا دلیں کو سسرال میں سے کوئی آئے۔ اب انہیں دوسرا صدمہ ہے۔ ایک تو ماں چائی دساتھ کی کھلی ہوئی لیکن کے گز رہا ہے کہ لیکن کی لیکن اور کھلی کی کھلی تھی۔ اور دوسرے یہ قتل ہے کہ لیکن ملنے کا داربان لے کر قبر میں ہا دہی ہے۔ اور دیا داربان کی قبر وال میں بنا سے ہوئے ہیں۔ دوسرے کھٹک ہو رہی تھی اور دوسر

چپکے چپکے دریاں اٹھوں سے تر ہو چکا تھا۔ جنم خانوں کے گرد بار یک سی سرخ ٹیکور۔ چروہ کی حالت ایسے وہ جو ٹپکے سے زکام میں حسین چروہ کی ہوتی ہے اور جو جنم حسن پسند کے لیے آفت کا حکم رکھتی ہے کیونکہ حسن اگر واقعی حسن ہو تو خلیف مرض میں اور ٹکرتا ہے۔ فلم میں اس میں بھی ہر ٹپکوں۔ حسین کے تازہ دل پر جو گزرتی ہے اس کے سبب تو دماغ بھی پڑتی ہے کہ خدا اے فلم سے مخلوق رکھے۔ لیکن حسن پر تو فلم میں وہ انداز آتا ہے جس سے حسن خود آکا نہیں ہے مگر ہوتا قیامت ہے۔ یہی رنگ اس فلم کی تصویر کا تھا جس کے سامنے میں بہت دیا بیٹھا تھا۔ ہوسری دیا آئی اور بیٹھا ہوا دریاں دیکھ کر کہنے لگی ”بیٹا کب تک روئے گاڑی۔ میں تو عمر بھر یہ دریا دل سے نہ مٹنے کا۔ لیکن اس طرح آنکھیں کھولنے سے کیا حاصل ہے۔ سچ سے ہوں یہ چار پائی کی پاکی سے لگ کر شیشی ہو۔ زانو تک نہیں بدلا۔ اٹھو سہ ہاتھ دو حوڑا لو۔ میں گرم پانی لے آتی ہوں۔“ ہاں حال جان، مگر ہاتھ بھی دھوئی کے سر نہ بھی لگا نہیں کے ہاں بھی کٹا نہیں کے، ہاں بھی ستوری کے، کپڑے بھی بدلنے کے، کون سا کام ہے جو جھوٹ ہانے کا مگر اس وقت تو معاف کیجیے، بھگے اپنے حال پر چھوڑ دیجئے، تم سو دیا اور اس کی ہمدردی اس وقت میرے زخم کا مرہم نہیں بن سکتی۔“ دیا چپکے سے کھسک گئی۔

وہ مظلوم سر جھک کر زانو پر آ رہا۔ لٹ اور بھی پریشان ہو کر سوجوں سے پردہ پٹی ہونے کی بددردی کرنے لگی۔ میری آنکھ اس فتنہ کا منظر سے ایک دم کے لیے نہیں ہٹتی تھی، اب اور کھٹکی بند ہو گئی۔ پانک جو اس نے سراپا لیا تو تصویر فلم کا عکس میری آنکھ کی ہتھی میں پلایا۔ یہ جی، ہمدردی کا فو تو تھا اور واقعی میرے دل پر اس وقت ایک ایسی کیفیت طاری تھی۔ کوشش چاہتا تھا کہ کوئی صورت ایسی ہو، جس سے میں تھوڑا سا حصہ اس درد کا لے سکوں۔ تھوڑی سی تکلیف اس درخ میں کر سکوں۔ تھوڑا سا شریک اس غم میں ہو سکوں۔ یہ بیٹھا، دل نے دل سے کہہ دیا۔ اور فوراً اس کا ہکا بھکا چہرہ پر نظر آ گیا۔ کھٹکی ہونے لگے کوڑ مارے سے بنایا۔ آنکھ کو دریاں سے پوچھا اور تھوڑی سا تسلی بھر کے کہا ”افو آج دھشت آگئی کی ہے۔ پوچھ خبر مت ہونی کہ آپ آگئے۔ دولت میں تو سر پھوڑ لیتی۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔“



حوالہ:

۱۔ درد دل بھی اہم تھا، اصل نام سے ”حکلی“ ”خون کا دور“ خاصوش ہے۔ یہ لسان ”درد و سدا“ کہتا ہے ”آپ کے نام سے شائع ہوا۔

ایک پرانی دیوار

علی محمود^(۱)

اردو کے تیسرے افسانہ نگار علی محمود کا ابتدائی افسانہ ”مختزن“ کا اردو نام اپریل 1904ء

رات کے دو بجے، جبکہ اس وقت کا لوہاں چاند اور طرب کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اور ایک ٹھہرے درخت کی چند سوگی ٹہنیاں اس کو رخصت کر رہی تھیں۔ یہاں تک رفتار سے چل رہی تھی اور چند پرانے تالوں کی کمر کڑاہٹ سے سنا ہوا جھرجھریاں اٹھا رہی تھیں۔ اس گھڑی انکا ایک پرانی دیوار کے پاس کھڑا تھا۔ جس نے سیری صلی دیکھی تھی آہ آج اس میں کتنا فرق تھا انیاں بھلی باتوں کو یاد آتا تھا اور صبرت موجود وہاں دکھلا رہی تھی اس وقت کی اصلی چاندنی نے اس کی ٹکس کو آواز دیا تھا کہ سیری آنکھیں کھلا کر دیکھیں کہ سارا رات نہ سناٹے آگیا۔ مگر وہاں اسی نئے نئے طرح سے جس طرح ایک اڈائی آگھ سے گھرا ہوا ادارت کے اکیلے پن نے اس دیکھ کر گویا کہ موجودہ حالت بالکل بھول گئی اور نہال ہی نہال میں اس گزرے زمانے میں پہنچ گئے جو حقیقت میں اب بھر بھی نہ پہنچا ۱۱

یاد آ رہی جس کے اس وقت ہم سامنے کھڑے ہیں۔ بستی کی بہت پرانی دیواروں میں سے ہے۔ زمانہ اس کے آگے گزر گیا۔ ہائے کسی وقت میں یہ جگہ کیا تھی عذاب کیا ہے ان دنوں آبادی تھی آج ویرانہ ہے۔ کل مکانات تھے آج کھنڈر ہے۔ مجھے اس کا نقشہ بھلا نہیں ہے۔ ادھر آگن تھا ادھر دلاں تھا۔ یہاں پر ساہن تھا وہاں پر کھڑی تھی۔ ادھر پارہی تھا وہاں ادھر کو طوط تھی لہائے سب مت کیا اس تک وہی طوط تھی جہاں سے یہ پرانے تال نظر آتا کرتے تھے۔ یہاں اکڑ ہم گریں میں شام کو اپنے ہوتے تھے۔ چاہیں دیوار کی نگہیں پر آدھتیں اور ادھر اہو نے تک چھپایا کرتیں۔ کوٹے کے اوپر فاختہ کا گھونسا تھا جو بھری بڑی بڑی تھی۔ دو پہر سائی گھنٹوں میں ہم اس کی در بھری آواز سنھوں سنا کرتے تھے۔ ہائے وہ فاختہ بھی تو اب مرنا گئی ہوگی۔ افسوس اگر ہم کو اس کے چند پر بھی مل جاتے تو ہم ان کو اپنے پاس رکھتے ۱۱

ہاں وہ دلاں جس میں ہم گریں کی ادھر میں سو کرتے تھے۔ اسی کی یہ ایک دیوار ہو گئی ہے۔ ہائے یہاں کیا اظہ تھا۔ راتوں کو خوبصورت لپ جاتا تھا اور یہاں کے اچھے اچھے فرش پر ہم لوگ کرتے تھے۔ ہمیں خوب یاد ہے۔ ان خوش دنوں میں جب ہم خوش رہتے تھے تو اسے دیوار تھو پر خوشی ظاہر ہوتی تھی۔ جبکہ تھے برے مگر بھرے محبت تھی۔ سیری خوشی میں تھے خوشی ہوئی تھی اور سرے رخ میں تھے علم ہوتا

تھا۔ ان دنوں کے ایک سالوں میں جبکہ میرا بھائی مرا تھا، میں خوب یاد ہے کہ میرا سارا گھر لٹکھن ہو گیا تھا۔ ہم ایک کھری نو پائی پر چڑھ رہے تھے تو اسے دیکھ کر اس وقت تھو پر ہادی چھا گئی تھی۔ ان بیٹوں پر سنا کہ کونوں میں جبکہ گرم اور شہ ہوا کی وجہ سے ہم سب لوگ پریشان سے رہ رہا کرتے تھے اس وقت تھو پر بھی ایک قسم کی پریشانی معلوم ہوتی تھی۔

اسے میری پرانی دیکھارہ روزانہ دیکھا ہوا؟ وہ دن اب میرا نہیں آسکتے؟ میرا بچپن مجھے بھر نہیں مل سکتا؟ وہ خوشنما ہادی رات جس میں ہم کھینا کرتے تھے، بھر وہی نہیں آسکتی؟ اسے اس وقت کے ڈوبتے ہوئے چاند تھو میں اب دیکھی ہوشتی ضروری؟ اسے اسی جگہ کے تارو قمر نے بھی آنکھیں بدل لیں؟ وہ نکاحیں کیا ہوئیں، جس سے تم بگھے بچپن میں دیکھا کرتے تھے؟ اسے وہاں کے جو کوہ قمر بھی مجھے اب لو بھن کی ہی نیند نہیں سلا سکتے؟ آہ نہ کہجے تھے کہ بچپن کی سب چیزیں بدل چاٹکی۔ بھائی بہن، دوست، شاہب کی صورتوں میں لڑتی آگیا۔ سب کا خیال جدا جدا ہو گیا تو بھارت کیوں نہ جاتی؟ تیری ذاتی چودھانیت بہت ہے کہ اس وقت تک تو ہم سے جدا نہ ہوئی اگرچہ تو خود کسی میں سے جدا تھو پر جدا ہوا؟ آئی لیکن میں بچپن کے کہ تو اپنے ہی سے بری نہیں۔ تو آج بھی دیکھو دیر کے لیے سر پر کے وقت اپنے سناپ میں بیٹھانے تو سوجھو ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے خوبصورت چتر جن پر میں دیکھتا تھا۔ وہ کھلی ٹھیکریاں جو مجھ سے اکثر ٹوک کی کیا کرتی تھیں۔ آج ان سب کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ لیکن اسے میری یاد دیکھارہ تو نے آج بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس لیے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ آج بھی تیرے سناپ میں چڑے ہیں۔

آہ۔ اسے دیکھارہ کیا یہ میرا خیال ہے کہ تو مجھے بھی بھوتی نہ ہوگی؟ کیا مگر بچپن کروں؟ ہاں جی تو یہی چاہتا تھا کہ تو بھی مجھے بھوتی نہ ہو۔ شاید نہ بھوتی ہو مگر میرے بڑا سے تجھے ضرور پہ خیال ہوتا ہوگا کہ میں تجھے بھول گیا۔ میری تیری جدائی میں مدت گزرتی۔ نہ مانہ ہو گیا۔ ہم دور رہے اور تجھو رہے۔ لیکن اسے میری قدیم رشتہ "میرے خیال سے غافل نہیں رہے" "بچپن کا زمانہ جب جب یاد آتا ہے سے خوں کے ساتھ یاد آتا۔ میرے لڑکپن کے ان جیسے ہی گواہوں گزرتے۔ مجھے پاؤں پاؤں پہناتے تھے۔ جب میری دایہ بگھے چھوڑتی تھی تو میں تیرے ہی سہارے کھڑا ہوا چاٹھو رہنا سیکھتا۔ اسے وہ بات مگر بھارتو ہے کی کہ جب بھی میں روٹھ جاتا تو میرے سب خواہ کوئی چیز نہ بچتی اور میں روٹھتا تو اسے دیکھ کر اگلے تھو سے آکر لگ جاتا اور انگوں کی طرف سے منہ پھیر کر اپنے فزادہ گال کو تھو سے مانے رکھتا۔ تو مجھے خوب یاد ہے کہ تو مجھے لپٹانے رکھتی اور میرے آنسو پھینکتی۔ جب اور بڑا ہوا اور گیند کھینا سیکھا تو اس وقت کی باتیں بھی مجھے خوب یاد ہیں۔ جب پانی رہتا ہوتا اور میرے ساتھ می میرے ساتھ کھیلنے کو نہ آسکتے تو اس وقت میں تھو سے نکلتا۔ میں تجھے گیند چھوڑتا کہ گیند روکتی۔ میں تیری طرف بھینکتا۔ اور تو میری طرف بھینکتی ہائے غمی اپنے نہ بھاتا تھا کہ تو اس قدر جلد گزرجائے گی اور اگر تو گزرتی گئی تھی تو اسے کاش یہ دیکھارہ کی ہی رہتی۔ تاکہ لڑکپن بھرتو آتا اور اس طرح پاؤں پاؤں پٹنے کے لیے اس کے سہارے کی ضرورت نہ ہوتی لیکن بڑا ہوا تو آتا اور اس سے علی گانے کی حاجت ہوتی۔ اسے "میری قدیم رشتہ" میں دیکھتا ہوں کہ تو اب بہت ہی چند دنوں کی مہمان ہے۔ تم سے تو وہ حال ہو گیا اور ماہ سے صدے کے مٹھی چاہتی ہے۔

چوہا ایک حلق تھا کہ یہاں آگئے۔ نہیں معلوم کہ پھر آنا غیب ہو یا نہ ہو۔ میری قدیم راج اور میں نے تو اب بہت آجیں میری اور ال لٹکھن ہو گیا۔ اسے کوئی نہیں چاہتا ہے۔ لے تیرا خدا خدا تھا!

جب میں چپ ہو گیا تو کہا بہت مہربان کہ آواز میں دیکھ لے اپنی زبان بے زبان میں یہ کہا کہ

”جیٹا! میری عمر تو اب پچھری ہو چکی۔ شاخ چھیں، دیکھا اب بحر نصیب نہ ہو۔ میری ایک وصیت ہے اسے یاد رکھتا۔ یہ کھلم کو کھاتا دے گی۔“

”جیٹا! ہم کو جب اس جگہ تک گزرا نہ پانا اور اس کے غرض میں میرا میرا ہوتا تو نادانوں کی طرح سے ہم پر ہوا کر رہ چکا۔ اگرچہ شئی تو نہ رہوں گی لیکن میرے کو چھوڑے جاتی ہوں۔ اس سے بے رخی نہ کرنا۔ اس سے آکر ملنا اور اس کی باتوں کو توجہ سے سنانا۔ جیٹا! میرے کی صحبت بڑی پاک صحبت ہے۔ خدا کے نیک بندوں کو ہمیشہ اس کے ساتھ دیکھو گے۔ جیٹا، بڑا عاقل کی وجہ سے اب ہم سے لڑاؤ ہو لائیں، جانتا۔ بس میری نصیحت یاد رکھنا اور میرے کا ساتھ نہ چھوڑنا کہ یہ سب سے بڑی نصیحت ہے۔ ہا میرا اللہ تمہاراں!



حوالہ:

۱۔ علی محمد، کاپا انسان، ”علی محمد، دہلی“ کے ہم سے شائع ہوا تھا۔

بد نصیب کا لالہ

راشد الخیری^۱

راشد الخیری کا دوسرا مطلوبہ افسانہ ”مخزن“ ۱۳ اگست ۱۹۵۵ء

مصیبت کا زمانہ پریشانی کے دن رات کا وقت، ہر سات کا موسم، منطقی ہے کسی بے بسی۔ ماں باپ، بھائی، بندو، بیو، بیٹو، ساس، سالا، کچھ مر کر چھوٹے، کچھ جیتے، کچھ جیتے ہی چھوٹے۔ وہ دن کی بیاری چوٹی تکیل سسرال آئی۔ باورچی سوار ہوئی اور ماں کو بخار چڑھا۔ ہر چند لالہ کچھ ایسی گھڑی کا چڑھا کر جان ہی لے کر نکلا، دن بھر لالہ چڑھی رہی تھا کہ سراسر سات کو کسرات کھا جاتے ہوئے رخصت۔

چوٹی کی دو ٹونگم سم سسرال سے پہلی اور دوتی چٹائی جیتے آئی۔ کچھ کو بھول ہوئے۔ گھر میں مہمان بھرے تھے، باہر لالہ جان کا شکار ہو رہا تھا۔ قصہ مختصر ماں پس گئیں ابا بیاں گئے۔ اور کوئی اول تو تھائی نہیں اور چھٹی بھی تو ایک۔ رشتے کی تانی۔ وہ آپ۔ جڑائی کے ٹکڑوں پر چھیں۔ ساتھ جینٹل برس کی بڑھیا، بھوس بھری جھنڈ، دھڑ میں دانت نہ پہنچے ہیں آنت۔ بات کی نہ جیت کی۔ کام کی نہ کاج کی۔ ہوتا نہ ہونا دونوں یکساں۔

بھائی، جس کے دم سے نکلا ہے، بد نصیب و لیکن کا کوئی نہ تھا۔ بخش کہنے کو تو ماشا اللہ ایک چھوڑا دو ٹکڑا ہوا ہے اپنے گھر پار کی ایک خوشحال، وہ پردہ بین، دوسری شہر میں، وہ نکال۔ اور نکال بھی نہیں کہ کاج تک کھلا جے۔ فرض، چیکے میں تو کوئی نام لوانا نہ پائی دیا۔ لے۔ کر ایک باپ کا دم بھلو دھو کہیں چٹائی کی مرئی آج ہی مر جائے۔ رہیں سو تیلی اماں، وہ ایک دھندلا کچی دھندلا اور دھندلا میں نہیں گئے والوں تک کے آگے اور چڑھی چھیں ہانگے پکارے اور کھیلنے لگے کبھی تھی؟ ”زندہ کو روٹی نہیں، اللہ کہ مرے کو کھن بھی بھرتا ہو۔“

ساس جب تک زندہ رہیں ہوئے کے دھڑوں کے پیچھے آگئیں بھائی رہیں۔ امیری نہیں طریق اور طریق نہیں کہ فقیری چھ سانس سے چھ روپیہ کی آمدنی خرچ ہو کر اکل چڑھا اور کھج کا ناشو مرتے دم تک نافذ نہ کیا۔ وہ تھکی ہوئی تھوڑی کھیر کو یہ دن نہ دیکھتا چڑھا۔ جیتے بھر نہ ہوتی، آدھا جیتے۔ سانس نہ کھا روٹی۔ روٹی نہ ہوتی سوکھی۔ وہ وقت نہیں، ایک وقت۔ تازی نہیں، ہادی۔ گھر کی نہیں، بازار کی۔ بازار کی نہیں محل کی، فرض پوری آدھی، ادنیٰ پانی، ابھی بری نظم قائم کسی نہ کسی طرح جیتے میں چڑ جاتی۔ یہ نہ ہوتا کہ صاف تین وقت کا کڑا کا گڑ رہا اور چھ وقت بھی

میں کامرہا ہوں کے سر پر دہی بھری تھیلیوں کا دھڑا تھا۔ بیکارگی ہوا پہلی نور الدینا نصیب ہو گیا کہ چم دوں طرف سے مصیبت کا پہلا ٹوٹ چلا۔ بڑے کے اندر ہی اندر مگر بھری صفائی ہو گئی۔ میراں جی میں، ساس، دادرش۔ دو فونٹریں۔ دو چپ میں دو رخس تین مہینے میں چار جنازے ایک گھر سے نکل گئے۔ ساری کائنات، دو باپ بیٹے باقی رہے۔ شب رات کا چاند میراں کو اس آج کا ایسا جان بھی اٹل ہے۔ توں نوں، ایک میراں ہی میراں رہ گئے۔ پانچ دو چپ باپ کی فٹن کے تھے، دو بند ہوئے۔ ایک دو چپ ہاں کے دم تک تھا، دو مگی ختم ہوا۔ آٹھ آٹھ چاہے کھاؤ چاہو بیچو۔ پادازو جو چاہو بچھاؤ۔ بکودان یوں مگی گز رہے مگر کہاں تک اور کب تک کچھ نہ ہو تو وہاں بیوی میں میراں آ کا روز تو ہو۔ مگر ہو کہاں سے؟ یہی صفتور، میراں مجبور۔ اس پر طرہ یہ کہ ادھر آ پاؤ چھٹا دھڑا یا رمضان۔ دونوں کے چنگے چھوٹ گئے۔ نہ چھٹا نہ کدو ایک، پہاڑ تھا۔ دلوں میں غم زلزلہ رہے ہوئے تھے۔ میراں بیوی کو کچھ کچھ کر پھینٹتے تھے۔ یہی میراں کو کچھ کچھ کر پھینکتی تھیں۔ اٹھ بیسواں روز، ہو گا، چار بجے کے قریب یہی کو بچہ چڑھا۔ میراں سے کہنے لگی

”ایک روز دادر، دگیا ہے اللہ پہ مگی پر کمرہ ہوئے۔“

میراں ”ایک ہو دادر، میں تو جیسا پریشان اب کے رمضان بھر، یا میراں دل چاہتا ہے۔ اماں ہاں کے ساتنے میرے تیسوں روزے ہوتے تھے۔ اب کے ایک پہلا اور ایک ٹھیکاکل دو ہوئے“ کیا کھا کے رکوں اور کیا کچھ کے کھلوں۔“

یہی ”مجھ سے پہلے رکھتے ہو تو خیر میں اگلے برس تو تم نے ایک مگی نہیں رکھا تم کیا اللہ بخلتے خدا یا جان ہی گنڈے دار رکھتے تھے۔ مگر بھر میں ایک اماں ہاں اللہ روزے کی پانچ تھیں باقی تو سب چھوٹے اور جو سونے داڑے دھڑلے سے کھاتے تھے۔“

میراں ”تم انکی بیوہ باتیں کیں کرتی ہو پندرہ دن کی چالیس چالیس کی دکن تم کو کیا معلوم کس کو روزہ ہے کس کو نہیں آیا جو دل میں آیا کہہ پا جو میں آ جا کہہ دیا۔ زو میں آ نہیں تو چھوٹے ہوئے۔ سونے داڑے سب کو کھاڑ پھینکا۔“

یہی ”سمان اللہ اور انکی مگی اندھی تو نہ تھی اس پر گھر گھٹت تھا یا کانوں میں ٹھیکوں۔ دو ٹھیکتی نہ تھی مٹی تو تھی۔ پکنا تھا اور میں ہانسی نہ تھی کھاتے تھے اور مجھے خبر نہ تھی تھی۔“

میراں ”بب کیا میں تو اب مگی اور صفحہ الہامی ہی نہیں اس کے ساتھ بد تمیز، بے ذلتی ہوڑ، بد سلیقہ بلکہ اس سے بھی بدتر سمجھتا ہوں۔ انکی ٹیکہ قدم آ نہیں کسب ختم ہو گئے۔“

یہی ”میں ٹھیک تھی کہ مگر بھڑکوں میں نہ، ساتھ برس کے بڑے برس میں کھا گئی، تم تو یہ گواہ تھے کہ میری جوان اماں کو گوش جان نہ کر سکے۔ تھوڑے پہاڑی تھی چھوٹ گئی۔ بہت بھرنے کو گھراؤں دن ڈھا گئے کو تو خواہنا توں تک کی تو نہ آتھی اور کیا ہو گیا۔“

میراں ”ہم نے تو چھ ماہ سے ہی کے وقت کہہ پا تھا کہ روکھی بلکہ سوکھی روٹی ہے اماں کی قبر پر جا کر جوتیاں، دوا اللہ مگی تھوڑی تھیں۔ کیا دیکھ کر کیا تھا؟ حاجی بھوسہ رہے تھے؟“

یہی ”کیوں مرے وہاں کامرہ پھینکے ہو؟ خیر اس تو میں میں سے کیا حاصل میں تو انچ حکام ہانسی ہوں، ہاتھ پکڑ کر نال باہر کر رہے۔ تم کو سلام تمہارے مگر کوسلام، میں ایسے گھر سے، باز آئی۔ اشراف ہوں کی تو پھر نام زلوں گی۔“

میراں ”اشراف کیا ہوئی ایک آفت ہو گئی، میری طرف سے تم ابھی، ہم اللہ کرو، تم نام زلوں کی تو میراں مگی کوئی پیغام نہ جانے گا میں اب

نکھیل تھے، چار باغ تھانے تھیں۔ اندر چھرا گھپ اور اس آفت کا سامنا۔ بد قسمتی سے دروازہ میں کواڑ بھی ایک تھا۔ ہوا کا بھجڑ کواڑ کی دھڑ دھڑ۔ دم پر پئی ہوئی تھی۔ ڈراما کھلا ہوا اور جان نکلی۔ حالی شان گل، جڑی بڑی حویلیاں، پکی پکی گل سرائیں۔ کوئی گرہ تھا، کوئی جھک، ہاتھ کوئی بندھ ہاتھ۔ عیدہ مظلوم کا مکان تو کس گنتی میں تھا۔ لمبی کوفٹری، چھوڑا در، حمام والی دیوار شام ہی کو چٹ پٹکے تھے۔ پانچا تھا اور پانچانے کے ساتھ ہی باورچی خانہ چپا آئے۔

ہینک بھڑکی گئی، ہوئی تھی اور عیدہ کھڑی اندر اندر کر دی تھی۔ آسمان پر نگاہ اور پچھ میں جان دودھانے سے چرمیان اور درے کی طرف کان۔ ایک آفت ہو چکی جائے، ہر طرف مصیبت ہی مصیبت تھی۔ عیدہ، اکیلے کا اللہ ہی بلی تھا۔ چھت کبھی تھی اب گری۔ درد کبھا تھا اب بیٹا۔ پچاسی راست ایک کواڑ کا گھر جان کا خوف، چور چکا دکا ڈر، جی بھوت کا لٹ پٹ، دل ہوا اور ہاتھ۔ مٹی تو درہ پھری سے بھڑکی تھی اب سڈ پر کی افشیں بھی شروع ہو گئیں۔ اینٹوں کا گڑنا تھا کہ عیدہ بالکل ہی ہے آس ہو گئی۔ بد حال اس ہو کر پچھ تو گود میں اٹھایا اور انگنائی میں آن کر کھڑی ہوئی۔ بچہ کا خدا تھا کہ اس اللہ کے بندے نے بچا شروع کیا۔ پیچھا ہی پہلا پانچو پ کس باپ کا بچہ تھا۔ جو جو چکا دئی تھی اور دکھا ہوتا تھا۔ چھپا اور دھپا۔ بہکا پانچسٹا پانچلی، بچیسے لگا یا۔ سب ہی چکا کیا گھر اس کی جگہ دھکا ڈھکی۔ ہانے پانچا اس بدس بھڑکی جان پر اپنی جان جان قربان تھی۔ اس پھول کے رونے میں سب بھول گئی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوتے اور عیدہ صبح اور عیدہ عیدہ ہوئی نیچے نے بھی دم لیا تو دھاپا جان میں جان آئی۔ ایک کوئی ہوئی کھوئی اندر سے لائی پائی ہوئی رڈائی اس پر بچھائی اور نیچے کو بچیسے لگا کر انگنائی میں لیٹ دی۔ بچہ بچاں ہو کر بوج اور چلی لوری، اور، کاتھوا، درد حد میں لیٹے ہی گئے میں ہاتھ ڈال کر سو رہا۔ اللہ اللہ بچہ کا بچیسے سے لگ کر سوتا تھا کہ وہ راست بھڑکی مصیبت پر بیٹائی کہ کوئی یاد نہ دی۔ میاں کی بے اعتنائی، باپ کی لاپرواہی، مانی عہدی سب بھول گئی۔ پانچا کے جوش میں دروازہ سے بیچنی تھی اور کبھی تھی۔

”میں کیا کسی کی ہوا کرتی ہوں۔ اللہ میرے بچے کی عمر میں برکت دے۔ میرا میاں تو یہ ہے۔“

زندگی کی تمام خوشیاں اور جوانی کی بہاریں اس شخص کی جان پر نثار تھیں۔ اس ہی دم کے ساتھ عمر کی تمام آرزوئیں اور ارمان گئے ہوئے تھے۔ لیٹ رہی تھی اور پٹار رہی تھی۔ چپ رہی تھی اور چپ رہی تھی۔ عیدہ مظلوم اسی طرح قربان ہو رہی تھی کہ برادر کی مسجد سے آواز آئی۔ اٹھی اور دوشرب کا پانی ان کے پیچھے کے پاس لگا کر دکھا۔ وضو کیا اور نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔



حوالہ:

۱۔ دانشگر، محی الدین، ”عمر و اندازہ“ کے علمی نام سے شائع ہوا تھا۔

غربت و وطن

سجاد حیدر یلدرم^(۱)

یلدرم کا پہلا افسانہ ”معلیٰ“ اردوئے معلیٰ“ علی گڑھ: اکتوبر 1908ء

رشید گھٹے کی میز پر دو ہانا ہاتھس پر رکھے ہوئے خیال میں مستغرق بیٹھا ہے۔ یس کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی ہے اور قادری ہے کہ کوشش میں (اس شخص میں جہاں رشید غربت کے دن، افس و اضطراب کی کچھ عجیب آمیزش کے ساتھ کاٹ رہا ہے) اس وقت خاموشی چھائی ہوئی ہے، لیکن اس کے دل میں خیالات کا طوفان موجزن ہے۔

چھاد طرف سناٹا ہے اور تاریکی، صرف کمرے میں گھڑی کھٹ کھٹ کھٹ کر رہی ہے۔ گلی کا کن ہونکا ہے۔ قریب کے کمرے میں نوکر دن کا کام ختم کر کے گھری خند (حیات سامانہ کا انعام) سو رہا ہے، اور اس کی خوشبو کی آواز یہاں تک آ رہی ہے۔ رشید اپنے خیالات سے عاجز آ کر آنسو کھڑا ہوا ہے، اور بہت مضطرب حالت میں کمرے میں بیٹھنے لگتا ہے اور باتیں کرنے لگتا ہے۔

”غربت اچھی کہنی دینا، نیا آسمان، نئے مناظر پیش نظر ہوتے ہیں۔

نہیں، وطن اچھا کہ پرانے دوست، پرانے رفیق۔

جانی پہچانی آوازیں، پہانی پہچانی صورتیں، سنائی دیتی ہیں، دکھائی دیتی ہیں۔

نہیں، غربت اچھی، جس میں ہر گرج نیا، ہر بات نئی جود آؤںی ملتے ہیں، گویا دورِ باہیں کہ پہلے جہاں ہوا ہے تھے، اب علم ہوا۔

نہیں، وطن اچھا، جہاں پرانے دوست گویا دوپہر دے ہیں، کہ ایک دوسرے سے ملنے ہوئے اُگے لہر جو تھے۔

نہیں، غربت اچھی، جہاں دوست فدا و دشمن اور آشنا و غریب اور آشنا صورت اختیار تو نہیں ہوتے، جن کی دہمات کرنی پڑے، جہاں غریب صاف کہہ سکتا ہے کہ میں غریب ہوں اور دوست، آؤ اور دوست نہیں، تو شناسا میں کہہ دیتا ہے۔

نہیں، وطن اچھا، جہاں دعاؤں کی نہیں ملتے، جن سے دل میں دس محبت پیدا ہو، مذاہم گزشتہ۔

نہیں، نہیں، بے یار و غربت اچھی، وطن اچھا، اور باہر یہاں خوش نصیبوں سے چوٹیں جڑ رہے ہیں۔“

رشید ایک آرام کرتی گر چہ ۲۲ ہے اور پھر خاموش خیالات میں گم ہو جاتا ہے، پھر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کائنات کے نگوں پر غزل سے
کہہ نکلتا جاتا ہے۔

یہ ایک نوازانی، مہذب، لہلہا، چمکیں، خفا کے لئے کوئے میں دیکھے سنے بار موسیٰ میں جا کر بھاتا ہے۔

غزل

چلے ہیں ہونٹ مرے تار و فہر کیلئے
کوئی زمانہ کا شکی، کوئی ظلم کا ہے
ہاک کر کے رہے گا، مجھے تکلیف درست
ہو اصرار و صبر کے سب مجھ پر مشتاق اے انیاب
ہوئے مجھ کو عین اعداء کبھی دریا کو بند
کرک چمک تو نہ اے برق اس سے کیا حاصل
مرا جو حصہ ہے وہ مجھ کو اسے مصیبت دے
بہن میں ہاتھ بھور کی نہیں فریاد

ہوا دے بار دہن بہت میں جانوں اے طریقت
دہن کا عشق ہے اک رنگ بھری جاں کیلئے

مثال کے سواں کی کڑی کھنٹی ہے، اور رشید کا چہرہ اس شہر کی زبان میں کہتا ہے

”مسٹر رشید! شاید آج آپ کے دہن سے کوئی بڑی خوشخبری آئی ہے۔ اگرچہ مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہے، لیکن میں آپ کو مبارکباد
دیتا ہوں، اور (کہہ دیتا ہوں) قسم سے (اگر آج رات کو خوشخبری نہ سنائی جائے)۔“



حوالہ:

۱۔ ہادیہ، حیدر آباد کا پانچواں نمبر کے قلم نویس کی یادگار ہے۔ لہذا ہم نے قلمی نام سے شائع کیا۔

دوست کا خط

سجاد حیدر یلدرم

سجاد حیدر یلدرم کا ایک اور ابتدائی افسانہ مطبوعہ "نثرین" لاہور، اکتوبر 1906ء

خوبصورت دوست کا پیارا خط ہے۔ تمہیں وہ کون سی برائی شے لکھی ہے R میرے دل کو دھڑکاتی ہے۔ تجھے کھوٹے وقت ہاتھ کیوں کاہنہ لگتے ہیں؟ اگر تمہیں اور کاغذوں سے کیا برتری ہے؟ ڈھنگی کاغذ کا ٹکڑا اور ڈھنگی کاغذ کے ٹکڑے، بلکہ وہ تمہ سے زیادہ بڑے ہیں۔ ہاں باعثِ خیر و خوں کی یہی ہے تاکہ دوست نے تجھے لکھا اب ہاں خوردہ سے آف، اب ہاں خوردہ سے لگاؤ بند کیا؟ بے شک، بے شک یہ بہت بڑا کٹوف ہے۔ اچھا میں حیرتِ امتحان لیتا ہوں، تجھے بے پروا ہوں، سو میں دیکھوں تجھے کتنے نمبر ملتے ہیں۔

40

ان کے ہاتھوں سے مجھے ملے جانے کے

50

اس بات کے کہ دوست کاغذ میں سے تجھے ہی منتخب کیا

70

ان لمبوں سے لگاؤ کو بند کیا

180

ہیں اتنے سو سے زیادہ نمبر پائے۔ نہیں یہ امتحان نہیں ہوا۔ دوسرے طریقے سے شمار ہونا چاہیے۔

60

اس بات کے کہ تجھے میرے لیے انتخاب کیا اور لکھی دوسرے کے لیے نہیں منتخب کیا

40

اس بات کے کہ ان کے قلم کی قلمبر تمہ پر ہے

500

اس بات کے کہ ان کے چہرے کا عکس تمہ پر چڑا کیوں کہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ راستہ کو لکھا ہے

600

کیا؟ ہمارے زیادہ ہو گئے۔ یہ غلط نہیں،

اچھا شہر کی بارگاہِ امتحان

اس بات کے کہ قانون کے مقررہ صحت و طبی مشورے حرج کی خبر لا رہے۔

اس بات کے کہ جیسے پاک کر دیے جانے کا حکم ہے

2014-2015

فہم۔ نہیں! میں یہ فائدہ کو تلاش نہیں کرتے گا۔ ٹو اسٹارٹن سے ہزار ہزاروں سے اعلیٰ باقیہ مقابلہ و مذاکرہ سے آزاد رہا۔ یہ سب سب کا جیسا جیسا، جانے میں کیسے ظاہر کروں، لکھتا ہوں یا غلط ہے! اٹھ سو سب سے لگا جانے کا تو فکرمزاجیہ سے پہچان جانے کا مگر حاشا تو چاہک نہیں کیا جاتے گا۔ ٹو میرے چاک محفوظ ہے! گاؤں میں ہزاروں مرتبہ تجھے تری گوشوں میں چھوٹوں گا۔



210

١٠ "قانون التعمير، ١٩٥٨، ص ١٠٤، في نسخة من "مجلد القوانين" رقم ١٠٠٠.

نابینا بیوی

سلطان حیدر جوش

سلطان حیدر جوش کا پہلا مطلوبہ افسانہ ”مطلوبہ“ ”نوائے دہلی“ دسمبر 1907ء

میرے گھر کے برابر دروازے پر ایک قاضی صاحب کا مکان تھا۔ چار سال پہلے ایک زمانے میں بڑے حصولِ آدمی تھے مگر ریاست کی زندگی خصوصاً ملازمہ صاحبہ کی تصویر ہوا کرتی ہے۔ ڈار اور صاحب کے کان بھرے اور بے قصور پر آفت برپا ہو گئی۔ اسی طرح ان شریف قاضی صاحب کے حصول نے افسانے کا پہلو بدل دیا اور فقط یہاں ساٹھ سو پچاس سالہ کی قلمی قلم پر خوار وقت بچا کر دے گئی۔ اسی پر میرے شکر کے ساتھ قاضی تھے اور اپنے پورا اپنی بیوی کا پیٹ پالتے تھے۔ عربی اور فارسی کی قابلیت سے دور دور تک ان کا شعر و قصہ اور دہلی سے اکثر اشیاء مشکل سے مشکل مسئلے حل کر لے آتے تھے۔

قاضی صاحب کی صاحب زادی کی شادی کی تقریب جب ہوئی تو نکاح میں مجھے بھی مدعو کیا گیا مگر چند روز پہلے ہی میری طبیعت کی وجہ سے میں شامل نہ ہو سکا۔ مگر میرے قاضی صاحب کی خبر پر اہل گھر میں معلوم ہوا کہ وہ لکھا کو پیسے سے اس لڑکی کی نسبت جس سے اب اس کی قسمت وابستہ ہونے والی تھی، کچھ بھی معلوم نہ تھا، اور میں نکاح کے وقت نہ معلوم کس بات کے علم پر اس نئی روشنی کے شہدائے شادی سے قطعاً انکار کر دیا۔ طرفین کی بڑی بدنامی ہوئی۔ اور آخر کار ریاست واپس آ گئی۔ اس کے بعد خود وہ لکھا سے میری راہ و رسم ہو گئی اور اس کی وجہ اس نے غریب لڑکی کی بدنامی بیان کی۔ یہ سن کر میرے خیالات بھی قاضی صاحب کی طرف سے ٹراپ ہوئے۔ لکھا اور میں نے ان سے ملنا چاہا مگر کدوا۔ راستہ میں بھی ان سے کچھ انکار لگا، چنانچہ وہ اور اصل مجھ سے محبت کرتے اور میرے والد بزرگوار کے بڑے سچ دوست تھے۔

اسی طرح چھ مہینے گزر گئے، اب گرمی کا موسم آ پہنچا۔ میری والدہ ضعیف تو تھیں میں سوچا کرتی تھیں۔ مگر میں انکیا صحت پر لینا کرتا تھا۔ ایک دفعہ مجھے خوب یاد ہے۔ جبکہ ان تھا۔ چلیا لائی گئی تھی۔ پھر بھر دن سے ہوا اندھی دلوں وقت تلے ہی مارا مار کر کے میں نے کھانا کھا دیا اور سیدھا کوٹھے پر جا چلا۔ چاروں طرف اسی چاندنی پھانگی ہوئی تھی اور جہاں اکا کا کھڑا تے تھے۔ دو تین گھنٹوں ہی کر میں بدلتے اور اچھ پازں بدلتے گئے۔ خدا خدا کر کے ۱۶ بجے ہوا دوسرا سرائی دور کچھ جاں میں جاں آئی۔ خیر کدو لگی میں پانچ بجے پر معلوم ہوا کہ کوئی میرے

مرہبانے ہل رہا ہے۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں چھاڑ چھاڑ کر پاروں طرف دیکھا۔ مگر آدھی تو آدمی پر چھا نہیں تک دیکھتی نہ دی۔ اسنے میں ہوا کے جھونکے کے ساتھ ایک درد بھری آواز کا قاضی صاحب کی چھت پر سے آئی۔ ”خدا جانے کیوں گرجا بنا دی ہوئی ہے۔ مگر خیر رب العالمین خوب جانتا ہے، مجھے کسی سے غرض ہی کیا، پاک پروردگار! میں نہیں چاہتی کہ میری شادی ہو۔ مجھ کو یہی ارادہ ہی تو کون قبول کرے گا؟ مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ میں چمک ہوں اور باصفت ہوں۔ آپ سے میں یہ پوچھتی ہوں کہ میری دنیا ہی نہ ہو اور برا کہنے والوں کا ساتھ نہ کر دے۔ ان درد بھرے سطحوں کے بعد ہر کوئی آواز قطعاً نہ آئی۔ یہ الفاظ میرے جوت کھائے ہوئے دل کے ساتھ جھک کا کام کر رہے تھے اور میری ساری رات آنکھوں میں کی۔ صبح ہوتے ہی میں جناب والد صاحب کی اجازت پر ایک دوست کے ذریعے سے پیغام بھیجا اور قاضی صاحب کی غلامی میں اپنے آپ کو چھاپا ہر گھر میں ہے اور پاک ہزار انسان نے اس کے جواب میں آدھ دینے اور کہا کہ ”ان سے کہہ دینا، ابھی صاحب زادہ ہو۔ ناخبر ہوا کہ ہو۔ کیوں اپنی زندگی بچا کرتے ہو۔ وہ بد نصیب لڑکی اگلی ہے۔ میں تمہارے والد کا نیا زادہ ہوں۔ قیامت کے دن انہیں کیا عذاب دیکھاؤں گا؟“

بھٹکل قلم میں نے قاضی صاحب کو کئی دنوں میں مجبور کر لیا اور اس مصیبت زدہ ناچنا لڑکی سے چپ چھپاتے شادی کر لی۔ اب وہ میرے گھر میں آئی اور میری بیوی بن کر رہنے لگی۔ اس کی فصاحت کی نسبت میں جانتا تھا کہ سکا ہوں کہ وہ بھرپور تھکتی، سچائی، بھرپوری محبت اور پاکہیزی کی مجسم تصویر تھی۔ اکثر اوقات کچھلی رات کبھی میری آنکھ کھل جاتی۔ تو میں ایک عجیب سا مؤثر نگاہ دیکھتا وہ چمک پر لپٹے لپٹے نہایت براہی کے ساتھ دھماکا مٹھول ہوتی اور بڑا ہزار طرح سے پہرہ میں میری حرکتی، آراستہ اور سائش کے لیے دعائیں مانگتی تھی (امکان میں اس کی خوشی کا خیال از حد نہ کرتا۔ جب تک میری والدہ ضعیف نہ تھیں۔ میری ناچنا بیوی کو میرے حاضر و غائب میں کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچی۔ مگر انہوں نے بھی ایک دن اس امر کا فیصلہ کر لیا کہ وہ ان کے صدمے سے میری بہت پرست کر دی۔ اب گھر میں صرف ایک خادمہ تھی اور راج ڈھکی پر ایک نوکر، والدہ صاحبہ کی آنکھیں بند ہوئے ہی خادمہ نے سے تکلیف پہنچانی شروع کی۔ مگر میں سچ عرض کرتا ہوں، کبھی بھول کر بھی اس نے نکاح کی تکلیف دھوئے جس کی ماورائے قضا کی بات کی اطلاع نہیں ہوئی۔

ایک روز اتفاقاً مخالف معمول، دوپہر کو گھر میں واپس آیا۔ جبکہ میری بیوی کھانا کھا رہی تھی، اور خادمہ دستر خوان کے پاس بیٹھی تھی۔ سالن والے دو بچے کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس ملا کو برا بھلا کہنے لگے کہ کچھ پر سے خرچ پر بھی کھانا بہت خراب تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے اچھا کھاتی تھی اور میری خوب ناچنا بیوی کے سامنے دھکی دھکی رہتا تھا اور اچھا کھاتا تھا، اور باقی سب اچھا اچھا چیز کر جاتی تھی۔ اسی دن سے میں صبح کو جب تک میری قاضی رحم بیوی ضرور بات اور نگرہ سے فارغ نہ ہو جاتی تھی، ماہر نہ جاتا، اور دوپہر سے پہلے واپس آ کر کھانا ہی کے ساتھ کھاتا۔ ہر شام سے ہی گھر میں آچڑھا اور تمام رات کھین نہ لگتا۔ اس کی بچی محبت اور راست بازی نے اس قدر میرے دل میں گہر کر لیا تھا کہ کلہا، کہ نہ ہونے پر میں خود کام کرتا، اس کے لیے وضو وغیرہ کے لیے پانی لانے میں مجھے عار نہ تھا۔ اس طرح گھر میں مجھے رہنے کی وجہ دوست و احباب مجھ پر بھروسے کئے تھے اور میرے ہم عمر میرے لڑائی اڑانے لگے۔ مگر میں نے یہ دان کی اور میرے معمول میں ذرا برا بھی فرق نہ آیا۔

اسی اثنا میں اس کی رہنمائی کے لئے جو ان کی شمس نے میری ناچنا بیوی پہنچا، اسلام کا اچھا بیوی وضو و حمام سے شادی ایک فتول لڑکی سے ہو گئی۔ مشکل سے ایک برس گزارا ہوا کہ شکر رکھی ہوئی اور بڑھتے بڑھتے خانہ بنگلے کی خوب آئی۔ تمام شہر میں افواہ پھیل گئی کہ ان کی بیوی

آدم ہے۔ انہوں نے اس کو قتل دیا۔ اس نے کچے کھینچے ہی ہاں غلط اور میر کی ناقص شوکت دی، اور لڑائی روکنے کے تو جوان کو پھیل کا کھانا بولا اور آگیا۔ غرض خوب مرضی پر پہنچا رہا۔ ان پر بھی کی ڈگری ہو گئی۔ اب انہوں نے خاندان کے بزرگوں کے سامنے منہ بہ منہ کی اور صلح ہو گئی۔ ان کی بیوی گھر میں آ گئی۔ مگر تھوڑے عرصے کے بعد پھر وہی عکاسی شروع ہو گئی۔ بہر حال ڈگری کے خوف سے وہ غصہ دیتے اور بھی کی جوتیاں کھاتے رہے۔

اس واقعہ پر ان کے قانون کے موافق تھوڑا عیب پر ایک خود مصیبت آئی۔ میری تابعدار بیوی کو بکلا آئے لگا میں نے ڈاکٹر، حکیم، ملا، سائنس دان، اور اعلیٰ درجے کے گھڑاٹھ، لیکن ان مرض کی وجہ سے بکلا میں کی نہ ہوئی تھی نہ ہوئی۔ میں نے بائبل، جرنل، آگاہانہ چھوڑ دیا۔ دور بار چھوڑ دیا۔ یاد دی۔ میں نے ہر قسم کی خدمت کی۔ یہاں تک کہ جو کہ بے لے ہاتا۔ دوائی پلا اور غیرہ میرا دوا نہ معمول تھا۔ کل بار میرے اکالہ ان اٹھاتے ہی اپنا کی آئی، اور جوئی میں نے اکالہ ان سامنے کیا۔ اس نے اٹھا شروع کیا جس سے میرے ہاتھ بھی اٹھ گئے۔ اگرچہ میں شہر میں نازک حراج مشہور ہوں۔ لیکن بھلا کبھی مجھے کسی کراہت نہیں آئی کہ محبت پر غالب آئی۔

ایک دن اس نے موافق بارہ کھینچے آگے نہ کھڑی اور مجھے اٹھا تھوڑی ہوئی۔ رات کے ٹکر چاٹو بچے تک اس کا سر میرے زانو پر تھا۔ اسے ہوش آیا۔ اس نے چھوئے ہی کہا۔ تم اس قدر کیوں تکلیف اٹھاتے اور مجھے شرمندہ کئے جاتے ہو؟ میں اس شرمندگی سے مرہاں تو اچھا ہے۔ تمہیں مانا پر اعتبار نہ ہو۔ تو اپنی شادی کسی سے کرو۔ وہ گھر کا انتظام خود کرے گی، اور تمہیں اس قدر دوسری نہیں کرنی پڑے گی۔ یہ نہ سمجھنا کہ مجھے سو کن کا خیال ہوگا۔ تمہارا بیوی ایک انسان کو تم نے میرا سرتاج بنا منظور کیا، ایسا ہے جس کا میں کسی طرح بدلہ نہیں دے سکتی۔ تم نے میرے ساتھ شادی کر کے واقعی اپنے اوپر بڑا ظلم کیا۔“

کچھ نہ بچنے کو ان الفاظ نے میرے ساتھ کیا کہ۔ میرے خون میں پکڑ آیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے کچھ تھام لیا۔ حالت دوا بردار رہا ہوئی گئی۔ قاضی صاحب دیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اس لیے اس نے اپنی والدہ کو بلا دیا اور دوسرے الفاظ کے ساتھ ہر معاملہ کر دیا اور میں دوتے دوتے بے ہوش ہو گیا۔ اسی دن سے بھنگی مل گئی۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے۔ ”اگر تم کو تکلیف ہوئی تو میری روح کو صدمہ ہوگا۔“



حوالہ:

۱۔ ”سفر“ 1907ء، میر کی ہمارے اہل سے تاریخ میرا کردار۔

عشق دنیا اور رُح وطن

پریم چند¹

پریم چند کا پہلا مصلوہ افسانہ ”مطلوہ“ ”دہلی“ کا چند ماہ قبل 1908ء

شہر لندن کے ایک پرانے خستہ مال ہوٹل میں، جہاں سرشام سے اندھیرا ہو جاتا ہے۔ جس خطہ میں فیشن اسل لوگ آتے ہیں، وہاں جہاں قمار بازی، شراب، خوراک اور بدکاری کے نہایت مہر کا کھارے ہر دم پیش نظر رہتے ہیں۔ اس ہوٹل میں، اس بدکاریوں کے اکھاڑے میں اعلیٰ کا سودا بہت ملن پہنچتی خاموش بیٹھ ہوا ہے۔ اس کا وجہ چہرہ زرد ہے۔ آنکھوں سے ٹکڑیوں رہی ہے۔ ہونٹ خشک ہیں اور شاہی بیٹوں سے چامت در دست نہیں ہوتی کپڑے بیلے کچلے ہیں۔ کوئی شخص جو پہنچتی سے پہلے وقت نہ ہوا سے دیکھ کر یہ خیال کرنے سے نہیں رک سکتا کہ یہ بھی انھیں ہر دم ہاتھتھ مصلوہ میں ہے، جو اپنے لٹس کے ظلام ہو کر مکمل ترین حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں۔

پہنچتی اپنے خیالات میں غرق ہے۔ آدھا بد نصیب قوم اسے مظلوم آئی کیا میری قسمیں بھی نہ سوسہریں گی۔ کیا میرے بھگوانوں سے تو اس کا وطن ادا بھی رنگ لائے گا۔ کیا میرے ہزار ہا جلا وطن دیس سے نکالے ہوئے جاں نثاروں کی آہوں میں ڈاما بھی تاجر نہیں لکھا تو ظلم و جبر، خدایا اور ظالمیت گزاری کے داس میں ہمیشہ گر جا رہے ہیں۔ حالانکہ تھ میں ابھی سوسہریں کی طور پر اپنے کی صلاحیت نہیں آئی۔ شاہی میری قسمت میں کچھ بظاہر اور ذات و طواری پہنچتی لگتی ہے۔ آزادی اپنے آزادی ا میرے لیے جس نے کیے کیے دوسہ جہان سے چارے دوسہ قربان کئے۔ کیسے کیسے نو جوان۔ ہونہار جن کی باتیں اور ہواں آج اس کی قبر پر آسہرہ رہی ہیں اور اپنے آلام و مصیبت سے بیزار ہو کر ان کی ہدایوں کی تکلیف میں بد قسمت، حرام نصیب، آفت رسید و پہنچتی کو بدوائیں دے رہی ہیں۔ کیسے کیسے شیر خوار بچوں کے مقابل بیٹھ بھیرنا نہ جانتے تھے۔ کیا یہ سب قربانیاں، کیا یہ سب غزریں کافی نہیں ہیں؟ آزادی تو ایسی تھی جسے ہے! ہاں تو بھاریس کیوں دعوہ ہوں۔ کیا یہ دیکھنے کے لیے کہ میرا چارہ وطن میرا چارہ دیس کا ہر سہ۔ جہاں شعراء و فنون کے بھروں کے دعوہ ہائے میرے چارے بھائی میرے چارے بھوٹن جو دھندلی کا شکار نہیں۔ نہیں میں یہ دیکھنے کے لیے دعوہ نہیں دے سکتا!!

پہنچتی انھیں خیالات میں غرق تھا کہ اس کا دوست دلچسپی۔ جو اس کے ساتھ جلا وطن کیا گیا تھا اس کا بھری میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ

میں ایک ہنسکے کا ٹکڑا تھا۔ رفیق کی عمر میں اپنے دوست سے دو چار برس چھوٹا تھا۔ بڑے سے شرافت جھٹک رہی تھی۔ اس نے میری کاشانہ بکڑ کر بٹایا اور کہا "جو زلف اپنا لوگوں کو کھلا۔" میری نے چونک کر سر اٹھایا اور ہنسکے دیکھ کر بولا "یہ کہاں سے اسے تمہارے پاس پیسے کہاں تھے؟" رفیق نے "پیسے کا لو بھر یہ باتیں ہو چکا۔ تم نے کئی شام سے کچھ نہیں کھایا ہے۔"

میری نے "پہلے یہ بتاؤ کہاں سے لائے۔" عیب میں تھا کہ وہ کاکا کا چمکی نظر آتا ہے اچھی دولت کہاں ہاتھ لگی؟" رفیق نے پوچھ کر کہا کرو گے۔ وہی اپنا تاج کوٹ جو دالہ نے بھیجا تھا کہ وہی دکھاتا ہوں۔"

میری نے ایک ٹھنڈی سانس لی دھواں گھوٹ کر آٹھ سوئچ ٹپ ڈھین پر گر پڑا۔ دو تھوٹے ہوئے بولا "یہ تم نے کیا حرکت کی۔ کرکس کے دن آتے ہیں۔ اس وقت کیا ہو گے۔ کیا اعلیٰ کے ایک لکھ بچی تاجر کا کھونا چنا کرکس کے دن بھی ایسے ہی پیسے پر ان کوٹ میں بسر کر لے گا۔ اے۔"

رفیق نے "کیوں کیا اس وقت تک کچھ؟" مانی نہ ہو گی۔ ہم تمام دونوں سے جوڑے خواہیں گے اور اپنے پیار سے وطن کی آنے والی آزادی کے نام پر خوشیاں منا لیں گے۔"

میری نے "آدھ لی کی تو کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ جو مشنوں ماہواری رسالوں کے لیے تھے گئے تھے وہ وہاں ہی آ گئے۔ مگر سے جو کھاتا ہے وہ کب کا ختم ہو چکا۔ اب اور کون سا لڑ رہا ہے؟"

رفیق نے "ابھی کرکس کو جنتا ہر جڑا ہے۔ ابھی سے اس کی کیا فکر کریں اور اگر بالخصوص جی کوٹ پہناتا کیا؟ تم نے نہیں مہری بناری میں ڈاکڑ کی ٹیس کے لیے ٹیکڈ این کی انگوٹھی بیچ ڈالی تھی۔ میں مغرب یہ وعدا سے ٹھیکہ دلا ہوں تمہیں کھانا پانی ہے۔"

کرکس کا دن ہے۔ اندھ میں ہر چہا ر طرف سرت کی گرم بازاری ہے۔ صغیر و کبیر، امیر و غریب سب اپنے اپنے گھر خوشیاں منا رہے ہیں اور اپنے ٹیس سے ٹیس سے بکڑے بکڑے کر لکھے گاؤں میں جا رہے ہیں۔ کوئی مظلوم صورت نظر نہیں آتی۔ ایسے وقت میں میری اور رفیق دونوں اسی ٹھک ڈاکڑ کے میں سر جھکا کے خاموش بیٹھے ہیں۔ میری ٹھنڈی آبیں بھر رہا ہے۔ اور رفیق دودھ کر دودھ سے پر آتا ہے اور دوست شرافتوں کو معمول سے زیادہ دیکھتے اور دیا نہ پنی کی حرکتیں کرتے دیکھ کر اپنی بے لوائی اور ناواری کی فکر دور کرنا چاہتا ہے۔ انہوں اعلیٰ کا سرتاج، جس کی ایک ٹکڑا پر بڑا ساں آدھ اپنا غلوں بہانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ آج ایسا بھٹکا ہوا ہے کہ اسے کھانے کا لکھا نہیں۔ حتیٰ کے آج صبح سے کہنے ایک سا دھکی نہیں چلا تھا کہ کوئی ہونا کی وہ وقت تھی جس سے وہ دوست بردار نہیں ہو سکتا تھا۔ اور وہ بھی آج اسے غصہ نہ ہوا مگر اس وقت سے اپنی فکر نہیں۔ رفیق نے جو جہاں طوفان و طوفان رہا ہونا اور رفیق کی فکر اسے سو پانی دوا ہو رہی ہے۔ وہ پوچھتا ہے مجھے کیا حق ہے کہ میں اپنے غم کو اپنے ساتھ صبر کی تنگی میں جھیلنے پر مجبور کروں جس کے خبر مقدم کے لیے دنیا کی سب نعمتیں ان لوگوں کو ملے ہوئے کھڑی ہیں۔

اسے میں ایک غمی رساں نے پوچھا جو زلف میری کہاں نہیں رہتا ہے۔ اپنی غمی نے جاہ رفیق نے خٹ لے لیا اور جوش سرت سے اچھل کر بولا۔ "جو زلف یہ اوجھڑا ان کا خط ہے؟"

میری نے چونک کر خط لے لیا اور بڑی بے مہری سے کھولا۔ اتفاقاً کھولتے ہی چند ہاتھوں کا ایک کچھانگر پڑا جو ٹیکڈ این نے کرکس کے خط کے طور پر بھیجا تھا۔ میری نے اس کچھ کو بوسہ دیا اور اسے اٹھا کر اپنے سینے کی عیب میں کھنکھنایا۔ خط میں یہ لکھا ہوا تھا۔

”مائی ایتز جوزف آپ بچہ تو قول کرو۔ خدا کرے جسیں ایک سو کر مس دیکھئے خوب ہوں۔ اس یادگار کو پیش اپنے پاس رکھنا۔ اور قریب ٹیکڈال کو بھولنا مس۔ میں اور کیا لکھوں بچہ مذکور کا بچا تھا ہے۔ ہائے جوزف! میرا بچہ امیرا کا کا میرا ناک جوزف! تو لکھے کب تک نہ ہائے گا آپ شاید نہیں ہوتا۔ آنکھوں میں آنسو اٹھ آئے ہیں میں میرے ساتھ مسیحین بھیلوں کی۔ قانون مردان کی۔ یہ سب مجھے گوارا ہے۔ مگر تجھے سے بے ادبیتا گوارا نہیں۔ تجھے قسم ہے تجھے اپنے ان کی قسم، تجھے اپنے وطن کی قسم ایسا آ جا۔ تجھے میری قسم پر آ گھسیں دس رہی ہیں۔ کب تجھے دیکھوں گی۔ کر کہ قریب ہے“ لکھے کیا۔ جب تک زندہ ہوں میری ہوں۔ تمہاری ٹیکڈال۔

2

ٹیکڈال کا گھر سوئٹزر لینڈ میں تھا۔ وہ ایک صرف سال تارک کی جینی تھی اور اچھا اسم کی حسینہ جیلے مس ہٹن میں بھی اس کا نظیر تھا۔ کتنے ہی امر اور روسیوں کا سودا سر میں رکھتے تھے۔ مگر وہ کسی کو بکھوٹال میں نہلاتی تھی۔ میرنی جب اٹالی سے بھاگا تو سوئٹزر لینڈ میں آ کر پناہ گزین ہوا۔ ٹیکڈال اس وقت بھولے بھالے قلاب کی گود میں کھیل رہی تھی۔ میرنی کی سرگرمیوں کے قریبیں پہلے ہی میں بچی تھی۔ کبھی کبھی اپنی ماں کے ساتھ اس کے یہاں آئے تھی۔ پھر باہمی ارادہ تھا جو بڑا حاکم میرنی کے ساتھ اس کا بھی کاجوں جب اس کے دل پر نقش ہوتا تھا۔ اس کی محبت اس کے دل میں پختہ ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے ایک دن خود شرم دیا کہ ہائے حلق رکھ کر میرنی کے جوں پر مرد کہ کر کہا مجھے اپنی خدمت میں مقبول کیجئے۔

میرنی پر بھی اس وقت قلاب کا عالم تھا۔ قوی فکرات نے ابھی دل کو چھوڑ نہیں ہوئے دیا تھا۔ جوانی کی یہ جوش امیدیں دل میں سو جوں اور رہی تھیں۔ اگرچہ اس نے عہد کر لیا تھا کہ میں ملک و قوم پر اپنے تئیں غدار کروں گا اور اس عہد پر قائم رہا ایک ایسی ناز میں کے نازک نازک لوگوں سے ملے درخواستیں نہ کر کہ وہ چھوٹی ہی جیسے اعتماد کے کچے پہاڑ کے پرے آئی کا کام تھا۔

ٹیکڈال باپ چاہم تر آگئی۔ مگر اس نے نہ ہوئی تھی، اس ناکامی نے اس کے دل میں آفتل محبت اور بھی چیز کر دی۔ اور گواہ آج میرنی کو سوئٹزر لینڈ چھوڑے کئی سال گزرے مگر وہ قدر ٹیکڈال ابھی تک میرنی کو نہیں بھولی۔ دونوں کے ساتھ اس کی محبت اور بھی گاڑی اور بچی ہوتی جاتی ہے۔

میرنی جب فلا پڑ چکا تو ایک لمبی آہ بھر کر کہتی سے بولا ”دیکھا ٹیکڈال کیا کہتی ہے؟“

کہتی۔ ”اس قریب کی چاہن کے کردہ ہو گئے۔“

میرنی ٹیکڈال میں ڈوبا ”ٹیکڈال تو تو جوان ہے۔ حسین ہے۔ خدائے تجھے دولت ہے اچھا عطا کی ہے۔ تو کیوں ایک قریب اختیار ہے۔ مظلّم تھا تو اور غربت زدہ شخص کے چپکے اپنی زندگی مٹی میں ماری ہے۔ مجھ جیسا مایوس آفت زدہ مصیبتوں کا مارا شخص تجھے کیوں کر خوش رکھ سکے گا۔ نہیں، نہیں میں ایسے خود غرض نہیں ہوں دنیا میں بہت سے ایسے نکلے حراج خوشحال نو جوان ہیں جو تجھے خوش رکھ سکتے ہیں۔ جو جی پی پر مشکل کر سکتے ہیں۔ کیوں تو ان میں سے کسی کو اپنی ملائی میں نہیں لے لیتی۔ میں میری محبت، اپنی نیک اور بے غرض محبت کی قدر کرتا ہوں۔ مگر میرے لئے جس کا دل قوم اور وطن پر غار ہو چکا ہے تو بجز ایک چارہ کی اور خود دیکھن کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ مجھ میں ایسی کیا خوبی

ہے۔ اچھے کون سے اوصاف ہیں کہ تھو بھی دچی میرے لیے ایسی نصیحتیں سمجھ رہی ہے۔ آواز میری کھلتے میری تو کھیں کا رہا جن کے لیے تو نے اپنے تئیں ڈار کر دیا وہ تیری صورت سے بڑا اور ہیں۔ جو میرے سرور میں وہ کھلتے ہیں تو خواب دیکھ رہا ہے "ان خیالات سے بے بس ہو کر میری نے قلم دوات نکالی اور سیکڑا لٹکھ کر شروع کیا۔

3

"بیاری سیکڑا لٹکھ کر اٹھا راجا مہاشی بہا تھ کے آیا۔ میں تھرا داتول سے مشکوروں کے قلم نے مجھ جیسے بے کس وہے کس ٹھٹھ کس تخت کے قابل سمجھا۔ میں اس کی ہمیشہ نہ رکھوں گا۔ یہ میرے پاس ہمیشہ ایک لگی ہے غرض اور غیر قانونی محبت کی یادگار رہے گا اور جس وقت یہ جسم فاقی کا غرض لٹھ میں جانے گا میری آٹری دھبہ ہے ہوگی کہ یہ یادگار میرے ہزارے کے ساتھ مل کر رہی جائے۔ میں شاید خود اس قہر سے کا اندازہ نہیں لگا سکا جو مجھے اس خیال سے ہے کہ یادداشت جہاں ہر چار طرف میری نسبت بدگیاں پھیل رہی ہیں کم از کم ایک ایسی فرستہ فصالی صورت ہے جو میری تھنوں کی صفائی اور میری آلائشوں سے پاک کوششوں پر پکا اعتقاد رکھتی ہے اور شاید تمہارے ہی حدودی کائنات ہے کہ میں زندگی کے اپنے سخت احتیاجات میں کامیاب ہونا چاہتا ہوں۔

مگر بیاری بہن مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ تم میری تکلیفوں کے خیال سے اپنا دل مت دکھانا۔ میں بہت آرام سے ہوں۔ تمہاری محبت بھی لازماً دل و دھڑک پا کر بھی اگر کس چند جسمانی تکلیف کا دروازہ لٹکھو جیسا کہ قسمت ٹھٹھ دیا میں کون ہوگا۔

میں نے سنا ہے تمہاری صحت روز بروز بدتر ہوتی جاتی ہے۔ میرا ہی سہا اعتبار چاہتا ہے کہ تجھے دیکھوں کاش میں آزاد ہوتا کاش میرا دل اس قابل ہوتا کہ تجھ سے مل کر کیا جاتا مگر ایک چمروہ اور فرد دل میرے قابل نہیں سیکڑا لٹکھ کر اٹھا کے اسلحہ جاتی صحت کا خیال رکھو۔ مجھے شاید اس سے زیادہ بات کی تکلیف نہ ہوگی کہ بیاری سیکڑا لٹکھ کر اٹھا کے اسلحہ جاتی صحت کا خیال رکھو۔ میرے لئے اجیری پاکیزہ صورت اس وقت لگا ہوں گے سامنے ہے! میرا دیکھو مجھ سے ناراض نہ ہو! بعد میں تمہارے قابل نہیں۔ آج کر کس کا دن ہے۔ تمہیں کیا تھو سمجھوں۔ خدا تم پر ہمیشہ اپنی ہے اچھا برکات نازل کرتا رہے۔ اپنی ماں کو میری طرف سے سلام کہتا۔ تم لوگوں کے دیوار کی بہت آرزو ہے۔ دیکھیں کہ تک یہ آرزو پوری ہوتی ہے۔ میرا جوزف۔"

4

اس واقعہ کے بعد بہت دن گزر گئے۔ جوف میری بھراٹھالہ پہنچا اور دم میں پہلی بار جمہوری سلطنت کا احاطہ کیا گیا۔ میں ٹھٹھ کا دربار سلطنت کے انصرام کے لئے منتخب کئے گئے۔ میری بھی امن میں ایک تھا۔ مگر خود سے ہی انوں میں فرانس کی زیادتیوں اور شک و شبہ محبت کی دغا بازیوں کی بدولت اس جمہوری سلطنت کا استراغ ہو گیا۔ اور اس کے ارکان دشمنی اپنی جانیں لے کر بھاگ گئے۔ میری اپنے مستند دوستوں کی دغا بازی اور دنیا سازی پر بیچ دھاب کھا دیا وہاں حال وہی نشان دم کی گھٹوں کی خاک کہ چھوٹا بھرتا تھا۔ اس کا یہ خواب کہ دم کو میں ضرور داپک دن۔ جمہوری سلطنت کا سرگزدا کر چھوڑ دیا گا پھر راہو کر بلر پر نشان ہو گیا۔

دو ہر کا وقت تھا۔ دھوپ سے آشفستہ حال ہو کر وہ ایک درخت کے سائے میں ڈرامہ لینے کے لئے غصہ کیا، کہ سائے سے ایک لہڑی آتی ہوئی دکھائی دی اس کا چہرہ زرد تھا۔ کپڑے بالکل سفید اور سادہ اس میں سال سے چھوڑا، میزین، طویل فراموشی کے عالم میں تھا کہ یہ زمین جوشِ محبت سے چاہ ہو کر اس کے گلے لپٹ گئی۔ میزین نے چہنک کر دیکھا۔ "وہا" پیاری میڈلن اہم ہو۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پرلم ہو گئیں۔ "میڈلن اہن نے رو کر کہا۔" جوزف! اور سب سے کچھ نہ لگا۔"

دونوں خاموش، انکی صحت تک دہتے رہے آخر میزین نے "وہا" تم یہاں کب آئیں گی؟"

میڈلن۔ "میں یہاں کب آؤں گی۔ مگر تم سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں لگتی تھی۔ تمہیں کلارہ ہارٹس کوڈ کیج کر لو کہ یہ کچھ کر کہ اب تمہیں ابھی بھی عورت کی ضرورت، ذاتی نہیں تم سے ملنے کی کوئی ضرورت نہ دیکھتی تھی (راک کر) کیوں جوزف! آپ کا سہا ہے کہ اکثر لوگ تمہاری برائی کی کرتے ہیں۔ کیا وہ اندر سے ہیں کیا خدا نے انہیں آنکھیں نہیں دیں؟"

جوزف۔ "میرا خدا وہ لوگ کج کہتے ہوں گے کی الٹا حق اچھ میں دو اوصاف نہیں ہیں۔ جو میں ٹوٹ کے باعث اکڑ کر کہتا ہوں کہ اچھ میں ہیں، یا نہیں تم اپنی سادگی اور پاک قسمی سے اچھ میں سو ہو جھکتی ہو۔ میری کڑواں دوز بدوز بھگے معلوم ہوتی جاتی ہیں۔"

میڈلن۔ "بھئی تو تم اس قابل ہو کہ میں تمہاری پرستش کروں۔ مہار ہے وہ انسان جو خودی کو مٹا کر اپنے تئیں بچ گھٹے لگے۔ جوزف! خدا کے لئے مجھے ہر صفت چاہیہ۔ میں تمہاری ہوئی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم وہی ہے پاک، صاف، بوجیہ ابراہیموس تھا۔ یہ خیال میرے دل میں جھلک ہو گیا ہے اور اگر اس میں ذرا کمزوری آگئی تھی تو تمہاری اس وقت کی جھلک نے اسے اور بھی مضبوط کر دیا۔ بچک تم فرمیتے ہو۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ دنیا میں کیوں لوگ اس قدر دکھتا نظر آ رہے ہیں جو نے ہیں اور خصوصاً وہ لوگ جنہیں میں جھک خیروں سے بالاتر سمجھتی تھی۔ ریلیٹی راری تو اپنا ہی تو۔ برتا ہاں یہ سب کے سب تمہارے دوست ہیں۔ تم انہیں اپنا دوست گھٹے ہو کر وہ سب تمہارے دشمن ہیں۔ اور انہوں نے مجھ سے میرے در پردہ ہتھکڑیاں لٹکی باقی تمہارے نسبت کیا ہیں؟ میں کا میں سر کر گئی یقین نہیں کر سکتی۔ وہ سب ظلم اچھ ہیں۔" وہا چلا جوزف وہی ہے جیسا میں سمجھتی تھی۔ بلکہ اس سے بھی افضل۔ کیا یہ بھی تمہاری ایک ذاتی خوبی نہیں ہے کہ تم اپنے دشمنوں کو بھی اپنا دوست گھٹے ہو۔"

جوزف سے اب میرے ہوسٹا اس نے میڈلن کے زرد ہاتھوں کو بوسہ کر کہا۔ "پیاری میرا میرے دوست ہے قصور ہیں اور میں خود غلام اور ہوں (راک کر) اب کچھ انہوں نے کہا وہ سب میرے ہی اشارے اور مرضی کے موافق تھا۔ میں نے تم سے نرمی دعا کی۔ مگر میری پیاری بہن یہ مجھ سے لے کر تم میری طرف سے ہے ہر دا ہو چکا اور اپنے شباب کے باقی دن اسرت سے بسر کرو۔ میں بہت غلام ہوں میں تمہیں سلفق نہ سمجھا تھا۔ میں تمہاری محبت کی گہرائی سے ناواقف تھا، کیونکہ جو میں چاہتا تھا اس کا لٹا اثر ہو مگر یہاں میں معافی کا طرا شکار ہوں۔"

میڈلن۔ "پائے جوزف۔ تم مجھ سے معافی مانگتے ہو۔ ای! تم جو دنیا کے سب انسانوں سے زیادہ بچک، زیادہ بچے اور زیادہ لائق ہو مگر ہاں بچک تم نے مجھے بالکل نہ سمجھا تھا۔ جوزف! تمہاری عقلی تھی۔ مجھے تعجب تو یہ ہے کہ تم اسے تنگ دل کیوں کر ہو گئے۔"

جوزف۔ "میرا خدا! ہاتا ہے جب میں نے دیکھی کہ یہ سب سکھانچہ سا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اس وقت میرے دل کی کیا کیفیت تھی۔ میں خود نکاح میں بچک ذاتی کی سب سے زیادہ وقت گھٹتا ہوں اور جس نے تریوں کے ذاتی مصلوں کو کبھی بڑا کال ترادہ کے ہوئے نہ چھوڑا۔ اپنے منہ سے سکھاؤں کہ چاکر گھٹے برا کہو۔ مگر یہ مجھ سے لے کر اس لئے تھا کہ تم اپنی صحت کا خیال نہ کرو اور مجھے بھول جاؤ۔"

حقیقت یہ تھی کہ میری نے میگزین ان کے مشق کو روز افزوں ہوتے دیکھ کر ایک خاص شکست کی تھی۔ اسے خوب معلوم تھا کہ میگزین ان کے شیدائیوں میں سے کتنے ہی ایسے ہیں جو اس سے زیادہ تکلیف دہ زیادہ جری، زیادہ دولت مند اور زیادہ لڑچیں ہیں مگر وہ کسی کو خیال میں نہیں لاتی۔ مجھ میں اس کے لئے جو خاص کشش ہے وہ میرے چند اوصاف ہیں اور اگر میرے ایسے احباب کی جن کی وقعت میگزین ان کی نگاہوں میں بھی ہے اس سے میری شکایت کر کے ان اوصاف کی وقعت اس کے دل سے مٹا دیں تو وہ خود بخود مجھے بھول جائے گی۔ پہلے تو اس کے احباب اس فعل کے کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے مگر اس خوف کے کہ کہیں میگزین ان نے نقل نقل کر کہاں دے دی تو میری اپنی زندگی بھر میں بھی نہ صاف کر سکے گا۔ انہوں نے یہ گوارہ کام قبول کر لیا تھا وہ سوکڑا لینڈ گئے اور جہاں تک ان کی زبان میں کوئی تھی اپنے دوست کی طبیعت اور کوئی میں صرف کی۔ مگر میگزین ان پر محبت کا رنگ ایسا گہرا چھا ہوا تھا کہ ان کو ششوں کا بجز اس کے اور کوئی نتیجہ ہو سکتا تھا جو ہوا وہ ایک روز دفتر پر ہو کر گھر سے نکل گئی اور دم میں آ کر ایک سرے میں مقیم ہو گئی۔ یہاں اس کا روز کا دلیرانہ تھا کہ میری کے پیچھے پیچھے اس کی نگاہ سے دور تھو، کرتی مگر اسے مطمئن اور اپنی کامیابی سے خوش دیکھ کر اسے چھڑنے کی جرأت نہ کرتی تھی۔ بالآخر جب پھر اس پر ناگہانیاں کا دار ہوا اور پھر وہ دنیا میں ہے کہ وہ نے جس کو کیا تو میگزین ان نے سمجھا اب اس کو کسی حدود کی ضرورت ہے اور تاثر میں دیکھ چکے ہیں جس طرح وہ میری سے ملی۔

5

میری دم سے پھر انگلستان پہنچا اور جہاں وہ میرے تک مقیم رہا۔ 1870ء میں اسے خبر ملی کہ سسلی کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہے اور انہیں میدان جنگ میں لانے کے لئے ایک تحریک کی ضرورت ہے۔ اس دوران سسلی پہنچا مگر اس کے جانے کے کچھ ہی دنوں میں نے ہانچوں کو زیر کر دیا تھا۔ میری جہاز سے اتارے ہی گرفتار کر لیا گیا اور ایک زمانہ خانہ میں داخل دیا گیا۔ مگر چونکہ اب وہ بہت ضعیف ہو گیا۔ حکام شاہی نے اس خوف سے کہ کہیں وہ تکالیف قیہ سے مر جائے تو رعایا کو شہر ہوا گا کہ بادشاہ کی تحریک سے وہ قتل کر دیا گیا۔ اسے رہا کر دیا۔ جہاں بادشاہ کی میری پھر سوکڑا لینڈ کی طرف روانہ ہوا اس کی زندگی کی تمام امیدیں خاک میں ملی گئیں۔ اس میں شک نہیں کہ اٹلی کے مشق اور جھگڑا جانے کے دن بہت قریب آ چکے تھے۔ مگر اس کی حکومت کی حالت اس سے بزرگ نہ تھی۔ جیسی اس طرح پھیلنے کے عہد حکومت میں۔ فرق یہ تھا کہ پہلے وہ ایک غیر قومی کردار تھا جس سے اس نے اب اپنے قوم کے ہاتھوں شد و خوار۔ ان سوا اثرات کا میں نے مستقل مزاج میری کے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ غالباً عوام کی کلی تعلیم اس حد تک نہیں ہوئی کہ وہ اپنے لئے ایک جمہوری طرز حکومت کی بنیاد ڈالیں اور اس نیت سے وہ سوکڑا لینڈ چار ہاتھ کر دیاں سے ایک زبردست قومی اخبار نکالے۔ کیونکہ اطالیہ میں اسے اپنے خیالات کی اشاعت کی اجازت نہ تھی۔ ویرات مہربانم تہلیل کر کے دم میں مقیم رہا مگر وہاں سے اپنے نژاد یوم پھیرا میں آیا۔ اور اپنی پاک فصال ماں کی قبر پر بھول چڑھا۔ بعد ازاں سوکڑا لینڈ کی طرف چلا اور سال بھر تک چند معتد احباب کی امانت سے اخبار نکال رہا۔ مگر سوا اثرات اور مصائب نے اسے بالکل لاغر اور لخت چاڑھا تھا۔ 1870ء میں وہ صحت کے خیال سے انگلستان آ رہا تھا کہ وہ آجیس کے دامن میں مونیایا کی تیار نے اسے سلسلہ حیات متعلق کر دیا اور وہ ایک پُر دامن دل لئے ہوئے جنت کو سدھارا۔ اٹلی کا مہرے دم تک اس کی زبان پر تھا۔ یہاں بھی اس کے متعدد حامی۔ بعد ازاں شریک تھے اور ایک

بڑے ہفتا فطرت بھلے مقام پر ایک مختلف جھٹے کے کنارے پر اس فحاشی القوم کو ملادیا گیا۔

6

میزنی کو کچا لکھ میں سوئے ہوئے آج تین دن گزر گئے۔ خام کا وقت تھا سورج کی درخشندہ تاب اس تازہ قبر پر حسرت ناک لگا ہوں سے تاکہ وہی ہیں کہ ایک اور میز موت و خواصورت شہالے جوڑے سینے کو کھڑائی ہوئی آئی۔ یہ ٹیکڈا لن تھی۔ اس کا چہرہ نہایت مضمون و چہرہ تھا۔ گویا اس جسم میں جان نہیں باقی رہی۔ وہ اس قبر کے سر ہائے فیلہ کی اور اپنے سینے پر گھسے ہوئے بھول اس پر چڑھائے۔ پھر وہ اٹھ کر صدق ال سے دعا کرتی رہی۔ جب خوب اندھیرا ہو گیا۔ براف چڑھنے لگی تو وہ پیچھے سے اٹھی اور خاموش سر جھکانے قریب کے ایک گاؤں میں جا کر رات بسر کی اور علی الصبح اپنے مکان کی طرف روانہ ہوئی۔

ٹیکڈا لن صبح اپنے گھر کی مالک تھی اس کی ماں بہت عرصہ ہوا انتقال کر گئی تھی۔ اس نے میزنی کے نام سے ایک خانقاہ بنوائی اور خود خانقاہ نشین۔ میر سی لپڑیوں کے لباس میں وہاں شب و روز رہتے گئی۔ میزنی کا نام اس کے لئے نہایت پرورد اور دلکش نئے سے کم نہ تھا۔ ہوردوں اور قدردانوں کے لئے اس کا گھر خانقاہ تکلف تھا۔ میزنی کے فطوٹ اس کی انجیل اور میزنی کا نام اس کا معبود تھا۔ آس پاس کے قریب لڑکے اور بچے اس کے لئے بیکہ ابرکت نام مصلیٰ معاش کا وسیلہ تھا۔ ٹیکڈا لن تین برس تک زندہ رہی اور جب مری تو اپنی آخری وصیت کے مطابق اسی خانقاہ میں دفن کی گئی۔ اس کا مطلق معمولی عیبت نہ تھا بلکہ وہ ایک پاک اور بے لوث جذبہ تھا اور وہ ہم کو ان پریم رس میں ڈوبی ہوئی گویوں کی یاد دلاتا ہے جو مری کرشن کے پریم میں بندہ کی چیز کی جگہ نہ تھی۔ میزنی کی خانقاہ آج تک قائم ہے۔ اور غرباد اور فقراء عامی تک میزنی کا پاک نام لے کر وہاں ہر طرح کی آسائش اور راحت پاتے ہیں۔



حوالہ:

۱۔ پریم چند کا یہ قصہ ”سحاب رائے“ کے قلمی نام سے شائع ہوا تھا۔

دنیا کا سب سے انمول رتن

پریم چند

پریم چند کا تحریر کردہ پہلا افسانہ ”میلوہ“ ”سوز و غم“ طبع الاول، جون 1908ء

دلنگار ایک نئے خاندان سے تھے۔ سچے دامن چاک چٹا ہوا وطن کے آنسو بہا رہا تھا۔ وہ وطن کی دیوی یعنی مکہ و قریب کا سما اور جانا ز عاشق تھا۔ ان عشاق میں نہیں جو مصر بنگلہ میں بس کر اور لہاس خاطر سے بچ کر عاشق کے گھس میں مستحیثیت کا دم بھرتے ہیں۔ بلکہ ان سیدھے سادے بھولے بھالے لہذا ان میں جو کوہ و بیابان میں سرنگراتے اور تال و فریا دیا کھاتے بھرتے ہیں۔ و قریب نے اس سے کہا تھا کہ اگر تو میرا سچا عاشق ہے تو جاہلوں دنیا کی سب سے بیش بہا شے کے کمرے سے دور رہیں آ۔ غپ میں تجھے اپنی غلامی میں قبول کر دوں گی۔ اگر تجھے وہ بیچ نہ تو ضرور دارا و خسرو سن نہ کرنا، اور نہ دار پر کھینچے اور نہ کی۔ دلنگار کو اپنے چہرے کے انکھارنا شکوہ و شکایات کا اور حال پار کے دیار کا مطلق موقع نہ دیا گیا۔ و قریب نے جو جی یہ فیصلہ سنایا۔ اس کے چہرہ داروں نے قریب دلنگار کو دیکھ کر کہا کہ ہر کمال دیا اور آج تین دن سے یہ قسم رسیدہ شخص اُسی پر خار و رخت کے پیچھا ہی دھشت ناک میدان میں بیٹھا ہوا سوچ رہا ہے کہ یہ کروں؟ دنیا کی سب سے بیش بہا شے دیکھ کر کوئی لانا ممکن، اور وہ ہے کیا؟ قادری کا خزانہ؟ آب حیات؟ تاج خسرو؟ جام جم؟ تخت طاووس؟ اور یہ بیچ؟ نہیں یہ چیزیں ہرگز نہیں۔ دنیا میں خسرو ان سے بھی گراں تر ان سے بھی بیش بہا چیزیں موجود ہیں مگر وہ کیا ہیں کہاں ہیں۔ کیسے ملیں گی؟ یا خدا میری مشکل کیوں کرتا سان ہو گی!

دلنگار انھیں حیلالت میں پھر کھار رہا تھا، اور عقل کچھ کام نہ کر سکی تھی۔ پھر شہر کی کوہا ممد کا دل گیا اسے کاش کوئی میرا بھی دہکار ہو جاتا۔ اسے کاش مجھے بھی اس چیز کا جو دنیا کی سب سے بیش بہا شے ہے نام بھلا دیا جاتا۔ باسے وہ شے دستیاب نہ ہوتی مگر مجھے افاقہ معلوم ہو جاتا کہ وہ کس قسم کی چیز ہے۔ میں کمرے سے باہر موتی کی کھونچ میں جاسکتا ہوں۔ میں سندھ کا غلہ بھرا کول، قصا کی آواز اور ان سے بھی زیادہ سہلکان چیزوں کی تلاش میں کمر بستہ باہر جاسکتا ہوں۔ مگر دنیا کی سب سے بیش بہا شے ایسے میرے پر پرداز سے بہت بالا ہے۔

آسمان پر بار سے نکل آئے تھے دلنگار، کیا ایک خدا کا نام لے کر اٹھ اور ایک طرف کا چل کھڑا ہوا۔ بھوکا پیاسا، بے ہوش، دھشت و زار وہ برسوں و دہائیوں اور آج کی خاک چھان بھرا کھوے کائناتوں سے بھٹی ہو گئے۔ جسم میں ہار مصر کی طرح پنڈیاں ہی پنڈیاں نظر آئے تھیں۔ مگر

دلدار دھوکے توئے، نہا کی ایک نئی قیمت چیز دھوکہ دکائی۔ تیری ہمت کو آفریں اور تیری فراست کو سراہا مگر یہ نہا کی سب سے بیش قیمت چیز نہیں اس لئے تو یہاں سے ہاور ہمارا کوشش کرنا ہے اب کی میرے ہاتھ دھوکہ دھو گئے اور تیری قسمت میں میری غلامی لگس ہو، اپنے عہد کے مطابق میں تجھے دار پر کھینچا کرتی ہوں مگر میں تیری جان بخشی کرتی ہوں، اس لئے کہ تجھ میں وہ اوصاف موجود ہیں جو میں اپنے عاشق میں دیکھنا چاہتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تو ضرور ایسی سرزد ہو گا۔ تا کا م، تا سرا، دلدار، اس حیات معشوقانہ سے ذرا دور ہو کر ہو گا۔" اس محبوبہ بختین احمدہ نے ہائے روزگار کے بحر سے آستین کی جب نہائی ٹھہر رہی تھی۔ پھر خدا ہائے اپنے دل کی آئیں کے، کیا تو اپنے عاشق چاہناز کے حال دار پر تو اس نے کھانگی بلادہ اپنے حال میں آ رہا ایک بھلاہو کا کراس سونڈن دلدار دکھائے تو وہی عشق کے پھیلنے کے لئے مستعد بن گئی۔ تیری ایک نگاہ مست کے نشہ سے بخود ہو کر میں وہ کر سکتا ہوں جو آج تک کسی سے نہ ہوا ہو۔" دلخربہ عاشق کے یہ اشتہاقی آمیز کلمات سن کر ہاور غصہ ہو گئی۔ اور عہد کیا کہ اس دوا جانے کو کھڑے کھڑے وہ ہار سے نکال دو۔ چوہ دار نے فوراً دلخربہ دلدار کو دھوکے سے کر کوچے دار سے باہر نکال دیا۔

کچھ دیر تک تو دلدار معشوقہ قسم کشی کی اس بندہ کوئی پی آ سو بہا تا، بار بار اس سوچنے لگا کہ اب یہاں جاؤں۔ عشق کی راد تو رومی ہمارا یہ چٹائی کے بعد یہ ظہر، دلدار اب ایسی کون سی چیز ہے جس کی قیمت اس در آ دار سے زیادہ ہو۔ حضرت طہر قمر نے سکندر کو پادشاہی کا رستہ دکھایا تھا کیا میری دھیمہ بی نہ کرو گے؟ سکندر شاہ بہت کشور تھا، میں تو ایک خائفانہ برادرسافر ہوں تم نے کتنی ہی واقعی کشتیاں سکھر سے نکالی ہیں۔ مجھ غریب کا بڑا بھی پڑ کر دے۔ اسے جبر نکل، عالی مقام! کچھ تمہیں اس عاشق خیم جامہ دوسیر رنجائش پر توں کا نہا، تو مطلقاً ان بارگاہ سے ہو۔ کیا میری مشق آسان نہ کرو گے؟ اظہر من الشمس دلدار بیچارے بہت فریاد چلائی مگر کوئی اس کی دھیمہ کی بے سود نہ ہوا۔ آخر یہاں ہو کر وہ بھلاہو صفت دوا دار، ایک طرف کو چل کر آیا اور

دلدار نے چہرہ پہ جھنجھٹا کر اترار سے دھن تک کھینچے ہی دوا داروں کی خاک چھائی، ابھی برقعہ لائی چہ نہاں پر سو یا ابھی ہونا تک دوا داروں میں بھٹکتا پھر انگریز جس چیز کی دھن تھی وہ نہائی۔ یہاں تک کہ اس کا جسم ایک توڑا استخوان ہو گیا۔

ایک روز وہ دھام کے وقت کسی دروازے کے کنارے منت حال چاہتا تھا شہر تیرہویں سے چھٹا تو کیا دیکھتا ہے کہ منزل کی ایک چٹائی ہوئی ہے ہاور اس پر ایک باز نہیں اٹھانے جوڑے پہنے، سولہوں سنگھار کے کتنی ہوئی ہے۔ اس کے ذرا نوچ اس کے چہرے سے ٹھوہری لاش ہے۔ ہزاروں آدمی ملحقہ ہاتھ سے کھڑے ہیں اور پھولوں کی برکھا کر رہے ہیں۔ ایک چٹائی سے خود بخود ایک شعلہ اٹھا۔ حتی کا چہرہ اس وقت ایک پاک ہند سے منور ہو، ہاتھ۔ مبارک شعلہ اس کے گلے پہن گئے۔ اور وہ دونوں میں وہ پھول سا جسم توڑا خاستر ہو گیا۔ معشوق نے اپنے تئیں عاشق پر ٹا کر دیا اور دوا داروں کی بھلی لافانی اور پاک صحبت کا آخری جلوہ دکھا، ظاہر سے یہاں ہو گیا۔ جب سب لوگ اپنے گھروں کو لوٹے تو دلدار چپکے سے اٹھا اور اپنے گھر پہاں چاک داس میں یہ توڑا خاک صیت لیا اور اس محبت خاک کو نہا کی سب سے اتر رہا چھوٹا ہوا کامرانی کے نشہ میں تھوڑا کچھ ڈاری طرف چلا اب کے چوں چوں وہ منزل مقصود کے قریب آتا تھا اس کی ہمتیں بڑھتی جاتی تھیں۔ کوئی اس کے دل میں جھپٹا ہوا کہہ ہاتھ اب کی تیری جگہ ہے اور اس خیال نے اس کے دل کو جو خواب دکھائے ان کا ذکر فضول ہے۔ آخر وہ شہر کو سو سو میں داخل ہوا اور دلخربہ کے آستانہ رخصت نشان پر ہار کھڑی کہ دلدار سرخرو اور دوا داروں کا ہے اور حضور میں بار بار ہوتا چلتا ہے۔ دلخربہ نے عاشق چاہناز کو فرار دہار میں بلایا اور اس جگہ کے لیے جود نہا کی سب سے بیش بہا بخش تھی ہاتھ پہنایا دیا۔ دلدار نے جرات کر کے اس ساتھ بھیجیں کا ہوسر لے لیا اور وہ محبت خاک اس میں، دکھ کر اس کی ساری کیفیت نہایت دوسو الفاظ میں کہ سنائی اور معشوقہ دلہ پر کے تازک لبوں سے اپنی قسمت کا

سہارن گ اور ہانغا فاضلہ خٹن کے لئے مختار ہو بیٹا۔ دقرب نے اس وقت خاک کو آنکھوں سے لگا لیا اور دھوکہ دینک دیا بے فکر میں غرق رہنے کے بعد بولیا کہ عاشق ہاں ہار دینگا، رونا دھونکے چہ خاک کی کیا صنعت، جوتو لایا ہے نہ کی نہایت پیش قسمت چیز ہے اور میں تیری صدق دل سے مومن ہوں کہ تو نے ایسا پیش بہا تھا مجھے بالکل کیا غم نہ دے گا، اس سے ابھی زیادہ اور غم نہ کوئی چیز ہے، جہاں سے تلاش کر اور جب میرے پاس آئیں حال سے رہ کر تھی ہوں کہ خدا تجھے کامیاب کرے۔ یہ کہہ کر وہ پردہ دار ہار سے ہاتھ آئی اور مستحق کا نام دے اپنے بھائی جاسوز کا بھاء دیکھا کہ کبھر نظراں سے اوجھل ہو گئی۔ ایک برقی تھی کہ کھنڈی اور بھر پردہ میں چھپ گئی۔ ابھی دھانگا کے حواس تہاں ہونے پائے تھے کہ چہ دار نے طاعت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کوچہ پار سے لالہ دیا اور بھر تھری ہار و بندہ محبت وہ زانو پھینک نکال گا یاس کے اتھاہ مست رہیں غم سے کھانے لگا۔

دلنگار کا ہوا چھوٹ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ میں دو تھیں یا شاید تیس اور کمر جانے کے لیے پیٹا کیا گیا تھا۔ اور اب مجھ میں کے اور کوئی ہمارے نہیں کہ کسی پہاڑ پر جڑ کر کھڑے تھیں گے اور اس کے ساتھ کھڑے ہو کر فریاد کرنے کے لیے ایک دین و انتظار بھی باقی نہ ہے۔ وہ دین و انتظار اٹھا اور اٹھنا ایک سر ہلکے کو کہی چوٹی پر جا پہنچا۔ کسی اور وقت وہ ایسے کوٹھے پہاڑ پر چڑھنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا مگر اس وقت جان دینے کے جوش میں اسے وہ پہاڑ ایک معمولی ٹکڑے سے زیادہ اونچا نہ نظر آیا۔ قریب تھا کہ وہ نیچے لوہے کے کپکپاتے ہوئے پتھر پر سبز لہجہ سبز لہجہ سے ایک ہاتھ میں تھپی اور دوسرے ہاتھ میں عصا لیے برآمد ہوئے اور بہت آفرا لہجہ میں بولے "دلنگار رتا دان دلنگار اپے کیا دن دان نہ خست ہے۔" احتمالاً راء عشق کی ٹھیک منزل ہے یا میں ہر دو دن کے عاشق، تجھے اتنی جگہ نہیں۔ مرد بن اور یوں بہت نہ ہار۔ مشرق کی طرف ٹیک ٹیک ہے جس کا نام ہندوستان ہے۔ وہاں جا میری آرزو پوری ہوگی۔ یہ کہ کر حضرت شاعر غائب ہو گئے۔ دلنگار نے شکر ہے کی نماز ادا کی اور تازہ دم بن کر نکلے اور ٹھیک امداد کا سامرا پر کر خوش خوش پہاڑ سے اتر اور جانب ہندو اہستہ کی۔

حقوں تک پہنچا، جنگوں، شر ہمارے گھٹنوں، دشمنوں، گزروں اور لوگوں اور سنا قابلِ موردِ پھانسی کو طے کرنے کے بعد دلفگارِ رخنہ کی پاک مروتِ شین میں داخل ہوا اور ایک خوشنود چادر میں طرکی کشیں دھو کر گلابِ باغ کی سب جوتھاریٹ کیا۔ شام ہوتے ہوتے وہ ایک کلب دستِ میدان میں پہنچا جہاں دینار و شکر نشہ و حیاں لاشیں بے گھر و گھن چڑی ہوئی تھیں۔ ذراغ و زلف اور خوشی و رنجوں کی گرم ہار لاری تھی اور سارا میدان خون سے شکر لہ رہا تھا۔ یہ صیحت، ناک تھار، دیکھتے ہی دلفگار کا بلی گیا تھا اور اس خطاب میں جان بھنسی۔ مرنے والوں کا کراہنا، مسکنا اور آج پاؤں رز کر بیان دینا۔ دلفگار کا چہرہ اور گوشت کے کوٹھڑوں کو لے کر بھاگنا۔ ایسا ہولناک سین دلفگار نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ پاک ایک اسے لپٹا آیا۔ میدان کا رزار ہے اور یہ لاشیں سوراخ سپاہیوں کی ہیں۔ اسے میں قریب سے کراہنے کی آواز آئی دلفگار اس طرف بھاڑا تو دیکھا کہ ایک فوجی دھنکلی میں کمرہ دار پیر و شریف ہاں کی سبز دروہو کا بے زمین پر گولی چڑھا رہا ہے۔ چھپے خون کا فوارہ جاری ہے۔ مگر شیریں آبدار کا قبضہ پلے سے الگ نہیں ہوا۔ دلفگار نے ایک گھوڑا لے کر وہاں دھم پر، کھوڑا تاکہ غولی رک جائے اور بولا "اے جہان خروار کون ہے؟" جہان خروار نے یہ سن کر آنکھیں کھولیں اور لیر لیر لہجہ میں بولا "کیا انھیں جانتا میں کون ہوں کیا پتا تو نے آج اس کو اس کی کاٹ نہیں دیکھی؟" میں اپنی ماں کا بیٹا اور ہمارے کائنات جگر ہوں۔ "یہ کہتے کہتے اس کے تھوڑوں پر بل چڑ گئے۔ زرد پیر و شریفس ہو گیا۔ اور شیریں آبدار بھرا پتا جو ہر دکھانے کے لیے چمک اٹھی۔ دلفگار سمجھ گیا کہ اس وقت مجھے دشمن ملال کر رہا ہے۔ طے سے بولا "اے جہان خروار میں تیرا دشمن نہیں ہوں۔ ایک آوارہ دہل۔ غریب دروہ۔ مسافر ہوں اور بھول چکنا آٹھا۔" وہاں تک مجھ سے یہاں کی متصل کینت جان کر۔ یہ سنتے ہی زخمی پای اٹھایت شیریں لہجہ میں بولا "اگر تو مسافر ہے آتا۔ اور میرے خون سے تر پہلو میں بیٹھا کھا کھک بھی اور انگلی زمین سے جو چھیرے اس پاؤں پر رانگی ہے اور جو سوائے موت کے کوئی نہیں بچتا۔

تکلیف فحوس ہے کہ تو یہاں ایسے وقت میں آیا جب ہم حیرتی مہمان نوازی کرنے کے قابل نہیں۔ ہمارے اہل اہل کار نہیں آج ہمارے ہاتھ سے نکل گیا، ہمارا وقت ہم سے ملن چیا۔ مگر (پہلو بدل کر) ہم نے ملے ملے اور ختم کو جتا دیا کہ راجھت اپنے دلش کے لئے کیسی ہے، کیسی ہے جان و جا ہے۔ یہ اس پاس جولا شیں تو دیکھ رہا ہے، یہاں لوگوں کی ہیں جاس لوگوں کے کھاٹ اتارے ہیں (مسکرا کر) اور گوگرد میں سے ملن ہوں۔ مگر فیصت ہے کہ حریف کے حلقہ میں مرد ہاں (یعنی کےظم سے جھڑپا نکال کر) کیا کرتے ہیں ہم کہ دبا خون لنگھتا ہے، دے دے کئے سے کیا فائدہ؟ کیا میں اپنے ہی ملن میں خفا کی کرنے کے لئے نہ رہا ہوں۔ نہیں، ایسی زندگی سے مرنا اچھا، اس سے بہتر موت ممکن نہیں۔“

جوانمرد کی آواز مدھم مدھم ہو گئی۔ اعضاء اچھلے ہو گئے، خون اس کھڑت سے بہ کر اب خود بخود بند ہو گیا۔ روبرو کر ایک آدھ قطرہ لپک چڑھا تھا۔ آخر کار سارا جسم پیچہ ہو گیا، قلب کی حرکت بند ہو گئی اور آنکھیں بند گئیں۔ دنگار نے سمجھا اب کام تمام ہو گیا کہ مرنے والے نے آہستہ سے کہا: ”بھرت ماتا کی ہے“ اور اس کے سینے سے آخری قطرہ خون نکل چلا۔ ایک سچے محبت ملن اور دلش جھگٹ نے حب الوطنی کا حق ادا کر دیا۔ دنگار اس نگار سے چند سانس ہوا اور اس کے دل سے کہا کہ ایک دیا میں اس قطرہ خون سے پیش قیمت لئے نہیں ہو سکتی۔ اس نے فوراً اس دھک لعل ربانی کو ہاتھ میں لے لیا اور اس دلیر راجھت کی رہائش پر غش غش کرتا ہوا ماتم ملن ہوا۔ اور وہی خلیاں جھپٹتا ہوا آٹا نظر ایک مدت اور ان میں ملک اہم خوبی اور دوصف محبوبی کے دودھ دیت پر چاہا، پچھا اور پچھا سو دیا کہ دنگار سرخرو کا سنگار لوتا ہے، اور وہ بارگہر بار میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔ دھریب نے فوراً اسے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ خود حسب معمول پر وہ زندگیاں کے کسی پشتہ بھیجی ہوئی۔ ”دنگار اب کی تو بہت دنوں کے بعد واپس آیا۔ لا دیا کی سب سے پیش بھانچہ کہاں ہے؟“ دنگار نے جھڑپا نکال کر کہا کہ وہ زندگیاں ہٹ گیا اور دنگار کے روبرو ایک دربار حسن آراستہ کیفیت پر جوش لپکے میں کہہ سکتی، وہ خاصا موٹا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ چاکہ وہ پر وہ زندگیاں ہٹ گیا اور دنگار کے روبرو ایک دربار حسن آراستہ نظر آیا۔ جس کی ایک ایک ناز میں دھک لعل تھا۔ دھریب صد شان و رعنائی مسند دارین کار پر جلوہ افروز تھی۔ دنگار یہ جسم حسن دیکھ کر حیر ہو گیا، اور غش و ریا کی طرح نکتے میں آ گیا کہ دھریب مسند سے اٹھی اور کئی قدم آگے بڑھ کر اس کے ہم آغوش ہو گئی، اور افسانہ دنگار نے شکوے کرنے شروع کئے۔ حاشیہ نیشیان و دربار نے دنگار کو خندہ یہی گزار میں اور ماہ و خورشید کو پہلا حلقہ تمام مسند پر بٹھا دیا۔ جب غلہ دل پسند بند ہوا تو دھریب کھڑی ہو گئی اور دست بستہ ہو کر دنگار سے ہوئی ”اے عاشق چاشنہ دنگار، میری رعنائی حیر بہدف ہو گئی اور خدا نے میری سن لی اور تجھے کامیاب و سرخرو کیا۔ آج سے تو میرا آقا ہے اور میں میری کنیز بن چلی۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک مربع صندوق چھانک دیا اور اس میں سے ایک لوح نکالا جس پر آبدار سے لکھا ہوا تھا۔

”اور آٹری قطرہ خون جو ملن کی مخالفت میں کر دے دیا کی سب سے پیش قیمت لئے ہے۔“



حوالہ:

۱۔ پافسانہ پہلی بار ”سوزا ملن“ مطبوعہ جون ۱۹۵۵ء میں ماٹھے آباد، چمکوتہ ”نواب رائے“ کے قلمی ہم سے شائع کی گئی تھی۔

گناہ کا خوف

محمد علی ردو دہلوی

محمد علی ردو دہلوی کے اولین افغانوں میں سے ایک، مضمون ”گناہ کا خوف“ لکھنؤ تجزیہ ’ ایک بیگ 1909ء

عبدالغنی صاحب نے حکمرانی کے پیشے میں وہ نام پیدا کیا تھا کہ لاپرواہی اور سہولیت پرستی کے بڑے بڑے زہید اور متعلقہ اور، میں جن خوشامدین کرتے تھے۔ کشمیری ہر میں کون ابتدائی مقدمہ ایسا ہوتا تھا جس میں عبدالغنی صاحب وہ فریق میں سے ایک کے عدالت گارٹ ہوں۔ ان کی ترحیم دی ہوئی مسئلہ دیکھ کر چہنی کے دکھا دکھا رہے تھے۔ کچھ لوگوں کو یہ کہتے تھے کہ اگر اس شخص نے عدالت کا امتحان پاس کر لیا ہوتا تو یہ باقی عدالت کے بہترین ایڈوکیٹس میں سے ہوتا۔

عبدالغنی صاحب نے بلا کار، بلا پایا تھا۔ پر نہیں کئے تھے۔ صوبہ ہر میں نہیں کا مقدمہ ہو اور کیسے ہی پیچیدہ مسائل تھے ہوں، اگر فریق مقدمہ ان تک پہنچ گیا تو سب مشکلیں حل ہو گئیں۔ رہا ان میں نہ معلوم کیا جاوے تھا اور نہ معلوم کیسے الجھن یا رہے کہ آدنی کو رام کرینا کوئی بات ہی نہیں تھی۔ جہاں صلح کا موقع ہوا اور دوسرے فریق کے دل میں جگہ کر کے صلح کرادی۔ جہاں لڑائی کا موقع ہوا اور مخالف فریق کے بہترین آدمی توڑ لئے۔ کوئی دوسرا ایڈوکیٹ ہر میں کا نہ نکالے، یہ سو سو میں کا صاحب ہو جائیں۔

دیکھ کر نہ ہونے کا خود ان کو کبھی فہم نہ کرتے تھے بلکہ سنا اور فہم کرنے کا موقع ہی کہاں تھا۔ کام کا تھا کہ فضول خیالی گھوڑے دوڑانے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ دیکھ کر یہاں ایک عہدہ ہوتا ہے۔ کوئی ایسا ہی بڑا ہوا جس کے یہاں دو ہوتے۔ ہائی کورٹ کے کوچے کوچے دکھا، کے ساتھ دو تین جوئے لگے، سچے ہیں۔ ان کے یہاں میں آدمی کام کرنے والے تھے اور پھر نہ جوئے کا سوال نہ سبکداری۔ خانی ہر شخص کی فطری قابلیت کچھ کر کا ہر کام پر دیکھا جاتا تھا۔ جہاں کام کر کے کرتا تھا ان کے جلسے میں مقدمہ کے ہر پہلو کے اسپیکر ملت موجود تھے۔ حسب حیثیت ہا موقع اعتبار والے دے اور چشم دے کو مہیا ہو سکتے تھے۔ ان کے جلسے میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو سوچاں برس کا سادہ کرم خوردہ کا نقد نکال دے۔ دھواں دے کر سنے کا نقد کو پڑا ہوا دے۔ جن دن ان کے اندر مہاشیہ کو دیکھ سے چٹاواں، جن دن ایسے کا دیکھا رہے۔

دستار دہن میں سے الفاظ غائب کر دیں اور مہارتیں اس طرح داخل کر دیں کہ جو سب سے بڑا آخری خیال دھوکا کھا جائے۔ ان کے

لئے دلوں میں ایک نئی صاحب تھی جہاں باخوبی سے موردِ پاؤں سے کسی کلمہ لپٹتے تھے اور نیکانِ محراب دل دیتے تھے بختِ قلم تھے اس سلی میں نہیں کہ شیخ الشیخ نکستہ و غیرہ و غیرہ لکھ لپٹتے تھے بلکہ اس دور سے کہ کثرتِ لوگوں کے اندازِ لحاظ کی ایسی نقل اتارتے تھے کہ خود بخود دہرا کر کہہ دین بعد دیکھتے نہ جانے۔

ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جو اکثر ضرورت ہو تو مسل ٹھہرا دیں، دینے سے، بکھری کے معاملے سے، مگر سے یا جہاں سے بہترین موقع ہو۔ لپٹتے سے ضرورتی کا ٹکڑا غائب ہو جانے، ہائی دینے سے، بکھرے ہیں۔ بالکل ایسی طرح کا بہت رکھنا چاہیے اور گواہ مگر سے کا کل کا چہرہ اصلی بہت سے لکھا۔ اپنے یہاں کے لکھنے بیٹھے دلوں میں سے ایک شخص کی خود تعریف کرتے تھے کہ انہوں نے دو جرات کی اور معذرتی کا وہ مکمل دکھایا کہ دوسرا ہوتا تو پاؤں کا تب جاتے اور دھریا جاتا۔ ایک بہت بڑے طریقِ مخالف، عموماً چپے، ہاڑوں کے دن، بغل میں بہت وہاں اپنے دیکھ کے چھپے کڑے بحث میں رہے تھے ان کی بغل سے بہت لکل کیا اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ ایسے لوگ بھی لکھتے تھے جہاں لڑائی لڑائی میں بھی ہند نہ تھے کبھی سب دوسروں کے لیے کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں مقدمہ بازی میں اور عشق بازی میں سب کچھ جائز تھا مگر خود اپنے سے عہدِ اعلیٰ صاحب ان تمام باتوں سے علیحدہ رہتے تھے۔ مقدمات معاملات کی اور بات ہے۔ مثلاً جان ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک نو جوان زہید اور قوی جو بالغ ہونے کے بعد اپنے باپ سے بھائی پر مقدمہ چلانے والا تھا سب مذاہن نہیں تھا۔ صرف دعویٰ داخل کرنا تھا۔ اسٹاپ خرید لیا گیا تھا۔ بعد میں صرف تین دن باقی تھے مگر وہ دعویٰ ہو جاتا، باپ سے بھائی کا جواب لکھ جاتا اور یہ بھی باپ کو مار جاتا۔ بڑا بھائی ان کے پاس آیا۔ عہدِ اعلیٰ نے دھار کے بھانے سے اس کو لڑنے کو چھوڑا اور تین دن کے بھانے کا بدلہ ان کے لیے اس کو نہ جانے کہاں الپ کر دیا۔ کسی کو خبر تک نہ گئی۔ بعد ازاں بھانے کے بعد چھوڑ دیا اور بیکار کی چائیس چلے کر وہ لوگوں میں بے جا کا دعویٰ کرنا کہہ دیں واقعات کا ذکر کرتے ڈرتا تھا۔ اس مطالبہ کسی کو بھی نہیں تھا۔ اپنے ذاتی معاملات میں ان کو کسی کے ساتھ زیادتی کرتے دیکھا۔ محل میں ہر شخص سے یکساں کاہنہ تھا اور کوئی اس کی خدمت انہوں نے نہ کی ہو اپنی بات کے وحشی تھے اور اس کے سے ایسے مضبوط تھے کہ جس بات پر حاضر ہو گئے پھر اس سے نہیں بچتے تھے چاہے کچھ ہو جائے۔

ایک مرتبہ طاعون آیا۔ بیماروں کی خبر گیری، مریضوں کی چاروازی، دیکھنے کا دل کرنا، سب اپنے ذمے لے لیا۔ طاعون کے نام سے لوگ گھبراتے ہیں مگر یہ ہر جگہ پھیلتا جاتا ہے۔ نہ معلوم کتنے عرصے خود اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتار دے، لوگوں نے کہا انھیں لے لو مگر انہوں نے بڑا بھی نہ کی۔ ان کے مرشد نے ایک تعویذ بچھا تھا، وہ تعویذ دے کر تے کے نیچے لگے میں ڈال لیا تھا۔ اور سورۃ تھن کی حوالہ دے لکھتے تھے اور اس طاعون کی جاقم ہونے کے بعد عہدِ اعلیٰ کا اثر اور اثر پہچاننا خاصا بڑا کیا تھا۔ اول تو ایسے آڑے وقت میں لوگوں کے کام آئے تھے۔ دوسرے وقتِ رفتہ جگہ جگہ پھیلنا اور بھی پیدا کرانی تھی، بہت سی دکانیں بنوائی تھیں، جن میں کرایہ دار بہت سے وقت کرایہ کا خیال اس قدر نہیں کیا جاتا تھا جتنا اثر بڑھ جانے کا اور لوگوں کو اپنی پارسی میں شامل کر لے گا، چنانچہ یہ سبیل اور اس حرکت پورے و غیرہ کے انگلیش میں ان کا کینڈ پڑے اور ان کی پارسی میں جتنی تھی۔ انھیں وجہ سے اگر عہدِ صاحب سے کوئی بات کہہ دیں تو اس کو بالکل مشکل ہو۔ چنانچہ ان کے مکان کے قریب ایک زمین تھی جو ایک شخص نے مول لی تھی، عہدِ اعلیٰ اس کے خدا معلوم نہ تھے۔ یہ راضی اس کے بھی موقع کی تھی اور اس کے بھی گھر ان کے عہد کی سب سے وہ اٹھارہ نہ کر سکا۔ اسی زمین پر انہوں نے ایک عظیم سا مکان عمارت تعمیر کیا اور بھی تیار ہوا تھا، اور خیال تھا کہ مہمانوں کے لئے وقف رہے گا۔ نماز روزے کے بڑے پابند تھے مگر اس کی تھوڑی زیادہ خشک بھی نہ تھے۔ دوست اصحاب کے ساتھ چوک بھی چلے جاتے تھے۔ خود ان کے گھر پر بھی

اس طرح کی صحبتیں آراستہ ہو جاتی تھیں۔ ان کے کمرہ میں گونے میں پایاں اور تان پھردھکی رکھا ہوتا تھا مگر یہ سب دوسروں کی خاطر اور آشنا پرستی میں گوارا کرتے تھے۔ خود ہیٹ بے لوث رہتے تھے، جس پرستی تک کہ ہاتھ جانتے تھے۔ مگر تڑا سلی میں بھی جھانکنا ہوتا تھا۔ وضع داری کا یہ حال تھا کہ ریاست پھر میں کسی زمانہ میں بیکار تھے اس سلسلہ کو منتقل ہوتے برسوں گزر گئے تھے لیکن ان کے نام کا سنا آج تک نہ آتا تھا۔ انھیں صاحب کی جانچو جانچائی نہیں، وہ لگی تھی دکھائی دے، اور انھوں نے اس وجہ سے کہ ان کی مصروفیتیں بہت زیادہ تھیں۔ انھوں نے انھیں صاحب کو منظور کیا کہ ان کا نام صاحب کے نام ہو جائے۔ یہ سب کچھ تھا مگر آج تک ان کو اپنا آقا ہی سمجھتے تھے، اور یہ کام ہوتا تھا اپنا کچھ کر کرتے تھے۔ انھیں صاحب کے بیٹے اور بہت قریب قریب ہمکن تھے۔ جس وقت کہ یہ واقعہ بیان کرتا ہوں، عبدالغنی صاحب چالیس اسیالیس برس کے تھے اور شہامت علی انھیں صاحب کے بیٹے کا سن 35 برس کے قریب دہا ہوا۔ آدمی ذرا شو تھیں حراج تھے، مصلحتات کی پیروی میں بہت آگاہ کرتے تھے۔

مگر بازار میں بھی، ہر وقت ہی دہداری بھی
 ایک مصیبت ہے جوانی بھی دھبہ داری بھی

اور چونکہ عبدالغنی صاحب کی وجہ سے کھانے اور قیام کی جگہ سے بے لگہ تھے، اس لئے شوقی بھی آزاری سے پرہیز ہوتا تھا۔ عبدالغنی صاحب کے لگہ میں ان کا کمرہ مسجد و تھا پورنک کی طرف نکلتا تھا۔ اس لئے اگر رات کو انھوں نے کسی کو بلایا بھی تو کسی کو خبر نہ ہوتی تھی۔ عبدالغنی صاحب سے کوئی شکلف نہ تھا۔ خود ان کا دل چاہا شہامت علی کی خاطر سے مصلحت و مصلحت کو چلے گی آئے اور یہ دیکھ کر کہ خاندان میں پائے اور لوٹا جاساں پانی کا، مگر سب سوچو رہے چلے گئے۔

شہامت علی جب مقدمہ کے سلسلہ میں آتے تھے تو عموماً دو تین دن رہتے تھے اور جب شہر کے قیام کوئی عذر مستقل نہ رہا تھا تو چلے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ خلاف عادت کی دن رہے پیر کی جگہ پر بیٹائی، ایک طرف مندی سے عبدالغنی کو پوچھا، تم چھٹے گئے تھے تو ہے۔ شہامت علی "یار کیا کہیں، یہ سامنے درزی کی دکان نہیں ہے اس کو غصے پر ایک دفعہ ڈال دینی ہوتی ہے۔ کہیں باہر کی ہے۔ میں نے اب کی ہی دور سے شہر دیکھا ہے۔ ابھی ہفتہ کیچہ رہے مگر وہ نام کسی طرح رنگ پر آتی ہی نہیں۔ کچھ ہم نے بھی حواقت کی کہ اپنے دل کا اور اس پر ظاہر کر دیا۔ اس کے بعد اب تو اس کے حراج ہی نہیں ملتے۔ تمہیں خان کو درمیان میں بلا کر وہ پابندی کا ذکر کرتی ہے۔ اور یہاں یہ حال ہے کہ خواب و غور حرام ہے۔ رات کی بیداری اور جیو جیو ہم کو پیش کرتے ہیں وہ اور کچھ بتاتی ہے۔"

عبدالغنی: "ان کو اپنی دفعہ میں بھی تو خرابی ہوتی ہے کہ ان کو خاطر دہداری میں لگاوت، سب کچھ کریں گی مگر مٹانے کی بات پر عجب حراج کی لینے لگتی ہیں۔ اور اگر کہیں مجھ سے ملنے کی بات ہو تو میں تو آسانی نہ ہوتی تھی ہی سمجھ کر آگئے۔ چھوٹے سلی ہی ناگاہ صاحب کتنی جیہ۔ نا صاحب ابھی مری پائی تم کہنا ہے کچھ دن آئے ہائے مٹانے چھٹے لڑکی سے مانوس ہو جائے۔ آپ اس کی طبیعت بچاؤ لیں وہ آپ کے حراج سے واقف ہو جائے مگر لوطی کو نہ دیکھا ہو سکتا ہے۔

اگر چہ میں آئیگی ہے تو نوکری کا سوال پہلے ہی دھرا ہے، مستقل تعلق کیجئے، پابند کیجئے، اور خود بھی پابند ہونے۔ ہر سب سے بی

خرابی یہ ہے کہ اگر حلق ہی نہیں، اور حراشی کے گڑبگڑ میں نام چھپائیں۔ اگر بڑے بڑے لوگوں کے نام سے یہ اپنے کو نہ منسوب کریں تو اصل طبع والی کہلائیں گی۔ اگر چوری چھپے حلق کھینچے تو اس میں بھی شب تک جھٹکوں، حاضری نہ دے جھٹکے اور ایک کی جگہ چار طرح نہ کھینچے کام نہیں چلتا۔ تمہارے معاملے میں ان کا فیصلہ ہے کہ تم یہاں کے رہنے والے نہیں ہو۔ پورا دل کی رسائی، چھری چھپے بھی ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں دھم بھٹکے پہنچے آجھڑتے جاتے ہیں اور عام طور سے کانٹے کا نام بھی نہیں ہوتا۔ خبر چلو راہم بھی دیکھیں۔ اسی طرف سے بنامکان بھی دیکھتے آئیں گے۔ آج کی دن سے جسں گئے۔ ٹھنک، چٹک، کرسیاں اور پھر تو کھینچ گئی ہیں ذرا دیکھنا ہے کہ کس طرح سے کہا جا رہا ہے اس طرف سے کھڑے کھڑے سدا ہاں میں چٹا مکان کی آرائش یہ فیروزہ میں تمہارے حلقے کے ہم بیٹھ سے قائل ہیں۔"

اس دہڑی کے یہاں کھینچ کر یہاں عیدالمنی صاحب نے منہ سے تو جگہ نہ کہا، مگر شہامت علی کا ایسا ادب و لاف لایا کہ گویا یہ ان کے اوقتی لازم ہیں۔ ایک ایک ٹکڑی دھڑکی کی اور دیکھیں صاحب کی طرف سے کچھ دے کر دونوں آدمی اٹھ آئے۔ لیکن صاحب وہاں رنگ ہی چل گیا اور یہ لوگ دھڑکتے ہوئے اور رادھارنگ نے استاد و محسن خاں کو لایا، کچھ سرگوشیاں ہوئیں، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاملہ در براہ ہو گیا۔ پیغام بھیجا کہ لوطی کو حکم میں بھی بڑھ رہا ہے۔ صرف بات یہ ہے کہ رات میں دوسرے کی پابندی ہے، اس کو چپ چاپ بے گڑبگڑی دہ گڑبگڑی کے لیے طلب کر لیجئے۔

اب دھڑک یہ ان چنی کر رات کے لیے تو ان کا کمرہ مناسب تھا مگر ان کے لیے بالکل ناموزوں تھا۔ عیدالمنی کے اعزاء کو کر پا کر، لڑکے سب ہی موجود تھے۔ مناسب بھی معلوم ہوا کہ وہی تو قیصر مکان ٹکلیہ کے لئے کام میں لایا جائے۔

عیدالمنی بکھری جا چکے تھے۔ چنانچہ شہامت علی نے ایک لڑکے کو دوڑایا کہ عیدالمنی سے اس مکان کی کتنی بات کہانے، یہ بھی کھانا بھیجا کہ جب فرصت ہو تو خود بھی چلے آئیں۔ کتنی تو انہوں نے لگھو لگھو اور خود کھڑی دیر میں آئے تو کہا۔ کچھ مراد ہاتھ آگئی، اب عیدالمنی کو کون یاد کرتا ہے۔ انہوں نے نوکر کو تو اس دہڑی کے یہاں بھیجا اور نوکر کتنی جیب میں لے کر اس سے مکان کی طرف چلے۔ سب سے پہلے ہی کھول کر دیکھا کہ پانی آ رہا ہے۔ اس کے بعد چٹک کی طرف متوجہ ہوئے۔ تو اڑکی چٹکڑیاں سچھو دھیمی ہوئی تھیں۔ ادھر دیکھ لکھو نہیں ہے نہ کسی، اونا بھی نہیں ہے۔ مگر شہامت کی الماری میں جبکہ اور لگاں تو ہیں۔ پھر کچھ پان منگولے چائیں۔ نوکر جب آئے گا تو وہ ہی لے آئے گا۔ شہامت علی صاحب کی بے تابی بیان کر کے اپنے چہرے دھڑکنے والوں پر ناخوشی کا اظہار کیا کہ انہیں چاہتا۔

قدر مختصر کچھ انتظار کے بعد مشفق خمیر پر شریف لائیں۔ انہوں نے دھڑکتے دل سے استہلال کیا۔ نوکر کو گھوڑیاں، عرف، سمیٹہ لیٹے کو بھیجا اور پاس تو بٹالیا مگر نوکر کی رہائی کے انتظار میں رہے۔ جس اور نہ چاروں نہ بڑھایا۔ جس جو باتیں اعتماد شوق کی بالکل پیش پا قدمہ تھیں ان کا ذکر نہیں مگر لگاؤ نوکر کے دھڑکے میں دھڑکی سے جڑی رہی۔ اسے میں نوکر بھی آ گیا اور اس کے ساتھ میں عیدالمنی بھی آ دھڑکتے۔ اس کو دیکھ کر شہامت علی صاحب کے چہرے پر مسرت، خلوص اور شکر گزاری کا اظہار کیا۔ مگر عیدالمنی صاحب کے چہرے پر عتاب ہیہ اور تنبیہ کی ممانعت۔ بلکہ اس سے بھی بالاتر وہ کہنے سے گھبراہٹ ہوئی ہے۔ جبکہ آدمی مراد سے کو نوکر ذکر کسی دوسرے کے خلاف دھڑکے فیصلہ کر لیتا ہے۔ شہامت علی کا دل دھڑک سے ہو گیا۔ دہڑی کے دوسرے بیٹھوں میں بیٹھنے کی دعوت دی مگر عیدالمنی نہ بیٹھے۔ ایک دیکھنے پاپ کھڑے رہے، اس کے بعد کہنے لگے۔ "پارسنہ۔ تم جانتے ہو کہ ہماری چیز، ہاں مال، درختوں کے لئے وقف ہے مگر ابھی مکان میں یہ کام نہیں ہو سکا۔ ابھی اس کمر میں میلا دھڑک نہیں ہوا ہے۔"

معنی تال

علی محمود

علی محمود کا تحریر کردہ تیسرا افسانہ ”موسیٰ“ لڑ آواں، جولائی 1910ء

پیارے دوست!

قیام معنی تال اب اس قدر مضحکہ رو گیا ہے کہ شاید یہاں سے یہ آخری خط ہے۔ تمہارے یہاں آنے کی جگہ کو حسرت رو گئی۔ مجب جانفزا اور بہت اظہارِ محبت ہے۔ تم دو گئے کہ بہت خوش ہوتے اور دل پر ایک کیفیت لے کر جاتے۔ بہر حال جب کبھی بھی آؤ گے تو یہاں کے مناظر زیبا تر قسمت و مقدر کرو چکے۔ بلا آسمان، ہوائے ہاں پر در کے سرد جھونکے، برگہائے نوخیز کی خطی و فرخ تاک، ہنری، بھون کی نازک و رنگین چھایں، مساب دار کھجور کی ٹھیکل پرور تھائی، فائنٹ در و در کی دلدور آواز، قمیص وارت و در ہوش کر گئی! چنگو فضا ملو! گرو سے صاف رہتی ہے۔ اس نے جانے کی اتنی آہنی موثر تو چٹھن ہوتی ہے، کہ قریب اندوار گھر سے باہر نکل پڑو گے۔ نظر اٹھا اٹھا کر بھی تاروں کو دیکھو گے، کبھی نام تاروں کو کبھی بیٹو جاؤ گے، کبھی کھڑے ہو جاؤ گے، یہاں تک کہ اس طرح ساری رات آنکھوں میں کٹ جائے گی۔

قیمم سحری طلوع آفتاب سے بہت پہلے تمہاری خواہگاہ میں آکر قہقہے جگانے لگی، کہ آس پاس کے درخت کی چڑیاں خیر خیراں کر رہی ہیں، جھمک آ کر کہیں پر سوتیلوں کا ہار پڑا ہے، افق مشرق میں دو لعل خیانت دہی ہے، گنگھائے نازک و رنگین ہے پردہ کھڑے ہیں اور تم سو رہے ہو! یہاں تک کہ ہوائے شوق قہقہے میں دو دو دو لے جائے گی، آواز ہمارے جگدجوں پر چڑھا کر دامن صحر کا لطف دکھائے گی۔ کر کوہ پر علم دار پر چڑھ راستے نہ لگی۔ صاف و سرد پانی کے گھرنے، دیکھو گے، جگدجہ پر چھوٹی چھوٹی کیمیناں آخر آ نکلیں، چڑیوں کی مٹھی اور پکلی آواز سنو گے، یہاں و ہاں گنگھائے خوش رنگ قہقہے آ گے جو صحنے سے دو کیس کے ان کو دیکھو گے۔ مسرت سے مسکراؤ گے، اُن کی نزاکت، نالغ ہوگی، مگر تم سے صبر نہ ہو سکے گا، تم انہیں قہقہے، سو گھوٹے اور چست ہو کر پیسے دو گے۔

اور پھر لوں بھجوں کی طرح یہاں کی بھی کبھی تمہارا سرور اور مسلمان معلوم ہوگی، مگر یہاں اس وقت بھی ایک عالم ہوتا ہے۔ مہا طرفداری کا دلدادہ کسی بلند، مساب دار اور غصہ سے کچھ میں ترس گھاسوں پر چڑا ہوا ہے، لار ٹھیکل کی پاک جھوڑ دی ہے کبھی پاس کے جگر سے پانی کے رستے اور

مگر نے کی خرم آواز کا نواں میں پڑ رہی ہے اور ہوا سے خوشگوار کے خوب آواز بھی گئے اس کے سر کے بالوں کا الجھا رہے ہیں کہ دھلتا کسانوں اور
 لکھ بانوں کی جھڑ سے لڑکیوں کی جھڑ سے آج صدا کا نواں میں پڑتی ہے، وہ اندھ دھندلے اور بے رنگ گلوکار اور جتا ہے، اس لئے کہ وہ علویا طوطی
 نگر، سوزوں اندام اور نغمہ فریب ہوتی ہیں، اور گمان کا لہاس یہ قطع ہے مگر ان کا قاسب اصناف نظر کے لئے سبب آراہوتا ہے اور علویا نگریاں
 چراتی ہوتی ہیں، درختوں کے نیچے جڑ کر کھڑے ہوتی ہیں۔ یہ باکانا کھینچتی ہیں، کوئی ہیں، اور بھڑک رہی ہوتی ہیں۔

پہاڑیوں کی ہولناکیں شہادی کچھ میں نہیں آئیں گی، مگر ان کے پیادوں کے میں تم سادگی، جھناوٹ اور دو پاؤں کے جس کے اثر سے جہاد
 دل بھی تھوکتا ہے، رہے گا۔ وہ سنانے کے عالم میں جس وقت اونٹنی اور دولہا انگیز لے سے گاتے ہیں قرآن کی آوازیں چنانوں سے اچٹ اچٹ
 کر دلوں سے بگارتی ہیں اور دیر تک دینے والے دل کا پتھر رہتے ہیں۔

ان وقتوں میں عمارت پر بار بار دستوں کی آوازیں بھی کچھ تم دھریب نہیں ہوتیں، حریفیں دہلاؤں گدھ اونٹنی اور کھیل چنانوں پر بیٹھے
 ہوئے کسی ہاں بلب ہانور کی صحت کا انتظار کر رہے ہیں۔ بدینت اور دھوکہ باز کو اس طرح گردن سوزے مینا ہے کہ کیا کچھ نہیں جانتا، مگر
 حقیقت میں اس تاک میں ہے کہ قتل نے جو فکھار کیا ہے اُسے کسا لے۔ گہری آواز دہلی ہوئی اخروٹ کے چھلکے کھڑی ہے۔ پہاڑی چنا کسی
 شام پر چٹنی آراہانے شعلہ کی شعلہ کر رہی ہے اور دوسرا چند ناست پھندہ پھندہ لفظ سے پانی میں غسل کر رہے ہیں۔

انہیں تماشوں میں تھیں شام ہو جانے کی اور غروب آفتاب کا عالم دیکھ کر بھر کمرہ جھٹکتے لگے، کیونکہ یہ وقت بھی یہاں نہایت ہی مختار
 انگیز ہوتا ہے۔ اور آفتاب سر کوہ کی طرف جھکا اور اعلیٰ مغرب میں آگ لگی، لہجی ہوئی سہری کونوں سے تمام رنگ کھڑا اور دھن ہوئی، انگریزوں
 اڑنے لگیں، ہوا سے سرو کے جھوکے چلنے لگے، بلند تھیں اور تباہی پھندہ پھندہ آوازوں کے قریب آ بیٹھے۔ شفق پہلوتی شروع ہوئی، لہجی انہیں اڑنے
 لگیں اور آفتاب غروب ہو گیا، اب کھاس نم ہونے لگی، پھول سرنگوں ہو گئے، تاریکی پھیلنے لگی، چناں چپ ہو گئیں اور چناں طرف اندھیرا
 اور سناہ ہو گیا، اگر سے گھر سے جا رہا ہے، ہو گئے اور وہ ان پندرہوں پر ہولناک سکوت چھا گیا۔

یہ نہ بھٹکا کہ فرصت ہو گئی۔ ابھی سر پر تاروں لٹری رات بے چھن کرے تو کھڑی ہے۔ حدت کے ہندیاہ فٹ جاگ اٹھیں گے،
 صرستہ دھنگر ہو جائے گی، جزاوں آوازوں اور تھناؤں کا جھوم ہو جائے گا، وہ نہ جانے تھرا دل کیا کیا پانے لگے گا۔

مگر تم کوہ کے کسی بھی جگہ کھو کھو نہیں، دکھایا، میں نے اس لئے نہیں دکھایا کہ وہاں کچھ دیکھنے کے لائق نہیں۔ بازاروں کے مکانات
 عموماً پست، تاریک و بے فضا ہیں جن میں تم پاپ اور ملازم بیٹوں کو کریموں بھرنا نہ کر رہے ہیں۔ تم ان کو کئی ضرورت سے ان مکانات میں جاؤ
 گے تو کئی بات پر تھرا سے سر میں چٹکے گی، کھوپڑیوں پر سے ہر پھیلنے لگے اور خود ہی دیر نہیں پڑے گی کہ وہ میری سے کھرا کر اٹھ
 کھڑے ہو گے۔ وہ ہے کہ چکر کی قلت کے سبب باور پائی قریب ہے اور نہ صرف باور پائی خانہ، باور پائی خانہ، نصرت خانہ، فصل خانہ،
 صحت خانہ، سب ایک جگہ پر ہے اور اس روش کے مکانات اس قدر تکلیف دہ گھونٹنے ہیں کہ، یہ کہ وہ کھٹکے لگتا ہے۔ مگر غریب و افلاس نے مصطفیٰ
 دلفاست پھندی کے احساس کو اٹھا کھنکھ کر دیا ہے کہ اس طرح کا بھی کوئی مکان خالی نہیں، البتہ انگریزوں کی کونسیاں اور پانڈیا اعلیٰ وطن کے
 ہنگے، جو بازاروں سے دور اور ایک دوسرے سے الگ الگ بلڈیوں پر واقع ہیں، وہ حقیقت میں میں درامت کے اعلیٰ ہیں، جن میں ہر وقت
 ایک کیفیت رہتی ہے۔ رات کے وقت ان مکانات کی روشنیوں سے پہاڑوں پر چٹاؤں ہو جاتا ہے۔ کسی ہنگے سے چٹاؤں کی آواز آ رہی ہے،
 کہیں ہادہ پست انگریزوں کے گھاس اور بھال بھال کر رہے ہیں، روشنی آراستہ کھڑوں میں تھان فرنگ کو آراستہ دھڑک رہا ہے۔ ایک طرف

افسران اعلیٰ اور پختل القدر حکام، سیکرٹری و اخبارچی میں مصروف ہیں، دوسری طرف سائناتوں میں فراغت پسند دولت مند انگریز آرام کر سہوں پر لیٹے ہوئے قلم نگار رہے ہیں۔ انہیں ہنگاموں کے قریب اور پھاڑوں کی گود میں وہ بدلا اور خوشنما تالاب یا "تالی" ہے جس میں راست کے وقت مارے نہاتے اور بہتا بہتا نکلتا ہے۔ اس کے چاروں طرف ایک سڑک گھوم گئی ہے، جس پر سایہ دار درخت لگے ہوئے ہیں۔ جن میں ہر باب محبت کا بیج اپنے رنگین کے لئے آچھتے ہیں۔ شام کے وقت سب آ ب پر چھوٹی چھوٹی کشتیاں دوڑتی بھرتی ہیں اور ان میں بادشاہان طاقت فرما، تفریح و تعلق کا وقت گزارتے ہیں۔

آج تم تمام دن مناظر پرستی میں مصروف رہے۔ کل کچھ اصحاب تمہیں محفل و قصہ اسرار میں شریک کرینگے۔ مگر یہاں تمہیں گالے کا کچھ بہت زیادہ لطف نہیں آئے گا۔ کیونکہ زبان دلچسپ کی ناقص، اقلیت کے سب اکٹھے ہارے گیت اور غزلوں کا خون ہو جاتا ہے۔ گونجیں بعض مستثنیات بھی ہیں۔ خیر کا انداز کسی مکرر دیکھنے کے قابل محفل میں سے ہر باب اولیٰ اہل نظر کو دکھارہ ہو گئے۔ اس لئے کہ کسی کی نگاہ غلط انداز دل میں اتر گئی اور کسی کا ہر دین آنکھوں میں کھلب کیا۔

لغان کین لولیاں طوط و شیریں کار و شہر آشوب
چنان بدو مبر از دل کہ زمان طوان یلما



بہراشہزادہ

غولہ حسن نظامی

غولہ حسن نظامی کے ابتدائی افسانوں میں سے ایک ”مطلوبہ“ ”ہمیں“ کا پورا پورا مجموعہ 1913ء

بھٹی کے تاج محل ہوئی میں مہاراجہ بھادراگر ظہرے ہوئے تھے۔ یہ برسات کا موسم تھا۔ سمندر میں صبح شام طوفان برپا رہتا تھا اور پانی کی آوازوں سے مسافروں کو قریب کی بات سنی بھی دشوار تھی۔

تاج محل ہوئی میں ایک خانہ اس سڑاق پر اس کی عمر کا ذکر تھا۔ جواسنے کام میں بہت ہوشیار اور تجربہ کار رہا تھا۔ اس خانہ میں کا نام قسمت چک تھا۔ ایک دن صبح کے وقت مہاراجہ بھادراگر نے چنگ پر لیٹے لیٹے قسمت دیکھ سے کہا ”میں نے چند مہینوں کو بچ پر بلا دیا ہے۔ پھر سے کہہ دیا کہ اس مہینوں کا انتقام کروں“ سمندر کے پانی کا تل شور مہاراجہ بھادراگر کی دھیمی آواز اور صبرہ خانہ میں یہ علم کیا کہ اس کے کاؤں تک پہنچ کر قسمت دیکھ کی قیصر رانی کا یہ عالم تھا کہ ہونٹوں کی حرکت سے مطلب سمجھ لیتا تھا آج ایسے اسباب جمع ہوئے کہ قسمت چک مہاراجہ کے حکم کو نہ سمجھا۔ اور اس نے ذرا چنگ کے قریب آ کر نہایت تہذیب اور ادب کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر سوال کیا کہ ”جو ارشاد ہوا ہے اس کی تعمیل ہو جانے گی لیکن اگر تکلیف نہ ہو تو تھوڑی سی تحصیل اور فرواٹی جائے۔“ مہاراجہ بھادراگر بالکل نہیں سمجھے کہ خانہ میں نے اس کی بات نہیں سنی تھی اور انہوں نے خانہ میں سے دوبارہ کہا کہ جن دن آدیسوں کو بلا دیا ہے وہ اعلیٰ درجہ کے لوگ ہیں۔ بچ کا اجرام اعلیٰ قسم کا ہونا چاہیے۔ قسمت دیکھ نے بات سمجھ لی اور ادب سے کہا ”جو حکم۔ فرمان کی پوری تعمیل کی جائے گی“ اور یہ کہ کر تھی قیصر رانی کے ساتھ جھپٹے تھے ہاتھ کر سامنے سے ہٹ گیا۔

مہاراجہ بھادراگر دیر تک سوچتے رہے کہ انگریزی ہونٹوں میں سب خانہ میں انگریزی ادب اور ادب استعمال کرتے ہیں۔ یہ بڑا حاکم ہے۔ جو پرانے زمانے کے شرقی ادب اور ادب کو استعمال کرتا ہے اس کا حال معلوم کرنا چاہیے۔ انہوں نے خدمت کار کو بلا کر حکم دیا کہ ”آج بچ کے بعد ملاقات کے کمرے میں قسمت دیکھ خانہ میں کو بلا دیا جائے۔ ہم اس سے کہو کہ تم کرنی چاہتے ہیں۔“ خدا شکر کہ کہا ”مصور اور بہت بد مزاج آدمی ہے۔ تو کرنی کے وقت تو بہت اچھا ہے لیکن دوسرے وقت میں وہ بہت بد مزاج ہو جاتا ہے۔“ ”مہاراج نے کہا ”میں کون ہے؟“ خدمت کار نے جواب دیا ”مصور اور کہتا ہے کہ میں ہندوستان کا بادشاہ ہوں۔ صاحب لوگ کہتے ہیں کہ اس کے دربار میں کچھ کڑی ہے۔“ یہ سن

کہ مہاراج مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ پھر کمرست کا دوسرے کہا "کچھ پرانا نہیں۔ قسمت ایک سے کہہ دو کہ وہ لٹکے کے بعد ہمارے پاس آئے۔"

مہاراج بجا دو گھر دو چور خانہ کھینچ دو پیر کا کھانا کھا کر باتوں کے کمرے میں آئے۔ تو مہاراج نے قسمت ایک کو بلایا۔ قسمت ایک نہایت ادب سے حاضر ہوا۔ اور تین فرشی سلام کئے۔ مہاراج نے کہا "قسمت ایک تم کون ہو؟" قسمت ایک نے کہا "مختور گستاخی موصاف۔ اس کا جواب تو آپ کو بھی معلوم نہیں ہے کہ ہم سب کون ہیں اور کیوں ہیں؟ چاہیں پیدائش کے لئے ہیں۔"

قسمت ایک کی یہ عجیب تقریر سن کر حاضرین بہت دنگ ہو گئے۔ کہ خاندان کسی غلط فہمی کا شکار ہے۔ مہاراج نے کہا "یہ شک ہم کو اس کا جواب معلوم نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم نے زندگی کی اس مشکاک کو گھٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے تم میرے سوال کا جواب دے سکتے ہو۔"

قسمت ایک نے کہا "مختور میں ایک آدمی ہوں۔ نسل کے لحاظ سے چوہری نسل ہوں۔ جو شر کے لحاظ سے تان گل بہن کی خاندان میں ہوں۔ عمر کے لحاظ سے بڑا حمار۔ طبیعت کے اعتبار سے کبھی بچہ اور کبھی جوان۔ بھوت نہیں ہوں۔ چوری نہیں کرتا۔ خدمت غلط کو اپنا مقصد نہ مانتا ہوں۔ گناہوں لیکن دل کے تحت پریشان ہوں۔" قسمت ایک کی موثر، مسلسل اور برصہ تقریر سن کر بے اختیار مہاراج کی زبان سے نکلا "کیا تم چوہری نسل کا دوسرے انسان کو کلام بنانے کی کوشش کی تھی۔ آپ نہیں تو آپ کے باپ دادا تو اس کے غلام تھے۔"

چوہرہ بھی کہ مہاراج نے سر ہٹا لیا۔

گنہگار کے بعد قسمت ایک نے کہا "مختور! میں ان لوگوں میں نہیں ہوں۔ جو باطنی پر فکر کریں یا احساس کریں۔ میں باطنی کا ایک ہوں، حال کا ایک ہوں، اور مستقبل کا بھی۔ ایک ہوں۔ یہ آسمان بھی میرا ہے۔ یہ زمین بھی میری ہے۔ یہ سمندر بھی میرا ہے۔ اور آپ سب لوگ بھی میرے ہیں۔" یہ کہتے کہتے قسمت ایک نے اچھٹا شروع کیا۔ اچھٹا جاتا جاتا پھر رہا کہ جاتا جاتا تھا۔ "میں ہوں۔ میں ہوں۔ جو کچھ ہے جو کچھ تھا۔ کچھ جو کچھ نہیں ہے۔ کچھ نہیں ہے۔ میں ہوں۔ میں ہوں۔ میں۔"

اس کے بعد قسمت ایک نے کہا "اب سنئے گھوڑا چار خاندانوں کی کہانی سنئے۔"

"بہادر شاہ بادشاہ کا بیٹا ہوں۔ میری ماں لوطی تھی اور بادشاہ کی محبوبہ۔ خیر 1857ء کے انقلاب میں میری عمر اس سال کی تھی۔ گھبراہٹ میں بادشاہ کو میرا اور میری ماں کا شاید خیال بھی نہ آ پاتا ہوگا، کیونکہ میری ماں ال ال قلعہ کے باہر ایک مکان میں داخل تھیں۔ جب دہلی کے باشعور نے مجھے تو میری ماں نے جھکوا اپنے ساتھ لیا اور پیدل گھر سے روانہ ہوئیں۔ دہلی سے نکل کر ہم دونوں قدم شریف کی درگاہ میں گئے اور راستہ پر ایک فونے ہوئے مکان میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ صبح بعد کوستانی فوج کے سپاہیوں نے میری ماں کو گرفتار کر کے ایک انگریز افسر کے سامنے پیش کیا۔ جس نے تمام حالات سن کر رحم کیا کہ ان دونوں کو آرام سے رکھا جائے۔ چنانچہ ہم کو ایک چھوٹا سا خیمہ دے دیا گیا۔ اور دو وقت کھانا ہم کو مل جاتا تھا۔

اس خیمہ اور میری والدہ کے نام میں روپے ہزار ہزاروں کے لئے مقرر کر دیے گئے۔ میں نے دہلی علی میں ایک خانہ ماں کی شاگردی کر لی اور جب میری والدہ کا انتقال ہو گیا تو میں دہلی سے سمجھتی چلا آیا اور اپنے ساتھ سے تان گل بہن بھی لے کر لیا۔"

مہاراج نے ایک خطا سانس لیا۔ انہوں نے اسے ایک ہزار روپے کا چیک کھد کر دیا اور کہا۔ "آئندہ وہی ہر سال بہن کے شجر کی مصروفیت ہزار روپے تم کو مل جائیگا کہ۔" قسمت ایک نے پھر سلام کیا اور چیک لے کر روانہ لگا اور جیسے قدم بہت کہ باہر چلا آیا۔

ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر

نیاز فتح پوری

نہال فتح پوری کا پہلا مطلوبہ افسانہ، مطلوبہ "قافز" مئی 1913ء

بیر کرنے والی، عالم نواری شیرازی، ایک نور پاشا اجتراز کے ساتھ خلاف فرمان، بیکر آتش، لاک بے خبر، مصروف شاہ شہنشاہ کی بجلی، ایک جسم تفریح، خدا بنیاد سے طراز کھلی رنگ میں ڈوبی ہوئی برقی تحریک، اچھے میں اپنے اٹارہ ہم سے اک اچھو اب منظر پیدا کر رہی ہے ماور میں ہوں کس وقت بھول کی طرف کھنچا جا رہا ہوں۔

روح کی تیز کر میں، مجھے ایک سو ب کا صلہ پر رکے ہوئے خوب رہی ہیں، ترپا رہی ہیں، آواز، وہ برقی پاشا نکاحیں، وہ طبعیت سوز نظریں، میرے دل و جگر سے پار ہو کر گزر رہی ہیں۔ اور میں ان کو سمیٹ کے، اپنی حریفیں آتش خلق سے ملا کے، اپنی تحیر، طامع، کشادہ آنکھوں میں اس شعلہ معطر کی پرستش کر رہا ہوں۔

آہ، یہ نہت باز ندگی، یہ شعلہ ترکیب محاصرہ، یہ شاداب حسن روغن و میرے وجود کو، میری روح لڑاں کو سمور کر رہا ہے، اپنی آنکھوں کے شعلہ خیال سے، اپنے بالوں کی بوئے فلفلی سے، اپنی شان بے خبری سے، اپنے خرام وقار سے، اپنی کان کے جسم آوازوں سے، اپنی بلوری کھانچوں سے، اپنی گوری گردن سے۔

میری روح نوٹ نوٹ کے، پاش پاش ہو کے اپنے کھلے شخص سے مل رہی ہے، جس کو شعلہ نظر جلانے والا ہے، اور یہ خاک ہو ہو کے اس کے نازک قدموں کے نیچے پس پس کے ٹپا ہو رہی ہے۔ اسے غزل کی آواز، غزل کی آواز، دانی دوشیزا، اسے ہر سانس کے ساتھ سینہ کو ابھار کے دماغ سے قوت احساس چھین لینے والی تصویر طرازیں، اسے شوقوں پر چھوٹی ہوئی زلفوں کے پرکے کاڑھے والی پری، اسے کالی بجلی والی مانی پکوں والی، نازک کمر والی لڑکی، خمیر، خمیرہ میں بھی میرے ساتھ حیرے، سبک خرام وجود کے ساتھ، حیرے یا سبکی شہاب کے ساتھ چلتا ہوں، تو چلتی چلتی کمزری ہو کے غفران، تو خود اک شعر ہے، اسی حیات، موتیقی ہے خراماں، تو مجھے دیکھ کے انکی تان میں کہ گویا مجھے جس دیکھتی، میری روح بے آرزو، اک آرزوئے بے دروغ ہے، جس کو سائے مٹ جانے، خاک ہو جانے کے اور کچھ نہیں آتا، اپنے وجود کا صدق نہت، اپنی ہستی

کا صدقہ نذاکت اک دلم کاری اور گائے چا افوا خدا کرے، تیری تکلفی کا کم رہے تو خوش رہے، اچھ کو یہ جیری مہر آ گئی مہارک رہے،
 اچھ ایسے، اچھ ایسی مہر ورجا دوجا دالے، اچھوں، روز جیرے اسی حسن و شہرہ پر قربان ہوتے رہیں۔



حوالہ:

۱۔ نچرناچ مہار کے اپنے بیان کے مطابق چالسا نونا نکل اچھ اور سے چا ٹر ہو کر 1910ء میں کھ گیا اور دو سال بعد یعنی 1913ء میں شائع ہوا۔

پھول

مہاشہ سدرشن

سدرشن کا پہلا مطبوعہ افسانہ مطبوعہ ”گلزارِ گلبرگ“ لاہور، دسمبر 1914ء

میں ابھی فوجی تھکنے اور نرم و نازک سبز چیتوں کی آغوش میں مصروف اسرارِ است تھا کہ ایک روز آسمان پر ابر تھا، ہادل تھا، اور کالی کالی گناہیں تھیں۔ اور نیم مستانہ پال سے باز ہے۔ آہستہ آہستہ چلتی تھی اور مجھے چمکایا دے دے کر چارے، محبت سے دھانے کی کوشش کرتی تھی۔

ہادل گرہا بجلی کڑی اور یوں ادا بندی ہونے لگی۔ میری آنکھوں پر پٹی اور منہ پر کھاب تھا۔ میں دیکھ نہ سکا تاہم میں نے سنا کہ باہر والے پھول بھائی خاموش ہو گئے۔ اُن کے سر فٹس لیٹے آواز قاتلی تھی کہ وہ کم کر ایک دوسرے کے گلے سے لپٹے ہوئے کانپ رہے ہیں۔
تھوڑی سی دیر کے بعد سنا کہ ٹوٹا اور پھر وہی قہقہے اُڑنے لگے۔ میں نے سمجھا ہارٹ بند ہو گیا کہ وہ کم خطرے والی بات گزر گئی۔ جب میں جھنڈی ہوا کے تھکنے سے سلتا، سکتا، سکتا اور کانپ کر بیٹھے گا میرے پھول بھائی آواز دے کہتے، دالیں بن جاتے اور اور مجھ پر پھتیاں اڑاتے تھے۔

ایک پھول نے کہا: ”خفے مہیاں! کب تک رقعہ پسند ہو گے؟ آؤ غلو، غلو، غلو! کیلو اور خوش ہو۔“

دوسرا بولا: ”یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ تم جانی میں! مجھے اور تمہاری میں سور ہے۔ باہر آؤ۔“

تیسرے کی رائے تھی: ”تم بے خوف ہو، یہ سمجھو اور کسی زندگی کی راہ ہے۔“

میں نے کہا: ”میں ہادل سے ڈرتا ہوں۔ بجلی سے ڈرتا ہوں، مجھے ہوا کا خوف ہے، مجھے پانی کا خوف ہے، ایک پھول نے جواب دیا ”جی جی جی! تم بہت ڈرتا ہو۔“

اتنے میں کوئی پاس سے گزرا، وہ کون تھا، میں نہیں جانتا، بعد میں مجھے بتایا گیا کہ وہ شاعر تھا۔ خیر وہ میرے پاس نہ آیا، مجھے چھوڑ دیا کہ

کر کہنے لگا

اے بھول تجری عمر طبعی ہے ایک دن
بہن کر گزار یا اے رو کر گزار دے

پہ آواز سن کر، یہ شعر کچھ کر میرے دل پر چوت گئی۔ میں ضبط نہ کر سکا، چاب اٹھ گیا۔ ہاتھ پاؤں، سرے، پیٹا، بڑھا، اچھلا، کودا مگر میں نازک قدم اور غلاب خستہ۔ میرے ہاتھ، کچے پاؤں، کچے ہنر کو خوش کی اما کھسک کر غلاب خستہ، ماترا، مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔

ابھی ایک ہی سیکڑ گز دور ہو گا کہ ایک آواز ہوئی اور بھول بھائیوں نے غوثی سے، مسرت سے، جوش سے تالیاں بھائییں۔ مہر جاب کے غم سے بلند ہوئے اور شاہنشاہ آفریدی کی آوازوں سے آسمان لی گیا۔

مجھے کیا خبر تھی؟ ایک بھول نے کہا ”دیکھو تو تھہرا“ ایک بھائی تاریکی سے گل کر روشنی اور راحت کی سرزمین میں قدم رکھتا ہے۔ ہم بھی خوش ہیں، مدد بھی خوش ہے۔ آؤ! اھو تم بھی، کر و صحت، اچھا دل و لہب، مانتا، پردہ، دھکم، چراور سرزمین راحت میں اٹھ سے دن گزار دو۔

بھول کی زندگی مثال۔ ”سب نے مل مار کر، ایک دور کے ساتھ، ایک جوش کے ساتھ، مجھے اٹھایا، اٹھا کر بٹھایا، بٹھا کر اٹھایا۔ میرے بدن میں از خود طاقت آ گئی۔ میں نے دور لگایا، کوشش کی، اور ایک آواز پیدا ہوئی۔ آواز کے ساتھ ہی میرا پروہ، میرا غلاب اڑ گیا اور میں نے پچھلی دفعہ باہر دیکھا۔

پچھلی کہوں۔ دینے دیکھ کر میں خوش ہوا۔ خصوصاً اپنے آپ کو نازک، دلرب اور خوش رنگ بھول بھائیوں کے درمیان دیکھ کر تو میں باغ باغ ہو گیا۔ میرے ہاتھ کچے، چیرا دیے گئے اور غوثی کے غم سے لگائے گئے۔

تمام بھول میری طرف دیکھتے تھے مگر میں اس کی طرف دیکھتا تھا جو ابھی ”راحت خوشتر“ مجھ سے پیٹلہ یا میں شپے سے بھول بٹھاتا۔ وہ بھی بار بار میرے چہرے پر لگائیں ڈالتا تھا۔

ہم دونوں، سب بھولوں میں شاہنشاہی، آفریدی تھی اور مصوبیت تھی۔ سینکڑاں لگا ہیں ہمارے چہروں پر قصیں۔ کسی نے ہماری ہایت ہی کہا تھا

ہر اکا مستانہ سر سے پاؤں تک پھلتی ہوئی
تف زری کافر بھائی جوش پر آئی ہوئی

دن بھی داخل کیا اور ان کے ساتھ ہی روشنی بھی داخل گئی۔ سب بھول سو گئے۔ میرا عمر بڑھا بھول بھی سو گیا اور میں بھی سو گیا۔ رات کر گئی اور دن چڑھا۔ ہم دونوں بھول، بھائیوں، دونوں ہم عمروں نے مصافحہ کیا۔ میں نے اُسے دیکھا اور مسکرایا۔ اُس نے مجھے دیکھا اور مسکرایا۔ بات یہ تھی، رات ہی رات میں ہمارا صحنہ دوئی تڑتی کر گیا تھا۔ سفید چہرے پر چٹکا گواہی، رنگ قیامت پر پا کچے دیا تھا۔

میں خوش تھا، میرے نفس خوش تھے۔ بات بات پر حقیت اُڑتے تھے مگر میرے دل میں۔ سچے میں کوئی کاٹا تھا۔ غوثی کے دریا کے راستے میں بندھا تھا۔ میں بستا تھا مگر اوپر سے، باہر سے، نگاہ برداری سے۔ یہ ایسی دل کی شمشاد تھی، ہرگز نہ تھی۔

اسے میں میرے نزدیک ایک ٹہیل آئی۔ اُس نے لکھ دیکھا، بھر دیکھ، بھر دیکھا، ایک بار بھر دیکھا۔ تب اُس نے پر پکڑا دینے، چوڑی کھولی اور میرے نزدیک آ کر نہ پاؤں، نزدیک آ کر اُس نے میرے نرم و نازک دستانہ سے اپنا دستانہ نکال دیا اور ایک لمحہ کے لئے بچہ مس و حرکت نہ کی رہی۔

اُس نے میرے ہونٹ چومے، میرا ہاتھ چوما، میری آنکھیں چومیں، اور صحت بھری نگاہوں سے میرے چہرے کو آنے لگی۔ مجھے ہانپنے لگی۔ آہ اس جیگر چھاڑ میں مجھے جوفلف اور مردہ آ رہا تھا۔ خستہ سے سخت تکلیف اس جسم کے مزے کے لئے برداشت کی جا سکتی ہے۔ دھوپ خستہ تھی اور میرا نرم و نازک جسم کالا ہوا جاتا تھا۔ خلق میں کانٹے چھکے، ہونٹ خشک ہو گئے۔ ٹہیل نے پکڑا دیا اور چوڑی چوڑی کر کے کہنے لگی۔ "بچا ہے، ہر خبر و راجھی پائی لاتی ہوں۔" مجھے اس کی چھائی شام گزری، آہ و آغی بھری میں اُس سے ہوں، اور وہ مجھ سے اتنا مل گئی کہ ایک لمحے کی جدائی پہاڑ دکھائی دینے لگی۔ میں نے کہا: "نہ جاؤ، ہرگز نہ جاؤ۔ میں بیجا سامراں کا دھوپ میں ہوں گا۔ مگر تمہیں نہ چھوڑوں گا۔" ٹہیل نے میری آنکھیں چوم کر جواب دیا۔ "میں داری، میں صدے۔" دھوپ خیر و (پچھلی بجا کر) اس طرح تھی کہ وہ (بھر پائی بجا کر) اسی طرح آئی۔

یہ کہہ کر اُس نے اپنے خوبصورت بازو کھولے۔ اور آڑی دو گز بھی نہ گئی ہوگی کہ کسی غلط، چاکار، اور بے رحم شخص کی ٹہیل سے لٹکا ہوا ایک مٹی کا ڈھیلا ٹٹاں ٹٹاں کرتا آ رہا اور ٹہیل کے پیٹے میں بیٹا۔ مٹی کا ڈھیلا کیا تھا۔ فرخندہ اصل کی کمان سے لٹکا ہوا تیر تھا۔ ٹہیل نے اوپر اصرار دیکھ، تڑپا اور مجھے پاس نہ دیکھ کر بازو اصل سے پہ شمع چھتی ہوئی اٹھادی ہو گئی۔

میں خراب میں تھا نکلا نہ سکا، کوئی مجھ کو وہاں پہنچا نہ سکا
میں جا نہ سکا وہ آ نہ سکا، یہ بھی نہ تھا وہ بھی نہ تھا

مجھے بتا رہا تھا، ہوا، ہوا، ہوا، جان سے باہر ہے۔ دنیا نظروں میں تاریک ہو گئی۔ میں نے چلا کر چھا۔ ٹٹاں سے چھا، جنوب سے چھا، مشرق سے چھا، مغرب سے چھا۔ چھا اور بار بار چھا کہ بچہ دیا سر زمین راحت ہے؟ کیا بچہ دیا آرام کی جگہ ہے؟ میں نے ہانپا کہا، مگر کوئی جواب نہ ملا۔ ٹٹاں کے الفاظ تھے، اور وہی کے الفاظ تھے، مگر میرے سوال کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

بہر حال فوٹ کیا تھا، اور میری خوشی کی گزیاں غم ہو چکی تھیں، میں بچے جھک گیا۔ بیکفروں سے صحت اور مسلوں سے کھنے گزر گئے، اون گزرا، رات گزری، مگر میں آدھا میں بدھیب تنہائی میں، چپکے چپکے دیکھا، دیکھا، دیکھا، میں وہاں کیا

کسی کی شب وصل سوتے کئے ہے
کسی کی شب بھر روتے کئے ہے
تاری یہ شب کبھی شب ہے ابھی
نہ روتے کئے ہے، نہ سوتے کئے ہے

آہ و آزاری کی رات بھی کٹ گئی۔ اچھی ٹھیک۔ اچھی طرح سے دن نہ چڑھا تھا کہ میرے کانوں میں ایک بار یک جہتی اور سرخی آواز پڑی۔ یہ آواز ایک صید کی آواز تھی۔ جو اپنے عاشق سے لفظوں میں مشغول تھی۔ آواز کی ہلکی کرن، محو پر جڑی اور میں نے دیکھا کہ وہ انہوں نے اس صید کے آگے دوڑا تو جینا ہے۔ وہ بھی دوڑا بھی جینا۔ اٹھا بھی جینا۔ دھاکے دھاکے، جھپٹیں کھائیں۔ جو کام انہوں نے کیا، وہ آگھوں نے کیا اور میں کو آگھیں بھی نہ کر سکیں۔ اسے آنسوؤں نے کر دیا۔

میں رو، میں بیچا، میں چلایا۔ اسے میرا بھی کوئی محبوب تھا۔ میرا بھی کوئی عاشق تھا۔ سورج سر پر کھلکا۔ غامضی نے رحم کی نظروں سے۔ محبت کی نظروں سے اپنے عاشق کو دیکھا۔ وہ بار بار باغ ہو گیا۔ میں رو یا، میں بیچا، میں چلایا۔ اسے کوئی میرا بھی محبت کرنے والا، محبت کروانے والا تھا۔ اسی خیال میں اسی تصور میں آفتاب نے اپنی مسافت طے کر لی۔ شام ہوئی، اندھیرا پڑا، ہاتھ پل کی گئے۔ غیصے لگ گئے، پردے سے اٹھ گئے، چپ اڑ گیا۔ غامضی نے اپنے آپ کو اپنے عاشق کی باتوں میں گمراہ پڑ جاتی ہے چھاتی اور لب سے لب لب گئے۔

جب سورج نکلا، نکھار اور تھا۔ غامضی وہی تھی، بابو صاحب وہی تھے، ان کے ان کی نظریں اور تھیں۔ غامضی وہی ہے، جتنی ہے مگر کسے پروا ہے۔ دیکھیں عاشق دوسری طرف متوجہ ہوا۔ غامضی نے چھری۔ چاند چھری کے لئے اپنے سینے میں جھونک لی۔ یہ دیکھ کر میں رو یا، میں بیچا، میں چلایا۔ پھر اپنا سوال۔ وہی پہلا سوال دہرایا، وہ کہہ رہا تھا۔ ایک بار نہیں ہزار بار وہ کہہ رہا تھا۔ میں نے سر ہلک کر دھنکوں سے پوچھا، کھنکھنکے سے پوچھا کہ کیا بھی دیکھنا سر میں رات ہے؟ کیا بھی دیکھا آواز مکی جگ ہے؟ میرے دانی کا ترچا تھا، گراہتا تھا مگر میرے سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

رات زیادہ گزرتی۔ آگ لگ گئی۔ جب ہاگ لگا تو دھاکا دھاکا سورج تخت پر قدم دھکا پٹکا تھا۔ میرے ہم عمر بھول نے میرا شانہ بٹا کر کہا۔ ”بھول بھالی! بھول میں ہے، تراری ہے، چل پل ہے، میں ٹپال کرتا ہوں کہ میرے سینے میں کوئی ملا ہے۔“ لب میں اندھیرے میں تھا، جب میں یہ اسے میں تھا، تاکہ کہتے تھے۔ بابو آواز آواز ہے، غوغا ہے، مگر اب کس آوازوں۔ میری طوائف نہیں، نہیں کس میں غوغا کرتا ہوں میری تھنا، جس میں میں پھر غوغا کرتا ہوں، میری آواز ہے، کوئی زندہ عاشق کوئی وجود آواز ہے اور میری آواز میں غوغا اے۔ وہ مجھے مجھ سے، وہ مجھے مجھ سے اور مجھ پر حکومت کرے۔ جب تک ایسا وجود نہیں۔ مجھے کوئی طوفانی غوغا نہیں۔ میں نے سوچا اس کے دل میں محبت کا ملا ہے، عشق کا تخت خالی پڑا ہے، جب تک بادشاہستان حکومت ہاتھ میں نہ لے۔ ضرور بھلا لڑی ہے کہ تک میں ہاتھی، اسے قادی کی کھلی رہے۔

میں نے چلا کر کہا ”جھپٹیں مٹوانی کی خواہش ہے، جھپٹیں عاشق کی تھنا ہے۔ دو گ۔ جو جھپٹیں لگا ہے، اسے عشق کہتے ہیں۔ اس کا وہ انداز۔ وہ مطالع سے بدلتا ہے، اور سچے پر دانی سے ترقی پاتا ہے۔ میری غوغا کا گھوڑا ہے، اندھیرے کا۔“

وہ مسکرا اور چپ ہو کر بار بار جھپٹا دھاکا دھاکا اور دھاکا دھاکا صاف صاف تھا تھا کہ اسے کسی کی غوغا ہے۔ محبت کی کشش وہ جھپٹوں کو کھینچتی ہے، جاتی ہے اور ملتا رہتی ہے۔ چنانچہ کوئی ایک ہی کھینچنے کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک بھونکا اس بھول کے سامنے آ پاور پاور پاور لگا۔ ایک دو تین پچھت گزرتے اور بھول اور بھونکا لگے۔

بھونکا بھول کے گمراہ غوغا کرتا تھا، اور بھول سر سے بھولتا نہ تھا تھا۔ میں نے پوچھا اور اس نے بتایا کہ یہ لمحہ حقیقت میں مسرت غوغا کے جانتے ہیں مگر غوغا، غوغا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور میں، رہا تھا۔

ایک لم تر تھا، بد صورت، بد نظیر، کا بار بار میں داخل ہوا اور چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ بھونکے نے ”بھول بھول، بھول بھول، بھول بھول“ کر کے کھنکھنکے چھتے تھیں، اندھیرا تھا۔ مگر وہ تھی، بد نظیر اور ہی جگا۔ بھونکا بھول سے کوئی گز کے فاصلے پر ہو گا۔

اُردو افسانے کے سو سال: انتخاب

ترتیب میں تقدیم کی بنیاد افسانہ نگار کا اولین مطبوعہ افسانہ ہے

راشد الخیری

نام	محمد عبدالرشید (والدین "انی" پکارتے تھے)
تلفی نام	سی۔ش۔ر۔ محمد عبدالرشید / مولوی عبدالرشید الخیری، بلوی / راشد الخیری ("مصور فٹ" کا خطاب "شیخ زندگی کی" مشابہت پر "اسوہ حسنہ" کے بند پر احسان الحق نے دیا۔)
پیدائش	نومبری 1868ء بہتقام دہلی (ا)
وفات	3 فروری 1936ء صبح سات بج کر پچیس منٹ پر بہتقام دہلی
تعلیم	مریکہ سکول دہلی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، جہاں غلام شہاب الدین (بیٹا ناصر) مرزا احمد بیگ (انگریزی) غلامہ الطاف حسین حالی (اردو، فارسی) اور امتیاز حسین (ریاضی) پڑھاتے تھے۔ نویں جماعت میں تھے جب دارا کا انتقال ہوا اور انہوں نے اسکول چھوڑ کر دہلی میں تعلیم پائی لیکن بھڑک نہ کر سکے۔

مختصر حالات زندگی:

راشد الخیری کے والد عبدالرشید دہلی سے تھے اور زیادہ وقت بھرتی میں گزارا۔ اس پر مصر کو راشد الخیری کی والدہ پر ایک انگلستان میں سکون لائے بغیر۔ راشد الخیری کی والدہ رشیدہ ان کی اور بیٹا اور مولوی عبدالقادر نے راشد الخیری کو اپنی گرافٹی میں رکھا۔ نو برس کے تھے جب والد کا انتقال ہوا۔ کچھ وقت اپنے چچا ذبیحی ٹکڑی ٹکڑی عبداللہ کے پاس اٹاؤ میں گزارا۔ چھوہ برس کی عمر تک چٹھیں اڑائیں، اگلی ڈنڈ اور گیزیاں پھیلیں۔ نو جوانی میں گلستان، بوستان، شاہ نامہ، دلی، جانی، شکیبیر، غنی سن اور غنیمت کو پڑھا، امام غزالی کا "احیاء العلوم" کا ساتھ دیا۔ چھاپہ نگار رہا۔ چچا کی سفارش پر 1891ء میں کلرک بھرتی ہو گئے اور کلرک بدست دلی گڑ سے 1901ء، 1902ء، دہلی سے۔ 1903ء میں مزاج بدست بدست تھے۔ 5 جنوری 1890ء کو نور قاسم عرفہ طرغاف بدست مولوی شاہ عبدالرحیم سے شادی ہوئی۔ کلرک بدست نو تاقو

ذہنی کشمکش ہی دماغ کے دفتر میں لگتی کی۔ اس زمانے میں یو۔ پی اور میرٹھ میں قیام رہا۔ کئی ملازمتیں کیں اور چھوڑیں۔ آخر میں ذہنی اکاذیب، جزلی پست اپڈ نیٹی گراف کے دفتر میں سب آدھر ہو گئے۔ پہلا "اول" "مہالانت" تک پہنچا 1898ء میں مکمل کیا جو 1898ء میں شائع ہوا۔ اچھ حسن وکیل ("مصمت" فروری 1939ء) کے مطابق مولانا شاعری بھی فرماتے تھے۔ افسانے لکھنے کی ترتیب والدہ سے ملی اور 1903ء میں انیسویں نے اردو کا پہلا "انٹرو" (نصیر اور ندیم) لکھا۔ 1907ء میں "عزیز" کے دہلی منتقل ہو جانے پر شیخ مہدالہار کے ساتھ مل کر پچھترہ برس کے بعد دہلی سے رسالہ "مصمت" جاری کیا۔ 1910ء میں ملازمت چھوڑی دی۔ اسی سال 1911ء میں دہلی سے رسالہ "تھون" شروع کیا جس میں ابتدائی ایک برس شیخ محمد اکرام ان کے شریک کار رہے۔ رسالہ "تھون" اپنے اہل قلم سے شائع کرتے تھے۔ یہ پچھترہ برس کے اپنے معشوق "طرابلس سے ایک مہار" کی اشاعت پر 1913ء تک بخیریت چلتی رہی کا شکار رہا اور زرخیزانہ طبع کر لیا گیا۔ 1915ء میں ہفتہ وار رسالہ "سبیلی" جاری کیا جو محض چند ماہ تک چلا۔ 1919ء میں تھون پریس کو آگ لگ جانے سے "عزیز"، "مصمت"، "تھون" اور "سبیلی" کے تمام پانے فاکس مل کر داکو ہو گئے۔ اس کے بعد دہلی سے ہی خواجہ کاپرچہ "جات" جاری کیا۔ 1919ء میں کالے جاس کی مسجد ترکاڑی منڈی، دہلی کے قریب رہائش گاہی۔ 1923ء میں "ترتیب گاہ جات" کا قلم کی اور کتبہ پڑھنا تقریباً سبوت ہوا۔ فروری کی صبح 7 بج کر 55 منٹ پر دہلی میں وفات پائی اور کولہ فیروز شاہ دہلی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

اولین تحریر:

"احسن و مصمود" ("اول" انوار تصنیف 1894ء، "یہ دہلی اول" "دہلی لکھنؤ گزٹ" بریلی میں 1894ء میں قطعہ اور شائع ہو چکا۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"نصیر اور ندیم" مطبوعہ "عزیز" لاہور، جلد نمبر 6، شمارہ نمبر 3، دسمبر 1903ء، صفحہ 27-31 شمارہ "سبیلی ہوئی چچا" مطبوعہ مصمت، یکم اپریل، دہلی، 1937ء۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- 1 "مہالانت (جیات ساراج) اس ناول میں بقول پریم چند "کوٹا سیت کا دلچسپ آغاز لکھا گیا ہے۔" یہ ناول ہے۔ تصنیف 1896ء، 1897ء، "شرعی محمد شفیع الدین" ایک ناول پر تنقید و کس دہلی، دہلی، 1898ء، دہلی، 1907ء، "طبع سوم دہلی، 1930ء۔
 - 2 "منازلہ ساراج" (ناول) تکمیل 1898-1900ء، "طبع اول علی گڑھ، 1902ء۔ یہ ناول علی گڑھ سے اچھ حسن وکیل نے شائع کر دیا۔ دوسرا ایڈیشن سر شیخ عبداللہ در نے لاہور سے شائع کیا، "طبع دوم لاہور، 1908ء۔
 - 3 "تقریرات اشک" (افسانے اور مضامین) دارالاشاعت و نصاب لاہور، "طبع اول 1921ء۔
- اولین انسانی مجموعہ اس کتاب میں درجن ہجرت افسانے یکجا کر دیے گئے ہیں۔ جن میں "مصمت و حسن" مطبوعہ "عزیز" لاہور

1907ء تک شائع ہے۔ دیگر افسانے ہیں "ایک مظلوم بوی کا خط" ("عزیز" دہلی، 1908ء) میں "کثرت الادب" کے نام سے شائع ہوا تھا) "مضمون" "دارالافتاد" (مطبوعہ نغون 1906ء) "بے نصیب کا روال" (مطبوعہ "نغون") "روایت قصود" (مطبوعہ "نغون" 1907ء) "سار کی چارک اوقی" (مطبوعہ "نغون" 1909ء) "نیر کا خط بھائی کے نام" (مطبوعہ "صصت" دہلی اولین شمارہ جون 1908ء) "ساو کی چڑیاں" (مطبوعہ "صصت" دہلی 1910ء) "مظلوم کی فریاد" (مطبوعہ "صصت" دہلی 1911ء) "نہ جیسی اندھا" (مطبوعہ "نغون" دہلی 1911ء) "درجہ بھائی کی خط کتابت" (مطبوعہ "نغون" دہلی 1912ء) "چاندنی چوک کا پتلا رزم" (مطبوعہ "کھکھان" دہلی 1918ء) "مہوے کی یاد" (مطبوعہ "تہذیب نسواں" 1921ء)

4. "شائین و دراز" 1908ء "نغون" لاہور میں قسط وار شائع ہوا طبع اول دارالاشاعت پنجاب لاہور طبع دوم 1940ء

5. "صبح زندگی" (مکمل 1907ء) نغون پریس دہلی طبع اول 1909ء

1935ء تک اس کتاب کے 18 ایڈیشن شائع ہوئے۔

6. "سار کی چارچا" (افسانے) دارالاشاعت پنجاب لاہور طبع اول 1921ء

اس کا دوسرا نام "شمید یہ تو" تھا اس کے کل 19 ایڈیشن طبع ہوئے۔

7. "گوہر قصود" (2 افسانوں کا مجموعہ) دارالاشاعت پنجاب لاہور طبع اول 1918ء

اس مجموعے میں شامل افسانے "کال کی تماشا" "جون اور اس کے بعد

جولائی 1910ء کے رسالہ "صصت" دہلی میں شائع ہو چکا تھا۔ دوسرا

افسانہ "خداستان کی پری" "صصت" 1911ء میں طبع ہوا تھا۔

8. "لوکیوں کی افکار" (آزاد خط کتابت پر) دفتر "صصت" دہلی طبع اول 1911ء

دارالاشاعت پنجاب لاہور سے اس کتاب کے چھ سات ایڈیشن

مولوی سید مختار علی نے شائع کئے۔

9. "شام زندگی" (ناول) ناشر محمد داسی، ایڈیٹر نظام طبع اول میرٹھ 1917ء

نومبر 1917ء تک تین ایڈیشن نکل چکے تھے۔ یہ کتاب 1964ء تک اشاعت دہلی،

27 مارچ 1965ء تک 160۔

10. "افسارہ" (افسانے اور ہر ایک کے سوانح حیات) ناشر محمد داسی، ایڈیٹر نظام طبع اول 1917ء

مئی 1959ء میں اس کتاب کا 14واں ایڈیشن شائع ہوا۔

11. "سات درجوں کے افسانے" (افسانے/مضامین) ناشر محمد داسی، ایڈیٹر نظام طبع اول 1917ء

اشاعت دہلی،

رسالہ "خطیب" میں قسط وار شائع ہوا۔ اس میں سات کہانیاں ہیں جو ابھی طور پر آئیں میں مربوط ہیں۔ یہ کتاب 1964ء تک 10 بار چھپ چکی ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے نصاب میں شامل رہی ہے۔

- 12 "طوفان حیات" (ناول) ناشر: مولانا عبدالحقید سہیلک، لاہور
- 1984ء تک یہ کتاب 14 بار چھپ چکی ہے
- 13 "سنگ" (ناول) ناشر: سید مجتبیٰ طبع: ازل 1918ء
- یہ ناول "تہذیب نسواں" کا دور میں قضا و ارشاد علی ہوتا رہا۔
ہمارے دارالاشاعت و طباعت: پنجاب، لاہور
- 1984ء تک اس کتاب کے 118 ایڈیشن طبع ہوئے۔
- 14 "ماہنامہ" (تاریخی ناول) دارالاشاعت و طباعت: لاہور، طبع: ازل
- یہ ناول امتیاز علی خان نے "تہذیب نسواں" کا دور کے لئے 1918ء میں لکھوایا تھا۔
- 15 "بست الوقت" (ناولت) ناشر: محمد دہادی 1918ء
- راشد الخیری نے یہ ناول اپریل 1918ء میں مکمل کیا تھا۔
ایڈیشن: 1، دہلی،
- 16 "آداب و منطق" (تاریخی ناول) ناشر: محمد محمود الدین، مالک و رسالہ "تحریر" لاہور
- یہ ناول 1918ء میں لکھا گیا۔ طبع: دوم: مبارک علی شاہ، گیلانی۔ گجراتی زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ 1984ء تک یہ کتاب دس بار شائع ہوئی۔ 1980ء سے یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی کے سرچپ عالم احسان میں شامل نصاب دی۔
- 17 "عجیبہ خداوند" (تاریخی ناول) ناشر: احسان الحق مالک، ایڈیٹر: طبع: ازل
- 1984ء تک 19 ایڈیشن طبع ہوئے۔
دو "نیا" دہلی،
- 18 "جوہر قدامت" (ناول) ناشر: ملک محمد دین طبع: اول: تحصیل 1919ء
- ایڈیٹر: صوفی، چنڈی بہاؤ الدین،
- اس ناول پر کئی فلمیں بنیں۔ قیام پاکستان سے قبل مدراس یونیورسٹی میں تصانیف کتاب دی۔ راشد الخیری نے اس ناول پر جنوری 1932ء میں نثر لکھی فرمائی۔ 1964ء تک اس کے 18 ایڈیشن طبع ہو چکے تھے۔
- 19 "سراب مغرب" (طویل نثر: راشد) ناشر: محمد دہادی، محمد امین شاہ، دہلی، طبع: اول: فروری 1918ء
- تحصیل 1917ء، 1964ء تک 12 ایڈیشن طبع ہوئے۔
- 20 "مردوں کا راز" (تاریخی ناول) صوفی پبلشنگ ہاؤس چنڈی بہاؤ الدین، طبع: اول 1919ء
- راشد الخیری نے 1933ء اسے ایڈیشن پر نثر لکھی کرتے ہوئے تراجم داناغے بھی کیے۔ 1984ء تک اس ناول کے 11 ایڈیشن طبع ہو چکے تھے۔
- 21 "شب زندگی" (ناول: دو جلدوں میں) مطبوعہ: دفتر "مست" دہلی، طبع: اول: اگست 1918ء
- یہ ناول جن 1918ء میں لکھی شروع کی گئی تھی۔ جولائی 1918ء میں مکمل ہوئی۔ پہلی جلد اگست 1919ء کو طبع ہوئی۔ جن میں دہلی

کی آتش زدگی کے بعد راشد الخیری کی پہلی کتاب ہے۔ جلد اول 1984ء تک 24 پارٹس ہو چکی۔ دوسری جلد راشد الخیری نے جنوری فروری 1923ء میں اپنی بہن خاتون اکرم کی دہائی کے لیے لکھیں چائے ٹیٹن میں شمل کی تھی۔ 1923ء میں ہی اس کے تین ایٹن چھپ کر بک گئی تھیں۔ دوسری جلد کے 1924ء تک 11 ایٹن شمل ہوئے۔ 1964ء کے بعد کے ایٹن میں جلد اول دودھ کو نکھیا کر دیا گیا۔

- 22- "نوحہء کی" (اول) - بشر حمزہی مہاس حسین نے "قوم دہلی" شمل اول اگست 1919ء، 1931ء کے ایٹن میں صفت کا دیاجہ کی چیز ہے۔ اس ایٹن پر بھی راشد الخیری نے نفر جانی کی۔ 1964ء تک 12 ایٹن چھپ چکے تھے۔
- 23- "سورہ" (اول) - مطبوعہ صوفی پبلشنگ ہاؤس شمل اول 1919ء، اس جلد کے 1964ء تک آخر ایٹن شمل ہوئے کل صفحات 58۔ چڑی بہا الدین،
- 24- "دوراء قصہ" (اشعری مجموعہ) - مطبوعہ دختر "صصت" دہلی، شمل اول ستمبر 1918ء، راشد الخیری کی دو نظمیں جماعتوں اور مضامین کے ساتھ شائع ہوئی تھیں۔ 1927ء میں جب یہ کتاب چھپ رہی تھی، صصت بک ڈپ دہلی سے شائع ہوئی تو راشد الخیری کی "صصت" "سورہ" "سکلی" میں شائع شدہ ان نظموں کا اضافہ کر دیا گیا جو راشد الخیری نے اپنے نام سے شائع نہیں کرائی تھیں۔ اس کتاب کی ضخامت 72 صفحات ہو گئی۔
- 25- "انگوٹھی کاراؤ" (طویل مختصر افسانے) - ناشر نسیم محمد یعقوب مطبوعہ دہلی، شمل اول 1918ء،
- 26- "نورہ صصت" (افسانے) - مطبوعہ صصت بک ڈپ دہلی، شمل اول جنوری 1920ء، پہلے ایٹن میں صرف تین افسانے شامل تھے دو ضخامت صرف 48 صفحات تھی۔ شمل دوم 1927ء کے ایٹن میں اس مزید افسانے شامل کر دیے گئے۔ اس مجموعے میں شامل افسانے "صصت" "نورہ" "نورہ" میں شائع ہوئے تھے۔ اس کتاب میں منظوم نثر کا پاک جذبہ نثر کی دلچسپی افسانہ نثر، ماسون الرشید کا دورہ، آگئی بھٹیش، جہانگیری عدل، شک شہزادہ، بلی کی شہادت، بک گنہ، کائنات، برج کی سستی، بھانج کا کینہ، مظاہر بھی اور خاتمہ بالآخر کل 13 افسانے ہیں۔
- 27- "تانیہ فی" (اول) - ناشر ممتاز دہلی مطبوعہ دہلی، شمل اول 1920ء، یہ جلد دس پارٹس اور آخری ایٹن میں مہاس حسین نے "سورہ" "دہلی" "انڈس کی شہزادی" کے نام سے شائع کیے۔
- 28- "قصہ سعید" (ناول) - ناشر حافظ مزین حسن جانی دہلی، شمل اول 1920ء، یہ ناول حافظ مزین نے چار پارٹس شائع کیا۔ آخری ایٹن 1931ء میں دہلی سے نکلا تھا۔ تین ایٹن صصت بک ڈپ دہلی سے شائع ہوئے۔
- 29- "دو شہزاد" (تاریخی ناول) - ناشر دہلی "قوم دہلی"، شمل اول 1921ء، اس جلد کے مزید 3 ایٹن چھپ مہاس حسین نے دہلی سے شائع کر دئے۔ پانچواں ایٹن راجہ خیری نے صصت بک ڈپ، سے شائع کر دیا۔

- 30۔ "پانچویں ٹائم" (تاریخی ناول) مطبوعہ: صوفی پبلیشنگ ہاؤس، طبع اڈس 1921ء، ملٹی میڈیا فاؤنڈیشن
- 31۔ "تاریخ نسوان" (ناول) مطبوعہ: عالم، طبع ناول 1923ء
- ناول کا دوسرا نام "سرنا کا پالنا تھا" دوسرا اور تیسرا ایڈیشن سید مبارک علی گیلانی نے گیلانی پریس لاہور سے شائع کئے۔ اس ناول کے آخری تین ایڈیشن صحت کبڈی، دہلی سے شائع کئے۔ کل چار طبع ہوا۔
- 32۔ "تجلی کمال" (ناول) مطبوعہ: صوفی پبلیشنگ ہاؤس، ملٹی میڈیا فاؤنڈیشن، طبع اڈس 1923ء
- راشد الخیری نے یہ ناول نگار پر میں صرف ایک نسخے میں مکمل کیا تھا۔ یہ کتاب چار طبع ہوئی۔
- 33۔ "مکتی، کھیں" (تاریخ و سیرت) ناشر: شفیق عبدالحمید، طبع ناول 1925ء
- ڈاکٹر وحید "مسعودی" دہلی،
- ازراج مطہرات پر کیے گئے اعتراضات کا جواب۔ ضخیم مسودہ جو مسودات کل چار ایڈیشن طبع ہوئے۔
- 34۔ "مستحق" (طویل مختصر افسانہ) صحت کبڈی، دہلی، طبع ناول: 1926ء
- 35۔ "سنا زل ترقی" (آخری مختصر افسانہ) مطبوعہ: صحت کبڈی، دہلی، طبع ناول: 1927ء
- یہ افسانہ سب سے پہلے "صحت" دہلی، اپریل 1918ء اور اس کے بعد افسانہ نگار، دہلی میں طبع ہوا تھا۔ کل صفحات 30۔ کل چار ایڈیشن دہلی سے طبع ہوئے۔
- 36۔ "بچہ کا کرتا" (مختصر افسانہ) مطبوعہ: صحت کبڈی، دہلی، طبع ناول: 1927ء
- یہ دراز مختصر افسانہ پہلے پہل "صحت" دہلی، اپریل 1918ء اور سب سے پہلے "مستحق" دہلی، اپریل 1918ء میں طبع ہوا تھا۔ آٹھواں ایڈیشن 1946ء میں طبع ہوا۔
- 37۔ "میں کا وہ انجمن" (تاریخی افسانہ) مطبوعہ: صحت کبڈی، دہلی، طبع ناول: تاریخ 1927ء
- یہ افسانہ پہلے پہل فروری 1919ء میں "مطلب" دہلی میں شائع ہوا۔ کل صفحات 32۔
- 38۔ "ایڈیٹور کی سرگزشت" (افسانہ) مطبوعہ: صحت کبڈی، دہلی، طبع ناول: اکتوبر 1927ء
- کل صفحات 32۔ پہلے پہل "نگر آدوہ صوفی تو وہاں بھی نہ تھا" کے عنوان سے "مطلب" دہلی میں طبع ہوا۔ کتاب کا ساتواں ایڈیشن جنوری 1956ء میں صحت کبڈی، کراچی سے طبع ہوا۔ طبع آزاد افسانہ ہے۔
- 39۔ "گلدستہ سید" (مضامین اور افسانے) مطبوعہ: صحت کبڈی، دہلی، طبع ناول: 1927ء
- 40۔ "بانی مشن" (عزادیت تفسیر) مطبوعہ: صحت کبڈی، دہلی، طبع ناول: جنوری 1928ء
- کل صفحات 58۔ "بانی مشن" جسے کی ایڈیٹری تھی چار قسطیں "صحت" دہلی، اپریل 1927ء میں شائع ہوئی تھیں۔ "بانی مشن"

مطبوعہ پر تاریخ سے لے کر شجرہ ہوئے۔ یہ کتاب دس بار طبع ہوئی۔

- 41- "سیلابِ اُتک" (7 افسانے) مصورائے کاشن مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی، طبع اول 1928ء۔
اس مجموعے میں ہر سادہ محبت، بلوچان کے گھنہ رنگ، حقائق کا سلیب ہل، آج اکبر، جہل گل ہدن، مہے تصور، بچی اور شاہ کا جھیل، بی کی سات افسانے ہیں۔ جن میں سے اکثر "عصمت" دہلی دہشت 1928ء تا 1927ء میں شائع ہوئے۔ کل پانچ ایڈیشن طبع ہوئے۔ آخری ایڈیشن 112 صفحات، مودتھارہ 8 ورق۔
- 42- "قلبِ حوس" (مضامین اور افسانے) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی، طبع اول 1928ء۔
یہ 30 مضامین اور افسانے راشد الخیری نے لکھے۔ ش۔ کے لکھی گئی ہیں۔ جو 1927ء تک کے "عصمت" دہلی میں شائع ہوئے تھے۔
- 43- "دراغِ ظفر مین نویت پچ روزہ" (تاریخ) مطبوعہ "عصمت" بک ڈپ، دہلی، طبع اول نومبر 1928ء۔
کل صفحات 128۔ بہادر شاہ ظفر کے عہد سے متعلق بہادر شاہ ظفر کی زبان تو قد قرانی۔ 1964ء تک ڈرائیو ٹیکن طبع ہوئے تھے۔
- 44- "طوبہاں اُتک" (12 افسانے) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی، طبع اول 1929ء۔
یہ افسانے 1915ء تا 1927ء، "عصمت" میں شائع ہوئے۔ 1964ء تک چار ایڈیشن طبع ہوئے۔
- 45- "مخدو شیعہ لی" (طویل افسانہ) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی، طبع اول 1929ء۔
یہ طویل ٹھکرا افسانہ جنوری 1928ء تا ستمبر 1929ء کے "عصمت" دہلی میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ کل صفحات 89۔
- 46- "شہید مغرب" (افسانے اور مضامین) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی، طبع اول 1929ء۔
اس کتاب میں شامل افسانے اور مضامین "عصمت" دہلی "تھون" دہلی (12-1911ء) کے علاوہ "بھدرہ" دہلی، "تخلیم" امرت سر اور "اتحاد" دہلی میں اس سے لگے شائع ہو چکے تھے۔ کتاب میں شہید مغرب، دو آسانی مسافر، شہید مغرب، امرت سر سے ایک عدا، ایک عرب سیدانی، سیاہ دارغ، افراط اور تقریب، عدا کے دل گداز، کلکوتیاں اور بیعت، کل دس جی، یہ شامل ہیں۔ کتاب کا تیسرا ایڈیشن 1934ء میں طبع ہوا۔
- 47- "تخلیم عصمت" (طویل ٹھکرا افسانہ) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی، طبع اول 1929ء۔
یہ افسانہ پہلے پہل "عصمت" دہلی کے تقریبی جہتی نمبر 1928ء میں طبع ہوا تھا۔ کل صفحات 60۔ یہ کتاب چھ بار طبع ہو چکی ہے۔
- 48- "دلائلِ شخصی" (تاریخ افسانہ) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی، طبع اول نومبر 1929ء۔
یہ افسانے "عصمت" دہلی میں قسط وار شائع ہو چکا تھا۔ جنوری 1946ء میں ساتویں بار طبع ہوا۔
- 49- "شہینہ کا فیصلہ" (تاریخی ناول) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی، طبع اول 1929ء۔
یہ ناول پہلے پہل "خطیب" 1917ء میں شائع ہوا تھا۔ کل صفحات 32۔ کل سات بار طبع ہوا۔
- 50- "دراغِ ناتھون" (3 مضامین) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی، طبع اول 1928ء۔
راشد الخیری نے یہ 3 مضامین اپنی جہاں مرگ، بہ خان توں اکرم سے متعلق 1824ء اور 1925ء میں "مہمان لکھن" "تقریب" نامہ اور آپ جی کے عنوان سے لکھے تھے۔ کل صفحات 24۔ یہ کتاب چھ بار طبع ہوئی۔

- 51- "محرطہ ایں" (تاریخی ادب) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اڈل-1929ء
یہ ادب کی پہلی بار "خطیب" 1918ء میں طبع ہوا تھا۔ کل صفحات 40۔ کل چھ بار طبع ہوا۔
- 52- "آفت کاراں" (مولو شریف) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اڈل، دسمبر 1930ء
یہ کتاب 1924ء تک 128 صفحات کی وضاحت میں 16 بار طبع ہوئی۔
- 53- "کر و قفس" (شعری مجموعہ) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اڈل-1931ء
لکھنؤ میں اسلام اور پیکر اس۔ کل تین ایڈیشن طبع ہوئے۔
- 54- "نصوئی زندہ گی" (افسانے) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اڈل 1931ء
اس کتاب میں چار غرضتوں کی ایک خدمت اور یمن کی محبت کل، چار افسانے ہیں۔ کل 54 صفحات۔ 1947ء تک اس کتاب کے چار ایڈیشن طبع ہوئے تھے۔
- 55- "سوداے نقا" (طویل مختصر افسانہ) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اڈل 1932ء
یہ 38 صفحات کا افسانہ پہلی بار "خطیب" 1918ء میں طبع ہوا۔
- 56- "سندہ کا دل" (تاریخی شہادت) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اڈل، جولائی 1931ء
یہ کتاب چار چیمبر، 1935ء میں چھپی۔ 1964ء تک اس کے سول ایڈیشن طبع ہوئے۔ یہ شہادت نامہ آج تک محرم کی مظلوم سماج کا چاہا ہے۔
- 57- "بندش میلہ المعروف ہندو کی ماری شیرازی" مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اڈل 1932ء
اس کتاب میں کئی قصائد، ہفت نون چاک کی قصید اور ان میں تین رنگوں میں تصاویر ہیں۔ کل صفحات 88۔ مئی 1929ء کے "عصمت" ادبی میں شائع ہوا شروع ہوا تھا اور دسمبر 1932ء میں تمام ہوا۔
- 58- "چہار عالم" (طویل مختصر افسانہ) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اڈل 1933ء
یہ 24 صفحات کا افسانہ "عصمت" ادبی 1924ء میں طبع ہو چکا تھا پھر "عصمت" کے "گلدستہ میلہ" میں شائع ہوا۔
- 59- "مراہن مشرق" (مضامین) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اڈل 1933ء
یہ 76 صفحات پر مشتمل کتاب کل 5 بار طبع ہوئی۔
- 60- "بزم رنگین" (خاکے) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اڈل 1933ء
64 صفحات کی یہ جاکھیر کتاب کل تین بار طبع ہوئی۔ اس میں نذر احمد، محمد حسین آزاد، ام علیہ افسانہ، قاتون اکرم، انیس اختر، انو سمر دے، بے بی، شمس، جہان بارید، جان ہارنگی، مرحوم بیگم جہاں، مولوی اشیر احمد، مرزا غالب، میر جالب، میر ناصر علی، مصطفیٰ بیگم، مولوی اشرف حسین، نقاری، مرزا حسین اور اشرف گورگانی کے خاکے ہیں۔
- 61- "قرنی قفسے" (ذاتی مضامین) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اڈل 1936ء
کل 144 صفحات کی کتاب 1964ء تک چار بار شائع ہوئی۔

- 62- "بے ٹکری کا آخری دن" (مضامین) مطبوعہ مصمت بک ڈپو، دہلی طبع ازل 1936ء
یہ مضامین کوٹاری لڑکیوں کے لیے 1912، 1922ء، "صمت" اور "سیکلی" میں شائع کئے گئے یہ مجموعہ تین بار شائع ہو چکا۔
- 63- "بچے دار" (مضامین) مطبوعہ مصمت بک ڈپو، دہلی طبع ازل 1936ء
یہ مضامین "صمت" دہلی و "تھان" دہلی میں 1908، 1918ء، شائع ہوئے۔ کتاب کے کل صفحات 88۔ یہ مجموعہ تین بار شائع ہوا۔
- 64- "گراپ حیات" (25 افسانے) مطبوعہ مصمت بک ڈپو، دہلی طبع ازل 1936ء
کتاب میں شامل 16 افسانے مصنف نے اپنے نام سے طبع کروائے تھے۔ یہ افسانے 1910، 1922ء، کے "صمت" اور "سیکلی" دہلی میں طبع ہوئے۔ کل صفحات 122۔ تین ایڈیشن طبع ہوئے۔
- 65- "بیات ہنر" (سفر نامے) مطبوعہ مصمت بک ڈپو، دہلی طبع ازل اگست 1935ء
1923-33ء میں تربیت گاہوں کے حلقے میں جو دورے کیے ان کے حالات "صمت"، "بیات"، "زہرہ کن" اور "تھان" میں شائع ہوئے تھے۔
- 66- "ادب الہجھو" (مزاحیہ افسانے) مطبوعہ مصمت بک ڈپو، دہلی طبع ازل 1935ء
اس مجموعے میں مولوی صاحب کا وہ خط مشاہدہ دہلی، بھائی ظفر اقرار تارکھور ہے جس اور کبوتری تنظیم کل پٹا افسانے شامل ہیں۔
- 67- "گدڑی میں گل" (مضامین) مطبوعہ مصمت بک ڈپو، دہلی طبع ازل 1936ء
1909، 1924ء، "رسالہ" "صمت" دہلی میں شائع ہوئے تھے۔ یہ مجموعہ 1964ء تک 5 بار طبع ہوا۔
- 68- "بہار حیات" (4 افسانے) مطبوعہ مصمت بک ڈپو، دہلی طبع ازل 1937ء
بے زبانون کا سیر (صمت 1909ء)، حیات انسانی پر دو بچہ نروں کی بحث (تھان 1914ء)، داستان ٹیلیں (سیر) (صمت 1916ء)، پانچواں گون ہے (کھام لٹریچر 1927ء)، گل چار افسانے۔ یہ مجموعہ تین بار طبع ہوا۔ کل صفحات 48۔
- 69- "خلیب دہرا" (کہانیاں) مطبوعہ مصمت بک ڈپو، دہلی طبع ازل 1937ء
8 کہانیاں جنہیں علامہ نے لڑکیوں کے فرضی ناموں سے "رسالہ" "صمت" 1909ء، 1918ء، میں لکھا تھا۔ یہ 32 صفحات کا مجموعہ تین بار شائع ہو چکا ہے۔
- 70- "سکلی ہوئی بچان" (4 افسانے) مطبوعہ مصمت بک ڈپو، دہلی طبع ازل 1937ء
11 افسانوں کا مجموعہ تمام افسانے غلطو کے انداز میں لکھے گئے ہیں جو 1903، 1918ء، "تھان" اور "صمت" دہلی اور "تھان" دہلی میں طبع ہوئے۔ اس مجموعے میں "بڑی بچن کا خلا" کے عنوان سے اردو کا اولین افسانہ "نصیر اور خدیجہ" مطبوعہ 1903ء پٹنن لاہور بھی شامل ہے۔
- 71- "ٹیلیں یاد" (مضامین) مطبوعہ مصمت بک ڈپو، دہلی طبع ازل 1937ء
19 مضامین کا مجموعہ مضامین "صمت" دہلی اور "خلیب" دہلی میں شائع ہوئے تھے۔ یہ مجموعہ تین بار طبع ہوا۔
- 72- "انجم نواس" (مضامین) مطبوعہ مصمت بک ڈپو، دہلی طبع ازل 1937ء

یہ کتاب تین بار طبع ہوئی۔ یہ مضامین رسالہ "ہفت" دہلی میں شائع ہو چکے تھے۔۔۔

74- "تو مائیں" (تلم بہتر) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اول 1937ء
کل صفحات 84۔ تین بار طبع ہو چکی ہے۔

75- "چند تان مغرب" (تراجم) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اول 1937ء
یہ تراجم اول اول رسالہ "تکلی" دہلی 1923ء میں طبع ہوئے۔ کتاب کی شکستہ ایک سو صفحات سے زائد۔ اس کتاب میں اردو شاعری کی "تکلی" کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ یہ تراجم علامہ سید علی گیلانی ناموں سے کیے گئے۔ یہ مجموعہ تین بار طبع ہوا۔

76- "مجموعہ جلیقی" (مضامین) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اول 1937ء
مفتوا کریم کی ذمت گرامی سے حقیق 14 مضامین جو پہلی بار "تکلی" نامی شائع "دہلی میں طبع ہوئے تھے۔ یہ مجموعہ تین بار طبع ہو چکا ہے۔
77- "حوار وادان" (افسانے) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اول 1937ء
7 افسانوں کا مجموعہ۔ کل صفحات 98۔ کتاب کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

78- "باد کا تیرن" (مضامین) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اول 1937ء
رسالہ "تیرن" دہلی کے لیے لکھے گئے مضامین۔ مجموعہ تین بار شائع ہو چکا ہے۔

79- "دلی کی آغری پہاڑ" (مضامین) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اول 1937ء
25 مضامین میں دہلی کا مریضہ لکھا گیا ہے۔ کل صفحات 128۔ کتاب 5 بار طبع ہو چکی ہے۔

80- "کاسٹین پارڈ" (مضامین) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اول 1937ء
غیر مسلم صاحب سورتھن کے اعزازات کا 198 تا تاریخی مضامین میں جواب۔ یہ مضامین "عصمت" دہلی میں شائع ہوئے تھے۔
کل صفحات 88۔ یہ مجموعہ 4 مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔

81- "ماتہیں موتی" (مضامین) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اول 1938ء
شوہر کیوں کر کرتے ہیں۔ بے خوف جی ادنیٰ وغیرہ 13 مضامین کا مجموعہ تین بار طبع ہوا۔

82- "میرزا حسن" (افسانے مضامین) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اول 1938ء
کل صفحات 108۔ یہ مجموعہ چار بار طبع ہوا۔

83- "کمالہ سوان" (مضامین) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اول 1938ء
کل صفحات 64 مضامین کا یہ مجموعہ 3 بار طبع ہوا۔

84- "فریب استی" (مضامین) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اول 1938ء
کل صفحات 48۔ یہ مجموعہ 3 بار طبع ہوا۔

"دہائی دہائی" (افسانے) مطبوعہ عصمت بک ڈپ، دہلی طبع اول 1938ء
کل صفحات 132۔ سات افسانوں کا مجموعہ تین بار طبع ہوا۔

- 85۔ "مسلمان عورت کے حقوق" (مضامین) مطبوعہ عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اول 1938ء
کل صفحات 104۔ یہ مجموعہ عین بارطبع ہوا۔
- 86۔ "شادی کا انتخاب" (مضامین) مطبوعہ عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اول 1938ء
کل صفحات 68۔ یہ مجموعہ عین بارطبع ہوا اس کتاب میں ایک مضمون ڈاکٹر شائستہ سہروردی (شائستہ اکرام بہتہ) کا بھی شامل ہے۔
- 87۔ "نکھری ہوئی بچان" (تکلیف اور مضامین) مطبوعہ عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اول 1938ء
یہ مضامین اور تکلیفوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جسے راشدہ نظری کی نکھری ہوئی تحریریں کہنا چاہیے۔ یہ مضامین اور تکلیفیں غیر مطبوعہ بھی ہیں۔
- 88۔ "یوم آخر" (ناول) مطبوعہ عصمت بک ڈپو، دہلی طبع اول 1984ء

غیر مطبوعہ تعلیمی آثار:

- ۱۔ تربیت کاوطالت سے متعلق بارہ تیرہ سالوں میں علامہ نے جو مضامین لکھے ان میں سے انتخاب ممکن ہے۔
- ۲۔ علامہ کے خطوط اور آثار کراف کا ایک مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔

نظریہ فتن:

"مجھے معلوم ہے کہ جو جن قصیم یافتہ، جہڑی عجم یافتہ کی ترقا اور قلعہ کی کسوٹی پر تو لے ہو رہے تھے۔ اس لیے مجھے یہ کہنے میں تامل نہ رہا کہ حقوق نسواں کے مسئلے میں ہماری زبان سے جو کہ کوئی گہرا ہے، مذہب سے بیحد ہو کر بھی ایک لفظ ایسا نہیں جس سے عقل سلیم متعلق نہ ہو۔"

(مطلب: انجمن حمایت اسلام لاہور، جنوری 1925ء)



حوالہ جات:

- ۱۔ "بھڑی اٹائی دسب" ترجمہ ڈاکٹر جمہال قریشی میں دہلی، پرنٹنگ خانہ، ۱۹۷۰ء۔
 - ۲۔ "مولا" (شاعرانہ) اس کے حوا میں یہ "اور راشدہ نظری، جملہ "دوسہ دستان"
 - ۳۔ علامہ نے انگریزوں پر آفری شمر کیا
- ہے ۔ ہمارا آخری ۔ اس کو قیمت دیتے
صحت تب ہم کہیں راشدہ کے آٹھ جاننے کے بعد
- ۴۔ "مولا دیا پتہ" صفحات "مطبوعہ انجمن اقبال پرنٹنگ ورکس، دہلی طبع اول 1898ء۔

قسیم کی سنگ دلی

راشد الخیری

قسیم دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں گھڑی آدھ گھڑی کو کھڑے کھڑے آتا۔ حراج میں غصہ، دل میں کپت، آنکھوں میں آنسو، تھوڑی پریشانی، سیدھی ایک آدھ بات کی اور دماغ خائے میں چالینا۔ پھر یہ بھی علم نہ تھا کہ کوئی وہاں آ سکے۔ نیرتو خیر بی بی جی اور بی بی جی دور اندیش۔ اس نے قسیم کی بہت پرکھی خبر دے دی تھی، مگر مخصوص پہلے پرخت مسیت آ کر پڑی۔ باپ کی یہ بے اشتناکی پھول سے کیلئے پرخت چڑکا تھا۔ سڑی ساری رات اور چارے چارے دن باپ کو یاد کرتا۔ اور اپنا کہتا۔ میں ساڑھے تین برس کا بچہ۔ بہت سی باتیں اپنی کھ کے لائق خاصگی بھر لیتا۔ گرتا چڑتا باپ کے پیچھے پیچھے اس کے پاس پہنچتا اور وہ کم بخت رخ نہ کرتا۔ بار بار ایسا ہوا کہ وہ اپنا بارٹا ہوا اور دوتا بلکتا اس کے پیچھے تیار اور خاتم نے بازو دکھا کر گھر میں چھوڑ کر گھڑی نکالی۔ پھر انیسواں کو بھڑاتی چکا رتی اور سمجھاتی مگر باپ کی یاد نئے سے دل سے دم بھر کو ابھی فراموش نہ ہوتی۔ ایک دن رات کے وقت تیار رہے ہوں گے انیسواں سال کو کیجئے سے چٹائے بے خبر پڑی تھی، کہ باپ کے غصوں کی آواز سے قسیم کی آنکھ کھلی گئی۔ سیدھا اٹھ کر کھڑا ہوا باپ کے پاس چلا گیا۔ بچے کا آنا اس وقت جبکہ قسیم اپنے نئے دوستوں کی صحبت میں حراسے اڑا رہا تھا، بہت سی غصہ معلوم ہوا۔ اس بیداری سے اس کو باہر نکالا کہ کھینے والے بھی دنگ رہ گئے۔ قسیم کی دونوں ہاتھیں چند روز کے واسطے دھن گئیں اب صرف نیرتو اور اس کا بچہ گھر میں رہ گئے تھے۔

میں ابھی دودھ تک باپ کی اس سنگ دلی پر کبھی قسیم پر کوئی خاص اثر نہ تھا۔ اس نے سبر قسیم سے کام لیا، اور ضبط کیا۔ محاسن کے بعد مضمی کی جان نہ بڑا وہ تاب نہ آئی۔ ایک دن اصر قسیم گھر آیا اور اصر وہ جا کر باپ کے پاؤں میں اپٹ گیا لیکن قسیم قتی القاب باپ نے اس طرح پاؤں جھٹکا کہ بچے کے منہ میں ایچی لگی اور خون نکل آیا۔ وہ روت پڑا، باپ اور قسیم یہاں پہنچا۔

اس واقعے کا تیسرا روز تھا کہ قسیم نے بچے کو تھپا یا سر میں تل ڈالا، کٹھنھی کر بھلی تو اس کی صورت نہ سمجھی، چارے آ یا، گود میں اٹھا کیجئے سے نکالا۔ مگر آنکھ سے پپ آپ آنسو کرنے لگے۔ قسیم ماں کی حالت دیکر کچھ ایسا بے چین ہوا کہ اپنے کرتے کے دامن سے اس کے آنسو چوڑھے اور کہتا "ماں جان، کیوں روتی ہو؟"

نیر: ”وہاں مجھ ہی چلو چل کر لیٹ جاؤ۔“

خیم: ”اماں! ہمارے گود میں نہیں لیٹتے۔ خیر میں اب یہاں جاؤں گا۔ میں بھی اماں ہی کو گود میں لوں۔ اس کو بھی نہ لوں گا۔“

نیر: بچے کی بات پر مسکرائی۔ خوب ہنسی کر بھاڑ کیا اور کہا۔ اٹھ تھوڑی دیر اور باز کرے تم جیتے رہو چکی سب کچھ ہے۔

دو پہر ہو چکی تھی۔ لے کر کھل تو بچہ سو گیا۔ غریب اماں اس ہوائی تو تھکا کر گئی۔ کارخانہ کر چپے کے پاس آئی تو اس کا ہنر اپنا تھا۔ کچھ دھک سے ہو گیا۔ بچے کو اس غصہ کا بخار چڑھا کر ابھی تو یہ عشا کے وقت تک وہ مصوم ہاتھ کی طرح بچہ رہا تھا۔ تاکہ وہ اسے دیکھ کر نہ اپلی گئی اور نیر سارے لالہ کی گود میں لئے چڑی رہی۔ اماں کی باتیں یاد آئیں۔ بچپن پر غور ہے۔ کچھ بعد کبھی تھی کہ شاید چن بچا گیا ہو مگر وہاں تو ہمارا بچہ رہا تھا۔ خیم آج کسی خاص جلسے میں تھا۔ مصوم بچہ عالم باپ کو بخار کی حالت میں خواب میں دیکھ رہا تھا۔ جلتا آ کر کھولی۔ اماں کہہ کر اس سے بہت گیا۔ ماں نے بری نہ چکا را مگر وہ رو دتا جتنا گود سے اتر اور وہاں خانے کے دروازے پر گیا اور باپ کو بلا دیا۔ انا کہ نیر کہہ رہی تھی کہ بیٹا ابھی نہیں آئے مگر وہ جگہ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ اماں جان! اندر لیٹے ہیں، کتھی لگائی ہے۔ اب نیر بچے کو گود میں اٹھا کر اندر کے دھان میں آئی۔ حد پر حد رکھا۔ بھاڑ کیا۔ چٹا پالا۔ گلے میں دھوا اگلے گلے گلے باغوں کو چپے پر رکھا اور کہہ کر کہا۔ ”میرا بچہ جی! یہ دیکھا مصیبت اور نیر کا لالہ تیری امانت ہے اے اللہ لیکن اچھے باغ میں ہے۔ پر تم مجھ سے۔ بچے آؤ اگلے میرا دیکھاری کا لالہ لگتا لالہ کا چڑا ہے۔“ نیر لیکن تک پہنچی تھی کہ خیم بھرا اٹھا اور کہنے لگا۔ ابھی ماں جان! اچھوڑو دیکھو اماں گلوں کے پاس کھڑے ہیں۔

نیر کے پاس اس کا کچھ ہو پ نہ تھا۔ آگے سے آنسو کی پھڑپھڑاں بہہ رہی تھیں۔ کبھی اس کو چپے سے لگاتی اور کبھی اس کی ضد پر پھوڑا دیتی۔ عین مٹا چکے تھے۔ چار برس کا پالا پالا بچہ آگے ماں کے ہاتھوں میں تھا۔ بارش زور شور سے ہو رہی تھی اور اس عظیم الشان مکان میں ایک بالھیب ماں اپنے بچے کے گود کے لئے ٹھہری تھی۔ ہاتھ پر ہاتھ پھیرتی پاؤں کو بھاڑ کرتی۔ بلبلاتی اور دیتی۔ بچے نے پانی مانگا رات کا وقت تھا۔ گود میں لے کر دروازے پر آئی کہ کسی سے شربت منگو اور مصوم کا حلقہ کر دوں۔

مگر سڑک پر سنا تھا۔ اپنی لونی اور یہ کہہ کر پانی پلا دیا۔ ”بچے کے گود سے“ شربت بھی نصیب نہ ہوا۔“

نیر کا ہی کہنے پانی تھی کہ خیم کو بھر غفلت ہوئی اور ماں کا منہ اس کے ہونٹوں پر تھا کہ وہ چوٹا اور کہا ابھی اماں! وہ آگئے۔ لہ آؤ

۱۶

بھرا ہی نیر نے اس وقت بہت ناچا یا مگر بچہ نہ سنبھلا۔ کھڑا ہوا مگر گردن گرتے ہی ماں نے گود میں لیا۔ لیٹتے ہی آنکھیں پھیر لیں۔ ”اماں! زبان سے نکلا۔ مگر کھلی ہی آواز ہے اس کو کیسے بھلی آئی۔ آنکھیں ماں کی صورت پر دھوڑاں اپ کی پاؤں میں تھی کہ نیر کی گود میں اس کا لالہ پہلے کی نیند سو گیا۔



سجاد حیدر یلدرم

اصل نام	سجاد حیدر یلدرم
قلمی نام	خانہ خان مسٹر شامی (جیک) / یلدرم (از ہندو) / سجاد حیدر یلدرم
تاریخ پیدائش	1880ء یہ مقام موضع نیلور، ضلع بجنور (بھارت)
تاریخ وفات	11 اگست 1943ء رات دو بجے کلکتہ میں انتقال کیا۔
تعلیم	ابتدائی تعلیم ہارس میں پائی۔ انڈین ہٹ اسکول۔ اے۔ او کانٹنٹلی گڑھ۔ الہ آباد یونیورسٹی کے تحت بی۔ اے کے امتحان میں صوبہ ہارس میں اول تھے۔ لیکن ریاضی میں ٹپس ہو گئے۔ اس سے قبل مدرسہ انصاف علی گڑھ کے طالب علم تھے۔ 1901ء میں ایم۔ اے۔ او کانٹنٹ، علی گڑھ سے بی۔ اے کیا اور الہ آباد یونیورسٹی میں سیکنڈریہ۔

مختصر حالات زندگی:

آپ کے والد سید جمال الدین حیدر شہزادس کے کوٹوال تھے۔ یلدرم بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ناگ پور کے راجہ اعظم شاہ کے اداہیق مقرر ہوئے۔ پھر کچھ عرصہ میں گورنمنٹ نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر علی گڑھ کانٹنٹلی گڑھ بھیجا دیا۔ 1901ء میں بھارت کے برطانوی قرضے خاتمے میں ایک ترجمان کی جگہ علی گڑھ کانٹنٹ کے پرنسپل مورسین کی سفارش اور ذریعہ زبان میں شہرہ کی وجہ سے یلدرم کا انتخاب عمل میں آیا اور یلدرم بھارت چلے گئے۔ وہاں سے ان کا جہاز قسطنطنیہ کے سفارت خانے میں ہو گیا۔ کئی برس تک صحت خرابی اور شرتی ہوسپ میں سیر و سیاحت کا موقع ملا۔ ایک بار ہندوستان آئے اور وہاں بھارت دے گئے۔ "محران" دہلی فروری 1908ء میں اطلاع دی گئی کہ یلدرم نے بھارت سے بھارت آ کر پٹنچنگل اسپتال میں سی۔ پی۔ رست کی اور وہاں وہاں میں کبلی ہسپتال ہوئی اس کے بعد پٹنچنگل اسپتال میں یلدرم کو معزول ایم۔ کاٹل ایم۔ پتھوب علی خان پر مسوری میں اسسٹنٹ پٹنچنگل اسپتال مقرر کر دیا۔ امیر یاقوب علی خان کے انتقال کے بعد پٹنچنگل

- پہلے کے افسانے کا ترجمہ ہے۔ ۱۰۔ "ازدواجِ محبت" (ترکی افسانے کا ترجمہ)۔ چار سو صفحات کی یہ کتاب میرٹھ کی تنقید کے ساتھ شائع ہوئی۔
- نوٹ: اس کتاب کا ایک ایڈیشن انگریز ایک ایجنسی نے ۱۹۳۴ء میں شائع کیا۔ افسانے "چراغِ سے کی کہانی" کا تیسرا پروڈکشن ہیرا (لوگ آباد دکن) کے حکومتی طور پر "چراغِ سے کی کہانی" مطبوعہ "ملون" لاہور شمارہ نمبر ۲ جلد نمبر ۳۱۳۱۔ نومبر ۱۹۰۲ء سے مستعار ہے۔ جب کہ اس مجموعے میں جدید کا پہلا مطبوعہ افسانہ "اسم" مطبوعہ "علی گڑھ منتقلی" مئی ۱۹۰۶ء کو دکنی اخبار "دکھان" سے شائع کیا گیا۔ (۱۳ افسانے اور ۴۴ افسانے) مسلم بولے دکن، پرنس علی گڑھ، طبع اول ۱۳۳۵ھ
- ۲۔ "دکھان" (۱۳ افسانے اور ۴۴ افسانے) مطابقت ۱۹۳۶ء
- (دکھان) ۱۔ "آئینے کے سامنے" ۲۔ "نوشہ کی پہلی ترکہ" (طیلسی رشتہ کے ترکی افسانے کا ترجمہ) ۳۔ "لسانِ ہائے عشق" (الف ہندوستان کی رقصہ) (ب) مصرقہ بزم کی مجموعہ ہائے عاشق نواز (ج) ہفت ہفتہ کا تہدی۔ ۳۔ "گنہ گم مطبوعہ" (طہرست میں گنہ گنہ دہا ہے) ۵۔ "بوسہ و فغان" ۶۔ "کوسم سلطان" ۷۔ "عورت کا افسانہ" ۸۔ "دکھان کا انتخاب" (احساسات) ۹۔ "ایک مقلد سے اچھا" ۱۰۔ "آویز نگہیں" ۱۱۔ "تجری" ۱۲۔ "موسے اور وطن" ۱۳۔ "دو بھائیوں کا خاتمہ"
- نوٹ: "دکھان" کے حصے کی چھ چیزیں خالد واریب خانم کے ترسے ہیں۔
- ۳۔ "دکھان" (نئی بھون) (افسانے) انگریز ایک ایجنسی، لاہور، طبع اول ۱۹۳۳ء سے قبل
- اس کتاب کی اکثر چیزیں "دکھان" اور "دکھان" (احساسات) سے چھٹی گئی ہیں۔
- ۳۔ "دکھان" (نئی بھون) (ترکی ناول) ادارہ عکس (ترجمہ) طبع اول ۱۹۰۳ء
- ۵۔ "توہرہ" (ترکی ناول) (ترجمہ)
- ۶۔ "مطلوبہ" (ترکی ناول) (ترجمہ)
- ۷۔ "آسیب الفت" (ترکی ناول) (ترجمہ) مکتبہ جامعہ دہلی طبع اول ۱۹۳۰ء
- ۸۔ "نہا خانم" (ترکی ناول) (ترجمہ) ادارہ ادب حیدر آباد دکن طبع اول س۔ بی
- ۹۔ "ایک کہانی چھوٹیوں کی کہانی" (پاشترک)
- ۱۰۔ "جلال الدین محمد و شہ" (ترکی ناول) (ترجمہ)
- ۱۱۔ "ہنگ و بدل" (ترکی ناول) (ترجمہ)
- ۱۲۔ "چراغِ خواب" (طولی نظم ترکی زبان سے ترجمہ)
- ۱۳۔ "مرزا پھولانی گڑھ کا گڑھ" (طولی نظم ترکی زبان سے ترجمہ)
- ۱۴۔ "چراغِ خواب" (ترجمہ) (ترجمہ)
- اس کتاب میں "چراغِ خواب"، "آسیب الفت"، "مطلوبہ" اور "نہا خانم" کے مترجم ہیں۔

نظریہ فن:

”زکوں کی سوئشل زندگی کی تصویر، جس مرد میں اس لیے ضروری سمجھتا تھا کہ ہماری سوسائٹی اور طرز معاشرت میں جو انتخاب پیش آ رہا ہے وہ انہیں بھی پیش آ چکا ہے۔ اس وجہ سے ہمیں اس نقشے سے معلوم ہو جائے گا کہ اس منزل سے وہ کس طرح گزرے ہیں اور اب کس کی ہیں۔“

۳۴ حیدر علی دم

(”انتقال سے حرج، مستطور“، ۱۹۰۴ء سے اقتباس)



حوالہ جات:

- ۱۔ ”کار جہاں مرد ہے“ از قمر الامین حیدر علی دم، حیدر علی دم کی پیدائش قصبہ کانرغہ ضلع بھائی کاٹائی کی ہے جب کہ حیدر علی دم اپنی پیدائش موضع لیچور ضلع بہاول کی ہوتے رہے ہیں۔
- ۲۔ حیدر علی دم کے ابتدائی دور کے تراجم اور طرائف ”حیدر علی دم (دور بعد از)“ کے قلمی نام سے شائع ہوئے۔ ”مخزن“ میں نکلے دہائیوں کے شمارے کرواتے ہوئے سر محمد ابراہیم ”مکھن“ نے بھی لکھی ”حیدر علی دم کی ابتدا کے اوقات میں، مضمون نگار ہیں۔“ اصل تصدیق قمر ۱۹۰۱ء میں لی۔ اسے کرنے کے بعد بعد از کے راجہ نوری آفzul خان سے میں نے اس معاملہ کی اطلاع ملے کے۔ وہ اپنی جگہ پر اس مضمون کو لکھ کر دیا تھا، اس پر ”حیدر علی دم (تراجم اور)“ انعامتہ پڑھا۔

چڑیا چڑے کی کہانی

سجاد حیدر علی مدرم

مطبوعہ ”عقلم“ لاہور، اپریل 1907ء

”چوں چوں چوں“ سب تلو، سب جوت اچڑیا چڑے کی کہانی بہت انسانوں نے لکھی ہے مگر قلم درگاہ دشمن سے، ”چوں“ چوں چوں، چوں“ میری اور چڑیا کی لڑائی، بہتان اچڑیا کی آنکھیں دیکھنے کا بیان کرنا، انفرادی چوں، چوں چوں، چوں چوں، آؤ اب میں تمہیں چند باتیں سنائیں کہ تمہاری آنکھیں کھلیں

حضرت انسان کو باتیں مانی بہت آتی ہیں، اور جس جھوٹے مطالبہ کی قوت عطا کی ہے۔ ویسے دیکھو تو میں بے وقوف ہوں ہوا اور ادراد چہ کن نظر آتا ہوں مگر میں دیکھتا سب کچھ ہوں، لکھتا سب کچھ ہوں، کہتا بھی سب کچھ ہوں، مگر تم نہیں سمجھتے۔

میں دیکھتا ہوں کہ خدا نے مجھے آزاد، آزادی طلب اور آزادی پسند حقوق عطا کیے ہیں۔ پرندوں اور چمچوں میں بہت سے ایسے ہیں کہ انسان سے بالکل غفلت کرتے ہیں اور جنگلوں میں انسان کے گونسلوں سے دور ہا کے رہتے ہیں۔ بعض بے وقوف ایسے ہیں کہ انسانوں میں انسان کے خادم ہو کے رہتے ہیں، مگر میں انسان کی کارستانوں کو دیکھنے کے لیے شرمیں رہتا ہوں۔ ان کے بڑے بڑے صوفیہ صوفیہ گونسلوں میں اپنا پیارا پیارا چھٹا چھٹا گونسلہ لٹاتا ہوں، لیکن وہ بکر کے مجھے رکھنا چاہیں تو کبھی نہیں دیتا۔ پھر سے میں بند کر کے دیکھنے کی بات دہری ہے۔ یا میرے پرکاش دین تو وہ اور ہی بات ہے وہ نہ میں کبھی حضرت انسان سے مانوس نہیں ہوتا۔ میں انہیں خود غرض سمجھتا ہوں اور یہ سارے بے کاغذ۔

مگر مجھے اپنی کہانی مانی ہے، بشرطہ حضرت انسان سے لگی ہو باتیں ہو جائیں گی۔ (چھڑک کے اور پروں کو پھیلانے کے) خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسا اچھا لہاس دیا کہ جسے نہ صرف خود سمجھتا ہوں، مگر خدا کا کہ انسان کی حرمیں لگا ہوں کا جوف بن جاؤں۔ جسم میں مہر قی دی کہ خوشی غم ہی چھڑکاں بھروں۔ چھوٹے پروں میں پرواز کی تیز طاقت دی کہ انسانوں کی رفیق مانی کی ہم نوا مانی کی ملجائی جی کی دست برد سے چوں۔ جسم ہر سوزوں دیا کہ بیان نہیں ہو سکتا، خدا کا وہ اگر لٹا چننا اور باز مجھ پر چھٹیوں، مجھے وہ کہتر پر چھپتے ہیں، خدا کا چھوٹا کہ مشرک الارض کی طرح

ضرورت ہے خدا رزق اپنے اہل بچوں کے سوا کسی کی خدمت کرنا کسی کے گھونٹے پر جا کر اور پیرا مگری کرنا عمار کی بات ہے، جنگ کی بات ہے مگر انسان دینی عقل، اخلاق جو اپنے تئیں دینی آموز قد رست خیال کرتا ہے اس نکتے کو نہیں سمجھتا۔

ہمارے رب کا ارشاد ان اسی نے ایک لفظ نکالا ہے اور اسی پر اسے بہت تار ہے، کہتا ہے: ”موا کے پیرے کسی میں حیا نہیں، سب جاہل اور موا کے انسان کے بے حیا ہیں، حیا اور شرم کا احساس صرف مجھ میں ہے“ اور انکے بارے میں دلی تھوڑی دیکھیں، ایسے تو حیا کیا ہے، وہ رب کا ربی ہے۔

انسان چاہے اور انسان چاہے، کھوتہ چاہے اور کھوتہ چاہے اور اسے بدلنے کے لئے اور پورا گھبراہٹ میں دیکھتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا انسان نے یہ حالت کھوتہ سے لی ہے یا کھوتہ نے انسان کی نقل اجاری ہے۔ میں اس کی تحقیق نہیں کر سکتا کیونکہ کھوتہ اگرچہ پہلو ہے، لیکن ایسا حلقہ قدرت ہے تاہم اس پہلو ہے کہ انسان سے بہت دافوس ہے اور ایسا کامل ہے کہ اپنے لیے گھوسا بھی نہیں دے گا انسان اس کے لیے گھوسا دے گا ہے اور یہ اس کے غرض میں اس کا اور ماغریہ و قلام بن جاتا ہے۔ وہ اسے پکڑتا ہے مگر پھر سے میں بد نہیں کرتا پھر بھی یہ اس سے غرض نہیں کرتا اور اس میں نہیں جاتا۔

نہیں کہو، گوارے رات ان طرحوں کی ضرورت نکالنے اور رات بدلی کرنے کے سوائے کوئی کام نہیں (صبح سے شام تک یہ حضرت رات بدلی کیا کرتے ہیں اور یہ خیال ہے کہ رات بدلی بچوں کا کام دھرنے کے لیے نہیں، اگر ایسا ہوتا تو کوئی بچہ کی بات نہ سمجھتا کیونکہ بچہ اسے بچہ اڑ نہیں سکتے اور ان کا کام وہاں بچوں ہی کو بھرا نا ہے کہ کہو تو بچی ہے فائدہ ایک دوسرے سے چھوٹی ملایا اور بھڑ بھڑا کرتے ہیں اور ایک صفت دہ صفت نہیں، گھنٹوں میں ہی کیا کرتے ہیں) گو، کہو تو کس کے سوا، کوئی اور کام نہیں تاہم سادہ لوح اور صاف اردن حقوق! وہ بھی انسان کی طرح چھپ چھپ کے رات بدلی نہیں کرتا۔

مگر حضرت انسان، جان کا یاد دلاؤ ہم ہی مرنا ہے۔ والد جلدی میں یہ کیوں کر کہ نہیں بلکہ بڑھے ہوئے ہی ہوں گے مگر وہ ہی خود اچھا چاہتا ہو کہ وہ شرم کی باندھی سے اپنے گناہوں میں چھپ چھپ کے لیکن پہلے کہ چٹا ہوں کہ وہ دنیا شرم نہیں ہے بلکہ وہ دنیا کا راز ہے۔ جو گناہوں میں وہ چوری چھپے کرتے ہیں وہ غلط نہیں کر سکتے۔

کلیسی کی قربت ہے یہ تھا۔ اے چڑھس کے گھونسلے میں کلی انسان چڑیا بیٹھے تھے۔ میں اور بہت میں تھا۔ وہ اپنی زبان میں چوں چوں کر رہے تھے۔ میں اپنی زبان میں چوں چوں کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس گھونسلے کے ایک حصے میں جسے تم کمرہ کہتے ہو، وہ سب انسان تو چلے گئے۔ بس ایک انسان چڑھو ایک انسان چڑیا۔ چڑھا دلی زبان میں یہاں بی بی ہو گئے۔ اب انہوں نے داند بدلی شروع کر دی اور بھروسہ بنیاد محبت کی باتیں ہونے لگیں۔ تم کو کس سے اس میں روکا کاری کی کوئی بات ہوئی؟ سنئے۔ جب ان کے ہم جنس بیٹھے تھے تو اس وقت انہوں نے یہ باتیں کیاں خدا رکھیں؟ اگر کوئی شرم کی وجہ سے، بہت خوب ان بعد میں بھی تو میں کمرہ میں موجود تھا، پہلے مجھے خیال ہوا تھا کہ شاید انہوں نے مجھے دیکھا نہیں، اس لیے میں ان کے اور بچہ پلاز ان کے ان کے قریب بیڑ پر چاہیٹھا، کمری پر چاہیٹھا وہاں سے ان کے دربار میں جو تھمرے لگی ہوئی تھیں، اس کے چوکھٹے پر چاہیٹھا وہ اب بھی ان پر کچھ توڑ نہیں ہوا۔ اپنے کام سے کام آتا غریب نے زور سے جانا شروع کیا۔ "میں یہاں ہوں، میں یہاں ہوں، چوں، چوں، چوں۔" تم کہے چلائی دیکھتے، مجھ کو دیکھ کر وہاں نے بیٹا شروع کر دی۔ مجھے نہایت غصہ آیا اور میں ان کو گالیاں دیتا ہوا سفر سے کمرے سے باہر اڑ گیا اور مارتے آپ علی فرماتے آپ اسے کیا کہتے ہیں، دنیا بار کا کاری؟

اسی ایک بات پر کیا منحصر ہے، حضرت انسان کے ڈھنگوں سے میں خوب واقف ہوں۔ کوئی مجھ سے بچنے کوئی لاکھ بار تو میں نے انسان چڑے کو انسان چڑیا کے سامنے لڑا مائے دفا داری کرتے سنا ہوگا۔

”آہا میں قسمیں پاتا ہوں تمہارے سوا اور بھی ہوتا اس پر آنکھ نہ اٹھوں“ ہے چاری بھولی بھالی چڑیا اسے یقین کرتی ہے اور محبت کی آنکھوں سے، ان آنکھوں سے جن سے آنسو اور احسان مندی پہنچتی ہوتی ہے اسے دیکھتی ہے۔ یہاں اس طرح کا شرع شرع میں اس سے بہت متاثر ہوتا تھا۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں کہ وہی انسان چڑا دوسرے دن دوسرے گھنٹے میں دوسری چڑیا سے (کبلی چڑیا کی نظروں سے دور کہہ رہا ہے آہا میں قسمیں پاتا ہوں تمہارے سوا اور بھی ہوتا اس پر آنکھ نہ اٹھوں۔“ اور یہ چاری مصروف چڑیا بھی اس جھوٹے باز کے پسندے میں پھنس جاتی ہے اور اپنا محبت بھرا دل اس کے سپرد کر دیتی ہے۔

تیسرے دن کہا دیکھا ہوں کہ وہی چڑیا ایک اور گھنٹے میں ایک تیسری چڑیا سے کہہ رہا ہے ”آہا میں قسمیں پاتا ہوں تمہارے سوا اور بھی ہوتا اس پر آنکھ نہ اٹھوں“ اور تیسری جھٹکے محبت بھی، ان باتوں پر یقین کر کے، دل باز چلتی ہے۔ آٹھ لاکھ ایک، ان آٹھ کے بیٹوں کو حقیقت معلوم ہو جاتی ہے اور ریا کمزوروں سے چند چالیں یافتہ انسان چڑیوں کی لاشیں نکلتی ہیں یا لاشیں باقی نیند سلا دیتی ہے۔

دل چاہتا ہے اس ناپاک خلق کو خوشیوں مار مار کر مار دالوں۔ یہاں چڑیا بول گئی۔ ”چڑے کا قلعہ کام تو ہوتا ہے مگر مجھے یہ کہنا ہے کہ انسان چڑیا کا بھولا بھلا نہیں فہم نہیں ہو جاتا کہ ہر بات سے ظاہر ہوتا ہے۔ میرا چڑا، میں اس کے سامنے کہتی ہوں، کچھ ذاتی قصور ہی ہوں، رات دن مجھ سے کیا کرتا ہے“ تم بے حد خوبصورت ہو تمہاری روبرو غماش کوئی خوبصورت نہیں، مگر خوشامد سے میرا دل غماش نہیں کھل جاتا۔ میں اس کا نینتی ہوں اور اس کا ہی اڑا دیتی ہوں، کیونکہ گواہ کی نظروں میں میں خوبصورت ہوں، لیکن حقیقت میں خوبصورت نہیں۔ اسے میں ابھی طرح جانتی ہوں مگر کبھی آدم نے غماش سے کہا تھا کہ ”تم بہت خوبصورت ہو“ میں وہ دن اور آج کا دن کہ انسان چڑیا کے سامنے سے آئینہ نہیں چلا۔ آئینہ نہیں تو آری ہے، آری میں تو پانی میں اپنا عکس دیکھا جاتا ہے اور اپنے عکس کو دیکھ کر کے خودی مبھرا کرتی ہے اور بارے غرور کے ذہن پر قدم نہیں رکھتی۔ یہ نہیں سمجھتی کہ یہ سب چڑے کی خوشامدی کی باتیں ہیں اور نہیں۔

بہار گھر میں بیٹھی، چڑے کو نیک اور اپنا عاشق سمجھا کرتی ہے اور چڑا اس کی نصیحت میں رنگ دلیاں مانتا ہے۔ یہ نہیں سمجھتی کہ ”بالِ حرب“ فٹنِ حرب“ بھی، تو ہے اور چاہتا ہے۔ میں اس نکتے کو سمجھتی ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں ہر وقت اپنے چڑے کے ساتھ ہوں۔ یہاں تک کہ اگر ایک معیشت میں بھی میرا ہی شریک ہوں۔ میں چڑے کو کھڑو تھوکی کا سونچ ہی نہیں دیتی۔ ”چڑے نے بہار کا شرع کیا“ سب مجھے دیکھیے یہ بہار غرور اور ستائش کے طور پر نہیں کہتا اور اپنی چاری چڑیا کو سامنے کے لیے کہتا ہوں۔ بلکہ واقعہ یہاں کرتا ہوں کہ میں ایک، اس ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں، ایکے کب کا طواف کرتا ہوں، ایکے دھوپ کی گرد بھرتا ہوں، میں ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں اور اس کے ساتھ چان دلا دیتا ہوں اور اس چان کو نہیں تو ڈاتا مگر یہ کس وقت آسکا سے تو ڈوے۔

میں ایک چڑیا کو دل دیتا ہوں اور اس کو پورا اختیار دیتا ہوں کہ میری کل حرکتوں کی نگرانی کرے میں جیس جیس ہوں، جس مجلس میں پہنچوں میرے ساتھ وہ لڑائی لڑوں تو میرا دل بڑھ جائے چیکوں تو میرا فہم سے لاشوں کی طرح ہمہ خط واحد واحد ذرہ کی ہر نہیں کرتے۔ میں (بچا کہنا چاہیے) کبھی کبھی اپنے ہر دوسری چڑیا کے لیے بھی بخلا دیتا ہوں، لیکن یہ مجلس خوشی روز گیل ہوتی ہے۔ اس سے کوئی خاص ارادہ، مقصود نہیں ہوتا اور میری چڑیا بھی اسے چاہتی ہے۔ اس لیے نہ وہ ناراض ہوتی ہے اور نہ میری طرف سے اس کے دل میں شبہ چشتا ہے۔

لوہم سے ہاتھ کرنے میں میں بھولی سی گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ میں انسان بچوں کی صرخہ نہیں کر سکتا اپنے بیٹے میں اپنے ہال بچوں کا خیال تک نہیں کرتے بلکہ بعض تو ہمیشہ کے لیے انہیں چھوڑ دیتے ہیں، ذہنی و فکری بھی نہیں دیتے۔ میں ایسا بے غیرت نہیں، جب ان بچوں کو دنیا میں لانے کا میں ہی سبب ہوا ہوں، تو جب تک غور نہ کر سکیں، میں خود گھبراہٹ ہوں گا لیکن اسی کا چاند بھراؤں گا۔ بڑی دیر ہو گئی، وہ چہ جیج کھوئے انتظار میں بیٹھے ہوں گے، یہاں ڈراما مجھے دانے یا دلی کی چھوٹی چھوٹی کولیوں کا کرتہ ڈال دو۔"

آیا، اتم نے میری خواہش پوری کی۔ شکر یہ ہوا کرتا ہوں، خدا تمہارے اور تمہارے ہال بچوں کے چٹوں کو بھی بہت بھرا رکھے۔ لوہب جاتے ہیں۔

ج "بھرتیس کے اگر خدا ہے"

اور یہ کہتے ہوئے دونوں بھرے اڑ گئے۔

سلطان حیدر جوش

نام	سلطان حیدر
تلمی نام	جان نکل / سلطان حیدر جوش
پیدائش	۹ نومبر ۱۹۸۶ء، مقام ملی
وفات	۱۱ مئی ۱۹۵۳ء، مقام ملی گڑھ
تعلیم	میٹرک / انٹر میڈ

ابتدائی تعلیم شیخوپورہ، پنجاب میں حاصل کی۔ مشن اسکول جموں میں چوتھی جماعت میں داخل ہوئے اور ایک سال بعد انہیں دہلی منتقل کر دیا گیا۔ انگریز ایک اسکول دہلی سے انٹرنس پاس کیا۔ ۱۹۵۵ء میں مدرسۃ العلوم ملی گڑھ میں داخلہ لیا۔ ۱۹۵۶ء میں ذوالحسن الملک کے خلاف طلبہ نے جو ہنگامہ کیا، اس کے سرکردہ لیڈر تھے اور جان نکل کے نام سے مشہور تھے، نتیجہ میں ان کا نام بھی گڑھ کاٹیج سے خارج کر دیا گیا اور انہوں نے فوراً تھانہ ملی میں قلعہ کو خیر باد کہہ دیا۔

مختصر حالات زندگی:

شیخوپورہ، پنجاب میں کے فریدی خانوادے کے رئیس خیر الدین کے ہاں پیدا ہوئے۔ ان کے مورث اعلیٰ شیخ شرف الدین تھے جبکہ والدہ کی طرف سے ان کا سلسلہ نسب حکیم حسن اللہ دہلوی سے ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۲ء میں واسطے سے حضرت بابا فرید گنج شکر سے جاملتا ہے۔ اسی سلسلہ سے ”ملاح فریدی“ کہلاتے تھے۔ خیر الدین، ہدی بخشی رئیس تھے، سوان کے طور اطوار کے سبب، جوش کی والدہ نے زیادہ وقت نیپک (دہلی) میں گزارا۔ جوش جڑی کا بچپن دہلی میں گزرا اور ابتدائی تعلیم و تربیت والدہ کے زیر اثر ہوئی۔ مولوی عہد السلام سے عم متعلق اور چھڑ سیکھ۔ لڑکپن میں گنگا سٹ سے شاعری کا کیرئیر شروع کرنا چاہا لیکن جراتی میں چپ لگ گئی۔

سلطان حیدر جوش کو تم جانتے نہیں
ایک ہی تو لوگ ہیں بچاتے نہیں

سلطان حمید جوش اپنے خاندان کے پہلے اکر پاس انگریز بی ڈان تھے اور انگریز سرکار کے وفادار۔ دیگر روایتی گونا گوں دلچسپیوں کے علاوہ کسرت، اوسر، جنگ، کشتی اور گڑھ ساری سے شوق رکھتے تھے اور اپنے وقت کے شہرور پهلوان تھے۔ خوبصورتی اللہ کی دین تھی اور تین ساری ان کا اپنا کمال۔ علی گڑھ کالج سے بی اے دہلی کے بعد ۱۹۱۲ء تک بے کاری کے دن گزارے۔ ۱۹۱۴ء میں ان کے چچا خان بہادر ممتاز الدین کی سفارش پر دارالاسلام نے جوش کو نائب قسیدہ دہلی ملازمہ سے ملا کر دیا۔ ۱۹۱۶ء میں ہروائی کے مقام پر قیام رہا۔ نائب قسیدہ دہلی اور قسیدہ دہلی سے رٹ کی کرکڑی کنگھڑے کے عہد تک پہنچے۔ ڈپٹی کنگھڑی کے زمانے تک اپنے سرکاری جنگوں میں اکھاڑا جواتے اور کشتی سے شوق فرماتے رہے۔ اس شوق سے انڈسٹریل میں نکلنے پر ان کے والد نے اکھاڑا بند کر دیا۔ ۱۹۳۹ء میں مین پوری میں ڈپٹی کنگھڑے۔ ۱۹۴۶ء میں بلورڈی کنگھڑے میں چائی تو اپنے آبائی علاقے شیو پور کی بجائے علی گڑھ میں مدرسہ روزہ خاندان کو مستقل مکان بنایا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کے قاضی رہے۔ جیلز کے پہلے میں اپنا ترجمان انسان "علاقہ" قلم بند کیا جو خاندان ان کا آخری افسانہ تھا۔ آخری عمر میں قوتِ نامت سے محروم ہو گئے تھے۔ ان کی ایک بیٹی عابدہ کی شادی ہندوستان کے صدر فخر الدین علی احمد کے ساتھ ہوئی، دوسری بیٹی علی گڑھ کے گڑھ کالج میں پروفیسر تھیں۔ بیٹے کا نام احسان حمید جوش تھا۔ جوش صاحب نے سرطان کے مرض میں مبتلا ہو کر لاٹھی ۱۹۵۳ء میں وفات پائی۔ ساری اولاد لاٹھہ چھوڑی۔ وہ آخر وہ لاٹھیاں اور ایک نواسی ان کے قریب موجود تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

اولین مطبوعہ تحریر:

جان کی کلمی نام سے ایک حوالہ قریب مولا اختر علی کے رسالہ "کوشش" کے لیے اپنی یادوں کے خزانے سے کھلی۔
ابتدائی تحریریں "کامریٹ"، "غیب" اور "تھان" میں شائع ہوئیں۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"نیا جی" مطبوعہ "نور" لاہور شمارہ نمبر (۳) دسمبر ۱۹۰۶ء بہت نکلن چہ رسالہ "غیب" کا "تھان" بہت ۱۹۰۵ء میں سلطان حمید جوش کا کوئی افسانہ شائع ہوا ہو، جس کا دعویٰ وہاں کر لیا کرتے تھے۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ "میری دہلی" (ایک افسانہ کتابچہ)
- ۲۔ "مداہات" (ایک افسانہ کتابچہ)
- ۳۔ "چاند بہر میں" (کتابچہ جوش) میں شامل کر دیا گیا۔
- ۴۔ "افسانہ زمانہ" (ایک افسانہ کتابچہ)
- ۵۔ "افسانہ بعد میں" (کتابچہ جوش) اور "جوش نگار" نامی مجموعوں میں شامل کر دیا گیا۔
- ۶۔ "افسانہ جوش" (۶۰ افسانے اور ۹ مطالعین)

مطبوعہ: عزیز بی بی پریس، آگرہ

مطبوعہ: انظار بی بی پریس، کھنوا

مطبوعہ: انظار بی بی پریس، کھنوا

مطبوعہ: انظار بی بی پریس، کھنوا

مطبوعہ: انظار بی بی پریس، کھنوا

مطبوعہ: انظار بی بی پریس، کھنوا

اس کتاب میں "مساوات" (مطبوعہ "الناظر" مئی ۱۹۱۲ء)، "پیراجی مرقیہ" (مطبوعہ "الناظر" اپریل ۱۹۱۳ء)، "طریق آجہ" ("الناظر" مارچ ۱۹۱۳ء)، "حوش مجیب" ("الناظر" یکم جنوری ۱۹۱۵ء)، "انکشافات زمانہ" ("الناظر" جنوری ۱۹۱۳ء)، "انوارِ مہبت" ("الناظر" یکم اپریل ۱۹۱۶ء) کل چھ افسانے اور نو مضامین پہ عنوان "انکشاف حقیقت"، "مرقیہ سے کیا طرح رہائی اور نتیجہ"، "آئینہ خودی"، "نرگس خود پرست"، "انکشافات زمانہ"، "مسٹر"، "سید دوستی"، "مرد یا عورت"، "قرض و مقراضی" اور "پیداگانہ" شامل ہیں۔ یہ سلسلہ الناظر کی دوسری کتاب ہے۔

۵۔ "بہوش فکر" (۵ افسانے اور ۶ مضامین) مطبوعہ اسٹریٹ گزٹ پریس علی گڑھ، طبع اول: س۔ ن۔

کتاب میں شامل "اقتباس" اور عرب سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب "فلسفہ حوش" کے بعد شائع ہوئی۔ اس کتاب میں "مسٹر ایلیس" (مطبوعہ "قرن" کا دسمبر جولائی ۱۹۱۱ء)، "پاس انھیں"، "خواب و خیال" (مطبوعہ "عقیق" فروری ۱۹۲۰ء)، "جذبہ دل کی دو تصویریں" (مطبوعہ "جامع" کا دسمبر ۱۹۳۲ء)، "انکشافات زمانہ" کل پانچ افسانے اور ۶ مضامین پہ عنوان "فلسفہ ازدواج"، "مسما"، "جنون ترقی"، "ایڈیڈ"، "عالم ارواح" اور "خانہ جنگی" شامل ہیں۔

۶۔ "سین مسلم" (ناول) دارالابلاغ، لاہور، طبع اول: ۱۹۲۶ء، طبع دوبارہ: ۱۹۵۳ء۔

۷۔ "انگلش و فاضل" نکاحی پریس، بدایوں، طبع اول: ۱۹۳۵ء۔

(ناول سرسٹ نامہ کے "The Moon and Six Pence" سے ماخوذ۔)

۸۔ "نواب فریہ" نکاحی پریس، بدایوں، طبع اول: ۱۹۱۷ء۔

(یہ کتاب پانی شنو پر، بدایوں، چشم بکس نواب فریہ کی سوانح ہے۔)

۹۔ "اسرارِ خفی" (مختلف شعراء کے کلام پر اساتذہ کی اصلاحِ تحقیق) طبع اول: ۱۹۱۷ء۔

۱۰۔ "سہری" (ایک انگریزی ناول کا ترجمہ کتابچہ) مطبوعہ دہلی، طبع اول: ۱۹۰۶ء۔

۱۱۔ "بہوشی" نکاحی پریس، بدایوں، طبع اول: ۱۹۰۶ء۔

(ناول۔ ارنسٹ ہیمنگ وے کے "A Farewell To Arms" سے ماخوذ۔)

غیر مدون

اس دور کے مشہور ادبی پروجن "صوفی"، "الناظر"، "قرن"، "جامع"، "تقدیر"، "کاسرین" اور "غیب" کی فائوں میں جوش کے متعدد مضامین اور افسانے نکلے جاتے ہیں۔ مجلسِ رسالہ "قرن" کا دسمبر میں متعدد جلدیں چھپتی رہتی ہیں۔

۱۔ "انتخاب" (حوالہ فقیر انسان) پہلی قسط "سوجھ بوجھ" ماہ اپریل ۱۹۰۹ء (جلد ۱، شمارہ ۱)، کے صفحات ۵۳۴ تا ۵۳۸ پر، دوسری قسط

"طہر پر" مئی ۱۹۰۹ء (جلد ۱، شمارہ ۳) کے صفحات ۳۳۴ تا ۳۳۸ پر، تیسری قسط "زبیرہ" جنوری ۱۹۰۹ء (جلد ۱، شمارہ ۳۰) کے صفحات ۴۱۳

۳۶ پر، چوتھی قسط جولائی ۱۹۰۹ء (جلد ۱، شمارہ ۳) کے صفحات ۶۰۵ تا ۶۰۹ پر، پانچویں قسط اگست ۱۹۰۹ء (جلد ۱، شمارہ ۵) کے صفحات

۱۹۵۵ء اور آخری قسط ”شیر علی“ کے بعد ”چٹاپ“ (شعبہ ۱۹۰۹ء) (جلد ۷، شمارہ ۶) کے صفحات ۵۱۳-۵۱۴ پر)

۲۔ ”اولیٰ“ (مضمون) مئی ۱۹۱۰ء (جلد ۱۹، شمارہ ۲) کے صفحات ۳۵-۳۶

۳۔ ”جانیہ ٹیٹی“ (افسانہ) ستمبر ۱۹۱۰ء (جلد ۲۲، شمارہ ۶) کے صفحات ۳۸۴-۳۸۵

۴۔ ”فرق مراتب“ (مضمون) نومبر ۱۹۱۸ء (جلد ۳۶، شمارہ ۱۱) کے صفحات ۵۱۳-۵۱۴

ان افسانوں اور مضامین کے علاوہ ”چٹاپ“ کے عنوان سے ایک ناول بھی غیر منسلک ادبیات میں موجود ہے۔

وفات سے قبل مستقل چٹا:

خالد عزیزی، میریں درد، اعلیٰ گڑھ (بھارت)

نظریہ فن:

”میں نے بیسٹ افسانہ اس وقت لکھا جب خود بخود میری طبیعت میں اس کے لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی، ابھی یہ تحریک دفنِ وجود میں آئی اور ابھی بھتیجی میں اس حد تک چٹکی کہ میں پہری طرح اس کو محسوس کر سکا۔ اس تحریک کے وجود میں آنے کے اسباب بھی مختلف ہوئے، ابھی صحتِ احباب، ابھی ریل کا سفر، ابھی کسی مقام کی میر اور کبھی غیر معمولی واقعات کا مشاہدہ۔ ابھی تحریک کے پیدا ہو جانے کے بعد دوسرا مرحلہ اس کے اظہار سے پہلے افسانہ بنانا ہے یہ مرحلہ کلا ویشٹری میں نے رات کی تھابی میں اور کچھ ٹیبلت کی امداد سے، چٹک پر لپٹے ہوئے طے کیا، واقعہ یہ ہے کہ تحریکِ صادق کے ساتھ محض ایک خیال، ایک مخصوص بدلہ، ایک غیر معمولی تصویر یا ایک نیا معاملہ مارا نہیں جاگزین ہو جاتا ہے۔ اس مخصوص تحریک کا افسانہ کے سانچے میں ادا کرنا بالکل ایسا ہی کام ہے، جیسے گوندھی جوتی مٹی سے مختلف اقسام کے رنگ رنگ کھلونے بناتا۔“

سلطان شیخ راجوش

(پروانہ ”میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں“ مرتبہ حکیم محمد عارف حسن)

دارالادب چٹاپ، دارود خان لاہور، طبعِ اولیٰ س۔ ن)



حوالہ جات:

- ۱۔ اکبر کتب میں حسن مجدد جوتی کو سال ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۰ء تک
- ۲۔ مختلف کتب کا ”۱۹۹۰ء“ کی انڈیکس اور ”مرتبہ“ ڈاکٹر وحید قریشی میں انیس سال ۱۹۷۲ء میں بھی گڑھ خود بخود مٹی سے حلقہ تیار کیا ہے ۱۹۹۰ء تک
- ۳۔ ”چٹاپ“ ”جوتی“ کے صورتوں کو اور محض صدیقی مکتوب ”سینہ“ (۱۹۸۸ء)
- ۴۔ ”مکتوبہ حسن“ جوتی نے ”مکتوبہ حسن“ کا لکھا ”مکتوبہ حسن“ کی لکھی ۱۹۸۰ء (چٹاپ راجوش جوتی) میں جوتی کی افسانہ نگاری کی ابتدا کا ذکر ۱۹۷۰ء تا ۱۹۸۰ء (چٹاپ راجوش جوتی) میں

طوق آدم

سلطان حیدر جوش

آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں در سال یا اقدار کے ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے "ضرورت ہے" والے کام کو کیوں نہ ستوں اور اس میں اس قدر دلچسپی کیوں لیتا ہوں۔ میں اس کا جواب صرف یہ دے سکتا ہوں کہ اگر آپ بھری جگہ پر ہوتے اور آپ کو بھی ایسا ہی تجربہ ہوتا تو آپ بھی ایسا ہی کرتے۔

مجھے اس کے بیان کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ بھری کالج کی زندگی ایک خوب آزادی کے ساتھ گزری ہے۔ میں آپ کو یقین دلانا ہوں کہ میں کبھی امتحان میں اقدار کے ساتھ کامیاب نہیں ہوں کبھی امتحان دینے کے بعد مجھے اپنی کامیابی کا یقینی نتیجہ آنے سے پیشتر نہیں ہوا۔ مجھے کتاب کے نام سے ہر کسی استاد کے غرت تھی۔ اگر کبھی اقدار و طرز کے دیکھنے کی طلبا مجھ سے مرزا ہوتی تھی تو محض اس خیال سے کہ کسی نے اشتہار کو معلوم کر سکوں۔ راضی سے مجھے اسی قدر لگاؤ تھا جس قدر ایک مسلمان کو ہو سکتا ہے۔ ایک سے لے کر ایک نا قابل بیان الجھن ہوتی تھی اور ملائی سے لے کر لکھی بغض تھا۔ میں خود قہر کرتا ہوں جب میں یہ سوچتا ہوں کہ میں نے کیا کام کیا جس طرح پایا۔

مستقل مزاجی مجھ سے اس طرح کوسوں بھاگتی تھی جس طرح احوال سے شیطان۔ ہمیشہ ایک ہی چیز کو اچھا کہنا میری رائے میں اول درجہ کی جہالت تھی۔ میں کبھی فٹ بال ٹیم کے ساتھ فوراً جاتا تھا اور کبھی روزانہ سب کی استعداد پر بھی روزانہ ٹیکسٹ میں شریک ہونے سے گھبراتا تھا۔ کالج کی زندگی نے مجھے "میراب" کا خطاب دیا اور میں اسی خطاب سے عام طور پر مشہور تھا۔ ویسی طبیعت اور اقبال نے ہونے میں نے ڈگری لینے کے بعد سارے کالج کو خدما خد کیا۔ ایک بھری دنیا میری اپنی بے شمار دلچسپیوں کے ساتھ میرے سامنے سوجن زن تھی اور میں نا تجربکار، ناواقف، حیران۔ اس کے ساتھ ساتھ کھڑا سوچتا تھا کہ انھیں بڑے کام کو چاہوں یا نہیں۔

یہ سن لیجئے کہ میں اپنے فرسٹ ایئر کے زمانے میں اپنے جونیئر، کم عمر دوست کے بار بار کہنے پر اس کے ساتھ بھٹی گیا تھا۔ میں کالج میں اسی سال پاس ہو کر شامل ہوا تھا اور وہ مجھ پر اسٹوڈنٹس میں تھا۔ آپ کو جاسٹس کے کھٹے میں رقت ہوگی۔ مگر یہ بھی ایک خطاب مجھ

لیجئے۔ جو اس کو تیسری جماعت کے زمانے میں ملتا تھا۔ وہ یہ بھی کہ وہ ایک روز اپنی ریلوے کے یاد کرنے میں، با آواز بلند مشغول تھا اور ”سی۔ ایچ۔ آ۔ ایس۔ لی جی اسٹ۔ پی سی بیٹی“ کی ریل ٹکڑا ہوا تھا کہ کسی بڑے طالب علم نے سن پایا اور اس اسی روز سے وہ ”جی اسٹ۔ پی سی بیٹی“ ہو گیا۔ اس کے ساتھ مجھے اپنی عمر میں سب سے پہلے بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ صرف ظاہر ہے کہ میں اسی کے یہاں مہمان ہوا اور یہ بھی سمجھتا تھا کہ میں اس کی والدہ اور اس کی نوکر چھوٹی رہیں گے جو مجھے پرہیزگار کیا۔ ”بھئی سے پرہیز گئے۔ گھر سے سیر سے سیک۔ سے زیادہ محفوظ ہے۔ اور جی۔ پی۔ کہ وہاں لوگ نہایت ترقی یافتہ اور آزاد خیال ہیں۔ میری دانے میں پرہیزگاری سے کسی معطل شکل میں بھی ایک نہایت وحشیانہ حرکت ہے۔ ممکن ہے کہ آپ اس معاملہ میں میرے ہم خیال نہ ہوں مگر آپ کی کڑی کا جواب دو سوائے آپ کے اور کوئی نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ محض یہ کہ اس گھر میں جو راحت مجھے اس قبل زمانے میں تھی، میں اس کو بھی نہ بھول سکا۔ اور اس گھر والوں کا یہ حد مطلق اور مہمان نوازی میرے دل اور مار پر بیٹھتی تھی۔ دماغ پر تو اس جذبے کے اس کے بعد سے جی اسٹ کے والدین کو بیٹھنے لگا تھا۔ اور وہ انتہائے انسانیت کے ساتھ برابر جواب دیتے رہے اور دل پر اس جذبے کے۔ غمخساری کی نسبت آگے چل کر مظلوم ہو گیا۔

ہاں اس قدر مستغرق ہو چھوڑے۔ میں نے جب کاغذ چھوڑا تو اپنا سامان وغیرہ دھولے سے فراغت حاصل کرتے ہی مجھے سمجھتی کی او کی۔ میں نہیں کہہ سکتا کیوں۔ مگر کوئی چیز تھی جو مجھے ذرا دقتی لے گئی۔ میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ دن کو کھانا کھا تھا شام کو سندر کے کنارے دل مار کھانا کرنے چلتا تھا۔ مگر پھر یہ سوچتا تھا کہ آفریں اس بھرپور دنیا میں کو کچھ ہوں یا نہیں!

جی اسٹ کے والدین مجھے قریب قریب روز ملتے تھے اور قریب قریب روز مجھے اپنے مکان میں اٹھالے جاتے پر مجبور کرتے تھے مگر میں خدا جانے کس شخص میں جتا تھا۔ میرے دل کو ایک گونہ تھی بلکہ ہوتی رہتی تھی اور میری آنکھیں اپنا مظلوم و کم از کم ایک مرد ضرور پا لیتی تھیں۔ مگر میں بلکہ یہی سوچتا تھا کہ آفریں حواج ہوا قریب میں کو کچھ ہوں یا نہیں۔

ایک ایک معمولی واقعہ بیان کرنا گویا داستان کرنا ہے اور مسئلہ وار کھانا ایک دقیق نوعی طریقہ ہے۔ میں بلا تفریق ہر اپنی حرکت سے غلامانہ اس قدر دین لیجئے کہ میں کبھی آفریں کا اس دل قریب ہرگز خدایں کو کھانا کھانا اور آنکھیں بند کر کے کو کھانا دوسرے سال کے ہاتھ میں اپنے اراکھ دوسرے میں جی اسٹ کی نوکر رہیں حیدر سے کوئی زمانہ اپنی بیوی سے یہ کہہ دیتا تھا ”کیوں بیواری! آج تو غصہ کی سردی ہے۔ بدن کا پتا جاتا ہے۔“

2

میں نہ تھا کہ ہنگاموں اور میری صفت بھی ہر دیکھنے وال کو بتا سکتی ہے کہ میں مستقل حواج نہیں ہوں اور نہ خدا خواست کسی حالت میں کو کھانا کا کل بننے کے لیے تیار ہوں کیونکہ مستقل حواج اور کو کھانا کل میری نظریں ہر لحاظ سے مراد نظر آتے ہیں۔ جس چیز کو میں آج پسند کرتا ہوں۔ کوئی دوسری چیز کو کل بھی اسی کو پسند کروں۔ مجھے اس مطلق کے مغربی و کوئی میں حصہ مشترک ہی منظور نظر آتا ہے، جو شخص مستقل حواج کی کامیابی ہو۔ وہ شرط طرست مجھ سے جدا خیالات کر سکتا ہے۔ خدا جانے یہ کیسی کیسی دنیا کا نتیجہ ہے۔ ترقی کے معنی ہی یہ ہیں کہ زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے رہنا اور مستقل حواج کے معنی یہ ہیں کہ معاف فرمائیے۔ مجھے اس کی طرح ایک جگہ ٹھہر جانا۔

دراصل میرا حراج اور میری طبیعت انھیں نہ کا موسم تھی، کوئی نہیں جانتا سکتا کہ کل میری حالت کیا ہوگی۔ میں کسی بات میں دلچسپی اٹوں گا اور کسی بات سے غفلت کروں گا۔ میں اس زندگی کا جاری تھا اور میرے لئے اس کو چھوڑنا یا اس سے بچنا مجھے بھل جانے کا ہی چھوڑنا۔ میں کسی کی ایک چیز کا علاج براہ راست نہیں کرتا، اور خدا کا شکر ہے کہ تھیکید کی غلطی مجھ سے کبھی سرزد نہیں ہوتی مگر یہ سچ ہے کہ حیدر نے میری اس عادت کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ وہ میری گرنت کی طرح رنگ بدلنے والی طبیعت کا ذاتی فکری تھا، اور میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ وہ مجھے دوسرے سے رنگ میں ملوانہ نظر آتی تھی۔ یہ ایک فنکٹ ہے کہ وہی ایک پہلی چیز تھی جس سے میں کبھی نہیں اکتا یا۔ وہی پہلی صورت تھی جس سے میرا دل کبھی سیر نہیں ہوا۔ وہ میری طبیعت کے ساتھ ساتھ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ وہی کی طرح میں غلطی نہیں نہ سکتا کہ وہ مجھے چھ مہینے خوش اور مطمئن رکھنے میں کیونکر کامیاب ہوئی۔

اس کی حقیقت اگر میں جاکم و کاست جان کر ہوں تو غالباً آپ سمجھیں گے کہ میں اپنی ذاتی اور فکری پروری کا جانتا چانتا ہوں یا میں خود اس کے پیچھے دھکے قس، بن گیا ہوں۔ مگر پھر آپ کو یقین دلا تا ہوں کہ میں عامری اور فریاد اربانی دونوں میری نظر میں بدل و بدلہ کے نتیجہ میں ہوں۔ میں ایسے مشق کو جانتا سمجھتا ہوں اور سچ ہے کہ ایسا نہ ملے اور میرا ہندو مشق میں سوائے مینوایت کے اور کچھ نہیں۔ شاعروں نے اس کو چار چاند لگائے ہیں بہت کچھ اپنی سے چوٹی تک کا دور لگایا ہے مگر سرے سے شاعروں ہی کی حقیقت میری نگاہ میں بگڑ نہیں۔ میں غصے شاعری میں ہی کوئی بات قابل متنازع نہیں پاتا۔ شاعری اور دنیا کی اور بہت سی فضولیات سب ایک قطار میں ہیں۔ فصیح ادوات کے لئے اب دنیا نے شاعری سے زیادہ دلچسپ مشغلے ایجاد کر لئے ہیں۔ اگر آپ کی رائے اس کے خلاف ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ میں دنیا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھوں۔ آپ کی یاد دہانی کی آنکھوں سے دیکھوں آپ جتنی کچھ سوچتی اور شاعری میں اگر کچھ شامنا جاتا ہے تو میں "دائرہ ہدف" کی طرح "میں رنگ ہدف" یا "پتھری پروف" ہوں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں کسی بات میں شاعری کرتی نہیں چاہتا۔ اس لئے میرا یہ کہنا حیدر میرے غلط خیال سے قائم خوبیاں اور حسن و کرم سے آراستہ نظر آتی تھی۔ کہانی سے بھی زیادہ ہے۔ وہ میرے مزاج اور طبیعت کے لئے نہایت موزوں تھی۔ لہذا اس میں صرف ایک حادثہ تھی جو آخر میرے مزاج کے خلاف ثابت ہوئی۔

وہ میرا ہی دل بھالنے کے لئے بھی روزانہ اپنی صورت وہاں میں ملوانہ کر ہوتی تھی۔ یہاں تک تو نہایت اچھا تھا۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی چاہتی تھی کہ میں روزانہ اس کی دلچسپی اور حسن کا اعتراف بھی کروں۔ اور یہی غلط تھا۔ میں بار بار اس سے کہہ چکا تھا اس کے سامنے شاعری کر چکا تھا کیونکہ میں ایسے الفاظ کا نظم ہی سمجھتا ہوں کہ وہ سب سے زیادہ حسین و سب سے زیادہ دلکش سب سے زیادہ دلچسپ و دلچسپ کی انتہائی صنعت و تہذیب اور ترقی کی عقل آفریں و دلیرانہ و غیرہ تھی اور ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ میں جیسا ان الفاظ کو طوطے کی طرح دہرایا کرتا۔ جب کبھی وہ غلط میں ہوتی ایک غلط خود ساختہ اس میں ہلکا الٹا اور اس وقت تک فروغ ہوتا جب تک کہ میں ملامتیں بلکہ تو الفاظ میں اس کی مدح سرائی نہ کرتا۔ میں اس کو نہایت مزید دیکھتا تھا۔ لیکن پھر بھی آپ جانتے ہیں کہ میرا نام کالج کا نام ہیسا تھا۔

اس کے علاوہ حیدر کو ایک بات سے غفلت بھی تھی۔ وہ کسی صورت کو میری زبان سے خواہ صورت سننا یا داشت نہیں کر سکتی تھی۔ گویا اپنی دلچسپی کی تعریف اور دوسرے کے اپنے اسرار ہونے کا اقرار۔ یہ دونوں ایسی عادتیں تھیں جو مستقل طور پر اس کی طبیعت کا بنی بن گئی تھیں، اور میں کسی حادثہ کے پابند ہونے سے ہی قدر دور تھا جس قدر دلچسپ، دلچسپ، دلچسپ ہوتی سے ہے۔ وہ کسی اور کے حسن کی تعریف سننا نہیں چاہتی

تھی، اور مجھے بعض لوگوں سے ملا کر اس کی دھن لگ پائی تھی۔ تاہم ایسے لمبے جو ہماری خاموشی اور صبر پر انجیز زندگی میں ہمارے سرکار
لوگوں کے پاس تھے، ان کے واقعہ ہوتے تھے، لیکن یہ آدمیاں بلا کسی ظاہری نقصان کے لوہے ہی طرح اتر پڑا کرتی تھیں۔ اور بہت جلد مطلع
ماف ہوا تھا۔

ایک روز میں اس وقت جبکہ وہ اپنے تالیف سے بے اختیار دیکر تھک چلی تھی، وہ میرے پیچھے کڑی ہوئی اپنی طرف
اور میں نے اس کا اندازہ لے لیا۔ آئینہ میں کرسی تھی۔ میں ایک تصویر، انگریزی منگیا میں دیکھ رہا تھا اور ایک انگریز کی تصویر میری
آنکھوں کے سامنے تھی۔ نہ ہادی خود نمائی اس کے اندر جھڑک اٹھا تھا۔ اور اس نے میرے پاس آ کر دیکھا تو مجھے ایک دوسری صورت کے
نکارے میں مشغول پایا۔ لیکن یہ کہ اس سے وہ فعلی طور نمائی نہ پاؤ، مطلق ہو گیا ہو۔ لیکن مجھے اس کا مطلق علم نہیں تھا۔ میرے لوہے اس تصویر کی
تعریف کرنے کی خواہش آ رہی تھی، مگر مسئلہ ہوتی پائی تھی، وہ میں نے آخر کار کہا۔

"جاری حیدرہ اوکھتا یا کیلین کس قدر خوبصورت ہے؟"

"کیا خاک خوبصورت ہے، مجھے تو اس میں کوئی خوبصورتی معلوم نہیں ہوتی۔" اس نے کہا۔

وہ جو ہم آتی تھی کہ کم از کم ایک مرتبہ غور کے ساتھ اس کو سنا پڑا دیکھ لوں، اور مجھ پر یہ جن سوار تھا کہ اسے میری ہاں میں ہاں ملائی
چاہیے۔ میں نے تصویر پر نظر جمائے ہوئے بھر کہا۔ "بھلا یہ کبھی ہو؟ اس کی آنکھیں تو دیکھو۔ اس کے ہال تو دیکھو؟"

"ہزار مسلوں کی ایک صفی سی۔" مجھے کیا؟ اس نہیں سمجھ سکتی۔ تم ایسی فضول باتوں میں کیوں پناہ دے رہے ہو؟ اس کا سر ہلایا کرتے ہو۔"
"کیا یہ ہے کہ نہ کوئی کہنا کوئی نہا نہیں ہے۔ میں تو صرف اپنی رائے ظاہر کر رہا تھا۔ اگر تم اس کے خلاف ہوتو یہ تمہاری ذاتی رائے ہے۔ جس
میں لیکن یہ کوئی اور چیز بھی پوشیدہ ہو۔ مگر اختلاف رائے کی وجہ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی آواز رائے ظاہر کر سکوں، اور یہ سب
معاذات کوئی تمہاری پابند نہ ہو گی جو اس کی حد تک کہ کبھی ہوئی ہو اس کی طرف اس نے ہند کرکوں۔"

یہ بحث براہ راست چلی گئی۔ مجھ پر اور اس پر دونوں نے اپنی بحث کے موافق ایک جن سوار تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس مرتبہ یہ آدمی بے نقصان
عظیم کے نہیں اتری۔ حیدرہ نے بات نہ چاہنے پر اپنی دھمکیوں سے قابو پائی اور وہ خدا حافظ کہتی ہوئی چلی گئی۔ چند منٹ کے بعد میں نے گاڑی
کے باہر جانے کی آواز سنی اور اس وقت مجھے اپنے ایک پرالے کا اس ٹیلا کا ٹھہرا، جو وہ جھڑکے طور پر ہمیشہ کہا کرتا تھا، یاد آیا کہ "شادی کر اور
برادری لے۔"

3

پہلے روز میں اپنے اسی خیال میں مشغول رہا۔ میری نگاہ میں حیدرہ کی یہ چہرہ دیکھ کر ناخوشی اور غم نظر آتی تھی۔ مجھے اپنی حالت پر
فسوس بھی تھا۔ فوسوں اور یہ وہ فوسوں۔ صرف اس بات کا فوسوں کہ میں نے اپنی پیش پیر آواز کی کوئی نہا نہیں دے سکی تھی۔ وہ دیکھ کر فوسوں
اور چھوٹی سی طرف چیزوں کے فوسوں کیوں نہ تھے کہ وہ۔ میری رائے میں اس وقت شادی "گورنمنٹ و دوسرے طریقے" سے نہ پاؤں قیام چیز
نظر نہیں آتی تھی۔ میں مروجہ غالب کی رہائی کو نظر نہ لگا تھا۔

یہ آدم دین بہ شیطان طوق لعنت
میرزا از وہ عظیم و بکلیل
دیکھیں وہ اسیری طوق آدم
گرمی تر آدم از طوق عزوجل

دوسرے دن میرے خیالات یہ نہیں تھے۔ طبیعت کا خباثت کے ساتھ ہوا ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی بھی نہیں تھی کہ جس کو میں کل پسند کر رہا تھا آج اسی کے لیے بے قرار نہ ہوتا۔ سچ ہے کہ کھائی کا لذت بخش بننے والا اثر مجھے بے چھین کے دیتا تھا۔ تو کرا کا کھانا تھا کہ فرخچہ شراب ہو رہا ہے۔ مرمت کی ضرورت ہے۔ خادوس کی خدمت تھی کہ پہلے برتن دیکھ لے جائیں اور بھی ٹوٹ گئے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مصل ایک حیدر کے نہ ہونے سے میں اپنے آپ کو کبھی مصیبت میں پاتا تھا۔ میں اور ویسی فضولیات کا صاحب و کتاب نامکن اقلی نامکن۔ میں کبھی ان دلچسپ باتوں کی طرف مشغول نہیں ہوا تھا۔ حیدر خدا ہائے کس طرح ان سب سے برابر آتی ہوگی۔ مجھے تعجب تھا۔ تاہم اب کیا کیا جائے۔ حیدر کو اب واپس آنا چاہیے۔

مجھے یہی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئی۔ کیونکہ کہ چوہاں سے صرف اس قدر پتہ چل سکا تھا کہ وہ قہار کے انٹھن پر اتری تھی۔ بڑی محال اگر مجھے معلوم بھی ہوتا تو بھی اس کے پیچھے اور مت گرفتاری کی طرح بربک نہ بٹنا۔ میرے دل و دماغ کے قسطنطین تھا۔ خود جا کر خوشامد کرتا یا دو ایک کو درمیان میں داخل کر اور زیادہ گھوم کر دیکھ لے قسطنطین تھا۔ پھر کیا کیا جائے۔ کہہ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ حیدر کے بغیر اب مجھے زندگی ایک کالا پانی معلوم ہوتی تھی۔

میں سوچتا رہا۔ اور سوچتا رہا۔ مجھے اس سے پہلے سوچنے کا اتفاق بہت کم ہوا تھا۔ کیونکہ سوچنا میرے خیال میں ایک بہت ناز و نجات ہے۔ اس سے انسان کی چیخاں پر گھبراہٹ پڑتی ہیں۔ اس سے طبیعت پر ایک بار معلوم ہوتا ہے۔ اس سے مرزا یا وہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس سے آدمی ہڈی سا ہو جاتا ہے اور دماغ رکھتا نہیں۔ اس سے تمام نقصانات ہی نقصانات ہوتے ہیں۔ بہر حال بندہ مجبور و لاچار۔ سوچنا ہی نہ نتیجہ ہوا کہ ایک نئی چیز دماغ میں بجلی کی روشنی کی طرح برقع آگن ہوئی۔ میں فوراً اٹھ اٹھ کر ٹولی سر پر رکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

جس قدر عرصہ میں گھڑی کی بی سوئی نے ۳۰ منٹ کا واسطہ طے کیا یا وہی قدر عرصہ میں میں نے اپنا راستہ طمع کر لیا۔ ۳۰ منٹ کے اختتام پر میں روزانہ اخبار کے افس میں منبر سے نہایت جھیل کے ساتھ کھڑا ہوا "ابھاتو آپ افلاک کے سب سے چارج کریں گے۔ خبر جس طرح آپ چاہیں۔ میں جو مہارت شائع کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ابھی نگہ دیا ہوں آپ ملاحظہ کر لیں۔"

منبر نے میری جلت کو قہر کے ساتھ دیکھتے ہوئے ایک سادہ کاغذ اور قلم و دوات میری طرف بڑھایا اور میں نے گڑ سے ہی گڑ سے منبر پر ایک ہاتھ تک کر دیکھے ہوئے گھبرا کر رہ گیا۔

"ضرورت ہے"

ایک چھ مہینے کے شادی شدہ شوہر کو اپنی عین بیوی کی جھوڑو سے تہائی حراج کی فرض سے کہیں چلی گئی ہے۔ آنکھیں ہوا اور گھبرا

سرخ و سفید بال کو نگہ رانے، قدم پھات، عمر ۱۸ سال۔ نام حمیدہ۔ جو شخص نے گورہا کو کسی طرح فیبر ۱۳۰ منزل نمبر ہاٹ نکالا میں اپنے ساتھ لے آئے گا۔ اس گورہا اثر نہیں بطور معاوضہ صحت ڈر کی جائیں گی۔ لہذا کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ خریدا، نہ دیا جائے چاہئے تھا۔"

بچے تھیں شوہر۔ عہد انجی سیمپ

لکھے انجی طرح یاد ہے کہ ٹھیکر نے اس اعلان کو پڑھنے کے بعد میری طرف دیکھا اور مسکراہٹ بوجھا کر کہا خوش خود اداری کی زنجیروں میں بکڑے جانے کی وجہ سے مسکراہٹ تھی کہ گورہا کی جی اور نہ قبضہ بنے کے لیے چار جی، اس کے دواؤں پر بلکہ جام پیرے پر ٹاپا ہوئی۔ میں نے اجرت دیا، صحت تھوڑا کی اور نہ اضافہ کیا، ہوا ہار تھا۔ میرے باہر نکلے عی و دو چار دیکھوں اور ٹھیکر کے دلی کھل کر بھینے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

میں ہا تھا کہ حمیدہ روزانہ اخبار کو دیکھتی ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ کل کے ہر پتے میں وہ اعلان شائع ہو گیا ہے۔ مجھے اس کا بھی یقین تھا کہ حمیدہ ہر پتے پتے پتہ بات کو پتہ پتہ کی نظر سے دیکھتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اسے اعلان ایک روزانہ اخبار میں کیا۔ کیا اور شخص اس خیال سے کیا کہ حمیدہ اس کو پڑھے میری حالت سے آگاہ ہو، حدت آمیز خیال کو پسند کرے اور بجلی آئے۔ آج دوسرا دن تھا۔ ایسا نہیں ہو سکا کہ اس نے اظہار پڑھی عی و دو۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ اس نے کل ہی پڑھا ہوگا۔ اور اگر اس نے مان لکھے کل بھی نہ پڑھا ہو تو آج میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ اب دو پہر کا عمل ہو چکی تھی۔ نصف سے زیادہ دن گزر چکا تھا اور میری خوشنویس بدستور چلتی تھی۔

میں اپنے ذرا رنگہ دم میں ہی خیال میں غلطیاں بچاؤں تھا۔ ڈوبا ہوا تھا کہ میرا لڑکا کوڑا کوڑا کھلا اور کہنے کا "مستور ایک شخص اور ایک کتاب پڑھ صورت آپ سے ملنا چاہتے ہیں" میں فوراً سمجھ گیا کہ ہوتا ہو عزیز، حمیدہ کا بچپن او بھائی ہوگا۔ حمیدہ کو لایا ہوگا۔ لیکن ہے کہ کسی کو حمیدہ اپنے ساتھ لائی ہو۔ میں نے فوراً انداز لے کر اہواز دہی اور کرسی پر سے کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے کے اندر تھاب سے سرعت کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ اس شخص کوں گا کیا۔ روزانہ دیکھا اور پڑا لی شخص جو صورت سے کوئی دیکھا اور معلوم ہوتا تھا، اندر دیکھا اور یہ کہتا ہوا اندر گھسا "حمیدہ، حمیدہ اندر آؤ" اس کے پیچھے پیچھے ایک نو جوان صورت جس نے کتاب اچھاڑ دی تھی، اندر آئی۔ اس کا چہرہ اس کی ہے باکی، اس کی وضع غرض اس کی ایک ایک بات بتا رہی تھی کہ وہ نہایت مٹھی ہوئی صورت تھی۔ جیسے تک میرا غصہ اور ادا شناسی کام کرتی ہے، میرے خیال میں وہ کوئی بازاری، آؤ اور وہ صورت تھی۔ لانے والے نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "لجئے یہاں موجود ہیں، یہ ہم کو ایک اونٹ میں ملیں۔ ہم نے کل سے اظہار پڑھ کر تمام سکھ دھوڑا لایا آج ہم کوئی تو ہم نے فوراً بکھڑا کیا۔ اس نے بہت کچھ شکایت کیا۔ تمہارا بانی کرتا ہے۔ غلام جانے یہ جانتے۔ یہ خود کیے قائم تھے گا اب ہر معاوضہ۔ بس ہم تلاش۔"

مجھے جب تھا، ہجرت تھی، اب پڑتی تھی۔ میری زبان سے نکلا "تم کہتے کیا ہو؟ یہ صورت کون ہے؟"

وہ "ہم کہتا ہے کہ تم نے اخیر میں کھسا کہ جو کوئی اس کو لانے گا، وہ دو گنی پائے گا۔ ہم گل بارہ تھکے سٹائی کیا۔ رات بھر ہی خیال میں رہا۔ آج بارہ گئے سے صبح چارہ ہے۔ اس کی آنکھیں سیاہ ہیں، رنگ گورا ہے، عمر ہی نہیں ہے تو وہ اس چاروں کی پریشانی میں جا تا رہا۔ بال ٹھیکر والا ہے۔ رتہ چا کا ہے۔ عمر کون اس کا ۱۸ سال سے زیادہ جاتا سکتا ہے؟ ہم اس کا حمیدہ ہے (اس کی طرف) "کیوں ہے؟"

اس میں شک نہیں کہ اس میں سب باتیں تھیں، مگر اس طرح اس جہالت کے معنی کیا؟ وہ میری بیوہ حمیدہ نہیں تھی۔ لیکن خدا نہ کرے۔ میں

نے جواب دیا۔ ”مگر میری بیوی نہیں ہے۔“

وہ۔ ”عورت کی طرف۔“ کہیں یہ کیا بات ہے۔“

عورت۔ ”کیا پورے سیماپ اچھا سے سیماپ۔ اب تم ایسے ٹھاہو کہ بچا سنے تک نہیں۔ میں تمہاری بیوی نہیں ہوں؟“

میں۔ ”حمیدو۔ میری طرف تو دیکھو!“

اب تک مجھے استغباب تھا۔ مگر میرے جواب پر وہ استغباب فصر میں بدل گیا۔ یہ ملائی عورت اور میری بیوی۔ اس کتنی جی کے معنی کیا؟

یہ بد معاشی۔ کئی درغمازی، جھلساڑی، مصر سے جڑ چلا اور میرے منہ سے نکلا۔ گستاخ عورت اس بد معاشی کے کیا معنی؟

میں غرقو بھی قسم ذکر نے پایا تھا کہ وہی لانے والا شخص ہوا۔ ”دیکھو بیٹو۔ بد معاشی و لہجہ کا وہ تجہائی میں ہے چھو۔ وہ چلا گیا تھا۔ اس کا قصور

ہے۔ سب کے سامنے یہاں سے کہو۔ آخر وہ تمہاری بیوی ہے۔“

میں۔ ”کہا بہت فصر کے ساتھ۔“ بد معاش ایسا چلتی عورت میری بیوی کہیں ہونے لگی۔“

وہ۔ ”دیکھو بیٹو۔ ہم پر زبان مت چلاؤ۔ تم یا تو تمہارا بیوی چاہتے۔ ہم سے کچھ مطلب نہیں۔ چاہے تم اسے رکھو چاہے نکالو۔ مگر ہمارا

دو گنی ہم کو روک رہی۔“

مجھے فصر تھا، پریشانی تھی، الجھن تھی، سب کچھ تھا۔ قطعی کچھ میں نہیں آتا تھا کہ آ غزلوں، کیا کروں۔ اسے میں دروازہ پھر نکلا۔ ایک

اور نکو اور باہل، ایک عورت کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا آمد رکھا۔ اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”یہ لو۔ حمیدو سوچو ہے۔ میں دونوں سے ناراضا پھرنا

تھا۔ آخر میں نے ایک دکان پر کھڑا کر دیا اور کھینچتا ہوا لو۔ آ کھ رنگ، ہال، صف، صحر سب دیکھ لو۔ یہ تمہاری بی بی حمیدو ہے کہ نہیں۔ اور میرا

انعام؟“

اب میرے لیے نے بھی مجھ سے ہوا کہ شروع کیا۔ میں راکھ تھا، خاموش تھا، مبہوت تھا۔

دوسری عورت۔ ”پیارے سیماپ! کیا اب بھی تم اپنی بیوی حمیدو سے نہیں روک گے۔“

پہلی عورت۔ ”تو کون چڑیل ہے جو میرے شوہر کو اپنا شوہر بتاتی ہے؟“

دوسری عورت۔ ”نہل چلے۔ تجھ بھی سکار میں نے بزاروں دیکھا نہیں۔ سیماپ میرا شوہر ہے یا حیرا؟“

دونوں اٹنے والے۔ ”تقریباً ساتھ ہی ساتھ۔“ تب ایک سیلو آپ کا بیوی کون ہے؟“

”یہ لو صاحبہ لو۔ ہاتھ پکڑ لایا۔ کا۔“

گود لٹٹ کا قانون کہنے۔ اپنی چڑیل کو لانا دیکھئے۔ یہ ایک حیرت زدہ ہو جانا اس کی بد فہم رہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس خیال نے

اس وقت لکھ دست و بازی سے روک لیا۔ میری حالت عجیب تھی۔ میں حیرت زدہ ہو چکی تھا۔ اور یہ چٹان بھی۔ خاک تھ بھی تھا اور فصر سے لڑائی

بھی۔ میں نے غصہ نہائی۔ ملازم فوراً آمد تھا، میں یہ کہتا ہوا کہ ”دیکھو چلیس کو بلاؤ اور سب بد معاشوں کو اس کے حوالے کر دو۔“ اور انگ دہم

سے گل کر سونے کے کمرے میں جا گیا۔ میرا خیال ہے کہ میں ہاستی چنگ پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

برادر والے کمرے میں سے سب کے باہر جانے کی آواز میرے کان میں آئی۔ پھر کچھ عمارت ہو اور قحوظی دیر میں خانا۔ میں نے

ارادہ کر لیا تھا کہ اب میں ڈرائنگ روم میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اسی طرح دس پانچ زبردستی بی بی بنے والیاں۔ میرا سلسلہ خیال

کو اڑ کھٹے سے فوٹ گیا۔ میں نے دیکھا تو پیاری حیدہ ہر شے میں کتاب ڈالے ہوئے ایک گلاب شاخ در بانئی کے ساتھ میرے سامنے تھی !
 تھوڑی دیر کے بعد جس میں معمولی شکوہ دکھائی دے گا دفتر شتم ہو چکا تھا۔ وہ میری آغوش میں تھی۔ اس کا شعلہ خود بخود بجائی بھر بھی بج کر اٹھ
 ٹکڑوں میں اس کے بچانے کے لیے کئی روز سے تیار تھا۔ اس وقت اور صرف اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ دونوں بازواری عورتیں اور لاواش آدھی
 حیدہ ہی کے اٹھارے پر آئے تھے اور مزین نے اس کا انتظام کیا تھا۔ میری دو اشرفیوں تو بچ گئیں۔ لیکن حیدہ کو اس پلاٹ کے چار کرنے میں دو
 گنپاس بخر کر کرنی پڑیں۔ آؤ شری شریخ پیاری حیدہ۔

دو دن اور آج کا دن اور باقیوں میں چوراچرا اعتقاد رکھتا ہوں، ایک تو یہ کہ اخبار کا "ضرورت ہے" والا کالم قابل فخر کلاشت چیز
 نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ مجرم مرزا نے سچ کہا۔

دو دن اور آج کا دن اور باقیوں میں چوراچرا اعتقاد رکھتا ہوں، ایک تو یہ کہ اخبار کا "ضرورت ہے" والا کالم قابل فخر کلاشت چیز
 نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ مجرم مرزا نے سچ کہا۔



پریم چند

نام	دھندھ رائے سری داس
تعلیمی نام	نواب رائے الہ آبادی نواب رائے قاری، پریم چند
پیدائش	۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء، مظاہر لکھی گاؤں، تحصیل پانچ سونہ، ضلع حارس، بھارت۔
وفات	۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء، پٹنام حارس۔
تعلیم	بی۔ اے الہ آبادی، نورتنی، الہ آباد ۱۹۱۹ء

ابتداءً تھری برس تک قاری چچی اور گورکھ پور کے ایک ڈال سکول میں براہ راست چھٹی جماعت میں داخلہ لیا۔ ۱۸۹۹ء میں میٹرک کا امتحان پچھلے دو چین میں پاس کیا۔ ۱۹۰۲ء میں میٹرک ورننگ کالج الہ آباد (Preparatory Class) میں داخلہ لیا۔ اپریل ۱۹۰۳ء میں میٹرک کلاس کا امتحان دہلی اول میں پاس کر کے جوئیئر ورننگلر (اولیاء) کی مندی۔ اسی سال اردو اور ہندی میں الہ آبادی نورتنی سے میٹرک ورننگلر (۵-۶) کا امتحان پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان کئی بار دہلی اور پانچ سونہ میں ٹل ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پچھلے دو چین میں پاس کیا اور ۱۹۱۹ء میں الہ آبادی نورتنی سے پچھلے دو چین میں بی اے کیا۔

مختصر حالات زندگی:

والد کا نام منشی غلام الہ کا کسٹھ تھا، جن کی سکونت موضع مذکورہ لکھی تحصیل پانچ سونہ، حارس میں تھی۔ پریم چند کے والد ذاک خان نے میں طرز نام تھے۔ پریم چند سات برس کے تھے، جب ان کی والدہ آئندہ دیوی کا انتقال ہوا اور ان کے والد نے دوسری شادی کر لی۔ پریم چند نے بچپن اور لڑکپن میں سخت تنگی تڑپی کا زمانہ دیکھا اور سہا۔ ۱۸۹۹ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد پانچ سونہ کے حساب سے ایک وکیل کے بیٹے کو نوٹش پڑھا تا شریع کیا اور پھر اسی سال حارس سے جس اسکول دور چار گزچہ، مرزا پور کے ایک چھوٹے سے عیسائی مشنری اسکول میں انعام دہ دہے، ۱۹۲۷ء میں سنسکرت، ستر کے طور پر پانچویں طرز دست کر لی۔ ۲ جولائی ۱۹۰۰ء کو گورنمنٹ ڈسٹرکٹ ڈال سکول ہراجا سے سرکاری

ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا ۱۹۰۱ء میں ہوتی زندگی کا آغاز ایک ناول پہ عنوان "ایک ناموں کا دروازہ" لکھنے سے کیا ادبی سفر اپنا پہلا مضمون "پرتاب چند" تھا۔ ۱۹۰۴ء میں نیچر ڈسٹرکٹ کالج الدہ میں ہے۔ دلی کا امتحان پاس کرنے کے لیے والد لیا اور اپریل ۱۹۰۵ء میں سند حاصل کی اور سینکڑوں دیگر (۱۹۰۶ء) کا امتحان دینے الدہ میں پھر دہلی چلے گئے، جہاں سے جنوری فروری ۱۹۰۵ء میں واپس پر اس کا تبادلہ بطور اسسٹنٹ لیٹر گورنمنٹ ہائی سکول پرتاب گڑھ کر دیا گیا۔ پرتاب گڑھ سے ۱۹۰۷ء میں کا پورہ تبادلہ ہوا۔ جہاں ۱۹۰۸ء تک قیام، پاس فرمانے میں ہالنگا وٹرنگ کی تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا اور تنگ کی بجائے گونگے سے متاثر ہوئے۔ ۱۹۰۶ء کے چار کن میں شہر اترتی کے دن پریم چند کی دوسری شادی منی دلی پر شادی چھ مہینے شہرانی سے ہوئی۔ ۲۳ جون ۱۹۰۹ء میں ترقی پا کر کانپور سے مہوہا ضلع صبر پور کے ڈسٹرکٹ بورڈ سب انسپکٹر مقرر ہوئے۔ اکتوبر نومبر ۱۹۱۰ء تک "غواب دانے" اور "غواب دانے باری" کے قلمی ناموں سے لکھا کرتے تھے، اس کے بعد پریم چند کا قلمی نام اختیار کیا۔ دسمبر ۱۹۱۰ء کے رسالہ "نمائندہ" کانپور میں اشعار "بڑے گمر کی بچی" پریم چند کے قلمی نام سے شائع ہوا۔ اس وقت پریم چند ضلع چھ رہتے تھے۔ گھنٹہ باری اور الدہ آباد سے ملازمت کر دیا۔ ۱۹۱۱ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع صبر پور رہے۔ جولائی ۱۹۱۳ء میں مہوہا سے گورنمنٹ ہسپتال ہائی اسکول چاہل نوا جہاں سے جولائی ۱۹۱۵ء میں لرانی صحت کی بنا پر واپس لوٹ آئے۔ اگست ۱۹۱۶ء میں ہسپتال سے گورنمنٹ ہائی سکول گورکھ پور چلا کر دیا گیا۔ اگست ۱۹۱۸ء میں باری سکول بڑا گنگا پور کے سپرنٹنڈنٹ رہے جہاں فروری ۱۹۲۱ء میں پریم چند نے وہ تعاون تحریک کے سلسلے میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا جو ۱۵ فروری ۱۹۲۱ء کو منظور کر لیا گیا۔ کچھ مدت ہندی ماہنامہ "سرملا" مدرس کی ادارت کی۔ جولائی ۱۹۲۱ء میں اس کے مدیر مقرر ہوئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے جتواری کی امداد دینا نہت سے چھٹے خانے کا کاروبار شروع کیا مگر اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تو مارچ ۱۹۲۳ء میں مدارس منتقل ہو گئے جہاں رسالہ "آج" مدارس کے ایڈیٹر رہے۔ لیکن چند دن بعد مارچ میں ہی کانپور چاکر مہاشا کاشی ناتھ کے بارہاڑی اسکول میں مدرس ہو گئے۔ مہاشا کاشی ناتھ کے ساتھ نہایت ہوا اور وہاں سے مستعفی ہوئے۔

سب پریم چند نے کاشی دو لایہ میں ملازمت اختیار کرنے کے ساتھ مہاشا ناتھ دیش کا قائم کردہ چھاپہ خانہ "سرسوتی پریس" خرید لیا اور نقصان اٹھایا۔ ۱۹۲۷ء میں پریم چند نے نول کشور کے پرچہ "بلا حوری" کی ادارت سنبھالی اور دوسرے ماہوار پانے لگے۔ اس کے بعد ۱۹۳۰ء میں انہوں نے مہاشا ناتھ دیش کا مجلہ "پیش" سنبھالا جس کا پہلا پرچہ سرسوتی پریس مدارس سے مارچ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا اور جون ۱۹۳۰ء میں یہ سلسلہ ختم کیا۔ ۱۹۳۱ء میں نول کشور پریس میں ملازمت کے دوران ان کی مرضی کے خلاف انہیں دہلی کتب کے قلعہ میں منتقل کر دیا گیا، جہاں انصاف ساز کمیٹی کی منظوری کے لیے انصافی کتب مرچ کیں۔ ۱۹۳۳ء میں نول کشور کی ملازمت ترک کر دی اور مدارس منتقل ہو گئے۔ چند روزہ "چارکن" بند ہونے کو تھا، پریم چند نے اسے سنبھالا اور ملت دورہ چلا دیا۔ واضح رہے کہ اس سے قبل انہوں نے "پیش" مدارس کو جنوری ۱۹۳۱ء میں دوبارہ جاری کر دیا تھا۔ جسے ۱۹۳۳ء تک مرتب کرتے رہے۔ ۱۹۳۳ء میں پریم چند کا ہندی ناول "سید اسد" (مطبوعہ دسمبر ۱۹۱۸ء) "اجنٹا سنے ٹون" (کبھی کے چاہت کا رازی میں مومن برادری کو پسند آتا تو اس نے مدارس و رابطہ قائم کیا۔ پریم چند نے اپنا پرچہ "پیش" مدارس ہندی سوتی پرچہ کی گھرائی میں دے کر بمبئی کی راوی اور "اجنٹا سنے ٹون" میں بطور منظر نامہ نگار آٹھ ہزار روپے سالانہ پر ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۹۳۳ء میں "سید اسد" کی کہانی پر مبنی فلم "دنگلارا جتواری" کی اور کا مہاشا دیش "اب پریم چند نے" "اجنٹا سنے ٹون" کے لیے

”اصل حروف“ لکھی جس میں مل حروفوں کے مسائل کو پہلی بار اڑائیے سکرین کا موضوع بنایا گیا۔ ”سیر بھڑا کے نامناسب رویے کے باوجود ناقدین نے اس فلم کی دل کھول کر داد دی۔ ۱۹۳۵ء میں جب موہن بھادوانی نے اپنا ذاتی ادارہ بھادوانی پروڈکشنز کو تک لایا۔ دوسری فلمی میں قائم کیا تو پریم چند بھی اعتداسی ٹون سے الگ ہو کر لاسر خفگی ہو گئے اور بھادوانی کے لیے فلم ”جاگرن“ لکھی۔ جس میں بے روزگاری کے دکھ، تعلیم یافتہ افراد کے مسائل کو پیش کیا۔ لیکن اس ادارے نے اپنی سادہ سادگی میں کچھ وقت لیا اور پریم چند فلمی دنیا سے ایس ہو کر ۱۹۳۶ء میں جاس آ گئے۔ (”جاگرن“ ۱۹۳۶ء کے آخر میں ریلیز ہوئی) جبکہ پریم چند نے ۱۵ اپریل ۱۹۳۶ء کو انجمن ترقی پسند مصنفین کے اولین اجلاس منعقدہ لکھنؤ کی صدارت کی اور ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء کی صبح جاس میں وفات پائی۔“

۱۹۳۵ء میں موہن بھادوانی نے پریم چند کے ہندی ناول ”رنگ بھری“ (”مطبوعہ ۱۹۲۵ء) کو اسی نام سے عیاں۔ فلم ”رنگ بھری“ ۱۹۳۶ء میں ریلیز ہوئی اور ہندوستان کے ہر سرکٹ میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ لیکن اس وقت تک پریم چند کی راکھ کو گنگا کے سپرد ہوئے چارے دیں ہی گزر چکے تھے۔“

اولین مطبوعہ تحریر:

ناول ”اسرارِ محابہ“ کی پہلی قسط مطبوعہ طبع روزہ ”آوارہ خلق“ جاس ۸ اکتوبر ۱۹۰۳ء۔ یہ سلسلہ یکم فروری ۱۹۰۵ء تک رہا۔ یہ سیرا تنقیدی مضمون ”زمانہ“ کا چودہ ماہیت، جنوری ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

”عشق و دنیا اور حب وطن“ ”مطبوعہ“ ”زمانہ“ کا چودہ ماہیت اپریل ۱۹۰۸ء

فلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ”سوز وطن“ (پانچ افسانے) ناشر خوب رائے زمانہ پریس کانپور طبع نول جن ۱۹۰۸ء یہ کتاب دوسری بار گیلانی ایلیٹریک پریس جب ۱۹۳۵ء میں دہلی سے ”حب وطن کے قصبے معروف پوسٹ وٹن دیر ورنیش“ کے مٹوان سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ سال اشاعت دین نہیں۔ طبع دوم میں ”سیر ورنیش“ نامی افسانے کا اضافہ کر دیا گیا۔

۱۔ ”دنیا کا سب سے اصول رقی“ ۲۔ ”شیخ محمود“ ۳۔ ”بھئی بھادوانی ہے“ ۴۔ ”ملا باقم“ ۵۔ ”عشق و دنیا اور حب وطن“ ۶۔ ”سیر ورنیش“

یہ کتاب تیسری بار ”سوز وطن“ کے مٹوان سے ڈاکٹر علی احمد عالمی نے عرغب کر کے انجمن تہذیب نو و جلی کی شرف ۱۹۷۰ء چک۔ الہ آباد سے ۱۹۸۰ء میں شائع کی۔

”پریم بھگینی“ دو جلدیں (بچپن افسانے)

دارالاشاعت، پنجاب جلد اول طبع اول: ۱۹۱۵ء

جلد دوم: ۱۹۱۸ء

یہ کتاب دوسری اور تیسری بار دارالاشاعت، پنجاب نے ۱۹۳۹ء اور چوتھی بار نارمان پبلیکیشنز، لاہور نے ۱۹۳۳ء میں شائع کی۔

حصہ اول: (۱) ماما۔ (۲) دو کراہت کا چنڈ۔ (۳) بڑے گھر کی بیٹی۔ (۴) رانی سارندھ۔ (۵) راج سہ۔ (۶) راجہ ہرود۔ (۷) لنگ کا رادھ۔ (۸) عالم بے گل۔ (۹) گناہ کا گنہگار۔ (۱۰) بے غرضی۔ (۱۱) آدھے کس۔ (۱۲) آغا۔
حصہ دوم: (۱) خون سفید۔ (۲) صرف ایک آواز۔ (۳) اندھیر۔ (۴) لگا زمیندار۔ (۵) تریا چتر۔ (۶) امرت۔ (۷) شکاری راجکار۔ (۸) کرموں کا بھل۔ (۹) مٹاؤں۔ (۱۰) مریح۔ (۱۱) اناؤں کی رات۔ (۱۲) غیرت کی کتاب۔ (۱۳) منزل مقصود۔

”پریم بھگینی“ دو جلدیں (بچپن افسانے)

زمانہ کا پور، حصہ اول

طبع اول: اگست ۱۹۲۰ء

حصہ دوم نومبر ۱۹۳۰ء

یہ کتاب دوسری بار دارالاشاعت، پنجاب لاہور نے ۱۹۳۰ء میں شائع کی۔

حصہ اول: (۱) سر پر نر۔ (۲) راجدھت کی بیٹی۔ (۳) لگاؤ دار۔ (۴) بیٹی کا دھن۔ (۵) لڑھک۔ (۶) بچتا ہا۔ (۷) قسطہ بھن۔ (۸) لگاؤ لڑکی۔ (۹) بچا۔ (۱۰) سو۔ (۱۱) لنگ بھر۔ (۱۲) سرخ مہارک۔ (۱۳) قربانی۔ (۱۴) دفتری۔ (۱۵) دو بھائی۔

حصہ دوم: (۱) باز یافت۔ (۲) بڑی کاک۔ (۳) بنگ کا دھ۔ (۴) لکھ بھوس۔ (۵) سوئی ہاں۔ (۶) مشعل ہریت۔ (۷) لکھ دھ۔ (۸) خواب پریشان۔ (۹) راہ ہریت۔ (۱۰) لکھ اکبر۔ (۱۱) آقا رام۔ (۱۲) ایمان کا فیصلہ۔ (۱۳) فتح۔ (۱۴) درگا ہریت۔ (۱۵) خون حرمت۔ (۱۶) اصلاح۔

”خاک پر دانہ“۔ (سول افسانے)

طبع اول: ۱۹۲۸ء

نکار پریس کھنڈ

(۱) خاک پر دانہ۔ (۲) دھن دوست۔ (۳) نکل راج۔ (۴) سچے گرب۔ (۵) حراز آفتیں۔ (۶) بڑے باب۔ (۷) عجیب ہوئی۔ (۸) دوست۔ (۹) لکھ دھ۔ (۱۰) خودی۔ (۱۱) مستعار گھڑی۔ (۱۲) لکھ۔ (۱۳) کپتان۔ (۱۴) لکھ۔ (۱۵) طبع کی۔ (۱۶) تحریک۔

یہ کتاب دوسری اور تیسری بار گیلانی ایڈیٹرک پریس لاہور نے ۱۹۳۳ء سے قبل شائع کی۔

”خواب و خیال“ (چھ افسانے)

طبع اول: ۱۹۲۸ء

لاہور کے ایڈیٹر لاہور، دھلی

(۱) لکھ امپ۔ (۲) لکھ بھوک۔ (۳) سوخو۔ (۴) شرمی۔ (۵) لکھ کی باری۔ (۶) بھرت۔ (۷) لکھ کی فتح۔ (۸) دوست لکھ۔ (۹) دوست شیراز۔ (۱۰) لکھ لکھ۔ (۱۱) لکھ کی بھرت۔ (۱۲) خودی۔ (۱۳) لکھ فیتہ۔ (۱۴) لکھ۔ نوے ”خودی“ وہی افسانہ ہے جو ”خاک پر دانہ“ میں شامل ہے۔

یہ کتاب دوسری اور تیسری بار نرائن دت سہگل، لاہور نے ۱۹۳۳ء سے نقل شائع کی۔

۶۔

”فردوس خیال“ (پارہ افسانے)

انجمن پریس لاہور

طبع اول ۱۹۲۹ء

- (۱) قہر۔ (۲) ظلم۔ (۳) سرحدی۔ (۴) جنگ بختی کے تار پانے۔ (۵) اراکھات۔ (۶) گری کے روپ۔ (۷) انزول برقی۔ (۸) بھڑے کا ٹھو۔ (۹) بھوت۔ (۱۰) سوا میر گیسوں۔ (۱۱) قہر پکارا۔ (۱۲) لٹلی۔
یہ کتاب دوسری اور تیسری بار نرائن دت سہگل، لاہور نے ۱۹۳۱ء میں شائع کی۔

۷۔

”پریم چالیسی“ (نودہ جلدیں) (چالیس افسانے)

گیلائی انٹیکٹرک پریس لاہور

طبع اول ۱۹۳۰ء

- پہلا حصہ: (۱) سحر۔ (۲) کشش۔ (۳) خانہ بردار۔ (۴) کٹارو۔ (۵) ترسول۔ (۶) بلی۔ (۷) واروٹ کی سرگزشت۔ (۸) مقلبی۔ (۹) اکلیم۔ (۱۰) انسانی کا عقلم فرفش۔ (۱۱) مقدم۔ (۱۲) ارام لیا۔ (۱۳) اوریداری۔ (۱۴) چوری۔ (۱۵) اوسم۔ (۱۶) قزاقی۔ (۱۷) آسودگی کی بولی۔ (۱۸) سہاگ۔ (۱۹) کچترو۔ (۲۰) قوم کا خادم۔
دوسرا حصہ: (۱) دوسکھیاں۔ (۲) جز جاپ۔ (۳) باس۔ (۴) لٹلی۔ (۵) بچوری۔ (۶) حرور اقلت۔ (۷) ابراہیم۔ (۸) جہاد۔ (۹) دوی۔ (۱۰) حیرت۔ (۱۱) پچک۔ (۱۲) جنت کی دوی۔ (۱۳) غصہ۔ (۱۴) بدو دروازہ۔ (۱۵) بھوس۔ (۱۶) احسان۔ (۱۷) سزا۔ (۱۸) گھاس دلی۔ (۱۹) بچی سے شہر۔ (۲۰) پس کی رات۔
نوٹ: اس حصے میں شامل افسانہ ”لٹلی“ اس سے نقلی ”فردوس خیال“ میں شامل رہا ہے۔ یہ کتاب ”پریم چالیسی“ کے عنوان سے بھی شائع ہو چکی ہے۔

۸۔

”آخری قہر“ (تیرہ افسانے)

نرائن دت سہگل ایڈیٹر لاہور۔

طبع اول ۱۹۳۳ء

- (۱) آخری قہر۔ (۲) بدو دلی۔ (۳) ہوا کی دوی۔ (۴) طالع بھت۔ (۵) ڈکار۔ (۶) ادیب کی عزت۔ (۷) قافل۔ (۸) سنی۔ (۹) ابراہیم سطر لٹلی۔ (۱۰) بردار۔ (۱۱) آخری میلہ۔ (۱۲) نہایت۔ (۱۳) قافل اور بردار۔ پریم چند کے رسالے ”بھس“ میں ان کی تصانیف شہسوارانی کے نام سے شائع ہوئے۔

یہ کتاب دوسری بار نرائن دت سہگل، لاہور نے ۱۹۳۸ء میں شائع کی اور بارہواں ایڈیشن بھی اسی ادارے نے دلی سے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ واضح رہے کہ اس مجموعے کا ایک جلد ایڈیشن ”نہایت“ کے عنوان سے ۱۹۳۶ء میں صدیق بک ڈپو بھٹنڈے نے شائع کیا تھا۔

۹۔

”زور اور“ (چند افسانے)

مالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دلی

طبع اول ۱۹۳۶ء

- (۱) ہوا کی دوی۔ (۲) زبرد کا ڈپ۔ (۳) آشیایا بردار۔ (۴) خانہ داماد۔ (۵) قہر خدا کا۔ (۶) قریب۔ (۷) کازاری۔ (۸) غصہ۔ (۹) بولی کی چھٹی۔ (۱۰) زور اور۔ (۱۱) اقلت۔ (۱۲) بڑے بھائی صاحب۔ (۱۳) مس چاہ۔ (۱۴) اقلت۔ (۱۵) اول قہر۔ (۱۶) آخری قہر۔ (۱۷) شام۔ (۱۸) ہوا کی دوی۔ (۱۹) زور اور۔ (۲۰) شام افسانہ ایک نہیں)

اس کتاب کو دوسری بار گیلائی انٹیکٹرک بک ڈپو، لاہور نے شائع کیا اور تیسری بار مالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دلی نے ۱۹۳۹ء میں طبع کیا۔ اس کا ایک ایڈیشن اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دلی نے ۸۷ء ۱۹ء میں شائع کیا۔

- ۱۷۔ ”وہیات کے افسانے“ (افسانے) دارالاشاعت، پنجاب، لاہور۔ طبع اول ۱۹۳۹ء۔
- ۱۸۔ ”پیل“ (افسانے) نرائن دت سنگھ ایچ سنز، لاہور۔ طبع اول ۱۹۳۰ء۔
- ۱۹۔ ”طفولہ کالم اور دوسرے افسانے“ (افسانے) کتابستان آروڑ، لاہور۔ طبع اول ۱۹۳۳ء سے قبل۔
- اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بعد دستی کتاب گھر لاہور نے شائع کیا جو نرائن دت کی اردو کراچی کے کتب خانہ خاص میں موجود ہے۔
- ۲۰۔ ”سورہ“ (افسانے) عالمگیر الیکٹرک پریس، لاہور۔ طبع اول ۱۹۳۳ء۔
- ۲۱۔ ”طسمہ زار“ (افسانے) بعد دستی کتاب گھر لاہور۔ طبع اول ۱۹۳۳ء سے قبل۔
- ۲۲۔ ”قافل“ (افسانے) نرائن دت سنگھ ایچ سنز، لاہور۔ طبع اول ۱۹۳۳ء سے قبل۔
- (یہ کتاب ۳ آخری قوتوں کے چار افسانوں کا انتخاب ہے۔ (۱) قافل۔ (۲) آخری قوت۔ (۳) ادیب کی عزت اور (۴) دھوکا۔)
- ۲۳۔ ”کوچہاں“ (افسانے / سفری زبانوں سے تراجم) جین بک سٹال، لاہور۔ طبع اول س۔ ن۔
- ۲۴۔ ”بوائی گیل“ (افسانے / مضامین) بعد دستی کتاب گھر لاہور۔ طبع اول س۔ ن۔
- ۲۵۔ ”خاموشی محبت اور دوسرے افسانے“ (نگار کے افسانوں کا ترجمہ) پبلیک لٹریچر کتب، لاہور۔ طبع اول س۔ ن۔
- ۲۶۔ ”چنگان اور دوسرے افسانے“ (سفری زبانوں سے تراجم) بعد دستی کتاب گھر لاہور۔ طبع اول س۔ ن۔
- اس انتخاب میں نائنائی، پامرا، گورکی، نامس ہارڈی، آدھر مارین، مارک ٹوین اور دیگر لوگوں کے افسانے شامل کتاب ہیں۔
- (نوٹ:۔) قمبر شمار ۲۳ تا ۲۶ کے سارے مجموعے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئے۔
- ۲۷۔ ”اسرار و سجاد“ (اردو ناول) یہ پریم چند کا پہلا اردو ناول ہے جو ہفت وار اخبار ”آوازِ خلق“ طیار میں اکتوبر ۱۹۰۳ء تا فروری ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا۔ قطعاً اول پریم چند کا نام لوبا دے آتا ہوا درج ہے۔
- ۲۸۔ ”سکھا“ (اردو ناول) بھول ڈاکٹر قرار رکھیں پریم چند کے ایک اور ناول بارالال کرشن جو ۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۳ء میں الہ آباد ٹریگ کالج میں پریم چند کے ہم جماعت تھے ان کا پہلا ناول ”سکھا“ قرار دیتے ہیں جو ان کے قول کے مطابق ٹریگ کالج کے زمانے میں ہی شائع ہوا تھا۔
- (پروالہ ”پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار“)
- ۲۹۔ ”ہم ٹراو ہم ٹراپ“ (ناول۔ اردو) ناشر: مہاراج پشاور، لاہور، کھنوی۔ طبع اول ۱۹۳۹ء سے قبل۔
- سول ایگت صدیقی کبداچ

پریم چند کے درستی خاص ملٹی وڈ نرائن دت لکھتے ہیں

”جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا، پریم چند کا سب سے پہلا ناول ”ہم ٹراو ہم ٹراپ“ کے نام سے مہاراج پشاور، کھنوی کے انتظام

سے بچنے کا فن پر معمولی چھپائی میں شائع ہوا۔

شعلی پر اسے اہل شاعر کہتے ہیں۔

”میرے کاچھوڑ آنے سے برس درجہ برس قفل ان کا پھیلا ہوا۔ ہم غم و ہم ڈوب“ شائع ہوا تھا۔ میں نے اس کو ۱۹۰۷ء میں دہلی میں پڑھا تھا۔“

”امیر برصغیر“ (اردو ڈائل)

”دلی گویاں اور اندر دھماکے“ نے اپنی مگر بڑی اور بھاری کی تعریف میں پریم چند کے پہلے ڈائل کا نام ”امیر برصغیر“ بتایا ہے جو ان کے خیال میں ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا۔“

”پلو کاغذ“ (اردو ڈائل)

کل صفحات ۲۴۸۔ اسی ادارے نے دوسری بار ۱۹۲۸ء اور تیسری بار ۱۹۳۰ء میں شائع کیا۔ ایک ایڈیشن کتاب منزل کا دور نے بھی شائع کیا ہے اس ڈائل کا بھاری روپ ”دوران“ کے نام سے شائع ہوا۔

”دھجی دانی“ (اردو ڈائل)

پانچواں ایڈیشن لاپتہ رائے ایڈیٹر سنز، لاہور نے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا۔ یہ ڈائل دراصل راجہ تانہ کے ایک تاریخی قصہ کا اردو روپ ہے۔

”ہزار حسن“ (اردو ڈائل)

یہ ڈائل ۱۹۱۶ء میں مکمل ہوا اور پہلے ”سوراسنی“ کے عنوان سے بھاری میں شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن اسی ادارے سے ۱۹۳۸ء میں اور ایک ایڈیشن حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے تجربہ ۱۹۵۵ء میں طبع ہوا، جس کی خلاصہ ۳۳۳ صفحات ہے۔ پریم چند کی اس ڈائل پر بھارت میں ایک فخریہ نظم بھی لکھی ہے۔ اس کتاب کا ایک عملی ایڈیشن شعلی بک اینڈ پرنٹری، لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔

”کوشے حلیت“ (اردو ڈائل) (اردو ڈائل)

اسی ادارے نے ایک ایڈیشن ۱۹۳۶ء میں شائع کیا۔ یہ ڈائل ادارہ فروغ اردو لکھنؤ سے ۲۹۵ صفحات کی خلاصہ میں شائع ہو چکی ہے۔

”چند گان سنی“ (اردو ڈائل)

اسی ادارے نے دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۵ء میں شائع کیا۔ بعد حالی کتاب مگر لاہور نے اسے ۱۹۳۳ء میں شائع کیا۔ ایک ایڈیشن مکتبہ تمکین دہلی سے ۱۹۳۸ء خلاصہ کی خلاصہ میں شائع ہو چکا ہے۔ دراصل بھاری ڈائل ”رنگ بھوم“ کا اردو روپ ہے۔

”چند گان سنی“ (اردو ڈائل)

پانچویں بار لاپتہ رائے ایڈیٹر سنز، لاہور، دہلی نے ۱۹۳۸ء خلاصہ کی خلاصہ کے ساتھ شائع کیا۔

”فرخ“ (اردو ڈائل)

کل صفحات ۲۵۰۔ اس کا ایک ایڈیشن شعلی بک اینڈ پرنٹری نے بھی شائع کیا ہے۔

- ۳۸۔ "نہجین" (اردو ناول) لچھہ رائے ایڈسٹریٹس لاہور طبع اول ۱۹۳۹ء سے قبل
یہ ناول تیسری بار احمد حسن دہلوی پبلشنگ ہاؤس لاہور نے جون ۱۹۴۴ء میں شائع کیا۔ ایک ایٹیشن اعلان پہلی کھنڈر راولپنڈی نے بھی شائع کیا ہے۔
- ۳۹۔ "نیر" (اردو ناول) ناشر: پریم چند سرسوتی پبلشنگ ہاؤس طبع اول ۱۹۳۵ء سے قبل
دوسرا ایٹیشن مکتبہ جامعہ دہلی نے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا اور مصمت کبک اپر دہلی نے ۱۹۴۵ء میں چھاپا۔
- ۴۰۔ "سیدان غفل" (اردو ناول) ناشر: پریم چند سرسوتی پبلشنگ ہاؤس طبع اول ۱۹۳۲ء
اس کتاب کا ایک ایٹیشن مکتبہ میری لاہور پری، لاہور اور چوتھا ایٹیشن مکتبہ جامعہ دہلی نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا ہے۔ ایک غفل ایٹیشن نظرا احمد قریشی لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔
- ۴۱۔ "مکودان" (اردو ناول) ناشر: پریم چند سرسوتی پبلشنگ ہاؤس طبع اول ۱۹۳۶ء
دوسری اور تیسری بار مکتبہ جامعہ دہلی نے ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۹ء میں شائع کیا۔ اس ناول کا ایک غفل ایٹیشن نشر پبلشنگ ہاؤس، لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔
- ۴۲۔ "سنگل سوٹر" (ہندی ناول) ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس، بنارس طبع اول
یہ پریم چند کا آخری ناول یکساں طرز پر ہے جو مکمل نہ کر سکے۔ اسے ۱۹۳۶ء میں ستر ملازمت پر لکھنا شروع کیا۔ انہوں نے اسے اردو میں لکھا تھا لیکن اردو روپ سے پہلے اور پریم چند کے آجمنائی ہونے کے بعد ان کے بیٹے امرت رائے نے ہندی زبان میں شائع کر دیا۔ اصل اردو روپ کا حال شائع نہیں ہو سکا۔
- ۴۳۔ "سید اسد" (ہندی ناول) ہندی پبلشنگ ایجنسی بنگلور طبع اول ۱۹۱۸ء
- ۴۴۔ "پریم چند آخرم" (ہندی ناول) ہندی پبلشنگ ایجنسی بنگلور طبع اول ۱۹۴۵ء
- ۴۵۔ "رنگ بھری" (ہندی ناول)
- ۴۶۔ "کاٹا گھٹ" (ہندی ناول)
- ۴۷۔ "پریم چند" (ہندی ناول)
- ۴۸۔ "آسمان کی پری" (اردو ناول) سرال اکاؤنٹس صدیقی بک ڈپ۔ طبع اول ۱۹۳۹ء سے قبل
- ۴۹۔ "سنگرام" (ہندی ناول)
- ۵۰۔ "دنگاراس" (ہندی ناول)
- ۵۱۔ "کرلیا" (اردو ناول) لچھہ رائے ایڈسٹریٹس لاہور طبع اول ۱۹۴۳ء سے قبل
- ۵۲۔ "دوجاتی شادائی" (اردو ناول) مصمت کبک ڈپ دہلی طبع اول ۱۹۳۳ء
- ۵۳۔ "روزخ" (اردو ناول) ہندوستانی کتاب گھر لاہور طبع اول ۱۹۴۳ء سے قبل
- ۵۴۔ "دفا کی دیوی" (اردو ناول) نرائن دت سنگھ لاہور طبع اول ۱۹۴۵ء

- ۵۵۔ "مشرق کا رونا" (اردو ناول) جہادی پریس، لاہور طبع اول: ۱۹۳۳ء سے قبل
- ۵۶۔ "پہلکار" (اردو ناول) ہندوستانی کتاب گھر، لاہور طبع اول: ۱۹۳۳ء سے قبل
- اس ناول کا دوسرا ایڈیشن شاہین علی کیشنور دارا لپنڈی نے شائع کیا۔
- ۵۷۔ "ہماروں کے درد من" (سوانحی خاکے) رام پرائس لال، دہلی، بام طبع اول: ۱۹۳۹ء
- ۵۸۔ "سوجھ بوجھ" (بھاری مضامین) "سوانح" طبع اول: ۱۹۳۹ء
- ۵۹۔ "سوانح" (سوانح) "سوانح" طبع اول: ۱۹۳۹ء
- ۶۰۔ "پہلکار" (بھاری ناول کا ترجمہ) "سوانح" طبع اول: ۱۹۳۹ء
- ۶۱۔ "رام جی" (رام چندری کی سوانح) ہندوستانی پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، بام طبع اول: ۱۹۳۹ء سے قبل
- ۶۲۔ "قرون وسطی میں ہندوستان کی تہذیب" ہندوستانی آئیڈیال ہاؤس طبع اول: ۱۹۳۹ء
- پچھڑے دن مارنے پہلور ٹھکر پیرا چندا دھما کا اردو ترجمہ کل صفحات: ۲۳۸، ۶۰۰ء ۱۹۴۰ء کی ہندوستانی تہذیب، مزاحیہ اور اقتصادیات کے حالات مع تصاویر۔
- ۶۳۔ "معاشریات کے ابتدائی اصول" (علم معاشریات) (۲۹۸ صفحات) امرت اکشرک پریس، لاہور طبع اول: ۱۹۳۹ء
- ۶۴۔ "تہذیب" (پہلی بار ترجمہ کے انگریزی ناول کا ترجمہ) ہندوستانی کتاب گھر، لاہور طبع اول: س۔ س۔
- ۶۵۔ "مضامین پریم چند" مرتبہ شعیب احمد انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی۔
- ۶۶۔ "مضامین پریم چند" مرتبہ ڈاکٹر قمر بخش، دہلی طبع اول: ۱۹۶۰ء
- ۶۷۔ "گپتہ دھن" (ادبی جملہ) مرتبہ امرت داسے
- یہ بھاری مشہور کہانوں کا مجموعہ ہے۔
- ۶۸۔ "میں سداک" (بچوں کے لیے بھاری) "میں کی کہانی" (بچوں کے لیے اردو)
- ۶۹۔ "بھنگل کی کہانیاں" (بچوں کے لیے اردو)
- ۷۰۔ "بھنگل کی کہانیاں" (بچوں کے لیے اردو)
- ۷۱۔ "بھنگل کی کہانیاں" (بچوں کے لیے اردو)
- ۷۲۔ "بھنگل کی کہانیاں" (بچوں کے لیے اردو)
- ۷۳۔ "بھنگل کی کہانیاں" (بچوں کے لیے اردو)

غیر ہندوؤں۔

نول والا مہلوہ سب کے ساتھ پریم چند نے انمول فرانس کے ناول "تاکس" کا اردو ترجمہ ایڈا رنگت اور جارج ایلٹ کے ناول "سپ سراج" (Sala Sarnaj) کا اردو ترجمہ سکھ اس رنگت کے لیے کیا تھا۔ یہ دونوں تراجم ناول شائع نہیں ہوئے۔ "سپ سراج"

(بھری ماہنامہ) میں شائع ہونے والے بھری افسانے اس کے علاوہ ہیں۔

نظریہ فتن:

"میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہیر یا قہر۔ یعنی ہوتے ہیں۔ اس میں ذرا دانی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر محض واقعہ کے اظہار کے لیے میں کہنا پس نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفے یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرتا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی غیاظ نہیں ملتی، میرا قلم ہی نہیں اٹھتا۔"

(پہلا کتاب نام حکیم یوسف حسن، "نیرنگ خیالی" ۱۹۳۳ء)



حوالہ جات:

- ۱۔ اداکار وحید فاروقی کی "بھڑی ادا کی ادب" کو دیکھ کر کتب میں پہلے چند کہ ۱۹۵۵ء میں ناپور میں دیکھا گیا ہے۔ پورا دستہ نکلیں۔
- ۲۔ ایسا سنہ ۱۹۵۱ء کی تیار کردہ فلم "رنگینا داجیہ" ۱۹۳۳ء میں رلیج ہوئی۔ فلم کی موسیقی پی اے ایس ہوگن نے ترتیب دی تھی۔ اداکاروں میں اسرار خان، پوریا، آزاد کی، دلگیر ایم خان اور سید لڑکیاں تھے۔ داجیہ کا اداکار اے ای ایس ہوگن تھا۔
- ۳۔ ایسا سنہ ۱۹۵۱ء کی تیار کردہ فلم "موسیقی پی اے ایس ہوگن نے ترتیب دی۔ اداکاروں میں پوریا، دلگیر، لویج، فاک، سید لڑکیاں تھے۔ داجیہ کا اداکار اے ای ایس ہوگن تھا۔
- ۴۔ پوریا کی فلم "پارک" کی موسیقی پی اے ایس ہوگن نے ترتیب دی۔ اداکاروں میں پوریا، دلگیر، فاک، پوریا، لڑکیاں تھے۔
- ۵۔ پوریا کی فلم "پارک" کی موسیقی پی اے ایس ہوگن نے ترتیب دی۔ اداکاروں میں پوریا، دلگیر، فاک، پوریا، لڑکیاں تھے۔
- ۶۔ "پہلے چند کہ" ۱۹۵۵ء میں رلیج ہوئی۔ فلم کی موسیقی پی اے ایس ہوگن نے ترتیب دی تھی۔ اداکاروں میں اسرار خان، پوریا، آزاد کی، دلگیر ایم خان اور سید لڑکیاں تھے۔ داجیہ کا اداکار اے ای ایس ہوگن تھا۔
- ۷۔ "پہلے چند کہ" ۱۹۵۵ء میں رلیج ہوئی۔ فلم کی موسیقی پی اے ایس ہوگن نے ترتیب دی تھی۔ اداکاروں میں اسرار خان، پوریا، آزاد کی، دلگیر ایم خان اور سید لڑکیاں تھے۔ داجیہ کا اداکار اے ای ایس ہوگن تھا۔
- ۸۔ "پہلے چند کہ" ۱۹۵۵ء میں رلیج ہوئی۔ فلم کی موسیقی پی اے ایس ہوگن نے ترتیب دی تھی۔ اداکاروں میں اسرار خان، پوریا، آزاد کی، دلگیر ایم خان اور سید لڑکیاں تھے۔ داجیہ کا اداکار اے ای ایس ہوگن تھا۔

کفن

پریم چند

جنون پڑے کے دروازے پر باپ اور چنا دونوں، ایک بجے ہوئے گاؤں کے سامنے خاموش بیٹھے تھے اور اندر بیٹے کی جوان چہرہ پر سیاہ رزہ سے چھائی ہوئی کھارسی تھی اور وہ کس کس کے منہ سے ایسی دلخراش صدا بگنی تھی کہ دونوں کیجوتھم لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی، غصا خانے میں غرق۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

”کھینو نے کہا۔“ معلوم ہوتا ہے بچے کی نہیں۔ سارا دن تو بچے ہو گیا، ہمارے کچھ تو آ۔“

دھوم دھواک لہجے میں بولا ”مرتا ہی ہے تو جلدی سر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا کروں۔“

”تو بڑا بچہ رہے بے اسال بھر جس کے ساتھ ہندوگانی کا کتھو ہو گا۔ اسی کے ساتھ اتنی بیوی چھٹی۔“

”تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پکڑنا نہیں دیکھا جاتا۔“

بھاریوں کا کتھو تھا اور سارے بنگ میں بدنام۔ کھینو ایک دن کام کرتا تو عین دن آدھرا سا دھوا کا کام چھوڑا کہ کھینے بھر کام کرتا تو کھینے بھر چم بیٹا۔ اس لئے اسے کوئی حرکت تھی نہ تھا۔ مگر میں ٹھکی بھرا تاج بھی سو جھوڑا ہو تو ان کے لیے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب وہ ایک فالتے ہو جاتے تو کھینو درختوں پر چڑھ کر کھڑکیاں توڑا کرتا اور دھوا بازار سے بیچ لاتا اور جب تک وہ پیسے رچتے وہ دونوں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے جب نہ سنے کی نوبت آ جاتی تو بھر کھڑکیاں توڑتے یا کوئی حودہ دی نکال کر دے گاؤں میں کام کی کہی تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ بھٹی آدمی کے ہے بھاس کام تھے۔ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت جاتے جب دروازے میں سے ایک کا کام پا کر بھی قیامت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاشتکاروں کا کام ہوتا تو انھیں قیامت اور توکل کے لیے خدا کے کی منتظر ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجیب زندگی تھی ان کی۔ مگر میں مٹی کے دو ہار برحقوں کے سوا کوئی کھاؤ نہیں۔ پھنے، بگڑے خوروں سے اپنی مریاتی کوڑا مانگے ہوئے دنیا کی لگروں سے آزاد۔ قرض سے نہ سے ہوئے گاؤں میں بھی کھاتے مگر بھی کھاتے مگر کوئی لقم نہیں۔ سکھیں اسے کہ رسول کی منتظر امید نہ ہونے پر بھی لوگ انھیں بکھڑا کر قرض دے

دیتے تھے۔ مٹریا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹریا آلو کھڑا کرتے اور بھون بھون کر کھا لیتے۔ پاؤں پاؤں کو کھڑا کرتے اور رات کو چوستے۔ کھسور نے اسی زیادہ انعامات سے ساتھ سال کی عمر کا تھی وہی اور مادھو بھی سعادت مند بننے کی طرف مہیاپ کے تھکن قدم پر چلے۔ ہاتھ بالک اس کا نام اور بھی روشن کر ہاتھ اس وقت بھی دونوں لالہ کے سامنے پیٹھے ہوئے آلو بھون رہے تھے، ان کی کھیت سے کھوٹا لائے تھے۔ کھسور کی بیوی کا تو دھت ہوئی انتقال ہو گیا تھا، مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی۔ اس نے اس خاندان میں خدائی کی بنیاد ڈالی تھی۔ پہائی کر کے کھاس پھیل کر وہ سیر بھرت لے کا انتظام کر لیتی تھی۔ اور ان دونوں بے لطفوں کا دواغ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور اُسی ہو گئے تھے۔ بلکہ کھانے کے بھی گئے تھے کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی کی شان سے دو گئی مردوسی مانگتے۔ دھو عورت آج تک سے دردناک میں مردھی تھی اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ وہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

کھسور نے آلو نکال کر پھیلے ہوئے کہا "جا کر دیکھو کیا حالت ہے" اس کی چڑیل کا بھسار ہو گا اور کیا، یہاں تو اوجھا بھی ایک دوپہر مانگا ہے۔ کس کے گھر سے آئے۔"

مادھو کا نہ پیشہ نہ کد، کوٹھری میں گیا تو کھسور آلو نکال کر بڑا اصرار سے کر دے گا۔ بولا "مجھے وہاں بڑا دکھ ہے۔"

"اگر کس حالت کا ہے۔ میں تو یہاں ہوں ہی۔"

"تو تمہیں جا کر دیکھو۔"

"بھری عورت جب سڑی تھی تو میں تین دن تک اس کے پاس سے جا بھی نہیں اور پھر مجھ سے لپانے کی کہ نہیں، ابھی اس کا منہ نہیں دیکھا۔ آج اس کا کھرا ہوا ہونہ دیکھوں۔ اسے تن کی سوجھ بھی تو ضروری۔ مجھے دیکھنے کی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پک سکے گی۔"

"میں سوچتا ہوں کہ کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہو گا؟ سوچو اگر۔ مثل بکری بھی تو نہیں ہے مگر میں۔"

"سب بکیرا ہانے گا۔ بھنگان بچہ ہی تو، جو لوگ ابھی ایک جیسے نہیں دے رہے ہیں۔ دھو جب بنا کر دیں گے۔ میرے دل کے ہونے، مگر میں کچھ بھی نہ تھا مگر اس طرح ہر کام میں مل گیا۔"

جس رات میں رات دن ملت کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں، وہ لوگ جو کسانوں کی کھرا دھوئی سے فائدہ اٹھا جاتے تھے ان کی زیادہ دواغ انہل تھے وہاں اس قسم کی مزیت کا پیدا ہو جا تو کوئی قہر کی بات نہیں تھی۔ ہم تو ان کے کھسور کسانوں کے مقابلے میں زیادہ دواغ دیکھیں ہیں تھا اور کسانوں کی جی دواغ ہیبت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی خدمت پر دواغ رعایت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ ملاصورت دھوئی کہ شاطروں کے آئینے و آداب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لیے جہاں اس کی رعایت کے اور لوگ گاؤں کے سرچل کو دیکھا جاتے ہوئے تھے۔ اس پر سارا گاؤں انگشت لٹائی کر دیا تھا پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خدمت حال ہے تو کم سے کم اسے کسانوں کی ہی جگہ تو خدمت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بچا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

دونوں آلو نکال نکال کر جلنے جلنے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھا تھا، آج صبر نہ تھا کہ انہیں خفتا ہو جائے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں مل گئیں۔ جھل جانے پر آلو کا روٹی کی صورت پر دواغ گرم نہ معلوم ہوتا لیکن راتوں کے تلے چڑے ہی اندر کا حصہ زبان اور منہ اور تلو کو جھلا دیتا تھا اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے خفتا کرنے کے لئے کافی سامان ملے۔

اس لئے دونوں جلد بھگن پاتے جاؤ گے اس کو خوشی میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھبراہٹ میں ایک وقت تو اس کی بات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ کیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو میری نصیب ہوئی تھی، وہ اس کی زندگی میں ایک بدکار واقعہ تھی اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا "وہ بھوج نہیں بھولا۔ جب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پور نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پڑنا ہی کھائی تھیں، سب کو۔ پھلنے پونے سب نے پڑنا ہی کھائیں اور اصلی لڑکی کی چٹائی، سرائے تین طرح کے سونے کے ساگ، ایک دس وارہ کار، دسی بھٹی، مٹھائی اب کیا بٹاؤں کا اس بھوج میں کتنا سوا ملا۔ کوئی روک نہیں تھی، جو چیز چاہو ناگوار جتنا چاہو کھاؤ لوگوں نے ایسا کھایا، ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا مگر پونے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم، کول کول، بجکتی ہوئی پکھر یاں ڈال دیتے ہیں۔ مٹھ کرتے ہیں کہ ٹھنک چاہیے نکل کو ہاتھ روکے ہوئے ہیں مگر وہ ہیں کہ اسے جانتے ہیں اور جب سب نے منہ دھو لیا تو ایک ایک بڑا پان بھی مار کر مجھے پان لینے کی کہاں سود تھی۔ کڑاٹ ہوا جاتا تھا۔ جھٹ پت چا کر اپنے کھل پر لیٹ گیا۔ ایسا اور پاؤں تھا وہ تھا کہ۔"

مادرہو نے ان شکلات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا "کب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھاتا۔"

"کب کوئی کیا کھائے گا؟ وہاں اور تھا۔ اب تو سب کو بکھارت سو جنتی ہے۔ سادی بڑا وہ میں مت کھرچ کر وہ کرم میں مت کھرچ کر۔ پانچم کر ہیوں کاہل ہنر ہنر کر کہاں رکھو گے۔ بکر ہنر نے میں تو کی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ میں بکھارت سو جنتی ہے۔"

"تم نے ایک میں پڑنا ہی کھائی ہوں گی۔"

"میں سے بچا وہ کھائی تھیں۔"

"میں بچا اس کا بچا۔"

"بچا کہ تم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی، ماچھا پٹھا تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے۔" لوگ کھاروں نے پانی پیا اور وہیں لاڈ کے سامنے اپنی دھوپیں لاؤں کر پاؤں پیٹے میں ڈالے سو رہے۔ جیسے وہ بڑے بڑے ڈوڑھے گینڈیاں، رہے چڑے ہوں اور بدھیا بھی بھگ کر اور ہی تھی۔

2

میاں کو مادرہو نے کوٹری میں جا کر دیکھا تو اس کی بولی غلطی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر کہاں بھگ رہی تھیں۔ چھرائی ہوئی آنکھیں اوپر اٹکی ہوئی تھیں۔ سارا جسم نہک میں ات پت، اور ہاتھ اس کے پیٹ میں بچہ مڑ گیا تھا۔

مادرہو ہکا ہوا گھبراہٹ کے پاس آیا پھر دونوں زہر زہر سے اپنے ہاتھ کر کے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ چڑوس والوں نے پتہ ڈال دیا یعنی تو دوڑے ہوئے آئے اور دم قدیم کے ملاحی غوروں کی نقلی کرنے لگے۔

مگر زہر زہر دے دھونے کا موقع نہ تھا کلن کی اور کلن کی فکر کرنی تھی۔ مگر میں تو یہ اس طرح غائب تھا جیسے خیل کے کونیلے میں۔

باپ بیٹے رہتے ہوئے گاؤں کے دھیمہ ار کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انہیں اپنے ہاتھوں

بیٹہ بیٹھے تھے۔ چوڑی کی طلعہ میں ادھارے پر کام نہ کرنے کی طلعہ میں۔ پوچھا "کیا ہے بے گھمراہ روٹا کیوں ہے۔ آپ تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ آپ معلوم ہوتا ہے کہ تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔"

گھمراہ نے نوٹیں پر سر دکھا کر آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے کہا۔ "سرکار بڑی ہیست میں ہوں۔ بادلوں کی گھروالی رات گھر کی۔ دن بھر تازی، رہی سرکار۔ آدمی رات تک ہم دونوں اس کے سر ہانے بیٹھے رہے۔ دوادارو جو بچہ ہو سکا۔ سب کیا۔ مگر نہیں دکا۔ گی۔ آپ کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا مالک۔ چاہو گئے۔ مگر اجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں۔ آپ کے سوا کسی کوں پار کاٹے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا، وہ سب دوادارو میں اٹھ گیا۔ سرکار، اسی کی دیوہی تو اس کی تلی اٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوا رہ جائیں۔"

زمیندار صاحب رچل آدمی تھے۔ مگر گھمراہ پر دم کرنا کالے کھل پر رنگ چڑھا تھا۔ جی میں تو آکا کہ دیں "چل دو رہو یہاں سے اول گھر میں دیکر کر سزا۔ میں تو بھانے سے بھی نہیں آتا آج جب غرض چڑی تو آ کر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خوردگیں کا بد معاش۔" مگر یہ غصہ و انتقام کا سوچہ نہیں تھا۔ غور و فکر کیا۔ دو روپے نکال کر بیچک دینے کو توفیق کا ایک گڑھی منہ سے نہ نکلا۔ اس کی طرف کا کچھ نہیں۔ گویا سرکارو جو اتارا ہو۔

جب زمیندار نے دو روپے دے کر گاؤں کے بچے مہاجلوں کو نکال دی جرات کیونکر ہوتی۔ گھمراہ زمیندار کے نام کا وصف وراثتہ جانا تھا کسی نے دوائے دے کسی نے پے دے۔ ایک گھنٹے میں گھمراہ کے پاس پانچ روپیہ کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسی نے تلے دے دیا کسی نے کلزی اور دوپہر کو گھمراہ اور بادلوں کے کفن لے لے چلے اور وہ ہنس دہنس کالے گئے۔ گاؤں کی ہر تہی انتھاب مور میں آ کر ایش کو کھینچی تھیں اور اس کی بے بسی پر دوہرا آنسو کرنا کر مل جاتی تھیں۔

3

بادار میں تلخ کر گھمراہ بولا۔ "کلزی تو اسے جو نے ہر کی ال گئی ہے۔ کیوں بادلو۔"

بادلو بولا "ہاں کلزی تو بہت ہے۔ اب کھنکھن چاہیے۔"

"تو کوئی پکڑا کھنکھن لے لیں۔"

"ہاں اور کیا" ایش اٹھنے اٹھنے رات ہو جانے کی۔ رات کو کھنکھن کوں دیکھتا ہے۔"

"کیہ مرادو بچہ کہ کسے چیتے جی تو ہاں گئے کو بھڑا اگنی نہ لے، اسے مرنے پر لاکھن چاہیے۔"

"اور کیا رکھا رہتا ہے۔ بچی پانچ روپے پہلے ملے تو کچھ دوادارو کرتے۔"

دونوں ایک دوسرے کے دل کا باہر سمٹتی طور پر گھمراہ تھے۔ یادار میں اور اور مٹھتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دونوں اتفاق سے باہر ایک شراب خانہ کے سامنے پہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ وہاں ڈاڈو ایک دونوں تہذیب کی حالت میں کھڑے رہے۔ مگر گھمراہ نے ایک باطل شراب لی۔ کچھ گڑبگڑ لی اور دونوں برآمدے میں بیٹھ کر بیٹھے گئے۔ کئی جگہاں جیم بیٹھنے کے بعد دونوں سرور میں آ گئے۔

”کیسے بولا۔“ لیکن گانے سے کیا ملتا۔ آکر مل ہی تو جاتا۔ کچھ سہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔“

”ادھر آسمان کی طرف دیکھ کر بولا گویا فرشتوں کو اپنی مصیبت کا یقین دلا رہا ہو۔“ ”دنیا کا دستور ہے۔ لیکن لوگ انہوں کو جباروں روپے کیوں دیتے ہیں۔ کون دیکھتا ہے۔ ہر لوگ میں ملتا ہے۔“

”تو بے آدمیوں کے پاس دھن ہے کچھ نہیں، ہمارے پاس کچھ کتنے کو کہا ہے۔“

”لیکن لوگوں کو جواب کیا دو گے؟ لوگ پہچیں گے لیکن کہاں ہے؟“

”کیسے جہا۔“ ”کہہ ہی گئے دوپے کرے کھک گئے بہت احمق۔“

”ادھر بھی بند۔ اس غیر متوقع خوش فہمی پر قدرت کا اس طرح شکست دینے پر بولا۔“ ”بڑی اچھی تھی بھاری مری بھی تو خوب کھانا کھا کر۔“ ”آدھی رات سے زیادہ فطرت ہو گئی۔“ ”کیسے سونے دو سیر پڑیاں تنگوائیں، گوشت اور سامان اور چٹ پٹا کچھیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے دکان تھی، ادھر آپکے کر دو چوں میں ساری چیزیں ملے آتا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے۔“

”دونوں اس دلت اس شان سے بیٹھے ہوئے پڑیاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار ازار پا ہو۔“ ”جواب دی کا خوف تھانہ بدنامی کی فکر۔“ ”شکست کے ان مراحل کو انہوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔“ ”کیسے فلسفیانہ انداز سے بولا۔“ ”بھاری آقا پر سن ہو رہی ہے تو کیا اسے پتہ نہ ہوگا۔“

”ادھو نے فردا صبحیت سے سر جھکا کر تھوڑی سی کی“ ”خود سے جڑو ہوگا۔“ ”نکھوان اقم اسر جہا (عظیم) ہو۔ اسے نکھو لے جانا۔ ہم دونوں بڑے سے اسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو ہم جن جادو، کچی امر بھرت ملا تھا۔“

”ایک لڑکے بعد، ادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔“ ”بولا۔“ ”کیوں؟“ ”ادھو لوگ بھی تو وہاں ایک شایک دن جائیں گے ہی؟“ ”کیسے نے اس نکلنے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔“ ”ادھو کی طرف پر حاضرت کے انداز سے دیکھا۔“

””جہوہاں ہم لوگ سے دوپے کھانے کی کرم نے ہمیں لیکن کیوں نہیں دیا تو کہہ کر گئے؟“

””لیکن گے تمہارا سر۔“

””سچ کھانے کی تو جڑو۔“

””تو کیسے جاتا ہے اسے لیکن نہ ملے گا؟ تو مجھے اب گھبراہٹ ہے۔ میں ساٹھ سال دنیا میں کیا کھاں کھو رہا ہوں۔ اس کو لیکن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا، جو ہم دیں گے۔“

”ادھو کو یقین نہ آیا۔“ ””بولا کون؟“ ”وہ پوچھے تو تم نے چٹ کر دیے۔“

”کیسے بھرا ہو گیا۔“ ”میں کچھ ہوساں سے لیکن ملے گا تو مان کیوں نہیں؟“

””کون دے گا، تاتے کیوں نہیں؟“

””دی لوگ دیں گے جنہوں نے اب کی دیا۔“ ”ہاں وہ پوچھے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے اور اگر کسی طرح آجائیں تو بھریم اس طرح یہاں پہلے نہیں گے اور لیکن تیری ہار ملے گا۔“

جوں جوں اندھا چراغ جلتا تھا اور ستاروں کی چمک خیز ہوتی تھی، بھٹکانے کی راہیں بھی بڑھتی جاتی تھیں۔ کوئی کاجاتھ، کوئی جھکتا تھا، کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا ہاتھ، کوئی اپنے دوست کے منہ میں ساغر لگانے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا، ہوا میں نشہ۔ کتنے تو پلوں میں ہی الو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آتے تھے تو صرف غور خواہ موٹی کا حوہ لینے کے لئے۔ شراب سے نڈیا دو یہاں کی ہوا سے سرور ہوتے تھے۔ زبیرت کی بار یہاں کھینچ لاتی تھی اور کچھ دیر کے لئے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ ہیں یا زندہ اور مردہ ہیں۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی حوہ لے لے کر چمکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جی ہوئی تھیں۔ کتنے غرض نصیب ہیں اور توں، چوری دھمکے میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر ماحوئے بچی ہوئی پھر میں کا قتل تھا کر ایک بھکاری کو سے دیا، جو کڑا ان کی طرف گرسن لگا ہوں سے، کچھ رہا تھا اور دینے کے غور اور مسرت اور اولوں کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔ گھسوں نے کہا "لے جا کھوب کھا اور شیر بادوے" جس کی کہانی ہے وہ تو مرگئی مگر حیران شیر بادوے جڑو پہنچ جائے گا۔ روٹیں دوئیں سے آ شیر بادوے بڑی گاڑی کہانی کے پیچھے ہیں۔ "ماحو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا "وہ کھٹھو میں ہائے کی۔ دارا کھٹھو کی رانی بنے گی۔" گھسوں کڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا۔ "ہیں چٹا کھٹھو میں نہ ہائے کی تو کیا یہ سونے لوگ ہائیں گے، جو کڑیوں کو دونوں ہاتھ سے لوتے ہیں اور اپنے باپ کے دھونے کے لئے لگا نہاتے ہیں اور صدوں میں مل چڑھاتے ہیں۔"

یہ غرض اعتقاد کی کار تک بھی بدلا۔ فطرت کی خاموشی سے اس سورم کا دور دورہ ہوا۔ ماحو بولا "مگر دادا چھاری نے جندگی میں بڑا کچھ بھرا گا۔ مری مری کٹتا دکھائیں گے۔" وہ آگھوں پر ہاتھ رکھ کر دھونے لگا۔

گھسوں نے بھایا "کیوں روتا ہے چٹا گھسوں ہو کہ وہ نایا جال سے نکلت ہو گئی۔ جنجال سے پھوٹے گی۔ بڑی بھگوان تھی جہاں جہاں ہندو مایا سوہ کے بندھن توڑ دیتے۔"

اور دونوں وہیں کڑے سے ہار کالے گئے چلتی کیوں بچا بھلاوے تھیں۔
سارا بچا زکوٰۃ تھا اور یہ دونوں میٹکس ٹھور کویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ ہار دونوں ناچنے لگے۔ اچھلے گی، دوہے گی، کرے گی، ملے گی، بھاؤ گی جاتے اور آ خر نکلے سے ہرست ہو کر وہیں گر چکے۔

محمد علی ردو لوی

نام	محمد علی
تلفی نام	چوہدری محمد علی ردو لوی (محمد علی ردو لوی)۔
پیدائش	۱۸ مئی ۱۸۸۳ء پشاور، پشاور، ضلع پارہ بنگل، صوبہ اودھ (بھارت)
وفات	۳۱ دسمبر ۱۹۵۳ء، نکلہ، ہندوستان
تعلیم	مکتب میں پائی (باقاعدہ کوئی سند لے سکے)
	کالون تعلقدار اسکول لکھنؤ میں داخلہ لے کر چھوڑ دیا۔

مختصر حالات زندگی:

قومیت: مسیحی، مساکن ردو لوی، آبائی پیشہ: تھکن داری۔ نام: تعلقدار میر چوہدری، ضلع پارہ بنگل، صوبہ اودھ۔ ماں: باب کا مذہب: شیعہ تھا۔ جس زمانے میں مشعلی نواحی اسلامی دنیا کے سترے دہائیں آنے لگی تھیں، وہاں سے ہوا، سندھ لایا۔ میرزا عبد القادر بیدل اور میرزا غالب کے قتل میں قلم کاری کا تاؤ لگا کر دفتر میں صاحب اسلوب ہوئے۔

محمد علی ردو لوی ابھی اڑھائی برس کے تھے جب ان کے والد کا انتقال ہوا اور وہ طوطہ تعلقدار ہو گئے۔ تعلقدار میر چوہدری، ضلع پارہ بنگل کوکورت آف داروڑ نے اپنے انتظام میں لے لیا۔ والدہ نے مارے لاڈ بچہ کے نظروں سے انہیں نہ ہونے دیا اور جس اسکول کی باقاعدہ تعلیم سے محروم رہے۔ کورٹ آف داروڑ کے انگریز منیجر نے زبردستی کالون تعلقدار اسکول، لکھنؤ میں داخلہ کروا دیا۔ جہاں انگریز سرکار کے معاملات یافتہ طبقے کی اولاد و شہسواروں کے ساتھ تاج برطانیہ سے متعلق درسی و قاعداری پائی تھی۔ اسکول سے فراہم کئے بعد چوہدری صاحب نے انگریزی ادب، فلسفہ، نفسیات اور آرٹ کے گہرے مطالعہ کے ساتھ ساتھ مذہب عالم کے تقابلی مطالعہ اور کارل مارکس میں دلچسپی لی۔

چوہدری صاحب بطور تعلقدار، تاج برطانیہ کے منظور نظر رہے اور اپنے کردار پر ناکردہ گناہوں کے صلے میں مزید جاگیروں کے علاوہ

”نائب“ کے خطاب سے غور اے گئے۔ نو جوانی میں راج کرامت حسینی کے عقیدت مند اور آخر میں مجدد ناصر حسینی کے حلقہ ارادت میں رہے۔ زندگی بھر لٹریچر کو بطور مضبوط دھڑکا دینا چھوڑا کیا۔ جس زمانے میں ان کا تعلق کورٹ کے زیر انتظام رہا تو چندوں کے لیے جنگ میں ملازمت کا شوق پورا کیا۔ چورس تک صوبہ کونسل میں ملازمت کی فراہمی کی۔ بہت اچھے شاعر تھے، تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ ۱۹۳۹ء میں عمر کی چالیس اور تھوڑی سی پگ ملت چھوڑ دی۔ سنی احباب اور اعزاء نے خوش ہو کر پچھا کیا کہ تکی ہو گئے؟ تو آپ نے جواب دیا کہ اگر تکی ہوتا تو شہر ہی کیوں نہ دیتا۔

۱۹۵۱ء میں جب انہوں نے اپنی کتاب ”میرا مذہب“ مکمل کی تو شیعہ اعزاء کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کتاب میں حضرت ابو بکر صدیق کی بہت تحریف کی گئی ہے۔ حال یہ نہ تھا کہ وہ حقیقت کیا تھے۔ چودری صاحب نے دو شاہدیاں کیں اور بہت سی شاہدیاں کر کے نئی خواہش دل میں بے گزر گئے۔

اولین تحریر:

”کام سن مری“ سلسلے کے مضامین (مطبوعہ ”ادب و ادب“) میں سے کوئی ایک تحریر ”خالق بی بی“ (کتابچہ) اس کے ناشر خود چودری محمد علی رودولی تھے۔

اولین مطبوعہ اقساط:

جلد ”یادِ نبی“ اور ”ہندوستان“ میں شائع ہونے والے اقساطوں میں سے کوئی ایک اقساط۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ ”گمراہ کا خوف“ (اٹھائے)
 - ۲۔ ”تکفل محمد شاہ فقیر“ (اٹھائے / خاکے)
 - ۳۔ ”خالق بی بی“ (مزاحیہ)
 - ۴۔ ”ملاح کار“ (جنایات)
 - ۵۔ ”نقدی کے کچے“ (گہمی تساہری پر کچے سے حلقی کتابچہ)
 - ۶۔ ”بھٹی“ (مزاحیہ)
- ناشر: محمد علی رودولی، تقسیم کار: نیا طبع اڈال س۔ ن
 مستعار لکھنؤ
 مطبوعہ: صدیقی کتب خانہ، لکھنؤ
 دنگلا پریس، لکھنؤ
 ناشر: چودری محمد علی رودولی
 ناشر: چودری محمد علی رودولی
 مرکز اذوقی پریس، لکھنؤ
 مرکز اذوقی پریس، لکھنؤ
 انوار بک ڈپو، لکھنؤ
- طبع اڈال س۔ ن
 طبع اڈال س۔ ن
 طبع اڈال س۔ ن
 طبع اڈال س۔ ن
 طبع اڈال س۔ ن
 طبع اڈال ۱۹۴۰ء

- ۷۔ "پہلے گارہو لا تا کر امت حسین مرحوم ساقی بیچ الہ آباد دہلی گورنمنٹ" ناشر چھپڑی محمد علی رودھوی طبع اول ۱۹۱۷ء
(سوانحی کتابچہ) یہ رسالہ مفت تقسیم ہوا
۸۔ "مہر ابد ہب" (ذہنیات اقلیت)
۹۔ "پہلے کی بات" (غیبہ و اہل بیت سے حقوق کتابچہ) ناشر: چھپڑی محمد علی رودھوی
تقسیم کار: غیاث سار گھنٹو۔
۱۰۔ "گو یاد بستان کھل گیا" (خطوط) اکادمی پنجاب ملتان اور
۱۱۔ "نور کھانہ اور افسانوں کا مجموعہ مشکوٰۃ" (مترجمہ سید علی کاظم) اردو اکادمی سندھ علی گڑھ کراچی طبع اول ۱۹۸۰ء
(اس کتاب میں "مشکوٰۃ محمد علی شاہ فقیر"، "سنا کا خوف" اور "اتالیق بی بی" تین کتابیں یکجا کر دی گئی ہیں۔)
۱۲۔ "سیرۃ القاب اردو" (سوانح) ڈاکٹر نور گھنٹو طبع اول قبل ۱۹۴۳ء

تیسرے قانون:

ان مطبوعات کتب کے علاوہ جملہ "مطبوعات" میں شائع شدہ ایک ایک کے تین ڈرامے "عیاش کسان"، "کسان"، "اور" سعید و سہیلی" ہیں۔ "مطبوعات" اور "ادب و بیچ" میں نکلے ہوئے مضامین اکٹھے کیے جائیں تو ایک کتاب کا مواد مل سکتا ہے۔ آسکر وائلز کے "مقدمہ شہر موت" اور برنارڈ شا کے "ہوا اڑا کس" کے تراجم اس کے علاوہ ہیں۔

اعزاز:

۱۔ نام نہاد (تاریخ برطانیہ کا اعلیٰ ترین سول اعزاز)

نظریہ فن:

"میں دو چار کہانوں میں برطانیہ اس سے طرز کے، وہی پرانا دورہ برقرار رکھا گیا ہے، یعنی جہاں تک ممکن ہو نچری ہو رہی رہے۔ چھپڑی محمد علی شاہ نے انجیل نہیں پڑھا کر سکتے۔

کافرنہ رانی شہناشاہ مطبوعات

اور

صحت بی بی اے چھپڑی

میں نے بھی وہی پرانا طرز اختیار کیا ہے۔ نئی بات نہ کہی، خدا کرے کہ یہی دھرم ہے چلتے ہی گیا ہو۔"

(پہلے احوال دیباچہ "گناہ کا خوف" از محمد علی رودھوی)

تیسری جنس

محمد علی اردو لوی

دی کا اصلی نام احمدی خانم ہے۔ تحصیلدار صاحب بیار سے دی دی کہتے تھے۔ وہی مشہور ہو گیا۔ دی کا رنگ ہنگال میں سو سو میں اور دھار سے سو چھ میں ہزار دو ہزار میں ایک تھا۔ جس طرح فیروزے کا رنگ مختلف روشنیوں میں بدلا کرتا ہے اسی طرح دی کا رنگ تھا۔ قہمی تو کھنٹی ہوئی سافولی رنگت جس کو بڑے کہتے ہیں۔ مگر مختلف رنگ کے دو بچوں یا سار جھوں کے ساتھ مختلف رنگ پیدا ہوتا تھا۔ کسی رنگ کے ساتھ دھک اٹھتا تھا، کسی رنگ کے ساتھ جھماکت پیدا کرتا تھا۔ بعض اوقات جلد کو زہری میں سبزی ایسی چھلکتی تھی کہ دل ہاتھتا تھا۔ دیکھا ہی کر بے۔ چٹائی روشنی میں دی کی رنگت غصہ ہی اٹھاتی تھی۔ کبھی آپ نے دوسرے درجے کے مدقوق کو دیکھا ہے۔ اگر چہ زہری سے قطع نظر کھنکے تو رنگت کی نزاکت ایسے ہی تھی۔ آنکھیں بڑی تھیں۔ مگر جب لگاؤ نچے سے اوپر کرتی تھی تو اولہ اور۔ معلوم تھا مندر کا درد آواز نکل گیا۔ دہی جی کے درشن ہو گئے۔ مسکراہٹ میں نہ شوشی نہ شرارت، نہ لہوٹ کی شرم، نہ لہوٹ کی کوشش۔ بگڑی لوہے کے قلم کو کیسے موٹھم کرواں کہ آپ کے سامنے وہ مسکراہٹ آ جائے۔

اس یہ سمجھ لیجئے کہ خدا نے جیسی مسکراہٹ اس کے بے تجویز کی تھی وہی تھی۔ دی اپنی طرف سے اس میں کوئی اضافہ نہیں کرتی تھی۔ اس کے کسی انداز میں طاقت نہ تھی۔ ہاتھ پاؤں، منہ، چہرے کے اعضاء سب چھوٹے چھوٹے گھروارے کا سب۔ آواز اٹنی، چال و احوال ہر چیز ایسی ہی۔ میں دی سے بہت بے تکلف تھا۔ مگر عشاق میں بھی نہ تھا، اور جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی اور بھی نہیں نہ گیا۔ ایسی خوبصورت عورت بلا مرد کے حفاظت کے نہ زندگی بسر کرے اور عشاق نہ ہوں، بڑے قہم کی بات ہے۔ مگر واقعہ ہے، ایک میں نے کہا دی اگر ہم جاؤ گے ہوتے تو جاؤ کے زور سے تم کو قتل کر دیتا تھا۔ میں نے کہا میں ہر کر کے اپنی بگڑی میں رکھ بیٹے اس فن شریف سے واقف کار مضمرات جانتے ہیں کہ جو کہ میں نے استعمال کیا تھا وہ کم خالی جانے والا تھا۔ مگر اس کے جواب میں وہی بے تکلف مسکراہٹ کی احوال جو تگوار کا منہ توڑے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اسے عطا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تگوار بھی نہیں

اکثر خیر لکڑتا ہے کہ یہ استقامت تحصیل اور عروج کی سفید راہی کے سایہ میں پروازیں پانے کا اثر ہے۔ مگر ملاحظہ کیجئے کہ جہاں جہاں نے یہ معلوم کئے سفید راہیوں میں چھوڑا ہے وہ سفید راہی قبر میں کھجائی کی اس کا اثر کہاں سے آیا۔ بہر حال قصہ سننے چاہئے اور وقت وافر دینے قائم کرتے چاہئے۔ مئی کے برائے اڑھائی سو اسیٹ کوٹ کوٹ کوٹری تھی۔ ایک بات الہی تھی، جو گوگروں میں بھی ہوتی ہے۔ مگر ہم ایسے بوڑھا دانگ اس کو مادی سے منسوب کرتے ہیں، لیکن اپنے ہم طبقہ عورتوں میں اور اسی طبقے کے مردوں میں مادی حکومت خوب کر لی تھی۔ ہر شخص حکومت کو مردان کا تابع فرمان دیتا تھا، اور ان کے اشارے پر چلنے کو چاہے۔ اب شروع سے قصہ سنئے تحصیلدار صاحب کا نام کیا کہئے گا جان کر مرحوم بڑے اچھے آدمی تھے۔ مگر بے عیب خدا کی ذات، ایک خاص کمزوریاں بھی ہائی تھیں۔ پرانی وضع کے لوگ تھے۔ بڑی شان سے تحصیلدار کی۔ انھوں نے کھانے اور چڑھوں اڑائے مگر ادا دہ ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی بے مرکز ہو گئی تھی۔ بی بی بہت دن ہوئے مگر بھلی تھی۔ کوئی قریب کا عزیز بھی نہ تھا۔ صرف ایک نوکر تھا اسی بے چارے کا لاک تھا۔ لگاوا اسی کے ہاتھ آتی تھی اور جب فاضل ہوئی تو فاضل کا بھی وہی حق، اور علمبردار میاں کے کپڑے اور کھانا بھی میاں حسن علی ہی پسند کرتے تھے۔ حسن علی کسی کام کو باز نہ گئے۔ دو تھان رادھا گری ڈورے کے لیے چھ آتے ہیں۔ میاں کے کرتے میں کے مگر میاں کو اس وقت خبر ہوئی کہ جب رادھی قطع کرنے لگا۔

”ارے میاں حسن علی، یہ ذور یہ کیا لائے ہو؟“

حسن علی ”آپ کے کرتوں کے لیے۔ ذور یہ مضعدار ہے۔ سٹلے پر نور کھیلے گا۔“

”کھیلے گا تو مگر کرتے تو میرے پاس تھے۔ ابھی اس ان خرچی لے آئے۔ آج اور بے چلے آتے ہیں آخر یہ چھوڑ لیا ہوتا۔“

”پاچھ کے کیا کرنا۔ آپ کیے تو کیجئے کہ ہنر مگر میں ایک چیز ہو گئی۔ رسات کا زمانہ ہے۔ مہولی پر میں آ کر سے کارہ و جوڑے

داخل ایسے ہوتے ہیں۔“

”خیر بھئی۔“

تحصیلدار رکھانے پر بیٹھے ہیں۔ ”میاں حسن علی آج کل بازار میں بھلی نہیں آتی۔“

”آتی تو ہے مگر گرمیوں کی وجہ سے میں نے نہیں سٹھرائی۔ اس فصل میں بھلی نقصان کرتی ہے، مچا کو مرغ تک جانے گا۔“ تحصیلدار

صاحب پر حسن علی کی شخصیت ایسی ذہب آتی تھی کہ ہر بات وہ ہنر کرتے تھے۔ تحصیلدار سمجھتے تھے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ اسی وجہ سے

لیہ ذور دارک دونوں کا اگر کر کے سٹھراتے تھے اور آپس میں آنکھیں مارتے تھے۔ میاں حسن علی کا ستر سے سناپٹ چہرہ اور تحصیلدار

صاحب کی ہموار راہی پر چھوٹکیاں ہوتی تھیں۔ رادھی سو لچوں کا مٹلا صرف انگریزی دان حضرات کا حق ہے۔ اگر حسن علی ایسے اپنی حال

چھوڑ کر شری کی پل نہیں گئے تو اللہ ہی نے کہا ہے۔ لوگ کوئی نہ کوئی مٹی نکالیں گے۔

بہر حال صلیت کی خبر خدا کو ہے۔ ہم تو جو کچھ بھی دیکھتے تھے، وہ یہ تھا کہ تحصیلدار کا ہر دو دن چاہوں میں حسن علی کے خطہ کوئی نہ تھا۔

حسن علی کو بھی اس سے اچھا آگاہ کرچا لے کے دھوڑے تو دیتا۔

اللہ مہاں نے وہ جنسیں بنائی تھیں۔ عورت اور مرد۔ ہر سب کے ذاکروں نے حقیقات کر کے ایک اور جنس ایجاد کی ہے جو اپنے ہی جنس

کی طرف راغب ہو۔ اس جنس میں عورتیں بھی شامل ہیں اور مرد بھی۔ اب یہ معلوم تحصیلدار اور حسن علی اس تیسری جنس میں سے تھے وہ ایسے ہی

تھے جیسے ہم آپ دیکھ کر کچھ اداں بدل ہوئی۔ اس کو نہ ہم جانتے ہیں نہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ جانیں اور ان کا کام۔ بظاہر ان دونوں

کے افعال سے دوسروں کی ساری زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے ہم کو کونج کی کوئی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ قصیدہ ارم صاحب ہماری ہر کلمہ آدمی تھے۔ اولاد نہ ہونے کا دکھڑا کیا روئے مگر ارم صاحب اس بات سے ظاہر ہوتی تھی کہ جب کھانا کھاتے تو صحن میں ارمی کو بولوا بیٹھتے تھے کہ دسرخوان پر چڑھ جائے۔ اسی وجہ سے کھانا تنہائی میں کھانے لگے تھے۔ تو کڑی لڑکی کو دسرخوان پر کھاتے تھے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر سب کے سامنے کھاتے تو صاحب اولاد نہ ہونے کا رنج اور بچوں کی تنہا تو رکھیں پر کھل جاتی۔ بی ارمی صاحب عرف مدی رحمہم کان چار برس کا رہا ہوگا۔ دسرخوان پر شہرہ بگڑا اور غمزدہ ہونے میں دال کا پھلہ مکھول رہنا بچوں کا شیوہ ہے اور عیس لوگ اسی وجہ سے بچوں کو الگ کھاتے ہیں۔ گو کہتے ہیں کہ جو انوں والا کھاتا بچوں کو نقصان کرتا ہے مگر قصیدہ ارم صاحب کو اس میں لطف آتا تھا۔ اور دسرخوان پر بیٹھتا اور دوسری مدی کی طلب ہوتی۔ رفت رفت مدی خود دلت پچاس گئیں۔ قصوڑے دان میں مدی قصیدہ ارم صاحب کے یہاں رہتے تھیں۔ چاکر میں ایک طرف جمنا ہمایا اور راج میں صحن میں بی بی جیسو یا ان کی پاشلی یا ان کی پاشلی پچھتے تھے۔ جو تھے پیسہ نہ کی خرید ہوتی کہ بھوٹا میلان ہو۔ لڑکی تھی پیدائشی میلان مند۔ ایک بار سے دوسری بار کھانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ چانچ چھری برس کے سن میں اب سلیطہ کیا کہ آدھی بی بی معلوم ہوتی تھیں۔ قصیدہ ارم صاحب کے ہاں خود بخاتی تھی۔ دس گیارہ برس کے سن میں جنس تولد کیا۔ کھانا کھاتا۔ سب کچھ مدی کے ہاتھ ہو گیا تھا۔ دن ہاتھ کچھ دھو نہیں گئی۔ چودھوی برس مدی کا شباب دمک اٹھتا۔ دیکھنے والوں کا دل پاپتا کہ دیکھا ہی کریں۔ مدی بھی جب بال جانے کڑی ہوتی تھی تو آئینہ کے ساتھ خود بھی تھیر رہ جاتی تھیں۔ اب ہاں کو شادی کی فکر ہوئی۔ قصیدہ ارم صاحب کو کہا گیا۔ انہوں نے کہا اہل مدی کہا ہے ہو جائے گی مگر لڑکی صحن میں کے کچھ کو بچپن ہی سے مانگی تھی۔ اور سے بھی اصرار ہوا کہ جو ان لڑکی کا امیر اس سے کھر میں رہنا چاہا نہیں۔ کچھ صاحب شادی ہو گئی۔ قصیدہ ارم صاحب نے خود تو اپنے کھر سے شادی نہیں کی۔ مگر جیڑ وغیرہ خوب سادیا۔ چانچھی پالے کے بعد پھر مدی قصیدہ ارم صاحب کے یہاں کارہنہ۔ مدی کے دلہا بھی قصیدہ ارم صاحب کے یہاں آتے تھے۔ مدی سسرال کم جاتی تھی۔ تنگی بھی تو کڑی سوا دی، بہت دین تو ایک رات انہیں تو اسی دن داناں آئیں۔ سسرال والے جائیل، شوہر بھی الف کے نام لکھا نہیں ہائے۔ کو مدی بھی بعد ازیں قاعدہ دارم کے پاس سے آئے کہ نہیں چانچھی کھر پھر بھی چھوٹے ہوئے کی پائی ہوئی تھی۔ مگر امیر مدی کا رخ نہ دیکھا تھا مدی کا دل سسرال میں کم لگتا تھا۔ کسنی میں بیاہ کا قہر پہ کچھ اچھے میں ڈالے تھا۔ شادی کے بعد اگر محبت پر کھوار بننے کی آپ نہیں رہ جاتی تو سہاگ کی رات چہرہ چکا رہتی ہے۔ مگر ارمی کے چہرہ شادی بات کا پتہ چلنا تھا شادی کا۔ یہاں ہی کے رہا تو کمال دو چار دن میں کیا کھاتا۔ مگر کسی خاص خوشی یا طبیعت کا انداز اس میں بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں پہلی سندھ گیا اور کھلم کھانا خوشی کے آچار کھا رہے ہوئے لگے۔ شوہر صاحب کچھ دے دے سے تھے۔ قصیدہ ارم صاحب کے یہاں اگر وہ بھی اپنی شوہریت کا روبرو رہتے نہیں سکتے تھے۔ خود اپنی چانچھری اور بی بی کی بلندی ان کی نظر میں نکلتی تھی۔ ضرور جس جھڑکرتی تھیں۔ بی بی بی بی کچھ وہیہ جیہ بھی ہاتھ آتا تھا۔ اس لیے چپ تھے۔ ایک دن اب اتفاق ہوا کہ مدی جو سر کٹھن میں ایک بھڑا غائب۔ ستر پر اور اور دیکھا۔ دلانی بھڑائی۔ پانچھی جھک کے دیکھا۔ مگر میں اور حوا عرف حوا کی مگر گئیں۔ ملا۔ نہ معلوم کیا کچھ کر چپ ہو گئی۔ دو چہرے کے قریب ہاں سے ڈاکر کیا۔ ہاں سے شوہر چلا رہا۔ قصیدہ ارم صاحب تک خبر ہوئی انہوں نے سختی کی کہ پا کہ یہ حرکت سوائے مدی کے دوا کھانے کی نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی کہا کہ اس کے بڑا کچھیلنے کی خبر بھی مجھ تک پہنچ چکی ہے۔ کچھ صاحب شوہر بھی روکھ گئے۔ دو چار دن کے بعد صحن کا اصرار ہوا۔ مگر چھڑے دہلی بات چلا کر مدی کے ہاں باپ نے انکار کر دیا۔ ایک روز مدی کے شوہر نے صحن علی کے کھر آ کر بہت عرصہ سنا۔ اور غصہ میں

یہ بھی کہا کہ حرمِ زادی کو چھوٹے بچہ کر گھسیٹا نہ لے جہاں تب ہی کہنا۔ اس وقت تک مہی نے کسی کی جانب مہری نہیں کی تھی۔ لیکن اب وہ بھی فریٹ ہو گئی۔ اور ایسی فریٹ ہوئی کہ مرتے دم تک بھر مت دیکھا۔ حسن علی نے بھی لبیاں کیا، دہاڑا نکلیں ہے، کچھ شہدایں ہی کر بیٹھے اس لیے مہی کا پورے طور سے قہقہہ اور صاحب ہی کے یہاں رہنا اچھا ہے۔ شوہر صاحب ہمیشہ کے لیے معطل کر دیے گئے۔

جب سے مہی کی شادی ہو گئی تھی۔ قہقہہ اور صاحب کچھ چپ سے رہتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد وہ بھی بحال ہو گئے۔ مہی کے شوہر نے اپنی ملازمت سے یہ بھی کہا کہ قہقہہ اور صاحب نے اس سے آٹھائی کروڑ کی ہے مگر اس کو کون یاد کرتا۔ حسن علی والی بات پر تو لوگ مہی خاق بھی کرتے تھے مگر اس بات کو کسی نے جھوٹا بھی نہیں دیکھا۔ البتہ قہقہہ اور صاحب تجربہ کار آدمی تھے۔ انہوں نے موت زندگی کا خیال کر کے مہی کے لیے طے کر اور کچھ بڑی کا انتظام کرنا شروع کیا۔ اس واقعہ کے دوسرے سال کے اندر قہقہہ اور صاحب کا انتقال ہو گیا۔ قہقہہ اور صاحب مرحوم کے باوجود کوئی نہیں تھا، کیا مہی کے معلوم کئے، وارث پیدا ہو گئے۔ اور آج میں مقدمہ بازی شروع ہو گئی۔ بی بی مہی نے بھاری ہاتھ چرم کے چھوڑ دیے، انہیں اپنے گھر پہلی آئیں۔ قہقہہ، چار پائیس، الفاریوں پر نشان کا حق تھا، انہیں نے دھڑی کیا۔ نقد جو کہ قہقہہ اور صاحب ان کو دے گئے وہ ان کو کون لے سکتا تھا۔ ہاتھ ناک، گلے میں بڑا کچھ تھا، وہ ان کا تھا ہی۔ مہی نے حسن علی کی صلاح سے یہ طریق اختیار کیا کہ اپنی طبقہ سے اونچی ہو کر رہنا پسند کیا، بلکہ جس طبقہ کے لوگ ان کے پاس باپ تھا ہی اور رازی میں رہیں۔ البتہ وہ پیسہ اور سلیقہ ہونے کی وجہ سے اپنے طبقہ میں پائیں رہیں جیسے، بی بی کی نگاہ میں سب بھانوں میں گلاب کا پھول ہوتا ہے۔

قہقہہ اور صاحب کے سال ہی بھر بعد طاعون نے سب زوروں کا چاڑھا، اس میں جہاں حسن علی اور ان کی بی بی بھی پہلے تھے، اب صرف بی بی مہی اور ان کا چھوٹا بھائی رہ گئے۔

اس وقت تک مہی نے بڑا کچھ اچھا برا کیا ہوگا اس کی ذمہ داری صرف ان کے اوپر نہ تھی۔ کیونکہ ہر معاملہ میں قہقہہ اور مرحوم اور اس سے کم نہ رہے، بلکہ ان کے باپ کی رائے شامل رہتی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا۔ وہ البتہ ان کے دل و دماغ کا نتیجہ تھا۔ مہی کا بڑا بڑا ہر شخص سے عداوت۔ کوئی شادی نہ تھا، بلکہ ان کے چڑوں کی عورتیں ہر وقت ان کے گھر میں موجود رہتی تھیں۔ ان سے بھی جو ہو سکتا تھا آئے جانے والوں کے ساتھ سلوک کرتی تھیں۔ گھر میں کپڑا پہنے کی مشین تھی۔ ان بھانوں کے کپڑے صفت کیا کرتی تھی۔ کسی کو اگر وہ بچے کی ضرورت ہوتی تو وہ بھی قرض کے نام سے دے دیے۔ جس کسی کا نہیں تھا نہ دے گئے وہ مہی کے یہاں چلا آئے۔ دونی اپنی پائے وال بی بی مہی سے لے لے۔ بان چاہی بی بی مہی کے ہاتھ ان سے نکلتے۔ اسی زمانہ میں ایک عورت نہ معلوم کہاں کی باہر سے آئی۔ اس کو بھی مہی نے دیکھا، عورت چھوڑ کر تھی۔ اپنا پار بھی من پر نہیں ڈالتی تھی۔ بلکہ پیسہ دے پیسہ سلوک کر دیتی تھی۔ کچھ گونیوں، کچھ کپڑوں، سما بون و لیرا بچتی تھیں۔ صبح ہوئی اور برج واز کو کھل گئیں۔ وہ پیر کو آئیں۔ کھانا کھایا، آرام کیا، اس کے بعد بھر نکل گئیں۔ شام کو لوٹیں۔ یہ سنا آتی تھیں تو یہ کہہ کر کہ وہ چار دن میں سو کر کے دوسری جگہ پہلی جا گئیں گی۔ مگر مہی سے بکواسی پر گھٹی کی گھر کی طرح رہتے تھیں۔ صحت و کچا گئی کی وہ چٹکیں بڑھیں کہ کئی ہفتے مہی تھیں۔ صورت حسن کی تو معمولی تھی مگر قد ٹھیک تھا۔ جب برج واز کو گراستہ پہنچی تو معلوم ہوتا تھا کہ مرد بھیس بدلے ہوئے چلا آتا ہے حال حال قد کے علاوہ بھی کچھ اور باتیں مردوں کی ایسی تھیں مثلاً ہاتھ پاؤں کے دیکھتے ہیں کہ تم تھ۔ کمر کو لٹھے، پاؤں کی چوڑی چوڑی اینٹیں اسی عورتوں کی ایسی تھیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ ہو گیا کہ ان کو یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ راستہ کو دوسری عورتیں کمر پہنے کھینچ۔ جب منہ کھل چلا تو پانے گھر میں کیسے بھر تھیں۔ پہلے تو عورتوں میں سرگوشیاں ہوئیں، پھر گلے میں ہر شخص ای کا ذکر کرنے لگا مگر مہی اور

اس عورت نے بھائے تو دیر کرنے کے آواز دیا ہے یہ وہائی کا انداز اختیار کر لیا۔ ان عورتوں نے کیا ہم لوگ کسی کی بیوی بنی ہیں یا بھائی سے نکاح کرنا ہے جو بر فحش کے آگے قسمیں کھاتے قرآن اٹھاتے بھریں۔ دنیا پانی راد ہم اپنی راد۔ علی نے کہا اگر ہمارے کوئی دلی وارث ہوتا تو کسی کی مجال نہی تھی کہ ایسی بات کہتا۔ زمانہ گزر رہا تھا اور لوگوں کا فک یہ بھی نہیں میں نہ لگا تھا۔ جامدہ ہے کہ بیچ برادری سے اگر وہب چاہے تو وہ اور دہاتے ہیں۔ اگر مقابلہ پر تیار ہو جائے تو لوگ اپنی تنگی کی وجہ سے اکثر معاف بھی کر دیتے ہیں، یہی حال اس دونوں کا ہوا کہ نہ کسی نے یہ چہ بگوئی نہ انہوں نے انکار کی ذمہ داری اٹھائی۔

لکھنے والے کو غلام مسافقے کے ذکر میں کوئی حوا نہیں آتا۔ مگر اسی کے ساتھ ان چیزوں کا ذکر کرنے سے ڈرتا بھی نہیں۔ اگر یہ چیزیں دنیا میں ہوتی ہیں تو چھپ رہے۔ ان میں اصلاح نہ ہوگی۔ نہ بے طے ہو سکے گا کہ کہاں تک یہ چیزیں فطری ہیں، اور کہاں تک اسبابِ زمانہ سے تخلیق آتی ہیں۔ کسی جوا ہے کے پاؤں میں تیرا تھا۔ طون پہتا ہوا تھا مگر دماغ میں، مانگ، ہاتھ اور کانہ کرے بھوت ہو۔

ہمارے عجیبے کے لوگ دراصل بیوقوف ہیں اور فرائض نہیں پڑھتے ہیں۔ اس وجہ سے مجبوراً ہمیں ان مسائل پر بحث کرنا پڑی۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ عورت میں کچھ بڑا مرد کا ہوتا ہے۔ اور ہر مرد میں کچھ بڑا عورت کا۔ جو بڑا غالب ہوتا ہے اسی طرح کے خیالات اور افعال ہوتے ہیں۔ مردانہ قسم کی عورتیں اور زنانہ قسم کے مرد ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن بے بعض ان میں ایسے ہوں جن کا فطریا اپنے ہی جنس سے ایسے تعلقات معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ اسبابِ زمانہ سے بھی لوگ اس راد لگ جاتے ہیں۔ بھائے اصلاح کی کوشش کے برعکس میں یہی رادے قائم کرنا کہ یہ قدرتی تقاضا ہے اور اس لیے اصلاح کی ضرورت نہیں۔ وہی کچھ میں نہیں آتا۔ ایسا ایسے فعل کی جس میں حاجت کا کوئی نقصان نہ ہوتا ہو تو قانونی سر ہو نہی جائے یا نہیں یہ دوسرا مسئلہ ہے۔

اچھا اب قصہ سنئے۔ مری اور اس عورت میں دو سال وہائی رہی۔ اس کے بعد لائی ہوگی۔ کس بات پر پکارا ہو کیا یہ کسی کو معلوم نہیں وہ عورت جس راد لائی تھی۔ اسی راد چلی گئی۔ لی مری اجڑی بھاری رابطہ پا کھینے لگیں۔ جو کچھ دیکھتا ہوں۔ تو ہونے والوں کے بعد ایک اور ہم جنس ملی گئیں۔ اس کے بعد اور بھی کئی عورتیں

نہ ہے وہائی کا اور تھا نہ علم چھائی کا
حوا میں کیا کہیں آواز آجائی کا

وہ پہلی ہی بات بھرت نصیب ہوئی۔ اب روپے پھر بھی کم رہ گیا تھا اسی لیے آمدنی جو حوائج کی بھی ضرورتیں کبیر ہوئی۔ لی مری نے تحصیلدار کے آگے ہاتھ بڑھا دیا۔ بھرت سے شادی کی ہوس کی۔ بلکہ خود کام کرنے پر تیار ہو گئیں۔ پر اچھے کہاں بھانا شروع کئے، ہانڈوں کی فصل میں اظہ سے اور گا بڑا ملو جانے لگیں۔ کچھ عورتوں کی ضرورت بات کا ہوا خانہ خانہ بھی منگوا لیا۔ لیکن کور شیا کا بھی ڈھیر ڈالا پیچھے والوں کی کمی نہ تھی۔ اور گرد کی لڑکیاں اور عورتیں سوداچ لاتی تھیں۔ اور حق الجھ مت سے نہ پاؤ حصہ پاتی تھیں۔ لی مری کو سوداگری کا سب سے بڑا کر نہیں پاد تھا۔ لیکن جرات ہی بہت سے کام ساتھ ہی کرتا ہے وہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خرچ آمدنی سے نہ پارہ ہی رہا۔ یہاں تک کہ مکان بھی گروہی رہ گیا تھا۔

روپیہ جانے کے بعد تو قبر میں بھی فرق آجاتا ہے مگر اس کی شانگلی نور رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ ہر بھی لوگوں کی نظر میں بچی نہ ہوتی۔ کپڑے اب بھی سلیقے کے پہننے تھے۔ گاڑ صاحبہ دیکھی نہیں تھا۔ آج بھی سڑاک پر مادی مادی نہیں بھرتی تھی۔ نکلا والے نوکر بھی نہیں تھے۔ آج بھی کام کاج کرنے والے آسانی سے مل جاتے تھے مگر اقبال مندی میں گنیں بہت دنوں سے لگ چکا تھا۔ اس لئے چہرے کی آپ رخصت ہو چکی تھی۔ زاد چل پڑنے سے حراج میں بھی فرق آ گیا تھا۔ ایک دن ان کے گھر میں کی عورتیں جمع تھیں کسی نے کہا "ہن مرد کی عورت سے کتنی عمار میں ہے" بلی مادی بولی تھیں "جنگ کتنی ہو بھگن" ایسی بات ان کے منہ سے کہی نہیں سنی گئی تھی۔ یہ سن کر بعض نے دوسروں کو اشارہ کیا۔ جنس نے اطلاق کیا۔ ووا ایک ایسی بھی تھیں جو مادی کا مزہ خوب سے دیکھنے لگیں۔ یہ وہ تھیں جنہوں نے مادی کے منہ سے مر کا نام ڈالنا کہ بھوں چڑھانے عمر میں جنس نہ تھا۔

زاد گزرتا گیا مگر بلی مادی کے دل نہ بھرے تھے نہ بھرے۔ کچھ دنوں بعد ایک شاہ صاحب آئے۔ بہت مزاج خلعتی تھے۔ عقیدت مندوں کا جھوم ہر وقت لگا رہتا تھا۔ بلی مادی بھی دو تین بار کسب پر اسے کی خورجناز فحش کر چکی تھیں۔ اسلئے میں خیر اڑی کر شاہ صاحب جج کو جائیں گے۔ بھٹہ مرٹھا پھاؤ کس پر کھدایا کیے۔ اب جج بھی تو کس پر کریں گے۔ جس دن شاہ صاحب چلے لوگوں نے دیکھا مادی بھی دامن سے نکلی چلی چہری میں نور لوگوں سے کہا تا معاف کر رہی ہیں۔ جو کہہ پٹی بھی پڑ گئی تھی وہ جج کر خنڈ کر لیا۔ باقی کے لیے شاہ صاحب کی ذات اور توکل کا تو شکاری ظہور۔ جج سے ابھی پڑا دن نہیں آئیں بلکہ شاہ صاحب ہی کے قدموں سے لگی رہیں۔ شاہ صاحب اپنے وقت کے عظیم ہامور تھے۔ جی ہاں ہے آگنی پڑا ل اچھے۔ چاہے چادر کی طرف کاٹے پڑا لکھتے۔ مادی میں جوانی کی کی تھیں اب بھی دیر چھی مگر شاہ صاحب کو دیکھ کر خواب میں بھی آشیانی کا خیال نہیں ہوتا تھا لیکن اگر غور کیجئے تو جی بھی ایک طرح کا شوہر ہی ہوتا ہے۔ جس پر میرے اسی طرح تکیر کرتا ہے جیسے عورت مرد پر۔

خواجه حسن نظامی

نام: سید علی حسن (والدین نے قاسم بن نام رکھا تھا جبکہ اسوں "علی حسن" پکارتے تھے۔ آخر میں یہی نام قرار پایا۔)

نسب: محمد علی حسن، لکھنؤی خواجه حسن نظامی

پیدائش: محرم بروز جمعرات ۱۲۹۶ھ بمطابق ۲۵ دسمبر ۱۸۷۹ء مسجد صادق کے وقت، بمقام سنی درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء، دہلی۔

وفات: ۳ جولائی ۱۹۵۵ء بمقام سنی نظام الدین، دہلی

تعلیم: پہلے علامہ و قراآن حکیم چاچا بھگتاری کی معمولی کتابیں، اس کے بعد عربی صرف و نحو پڑھی۔ استاد اذلی مولانا محمد اسماعیل صاحب کا مدرسہ طبع مظهر گڑھ تھے۔ ان کے دیگر اساتذہ میں مولوی وصیت علی، مولوی محمد اعلیٰ محدث، مولوی حکیم الدین بخاری اور مولوی رضی الرحمن (سابقہ کاغذ محل) جیسے بزرگوں کے نام نمایاں ہیں۔

مختصر حالات زندگی:

آپ کا تعلق مولانا سید بدر الدین اسحاق کی نسل سے ہے۔ والد کا نام سید عاشق علی تھا، جو بھوسا سازی کا کام کرتے تھے یا درگاہ نظام الدین اولیاء کے چارھاؤں پر گزارا تھا۔ گیارہ برس کی عمر میں والد انھیں قوسہ شریف (ذریعہ غازی خان) لے گئے اور حضرت اللہ بخش کے ہاتھ دست کر دیا۔ ۱۴ برس کی عمر میں والدین انتقال کر گئے۔ ۱۶ برس کی عمر میں بڑے بھائی سید علی حسن شاہ کے ساتھ چاچا بن خریف (بہار پور) گئے اور حضرت خواجہ نظام فرید کے ہاتھ دست کی۔ چالیس برس کی عمر میں بڑھاپے میں شہر کوڑی کے مریض ہوئے۔ ۵۰ سالگی کے مطابق شریعت میں ان کے استاد مولوی محمد ایوب تھے اور طریقت میں خواجہ نظام الدین۔ ۱۸۹۶ء میں لکھنؤ شروعا کیا۔ ۱۹۰۳ء میں مطلوبہ کتب اور دینی کی تاریخی تصانیف کے فوٹو، ٹیکسٹریٹنگ کر بیچنے لگے۔ شادی مرحوم پچاسید معشوق علی کی بیٹی حبیب بانو سے ہوئی جو زیادہ مدت حیات نہ رہیں۔ جولائی ۱۹۰۹ء سے رسالہ "نظام المعارف" مرتب کرنا شروع کیا۔ جبکہ "صفت نظام المعارف" سے ارکان کا ایک کام یہ بھی تھا کہ درگاہوں پر نہ تھیں اور طریقوں کا باقی کاغذ شرم کر آئیں۔ ۱۹۱۳ء میں پھر نئے منشور ہو گئے اور اظہار "قومیت" کی ادارت سنبھالی۔ ستمبر ۱۹۱۸ء

میں ارسال "مترشح" چھپی گیا۔ مختلف اوقات میں روزنامہ، ملت، روزِ دہ، ماہانہ اور دوسری اخبارات و جرائد مرخپ کیے۔ "جنگِ مسلم" اور "اکتیز" کے نام سے انگریزی اخبار جاری کیے جبکہ بھول ان کے انجمن انگریزی نے آئی تھی۔ ۱۹۳۷ء کے فسادات میں میرزا بادکن میں جا بیٹے تھے۔ لیکن حالات ابھر ہوئے تو دہلی واپس آ گئے۔ مولانا آزاد اور مولانا فضل خان کے ساتھ جنس بنی لیکن لحد میں اور سنگسٹن کی تحریک پہلی تو تھیں نے اس کی مخالفت کی۔ خواجہ صاحب کا سواہی شروحات سے مبالغہ ہو کر سواہی بی بیہ ان چھوڑ گئے۔ خواجہ صاحب نے طلبہ سے میں بھی بڑا نام کمانا، مسریم کدو پنے نفسیاتی علاج کیا کرتے تھے۔ جہزوں کے درد کے لیے ان کا تیار کردہ فاسورس کا تیل بہت مشہور ہوا۔ وہ اکٹرا پنے مریدوں کو تے خطابات سے فائدے تھے۔ علامہ اقبال کو "شاعرِ شرقی" کا خطاب بھی آپ نے ہی دیا۔ انجیابک سودی ذوق لپیٹا، بھری ادبیں فلم "افغان شہزادہ" المعروف "ترکی خون" کے مکالمے ۱۹۳۳ء میں لکھے اس فلم کی کہانی علامہ اقبال نے تحریر کی تھی۔ لیکن ان دو ماسوں سے اس فلم کے رلیز ہونے کی تصدیق کسی فلم ڈائریکٹری سے نہیں ہوئی۔ بہت ممکن ہے بات کا لفظی تھاریوں سے آگے نہ جی ہو۔

اولین مطبوعہ تحریر:

"شکس کے فرب طاق" مولانا جلال الدین سجولی کے عربی رسالہ کا ترجمہ مطبوعہ ملک بنگ ۱۹۰۰ء

اولین مطبوعہ اقساط:

"عرب شیعہ کا گھر" مطبوعہ روزنامہ "توسیع دار" لاہور، ۱۹۱۲ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب)

- ۱۔ "نقدِ ملی کے فلسفے" (جلد اول یکامات کے آنسو) مطبوعہ اخباراتِ حید، میرٹھ طبعِ اول ۱۹۱۳ء
- ۲۔ "نقدِ ملی کے فلسفے" (جلد دوم انگریزوں کی چچا) مطبوعہ کارکنِ حلقہ مشائخ، دہلی طبعِ اول ۱۹۱۷ء
- ۳۔ "نقدِ ملی کے فلسفے" (جلد سوم کامرہ دہلی) مطبوعہ کارکنِ حلقہ مشائخ، دہلی طبعِ اول ۱۹۲۰ء
- ۴۔ "نقدِ ملی کے فلسفے" (جلد چہارم زہارِ شاہ کا مقدمہ) مطبوعہ کارکنِ حلقہ مشائخ، دہلی طبعِ اول ۱۹۲۰ء
- ۵۔ "نقدِ ملی کے فلسفے" (جلد پنجم گرفتار شدہ غلو) مطبوعہ کارکنِ حلقہ مشائخ، دہلی طبعِ اول ۱۹۲۰ء
- ۶۔ "نقدِ ملی کے فلسفے" (جلد ششم نقدِ ملی کے اخبار) مطبوعہ کارکنِ حلقہ مشائخ، دہلی طبعِ اول
- ۷۔ "نقدِ ملی کے فلسفے" (ساتواں حصہ غالب کا روزنامہ "نقد") مطبوعہ کارکنِ حلقہ مشائخ، دہلی طبعِ اول ۱۹۲۳ء
- ۸۔ "نقدِ ملی کے فلسفے" (آٹھواں حصہ دہلی کی چچا) مطبوعہ کارکنِ حلقہ مشائخ، دہلی طبعِ اول ۱۹۲۳ء

نوٹ: ان آٹھ کتب کے کئی ایڈیشن نکلے۔ مثال کے طور پر آخری کتاب کا تیسرا ایڈیشن اپریل ۱۹۲۵ء میں نکلا

۹۔ "سفرِ کبلی کا روزنامہ" مطبوعہ ۱۹۱۴ء

۱۰۔	”مسلم کا ایمان“ (مؤرخ قاضی بکری) (عربی سے ترجمہ)	مطبوعہ ۱۹۱۲ء
۱۱۔	”اسرار“ (نور ہما شاد) آخری دینی فرقہ بابیہ کا ترجمہ	طبع اول ۱۹۱۳ء
۱۲۔	”مجموعہ مضامین حسن نظامی“ (دیباچہ سر سیرت رنگ صفحات ۱۵۲)	مطبوعہ طبع اول ۱۹۱۳ء
۱۳۔	”سی پارہ اول“ (مضامین) (مترجم لطیف)	مطبوعہ طبع اول ۱۹۱۳ء
۱۴۔	”سفر نامہ مصر و شام و حجاز“ صفحات ۲۱۲	مطبوعہ اخبار ”توحید“ میرٹھ طبع اول ۱۹۱۳ء
۱۵۔	”اقبال حزب الحمر“ صفحات ۱۰۰	مطبوعہ اخبار ”توحید“ میرٹھ طبع اول ۱۹۱۳ء
۱۶۔	”مخطوطی کے قریب حقائق“ (ترجمہ جمال الدین سیوٹی)	طبع اول ۱۹۱۰ء
۱۷۔	”ظہور مہدی یعنی شیخ سنوی“ (جلد اول) ۳۲۲ صفحات	طبع اول ۱۹۱۱ء
۱۸۔	”یقینان سنوی“ (جلد سوم)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی طبع اول س۔س۔ان
۱۹۔	”یقین پر ایک“ (یقینان سنوی کا چوتھا حصہ)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی طبع اول ۱۹۱۳ء
۲۰۔	”باگھوہ“ (یقینان سنوی کا پانچواں حصہ)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی طبع اول س۔س۔ان
۲۱۔	”برصغیر خلافت“ (یقینان سنوی کا چھٹا حصہ)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی طبع اول س۔س۔ان
۲۲۔	”اور دور جائیں“ (صفحہ ۷۷)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی طبع اول ۱۹۱۶ء
۲۳۔	”کم نو سوئے“ (صفحہ ۱۶۹) (کلا اور پتلا پر)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی طبع اول ۱۹۱۷ء
۲۴۔	”قبروں کے بھی نوشتے“ (الوارق قور)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی طبع اول ۱۹۱۷ء
۲۵۔	”محرم نامہ“ (واقعات کر بلا)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی طبع اول ۱۹۱۶ء
۲۶۔	”سید عالم“ (سید عالم و تاریخ اسلام)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی طبع اول ۱۹۱۷ء
۲۷۔	”بی بی کی تعلیم“ (از نامہ تعلیم سے حقیقت)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی طبع اول ۱۹۱۷ء
۲۸۔	”کتاب الاسرار عرف امام مہدی کے انصار“	ترجمہ جمال الدین سیوٹی طبع اول ۱۹۱۸ء
۲۹۔	”نیر عالمہ“ (محرم نامے کا دوسرا حصہ)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی طبع اول ۱۹۱۷ء
۳۰۔	”اتالیق خطوط نوکی“ (۲۰ جلدیں)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی طبع اول ۱۹۱۶ء
۳۱۔	”مجموعہ خطوط حسن نظامی“ (صفحہ ۱۳۷)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی طبع اول ۱۹۱۷ء
۳۲۔	”مجلس نامہ گیارہویں شریعت“ (خوش پاک کے حالات)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی طبع اول ۱۹۱۸ء
۳۳۔	”کرشن جی“ (کرشن مہاراج کے حالات) (ماہنامہ)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی طبع اول ۱۹۱۷ء
۳۴۔	”رہنمائے سیر دہلی“ (دہلی کا تذکرہ) (ماہنامہ)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی طبع اول ۱۹۱۷ء
۳۵۔	”الحکامہ توحید“ (مضامین)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی طبع اول ۱۹۱۳ء
۳۶۔	”چنگیاں دار گرد گدایاں“ (مواہجہ مضامین)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی طبع اول ۱۹۱۸ء

۳۷۔	"جنگ عقی" (کہانیاں) (مجلدات ۸۰۰)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۷ء
۳۸۔	"رہسول کی مہم" (بچوں کے لیے مضامین)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۳ء
۳۹۔	"فلسفہ شہادت" (بچوں کے لیے مضامین)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۱ء
۴۰۔	"توبہ خانہ" (بچوں کے لیے مضامین)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۱ء
۴۱۔	"سموڈ جنگ صفین" (خطوط)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۷ء
۴۲۔	"پہلوں کی چھات" (کناچہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۳ء
۴۳۔	"پن دس کے سروہابی" (کناچہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۳ء
۴۴۔	"دیاستانی"	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۱ء
۴۵۔	"آخری سانس ڈاہا اور شاہ کارولنا مجھ"	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۵ء
۴۶۔	"نور کا نتیجہ"	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۶ء
۴۷۔	"کانا باقی" (خطوط)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۷ء
۴۸۔	"اپنی آنکھ اپنی دین" (مضامین)	مطبوعہ: دوولش پریس، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۳ء
۴۹۔	"مکتبہ دہلی" (شاعری)	مطبوعہ: انھامی پریس، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۱ء
۵۰۔	"مسلمان مہارانا" (سوانح)	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۷ء
۵۱۔	"اردو سکالے کے مضامین" (تعلیم)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۳ء
۵۲۔	"جاری سلاطین عباسیہ" (تصاویر)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۶ء
۵۳۔	"جاری سلاطین عباسیہ" (مصورم)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۷ء
۵۴۔	"سلاطین عباسی" (جاری حیدرآباد دکن)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۵ء
۵۵۔	"غزنی جہاد" (جاری دکن)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۱ء
۵۶۔	"دوسرا دین"	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۳ء
۵۷۔	"مغربیہ ہندوستان"	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۳ء
۵۸۔	"آپ جی"	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۱ء
۵۹۔	"خانہ باغیال" (عقب)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۱ء
۶۰۔	"میری کی تربیت" (اخلاقیات)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۷ء
۶۱۔	"بچوں پر رحم" (کفار کے مسلمانوں پر رحم کی داستان)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۱ء
۶۲۔	"روزنامہ ہندوستان" (شعری روزنامہ)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۱ء
۶۳۔	"دلی کی میدان" (نقصیہ مضامین نظم و نثر)	مطبوعہ: کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع: اڈول ۱۹۸۱ء

۶۳۔	"ہاں حق" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول س۔ن
۶۵۔	"برونکشی مولود" (سینکڑوں بچوں کے لیے)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول س۔ن
۶۶۔	"والی داس" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول س۔ن
۶۷۔	"نورانی کتب خانہ" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۵۷ء
۶۸۔	"طوبی کی تعلیم" (مستحقین کے لیے)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۶۰ء
۶۹۔	"پارویشیوں کا تذکرہ" (پارویشیوں کے لیے)	خوبہ پریس، بنال	طبع اول ۱۹۶۲ء
۷۰۔	"تین شہید" (طرابلس، ایران اور عراق کے شہداء)	خوبہ پریس، بنال	طبع اول س۔ن
۷۱۔	"بھائی کی دکان" (پان ساری سے متعلق)	خوبہ پریس، بنال	طبع اول س۔ن
۷۲۔	"تعلیم و تہذیب"	خوبہ پریس، بنال	طبع اول ۱۹۶۹ء سے قبل
۷۳۔	"تینوں احساس" (تھوڑے)	خوبہ پریس، بنال	طبع اول ۱۹۶۹ء سے قبل
۷۴۔	"تینوں مرد" (یعنی احوال غریب، مسکین، بھوکے)	خوبہ پریس، بنال	طبع اول ۱۹۶۹ء سے قبل
۷۵۔	"بچوں اور دست پنہاں" (بچوں کے لیے)	خوبہ پریس، بنال	طبع اول ۱۹۶۹ء سے قبل
۷۶۔	"بندوبست کی ضروریات"	خوبہ پریس، بنال	طبع اول ۱۹۶۹ء سے قبل
۷۷۔	"کتابت کتب" (دو جلدیں۔ اکبر الہ آبادی کے خطوط)	خوبہ پریس، بنال	طبع اول ۱۹۶۹ء سے قبل
۷۸۔	"مرگ نامہ" (حق آزمائش)	خوبہ پریس، بنال	طبع اول ۱۹۶۳ء
۷۹۔	"مرگ نامہ کی تہذیب و تمدن"	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۶۹ء سے قبل
۸۰۔	"مرگ نامہ" (ایک نکتہ پر مبنی)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۶۹ء سے قبل
۸۱۔	"مرگ نامہ" (کتابت کے خاص ارشاد)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۶۹ء سے قبل
۸۲۔	"مرگ نامہ" (مختصر سے کام)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۶۹ء سے قبل
۸۳۔	"مرگ نامہ" (مالی بنک کی ضروری)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۶۹ء سے قبل
۸۴۔	"مرگ نامہ" (مختصر سے کام)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۶۹ء سے قبل
۸۵۔	"مرگ نامہ" (مختصر سے کام)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۶۹ء سے قبل
۸۶۔	"مرگ نامہ" (مختصر سے کام)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۶۹ء سے قبل
۸۷۔	"مرگ نامہ" (مختصر سے کام)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۶۹ء سے قبل
۸۸۔	"مرگ نامہ" (مختصر سے کام)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۶۹ء سے قبل
۸۹۔	"مرگ نامہ" (مختصر سے کام)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۶۹ء سے قبل
۹۰۔	"مرگ نامہ" (مختصر سے کام)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۶۹ء سے قبل

۹۱	"طراحی بر خردار بنیاد" (نمای بنیاد، این دیوار و کمرے حلقہ)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۳۳۹ء سے قبل
۹۲	"قرآن پاک کی آسان الفیہ" (پادہ منبر کا نمبر ۳۰)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۳۳۹ء سے قبل
۹۳	"طریقہ کی پہلی کتاب" (قصوف)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۳۳۹ء سے قبل
۹۴	"طریقہ کی دوسری کتاب" (قصوف)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۳۳۹ء سے قبل
۹۵	"شیخان کا خطبہ" (اسلامی تعلیم کی برائیاں)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۳۳۹ء سے قبل
۹۶	"شامی جہاز" (تاریخ)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۳۳۹ء سے قبل
۹۷	"سکھو تم" (اگر وہ گرفتار صاحب کے حوالے سے)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۳۳۹ء سے قبل
۹۸	"اردو کی پہلی کتاب" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۳۳۹ء سے قبل
۹۹	"اولاد کی شادی" (سانچیات)	مطبوعہ دہلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع اول ۱۳۳۹ء سے قبل
۱۰۰	"ایک روز ڈائری"	مطبوعہ دفتر "مبارک" دہلی	طبع اول ۱۳۳۹ء سے قبل
۱۰۱	"بزم نامہ" (تاریخ)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۱۵ء
۱۰۲	"بزم خلافت" (تاریخ)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۱۵ء
۱۰۳	"حاصل خور" (سانچیات)	فولمر پریس، لاہور	طبع اول ۱۳۴۱ء
۱۰۴	"خوشی کی زندگی" (سانچیات)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۳۷ء
۱۰۵	"خراب طوری اور جسے نری" (سانچیات)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۴۵ء
۱۰۶	"کاغذ جی نامہ"	مطبوعہ نظامیہ بک ڈپو، لاہور	طبع اول ۱۹۴۲ء
۱۰۷	"وسب قیہ"	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول سن۔ ن
۱۰۸	"اولاد کے کان میں کہنے کی باتیں"	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۴۵ء
۱۰۹	"اورنگ زعب کی اصل تاریخ" (تاریخ)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۴۵ء
۱۱۰	"انگریزوں کی دعوت اسلام"	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۴۵ء
۱۱۱	"اقبال حزب الملو" (دعا کے فوائد)	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع دوم ۱۹۴۷ء
۱۱۲	"انام صہیں کا نام دارن کیریکٹر"	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۳۱ء
۱۱۳	"قربا کو نامہ یعنی ترک سکریت"	مطبوعہ کارکن حلقہ مشائخ، دہلی	طبع اول ۱۹۴۳ء
۱۱۴	"توفیق حساب"	محبوب المطابع برقی پریس، دہلی	طبع دوم ۱۹۴۶ء
۱۱۵	"تذکرہ"	محبوبہ نجمن اردو بک ڈپو، دہلی	طبع اول ۱۹۴۷ء
۱۱۶	"تہنیتی شہداء روضہ محمود"	محبوبہ احمد برقی پریس، دہلی	طبع اول ۱۹۴۶ء
۱۱۷	"ایک سو پچیس صیغہ کارڈ"	محبوب المطابع برقی پریس، دہلی	طبع چہارم ۱۹۴۸ء

۱۱۸	"اسلام کے ضروری عقائد"	مطبوعہ: احمد دہلوی برقی پریس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۵ء
۱۱۹	"بابا فرید گنج شکر کا روزنامہ"	مطبوعہ: دکن فوٹو پریس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۵ء
۱۲۰	"تاریخ مسیح" (۱۱ حصے) احمدی انگریزی کتاب کار (ج ۱)	مطبوعہ: محمدیہ پریس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۵ء
۱۲۱	"سطر نامہ پاکستان"	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع: اول ۱۹۶۳ء
۱۲۲	"تاریخ رسول" (۴ جلدیں)	مطبوعہ: شہداء یادگار	طبع: اول ۱۹۴۸ء
۱۲۳	"امداد سخی" (تعلیم)	مطبوعہ: اہل بیت پریس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۳ء
۱۲۴	"قرآن مجید کے معجزات"	مطبوعہ: احمد دہلوی برقی پریس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۶ء
۱۲۵	"گمراہ دعویٰ کلمات"	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۷ء
۱۲۶	"تکبیر اور نبوت نامہ"	مطبوعہ: احمد دہلوی برقی پریس، دہلی	طبع: اول ۱۹۳۶ء
۱۲۷	"حدیث کی عقلی گواہی"	مطبوعہ	طبع: اول ۱۹۴۰ء
۱۲۸	"محمد اور محمدیہ کے امداد طلبے"	مطبوعہ: احمد دہلوی برقی پریس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۶ء
۱۲۹	"ترکیب نما"	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۵ء
۱۳۰	"روزہ کے سب احکام و مسائل"	محبوب المطابع برقی پریس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۶ء
۱۳۱	"تعلیم امیر و تصوف"	کارکنان مکتبہ مسیحی، دہلی	بارہواں ایڈیشن ۱۹۵۱ء
۱۳۲	"شیخ علی کی ازادری" (احراج)	مطبوعہ: اہل بیت پریس، دہلی	طبع: اول س۔ان
۱۳۳	"تذکرہ اسلام" (مضامین ۱۱۲)	محبوب المطابع برقی پریس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۷ء
۱۳۴	"نامان دہلی" (اہل حدیث کے عقائد سے انکشاف کا چیل)	مطبوعہ: شاہجہان پریس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۵ء
۱۳۵	"دلی سالن"	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۳ء
۱۳۶	"دو چہرہ عالم کلمات میں"	مطبوعہ: خواجہ پریس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۳ء
۱۳۷	"مرگ نامہ"	مطبوعہ: خواجہ پریس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۳ء
۱۳۸	"نکاحی ضروری"	مطبوعہ: اہل بیت پریس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۵ء
۱۳۹	"تذکرہ گاندھی"	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۳ء
۱۴۰	"دلی کی زبان"	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۳ء
۱۴۱	"امداد کھانے کے مضامین"	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۳ء
۱۴۲	"بہارِ عجب کے مضامین"	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۷ء
۱۴۳	"مہترت امیر خسرو کا تذکرہ"	مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۵ء
۱۴۴	"دلی کی آفریں شمع"	مطبوعہ: راسخ برقی پریس، دہلی	طبع: اول ۱۹۴۸ء

طبع اول: ۱۹۳۶ء	"دلی کی سڑا"	۱۳۵
طبع اول: ۱۹۵۰ء	"سرطاس و تکلف کی لائبریری"	۱۳۶
طبع اول: ۱۹۳۳ء	"عام فہم کلمہ"	۱۳۷
طبع اول: ۱۹۴۷ء	"انسداد نگہاری اور اصلاح خیرات"	۱۳۸
طبع اول: ۱۹۴۷ء	"بہارِ قرآن"	۱۳۹
طبع اول: ۱۹۳۴ء	"قرآن و حدیث کے قربان"	۱۴۰
طبع اول: ۱۹۳۶ء	"نئی تہذیب کی بوجھ کا کاک"	۱۴۱
طبع اول: ۱۹۴۵ء	"خاقان سدرہ"	۱۴۲
طبع اول: ۱۹۳۶ء	"اسلامی توحید"	۱۴۳
طبع اول: ۱۹۳۵ء	"قرآن مجید کے فوہداری قوانین"	۱۴۴
طبع اول: ۱۹۳۳ء	"حق پرستی پر ختم"	۱۴۵
طبع اول: ۱۹۳۳ء	"بھارتی" (کتابچہ ۶ صفحات)	۱۴۶
طبع اول: ۱۹۳۳ء	"ہم" (کتابچہ ۶ صفحات)	۱۴۷
طبع اول: ۱۹۳۳ء	"چشمہ کا اعلان جنگ" (کتابچہ ۳ صفحات)	۱۴۸
طبع اول: ۱۹۳۳ء	"سوائی جہاز" (کتابچہ ۱۱ صفحات)	۱۴۹
طبع اول: ۱۹۳۳ء	"جو زمین خواروں کی لاش" (کتابچہ ۱۱ صفحات)	۱۵۰
طبع اول: ۱۹۳۳ء	"غزواتِ قبلہ و بعدہ (۱۸۷۱ء تا ۱۸۷۸ء) کے نام خط و صفحات ۱۸ (کتابچہ)	۱۵۱
طبع اول: ۱۹۳۳ء	"سرمشورہ" (کتابچہ ۳ صفحات)	۱۵۲
طبع اول: ۱۹۳۳ء	"دلی اور داشت" (کتابچہ)	۱۵۳
طبع اول: ۱۹۳۳ء	"ہمارے رسول کی دہ کیسے" (کتابچہ)	۱۵۴
طبع اول: ۱۹۳۳ء	"آل انڈیا عاکب: ایک پیشکش" (کتابچہ)	۱۵۵
طبع اول: ۱۹۳۳ء	"تھریج بھاری"	۱۵۶
طبع اول: ۱۹۳۳ء	"دلی کی جہاں گئی"	۱۵۷
طبع اول: ۱۹۳۳ء	"نور دلی کے انبار" (کتابچہ)	۱۵۸
طبع اول: ۱۹۳۳ء	"کرشن کھا" (کتابچہ)	۱۵۹
طبع اول: ۱۹۳۳ء	"نقشہ پیدائش میں لکھا نام" (سفر نامہ)	۱۶۰
طبع اول: ۱۹۳۳ء	"نور دلی کی جہاں" (کتابچہ)	۱۶۱

۱۷۲	"تاریخ فرعون"	مطبوعہ: کارکن مکتبہ مشائخ، دہلی
۱۷۳	مختصر لکھائی کا بیچ مسمیٰ ہے، یہ مسلم لیگ والوں کے نام "(کتابچہ)"	مطبوعہ: کارکن مکتبہ مشائخ، دہلی
۱۷۴	"مہارانا"	مطبوعہ: کارکن مکتبہ مشائخ، دہلی
۱۷۵	"سرکار کے خوشامدی سرکشی"	مطبوعہ: کارکن مکتبہ مشائخ، دہلی
۱۷۶	"ظلمہ تعلیم اقصیٰ" (کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن مکتبہ مشائخ، دہلی
۱۷۷	"مردِ حقانے کے طریقے" (خطبہ)	مطبوعہ: کارکن مکتبہ مشائخ، دہلی
۱۷۸	"گورنمنٹ اور خلافت" (کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن مکتبہ مشائخ، دہلی
۱۷۹	"تاریخ اولیاء" (ترجمہ)	مطبوعہ: اولیاء کتاب گھر، نئی دہلی
۱۸۰	"انگریزوں کی چٹا"	مطبوعہ: کارکن مکتبہ مشائخ، دہلی
۱۸۱	"تخلیقی کارڈ"	مطبوعہ: کارکن مکتبہ مشائخ، دہلی
۱۸۲	"سچوں کی کہانیاں" (ماہنامہ)	مطبوعہ: کارکن مکتبہ مشائخ، دہلی
۱۸۳	"داعی اسلام"	مطبوعہ: کارکن مکتبہ مشائخ، دہلی
۱۸۴	"دورِ مٹی سوز" (کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن مکتبہ مشائخ، دہلی
۱۸۵	"سرشد کاہنہ عقیم" (کتابچہ)	مطبوعہ: کارکن مکتبہ مشائخ، دہلی
۱۸۶	"ابومہدی کی پچھلی لڑائی" (کل صفحات ۱۱۴)	دہلی پرنٹنگ ورکس، دہلی
۱۸۷	"میدادِ یادگار" (کتابچہ ۸ صفحات)	مطبوعہ: کارکن مکتبہ مشائخ، دہلی
۱۸۸	"میدادِ یادگار کے قانون جان" (کتابچہ ۸ صفحات)	مطبوعہ: کارکن مکتبہ مشائخ، دہلی
۱۸۹	"میدادِ یادگار" (کتابچہ ۳ صفحات)	مطبوعہ: کارکن مکتبہ مشائخ، دہلی
۱۹۰	"ہاگیر دار" (کتابچہ ۳۴ صفحات)	دفتر "مناوی" دہلی
۱۹۱	"نیک کار" (کتابچہ ۱۵ صفحات)	دفتر "مناوی" دہلی
۱۹۲	"تہوار" (۱۸ صفحات ۱۸۸)	دفتر "مناوی" دہلی
۱۹۳	"نمرز اعلیٰ کی بیٹی" (افسانے)	دفتر "مناوی" دہلی
۱۹۴	"میدادِ یادگار کے دکان دار" (کتابچہ ۳۲ صفحات)	دفتر "مناوی" دہلی
۱۹۵	"بھارت کی تہذیب کی شرعی بنیاد" (کتابچہ ۴۸ صفحات)	دہلی پرنٹنگ ورکس، دہلی
۱۹۶	"تہذیب اسلام و ترویج اسلام" (السلامنا حقیقۃ الدینی کا ترجمہ) جیسے برقی پریس	مطبوعہ: کارکن مکتبہ مشائخ، دہلی
	اس کتابچے کے کل صفحات ۶۷ ہیں۔	
۱۹۷	"برائی دہلی کے حالات" (کتابچہ ۹۶ صفحات)	محبوب المطابع برقی پریس، دہلی

۱۹۸	"خلاصہ سیرۃ نبوی"	کارکن حلقہ اشاعت، دہلی
۱۹۹	"اسلام کا کھانہ" (کتابچہ)	عصر جدید پریس، میرٹھ
۲۰۰	"اسلام آفرینوں کی آمد"	محبوب المطابع، دہلی
۲۰۱	"سچوں کی حدیثیں" (کتابچہ)	محبوب المطابع، دہلی
۲۰۲	"آکر غوث پاک" (کتابچہ)	
۲۰۳	"سیرۃ امام حسین"	
۲۰۴	"قرآن کی کہانیاں"	کارکن حلقہ اشاعت، دہلی
۲۰۵	"طہیروں کی کہانیاں" (کتابچہ)	کارکن حلقہ اشاعت، دہلی
۲۰۶	"محمدؐ دشنی" (کتابچہ)	کارکن حلقہ اشاعت، دہلی
۲۰۷	"سہاس منہ" (کتابچہ)	کارکن حلقہ اشاعت، دہلی
۲۰۸	"کتابِ قیامہ" (کتابچہ)	طبع اول ۱۹۲۲ء
۲۰۹	"سہائی رسول" (کتابچہ)	دکن سناری، دہلی
۲۱۰	"سلام بیکر بیگم" (کتابچہ)	کارکن حلقہ اشاعت، دہلی
۲۱۱	"بند وقت" (کتابچہ)	کارکن حلقہ اشاعت، دہلی
۲۱۲	"سہائی رسول کے عہد کے حالات" (کتابچہ)	کارکن حلقہ اشاعت، دہلی
۲۱۳	"تعلیمی سرگے" (کتابچہ)	کارکن حلقہ اشاعت، دہلی
۲۱۴	"عرب کا آمد اور اس کا دور کا انداز" (کتابچہ)	محبوب المطابع، دہلی
۲۱۵	"محمدی صلوات کے اسباب" (کتابچہ)	کارکن حلقہ اشاعت، دہلی
۲۱۶	"لغات کی کہانیاں" (کتابچہ)	کارکن حلقہ اشاعت، دہلی
۲۱۷	"تعلیم الاسلام" (کتابچہ)	کارکن حلقہ اشاعت، دہلی
۲۱۸	"عام فہم قرآن بخاری" (کتابچہ)	کارکن حلقہ اشاعت، دہلی
۲۱۹	"آسان قواعد تعلیم القرآن" (پیکل اور دوسرا حصہ)	دہلی پرنٹنگ ورکس، دہلی
۲۲۰	"خود تعلیم تصوف" (کتابچہ)	کارکن حلقہ اشاعت، دہلی
۲۲۱	"تاکیدِ تہلی" (کتابچہ)	کارکن حلقہ اشاعت، دہلی
۲۲۲	"کتابِ تہلی" (کتابچہ)	کارکن حلقہ اشاعت، دہلی
۲۲۳	"کتابِ ناصر" (کتابچہ)	روز بازار پریس، مامٹر
۲۲۴	"کتابِ ابوہریرہ" (کتابچہ)	روز بازار پریس، مامٹر

شہزادی کی پٹا

خوبه حسن نظامی

ہونے تو قدر پچاس برس کی کہانی ہے مگر مجھ سے پچھو تو کل کی ہی بات معلوم ہوتی ہے۔ ان دنوں میری عمر سوڑھ سو برس کی تھی۔ میں اپنے بھائی یا درشاہ سے دو برس چھوٹی اور میرے والدی بھائی کا نام نور سے چھ سال بڑی ہوں۔ میرا نام سلطان یا نور ہے۔ اما جان میرا توفیق بہادر علی بدایونی حضرت بہادر شاہ کے جیسے اور انوکھال فرزند تھے۔

بھائی چوہدرہ اور ہم بچوں میں بڑی محبت تھی۔ میں ہر ایک دوسرے پر فدا تھا۔ آج کا بھائی کے لیے ہر کئی استوار طبعی طرح کی باتیں سکھانے والے تھے۔ کوئی مافیہ تھا اور کوئی معلوی کوئی طوفانوں میں تھا اور کوئی حیرانہ۔

اور ہم اہل میں بیٹا پروانا اور کفیلہ کا زحمتا مغلایوں سے بچنے تھے۔ دستور تھا کہ حضرت علی ہجوئی جن بچوں اور پروانوں پر خاص ممانعت رکھتے تھے۔ ان کو کھانا کھانا شایہ و حضور دلا کے مراد کھلا دیا جاتا تھا۔ چنانچہ علی ہجوئی بھی کو کھلی بہت مانتے تھے اور میں ہیبت کھج کے وقت کھانے کے واسطے جاتی تھی۔ جب میں نے ہوش سنبھالا اور بچا ابو بکر کے لڑکے میرزا اسباب سے میری نسبت ظہر لگی تو حضور کے دستر خوان پر جاتے ہوئے شرم آتی تھی، کیونکہ وہاں مرزا اسباب بھی کھانا کھانے آیا کرتے تھے۔ اگرچہ عمارت علی خاندان میں باہم پردہ و حجاب اور ناپ ہے۔ شرابی باہم کمر میں آتے جاتے تھے مگر میں اپنی طبیعت سے مجبور تھی۔ میں ایک آن کے لیے کسی غیر مرد کے سامنے جانا گوارا نہ کرتی تھی۔ پر کیا کرتی حضور کے حکم کے خلاف دستر خوان پر کسی طرح نہ جاتی۔ لیکن یہ طبیعت تھا کہ آداب سلاطین کے باعث سب نظریں جھکا کر رکھتے تھے۔ جمال زحمتی کہ ایک بچہ بھی اور اوروں کے آواز سے بولے۔

تو بعد ازاں کہ جب حضور مصلیٰ کوئی خاص کاما کسی کو عرض فرماتے تو وہ بچہ ہو یا جوان عورت ہو یا مرد اپنی جگہ سے اٹھ کر جائے ادب پر جاتا اور جگہ کرکچن سلام بجا لاتا۔ ایک دن میرے ساتھ بھی ایسا اتفاق پیش آیا کہ حضور نے ایک نئی قسم کا امرائی کا کمانچہ کوٹنے کی اور فرمایا: "سلام و اتوا تو چکر کمانی ہی نہیں۔ ادب دلا تا ایک مددگج چھا ہوتا ہے۔ نہ کہ اتاک و مدخر غواں پر سے بھوکا اٹھا جائے۔ میں کھڑی ہوں گی اور چائے ادب پر چکر کچن آداب بجا آئی تم پر کچھ نہ چھو۔ اس مشکل سے آئی گئی کردلی ہی جاتا ہے۔ ہر قدم پر بالچشمی تھی اور نوران لٹا ہونے

جاتے تھے۔

اب میں سوچتی ہوں کہ وہ زمانہ کیا ہوا۔ وہ خوشی کے دن کہاں چلے گئے جب ہم اپنے گھلوں میں آزاد و بے فکر رہ کر رہتے تھے۔ بھلی بھائی کا سایہ سر پر تھا اور لوگ ہمیں ملکہ عالم کہہ کر پکارتے تھے۔ بچا کے سحر چڑھا دیسے ہی ہوتے ہیں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب حضور مصلیٰ و مغیرہ حضرت تاجوں میں گرفتار کیے گئے اور ایک گورہ نے سچا ہاں حضرت مرزا ابوبکر ہزار کے پیچھے مارا تو میرزا سرب خود رخصت کر دوڑے مگر دوسرے گورہ نے ان کے بھی گولی مار دی اور وہ ایک آدھ کر کے چلا جا ہی کی شکل پر کر پڑے اور تپ کر خضہ سے ہو گئے اور میں بہت ہی حاشہ و سختی رہی۔ اسے میں خوب سراہا اور کہنے کا حکم کیا کہ کڑی ہو، چلو تمہارا بھائی جان نے بڑا ہے۔ میں اسی بے خودی کی حالت میں اُس کے ساتھ ہوئی۔ وہ پائی دروازے سے اتر کر دیکھا کہ باہاں میرزا قاضی بہادر گھوڑے پر سوار، مجھے سرگھڑے ہیں۔ تمام چہرے اور سر کے بال خاک آلود ہو رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی آنسو ٹھکرائے اور فرمایا "تو سنا ظاہر ہمارا بھی کوئی ہے۔ جہاں جتا جس کے سر سے کی آرزو تھی، آنکھوں کے سامنے ایک ٹکڑی عکس کا نشانہ بن گیا۔" یہ سنتے ہی میں نے ایک چیخ ماری اور ہائے بھائی یاد کر کہہ کر رہ گئی۔ وہ گھوڑے سے اتر آئے۔ مجھ کو اور ہزار ہا لوگ گنگے کا کرچا اور درختی دیتے گئے اور کہا "بھئی! اب لوگ میری تلاش میں ہیں۔ میں بھی دو چار گھڑی کا سہارا ہوں۔ تم باٹھا مالٹہ جوان اور سمجھا رہا ہوں۔ اپنی پھولی بہن کو دلا سادہ اور عورتانہ دانی مسیتوں پر میرا کر۔ مجھے نہیں اس کے بعد کیا پیش آنے والا ہے۔ یہ تو نہیں چاہتا کہ تم کو کتن چٹا چھوڑ کر گھس جاؤں۔ پر ایک نایک دن تمہیں بن باپ کا ہونا پڑے گی۔ گار۔ ہزار ہا تو ابھی بچے ہیں اس کی دلداری کرنا اور بھلی سے زندگی بسر کرنا اور دیکھو ہزار ہا خوب تم خیرا دانی نہیں ہو۔ کسی چیز کے لیے خدمت کرنا۔ جو میرا سے فکر کر کے کہ لینا اور اگر کوئی شخص کہہ کہتا تھا تو حق آگیا تھا کہ نہ دیکھنا۔ وہ لوگ کہیں کے کہے شہزادیاں بنائی بدلیت ہوئی ہیں۔" ہمارے ہم دونوں کو خوب میرا کے پرہیز کر کے کہنا "ان کو جہاں ہماری خاندان کے آدمی ہوں پہنچا دیں۔" اُس کے بعد ہم کو چار کیا اور دوتے ہوئے، گھوڑا اور دوتے جنگل میں گھس گئے۔ ہمارے نہ لگا کہ وہ کیا ہوئے۔ خوب میرا ہم کو لے چلا۔ یہ ہمارے گھر کا قدرتی ملک خوار تھا۔ توڑی دور تک ہزار ہا ہونا دونوں کی پہلی ہوئی تھی جہاں ہمارے باؤں کی طاقت نے جواب دے دیا اور وہ قدر چٹا دو ہر ہو گیا۔ مجھ کو بھی کبھی یہ یوں چلنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ جبکہ مجھ کو کریں کھاتی تھی مگر باؤں کو لیے ہوئے پہلی پہلی تھی۔ اسے میں ہزار ہا تو کے ایک نوکدار کا لٹا ہوا چہرہ کیا اور وہ ہائے کہہ کر کر پڑی۔ میں نے جلدی سے اُس کو اٹھایا اور کاٹا لٹا لے لگی مگر وہ اٹھو سر اوٹھ گیا۔ اور یہ نہ ہوا کہ میرا ہاتھ تالیاں۔ بلکہ پھٹنے کی جلدی کرنے لگا۔ لیکن بولی آپا جان مجھ سے یہ لکھیں چلا جاتا۔ ناظر کو بھیج کر گھر سے پاکی دیکھا۔ مگر وہ پاکی کا نام بن کر میرا ہی بھرا آیا اور اُس کو اتلی دیتے گئی۔ خوب میرا نے پھر کہا کہ جہاں میں ہو چکا، جلدی چلو۔ ہزار ہا تو کا حراجن خیر تھا۔ ہزار ہا کو دیکھتے تھے کہ لاکھ کی تھی اور یہ لوگ دم خود ہو کر بن لیتے تھے۔ اسی خیال سے اس نے خوب میرا کر پھر دیا ایک ہاتھیں بنا دیں۔ کم جھٹک دیتے ہی ان کا خضہ آگ کا پے سے باہر ہو گیا اور بولی بہ تری سے بن باپ کی دیکھا لٹا کے ایک سانچے مارا۔ ہاؤں بھلا گئی۔ وہ بھی پہلوں کی چھڑی سے بھی نہ تھی تھی۔ یا ایسا تھا لٹا لٹا۔ اس کے دوتے سے مجھ کو بھی بہ اختیار روٹا آ گیا۔ ہزار ہا تو دوتے رہے اور خوب میرا کہیں چلا گیا۔ پھر خبر ملی کہ وہ کیا ہوا۔ ہم دونوں بھٹک کر تمام کرتے پڑے۔ دیکھا حضرت نظام الدین اولیاء میں پہنچے۔ یہاں دہلی کے اور خاص جہاز سے خاندان کے بھتیگوں آدمی تھے۔ مگر ہر ایک اپنی اپنی مصیبت میں گرفتار، قیامت کا صوت تھا۔ کسی نے بات تک نہ کی تھی۔ اسی اثناء میں وہاں چلی اور چار دی، لیکن ہزار ہا تو اس میں رہے تھے ہوا کہیں۔ میں کہلی رو گئی۔ اس ہوا جب بھی مجھ کو لٹا کو کھٹکے ملا۔ اس طرف کا کرنا یا ہوا کہ اگر پڑی میرا کر۔ نے ہم لوگوں کی پرورش کرتی تھی اور میرا لٹا لٹا رہا۔ یہ مجھ پر عظیم مقرر ہوا، جو اب بھی ملتا ہے۔

نیاز فتح پوری

نام	نیاز محمد خاں (والدہ کی طرف سے)
تاریخی نام	لیاقت علی خاں (والدہ کی طرف سے) پہ خطابتی چارنچ پیدائش ۱۳۰۲ھ
قلمی نام	نیاز فتح پوری
پیدائش	تقویری ۱۲۸۶ھ کے کسی مہینہ میں۔ ۱۸۸۳ء پہ مقام سٹی گھاٹ، ضلع بارہ بنگلہ بھارت۔
وفات	۲۳ مئی ۱۹۶۶ء پہ مقام کراچی (سندھ) پاکستان۔
تعلیم	میٹرک مدرسہ اسلامیہ فتح پور ۱۸۹۹ء

فتح پور سے وہیں ابتدائی تعلیم مولوی حبیب الدین سے اور بعد ازاں گھنٹہ میں مولوی صدیق حسن غازی پور سے پائی۔ دس برس کے تھے کہ ۱۸۹۳ء میں مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں داخل ہوئے۔ جہاں سے ۱۸۹۸ء میں انگریزی نڈل پاس کیا۔ اس نڈل میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لاہور سے عالیہ، رام پور میں تقریباً آٹھ برس مولانا عرب محمد طویب اور مولانا ظہور الحق خیر آبادی کی شاگردی کی۔ بعد ازاں مدرسہ اسلامیہ فتح پور سے ۱۸۹۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

مختصر حالات زندگی

نہاڑ کے والد محمد امیر خان پلیمس انچسٹر تھے۔ آبائی وطن فتح پور سے وہ (جو۔ لی) تھا۔ والد کے چاروں کے سبب بارہ بنگلہ فتح پور گھنٹہ اور رام پور میں بھیجے، راجپن گڑ۔ چارم ۱۸۸۳ء تا ۱۹۱۳ء تقریباً کہیں پانچ برس فتح پور میں قیام رہا۔ ۱۸۹۶ء میں جب والد صاحب رینڈر ہوئے اور رام پور میں دکانت شروع کی تو نیاز بھی ان کے ساتھ رام پور میں رہے، جہاں سے واپسی پر فتح پور سے نڈل اور میٹرک کے امتحانات پاس کیے۔ ان دنوں شعر کہنے لگے تھے۔ نیاز نے ۱۹۰۰ء میں بطور سب انسپکٹر مراد آباد میں پلیمس لڑی ٹیگ لی۔ ۱۹۰۱ء میں پہلی شیت سب انسپکٹر قلعہ بھڑیا (الو آباد) میں تعینات ہوئے اور ۱۹۰۴ء میں مستعفی ہو گئے۔ ۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۵ء مدرسہ اسلامیہ (انگریزی شائع) کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ ۱۹۰۶ء تا ۱۹۰۷ء ایف آئی اسٹینٹ (گھوڑا) میں نوآپ ریاض الحسن خاں کے زمانہ میں ہیڈ ماسٹر کولوال شہر اور پانچوے تھکڑی کے طور پر کام کرتے رہے۔

[illegible]

اولین تقریریں

اقدامی مضامین (۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۲ء) ”ملائے عام“، ”الحجاب“ اور ”تھری“ تو ملی اور تھری آگرہ میں شائع ہوئے۔

اولين مطلبو عناقيد:

"ایک پاریس شیزو کو دیکھ کر" منطوبہ "تھاؤ" آگرہ "تھن" "نوبلی جنوری 1994ء

بقول غزالی، یہ انسان نہ لنگھتا ہے نہ آہستہ سے حشر ہو کر ۱۹۰۰ء میں قائم ہو گا کیا تھا۔ یہ انسان ”کھڑکھن“ کے پہلے ایجنٹوں میں شامل تھا۔
 دوسرے ایجنٹوں نے اسے خارج کر دیا تھا۔

تکلی آچار (مطبوعہ):

- | | | | |
|----|---|--------------------------|----------------|
| ۱۔ | "آئینہ شاعر کا انعام" (علوی مختصر روایات) | مطبوعات برائے بیس، لاہور | طبع: اول ۱۹۵۳ء |
| ۲۔ | "نثر کا ایک نکتہ" | نثر کا ایک نکتہ، لاہور | طبع: دوم ۱۹۵۴ء |
| ۳۔ | "نثر کا ایک نکتہ" | عبدالحق اکبر، لاہور | طبع: سوم ۱۹۵۵ء |
| ۴۔ | "نثر کا ایک نکتہ" (نثر کا ایک نکتہ) | مطبوعات برائے بیس، لاہور | طبع: اول ۱۹۵۶ء |
| ۵۔ | "نثر کا ایک نکتہ" (نثر کا ایک نکتہ) | نثر کا ایک نکتہ، لاہور | طبع: اول ۱۹۵۷ء |

- ۴۔ "ہرستان" (افسانے) ڈارک ایجنسی بکسٹو طبع اول ۱۹۳۳ء
- ۵۔ "حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے" (چوبیس افسانے) ڈارک ایجنسی بکسٹو طبع اول س۔ ن
- ۶۔ "ملا راجہ ناز" (افکار افسانے، مضامین، کہانی) مجموعہ ۱۹۳۹ء سے نقل طبع ہوا، اس میں ۱۹۳۷ء، ۱۹۳۸ء تک کی آئریہ ہیں، جن میں سے بیشتر ترجمہ کردہ ہیں۔ اسی کتاب کا ایک ایڈیشن ادارہ فروغ اردو نے ۱۹۴۷ء میں طبع کیا۔
- ۷۔ "مطالعہ کی سرگزشت" (طویل مختصر افسانہ) صدیقی بک ڈپ بکسٹو طبع اول س۔ ن
- یہ کتاب ۱۹۳۹ء سے نقل طبع ہوئی۔ صدیقی بک ڈپ نے ۱۹۴۲ء میں دوسرا ایڈیشن طبع کیا۔
- ۸۔ "مختصر داستان کا قلمرو گوہرین" (طویل مختصر افسانہ) آخری بار یہ کتاب ادارہ ادب العالیہ، کراچی نے طبع کی
- ۹۔ "قربان کا حسن" (ارضی، باطنی، تاریخی طویل مختصر افسانہ)
- ۱۰۔ "بچہ پٹیل ساگی" (طویل مختصر افسانہ)
- ۱۱۔ "سجایات" (سوانحی مضامین)
- ۱۲۔ "اسلمند انشراح" یہ سیاسیات اسلامی سے متعلق کتاب کا مرثیہ از مصطفیٰ کمال پاشا سے ترجمہ ہے۔
- ۱۳۔ "کلی مقدمہ ہم کی مدحوں کا اجتماع"
- ۱۴۔ "مکلفات ناز" (نمونہ جلدیں) ڈارک ایجنسی بکسٹو طبع اول ۱۹۳۹ء سے نقل
- ۱۵۔ "جہاں بھاشا" (مضامین) ڈارک ایجنسی بکسٹو طبع اول ۱۹۳۹ء سے نقل
- ۱۶۔ "ترغیبات جنس" (جنسیات، نفسیات) ڈارک ایجنسی بکسٹو طبع اول ۱۹۳۹ء سے نقل
- ۱۷۔ "مجموعہ اشتقاقات و جہاںات" (نمونہ جلدیں) ڈارک ایجنسی بکسٹو طبع اول ۱۹۳۳ء
- ۱۸۔ "انتقادات" (نمونہ جلدیں، مضامین) مہاراجن اکیڈمی، حیدر آباد، دکن طبع اول ۱۹۳۶ء
- ۱۹۔ "مذہب" (مذہبیات) ڈارک ایجنسی بکسٹو
- ۲۰۔ "بار و باطن" ڈارک ایجنسی بکسٹو
- ۲۱۔ "تکلیف کا ایک سانچہ" ڈارک ایجنسی بکسٹو

- ۲۲۔ ”اصحاب کہف“ (تاریخ سوانحی ائٹارے) تاریک انجینی بکھنؤ
- ۲۳۔ ”جہانگیری کی رائی“ (سوانح)
- ۲۴۔ ”پندرہ تھکے ملائے کرام کی دھوں کے ساتھ“ (تاریخ، مانا کے)
- ۲۵۔ ”ادنیوں کا مذہب“ (انجینیا، فلسفہ)
- ۲۶۔ ”مشکلات غالب“ (تجربہ)
- ۲۷۔ ”مذہب عالم کا تقابلی مطالعہ“ (فلسفہ، انجینیا)
- ۲۸۔ ”تاریخ تفسیریں از حدیثی ادیان کا عربی سے تیسرا (تاریخ اسلام) ہمدانی، دہلی طبع اول ۱۹۳۹ء سے قبل
- ۲۹۔ ”مرض نفل“ (از ادبیات تاجیوں کا ترجمہ السورہ) ”سیت علی“
- ۳۰۔ ”فراسٹ ایڈ“ (علم نجوم) تاریک انجینی بکھنؤ طبع اول س۔ س۔
- ۳۱۔ ”مذاکرات، ہا“ (۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۹ء کے مضامین) آزاد پبلشرز، دہلی طبع اول ۱۹۳۹ء سے قبل
- ۳۲۔ ”مطالعات نیا“ تاریک انجینی بکھنؤ
- ۳۳۔ ”من ادب دانا“ (فلسفہ، انجینیا) دو جلدیں
- ۳۴۔ ”تجربہ و تجربہ“ (مطالعات) ناشر مولوی قمر الحسن ندو، بھوپال طبع اول ۱۹۶۳ء سے قبل
- ۳۵۔ ”تفصیل ہائے رنگ و رنگ“
- ۳۶۔ ”تھریں کام سے ہارنگ“ (تاریخ، مطالعات)
- ۳۷۔ ”اسلامی ہند“ (تاریخ، ہمارے)
- ۳۸۔ ”توقیت“ (تاریخ) تاریک انجینی بکھنؤ طبع اول س۔ س۔
- ۳۹۔ ”عربی نیا کی لائری“ (مضمون) تاریک انجینی بکھنؤ طبع اول ۱۹۳۹ء سے قبل
- یہ مضمون ۱۹۱۵ء میں لکھا گیا۔ اس کا مقصد اہم رول کی تحریک کو مسلمانوں کے لیے ضروریات کرنا تھا۔
- ۴۰۔ ”سورہ صحر“ (قرآنی نظم) تاریک انجینی بکھنؤ طبع اول ۱۹۳۹ء سے قبل
- ۴۱۔ ”مطالعات ہم“ (تین مقالات) تاریک انجینی بکھنؤ طبع اول ۱۹۳۹ء سے قبل
- ۴۲۔ ”سورہ کے کرشمے“ (تین مقالات) تاریک انجینی بکھنؤ طبع اول ۱۹۳۹ء سے قبل
- ۴۳۔ ”قرآنی حکیم“ (سوانح) مطبوعہ اردو انجینی بکھنؤ، کراچی طبع اول ۱۹۳۹ء سے قبل
- نوٹ: ”نیا تاریخ ہندی ہر ایک نظر“ (از ڈاکٹر فریدان فتح پوری مطبوعہ ”سالانہ“ نگار پاکستان“ کراچی ۱۹۶۲ء) میں فریدان کردہ علم سے کتب میں کی مطبوعہ کتب کے نام شامل ہونے سے روکے ہیں۔

فیصلہ اول:

القائد دہلوی دہلی مضامین اور تبصرے۔ پانچ کے گزیر کردہ "نگار" کے نام پر تبصرہ جن کی اہمیت باقاعدہ مطبوعہ کتب کی ہی ہے

- ۱۔ "حکومتِ فہر" جنوری ۱۹۳۶ء
- ۲۔ "ڈرامہ صحابہ کرب" جنوری ۱۹۳۷ء
- ۳۔ "قرآن فہر" جنوری ۱۹۳۵ء
- ۴۔ "پاکستان فہر" جنوری ۱۹۳۸ء
- ۵۔ "ایک مستقبل کی تلاش فہر" (الف حصہ) جنوری ۱۹۵۱ء
- ۶۔ "فرما رہا ہوں اسلام فہر" جنوری ۱۹۵۳ء
- ۷۔ "علوم اسلامی و علمائے اسلام فہر" جنوری ۱۹۵۵ء
- ۸۔ "مطلوعات فہر" جنوری ۱۹۵۸ء
- ۹۔ "منتقح اسلام فہر" جنوری ۱۹۵۹ء
- ۱۰۔ "کاتب فہر" جنوری ۱۹۶۱ء

اعزاز:

- ۱۔ "پدم بھوشن" حکومت ہند کا اعلیٰ ترین سول اعزاز ۱۹۶۲ء

نظریہ حق:

سب سے زیادہ عجیب و غریب بات (جو قانون اصول انسان نگاری کے بالکل خلاف ہے) میں اپنے اندر یہ پاتا ہوں کہ آج تک میں نے کوئی افسانہ لکھا نہیں ہے۔ لیکن یہاں تک کہ بعض اوقات تو میں اس سے بھی بے خبر ہوتا ہوں کہ "ذیر تحریر" لفظ کے آگے دوسرا لفظ لکھ کر کیا لکھتا ہے۔ لیکن چونکہ کلچر و سوشل سائنس افکاروں کا آغاز "تھیوری برت" (Charlensabon) سے ہوتا ہے اس لئے ابتداء ہی میں کچھ لکھنے سے نقشہ درخشاں میں ایسے ضرور پیدا ہو جاتے ہیں جو پڑھنے کی تھکن میں غیر ارادی طور پر معاون ہوتے رہتے ہیں۔

نیا ذریعہ پوری

(پہلے "میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں" مرتبہ حکیم یوسف حسن،

دارالادب پنجاب، لاہور، پاکستان اور طبع اول سن۔ ۱۹۸۱ء)

کیو پڈ و ساگی

نیاز فتح پوری

یوں تو بچہ مان کے مہر زری کا زرد روارہ بجائے خود ایک حسن آباد تھا۔ لیکن ساگی کے شباب نے جس روحانی جلال کا مسونہ پیش کیا، وہ حقیقتاً "عشرت کی دنیا" میں ایک بحر تھا، ایک اعجاز تھا۔

حسن کی نسبت بجز عین شاعرانہ تخیلات کے ذرا اثر ایک اور کوئی ایسی تصویر نہیں پیش کر سکتا تھا، جسے ساگی کے حسن عالم اطروذ سے کوئی نسبت دینی نہ سکتی، پھر یہ خدا کی شان ہے کہ عطاء و ساگی کے دیکھیں جو مان کی دو دنیاں اور بھی تھیں، لیکن جب رات کو شامی بانگ کے گھن اور اس کے گھنوں میں گھڑی گھڑی بجلی کی سی چمک نمودار ہو کر غائب ہو جاتی تو سارے شہر کو مطمئن ہو جاتا کہ آج ساگی پارغ میں خطاب الہ الہ کر پھولی تو ذریعہ ہے۔

اگلا اس دیکھنے میں بھی غیر معمولی حسین تھیں، اور اگر قدرت کے پاس ایک آخری گھٹن حسن و شباب (ساگی) کا روزہ ہوتا تو اس میں کلام نہیں کہ یہ دونوں سچیں بھی وہ چیز تھیں، کہ وہ نپا انھیں کے لیے ترقی، انھیں کے لیے ترقی، اس لیے وہ اگر اپنی جھوٹی بکس سے خوش نہ تھیں تو ہائے جب نہیں تا ہم چونکہ ان کی شادی ہونے والی تھی، اس لیے وہ اپنی تعلیم اپنے انتظام کی تحسین اس خیال سے کر لیتی تھیں کہ ہر چند ساگی زیادہ ضعیف تھی، مگر کم از کم وہ ان عداوت سے قدامت بھی آشنا تھیں، جو کتنی جن سے ہمدردی تھیں بہت جلد بروج ہونے والی ہیں۔ "نکاح و اہلی ساگی کی زندگی میں کوئی رات نہ تھی" اب دیکھیں جو مان کے پیش نظر صرف بھی ایک فکر تھی، جس میں وہ شب و روز مستغرق رہتا، دنیا کے ہر گوشے شادی کے بیچام آئے، خدا جانے کتنے شاہزادوں کی تصویریں مختلف سطحوں سے آئیں اور اگر ہم اس میں ان لوگوں کا بھی شمار کر لیں جو ساگی کی مواصلت کی صرف آرزو اپنے دلوں میں لیے ہوئے تھے اور زبان تک نہیں لاسکتے تھے تو اس پیرا و پیراں ہندوؤں کے کھلم کا کوئی شمار ہو ہی نہیں سکتا لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہ آئی کہ ساگی کے لیے کوئی ہر کس طرح متکب کیا جائے۔

اب ساگی کوئی بچہ تو تھی نہیں کہ اس کو برے بھلے یا اپنی طبیعت کے میدان کی تیز رفتاری و جواب پوری جان تھی اور اس لیے انتخاب

شہر کی حس۔ جو صورت کی جوائی کی تجھاس ہے اس میں بدرجہ اتم موجود تھی اول تو بہت ہی تصویریں اس کے سامنے پیش ہی نہ کی جاتی تھیں اور جو اسے دکھائی بھی جاتی تھیں تو سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوتا تھا کہ وہ ایک دفعہ تصویر پر نگاہ ڈالنے ہی والے والے کو نہایت غور سے از سر تا پا دیکھ لیتی۔ پس اسے غور تھا کہ اپنے حسن پر بلا تعلق۔ بار بار یہاں ہوا کہ اس نے تصویر کی پشت پر کھسکا دیا کہ ”اگر یہ انسان ہے تو مجھے انسان کی ضرورت نہیں۔“ مگر اسے کیا نظر تھی کہ وہ اس غرت سے اپنی آنکھ و زندگی کے لیے ایک جی وطن کوئی کر رہی تھی۔

دو خوب جانتی تھی کہ اس کے باپ کو کیا فکر لاحق ہے اور جب اسے معلوم ہو گیا کہ بردہ چاہے کو شہ میں اس کے حسن کے پرستار موجود ہیں تو اس کی زندگی میں بڑا پیارا انقلاب پیدا ہو گیا۔

وہ کسی شہر کی بھڑی تصویر اٹھاتی اور جذبات حسن و مطلق میں یہاں تک مستغرق ہو جاتی کہ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی، بار بار یہاں ہوتا کہ جب کتاب اچھٹے دیکھتے اسی حالت انہماک میں اس کی نگاہ کسی پھول پر پڑ جاتی تو وہ خدا جانے کیوں شراب پاتی اور پھر اٹھ کر چیلے کئی فرشوں کو اس کی تبدیلی کی کوئی ایسی گزری تھی، طلسمات کی کوئی سماعت ایسی نہ تھی تھے وہ اپنے حسن سے معصوم نہ جاتی ہوا اور اس کا کوئی تخیل ایسا نہ تھا جو شراب و خواب پر قائم نہ ہوتا اور چونکہ قریب قریب نصف حصہ اس کے اوقات کا اسی گلیں میں گزرتا تھا یا پھر ایسے مکھلیوں میں، جن میں وہ طود کی کوڑا صدمہ، یا اپنے تئیں اضمحناں چاہتا پسند کرتی (یہاں تک کہ بعض دفعہ جب وہ انکی ہوتی تو مہندی کی بھول بھلیاں میں گھس جاتی اور آپ اپنی عیاش کرنے لگتی) اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ساگی نصف عمر تھی اور نصف اضمحناں و جستجو۔

دن گزار گئے، یہاں تک کہ ساگی کا شباب، مراد سے سکر، اور سکر سے سرشاریت کی حد تک پہنچ گیا، انجمن اس وقت تک کوئی فیصلہ انقلاب شہر کے مطلق نہ ہو سکا۔

پانچویں رات تھی اور چاندنی بھی موسم بہار کی اور موسم بہار بھی یونانی کا جس کی زمیں کے نسبت فرش گل کا چھلک اونی زمین چھلک ہے۔ ساگی اپنے باغ کے ایک کچے میں جو بیٹھا تھا، وہاں ایک تھا بیٹھی ہوئی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی سے تھکے، دھڑلے ایک طویل دن کہ سخت تھی، یہاں تک سیر ہو گئی تھی کہ کھڑ جا رہا تھا، خامات میں وقت صرف کرنا پسند کرتی تھی۔ مگر وہ یہ دیکھ کر کہ کسی گھبراتی کہ ہر جاہ کی اس کے لیے روشنی ہے اور اس کی برداشت چاندنی، وہ دنیا میں لڑائی سبز و پاشمی ہوئی، پگھلنے والوں کے ذخیر کو ایک ہاتھ سے منتشر کرتی جاتی تھی اور بچوں اور نازک شاخوں سے جاگن جاگن کر آنے والی کڑور شعاعوں کو دیکھ، دیکھ کر گردن اٹھائے ہوئے اپنے ہی تعریف کیے ہوئے شعر آہستہ آہستہ گنگاری تھیں، اپنا درد کہہ رہی تھی، مگر تئیں کر رہی تھی کہ

”میں پانچویں ۱۹۶۲ء میں کی ساگی ہے۔“ وہ سن ہی میں وہ دیا کو میری خریدتے تھیں کہ وہ پہلے ایک ساگی سے جا آئے، وہ نہیں، میں میں اب مر رہی ہیں یہ سنائی دے ہو گی ہے، سنہن ہے۔ گلیں میرے گھر ۶۶۵ اور یہاں سے کہ اس طرف جاتی ہے۔ میں گلی میں اٹھ، انگوٹوں کی دکانیں، بیری دکانیں، جین بھینے ہوئے، چرواہ کی طرف سے کچا چھانڈا ہے۔ میں اسے بکھڑکتی ہوں تو سنہن، کیا کرتی ہوں۔ میں کاوش کرتی ہوں کہ گلی میں چلتے سے پہلے اس سے کہہ دو کہ اس نے دھڑکے کی کہ میں نے اپنے دھڑکے سے نہیں اٹھا دیا، اپنے باغ سے کہیں لکھوں، یہ کہ جب شہنشاہ کی تو پٹنگ کیا کریں گے کہیں وہاں کی دکان سے کہیں یہاں کی دکان سے کہیں چلتے چلتے، راتنی ہوں کہ اگر رات کو میری اٹھیں گے سر سے چرواہ کی کوچ لے، ان کو وہاں کہاں کہیں۔

بھری گون جس پر بیوی کی گردنیں فدا ہیں، داخلی جاتی ہے، بھری وہ آنکھ جس پر جنگلی گاہیں کی آنکھیں
 قربان ہیں، دھماکا جاتی ہے، بھرا ہوا جسم پر اسے چاندنی، ہر کتاب پر اسے ایک نگرانگرا آج ہے، بھرا وہ ہے
 کیوں کہ چاندنی کوئی مصداق نہیں ہے جو ہے سے بھر دیا گیا جس جاتی رنگے کوئی خاصہ نہیں بھری
 تھکان کو لگے، کوئی داخلی جاتی نہیں جس کے وہاں کے اور بھری تربیت میں کتاب تکس۔ ہر اسے دین کی
 ساگی قوی، داکہ نہیں، بھری قوی، ہر اسے، جو سترہ لگے، بھرت کھانے، کہاں سے کھا۔

ساگی بھی مسین، ڈمبل جاتی، دینی ہی لطیف الہامی خاصہ اور نازک، دستہ مصور، مچی جاتی، اور اس لیے وہ قہر دغا اس بات کی خواہشمند جاتی
 کہ یہی اسی مسین، اسی وہب کا شاعر، حرا، حرا، کھینے والا اور ایسا ہی ہے مش فاش اس کی زندگی کا عدم ہو۔ وہ دیر تک اپنے جانے گیت گاتی رہی
 اور بڑھ بجا یا کی، یہاں تک کہ وہ غصہ ہی ہوگی اور اس نے ایک آخری ضرب کے ساتھ جس سے تاریک دیر گونا کھے۔ ہر چاہ کو پھینک دیا، گونا وہ
 اس سے بھی، جزیر ہوگی جاتی اس نے چاندنی میں ایک بڑائی لی، اور بھرا گزرائی گئی ہوئی وہیں ایسٹ کی وہ اب سونا چاندنی جاتی، یعنی اس کی قربانی
 آنکھیں جو یوں بھی ہیو، نیم خواب ہی رہتی تھیں، اب ہانک سوچنا چاندنی تھیں۔ ساری فضا سوری جاتی، آسمان وہ زمین سارے تھے، وہ
 شاعر وہ زری جس پر چاند کی شعاعیں ایک مستقل خاموشی کے ساتھ چہرہ تر رہی تھیں، سوری جاتی مگر سکوت خواب تو اس خوش نصیب کچا کا تھا جو
 بے ہوش ساگی کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے سورا تھا۔

آہ، اس حالت کو بچر گھٹوں تک دیکھا، ہا

پایاں کا رچا یوں کی شیریں خوشی شروع ہوئی، بھنی مچ پاگی، ہر شارع پھول ہی پھول ہوئی تھیں نکلیاں، جاگ اٹھیں۔ ساگی بھی اور کچ
 بھی اپنے جسمہ، باد میں جاگ اٹھا، وہ یہاں حقیقتاً سوتے نہیں آتی تھی، اور دغاں کو یہ لگان تھا کہ دغاں قہر دغا، اور دیر تک یہاں سوتی رہے گی لیکن
 اس کو کیا کیا جائے کہ اس کی نزاکت مستقل کا بار دغا نکلی، جس کے ہر چہرہ چڑھا کے ساتھ اس کا شاپ صرف ہوتا تھا۔ گیت کے بول جن میں
 اس کے سارے حیات الطیف کی قوت تھی جاتی تھی اس کو بہت جلد ملت کر پنے والے بے ہوشے چہرہ، دوسری اور انھیں تھکان، ہلاکتوں اور
 جزیر یوں کو اپنے دماغ میں لیے ہوئے ہو گئی، جن میں اس کے اجزائے مدح، مکمل مکمل کر مل رہے تھے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس کی بڑائی بڑائی
 آنکھوں نے بند ہونے پر کیا کیا دیکھا مگر ہاں جب وہ اٹھی تو اس کے اعضاء کورہے تھے، اس کا سارا بدن منحنی سے چہرہ ہو رہا تھا، اس نے ہاتھ
 اٹھ کر اپنی پیشانی کو چھوا اور پھر اپنے بازوؤں کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر قریب آدھ دفعہ مل دیا اور اپنے مستحضر بالوں کو سمیٹتی ہوئی کمری ہو گئی اور
 آہستہ آہستہ گئے، مکمل کر رہی ہوئی۔

پھر یہ بدن ہوا، نازک کمر، رقہ رقا میں لوح کا پیرا ہونا ضروری ہے، لیکن اگر رقہ رقا کی پلک کوئی مستقل چیز ہے، اگر تک ٹرای صرف
 کشیدہ قاحتی کی صفت، ذم نہیں، بلکہ ایک جہاں میں ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ جس صرف ساگی کی رقہ رقا کو پکڑ کر کچھ میں آستہ کا کوئی
 نقل نہیں، مگر ہوا اس سے مہمور ہے، بھجوری لڑکھلکی گئی مگر اس کی پلک اور ایک پرواز اب بھی دکھا میں قہر فرما رہی ہے۔ ساگی کون میں ناب
 ہوگی، لیکن اس کی رقہ رقا کا ارتعاش اب بھی روح میں ملا ہوا ہے۔ وہ دے پاؤں اپنی خواب، جاگ رہی تھی اور اپنی تاج پر گر پڑی، اس نے سمجھا کہ
 جان کا درد، اعضا کی دھن، عدم آسودگی خواب کی وجہ سے ہے، اور اس نے چاہا کہ پھر سو جاؤں، لیکن وہ ابھی کہ دوسری لے رہی تھی، کہ سر میں
 جو ساگی کی محبوب سطر چھٹی ہاتھ میں اپنا زری جہاں لیے ہوئے آئی اور پائی کی طرف فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے جہاں کے تاریکی نازک الطینوں

سے درست کیے اور یہ دیکھ کر کہ شاہزادہ کی رات شاہ کرب میں گزری ہے اور وہ ابھی سو جا چاہتی ہے اس نے افسوس خواب لہایا، یہ فی الفور شیریں لہجہ میں گانا شروع کیا۔

”اے خندان، اور بھی جگن کو بھر دے کہ ابھی ان میں کچھ نہ داتی ہے، اے خندان، اور انگریزوں کو بھر دے کہ
 دے کہ ابھی ان میں کچھ نہ دے، وہ انی چہاں کی بچی کو کھڑا رکھ کر کی طرف دے نہیں، اس کا خطاب خود شراب
 ہے، میں نے چاہتی رہا تو میں بھی ہمارے اندر سے اسے لٹکے رکھا ہے اور اگر کی رات دیکھو تو چپ
 کر رہی کی ہے تو کچھ گوش نے ہوشوں پر ہے اس کے ساتھ تو مہاپے اچھے سے مٹانے ہیں کہ کوئی اس کی
 غلطی نہ دقت نہ یوں ہے، اے خندان، چاہ کہ ابھی سوچ کی کر گئے اور غلطی بھی نہیں ہوگیں۔ سادگی کہ میں نے
 دی ہے، اس کا دل شاہزادہ باپ رات کی شراب ابھی اچھی طرح آسودہ۔“

”سرین خاموش۔ افسوس خواب کا نظم کر کے میری گھر آتا ہے۔“

اب ساگی اپنے تخلصی قحی اور پیشانی پر ایک ڈاک چھین، ایک تخلصی موج طور پر، ڈالے ہوئے کچھ سوچ رہی قحی، یہ خبر کار اس نے
 چنگ کر سرین کے ہاتھ سے رہا لے ہوا اور اس کی بطور کسی نظام، اصول کے اپنی انگلیاں تاروں پر آہستہ آہستہ چلانے لگی۔ سرین خاموش
 مودب کڑی ہوئی ساگی کی اس تکلف معمولی دھڑکی سے زور دی قحی۔ یہ حالت ذاتی دیر تک قائم رہی کہ آداب ابھی طرح نکل آیا اور تمام
 کثیر یہ قحی اتمام اور ضروریات کج کے متعلق اپنے اپنے فراموشی داکر کرنے حاضر ہو گئیں۔ لیکن ساگی نے ان کو فوراً زبردست کر دیا اور سرین کو
 قریب چاکر اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر بولی

”اے سرین! ان تو اس بات اپنے منہ سے نہ نکال۔ میں ہاں تجھے افسوس کرنا چاہے۔ میرے افسوس نے
 ہمیشہ میری دل اس کمرے پہنچا لی تھیں اس وقت سے اور جب لکھن سے تکلیف پہنچے ہونے لگے۔ کیونکہ
 باہمی کہ کہ میرے ہونے ہونے ان میرے سامنے آ جائیں تو لکھنے ملنا چاہتی ہے تو میری ان راتوں کا ذکر
 نہ کرنا میں دیکھتا رہتی رہتی ہوں تو تو لکھنے لہریاں بنا کر میں چلا اس رنگ کو بھول چکاں میں کاہر
 میرے لیے نکال کر دانت ہے اور پھر ایک دل پہنچے ہیں چاہوں۔“

اور میری جگہیں ملو اور دوسری آکھیں ملدے آگئیں جس کا کیا اگر چہاں کی بچی کا خطاب مودعہ صہا ہے تو
 کیا؟ کیونکہ اسے لہریاں ملو کس ملو کس کی کیا لہرت چہاں ہے میری زندگی تو ایک ایک صدا ہے، دوسرا کی
 دست میں تم ہو جائے۔ بہن! اگر اپنی کھبت سے آپ کا نہ اٹھا سکتا ہے، اگر اپنی روحانی پر غور لگاتے ہو
 کتنے بے وقار اور مودعہ گا۔ جو ابھی گائی ہونے لپکا رہا کے تار تو اصل طریقہ تاروں سے افسوس کو بھول
 جا اور اپنے سادگی کو نہ کسی جھٹک کر، اور میرے ساتھ کرنا۔“

قحی اس کے ساگی اپنی گفتگو نظم کرتی، دوسری انڈوں بکری میں جن کو سب سے پہلے غم دیا گیا تھا آگئیں اور ساگی سرین کو بہت دھیر بھوز
 کر ان کے ساتھ چل دی۔

ساگی قحی سے فارغ ہو کر حمام سے نکلے اور نکاح کی طرح فوراً آئینہ خانہ میں داخل ہو گئی۔ آج اس کی سحر میں ساگرہ قحی اور اسے

حبہ رواج اور دار میں شریک ہونا تھا۔ ملک کے تمام شعراء، شایر، مثنوی، سخی، موزوں تھے۔ مورد دار میں ساگی کی آہ کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ تمام کو ساگی کناس کی آسانی رنگ کی چادر میں اپنا بدن چھپانے اور اسی رنگ کا بگڑا نقاب اپنے چہرہ پہ ڈالنے کو بتے رہ آئے ہوئی۔ سب گردنیں جھکا کر کھڑے ہو گئے اور ساگی اپنی جگہ پر غور سے مرتقلی تھی، کنیزوں کے منظر میں بیٹھ گئی۔

اس کے بعد مہنہ رواج ہوئی۔ ہر شخص جو نہ جانتا تھا اس کے ایک ہاتھ میں دار ہوتا تھا اور دوسرے میں دو بیج جو خد کے لیے مخصوص تھی۔ پہلے اس کے کندھوں پر پھولوں کو ڈال دیتا تھا اور پھر خد ویش کرتا تھا چنانچہ تھوڑی دیر میں ساگی کے چہرے پر موسم بہار کی بہترین عیدوار اور صفا انسانی کے نازک و لطیف ترین چہرے کا اظہار ہو گیا۔ شعراء نے اپنے قصا کو شروع کیے مثنویوں نے اپنے ساز و دست کیے یہاں تک کہ اختتام و راکتات قریب آ گیا۔ جس کے لیے ہر دل تڑپ رہا تھا اور جس ایک لمحے کے لیے یہ سارے تفکلات خمیدی برداشت کیے گئے تھے۔ یہ دستور تھا کہ جب دربار ساگر شمع ہو جاتا تو ان ہدایا کی پذیرائی میں ساگی کو ایک لمحہ کے لیے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دینا پڑتی تھی اور غالب اس برقی پاش دم کا یہ اثر تھا کہ تمام عام میں ساگی کی غائبانہ پرستش ہو رہی تھی اور ساری دنیا اس جلوہ میں اس کے لیے سب تپ نعر آتی تھی۔

جانبے کہ جس وقت ساگی چورے پارہ برس کی ہو گئی اور دل دربار میں نقاب پوش ہو کر آئی تو اس قدر بھوم نہ تھا لیکن اس کے بعد جب اس کے بے نقاب ہونے کی خبر منتشر ہوئی تو ہر سال لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ جب پانزہ سال ساگی کی سائگرہ ہوئی تو تمام اقطاع عالم میں اس کے صن کی آگ مشتعل ہو چکی تھی اور اس سال جب کہ اس کا شباب چورے سترہ سال کا تھا اتنا کثیر بھوم ہوا کہ شاید سرزمین یونان نے اس سے قبل اسے پودوں کا بھوم بھی نہ دیکھا ہوگا مگر غریبکہ وہ ساعت آئی۔ جب ساگی کو بے نقاب ہوا تھا۔ یوں تو جب تک وہ وقت نہیں آیا تھا ہر شخص ایک مستقل انتظار ایک لڑائی بے گنتی میں رہا تھا، لیکن جب وہ وقت آیا اور نگہبوں نے اس ساعت کا اعلان کیا تو اسے بڑے مجمع میں کوئی حرکت، کوئی صدا، اثر حیات کا پھل دینے والی نہ تھی، البتہ باعموہ کل ہو کر وہ گئے تھے اور آنکھوں نے جھپٹنا ترک کر دیا تھا۔

آخر کار ساگی اچھی اور اپنی طور پر، نازک انگلیوں سے نقاب کے دلوں سے ایک جھٹکے سے سر کے اوپر کر لے اور اپنے عرصہ میں سے سب کو کم از کم ایک گھنٹہ کے لیے جگر کاٹ کے جل دی۔

2

اگر دیش (زیر) کو اپنے حسن و جمال پر ناز تھا تو بے جا ناز تھا، کیونکہ ملدا آستان اور تمام آستان والے اس بات کو ان چٹکے تھے کہ دیش سا حسین ہوا، گویا خدا ہوتا ہے اور مظلوم نہیں، یونان والوں کو یہ آسانی عقیدہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ انہوں نے بھی دیش کو دیوی مان کر اس کی پرستش شروع کر دی، بہت قراٹوں نے اس کے گھمے چار کیے، مصوروں نے اس کی تصویریں بنائی، شعراء نے اس کے صن کی قریط میں قصا کہ کیے اور مصلیوں نے اس کے ترانہ پائے جمال سے دنیا کو بھوتہ عقیدہ کرنا چاہا۔ مگر یہ پرستار ہی صن (خدا) مان والوں کی دلوں کو خوش رکھے، کچھ اس سے بھی زیادہ وسیع جذبات رکھتے تھے اور اس لیے آخر کار انہیں منہ کے بل اس کے سامنے گر کر کہنا پڑا کہ "اے ملک صن تیرے گھمے باوصف اس کے کہ ملک کے بہترین نقاشوں کے، دلوں نے اپنی بہت سی راقشیاں ان کی چٹاری میں جاگ کر کاٹ دی ہیں، ہمارے

ہیں۔ ہمارے تھا کہ جس میں حسن کی نسبت لطیف ترین خیالات کو چٹیل نظر آتا کہ تیری تعریف کی گئی ہے، نامکمل ہیں اور ہمارے راک جن کو ہم اپنے بھائی سارا میں کے ذریعہ سے ایک زمانہ عودت کی صورت میں میرے آستانہ ہلال تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر وہ ناقص ہیں، مگر اسے تو، کہ حسن سے بھی بلند کوئی چیز ہے، اسے تو وہ کہ ہمارے خیال کی پرواز حیر سے سامنے ایک سرخ پر شکستہ سے زیادہ جس میں یہ نہ تھا کہ کیا ہے بلکہ ہمیں یہ دکھا کر دکھائی ہے۔" یہ جسے دنیا کے خیالات و فحش کے حسن کی نسبت اور پر تھا کہ ہم نے جتنی دماغی کامیابی۔

وہ روزہ جو آج سے بڑا دنوں سال پہنچتا تھا ان کے سامنے جو ماضی چلتی تھی، آج بھی شاید اسی انداز سے درشتاں ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ وہ اسے حسن کی دیوی کیجئے تھے، اور ہم ایک کہ غیر آباد یقین کرتے ہیں سو پہ ہو سکتا ہے کہ کسی زمانہ میں وہ آوارہ اور دھنیں وہاں کی ملک ہو، اور اگر جس ہو سکتا تو بھی ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ اس وقت اس ملک کی سبکراں ایک حسین و جمیل عورت تھی، جو ہر چند طبقہ انسان سے تھی، مگر طبقہ انسان میں اس کا اثر و رہتا تھا اور اس نے آسمان میں وہی زمانہ پایا تھا، جو سانگی نے زمین میں۔

اسی زمانے میں ایک دن کا واقعہ ہے (ہم دن کہتے ہیں، مگر ہمیں معلوم نہیں کہ اس ملک میں دن رات کا کوئی مضمون تھا بھی یا نہیں)۔ بہر حال ایک جزو زمانہ کا واقعہ ہے، وہ فحش اپنے کا شاندار طور پر چلی ہوئی کئیڑوں کا قاتل حسل و کچر دھن تھی اور نہایت سرور تھی، ایک بلور میں حوض جس کی تباہی و بربادی میں محض کیے ہوئے آئینہ کی تھیں، ہلکا بہت شگاف پانی سے لبرح تھا اور ان میں کئیڑے پیاں بہہ نہا رہی، اور آہیں میں کھیل، سی تھیں، چھنگ و فحش خود مسند کے کتب سے پیدا ہوئی تھی اس لیے وہ طعنا مریانی پسند تھی اور اس کے محبوب ترین مشاغل میں سے ایک مشغلہ یہ بھی تھا، طرہ فحش، اپنی پانچوں کئیڑوں کی اس جدوجہد کا قاتل نہایت اتمہا کہ سے دیکھ رہی تھی کہ ایک کئیڑے نے باہر سے آ کر کسی کے آنے کی اطلاع دی اور وہ اٹھ کر پہلی گئی۔

اور فحش کے ملک کی مشہور سیاحت اور شہرت کی دیوی، جو اس سے قبل کسی ہمارا کر، ارض کا ستر کھلی تھی اور وہ فحش کے بہت مقرب درباریوں میں تھی، و فحش سے ملنے آئی تھی، وہ فحش کچلی اور نہایت چاک سے پذیرائی کر کے اس کی مٹی سیاحت دنیا کے حلقوں پہ پھینک لی لیکن اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "اے فحش، میرے حالات سیاحت کے تمام جزو نجات سے آگاہ ہونے کی خواہش نہ کر، کیونکہ ممکن ہے کوئی بات اس میں میرے لیے اضطراب و افسردگی کا باعث ہو۔"

و فحش نے نہایت تحیر ہو کر پوچھا "اے ارادہ فحش، آخروہ کون سی بات اب کے دیکھ آئی ہے جو مجھے تکلیف پہنچانے والی ہو گی، مجھے یقین ہے کہ تو نے کہ درش کے ان دلیل ہاشموں میں، جن کی ہوانہ سنبھالے تو مت کے بل زمین پر گر پڑیں، کوئی بات اسکا نہ پانی ہو گی، جس کو ان کر و فحش ہے، کہا تو اس سے لعل وہاں کے حالات تھے جسکے کبہ اور کیا میں یہ سن کر ہستے ہستے چاہ نہیں ہو گی کہ انسان اپنے جسم کو ہاتھوں کی طرح مٹا دینا سے کھاتا ہے تو اس کے جسم پر مٹی کی کھیر بن جاتی ہیں۔ اے ارادہ فحش کہہ اور نہایت آوازوں سے کہ، جو کھو تو نے دیکھا ہے میں دیکھتی ہوں کہ آج تو اپنی ملک سے خلاف معمول کچھ مذاقی کرنا چاہتی ہے۔"

ارادہ فحش جو تمام دیویوں میں نہایت سنجیدہ و متین دیوی تھی، یہ سن کر کچھ گھبراہٹ نہیں ہوئی اور بولی۔ "اے فحش، مانا کہ تو نے ارض تکلیف ہے اور اس کے رہنے والے ملک کی ماضیت مٹی سے ہوئی ہے ذلیل ہیں، لیکن مائے کیا کیا جائے اسی کہ وہ میں ایک ہلکے برتنان بھی ہے، جس کا ذکر میں تھو سے نہیں کرتا، چاہتی تھی، لیکن جب تو نہیں مائی اور کھنکھی سے کہ میں غافل کر رہی ہوں تو سن میں بتاتی ہوں کہ وہاں کی جان کی چھوٹی مٹی جس کا ہم سانگی ہے، اسکی حسین ہے اگر خاک پائل جائے تو وہ فحش کو چاہے کہ اس کا ناز و غنا سے اور غر کرے، بلکہ اس کی سانگرہ کا دن تھا اور میں اس

تقریب میں اتفاق سے پہنچی گئی تھی، لیکن اسے دھن بیٹھیں کر دکھ میں جو اس وقت آتی اس سے دھن کو بے غائب دیکھ رہی ہوں، اور اس سے قبل جہازوں یا دہریہ جہازوں میں اس ایک مہر کی غائب نہیں ہو سکتی، غائب سائگی نے اپنا غائب چہرہ سے جدا کیا، اسے دھن میں افسوس کرتی ہوں اور رخصت کرتی ہوں کہ کبوں نہ افسان ہوئی کہ اس کی سمیت کیا آؤ گا اپنے دل میں ہے اگر کھلتی۔۔۔

دھن جس کے نزدیک اس سے قریب بھی اس امر کا امکان بھی تھا کہ کوئی اس کے برابر نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ سن کر ایک عرصہ اور وہ بھی کہہ افسانہ کی ماں سے زیادہ مسکین ہے۔ چونکہ چنی اور اس کے فرد میں کوئی جان سے ایسا سلسلہ نہ تھا کہ اس کا چہرہ و زرد چ گیا اور وہ سخت مگر مدد ہو کر سامانی ہو گئی، لیکن کچھ سوچ کر ہوئی۔

اسے دھن نے غصہ میں اچھی ٹھنسی آئینہ دکھا کر سائگی کی تصویر دیکھتی ہوں، اور اگر وہ ایسی نہ ہوئی تھیں تو ظاہر کرتی ہے، تو یہ کچھ دھڑکے دھن جس طرح حسن نہایت ہے، انعامات کی یاد دہا کرتی ہے اس طرح وہ چو بھی جاتی ہے کہ کس آئی اور جھوٹ کی یہ چیزیں نہ دیکھا ہے۔۔۔

اس نے اور اس کو رخصت کیا اور کھیزوں سے ظلم بند آئینہ تنگوار اپنے سامنے ایک طوری میں بیز پر رکھا اور سب کو بیکھہ کر کے چھپا اس کے دور و آٹھیں بند کر کے ڈھکی، یہ آئینہ دیکھنے کا طریقہ تھا۔ کوئی پردہ نہ تھا، وہ اسی طرح سر جھکانے اور آٹھیں بند کیے چلی رہی، لیکن اس کے جھرت و استہباب کی کوئی انتہا نہ تھی جب اس نے آٹھیں کھول کر آئینہ کو ایک ایسی تصویر پیش کر کے ہونے دیکھا، جو حقیقتاً دھن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ اس کی نگاہیں کاپ کر کر چہرہ آئینہ ہاتھ سے چھوٹ چڑا اور غیب مضطرب پانا لگا اسے اپنا سر ہلاتے ہوئے گئی۔

کالہ اور کھٹے ہوئے تھے اور دھن کا اضطراب کسی طرح کم ہونے میں نہ آتا تھا کہ دھن ایک تصویر اس کے دامن میں آئی اور اٹھنا بے تابی میں بکری بیٹا ہوئی۔ "جنگ میں سائگی کے من کا پی نہیں، کچھ حق، ہمارے وہ چھ سٹاش کرتی ہے جو اس کے من کو ہلکا ہلکا کر کے اور اس کی رہنمائیوں کو ہلکا کر دے اور اس کو ہلکا سے ہلکا کر دے، چھوٹا چھوٹا حق بھی نہایت شہ ہے، سخت ناکام رہا، اسے کچھ بھی نہ ہوئی وہ اچھی اور اپنے باغ کی طرف نہایت تیزی سے چلی رہی۔

کو پنے دھن کا بیٹا خانہ پر کمان اور ترکش میں تیرے لیے، اپنے پر دار بازوؤں کو سینے اور دھن پر ٹیلہ رہا تھا اور بھول تو ڈر کر ڈھیر لگا رہا تھا کہ اس پر مشق تیرا ادا کرے (چہرہ چھڑا دھن اس کی صورت ایک پر دار مصومہ بچہ کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا، اس کا شعور ان خواب تھا اور اس لیے اس کی نازک اندازوں کی کوئی انتہا نہ تھی، اور دھن آہستہ آہستہ اس کے پاس پہنچی اور اپنے کام سے ہٹ کر کہنے لگی: "اسے کو پنے میں سے ملے کہ جب تیرا کمان سے کر باہر نکلتا ہے تو جنگ کی زبان لڑائیاں تیرے ہاتھ جڑتی ہیں کہ اٹھنے کو پنے دیتی، چاہے عداوتوں کو پنے تیروں سے چھٹی کر دے، لیکن عدا کے لیے جہازوں میں دھن جھرمٹ نہ ڈال، کیا واقعی تیرے جہازوں کے دھڑلے جھرمٹ سے زیادہ آسان ہیں، کیا میں کچھ حق ہوں کہ ان جہازوں سے کہہ کر وہ دھن چڑھ کر آتا ہے، کہہ اور اس میں دھن کی بات کی چھوٹی چنی سائگی تیری تو کب نہیں، چاہا اور اس کو تاکہ دھن کا جوتا کھیتا تیرا ادا و طور دیکھتے ہے۔"

کو پنے یہ سن کر پلڑا کر گیا، اسے دکھار کا حال معلوم کر کے اس کی چٹکیاں بٹھکے ہو گئیں۔ کون شانہ سے اتر کر ہاتھ میں آگئی اور تیرا ترکش سے نکل کر کمان میں۔ اس کے ہر دوں کی ٹھیکیں ٹھیکیں اور دفعتاً نگاہ سے غائب ہو گیا۔

سائیکہ کی رسم ساگر، جس نے اس کے شباب میں ایک سال کا اور اضافی وقت کی موت کیا ختم ہو گئی، اور سارا عالم پھر ایک سال تک اس کو
 عمران کے انتھار میں تڑپنے کے لیے جھوڑ دیا گیا، جس کو ستارہ پھینکنے کی تمنا تھی اس کو وہ شہر چھوڑ گئی کہ اگر ساری دنیا سے اس وصیت کا کوئی عوض
 پناہ پا تا اور واقعی وہ عوض ان بھی نہ پا تا تو ساگی کے سبب نقاب چھوڑ دیا کہ اب کلا کے سامنے خاکستر حیات کا ایک ڈھیر ہو جاوے پھر وہ تمام عمر
 کے لیے اپنے نقاب سے بے نیاز ہو جاتی، لیکن اس کا صمن معلوم ہوتا ہے کہ حیات کو رفتہ رفتہ دنیا سے اٹھانا چاہتا تھا، اور وہ اس کو جھڑک کھڑا
 نکلو کر رکھ کرنے کا طور اختیار تھا، دنیا سے اب یہ خیال اعتقاد باق تھا کہ ساگی واقعی نوع انسان سے ہے اور یہ طواغیل کہ کم از کم ایک سی رات ایک
 ہی راحت، ایک ہی گھاس کے صمن وہ شباب میں تھا ہونے کے لیے مہمرا جاتے، آہا یہ خواہش تو ایسی تھی، جواب کفر میں داخل تھی کیونکہ اس کا
 صمن انہوں کے دلوں میں اب ایک عجیب و غریب عظمت کی صورت اختیار کر چکا تھا اور اس سے محبت کرنے کا مصلوب سوائے اس کے اور کچھ نہ رہ
 گیا تھا کہ دنیا اس کی پرستش کرنے لگے، مہمرا سے پوچھتے تھے، ساگی کا نام لیا ہائے تو لوگ سجدوں میں گر پڑیں اور جب اس کا واسطہ دلا دیا
 جاتے تو خالہ سے خالہ قہقہہ اٹا دیا اور دمک لے کر اور طواغیل سے طواغیل حاکم کی تلواریں جہاں تک اندھ بھگی ہے وہیں تک اٹھ کر رہ پڑے اور دنیا میں
 صرف وہی مہمرا وہیں قابل اعتبار سمجھا جاتے تھے ساگی کی قسم سے شروع کیا تھا ہوا، فرشتہ دیکھیں جو ان کو پورا یقین تھا کہ اب ساگی کی شادی کسی
 طرح نہیں ہو سکتی کیونکہ ان کی شخصیت بھگ بھی کیا جاتا تو یہ طواغیل کو کیونکر پہنچتی ہوتی کہ وہ ساگی کا شہر ہونے والا ہے۔ حال تو کوئی شخص ایسا نظر
 ہی نہ آتا تھا جو یقیناً اس رات کا اہل ہوتا کہ ساگی اس کے آغوش میں سپرد کر دی ہے نہ اور اگر کوئی ہوتا بھی تو یہ بالکل یقینی امر تھا کہ ساگی کے
 صمن کی برداشت اس کے امکان سے باہر ہے، مہمرا دل اس سحر میں ساگر کی تقریب میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ شاید کوئی انتخاب ہو سکے گا
 لیکن انصاف سے کہ اس میں بھی کوئی کامیابی کی صورت نظر نہ آتی۔

سائیکہ کے ٹھیک اور سے ان شام کو ساگی اپنے باغ میں غرض میں چٹلی ہوئی، دھنیں چھلیوں کی دھڑاری کا نشانہ دیکھ رہی تھی، وہ شاید
 چند لمحوں کے لیے اس بات کو بھول گئی تھی کہ وہ وہی ساگی ہے جس کی ناکامیاب رسم ساگر، ابھی دو دن ہوئے ختم ہوئی ہے اور وہ اس سال بھی
 اپنے شباب کو غلط دھڑکی میں گائے کے لیے چھوڑ دے اور وہاں سے واپس آنے کے بعد ایک دن تک اس کی اطرد کی کا یہ علم ہوا کہ دنیا کی
 ناکامی تقریباً محسوس اسے بے بسی نظر آتی تھی اور سرت کا جو دافل مفلو، وہ کھینچتی تھی کہ موت ہونا، اور ارا صمن ہونا ایک ایسا قریبے جس کا
 مدنی ان دنیا میں ممکن نہیں اس نے کہنا نہیں کیا۔ کیونکہ تھکے حیات کے لیے ہے اور وہ کھینچتی تھی کہ شاید موت کا شباب موت کی حیات
 سے جدا کوئی چیز ہے، جانوں میں شاید نہ کرتے ہی ابھی تو اٹھ چٹلی کیا فرکیں؟ آئینہ دیکھا تو منہ پھیر لیا کہ آہ ساگی جہاں کہیں بھی ہے
 مقصود و امر او ہے، پھلوں کے باغوں ہی، دیکھ کر سوچا کہ اس نے نہیں پہنے کیونکہ وہ کھینچتی تھی کہ شاید گروں کا کوئی اپنے لیے نہیں
 پہنتا، ہمارے لے کر ان میں نہیں ہوتے کہ ان کی کھبت کو صرف ہوا اڑانے لیے پھرے۔ ان سے یہ مقصود نہیں کہ وہ ایک امیر وہ چنے پر پڑے
 پڑے سوچا کہ انہیں کھٹ شاید ان سے یہ وہ ہے کہ کوئی دوسرا ان کی کھبت سے حقارت ہوتے والا ہو اور ان کی جنش ایک جڑ کئے ہوئے دل کی
 بامب سے اسے دھڑکی کا جواب دے اور انہوں ناکام سینا ایک حرام ہے اور حرام پر چڑھائے ہوئے بھول گیا، اس نے گائے میں بھی دیکھی
 نہ لی کیونکہ وہ دل میں کچھ نقصان محسوس کرتی تھی۔ ساروں کی بہت سے یہ گمان تھا کہ شاید ان کے ناموں میں کسی خاص تاریکی ہو گئی ہے اور

چیز پر غور نہ کر چکے ہیں، اور نہیں جانتے ہیں، مسرت آنکھیں اور سوتالی بن گئیں، فیک بھی وقت تھا اور بھی عالم کہ کیونکہ اپنا حق و کمال سنہارے نگاہ میں سے نکلا اور اس ادارہ سے نکلا کہ آج پتا چل گیا کہ وہ کمال کی بات کر رہے تھے۔ لیکن نکات کو پیش نظر رکھنے کے لیے، کیونکہ نے ساگی کوٹا، بھر کے دیکھ ہی تھا کہ یہ جنگی سے چھوٹ گیا، کہاں ہاتھ سے گر جائی، چھڑا تیرا اور کیونکہ پیش کھا کر نہ میں نے گر جائی۔

آء کاٹھ کوئی ساگی سے اس وقت جا کر کہہ دتا کہ جس عورت کی اس کو تھوکتی ہو، خود اس کی آرزو مند ہے، جس عشق کی اسے تھوکتی ہو، اب خود اس کا عشق ہی ہے، دنیا خود اس کا بھروسہ ہے۔ عشق خود اس کا ریا، یا اس ہے اور حیرت آپ اس کی نگاہ کا رنگی۔

اسے کیونکہ قوت سے انگوں ہاتھوں پر حیرت جاتے ہوں گے، خدا معلوم کتنے سینے تو بے گروہ کے ہوں گے، لیکن وہ حیر جو حسن کے درخت میں پیاں ہیں وہ یہاں نہیں صرف ایک عیسویہ شیزہ ہی کی غم باز آنکھیں چلا سکتی ہیں حیرتی ڈاک اندازوں سے کبھی زیادہ، جاہ کن ہیں۔

جاہ حیرا جے ناب صرف فیکر ہے، بازو سے ہوا حیر کی کوئی نہیں صرف اک تیرا ہے، بے ملو، جو کچھ ہوتا تھا ہو گیا، فرشتوں نے سما تک میں تھرایا، جو رو نے اپنے کا شاتروں میں سن لیا کہ خوش کا بیٹا آج ساگی کے ہاتھ میں بے ہوشی جا رہا ہے۔

دش کی یقین تھا، اور دش کی ہر جگہ کیونکہ کی بے نہ ڈاک اندازوں کا حال سن چکا ہے، وہ بھی یقین کرنے کا کہ ایک ساگی کیا اگر اس جیسی طرز ہوں تو وہ جنگی کی صرف ایک جھنجھٹ سے سب کے ہاتھوں کو پھنسی کر سکتا ہے۔ مگر فطرت کے پاس اک تیر اور تو، ایک ڈاک اور تھا، جو کیونکہ کے تیروں کی طرح بدنام تو نہ تھا، مگر ان سے بڑا وہ کار تھا اور جس وقت ساگی اس عالم میں آئی تو وہ ڈاک اس کی نقلی آنکھوں میں اٹا ہوا کہ نہ دیکھا گیا، کیونکہ کو تو جرات بہت پہنچانے کے لیے قصد و ارادہ کی ضرورت تھی، اجتہاد، انصرام، اور کار تھا کہ کہاں میں تیر کے ہاتھ پہنچ کر جنگی اٹھلی کرے، لیکن ہر جگہ کی مسرت آنکھوں کو یہ ہوش کہاں، اندوہ کسی قصد کو یا غیبتی اور نہ کسی اجتہاد کو، وہ نہ کسی ارادہ سے واقف تھی اور نہ کسی انصرام سے، ایک باز پک سے چمک جدا ہوئی اور تیروں کی پاش شروع ہو گئی۔

غریب کیونکہ ساگی کے ہاتھ سے ڈھکی ہو کر پھرا اور اسے دفنی کی گرم ہاچیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کا دل پاش پاش تھا اور اس کی روح نکھر چلا تھی۔

وہ ہاتھ میں ٹھیل رہا تھا اور نہایت اظہار کی حالت میں اپنے اضطراب و حیرتاری کا لطف اظہار تھا کہ دش کی آنی اور غلاف معمول اس روز یہ مقصود اور دور تک کر رہی تھی۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہ کہہ سکتی تھی کہ کیونکہ کسی مجھ سے کام نہ مارا، وہاں آ سکتا ہے، چہ جائیکہ اس کا مستقبل ہو، اور نہ وہ کہہ سکتی تھی کہ کتنی اور بھڑکے جوشی اور ایک خاص انداز سے بولی "اسے کیونکہ مجھے پتا چل گیا کہ میں اسے خالی دیکھ کر طیش ہوں اور میرے ہاتھ سے کھانچ کر کو آج تو حیر چلا رہے ہوتے چنگیاں دکھا گئیں، ہاں، سمجھتی ہوں شاید اب تو اسوں کو بتا ہوا کہ کیوں ساگی کو دفنی کیا، وہ ایسی ہی عیسویہ ہے، اور اسے کیونکہ بھی، وہ تھی جس نے اس کی جاسی ویرہی کو رام کر لیا تھا۔ اسے کیونکہ ہول، بھڑکی کہہ کر وہ چلا نہ اور وہ اداس سے سر ٹھکرا رہی ہے، چلا اور اس میں کبھی خراب وقت بھر رہی ہے۔"

کیونکہ ساگی کی نسبت چاہی، کھنگلی کا ذکر نہ سن سکا، وہ بے قرار ہو کر ہول اٹھا۔

"ہاں بھرا، کھنگلی بھی خالی ہے اور چنگیاں بھی دکھتی ہیں، کیا تیرے طرمان سے کا صبر نہنے کے لیے یہ خذ کافی نہیں ہیں، میں ساگی کے بھروسہ ہونے پر ہنسوں نہیں کرتا، کیونکہ وہ بھروسہ نہیں ہے اور اگر کہیں وہاں میں پریشان بھر رہی ہے یا وہاں سے سر ٹھکرا رہی ہے تو وہ تنہا نہیں ہوگی، کیونکہ نے اپنی کہاں تو زوال، حیروں کو پھینک دیا اور اب اس کی زندگی صرف یہی ہے کہ وہ ساگی کے درد و مصیبت میں، اپنے قہقہے

مٹا دے۔ اسے دھن بجھے طاقت نہ کر، کیونکہ وہ اپنی تیرا انداز میں مجھ سے زیادہ مشتاق تھی اور مجھ پر بے انتہائی مہربانی نہ کر کیونکہ ساری عمر میں آج ہی تو یہ مظلوم ہوا ہے کہ میرے چلانے سے میرے کھانے میں زیادہ مزہ ہے، آہ اگر مجھے یہ دلتک نہ ہوتا کہ نہ مانا اس سے کہو کیجئے گا تو میں اس کو اس پرانی میں کہ وہ میرے طوق کے بہترین قطرات سے درختیں ہوتا، لوہے کی چونچوں پر نصب کرو چاندی میں کی اس پے مثل یادگاری پر مشقی سارے آسمان، انوں سے کرا کر گر گئیں وہ پہلو میں ہے اور وہ رہے گا تو اس کے کالائے کی کوشش میں سے پھر میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ کر کاٹے۔"

عائش کے استیصال کی ضرورت نہیں کہ دھن پر کچھ نہ کی اس تقریر کا کیا اثر ہوا، وہ انتہائی فیض و غلبہ کی حالت میں وہیں سے چلی گئی بلکہ سب سے پہلا نظم جو اس نے دہائی آ کر دیا یہ تھا کہ "ساہن سفر دست کی جائے۔"

یہ ان نجات جلالت کے ساتھ اجتماع و چہاری میں مسرور ہو گئیں اور وہ ہادی کی تلواریں دھن کے بلو میں پھٹنے کے لیے آ رہی۔ پر اگر گھوڑے جن کا ساز و راق بجا رہا ہے کا تھا اور جن کی دھواں ہال میں نہایت آواز موزنی کندھے سے سوئے تھے دھن کے دریاں چھوڑ کر گئے اور معاصرین کھڑوں، اور پرچوں کے دھلکا پادلوں کی طرح جو نہ پر چھا گئیں اور پھر قہوڑی دیر بعد آلاب کی روشنی میں تھیل ہو کر گام بہ ہو گئیں۔

4

سارا راج آج چرخاں ہوا با تھا۔ اور راجان کا بڑا بڑا سر قریب ہوا۔ ایک سیلاب مسرت تھا کہ ہر بیٹائی اس میں فوق نظر آتی تھی۔ ایک طوفان ٹکا تھا کہ ہر دل اس میں ڈوبا ہوا کھائی رہتا تھا، ہر گلی کو چہ میں درہم کی پاشی ہو، بی بی، شادی، انیس، کاسٹلہ، رابر ہادی تھا اور نہیں کہا جا سکتا کہ ناکے کی پاشی میں ایک دواؤں کے دست کرم نے اس سے زیادہ دلچسپی نہ لیا ہو۔ آگسٹس، دہائی، چان کا مہر سلطنت نہ صرف اس وجہ سے عہد زریں گھما جاتا ہے کہ وہ سب اختصار، شہم و فیض تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ دہائی کا غیر خواہ بادشاہ راجان کی تاریخ میں اور کوئی دوسرا نظر نہیں آتا اور یہ نہ سماں کی کہ تھا کہ میں کہیں طرف رہا گوڑ پر ہار احسان کر رہا اور اس سے بہتر موقع اس کے لیے اپنا حوصلہ کالنے کا اور یہ ہو سکتا تھا کہ دہائی دو مہینے بھٹیوں کی شادیوں کر رہا تھا، اسرار اور ہارز راہ و تھو اور ہادی پر ہر چچ بجا رہا کہ۔

راجان کے تمام امراء جمع تھے اور پانچ تخت کی ہر مہینہ لڑی شادی مہمان تھی، انکا دس دیکو پڑا، ساہجی کی دونوں بھینس سر سے پاؤں تک بجا رہا، اس میں فرق دہائی بی بی، بی بی، اور ان کے خوش نصیب اور ان کے پہلوؤں میں مسرت دہر شاد، ملک کی بہترین موزیکی سازوں سے اعلیٰ دہائی تھا، اور راجان کی اعلیٰ ترین شراب اور دہائی دہائی گلاسوں میں چٹک رہی تھی۔

نیک سخی وقت تھا اور جشن طرب کا سخی عالم کہ دربار کے مکان کا ایک در نہ کھلا اور کوئی بیچ اندر آ کر روشنی میں مل کر رہا، ہوا چھوڑ کر تخت سے چھٹ کر رہا۔

نئے ہرن ہو گئے، مسرور مظلوم ہو گئیں، دکن کی ہلکے خطر اب نے لے لی، دہائی بھان پر ہر سہاگنی نے چھڑ کر لیا، اور ہر شخص ہوشیاری طرف دوزخ اور دہری طرح خواب رہا تھا، آنکھیں شدت درد سے ابلی ہوئی تھیں، اور کسی کی کھمبہ میں نہ آتا تھا کہ کیا بات ہے، ملک بچ کر

جب وہ اس ساراہل سے اپنی تسلی کر چکی تو اپنے مریض شوہر کے ستر عطا کر چکی اور سب کے سامنے ساگی کو نکال کر کے یوٹی ک
 "اے بیٹی! اتنا دھرم بھاریں تجھے اپنا زنت دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہوتی ہوں اور اس کی تعمیل کر کے اپنے فرض کو ادا کر دے
 ساگی میں چند لمحے بچیں ہے کہ تیرے بعد میں زیادہ مدتی سکوں گی۔ لیکن اگر تجھے اپنی ہی جان دینی چاہی تو کیا تجھے پس و پیش کرنا چاہیے تھا، پھر
 میرا چلا جاؤ گی تو میری اپنی ہی جان کا پتلا ہونا ہے۔ میرے بلکہ کے کھڑے دیکھ اپنی کھڑی سے اس وقت میرے اردوں کو کھڑے کر دینا۔
 تو نہ وہ چہ چنان نہ ہو، کیونکہ جی میں بھی بہت جلد تھوڑے آٹنے کی اور پھر بھی جلد نہ کرنے کے لیے تجھے اپنی آغوش میں لے لے گی۔"
 اب ملکی آنکھوں میں آنسو اٹھانے لگے اور اس کی آواز کانپنے لگی۔ یہاں تک کہ اس کی ہلکی جلد لگی اور پھر آگے چہ رو بال دکھ کر
 اس بات کا اشارہ کرنا چاہا کہ "بس اب ساگی کو لے جاؤ اور وہ نہ کرو۔"

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ساگی نے اول اول اس طرز کو کہ وہ قربان گاؤ پر چڑھائی جانے کی، کس طرح سنا اور اس حالت اشکبار کو جب تک حکم
 لے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کیونکہ کانٹا مگر ہاں یہ ایک واقعہ ہے کہ جب اس کی نسبت ایک قطعی رائے قائم کر لی گئی اور اسے پھاڑ لے جانے کی
 تیار ہاں ہوئے تھیں، تو وہ بالکل مردہ ہی تھی اور اس کے قوائے ہائیکل جواب دے رہا تھا۔

صوت سے اس کا بالکل غلطی مرتبہ اس لئے ساگی کیونکہ مسکاتی ہو سکتی تھی لیکن اس میں نکام نہیں کہ جس علم نے اسے گناہ کا دوا دیا جس
 صدر نے اس کی آنکھوں سے آنسو بہا کر کہے "وہ صرف یہ تھا کہ "میری جدائی کو اس، کیونکہ برداشت کر سکتے گی۔" اس نے اپنے ہاتھ
 پاؤں ڈال دیئے۔ بدن ڈھیلے کر دیا اور اس طرف گواہی لے اپنا زنت دے دی کہ اس جسم کو جہاں لگی چاہیے لے جاؤ۔

اکاثر اس کے پٹے سے جلدی جلدی سارا انکسار ہو گئی کا کیا اور غریب ساگی کا زنت دینا تو ایک گاڑی پر ڈال کر کوہ انوکھی طرف چل
 دیئے۔

سوا گوار ہاں۔ جس کی حالت دیکھ کر کوہ انوکھی کے پیچھے پہنچے ہاتھ تھے ساتھ ساتھ تھی اور اک جھم تھا جو پر داند و اس شہرہ کو گھیرے
 ہوئے تھا، سارے شہر میں ایک کیرا مہر پڑھا، اور گھر میں جلد و انجم۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو خوش باندہ ہو اور کوئی دل نہ تھا جو بے قرار نہ ہو۔ یہ معلوم
 ہوتا تھا کہ اس وقت ساری کائنات چلتی دیتی جانتے کو ہے اور آسمان ٹوٹ چڑھنے کو۔

ایکے کھنڈ میں یہ جماعت اس چوٹی پہنچتی تھی جہاں ساگی کی قربانی پیش کی جانے والی تھی اور جلدی جلدی اسے ٹھانڈا بلوط کے اس درخت
 سے ہاتھ دیا جو سب سے زیادہ لمبا ہاں وہاں کے درختوں میں تھا۔

اب اس کی ہارک کھانیاں جو ایک ایک چوڑی کا پادری برداشت نہ کر سکتی تھیں، ابھی پشت دہی سے ہاتھ دہی گئی تھیں اور وہ گھر جس کی
 نزاکت کی پائیکل کے نیچے چاند ہاتھ فیتہ کی داند تھا اور دست کے زبردست تھے سے کس دی گئی تھی اس کی دلی ریشمی چادر سے وہ نصف
 پاندہ تھی اور نصف اوڑھ لی تھی اس سے جسم پر تھی لیکن وہ خواب جھٹ سال سے اس کے چاند سے کھڑے کو اپنی آغوش میں چپا کرے ہوئے تھا،
 اب یہ تھا، کیونکہ یہ بھی برہم تھی کہ جس کی قربانی کی جانے اس کا سرہ چہ وہ ہند کر دیا جائے۔

ساگی کا یہاں تک ڈا دیا جاتا اس کی کھار کا جیوں کو ہاتھ نہ کر دست سے کہہ دیا جاتا، یہ سب عالم لے ہوئی میں ہوا لیکن جس وقت اس
 کی ہاں نے چٹا پاندہ آغوش بوسہ کی کیوٹائی کا لیا تو ساگی کی آنکھیں کھل گئیں اور چٹک اب وہ ہاتھ نہ جھڑکتی تھی (کیونکہ وہ ہند سے
 سوسے تھیں وہ قہموں پر نہ کر سکتی تھی) (کیونکہ وہ درخت سے کس دی گئی تھی) (کیونکہ اس کے حلق و زبان خشک تھے) اس

لیے اس نے دوسری اچھی دوسری ہاتھیں جو دیگر اعضا سے کی جاتگی تھیں اب صرف اس کی آنکھوں میں کچھ کراچی تھیں اور اس لئے عالم پاس میں اس کی آنکھوں کا ہاں سے دم طلب کرنا حقیقتاً ایک ایسا بل ہا دینے والا مظہر تھا جس کی تاب بھلا غریب اس کی آنکھیں تھیں وہ بہ ہوش ہو کر گر پڑی، لوگوں نے اسے اٹھایا اور سامگی کو یوں ہی بجا پہاڑ کی چوٹی پر چھوڑ کر چل دیے۔

مگر آ، وہ سامگی کا کسم، کسم، کراک آ غری شاہ وایس کے ساتھ دیکھنا اور اس وقت تک اپنی طحال گردان موزوں کر دیکھتے رہنا جب تک سب لوگ غمروں سے مل جھل نہیں ہو گئے (کہ شاید اب بھی کوئی رحم کرنے کا سینا اور ناک نکال دیا کہ شاید اگر وہیں خود بخود ہوتی تو وہ بھی آنسو بہاتی مگر آ، وہ وہیں وہاں تھی کہ اس کو کچھ رحم آتا اور وہیں وہاں سوچ تھی کہ ہر ایک ہار بیچ کر اپنی غلی کو بھینے سے نکال لی۔ صرف ایک سناں پہاڑ کی چوٹی تھی اور حشمت ناک جنگل کی خاموشی جس کی ساک وہ سچ لٹھا میں سہی کی نکال دیا انہیں گم اور وہ خود ایک طرف گردان ڈال کر رہ گئی۔

5

”اب خواب کی ٹکڑے پیٹنی دیوی جا اور اس کی آنکھوں کو اک شیریں سونہی بھر دے اور تو بھی اسے جیم کی دیوی اٹھا اور اس کی کمر اور کلائی کے بند چا کر دے، کیونکہ قاتی نوع انسان میں ایسا ساحر ملدو حسن میں نے بھی نہیں دیکھا جلدی کہ کیونکہ صرا دل اس کی محبت میں پانکھ رہا ہے۔“ کیونکہ قاتی اس اچھا کو ان دیویوں نے سنا اور ملتا کہ وہ ان کی اس خوفناک چوٹی پر پہنچی تھیں، جہاں ایک شاہ ملو ط کے تنے سے یہ پائے ملو ط اور ہاتھ۔

شاہوں میں جنتیں شروع ہو گئیں۔ چپس ملے تھیں اور رفو رفو ایک لطیف و محبت پر ہوانے سارے پہاڑ کو مسخر کر دیا۔ سامگی کے داغ کا اس تجربے کا اثر ہوا تھا کہ اس کی آنکھیں چمک چمک گئیں اور اس کا سونا تھا کہ ہاں چھوٹے اور حشمت سے جدا کر کے اپنے ہاتھوں پر سنبھال کر فرش پر لٹا دیا۔

سامگی بے خبر پڑی سو رہی تھی، جا اور اس کے سر و پیٹ سے جدا تھی اور اسے یہ ہوش تھا کہ ایک حریف آ نکھ سے دیکھ رہی ہے۔ اس لئے اپنے گرداں حصہ جسم چپا کر اسے منہ چاٹا چاہے اس کے بال ہوا سے اڑا کر اس کی پوٹائی اور چہرہ پر لے کر ہے تھے اور اسے کہہ کر تھی کہ ایک غیر غصہ اس سحر سے لطف اٹھا رہا ہے، اس لئے اپنے بال درست کر کے چہرہ پر کتاب ڈال لیا تھا ہے۔

کیونکہ اس سے قلمی جب سامگی کو داغ میں دیکھ تو وہ بے کتاب ضرور تھی مگر خواب تھی، لیکن اسے کیا خبر تھی کہ جب صحن سہا تھا بے حد کیا ہو جاتا ہے اور جب لباس بے ترتیب اور بال برہم ہو جاتے ہیں تو ایک عورت کیا قیامت ہو جاتی ہے۔

کیونکہ خاموشی و تجر کھڑا کیونکہ ہاتھ اور جہاں ہر ہاتھ اس کی کچھ میں تھا تا تھا کہ سامگی کی کھلی ہوئی بلوریں گردان کو دیکھ کر اسے یا صرف اس کے گرداں میں کھڑکی اس کے یا قاتی ہو گئی پر ہاں دے یا اس کی کشادہ پوٹائی پر۔ اس کی ٹھہر اس امر کا فیصلہ کرنے سے کام تھی کہ سامگی کی سیاہ و ابرو اس سے محبت کرے یا اس کی حوالی آگے سے وہ تجر تھا کہ اس کی بازگ کر رہے اپنے تئیں جا کر اس کی کٹیہ و قاحلی کے انتہائی کامیاب ہے۔ وہ وہی عالم حیرت و استعجاب میں کھڑا ہوا اور آٹھ کا کہ فیصلہ کر کے سامگی کا رہا اس سے بہت زیادہ بلند ہے کہ کوئی شخص اپنے تئیں اس سے محبت کرنے کا اہل سمجھے وہ اس کے قدموں پر گر پڑا اس کے تئیں کھڑکی پر ایک طویل رسد سے کہ یہ کچھ ہوا اٹھ بیٹا کہ

ابتداءً فرشتے سے لے کر اس وقت تک کہ اولیٰ الحس کی زندگی میں یہ پیدا واقع تھا کہ اس نے کسی آبادی کو اپنے دامن میں جگہ دی ہو
کیونکہ اس کی بلند چوٹیاں نہ صرف اس وجہ سے کہ وہ اونچے چوٹی کی جگہ کا، جس، بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ان کو آباد کرنے ایک انسانی قوت سے باہر تھا
بیٹھ مسلمان اور ویران رہیں۔ تا قاضی یہ نقل حقیقہ عماروں کی تاریک وسعت، نہایت ہولناک سیاہ پانی کے حقیقہ ششوں کی من وسعت میں
دھانی، بڑے بڑے درختوں سے بچے، ہونے والا، ہوا کا مریب سنا، ٹوٹا ٹک درختوں کی گرج کی آواز باز آگیت، بڑے بڑے کانٹوں والی
جھاڑوں کا ایک غیر خیر خلیہ، اور اسی طرح کی اور بیٹھ سی ذرا فانی چڑوں اور جسم میں لرزہ پیدا کر دینے والے مناظر کا مجموعہ۔ یہ تھا کہ وہ
اولیٰ جس جہاں کیونے نے سبھی کے ساتھ رہنا پسند کیا، اور یہاں تک کہ اس نے اپنی کھسی اور ناچر پہکار دی سی کے لحاظ سے کہا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا
کہ جب وہیں کوثر ہو جائے گی تو وہ کوئی قدر سائنسی کی طاقت کی نشا عیار کے کی۔ مگر وہ کہاں جاتا؟ کہ وہ اولیٰ جس ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں کسی
کی رسانی نہ تھی اور، اپنی زندگی سبھی کے ساتھ امن و سکون کی حالت میں بسر کر سکتا تھا، کیونکہ جب وہ پتھر کو کوئی طباب کرنا ہوتا تھا تو وہ اسی
پہاڑی کی چوٹی پر ہوا کرتا تھا اور طباب نازل کرنا تھا، چنانچہ اس سے قبل دارہ کو اولیٰ جس کی چوٹیوں سے جیہ پتھر کا خضہ ٹک بن کر نکلا اور درود
آبادیوں کو بڑا ہوا کر گیا، پھر ایک جگہ جو اسان سے دو تاقوس میں سب سے بڑے دو تاقوس کے خضر کرنے کی جگہ ہر کوئی ہا سکتا تھا مگر چونکہ کیونے،
جیہ پتھر کا محبوب تر ہے چاہتا اور اپنے فرشتوں کے لحاظ سے نہایت اہم مانا جاتا تھا اس لیے وہ وہاں پہنچ سکا، اور اپنے ساتھ رہنے والی خصوصیات
دو تاقوس، مادھس اور تھیر کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

اس زمانہ قہر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، جو اس نے سامی کے خوش کرنے کے لیے تیار کیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کیونے سے مواصلت کی
سرت ایک ایسی سرت سامی کے ہے تھی کہ ایک ہند تک قوتے ہوش بھی نہ ہوا کہ وہ ہے کہاں۔ مگر پھر سے ایک ہند تک اس برج طاری کی
شخصت میں بند رہنے سے بعد، وقت آگیا کہ سامی کو اپنی ہی زندگی پر یکہ غور کرنا چاہا اور اسے یہ معلوم ہوا کہ اب کیونے اس سے زیادہ مستقل وقت
نہیں دے سکتا، کیونکہ انہیں آسمانوں میں کیونے کے مطلق بیخود نے سے کرہ ارض میں کی مطلق، بے رنگی اور زندگی بہت تک ملی تھی اور اس
لئے ضرورت تھی کہ وہ اپنا جیہ وہاں سنبھال کر لہایت سرگرمی کے ساتھ اس کی کو پر راکرے، لیکن سوال یہ تھا کہ جب تک وہ نہ جانے گا سامی کیونے
اپنا وقت ہر کرے، کیونے مثل میں اپنے تئیں لہجے سے رنگی گی جس کا جواب ذرا دشوار تھا مگر آخر سامی نے یکہ رنگ سوچنے کے بعد کیونے
سے التجائی کرد و حال قصہ میں ان تمام سہا سہا تقریر کو سمجھا کر، جن کی وہ اپنے زمانہ و شیرازی میں مادی تھی۔

کیونے نے دو ٹوک سے اظہار کر دیا کہ اسے ہرے جو خود قوت غالب ہو گئے، لیکن بجائے ان کے وہ حسین فرشتے جن کے پروں میں
طراس تھے ہونے تھے اور جن کی عمریں ۱۳، ۱۴ سال سے زائد تھیں گل کر سامی کے سامنے کھڑے ہو گئے، کیونے نے ان سے کہا کہ ”ہاں اور
قلم اس کے حکم سامی اور زون تک پہنچے تمام حوائی قہر کو ان مناظر سے آہاد کر دو جو دھانی پیمان کے ہیں سے متعلق ہیں۔“ امن کو خستہ کر کے
کیونے نے جتنے گندہ تھے وہاں، گئے تھے سب کو فرش زمین پر پکنا شروع کیا، یہاں تک کہ تمام زون میں سارا قہر مہیں پروں سے بھر گیا اور
سامی ان پر اور چلی خدشوں سے مگر کی سامی کے ہاتھوں میں مختلف قسم کے ساز تھے، جن کے تاروں سے دھواش کے وقت جب سحر فرستہ پیدا
ہوتی تھی سامی اس زمانہ کیا میں اس نوع کے گلاب و غراب سے اس وجہ آٹھا ہو کہ تھی کی اس سے زیادہ حیرت نہیں ہوتی اور کیونے کے شانہ پر

باجوہر کے گھر پر یوں کے مصلحت میں قصر سے باہر نکلے لیکن اس کی نگاہ دور انداز سے باہر نکل کر پختی کی تھی کہ وہ مشن شروع ہو چکی کہ شاہ ایران کا باغ
مسی اپنی اقامت، رہائشیوں، گھروں، کنوئیں، فواروں، درختوں اور عمارتوں کے کیمرے پر نکلے جو سکا، وہ اپنے اس باغ اور اس باغ میں جو فرائض نہ
پائی تھی وہاں اس کے کہ وہاں بلور کے کنگرے روشنائی پر بیٹھے ہوئے تھے اور یہاں فوارہ ہائے طعاس تھے، وہاں حوض رنگ مرمر، بلور کے تھے
اور یہاں شگاف طلا اور مصطل کی ہوئی چاندی کے، وہاں وہ اپنی ادنیٰ کی کی سب عمارتوں کی سرکاری تھی اور یہاں وہ کوہ کے ساتھ مست و
سرشار تھی۔ ساکھی خوش خوش اس باغ میں داخل ہوئی اور ٹپکتے ٹپکتے ہر جگہ کو دیکھتی ہوئی پھولوں کو سمجھتی ہوئی کوہ کے گولے کرچے کے کنارے کے اندر چلی
گئی اور ساری یہاں باہر صوبہ کھڑی رہی۔

شاہر ہو گئی تھی، چاند نکل آیا تھا۔ اس لئے پھر ساکھی وہاں سے نہیں نکلی اور وہ رات قصد اس نے کوہ کے ساتھ اس کچھ میں بسر کیا
چاہی کیونکہ جب وہ ایران میں تھی تو یہی کچھ تھا جہاں اس نے پہلی ایک طویل رات نہایت کرب میں گزار دی تھی۔

7

کچھ زمانہ ہی انداز سے گزرے کہ کوہ پڑوہا دونوں کے لیے باہر چلا جاتا اور پھر ایک نیا شوق، نیا جوش نے کہ وہاں آتا اور ساکھی کے
پاس رہتا ہر چند ساکھی بھی اس کی عادی بننا چاہتی تھی اور کوہ پڑوہ کی نسبت میں ہتکار کی کھڑکیاں مختلف مشاغل تفریح میں کافی تھیں لیکن وہ کوہ پڑوہ کی
اس کھڑکی کی عادی کی ممانعت سے بعض واقعات بہت دل گرفتہ و مصطل ہو جاتی، اور وہ اپنے بھائی، پھوپھوں اور پر یوں سے بیز ادب اور چاہتی تھی
کہ کوئی ایسی کام جس میں مل جائے اور اس سے اپنی موجودہ کامیابی کی دالے۔ وہ ان پر یوں سے صرف انہماک سے کام لیتی تھی، کیونکہ کام کرنے
والی یہاں بات نہیں کر سکتیں اور شاید کوہ پڑوہ نے کسی مصلحت کی خاطر ایسی کھڑکیں مہیا نہیں کیں، جن سے ساکھی لکھ کر سکتی۔ فریاد جب کوہ پڑوہ
جاتا تھا تو وہ غلطہ حوض پر پانی اور ہدف اس کے کہ کھڑکیوں کی ایک کثیر تعداد اس کی جلو میں ہوتی، وہاں سبہاں حشر کے تصوروں سے کھرا
کر بھی لگتی کہ "میں تو اب بھی ویسی ہی اکیلی اور تنہا ہوں۔"

جس وقت تک صورت اپنی بہت میں کامیاب نہیں ہوتی، اس وقت تک تو اس کی زندگی ایک آل کی سی عظمت آدمیہ زندگی ہے وہ نہ
کچھ چاہتا پسند کرتی ہے اور نہ کسی سے بات کرتا۔ لیکن جب وہ اپنی بہت میں کامیاب ہو جاتی ہے، جب اس کی حیات حاشا شک کا عمل صورت
اقتدار کی لگتی ہے تو وہ پھر اگر تنہا بھی ہے تو بھانے طوفاک انہیں ہے اور عظمت سے سخت بڑا، جب تک اس کی بہت کا کوئی جواب دینے والا
نہیں۔ لیکن جب کوئی ایسا شخص اسے مل جاتا ہے اور اس کی جراتی کی لذتوں کو اس کیلئے قابل فہم بنا دیتا ہے تو پھر صورت اپنی سرت کے ہار کو
برداشت نہیں کر سکتی اور اپنی ہی جنس کا کوئی فرد اپنے پاس چاہتی ہے۔ جس سے وہ اپنی لذتوں کا اظہار کرے یعنی جس طرح وہ اپنی کامیابی
میں دوسروں پر دلکھ کیا کرتی تھی اسی طرح اپنے مسرور و شاد کام زمانہ میں یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوسرا بھی اس پر دلکھ کرے۔ اس لئے ساکھی
بعض وقت کھرا تھی کہ کوئی اور نہیں تو کم از کم ان کی کھٹیں، انکار سے کہو یہی اس آگے دیکھیں اور اس کی خوش قسمتی پر دلکھ کرتے۔

ایک دن جبکہ کوہ پڑوہ خلاف معمول کی دان کے بعد آیا تو ساکھی بھی گئی کہ میں تو اپنی بہنوں کو دیکھوں گی، بعد ازاں میں وہاں میں چائے تو
انہیں کہ یہاں ملے گا اس کی، پتا تو وہ اس کے پاس جاتا کہ سے یا پھر کوہ پڑوہ اس کا نگار ہی کو بلو اسے کہ چند دن انہیں کے ساتھ بسر ہوں۔

کیونکہ تاسوئی سے ساگی کی صندوق کو دیکھتا اور مختار پاؤں جب وہ کہہ چکی تو اس نے نہایت عجیبگی سے جواب دیا کہ "اے ساگی میرے لئے اس سے زیادہ درست تعلق امر اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ تیرے احکام کی تعمیل میں اپنی ساری توانا کو صرف کروں لیکن میں ذرا تباہوں کہ ان کا آنا میری مسرتوں کو محض نہ کر دے، یہ بالکل ممکن ہے کہ ان کے آئے سے تیری بعض صندوقیں بکرا اسرہ لڑو ہو جائیں اور وہی خدشات سامنے آ جائیں جن کے خیال سے میں کا پیٹے لگتا ہوں، شاید وہ تیرے دل میں کوئی تقویٰ پیدا کر دیں اور میں ایک چیز ہے جو میں تیرے دل میں دیکھتا نہیں چاہتا۔

مگر ساگی جسے اپنی محبت پر راجہ سمجھتا اور جو کیونکہ کے خلاف حراج کسی بہت کا کرتا اپنے لئے بالکل ناگھن خیالی کرتی تھی، اپنی صندوق کا قلم دری اور کیونکہ کو دل خواست مانا چلا۔

اس نے مارٹینس دوفر کو بلا دیا اور انکار اس دیکھ چٹس کے بلانے کا حکم دیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی تاپہ کر دی کہ ان کو کسی طرح بہت معلوم ہو کہ کس کے اشارہ اور حکم سے وہ طلب کی جاتی ہیں۔

"نہیں ان اتوں پر دلچسپی نہیں کرتی جو میری صحبت میں آ رہے ہوں، ان کے ایک ایک عیب تک تو میرے صندوق سے آگے نہیں جاتے لیکن میں ان باتوں سے ضرور جانتی ہوں جو اور کچھ پر ہوا اور کچھ پر کیا کر رہی۔ کیونکہ اس وقت میں یہ سمجھتی رہتی ہوں کہ میری صحبت صرف انہیں کے ساتھ ہے، لیکن جب تو کچھ سے اور کچھ سے کہہ سکی تھی تو یہ باتوں، کیونکہ میں صرف ایک آواز ہوں اور ان کی طرف سے جانے کی باتوں سے محبت کرتی۔" مارٹینس کچھ سے کچھ دیکھ کر میری اس طرح کرتا ہے جیسے کسی اور کی چیز کا خیال کیا جا رہا ہے تو غلطی ہے کیونکہ آواز تو میرے ساتھ ہے مگر یہ لیکن کہ "اگر کیونکہ کے خیال کے دوران میں ایک دفعہ ہمارے کہہ سوتے لگتا ہے، خاصا سنا ہو جاتا ہے، اور کھٹک دھڑکن میں تو ہوں جو میری زبان کو تیرے کام سے جی بادل کا میرے فرض سے نہ لیتی، ہوں تو رات ان کی اور اور زمین میں سوتے سوتے چونک جاتا ہے، انھوں ہمارے کہہ سکی تھی کہ یہ باتوں کہ وہ میری اور کہہ کھڑا ساگی ہے جو میری آنکھوں میں آ جاتی ہے، اور جی بے خیال سے لپٹ جاتی ہے، انہیں کہتے ہیں محبت دہی ہے مگر میں دیکھتی ہوں کہ میرے دل میں کہنے کے لئے کوئی خاص میرے حق کو نہ چاہتا۔"

کیونکہ کے جسم میں اس فقرہ سے ایک گردش پیدا ہوئی لیکن ان کا اضطراب چھپانے کے لیے بول اٹھا کہ "اے ساگی، کیونکہ نے کیا چاہا یہ کہہ کہ میں نے چاہا؟"

ساگی نے لی ہاں جاکر انھیں نے چاہا تو کیا تم کیونکہ ہو؟ انہیں تم کیونکہ نہیں ہو سکتے کیونکہ میں نے سنا ہے دو خود کسی سے محبت نہیں کرتا اس کے دل میں ذرا جھنجھٹ نہیں ہے، اس کا سپرد کو خوشی سے غالی ہے، اور اس کا ہے اور تم تو کچھ سے محبت کرتے ہو، لیکن چاہتے ہو۔ کیونکہ "ہاں میں کیونکہ نہیں ہوں، مگر یہ خیال کہ کیونکہ کو کسی سے محبت نہیں ہو سکتی، سنا ہے درست نہ ہو، کیونکہ بہت سی باتیں غلط مشہور ہو جاتی ہیں۔"

یہاں یہ غلط ہو رہی تھی کہ مارٹینس اور دوفر، ساگی کی، جنوں کو باتوں پر لے گئے تھے اور دھکا کر غائب ہو گئے۔ ساگی اپنی بیٹیوں کو لے کر گھر میں گئی اور ایک ایک چیز وہاں کی دیکھائی پھر وہاں سے ہاتھ میں لائی اور دوفر کے ساتھ ہر پر گئی کی سیر کرانی، دل میں تو وہ اور نہیں کہ

سہیلی سہیلی تک نہ صرف زندہ ہے بلکہ اسکی شادان زندگی بسر کر رہی ہے لیکن ظاہر میں انہوں نے سہیلی کو مہاراک ہادی اور پچھا کہ ”پہلو جو ابیر یہ سہانہ لٹا دکھیں سے آیا۔“

سہیلی نے جواب دیا کہ ”لکھے یہ نہیں معلوم کہ کہاں سے آیا اور وہ کون ہے، جس نے میا کیا؟“ انہوں نے نہایت جرات سے کہا ”تو کیا اس وقت تک حیرت شہر ہر نے اپنا نام سہیلی تجھے نہیں بتایا؟“

”آہ میں اس کا نام نہیں جانتی مگر اس کی ممانعت ہے۔“

”مگر اسے نہیں تو نے اس کا چہرہ ضرور دیکھا ہوگا، کیا بہت خوبصورت ہے۔“

”نہیں، میں نے اس کی صورت تو نہیں دیکھی کہ نہ وہ بیٹھ تھا نہ اسلہ تھا ہے۔“

”ہاں ہاں اب میں سوچاتی ہوں تو خواب اور میری خیر میں اس کے عین چہرہ سے جھلک اٹھتی ہیں۔“

بچیں روٹیں۔ ”اسے لڑکی تجھے غریب دیا گیا، کیونکہ یہ وہی غریب ہے جس کی دان تجھے کھائے گا۔“ سہیلی نے کہا ”میں وہ غریبیت تو برتن نہیں ہو سکتا۔“ مگر وہوں بچوں نے ہر جی کہا اور اس قدر اصرار کے ساتھ اس کے غریب ہونے کا یقین دلایا کہ سہیلی بھی ہر خوشگرمی ہو گئی اس انگڑ سے انہوں نے اور ٹانگہ اٹھا اور آفر کا راسے بھر کر دیا سہیلی جاے اور کاپ الٹ کر اس کا چہرہ دیکھے۔

رات ہو گئی تھی، کچھ بچہ اپنی خواب گاہ میں ہے ہواں چہ اسور ہاتھ سہیلی آہستہ آہستہ اگے اڑتے اس کے چہرے سے کاپ الٹ دیا مگر بجائے اس کے کہ وہ غریبیت کی ڈرامائی شکل دیکھتی تھی اس نے ایک نہایت ہی عین و جمل شکل دیکھی اور ایسی ایک لڑکی سہیلی کی محبت نے خدا پہ نہ کتنے مہاراج اور سنے کر گئے۔

کچھ پانچ گھنٹہ اور بیچے اور برہم ہو کر دیا کہ ”اسے بے وقوف سہیلی یہ تو نے کیا کیا کیا تو پہ نہ پانتی تھی کہ میں ایک تو بے غیر لاتی ہوں اور کیا میں نے تجھ سے یہ بات بار بار نہیں کہی کہ کوئی انسان میرے چہرہ کو دیکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔“ یہ کہہ کر اس نے باہر اٹھ جانا چاہا لیکن بد قسمت سہیلی نے اپنی جتنی دکھاہوں سے کہہ پڑا کہ وہ دیکھ کر اسے کسی طرف نہ لوٹ آئے اور اس کی خطا کو معاف کر دے۔ ہر چند کہ پڑا، سہیلی کی اس ادا سے بے انتہا متاثر ہوا اور بے اختیار اس کا پی پڑا کہ اس سے لپٹ جائے، لیکن وہ رک گیا، کیونکہ اب ایسا کرنے سے اس کی غیر لاتی روح اس سے جھین لی جاتی۔ اس لیے کہ پڑا فوراً ایک بادل اپنے اور سہیلی کے درمیان حائل کر کے غائب ہو گیا اور سہیلی بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

کیا خبر ہو سکتے غریب تک بے ہوش رہی لیکن ہاں ”جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ وہ تھا وہ وہ اس کی تکلف خراپ کا، خدا ہاں بارش تھا، وہ کوئی کھیر ہوئی وحشت تاک کہ وہ لوند کی چوٹی تھی جہاں وہ پہلی دفعہ قربانی کے لیے آئی تھی تھی، اور وہی شاد و ملوٹا سا تھا جس کے سحر سے وہ کبھی کس کے ہاتھ ہوئی تھی تھی، پہلے تو وہ یہ بھی کہ میں کوئی وحشت تاک خواب دیکھ رہی ہوں لیکن تھوڑی دیر کے بعد اسے یقین کر لینا چاہا کہ خواب نہیں ہے، بلکہ خواب تو وہی تھا جس میں اس نے پہلے زندگی بسر کی مگر ایسا خواب مایوس طبعی خواب نہیں ہو سکتا، مگر ہر کچھ تھا!

آہ وہ اس حقیقت پر ہلکا ہوا اور کرنے کی طاقت اپنے میں نہ پاتی تھی وہ بالکل بے ہوش تھی وہ نہ پانتی اس کے چہرے سے برس رہا تھا اور وہ راتر جا رہا تھی تھی۔

ساحلی دیوار تھوڑا پہاڑی پر بکھری تھی، پاؤں کا ٹٹول سے مجروح تھے اور سردارانِ چٹول سے داغدار، کراہتی تھی، اور روتی تھی، جنگلی تھی اور گرہ پڑتی تھی، لیکن دھن کی برسی کا وہی عالم تھا، اس نے آدھوں کو علم دیا کہ ساحلی کو پکڑ کے سامنے لائیں اور طوطا جو علم دے کہ کچھ بائبر کے پاس چلی گئی۔ بیچ بیچ اس کا شور مچا لیکن تھا اور یہ کسی زمانہ میں اس کی محبوب ترین چھٹی رو بھٹی تھی، اس لئے اس نے ایضاً خاصۃً طور پر عمل کیا اور اپنے چندا میں ایسی مبینہ بن کر بیڑائی کہ ساحلی کا ضمن اس سے شرباب نے گا مگر جس وقت ساحلی لائی گئی تو دھن بیڑا کچھ کہ اس حالت جنگلی میں بھی ساحلی کے ضمن کا وہ عالم ہے کہ وہ باہر صاف کھمبہ اور حسن الطرز کے بھی مقابلہ نہیں کر سکتی، عرق عرق ہو گئی اور یہ عزم کر لیا کہ ساحلی کو تازہ لٹکا جائے، لیکن بیچ بیچ نے رات کو دھن کے خواب میں آ کر اس کا خیال بدل دیا اور ساحلی کی جان بچانے کی یہ شرط قرار دی گئی کہ وہ جو میری برساتی کا ٹکسی صندوق لے آئے جس میں حلا کے ضمن بند ہے۔

سامانی اپنی قسمت کا فیصلہ ہی کرنا چاہتی تھی، کیونکہ اس کے نسبت مشہور تھا کہ وہ گویہ بیٹن کے سب کے بچے اور حق چار میں محفوظ ہے اور کسی کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی، لیکن ایک آواز اس کے کانوں میں آئی جسے سوائے اس کے اور کسی نے نہیں سنا کہ ”تکبر نہیں، جبر امانت جبرے ساتھ ہے۔“ یہ محبت بھری آواز اسے کچھ آشنایا معلوم ہوئی اور وہ اس شرط کے پورا کرنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئی۔ نہ اس نے دشوار گزار پہاڑی راستوں کی پروا کی اور نہ درندوں کی، نہ اس نے کانٹوں کا خیال کیا اور نہ صہب قاروں کا، کیونکہ ایک روشنی تھی، ایک محبت پاش چمک تھی جو اس کے آگے تھی، اور اسے ان مصائب میں تنہا نہیں لے جاتی تھی، راستے میں درندے اسے لے جکر وہ اس کے حسن سے سکھ رہے تھے، مستحکم رہ رہا وہ اس آئے، لیکن وہ بھی ٹھنک ہو گئے، غرضیکہ وہ کسی نہ کسی طرح پراسر پاشن کے دربار تک پہنچی اور طلسمی صندوق اس سے حاصل کیا، سامانی ٹوٹن ٹوٹن دیا جس کی آواز وہ صندوق و دھن کے سامنے آ کر ازال دیا، اس امید پر کہ شاید وہ زمانہ بھر رہا جس آجائے جس کے لئے وہ تیار رہی تھی۔ لیکن دھن، سامانی کے اس عزم و اشتغال سے اور زیادہ جلی اور پھبھی پر آمادہ ہو گئی۔ بیوی بیٹن اس پر راضی نہ ہوا اور دھن کا عزم دیا کہ سامانی کو چھوڑ دے کیونکہ جب اس کے پاس طلسمی صندوق آ گیا ہے تو اسے کسی کے حسن سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں، آخر کار اسے راضی ہونا پڑا اور سامانی کو بیخیر نے خاص اپنی شرب الوہیت دے کر چلا دی جس سے وہ بھی طیر فانی ہو کر آسانی مخلوق میں مل گئی۔

کے چند سماجی پیمائش کو دیکھیں، ہر چہ مجھے اور سماج کی بہبود حق زندگی شروع ہوگی، جس زندگی کا خواب وہ ایک دفعہ کبھی بچپن میں اس کے اہل کار نے نہ سنا ہے۔ یہ ہم کتاب نہیں ڈال انگریزوں اس وقت جب اسے انسانوں کی نگاہ سے محسوس کرانے پر حیرت منقش ملا، مگر قصور ہوتا تھا۔

مہاشہ سُدرشن

مقام	ہندو بدلی ناتھ شریا
لکھی مقام	بدلی ناتھ شریا سدرشن (مہاشہ سُدرشن) سدرشن
پیدائش	نومبر ۸۹۵ء، پتھام سینگوٹ
وفات	۶ اکتوبر ۱۹۶۷ء، پتھام سینگوٹ
تعلیم	پلی۔ اسے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

مختصر حالات زندگی:

سینگوٹ میں تھے لیکن ان کی ادبی سرگرمیوں کا مرکز لاہور رہا۔ ۱۹۳۹ء میں بنارس جا کر برہوتی پریس قائم کیا اور ۱۹۴۰ء میں بنارس سے ادبی مجلہ ”نفس“ جاری کیا۔ ۱۹۴۰ء میں علی لاہور منتقل ہو گئے اور سدرشن چٹنگ باؤس قائم کیا، جہاں سے پہلی کتاب خود ان کی اپنی شائع ہوئی۔ یہ ان کا افسانوی مجموعہ تھا ”طائر طیل“۔ ۱۲ افسانوں کا یہ مجموعہ بعد میں تاج کتبیں پھنڈا، لاہور نے بھی شائع کیا۔ ۱۹۳۱ء میں ماہنامہ ”چندان“ جاری کیا۔ ۱۹۳۹ء تک نگاشت دست رہے۔ قسمت آزمانے کے لئے ۳۹-۱۹۳۸ء میں کلکتہ بھی گئے۔ تلف کتب کے تراجم کر کے روزی کرائی۔ اسی سال لاہور کی ایک فلم کتبیں کے لیے کیا گئی، سکرین پلے اور مکالمے لکھے لیکن یہ کام ان کے حراج نہ تھا، چھوڑ دیا۔ ۱۹۴۷ء ”محبت کا انتقام“ پر حکومت، پنجاب نے پانچ سو روپے انعام سے نوازا۔

۱۹۴۵ء تک فری لانسری زندگی گزارنے کے بعد ایک بار پھر فلمی دنیا کا رخ کیا اور سرور انٹرنوڈ کے ہاتھ ملازم ہو گئے۔

۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے ممبئی منتقل ہو گئے۔ ممبئی میں اپنے بیٹے شاش بھوشن کے ساتھ قیام تھا۔ ان کے ساتھ ترقی پسند ادیبوں میں

نمایاں تھے۔ بہتر سالانہ زندگی میں ڈی جی جی کے قریب افسانے لکھے۔ ان کے نو افسانوی مجموعوں میں ایک سو ستائیس افسانے شامل ہیں۔

"بھول" مطبوعہ "محران" لاہور، دسمبر ۱۹۴۳ء

یہ افسانہ سدرشن نے ۱۹۴۴ء میں قلم بند کیا تھا جب ان کی محترمہ ویرس کی تھی۔ خود میں نے "اور افسانہ کی روایت" کے پہلے ایڈیشن میں افسانے کا سال ۱۹۴۳ء درج کیا تھا لیکن "محران" کا ہوا اس افسانے کا سال ۱۹۴۳ء مت جووری ۱۹۴۳ء تھا ہرگز کہتا ہے۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱ "گاما خلیل" (بارہ افسانے) ناشر مہاش سدرشن
سدرشن، پینٹنگ پاؤس، لاہور طبع اول: ۱۹۳۰ء
- ۲ "سدا بہار پھول" (۱۱ افسانہ افسانے) ناشر مہاش سدرشن
رام گپتا کیلاچ، لاہور طبع اول: ۱۹۳۱ء
- طبع دوم رام گپتا کیلاچ، لاہور طبع دوم: ۱۹۳۶ء
- طبع سوم اراچالی ایڈ سنز لاہور طبع سوم: ۱۹۳۶ء
- ۳ "چند" (۱۱ افسانے)
مطبوعہ رام گپتا کیلاچ، لاہور طبع اول: ۱۹۳۰ء
- اس مجموعے میں ۱۵ افسانے ہیں۔ کتاب کا دیباچہ خوب حسن نگاہی
لے لکھا۔ یہ کتاب تین کتبیں لکھ، قرآن مجلی، دہلی سے دوڑ
لاہور نے بھی شائع کی۔
- ۴ "چنگیاں" (مضامین)
مطبوعہ رام گپتا کیلاچ، لاہور
- ۵ "قوس قزح" (بارہ افسانے)
مطبوعہ رام گپتا کیلاچ، لاہور طبع اول: ۱۹۳۲ء
- مطبوعہ سرسوتی آفریم لاہور طبع اول: ۱۹۳۰ء
- ۶ "بگال جیسی" (دو جلدیں)
گیلائی انجینئرنگ پریس لاہور طبع اول: ۱۹۳۳ء
- اس کتاب میں راجندر ناتھ نیگور، دیو پرکاش، کمار چڑگی،
شرمستی ایچر، نارنجی، دیو شرت چند چڑگی، دیو شرتہ کوشالی،
دیو کیشو چند گپتا، دیو جلدو کھنن، دیو ایچر ناتھ انگلو، سریندر
موہن مکرجی، شرمستی فرد پنداری، دیو کیم ناتھ سرکار اور دیو کر جا
کمار کوش کی بگالی کہانیوں کا انتخاب درج ہے۔
- "وہ بے شک" (ڈراما)
مطبوعہ گیلائی انجینئرنگ پریس لاہور
- (یہ ڈراما ایل۔ رائے کے بگالی ناول کا ترجمہ ہے)
- ۹ "محنت کی محبت" (ڈراما)
گیلائی انجینئرنگ پریس لاہور طبع اول: ۱۹۳۵ء
- (یہ ڈراما ایل۔ رائے کے بگالی ناول کا ترجمہ ہے۔)

۹	”سمن کی سرخ“ (مضامین)	مطبوعہ: راس کنیا پبک ڈپ، لاہور	طبع: اول ۱۹۲۳ء
۱۰	”پتھراں کا سوداگر“ (ناول)	مطبوعہ: گیلانی الیکٹریک پریس، لاہور	
۱۱	”گناہ کی شین“ (ناول)	گیلانی الیکٹریک پریس، لاہور	طبع: اول ۱۹۲۶ء
	(پہلا ناول نگاری سے ترجمہ ہے)		
۱۲	”آزمائش اور دیگر افسانے“ (ادب افسانے)	مطبوعہ: راجپال اینڈ سنز، لاہور	
۱۳	”راج سنگھ“ (ترجمہ ناول)	مطبوعہ: لانچھہ رائے اینڈ سنز، دہلی	طبع: اول سن۔ ن
	نیکم چند چڑی کے نگاری ناول کا ترجمہ ہے اس ناول کا مرکزی کردار پائی پچھل کناری کا حقیقی کردار ہے۔		
۱۴	”قدرت کا کھیل“ (ترجمہ ناول درنیکم چند چڑی یعنی ”نہن“ رتی“)	مطبوعہ: لاہور	
۱۵	”گھر و شہر“	مطبوعہ: نرائن دت سنگھ، لاہور	طبع: اول ۱۹۲۸ء
	(ادب و شاعری کی مختصر ترین سیر شعراء کے حالات زندگی اور انتخاب کام)		
۱۶	”تجدیب کے تازہ سائے“ از نیکم چند چڑی کا ناول سے ترجمہ	مطبوعہ: لاہور	
۱۷	”زہرا آباد حیات“ از نیکم چند چڑی کا ناول سے ترجمہ	مطبوعہ: لاہور	
۱۸	”بے گناہ گھر“ (ترجمہ ناول)	مطبوعہ: گیلانی الیکٹریک پریس، لاہور	
۱۹	”صحبت کا اظہار“ (انعامیوں کا ناول)	مطبوعہ: تاج کتب خانہ، لاہور	
	یہ کتاب پہلے ہندی میں شائع ہوئی تھی بعد میں اردو میں نے اسے اردو روپ دیا۔		
۲۰	”قوم پرست“ از ہادی محمد رائل رائے کے ناول کا ترجمہ۔	مطبوعہ: تاج کتب خانہ، لاہور	طبع: اول ۱۹۳۱ء
۲۱	”اندر سے کی دنیا“ (تین ایکٹ کا ڈراما)	مطبوعہ: تاج کتب خانہ، لاہور	طبع: اول ۱۹۳۱ء
۲۲	”بہارستان“ (سوانح رائے)	راہ کنیا پبک ڈپ، لاہور	طبع: اول ۱۹۳۵ء
	سردار کے طبع زاد افسانوں کے اس مجموعے کا اردو چہرہ پر کم چند کے لکھا ہے۔		
۲۳	”چشمہ چراغ“ (چند افسانے)	مطبوعہ: راس کنیا پبک ڈپ، لاہور	طبع: اول ۱۹۳۸ء
		مطبعہ: تاج کتب خانہ، لاہور	طبع: اول ۱۹۳۵ء
۲۴	”سرد گناہ“ (سوانح رائے)	مطبوعہ: لانچھہ رائے، لاہور	طبع: اول جنوری ۱۹۳۸ء
۲۵	”صحیح وطن“ (ادب افسانے)	مطبوعہ: راس کنیا پبک ڈپ، لاہور	
۲۶	”پریم چالیسی“ (ادب چالیسی)	مطبوعہ: لاہور	

۳۷	"سنگیت مہابھارت" (ڈراما)	مطبوعہ لاہور
۳۸	"دلی دلیا سنگھ" (ڈراما، ترجمہ)	مطبوعہ لاہور
۳۹	"پرہا" (ڈراما)	مطبوعہ لاہور
۴۰	"راجپوت کی شکست" (ڈراما)	مطبوعہ لاہور
۴۱	"سچایا" (ڈراما)	مطبوعہ لاہور
۴۲	"گھوڑا کا پرانچھٹہ کٹو" (ڈراما۔ چار جلدیں)	مطبوعہ لاہور
۴۳	"فرخشاںجام" (ترجمہ)	مطبوعہ لاہور
۴۴	"گنج حلیفہ" (ناول)	مطبوعہ لاہور
۴۵	"امرت" (بچوں کے لیے)	
۴۶	"بچوں کے لیے ہویہ پش" (بچوں کے لیے بھاشا کی اخلاقی	مطبوعہ لاہور
	کتاب کا ترجمہ)	
۴۷	"بچوں کے لیے مہابھارت" (بچوں کے لیے بھاشا کی اخلاقی	مطبوعہ لاہور
	کتاب کا ترجمہ)	
۴۸	"بچوں کے لیے بھاشا کی اخلاقی کتاب کا ترجمہ)	مطبوعہ لاہور
۴۹	"مہارشی کی بیداری پانچویں" (اخلاقیات)	مطبوعہ پنجاب پرنٹنگ ورکس، لاہور ۱۹۳۹ء سے قبل
۵۰	"پارس" (چند افسانے)	مطبوعہ مقبول عام پریس، لاہور طبع اڈل ۱۹۴۶ء
۵۱	"پھول دلی" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ تاج کتب سوسائٹی، لاہور طبع اڈل ۱۹۴۳ء سے قبل
۵۲	"زخم و سب" (ڈراما بچوں کے لیے)	پنجاب پرنٹنگ ورکس، لاہور طبع اڈل ۱۹۴۳ء سے قبل
۵۳	"آخر ہی جھڑپ" (گفتگو)	مطبوعہ تاج کتب سوسائٹی، لاہور طبع اڈل ۱۹۴۵ء
۵۴	"دنیا کے عجائبات" (بچوں کے لیے)	
۵۵	"سب بھرتی کیا جانا" (بچوں کے لیے)	
۵۶	"فرخشاںجام" (ترجمہ حکم چند جزی کے ناول کا ترجمہ)	
۵۷	"بیجا سنگھ"	مطبوعہ دلیاندر پبلشنگ، دلی طبع اڈل ۱۹۴۳ء

آخر از:

۱۔ ڈراما "محبت کا انعام" پر حکومت پنجاب کا ایوارڈ نقد انعام، پانچ سو روپے

وزیر عدالت

مہاشہ سدرشن

ایک دن عاصم کے وقت جب کہ آسمان پر پادل براہ راست تھے۔ ایک اجنبی، ششوپال برہمن کے دروازے پر آیا اور لجاجت آمیز انداز میں ہوا "کیا تجھے رات کا نئے کے لیے پناہ مل سکے گی؟" ششوپال اپنے گاؤں میں سب سے طریقے سے۔ عاصم اجنبی کو دروازے پر دیکھ کر ان کا چہرہ مختلف ہو گیا۔ انہوں نے کہا "یہ میری خوش نصیبی ہے۔ آجے تشریف لے جئے۔"

ششوپال کے لڑکے نے اجنبی کی خاطر عدالت کی۔ اجنبی اس پر ٹوٹا ہوا گیا۔ س نے برہمن سے کہا، "آپ کا لڑکا بڑے کام کا ہے۔ اس کی مدد سے میرا بھائی خوش ہو گیا۔" ششوپال نے اس طرح سرائی کا جیسے کسی نے سنا نہ کہ جیسو دیا ہوا اور حکایت آجیہو میں کہا، "تم تمہارے مہمان کو دروازے پر برہمن ایسے الفاظ سننے کی تاب نہیں رکھتے۔" اجنبی نے اپنی غلطی پر ہوم ہو کر کہا، "ملا کیجئے امیرا مطلب یہ تھا۔ مگر آج کل وہ برہمن کہاں ہیں۔ اب تو آنکھیں ان کے لیے ترستی ہیں۔" ششوپال نے جواب دیا "برہمن تو اب بھی ہیں۔ کی صرف کھڑکیوں کی ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

ششوپال نے ایک حالت تقریر شروع کر دی۔ اجنبی حیران ہوا کہ ایک ایسے چھوٹے سے گاؤں میں ایسا جبر بھی موجود ہے۔

"مجھے خیال نہ تھا کہ گواہ میں ال چھا ہے۔ میرا راج اشک کو مسکوم ہو جائے تو وہ آپ کی موت بڑا اہم ہوتے۔"

ششوپال (مسکرا کر) آج کل بڑی بے انصافی ہو رہی ہے۔ جب دیکھتا ہوں تو میرا خون کھولنے لگتا ہے اجنبی (دشمنانہ لہجہ میں) "میرا

میری ایک گھاٹ پر پانی پی رہے ہیں۔"

ششوپال "ترپے بھی دو میں سب جانتا ہوں۔"

اجنبی "انھیں ٹھاننا آسان ہے مگر کچھ کر کے دکھانا مشکل ہے۔"

ششوپال "اگر مجھے موقع ملے تو دکھا دوں انصاف کے کہتے ہیں۔"

انجی "اگر میں اشوک ہوتا تو آپ کی خواہش پوری کرویتا۔"

2

دوسرے دن مہاراجہ اشوک کے دربار میں ششوپال کی جلی ہوئی۔ لوگوں نے سمجھا کہ ششوپال کے لیے یہ جلی کا حکم جام مرگ ہے۔ سب کو یقین تھا کہ اب ششوپال زندہ و زونہیں کے۔ شام ہو گئی تھی۔ جب ششوپال باٹلی چڑھنے تو ان کو ششوپال میں پہچانیا کر۔ اس وقت تک انہیں خیال تھا کہ شاید ان کے افلاس کی کہانی یہاں تک لکھی گئی ہے۔ اس نے مہاراجہ نے کھودینے کے لیے بلایا ہوگا۔ لیکن جب نوکر نے کہا مہاراجہ آ رہے ہیں تو ان کا کچھ دھڑکنے لگا۔ اسے میں مہاراجہ اشوک شاید اعزاز سے کمرے میں داخل ہوئے اور مسکرا کر کہا "برہمن دیوتا مانا آپ نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔ ششوپال گہرا کراٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ انجی مہاراجہ اشوک تھا۔ اگرچہ مہاراجہ کو کچھ کر بہت اوسے۔ مگر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

3

ششوپال "مجھے معلوم تھا کہ آپ ہی مہاراجہ ہیں۔ ورنہ میں ایسی آزادی سے لکھی اٹھکڑ کرتا۔"

مہاراجہ "سہو"

ششوپال "لیکن میری بات میں، آئی میرا ہاتھ تھا۔"

مہاراجہ "لیکن آپ کی جلی تھی۔"

ششوپال "میں میں موت دے سکتا ہوں۔"

مہاراجہ "میں آپ کی آزمائش کرتا ہوں۔ دیکھوں تم کیسے انصاف کا اظہار کرتے ہو۔ کل صبح سے تم وزیر عدالت ہو۔ مہاراجہ شجر پر

تیار رہا۔ اختیار ہوگا اور تم اس کے کام دار کیجے گا۔"

4

ایک ماہ گزرا گیا۔ وزیر عدالت کے انتظام اور انصاف کی چاروں طرف مہم چلی گئی۔ رات کا وقت تھا۔ آسمان پر تارے نکلتے ہوئے

تھے۔ ایک مہر نے ایک جالی خانہ مکان پر دھک دی۔ درجے سے ایک عورت نے سر نکال کر پوچھا۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں۔ دروازہ کھول دو۔"

"مگر وہ یہاں نہیں ہے۔"

"پر وہیں تم دروازہ کھول دو۔"

”اور وہ بھی کھل سکتا۔ شہر پر خشک پال کی حکومت ہے۔“

”بہن! اور وہ تو جانتا ہوں۔“

امیر نے گوار نکال کر دروازے پر حمل کیا، ایک چہرہ دار نے آ کر اسے دھکا دیا اور اسے پیروہ دار نقل ہو گیا۔ اب وہ اس کا خون خشک ہو گیا۔ اس نے پیر سے دار کی لاش کو ایک طرف پھینکا اور بھاگ گیا۔

5

خشک پال کے قتل کے بعد یہ پہلا واقعہ تھا۔ اس نے سرگرمی سے تحقیقات کی، مگر قاتل کا پتہ نہ لگا۔ آخر مہاراجہ نے اسے باز کر کہا تم کو تین دن کی سہولت ہے۔ اگر اس عرصہ میں قاتل نہ پکڑا گیا تو اس کی جگہ تم کو چھانسی دی جائے گی۔ رات کا وقت تھا۔ مگر خشک پال کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ وہ شہر کے اس گلیان حصہ میں گھوم رہا تھا، جہاں یہ واردات ہوئی تھی۔ یا ایک ایک مکان کے در پہلے سے ایک عورت نے بھاگ کر باہر دیکھا۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہو تھا۔ عورت نے آہستہ سے پوچھا: ”تم کون ہو؟ پیر سے دھر؟“ خشک پال نے جواب دیا: ”میں اس در پر عدالت ہوں۔“ ڈراٹھیرو، کہہ کر عورت کوڑی سے قابو ہو گئی اور روٹنی کے کرہ دار سے سے نمودار ہوئی۔ اور در پر عدالت کو اپنے کمرے میں لے جا کر ایک چوکی پر بیٹھا اور کہا: ”یہاں خرابی رات ہے؟“ خشک پال نے جواب دیا: ”ہاں! آخری رات۔“ عورت تھکا کر کوڑی ہو گئی اور بولی: ”میں سب کچھ جانتی ہوں۔ قاتل جس کے پاس آیا کرتا تھا۔ میں اس کا نام نہیں لے سکتی۔ ایک دن جلد وہ آپا تو وہ مگر میں نہ جانتی۔ قاتل نے میری بات کا یقین نہ کیا۔ اور دروازہ توڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ پیر سے دار نے در کا تو اس کے ہاتھ سے، را گیا۔“ در پر عدالت نے قاتل کا نام پوچھا تو اس عورت نے سکھ ہوئی کیونکہ اس کی طرف دیکھ کر اس کے کان میں بگڑ بگڑ کر جلدی بھدی اسے دلھت کر دیا۔

6

مہاراجہ اشک نے کڑک کر خشک پال سے کہا: ”میرا گڑبگڑی۔ کو مجرم کا پتہ لگا؟“ اس نے کہا کہ: ”ہاں میں نے معصوم کر لیا ہے کہ مجرم کون ہے۔ لیکن شاخروں میں رہنے کی ذات مقدس تسلیم کی گئی ہے۔ اسے انٹرویو سزا دے سکتا ہے۔ در پر عدالت کو اختیار نہیں کہ اس کو سزا دے۔ اس لئے میں گھم پتا ہوں کہ قاتل کے ہت کو پھنسی پر لٹکا دیا جائے اور مہاراجہ کو صبر کرو دی جائے۔“ یہ کہا اور خشک پال نے عدالت کی مہر اشک کے سامنے رکھ دی اور اپنے گاہکس داہن جانے کی اجازت مانگی۔ لیکن اشک نے اس کی طرف احترام کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا: ”آپ کی جرأت تاریخ بعد میں یادگار ہے گی۔ یہ بات آپ ہی اٹھا سکتے ہیں۔“

○

(پاکستان) چلے آئے۔ انھارہ بے کے خوردار شخص تھے۔ کچھ بیکسب ہے کہ ان کے شیعوں افسانے کتابی صورت میں نکلا ہونے سے روکے۔ سر پادہ اردو پشاور سے ان کی کچی نہ بنی اور سب سے داسوں اپنے افسانوں کو فروخت کرنے پر گنتائی کی صورت کو ترجیح دی۔ اسباب نے بیوانی اور انسانی پہچانوں میں ان کی غریب مدت ملازمت کو دیکھتے ہوئے ”اکثر“ کہا شروع کر دیا تھا جب کہ تو بی افکار لائی تھے اور خدا کی بیانی نہیں۔ کراچی میں ڈاکٹر کاکورے آف صوبہ ایل آفڈ فورسز میں ڈیک درک کرتے تھے، داسر اسے کیشز آفیسر (عرف نامہ میں ڈاکٹر جسد) تھے۔ ۱۹۵۴ء میں یہ معلوم فرار ہونے انھیں کراچی میں قتل کر دیا۔ ان دنوں ”عظم کریمی“ ماخوذ میں جرائم پیشہ افراد سے متعلق ایک نئی پہچان پھر نکلا کرتے تھے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

- ۱۔ ”پہم کی انگوٹھی“ مطبوعہ ”طوقان“ لاہور، گنگ بہک ۱۹۶۳ء، (۱)
- ۲۔ ”انصاف“ عظم مطبوعہ ”زمانہ“ کراچی، مئی ۱۹۶۳ء

قلمی آثار (مطبوعہ سب):

- ۱۔ ”پہم چتر“ (روانی خطوط) مطبوعہ پیر چھہ طبع اول ۱۹۶۹ء
- ۲۔ ”ہندی شامی“ (تاریخ و تنقید) ہندوستانی اکیڈمی، لاہور طبع اول ۱۹۳۹ء سے قبل
- ۳۔ ”دیہاتی کیمت“ (تاریخ و تنقید) عصمت بک ایچ، علی طبع اول ۱۹۳۹ء سے قبل
- ۴۔ ”پہم کی پوزیوں“ (ادب، افسانے) کتاب خانہ دانش گل بکسٹو طبع اول ۱۹۴۳ء
- ۵۔ ”ڈکھ کھ“ (ادب، افسانے) مطبع انوار احمد، لاہور طبع اول ۱۹۴۳ء
- ۶۔ ”شیخ بریمنا“ (سوانح نامہ) کتاب خانہ دانش گل بکسٹو طبع اول ۱۹۴۳ء
- ۷۔ ”انقلاب اور دوسرے افسانے“ (ادب، افسانے) کتاب خانہ دانش گل بکسٹو طبع اول ۱۹۴۳ء
- ۸۔ ”سکول اور دوسرے افسانے“ (ادب، افسانے) عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد، دکن طبع اول ۱۹۴۳ء
- ۹۔ ”روپ سنگھار“ (چند افسانے) دارالاجلاخ، لاہور طبع اول س۔ بی
- ۱۰۔ ”دل کی باتیں“ (ادب، افسانے)
- ۱۱۔ ”ہندوستانی افسانے“

نوٹ۔ افسانوی مجموعوں میں نوے افسانے سمیت پائے ہیں جب کہ انہوں نے ایک سو چالیس افسانے قلم بند کیے۔ ان کا آخری افسانہ ”سماجی مین“ میڈ ”تھا اور روزنامہ ”جنگ“ کراچی بابت قلم اگست ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔

تیسرے دن:

۱۹۶۷ء تا ۱۹۶۸ء، عظم کریمی نے ”اکبر“، ”عالم کیم“، ”قوس و قزح“، ”تیرنگ خیال“، ”الامصر“، ”یادگار“، ”طوقان“،

”تھوڑی“، ”مست“، ”زمانہ“، ”کھٹیاں“ اور ”ہاجیں“ کے لیے بلکہ زبان سے متعدد الفاظ نے ترجمہ کیے۔ اس سلسلے کا پہلا ترجمہ ”ز۔۔“ کا پھر جنوری ۱۹۲۷ء میں ”مولانا“ کے عنوان سے نکلا ہے۔ جب کہ دسمبر ۱۹۲۷ء کے شمارے میں ”ڈاؤ“ کے زیر عنوان افسانہ بھی بلکہ زبان سے ترجمہ ہے۔ ان تراجم کے علاوہ مختلف ادبی جرائد میں االقعدہ تحقیقی و تنقیدی مضامین نکلے پڑے ہیں۔ خصوصاً ”مست کی کہانیاں“، ”دکھیا کی کہانی“، ”سجڑی زبان“ اور ایک ناول ”جوتھیں“ جو شائع نہ ہو سکا اس کے علاوہ ہانوے افسانے مجلہ ”زمانہ“، ”مکبر“، ”مست“، ”تیرنگ خیال“، ”ساقی“، ”عاشقیر“، ”ہاجیں“، ”گود“، ”داستان“ میں نکلے پڑے ہیں۔

نظریہ فن:

”میں نے آج تک جتنے اور کتنے افسانے لکھے ہیں، وہ تقریباً کسی نہ کسی تجربے یا مشاہدہ کے نتائج ہیں۔ کہہ دوں گا کہ میرے لیے خاص چیز ہے۔ بات کی میں بہت کم پردہ کرتا ہوں۔ واقعات کے کشیدگی پہلو کو میں نے بھی نظر انداز نہیں کیا۔ انسان میں اس بات کا خاص خیال رکھتا ہوں کہ جو واقعہ گھبراہوں وہ طعنے انسانی کے مطابق ہے بھی یا نہیں۔

عام فہم زبان استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ موسم یا وقت کا میں زیادہ دیا نہیں۔ جب دل پر چڑے گی یا کسی نگارے سے حسرت ہوا تو افسانہ لکھتے بیٹھ جاتا ہوں۔“

اعظم کراچی، جولائی ۱۹۵۳ء، کراچی

محوالہ ”مذہب“، ”مرتبہ“، ”اعظم زیدی“، ”مطبوعہ“، ”میری لاہوری“، ”لاہور“، ”طبع“، ”اول“، ”جنوری ۱۹۶۵ء“



حوالہ جات:

- ۱۔ ”مرتبہ“، ”مطبوعہ“، ”میری لاہوری“، ”لاہور“، ”طبع“، ”اول“، ”جنوری ۱۹۶۵ء“

ابھتھوت

اعظم کرپچی

شکرہ اپنا راپنی جھونپڑی میں بیٹھا چل رہا تھا۔ قریب ہی اس کا اکوٹا لڑکا "بھئی" کہیل رہا تھا۔ بھئی کے سوا شکرہ کا اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہی اب اس کی ٹھٹھلی کا سہارا تھا۔ دن بھر صحت حدود ہی سے جو کھول ہوتا ہی میں دونوں کا فریج چلتا۔ لیکن دونوں سے دو دکان کے زمیندار چنڈہ رام پر شاہ کے یہاں بیگار کر رہا تھا۔ زمیندار کو سرکار نے اسے صاحب کا خطاب دیا تھا۔ جس کی خوشی میں جشن منایا جا رہا تھا۔ دن بھر کی بیگار سے فرصت پا کر تھوڑی دیر ہوئی شکرہ نے اپنی جھونپڑی میں قدم رکھا تھا۔ بھئی نے باپ کے گلے سے لپٹ کر کہا "بابا ماما (مجھ کو) اتنی دھڑکی مٹا دو۔"

شکرہ نے غصہ کی سانس بھر کر کہا "اک کے یہاں کام ختم ہو جائے اور کچھ انعام ملے تو اسی سے تھک کر دھڑکی مٹا دوں گا۔" بھئی نے بال ہٹ سے کام لیا "لوں لوں میں تو ابھی لوں گا۔ مالک کے یہاں سب لوگ اچھے اچھے کپڑے پہنے ہیں۔ میں بھی پہنوں گا۔" شکرہ نے کہا "پانگل نہ بن ہم قریب دو امیر۔" تارا ان کا کیا مقابلہ؟ بھئی نے بھولے ہنسنے سے کہا "ہمیں قریب اور ان کو امیر کسی نے بنایا ہے؟"

"بابا! شکرہ نے قہقہہ مار کر کہا "تو بڑا پانگل ہے۔ بھگوان بتائیں ہیں اور کون بنا سکتا ہے؟"

"تو بھگوان نے ہم کو امیر کیوں نہیں بنایا؟"

"اب۔ ام جانیں اگلے ختم میں ہم سے کوئی غلطی ہوگی ہوگی۔ اسی کی سزا ملی ہے۔"

"اگر بھگوان ہم سے خوش ہو جائیں تو کیا وہ ہم کو امیر کر دیں گے؟"

"اور بھگوان تو کیا؟ بھگوان کے ہاتھ میں تو سب کچھ ہے۔" تو بھگوان کیسے خوش ہوتے ہیں؟"

"کچھ بات ہے۔" تو ہم کچھ بات کریں گے۔"

”لیکن ہم سب میں نہیں گھر سکتے۔“

”کیوں؟“

”ہمارا گھر اجھڑا ہوا ہے۔ چننے والے کچھ نہیں ہیں کہ اسے کھینے سے سب کو ہار پا کر ہو جائے گا۔“

”تو کیا ہو گا؟ ہم سب ہی میں رہتے ہیں اور کبھی نہیں؟“

”نہیں، بھگوان تو ہر جگہ ہیں۔“

”تو میں بھی اپنی بھوپنڈی میں ایک چھوٹا سا سب سے بڑا گھر رکھوان کی پوجا کیا کروں گا۔“

”لیکن بغیر کسی پڑنے کی حد کے پوجا نہیں دینی جائے گی۔“

بھگوان کا دل ٹوٹ گیا اور کچھ عرصہ تک وہ سب سے کسی نے پائیر سے آواز دی۔ ”ابے شکر دلا“ پائیر نگل کر شکر دانی دیکھا کہ زمیندار کا بیٹا وہ ۱۵ تا ۲۰ سال کا ہے۔ شکر دانی اب سے پوچھا ”مہاراج کا حکم؟“

”اگر نہیں، ہاں ابھی!“

”سرکار ابھی تو دن بھر کی بیچارے دانیس آئے ہوں۔“

”میں تو نہیں جانتا۔ میں نے تجھے، ناک کا حکم دیا ہے۔ اگر تو ابھی انٹیشن نہیں جانتے گا تو پھر فریضہ نہیں۔“ یہ کہہ کر مہاراج ۱۵ تا ۲۰ سال کے لڑکے ہوئے چلے گئے اور شکر دلا آسمان کی طرف صرختے دیکھ کر کہہ گیا۔ دن بھر یہی بھاری رہا۔ کھیت تھا کہ رات کو آرام سے گا بھر فریضوں کی قسمت میں آ۔ ام کہاں؟ کچھ چیزیں پانی کو لے کر اسے گھڑی پہ لاد دیا اور خود انٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

2

رات کے صاحبِ رام پر شاہ کے مکان کے سامنے ایک عالی شان شامیالے میں چننے والے کو بھونچا دیا جا رہا تھا۔ چننے کوں تھے؟ پھر ظاہر فریب پر گھبراہٹ ہوئی تھی۔ لیکن جن کے گھروں میں موٹا رہتا تھا۔ جو وہ جس کا کھانا کھا کر اسے موندے ہو گئے تھے کہ وہ قدم پھینا مشکل تھا۔ اسی قدس کے برصغیر آج تقاضا کے یہاں انواع و اقسام کی مٹیاں کھا رہے تھے۔ ان سے دور چننے والا کبھی پچھریاں سرور نہیں چننے والوں نے اچھوت کا خطاب دے دیا تھا۔ صرختے بھری نگروں سے چننے والوں کی قوت کو کچھ رہے تھے۔

شکر دلا چاروں کو اسے بھرا انٹیشن پر رہتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر ہوئی مہمانوں کا سامان لے کر گاؤں میں واپس ہوا تھا۔ اب تک اسے گھر جانے کی اجازت نہ تھی۔ وہ ایک طرف تنہا ہی باغیچے میں چپ چاپ کھڑا تھا کہ ایک ٹھک دھاری چننے والے شکر دلا میں گنگا جلی لے کر آواں چننے والا سامان کی دکان چھتے ہوئے اس طرف سے لگے۔ زمین بگھڑائی ہو چکی تھی۔ چننے والے لڑکے نے اور ان کا بدن شکر دلا سے چھو گیا۔ بات سمجھتی تھی۔ چننے والے اپنے گھر کی صرختے بھریوں ہی سے کراتے تھے۔ مہاراجن کا ڈول بھاری اٹھاتے تھے لیکن اس وقت ان کے ہاتھ میں گنگا جلی تھا۔ وہی گنگا جلی کا جلی جس سے ساری دنیا سیراب ہوتی ہے۔ جس میں بھلی، بھرا، برہمن سب امتحان کرتے ہیں۔ وہی گنگا جلی دنیا میں لڑکوں کو دیتا ہے جسے بڑا کر رکھیں گے۔ لعلی تھی اپنی لیکن قصور تپا لیا تھا شکر دلا بھرا کا۔ جب اس نے چننے والے کو اپنے پاس سے گزرتے

دیکھا تو ہانکیوں نہیں۔ بھری سہا میں اس نے جان بوجھ کر ہنستے ہی کی ہنک کی۔ اب ان کو ہار اٹھنا کرنا چاہئے گا۔ اسی قسم کی باتیں سوچ کر ہنستے ہی شکرہ اچھا پرہیز کرنے۔ "پاپی ہنڈل۔ بد معاش۔" غرض ہنڈتے ہی کو ہنسی کا لیاواں یا تو جس وہ غم کر دیں۔ تعلق دار صاحب شہر و نخل من کر دے آئے اور ہنڈتے ہی سے پوچھا "مہاراج کہا بات ہے؟"

مہاراج نے گڑ کر کہا "جہاں ہنڈتوں کو گھوٹا دیا جاتا ہے وہاں پھاروں کا کیا کام؟ دیکھئے خاص پانی نے ہاں بوجھ چھو لیا۔ اب آپ ہی بتائیے مجھے لفظ کیوں نہ آئے۔ رام رام! آپ نے پھاروں کو بہت سرچڑھا کر کہا ہے۔" مہاراج کے آخری جملے نے تعلق دار کو آگے گھولا کر دیا۔ انہوں نے شکرہ پھار سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ پھارے کو اشارہ کر دیا کہ "دوسرے کو وہاں تو حکم کی اور تھی۔ شکرہ بھوک کے مارے ہوئی مہاراج پھار۔ مار چئی تو زمین پر گر کر لوٹے لگا۔ پھارے نے کہا کہ ٹکر کر رہا ہے۔ اس نے کس کرات، دی۔ ہنڈتے ہی پر لگی اور وہ چھٹ گئی اور دیکھتے شکرہ انے دم توڑ دیا۔ جشن میں ایسی بدگشتی۔ سب لوگ گھبرا گئے۔ تھوڑی دیر کے لیے تعلق دار صاحب بھی پریشان ہو گئے۔ ان کو اس کا تو کوئی غم نہ تھا۔ کہ ایک طرح کی جیتا ہو گئی۔ بلکہ اس کا صدمہ تھا کہ کھنڈت آج کی کیوں مرا۔ سب پر اس کا کیا کیا چنگے تھے اور سب رام رام کہتے ہوئے چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ ایسے پاپ کی جگہ پر کیسے دھنکے تھے۔ برادری ان کو چھوڑ دیتی۔ لیکن تعلق دار کے پاس ہنڈتوں کو رام کرنے کا نسخہ موجود تھا۔ گھنڈی دیتی ان پر مہربانی تھی۔ ایسی صورت میں انہوں نے پھاروں کو جاکر غم دیا کہ "شکرہ کی لاش کوئے جا کر فوراً نہا دو۔" ساتھ ہی دھنکی دی کہ اگر کسی نے پرہیز میں ہار بیٹ کی شہرہ تو اس کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔

شکرہ کو عمر سے میں حال ہو چکے تھے۔ تعلق دار رائے صاحب رام پر ٹاڈا نہ دے تھے۔ لیکن چڑاں حریف دگر اس مشقی کے عالم میں بھی جب پرگنے کا حاکم ان کے علاقے میں آتا تو رائے صاحب فوراً حاکم کے سلام کے لیے حاضر ہوتے۔ ایک دن رائے صاحب نے سنا کہ ایک نئے حاکم مسٹر ایوان کے علاقے میں آئے ہیں۔ فوراً چڑاؤ پر پہنچے۔ سب سے پہلے پیش کار سے ملے۔ وہ رائے صاحب کے پرانے چادر صندوق میں سے تھا۔ اس نے رائے صاحب سے کہا "یہ صاحب دیکھوں سے بہت کم ملتے ہیں۔ آپ ان سے نہیں تو بھڑے۔"

"تو کچھ مجھ سے بھی نہیں گئے؟"

"نہیں آپ جیسے نہیں۔ تو ضرور میں گئے لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ ان سے مل کر آپ کی طبیعت خوش نہ ہو گی۔"

"میں نے تو سنا ہے کہ یہ بچ ذات دلوں سے بھی ملتے ہیں۔ پھر مجھ سے کیوں نہیں گئے۔"

"ہاں یہ صاحب اجموتوں سے بہت ملتے ہیں اور وہی کو کڑی پہناتے ہیں لیکن دیکھوں سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے۔"

"بوسائی جتا، لیکن اب تو میں آگیا ہوں۔ مل ہی کے جانے گا۔ میری اطلاع تو کرو چھتے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" اتنا کہہ کر پھٹکار، ذرا صاحب کے خیمے میں داخل ہوا اور اطلاع کی حضور رائے صاحب رام پر ٹاڈا ملنے کے لیے آئے ہیں۔

ذرا صاحب نے کچھ سوچ کر کہا "اچھا انداز بچچہ نہا۔" رائے صاحب نے خیمے میں داخل ہو کر کہا یہ ادب سے صاحب کو جھک کر سلام کیا اور پھر حسب معمول خود ہی ہاتھ ملانے کے لیے آگے بڑھے لیکن ذرا صاحب نے ان سے ہاتھ نہ ملا دیا اور کہا "معاذ بچتے میں آپ جیسے عالی خاندان ہنڈتوں سے ہاتھ نہیں داسکتا کیونکہ میں اچھوت ہوں۔" رائے صاحب بولے۔ "حضور ایسی باتیں نہ کریں۔ راج کو ہم انطور کا سہیہ سمجھتے ہیں۔"

”لیکن میں اچھوت ہوں۔“

”وہ کیسے؟“ ”یہ آپ کو بہت بھلا معلوم ہو جائے گا۔“ ”ہاں یہ تو قاتل ہے آپ کے کاؤں میں کوئی شکر دار بچا تھا؟“

شکر دار کا نام سن کر پڈتائی کو کہیں برس کی باتیں یاد آ گئیں۔ ڈور کے مادے ان کا چہرہ لہن ہو گئے۔ انہوں نے دہلی زبان سے کہا ”کی جی جی میرا ایک اسی نام کا ضرور تھا لیکن اس کو مرے ہوئے میں سہل ہو گئے۔“

ڈیوڑ صاحب نے کہا ”میں نے سنا ہے آپ نے اس کو جان سے مراد والا تھا۔“ ”میرے صاحب جی گئے

”بھوت، بالکل بھوت۔ بھانگیں ایسی چوہا بھانگی ہیں۔“ ”کی جی ہاں، آپ بے درد دھنگ نظر لوگوں سے چوہا بھانگی ہے اور اے

صاحب احمد دیکھئے۔ جس کو اس وقت آپ حضور کہہ کر حق کر رہے ہیں۔ جس کو سلام کرنے آپ یہاں حاضر ہوئے ہیں۔ وہ اسی بد نصیب شکر دار

بھادرا کا لڑکا بنی ہے۔“ ”میرے صاحب یہ سن کر بے ہوش ہو گئے۔ ڈیوڑ صاحب نے انہیں گھر بھیج دیا، جہاں وہ اس حد سے سے باخبر نہ ہوئے

جب ان کی اڑتی ڈیوڑ صاحب کے گھپ سے گزری تو وہ ”نام نام ست ہے۔“ کی آواز سننے ہی ٹوٹی جا کر کرکڑ رہے۔



حامد اللہ افسر

نام	حامد اللہ
تعلیمی نام	حامد اللہ افسر افسر مرٹھی
پیدائش	۱۹ نومبر ۱۸۹۵ء مقام میرٹھ۔ بھارت
وفات	۱۹ اپریل ۱۹۷۷ء پٹنہ
تعلیم	ایم۔ اے (آرٹس)

ابتدائی تعلیم مولوی امجد علی محمد سے حاصل کی، بعد ازاں انھیں کی گرائی میں عربی و فارسی کی تعلیم مدرسہ عالیہ دہلی میں ہوئی۔
 پٹنہ میں ایک مدت دینی مدرسہ میں رہے، اس کے بعد انگریزی کی تحصیل میرٹھ کالج میں ہوئی جہاں سے بی۔ اے ۱۹۲۰ء میں کیا۔

مختصر حالات زندگی:

جہی ہشتی میرٹھ کے تھے۔ معزز متقی خاندان میں متقی محمد عصمت اللہ کے ہاں پیدا ہوئے اور انہی کی زیر نگرانی ابتدائی تعلیم پائی۔
 بی۔ اے کرنے کے بعد ابتداً کچھ مدت اخبار نویس کی۔ شاعر، افسانہ نگار اور ناقد کے طور پر شہرت پائی۔ میرٹھ میں قیام کے دوران کچلی دار
 ۱۹۱۶ء میں پہلا مشاعرہ پڑھا۔ ان کے والد انھیں عربی اور فارسی کا عالم بنانا چاہتے تھے۔ مدرسہ عالیہ میں جب افسر نے کم نمبر حاصل کئے تو ان
 کے والد نے دنگن ہو کر انھیں مدرسے سے اتھا کر دیجے بندھیج دیا۔ جہاں ایسے چار پڑے کہ علاج کے لیے میرٹھ واپس آنا پڑا، صحت یاب ہوئے
 تو والد نے انھیں ہاسدالابرہ، قادیان بھیجے کا پیر و گرام بنایا لیکن ہاسدالابرہ نہ بن سکے کی وجہ سے وہ گئے۔ گورنمنٹ ہائی سکول میرٹھ میں براہ
 راست نویں جماعت میں داخلہ۔ نظم و نثر آگے بڑھے۔ ۱۹۲۰ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد انھیں اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیا گیا، جہاں
 جب عرق نہ آ رہا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بورڈنگ ہاؤس میں ان کا کمرہ ملک بھر کے شعراء کی آماجگاہ تھا۔ بنگلہ اور کافی اکثر ان کے مہمان

رہے۔ سڑک کے بعد نائب تحصیل داری کو شوکر باری تھی۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ میں اردو کے لکچرر مقرر ہوئے۔ جہاں سے ۴۳ برس بعد ۱۹۵۰ء میں سبکدوش ہوئے۔ ملازمت کے آخری زمانے میں کالج کے وائس چانسلر تھے۔ علی گڑھ سے شائع ہونے والے اردو رسالہ ”نوبہار“ اور میرٹھ کے اخبار ”انجیل“ کے مدیر رہے۔ ناٹاقہ، بات سب بات کھوکھلی ملی بیٹنے والے انگریز لکھی نے سچاں کے شاعر کے طور پر سہ پناہ شہرت پائی۔ عہدہ ذاتی کے باوجود، ملا ولد ہی رہے۔ لکھنؤ میں آخری امام امتیابی صحت میں بسر کیے۔ چپ وق کا گذر تھے۔ ی۔ پی اردو اکادمی اور حکومت نے کچھ مالی امداد کی۔ آخر بغرض، راج لکھنؤ میں بیکل کالج کے شعبہ چپ وق میں داخل کئے گئے۔ وہیں ۱۱۹ پر مل ۱۹۷۷ء کی سرپر میں انتقال ہوا۔ تجویز و تحقیق اگلے روز ۱۳۰ پر مل کو ہوئی۔ قدیم اہلماں لکھنؤ کے خانہ دانی قبرستان محلہ بھوانی ٹوٹ لکھنؤ کی ملی میں ملی ہو گئے۔

اولین تخلیق:

ایک اردو ناول ۱۹۱۶ء

اولین افسانے:

گگ بیک ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔

فکمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ ”چار چاند“ (۴ افسانے) میرٹھ طبع اول ۱۹۱۷ء
 - ۲۔ ”زانی کا درگ“ (افسانے) اظہارِ پس مال آباد طبع اول ۱۹۲۷ء
 - ۳۔ ”آگ کا نور“ (افسانے) احمد دہستانی پبلشنگ ہاؤس، میرٹھ طبع اول ۱۹۳۲ء
 - ۴۔ ”پر چھانکناں“ (افسانے) دافن محل، لکھنؤ طبع اول ۱۹۳۳ء
- یہ مجموعہ گروہ سے بھی ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔
- ۵۔ ”کھام سدھ“ (شاعری) اظہارِ پس مال آباد طبع اول ۱۹۳۷ء
 - ۶۔ ”نئے دواں“ (شاعری) کتاب خانہ عزیز، دہلی (طبع اول ۱۹۳۹ء سے قبل)
 - ۷۔ ”بافو“ (ازدادہ رمانو نیوکار کا ترجمہ) کتاب خانہ عزیز، دہلی طبع دوم ۱۹۲۳ء

یہ نیوکار کی کتاب ”کریکٹ سوان“ کا ترجمہ ہے جو میرٹھ سے پہلی

بار ۱۹۱۸ء میں طبع ہوا۔ اس اردو ترجمہ کی جگہ اہلماں شاعرت پر

نیوکار کے ناشر میک میلن کمپنی، برطانیہ نے ہر جہے کا دعویٰ کر دیا

تھ۔ مگر اس مشکل کا حل بھی خود نیوکاری نے نکالا۔

- ۸۔ ”کلیات گاندھی“ حکیم کتاب گروہ علی طبع اول: ۱۹۵۳ء
- ۹۔ ”نقد ادب“ (تہقید) بہار گورکھول بک ڈپوٹیشن طبع اول: ۱۹۵۳ء
- ۱۰۔ ”نوری“ (تہقید) بہار گورکھول بک ڈپوٹیشن طبع اول: ۱۹۵۳ء
- ۱۱۔ ”حق کی آواز“ (تہقیری۔ جنگ عظیم سے حلقہ نقیص) نکستہ طبع اول: ۱۹۵۴ء
- ۱۲۔ ”جنت نظر“ (ڈراما) نکستہ طبع اول: ۱۹۵۴ء
- ۱۳۔ ”تاریخوں کی جنگ“ (تہقید) نکستہ طبع اول: ۱۹۵۸ء
- ۱۴۔ ”ہمارا جھنڈا“ (قومیت) نکستہ طبع اول: ۱۹۵۸ء
- ۱۵۔ ”پندرہ اگست“ (قومیت۔ تاریخ تحریک آزادی) نکستہ طبع اول: ۱۹۵۷ء
- ۱۶۔ ”گاندھی جی کے ساتھ“ (مباحث کے اقوال) نکستہ طبع اول: ۱۹۶۰ء
- ۱۷۔ ”آج ہمارا کامیاب“ (عملی نفسیات۔ بچوں کے لیے) الہ آباد طبع اول: ۱۹۵۳ء
- ۱۸۔ ”پانچوں کی عقل مندی“ (بچوں کے لیے) حکیم کتاب گروہ علی طبع اول
- ۱۹۔ ”گلے کا سفر نامہ“ (سوانح کی کتاب کا ترجمہ)

غیر بدانت:

غیر منسلک کتب میں ایک سندس ”رازم آف“ اورنگ زیب اور راجگروہ کی جنگ سے متعلق، ایک طویل مثنوی ”آدم نامہ“ تہقید سے حلقہ ایک کتاب ”اولی ادب کی تاریخ“ اور مکمل آپ جی دے ۱۹۶۷ء میں رقم بد کر شروع کیا تھا۔

میوہ فروش

حاجہ اللہ افسر

سیٹھ فاروق سمیٹی کے مشہور تاجروں میں تھے۔ ان کے مال و متاع کا اندازہ مشکل تھا۔ ان کے مقدور کی قسم کھائی جاتی تھی۔ منی میں ہاتھ ڈالنے تو سنا ہو جاتی۔ وہ سمیٹی کی سب سے بڑی چہاز اس سمیٹی کے مالک اور ایک بین الاقوامی بینک کے سب سے بڑے صدر ہوتے۔ سمیٹی کے علاوہ ان کی ایک کپڑے کی مل احمد آباد میں بھی تھی۔ اور وہاں کا مشہور ترین دیہا سلائی کا کارخانہ انہیں کے روپے سے نال رہا تھا۔ سیٹھ صاحب یوں تو سمیٹی کے روشن خیال طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر بخیل اور منکر مشہور تھے۔ ایک چیرہ بھی خیرات نہ کرتے۔ خدا کے غریب اور نادار بندوں کا ان کے یہاں گزرتا تھا۔ اس کے برخلاف نورانہ سیٹھ صاحب کی بیوی بڑی دین دار اور بخیر تھی۔ یوں تو وہ ایک غریب گھرانے کی بیٹی تھی۔ مگر بہت کشادہ طبیعت۔ کبھی کسی کو مصیبت میں نہ دیکھ سکتی تھی۔ مگر کے اظہار بات میں سیٹھ صاحب بہت تنگ دل تھے۔ نورانہ گھر میں تنہا تھی۔ کوئی ہاتھ کرنے والا نہ تھا۔ یہاں بیوی کے حرائج میں بعد از سر قین تھا۔ انس و محبت کا پتہ نہ تھا۔ یہاں بیوی ایک ستار کے دو ایسے تار تھے۔ جو ہم آہنگ اور ہم ساز نہ ہو سکتے تھے۔

2

بینک پرپ کو قسم ہوئے اسکی چند بیوی گز رہے تھے۔ وہ اپنا اقتصاد ای الجھنوں میں گرفتار تھی۔ بڑے بڑے زبردست بنگلوں کی بنیادیں لڑ رہی تھیں اور ان کی قسم کے کاغذی ٹکے ہمارے ہوتے تھے کہ یا ایک سیٹھ فاروق کے بین الاقوامی بینک کا وہ الٹا نکل گیا۔ ساری بیٹیاں اور کارخانے اسی میں ختم ہو گئے۔ تمام جائیداد ہاتھ سے نکل گئی اور جو شخص تاجروں کا بادشاہ کہلاتا تھا۔ وہ آج کی آن میں فقیر ہو گیا۔ چار روز سے سیٹھ فاروق کا پتہ نہیں۔ سارے سمیٹی میں کیرام جگ رہا تھا۔ کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ۔ چلتے سہاٹی ہاتھیں۔ اکثر لوگوں کا خیال یہ تھا کہ وہ مصالحت چاہتے نہ کہ سکا تھا اس لیے روپوش ہو گیا۔ لیکن حقیقت یہ تھی۔ مصالحت کی پوری رقم ادا ہو جانے کے بعد ایک مکان بچا

کیا تھا۔ نورانہ پر ان تمام واقعات کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ مالی و متاع کے ہانے کا اسے ظمِ زندہ کر اس نے اس سخت کی بھی بھارت دیکھی تھی۔ اسے جو کچھ ظمِ زندہ اور بیسٹو صاحب کی روحِ شفی کا تھا۔ نورانہ اور بیسٹو صاحب کی شادی کو بیس برس سے زیادہ ہو گئے تھے۔ آپس میں صمیمیت تھی، لیکن کوئی خاص اختلاف بھی نہ تھا۔ مدت کے ساتھ سے ایک قسم کی سرد روی اور رفاقت بھی موجد تھی۔ طوافِ امیہ جہائی نے عورت کے پہلے میں محبت کے خاص سائل جذبات کو ختم کر دیا۔

نورانہ بچپن سے ہی تھی۔ "میں نے ان کی قدر نہ جانی۔ میں نے ان کی کوئی خدمت نہ کی۔ مگر میں نکھ اور بھگن نصیب ہوتا تو وہ آج اس طرح خود کو دنیا میں تنہا کھو کر رکھیں پہلے نہ جاتے۔ میں بھیران کے اس گھر میں کیوں رہوں۔ درد و رنج اور کھانے کو آتے ہیں خدا ہانے وہ کب آئیں گے۔ لیکن بے میرے مدد میں خاک وہ کبھی نہ آئیں۔ صاب کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ نہیں، میں اپنے طور سے جاندہ و سکون گی۔ ان کا پتہ کس سے پچھوں؟ مگر پتہ کی کیا ضرورت ہے تلاش اور طلب صادق کو پتہ کی ضرورت نہیں۔ پردہ و اب پردہ کس کے لیے کروں؟"

3

اس واقعہ کا پانچ سال ہو گئے۔ لوگ بیسٹو صادق کا نام بھی بھول گئے۔ گو یاد دنیا میں تھا ہی نہیں۔ رات بھر کی بارش کے بعد صبح خود اور ہوئی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جبکہ اور بھی کچھ اکیلے اکیلے ہوا تھا کر رہی ہے۔ سورج کی کرنوں نے شام پھر کے بازاروں کی دھندلوں پر ایسا صبح کر دیا تھا کہ جس میں زندگی کی ہلکے معلوم ہوتی تھی۔ ایک بیوہ فروش سیلا سا تھپکا دکھائے، ہاتھ میں انگوروں کی چاریاں لیے "کاش کا بیوہ" چننا بھرتا تھا۔ اس کے چہرے پر مسرت اور راحت کا اثر نمایاں تھا۔ یہ بیوہ صادق تھا۔ صادق نے اس قصبے میں اپنا نام بدل دیا تھا۔ داڑھی بڑھا لی تھی۔ اس کو "عارف" کے نام سے قہر کا کچھ چن جاتا تھا۔ وہ ان میں دو گئے لیکن اور مختلف بیوہ بات کیوں میں بھیری لگا کر فروخت کرتا تھا۔ اول ازل اسے چار پانچ کھٹے کھٹے لگانا پڑا لیکن اب اس کے گھر سے نکلتے ہی لوگ بولتی بولتی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور ادب بہت جلد سونا فروخت کر کے اپنی بھونچڑی میں داخل ہو جاتا ہے۔ بیوہ فروشی سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس کے گزارے کے لیے کافی تھا۔

عارف کو کچی راحت نصیب تھی۔ اس کی سادہ زندگی مسرت اور شاندارانی سے ہم کنار تھی۔ لیکن اب تکلیف و دھیاں نے اس کی خوشی کو دال سے بدل دیا تھا۔ وہ نورانہ کے لیے بے ممکن تھا۔ اسے درد اور کڑی خیال آتا تھا۔ "میں نے کم سخن نورانہ پر ظلم کیا ہے۔ وہ میرے ساتھ کبھی آرام و آسائش سے زندگی بسر نہ کر سکی۔ اور دامن چھوڑتے وقت بھی میری خود غرضی نے مجھ سے اس کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔" عارف ایک مرتبہ بیکس بدل کر بھیجی گیا بھی تھا۔ لیکن وہاں نورانہ کا کچھ پتہ نہ چلا۔ صرف یہ معلوم ہوا کہ بیوہ صادق کے عاب ہو ہانے کے بعد وہ بھی نہیں پہلی گئی۔

4

ایک روز کا ذکر ہے کہ عارف بیوہ فروش صبح کے وقت اپنی بھونچڑی میں بیٹا ہوا تھا کہ ایک عورت سیلا اور بیوہ لگے کپڑے اور ایک پہائی چار لوڑ سے گھوٹ لگائے ہوئے آئی اور گڑا گڑا کر کہا "عارف، خدا نے میری دعا میں اثر دیا ہے تو خدا کا نیک بندہ ہے۔ میں، انکیاری

ہوں۔ میرا خاوند پانچ برس سے لاپٹا ہے۔ تو خدا سے دعا کرو گھٹے میرے عزیز شوہر سے ملاوے۔ یہ جوت نورانہ تھی۔ عارف نے نورانہ کی آواز نہ پہچانی۔ شاید یہ ہو کہ سمیتوں کے گھم نے نورانہ کی آواز پر گئی بکھڑا کیا ہو۔

مگر آج ضرور ہو اگر عارف کے دل پر چھٹی گئی اور اسے ایسا معلوم ہو کہ وہ کبھی نہ کو گیا ہے۔ آخر اس نے اپنے جذبات پر قابو پا کر کہا: ”بی بی تم کون ہو۔ کہاں کی رہنے والی ہو۔ تمہارے خاوند کا کیا نام ہے۔ وہ کیوں چلا گیا؟“

نورانہ نے یہ آواز ضرور پہچانے لگی ہے۔ وہ ہنسی مگر ہلکے سنبھل کر بولی: ”خدا کے نیک بندے میرے خاوند کا نام سید محمد فاروق ہے۔“

عارف ”کون؟ کیا تو نورانہ ہے؟“ نورانہ! جیسے تو عارف سیدہ فریادیں کھینچ رہی ہے وہ خود سچا لکھڑا خاوند فاروق ہے۔“



مسز عبدالقادر

نام	نسب خاتون
قلمی نام	مسز عبدالقادر والدہ سراج الدین ظفر
پیدائش	۱۸۹۹ء بمقام جہلم۔
وفات	۱۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء بمقام لاہور۔
تعلیم	

مگر یہ سی مسلم اور معلومات کے ذریعے سے ہوئی۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق ہر نیک عالم ایذا و کث سے آزرہ اور عربی کے علاوہ فارسی میں "گلستان"، "بوستان"، "چند نامہ" اور "کرمیا" ابتدائی کتب تھیں جو مگر یہ سی پڑھیں۔

مختصر حالات زندگی:

آپ کے والد کا نام مولوی فقیر محمد قاسم "آفتاب محمدی"، "محمد سیف الصدام" اور "سراج الدین" کے معنی ہیں۔ یہ ایک محی کھرا تھا۔ مسز عبدالقادر کی دادی اور اس کے قلمی نام سے بخاری میں سی حرفی اور بارہا "الکھنسی" تھیں۔ خیال اور چنی ذات کا تھمیری کھرا تھا۔ مسز عبدالقادر کے والد مولوی فقیر محمد اپنے وقت کے جید عالم (فاضل دیوبند) اور دینی راہنما ہونے کے ساتھ ساتھ "سراج الطالع" "جہلم اور "سراج الاخبار" "جہلم کے مالک و مدیر تھے۔ مسز عبدالقادر کا بچپن جہلم میں گزرا۔ اپنی والدہ کی طرح سیاست کا شوق بلکہ جنون بچپن سے تھا اور ساری زندگی دیرین اور مشائخ بھکوں کو دیکھنے کی شائق رہیں۔ اپنے کمرہ والوں سے اپنے کھانے پینے کے برتن ایسے الگ رکھے۔ گوشت اور بھلی کو کبھی چھوا تک نہیں اور ان سے بیزار کراہت محسوس کی۔ یہاں تک کہ اگر وہ بڑا گری ہاتھ سے چھو جاتی تو فوراً ہاتھ دھو تھیں۔ سان پر اڑتے بگڑتے بالوں میں انھیں غلغلہ مٹی شہوں کی بچ گھیاں مصروف و متحرک ہزار دھنکات اور وسیع و عریض دھکیل دکھائی دیتے تھے۔ اپنے مگر کی

محبت پر لگی ہوئی بھولی دار چھت اور محبت کی کڑیاب میں بھی ایمان کھنڈ اور صورتی جہان آباد دیکھتی تھیں۔ مظاہر فطرت چاند، سورج، ستارے، ہوا، آد اور پانی کو کچھ کہ پھر وہ مقام جہت میں گھر گھسی۔ لڑکیوں میں ہر وقت سوچے و بچنے کی عادت سے لاغرا ہو گئیں تو ڈاکٹر صبر داریت اللہ اور حکیم قاضی عزیز احمد کے زیر مطالعہ رہیں۔ بی بی بیگم عالم چلیڈ (جوان کے فارسی کے استاد بن گئے) کے مشورے پر پیر حافظہ عہد انت آف برما کوئل کے ماتحت کراچی آئی اور شاہ اسماعیل کے مشورے کے مطابق ساڑھے تھے ویرس کی عمر میں ان کی شادی ہوا رنی ہی کے ایک پلٹہ عمر جان رحمان (ریلوے انجینئر) سے ہو گئی لیکن بچہ انتقامی طرح قائم رہا۔ اپنے میاں کے ساتھ نکلے، عمارت، دولی اور آگرہ کی جی بھر کر گئے محبت کی، یہاں تک کہ پورا ہندوستان دیکھا۔ تکمیل کے بعد ورجیم گواڈا، بری برا شرم، ورشی کشی، امر سوئی کنڈ، ہانگن جھولا، سورگ آ شرم، ایچ، ایچ اور ادوالی نکلا کے خاں، دولت آباد، کوکٹو، گوانا، راجپاس، اور کرکٹ کے قلعہ جات ملاحظہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہندو مت، شومت، برہمن مت، جومت، مثل مت، جومت، جومت، ہندو مت وغیرہ کی رسومات کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ جیوتھی، ہنوب اور شاستروں کے مہاترئی فلسفہ جات سکھان ڈالے لیکن۔ ہیں راج علیہ عقیدہ مسلمان اور پابند صوم و صلہ۔ بیج کیا، ایادات پر حاضری دلائی۔ پاپ دیکھا، الجناں، قہر اور سحر میں رہیں۔ سراج الدین ظفر صیت بھی جیٹاں اور جیٹاں کی خوشیاں دیکھیں، قاری کے سر بیٹھ میاں کے سونگ میں بیٹھیں اور کہہ نیاں نکھیں۔ لیکن وہ بے ہنگامی بلوں کی قوں رہی اور اس سے آخر دم تک بھی۔ انصہر برکس کی عمر تک یہ معمول رہا کہ موسم سرما، معاملہ صند رہے۔ موسم گرما پھاڑی مقامات پر، پھر مل اور انڈونیشیہ جہلم میں اور ہائی وقت راولپنڈی، پٹار اور دولا ہو میں گزارتی تھیں۔ ان کے ایک شاعر اور افسانہ نگار بیٹے سراج الدین ظفر نے ادب میں نام کیا۔ پہلا دل کا دورہ وہاں ۱۳۱۱ ہجرت ۱۹۹۲ اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں لاہور میں انتقال کرنے کے بعد شہادہ وراج ان کے قبرستان واقعہ پانچ پانچ پور دولا ہو میں مشعل مکانہ پایا۔

البرق

”لاشوں کا شیر“ مضمون ”لاشوں کا شیر اور دوسرے اداکار“ نگہ ۲۰-۱۹۹۱ء میں لکھا۔

قلمی آثار (مطبوعات):

- | | | | |
|----|--|----------------------|---------------|
| ۱۔ | "آشوں کا شہر اور دوسرے قصائے" | اردو پبک سٹال، لاہور | طبع اول ۱۹۳۶ء |
| ۲۔ | "قصائے جبریں" (آٹھ قصائے) | اردو پبک سٹال، لاہور | طبع اول ۱۹۳۹ء |
| ۳۔ | "نارہ اور دوسرے قصائے" (تین قصائے) | اردو پبک سٹال، لاہور | طبع اول ۱۹۳۶ء |
| | طبع دوم ۱۹۳۸ء، طبع سوم ۱۹۵۰ء، طبع چہارم ۱۹۵۳ء، طبع پنجم۔ | | |
| | ۱۹۵۶ء (اس کتاب میں "نارہ"، "کاسے سر" اور "ٹھکڑی" تین | | |
| | مطالعی شعرا قصائے ہیں) | | |
| ۴۔ | "داہنی کاف اور دوسرے قصائے" (قصائے) | اردو پبک سٹال، لاہور | طبع اول ۱۹۵۳ء |
- پانچویں باب مجموعہ شعرا کا وہ باب ہے جس کا آغاز گلہ لاہور نے
- اعلیٰ مراتب شاعری کے پیش کیا ہے۔

دوسری بار یہ ناول شعاعِ ادب، لاہور نے شائع کیا۔

غیر عدوان:

ان پانچ مطلوبہ کتب کے علاوہ چار ناول نامکمل حالت میں یادگار چھوڑے۔

نظریہٴ قلم:

”میں نے کبھی کسی کہانی کا پلاٹ سوچنے کی زحمت کو ادا نہیں کی بلکہ جب کبھی مجھے کسی کہانی کے پلاٹ کی ضرورت پڑے تو میں کسی ویران اور سنامان کشندہ میں چلی جاتی ہوں تو وہاں ماحول کے تاثرات سے کہانی کا پلاٹ خود بخود نمودار ہوتا ہے۔ مگر اس کہانی کو قلم بند کرنے کے لیے بہت کد وقت لگتا ہے۔ کیونکہ میں ایک جگہ تو کتب کو تخلیق ہی نہیں۔ میرے پاؤں میں پتھر ہے اور نگھنے کا وقت نہیں نکال سکتی۔“^۱

(سرمزید اظہار)



حوالہ جات

۱۔ اقبال، ”نمودارِ روایتِ زندگی“ (سرمزید اظہار) (کلی چار مکالمات، غیر مطلوبہ) (محرک مرزا محمد عیسیٰ)۔

بلائے ناگہاں

مسز عبدالقادر

حیدر میرا بچپن کا دوست تھا۔ ہم دونوں ایک ہی محلہ میں رہتے تھے اور دونوں نے ایک ہی سکول میں تعلیم پائی تھی۔ سکول چھوڑنے کے بعد اس نے کوئی تجارت اختیار کی اور اس تجارت کی وجہ سے اس کی بیشتر زندگی کافرستان میں گزری۔ اب وہ ایک دوکاندار شخص کی حیثیت سے آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ مگر باوجود اس آسودہ حالی کے اس کی زندگی غیر مطمئن معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہر وقت کھوپا کھوپا سا رہتا۔ اسے کسی کام میں دلچسپی نہ تھی۔ وہ سوسائٹی سے بھٹکتا تھا۔ سوائے میرے کسی سے زیادہ میل جول نہ رکھتا تھا۔ میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ اس کی افسردگی کا راز معلوم کروں گا مگر سوچتے نہلا۔ ایک دفعہ فصل کے موسم پر میرا اپنے حصہ داروں سے کچھ جھگڑا ہو گیا اور مجھے اپنے گاؤں ہانا چڑا

وہاں جا کر میں زمیندار کی بندھنوں میں ایسا گرفتار ہوا کہ دو سال تک چھٹکارا نہ ہوا۔ اس عرصہ میں حیدر سے میری خط و کتابت جاری تھی۔ اس کے خطوط سے اکثر وحشت اور ناہنجی کا جذبہ پھٹکتا تھا۔ دو سال بعد جب میں واپس آیا تو میں نے سنا کہ حیدر بالکل گوشہ نشین ہو گیا ہے۔ دو تین دن تو گھر کے معمولی کام کاج میں صرف ہو گئے۔ پھر سے دن شام کے قریب میں اسکے گھر گیا۔ میرا لڑکا سلیم میرے ہمراہ تھا۔ حیدر کی حالت دیکھ کر مجھے دلی صدمہ ہوا۔ وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بن رہا تھا۔ اس کا رنگ شیاالا اور جلد بدلنا بطور پر خشک ہو رہی تھی۔ اس کی اندر کوٹھنی ہوئی آنکھوں سے خوف و ہراس کی علامات ظاہر تھیں۔ مجھے دیکھ کر ایک مردہ سی مسکراہٹ اس کے چہرہ پر ہونٹوں پر کھیل گئی۔ میں اسے دیر تک حیرت سے دیکھتا رہا۔ میری حالت سے آگاہ ہو کر وہ مری ہوئی آواز سے کہنے لگا ”کیا دیکھ رہے ہو“ میں نہ موٹی نہ ہاروود بارہو لا ”آقا تم نہیں جانتے میری زندگی کس خطاب میں ہے۔ میں نے آج تک اپنا راز تم سے پوشیدہ رکھا تھا۔ مگر اب نہ پاؤں نہ رکھ رہا ہوں۔ میرے دل میں نہیں رہ سکا۔ میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں“

”سکول چھوڑنے کے بعد میری دوستی ایک ایسے شخص سے ہوئی۔ جو کافرستان میں کھڑی تھارت کرتا تھا۔ یہ شخص انجیلی ایک شخص اور دوست نواز تھا۔ وہ دنیا میں بالکل اکیلا تھا اور تھارت کا کام اہتمام دینے میں اسے بہت طاقت ہوتی تھی۔ اس لیے اسے ایسے آدمی کی تلاش تھی جو اس کے بائبل کافرستان کے علاقہ میں دورہ کر کے کافرانہم کرنے میں اس کی مدد کرے۔ ان دنوں میری عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی میں بالکل نا تجربہ کار تھا تاہم اس نے مجھے دیا تھا اور اس وقت پا کر تھارت میں حصہ دار بنا لیا اور میں نے اپنا کام اس قدر خوشی اور محنت سے کیا کہ سال کے اندر اندر ہماری تھارت چمک اٹھی۔ انہی ایام میں ایک دلع میں اپنے کو پھنسی ملازم کے ہمراہ دورہ کرتا ہوا بھول کر ایک طیارہ علاقہ میں جا بیٹھا۔ گو یہ علاقہ نہایت سرمہز تھا، میوے سے لدے ہوئے درخت تھاری خوراک کے لیے بکثرت موجود تھے اور پکائے اور پکائے کھانے کو چھ چھہ یہ حیات بخش فطرت ہادی تھے۔ لیکن رات کو سر جھپکانے کے لیے جگہ ملنی دشوار تھی۔ تمام دن ہم جنگلوں میں جھنگتے رہے حتیٰ کہ شام قریب ہو گئی۔ شکستہ طور پر آفتاب دن بھر کی تھارت سے زبردور ہو کر لیرائے شب کی سیاہی تمام زخموں میں منہ چھپانے لگا۔ جنگلی ہمارے شور و غل جانتے ہوئے اپنے گھونسلوں کے اندر گر دھوپ کر کے لگے۔ اور گھٹے اور غشوں کی وجہ سے جنگل بے حد تاریک ہونے لگا۔ ہم اندھا اندھ آگے بڑھتے گئے۔ ایک جنگلی شخص ہوا گیا۔

ہم ہمارے ایک نفعہ سے باہر نکلے تو افق کے دھلے مناظر سے اندازے آٹھیں روٹیں ہو گئیں۔ ہم ایک شہرِ آب و زرخیز میدان کے کنارے کھڑے تھے۔ کہیں دور سے روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ ہم اس طرف بڑے بڑے اور تھوڑی دیر میں ایک جھونپڑی کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔ جھونپڑی میں بجلی بجی ہوئی تھی اور وہی بجلی دو کھٹی سے دو کھٹی کے پھاروں کے بلکارے گل رہے تھے۔ اور پختے ہوئے گوشت کی طرف لگا رہا تھا۔ اچھ رہی تھی۔ ہم نے جھپکا پاتے ہوئے دھک دئی۔ ایک خشک روٹھن صورتِ قحط نے دروازہ کھولا۔ میں نے رات بسر کرنے کی درخواست کی۔ اس نے ہم دونوں کو سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ پھر ایک ٹوٹا کھجور کا تھیلہ لگاتے ہوئے اندر لے گیا اور کہا۔ اس ٹوٹا کھجور کا تھیلہ سے میرا دل مل گیا۔ طرح طرح کے دوسرے اٹھنے لگے۔ مگر تھکان سے بھرا ہو کر چپ چاپ اس کے پیچھے ہو گیا۔ جھونپڑی کی اندرونی حالت بہت روتی تھی۔ دروازے اندر میں سے سیاہ ہو رہی تھیں۔ ہر چیز پر سیاہی پائی گئی تھی۔ ابھی ہوتی تھی۔ اس نے ہمیں ایک شکستہ تخت پر بٹھایا اور خود ہمارے کھانے کے بعد رات میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں اس نے بھنا ہوا گوشت اور کئی روٹیاں لاکر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر میرے ملازم نے میرا دستہ ایک طرف لگا دیا۔ مگر میرا دل اس نے کون چاہتا تھا۔ مجھے اس شخص صورتِ آدمی کی آنکھوں میں شکوہ مسکراتی دکھائی دیتی تھی۔ اس بدگمانی کے زیر اثر میرے دل میں ایک نامعلوم فطری پیدا ہو چکا تھا۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ وہ قہور لے آیا۔ نیند کو دور کرنے کے لیے میں نے خوب قہور دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے سخت تیر کے سمو گئے آنے لگے میں نے چاہا کہ ملازم کو بغیر دروازے کی تاکید کر کے خود سو جاؤں مگر دیکھا تو وہ پہلے ہی گری نیند کے حیرے لے رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی۔ وہی۔ مجھ کو اکرے سو۔ مجھ پر نیند کا غلبہ زیادہ ہو رہا تھا۔ رفو رفو اور گرد کی چڑی دھندلی نظر آنے لگیں۔ پھر مجھے کچھ ہوش رہا۔ رات کا مجھے نہایت ٹوٹا کھجور کا خواب دکھائی دے۔ میں نے دیکھا کہ چند روٹیاں اور آدمی مجھے کندھے پر اٹھانے ہوئے گئیں۔ لے جا رہے ہیں۔ ایک ایک میرے سر میں سخت ٹپٹپٹ ٹپٹ ٹپٹ کی کیفیت سے میرے پٹھے اٹھنے لگے۔ دورانِ خون سر کی طرف زیادہ ہوئے۔ دماغ پھٹنے لگا۔ سخت تکلیف سے میری آنکھ کھل گئی۔ آف اپنا انتظار میں نے ایک ایسا بریٹا لگا۔ مگر دیکھا کہ میرا خون خشک ہو گیا۔ بدن کے روتھیں سوچیں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ اور دل ایک بڑے کھوک کی اندر تک تک کرنے لگا۔ آواز میں ایک تھوڑا سا رافٹانی غار میں ایک لمبی سی چوٹی بڑھ چلا ہوا تھا۔ میری ٹھٹھکی کسی ہوئی تھیں اور سر ہانے کی

طرف ایک دیراستہ لارڈ چل رہا تھا۔ دیکھتے ہوئے انگاروں کی سرخ حرکت ہوئی روشنی میں دو آدمیوں پر صیپ سامنے تاج رہے تھے۔ فار
دوڑا کی پہلی کی طرح لال اور نرم تھی۔ غصہ کری سے ہراسہ پکڑا رہا تھا۔ سبز کے قریب ایک دیر لارڈ آوی کھڑا تھا۔ جس کا ہاتھ سے بے
باز سر ایک پٹا ہوئی تیرہ ذکی طرح بڑا تھا۔ اس کا سر سبز چہرہ جس پر جگہوں کی طرح ہونے پر بے سیاہ لپے لگے تھے۔ انگاروں کی لال روشنی میں
ظن سے در لگا ہوا مضمون ہوتا تھا۔ وہ ہاتھ میں ایک لمبا تھاری چاقو پکڑے کسی کو کچھا مکام دے رہا تھا۔ اجتماعی دہشت سے میری زبان مطلق میں
جس کی صورت نس، رک رک کر آئے گی۔ اسے میں ایک تسلی آواز سنائی دی۔ کچھ سے منہ کی سرخ چہرہ ہلا دے اپنا مضبوط چاٹھو اٹھو اور چاقو
سے میرے سر میں گھاؤ لگانے لگا۔ میں شدت خوف سے پیٹلی نیم جاں ہو رہا تھا۔ زلموں کی تکلیف سے بے ہوش ہو گیا۔

3

مجھے ہوش آیا تو میں ایک صاف سحرے کشادہ کمرے میں ایک آرام دہ سبز پر بڑا تھا۔ کمرے میں بالکل سکوت تھا۔ ایک طرف
آخری در کے پر کے ہوئے تھکن کے بڑے سے چار اس میں بچھل چل رہا تھا، جس کی کیف آدہ روشنی صفر کے قرابے لٹھارتی تھی۔ چاند کی
صیبن نہیں کھلی کڑی سے داخل ہو کر فرش زمیں پر گرت رہی تھی۔ میرے سر اور گردن کے پچھے اکڑے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ مجھے سب
واقعات یاد آنے لگے اور غار کا سحر آگھوں کے سامنے لگنے لگا۔ میں نے گھبرا کر کھڑو اور نگاہ ڈالی۔ سر ہانے کی طرف ایک سایہ سا دیکھ
کر میری آنکھیں کل گئیں۔ فوراً کسی نے شفقت بھرا ہاتھ میرے چہلے پر رکھ کر کوئی پہوٹی چٹو میں کہا۔ ”خالع مندو جان، تمہیں اپنی زندگی اور
جراتی سہارک ہو، تمہاری اس طرح اور مسلسل غمی نے مجھے تمہاری زندگی سے واپس کر دیا تھا۔ تمہارا آج آخر دن کے بعد تمہیں ہوش میں دیکھ کر
بہت خوش ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میری صحت ٹھکانے لگی۔ اب کچھ فکر نہیں تم بہت جلد اٹھو ہو جاؤ گے۔“ دلچسپی کے الفاظ سن کر میں نے
مستطش لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک چالیس سال دھیر ہو رنگیل آدمی تھا۔ اس ایک دل انسان کی بڑی ہوئی ہو رہی اور ان ایک
خدمت گزار سی سے میری صحت بہت بہتر ہو کر گئے تھی اور میں بتدریج صحت پاب ہوتا گیا۔ دورانِ ملاقات میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے صحن
کا نام جہاں بنت ہے۔ اور وہ ایک قلیل کا سردار ہے۔ میرے اختلاف پر جہاں بنت نے مجھے ایک عجیب و غریب داستان سنائی۔ اس نے کہا،
”اس علاقے میں کافی ایک ایسی وادیاں ہیں، جو خود دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ ہر ایک وادی کا راستہ اتنا خفیہ اور پراسرار ہے، کہ کوئی انہیں
ان میں داخل نہیں ہو سکتا، اور ہر وادی میں جدا جدا قلیل آباد ہیں۔ چنانچہ یہ وادی بھی، جس میں میرا قلیل آباد ہے۔ اسی طرح کی ایک پوشیدہ
وادی ہے۔ اور یہاں سے ایک دن کی مسافت پر ایک اور ایسی ہی پوشیدہ وادی ہے۔ جس میں ایک بڑا خوش کا قلیل آباد ہے۔ ان کی سردار ایک
عورت ہے۔ جس نے جراتی کا جوہر اجاگر کیا ہے۔ انھار دس لکھوں سال تک کی عمر کے جو جوانوں کے سر سے وہ اس جوہر کو کی پادی طریقے سے
حاصل کرتی ہے، اور اس جوہر کے اثر سے ہاڑ جو سن رسیدہ ہونے کے ابھی تک جو سن اور نو خیز نظر آتی ہے۔ اس جوہر کو حاصل کرنے کے لیے
اس نے اپنے ملازم مختلف علاقوں میں اس غرض کو چھوڑ رکھے ہیں کہ وہ کسی طرح تو جو انوں کو اس کے لیے فراہم کریں۔ ان میر تو جو انوں کو
اس کے ملازم مختلف علاقے سے بے ہوش کر کے خفیہ قمار میں لے جاتے ہیں۔ جہاں وہ عورت ان کے سروں سے جوہر کھینچ کرتی ہے۔ انہیں نے
پچھلے آج آپ کو یہ باتیں کچھ معلوم ہوئیں۔“ اس نے کہا ”جراتی میں مجھے بھی ایک دفعہ اس کے آدمی پکار لے گئے تھے۔ لیکن میرے قلیل کو اس

بار کا کسی طرح تکون ملی گیا، اور اس نے شخون مار کر گھسے میں اس وقت چھڑایا۔ جبکہ ایک سرخ چہرہ جلاویر سے سر کو ڈھکی کر رہا تھا۔ ”جوان بخت نے گلا، اتار کر اپنا سر گھسے دکھایا، میں نے ہاتھ بڑے بڑے سفید داغ تھے۔ بھر کینے لگا۔“ میں نے اب اس علاقہ میں اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں۔ جب کوئی نوادہ وہاں کے مجھے چڑھ جاتا ہے۔ تو مجھے اطلاع مل جاتی ہے اور میں چھاپ مار کر ان نو جوانوں کو بچہ لینا ہوں۔ مگر وہ صورت اختیار کا فارسی بدلتی رہتی ہے۔ مگر میں ہمیشہ تکون لگانے میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔ چنانچہ جس دن درجن قہقہوں اس راؤن کے پاس لے جا رہے تھے۔ مجھے جاسوسوں نے مطلع کیا۔ جس پر میں نے کئی ایک چاروں میں قہقہوں کا کیا۔ اور آخر کار ایک خار پر حملہ کر کے قہقہوں کی جہات دلائی۔ میں کئی دفعہ اس صورت پر حملہ کر چکا ہوں مگر وہ دوسرے دھم سے بچ کر صاف لٹل جاتی ہے۔ کاش مجھے اس کی ادنیٰ کاراستہ معلوم ہو جائے اور میں ہمیشہ کے لیے دیا کو اس راؤن کے دھم سے پاک کر دوں۔“

4

میں تقریباً چھ ماہ جو اس بخت کی رادی میں مقیم رہا۔ کئی دفعہ راجی کا ارادہ کیا مگر اس کی بے لوث محبت میرے لیے نہ ٹھہر پائی۔ چھ ماہ بعد میں نے دل کڑا کر اس سے اجازت طلب کی۔ وہ بکسوچ کر بے دلی سے کہنے لگا ”میں شوق سے جا سکتا ہوں۔ مگر قہقہوں میں سے آنکھوں پر پٹی باندھ کر جانا ہوگا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔“ ”کیوں؟“ ”وہ لیا بخت سے بولا۔“ ”مگر میں قہقہوں پہلے ہٹا چکا ہوں۔ کہ پانچ پانچ ماہ رادی ہے، اس لیے سوائے اپنے قبیلے کے کسی اور کو ان ظہیر راستوں کا راز دانا ہمارے اصول کے خلاف ہے اور اس اصول میں بے جا قہقہہ کی وجہ سے نقصان کا خوف خطرہ ہے۔ کیونکہ اگر ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے کی رادی کا راستہ معلوم ہو جائے، تو وہ شخون مار کر رادی میں بے جا قہقہہ کی وجہ سے قبیلے کو چاروں برا کر دیتے ہیں۔ کو گھسے تم پر کوئی بدگمانی نہیں مگر اپنے قبیلے کے خلاف بکسوچ کر سکتا۔ ان کے قہقہہ کردہ اصول کی خلاف ورزی میری طاقت سے باہر ہے۔“ میں نے اس ردی سے کہا۔ ”تو بھاریا میں یہاں کبھی خا سوں کا؟“ ”میرے خیال میں کبھی نہیں۔“ اس نے کہا۔ میں نے کہا۔ ”لیکن آپ کی طاقت“ ”وہ میری بات کاٹ کر بولا۔“ ”یہ بھی تقریباً ممکن ہے۔“ اس کا گوارا گفتگو نے مجھے مایوس کر دیا مجھے اس سے دلی الفت تھی۔ اس لیے اس کے قبیلے سے میرے دل پر گہری چوٹ لگی اور میرے آسوار جاری ہو گئے۔ وہ دیا تو نہیں مگر اس کے چہرے کا اڑنا ہمارا رنگ اس کے اضطراب کا شاہد تھا۔ وہ گاؤں گئے پر کہناں نیچے بکسوچ رہا تھا۔ اس کے حلقہ چہرے پر سادہ جلیاں نمایاں تھیں۔ کمال وقت کے بعد اس نے سرائی اور اپنی گہری ہوئی منور پیشانی پر ہاتھ بھرتے ہوئے لہرات طاقت سے کہنے لگا۔ ”ہاں ایک صورت ہو سکتی ہے۔ اگر تم میرے ذہنی طریقے پر قسم اٹھا کر میری رادی میں شامل ہو جاؤ تو میرے قبیلے کو اطمینان ہو جائے گا۔“ میں نے اس شرط کو فوراً مستحضر کر لیا۔ دوسرے دن جو اس بخت نے اپنے تمام قبیلے کی دعوت کی اور سب کے سامنے یک علم مایاں کا بن نے جو اس بخت کی پھٹکیا سے چند قطرے طون لٹال کر ایک مختصری میں پکائے۔ بھاری پانی خاص دہان میں اس خون پر گھسے قسم ملی گئی۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر میری جہد سے جو اس بخت کو کسی قسم کی تکلیف پہنچے تو وہ میں گھسے بھی وہی سزا دیں۔

اس کے بعد علم مایاں کا بن کی ہدایت کے بموجب میں نے اس مقدس خون کو پیکھا اور اس دم کے اختتام پر جو اس بخت نے مجھے سکے سے لگا لیا۔ اس کے بعد قبیلے کے سب لوگ یکے بعد دیگرے میرے گئے ملے اور خوشیاں مناتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اگلے دن مجھے

وادی کا راجہ تھا۔ یا گیا اور چلتی دفعہ جوں بخت سے تاکید کی کہ جب تک میری عمر ۴۵ برس سے تجاوز نہ کر جائے۔ اس علاقہ میں آگیا یا کسی آبپاشی کے بہرہ و سرفراز کردیں۔ جوں بخت کے خاص آدمی مجھے اس جگہ پہنچا گئے جہاں میرے حصہ دار کا بیڑہ کھڑا تھا۔ یہ خطہ جوں بخت کی وادی سے دو سو میل کے فاصلے پر تھا۔ میرا حصہ دار جو میری زندگی سے باہر ہو چکا تھا۔ مجھے ذمہ و مسامتہ پا کر بہت خوش ہوا۔ جوں بخت کی دوستی سے میری اہمیت کو بہت فائدہ پہنچا۔ کیونکہ جہاں بخت کی وادی میں کتبہ بہت کمزور سے پائی جاتی تھی۔ اس کے آدمی بیٹھ کتبہ پہنچاتے رہتے۔ انہی آدمیوں کے ساتھ میں بھی ہر دوسرے قبر سے چھینے جوں بخت سے ملے جا پا کر تھے۔ اسی طرح کئی سال گزار گئے۔ میری عمر ۴۵ برس سے تجاوز کر گئی۔ اب میں بغیر ممالکوں کے بے تلکے اس علاقے میں سفر کرنے لگا۔ ایک دفعہ میں جوں بخت کو ملے جا پا تھا۔ راستے میں ایک چھوٹی سی کوہستانی سرانے میں میری ایک خوش پوش شاہسوار سے ملاقات ہوئی۔ یہ شخص بڑا بااقتی تھا۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے ذکر کیا کہ تلوں راستے سے آتے ہوئے کئی دفعہ اس ندی کے کنارے جو یونیشی کوئی کے ملحق میں ہے اس نے پیروں کو کھاتے دیکھا ہے۔ اس وقت تو میں نے اسے جھٹک دیا مگر دوسرے دن سفر کرتے ہوئے راستے میں مجھے اس ندی کا خیال آیا جو یہاں سے زیادہ دور تھی۔ میں نے گھوڑا اس راستے پر ڈال دیا ندی کے کنارے گیا تو کہیں دور پار سے بجلی بجلی دھنک آواز جو جسم بہار کی نرم دھڑکیوں پر مستی بکھیر رہی تھی کہ میرے دل میں گدگدی پیدا ہونے لگی۔ میں نے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ برساتی ندی میں پانی بہت کم تھا جس پر آسانی سے عبور کر کے پار کے کھلے جنگل میں داخل ہو گیا۔ اب سمیت کہیں قریب ہی جانی دیتے تھے۔ یہ تھا ادا انگیز رانگی مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی جس طرح حنا میں لوہے کو کھینچتا ہے آگے بڑھ کر معلوم ہوا کہ جنگل کو وسط سے کاٹ کر چھوٹا سا میدان بنایا گیا ہے۔ اور اس میدان میں ایک خوشنما جھونپڑی ہے جس کے ارد گرد خوش رنگ پہلواریوں کی بساط لگی ہوئی ہے۔ قریب کیا تو فرما حضرت سے میری آگھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سوسن کی پہلواری میں ایک بہی جمال حسینہ یک پہاڑی سار پہاڑش سے مل گئی تھی اور چند کوہستانی لڑکیاں ہاتھوں میں شکر و باد سے اس کے سامنے رانچ رہی تھیں۔ اس حسینہ کو کچھ کر میں ہلکا کر لیا۔ اس کی بڑی بڑی خوشنما صدائی آنکھوں سے ایک ایسا کیف کا سیلاب انداز تھا۔ جس کی تیز دھڑکیں میرے ہوش و حواس تک پہنچ گئے تھے۔ کچھ کر انہوں نے رگ رنگ فتح کر دیا۔ حسینہ نے مجھے جا کر بڑے اخلاقی سے اپنے قریب خنایا اور نوٹی چھوٹی چٹو میں دھیں کرنے لگی۔ جب میرے حواس قدرے اور مست ہوئے تو میں نے اس حسینہ سے نام و غیرہ دریافت کیا۔ ”تو کہتے تھی میرا نام ساقا ہے میں ایک کوہستانی دیہی کی لڑکی ہوں۔ والدین کے اھلال پر میرا دل ٹوٹ چکا ہے۔ یہ جگہ بھی میرے باپ کی فکر کا تھی یہاں اپنی کھیتوں کے ساتھ زندگی کے دن پارے کر رہی ہوں۔“

میں نے قلمبوں اس حسینہ کی صحبت میں گزارا۔ خوشی کے لمحے جیکس میں گزر جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ کی دھنکی چھانوں وقت کی رفتار کا پتا دیتے لگی۔ ساقا سے رخصت ہو کر میں جوں بخت کی وادی کی طرف دھڑکیا۔ میں ابھی تک محبت کی چاشنی سے نا آشنا تھا۔ آج پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ میں چاند اس لڑکی کو دے چکا ہوں۔ جوں بخت کی ملاقات کے بعد میں اپنے اوپر سے دھنک دیا اور تیر جوں بخت کے پاس پہنچے شادی کرنے لگی۔ بہت کوشش کی کہ اس کو بھول جائے مگر دل نہ اٹا اور آخر کار اپنے کاہنہ سے ہدال ہو کر کرایا اور تیر جوں بخت کے پاس پہنچے لگا۔ جوں بخت میری اس تہذیبی پر حجب تو نہیں میں نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنے عشق کا راز اس سے چھپانے لکھا۔ ساقا کی جھونپڑی جوں بخت کی وادی سے زیادہ دور تھی۔ اس لیے اکثر اس سے ملاقات ہوتی رہتی تھی وہ اکثر جاتے رہاں دریافت کرتی۔ ہمیں نے بھی اس سے جوں بخت کا ذکر کیا۔ اسے ایسا شہ اپنے ذہن کا پتہ دیا۔ جو میرے کاہنہ کا مرکز تھا۔ یہ سن کر وہ دگمائی سے صدمہ پھیرا کرتی۔ کیونکہ وہ

وہاں یہاں سے غریبوں کو سونیل کے فاصلے پر تھا۔ ایک دن جب کہ اسے اپنی محبت کا نتیجہ دلدادہ تھا وہاں ہوا ہوا ہوا ہوا ہوا۔ "تمہاری محبت کا میں کیسے یقین کر سکتی ہوں۔ جب کہ تم اپنی جائے رہائش تک مجھ سے بچا رہے ہو۔" غصہ سے جھٹ جھٹ جھٹ جھٹ جھٹ سے لنگ لنگ کیا۔ "دوسرے کارڈ میں نہیں تھا سکتا۔" میرے اس جواب پر وہ اپنی حسین آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "آؤ آپ مجھے اس قدر سونیل سمجھتے ہیں۔ کیا میری ذات سے کسی کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔" اور حقیقت آنسو غصہ کا زبردست اظہار ہے۔ جسے دیکھ کر مضبوط سے مضبوط اور اسے کامرہ بھی زیر ہو جاتا ہے۔ آؤ میں بھی ان صدقان گو بہر یاد کو دیکھ کر کہہ نہ پو گیا اور ان خوشنما آنسوؤں نے مجھے مغلوب کر لیا۔ انہوں نے اپنے افسانہ کی جہد تو کر اسے اس دوا کی کارزار بتا دیا۔

5

رات کسی بد عہد گنہگار کے دل کی طرح تاریک تھی۔ جس کی گھومت سے کائنات دھواں دھار ہو رہی تھی۔ تیسری تاریخ کا نیا چاند اپنی کی تاریک گھرائیوں میں کھوپکا تھا۔ سارے سیاہ بالوں میں گم ہو چکے تھے۔ تمام دنیا ایک کالے دیو کی منہ میں بند معلوم ہوتی تھی۔ جہاں بخت اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا کہ میری آنکھوں میں غیز مغلج تھی۔ ایک نامعلوم خطرہ مجھے قریب تر معلوم ہو رہا تھا۔ کسی مجسمہ خوف سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں جنگلی اذیت محسوس کرتے ہوئے اپنے کمرے میں بے چینی سے پھر لگا ہوا۔ آؤ میری رات کے قریب ایک ایک ایک گرجا رہا آؤ اسے تمام دوا کی گونج اپنی۔ اس پر ہول آؤ اسے میرے دل کے کھڑے ہو گئے۔ آؤ چاہاں صوبہ خوار سے کی آؤ تھی۔ جس پر خطرے کے وقت چوتہ پڑتی تھی۔ خطرے کے آرام پر تمام قبیلہ بیدار ہو گیا۔ جہاں بخت کے گھر میں کھلی کھلی تھی۔ اس نے نہایت جلد سے جھپٹا لگائے اور تھاپے کے لیے تیار ہو گیا۔ یکدم ریزوں کا ایک زبردست گروہ جہاں بخت کے گل پر فوٹ چلا۔ وہ کمال بہادری اور جوانمردی سے لڑا اور ریزوں کے تلواروں کے سامنے اس کی پیش نہ کی۔ وہ مجروح ہو کر گر چلا۔ ریزوں نے اس کے ساتھ ہم سے کی شخصیں کیں۔ پس اور میں رتی رفتار گھوڑوں پر آؤ کر دوا کی سے نکال لائے۔ ابھی وہ دوا کی سے لگے ہی تھے کہ جہاں بخت کا ہاتھی قبیلہ قاتل کرتا ہوا آؤ نکلا۔ چند میل کے فاصلے پر وہاں لشکر آؤ میں میں قہم تھا ہو گئے۔ لوہر میدان کا زار گرم ہو رہا تھا اور ہم قیدیوں کو ایک عمارت میں بچھا دیا گیا۔ عمارت میں آؤ میں۔ آؤ میں اور ایک جگہ سے ہونے شیر کے جھگڑے کے قریب ایک عورت کھڑی تھی۔ اس عورت کو دیکھ کر میں حیرت و استعجاب سے اچھل چلا۔ آؤ میں رات تھی۔ وہ فیسے سے رات تھی۔ حالت نیتہ میں اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ ایک کونے میں وہی خوش پوش مسافر کھڑا تھا جو بھی مجھے سرائے میں لایا تھا۔ جس نے سڑک کے اشارہ اید پر جہاں بخت کی شخصیں کھڑیں۔ اور اسے خوشنماک شیر کے جھگڑے میں ڈال دیا۔ صوبہ شیر نے آؤ نکالا جہاں بخت کو اپنی مضبوط رانوں میں دلوں کر جاگ کر دیا۔ میں اسی وقت ریزوں کے لشکر میں بھاگتا چلی اور حملہ آور بار دھاوا کرتے ہوئے عمار کے قریب پہنچ گئے۔

خطرے کو بھاپ کر سڑھا فوراً غار سے باہر نکل۔ اور اپنی جماعت سمیت جنگ میں غائب ہو گئی۔ حملہ آور جب عمار میں داخل ہوئے تو انہیں جہاں بخت کا مسرتہ تھا۔ انہماک دیکھ کر اسے صدمہ ہوا۔ اس کی لاش وہاں میں لائی تھی جہاں نہایت احترام سے اسے سپرد خاک کیا گیا۔ چالیس دن تک اس کا قبیلہ سو گوارہ رہا۔ آخر چالیسویں کی رسوم پر جب کہ تمام قبیلہ جمع تھا۔ ہم عمار کا مین نے کہا "یہاں میں یہیں جانا

چاہتا کہ تم میں سے خدا کو ملے۔ لیکن تمہیں یہ قانون چاہتا ہوں کہ خدا مرزا سے کبھی نہیں جاکر سکا۔ تم لوگ مقدس خون پر جہاں بخت سے
 دلاؤاری کی قسم اٹھا چکے ہو، اور یہ کوئی معمولی چیز نہیں۔ جہاں بخت کی عمر اس وقت پچاس سال کے قریب تھی۔ اس لیے پچاس سال کی عمر میں
 خدا پر اس مقدس قسم کی لعنت پڑے گی کہ وہ وہ شیر کے پاتھوں ہلاک ہوگا۔ "نیم مریاں کا کہن کے اس اعلان سے سب کے دل دہل گئے
 کا کہن کے ان الفاظ کا مجھ پر خاص اثر ہوا۔ عمر صدمہ کے دل کو برقرار رکھا اور دوسرے دن اپنے ڈیرے کی طرف واپس ہوا۔ میں محرم تھا۔
 میرا سکون نکل پڑا۔ رخصت ہو چکا تھا۔ اب تہارت میں بھی میرا دل نہ لگا۔ میں تہارت چھوڑ کر اپنے دیس چلا آیا۔ چونکہ میں نے جہاں بخت کی
 بدولت سے شہر دولت کوئی تھی۔ میں میرا زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن میرا دل کبھی مطمئن نہ ہو سکا۔ اس نیم مریاں کا کہن کے الفاظ بیٹھ میرے
 کانوں میں گونجتے رہے۔ اب جس دن سے میرا پچاسواں سال شروع ہوا ہے خوف سے مجھے زندگی دہال ہو گئی ہے۔ رات کو شیروں کے
 دبانے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ شیروں کے طوفان کے سامنے دیواروں پر متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ اکثر ایک الموت کے مرد پاؤں کی چاپ
 محسوس کرتا ہوں۔ رو میں میرے ارد گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ جہاں بخت کی کلن پائل لاش مجھے اشاروں سے بتاتی ہے، اور اسی خوف سے گوش
 نشین ہو رہا ہوں۔" حیدر کی داستان سن کر میں نے اسے قہقہے دیتے ہوئے کہا کہ "تمہیں وہم ہو گیا ہے۔ وہ نہ ایسی قسمیں کہ جو حقیقت نہیں
 رکھتیں اور نہ ہی تم نے جان لو جو کہ خدا کی۔ ایسی فضول قسموں کا خیال نہ کرو۔ یہاں شہر میں شیر کہاں سے آئے گا۔" میں بہت دیر تک اسے
 کھانا تار ہا۔ بارہ بجے کے قریب میں اٹھا۔ میرا خیال تھا کہ سلیم لاہوری میں سو رہا ہوگا۔ میں لاہوری کی طرف گیا۔ تو وہ کرسی پر بیٹھا مسکرا
 رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا "اٹھائیں سے بچا کی تمام باتیں سنیں ہیں۔ وہ بہت ڈراؤنک ہے۔" میں نے اسے آہستہ سے اٹھنے کوئے کہا۔ "سلیم
 ایسا نہیں کہا کرتے۔" وہ حریفی سے ہلکا۔ "وہ حقیقت بہت ڈراؤنک ہے۔ دیکھو میں نے اسے ڈرانے کے لیے دیوار پر کیا پایا ہے۔" میں
 نے دیوار کی طرف دیکھا۔ سلیم نے اس پر اپنی دھمکی پھیل سے ایک بہت بڑے شیر کی تصویر بنائی تھی۔ تصویر کو اچھ کر بے اختیار دھس دیا۔ اور اسے
 ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔

6

چاند رات کو میں در سے سو رہا تھا۔ اس لیے صبح میرے آگے کھلی تھی۔ ابھی میں بستر میں ہی تھا کہ حیدر کی موت کی خبر پہنچی۔ اسے رات کو
 کسی درد سے لے جا کر کر دیا تھا۔ میں اس وقت حیدر کے مکان پر پہنچا۔ وہاں پو پو نہیں صبح تھی۔ حیدر کی لاش بستر پر کھات اور حالت میں پڑی
 تھی۔ اس کی شادک کے قریب ایک بہت بڑا گروڈم تھا اور کسی درد سے کے خون آلود پنے بستر کی ملید چادر پر صاف لٹایاں تھے۔ میں
 مرزا سے اسے آہستہ آہستہ اٹھا ہوا لاہوری میں ہانکا۔ اچانک مجھے سلیم کی بھائی ہوئی تصویر کا خیال آیا مگر وہ میری طرف دیکھ کر میرے
 اوسان خطا ہو گئے۔
 سلیم کی بھائی ہوئی شیر کی تصویر دیوار سے غائب تھی۔



جلیل قدوائی

نام	جلیل قدوائی
تلمی نام	جلیل قدوائی
پیدائش	۶ مارچ ۱۹۰۳ء بمقام اٹاڈ (اوڈھ) بھارت۔
وفات	یکم فروری ۱۹۹۶ء راول پنڈی پاکستان۔
تعلیم	ایم۔ اے (اردو) الہ آباد، یونیورسٹی ۱۹۳۳ء گورنمنٹ ہائی سکول طلیح اٹاڈ (اوڈھ) سے ایس۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ ایف۔ اے میں احسن مارچ ۱۹۳۱ء سے اردو کا مضمون چننا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۳۶ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں ایم۔ اے (اردو) کرنے کی غرض سے الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۳ء میں اول درجہ میں ایم۔ اے (اردو) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

جلیل قدوائی نے میٹرک تک کا زمانہ اٹاڈ (اوڈھ) میں گزارا۔ چھ ماہ قریب اور بے سے علی اردو شعر و ادبیات کا ذوق بیدار ہوا۔ اٹاڈ کے قصبہ موہن میں مدرسہ موہانی، ملازمتی چوری اور نیکت موہن نال دواں بھی خفیات قیام پذیر تھیں اور اٹاڈ میں بکسر اور آجادی، اصغر کوٹادی، جعفر علی خان اثر اور مرزا گلشنوی اکڑ آتے تھے۔ یوں اٹاڈ کی لغت شعر و ادب عربی سے مسوری تھی۔ جلیل قدوائی نے زبان غالب علمی سے ہی شعر کہنے شروع کیے اور ”غیب“ ”چادیں اور“ ”صوفی“ ”پنڈی بہاد الدین“ میں شائع ہونے لگے۔

۱۹۳۲ء میں حصول علم کے لیے علی گڑھ چلے گئے جہاں سید سجاد حیدر یلدرم مسلم یونیورسٹی کے ریسرڈر تھے۔ یلدرم ان کے سب سے بڑے مرثی اور محسن ثابت ہوئے۔ ہم سعادت طالب طوں میں غولہ منظر حسین اور غولہ نظام الہید بن بہت فریاد تھے اور اس زمانے میں

ابھیں کاساتھ رہا۔ طویلہ منظر حسین اور طویلہ خاتمہ دے دی۔ یہی مسلم یونین خدو خدائی گزرا کہ وہ اپنی پہل کے مدبر تھے۔ جنہی کے بعد جمیل قدوائی نے ادارت سنبھالی۔ اسی زمانے میں ”ہزار داستان“ اور ”الناظر“ جیسے قیامی ادبی جرائد میں شائع ہونے لگے۔ ۱۹۲۶ء میں بی۔ اے کے بعد جمیل قدوائی کو نظر انداز کر دیا گیا۔ صوبہ صواب نے اپنے جریہ ”الناظر“ کی ادارت کے لیے کھنڈہ چاڑھا۔ کھنڈہ خلیج کر جمیل قدوائی نے ”الناظر“ کھنڈہ کے کاپی ہارنگر نمبر ورتبہ کیے۔ چند ماہ بعد صواب نے انہیں علی گڑھ مسلم یونین خدو خدائی کے دفتر میں ملازمت کی پیشکش کی تو سب بکھیر دیا۔ جمیل خدو خدائی گزرا۔ خلیج ہو گئے۔ جہاں ساتھ سے دور رہے۔ ماہوار پر انگریزی سمجھتی کے عالم میں رہے۔ مضمون نویس اور شاعری کے ذریعے ایک پروڈیوسر رائٹر کے طور پر ”مقنوی“ اور ”معارف“ علی گڑھ ”صوفی“ پنڈی بہاؤ الدین اور ”نیرنگ خیالی“ کا ادب کی مصروفیت ابھرے۔

۱۹۳۱ء میں صواب انکار سے (اردو) کرنے لگا۔ آج کے تو سر داس مسعود اس کا منظر علی گڑھ مسلم یونین خدو خدائی نے نہ صرف دو برس کی طواری رخصت حاصل کرنے میں مدد دی بلکہ دو برس کا وظیفہ خود منظور کرنے کے علاوہ سر عزیز الدین احمد سے بھی وظیفہ دلایا۔ ۱۹۳۳ء میں جمیل قدوائی کو مسلم یونین خدو خدائی کی انتخاب کھینچنے کے ممبران ڈاکٹر سر محمد اقبال اور سید سلیمان ندوی کی مخالفت کے باوجود شعبہ اردو میں نیچر منتخب کر لیا گیا۔ نیچر شپ پر تقریر ۱۵۰ روپے ماہوار پر ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں خان بہادر سید نجم الدین احمد جعفری نے ہمارا ۲۰۰ تا ۳۰۰ روپے ماہوار پر شعبہ انتخابات حکومت ہند میں سرکاری اظہار نویس کے طور پر بلا لیا۔ یہاں جمیل قدوائی کا مشاہیرہ چیلے سے کھینچا جا رہا تھا اور ۱۹۳۸ء میں بطور اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر یہ نظامہ ۲۰۰ تا ۶۰۰ روپیہ ماہوار تک خلیج کیا لیکن ادبی ملاط سے یہ سب کچھ ترقی منکوں جانب ہوا۔ جمیل قدوائی جتنا کام کر سکتے تھے اتنا کر گئے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی منتقل ہو گئے۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد بطور معاون محترمہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی سے منسلک رہنے کے ساتھ ساتھ اپنے قائم کردہ ادارے داس مسعود نیچر کھینچنے اینڈ نیچر سوسائٹی، کراچی کے لیے بھی کام کرتے رہے۔ آخری زمانہ ادبی زندگی میں گزرا لیکن قدوائی کراچی میں ہو گئے۔

اولین مطلوبہ تحریر مطلوبہ:

”صوفی“ پنڈی بہاؤ الدین ۱۹۶۹ء

تفصیلی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ ”سیر گل“ (خلیج نامہ ترجمہ کردہ افسانے) مصنف علی گڑھ طبع اول ۱۹۲۵ء
روایت افسانہ نگاروں خصوصاً کچھوف سے ماخوذ ترجمہ۔
دوسرا ایڈیشن زمانہ بک بھنجی کا پتہ دے ۱۹۳۸ء میں شائع کیا۔
- ۲۔ ”نقشِ اظہار“ (تھیں افریقہ میں) مول ایڈیٹ صدیقی کراچی طبع اول ۱۹۳۰ء
- ۳۔ ”انتخابِ صرحت“ (خلیج نامہ کا انتخاب) طبع اول ۱۹۳۸ء
- ۴۔ ”اسلامِ ملیلی“ (خلیج نامہ ترجمہ کردہ افسانے) اختر پبلک ورکس علی گڑھ طبع اول ۱۹۳۳ء
- ۵۔ ”سوانح“ (ڈراما ایڈیٹس مترجم) اختر پبلک ورکس علی گڑھ طبع اول ۱۹۳۱-۳۳ء

- ۱۔ "دیوان بیدار" (تحقیق) ہندوستانی، انڈی، الد آباد، طبع جول ۱۹۳۸ء
- ۲۔ اس کتاب کا مقدمہ ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء کے درمیان لکھا ج۔ رسالہ "ہندوستانی" الد آباد میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں میر و سورا کے سطور معاصر میر جھڑی بیدار کے کام کو پہلی بار لکھا گیا ہے۔
- ۳۔ دیوان بیدار کے ایک نایاب نسخے کی "دیوان بیدار" (مملوکہ حسن ماہرہ ری) سے تقابلی مطالعے کے بعد کی اشاعت ہے۔
- ۴۔ "تقدیریں اور خاکے"
- ۵۔ "نثر کرے اور تھرے"
- ۶۔ "نکھوتات مہدالقی" (ترتیب و تہذیب)
- ۷۔ "نثر کرے شعرائے بدنام" (ترتیب و تہذیب)
- ۸۔ یہ کتاب برکت، انکشاف، ناخ، امانت اور دلکشوی کے کام کا انتخاب ہے۔
- ۹۔ "مہر قیام مسود" (سر اس مسود سے مشتق)
- ۱۰۔ "خیالان مسود" (سر اس مسود سے مشتق)
- ۱۱۔ "مقطعات مستجیل" (سر اس مسود سے مشتق)
- ۱۲۔ "ناموں جان" (از ارباب الخوف کا ترجمہ)
- ۱۳۔ "چند اکابر چند معاصر" (خانکے)
- ۱۴۔ "نظرات خمیم" (نثری نظمیں)
- ۱۵۔ "چند آفتاب" (نثری نظمیں)
- ۱۶۔ "نوائے سید تاب" (نثری)
- ۱۷۔ "خاکسرخ روان" (غزل، نظم، داستان و قصات)
- ۱۸۔ "سلسلہ انگریزی اردو دانشوری" (مترجم مولوی مہدالقی نظریاتی، تحلیل قدوائی، انجمن ترقی اردو پاکستان) کراچی
- ۱۹۔ "حسن انتخاب" (ترتیب و تہذیب)
- ۲۰۔ "کارنامہ ادب" (ترتیب و تہذیب)
- ۲۱۔ "حیات مستعار" (خوار و شہت)

غیر بدقوان:

جلیل قندوانی کی اپنی حرب کرد و جواب والا کتب کے علاوہ ان کے متعدد علمی مضامین اور اقداد خطوط طبر عرب حالت میں موجود ہیں۔

نظریہ فتن:

”مجھے کہانوں میں زندگی کی اصلی کشش بہت پسند ہے، اسی لیے میں کوشش کرتا ہوں کہ جتنے ہوئے واقعات کی کہانیاں لکھوں۔ اقداد خروار اقداد چٹیں آیا ہوں، یاد و صرف دماغی کیفیت ہو پادشاهی جد و جہد وغیرہ، میں نے انسانوں کے لیے کبھی خود سے کچھ کر نہیں لکھتے کیے مختصر اقداد زندگی کی آہنی ہوئی زندگی کی ایک لہر ہے، جسے برف کی قاش کا کرادب کے برقعان میں محفوظ کر دینا چاہیے۔“

جلیل قندوانی

پہ ہوالہ: ”میں انسان کیوں کر لکھتا ہوں“

مرشد حکیم محمد یوسف صمن

دارالادب، پنجاب، ہارون خان والا ہو راج طبع اول: س۔ ان

پیشگی

جلیل قدوائی

اختر تھیں۔ کا ایک نو عمر لکھن (جنس کی جانیدار احوال ہی میں گوشت آف دار اس سے چھوٹی تھی) اور آخر ہی جھڑپے، اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹا ایک مقدمہ کا فیصلہ نکد رہا تھا۔ کچھ دن پہلے مقدمہ کی کارروائی ختم ہو چکی تھی، اور صبح تک اسے فیصلہ لکھ کر دینا اور اسل کو اپنے حاکم قسطل کے پاس بھیج دینا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ پانی ابھی ابھی برس کر نکلا تھا۔ اختر نے کمرے کی کون کونیاں کھول دئی تھیں اور ورد انوں پر پردے چڑھا دیے تھے، تاکہ ہوا آسانی سے کمرے میں آ سکے۔ لیکن ہوا کی ہوائی تھی اور کمرے میں نہیں آ رہی تھی۔ سچو دھنی دینے والا لپ جس کے اوپر گلوب نہیں چڑھایا گیا تھا، کمرہ کی دیواروں پر دھنی ڈال رہا تھا۔ دیواروں کے بعض حصوں پر دھنی نہیں پہنچتی تھی جہاں تصویریں لگے رہی تھیں۔ ان حصوں پر تصویروں کے سائے پلے پڑ رہے تھے۔ لپ کی چٹائی نے کمرے کی چھت میں ایک جگہ پر زور تک کا کول دھا ڈال رکھا تھا۔ سائے آ قتل دان کے کادرس پر لگی ہوئی تصویروں کے نقشے چمک رہے تھے۔

اختر نے اب تک کب کا فیصلہ کیا ہوتا۔ وہ مختص آدمی تھا اور وقت کا پابند اور ہر کام کو اپنے وقت کے اندر ختم کر لیتا تھا مگر ابھی بھی جب اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی تو بھورا اسے اپنے اصول توڑنے پڑتے تھے اور وقت کے خلاف کام کرنا پڑتا تھا۔ اور دونوں سے اس کی طبیعت خراب تھی۔ موسم کی تبدیلی اور ہوا کے وقت تا وقت چلنے سے اس کے جوڑ جوڑ میں درد پیدا کر دیتا تھا جس کی وجہ سے وہ کام کرنے کے اگلی خدا با اور آرام کرنا رہا تھا۔ دن کو اس نے فیصلہ لکھ لینے کا ارادہ کیا، مگر تھیک اس وقت جب وہ کام کرنے جا رہا تھا، اس کے چند دوست اس سے ملنے آ گئے۔ جنہوں نے اس کے کئی تھکے خراب کئے۔ اس وجہ سے وہ ابھڑ کر نکلا اور اب تھکے بیٹھا تھا۔

ایک ایک ایک جاسا گیا وہ چیز جس کے پر نکل آئے تھے، معلوم نہیں کہاں سے اڑ کے آیا اور لپ کے چاروں طرف پتھر کاٹنے لگا۔ پتھر کاٹ کر وہ اختر کے سامنے کا تختہ پڑا کر۔ تھکے اس نے چھوٹ کر اڑا دیا۔ اس کے بعد ایک چوڑا سا پھوٹا طوفان شروع کرنے لگا۔ اختر نے اسے بھی پہلے گیزر سے کی طرح اڑا دینا چاہا، مگر یہ زیادہ مستقل مزاج بلکہ ضدی تھا اور اس کی کوشش کے باوجود وہاں سے نہ ہٹا۔ دیکھتے دیکھتے چار

جوتے دے جانے، جنگلی بوٹ اور بے شمار کپڑے اور پٹنگے جن کے نام کسی کو نہیں معلوم، لمپ کے گرد جمع ہو گئے اور لمپ کی سطح پر بیڑ پش پر کاغذ پر لیٹ گئے اور روات اور اس کی قیمیں کے اندر داخل ہونے لگے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے باری باری از کر گانا بھی شروع کر دیا۔ کچھ سیاہ رنگ کے ارد کی دھل کے برابر کپڑے اڑتے اڑتے جھک کے ایک جگہ گر پڑے اور دہریک بے حرکت گویا دم سادھے مردے کی طرح پڑے رہے۔ ان میں سے ایک طرح کی بدبو آنے لگی۔ کچھ کپڑے اور پٹنگے اس کے گرد ان اور آسمان کی رما سے اس کے کپڑوں کے اندر تھس گئے۔ بعض اس کے منہ اور رنساہوں پر ٹھانچے مارنے لگے۔ ایک سیاہ پٹنگے نے اپنے آپ کو اس کے قلم کے راستے میں ڈالا اور اس بات پر مصر ہوا کہ چادہ لکھنا بند کر دے یا اسے پال کر ڈالے۔ ایک اور کپڑا اس کے ایک کے اوپر ایک رکھے ہوئے کاغذ کی تہ میں گھس گیا اور کاغذ اچھالنے لگا۔ اس نے کاغذ اٹھا لیا اور اسے چھوٹ کر اڑا دیا چاہا۔ مگر وہ از کر گسی اور طرف جانے کے بجائے اس کے منہ کے اندر چلا آیا۔ جسے اس نے بڑی مکر وہ صورت سے جاکر ٹھوک دیا۔

”جانتے سارے کپڑے آتے کہاں سے ہیں؟“ اختر پریشان ہو کر سوچنے لگا۔

”جپ روشنی نہیں ہوتی تو یہ کبھی اُصغر نہ سے بھی نظر نہیں آتے اور چراغ بجنے ہی ہر طرف سے اپنی جان جھیلی پر لے کر دوڑتے ہیں۔ شاید یہ اسی وقت پیدا ہوئے اور اسی وقت مر جاتے ہیں اور اس بڑی طرح جان دینے میں آخر انہیں کیا حیرت آتا ہے؟“ افسر نے ان دیکھوں پر دم کر کے اور انہیں بھروسے۔ انہیں کوئی کیسے بگاڑے؟“ آدمی ہنسی بکھر سکا ہے اور شیر مار سکتا ہے اور میدان جنگ میں ہزاروں دیکھوں آدمیوں کا طعنہ بھا سکتا ہے۔ مگر یہ دالے نہیں اڑا سکتا۔ اس نے انہیں غور سے دیکھا شروع کیا۔ وہ چھوٹی چھوٹی، اٹھی جا میں تھیں۔ جن کی زندگی کا کوئی مشعلہ کبھی میں نہ آتا تھا۔ وہ اڑتے تھے اور پہلے پہلڑاتے تھے۔ دیکھتے تھے اور غور جاتے تھے۔ بہت سے پروانے جل کر مر چکے تھے اور بہتوں کے پر ان کے بازوں سے الگ ہو کر میڑ پاشی کی سطح پر پڑے تھے اور وہ خود پر داری کی قوت کے شمع کے گرد صرف دیکھتے پر اکتفا کر رہے تھے۔

مگر اب کوئی لطف بھی کب تک اٹھائے اختر نے سوچا۔ ”اس کے لیے فرصت کی ضرورت ہے اور اچھی صحت کی۔ میرے پاس نہ فرصت ہے نہ اچھی صحت۔“ لگے کام کرنا ہے۔ میرے جسم میں درد ہو رہا ہے۔“ لگے آرام کرنا ہے؟“ اس نے بھر لکھنا شروع کیا۔ مگر پٹنگے اسے کام سے باہر نہ کئے گئے۔ اسے مشورہ کی ضرورت ہو رہی تھی۔ دیکھیں اور گواہوں کے جاننا اور بحثوں پر غور کرنا تھا۔ قانونی موٹوں گلوں سے سر کھپاتا تھا اور خیانت کا کھڑا کرنے تھے۔ مگر فی الحال ان سب سے زیادہ دشوار اور بڑا مسئلہ یہ تھا کہ پروانے کیوں کر اڑاتے جائیں۔ وہ اٹھ اٹھ کر اس سے کمرے میں گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور اس نے پیاز کے جگہ ٹھوکے لمپ اور میڑ پر رکھے۔ اس کے بعد اس نے کمرے کی سب کچھ دیکھی۔ یہ کہیں اور دو دروازوں کے پردے گر گئے تھے لیکن پیکروں کی تعداد میں کوئی کمی نہ ہوئی۔

آؤ پروانہ کیا کرے؟ اس کے پاس صرف یہی رات تھی اور اسی رات اسے فیصلہ لگھ کر چار کر لینا تھا مگر وہ کیوں کر لکھے؟ اگر کچھ تک اس نے فیصلہ نہ لکھ لیا اور لیکن نہ تھا اور اصل کو تفصیل نہ بھیج دیا تو اس کی بڑی تکلی ہوگی اور اس کی ساری سادھنا ناک میں مل جائے گی۔ وہ ایک باعزت لکھنے تھا اور سارے حکام اور راجا پر اس کا بڑا اثر تھا۔ معلوم نہیں فیصلے میں وہ ہوتی تو اس کا لوگوں پر کیا اثر پڑے۔ ان باتوں کو کیا معلوم کہ ان کے اس فیصلے سے مختلف فرقہ میں اس کے لیے کبھی صحیح مصیبت کا سامنا تھا۔ اسے فیصلہ سا لے لگا۔ کمرے کی گری اور اس نے اس کے مزاج میں نور برسی پھیرا۔ وہ دروازہ کھول کر لمپ کو باہر پھینک دینا چاہتا تھا۔ اس کی بیٹھائی سے پیسہ کے چند ٹکڑے کاغذ پر چپکے پڑے جن کے تیل رواں نے اس کی کوششوں پر پانی پھیر دیا اور اس کے تھکے ہوئے کو منہ کا شروع کیا۔ اس نے ٹھک آ کر ٹھکر کاغذ پر زور سے پٹک دیا۔ جس

نے کاغذ اور میری چٹائی پر لکھی ہوئی کھانسی دیکھ کر اس نے اس کے دماغی قوتوں میں الجھن پیدا کی۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے لمپ کو پھونک مار کر گل کر دیا۔

یہ دم تار کی چھانکی کوئی چیز نہ کھائی دیتی تھی اور چمک پاروشی کی ایک شعاع بھی کسی طرف سے نہ آتی تھی۔ صرف تاریکی ہے امن تاریکی۔ کسی خوشگوار سفر کے ڈارک روم سے زیادہ تاریک کچھ اس میں بھی دھبے سرخ روشنی حیات کا چاند دیتی ہے۔ شبنم کی جلیں کی موٹی مٹی پر تاریکی سے زیادہ سیاہ تاریکی ہر طرف چھا گئی۔ کانکھتے ہو کر کوا روشنی کے وجود کے ساتھ زندہ تھی سیاہ ہو گئی۔ یہ دم جیسے چپ ہو گئی، سر گئی۔ آہستہ آہستہ اٹھنے کے لیے ہر جانے کے لیے قدم بڑھائے اور دروازے کو صاف اور آہستہ آہستہ کھولنے کے لیے وہ اپنے سونے کے کمرے میں پہنچا اور ستر پر جا گیا۔ دن بھر سرد ہوا اچلی تھی اور اس وقت بھی ٹھنکی تھی اور دن بھر وہ ملاقاجوں کے ساتھ ٹھنک سے بندھا ہوا، بچکا ہوا، اپنی طبیعت پر جبر کے تکلیف سے بیٹھا رہا تھا۔ وہ آرام نہ کر پا تھا۔ جس سے اس کا بدن خوش نہ رہا تھا۔ اب پرداؤں نے آ کر اس کے دماغ میں دھڑکی پیدا کر دی تھی۔ اس نے ستر پر پڑے پڑے کروٹیں بدلیں اور اپنے ہر پارہے دے مارے۔ اس کے دل اور دماغ میں اس وقت ایک سہ گنتی تھی اور وہ اپنے کواکب بہت بد قسمت آدمی خیال کر رہا تھا: "مجھے اگلی دوپہاں بہت بگڑا ہے۔ بہت بگڑا۔ مگر جب یہ پتچے بگڑا کرنے دیں۔" اس نے اپنے پیروں کے نیچے چڑھا اور کھلی اٹھا کر اپنے دل پر ڈال لیا اور سر ہانے پڑا اور کوا اپنے سر اور کانوں سے لپکتا ہوا۔

آہستہ آہستہ اٹھنے لگا کوا کچھ کچھ اس کمرے کی ہر چیز اس میں سے ابھرنے لگی۔ اور صاف نظر آنے لگی۔ اس کے سر ہانے اس کی چھوٹی بھڑکی۔ جس پر سلیہ چھارہ اور میری چٹائی پر اٹھا۔ وہ اپنی طرف دیاار سے برسر لگے ہوئے بید کے سونے صوفوں کی قطار تھی۔ سامنے کی دیوار سے لگی ہوئی اس کی سنگار بھڑکی، جس کا بڑا صاف آئینہ تاریکی میں چمک رہا تھا۔ اور دوسرے کمرے میں سے حنا کی لطف اور دل پر اپنی چھانسیا ہوتے اور بکھڑے عین نقوش کی آواز پر آ رہی تھی۔ یہ اس کی بیوی اور اس کی چھوٹی سالی تھیں جو موسیقی کی مٹی اور آئیں میں طوائف لعلیں کر رہی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ آخر کوا اس وقت ان کے سر پر عین نقوش اور دل کی آوازوں کے بجائے خفاک اور خرم آئیں لکھیں۔ حدود و ٹھکانہ آوازوں کی ضرورت تھی جہاں کے سال کو سنہا لیں ایک ایسے وجود کی ضرورت تھی جہاں کا سال پوچھے اور ٹھکانہ ہوتا۔ اس کے ہوا ہے۔

"بھرے ہوئے کون دہانے؟" آخر نے ایک خطی سانس لے کر کہا اور بھر سوچنے لگا۔ خیال ان کی دنیا بھی عجیب دیا ہے۔ جس طرح کمرے کی لٹائے سیاہ میں سے ہر چیز آہستہ آہستہ ابھری اور اس کی آنکھوں کے سامنے آئی تھی، اس طرح اس کے دماغ اور خیال کی دنیا میں سے دے دے ہوئے۔ گڑے ہوئے طوائف ابھرنے اور دچہ دل کے سامنے آنے لگے۔ نہ معلوم کس طرح اسے ایک دہرے یاد آ گئی۔ جب ہر طرف اس طرح کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اس کی اس کے باپ سے آہستہ آہستہ گٹھ گٹھ کر رہی تھی اور سسکیں بھرتی چلی تھیں۔ اسے صاف یاد آیا یہ زمانہ تھا جب اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اسے ایک بے حد حسین لڑکی سے محبت ہو گئی تھی اور وہ اپنی ماں کی مرضی کے خلاف اس لڑکی سے شادی کرنے پر آمرا کر رہا تھا۔ مگر اس کی ماں کے اس کے باپ سے آہستہ آہستہ گٹھ گٹھ کر رہی تھی اور وہ اپنی ماں کی مرضی کے خلاف اس لڑکی سے شادی نہ ہانے کیوں یہ خیال کر کے اٹھیں ہوئے لگا کہ اس کی شادی اس لڑکی سے نہیں ہوئی، البتہ وہ اس قدر چاہتا تھا۔ جس کے لیے وہ دیا جانے لگا تھا۔ وہ جواب تک کوا رہی تھی۔ کیا چاہتا تھا کہ اس اپنی اس پہلی ماں کی موت کی یاد میں اپنی زندگی شادی کے بغیر گزاری ہوئی۔ لوگ اسے دیکھتے اور اسے ایک عجیب و غریب شخصیت سمجھتے۔ ایک پرانا ہستی جہاں تک کوئی نہ جانتی تھی کہ اس کی یاد کو کیجیے سے لگائے ہے اور اسی کے ہمارے

زندگی ختم کرنا چاہتا ہے۔

"مگر یہ کیا؟" اس نے خیال کیا۔ چنگوں کو میری کوئی ہوئی محبت سے کیا تعلق؟ یہ خیالات میرے دل میں کیسے آئے؟ اور یہ وہ مذکورہ مکان۔ اس نے کمرہ لٹا اور اس کے جسم کی ہڈیاں چٹ چٹ ہو گئیں۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے نیچے کا دھڑ اس کے بدن سے جھلک رہا ہو گیا ہے اور اس کا نہیں ہے۔ کمرہ دوسرے کا ہے۔ میسر پر اسے کل نہیں آ رہی تھی۔ اس کے دماغ کی کوئی کل بکڑی تھی۔ اس کے خیالات میں ایک جھٹک سی ہو رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے اس کے جسم کا ہر حصہ اس جنگ سے متعلق ہے۔ وہ میسر سے اٹھا اور کھل کر گئے۔ کمرہ میسر کے نیچے فرش پر چڑھتا ہوا کہ چٹا لٹا کی آہ کو روک سکے اور انکسار دماغی کو کم کرے لیکن ایسا نہ ہوا۔ اور اسے اپنی زندگی کے بعد سے عہد واقعات اور حادثات یاد آتے رہے۔ جیسے اس رات خیالات نے جسم کھالی تھی کہ اس کی مادی گزشتہ زندگی اس کے سامنے آئے انہیں گے پورے وہ سمجھنے لڑ گئے۔

کدوم نہیں سے ایک روحانی نمودار ہوئی اور پہلوؤں کی سرسراہٹ نکالی دی۔ اس کی بیوی اپنے ہاتھوں میں موسم ختی کے کمرے کے دروازہ کا پردہ ہٹا کر اندر آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے ایک چمڑکی کتھی میں چائے کا سامان لیے تھی۔ فوراً جیسے مردہ زندہ ہو جائے۔ اختر چونک چڑا اور راستگی میں کھیل کود نکلیں کو کافی کر اپنے میسر پر آیا اور ایسے اقسام سے چپ چاپ پڑ گیا۔ جیسے وہ کھٹنوں سے بے خبر پڑا سو رہا ہے۔

"میں سارے میں تمہیں دھڑلانی بھاری، کیا کام ختم کر لیا؟" اسے تم یہاں اندر میرے میں کیسے چڑے ہو؟ خطرہ چڑھ رہی ہے۔ میں تمہارے لئے چمڑکی ہوں۔" اختر نے اپنی بیوی کی یہ دلداریاں دیکھیں تو اس کا سارا انکسار دماغی اس ایک پرتو میں اور سکون آمیز صدا کی لافٹ میں جمیل ہو گیا۔

اس نے اپنی بیوی کو تاکہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہ فیصلہ نہیں لکھ سکا اور ہر کام کر کے بیٹھے گا۔ اس کی بیوی نے لبس پہن کر دھڑلانی سے چائے پلائی اور اس سے ہر تک پہنچی باتیں کر کے اس کا دل بڑھاتی رہی۔ خوب گھر سے رنگ کی تھڑپانے کی دوجا ہاں پٹی کر اختر کی جان میں جان آئی۔ پھر اس نے کئی مگر نہیں لکھیں کہ ان کے جو نہیں اڑا لے اور کمرے میں ادھر سے ادھر چمڑکا۔

کوئی کیا نہ بچے کے قریب وہ اپنے دختر کے کمرے میں پھر داخل ہوا اور میز کے سامنے بیٹھ کر وہ بچے تک خوب دھواں اور زخموں کھتا رہا۔ میز پر چش پر چٹنوں کے پر اب تک چڑے تھے۔ مگر پر والے اڑنا اور باہر سے چٹنے آنا بند ہو گئے تھے۔



بھٹوں گورکھپوری

نام	احمد صدیقی
قلمی نام	احمد صدیقی بھٹوں (بھٹوں گورکھپوری)
پیدائش	۱۰ اگست ۱۹۰۳ء، بدھنام موضع پنڈ، (بستی) تحصیل ظلیل آباد، ضلع گورکھپور (بھارت)
وفات	۴ جون ۱۹۸۸ء صبح سات بج کر چوبیس منٹ، بدھنام، کراچی، پاکستان
تعلیم	ایم۔ اے (انگریزی)، آگرہ یونیورسٹی، آگرہ ۱۹۳۳ء ایم۔ اے (اردو) گلگت یونیورسٹی گلگت ۱۹۳۵ء ابتدائی تعلیم سینٹ ایڈریس سکول، گورکھپور میں پائی، جہاں سے ۱۹۲۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ انجین میں دلی کے مرید بننے ہونے کے سبب والدین نے چار سال تک ان کا امتحان نہ دینے دیا۔ تاہم اعلیٰ گزٹ مسلم یونیورسٹی کالج، علی گڑھ سے ۱۹۳۵ء اور بی۔ اے سینٹ ایڈریس کالج گورکھپور سے ۱۹۳۹ء میں کیا۔ درس نگار، اخبار اور بی اے تک کی تعلیم گورکھپور میں اعلیٰ گزٹ اور اے اے میں حاصل کی۔

مختصر حالات زندگی:

بھٹوں گورکھپوری کے والد کا نام محمد طارق دیوان تھا جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر رہے۔ بھٹوں کا خیر موضع پنڈ، (بستی) کی خاک سے اٹھا۔ یہ گورکھپور کی تحصیل ظلیل آباد کا ایک دیوانہ اور سیاح زوردار گاؤں تھا جسے ”مکلی جوت“ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بھٹوں کا درجہ اہل حقارتی تہذیب تھا۔ بھٹوں کی تعلیم آریز اسکول سے کے درمیان کھینچا جانے والی پندرہ سالہ کے کنارے واقع ایک چھوٹے سے گاؤں منجیر پور میں ہوئی، یہ بھٹوں کا تہذیب تھا۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں بھٹوں کی ابتدائی زندگی کے چودہ برس گزرے۔ ان کا درجہ اہل حقارت و غفلت اور فقر و روکٹی میں اپنا ایک ممتاز مقام رکھتا تھا۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۶ء میں شادی ہوئی۔ (۱۱ اور) تین بیٹے اور ایک بیٹی (۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے) کے بعد ہاراج اسٹا میں پائی اسکول، گورکھپور سے تدریس زندگی کا آغاز ہوا۔ بھٹوں گورکھپوری کی زندگی کا بیشتر حصہ کالج اور یونیورسٹی میں درس و

تذریبی میں گزرا۔ جس کی تفصیل اردو ادبی ہے۔

ہنگو شعبدہ نگری، چھٹ ایڈرچر کاٹچا، گورکھ پری ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۵ء،

ہنگو شعبدہ نگری، سربراہ شعبدہ تحقیقات، عامر علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، جولائی تا دسمبر ۱۹۳۵ء،

ہنگو (انگریزی منطق) مہاں صاحب ہارن، سلاسیا عریضہ کاٹچا، گورکھ پری، جولائی ۱۹۳۶ء تا مئی ۱۹۳۷ء،

پروفیسر انگریزی، احمد شعبدہ اردو، چھٹ ایڈرچر کاٹچا، گورکھ پری، جولائی ۱۹۳۷ء تا دسمبر ۱۹۵۸ء،

صدر شعبدہ اردو، گورکھ پری، دسمبر ۱۹۵۸ء تا اکتوبر ۱۹۵۸ء۔ اس وقت ڈائریکٹر علی گڑھ یونیورسٹی ادب و ریاضہ شعبدہ اردو، علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی، دسمبر ۱۹۵۸ء تا مئی ۱۹۶۸ء،

ادب کی جاتی میں بھوں تھیں اختیار کر کے شاعری کی طرف مائل ہوئے لیکن بچپان انسان نگاری اور تنقیدی تخیل تو لیکن طویل مختصر افسانہ "زیدی کا حشر" ۱۹۲۵ء میں مکمل کیا۔ اس سے قبل لکھنا نہ سماں نہ مہانت سے متعلق مضمون نگاری کی۔ اشاعتی ادارہ "ایمان ادب" قائم کر کے ادبی تحفہ "ایمان" کا اجرا کیا۔ زندگی کا بیشتر وقت گورکھ پری علی گڑھ میں گزرا۔ پہلی بار دسمبر ۱۹۲۷ء میں پاکستان تحریک لائے اور دوسری بار اپنی انکوائٹی علی ادب آفری لاء ارجینٹ اور اس کے بچوں سے ملنے مئی ۱۹۶۸ء میں آئے۔ اس وقت تک فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ ادب میں جائیں یا نہیں کے ہو چکے۔ یہاں تک کہ سارا سب تک سوجا ہوا آجے آ کر کار میں سے ہوا ہے۔ ۱۹۷۸ء تک کراچی یونیورسٹی میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ دسمبر ۱۹۷۸ء میں بھوں کے انتقال کی خبر ملی۔ علی گڑھ لکھنؤ اور گورکھ پری میں قلمی اجلاس ہوئے۔ بھوں نے اپنے انتقال سے متعلق خبر کی تردید علی سردار جعفری کو فضا گھر کر کی۔ مئی ۱۹۸۸ء میں بھوتہ کمزوری بن گئی۔ ۳۰ مئی کو ہسپتال داخل کر دیا گیا اور ۳ جون کو دل اور پیچھے سے جواب دے گئے۔ ۳ جون ۱۹۸۸ء کی صبح سات بج کر کچھ صحت پر دیا سے اٹھ گئے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

۱۔ "زیدی کا حشر" (مختصر افسانہ) میں قسطیں مطبوعہ "گزار" اول مئی ۱۹۲۵ء، قسط دوم جون ۱۹۲۵ء اور قسط سوم جولائی ۱۹۲۵ء،

۲۔ "ایمان" مطبوعہ "گزار" یکم جون ۱۹۲۶ء،

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "توبہ و خیال" (افسانے)

۲۔ "ایمان" (مطبوعہ کتب) (چھ افسانے)

۳۔ "ایمان" (مطبوعہ کتب) (چھ افسانے)

اس مجموعے کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۲ء میں نئی کتب خانہ علم ادب دہلی نے شائع کیا۔ پھر اسی ادارے سے ایک ایڈیشن ۱۹۳۷ء میں نکلا۔ جس کے کل ۵۲ اصلاط ہیں۔ اس ایڈیشن میں "گاہ باز گشت" (دوسرا مقدمہ مرقوم ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۲ء)، "ایمان کا افسانہ"

(مطبوعہ "ایمان" گورکھ پری، ۱۹۳۳ء)، "گرچہ" (پہلا مقدمہ مرقوم ۲ اکتوبر ۱۹۳۳ء) کے علاوہ چھ افسانے پر مبنی "ایمان" نامی

آپ اکیل سے دور "ایمان" نامی "سبز پری" "میں شاد" "مہمت کا جگ" اور "تم میرے ہو" شامل ہیں۔ کتاب کے ۱۹۲۷ء

والے ایڈیشن کو افسانہ دوسرا ادارہ کراچی نے ۱۹۷۸ء میں بارہ کر شائع کیا۔

- ۳۔ ”زیوی کا مشر“ (طوفانِ مختصر افسانے) اردو اکیڈمی، لاہور، طبعِ اول: ۱۹۳۶ء
 - ۴۔ ”مقتلِ ناہید“ (افسانے) ایچ این اشاعت، گورکھپور، طبعِ اول: ۱۹۳۳ء
 - ۵۔ ”بھٹوں کے افسانے“ (افسانے، انتخاب) حالی پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، طبعِ اول: ۱۹۳۶ء
 - ۶۔ ”سوگوارِ شہاب“ (افسانے، ترجمہ) ایچ این اشاعت، گورکھپور، طبعِ اول: ۱۹۳۱ء
 - ۷۔ ”مسجدِ عرس“ (افسانے، ترجمہ) ایچ این اشاعت، گورکھپور، طبعِ اول: ۱۹۳۳ء
 - ۸۔ ”مروِ شست“ (افسانے) اوارہ اشاعت، اردو، طبعِ اول: ۱۹۳۳ء
 - ۹۔ ”سرآپ“ (افسانے) اوارہ اشاعت، اردو، حیدرآباد، دکن، طبعِ اول: ۱۹۳۵ء
 - ۱۰۔ ”قیام اور دوسرے افسانے“ (افسانے) حالی پبلیشنگ ہاؤس، لاہور، طبعِ اول: ۱۹۳۵ء
 - ۱۱۔ ”سنگسارِ چشمی“ (اردو نوک کہانیاں) ایچ این اشاعت، گورکھپور، طبعِ اول: ۱۹۳۶ء
- (یہ کتاب احمد علی بیگ فرنگ لہل کشور بھٹو سے بھی شائع ہوئی)
- ۱۲۔ ”افسانہ اور اس کی غایت“ (تحقیق) ایچ این اشاعت، گورکھپور، طبعِ اول: ۱۹۳۵ء
 - ۱۳۔ ”اقبال“ (ایضاحی تبصرہ، (تحقیق/ترغیف) عظیم پبلیشنگ ہاؤس، آلآباد، طبعِ اول: ۱۹۵۳ء
 - ۱۴۔ ”تحقیقی حاشیے“ (تحقیق) اوارہ اشاعت، اردو، حیدرآباد، دکن، طبعِ اول: ۱۹۳۵ء
 - ۱۵۔ ”تاریخِ جمالیات“ (تحقیق/تاریخ) انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، طبعِ اول: ۱۹۵۹ء
 - ۱۶۔ ”زیرِ عشق“ (نواب مرزا شوق (مرتبہ) ایچ این اشاعت، گورکھپور، طبعِ اول: ۱۹۳۰ء
 - ۱۷۔ ”سراوئی“ (اردو سکروالنگ) (ترجمہ/ترغیف) کتابستان، آلآباد، طبعِ اول: ۱۹۴۵ء
 - ۱۸۔ ”شونہار“ (جسمن و سفر کی زندگی اور فلسفہ پر کتاب) طبعِ اول: ۱۹۳۵ء
 - ۱۹۔ ”گرگوش“ (ترغیف) کتب خانہ عظیم دہلی، طبعِ اول: ۱۹۳۵ء
 - ۲۰۔ ”نوب اور زندگی“ (تحقیق/ترغیف) ایچ این اشاعت، گورکھپور، طبعِ اول:
- ایک ایضاً نیشنل بک ڈپال، کراچی نے ۱۹۶۶ء میں شائع کیا۔
- ۲۱۔ ”نقوشِ افکار“ (تحقیق) صفی اکیڈمی، کراچی، طبعِ اول: ۱۹۶۶ء
 - ۲۲۔ ”نکاتِ بھٹوں“ (تحقیق) مکتبہ عزم و عمل، کراچی، طبعِ اول: ۱۹۶۶ء
 - ۲۳۔ ”شعر و نثر“ (تحقیق) ادبی اکیڈمی، کراچی، طبعِ اول:
 - ۲۴۔ ”دوشِ طرہ“ (تحقیق) اوارہ اشاعت، اردو، حیدرآباد، طبعِ اول: ۱۹۵۹ء
 - ۲۵۔ ”نثر و سر“ (تحقیق) مکتبہ جامعہ نئی دہلی، طبعِ اول: ۱۹۶۳ء

- ۲۶۔ "پراسکی کے خطوط" (تقدیم و جلدیں) دار و فروغ، لاہور و کھنڈ
- ۲۷۔ "غائب شخص اور شاہنشاہ" (تقدیم) مکتبہ ادب و قلم، کراچی
- ۲۸۔ "مریم بھارتی" (کراچی سٹرک) (ترجمہ و نامہ) ایوان اشاعت، گورکھپور
- ۲۹۔ "آوازِ سچی" (آوازِ بھارت) (ترجمہ و نامہ) ایوان اشاعت، گورکھپور
- ۳۰۔ "ابوالمز" (آوازِ سچی) (ترجمہ) پونا پبلشرز، پونا
- ۳۱۔ "سنگ پتھر" (آوازِ سچی) (ترجمہ و نامہ) انجمن اکیڈمی، دہلی
- ۳۲۔ "کاقل" (آوازِ بھارت) (ترجمہ) ایوان اشاعت، گورکھپور
- ۳۳۔ "افسوس بہ روز" (ترجمہ و نامہ) ایوان اشاعت، گورکھپور
- ۱۹۷۳ء میں ایک نیا پتہ لکھنؤ، انجمن ترقی ادب، کراچی نے بھی شائع کیا۔
- ۳۴۔ "حسن ظہرت" (آوازِ بھارت) (ترجمہ و نامہ) (تالیف)
- ۳۵۔ "بھارتیوں کی بھارتی مورخین"
- ۳۶۔ "انتخاب و بیان شخص بھارتی" (آوازِ سچی) (ترجمہ و نامہ) (تالیف)

نظریہ فن:

"نہایت خیال میں زمانے کی اصل دریافت دی ہے جو تمام نون لینڈ کی ہے۔ یعنی حقیقت کو ہمارے پردے میں اس طرح پیش کرنا کہ وہ اس حقیقت کو اس کے اصل کی شکل میں ہو سکے۔ زمانہ نام ہے حقیقت کی تلاش کا اور شاعری اور مصنف کی طرح فن کی اصلیت بھی وہی ہے جو بحرِ فنون کی جنگ کی ہے۔ یعنی "نہ نہ ہے نہ حقیقت، افسانہ و نہ"

فرق ہے کہ یہ بحرِ فنون اس زمانے کو حقیقت سمجھتے ہیں اور ہم لوگ اس کو حقیقت کا "فہم ابدال" سمجھتے ہیں۔"

انجمن گورکھپور

(دیباچہ "سمن پاش" "طبع اول ۱۹۳۲ء)



حوالہ جات:

۱۔ "دیباچہ" (پیش لفظ) ۱۹۳۲ء ہے۔ جو کہ ہے۔

سمن پوش ”شہید نظم شمشیر قاتل راجہ ہاراد“

بجوں گور کچھوری

ہمید سے میرا تعارف کھمبھو میں ہوا جب کہ میں نے پہلی بار اس کی تصویر اپنے ایک عزیز دوست ناصری کے کمرے میں دیکھی تھی۔ ناصری کو فن نگارشی سے خاص شغف تھا، جو فنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ کوئی وکٹل تصویر اس کی نظر سے گزر رہائی پھرنا ممکن تھا کہ وہ اس کو گئی نہ کسی ذریعہ سے حاصل کر کے اس کی منتقلی خانا کرتا۔ اس کو اس فن میں کافی مہارت ہو چکی تھی، اور ہمصری کی نگاہ میں وہ ایک ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ میں نے یہ جاننا چاہا کہ یہ کس کی تصویر ہے اور اس کا نام کیا ہے۔ مگر خود ناصری کو اس کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ ایک مشہور دکان سے خرید کر لایا تھا۔ اس سے مجھ کو معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان کے ایک ماہر فن کی صنعت تھی۔ مصور کے نام کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا، میں اس بیکر جمال میں مجھ ہو گیا جو مصوفہ قرطاس سے مجھ کو کچھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خاموش مگر طبع فہم تھا۔ پنجیلی کا ایک بار اس کے چہلے پر لنگ رہا تھا۔ انداز سے وہ ایکٹرس معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس کو میں پہلے سے جانتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی کشش تھی جس نے میری آنکھوں کو مبسوط کر لیا، گویا وہ کہہ رہی تھی ”مظہر اور آغا سے الہام تک میری داستان سن لو۔“ اس کے درخشاں گلابی تھے، نکھرے ہوئے بال اس کے سرمے پر بہ چہلے سے نکھیل رہے تھے اور میں خواب میں تھا یا واقعی ہوا میں پنجیلی کی مہک بجیلی ہوئی تھی؟ میں اپنے عالم حیرت سے چونکا۔ ایک لارڈش فنی میرے تمام اعصاب میں دوڑ گئی۔ میں وہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا کہ ناصری میرا سامان نقاشی لینے دھرتے ہوئے چلا گیا تھا، وہاں آ گیا اور ہمید کی تصویر سامنے رکھ کر اس کا خاکہ کھینچنے لگا۔ میں راک گیا۔ ہمارا قلم اپنی قدرت دکھا رہا تھا۔ الہت جس منار کا نام مجھے بتایا گیا تھا۔ وہ اس باب میں کامیاب ہوا تھا۔ اگر یہ واقعی اس کی صنعت تھی جس کا مجھ کو اس وقت یقین تھا۔ خواب ہے۔ میں ناصری کے مکان سے خاموش روانہ ہو گیا۔ ہاجر برآء وہ میں پہنچ کر چپکے دیکھا تو وہی دلربا اور جادو نظر صورت سامنے تھی، جو مجھ کو پارتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مسکراہٹ جس میں تاثرات کی ایک دنیا پوشیدہ تھی، میرے حواس میں لٹل پیدا ہو رہا تھا عجیب عجیب خیالات ذہن میں آ رہے تھے۔

آخر کار خود اپنے توہمات سے خاکف ہو کر برآمدہ سے بچے اتر آیا اور اپنی اقامت جگہ کی طرف چلا۔ میں قصر بارگ کی طرف سے پار تھا۔
 ایک میرے قلب کی حرکت خوفناک سرحد پر چل رہی تھی۔ میں حیران ہو کر جہاں تھا وہیں رک گیا، جسم کے پاس پہنچ کر بیٹھا ہوا کوئی پناہ نہ تھا
 وہی سفید پوش عورت یہاں بھی سرگوشی بھیجی تھی، اس کے گھٹے میں وہی پتیلی کا پار تھا۔ جس کے ساتھ وہ بے ارادہ فعل کر رہی تھی۔ دھڑ دھڑانام
 میں اس کی جانب بڑھتا ہوا میرے قدموں کی آہٹ سے وہ چوگی اور اس کی لہار آگئیں آنکھوں نے ایک اٹنا تک جسم کے ساتھ میری طرف
 دیکھا، باوجود بارگ کی بی بیٹائی کے میں نے اس قدر چاڑھ لے لیا کہ اس کا چہرہ زرد ہوا، جسم کی سادگی بازگ تھی، رنگ میں مباحثہ تھی، دوش
 تک وہ بڑیاں تھیں، اس کی طواری گردن دیکھنے والی کی آنکھوں میں تازگی پیدا کر رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے جھوکے اس کی چھٹی ساری میں جنکوں پر جنکوں
 ڈال رہے تھے، باوجود ان کو براہ کرتی جا رہی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا راستہ پھنے والوں میں سے کوئی اور بھی اس زہرہ وادش کو دیکھ رہا تھا یا
 نہیں؟ لیکن کوئی ہماری طرف حوصلہ نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہوئی، اس لیے ہوئی کہ یہ کوئی ایسی صورت نہ تھی جو بغیر اپنا خراج لیے ہوئے کسی کو گزر
 پائے رہتی۔ میں کا پچھلے لگا، کیا اس کو میرے علاوہ کوئی اور نہیں دیکھ رہا تھا؟ کیا میرے سرکزی اٹھام بھی میں کوئی اشتغال رونما ہو چکا تھا؟ کہتے
 ہوئے خرم آتی ہے کہ میں نے تعلیمات، اصطلاحات اور دیگر علوم بدلے دکان کا ترسٹا لیا ہے۔ جس نے مجھ کو شکف جاکر چھوڑ دیا ہے۔

اس سطر سے مجھ پر وہ ہیبت جاری ہوئی کہ میں بے سادہ چلا اٹھا پھر دیکھا تو نفست خالی تھی۔ وہ عجیب الفت عورت وہاں سے جا
 نکلی تھی اور پتیلی کی شام ساز تک بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ میں رنگ رنگ میں نکلی جنکوں کر رہا تھا۔ جلد جلد قدم اٹھا ہوا قصر بارگ سے باہر
 نکلا، ایک جاگ پر چڑھ کر فریج ہوش میں کسی نہ کسی صورت سے پہنچ گیا۔ جہاں میں اپنے احباب کے ساتھ طعمہ تھا۔ اپنی داستان اگر بیان کرتا
 مستحکم کا لکھتا نہ تھا، میں نے اس قصہ پر کبھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ جس کو ناصری کے "لکھناٹہ" میں دیکھا تھا اور جس کی اثر آفرینیوں نے اس
 حد تک چھو گئے تو برکرا رہا تھا، میرے احباب کی الفت میں زندگی نام تھا۔ صرف شاد کیشی کا، ہمارے بیشتر اوقات خوش باشیوں میں گزر جاتے۔
 میری دفتر کی لذتوں اور حلقہ دلچسپیوں نے "ممن پوش تارین" کا تصور میرے ذہن سے مٹا دیا اور اگر کبھی اس کی یاد آتا تو وہ بدلتی تو میں اس
 سے پہلو بچا چکا ہوں اس طرح اس بارہود دگر گئے۔

ایک روز ہم سب کو معلوم ہوا کہ افریقہ قیصر آیا ہے۔ بلا تلافی یہ ملے پایا کہ پہلی رات کا کھیل ضرور دیکھنا چاہیے، چنانچہ اس کا انتظام کیا
 گیا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں قیصر دیکھ رہا تھا۔ مگر نہ تو قیصر کی حمایت کی طرف دھیان تھا، اس پر تنقید کرنے کا ہوش، میں بس ایک
 جج دیکھ رہا تھا، یعنی وہی عورت پتیلی کا پار بٹھ گئے ہوئے اور جزائش بھیجی ہوئی تھی اور رعیت کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی، وہ تھا تھی، اس کے
 لباس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، میں نے اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہا۔ "اس کو دیکھتے ہو جو سامنے چھٹی ساری زیب تن کیے ہوئے بھی
 ہے؟" وہی جس کے گھٹے میں پار ہے۔

میرے دوست نے لگا دھاغائی اور سر جاکر جواب دیا "فحش تو کہاں بھیجی ہے؟"

"بالکل سامنے۔" میں نے کسی قدر حیرت ہو کر پھر کہا "آر جیڑا میں دیکھو، وہ ہم کو دیکھ رہی ہے۔"

میرا احباب جب سے مجھ کو دیکھنے لگا۔ "غواب تو نہیں دیکھ رہے ہو؟" آرکسٹرا میں کوئی عورت نہیں ہے۔" اس نے مجھ سے کہا۔ "کوئی
 عورت نہیں؟" اب مجھے ہوش آیا۔ میں نے مسکراتے کی کاٹش کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیکہ مجھ کو مٹا لو" پھر فوراً ہوا چلتا رہا۔ جب تک میں
 صبر بال میں تھا میرے احباب کھڑے تھے کہ کتا شہ دیکھنے میں مصروف ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی نظر اس جگہ سے ہٹا ہی نہیں سکتا تھا۔

جہاں وہ اس حادثہ اور خاموشی کے ساتھ ٹھہری دو دھند لگا ہوں سے میری قوتوں کو سلب کر رہی تھی۔ آج اس کے سالہاں آرائش میں ایک بچہ کا اضافہ نظر آ رہا تھا۔ یعنی ایک طرہ صورت، چمکا جس کو بھی بھی جنم دے دیتی تھی۔ رورہ کر اسی پر حسرت اعدائے سے مسکراتی ہنس میں پوچھو تو بہت کچھ تھا لیکن جو اپنے راز کو لٹکانے دے دیتا تھا۔ جب تھوڑا سا غم ہوا اور سب چلنے کے لیے کھڑے ہوئے تو وہ بھی انہی اور ساری کا آئینہ ایک مصداق بنا رہا۔ سنہا لاتی ہوئی، غم میں غائب ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد میں نے شاعرانہ پیرائوں کی جھلک دیکھی، اس کا جسم اس قدر نازک تھا، وہ اس قدر کم عمر اور آؤسودہ کار معلوم ہوتی تھی کہ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں اور ہاتھ کر لوگوں کے اس حلقہ میں گئیں اس کو کوئی صدمہ نہ پہنچ جائے۔ کیا یہ کوئی روح ہے جس کو کبھی خاص غرض سے از سر نو اس دنیا کا قالب عطا کیا گیا ہے یا محض میرا دماغ ہے جو مجھے پریشان کر رہا ہے۔" میں اپنے دل سے سوال کر رہا تھا۔ "لیکن اس کی صورت اس قدر متعین اور آرزو ہے کہ میرا دل اس کے لیے دکھ رہا ہے۔ خواہ وہ خواب ہی کی گھمائی کیوں نہ ہو۔"

اسی گفتگو میں جتنا اپنے دوستوں کے ساتھ مجمع کو پہنچا ہوا ہمارا ہاتھ کہ پیچھے سے کسی نے چھو کر مجھے چڑھایا۔ میں نے حیرت سے دیکھا تو ایک نازک ہاتھ میرے شانہ پر تھا جو پوچھنے لگا دیکھتے غائب ہو گیا۔ آج میرے ذہن میں ایک تصویر رہنا ہوا۔ یعنی میری وحشت دور ہو گئی اور مجھے خیال ہو گیا کہ یہ کھل سستی قبیلہ ہو یا مادی، عالم اور روح سے تعلق رکھتی ہو یا نہ لہذا جس سے کسی نہ کسی غرض سے میرا حلقہ کر رہی ہے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اب اس کو کچھ کر ڈروں گا نہیں بلکہ بہت کے ساتھ واقعات کا ترحیب وار مطالعہ کروں گا اور مجھے یقین تھا کہ اگر اعتدال سے کام لیا تو حقیقت کا رخروہ بے شک پھر کھلے گا۔

حکومتوں میں چند روز دور کیا میرا بھی ممکن پڑا "میں اور ان میں ہر نظر نہ آئی۔ اہل تہ صبری کے ساتھ جا کر میں نے اس کی تصویر کی ایک کاپی خرید لی جو میرے لیے ایک خاص اہمیت رکھنے لگی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ تصویر کو اصل سے کئی ماہیت نہیں اور اس سے ماہیت کی وضاحتیں اور پیرائیں کچھ عجیب انداز پر بیان کرتی ہیں۔ اس کے بعد میں بارہ بھی چلا آیا اور اپنی روزانہ مصروفیتوں میں ماہیت کو بھر پور کیا۔ میں نے اسی سال ہی اسے کیا تھا اور وہ قسطیں سے گزر رہا تھا جس سے سکول اور کالج کا زمانہ غم کے کم وقتوں کو گزر رہا ہوتا ہے لیکن ابھی یہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ مجھے کرنا کیا ہے۔

میرے ایک چچا کی لڑکی ساغرہ طبع چچا چچا کے ایک باوقار رئیس مہداصل کے لڑکے شمیم سے چاہی ہوئی تھی۔ شمیم نے بھی اسی سال میرے ایس بی ای کیا تھا اور چونکہ میرا چچا دار تھے اور سب معاش کی فکر سے بے نیاز اس لیے ان کا ارادہ تھا کہ اپنی زمینداری کا انتظام کریں گے۔ ایک دن میری ماں کے نام ساغرہ کی تقریر پڑائی جس سے معلوم ہوا کہ مہداصل صاحب نے حال ہی میں ایک چھ گاؤں بیچ ایک عالی شان عمارت کے خریدے ہیں اور ان لوگوں کی طوائش ہے کہ ہم سب ان کی مسروق میں شرکت کریں۔ ساغرہ کا مصداق تھا کہ تم از کم میں ضرور اپنی کیفیتوں سے اس کے لطف میں اضافہ کروں ورنہ وہ مجھے کبھی نہ سہا کرے گی۔ میں کہہ نہیں سکتا ساغرہ کو میری مصالحت میں کیا لطف ہو سکتا تھا جب کہ اکثر اصحاب کا خیال ہے کہ میری فنی مصروفیت ہو کر رہی ہے اور فی الحقیقت میرا طہیر الہا کیوں سے ہوا ہے۔ یہاں رہت ہے کہ میں ہر قسم کی صحبت میں شریک ہو جاؤں کرتا ہوں، ہر حال ساغرہ کو میری طرف سے حسن نیت تھا جو ملوکی حد تک پہنچا ہو تھا اور وہ چاہتی تھی کہ زندگی کے بیشتر فرصت ناک لمحے میری مصیبت میں گزریں۔ مجھے خبر ہی کیا ہو سکتا تھا۔ وقت کاٹنے کے لیے کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا میں نے فوراً سامان درست کر لیا میری ماں اہل تہ چچا صاحب کی اطلاع نہ دیا تھیں۔

”جمال منزل“ واقعی نہایت خراب صورت اور شاندار نمائندہ تھی۔ جو ایک وسیع احاطہ سے گھری ہوئی تھی۔ عیسائی گاڑی نے جس وقت لکھے پڑے گاؤں، آکر اتار دیا، اس کی شوکت سے سرخرو ہو گیا، جس نے اپنے دیوانہ جہالت میں اس ”فروری دانشی“ کو اپنے لیے قیصر کر لیا ہو گا۔ اس میں ذوقِ سلیم اور حسنِ لطیف کہاں تک چاہا ہو گا۔ اس کے علاوہ ”جمال منزل“ سے اس کے اصل مالک کی مالی استقلالیت کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ چونکہ میں شام کو پہنچا تھا اس لیے مالدور، دارا کی بیکری تک ملتی رہ گئی تھی۔

مہد اعلیٰ اور ان کی بیوی نے نہایت خلوص سے میرا غیر متقدم کیا۔ شیم ضرورت سے زیادہ جس رہا تھا اور پھر بھی ان کو سیری نظر نہیں آتی تھی۔ سائزہ نے سبھی کی ہمدردانہ سے اپنی خوشی کا اظہار کیا جیسا کہ اس کا دستور تھا، اس عرض میرے آنے سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ کافی سرور تھا۔ جب ہم رات کے کھانے پر بیٹھے تو ہماری گفتگو کا موضوع وہی گاؤں اور مکان تھا اور اس میں خلک نہیں کہ موضوع دلچسپ ثابت ہوا۔ شیم نے کہا ”تم اس مکان پر اس حیثیت سے غور کرو کہ جس پر نصیب نے اس کو حوسوں کیساتھ تھوڑا تھوڑا کیا تھا وہ مصنف تھا، شاعر تھا، دانشور تھا اور آج کل برس سے زیادہ غور گزار رہے کہ اس نے ٹوہنچی کر کے اپنی زندگی کا حائر کر لیا۔ تم اس کا نام جاننے کے لیے بے تاب ہو گے، اس کا نام ”جمال الدین“ تھا۔“

”جمال الدین“ میں چونکہ بڑا میں نے اس کے کچھ احتشاور شعور کا مطالعہ کیا تھا اور اس کا ایک ڈرامہ ”بدیانِ محبت“ بھی چڑھا تھا جس کا مجھ پر گہرا اثر ہوا تھا، یہ نہ جان تھا کہ وہ دانش بھی ہے اور نہ یہ فخر بھی اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جان دی۔ سائزہ اور سے لگے دیکھ رہی تھی اور خوب افق تھی کہ میرے اصحاب کتنے سرخی لکھیں اور اڑ پڑیں۔ اس نے شیم سے پوچھ کر دیکھی کے ابھی نہیں کیا۔ ”آپ نے بڑا کیا۔ سبیل بھائی کے لیے قاصر ت کہ وہ میں بدلتے رہنے اور مرد و عورت کا سامان فراہم کر دیا۔ ابھی وہ سطرے نامہ دو فست ہے آ رہے ہیں۔ آپ نے ان کو رات شب سے بھی محروم کر دیا۔“

”میں نے سمجھا کہ انہیں انہیں افسہ بخشنے کے لائق ہے۔ میں تو شیم اپنے نہیں معلوم کہ ہمارا شاعر کتنا بڑا دانشور ہے چہرہ کیوں ہو گیا۔“

”میں لکھ نہیں کہ سکتا سنا ہے اس کو اپنی بیوی سے بے انتہا محبت تھی جس کو کسی نے داخلہ علم کیوں کر دیا۔ جمال الدین اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکا اور نہ لڑا، چند سال کے بعد اس نے بھی اپنا عنصری جامہ اتار پھینکا۔ شاعریوں بھی خفگی آئی اور اپنے دل کے تھام ہوتے ہیں اور ان کا کسی دہ میں خودکشی کر لینا کوئی حیرت انگیز نہیں۔“

شروع سے آفریق شیم کے لیے سے حسرت و استغواء بڑا جاتا تھا میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان اس قدر بے حس ہوتا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ ”شیم انتہائی گفتگو نے تو مجھے بہت دکھ پہنچایا لیکن تم سے اس کے سوا امید ہی کیا ہو سکتی تھی، یہ کوئی تہہ دار اچھا خیال نہیں، یہ مرضِ حاکمیر ہے، جو ساری دنیا میں وادی طرح پھیلا ہوا ہے۔ جو انسانیت اور اوجہ و دلوں کو کاکات سے ملغور کر رہا ہے۔ لیکن تمہارے ذہن میں تو شاید ان افسانہ کے کوئی صحن بھی نہ ہوں۔ تم بھول کر ایک بار گوشت کھتے ہو جو بچہ بچہ کا کام دیتا ہے، تم جو انسان کو ایک آدمہ لگتے ہو، تاہم تم نے انکی مرض خارج کر کے کوئی نئی بات حاصل کی؟

آنچه دل نام کرد ای چه ناز
زوبه قلی مکان کو اعزاز

ثابت برقیوں جو انسانوں اور جانوروں کو جوڑتا ہے اور یہ جانور ہے۔ اس قدر جان سکتا ہے کہ الی صوری
 نسل کا ایک ٹکڑا ہے جو مختلف قلب (pericardium) میں محفوظ ہے اور جس کا کام خون کو اندر کھینچنا اور باہر پھینکنا ہے مگر حق کو کیا کہوں، جو سے
 سے بڑا فطرتی اور بڑے سے بڑا کائناتی طور پر جن میں جلا ہے۔ وہ عقل کی رہنمائی میں چلتا ہے اور وہ دھانسیہ دھانسیہ کو نیچے پھونکنا ہوتا ہے
 کہ وہ ان کے اسی لیے ایسے لوگوں کا نام "مخلوق تراش" (Logic Choppers) رکھا ہے۔ اسی لیے کسی چیز کی بابت کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جا
 سکتا۔ عقل کی اطاعت نے اس کی رو بہ پیش ہمیں ملی اور اس کے ارتقا کا سد باب ہو گیا۔ وہ اپنا نصب العین بھول گیا بلکہ اپنی اصلیت بھی اس کو باندھ
 رکھی۔ یہ دل نے ہم کو بہت صاحب دماغ اس بار سے سنبھل دیا ہے۔

ہر چند عقل کل شدہ ہے جنوں مہاش

ظہیر یہ ہے کہ دنیا میں چند ایسے نفوس ہیں جو ہر جگہ کی حقیقت کی جھلک دیکھ لیا کرتے ہیں اور ہم کو اپنے آغا و انہما سے آگاہ
 کرتے رہتے ہیں اور وہ آج بھی عقلی طور پر جاننے والی عقل سے مت جاتی جو "انسان" کہلاتی ہے۔

میرے بچپان کا دور شروع ہو گیا۔ میں انسان کا "مخلوق مرکب" نہیں برداشت کر سکتا یہ بتا رہی تھی کہ انسان کے علاوہ کسی دوسرے جانور
 میں نفس پائی جاتی کہ وہ اپنی جہالت کو ظلم سمجھنے کی کوشش کرتا یا جانتا ہے اور اپنی اس دانستہ فریب کاری پر ناز کرتا ہے۔

میں نے کیف ہونے لگا تھا۔ میرا مانتا کٹر خراج ہوا کرتا ہے اس لیے جہاں سوئی سے کام لینا چاہیے۔ وہاں میں تیراں اور بھانوں
 کے دوا کرنے لگتا ہوں اور سنے والے میری محبت سے اعلیٰ اٹھاتے ہیں مگر میرا عقلی ہمیشہ مجھ سے متعلق ہو جایا کرتا ہے، چنانچہ میرے چاہنے
 والوں سے وہ لوگ تعداد میں زیادہ ہیں جو میری طرف سے اپنے دلوں میں غبار لیے ہوئے ہیں۔ میں نے میری رنگوں میں پنگار یاں بھردی
 تھیں اور میں آگ برسانے لگا تھا جس کا سلسلہ نہ جانے کہاں ختم ہوتا کہ ان کی والدہ اور میمان میں بدول دی ہوئیں۔ اچھا اب بے کار بحث
 کو جانے وہ ایک عقیدہ اور متون گانے والوں میں مشہور ہے کہ "بہال منزل" "روحوں کا سنگھ" ہے اور میرا خیال ہے کہ بیٹھے والوں نے اسی وہم
 سے اس کو پیدا کیا تھا مگر ہم لوگوں پر اس قسم کے پہلائے عقائد کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔"

میں نے اپنے دل میں کہا "نہ جانے گانے والے جہاں ہیں یا آپ۔" میں سے بھرندہ باگیا اور لہجہ پر حملہ کر ہی بیٹھے، انہوں نے کہا
 "مگر اب مجھے امید ہے کہ میرے گھر میں ایک ایسا شخص موجود ہے جو ہم کو اصلیت سے خبردار کر سکے گا۔"

"تلاذلیال ہے۔" میں نے جواب دیا میری تحقیق مدت قبل سے قائمہ اٹھنے کی صلاحیت میں نہیں ہے۔ اگر کوئی دلا مجھ پر مختلف
 اہلی ہوگا تو میں اس کو تم سے اعلیٰ رکھوں گا۔"

رات زیادہ ہو چکی تھی ایک دم ایک دوسرے کو "شب بخیر" کہہ کر اپنی اپنی خواب گاہ کو رخصت ہوئے۔ چلتے ہوئے سنا کہ وہ کہا۔ "آپ کا
 چہرہ وحشتناک ہو گیا ہے، دیکھیے سونا غصیب ہوتا ہے یا نہیں، آج کے سوچ پر زیادہ تبصرہ نہ کیجئے گا۔"

میں نے غصے سے جواب دیا "ساترہ" بچوں کی ہی باتیں نہ کرو اور "کریسمس" پر لپٹ رہا ہیند کی کوئی علامت میری آنکھوں میں نہ تھی۔
 میں وہ بیچ رات تک چہرہ ہار کر لی کی سہانی دے رہی تھی، پچھلے پیر ہوا میں ایک سکون بھری تھی یہاں تو میری آنکھ لگ گئی۔ جیسے پاٹا ہی ہے
 کسی کے قدموں کی آہستہ سے جاگ گیا۔ دیکھا تو میں مجھے میں اٹھ بیٹھا، میں نے کہا۔ "ہوا فزگوار ہے پلو باغ میں غریزہ کرتا نہیں، اوارات کی
 کبیدگی ہونہر باقی ہے؟"

”کیوں ساڑو نے رات بھر تھامے کان تو گرم نہیں کیجے؟“ میں نے ج چہلا۔
 ٹیمس فیس دینے اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے ”تم شاید رات بھر سوئے نہیں؟ چہلا ہلو اور کھل دو دروازے کی۔“
 ”اس بات کو وقت کی سیر ضرور رات میں یاد آئیگی پچھ کرے گی۔“ یہ کہہ کر میں ٹیمس کے ساتھ ہوا۔

ہاتھ کو میں نے امید دل سے زیادہ دھک لاد کر تھاک پایا۔ اساطیر کے وسط میں ایک خوب صورت تالاب تھا۔ جسم قسم کے درخت اور مختلف رنگ و بو کے پھول روشنی کے کنارے ملنے لگے۔ کھیل کا موسم بہت ہوئے تھے۔ ہر چہرہ کو قرآن کی سے نکھر ہوتا تھا کہ مدت سے ان کی پروا نہ کرتے وہاں کوئی نہیں، تالاب کے چاروں طرف پتیلی کی کھاریاں تھیں جن سے لٹخا جھک رہی تھی۔ مجھے بے اختیار اپنی ”سمن پش“ یاد آ گئی تھوڑی دیر کے لیے میں بھر عالم خیال میں گم ہو گیا۔ ٹیمس نے یہ دیکھ کر پوچھا ”کیا سوچ رہے ہو؟“
 ”کوئی خاص بات نہیں“ میں نے جواب دیا۔

ٹیمس نے کہا ”اب آؤ میں تم کو جمال الدین کی بیوی کی قبر دکھاؤں۔“ میں میرا اشتیاقی بین کر ٹیمس کے ساتھ آ کے بڑھا پتیلی کی ایک کھاری میں ایک پختہ قبر تھی جس کی شکل بھی کبھی تھی کہ اب ایسا بھی کوئی نہیں؟ جو اس کی مرمت کرانے کی دھمت کا راکرے۔ رات کو نوے کر چھوڑ دین میں جس سے تھی اس پر کہاں گ آئی تھی۔ اس سے پتھر ٹیمس یا کسی اور کی نگاہ بھی اس پر نہیں پڑی تھی، میں نے جھک کر اس کو صاف کیا تو اس پر غائب کیا ہوا پایا۔ ٹیمس نے میرے ایماء پر ایک خدمت گار کو بلایا جس نے رات کو زمین سے باہر نکالا، دوسری طرف بھی کچھ کتبہ نظر آئے۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ کوئی لاری شہر سے گرہا جو دھکی بسا کہ گج گج چڑھا ہے۔ اس لیے کہ وہ حصہ تقریباً ایک ہالٹ زمین کے اندر تھا، اور زمانے کی رگڑ نے تقریباً کافی مٹا کر تھا میری رگ۔ رگ پہ چین ہو رہی تھی کہ کسی طور سے اس کتبہ کو بڑھالوں۔ لیکن کچھ کس نہ چلا۔ شہر بھی کوئی ایسا نہ تھا جو عام طور پر مشہور ہو تاکہ قیاس سے چڑھایا جاتا، آخر کار مایوس لوٹنا پڑا۔

یہاں عبدالحی صاحب ساڑو وغیرہ کے ساتھ چائے پے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ آج کی گفتگو کا سرگز ”ناہید کا حزانہ“ تھا۔ مجھے رورور کر ہی کہنے کا خیال آتا تھا۔ جس نے مجھے تاریکی میں دکھ چھوڑا تھا۔ سارا دن بھر صومالیہ تو گراف تاش اور دیگر مسائل میں مشغول ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ کچھ لکھوں مگر یہاں اس کی کوشش کرنا ”بت پرستوں کے شہر میں نماز“ کے لیے بہادر کرنے سے گھبراتا تھا۔ شام کو ٹیمس نے گاڑی تیار کرائی اور مجھے لے کر ہوا کمانے لکل لگے۔ غصہ یہ کہ مجھے اس قدر موقع نہ ملے کہ ایک بار بھرنا ہیڈ کی قبر پر جاتا اور لوٹ کر نظر پڑتی کرتا۔ جب کھانے کے بعد اپنے بستر پر گیا تو کسی قدر سکون پھر ہوا، دلی پہلانے کی غرض سے تھوڑی ٹھنڈی صواب دار دم دیکھا رہا۔

خند کے آثار اس دن بھی غائب تھے۔ رات کا جانا بڑھ رہا تھا۔ میرا مطالعہ پستور چاہی تھا، کبھی کبھی کتاب بند کر کے کچھ سوچنے لگتا تھا۔ تقریباً ایک ہفتے بستر سے اٹھا اور سامنے کے کمرے سے ٹکٹ لے کر واپس ہوا ہا تھا کہ مجھے چار پانچ گز کے فاصلے پر ایک عورت کی مثل دکھائی دی جو دیکھتے دیکھتے میرے مقابل تھی۔ یہ کیوں؟ واقعی ”سمن پش“ اس وقت میں نے حیرت کو اسباب پر قابو پانے دیا نہ ہراس کو۔ یہ میری طوطی نصیبی تھی کہ میں اپنے عواس قائم رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے جس وقت ملیں تو اس نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا گویا مجھ سے کسی بات کی بات کر رہی ہے۔

”تم یہاں کس لیے آئی ہو؟“ میں نے آہستگی سے ج چہلا۔ ”اور میرا اتفاق یہاں کیوں کر رہی ہو؟“
 اسی طرح اس نے بھر ہاتھ کو کڑکھائی دی اور کابھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اس لیے کہ آپ کو مجھ سے ضرور ملی ہے۔“

”کیا تم سکون سے محروم ہو؟“

”یکہ قسم۔“ یہ کہتے کہتے اس کا سر ہونے لگا جیسے کچھ کا درد چڑ رہا ہو۔ میں گھبرا سا گیا تاہم سطلے کو قطع نہ ہونے دیا۔
”ابھا تو آؤ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“ میں اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

اس نے اپنی کھائی آنکھیں اوپر اٹھا دیں جو ہم آلود تھیں۔ ”میرے لیے دعا کیجئے، جب سے میں مری ہوئی تھی نے میرے لیے دعا کیجی۔ میں برس سے کسی نے مجھ پر ترس نہیں کیا۔“ اس نے کچھ ایسے لہجہ میں کہا کہ میری ہر آہ آئی۔
”تمہاری موت کا سبب کیا ہوا تھا۔“ میں نے سوال کیا۔

”اب“ میں پوش کی قرب کی ایک کمری پر بیٹھ گئی، اس نے ایک ٹنگین انداز سے سسکراتے ہوئے اپنے سینہ سے ہار جتا ہوا برس نے دیکھا اس ہڈی کے کپڑے پر خون کے گہرے دوپٹے تھے۔ اس نے دھبوں کی طرف اشارہ کیا اور بھراں کو اپنے ہار سے چسپا لیا میں کچھ گیا۔
”قتل؟“ میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

”کسی کو اس کا صحیح علم نہیں“ اس نے کہا ”آپ میرا پرانا افسانہ دیا ہے سننا چاہتے ہیں تو سنئے امیں وہی ڈاہید ہوئی میں کاہل آہ آپ نے اس احاطہ میں دیکھا ہے۔“
”ہاں!“

”خبر کوئی نے نقل کیا اور کیس؟“ میں نے بات کاٹ کر بلراج چلا۔ میرے اصحاب ہر بے قابو ہو چلے تھے، میں سب کچھ اسی ایک صحنہ میں جان لینا چاہتا تھا۔ نوادہ ہید کے شہر سے سے ظاہر ہوا تھا کہ وہ ایک اندرونی کرب سے بے بس ہو رہی ہے۔ گو اپنی داستان کو دہراتا اس کے لیے ڈی آر آئی کا کام تھا۔

”ذرا سہر کیجئے تو میں پوش کی کہے اپنی زندگی کے واقعات آپ سے جان کر دوں۔“ اس نے کہا ”میرا قاتل میرا شہر ہے لیکن اس سے چھ حرکت ایک زبردست طاقت فنی میں سرزد ہوئی تھی۔ اس کو دھوکا ہوا، میں کا مرنے وہ اس کو علم نہ ہوسکا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ ایسی محبت جس کی مثال اس دور ہاں بات میں کم لگے گی۔ سہاوتہ کھینچے وہ مجھ کو بچ رہا تھا۔“

آپ خاموشی سنتے جاہئے۔ میرے لیے وہ اپنے عزیزوں سے کنارہ کش ہو گیا اور اس دیران کو آباد کر کے چلا گیا۔ وہ کی کرتا تھا، میرے دونوں جہاں تیری آنکھوں میں ہیں۔ ”بھال منزل“ اس نے میرے لیے حوالی تھی اور میں امیں تو یہ بھیجی تھی کہ زمین، آسمان، چاند، سورج، دن رات سب اس کی چٹیاں ہیں۔ مجھے یقین تھا اور اب بھی ہے کہ مجھے زندگی اس کے غلیل ملے ہے۔ اگر انسانی دنیا کی تمام زبانیں میرے ہند بات کو معرض اختیار میں لائے کی جھٹکا پوش کر میں تو مہر دور انھیں ہو سکتیں۔“

تاہید کی زبان میں گانے نہ گئے تھے وہ دوم لینے کے واسطے رک گئی۔ میں بے ٹوہ کی کی حالت میں اس کو دیکھ رہا تھا۔

”میں پاری تھی یعنی“ آفتل پرست۔“ اس نے آخری الفاظ پر زور دیتے ہوئے بھر جان شروا کر دیا ”اور ایک کنگ میرا ذریعہ معاش لیکن اگر چہ مردوں کا ساتھ شب و روز رہتا تھا، مجھے کسی سے بھی افس نہ رہا تھا۔ خیال نے مجھے ایک نئی لذت سے آشنا کیا۔ اس کو مجھ سے محبت ہوا ہو گئی۔ اس کے ایک ایک کھلا، اس کی ایک ایک ادا سے غرض و صداقت کی برائی تھی۔ میں بھی اس کو دیکھ لوں کی طرف چاہتے گی۔ اس کی ہستی مجھ کو دیا سے نرمی نظر آئی۔ اس کی ہنسی میں جھٹکا کو بھرا ہوا تھا۔ اس کی آواز میں چھپے کی سی دلدزدانہ چھٹی، سوز و گداز اس کے طہر میں

قہار و سرِ پاتھور و درخت و میرا میان ٹری پھڑکی کی طرف تھا اس لیے جمال نے مجھے آسانی سے جیت لیا۔"

وہ مجھ اس مرتبہ زبان نہ کر سکے اور کی اس نے یہی محاسب سمجھا کہ وہ ترتیب وار اپنا سارا قصہ بیان کر جائے لہذا خاموش منتظر رہا۔

"میں آپ کے آرام میں خلل نہیں ہوں؟" اس نے نہ جانے کس حال سے پوچھا اس کا چہرہ اس کے امداد تکیے کا آئینہ بن رہا تھا۔

"بالکل نہیں، میں اس گھڑی کا حقائق تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"میں گھنٹی جی کہ آپ میری غم خواری کریں گے۔" اس نے حذر مان لیا مجھ پر کہا۔ "اور آپ کا قہار نہ کرتی۔"

"ہاں تو ہماری مہبت خوش آمدت ہے ہوتی۔ جمال نے مخالفوں اور انگشت لٹائیوں سے بے پروا ہو کر مجھ سے شادی کر لی اور ہم دونوں

نے ہنگاموں سے دور اس جنگل میں ایک جنت بنائی۔ دونوں کی زندگی ایک مسلسل لہو سر تھی۔ جمال نے اپنی ساری دولت میرے لیے وقف

کر دی۔ وہ حصول آدمی تھا۔ ادبیات اور مصوری سے اس کو انہماک تھا۔ مصوری کا وہ ماہر ہو چلا تھا۔ اس نے میری تصویریں بھیجیں اور ان میں سے

اکثر کی ایک میں نمائش بھی کی جن سے اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ تنہائی کی کیا ریاں میری منتوں کا نتیجہ ہے۔ شام کو جب ہم باغ میں

تعلقات کرتے ہوئے قہار پھول توڑتا رہتا تھا۔ میں ہر گز نہ کہ خود بخود بیٹھی اور اس کو پرہیز کرتی۔ اسی طرح دو سال گزر گئے۔ چار ایک زمانے نے

اپنی کمرش کی کہ ہمت کی بات میں ہمارے غریب کا ظلم ٹوٹ گیا۔ جمال مجھ کو بے قہار رکھتا تھا۔ میں نہ صرف اس کے رشتہ داروں اور دوستوں

کے سامنے بلکہ نام شمع میں بھی اس کے ساتھ بے پروا رہتی تھی۔ جمال نے اگرچہ بھائی اختیار کر لی تھی تاہم کبھی بھی اس کے احباب اس سے

بٹھے جایا کرتے تھے اور وہ ان سے ملی کر خوش ہوتا تھا۔ اس کے رشتہ داروں میں فیروز جو اس کا شہداء مشہور تھا، اہم کو دیکھنے اکثر آتا تھا اور منتوں آ

کر، ہا کرے تھا۔ فیروز کی طبیعت جنتی اور عامیانتھی اس کی نفسانیت کی داستانیں اکثر سنائی دیتی تھیں مگر جمال اس کی ہولناکیوں سے واقف نہ تھا۔ وہ

معلوم نہیں کیوں فیروز کی قدر کرتا تھا۔ حرم و مسائل انسان کو بحیثیت انسانی کیوں نہ سمجھتے تھے لیکن جہاں اطراف سے ساتھ چلتا ہے وہ اکثر

دھماکا کھاتا ہے۔ فیروز کی لاپرواہی مجھے کراں نہ کرتی تھی، اس کی مسکراہٹ مجھے ناگوار ہوتی تھی۔ میں نے متعدد بار چاہا کہ جمال کو ہوشیار کر دوں

مگر پھر یہ خیال ہوا کہ بیکار بدعنوانی ہے۔ مجھے اپنی اخلاقی قوت پر اس وجہ غرور تھا کہ میں گھنٹی تھی فیروز مجھ سے خالی کرنے کی بھی

ہمت نہ کرے گا اور چونکہ وہ ہونا میرے سامنے مہذب اور شائستہ رہا کرتا تھا اس لیے اب بھی مطمئن تھی اور جمال کو بھی مجھ پر اعتماد تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ فیروز دارا مہمان تھا۔ جمال کو کسی اشد ضرورت سے جیتا چاہا جانا چاہا اس لئے کو آٹھ بجے جب کہ اس کی رانہیں کا

وقت تھا، میں اس کمرے میں جا کر آپ کے کمرے کے متصل سے منتہی کچھ بھی آواز میں گارڈ تھی دفعتاً مجھ کو کمرہ دار ایک ہوتا معلوم ہوا۔ پیچھے مڑ

کر دیکھا تو فیروز تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ روشنی تم کہاں کر دیتی؟" میں سوال قطع کرنے نہ پائی تھی کہ میرا بازو اس کی آہنی گرفت میں تھا

اور وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ بعض ساتھیوں میں جو کچھ در دل میں خوشا کہ بکرا ماند جھارت پیدا کر دیتی ہے۔ میں نے اپنے تمام جسم کی

قوت صرف کر کے ایک بار اس کی گرفت سے بچا ہاتھ چھڑا لیا مگر کم ہمت پر ہیبت کا رویہ مسلط تھا۔ دوسرے منٹ میں میں اس کی تلک آغوش میں

تھی۔ میں نے ابھی تلک کسی ہانک کو اس لیے نہیں ملا دیا تھا کہ ان میں اس واقعہ کے مصطفیٰ خواہ بخوار اور گشتیاں ہوں گی۔ اب میں نے ایک بار پھر

فیروز کے مہلک چال سے آواز ہو کر غور کو آواز دی۔ اس کے آنے میں تاخیر ہوئی۔ فیروز پھر میری سمت بڑھا لیکن اسے میں جمال نے مجھے

پکارا فیروز کمرے سے باہر نکل گیا اور میں جمال کے پاس دوڑی۔ میرا ارادہ تھا کہ اس سے یہ کہہ دوں کہ سب باہر آکر کہ فیروز کو کسی وقت لکھا

روں کی بکرا اس کی ٹوہنتیں آئی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے مجھے فیروز کی آغوش میں دیکھا تھا اور اپنی رائے قائم کر چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے

جس وقت اس نے یہ دیکھا اسی وقت میں نے اپنے کو فیروزہ گرفت سے چھڑایا تھا۔ حال اف اف اکڑا ہوا اپنے حلقہ میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے اس کو کبھی غصہ نہ کیا۔ دیکھا تھا اس کی آنکھیں خون کی مانند سرخ ہو رہی تھیں۔ صورت جوش غضب میں سرخ ہو گئی تھی۔ میں کمرے میں داخل بھی نہ ہونے پائی تھی اس نے مجھ کو شیر کی طرح میرے کان کی پکڑ لی اور کہا "دعا باز! تیری زندگی کا ایک ایک لمبے اب مجھ ہی کو تپا پاک کر رہا ہے۔" مجھ میں چار دایا تھا کہ "دعا باز" غلابا چاہانے کے بعد میں نے اپنی بیعت کے لیے ایک حرف بھی نہ کہا اور وہ کچھ ایسے عالم میں تھا کہ اگر میں نہ کہتی تھی تو وہ مجھے جیونہ بھرتا۔ حال سے ابھی مطلوب ایذا بات اور انہیں واقع ہوا تھا اس کے مصداق ہلاک رہے تھے۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا اس نے ایک لاکھ میری اس پانچھل تصویر پر ڈالی جس کے لیے وہ ان دنوں بڑی محنت کر رہا تھا اور میری حرا سے جیسی بغض نکال کر میرے سینے میں اچھڑا دیا۔ یہ سب ایسی طبعی صورتیں سرعت کے ساتھ ہوا کہ میری نگاہیں کچھ نہ آئی۔ "جانی کا شیطان" فیروزہ پانچھل صحت کے اندر گھس کر میری جھٹ سے محروم کر گیا۔ اس کے بعد ہر چند کہ حال پر کوئی اثر نہ آیا اور مشہور ہو گیا کہ مجھے کسی دشمن نے قتل کر دیا ہے۔ لیکن اس کی زندگی اس قدر امانت ہو گئی کہ چھ مہینے کے بعد اگر اس نے خود بخود نہ کر لی ہوتی تو وہ جا کر قتل کا اقبال کر جیتا۔

ذہید کے آنسو کرنے لگے۔ میں ڈب گیا، اچھڑا تھا کہ اس کے آنسو مجھوں لیکن اس نے ہاتھ کے اشارہ سے منع کر دیا اور دیکھ بھلے جان شروع کر دیا۔

"آپ جہاں کو خود اور اور خوشی گئیں گے۔ مگر میرا ایمان یہ ہے کہ اس کو میرے ساتھ شدہ جسم کی محبت تھی۔ یہ محبت کی اچھی تھی کہ اس نے محبت کے لگا ہو جانے کے ذریعے مجھے بیعت کے لیے گھبرا دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اس نے مجھ بیٹے کے مشہور ڈرامہ "اقبلا" کا ڈرامہ کر کے سنا دیا تھا۔ میں گھٹوں "ڈرامہ جیونہ" پر رش کرتی رہی۔ میں نے حال سے کیا تھا کہ کاش! مجھے اس کا ہارنے ہی کا غضب ہوتا۔ اس پر اس نے مجھے بہت پیار کیا تھا۔"

اب یہ تھک گئی تھی لیکن اب اس کے ہرے سے آواز کی ٹھک رہی تھی۔ صبح کی پیچیدگی سوز اور ہو رہی تھی۔ وہ رخصت ہونے کے لیے اٹھی بیٹے بیٹے اس نے کہا "ہاں ایک بات بھول گئی۔ حال نے ایک علم گھر پر کیا ہے۔ مجھے یاد کرنا ہے کہ تھیں نہ ہوئی اس نے میرے حرا کی موت پر یہ شعر کہہ کر ادا کیا۔

وفا آسختی از یادگار دیگران کردی
دیوے گویاں از دایم دیگران کردی

اس کو آخر وقت تک ملاطفت اب اس شعر کو کہ یہ شعر کہہ کر ادا کیجئے۔

من کہ جز با تو نہ پرداخت ام
گر خود ساختہ ام ساختہ ام

بس مجھے اطمینان کلی میرا جانے کا اور میں سکون کا سانس لے سکوں گی۔ آپ کو ہر کچھ تکلیف نہ دوں گی۔ ہاں اگر آپ کا بی بی چاہے

تو جا کر اس باغی قلعہ کو بھی دیکھ لیتے جس نے دو مہینوں کو بیٹھ کے لیے جہاد کر دیا اور جو "مسلحہ" میں ابھی تک ایک بوسیدہ صندوق میں چڑا ہوا ہے۔ "یہ کہ کرنا بید نے اعلان کیا۔ میں نے سن کر اس تک اس کو ہاتھ دیکھا، اجاں وہ لگاؤ سے غائب ہو گئی۔

میں باجمہ و مکر چاہنے سے ہمت سے پہلے ہی سازو سے تباہی میں ملا۔ اس کو لے کر سید عباس کمرے میں گیا جو جہاں کا "مسلحہ" روہنکا تھا۔ سب سے پہلے میری نگاہ میں چیز پر غصہ ہی وہ ایک ہلکا صندوق تھا۔ اس میں کمر خورہ کا کھانا تھا ایک اتنا تھا جس کے دو میاں مجھے دو خوش قلعہ ملا جو ہر دوڑک آ کر دوڑنے کے اپنی ٹون آٹائی کا اقرار آپ کرنا ہو مظلوم ہوتا تھا۔ میں نے سازو سے کہا اس کمر میں جتنے افراد ہیں ان میں سے ایک تو ایسی ہو جس کے سامنے میں اپنے مقابلہ ہاتھ پاؤں کر سکتا ہوں اس لیے کوئی مجھ کو بھی دیا جائے یا فائر اسلحہ نہیں کھو گئی۔

میں نے سازو کو حقیقت بتا کر دیکھا تو وہ حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگی۔ وہ مجھ کو بھڑا تو کچھ کھنکھاتی تھی اور اس کی باتوں کو آسانی سے سمجھ مان لینا بھی کوئی معمولی کام نہیں۔ سازو نے کہا اعلیٰ اور فہم و فہم سے اس کا ذکر کیا اور بہت صبر کے ساتھ کہا کہ جہاد کی کوریج پر وہ دوسرا شعر لکھ کر لایا ہائے جہاد میں لکھے جا چکی تھی۔ لیکن اس کا جواب دہی ملا جس کی گھٹے امید تھی۔ یعنی میرے ساتھ ساتھ اس کا بھی خوب مصلحہ لایا گیا۔

مجھ کو قسوس ضرور ہے کہ ناہید کی آڑی خواہش پہری نہ کر سکا مگر میرے امکان میں جو کچھ تھا وہ کیا لو اب بھی اس سے ناقل نہیں ہوں۔ میں اس کے لیے راز و دھن نہیں کرتا رہتا ہوں۔ کیونکہ میرا دعائی اعتبار یہ ہے کہ درجنوں کے تعلقات اس دنیا سے بھی حقیقی نہیں ہوتے۔

یہ واقعہ توں میرے غور و فکر کا موضوع رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں اور کئی تجویز نہیں دیکھتا۔ محبت بھی کیا سمجھ ہے۔ کوئی ایسا دماغ آج تک پیدا نہ ہوا جو اس ظلم کو توڑ سکا۔ حلقی اپنے اصول، موضوع اور مظلوم متاثرہ لیے ہوئے دیکھا رہا تھا تو اور بعد کچھ لینے تھے کہ "خدا ہی" کا اجراء اور "تختین" کا تاج ہی نہ صرف لیکن ہے بلکہ ہستی کا اصل راز ہے۔ ہم اس کھنکھاتی کوئی داپنر یا سینہ دورہ راہی کی مدد سے نہیں سلجھا سکتے۔

اب آخر میں جانے نفسیات اور باہرین مصیبت کو بھی اس واقعہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کال یقینی ہے کہ وہ اس کو خواب یا القاس نظر کرتا کہ غیر ذمہ دارانہ طور پر اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کر لیں گے، لیکن دوسری طرف مجھے یہ بھی اطمینان ہے کہ لوہار کو اپنی اس رات پر ہر دہرہ کہنا ہو گا۔ وہ خود فریادوں کے ذریعے سے اپنے اس کرب و اضطراب کو دور کرنا چاہتے ہیں جو تکنیک کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ کسی سرسٹ کی بات ہے کہ ہم انسانی کی تنگ مانگی کا پرہیز اب فاش ہو رہا ہے۔

انسان کو ختم کرتے ہوئے میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ناہید کی ہر قصور یا سری کے پاس تھی وہ اس مظلوم و مظلور کی منافی نہیں ہے جس کا نام مجھے بتایا گیا۔ بلکہ عدالت کی سرطرازی ہے جس کا ہم میرے سوا کسی کو نہیں۔

(مکمل ۱۹۳۶ء)



حوالہ جات

- ۱۔ یہ انسان "میں باغی اور دوسرا صفائے" مظلوم کتب، ادب دہلی، مئی ۱۹۷۷ء میں کسی قدر مہارت کے غرق کے ساتھ دیا ہے۔ "تقریباً" انسان ۱۹۵۵ء کے لیے لکھوں نے ایک بار پھر لکھنا کی ہے۔

علی عباس حسینی

نام	علی عباس حسینی
لقب نام	سر سید احمد پاشا / علی عباس حسینی
پیدائش	۳ فروری ۱۸۹۹ء، پتھان موضع چارہ، ضلع غازی پور (جو۔ پی) بھارت۔
وفات	۷ اکتوبر ۱۹۶۹ء
تعلیم	ایکمراسے (تاریخ) ۱۹۲۳ء

ابتدا میں مدرسہ سلیاب، پٹنہ سے عربی اور دیانت کی تعلیم پائی۔ مٹن ہائی اسکول، الہ آباد سے بھرتک ۱۹۱۵ء اور اعظمیہ سے ۱۹۱۷ء میں کیننگ کالج، آکسفورڈ سے بی۔ اے کیا۔ ۱۹۲۱ء میں الہ آباد کچھڑا کیننگ کالج، الہ آباد سے ایل۔ بی کیا اور ۱۹۲۳ء میں ایکمراسے (تاریخ) الہ آباد یونیورسٹی۔

مختصر حالات زندگی:

موضع چارہ، ضلع غازی پور (جو۔ پی) کے سادات مولوی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق بہ سادہ و مسعود غازی الصیغی ترقی کی نسل سے ہے۔ جنہوں نے خیر و شفا، تعلق کے بعد میں غازی پور بسایا۔ مدرسہ میں دینی تعلیم پانے کے ساتھ نماز، روزہ کی پابندی اختیار کی اور مگر والوں نے یہ کچھ کر کے طاعن مسجد بننے کی صلاحیت سے ہماری ہیں، انہیں انگریزی پڑھنے کی اجازت دے دی۔ قلم کمالوں سے طبعی رغبت تھی پتا چھڑاں گیارہ برس کے سن تک اردو میں "الف لیلیٰ" کے ساتھ ہو گئے۔ سات یا د فردوسی کا "شاہنامہ" چھڑاں اس زمانے میں عبدالحکیم شرما اور محمد علی عیوب کا ادب میں طویل بحث تھا، جسکی نے بڑے بڑوں کی آنکھ بچا کر ان دونوں کی ہماری کتابیں پڑھا لیں۔ فریڈرک مٹنوں شباب سے پہلے اردو میں شائع ہونے والے سب سے بڑے ناول، جٹو ہاں اور اس وقت ان کی نظر سے گزر چکے تھے۔

۱۹۱۷ء میں پہلے افسانہ "فلپنا گھنٹہ" لکھا اور ۱۹۲۰ء میں "سر سید احمد پاشا" کے عنوان سے پہلا روایتی ناول مکمل کیا۔ ۱۹۲۱ء میں

ای۔ فی کرتے کے بعد سکول چھوڑ گئے۔ بعد ازاں گورنمنٹ جونی کالج، بھٹنوں میں ساری زندگی درس و تدریس میں گزار کر ۱۹۵۴ء میں پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ضرورامووی ٹی وی سسٹم کے، ایک معروف ہدایت کار سرگوب مووی کے لیے فلم "امیر چور" لکھی، لیکن یہ فلم نہ بن سکی۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

۱۔ "جذبِ کمال" مطبوعہ "زمانہ" کانپور، ستمبر ۱۹۴۵ء

۲۔ "چاند کھیاں" مطبوعہ "زمانہ" کانپور، دسمبر ۱۹۴۵ء

فکری آثار (مطبوعہ کتب):

۱ "سرسید احمد شاہ" عرف "کاف کی پری" (دوبلی جلد) بہار گوک واپ بھٹو طبع اڈال ۱۹۶۱ء

۲ "رفیقِ حجابی" (افسانے) کتبہ اردو لاہور طبع اڈال ۱۹۶۲ء

"رفیقِ حجابی" کے عنوان سے ایک مجموعہ ناول اور ناولوں نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ کل صفحات ۳۶۳ ہیں۔ دوسرا ایڈیشن کیا اور دہلاہور نے شائع کیا ہے۔

۳ "پاسی پھول" (چودھوا افسانے) کتبہ اردو لاہور طبع اڈال ۱۹۶۹ء

یہ کتاب چودھری اکیڈمی لاہور نے بھی شائع کی ہے۔ تیسری بار یہ کتاب سلیم برادرز راجندر اسرائیلی، نکلنے نے ۱۹۷۸ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں "پاسی پھول" (۱۹۴۸ء)، "پاسی پھول" (۱۹۵۰ء)، "گولا پری" (۱۹۴۳ء)، "بیدی" (۱۹۴۹ء)، "بلی برائی" (۱۹۳۳ء)، "بلی پھول" (۱۹۳۲ء)، "بکے کا بھوک" (۱۹۳۹ء)، "بہار الہ" (۱۹۴۹ء)، "آدم کا بچل" (۱۹۴۹ء)، "استانِ قدرت" (۱۹۴۰ء)، "کلر واپ کلاری" (۱۹۳۸ء)، "خوش قسمت لڑکا" (۱۹۳۹ء)، "حق ایک" (۱۹۳۹ء) اور "سپنا کیا ہائے" (۱۹۳۸ء) نکل چودھوا افسانے ہیں۔

۴ "کائنات میں پھول" (افسانے) اردو اکیڈمی، سندھ کراچی

۵ "سینہ گھسی" (افسانے) نیا ادارہ، سرگرمی لاہور طبع دوم

یہ کتاب کھلی بار کتبہ اردو لاہور نے شائع کی تھی

"ایک نیکٹ کے دارائے" (ڈرامے)

کتبہ جاسو لمیٹڈ، راولی

"عزیز اب" (تھیڈ)

ساقی بک ڈپو، راولی

"نوریا گھارے" (افسانے)

پبلی کیشنز، ڈوچن شہری، ۱۹۶۳ء

"ہمارا گادیں اور دوسرے افسانے" (۱۰ افسانے)

کاشف ایڈ انفارمیشن، راولی

"تھیم بالائی" (حزایہ قصے)

مبارک بک ڈپو، کراچی

"شاہد کہ بھار آئی" (ناول)

اردو کتاب گھر، کراچی

"آئی۔ سی۔ ایس اور دوسرے افسانے" (چودہ افسانے)

ایڈ نیشن پریس، ملتان آباد

اس کتاب میں "آئی سی ایس"، "شیخو پچا"، "دو خریفوں کا مقابلہ"، "ملک خدا تنگ بیست"، "بیٹوں کی جھڑی"، "کافور باہن"، "بختیار کے کانسٹو"، "شیخ کریم کی غرت"، "ساج کی بیجنت"، "شریف عزود"، "دل کی آگ" اور "بیاضی جوگن" کل چودہ افسانے ہیں۔

"یہ کچھ اسی نہیں ہے" (افسانے)

ایڈ نیشن پریس، ملتان آباد

"اٹھ دھام گئے" (افسانے)

"نورجی" (ڈرامہ)

"ناول کی تاریخ و تہذیب" (تھیڈ)

"کولگری" (ہندی)

"پھولوں کی چھری" (ہندی)

"گائے ماہی" (ہندی)

"ایک صام میں" (افسانے)

"سیلاب کی راتھی" (افسانے)

اس کے علاوہ سکول کے مختلف درجوں کے لیے نصف درجن سے زائد نصابی کتب۔

نظر یہ فن:

”اگر نصاب کی پہلی ترقی پندی ہے تو میں یقیناً ترقی پسند ہوں۔ اگر اس کے معنی مارکس کے فلسفے کو الہامی سمجھنا ہے تو میں یقینی ترقی پسند نہیں ہوں۔ حقیقت یہ کہ میں متفک ہوں۔ میں آدھے کام، مضوری اور دھکتی رنگوں پر اٹھ چکا ہوں۔ کچھ دیکھتا ہوں۔ نظریات کا پچاس سو فیصد کام ہے اور ان کو عملی جامہ دینا چاہتا ہوں۔“

علی عباس حسینی

”میرا بہترین استاد“ مرزا محمد حسن عسکری سے اقتباس

”میں نے اس فن (ادبیات) کے متعلق جو کچھ سیکھا ہے وہ انگریزی ادب کا حصہ ہے یا انگریزی زبانوں کے ترجموں کا۔ جو انگریزی

میں ہے۔“

علی عباس حسینی (۶ جون ۱۹۶۳ء بمبئی)

”میرا ادب“ ”معرضہ“ انگریزی مطبوعہ کتبہ صبری لاہوری

۱۰ جون، طبع اقبال ۱۹۶۵ء

میلہ گھومنی

علی عباس حسینی

کافوں کی سنی نہیں کہتا، آنکھوں کی دیکھی کہتا ہوں۔ کسی دیکھی واقعے کا بیان نہیں، اپنے ہی دیکھنے کی داستان ہے۔ گاؤں گھر کی بات ہے۔ بھوت کچ کا انعام جس کے سر پہ چاند کھینچے۔ گھنے کھائی کہتا ہے اور آپ کو سنتا۔

دو بھائی تھے چانو، منو، ماس۔ کھلاتے تھے پھراس۔ مگر پھال جولاہے فوٹی میں تھی اور دادو پھال سندھ وارے میں۔ ہاں، پر ہا کی طرح میر صاحب کے ہاں کام کرنے آئی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی صاحب نے اس سے کہہ کر اور کام بھی لیے اور نیچے میں ہاتھ آئے، چلو منو۔ دو درجہ یادگار ہی چھوڑ کر جنت سدھارے اور طیارہ بھگت بڑے میر صاحب نے۔ انہوں نے بی جولاہے کو ایک کچا مکان عطا کیا اور چوڑی کی پروش کے لیے بنگلہ روپے دیئے۔ وہ دونوں لپے اور بڑے اٹھکے ہاتھ پاؤں نکالے۔ چنو ذرا سنجیدہ تھا۔ بھائی منہ لے کر میر صاحب کے کارندوں میں ملازم ہوا اور ہمیں میر صاحبان کا مصاحب بن کر منہ لگا ابائی تھا۔ ابھروں کے ساتھ اکھڑوں میں کشتی لڑا کر آیا اور رام کے لیے کشتی پاڑی کرنے لگا۔

لیکن دونوں جوان ہوتے ہی اصحاب کا شمار ہوئے۔ خوں کی گرمیاں وراثت اور ماحول میں ملی تھیں۔ دونوں ہنریت کے میدان میں بڑے بڑے سر کے سر کرنے لگے۔ شہ و شہ میر صاحب کے کافوں تک ان کے کارناموں کی، داستانیں سنیں۔ انہوں نے چوڑی طرح کی ایک لڑکی سے بیاہ کر کے باغ دو پا۔ مگر منو نیچے ساڑی کی طرح مختلف کھیت چہ تار با۔ اس کی ہنگامہ ساز مائیں کا غلط دور تک پہنچ۔ بالآخر میر صاحب کے پاس ابھروں، پھاروں، جولاہے فوٹی اور ہر سمت اور ہر جگہ سے فراہم کی صداغیے پہنچے لگیں۔ انہوں نے عاجز آ کر ایک دن اس کی ماں کو بلوا بھیجا۔ جب وہ گھر گھٹ لگائے لپاتی، سمجھتی ان کی بیوی کے چنگ کے پاس زمین پر آ کر بیٹھی تو میر صاحب نے منو کی شکایت کی اور کہا اس لڑکے کو روکو۔ روٹ ہاتھ پاؤں فوٹیں گے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ آپ ہی چوڑی طرح اسے مگی کسی نام سے مار چکے۔"

میر صاحب بڑی سوچ میں چمکے۔ یہ نئی قسم کا قلمی پردہ کسی صاحب ہی تھا اسے میں لکایا جاسکتا تھا۔ ہر زمین کو اس کو قبول نہیں کر سکتی اور وہاں اس کے کارناموں کی شہرت نے ہر جگہ خودیٹ پھیر کر دی تھی۔ وہ زمانے نے اسے سوچنے والے باہر چلے آنے اور برابر سوچنے ہی رہا۔

الحاق سے انہیں دس روزی کے پٹے سے واپس ہونے والوں کے ساتھ ایک نامعلوم قلعے کی صورت کاؤں میں آئی اور ایک دن میر صاحب کے ہاں نوکری کی تلاش کے بہانے پہنچی۔ سیدانی پلے صورت نکال دیکھتے ہی بکھریا کہ وہ ان کے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے رہنے والی عورت تھیں۔ پوچھنے لگئے کہ یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ گاؤں کے روزی کے ساتھ پٹے سے آئی ہے اور اس کے ہاں کئی بھی ہے۔ سیدانی نے اس روزی کی حکایت سن چکی تھیں۔ جب سے اس کی دوزن سدھاری تھی اس نے پٹے سے نئی نئی صورتوں کا اور گاؤں کی نسوانی آبادی میں اضافہ کرنا چاہا۔ طے کیا تھا۔ پھر بھی سیدانی پلے کے ساتھ مزاج نے صاف صاف انکار کی اجازت نہ دی۔ انہوں نے کہا

”اچھے گھر میں، اور کام کرو اور دھارن میں تمہارے لیے کوئی بندوبست کروں گی۔“

اور مردانے میں میر صاحب کو ان کے ہم چلتوں نے نوادار کی خریدی۔ ایک صاحب نے جو ذرا غریب طبیعت بھی تھے، اس کی تعریفیں پا کر جان کی

”مادون صاف کا قول ہے کہ اصل اس کی بھاری ہے۔ وہ بھاری سے لکرائی گئی، بھاری سے بھاری، پندہ نئی سے کھان، بکھان سے اور ان اور اب دوزن سے سیدانی پٹے کے ارادے رکھتی ہے۔“

ایک صاحب نے پوچھا ”اور اس کے بعد؟“

اور انوں کا ہاتھ پھیلا کر بولے ”خدا جانے شاید اس کے بعد فرشتوں سے آکر لڑائے گی۔“

میر صاحب جب گمراہ آنے والی نے ان محترمہ کی خریدی۔ بہت جلد ہوئے۔ اس سیرت کی صورت اور شرفاء کے گھر میں، وہ ایک قدم بڑھ کر کسی کام کے سلسلے میں سامنے آئیں۔ میر صاحب نے کھانے لگے۔ نوکری کرنے آئی تھی۔ اگر ان کا دے کر اور گھر سے نکال دیتے ہیں تو اسے مصیبت کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ بیٹ کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کرتے ہیں۔ اگر اپنے ہاں بار دیتے ہیں تو گھر میں، ماشاء اللہ کئی چھوٹے میر صاحبان ہیں، کبھی چلو منو کی نسل اور نہ بڑھے، ان ناموں کی یاد سے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ سحر کر جی سے سرگوشی کرنے لگے۔ پھر سوچی، ان کو بڑا کر انہوں نے اسے چار شاہی عہدہ دیا کہ

”ہم نے منو کی نسبت طے کر دی، اس سے کہہ دیکل اس کا عقد ہوگا۔“

چار شاہی بھائیوں کو چاروں چاروں کی حوالہ تھی۔ وہ بہت اچھا کہہ کر بولے، دلی ہو پر ایک نظر اسے چلی گئی۔ وہ بھی رشتے سے باہر ہے، تو جی اس لیے بہت کھل کے ہاتھ ہو گیا۔ چار شاہی اس کے طور طریقے سے زیادہ مطمئن نہ ہوئی لیکن جانتی تھی میر صاحب کی خوشی ہی میں ہے، اختلاف کا یا نہیں۔ رہنے کا لہجہ انہیں کا وہاں ہے، چوکی نوکری انہیں کی حد کر وہ ہے اور منو کی جوت میں کھیت بھی خود انہیں کے ہیں۔ غرض گمراہ آئی اور رات ہی میں منو کو میر صاحب کا فیصلہ خاں دیا۔ وہ اسے روزی کے گھر، بھادج کی حیثیت سے دیکھ کر پندہ کر چکا تھا۔ جلدی سے راضی ہو گیا۔

دوسرے دن مولوی صاحب بلائے گئے۔ منو کوئی دھوئی، لیا کرتا میر صاحب نے پہنایا۔ رات کو شاہانہ جوتا اور چند چاندی کے

رج رات ان کی پہلی سنے پہنائے اور مقرر ہو گیا۔ پھر میر صاحب اور ان کی بیوی نے روٹھائی کے نام سے اس روپے منویٰ میں کو روپے اور ملجن کو اس کے پاس رخصت کر دیا۔

دن چلتے گئے دن چلتے گئے۔ بیٹھے ہوئے، ایک سال ہونے کو آیا مگر ملو اور اس کی دلہن کی کوئی نکاحیت شے میں نہ آئی۔ میر صاحب کو اطمینان میں سا ہو چلا کہ قنبر کا گروہ اور اصحاب کے دو چار ایک ہی چنگے میں اچھے ہو گئے۔ کہ کھانا ایک دن بلی جولا میں روٹی منورتی نکلیں۔ معطوم ہوا منو نے مارا ہے۔ یہ چھ بکھوے کھانا کہ چھ بیٹھے سے اسے لٹے کا شوق ہوا اور جس طرح وہ خوش ہوئی پر اتنا مارا جیسی طرح رخصت ہاں پر۔ کل رات میں تو اس نے بارہا نہیں بکھا اسے ایک کوٹری میں ہے اب دو دانہ بند کھا۔ اب منوئی بچے قنبر لڑائے کرتی ہے۔ میر صاحب کے اس سوال پر کہ پہلے ہی کیوں نہ تھا کہ فوری تدارک سے شاید بری عادت نہ پڑنے پائی۔ جولا میں سوائے "ماحا" کے اور کیا جواب دے سکتی تھی۔ انہوں نے قسم دیا "آج سے نہیں رہو مگر جانے کی ضرورت نہیں۔"

مگر میر صاحب کو منویٰ نظر ہو گئی۔ خون کنڈی ٹالی میں بہہ کر نہ بدل جاتا ہے اور نہ پھٹ کر پیچ ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسے بلا بھیجا اور حد سے زیادہ فضا ہونے اور یہاں تک کہہ دیا کہ "اگر پھر سا کہ تو نے تازیانی تو رخصت سے بندھو کر کاٹنا چاہاں گا کہ چھڑا دھڑ جائے گا" ساتھ ہی پارسی کے پاس مخصوص کارندہ بھیج کر کہا کہ بھیا کہ "اب اگر منو کو ایک قنبر بھیج دینے کو تو تازیانی خانہ خوار ہو گئیں گی۔" "موضع منویٰ پر سے طور پر بدلتی کر دی گئی اور تازیانی بند ہو گئی۔" نئے کا نقش منوع قرار دے دیا گیا۔

مگر جب تک اپنا کام کرتی رہی اور تازیانی بند ہونے کے چھ ماہ بعد وہ آ نکلیں، اگلے لگا۔ بالکل درود کو کھا ہوا آ منو کیا اور کھانسی جھڑکا نکلا رہا۔ جب میر صاحب کو کوٹری کی عمارت کے بہانے پارسی کی نقشیں ہونے لگیں اور بیو نے تیوں کے ہاں چلانا شروع کر دیے تو انہوں نے بی جولا میں آ کر دیکھ کر ہندوے مگر سمجھا اور بیٹے کے طالع اور بہو کی گھرانی کی تاکید کی۔ لیکن یہ گھرانی وہاں اسی طرح نہ کارگر تھی جس طرح بہو کی وہ پریس کی گھرانی تھکتی ہے۔ وہ پارسی انگیر کرنے کے بعد وہاں کی چھری تیز ہونے لگی۔ ساس بھلا سس سے کم تھیں۔ انہوں نے کلاہ کھڑا کر دیا شروع کر دیا۔ ایک دن تو ہاتھ پائی تک پہنچی۔ جولا اور بیو صاحب کا مقابلہ کیا تھا۔ بیو ساس کے بیٹے پر سوار ہو گئی۔ منو چنگ سے چھت کر اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ساس کو چہرے پہنچا۔ بیوی نے بیٹے پر دولا دے دی کہ ہاتھ کر کے وچا ڈھیر ہو گیا۔ دولاں لڑا بھول کر اس کی سار رواری میں مشغول رہیں لیکن خطر کے ساتھ تھوڑا تھوڑا خون بھی آنے لگا اور وہ ایک ہفتہ بعد گھر سے اٹھ کر قنبر میں چلا گیا۔ اب روٹھو شروع ہوا، بیو ہونے لگی اور ساس بیو میں اسی پر مقابلہ لڑا کہ دیکھیں سوگ کوں زیادہ مٹاتا ہے۔ چانچ روٹھو اسی طرح میں اطمینان رہی کہ میر صاحب کو لودا کر سمجھا چکا۔ لیکن آہستہ آہستہ سب فہم کھنا شروع ہوا ساس بیو کو ایک دوسرے سے بھٹکا رہا پانے اور رشتہ قرار نہ ہونے جانے کی غیر شعوری طور پر فریفتی ہونے لگی کہ کھانا چوکی کی چوکی چلی اڑت مگر اچھے جن کر پور کے پاس پہنچی گئی۔ بی جولا میں کو چار بھونے بھونے پاتوں کو سنبھالنا چاہو منویٰ چھ کو کھت کے احکام بھول جانے کے مواقع ملنے لگے۔

ایسے ہی ایک موقع سے فافہم بھانے اور بی بیو نے وچو رہائی کے پاس آ بیٹھا۔ خاطر قراضع ہوئی اور باتوں کا سلسلہ پھرنیلا۔ درو جان ہوئے تنہا لیوں کا ذکر پھر اور ساس کے در کرنے کے ذرائع پر غور ہوا۔ بالآخر ایک شب امتحان کی قرار پائی۔ جب اس کی سار سرفروشی سے ہوئی تو خانو نے اس سے اصرار کیا کہ اس رشتے کو مقرر کے ذریعے منظم ہا۔ وہ بیٹے کو کئے کمر وادی صاحب کے پاس پہنچی۔ وہاں بیات میر رہنے کی وجہ سے شرع کی کتابیں اب تک نہ ڈھولے تھے۔ انہوں نے امتحان اور ساس کے نتائج سے واقف ہو جی کان پر ہاتھ رکھا اور نکاح کے

مصنوع ہونے کا ثبوتی فوراً ساغر مار دیا۔ بی بی دیر تک ایک مکمل کی طرح محسوس رہیں۔ یہ جب مولوی صاحب اپنے فیصلے سے نہ ملے تو مل کر بیٹے سے ہوئیں۔ ”بھئی بے گھر بھائی، انگ میں میرے سامنے سیندھو دھرو بنا، وہ اب میری بیوی ہے، میں خوش میرا خدا خوش۔“ بھائی نے ماں کا کہنا کیا۔ انگ میں سیندھو رکھی جنگی ادا لیا اور اپنے پاؤں میں سمیت اس گھر میں ٹھہر گئے۔

ایک مہینہ چار دو بیٹے، تین بیٹے، مگر جسے میں نے جنوئی کرا چک گئی۔ اگر باہر دنیا جن کے چلتا سب چھوٹ گیا۔ وہ اب ارا بھک کے چھٹے لگا۔ ہمیں میرا صاحبان میں سے ایک صاحب طوبی تھے، ان کو کھانا پانہیوں نے کھوئیں اور گولیاں کھانا شروع کیں۔ دو دن کے ذریعہ پر بکھ اور چلا۔ بد قسمتی سے حکیم صاحب ایک ریاست میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ میں جنوئی کر بھئی کھڑی کی طرح بوجھ چنے سے بھٹک گئی۔ ساتھیوں نے انھوں کی صلاح دی۔ شروع میں تو کافی سرور تھا مگر انھوں کی جنگی نے دیو بھا۔ بی بی نے حکیم، گئی ہیں، دو دو کھن، گئی، ملائی اور یہ جتنے چار روپے میں کہاں ٹھہرے۔ وہ لگا کھینے کمال کے ہاتھ پھیلائے اور پیسے، کھینے۔ مگر اس پر جو کھانا کھاتے نہ سنا اور انھوں کی است چ بھئی تھی وہ چھوٹی نہیں۔ اس نے آہستہ آہستہ دل دیکھ کر کھینے کیا اور بھوٹاں کو افکار کے دور سے چنے گئے اور سوکھی کھانسی آنے لگی۔

ایک دن بخوری کے سینے میں جب ہوتا ہادی بخوری تھی اور لالے چنے والے تھے کہ جنو کو افکار شروع ہو گیا۔ بخوری پر کسی کام کے سنبھلے میں حاضر تھے فوراً تھ کر گھر کی طرف بھاگا۔ راستے ہی میں کوٹا لپکا اور جان چڑا سی کے سر پر چڑا۔ اسی کے سر پر بھئی گری احمد کے دل زمین پر آ رہا۔ سنبھل کر اٹھا مگر دل کا یہ حال تھا کہ منہ سے بھلا چڑا تھا ہے ساتھ سر سے ماں، سر سے ماں، ”بھئی بھو اور ڈا، راستہ بھائی نہو چا تھا۔“ دھنکا جا رہا تھا مگر پاؤں پیچے کی طرح ٹھٹھ رہے تھے۔ گھر کی ادلیٹر میں قدم رکھا ہی تھا کہ دوسرا کڑا ہوا۔ دھنکا کر کھانا دھنکا کر اٹھا اور لالان والے چٹک پر ہ کر بج بی کے پہلے سے چھوٹے ہوئے کھڑکی طرح بھڑے گرج لگا رہی طرح اس کا ہر عضو ہلڑ کئے لگا۔ بی بی ”ارے کیا ہو گیا کوٹا، کبھی بخوری بخوری۔“ جنوں نے پاؤں پہلو اور ڈاں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا۔

”اب میرے بعد تم کو کون خوش رکھے گا؟“ اور بھٹھ کے لیے خاموش ہو گیا۔

جنوئی کا تھ کے تیسرے دن اس کی خوش نہ ہونے والی بد لگاؤں کے ایک جوان کسان کے ساتھ کبھ کا سید گھوڑے اٹا ہار چلی گئی۔



محمد مجیب

نام	محمد مجیب
تعلیمی نام	محمد مجیب ایچ ڈی فیسر محمد مجیب
پیدائش	۳۰ اکتوبر ۱۹۰۲ء بمقام کھنڈ، بھارت
وفات	۲۹ جنوری ۱۹۸۵ء بمقام ممبئی، بھارت
تعلیم	پی۔ اے (آنرز تاریخ) آکسفورڈ یونیورسٹی ۱۹۲۳ء

کتب کی تعلیم گھر پر ہوئی، اس کے بعد انھیں بورنگ کالج میں داخل کر دیا گیا۔ ایک سال کے بعد اسلامیاتی سکول کھنڈ میں منتقل ہو گئے۔ دیر بعد ان کالج سے بیٹریکلیج (۱۹۱۸ء) کا شریکیت حاصل کر کے ۱۹۱۹ء میں ممبئی تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان چلے گئے، آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۳ء میں وہاں سے پی۔ اے (آنرز تاریخ) - مہد ہدیہ کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد طباعت میں ڈیپنگ کے لیے برلن (جرمنی) چلے گئے۔ جہاں سے ۱۹۲۶ء میں واپس ہوئی۔

مختصر حالات زندگی:

محمد مجیب چاندنی کانچس ٹاؤنہ میں سولے کالج لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد محمد نسیم ایڈووکیٹ کھنڈ میں اپنے زمانے کے کامیاب ترین دیوانی وکیل تھے۔ محمد مجیب نے اپنے دور کے اعلیٰ ترین تعلیمی اداروں میں تعلیم مکمل کی۔ پی۔ اے (آنرز) آکسفورڈ سے کرنے کے بعد برلن (جرمنی) سے طباعت میں ڈیپنگ لیا۔ جنوری ۱۹۲۶ء میں بحری جہاز کے ذریعے ڈاکٹر ڈاکٹر عابد حسین کی ہمراہی میں ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے اور براستہ کولمبو (سری لنکا) انڈیائی ۱۹۲۶ء میں ممبئی پہنچ کر بطور ریٹائر (تاریخ) چاہے وہ طباعت اسلامیہ ممبئی کے تدوین کنندہ کے لیے شامل ہو گئے۔ تین سو روپے منظم ہو انھیں آپ نے صرف تین روپے امانت لیا منظور کیا۔ (۱) جامعہ ملیہ اسلامیہ کی کونسل ۱۹۳۷ء

تک (انوں) دل دی اور دیگر اساتذہ کی طرح عجب صاحب کو بھی کئی کئی بار تنخواہ نہ ملی، ہندو الطرہت خازن سے پانچ دس روپے لے کر گزرا کرتے رہے جب کہ عجب صاحب کی لیاقت کے لوگ اس دور میں بھی ہزاروں طلب کرتے تھے۔ عجب صاحب ادبیات، سیاسیات اور تاریخ کے شعبہ جات میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ انہیں فنون لطیفہ کی مختلف شاخوں سے بھی ماہرانہ شغف تھا۔ ڈیڑھ اسی ملین قسیر اور مجسمہ سازی (۲) میں انہیں کمال حاصل تھا۔ ۱۹۲۸ء میں میو راباؤ کوکن کے پروفیسر و پانچ الدین کا ورانا "کلاچ ہالجر" عجب صاحب کی ہدایت کاری میں جامد کی پہنچ پر پیش کیا گیا جس میں جوتی کا کردار غلاموں نے ادا کیا۔ اسی سال جامد فیہ کی مالی حالت کے پیش نظر "امٹانے جامد" کی جگہ "امین قسیر" کا نام ہوئی جس کے عجب صاحب سمیت کئی دہرا کہیں نے عہد کیا کہ وہ کبھی ان کم کم میں برس تک یا تاحیات جامد کی خدمت کریں گے اور پانچ سو روپے ماہانہ سے زیادہ کا مطالبہ نہ کریں گے۔

۱۹۲۹ء کے آغاز میں ان کی شادی سمنہ (جو بی بی) کے ایک معزز خاندان میں احمد خانوں سے ہوئی۔ ۱۹۳۱ء میں عجب صاحب کا چہلہ ڈراما "ننگی" خود مصنف کی ہدایت کاری میں جامد کی پہنچ پر کھیلا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں جامد کے اولین خازن سمنہ جلال بھارج کی جگہ عجب صاحب کو خازن مقرر کیا گیا اور پھر اگلی خدمت ۱۹۳۷ء تک انجام دی۔ جنوری ۱۹۳۴ء میں ان کا نام "جامد" کو بی کے ادارہ گر میں شامل کیا گیا اور اسی ماہ ان کا دورہ ڈراما "انجام" نہ صرف جامد دہلی میں شائع ہوا بلکہ میو کے موقع پر (قریباً وسط جنوری) حسب معمول مصنف کی ہدایت کاری میں پہنچ ہوا۔ مارچ ۱۹۳۵ء میں عجب صاحب نے خالدہ اور عجب خاتم کے دورہ ہندوستان میں ان کی راہنمائی کی۔ ۱۹۳۸ء میں عجب صاحب نے پہنچ الیامد تھے۔ ۱۹۳۹ء میں جامد میو کے یوم تیس کے موقع پر "امیران کے دربار میں عرب کے سفیر" اور "کلاچ ہالجر" (دو دراستے) عجب صاحب (عجب فتح الیامد) کی ہدایت کاری میں جامد کی پہنچ پر کھیلے گئے۔ جب کہ "کلاچ ہالجر" میں انہوں نے غلام کا کردار بھی ادا کیا۔ ۱۶ نومبر ۱۹۳۶ء میں دہلی کی چھار روزہ تقریبات (۱۶ تا ۲۱ نومبر) کے موقع پر عجب صاحب کا قسیر ڈراما "خاندان ننگی" خود ان کی ہدایت کاری میں پیش ہوا۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں ڈاکٹر ڈاکٹر کریمین کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چلے جانے پر عجب صاحب نے جامد میو کے فتح الیامد کی حیثیت سے چارنگ لیا۔ ۱۹۳۹ء میں حکومت ہند کے ایک وفد کے ساتھ پاجین اور بھول سہیل میں شرکت کی۔ ۱۹۵۱ء میں انھوں نے کافر پڑھ سہیل کے تحت تین کا دور کیا۔ ۱۹۵۲ء میں خیو اور جیس گئے۔ ۱۹۵۳ء میں چانکو کے اجلاس میں شرکت کی۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۵۴ء میں لاہور کو دور کیا۔ ۱۹۵۵ء میں مرکزی دینی تعلیمی بورڈ سمیت ملائے ہند کے شریک صدر مسودہ تعلیمی و انتظامی مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں تعلیمی حکام کے ساتھ ملے کے لیے دس تحریف لے گئے۔ ۱۹۶۱ء میں مکمل یونیورسٹی باکس ہال کینیڈا میں انھوں نے پروفیسر چلے گئے۔ جہاں سے طرہ دی ۱۹۲۶ء میں واپس ہوئی۔ اپریل ۱۹۶۶ء میں حکومت ترکی کی دعوت پر انقرہ اور استنبول میں خود دینی میں ہجرت دینے۔ ۱۹۶۵ء میں ۱۹۶۷ء میں اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز لندن یونیورسٹی کے زیر اہتمام (۱۷ تا ۲۲ جولائی) بین الاقوامی سیمینار میں تقسیم ہند کے موضوع پر مقالہ پڑھنے لندن تحریف لے گئے۔ ۱۹۶۹ء میں ترقی اور پورہ دینی دہلی کے پہلے دس پختہ زمین منتخب ہوئے۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں نائب ہجرت کے سلسلے میں امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں کا دور کیا اور ترکی سے ہو کر واپس آئے۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۷۲ء کو ایم۔ اے (تاریخ) کے طلبہ طالبات کے ساتھ قصب جتا گئے جہاں محسن ہوا کہ ان کی چارلس کام نہیں کر دی خود آدھانی ماہرین سے رابطہ قائم کیا گیا تو پانچا کے سامع میں ایک جگہ رکھتے ہیں۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۲ء کو ان کا دہلی آج پڑھ کر کے دھند کات کر دیا گیا۔ تقریباً چار ماہ کی طمان کے بعد ۱۲ اپریل ۱۹۷۳ء کو بے حیثیت فتح الیامد بارہ کام شروع کر دیا جہاں سے ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو چھ ماہیں برس کی خدمت گزار کی کے بعد جامد سے ریٹائر

ہو گئے مورخہ ۳۰ جنوری ۱۹۸۵ء کی راستہ طویل حالات کے بعد انتقال کیا۔

اولین مطبوعہ افسانے:

"ہانی" سلیبہ "جامعہ" دہلی، فروری ۱۹۳۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ "کیا اگر دوسرے فائنے" (نوائے) کتبہ جامعہ دہلی طبع اول ۱۹۳۲ء
دوسری بار ۱۹۳۸ء میں کتبہ جامعہ دہلی سے نور تیسرا ایڈیشن
۱۹۳۶ء میں نکلا۔
- ۲۔ "کبھی" (ڈراما) کتبہ جامعہ دہلی طبع اول ۱۹۳۱ء
اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن کتبہ جامعہ نے ۱۹۳۸ء میں نور آخری
ایڈیشن ۱۹۷۸ء میں نکلا۔
- ۳۔ "الہام" (ڈراما) کتبہ جامعہ دہلی طبع اول ۱۹۳۳ء
یہ ڈراما دوسرے مرتبہ نے بھی شائع کیا۔
- ۴۔ "تاریخ فلسفہ پاکستان" ہندوستانی اکیڈمی مالدار طبع اول ۱۹۳۶ء
- ۵۔ "تاریخ ہندوستان کی تحریک" (توسیقی خطبہ) کتبہ جامعہ دہلی طبع اول ۱۹۳۷ء
دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔
- ۶۔ "دنیا کی کہانی" (ریڈیائی تقاریر) کتبہ جامعہ دہلی طبع اول جون ۱۹۳۷ء
دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔
- ۷۔ "سلطان محمود غزنوی" (تاریخ) ہندوستانی اکیڈمی مالدار طبع اول ۱۹۳۷ء
- ۸۔ "بڑی اوب" (دو جلدیں) انجمن ترقی اردو (بند) دہلی طبع اول ۱۹۳۷ء
- ۹۔ "خاندان جنگی" (ڈراما) کل سلاطے ۸۸۔ کتبہ جامعہ دہلی طبع اول ۱۹۳۶ء
دوسرا ایڈیشن کتبہ جامعہ دہلی سے ۱۹۷۸ء میں نکلا۔
- ۱۰۔ "شیدائے دوسری کہانیاں" (بچوں کے لیے) کتبہ جامعہ دہلی طبع اول ۱۹۳۸ء
- ۱۱۔ "نہ خانوں" (ڈراما) کتبہ جامعہ دہلی طبع اول اپریل ۱۹۵۲ء
- ۱۲۔ "سیرت کی صفائی" (ڈراما) کتبہ جامعہ دہلی طبع اول: اکتوبر ۱۹۵۳ء
- ۱۳۔ "دوسری شام" (ڈراما) کتبہ جامعہ دہلی طبع اول: اکتوبر ۱۹۵۶ء

۱۳۔	”آرامش“ (اوراد)	کتبہ جامعہ دہلی	طبع اول جولائی ۱۹۵۷ء
۱۴۔	”ہریت قرآن ہند“ (مہد قلم)	کتبہ جامعہ دہلی	طبع اول ۱۹۵۸ء
۱۵۔	”ہادی آداری“ (از مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمہ)		طبع اول جنوری ۱۹۵۹ء
	”یہ“ اظہار و نظریہ“ کا ترجمہ ہے۔		
۱۶۔	”اسرار پنے کا حورہ“ (ترجمہ)		طبع اول نومبر ۱۹۶۵ء
۱۷۔	”آؤ دارا کریم“ (بچوں کے لیے)		طبع اول
۱۸۔	”دیوان غالب“ (مترجم)		طبع اول۔ نگ ہنگ
	اس کتاب کی پشت گویند نگ نامہ خورشید صاحب نے کی تھی۔		۱۹۶۳ء
۱۹۔	”تاریقات افکار“ (مترجم)	کتبہ جامعہ دہلی	طبع اول
۲۰۔	”Yugoslavia-A Birds eye View“		
۲۱۔	”Ordeal 1857 (a historical play)“		Jan, 1958
۲۲۔	”World History-Our Heritage“		April 1960
۲۳۔	”Education and Traditional Values“		Dec. 1965
۲۴۔	”The Meaning of Indian History“		
	(Babu Memorial Lecture)		
۲۵۔	”Social Reforms among Indian Muslims“		April 1968
	(Evelyn Hersey Memorial Lecture)		
۲۶۔	”The Indian Muslims“ 1967 (London)		
۲۷۔	”Ghalib“		1969
۲۸۔	”Akber“		Feb. 1969
۲۹۔	”Mirza Ghalib“		Dec. 1970
۳۰۔	”Islamic Influence of Indian Society“		1972
۳۱۔	”Dr Ziaur Husan“: A Biography		March 1972

زندگی میں مستقل تھا:

جامعہ گر دہلی۔ بھارت

۱۔ پدم بھوشن حکومت ہند کا اعلیٰ ترین سول اعزاز ۱۹۶۵ء

نظریہ فتن:

”دنیا جس میں پاک دماغی ترغیب گناہ کی قید میں ہے اور کفار و گناہ و اشیاء و جنم واد بد کا مختلر“

(پہ حوالہ آل نظر پارٹیج، دہلی کا ایک نشریہ ستمبر ۱۹۵۹ء)



حوالہ جات:

۱۔ پیمار ”عجیب صاحب“ اور ان کے دام بطور ”تاری زبان“ دہلی، نومبر ۱۹۸۳ء

۲۔ ”نہ مودی کے سوچی پر ۱۹۶۹ء میں عجیب صاحب نے غالب کا جو کوئی کا کمرز اٹھا قرار دے دی گئی چھوٹی کتاب دہلی میں ان کی چھاپا کرتا ہے۔

کیمیایگر

محمد مجیب

یہ قصہ اس زمانے کا ہے جب سلطان ہندوستان میں ملے جلتے آئے تھے۔ دہلی اور دہلی سے اٹھانجان کی سرحد تک ان کی حکومت تھی۔ قندھار تک پہنچی تھی۔ مگر دہلی سے مشرق کی طرف انہوں نے پھر ملے کئے تھے۔ ہندو تصور نے عام طور پر مسلمانوں کی فتح تسلیم نہیں کی تھی اور نہ ہندوؤں کو انہیں تھا کہ مسلمان ہمیشہ کے لیے ہندوستان میں بٹنے والے ہیں۔ ابھی تک شیخ اور برہمن نے ایک دوسرے پر لعنت نہیں بھیجی تھی اور اس بے گنتی کو دور کرنے کے واسطے ہر ایک دوسری قوم کے ملک پر حاوی ہونا سے بھیل گئی تھی اسلام کا یہ مڑو کافی تھا کہ خدا کے نام ہند سے براہ ہیں۔ اس کا کمر سب کا گھر ہے۔ اس کا تاج دین دیا گیا تھا جی ہاں پیدا کرنے آیا ہے۔

تیسیم سیک درکنان سے اپنی ہوا میں جس کا نام خاند پر رکھا گیا تھا، مسلمان آبادی کی بنیادیں ڈالیں۔ تیسیم سیک نے عجم کی قبیل کی اور خاند پر میں ہرے۔ وقت رفتہ دوسرے خاندان بھی آئے اور مسلمانوں کی ایک مستقل آبادی ہو گئی۔ تیسیم سیک نے اسلامی دنیا کے تقریباً تمام مشہور خطیوں کی شاگردی کی تھی اور اپنے فن میں ماہر تھے اس لیے یہ کوئی حجب کی بات نہ تھی کہ وہ تھوڑے دنوں میں اس پاس مشہور ہو گئے اور درکنان میں ان کے خاندان نے جو کچھ کھوایا تھا وہ ہندوستان میں انہیں دیکھنے لگے۔ ان کی پاس نے ایک ترکی دیکھ کر انہی سے ان کی شادی بھی کرادی جس سے انہیں شرافت اور سرمایہ داری کا حصول کیا۔

تیسیم سیک نہایت صمیم اخلاق مزاج اور شائستہ آدمی تھے۔ دنیا کی مصیبتیں ان کی طبیعت میں ذرا بھی ترقی یا لگی نہیں پیدا کرتی تھیں۔ وہ اونچا نکھ کچے تھے، بلور ہندو کی کاش میں وہ بچے تھے دراب ہر ایک سے اچھا سلوک کرنے پر چار تھے۔ تجربے انہیں انسان کی غفلت کے بھید بتا دیے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ محبت سے بات کرنے کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ عربی کو داسے کتنا قندہ پہنچتا ہے اور حبیب کے اخلاق سے کتنا ان کا ہونا چاہوں اور تیار دلوں کے ساتھ ایسا تھا کہ لوگ حمل ان کی توجہ کو کافی لگتے تھے لیکن وہ مرضی کی شخص بھی بہت بھر کر کرتے تھے اور دوائیں نہایت احتیاط سے اکٹرا اپنے سامنے چار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی ناکا کی جھپٹا اور نقد کے لڑکوں کی نہیں بھی ہاتی تھی۔

لیکن حکیم سچا دھڑا تھا اور شہرت کے اپنی زندگی سے مطمئن نہ تھے۔ کچھ اپنے وطن کی یاد سے چین کرتی تھی۔ کچھ ہندوستان کی فضا، مگر سب سے زیادہ انہیں یہ خیال ستاتا تھا کہ اب وہ بھی وطن ہوں گے۔ ان کا دل ہر قسم کے قصب سے پاک تھا لیکن ہر قسمی وہ ہندوؤں کو اپنے جیسا آدمی سمجھتے تھے، نہ ہندوستان کو اپنے جیسا ملک۔ ان پر کچھ اثر ان کی بی بی اور ان کی سرسراہل کا تھا۔ یہ لوگ کسی مجلس کو بغیر اپنے ملک کی یاد میں نہ دعوت کیے بغیر نہیں برخواست کرتے اور بغیر ہندو قوم اور ہندو مذہب پر لعنت جیسے کسی مسئلہ پر گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ حکیم سچا کو ہندوؤں سے اس قدر وابستہ چاہتا تھا اور ہندوؤں کی اس قدر عزت والوں سے اتنی محبت کرتے تھے کہ ان کا اپنی سرسراہل والوں کا ہم خیال ہونا ناگوار تھا۔ لیکن ان لوگوں کے قصب کا اتنا قوت اثر ضرور ہوا کہ حکیم سچا نہ ہندوؤں میں اس طرح تعقل کے چھپے کہ ان کی فطرت کا اتفاق تھا اور نہ ہندوستان کے زمین آسمان کو اپنا وطن مانگے۔ عزت اور شہرت حاصل کرنے پر بھی ان کو اس کا ارمان نہ گیا کہ ایک دم بھر کے لیے طوالت میں نہ وہ سکون پیدا کر سکیں۔ اپنی زندگی کو مسئلہ بنائے گا کہ گھر کچھ نہیں۔

یوں ہی دن گزرتے گئے حکیم سچا کی ماں کا انتقال ہو گیا اور دو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہو گئیں جو آبادی کے ساتھ رفتہ رفتہ بدھ رہا تھا۔ لیکن حکیم سچا کو کسی طرح سے چین نہ آ سکا کہ ہندوستان میں ان کی نسل نے جو پکڑ لی ہے، اور ان کی روحانی پہچانی انہیں پرچین کر رکھی رہی۔ "کاش نا مجھے ایک ایسا گیارہواں لے لیتا جو ہی سے ایک دن کہا "جو میری فطرت میں اس سرزمین سے مناسبت پیدا کر دیتا۔ آخر میں کب تک اپنے آپ کو سرفریا مہمان سمجھتا ہوں گا؟"

اس کے جواب میں ان کی بی بی نے آگئیں نکالیں اور غصے سے کہا:

"بہن جوانی تھی تو امت پار سے پیچھے رہے۔ اب بڑھاپے میں کیا کر کی تلاش ہے۔ جو ارادہ کا کفر ہو اس کی۔ دیکھنا تار مطلق کے امکان سے بھی باہر ہے۔" حکیم سچا گھبراہٹ سے ایک ٹھٹھکی سانس بھری اور خاموش ہو گئے۔

اس گفتگو کے بعد ان بعد ہی ان کی مطلب میں ایک طاعون کا مریض لایا گیا۔ حکیم صاحب نے اس کے لیے تو نسخہ لکھ دیا لیکن اپنے گھر کھلا کچھا کا خالہ پر میں طاعون کا اندیشہ ہے اور سب کو تو راستہ ہی چھوڑ کر چلا جائے۔ ان کے گھر سے دوسرے مسلمان گھرانوں میں خبر پہنچائی گئی اور ساری سستی میں کھٹکلی لگ گئی۔ جب حکیم سچا کے پاس شام چمک اور مریض بھی پیچھے تو انہوں نے یہ اطلاع دی کہ طاعون کا مصلحانہ شہید ہوئے والا ہے۔ جو سب نے اسی رات ہی چھوڑ دینے کا حقہ کر لیا۔ حکیم سچا خود خالہ پر میں ٹھہرے کا ارادہ کر چکے تھے اور انہوں نے اپنی بی بی کو اس کی مصلحت سمجھانے کی بہت سی دلیلیں بھی سوچ لی تھیں۔ مگر ان کی بی بی ان سے زیادہ دوا دماغی حالت ہوئی اور جب وہ مغرب کے قریب گھر کے اندر گئے تو انہوں نے دیکھا تمام نوکر بکھڑے ہوئے اور دھڑکھڑکے ہیں اور ان کی بی بی رو پیچھے رہی ہے۔ پہلے تو ان کو یہ شبہ ہوا کہ شاید مگر میں کوئی طاعون کا شکار ہے مگر جب بڑی دقت سے انہوں نے واقعہ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایسی ہی کا تمام ہو رہا ہے۔ ان کی بی بی نے محض اس اندیشہ میں کہ وہ خالہ پر میں چھوڑنے سے انکار کریں گے صرف خود ہی دوا دماغی شرعاً نہیں کر دیا تھا بلکہ تمام مٹکے والوں اور مزینوں سے ان کی اس حماقت کی افکارت بھی کی تھی۔ اور ہر ایک کو رو رو کر ان کے ارادہ کی مخالفت پر آمادہ کر لیا تھا۔ حکیم سچا کھڑے سے تھوڑی سی سوچ رہے تھے کہ ان کے خضر اور سالے آگے اور انہیں گھر کے کھڑے ہو گئے۔ باری باری سے ایک کھانا دوسرا لایا تھا اور دونوں اس قدر گھبراہٹ سے کہ بہت دیر تک حکیم سچا کو بھڑکی نہ چاکہ دیا کیا کہہ رہے ہیں۔ لیکن وہ تو حکیم سچا کو بات سمجھنے اور جواب سوچنے کا موقع ہی نہ دینا چاہتے تھے اور علی اس کے حکیم سچا زمانہ باندھیں دونوں نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے اور خدا اور رسول اور مسلمانوں کی جانوں کی قسمیں دلائیں ان

کی جوان بوی اور نئے چہرے کی شگفتہ کافرش یاد دلایا اور آخر میں ہندو قوم پر غصے بھگی اور کہا کہ پرانی قاتل ہے کہ ظالم اور بیستہ میں بادک ہو اور کئی مسلمان کو اس کو پھانسنے کے لیے اپنی ہاتھوں میں ڈال رہی ہے۔

اب حکیم سچ کہے کہ اس عجیب طرحی تقریر کا مقصد کیا ہے اور انہوں نے جو باتیں اپنی بوی کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے سوچیں رکھیں ان سے کام لینا یا پھر ان کے خسرو سالے نے ان کی ذرا سی خاصوٹی کو خداوندی قرار دیا اور چلا اٹھے:

”اے وہ بے چارہ تو کہہ کچھ ہی نہیں۔ وہ خود ہانسنے پر تیار ہے۔“

حکیم سچ پھر کھڑے رہ کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی بوی جو اپنے فریق کو مضبوط پا کر ان کے سامنے آ کر کڑی ہو گئی تھیں کہیں نہیں۔ آپ لوگوں کے کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے اطمینان اسی وقت ہوگا جب یہ خود اپنی زبان سے کہہ دیں کہ ہمارے ساتھ چلیں گے۔“ باتیں گئے، کچھ نہیں۔“ حکیم سچ کے سالے نے کہا۔ ”تم سناں تیار کرادو، اپنی مرضی سے نہ گئے تو ہم زبردستی لے جائیں گے۔“

یہ کہ کر حکیم سچ کے سالے نے اندر مڑی تیار کیا اور بارہ عزم و ہمت اور حکیم سچ کا ہاتھ پکڑ کر انہیں باہر لے گئے۔ یہاں انہیں قاتل کرنے کے لیے بہت سے مسلمان مہمانیہ موجود تھے، ہر رگ جن کی حکیم سچ بہت عزت کرتے تھے، ہم عمر دوست جن کی صحبت کے بغیر ان کا زندگی نہ رہتا دھڑکھڑاتا، یہ لوگ بھی کبھی پہلی بار ہی سے، کبھی ایک ساتھ تقریریں کرتے رہے مگر حکیم سچ نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔ انہوں نے اپنے دلی میں یہ سنے کر کیا تھا کہ ان کا خاندان ہر کے ہندو باشندوں کو اس طرح سے چھوڑ کر چلے ہانا، ایک شدید اخلاقی جرم ہے جس کا اثر ہم زندہ اپنی بچی پر لگا سکتے ہیں، شدتہ زانوں پر لیکن انہوں نے اس وقت کی بھی تصویر کھینچی وہ ایک مسلمان باپ کی خدا کا لوگا ان کے سارے دوست اور عزیز ہندوستان کی رحمت میں غائب ہو گئے ہوں گے۔ وہ طرز زندگی جس سے وہ مانوس تھے، بالکل ہو جائے گا۔ وہ خود اگر زندہ رہے تو کھر میرا کچھ چھوٹے ہوائیں ہاتھ دیں گے اور اگر مر گئے تو اکیسے دفن ہوں گے اور ان کے جنازہ کی نماز تک نہ پڑھنے کے لیے کوئی مسلمان نہ ہوگا۔ خاندان پر چھوڑنا ان کے لیے ایک اخلاقی جرم ضرور تھا مگر ان کی برداشت کرنا کسی جرم کی مواجہت سے ابھی انہیں مشکل معلوم ہوا۔ انہوں نے دلی دلی میں اعلیٰ آگ کی آگ میں زندہ جھونک دیا اور سر ہٹا کر بیٹھ گئے۔

جب رات کو مسلمان قافلہ بستی سے نکلا تو حکیم سچ اس کے ساتھ تھے۔

ان کو سیدہ حق کی اپنے خیر کو وہ کسی طرح سے سمجھا رہے تھے لیکن بد قسمتی سے ان کی ساری تدبیریں پلٹ گئیں۔ انہوں نے ہزار کوشش کی کہ گرفتار زندگی کو بالکل بھول جائیں۔ مگر ان کا قصور چاہے نہ گل کیا اور ہر ایک خاصہ نہ بچانے کا۔ ذرا کہیں کھٹ کھٹ کی آواز آئی اور انہیں بلبل آ یا کہ اس وقت معلوم نہیں کتنے لوگ جن کو انہیں اس کی خبر نہیں ملی ہے کہ حکیم سچ انہیں مصیبت میں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ ان کے ہزاروں کی کڑی تکلیف ہے ان کے۔ کوئی یہ دیکھو اور انہیں یاد آ کر ناگہانی صدمہ کبھی ملا ہوتی ہے خاندان پر میں کتنے بچے اس وقت اپنی مردہ ماؤں کے پیار کے لیے تڑپ رہے ہوں گے۔ کتنی مائیں اس وقت اپنے فریال کر کہہ رہی ہوں گی کہ اگر حکیم سچ چلے گئے ہوتے تو ان کے بچوں کی جان بچا لیتے۔ حکیم سچ کی آنکھوں میں بار بار تصویر اتر آئے۔ سر ہٹا کر کھانے کا ٹکڑا انہیں ہانسنے کی صحت انہیں بھر گیا نہ ہوئی۔

قافلہ نے خاندان سے کوئی دن میل پر جا کر منزل کی۔ حکیم سچ تھک کر چرہ نہ گئے تھے لیکن انہیں یقین تھا کہ خاندان کی طرف سے صوبہ نہ ہوگی اور ہوا بھی بیکو۔ کچھ تو تک تو ان پر ایک فطرت کی عاری، ری جس سے ان کی نگاہ جاتی، ری لیکن بھرہ پر چنان خوب دیکھنے گئے۔ کبھی وہ پہاڑ کی چوٹی پر سے پہل کر پہاڑ کرتے تھے، کبھی گھوڑے پر سوار ایک عمارت میں چلا جاتے تھے۔ جس کی دھن خوشی کا تار کی کے سوا

کچھ نہ تھا۔ خواب ہی میں ان کو خیال آیا کہ وہ دہلی چاہے ہیں۔ ایک تیز آواز مچی جس میں ان کا گھوڑا کی مرتبہ زمین پر سے اڑا۔ اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک وسیع میدان میں کھڑے ہیں۔ ان کے سامنے ایک لمبی چنگی سڑک ہے جو دور جا کر کالے بادلوں میں گم ہو جاتی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف ایک سو پانچ میڑے ہیں اور میڑے کے بعد کھیتوں کا سلسلہ ہے جو کبھی ختم ہی نہیں ہوتا۔ انہوں نے گھوڑے کو اپنے گھائی اور کالی گھٹا کی طرف دھانک دیا۔ دہلی کا رخ وہی تھا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد انہیں سامنے سڑک کے کنارے ایک سیاہ نقطہ سا نظر آیا۔ پاس پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی جاہلستانے کے لیے میڑے پر بیٹھا ہے۔ انہوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی ہوا گے جو کہ گھر کوئی دس قدم چلنے کے بعد ان کا گھوڑا رک گیا اور اپنے چاک بھی اسے اس جگہ سے نہ ہٹا سکے۔ واپس جانے پر وہ تار تھا۔ آگے معلوم ہوتا تھا کہ اسے مردہ لے ہوا تھا۔ مشکل ہو گا۔ حکیم سچا کہے کہ وہ کسی چیز کو بچ کر لڑاکا گیا ہے اور اس کا مزاج درست کرنے کے لیے وہ تھوڑی دور واپس جانے پر راضی ہو گئے۔ جڑے وقتے ان کی نظر پھر اس مسافر پر پڑی اور میڑے پر بیٹھا انہیں تکہ ہوا تھا۔ گھوڑا کسی وجہ سے خود بخود اس کے سامنے جا کر کھڑا ہوا تھا اور حکیم سچا نے سوچا کہ گھوڑا ہی سے باتیں کر لیں۔

تھوڑا شرم سے پہلے حکیم سچا نے اسے غور سے دیکھا۔ مسافر کا لباس ایک خوشحال ہندو کا رہتا تھا۔ یعنی بچے ایک سونے سوت کی جوتی، ہاتھ ہی سونے کی پڑے کی بڑی اور سر پر ایک پگڑی جو اس نے اس وقت اٹار کر اپنے پاس زمین پر رکھ دی تھی۔ اس کے کندھوں اور پیٹ پر ایک موٹی تختہ لٹکی ہوئی تھی۔ مسافر کا قد بہت لمبا تھا۔ سینہ چوڑا، پٹھے جھجھکے اور اچھے ہوئے۔ جس کی وجہ سے وہ بلی نظر میں وہ ایک معمولی انسان نہیں بلکہ ایک زندہ ہوا آدمی دھلی ہوئی صورت معلوم ہوتا تھا۔ اس کی داڑھی کے لیے سیدھے بال، اور پٹی تیلی ڈاک، چوڑی وستانی، چیرہ کا لایاں سنوں، سب اسی دھم میں ڈالنے جھے کہ اس کا جسم اتنی ہے مگر انہوں کو دیکھتے ہی ہمارا عظیم ٹوٹ جاتا اس کی جڑی جڑی رنگیں آنکھوں میں ایک نری صحت اور تازگی تھا۔ حکیم سچا پر بھی ان آنکھوں کا اثر ہوا۔ وہ جواب میں مسکرا کر اپنے اور ہر ایک مسافر کے مردانہ حسن کا لطف اٹھاتے رہے۔ آخر کار انہوں نے پوچھا: ”اے اپنی قسم کے مسافر تو کہاں جا رہا ہے؟“

مسافر نے پہلے سر جھکا لیا، پھر ان سے آگے لڑاکا کہہ کر واپس کے لیے جس میں کہا: ”خالہ چور“

”گھر وہاں تو خالصن ہے۔“

”وہاں میں اسی لیے جا رہا ہوں۔“

حکیم سچا کو اس قدر حیرت ہوئی کہ وہ تھوڑی دیر تک کہہ نہ سکے لیکن مسافر نے اگلوئی سی ملی اور انہیں اسی خواہش سے مراد ان جسم پر دم آیا اور جان بوجہ کہ صورت کو دھت دے، ہاتھ۔ انہوں نے بڑی حسرت سے مسافر کی طرف دیکھا اور پوچھا: ”اے مسافر! کہاں تھے اپنی جان عزیز نہیں؟“

”مجھے اپنی جان بہت عزیز ہے اور بیٹھ رہے کی۔“ مسافر نے غصہ ظہر کر کہا: ”جتنی وہ مجھے عزیز ہے اتنی ہی خدا کو عزیز ہوگی، اگر میں نے اس کی راہ میں قربان کر دی۔“

حکیم سچا بھر چپ ہو گئے۔ مسافر کی صورت سے ظاہر تھا کہ اس کا قول سچا ہے۔ انہیں اپنی مکروری یاد آئی اور اس بلند صفت اور بلند انداز پر رشک آیا۔ لیکن انہوں نے سوچا کہ شاید یہ دنیا میں اکلیا ہوا اور انتہائی ایمار سے روکنے کے لیے کوئی دنیاوی تعلقات نہ ہوں۔ بلکہ وہ اپنا بھلاؤ بھی کرنا چاہتے تھے۔

"اسے مسافر اکیاد پنا میں تیرے ساتھ محبت کرنے والا کوئی نہیں؟"

"محبت کا جواب بہت ہے۔ میں جہاں جاتا ہوں، جگہ سے محبت کرنے والے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر محبت مجھے کسی بھارتی سے نہیں روک سکتی۔" آفری ہلے حکیم مسیح کے پیٹ میں تیری طرح لگا اور وہ تپ ہو گئے۔

"اسے مسافر آقا فرما لیں سے آیا ہے؟" انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

"میں خدا کا بند ہوں، کسی ملک کا باشندہ نہیں۔" مسافر نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "جس ملک میں میرا خدا مجھے پہچاؤے وہی میرا وطن ہے، اسی کی خدمت میرا فرض ہے۔"

"لیکن تیرا مکان تو ضرور ہو گا؟"

"وہاں میں ہزاروں خدا کے بندے ہیں جن کے پاس مکان، پیسے، بچے، بھتیجے نہیں۔ میں جہاں تھا وہاں ہیں، وہ جہاں تھا وہاں آئی ہیں۔ سوچنا نہیں۔"

مگر مسافر تیرے پیسے بچے ہوتے تو تو کیا کرتا؟

"محبت کی محبت سے بہتر اور کوئی نعمت خدا نے انسان کو نہیں بخشی ہے۔ میری اگر یہی سوائی قریش سب سے پہلے اس کے قدموں پر گرتا اور اس سے کہا کہ مجھ میں طاقت نہیں، دست نہیں، صرف تیری محبت مجھے سیدھے راستے پر چلا سکتی ہے۔ چلی میری رہبری کر، میں تیرے بغیر بالکل بھول ہوں۔"

"مگر مسافر ماعون کا علاج محبت سے کیسے ہو سکتا ہے؟" حکیم مسیح نے مسافر کو دھوکہ کر کہا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے کو چاہتے تھے اور جان لیو سے شرابور ہو گیا۔

"محبت ہر بیماری کا علاج ہے، ہر دھرم کا سرچشمہ ہے، محبت زندگی اور موت کا فرق بنا دیتی ہے، ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔ انسان کی محبت میں خدا کی رحمت کی تاثیر ہے۔ حقے یقین خدا سے تو تجربہ کر کے دیکھ لے۔"

"حکیم مسیح! مسافر اچانک بول اٹھا۔ "مسلمان کسی خاص ملک میں پیدا ہونے سے نہیں جنتا، اسلام کسی خاص طرز معاشرت کا نام نہیں۔ مسلمان جنتا جانتا ہے، ہوتا جہاں خدا کو سجدہ کر دے، دنیا کی مصیبتیں بھلے، دوسروں کی خدمت کر دے، ان پر سے زندگی کا بوجھ ہٹا کر وہ تہا سے دل میں ایمان کا خزانہ ہے۔"

حکیم مسیح کی آنکھ کھل گئی۔ اس قدر رونے لگے کہ ٹھیک ٹھیک کیا تو لیکن ان کو اپنی سرخ آنکھوں کی پیدائشی خشک مٹھے مٹھے جسم کی ہانپوں نے "یار رسول اللہ! کافر خدا کا چنگ ہے، اسے چنگ کر دیتے ہوئے اسٹیل کے لڑاکیہ گھوڑے پر بیٹھ کر، اس کے سوار ہو کر خدا پر کی طرف چل دیں گے۔"

دلت کو حکیم مسیح کے ہاتھ کی قبر میں کر خدا پر کی آزادی میں ادم جی کیا۔ کسی میں اتنی صحت باقی نہ رہ گئی تھی کہ ماعون سے بچنے کی امید کرے اور ہر شخص اپنا حق کرنے لگا۔ لیکن سوسے جب حکیم مسیح کی درانی کی خبر مشہور ہوئی تو ہر ایک کی ہان میں ہان آ گئی۔ جس نے بھی یہ طرز سخن وہ اپنا دل مضبوط کر کے ان کے مطلب میں بھاگا ہوا آیا اور اس نے حکیم مسیح کو درخانہ کے دروازہ پر بیٹھا پایا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ شرمندگی سے ان کی نظریں پٹی تھیں۔ مگر جس کسی نے چاہا بغیر رکائی اور دانی۔

آخر تک سوسے جب مسلمان قافلے نے کوئی کی چوڑی کی تو معلوم ہوا کہ حکیم مسیح غائب ہیں۔ نوکروں میں سے ایک نے کہا کہ اس

نے رات کے تیسرے پہر "پارسوں" کا ایک غروہ حلقہ لیکن اس سے بڑا دھوا اور بگڑا تھا۔ حکیم سجاد کی بیوی کو جب یہ معلوم ہوا تو فوراً کچھ گئیں کہ وہ خاندان پر وار نہیں بھاگ گئے ہیں۔ وہ بہت روئیں، اپنے دونوں بچوں کو بھائی کے سپرد دیکھا اور خود کی زندگی سے بچنے کے لیے بیوی کی موت مرنے والہ پر نہیں۔ جب وہ اپنے گھر پہنچیں تو شام ہو چکی تھی۔ درہانت کرنے سے معلوم ہوا کہ حکیم صاحب سویرے سے وہاں خانہ کے سامنے بیٹھے ہیں نہ پانی پیا ہے، نہ کھانا کھایا ہے، بال پر پٹنوں ہیں، آنکھیں سرخ، گھٹنوں میں کھانوں کا آلودہ حلقہ اور وہ بے ہوش ہے جس کو دیکھ کر وہ گھبرا گئے۔ انہوں نے نوکر کے ذریعہ سے کہہ کر بلا بھگلا کر نوکر کو حکیم صاحب کے پاس پہنچنے میں زیادہ دیر لگی، اور جب وہ پہنچے تو حکیم صاحب نے نہ اسے پہچانا نہ اس کی بات سمجھی۔ رات گزر انہوں نے حکیم صاحب کی آمد کا نہایت بے تابی سے انتظار کیا۔ لیکن جب وہ سویرے تک نہیں آئے تو غور و بار ہو گئی۔ وہاں ابھی سے لوگ موجود تھے لیکن انہیں دیکھ کر راست چھوڑ دیا اور وہ حکیم صاحب کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئیں۔ حکیم سجاد انہیں آسانی سے پہچان نہ سکے لیکن جب پہچان لیا تو مسرور ہوئے، کچھ سوچا اور کہا:

"نارہ جیسا کام کی بیوی تیار ہیں۔ میں نے وہاں بھیجا ہی ہے لیکن ان کی چارہ داری کے لیے کوئی نہیں۔ اگر وہاں پہنچ جاتیں۔"

حکیم سجاد کی بیوی نے ان پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ پچھلے دنوں کی طمان کا نام و نشان نہ تھا، انکھیں اب بھی سرخ تھیں مگر چہرہ اسے نور میں رہا تھا۔ بچوں پر کچھ مٹی کی رنگ دیکھی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات کو زمین پر سوئے ہیں۔ یہ ایک نظر کافی تھی، وہیں ہر شخص اور راست پوچھتے پوچھتے اور جیسا کام کے گھر پہنچ گئیں

خالد چہرہ میں اور ایک طالعون کا دورہ ہوا، اس کی بڑی ہونے پر قہر کے چاندروں کا طالع کیا جاتا تھا لیکن چاندی گورکھ کی تدبیر کوئی نہ تھی۔ لیکن اگر حکیم سجاد نہ ہوتے تو خاندان ساری ہستی جاہ و باقی۔ ان کی موجودگی سے وہم اور خوف جو اکثر چاندی سے زیادہ جھک جاتے ہوتے ہیں لوگوں کے دلوں میں جڑ نہ کھائے۔ کوئی مریض اپنا نہیں تھا جس کو وہ دیکھ نہ سکے ہوں یا جس کی موت ان کے اعصاب اور ہمدردی نے دو گونہ کر دی ہو۔ وہ دن رات مریضوں کو دیکھتے ہیں اور ان کے لیے وہ انہیں تیار کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ لیکن یہ بھی ان کو تسکین دلانے کے لیے کافی نہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مردوں کو نجات دہانے اور جتنا ترے کو شہر سے باہر پہنچانے میں مدد دیں۔ لیکن اس کام کے لیے ان کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ ان کی بیوی نے اپنے ذمہ لے لیا تھا جس کو وہ علاوہ عورتوں کی چارہ داری اور عظیم بچوں کی دیکھ بھال کے کرتی تھیں۔ اپنی اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اس زمانے میں وہ اکثر ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ سکتے۔ مگر ملحق والوں کو ان دنوں سے اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ حکیم صاحب کو ان کی بیوی کی اور ان کی بیوی کو حکیم صاحب کی خبر پر ہر جہت پہنچتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ چاندی اور موت کی پریشانیوں میں دوسرے انہیں بھول گئے اور ان کے ضمیر نے طاقت کے لیے فراخ نظر ترک کرنے کی اجازت خدای تعالیٰ کے دلوں میں خدا پر اس قدر قوی اور زیادہ مان تھا کہ باوجود خود مرضی یا خوف ان کے پاس نہ پہنچنے پانے اور جتنا اور نہ ملحق ان کی دھڑکیوں کو چاند کرنا۔

آخر کار طالعون کا زور کم ہوا اور اب وہ حالت لیکن ہونے لگی جسے حکیم سجاد موت کی سزا سے زیادہ تکلیف دہ سمجھتے تھے۔ مریض کم ہونے، کام کم ہوا، موت کا وقت نہ جا سکا، حکیم سجاد بھلا آبادی میں قتل ہو گئے تھے۔ جو یہاں وہ ہم نے ان کے اور بھلاؤں کے درمیان کھڑی کر دی تھی۔ جسے دیکھ کر وہ بگڑ گئی۔ پھر کئی کوشش کے حکیم سجاد کا مکان ہستی کی زندگی کا مرکز بن گیا تھا۔ ایک درگاہ جہاں حاجت مند دس کے لیے آتے تھے۔ باہر جین فین تھ رہائی اور صحت افزائی کے لیے، مظلوم دکھایا دے کے لیے اور محض انصاف کے لیے، ان کی شہرت کا ذکر اور اور دور تک پہنچا تھا، لوگ دور دور سے ان کے پاس آتے تھے اور دل میں اس کا شوق دہائیں لے جاتے تھے کہ حکیم صاحب کافی مقبول نہیں۔ جس نے حکیم سجاد کا نام نہاد

ان کی بیوی کی شخصیت سے بھی خرم و اکتاف ہو جاتا تھا۔ ان کے لیے ہر جگہ سے جتنی نکلے آتے تھے، مگر کامران، کپڑے، جواہرات ایسے جو بادشاہوں اور بزرگوں کو بھی نصیب نہیں ہوتے مگر حکیم صاحب اور ان کی بیوی اپنے مکان میں لڑکیوں کی طرح سے رہتے تھے اگرچہ انہیں سکھ چکا تھا کہ دنیا کی اصل نعمت کیا ہے اور انھوں کو یہ بھی پتہ تھا کہ جس سے دوسروں کو سودا چاہئے جس سے وہ ان کی خدمت میں داخل کیے جاتے تھے۔

خالد چرخ میں کوئی ایسا ذاتی یا عام معاملہ نہ تھا جس کا حکیم صاحب اور ان کی بیوی کو علم نہ ہو اور نہ کوئی ایسی شہرت تھی جس میں ان کی شریعت لازمی نہ تھی جانتی ہو لیکن باوجود اس کے ان کی زندگی کا ایک پہلو تھا جس کا راز سوائے ان کے اور ان کے خدا کے کسی پر ظاہر نہ تھا۔ لوگ انہیں مصروف دیکھتے تھے انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ان دونوں کے دل کیسے اور ہیں اور وہ محبت اور پیاری کی نظر میں جو وہ اوروں پر برساتے ہیں اسی محبت کا عندیہ لکھ ہے جس میں ان کی ہستیاں فنا ہو گئی ہیں۔ وہ دونوں بھی جانتے تھے کہ یہ محبت کوئی پرانی چیز نہیں ہے، خود بخود پیدا نہیں ہوئی اور ہر حالت میں قائم نہیں رہ سکتی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کبھی ان کی افسانیت کا جوہر ہے اور اگر وہ اس کی قیمت کم نہیں کرنا چاہتے تو انہیں وہ آگ جلاتے رہنا پڑے جس میں وہ جلتے ہوئی تھیں اس لیے جب حکیم صاحب نے دیکھا کہ طاعون انہیں بہت مصروف نہیں رکھتا تو انہوں نے خالد چرخ کے باشندوں سے ایک مسجد بنانے کی اجازت مانگی۔ وہ اس پر بہت خوشی سے اضافی ہو گئے بلکہ یہ خواہش بھی کی کہ چند مبلغ کر کے ایک عالی شان عمارت بنائی جائے لیکن حکیم صاحب کو یہ منظور نہ ہوا۔ انہوں نے اپنی بیوی کی مدد سے ایک چھوٹی سی کچی مسجد ایک بڑے سایہ دار درخت کے نیچے چہر کر لی جس میں صرف یہ خوبی تھی کہ اسے دو سچے مسلمانوں نے اپنے دین اور اپنی محبت کو بڑھانے کے لیے بنایا تھا۔

ہر شام کو مغرب کے وقت حکیم صاحب اپنی بیوی کو ساتھ لے کر اس مسجد میں جایا کرتے تھے۔ وہ وہاں کبھی بائک کھٹکتی دور کبھی ساری رات گزارتے تھے ایک مرتبہ ان کی بیوی کو آٹے میں مذہب مایہ ہو گئی۔ وہ مغرب کی نماز چھ چکے تھے، ان کی بیوی چڑھ رہی تھیں۔ حکیم صاحب ان کی طرف متحرک کر کے بیڑ لگے ان کی بیوی کہا بہت غلط سے نماز چڑھ رہی تھیں اور اس غلطی سے ان کے چہرہ پر لکس روشنی آ گئی تھی کہ حکیم صاحب اپنی نظر نہٹا سکے۔ دیکھتے دیکھتے انھیں یاد آیا کہ انہوں نے اپنی بیوی سے نہ اپنے خواب کا ذکر کیا ہے نہ اس چھٹی قسم والے مسافر کا جس نے ان کو خالد چرخ میں بھیجا۔ وہ خود اس خواب کے بارے میں تاریکی میں بیٹھیں چھیل نکلتے تھے اس بھاری صورت کو یہ وہ عانی قوتیں بھی بصر نہیں ہوتی تھیں اس لیے وہ ان سے ایک قدم پیچھے نہیں رہی۔ یہ محبت سوائے اس محبت کے جو چھٹی قسم والے مسافر کی طرح ہو حکیم صاحب بھی دل ہی دل میں اپنی بیوی کے قدموں پر گرے اور اس سے دلجوئی کی کاپی محبت سے ان کی محبت کو گونہ کرتے ان کے فرائض یا دلاتی رہے اور انہیں یاد کرنے کی قوت بخلتے۔

جب ان کی بیوی نے سلام پھیرا تو انہوں نے دیکھا کہ حکیم صاحب کی آنکھوں میں آنسو پھرے ہیں اور وہ ہلکی لگائے ان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے جو پوچھی۔ حکیم صاحب کچھ دیر تک جواب نہ دے سکے۔ پھر اپنے خطاب کا سارا قصہ نہا اور آخر میں کہا۔

”تم کو شاید یاد ہو، میں نے ایک مرتبہ اس وقت شام کو ایک ایسے کپڑا کر کے آرزو کی تھی جس کا کویرا وطن یاد دے، اس قوم میں مجھے کیا دے۔ دیکھو اس کپڑا اگر مجھے ہم دونوں کو کیا کیا ہے یاد دے۔“

انہیں کہنے کہنے حکیم صاحب اپنی بیوی کے ہاتھوں پاس پہنچ گئے تھے۔ ان کی بیوی نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دیا کہ چہرہ ان کے منہ پر ایک عجب چہرہ کر رہی تھی اور انہوں نے اپنے کپڑا کے تصور میں گھوم گئے۔

اوپندر ناتھ راشک

نام	چاندھرام
تلمی نام	شیلور ناوپندر ناتھ راشک
پیدائش	۱۳ دسمبر ۱۹۱۰ء پشام جالندھر مشرقی پنجاب، بھارت
وفات	۱۹ جنوری ۱۹۹۶ء
تعلیم	پی۔ اے ایل ایل بی

دیا نند اینگلو سنسکرت ہائی سکول، چاندھر (نندو مکتو محلہ) کی پرائمری برانچ سے چھ اور بچے تک تعلیم پائی اور اس کے بعد ہائی سکول برانچ میں منتقل ہو گئے۔ پی۔ اے۔ ڈی۔ اے۔ وی کالج چاندھر سے ۱۹۳۱ء میں اور ایل ایل بی۔ پنجاب یونیورسٹی لا کالج، لاہور سے ۱۹۳۶ء میں کیا۔

مختصر حالات زندگی:

اشک کے والد شمال مغربی، ریلوے میں انٹنشن ماسٹر تھے، جنہیں شراب پینے اور گھر سے بچے پر وار پنے کی عادت تھی اور باپ بستی دینے کی برصوں کے شرکمرانے کی محرم پر امن، ایک سیرت، پاک طبیعت صورت، گھریلو حالات اکثر خراب ہی رہے اور اشک چھوٹی عمر میں ہی روزی کھانے لگے۔ انھوں نے وہ بچے میں تھے جب پنجابی شاعری کا آغاز کیا۔ شکس رام اور بی بی گھرائی کے انداز میں پنجابی بیت کہے اور بھر یکانت اردو کی طرف آ گئے۔ چاندھر کے استاد ڈاکٹر شاردی قبول کی اور اردو غزلوں کے ڈیپرنگا دیے۔ ۱۹۳۶ء میں استاد ڈاکٹر چاندھری کی محکمہ دلی سے فارغ ہو کر افسانہ نگاری شروع کی۔

۱۹۳۲ء میں دیا نند اینگلو سنسکرت سکول چاندھر میں مدرس ہو گئے لیکن جلد ہی لاہور منتقل ہو گئے۔ لاہور میں حصول رزق کے لیے اشک نے ریڈیو کے لیے ادارے کیے اور سنٹر ایکٹ اور پبشر کے طور پر کام کیا۔ بعد ازاں فلمی دنیا میں گئے تو پچھتے مکالمہ نویس، کہانی کار، گیت

کار اور ادکار، فریضہ سب کہہ کیا۔ پہلی شادی شیلا سے ہوئی، ان دنوں الٹک ”وہ بھارت“ کے سب ایڈیٹر تھے۔ اس کے بعد اخبار ”بندے بازم“ میں بطور سب ایڈیٹر چلے گئے۔ شیلا بی بی کی مریدہ تھی اور مگر کراچی پرانا ہوتا تھا۔ یوں الٹک نے مختلف قلمی ناموں سے Ghosai Writing کی۔ ان کے لکھے ہوئے ہدایت نامے لاکھوں کی تعداد میں گئے لیکن الٹک کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ شیلا کا علاج گلاب دیوی (بی بی) ہسپتال، لاہور سے جاری تھا اور الٹک نے غشاء خداوندی کے خلاف جدوجہد کو انتہا تک پہنچا کر کہا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں انہوں نے سیشن بیج چنے کی ٹھنی اور بیج ٹھونڈی لا کھانچ، لاہور میں داخلے لیا۔ ۱۹۳۷ء میں شیلا چل بسیں اور الٹک اہل اہل بی بی کر گئے۔ الٹک نے شیلا کے سرگ پاشی بننے کے بعد چار برس تک شادی نہ کی۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں پوسٹ گر چلے گئے جہاں دو برس ”پوسٹ لڑی“ کے بعد بی بی (اور دایہ پشتوں کی اوریت کی۔ فروری ۱۹۳۱ء میں دوسری بار ستمبر ۱۹۳۱ء میں تیسری شادی کی۔ (تیسری بی بی کو شیلا بھٹی اور اردو کی فلمیں افسانہ نگار تھیں) ۱۹۳۱ء میں الٹک آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے منسلک ہو گئے جہاں تاہر رہے۔ ۳۶-۱۹۳۵ء میں فلموں کے لیے کہانیاں اور سکانے لکھی گئیں۔

الٹک نے اپنی جوانی لاہور، دہلی اور ممبئی میں گزاری۔ وہ حدودہ انا پیڑ اور خدی مشہور تھے۔ لڑکپن سے بڑھاپے تک مصیبتوں میں برسوں پیش کش، گھنگری، پھیر یا توڑ، دبی، دای، اوغولیا، اکوٹ، کیسلر، پش، گنہر، اور وہ کے مریدین ہونے کے باوجود جب شانہ سے لڑا وہ رہا۔ ۱۹۷۶ء سے الہ آباد ریڈیو کے اعزازی پروڈیوسر ہونے کے علاوہ وہیں برس تک تعینات وکیل کو ذریعہ روزگار بنائے رکھا۔ ۱۹۳۷ء سے اردو کی نسبت بھٹی میں زیادہ لکھا، بھٹی میں لگ بھگ ہفتہ ستر لکھوں کے مصنف ہیں۔ ایک پنجابی افسانوں کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان کا چہل ”کرتی دیو دین“ کا لقب نیا کا تخمینہ تین ماہ سے ہو چکی فلموں پر مشتمل ہے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

”دوہا کے جذبات“ مطبوعہ لاہور نامہ ”پر تاب“ لاہور (سنہ ۱۹۲۶ء) (۱۰ ماہ ۱۹۲۶ء)

قلمی آثار (مطبوعہ کتب) افسانے

۱۔ ”تورجی“ چاندھر شام لکھا ایک ڈیپ ۱۹۳۰ء میں ۹۳

مندر جات (۱) لکھیا چھ نظمیں۔ قلمی چاندھری۔ میں ج (۲) طالب امن۔ میں ۳-۱۳، (۳) دھوری تھی۔ میں ۵-۱۳، (۴) ۱۱-۱۳، (۵) ۱۱-۱۳، (۶) ۱۱-۱۳، (۷) ۱۱-۱۳، (۸) ۱۱-۱۳، (۹) ۱۱-۱۳، (۱۰) ۱۱-۱۳، (۱۱) ۱۱-۱۳، (۱۲) ۱۱-۱۳، (۱۳) ۱۱-۱۳، (۱۴) ۱۱-۱۳، (۱۵) ۱۱-۱۳، (۱۶) ۱۱-۱۳، (۱۷) ۱۱-۱۳، (۱۸) ۱۱-۱۳، (۱۹) ۱۱-۱۳، (۲۰) ۱۱-۱۳، (۲۱) ۱۱-۱۳، (۲۲) ۱۱-۱۳، (۲۳) ۱۱-۱۳، (۲۴) ۱۱-۱۳، (۲۵) ۱۱-۱۳، (۲۶) ۱۱-۱۳، (۲۷) ۱۱-۱۳، (۲۸) ۱۱-۱۳، (۲۹) ۱۱-۱۳، (۳۰) ۱۱-۱۳، (۳۱) ۱۱-۱۳، (۳۲) ۱۱-۱۳، (۳۳) ۱۱-۱۳، (۳۴) ۱۱-۱۳، (۳۵) ۱۱-۱۳، (۳۶) ۱۱-۱۳، (۳۷) ۱۱-۱۳، (۳۸) ۱۱-۱۳، (۳۹) ۱۱-۱۳، (۴۰) ۱۱-۱۳، (۴۱) ۱۱-۱۳، (۴۲) ۱۱-۱۳، (۴۳) ۱۱-۱۳، (۴۴) ۱۱-۱۳، (۴۵) ۱۱-۱۳، (۴۶) ۱۱-۱۳، (۴۷) ۱۱-۱۳، (۴۸) ۱۱-۱۳، (۴۹) ۱۱-۱۳، (۵۰) ۱۱-۱۳، (۵۱) ۱۱-۱۳، (۵۲) ۱۱-۱۳، (۵۳) ۱۱-۱۳، (۵۴) ۱۱-۱۳، (۵۵) ۱۱-۱۳، (۵۶) ۱۱-۱۳، (۵۷) ۱۱-۱۳، (۵۸) ۱۱-۱۳، (۵۹) ۱۱-۱۳، (۶۰) ۱۱-۱۳، (۶۱) ۱۱-۱۳، (۶۲) ۱۱-۱۳، (۶۳) ۱۱-۱۳، (۶۴) ۱۱-۱۳، (۶۵) ۱۱-۱۳، (۶۶) ۱۱-۱۳، (۶۷) ۱۱-۱۳، (۶۸) ۱۱-۱۳، (۶۹) ۱۱-۱۳، (۷۰) ۱۱-۱۳، (۷۱) ۱۱-۱۳، (۷۲) ۱۱-۱۳، (۷۳) ۱۱-۱۳، (۷۴) ۱۱-۱۳، (۷۵) ۱۱-۱۳، (۷۶) ۱۱-۱۳، (۷۷) ۱۱-۱۳، (۷۸) ۱۱-۱۳، (۷۹) ۱۱-۱۳، (۸۰) ۱۱-۱۳، (۸۱) ۱۱-۱۳، (۸۲) ۱۱-۱۳، (۸۳) ۱۱-۱۳، (۸۴) ۱۱-۱۳، (۸۵) ۱۱-۱۳، (۸۶) ۱۱-۱۳، (۸۷) ۱۱-۱۳، (۸۸) ۱۱-۱۳، (۸۹) ۱۱-۱۳، (۹۰) ۱۱-۱۳، (۹۱) ۱۱-۱۳، (۹۲) ۱۱-۱۳، (۹۳) ۱۱-۱۳، (۹۴) ۱۱-۱۳، (۹۵) ۱۱-۱۳، (۹۶) ۱۱-۱۳، (۹۷) ۱۱-۱۳، (۹۸) ۱۱-۱۳، (۹۹) ۱۱-۱۳، (۱۰۰) ۱۱-۱۳، (۱۰۱) ۱۱-۱۳، (۱۰۲) ۱۱-۱۳، (۱۰۳) ۱۱-۱۳، (۱۰۴) ۱۱-۱۳، (۱۰۵) ۱۱-۱۳، (۱۰۶) ۱۱-۱۳، (۱۰۷) ۱۱-۱۳، (۱۰۸) ۱۱-۱۳، (۱۰۹) ۱۱-۱۳، (۱۱۰) ۱۱-۱۳، (۱۱۱) ۱۱-۱۳، (۱۱۲) ۱۱-۱۳، (۱۱۳) ۱۱-۱۳، (۱۱۴) ۱۱-۱۳، (۱۱۵) ۱۱-۱۳، (۱۱۶) ۱۱-۱۳، (۱۱۷) ۱۱-۱۳، (۱۱۸) ۱۱-۱۳، (۱۱۹) ۱۱-۱۳، (۱۲۰) ۱۱-۱۳، (۱۲۱) ۱۱-۱۳، (۱۲۲) ۱۱-۱۳، (۱۲۳) ۱۱-۱۳، (۱۲۴) ۱۱-۱۳، (۱۲۵) ۱۱-۱۳، (۱۲۶) ۱۱-۱۳، (۱۲۷) ۱۱-۱۳، (۱۲۸) ۱۱-۱۳، (۱۲۹) ۱۱-۱۳، (۱۳۰) ۱۱-۱۳، (۱۳۱) ۱۱-۱۳، (۱۳۲) ۱۱-۱۳، (۱۳۳) ۱۱-۱۳، (۱۳۴) ۱۱-۱۳، (۱۳۵) ۱۱-۱۳، (۱۳۶) ۱۱-۱۳، (۱۳۷) ۱۱-۱۳، (۱۳۸) ۱۱-۱۳، (۱۳۹) ۱۱-۱۳، (۱۴۰) ۱۱-۱۳، (۱۴۱) ۱۱-۱۳، (۱۴۲) ۱۱-۱۳، (۱۴۳) ۱۱-۱۳، (۱۴۴) ۱۱-۱۳، (۱۴۵) ۱۱-۱۳، (۱۴۶) ۱۱-۱۳، (۱۴۷) ۱۱-۱۳، (۱۴۸) ۱۱-۱۳، (۱۴۹) ۱۱-۱۳، (۱۵۰) ۱۱-۱۳، (۱۵۱) ۱۱-۱۳، (۱۵۲) ۱۱-۱۳، (۱۵۳) ۱۱-۱۳، (۱۵۴) ۱۱-۱۳، (۱۵۵) ۱۱-۱۳، (۱۵۶) ۱۱-۱۳، (۱۵۷) ۱۱-۱۳، (۱۵۸) ۱۱-۱۳، (۱۵۹) ۱۱-۱۳، (۱۶۰) ۱۱-۱۳، (۱۶۱) ۱۱-۱۳، (۱۶۲) ۱۱-۱۳، (۱۶۳) ۱۱-۱۳، (۱۶۴) ۱۱-۱۳، (۱۶۵) ۱۱-۱۳، (۱۶۶) ۱۱-۱۳، (۱۶۷) ۱۱-۱۳، (۱۶۸) ۱۱-۱۳، (۱۶۹) ۱۱-۱۳، (۱۷۰) ۱۱-۱۳، (۱۷۱) ۱۱-۱۳، (۱۷۲) ۱۱-۱۳، (۱۷۳) ۱۱-۱۳، (۱۷۴) ۱۱-۱۳، (۱۷۵) ۱۱-۱۳، (۱۷۶) ۱۱-۱۳، (۱۷۷) ۱۱-۱۳، (۱۷۸) ۱۱-۱۳، (۱۷۹) ۱۱-۱۳، (۱۸۰) ۱۱-۱۳، (۱۸۱) ۱۱-۱۳، (۱۸۲) ۱۱-۱۳، (۱۸۳) ۱۱-۱۳، (۱۸۴) ۱۱-۱۳، (۱۸۵) ۱۱-۱۳، (۱۸۶) ۱۱-۱۳، (۱۸۷) ۱۱-۱۳، (۱۸۸) ۱۱-۱۳، (۱۸۹) ۱۱-۱۳، (۱۹۰) ۱۱-۱۳، (۱۹۱) ۱۱-۱۳، (۱۹۲) ۱۱-۱۳، (۱۹۳) ۱۱-۱۳، (۱۹۴) ۱۱-۱۳، (۱۹۵) ۱۱-۱۳، (۱۹۶) ۱۱-۱۳، (۱۹۷) ۱۱-۱۳، (۱۹۸) ۱۱-۱۳، (۱۹۹) ۱۱-۱۳، (۲۰۰) ۱۱-۱۳، (۲۰۱) ۱۱-۱۳، (۲۰۲) ۱۱-۱۳، (۲۰۳) ۱۱-۱۳، (۲۰۴) ۱۱-۱۳، (۲۰۵) ۱۱-۱۳، (۲۰۶) ۱۱-۱۳، (۲۰۷) ۱۱-۱۳، (۲۰۸) ۱۱-۱۳، (۲۰۹) ۱۱-۱۳، (۲۱۰) ۱۱-۱۳، (۲۱۱) ۱۱-۱۳، (۲۱۲) ۱۱-۱۳، (۲۱۳) ۱۱-۱۳، (۲۱۴) ۱۱-۱۳، (۲۱۵) ۱۱-۱۳، (۲۱۶) ۱۱-۱۳، (۲۱۷) ۱۱-۱۳، (۲۱۸) ۱۱-۱۳، (۲۱۹) ۱۱-۱۳، (۲۲۰) ۱۱-۱۳، (۲۲۱) ۱۱-۱۳، (۲۲۲) ۱۱-۱۳، (۲۲۳) ۱۱-۱۳، (۲۲۴) ۱۱-۱۳، (۲۲۵) ۱۱-۱۳، (۲۲۶) ۱۱-۱۳، (۲۲۷) ۱۱-۱۳، (۲۲۸) ۱۱-۱۳، (۲۲۹) ۱۱-۱۳، (۲۳۰) ۱۱-۱۳، (۲۳۱) ۱۱-۱۳، (۲۳۲) ۱۱-۱۳، (۲۳۳) ۱۱-۱۳، (۲۳۴) ۱۱-۱۳، (۲۳۵) ۱۱-۱۳، (۲۳۶) ۱۱-۱۳، (۲۳۷) ۱۱-۱۳، (۲۳۸) ۱۱-۱۳، (۲۳۹) ۱۱-۱۳، (۲۴۰) ۱۱-۱۳، (۲۴۱) ۱۱-۱۳، (۲۴۲) ۱۱-۱۳، (۲۴۳) ۱۱-۱۳، (۲۴۴) ۱۱-۱۳، (۲۴۵) ۱۱-۱۳، (۲۴۶) ۱۱-۱۳، (۲۴۷) ۱۱-۱۳، (۲۴۸) ۱۱-۱۳، (۲۴۹) ۱۱-۱۳، (۲۵۰) ۱۱-۱۳، (۲۵۱) ۱۱-۱۳، (۲۵۲) ۱۱-۱۳، (۲۵۳) ۱۱-۱۳، (۲۵۴) ۱۱-۱۳، (۲۵۵) ۱۱-۱۳، (۲۵۶) ۱۱-۱۳، (۲۵۷) ۱۱-۱۳، (۲۵۸) ۱۱-۱۳، (۲۵۹) ۱۱-۱۳، (۲۶۰) ۱۱-۱۳، (۲۶۱) ۱۱-۱۳، (۲۶۲) ۱۱-۱۳، (۲۶۳) ۱۱-۱۳، (۲۶۴) ۱۱-۱۳، (۲۶۵) ۱۱-۱۳، (۲۶۶) ۱۱-۱۳، (۲۶۷) ۱۱-۱۳، (۲۶۸) ۱۱-۱۳، (۲۶۹) ۱۱-۱۳، (۲۷۰) ۱۱-۱۳، (۲۷۱) ۱۱-۱۳، (۲۷۲) ۱۱-۱۳، (۲۷۳) ۱۱-۱۳، (۲۷۴) ۱۱-۱۳، (۲۷۵) ۱۱-۱۳، (۲۷۶) ۱۱-۱۳، (۲۷۷) ۱۱-۱۳، (۲۷۸) ۱۱-۱۳، (۲۷۹) ۱۱-۱۳، (۲۸۰) ۱۱-۱۳، (۲۸۱) ۱۱-۱۳، (۲۸۲) ۱۱-۱۳، (۲۸۳) ۱۱-۱۳، (۲۸۴) ۱۱-۱۳، (۲۸۵) ۱۱-۱۳، (۲۸۶) ۱۱-۱۳، (۲۸۷) ۱۱-۱۳، (۲۸۸) ۱۱-۱۳، (۲۸۹) ۱۱-۱۳، (۲۹۰) ۱۱-۱۳، (۲۹۱) ۱۱-۱۳، (۲۹۲) ۱۱-۱۳، (۲۹۳) ۱۱-۱۳، (۲۹۴) ۱۱-۱۳، (۲۹۵) ۱۱-۱۳، (۲۹۶) ۱۱-۱۳، (۲۹۷) ۱۱-۱۳، (۲۹۸) ۱۱-۱۳، (۲۹۹) ۱۱-۱۳، (۳۰۰) ۱۱-۱۳، (۳۰۱) ۱۱-۱۳، (۳۰۲) ۱۱-۱۳، (۳۰۳) ۱۱-۱۳، (۳۰۴) ۱۱-۱۳، (۳۰۵) ۱۱-۱۳، (۳۰۶) ۱۱-۱۳، (۳۰۷) ۱۱-۱۳، (۳۰۸) ۱۱-۱۳، (۳۰۹) ۱۱-۱۳، (۳۱۰) ۱۱-۱۳، (۳۱۱) ۱۱-۱۳، (۳۱۲) ۱۱-۱۳، (۳۱۳) ۱۱-۱۳، (۳۱۴) ۱۱-۱۳، (۳۱۵) ۱۱-۱۳، (۳۱۶) ۱۱-۱۳، (۳۱۷) ۱۱-۱۳، (۳۱۸) ۱۱-۱۳، (۳۱۹) ۱۱-۱۳، (۳۲۰) ۱۱-۱۳، (۳۲۱) ۱۱-۱۳، (۳۲۲) ۱۱-۱۳، (۳۲۳) ۱۱-۱۳، (۳۲۴) ۱۱-۱۳، (۳۲۵) ۱۱-۱۳، (۳۲۶) ۱۱-۱۳، (۳۲۷) ۱۱-۱۳، (۳۲۸) ۱۱-۱۳، (۳۲۹) ۱۱-۱۳، (۳۳۰) ۱۱-۱۳، (۳۳۱) ۱۱-۱۳، (۳۳۲) ۱۱-۱۳، (۳۳۳) ۱۱-۱۳، (۳۳۴) ۱۱-۱۳، (۳۳۵) ۱۱-۱۳، (۳۳۶) ۱۱-۱۳، (۳۳۷) ۱۱-۱۳، (۳۳۸) ۱۱-۱۳، (۳۳۹) ۱۱-۱۳، (۳۴۰) ۱۱-۱۳، (۳۴۱) ۱۱-۱۳، (۳۴۲) ۱۱-۱۳، (۳۴۳) ۱۱-۱۳، (۳۴۴) ۱۱-۱۳، (۳۴۵) ۱۱-۱۳، (۳۴۶) ۱۱-۱۳، (۳۴۷) ۱۱-۱۳، (۳۴۸) ۱۱-۱۳، (۳۴۹) ۱۱-۱۳، (۳۵۰) ۱۱-۱۳، (۳۵۱) ۱۱-۱۳، (۳۵۲) ۱۱-۱۳، (۳۵۳) ۱۱-۱۳، (۳۵۴) ۱۱-۱۳، (۳۵۵) ۱۱-۱۳، (۳۵۶) ۱۱-۱۳، (۳۵۷) ۱۱-۱۳، (۳۵۸) ۱۱-۱۳، (۳۵۹) ۱۱-۱۳، (۳۶۰) ۱۱-۱۳، (۳۶۱) ۱۱-۱۳، (۳۶۲) ۱۱-۱۳، (۳۶۳) ۱۱-۱۳، (۳۶۴) ۱۱-۱۳، (۳۶۵) ۱۱-۱۳، (۳۶۶) ۱۱-۱۳، (۳۶۷) ۱۱-۱۳، (۳۶۸) ۱۱-۱۳، (۳۶۹) ۱۱-۱۳، (۳۷۰) ۱۱-۱۳، (۳۷۱) ۱۱-۱۳، (۳۷۲) ۱۱-۱۳، (۳۷۳) ۱۱-۱۳، (۳۷۴) ۱۱-۱۳، (۳۷۵) ۱۱-۱۳، (۳۷۶) ۱۱-۱۳، (۳۷۷) ۱۱-۱۳، (۳۷۸) ۱۱-۱۳، (۳۷۹) ۱۱-۱۳، (۳۸۰) ۱۱-۱۳، (۳۸۱) ۱۱-۱۳، (۳۸۲) ۱۱-۱۳، (۳۸۳) ۱۱-۱۳، (۳۸۴) ۱۱-۱۳، (۳۸۵) ۱۱-۱۳، (۳۸۶) ۱۱-۱۳، (۳۸۷) ۱۱-۱۳، (۳۸۸) ۱۱-۱۳، (۳۸۹) ۱۱-۱۳، (۳۹۰) ۱۱-۱۳، (۳۹۱) ۱۱-۱۳، (۳۹۲) ۱۱-۱۳، (۳۹۳) ۱۱-۱۳، (۳۹۴) ۱۱-۱۳، (۳۹۵) ۱۱-۱۳، (۳۹۶) ۱۱-۱۳، (۳۹۷) ۱۱-۱۳، (۳۹۸) ۱۱-۱۳، (۳۹۹) ۱۱-۱۳، (۴۰۰) ۱۱-۱۳، (۴۰۱) ۱۱-۱۳، (۴۰۲) ۱۱-۱۳، (۴۰۳) ۱۱-۱۳، (۴۰۴) ۱۱-۱۳، (۴۰۵) ۱۱-۱۳، (۴۰۶) ۱۱-۱۳، (۴۰۷) ۱۱-۱۳، (۴۰۸) ۱۱-۱۳، (۴۰۹) ۱۱-۱۳، (۴۱۰) ۱۱-۱۳، (۴۱۱) ۱۱-۱۳، (۴۱۲) ۱۱-۱۳، (۴۱۳) ۱۱-۱۳، (۴۱۴) ۱۱-۱۳، (۴۱۵) ۱۱-۱۳، (۴۱۶) ۱۱-۱۳، (۴۱۷) ۱۱-۱۳، (۴۱۸) ۱۱-۱۳، (۴۱۹) ۱۱-۱۳، (۴۲۰) ۱۱-۱۳، (۴۲۱) ۱۱-۱۳، (۴۲۲) ۱۱-۱۳، (۴۲۳) ۱۱-۱۳، (۴۲۴) ۱۱-۱۳، (۴۲۵) ۱۱-۱۳، (۴۲۶) ۱۱-۱۳، (۴۲۷) ۱۱-۱۳، (۴۲۸) ۱۱-۱۳، (۴۲۹) ۱۱-۱۳، (۴۳۰) ۱۱-۱۳، (۴۳۱) ۱۱-۱۳، (۴۳۲) ۱۱-۱۳، (۴۳۳) ۱۱-۱۳، (۴۳۴) ۱۱-۱۳، (۴۳۵) ۱۱-۱۳، (۴۳۶) ۱۱-۱۳، (۴۳۷) ۱۱-۱۳، (۴۳۸) ۱۱-۱۳، (۴۳۹) ۱۱-۱۳، (۴۴۰) ۱۱-۱۳، (۴۴۱) ۱۱-۱۳، (۴۴۲) ۱۱-۱۳، (۴۴۳) ۱۱-۱۳، (۴۴۴) ۱۱-۱۳، (۴۴۵) ۱۱-۱۳، (۴۴۶) ۱۱-۱۳، (۴۴۷) ۱۱-۱۳، (۴۴۸) ۱۱-۱۳، (۴۴۹) ۱۱-۱۳، (۴۵۰) ۱۱-۱۳، (۴۵۱) ۱۱-۱۳، (۴۵۲) ۱۱-۱۳، (۴۵۳) ۱۱-۱۳، (۴۵۴) ۱۱-۱۳، (۴۵۵) ۱۱-۱۳، (۴۵۶) ۱۱-۱۳، (۴۵۷) ۱۱-۱۳، (۴۵۸) ۱۱-۱۳، (۴۵۹) ۱۱-۱۳، (۴۶۰) ۱۱-۱۳، (۴۶۱) ۱۱-۱۳، (۴۶۲) ۱۱-۱۳، (۴۶۳) ۱۱-۱۳، (۴۶۴) ۱۱-۱۳، (۴۶۵) ۱۱-۱۳، (۴۶۶) ۱۱-۱۳، (۴۶۷) ۱۱-۱۳، (۴۶۸) ۱۱-۱۳، (۴۶۹) ۱۱-۱۳، (۴۷۰) ۱۱-۱۳، (۴۷۱) ۱۱-۱۳، (۴۷۲) ۱۱-۱۳، (۴۷۳) ۱۱-۱۳، (۴۷۴) ۱۱-۱۳، (۴۷۵) ۱۱-۱۳، (۴۷۶) ۱۱-۱۳، (۴۷۷) ۱۱-۱۳، (۴۷۸) ۱۱-۱۳، (۴۷۹) ۱۱-۱۳، (۴۸۰) ۱۱-۱۳، (۴۸۱) ۱۱-۱۳، (۴۸۲) ۱۱-۱۳، (۴۸۳) ۱۱-۱۳، (۴۸۴) ۱۱-۱۳، (۴۸۵) ۱۱-۱۳، (۴۸۶) ۱۱-۱۳، (۴۸۷) ۱۱-۱۳، (۴۸۸) ۱۱-۱۳، (۴۸۹) ۱۱-۱۳، (۴۹۰) ۱۱-۱۳، (۴۹۱) ۱۱-۱۳، (۴۹۲) ۱۱-۱۳، (۴۹۳) ۱۱-۱۳، (۴۹۴) ۱۱-۱۳، (۴۹۵) ۱۱-۱۳، (۴۹۶) ۱۱-۱۳، (۴۹۷) ۱۱-۱۳، (۴۹۸) ۱۱-۱۳، (۴۹۹) ۱۱-۱۳، (۵۰۰) ۱۱-۱۳، (۵۰۱) ۱۱-۱۳، (۵۰۲) ۱۱-۱۳، (۵۰۳) ۱۱-۱۳، (۵۰۴) ۱۱-۱۳، (۵۰۵) ۱۱-۱۳، (۵۰۶) ۱۱-۱۳، (۵۰۷) ۱۱-۱۳، (۵۰۸) ۱۱-۱۳، (۵۰۹) ۱۱-۱۳، (۵۱۰) ۱۱-۱۳، (۵۱۱) ۱۱-۱۳، (۵۱۲) ۱۱-۱۳، (۵۱۳) ۱۱-۱۳، (۵۱۴) ۱۱-۱۳، (۵۱۵) ۱۱-۱۳، (۵۱۶) ۱۱-۱۳، (۵۱۷) ۱۱-۱۳، (۵۱۸) ۱۱-۱۳، (۵۱۹) ۱۱-۱۳، (۵۲۰) ۱۱-۱۳، (۵۲۱) ۱۱-۱۳، (۵۲۲) ۱۱-۱۳، (۵۲۳) ۱۱-۱۳، (۵۲۴) ۱۱-۱۳، (۵۲۵) ۱۱-۱۳، (۵۲۶) ۱۱-۱۳، (۵۲۷) ۱۱-۱۳، (۵۲۸) ۱۱-۱۳، (۵۲۹) ۱۱-۱۳، (۵۳۰) ۱۱-۱۳، (۵۳۱) ۱۱-۱۳، (۵۳۲) ۱۱-۱۳، (۵۳۳) ۱۱-۱۳، (۵۳۴) ۱۱-۱۳، (۵۳۵) ۱۱-۱۳، (۵۳۶) ۱۱-۱۳، (۵۳۷) ۱۱-۱۳، (۵۳۸) ۱۱-۱۳، (۵۳۹) ۱۱-۱۳، (۵۴۰) ۱۱-۱۳، (۵۴۱) ۱۱-۱۳، (۵۴۲) ۱۱-۱۳، (۵۴۳) ۱۱-۱۳، (۵۴۴) ۱۱-۱۳، (۵۴۵) ۱۱-۱۳، (۵۴۶) ۱۱-۱۳، (۵۴۷) ۱۱-۱۳، (۵۴۸) ۱۱-۱۳، (۵۴۹) ۱۱-۱۳، (۵۵۰) ۱۱-۱۳، (۵۵۱) ۱۱-۱۳، (۵۵۲) ۱۱-۱۳، (۵۵۳) ۱۱-۱۳، (۵۵۴) ۱۱-۱۳، (۵۵۵) ۱۱-۱۳، (۵۵۶) ۱۱-۱۳، (۵۵۷) ۱۱-۱۳، (۵۵۸) ۱۱-۱۳، (۵۵۹) ۱۱-۱۳، (۵۶۰) ۱۱-۱۳، (۵۶۱) ۱۱-۱۳، (۵۶۲) ۱۱-۱۳، (۵۶۳) ۱۱-۱۳، (۵۶۴) ۱۱-۱۳، (۵۶۵) ۱۱-۱۳، (۵۶۶) ۱۱-۱۳، (۵۶۷) ۱۱-۱۳، (۵۶۸) ۱۱-۱۳، (۵۶۹) ۱۱-۱۳، (۵۷۰) ۱۱-۱۳، (۵۷۱) ۱۱-۱۳، (۵۷۲) ۱۱-۱۳، (۵۷۳) ۱۱-۱۳، (۵۷۴) ۱۱-۱۳، (۵۷۵) ۱۱-۱۳، (۵۷۶) ۱۱-۱۳، (۵۷۷) ۱۱-۱۳، (۵۷۸) ۱۱-۱۳، (۵۷۹) ۱۱-۱۳، (۵۸۰) ۱۱-۱۳، (۵۸۱) ۱۱-۱۳، (۵۸۲) ۱۱-۱۳، (۵۸۳) ۱۱-۱۳، (۵۸۴) ۱۱-۱۳، (۵۸۵) ۱۱-۱۳، (۵۸۶) ۱۱-۱۳، (۵۸۷) ۱۱-۱۳، (۵۸۸) ۱۱-۱۳، (۵۸۹) ۱۱-۱۳، (۵۹۰) ۱۱-۱۳، (۵۹۱) ۱۱-۱۳، (۵۹۲) ۱۱-۱۳، (۵۹۳) ۱۱-۱۳، (۵۹۴) ۱۱-۱۳، (۵۹۵) ۱۱-۱۳، (۵۹۶) ۱۱-۱۳، (۵۹۷) ۱۱-۱۳، (۵۹۸) ۱۱-۱۳، (۵۹۹) ۱۱-۱۳، (۶۰۰) ۱۱-۱۳، (۶۰۱) ۱۱-۱۳، (۶۰۲)

(۵) لہور۔ ص ۹۷۔ ۹۳ (۶) احساسِ فقر۔ ص ۹۵۔ ۱۱۱ (۷) نظمِ شمشاد۔ ص ۱۱۵۔ ۱۱۹ (۸) لہجہ۔ ص ۱۳۱۔ ۱۳۳ (۹) زمرگی کا راز۔ ص ۱۳۵۔ ۱۳۹ (۱۰) زمرگی کا راز۔ ص ۱۳۵۔ ۱۳۹ (۱۱) سیلاب۔ ص ۱۵۵۔ ۱۶۴ (۱۲) اکو۔ ص ۱۶۵۔ ۱۸۱ (۱۳) حریہ۔ ص ۱۸۳۔ ۱۹۰ (۱۴) محبت۔ ص ۱۹۱۔ ۲۰۸

۳۔ ”کوئٹہ“۔ لاہور: مکتبہ اردو، ۱۹۴۴ء۔ ص ۲۳۳

مصدر جات: (۱) افسانے کا لٹریچر ترقی پسندی۔ ص ۹۔ ۲۸ (۲) کوئٹہ۔ ص ۲۹۔ ۵۴ (۳) سنگدل۔ ص ۵۳۔ ۷۱ (۴) تہذیب۔ ص ۷۳۔ ۸۸ (۵) گنگوہر۔ ص ۸۹۔ ۱۰۹ (۶) موتی۔ ص ۱۱۱۔ ۱۱۷ (۷) بے مرد۔ ص ۱۱۹۔ ۱۳۳ (۸) زمرگی۔ ص ۱۳۵۔ ۱۶۱ (۹) برا بھلا۔ ص ۱۶۳۔ ۱۸۰ (۱۰) کوئٹہ۔ ص ۱۸۱۔ ۱۹۶ (۱۱) لہجہ۔ ص ۱۹۷۔ ۲۱۴ (۱۲) نقوش۔ ص ۲۱۵۔ ۲۳۳

۵۔ ”پہاں“ گنگوہر مکتبہ اردو، ۱۹۴۱ء۔ ص ۱۳۹

مصدر جات: (۱) پہاں۔ ص ۱۔ ۹۴ (۲) شجین کا پودہ۔ ص ۳۱۔ ۳۸ (۳) اباں۔ ص ۳۹۔ ۵۳ (۴) بیدردی کے خواب۔ ص ۵۵۔ ۶۲ (۵) کاسور۔ ص ۷۷۔ ۸۰ (۶) کاکڑاں کا چیل۔ ص ۸۱۔ ۹۴ (۷) جھنگے۔ ص ۹۷۔ ۱۰۴ (۸) کالہ۔ ص ۱۰۷۔ ۱۲۹ (۹) جھنجھکی کی باں۔ ص ۱۲۱۔ ۱۳۹ (۱۰) بے انسان۔ ص ۱۴۷۔ ۱۵۰ (۱۱) کھلوتے۔ ص ۱۵۱۔ ۱۶۹

۶۔ ”کاسور“ دلی ساقی بک ڈپو، ۱۹۴۳ء۔ ص ۲۷

مصدر جات: (۱) شہزادہ شہزادہ نظام۔ ص ۷۷۔ ۸۰ (۲) شہزادہ۔ ص ۸۱۔ ۱۰۹ (۳) بھائی کی شام کا گیت۔ ص ۱۳۳۔ ۱۳۵ (۴) نکلیاں۔ ص ۱۳۶۔ ۱۳۹ (۵) اوہ میری شجیر تھی۔ ص ۱۴۷۔ ۱۶۰ (۶) چھوٹا کامیاب۔ ص ۱۷۱۔ ۱۷۷ (۷) تہذیب۔ ص ۱۷۷۔ ۱۸۰ (۸) بڈری۔ ص ۱۸۱۔ ۱۰۰ (۹) سطر سطر۔ ص ۱۰۱۔ ۱۰۵ (۱۰) جہنم کا انتخاب۔ ص ۱۰۶۔ ۱۲۳ (۱۱) مراب۔ ص ۱۲۳۔ ۱۳۳ (۱۲) برا بھلا۔ ص ۱۳۵۔ ۱۳۹ (۱۳) کالہ۔ ص ۱۵۰۔ ۱۵۹ (۱۴) ترفیہ گدا۔ ص ۱۶۰۔ ۱۹۰ (۱۵) کاسور۔ ص ۱۹۱۔ ۲۰۷

۷۔ ”نقوش“ دلی ساقی بک ڈپو، ۱۹۴۳ء۔ ص ۱۷۱

مصدر جات: (۱) حرف آواز (انشاء)۔ ص ۵۔ ۸ (۲) نقوش۔ ص ۹۔ ۳۱ (۳) کالہ۔ ص ۳۲۔ ۳۹ (۴) بکولے۔ ص ۴۰۔ ۴۷ (۵) اوہ میری شجیر تھی۔ ص ۴۱۔ ۵۷ (۶) آدھ۔ ص ۵۸۔ ۶۰ (۷) ایک جھنگ۔ ص ۶۱۔ ۷۱ (۸) پار جیت۔ ص ۷۲۔ ۸۷ (۹) ۳۳۳۔ ص ۸۸۔ ۹۷ (۱۰) زمرگی۔ ص ۹۸۔ ۱۰۹ (۱۱) شاعر کی ٹکست۔ ص ۱۱۰۔ ۱۱۴ (۱۲) لہجہ۔ ص ۱۳۰۔ ۱۳۸ (۱۳) ترفیہ گدا۔ ص ۱۵۱۔ ۱۷۱

۸۔ ”کالہ صاحب“ دلی مکتبہ جامعہ، ۱۹۵۲ء۔ ص ۱۸۷

مصدر جات: (۱) جیٹ لفظ محترمہ صالحہ عابد حسین۔ ص ۷۷۔ ۱۳ (۲) کالہ صاحب۔ ص ۱۵۔ ۲۸ (۳) ٹکلف۔ ص ۲۹۔ ۵۴ (۴) بھنگل لینڈ۔ ص ۵۳۔ ۶۷ (۵) درانی۔ ص ۷۷۔ ۱۰۴ (۶) نقوش۔ ص ۱۰۳۔ ۱۱۰ (۷) بچے۔ ص ۱۲۱۔ ۱۳۲ (۸) مسٹر گھٹ پانے۔ ص ۱۳۳۔ ۱۴۴ (۹) کٹیٹھن رشید۔ ص ۱۶۵۔ ۱۸۷

۹۔ ”چنگ“ کراچی اردو پبلیکیشنز (پاکستان) پبلیشنگز، ص ۱۰

۱۰۔ ”چنگ“ دہلی اردو پبلیکیشنز، پبلیشنگز، ص ۱۰

۱۰۔ ”بھروسے پر چھٹی شام“ (انہیں اردو افسانے) ۱۹۸۷ء

۱۱۔ ”ایک کے چٹاپا افسانے“

۱۲۔ ”نیکل لینڈ“ طبع اول ۱۹۹۵ء

ناول:

۱۳۔ ”سندھوں کے کھیل“۔ دہلی ساقی بک ڈپو ۱۹۳۲ء، ص ۴۵۸

۱۴۔ ”چھرا بھٹھر“ (آل آ پار نیا ادارہ ۱۹۸۱ء، ص ۱۷۶)

سندھ جات (۱)۔ جیٹس لنگ (ایک) (۲)۔ سندھ لنگ کے ناول اور چھرا بھٹھر: ڈاکٹر علیہ کھٹا۔ ص ۷۷-۸۰ (۳)۔ ناول۔

ص ۳۶-۳۷

۱۵۔ ”بڑی بڑی آنکھیں“

۱۶۔ ”گرتی دیواریں“ (نئی جلدیں)

اس ضمن میں ناول کی پہلی جلد ”گرتی دیواریں“ ۱۹۶۷ء، دوسری جلد ”شروعی گھوٹا آئینہ“ ۱۹۶۸ء اور تیسری جلد ”ایک نئی کہانی“

۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔

طویل ڈرامے:

۱۷۔ ”تقدیر جانتی“۔ لاہور: کتبہ اردو ۱۹۳۷ء، ص ۱۳۳

سندھ جات (۱)۔ یہ دو ڈرامے لکھتے ہوئے۔ ص ۳-۱۲ (۲)۔ تقدیر جانتی۔ ص ۱۳-۸۶ (۳)۔ لکھاری۔ ص ۷۷-۸۰

۱۸۔ ”وہترے“۔ آل آ پار، نیا ادارہ ۱۹۷۹ء، ص ۱۳۲

۱۹۔ ”چھٹا چٹا“۔ آل آ پار، نیا ادارہ ۱۹۸۱ء، ص ۱۱۴

سندھ جات (۱)۔ جیٹس لنگ ڈاکٹر اطہر جے دیچ۔ ص ۹-۱۹ (۲)۔ چھٹا چٹا۔ ص ۳۱-۱۱۴

۲۰۔ ”گرواپ“۔ آل آ پار، نیا ادارہ ۱۹۸۱ء، ص ۹۶

سندھ جات (۱)۔ جیٹس لنگ ڈاکٹر اطہر جے دیچ۔ ص ۹-۳۰ (۲)۔ گرواپ۔ ص ۳۱-۹۶

۲۱۔ ”انچو دانی“ ۱۹۸۳ء

۲۲۔ ”جنت کی جھک“ ۱۹۸۳ء

ایک بابی ڈرامے:

۲۳۔ ”پاپی“۔ لاہور: کتبہ اردو ۱۹۶۱ء، ص ۱۹۶

مندرجات (۱) اردو جاز کے سائے تلے۔ ص ۱۶۔۱۷ (۲) چھو۔ ص ۷۱۔۷۲ (۳) ترقی کو مانڈو۔ ص ۳۳۔۶۶ (۴) چالپی۔ ص ۶۷۔۸۶ (۵) کراس ورڈ۔ ص ۸۷۔۱۰۴ (۶) کشمی کا سواکت۔ ص ۱۰۳۔۱۲۴ (۷) پانسی سمجھو۔ ص ۱۲۳۔۱۳۳ (۸) جرنک۔ ص ۱۳۵۔۱۹۶

۲۵۔ ”چھوڑا ہے“۔ لکھنؤ۔ مکتبہ اردو ۱۹۴۳ء۔ ص ۷۲

مندرجات (۱) چھوڑا ہے ایک مطالعہ مختار صدیقی۔ ص ۸۲۔۸۳ (۲) چھوڑا ہے۔ ص ۲۵۔۲۵ (۳) میوت۔ ص ۳۹۔۶۳ (۴) پانسی۔ ص ۶۶۔۹۴ (۵) مخمورے۔ ص ۹۳۔۱۰۸ (۶) چلن۔ ص ۱۰۹۔۱۲۴ (۷) کھڑکی۔ ص ۱۲۵۔۱۳۹ (۸) سوئی زانی۔ ص ۱۳۹۔۱۴۳

۲۶۔ ”ازلی راستے“۔ سلطان پور بکس پبلیکیشنز طبع اڈل۔ ۱۹۴۶ء

۲۷۔ ”تو لے“۔ ال آ پارنچاوارہ ۱۹۷۹ء۔ ص ۱۵۶

مندرجات: (۱) تو لے۔ ص ۱۰۳۔۱۲۳ (۲) چالپی۔ ص ۷۱۔۷۲ (۳) کیرا صاحب کھی آیا۔ ص ۷۱۔۹۴ (۴) پر مرام۔ ص ۹۳۔۱۱۳ (۵) چالکا گا۔ ص ۱۱۵۔۱۵۶

۲۸۔ ”چوڑی کا کوٹ“ ۱۹۸۳ء

تذکرے:

۲۹۔ ”مختصر انٹرن“۔ ال آ پارنچاوارہ طبع اڈل ۱۹۵۵ء۔ ص ۱۲۳

مندرجات: (۱) گزشتہ احوال، اٹک۔ ص ۹۔۱۶ (۲) مختصر انٹرن۔ ص ۱۲۳۔۱۳۳

”بھری اٹا تو کسی کے چائیس برس“ طبع اڈل ۱۹۸۸ء

شاعری:

۳۰۔ ”برگد کی جی“ طبع اڈل ۱۹۴۷ء

۳۱۔ ”گرتی دھاری“ (ہندی) طبع اڈل ۱۹۴۷ء

۳۲۔ ”شیر میں کھوتا آئینہ“ (ہندی) طبع اڈل ۱۹۶۳ء

۳۳۔ ”اک نعلی قد ملی“ (ہندی) طبع اڈل ۱۹۶۶ء

نوٹ: اس کے علاوہ گاہک ہنگ ماٹھو ہندی کتب خانہ سے ملے۔

غیر مدون:

مختصر مطالعہ، اٹک، لکھنؤ، نو کے اشاعت کے پھریں۔

سورگ باش ہونے سے قبل مستقل چا:

۵۔ خسرو باغ اردو، آلہ آباد، بھارت۔

اعزاز:

۱۔ شگیت، ٹانک، آئیڈی، راجپوت، ۱۹۶۵ء

۲۔ سوویت لینن فیروزہ ایچ اردو (جرائے ڈراما) ۱۹۷۴ء

۳۔ اردو آئیڈی ٹیکسٹ، ایچ اردو (جرائے ڈراما) ۱۹۷۳ء

۴۔ ساپتہ دروگی ایچ اردو، آلہ آباد

نظر یہ فن:

”چونکہ میں نے کسی سے اصلاح نہیں لی، مشورہ نہیں کیا۔ خود ہی کہانوں کو لگا ڈتا سنوارتا رہا۔ اس لیے مجھے ایک کہانی کو کئی بار لکھنے کی عادت پڑ گئی۔ جب تک میری قلمی نہیں ہو جاتی میں براہ کشتہ کرتا ہوں۔ مجھے کافی کاسیانی حاصل ہوئی ہے لیکن کاسیانی سے مجھے کبھی اطمینان نہیں ہوا۔ میری بھوک ان سٹ ہے۔“

(حوالہ ”میرزا بھتر پنے افسانے“ مترجم: محمد حسن عسکری)



حوالہ جات:

۱۔ ”تذکرہ قزوان“ مولانا محمد محمد چندی مبلوہ، ”الانوار“ علی گڑھ، مارچ ۱۹۶۵ء

پنگ

اوپندر ناتھ اشک

دلہن کی آنکھوں پر چٹکتی ہوئی تیشی کی نگاہیں، چاک چنگ کے سر ہائے گول شیشہ میں لگی اپنی ماں کی چھوٹی سی تصویر پر چلی گئیں۔ مسین سکاہی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، غلامی پگھلیں، تپکی نازک ناک، ترشے ہوئے چہتے ہونٹوں میں موتوں کی نگار اور چاک دہن کے چہرے پر کبھی کی اپنی ماں کے خطوط اچھر آئے اور ان کے قد و قامت، ناک خنک میں کتنی مشابہت تھی کبھی کا ذہن دھندلا کر۔ ایک کنگھی اس کی رگوں میں دوڑتی چلی گئی۔ سر کو دارسا بھنگا دے کر اس نے اس تصویر کو نگاہوں سے ہٹانے کی ناکام کوشش کی لیکن بچپن سے لے کر ابھی تک ہی سال پہلے تک وہ نہ جانے کتنی ہی بامی طرح ماں کے سینے پر لیٹا تھا اور وہ یاد اس لحاظ کے ذہن کے پردے سے ہو کر نکلتی اور اپنی دلہن کی پگھلی پگھلی آنکھیں اور کھینچے ہوئے ہونٹ چہرے کے بدلے وہ چاک دہنیں جانب کو بھل چکا۔ چٹ لٹ گیا۔ پہلے بھر کو اس کی نگاہیں مسوری کے خانی فریم پر جمائے سو جانے لے باروں پر چلی گئیں۔ اس کا ہاتھ صبح پر بھی نیلے کی ٹکڑوں پر جا چکا اور اس کے پی میں آئی کہ وہ اچھل کر اٹھے اور اس معطر و معطر جگہ عروسی سے باہر نکل جائے۔

لیکن وہ نہ چلا نہ اٹھا، چپ چاپ لیٹا رہا۔ دلہن نہ جانے کیا سمجھے۔ یہی خیال اشعر میں اسے چنگ سے بانہ سے دبا کر کو بھنگا دے کر اس نے بھر پور پہلی تصویر کاغذوں سے ہٹانے کی ناکام کوشش کی لیکن ایک کے بدلے کتنی ہی تصویریں ایک دوسری کے اوپر برساتی یادوں سے لپٹ چکی۔

اسی کمرہ میں۔ اسی چنگ پر اس کے پاپا اور مکی ساتھ ساتھ لیٹے ہیں۔ رات دے میں پگھل چکی پروہ چاہے اور ایک تک انہیں تک رہا ہے۔ پاپا کے ساتھ لیٹی ماں کتنی چھوٹی، کتنی مسین لگتی ہے۔

ماں آکھنے کے سامنے ٹھہری سٹار کر رہی ہے اور وہ دروازہ کے جھپکے کھڑا چپ چاپ اسے دیکھ رہا ہے۔ آج ماں نے ہی کی کہانی سنا کر کرتی تھی، وہی سی مسین تو اس کی ماں ہے۔ وہ اسے دیکھ لیتی ہے اور چار سے چار آتی ہے۔ زمین پر گھٹنے تک، خوشی سے وہ اس کی گود میں سر جمنا

لگتا ہے۔ اس آیت ہاتھ سے اس کے بال سہلاتی ہے، دوسرے سے اپنے بالوں میں گتھکی کے جاتی ہے۔

ہائے پاپا کو کیا ہو گیا ہے؟ ایک آؤلی روز آتا ہے، اس کے گلے میں دو سانپ سے لگد ہے ہیں، ان کا ایک ایک سر اداوں کانوں میں لگا کر ان کا منہ وہ پاپا کی چھاتی پر جہاں تھیں رکھتا ہے مگر ان کے بازو میں سونپاں آٹھوتا ہے۔ پاپا نہیں دوتے، اب وہ روئے لگتا ہے۔ مگر اسے چھاتی سے لگا لیتی ہے اور دوسرے کمرے میں لے جاتی ہے۔

پاپا زہین پر لیٹے ہیں۔ بچے ڈولنے نہیں۔ مگر میں سب دور ہے ہیں۔ وہ ابھی دوتا ہے۔ اس روئے جاتی ہے۔ اسے چھ سے جاتی ہے۔ روئے جاتی ہے۔ اور میں اس کی چڑیاں تو زودیتی ہیں۔ اس کے ماتھے کا سندور پر پچھو دیتی ہیں۔ کشلی کو اس کی گود سے جھین لیتی ہیں۔ وہ دوتا ہے۔ روئے جاتا ہے مگر اسے کوئی چپ نہیں کراتا۔

وہی چنگ ہے۔ وہ اپنے پاپا کی جگہ لیٹا ہے۔ اس اس کے ساتھ لیٹا ہے۔ ایک ملائی سی ملائی دھاتی پہنے ہے۔ صبح کا اچھا کمرہ میں جھانک رہا ہے۔ لیکن اس بے سوجھ سوتی ہے۔ وہ ایک کب اسے دیکھتا جاتا ہے۔ پتلا نازک پر یوں کا سا پھر وہ بتا آٹھیں کھلے ٹکڑے بال وہ اسے اس شہر دہلی کی گتھی ہے جو عورت دہلی تھی اور جسے شہر کو نے آ کر نکالا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے بڑھتا ہے اور اسے کسی (Kiss) کر لیتا ہے۔ اس کی ماں بک جاتی ہے۔ بائیں بچھا کر اسے اپنے سینے سے لگا لیتی ہے اور اس کی پیٹانی آنکھیں اور اس کے ہونٹ چوم لیتی ہے۔

وہ اپنی ماں کے سینے پر لیٹا ہے۔ وہ اسے شہر کو کے کی کہانی سنارہی ہے جو سات مسند پار سے شاہ جہاں کی جادو لاکھ۔ کہانی سن کر وہ اس سے پوچھتی ہے۔ ”کیا تو بھی ایسی شہزادی سے شادی کرے گا۔“

”میں تم سے بڑا کروں گا۔“

”دھت چنگ انکھی سینے لگی ماں سے بڑا کرتے ہیں؟“

اور وہ اسے یقین دلاتی ہے کہ وہ اس کے لیے اپنی ہمیں ماہن بڑا کر لے گی۔

”میں بھر بھی چنگ لوں گا۔“ وہ چنگ کے سر ہانے لگی اپنی ماں کی حسین تصویر کو دیکھ کر ہنستا ہے۔

”ہاں۔ ہاں۔ یہ چنگ میں تجھیں اور تمہاری دلہن کو دوں گی۔“

اور وہ اسے سینے سے لگا کر بچھ لیتی ہے۔

”کیا بات ہے عہدیت بگو کہ ایک نہیں ہے؟“ کچا چنگ دلہن نکلی کے مل ہو کر اس کی پیٹانی اور بالوں پر ہار سے ہاتھ بھرتی ہے۔

”نہیں۔ بھگتوں؟“ سر کی ایک ہلکی سی جھنجھ سے ہاروں کو پر سے ہٹاتا ہوا کشلی ہنستا ہے۔ ایک ایسی مٹی، جو لکی سانس بھی معلوم ہوتی ہے۔

اس کی ماں نے تو کچھ ہی کہا تھا۔ دیر ہی ہونا ساتھ، مسین چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، جیسے ٹھنڈے، نازک ہونٹ، موتیوں جیسے دانت۔ اس واقعی اس کی دلہن اپنے ہی ہمیں لاتی تھی اور مادا ناک جھڑ میں جو اٹھتا ہوا دھت چنگ آتا تھا مگر اس نے برسوں پہلے کے اپنے دھتے کے سوا کچھ ہی دیا تھا۔

دلہن اس پر ہلکی ہلکی آنکھوں میں کہیں دور بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ جانتا تھا جتنی بھی کہ چھوٹا لعل کا اس کا جوش و خروش یک دم

سردیوں کا کیا؟ لیکن یہ ہائے کاس کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا اور نہ ہی تھاپ آ سکتی تھی۔ اس پر قہر اٹھی اس کے بال سہلے جاری تھے۔

کبھی چند لمبے چپ چاپ ہزار ہا بھر چاک اس نے دلہن کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ کبھی ہی دیر تک وہ اس کے سر کو اپنے سینے پر رکھے اس کے ہاتھوں، گالوں اور ہونٹوں کو سہلا تا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے دماغ سے تمام جا بے دور ہو گئے اور سینے پر اپنی دلہن اور اس کے گورے گلاب جسم کی گرمی اس کے دل و پریش میں ساگئی۔ اس نے آہستہ سے اسے چوم کر اپنے سینوں میں لٹا لیا اور اس کے گرم گلاب سینے پر سر کو کر لیت گیا۔ بار بار اس کا پیچا کر دوسرا اٹھنے اپنی بولی کو بڑا کر کے لیکن جیسے اس تصور کا سامنا کرنے کی اس میں تھپ نہ تھی وہیں لینے لینے ہائیں ہاتھ سے اس نے اپنا کلیانہ کرنا عاز سے تصور کے آگے رکھ دیا۔ پھر اس نے سراپا لی لیکن وہ تصور کو گواہ اس علی کے پیچھے چپ کر اور کبھی نہایت سوکھی تھی اور دلہن کے چہرہ پر کبھی دوسرے چہرے کے خطوط چنے لگے تھے نہیں تھیں نہیں اور جھٹلا کر دل ہی دل میں ہلکا اور بھر پور کر دیے ہی چٹ لیت گیا پھر نہ ہائے کیا گولہ ماں کے دل میں اٹھ کر وہ جھٹلا اور جھڑوئی سے باز لگ آتا۔

برآمدے کی پھللی سے چوت کی چاندنی بڑی شرمائی لگا ہوں سے اندر جمنا تک رہی تھی۔ لہو بھر کو وہ برآمدے کی محراب میں دکھ چپ چاپ باہر بجلی چاندنی میں بھٹا رہا۔ خطی ہوا کے لمس سے اس کے سنے ہوئے اصاب کو کچھ لمبی راستہ لی لیکن وہ چلتا نہیں بلکہ باز لگ آتا۔ دائیں طرف پھولوں کی روشنی میں لگا کر ہونٹا کھلے تھے۔ سامنے ڈیپا کے پوے، پھولوں کے ہارے تھے، بجلی ہوا کے جھوکوں سے پھول رہے تھے۔ گمان کے ان کے ساتھ کئی پھٹی مہندی کے پیچھے کھاری میں سوس نکلا تھا اور گلاب کی پل کے گرد گول تھا لے میں ہنسنے پھرتے دھیروں پھول گواہ اس چاندنی میں نہ رہے تھے۔ کبھی ان راستوں میں انکھ بھٹکا، پھولوں کے رنگوں کو جبک کر دیکھا، بے پہلی میں انہیں چھو تا ہوتا چلا گیا۔ سورج کی تیز روشنی میں جو پھول اپنی دلہن سے آنکھوں کو چھ لہو میا رہے تھے وہ اس تک پہنچی میں ہی دکھلے، ہر سکون اور فرحت پھل مسم ہوئے تھے۔ زرد اور لگا پتی رنگ، سفید سفید لہرے ہاتھ اور کمر سرخ، انڈیا جا جانی سیاہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ کالے کی چورہ باری کے پاس آئی کہ وہاں دکھا جہاں دیوار کے ساتھ ساتھ آواز بھرا جا چلا تھا۔ چارہ باری کے شمع تار یکے سامنے میں نیلے کے پھول سوتیلوں کی مانند چمک رہے تھے۔ پچھلے کب جب چاندنی راتوں میں وہ چلا نکلا اور کھٹا تو ہمیشہ کہیں چمے ہائے گیت کی ایک لہن اس کے ہونٹوں پہ لگ جاتی تھی اور وہ بے اختیار ہر کھٹا تھا تھا۔

بہت دنوں کے بعد نکلا جلا، میرا آگن مہکا

آگن مہکا

لیکن آج وہ بے گنج اس کا آگن مہکا تھا تو وہ گیت نہ جانے دھن کے کس تار یک گوش میں کھو گیا تھا۔ اپنے سنے ہوئے اصاب کے ساتھ وہ کالے کے گیت تک اور گیت سے کالے تک چپ چاپ کھنکھار رہا۔ پھر جب دوسری بار گیت سے دل میں آواز تھا تو اس کی نظر کالے کے دوسرے کنارے والے کمرے کے شیشے پر گئی۔ اندر روشنی تھی۔ اس کی ماں بیٹھنا جاگ رہی تھی۔ اس کی آبی اور دوسری عورتیں بھی جاگ رہی تھیں اور شاید انہیں کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ اس کی ماں نے سختی اور شوق سے اس کا گلہ عروسی چھایا تھا۔ سردان کنارے والے کھانے کے کمرے میں (جن کی بھر کر یہاں باہر برآمدے میں رکھ دئی گئی تھیں اور جس میں بھوکا تارا گیا تھا) ماں، بیٹی اور دوسری عورتیں

مکمل، مصلحتی، مانگ بھرائی اور مست و دکھائی کی دیکھیں پوری کرتی رہی تھیں۔ ساتھ کے ڈرائنگ روم میں دو اپنے دوستوں میں گھبراہٹ پڑ رہی تھی۔ اس کے اپنے کمرے میں دیا جہاں کے سنان میں خلیج کا سارا سامان اور فرنیچر رکھا جاتا رہا تھا۔ اور دوسرے کے پاس کوہنگ رات کے لیے کھانا پاتا رہا تھا۔ دیکھوں رسوں، مہمانوں کی آواز بھٹکتی اور دوسرے بیویوں کاموں میں ابھی اور کئی راتوں کی تھی۔ اپنی ماں کو اس نے پار پاس کمرے میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ آخری دور دور کے دھڑکنے کی اس کی ایک جہان نکل اس کام میں اس کا چہرہ دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی گویا اسے رات بھر اس کی دوڑ و دوپ، اتنی جانتی اور اسے دیکھ سوں کا حاصل پس ای کرے کی آواز کی زیر اثر تھی۔ وہ ایک بار یہاں سے آتا تھا کہ آواز دھڑکی تو دیکھے اس کی ماں اور آواز نئی وہاں کہا تھا کہ کراہی میں لیکن ہر بار اسے جھکا دیا گیا تھا۔ رات سے پہلے اسے دوسرے کھانے کی بھی اجازت تھی۔

دوستان سے باتیں کرتے رسوں میں شامل ہوتے اور عورتوں کے خلاف سختے ہوئے کیشی کی نظریں، پار پار اپنی ماں کے چہرے پر جا پڑتی تھیں۔ اگرچہ اس کی عراب پائیس کی ہونے کو آخری تھی، وہ پائیس برس کی طویل ہوئی نے کچھ عجیب سی تھی اس کے چہرے پر پیدا کر دی تھی اور اس کی آنکھوں کے گرد بچے سیاہ گڑھے بن گئے تھے لیکن سفید سفید کی سیاہی میں اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کی خوشی میں جھولتا اس کا چہرہ کیشی کو تو دوسری عورتوں سے زیادہ میں نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سیاہ حلقہ نہ پائے کس جاوے کے ذریعہ اثر نہ ہو گئے تھے۔ دیکھیں اور آخری دور مہمانوں کا خیال رکھتی ہوئی اس کی، ان وقت کمال کر چکا عروسی کو کھانے میں لگ جاتی۔ کھانا کا اس کے چہرے پر کبھی نشان نہ تھا۔

وہ جانتا تھا اتنی محنت اور شب بیداریوں کے باعث ماں پار پار جاتے کی ان دنوں وہ مہربان ہونے سے پہلے ماں کے پاس جا کر اس سے کہتا تھا۔ "بابا سو ہاؤ؟" لیکن خود سونے کی بجائے ماں سے اس کی پار پائی پر لے جا کر بٹکا سا چلنے کی کینچلیاں پر چلتی اس کی بھڑکیاں کو سہلاتی ماں سے سرخ و خروش میں جا چکی۔ کیشی کو بہت پہلے میں تیل ڈالنے کی عادت چ گئی تھی۔ اس حجام کے دنوں میں جب وہ رات رات بھر چڑھتا تھا اور ان کو ایک آواز بھٹکتی سنا جاتا تھا اور اسے نیند نہ آتی تھی تو ماں اس کے سر میں تیل لگاتی تھی اور اس وقت کیشی اپنے سر پر بچنے اس کے بچہ کو ایک لگ دیکھتا رہتا اور سوتا تھا۔ جب ماں پار سے اس کی آنکھیں بند کر دیتی تھیں۔ انہیں آہستہ سے چوم کر اس کی بھڑکیاں پر اپنی ڈھکی ڈھکی، بچوں جلدی جلدی چلاتی تھی اور کتا بیدار ان نرم انگلیوں میں بھرا دیتی تھی کہ اس کی ٹانگیں بھاری ہو جاتی تھیں اور وہ گہری نیند سو جاتا تھا۔ کیشی نے خود بھی پرانی اس سے سیکھ لیا تھا۔ کبھی جب کھانا یا کمرے میں کوئی نہ تھا تو وہ اس کے سر پر ہاتھ لگا کر بڑے ہی پیار سے اس کی کینچلیاں سہا کرے سلاتا تھا۔ جب وہ چھوٹا تھا، صبح وہ بچہ وہ جس کا تو ایسے میں ماں کبھی کبھی اس کا سر جھکا کر اسے چوم لیتی تھی۔ جب وہ بڑا ہو گیا۔ لی، اے، اہم اس کے بچہ خود ملی میں نفسیات کا پروفیسر ہو گیا تو اس ایسے موقعوں پر صرف اس کی بیٹائی چڑھتی تھی کہ بچہ بڑے پیار سے اسے چھینچا کر سلاتا تھا۔ وہ جا رہا تھا۔ شادی میں آئی ہوئی عورتوں میں گہری اپنی ماں کو اٹھائے اور اسے کمرے میں لے جا کر گہری نیند سلاتے لیکن وہاں تو وہ کوہنگ رات کے سنا کھانے میں لگی تھی، بھلاؤں کی کی کہ وہ نہ جانے اس نے کتنے آدمیوں کو کہاں کہاں بھیجا تھا اور کتنا پیسہ پائی کی طرح بھاتا تھا۔ وہ اس سے کہتا جانتا تھا کہ "ماں اتم کیوں جان بھائی کر رہی ہو، تمہارا بیٹا رات بھر ساری راتوں میں، مٹھوں، آرائشوں، زیورات سے بڑا ہے۔ میرے لیے اس کا سول ان سب سے کچھ زیادہ ہے تم پیار چڑھاؤ گی" لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس کی ایک نہ سننے کی۔ "میری شادی تو جیتے کچھ ہو چکی ہوئی تھی۔" اس نے کیشی سے ایک بار کہا تھا "تمہارے پاپا مصوبی ملک رکھے تھے اور کینچلیاں میں ابھی بیٹھے نہ

تھے۔ میں جھس چہ ہتی کہ تھاری بھو کے دل میں کوئی فتنا نہ جائے، بھولوں کا ایک گراٹک نہ آتا تھا میرے لیے۔ تم ذرا دیکھنا تھاری دہن کی کج میں کیسے جاتی ہوں۔“

اور جب جلد عروسی کا پروا اٹھ کر اسے اندر و خلیق اور ”نو کیو غلطی نہ کھارو“ رہتا۔ ”کبھی اور ہستی ہوئی اس کی جہان خانہ پہلی گئی تھی تو کبھی گھر بھر کو جہان سا کھڑا رہ گیا تھا۔ کمرہ اس کا چھوٹا تھا۔ چنگ اور دوسرا سا زو سامان بھی اس کا چھوٹا تھا۔ اس نے اپنا زینک نیل اپنا سنگھار دیا، سہریشی کا چھڑی کس کبھی سے لٹکایا ہوا اپنا چھتی نکل بسپ۔ سب کمرہ میں بیکاس ڈھنگ سے چار تھا تھا کہ ہر چیز اپنی اپنی جگہ تھو اس نظر آتی تھی۔ لیکن جس چیز نے کمرے کو سب سے زیادہ حسین بنا دیا تھا وہ تھے آقا زہرا کے سوچے کے پھول، چنگ پر چھرا دھنی نہ تھی۔ اس کے فریم پر چھائے ہوئے سوجن کے لیے بارہ دونوں جانب نیچے تک یوں لگے رہے تھے کہ بھولوں کی مسمری سی آتی تھی۔ چنگ پر بیٹے کے بھولوں کی سوئی پانچ بھی تھی جس پر لکھن بھولوں کی، پوری تھی، بلکہ سا کو گھٹے کا ڈیسے بیٹھی تھی۔

پہلے بھر کے لیے کبھی کی نگاہوں کے سامنے اس کی ہاں کی شادی کا سطر گھوم گیا تھا، خنار کے ایک معمولی ٹکڑے کی دہن۔ چھوٹی سی کھڑی، معمولی چار پائی، لاجپت کی مدھم روشنی اور آسمانوں کو چھوئی ہوئی آرزوئیں۔ اس کے پاؤں بعد میں ایک بکٹو اچھتر ہو گئے تھے۔ کمرہ میں کسی چیز کی کمی نہ تھی تھی، لیکن اس پاس دوسروں کو کبھی فراموش نہ کر گئی تھی۔ اپنے بیٹے کے جلد عروسی کو اپنی مرضی کے ساتھ تھی، ہاں اس نے اپنی نگہ خواہوں کی تکمیل کرنی تھی، لیکن وہی سجادہ کبھی کے لیے وہاں جان ہو گئی تھی۔ جدھر بھی اس کی نگاہ جاتی، وہی منظر اس کی آنکھوں میں ابھرتا۔

”دیکھنا ملا علی نہ کھارو رہتا۔“ اچانک کبھی کے ذہن میں خانہ کا جملہ اور فنی گونج اٹھی۔ تو کیا وہ اپنے ہی حال میں بھڑا ہے؟ اس کی دہن نہ جانے کیا سوچتی ہوگی؟ اس کے سامنے کئی واقعات گھوم گئے۔ جس میں پہلی رات مرد کی کھڑی دہن، دہن کی آرزو دہنی زندگی کو لے آئی۔ ”لیکن پہلی ہی رات مرد کے لیے اپنے کو مرد ثابت کرنا ناخوشی ہے؟“ یہ تو میں اس کے لیے کیوں اتنا تردد کرتی ہیں۔ کیا یہ سب کی سب دوسروں کی جلد عروسی کو جانے میں اپنی اپنی سہاگہ رات کا نصف بھر نہیں حاصل کر گئی؟ تو کیا اس کی اس بھی اس کے جلد عروسی کو جانے میں اتنی ہمت کرنا اپنا چنگ وہاں رکھ دینا۔ اسے بھولوں سے دیکھا جاوے جیسا کہ اس کے دل میں اپنے جلد عروسی کو سہا دیکھنے کی قضا تھی اور اس کے پاؤں کی فریب اور سہوئی کی جہ سے ہر چہ پوری نہ ہوئی تھی۔ کبھی نے سر کو جھکا دیا۔ اسے کیا ہو گیا ہے؟ اس نے کیوں کہا تھا، میں بھی چنگ اس کا؟ لیکن وہ تو چھٹا، کہا اس کی اس بھی چھ تھی؟

اور اس پر آدھے میں آ گیا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا۔ دہن عراب کے لیے کھڑی ہے۔

”طبیعت کچھ شراب ہے ہی؟“

”ابھی اس“

”کیا مجھ سے کچھ قصور ہو گیا؟“

کبھی کا ہی ہا ہا زور سے قہقہہ لگائے۔ ایک ہی بات اس کی دہن کے دماغ میں بھی بھرنا لگی ہے۔ اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے وہ اسے اندر لے گیا۔ اس نے لے کر لیا کہ اپنے داخلی دستکار کو بھٹک کر عروسی کرے گا جس کی سب توقع رکھتے ہیں۔ اس نے دہن کو خود ہی اپنی سے چار پائی پر لٹا دیا۔ گھٹکے سے اس کے جاؤز کے ٹپ ٹپ کھول دیئے۔ وہ اس پر جھکا۔ لیکن دہن نے نگے کو بھر اس کی جگہ پر رکھ دیا تھا۔ کبھی کی

نظر پڑا اپنی اس کی تصویر پر مگی اس کا دماغ بھر دھندلا گیا۔ وہ اٹھا باہر جانے لگا تھا کہ لیکن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”کیا بات ہے بیٹی؟“

کیشی کی نظر درمیاں کی دردناک وہ کی طرف گئی۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ماں نے اپنے اس کمرہ میں اس کی سہاگ رات کا اہتمام کرنے کی بجائے اس کے اپنے کمرہ میں وہ سب انتظام کیا ہوتا۔ لیکن اب تو اس کا کمرہ جھیز میں آئے ہوئے فرنیچر اور دوسرے ساڑھوساہن کا گودام بنا ہوا تھا اور اس کی چالی بھی اس کے پاس نہ تھی۔

نہایت جھوٹی سے اس نے باہر برآمدے کی طرف دیکھا۔ چاندنی اب بھی بدستور جھلسی سے چمن چمن کر رہی تھی۔ اچانک اس نے کہا۔

”دیکھنا دیکھیں چاندنی کی مٹی ہے۔ آؤ اورا ہمارے گھوس بیٹا۔“

دلہن مگی اس نے اپنے بے ترتیب لباس کو درست کیا ایک نگاہ غلط انداز آنکھ میں ڈالی۔ بالوں کی دو ایک لٹوں کو ٹھیک کیا اور آگے بڑھا۔
 گھونگھٹ کا زور کیشی کے پیچھے ہوئی۔

دوبار برآمدے سے گئے تک نہ روکھتے سے برآمدے تک چپ چاپ کیشی آئی۔ دلہن نے ایک دوبار چاندنی کی تعریف میں ایک آدھ جملہ کہا لیکن کیشی کو خاموشی دیکھ کر وہ بھی چپ چاپ اس کے ساتھ چلتی رہی۔

پہلی کی چاندنی غیر مرنی خراب کی مانند اس کی رنگہ رنگہ میں ساری تھی لیکن وہ دونوں اس کی جانب سے بے نیاز تھے۔ دلہن کو اپنے شوہر کے اس عجیب رویے سے الجھن ہو رہی تھی۔ اپنی کہنیوں سے (جن میں سے بکھودو بچوں کی مائیں تھیں) کو پیکی رات کے حلقے اس نے جو بکھو کر دکھا تھا وہ جیسے اس کی گرفت میں آ کر دوڑ چلا جاتا تھا۔ اپنے شوہر کی خوبصورتی، اس کی قابلیت اور فرض شناسی کی اس نے بہت تعریفیں کی تھیں مگر کیشی کی معذرت رنی میں وہ بد فیض تھا اور ایلانی نے نہ صرف اس کے سانچے پر بد فیضوں بلکہ اس کے شاگردوں تک سے اس کے حلقے ہر طرح سے ہر طرح کی سطوات حاصل کی تھیں اور چندی طرح مطمئن ہو کر ہی انہوں نے یہ دھوکہ منظور کیا تھا۔ اس کا ہونے والا نتیجہ بھی ہے یا اس کے دماغ کا کوئی ہندو اسیلا ہے؟ یہ تو کسی نے بھی نہیں کیا تھا۔ اپنے شوہر کی اس بے رخی کے حلقے سوچتی اور اپنے مستقبل کے قدموں سے ہٹاؤ میز اندیشوں میں گرفتار لیکن کئی کئی اپنے شوہر پر نظر ڈال سکتی اور چپ چاپ اس کے ساتھ چلے جاتی۔ چاندنی کی طرف اس کا ذرا بھی دھیان نہ تھا۔

اور کیشی کا دماغ ایک دھڑلہ بنا ہوا تھا۔ وہ کچھ بھی سوچ نہ پا رہا تھا۔ دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے کئے۔ انہیں ہاتھ کی کھائی کو انہیں ہاتھ سے پاندے سے کھدے آ رہا تھا۔ وہ چپ چاپ لیٹے ہار رہا تھا۔ جب وہ دوسری بار گت تک پہنچے تو اچانک کیشی نے کہا۔ ”آؤ اورا ہمارے گھوس۔“
 ”رات کاٹی ہو گئی ہے؟“ دلہن نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

کیشی کو اچانک اپنے ایک دوست کی یاد آ گئی جس نے کبھی اپنے لئے حلقے کا تھہرنا سے ہونے اس سے کہا تھا کہ پانی کی مٹی سے گروڈز ٹک دوڑ کے بھاگ تک سڑک اتنی سنسان، سایہ دار اور پراسرار تھی ہے کہ مجھت کرنے والوں کے لیے اس سے بہتر کوئی سڑک نہیں۔
 اور وہ بولا۔ ”میں ڈرا پانی کی مٹی تک جا نہیں گئی۔“

کیشی ہلکا ہاتھ کھول کر ہار بٹھا۔ پانی کی مٹی کہاں ہے۔ لیکن کو مسطور نہ تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چل چکی۔ کیشی اسے

وہاں کا حدود اور پھرتانے لگا کہ کس طرف کون سی عمارت ہے کس طرف تو وہاں پہلے لڑا تو ترہیلے سے کے مگر جزا افسران رہے تھے پھر کیسے آزاد کی کے بعد وہ لوگ چلے گئے اور وہ چٹکے بندوستانوں کے قبضہ میں آ گئے۔ آگاہی کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے بتایا کہ وہاں کیسے آ جا اور میں وہ چار کیا جاتا ہے۔ کیسے وہاں آنکوں نے کوڑا اسٹور تھکا جا رہا ہے۔ جہاں وہاں آنکوں میں آلو ہر سال اسٹور کر کے بیچتے ہیں۔ پر اس کے پاس پہنچ کر اس کی کڑکیوں کے شیشوں میں سے وہ بڑے جوتے سے روڑی مشین کے کام کرنے کا ڈھنگ اسے سمجھانے لگا۔ کس طرف ایک جانب سے کاغذ لگتا چلا جاتا ہے اور دوسری جانب سے پورا انبار چھپ کر اور مرکز رکھتا جاتا ہے۔ وہ آنکھیں کی طرف چلا ہوا تھا کہ اسے کب سے بھر پانی کی ٹنگی سے گرفتار رک رک روڑا کی کٹھالی کی یاد آئی اور دوسرے کریلے پر بھٹک کی جانب ہوا۔ بھٹک بدلتا۔ مال جی دیکھ کر کٹھالی سے تھکا۔

”یہ بھٹک بھی ایک سمیت ہے۔ چوبیسویں گزری ایک شاہک گاڑی گزرتی رہتی ہے۔ اتنا بڑا انٹینسٹی بن گیا، لیکن اس بھٹک کی قسم نہیں جا گی یہاں بلے ہنے تو سمیت دور رہا۔“

گاڑی آنے میں ابھی دو تھری بج رہے دست سے نکل کر وہ پانی کی ٹنگی تک آ گئے۔ دائیں جانب مرکز کھلی اور روشنی تھی۔ بائیں جانب تاریک اور ساپا۔ وہ چپ کٹھنی اور سر سے لگا تو ایک ہار بھر لیکن نے تھکا۔ ”پہلے اب گھر چلیں۔ رات کافی ہو گئی ہے۔“ لیکن کٹھنی نے اسے اپنے دائیں بازو میں لے لیا۔ ”ہلو“ دھک دھک پلٹے ہیں۔ کٹھنی کٹھنی ہوئی چاندنی مرکز پر کھلی ہے۔“

”اس جانب کیوں نہیں گئے گاڑی کھلی مرکز ہے۔“

”کیوں ڈارنگا ہے؟“ اور ڈارنگا ہوتے ہوئے بھٹک کراس نے لٹھن کی پوچھائی چوسنی۔

”لیکن خوب کراس کے بازوؤں سے نکل گئی۔“ کیا کرتے ہو مرکز پر !!!“

کٹھنی نے منہ کر بھڑا اپنے بازو میں لے لیا۔

”کون ہے یہاں اس وقت؟“ منہ کراس نے اسے چوسنا چاہا لیکن منہ سے سے جڑ روٹنی اس کی آنکھوں میں چڑی اور تھک ہر بعد ایک بغیر باڈی کا رک گزرتا تھا ان کے پاس سے نکل گیا۔ ابھی ان کی آنکھوں کی چکا چوندور بھی نہ ہوئی تھی کہ دوسرے کی حق آنکھوں میں کودی اور مرکز ایک کے بعد ایک ویسے کٹھنی ٹک گزرتے جاتے کہاں سے آ رہے تھے اور کہاں جا رہے تھے۔ ”کیا طوط سنہاں اکیلی مرکز ہے؟“ کٹھنی نے دل ہی دل میں کہہ اس کا سارا بدن ہوا ہو گیا۔

”پہلے اب چلیں۔“ لیکن نے ہر پہلے ٹک کی حق دیکھ کر ہی اس کے بازوؤں کے منہ سے نکل گئی تھی۔ تقریبا دھکے لگے میں جا۔ میں تھک گئی ہوں۔“

”یہ کا پورہ وہاں ہے دن رات یہاں ٹک اور موٹر گزرتی ہیں۔“ کٹھنی نے اسے سمجھا یا۔ ”پتلا ہم۔“ ٹی انٹری کی جانب چلنے ہیں کر ہٹک بالکل موٹی مرکز ہے۔“

”دائیں چلے ابیں تھک گئی ہوں۔“ لیکن منہائی۔

لیکن اسے ہر بازو میں بھرتا ہوا کٹھنی طری انٹری کھلی مرکز پر بڑھ چلا۔

مرکز کی دونوں جانب بنگلوں پر چاندنی خاموش برسی رہی تھی۔ گھبرتی تھرتی، جیسے نیران کھلی مرکز، بنگلوں پر وہ خوش کے بچے اندر سے اہالے کے ہال۔ جیسی کہیں سے خوشی کا ایک تھوڑا سا آیا۔ کٹھنی کے تصور میں چاندنی کی کھلی سکرانی رات دانی گھوم گئی یہ

سافسٹنڈا کو صطربا رہی تھی۔

کیشی نے دلن کو بلکہ بازوؤں میں بھر لیا اور سڑک کے کنارے بیڑوں کے سامنے میں ہو گیا۔
”کیا بہت تھک گئی ہو؟“

دلن نے جواب نہیں دیا۔ اپنے جسم کا پورا بوجھ اپنے شوہر پر ڈال دیا اور بیچ کے سارے میں اسے اپنے سینے سے لگائے کیشی نے اسے چم

لایا۔

جھکی ہوئے سڑک سے پار تھی روشتی چٹکی۔ دونوں الگ ہو گئے۔ کیشی کارنگ فلی ہو گیا اور دل دھڑک اٹھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ
ایکملی لاکڑ میں ہارو کے بعد گھومنے کی اجازت نہیں۔

پروہویں کا چاند ہوا، یا آفتاب ہو
جو بھی ہو تم، خدا کی قسم آفتاب ہو

گہری بری دریاں پہنچے تھیں پار فونی کسی نئے ظلم کا ماحول ماسٹکانا گاتے پاتھنی کے باوجود تاروں ان پر پھینکتے ہوئے سڑک سے گزار
گئے۔ ان کی جہی انہی سنتے ہی کیشی نے پاجا تھکا پائی، دلن کو پانیوں میں گھر لے اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا لگائے۔

پروہویں کا چاند ہوا، یا آفتاب ہو

لچکی فونیوں کی پھیری نے اس کا سارا دھول غم کر دیا۔ اسے ایک دوست کی یاد آگئی جو ایم۔ بی لاکڑ کے ایک بھگ میں اپنی بہن کے
ساتھ تھانے پر آیا تھا۔ باتیں کرتے کرتے بارود بیگئے تھے۔ جب سارا مے بارو کے الگ الگ رکشہ نہ بنے تھے وہ پیدل آ رہے تھے تو انہیں
پہاویوں نے روکا اور دوست کو کہہ ایس بھگ پر پہنچ کر تابت کرنا پڑا کہ وہ اپنی بہن ہی کے ساتھ وہاں کھانے پر آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ دلن گھر
پہنچی تھی کیشی، انہیں لودا۔ جب فونی نے گانا گاتے گاتے پار تھی کی روشتی اس کی بہن پر ڈالی تھی تو مارے غصے کے کیشی کانچی پاجا تھا کہ
اسے کال سے باز اور تھیلے اسے جس دے لیکن اگر کوئی اس سے پچھتا کر پوچھ روشتی کا پوچھ پڑائی، دلن کے ساتھ آدمی رات کو اس سٹان مقام پر
کیوں گھوم رہے؟ تو وہ کیا جواب دیتا اور اس کا سارا قصا پائی، اس پر اس چنگ پر لودا پائی جتنی کڑوہوں پر امن پڑا۔

”تو تھو تھو پینا دیکھ آ یا۔“ دلن ڈرلا اس سے پیچھے کھینچی پٹی آئی۔ بھگ میں پہنچ کر اپنا ک کیشی کی چال دیکھی ہو گئی تھیں وہیں نہیں رہی۔
سکھتی ہوئی دو بی بی پٹی آئی اور ہا کر چنگ میں غصہ لگی۔ کیشی جب کمرہ میں داخل ہوا تو وہاں گھنٹی بجی کسے چپ لٹھلی تھی۔ سازشی کانچ ایک جانب
لٹکا تھا۔ جواز کے کھلے لگے اس کا کمرہ میں بیٹھے کی طرح ٹھکڑا ہوا تھا۔ کیشی کانچی پاجا وہاں گھنٹوں کے بل بیٹھے فرش پر بیٹھ جائے اور اپنا سراس
نی کو میں دیکھ دے لیکن اپنی بیوی پر سے کھینچتی اس کی نظر پھر شعوری طور پر اپنی ہاس کی اس تصویر پر پھیلی گئی اور وہ دھڑب ڈب کے ہم میں کمرہ کے
درمیان کھڑا رہا۔

دلن چپ چاپ جھپٹ کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھیں لڑبڑا رہی تھیں۔

کیشی کی نظر میں اچانک سچ کے دروازہ پر گھمیں اور اس نے کہا۔ ”یہ کمرہ تو پامیر سے بند ہے۔“

”کی؟“ دلہن نے اسی طرح بہت پر نظر میں دعا سے جواب دیا۔

کیشی نے کمرہ کے در پر ہنکڑا گئے۔

”اس کی پانی کہاں ہے؟“

”آئی کے پاس ہوگی۔ سب سداں انہیں نے رکھ لیا تھا۔“

کیشی باور کھل۔ کاج کے دوسرے کونے تک گیا۔ اس کے کمرہ کی حق جھجکتی تھی۔ جھکی ہوئی سرخیں سوئیں تھیں۔ اس کے دل میں آیا کہ کوہنگے نکلے خال تک جی اور اس نے مذاق کر دیا تو۔ وہ وہیں بھرا کمرہ میں آ کر کچھ تو گھوم رہا۔ اس کی نگاہ دلہن پر پڑی اور وہ اسی طرح بہت لعل جھست کو تنکے ہار دی تھی۔ اچانک بہت کراس نے سچ کے کمرہ کا دروازہ پیچھے کی طرف دھکیلا۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور نیچے کی چٹائی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر صرف اوپر کی چٹائی تھی تو اوپر کا شیشہ تو ذکر کھول لے گا لیکن اس کی اس بہت کوالوں کی پٹی چھتیاں لگاتی تھی۔ پیچھے ہٹ کر اس نے دروازہ پر ایک نظر ڈالی۔ دونوں کوالوں میں تھیں تھیں ٹھٹھے لگے تھے اور پھر لکڑی کا پلہ تھا۔ اگر وہ تیسرا شیشہ توڑ دے تو باہر اداستے پر پلنگ چٹائی کھل سکتی تھی اور اس کے سی میں آیا کہ وہ کایک حکمہ در کیشیت پکن چور کر دے لیکن تھیں داندوں کے پاؤں نے کانیال اس کے جوش پر غصہ سے پانی کا پھینکا تھا۔ دونوں مضہیاں کمر کے پیچھے داندہ د کمرہ میں گھومنے لگی۔ دو تین چکر لگا کر وہ دروازہ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کی نظر میں دروازہ کے چلے حصہ پر پڑیں۔ دائیں کواڑ کا کتا چھت کھایا تھا۔ نوک یک ہا کر اس نے دیکھا۔ روئی میں ایک ہلکی سی ٹیکہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ پیچھے اس نے چنگ کی پٹی سے لگائی اور اپنی کا پیچہ حصہ کواڑ کے اس پوٹے کھائے حصہ پر اڑا کر پچ دروازہ لگا دیا۔ دروازہ تو نہیں ہلا لیکن چنگ پیچھے کاٹک گیا۔

بہت کی طرف جھکی ہوئی دلہن اسی طرح لعل دی۔ چنگ کے پلے کا پیچھے اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اچانک کیشی نے اس پر ایک چور نگاہ ڈالی۔ دلہن نے اس کی جانب دیکھا۔ نہ جانے ان نگاہوں میں کیا تھا؟ ٹھوکی ایک ظریف سی جھک۔ جو کسی غیلی کے کرب دیکھنے والوں کی آنکھوں میں جھپتی ہے۔ کیشی کے سر پر جوں سوار ہو گیا۔ اس کی سوچی سمجھی ساری قوتیں سب اوٹھیں اچھل کر وہ اٹھا اور بڑا کراس نے دروازہ کا کتا پچلے سچ کے شیشہ پر دے مارا۔

شیشہ جھجھکا کر ٹوٹ گیا۔

دلہن لعل نہ ہوئی۔ تھوڑا گھبرا کر وہ داخلی اور اپنے شوہر کے پاس آ کر کھڑی ہوئی۔

”آپ کیا کر رہے ہیں؟“ اس نے پچ کر کہا۔

کیشی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی جانب دیکھ تک نہیں۔ نوٹ پچھ شیشہ میں سے ہتھوڑا دل کراس نے جھجکتی گھولی۔ اس کے ضم کے پوچھ سے اچانک دروازہ پیچھے ہٹ گیا۔

دائیں ہاتھ سے کواڑ کا تھم کیشی نے آہستہ سے سنبھال کر ہاتھ باہر نکالا تو جھکی کھلی کے اوپر غرائی آ گئی۔

”ہائے آپ کیا کر رہے ہیں؟“ اس کی پٹی نہیں سے طون رہتے دیکھ کر دلہن نے گھرانے ہوئے نکلیت آ میز لچے میں کہا اور اس کی غور و نگاہیں سارے کمرہ میں گھوم گئیں کہ کہیں جکھلے۔ جس سے وہ دھڑلے پئی داندہ دے۔

کیشی نے اصرار کیا نہیں دیا۔ دونوں ہاتھوں سے کواڑ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔ مضافی انگلیوں سے اس نے نکلی کاغذی دیا۔ کمرہ میں جھیز کا سارا سامان گڈھ چڑھا۔ فرنیچر ڈریسنگ ٹیبل الماری۔ کپڑوں کی گھڑیاں۔ میوے مٹھائیوں کے قندیل۔ ایک جانب وہ چنگ بھی چڑھا۔ جو جھیز میں آیا تھا اور اس پر سہ ہزار کپڑے لٹے تھے۔ دونوں ہاتھوں میں ہر گز اس نے کپڑے صوف پر پٹکے۔ لیکن اس کے پیچھے اندر آگئی تھی اس کی آنکھوں میں ٹھوکی جگہ بھر خوف نے لے لی تھی اچانک پٹ کر کیشی نے اسے دونوں کانٹوں سے تھام لیا۔ پل بھر وہ ان ڈری۔ کبھی آنکھوں میں جھٹکتا رہا۔ پھر پکا یکے اس نے اسے دونوں ہاتھوں میں بھر کر چوم لیا۔

لیکن اور بھی جسم کئی لکھن چنے شوہر کی آنکھوں میں اس نے کرنگھی کی جگہ ہے بناو صحت پائی اور اس کے گرم ہڈیوں کا لمس اپنے کانوں کے گواہوں کے نیچے گردن پر محسوس کیا تو اس کے سہارے اٹھنا چیلے چڑھنے اور وہ اس کے ہاتھ جھانپنے لگی۔

علی الصباح اس باہر آئی تو جگہ عروسی کا دروازہ چھوٹا کھلا دیکھ کر چوکی اور سب پاؤں بڑھ کر اس نے پردہ درہنایا۔ دلی دھبک سے روکنا۔ آٹھ آٹھ کمرہ بھاگنے بھاگنے کر ہاتھ۔ اچانک اس کی لگاؤ بیچ کے کھلے دروازے کے نزدیک فرش پر کھڑے شیشہ کے ٹکڑوں پر گئیں۔ چوری کے خوف سے ٹھہرا کر وہ اصرار بڑھی۔ چوٹ ہی میں ہی کڑی رہ گئی۔ کوچ کی گدیوں سر کے پیچھے کئے جھیز کے کمرے سے چنگ پر اٹھا لیکن بے حس ہوئے تھے۔



خانہ عالی میں رہا اب بھی دشمنوں کا اہت کا مطالعہ جاری ہے۔

اشرف صہابی کو کچھین اور کرکین میں، ہائی اور پرائی کی صحبت بھرس رہی جنہوں نے وطن کی بربادی، آکھنوں، دیکھی اور کانوں میں کا احوال دیا تھا۔ چپکے میں اور کرکینوں کی صورت میں، سنا ہوا اشرف صہابی کو اس قدر بھائی کی تکمیل کو دیکھیں دل نہ لگا۔ چپکے اور کرکین میں دوستی تھی تو کچھ بھی زیادہ بھائیوں بھٹرا احمد اور شاہد احمد دہلوی سے، اور کچھ بھی، اشرف صہابی کو اچلی اور اسے جو کچھ اچھی تھی۔

ملازم کے زمانہ میں پہلے چھانے اپنے چٹوں کے ساتھ چٹا کر گرج کی کاوس دیا اور دفنہ دقتہ کا بستہ کی کاکیوں کی گھجی کے لیے ساتھ بٹانے لگے۔ یوں ان کے عقد اور بلند خوانی کی گھجی بھی ہوتی گئی۔۔۔ لائق اسے جسے انھیں برس کی عمر میں اپنے بہو چھامو کی خیر الدین احمد دہلوی کے مجدد کا نام ”دو چھان شیر“ کی تقریباً کہیں، یہ ۱۹۲۳ء کا قفس ہے۔ اشراف صدیقی نے ۱۹۳۹ء میں مختلف اک و پار کی ملازمت اختیار کی اور اس سال خاکہ نگاری اور مافسانوں کی کا آنا چاہا۔ لیکن ان کی شہرت ہلور شاعر اور طبیب ۱۹۲۷ء سے ہی جو پہلی تھی۔

[illegible]

اولین مطبوعات

”تقریباً وہاں ٹھہر کر انیسویں صدی کی تمام مکتوبات کو طبعی قوت سے ۱۹۲۳ء

تقریباً آٹھ (8) ملین روپے:

۱۔ "ری کی جنرل ہفتا" (۷۷)

مطبوعہ: المجلس ترقى العلوم (پنجاب) طبع اول ۱۹۳۳ء

کتابخانه ملی افغانستان

- ۲۔ "جمہور کے" (خانکے/افسانے) کتب خانہ علم و ادب، دہلی
- ۳۔ "ہندو اکادمی بری" (ترجمہ۔ ناول) کتب خانہ علم و ادب، دہلی طبع اول: ۱۹۳۰ء
- یہ کتاب انگریزی سے ترجمہ کردہ ہے۔ طبع دوم ۱۹۳۳ء سے اس کتاب کا نام بدلے "کرد و کیا تھا، جیسرا لے لٹن ۱۹۳۶ء میں آیا۔ اس کتاب کا دوبارہ تراجم سعید دہلوی نے لکھا ہے
- ۴۔ "سینہ بانی راجی" (ترجمہ۔ ناول) کتب خانہ علم و ادب، دہلی طبع دوم: ۱۹۳۵ء
- مقدمہ از مرزا محمد سعید دہلوی
- ۵۔ "سوسل کے سوداگر" (ترجمہ۔ ناول) کتب خانہ علم و ادب، دہلی
- ۶۔ "غبارِ کارواں" (خانکے/افسانے) کتب خانہ ادبیات کراچی طبع اول + ۱۹۷۰ء
- ۷۔ "دھوپ چھاؤں" (ترجمہ۔ ناول) دارالاشاعت و نصاب، لاہور طبع اول ۱۹۵۹ء
- یہ نثر لکات کے انگریزی ناول کا ترجمہ ہے۔ کل صفحات ۵۱۴
- ۸۔ "انگلی دیا" (ترجمہ۔ ناول) کتب خانہ علم و ادب، دہلی
- یہ چلتی معنوں آتی۔ اس چالک کی ناول کا انگریزی کی معرفت ترجمہ ہے۔ اس ناول کو دوسری بار میری لاہوری، لاہور نے "انگلی دھرتی" کے عنوان سے شائع کیا۔
- ۹۔ "ناشکر انگوٹھی" (ترجمہ کہانیاں) عقیدل اکیڈمی، لاہور
- یہ دایرہ الاس کی انگریزی کہانوں (بچوں کے لیے) کا ترجمہ ہے۔ جو سوسل فرینٹھن نند پارک کے تعاون سے شائع ہوا۔
- ۱۰۔ "بیاہر بچہ" (ترجمہ۔ کہانی) علامہ اعلیٰ ایڈ سنٹر لاہور
- یہ ایڈ وارڈ کی تصویر کہانی (بچوں کے لیے) کا ترجمہ ہے۔ جو سوسل فرینٹھن نند پارک کے تعاون سے شائع ہوئی۔
- ۱۱۔ "ہدم آفیز" از فیاض (مغرب: اشرف مہدی) انجمن ترقی ادب، لاہور
- کتب کو مشعل انصاف کی لڑچک کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔
- ۱۲۔ "سترانے گوہر" (بچوں کے لیے) مطبوعہ: کتبہ جامعہ دہلی طبع دوم۔
- ۱۳۔ "نونی کی شادی" (بچوں کے لیے) مطبوعہ: کتبہ جامعہ دہلی طبع دوم۔
- ۱۴۔ "بدھ شتر ہری" (بچوں کے لیے) مطبوعہ: کتبہ جامعہ دہلی طبع دوم۔
- ۱۵۔ "شریر لڑکا" (بچوں کے لیے) مطبوعہ: کتبہ جامعہ دہلی طبع دوم۔

۱۶۔	"ایمانداری" (کہانی۔ بچوں کے لیے)		
۱۷۔	"بچوں کی کہانیاں" (بچوں کے لیے)	انوار احمد پریس، الہ آباد	طبع اول س۔ ی
۱۸۔	"بچوں کی ہشیا" (بچوں کے لیے)		
۱۹۔	"مصلح شہزادہ" (بچوں کے لیے)	صدر ای بک ڈپو	طبع اول ۱۳۳۹ھ سے قبل
۲۰۔	"شہزادہ نے نوازا" (بچوں کے لیے)		
۲۱۔	"صبر بادشاہ اور" (بچوں کے لیے)		
۲۲۔	"صوفی تاراج تھے چاند" (بچوں کے لیے)		
۲۳۔	"سحر امن عطا" (بچوں کے لیے)		
۲۴۔	"گوہر شہزادی" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی	طبع دوم
۲۵۔	"ہرن کا دل" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی	طبع دوم
۲۶۔	"باغستان مست" (بچوں کے لیے)		
۲۷۔	"شہر شیر" (بچوں کے لیے)		
۲۸۔	"بادشاہ کی سازش" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی	طبع دوم
۲۹۔	"بادشاہ کا چٹا" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی	طبع دوم
۳۰۔	"بھری جوتی" (بچوں کے لیے)		
۳۱۔	"اگر کی کھجور" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی	طبع دوم
۳۲۔	"درا کی مانی" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی	طبع دوم
۳۳۔	"بادشاہ کی لکڑی" (بچوں کے لیے)		
۳۴۔	"رحمت" (بچوں کے لیے)		
۳۵۔	"سر کے والی" (بچوں کے لیے)		
۳۶۔	"رحمت شہزادہ" (بچوں کے لیے)	مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی	طبع دوم
۳۷۔	"نہاں لے" (بچوں کے لیے)		
۳۸۔	"نہا کہانہ" (بچوں کے لیے)		
۳۹۔	"انوکھی ہاتھی" (بچوں کے لیے۔ باغیچہ)	مطبوعہ شیخ غلام علی ایڈمنسٹریشن	طبع جانی ۲۰۰۷ء
۴۰۔	"چار بے خوف" (بچوں کے لیے۔ باغیچہ)	مطبوعہ شیخ غلام علی ایڈمنسٹریشن	طبع جانی ۲۰۰۷ء

ان مطبوعہ تحریروں کے علاوہ لاتعداد کہانیاں، دریائی بیچر، دریائی ڈرامے اور مطالعہ مختلف رسالوں میں نکھرے چکے ہیں۔ مرتب شدہ غیر مطبوعہ کتب درج ذیل ہیں۔

۱۔ کہانوں کی کہانیس (تحقیق)

۲۔ ”بھگت کے موتی“ (معشرت علی کے ادا شادات گرامی کا ترجمہ مع شرح)

۳۔ ”مزا یہ تھا میں“

۴۔ ”خوار سلاطین کی جھمکیاں“ (اسلامی تاریخی واقعات)

۵۔ ”توجہ کے دہس میں“ (انگریزی سے ترجمہ کہانی)

۶۔ ”پلوں کے دہس میں“ (انگریزی سے ترجمہ کہانی)

۷۔ ”یہاں مہوتی“ (انگریزی سے اقصاءات / تاریخیں / نظمیں)

رسالہ ”ساقی“، ”دہلی“، ”پہنستان“، ”دہلی اور ”ناٹو“ ”سراچی“ اور ”میر“ درج ذیل مواد غیر مرتب شدہ حالت میں موجود ہے۔

۱۔	”دراہم و دینار“	مطبوعہ ”ساقی“، دہلی	درج ۱۹۴۷ء	ص ۶۳
۲۔	”تسفر حیات“	مطبوعہ ”ساقی“، دہلی	جولائی ۱۹۴۷ء	ص ۶۱
۳۔	”اے کیوں ہم نے دیوالی“	مطبوعہ ”ساقی“، دہلی	اپریل ۱۹۴۸ء	ص ۱۴۴
۴۔	”واہ بچس“	مطبوعہ ”ساقی“، دہلی	اپریل ۱۹۴۸ء	ص ۱۵۰
۵۔	”طوب تھا جو کہو کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا“	مطبوعہ ”ساقی“، دہلی	اکتوبر ۱۹۴۸ء	
۶۔	”شہر سے سی سی“	مطبوعہ ”ساقی“، دہلی	جولائی ۱۹۴۹ء	ص ۱۰۵
۷۔	”فولادی حلق“	مطبوعہ ”ساقی“، دہلی	جولائی ۱۹۴۷ء	ص ۱۳۱
۸۔	”نئی روشنی کا اندھیرا“	مطبوعہ ”ساقی“، دہلی	دسمبر ۱۹۴۷ء	ص ۵۳
۹۔	”تھکے مٹی کی ایک جھلک“	مطبوعہ ”ساقی“، دہلی	جنوری ۱۹۴۸ء	ص ۴۱۸
۱۰۔	”زلی کا ایک سطر“	مطبوعہ ”ساقی“، دہلی	اپریل ۱۹۴۸ء	ص ۸۸
۱۱۔	”تروکی چنڈت“	مطبوعہ ”ساقی“، دہلی	مئی ۱۹۴۸ء	ص ۳۸
۱۲۔	”تاریخ کا ایک سطر“	مطبوعہ ”ساقی“، دہلی	اگست ۱۹۴۸ء	ص ۴۰
۱۳۔	”مختصر حالات مولانا بشیر الدین احمد“	مطبوعہ ”ساقی“، دہلی	اپریل ۱۹۴۸ء	ص ۳۳
۱۴۔	”تقریر دہلیان بشیر“ (بشیر الدین احمد)	مطبوعہ دہلی	۱۹۴۳ء	
۱۵۔	”اروڑ“	مطبوعہ ”پہنستان“، دہلی	جنوری ۱۹۴۸ء	ص ۴۱

۱۵۶	مطبوعہ "ساقی" دہلی،	جولائی ۱۹۳۹ء،	ص ۱۵۶
۱۵۷	مطبوعہ "ماہو" کراچی،	ستمبر ۱۹۳۹ء،	ص ۲۵
۱۵۸	مطبوعہ "ماہو" کراچی،	جولائی ۱۹۵۰ء،	ص ۳۰
۱۵۹	مطبوعہ "ماہو" کراچی،	اگست ۱۹۵۱ء،	ص ۸۵
۱۶۰	مطبوعہ "ماہو" کراچی،	دسمبر ۱۹۵۳ء،	ص ۳۹
۱۶۱	مطبوعہ "ماہو" کراچی،	اگست ۱۹۵۴ء،	ص ۳۱
۱۶۲	مطبوعہ "ماہو" کراچی،	نومبر ۱۹۵۴ء،	ص ۵۱
۱۶۳	مطبوعہ "ماہو" کراچی،	جون ۱۹۵۵ء،	ص ۳۵
۱۶۴	مطبوعہ "ماہو" کراچی،	اپریل ۱۹۵۶ء،	ص ۵۷
۱۶۵	مطبوعہ "ماہو" کراچی،	فروری ۱۹۶۱ء،	ص ۴۴
۱۶۶	مطبوعہ "ماہو" کراچی،	ستمبر ۱۹۶۱ء،	ص ۳۵

وفات سے قبل مستقل ہے:

کوڑی ہوسر، E/۵ چاک ۵ / سائیکشن اقبال، کراچی

نظر یہ فن:

"قلم کاروں سے کہہ رہا ہوں کہ وہاں پہنچا"

اعتراف صہبائی دہلی

موٹے آکا

اشرف صہوتی

خود کے بعد اپنے باری ہستی تو، فی ہوتی ہستی تھی۔ مرزا ولی اللہ ایک اچھی عمرے ہیں، جن کو کوٹلی تھا کہ سوچا اس ایک طرف کھڑے ہو جائیں اور راکریں، جس سب کی چوٹیں چھاننا اور اپنی چوٹ کرتا نکل جائیں گا۔ مگر چھپے دستوں میں ایک آکا مسٹے جگہ کا دم باقی رہ گیا تھا۔ جنہیں لوگ عام طور پر ”موٹے آکا“ کیا کرتے تھے۔

چاؤنی بازار میں شاہویدائے بڑے قاضی کے حوض کی طرف چوڑی، الوں کے ٹکے کے برابر جانور ڈاکا کمرہ ہے۔ اس کمرے کے نیچے اب تک ایک دکان رہ گئی کی ہے۔ اس زمانے میں یہاں مرزا لیا نہاں ایک کھجوری، ناٹا ساقد، ہاتھ بھرے کمرے، ڈنڈے پھیلائے بیٹھے رہ کر کیا کرتے تھے۔ آکا مسٹے جگہ اپنے آخری دنوں میں ای کمرے پر آ رہے تھے اور اس لیے صبر کے بعد مولانا مرزا لیا نہاں کی دکان کے آگے موڑ دیے یہاں کی دھک تھی۔ اپنے ڈیل ڈول اور نکلے جڑے کے آدی اب دیکھنے میں نہیں آتے۔ نکل بچوں کا پورا صوفہ ہے۔ بڑا حباب میں چرے سے خون چھتا تھا۔ آواز لگی کمری کو بولتے تو چہ مطور ہوتا شیر گرج رہا ہے۔ جسم کی کمال تو اب تک گئی تھی، لیکن ذہنوں کی پھلیاں اب بھی ایسی جاننا تو تھی کہ کیا جہاں جو ہنگی توئی جاسکے۔

کہتے ہیں کہ شاہی میں اس کے والد اپنے وقت کے بڑے ہاکے تھے۔ انہوں نے بھی قلم میں پورے پائی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد جس وقت تک انظر سراج الدین کا چراغ ٹھٹھا مارا، قلم ہی میں رہے۔ خود ہوا تو زنی ہو کر تپہ ہوئے۔ چھوٹے تو وہاں سے چھپچھپے، اور جڑ عمر میں دلی آئے اور جب تک جینے انکے بیٹے۔

آکا کی نسبت سنا ہے کہ باک میں اپنا تانی نہیں رکھتے تھے۔ باک نخر ہاڑی کا کام ہے۔ کبھی کبھار کی چھریوں سے اس کی مشق ہوتی تھی۔ پھر کھڑکی کی چھریاں ہو گئیں۔ اس میں بہت سے داؤں بھی ہوتے ہیں اشتہار بہت کوزا، انگلیں مٹھو، گواہ غلی، ہاڑ بندہ وغیرہ۔ جس طرح بوٹ کی چوٹیں کاری کبھی ہاتی ہیں اسی طرح اس کے داؤں ملا انہیں میں اس کا استعمال کب ہوتا تھا، کب انہیں مطوم۔ داستانوں میں عیاروں کی

مغز رازی بنی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہنگ مغلوں میں جب گوار چلانے کی ہنگ بنی ہوگی تو مغز اور کنار سے کام لیا جاتا ہوگا۔ بہر حال یہ بھی ایک سپا یا ڈن تھا اور اس کے چائے والوں میں آ کا بھی ہے۔

آ کا کی شہزادی اور کبھی کی عام طور پر شہرت ایک انتہائی واقعہ سے ہوئی۔ ان دنوں شاہی بلا کے بڑا زلزلہ، ساڑھوں کا اکھاڑ تھا۔ تیسرے چوتھے روز ضرور ایک آدمی کشتی ہو جاتی۔ سیالوں کے حضور لگ جاتے۔ اس میں کبھی کبھی بھاگ دوڑ میں لوگوں کے چوٹیں لگ جاتیں مگر یہ کبھی ایک یہ بھی۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ آ کا یا درجہاں کی دکان کے آ کے موٹے سے پتہ کر بیٹھے ہی تھے کہ شاہی بلا کے بڑی طرف سے ایک شور اٹھا، مظلوم ہوا کہ کوئی بڑی جڑ جھوٹی ہے۔ اسے میں ساڑھوں کراتے ہوئے قاضی کے عوض کی طرف چلے۔ لوگ ادھر سے ادھر ہوا ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔ یا درجہاں نے آ کا سے کہا کہ پتہ کرنا اسی طرف ہے۔ آ کا نے قس کر جواب دیا مرزا آدمی نہیں، چاندروں سے کیا بھاگنا، آ رہے ہیں تو آنے دو۔

ساڑھوں کو اپنے زور دکھانے سے کام تھا۔ کوئی روغن میں آ جانے کی کسی کا خواہنا لٹ جانے میں کی جاتے۔ اسے میں ساڑھوں نے دکان کے آ کے آ کر پیگ جڑ لٹے۔ اب پھر یا درجہاں نے کیا

”آ کا دکان کے لوہے پر کیوں نہیں آ جاتے؟“ آ کا بھر بیٹھے اور کہنے لگے۔

”مرزا دیباں بھی ایک ساڑھو بیٹھا ہے۔ آ نے تو وہ۔“ یا درجہاں بکھرا کر کہتا ہی جاتے تھے کہ ساڑھو آڑے ہو کر لڑنے لگے۔ سڑک پر تازہ تازہ پھڑکاڑا ہوا تھا۔ دکان کی طرف جس ساڑھو کی پشتہ تھی اس کا پاؤں رچا اور دوسرا اسے رگیدتا ہوا چلا۔ آ کا کے موٹے سے کے قریب چاری کے نیچے اس نے گھٹنے ٹیک دیے۔

آ کا ”بس کبھی بس۔ اب اس نے گھٹنے ٹیک دیے۔ تم ہی مٹ جاؤ۔“

لوٹ بیٹھے گئے کہ آ کا چاندروں سے بھی ایسی باتیں کرتے ہیں، جیسے آدمیوں سے۔ بھلا ساڑھوں کی پیش کے۔ وہ چار نے آ کا سے اصرار بھی کیا کہ کبھی حیدری، انجی نہیں، اپنے موٹے حاد بنا لے کر آ کا قلعہ ہے۔ قلعہ اب چاہی تھپد کے مصداق انہوں نے جب دیکھا کہ گرے ہوئے کو دوسرا مارے جاتا ہے تو آ کشین چڑھا کر بولے ”نہیں، آ کا اب کیا میں انہوں؟“

اسے میں پھڑکاڑا ہوا ساڑھو چاری کے برابر کھالیا لیتے تھا تو اور دوسرے نے اس کی چھاتی پر گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ آ کا نے اٹھنے ہی پہلے تو پہنچاتے ہوئے ساڑھو کی کوئی پر ایک ات۔ رسید کی۔ اسے تو کو تو ملی گیا، بلکہ پھیل گیا اس نے آ کا پر حملہ کرنا چاہا تو آ کا نے اپنے دلوں ہاتھوں سے اس کے دلوں۔ پیگ پکڑ لیے اور ایک دو میں اس کو سڑک کے چچ میں لے گئے۔ ساڑھو نے جھرمجری لے کر پیگ پھڑانے چاہے۔ ساڑھو کا جھرمجری لینے تھا کہ آ کا نے گاڑا کھوکھاواں کیا۔ ساڑھو اڑا اڑا کر زمین پر آ چڑھا تھا جس میں حیرت چھائی ہوئی تھی۔ ساڑھو کے گرتے ہی شور مچ گیا کہ آ کا وہ کیا بات ہے، کچل کچل کا گاد کھوڑا جتنا دیکھا ہے۔

ساڑھو کے چڑھنے آ کا نے اس کے منہ پر چھو کر دیا اور بولے ”اسی برتے پتہ کا کا موٹے حاد اٹھوا رہا تھا۔ اب اب سیدھا چلا جاؤ، رہنے ہے جھرمجری حلال کروں گا۔“ ساڑھو کوئی ایک صحت تو پیچ چڑا رہا۔ پھر اٹھ کر ایسا بھاگا کہ پیٹے کر نہیں دیکھا۔

اس واقعہ بھی دینی کشمکش اور کشمکش وغیرہ کے بنگلوں پر چل پڑی دیکھ کی کمر نہیں لایوں میں لگ کر جایا کرتی تھیں۔ وہ جب حکام سے ملنے آ زادی کے ساتھ اور اپنے کو لے دیے۔ حکام بھی ان کی ویسی ہی عزت کرتے۔ برابر کی ملاقاتیں ہوئیں مگر کچھ تو کام کی باتوں کے

طاو و شہر میں جو اچھے کی بات ہوتی اس کے متعلق رائے دیاں کی جاتیں۔ مسلمانوں میں ذہنی ہادی مسیحین خاں، شکر اور دہلیہاں شاد اور بعد وہاں میں مالہ بلاچہ شاد و ضرور مالہ، مخصوصیت کے ساتھ اس بات کا خیال رکھتے کہ وہاں ہر کوئی حرف نہ آئے۔

اچھا، آ کا مطلب ایک کی سائے کے کشتی کے بعد جو ذہنی ہادی مسیحین خاں کی ذہنی کھٹر بہادر سے ملاقات ہوئی تو کہیں اس واقعہ کا بھی ذکر کیا۔ صاحب نے یہ چھاپا کہ آ کا کون شخص ہے۔ ہم اس کو دیکھنا چاہتے ہیں؟ ذہنی صاحب نے کہا: ”ایک ہا میں شہری ہے۔ بخاری اور خاص کر بانک کے لہجے کا جانتے والا اب ان کے ساتھ بیٹھنے والے میں دوسرا نہیں رہا۔ وہاں کے دیکھنے کا سوال شکر کو بلا تاخیر پانڈری ہا زار میں ہر لحاظ اور سے کمرے کے پیچھے کی نشست ہوئی ہے۔ جب لی جا جاوے نکل جائے اور دیکھا ہے۔“

صاحب بہادر: ”وہ ہمارے بچے پر نہیں آئیں گے۔“

ذہنی صاحب: ”انہ کا ذہن سے آپ واقف نہیں۔ بے ملاوٹ یہ یاد میں ہوں کہ وہاں میں تو کھٹے نہیں اور کھٹے بھی تو پہلے یہ فیصلہ کرنا کہ کہاں ٹھکانے جائیں گے۔ کس طرح ان سے گفتگو کی جائے گی۔“

صاحب بہادر: ”لیکن وہ زانا اور تھا۔ ان پر مالہ دستوروں کے ہم پائے نہیں۔“

ذہنی صاحب: ”آپ پانڈری نہیں دہو تو پانڈری ہیں۔“

فرضی ای طرح کی روداد کے بعد صاحب نے وہ دیکھا کہ کچھ کم کریں گے اور عزت کے ساتھ بیٹھیں گے۔ ذہنی صاحب نے کہا کہ میں ادھر دیکھیں کرتا لیکن کوشش کروں گا کہ انہیں آ کر آپ سے ملا دوں۔

آ کا کی نشست آ کر مسیحین خاں کے پاس رہتی تھی۔ چنانچہ ہادی مسیحین خاں نے ان کے دربار سے آ کا کو ذہنی کھٹر کے بچے پر پہلے کے لیے بھیجا۔ کیا اور صاحب کا چٹلی تھی کہ میں نے جی کوشش کے بعد آ کا کو جناب کی ملاقات کے لیے رفاہیہ کر لیا ہے۔ آپ جو ان اور وقت مقرر کریں انہیں لے کرہ ضرور ہوں۔ امید ہے کہ آپ ان کی راجہ بھٹکھڑا لائیں گے۔ صاحب نے ہادی مسیحین خاں کی چٹلی کا فوراً جواب دیا۔ ملاقات کا دن اور وقت مقرر کر کے وہ دیکھا کہ ملاقات چھک لٹی ہے اس لیے وہ محتاج ہوگی۔

چنانچہ جب ذہنی صاحب آ کا کو لے کر صاحب کے بچے پر پہلے اور اطلاع دہنی تو وہ ملاقات باہر نکل آئے۔ ذہنی صاحب چٹلی سے آدمی تھے اور ان کے مقابلہ میں آ کا کے ذہنی ذہنی اور چہرے پر نظر پڑی کہ ایک شیر ہے۔ ذرا دھمی چڑھی ہوئی، جسم کا رنگ مٹل کے ہار یک اگر کے میں سے پھوٹا چڑھا تھا۔ حیران رہ گئے۔ آ کے جڑ سے۔ پہلے ذہنی صاحب سے ہاتھ ملایا پھر آ کا سے، معلوم ہوا کہ فلاو کے بچے میں ہاتھ ڈال دیا۔ صورت دیکھنے لگے۔

صاحب (آ کا سے): ”آپ اچھے ہیں؟“

آ کا: ”اچھا تو خدا کا نام ہے اور وہ ہوں۔“

صاحب (ذہنی صاحب کی طرف دیکھ کر): ”کیا مطلب؟“

ذہنی صاحب: ”آ کا صاحب کا مطلب یہ ہے کہ آپ جیسے حاکم جس شہر میں ہوں وہاں برائی کا کیا کام۔ خدا کی اس مہربانی کا نظریہ ادا کرنے کے لیے ہم زندہ ہیں۔“

صاحب (آ کا سے): ”گھٹھا پہ کی ملاقات کا بہت شوق تھا۔“

آ کا "آپ کی مہربانی۔"

صاحب "آپ کے تعلق میں معلوم ہوا ہے کہ آپ پلازاری کا مہر لوبہ جانتے ہیں۔"

آ کا "پلازاری کبھی، میں سمجھا نہیں۔"

صاحب "مہم میں قویوں کے سامنے ٹکڑیوں سے جو ٹکھیل کھیلنے ہیں کیا آپ وہ نہیں جانتے؟"

آ کا "صاحب خدا خدا کچھ ایک ستر و س کے بڑے کو ٹکھیل سے کیا نسبت۔"

صاحب "ہم نے تو بڑے سے بڑوں کو کھیلنے کو دے دیکھا ہے اور ہمارے بڑی صاحب کہتے تھے کہ آپ ان کے استاد ہیں۔"

آ کا "ہاں انہوں نے وہ چار گنا نیاں مجھ سے نکلی ہیں۔"

صاحب "گنا نہیں کیا؟"

آ کا "ٹکڑی کے ٹکڑی کے داؤں یا چوٹیں۔"

صاحب "تو کیا اس میں بھی کھیلنے کو دتے ہیں؟"

آ کا "ٹکھیل کو تو پلازاری یا انوکھی میں ہوتی ہے۔ ہاں اور ٹوٹ کو ان بڑے ہر ٹکڑوں سے کیا تعلق؟"

صاحب "ہاں اور ٹوٹ میں کیا ہاتھ پاؤں ہلاتے نہیں دتے؟"

آ کا "ہلاتے دتے ہیں لیکن صرف ضرورت کے وقت۔ ٹوٹ کے تو نام ہی سے لیا ہر ہے کہ اس کی کوئی اونٹ نہیں۔ اس کے داؤں

سے جس کی نہیں سکا۔ ہاں وہاں بیٹھے بیٹھے اور لیٹے لیٹے بھی اپنا داؤں کر جاتا ہے۔ جس طرح ٹوٹ کے لیے کسی تھوڑا سا ہونا لازمی نہیں۔ اس

کا ہاتھ والا داؤں کی کر دے ہندو کی کوئی کام لے سکتا ہے۔ اسی طرح ہاں کے اگر کسی کو داؤں رو داؤں بھی وہاں ہیں تو مقابل کے

سارے تھوڑا سا ہونا۔"

صاحب "لیکن یہ ٹکڑے ڈانے میں شاید کچھ بکرا آدہ ہو۔ آج کل ہندو اور پرا اور کے مقابلے میں اسے کھانا ادا ملنے کرنا

ہے۔"

آ کا "ہندو اور لہجے کے سامنے واقعی ہاں اور ٹوٹ کی کارگیری کچھ حقیقت نہیں رہ گئی۔ آپ کا مرثا دجا ہے۔ مگر ایسے بھی تو بہت

سے سوتے آدی کو کھینچا جاتے ہیں جہاں یہ چیزیں نہیں ہوتیں۔ لہذا ہاتھ پاؤں سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔"

صاحب "وہاں سے ہر ٹکڑے اور ٹکڑے ہم لوگ بھی اسی مطلب کے لیے پکھتے تھے۔ لیکن، پرا اور کے مقابلے میں اب یہ چیزیں صرف

ٹکھیل بھی جاتی ہیں۔"

آ کا "ٹکڑے اور ٹکڑے کیا ہوتا ہے؟"

صاحب "کھوٹے پلازی اور شیر زلی۔"

آ کا "میں نے یہ ٹکھیل نہیں دیکھے۔ اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے اس کی کھینچی اور ٹکڑی کے ٹکڑے کے مقابلہ میں اس کی کیا حیثیت

ہے۔"

صاحب "میں نے بھی دلا بہت میں ان دونوں میں چھانکالی چھانکالی۔"

آکا "بہت مبارک! لیکن کبھی ان کے دکھانے کا کوئی موقع بھی ملے۔"

صاحب "کیا مطلب؟"

آکا "میرا مطلب یہ ہے۔ جب سے آپ نے یہ فون نکھے ہیں، آپ کو کبھی دشمنوں سے متاثر نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ جب تک انکی صورت غائب نہیں آتی کسی فون کی حقیقت نہیں نکلا کرتی۔"

صاحب "مجھے تو کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ مگر ہمارے ملک میں ایسے واقعات بہت ہوتے رہتے ہیں۔"

آکا "وہ لوگ گھونے کے مقابلے میں گھونے اور گھونے کے مقابلے میں تو اسی جلاتے ہوں گے۔"

صاحب "قطعی۔"

آکا "اگر کسی کو گھوننا پڑی نہ آتی ہو تو اس کے پاس نہ ہو اور دشمنوں میں مگر جائے۔"

صاحب "تو اس کی موت ہے۔ دشمن اس پر تلے پائیں گے۔"

آکا "لیکن ہمارے اہل اختیاروں کے بغیر کبھی اپنے جانے والے کی جان بچ سکتا ہے۔"

صاحب "ہاں آپ تو اس کے مقابلے میں تو اس گھونے کے جواب میں گھونے کی ضرورت نہیں۔"

آکا "بالکل نہیں۔ بلکہ ایک دوسرا بدوق اور ملہ کی زد سے بھی بچ سکتے ہیں۔"

صاحب "میں نہیں سمجھ سکتا۔"

آکا "سادہ کے مقابلے میں میرے پاس کیا اختیار تھا؟"

صاحب "مگر سادہ تو جانور ہے۔"

آکا "آپ کا تھے ہمارے سوتے پر کیا کرتا سادہ کی بیوی سے کیا کر چھ؟ گھونے تو اس پر کا گزرتے ہوئے۔"

صاحب "(کیونکہ وہی کر)" "اچھا آپ اس سے کسی گھونے باز کے مقابلے میں کیا کریں گے؟"

آکا "کوئی گھونے باز سامنے ہوتا تو ان، ایک گھونے کے بعد شاید اس کا ہاتھ دوں گھونے کا سکے۔"

صاحب "ہم آپ کی اس شگنی کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں اپنے طریق پر اگر گھونے، اس تو آپ کیا کریں گے؟"

آکا "(بہت کر)" "مگر میں آپ کو گھونے، اسے کی حد تک نہیں دوں گا۔ آپ حاکم وقت ہیں اور میں ایک گوشہ نشین مسکین ہوں۔"

صاحب "کیونکہ میں نہیں۔"

فری صاحب "کوئی دوسرا اگر یہ اس وقت دلی میں ایسا نہیں جو گھونے بازی جانتا ہو؟"

صاحب "(کھنکی طرف دیکھ کر)" "تھو میں ایک سکر ہمارا دوست ہے، گھونے بازی کا پرمعلاق ہے۔ وہ شاید ابھی آجائے۔"

اسنے میں رہنے آ کر بھڑکا کر دیا۔ صاحب نے اسے اندر بلا دیا۔ "وہ چار اوقوں کے بعد صاحب نے بھڑکا کر جی میں

کہا۔ اس نے آکا کی طرف بطور دیکھ کر فری کی پہلی اردو میں بولا "تم بڑا عا آدمی ہو۔ میرے گھونے بازی کرنا اچھا ہے؟"

آکا "بازی بازی ہم کبھی نہیں جانتے۔"

بھڑکا "بھڑکا؟"

آکا "تم گھونٹ چلاؤ، ہم دیکھیں وہ کیا چڑ ہے۔"

بھیر "تم کیا کر سکتا۔ اگر مر گیا؟"

آکا "ٹون صاف، لیکن اگر قبہرا ہاتھوں نے مچا۔"

بھیر "(قبہرا کر)" کچھ ہوا نہیں۔"

آخر فیصلہ یہ ہوا جہاں تک ممکن ہو ضرب شدہ سے، حیاتا درگئی جائے۔ چنانچہ بھیر صاحب نے گولٹ ۴۱۰ دیا۔ فیصلے کی آستینیں چڑھا

لیں اور آکا کی طرف اشارہ کیا کہ "آکے میدان میں۔"

آکا "آپ گھونٹ بازی شروع کیجئے۔"

بھیر "(بٹ کر)" بیٹھے بیٹھے لڑے گا۔"

آکا "لڑا کچھا قبہرا سے صاحب کو ایک ڈراما سا چلا، دکھاتا ہے۔" بھیر صاحب نے اپنی کھنکھ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے سید بازی

صمیم سے دیکھا، سید صاحب نے "ران چلا دی۔ صاحب نے بھیر کو اشارہ کر دیا۔ وہ جیخراہڈ اٹھ کھولے چلاتا آکا پر چلا۔ آکا دیکھتے رہے۔

جب بھیر صاحب آکا کے قریب پہنچے، اور گھونٹان کے منہ پر مارنا چاہتا تو ایک مصمم ہوا جیسے کسی درخت کا گدا لگا۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی جناب

بھیر زمین پر چپٹ چپٹ ہوئے، دکھائی دے اور آکا صاحب پہلے کی طرح اڑنے لگا۔ اٹھان سے کڑی پر جیسے تھے۔ صاحب اور اپنی صاحب انگو

بھیر کے قریب تھے۔ پوچھا "کیا ہوا؟" کہنے لگا۔ "بھیر بکھڑا نہیں مصمم۔ ہم نے گھونٹ مارنا چاہا، پڑھے نے ہاتھ مردہ کر رکھیں گے۔"

صاحب (آکا سے) "ہم تو بکھڑا نہیں دیکھ سکتے۔"

آکا "آپ کہاں چلے گئے تھے۔"

صاحب "ہم نے سمجھا تھا کہ آپ کے کئی کام بھیر صاحب کے لئے سے دو چار منٹ مقابلہ ہو گا اس لئے پوری توجہ نہیں کی۔"

آکا "تو اسے فنی میں مقابل سے کھلاڑیاں کرنا تھا یا مسمی؟ بھیر صاحب نے گھونٹ مارا، ہم نے کیلی کر کے انہیں بچھاؤ دیا البتہ اتنی

۔۔۔ یہ کہ کہ ان کا ہاتھ سلامت رہا۔ کراپے صوفے پر واقعی کوئی دشمن ہوتا تو کئی اتر جاتی یا بارہا ٹوٹ جاتا۔"

صاحب "کیلی کیا؟"

آکا "بھیر چھینے کا ایک داغ ہے، مارنے والے کا ہاتھ پکڑ کر مردہ رہے ہیں۔"

صاحب "مگر آپ نے تو کھلی کی ہی بھرتی کی۔"

آکا "اگر ہر فنی میں بھرتی ہی سے سارے داغ ہوتے ہیں۔"

بھیر صاحب نے دو چار منٹ تو اپنے ہاتھ کو رہا چلے سے لے کر کھانے تک سہلایا۔ اس کے بعد آکا کے قریب آکر آکا کو پہلے تو جے

خوار سے دیکھا۔ ان کی تجویز پر بل تھکڑوں پر جنم، اس کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ بھیر بڑے تھاک اور لہا یہیے شہد ویشانی کے ساتھ آکا سے

باجھلا یا تو کہا کہ "کیا آپ طمچا اور بدھاتی کی کوئی کا مقابلہ بھی کر سکیں گے۔"

آکا "بدھاتی مارنے والا اگر سامنے ہے تو ایک دلہو شاہ اس کی کوئی بھی بچا چاہیں گے۔"

صاحب "ہاں لیکن ہے۔"

آکا: ”آپ نے گھوٹے بازی کا تماشا تو دیکھی کیا۔ اب ان سے کہیے کہ ٹھنڈ چلائیں، اٹھائے جا تا تو پٹنے سے پہلے ٹھنڈ میں پرچا ہو گا۔“

صاحب نے بھڑکی طرف دیکھ کر اس سے انگریزی میں کہا کہ گئے باقوس اس بڑے کا بچہ کال بھی نہ کر لینا چاہیے لہذا۔ راجہ اور میں کاروس نہ ہوتا کہ اسے قصاص نہ پہنچا اور صاحب نے اپنا راجہ اور لاکر بھڑکوا دیا۔

آکا اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ بھڑنے راجہ اور ہاتھ میں لایا اور دو چار قدم پیچھے ہٹ کر راجہ اور تاتا۔ راجہ اور بدھاتی کی طرف نہ ہانڈھ کر نہیں مارا چاتا بلکہ اس کی نالی داؤنی کر کے آہستہ آہستہ حمار کے مقابل پر جمو گئے ہیں۔ چنانچہ بھڑنے راجہ اور ابھی سید صاحب بھی نہیں کہا تھا اور اس کی گھوڑی دہانی پا چتے تھے کہ آکا ایک اٹھواں اپنی جگہ سے اڑے۔ راجہ اور کی نال سیدھی ہوئے نہیں پانی تھی، ہاتھ پیچھے آئی، ہاتھ کر آکا کے ہاتھ کی گدی اس کی کھائی پر اس زور سے چڑی کہ راجہ اور چھوٹ کر زور چاچا اور بھڑکنا صاحب ہاتھ بکڑ کر رہ گئے۔ آکا بھڑکنا سے اطمینان کے ساتھ اپنی کری پر جا بیٹھے۔

صاحب ”آپ نے کیا کیا؟“

آکا (مسکراتے ہوئے) ”اے بہت کئی کہتے ہیں، میرے پاس گھوڑی ہوتی تو یہی داناں گھوڑی سے نہ تار گھوڑی نہیں تھی، میں نے گھوڑی کا کام اپنے ہاتھ کی گدی سے کیا۔“

صاحب ڈپٹی کمشنر بہت صعب ہوئے۔ سید ہادی حسین خاں سے آکا کی تعریف کی اور فرمایا ”کو آ رہے ہم سے کبھی کبھی ملے رہیں تو اچھا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد کا رخصت ہو کر گھر آ گئے اس روز سے مرزا اور لڑکی دکان پر بیٹھنا بھی نہ کر دی۔

اب ایسے لوگ کہاں قصہ کی بھاری کھی یادگار ہیں تمہیں، وہ بھی اٹھ سکیں۔



رشید جہاں

نام	رشید جہاں انگلہ عرف "رشیدہ"
لقب -	رشیدہ جہاں / ڈاکٹر رشیدہ جہاں
تاریخ انکس	۲۵ اگست ۱۹۰۵ء بمقام دہلی
دولت	۲۹ جولائی ۱۹۵۲ء لندن، (سکولہ سوویت یونین)
تعلیم	میٹری کالجیشن و پبلک مسلم گرلز کالج، پٹنہ ۱۹۳۶ء
	ایف۔ ایس سی اے جیلا تھوہری کالج، گھنٹہ ۱۹۳۸ء
	ایم۔ بی۔ بی۔ ایس لیڈی مارڈیک سنڈیکل کالج، دہلی ۱۹۳۳ء، ۱۹۳۴ء

مجلس شورای اسلامی

ایچ۔ بی۔ بی۔ ایس کرنے کے بعد ج۔ بی میں نیکل سروس اختیار کی۔ میڈیکل ملازمت کے سلسلے میں کانپور، (انڈیا ڈائریکٹری ہسپتال) بی۔ ایچ۔ او۔ (کانپور میڈی ہسپتال) تکھنوں میں قیام را۔ انڈیا میں جیولاجی کی پالی ٹیکنک میں۔

۱۹۳۳ء میں محمود الحسن (دکنس پرنسپل ایم۔ اے) کو کالج امر قمر سے بھرا کالج میں شادی کے بعد سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو کر ہمسفر آئیں اور پانچویں پرنسپل شروع کی۔ ساہوا اور بے تکلف مدد بہت دور لڑاکا مشہور تھیں۔ ۱۹۳۳ء میں درج والعقیدہ، دکنسی ہوئیں اور کراکھور کے لباس میں بیویوں نظر آئیں۔ چڑیاخیں کہیں اور بیٹل کافی۔

۱۹۳۷ء میں میاں بی بی سب کچھ چھوڑ چھاڑ دے رہے تھے۔ وہ انہی پر جب غمزدہ نظر نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دیا تو دونوں بزرگوار نے میں، راکش پر ہنسنے لگے۔ وہاں کچھ وقت شدید جہاں نے ہر راجہ جنت پر یکسٹھ بھی کی لیکن زیادہ تر دونوں نے سانی دھاسی کاموں میں اپنے آپ کو مصروف رکھا۔ واضح رہے کہ رشید جہاں کے والد شیخ عبداللہ نے کاموں میں اپنے آپ کو مصروف رکھا۔ واضح رہے کہ رشید جہاں کے والد شیخ عبداللہ صرف بیاباں میاں اور والدہ امجدہ جہاں کچھ صرف "اعلیٰ بی" اپنے زمانے کے بہت بڑے سانی کارکن تھے۔ وہ مسلم گزرا سکول

اس مجموعے میں گیارہ افسانے بعنوان "اللہ ری"، "مکرم کون"، "نالی پر بس، نخاس نکستہ"، "سچدا کی ماں"، "فیصلہ"، "مضطر"، "آصف جہاں کی بہو"، "دو"، "سہاس اور بہو"، "اندھے کی داغی"، "دو بھل گئی" اور "چند بات" کے علاوہ ایک فارا شامل ہے۔

اس کتاب میں گیارہ افسانے بعنوان "الطمانی"، "آصف جہاں کی بہو"، "چندر"، "نسودا"، "سچدا"، "دو"، "سہاس اور بہو"، "سہرا ایک سطر"، "بے زبان"، "مکرم کون" اور "مضطر" کے علاوہ چھ ڈرامے بعنوان "گوشہء حلیت"، "بندہ جانی"، "پہرے کے پیچھے"، "پڑوسی"، "عورت" اور "کائنات و لا" کے علاوہ ایک مضمون "عقبتی پریم چند اور ترقی پسند ادیبوں کے جہلی کاغزوں" شامل ہے۔ کتاب کا آغاز "اعتراف" کے عنوان سے آئندہ نرائی ملانے اور فیضی لفظ سید نور الحسن نے لکھا ہے۔ کتاب میں رشید جہاں سے متعلق باجوہ حکیم اور ڈاکٹر پرکاش کے مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔

نوٹ: رشید جہاں نے کل تیس افسانے اور نو ڈرامے تخلیق کیے۔ اگرچہ دی میں مضامین اور افسانے اس کے علاوہ ہیں۔

غیر مدقّقان:

رشید جہاں کے جملہ انگریزی افسانے اور چھ مضامین نامال کیا گئیں ہو سکے۔ مضامین کے عنوانات ہیں: (۱) پریم چند اور ادیبوں کی جہلی کاغزوں، (۲) بیکاری آواز، (۳) دو ادب میں انتخاب کی ضرورت، (۴) عورت گمراہ ہے، (۵) ادب اور عام، (۶) چند نظریات

نظریاتی فن:

"میں اپنے افسانوں میں یہی کوشش کرتی ہوں کہ جو صرے خیال ہیں ان کی ترجمانی ایمانداری سے کروں۔"

پہلا، "سہرا بھجرین افسانہ" مرتبہ محمد حسن مسکری

نئی بہو کے نئے عیب

رشید جہاں

نونا جی کی سی سے انہوں نے ہلر شروع کیا اثر دیا۔

اے بھئی کیا پچھتی ہو کہ تمہاری ساس کیوں خفا ہو رہی ہیں۔ ان کی عادت سی ہے۔ جو آئے گلے سب کے سامنے سے ادا کرنے کو چاہتی ہے۔ ساری دنیا کے عیب بھئی میں ہیں۔ صورت میری بڑی نرئی ابھو بڑی میں بچوں کو رکھنا میں نہیں چاہتی اپنے بچوں سے گلے دشمنی میں کی میں جی غرض کہ کوئی برائی نہیں جو مجھ میں نہیں اور کوئی خوبی نہیں جو میں میں نہیں۔ کہ میں کھا کھاؤں تو زبان پر نہ کہہ کر غور انھوک دین کی ہو۔ وہ ہمارے گھس کی کہہ دی ہے کہ دوسرا بھی نہ کھا سکے۔ شروع شروع میں تو مجھے کہہ کھانے میں کافی دلچسپی تھی۔ تم چاہتی ہو کہ اپنے گھر پر بھی اکتا کھا لیتی تھی اور میری ساس کو اکتا کھا کھا کھا آتا ہے کہ اپنے رشتے داروں میں ہر جگہ مشہور ہیں۔ یہاں تو جھپکا پکا میں برائی تھی کہ کھک تو دیکھو زبردست ایسا کہ مٹی کھاؤ ایک دن خود ہی بڑے پکائے کہ ہمارے سر نے کہہ کر ایسے واقعات بڑے کس نے کائے ہیں۔ خوب بڑا ہو گئیں کہ جس قسمیں تو بہو کے ہاتھ کی چیزیں ابھی مظلوم ہوتی ہیں۔ ساری عمر یہی تو کھانا کھاتی رہی ہے۔ اب میں کیا بولتی خوب سننے کہ تمہارا ممبر بڑا۔ میں نے سوچا کہ کام کرو اور پائیں گی سنو تو اس سے بھرتی کرو۔ کھائے پکائے ہو ہی کیا ہے۔

چھلے ہونے میں جو کچھ کھانا ایک آدھ چڑ دوڑی سے سلاواں تو بس پھر سنو۔ میٹوں پر آئے گلے کے سامنے نہ کر۔ ہوتا ہے کہ چارلی بہو صاحب تو حکم صاحب ہیں۔ وہ تو دوڑی سے سلاواں ہیں۔ ہر چڑ دوڑی سے سلاواں ہیں۔ ہر چڑ اپنے بچوں کی، ان کے کرتے پائے خود ہی بنی ہوں لیکن کچی کھانا کچی قسم کی بناؤ یا کوٹ کوٹل چو بنے گلے تو دوڑی کوڑے دیتی ہوں۔ چھپا کر دیتی ہوں۔ پھر بھی میں کے اسے بھر میرے پیچھے گئے جے ہیں کہ ہر بات کی فخر کر دیتے ہیں۔ جب میں ٹی ٹی آئی تو ان کا ایک بچن کا کرتہ میں نے ہی دیا تھا۔ ہر ایک کو کھانا کھا اور برائی کی گئی۔ جو دیکھے چپ ہو جائے۔ اچھے خائے کرتے کی کوئی کچھ برائی کر دے۔

جب کسی نے برائی نہ کی تو اس کو سارے کو میز ڈالا اور پھر کچی اور سے سلاواں۔ دل تو میرا بھی چاہا کہ اب سب کو کھاؤں۔ لیکن میں یہ

کیسے کر سکتی تھی۔ دو بڑا ہونے اور سانس بٹنے کا فائدہ اٹھاتی ہیں۔ ہر وقت چار ساکن ہوئے کا طعنہ ہے۔ کوئی کتاب میرے ہاتھ میں دیکھیں تو ہل جاتی ہیں۔ کسی کو کھڑکھٹا دیکھ لیں تو سمجھتی ہیں کہ ان ہی کی برائی کھڑی ہوئی۔ کوئی بات ہی ان کو میری پسند نہیں اور سب سے بڑی بات جو حق ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی بھی خوش ضرور ہیں۔ کبھی اگر یہ دیکھ میرے لیے آئیں اور غریبوں ہائے تو ہل نہیں کر رہ جاتی ہیں اور اٹھتے بیٹھتے من کاٹھنے ہیں کہ "تم تو بیوی کے کام ہو" ہر وقت میری برائی ان کے سامنے کرتی ہیں۔ وہ من نہال ہوتے ہیں کبھی میں سے کڑ بھی ہاتے ہیں اور کبھی ہنس کر کہہ بھی دیتے ہیں کہ "ہاں بہت بڑی ہے۔ ہاں میری دوسری بیوی کر دو" اس وقت تو ان کی ہائیں سناتی ہیں کہ "جو تمہارے میں یہ بہت ہوئی تو یہ سہی کیوں چڑھتی" اور دوسروں کے سامنے کھتی بکھرتی ہیں کہ میرا لڑکا تو اپنی قسمت کو دیتا ہے۔ مجھے کہتا ہے کہ دوسری کر دو۔ اور تو میں ہی ان کو اپنے چہرے پر ان بیوی کے لیے نظر کر رہی ہوں۔ کوئی دوسری وہاں ہوتی تو کبھی کا کر دیتی۔ اس کرانت چکن ہے نہ نہ کر دیتا۔

بچان کے سہ ماہی۔ ہاتھ ناک جو کھینچا ہے۔ جسما ہاتھ کو میں ناکوں کی یہ بات۔ جس بات کو منج کر ان کی یہ ضرور کر کے ان کی۔ ہاں کوئی سو سے ۱۵ پارے۔ بچے تو ضرور ہاتھیں کے۔ مجھے یہ سو سے والوں سے نکھیں کا بھٹکا سودا اپوں کو لے کر دینا پسند نہیں۔ میری ضد میں ضرور سے کر دے گی۔ چھ سال پر سات میں بڑے کوئی کی براب کہا کر اور کا بخار چڑھا۔ دو بیٹے لیے بنی رہی۔ اس میں ہر وقت لڑائی کہ بچے کو کھانا دے دے رہی ہے۔ انگلش تو ان کا اگر چھید کر دے۔ دو سے سے تھوڑے آتے تھے اور ساتھ ہی مولوی صاحب جہاڑ بھوک کے دانے اٹے نہ تھے۔ جب کسی طرح نہیں مائیں تو میں چار بچے کو کھانا کھچال لے گی کہ کچھو درم ملے۔ دو تو کہو بے چاری آ اکڑی میری دوست ہے وہ ان کو کسی کی ہاتھ سنتا ہے۔ یہ ہاں بھی جا کر ہاں ہاتھیں لاکھوں انگوٹوں انگوٹوں کو اور اس بھوکنا آتی ہیں۔

بچان کو وقت پر دو دے دینے کی بخاری سانس انکی دھن ہیں کہ کیا نکالیں۔ دو کبھی ہیں کہ ہاں ہو کر بچان کی دھن ہیں۔ بچے بڑھتے رہیں اور میں بٹھتی دیکھتی رہتی ہوں اور یہ ان کا چکر ہے۔ میں بچان کو بچا ہونے ہی کسی بھل کا عرق نہیں ہارتی یا سب کا دیتی ہوں۔ جب پہلے بچے کو کھانے دیا تو کھڑی اور بٹھتی بٹھتی تھیں کہ میں بڑ بڑ نہیں دیتے وہ ان کی۔ یہ تو بچے کو کھانا کر کے مارا چا رہی ہے۔ ہمارے سر پہرے سے ایک ہیں۔ منہاں نے سمجھایا۔ جب یہ کسی طرح نہیں مائیں تو مجھے میرے نیچے چھوڑ آئے۔ چہ بیٹے ہاں رہی پھر یہ ہا کر لے آئے۔ مینہاں بات نہیں کی۔ ہاتھ کو کبھی نہیں کہ بچے کو اپنے پاس ملا دے۔ میں الگ سٹاتی ہوں تو غم کرتی ہوں۔ میرے تو تین بچے ہیں۔ سب پہلے وہی سے الگ سٹے ہیں کہ کوئی بہت پرہت چمت نہ گئے۔ بچے کو کھانا کر اپنے پاس سٹاتی تھیں۔ اور تو اور رات کو دیکھو تو دو دن کنواری سے حق والی نہ چار۔ یہی ہیں۔ جوش مع کروں تو انھوں کی دھن ہوتی ہے۔ ہر بچے پر اپنی طرح دیتی کرتی ہیں۔

مجھ کو کھانا دیکھو بڑا مہوڑا کیا کھتی ہیں۔ ذرا ان کی طرف جا کر دیکھو۔ ہر طرف ایک چڑی ہوئی دیکھیں بھٹکتی ہوئی۔ اس کا ہمنگانی ہے۔ اگال ان ہاتھ رکھا ہے لیکن گھن میں جب تو کہیں کی تو میں پر۔ پاس بیٹھتے ہوئے نہیں آتی ہے۔ لیکن میں جو ہر جگہ پر کھتی ہوں۔ لیکن تمہیں کی وجہ سے والی ہوں تو گندی ہوں۔

اب سال میرے یہ بٹھکی کہ ہمارا الگ کر دیا۔ اب کوئی کسی وقت بھی دونوں ہاں پی خائے جا کے دیکھ لے۔ میرے ہاں کسی خیر کاوی نکالی ملے گی نہ رہتی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میرے ہاں ایک بھی نکھیں نہ ملے گی۔ ان کے ہاں ہر وقت تمہیں کی ہمارت لگی ہے۔ کبھی

غلام عباس

نام	غلام عباس
تعلیمی نام	غلام عباس
پیدائش	۷ نومبر ۱۹۰۹ء، پشاور، امرتسر شرقی، پنجاب، بھارت
وفات	یکم نومبر ۱۹۸۳ء، کی رات، پشاور، کراچی
تعلیم	ایف۔ اے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۳۳ء
	ابتدائی تعلیم دیال سنگھ ہائی سکول، لاہور میں پائی۔ تعلیمی پس منظر نوٹ کر جز۔ ۱، ۱۹۳۱ء میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے اریب، ایم۔ اے کیا، ۱۹۳۶ء میں بھارت اور بھارت سے ۱۹۳۳ء میں ایف۔ اے کیا۔ پی۔ ایس۔ کا امتحان دینا چاہتے تھے لیکن حالات نے اجازت نہ دی۔

مختصر حالات زندگی:

آپ کے والد کا نام میراں عبدالعزیز تھا۔ غلام عباس کی تعلیم و تربیت لاہور میں ہوئی اور ادبی زندگی کا آغاز میراں کی عمر میں ہوا، جب دیال سنگھ ہائی سکول کے طالب علم تھے۔ یہ زمانہ ۱۹۳۲ء کا ہے جب انہوں نے اپنا اولین افسانہ "کرمی" لکھ دیا تھا۔ چند برس کی عمر میں ان کا پہلا ترجمہ "جہان وطن" (مصنف: سائمن) کا جنوری ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء تک کے معروف رسالے "پھول" لاہور اور خواجہ شمس کے محبوب پر ہے "تجدیب نسواں" کے ناقد مدد ہے۔ واضح رہے کہ چند دنوں پہلے دارالاشاعت لاہور کے "گل اور ادبی دنیا کی مشہور و معروف سہ ماہی" اختیار علی تان کی زیر نگرانی نکلا کرتے تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا پارٹی، جی۔ ایل۔ سے منسلک ہوئے اور پی۔ جی۔ کے رسالہ "آواز" کے مدیر مقرر ہوئے۔ انہوں نے اسی سال دہلی چکا ایک اور رسالہ "پنڈیان ہندی" "سارنگ" بھی جاری کیا۔ قیام پاکستان کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آ گئے اور پی۔ جی۔

کی علامت برقرار رہی۔ ۱۹۳۸ء میں ریلوے پاکستان کارسٹاں "آجکے" ان کی ادارت میں جاری ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں کچھ وقت مرکزی وزارت اعلیٰ حالت و خرابی سے وابستہ ہو کر بطور اسٹنٹ ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز خدمات اہتمام دیں۔ ۱۹۳۹ء میں سی بی پی ٹی لندن سے بطور چوہدری وچمرہ وابستہ ہوئے ۱۹۵۴ء میں وطن واپس آ کر ایک ہارپیکر "آجکے" کی ادارت سنبھالی جہاں سے ۱۹۶۷ء میں ریٹائر ہوئے۔ بی بی سی کی علامت کے دور میں فرانس اور چین میں کچھ وقت گزارا، نئی شادیاں کیں، پہلی شادی ۱۹۳۹ء میں ڈاہوہ نامی ایک سطحی نرکی سے، جسے چھ برس بعد طلاق دے دی۔ دوسری شادی ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ سے محقق (اکبر حکیم سے) جن سے ایک چٹا اور چار بیٹیاں ہوئیں، اور تیسری شادی ایک برطانوی خاتون سے، جنہوں نے مولانا اقصیٰ مہاجر کے ہاتھوں اسامہ قبول کیا۔ اس شادی سے ایک چٹا دو تین بیٹیاں ہوئیں۔ علامہ مہاسی نے ریٹائرڈ زندگی گزاری تھی۔ یکم نومبر ۱۹۸۲ء کی رات حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا اور بی بی سی ایچا سوسائٹی، کراچی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

اولین مطبوعہ افسانے:

- ۱۔ "ہاٹار دوست" مطبوعہ "عنوان" کراچی، اکتوبر ۱۹۶۷ء
- ۲۔ "قرطانی" مطبوعہ "عنوان" کراچی، ستمبر ۱۹۶۹ء
- ۳۔ "سوت کا درخت" مطبوعہ "تحریک میل" کراچی، ۱۹۶۹ء

اولین مطبوعہ تحریر:

"جلال وطن" (ڈائری کی کہانی کا ترجمہ) مطبوعہ "بزرگ داستان" ۱۹۶۳ء

اولین تحریر:

"کبری" (کہانی) جمیل ۱۹۶۰ء (اس وقت دیپال نگہ بانی اسکول لاہور کے طالب علم تھے)

فکری آچار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "آندلی" (دس افسانے)	کتبہ چوبیلا پور	طبع اول ۱۹۶۸ء
(۱) "بھاری" (۲) "مہاسے" (۳) "مکتبہ" (۴) "مہاسم"		
میں (۵) "ناک کاٹنے والے" (۶) "پتھر" (۷) "اندھیرے"		
میں (۸) "مجموعہ" (۹) "بیاد و مطبوعہ" (۱۰) "آندلی"		
"جانے کس پادری" (چند افسانے)	۴۰۰ روپے کا سران پیشہ کراچی	طبع اول جولائی ۱۹۶۰ء

۱۔ ”کوہِ گوشت“ ۲۴۔ ”اس کی بیوی“ ۳۔ ”بھنوز“ ۲۔ ”ہاپے والا“
 ۵۔ ”سناچ“ ۶۔ ”سرخ جلیں“ ۷۔ ”انیسی ہفتہ رنگ جلیں“
 ۸۔ ”ہمدرد فریض“ ۹۔ ”مجھے کاسہارا“ ۱۰۔ ”پتلی ہائی“ ۱۱۔ ”نکمری
 ہالہ کی ڈائری“ ۱۲۔ ”ایک درمیدر دل“ ۱۳۔ ”دو تاشے“
 ۱۴۔ ”تاری سرز“

۳ ”کنیں میں“ (تو افسانے) اقبال آباد پور طبع اول دسمبر ۱۹۶۹ء

۱۔ ”کنیں میں“ ۲۔ ”بھروچھا“ ۳۔ ”نکراں“ ۴۔ ”سرخ گلاب“
 ۵۔ ”جو پری پری ہو لوگ“ ۶۔ ”جواد بھاتا“ ۷۔ ”فرانز“ ۸۔ ”چمک“
 ۹۔ ”لوچاز“

نوٹ: نوں سہاس کے افسانوی مجموعوں میں کل ۲۳ افسانے یکجا کئے ہیں اور اگر ان میں درج ذیل چار افسانوں

(۱) ”بھس“ ”مطلوہ“ ”کاروان“ کا پورہ ۱۹۳۳ء

(۲) ”نواب صاحب کا بیٹھ“ ”مٹول“ ”۱۷۷۷ء کے منتخب افسانے“ ”مرچ“ ”بھروچھا“ ”میں ۱۱۵۹

(۳) ”ارنگیے والے“ ”ہرج و مرج“ ”چٹا اور (۱) میں ۲۵۹۲۲۳۹

(۳) ”روٹی“ ”گنگائی روپ (۱) میں ۲۵۹۲۲۳۲

(۵) ”ہمدرد والا“ ”کلکارہ“ ”اکتوبر ۱۹۸۱ء میں ۵۶۲۵۳

(۶) ”محبت کا گیت“ ”نمبر ۳۳-۳۳۳ء

کو بھی شامل کر لیا جائے تو ان کے افسانوں کی کل تعداد ۳۹ ہو جاتی ہے۔ جس سے ان کی سب سے وفاداری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۴ ”تیرہ غمراہ“ (طہریہ) کتب خانہ پیرا داس تانہ بولٹی طبع اول ۱۹۳۱ء

پہلے یہ کتاب ہفتاد ”شیرازہ“ میں قسط وار شائع ہوئی۔ اس حنیف
 کا پہلا ہی فیصلہ اُس سے ۵۷۷۷ء کے ایک طہریہ سے مستعار ہے۔

۵ ”دھمک“ (الاسانوی طہریہ) جہان کامران پبلشرز، کراچی طبع اول جون ۱۹۹۹ء

۶ ”گھونٹی والا کچھ“ (الادلی) جہان کامران پبلشرز، کراچی طبع اول ۱۹۸۳ء

۷ ”الہرا کے افسانے“ (ازاد شفیق ادھک کا ترجمہ) دارالاشاعت پنجاب، لاہور طبع اول ۱۹۳۹ء

۸ ”نورنگی بلکھ“ ”پچھرا“ (منتخب افسانے) طبع اول ۱۹۸۳ء

۹ ”بیم کی بیٹی“ (بچوں کے لیے) دارالاشاعت پنجاب، لاہور طبع اول ۱۹۳۳ء

۱۰ ”جان کی بیٹی“ (بچوں کے لیے) (جاپانی کہانیاں) دارالاشاعت پنجاب، لاہور طبع اول ۱۹۳۷ء

۱۱ ”شیا کی گڑب“ (بچوں کے لیے) دارالاشاعت پنجاب، لاہور طبع اول ۱۹۳۳ء سے قبل

- ۱۲ "چہ مختاراً" (بچوں کے لیے لکھیں)
- ۱۳ "میں رزاق سے آتی ہو پروا میں کوئی نہ ہے" : سیدہ امجد علی پری، سرائی : طبع اگست ۱۹۶۶ء
- (تراجم خاں کا ترجمہ) یہ فیض آباد میں جرنل محمد اعجاز خاں کی انگریزی خودنوشت "Friends Not Masters" کا ترجمہ ہے۔ کل صفحات ۳۳۰ ہیں۔
- ۱۴ "دلی کے شاہکار افسانے" (تین جلدیں) (پہلا اثر اک ترجمہ) مکتبہ المدینہ، حیدرآباد دکن : طبع اگست ۱۹۶۲-۶۳ء
- مرتب: عبدالقادر مرادوی
- ۱۵ "چاند کا کھٹا" (بچوں کے لیے)
- ۱۶ "ایک آنکھ والا دھن" (بچوں کے لیے)
- ۱۷ "خیر اللہ اور لکھنؤ" (بچوں کے لیے)
- ۱۸ "کھلونوں کی کہانی" (بچوں کے لیے)
- ۱۹ "میر و لڑکی" (بچوں کے لیے)
- ۲۰ "اندھا فقیر" (بچوں کے لیے)
- ۲۱ "ایک لکھنؤ کا دارو شاہ" (بچوں کے لیے)
- ۲۲ "بلا وطن" (بچوں کے لیے)
- ۲۳ "کلام مہاس کے دس بھترین افسانے"
- دارالاشاعت پنجاب، لاہور : طبع پہلے ۱۹۶۳ء
- شیخ کلام علی ایچ سنز، لاہور : طبع دہائی ۲۰۰۰ء
- شیخ کلام علی ایچ سنز، لاہور : طبع دہائی ۲۰۰۰ء
- شیخ کلام علی ایچ سنز، لاہور : طبع دہائی ۲۰۰۰ء
- شیخ کلام علی ایچ سنز، لاہور : طبع دہائی ۲۰۰۰ء
- شیخ کلام علی ایچ سنز، لاہور : طبع دہائی ۲۰۰۰ء
- شیخ کلام علی ایچ سنز، لاہور : طبع دہائی ۲۰۰۰ء
- تحقیق تارا پور : طبع دہائی ۲۰۰۰ء

زندگی میں مستقل چتا:

مکان نمبر ۷، گلی نمبر ۴، ایچ ایچ سوسائٹی، کراچی۔ پاکستان۔

اعزاز:

- ۱۔ پنجاب ایڈوائزری بورڈ فار بکس پرائز برائے "آئندہ" ۱۹۶۸ء
 - ۲۔ پاکستان رائٹرز گلڈ، آدم جی، لاہور ایڈوائزمنٹ برائے "ہارے کی چاندنی" ۱۹۶۰ء
 - ۳۔ ستارہ امتیاز (حکومت پاکستان کا اعلیٰ سول اعزاز) ۱۹۶۶ء
 - ۴۔ نیکو سٹور ایکسٹینڈیو ایڈوائزمنٹ ایوارڈ برائے "آئندہ"
- ان کے تین اقوامی شہرت کے حامل افسانے "آئندہ" پر بھارت کے عالمی شہرت یافتہ جوائت کار شیام جیجیک نے ۱۹۸۳ء میں فلم "منڈی" بنائی۔ فلم کے اداکاروں میں نصیر احمد، شاد، شیاوا علی اور سجتا پال نمایاں تھے۔

نظریہ فتن:

” قضاۃ نگاری، ادب کی سب سے زیادہ آسان صنف ہے۔ ایک معمولی چمکا کھڑا آؤ لی جو صرف دیکھتا ہوتا ہو، تھوڑی سی کوشش سے افسانہ لکھ سکتا ہے، شریک وہ یہ پانتا ہو کہ زندگی کی جھلکوں کو کم سے کم لفظوں میں کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے اور افسانہ نگار کی تمام صنف میں اس لیے بڑی رشتہ ہے کہ وہ چند صفحات میں لکھا جا سکتا ہے اور زندگی کی حقیقت کو پیش کر سکتا ہے۔“

(انوار ایک انٹرویو، از اظہر فیض، روزنامہ ”جنگ“ کراچی، ۱۰ جولائی ۱۹۷۸ء)



حوالہ جات:

- ۱۔ بیٹو کتب میں موجود، نقلیہ، ۱۹۱۹ء، ج ۱، ۱۰۷ صفحہ۔
- ۲۔ ”کونجھیں“، خانہ جاس کا پیرا مفلور، افسانہ ”کمر سلوٹ“، کارا افسانہ، ۱۹۳۳ء، ج ۱، ۱۰۷ صفحہ۔

آنندی

غلام عباس

بلد یہ کا جلاس زوروں پر تھا۔ بال کچھا کچھ بھرا ہوا تھا اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلد یہ کے زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ زمان بازار کی کوشر بد کر دیا جائے کیونکہ اس کا وجود انسانیت، شرافت اور قہدیب کے دامن پر بدلنا اور اٹا ہے۔

بلد یہ کے ایک ہماری بھر کم رکھی جو ملک دھم کے بے خبر خواہ اور دوسرے کیجے جاتے تھے۔ نہایت فصاحت سے سخن کر رہے تھے۔ اور پھر حضرات آپ یہ بھی خیال فرمائیے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بچوں کا عام گزرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے چنانچہ ہر شریف آدمی کو پانا دنا چاہا اس بازار سے گزرنے کا ہے۔ علاوہ ان میں شرفاء کی پاک دامن بیوی بھینیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبانِ ادب یہ شریف زبانیوں ان آبرو یافتہ، نیم مریاں سوداؤں کے بناؤ سنگار کو کھینچتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دلربائی کی فنی فنی اطمینان اور دل لے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے غریب شہروں سے طرح طرح کے خانوں، لوطیوں، ازرق برقی سازوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پرست گھرانہ کا راحت کہہ ہمیشہ کے لیے جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔

” اور صاحبانِ پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمائیے کہ ہمارے نوہالان قوم جو درس گاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی آنکھوں تر قیوں سے قوس کی امیدیں وابستہ ہیں اور قیاس چاہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کا ستارے ٹکائے گا سیران ہی کے سر بندھے گا۔ انہیں بھی بیچ شام ہی بازار سے ہو کر آنا چاہنا پڑتا ہے۔ یہ لگتا نہیں جو ہر وقت پارہ المرن سول سنگار کے ہر ماہر پر بے گناہانہ نگاہوں کے حمہ و سٹان برساتی اور اسے دعوت حسن پر مبنی دیتی ہیں۔ کیا انہیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے نا تجربہ کار جوانوں کے نشتے میں محو، سودا زبانیوں سے بے پرواہ نوہالان قوم اپنے جذبات و خیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھا رکھتے ہیں؟ صاحبان! کیا ان کا حسنِ زائد غریب ہمارے نوہالان قوم کو جہاد مستقیم سے ہٹا کر ان کے دل میں گناہ کی پراسرار لذتوں کی فتنگی پیدا کر کے ایک بے گناہ ایک اضطراب،

ایک بھابی پر پاندہ کر دیا ہوگا

”اس موقع پر ایک رکن بلدیہ نے جو کسی زمانہ میں مدرسہ چلے گئے، اور اس ادارہ سے خاص شغف رکھتے تھے بولے تھے۔

”سامانہ دوا خراج رہے کہ احتیاجوں میں کام رہنے والے طلبہ کا کتاب کچھ پانچ سال کی نسبت زیادہ حاصل ہو گیا ہے۔“

ایک رکن جو چشمہ لگا سکتے تھے اور ہفتہ وار اخبار کے مدیر ”مذاہبی“ تھے، تحریر کرتے ہوئے کہا ”حضرات ہمارے شہر سے دور ہیں،

غیرت و شرافت، مردانگی، کاری اور پرہیزگاری، اخلاقی ہادی ہے اور اس کے بجائے بے غیرتی، نامردی، بزدلی، بد معاشری، چوری اور منہل سازگی

کا دور دورہ ہوتا جا رہا ہے، خشیات کا استعمال بڑھ گیا ہے۔ گھر و تجارت، طور کشی اور دینا والہ لنگے کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کا سبب محض

ان زمانہ ہزاری کا ناپاک وجود ہے کیونکہ ہمارے بولے بھالے شہری ان کی ذلت گرد میر کے اسیر ہو کر ہوش و خرد کو بیٹھتے ہیں اور ان کی بارگاہ

تکبر و ساقی کی زیادہ سے زیادہ قیمت لے کر نئے کے لیے ہر چہ کو ذرا جائزہ لیتے ہیں۔ ہمارے حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس سلی کو بخشش میں

پامانہ سمیت سے باہر ہو جاتے اور سچی افعال کا ادراک اب کر بیٹھتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جان مریضی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور باقی افعالوں

میں چہ سے سڑتے ہیں۔“

ایک بخشش یافتہ مسٹر رکن جو ایک وسیع خانہ ان کے سر پرست تھے اور وہ کامزدار مہم و کچے پکے تھے اور اب مکمل حیات سے تھک کر

باقی ماندہ عمر سستائے اور اپنے اہل و عیال کو اپنے سایہ میں دھپتا ہوا دیکھنے کے جتنی تھے، فقر پر کرنے لگے۔ ان کی آواز لرزتی ہوئی تھی اور لہجہ

فریاد کا انداز لے ہوئے تھا۔ بولے کہ یہاں رات رات بھر ان لوگوں کے ٹپک کی تھاپ۔ ان کی گتے پاڑیاں، دن کے عشاق کی دھیمے مٹتی،

کالی کھوٹی اور دھول پاڑیاں ہوتی ہیں، من کر آس پاس کے رہنے والے شرفاء کے گھر چلے گئے ہیں۔ حقیقت میں جان آگئی ہے۔ رات کی قید

حرام ہے تو دن کا بھگن مفقود۔ عزا و ازین ان کے قریب سے ہماری بھونچوں کے اخلاق پر جو برا اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ہر صاحب اولاد

خود کر سکتا ہے۔

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز مخرامی اور دوا سے زیادہ کچھ نہ کہے۔ سب اراکین بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی کیونکہ بد قسمتی

سے ان کا مکان اس بازار حسن کے میں وسط میں واقع تھا۔

ان کے بعد ایک رکن بلدیہ نے جو اپنی قید حب کے طبردار تھے اور آج قدرتیہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے فقر پر کرتے

ہوئے کہا۔

”حضرات ہمارے جو سینا اور تار سے انجاب ہمارے اس مشہور اور تاریخی شہر کو دیکھنے آتے ہیں۔ جب وہ اس بازار سے گزرتے

اور اس کے حقیقی اقتدار کرتے ہیں تو یقین کیجئے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔“

اب صدر بلدیہ نے فقر پر کرنے لگے۔ گوشت لگتا اور ہاتھ پاؤں چھوئے چھوئے تھے۔ مگر سر بڑا تھا۔ جس کی وجہ سے نہ ہوا دی مصیبت

ہوتے تھے۔ لہجہ میں ہمدردی محانت تھی۔ بولے ”حضرات! اس امر میں قطعی طور پر آپ سے شفق ہوں کہ اس طبقہ کا وجود ہمارے شہر اور

تار۔ جہل و جہنم کے لیے باعث صدمہ ہے جس مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ چاہتا

ذلیل پیشہ مزدور ہیں۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کہاں گئے کہاں سے؟“

ایک صاحب بولے تھے ”یہ جو تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟“

اس پر یک طویل فرمائی قبضہ چھوڑ دیا کی راقی لٹا میں یکہار تشنگی کے آچار پھوٹے ہوئے تھے۔ جب احساس میں خاصا ہوا تو صاحب صدر بولے۔ ”حضرات یہ تجویز ہمارا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ اس کا ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اسود اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انھیں اپنے گھروں میں گھسنے نہیں گے اور مجلس اور ادائی طبقہ کے لوگوں کو جو مجلس کی دولت کے لیے ان کے شادی کرنے پر آمادہ ہوں گے، یہ عورتیں خود نہیں لگائیں گی۔“

اس پر یک صاحب بولے۔ ”لہذا یہ ان کے نئی ماحول میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ لہذا یہ کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ یہ دُک ہا ہے جنم میں جا نہیں لگتا اس شہر کو خالی کر دیں۔“

صدر نے کہا۔ ”ساحباں یہ بھی آسان کام نہیں ہے۔ ان کی تعداد دس میں نہیں بتکڑوں تک پہنچتی ہے اور ہر ان میں سے بہت سی عورتوں کے ذاتی مکان ہیں۔“

یہ مسئلہ کوئی مسئلہ ہر تک لہذا یہ کے زیر بحث رہا اور بالآخر تمام اراکین کی اتفاق رائے سے یہ اقرار پایا کہ زنان بازاری کے محلوں کو مکانات کو لڑ لیتا چاہیے اور انھیں رہنے کے لیے شہر سے نکال کر وہ کوئی الگ تھک علاقہ دے دینا چاہیے۔ ان عورتوں نے لہذا یہ کے اس مسئلہ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے بازاری کر کے بھاری جہانے اور قہر میں بھینس مگر لہذا یہ کی مرضی سے آئے ان کی کوئی فیصلہ نکل بھی نہیں اور وہ ناچار ہر کر کے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک ان زنان بازاری کے محلوں کو نکال کر انھیں شہر سے ہٹا دیا اور مکانات کے گاہک بھاگے جاتے رہے۔ بیشتر مکانات کو ذریعہ بلامقصدت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو جو مسینے تک شہر میں اپنے رہنے ہی مکانات میں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ تاکہ اس عرصے میں وہ کے علاقہ میں مکان وغیرہ بنا سکیں۔

ان عورتوں کے لیے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک بڑی سڑک پہلی تھی اور اس سے آگے کوں بڑا کچا راستہ تھا۔ کسی زمانہ میں وہاں کوئی پہلی ہوئی کھراب تو محلوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ جن میں سائیں اور چنگاڑوں کے سکن تھے اور ان دیکھانے والوں تھا۔ اس علاقے کے لوگوں میں بچے کھڑے نہ والے لڑکی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ کسی کا فاصلہ بھی یہاں سے دو اداستانی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤں کے لئے والے کسان دیں کے وقت کھیتی باڑی کرتے، باجی بھرتے بھرتے اور نکل آتے تو نقل آتے اور نہ ماحول پر اس شہر محو شاں شہر و مزار کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات دودھ دینے کی میں گیدڑ اس علاقے میں بھرتے دیکھے گئے تھے۔

چالو سے کچھ اوپر چھوڑاں میں سے صرف چھوڑاں کی جھیں جو اپنے مشاکی کی داہن والی یا ٹو داہنی دل بنگلی یا کسی اور جہ سے شہر کے قریب آتا اور نہ پنے پر کچھ جھیں اور اپنے دولت مند چاہنے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے مجر سے ہاں ناخواست اس علاقہ میں رہنے پر آمادہ ہو گئی تھیں اور نہ ہائی عورتوں نے سوجھ رکتا تھا کہ وہ باقواسی شہر سے ہٹوں کو اپنا سکن نہ نہیں کی یا بظاہر پارستانی کا چارہ بن کر شہر کے شریک محلوں کے کولوں کھدوں میں جا بھیجیں گی یا پھر اس شہر کی کو چھوڑ کر نہیں اور نکل جائیں گی۔

یہ چھوڑاں بھی خالص مالدار تھیں اس پر شہر میں ان کے جو محلوں مکان تھے ان کے کام انھیں اچھے موصول ہو گئے تھے اور اس علاقہ میں زمین کی قیمت بڑے نام تھی اور سب سے بڑا کہ یہ ان کے لئے والے دیہان سے ان کی مالی امداد کرنے کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے بڑے ہائی شان مکان بنوانے کی فرمان لی۔ ایک اونچی اور ہموار جگہ جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر

راہے مطابق کے عہد اور دیکھی اپنے اپنے مکانوں کو متا دیکھنے آہائیں اور قریب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جائیں۔ اس موقع پر قلعہ وں اور قلعہ یوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آجائیں اور جب تک خیرات نہ ملے لکھیں اپنی صندوقوں سے برابر شور مچاتی رہیں اور انہیں بات نہ کرنے دیجیں۔ کبھی کبھی شہر کے لنگہ دو ہاش و پیکار مہاش کو کیا کر کے صدیقی شہر سے پیدل مل کر بیسواؤں کی اس ٹولی پہنچی کی سہاگن لینے آہاتے اور اس دن بیسواؤں کی آئی ہوتی تو ان کی عید ہوتی۔ وہاں سے دو بہت کران کے گرد گرد پکار لگاتے رہتے نظر سے کتنے سب کے ختم لگاتے۔ گیب گیب لکھیں جاتے اور بخونا نہ کرتیں کرتے۔ اس روز کھلی کی خوب بکری ہوتی۔

اس مدت میں جہاں تھوڑے ہی دن پہلے ہوگا کہ قلاب پر طرف کبرگھی اور پچھلی پہلی نظر آنے کی۔ شروع شروع میں اس مدت کی اور پنی میں ان بیسواؤں کو یہاں آ کر رہنے کے خیال سے جو دھشت ہوتی تھی وہ بڑی دھک جاتی رہی تھی اور اب وہ ہر عہد خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے سرخوب رنگوں کے حلقہ معادوں کو کیا یہی کہہ سکتے ہیں۔

پہلی میں ایک چنگ ایک ٹونا پھوٹا حصار تھا۔ جو قرآن سے کسی بزرگ کا معصوم ہوتا تھا۔ یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن ایک صبح کو پہنچی کے راج حوروں نے کیا دیکھا کہ حصار کے پاس دو عورتیں اندر رہا ہے اور ایک سرخ سرخ آگھوں والا لہڑا تاج مسے قلعہ لنگوٹ باندھے چار دار کا سفایا کرانے اس حصار کے اندر دربار رہا اور کنگر جگر اٹھا اٹھا کر بے چہرہ لگا رہا ہے۔ وہ پیر کو وہ قلعہ ایک گڑا لے کر کوئی پر آیا اور پانی بھر کر حصار پر لے جانے اور اسے دھو لے گا۔ ایک دھو جو آیا تو کوئی پر تو وہ تھیں راج حوروں کو لے گئے۔ وہ غم و رنج کی اور غم فرازائی کے عالم میں ان سے کہنے لگا "ہائے ہووہ کس کا حصار ہے؟ کوک شامیج بادشاہ کا امیر سے باپ دلاواہی کے بھادر تھے۔" اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آگھوں میں آٹھ بھر کر کوک شامیج کی بکھو جاتی کرانا تھیں بھی ان راج حوروں سے بیان کیں۔

شام کو یہ فقیر کیں سے ناکھ تاک کر سنی کے دو دیے اور سرسوں کا تیل لے آیا اور کوک شامیج کی قبر کے سر جانے اور پانچ چار داغ روشن کر دیے۔ رات کو کچھ بھر کبھی بھی اس حصار سے اندھ بکا مسٹ فوہ نہائی دے جاتا۔

چھ بیسے گزولنے نہ پائے تھے کہ یہ چند مکان ہی کر تیار ہو گئے۔ یہ سب کے سب دو منزل اور قریب قریب ایک ہی وضع کے تھے۔ سات ایک طرف اور سات دوسری طرف۔ سچ میں چوڑی چنگی سڑک تھی۔ ہر ایک مکان کے لیے چار چار کائیں تھیں۔ مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رخ و پنج عرصہ تھا۔ اس کے آگے چلنے کے لیے کھلی ٹھاٹھیں چائی گئی تھیں۔ جس کے دونوں سروں پر یا تو سنگ مرمر کے مور قصب کرتے ہوئے جاتے تھے اور یا جمل پر یوں کے گھسے تراشے گئے تھے۔ جن کا آدھا حوض چمیل کا اور آدھا انسان کا تھا۔ ہر آدم کے پیچھے جوڑا کرہ چلنے کے لیے تھا اس میں سنگ مرمر کے تازک ستون جاتے گئے تھے۔ دیواروں پر خوش نما چنگی کاری کی گئی تھی۔ فرش چھوڑا چھڑا ہوا تھا۔ جب سنگ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرش زمر روی پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ اسٹندہ براق چروں والے راج حضوں نے اپنی بھی بھی گردنیں چمیل میں باندھ دی ہیں۔

بدھ کا ٹیڈون بھی پہنچی میں آنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس پہنچی کی سب بیسواؤں نے نل کر بیٹ بھاری نیاز دوائی۔ پہنچی کے کھلے میدان میں زمین کو صاف کر کر شامیانے نصب کر دیے گئے۔ دیکھیں کون کتنے آواز اور گوشت ہو گئی کی خوشبو نہیں جس کون سے فقیروں اور کون کو کھنچا دئی۔ وہ پیر ہوئے ہوتے ہی کوک شامیج کے پاس جہاں نظر تعمیر کیا جاتا تھا اس قدر فقیر جمع ہو گئے کہ عید کے روز کسی بے شہر کی جامع مسجد کے پاس بھی نہ ہونے ہو گئے۔ جو کوک شامیج کے مزار کو خوب صاف کر دیا اور دھوا لیا گیا اور اس پر چٹوٹوں کی چادر

ایہاں، پانوں کی ایک دھونی، چنے کے تباہ کوئی تھیں پارنگیوں اور موسم ہی کے نصف بڑی سے زیادہ خالی۔

دوسری دکان میں ایک بنیاد پھیری میں صوفائی اور غیر فرش، چوکی میں قباٹی، پانچ میں کبھی اور چھٹی میں ایک گلو، آہے۔ گلو، آس پاس کے دیہات سے سستے دھوپ چار پانچ قسم کی سڑیاں لے آتا اور یہاں خاصے متانے پر لچک دیتا ایک آدھ کر اچھوں کا بھی رکھ لیتا چونکہ دکان خاص کلی تھی۔ ایک پھول والا اس کا سانگھی بن گیا۔ وہ دن بھر پھولوں کے ہار، گھرے اور طرطرن طرن کے تھنے ہار بنا رہا اور شاہ کا انھیں چنگر میں اداں ایک ایک مکان پر لے جاتا۔ اور صرف پھول ہی لچک آتا کہ ہر جگہ ایک ایک دو دو گڑی بیٹو، سہ زخموں سے کپ شپ بھی ہانک لیتا اور جتنے کے دم بھی لگا آتا۔ جس دن قاش بیٹوں کی کوئی ٹولی اس کی سوجھ بوجھ کی ہی میں کوٹھے پر چڑھ آتی اور وہاں بچا شرواب پاتا تو وہ سازندوں کے ناک بھوں چہ حسانے کے باوجود گھنٹوں اٹھنے کا نام نہ لیتا، دھڑ سے کانے پر سر دھکتا اور بیٹو ٹولوں کی طرطن ایک ایک کی صورت نکلتا رہتا۔ جس دن رات زیادہ گزر جاتی اور کوئی ہر چنگر دیتا تو اسے اپنے گے میں ڈال بیٹھا اور سستی کے باہر کا پھل چڑھ کر کھا لیا کرتا۔

ایک دکان پر ایک جیسا کا پاپ اور بھائی جو روز بچوں کا کام جانتے تھے۔ بیٹے کی ایک مٹھیں رکھ کر بیٹھے۔ ہوتے ہوتے ایک چارہ بھی آ گیا اور اپنے ساتھ ایک ہر گھر کو بھی دیتا آپ۔ اس کی دکان کے باہر آتھی پر نکلے ہوئے طرطن طرن کے دکانوں کے دوپٹے بھاس براتے ہوئے آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک مٹ پر لچے بھائی نے جس کی دکان شہر میں چلتی تھی، بلکہ اسے دکان کا کرایہ بھی ان کی مشکل ہو جاتا تھا شہر کو خیر یاد کر اس ہستی کا رٹ کیا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے طرطن طرن کے کوٹے، جسم چھپاؤ اور صاف نکھلیاں بھٹی، دھونی، دھاکا، لٹس، پیٹے خوشبودار تیل، دودھ، تاجن کی خراب کری ہوئے لگی۔

اس ہستی کے رہنے والوں کی سر پرستی اور ان کے سر یا ضابطہ کی وجہ سے اسی طرطن دھڑ سے جیسے روز کوئی نہ کوئی مٹ پر لچا دکاندار کوئی بڑا از کوئی پٹناری کوئی بچہ بڑا کوئی ناہائی مصدے کی وجہ سے یا شہر کے بڑے ہوتے کرایہ سے گھبرا کر اس ہستی میں آچہ لیتا۔

ایک سے دس سہاں عطار، جو نہکت میں بھی کھی تھوڑا دھڑلے رکھتے تھے۔ ان کا بی شری گھانا آدای اور ٹیکسوں اور دو خانوں کی افراط سے جو گھبرا یا تو وہ اپنے شاگردوں کو ساتھ لے شہر سے اٹھ آئے اور اس ہستی میں ایک دکان کرایہ پر لے لی۔ سارا دن بڑے مہاں انداز کے شاگرد دواؤں کے ڈبوں، شربت کی بوتلوں اور مرہے پٹائی اہار کے بو یا سوں کو ہمارچوں اور طاووں میں اپنے اپنے ٹکانوں پر رکھتے ہوئے۔ ایک خانے میں طب اکبر، قرادین کاوری اور دوسری طبی کتابیں بٹھا کر رکھ دیں۔ کو آؤں کی اندرونی جانب اور بیرونی میں جو جگہ خالی بچی وہاں انہوں نے اپنے خاص الخاص گھربات کے اشتہار یا دوا دھانی سے بھی لکھ کر اور پتھروں پر چپکا کر آویزاں کر دئے۔ ہر دوا میں کو بیٹوؤں کے ملازم لگا کر لے لے کر آس جہاں ہوتے اور شربت بڑاوری، شربت بخشد، شربت انار اور ایسے ہی اور بہت بھلی دوا، افرا شربت دھڑلے، وغیرہ گاؤں زبان اور گھوٹے پہنچانے والے سر پہ سج دھنک دیا لے لے کر لے جاتے۔

جو دکانیں بیکار ہیں، ان میں جیواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چار پائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دکانوں میں ناش چہر اور خطر پر کھیلنے، ہڈیوں پر تل لٹواتے، ہجری گھونٹے، پھیروں کی پانیاں کرتے، پتھروں کے ”سہاں حیرتی قدرے“ کی دھت لگواتے اور گھبراہٹا ہوا کرتے۔

ایک جیوا کے سازندے نے ایک دکان خالی دیکھ کر اپنے بھائی کو جو ساز لٹا جاتا تھا اس میں کاٹھالی۔ دکان کی دیواروں کے ساتھ

ساتھ کھینچ کر فونی پھونکی مرمت طلب سہارنگھاس، حصار، شیوہ، اور باو پیر، مانگ دیے گئے۔ یہ شخص حصار بھانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام کو اپنی دکان میں حصار بھانا، جس کی پہلی آواز اس کی آس پاس کے دکان دار اپنی دکانوں سے اٹھ اٹھ کر آ جاتے اور دیر تک رت بے حصار بننے رہتے۔ اس حصار دکان کا ایک شاگرد تھا جو روئے کے دفتر میں لکھ کر تھا۔ اسے حصار کیسے کاہت شوق تھا۔ جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوتی، سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس سٹی کار کو لے کر تیار لکھنے والے گھنٹہ دکان میں جڑ کر منتظر کیا کرتا، مگر اس حصار دکان کے دم سے کسی میں خاصی رات کی دہنے لگی۔

مسجد کے مطابق، جب تک تو یہ سٹی زبر قیصر دی رات کو دیات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے۔ مگر اب جبکہ انہیں دو دن وقت مرنے کا ہمارا ہوا پہنچے گا تو وہ رات کو بھی نہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض سواروں کے گھروں سے بچے بھی مسجد میں چلنے آئے گئے، جس سے حاجی کو روپے پیسے کی آمدنی بھی ہونے لگی۔

ایک شہر شرموٹے والی تھیا، اہد کی تھیز بیکل کہتی کو بپ زمین کے چڑھے ہوئے کرپا اور اپنی پ، اٹلی کے باعث شہر میں کہیں کہیں تو اس نے ای سٹی کار سے کیا اور ان سواروں کے مکانوں سے کچھ حاصل پر میدان میں کچھ کھڑے کر کے ڈیرے ڈال دیے۔ اس کے ایکٹر ایکٹری کے فنی سے محض ڈانڈا تھے۔ ان کے درمیں پہنے پرانے تھے جن کے بہت سے حصار سے جڑ چکے تھے اور یہ لوگ کھائے بھی بہت پرانے اور قوی تھے کہ اس کے ہاں جو یہ کھینچاں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کھٹ کے کام بہت کم تھے۔ شہر کے مرنے والی پوچھ لوگ، کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غریب اور باجدار، ہر کی کڑی محنت محنت کی سر طور، دخل خرچہ مرنے اور اپنی معاشیوں سے لگانا چاہتے تھے۔ پانچ پانچ چھ پچ کی ٹولیاں، نہ کر گئے میں پھولوں کے بازو اٹے، جتنے بولے، یا نرسری اور انھوں نے بھانے اور ہاتھوں پر آواز سے کہتے، کالی ٹوچ بکتے، شہر سے بڑے بل چل کر تھیرا دیکھتے آتے اور گئے ہاتھوں اڑا دین کی سیر بھی کر جاتے۔ جب تک ایک شرواع ہوتا تھیرا کا ایک ستر، دھتو کے ہاں ایک اسٹول پر کڑا بھی کولہا جاتا، کھی مٹ جاتا، کھی آکھیں، مٹکا جاتا، غریب غریب حصار دکان میں کرنا نہیں دیکھ کر یہ لوگ دکانوں سے فٹھے لگتے اور گاہکوں کی صورت میں آواز دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس سٹی میں آئے شروع ہوئے۔ چنانچہ شہر کے بڑے بڑے چلوں میں ڈالنے والے معاشیوں لگانے لگے۔ ۳۳ کوئی ٹی سٹی کو شہر سے پانچا کوں تک جو کھی سڑک جاتی تھی، اس پر پہنچ کر تانگے والے سواروں سے انعام حاصل کرنے کے لالچ میں یا ان کی فراہم، کھل پر تانگوں کی دکانیں کھلتے۔ منہ سے، دہان بھانے اور جب کوئی تانگے کے نکل جاتا تو اس کی سوار یاں نوروں سے، سامان سر پر اٹھا لیتیں۔ اس دکان میں غریب گھوڑوں کا بہا حاصل ہو جاتا اور ان کے تانگے میں چڑھتے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بھانے خشبو کے پھنے کی بدبو آئے تھی۔

رکھو لے، تانگے والوں سے کیوں بیچھڑتے۔ وہاں سے کم دام پر سوار یاں خفا، مگر اسے مرنے اور کھنڈہ بھانے اس سٹی کو بھانے تھیں۔ مگر وہیں ہر پہنچنے کی شام کو اسکولوں اور کالوں کے طلب ایک ایک سائیکل پر دو دو ملے، جوق اور جوق اس پر سرور بازار کی سیر دیکھنے آتے، جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خود کو لے انھیں محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس سٹی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے لگی اور کالوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ دوسرے سوار بھی جو پہلے اس سٹی میں آئے پر حیرت ہوتی تھیں اب اس کی ان دکانی رات چنگی ترقی دیکھ کر اپنی بے وقوفی پر انھوں نے گھٹے لگے۔ کئی عورتوں نے تو سمجھ دھنیں مرنے ان

جسواؤں کے ساتھ ساتھ اسی موضع قطع کے مکان ہوائے شروع کر دیے۔ علاوہ انہیں شہر کے بعض مہاجرین نے بھی اس ہستی کے آس پاس سے
 اسیوں و بیسیں خرید کر کراپے پر اٹھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے مکانی گاؤں والے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قصبہ عورتیں جو بچوں اور شریف
 عکلوں میں رہا کرتی تھیں۔ سودا خانہ کی طرح اپنے گھرانوں سے باہر نکل آئیں اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے
 مکانوں میں اس ہستی کے دو دوکاندار آجے جو عیال دار تھے اور رات کو کھانوں میں سو سکتے تھے۔

اس ہستی میں آبادی تو خاص ہو گئی تھی مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا اٹھنا نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان جسواؤں اور ہستی کے تمام رہنے والوں کی
 طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لیے درخواست بھیجی گئی، جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈاکخانہ بھی کھول دیا گیا۔
 ایک بڑے مہمان ڈاک خانہ کے باہر ایک صندوقچے میں لٹانے، بکار ڈاک اور قلم و رات کو کھانوں کے لوگوں کے خط پتر لیٹنے لگے۔

ایک دھندلی ہستی میں شرایوں کی دو ٹولیوں میں لٹا ہوا ہو گیا۔ جس میں سوا ڈاک کی ٹولیں، پانچواں اور انھوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا۔
 کئی لوگ سخت بکراہ شروع ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس ہستی میں ایک قند بھی کھول دینا چاہیے۔

قیصر بالکل کھلی دو بیٹے تک رہی اور اپنی بھانجی کے مطابق خاصا کمانے لگی۔ اس شہر کے ایک سینا کے، ایک نے سو پا کر کہیں نہ اس ہستی
 میں بھی ایک سینا کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر نہیں کہ اس نے سمجھت ایک موقع کی جگہ میں کر پڑی اور جلد ہی قیصر کا کام شروع کر دیا۔
 چند ہی مہینوں میں سینا مال پیر ہو گیا۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا ہانچہ بھی لگوایا گیا تاکہ تماشا ٹائی کر ہانچہ شروع ہونے سے پہلے آجائیں تو
 آرام سے باہر بیٹھ سکیں۔ ان کے ساتھ کھانے کی میز بنائی گئی۔ ہانچے کی طرف سے آ کر بیٹھنے لگے۔ یہ ہانچہ خاص میر کا وہ تھا۔ رفتہ
 رفتہ بڑے کھانا بچے اس باہر بیٹھنے میں آئے اور عیسائی کی بوسہ بھانے لگے۔ سرنج میں داخل والے نہایت کھانا قسم کے کھانے شہر والے محل کی
 شیشیاں داسکتے کی بیویوں میں شہر والے کا کھانے پر میلہ لگایا تو یہ اسلئے دل پسند، دل بہار، مالش کی صدا لگاتے دوسرے کے مریضوں کو اپنی
 خدمات پیش کرنے لگے۔

سینا کے مالک نے سینا مال کی عمارت کی چاروں طرف دو ایک مکان اور کئی دکانیں بھی بنوائیں۔ مکان میں ہوش کھڑا کیا۔ جس میں
 رات کو قیام کرنے کے لیے کمرے بھی مل سکتے تھے اور کھانوں میں ایک سوا ڈاک کی چھتری والا، ایک فوٹو گرافر، ایک سائیکل کی مرمت والا،
 ایک فوٹو ری والا، دو بچہ بازی، ایک بوٹ ٹاپ والا اور ایک ڈاکٹر سمیت اپنے دو خانہ کے آ رہے۔ ہوتے ہوئے پاس ہی ایک دکان میں کمال
 خانہ کھینچنے کی عمارت مل گئی۔ فوٹو گرافر دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گڑی ساز نے آؤ برتایا اور ہر وقت صوبہ شیشہ کھڑے چڑھانے
 گھڑیوں کے کھن پر زوں میں غلطیوں کو دیکھ رہے تھے۔

اس کے بجویں ان ہستی میں مال، روٹنی اور مٹائی کے باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارخانہ سے سرخ جھنڈا،
 برعین اور اونچے کھینے والے لے کر آئے پٹنے اور تاپ تاپ کر سڑکوں اور گلی کو چھان کی داغ بیل ڈالنے لگے اور ہستی کی کئی سڑکوں پر سڑک کوٹنے
 والا انجن چلنے لگا۔

اس واقعہ کو جس برس گزر رہے ہیں۔ یہ ہستی اب ایک بھرا ہوا شہر بن گئی ہے۔ جس کا پندرہ لاکھ سے انھن بھی ہے اور پندرہ لاکھ بھی، بکھری
 بھی اور بھل خانہ بھی، آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج، دو ہائی اسکول، ایک لڑکوں کے لیے، ایک لڑکیوں کے لیے اور
 آٹھ پرائمری اسکول ہیں، جن میں سب کھانگی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ چھ سینا ہیں۔ اور چار چنگ جن میں سے دو دھانے کے بڑے

بڑے چٹکوں کی شاخیں ہیں۔

شہر سے دور ورائے، تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل و جرائد کا شائع ہوتے ہیں۔ ان میں چار ادبی، دو اخلاقی، دو معاشرتی و مذہبی، ایک صنعتی، ایک طبی، ایک زمانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں چھ مہر ہیں، چند روزہ مسند اور دھرم شالے، چھ تنظیم خانے، پانچ ادا خدہ آشرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن میں سے ایک صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔

شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کی مناسبت سے "مکسن آباد" کے نام سے موسوم کیا جا تا رہا مگر بعد میں اسے "مانو سب" سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی۔ یعنی یہاں "مکسن آباد" کے "مکسن" کو ہٹا دیا گیا۔ مگر یہ نام پہلے نہ رہا کیونکہ عوام مکسن اور من میں امتیاز نہ کرتے آخر یہی بڑی بڑی ہوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا۔ جس سے پہلے آج سے سیکڑوں برس قبل اجڑے سے پہلے موسوم تھی اور وہ نام ہے "آندی"۔

جس تو سارے شہر بھرا چڑا، صاف تھرا اور خوشنما ہے مگر سب سے خوبصورت، سب سے بارش اور تھارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے، جس میں نہاں بازار کی برکتی ہیں۔

آندی بلند یہ گا اجلاس زوروں پر ہے، ہال کچا کچھ بھرا ہوا ہے اور خلاف معمول ایک مہر بھی غیر حاضر نہیں۔ بلکہ یہ کئی بھٹے مسئلہ یہ ہے کہ نہ بازار کی کوٹھیر بڑھ کر دیا جائے، کیونکہ ان کا وجود انسانیت، اشرافت اور تہذیب کے دامن پر جاندارا ہے۔

ایک ضحیٰ انجمن قرار نظر کر رہے ہیں، "معلوم نہیں" وہ کیا مصیبت تھی جس کے زیر اثر ناپاک شہتہ کو ہمارے اس قدیمی اور تاریخی شہر کے سین بچوں کا رہنے کی اجازت دی گئی۔

اس طرح ان عورتوں کے لیے جو طاق منتخب کیا گیا وہ شہر سے بارہا کئی دور تھا۔



عزیز احمد

نام	عزیز احمد
تلفی نام	عزیز احمد عثمان آبادی (عزیز احمد)
تاریخ پیدائش	۱۱ نومبر ۱۹۱۳ء ضلع یارو، بنگلہ، حیدرآباد (دکن)
تاریخ وفات	۱۶ نومبر ۱۹۷۸ء پورنوا، کینیڈا
تعلیم	بی۔ اے (آنرز) اسلامیات، انگریزی، فارسی (دیوبند)، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، ۱۹۳۳ء بی۔ اے (آنرز) انگریزی زبان و ادب، لندن یونیورسٹی، ۱۹۳۸ء ڈی۔ لیٹ (انگریزی) (ایلمنٹری) قاری خلیفہ، لندن یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء

مختصر حالات زندگی

عزیز احمد نے بلوچستان، حرم، افسانہ نگار، ناول نگار، اقبال شناس، مفسر گو، محقق اور ناقد کے شہرت پائی۔

عزیز احمد کے والد شیخ احمد کا کوری کے محلہ گھراٹھل میں اقامت پذیر تھے۔ ان کا شمار حیدرآبادیوں کے نامور لوگوں میں ہوتا تھا۔ عزیز احمد بچپن میں والدین کی شہادت سے محروم ہو جانے کے بعد اپنے چچائی ماسوں محمد احمد کی سرپرستی میں چلے گئے۔ محمد احمد کا پیشہ کاشتکار تھا۔

عثمانیہ، بٹی سکول عثمان آباد سے عزیز احمد نے میٹرک کے بعد ۱۹۳۸ء میں جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا۔ وہیں سے ایف۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں انڈین کے ساتھ بی۔ اے (آنرز) کیا۔ جامعہ عثمانیہ میں عزیز احمد کو ڈاکٹر مولوی عبدالقیل، ڈاکٹر یحییٰ الدین قادری، ذوالچشم عبدالقادر سردہ، مولوی وحید الدین شہماور مولانا مہرا حسن کیلانی جیسے اساتذہ و مہر آئے۔ طالب علمی کے زمانے میں دیگر ساتھ کی بہت سب سے زیادہ دلچسپی ڈاکٹر مولوی عبدالقیل اور پروفیسر عبدالقادر سردہ سے رہی۔ عبدالقادر سردہ کی کہ "بہت اچھے" کہتے "کے لیے اہل علم و ادب کام کرتے رہے۔ بی۔ اے (آنرز) کے بعد مولوی عبدالقیل کی کوششوں سے عزیز احمد کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وٹلیف، ۱۹۳۵ء میں انگلستان چلے گئے۔ لندن یونیورسٹی میں قیام کے دوران ڈاکٹر مولوی عبدالقیل کے توسط سے ای۔ ایم۔ فورسٹر سے ملاقاتیں رہیں۔ ۱۹۳۸ء میں لندن یونیورسٹی

سے پی سائے (آنرز) کی ڈگری لی اور کچھ عرصہ یورپ کی سیر و سیاحت میں گزارا۔ انجی ایام میں فرانسیسی سرکاریوں نے خود کشی سے کچھ عرصہ منسلک رہے اور فرانسیسی زبان سیکھی۔ ۱۹۳۸ء میں دہلی و انیسویں پر جامو و کشمیر سے منسلک ہو گئے۔

۱۹۳۵ء میں شاہی ہوئی اور ۱۹۳۶ء تک بطور چیکنگر شعبہ انگریزی، جامو و کشمیر، حیدرآباد و دکن میں رہے۔ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۵ء نے خود کشی میں ۱۹۳۸ء کا دورہ و شہرہ آفاق دورہ کیا اور (نواب میر عثمان علی شاہ کی بہادر زہد و ملی مہر نظام دکن علی خان بہادر) کے پرائیویٹ سیکرٹری رہے۔ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء رفیعہ شیعہ انگریزی، جامو و کشمیر، حیدرآباد و دکن کا دورہ کیا اور ۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۸ء پروفیسر کے عہدے پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۹ء میں استعفیٰ دے کر پاکستان ہجرت کر آئے اور ۱۹۳۹ء تا ۱۹۵۰ء اسٹینڈنگ ڈائریکٹر ٹیکسٹائلز (مطلوبہ حالت و قلم نیکوئی) کراچی حکومت پاکستان رہے۔ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۳ء ڈائریکٹر ٹیکسٹائلز، وزارت امور کشمیر اور ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۵ء ڈائریکٹر ٹیکسٹائلز، جامعہ وزارت امور کشمیر بننے کے بعد برطانیہ چلے گئے۔ ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۲ء اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز، لندن میں اور پھر چیکنگر شعبہ اردو بننے کے بعد کینیڈا منتقل ہو گئے جہاں ۱۹۶۲ء تا ۱۹۷۵ء شعبہ اسلامیات نورونوچ خود کشی (کینیڈا) میں ایسی ہی ایسٹ پروفیسر کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۶۹ء سے کبلی نورونوچ خود کشی، ایلاس انجیلز اور کچھ کے ڈائریکٹر پروفیسر تھے۔

آفری عمر میں آسٹریا کے سر جان کا کھار ہوئے۔ کینیڈا میں اس کے تین آپ بچے بن گئے۔ آخری آپ بچہ بننے سے ان کی بیوی آنت نکال کر ایک پلاسٹک کی قسطی لگا رہی گئی تھی۔

عزیز احمد کو ملی زبان کی انجی شدہ تھی۔ اردو، انگریزی، فرانسیسی اور فارسی زبانوں پر کمال عہدہ حاصل تھا جبکہ ترکی، اٹالوی اور جرمن زبانوں میں گفتگو کر لیتے تھے۔ آخری عمر میں مادہ سخن زبان بکھر رہے تھے۔

نورونو (کینیڈا) میں ان کا قیام صحت جان و ملک کے تین بیڑوں پر مبنی رہا۔ وفات (۱۶ دسمبر ۱۹۷۷ء) کے ٹھیک چھ ماہ بعد ان کی وصیت کے تحت ہوتی تھی۔ نورونو (کینیڈا) میں دفن ہوئے۔

اداکار ۱۹۵۷ء میں آفری پارک کا انجیلز پورہ ملی چیکنگر کے سطلے میں اسلام آباد (پاکستان) آئے۔ ان کی آخری پبلک بیننگ ۱۸ نومبر ۱۹۷۸ء کی شام فیض احمد فیض کے ۱۶ سالوں میں ہونے والے سلاطین و معتقد (نورونو) کینیڈا میں شرکت تھی۔

ابتدائی مطبوعات و تحریریں

عزیز احمد نے تصنیف و تالیف کا آغاز بچے سے کیا۔ ان کی پہلی و مطبوعہ تحریریں:

- ۱۔ ”بھین“ (نورونو پارک پبلک کے افسانے کا ترجمہ) مطبوعہ ”لاہور“ نیرنگ پبلیکیشنز، لاہور، دسمبر ۱۹۳۸ء
- ۲۔ ”نورونو پارک“ (نورونو پارک پبلک کے افسانے کا ترجمہ) مطبوعہ ”لاہور“ نیرنگ پبلیکیشنز، لاہور، دسمبر ۱۹۳۸ء

اولین مطبوعات و افسانے:

- ۱۔ عزیز احمد نے اپنا اولین افسانہ ”کتنی کھلی جذبات“ کے عنوان سے لکھا، جو پروفیسر عبداللہ نورونو کی ادارت میں شائع ہونے والے، ”نورونو“ مجلہ ”حیدرآباد“ میں، مکتبہ برائے سیر، لاہور، نومبر ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ اس وقت عزیز احمد کی عمر سولہ سال تھی۔

۲۔ عزیز احمد کا دوسرا مطبوعہ الماسات: "افغان" تھا جو مجلہ "مکانات" کا نام تبدیل کر کے نکلا۔ پہلا ۳۱ اگست ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

الماسات نوی مجموعے:

- ۱۔ "قصص باقوام" (گیارہ افسانے) مکتبہ جدید، لاہور طبع اول ۱۹۳۵ء
۱۰۔ "اور پستی نہیں ہے" ۲۔ پاش ۳۔ موندکا ۴۔ دن جینا اور صدیاں ۵۔ رانچاں قہم ۶۔ پاشا من ۷۔ رومٹ انکھ کی کی ایک شام ۸۔ قصص باقوام ۹۔ زون ۱۰۔ اور خطرناک کھلڑی ۱۱۔ ہارو کا پہاڑ (کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا)
- ۲۔ "پکارو دن بیکارا تھیں" (سات افسانے) مکتبہ جدید، لاہور طبع اول دسمبر ۱۹۵۰ء
۱۱۔ سستا پیر ۲۔ جونا غراب ۳۔ زریں تاج ۴۔ قصور شمع ۵۔ زرخیز ۶۔ کالی رات ۷۔ پکارو دن بیکارا تھیں (پہلا بار احمد علی کے نام مضمون کیا گیا ہے)

- ۳۔ "خدا کب جنت" (دو طویل افسانے) میری لائبریری، لاہور طبع اول ۱۹۶۵ء
۱۔ خدک جنت ۲۔ جب آنکھیں آنکھیں پاش ہو گئیں
- ۴۔ "آپ حیات" (تاریخی افسانے) مکتبہ میری لائبریری، لاہور طبع اول سن ۱۹۶۵ء
(مصلحت اور الفت، میراثیں میراثی، دن جینا اور صدیاں، زریں تاج، من لیل، رومٹ انکھ کی ایک شام اور آپ حیات کل سات افسانوں کا مجموعہ تھا جسے انڈیا کو مرکز احادیث کے بورڈ آف کنٹرول نے احمد علی، شہرانی تجزیات از ممتاز شیریں، مسعود ہادی، اختر اور مظہر بشیر احمد اور اور خالد مصطفیٰ شامل کتاب ہیں) یہ کتاب مکتبہ میری لائبریری سے شائع ہونے والی آخری کتاب تھی۔ اس کے بعد ادارہ ختم ہو گیا۔
- نوٹ: کثیر الادب اور نے الماسات نوی مجموعے "مکانات میری لائبریری" اور "کلیا پلٹ" کے عنوان سے شائع کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن یہ دونوں مجموعے شائع نہ ہو سکے۔

تفصیل:

- ۵۔ "ترقی پسند ادب" (تفصیلی تاریخ) مجدد آباد کن، نواہر اشاعت اردو طبع اول ۱۹۳۵ء
- ۶۔ "انہال بی تکلیف" (تفصیلی) کراچی، مکتبہ شمس تاج آفٹس طبع اول ۱۹۵۰ء
- ۷۔ "شعرا کے شعرا کا انتخاب جدید" (بانشراک آل احمد سرور) دبی، الممن ترقی اردو (بند) طبع اول ۱۹۳۳ء
۱۹۷۳ء تک الممن ترقی اردو (پاکستان) کراچی نے پانچ ایڈیشن شائع کیے۔ پہ ۱۹۱۲ء، ۱۹۲۲ء، ۱۹۳۲ء کے شعرا کا انتخاب ہے۔ مزید احمد نے قصبہ کے طور پر صفحات شامل کتاب کیے ہیں۔
- ۸۔ "اقبال اور پاکستانی ادب" لاہور، مکتبہ عالیہ، طبع اول ۱۹۷۷ء
(تفصیلی مضامین مرحوم علامہ قاسمی)

- ۹۔ "ہوس" (ناول) مکتبہ اردو، سوہا اپریس، لاہور طبع اڈل ۱۹۳۱ء
- ۱۰۔ "عمر اور طوفان" (ناول) لاہور، مکتبہ اردو، سوہا اپریس طبع سوم ۱۹۵۱ء
- ۱۱۔ "مگر یہ" (ناول) لاہور، مکتبہ اردو، سوہا اپریس، طبع اڈل ۱۹۴۲ء
- ۱۲۔ "آگ" (ناول) لاہور، مکتبہ اردو، سوہا اپریس طبع اڈل ۱۹۴۵ء
- ۱۳۔ "ایک بلندی ایسی باقی" (ناول) لاہور، مکتبہ اردو، سوہا اپریس طبع دوم ۱۹۴۵ء
- ۱۴۔ "خشم" (ناول) لاہور، مکتبہ اردو، سوہا اپریس طبع اڈل ۱۹۴۸ء
- ۱۵۔ "شٹ" (ناولٹ) لاہور، مکتبہ اردو، سوہا اپریس طبع اڈل ۱۹۸۵ء

(عزیز احمد، حیات و خدمات، از ابو سعادت خلیلی، مجلس القادریہ، لاہور، ۱۹۸۵ء)

احمد خلیلی کی مداحیت "شٹ" از خیم احمد شامل کتاب ہیں۔

- ۱۶۔ "تری دلبری کا گھر" (ناول) لاہور، مکتبہ اردو، سوہا اپریس طبع اڈل ۱۹۸۵ء
- ۱۷۔ "دوتا رنگی" (ناولٹ) لاہور، مکتبہ اردو، سوہا اپریس طبع اڈل ۱۹۸۵ء

(کتاب میں، خدیجہ جنت، اور شب آنکھیں آنکھیں پڑتی ہیں، کے علاوہ، قواعد از فاروقی، مثنوی اور افکار از ڈاکٹر نرہستہ، سب شامل ہیں۔ کل صفحات ۱۵۴)

ترجمہ:

- ۱۸۔ "سہارا فخر" (از رانا نرہستہ، کلاس) دہلی، عالم ترقی اردو، ہند طبع اڈل ۱۹۴۵ء
- ۱۹۔ "مثنوی شاعری" (Poetics) دہلی، عالم ترقی اردو، ہند طبع اڈل ۱۹۴۲ء

(بڑھتی۔ کا ترجمہ مقدمہ مدعو تھی۔ آخر میں بطور فیصلہ ترجمہ کی طرف سے اشتراکات و تھیمات کی وضاحت کر دی ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے ۱۹۷۷ء میں ۱۲۶ صفحات کی مختصراً میں شائع کیا۔)

۲۰۔ "روم جو لیت" (از مارٹا دیم لکھیچو) دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند) طبع اول ۱۹۳۱ء

("Romeo and Juliet" کا ترجمہ مقدمہ مدعو تھی۔ اس ترجمہ کو انجمن نے کراچی سے ۱۹۶۱ء میں دوبارہ شائع کیا۔)

۳۱۔ "مکالمات گارماں داسی" دو جلدیں (از گارماں داسی) دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند)

فرانسیسی زبان سے 1871-1877 A Langue Et la Literature Hindustanien En کا ترجمہ ہے۔ اشتراک ڈاکٹر یوسف حسین خان و ڈاکٹر اختر حسین داسے چادی۔ پہلی جلد یوسف حسین خان، دوسری جلد اختر حسین داسے چادی و مزاج احمد۔

انقرضیاتی ڈاکٹر محمد میدانہ۔ کتابی صورت میں شائع ہونے سے قبل یہ ترجمہ انجمن کے مہذب "اردو" جلد ۱۹، شمارہ ۴، جنوری ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ دوسری بار انجمن نے کراچی پاکستان سے ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔

۴۲۔ "طریقہ خداوندی" (دو جلدیں) (Interno از مارٹا دیم لکھیچو) دہلی، انجمن ترقی اردو (دہلی) طبع اول ۱۹۳۳ء

(جرمن زبان سے ترجمہ مقدمہ مدعو تھی "Divine Commedia" کا ترجمہ دوسری بار انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی نے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا۔)

۴۳۔ "تہذیب" (از بیری لایم) لاہور، شیخ گلجام علی ایڈیٹرز

پہلا اشتراک موسسہ فرهنگستان

("تہذیب" کا ترجمہ، امیر محمد سے متعلق سوانحی گفتیں)

۴۴۔ "چنگیز خان" (از بیری لایم) (انگریز زبان سے متعلق سوانحی گفتیں) لاہور، مکتبہ چاند طبع اول ۱۹۵۲ء

۴۵۔ "۱۲۵۲ء کی جنگ" (از بیری لایم) لاہور، شیخ گلجام علی ایڈیٹرز، طبع دوم ۱۹۶۰ء

("The March Of The Barbarians" کا ترجمہ، دیباچہ، مولانا گلجام رسول صبر۔ بقول مولانا گلجام رسول صبر: کتاب "مستقل تعریف کا درجہ رکھتی ہے۔" ص ۳۰۰)

۴۶۔ "دہلی کے شاہکار افسانے" محمد آغا، دکن، مکتبہ امیر محمد طبع اول ۱۳۳۱ھ مطابق

مہینہ، مہینہ اور سردی پہلا اشتراک مزاج احمد (فرانسیسی افسانے) ۱۹۳۳ء، ۱۹۳۲ء

(یہ کتاب کئی جلدوں میں شائع ہوئی۔ جرمن افسانے، فرانسیسی افسانے، روسی افسانے اور دیگر جدید افسانے، داس کی جلدوں میں مزاج احمد کے تراجم بھی شامل ہیں۔ مثال کے طور پر فرانسیسی افسانے دہلی جلد میں ان اٹول فرانس، انکاسٹو پاساں، ایڈیل زولا، بگنیش فٹیر، ڈاکٹر جوتوار با لڑاک کے افسانوں کو صوفی غلام مصطفیٰ رحیم، ڈاکٹر ایم ای تاخیر، غلام عباس، معراج الدین شاہی اور بدرالدین بدر نے اردو میں منتقل کیا۔)

۴۷۔ رسل کی ایک کتاب کا ترجمہ (از حال در یافت طلب) دیکھئے،

کتوبات مہد الحق، مہینہ، جلیل قادیانی، ص ۵۵۴

تاریخ / پاکستانیت / اسلامیات / سماجیات :

- ۲۸۔ "اسلام و سلطنت" (تاریخ) دہلی : انجمن ترقی اردو (ہندوستانی) طبع ازل ۱۹۳۱ء
- یہ تاریخ سے حلقہ طرز امر کی طبع اور تصنیف ہے۔ کل صفحات ۱۸۹۔ آریاؤں کی قبلی برتری کے جرمن ادعا کی تاریخی بنیاد پر تحقیق، علوم اداوان اور سماجیات کے حوالے سے۔
- ۲۹۔ Oxford Varsity Press "Studies in Islamic Culture In The Indian Environment" (تاریخ سماجیات) لندن طبع ازل ۱۹۶۳ء تا ۱۹۷۰ء
- ۳۰۔ Oxford Varsity Press "Islamic Modernism In India and Pakistan" (لندن) طبع ازل ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء
- ۳۱۔ Edinburgh Varsity Press "An Intellectual History of Islam In India" (برطانیہ) طبع ازل ۱۹۶۹ء
- ۳۲۔ "Readings in Muslim Self- Statement in India and Pakistan 1957-1964" (پاشخراک Wiesbaden) طبع ازل ۱۹۷۰ء
- ۳۳۔ "Religion And Society in Pakistan" (جلد دوم - مرتبہ Lieden E. J. Brill) طبع ازل ۱۹۷۱ء
- ۳۴۔ "A History Of Islamic City" (برطانیہ) طبع ازل ۱۹۷۵ء
- ۳۵۔ "Intellectual History Of Muslims" (برطانیہ) طبع ازل ۱۹۷۵ء
- ۳۶۔ "Quqod-e-Azam Memorial Lectures" (برطانیہ) طبع ازل ۱۹۷۵ء

شاعری :

- ۳۷۔ "ماہنامہ اردو سہری نظمیں" حیدرآباد دکن : انجمن تعلیم پرکس طبع ازل ۱۹۴۳ء
- اس مجموعے میں "محرر ایام" مشہور مضمون ۱۹۳۲ء، "ماہنامہ" مضمون ۱۹۳۸ء اور "طرز و سہری دوسے زمین" مضمون ۱۹۴۲ء شامل ہیں۔

ترتیب و تہذیب :

- ۱۔ تحقیقی و ادبی بیگز "کتبہ" : انجمن ادب اداسی مکتبہ راجستھان، حیدرآباد دکن۔ (پروفیسر محمد تقی سہری کے شریک و مددگار ہیں۔)

غیر مدون: متفرق مضامین:

- ۱۔ "مرزا فرحت اللہ: ایک کاسراچیہ اسلوب" نقوش، لاہور، نمبر ۱
- ۲۔ "کاماری لہجہ" نقوش، لاہور، نمبر ۲
- ۳۔ "قصائد گلاب اور چاند" (تحقیق) نقوش، لاہور، نمبر ۵
- ۴۔ "سنگول" نقوش، لاہور، نمبر ۱۱
- ۵۔ "شمارِ عظیم آبادی" نقوش، لاہور، نمبر ۲۲، ۲۱
- ۶۔ "سخت" (مخصوصیت) نقوش، لاہور، نمبر ۳۳، ۳۲
- ۷۔ "سہیہ اردو تنقید" سویرا، لاہور، نمبر ۴
- ۸۔ "اقبال اور فنِ برائے زندگی" سویرا، لاہور، نمبر ۶۰
- ۹۔ "السانہ افسانہ" (تنقید) سویرا، لاہور، نمبر ۱۲
- ۱۰۔ "ادبی تنقید" (تنقید) نیا دور، لاہور، نمبر ۱۳
- ۱۱۔ "کلاسیکی تصورات، اقبال کی تنقید" (تنقید) نیا دور، کراچی، نمبر ۱۹، ۱۸
- ۱۲۔ "اقبال کا نظریہ فنی" (تنقید) رسالہ اردو، کراچی، ۱۹۳۹ء
- ۱۳۔ "سب دس کے ہاتھ دھماکے" (تحقیق) رسالہ اردو، کراچی، ۱۹۵۰ء
- ۱۴۔ "عظیم ہوشربا" (تنقید/تحقیق) اردو ادب، لاہور، نمبر ۴
- ۱۵۔ "اقبال کا رد کردہ کام" (تحقیق) بادلوں، کراچی، ماہِ پریل ۱۹۵۲ء
- ۱۶۔ "اقبال" (تنقید) بادلوں، کراچی، مئی ۱۹۵۵ء
- ۱۷۔ "Urdu Literature In Cultural Heritage Of Pakistan" (Eds. S.M. Ikran And Perveen Kar, Oxford Varsity Press 1955 Spear)

(اس کتاب کا ترجمہ "اردو ادب ثقافت پاکستان" کے نام سے پمپل پبلیکیشن نے کیا تھا جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔)

"Encyclopedia Of Islam" ہلردوم-Leiden طبع اڈل ۱۹۶۲ء

18. "DIN-ILAH" Fasc. 27, pp. 296-7;
19. "Djam' iyya" (India & Pakistan) Fasc. 29, P 437;
20. "Djamati" Fasc. 29 pp.421-422.

- 21.. "Islam-d-Espagne et Inde Musulmane moderne" in (Études d' Orientalism de ' dieux la Memore de Iev-Povencal) Paris. G.P. Maisonneuve et Larose, 1962
- 22.. "Origin of Country love and the problem of Communication" (Islamic culture, Vol. XXIII, 1949, pp 48-61).
- 23.. "Sources of Iqbal's Perfect Man" (Iqbal, Vol. Vi, No. I-1958)
- 24.. "La Littérature De Langue Ourdou" (Orient, Vol. VII, 1958)
- 25.. "Le Mouvement Des Mujahidin Dans L'inde Au Xixe Siecle" (Orient Vol. XV, 1960, pp 105-16)
- 26.. Influence De La Littérature Française Sur La Littérature Ourdou" (Orient, Vol. XI, 1959, pp 125-38)
- 27.. "Iqbal Et La Theorie Du Pakistan" (Orient Vol. XVII, 1961)
- 28.. "Les Musulmans Et Le nationalism Indien" (Orient, Vol. XXII, 1962, pp.75-96).
- 29.. "Remarques Sur Les Origines Du Pakistan" (Orient, Vol. XXVI, 1963, pp.21-30).
- 30.. "Sayyid Ahmad Khan, Jamal Al-din Al-Afghani and Muslim India" (Studia Islamica Vol. XIII, 1960, pp.55-78)
- 31.. "Trends in the Political Thought of Medieval India" (Studia Islamica, Vol. XVII, 1963)
- 32.. "El Islam Espanol Y La India Musulmana Moderna" Ford International. Vol. 1, No. 4, 1960
- 33.. "Religious & Political Ideas of Shaikh Ahmad Sahind" (Rivista Degli Studi Oriental Vol. XXXVI, 1961.)
- 34.. "Akbar, Heretique Ou Apostat?" (Journal Asiatique No. 1, No. CCCXLIX, 1961).
- 35.. "Moncol Pressure in an Akon Land" (Central Asiatic Journal, Vol. VI, No. 3, 1961)
- 36.. "Moghul Indien and Dar-AH-Islam" (Saeculum, No. 3, 1961).
- 37.. "Political and Religious Ideas of Shah Wali-Ullah of Delhi" (The Muslim World, No. 4, 1962)
- 38.. "The Suh and the Sultan in Pre-Mughal Muslim India" (Der Islam, Nos. 1-2, 1962).
- 39.. "Dar al-Islam and the Muslim Kingdoms of Deccan and Gujarat" (Journal of World History No. 3, 1963).
- 40.. "The Conflicting Heritage of Sayyid Ahmad Khan and Jamal Al-Din Afghani in the Muslim Political Thought of the Indian Sub-Continent" in Trudi XXV Mejdunarodnovo Kongressa Vostokovedov, Moscova 1960, Moscow. Izdatelstvo Vostochnoi Literatur, Vol. IV, 1963-64)

- 41.. "Sufism and Hindu Mystik" Saeculum, Vol. XV, No. 1-1964.
(CAMBRIDGE HISTORY OF ISLAM)
- 42.. "Indo-Pakistan" being Chapter 8 in Part VIII, Vol. II Section on Urdu Literature in Chapter I, Literature, in Part X
- 43.. The Islamic Contribution to Civilization' Vol. II.
- 44.. "Mawdudi and Orthodox Fundamentalism in Pakistan" (Middle East Journal, Vol. 21, No. 3, 1967, pp. 359-380)
- 45.. Universalgeschichte, No. 1/2, 1967, pp. 1-12)
1962 LEIDEN (ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM)
- 46.. "Ghiyas-al-Din Tughluk I"
- 47.. "Ghiyas-al-Din Tughluk Shah (II p. 1076-77)
- 48.. "Hah (III, p. 93-94)
- 49.. "Hamasa" (Urdu Literature) III, p. 119
- 50.. "Hassan Dihlawi" (III, p. 248)
- 51.. "Hida-IV Urdu" (III, p. 358-6)
- 52.. "Hikaya - IV Urdu" (III, p.375-6)
- 53.. "Hind - Islamic Culture" (III, p.438 - 40)
- 54.. "Epic and Counter-Epic in Medieval India" (Journal of the American Oriental Society, Vol. 83, No. 4, 1963, pp. 470-76)
- 55.. "Cultural and Intellectual Trends in Pakistan" (The Middle East journal, Vol. 19, No.1, 1966, pp. 35-44).
- 56.. Approaches to History in the Late Nineteenth and Early Twentieth Century Muslim India" (Journal of World History, Vol. IX, No. 4, 1966, pp. 987/1008).
- 57.. "Problems of Islamic Modernism with Special Reference to Indo-Pakistan Sub-Continent" (Archives De Sociologie Des Religions, Vol. 23, 1967, pp. 107-116)
- 58.. "An Eighteenth Century Theory of the Caliphate" (Studia Islamica, Fasc. XXVIII, 1968, pp. 135-44)
- 59.. "Alghami's Indian Contacts" (journal of the American Oriental Society, Vol. 88, No. 3, July-Sep. 1968 pp. 476-504)

60. "Muslim Attitude and Contribution to Music in India" (Zeitschrift Der Deutschen Morgenlandischen Gesellschaft, Band 119, Heft I, 1969 pp. 86-92).
61. "L'islam Et La Democratie Dans Le Sous-Continent Indo-Pakistan", Orient, 51-52/3-4, (1969), pp. 9-26.
62. "The Role of Ulama in Indo-Muslim History" (Studia Islamica, Fasc. XXXI, voluminis Memoriae J. Schacht Dedicata Pars Prior, Pars G.P. Maisonneuve-Larose, 1970 pp 1-13)
63. "Pakistan Faces Democracy" (The Round Table, No. 242m April 1970, pp. 227-238)
64. "Islam and Democracy in the Indo-Pakistan Subcontinent" in Religion and Change in Contemporary Asia", by Robert F. Spencer Ed., pp. 123-142. Minneapolis: University of Minnesota Press, 1971.
65. "The formation of Sabk-i-Hind", in Isen and Islam, in Memory of the Late Vladimir Minorsky, Ed. C.E. Bosworth pp. 1-9. Edinburgh University
66. "Indien", in Fischer Weltgeschichte, Band 15: Der Islam II, Herausgegeben von G.E. von Grunebaum, Frankfurt Am Main: Fischer Taschenbuch Verlag GmbH, 1971, pp. 226-287

- ۶۷۔ "ترقی پسند ادب کیا ہے؟" (مضمون)
- ۶۸۔ "قرآن کی شاعری" (مضمون)
- ۶۹۔ "ان سدا شد" (مضمون)
- ۷۰۔ "اگر کیا ہے؟" (مضمون)
- ۷۱۔ "کائنات کا نظم سے ایک ملاقات" (پاوراشٹ)

تبصرے:

- ۱۔ "عقلمندی کے فلسفہ" (از قاضی محمد انصار)
 - ۲۔ "سوت سے پہلے" (از اجماعی)
 - ۳۔ "اور ضروری گفتی دی" (از ایچ محمد ستیا راجی)
 - ۴۔ "آئینہ بدعتی" (امریہ ایس۔ ایس۔ عطاء الرحمن)
 - ۵۔ "مجموعہ اشعار حسن علی" (مرتبہ سید حسن)
 - ۶۔ "انجلی قصے فارسی زبان میں" (از ڈاکٹر محمد ہاشم)
- مطبوعہ رحمان اردو اورنگ آباد دکن اپریل ۱۹۳۵ء
- مطبوعہ نیاز و رنگور شمارہ نمبر ۱۲
- نیاز و رنگور شمارہ نمبر ۱۲
- ملین آف دی سکول آف آرٹس جلد اول بحران، ۱۹۶۱ء
- ایڈ افراطی ملاحظہ
- ایڈا ۱۹۶۱ء
- ایڈا ۱۹۶۱ء

- ۷۔ "مسلمانوں کے سیاسی افکار" (از رشید احمد جعفری) ایضاً ۱۹۶۲ء
- ۸۔ "اسلام اور" (از رشید احمد جعفری) ایضاً ۱۹۶۳ء
- ۹۔ "پیرائیکلس" (از خاقان احمد خاں) ایضاً جلد دوم ۱۹۶۳ء
- ۱۰۔ "تقدیمات فرعون" (از محمد حنیف مدنی) ایضاً ۱۹۶۳ء
- ۱۱۔ "انقری" (از جعفر شاہ پھولادی) ایضاً ۱۹۶۳ء
- ۱۲۔ "تاریخ تصوف قبل از اسلام" (از شبیر احمد زار) ایضاً ۱۹۶۳ء
- ۱۳۔ "Storie Dell E Letterature Del Pakistan" (by. Alessando Bausan) ایضاً (جلد سوم) ۱۹۶۱ء
- ۱۴۔ "Religious And Politics in Pakistan" (By: Leonardo Binder) ایضاً (جلد دوم) ۱۹۶۳ء
- ۱۵۔ "Akbar The Religious Aspect" (By. R. Kanishnamurti) ایضاً (جلد چہارم) ۱۹۶۴ء
- ۱۶۔ "History Of Afghans In India" (By. M. A. Rahim) ایضاً (جلد دوم) ۱۹۶۳ء
- ۱۷۔ "Arab Role In Africa" (By: J. Baulem) ایضاً (جلد دوم) ۱۹۶۳ء
- ۱۸۔ "Modern Islam" (By: G E Von Gunstbaum) ایضاً (جلد سوم) ۱۹۶۳ء
- ۱۹۔ "Political Change In Morocco" (By: D.E. Ashford) ایضاً (جلد سوم) ۱۹۶۳ء

منتشرق افسانے (غیر مدقن):

- ۱۔ "نقز کون قق" مطبوع نقوش لاہور شمار نمبر ۱
- ۲۔ "بل منزل" مطبوع ایضاً شمار نمبر ۲
- ۳۔ "ان زلی" مطبوع ایضاً شمار نمبر ۱۵، ۱۶
- ۴۔ "قائل کیر" مطبوع ایضاً شمار نمبر ۲۵، ۲۶
- ۵۔ "کوسب" مطبوع حویلا لاہور شمار نمبر ۱۵، ۱۶
- ۶۔ "کچھ پتلیاں" مطبوع اردو ادب لاہور شمار نمبر ۲
- ۷۔ "سکھائش جذبات" مطبوع "کلمہ" مکتبہ "میداد" لاہور نومبر ۱۹۶۹ء

متفرق تراجم (غیر مدون):

- ۱۔ ”لکھن“ (رازدار کھنگ کے افسانے کا ترجمہ) مطبوعہ ”نیرنگ خیال“ لاہور، جنوری ۱۹۲۸ء
- ۲۔ ”شریر کا“ (لکھور کے افسانے کا ترجمہ) مطبوعہ اپنا، دسمبر ۱۹۲۸ء
- ۳۔ ”غرب آباد“ (Wasteland By T.S.Eliot) مطبوعہ ”رسائل“ اردو اورنگ آباد، ۱۹۳۶ء
- ۴۔ ”پھارن“ (لکھور کے افسانے کا ترجمہ) مطبوعہ ماہنامہ ”کتاب نو“ کراچی، شمارہ نمبر ۸، نومبر ۱۹۸۲ء
- ۵۔ عزیز احمد کی تقریباً ۱۵ مضمومات جمع انگریزی متن۔ مضمون ”ساز و ساز“ مرتبہ حسن الدین احمد (لہارت)

متفرق نچر / ڈرامے (غیر مدون):

- ۱۔ ”عزیز نچر“ جامعہ میں پیش کیا گیا، ۱۹۳۶ء
- ۲۔ ”کالج کے دن“ (۱۹۳۶ء) جامعہ میں پیش کیا گیا، دسمبر ۱۹۳۶ء، مطبوعہ ”مطانیہ“، ۱۹۳۲ء
- (یہ ڈرامائی اہمیت کا ادبی زور اور ڈاکٹر سادات علی خاں (پروفیسر شعبہ قانون) کی نگرانی میں پیش کیا گیا۔ حالات سید محمد اکبر واقعہ کافی۔ اس ڈرامے میں محمد علی الدین، انجیل احمد، لکھوریک، رفعت، مہارشی اور غفر الحسن نے کلف کر دیا ہے۔)
- ۳۔ ”سو“ (دیکھئے عزیز احمد اور ان کی ناول نگاری، ماضیت ہتیر)
- ۴۔ ”مستقبل“ (یہ مضمون حیدرآباد دکن نے پیش کیا، ۱۹۳۳ء)
- (یہ مضمون کا پرانا نام حیدرآباد دکن ایک ایسی نیشن تھا۔ اس ادارے کے سرپرست نواب سرائین جنگ اور مستقیمہ صاحبہ علیہ تھے۔ حالات سید محمد اکبر واقعہ کافی کی تھیں۔)

غزلیں (غیر مدون):

غزلیں ”پہلے غزل مرگ“ ۱۹۷۶ء تا ۱۹۷۷ء

متفرق خطبات (غیر مدون):

- ۱۔ خطبات اسلام آباد (کا تمام مجموعہ ملی پیکرز) جمع ذہانی مکتبہ اور سوال و جواب۔ موضوعات مختلف پاکستان، پاکستان، مسلم برصغیر، اسلام، مسکن، تاریخ نگاری اور سکلی سے متعلق خطبات۔ (راجل ۱۹۷۷ء، سکلی سے متعلق خطبات بطور جواب کتاب خطبات ایف بی میں شامل ہیں، جبکہ نچر کا مجموعہ حال ترقیب طلب ہے)

۲۔ امریکہ و یورپ کی جامعات اور دیگر ادارہ جات میں پیش کردہ خطبات ترتیب طلب ہیں۔

مترجمہ تصانیف:

- ۱۔ "ایکسی پلندی ایکس نختی" (۱۹۸۱ء) از عروج احمد بعنوان THE SHORE AND THE WAVE (مترجمی) (ترجمہ رالف رسل) عروج احمد مطبوعہ لندن ۱۹۸۱ء سے نقل
- ۲۔ "تاریخ سسلی" (تاریخ عروج احمد) اٹالوی زبان میں ترجمہ
- ۳۔ "URDU LITRATURE IN CULTURAL HARITAGE OF PAKISTAN" از عروج احمد کا دوسرا ترجمہ بعنوان "اسروادوب ثقافت پاکستان" از پبلیشنگ ڈاٹ۔ طبع دوم ۱۹۹۷ء

زندگی میں مستقل چہ:

۱۔ جامعات آف اسلامک سٹڈیز، ایچ یو سی آف نورڈنبرگ، کینیڈا۔

اعزاز:

- ۱۔ الجڈ آف دی رائل سوسائٹی آف کینیڈا۔
- ۲۔ اعزازی شہریت، بیسٹ ممبرز دی رلم مین جاب حکومت اطالیہ (اٹلی)
- ۳۔ عروج احمد کے اعزاز میں یادگار مقامات کا مجموعہ Islamic Society And Culture
- مرحہ ملٹن اسرائیل راج کے رائل مطبوعہ Manohar انصاری روڈ، دہلی، کالج رانی دہلی ۱۹۸۳ء
- ۴۔ عروج احمد گجرات، سالانہ انعام نورتنیج پورٹی، کینیڈا۔
- ۵۔ رکنیت اکادمی ادبیات، کینیڈا۔

نظریہ فتن:

"انہ سنے میں ہر چیز اجم ہے، اجاس کی جان ہے اور ہر کسی تحریک کی پابند نہیں اور وہ فقہ کفر واقعہ ہے۔"

عروج احمد

پہوالہ مضمون "افسانہ افسانہ" مطبوعہ "سویہ" لاہور

آیات

112

اور خدائے تعالیٰ نے کہا۔ دنیا تجھ کو آدمی ادا کرے جیسے ہوا گیا ہے۔ کیونکہ وہ تجھ اور باد کو چھلانے لگا ہے اور اب تجھیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ جو حائل اور ذرہ کی کمر بستہ کا پھل بھی کھا لے اور غریبانی ہو جائے۔

اس لیے خدا کے تعالیٰ نے اسے باطنی حدوں سے نکلوا دیا تاکہ وہ اس زمین میں اٹل چلائے جس کی مٹی سے وہ بنایا گیا تھا۔
اس نے اس نے انسان کو باطن نکلوا دیا اور اس نے باطنی حدوں کے مشرق میں فرشتوں کو مقرر کیا، جن کے اٹھ میں پہنچی ہوئی تلوار ہیں۔
جنہیں جوہر سے چلتی مٹی جسے تاکہ وہ نہ لگی کے درخت کے راستے کی نمونہ بنی کریں۔

(۲) $\frac{1}{2} \left(\frac{1}{2} + \frac{1}{2} \right)$

گل کاٹش، ہاٹل کا سب سے طاقتور انسان، جس سے ہاٹل کے دریا کھڑے تھے، اپنے دوست این کی دوکی لاش کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کا مصاب، غضب اور رنج کی شدت پر گھٹکے گئے تھے۔ اس کے جسم کا فوارہ اس آگ میں مل رہا تھا جو اس فوارہ کو جلا سکتی تھی، کیونکہ اس کی تھی۔

اور گل کا مٹھلے نے چوں نہیں کیا، اور چٹکاؤں کے سے دکھارے۔

”میرے دوست، میرے بھائی جو پہاڑوں کی دھولان پر میرے ساتھ جنگلی جانوروں اور میڈانوں کے شیریں کا شکار کرتا تھا۔ ان کی دیر و دوست، میرا چھوٹا بھائی جو میرے ساتھ پہاڑوں کے دامن میں گودرا اور میڈانوں میں شیریں کا شکار کرتا تھا، جو میرے ساتھ ساتھ ہم سب کو کمر کھاتا تھا، جو چوٹی اور چٹانوں پر چڑھا، جس نے آسمان کے سائو کو پکڑا اور جاک کر دی۔ جس نے ہولہ اکواٹھ کے چنگ و دیو رنگوں میں، جتنا تھا۔ کتاب کی کون سی جگہ سے جس نے تجھے بکڑا لیا ہے؟ تو یہاں چمکا ہے اور مجھے کچل نہیں سکتا۔“

مکمل کاشت کے دوست کی اولیٰ نے آنکھیں اوپر نہیں اٹھائیں۔ مکمل کاشت نے اس کے دل پر ہاتھ رکھا۔ اس کے دل کی دھڑکن

اور جب یہ ہوا کہ رنج کی جگہ غصہ اس طاقت ور اور اس حیثیت نامک انسان پر طاری ہونے لگا کھل کاشمیر پر جس سے راجہ بھی بڑا ہو گئے تھے۔ اس کا دورستہ کسی مصرعے میں لکھی جاتی لڑائی میں، شیروں کے جنگل میں، کئی اور انسان پاؤں پا کر کھڑا کر کے چاک نہیں ہوا تھا۔ ایک بھاری جیسی ایک بھاری تھا، جس نے اس کے طاقت ور درستی کو اس قدر دہم دیا کہ پاؤں وہ جو کھل کاشمیر کا سا جیسی تھا اور کوئی اس کو بھانپ نہ سکتا تھا۔

نکل کاغذ نے اپنے دوست کو چادر سے چھپا دیا تھا، جیسے لیکن چادر سے چھپائی جاتی ہے اور نگل کاغذ کی شیر بھی آواز کوئی انجی۔ بار بار اور بھر بار بار وہ اپنے دوست کی طرف پلٹتا اور اپنے ہال نوچتا اور اپنے داخلوں سے اپنے جسم سے ذوق برق لباس تک کو سونے لگتا۔ یہ نقصان ایسا تھا کہ وہ اسے حقیقت سمجھنے کے لیے تیار نہ تھا۔ گویا پھر نکل ایک خواب تھا جس کی کوئی اصیت نہ تھی۔ یہ کہ اس کی دوسری نہیں سکتا۔ جرات کی بجائے سے الفا کر رہا تھا۔ سات دن اور سات راتیں گزر گئیں اور اس نے اپنے دوست کو الٹ نہیں کیا۔ کیونکہ انجی اسے یہ سچ تھی کہ جس کے پیش کی آواز میں کراس کا دوست جاگ اٹھے گا۔

یہاں تک کہ سات دن اور سات راتیں گزر جائے کے بعد ایک سفید سا کبوتر ایمن کی دکان کا گھبراہٹ سے باہر نکلا۔ یہ اس کی بھائی تھی۔ اس کی اڑن اندر سے سڑنے لگی ہے اور ہر گل کاٹش کو لپٹتی ہے آگسا انسان کی تھوڑی سی کے دو سٹھ ایمن کی دوپٹے غالب آ چکی ہے۔ اور ہر گل کاٹش کے لیے جیسی باقی رہ چکا تھا کہ وہ کبھی نہیں دے لے آ رہا نہ اٹھائے اور بھٹکے ہوئے شکاری کی طرح کھائی کھائی کھائی میدان میں گر کر ۲۲ پھرے۔

جولوہی باہل میں ایک شہر تھا اردک۔ اردک کے سردار دسی کا نام گل کاخش تھا۔ وہ انسان تھا، دلیع تھا نہیں تھا۔ ہر قسم کی طرح، ایک اور پہانی کوڑی جس میں انسان کی قوت اور بھڑکی تھی، لیکن دلیع گاؤں کا سماجی نظام اور اشتعال۔ یہ گل کاخش ظالم اور پار تھا اور اس کی دعا یا اس سے تلاش نہیں تھی۔ یہ بیچارہ بکریوں اور حقوق کا طرائق وصول کرتا تھا۔ اس کے دل میں درد نہیں تھا اور اسے دوسروں کے درد کا احساس نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس کی دعا یا نے غلب آ کے باہل سے دلیع گاؤں سے دھما گلی کہ وہ گل کاخش ہی جیسے ایک اور طاقتور انسان پیدا کرے۔ اس کا نامی تاکہ بد دونوں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے رہیں اور نہایا کو ٹکھن لے۔

دو ہفتوں نے اس ملک کی رعایا کی فراہمائی اور اس کی روکو پیرا کیا۔ لیکن گل کاشش کا مد مقابل اور طیب بیٹے کی جگہ وہ اس کا دوست۔ ساتھی اور حلیف بن گیا۔ طاقت و دانش ہی اکثر ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں۔ اور تب تو گل کاشش کے نگہبان کی طاقت اور اس کی خیر و برکت کی کوئی حد نہیں رہی۔ اب وہ اپنی رعایا کو بھیڑ بکریوں کی طرح بہت معمولی نگاہ دیکھتا تھا۔ اس کی اور اس کی روکو کی دوستی آسانی نگاہ سے جانچ لیا جاتا تھا۔ اس کی رعایا کی کیا حقیقت تھی۔

ان دونوں نے خود دوا اور دے دے سے خطرناک سڑکوں کا بیڑا اٹھایا۔ جہاں گھاناں جنگل میں گھس گئے جو سورج کے دھج تاجین کی
 گک کر رہا اور سورج کے دھج تاجین کی گک کر رہا۔ لیکن ان دونوں نے ہوا کو اٹھانے کے چب دیا اور اسے

جب گل کاغذ اور اے کی دو اس ہولناک شکار سے ڈھانس آ رہے تھے انہو کی سنسن آگھوٹنے لگی کاغذ کا مروتانہ جوں و جمال دیکھ لیا اور اس پر حاشق ہو گئی۔ یہ انہو اس نہالے میں اور اس ملک میں اتنا کھلائی تھی۔ انہو کے کئی نام تھے اور وہ عورتوں کی سرتاج اور زندگی کی افتاد اور سب سے بڑی دلجو گی۔ وہ کہیں انہو تھی کہیں انہو مارنے والی ستارہ تھی، بیسے آسان مرز پر کہتے ہیں اور چرائی شو بہ ناک نظر دیا

سے انسانوں کو بچے کی طرف کھینچتا ہے۔ جس نے ہاروت اور ماروت کو بائبل کے کوٹیس میں قید کیا، جیسے حضرت عیسیٰ کے بھائیوں نے یا زلیخا نے حضرت یوسفؑ۔ یہاں مصر میں آئی کس اور جاسے کیل تھی۔ یہی افراد نے آئی یاوی کی نس تھی یعنی حسن کی بیوی اور عشق کے دیوتا کی بیوی کی۔ اب لیکن یہی جولو بھی تھی۔ دوج جہاں کے دوج تالیس کی بیوی۔ اصل میں یہ دھڑھو تھوڑی ساں، بیوی اور، لیکن تھی جو ہر سال قتل ہوتا تھا اور باڑے آ جاتے تھے اور جاتا تے پر خزاں آ جاتی تھی اور اسٹین اور ہانو دھر جھانے سے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ دھڑھو جاکے تھوڑے دوزخ میں رہ دیتا۔ میں پھر سے زندہ کرتی اور دنیا پر بھرا آ جاتی۔ شاخوں سے ٹٹو نے پھوٹ نکلتے دھڑھو سے دیا کے نسل میں زمین کو زخیر بنانے والی علیانی آ جاتی۔ لہذا ان کے جنگل بری بری تھوڑے سے پہلے ہانے نکلتے۔ مندر وہ میں اور میدانوں میں مور قتل اپنے ہمدان کی عاشق کے لیے کھف کر دیتی۔ ہاتھوں کی بھولیس بھر جاتیں۔

جنگل دشمن تھی، یہی دشمن جس کے دریاں کو صدموں سے لہو لہو کرنا سکاتے اور پھر برہم کرنا چاہا اور مریم محمد لین کو اس جنگل سے جھین لیا۔ اسی کے جنگل میں حضرت اے سب کا ضمن سیر ہوئی رہا تھا کہ بال بال بن گیا۔ اور ان واقعات سے ہزاروں سال پہلے اس دشمن نے گل کا مثل کا نمونی بنالیا۔ یہاں جو جلال کی ایک کلیتہ تھی اور وہ گل کا مثل پر عاشق ہو گئی، جیسے وہ ہزاروں سال بعد وہیں بن کے ایک چرواہے پر عاشق ہونے والی تھی۔

دماغ تو آنکھوں کے جہاز نے کل کا مشاہدہ کر لیا اور دیکھا کہ اس کے غولوں میں غارت اور بربکت اور قحط کا خون موجیں مار رہا تھا۔ عشق آجے تجھیں نعل ہے اور عشق اتنی کھست ہے۔ اپنے اور اپنی حیات اور اپنے جسم کی ٹکست کا اعتراف ہے۔ عشق زمانے میں زندگی کے تسلسل کا سچا ہوتا ہے اور اس وقت عشق اور وقت کے طرہوں میں کل کا مشاہدہ کر لین میں بھی یہ تصور نہیں آ سکتا تھا کہ دماغی ہے یا اس کی زندگی یا اس کا جسم دماغی ہے اور یہ کہ زندگی کے تسلسل کے لیے ضروری ہے کہ جب وہ مر جائے تو کوئی اور جسم باقی رہ جائے جس کے جسم کے غم سے جا بجا اور اس طرح زندگی موت کا اور حیات کا کائنات ہے۔ آپ کو یاد آئے گا کہ اس کی طرح لافانی، دماغی، رانی، حسی اور باقی سمجھتا تھا۔

۴۔ وہب دھڑنے دیکھا کہ اس کے حسن کا نکل کاغذ پر گئی اور نہیں۔ ایک معمولی انسان ہو کے وہ بچوں کی دماغی اور فکری اوراد ہے۔ قرینہ و شہادت لکھتا ہے اس نے بھی دماغی کام ہو مصر کی زبان کرنے والی تھی۔ اس نے نکل کاغذ اور اس کے دوست ایمن کی دو کو پاک کرنے کے لیے آسانی سے ناک دیکھا جس کی سانس میں آگ تھی لیکن نکل کاغذ اور اس کے دوست نے اس آسانی سے ناک کو بھی پاک کر ڈالا۔ اور کچھ ہر گز کچھ حال کے عالم میں نکل کاغذ نے اس سے ناک کا ٹکس اکٹیز کے دھڑے کے منہ پر سے مارا۔

[illegible]

اور اس طرح انہی کی دوزخ میں کل کائنات کے ساتھ یہاں ان کی اسطوانات پر گھوم رہا ہے۔ تھوڑے عرصے میں ان میں شیعہ۔ جس نے ہوا اور آسمانی سال کو ہلاک کیا تھا۔ بالکل اسی آسمانی لکھی تھی۔ ساتھی سے مر کا جیسے بھی مرنے ہے یا پھر مر رہا ہے یا جیسے کوئی برساتی کیز ہلاک رہا ہے۔

گل کاٹش کو اس پر سخت رنج و غضب تھا۔ وہ غلام اور پھل نہیں دے گا تھا۔ اور اب رہنمائی پر غم کرنے کا زمانہ نہیں رہا تھا۔ اب اس کے اپنے بچہ میں انسانی شعور نے مکمل مرحلہ پیدا ہو کر اسے انصاف کا مطالبہ کیا۔ اس انصاف کا پھل ہائی کی روایا کا حق سمجھتی تھی۔ یہ کہ یہ غلط انسان کے خلاف ہی ہو سکتی ہے اور اس کی سزا بھی ہے لیکن قدرت میں قدرت کے اعمال اور افعال میں غلط اور بر اور جزا کا کوئی تصور نہیں۔ یہ کہ جسم کی غلط زیادہ ہوتی ہے اسے سزا نہیں ملتی، یہ کہ وہ کو ملتی ہے۔ مثلاً گل کاٹش اور اس کی دوکان کا واقعہ ہے۔ جو اور آسانی سناؤ کو ہلاک کرنے میں بڑا حصہ گل کاٹش کا تھا لیکن وہ محفوظ رہا۔ لیکن وہ محفوظ رہا۔ اور سونا کے دیکھنا نے اس کی دوکان کی جان لی جو شخص اس کا شریک اور رفیق تھا۔ آخر موت کا کیا ہوا ہے؟ اور انسان کا کے درد سے ہے کیوں گڑبغا ہے؟ گل کاٹش نے سوچنا شروع کیا۔ لہذا موت سب سے بڑی سزا ہے۔ یہ نفرت کی انتہا ہے۔ گل اس کو کیا پاتا ہے جسے ہم اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں اور اسے معاف نہیں کر سکتے اور اسے زندگی کے وہپ میں نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن یہ سزا قدرت ہلاک کو خاص انتہا کے واسطیوں، بے انصاف، بے مقصد، بے ایکہ کو دیتی ہے، مگر جلدی بھی اس میں۔ مگر کس آفریں؟

اس سوال کا جواب خدائے مآلا خدائے باطن کو جنوں نے اس کی داستان تخلیق کی اور وہ آواز دہرا کرنا رہا۔ وہ دہرائی کی دوکان بھری گیا۔ وہ جو معمولی انسان سے لے کر آسانی سناؤ تک سب کو زیر کر چکا تھا۔ اب صرف ایک دشمن کو زیر کرنا چاہتا تھا۔ موت کو۔ یہاں یہ کہہ دین ضروری ہے کہ گل کاٹش موت سے ڈرتا نہیں تھا۔ اگر وہ موت سے ڈرتا ہوتا تو اب سے بہت پہلے جب اس صیب دج سے لڑنے لڑتے تھے، اس کی دوکان صحت نہ رہ جاتی تو وہ دہرائی کی دوکان بھی سے یہ کیوں سمجھتا۔

”میرے دوست اور کون ہے جو آسمان کی بلندی تک بلند ہوا تاکہ وہ ایٹم ایٹم سورج کے دھماکے میں سمجھ جائے۔ وہ شخص انسان ہی تو ہے۔ اس کی زندگی کے دن محدود ہیں خواہ وہ کوئی صحران کس قدر کرے۔ وہ چھل سوا ہے اور رقم انکی سے موت سے ڈرتے ہو۔ تمہاری صحت اور طاقت کہاں ہے؟ انکو کس اس دج پر غلط شروع کرتا ہو اور غم ظہور کے چنا کے کچھ ہاں بڑھو۔ اور موت۔“ اور اس میں مارا باؤں تو صحت کی وجہ سے ہر اہم تو زور دے گا۔ تاکہ انکی کے صیب دج ہوا دے ڈالے میں گل کاٹش مارا گیا۔

اس طرح کی موت کے تو کوئی معنی تھے مگر یہ کیا کہ معمولی ہی چارے اور ان کی دو جیسے کڑیل پہلوں کا کام تھا۔ جو ہائے۔ اور گل کاٹش نے موت کا مقابلہ کرنے اور موت کو شکست دینے پر کمر بستہ ہو گیا۔ یہاں کا آخری اور سب سے بڑا صحران تھا۔ سب سے بڑی ٹیم۔ اب ایک ہی خیال تھا، ایک ہی نگر، ایک ہی مقصد، جن رات گل کاٹش کے دل و دماغ پر حاوی تھی۔ یہ کہ کس طرح موت کو شکست دینی پائے۔ کس طرح تو کوئی کیا پائے اور سوچتے سوچتے گل کاٹش کو یاد آیا کہ اس کے جہوں میں سے ایک شخص تھا (شاہجادی جسے میرانی شعر علیہ السلام سمجھتے ہیں) اب موت کے سمندر میں اسے پار دینا ہے اس دوسرے سرے پر جاتا تھا اس نے بتائے وہام حاصل کرتی ہے۔ صرف اس نے۔ مگر اور نے نہیں۔ اور کسی انسان کو بتائے وہام غیب نہیں ہو سکتی۔ بتائے وہام کا راز اسے معلوم ہو گا۔ گل کاٹش نے چہرہ کیا کہ وہ اس کے پاس پائے گا اور اس سے یہ راز اور طاقت کرے گا۔

چنانچہ تین چار گل کاٹش نے دروازہ کا سفر شروع کیا۔ اس نے ان پہلوؤں کو کئے کیا جن کے اس پار آفتاب غروب ہوتا ہے۔ پھر اس نے وہاں صحران راستہ لے کیا، جس سے آفتاب رات لگزرتا ہے۔ وہاں جس کو کیا کہ پھر انکی دو روشنی کو نہ کچھ سکے گا۔ اور پھر وہ ایک بحرِ فجار کے کنارے پہنچا۔ راستہ میں اسے جو کوئی مٹا اس سے وہ اس کا فانی بزرگ اتنا شتم تک پہنچنے کا راستہ پر چھتا اور جانے وہ اس کی تفصیلیں

پوچھتا اور بار بار اسے ایک ہی جواب دیتا۔

”گل کا شتم تم کہاں مارے مارے بگڑ رہے ہو۔ بھائے دوام جس کی قسمیں آرزو ہے تمہیں نہیں ملیں گی۔“ کدک جب ایساؤں نے انسان کو بلایا تو سوت اس کے نصیب میں کھڑی اور زندگی کا راز اپنے دلوں میں محفوظ رکھا۔ گل کا شتم کہنا ہیچ اور سوتے اڑنا۔ بچپن سے زندگی بسر کرو۔ دن رات تپا کاؤر۔ سنے سے بکڑے۔ پتھر لہاؤں کھائی سے سر مھلو۔ اپنے بچے کی طرف دیکھو جو تھرا رہا تھو بکڑے۔ بے اور اپنی بیوی کو اپنی آغوش میں ملے کے راحت بخشو۔ انسان کو انہیں ہیچ دلیں میں گم رہتا ہے۔

نہیں گل کا شتم ہم انسانوں کا راستہ چلنے نہیں نکلا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہڈاٹنے والا تھا۔ بھائے دوام کی آرزو اس کے تن جان کو جاتے دے رہی تھی اور وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ سمندر کے کنارے اسے ایک کشتی ملی اور ایک کشتی بان جرات کا شتم کا ملازم تھا وہ اسے سوت اور کھانے کے گرو خدا کے پاس پار کا شتم کے پاس لے گیا۔ اس نے آگے شتم سے یو چھا کہ بھائے دوام کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن آگے شتم بھی اس کی مدد کر۔ کیا کیونکر خداؤں کو بھائے دوام ملا تھا؟ کچھ ایسے عجیب حالات میں حاصل ہوئی تھی جن کا وہ بارہو چش آ سکتا نہ تھیں تھا۔ بہت عرصہ ہوا جو سے قدم نہڑانے میں جب وہ چٹاؤں نے انسان کی بد عنوانیوں اور گمراہیوں سے شک آ کر نئی نوع انسان کو نصیب دیا اور کرتے کا چیرہ لیا تو ان کے مشورے سے سوت کے کوچ بنایا۔ گل نے زمین پر ایک عالمگیر طوفان بھیجا۔ اس طوفان میں آگے شتم اور اس کی بیوی اور اس کے بچوں کے سوا سب ڈوب گئے۔ آگے شتم کو پہلے سے آنے والے طوفان کی اطلاع ملی تھی۔ اس نے ایک بڑی کشتی بنائی جس میں وہ خود اس کے بال بچے تمام چاروںوں کے یک ایک جڑے کے ساتھ سوار ہو گئے۔ ان لیل کو کچھ دنوں کے بعد انھوںں ہوا کا تاج اور طوفان سمجھیں ہلہ بازی کا کام تھا۔ اور اسے خوشی ہوئی کہ آگے شتم نے زندگی کے اسے نمونے ہاک ہونے سے بچائے۔ اس کے انہم میں اس نے آگے شتم کو بھائے دوام ملے کی۔ لیکن ایسے واقعہ بار بار پیش نہیں آتے۔

گل کا شتم ستارہ بارہو مہر انہوںں سے بہت پیسے گزرا تھا اس لئے وہ چونک نہیں چا کہ بانیں یہ حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ ہے اور بھائے دوام نے انہیں غصہ کوٹھ ہوئی اور انہیں مل نے نہیں دیا کی۔ خدا نے بزرگ۔ برتر نے عطا کی۔ گل کا شتم جو جو وہ سائنس دانوں سے بہت پیسے گزرا تھا اس لئے اس نے نظریہ نہیں بنایا کہ طوفان نوح شاید بچہ و مرد کے بھرنے کی یاد ہو۔ جب نسل انسانی کے پاس کی چٹاؤں کو توڑ کے بھرنا اٹھا تک کا پانی ایک بہت بڑے۔ تھے میں گھس آیا، جس میں انسان آباد تھا اور جہاں آبادیاں تھیں وہاں آج بھر کا دم ہے۔ اور زندگی کا شتم نے یہ نظریہ بنایا کہ یہ باہل اور اس کی زمین میں کھینچاؤں کا طوفان تھا۔ اور اس نے اس نظریہ پر غور کیا کہ جب آخری عرفانی دور کے گزرا جائے تو کھٹکا زور اور رات کا بہت سا برف۔ کھٹکا ہو کا تو تھا بڑا ہلہ اور طرات میں اسکی خطائی آئی ہو کہ سارا ملک پانی میں ڈوب گیا ہو۔ نہیں گل کا شتم کو بھی کے افسانے کی فکر نہیں تھی۔ وہ مستقبل کی فکر میں مبتلا تھا۔

آگے شتم نے گل کا شتم سے کہا لیکن تمہیں سوت سے لڑنے کی ایسی ہی تمنا ہے تو ضرور جو پہلے خند سے لڑو۔ اور وہ اس طرح کا ایک ہادہ کی خند ہے۔ اگر تم اس خند سے ہاک کھٹو تھیں ہے سوت کے بعد ہاک کھٹو۔ گل کا شتم جاو کی خند سو گیا لیکن ہا گیا اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ ہاک ہونے ہی والا تھا کہ آگے شتم کی بیوی کو اس پر دم آیا اور اس نے اسے جاو کی خند سے دھکا دیا۔

لیکن گل کا شتم کی مہم کا کام اب بھی تھی۔ پتا خاص صحت ناک بہت در آوی نے بارہاں ملی اور آگے شتم سے ارادہ دیا کہ جانے کی اجازت پائی۔ آگے شتم کی بیوی نے اپنے عادی سے درخواست کی کہ نصیب سے جتے وقت وہ گل کا شتم کو کوئی تحفہ سے ابرا آگے شتم نے اللہ واسی

مٹنے کے طور پر اسے یہ کہنا یا کہ سمندر کی جہ میں ایک اور غصہ ہے، جو اس کے بچے کھالے اس کا بڑا چاہا چاہا تھا ہے اور اس طرح وہ مسلسل جہاں رہتا ہے۔ یہ جہاں وہ کام کر رہا تو نہیں تھا لیکن ٹیلی موت کا علاج ضرور تھا۔ اور گل کاٹل اس دوسری موت سے نہیں ڈرتا تھا وہ دشمنوں کا مقابلہ کرنے میں، کسی جہم کو مرنے میں آجاتے۔ انکا ہتھم کے آخری تھلے سے ہر اس کی لادائی ہوئی ہمت نے ایک نئی جگہ کی محسوس کی۔ صید کی ایک نئی کرن ٹھکرائی اور وہ اس لادائی مرد پر درگ سے رخصت ہوا۔

انکا ہتھم کا علاج جہاں سے موت کے سمندر کے اس پار پایا تھا، پھر اسے لے چلا۔ اس نے سمندر میں ٹھیک اس مقام پر اسے اچھپایا، جہاں سمندر کی تھا کہ کرائی میں جہاں کو دیکھ دینے والا تھا تو گل کاٹل نے غور کیا تھا اور سمندر کی جہ سے اس میں بہا پانے کو اچھپایا اور پھر گل کاٹل کاٹل کو ہی علاج جس کا نام ارشیا پائی تھا اس کے دار الحکومت اور کھانے کے چار۔ وہ دونوں ٹھیک فادس کے کنارے پہنچے اور پھر ارشیا پائی زمین پر منزل مقصود کی جانب روانہ ہو گئے لیکن وہاں بڑا گرم تھا۔ آفتاب تیز تھا نہ میں تب ہی تھی، جہاں وہاں جی اور سفر رخصت تھا۔ ایک چشمہ ٹھکرایا جس کا پانی ٹھنڈا پانی دیکھ کے اس کا پی ہوا کہ کھانے کا راضی تھا۔ اس نے کپڑے اتارے اور نہانے کے لیے چشمہ میں اتر چلا۔ جہاں کو دیکھ دینے والے پورے کھجی اس نے چشمہ کے کنارے ہی چھوڑ دیا تھا۔ ایک ساپ نے اس پورے کی خوشبو کھجی، اپنے من سے باہر نکلا، اور پورے کوٹنے کے تاب ہو گیا۔ وہ بھی تو ایک ساپ ہی تھا جس نے آدم دھا کو ٹنگ دیا۔ کے درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی اور نہ کی کے درخت کے بچے کھالے اس نے ساپ کھجی میں مرتے۔ جب وہ بڑھے ہو جاتے ہیں تو پرانی کھجی اتار بیٹھتے ہیں۔ اور تب گل کاٹل نے اپنی پہلی اور آخری ٹھکست پر اتم کیا۔ چشمے کے کنارے جہ کے ارشیا پائی سے خطاب کر کے اس نے رونا شروع کر دیا۔ وہ جو کھجی میں رہا تھا، اس کی وہ کی موت پر کھجی نہیں۔ اس کے دونوں رشتہ داروں پر اسوہنے لگے اور اس نے کہا۔

”ارشیا پائی کس کے لیے میں نے اپنے بازوؤں کا انکار اور اپنی طاقت صرف کی، کس کے لیے میں نے اپنا خون بکھریا کیا؟ مجھے خود کوئی موت میسر نہ آئی۔ ہاں زمین کے اندر بننے والے سانپوں کی میں نے ضرور بڑی خدمت سرانجام دی۔ اور اہل پائل کو اپنے سوال کا جواب مل سکے۔ اور وہ نہ کی اور موت کا جنتان مل نہ کر سکے۔“

2

ایک بھائی تو جہاں تھا۔ یا اسے علم دیا، ہم تو جہاں کہہ لیجئے کہ کب اس زمانے تک انسانی زمین پر کس اور انسانوں میں زیادہ اختیار نہیں کرتے پایا تھا۔ خبر اس تو جہاں کا نہ رہی سہی تھا۔ یہ ایک چشمے کے کنارے بیٹھا تھا اور اپنی جہ میں کس نہ کھڑا تھا۔ اپنا کس۔ اور اسے بتلیں تھا کہ اس کے اپنے کس سے زیادہ جہیں اور کوئی ہے نہیں۔ یہ کہ اس جیسا کوئی اور بیٹھا نہیں ہو سکتا۔ اور وہ اپنی طرح سا لہا سال چشمے کے کنارے بیٹھا اپنا کس نہ کھڑا۔

یہ چشمہ بھی شاید دیکھا تھا، کہ شاید وہی تھا جسے وہ چشمہ جس میں نہانے کے لیے گل کاٹل نے کپڑے اتارے تھے اور جس کے کنارے اس نے سوا بیکار جہاں کا کام نہ کھو دیا تھا۔ جسے ساپ جہاں کے تھے۔ شاید یہ نہاری کس وہی گل کاٹل تھا۔ مگر اب وہ میرا نہیں رہا تھا۔ اس کی جہاں کی خصوصیات، رخصت ہو گئی تھیں، جہاں ہی جہاں باقی رہ گیا تھا۔

اور چشمے سے جڑاؤں باندھ ہوئی صدائے بازگشت وہ ایک پری بن گئی، ایک صورت۔ وہ اس خوش جمال انسان پر عاشق تھی کہ اس کے اپنے وطن میں اس خوش رونو جوان کا حق پہلے بھولے اور وہ ایسے ہی حسین بچوں کی ماں بنے۔ آخر اس صورت کا حضرت حوا سے بہکنا تو باطل تھا جنوں نے سانپ کے کنبے سے بنی اور بڑی کے طم کا پھل پہلے خود کھایا پھر حضرت آدم کو کھلایا اور اس کے بعد خدا نے قناتی نے چائے دوام کے درخت پر فرشتوں کو پھر وہاں مقرر کر دیا کہ گھیس انسان جو تنگی اور بڑی کے طم سے اوقف ہو گیا تھا، چائے دوام بھی حاصل نہ کر لے۔

چنانچہ نہ رہی سن نے اس پری کی آواز نہیں سنی اور اپنا ٹکس دیکھتا رہا اور اپنے ہی ٹکس پر عاشق ہوتا گیا اور یہ پری، یہ صورت اس کے وطن میں مکمل گل کے گل صدائے گل صدائے گل صدائے بازگشت بن گئی۔ اور سدا بہار جوانی کا چارواں سائوں کے قبضے میں رہا۔ یہاں تک کہ فارسی کس کو اس خطے پر شک ہوا، جس میں وہ اپنا ٹکس دیکھ رہا تھا۔ کیا یہ پشتر گل ایک آئینہ تھا، کیا ایک خطرناک آئینہ جس میں اپنے ٹکس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اور شاید یہ آئینہ کسی کی حسین آنکھ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک صورت کی حسین آنکھ اور وہی آنکھ کی شکل کا ایک پھول اب ان میں نکلا۔

اب انکوں نے فارسی کس کا کچھ نہ کچھ جاننا تھا۔ یہ سنا تھا اور انہوں نے اس کا نام گل زکریا رکھ دیا۔ لیکن نہ پشتر کیا تھا، نہ یہ رونو جوان کیا اور وہ صورت وہ پری کی تھی جی جو خلق کے طم میں گھلتے گھلتے صدائے بازگشت بن گئی تھی۔ کیونکہ بلاد فلسطین میں ایک مقدس درخت تھا۔ جس کے سامنے میں ایک کنواں تھا ایک اور رونو جوان چاند کی روشنی میں اس میں اپنا ٹکس دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے صحنی جسم کو چاند کی روشنی میں نیم مریاں کر دیا تھا۔ کیونکہ چاند کے صحن اور اس کے صحن میں ایک طرح کی مشابہت تھی۔ یہاں تک کہ اس رونو جوان کے والد اسے محفوظ رکھنے کا حکم دیا تھا۔ ان کی مقدس آنکھوں پر شک اور ملامت کا سایہ چاند اور گر رہا اور انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا "بوسف اپنی شوخاں نہک کر"۔

اس کے بعد حضرت جبرائیل علیہ السلام کو انکوں کو اس کی باتوں کی باتوں سے سنا تھا۔ ان سب کا اپنا ٹکس بلاد فلسطین تھا۔ فارسی کس کی طرف اپنا ٹکس انہوں نے چشمے میں نہیں دلوں میں دیکھا۔ مگر کچھ دل کھرے ہوئے ہیں اور کچھ کھوئے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں اتان کا ایک خوش ہے اور ان کے ہاتھوں میں بھی اتان کے خوشے ہیں مگر ہاتھوں کے ہاتھ کے اتان کے خوشے ان کے ہاتھوں میں اتان کا جو خوش ہے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر رہے ہیں۔ مصر کی قضا سالی میں یہ خواب چرچا ہوا، مگر اس وقت ان کے ہاتھوں کو پکڑ نہیں آیا۔ پھر انہوں نے خواب میں دیکھا کہ سارے کاکب ان کے سامنے سر تسلیم خم کر رہے ہیں۔ یہ خواب بھی ان کے ہاتھوں کو پکڑ نہیں آیا، مگر کچھ دنوں بعد ان کو ایک کونٹوں میں پھینک آئے۔

اور تین دن کونٹوں کی تہ میں گزار کے حضرت جبرائیل نے حواریہ کس کی صدائے بازگشت کی عراج زلیخا ان پر عاشق ہوئی۔ وہی تنگی اور بڑی کا طم۔ مگر ابھی اپنے ٹکس کی محبت میں نہیں پائی تھی اور اس مرتبہ جس قدر جس کونٹوں میں زمانہ میں حضرت جبرائیل کو خداوند نے امیر کیا اس میں بجائے تین دن کے تین سال گزارنے پڑے۔ یہاں تک کہ جموں لاؤ دلا میری کا سہیل ان کی آنکھوں نے یاد کیا کہ کس طرح یہ سال دریاے نعل میں غلایا آتی ہے اور دریاے نعل کی ایک تہہ جم جاتی ہے، پھر سے زندگی کی ایک تہہ دریا جاتی ہے۔ یہاں میں زندگی کا پھر سے طموح ہوتا ہے۔ لاجت، عبادت اور انسان اور زلیخا کو باغ غرضت کا شرملا اور حضرت یعقوب کی آنکھیں روشنی ہوئیں۔

لیکن حضرت جبرائیل کے زمانے میں جب یہ دریا مغز اور مختلف الجود فرعون اختاؤں، لہجی قرہ کر رہا تھا اس کے ہم وطن چائے دوام کا ایک اور بڑا دلچسپ راستہ اصرافہ چنگے تھے۔ انہوں نے جسم کے ذوال سے انکار کر دیا تھا۔ اگر جسم باقی رہا ہے تو روح ایک دی صورت ہی آئے

2014年12月

3

اس باغ لٹاوا میں، جس کی دلچسپ مردوں اور عورتوں سے ملا۔ ایک تو حضرت لہقا تھے جن کے ہونٹوں پر بیٹھ عجم، چٹا اور جوڑا دلہنی سے ہانچیں آتے۔ ایک خاتون عجم، لہقا کی عجم، بات اس طرح کرتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا عجمی ہادی ہیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ، جس سے مل کر میں حائر ہوا ایک چونا سا دیتا تھا کیونکہ۔ عشق کا رنگ یہ دیتا جو بڑوں بڑوں کا مان توڑتا تھا۔ جس کی ایک نگر سے زچہ میں بھا جاتا تھا۔ جس کی آنکھوں کی تیش سے سستیں پھٹل جاتی تھیں۔ عشق کے دیتا کے ساتھ ساتھ ایک اور لہقا تھا جس کے ہاتھ میں دوڑا تھل تھے اور ہر ترکش میں پانچا بھر تھے۔ پہلے ترکش میں جو تیرے ان میں سے ہر ایک پر اس کا نام لکھا ہوا تھا اور ان پانچوں مردوں کے نام یہ تھے۔ صمن، سادگی، سلاوت، ساجھ، غوطی، وضعی اور دوسرے ترکش میں جو لہقا تھے تیرے ان کے نام تھے غروہ، بدھماشی، بے شری، بے آراہی،

عشق کے دیوانے کا ہاتھ میں ہاتھ دے لیے میں نے ایک حید کو آتے دیکھا جس کا نام حسن تھا۔ اور اسی کی صحبتیں جوڑے اس کے ہم راہ کا پتے جس میں یہاں ہی کے تحصیل ڈاکری فرست تھیں۔ میں تو اپنی چٹا چٹاں کروں گا۔ عشق کے دیوانے اپنے ساتھی خوش منظر کو علم دیا کہ مجھ پر حیرت برسا ہے۔ اب میں اپنے کے دوستوں میں بچتا ہوں کہ وہ عشق کا دیوانہ اور اس کا ساتھی میرا تعاقب کر رہے تھے۔ چار گھنٹوں اور دو گھنٹوں کے درمیان جہاں جہاں بھانت بھانت کی چیزیں چھپا رہی تھیں۔ یہ تعاقب جاری رہا۔ یہاں تک کہ ایک ایک کوئی کے کنارے پہنچ گیا۔

وہی کواں جس کے کنارے گل کا عشق نے سدا بہار جوانی کا درخت کھودا۔

یاد کروں جس میں قاری سس اپنے کس کو دیکھتا رہا اور عاشق ہوتا رہا اور اس نے اس پر ہی کو حکمران یا جو اس کے فراق میں کھل کھل کے صدا سے بازگشت بن گئی؟

یاد کروں جس میں حضرت یوسف کے بھائیوں نے انہیں قید کیا تھا۔ وہی قید جو زلیخا کو کھل کے بھگت گئی؟

ہر ماں میں ایک کوئی کے کنارے پہنچ گیا جس کے کنارے سو پر کا درخت تھا اور کہتے ہیں کہ قاری کے بڑے پرانے ہاتھ اپنے بچے کے زمانے سے اب تک ایسا ظاہر و درخت نگہ روئے زمین پر نہیں آگا۔ اس درخت کے نیچے تک مرمی کی ایک چٹان سے ایک چشمہ بہت نکلتا تھا۔ تنگ مرمی پر ایک چھوٹا سا کچھوٹا تھا۔ "یہاں میں قاری سس نے وفات پائی۔" میں اب آپ کو حسین قاری سس کا قصہ کیا سناؤں۔ وہ آپ ہی چکے ہیں کہ آپ ہی کے فراق میں نکل نکل کے صدا سے بازگشت بن گئی۔ مگر قاری سس نے عشق کے دیوانے کی نظروں کی قہر اور عشق کے دیوانے سے اپنے ہی کس کے عشق میں جتا کر دیا تھا اور اپنے کس کے بے صرف، بے فرض، بے توجہ عشق میں اس نے جان دے دی۔ کیونکہ اس طرح جے دام حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ چشمہ کوئی کے کنارے میں بہتا تھا آپ حیات کا چشمہ نہیں تھا، انہیں یہ قاری سس کا خطرناک آئینہ تھا، خطرناک چشمہ، جہاں زندگی فنا ہوتی ہے۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ ذرا جھانک کے تو دیکھوں کہ یہ چشمہ کہا ہے۔ اس کا پانی صاف تھا اس میں آئینہ کی سی جاتھی۔ اس کے اطراف دور دور اگلے اوپلی گھاس تھی۔ کبھی یہ کواں خشک نہیں ہونے پاتا۔ لیکن میں نے جب غور سے اس کی تہ کی طرف دیکھا تو مجھے وہ چمکنے ہوئے سنگریزے نظر آئے۔ وہ چمکنی آنکھیں۔ دور کس کے پھول۔ جب سورج پختہ تو یہ دونوں سنگریزے اس طرح جھلکے کہ کوئی کی تہ کی روشنی سے روشن ہو جاتی۔ چارے ہارنگ کا کس ان دونوں سنگریزوں میں نظر آتا تھا۔ تب میں سمجھا کہ یہی وہ چمکنی آنکھیں، (معلوم نہیں کسی صورت کی آنکھیں؟ یا اس کی اپنی آنکھیں؟) وہ خطرناک آئینہ جس میں میں اپنی پرستش کر کے قاری سس نے اپنی جان دی۔ خدا جانے قاری سس کے علاوہ اور کتنوں نے اس آئینے میں اپنی صورت دیکھ کے ہلاکت کا راستہ اختیار کیا۔ کیونکہ وہ خطرناک منزل ہے جہاں بڑے بڑے دل گردے والے بے بسی ہر کی طرح دکھا رہا ہوتا ہے، جہاں لوگوں کو غم و غصہ کا شکار رہنا پڑتا ہے۔

لیکن اب میں اپنی داستان بھر سے جان کر رہا ہوں۔ ان سنگریزوں میں جہاں میں نے سارے ہارنگ کا کس دیکھا وہاں میں نے ایک گلاب کا درخت بھی دیکھا۔ اس میں ایک گلاب کا پھول نکلتا تھا۔ یہ پھول کیا تھا ایک ایسی بدویشہ جتنی کہ معلوم ہوتا تھا یہ سارا ہارنگ ہی کے لیے نکلتا تھا۔ لیکن جہاں پھول ہوتے ہیں وہاں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ اس حید کے اطراف ایک ایسا صدارت دار دار چھوٹا چھوٹا گلاب کا کواں تھا کہ

اس تک پہنچنا ناممکن تھا۔ میں اس مہینہ گلاب کے دیوار میں کھڑا کہ مطلق کے دیوار کو موقوف کیا اور اس نے چہرے پہ انچون میر چھائے۔ حسن، سادگی، سادت، ساتھ طوٹاؤ، عقل، میرے قلب دیگر جن حیرتوں سے بھٹی ہو گئے۔ دلوں سے چہرہ چہرہ کے میں نے مطلق کے دیوار کی اطمینان قبول کی اور اس نے ایک شہری کٹی سے میرے قلب کو قتل کیا تاکہ میرے دل پر ایسا کارخانہ ہے۔ اس نے مجھے مطلق کے مراسم اور آداب سکھائے۔ اس نے کئی ساتھی میری مدد کے لیے مقرر کئے کھٹا طوٹاؤ جانی۔ اگر صیغہ۔ راز داں اور چہرہ دار۔ لیکن سب سے بڑا دوست جو اس نے مجھے دیا کیا ایک شخص تھا جس کا نام چہرہ ساز تھا اور جو اخلاق چمک چمکاتا تھا۔ چہرہ ساز نے کہا کہ ”جناب میں آپ کی گلاب کے درخت تک رہنا ہی کروں گا۔ اس طرح کہ کاغذوں سے آپ کا دامن نہ اٹھنے پائے“ اس کی رہنمائی میں میں کاغذوں سے دامن چھوٹا ہوا گلاب کے درخت کے قریب قریب پہنچ گیا لیکن دھنکا ایک دہنا آؤ دی گلاب کے درخت کے قریب ہی کہیں سے نمودار ہوا۔ اس کا سر قریب ڈانگیان تھا۔ یہ وہی کس کس کاٹھنیاں بات میں چھپا بیٹھا تھا کہ ہر ایک شخص کو گرفتار کر لے جو گلاب کے چہرے کی طرف ہاتھ بڑھائے اور یہ کیا انھیں تھا اس کے ساتھ اور بھی کئی ہر تین تھیں مختلف زبان بولنے والی، حشرم۔ لیکن ان سب میں یہ قریب جو اصلی ٹھکانا تھا وہی رہا تھا اور اس کی آنکھیں انھوں کی طرح چلتی تھیں۔ اس سے اور چہرہ ساز سے پہلے تو کچھ بھٹ ہوئی مگر قریب کے چہرہ دیکھ کے چہرہ ساز بھاگ کر ہوا اور میں قریب کے زمرے میں آ گیا وہ کیا۔ مجھے ایک شریف خاتون نظر آئی جس کا نام مطلق تھا اور جو مطلق کو مطلق مانتی تھی۔ اس نے مجھے نصیحت کرنا شروع کی کہ مطلق سے باز آؤ چھٹ جوں ہے۔ زبان مطلق تھیں بدنام کر سکی۔ چہرہ ساز میں نے مہینہ گلاب کی حفاظت کے لیے مامور کیا ہے۔ اور جب وہ سب کچھ دیکھ لی اور مجھے ہانک کر کہی تو وہ بھی رخصت ہوئی۔ مطلق نے میرے لیے ایک اور دو دیگر مقرر کیا یہ میرا مطلق اور راز داں تھا۔ اس راز داں نے کہا کہ یہ قریب بڑا اسی بڑا حسب آدمی ہے مگر خوشامد سے یہ بھی رام ہو سکتا ہے۔ اس کی بات ان کے میں قریب سے سمجھنے کی بات دیتے کرنے کے لیے بڑھا لیکن قریب نے خاردار ہماڑیوں سے آگے مجھے نہ بڑھنے دیا۔ میں نے ہر حال اس سے باجست سے کہا کہ ”میں اپنے کلمے پر نام ہوں کہ آپ کی اجازت کے بغیر اس گلاب کے درخت کے اس قدر قریب آ گیا۔ کیا کروں میں مطلق کے دیوار کا خاتم ہوں اور محبت نے مجھے مجبور کر دیا۔ مجھے صرف محبت کرنے کی اجازت دو۔ کیونکہ محبت کرنا یاد نہ کرنا ایک ایسی بات ہے جو میرے اختیار سے باہر ہے۔ میں مجبور ہوں۔ میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا مگر مجبور ہوں“ اس پر قریب ذرا نرم چڑا اور اس نے کہا ”خیر یہی بہت اچھی رہی تھی معلوم ہوئی۔ تو میرے گلاب کے درخت سے دور دو۔ آج اچھا ہی چاہے دور سے محبت کر، مجھے اس سے سروکار نہیں مگر وہ شیر و گلاب سے دور رہنا۔“ یہاں میں یہ کہہ رہا تھا ہوں کہ یہ قریب پر اسے مطلق میں گلاب کے درخت کا نگہبان تھا۔ بے مطلق میں میری طرح مہینہ گلاب کا مطلق نہیں تھا۔

بہر حال کچھ اپنی جہد زبانی سے اور کچھ اپنے رفیقوں کی مدد سے میں نے قریب کو اس حد تک رام کیا کہ مجھے گلاب کے پاس جانے کا موقع ملا اور مجھے مہینہ گلاب کا پہلا بوسہ لیب ہوا لیکن یہ بوسہ جو دو سال فرضی سے بھی بہت کم تھا، غصہ ہو گیا۔ سب سے پہلے زبان مطلق نے چہرہ نکالنا شروع کیا۔ مگر شک اور جانے سے زور پکڑا۔ یہ قریب کو ان سب نے قسمت طامست کی کہ وہ میری اور میرے ہوا اطواروں کی باتوں میں آ گیا اور اب قریب نے خود انھوں کو ناراض کیا کہ کیوں اس نے غفلت مرقی۔ اب شک نے مہینہ گلاب اور گلاب کے درخت کے اطراف ایک فیصلہ گیری، حشرم جانی اور میرے لیے اس تک پہنچنا ناممکن بنا دیا۔ شک کے تمام ساتھیوں اور رفیقوں نے اس کی فیصلہ کی حفاظت شروع کی۔ اب میں تھا اور مطلق کا عالم میں بڑا تھا اور کسی طرح گلاب تک پہنچ نہ سکتا تھا۔

لیکن اب مطلق کے دینے والے اس کو میری امداد کے لیے مامور کیا۔ یہی نہیں مطلق کے دینے والے اپنے تمام سرداروں کی ایک مجلس مشاورت طلب کی اور بااثر افراد سب نے مل کر اس حصار پر حملہ کیا جو رقبہ نے حیدر گاہ کے اطراف طایا تھا۔ ایک ایک کر کے زبان مطلق، شرم، حیدر گاہ رقبہ سب زخمی ہو گئے اور مجھے گاہ تک رسائی نصیب ہوئی۔ گاہ کے درخت تک، حیدر گاہ تک آگلی تک، پکاؤلی تک، یہ آپ حیات کے چشمے تک پہنچنے کا دوسرا اصول تھا، جو سارے نے حضرت حوا کو سکھایا تھا کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ چشمہ آب حیات حیدر گاہ کا وہاں ہے۔

4

ایک تھوڑا وقت جس کا نام مطلق تھا۔ اس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام دل تھا اور عقل نے دل کو انجم بان کا سردار مقرر کیا۔ یہ شاہزادہ دل، انجم بان کا انجم و شوق، انجمی طرح چل رہا تھا کہ کسی نے چشمہ آب حیات کا ذکر بھیڑ دیا تو یہ بڑا کرسن کے دل دلو سا نہ ہو گیا کہ آخر یہ کیا چشمہ ہے جس کا کہہ رہا ہوں یہ ہے لیکن جو بظہر سے پوشیدہ ہے۔ بااثر افراد نے اپنے ایک معتد رفیق نظر کو روانہ کیا کہ وہ بھڑکا پھر لگے اور چشمہ آب حیات کا سراغ لگائے۔

نظر، ملک ملک زمین زمین ساحل کے ارادے سے روانہ ہوا۔ سب سے پہلے وہ ایک شہر پہنچا جس کا نام تھا عاقبت۔ یہاں کے شہریار کا نام ساموس تھا۔ یہاں نظری کی والدہ زادہ بیٹی تھی۔ اس نے شہریار ساموس کی نصیحتیں سنیں اور اس کے روانہ ہو گیا۔ حصار زدہ میں اس نے ایک چار مرد فیدہ کر کے ساموس کا نام لے لیا۔ اس نے اسے اپنے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر وہ آگے بڑھتا چلا گیا اور شہر حیات پہنچا۔ یہاں کا بادشاہ جو ساموس تھا۔ قتل کن اور قومت اس کا نام سمٹ تھا اور بااثر سمٹ ہی سے اسے چشمہ آب حیات کا پہلا سراغ ملا۔

سمٹ نے اسے شہر دی کہ ایک بہت بڑا شہنشاہ ہے جس کا نام مطلق ہے۔ یہ بڑا ہی باجبروت شہنشاہ ہے۔ یہ شہنشاہ مطلق شہر سے ہٹا نہیں جاتا ہے یہ وہ ہے کوٹھ کر سوم کو چاہے یہ مطلق ہی تو تھا جس نے سب سے پہلی جمع چوٹی اور اس پہلی طبع پر پہلا چرواہہ ڈال دیا تھا۔ اسی نے باغ میں لائے کھائے اور بیٹوں کے دل کو داغ دیا۔ اس شہنشاہ مطلق کی ایک لڑکی ہے جس کا نام حسن ہے۔ اسکی بڑی رو کہ آسمان کا چراغ اس کا بہ دان ہے، جہاں سوز اسکی کہ گرد پاکی طرف دیکھ کر پانی میں آگ لگ جائے۔ شہنشاہ مطلق نے اپنی اس بیٹی شاہزادی حسن کو شہر و چار کی حکومت پر رکھی۔ یہ شہر و چار کوہ قاف کے قریب واقع ہے۔ اس شہر میں ایک جنت فدا باغ ہے جسے باغ رمدار کہتے ہیں۔ اسی باغ رمدار کے کنارے چشمہ آب حیات واقع ہے۔

لیکن جہاں جنت نے نظر کو شہر و چار اور رگھن پر رمدار اور چشمہ آب حیات کا پتہ بتایا وہاں یہ بھی بتا دیا کہ یہاں سے لے کر چشمہ آب حیات تک راستہ بڑا ہی دشوار گزار اور خطرناک ہے۔ راستے میں بڑے بولہ ناک، پانی آتے ہیں۔ بڑے خطرناک طمسات ہیں۔ جو سے ہی سنگ میرت آدی خود راستے میں ملتے ہیں جن کا سر تا پا ایک میوہ دلو ہے جس کا نام رقبہ انجم بان ہے۔ شہنشاہ مطلق کے عزم سے یہ رقبہ دلو میرت اور المک و چار کا دربان ہے۔ اگر تو اس کے جنگل سے بھاگ کر نکل گیا تب کہیں شہر و چار تک تیری رسائی ہوگی۔ چار خدا میری مدد کرے۔ نظر جنت کے پاس سے راستے پر روانہ ہوا۔ اس کے آگے اسے چشمہ آب حیات کا سراغ لگانے بھیجا تھا۔ وہ خطروں سے

اوسے بطور محبت کر کے بڑھتا چلا گیا اور جب وہ اعلیٰ عشق میں پہنچا تو دیکھا یہاں عجیب حال ہے۔ مگر کیا یہ عالم ہے کہ آگ ہوا ہے اور ہوا آگ ہے۔ زمین بخاری طرح سخت اور جگر فلا کی طرح مضبوط، یہاں سرسبز گیہی تھی لیکن جگہاں ہی طرح کی، آگ ٹھیکیں ڈنکے کا پھول بن گئی تھیں۔ اور آگ نے خون نیکر سے میرا پ تھے۔ جب اعلیٰ عشق میں تھوڑے سارے کے پاس اس کا گڑہ ہوا تو قیب کے سنگ سیرت پہنچیں نے اسے گرفتار کر لیا۔ جب نگر نے خود قیب کو دیکھا تو قسم کیا۔ ایک سنگ سیرت، سنگ صورت، ساقط، قوی رنگ، درجہ بیکر، طول، بے اصول، ناقول، جہول، درجہ طول، در قیب نے اسے سرخس کی کی اس علاقے سے گزرنے کی تجھے آخر محبت کیسے ہوئی جہاں پہنچے نہیں بار سکا۔ لیکن نگر ایک عیاں تھا اس نے در قیب کو دشمن میں بہت سا سنا دیا اور اسے شروع وادارہ بارش کا مست تک پہنچا دیا گیا۔ بارش کا مست کا سرور ایک بلند بالا، بازگ اندام سا مرد تھا۔ اس نے در قیب درجہ سیرت کو دیکھ کے پچھا کہ اسے چلک تھوڑا آؤ نہائی، اسے چلک تھوڑا آؤ نہائی، آج میرے ساتھ یہ چاند اور انجلی سا آدمی کون ہے اور یہ یہاں کیسے پہنچا۔ در قیب نے کہا کہ مجھے دار شکب کی عام بیاد ہے اور یہ شخص میرا صاحب ہے۔ میں اسے ساتھ لیتا آیا۔ کا مست ایک فریسی تھا، اس نے مجلس آراستہ کی اور درجہ سیرت در قیب کو انکی شراب پانی کو دے دوش ہو گیا۔ پھر اس نے نگر سے اس کا حال پچھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور اس کا کام سے آیا ہے؟

اور جب جاہست اور نگر کی مجلس کے دہن میں ہو گئی تو کا مست نے نگر کو اپنا نام راز نکال دیا۔ اسے بارش کا مست کے چاچا تھا دکھائے۔ دربار کے دو صراف میرا کھاپ۔ ان بھلوں کے درمیان فخر و دین، صوفے کر، ابھی نگر بارش کا مست کی میر کر رہا تھا زلف مشکبار بھر کھینچے آئی، اس کے ساتھ یکسوں جھٹی سواروں کی فوج تھی اور یہ یکسو ڈال کے نگر کو گرفتار کر کے لے گئی اور نگر نے بھی اس قید سے کشن و غبار کا بخار، کیا۔ کشن و غبار میں اس نے اور بہت سے غایات دیکھے اور وہ مہجوت سا ہو گیا۔

نگر کا ایک بھائی تھا۔ ایک عرصہ تک شہر جوڑن کھان اور غار کی سرحد پر رہا کرتا تھا۔ نگر اس کے حال سے آگاہ نہیں تھا۔ اس کا نام فزہ تھا اور یہ شیرازی حسن کے دربار میں ایک بڑا آدمی تھا، فزہ نے شیرازی حسن کے حکم کی بنا پر نگر کو قید کر لیا اور قریب تھا کہ نگر کے ایک وار سے اس کا سر قلم کر دے کہ اس نے دیکھا اس مرد کو دیکھا تھا نگر کے بازو پر بندھا ہوا تھا اور پہچان لیا تھے وہ قتل کرنا چاہتا تھا اس کا پتا بھٹی ہے۔ نگر ابھی تک کے کہ اس سے بغل گیر ہو گیا۔

جب حسن کو یہ معلوم ہوا تو اس نے فزہ کو حکم دیا کہ نگر کو اپنے ساتھ نگر اور غار میں لائے۔ جب خانہ و نگر اور حسن کی نگر نے میر کی تو اسے طرح طرح کے حسین نظر آئے۔ تان بکین و خطا، و حرقہ کے شکر، دین، طواریز کے جاناظم عراق کے نظارہ سلطان کے یہ چشم، شیراز کے جنگ دین، نگہاںے تہرچہ، لیجان عرب، شکر جہان مصر، مگر کثرت نگارہ اور شدت جمال سے مہجوت تھا کہ حسن نے اس سے سوال و جواب شروع کر رکھے۔ حسن نے پچھا ستارہ کا قصود کیا ہے؟ نگر نے جواب دیا اس کی صنعت کا نگارہ کرنا۔ حسن نے پچھا کہ چشم چاکس لئے بنی ہے؟ نگر نے کہا رخسار دنیا کے مشابہ سے کے لئے۔ اور اسی طرح کے سوال و جواب میں نگر نے اپنے شاہزادے دل کا ذکر کیا۔ حسن نے اپنا دل اسے دکھایا جو ایک گوبر تھیں تھا۔ اس کے مقابلے میں جب نگر نے شاہزادہ دل کا ذکر کیا جس کا دل دل عادل اور دل عاشق تھا تو حسن اس کی گردید ہو گئی۔

اب عشق کی آگ و دھواں طرف لگی ہوئی تھی۔ حسن کا ایک پری کشال لہام تھا، جس کا نام تھا خیال۔ خیال کو حسن نے نگر کے ساتھ ملک و بن بھیجا اور حسن نے نگر کو ایک فلسفی انگوٹھی دی کہ وہ اسے دل تک پہنچائے۔ اس فلسفی انگشتری کی خصوصیت یہ تھی کہ جو اسے مت میں رکھ لیتا تو

خود کو سب کی نظروں سے رو چاہی ہو چاہا مگر خود سب کو دیکھ سکا اس آنکھ بھری کی مدد سے مملکت مشرق کے چاہیوں کی آنکھ سے بچ کے نظر ملک بہان واپس پہنچ گیا۔ دل کو اس نے شہزادی حسن کے حسن و جمال کی کہانی سنائی۔ نظر اور خسار کا ذکر کیا کہ اس وقت ارضی میں ہر شے آب حیات پہناں ہے اور بجز ساقیان حسن گل ما کے کوئی اس آب حیات کے خوشے سے واقف نہیں۔ نظر اور بیانی کی لسانی سے دل کا مشق اور شدت اختیار کر گیا۔ اب مشق نے جنوں کی کیفیت اختیار کی اور دل نے شہزادی مراد کو ہونے کا ارادہ کیا لیکن دل کے ایک صاحب مشق بعد کو اس سفر کے چھ کا پتہ چل گیا۔ دوسرے دن کے والد شہنشاہ محل کو آگاہ کر دیا اور محل نے مصلحت اس میں دیکھی کہ اس جنوں سے بچانے کے لیے اپنے بیٹے دل کو نظر بند کر دے۔ چنانچہ دل محل کے حکم سے نظر بند کر دیا گیا۔ اور زندان میں دل کی حالت غیر تھی۔ دوسرے نظر بھر شہزادی مراد میں حسن کے پاس پہنچے اور نظر اور خسار میں عقلی کے عالم میں اسے ہر شے آب میں اس نظر آ رہا مگر جیسے ہی اس نے خوشے کا پانی پینے کے لیے منہ کھولا طلسمی آنکھیں اس کے منہ سے ہر شے آب میں گر پڑی۔ نظر جو سب کی نظر سے بچا ہوا تھا۔ سب کو نظر آ رہا تھا اور اسے رقیب نے گرفتار کر لیا۔

لیکن سب سے اہم واقعہ جو پیش آیا یہ تھا کہ ہر شے آب میں اس کی نظر سے غائب ہو گیا۔ جیسے سدا بہار جوانی کا درخت گل کا مصلیٰ کی نظر سے غائب ہو گیا تھا۔

نظر نے بہر حال رقیب کے ہاتھ سے ہاتھ پائی حسن نے غمزے کو نظر کے ساتھ بھر دل کی حلائی میں روانہ کیا۔ راستے میں حصار زہد پہنچا تھا۔ غمزے نے اس حصار کی اجھٹ سے اجھٹ۔ بھادی۔ بھران دونوں نے چوتھیں چوتھیں حرکت درویشوں کا بھیج دیا اور راجی ہاتھوں سے سامان کو تختہ و تختہ چلے۔ یہ سامان محل کی مملکت میں ایک بڑا امر واقعہ۔

لیکن قہر کے سامنے نظر اور غمزے کی ایک نہیں چلی۔ یہ تو بڑا اجھٹ جان مراد تھا۔ یہ غمزے کا نشان جھین کے شہنشاہ محل کے سامنے لے گیا اور محل نے اپنے بیٹے دل کو سمجھایا۔ دل کو قائل کر دیا۔ اور دل ایک لشکر بھرا لے کر اس ارادے سے روانہ ہوا کہ شہزادی مراد کو سزا کرے لیکن اب غمزے نے ایک نئی چال چلی۔ آہو کا بھیج بدل کے اپنے ساتھ بہت سے آہوان جن کو شریک کر لیا اور دل کے حکار کے شوق میں اس آہوان کے تھاقب میں روانہ ہوا اور اس طرف اپنے لشکر سے چلا گیا۔ اب شہنشاہ محل نے خود ایک بڑے لشکر کے ساتھ شہزادی مراد کی تحویل کا ارادہ کیا اور شہزادی مراد کے قریب پہنچ گیا۔ اپنے لشکر کو محل کی زد میں پا کے شہزادی حسن نے اپنے باپ شہنشاہ مشق سے مدد مانگی اور مشق خوشوار کا سپہی لشکر دل کے لشکر کے مقابلے میں روانہ ہوا۔ زلف سرکش نے دل کی فوج پر شب خون مارا۔ اور وہاں نے کہاں کڑی کی مڑ کاں نے حیر چلا دیا اور باقی غریبال نے دل کو قید کر لیا۔ جب دل گرفتار ہو گیا تو محل اور دل کی سپہ کے قدم اکٹھے گئے۔ اور حسن نے دل گرفتار کو ہوا زندان میں گرفتار کر لیا۔

شہزادی حسن اپنے گرفتار یعنی شہزادی دل کی محبت میں گرفتار تھی۔ اس کی ایک کھلی تھی دغا اس کے ساتھ دھنگلاری کی سیر کو اٹھایا اور بھی دغا دل کو چاہا وہاں کی قید سے باغ آئینی میں لے آئی۔ اور نظر آتھوں میں آنسو بھر دیا اور شہزادی حسن سے اس نے شہزادی دل کی سفارش کی حسن نے دغا سے مشورہ کیا۔ دغا تو یہ چاہتی تھی کہ حسن اور دل ایک دوسرے کے ہو جائیں لیکن بڑا کا حکم دھا "خوشی برادرش ارزاں" مانا اور دغا میں جھٹ ہوئی رہی۔ باآ خر حسن نے خود ایک محل سجا حسن نے دل کو جسم سے بے خود ہو کر دل کو اپنا بھرا اپنے پیلو میں بکھری۔

لیکن یہ وصال نہ دھن تھا۔ ابھی تک ہر شے آب میں اس کا لگا ہوں سے دور تھا۔ اسی عالم میں دل پر ایک مصیبت پڑی۔ رقیب کی ایک بیانی کی کردہ صورت دیکھ کر دوسرے غلی تھی جس کا ہم بھر تھا۔ ابھی دل پر عاشق تھی اور حسن سے غلی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی ساعہ تھی جسے

معر سے صورت ہانے میں کمال حاصل تھا میر نے ایک دن حسن کی صورت دیکھی اور دل کو پھانسی کی کوشش کی۔ اس کی اطلاع خیال نے حسن کو دی۔ اب حسن کے حوال کا عالم ہی اور تھا۔ دل نے میر کے پہلو میں بیٹھ کر اس سے بے وفائی کی تھی۔ دل کو بھرنے کر دیا گیا۔ اس مرتبہ چاہ وقتن میں نہیں جھکے وادی عتاب میں۔ اصر فیر جو فطرتاً پر نہاد تھی۔ دل کے بھی در پہ تھی۔ اس نے اپنے باپ رقیب سے دل کی شکایت کی اور رقیب نے دل اور اس کے مقل غلاموں کو قلعہ جہاں میں قید کر دیا جو جہاں فراق میں واقع ہے۔

لیکن میر کی سادش کا دل شہزادی حسن پر آ نکھر ہوئی گیا۔ اب اسے سندامت ہوئی کہ تاقی اس نے دل کو اتنی سخت سزا دی اور اب دل کے فراق میں خود حسن کی جالی بکھرنے لگی۔ خیال نے حسن کا خطا دل تک اور دل کا نامہ شوق حسن تک پہنچا دیا۔ صبر اور مت نے دونوں کو خاڑا میں دی اور آقا فرمے نے حسن اور دل کی اس دالہا نہ محبت کی اطلاع شہنشاہ عشق کو دی۔ بہت نے شہنشاہ عشق سے کہا کہ قہار نے نے میں ایک شہنشاہ تھا اس کا نام فرمادھا۔ یہ شہنشاہ بڑا ہی بے دل تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کے دھوکے اپنے دوستان میں تقسیم کر دیے ان میں سے ایک شہزاد کا تاجہ اور بادشاہ مرعرب کا۔ ان میں سے ایک بھائی کی نسل سے شہنشاہ عشق ہے اور دوسرے بھائی کی نسل سے شہنشاہ عقل۔

فانک ہر کے عشق نے اپنے ایک معتبر در پر ہر کو عقل کے دربار روانہ کیا اور جب عقل اعظم عشق میں پہنچا تو عشق نے اس کی بڑی خاطر قوا مح کی اور اسے اپنی غایت کی کمری پر بٹھایا۔ یہاں لکے کہ عشق کا مرتبہ اور عشق کی طاقت ہر حال میں عقل سے زیادہ ہے۔ ہر عشق نے بہت کو جہاں فراق اور قلعہ جہاں کی سمت روانہ کیا کہ وہ دل کو رقیب کے چنگل سے بچھلا لے۔ جب بہت دل کو اس قید سے بچھا لیا تو شہزادہ مرعرب قاسم نے دل کا احتفال کیا۔ بآ فراق عشق اور عقل نے حسن اور دل کی شادی رچائی اور اب دل کو معلوم ہوا کہ چشتا بہ صبا اب دیکھ ہے اور یہاں سے زندگی بھری ہوئی رہتی ہے۔

شادی کے بعد جب دل کلشن رخسار کی میر کو نکلا تو ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ یہ حضرت فخر علیہ السلام تھے۔ یہ آپ صبر میں سے ششے کے کنارے شریف رکھتے تھے۔ حضرت فخر علیہ السلام نے دل کو اس جلسہ کا کارزار سمجھایا۔ یہ کہ دل ہی اصلی خزانہ ہے اور دوسری اشیاء غصوات ہیں جو اس خزانے کی حفاظت کے لیے بنائی گئی ہیں۔ دل جان ہے اور قزاق مزاجات جسم ہیں۔ فخر فخر صواب ہے اور بہت فیض راہ میں ہے۔ رقیب دیر سیرت دراصل غمیں دوں ہے۔ فیرا لکھیں لکھیں ہے۔ یہ وہی سانپ ہے جس نے حوا کو بہکا یا اور جو گل کا شش کا سوا بہار جوانی کا پردہ اچھا لے گیا۔

اور وہ کیا یہ چشتا بہ حیات ہے یہ چشتا بہ صبر میں ہے۔ یہ کیا عجیب چشہ ہے کہ اس میں زندگی کھو گئی جاتی ہے مگر اس سے سیراب بھی ہوتی ہے۔ کبھی یہ سیراب معلوم ہوتا ہے کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ کبھی اس کے کنارے سوا بہار جوانی کا پردہ نکھو جاتا ہے۔ اسی کو نہیں میں یوسف کو قید کی سزا ملتی ہے۔ آئی بچنے میں قادی سس اپنا کھنک دیکھ دیکھ کے ہلاک ہو جاتا ہے لیکن اسی سے زندگی ملتی ہے اور زندگی کے دریا پاروں طرف بہتے ہیں۔ چہ وہی طرف اٹھتے ہیں۔ اسی سے ابرائیم نے جہاں اور جہاں کو خوف زندگی کا پتہ برساتے ہیں۔ گل کا شش کا ہو جاتا ہے۔ یوسف کا حسن ایک دن باقی نہیں رہتا۔ قادی سس کا کھنک مٹ جاتا ہے اور صرف چکھدر عمریز سے باقی رہ جاتے ہیں لیکن انسان کا نہیں ہوتا۔ ایک نسل کے بعد دوسری نسل۔ اسی فطرت کے فیضان سے انسان زندہ ہے۔ سب سے مقابلہ کرنے کے لیے۔ سانپ سے۔ اٹھیں سے۔ دیکھ کا فانی سے اور اس صوفی سے جو اس کے اندر چھپا ہوا ہے۔

سیّد فیاض محمود

نام	سیّد فیاض محمود
تلفی نام	سیّد فیاض محمود، فیاض محمود، اگر آپ کتبیں فیاض محمود
پیدائش	۳ اکتوبر ۱۹۰۶ء، شملہ (بھارت)
وفات	یکم اور ۲ جنوری ۱۹۹۳ء کی درمیانی رات، لاہور۔
تہیم	۱۹۱۷ء (انگریزی)، پنجاب، برطانوی ہندوستان، لاہور ۱۹۳۰ء گورنمنٹ کالج لاہور (پنجاب، برطانوی ہندوستان) سے ۱۹۳۹ء میں بی۔اے (آنرز) کیا اور ۱۹۳۹ء میں ایم۔اے (انگریزی)

مختصر حالات زندگی

سیّد احمد کے ہاں شملہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت سے فارغ التحصیل ہونے تک لاہور میں ہی رہے۔ ۱۹۳۰ء میں ایم۔اے (انگریزی) کر کے چھ ماہ تک خواب صاحب ہوتی (مردان) کے پانچویں پیکر لڑی کے فرائض انجام دیے۔ اسی سال اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی کے پیکر لڑی کی سامی لگی تو درخواست گزار ہوئے اور ۱۹۳۱ء میں منتخب بھی ہو گئے۔ ۱۹۳۱ء تا یکم جون ۱۹۳۵ء اسلامیہ کالج میں رہے۔ ۱۹۳۵ء لاہور میں بطور انگریزی کے استاد ملازمت کرنے کے بعد پاکستان ایجوکیشن کے شعبہ تعلیم سے منسلک ہو گئے، جہاں سے گروپ کنکشن کے ایک چار چار ہوئے۔ درج ذیل منٹ کے بعد کلرکٹ پر بطور ڈائریکٹر "شعبہ تاریخ و عجائبات" پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے ساتھ منسلک ہو گئے اور کئی جلدوں پر مشتمل "تاریخ و عجائبات مسلمانانِ پاک و ہند" (۲۷-۱۹۶۸ء) مرتب کی۔

۱۹۳۹ء میں تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا۔ پروفیسر محمد احمد خاں کی معرفت ابتدائی چار افسانے رسالہ "ہماچل" لاہور میں شائع ہوئے اور یہیں سے بطور افسانہ نگار شہرت ملی۔ ۱۹۴۰ء کے بعد "گلوب لیلیٹ" لاہور اور "ساتھی" کے لیے قوتور کے ساتھ افسانہ نگاری کی۔ اسلامیہ کالج، لاہور میں پھر پڑاویپ ان کے شاگرد تھے۔ آخری تیس برس میں انہوں نے کچھ نہیں لکھا۔ ادبی سحر مائے سے غائب اور گھبرگ، لاہور میں

کو ششیں رہے۔

اولین تحریر:

”کالی“ ڈراما زمانہ تقریباً ۱۹۲۸ء

اولین مطبوعہ افسانہ:

”زبدہ“ مطبوعہ ”کماپوس“ لاہور جولائی ۱۹۳۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ ”سپرنگ ویل“ (افسانے) مکتبہ اردو لاہور طبع اول ۱۹۳۰ء
- ۲۔ ”پہلی اور کانٹے“ (افسانے) دیباچہ، پروفیسر مجید حسن اشاعت ۱۹۳۷ء سے قبل
- ۳۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک ویلڈ“ مرتبہ نقاب یحیٰ نور علی لاہور
- ۴۔ ”Short History of Islam“ تاج محمد عظیم یحیٰ نور علی اسلام آباد
- ۵۔ ”History of Islam“ تاج محمد عظیم یحیٰ نور علی اسلام آباد طبع دوم ۱۹۹۸ء
- ۶۔ ”Inner History of Indo-Pakistan“ اس کتاب کے ترجمہ، بیچا نوری اور عربی زبان میں تراجم ہوئے۔
- ۷۔ ”There was once a king“ (لوگ کہانی) لوگ ورثہ اسلام آباد طبع اول ۱۹۹۰ء
- ۸۔ ”Folk Romances of Pakistan“ (لوگ کہانیاں) لوگ ورثہ اسلام آباد

غیر مطبوعہ

(۱) ”چند داستان“ (افسانے)۔

اعزاز:

ارٹسٹ پاکستان (نثری)

نظریہ فن

”افسانوں سے مراد کیا ہے۔ زمانہ بدل گیا۔ لیکن ادبی اقدار نے جگہ سے لی۔ افسانہ ہمارے ہاں ”کہانی“ میں تبدیل ہو گیا۔ وہ چیز جو آثارِ ممت چھٹی تھی اور جس سے زندگی کے درجے نکل جانا کرتے تھے، ایک بھو دو بیاتے میں سمٹ آئی۔“

(نحوالہ مکتوب عام مرزا حامد علیک بخرد، ۲۰ اچ بی ۱۹۹۲ء)

کام چور

سید فیاض محمود

مٹی کے دیں تھے۔ صبح تھیں بے کمال تھیں۔ گھر کے سب لوگ صبح میں سو رہے تھے۔ رات گھبراہٹ میں کئے آنکھیں لگی تھیں۔ اس وقت جس سے بخوئی بخلی ہوا کے پتے پتے چھوٹے آنے لگے تھے۔ اس ہوا میں اگر کنگلی ڈھکی تو کم از کم حد تک بخلی ڈھکی۔ لوگ جو کہ نہیں بیٹے بیٹے تھک گئے تھے اب پاؤں پیر کے سوجھے۔ گڑبڑوں کی ٹکان جوں تو سست کی رات میں دور نہ ہوئی تھی، اب ساری ہوا جسم کے بدنہ سے اڑا کیے ہادی تھی۔ وہ لوگوں پر ایک بڑا ایک سکون جاری ہو رہا تھا۔ تمام صبح بخلی خند میں مدھوش تھا کہ اسے میں پہلے آہستہ بھر ڈاڑھ اور زور سے اور بھر بندہ آواز سے نکلے۔ دوا شروع کیا۔ بولی گہری خند میں سوری تھیں۔ ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ نئے کی ناگھیں اور بھر بازو دوانے کے ساتھ ہی جیسے شروع ہو گئے تھے۔ رات رفتہ رفتہ ان کی حرکت میں بڑی پیدا ہو گئی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ دوسرے سارے کتابوں کے بیٹے سے نڈر دیکھ کر ہوا گیا اور اس کی ناگھیں اس کے جسم پر چڑنے لگیں۔ ساتھ ساتھ نئے نے پوری آواز سے جھنجھ شروع کر دیا۔ آخر خوب جاگ اٹھا۔ پہلے دوا ایک منٹ تو اسے اپنی گھبراہٹ کی وجہ سے نہ ہوئی پھر اسے نئے کے رونے نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس نے کہا ”اے اے اے اے اور بھر اور زور سے“ اے اے۔“ دوسرے بولی کو بھائی آیا۔ جڑ بڑا کے جا گئیں۔“ کیوں؟ کیا ہے؟“

”فلفلہ نہ سے رو رہا ہے۔ سونے نہیں دیتا۔“

بہائی نے پہلے تو نئے کو علم غراہی کی حالت میں چھکنا چاہا۔ مگر غصا چپ نہ ہوا۔ پھر ایک کھلی کے سہارے ڈال دیا۔ پھر دوسرے ہاتھ سے نئے کو اٹھا ڈالا۔ یکدم تو کپڑے شراب کے ہوئے تھے۔ انہوں نے آواز دی ”کرہیں لاوی تو کرہیں اے“ پھر ”کرہیں اکرہیں اکرہیں“ مگر کرہیں سب سے اور بڑی جارحانہ پر چٹ لٹل آرام سے سوری تھی۔ آخر یہی نے کہا ”اس کم بخت پر لدا کی بار، لاکھ سر جگہ جاگتی ہی نہیں۔ خدا جانے اسے سانپ کیوں جھگڑا جاتا ہے۔ اکرہیں اے اے اے کرہیں“ مگر کرہیں کہاں۔

تھک کے یہی بالکل اٹھ بیٹھیں، دونوں ہاتھوں سے نئے کو اٹھا ڈالا۔ سر مٹانے اسٹول پر لیپ دم مٹا مل رہا تھا۔ ہاتھ بڑھا کے حتیٰ کو نوچا کیا۔ دیکھا تو نئے کا چھوٹا سب سے چٹ تھا۔ اچھا ہاتھ ہے، اس بے ہمت کی تکلیف پر اور بات سب کے سونے رہنے پر، یہی کہ بہت

غصہ آیا۔ آواز دئی "مغرلوب اور مغلوب"۔ وہ سچہ سدا اگلی کچھ فائدہ میں تھا مگر چونکہ ذہن اور ذہانت رشتی سے دور "کیا ہے؟"

"ذرا اٹھ کے اس نامزد کو چکا تو دو۔ مگر دوں سے شرط باندھ کر سوتی ہے۔" "مغرلوب طوطا دیکر اٹھا۔ ہا کے کریمین سے کندھے کو بٹا۔ جب اس سے کچھ اثر نہ ہوا تو زور زور سے اسے الجھوز اور آواز دیں۔ آخر کریمین کی آنکھ کھلی۔ جب چار پائی سے پاؤں پیچہ کھا تو یہی نے فیض سے کہہ دھر امرادراد میں کھٹکا مگر سے آواز دیں۔ دے دی ہوں۔ میرے کان پر جوں تک نہیں دینگئی۔ پائی اٹھیں نئے کو صوفیوں۔ کریمین آنکھیں ملتی ہوئی کھڑی ہوئی سے جو گھن میں چڑی تھی، دلونا بھرا لائی اور نئے کو صوفیوں بھر دی کے کہنے پر تھلا پڑے ہستر سے اٹھائے اور نئے بچھائے۔ باور پائی خانے میں جا کے ہاتھ دھوئے اور اپنے ہستر پر آ کے لیٹ رہی۔

تقریباً آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ گھ کے چار بج رہے ہوں گے۔ بجلی بجی ہوا چل رہی تھی۔ گھن میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سانس لینے کی آوازیں پر بھی سکوت۔ نے غیب کیا تھا۔ یہی کے بائیں طرف کی ایک چار پائی پر ایک تین برس کا بچہ اٹھ بیٹھا اور "اماں! اماں! کہہ کر چوٹے لگا۔ جب دیکھی آواز سے کچھ نہ جانتا تو پائی آواز سے پکارا شروع کیا۔ یہی کی آنکھ کوئی میں صاف ہوئے تھی تھی کہ اب اور حشر شروع ہوا۔ آخر اب کے جھڑی ہاگ اٹھیں۔ پوچھا کیا ہے؟ جواب ملا "پائی! اس پر یہی نے آواز دئی "کریمین دلو کریمین؟" "جی۔"

"میری تو ایک آواز سے نہیں اٹھ سکتی۔ بہروں کوئی چکا تار ہے مگر کہیں اٹھتی ہے۔ بیڑ کو پائی دے دو جو اس سے بگھن ہو رہا ہے۔" کریمین نے اٹھ کر بیڑ کو پائی پلایا اور مگر اس کو گھڑ دی پھر نکلا، جا کے سو رہی۔

اسے میں پاؤں بھی رنج تھے۔ ہوا بدستور چل رہی تھی۔ اب تو اس کے بھونکوں میں کچھ کھنکی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس لیے سونے والوں میں سے بعض نے ہانکتی سے چار دیں۔ اٹھا کر اڑھائی تھیں اور بے غلری کی جڑ کے سر سے سارے تھے کہ گھن کے ایک کونے سے کھانسی کی آواز میں اٹھنی شروع ہوئیں۔ پہلے تو آہستہ جیسے کوئی گلا صاف کرتا ہوا، مگر رک رک کے، مگر یہی آواز سے۔ مگر آواز میں تو اتنی زحمت، کھانسی کے ایک جھلے کے بعد سٹل سے ایک آدھ تکلیف کا سانس بھی نکل جاتا تھا۔ یہ یہی کی سانس تھیں۔ جوتی، پاؤں سے نکل کر بیٹھنی اور چار پائی کی پٹی پر دونوں ہاتھوں کو دبا کے اپنے زانوؤں کے کنارے لے آئیں۔ اس وقت آسمان سے چوکی غائب ہو چکی تھی۔ یہی کے سر ہانسنے یسپ بدستور چل رہا تھا، اسے بچھڑا، بچھا کے اسے وہاں سے اٹھا کے گھن کی اس الماری میں جہاں یسپ دنگے ہاتے تھے۔ کوئی مگر اور اور اپنے کونے کے لیے فکر وہ زانی کھنکان کا کونہ مخصوص تھا، کوئی اسے چھو نہیں سکتا تھا مگر وہ دلونا نظر نہ چلا۔ باور پائی خانے میں بھی دیکھ، وہاں بھی نہ دکھائی دیا۔ باور کھروں کے پاس بھی نہ تھا۔ حیران ہوئیں کہ کونسا کہاں کیا۔ پہلے تو کسی اور کونے کی گھر میں نظر اٹھائی۔ مگر پھر یہ نہ جانا اس لیے گھن کے دوسری طرف کریمین کی چار پائی کی طرف متوجہ ہوئیں۔ اسے دکھایا وہ اٹھی، اٹھ کے بڑی بی بی کو سلام کیا اور مگر ان سے استفسار کے جواب میں دلونا حوض نے چلی۔ گھن میں اس نے دیکھا، کہیں نہ تھا، بڑی بی بی نے پوچھا "آخر راستے بہت دور سے کوئی تھیں یا نہیں؟" "جی۔"

"تو صبر رکھنا بھی دعو ہو گا۔"

"جی ہاں آپ کا کونسا تو میں نے بہت احتیاط سے صاف کیا تھا۔ دیکھوں تو شاید باور پائی خانے میں رکھ دیا ہو گا۔" باور پائی خانے میں گئی اور وہاں سے کچھ کھڑکڑاہٹ کے بعد بڑی بی بی کا کونسا لال لائی۔ گھن اب کالنی روشن ہو گیا تھا۔ پہلے تو سوچا کہ ذرا حوض اس اور سو لیا جائے مگر

پہاڑا کدوات رہتی بہت سے تھے۔ اس لیے اس کو صوفے دے دیے ہوئی تھی اور گھر سے نہیں نکلے سوتی تھی۔ خیر تو بہت آ رہی تھی آ نکھیں بند ہوئی ہا رہی تھیں مگر بھڑکی کی آنکھیں پڑ آ نکھیں۔ اس لیے اپنا ہسٹریوٹ، چار پائی اٹھائی اور ہار سے لگا دی۔ ہسٹریوٹ کو سالانہ والی کوٹھڑی میں رکھ آئی۔

میں نے ایک کوٹھڑی میں ہاتھ سے چھ کر پانی لٹائے کال لگا تھا اس کے پاس گھر سے اٹھا آئی اور دل سے ایک اور نہیں جانتی کہ پانچ گھنٹوں کا پانی نکلا۔ اٹھا اٹھ کے انھیں اپنی جگہ پر رکھا مگر میں آئی اور بھڑکی کی پانچ کی سے ننھے کے مستعمل ہوتے ہوئے ہڈے سے لیے اور انھیں ایک طرف ایک کتے میں ڈال آئی پھر ادھر جا کر وہ کپڑے جو رات کو دھوا کے کھانے کے لیے دیسوں پر ڈال رکھے تھے۔ اٹھا آئی۔ انھیں نہ کر کے بھڑکی کی پانچ پر رکھ دیا۔ پھر ہاتھ منہ دھوئے۔ کپڑے کپڑے ہاتھ ہاتھ پر پھیر کے جو جو بال سوتے میں پھر گئے تھے نہیں ہوا یا مگر چونکہ رات گری کی وجہ سے بہت بے آرامی سے گزری تھی اور کمروں اور سر کے پٹے چلنے سے بال کچھ معمول سے زیادہ پکھر گئے تھے اس لیے وہ اپنی اسی سہیلی والی کوٹھڑی میں جہاں اس کا صندوق اور اس کی ایک آدھ دوسری دوسری چیز رکھی تھی، آئی اور ایک نئی سی دو تین نوٹے ہوئے دنوں والی کٹھنی لٹال ہوئی۔ ابھی وہیں کڑی کڑی چوٹی نکول رہی تھی کہ اس نے آواز میں آئی شروع ہو گئیں۔ ”اوکر مکن اری لہ کر مکن؟“ کہیں نہ رست ہو گی؟“ کٹھنی کو وہیں چھوڑ چئی کو ہاتھ مٹی ہوئی ”مٹی آئی“ کہہ کر باہر نکل آئی۔ دیکھا تو بڑی صاحبزادی رتی اور مہاں امفر ہاتھ سے ہوتے ہیں اور وہیں سے چلا رہے ہیں ”اوکر مکن، اوکر مکن ارے کہاں مر گئی؟“ کہیں نے کہا ”مٹی میں تو نہیں تھی۔ کمرے میں ہسٹریوٹ کی تھی۔“ رتی ہو گئیں۔ ”ارے جھوٹ کیوں کہتی ہے۔ یہاں نہیں کیوں کی تو تو ہال نکاتی آئی ہے۔“

”نہیں تو بی بی مٹی میں نے تو ہالوں سے کٹھنی تک نہیں چھوٹی۔“ ”تو یہ کڑی تو یہ تو تو پٹیا پٹختی پٹی آ رہی تھی، جھوٹی نہیں کی، پانی کا منہ دھوئیں تو مجھے معمول پانی ہے، مجھے سکول جانا ہے، اب دیکھ بچے کھتا ہے، دیکھ بچے؟“

”دوسری طرف مہاں امفر ہوئے“ کہیں پھر کپڑے نکال لے۔ مجھے ہلے ہیں؟“ رتی۔ ”خود اٹھ کے کیوں نہیں دیکھ لیتا۔ سستی کا مارا ہوا۔“

امفر ”تو آتا چھیں کیوں نہیں پانی اٹھ کے لے لیتیں اور ابھی تو کسی نے آگ تک نہیں جلائی، میں آج کھا کے کیا یہ ڈنکا۔ ماں، اسے ماں اٹھو گی، اب سکول کا وقت ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تو کچھ نکاتی نہیں دیتا۔“

بھڑکی ابی جاگ اٹھیں۔ کہتے تھیں ”ابھی تو بہت سو رہا ہے، کیوں اٹھا ضرر بچا ہے؟“ ”خوش کرنے چاہی ہے؟ میں تو آپ کو بگاڑ رہا تھا یہ آپ اسی صبح سے چلا رہی ہیں۔“

”کیسٹ امفر صبح ہی تو تم نے جینا شروع کر دیا۔ میں نے کیا کیا؟“ ”تو ماں کہیں سے کونسا بچہ کرے۔ میں کھا کے کیا جاؤں گا؟“

”اوکر مکن؟“ ”کی ایوی آئی۔ میں بی بی کے لیے صابن تولیہ داری ہوں۔“

رتی نے کہا ”ماں یہ کہیں ایک کام میں دس گھنٹے نکاتی ہے۔ آپ اے کہہ نہیں بھی نہیں۔“ بھڑکی نے رتی کو کچھ جواب دیا کہ کہیں سے کہہ ”مخربوب کو بگاڑے۔“ رتی منہ دھو رہی تھی کھاتے صوفے ہوا کہ رات کی گری کی جگہ

سے کپڑے جہاں سے چپکے رہے ہیں۔ رات بچہ بہت آتا رہا ہے۔ اس لیے منہ ہاتھ دھو کر چھوڑ کر کہیں کو کھجور یا کھٹل خانے میں جا بیٹا اور قوی رکھو آئے۔ وہ ادھر گئی، آپ اندر سے اپنے سکول کے کپڑے نکال کھٹل کرنے چلی گئی مگر اسے اور مرعوب کو کون نہیں دے، انہوں نے منہ ہی دھوئے پراکٹھا کیا اور اندر جا کر جلدی جلدی کپڑے پہنے کر کہیں نے رقبہ سے طراعت پا کر جلدی جلدی آگ جھانکی اور دوچار دونوں کا آگ کھنڈھ لیا۔ اسے کش صفرو اور مرعوب نہ شیعہ کے لیے سر ہو گئے۔ انہیں معمول کے مطابق چھوٹے چھوٹے ٹھیکے پر اٹھے پکارے لیے اور ساتھ ہی دے دیا۔

واقعہ کے لیے اب کسی دینی قہمی، کیا تک، و ہر اس شخص کے ساتھ بیٹھ کسی بڑا کرتی تھی۔ مگر کرکین تو دینی بھاری تھی، کسی کون حائے ہر واقعہ نے شور مچا تاثر و ع کیا۔ "بھری کسی کہاں ہے؟ بھری کسی نہیں حائی؟" کرکین نے پہلے کیوں نہیں حائی؟" "خیر یہ فردی کہ اب تکہ فردی کی دہائی نماز سے فارغ ہو چکی تھیں۔ اس نے بڑی نے ان سے کہا۔ "کس واقعہ کی کسی ذرا دوا اس نے شور مچا رکھا ہے۔" دہائی وہاں نے کرکین سے پوچھا۔ "طولی کہاں ہے۔" اس نے کہا۔ "پاور پٹی حائے میں۔" "وہاں بڑی پٹی پٹی کوئی تو پھر شور مچا۔" "یہ کرکین بھی بچہ جگہ پر کھلی بھی ہے و انہیں اس پر حنائی مارا، ابھی کل تو یہاں دیکھی تھی، یہاں اچھی تھی، یہاں۔" "کرکین نے کہا۔ "پاور پٹی حائے میں پر جو کس کی الداری کے الدوج کے حائے میں۔ کئی تھی کسی دیکھنی کے پیچھے ہوئی ہوئی۔" "ہارے طولی ملی، کسی حار ہوئی۔" واقعہ نے ناشد کیا۔ ادھر ادھر اور مر خوب نے بھی اپنا پنا پنا حفا ختم کر لیا۔ اسے میں واقعہ کے سکول کی حازمہ صا تھی۔ وہ اس کے ساتھ سکول پہلی گئی۔ ادھر تو کے بھی اپنے سکول کو روانہ ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد وہی جی اٹھیں۔ انہو کے پہلے شب خوابی کا سہارا چاند چوبلی کیا پھر ہاتھ منہ دھو کر اپنی ماس سے بالوں میں خشک کر لیں۔ اسے میں کرکھن چو لے کے کام سے فارغ ہو چکی تھی۔ اس سے کہا گیا کہ سبز جہاں لے۔ اس نے سب سبز اعدہ رکھے اور چار پائیاں اٹھا کر ایک طرف دھکیں پھر والا ان کے آگے سے اور چو لے کے قریب قریب سے بھاڑو دی۔ قحوی دیو میں بھرانی آگئی اس نے کہانی کی پہلے چوڑے دھوا لکھتے۔ اس نے کرکھن سے پھر کہا گیا کہ پانی پھر پھر کے بھرانی سے کپڑے دھوا لے چتا چتا آدھ گھٹلے سے نہ ادا وقت اس کام میں صرف ہو گیا۔ یہی کار اور اپنے ناشہ بڑی بی بی نے تیار کر لیا تھا کیونکہ یہی توقیف توہمناہیت گوہن کا حلوا پونا کر رکھا ہوا تھا۔ کھانا کرائی تھیں سابقہ بی بی بی بی انہوں نے وہی سے ایک آدھ چپاتی کھائی۔

کرکھن نے اس بات میں بھڑائی کا کھڑا بھر دیا جس سے وہ تائیاں دھیر دھیر صاف کیا کرتی تھی۔ بعد میں اس نے ہاتھ دھیر دھیر کے دھڑک
توڑا والڑی۔ اس سے گوشت اور مٹی کا لک کا سا گ اٹنے کو کہا۔ خود گھر کا آنا گوندھنے کیلئے آج اسے کچھ فرست سی مٹوس اور سی تھی کہ کچھ
ن سے مہماں دور ہے یہ جا چکے تھے اور آج ان کے ناشتے کی تیاری کا کام نہیں تھا۔ اسے میں نوکر سورا سلف لے آیا۔ اس نے آواز دی کہ سورا
لے لیجئے۔ کرکھن آگوندھ رہی تھی۔ اس لیے نہ تھی۔ چوہی نے نوکر کی دوسری آواز پر غصا اور کہا "کیوں دلی مٹھی کیوں نہیں لے کر کون حیرا ہارا
انہ کے جانے۔ مٹی نہیں وہ میرے کھڑا آواز ہی دے دیا ہے۔" کرکھن انھنے کوئی تھی کہ بڑی بی بی نے کہا۔ "میں لے آتی ہوں تو گوندھ تھی
رو۔" جب آگوندھ لیا تو مسالا جیسا آگ جلانی اور گوشت چڑھا دیا۔ اب مٹی جان رہی تھی کہ آواز آتی "کرکھن بھاگ کے آئیو۔ جلدی آ
ہندی۔" کرکھن جلی جہادی تھی کہ بھر چوہی جی کا پیار یہ "ماری آتی ہے کرکھن اصر تھے نے سارا ستر شراب کر دیا ہے۔" ہارے کرکھن نے جا
کے ٹھنکے کو دھو لیا۔ بچے کے کپڑے پہناوے اور بھر بڑی کاٹنے لگی۔

کر بھی کو بے شدت کی جھک گے۔ وہی قسمی کیونکہ صحت مند جسم ہونے کے باعث صبح ہی سے چہرہ خالی رہ لگتا تھا۔ آج رات کی ہا ہی روئی بھی کوئی نہ پٹی قسمی اور صبح کے چہرہ انھوں کے بعد جو روایک چہرہ اس پہلی قسمی۔ روزی کی بی بی نے کہا کہ تمیں بھر بھی شاید ایک آدھ بھروسہ کیا

رہ گیا ہوا اس لیے جتنی مجھ کو یاد ہو رہی تھی تانے میں جاسے کچھ کی کہ وہی جن کی آنکھیں دن بھر اور لوگوں کے کام میں گڑی رہتی تھیں۔ "پتا رہا اب کہیں میرے لیے جا رہی ہے۔ یہ جتنی جلدی جلدی صاف کر کے آؤ گی جتنی میں ابھی آ جاؤں گے۔" کرکمن نے کہا۔ "تمی زادہ کھینے بھی جتنی کوئی نکلا اچھا ہو، جھوک بھڑکی جتنی۔" بولیں۔ "تجھے یہ وقت جھوک ہی لگی رہتی ہے۔"

کرکمن نے ساک کاٹ کر دوا اور دنگلی میں داخل رہا۔ سب دایک لمبے کی فرصت ہوئی جتنی کہ وہی نے کہا۔ "کرکمن یہ لڑکیوں کے نکلیں کے خلاف بہت پہلے ہو گئے ہیں۔ انہیں ابہر کے ۱۰ ورہن کا ایک بھی اٹھاؤ میں تجھے دیکھتے ہوئے خلاف نکال دوں۔" چنانچہ خلاف ہلے گئے۔ بڑی بی بی نے بچھا "دھوئی کپڑے نہیں لائی بہت عرصہ ہو گیا ہے کیا ہوا اسے؟" "وہی نے کہا" اس کی لڑکی چارہ بیٹا ہے شاید اس لیے دیر ہو گئی ہو۔ کرکمن ہاتھ پر جم کو آواز دے۔ اسے دھوئی کے ہاں لکھیں اور وہاں اندر سے پہلے کپڑے بھی اٹھا کپڑوں والی کاپی لکھی لکپڑے لکھوں۔" چنانچہ کپڑے لکھے گئے۔ جسم سے جو کچھ کا ڈیوڑھی میں کھڑا تھا کہا کہ "دھوئی سے جا کے کھڑے کیا کے کپڑے لے جائے پھر وہ دن ہوئے خرابی ہوئی۔"

کپڑے نہ کو، ابھی پونے سے پاس پہنچی تھی جتنی کہ بڑی بی بی نے کہا "کرکمن ذرا میرے ہاں میں کھینچی کر دے اندر سے اٹھا میری کھینچی۔" ہلے سر میں کم بہت لکھی کھیں ہوئی جا رہی ہے۔ "کرکمن نے اٹھ کے بڑی بی بی کی کھینچی چوٹی کی۔ خیال آیا کہ اب تو دراصل صحت ہے اپنے ہاں میں کھینچی کرکمن۔ اس لیے اپنی کوٹھڑی میں بی اور وہاں پل جا کے چوٹی باندھ دی جتنی کہ بی بی نے آواز دی "کرکمن دیکھو سالن کو، انہیں مل جاتا ہے۔" کرکمن کے بھر پانے کی طرف توجہ ہو گئی۔ اب دس بج گئے تھے۔ صفر اور مغرب آ گئے انہیں جلدی سے روٹی پکا کر پی پھر پانی آئے کی دوا نہیں پائی۔ آگ بجھائی، بات دھوئی، بھر پی اور بڑی بی بی کو کھانا دیا۔ رات کے لیے الگ سالن نکال کے رکھا اور باہر چلے کو روٹی دی، بعد اس کے آپ روٹی کھائی۔ اب سو بج سر پہ آچکا تھا۔ سارا گھن چنانچہ شروع ہو گیا تھا، اس لیے سب رات اٹھا وہ باہر رہی خانے میں چلی گئی۔

بڑی بی بی نے اور جی نے کھانا کھا کر کرکمن سے رات اٹھا کے کہا۔ دن کے رات باہر کے رات صبح گئے۔ انہیں ابھی باہر نکلوں کو کرکمن آہستہ آہستہ دھو رہی تھی اس ار سے کہ اگر جلدی جلدی دھو کے خارج ہو گئی تو دیکھتے ہی جی کوئی شکوئی کام دے دیں گی لیکن ابھی دھو رہی تھی کہ ننھے سہاں کے رونے کی آواز آئی۔ اس نے بڑوں کو اور اور ذرا زور سے فری پڑ رکھا شروع کیا کھانا دوازیں کر دیں کچھ پائیں کہ رات ابچ رہی ہے۔ کچھ دیوں کیوں ننھے کو بھلانے کے لیے گواہی لے کر اور اور بھر میں دوازیں سے آواز دی "اور کرکمن، اور کرکمن اور آئینہ" کرکمن ہاتھ دھو کے کئی تو علم ہوا کہ ننھے کو ڈالے کر بھر، پگڈنڈے میں بھی چپ نہیں ہوتا۔ کرکمن نے بچھا "وہی دودھ کے لیے تو نہیں دوا؟" "وہی بولیں" تو مت غور سے دیا کہ ۱۹۱۱ میں نے اسے دھو دھو پلایا ہے اب دودھ تو جسکے بچہ، معلوم نہیں اسے کیا حمل ہے؟ اسے لے کے نکلیں، اعلان میں۔"

یہ تھا اور پھر کا کام۔ بی بی، رات سب اسکو سے آئیں تو انہیں کھانا دیا کھانا چھوڑ دی بھر پی بی نے بھر پلایا۔ کرکمن اور جتنی جتنی کہ رات نے بھر پلایا شروع کیا۔ "اور کرکمن، کرکمن، اور جی کے اعلان میں انہیں پکھا چھوڑ دی جتنی کیونکہ وہ بھر کی لڑی میں دوا تو سو گئی تھیں، تو کرکمن کو علم رہا تھا کہ کھانا چھوڑ دے، صبح پانچ بجے سے اٹھی ہوئی تھی۔ ابھی تک سو دھو دھو باہر لگی ہوئی۔ دن چور ہو رہا تھا۔ پکھا پکھلتے پکھلتے ذرا کھوئی جتنی کہ رات کی آواز نے پکا دیا۔ اب وہاں جتنی ہے تو غور ہے کہ وہی جاگ نہ لکھیں اور انہیں رات تو بی بی رات سارا کرکمن پر

الٹاتی ہیں۔ پانچ راگنی اور رتی کے کمرے میں تکی۔ وہاں بیگم تھا کہ ان کے کمرے کے دروازے بند کر کے باہر سے انھیں چھوڑ دی جائیں اور کہیں سے انھیں بلکا دھواڑ کے آدراہانے کیونکہ ان کے چنگے پر تو جہ وقت چور لگے رہتے ہیں۔

بلکا تلاش کرتی پھر تکی چھٹی کو نکھیں نے ٹھک کیا انھوں نے نئے کے اوپر تو مل کا ایک دو پلا ڈال دیا تھا چونکہ کہیں انھیں بلکا جمل رہی تھی اس لیے خود ویسے ہی جی جی تھیں۔ اب کھیاں جو منہ تک پر بیٹھیں گئیں تو وہ ہانک تھیں۔ کہیں کو نکھی، خزاوی سب بلکا ہوا یا۔ خوب تھا ہونے۔ خیر گزری کہ تھا سور ہاتھ۔ آواز بہت اونچی نہیں نکالی تھیں ورنہ شامت ہی آجاتی۔ کہیں آئی اور ساری دو پیر جی کے سر ہانے جی جی پر تھیں اور تھیں ہوئی بلکا جھٹکی رہی۔ بہت دیر ایک جگہ بیٹھنے سے پاؤں بھی سو گئے مگر نکھی وہ تھیں رہی۔

سورہ کے وقت بلکا نکھی دغیرہ کا سامان کرنا تھا۔ کسی کے لیے کسی ہائی۔ کسی کو خیر دے شکوہ کے لیے اور جی کو اور ہونا کے یا بلکا شام کو سورہ اسکو دیا۔ مسالا چوسا، بند پاؤں لٹے پر کھی، سامان پکایا، روٹی پکائی۔ باقی دن ہی طرح گزر گیا۔ اس میں ہی بی رتی کے کمرے میں جھاڑو بنا بھی مثال تھا کیونکہ ان کی پانچوٹی پر کسی نے میلا پاؤں رکھ دیا تھا۔ رتی نے اس کو اٹھی، گدھی اور جو جو کھان کے نہ پانچوٹا یا کھو رہی تھی کہ کہ ہمارے سر پر یہ بڑا اب معلوم نہیں کہاں سوار ہے۔ ایک آواز نکالی تھی مگر اس کی ہی نہیں اس آواز میں دھوکہ کچھ تھی ہے ہمارے بلکا کا سامان ہادی سے کرتی ہے کہ نہ ہونے سے بدتر ہوتا ہے۔ معلوم نہیں اس نے اسے کہاں رکھا ہے، دغیرہ دغیرہ۔ بہر حال سر شام کہیں سے انھیں میں چار پائیاں چھوڑیں۔ ان پر سب کو کھانا نکلا کے رتی جمع کر کے انھیں صاف کیا۔

اب رات کے اس دن چنگے تھے۔ کہیں نے اگلی اگلی برحقوں سے فراغت حاصل کی تھی۔ اب کمرہ صاف کر دی تھی۔ ہاتھیں اگلی پر جمل محسوس ہو رہی تھیں جیسے ان میں سہرا ہوا ہے۔ آنکھیں بند ہوئی ہاتی تھیں لہذا اس نے سوچا کہ پانی صبح اٹھ کے کمرہ کی اب تو قلم نہیں چلا یا جانے کا اور بلکا اس کے چلانے سے شور ہوگا اور سوچا کہ گزروٹھی کے گزرنے تو اگلی خالی نہ ہونے ہوں گے کیونکہ سورہ کو کچھ تھے آدھے آدھے لمبے ہونے تھے۔ اس لیے اپنی چار پائی بچانے چلی۔ آج بلکا ہوا نہ تھی مگر کھیتا جس نہ تھا۔ چار پائی تو بچائی، اندر سے ستر لانا دھرا ہوا کیا۔ بہر حال بے آئی ہو بچانے کے ساتھ ہو جی تو ایک ہی صحت میں ہو گئی۔

اگلی رتی اور صفر جاگ رہے تھے، اپنے اپنے سکول کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میاں صفر کو پانی کی ضرورت ہوئی۔ وہ اٹھ کے کمرہ کھانے گیا تو دیکھا کہ گزرنے میں پانی نہیں ہے۔ بس اس نے چھانٹا شروع کیا۔ "گھڑوں میں کبھی پانی ہوتا ہی نہیں۔ معلوم نہیں ہشتی کیوں نہیں رکھ لیتے۔ وہ تو دیکھتا ہوں پانی نہیں ہوتا۔ اب میں کیا کروں؟" صفر کی دادی نے کہا ہانک رہی تھیں، کہنے لگیں: "بیٹا اور پی نہ مانے میں سے نہ تو" مگر صفر کیوں جاتا۔ وہیں سے کیا اپنی والدہ کے سر ہانے اور لگا انھیں بھڑکنے "کہاں! کہاں! کہاں! اس کی اگلی اگلی تھی بلکھتے جو جاگنا بہت طسٹا یا۔ کہنے لگیں۔" ہے ہے تجھے میری جی جی جاتا۔ کسی کو سونے بھی دیتا ہے کہ نہیں؟ سارا دن گری سے آنکھوں پر خیرہ رام رہی اب ذرا سوئی تھی کہ چلا دوسرے آن سوار ہوا۔"

"تو میں کیا کروں۔" صفر نے تھلا کے جواب دیا "گھڑوں میں پانی بھی ہوا، مجھے صحت نہ مانے پتا ہے۔"

"تو میرے سر کیوں ہوا ہے نامراد، کہیں مراد سے کہ وہ ذوق زادی تو سر شام ہی سو جاتی ہے۔ اسے کہہ تجھے پانی نکال کے دے۔

ایسی کالی بھی کوئی لڑکی نہیں دیکھی۔ تو پانی خیرہ کی پانچویں ہے کہ پانی تک نہیں رات کو بلکا نکھی۔ اٹھا اس کام پر کو اور کہیں۔ کہیں

اے کہیں۔"

حیات اللہ انصاری

نام	حیات اللہ انصاری
تلمی نام	حیات اللہ انصاری
پیدائش	یکم مئی ۱۹۳۸ء بہتنام فرنگی محل بکسٹو۔ بھارت
وفات	۱۸ فروری ۱۹۹۹ء بہتنام بکسٹو، بھارت
تعلیم	پہلے اے مسلم یونیورسٹی گل گڑھ ۱۹۶۳ء "اسکالرشپ ان تھکری" کی اعزازی سند سرانسن یونیورسٹی
	ابتداء اپنی دینی مائیں سے قرآن مجید کا سبق لینا شروع کیا۔ اس کے بعد مدرسہ نظام فرنگی محل بکسٹو سے "مولانا" کی سند لے کر ۱۹۶۹ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ مولانا سید علی الحق، مولانا سید سبط حسن اور طفیل عرب سے عربی کی تعلیم پائی۔ میٹرک ۱۹۶۹ء میں کیا۔ جو بی بی کالج بکسٹو سے ۱۹۶۶ء میں انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد بکسٹو یونیورسٹی سے "فاضل ادب" کیا اور ۱۹۶۳ء میں مسلم یونیورسٹی، گل گڑھ سے بی۔ اے۔ سرانسن یونیورسٹی نے آپ کو "اسکالرشپ ان تھکری" (ڈاکٹریٹ) کی اعزازی ڈگری دی۔

مختصر حالات زندگی

والد کا نام سید اللہ انصاری تھا۔ آپ کے جد امجد مولانا نقیب الدین قصبہ سہانی، یارو بکس کے رہنے والے تھے۔ مذہبی، علمی تصنیف و تالیف کا کام آپ کے خاندان میں سادھے چار سو برس سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ شہنشاہ ہند جلال الدین محمد کبیر نے اپنی تخت نشینی کے چار برس بعد حیات اللہ انصاری کے جد امجد کی طاقت کے اعتراف میں شاہی مکتوب سے نوازا۔ واضح رہے کہ بحال اکبر کا یہ پہلا فیصلہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس خط میں جلال الدین محمد اکبر نے ملا جان کو گواہ القابات سے نوازا تھا۔

تعلیم یافتہاں کے طبقے کی دوسری کتاب جس میں انھیں 'اور معلومی مضامین کو کچھ کیا گیا ہے۔

۱۲ "جدید فی افسانے کی سیر" (تتبیہ)

طبع اول: ۱۹۸۸ء

۱۳ "نئے ج"

ایچو کنٹیکس پبلشنگ ہاؤس دہلی

طبع اول: دسمبر ۱۹۹۱ء

وفات سے قبل مستقل چا:

B-2۱4 ریور سٹریٹ کالونی لکھنؤ بھارت۔

اعزاز:

۱۔ سابقہ انگریزی ادبی ادارہ برائے "نور کے پھول" (۱۹۷۰ء)

۲۔ اگلا پٹھان فکر پتہ (اعزازی ڈاکٹریٹ) مراٹھ پٹھان دہلی۔

۳۔ کینڈل پٹھان پٹھان ڈاکٹر "نور" کی کہانی کے لیے۔

نظریہ فن:

"زندگی کے چاروں طرف جاری ہو رہا ہے اور صحت کے ساتھ ساتھ کوئی حد کوئی ان کی تلاش میں سرگرداں کر رہا تھا۔ جب زندگی بھلی چلتی تھی، پھر اور کی افراطی اور آج کی طرح کا اضمحلال تھا، پھر کہہ سکتے تھے کہ انداز اور پٹھان سے لے کر سکرانی اور عالمی جنگ تک جاتا ہے اور دوسری طرف وہ صحت کا تاریخ نویسی اور نہ سب کی ترجمانی تک میں محسوس جاتا ہے۔ آج کو کوشش عافیت میں بھی مظلوم کی آجیں پہنچ کر سکون دردم برہم کر رہی ہیں۔ اس کا ایک نئے میں انسانہ نویس کا قسم خوردہ تو بہت بڑی چیز ہے، روشنی کی چھوٹی موٹی کرشمیں دھڑکا پھر رہا ہے، جہاں وہ اہل بھتی ہے، سترائیں بکری کی طرح اس کو اٹھا کر جہاں میں مقید کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"

(مکتوب، مام ہرن اعلیٰ، ایک خورہ، نومبر ۱۹۸۳ء)



حوالہ جات:

۱۔ ایک راسلے "تذکرہ ۱۰ سال" میں یہی تاریخ ہے، پھر پٹھان ۱۹۸۱ء اور جی کے ہے، پھر دست لکھن "مات اند اندہ" نے ۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء کو پٹھان ۲۰ ایک مام ہرن اعلیٰ تاریخ پٹھان ۱۹۸۱ء لکھی تھی۔

آخری کوشش

حیات اللہ انصاری

نکلت باہر نے گیمٹ پر ٹھپے کو روک کر کہا
”نکلت“

ٹھپے نے ٹھکسٹیا کر باہر کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اس کی کافی دیر سے کراہت سے پچا ٹھک کے باہر دیکھ لیا۔ ایسے ہلکے ٹھکوں کے ساتھ جب وہ پلانکٹ طر کر رہا تھا اور کیا ہی کیا جا سکتا ہے؟

ٹھپے نے انٹھن سے باہر نکل کر اطمینان کی سانس لی کہ خدا خدا کر کے سفر ختم ہو گیا۔ راستہ ہلکٹ باہر اس کی گالوں میں ٹھو کر رہا تھا۔ ٹھپوں کے بار بار ملنے سے اس کا کیا کیا ایک انٹھن سے دوسرے انٹھن پھول بھی پھٹا پڑا ایک دن کے سفر میں بائیس دن گئے تھیں ان دنوں سے کیا؟ کسی نہ کسی طرح اپنے وطن تو پہنچ گئے۔ وطن یا بچیس برس کے بعد وطن۔ ہاں بچیس ہی برس تو ہوئے جب میں ٹھکٹ پیچہ تو کالی مل گئی تھی اور اب لوگ کہتے ہیں کہ اس کو کھلے بچیس برس سے زیادہ ہو گئے۔ آگے وطن۔ ہاں اب ماضی کی کیا ہے۔ اگر یاد لفظی نہیں کرتی ہے تو وہ کس کا کیا راستہ اور وہ ٹھنڈ کی بات۔

اپنا گھر اپنے لوگ اور بھتیجی جن کا بچیس سال سے حرا نہیں بچھا۔ ٹھکٹ میں گھر کے نام کو مزید تھی یاد کا توں کے تھنے یا بھر شہر سے میلوں دور ٹھیکہ دار کی بھوت چڑیاں جس کی زمین پر اسے آدمی ہوتے تھے کہ کروڑ لپے بھری ٹھکٹ تھی تھی تو ہے اپنے لوگ سو وہاں اپنا کون تھا؟ سب فرض کے بندے نے اپنے ایمان حرام زور سے ایک دو سالہ تھا بھوتہ اور دوسرا تھا۔ بھوتہ اور وہاں ٹھکٹ کی جو ٹھپے کی ساری آہ لی کہا گئی۔ وہ لوگوں کے حوروں بھائی ہیں مگر حوروں کا موقع آیا کہ ہر ایک کو اپنی اپنی چنگی جہاں جلا کوئی دوسرا حوروں سٹارٹ لے لے سو جو یہاں سٹارٹ کر لے دلا کون تھا؟ جب بیلے نے آکر مجھے حکم دیا ہے کہ تیری سٹارٹ ختم تو آنکھوں سے نہ ہائے کیوں آنسو نکل آئے۔ جس ایک دم سے گھر کی یاد آ گئی۔ مگر کیا چیز ہے؟

ٹھپے کو بچیس تھا کہ بچیس سال کی تھی مادی آقا کو گھر پہنچنے ہی سکھل جائے گا اور گھر اب قریب تھا۔

انٹھن سے بکھوڑا کر بھیجے جو چکا سادہ گیا۔ یہاں کی دنیا ہی اب اور تھی۔ کھیتوں اور باغوں کی جگہ ایک شکرمل کڑی دھواں اڑا رہی تھی۔ جس کی لہاڑیاں یہاں سے وہاں تک نظر آتی تھیں۔ کچی سڑک کی جگہ اب کچی سڑک تھی اور اس کے برابر ایک ریل کی پٹاں اب بھی چوٹی تھی۔ سڑک خوب آباد تھی۔ سڑکوں کے بہت سے پھولے ہوئے غول آباد رہے تھے۔ انٹی دیر میں کی سڑکیں خراب ہو گئی تھیں۔ ایک مال گاڑی چمک چمک کرتی جا رہی تھی۔ غرض کے متفرق اکتاہٹ کی گھاٹ راستہ بچھا تھا اس سے باہر تھیں لیکن پھر بھی بھیسنے کا دل اس بات پر راضی نہ ہو کہ میں اپنے انٹھن پر اتار کر اپنے ہی قہب کا راستہ چلوں۔ یہ آپ ہی اب ایک طرف جا گیا۔ تھوڑی دُور آ کر جب شکرمل کی حد میں شرم ہوئے تھیں، اور ادا کے کھیتوں اور باغوں کے سلسلہ آگیا تب اس کے دل نے دھڑک کر کہا میرا راستہ ٹھیک ہے۔

وہ دن کون پتلے کے بعد اپنے قہبے کے بازو کی دینے لگے۔ ڈر اور ریل کر شاہی زمانے کی ایک ٹوٹی ہوئی مسجد ملی جس کا ایک پتھر تو باقی ہوئی بیویوں سے ملے جانور جنگلی کھڑوں سے آباد تھا اور دوسرا تقریباً مسلم زمین پر لیٹا کافی کی کھیتیں جا رہا ہو رہا تھا۔ اس پر نظر پڑنا تھی کہ کھیتوں کی بہت سی چھوٹی چھوٹی یادیں جو کب کی بھول چکی تھیں، کھیتوں کے برسوں کے بھاری بوجھ کے نیچے ایک دم پلاز پلاز کر ٹپ کر نکل آئیں اور کم میں دیرپائی چھو کر ان کی طرح سامنے اچھکے ہوئے تھیں، تو زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا جب اس مسجد کے گرد پانی بھر باجلا گاؤں پھر کے ٹوڑے ٹکڑے میں میں نہاتے تھے۔ اس وقت بھی یہ کھڑا تھا، پس ہی کھڑا تھا اور لیٹا تھا، یوں ہی لیٹا تھا۔

آگے مل کر برکد کا درخت ملے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں میرا بھائی "بائی" تھیں، خدا سمورج "بائی" اور وہ کھانا کھا کیا نام تھا اس کا، اور کون کون ساڑی کی ساری ٹوٹی چھوٹی ہوئی تھی اور دن میں ہر سہارا اور اظہار ادا کرتا تھا۔ وہ انوکھے کے اس پامامو کا ایک پار تھا۔ اس پر کبھی کبھی لٹا ادا کہ پڑا کرتا تھا۔ ٹوڑے ٹکڑے اور چپکے چپکے کچے کچے اور وہ فوج فوج کر بیویوں میں بھرتے لگے اور رکھوا، ماں، بہن کی نسا تا دوڑا اور دوسرے آٹا ناخن سب ہوا ہو گئے۔ ایک بار یہاں ہوا کہ ٹوڑے اور دھکسٹ رہے تھے کہ دوسرے ایک فقیر نے انھیں جو ملنا ملنا کر کا رہی تھی۔ یہ کہ ٹوڑوں کو سو بھی شراعت۔ وہ چڑی چڑی پکارا بھاگے۔ پکارا کیا تھا۔ سب سر پر پاؤں دکھ کر بھاگے۔ بھائی وہ گیا۔ اسے ڈر کے مارے اس کی جو کھنکھناتی ہنسی ہے اور جو کچھ فقیر نے کے سامنے ہاتھ جوڑنے

کھینچے یہ یاد کر کے بے اختیار غصہ چڑا۔

سورج دن بھر کا سفر کرنے کے آخری کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دھوپ میں ملاکت آگئی تھی اور ہوا میں خوش گوار لگی۔ راستے کے ایک طرف چار۔ کے بہرے ہرے جھل جھل تھے، ان کے چھ جھ سے بڑی سرگیاں سر ادا نکالنے کے انوں کی طرح کڑی ہونے کی کاوش کر رہی تھیں۔ دوسری طرف "ہاں" کے کنارے تک کھیتوں اور مرد کے باغوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ میرا لپٹے والی چٹاؤں اور گودوں کا طرز کھیتوں سے واپس آنے والے بیلوں کی کھنٹیاں۔ لہاڑیوں کی بہت بہت باغوں کے کھانوں کی جو "ہاں" سب سے ہوا ہی طرح ہی ہوئی تھی جیسے پکاروں کی کھنٹی بھٹی بھٹی جھٹی خوشبو سے مملوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا ایک بہت بڑا گھر ہے جس کے درجے والے یعنی کھیت اور غلے ہوا آئے والی صدائیں اور خوشبو سب قریب دھند دار ہیں اور خوشی خوشی مل جاتی رہتی ہیں۔

گھٹاؤں کا آہ جھٹکا کھیتوں سے واپس آتا ہوا آگے آگے ایک لڑکی بھٹی اور جھٹی سر سے لپٹے کافی چلی جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہاں کو کندھے پر رکھے بیلوں کو بھگاتے چھ سات مرد تھے۔ ان لوگوں نے پہلے ماں کھینچنے کی طرف توجہ نہ کی۔ مگر جیسے ہی کھینچنے کی ان میں سے ایک کھینچنے سے لگا ملی، وہ بے اختیار سر ادا جیسے کوئی اور مرد اس طرح سے آگے آگے اپنے عزیزوں کو دیکھ کر سکر ادا رہا ہے۔

اور سورج اُٹھنے کے دامن میں چھپا اور دوسرا قہر آگیا۔ ان کا نشان ایک اُٹھ کر آتا تھا جس سے کچھ دور بہتے کرتا تھا۔ وہ چار بوڑھے اور دسٹ شام کا دھندلا کواڑھے کسی یاد میں کھوئے کھڑے تھے۔ اس مقام سے ایک بہت دور ان بھری یاد انگاری کے کرشمی اور ٹھپنے کے پاؤں تھم گئے۔ وہ بلا ارادہ کھڑا ہو گیا۔ وہ سامنے کی بھاری اور گڑھا، ٹھپکی، دلائی سے چسپ کر رہے تھے۔ وہ بھرے جسم کی پہنا بھلی دلائی جس کے اندر ٹھپنے کا ٹھپک چھ چلتا تھا۔ وہ نہ مٹنے کا۔ دباؤں چڑھ کر وہ دلائی کا انتظار کرتا تھا۔ اُتار دلی میں کیا کیا نقشے بنے تھے۔ شہر پاؤں کا نوکری کروا گا۔ دونوں وقت پنے چہاؤں کا گھر سوچے جوڑ جوڑ کر دکھوں گا۔ پھر چپ ڈھائی سو روپے ہو جانے کا تو دباؤں انہیں گاوریہ الال کی طرف ایک دم سے ایک کوئی تھل لے کر کھینچ شروع کر دیا گا۔ اسی وقت دلائی بھری کھلی ٹوٹا دی کرے گی۔ میں تو کم سے کم دو مہینے تک اس سے بات بھی نہ کروں گا۔ بس اس جگہ ٹھپنے آج یا کروں گا۔ وہ آئے کی ضرورت اور وہاں درخت کی جڑ پر چڑھ کر وہاں میں ڈھیلے پھینکے گی۔ مٹھانے گی۔ بھری طرف کھینچوں سے، کچھ کچھ کر دے گی۔ بڑی چڑچڑاہٹ نہ جانے اب کہاں ہے؟

ٹھپنے درختوں سے نکل کر سوک پر آگیا اور ٹھپے کے اندر چلا۔ گھر اب اس کی حال دیکھی تھی۔ وہ ان یادوں میں اب ڈوب گیا تھا کہ آنکھیں دیکھنا اور کان سنا سنا کر لے گئے۔ ایک بچی ایک موز پر چڑھ کر پڑا ٹھپے کوئی بھری بات اک دہرا لگی ہو۔ بچہ جگرتا ہے۔ یہاں، بچہ ابانے دو چاہتے ہار کر میرے گئے سے ٹھپیں میاں کی ٹھپیں کا ٹھپ ٹوٹا لیا تھا اور ٹھپیں میاں گھر کے اندر آئے اور وہاں ڈھیلے لگائی۔ ٹھپنے آنکھیں۔ کدھر م گیا؟" ناٹکس پھیلا کر دونوں بوٹے میرے صدمہ کی طرف بڑھ رہے ان کو اتار دو پھر جڑ میں اتار دو۔ ٹھپوں کو لے لے سے پچھو پھر جڑ کی لاکر پاؤں کے لیے صدمہ۔ ٹھپیں میاں کی چڑیہ، ایک کچھ کر تھی پتا تھا کہ اس میں سے دو ایک ہا۔ بس اس بھی ہو تھی اتار سے پاس کیا تھا؟ ایک پتا کر وہ پاہل پھرتے رہتے تھے۔ جب وہ پاہل پھرتے ہو جاتا تو کان صاحب میں ہار کی کا پھر اتار جڑا دے دیتیں۔" پھر پڑا لیا اس کے جان پر تو کاسٹے ہیں۔ یہ کہاں سے کوئی پکا گیا؟ کچھ تو کوئی ٹھپڑا لے گی۔" ایک بار ٹھپیں میاں کے کمرے میں جو گیا تو دیکھا کہ اس کی ٹھپیں کے کھ کے دو ٹھپ چنگ پر پڑے ہار ہار رہے ہیں۔ اس وقت بکھا پیسے چارے معلوم ہوئے کہ میں نے بچے سے ایک ٹھپ میں ادا کیا۔ ٹھپڑی دیر میں ٹھپیں میاں چلانے لگے۔ "ایک ٹھپ کیا ہوا؟" میں نے کہا؟" میں نے ہی میں کہا۔ میں لایا ہوں۔ کو کیا کہتے ہو؟ ٹھپ تو دوس کا ہا ہے کو کرو۔ بکاب تو تمہارے گھر کا کا بھی نہ کروں گا۔ سب کی آکھ بھا کر باہر چلا آیا۔ بھری ٹھپیں میں آتیں کہاں تھی؟ میں نے دو ٹھپیں لگے میں اس طرف لگا کر ٹھپیں اور زنجیریں اونوں چڑیہ باہر چار ہار کر لیں اور پھر ان ٹھپوں کا پتا کھوں کھوں کھو جاتا۔ جب رات آگئی جب ٹھپ ہوئی کہ اب کہاں جاؤں گا۔ میں اور اوسر دیکھا پھر تھا کہ ادا نے جو میری کوٹ میں لگے تھے ان کے لیا۔" تو ٹھپیں میاں کا سونے کا ٹھپ لے لیا۔ سونے کا ٹھپ۔" اور ٹھپ چڑے تھے کہ میں بھاگا۔ سونے کا ٹھپ۔ ٹھپوں میں چار پیسے پڑے تھے۔ چہہ چاہا اتار لے لو۔

بچہوں اور بچی بچی بچی دیا دوس پر شام کی سائوٹی رنگت چھا گئی۔ فضا میں بجلی بجلی ٹھپکی تھی، جس سے دل کو جب سکون ملتا تھا۔ گھروں میں چڑھنے میں لگے تھے جن کا دوس اور دوسری بچہوں سے ٹھپ ٹھپ کر لیا کی گھر بہت سے گھر پر چڑھ رہے تھے۔ پکارنے اور دوا دوا سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جڑا پنے ساتوں بھری کان کو لے لے بھا کی جاری تھیں۔ دوسرا بے پرو کے لڑکیوں اونچا بچا کھیل رہے تھے اور بے حد شور مچا رہے تھے جیسے بھرا لپٹے وقت ٹھپکی جاتیں۔ ایک گھوڑا ان بھڑوڑ دھوپ کر کے ابھی ابھی تھن پر آیا تھا اور خوشی سے جھپنا رہا تھا۔

[illegible]

ساتھ مگر ہے کٹھن؎ بنیائے ابر آتے ہی تھپتے کے دل نے دھڑک کر ڈی بے تابی سے پوچھا وہ کچھ غمی وہ ہاں وہاں کہہ ہے تو خدو۔

شروع تاریخی کی دوس کی رہی پھر جانتی میں اندھیرے وہاںے کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ ایک دیوار تھی جس کا آدھا حصہ نیچے کی طرح ڈھیر تھا۔ آدھا تو کڑا تھا۔ اس پر ایک نوا پھوٹا پھیر تھا جس کا پلوں و صوفوں کھائے ہوئے تھوڑے کے ہائے کی طرح ہر طرف بھول رہا تھا۔ پھیر کے سامنے کی طرف چھ صدی کی جگہ جھانکوں گا تو دیکھیں کہ وہاں کسی سوکھی گل کا کٹا جلا ایک انوم تھا جس کے پتے تلے تلے سے پھیرے ہوئے تھے۔ کچھ دیر اور دیکھیں تو میں پر بخار ہے تھے۔ گھرا رہے تھے۔ میں قبرستان تھا۔ اندر تو جگہاں مل رہی تھیں۔ ہر جگہ ایک ایک چیز

ہار ہار کر کہہ رہی تھی کہ ”میرا خود گلوے گلوے کھتا ہے“ تم کو کیا کھائیں گے؟“

بچی مگر تھا جس میں سفر کی جھلی باندھی آٹا کو بچن کی تلاش تھی۔ سمیٹنے کی امیدوں کا جتن، بڑے دھماکے روز سے بچوں برسوں کے کپے اور انوں کے طون سے بچنے، ہاتھ اکھاڑ کی سر جمائی۔ اس کا دل ہار ہار تک دلاتا کہ یہ مگر خالی ہوگا۔ وہ لوگ کھیں اور اٹھ گئے ہوں گے اور ہار ہار بکریوں کے موت کی کراہت اور ہانپان کی سڑکتا ہو رہا چل ہوا سے دلی ہوئی گھر کے گرد تپتے تھیں ان ہاتھ کے گردلوں کو امداد تھیں۔ سمیٹنے آدھ کھٹے تک جہاں جہاں کھڑا ہار اس میں انکی ہمت نہ ہوئی کہ اندر چلا کسی کو آواز دیتا۔

وہ دیکھیں یہ ایک چارہ ہار ہاتھ، روتے روتے اس کی آواز سے ایک طرح کی امداد میں بندھی اور یہ کھٹا رات جواب نہ ملنے پر پھر کھٹا رات ہار ہار کھٹا رات نے یہ کوئی دھپ پاؤں پاؤں ہار ہار آواز اور رات دھپ سے بچے میں ہوا۔

”اندھ بلی آؤ نا۔“

اس دھپ کے سمیٹنے کی ہمت اور سڑکتی۔ اب کی دھپ ہار لینے کوچ بچے کھٹا رات پھر کہنے کا

”کون فقیر؟“

”ہاں!“

فقیر الراج کر ہوا۔ ”تم کون ہو؟“

”ڈورا اور آؤ۔“

فقیر انگلی کر تہیہ آؤ اور ہوا۔ ”تم کون ہو؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”ڈورا ستونو بھائی تم فقیر ہو؟“

”ہاں کہہ دیا۔“

”تم کبھی رہتے ہو۔“

سمیٹنے کی آواز میں کچھ اٹھاپے رہا کہ فقیر کا قصہ قاصد نام، ہا گیا مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ شخص کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ دوسری طرف سمیٹنے کی بکھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے کو کیسے بکھڑائے۔ اسے خیال تک نہ آتا تھا کہ اپنے مگر بچنے کر یہ کام بھی کرنا ہوگا۔ آخر دل نزا کر کے ہوا

”میں ہا بکھ دوز کا سڑ کر کے آ رہا ہوں۔ تمہارے پاس۔“

اب بھی فقیر انکھ نہیں کھلا مگر ڈورا اور اس کی زبان سے نکل گیا۔ ”تو اندھ آؤ۔“

اندھ آؤ کر سمیٹنے کی ہمت نہ ہوئی اور ساتھ ہی راحت دہنے کی امید بھی ملا وہ ہر پائے لگی۔ فقیر نے دیا سٹائی کھینچ کر چرخ چلا دیا۔ بچہ کے کپے سات بکریاں اور بکریوں کے کپے بندھے تھے۔ انھیں سے شاید گھرانے کی روٹی ملتی تھی۔ ڈورا اور ہرے کر زمین پر ایک پھیدہ حانات بچھا تھا جس پر ایک بھلی سی چیز جو شاید کبھی رضائی ہو مگر جو تھرا اور کر گناہ ہوئی تھی آواز سننے کے لئے پڑی تھی۔ سمیٹنے نے تاپ پر لیٹر کر کچھ پاتے چراغ کی دھندلی روشنی میں فقیر کو غور سے دیکھا۔ ملا پتلا آنکھیں اندر مٹتی ہوئیں اور بے نور دھڑ بھڑ کی کھال جوتے کے پتھر۔ کی طرح کھردری اور اس پر دھولیں طرف دیکھی تھی جھریاں تھپتھپتی تھیں اور ہر جگہ کے پانی کی گھیریں۔ بال بگھڑی جن میں سفیدی زیادہ۔ یہ تو سمیٹنے کا جہان بھائی فقیر اس سمیٹتے اور دیکھتے دیکھتے میں اس سے لڑا وہ جہان تھا۔

اگر وہ بھرتھو، وہ فکرت کی ایک صورت الا سنگھ کا ہے۔ وہ درجے والا این کا بڑا اور پیسے کی گجیوں جیڑاں ایہ وہ فقیں جس نے ہے۔ یہاں تو کہہ گا تھا۔

تھیں نے ایک خطی سائنس بھری اور در تک بھیجے ہوئے مگر کے کھٹوں کی طرف دیکھا۔ میری زندگی ابھی کیا دنوں کی رہی ہے۔ چند روزوں میں کے سن تک باپ کے لڑائیوں کی یاد کھائی۔ کھانے پینے کوڑے رہے، مگر صحت کر کے کونے کھانے کے لیے بڑھا گئے۔ ہاں مجھ کو تو کچھ کھائیں، کہا جھوٹا، وہاں پہنچے ہی ابھی ہی نوکری مل چانگی اور سب باپ کٹ جائے گا، کھلکے کے بچیں ہر دن "افواہ کوئی کوشش نہ نہیں رکھی، در کھانک چلائی، بیسویں نے کہا گاڑی لیتا ہے تو، جانتی لا۔ میں کے "؟ ہو وہاں کے بڑے والے تھے ایک دوسرے کو جانتے تھے، مگر ان کے مگر انے رہتے تھے۔ جانتی لے آتے تھے۔ لیکن یہ "۔ دو آنے روز دو تو گونا گونا گونا جانتی ہو جانے کا۔ دو آنے روز اسے اپنے، مگر ابھی سالے بیسویں نے فونی پھونی گاڑی دی۔ اسے دور سے دیکھ کر لوگ دوڑ پڑ جاتے تھے۔ جب بیسویں نے خوشوار کر کے ایک ابھی گاڑی دے دو تو وہاں کو کر کہا تھا کچھ وہ پہنچ کر لاؤ۔ روپیہ چلا کر کیسے آؤ؟ آری بھر تو کون کھا جاتا تھا۔ چار سال دوڑے مگر یہ وہی سو پل کے سو پل۔ ہمارا جوا تو کسی طرح ابھی نہیں۔ ہسپتال میں چلے چلے چلے گئے، اسی دن وہ نے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ اب ٹرہو رو دکھانے چلا اور نہ زیادہ صحت کا کام کرنا۔ مگر وہ روپیہ قرض اٹھا کر کے پاؤں سگریٹ، دیا سٹائی کا ٹوٹا لگا کر جب جوتا تاکھا سیزر لاؤ انکی کٹ لاؤ، یہ لاؤ لاؤ، یہاں کیا تھا؟ کہتے "نہیں ہے صاحب، انہیں ہے بھور۔" وہ ابھی کاشا کھوڑوں پر دانت بیٹھنے کو ابھی کھدھی تاجہ سامان تھا اس پر جو کچھ ابھی آج اس صحت دہی سلگتی کھائی۔ نہ جانے کچھ سالے کو اور نہ کہنے کی یاد ہی تھی۔ ٹھنکی میں چاک

مجھے اپنے اوپر غلط فہمیا یا اور اپنے کو خوب گالیوں دینے لگا۔ اس کے میں فقیر، ماسٹری سے آ یا اور آتی حق کر رہے ہیں سے ہوا۔ "نہر قمر نے چرا کر دھو بیچ لیا۔ اب بازار اٹھ پاریں گز دور نہیں ہو سکتا۔ جہاں چاہا تھا وہ چلے جاتا۔"

کھینٹنے نے جواب دیا "کبھی چوری؟ کچھ پاگل ہو گیا ہے تو؟ اور کیا کبھی قصبہ، روز کا کبھی قصبہ۔ برا آؤ بے گھر سے نکالے گا۔" مجھے گھر میں میرا حصہ ہی نہیں اور کمرہ یوں میں میرا حصہ ہی نہیں۔"

”مگر میں حنفی، کبریٰ میں حنفی، جو حنفی بنائے گا؟ کام کا نہ کامیاب ہو، دشمن اناج کا نہ کھجوریں سال ٹکٹوں میں گنوا کر دیا جی ہاں کو آئے ہے۔
میرا قہار دیکھ گئے“

کھینچنے گرم ہو کر بولا "فلکستو میں کھانا کچھ آسان ہے؟ تو خود زندگی بھر قصبہ سے باہر نہیں گیا اور چلا ہے فلکستو کی کھانوں کی باتیں کرنے۔ وہاں وہ کھانا ہے جس کے دہن جاننے والے ہوں جو اس کے لیے ٹھوس لگا نہیں۔ وہ کھانا ہے جس کے پاس وہ ہے جو کہ کچھ کم کر سکے۔ کام کچھ دنوں کے بعد آتا ہے کیا آپ ہی آئے؟"

فقیرانے طعن سے کہا: "ہاں جو یہاں سے جاتے ہیں وہ بچے کے اذیت کرنے کر جاتے ہی ہیں۔ مٹی جو انکار دے رہا ہے تو کیسے لایا جاتا ہے؟"

اپنے گھینے غلام کیا۔ وہ سب بچوں کو سن سکتا تھا مگر یہ کہ اس نے لکھتے ہیں کہ اگر کچھ نہیں کیا یا نکل ہی نہیں سن سکتا تھا۔ وہ چلا کر آیا۔
 ”اگر تو نے کیا کر لیا ہے چنا گئیں گا۔ انہی بچوں میں، اس گھر میں کیا میرا حصہ نہیں تھا؟ سب کا سب بچ کر کہا گیا۔“ لایمیر ایضاً
 دے۔ میں آج ہی اس شخص کا دس سے چار تاروں۔ یہ انہی بچوں کا۔“

کھینچنے سے بن نہیں جاتا تھا کہ اچھا سر پھوڑا اسے پا ہاں نکال کر رکھ دے۔ کیا کرے جو فقیر کو کویتین والا دے کہ نکلنے میں میں سے کوئی کوشش نہ کرے۔

کچھ دن ہی تو تو میں میں ہوتی رہی۔ پھر فقیر ایسا بڑا اتنا ہوا اندر چلا گیا۔ اب تک وہ اندر سے اور یہ باہر سے بڑبڑاتے رہے۔ یہ قصہ آج کچھ چالیس تو بکے چار مہینے سے ہو رہا تھا۔ روز بھی، منگلوار بھی، بدھ بھی ہوتیں اور روز دونوں اسی طرح بڑبڑا کر چپ ہو جاتے۔

رات جب روکی روئی کھا کر کھینچے بہتر چہرہ کر جاتا تو گزرنے لگا تو پھر ایک عضوی سانس کے ساتھ ٹھٹکی کی یاد آئی اور وہ سوچنے لگا کہ شاید اب میں ہیٹھ کے لیے اس اجازت گاہ میں دفن ہو گیا۔ اب باقی زندگی اسی طرح تاتا ہے۔ کاش ایک بار صرف ایک بار میرے پاس کچھ دیر آ جاتا جو میں کچھ دنوں اپنی اگلی مادی آقا کو کھو دے لیتا۔ چالیس برس کی اگلی مادی آقا میں یہ نہیں کہتا کہ بڑا سا گھر ہو وہاں سے کھینچ بندھی ہو۔ کھینچوں میں اتان بھرا ہو۔ گھروانی ہو، جو ساری کے پلے سے قتالی صاف کرے، اس میں اہل بھات لگا کر ساتھ رکھ دے، اس کے پاؤں میں مٹے مٹے کڑے چڑے ہوں جو ہدی کی طرح آڑے آڑے ایک طرف جھکے ہوں جیسے شرابی سہائی کا سر۔ بس مجھے تو بس اتنا چاہئے کہ اپنے ایک ٹکٹ چھوڑ دوں تو وقت اپنی روکی روکی ہو۔ بس، ارے ہاں اپنے پاس کچھ تو ہو۔ اب یہیں گھر والی کی خواہش اور یہیں بچن کا سر مان۔ چالیس کا سن ہوئے کو آقا

سن کا خیال آتے ہی دل میں ایک میز ہوک اٹھی۔ اب وہ چار برس پہلے اور ہے پھر اندر میرا کچھ جانتے کب سوچا جاتے۔
 ایک زبردست سنگ اٹھی کہ جیسے بنے ایک بار اور ہاتھ پاؤں مارو۔ خودی اور تک سوچا رہا۔ پھر اس نے فقیر کو پکارا۔ ”بھیا فقیر لا“
 فقیر اپنے کی پکار سن کر فوراً پاس آ گیا۔ جب وہ آرام سے بیٹھ گیا اور حلق کا ایک دم لے چکا تو کھینچے ہوا ”میں یہ کب کچھ ہوں کہ میں کچھ کروں گا ہی نہیں۔ مگر کوئی کارسگی تو ہیں، ہو کہ جس سے کچھ ملے۔ ارے یہی تم کہتے ہو کہ ٹھٹکی میں میں نے کچھیں برس بھار بھونکا مگر میں کہتا ہوں کہ میں کم سے کم اتنی تو سیکری کیا ہوں کہ کون کام چل سکتا ہے اور کون نہیں۔ یہ کہتے ہو کچھ سیکری لگا نہیں یہ کریں وہ کریں، کچھ کہوں کہ ان میں کچھ نہیں دھرا ہے۔ پیچھے والوں کے سامنے کوئی اپنا روزگار نہ سکتا ہے۔“

کھینچ پوچھ کر اس طرح خاموش ہو گیا جیسے اگلی بات نہیں ہوتی پھر فقیر کی طرف دیکھ کر بولا ”اگر کچھ مل سکتا ہے تو اسی طرح جیسے ہم کہتے ہیں۔ مگر جو ہم کہتے ہیں وہ تو قہر مانتے ہی نہیں۔ اس میں قہار اگلی ہوتا۔ تار اگلی بھلا کون جانتے گا کہ ہم کہتے کاتے ہیں اور وہاں بھی گیا تو کیا؟ جب وہاں سے پاس پہنچے ہوں گے تو سب ہماری برائی کو بھی اچھا ہی کہیں گے۔ جو کیوں کو دیکھو وہاں کے گھر میں برس رہا ہے میں، کھینچے کو ہم شریف اور وہ بڑے۔ مگر کون کس کی خوشامد کرتا ہے؟ ہم ہی ہیں جو آئے دن دوزخ سے جاتے ہیں کہ اگلے منگھو میرا آنا اور میرا دے وہ وہاں تکویناں تک دے وہاں رہا تو کھو دے وہ وہاں مل بھی کرتے ہیں وہ کھار بھی دیتے ہیں مگر ہم بھڑھاتے ہیں نہ چاہیں تو کریں کیا؟“
 فقیر ابھی چپ چاپ مٹھ رہا تھا جیسے دم سے کہہ کر کھینچے لگا ”اور تم تو کہتے ہیں کہ سب ہم کو کھوڑ دیں تو کیا کیا کوئی لڑکا لڑکی یہ ہے کہ بیٹھے ہیں ہم؟ ہم دونوں جہنم سے اگلی ہی روئیں گے۔“

کھینچ نے اگے دم سے کچھ پا کر کہے فقیر کی طرف مٹی پڑھواری سے دیکھا اور پھر کہا
 ”ہاں قہار اسامی چا کرنا ہے وہ چپ دیکھ کر سب ہی لڑکی دینے کو راضی ہو جاتے ہیں اور نہیں تو پھر اپنی برادری میں نہ سکی کسی اور میں

اسی۔ اے ہاں اس طرح تو کہیں بھی نہیں کر سکتے ہو، پھر یہاں کے لیے بھی اچھے ہیں۔ جب پیسے ہوں گے تو ان کو بھی خوب کھائے تو ہے گا۔ فقیر اب بھی بکھر نہیں ہوا۔ اس سے پہلے بھی بھینے کی بارہی یا تھیں کر چکا تھا۔ مگر تب انہیں ان کو فقیر کو نصرت کیا تھا۔ روپیہ کے لیے کہیں شرافت چننی جاتی ہے؟ روپیہ ہے کیا؟ ہاتھ کا میل۔ آج آیا تو کل کیا۔ اور شرافت وہ دھن ہے جو ہزاروں پتا ہے اور غریب نہیں ہوتا ہے۔ شریف بھول کا رتن ہے بھٹا بھی کیڑا میں سوہا ہے، جب بھی دالہ جو پار کر کے نکلتا ہے اور جہاں شرافت گئی پھر آتی مٹی ہو جاتا ہے مٹی۔ دانا جو کھوکھ کے پاس روپیہ ہے وہ ہے، مگر گڑھی ہے، ہم یہی ان کی خوشوار کرتے ہیں اور نہیں کرتے، ہم یہی ان سے روٹی اور حارہ لگتے ہیں اور نہیں۔ مگر اس سے کیا؟ ہاتھ لکھ کر لے جانے پھر بھی سو انا کہ لگے گا۔ ہم اور وہ کھیا کے گھر جائیں تو بہتو پتو ترے پر نہیں گے اور وہ اور نہیں ہے۔

فقیر اپنا دل بے کافہ جب سمیٹے دوپہے کھائے شہر ہو گ کیا قاصد ہے اس کے دل میں بھی کھائے کی خنجر ہوا ہوا کی جس جیسے جیسے دن بیتے گئے اور سمیٹے دوپہے کا کھڑے کر لیں گے اس کی خواہش مرنے لگی۔ غریبوں کو کہاں جیسے رہتا ہے۔ بڑے ہاتھ کا تو کوئی خراب ہی کیوں رہتا اس جیون میں کس سبکی ہے کیا پتہ دوزخ یا پتہ نوار اور صوفی طے تو کس سے ملے گی کرلو اور کیا دھرا ہے؟ بھروسے کا مشورہ کیج کر تو رہی سہی آس بھی گمراہی بندھ سکتی۔ لیکن اب تجھ سمیٹے روز دوشام کو اب یہ دونوں کام کاغذ سے فارغ ہو کے بیٹھے آس دیکھنے کا یہ ستر اسی سوئی سے چھتا رہا تو دلتو دلتو فقیر کی سوئی ہوئی آس چوکی، انگڑائی لے کر اٹھی اور پرے کھانے لگی۔ وہی فقیر اٹھ کر کھانے کی کوئی فکر نہ تھی آج جو پایا کے مندر کی راسو بھائی دی تو دیکھا کہ وہی چھندہ رکھتے دوا یہ بھجر بدل جاتا تھوڑی سی بکریاں اور دو باغیچے اور ذرا چار پانچ روپے کھنے ہو جاتے تو بھرتا، مگر بس جاتا۔ اورے ہاں اب مگر نہ بہا تو ہر کب بے گارو، دھنیا کی بیوہ آ کھلاؤ تو کھانے جاتی ہے اس سے آج کھوؤ آج مگر نہ جاتے، کیا گد یا دن ہے۔ جیسے پکا آم۔ کیا کھک کھک جاتی ہے اور کتنی کھتی ہے وہ وہ وہ وہ وہ ہے، اوپے دھاپے، وہی وہ جسے، ایکلی جھوٹا پانس اٹھا کر کھیتوں میں دھڑالے، کیا محنت ہے اس نے دیر کی تو کوئی اور اپنے کمر خٹائے گا یا کھر میں جھٹکتا رہا دن بھر۔ جس دن سے فقیر اس کے دل میں یہ طبقات کو کھینچنے لگے، وہ رمضان کی بیوہ سے کوئی کائنات کا۔ اور وہ سائے دکھائی دیتی اور یہ رات کو کھرا کر نکل جاتا۔ پھر وہیں روز جوں ہی کٹ گئے۔ ایک دن پہنگڑی چڑ رہا تھا کہ وہ اسکا رکی پیچھے سے آئی۔ اسے ہانکتے نہ تھی۔ کچھ باغیچے ہوئیں، کچھ فاسی دلی ہوئی، پھر وہی جس کا فقیر اکو دھرا کا تھ یعنی اس دن اس نے سمیٹنے کی بات مان لی۔

4

ابھی پھر رات ہوتی تھی کہ کھینچنے نے الفیہ کو جگایا۔ وہاں چاروں کی یہ حسرت فانی میں اٹھنے اور ایک دم کرے کہ ہانس سے نکلا کر ایک اولیٰ سی جاتی اور اس میں خوب سا بیہوشی اور بے پرواہی کے پاس گئے۔ کھینچنے نے ایک ہاتھ گلے میں اور ایک کمر میں ڈال کر اس کو چھپکلی کی طرح جھٹک لیا۔ آگے کا کھانا تھا کہ دو گلی بپ، باب، باب کر کے اٹھارے سے کھانا مانگئے۔ کھینچنے نے پہلی بار اسے چھو اٹھا۔ اسے ایک خوب لذت دے ہوئی جس سے اس کا چہرہ خوب ہونق ہو گیا۔ ایک طرف تو آنکھوں میں آنسو رہے تھے اور دوسری طرف بدن کے دو تھیں کمرے سے جا گئے تھے۔ کھینچنے نے اسے لے جا کر آہستہ سے جیسے کوئی شیشے کا برتن ہوا تو کرے میں رکھ دیا اور پھر اسے چھوٹا ٹھوس میں پھنسا دیا۔

ایک طرف کا بانس فقیرانے تھا اور دوسری طرف کا پھینے نے اور دونوں گھر کے باہر چلے۔ کمریاں ان لوگوں کو جاتے دیکھ کر بے کسی سے مٹی میں گر پڑیں۔ جیسے پہلوگ ان کو بھٹ کے لیے بے یار و مددگار چھوڑے جا رہے ہوں۔

جب یہ دونوں رات کے کالے کالے پردوں کی آہٹ میں منہ چمپائے ہوئے گاؤں کے گھر پر آ گئے تو پہلی اور نیم خطا خطا کر چلنے لگی۔ یہ خوش تھے کہ سچو حکم فکروں سے بچ کر نکل آئے کہ چانک ایک طرف سے ایک کسان کندھے پر تلے گئے نکل پڑا اور پچان کر چہ چہنے لگا۔ ”کہاں چلے فقیر؟“

ہوا کا خطا جھوٹا فقیر اس کے پیچھے کو رہتا نکل گیا۔ اس کے کندھے کا بانس لانا۔ کسی وجہ سے ٹھیکے، گھبرا کر فقیر کی جگہ ٹوڑ جوں اٹھا۔ ”شیرا تن کا حال خراب ہے۔ اماں کو لیے وہاں جا رہے ہیں۔“

”اماں کو لئے؟“ کسان آکا کھٹاڑ ہوا کہ بے اختیار کہہ اٹھا۔

”کنا بانس تم کو کون کو اپنی بیٹاری کی اتنی ہڈا کرتے ہو؟“

شہر کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کا خطبہ شروع ہوا تھا۔ اس وقت فقیر اور پھینے نے مسجد سے دُعا مانگ کر، ایک گلی میں آ کر ڈوٹی دیکھی۔ پھینے نے بدھیا کو جو کھڑکی مارے کو کہے میں سوار تھی، اٹھا کر ایک لڑکے خدا اور بکراس کے کا پیچے ہوئے ہاتھ کوڑکے سے دھکے کھڑے ہاتھ کو اس پر دھک دیا۔ پانچا تھکی اس بات کی کہیں ایسا نہ ہو کہ باب کرتے وقت کہیں ہاتھ بجائے منہ کی طرف آئے کے کاپ کر کسی اور طرف نکل جاتے۔ مگر ہاتھ داخل تو تھی کیونکہ اس برس سے اس ہاتھ کا صرف یہی کام رہ گیا تھا کہ صبح کی طرف ہاتھ کا اشارے سے کھانا لانا کرے۔ اب سوائے دھر کے اور کسی طرف جانے کی ہاتھ میں سکتی ہی تھی۔

بڑھیا ہانک چڑی گروہ لپکے لئے کھاتے کھاتے اور رات دے سے اس وقت تک باب باب کرتے کرتے اتنی تھک گئی تھی کہ جا چائے اور کھانا کھائے، جیسے بھائی کی تھی وہی ہی تھی رسی۔ یہ تو بڑی دسی۔ ساری کی کرائی پر پانی پھر جاتا تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، فوراً پھینے نے ایک کمرہ سٹے کی طوائف کی دکان سے ایک چوڑا چلیچلیوں کا شیراز لایا۔ اس نے قہار پر چلی ہوئی بکڑوں اور بھٹکی ہوئی کہیں کو اڑا کر قہار ایک طرف بیکار اور جتنا شیراز بہا ہے اتنی سے پونچھ پونچھ کر ایک چوڑا چلیچلیوں کا شیراز لایا۔ اس نے لاکر شیراز کی ایک انگلی بڑھیا کو چنا دی۔ اس کا چنا تھا کہ وہ فوراً باب کر کے اور مانگے گی۔

جہوں کا سیلاب رہا۔ بڑھیا کی کوک اچھا لگی۔ پھینے نے پھر فقیر سے کو بکڑا کر ہایت کی کہ سوچ رہا تھا کہ ایک انگلی چنا دیا۔ فقیرا دعائی میں تھری مار ڈھٹا دیا تھا۔ یہاں کی گھبراہٹ، سیر بھاڑ اور بڑی بڑی دکانوں سے دو بھر چکا ہو گیا تھا، اگل چندھیا کی تھی۔ اس کے برخلاف شہر کی سوائے ہی تھیں کی ہر بات میں خود اعتمادی آگئی تھی۔ پھینے شائق ہوا کہ کی طرح تھا جو دریا میں اترتے ہی پھینے کرتے لگتا ہے اور فقیرا اوسلے کی طرح چڑھائی دیکھ کر کہہ جاتا ہے۔ پھینے فقیر سے کو کھم دے رہا تھا اور وہ کی کی طرف اس کے اشاروں پر ہاتھ رہا تھا۔

دونوں ڈوٹی کے رخصت کے سامنے آئے۔ خدا کے گھر کے سامنے انسانی کوڑے کا ڈھیر لگا تھا۔ کی انگلیاں اور پھینے ہانک دے کوڑھی، ملنا کر اڑھائی آواز میں بولنے والی آنکھیں بڑھیاں، چندے چڑے سے بچے جن کے ہاتھ پاؤں سو کھوے اور پیچہ جڑے ہوئے تھے، جوتہ جانے کھان مسلسل رہ رہ کر رہے تھے، پیچھے، بے چاروں والی جوان عورتیں جن کے سر پر بلوزوں کا ڈھنگ اور چل پر میل کی کٹھن۔ جی جوتے، ٹھیکرے، میں داغوں، غم، ناک، چھپ بھکیاں، جراثیم، غریب، جھوٹے داران سب کو ڈھانک دینے والی، نور پاس دے دے کر تھپ تھپ کر

دیکھتے ہی جو صبا پا لگا، چ جاتی تھی۔ یہ درد اٹھنے لگا، درد دل کو مہمانی اور وحشت سے بھر دیتا تھا، جس کی دوا صرف بھیک کے پتھر پہنے تھے۔ بلا صبا کے سامنے فیروز کی بارش ہونے لگی۔ آس پاس کے فقیر یا خوشامی یا تھو ایک ایک دودھ پہنے لیے حسرت سے ان دونوں خوش نصیبوں کو تک رہے تھے، وہ دل ہی دل میں کڑوا رہے تھے کہ ہمارے پاس بھی کوئی ایسی ہی بڑھیا تو کیوں نہیں ہے۔ ٹھیکے لاپٹی اتنی کامیابی دیکھ کر خوشی اور غرور سے مٹا ہو گیا اور خوب کراک کر صدا لگائے لگا۔ آج زندگی میں پہلا دن تھا کہ جس پہنچے میں وہ گھسٹا تھا اس میں چوٹی پر ہلکی تھی۔ حسرت ہی کہ کبھی یہ ہوتا کہ شمس پہلے میں تمہیں اس کا اچھا سامان، اس کا سب لوٹا بچے معلوم ہو مگر آخر آج دونوں فقیریں بھسرا آئی گئیں۔ میرے پاس جو سامان ہے وہ کسی کے پاس نہیں اور میں صدا بھی کیا خوب لگا رہا ہوں۔ سب خدا کی دین ہے۔ آخر وہ کب تک اپنے بندے کا احسان لیتا۔ دیکھو۔ پیسے کیسے برس رہے ہیں اتنی داتا ہے اور تو ہی چون کا کھون ہار ہے مالک۔ ان دنوں کی ہر کوشتل کر مر رہی کہ بگو چہ جو زگر مگر کی رات سو جا رہی، ایک ایک بات کے پیچھے جان دے مر رہی مگر کچھ نہ ہو اور اب ہوا بھی تو کبھی آسانی سے۔ یہ خدا کے کارخانے ہیں۔ ٹھیکے روڑی بہانے صحت۔

سہ پہر کی سہری دھوپ میں ٹھیکے اور فقیر اداؤں کے شہر کے باہر ایک شاہی کھنڈر کے پاس آئے۔ دونوں سارا دن ادولی اداؤں سے بھرنے لگے، انکس سے چور چور تھے مگر ہر گھنٹی آنگھوں میں اطمینان اور خوشی سوچیں با رہی تھی۔ مست تھے۔ گارہے تھے اور زور زور سے شمس میں کراہتیں کر رہے تھے۔

ایک کھنڈر کے سامنے میں ادولی اتار دی گئی۔ ٹھیکے نے بھیک کی بھولی کوئی۔ اس میں پانچ چھ اداویوں کے کھانے بھر دوغوں کے ٹکڑے، دال بھرت اور تھکا ہوا میٹھی تھی۔ اس پر ایک غفر ذیل کرہاں کی کالی دے کر ایک طرف پھینک دیا۔ پھر ذرا اطمینان سے چوڑ کر ایک پانی کوئی۔ جس میں تھیں بہت سی تھلی کی پوری، انکی قسم کی تھکا ہوا، سیر مہر جی میل مشائی، چٹ پیسے کوب، سولہاں اور چوڑی کا بڈل۔ آج کے پکیرے میں پونے دو روپے سے تھے۔ جس میں سے چوڑی کی یہ سب خریدی تھی اور ہمارے انکی ٹھیکے کی جیب میں اچھل رہے تھے۔ ٹھیکے نے سب غفریں نکال کر سامنے یہاں سے وہاں جی دیں۔ سب کچھ چار اداویوں بھر کھاتا تھا۔ دونوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ سامنے غفریں کا ذخیرہ تھا۔ جس طرح چاہے کھاتا اور جو چاہے بھینگو۔ پہلے دونوں نے مشائی کی ایک ایک ذی منہ میں ادولی اور دھوا سے ان کو گلے سے بھر کر بھوکوں کی طرح مشائی پر نوٹ چڑے۔ گویا زندگی بھر کی بھوک، اسی ایک آن میں بھجوا دی گئی۔ پوریوں کی ہاری آئی، ایک ایک پوری کا ایک ایک غفر۔ کس کس کو دو چار دانت مارے اور مارنے سے درد رخ میں اجاڑ لیتے۔ اس شور سے جو صبا جو سوری تھی جاگ چڑی اور چاہتے ہی کھانا اٹھنے لگی۔ اب ان دونوں کو وہ بھی یاد آئی۔ ٹھیکے اس کی طرف چار سے دیکھ کر بڑا ہورا سے اٹھا کر ایک کا کر خدا دیا۔

”لو آج تم بھی حوسے دار چڑی نہ کھانا۔ کھلی کا بے کو کھائی ہوں گی۔“

ٹھیکے نے بھوک نکلیاں اس کے منہ میں دے دیں۔ وہ جلدی سے ان کو گلے لگی اور لٹکتے ہی بدھوا سے باب باب کر کے لگی۔ جبرحت کی بات ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح باغیوں اور دن کو بلا دیا، کڑا کے سرک آئی۔ گویا کہ چاہتی تھی ایک جھنڈا مار کر سب بھکا ایک ہی دلہا اپنے منہ میں بھر لے۔ فقیر اور ٹھیکے کے لیے اشارہ ہی یہ تھی کہ کھانا کھیں یا نہ کھائیں۔ دھوا اس کے منہ میں بھوک دیتے اور دھوا ہلک کر ماتھے لگتی۔ ٹھیکے جھنڈا کر رہا۔ ”لو تم بھی کھا یاد کرو گی۔“

ادانت سے کٹ کر سولی کا ایک ٹکڑا جو صبا کے منہ میں دے دیا۔ جو صبا فوراً غرض غرض اسے چبانے لگی مگر چپتا کیا۔ وہاں بار منہ سے نکل

آج اور ہر کسی کی طرح کچھ باتوں سے اسے اندر غصہ ملتی۔

دونوں بکرا چاہتے ہوئے میں جٹ گئے۔ ذرا دیر میں بڑھیا کو فنی۔ اس کے حلق میں ٹھکرا پنس کیا تھا۔ آہستہ آہستہ چڑھ گئیں اور آگے پیچھے جھوم جھوم کر سوس کرنے لگی۔ مظلوم ہوتا تھا کاپ دم نکلا اور جب دم نکلا۔ سمجھتے اسے مرنے والے کھانا بھول گیا اور جلدی سے اٹھی ڈال کر اس کے حق سے ٹھکرا نکال لیا۔ تھکے ہی بڑھیا نے ایک چچا ماری جیسے کسی نے اس کا خزانہ لوٹ لیا اور وہ حق پہاڑ کھڑے ہو کر دیکھنے لگی۔ اب سمجھتے تھے اسے مشغول دیکھ کر ہاتھ میں ایک دس بکرا بکڑا دیا۔ بڑھیا نے اسے اپنی ٹانگی میں ڈور سے دبا لیا اور دھوکے طرف لے چلی۔ مگر ایک تو ہاتھ کاپ رہا تھا اور دوسرے دس بکڑے کی جگہ سے کی فنی۔ وہ کی طرح منہ کے اندر نہ پاسکا۔ دس بکرا وہ رہا تھا۔ اس کا شیرازہ مظلومی ہاتھوں سے ہوتا ہوا بکڑے پر اور بکڑے سے چھاتوں میں بہہ رہا تھا۔ بڑھیا ساری کی ساری مٹھی بھونکی تھی۔

اس دور بچے کھاتے چلے جاتے تھے۔ ذرا بچھٹی تھی اور نہ وہ دفعہ دفعہ ڈال کا ہاتھ دوست ہوتا کیا مگر ان کا بپ اب بڑی ہوتا تھا۔ آخر جب سمجھتے اور فقیرا میں ٹھنکے کی ہانک سکتے تھے وہ تو دونوں نے بچا کھچا کھانا آگے سے سر کا دیا اور وہیں چکر ڈالیاں پہنے گئے۔ بڑھیا چلائی رہی۔ آخر چلا تے چلا تے تھک کر وہ بھی دوڑے میں گر پڑی۔

فقیرا بہت خوش تھا۔ اس کے دل میں اب تو یہ خیال تک نہ تھا کہ اگر کہیں کسی کو مظلوم ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اب اس کے سامنے ایک دنیا تھی جس میں مچھیرا ہوا کیا تھا۔ اس میں ایک طرف لہا پتا چڑھا تھا جسے رمضان کی بڑھ چلی ہوئی بھوکہ رہی تھی۔ جب چراغ بجے کریاں کا ایک بڑا سا گھر لگے وہ وہاں آتا ہے تو رمضان کی بڑھ چلی ہوئی بھوکہ رہی تھی۔ مگر اسے سنا سنا کر وہاں چلا کر سامنے رکھ دیتی ہے۔ قہار میں ایک بھول کی قہار بھی آگئی ہے۔ ایک طرف کبری کا سنا بھی ہے۔ فقیرا خوش تھا۔ بہت خوش۔

سمجھنے کی طبیعت بھی زوروں پر تھی۔ زندگی میں پہلی بار کامیابی ہوئی تھی۔ کامیابی کی کامیابی اپنے دور پہلے دور صرف ایک دن میں؟ یہاں روپیہ مینڈا ہوا اگر ہم نہیں ٹھکے میں ہوتے تو وہاں بھی آمدنی ہوتی؟ مگر جب روپیہ ہوتا ٹھکے کی زندگی مشکل پڑے۔ وہاں اس اتاری نانا، بھنا گوشت، وہ سالی خیرین ریڑیاں، وہ ان کا ٹھک ٹھک چلنا، وہ گویں دل کا کھانا، سمجھنے سنا کر لگے۔ کچھو پرانے خیالوں میں ڈوب رہا۔ بھر دار رنجیدہ ہو گیا۔ سوچنے کی بات ای تھی۔ فقیرا نے سارے گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔ سب کھریاں اپنی کرتی ہیں۔ حصہ لاکھ تو سر بکرتا ہے۔ جی ہاں ہے سر بکرتا توں سالے کا۔ اب اس میں بھی حصہ پانے کا۔ فنیس ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں گھر سے دوں گا، بکریاں سے دوں گا مگر ان کے نہیں دے سکتا۔ آخر میں بھی تو اس کا لاکھ بکریوں اور اب فقیرا کا حق ای کیا ہے؟ وہ سب کھوتے چکا۔ اتنے دنوں تک ان بھی اس کی رہی، آخر بکڑے بھی تو کھوتے۔ ان کو نہیں دے سکتا۔ اگر وہ بکرا کرے گا تو باروں کا سر بکرتا توں کا۔ خرابی سا فقیرا؟

سمجھنے سوچ سوچ کر کھولے گا فقیرا آجی، وہ میں تو کھو گیا تھا۔ سمجھنے نے اس کو چھوڑ کر دیکھا اور کہا۔ "فقیرا سنا ہوگا، پہلے حصہ پانے کو۔ آج اب بکرا چک جاتا ہے۔"

"کابے کا حصہ پانے؟"

"اب تو کھو گئے، کابے کا حصہ۔ اسے گھر کا، بکریوں کا اور جو کھایا ہو اس کا۔"

فقیرا اٹھا کر کھڑے بیٹا۔

"بھروسہ کمر، بھروسہ کمریاں۔ بھروسہ کمر، کمر کا کھانا ہوا مچھیرا چھوڑ دے جسے جب ہی سڑک کر ختم ہو گیا تھا۔ یہ میں نے خواہا

ہے۔ اور وہ بکریاں بھی مر گئی تھیں۔ یہ سب میری پانی ہوئی ہیں۔ چاہے حنفہ یا نہ کرنے اور اسے منوں تو جو جاری رہوئی تو زائر ہا ہے۔
 فقیر اب شہر والا فقیر آج نہیں تھا۔ شہر سے نکلنے ہی پر مری ہو گیا تھا۔
 کھینچے تھے میں مگر بھانے کے انداز میں کہنے لگا، اچھا چلو مگر تم نے جاؤ اور بکریاں بھی تم ہی سے جاؤ۔ مگر لگاؤ کا مری اماں کو نہیں دے
 دے۔ دے دوں، اگر تم نے کھلا دیا ہو تو اب ہم کھا نہیں گے۔

”ہاں اب تو نکلائے ہی کا؟“ چند دیر میں پاؤں رہا۔ گھومتا مٹا کر تارہا۔ جب لاس کی یاد آئی۔ اب جنمکائی کے قاتل ہو گئی تو لاس میری ہے۔ تجھے دس دس سال ہے میری قتلے جانے؟“

تھیں یہ بہت سارا ہو گیا اور وہ ہنسنے میں اس کی طرف ہلکا۔ جیسے اس کو جب ہی میں تو رکھ لے گا مگر فقیر افرار کو دیکر سامنے آ گیا اور لگا تھیں کہ کالیاں دینے۔ تھیں کا بارہا سے اونچا کھ گیا۔ اس نے جو کچھ فقیر کا کوزہ دے دیا اور وہ ذکر بدھیا کہ اس طرح ہاتھوں میں وہ بچ گیا کہ بارہا کوئی تھڑی ہے۔ جس طرح ملی پر ہے یہ سمجھتی ہے۔ فقیر اب بدھیا پر جھٹکا اور اس کے سر اور کمر میں ہاتھ دے کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ بدھیا اس کی بی کی طرح جس کا پھر مر گیا اور کمر کے مطلق پہاڑ پہاڑ دے لگی۔ مگر ان دونوں کی کالیاں اور دلی غمازے کے نیچے اس کی آواز وہ بگئی۔ تھوڑی دیر چھپا کھینچ ہوئی تھی کہ بدھیا فقیر کے ہاتھوں میں آ گئی۔ نہ پانے فقیر نے زور کر کے جھین لیا یا تھیں نے بدھیا کے سر جانے کے زور سے اسے خود ہی چھوڑ دیا۔ مگر فقیر جیسے ہی اس کو کالیاں دیتا جیسے بنا۔ تھیں ہمو کے بھڑپے کی طرح اس پر پھانچا۔ وہ تھوڑے کڑے قند جیسے گر پڑا۔ اور بدھیا پہنچی، قلاباڑی کھاتی ایک طرف جا پڑی۔ تھیں فقیر پر چڑھ جھٹکا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ فقیر کا اور تو کوئی اس نہیں چاہا وہ نیچے سے اس کے سینے اور صوم پر ٹھونسے جمانے لگا۔ تھیں جیسے جیسے گھونٹنے لگا تا۔ یہی وہ پیدار سے لگا دیا تا۔ آخر فقیر کے ہاتھ ہاتھوں اڑھینے چمکے۔ تھیں نے کسی کس کردہ جھٹکے اور بچے۔ فقیر کی آنکھوں کے دلیے قلوں کی طرح باہر نکل آئے۔ صومہ بیاک ہو گیا اور ہاتھ ہاتھوں پر مار گئے۔ اب تھیں کا ضمیر اترا اور پتہ چلا کہ میں نے کیا کیا۔ وہ کاپ کر کھڑا ہو گیا اور سکتے کی سی حالت میں فقیر انگوٹھ لے لگا۔ اس کا چہرہ نام لیا کہ بھائی کی طرح ہوتی ہو گی۔

قہوڑی ہی دس دس گھنٹے نے اپنے حواس درست کر لیے۔ نکلوتے میں ایسے ایسے کئی قفسے یہ کچھ چکا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس کے ساتھیوں میں آدھس میں لڑائی ہوتی تو ایک نے دوسرے کو مار ڈالا۔ اور کس بات کا؟ فقیروں کے مرنے پینے کی کسے پروا ہوتی ہے۔ مہر گیا۔ مہر گیا۔

فقیرا۔ خالق مہرا۔ ان لکھنوی بات۔ میں نے کیا ہوا کہا تھا کہ اسے دوں تک اماں تم نے رکھی ہے۔ اب مجھے دے دو۔ ارے ہاں۔ میں بھی تو کچھ دنوں زندگی کی پرہیز کرچکی ہوں۔ میرے بھی تو ہاں ہے۔ مجھے اسے جہنم کا تھا چہرہ کہ ہوا ہلکتا۔

ہاں اب جلدی سے اماں کو کھانا دیا۔ بڑا ہی اماں نکلتا ہوا کی جھپک کا کیا کہنا۔ باب حراٹے کا نکلتا۔
 تھپتھپ جلدی سے بڑا ہی کی طرف حراٹا دیکھا تو وہ آدمی چپ آدمی ہٹ چلا کے چوتھ کی طرف اڑا ہوا ہے۔ آنکھیں چڑھ چکی ہیں۔ منہ
 کھلب کی طرح کھلا ہوا ہے اور اس میں سے رو رہا کہ کلم اور تھوک میں استغزی آدمی جلی آدمی پاری خدا اکل رہی ہے۔ کھنیاں دکھاپ جاسن پوری
 کے تھپتھپ ہوتے نکولے۔ لوندے کے لوندے سے زوردار دھچکوں۔ تھپتھپ نے جا کر ہاتھ لگایا۔ بڑا ہی میں کیوں تھا۔

سورج اُلوہ گیا تھا۔ کھنڈر کا ہر کونہ چادراں کا بھٹہ معلوم ہوتا تھا۔ پتہ بھاتا ہوا کسے جھکڑ، پتھروں، میل سے درختوں کو تاراج کرتے سرورہیوں کا اٹھ اٹھ کر چلتے۔ بدھشت ناک سرورہ میں ساتھیں ساتھیں کرتے ایک طرف سے آ رہے تھے اور دوسری طرف بھاگے جا رہے تھے۔

احمد علی

نام	سید احمد علی
نسبی نام	احمد علی، پرویز احمد علی
پیدائش	یکم جولائی ۱۹۱۰ء بمقام دہلی، بھارت
تاریخ وفات	۱۳ جنوری ۱۹۹۳ء، کراچی
تعلیم	ایم۔ اے (انگریزی)، ایم۔ اے (تفصیلی)، گولڈ میڈل
	ابتداءً امرنہ ایچ۔ گورنمنٹ کالج کراچی کے پرائمری اسکولوں اور اس کے بعد ویسٹلین سکول، اعظم گڑھ میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۳ء میں علی گڑھ ہفتیہ بورڈ کے اور ۱۹۲۵ء میں سنٹرل سکول، علی گڑھ سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۲۷ء میں ایمر (سائنس) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ۱۹۳۰ء میں بی۔ اے (آنرز) تھنٹھوچ یونیورسٹی سے کیا۔ اسی یونیورسٹی سے ۱۹۳۱ء میں ایم۔ اے (انگریزی) فرسٹ کلاس فرسٹ کے ساتھ پاس کیا اور ایم۔ اے (تفصیلی) سے کراچی کالج میں حاصل کی۔ اس شاندار کامیابی پر انھیں ممتاز گولڈ میڈل بھی ملا۔

مختصر حالات زندگی:

احمد علی کے والد سید شجاع الدین سرکاری ملازمت کے سلسلے میں مختلف شہروں میں رہے۔ وہ ایکسٹر اسٹنٹ کشتی جہاز ۱۹۱۹ء میں دولت پانگے۔ احمد علی کالابکین تھا اور وہ پرائمری درجوں کے طالب علم تھے۔ آپ ان کی تربیت بچانے کی جدو۔ بی میں ذاتی کشتی تھے۔ احمد علی ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۶ء میں تھنٹھوچ یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد رہے، اسی دوران تقریباً دوسرے کے لیے الہ آباد یونیورسٹی اور آگرہ کالج میں بھی پڑھا۔ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۳ء بی۔ بی۔ ایس کے لیے لندن سے وابستہ رہے۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۷ء پرنسپل کالج تھنٹھوچ میں صدر شعبہ انگریزی رہے۔ جنوری ۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۹ء انھیں کیپٹن سنٹرل یونیورسٹی میں ڈیپٹی پروفیسر کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۳۹ء میں بھارت سے پاکستان ہجرت کر آئے اور

پاکستان قادیان مردہاں سے منسلک ہو گئے۔ جنوری ۱۹۵۰ء میں انھیں ڈپٹی کمشنر کی دہ انت خادج مقرر کیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں پورٹر آف ملز کی جینی بھیس جہاں جھم سے شادی ہوئی۔ ۱۹۶۰ء تک جین اور مراٹھ میں قوٹنلر اور ناظم الامور کے طور پر خدمات انجام دیں۔ دہاکی پر ۱۹۷۰ء تک پرنس ایڈوائزٹری کے مشیر تعلقات عامہ رہے۔ ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۱ء آٹو میں لکھنؤ کے صدر ٹیٹن اور ٹیٹن ڈائریکٹر کے طور پر اپنا کاروبار کر رہے۔ حکومت پاکستان نے انھیں ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۲ء کراچی پورٹورٹی کا اعزاز دی پورٹس مقرر کیا تھا۔ اس دوران میں جیون ملک کی متعدد پورٹورٹیوں میں اعزاز دی شپڈ رہے۔

پورٹس مقرر ملز نے ترقی پورٹس مقررین کی انجمن کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۳۹ء میں "ایڈیٹور ٹنگ" کے پانچواں اک اقبال علم دہر رہے۔ ۱۹۳۳ء میں جیون قوی شہرت یافتہ بھارتی ادیب راجا راڈ کے سرٹوٹل کر "نومورڈ" مرثب کیا گوارہ ۱۹۵۰ء میں "پاکستان پی ای ای" ایڈیٹری "کے دہر رہے۔ ادب ملز نے بطور افسانہ نگار، ناول نگار، نقاد، مترجم، جڈا کا ستر، مؤلف اور نقاد کے شہرت پائی۔

ادب ملز مطبوعہ افسانے:

"پرانے زمانے کے لوگ" مطبوعہ "ایڈاپ" اور "ایڈ" "دہاکی" ۱۹۳۰ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ "انڈر" "انڈرلونی مرثب ادب ملز، مطبوعہ لکھنؤ
اس مجموعے میں بہاؤتھ، ارشد جہاں اور محمود اختر کے افسانوں کے ساتھ ادب ملز کے دو افسانے "بھاؤٹوں کی رات" اور "پادل نہیں آتے" شامل ہیں۔
- ۲۔ "فیلے (پارہ افسانے)"
ایڈیٹور الہ آباد
طبع اول، ۱۹۳۶ء
(۱) "تصویر کے دورے" (۲) "استادوں خان" (۳) "اس کے بلیز" (۴) "ہمارے باسٹر" (۵) "بھڑکت" (۶) "اس کے فیلے" (۷) "نوروز کی رات" (۸) "تھائی" (۹) "آپ جی" (۱۰) "نوروز" (۱۱) "شادی" (۱۲) "آکھیں" "کل پارہ افسانے شامل کتاب ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۶ء ی میں کتبہ اردو اور نے بھی شائع کیا تھا۔
- ۳۔ "بھاری گلی" (سات افسانے)
انڈر پرنس ملز
طبع اول، ۱۹۳۳ء

- (۱) "عاری قلی" (۲) "مہرا سمر" (۳) "گلزار"
 (۴) "مستخرس الحسن" (۵) "مارچ کی ایک رات"
 (۶) "شراب خانے میں" (۷) "نوروز کی شام"

- ۴۔ "قید خانہ" (چار افسانے) انشاء پر بس دہلی طبع اول: جن ۱۹۴۴ء
 (۱) "قید خانہ" (۲) "پریم کہانی" (۳) "قصہ"
 (۴) "گزرے دنوں کی یاد"
- ۵۔ "سوت سے پہلے" (ایک افسانہ) انشاء پر بس دہلی طبع اول: ۱۹۴۵ء
 اس کتاب کا مقدمہ آرٹ، سیاست اور زندگی سے حلقہ منقطع
 تھا ہے، جسے بعد ازاں "نقوش" اور کے عصری ادب نمبر
 شمارہ ۱۲۹، ستمبر ۱۹۸۳ء میں شامل کیا گیا ہے۔ "سوت سے پہلے"
 میں چھ قصے بھی شامل ہیں۔
 نوٹ "اٹلارے" میں شامل دو افسانوں سمیت اجماعی کے
 چاروں افسانوی مجموعوں میں کل ۱۲۶ افسانے ہیں۔ یوں صرف
 دو افسانے "پہلے زمانے کے لوگ" مطبوعہ "نیا ادب" اور
 "شرابی اور چھائی کا خواب" مطبوعہ سیپ کراچی شمارہ نمبر ۳،
 کتابوں میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ جنہیں علامہ علی
 کے کل افسانے ۴۹ بنتے ہیں۔
- ۶۔ "Mr. Eliots Penn-World of Drams" تھنڈو نیو دہلی پر بس طبع اول: ۱۹۴۱ء
 ۷۔ "آرٹ کا ترقی پسند نظریہ" انجمن ترقی اردو پر بس اورنگ آباد طبع اول: ۱۹۳۶ء
 ۸۔ "Teaching of Poetry" سکول پر بس تھنڈو طبع اول: ۱۹۴۰ء
 ۹۔ "Muslim China" کراچی طبع اول: ۱۹۴۹ء
 ۱۰۔ "The Flaming Earth" کراچی طبع اول: ۱۹۴۹ء
 (انجمن اردو پیشیا کی شاعری کا ترجمہ)
 ۱۱۔ "The Bulbul And The Rose" کراچی طبع اول: ۱۹۶۳ء
 (انجمن اردو شاعری کا ترجمہ)
 ۱۲۔ "The Golden Tradition" کولمبیا یونیورسٹی پر بس، نیو یارک طبع اول: ۱۹۷۳ء
 (۱۹ویں صدی اور ۲۰ویں صدی کی اردو شاعری)

- ۱۲۔ "The Lamp of The Temple" طبع اڈل ۱۹۷۰ء
- (غالب کی فارسی شاعری)
- ۱۳۔ "The Quran" طبع اڈل امریکہ
- ۱۴۔ "Problem Of Style And Technique in Ghalib" ٹی۔ اے۔ سی۔ سی۔ کراچی طبع اڈل ۱۹۶۹ء
- ۱۵۔ "Failure of An Intellect" آکاش پریس، کراچی طبع اڈل ۱۹۶۸ء
- ۱۷۔ "Purple Gold Mountain" کپساک پریس لندن طبع اڈل ۱۹۶۰ء
- ۱۸۔ "First Voices" (پارہ نکلیں) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی طبع اڈل ۱۹۶۵ء
- ۱۹۔ "The Shadow And The Substance" کراچی یونیورسٹی پریس طبع اڈل ۱۹۷۷ء
- ۲۰۔ "Twilight In Delhi" (ناول) برطانیہ طبع اڈل ۱۹۳۶ء
- ۲۱۔ "دہلی کی شام" "Twilight In Delhi" کا ترجمہ ہے نکر اش پریس، کراچی طبع اڈل ۱۹۶۳ء
- انگریزی سے یہ ترجمہ ادب کی حکم نقیص جہاں نے کیا ہے۔
- ۲۲۔ "Urdu Selected Short Stories From (Pakistan)" مکتبہ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد
- مرتبہ احمد علی (دیباچہ پر مبنی ۱۹۸۳ء میں ہے)
- ۲۳۔ "Of Rats And Diplomats"
- ۲۴۔ "Ocean of Night" دہلی فلیکس اینڈ دی پلٹر ہاؤس
- ۲۵۔ غالب کا لکھا ہوا پتھر
- ۲۷۔ میکسم گورکی ادا اے شادرت سنوری رائٹر
- ۲۸۔ دی اینڈ آف نو بیادیت
- ۲۹۔ بریک دی شیئر

غیر مدقون:

شعور و مضامین پر زبان انگریزی، دہلی، ۱۹۳۵ء کے بعد کی تخلیق ہیں اور ایک عربی شعرا کتاب "آئینہ دایمیت کا زوال"۔

وفات سے قبل مستقل ہوا:

۲۱۔ اے قارئین سوسائٹی، حیدر علی روڈ، کراچی۔ پاکستان

(۱) ستارہ کا کھانا نظم

(۳) اکادمی ادبیات پاکستان کے ناولنگ فیلو

نظریہ فتن:

” میں نے میں وسعت نہیں ہوئی۔ افسانہ، انہی زندگی، اس کے اثرات اور پیرائے کے بدلے ہوئے روح کو ایک حد تک فانی کر سکا ہے اور اسی لیے کہنے والے میں تنگی کا احساس باقی رہ جاتا ہے۔ گویا افسانہ ایک کڑی ہے جو اپنی جگہ معنی خیز ہونے کے باوجود محض ایک کڑی رہتا ہے۔ اس سے ادب کچھ نہیں بنتا۔“

احمد علی

(تحوالہ: ”یہ صورت گری کہ خواہیں کے“ مرثیہ: طاہر مسعود، ۱۹۸۵ء)

”ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ اس کی گہرائی زندگی کی گہرائی سے وابستہ ہے۔ اگر قوی زندگی میں پہنچی آج بھی ہے تو ادب میں پستی کا منہ آسمان نہیں۔“

احمد علی (۲۳ جولائی ۱۹۵۳ء، کراچی)

(تحوالہ: ”معارف ادب“ مرثیہ: اعظم لڑکی، مطبوعہ:

کتبہ صحری، لاہور، ۱۹۶۵ء، طبع اولیٰ: جنوری ۱۹۶۵ء)



حوالہ جات:

۱۔ اکثر کتب میں احمد علی کا پہلا افسانہ ”معاذوں کی دانت“ بتایا گیا ہے۔ جو درست نہیں۔

ہماری سہلی

احمد علی

میرا مکان چنڈے کے کوچہ میں تھا۔ میرے گھر کے دروازے میں دو پتے تھے۔ پہلے کھنڈہ بند کر دینے سے صرف اوپر کا حصہ ایک کھڑکی کی طرح نکلا رہ جاتا تھا۔ یہ کھڑکی چمکی سڑک پر چمکی تھی۔ سامنے مرزا دودھ والے کی دکان تھی اور میرے دروازے کے برابر مصری بیٹے کی اور اس کے برابر عزیز خراوی کی اور آس پاس کھاروں کی دکانیں۔ مظار کی دکان، پان والے کی اور دودھ دار اور دکانیں تھیں۔ سٹلا تھنی کی، برائلی کی، سطوائی کی دکان۔

ہمارے محلہ میں سے دو کروگ دوسرے محلوں میں جا سکتے تھے۔ اس لئے سڑک برابر چلا کرتی تھی اور اس طرح کے ٹوک راستہ بنائے گئے لیے میری کھڑکی کے سامنے سے گزرتے کبھی کوئی سفید پوش مری کی پچھلتی دھوپ میں جاسڑی لگائے ہوئے چلا جاتا۔ کبھی شام کو کوئی دلا بچی منڈا پیٹا انگریز کی ٹوپی لگائے چمڑ کا کڑے پانی سے چٹا ہوا۔ اپنے کپڑوں کو گھٹیلوں سے پھالتا۔ بچوں اور لڑکوں سے کھراتا ہوا ان کے گھر سے چہ خرا تا اور آگھیں لٹکتا برا گزرتا جاتا۔ کبھی کبھی رات گھر یا بازار لڑکوں کو مارنے کے لیے لکڑی یا پھری اٹھاتا اور بھاگ کرڑے چلاتے "گولو ہے بے گولو ہے۔" پھر مرزا دودھ والے کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دیتی۔

"اے بڑے! کیا کرتے ہو؟ تم کو گھروں میں کچھ کام نہیں؟" اور آ کر کوئی پاس بیٹھا ہوتا تو مرزا اس سے کہنے لگتا۔ "ان کی ماؤں فوت ہو گئیں۔ ٹوٹاؤں کو چھوڑ دیا ہے کہ ساتھ بیٹوں کی طرح لگیوں میں دولا چلا کر رہیں۔" حرامزادوں کو کافی گونج اور دھون کا شوقی کے علاوہ اور کچھ کام ہی نہیں۔"

اور مرزا کی چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں چمکنے لگتیں اور اپنی سفید ٹھوٹی داڑھی پر ایک ہاتھ بھیرتا اور کسی فریاد کی طرف غائب ہو جاتا اور کوفہ سے شے سے دھکیلا کر حاذ میں سے دودھ نکال کر لطائی کا ٹکڑا ڈالتا اور فریاد کی طرف بڑھا دیتا۔

لوگ کہتے تھے کہ مرزا کی دگوں میں شریف خون دودھ کرتا ہے بلکہ کہیں میں سچا نہ پاؤ گے کہ اس کے باپ نے اس کو گھر سے نکال دیا

اور کچھ روزوں کے بعد اس نے دکان کرائی۔ اس کے بعد انکھڑاں کے باپ نے اس سے معافی بھی مانگی اور خوش آمدی کی
 لیکن مرزا نے ٹھانی کر لی اور اس کا کام چل لگا۔ اس کی دکان کے چھوٹے چھوٹے ملائی کے چلے سے شہر میں پھیلے تھے اور اس کا دودھ بہت
 لذیذ ہوتا تھا۔ رات کو جب کوئی دودھ پینے آتا تو وہ اس کو آب خود سے اور لٹا میں خوب اچھا کرتا یہاں تک کہ اس میں سے بھانک نکلتا۔ پھر
 کچے سے ملائی کا کھانا اس مٹائی سے توڑتا کہ دودھ پلٹے تک نہ پاتا تھا۔ انکھڑاں کی بیوی دکان پر شعلی تھی۔ وہ بد زحی ہو گئی تھی۔ اس کے
 چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کی کمر چٹک لگی تھی اور منہ میں ایک دانت باقی تھا۔ اس کی اور بیٹی بیٹائی اور اس کے گھر سے رنگ سے
 معلوم ہوتا تھا کہ وہ کبھی اچھے گھرانے کی عورت ہے۔

لیکن اب ان کا کاروبار کم ہو گیا تھا کیوں کہ شعلی کی وجہ سے وہ زہاد و صحت نہ کر سکتے تھے۔ ان کا انکھڑا بیٹا مر چکا تھا اور اب ان کا بچہ
 جانے والا کوئی نہ تھا۔ ترک سوارات کے کھانے میں جب آزادی کا خیال ملک میں اوجھڑا اٹھ گیا تھا تو مرزا کا لڑکا اپنے دوستوں کے
 ساتھ بھوک میں شریک ہوا۔ گاندھی جی کی سب اور بند سے ماتم کے نفروں سے لٹکا کو بچا رہی تھی۔ کھنڈ کمرے گھروں کی فوجیں سیاہ تھیں۔
 پتھریں پلٹیں، ہڈی پھٹتی تھیں اور چند اور مگر پتھروں سے گھر گھر کی کھنڈ کمرے پتھریں سے دلچسپ ہے تھے۔ لوگ آگے جانا چاہتے تھے
 لیکن فوجیں ان کو آگے نہ جانے سے روک رہی تھیں۔ لوگوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور بیٹی کھنڈ کمرے کوئی چلائے گا حکم دے دیا۔ گولیوں
 کی بو چھانڈ میں بہت لوگ کام آئے اور مرزا کا بیٹا بھی مرنے والوں میں تھا۔ بیوی دودھ کے بعد جب لاش لے جانے کی اجازت ملی تو لوگ مرزا
 کے لڑکے کی لاش کو اس کے گھر لائے۔

ساری رات میں بدھ تھیں اور غصے میں مٹا چھایا ہوا تھا۔ جاڑوں کی دھوپ مردہ اور مرده معلوم ہوتی تھی۔ بانیوں میں مٹائی نہ ہوئی تھی اور
 ان میں مرزا کا جھوٹا رہی تھی۔ جب لاش گھر میں آئی تو مرزا ہر اس کی بیوی کی کھنڈ کمرے کے عالم میں رہ گئے۔ ان کو کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ ان کا
 بیٹا جو ابھی زندہ تھا نہ مرنے لگا تھا۔ جس نے سچ ہی چلے گا چلے گا۔ کڑھانہ لٹکا تھا۔ جو کچھ سے بدل کر اپنے کسی دوست سے ملے کیا تھا
 اب زندہ نہیں ہے بلکہ مر چکا ہے۔ وہ بار بار غلوں میں تھڑکی ہوئی لاش کو دیکھتے تھے اور مرزا کی بیوی لاش سے پہن کر جھوٹ جھوٹ کر رہی
 تھی۔ لوگوں نے اس کو ایک کمرے کی کوشش کی لیکن وہ ایک صدف کے لیے لاش سے چھوڑ دیا ہوئی تھی۔ وہ "ہے بھرا ال" کہہ کر مرزا کی
 خفی اور کبھی بھی اس کے منہ سے نچھلنے لگتی اور وہ چلاتی۔

"ان فرنگیوں کو خدا عزت کرے۔ میرے ال کو کھنڈ سے بھیج لیا۔ خدا کرے کہ یہ عمارت ہوں۔"

مرزا انکھڑاں کی طرف بھی کمرے کے اندر بھی پہنچا ہوا تھا۔ صدقہ پھیلنے لگی دکان کوئی تھی اور مرزا جو ہال بکھرے ہوئے اوجھڑا
 سے نہ رات کو کسی نے آواز دی اور پچھل "بھائی بڑا غصوں ہو اور دعاؤں کیا بقی آ؟"

مرزا کی آنکھوں میں ایک آنسو باقی تھا لیکن اس کے سارے چہرے پر کرب کی حالت تھی۔

"نقد پر جھوٹ تھی۔ میرا چلا لیا لٹکا ہوا تھا۔" یہ کہہ کر مرزا انگریز طرف چلا گیا۔

بیک جو کھڑے ہوئے تھے پچھلے لگے کیا ہوا۔ صدقہ نے جب کر دیکھا۔ اسی وقت ہوا کا ایک تیز جھونکا آواز اور مزک پر گورو ملہار
 نے لگے۔ ایک کاندہ کا ٹکڑا ہوا میں اٹھ اور دیکھ دو لوہ جا کر اٹھا پٹتا ہے گی طرف کر لے گا۔ مرزا کے پہلے ہال ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہاں
 میں غائب ہو گیا۔

”ہوا کیا۔ ترک مولات کرنے گیا تھا۔ گولی لگی اور سر گیا۔ نہ جانے اپنے کام میں دل کیوں نہیں لگاتے۔ سرکار کے خلاف جانے کا بھی نتیجہ ہے۔ کڑا جان تھا۔ اس دوزخ کے بیخیزوں اور کھد ریشوں کا شکار ہو گیا۔“

ہر کہتے کہتے صدیقی نے ایک شے نکلیہ ڈالا۔ بہت سے شے دھار میں گڑے ہوئے تھے اور گاچک کی طرح مٹھور ہوئے تھے۔ نکلیہ میں دل کال کر صدیقی نے ایک کاکب کی طرف بڑھائی۔ کاکب جو بے غوری سے صدیقی کی باتیں سن رہا تھا۔ دل کو اپنے کپڑے میں باندھنے لگا۔ ایک اس کی لگا وال پر پی اور بولا۔ ”اوسوں پاشا کیا کون سی وال دے رہے ہوں نے تو ابرہ کی مانگی تھی۔ ذری پرتی کرو۔ مجھے دہر ہو رہی ہے۔ چوٹی بکے گی۔“

گھر میں مرزا کی بیوی اپنا سر دے مار رہی تھی اور دین کر کے روٹی تھی اور اکر جیروں اور کادائی کو کوئی تھی۔ پاشا کی ہاں کو جب اس مادے کی خبر لی تو وہ دے کے لیے آئی۔ اس کا جواں لاکا بھی دیوار کے نیچے دھک کر مڑ گیا تھا اور اس کے نیچے بچوں کو سوائی کر کے پاتی تھی۔ دونوں کھل کر غوطہ دیکھیں اور مرزا کی بیوی کو ڈراتی ہوئی آ کر مار ڈکے کو کوئی کرنے لے گئے۔ رات اندھیری تھی اور بے کسی تاریکی کی طرح سارے محل میں پکھنی ہوئی تھی۔ ہوا سرد تھی اور محل میں بھل کی وجہ سے ہاڑا زیاہ مٹھور ہوتا تھا۔ لیہوں کی دھبی روٹنی میں جلد ہیا تک اور ڈاڈا مٹھور ہو رہا تھا اور سڑک پر کوئی چاند اچھڑکے لی نہ دیتی تھی۔ صرف مرزا کی دکان کے اندر گلی میں سے غرنے اور کڑ بڑکی آواز آرہی تھی۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد تک اکثر مرزا کی بیوی کے گانے کی آواز آ کر تھی:

کلی یک یک جو ہوا پلٹے نہیں میرے دل کو تار ہے

لیکن پھر وہ خاموش رہنے لگی اور کام کاج میں مشغول رہتی۔

میرے مکان کی باجڑی میں ایک پرانا گھوڑا کاروبار تھا۔ ایک زمانہ میں اس میں پھل لگا کرتے تھے اور شہد کی مکھیاں غذا کی تلاش میں بچے اتر آتی تھیں۔ اس کی بڑی ڈالوں پر اکثر چنونا کر بیٹھے اور بولے شے کہتے راتوں کو ابیرا کر لیا کرتے تھے لیکن اب اس کے بچے بھڑکے تھے ڈالیاں کر بلی تھیں اور اس کا تاجہ اور بدونت رات کی تاریکی میں اس بات کی طرح کھڑا رہتا جو کھڑی میں جانوروں کو ڈرانے کے لیے گاڑ دیا جاتا ہے۔ اب اس پر جانور مڑا لاتے تھے، نہ شہد کی مکھیاں اس طرف آتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی کوا اس کے ٹھکانے پر چوکر کائیں کائیں کرتا اور لپٹا لگا پھاڑتا کوئی خیل اس پر رادہ کو کاٹ پاتی اور پھراڑ جاتی۔ مچا کو بڑھتی ہوئی روٹنی میں کا آسان پر چبک اٹھتا تھا لیکن شام کی خفا کی بدھتی تاریکی میں آہستہ آہستہ غصوں سے اوجھل ہو جاتا اور رات میں ش جاتا۔ رات کو اکثر گھر میں دھن دھن ہوتے وقت میری لگا ہاں سونے اور بھیا تک سنے پر نہ پتی پھر اس کے ساتھ ساتھ اٹھتی ہوئی آسان پر جاتی۔ مارے پکھنے ہوتے تھے اور ٹیک اس کے سرے پر جاتے بعض کا آخری ستارہ بھڑکدھکی رہتا تھا لیکن وہ کابھری لگا اور آسان کے درمیان حائل ہو جاتا اور میں تاروں کے پھیلاؤ کو نہ دیکھ سکتا۔

محلے میں اکثر ایک پائل گھر آ کر کرتی تھی۔ کسی نے اس کے ہاں کات دیکھے تھے اور اس کا سر اس کے قوت اور بھری جسم پر ایک اخوت کی طرح مٹھور ہوتا تھا۔ خدا ترس لوگ کبھی کبھی اسے کپڑے پہنا دیا کرتے تھے۔ لیکن چندی گھنٹوں کے بعد وہ بھرتی ہو جاتی تھی۔ یا تو کوئی کپڑاں کو اڑا لیتا یا وہ خواتین کو پھاڑ کر پھینک دیتی تھی۔ اس کے منہ سے ہمیشہ دال بھاڑتی اور اس کے ہاتھ ہمیشہ آگے بڑھے رہتے۔ وہ ہمیشہ شک شک کر سڑک پر نہ جاتی اور کھڑکی اور کونوں کی طرح گھن گھن کرتی۔ جیسے ہی وہ محلے میں داخل ہوتی لوگوں کا ایک غول اس کے پیچھے

چھپے تاجاں، بھاتا اور "پنگلی" کہہ کر کہہ کر پھرتی پھرتی اور منہ پر اناں عورت "ایں ایں" کرتی اور گونوں میں جھپکی۔ جب کبھی مردانہ کی دکان کے سامنے یہ واقعہ ہوتا تو مردانہ لڑکوں پر چلتا "اے سرور تمہیں مرنا نہیں ہے ابا کو یہاں سے اور ہو۔"

لکھن ڈراویہ کے بعد لڑکے بھر بیچ ہو جاتے۔

اکثر بڑے آدمی بھی اس سے مذاق کرتے۔ وہ بہ صورت ضرورت چلی لکھن اس کی عمر زیادہ تھی کہ اس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ اکثر منہ پر کھاتے پیتے گمراہنے کا لڑکا تھا لیکن اب بد معاشرلوں میں لڑ گیا تھا۔ اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہتا "کیوں، تمہارے بچے کب ہوگا؟"

اور پنگلی ایک درد انگیز دھچکا دے اور لڑکائی اور اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر کھیلنے دیتے کسی راہ گیر یا دکاندار سے مخاطب ہو کر منہ کی طرف اشارہ کرتی۔ اس کی کریم آواز میں ایک صحت ہوتی۔ ایک بے گناہ کی ہاتھوں کی وہ انگڑا ہر وہ اپنے ماکہم اپنے سے زیادہ طاقتور انسان سے کہتا ہے کہ مجھے بھلی ذرا دیر چاہو۔ مگر اور لوگ بھی مذاق کرنے میں شریک ہو جاتے اور زور زور سے قہقہہ لگاتے

ہندوستان میں ہزار ہا لوگ ایسے ہیں جن کو سوائے کھانے پینے اور مر جانے کے کسی بات کا احساس نہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہیں اور جیتے ہیں، مکھانے کھتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انکس دنیا کی کسی بات سے کوئی واسطہ نہیں۔ انسانیت کی نہ ان میں نہیں ہوتی۔ زندگی کی غفلت کا ان کو کوئی احساس نہیں جیسے غلام کوئی کام کرنے اور مرد رہنے کے علاوہ کوئی دوسری حقیقت ہی نہیں جانتے۔ زندگی کا طوط اور صحت کا غروب ان کے لیے دونوں یکساں ہیں۔ ان کے لیے دن کام کرنے اور راتیں سو رہے کوئی ہیں۔ بس سبکی ان کی زندگی کی حقیقت ہے۔ اور صرف موت ان کو زندگی سے تھوکتا لاکھتا ہے۔

ایک اور جگہ جو ہمارے مجھے میں کھڑت سے دکھائی دیتی تھی، دو کھتے تھے۔ مرے ہوئے اور قاتل زور۔ اکثر کھنکھلی تھی اور اس کی کھال میں سے گوشت نظر آتا تھا۔ اپنے بڑے بڑے دھواں کوکوس کر دو۔ اپنے بیلے کھاتے تھے ہاتھائی کی دکان کے سامنے ایک بڑی کے پیچھے ایک دوسرے کو اپنے اور اپنا لہان کر دیتے۔ وہ اپنی دھواں کوکوس کے بیچ میں دبانے ہاتھوں میں سوتھتے دے دے آتے تھے اور ہاتھائی کی دکان کے سامنے گھجڑوں پر پہنچتے تھیں اکثر جیسے ہی ان کو کوئی گوشت کا ٹکڑا یا بڑی دکھائی دیتی تو پھیلنے لگے۔ سے بھانڈا راتیں اور ان کے سامنے سے گوشت کو اٹھالے جاتے۔ ہمارے ایک آدمی کی طرح جو خلیفہ ہو گیا ہوا اپنی دم دبانے ہوئے سڑک کو سوجھا کرتے یا اپنی جھپٹ آہاں میں لڑائی کر کے اور ایک دوسرے کا خون بہا کر مارتے۔

مجھ کو بہت سارے شیر اپنے بیچے والے کی آواز آتی۔ وہ اپنی بھولی میں گرم گرم ہاتھ دے جھپٹے ہوئے مومے پتے لگی ہو کر پوچھ پچھا بھرتا تھا۔ اس کی عمر کوئی چالیس سال کے قریب تھی لیکن وہ بلا اور سوکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر گھریاں ابھی سے لٹایاں ہوئی تھیں اور اس کی خشکی داڑھی میں سفید بال آگئے تھے۔ اس کی آنکھیں ایک چار کی آنکھوں کی طرح تھیں جن کے نیچے سیاہ مٹھے بڑے ہوئے تھے اور جن میں لہو اور غربت اور مصیبت صاف جھلکتے تھے۔ ان کے لہو میں بار بار ایک سرخ رنگیں دور سے دکھائی دیتی تھیں جیسے ہر قحطی میں پاکی دلوں کے قاتلے اور ہمارے بعد پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کے سر پر ایک کپڑے کی مٹی ٹوپی رکھی دیتی تھی۔ گلے میں پٹائی ہوئی تھیں اور اس کی انگلی دھرتی میں سے پٹائی پٹائی انگلیں دکھائی دیتی تھیں۔

عصر ہوا وہ ہمارے شہر میں کسی نرادیچ کے ضلع سے کام کی تلاش میں آ گیا تھا۔ وہ رات کو ایک مسجد میں چڑھا اور دن بھر شہر کی سڑکوں پر مار مارا بھرتا لیکن شہر کی حالت روزگار کے معاملہ میں گاؤں اور قصبوں سے کسی طرف بہتر نہیں اور شہر ان کو کوئی کام نہ ملا۔ مسجد میں صبح

ان اہل فرائض نے اپنے آپا کرتے تھے۔ شیرانے ان کو اپنا قفس بنایا۔ میر صاحب کو اس کی حالت پر ترس آیا اور وہ اسے اپنے گھر لے گئے۔ شیہ یک اور پانستہ دار آگئی تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد میر صاحب نے اسے پانچ روپے دیے اور کہا

”ان سے کوئی کام شروع کرو چاہے اس لیے میں یہ روپے دیتا ہوں۔ جب تمہارے پاس پیسے ہوں تو یہ رقم واپس کرو چاہے کوئی فکر کی بات نہیں۔“

شیرانے دال اور کالی جنوں کا خواجہ نکالیا۔ کچھ عرصے میں شیراکو بہت سے قلعہ والے جان گئے اور اس کا سودا خوب چلنے لگا۔ سال بھر کے اندر ہی اس نے میر صاحب کے روپے واپس کر دیے۔ اپنے بڑی بچوں کو پایا اور ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگا اور بہت خوش تھا۔ اسی دوران میں عبدالرشید کو سواکی شہر کا خاندان کوٹل کرنے کے جرم میں پھنسی کی سزا کا حکم ہو گیا۔ سارے شہر کے مسلمانوں میں ایک جھگڑا مچا ہوا تھا۔ پھنسی والے روز قتل کے باہر بڑا ہڈا آدمیوں کا ہجوم تھا۔ دسب دو روز تو ذکر کرنا رکھس جانا چاہتے تھے لیکن جب پولیس نے عبدالرشید کی لاش کو دینے سے انکار کر دیا تو کوٹوں کے جوش اور غصے کا کوئی نمکا نہیں رہا۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ کس طرح شیہ کو سزا کر دیں اور اس مرد کا زنی کی لاش کو ایک عیب کی طرح دفن کریں۔

اس دن شیرا کی کام سے ہاتھ مسد کی طرف گیا ہوا تھا۔ اس پر غبار چھایا ہوا تھا اور سڑکیں ایک شہر غمناک کی طرح تھیں اور سنسان معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کو انکی ایک جھوٹے کتے چنے ہوئے دوئے چاہتے ہوئے دکھائی دیے۔ ایک نالی میں ایک مرا ہوا کبوتر چڑھا۔ اس کی کمران ایک طرف کو حرکت کی تھی۔ اس کی ہاتھیں سخت اور نیلی اور پٹلی ہوئی تھیں۔ اس کے پر پانی میں چمک گئے تھے اور اس کی ایک آنکھ کربہ معلوم ہو رہی تھی۔ شیراکو اس کو دیکھنے لگا۔ راستے میں سامنے سڑک کے موڑ سے گل کی آواز اور دزدوں سے آنے لگی۔ لوگ یک جہازہ نئے پلے آ رہے تھے۔ جوں جوں جہازہ شیرا کی طرف آتا گیا چھپے میز اور زیادہ نظر آتی تھی۔ یہاں تک کہ دو دروازوں کے علاوہ کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ طاقت عبدالرشید کے جہازہ کو کسی طرح لے جایا گئی تھی۔ شیرا بھی جہازہ کی طرف بڑھا اور کدھا اپنے میں شریک ہو گیا۔ اسے شیہ سامنے سے چالیس سو روپے ہوئی اور انہوں نے جہازہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور انکی ایک آدھوں کو گرفتار کر لیا۔ ان لوگوں میں شیرا بھی تھا اور اس کو اس طرح سے حرکت کرنے کی بدولت دو سال کی سزا ہو گئی۔

اب وہ قید خانہ چکا تھا لیکن اس کے کاجب اس کی آواز سے آٹھ شاہو بچے تھے اور اس کے پاس اسے پیسے تھے کہ وہ دروازہ کھولنے لگا۔ کچھ لوگوں نے چندا کر کے اسے دروازہ بند کر دیا۔ دیکھے اور ان سے شیرانے بھر کا کام شروع کیا اور اب پتے چکا بھر کا تھا لیکن اب اس کا بیچا کر دیا گیا ہوا تھا اور مصیبت اور تکلیف اس کی ہر پکار میں سنائی دیتی تھی۔ تاہم شیہ اس کی آواز سن کر پتے لے کر دروازے سے اور وہ بھی سے نکال کر پتے کو لگا اور ان کو دیتا تھا۔

ایک اور شخص جو جہازہ سے نکلے میں ہر روز رات کو آتا تھا وہ ایک اندھا شخص تھا بہت چھوٹا تھا اور اس کی ہتھیلی وادھی پر بیٹھ خاک چڑی دیتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک نوہا ہاٹس کا ڈنڈا تھا جسے ٹپک ٹپک کر دے کے دھکتا تھا۔ وہ داخل قید خانہ اور باہر جاتا تھا جیسے کوڑے کے ذریعہ پر گھنوں کا غول یا کسی مری ہوئی بی کا ڈنڈا لیکن اس آواز میں وہ باہر کی اور دروازہ کھولنے کی شہنشاہی کا نقشہ کھینچ دیتا تھا۔ جہازوں میں اس کی آواز جیسے سارے قلعہ میں ہے مگر پہچانی جاتی نہیں اور سے آتی۔ میں نے آج تک اس سے نہ بڑا ہٹا کر دیکھا۔ وہ انکی آواز نہیں سنی اور باہر تک وہ میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ بہادر شاہ کی فرمائش اس کے منہ سے بھر پورانے زمانے کی یاد دہانہ کر دیتی تھی۔ جب بندوستان باہر آتی تھی

بدرشوں میں نہیں بکڑا گی تھو۔ اس کی آواز سے صرف ہمارا شہ کے رنج کا ہی اعتراف نہیں ہوتا تھا بلکہ ہندوستان کی غلامی کا لوحہ سننے میں آتا تھا۔ دوسرے اس کی آواز آتی تھی۔

”کسی کی آگہ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے وہ میں ایک مشت لہار ہوں“

لیکن جھڑ کے شرفا اس کو پسند نہ تھے کیوں کہ وہ چس بیچتا تھا۔

ایک روز رات کو میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ میریوں کی رات تھی اور کوئی دس بجے کا وقت نہ یا دو تہر کا نہیں بند ہو چکی تھی لیکن کوئی اور مرکز کی دکان میں ابھی تک کھلی ہوئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف لوگ اپنی اپنی چار پائوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ بکھو سو گئے تھے اور کچھ ابھی تک باتیں کر رہے تھے۔ اب میں تنگی اور گرمی تھی اور نالیوں میں سے سزاوار پھوٹ رہی تھی۔ مرزا کی دکان کے چلنے ایک سیارہ فی گناٹ لگائے جنسی تھی جیسے کسی شکار کی غریب میں جنسی ہو۔ ایک شخص نے ایک آد کا دو دو لے کر بیٹھا اور آخر دے گا زمین پر ڈال دیا۔ بلی ابے پادس چلتے کے پیٹے سے نکلے اور آخر دے کو ہانپنے لگی۔ اسی وقت میری کڑکی کے سامنے سے کلو گزری۔ اس کا رنگ سیاہ تھا لیکن شباب نے اس کی چہرے پر ایک روشنی اور طور اصورتی پیدا کر دی تھی۔ اس کی چال میں ایک بے باکی اور الحزین تھا اور جسم زندگی کے اہوار سے توانا اور سبک تھا۔ وہ مصنف صاحب کے یہاں طائر تھی جن کی بیوی نے اس کو پھینک دیا تھا اب وہ بیٹھ ہو گئی تھی اور اسے چہرے کی تین سال گزار گئے تھے لیکن اٹل کے نو جوانوں کی ناچیں اس کی طرف گزری رہتی تھیں۔

اب داگی کے کنز پر پگلی تو منوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کلو مضطرب کر رہی

”موا مضطرب کہیں کا تھا پر خدا کی سنوار۔ ایک صورت کو اکلیا دیکھ کر ہاتھ ڈال ہے۔“

منو کا

”تیری جوانی بیکر کس دن کام آئے گی؟“

”بہت دور ہو سوسے میرا ہاتھ چھوڑ۔“

مرزا ایک مکان کی چھت پر دو بیٹوں کے کڑنے کی آواز آتی۔ اسی وقت کلو نے زور سے جھٹکا دیا اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

”بھانڈو پینے، اچھا حرکت کرتا ہے اچھا میں ہم نہیں۔ اچھا پنے اگلی کی کہ عمر میرا دور ہے گا۔“

مرزا ایک طرح اور دو دو حد دینے کے بعد ادا رہے کے لیے گھر میں چلا گیا تھا اسی وقت دانیس آیا اور کلو کا آخری جملہ سے سنائی دیا اور وہ

یاد

”کیا بات ہے کلو؟ کیا ہوا؟“

لیکن کلو طیر پیچھے سر۔ بختری سے لگی کے اندر داخل ہو گئی۔ مزاج خیراتی جوانی دکان کے سامنے سو رہا تھا، شور سے اٹھ گیا۔ منو کو کھڑا

دیکھ کر پچھنے لگا۔

"*Yes, Yes, Yes*"

منو باجی اور غصے سے بھرا کھڑا تھا۔ اس کا منہ ٹٹک ہو کر رہا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک سادپ کی آنکھوں کی طرح تھیں۔ زبردستی اور جبر سے کوئی نہیں۔ کوڑے کے پھر یہ ایک ملی کی آنکھیں ڈرادیں چلتی ہوئی، دکائی دے رہی تھیں پھر غائب ہو گئیں۔ منو نے ذرا دور بھیج دی ہوئی وہ مریخی کی آواز میں جواب دیا۔

—A—

“*Wah wah wah*”

"نہیں یہاں جتنے کھجور میں۔۔۔ تو ہلکے کے ہلکے گئی۔ لیکن شہری مارنے کی کہاں؟"

اور بڑیاں ابھی تک لڑ رہی تھیں۔ وہ ایک بھانجے کے طریقے سے خوانے کے اہلکاروں کو دے چکی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسری کو کھانا نہیں گی۔ پھر میاؤں میاؤں کر کے ایک بھانجے کو دے کر فرات جہاں اس کے چچے بھیجے ہوئے۔

عزیز خیراتی نے منو کو اپنے ہنگ پر بٹھا لیا اور سر ہانے سے چوڑی نکال کر اس کی طرف بڑھا لی لیکن منو نے اپنی قمیص کی بیب میں سے ایک چاندی کا سکرےٹ نکھس لیا اور عزیز سے کہا۔

"لوہیاں تم بھی کیا رو کر گئے۔ میں نہیں بڑا اوجھل کرٹ پاتا ہوں۔"

اور ایک حکمت کا لہر چلا رہا ہے۔

”اے بیارہمیں نے کہا آپ کے کسی کاروبار پر؟“

”تمہیں باروں کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ جس کو تیرے مولا، یا اس کو تیرے آصف اللہوں۔ اگر اللہ تمہاری کمی کو دیکھ لے تو کام تمہارا پورا ہو گا۔“

”میں نے اپنی انکس سے ان کو روک لیا میں اس کے لئے تیار تھا۔“

”ہا ہا یہ بھی کیا گڑبڑ کی باتیں کرتا ہے۔ میرا تو یہ چاہتا ہوں کہ نوجوان دورے کرو۔ اس سے زیادہ سارے نئے سکھایا ہی نہیں۔ میرا تو سوچوں کہ اتنا تو بچا ہوں اور چنے چنے ہینڈ آؤ ہوں۔ کہاں کی روزگار لگائی۔ اگر کوئی بھی تو بھگت لیں گے۔ اب کہاں کا روک رہیں۔“

”جیسے یاد رہیں۔ کیوں کہ آپ ہاتھ منہ سے لالہ رہا ہے۔ سب آگے آ جاتا ہے۔ ساری بات کو دھری رہ جاتے گی۔“

”اچھا، مگر تو اس طرح باتیں کرنے لگا، جس پر میں دبا“

’ذریٰ کی تیار۔ ایک بات مجھے ملوں سے مرادیں کہتی ہے۔ قسم کھاتا ہے۔‘

”ایمان کیا ہے؟“

"*የፍትሕ ምክር ቤት*"

”بھئی اس کی ٹھوس جڑ تھی۔“

”کیونکہ میں نے یہ سنا ہے۔“

انجمن اہل بیت (ع) نے ۱۳۸۵ھ میں "سیرت النبی کریم (ص) کے بارے میں" کتاب شائع کی۔

۱۰ "جہاں تو میں اور کئی خیراں تھیں۔"

”بھرا ایک بھائی گنا تھا۔ اونٹ اٹھیں تھا۔ یہ کوئی دس برس کی بات ہے۔ قومیری بکواس سے بھل کی تھی۔ ہم دونوں مد سے میں ساتھ چہتے تھے۔ اس نے ہنر سے میرے شکایت کردی اور چھین گوا کہیں۔ میرے اوپر بھگت سوار ہو گیا۔ میں نے کہا سالے بدل نہ لایا ہوتا بیٹاب سے سوچیں منف دھوں کا۔ ایک موقع ہا کر میں نے سالے بگوت چرا لیا۔ اس کے اٹھارہ بڑی بڑھیا ہو گیا چڑی تھیں۔ اس سے شروعات ہوئی۔ پھر ایک مرتبہ بھگیا ایک ہاوں کا سر پینے کہیں پہنچا کیا۔ میں ان سے ہا بگوت نہ کہتا تھا لیکن میں نے ہا کر دیا۔ اس کے بعد میں نے سو ہا کہ ان حراہوں کے ہاں روپے بھی ہیں اور انگی انگی چڑی بھی۔ کیوں خانہ الیا کر دں اور بھرتو میرا دھو خوب صاف ہو گیا ہے۔ ہار جی پچھو تو ہا کہ بھی غریب کو ہر کر بھی کوئی چیز نہ دیں۔ ان سے تو بس اسی طرح چڑی ہا وصول ہو سکتی ہیں۔“

”لیکن ہا کر کہی بکڑے کے ہوتو“

”میں نے اس کو دیکھا ہے۔“

”میرے وہی فضول باتیں شروع کر دیں۔ اچھا اب میں چاہتی تو گھر میں تو قویں میں ہو گی۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ اوردروازہ کی کمرے

Walter D. Koenig

دور سے ملنے کی سہولت میں ٹھہرا اور ملازمین دیا کرتے تھے۔ یہ قوی بنگلہ اور منجھوٹا تھے۔ ان کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور ان کی جات بھی مہدی سے سرخ رنگ کی تھی۔ ان کا سر تا سحری تھا لیکن پہلوؤں میں اور گویا ان کے ہنسنے بال چہ سے بدلتے تھے۔ ان کے ہاتھ پر ٹھیک جگہ میں ایک بڑا سا گنا چڑھا تھا جس کا رنگ راکھ کا سا تھا اور انگ دور سے چمکتا تھا۔ آکڑوہ پھری کمر کی کے سامنے سے نکلتا دے ہوئے گزرتے تھے۔ وہ گزرتے کا جھلکی مورچوں کا پانچواں اور گناڑے کا کرتا پہننے رچے تھے اور ان کے کندھے پر ایک بڑا سرخ رنگ کا چھپا ہوا اور بال چہ اور ہاتھ تھا۔ ان کی آواز میں ایک ایسا کرارہن، گری کے ساتھ ساتھ وہ متری تھی جو انسان کو کم مٹا ہوتی ہے۔ ان کی اذان دور دور دھجھوڑتی تھی اور ان کی آواز بہت دور سے جاتی رہتی تھی۔ شروع شروع میں ان کی آواز سے اس بھاری شان نکلتی تھی جو مسلمانوں کو نماز کے لیے جاتی ہے۔ پھر اختتام کے قریب آوازی جھلک رہی کی جاتی اور ان کے جھٹلے مل گئے ہوتے ایک سناٹا اور خاموشی پیدا کرتے ہوئے فضا میں گھومتے تھے۔ لوگ ٹھہرا کر حضرت دلال جیٹ کیسے تھے اور اس مقابلہ میں بہت سی باتیں دونوں میں مشترک تھیں۔ ان کی شاندار آواز اور ان کا بڑا رنگ۔

ایک مرحہ میں اپنے مکان کی چھت پر اٹھ گیا دیکھا تھا۔ آسمان پر جگمگاتے ہلکے ہلکے ہوائی جہاز تھے اور سورج کی روشنی ان کے پیچھے سے چڑھتی تھی اور ان میں سے ہلکی سی ہلکی روشنی نمایاں تھی۔ کیوں کہ سطح صاف تھا اور شہر کا گرد و غبار اور دلوں کی چٹائیوں کا دھواں فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ شہر کے شور و غلب کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ ساری فضا میں ایک دلی شگفتہ پائی تھی۔ وہ تکلیف دہ تکلیف دہ اور شہر والوں کی غامضی بھرا ہوا تھا۔ جس میں طہارت اور شگفتہ زندگی کی نگاہ تھی اور بے لکی کا احساس ہوتا ہے۔ گرد و غبار سے پہلے اور پچھلے ہاتھوں میں ایک ہلکی کوثر اڑا رہا تھا اور ان کے پیچھے رکوں میں غائب ہو گیا۔ دور سے طوں کی سیٹھیں اور ریل کے انجنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شہر کی ہر گلی میں لوگ اور چٹاؤں سے کیڑاڑتے تھے یا منظر لا منظر ان پر دھڑکتے تھے۔ دور دور چھوٹے چھوٹے شہر والے اور بڑے شہر والے ایک جگہ اکٹھے ہوئے تھے اور ان کی گھنٹیں بجاتی رہتی تھیں۔ دور دور چھوٹے شہر والے دیکھ سکتا تھا کہ ان کی کی سڑکوں پر اور بے کاری کا احساس ہوتا تھا۔ کہیں کہیں کوئی دو چرخہ مکان میں رہا تھا اور ان کی گاڑیوں آسمان پر نکلا کہ وہ درمیان سے دوڑا ہوا تھا۔ اسی وقت ٹھکانے کے کھڑے ہاتھوں اور لیٹوں کے درجہ بجا کو تکلیف دہ پہنچاتے تھے اور ہاتھوں کے رنگوں میں مل کر چلے اور وہ ہم دیکھائی دیتے تھے۔ اسی وقت ٹھکانے کے کھڑے ہاتھوں اور لیٹوں کے درجہ بجا کو تکلیف دہ پہنچاتے تھے اور ہاتھوں کے رنگوں میں مل کر چلے اور وہ ہم دیکھائی دیتے تھے۔

سہری آواز فضا میں کھینچ گئی۔ یہ آواز کچھ لمبی دیر میں کسی جگہ تک نہیں پہنچ سکتی تھی کہ میری کوفت ایک خاموشی، رنج سے بدل گئی۔ اس آواز میں کوئی غصہ اور بڑائی نہ تھی بلکہ اس سے زندگی کی بے انتہائی کا احساس ہوتا تھا۔ اس بات کا کہ دنیا مردار ہے اور اس کے جانے والے کتنے آسان بات کا کہ زندگی حقیر اور ناتجربہ ہے۔ اسی طرح جیسے ہاتھوں کے چم سے پر گرد اور دھواں اور غبار۔ اپنے موعوم طیالات کا افکار میں اذان ملتا رہا۔ یہاں تک کہ احتیاط کے قریب آ گئی یہی اصل صورت کی خاموشی پیدا کرنے والی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔ پھر یہی اعلانِ مٹی میں اللہ کی آواز سنانا چھاتی ہوئی دنیا کی بے انتہائی کا نتیجہ دلائی ہار یک لمبی تان کے دھبے سروں میں ہوتی اس آہنگی اور دل بھگی سے فہم ہوتی کہ یہ نہ موعوم ہوتا کہ آواز رک گئی ہے یا ساری دنیا پر خاموشی طاری ہے، ایک گہری خاموشی جس سے موعوم ہوتا تھا کہ دنیا سے پرے بہت دور ایک دور دنیا ہے۔ جس میں ازل اور ابد دونوں ایک ہیں اور یہ دنیا پچھلے موعوم ہے۔ آواز اس طرح فضا میں گونگی جس طرح افق پر زمین ختم ہوتی ہے اور آسمان شروع ہو جاتا ہے اور تیز نہیں ہو سکتی کہ زمین قطع بھی ہو گئی یا ہر جگہ آسمان ہی آسمان ہے۔ اسی طرح آواز اس آہنگی سے رک گئی کہ آواز اور خاموشی میں امتیاز ہو سکتا تھا۔ آواز کانوں میں گونج رہی تھی لیکن یہی شبہ ہوتا تھا کہ صرف خاموشی کانوں میں یہاں چائے ہوئے ہے۔ اور میں سوچتا رہا کہ یہ اذان ہماری زندگی کی حقیقت کو کس خوبی سے ظاہر کرتی ہے۔ دہی ہے یہی اور مایوسی جو ہماری رگ۔ رگ میں بیست ہو گئی ہے۔ دہی نامیدی اور خارجی حقیقت کا خوف جو ہم کو ایک اعلیٰ زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رہا ہے اس اذان میں موجھو تھے۔ ہم دنیا کو چھوڑ کر ازل اور ابد کے طوطہ دیکھ کر رہے ہیں۔ آدمی کو بھلا کہ خدا کی حقائق میں مشغول رہتے ہیں اور ہماری زندگی کی ہر چیز ہم کو اس بات کی ترغیب دلاتی ہے۔ ہمارا ہر گیت ہمیں یہی یاد دیاں سنا رہا ہے۔ ہمارے ہر آواز میں جڑیاں ہیں لیکن ہم ان کی رگوں کے اگلے حادی ہو گئے ہیں کہ وہ ہم کو ایک خارجی حقیقت نہیں موعوم ہو جس۔ ہمارے ہاتھوں میں جھکریاں پڑی ہیں، ہمارے گلوں میں ملوث ہیں۔ ہماری زبانوں پر قفل ڈال دئے گئے ہیں لیکن ہم کو کسی بات کا احساس نہیں، ہمارا جسم بن ہو چکا ہے، ہماری روح سو گئی ہے اور ہم اپنی بے بسی پر گمن ہیں اور لا پرواہی اور جسے کی زندگی گزار رہے ہیں حتیٰ کہ موت اپنے پہلے بڑھاتی ہے اور اپنی تاریک آغوش میں گھنچ لیتی ہے۔ ہماری نیک نائی اور دنیاوی دونوں برابر ہیں۔ ہماری زندگی ہر صحت و فتنوں کیساں ہیں اور اذان کی آواز کی طرح ہم اس طرح زندگی سے صحت میں بدل جاتے ہیں کہ کوئی تیز نہیں کر سکتا ہم بھی زندہ بھی تھے یا سب ہم دگمان تھا اور ہم صحت کے دورے ہمیشہ سے اس کی لہریوں سے ظہور غفلت کی نیند سو یا کرتے تھے۔

ایک رات کو مرزا کی دکان پر تین چار آدمی بیٹھے ہوئے باقی کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو بڑھاپا ایک کو ابلی اور ایک دو آدمی اور جع ہو گئے تھے۔ ان کے سامنے حذر کھنقاہ و دہ ہادی ہادی کھنقاہ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔

”میں تو بارہ ایک چیز میں اس کی شان دیکھ رہا ہوں۔“

اس پر میرے کان کھڑے ہوئے اور میں غور سے سننے لگا۔

اسنے میں ایک کباب آیا اور اس نے مرزا سے پانچ پیسے کا دو روہ لگا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مرزا نے ایک آنکھ اور دو روہ نکالنے کے لیے حقہ دو روہ کی طرف بڑھائی۔ اس آواز نے اپنی بات ہماری رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ لے دن میں چاندنی چمک میں سے چار ہاتھ کر سامنے سے ایک چھپا کر رہی تھی۔ اسی جگہ ایک پچہ پڑا ہوا تھا۔ گائے بچے کے پاس آن کے رک گئی۔ میں نے سوچا کہ کچھ روپ کیا کرتی ہے۔ دسے میں صاحب اس چھپانے اپنے چاروں ہر چیز کر ایک خانجی ہادی اور بچے کو صاف لاکھ گئی۔ مجھ کو اس ہتار کی عقل میں اس کی

شان نظر آگئی۔

مرزا کا ایک ہاتھ کڑھاؤ کے پاس تھا دوسرے میں آنکھ دھوا رہا تھا۔ اس کے ایک طرف گھوڑا تھا۔ عزیز بولا۔
 ”اور وہ کیا اس کی شان ہے؟“

مرزا نے قہقہہ دیا اور اس کو اچھالنے لگا۔ اس نے میں ایک دوسرا شخص بولا

”ہاں یہاں اس کی شان کا کیا بچہ رہے ہو۔ ایک مرتبہ حضرت سلیمان کو حکم ملا کہ کل بناؤ۔ تو میں صاحب انہوں نے تیار کیا شروع کر دیں۔ جناتوں نے آٹا ڈالا میں بڑے بڑے خنزیر بن گئے اور پھیلے آٹا کر بیج کر دیں اور مدت تک گئی۔ تمہارے ہوتے جناتوں کا کام کتنی لمبی کا ہوتا ہے۔ آج اتنا کل دیا۔ تمہارے ہی دنوں میں کل آٹا جان سے ہاتھ کر کے لگ گیا۔ حضرت سلیمان روز اس جگہ جا کے دیکھا کرتے تھے کہ کوئی کام میں سستی تو نہیں کر رہا ہے تو میں صاحب ایک دن کل کھڑا ہو گیا۔ اب صرف اس کے اندر کی فطرت اور خیر صاف کرنے دو گئے۔ دوسرے روز پھر حضرت سلیمان اپنے کل کوئی ایک کے کھڑے ہو گئے اور دل پہ پڑ گئے کہ حکم دے دیا لیکن دے میں وہاں سے کچھ اور ہی حکم آچکا تھا۔ اب دیکھنے کل کی شان کہ یہاں تو اس کی صفائی ہو۔ ہی ہے اور وہاں اس کل کوئی میں گھنٹا شروع ہو گیا لیکن وہ ڈے کے کھڑے رہے یہاں تک کہ گھنٹے تھکتے سو گئے تک پہنچ گئے۔ لیکن ان کو اور بھی خبر نہیں ہوئی اور کل کوئی را کو کی طرح چون چڑھتی اور ان کا خود کا دم اٹھ گیا۔ اور تو ان کا کام تمام ہوا، دوسرے جناتوں نے دیکھ کر جن کا دھاب شہاب تھا وہی نہیں رہے تو چہچہتے رہے۔ لیکن میں تو اس بات پر حیران ہو رہا ہوں کہ اب ان جناتوں اور فطرتوں کو کون صاف کرے گا؟“

عزیز کے ہاتھ میں ہڈی کی آبی اس کے منہ کے برابر رکھی ہوئی تھی اور دو روئے والے کی طرف گھوڑا تھا۔ مرزا کا ایک ہاتھ جس میں لایا تھی اور آٹا دھوا لے چھوٹا۔ اور وہ ہفتہ میں کھڑا تھا۔

میں نے زور سے قہقہہ بکایا لیکن پھر سوچا میں پڑ گیا کہ افسی ان ”فقل“ اور ”فخر“ کو کون صاف کرے گا۔

ہوا کا ایک جھونکا زور سے آیا اور مٹی کے ٹکڑے کا لپٹا کل ہو گیا اور مزاح پر اندھیرا تھا۔ اس وقت لوگ مرزا کی دکان سے اٹھ کر روانہ ہوئے گئے اور میں بھی گھر کے اندر چلا گیا۔



مرزا نے فراموشی سے ہاتھ دھو کر لیں۔ حشر ظہر آ رہی کی ہے۔ (مرزا مار چکے)

راجندر سنگھ بیدی

نام	راجندر سنگھ بیدی
قلمی نام	عسکری لاہوری اور راجندر سنگھ بیدی
پیدائش	یکم جنوری ۱۹۱۵ء، پتھان پور، برطانوی پنجاب، برصغیر ہند
وفات	۱۱ نومبر ۱۹۸۴ء، پتھان پور
تعلیم	ایف۔ اے۔ ڈی۔ اے۔ ڈی۔ کالج، لاہور
	ابتدائی تعلیم لاہور میں پائی۔ میٹرک ایس بی بی ایس خالصہ سکول سے ۱۹۳۱ء میں کیا۔ انگریزی۔ اے۔ ڈی۔ کالج لاہور سے ۱۹۳۳ء میں کر کے بی۔ اے میں داخلہ لیا لیکن والد نے اسی سال اختتامی دے کر انہیں اپنی جگہ پست آفس میں بھرتی کر دیا۔ یوں بی۔ اے نہ کر سکے۔

مختصر حالات زندگی:

بیدی کے والد ہیرا سنگھ بیدی ذلت کے کھشتی کار والدہ سیدادتی برہمن تھیں۔ ہیرا سنگھ بیدی صدر بازار، لاہور میں پست میں تھے اور انہیں جی۔ بی۔ لاہور کے چھوٹے گودا ٹرلا ہوا تھا۔ ان کا آبائی علاقہ "ڈوے کی" تحصیل واسطے ملکوت تھا۔ ماں باپ کی محبت کی شادی تھی۔ بیدی بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ وشتو مانتا تے دھارے میں گئے اور اکثر آریہ جانج لاہور کے مندر میں والد کے ساتھ حاضر رہے۔ ماں باپ دتی کی مرید تھیں۔ باپ اور بیٹے کی دعاتیں قبول نہ ہوئیں اور سیدادتی دوسرے جہاں سدا رہیں۔ جس دن ان کا انتقال ہوا، اس شام ہیرا سنگھ اپنے بیٹے کے ساتھ قم لٹا کر نے امرتسر گئے اور فلم "سوانی مینوال" دیکھی۔ بیدی نے بچپن اور لڑکپن میں انتہائی مسرت کی زندگی جیلی، لکھنوی صوبہ ہے کا اعتراف نہ (۱۹۳۳ء) کے فوراً بعد یہ حقیقت کراک، جہاں پست آفس، لاہور میں ملازمت کرتی اور داخلہ لینے کے باوجود بی۔ اے نہ کر سکے۔ ۱۹۴۰ء میں اہلاد "بندے بازم" کٹر کرافٹس ٹھکانے کا آغاز کیا اور ۱۹۴۴ء میں پنجابی رسالہ "سارنگھ"

مرقب کیا۔ انھوں نے دوسرے کے ساتھ جب شادی سے بچنے کے لیے اپنے آبائی گاؤں "کولے کی" (تحصیل ڈاکہ) کے ایک اہل رکنوں میں چلا گیا۔ لاکھو لیجن بچا لے گئے اور ۱۹ برس کی عمر میں (۱۹۳۳ء) سوداگری (سمرانی نام: سٹوٹن کور) سے شادی ہو گئی۔ ۱۹۳۳ء میں ڈاکہ ٹاؤن کی عازمت سے استعفیٰ دے کر بھٹلی ڈیم ریسٹ (حکومت ہند) سے وابستہ ہوئے اور چھ ماہ بعد لاہور منتقل آ رہے تھے۔ انھیں چھ ماہ بعد آمل انڈیا ریج، لاہور منتقل ہوئے۔ اس زمانے میں ۱۵۰ روپیہ ماہور پاتے تھے اور مازیل قانون، لاہور میں قیام پزیر تھے۔ ریج جج کے لیے کئی بار کارڈز سے کھلے ہاتھ میں سے ڈراما "حق مر" کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

۱۹۳۶ء میں ۱۵ سالہ عمر میں عظیم ہندو لیڈر کے نام سے اپنا کاشتکاری ادارہ قائم کیا۔ اسی زمانے میں چند نظموں کے سکرین پر لے کر اور مکالمے کیے۔ مئی / جون ۱۹۳۷ء میں قسبات کے قاضی نظر اچھے بھائی پر جس عظیم ہندی کے ہاں روپ چلے گئے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب بھارت کو آزادی ملی تو، وہند میں تھے۔ ۱۹۴۹ء میں، علی آگئے، جہاں سے، قلعہ احمد قادی کی معرفت، چار چھوٹے کھیتوں کے انتظامی ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ شیخ عبداللہ کے ساتھ ان کے خصوصی مراسم رہے۔ ۱۹۴۹ء میں اپنی نکاح محمد سے فیصلہ ہو جانے کے سبب ملازمت سے استعفیٰ دیا اور علی آگئے۔ علی سے ڈی۔ ڈی کیپ نے انہیں اپنی ملازمت اور بی بی نے ایک ہزار روپے ماہوار پر قلعہ کی شروعات کر دی۔ بی بی نے یہاں رہ کر "بی بی بک"، "داغ"، "راج داس"، "دھرم سنی"، "پہاگھی"، "آرام"، "انور دھوا"، "بندھن"، "عظیم مان"، "ہنسہ بہار"، "مسافر"، "انوپہا"، "کھور" "سچہ کام" جیسی میڈیاری نظموں کے سکرین پر لے کر اور مکالمے کیے۔ اس میں سے بیشتر کام رشی کیش مکری کے لیے کیے جبکہ سرباموہری کے لیے "مرزا غالب" کی تھی۔

مجموعی طور پر سفر سے زیادہ ٹھیکس لکھیں اور "ہمارے" "آٹھ ٹھیکس دیکھی" "گرم کوٹ" اور "ڈسک" بھی معیاری قلموں کے چارے کا کار کے طور پر سامنے آئے۔ ۱۹۷۷ء میں ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۷۸ء میں انہوں نے ایک نئی لڑکی مین کو اپنی نظم "آٹھ ٹھیکس دیکھی" کی بیرونی کے لیے منتخب کی اور اسے اول دے دیئے۔ اپنی جگہ پر پھر اور اپنا ٹھیکس کے چارے مریض چلے آتے تھے۔ آخری زمانے میں کینسر بھی ہو گیا۔ بچے خرید رہی تھی سے کبھی نہیں تھی۔ تمام لائے سمیت چارے کے مضمون نے انہیں نہیں کا کا۔ یہ تھا شاید اپنے لگے تھے جس کا نتیجہ انور ۱۹۷۸ء میں نائج کی صورت میں نکلا۔ سوچا بڑے کا آپ بخت ہو تو بھل معذور ہو کر رہ گئے اور دفتر چاؤ برس اسی بیٹے کے دم و گرم پر رہا تا ان جس سے کبھی نہ تھی۔ اور اگر وہ کبھی کی محبت میں سبیلہا مسکن کا ساتھ میں معزول سے کہہ کر خود کشی کی کوشش کا کام دے۔ آخری وقت انتہا دور ہے کی دہلی پر بیٹانی اور مسلمان معزوری کے ساتھ گزرا۔ ۱۱ نومبر ۱۹۸۳ء کو کبھی میں انتقال کیا۔ انکوئی اولاد نہ رہی بیوی کا انتقال ان کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا تو ایک ایک اگر یہ صورت سے پہلی کی تا جائز اولاد (بچی) لکھی میں مقیم ہے۔

ولم يكن الفيلسوف:

”بعد سے تمام شخصوں کی بحوری کے قتل نام سے ۱۹۳۷ء میں لکھا۔“

مطبعة دار الكتب والعلوم

“سہولتی” کے معنی “آسانی”

- ۱۔ "راشدہ نام" (المانے) مکتبہ اردو لاہور طبع اول ۱۹۳۹ء۔
مکتبہ جامعہ لکھنؤ دہلی طبع دوم ۱۹۶۳ء۔
دوسرے ایڈیشن کے حدود ہات: (۱) ۲۳۔۹ ص ۲۳۔۹ (۲) حدود ۳۶۔۲۵ (۳) مہن کی مہن میں۔ ص ۳۷۔۵۳ (۴) گرم کوٹ۔ ص ۵۳۔۶۹ (۵) چھوڑ کر کی ٹوٹ۔ ص ۷۰۔۸۶ (۶) اپنی شاپ۔ ص ۸۷۔۱۰۲ (۷) جنگل بھنگا۔ ص ۱۰۳۔۱۱۹ (۸) گارڈین۔ ص ۱۲۵۔۱۳۶ (۹) ڈاکوان۔ ص ۱۳۷۔۱۵۲ (۱۰) دس مہن پارٹی۔ ص ۱۵۳۔۱۶۵ (۱۱) درج مہن لی۔ ص ۱۶۶۔۱۸۰ (۱۲) بگھن۔ ص ۱۸۱۔۱۹۵ (۱۳) روٹل۔ ص ۱۹۶۔۲۱۳ (۱۴) موت کا راز۔ ص ۲۱۴۔۲۲۳۔
- ۲۔ "مگر مہن" (۱۳۰ ہٹاے) مکتبہ اردو لاہور طبع اول ۱۹۴۳ء۔
نیا دارو لاہور طبع دوم:۔
- ۳۔ "سات کھیل" (۱۱۰ ہٹاے) لاہور ادبی سنگم طبع اول ۱۹۳۶ء۔
حدود ہات: (۱) غمیرا۔ ص ۳۳۔۹ (۲) چاکی۔ ص ۳۵۔۷۲ (۳) چھت۔ ص ۷۳۔۱۱۳ (۴) نقل مکانی۔ ص ۱۱۵۔۱۵۳ (۵) آج۔ ص ۱۵۵۔۱۹۰ (۶) کرشمہ۔ ص ۱۹۱۔۳۲۰ (۷) بپاؤں کی مروج۔ ص ۳۲۱۔۳۴۳۔
دوسری بار یہ کتاب مکتبہ جامعہ لکھنؤ دہلی نے جون ۱۹۸۱ء میں شائع کی۔ ۱۹۳۶ء میں اس کتاب کو مکتبہ اردو لاہور نے بھی شائع کیا تھا۔
- ۴۔ "آکھ بلی" (۱۱۰ ہٹاے) کتب پبلشرز لکھنؤ دہلی طبع اول ۱۹۴۹ء۔
حدود ہات: (۱) مہن۔ ص ۱۹۔۹ (۲) کوڑا بلی۔ ص ۲۰۔۷۲ (۳) بچاؤ خدا۔ ص ۷۳۔۵۸ (۴) مہن۔ ص ۵۹۔۷۳ (۵) مہاجرین۔ ص ۷۴۔۹۵ (۶) نکٹن۔ ص ۹۶۔۱۱۷ (۷) ایک عورت۔ ص ۱۱۸۔۱۲۶ (۸) کرشمہ۔ ص ۱۲۷۔۱۴۸ (۹) گاٹی۔ ص ۱۴۹۔۱۶۱ (۱۰) لکھ مستقیم اور تسمین۔ ص ۱۶۲۔۲۰۰ (۱۱) آگ۔ ص ۲۰۱۔۲۲۳۔
- ۵۔ "ایک چادر بھلی" (۱۱۰ ہٹاے) لکھنؤ دہلی مکتبہ جامعہ طبع اول ۱۹۶۲ء۔
دوسری بار ۱۹۷۵ء میں مکتبہ جامعہ سے شائع ہوئی۔ ۱۳۶ ص
یہ دولت بھائی میں "ایک چادر اور رانی" کے نام سے شائع ہوا۔ پاکستان میں اس کہانی کو جلیبہ کارہ سمجھتے تھے "بھلی بھر چال" کے نام سے لکھا۔ یہ دولت پاکستان سے بھی شائع ہو چکا ہے۔
- ۶۔ "اپنے دکھ مجھے دے دو" (۱۱۰ ہٹاے) لکھنؤ دہلی مکتبہ جامعہ طبع اول ۱۹۶۵ء۔
دوسری بار ۱۹۷۵ء میں مکتبہ جامعہ سے شائع ہوئی۔ ۱۳۶ ص
حدود ہات: (۱) لکھ بھٹی۔ ص ۳۳۔۹ (۲) چوکا۔ ص ۳۶۔۲۵ (۳) تلی۔ ص ۳۷۔۸۴ (۴) لکھ لکھ۔ ص ۸۵۔۱۳۰ (۵) اپنے دکھ مجھے دے دو۔ ص ۱۳۱۔۱۵۶ (۶) کرشمہ سے پرے۔ ص ۱۵۷۔۱۸۹ (۷) چاکر الہ آباد کے۔ ص ۱۸۹۔۲۱۲۔

(۸) (۱) ازل۔ ص ۱۳۸-۴۳۸ (۲) کچنٹس۔ ص ۲۳۹-۶۰۔

یہ مجموعہ پاکستان سے لگی شائع ہو چکا ہے۔

۷۔ "ہاتھ ہمارے قلم ہوئے" (اٹلانے) نئی دہلی، مکتبہ جامعوہ طبع ازل ۱۹۷۳ء

مندرجات: (۱) ہاتھ ہمارے قلم ہوئے۔ ص ۷-۳۵ (۲) صرف ایک سحر ہے۔ ص ۳۶-۷۳ (۳) کچیائی۔ ص ۷۵-۹۰

(۴) تھکن۔ ص ۹۰-۱۰۹ (۵) ہماری کاغذ۔ ص ۱۱۰-۱۴۰ (۶) سوئلیا۔ ص ۱۴۱-۱۶۴ (۷) وہ بڑے حیا۔ ص ۱۶۴-۱۸۷

(۸) جہاز وہ کہاں ہے۔ ص ۱۸۸-۲۰۹ (۹) قنصل۔ ص ۲۱۰-۲۲۶ (۱۰) آئینے کے سامنے۔ ص ۲۲۷-۲۴۰

یہ مجموعہ پاکستان سے لگی شائع ہو چکا ہے۔

۸۔ "صہبان" (۹) طہریہ (اٹلانے) طبع ازل، بہتر پاکٹ بکس۔ دہلی، (س۔ن)

طبع دوم: اردو پاکٹ بکس (پاکستان) کراچی نمبر ۱۸، (س۔ن)

۹۔ "جو گپا" (رومانی اٹلانے) طبع ازل، اردو پاکٹ بکس (پاکستان) کراچی نمبر ۱۹، (س۔ن)

۱۰۔ "کنڈان" (اٹلانے) طبع ازل، مکتبہ اردو ادب، لاہور (س۔ن)

۱۱۔ "بھئی کے افسانے" (اٹلانے) طبع ازل، مکتبہ اردو ادب، لاہور

۱۲۔ "پتلے بھرتے چہرے" (خاکے اور مطامین) طبع ازل، مکتبہ اردو ادب، لاہور

۱۳۔ "بے جان جی پی" (اڈامے) طبع ازل، مکتبہ اردو ادب، لاہور، ۱۹۴۳ء

۱۴۔ "تھکن" (اٹلانے) مکتبہ جامعوہ نئی دہلی، طبع ازل، ۱۹۸۳ء

۱۵۔ "لمبی ہڈی" (اٹلانے) نیا اور لاہور

۱۶۔ "پلی کالج" (اٹلانے)

۱۷۔ "کار کی مٹادی" (ڈرامے)

۱۸۔ "روح انسانی" (ڈرامے)

۱۹۔ "کراچی" (اٹلانے) نیا اور لاہور

۲۰۔ "پلس" (اٹلانے)

۲۱۔ "اک چار اور صرفی" (پانچالی ہولٹ) مطبوعہ دہلی

نوٹ: شمار نمبر ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸ اور ۱۹ راجندر سنگھ بھٹی کی کتابوں کے پہلی ایڈیشن ہیں۔

۲۲۔ "سٹوڈنٹس جھوٹ" (بچوں کے لیے) طبع انعام علی ایڈ سنز، لاہور طبع دہلی، ۲۰۰۰ء

۲۳۔ "مجموعہ راجندر سنگھ بھٹی" (اٹلانے/پاول کی کتابت) سنگھ میل دہلی پبلیکیشنز، لاہور طبع ازل، ۲۰۰۰ء

۲۴۔ "کب تو گھبرا کے" (ڈرامے)

۱۔ ”پدمشری“ (حکومت ہند کا سول ایوارڈ)

۲۔ ساجیہ انڈی ایوارڈ

۳۔ صوبائی ناول ایوارڈ

۴۔ سجاد کبیر ہندو ادب ایوارڈ

۵۔ فلم فیئر ایوارڈ

وقات سے قفل مستقل چا:

۳۴۷۔ کلکتہ روز نگار، بمبئی ۳۹۹۵۴۔ (مکارت)

نظر سے فن:

”مجھے نکل فن پر یقین ہے، اب کوئی واقعہ مناجا ہے جس آتا ہے تو میں میں امن چاہی کر دینے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے اسے اس طرح تحریر میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔“

(دبیاچہ ”گرہین“ سے اقتباس)



حوالہ جات:

۱۔ پدما ”بیکل سے ایک منظر“ پدما، ترجمہ مرزا علی بیگ، ”پدما“، لاہور، ۱۹۸۷ء

لا جوتنی

راجندر سنگھ بیدی

”جھوٹا یاں کھٹان، ٹی لا جوتنی دے نوئے“

(یہ چھوٹی سوتی کے پاس دی ہاتھ لگی لگاؤ تو کھٹا جاتے ہیں)

ایک ہاتھالی کہتے

بزار، دھارا اور بے شمار زخمی لوگوں نے اٹھ کر اپنے بدن پر سے خون پونپھڑا لیا اور بھر سبیل کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے جن کے بدن سچ
وسالم تھے لیکن دل زخمی

گلی گلی ملے ملے میں ”بھڑ بھاؤ“ کیلپاں بن گئی تھیں اور شروع شروع میں بڑی تن دی کے ساتھ کاروبار میں بھاؤ ”زمین پر بھاؤ“
”اور گھروں میں بھاؤ“ یہ دو گرام شروع کر دیا گیا تھا لیکن ایک پروگرام یہ تھا جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی تھی۔ وہ پروگرام سڑیہ عورتوں کے
ستیلے میں تھا جس کا سلوگن تھا ”دل میں بھاؤ“ اور اس پروگرام کی بار آجین ہڈا کے مصدر اور اس کے آس پاس بیٹے والے قدامت پسند طبقے کی
طرف سے جڑی نکالتے ہوئی تھی

اس پروگرام کو حرکت میں لانے کے لیے مصدر کے پاس ٹھٹھے ”لا شکوہ“ میں ایک کھیتی قائم ہو گئی اور گیارہ دوڑوں کی اکثریت سے مصدر
لال باجو کو اس کا بیکہ نری بن لیا گیا۔ وکیل صاحب مصدر، چوکی کاں کا پوز صاحب اور محلے کے دوسرے مستحق لوگوں کا خیال تھا کہ مصدر لال سے
زیادہ دھانڈھائی کے ساتھ اس کا مکہ کوئی اور نہ کر سکے گا۔ شاید اس لئے کہ مصدر لال کی اپنی بڑی دھوا ہو چکی تھی اور اس کا نام بھی لا جوتنی۔

چنانچہ یہ بھات پھیری نکالتے ہوئے جب مصدر لال باجو اس کا ساتھی راسو اورنگی رام دلیہ ریل کر گاتے ”جھوٹا یاں کھٹان
ٹی لا جوتنی دے نوئے“ تو مصدر لال کی آواز ایک دھڑک ہو جاتی اور وہ خاموشی کے ساتھ چلتے چلتے لا جوتنی کی دانت سوچنے پالنے وہ کہاں
ہوئی، کس حال میں ہوئی، ہماری دانت کہا سوچ رہی ہوگی، وہ ابھی آنے کی بھی یا نہیں؟ اور پھر بے قرشی پر چلتے چلتے اس کے قدم

اور اب تو یہاں تک فوج آگئی تھی کہ اس نے لاجپتی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کا علم اب دیا کاظم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دھم سے بچنے کے لئے لوگ بھرا میں اپنے آپ کو فوجی کر دیا۔ اس کے باوجود دوسرے ساتھیوں کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے اسے یہ طیال ضرور آتا۔ انسانی دل کتنا ذراک ہوتا ہے۔ اور اسی بات پر اسے ٹھس لگ سکتی ہے۔ وہ لاجپتی کے ہارے کی طرح بے حس کی طرف ہاتھ بھی بڑھاؤ تو کھٹکا جاتا ہے لیکن اس نے اپنی لاجپتی کے ساتھ بدسلوکی کرنے میں کوئی بھی کسر نہ اٹھار لی تھی۔ وہ اسے ہلکے ہلکے اٹھنے چلیے، کھانے کی طرف بے وقوفی برحقے کو راسی کی مصنوعی مصنوعی باتوں پر بھید دیا کرتا تھا۔

اور اگر ایک جنگی حیثیت کی ڈالی کی طرح ہارک سی دینا پڑی لڑائی تھی۔ زیادہ دھوپ دیکھنے کی وجہ سے اس کا رنگ سنو پکا تھا۔ طبیعت میں ایک عجیب طرح کی بے قراری تھی۔ اس کا اضطراب ختم کے اس منظر کے کی طرح تھا جو بارہوی کس کے ہارے سے بچنے کی ادھر اور بھی ادھر لڑ سکتا رہتا ہے۔ اس کا دلچسپ اس کی صحت کے خراب ہونے کی دلیل دیتی تھی ایک صحت مند کی دکھائی تھی جسے دیکھ کر بھاری ہلکے سندھو ال پہلے تو گھبرا گیا لیکن جب اس نے دیکھا کہ لاجپتی ہر قسم کا بوجھ و حتم کا صدمہ جتنی کہ مار ہیٹ تک سرگڑتی ہے تو وہ اپنی بدسلوکی کو بدتر بنا دیتا جاتا تھا اور اس نے اس حد تک لڑائی ہی نہ کیا جہاں پہلی جاتے کے بعد کسی بھی انسان کا صبر ٹوٹ سکتا ہے۔ ان حد تک کو سندھو لڑتے ہیں لاجپتی خود بھی تو مدد مانگتے ہوئی تھی۔ چونکہ وہ ایک اور اس نہ بیٹھ سکتی تھی اس لئے بڑی سے بڑی لڑائی کے بعد بھی سندھو ال کے صرف ایک بار سکر اپنے پر وہ اپنی اٹھی تھک سکتی اور لپک کر اس کے پاس پہلی آتی اور لگے میں بائیں ہاتھ لٹے ہوئے کہا "میرا ہاتھ میں تم سے نہیں ہوں گی۔" صاف پتہ چلتا تھا وہ ایک دوسری مار ہیٹ بھول چکی ہے۔ گاؤں کی دوسری لڑائیوں کی طرح وہ بھی جانتی تھی کہ مراد یہی ہی سلوک کیا کرتے ہیں بلکہ عموماً میں کوئی بھی سرنگی کرتی تو لڑائیاں خود ہی ناک پر اٹھتی رکھ کے لکھیں۔ "لے دو بھی کوئی مراد ہے بھلا صورت جس کے تو میں نہیں آتی۔" اور یہ مار ہیٹ ان کے گیتوں میں پہلی گئی تھی۔ خود لاجپتی کوئی تھی۔ میں شہر کے لڑکے سے شادی نہ کروں گی۔ وہ بھٹ پختا ہے اور میری کر بڑی جتنی ہے لیکن پہلی ہی فرصت میں لاجپتی نے خیر کے ایک لڑکے سے نوکائی اور اس کا نام تھا سندھو ال، جو ایک رات کے ساتھ لاجپتی کے گاؤں چلا آیا تھا اور جس نے وہ لہجہ کے کان میں صرف اتنا سا کہا تھا۔ "جیری سانی تو بڑی لکھیں ہے یاد، چوٹی بھی چنٹ پٹی ہوگی۔" لاجپتی نے سندھو ال کی اس بات کو سن لیا تھا مگر وہ یہ بھول ہی گئی کہ سندھو ال کہتے بڑے بڑے اور بھڑے بھٹ پہنے ہوئے ہے اور اس کی اپنی سرنگی پہنچا ہے۔

اور یہ بھارت پھیری کے سے لکھی سی باتیں سندھو ال کو یاد تھیں جو وہ بھی سوچتا۔ ایک بار صرف ایک بار جانی جاتے تو میں اسے جج جج سی دل میں بھالوں اور دواگوں کو تھوڑوں۔ ان تھوڑی عورتوں کے علاوہ ہوائے میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ فسادچوں کی ہوس ناکوں کا شمار ہو جانے میں ان کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ سناج جوان مصوم اور بے قصور عورتوں کو قتل نہیں کرتا، انہیں اپنا نہیں لیتا۔ ایک گھبراہٹ ہے اور اسے ختم کر دینا چاہیے۔ وہ ان عورتوں کو گھر میں اور انہیں ایسا مرد دینے کی پرہیز کرتا، جو گھر میں کسی بھی صورت، کسی بھی ماں، بیٹی، بہن یا بیوی کو دیا جاتا ہے۔ مجرور کہتا۔ انہیں اشارے اور کنا سے سے بھی ایسی باتوں کی یاد نہیں دلاتی چاہیے جوان کے ساتھ نہ نہیں۔ کیوں کہ ان کے دل دلتی ہیں۔ وہ ہارک ہیں، چھوٹی موٹی کی طرح۔ ہاتھ بھی لگاؤ تو کھٹکا جائیگا۔

کوہاں میں بساؤ پر ہر گھر کو کھلی جاسے پہنانے کے لیے جھٹلا مشور کی اس کھلی نے کئی پر بھارت پھیریاں لکھیں۔ سچ ہار دیا جیج ہے کا

وقت ان کے لیے سردوں تریخ وقت ہوتا تھا، نوگوں کا شور و ٹریک کی الجھن۔ رات بھر چوکیداری کرنے والے کتے تک بچے ہوئے خودوں میں سردے کر پڑے ہوتے تھے۔ اپنے اپنے بستروں میں دیکھے ہوئے لوگ پر بھات پھیری دہانوں کی آوازوں کو صرف اتنا کہتے۔ ہوا بوی مڑا ہے۔ اور بھر کھی بھر کھی تک حوائی سے دوہاؤ سندرال کا پو پیکلا ادا کرتے۔ وہ عورتیں جو بڑی گھٹھا اس پار کچی کچی تھیں کو بھی کے ہانوں کی طرح کھینچی چڑی دھنیں اور ان کے شادمان کے پیلوں میں اظفوں کی طرح اڑا سے چڑے چڑے پر بھات پھیری کے طور پر احتجاج کرتے ہوئے حد میں بکھو مٹاتے چھ جاتے۔ "اکتیں کوئی کچھ قوی دیر کے لیے تھیں کون اور "دل میں بھاؤ" کے فریادی اور اعدا تھیں پر پیکلا۔ کو صرف ایک گانا بکھو بکھو جاتا۔

لیکن صبح کے سے کان میں چڑا ہوا شہ بکا نہیں جاتا۔ وہ سارا دن ایک گھر کے ساتھ ویاٹ میں بکھو لگا تا رہتا ہے اور بعض وقت تو انسان اس کے مٹی کو بھی نہیں بھگتا، پر نگشتا چلا جاتا ہے۔ اسی آواز کے گھر کر جانے کی دولت ہی تھا کہ انھیں ہانوں جب کہ کس مرد و لا سارا بھائی بند اور پاکستان کے درمیان افواشہ و عورتیں چلائے میں ادا کھی تو مظلوم شہور کے کچھا آوی انھیں ملے سے بے لے لیے تیار ہو گئے۔ ان کے وارث شہ سے باہر چو کی گاں پر انھیں ملے کے لیے گئے۔ ملو یہ عورتیں اور ان کے نوا تھیں بکھو پر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور بھر سر بھگتے اپنے اپنے پر باد گھروں کو بھر سے آیا کرنے کے کام پر نکل دیتے۔ رسا اور کھی رام اور سندرال لاں پو ابھی "مہندر سندر دہاؤ" اور کھی "سو ہی دل زہ دہاؤ" کے غرے لگاتے۔ وہ دو غرے لگاتے رہے حتیٰ کہ ان کے گلے سوکھ گئے۔

لیکن ملو پر عورتوں میں ایسی ایسی تھیں جن کے طور ہوں جن کے ماں باپ، لیکن اور بھائیوں نے انھیں پکھائے سے اٹھا کر دیا تھا۔ آخر وہ کیوں نہ گئیں؟ اپنی مفت اور صحت کو بھالنے کے لیے انہوں نے زیر کیوں نہ کھالیا؟ کونہیں میں بھلائی کیوں نہ لگا دی؟ وہ بڑا دل تھیں جو اس طرح لڑکے سے جاملی ہوئی تھیں۔ بھنکوں ہزاروں عورتوں نے اپنی صحت لے جانے سے پہلے ہاں دے دی لیکن انھیں کیا پتہ کہ وہ زندہ نہ کر سہیں۔ وہی سے کام کر رہی ہیں کیسے تھرائی ہوئی آنکھوں سے صحت کو گھر دے دی ہیں۔ ایسی دہانیں جہاں ان کے شو بربک انھیں نہیں بچھتے۔ بھر ان میں سے کوئی بی بی میں اپنا نام دہرائی سہاگ دھنی سہاگ دانی اور اپنے بھائی کو اس جرم خیر میں دیکھ کر آخری بار اتانکتی۔ آخری لمحے انھیں پکھانا پر رہی؟ میں نے تجھے کوئی کھلا تھا رہے اور یہاں ہی چلا دیتا چاہتا۔ بھر وہاں باپ کی طرف دیکھتا اور ماں باپ اپنے بھر پر ہاتھ رکھ کے دہانوں یا باکی طرف دیکھتے اور نہایت بے لای کے عالم میں دہانوں یا با آسان کی طرف دیکھتا جو دراصل کوئی حقیقت نہیں رکھتا، جو صرف دہائی نظر کا دھوکا ہے جو صرف ایک حد سے جس کے چار دہائی لگا ہی کام نہیں کرتی۔

لیکن فنی نر۔ میں کس سارا بھائی چولے میں جو عورتیں ان میں ان میں لا جو تھی سندرال نے مسیو دم سے غری لڑکی کوڑک سے لے اترتے دیکھا اور بھر اس نے ہائی کاسوٹی جوڑ سے عرس سے اپنی کھلی کی سرکریوں کو دھت کر دیا۔ اب وہ صرف سکا کے سے ہی پر بھات پھیری کے لیے نہ بھگتتے تھے بلکہ شام کو بھی ہانوں کھانے گئے اور کھی کھی ایک آدھ جھونٹا مونا چلے گی کرنے گئے جس میں کبھی کا یو زحاصد وکیل کا پو پو صوفی کھلا دے سے ملی ملی ایک تقریر کر دیا کہ بھور سانا کیک پکھنے کے لیے ڈیوٹی پر ہیٹھ مونا ہو رہا۔ لاؤ آؤ اکتیک سے عجیب طرح کی آواز نہ آتھی۔ بھر کھیں کھی رام بھر چو کی کچھ کھنے کے لیے اٹھے لیکن وہ جیتی جیتی تھیں کھنے اور جیتے بھی شادمان اور ہانوں کا حال دیکھتا ہی اپنے صحت کے خلاف دہانیں کرتے اور ہاں میداں ہاتھ سے جاتے دیکھ کر سندرال یا بھائی لیکن وہ دو دھنوں کے سکا دیکھو بھی نہ کہ پاتا۔ اس کا کھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو پھنے لگتے اور دہانوں ہانوں کے کاروں وہ تقریر نہ کر پاتا۔ آخر چھ جاتا جس میں کچھ پر ایک

جب طرح کی خاموشی چھا جاتی تو سردار دل باز کی ان دو باتوں کا اثر جو کہ اس کے دل کی گرائیوں سے پہلی آتیں، وکیل کا کامیاب مصروفی کی ساری ہمدردانہ صحت پر بھاری ہوتا لگن لوگ ہیں رہ جیتے۔ اپنے ہڈ بات کو آسودہ کر لیتے اور پھر نقل و نقل میں مگر اس بات ایک رو کیلی والے سانچے کے سے لگی پر چار کرنے چلے آئے اور ہوتے ہوتے قدامت پسندوں کے گڑبڑ میں پھنسا گئے۔ سردار کے باہر پھیل کے ایک جڑ کے اور کروہینٹ کے قعرے پر کی شروعات ہو چکے تھے اور راجہ کی کتھ ہو رہی تھی۔ نارائن ہاراد راجہ کا وہ حصہ بنا رہے تھے جہاں ایک دھولی نے اپنی دھویں کو گھر سے نکال دیا تھا اور اس سے کہہ دیا۔ میں راجہ رام چند نہیں جانتے سہل راویں کے ساتھ رہا آئے پر بھی جیتا کو رہا لے گا اور رام چند دینی نے یہاں سنی جیتا کو گھر سے نکال دیا۔ لیکن حالت میں جب کہ اگر بھوتی تھی "کیا اس سے لگی جڑ کر راجہ راجہ کا کوئی شوبھ مل سکتا ہے؟" نارائن ہارائے کہا "یہ ہے رام راجہ جس میں ایک دھولی کی بات لگی اتنی ہی قدر کی لکھو سے دیکھا جاتا ہے۔"

کئی کا جوں سردار کے پاس رک چکا تھا اور لوگ راجہ کی کتھ اور شلوک کا درنی منٹے کے لیے نظر پکے تھے۔ سردار دل آخری فقرے سننے ہوئے کہنا

"میں یہاں رام راجہ نہیں جا رہا"

"چپ رہو جی" "تم کون ہوتے ہو؟" "خاموشی" مجمع سے آواز میں آئیں اور سردار دل نے جڑ کر کہا "مجھے ہوئے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

پھر پہلی آواز میں آئیں "خاموشی! ہم نہیں بولنے دیں گے" اور ایک کونے میں سے یہ بھی آواز آئی "مادر میں ہے۔"

نارائن ہارائے بڑی پھٹی آواز میں کہا "تم شاعروں کی ان سر جانا کو نہیں سمجھتے سردار دل!"

سردار دل نے کہا "میں ایک بات تو سمجھتا ہوں ۱۱۱۔ رام راجہ میں دھولی کی آواز تو سن جاتی ہے لیکن سردار دل کی نہیں۔" انجی لوگوں نے ہر اچھی بار اپنے پتے سے ہٹا پتے چپے سے پھیل کی گڑبڑ میں ہار دیا اور دھول سے چپے ہوئے بول اٹھے "ستو، ستو، ستو۔"

دوسرا اور تیسرا رام نے سردار دل کا ہاتھ کھوکھار دیا اور سردار دل بولے "شری رام جیتے ہمارے۔ یہ کیا بات ہے ہارائی انہوں نے دھولی کی بات کو سنے بھلا کیا مگر اتنی جڑی مہارانی کے سچے پوشش ذکر پائے۔" نارائن ہارائے اپنی داڑھی کی پھوٹی پکاتے ہوئے کہا "اس لیے کہ یہ جان کی اپنی خلی تھی۔ سردار دل! تم اس بات کو جان کو نہیں جانتے۔"

"ہاں ہاں" سردار دل ہارائے کہا "اس سنا میں بہت سی باتیں ہیں جو میری کتھ میں نہیں آتیں۔ پر میں یہاں رام راجہ سے سمجھتا ہوں جس میں انہیں اپنے آپ پر بھی غم نہیں کر سکتا۔ اپنے آپ سے بے انصافی کرنا اچھی بڑا پاپ ہے جتنا کسی دوسرے سے بے انصافی کرنا۔ آج بھی بھگوان رام نے جیتا کو گھر سے نکال دیا ہے۔ اس لیے کہ وہاں کے پاس دہائی ہے اس میں کیا صورت حال جیتا؟ کیا وہ بھی ہماری بہت سی باتوں اور بیہوش کی طرح ایک جملہ اور کہنے کا کارروائی؟ اس میں جیتا کے سپہ اور اس کی بات ہے یا کشش ہارائن

کے وحشی پن کی ہنس کے دس سرائن ان کے تھے لیکن ایک اور سب سے بڑا سرگرمے کا تھا۔

”آج ہماری بیٹا مردوش گھر سے نکال دی گئی ہے۔ بیٹا۔ لاجپتی۔ سو سندھ لال ہارنے رونا شروع کر دیا۔ دسرا لوارنگی رام نے تمام دوسرے جھنڈے اٹھ لیے جن پر آج ہی اسکول کے چھوڑ کر انہوں نے بڑی صفائی سے ٹھہرے کاسٹ کر چکا دیکھے تھے اور پھر وہ سب ”سندھ لال ہارندہ باد“ کے ٹھہرے لگاتے ہوئے نکل دیکھے۔ جلیں میں سے ایک نے کہا۔ ”مہاشی بیٹا زہد باد“ ایک طرف سے آواز آئی۔ ”شری رام چندر۔“

اور پھر بہت سی آوازیں آئیں۔ ”خاموش خاموش!“ اور بارشیں ہوا کی میٹھوں کی کھٹاکا رست پیلی گئی۔ بہت سے لوگ ہلوں میں شامل ہو گئے۔ بس کے آگے آگے وکیل کا گاڑی شاد اور ختم سنگ، عمر چوکی کلاں، ہارے تھے اپنی بوڑھی چھڑیوں کو زین پر ہارے اور ایک فاتحانہ آواز پڑا کرتے ہوئے۔ اور ان کے درمیان کھیں سندھ لال ہار باد تھا۔ اس کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو بہہ رہے تھے۔ آج اس کدال کو بڑی جھس گئی تھی اور لوگ بڑے جوش کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر مار رہے تھے۔

”جھٹکناں کمان کی اور جھٹکی دے ہوئے۔“

ابھی کھیت کی آواز نہ گون کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ابھی صبح بھی نہیں ہو پانی تھی اور غلط ملاحظہ کے مکان میں کی بدھوا ابھی تک اپنے بستر میں کرچاک سی انگڑا نہیں لے رہی تھی کہ سندھ لال کا ”گرا نہیں“ لال چند جسے اپنا اثر دوسرے استعمال کر کے سندھ لال اور غلیق کا گاڑی شاد نے راجن نہ پڑا، یا فاتحانہ آواز آیا اور اپنی گانڑھے کی جاوڑ سے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوا۔

”بدھوائی ہو سندھ لال۔“

سندھ لال نے جھٹکناں کو جھلم میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”کھنیا ہاتھ کی بدھوائی لال چند؟“

”میں نے لال چند بدھوائی کو دیکھا ہے۔“

سندھ لال کے ہاتھ سے ہلم کر گئی اور جھٹکناں کو فرش پر گر گیا۔ ”کہاں دیکھا ہے؟“ اس نے لال چند کو کندھوں سے پکڑتے ہوئے پوچھا اور جھٹکناں جواب خود سے پانے پر جھٹکناں دیا۔

”ہاں کی سرحد پر۔“

سندھ لال نے لال چند کو چھوڑ دیا اور آگے بڑھا۔ ”کوئی اور ہوگی۔“

لال چند نے یقین دلانے ہوئے کہا۔ ”نہیں، یہاں دھوا جی تھی، لاجپتی۔“

”تم اسے پہچانتے بھی ہو؟“ سندھ لال نے پھر سے جھٹکناں کو فرش پر سے اٹھائے اور جھٹکی پر مٹھتے ہوئے پوچھا اور ایسا کرتے ہوئے

اس نے رسالہ کی ہلم جھٹکی سے اضافی اور دھوا۔ ”بھلا کیا پہچان ہے اس کی؟“

”ایک ٹھنڈا ٹھنڈی ہے، دوسرا کال ہے۔“

”ہاں ہاں ہاں! اور سندھ لال نے غور سے کہہ دیا۔“ تھیرا تھا ہے؟“ وہ نہیں جانتا تھا اب کوئی فرق نہ پائے گا اور ایک دھوا سے لاجپتی کے ہاتھ پہچانے جسم کے سارے تھیلے پاد آگے جھٹکی نے پہچنے میں اپنے جسم پر ہاتھ لگے تھے جو ان کے ہاتھ سبز دھواں کی ہاتھ تھے جھٹکی مرنے کے چوڑے کے بدن پر ہوتے ہیں اور جس کی طرف اشارہ کرتے ہی وہ کھلائے گئے۔ ہاتھ اس طرح ان تھیلوں کی طرف ابھی

کرتے ہی لاجبתי شراب پانی تھی اور تم ہو جاتی تھی، اپنے آپ میں سمٹ جاتی تھی۔ گویا اس کے سب راز کسی کو معلوم ہو گئے ہوں اور کسی نامعلوم خزانے کے کت جانے سے وہ مطمئن ہو گئی ہو۔ سندھ لال کا سارا جسم ایک کان جاٹے خوف، ایک اٹھائی محبت اور اس کی مقدس آگ میں پھٹنے لگا۔ اس نے پھر سے لال چند کو پکڑ لیا اور پوچھا

”ابھو داس کہیے کچھ کچی کچی؟“

لال چند نے کہا ”بھند اور پاکستان میں محدودوں کا چلہا ہو رہا تھا۔“

”پھر کیا ہوا؟“ سندھ لال نے انہوں سے پوچھتے ہوئے کہا ”کیا ہوا پھر؟“

رسالہ کی اپنی ہار پائی پر اٹھ بیٹھا اور تباہ کن خوشی کی قسمیں کھانسی کھانستے ہوئے ہوا ”سچ کچھ آگئی ہے لاجبتی بھائی؟“

لال چند نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”داس کہہ پر سولہ عرصہ پاکستان نے دے دیں اور اس کے عوض سولہ عرصہ لے لیں۔ لیکن ایک بٹکڑا کھڑا ہو گیا۔ ہارسہ انکمپر اعتراض کر رہے تھے کہ تم نے جو عرصہ دی ہیں اس میں انکمپر، پوڈھی اور پیکار عرصہ نہیں زیادہ ہیں۔ اس کا ذرا پر لوگ فتح ہو گئے۔ اس وقت داس کہہ کے انکمپر نے لاجبہ بھائی کو کہا تو ہوئے کہا ”تم اسے پوڈھی کہتے ہو؟ دیکھو دیکھو جتنی عرصہ تم نے دی ہیں ان میں سے ایک بھی برابری کرتی ہے اس کی؟“ اور وہاں لاجبہ بھائی سب کی نظروں کے سامنے اپنے قہقروں سے چھا رہی تھی۔“

پھر ہنگامہ بدھ گیا۔ دونوں نے اپنا ”بل“ داپس لے لینے کی طمان لی۔ میں نے شور مچایا ”لاجبہ لاجبہ بھائی“ مگر ہماری فوج کے سپاہیوں نے ہمیں ہی مار مار کے بھگا دیے۔

اور لال چند اپنی کچھی دکھانے لگا۔ جہاں اسے داغی پڑی تھی۔ رسالہ اور نکلی رام چپ چاپ بیٹھے رہے اور سندھ لال کہیں اور دیکھنے لگا۔ شاید سوچنے لگا۔ لاجبہ آئی کچی پر نہ آئی اور سندھ لال کی شکل ہی سے جان نہ تھکا دیکھتا دیکھتا کیر کا صحر اچھا نہ گرا پا ہے اور اب کہیں وہ صحت کی چھاؤں میں زبان نکالے باپ رہا ہے۔ صحت سے انکا بھی نہیں نکلتا۔ ”پانی دے دو“ اسے یوں محسوس ہوا، ہزارے سے پہلے اور ہزارے کے بعد کا کھنڈ داغی تک کا دفر ا ہے۔ صرف اس کی شکل بدل گئی ہے۔ اب لوگوں میں پہلا سارہی بھی نہیں رہا۔ کسی سے پوچھو، سائیکھر دھاک میں نہتا نکھر رہا کرتا تھا اور اس کی بھائی بیٹر تو وہ جھٹ سے کچھ ”مر گئے“ اور اس کے بعد موت اور اس کے مضمون سے پاگل ہے خبر پاگل عادی آگے چلا جاتا۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر تاجر انٹی مال، انسانی گوشت اور پرست کی تجارت اور اس کا چکر کرنے لگے۔ سوشلی خریدنے والے کسی پھنس یا گائے کا بڑبڑہتا کردار ان سے اس کی عمر کا موازنہ کرتے تھے۔

اب وہ جوان عورت کے روپ۔ اس کے نکھار، اس کے مزاج، ترقی یافتہوں میں کی شارح عام میں فراخی کرنے لگے۔ کھنڈا سہا جڑوں کی نس میں پس چکا ہے، پہلے مڑی میں بال بٹکا تھا اور بھاؤ ڈانڈ کرنے والے ہاتھ ملا کر اس پر ایک روال ڈال لیتے اور یوں ”کچھی“ کر لیتے۔ گوچر وال کے پیچھے انگلیوں کے استعاروں سے سودا ہو جاتا تھا۔ اب ”کچھی“ کا روال بھی موت چکا تھا اور سترے سودے ہو رہے تھے اور لوگ تجارت کے آداب بھی بھول گئے تھے۔ یہ سارا المین دین، یہ سارا کاروبار پرانے زمانے کی داستان معلوم ہو رہا تھا جس میں عورتوں کی آزادانہ خرید و فروخت کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ ایک کان گھٹت عریاں عورتوں کے سامنے کھڑا ان کے محسوس کو توڑ دے دے دیکھ رہا ہے اور جب وہ کسی عورت کے جسم کو انگلی لگا رہا ہے تو اس پر ایک گھائی ساز گز جا چکا ہے اور اس کے ارد گرد ایک زوردار صاعقا اور پھر زور پیاں اور

سرخوں ایک دوسرے کی جگہ لینے کے لیے دوڑتی ہیں۔ انریک آگے گزر جاتا ہے اور باقاعدگی سے قول صورت ایک اعتراض نکلتا، ایک انفرادیت کے عالم میں ایک ہاتھ سے اندازہ بخدا ہے اور دوسرے سے اپنے چہرے کو اوس کی نظروں سے چھپانے سکایاں لیتی ہے

سندھ لال اسوگر (مرشد) جانے کی تیاری کر رہی رہا تھا کہ اسے آج کے آنے کی خبر ملی۔ ایک دم ایسی بھول جانے سے سندھ لال گھبرا گیا۔ اس کا کچھ قدم بڑا اور اس کی طرف بڑھا لیکن وہ پیچھے لوٹ آیا۔ اس کا بی بی چاہتا تھا کہ وہ روتھ جائے اور کھین کے قلم لپٹے گا رازوں اور جھنڈوں کو بچھا کر چھپ جائے اور بھروسے لیکن وہاں جذبات کا وہیں مظاہرہ لیکن خدا کا اس کے مراد خدا اور اس انفرادی کشاکش کا مقابلہ کیا اور اپنے قدموں کو اپنے ہونے چکی کھان کی طرف بلایا۔ کیا کھانہ ہی جگہ تھی جہاں صفو پر عورتوں کی انفرادی ہی جاتی تھی۔

اب آج سنا تے کڑی تھی اور ایک طرف کے ہڈیے سے کپ رہی تھی، وہی سندھ لال کو جانائی تھی، اس کے سوائے کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تھا اور اب جب کہ وہ ایک غیر مرد کے ساتھ زندگی کے دن بتا کر آئی تھی۔ نہ جانے کیا کرے گا؟ سندھ لال نے آج کی طرف دیکھا۔ وہ نائس اسلامی طرز کا دل دھونڈاؤ سے تھی اور ہائیں اٹک مارے ہوئے تھی۔ محض حادثہ دوسری عورتوں میں تھیں مل جانے اور باآخراے عیاد کے دامن سے بھاگ جانے کی آسانی تھی اور وہ سندھ لال کے ہارے میں اتنا زیادہ سوچ رہی تھی کہ اسے کیڑے دے دے۔ یہ دھونڈ ٹھیک سے داؤ بٹنے کا بھی خیال نہ رہا۔ یہ خدا اور مسلمان کی تہذیب کے بنیادی فرق۔ دائیں اٹک مارا ہائیں اٹک میں اکتیاز کرنے سے تھ صریح تھی۔ اب وہ سندھ لال کے ساتھ کڑی تھی اور کپ رہی تھی ایک امید اور ایک ار کے ہڈیے سے ساتھ

سندھ لال کو بچھا گیا گا۔ اس نے دیکھا کہ کاکرنگ کو بگڑ گیا تھا اور وہ پھیلنے کی بہ نسبت کہ کھنڈہ رستہ کی نظر آتی تھی۔ نہیں۔ وہ سونی ہو گئی تھی۔ سندھ لال نے جو بگڑا جو کے بازے میں سوچ رکھا تھا وہ سب ملتا تھا۔ وہ گھٹتا تھا غرض میں تھیں جانے کے بعد لا جاتی باطل میں ہو چکی ہو گئی اور آواز اس کے منہ سے نکالے گئے نہ لگتی ہو گئی۔ اس خیال کے کہ وہ پاکستان میں بڑی خوش رہی ہے اسے بڑا امیدوار لیکن وہ چپ رہا کیونکہ اس نے چپ رہنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اگرچہ وہ نہ جان پایا کہ اس کی خوش تھی تو پھر ہل کیوں آئی؟ اس نے سوچا شاید بندہ سرکار کے داؤ کی وجہ سے اسے اپنے مرثی کے خلاف یہاں آنا چاہی لیکن ایک چیز وہ نہ سمجھ سکا کہ لا جاتی کا سلوک یا ہوا چہرہ زردی لے لے ہوئے تھا اور غم محض غم سے اس کے بدن کے گوشت نے ہڈیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ غم کی کھڑے سے سونی ہو گئی تھی اور صحت مند نظر آتی تھی لیکن یہ ایسی صحت مند تھی جس میں دو قدم چلنے پر آؤی کا سانس بھول جاتا ہے

صلو کے چہرے پر لیکن کھانڈا لٹے کا تاثر کہ عجب سا ہوا لیکن اس نے سب طے کیا کہ ایک اٹھاتی مراد تھی سے متعلقہ کیا اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ کسی نے کہا ”تم نہیں لیٹے مسلمان (مسلمان) کی جھوٹی صورت“

اور یہ آواز رسواں۔ لیکن اس بھروسے کی کھان کے بوڑھے عہد کے نعروں میں گم ہو کر رہ گئی۔ ان سب آوازوں سے الگ کا کلام شادی کی پختی اور چھٹی آواز آ رہی تھی۔ وہ کھان بھی لیتا اور بولتا بھی جاتا۔ وہ اس کی حقیقت، اپنی شدھی کا شہدے سے قائل ہو چکا تھا۔ جس میں معصوم ہوتا تھا آج اس نے کوئی نیا وعدہ نہ کیا اور ان شام سر چھ لیا ہے اور اپنے اس حصول میں دوسروں کو بھی جسے دار جانا جاتا ہے۔ ان سب لوگوں اور ان کی آوازوں میں گھرے ہوئے آواز اور سندھ لال اپنے ذریعے کو جا رہے تھے اور ایسا جان چڑھا تھا جسے ہزاروں سال پہلے کے رام چندر اور جیتا کسی بہت لیے اخلاقی بن جان کے بعد جو دھماکا لوٹ رہے ہیں۔ ایک طرف تو لوگ غوغائی کے اظہار میں دھپا کر رہے ہیں اور دوسری طرف انہیں اپنی لمبی ملازمت دیکھ جانے پر تاسف بھی۔

لاہوتی کے چلے آنے پر بھی سند رال باہر نے اسی شہدہ سے ”دل میں بھاؤ“ ہو کر ام کو جاری رکھا۔ اس نے قول اور فعل دونوں اعتبار سے اسے بھادیا تھا اور وہ لوگ جنہیں سند رال کی باتوں میں خلی خلی جذبات سے نظر آتی تھی، جاکر ہوا شروع ہوئے۔ اکمل لوگوں کے دل میں خوشی تھی اور بیشتر کے دل میں افسوس۔ سال ۱۳۳۱ کی جد کے علاوہ محلہ ملاٹکھور کی بہت سی عورتیں سند رال باہر کو قتل و کر کے کھڑے سے گھر لے گئیں۔

لیکن سند رال کو کسی کی احتیاج یا احتیاجی کی پروا نہ تھی۔ اس کے دل کی رانی آج بھی تھی اور اس کے دل کا غلاف چکا تھا۔ سند رال نے لاہوتی کے سورن سودنی کو اپنے دل کے سحر میں استقامت کر لیا تھا اور طور و راز سے پرہیز اس کی حالت کرنے لگا تھا۔ لاہوتی جو پہلے خوف سے کبھی راتی تھی، سند رال کے غیر متوقع نرم سوک کو دیکر آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔

سند رال لاہوتی کو اپ ”لاہوتی“ کے نام سے نہیں پکارتا تھا، وہ اسے کہتا تھا ”راجی“ اور لاہوتی جن پہلی خوشی سے پاگل ہو جاتی تھی۔ وہ کہتا ہے جی تھی کہ سند رال کو اپنی واردات کے سناے اور سناے سناے اس قدر روئے کہ اس کے سب گناہ عمل جائیں لیکن سند رال لاہوتی کو دبا نہیں دیتے تھے۔ گریہ کرتا تھا اور جاپے کھل جانے میں بھی ایک طرح سے رنجی۔ البتہ جب سند رال سو جاتا تو اسے دیکھا کرتی اور اپنی اس جہد میں بکڑی جاتی، جب سند رال اس کی ہوج پر چمٹا تو وہ ”نہیں“ ”نہیں“ ”نہیں“ کے سوا اور کچھ نہ کہتی اور سارے دن کا تھا بار سند رال پھر اٹھ جاتا۔ البتہ شروع شروع میں ایک دفعہ سند رال نے لاہوتی کے سیاہ دنوں کے بارے میں صرف اتنا سا پوچھا تھا۔

”کون تھا وہ؟“

لاہوتی نے گلاں بچی کرتے ہوئے کہا ”ہمارا“ پھر وہ اپنی گلاں سند رال کے چہرے پر جمائے، کہہ کیا جاتی تھی لیکن سند رال ایک عجیب سی نظروں سے لاہوتی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے بالوں کو ہلکا رہا تھا۔ لاہوتی نے پھر آنکھیں پٹی کر لیں اور سند رال نے پوچھا۔

”اچھا سوک کر تھا وہ؟“

”ہاں۔“

”بار تو نہیں تھا۔“

لاہوتی نے اپنا سر سند رال کی چھاتی پر سرکاتے ہوئے کہا ”نہیں“ اور پھر یوں ”وہ بار تو نہیں تھا، پر مجھے اس سے زیادہ یاد آتا تھا۔ تم مجھے مارتے تھے، پر میں تم سے راتی نہیں تھی۔ اب تو نہ مارو گے؟“

سند رال کی آنکھوں میں آنسو آئے اور اس نے بڑی عداوت اور بڑے تاسف سے کہا ”نہیں راجی اب نہیں“ لیکن باروں کا۔“

”راجی“ لاہوتی نے سوچا اور وہ بھی آنسو بہانے لگی۔

اور اس کے بعد لاہوتی سب کہہ کر چلا جاتی تھی لیکن سند رال نے کہا ”جانتے ہو جی تھی اس میں تمہارا کیا قصور؟ اس میں قصور ہے ہمارے سانچ کا جو تھا وہ کیا راجیوں کو اپنے اہل عزت کی جگہ نہیں دیتا؟ وہ تمہاری اپنی نہیں کرتا اپنی کرتا ہے۔“

اور لاہوتی کی من کی من بھی میں رہی۔ وہ کہہ نہ سکی ساری بات اور وہ کچھ نہ کی جی جی رہی اور اپنے بدن کی طرف دیکھتی رہی جو کہ خود اسے

کے بعد اب ”دوبئی“ کا دن ہو چکا تھا۔ لاجبئی کا نہ تھا۔ وہ خوش تھی بہت خوش لیکن ایک ایسی خوشی میں سرشار جس میں ایک شک تھا اور دوسرے ۔۔۔ وہ لعل لعل اچانک بیٹھ ہاتی جیسے ایجنٹی خوشی کے لمحوں میں کوئی آہستہ پا کر آیا آئی اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔

بہت بہت سے دن بیت گئے تو خوشی کی جگہ پرے شک نے لے لی۔ اس لئے نہیں کہ سندھ لال پاؤ نے پھر وہی پرانی بدسلوکی شروع کر دی تھی بلکہ اس لیے کہ وہاں سے بہت ہی اچھا سلوک کرنے لگا تھا۔ ایسا سلوک جس کی لاجبئی توقع نہ تھی۔ وہ سندھ لال کی وہی پرانی لاجبئی چاہتی تھی جو گاڑے لڑ پڑتی اور مولیٰ سے مان جاتی، لیکن اب لڑائی کا سوال ہی نہ تھا۔ سندھ لال نے اسے یہ محسوس کرا دیا جیسے وہ

لاجبئی کا جاکے کوئی چیز ہے جو چوتے ہی ٹوٹ جائے گی۔ اور لاجبئی نے میں اپنے سر پا کی طرف دیکھتی اور آغاس تپتے پر کھینچی کہ وہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے لاجبئی نہیں ہو سکتی۔ وہ بس گئی، پھر لگتی۔ سندھ لال کے پاس اس کے آنسو بکھینے کے لیے آنکھیں چھیں اور نہ آجیاں سننے کے لیے کان۔ ہر بات پھیریاں نکلتی رہیں اور غلطے کا ظہور کے ساتھ حاکم دسا کو اور نکلی رام کے ساتھ مل کر اسی آواز میں گاتا رہا۔

تھلا تھاں کلان لی لاجبئی دے فو نے



حجاب امتیاز علی

۴۴	حجاب
تقریباً ۴۵	حجاب اسماعیل / حجاب امتیاز علی
پیرائیل	۳ نومبر ۱۹۷۹ء یہ مقام حیدر آباد دکن، بھارت
دہشت	۱۱ اور ۱۲ مارچ ۱۹۹۹ء کی درمیانی شب، یہ مقام ۲۰ سو
تعلیم	سیکرٹری بھرت
	عربی، اردو اور موسیقی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔

مختصر حالات زندگی:

حجاب کے والدین سید محمد اسماعیل نظام دکن کے فرسٹ بیکریٹری تھے اور والدہ عہدہ ہی جیکم اپنے دور کی نامور اہل قلم خاتون۔ آپائی وطن، حیدر آباد دکن تھا۔ حیدر آباد اگرچہ امر اور دوسا کا شہر تھا اور معاشرت تو انہاں تھی مگر ان دنوں خصوصاً موسم سرما میں، وہاں خاتون کی دیا بھوت چلتی اور لوگ بھاگ بھاگ کر جان ہی تے۔ حجاب کے والد نے بچوں کی تعلیم کے پیش نظر اپنے گھر اسے کوہداس منتقل کر دیا، جہاں کڑا کے کی گری چلتی اور یہ گھرانہ موسم کے چھ ماہ فرساج، ضلع کرشنا، گواٹی، ہند میں گزارتا۔ فرساج دہریا نے گوداری کے کنارے آباد تھا۔

فرساج، ریش ان کے بچنے کو حجاب کے ۱۹۷۹ء نے اعلیٰ قسم کے فزیکل سے سہا، کھا تھا۔ حجاب آخر دم تک لمبے برآمدوں کے، القاش پائیں بارٹ کے چودہ دانے پر سہا یہ نکلن اہلی کے درخت اور دریا نے گوداری کے ساحل کے طواجاک مناظر نہیں بھول پائیں۔

حجاب کی تعلیم گھر ہی ہوئی۔ عربی، اردو اور موسیقی کے استاد الگ الگ تھے۔ بچپن اور لڑکپن میں حجاب خستہ تہائی کا دکھارہیں۔ ان کی بڑی بہن ذکیہ عمر میں ان سے بہت بڑی تھیں اور پھر انہیں دنوں میں ذکیہ کی شادی بھی ہو گئی۔ لے کے کر گھر میں والدہ کا وہ طبیعت تھا اور عہد ہی جیکم نے سخی حجاب کی دلجوئی بھی خوب کی۔ والدہ کی عادت تھی کہ حجاب کو بکھر تھا کر دیا تو والدہ نے سرکاری دودھوں میں حجاب کو اپنے

[illegible]

اس فکرمعربین کا شرف قبولیت اعلیٰ ہے۔ کتاب کا چار سو چنداں ضروری نہیں۔ اسے ایک غصیر سمجھئے، طویل اور بے مٹی۔

2007/03/26

۱۹۳۳ء میں تھامز جیلور کی معرفت نجاب کی شادی اختیار علی تاج سے بلہاری، (جنوبی ہند) کے مقام پر ہوئی اور اس کے بعد نجاب اپنا مکمل نجاب اختیار علی کے طور پر لاہور کی مستقل شہری بن گئیں۔ اس کی شادی کے موقع پر سہاویہ جیلورم نے سہرا لکھا۔

ہاں میں کچھ تکلیف ارمیں فزا آتی ہے
 باز کرتی ہوں جو بار مہا آتی ہے
 ہفت اہمہ تجھو کی ہے تاریکی غم
 چٹائی مشروغ کی اب صبح دہی آتی ہے

اس سیر کے دوسرے شعرے احمد ادا کرتا ہے کہ تاج اور تاجاب نے اس زمانے کے اعتبار سے تجر و کی طویل زندگی گزاری اور دونوں کی شادی پختہ میں ہوئی۔ تاجاب نے "تہذیب لہواں" کی ۱۱۱۱ء تک بھی کی لیکن ۱۹۳۶ء میں انہوں نے ان کی تمنا کی ہے۔ تاجاب آ کر نارمان ادا تاجاب لہنگ تاجاب کی رشتہ اعتبار کی اور پاریس کے دستور کی شاگرد ہیں۔ اس زمانے میں "اے" کا شش حاصل کرنے کے لیے چالیس سے پچاس تھن کی پرواز تھوڑی تھوڑی تاجاب نے یہ تہذیب صرف انیس تھنوں میں مکمل کر لی اور اس کے فوراً بعد سولہ تھنوں پر اگل گئیں۔ یاد رہے کہ تاجاب برصغیر پاک و ہند کی اولین ہوا باز خاتون ہونے کا اعزاز رکھتی ہیں۔ ان کا یہ شوق آٹھ برس تک قائم رہا۔ تاجاب نے راقوں کی پرواز کی، لیکن یہ تہذیبیں جہازت کا شوق دیا۔ یہاں تک کے انہیں ایک بار Forced Landing بھی کرنا پڑی۔

کتاب، بیسٹ اوپن ایج، مختصر اور پُر اثر، چار اور پانچ سو سال کے عرصے میں لکھی اور ادیب کو دو ایسٹیمس ہوئی۔ تصنیفی زندگی سے بچا ہوا بیشتر وقت اپنی بیویوں کے ڈرائیو سے میں صرف کرتی تھیں۔ ۱۹۰۹ء اور ۱۹۰۹ء کی دورانی میں شب و حید لطیف، ہسپتال، لاہور میں آخری سائنس لکھے۔ ۱۹۰۹ء کی سہ ماہی میں لکھنؤ، قمبر، ملتان، دکن، لاہور میں پھر وہ خاک ہو گئیں۔

"سیری با تمام محبت" مطبوعہ "خیرنگ خیالی" لاہور ۱۹۳۲ء

مجموعہ "سیری با تمام محبت" سے دیا چہ میں کتاب نکلتی ہیں کہ یہ افسانہ انہوں نے ٹھیک ساڑھے گیارہ سال کی عمر میں لکھا۔ جو واقعہ ہے اس جان کوئی مانتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ایک کم سن لڑکی ایسا عشقی افسانہ لکھ سکتی ہے تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ ۱۹۳۷ء میں تقریر کردہ یہ افسانہ پانچ برس کی تاخیر سے ۱۹۴۲ء میں کیوں شائع ہوا؟

قلبی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ "سیری با تمام محبت اور دوسرے رومانی افسانے" (افسانے) دارالاشاعت پنجاب، لاہور طبع اؤٹو ۱۹۳۲ء
 - ۲۔ "لاش اور دوسرے حبیب ناک افسانے" (افسانے) دارالاشاعت پنجاب، لاہور طبع اؤٹو ۱۹۳۳ء
 - ۳۔ "ظلمات کی انجمن" (ناول) دارالاشاعت پنجاب، لاہور طبع اؤٹو ۱۹۳۶ء
 - ۴۔ "کافوریت الیاس کی موت" (افسانے) دارالاشاعت پنجاب، لاہور طبع اؤٹو ۱۹۳۵ء
 - ۵۔ "ادب زریحہ" (مضامین) عصمت بک ڈپو دہلی طبع اؤٹو ۱۹۳۲ء
 - ۶۔ "تختے اور دوسرے گنگنا افسانے" (افسانے) دارالاشاعت پنجاب، لاہور طبع اؤٹو ۱۹۳۹ء
 - ۷۔ "مصور کے سہارے اور دوسرے رومانی افسانے" (افسانے) دارالاشاعت پنجاب، لاہور طبع اؤٹو ۱۹۳۹ء
 - ۸۔ "نغمات موت" (نثر لطیف) عصمت بک ڈپو دہلی طبع اؤٹو
- یہ کتاب ناصر محمد کے مرحوم کا مجموعہ ہے پنجاب کی اذلیں کتب۔
- ۹۔ "کافوریت" (ناول) دارالاشاعت پنجاب، لاہور طبع موسم ۱۹۳۸ء
- اس کتاب کا ایک ایڈیشن آئینہ ادب، لاہور نے بھی شائع کیا۔
- ۱۰۔ "مکی خانہ اور دوسرے حبیب ناک افسانے" (افسانے) پبلشرز ریڈائیٹڈ، لاہور طبع دسمبر ۱۹۳۵ء
 - ۱۱۔ "ڈاکٹر گھر کے افسانے" (افسانے) دارالاشاعت پنجاب، لاہور طبع اؤٹو
 - ۱۲۔ "کہو بھاری چہ چڑا تھیں" (افسانے) دارالاشاعت پنجاب، لاہور طبع اؤٹو ۱۹۶۳ء
 - ۱۳۔ "مکی خانہ اور دوسرے حبیب ناک افسانے" (افسانے) پبلشرز ریڈائیٹڈ، لاہور طبع اؤٹو ۱۹۳۵ء
 - ۱۴۔ "نذر میرا خواب" (ناول) دارالاشاعت پنجاب، لاہور طبع اؤٹو ۱۹۵۰ء
- اس ناول کا دوسرا ایڈیشن آئینہ ادب، لاہور نے شائع کیا۔
- ۱۵۔ "کالی حویلی" دارالاشاعت پنجاب، لاہور طبع اؤٹو
 - ۱۶۔ "پانگ خانہ" (ناول)
 - ۱۷۔ "موسمِ بھل کے سامنے" (۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کا روزنامہ) آئینہ ادب، لاہور طبع اؤٹو ۱۹۶۸ء

- ۱۸۔ "مختصر بیچاں" (ناول انوکھا نکاح کا ترجمہ) دارالاشاعت پنجاب، لاہور طبع ازال ۱۹۶۸ء
- ۱۹۔ "تجے" (ناول) "Little Women" کا ترجمہ ہے۔
- ۲۰۔ "مستمر بتاں" (مضامین) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع دوم ۲۰۰۷ء
- ۲۱۔ "میل و منہاڑ" سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع دوم ۲۰۰۷ء
- ۲۲۔ "بہارِ مری انڈیا اور موٹر ہسپ" (ڈرامے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع ازال ۱۹۹۳ء
- ۲۳۔ "اسٹیڈی اسٹیشن" (افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
- ۲۴۔ "سو کھے بچے" (ڈرامے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
- ۲۵۔ "کتابِ کتاب" (افسانوں کی نگاہات) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
- ۲۶۔ "چچا بھتیجاں" سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

وفات سے قبل مستقل پتا:

۵۵-۵۵، ازال ٹاؤن ۵۰، لاہور، پاکستان۔

تفکرِ رفیق:

"میرا خیال ہے کہ جو کچھ لکھیں اس میں کہانی ہی ہوتا ہے۔ کہانی کی راہ لی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔"

(پہلا سال ہفت روزہ "پاکیزہ" ۲۹ ستمبر ۱۹۷۷ء)



حوالہ جات

- ۱۔ کتاب نے اپنی تاریخ پر اپنی ہیٹ انگلیش رکھی۔ میرے ۲۲ دسمبر ۱۹۸۸ء کے ایک بلاگ لکھتی ہیں "میں نے عہد کر رکھا ہے کہ میری اپنی عمر کبھی کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ تقریرات چھپیں، مگر نہ کہانے کا خاکہ، ۲۳ سے مختصر اور مختصر ہوتا ہے۔" ان کی آکوتی بی بی یو ٹیوب چینل پر ۱۹ دسمبر ۲۰۱۸ء کے سٹاپ آف آن کی تاریخ رپورٹ ۱۹ دسمبر ۱۹۸۸ء ہے۔ کتاب کے پبلیشرز پر ۱۹ دسمبر ۱۹۸۸ء کے پتے پر سرسید ہے۔
- ۲۔ "نوائے" ذرا گھٹ مسطورہ دارالاشاعت پنجاب، لاہور کی خالی۔ "تہذیب نسواں" کو ہر، میں ان کے عہدہ سٹائٹس اور ایسٹائٹس ٹھہرے چپ ہیں۔
- ۳۔ "دعا" تہذیب نسواں" میں اس نوائے کی تقریریں قاتر کے ساتھ شائع ہو گئیں۔
- ۴۔ کل انعام ہیں۔ شادی کے بھٹوں میں سب سے لاپاں عہدہ ایس چٹائی کی جوائی اور عوامی رگوں میں ایک پینکٹ تھی۔

صنوبر کے سائے

حجابِ احتیازِ بلی

میں جب سے ان پہاڑی علاقوں میں آئی تھی "صنوبر و حناک" کی دھانیوں کا ذکر ہر خاص و عام سے سنتی تھی، لوگ کہتے، اس کے صنوبر کے ساجوں سے ڈھنگے ہوئے کناروں پر بہانے خواہوں کی دریاں جھلسلاتی ہے۔ پہاڑی خانہ بدوشوں کا بیان تھا کہ "موسم پہاڑوں کی بلندیوں نے ایک مقام پر آسمان کے نخل میں خلافت کر رکھا ہے اور درو حناک کی نیلی دھار وہیں سے اترتی اور گویا ساروں میں سے ہوتی پھرتی اس دلدلی میں ایک نہری بن کر آگتی ہے۔

بھلا آپ فور سمجھتے۔ ان رومانی اقدروں کو کون کر جھوٹا ہیرو یا صحت کی دلداد دے کب لپکا بیٹھا پاسکتا تھا؟ ایک دن میں نے اپنی محبوب کیلی جسوتی سے جلی کر کہا "جسوتی ہمیں یہاں آئے دو بٹے گڑہ بچے۔ مگر ہم نے صنوبر و حناک کی سراب تک نہیں کی۔ تم چند کروڑ آج شام کشنی کی سرکھلیں۔"

جسوتی کو آپ ہانستے ہیں۔ سفید چہرے والی سلیم الملق لڑکی ہے۔ اس سفر میں، میں اسے اپنے ساتھ تقریباً کھینچ کر لائی تھی۔ اس نے مسکرا کر کہا "مجھے تمہاری مرضی روٹی، لیکن پانی سے بھگدڑ لگتا ہے۔" اسی وقت جسوتی کے ایک محبوب جیسی بھڑکنا دوانے کہا "خاتون میں نے تاجے ساحل درو حناک پر ایک بہت مٹاق سو سال کا ہونہا مٹا ہوتا ہے۔ اس کی کشنی کچی گوروں پر نہیں ڈالگاتی۔ اگر آپ اہانتہ دیں تو اسی طاق کی کشنی کرے پر لے لی جائے۔" میں نے سہ پر دوائی سے کہا "کوئی طاق ہو کوئی کشنی ہو۔"

جسوتی کہنے لگی "سو سال کا طاق و حناک کشنی چلا جا رہا گا۔" خاندان دوانے کہا۔ "خاتون سنا ہے وہ سو سال سے کشنی بانی کرتا ہے۔ اور آج تک اس کی کشنی کو کوئی حادثہ نہیں آیا۔" غرض اسی وقت ہم نے اسے کشنی کر دیا پر لینے اور شام کی جائے کا انتظام کشنی ہی میں کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ جب ہم دونوں اس مقام پر پہنچے جہاں

سے نہایت راجح کی سیر کے لیے پانی کا سفر شروع کرتے ہیں تو ہم نے دیکھا کہ ایک سرخ اور نیلے رنگ کا مربع ٹکڑا اچانک اٹھار میں ہے۔ اس کے سوجھ کے کچھ پتے ہونے پر وہ میں سے اپنی ٹانگیں پادوں پر رکھے ہوئے خوش وضع اور خوش قطع ٹکیے دولت سحر است دے رہے تھے۔

میں نے مسکرا کر موسیقی سے کہا: ”یہ طیلہ جہاد کا خواب تفریح معلوم ہوتا ہے۔“

اندر آرام سے صبر و برد ہونے کے بعد ہم نے مڑ کر کشتی چلانے والے کو دیکھا ایک بڑے صندسار کشتی کے پرے سرے پر بیٹھا تھا جس نے بیٹھا تھا۔ اس کے سر بھائے ہوئے چہرے پر سلید لکھی والا می کے بال بکلی لگی ہوئے تھے۔ پانی آنکھوں میں زندگی کی تابی اور روشنائی تھی بلکہ جیسے ایک دھند میں سے ماضی کی حسرت و یاد چلتی نظر آ رہی تھی۔

جھلی خاندان نے جانے تیار کر رکھی تھی۔ ہم گرم گرم پانی کے خوشگوار گھونٹے حلق سے اچارتے دھیرے دھیرے راجح کی طرف جا رہے تھے جس کے نکل پر غروب آفتاب چل چل کر شباب پاٹی کر رہا تھا۔

مظہر ہندوئی دارلک سا بنو اچانک ہوا تھا۔ ہولناکی میں کھبت بڑھ رہی تھی۔ پانی کی جھولی لہروں کی آواز پر شبہ ہوتا تھا جیسے کہیں اور خواب کے جزیرے میں پانی برکس و ہوا و طہارت اپنی بے ساختہ رعنائیوں کا دامن پھیلائے ہوئے سانسے تھی۔ ایک تصویر جس میں آہستہ ہوئے سورج کا برکس سے انداز سے تھیں مگر کھم کی شعبدہ بازیوں دکھا رہا تھا۔ اسے انداز چٹکے وہ خواب کی سرزد میں تھی، دروان کا جزیرہ تھا۔ سید سے نور کا درمنبر، جیسے ہم ان کوڑے تھے، دروان کے درمیان سے کہیں پھولوں سے ڈھنگی ہوئی ڈھلوانیں نظر آئیں۔ کہیں ایک اچھوتے نور میں نہانے ہوئے ہرے نیلے اور کہیں رافعی کے کتاب پادوں میں گھومتے ہوئے کھسار۔

ہم چپ تھے۔ مجھے معلوم تھا، ہم کتنی دور نکل گئے، ماوراء ہارے کنارے کو پہنچنے کا کھت ہو گیا۔ چاکر جھٹی خاندان کی آواز نے ہمیں بچا ڈالا۔

”جہاب دیکھ چلے۔ آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ کہیں یہاں نہ ہو کہ پانی کے راستوں پر ہم ٹپک جائیں۔“
 باز سے طمان نے ایسے چہرے سے، جس پر سکراہٹ کا شہ ہو سکتا تھا کہا: ”رہا سے بھگنا ناہن ہے۔ میں ساتھ سحر سال سے ان آبی راستوں کا عادی ہوں۔“

میں ڈار اور چپ چاپ طمان کا چہرہ دیکھ رہی، جس پر زندگی کے گرہ ہر دن نے طرح طرح کی بھریاں ڈال دی تھیں۔ ہر چہرہ چھوٹا ہوا
 تم قریب قریب ایک عسلی سے یہاں رہتے ہو؟“

”جی ہاں“

”تمہارا مکان کہاں ہے؟“

”مکان کبھی نہیں مانتوں۔ صوبہ کے ان ساروں کے چہرے ہوں۔“

مجھے غصہ ہوا۔ یہ کہتے ہوئے اس کے ضعیف سینے نے اک آدھ بھری ہے۔

”صوبہ کے ساروں کے“ میں نے حیران ہو کر کہا۔ ”یہ پتہ گری اور لڑاؤ ہے والی سردی، جہیں زندگی سے جڑا نہیں کرتی۔ اس کا تمہارے پاس کیا جانی ہے؟“

"طرح ۶" اس نے ایک ہنسی ہنسی کے ساتھ کہا "میرے پاس پرانی ڈائری ہیں۔ جس کے پاس کوئی یاد ہو، اس پر کسی موسم کا ذکر نہیں ہوتا۔" "میری ڈائریس ایکٹ بنا دی گئی۔" "تمہارا ماضی تو افسانوں سے گہرا معلوم ہوتا ہے۔"

مگر بڑھے نے میری بات کی طرف توجہ نہ دی۔ آپ ہی آپ بڑبڑا رہا تھا۔ "مجھے صنوبر کے سایوں سے رہنا پسند ہے۔ مجھ پر ان سایوں سے چند گھنٹے کی مزارقت بھی شائق گزارتی ہے۔ جب ہی تو میں شہر میں مزدوری کرتے نہیں جاتا۔ میں ان سایوں کے گھنٹی لے دھو دھو بکارتا رہتا ہوں۔"

"کیا تم ہمیں اس رات سے آگاہ کر سکو گے کہ صنوبر کے سایوں سے تمہیں کیوں عشق ہے؟" میں نے اس کے لہجہ میں پوچھا۔

"یہ کوئی راز نہیں۔" اس نے دم توڑتے ہوئے سورج کے مقابل ایک سیاہ تصویر بن کر کہا۔ "مجھی جانتے ہیں کہ مجھے صنوبر کے سایوں سے کیوں محبت ہے اور کیوں میں اپنی زندگی کے آخری سانسوں کے چھپوٹ کرنا چاہتا ہوں۔"

جسوتی اور میں کھپاں کھپوں پر دیکھ کر حیرت ہو گئیں۔ کبھی بھانپ رہا رہی تھیں۔ بڑا چھوٹا جھم میں تھا سے بے پردہائی سے اپنی کہانی کہہ رہا تھا۔

2

آج سے ستر سال پہلے کا ذکر ہے کہ وہاں میری نظروں میں نو جوان تھی۔ زندگی کی ہر ہر حرکت میں بڑا دل ہی دلچسپاں محسوس ہوتی تھیں۔ میں طرح طرح سے تھا۔ ان پہاڑی علاقوں کا ایک خوبصورت تاجر تھا۔

بہار کے موسم میں ایک دن شام کے آستان پر سیر اچھا محسوس رہا تھا، جب میں اسی روح ناک کے ساحل پر انہیں صنوبر کے سایوں سے چل ڈری کے لیے نکل آیا۔

میری نظریں گاڑی صحن کے ایک چاروں طرف پر پڑی ایک کسمن لڑکی پر، جس صنوبر کے سائے سے ایک سبز چتر پر چٹکی ایک نوکری نے دہری تھی۔ مجھ سے قسطنطنیہ کی رنگین دریا تھتے۔ رات کا اندھیرا آنے لگا۔ کچھ نیچے میں خود وہاں آ گیا تھا۔ مجھے وہاں سے نکال دیا گئی تھی۔ جہر نو جوان کے دل کو زندگی کے پہلوؤں کے درمیان کشاں کشاں لے لے لے رہی ہے۔

میں میں محبت شروع ہو گئی۔ ہم شباب کی ایک دہلیز دارنگی میں ہم محبت کرنے لگے۔ ہم ہر روز انہیں صنوبر کے سایوں سے کھینچے ہوئے سایوں سے ملنے اور اپنی آواز میں ایک دوسرے کے دھڑکنے والے دل سے کہتے۔ بہت جلد ہماری شادی ہو گئی۔

اسی وقت اچانک صنوبر کے درخت پر سے ایک ناشادہ ٹیل پکا چیک چلائی۔ بڑھے نے حیرت سے دیکھا اور ہلکا سا کہنا۔ "یہ وہاں سے نہ کیا کہہ رہا ہے؟" یہی ناکہ محبت بہت ظالم لہجہ ہے۔

جسوتی نے مجھے اور میں نے جسوتی کو چپ چاپ دیکھا۔ اس بڑھے دل میں چھپا کبھی شعر کے خطے اچھے رہے تھے۔ بڑھے نے چند ہاتھ تڑپے چلائے تو ایک آہ بھر کر ہوا۔

"شادی کے بعد چھ بیٹے نہایت سہرے گزارے اور ایک شخص طراب نے ہماری زندگی کا رخ بدلا دیا۔"

ایک صبح جو فوجی بھری ہوئی لے گئے پر نیم گھنٹے آنکھیں کھولیں۔ اس لچھے میں بولی۔ "میں نے ایک ہولناک خواب دیکھا ہے۔"

بھری بہت کی نظروں نے اس سے پوچھا "کیا خواب؟"

ہوئی نے آہ کھینچ کر کہا۔ "میں نے رات بھر کے فرشتے کو دیکھا، جو پہاڑوں کی بلندیوں پر اپنے پر بٹا ہوا کرکھہ ہاتھ کا اگر قہ نے

اتھک اپنے بالوں میں ایک کاسنی رنگ کا گلاب نہ سنوارا تو تھراوا گر جاوے گا۔"

آج سے ستر سال پہلے دنیا بہت اداس و پست تھی۔ چنانچہ بولی کا یہ ہولناک خواب سن کر میرا حلق سہم گیا۔ بھری پر پٹائی دیکھ کر بولی

بولی "پراتے ٹھہر کر کیا بات؟"

میں نے کہا "گر کیسے نہ ہو؟ میری سڑیوں کا تھپے نہیں معلوم کہ کاسنی رنگ کا گلاب ان پہاڑی سڑیوں میں آیا ہے؟"

بھری بولی کا چہرہ بڑھ گیا۔ "ایسا؟ پھر کیا کرو گے؟ کاسنی رنگ کا گلاب آج رات تک بالوں میں لگانا ضروری ہے۔ ورنہ پھر ایسے

سنگرا تا ہوا گر جاوے گا۔ فرشتے نے یہی کہا تھا۔"

یہ معلوم نہ ہونے سے تھراوا کہہ روئے گی۔ "میں نے اس کا سراپے بیٹے سے لگا لیا اور وعدہ کیا کہ طوائف کے علاقوں کے تمام باغوں

میں شجر کے باغیچوں کو کھجور کا دھوکا دیں کہ ان کی طرح اسے دستاویز کر کے کاسنی رنگ کا ایک گلاب لے آئیں۔"

بھری بولی نے اپنے لیے بال کھول کر جانے سے لیے دھننے پر پہنچی گئی تاکہ گلاب کے آگے سے پہلے بال سنوار لے۔

میں پر پٹائی کے عالم میں اسی وقت کاسنی گلاب کی حاش میں لٹک گیا۔ شجر کے ہر باغیان سے ملا۔ گر ایک ایک لے کہا کہ اس علاقہ میں

کاسنی رنگ کا گلاب کبھی نہیں مل سکتا۔ پھر پھر واپس ہو کر میں حاکم خیر کے باغیان کے ہاں گیا۔ اپنی ضرورت اس کے آگے کہی۔ وہ بڑا ہی

سلاک آ رہا تھا۔ سوچی کر بولا "کاسنی گلاب ہمارے باغ میں ہے تو۔ پر اس کی قیمت چھ اشرفی سے کم نہیں۔"

میں نے چھ اشرفی اس کی آغوش پر رکھ دیں اور کاسنی گلاب لے کر حلالی غول گھر پہنچا۔

بھری بولی کاسنی گلاب دیکھ کر باغ باغ ہو گئی اور سنگرا کر بولی۔ "اگر آج میں کاسنی گلاب بالوں میں نہ سنوار سکتی تو جانے ہم پر کیا

مصیبت آتی۔"

میں نے کہا "اسے فوراً بالوں میں لگاؤ۔"

یہ نہ ہائے اس نے کس خیال سے کہا "میرے بال گھیلے ہیں ابھی میں نہ لگاؤں گی۔ جب رات شروع ہوگی تو لگاؤں گی۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک بطوری صراحی میں پانی بھرا اور پھول کو ہاتھ میں دیکھ کر تادہ ہوا کے خیال سے صراحی اور بچے میں رکھ دی۔ میں

دن بھر گلاب کی سڑیوں میں اپنے کام پر نہ جا سکا تھا۔ دکان پر جا بیٹھا۔ رات کے وقت جب گھر واپس آ رہا تھا تو میرا پرانا دوست بھری مجھے

بہرے بھر کے قریب مل گیا۔ اسے میں نے ادھر کی بھلتوں سے نہ دیکھا تھا خوش ہو کر گلے سے لگا لیا۔

"میں تمہارے ہی ہاں گیا تھا، تم نہ ملے تو جاؤں ہو کر وہاں آ گیا۔"

اس نے یہ جملہ غم بھی نہ کیا تھا کہ بھری نظروں کی حاکم کے کان پر نہ گئی۔ میرا خون بھری رنگوں میں جم گیا۔

میں نے باجھت پر چھا "بھری یہ کاسنی گلاب تمہیں کہاں سے ملا؟"

بھری ہنسا خوش تھا۔ نہیں کر بولا "کیوں؟ تمہیں کیا لگتا ہے ابھی میری جھوٹے گلے تھا دیا ہے۔ ایسا ہی ہے۔"

میری آنکھوں کے لئے اندھیرا چھا گیا اور میں لڑکھڑاسا گیا۔ وہ خواب تقدیر کا فرشتہ اس کی پیش گوئی اسب جھوٹ تھا اچھل چری کی جہاں کا کوئی کھانے کے لئے میری پوری نے یہ یقین جھوٹ تراشا تھا۔ ہائے خالم زندگی انگلیں زدگی!"

3

میں غصہ میں کاجتا ہوا گھر پہنچا۔

مجھے دیکھتے ہی میری پوری دوڑنی دوڑنی آئی، اور اٹکے آلود آنکھوں سے پوئی، "السن، بد بختی دیکھو کہ وہ پھول غائب ہو گیا۔ اسے لہا میں اب کیا کروں؟ ہم پر ضرور کوئی مصیبت نازل ہوگی۔ ضرور نازل ہوگی۔" میں نے کرن کر کہا، "سوٹ سے زیادہ بڑی مصیبت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ تمہاری موت آگئی۔"

پوری حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ مگر اس وقت مجھے اس کی ایک ایک حرکت سے ہماری چلتی مضبوط ہوتی تھی۔ میں نے ہر چ کر کہا "تمہاری موت آگئی۔ شجر کے فرشتے کی پیش گوئی کے لئے چار ہوا تھا۔"

وہ عجیب ہو کر پوئی "تم کیا کہتے ہو؟ ایسا نہ کہو۔ خدا کے لئے کتنی گلاب کوڑا صوف۔ میں نے سے ہارے کے درپے میں تازہ ہوا کے لئے دیکھ دیا تھا۔ اندر بال سنوارنے کی تھی۔ واپس آ کر دیکھتی ہوں تو پھول وہاں نہ تھا۔"

اس کی ان ہکار باتوں نے میرے تن بدن میں شعلے بکڑا کر دیئے۔ میں نے اس کے نرم بازوؤں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں پکڑ لیا اور اب زور سے دل پر دھکا دیا کہ کر کہا کہ اس کے سر سے خون کا ایک سرخ فورہ پلوت گا۔

راتوں رات میں نے اسے اسی صورت کے سامنے کھدکھار دیا، جہاں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

ایک ہفتہ کی بے انتہاری میں میں گھری طرف لوٹ دیا تھا کہ اتفاق سے میرا دوست حری ہار گئے ایک لگی کے موڑ پر ہی گیا۔ اسے دیکھتے ہی میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

وہ دہس کر بولا "تمہاری آنکھیں ایسی سرخ ہو رہی ہیں جیسے تم خون کر کے آئے ہو۔"

وہ اس طرح باتیں کر رہا تھا کہ وہاں اس کے راز سے ناواقف ہوں۔

میں نے لپک کر اس کی گردن پکڑ لیا اور بولا "بد معاش! تو جانتا ہے کہ میں نے غری نہیں کیا؟ میں اسے لٹکانے لگا چکا ہوں۔ یہ کہہ کر کائنات رنگ کا گلاب میں نے اس کی سر کے کان سے نوح کر دین پر دے مارا اور اپنے پرتوں کی جھوناند حرکت سے مسل ڈال دیا۔ حری آنکھوں میں دھشت کے میرا چہرہ دکھ رہا تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ میں نے اس کی گلو بہ کا خاکہ کر دیا، اور اب اس کا کام تمام کر دیتے پر آ رہا ہوں تو اس نے ایک دلدوز قیچ باری اور کہنے لگا، "کوئی اندیش اور جلد باز تو بد بخت ہے اور وہ گلاب تو میں نے سڑک پر سے اٹھایا تھا۔ میں بازار میں سے گزرا ہوا تھا کہ گلاب کا پھول دیکھ کر اٹھالیا۔ شاید تمہارے ہی درپے سے پیچے کر چلا ہو۔" یوں کہ میری آنکھوں کے اندھیرا چھا گیا۔ ایک ایسا اندھیرا جس نے آج تک دنیا کی یہ نیکیوں کو مجھ سے اٹھل کر کھا ہے۔

"انڈیرے فرشتے کا کہنا درست نکلا۔ میری چوٹی اس راستہ کا سنی گلاب ہے۔ بالوں میں نہ سنوار سکی۔ ہمارا گھر میری بے وقوفی اور جلد بازی کے ہاتھوں چاہو گیا۔"

آج اس قصبے کو ستر سال گزار گئے۔ مگر میں اپنی غلطی پر مادم، اس مٹی کی پرستش کر رہا ہوں۔ جس میں ان صغیر کے مایاں تھے میری محبت دفن ہے۔"

سنگتی سامل سے آگئی۔

اختر اور یونی

نام	سید اختر احمد
لقب نام	اختر اور یونی / ڈاکٹر اختر اور یونی
پیدائش	۱۹ اگست ۱۹۱۰ء پستہ، قصبہ ککو، جہان آباد، ضلع گنیا، (بہار) بھارت
وفات	۳۱ مارچ ۱۹۷۷ء پٹنہ، مدلیں، قاریان (پنجاب)
تعلیم	ایم۔ اے (اردو) کلاں۔ لیٹ

ابتدائی درس والدہ ماجدہ سے حاصل کیا۔ قرآن شریف مع ترجمہ دارودہ دہاری اور انگریزی دیکھوہ کی تعلیم والدہ بزرگوار اور چچا جان سے حاصل کی۔ موگلیہ ضلع اسکول سے ۱۹۲۶ء میں میٹرک کیلئے فرسٹ ڈویژن سے پاس کر کے دہلیہ حاصل کیا۔ ۱۹۳۸ء میں آئی ایس سی سائنس کالج، پٹنہ سے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر کے دہلیہ یاب ہوئے۔ اس کے بعد ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے پہلے سال میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۹ء میں اس کو پاس کر کے ایچ۔ بی۔ بی۔ ایس کے دوسرے سال میں آئے۔ تعلیم ہوئے اور ۱۹۳۹ء سے ۱۹۳۶ء تک خلافت کے سلسلے میں اور یونی میں مقیم رہے۔ صحت یاب ہوئے تو پٹنہ کا رخ میں لی اے (آفروز) انگریزی میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۳ء میں شاندار کامیابی حاصل کر کے گورنمنٹ میڈل لیا۔ ۱۹۳۶ء میں ایم اے (اردو) فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ ۱۹۵۶ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے ڈی لیٹ کی انگریزی حاصل کی۔

حالات زندگی:

فقیر زیدی چاہیجری (سادات) خاندان کے تھے ان کے مورث اعلیٰ سید احمد صوبہ بہار کے اولین خاتج اعلیٰ بہار یونیورسٹی علی گڑھ کے لشکر کے ساتھ ہندوستان آئے۔ چچا آباد پہ گری قند۔ سید وزارت حسین کے پاس، کھڑا دینی مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی مذہبی اور علمی ماحول ملا، جس کے اثرات آخری تک رہے۔ قرآن حکیم کی سورتوں کی تفسیر میں علامہ "الفضل" قاریان میں شائع ہونے

دارے مضامین اختر اور بخاری کے نکتہ نظر کے حاکم ہیں۔ ۲۵ مئی ۱۹۳۲ء کو قصبہ اردل ضلع کیا میں معروف افسانہ نگار خاتون گلبدن اختر سے شادی ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں نئی۔ نئی کے مرض میں مبتلا ہو کر راج پوتہ میں آگئی جینا ٹوریم میں گزارا۔ ۱۹۳۸ء میں پنڈ ناگڑی سے بطور ریٹائرمنٹ ریٹائر ہو گئے۔ ساری زندگی درس و تدریس سے متعلق رہے۔ ۱۹۵۲ء میں پنڈ ناگڑی کے صدر شعبہ اردو مقرر ہوئے، جہاں سے ۱۹۷۳ء میں ریٹائر ہوئے۔

ڈاکٹر سید انور سہا کے انگریزی رسالہ ”ہندوستان ریج“ پنڈ میں ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۶ء کے کام پر اختر اور بخاری نے لکھے۔ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۷ء ”معاشر“ پنڈ کے ادارہ لکھے۔ ادبی، سماجی، مذہبی، دینی موضوعات پر ریج کے لیے دستکروں نگار لکھیں۔ تاہم ہرگز لاؤنڈر ہے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

”جگمگانی“ مطبوعہ ”المیم“ پنڈ ۱۹۳۱ء

اسی زمانے میں یہ افسانہ ”بہارستان“ پنڈ میں بھی شائع ہوا۔

تفصیلی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ ”شہنشاہ صوفی“ (اردو) کتب خانہ اردو لاہور طبع اول ۱۹۳۸ء
- ۲۔ ”مختصر و بکس مختصر“ (انٹیم افسانے) ناشر کتب خانہ اردو لاہور طبع اول ۱۹۳۰ء
- ۳۔ ”کیاں اور کائنات“ (کیاں و طمانے) ناشر کتب خانہ اردو لاہور طبع اول ۱۹۳۱ء
- ۴۔ ”آزادی، رجول و طمان“ (سات افسانے) ناشر اقبال بک ڈپو، پنڈ طبع اول ۱۹۳۳ء
- ۵۔ ”بھٹن اور انکسیت“ (افسانے) ناشر ضلع شاہ آباد سے طبع اول ۱۹۳۷ء
- ۶۔ ”کچلیں اور بال جبریل“ (افسانے) ناشر سماجی بک ڈپو، پنڈ طبع اول ۱۹۶۰ء
- ۷۔ ”صبرت و غیرت“ (افسانے) ناشر فروغ اردو بکسٹو طبع اول ۱۹۶۱ء
- ۸۔ ”قد و نظیر“ (تختہ) ناشر فروغ اردو بکسٹو طبع اول ۱۹۵۶ء
- ۹۔ ”تفحیظ و تکتہ چہ“ ناشر کتابستان، شاہ آباد طبع اول ۱۹۶۲ء
- ۱۰۔ ”موسیقی“ (تختہ) ناشر مام نرائن، شاہ آباد طبع اول ۱۹۶۳ء
- ۱۱۔ ”مکتبہ اقبال“ (کتب) ناشر موسیقی آل حادی داس طبع اول ۱۹۶۰ء
- ۱۲۔ ”مکتبہ نظیر“ (کتب) ناشر موسیقی آل حادی داس طبع اول ۱۹۶۲ء
- ۱۳۔ ”سراج و منہاج“ (تختہ) ناشر موسیقی آل حادی داس طبع اول ۱۹۶۳ء
- ۱۴۔ ”بہار میں اردو ادب کا ارتقاء ۱۹۵۹ء تک“ ناشر بذات خود طبع اول ۱۹۵۹ء
- ۱۵۔ ”آئینہ آرزو“ (شاعری) ناشر حکیم کتب گھر، ادلی طبع اول ۱۹۶۳ء

۱۶۔ ”نزدال کھٹکن“ (انچہ کی ڈرانا)

۱۷۔ ”کاروان“ (کارول)

۱۸۔ ”چٹوں کے دلہن میں“ (افسانے)

۱۹۔ ”اختر اور بیوی کے افسانے“ مرتبہ: ڈاکٹر عبدالمعنی، طبعی اڈال، ۱۹۷۷ء

(پاکستان ۱۵ انسانوں کا انتخاب ۷۷ مصنفات پر مبنی کرتی ہے۔) بہار، کینڈی پبلی

۲۰۔ ”ایک کاروباری“ (افسانہ) کتب خانہ اسلامیہ، حیدرآباد، دکن

نظریہ فن:

ان مشہور کتب کے علاوہ شاعری کا ایک مجموعہ درج ذیل پائی مضامین کے دو مجموعہ مجموعے اور اتحاد ادبیاتی مضامین یادگار چھوڑے۔

نظریہ فن:

”میرے کی شائع شدہ افسانے ایسے ہیں جن میں خود میں بھی چھپا بیٹھا ہوں، اور میرے دوستوں کے نزدیک میں نے ان افسانوں میں خود اپنی رسوائی کی ہے۔ میرے دماغ اور میری شخصیت کی تعمیر میں چند چیزوں نے بہت حصہ لیا ہے۔ اجماعیت، اقبال کی شاعری، انچہ کی افسانہ نگاری، سائنس کا مطالعہ، گھر کی فضا، اختر اکیٹ کا شخصیتی مطالعہ اور میری مسلسل محنت۔“

اختر اور بیوی

(مکمل، ”میرا بھائی افسانہ“ مرتبہ: محسن عسکری)

کلیاں اور کانٹے

اختر اور یغوی

دو تھوڑے تو تھیں۔ گوری، سالوٹی، گوارا اور نگوارا، بعض ان میں دھن کی جاکھن تھیں مگر غصہ سرت کوئی نہیں۔ سورج اسی طرف سے طلوع ہوتا تھا جس طرف سے وہ اپنی سفید ساریں میں بلبوں کی طرح گئے چھبوں کے ساتھ ہاکس اور ڈورینڈا کی بھانڈیوں کی آواز سے نکلتی دکھائی دیتی تھیں۔ ہر صبح آٹھ اور سات بجے تھیں اور ایک نوے ہوئے بارے کی طرح مشرقی افق کی طرف سفر کر جاتی تھیں۔ دو بچوں کے کولہرو، صحت کا، کے عام دلدروں سے تقریباً تین فرلانگ پر آب کی جانب تھے۔ ان میں سے کسی ایک کی ٹائیٹی اسی طرف ہوتی تھی اور بچوں کی جاتی رہتی تھیں۔ یہ چند روز نہ۔ عام دلدروں کے بھی دور رہتے تھے۔ دوم دوم۔ دو بچوں کے کولہرو تو اسے بچکے تھے، ان کی اپنی شخصیت تھی۔ وہ ہسپتال نہیں گھر معلوم ہوتے تھے۔ ساتھ روپے ماہوار ان کا کرایہ تھا۔ دو دو دوسرے کالیں روپے ماہانہ تھے۔ ایک مریض کو دوا کھڑیاں مل جاتی تھیں۔ ایک اپنے لئے ایک چار دار کے لیے۔ تیس سو روپے کے معنی تھے ایک سو بیس سالانہ چار ڈاکرو۔ ایک کمرے میں آٹھ چنگ ہوتے تھے اور جب حیات کے اسب ڈیو کی رفتار میں زیادہ تیزی ہو جاتی تو اسل وادی کے جراثیم کے چند اور نکلا آ جاتے تھے۔ اور کمرے کی آبادی بارود و جنگ نکلتی جاتی تھی۔ دو سو سال کا کرایہ بچوں روپے، ہوا تھا۔ زندگی، موت کے درمیان بھی انسانیت درجوں میں ملتی ہوئی ہے۔ گھر، ہسپتال اور قبرستان، یہ تین گھر ایک، گھر دو اور گھر تین کی تعریف ہوتی ہے۔ کانوں کا قبرستان، گھروں کا قبرستان، شرفاء کے محل اور غریبوں کے گھر حیات۔ ہر شہر اور قصبہ اور گاؤں میں پائے جاتے ہیں۔ صحت کا، اسی کو یہ واقعہ اور اسی کے لئے بے قانون کا پابند۔

بہانوں میں تھے۔ "صحت کا" کے انتہائی بڑی طرف تیس سو روپے کے دلدروں میں یہ بے نرس کولہرو سامنے نظر آ جاتا تھا۔ نوے کے چنگ پر چار سو روپے مریضوں اور بچوں کے درمیان ترسوں کی اقامت کا وہاں طرح دیکھتے تھے جیسے فٹ پاٹھ پر چلتے ہوئے حواریوں کے قریب سے ہوئے بچے پر ستانی دکانوں میں شیشے کی امدادوں کے اندر رکھنے دیکھتے ہیں۔ وہ تو تیس سو روپے کے گھاسا تھیں۔ ان میں سے ایک کی ٹائیٹی ہم لوگوں کے دلدروں میں بھی تھی، وہ بھی تھی۔ اس کے علاوہ کا ہے گا بے کی پارلیوں اور کچھ کوں میں ہم لوگوں کا ساتھ

رہتا تھا۔ ہم سب نرسوں کو اچھی طرح پانتے تھے اور وہ ہمیں۔ ہماری گفتگو کا مرکز صافھی سے متعلق ہوتا تھا۔ ان کی تعریف میں بی زبانیاں، ان کے ہاتھ، ان کی سازشیں، ان کی محبت و طرح۔ ہم وہاں سے تھک کر ٹھیکہ حقیقت طرازی پر اتر آئے تھے۔ ہمارے گریز جذبات روحانی حیثیات کے شربت کو براہ راست کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ ہمیں مصالحوہ اور فحش چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہم میں سے اکلا افراد ایک سال اس دار میں گزار چکے تھے اور پھر ایسے بھی تھے جن کے تین سال قطع ہو گئے تھے۔ امید و ہوسیدی کے تین سال، اربابوں اور غریبوں کے تین طویل سال۔ ایک دفعہ وہاں سے۔ پھر گرفتار ہے ہے، پیچیدہ داخل، حیران ہے اس اور سچی سے نظر آتے تھے۔ چند محنتوں میں یہ پاک موناور ہو جاتی تھی اور نئے بہت جلد پرانے ہی جاتے تھے لیکن ایک دور پرانے بھی ایسے تھے جن کی مستقل باجوڑ اور گھبراہٹ تھی اور نہ ہوتی۔ ہر کیف موت اور بیماری کے درمیان بھی وارو کی مجموعی فضا طوطا گرجتی۔ استراحت کے گھنٹوں کے علاوہ وقتوں میں ہم لوگ کھینچتے تھے، چستے تھے، جملہ باتوں ہوتی تھیں، قہقہے، گتے، نرسوں سے لگاوت ہوتی تھی، اصلی اور نقلی آجیں کھینچی جاتی تھیں، سرگوشیاں ہوتی تھیں اور راز و دریاں بھی۔ ہم وہاں کا ایک خاندان تھا۔ ایک خدہ سب۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوش ہوتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ رنجیدہ۔ دار میں بڑے بھی تھے اور بچے بھی، سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ کم از کم اپنا نظریہ تھا، ہاں استراحت کے وقتوں میں ہماری ہاتھ محبت ٹوٹ کر کھنکھاتی تھی اور ہم میں سے ہر ایک اپنی دنیا میں آتا تھا اور وہاں کر رہتا تھا۔ رات کے آرام کے علاوہ دن بھر میں تین استراحت کے وقفے ہوتے تھے۔ باضابطہ طور پر نرس گنتی بجا کر مریضوں کو پارٹر ہو جانے پر مجبور کرتی تھیں۔ یہ بھی ایک علاج تھا، نیند اور گفتگو ممنوع، زندہ ناٹھنی طرح بچے سے بچنے، جہاں تک ممکن ہو سکے کہ کم روت، کھٹے اور یکسویت سوچنے، مگر وہاں ایسے مریضوں کے لیے مہلک ہے۔

”سوچا مت کیجئے۔ اچھا ہاں“

نرسوں نے بڑے بڑے کچھن مگر بھلا کوئی کیسے نہ سوچے؟ ہم اکیلے چنگ پر پڑے پڑے سوچتے رہتے تھے۔ زندگی کا سوچ، موت کا سوچ، مل کا سوچ، دوق کا سوچ، آرزوؤں کی اوشی، ماضی کا نام، مستقبل کا رنگ، سب سے بڑا حکرونی کی وہ مہیب لنگی جو وہاں کے ہمارے سے بھد کی شکل صورت سے ہی طاری ہو جاتی ہے۔ جسم، محسوس، جنس، ہلک، خود کو غرض صورت اور حقیقت کا چاک مراد اور بے حس ہو جاتا، احساس و ادراک بھٹکانے لگتے ہیں۔ فرد کے وجود کا معلوم ہوتا ہے۔ بے پایاں، بے دماں، دستوں میں تحلیل ہو کے کتا ہو جاتا، سوچنے والے دماغ، دھڑکتے ہوئے دل، حیرتے ہوئے غریب کا قتل اور انسانی کار و فیض کا قتل تصور پھیلاؤ۔ یہ کائنات کا سب سے المناک سانحہ ہے۔ ہم صحت کا وہی خاصہ میں کھینچے ہوئے علامات کو سر کی، تنہائی، ذوقی ہوئی زندگی کے انہام کو سوچ کر رزدا لیتے تھے۔ ہم حیثیات کے بوجھ کو فضا میں پھینک کر اپنی قیعوں کے فن پار چنگ کی پٹی کو بکڑ لیتے تھے تاکہ معلوم ہو، شفا سا چیزوں کی دستی کا ٹکٹل پائے۔ ہم گاہ نماز کے دامن اور جتنی کوٹ کے سانچے کو گنگل سے چھوڑ کر زندگی کی لڑائیوں سے بچا لیتے تھے اور ابھی بے خواب راتوں کی ٹیکہ کا کامل گول کر احساس کو دلچونہ دینے کی کوشش کرتے۔ سر جھانے ہوئے پھول کی طرح پونے خد حال ہونے لگتے تو

”کوہ“ سے ”سے“ صاحب سے کہہ دوں گی، یہ تو سونے لگے ہیں۔“

کی آواز سنائی دیتی اور گاہ گاہ کے کمال و پیوستگی پر ایک آشامی بیت۔ یہ نجات دہندہ آواز میرے سر سے بڑھا اور دیتی تھی۔ ہماری آنکھیں سکرانی ہوئی ہاتھیں۔

”میں تو آپ سے خالق کر رہا تھا صاف۔ سو کون ہے؟“ ”آج آپ بھی سوچا ہے۔“ ”یہ جواب دتا۔“ بھر کی تسکین

دو روز طوع آفتاب کے بعد کروڑوں کی طرح دارو میں آتی دکھائی دیتی تھیں۔ پہلے نسائی آوازوں کے ٹکٹورہ بونے لگتے تھے۔ ہم بڑھکے ہوئے اس طرف دیکھتے۔ صحت کا وہی دہشتوں میں روزانہ کا واقعہ بھی کافی اہمیت رکھتا تھا۔ سفید سارپاں سبز بھانڈیوں سے نکلتیں جیسے نیلے کے چولہا کوڑھی کے منظر پر ہمارے سے نکلتے ہیں۔ بنگلوں کا یہاں قریب تر ہوتا ہوا تاجورا والی لپاؤ دریا۔

پچھلانی چھوٹی اور دو چھوٹی ہم لوگوں کے دھڑ میں آگرتے۔ ہمدوسوں میں بعض انہیں اپنے دامن نگارہ میں لے لیتے۔

چپ کسی کڑی کی ڈیوٹی دیکھا اول کے کوارٹر سے اس دارو میں چلتی تو کھوادی ہوتا کہ جیابے جاحظ پر کر دونا کر دہ ظلیوں پر ہمارو کوئی کی سرٹشیلوں کی جاتی۔

”ہیں“ اے“ دارو میں پہلی تھی۔ کیسے اچھے میں بعض ہیں اے دارو کے۔“ اے“ دارو کے میں بعض تو ہاں کھا جاتے ہیں۔“

”کیسے اچھے ہیں اے دارو والے اپنے لوگوں سے کام کرا لیتے ہیں۔ بے پارے اور یہ لوگ تو جڑ سے سیدھے کرواتے ہیں جیسے میں ان کی لگاٹی ہوں۔“ اور بھی زیادہ دلدوز۔

”گھر میں کرتے ہوں یہ خاصہ۔ شای دکھانے آئے ہیں۔“ اے“ دارو میں نواب صاحب اپنا منہ تک میلا نہیں کرتے تھے۔“

ہمدوسوں میں بعض اقلک (لوگوں سے دھما اول کے کوارٹر کو معاندانہ دیکھتے تھے اور کوارٹر کی سرخ ایشیں خطرہ بھی ہستی نظر آتیں۔ معمر نواب صاحب کی مولیٰ ہاں کا ہواں لڑکا منصف صاحب دھن راج بھی کے بھائی کی تو خدا اور شہوٹی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سو بے کے صدر بہتال کے پر شہزادہ صاحب کا گورا چٹا چٹا ناک و کھنکھارو نظر چارو چارو دارو میں دھما اول کی ساری تھوٹی سل کے کیزوں کی طرح محسوس ہوتی، جو ہمارے پیچھے وہاں کو چھٹی کر رہی ہے۔ ہم ان سب کو اپنے اندر سے نکال کر ٹھوک دیتا جا رہے تھے۔ ٹھوک دانی کے کارہا لگ لپٹ ہیں کھا ہونے کے لیے۔

اس روز بیٹے کے کھانا زیادہ خوش پیلا کرتے اور ہم میں سے کئی کڑی حصار کے خیم کا خطرہ بھی ہاں کر کے دل کا بھڑاس اور چھپے ہوئے جیسی دامن لگاتے تھے۔

داروے دلوں میں بھی چورق اور ان کے دلوں میں بھی۔ ہمارے اندر کوئی نیلا بھی سپر ہی رگ ضرور ایسی تھی جو ترسوں کو ڈھیل کھلے پر آسانی دیتی تھی اور ترس میں بھی بد وقت اپنی شخصیت اور چہرے کے لحاظ کے لیے تیار ہوتی تھیں۔ ان کے تجربے رنگ رنگ کے تھے ماضی کے کہاں خانے میں پتنگروں میں بعض جیسوں! انکو روکھا تو فریچھے ہوئے تھے۔ ترسوں کے دلوں سے ہو کر ایک تاریک روتا تھا جو ان میں بیٹوں اور لڑکوں کو گولہ جتے ہوئے نہیں بھی ہوتا چلا جاتا تھا۔

تیسرے دن سے میں ملوث کہ سکون اور مواقع نہ تھے لیکن اجتماع کا شعور، ہمدودی اور دیتی تھی۔ ”اے“ دارو کے ملاوہ ”اپنی“ دارو اور ”کوڑی“ دارو کے دو میں بھی رہا تھیں جس مگر یہ دوسری رہا بہت دلوں انگیز اور مل پرور تھی۔ یہ ہم اور لوگوں میں کے خلیب و فراز کا فرق تھا۔ پیرانی دارو میں ڈھن کا اونچا بچہ بہت سی نظروں لڑھکتا ہے۔ دونوں ہی دارو تیسرے درجے کے دارو تھے۔ دونوں کا اعتبار دارو اسکا تا رہا رہتے۔ لیکن ہمارے دارو کا ایک ساری ”صحت کا“ میں مشہور تھا۔ ہماری داگ اور لگاؤ میں کھٹے حصار تھی۔

دارو کے اچھائی داخلی طرف اور دوسال کے ایک گھر سے نازک سے لاکے کا بڑھتا تھا۔ اس کے دلوں پیچھے وہاں میں ”اے“ ملی ”تری جاتی

تھی۔ یہ اس صحت گاہ کا مجوزہ تھا اور مثالی نمونے کی حیثیت رکھتا تھا۔ دوسری ڈاکٹر نے اسے حیرت انگیز طور پر عمل کے بل بوتے سے جینا تھا۔ اسے بہت زیادہ آرام کرنے کی ہدایت تھی۔ مگر اکی دو وارڈ کی دلچسپیوں میں کافی حصہ لیتا تھا۔ دوسروں کا کھانا تھا "کھانا گوبال" گوبال پندرہویں سال میں چلی گئی اور آج تھا۔ اس کے ایک جانب ایک اردو لڑکی تھا۔ بہت سی صوفی تازہ۔ تین من اس کا وزن تھا۔ پر یہ خوب ساڑھے تین سال صحت گاہ میں رہ کر بغیر شلٹاب ہوئے چلا گیا۔ اس کے دونوں بھیمڑوں میں بڑے بڑے خار تھے۔ اس کے بڑے ایک بارہ اونچی آبی۔ یہ انکا دیا تھا کہ ہم لوگ اسے سختی ماما کا بہت کہتے تھے۔ تیسری اسٹی ایک سیاہ رنگ کے مریض کی تھی جو چھ تین کے خون میں صرف ایک سیرولر دانہ نمبر میں کھانا چلا گیا تھا۔ وہ کم ختم مگر ذہن دل تھا۔ یہ حضرت عمر کے پتے تھے۔ شاید ان کی صحت دیکھ کر ملک الموت بھاگ کر آیا ہو تھا۔ چھٹا خود میں تھا۔ صحت گاہ میں اپنی شادی کے سوٹ پہن مگر کمر کو سرٹ نکالنے والا۔ میرا دوسرا امیر یہ تھی تھا۔ ایک طرف بھائی کی سادہ سی اور دوسری جانب تکی کا کافر کی رنگ۔ ہم تینوں مل کر اس اشجار کی تصویریں بن جاتے تھے جس کے لیے کچھ ادا رہتا ہے۔ "ب ک کار کوئی نہیں رہے گا۔" اٹھی، مبین تھا اور بے حد جو سن معلوم ہوتا تھا۔ شرعاً بچ نچال، دیباک اور غرض نکم۔ اس کی آمد سے لڑکی وارڈ کا پانچ گراں ہو گیا تھا۔ یہی وارڈ میں مٹوش، بڑوں کا سر کر فٹل تھا مگر اب ذرا بچہ فتم ہوئے سی ساری ترسیں اپنے کو ادا کرتے ہوئے لڑکی وارڈ میں چلی جاتی تھی۔ کڑی اور کھڑی کے لیے سنانے کی چیز کے گرد بی بی دل فوٹ لٹا دیا اور جاتی تھی۔ چھل سال، کیکل صاحب کے ساتھ فکر سے بڑوں کو بہت ہوتے تھے۔ دوسرے وارڈ میں دو وکیل صاحبان تھے۔ ایک لڑکی رکھتے اور لکھیں کرتے تھے۔ دوسرے پیشانی پر پندھ کا ٹیکہ لگاتے اور بڑوں سے فٹش مذاق کرتے تھے۔ جو تین وکیل صاحب کی تاجا ک پیشانی پر پھر کی سرخ بندی بڑوں کے لیے سرمایہ لگتا تھا۔ ان دونوں بڑوں کی ٹھٹھک ایک سی تھی۔ یہ پہلے بیوقوف بن کر اور پھر بھلے سر کر اپنا حق بھالیے تھے اور پھر مصروفانہ انداز میں مذاق کا جواب دیتے تھے۔ ان دونوں کا بھگت ہے لٹا تھا مگر ایک کی فطرت میں پاداشی ٹھنڈا اور دوسرے میں واقفیت لہلاہا۔

تکی کے بائیں پیلو میں ایک نو جوان مصری تھے۔ گوارا رنگ، جس پر سرفی کی چھوٹ تھی۔ مصری بہت ہڈیاتی اور تکی القلب تھے۔ ہمسائی طور پر یہ ہانگی رہے ہوں مگر ذہنی طور پر یہ بالکل کوا رہے تھے۔ اچھوت کنہا کی طرح۔ کچھ تکی اور مصری کو ایک بھیجڑے میں "اسے بی" دی جاتی تھی۔ مصری کونہ مریض تھے۔ "اسے بی" کا کورس فتم ہو چکا تھا۔ ان کے مریض بھیجڑے کو "فریک زو" کی جرأت کے ذریعہ متھل کر دیا گیا تھا۔ جس اور مصری مپنیکل کالج کے طالب علم رہ چکے تھے۔

نویں صاحب ایک اڑتالیس سال کے دھمکی بیسائی تھے۔ یہ تاجیاتی سی عداوت مند فتم کے مریض تھے۔ استراحت کے ٹھکانوں کے اندر اور اس کے اندر ہی وہ فطرتی طور پر کھڑکی کے سٹچ کی طرح پتہ لپٹے بیویا سکا سے ادا کرتے رہتے تھے۔ کوئی جھنجھٹ نہیں۔ کبھی جسم کے آہر مہیات نہیں۔ وہ جب ضرور بنا پٹلے پھر نے پر گھور ہو جاتے تھے تو جوں پہتے تھے کہ "تو یہ قومت بڑا جان است" صولہ وہ اپنے کل ذہن بھیجڑوں کو کم سے کم حرکت اور زیادہ سے زیادہ آرام دینا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک منگھو بھی زبان حلیات تھی۔ ہر وقت، ہر روز، ہر سال ان کی ذہنی گزارتے تھے جیسے مسائل میں غی رہیں۔ "صحت گاہ" میں انھیں ڈھائی سال ہو چکے تھے۔

دسویں سٹی ایک بھائی مسلمان لڑکے کی تھی۔ سولہ سترہ سال اس کی عمر ہوئی۔ سولہ گولی متول سا مگر ان عداوت لڑکا کلام رہانی بھی پر ہو باہر کا مریض تھا۔ کم ختم ختم آواز مگر بسیار رخا اور بسیار غراب۔ اسے ہم لوگ "مرغا" کہتے تھے اور یہ بھو باہر کو "کھٹرس دلی"۔ "مرغا" دھنوں کے علاوہ فتم بھی "تا" تھا۔

یہ دونوں مختلف لمبائے کے لوگ ایک انوکھی تھوڑی کے ڈالیں ایک دوسرے سے وابستہ و چوست تھے۔ نرسوں سے مذاق کے وقت "بھلے ہوئی" بھی ایک دو ٹکڑا انیس ضرور لڑا اس کرہ پا کرنے تھے۔ ویسے بھی وہ ہمارے رونوں سے کافی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ کیتھرین اور ایڈری کی آواز سنتے ہی "سرخ" بھی ہانک دینے لگتا تھا۔

یہ دو تئیس باہن کھلی نوریم تھیں۔ ایڈری تئیس سال کی صندلی رنگ اور لالہ، چھوٹی مگر سسکراتی ہوئی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ وہ بھاتی تھی جیسے "سپ" نازی قدم" چلتا ہے۔ وہ اس کی گردن اور سینے کا "کون ہوتا ہے حریف" سے سرواگن عشق "اسم کا نم" ایڈری بلنڈا، دلوں اور جسم پر لڑی تھی۔ وہ نیم خوش ہنس کی مثال۔ ڈاؤن ہر گیز تھی۔ ایڈری کیتھرین کو کوئی کہتی تھی۔ کیتھرین کچھ سالہ بھر چار جوان عورت تھی۔ سانوا رنگ، چراغات جتنا چمک رہا، اس کے پیچھے اور گھلاؤ کو لے کر اس کی مثال ہندی چال، مسرت ہاتھی کی طرح۔ وہ اپنی نظر میں داخل ہوتی تھی جیسے سمندری سڑک بعد چار چنگے لے گا تھا وہ اس کی طرف آتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بھاری کولہوں کے ٹھور پر ہائی جسم چلتے وقت جھوم سا ہاتھ تھا جیسے کھل دار شاخ مٹنے سے پریکس سی جائے، پھر اس کے کولے پیش وہیں ڈانگا کے ساتھ سے آتے جڑتے جاتے تھے۔ وہ بنے باجو سے ہلکا سا اشارہ کر کے ساری کے چلو میں ٹاؤ پیچھا کرتی وہ چھوڑ دیتی تھی۔ آج کل کی فلمیں میں اس کے سینا بھرتا ہے جسے اور چلوہ نے لگتا تھا۔ کیتھرین عموں تئیس ہی رہتی تھی مگر چاک طور پر وہ خوش دھرم کاربن جاتی تھی اور بھر سمجھ۔ بجلی کا فٹکل پن اور اسٹریٹ ہونے کا لے موج اور موج ہال کی سمجھ رہا، یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کو ناپائا کر کے کامل تر جاتی تھیں۔ اس کی فطرت میں بھرا کال کی گھری تھی۔

ان دو کے علاوہ سات اور تھیں۔ ایک جوڑا تھا، مارا تھا اور لٹھی۔ مارا تھا مارا داندہ دارا لپی چلتی سی عورت تھی، دستوز اور بے لچک۔ بھی اس کے ریح حکومت تھی۔ جس کو مار کے ایک ہی کرے میں دونوں رہتی تھیں۔ وہاں وہ چمک کے کمرے تھے۔ "ملی قوطان" عربی سے کھل لی کر کیاں ملی آٹلاں نے تھے سے چھڑا چھڑائیوں کی "آ" اس جڑے کے "عنف" بھڑ" جیسے پر ہر وقت پہرا تھا، مارا تھا، وہاں مصری سے خوش تھی۔ شریچا بھوت کیا سے مصری۔

ایک جوڑا تھا دو بچے اور بھوں کا۔ سٹوی اور فٹورس۔ دونوں گوری گوری، گھلاؤ گھلاؤ، ماکس پرفرینی اور تئیس، مگر لڑکیاں بھی جانے پر مصر۔ سٹوی اٹلا تھا ضرور خائنی کی ہاتھی تھی جس کی طور سے تو بہت ہی بلند اخلاقی اور اشد ضرورت کے باوجود عورت سے لڑی نہیں، بن سکتی تھی۔ تئیس اور "لا رنی" کالی کالی کھپٹی ناؤں والی تھیں جھیں۔ غرضی اخلاق، کرم فرما، ہر دل عزیز، اپنا پند، تئیس اور جیزو مرکی تھی اور "لا رنی" جوان۔ اس کے چھوٹا کپدکی سٹوئی سی جھپٹی، تاک کے پیچھے پن کا اس حد تک کھلا ضرور دارا کر دیتی تھی کہ اس کی پیچانی کے لگاؤ سے نظریں پھسل کر معد میں غوس سہا سے کھلی پر چم جاتی تھیں۔

نورین تھی لاؤلی۔ دوسرا لاؤلی تھی۔ چھوٹا سا کھلو تا مگر آکھیں، دکھانے اور میں میں کرنے والی گڑیا۔ گھرا سانوا رنگ، بونا ساقد، پانی آنکھیں، کھنڈری، بے پاک، لڑنے والی اور لڑا کر ہنس دینے والی۔ یہ سب سے کم عمر تھی۔ انہار، انیس سال کی ہوئی، کچی تو یہ بد صورت دیکھتی تھی اور کچی گولہ اند تک بھولی۔

"صحت کاہ" ایک دیرانے میں تھی۔ سب سے خرد ایک کا گاؤں ڈچ مکمل پر تھا اور سب سے خرد ایک کا شہر اٹھارہ میل پر۔ "صحت کاہ" کی بس اپنی ایک چھوٹی سی دنیا تھی، الگ جھلک۔ دو ڈاکٹر، ایک کپاؤ ڈاکٹر، ایک دارمگر، ایک انیس دے ہاؤ، دو کلرک، نو تئیس، ایک بھڑن اور

مسٹر آخوندوار اور اسے چند مہتر اپناں اور پچاس کے لگ بھگ ملے دوستی کے مراسم منع اپنے باورچیوں اور چند چارواکوں کے وارڈوں کے چاروں طرف باغ، جنگل اور سرخ سرخ صوم کے بڑے بڑے لیلے تھے کچھ دور پر چھوٹی چھوٹی مگر پرشور پہاڑی ندیاں تھیں۔ بانڈوں اور گرمیوں میں یہاں سریشوں کے آئسوؤں کے ساتھ خشک ہو جاتی تھیں۔

ایک روز میں اورنگی انکس۔ رے کے لیے نرس ڈولی کے ساتھ جا رہے تھے۔ ڈولی منج سے ٹٹکیں اور چڑچڑی تھی۔ بڑے صاحب نے اسے ڈانٹا تھا۔ راستے میں اس نے دود سے بڑے صاحب کو بکھا۔ کہنے لگی

”بڑا بیٹا ہے۔ انکس۔ رے کرنے کے بھانے ڈارک روم میں خود جو چاہے کر گزرتے اور دوسروں سے جتن ہے۔“

ڈولی نے ٹٹے کی بے فیملی میں یہ جھٹکے اڑا رکھے۔ ہم لوگوں کی موجودگی کے احساس نے اسے چٹکلا دیا۔ پردہ داری کے بغیر پردہ بان دیتا ہے نہ کشش دہ کہ بلی۔

”نرسیں اگر ایسی ہوتیں تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ خدا اپ ہم لوگوں کو بھالیتا ہے۔“

بات یہ تھی کہ بڑے صاحب کے ہڈ بڑا چارہ داری کے باوجود نرسوں کی اغراض سے بھٹکے سرنگھی چلی رہتی تھی۔ سمجھتے ہیں ایک روز نرسوں کو ’ڈے آف‘ ملتا تھا۔ وہ تھپا دو تھپو ٹولی کا کر شربیلی جاتی تھیں مگر انجینی ٹھر میں دل کی پیاس بھرتا پلا ڈالیا جتنی کوٹ کی لپس طرے۔ تا تو ہے نہیں۔ نرسیں عموماً وہاں سے دل کا بوجھ اٹھائے ہوئے واپس آتیں بلکہ سینا دیکھنے کے بعد آرزوؤں کی خاکستر کے اندر چند چٹکارہاں اور سنگ اچھیں۔

کارڈ میں دو دوسروں کی فوٹیاں تھیں۔ یہ فوٹیاں زیادہ تر زندگی کی انہوں تحقیقوں اور مکالموں پر چاند اڑا تھیں۔ کیا کرتی تھیں۔ ناش صدائق کو انکسوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی تھیں۔ جب سب مل بیٹھیں تو ہر سریشوں ڈا انگڑوں اور اسے فلف کی باتیں، لطف و طعنا، چھیڑ چھاؤں اور کچی جھومر کے گیت

آئے آئے میں بلی اور پیچھے پیچھے سناں
مردہ کا ہے بھول آئے چارے نند دیا

اور غزلیں۔

اسے عشق عطا کر دے وہ کیف کا چاند

یہاں تو خیر وہ کی بات تھی مگر ایک کے جانے کی تلاش جاری رہتی۔ ہر نرس کی کچی کچی داستانیں تھیں مگر ان سے ان کی طبیعت بھی سیر نہ ہوتی۔ جراثیمی محبت، دیوی اور ماں، بیٹھا ان میں جا گئی رہتی تھیں اور نہ جانے کتنے جانے اور ان جانے روپ بدل بدل کر ان کے جذبوں پر چھا جاتی تھیں۔ سنا کے چپکے آسودگی اور جزیری ہمشیرہ رہتی تھی۔ سردی اور غیر ارادی قوتوں نے انہیں زندگی کی اس سحر میں لا ڈالا تھا۔ لطافت ملی نہ تھی۔ دھچک ہو گئی تھی۔

کچھ عجیب بات معلوم ہو گی مگر یہ بھی ہوتا تھا کہ زس نے مریض کے اعظم میں سہل کے کیزوں کے پائے جانے کے باوجود اس کے لیے اپنے لب و دُعا ساز دُعاں کروئے اور یہ سہلول سہل کے کیزوں کو مکمل طور پر اپنے دل و دماغ میں بسٹم کر جاتے تھے۔ "ثبت" مریض کھنسا سا پ سے زیادہ خطرناک لگے جاتے ہیں مگر یہ دیکھاں بس کھول کر اپنی جاتی تھیں۔ کون ہائے محبت کے امرت میں مے یا آفتق جہاں ہوں کی آگ میں بجھا کر مریض تو زراجم کتنا سے محبت کی دوسں بہا دیتے تھے۔ دوا آتی داتی۔ لی۔ لی۔ لی کا ورد کرتے تھے کئی۔ لی۔ یہ حقیقت ہو جاتی تھی جیسے مے کی تسخیر پر کھو جتے کھو جتے خدا سے حقیقت ہو جاتا ہے۔ ایک بار بھائی حاذق نے اسوں ہم فلاںک میں تخت کھائی کے بعد اعظم پینچنے ہوئے مصری سے سکرانے ہوئے کہا تھا

"بھائی قمری بی اور نے لی زنیس لکھوڑوں سے لطف اٹھاتے ہو، میں صرف لی۔ لی سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔"

میں نے کہا تھا۔ "نیکلی بھی تو ہم قمری۔ یہ داپلی فرمل کے لیے آپ سے استعمال کیجئے" بھائی حاذق جتنے لگے اور انھیں زور سے تکلیف دہ کھائی آ گئی۔

ہم لوگ کرسمس، عید، ہونی سب سچ پا رہنما کرتے تھے لیکن مریضوں کے علاوہ دُعا فرامیض بھی اپنے دیکھو دیکھو بھلا کر فم غلط کر لیا کرتے تھے۔ کئی کی صحت کا دوسں آئے ہوئے ساتوں میں تھوڑا سا کھنسا آ گیا۔ اس طرح سے کے اندر میں اور آتی بہت قریب ہو پئے تھے۔ عورتوں کے دارا دارا لیاں ہیں "سارں کا چھڑا" کہتی تھیں۔ زنا خوار دُعا ہم لوگوں کے دارا کے پہلو میں تھا۔ معلوم سے مصری وہاں برتاؤ کا حکیم کیلئے کے لیے مایے جاتے تھے۔ مسٹر شکر اور مسز اکرام نے ایک دو دھند سارں کے بوڑے کا بڑا بھی بھیجا مگر ہم لوگوں نے تاپ متا بلند پا کر دوسں کو دل دیا مگر جب ہم لوگ ذرا سے کیلئے تھے تو پھر زور دیا۔ کیز۔ مانگنے کی تقریب سے میں لطیف سے مے کا قاش ہوئی بنایا کرتی تھیں۔ کرسمس کے موقع پر ہم لوگوں نے دارا مکیلا۔ زسوں نے بھی شرکت کی مگر یہ کرسمس زسوں کے ہڈیات میں ملوکان پر پا کرتا ہوا آیا۔ کئی ٹوڑی دارا میں سب سے زیادہ خواہصورت اور زنا دُعا دل فوجوں تھا۔ اس کی خواہص میں آ نکھیں چاند شیریں کی طرح تھیں۔ صنف نازک کے لیے دل کی چاس۔ بھانے کا نہایت ہی شاداب ذریعہ۔ ہرزس نے اس کی لانی اور کھلی چکوں کے گلستان میں بنا لی چاقی مگر انٹری کی جڑاتوں کے سامنے جسے سب قمری زسوں کی آرائشیں کر رہی تھیں۔ ہاں نسلی ڈول اس طرح دُعا دے رہی تھے ہندوستان کے ساتھ لگا۔ ذاتی کلمہ کی قمری، ام و رخت پر چڑا کر پھل کترنے والی مگر چوری چوری یہ لے اور وہ بھاگ۔

انٹری سہلہ ہڈیاتی قمری۔ اس کے ہڈیات کی دوسں ماضی، حال اور مستقبل سب بہہ جاتے تھے۔ اس پر محبت کے دور سے چڑے تھے۔ دُعا میں ماہ سے زیادہ دُعا کے ساتھ کئی کوششیں چلائی تھیں مگر مٹی نے اسے رام کر لیا تھا۔ محبت کے دور سے کے وقت بھی وہ کسی کے ہڈیاتی مے سے کھو نکلیں کرکٹی تھی۔ اسے دارا کے صنف صاحب اس پر مرنے لگے تھے۔ انٹری نے سن کا دل بھی نہیں توڑا اور دل ہی کے لیے وہ اپنی بخششوں سے کام بھی لے لیا کرتی تھی۔ "مجھ سے کسی کا زحمتا دیکھا نہیں یا ناگنی اور ایک تم ہو۔"

انٹری نے میرے سامنے ایک دار جو لے کے سامنے میں کہا تھا۔

وہ اپنے سارے مجھ ہم لوگوں سے کہہ دیتی تھی۔ اس کا کوئی راز نہ تھا۔

کبھی نہ انٹری کی ضد تھی۔ وہ مجھ ماہر سے کئی کوششیں کرتی تھی اس کی خواہصات جس پر وہ ہوا کرتی تھیں۔ اپنے کو دُعا نہایت ہی پارما

ہستہ کرنا چاہتی تھی مگر کثاف و کجاب کا آنا کو خود، چٹکیوں سے ادا و خیر و اذیت دیتی تھی کہ اس کی مجبوریات اور کراہی، ملکی اور عالمگیر طور پر بظاہر برسرِ جہا نہیں۔ کیمٹرین نے بھی لگی کوا چٹا دکھانا چاہا مگر لگی اس کی آہستہ خرابی اور راز و راز انعامی از کی غرضاً تاب لاسی نہیں سکتا تھا۔ وہ جیت میں جری تھا۔ جواک انٹری کی ذات میں اس کو وہ ناپہل کیا جو نہ بات کے کھیل میں ہر رکاوٹ کا ٹکنا دیکھتا ہے۔

یہ سب کچھ ہو چکا تھا جب میں پہلی فورم آیا۔ ایک بیٹے کے اندر میں اور نفی کھل مل گئے تھے۔ انٹری میرے سامنے بھی لگی سے ہے کثاف بائیں کرتی تھی۔ مگر کیمٹرین نے جب ایک روز میرا دستہ دوست کرتے ہوئے چپ چاپ اوڑھنے والی چادر کے اندر میرے ہاتھوں میں کواپ کا پھل دے کر آہستہ سے کہا۔ ”ڈارلنگ!“ اور میں نے اس سادہ کات کر لیتی ہے کہ روبا تو کیمٹرین نے مجھ سے ٹکے کئے“ آپ تو بڑے نا کچھ ہیں۔ دیکھئے لگی مجھے بھائی کیسے لگا ہے۔ میں یہ باتیں پسند نہیں کرتی۔ میری بھی تو عزت ہے۔ وہ تو آپ سے ”کیمٹرین نے اپنی علیحدہ، شیریں، لالچ دار اور اذیت دہانہ بات کو مکمل کرتے کرتے راستہ ترک کرنے لگی۔

کرکس کی چادر میں خوب ہوئیں۔ ہم سر بیٹھوں نے رنگ رنگ کے کاتھوں کے ذخیرے اور بھنڈیاں مانگیں۔ ساری صحت کا وہ کی آرائش کی لگی۔ چوہیں دیکھ کر ہر جگہ غولی غم غم کر اٹھنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ ترسین خوشخبر ہونے کی طرف نکلیں کرتی تھیں۔ اس روز بڑے صاحب نے بھی رجاست اور فرض کی ذخیریں ڈھیل کر دی تھیں۔ شام کو ترسین اور راز میں جھڑپ کا کسوف ہے یا سوہنے آئیں کہ وہ لوگ کرکس کا ”فلسفہ“ کاتی ہوئی صبح کا آپ کے دھتے ہی اور راز میں آئیں گی۔ سب لوگ ان کی پذیرائی کے لیے تیار ہیں۔ وہ سب کی سب دردی و طرف کے سینوں، راز و خیر و ساروں میں پہلی جذبات کے ہر جہ سے لاکھڑائی نکالیں دھتے ستار کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ انٹری عروہ و دھتاپ تھی۔ کیمٹرین نے اپنی غرضت کا کثاف الٹ دیا تھا۔ وہ بھی ”کرکس“ میں بے جا چلی اور کون اس شام کو تحریک پر لگی نہ تھا۔ کوڑی اور راز میں کھریا کی کھروڑ لگی۔ سمر وکیل صاحب (جنہیں ہم لوگ ہر مقام کہتے تھے) سے لے کر کامیابی تک لوگ عالم صومعات میں ڈانوا ڈول ہو رہے تھے۔ ہمارے ہاتھ اٹھتے تھے لیکن ہمارے جذبات آغوش داکے ہوئے تھے۔ ہر ای اور راز کے ٹھکانات اور مواقع کھتے محدود تھے ہمارے دل میں اپنی بھینس ہوز ”اے اور“ کی ظلمتیں، انفرادی ٹھکان میں آسودہ ٹھک رہی تھیں۔

”ترسین بڑے صاحب کے یہاں ”کرکس لڑی“ مانے جا رہی ہیں۔ جاگتے رہتا ہاں آؤ ایک کوچہ دار اور اذیت میں لہرا کر دنوں میں اتر گئی۔

”اور“ سے ”انہیں سو کیسے جائیں گے۔ تمام بھی تو جان کے فقی ہو۔ بھلا آج رات بخیر ہی کب آئے گی انہیں؟ ذرا سمر کی کوڑا دیکھو۔“

ایکہ، جرن ٹھیکن ہوئی نے دیکھی ہوئی، گ پھولی ہر طرف کا برقی قاضم کا قہقہہ ترنم ہار اور دھتکی کو پھنڑتی ہوئی سب ترسینوں میں پہلی گئی، جیسے آتش بازی چھوٹ کے رہ گئی ہو۔

دورات قیامت فیر گئی۔ ترسوں کے چلے جانے کے بعد ہم سب لوگ ایک ایک ٹھکانوں ہو گئے۔ میں دیکھ کر کایا رہا ہوں سر میں ہم لوگوں کے اور راز میں داخل ہوا ہاں کچھ کو وہ جیت ہی حدود کرپ کے عالم میں ہاں لیکن ہو گیا۔ اس کا بھیجوا ہیست کیا تھا۔ ہم دوسوں کی نظریں غولی بند ہونا کر ہم آغوش ہوئیں۔ خاصوش، اقام کی حالت میں ہر جاتی آپ جاتی کی جا رہی تھی۔ کچھ دیکھ کر ہم سب محدود اذیت میں چپ چپ سے رہے۔

ہم اس اندوہناک سے بچا جا رہے تھے اور انھیں نام نہاد سارے جہاں کی خوشیاں بھیجیں کہ اپنے دل میں فتح کر لینے کی تمنا کر رہے تھے۔ ”بھروسا“ مطلب کی لٹاؤ پڑھنے چلے گئے وہاں سے انہوں نے کچھ سکون مستعد کیا اور سلام بھیجے ہی آخرب کی امیدوں کے ٹکڑے بچھڑائے۔ ہم سب لوگ ٹوٹ کر ان تصورات سے لطف لیتے گئے۔ فیر گیارہ کے جسم کو پھر سے ہلا کر ہم نے ذرا متفقہاں بکھیر دیے اور اس کی روح خیالات کی اونچائی گیارہوں میں دفن کر دی۔ اس ٹام کو ہم نے اسراریت کے کھیلے بھی بچھڑا دیا۔ سے کھٹکری، بے ہمتی کی ہمتی سے اور برسوں کا ستے پہلو اور اوج سے جو یہ کیا کہ اس کے جسم میں ہلکی ہو کر اس میں ہلکے اور ہم ان میں۔

لطف شب ہی سے ترس کو ہار بیدار ہو گیا تھا۔ چلتے اور بیٹوں کی آواز میں ہماری مضطرب نیندوں کو اور بے کھل کر دی تھیں۔ ابھی رات ہی تھی کہ کمر کا صحن ”نقوش“ اپنا کھلے طور پر لوزی وارڈ کے بہت قریب سامنے اڑا ہوا۔ ہم غصہ کی اور غصہ کے درمیان سے آنکھیں ملنے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ ہم میں سے اکڑے جلد بدلے اپنے اگلے ہوئے ہال اور سٹ کے لیے۔ ترس ہار و نیم پر کرکس کرول کاتی، چلیں کرتی، کڑھاتی پھل آ رہی تھیں۔ وہ آنکھیں جیت کی شعل ہوئی ہواؤں کی طرح۔ شب کی اسٹوں کی مثال۔ بکھیر کے لیے نئے رک گئے، شہداء بیک آہٹ کے اور غصہ کو سستی سے بھر چ ہو کر چھٹکے گی۔ دلوں ہماراں خاموشی کا ترغیم زدہ سکوت کی ادھی لے آغوش و جھوٹ میں قہر قرار دی تھی۔ اس کے قتل کے بعد کوئی بھی کاشن دبا ہے بہت سی صرخیں پڑی ہوئیں، بہت سی آواز ہوئیں جہاں ہوئیں، انکی ارمان پیدا ہوئے اور ان گنت ناز و کناہ صرخت کی دلوں دینے کے لیے دردناک مستحکم سداں میں گئے۔ آج الفاضل خود جراثیم زدہ اور صلا ہوا تھا۔ ہاں سب طرح پر چلنے والی جہاں ہوا میں سرد، بڑھتا ہوا سمی، گہرے نیچے آسمان کے سامنے میں اللہ و خیراؤں کی طرح ظریف تھیں۔ چوب کے دلوں کے کھلے ہوئے تھے۔ میں نے آوازوں کی چند آواز و شہاؤں کی دھم دھن میں مائل اٹھنا دیکھو نہ کہ اپنے بہت قریب پایا اور جب کسی نے ہلک سے روشنی ملا دی تو میں نے دیکھا کہ وہ ابھی تھی کہ درمیان ایک نیند میں قہر کی دھڑکی پیدا ہوئی۔ اس کے علاوہ ابھی کئی قاش بنے اور کھرے۔ نئے پھر بلند ہوئے ہار و نیم ابھی بھاری تھی اور سامنے نے قار کرکس کا سا کھ بھرا تھا۔ سرخ پا جامہ سرخ مہا، نیلی اور پٹی شریفی ڈالیا اور طریقہ لابی اڑھی۔ ہم سب لوگ اسے دیکھ کر بے جا حلقے لگانے لگے ”بھروسا“ نے ہلک کر قار کرکس سے معاف کیا۔ اس پر ایک اور کو بٹا ہوا تکتہ لگا۔ دلائل کے کھلے ہوئے جسے میں ایک مشت ذال دیا گیا۔ قہر و نئے شروع ہوئے۔ ترس اپنا بھلین لیا اس ذریعہ سے ہونے سوز کی طرح ناچ رہی تھیں۔ باری باری اور گاؤں بھروسہ وال کر رہی تھیں۔ ان کی بے پناہ سپردگی ہم لوگوں کو ہوش کر رہی تھی۔ گاتے گاتے ان کے حشر خیز اشارے، ناچنے ناچنے ان کا شانوں پر سرور کا قار آسودگی حاصل کر لینا موت اور حیات کی سرحد میں حار ہا تھا۔ ”بھروسا“ نے ابھی کے لگے سے بندھا ہوا ہار و نیم اتار کر اپنے گے میں ڈال دیا۔ میں نے اونٹنی نے ہار و نیم کو سہارا دیا۔ ہمیں اس گڑھی بھی بھروسہ بھروسہ پر وزن بن جانے کی ضرورت نہ تھی۔ عمر و نکل صاحب نے ہجوم ہجوم کر ٹوٹ دلوں خیریت بجائے اور رات کی بڑیاں ہم غزل الفرواٹ بنی ہوئی لہانے محبت کے جلوں کے خیر مقدم میں عرض نفاذ کر گزشتہ رقص پیش کرتی رہیں۔

کرکس کے بعد حجابات اٹھ گئے تھے۔ سچ کی شریک شرفی بنے ان کے دلوں روشنی کی تصویر بن گئے۔ ہم سر بیٹوں کے جذبات کی ہزین، صحت گاہ کی زمین سے دنیا کو جیت رہے تھیں۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ یوز سے کرکس نے سینا نورم کی بالائی سچ کھڑا کر بھرا نہ طور پر ایک ہی دنیا بادی ہے جس میں ہچکال کی سچ حقیقتوں کے ساتھ کھیلے لٹا کی لطافت اور ہمدردی بھی ہے۔ ہم لوگوں نے ”بھروسا“ کی شادی طریمنا

”قادر کرکس“ سے کردی جو صبح ہوتے ہی چلا بدل کر ”در کرکس“ تھی۔ ”بھڑھان“ اسے پھری گھر میں کے اصول سے پھری ”نورۂ شمس“ کہنے لگے۔ ایفیری ہاضمہ بلور سے پھری سہالی کی گئی اور کیتھریں لگی گئی ”بھائی“ تھی۔ اس فوج کی اور گئی کئی رشتہ داروں کا ٹھکانہ ہوئی تھیں۔ ہم لوگ اس رشتہ داروں کو اس استقبال کرتے تھے جیسے لشکر سے بیٹا نکلیں استقبال کرتے ہیں۔ ہمارے یہ ذاتی ہمارے فریب کی بنا پر قائم تھے مگر زندگی میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فریب حقیقت سے زیادہ حقیقی بن جاتا ہے۔ ہم لوگ کشتی بھٹکے سندھ اور جہاز کی امان میں اس کو سونپ کر طرح ”صحت“ ہمارے کے صحتی جزیرے میں بیٹھے سندھ سے الگ تھکے انتظام کی دلی ہوئی آگ سینوں میں لے کر یہی کھلی اپنی ایک جہانی سی دکان چلا رہے تھے۔ انسانیت کے دل میں کتنی لا اچھا دھرتی چھیرا بھری ہوئی ہے۔

یوں تو پہلے بھی انہیں ہم لوگوں کے لئے "اے آف" میں شہر سے باہر اور میوے سے لے آتی تھیں مگر کرمس کے تھنوں کی رہنمائی اور دل آویزی سے انہی کے دور کی ابتدا ہوئی۔ پہلے باہر میووں نے رومانی کائناتوں کی شکل اختیار کی۔ جذبہ کی حدت نے انہیں حسی رومانی اور محرومیت میں تبدیل کر دیا۔ حقیقت کی ایک سیاہ صورت وہاں ہے جہے صرف سے پانی اور پانی سے بھاپ بن جاتا ہے مگر کچھ لوگوں کے بعد وہاں اور حالت سماج کے پتھر میں چرچہ مچا رہی اور چنگ بن گئے۔ آخر وہ حیات کے لئے روزمرہ کی واقعت کا پسواں بازی ہے۔

گوپاں بہت خوش تھا۔ اکثر کہتا: ”مٹی بوائے حارث میں بہت مٹی لگتا ہے۔ ایسا مظلوم ہے کہ میری پیاری ماں بھی ہو گئی۔“ تب یہی تو اور ہم چاکر پھر اسکول میں نام لکھا لیکن کسے؟ ”اس کی آنکھوں میں زندگی کی آرزو تھی جسکے لکھیں۔۔۔ وہ دارالافتاء حال ہو کر کھتا: ”مگر یہ نائف اور پتھر مٹی روٹی اور کٹڑیا کے گیت۔ طبیعت بہت گھبراہٹ مٹی یہاں سے جا کے ہے؟ چاکر بہت ملے مرے بیٹوں سے کون کھیل کرے گا؟ سانپ سے کون کھیلے گا۔ لاشیڑی بھائی اور کٹڑیا کا کچم کچاں ملے گا؟“ تاہم ان اور چاکر ماں کو چال چ رقت سی طاری ہو گئی۔

لوہی دھڑا کے تعلق میں اجتماعیت کا رنگ چمکے تھا۔ چرمو ہوا اپنی صوفیت اور گوپال اپنے کوشل اداؤں کے باوجود دوسرے دارڈوں سے ہم سب لوگ زیادہ واقف کرتے تھے۔ وہ اصل دہلی کے جلال میں نہائی خطاطوں کا مہارت ادا لی کر سیتے گویا دھانے کے لیے بے یکن تھے۔ چرمو باؤ گویا اپنے باؤ سے بے کسمی کی ڈس اداں پدا آتی تھیں۔ یوحنا کی محبت، ادرج اور کیم کے کھیل یا نرسوں کا ناؤج جرمی زخم پر مرم کا چہرہ نکرتے۔ جس سے غمی غلا ہو جائے۔ ایک روز گوپال پر ہم پر ہم سائل کر دیا جس آ یا۔ اب سے چند روز تک پہلے پھر نے کی اجازت لی تھی اور میر کے بعد اس کی حرارت کا وہجہ جہت تھا۔ ان دنوں وہ بہت مسرور تھا۔ اسے اسے سمجھتی کہ وہ رفتہ رفتہ اسے بھائی جانی کی طرح ایک میل میر کی اجازت مل جائے گی۔ گوپال کو جہر اور پر ہم دیکھ کر کھینچے اور پتی کو کھنٹے چوب ہوا۔ ہر لوگ بھی وہ میل کی میر کے بعد چنگ پر لیٹ کر قہرنا پھل رہے تھے۔ اس کے بعد فرما شام کی استراحت کا کھنٹ شروع ہو گیا۔ ڈولی کی ادرجی تھی۔ سب یک یک کرنے والی لڑکی نے ہم لوگوں کو باتیں کرنے لگیں۔ گوپال کا نازک سا چہرہ ختم ہوا تھا۔ وہ کچھ کہنے کے لیے بے یکن تھا اور ہم لوگ ہنسنے کے لیے مقرر مریض برہان مریض۔ ایک کھنٹ ہم لوگوں نے جب انھیں میں گزرا۔ انہوں نے انھیں بھی اور گوپال جھٹ اٹھ کر میر نے ادرجی کے چنگ کے درمیان آکر ایسا۔ ہم بھی اٹھ بیٹھے۔ ”تو وہ آج روایتی دارڈوں میں بہندہ ہوئے۔“ گوپال رک گیا۔ اس کا چہرہ صراخ ہو گیا۔ ”مہندہ باؤ نے کھڑکے گال میں۔“ اب کے اس نے ہوا انھیں کیا۔ ”انور بھائی پتھر سے مت روئے۔“ گوپال بہت تھا تھا۔ اس کی آنکھیں پر غم ہو گئی۔

ایک گھنٹے کے بعد اسی نے فریفت ہو گئی تو کچھ خیر نہ ہو سکی کہ وہ اس میں آئی، ایک شرمیلی ہوئی اور عظیم۔ وہ سیدھی میرے پاس آئی۔
 ”انور! یہ جانیے، میں نہیں آتی۔ وہ اسے میں میرا رونا دہاٹ ہے۔ میں آپ سے تو جانی کہ اسے نہ سناں گی۔“ یہ کہہ کر وہ

سکرائی، لنگی اور دو چہرہ لکھوں سے اس نے گوپال کو بھانپا۔ کیتھرین نے بھی کارخیز کرتے وقت غائب گوپال کو دیکر لیا تھا۔ یہ غلط آواز نہ تھی جسے
میں کے اعدا اس میں اغرض نے مستحب نہ پائی کہ وہ پہلا دھماکا لے کے لیے نوازش اور شیرینی کی آمیزش کر دیتی تھی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے دیکھ کر ہچکچا تو میں ایک کتاب اٹھا کے بنے بیٹھ گیا۔ کیتھرین چلی گئی۔ اس کے اعدا سائی چھار کاٹنی
تھیں اور ہر روز کو دو مشورہ دہریائی کتاب گورا کر سکتی۔

ہم کو کون میں بات چیت بند ہو گئی۔ ایک روز لنگی بھی بارش ہو رہی تھی۔ ایٹری دوسرے وارڈ جاتے ہوئے میرے پاس آئی اور چپ
ہاپ سے صرف یہ کہ گئی۔

”کوہا کا آج ڈسٹ آف ہے۔ وہ خیر نہیں لگیں۔ اپنے کمرے میں ہمارے سے منہ پلپے دور رہی ہیں۔“

ان دنوں ایٹری بھی اسے وارڈ کے مصنف صاحب سے خوب فتنیں بڑھا رہی تھی میں نے لڑائی نے یہ مشورہ کیا کہ کیتھرین اور ایٹری
ان دنوں ات اور سناٹے کو کھینچ کر اٹھارہ پتھار چاہتے۔ اپنے فیصلے سے ہم نے اہل وارڈ کو مطلع کر دیا۔ یہ بھو بھو اور ہر مقال نے ساد کیا۔ طے
صرف یہ ہو گیا کہ صرف کیتھرین سے مراسم ترک کر دوں اور لنگی صرف ایٹری سے دوسرے مریضیں حسب سابق میل جول جاری رکھیں اور نہ وہ
تیس دنوں وارڈ ہی سے گرج کر جا سکی گی۔

چپ چپ ایک دفعے تک چوری رہی۔ ایک روز ٹام کی میرے پہلے اسنو روم سے لگی گھوب سی ٹیٹی جیتا ہوا تھا اور مجھے نے چاکر
کہنے کا ”سناپ کو مسٹر ویرا روگ کہتی ہے۔ گریٹاپ کو سناپ بھی کہیں روگ پاتا ہے۔ ہارکھیدی کی ہو چلی۔“
ایٹری کی شخصیت کی عموماً وہی لنگی کی خطہ حوالی کو بکھرا جھل گئی۔ میں نے اسے بہت برا بھلا کہا۔ وہ ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بس اٹھا
ہوا ”مصنف بھی کیا یاد کرے گا۔“

میں نے جواب دیا۔ ”مگر تم ایٹری کو اپنا قوت نہ کر سکتے۔“

”کوہا تم نے چپ نہ کر کیتھرین کو اپنا لیا؟“ گلک کر لیا اور کامیاب ٹیٹی پٹنے لگا۔ میں نے واقعیت کا ٹھوس پین اور جذبات چوری کی
نامرادی کا زہر پین ٹھوس کیا۔ بات یہ ہے کہ گوپال کی رپورٹ میرے احساس کی بالائی رخ سے کوئی بچے اتر گئی تھی۔ کرکس نے ہم لوگوں کی
توہمت کو بہت آگے بڑھا دیا اور توہمت کا قیام مطلق نامرادی میں بس گھرا رہا ہے اور میں ادا مثالی بندو بچوں پر اڑ کر غیر معمولی لذت حاصل
کرنے کا جالی۔

”وہیں روز بعد میں لنگی رات کے کھانے سے طارغ ہو کر وارڈ کے گھن کے ایک گوشے میں بچ گھاس کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے۔
پاؤنی تھی جسے گھبراہٹ کے شدید سفید گھوٹے چاند کو یاد کرتے ہوئے نیچے آسمان میں میرے جاتے تھے۔ ہاشمال میں چل رہی تھی جیسے آسمانی
کے خیاالات ماضی کی رنگیں و آواز معنوں میں غلط پرواز حاصل کرتے ہیں۔ ہم لوگ ڈرامائیہ حالات میں ایک دوسرے کے منطقی کے
حقیقی حدود دانہ سوچی چھا کر رہے تھے۔ کیف دار ماحول میں کبھی طبیعت بڑی پیچیدہ اور گہرا ہو جاتی ہے۔

اپنا تک غولگوار ٹیٹی کا ٹھہر ہوا کے فرش پر دھس کر گیا۔

”پانگوں کو دیکھو۔“ کیتھرین کی اونچ وارڈ اور مصنف سے آئی۔

”پاکستان سے بھی بڑے پاک ہیں۔ ہانگ کانگ ہاؤس۔ اچھا یہ سارا کس کا جواز کیا کر رہا ہے؟“ پانچو سے یہ کہہ کر رہا ہے۔ ”یہ انٹری کی شہریت ملی ضرور تھی۔“

میں نے کہا: ”آؤ لٹری انکم سے پرہیز کریں۔“

”واہو! یہی آپ کی؟“ وہ دے دے اور کہتا نکلتا ہوا تھیں۔ ”جی ہاں۔“

میں نے ان کو دیکھ کر ہی میرے پاس گھاس پہنچا دی۔

”دیکھو آج بڑے صاحب نے میرے والدہ کو ”کوڑا کھلم“ کا انکسشن دیا ہے۔ مچلی انکنا چھل گیا ہے۔ بہت بے درد ہے انور۔“ اس نے حرم خاتونوں سے مجھے دیکھ کر کہا۔ میں بے گانہ سا ہار رہا۔ وہ کہہ چکی۔

”اے بھروسوں کی زندگی کیا۔ بھروسوں کے لیے سب کچھ کر دو۔ مگر کبھی کوئی اچانک ہو کر اپنا ہمارا کوئی جینٹل مونا ہے۔“ ٹھنکی تو تجھ ہے مگر میں۔ میرا ایک بڑا صاحب اور ایک سوچا بھائی ہے۔ جو بھی پاسے فی۔ فی میں رہا ہے کہ تو کون و آ تو یہاں دے والا آئے گا۔ بڑے صاحب کہتے تھے کہ کبھی میں نے کسکس بہت کھو دیا۔ اسی لیے تو یہ گھڑی سو نہیں جھوٹے ہیں۔ چل ٹھنکی کو اردو راہ چک دے اسے۔“

واللہ ہی سے طالب ہو کر اٹھے گی۔ تقی نے جو کہ کتب خیر کا بازو دیا تھا مس کیا۔ اس نے مار سے ہاتھ کھینچے ہوئے کہا

”جس وقت پر گمان کی طرح گھونسلانے آتی تھی وہ لکڑی ہوئی ہے تو پھر دوسری مثالیں کیوں بھری ہو چکی ہے؟“

اب باہاگی جو تھقی۔ تیروٹ پر لگا۔ پر سہل نے سکھت کی مہر توڑی۔ اس روز ہم لوگ کچھ دیر تک اپنی اور نرسوں کی زندگیوں کے معلق باقی کر رہے۔ مٹی نے گوبال دانی (ملا) سے گریز ہی کرنا چاہا۔ لیکن پلٹے پلٹے کھتر میں نے انگریز سے کہا:

”مطلق ہے مطلق“ میں مجدد کے مطلق میں ”مزدکس پینٹ“ لگا رہی تھی۔ نہ جانے اس نے کیا کیا انور یاخ سے کہہ دیا۔ ”خواب ہے۔ میں تو اسی وقت اُری تھی۔ یہ مریض بھی عجیب ہو رہے ہیں۔ رسول کی عزت سے ان کے نزدیک کوڑی کی بھی نہیں۔ بات کا آتشجو جانا خوب جا میں بھری ہے جیتے ہوئے کہا“

”اٹکا ہے جی تو بھڑادی کھیں نہیں کر لیتے؟“ دوڑیں خنق ہوئی چل دیں۔ بادشاہ ان کے جانے کے بعد دیوار تک ان کی فحش کی لہریں ہم تک پہنچائی رہیں۔

اس واقع کے تیسرے روز ”بی سٹاں“ صحت کا وہ چل اٹیک، دو صحت یاب ہو چکے تھے، ایک سال کے بعد بڑے صاحب نے انھیں پرنسپل کی اہانتہ اے دی تھی۔ دھست کے وقت اس سٹی نے لڑائی طور پر دینے کی اقل کی۔ ”بی سٹاں“ بھی جیتے ہوئے اپنی ”ہارڈ ٹین“ سے دھست ہوئے مگر جب وہ ہم لوگوں سے دھست ہونے لگے تو ان کی آنکھوں سے آنسو چلک رہے تھے۔ کتنے درد آگیا اور کتنے کفریجی دن ہم لوگوں نے ساتھ گزارے تھے۔ بڑے وکیل صاحب بڑے زکوہ دل شخص تھے اور شکرگزار۔ سب توں دارا سوتا سوتا رہا۔

ہم لوگوں نے چھوٹے وکیل صاحب کو "بڑا مفتاح" منتخب کیا اور صحت کا وہ اپنے زہم و مرحوم کے ساتھ اسی طرح چلا رہا ایک مہینے کے بعد یہ بھی بادل کو لگی جانے کا یہی حال کیا۔ وہ احتیاط جاننا بھی جانتا تھا کہ اسے چاہنا نہیں چاہتا تھے کہ مریم بیٹیوں کی ککڑت سے بوری تھی اور جبکہ بھروسہ۔ ان کو جانتا ہی نہ۔ ہائے اس گرفتار آکا زادہ ہوتا جس کے بازو نوٹے ہوئے ہوں۔ یہ جو باؤساڑے تین سال کے بعد گر جاتے ہوئے ابھک محسوس کر

رہے تھے۔ جانے بلورہاں بھیجڑے کیسے رہیں۔ وہ درمست کے روز بہت دیر تک باخبل چمکتے رہے اور دے رہے۔ سیر کی انہیں اہانت تو تھی لیکن انہیں جانتے ہوئے ان کے پاؤں ڈنگا گئے تھتے۔ صحت گاہ۔ میں صرف ایک ہی رکنا تھا۔ وہ صرف ڈی فرائز مراٹھوں کو ادارے انہیں دے رہا تھا۔ یہ بلورہاں کی پریشانی تھی۔ دیکھ کر اُس کو رکنا منگوانا چاہا۔ ان کو صحت گاہ سے اٹھے ہو کر جانے کی سرت تھی مگر اس سرت کے آئسو کے ہوا ان جہاں مستقل کا خوف بھی انہیں دارا تھا۔ ایک دلہن کروج ہو کر گئی ہونے کے بعد وہ انہیں پرہاز کرنے سے اڑتے تھے۔ ہم وہ انہیں تک انہیں پہنچانے گئے اور سہارا دے کر گاڑی پر چڑھایا۔ ہم سب لوگوں پر رقت طاری تھی۔ وہ انہیں آ کر ہم لوگوں نے دیکھا کہ اُس دارا دارا کر دے دیتی ہے۔ وہ یہ بلورہاں کو باپ کی طرح چاہتی تھی۔

بھانوکہ کے ادارے کے بھی پائے نہ مریش اٹھے ہو گئے تھے مگر جی تو رہا کہ اچھا ہونا بہت سی جگہ حالت ہے۔ کبھی فم دل کو کھاتا ہے اور کبھی دل کو۔ پہلے اس کے کپڑے تار سے بھیجڑوں کو کھارہے تھے۔ وہ اب تار سے بھیجڑے ان کپڑوں کو کھارہے ہیں مگر کارخانہ کب پہنچتا ہے یہ کہ اس ہم لوگوں کے خیالات پر سوار تھا۔ ہم لوگوں نے اس غلطی سے نہایت پائے کے لیے قاتل کے ساتھ قتلہ ادارہ کاری کا سلسلہ جاری کیا۔ نرسوں نے اس کیمبل میں بھی ہماری بہت مدد کی۔ کیتھریں اور ایٹری نے ان دنوں ہم لوگوں پر انصاف و کرم کی بارش کر دی اور دونوں کی سیرت کا ایک خاص پہلو ابھر کر ہمارے سامنے آیا۔ اس کی ابتدا تو اس چاندنی رات ہی ہو گئی تھی۔ میں نے کیتھریں سے زندگی کے عجیب و غریب مسئلوں کے متعلق مشکوکی طرح ڈالی۔ وہ اپنے باطنی سے بڑا مستقل کی طرف سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانا چاہتی تھی۔ ”انور ہاں! سیرہ سال کے سن سے میں مین اسکول میں چڑھ گئی۔ وہاں کی لڑکیاں نرس بننے کو بہت اچھا سمجھتی تھیں۔ وہ آزادی کو پسند کرتی تھیں۔ میں نااہل تھی۔ میں نے چنگ دیک کی طرف رخ کیا۔ بہت برا ہوا اور ہاؤس کیتھریں نے ایک بار کہا۔

”آپ نہ ہو گئی تو مریش اٹھے کیسے ہوئے؟“ میں ہلا۔

”تو کیہ ہماری اپنی زندگی کوئی نہیں؟“ دوسروں کے لیے اچھی بات، یہ دوسرے ہمیں اچھا نہ سمجھیں۔ انور ہاؤس! ہم صرف نرسیں تو نہیں۔ اورت بھی تو ہیں اور یہ ہم دہائیں جسم کے جوہر کے ہیں۔ سب تجھ ان کے سامنے پیش کر دو سب دیکھ اور ادنیٰ سی عزت بھی نہ دیں۔“ کیتھریں بڑا ہی سے کہا تھی۔

”سب تو اپنے نہیں ہوتے۔“

”کون اسب مرہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ سب عورتیں ایک جیسی۔ مگر ہماری مٹھاس ہماری زندگیوں کو ختم کر دیتی ہے اور مٹھاس کے ابا کی مراد جی کی طرح ڈانک داتے ہیں اور اڑا جاتے ہیں۔ انور ہاؤس! جب تک صحت ہے کام کرتی ہوں اور اس کے بعد کب ہوگا؟“ ہماری کراہی کی کراہی۔

”ضرور کر لیجئے!“

”کر لو؟“

اسے ”کرنا“ کہتے۔ ”کہنا“ تھا۔ اس نے مجھے ہمیشہ آپ کہا اور میں نے بھی اسے آپ ہی سے خطاب کیا۔ اس کر دہا کی بے تکلفی میں ”میں ہوں تو کی ہوگا“ کی سرت پوشیدہ تھی۔ ”میں اس کے مریش آپ کی کیا دکر سکتے ہیں؟“ میں نے یہ ہمیں ساجو اب دیا۔

”تم نرسوں کو نہیں سمجھتے اور ہاں“۔ آپ کے بھی ”تم“ تھا۔

کیتھرین بڑی محنت نظر سے لکھ دیکھنے لگی۔ زندگی اور تقدیر کی کہانیاں پہنچا دیکھنا اور استوار استوار کرنے کے لیے۔

کیتھرین اس نرس کی دروازہ شناسا ہوا تھا کہ وہ کبھی کبھار اپنی سہیلیوں کی باتوں کی تاب بھی نہیں لے سکتی تھی۔ جب اس طرف سے باتیں پہنچا کر تھیں تو انگریزی اکتا جاتی تھی۔ لیکن اسی وقت وہ عمارت چڑھتی جاتی پہلو میں چٹکی بھر لیتی۔ وہ صرف گرم جوشی کی ناکل جی مال اس کے لیے سب کچھ تھا۔ اپنی شاہکار میں اس اور مردوں کے ساتھ لگتی نے ایک بار انگریزی سے کہہ

”تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟“

انگریزی نے جواب دیا۔

”کتنے مردوں سے شادی کروں؟ سب ہی تو مجھے میں بکرا کر اپنی من مانی مراویں گی ہرگز پوری کر لی جا رہے ہیں۔“

نرس سولی کو قہقہے اور ادھر کی بات ادھر کرنے کی بہت عادت تھی۔ اس نے ایک روز کیتھرین کے سارے پست کندہ حالات مجھے بتائے اور حال کے نکاح سے بھی آگاہ کیا۔ کیتھرین نے آج تک کسی کو کچھ نہیں دیا تھا۔ وہ صرف لینے کی عادی تھی۔ جہنڈ ”شوش“ دو بیڑوں کی ٹی۔ بی۔ ڈی فراشی مریمین ہر ایک چند سبوں کو باری باری اس نے اپنا ہر دانت دیا تھا۔ ٹھیک کہاؤں تو دیکھیں دے گا، یہ سبکی اس کے گناہوں کو دیکھتے تھے یہ وہ راز داری کی ناکل تھی اور اس وقت کے بعد ایسا کسٹ کر چھوڑتی تھی کہ کسی کو ہلک نہ لگے۔ جہنڈ سے اب تک کچھ سنا تھا۔ وہ ایک صاحب ثروت کا بیٹا تھا۔ مجھے خبر تھی کہ کیتھرین نے اپنا اصول بدل کیسے ڈالا۔ اس نے مجھے بہت سے حقے دیے تھے کبھی کسی چیز کا مطالعہ نہیں کیا اور انگریزی کا تو یہ نہ لکھا کرتی کہ اپنا سارا مطالعہ صرف کر سکتی تھی۔ اس نے مختلف اوقات میں اپنی سونہر جانے کا شلٹ، نرم پالاکے، مظہر، لیمو، لیمو کر دے تھے۔ ایک بار وہ لکھی کا سوٹ خزانے پر صبحی مگر لکھی نے انکار کر دیا۔ انگریزی کی دواں تک۔ لکھی بری ہے۔ اس نے شادی کیا؟ ”نرس سولی“ میں اپنا کو اپنا نصف مشاہیر کہتے ہوئے دیتی ہے۔“

ہم لوگ خبر سے دور ہو گئے۔ تیس سال لکھی اور میں کہتا۔ میں کہتا میں سال کا ایک کر اپنا پٹا لکھا تھا۔ بہت سی طریب۔ وہ مریمین دوستوں کی مدد سے اور نہ جانے کیسے اپنا سلی فورم کا طریق چارہ تھا۔ یہ کیا عکاش تھا کہ لکھی اس کی مدد کرتی ہے۔

لکھی کی حالت میں اس اور میری کی محبت کا احراج تھا۔ وہ میں کہتا کی مرئی جتنے میں اپنے دارلہ جذبات کی تسکین چاہتی تھی۔ نیز حیات کی منزل میں لے کر لے ہوئے وہ کسی مرد کا خا قریب کر لینا چاہتی تھی کہ اسے اپنا سہارا اپنا جذباتی ایک جھٹکے۔ انگریزی نے بتایا کہ جب نرس سے میں کہتا کہ ہمارے میں جھنجھرتی ہیں تو وہ خوش ہوتی ہے۔ شاید اس کی نہایت تکرار شکایت ہی سے وہ ہر کرنے لگتی ہے۔ مگر اس کی جنسیت میں لگت کا کوئی پہلو نہ تھا۔ اس نے میں کہتا کی باتوں کو بھڑکایا دیا تھا۔ اس نے ہر اپنے کو کھانے سے روکی ہے۔ مگر انگریزی اور میں اس آکاش اور پاتال کا فرق تھا۔ انگریزی مردوں سے اس طرح برتاؤ کرتی تھی جیسے وہ ڈھکے ساریاں اور بولتے ہوئے ملاؤں ہیں۔ آج اس کو سینے سے لگا لیا کہ اس کو اپنے گرد لپیٹ لیا۔ اسے سب ساریاں مزہ تھیں۔ لکھی اس کی سب سے بڑی ساری کی طرف تھا۔ لکھی مگر لکھی کی طرف لکھی اور ایک لمحہ کے گرد گھومتی تھی۔

جہنڈ دھمکے پر سلی فورم کا ڈاکٹر نرسوں کا انکس دے سکتی تھی کبھی کر لیا کرتا تھا۔ نرس ڈولی لے لکھے رازدارانہ طور پر بتایا کہ لکھی اور

نرس سوشیلا کے بچھڑوں میں داخل پائے گئے۔ یہی نرس سوشیلا، سلوی کی جگہ پر بلائی گئی تھی کیونکہ سلوی نوکری سے استعفیٰ دے کر ایک مندر دارمندر سے ملائی کرنے والی جا رہی تھی۔ لی نرس دوسری صحت گاہوں میں بھی کام کر چکی تھی اور چار ہجڑہ کر مرے سے کمرے تھی لیکن مسلسل کمر پرانے گئے لوگ ہی رو سکتے ہیں۔ اگلے خاندانوں کے لوگ، جو سے لوگ، خلقت تو پائیل کی بددعا کی تیار رہتی ہے "تمہارے لیے اس زمین پر شخصیت۔ اپنی زندگی کے سارے دن تھے غم و اندوہ کے ساتھ طے لگی۔ اپنے چہرے کے پینے میں شریار ہو کر دو لپیاں کھائے گا۔"

سلوی چلی گئی۔ اب پھر وہ دہلی کی تھی۔ سوشیلا کو بھائی حاذق سے دلچسپی ہو چلی تھی۔ دونوں ہم رنگ تھے مگر بھائی حاذق اس سے پناہ لگتے تھے۔ تاہم ہم لوگوں کی شہ پر سوشیلا کو اپنے ملائے ہوئے کو کہنا کہنے۔ سوشیلا کے اکٹھا رطلوں کا انداز نازا تھا۔ وہ اپنے محبوب کو پیش کی مادی تھی۔ بھائی حاذق مگر چار پارت پر پناہ کرتے تھے۔ چہت کھاتے تھے کبھی سوشیلا کی چنگیوں کی مسکن سے بلجا لیتے اور ہم لوگوں کے نام پر صبر کرتے تھے۔ وہ تو خیریت تھی کہ مریض تھے وہ دوا دھندنا دھونکے تھے۔ یہ حسن انکار دیکھ سکتا رہے صحت آگے بڑھا تھا۔ بھائی حاذق رو ہادی دھانی چن چکا کرتے تھے کہ یہ صحت ان کے سر پر سوار ہی رہا۔ آخر کار دوا خود ہی جتنا دیکھ سے چل رہے تھے۔ اور دوا سے صرف وہی شخص تھے جو متحرک تھے ہوئے رخصت ہوئے۔ شاید ان کی نگاہیں، ہمیشہ اپنی ڈاک خانے کی ٹکری پر تھی، رہتی تھیں اور جو تھوڑا بہت دوا سے انہیں لگاؤ تھا، وہ سوشیلا کی بے پناہ دوا لایوں نے ہر دن کر دیا تھا۔

بھائی حاذق کے بعد غلام مرہائی بھی چلا گیا اور مصرعی بھی۔ مگر مصرعی جوں گئے جیسے کوئی سبز رہ جاتا ہو۔ وہ لوگوں سے رخصت بھی ہوئے نرسوں سے مل کر روئے بھی گھر ان کے انداز میں ایک ایسی بات تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ فرات کے دن لڑا رہے تھیں۔

کلی نو، عجم کا ڈاکٹر، شہناز، عجمہ مرلیوں کو انڈی دارو میں لگے رہا تھا۔ دیکھو یہ وہی تھی اور یہ کہ یہاں کی طوطی، شادند دوا ہات کا اثر کرای فراش مرلیں ایک دوا میں پلے پلے پھر تے بیٹے کیلئے آئی تھیں جانتے تھے۔ زندگی سے دلچسپی خاصاں حیات ہے۔ ارادہ دیتا تھا کہ سب سے زبردست سادہ ہے بدال، اکتانے ہوئے مگر مند مریض اپنی قبر پر لکھواتے ہیں۔ یہی دارو کے چننے، بخشش اور فطیح کی حالت دیکھو ایسی خراب نہ تھی لیکن ان میں حیات کی انگلی باقی نہ تھی۔ ان کا اور دوا مگر مند ہیں کی آغوش میں سو یا ہوا تھا اور اس حسین کردہ کے خیر جنگ حیات نہ ان کی نیکیوں کو اکٹھا تے تھے اور بد چل کو۔ ان کے لیے دوا اب میں لذت تھی اور نہ گناہ میں کیف۔ جب خدا اور شیطان دونوں مرہائیں تو پھر صحت اور عدم بھی ایک دھکی دھکی ہو جاتے ہیں۔ زندگی کا یہ تو تک کہاں!

دارو میں جوئے مریض بھی "سے سوائے ایک کے سب صحت کی طرف تمام انھار ہے جسے گھر انکی وہ ہم لوگوں سے بہت گھلے لٹے نہ تھے۔ ہم لوگ صرف پانچ پرانے مریض رو گئے تھے کٹی، میں، جھونے وکیل صاحب، کو پال اور مارواڑی۔ ہم لوگوں میں اب خطرناکی کیفیت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ صحت کی قربت نے زندگی کی تو قحط اور سٹالینوں کو جو حاکم اپنی محرومیوں اور مارواڑیوں کے احساس کو گھٹا کر تیار دیا تھا۔ آج میں تو جنس مگر دوسرے دارووں سے ہم لوگوں کی رہا بہت بد چل گئی تھی اور نرسوں سے ہم لوگ بے جا غور پر الجھ چکے تھے۔ آج دارو سے لڑائی ہوئی تھی لیکن کوڑا امت نہ تھی۔ آخر میں ان نرسوں کی پاری آئی جو ہم لوگوں سے زیادہ قریب ہو گئی تھیں یا جنہیں قریب ہونے کا سلا تھا۔ ان نرسوں کی آپس میں جو رفاقتیں تھیں اور نہ تو یہاں تک نکلی جاتی کہ پرہی صحت گاہ میں ہم لوگوں کا ایک ہندو بھی نہ رہا تھا۔ اس افیونی کو کسی سے دوا بہت نہ تھی لیکن وہ بھی اتنی پیچیدہ ہوئی نہیں تھی کہ اپنی یا دوسری نرسوں کی تنہیک کے بارے میں سوچنا گوارا بھی

جس کا تاجی گوشہ ذہنی کو کیا نہیں کہہ سکا۔ میں شیشے سے کانپ رہا تھا اور وہ لڑتے لڑتے سسکیاں لے کر روئے گی۔ ایک دوسرے کے خلاف پور نہیں ہوئیں اور یہ ہو کہ سلسلہ کام قطعی بند۔ انٹری اور کیسٹری نے بات کو سلجھا دیا لیکن گرہ نہ کھلی۔

مجھے گہرا درد بھی تو ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں ہونے لگے تھے اور جی تو ایک سال سے کچھ زیادہ ہم دونوں اس نئے ٹکر ٹکر میں درخشاں تھیں۔ وہ اس موسم میں پہلی بار دیکھ سے جا، مناسب تھا۔ کرن کے خون تھوکنے سے ہم لوگ اور گھبرا گئے تھے۔ وہ چٹان پھر بائیں تھا کہ اچانک اس پر عرض نے سٹلے کا ارادہ کیا۔ کرن کیسب طرح ہماری زندگی میں داخل ہو گیا تھا۔ جوئی کے بعد ایک ہفتے تک اسے خون آنا رہا۔ ایک بار ہوا تھا کہ پہلی فورم میں آیا تھا۔ وہ پہنچے ہی فرش رہنے کے بعد اسے یہ کہی اجازت مل گئی تھی۔ وہ کچھ پاؤں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اکثر چپ رہتا تھا اور گاہے معمولی سی بات پر بے تحاشہ ہنسنے لگتا اور وہ اپنے لباس کی طرف سے بے پردہ ہوا تھا۔ وہ کبھی کبھی ایسی باتوں سے چڑھتا جو پرستش و ستائش کے تحت آئیں۔ اس کا کوئی ماموں اسے برا سے روک نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے ماموں کو خط لکھنے سے منع کر دیا تھا اس کا کھور کوئی دیا نہیں تھا۔ یہ ایک وقت تھا۔ وہ اپنے ماموں کو گالیاں دیتا تھا۔ کہتا "اس نے مجھے مرنے کیوں نہ دیا۔" باقی میرا علاج کر کے مجھ میں زندگی کا لالچ پیدا کر دیا اور اب مسلسل خوف، بچنے کی مصیبت، گرنے کا درد، مل کے سر میں کاٹنا، اسکی فورم میں جا کر ہم لوگ کیا کریں گے؟ آرام اور تندرست ہونا؟ آرام و راحت کے کھیلے اصول اپروگرام اٹل سے اور وہ انھیں ناچنے نہ لے لگیں اور وہ دیکھا اور کچھ فکر نہیں لگتا۔ گھر سے بچے ڈاکٹر اچھے بیماری سے پہلے تیار سے پہنچ گری تو رہے تھے۔ سب تو جوانوں کو مل کے کیڑے کا انگشت دے کر مارا۔ اتنا ساق اور کھوکھلا کہ فرض ہے نہ کہ بیماریوں کا علاج نہ کرنا۔ "اس کی آنکھیں شطہ پار ہونے لگیں اور وہ پاؤں کی طرح بچنے لگا۔" بسب میں خون ٹھوکر رہا تھا تو اسے روکا گیا؟ میں دو کھیلے میں سر پہنچتا اور اب کیسے سروں غلط اور شیطان نے مل کر انسان کا ٹنگر کھینچ کر دیا۔ یہ حق انسان خدا اور انسان کے درمیان بن گیا ہے اور زندگی تھوکر کے پاس ہے نہ شیطان کے پاس۔ یہ ہے ہمارے پاس فوڈ کے پاس اور اسکے پاس۔ جو خدا اور شیطان دونوں سے زیادہ طاقتور اور زیادہ خطرناک ہیں۔ مگر انسان اس قابل ہے کہ اس کے جوہر کو ہٹا کر گد جا جائے۔

کرن لکھتے ہیں اور مل گاؤں۔ اے تھا۔ وہ نہ تو مگر کے باقی پر ایمان رکھتا تھا نہ مستقبل پر۔ اس میں خود میت کی روح ملوں کر گئی تھی۔ وہ سب سے فطرت کرتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی فیروز معلوم طور پر وہ بڑی محبت سے گفتگو کرتا۔ چوں کی طرح اور ہاتھیں کرتے کرتے اس پر رفت ہی جاری ہو جاتی۔ وہ حیات کی آغوش کے کسی کھوئے ہوئے سرے ششکے کو دھو کر مٹاتا تھا۔

اب کے جو تین کوٹھن آغوشِ ہوا تو ہم لوگ اس کی چار پرہی کو کھلے۔ ایسی حالت میں بولنے کی سخت ممانعت ہوتی ہے مگر ہم لوگوں کو کچھ کہہ دینا ضرور ہے۔ بولنے کا اور چنگ پڑانے کا فیصلہ کیا۔ پانچوں نے ہر قسم سے کھلے گالے۔

"Kufu Kufu"

وہ دیر تک ہکا بکا رہا۔ صبح کو کڑس دلا رہی اور کیتھرین کی اس روز قہقہہ کی آواز نہ آئی۔ وہ دیر ہوئی ہوئی آئی کہ اسے لگتا ہے۔ ہم کو کس نے بھی بھڑکا رکھا ہے مگر وہ چوتھا بار اسے تو وہ غصوں کی ایک لہر بھی آئی۔ کمرن نسوں سے بہت بڑا تھا مگر اس روز جب کیتھرین نے اسے آ کر اپنے خاص کمرے سے کہا۔ ”کمرن پاؤ!“ تو وہ فوراً اپنے گیارہ اور کیتھرین کو سر سے دیکھنے لگا۔ خدا جانے ان دو لکھنویوں میں کس نے کئی مناس و ملاقات و عروپ اور غلوں گھولی دیا تھا کہ کمرن راس ہو گیا۔

اسراحت کے گھنٹوں کے علاوہ میں اور فنی اس کی ضرورت کرتے تھے۔ اسے برف کے ٹکڑے دیے، بھل کا مرقہ پکا اور چپ چاپ اس کے پاس بیٹھ رہا۔ دریاں خون کے دورے کے وقت وہ بار بار جاتا اور اس پر غرائی حالت سی طاری ہو جاتی۔ وہ اٹھ جاتا اور چنگ چھوڑ کر دوڑنے کی کوشش کرتے لنگ۔ یہ عجیب بات تھی کہ وہ قیصری بات ایک سو تک سٹپا کیتھرین کی ماں لپٹا کیتھرین نے مجھ سے وہ پھر گواہ کر لیا۔

"انور! وہ میں ہر وقت تو نہیں رہوں گی۔ پاگل ہے بالکل۔ آپ کا کچھ خیال کرتا ہے۔ درست چرنے کے بعد کرن کو کچھ لپٹا کیجئے گا۔ مجھے اسی وقت کرن سے بچنے کے کوہ سے کی طرح روایت محسوس ہوئی۔ میں نے کیتھرین کے بچے اور خود میں کچھ محسوس کیا۔ ہم حال میں وہی کرتا رہا کیتھرین نے کہا تھا۔ پتہ نہیں یہ کیتھرین کا پاس تھا یا کرن کا خیال۔ کیتھرین کرن کے لیے غیر معمولی قربہ کا عملی اظہار کر رہی تھی۔

تیسرے روز کرن پہ پتھری کا شدید حملہ ہوا۔ بڑے ڈاکٹر نے اسے۔ اپنی سہیلی سیرا، کلیم، اور امیٹی، مورخہ اور انگریز کے انجینئر اپنے مگر خون نہ تھا۔ رات کو حالت ڈاکٹر ہو گئی۔ میں اور فنی کرن کے پاس تھے۔ اس نے ایک ایک بچل کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ اسے سوائے رقی خدائے کے اور کسی چیز کی بہتارت نہ تھی مگر اسکی رقت اور لپا جت سے اس نے بچلی ماگی کا ہم لوگ اسے نہ مانی چیز دینے پر تیار ہو گئے۔ دارا میں بچلی خدی۔ اسی درمیان میں پھر اس کے منہ سے خون آیا۔ میرے دل میں یہ خواہش سلیہ کا قدر ہر سہارہ دشمنی کی طرح بچل گئی کہ کرن کا خون نہ گھے اور وہ ختم ہو جائے۔ پھر ایک ایک جیسے کسی نے اس روشنائی کو چاڑھ سے اٹھایا ہوا۔ اب بھی ایک کا اسامہ موجود تھا۔ میں نے اس درجہ کو اپنی اہلیت کی لگا ہوں سے چھپانے کے لیے فوراً اپنے جیبوں سے کرن کے لیے اسٹور سے بچلی سٹکوا لی اور اپنے جیبوں سے اسے نکلائی۔ وہ اپنے اپنا صلیت کی نظروں سے مجھ دیکھ کر کہیں۔ تاکہ نہ کر لیت کیا اور آتھیں ہڈ کر لیں۔" تم کہ اسے بہت بہتر ہو۔"

ایک بچے کے ہونے کرن اچھا ہو گیا۔ سبوں کو جرت ہوئی کہ کیتھرین کو جرت کے ساتھ قابل جان قومیت کی سرت تھی۔ وہ اپنے کو کرن کا طرہ حذات محسوس کرنے لگی تھی۔ مجھے کرن سے پوچھنا ضرورت ہونے لگی۔ میں کیتھرین پر فخر سے کہنے لگا۔ وہ تمہیں کہتی اور صرف اتنا کہتی "وہ پاگل ہے۔ پھر وہ کرن۔" اس پکارنے سے مجھے پڑھتی مگر حالت نے مجھ پر یہ عبات کر دیا کہ وہ کرن کو یوں چاہتی ہے جیسے کوئی جوانان مگر شریہ بچے کو چار کرے۔ پھر بھی میرے دل میں عجیب سی کھٹ تھی۔ کرن اچھا ہو کر کیتھرین سے مجھ سے دور اکڑے طرہ ضرورت کرنے کا پرتیلی گویا دکر کے اب بھی وہ میرا اخصانہ شکر پہرا کرتا تھا۔ کہا تھا۔ "وہ میری جان چالنے کی کوشش نہ تھی۔ تمہاری غاصص محبت تھی۔ میں اپنی مسہ مصل۔ آ زاد و صہب مگر چارائی اور اندھی محبت پر میں تمہیں اس محبت کے فطری بھی صاف نہیں کر سکتا۔ تم اور کیتھرین۔" اس غرت کے باوجود کیتھرین کرن کو چاہتی ہی رہی۔ وہ اس کے لیے کڑی حق تھی کہتی۔ "ایسے پاگل مریض کہیں دیکھے ہوئے ہیں۔"

دش کچھ کھانہ اور کیتھرین کو اپنی صلیت معلوم تھی کہ وہ کرن کی بھونا نہ بے لگی کی جو سے اس کی طرف کھینچی تھی اس کی بے پناہ ہر طور ذاتی قومیت کے سبب۔ وہ اب میرے پاس آ کر زندگی، مستقبل، محبت، ملازمت کی پر پٹانیاں اور اپنی خیالی شادی کے متعلق گفتگو کرتی تھی۔ اسے میری ہوا کرن دونوں کی پند پاتی اشتیاق تھی۔ پھر وہ اس کا قبضہ نہ کر پائی اور میں غرت کے کچھ میں کھڑے کی طرح حملہ چار ہا۔

کرموں میں سل کے مریضوں کی اور کھوت ہونے لگی۔ بہت سی در خواہش صلیت کی کی بچہ واپس کر دی گئیں لیکن کچھ تو میں ایسی بھی ہیں جن کی درخواستیں درج نہیں کی جاسکتیں۔ یہاں ڈاکٹر کی شش و کھ کا مسئلہ نہیں بلکہ غاصص انور اور سہارہ کا مسئلہ تھا۔ ایسے طبقے کے پندر لوگوں کو چنگ کی ضرورت تھی جس کے افراد دوسرے طبقات کے سر آتھوں پر اٹھائے جاتے ہیں۔ اسے دارا میں جگہ نہ تھی اور وہاں کے ہتلا

ہوتا۔ وہاں دالوں کی رنگوں میں بھی تو خون تھا۔ تو سٹے سے ہوا کو فوری طور پر ہی وارڈ میں جگہ خالی کی جانے اور پھر موقع ملنے پر ان میں قہقہے
 ہنسنے کو اسے وارڈ میں منتقل کر دیا جانے۔ کوپال اپنی اور جوئیزہ کیل صاحب کو جب قلم ڈالنا شروع کر دیا۔ میں نے کچھ ایسی کھراست محسوس
 کی جس ارادہ ہوا کہ سیرٹیفکٹ سے کہوں کہ میرا نام بھی کات دے مگر جوں کے سینے میں جیٹی نوریم چھوڑنے کے خوف سے لرز دیا اور خود بخاطر
 کی منہ سے دوسرے احساسات پر غالب آ گئی۔

کوپال اضطراب میں ڈاکٹر کے جانے کے بعد بیٹھنے لگا وہ پہلے بہت خوش ہوا پھر اس پر حیرانی اور تذبذب طاری ہوا۔ آخر کار وہ رونے
 لگا وہ میرے پاس آیا اور کہتے گیا۔ ”نور بھائی تم بھی چلو جاؤ مگر جانیں ہم نور بھائی کا دہاں ہے۔ بیٹی کوئی دنے گا؟ چائے میں جاتے یہاں
 سے۔ سناڑے تین برس اسی ادارہ میں رہے۔ ذمہ داری سناڑے اس پر ہو گئے۔ کوپال نے اپنے خاص گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھیں
 اندھ آئیں۔ ”پھر ہم سب لوگ اپنی بھائی، آپ، ایچ سٹاں، ہمرتی، بھائی عاویق، پربھو پرا، نور بھائی، انجیوں آدی پلے ٹھو کے کنارے کمرے
 کا مکان لے کر رہیں۔“ اس نے اس پر وگرام کی دقت کو محسوس کیا اور مجھ کو کے حساس سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں اپنی اور وکیل
 صاحب سب بے چہن تھے۔ میری اور جیٹی کی رفاقت جیٹی نوریم میں مثال کے طور پر مشہور تھی۔ میرا دل بھی ٹھرا آیا۔ ہم سب لوگ ملے جلے، داغ
 اور نیم چاند بات کو رونا رونا اثرات کے تضاد کے یو جھ کے پچھلے سونے آئسو بہا رہے تھے جیسے کئی بیماری چٹان کے سینے سے پانی کا سوتا
 رہ رہا ہو۔ فرسوں نے بھی اپنی خبر کو بے چینی سے سنا۔ ایٹری تو اس اچانک حادثے سے بدحواس ہو گئی۔ یہ تینوں مریض دوسرے وارڈ جا رہے
 تھے۔ ہم لوگ ان بھر ہاتھ کرتے رہے۔ دو کو دور، اسپید اور اسپید خوشی اور موت، رفاقت اور ٹھکانداری، بیماری اور صحت کی باتیں۔ ہم لوگوں میں
 دوسرے امید ہونے کا ایک دوسرے کو خدا بھیس گئے۔ ایٹری وارڈ کے خاندان کا بقیہ بھی ٹھہرا ہوا تھا۔ مریض صحت پا کر جا رہے تھے مگر اس قابل
 جان سرت کے ساتھ ٹکست رفاقت کا جرب غم بھی تھا۔ جیٹو نوریم کی رفاقت بھی مہمان ہنگ کی رفاقت سے کم نہیں۔ کیسے کیسے کا حل ملے گا
 ہم لوگوں نے مل جل کر مقابلہ کیا تھا۔ جیٹی، اسپید جی کو ہم نے ٹکست دی تھی۔ کتنے ارمان، کتنی محنتوں کو ہم سب نے ساتھ ڈالا تھا۔ سرت اور
 فریب جی مریضوں اپنے آسرا شاہیں انارک محسوس، والدہ اریاں، تنہا اریاں، اوردہاں سب یاد آ رہی تھیں۔ موت سے ہم لوگوں نے لڑائی
 جیتی تھی۔ جیٹی ہی تھی۔ جی کے احساس سے امید کی حاصل ہوتی ہے۔ کاش اس سیاہی ایک مغربیت کے آئینہ محلوں کے دقت بھی ہم سب
 لوگ ایک ساتھ رہتے۔ آؤ زمانہ ہر دے کو ٹکھو دیکھو کہ کے پتی ٹھکانے میں ہیں لیجا ہے۔

ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ایٹری جی سے ملے آئی۔ سب تو ہیں آئیں۔ ایٹری سب کے چلے جانے کے بعد بھی وہ تک ٹھہری رہی۔ وارڈ
 کے کچن میں ہم لوگ ساتھ بیٹھے۔ وہ جیٹی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے روٹی پکائی اور باتیں کرتی پکائی تھی۔ جیسے جیٹی کے ہاتھ کیڑا کا ایک جزو ہو
 جسے کسی بچے کے ہاتھ سے جیٹن لے جانے کی دھمکی دی جا رہی ہو۔ وہ ہاتھوں کو اس مردادہ بٹے ہوئے جیٹی کی آنکھیں کھلی نہ چھوڑے گی۔ اس نے
 رخصت ہوتے وقت نہایت چپاک غلوں کے ساتھ کہا۔

”اگر مجھے یہ خیال ہوتا کہ تم جوں ہی میں چلے جاؤ گے تو میں دعا کرتی کہ ابھی جا رہی رہو۔ میں تمہیں چارو کچھ کھتی ہوں مگر تم سے
 چھڑنے کی تاب نہیں لاسکتی۔“

وہ چٹپٹ چلے گئے۔ مردادہ ڈیوٹی اور میں رو گئے تو مریض اور تھے پھر بھی ہم لوگ ملت جہانی محسوس کر رہے تھے۔ میرا دل تو بالکل نہیں ٹک

دائیں آ پائے، شاہ رخ و داہی خون، ٹوٹی ہوئی رگوں کو جوڑ دے، مجھے سہرت ہوئی۔ میں نے زہر سے صبر نہ کیا۔ انسان میں بھی اتنی الوہیت ہے۔ ہر آن اپنے کو کھانا چاہتا ہے اور اس کے لیے اپنا اور دوسروں کا خون بھی بہ سکتا ہے۔ خدا تو صرف دوسروں کا خون بہاتا ہے۔ اپنا خون بہا کر کھاتا ہے۔ زہر حاصل کرنے کا سے تجربہ کہاں۔ یہ تو کھانا اس اس کے بس سے ہا رہے۔

مجھے بھی پار ہمزہ کرنا پڑا۔ وہی باتیں ہوئیں جو کرن کے ساتھ ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر نے مجھے تسکین دینی کہ بھیجیڑے کی حالت بہت اچھی ہے کل کے مریضوں کے ساتھ ایسے واقعات ہوتے ہی ہیں۔ جو انجم غفلت حالت میں رہتے ہیں خود بھی کبھی سوئے سوئے بھی بھیجیڑے کی رگوں کو کھاتے رہتے ہیں۔ کسی رگ کی دیوار پھٹ جاتی ہے اور خون آنے لگتا ہے۔ جہازے ہائے ذہن میں ہا ہمزہ دس ہو چکی ہے، سترے ریٹے نکل آئے ہیں اور عرض قیسے کے اعداد گنیا ہے۔ یہ گزر جانے والا درد ہے۔ گھبراہٹ! "نرسوں نے بھی عیادت کی، جی پہلا پاؤں تھکی ہوئی۔ مگر میں عجیب حالت میں تھا۔

گزشتہ سال جو میرے منہ سے ایک ماہ تک طواری آتا رہا تھا۔ تو میں نے اپنے ہڈ پانی سہارے کے لیے رو مانا، باوجود الطبعاتی عالم کی طرف رخ کیا۔ اب کے میرا دل خرقہ، بالکل خنجر۔ بالکل خنجر زمین کو ب سے زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے یہ فطرت کہ عورت کے جسم میں نظر آتی۔ جسے تانجیز طور پر مجھے حوائی عشرت کی طلب ہوئی مگر خودی نے دل میں جنم سا بھڑکا دیا۔ موت سے قربت ہو تو خدایا دعا ہے لیکن شاید داد کے گھڑ جانے کے احساس نے مجھ میں داد، جسم اور دنیا کی شدید حریصان محبت پیدا کر دی تھی۔ جو چیزیں پھٹ جانے والی ہوں ان سے کتنا بچا ہوا ہے۔ پانچیا اور اشیاء کو کھانا کھاتے پیدا کرتی ہیں۔ فنا کے سبب بلا سے محبت ہوتی ہے اور غیر قابل ہستی بھی اتنی محکم، ورنہ خود غمخیز و مٹیل معلوم ہوتے تھے کہ اس کے وزن اور پانی و حاضرہ عمر ہونے کے تصور سے روح کس جاتی ہے۔ خدا اتنی ہی حقیقت ہے کہ اس اس و ہول کر اپنے کو بکا کرنا چاہتا ہے۔ دنیا کا آئی جانی ہوائی کشش کا باعث ہے۔ اس دوی دنیا کی سب سے حسین ترکیب داد، عورت ہے۔ داد کا فطرت کمال، جسم کے حسن تعمیر کا عروج پیکل۔ اس لیے دوی سہارے میں سب سے بڑا سہارا عورت ہے۔ میں ہمزہ کر لینا لینا فنا کا خیال کر کے وہ بار زلے لگتا تھا جو سامان ہوتا ہیں۔ مجھے اپنی روحانی مثال پسندی سے غرت ہونے لگی۔ میں سوچتا کہ زکا و دبی ہوں۔ بدن کی روایت مجھ دور حقیقت مثالی کو چھوڑ کر جذب و کشش کی لکڑیوں کے جانے میں اٹھنے دیتا ہے۔ یہ مٹی اور نامر دبی کی دلیل ہے۔ مجھے تھی اور اس کی قوت اقدار اہل یاد آتی اور میں اپنی عروسی دکھانا کر دگی کے طم میں غلطاس ہو جاتا۔ یہ فطرت کا کتنا عالم پاک طرفہ کہ اس بھی ہوتی نہ کسری حالت میں مجھے مٹل کے جہاز ہلانے کی شدید تڑپا ہو رہی تھی۔ میں نرسوں کو صرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا بلکہ انہیں چھونا، دھنکا اور پھٹکا چاہتا تھا۔ عورت ہی ایک ایسا عنصر مجموعہ ہے جو سارے عواس کو ایک وقت شاد کام کرتا ہے۔ جس گھڑی میرے منہ سے خون آتا، میں مجھوڑی جھوڑی کے احساس میں لڑتی ہو کر اپنے ہی جسم کو کھاتی پیا اور محبت سے چھوٹے لگتا۔ مجھے اپنا ہاتھ اپنی انگلیاں میرے منہ سے مٹا کر ہوتیں۔ میں نے ان سے اتنی شدید محبت کا احساس بھی نہیں کیا تھا۔ اتنی پار میں نے بھی ان کو اتنے احباب سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں نے جو امید قائم کی تھی کہ میری اس سال میں تو ضرور مجھ سے من ہی جائے گی۔ نوٹ لگی۔ کیسٹریں کس ذہنی کے طور پر دہرا میں آتی اور چلی جاتی۔ اس نے میرا حال تک در وقت نہ کیا۔ صبح تھی نہیں آتی۔ ٹھوکی لگنا نہیں صبح در صبح ہوتی ہیں۔ کیسٹریں کبھی طوور در خود میں تھی۔

ٹھکانے کے خلاف ذہنی جیسے میں نے کیا نہیں کہہ سکتا تھا۔ جس سے میری کوئی توقع وابستہ نہیں تھی، وہ ذہنی نہ ہونے کے باوجود میری

حالت کی خبر سنتے ہی بھاگی ہوئی آئی اور مضطرب مسکراہٹ کے ساتھ ہمیری خبر دیتے دریافت کی۔ میں چپ رہا۔ تنگی سے نہیں فرم سکتی تھی۔ اس وقت وہ چارہ دیکھ کر چلی گئی پھر وہ رہا کرتی رہی۔ مجھے دارا کی بے گانگی سے وحشت ہوتی تھی، لہذا مجھے صاحب کے کمرے میں دھک دیا گیا۔ ایک دوپہر کو ادنیٰ حوازی پر ہی کے لیے آئی۔ میں انتہائی عداوت میں گڑا گیا اور یہاں جہاں سے مجھے روچنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ادنیٰ کا ہاتھ پکڑ کر دقت معافی مانگی۔ وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور صرف اٹھا کہلا۔ "اور صاحب! آپ نہیں جانتے۔"

میں نے اسے آنسوؤں میں باطنی کے کاغذوں کی جھین جھینوں کی اور زندگی کے کیا پ حسن کی چند نورانی نکلیاں نکلی ہوئی دکھا دیں۔ ان کے طور پر محسوس کیا کہ عورت ہی مرد کی ابدیت کا ازیدہ ہے۔ فانی انسان عورت ہی کی مدد اور ریویٹ سے چند قہروں کو ناپید کرتا رہتا رہتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ انسانیت کا کیا نہیں رہتا ہوا مسند عورت کی آغوش سے نکل کر ازل اور ابد کو گھبرے ہوئے ہے۔

آخر کار میں اچھا ہو گیا۔ چند ماہ اور میں نورم میں رہ کر مجھے گھر واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ میں بہت اکتاہٹی تھی۔ ابھر کیتھرین نے مجھ سے رونا کر اپنی زندگی کی بدل لی تھی۔ وہ سب سے تعلقات توڑ بیٹھی تھی۔ اگر وہ مجھ سے باتیں نہیں کرتی تھی تو وہ اور لوگوں سے بھی کر رہا تھا ہی رہتی تھی۔ شاید وہ اپنی زندگی کے تجرباات کو شیریں کے بعد شکست فریب کی نکلیاں برداشت کر رہی تھی۔ اب وہ صرف کیلکٹا میں زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔

دقت کا اکڑنا کچھ آسان نہیں ہوتا۔ درد زندگی میں سب سے بڑا دھکا تھا۔ ہے۔ جڑیں اصل زمین سے محروم کئے جاتے وقت کراسے نکلتی ہیں۔ میری حیات کا وقت بھی صحت کا وہ دین چھ سال تک نصب رہا تھا اور زندگی کے وقت اصحاب کے سوتے رونا تک ہو رہے تھے۔ میں دقت سے پہلے نرسوں سے ملنے ان کی اقامت کاہ کو کیا۔ سب بخشی ہوئی باتیں کر دی تھیں۔ سبوں نے بڑے انس اور محسوس سے میری ہڈ پرانی کی اور محسوس نے فحاشی کا اعتبار کیا کہ اب میں اچھا ہو کر اپنے گھر جاتا ہوں کیتھرین وہاں بھی عاشق رہی۔

دقت کی جگہ کا میٹری نے مجھ سے کہا۔ "تو اب اسات پھر رہتی رہی ہیں اور ادنیٰ بھی۔ آپ کو کبھی لوگ چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جو میری خطرناک حالت میں بھی بے گار رہا ہوا وہ چار کے بچوں میں ٹوٹ جاتے پرتو وہ دھک ہے مگر میرے لیے اس کے آنسو کی ایک لہ لہائی نہیں ہو سکتی۔ ان ادنیٰ سے میں بے حد شرمندہ ہوں۔"

میٹری مجھ سے باتیں کر رہی تھی کہ کیتھرین آئی اور اس نے میٹری کو ڈھکی چھپی رو میں میں جلا لیا۔ ذرا دیر میں وہ مسکراتی ہوئی لوٹ آئی اور جس کر کہنے لگی۔

"ہا چھل لےجے ابو بدلتی ہیں۔"

دبا نے کیوں میں اس واسے کے خلاف اندر چلا گیا اور وہ میٹری اور ادنیٰ میں ہر ماٹوں کا لپیر پکڑ لینے لگی۔

خود دار خود بھی کیتھرین کر رہی پر بھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ اس نے میرا ہاتھ زور سے جھپاتی اور اس میں پکڑ لیا اور اس حال میں میری ایک ٹاکرا کرتا بہت سسکیاں بھر نے لگی۔ اسے اپنے آنسو دکھانے میں بھی مارتھی۔ اب تک اس نے سراٹھا کر کہا۔

"انور ابو! آپ نے اہم نرسوں کو عورت نہ سمجھا۔ میں ایک گڑا یا ایک گڑا یا ایک گڑا یا!"

سعادت حسن منٹو

نام	سعادت حسن
تخلصی نام	ای آ دم (سعادت حسن منٹو منٹو)
پیدائش	۱۱ مئی ۱۹۱۲ء، بہتنام، سہرا، ضلع لودھیانہ، مشرقی پنجاب، بھارت
وفات	۱۸ دسمبر ۱۹۵۵ء، بہتنام، لاہور، مغربی پنجاب، پاکستان
تعلیم	میٹرک مسلم ہائی سکول امرتسر (پنجاب) بخود شی لاہور (۱۹۳۱ء)
	امرتسر لاہور، علی گڑھ اور دہلی کے کثیف سکولوں میں ذریعہ تعلیم رہے۔ میٹرک کا امتحان مسلم ہائی سکول، امرتسر سے پاس کرنے میں چار برس لگ گئے۔ عین بارہ سال ہوئے لورڈ فرکارا ۱۹۳۱ء میں یہ امتحان دوبارہ سوم میں پاس کیا۔ اردو کے بارے میں براہِ عمل چلے آتے تھے، چوتھی بار میٹرک تو پاس کر گئے لیکن اردو کے مضمون میں نکل ہی رہے۔ انٹر کے طالبِ اعلیٰ کی حیثیت سے پہلے ہندو سما کالج امرتسر میں داخلہ لیا اور اس کے بعد ایم اے اور کالج، امرتسر چلے آئے۔
	اظہارِ قریہ کر کے البتہ ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہنچ گئے، جہاں چند ماہ گزارے۔ یونیورسٹی حکام نے انہیں وپ دلی کا مریض قرار دے کر یونیورسٹی حدود میں داخل ہونے پر پابندی لگا دی۔ یہ دیکھ کر سما کالج ("سماجی تحریک") لاہور، جنوری ۱۹۳۸ء ("") کے مطابق منٹو کو یونیورسٹی سے نکالنے کی دہلیان کے انتظامی حکمران تھے۔ کچھ مدت پہلے لاہور طالبِ علم بھی صورتِ علی سہرا اور جھٹری کے ساتھ بھی پیش آئی تھی۔

مختصر حالات زندگی:

منٹو کے والد میاں غلام حسن، حکومت پنجاب کے گلبرگ انصاف میں سب جج تھے اور منٹو کی والدہ سرور بیگم میاں صاحب کی دوسری بیوی۔ پہلی بیوی بھی حیات تھیں اور اولاد نہ تھی۔ مسلم ہائی سکول امرتسر میں زمانہ طالبِ علمی کے دوران رات دن انگریزی ناول پڑھتے،

دوستوں میں چوری کے چاٹ سا کر دیا سمیٹے اور خالص ہمایون نامہ میں انگریزی بولتے تھے۔ چنانچہ اسکول کے ساتھیوں میں اس کا نام ”ٹائی“ چمک گیا۔ اس زمانے میں کثرت مطالعہ نے انہیں کھلی کانٹہ کھا کر سے پیچھے چھوڑ دیا۔ دوست و اداں اور دوستوں سے قرض لے کر یہاں کھینچ لے گئے۔ یہاں تک کہ ایک بار امرتسر میں آئے ناٹھن پر قائم و بیوا بچہ دیکھ کر کے کب مثال سے کتاب چرائی اور پکڑے گئے۔ پولیس کے چاقو تھانے لے جانے لگے۔ ”انکاب دہماد“ کا فخر دیا گیا۔ لوگ کہے کہ جی ملزم ہے، مجھ کو کھانا ہو گیا اور پولیس کو ناچار پیچھے ہٹنا پڑا۔“

اسکول کے زمانے میں اردو کے استاد اور ہمارے ایک صاحب، منو گورو آناٹھ کھڑے، لیکن ”کھے موئی چھے خدا“ والا سوانہ تھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۳ء تک رہا بقول مولانا حامد علی خاں، ”اباویں“ کا روی اوپ نمبر مرقب کرنے کے دنوں میں منو نے انہیں ایک افسانہ ”ریٹش ووش“ کے عنوان سے سنایا، ”موش“ سے مراد ”موچھ“ تھا۔ میٹرک میں تین برس کام کرنے کے بعد چھٹی بار امتحان کے دنوں میں منو بغیر اطلاع کے بھگتی برآمد گئے۔ مسلم پائی سکول، امرتسر کے ہیڈ ماسٹر محمد مرزا خاں (معروف ٹکائی کا نام لگا کر اصرار تھا خاں کے والد) کی نکلاندی پر دایا آئے اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے خلاف منو نے ”حسن بن مہاج کشمیری“ لکھ لیا، وی اور اس پارٹی کی جانب سے شریک و ہمراہوں پر دھم سے لکھے پائسٹر لگائے، جس کا مضمون یہ تھا۔

”ہیڈ ماسٹر محمد مرزا خاں“

ملتان اسلام کے ہونہار فرزندوں کا قاتل ہے۔ وہ ہر وقت طالب علموں کو بے حاکم انہیں برہادر کرنا چاہتا ہے۔ اگر اسے جلد از جلد ہیڈ ماسٹر سے معاف نہ کیا گیا تو انہیں اسلام کے خلاف تحریک چلائی جائے گی۔

کارکنان انجمن حسن بن مہاج

یہ انگ بات ہے کہ اس بار منو امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ میٹرک کے امتحان کے بعد منو چند ماہ کے لیے علی گڑھ گئے اور چپ چاپ امرتسر واپس آ گئے۔ اب انہوں نے غازی عبدالرحمان کے اخبار ”مسوات“ امرتسر کے لیے ترجمہ نگاری کی۔ لیکن زمانہ ہے جب منو نے ہاری ملک کی ہدایت پر ۱۹۳۳ء میں دکن بھوکے کو ”ناول“ ”The Last Days of Condemned“ کا ترجمہ ”ترک شمسیر“ کے نام سے اور آٹھ ماہ کے ایک ڈرامے کا ترجمہ (پاشتراک حسن مہاج) لکھا اور امرتسر کے لیے ”دہما“ کے نام سے کیا اور ان دنوں رات شربت حاصل کر لی۔ پہلے آل انڈیا ریڈیو میں بطور سرپرست ایجنٹ مقرر ہوئے۔ منو گورو کی فلم ”نہارہ“ نکلی اور جب یہ اور نوٹ کیا اور فلم نہ بن سکی تو بھگتی بھگت گئے۔ اس وقت فلم انڈسٹری میں بڑے بڑے گداگ چلے گئے، انہیں کسی نے گلاس ڈالی تو بھگتی ان کی دیکھی رنگ پر ہاتھ رکھا، بھگت وادھنی اخبار ”مسوات“ کے ایڈیٹر ہو گئے۔ فلمی لباس خالوں میں جھانکتے ہوئے اس اخبار کے ایڈیٹر اپنی شہرت کا دھڑلہ دیا کہ ایک طرف ان نے کیا اور اس طرف ان میں ایک جی کہہ کر اضافہ اس وقت ہوا جب ”دھما“، ”کالی طاوار“، ”دہما“، ”کھول دو“ اور ”خطا گوشہ“ سے متعلق فلم نگاری کے الزام میں منو کو انجمن ترقی پسند مسیحیوں سے نکال دیا گیا اور منو سختی سے جلائے گئے۔ منو بھگتی سے آ کر لاہور کی حد امتوں میں حاضری دیتے رہے۔ ۱۹۳۸ء میں اس کی والدہ بھی امرتسر سے بھگتی بھگت گئیں اور بچنے کی حالت زاد کو دیکھتے ہوئے مئی ۱۹۳۸ء میں منو کا نکاح شیمیری خاندان کی ایک سادہ سی لڑکی منو سے کر دیا، والدہ دھرم پتی ۱۹۳۹ء کو ہوئی۔ اس وقت منو ہندوستان سے نکل فلم کشمیری سے منسلک تھے اور ان کے لیے فلم ”پانی گری“ (ریلیز ۱۹۴۰ء) لکھ کر مالی حالت میں بھری لا چکے تھے۔ بھگتی میں وہ کہ بہت عزت پائی لیکن

مالی حالت ہمیشہ انہوں کی ذمہ داری۔ جنوری ۱۹۳۸ء میں لاہور منتقل ہو گئے۔ ان کا تھم دو اس رہا لیکن معاشی مسائل کو حل نہ کئے۔ منٹو کی مخصوص تنگ اور شراب کی بات نے کہیں کا نہ کھار دیا۔ منٹو نے اس مرض کے قضا خانے لاہور میں رہے۔ زندگی کے اس اہم سوز پر گھر پر تلے پر بھی لکھنے نے تھم لیا اور جب یہ عظیم فنکار ہوش میں آیا تو موت نے سہلت نہ دی۔ ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو مرتے وقت منٹو نے اپنی ساری جی صنف سے کہا: ”اب یہ بات ختم ہو جاتی ہے۔“

اولین مطبوعہ افسانہ:

”قراشا“ (افسانہ نامی ”آدم“ کے قلمی نام سے لکھ) مطبوعہ: وقت دوزخ، ”خلق“ امرتسر ۱۹۳۳ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

”آتش پارے“ (آئینہ افسانے)

اردو بک سٹال لاہور، پنجابی پرنٹنگ، طبع اول: ۱۹۳۶ء

پہلی

(۱) نئی قمرک (۲) انتھاپ پنہ (۳) بی آہ صاحب (۴) قراشا (۵) طاقت کا امتحان (۶) دیوانہ سحر (۷) چوری (۸) کتاب کے دیباچے پر ۵ جنوری ۱۹۳۶ء کی تاریخ درج ہے)

”منٹو کے افسانے“ (پانچویں افسانے) ساقی بک ڈپو، علی، طبع اول: اگست ۱۹۳۸ء

(۱) نیا کالونی (۲) قفل (تکسیم گورکی یاد میں) (۳) چھا (۴) نیلی نگر (ایک خطی) (۵) شرابی (ہمارا ہلال نمرہ کے نام) (۶) قراشا (۷) خوش (۸) خوشی (۹) ہاتھ (۱۰) نمرہ (۱۱) ششماں پر (۱۲) طاقت کا امتحان (۱۳) اس کا جی (۱۴) موسم کی شرمٹ (۱۵) خود کشی کا اقدام (۱۶) نیگہ (۱۷) منتر (۱۸) انتھاپ (۱۹) میرا اور اس کا انتقام (۲۰) استوائی پانچویں کپ (۲۱) موسم جی کے آنسو (۲۲) دیوانی کے دیے (۲۳) بنگ (۲۴) ڈرپاک (۲۵) اس روپے (۲۶) سسڑی کوٹا۔

(جد کے ایڈیشن میں سے چھا، شرابی، قراشا، طاقت کا امتحان، خود کشی کا اقدام، انتھاپ اور استوائی پانچویں کپ خارج ہو گئے اور ان کی جگہ ”پچاس“ اور ”چھانو“ نے لے لی۔

”دھواں“ (پانچویں افسانے اور ڈرامے) ساقی بک ڈپو، علی، طبع اول: ۱۹۳۷ء

(۱) دھواں (۲) کھیتوں والا سانپ (۳) انوکھا پنجا (۴) نامکمل تجربے (۵) قبض (۶) ایک نرگس کی آنکھ (۷) وہ خط جو پست خد کے گئے (۸) سمیری کی ڈلی (۹) باقی جلوس (۱۰) نکون (ڈرامہ) (۱۱) سمیرہ (۱۲) ترقی پنہ (۱۳) نیا سال (۱۴) چھوٹے دان (۱۵) چوری (۱۶) کام (۱۷) دیوانہ سحر (۱۸) کافی طوار (۱۹) لائیں (۲۰) نکھر (ڈرامہ) (۲۱) پہلوں کی سادش (۲۲) گرم سوٹ (۲۳) میرا منتر (۲۴) چھانی کا سبب۔

ادارہ اشاعت اردو پبلیکیشنز لاہور

(سات انسانے، ایک لیلیائی ادا، ایک فوجی ہارٹنگ ڈرامے)

(۱) بلاؤز (۲) شیر (۳) سرفرا (۴) آم (۵) خونی تھوک (۶) مسز ڈی سٹوا (۷) غسل خانہ
(ظفر رازدار لاہور نے اسی مجموعے کو ”ایک مرد“ کے نام سے شائع کیا ہے)

”لذت رنگ“ (تین طمانے)

نظارہ لاہور

طبع اول: ۱۹۴۷ء

(۱) بو (۲) دھواں (۳) کافی طور

(ایک ایچ بی ٹی کتبہ جدید دہلی نے بھی شائع کیا ہے)

”پتھر“ (طمانے)

کتاب پبلشرز، ممبئی

طبع اول: جون ۱۹۳۸ء

(۱) ایک عدا (۲) ڈھارس (۳) چھ (۴) چنے سے لکڑ (۵) سس لین والا (۶) بابہ کوئی نامہ (۷) میرا نام راجا ہے
(۸) بھاگی (۹) پانچ دانہ۔

”ظفر اکبرشت“ (آٹھ انسانے)

کتبہ جدید، لاہور

طبع اول: ۱۹۵۰ء

اجتاد میں ”زمت سرور شمس“ انسانی صفحات کا دیباچہ

(۱) لطفاً کرشت (۲) کوئی (۳) زمت خود بخود کے پھول (۴) ساز مجھے تین آنے (۵) بیرون (۶) غورشت
(۷) پاسٹ (۸) شادرا

(یہ کتاب کتبہ نو دہلی نے ۱۹۴۷ء میں شائع کی ہے)

”نیل بوتھیں، خالی ڈبے“ (تیرہ انسانے)

کتبہ جدید، لاہور

طبع اول: ستمبر ۱۹۵۰ء

(۱) خالی بوتھیں خالی ڈبے (۲) سہائے (۳) ٹوٹو (۴) آرام نکلاؤں (۵) بسم اللہ (۶) لگی آواز میں (۷) شائق
(۸) خالد مہاں (۹) بدوقتیں (۱۰) مجھ کا ماضی (۱۱) سادہ کاپی (۱۲) کائناتیں (۱۳) ب کا ظامہ

”نفرود کی خدائی“ (چار انسانے)

نظارہ لاہور

طبع اول: ۱۹۵۰ء

(۱) کھول دو (۲) سودا کے لیے (۳) اورنگ (۴) بد قیصر (۵) موت کے لیے (۶) ہارنا چاہ گیا (۷) شیر آیا، شیر
آپاؤ ڈا (۸) شیر میں (۹) میرا مکر (۱۰) شہید مار (۱۱) بی زانی نگم (۱۲) کچھ کھارو۔

”بادشاہت کا خاتمہ“ (ایک آدمی انسانے)

کتبہ جدید، لاہور

طبع اول: ۱۹۵۱ء

(۱) بادشاہت کا خاتمہ (۲) اتنی صاحب (۳) والد صاحب (۴) محبت ذات (۵) عشق حقیقی (۶) کچھ کی رہا (۷) میری
(۸) خود فریب (۹) میری لڑکی (۱۰) نو بھائی (۱۱) انجی ڈاؤ۔

(ایک ایچ بی ٹی کتبہ نو دہلی نے بھی شائع کیا ہے)

”چنچہ“ (تو انسانے)

کتبہ جدید، لاہور

طبع اول: نومبر ۱۹۵۱ء

(۱) چنچہ (۲) گر کچھ ٹکڑی دیتے (۳) آخری طبعوت (۴) جھوٹی کہانی (۵) نڈال کا کتا (۶) ۱۹۱۹ء کی ایک بات (۷) چھ

(۸) مکی (۹) مکی

- ۱۲ "سزک کے کنارے" (گیارہ افسانے) نثار احمد لاہور طبع اول: ۱۹۵۳ء
- (۱) شادان (۲) پتھر کا رملی (۳) نفسیاتی معاملہ (۴) بنو تری (۵) لطف (۶) سزک کے کنارے (۷) سراج (۸) سوکھنڈل پادکامپ (۹) خدا کی قسم (۱۰) سواٹل (۱۱) صاحب کرامات (۱۲) ایک ایسے بچے کا تعلق آفس میں بھی شائع کیا ہے
- ۱۳ "سزکوں کے پیچھے" (تیرہ افسانے) نثار احمد لاہور طبع اول: اکتوبر ۱۹۵۴ء
- (۱) لونٹو ٹکڑے ٹکڑے (۲) آنکھیں (۳) ہاؤز خلیفہ جادو (۴) شادی (۵) اللہ کا (۶) کتنی (۷) سرکڑوں کے پیچھے (۸) وہ لڑکی (۹) محمود (۱۰) سب سے پہلی (۱۱) بھگتن (۱۲) سہو بھائی (۱۳) حسن کی تعلیق (۱۴) سٹوڈنٹس (۱۵) اس کتاب کا ایک ایسے بچے کا تعلق مالی پبلشنگ ہاؤس میں شائع کیا ہے
- ۱۴ "پتھر نے" (گیارہ افسانے ایک ڈرامہ) کتبہ چاند لاہور طبع اول: جنوری ۱۹۵۵ء
- (۱) نوپلنگ ٹکڑے (۲) لڑکھو (۳) پتھر نے (۴) بد صورتی (۵) اس کا (۶) بدو پتھر (۷) مسٹر مین الدین (۸) سودا بچے والی (۹) مٹھو کی کہانی (۱۰) سٹوڈنٹس (۱۱) اس کا (۱۲) خود کار میں (ڈرامہ)
- ۱۵ "پتھر چارٹ" (گیارہ افسانے) ظفر بھارتی لاہور طبع اول: ۱۹۵۵ء
- (۱) سونے کی انگوٹھی (۲) آگے والے کا بھائی (۳) مسٹر جیدہ (۴) پتھر چارٹ (۵) قدرت کا اصول (۶) خوشبودار چمک (۷) سٹوڈنٹس (۸) جسم بدو (۹) اب اور کہنے کی ضرورت نہیں (۱۰) درمخت (۱۱) بچے کی بھانجی (۱۲) چارٹ میں اور وہی افسانوں کے تراجم ہیں)
- ۱۶ "برہمن" (گیارہ افسانے) ظفر بھارتی لاہور طبع اول: ۱۹۵۵ء
- (۱) پیتھ (۲) گھوڑا (۳) بھگتن (۴) بدو اور اس کا بھائی (۵) سونچ دین (۶) ایک بھائی ایک داماد (۷) بدو صوبہ کا چاند (۸) بدو بھائی (۹) فرض کی پیتھ (۱۰) بدو اور بھائی (۱۱) برہمن
- ۱۷ "شادی اور عرس" (بارہ افسانے) ظفر بھارتی لاہور طبع اول: ۱۹۵۵ء
- (۱) میرٹھ کی پہلی (۲) شادی اور عرس (۳) پتھر کے کایرش (۴) کاسٹ (۵) بدو کا بپ کی شہت خاں کے گھر (۶) لکھت ہے ایک بدو (۷) جی اکبر (۸) دلدادہ (۹) سوچا (۱۰) نوپلنگ کا شیری (۱۱) بدو کا بھائی (۱۲) بدو اور بھائی
- ۱۸ "ریتی پتھر اور رتی" (دس افسانے ایک ڈرامہ) ظفر بھارتی لاہور طبع اول: ۱۹۵۵ء
- (۱) بھگتن (۲) پتھر (۳) رتی کا پانی (۴) پتھر کے (۵) رتی پتھر (۶) کافہ تم (ڈرامہ) (۷) افسانے شمس (۸) انعام پتھر (۹) لکھت (۱۰) سٹوڈنٹس اور لکھت (۱۱) تھیں شمس پتھر
- ۱۹ "پتھر کی" (دس افسانے) کتبہ چاند لاہور طبع اول: س۔ن
- (۱) بدو کی (۲) پتھر (۳) بدو کی (۴) بدو اور اس کا بھائی (۵) بدو کی (۶) بدو اور اس کا بھائی (۷) بدو کی (۸) بدو کی (۹) بدو کی (۱۰) بدو کی

زادہ ایک قاصد (۹) شیدا (۱۰) پڑھا کھوس

۲۰

"ایک مرد" (آغا خان نے چار ڈرامے، ایک ٹیٹر)

ظفر بھارتیہ لاہور

طبع اول: س۔ س۔

(۱) ایک مرد (ڈرامہ) (۲) شیرد (۳) بلا ڈ (۴) دو چار سال بعد (ٹیٹر) (۵) آم (۶) تین انگلیاں (ڈرامہ) (۷) مس لڑکا (۸) قتل خانہ (۹) لٹری توک (۱۰) قند (ڈرامہ) (۱۱) سرکاری سٹوڈ (۱۲) قانون کی حفاظت (ڈرامہ) (۱۳) تین تھے۔

یہ مجموعہ مثنوی کتاب "آغا خان نے چار ڈرامے" کا پہلی ایڈیشن ہے۔ اسی کتاب کا ایک اور پہلی ایڈیشن "ایک مرد" کے عنوان سے مکتبہ برادری ترکمان گیت، دہلی نے ۱۹۰۰ء مصلحت کی حفاظت میں شائع کیا ہے جس میں صرف چار ڈرامے اور پانچ ڈرامے شامل کیے گئے ہیں۔

۲۱ "ہندو کے چیمپ" (دس ڈرامے اور آغا خان نے) کل صفحات ۱۷۵ مکتبہ تگین، دہلی

طبع اول: ۱۹۵۳ء

۲۲ "شیرد" (ساتھ آغا خان نے) کتب خانہ آریہ دت

طبع اول: س۔ س۔

(اس کتاب کے کل ۱۳۲ صفحات ہیں۔) اول کتابوں، دہلی

۲۳ "بھڑے" (پانچ ڈرامے) مکتبہ جدید، دہلی

طبع اول: ۱۹۵۳ء

کتاب کے کل صفحات ۱۳۲ ہیں۔

۲۴ "کوچہ نیچا اور دریا" (آغا خان نے آغا خان کے اور مضامین) مکتبہ یکاچ، ٹنکٹو

طبع اول: ۱۹۵۳ء

کتاب کے کل صفحات ۷۹ ہیں۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن گوٹ

اوپ، لاہور نے بھی ۱۹۵۴ء میں شائع کیا ہے۔

۲۵ "تین غیر مطلوبہ کتابیں" (تین ڈرامے) مکتبہ نقوش، چاندنی چوک، دہلی

طبع اول: ۱۹۵۴ء

کتاب کے کل صفحات ۱۰۰ ہیں

۲۶ "چترے" (ڈرامے) ساتی یکاچ، دہلی

طبع اول: ۱۹۵۴ء

۲۷ "مثنوی تین کتابیں" کاروان ادب، دہلی

طبع اول: ۱۹۸۶ء

(مرحب! اکڑاے۔ بی ایشرف، اکڑا اور احمد)

کتاب میں مثنوی خصوصیت اور فن پر مرتبین کے مضامین بھی شامل کتاب ہیں۔ کل صفحات ۳۰۳ ہیں۔

۲۸ "کالی ٹھوڑا" (آغا خان نے) ظفر بھارتیہ لاہور

طبع اول: س۔ س۔

کل صفحات ۲۳۶ ہیں۔

۲۹ "لوڈا آتھیکر" (آغا خان نے اور مضامین) آریہ دت، دہلی

طبع اول: ۱۹۵۵ء

کل صفحات ۲۸۸ ہیں (یہ کتاب گوٹ اوپ، لاہور نے ۱۹۵۵ء

میں شائع کی۔

۳۰	"خج ترش شیریں" (مطالعین اور اساتے)	ادوارہ فروری ۱۹۳۰ء لاہور	طبع اول: س۔ ن
۳۱	"سیا، چاہیے" (السا نے)	کتب چہ چہ لاہور	طبع اول: ۱۹۳۸ء
۳۲	"طایر ہست طایرہ" (السا نے)	ظفر مراد لاہور	طبع اول:
۳۳	"خیر حوالان کے" (السا نے)		
۳۴	"مٹلو کے شامہ و اساتے" (محبوبہ اکرم طبع اختر)	کتبہ علم دار لاہور	طبع اول: ۱۹۸۳ء
	کل صفحات ۲۸۹ ہیں۔		
۳۵	"آڈ" (ارنا)	کتبہ اردو لاہور	طبع اول: ۱۹۳۰ء
۳۶	"سرگزشت سیر" (ارنا اور کٹر جیو کا ترجمہ)	اردو بک شال لاہور	طبع اول: ۱۹۳۳ء
	اس میں دو کٹر جیو کا لکھا ہوا دیا چاہے (۱۵ مارچ ۱۹۳۱ء) مکی ترجمہ کر کے شال کتاب کیا گیا ہے۔		
۳۷	"مٹو کے ڈارے" (ڈارے)	کتبہ اردو لاہور	طبع اول: ۱۹۳۳ء
۳۸	"دلی را" (از اسکرین رائٹر کا ترجمہ با اشتراک حسن مہاس)	مثالی برقی پریس دارالاحرار مدرستہ	طبع اول: ۱۹۳۳ء
	یہ کتاب دوسری بار کتبہ شعروادب، کمن آباد لاہور نے ۱۹۷۵ء میں شائع کیا ہے۔		
۳۹	"صحت پختی" (خاک)	کتبہ پشاور لٹریچر سوسائٹی	طبع اول: ۱۹۳۸ء
۴۰	"گلاب کا پھول" (السا نے)		
۴۱	"باغین کا قرض" (السا نے)		
۴۲	"چشم بردان" (السا نے)		
۴۳	"دلی اساتے" (ترجمہ)	دارالاحرار مدرستہ پنجاب لاہور	طبع اول: ۱۹۳۳ء
۴۴	"گورکی کے اساتے" (انجیکس گورکی کا ترجمہ)	کتبہ شعروادب لاہور	طبع دوم: س۔ ن
	اس کتاب میں مٹو نے دیا چاہے کے طور پر گورکی کی شخصیت اور دل پر ۳۱ صفحات کا حوالہ شائع کیا ہے۔ "میدانوں میں"، "تجلیں حوروں اور خوشی"، "خانہ اور اس کا بیٹا" اور "غزائ کی رات" نکل چکا اساتے شال کتاب ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار کتبہ ادب لاہور نے ۱۹۳۶ء میں شائع کی تھی۔		
۴۵	رسالہ "کلیان" کا دور (دلی ادب نمبر)	دلی: حامد علی خاں بہ اشتراک سعادت حسن مٹو	
	مئی ۱۹۳۵ء، نمبر ۲۷، نمبر ۲۸، نمبر ۲۹، کل صفحات ۳۳۵۔		
۴۶	رسالہ "کلیان" کا دور (دلی ادب نمبر)	محبوبہ سعادت حسن مٹو	
۴۷	"کچھ فرشتے" (خاک)	انجلیان لاہور	طبع اول: ۱۹۵۲ء
۴۸	"نور جہاں سرود جہاں" (خاک)	کتبہ انکسور لاہور	طبع اول: ۱۹۵۲ء
۴۹	"گدے" (ڈارے)	اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی	طبع اول: ۱۹۳۷ء

۵۰ "مستحوکے مضامین" اردو اکیڈمی، لاہور طبع ازل: ۱۹۶۶ء

۵۱ "خیراً یا خیراً پاورڈ" (پتھن کے لیے) شیخ الاسلام علی ایچ سنز، لاہور طبع ازل: ۲۰۰۷ء

نظریہ فن:

"پتلی دوتا سحر یوں اور نیک ال بچہ یوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اب انکی داستانیں فضول ہیں۔ کیوں نہ انکی صورت کا ال کھل کر بتایا جائے جو اپنے پتلی کی آغوش سے نکل کر دوسرے مرد کی بغلی گداری ہو اور اس کا پتلی کرے میں بیٹا سب کچھ دے دے، گویا کچھ دیتی نہیں، رہ نہ نہ کی کو اس نکل میں پیش کرنا چاہیے۔"

(پہچال، "مستحوکے خطوطِ علم کے نام" مرتب احمد رفیع قاسمی)



حوالہ جات:

- ۱۔ یہ حوالہ "میراج پری پریس" (مرحوم محمد حسن منگری) لاہور پر کردہ ایک سولہ نمبر ۱۳۵
- ۲۔ یہ حوالہ "کیا قلم چاتا ہے" از حضرت خان سلیم کتب خانہ چھپائی، کراچی طبع ازل ۱۹۸۳ء سولہ نمبر ۱۷۵
- ۳۔ یہ حوالہ اشراج (دوسرا جلد، یک) ۱۴۱ تا جلد علی خان مدنی "تاجی" کا پورے ۱۹۷۹ء سولہ نمبر ۱۷۱ کی پائس، مقرر اب ادبی لاہوری، لاہور کا خصوصی یہ کام "مستحوکے خاں کی یاد میں۔"
- ۴۔ "کیا قلم چاتا ہے" از حضرت خان سلیم نمبر ۱۵۲
- ۵۔ فلم کے بارے میں کار کمال، مستحق، رفیق، فراوی، کاسٹ، شریلا سرگود۔ ڈائری۔ جینٹ۔ کے این جگہ ایڈ۔ لاہوری
- ۶۔ ان دونوں پر میں میں شامل، اکبر علی، "اہل سائنس اور کہانیاں" نور مستوحے فریڈ کینس، "دوران" "تاجی" میں ان کا ایک مضمون "نری ادب پر ایک طائر نظر" بھی شامل ہے۔
- ۷۔ ایڈنا

نیا قانون

سعادت حسن منٹو

منٹو کو چوان اپنے اڈے میں بہت مختصر دلی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت مسٹر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا دست بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے دو مقام کو چوان میں کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ کیا کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ استاد منٹو کی سب سے زیادہ بات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منٹو نے اپنی ایک سواری سے انجین میں بنگ بنگ بنگ جانے کی آواز سنی تو اس نے گاڑی دھری کے چوڑے کنارے پر ٹھیک سے کہہ کر اندر آکر اس میں بیٹھ کر کی تھی۔ ”کیچہ لینا چو دھری تھوڑے سی دنوں میں انجین کے اندر بنگ بنگ بنگ جانے لگی۔“ اور جب گاڑی دھری نے اس سے پوچھا تھا کہ انجین کہاں واقع ہے تو استاد منٹو نے بڑی سادگی سے جواب دیا تھا۔ ”ولایت میں اور کہاں؟“

انجین میں بنگ بنگ بنگ اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو انجن کے اڈے میں جتنے کو چوان ملتے بٹاتے تھے پتہ رہا ہے تھے۔ دل میں اس استاد منٹو کی جوانی کا احترام کر رہے تھے اور استاد منٹو اس وقت بال روڈ کی چٹائی سی پر تھک چکے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم شاہ پر چارہ ڈیاں کر رہا تھا۔

اس روڈ شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا تو اس کا چہرہ طبعی معمولی طور پر تھکا ہوا تھا۔ ٹپے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم شاہ کی بات چٹری تو استاد منٹو نے سر سے خاک کی چٹری اتاری اور بل میں داب کر بڑے منظر کو لکھ میں کیا:

”یہ کسی بڑی بددعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں جاتو، چھریاں چلتے رہتے ہیں اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ کبیر بادشاہ نے کسی درویش کا دل ڈکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر بیڑہ دہی تھی، چارہ تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے۔ اور دیکھو کہ اب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے، ہندوستان میں فساد پھیلنا ہوتے رہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے غلطی سانس بھری

اور بھرے کام لگا کر اپنی بات شروع کی۔ ”یہ کیا کر رہی ہے؟ یہ کونسی حدودِ ستان کو آ کر کھڑا کرنا چاہتے ہیں، میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ بڑا رسالہ بھی سرچکے ہیں تو کچھ تو گا، بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی آگئی والا آ جائے گا یا وہیں والا جس کی بات میں نے سنا ہے کہ بہت کھڑا آ رہی ہے لیکن حدودِ ستان سدا نظام رہے گا۔ اس میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ جیسے یہ بددعا بھی وہی تھی کہ حدودِ ستان پر بیٹھ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔“

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی غارتھی تھی اور اس غارت کا سبب تو وہ یہ بتا رہا تھا کہ وہ اس کے حدودِ ستان پر اپنا کسک چلائے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ادا کرتے ہیں مگر اس کے خطر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورنر سے بہت متایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب بھی وہ گورنر کے سر ٹا بید چہرے کو دیکھتا تو اسے جی سی آ جاتی، وہ معلوم کیوں، وہ کہہ کر تھا کہ اس کے لالہ کی جھریں ہر گھڑے چہرے دیکھ کر گھٹے دلاش یاد آ جاتی ہے جس کے جسم سے گلاب کی محفل بھی گل کر پھڑ پھڑ رہی ہو!

جب کسی خرابی کا سب سے اس کا کھڑا ہو جاتا تو سارا دین اس کی طبیعت کو دردناقی اور وہ شام کو اسے میں آ کر مل مار کر مگر بے چارہ بچے کے کھل گاتے ہوئے اس ”گورنر“ کو بھی بھر کر متایا کرتا۔

”یہ سونے گا لی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ذلیل بگڑی صیبت بھلا دے کہ کہا کرتا تھا۔“ آگ لپٹنے آئے تھے اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ مالک میں دم کر رکھا ہے ان حدود کی دل دلا دے، میں دھب کا نظیہ ہیں گویا ہم ان کے بادشاہ بن کر ہیں۔“

اس پر بھی اس کا فتنہ ختم نہیں ہوتا تھا جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا وہ اپنے بیٹے کی آگ لکھ رہتا۔ ”فکر دیکھتے ہو تم اس کی جیسے گوند ہو رہا ہے بالکل خراب، ایک دھبے کی مار اور گٹ پٹ گٹ پٹ پٹوں بک رہا تھا جیسے بار بار ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل ہی میں آتی کہ طعون کی کمر بڑی کے پرستہ اور اس لیکن اس خیال سے کہی گیا کہ اس مرد کو مارنا اپنی جگہ ہے۔“ یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی گیس کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا۔

”قسم ہے بیگوان کی، ان لائٹ صاحبوں کے بازو اٹھاتے اٹھاتے ٹھک آ گیا ہوں۔ جب بھی ان کا منہس چہرہ دیکھتا ہوں، دگوں میں خرابی کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون دلوں ہے تو ان لوگوں سے نعمات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آ جائے۔“

اور جب ایک روز استاد منگو نے پھیری سے اپنے آگے پر دو سوار چاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ حدودِ ستان میں جدید آئین کا نافذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

وہ مارواڑی جو پھیری میں اپنے دو چابی مقدمے کے سلیطے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے جدید آئین کا معنی انگریزوں کے متعلق آج بھی میں بات ہیبت کر رہے تھے۔

”سننا ہے کہ پہلی بار مل سے حدودِ ستان میں نیا قانون چلے گا۔ کیا ہر چیز بدل جائے گی؟“

”ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور حدودِ ستان کو آزادی مل جائے گی۔“

”کیا جان کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟“

”جو بچہ کی بات ہے۔ کل کئی اکیل سے دریافت کریں گے۔“

اس بارواڑیوں کی بات جیت استو سگو کے دل میں ناقابل بیان خوشی پیدا کر دی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو بیٹھ کالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بری طرح چٹا کرتا تھا کراس روز وہ ہر پار پیچھے مڑ کر بارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی سونجھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی مٹائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کی پیٹ پر پائیکس اٹھلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا ”چل چٹا، چل چٹا“ ڈرا ہوا سے باتیں کر کے دکھاوے۔“

بارواڑیوں کو اس کے لٹکانے پہنچا کر اس نے اتار رکھی میں دینے طولانی کی دکان پر آدھ سیر دی کی کس پی کر ایک بڑی ڈاکار لی اور سونجھوں کو منہ میں دما کر ان کو چومتے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہتا ”بہت تیری ایسی کی تھی۔“

شام کو جب وہ آئے کہ لواتا تو خلاف معمول اسے وہاں اپنی جان بچکان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ کچھ کر اس کے سینے میں ایک غیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنائے والا تھا۔ بہت بڑی خبر اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لیے دو سخت مجبور ہو رہا تھا لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ کھلے تک وہ چابک بغل میں دبائے انگلیوں کے آؤے کی پہلی جھپٹ کے لیے سحراری کی حالت میں جھٹکا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آ رہے تھے سارے قانون کے نقاد کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لاکھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے معلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا۔ اپنے دماغ کی تمام قہاں روشن کر کے غور و فکر کرتا تھا۔ اس کے کانوں میں اردو اڑی کا یہ اندیشہ ”کیا بیجا کے معلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہو گا؟“ بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں سرکت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کل ہمارا اپنی سونجھوں کے اندر رخص کر اس نے ان بارواڑیوں کو گاکی دی ”طرہیوں کی کھیا میں گھسے ہوئے کھل“ نیا قانون ان کے لیے کھانا ہوا پانی ہو گا۔“

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت غصہ کچلی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں، سفید چڑھوں (دودھوں کے) نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی خمر تھپیاں سارے قانون کے آتے ہی بلوں میں بیٹھ کے لیے قابو ہو جائیں گی۔

جب فکر گھبرا، پکڑی بغل میں دبائے ملائے میں داخل ہوا تو استو سگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا ”اچھا دھرم! ایسی خبر نہ دے کسی خوش ہو جائے تیری اس بھی کو بڑی پر ہال آگے آئیں۔“

اور یہ کہ سگو نے بڑے حوصلے سے لے کر سارے قانون کے معلق اپنے دوست سے اس سے ہاتھ شروع کر دیں۔ دوران گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ تھر گھسے کے ہاتھ ہر دو سے اپنا ہاتھ مار کر کہا ”تو دیکھتا رہا، کیا ہوتا ہے، یہ وہی والا بادشاہ بکھڑا بکھڑا کر رہے گا۔“

استو سگو موجودہ سوویت نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے معلق بہت کچھ سن چکا تھا اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لیے اس نے ”روس والے بادشاہ“ کو اڑیہا بکھڑا ”یعنی جہد آئیں کے ساتھ ساتھ دیا اور پہلی اپریل کو پانے تمام میں جہدیں تبدیلان ہونے والی تھیں۔ اور انھیں ”روس والے بادشاہ“ کے اڑیہا بکھڑا۔

کچھ عرصے سے پٹا اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استو سگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں ”روس والے بادشاہ“ اور دیگر سارے قانون کے ساتھ خطا مل کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے ملتا کہ ان شہر میں اسے ہم ساز بکھڑے گئے ہیں یا

قاس جگہ اسے آویسوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلا دیا گیا ہے تو ان تمام واقعات کو ملے قاتلوں کا جرمیہ خیر سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اس کے ہاتھ میں دو سرخ ریشے ملے آئین پر بڑے دار سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔

”جہاں آئین کا دوسرا حصہ فیڈ ریشن ہے جو ہماری کچھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ اسکی فیڈ ریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک ذہنی نہ کی گئی ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی فیڈ ریشن بالکل غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ کی فیڈ ریشن ہے ہی نہیں!“ ان دونوں کے درمیان جھگڑا ہوئی چونکہ اس میں مشترک الفاظ انگریزی کے تھے۔ اس سے استغنا صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے خیال کیا۔ یہ لوگ بددستوں میں ملے قاتلوں کی آمد کو برا سمجھتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ان کا ملن آزاد ہو چکا تھا اس کے ذرا اثر اس نے کی سرچہ ان دونوں طرفوں کو خدشات کی لگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا ”نووی ہے!“

جب بھی وہ کسی کو دہلی زبان میں ”نووی ہے“ کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو گنجی جگہ استعمال کیا ہے اور وہ شریف آدمی اور ”نووی ہے“ میں تیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلباء کو اپنے ہاتھ میں بٹھا کر محکمہ چارہ تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آٹھس میں بائیں کر لے لیا۔

”لے آئیں نے ہماری امیدیں بڑھا دی ہیں اگر صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔“

”وہیے بھی بہت سی جگہیں اور تعلیم کی۔ مثلاً اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی بکھڑا جائے۔“

”ہاں ہاں، یہی نہیں۔“

”دوہکا اگر جوتھ بڑا دے دے دے بھر دے ہیں۔ ان میں بکھڑا کی ہوگی۔“

اس گفتگو نے استاد دنگر کے دل میں جہاں آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی اور وہ اس کو اپنی ”جج“ سمجھنے لگا جو بہت جتنی ہو ”نیا قاتلوں“ وہ دن میں بھی یاد رہتا۔ ”یعنی کوئی نئی چیز!“ اور پھر ہمارا اس کی ٹھنڈی کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا سارا ہاتا جو اس نے دوسرے ہونے جو دھری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح محکمہ بھا کر خرید لیا تھا۔ اس سارے جب وہ لپکا تھا جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کلیں جانتی تھیں اور جہاں جہاں جھل کا کام تھا، تو سونے کی طرح دنگر تھا اس لحاظ سے بھی ”لے قاتلوں“ کا درخشاں رہا تھا اس ہونا ضروری تھا۔ پہلی بار مل تک استاد دنگر نے جہاں آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سمجھا کر اس کے حلق جو قصور وہ اپنے ذہن میں قائم تھا بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپرل کو ملے قاتلوں کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں آئیں گی ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور غلط کچھ لگے گی۔

آخر کار راج کے انکھیں دن فتح ہو گئے اور اپرل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلاف معمول سرد تھا ہوا میں تاریکی چھٹی اپرل کو جتنا سویرے استاد دنگر اٹھا اور اسٹیل میں جا کر تانکے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج

غیر معمولی طور پر سرد تھی۔ وہ سبے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے سچ کے سرور و حدنگے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا پتہ لگا یا گھرا ہے ہر چیز پر اپنی نظر آتی۔ آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر چار رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کھلی کے جو رنگ رنگ کے پتوں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر بھی ہوئی تھی اور سب چیزیں پر اپنی نظر آتی تھیں۔ یہی کھلی اس نے سبے قانون کی خوشی میں ۱۳ مارچ کو چورہری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آدھ میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کھل سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا اکا سلا چھوڑ کر گائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گٹے میں چڑے ہوئے گنگھرو کی جھنجھناہٹ، ہمارے میں پلٹے پھرتے آدمی۔ ان میں سے کوئی ہی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں، لیکن رات دنگو جیس نہیں تھا۔

”ابھی بہت سو رہا ہے۔ دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں۔“ اس خیال سے اسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا۔ ”ہائی کورٹ میں ٹوپیج کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے سبے قانون کا کیا نظریہ ہے؟“

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گزریال نے بڑی رعیت سے نو ہمارے جرحلہ کالج کے دروازے سے باہر نکل رہے تھے خوش پیش تھے۔ مگر استاد دنگو کو نہ جانے ان کے کپڑے کیسے کیسے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کئی چیزیں دیکھ رہی تھیں۔

تانتے کو دکانیں، ہاتھ سوز کردہ تھوڑی دیر کے بعد پھر اندر لک میں تھا۔ بازار کی آدمی دکانیں کھلی چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ سڑکی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب جھگڑ تھی۔ ہماری دکانوں کی کرائی چیزیں شیش کی دکانوں میں لوگوں کو دھوکا دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کپڑے آویں تھے۔ مگر استاد دنگو کے لیے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ سبے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹیکس اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

اب استاد دنگو کے گھر میں بچ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گزارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں گات سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ بچہ پیدا ہو رہے چنانچہ اسی غیر معمولی خواہش کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیوی کے پیٹ کو دبا دیا مگر اس کے اوپر کان نہ کر کے کہ اپنے بچے کے متعلق کچھ جانتا چاہتا مگر تاکہ کام نہ ہوتا تھا ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر دھک آ گیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس بھی پڑا تھا۔

”تو ہر وقت مرنے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اندھ دانا چل بھر رہی ہے۔ ایک میں تھوڑی سی عافیت تو آئے۔ یوں تھک رہے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جنی دے گی؟“

استاد دنگو جتنا بہت بلند بازار داغ ہوا تھا۔ وہ ہر سب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہشمند تھا بلکہ تجسس تھا اس کی بیوی لگاوتی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر کام طور پر یہ کہنا کرتی تھی۔ ”ابھی تو اس کو دھکیں گیا اور تم جیاس سے بے حال ہو رہے ہو۔“

لیکن ابھی ہونگرا استاد دنگو سبے قانون کے انتظار میں تھا بے قرار نہیں تھا بھٹا کر اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہوتا چاہیے تھا وہ آج سبے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا ٹیکس اسی طرح جیسے وہ گاؤں یا جواہر لال کے مجلس کا نظارہ کرنے کے لیے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد دنگو جیوان کے ہلوس اور ہنگاموں پر ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے بادلوں سے کیا کرتا تھا اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے ملتا ہوا استاد دنگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے ہلوس میں پھول کے باعث دو تین لہرا ہوتے ہوتے وہ ہائیکس قواس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ آپ نے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی قزاقوں میں قزاق بنایا تھا۔ انارکلی سے نکل کر وہ بال روڈ کی چٹکلی سڑج پر اپنے تلے کو آہستہ آہستہ ہزار ہا تھا کہ موطوں کی دکان کے پاس اسے چھادائی کی ایک سواری مل گئی۔ کہہ رہے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں پڑیاں کیا۔

”ہلو یہ بھی اچھا ہوا شاید چھادائی ہی سے نئے قانون کا کچھ بچہ نکل جائے۔“

چھادائی کھنچ کر استاد دنگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر ہائیکس قواس کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر چڑھ گیا۔ جب استاد دنگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اسے کسی بیٹے ہوئے دھنچے پر غور کرنا ہوتا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر چٹکلی نشست پر بڑے سطحیان سے چلے کر اپنے گھوڑے کی ہائیکس دھنچے ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا قہورزا سا اٹھانے کے بعد بڑی دھکی چال چلنا شروع کرتا تھا۔ گویا اسے کچھ بے کے لیے بھاگ روڑ سے پھٹل ل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد دنگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اسی طرح استاد دنگو کے ذہن میں نئے قانون کے حلقے سے قزاقیات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں یہ نہیں کھنچی سے ہائیکس کے نمبر لے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس کا غور بات کو آئیں جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سلی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ چھادر میں غرق تھا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے جیسے پلٹ کر دیکھنے سے اسے مزہ کے اس طرف دوڑنے کی کجی کے کجی کے پاس بایک ”گمرا“ گمرا اٹھرا یا جہا سے ہاتھ سے ہار تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ استاد دنگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی جب اس نے اپنے تازہ کاکہ کو گورے کی اٹھل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے پہلے تو اس کے پی میں آئی کہ بالکل قہر نہ سے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اسی کو پیال آیا۔ ”ان کے پیچھے چھوڑنا بھی بے فوٹی ہے۔ کھنچی پر جو ملت میں سادھے چھوڑ آئے طرح کروائے ہیں۔ ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو پلٹے ہیں۔“

خالی سڑک پر بڑی مسافتی سے تانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آٹھ جھپکنے میں وہ کھنچی کے گھمے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی ہائیکس کھنچ کر اس نے تانگہ ضمیر ایا اور چٹکلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے بچا۔

”مساہب بہادر کہاں جانا دکھا ہے؟“

اس سوال میں جانا کا طرز یا انداز تھا صاحب بہادر کچھ وقت اس کا وہ پر کا سو پھولوں بھرا ہونٹ بیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو دم ہی کھرباک کے تختے سے قہوری کے ہلائی جیسے تک جلی آ رہی تھی۔ ایک لرزش کے ساتھ گری ہو گئی گویا کسی نے نو کیلے ہوا تو سے شیشم کی سافٹی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ دھس رہا تھا اور اپنے اُمداس نے اس ”گمرا“ کو بیٹھنے کی آگ میں جھانکر ہسم کر دیا تھا۔“

جب ”گورے“ نے جوتلی کے کھجے کی لٹ میں ہوا کا رخ چا کر سکرینٹ، لگا رہا تھا سڑک گتے کے پانچیاں کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد دنگو کی اور اس کی ٹانگیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ ایک وقت آئے سانسے کی بندوبست سے گولیاں خارج ہوئیں اور انہیں میں کرا کر ایک آفتیں گولیاں کرلو پر گواڑ گئیں۔

استاد دنگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے قتل کوئی کرتا گتے پر سے نیچا ترنے والا تھا، وہ اپنے سانسے کڑے گورے کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے بارے کو اپنی نگاہوں سے چہارہ ہے اور گویا کھاس طرح اپنی نیلی چٹون پر سے پیر مرنی چیز یہاں ہوا ہے گویا وہ استاد دنگو کے اس جملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ گورے نے سکرینٹ کا دھواں لگتے ہوئے کہا ”جانا نکالنا پھر گڑ بڑ کرے گا؟“

”وہی ہے“ یہ الفاظ استاد دنگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر رچنے لگے۔
 ”وہی ہے“ اس نے یہ الفاظ اپنے منہ کے اندر ہی باغ و ہوائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گویا جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی تھڑپ ہوئی تھی اور طواغلوں کے جھگڑے میں جس کا کامٹ گورے کے دماغ میں چمکی ہوئی شراب تھی۔ اسے طواغلوں کا بہت سی باتیں سنا چڑی تھیں۔ استاد دنگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پرزے سے اڑا دیے ہوئے ٹکروہ کسی خاص مصیبت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا ذریعہ عام طور پر کوچاں ہی پر کرتا ہے۔

استاد دنگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے سب سے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا۔ ”کہاں جانا نکالنا ہے؟“
 استاد دنگو کے لہجے میں چاہک ایسی محسوس تھی۔
 گورے نے جواب دیا ”بیر اسٹری۔“

”کہا یہ پاٹل روپے ہوگا۔“ استاد دنگو کی سوا گلیں اتر گئیں۔
 یہ سن کر گویا حیران ہو گیا۔ وہ چلا یا۔ ”پاٹل روپے۔ کیا قسم۔؟“
 ”ہاں، ہاں، پاٹل روپے۔“ یہ کہتے ہوئے استاد دنگو کا داہنا ہاتھ بھر لیا کھچ کر ایک دڑی گھونٹنے کی شکل اختیار کر گیا۔ ”کیوں جانتے ہو پاٹل روپے کا تعلق؟“

استاد دنگو کا لہجہ بڑا غلط ہو گیا۔
 گویا پچھلے برس کے واقعے کو قیاسی طور پر استاد دنگو کے جتنے کی چوڑی نظر انداز کر چکا تھا وہ وہاں کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی بھر سکھا رہی ہے۔ اس کی اصل صورت اقبال کے دروازہ ہوتا تھی کی طرف اکثر بڑھا ہوا رہتی پھرتی سے استاد دنگو کو تگے پر سے نیچا ترنے کا اشارہ کیا پیدا کی یہ بات تھی کہ کوئی جتنی پھرتی استاد دنگو کی سوئی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ پھرتی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پست تھا گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے دروازے سے اسے دیکھتا تھا جتنا ہے۔ پھر اس کا گھونٹہ کان میں سے حیر کی طرح سے اوپر کو اٹھا اور ختم ذوق میں گورے کی خنواڑی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے دھکیلا اور نیچے اتر کر اسے دھڑا دینا شروع کر دیا۔

ششدر اور حیران گورے نے دھڑا دھڑ سے استاد دنگو کے دڑی گھونٹوں سے نیچے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دھکا لگی کی ہی حالت جاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرابے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلنا شروع کیا۔ اس چلنا پکارنے

استاد منگو کی باتوں کا کام اور بھی چیز کر دیا۔ وہ گورے کوئی ٹکڑے کا پتہ نہ دیا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا چلا تھا:

”کلی اپیل کو بھی دسی اکڑوں کلی اپیل کو بھی دسی اکڑوں اب ہمارا راج ہے سچ“

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے جی مشین سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چلا لیا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی جھبہ سے اوپر چھپے ہوئے تھے۔ سر سے بھاگ بھاگے ہوئے استاد اور اپلی منکرائی ہوئی آنکھوں سے جھرتا زور جمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

”وہ دن گزر گئے وہ ٹیلی ٹھان قانون اڑا کرتے تھے اب نیا قانون ہے یہاں نیا قانون!“

اور بے چارہ گورہ اپنے گڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفی کے ساتھ کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی پیچھے کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی اٹھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور اٹھانے کے اندر کمرے میں وہ ”نیا قانون، نیا قانون“ چلا جا رہا مگر کسی نے ایکہ نہائی۔

”نیا قانون، نیا قانون، کیا کہہ رہے ہو قانون دسی ہے پرانا!“

اور اس کو حشرات میں بند کر دیا گیا۔



اختر حسین رائے پوری

نام	سید اختر حسین
تعلیمی نام	نا خدا اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
پیدائش	۱۲ جون ۱۹۱۲ء برائے پور (سی۔ پی۔) بھارت
وفات	۲ جون ۱۹۹۲ء کراچی
تلمیم	ایم۔ اے (تاریخ) پی ایچ۔ ڈی (فزیس) سوہیہ یونیورسٹی، جیس فرانس ایڈوانسڈ تعلیم مولوی محمد اسحاق کے کتب میں پائی۔ ۱۹۲۸ء میں رائے پور سے منسلک کیا۔ کلکتہ یونیورسٹی سے ایف۔ اے، علی گڑھ یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ایم۔ اے (تاریخ) کیا۔ دارس یونیورسٹی سے شہریت میں ایم۔ اے کی سطح کا امتحان ”سٹیپ انڈیکار“ پاس کیا۔ جیس (فرانس) یونیورسٹی سے ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

مختصر حالات زندگی:

آپ کا آبائی وطن پنڈ (صوبہ بہار) تھا۔ آپ کے والد سید اکبر حسین، علی گڑھ مسلم کالج اور طاس انجیئرنگ کالج رڈ کی (دکن) کے فارغ التحصیل تھے، جو سرکاری ملازمت کے سلسلے میں مختلف شہروں میں رہے۔ ان کا تعلق غمخ آجاشی سے تھا۔ اختر حسین رائے پوری کی طبی اور ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۵ء میں ہوتا ہے، جب وہ ڈاکٹر مولوی محمد الحق کے ہمراہ اورنگ آباد، دکن گئے اور ”اردو انگلش ڈکشنری“ کی ترتیب اور انجمن ترقی اردو (بھد) اورنگ آباد کے ادبی مجلہ ”اردو“ کی ادارت میں ان کے معاون رہے اور رسالہ ”اردو“ میں ”نا خدا“ کے علمی نام سے متعدد کتب و جرائد پر تبصرے قلم بند کیے۔ ہفتہ وار ”ریاست“ دہلی میں دو ایجنٹوں کے نائب مدیر اور ہفتی رسالہ ”دشوائی“ کے اعزازی مدیر رہے۔ ایک زمانے میں اپنا رسالہ ”جہاں تھا“ جاری کیا۔ ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۰ء کا زمانہ جوپ میں گزارا۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں واپس آکر دوسری آل انڈیا ریڈیو میں نائب نڈر ایڈیٹر کے طور پر کام کیا، جہاں سے جون ۱۹۴۱ء میں مستعفی ہو کر بطور پروفیسر

شعبہ تاریخ و ادب میں پرنسپل ایم اے او کالج امرتسر چلے آئے، جہاں سے ۱۹۳۵ء میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن نے انھیں حکومت ہند کے عظمیٰ تعلیم میں معاون شطیر تعلیم کے عہدے کے لیے منتخب کیا۔ پہلے معروف ماہر تعلیم سر جان سارنٹ کے نائب کے طور پر کام کیا اور اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد (وزیر تعلیم) کی معاونت کی۔ ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے بذریعہ آتشیں لڑیں پاکستان آ گئے۔ ان کی خدمات ان کی مرضی کے مطابق وزارت تعلیم پاکستان کو منتقل کر دی گئی تھیں، جوں ۱۹۵۵ء تک حکومت پاکستان کے نائب شطیر تعلیم، ذہنی تکروری تعلیم اور کراچی کاغذی تعلیمی بورڈ کے چیئرمین رہے۔ ۱۹۵۶ء تا ۱۹۷۱ء یونیٹکو سے وابستہ رہے اور بطور عالم شعبہ ترقی تعلیم، یونیٹکو، ان کا قیام پہلے آفیس جرن میں رہا۔ اسی حیثیت میں ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۱ء صوبائیہ اور ایم این میں بھی قیام رہا۔ بعد ازاں یونیٹکو کی کراچی شاخ کے پہلے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ جہاں سے محروم ہونے تک جامعہ کراچی کے ڈائریکٹر رہے۔ مستقل قیام کراچی میں رہا۔ بعد اوقات مدظلین سوسائٹی، کراچی کے قبرستان میں ہوئی۔

اولین مطبوعہ تحریر:

ہندی افسانہ "پراپت" (نکست غور) مطبوعہ "ماہروی" ۱۹۳۸ء

اولین مطبوعہ افسانہ:

"زبان بے زبانی" مطبوعہ "گلار" راج ۱۹۳۳ء

تلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱ "سمت اور غرض" (حوالہ لسانے) ساقی پب ڈپو، دہلی طبع اول ۱۹۳۸ء
 لسانے (۱) زبان بے زبانی (۲) منزل تا نام (۳) جوں ہوتا تو کیا ہوتا (۴) سمندر (۵) میرے غریبوں کا سمندر (۶) دروں
 دونوں (۷) کاغذ کی ٹاؤ (۸) صورت (۹) بچپن (۱۰) دزلہ (۱۱) میرا گھر (۱۲) ایک ماہرکاری (۱۳) مجھے پاتے دو
 (۱۴) صورت (۱۵) سرگشت (۱۶) سمیری ڈائری کے چند نثر
 چمکورو اور اکیڈمی سندھ کراچی نے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا ہے۔ اور اکیڈمی سندھ کا ایک ایڈیشن ۱۹۵۹ء میں بھی طبع ہوا۔ ایک
 ایڈیشن مکتبہ احول، کراچی نے بھی شائع کیا ہے۔

- ۲ "زندگی کا سیل" (آٹھ افسانے) مکتبہ ذوق، کراچی طبع اول ۱۹۳۹ء
 افسانے (۱) دل کا اندھیرا (۲) جسم کی نگار (۳) حائل کشور (۴) بچہ مری (۵) قبر کے اندر (۶) دو بچہ خانہ (۷) کافرستان
 کی شہزادی (۸) چتر کی صورت

(اور اکیڈمی سندھ کراچی نے یہ کتاب ۱۹۷۷ء میں شائع کی پھر ۱۹۵۶ء میں دوبارہ شائع کی ہے۔)

- ۳ "آگ اور آسمان" (افسانے) طبع اول ۱۹۳۷ء

میں ایک طاقتور کبھی ہے اور دوسری کڑی۔ گاہے گاہے یہ دونوں طاقتیں کسی واقعہ میں اچھے عجیب طریقہ سے آپس میں مکمل مل جاتی ہیں کہ ہمارے قہر کی اچھا کھیں رہتی۔ ہمارا یہ محدود عقل حیران زدہ جاتی ہے۔"

اکبر حسین رائے پوری، یکم اگست ۱۹۵۵ء، کراچی
 (یہ حوالہ "مقام ادب" معرضہ اکبر رائے کی مطبوعہ
 مکتبہ سہری لاہور کی، لاہور، طبع اول، جنوری ۱۹۶۵ء)

تلاشِ غم شدہ

اختر حسین رائے پوری

دوسرے درجے کے مسافروں میں اختلاف رائے کی گھانٹل کم ہی ہوتی ہے، چنانچہ سب نے سردار جیٹا سنگھ کے اس اعلان کو ہی بھر کر سراہا کہ جاتے جاتے لیے جنگ ازبس ضروری ہے۔ سردار جی نے سب کے سامنے پکڑے اتارتے اور جیٹا ہوتی تو خدا کا بھیہا جا کر کرتے ہوئے کہا "سزا بھائیوں بندہ ہو جائیں تو سب لوگ نامزد ہو جائیں۔" "تو خدا بھائیوں کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی غبارہ کی طرح پھول مٹی اور سردار جی کے ہتھوں کے اقتدار سے اس میں خلیب فرار فرماتا ہوتا ہے۔"

سردار جی کی دیکھا دیکھی اور لوگوں نے بھی کر دھلی کرنا شروع کی اور تھوڑی دیر میں بجلی کے قند کے ارد گرد مڑنے والے پودوں نے دیکھا کہ ڈب میں پٹیلے اجسام کا ابار لگا ہوا ہے اور ان میں جنس اس حد تک مفقود ہے کہ اگر انہیں کاٹ کر قصاب کی دکان میں لٹا کاٹک دیا جائے تو کاٹک کی سمجھ میں یہ نہ آئے کہ کب کون ہے اور کون کون!

سردار جی نے سونے سے پہلے گرو نام چنا اور باخمس کی دوا کھائی، جس کا رد عمل ایک ہولناک ذکار کی صورت میں ظاہر ہوا، پھر عجیب پر سر دکھا کر چشکی کائی کو داڑھی کے انگوٹوں سے نکال کر اپنی ڈائری کا مطالعہ شروع کیا، جس میں سرکاری ٹھیکوں اور ان کے متعلق انواع و اقسام کی چند چوس کا ذکر تھا۔

لازچٹول نے سفید لہیس کے اندر جیٹا ہوتی تکلیف مرزئی کو اتارتے ہوئے تواری سطوئی میں ایک حدود کا انکشاف کیا اور چادر پر پانی کی بیک پکارتے ہوئے کہا "تفکرت میں جد کی مشکل ہوگئی ہے۔"

لوہ کی برتھ پر ایک ڈیڑھی صاحب خلیب میں کپڑے بدل رہے تھے، دکان کا پھلٹا حصہ کسی آنکھ او جھل کیل میں ایک مچا تھا اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ گردان کیوں بچھا رہی ہے۔ اس سمجھنا جانی میں ان کا چہرہ بھٹان تھرتھ بن کر رہ گیا تھا

جب سب لوگ اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے تو سپاہی نے چادر سے منہ نکال کر اوپر اوپر دیکھا، ذرا وقت سے اس کا دھڑلہ بڑھ چکا تھا اور

پھر ایک نقلی ٹانگ ہوا میں ادھر تک کر رہی تھی میں چپکے لگی۔ ٹکڑی کی یہ سلاسل ٹانگ یا ٹکٹ کے سرکاری کارخانے سے ہی کرنا تھی۔ حکومت نے ٹکڑے سپاہی کو اس ٹانگ کے ساتھ بیسائی کا قہودا تھا۔ اللہ سہاں کی مدد کر دیا ٹانگ میں بھلا پرانگہ دورانی کب ہوتا ہے۔ دوران جنگ میں سپاہی کی ٹانگ غائب ہو گئی تھی۔ اسے خود نہیں معلوم کہ یہ حادثہ کب پیش آیا۔ وہ عشق میں بندوبست چھپانے بیٹھا تھا کہ بڑو ایک دھماکہ ہوا اور اس کی آنکھ بند ہو گئی۔ بہت دیر بعد جب ہوش آیا تو جسم بکا پھلکا اور ساتھ ہی ساتھ بے حرکت وساکی ہو گیا تھا۔ ٹانگ، عشق کے ذکر ایک جڑ کے زخم چاٹتی تھی۔ سپاہی یہ دعویٰ تو کر سکتا تھا کہ وہ جڑ، جڑ گئی ہے بے پکڑے کی طرح پھیل ہوئی تھی اس کی اپنی دلدلا آٹھ ٹانگ تھی لیکن یہ حقیقت بھی تو مسلمہ تھی کہ اس کی ایک ٹانگ بلا اطلاع غائب ہو گئی تھی اور سرسای کیفیت میں اسے گمان ہوا کہ جس طرح کوئی ڈاکٹر لڑکی خاندان کو توجہ نہ دے کر دوی کے لیے نکل جاتی ہے۔ یہ ایک حرام ٹانگ باقی بدن سے الگ ہو کر ہوا خوری کے لیے نکل کھڑی ہوئی ہے۔

سپاہی نے نقلی ٹانگ اتار کر بیسائی نقل میں ڈالی اور ادھر ادھر آجک کر اس کی سکت کو چاٹنے لگا۔ باقی ماندہ ٹانگ نے کسی بیوہ کی طرح بدنام زندگی کے بارگاہ خانے سے الگ کر دیا اور بیسائی کے گود کے تھے۔ بھلی ٹھونس کی طرح اس کی پہلی سے باز پرس کرنے لگے تاہم یہ اسر نا قابل تردید تھا کہ بیسائی لٹی تھی اور اس میں سے تار و وارڈش کی پیرا رہی تھی۔

سپاہی کو خندا لگی اور اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک فرشتہ آیا اور اس کے گھٹنوں پر آب حیات اس طرح سینچا کہ اس کی جڑوں سے ایک تار اور پانچ ٹہنیاں اُگ آئیں۔ ہر ٹہنی میں ان گنت ٹانگیں لگ رہی تھیں۔ ٹکڑوں کے لیے تو گویا یہ طوبی کا درخت تھا جس سے ٹانگیں نوج نوج کر اچھٹے بدن میں جڑتے اور ہر جڑوں کی طرح اچھٹے کو تے چلے جاتے تھے۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو قہر کی گواہیوں سے سورج انکارہ سامنے لائے ٹھوکر دیا تھا۔ سپاہی نے جلدی سے وردی پہنی اور بے چینی سے اگلے آٹھ گھنٹوں کا انتظار کرنے لگا جہاں اتر کر اسے گر بیٹھا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی کیوں کہ اب تک گھر والوں کو اس حادثہ کی اطلاع نہ ملی تھی اور اس لیے یہ سوچنا ممکن تھا کہ ٹانگ کی گمشدگی ان پر کیا اثر کرے گی۔ کچا تو یہ ہے کہ زندگی میں پہلی مرتبہ اسے ٹانگ کی اہمیت کا احساس ہوا۔ جسم کے ہر عضو کو کسی نہ کسی خدمت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ٹانگ چواری ناچھین سے لے کر بڑا سا بنگ مٹی کے اس قہودے اور اس کے گناہوں کا بار لادے ہر موسم میں بے ٹھکان باری باری بھرتی ہے۔ میدان جنگ میں بھی یہ ہوتا ہے کہ وہ ٹانگ کا ساتھ چھوڑ کر اکیلے ہمارا گ کھڑی ہوئی ہے۔

اسے میں انجمن نے بیٹی دی۔ ریل کی رفتار آہستہ ہو گئی اور پلیٹ فارم پر دو بہائی ہاتھوں کا شور مچا دیا۔ سپاہی ٹونٹوں نے وردی لپک کر کے اگلے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے گھٹنے سے آنکھوں تک بے چاری کا ریتی سے عیاں بیچام کھینچا کہ ان میں آسودہ دنیا آئے۔ جب پلیٹ فارم سے ٹونٹوں نے دوبارہ ڈاکٹر و ہلڈ ہوا تو سپاہی ہراساں و ماہجس بیٹ پر بیٹھ گیا۔

کسی نے ہانک کر کہا "دور ہے ملوٹا۔۔۔ اسے نیچے آؤ پار"۔

پلیٹ فارم پر دو بیٹیاں کی کھیر لگی ہوئی تھی وہ ہاتھ اور پھولوں کے پار لیے اپنے سورہ کی آؤ بھگت کے لیے آئے تھے جو سمندر پار سے حیدان مار کر واپس آ رہا تھا۔

ٹونٹوں نے پھری کا سہارا لے کر زمین پر قدم رکھا۔ ہاپ نے گلے لگایا۔ کسی نے ہار پھینا یا کسی نے ہاتھ ملایا اور بدلتی بیٹھنے میں قہور کو بھرتی کر آئی۔

ایک ایک کوئی پکارا تھا "لو جس کی ہانگ ا"

نعرے سرزد ہو گئے، بیڑہ ساکت ہو گیا اور سب حیرت و حیرت کے عالم میں غواں کی دواہنی ہانگ کی طرف ہانکتے رہ گئے۔

غواں نے جلدی جلدی کہا شروع کیا۔ "ابا یہی ہانگ ہے جو بچپن میں مل گئی تھی۔ اس کے بدلے مجھے ہانگ ملی ہے، افسے ہانگ میں خیریت ہانگ ہوتا رہا ہوں سو سے کم نہ ملے گی۔ جب پرانی ہونے لگی تو بدلوانو۔ کوئی نہیں ہے؟"

لوگوں نے دیکھا کہ غواں کی ہانگ دھوپ میں بھرے کی چھتری کی طرح چمک رہی ہے وہ جب چاہے اسے بچ کر تھل کی ایک جڑی خرید سکتا ہے گویا اس کی ہانگ سے دواہنی بندھے ہوئے ہیں۔

لیکن اصلی ہانگ کی بیچ قیمت کا اندازہ دو بچوں سے نہیں لگایا جاسکتا۔ کسانوں نے کیا کوئی ہانگ کو خوب ٹھونک بھا کر دیکھا اور ان میں سے ایک منظر نے رائے دہنی کی "اس میں شک نہیں کہ یہ دیکھنے میں سہانی ہے اور اسے کبھی کوئی روگ نہیں لگ سکتا۔ غواں اسے بچ کر سرکار سے کہہ سکتا ہے کہ تم ہو گئی اور اسے پھر بھی ہانگ مل جائے گی۔ یہ کاروبار برا نہیں۔ لیکن افسہ میاں کی دہی ہوئی ہانگ کی بات ہی اور ہے۔"

گھر چلنے کے بعد غواں کو یہ کچھ کرخت حیرت ہوئی کہ سب چپ چپ سے رہتے ہیں۔ بوڑھی ماں و ساسی کو بھوکہ روئے لگتی ہے۔ شام کے دھند لگے میں اس کے بچے کیت کی میٹل پر ٹیلے پینے پینے چمکے ہاتھ کرتے ہیں۔ "کہا ایک جرمن کو بیکار نے دوڑے اور ایک کڑھے میں گر پڑے لیکن اس کی ہانگ نے دشمن کا چھینا تو چھوڑا اور اس کے پیچھے دو بچے لگ گئی۔"

"بھیا! آدمی ایک دوسرے کو مار تے کیوں ہیں؟" بھائی نے اپنے منہ سے سر کو کھینچتے ہوئے کہا "میں کیا جانوں میں اس کا معطوم ہے کہ لوگ رو بچوں کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ جو سپاہی جتنے زیادہ آدمیوں کو مارے اسے اتنا ہی زیادہ اعزاز ملتا ہے۔ میں بھی بڑا ہو کر سپاہی ہوں گا اور ہندوئی سے بہت سے دشمنوں کو ماروں گا۔ سب سے پہلے تو ہلو کی ہانوں کا منہ نے آج مجھے لگے میں چکا۔"

غواں کے ماں باپ جب مل کر کوئی شے پر بیٹھتے ہیں تو اس کی کھٹک کا موضوع اٹھتے بیٹے کی کم شدہ ہانگ ہوتی ہے۔ بیٹے سے زیادہ انھیں اس کے کم ہونے کا دکھ ہے۔ دونوں نے مل کر اسے بھونکا اور پالا۔ اب جو وہ پھولنے پھٹنے لگی تو غواں اسے سمندر پار کے کسی دیس میں بھجوا دیا اب دیکھو کہ وہ ایک نئے گھر کی طرح ویا کھی کی موٹھ پر تاج رہا ہے۔

بوڑھا اپنے دندھے ہوئے گئے کو صاف کر کے کہتا ہے "بڑی بی بی ہر سال شاد کی درگاہ پر منہ باغوشا یہ غواں اچھا ہو جائے۔"

غواں کی کھٹک میں خفا تھا کہ سارا گاؤں کیوں اس کی بیچ سارم ہانگ کو نہیں بلکاس کی ہے وہ لاکھن کو محفوظ رکھتا ہے۔ اس کی چٹکی ہوتی ویا کھی کا عرب بھی اس کے رنگ کے ساتھ کم ہونے لگا اور میرا میرا سے دیکھ کر کہتی ہوئی آواز میں یہ کہتا "ایسا اچھا جوان ہے کار ہو گیا۔"

غواں کے دوست جب شہر میں تیرے یا گھوڑوں کی گلی چوہ پر طرارے بھرتے لگ جاتے تو اس کے گھر راج گھٹنے کے اندر ہ گھلی ہی ہوتے تھکتے اور وہ بے اختیار پچا پچا کر پاتی اور ہوا کی لہروں کو بچہ رہا ہوا لگ جاتے۔

لیکن سب سے گھٹن گھڑی وہ ہوتی ہے جب اس کی بی بی اس کے گھٹنے پر ہاتھ کرتی ہوئی پاس چڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھوں سے دھن دھن سے

آنکھ لگاتی ہے اور اس کی ہر ادا پر کڑکھتی ہے کہ مجھے زندگی کا اس کون سا دن کا۔ بچے میں وہ لڑکھڑائی ہے گویا اپنے بوجھ سے آپ دہلی جا رہی ہو۔ اس کی آنکھیں سامنے نہیں بلکہ دائیں دائیں دیکھتی ہیں اور جب وہ کھیت میں جاتی ہے تو وہاں کی ہالیاں سرچا کر جھانکی ہیں کہ اندر ۔ اس گھر میں میں تیرا یاد مر چکا بیٹھا ہے۔ جب وہ کھیت سے واپس آتی ہے تو اس کے پیڑے گاؤں کے لنگوں سے منڈھے ہوئے ہوتے ہیں۔
 بنو خاں یہ سب سمجھتا ہے اور انکھوں کی ہر سیڑھی سے وہ چار دیکھتی ہوتی ہے لیکن اس کے جہان بدن کی انکھیں کسی اور قسم کی چوٹ چاہتی ہے۔ وہ مطلق پرہیزگار نہیں کرتی اور ہر اسچے محبوب مطلق میں مصروف ہو جاتی ہے۔

بے چارہ بنو خاں اس گھر میں گھلا جاتا ہے کہ ایک ٹانگ کی کچی یا زراہتی کتا بڑا فرق پیدا کر دیتی ہے وہ کسی کے رحم و کرم کا بچ نہیں بلکہ بھی سب اسے رحم و کرم کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کوئی اس سے فطری تعلق نہیں رکھتا۔ اس باپ دس سے اچھی آواز لگاتی اور بے حیائی سے ہر اس کے بچے خوف و ہراس سے پیش آتے ہیں اور گاؤں سے ہیٹھا ایک پر ہیٹھا سات بچے میں آتی ہے۔ ”بنو خاں کی ٹانگ ا!“

رفتہ رفتہ کم شدہ ٹانگ کا خیال بنو خاں پر جن کی طرح سوار ہو گیا اٹھنے بیٹھنے، پٹنے بکرتے اور اسی دھواں میں رہنے لگا کہ وہ بارہ ٹانگ پیدا کرے اور اپنی بیوی کی سرنگھنی کو اس کے تے بکلیں۔ اس کے عضو عضو کی سرنگھنی کو اس سے دودھ دے اور بچے کھانے کا مال ہے۔

رات کا وقت تھا اندھیری رات، بنو خاں بخار کی حالت میں برآمدہ میں چڑا ہوا تھا اور سب گری کے کھانے ہوئے پھر سوار رہے تھے۔ ایک بیک بنو خاں کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کیا دیکھتا ہے کہ وہ کھیت کے پاس ماہی کی روٹھی ہوئی اور بھج گئی۔ اس اشارہ پر اس کی بیوی چار پانی سے اٹھی آس پاس اٹھی طرح دیکھا اور بے پائوں چل کر گڑی ہوئی۔

بنو خاں دم بخود دیکھتا رہا یہ صورت ایک غیر مرد سے ملنے کیوں چار ہی تھی۔ مگر وہ آواز جس کے پاس گھر بے درمیں۔ اس کے پاس کیا ہے جو بنو خاں کے پاس نہیں۔ آواز وہ کیوں ہزاری کی کیا کی طرح اس کے پیچھے بکرا کرتی ہے۔ دفعتاً اسے خیال آیا کہ یہ کرشمہ محض ٹانگ کا ہے۔ وہ جنس، باب جس کے پاس سے گھوٹی۔

بنو خاں نے اٹھ کر اندر کی کوٹھری سے کڑا سر نکالا اور آہستہ آہستہ گویا میدان جنگ میں دشمن کی فوج لینے نکلا۔ اس نے اسی روٹھی کے نشان پر چلا تو اب آ کر اس نے بھڑکی پھینک دی اور زمین پر پڑ گئے ہوئے جاتے لگا۔

ہر طرف خاموشی تھی۔ بس جاسن کے بچے کسی کے اپنے کسی کے اپنے اور کسی کے کل کھانے کی آواز آ رہی تھی۔

بنو خاں کی رنگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ اسے فوج کے دو سب داؤں گناہ پورا گئے جو شب خون مارنے وقت استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں دھندوں کی سی چمک آ گئی اور اس نے اندھیرے میں دو دیکھا جو تھک چکا ہے تھا۔

اس کے گھڑے کا بھر پور دھرم کی راتھی ٹانگ پر چڑا اور وہ اس سے کت کر الگ ہو گئی۔ ایک دھشت ناک چنچا سے لٹکا گونج اٹھی۔ رقیب کی خون آلود ٹانگ بنو خاں نے اٹھائی اور اپنے زخمی سینے سے ہاندہ لی۔

اور جب گاؤں والے وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہر طرف میں شرابور سہا سہی چڑا ہے، صورت اڑ کے مارے بے دم ہو گئی ہے اور بنو خاں وہ ٹانگ ہاندے سے پاگوں کی طرح افسوس رہا ہے!

اختر انصاری (دہلوی)

نام	امجد اختر
تلمی نام	اختر انصاری، اختر انصاری دہلوی
پیدائش	تیم اکٹوبر ۱۹۰۹ء بمقام بدایوں، بھارت
وفات	۵ اکتوبر ۱۹۸۸ء بمقام علی گڑھ
تعلیم	ایم اے (اردو)، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۳۲ء پی۔ ٹی نیچرل سائنس کالج، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، ۱۹۳۴ء
	پہلے قدیم اینگلو بریک ہائی سکول، دہلی اور پھر سینٹ اسٹیفن مشن کالج میں تعلیم پائی۔ ۱۹۳۴ء میں میٹرک اینگلو بریک ہائی سکول، دہلی سے کیا اور پی۔ ایسے (آخری ۵ تاریخ، سینٹ اسٹیفن مشن کالج، (دہلی یونیورسٹی) سے ۱۹۳۰ء میں کیا۔ ۱۹۳۱ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے انگلستان گئے لیکن بدھ جو تعلیم اور صوری چھوڑ کر واپس آئے ۱۹۳۱-۳۲ء میں قانون پڑھنا شروع کیا لیکن جو جو پہلے سلسلہ بھی ترک کر دیا۔ پی۔ ٹی، نیچرل سائنس کالج، علی گڑھ یونیورسٹی سے ۱۹۳۳ء میں کرنے کے بعد وہیں سے ۱۹۳۷ء میں ایم۔ ایسے (اردو) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

اختر انصاری دہلوی کا مولد بدایوں سے لیکن انھوں نے وہاں زندگی کے محض چند ماہ گزارے۔ کچھ ہی سبب سے کہ بدایوں سے زیادہ دہلی کو اپنا وطن خیال کرتے تھے۔ ان کے والد اکبر خواجہ دہلوی پنجاب میں نیکل سرحد کے رہنے والے تھے اس لیے زندگی کے ابتدائی تین چار برس اختر انصاری نے پنجاب کے مختلف شہروں میں گزارے۔ اس کے بعد ان کے والد دہلی منتقل ہو گئے۔ اس زمانے میں اختر انصاری تین برس کے تھے، وہیں ہوش سنبھالا اور ابتدائی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ جب پانچ برس کے تھے تو والد کا انتقال ہو گیا۔ لگ بھگ ۱۹۲۸ء میں ان کے والد دہلی میں سسٹنٹ سول جرنل رہنے کے بعد منتقلی ہوئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ والد کا انتقال ۱۹۲۹ء میں ہوا۔

اختراعات کی طرح تصانیف کی کتابوں سے ہمیشہ پائی رہی۔ بدیہ مجبوری امتحانات دینے اور پاس ہوتے رہے۔ اعظمیہ کے امتحان باقاعدہ تباری کے ساتھ دیا اور اختیاری لمبروں کے ساتھ پاس ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں شعر گوئی کا آغاز ہوا اور ۱۹۳۳ء میں نثر نگاری کی طرف راہ پھولے اور افسانہ نگاری شروع کی۔ ۱۹۳۳ء تا ۱۹۴۷ء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سنی ہائی سکول میں ٹیچر رہے۔ ۱۹۴۷ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ اردو میں ٹیچر کی حیثیت میں تقرر ہوا جہاں سے ۱۹۵۰ء میں ٹیچر ڈیپارٹمنٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ منتقل ہو گئے اور ریٹائرمنٹ (۱۹۷۱ء) تک وہیں رہے۔ اس کے بعد علی گڑھ میں مستقل قیام رہا اور تادم ہرگ ادبی مسائل کو جاری رکھا۔ چارہال شہر میں بیٹے نکل کالج، علی گڑھ میں تھے جب ۷۹ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

اولیٰین مطبوعہ افسانہ:

”اے بہا آرزو کہ خاک شدہ“ مطبوعہ ۱۹۳۳ء

تفہی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱ ”انفرد“ (قطعات، نثریات اور نظمیں) سول ایجنٹ، صدیقی بک ڈپو، طبع اول: ۱۹۳۳ء
(یہ مجموعہ دوسری بار ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا)
- ۲ ”انگلی دنیا اور دوسرے افسانے“ (۱۲۳ افسانے) کتبہ جہاں نادر علی، طبع اول: ۱۹۳۹ء
(۱) ”اے بہا آرزو کہ خاک شدہ“ (۱۹۳۳ء)، (۲) حور (۱۹۳۵ء)، (۳) یوں بھی ہوتا ہے (۱۹۳۵ء)، (۴) انکھل (۱۹۳۶ء)، (۵) اختار دہی صدی کا نظم (۱۹۳۶ء)، (۶) ہسپتال (۱۹۳۶ء)، (۷) متھون دنیا کے غیر متھون انسان (۱۹۳۶ء)، (۸) پانو (۱۹۳۶ء)، (۹) ایک شام (۱۹۳۶ء)، (۱۰) انصاف چکاری (۱۹۳۶ء)، (۱۱) زینبی صاحب (۱۹۳۷ء)، (۱۲) ایک سق (۱۹۳۷ء)، (۱۳) ایک طاقت (۱۹۳۷ء)، (۱۴) چند خطوط (۱۹۳۷ء)، (۱۵) ولی کی سیر (۱۹۳۷ء)، (۱۶) بھوک (۱۹۳۷ء)، (۱۷) انگلی دنیا (۱۹۳۸ء)، (۱۸) میں نے ایسا کیوں کیا؟ (۱۹۳۸ء)، (۱۹) گرمیوں کی ایک دوپہر (۱۹۳۸ء)، (۲۰) خام سورا (۱۹۳۸ء)، (۲۱) جراتم پیشہ لوگ (۱۹۳۸ء)، (۲۲) چودھری صاحب (۱۹۳۸ء)، (۲۳) منقولہ (۱۹۳۸ء)
- ۳ ”نار و نور دوسرے افسانے“ (۱۱۳ افسانے) کتبہ جہاں نادر علی، طبع اول: ۱۹۴۰ء
(۱) پیشہ خاں خاں خاں (۱۹۳۳ء)، (۲) ایک افسانہ جو کھل نہ ہوسکا (۱۹۳۳ء)، (۳) میرے بچوں کی قسمت (۱۹۳۵ء)، (۴) آرزو (۵) دوست کی بیوی (۱۹۳۶ء)، (۶) بزدل (۱۹۳۶ء)، (۷) کہہ کہیں ہے؟ (۱۹۳۶ء)، (۸) زینبہ (۱۹۳۹ء)، (۹) سید صاحب (۱۹۳۹ء)، (۱۰) میرے مگر صاحب (۱۹۳۹ء)، (۱۱) گمشدگی کی کہانی چاندنی کی رہائی (۱۹۳۹ء)، (۱۲) زینت (۱۹۴۰ء)، (۱۳) غم صیب (۱۹۴۰ء)، (۱۴) جیسے کوئی نہ (۱۹۴۰ء)
- ۴ ”آگیتے“ (قطعات) کتبہ اردو، حیدر آباد دکن، طبع اول: ۱۹۴۱ء

۵	"انٹرویو" (مجموعہ)	چاندنی کتاب گھر، پٹنہ	طبع اول: ۱۹۴۱ء
۶	"خوشی اور دوسرے افسانے" (گیارہ افسانے)	کتبہ اردو لاہور	طبع اول: ۱۹۴۳ء
	(۱) خوشی (۱۹۳۶ء)، (۲) غرت (۱۹۳۹ء)، (۳) فریب (۱۹۳۹ء)، (۴) گرج (۱۹۳۹ء)، (۵) بھول (۱۹۴۰ء)، (۶) نور (۷) قہر منو (۱۹۴۱ء)، (۸) بوجا (۱۹۴۱ء)، (۹) شہزادہ (۱۹۴۱ء)، (۱۰) اظہار آئے (۱۹۴۱ء)، (۱۱) ایک واقعہ (۱۹۴۱ء)		
	(۱۱) درد کی سیر (۱۹۴۲ء)		
۷	"غریب" (غزلیات)	محبوب الطالع، دہلی	اشاعت اول: ۱۹۴۳ء
۸	"بھرا بھر" (قصیں)		اشاعت اول: ۱۹۴۳ء
۹	"ایک ادبی آزمائی"	لاہور	اشاعت اول: ۱۹۴۳ء
	(مختلف مصنفین کے واقعات، ادب سے متعلق)		
۱۰	"روم صبر" (قصعات، غزلیات اور قصیں)	لاہور	اشاعت اول: ۱۹۴۵ء
۱۱	"سوا یک قہر منو" (۱۲ افسانے)	پنچورٹی پبلشرز، نئی گڑھ	اشاعت اول: ۱۹۵۳ء
۱۲	"اچھوت اور انسانی" (مختب کلام)	پنچورٹی پبلشرز، نئی گڑھ	اشاعت اول: ۱۹۵۷ء
۱۳	"چاندنی اور دوسرے افسانے" (۱۳ افسانے)	پنچورٹی پبلشرز، نئی گڑھ	طبع دوم: ۱۹۵۸ء
۱۴	"غزل اور دس غزل" (تعلیم)	انجی کیشنل بک ہاؤس، نئی گڑھ	اشاعت اول: ۱۹۵۹ء
۱۵	"بارہ افسانے" (مختب کلام)		اشاعت اول: ۱۹۶۱ء
۱۶	"عالمی اور بابتھیدی شعور" (مجموعہ)		اشاعت اول: ۱۹۶۳ء
۱۷	"Studies in Language and Language Teaching"		اشاعت اول: ۱۹۶۴ء
	(تعلیم)		
۱۸	"نئی مہین" (قصعات)		اشاعت اول: ۱۹۶۳ء
۱۹	"سرور جاں" (غزلیات)		اشاعت اول: ۱۹۶۳ء
۲۰	"سطح و عمق" (مجموعہ)		اشاعت اول: ۱۹۶۵ء
۲۱	"A Background to Educational Theory" (تعلیم)		اشاعت اول: ۱۹۶۵ء
۲۲	"پہاؤس" (مختب قصعات)		اشاعت اول: ۱۹۶۵ء
۲۳	"چندر تھیں" (قصیں)		اشاعت اول: ۱۹۶۷ء
۲۴	"دور و دراز" (مثنوی)		اشاعت اول: ۱۹۶۷ء
۲۵	"خطبہ جام" (ادبیات)		اشاعت اول: ۱۹۶۸ء
۲۶	"دہلی دھم" (مختب کلام)		اشاعت اول: ۱۹۷۱ء

اشاعت اول ۱۹۷۲ء	"Anecdotes from life of Ghalib"	۲۷
اشاعت اول ۱۹۷۳ء	"شعلہ کینٹ" (مکتبہ دیاعیات)	۲۸
اشاعت اول ۱۹۷۳ء	"روح نقوش" (مکتبہ ہندی قطعات)	۲۹
اشاعت اول ۱۹۷۵ء	"نورال کی سرگزشت" (مکتبہ)	۳۰
اشاعت اول ۱۹۷۷ء	"دلی کا دور" (سوانح حیات)	۳۱
اشاعت اول ۱۹۷۹ء	"وقت کی باہوں میں" (طویل نظم)	۳۲
اشاعت اول ۱۹۷۹ء	"نورال اور نورال کی تعلیم" (تعلیم)	۳۳
اشاعت اول ۱۹۷۹ء	"تعلیم، سائنس اور کج" (تعلیم)	۳۴
	"نورال کی سرگزشت" (محقق و تحقیق)	۳۵
	"ایک قدم اور سی" (مجموعہ نغمہ)	۳۶
	"اردو کشن، بنیادی و تکنیکی عناصر" (مکتبہ)	۳۷

غیر ہندو ان:

مقامی اور شعری تخلیقات کے علاوہ ہندو افسانے: "ارنی بدھیب" "مور" "غیر مرئی انسان" "مطبوعہ" "نقوش" "کاہور پارت" دسمبر ۱۹۷۷ء اور افسانے: "ایک شخص" "مطبوعہ" "نقوش" "کاہور پارت" جنوری ۱۹۷۹ء "کامل آپ جی" "بادوں کے چراغ" "مطبوعہ" "کویپ" "اور" "علی گڑھ بنگرین"۔

زندگی میں مستقل چنا:

"شیراز" "چاندرا اور دودھ" "علی گڑھ" (آر پی دہلیش) بھارت۔

اعزاز:

۱۔ "مسودی طالب ایوارڈ" برائے اردو شاعری ۱۹۸۸ء

۲۔ آر پی دہلیش اردو اکادمی بکسٹو ایوارڈ برائے مجموعی خدمات

نظریہ فن:

"گزشتہ چند سالوں میں میری ادبی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو میرا ترقی پسند اندازِ خیال رہا ہے۔ ادبیاتی چھانسنوں کے مطالعہ میں نے اپنے کام لانے اسی رجحان کے ماتحت لکھتے ہیں۔"

(پہچان "ستاروں کی مٹل" "مرتبہ: شیر ہندی، مطبعہ نمبر ۲۰)

حوالہ جات:

- ۱۔ "کامی اورادوب" ۱۹۸۱ء، مروجہ ادبی کتب کرم مطبوعہ، پبلشرز ڈیفنڈن لیمیٹڈ، لاہور، دہلی، بمبئی ۱۹۵۵ء میں تاریخ پیدائش ۳۰ ستمبر ۱۹۰۹ء درج ہے۔ کم آنکوری ۱۹۰۹ء کی تاریخ "تاریخ" کتابوں کی مکمل "مروجہ" اخیر بعدی کے لیے اکثر اعشاریہ اہلی کے مروجہ کردہ کو نصف سے لی گئی ہے۔
- ۲۔ "تہ کوہادو سال" اورادوب نام۔
- ۳۔ "کامی کتبہ سنو" کے بعد والہ نے اس سے لگی "یہ زندگی" نامی مجموعے میں مثال کے کے تھے۔
- ۴۔ "یہ زندگی اورادوب سے الہا کے" میں ۱۹۳۸ء سے لگی لکھے گئے اوراقوں کو یک جا کیا گیا ہے۔

لوا ایک قصہ سنو!

اختر انصاری دہلوی

”میں اب سوشل سائنس پڑھ رہی تھی۔“

مجھ نے بھائی کے ساتھ خطوط جو اس مضمون پر مشتمل تھے، پڑھا سے آچکے تھے۔ میری کاملی جواب دہی کی اہلیت ہی خود بخود تھی۔ روز پیرا دہ کرنا تھا اور روز پیرا دہ ملتی ہو جاتا تھا۔ جب نصف درجن خطوط فتح ہو گئے اور میں بھی اپنی خیریت کا خط لکھے بغیر کم و بیش دو مہینے گزر چکے تو ایک دن غیر معمولی غم سے کام لے کر کاغذ اور قلم و دات لے کر بیٹھا اور تجزیہ کر لیا کہ نہایت مفصل خط لکھوں گا اور انتہائی چرب زباناً اور دلائل آفرینی سے کام لوں گا تاکہ میں مہمانِ ہندوستان واپس آنے کے خیال سے غم ہو کر ہمارے میں اپنا قیام جاری رکھنے پر مجبور ہو جائیں۔ میں مہمانِ خدا تمہیں خوش رکھے اتم خدا کو سراہے۔ وادوں کے دماغ کی پیداوار سمجھتے ہو لیکن میں اس خدا پر ایمان رکھتا ہوں جس کا وجود سرابِ وادوں کے وجود سے بہت پرانا ہے۔ اس لیے بھائی! میں تو اپنا خط اسی دعا سے شروع کروں گا کہ خدا تمہیں خوش رکھے۔ ایک اعمال کی توفیق دے اور ایمان کی روشنی عطا فرمائے۔ آمین! ”لوا ایک قصہ سنو!“ ایمان کی روشنی“ پر یاد آ گیا۔

بہت دنوں کی بات ہے کہ میں برسات کا لطف اٹھانے کے لیے سرحدی میں بوسٹ کے یہاں مقیم تھا۔ ایک دن قلبِ میر کی سیر کو گئے۔ ہم لوگ اپنے اپنے سیر میلوں پر چڑھ رہے تھے۔ ہمارے چچے چچے فوجیوں کی ایک فوجی تھی اور کہیں اس کے قریب ہی یکہ رقعہ پاش مورچہ تھیں۔ مورچہ رقعہ پاش ضرور تھیں مگر اس کے چہرے بے غصہ تھے اور وہ آدھی کے ساتھ منہ منہ ہلاتی، جیسے لگاتی اور ”وہی اللہ“ اور ”ہے“ کرتی ہوئی غیر مردوں کے دوش بدوش سیر میلوں پر کھڑی تھیں۔ ماحول کی تبدیلی بھی کسی عجیب چیز ہوتی ہے۔ میں میلوں اور انور کرنے کی بات ہے یہی مورچہ جوشوری زندگی اور معاشرتی زندگی کی حدود میں رہتے ہوئے ہمیں اپنی جھلک بھی دکھانا گوارا نہ کرتیں، اب اس زندگی سے دور لکھ بلٹا ہو کر اپنے آپ کو کس قدر آزاد محسوس کر رہی تھیں! اخیر تو جہانوں کی اس بولی میں ایک گڑے دل بھی موجود تھے۔ وہ چار گوری جتنی صورتیں جو کہیں تو آواز آنے شراعت پر۔ اپنے کسی ساتھی سے بولے ”اماں پیرا روشنی تو یہاں بہت ہے پھر لائٹوں کی کیا

ضرورت ہے؟" ان مردوں کے ساتھ ایک بڑی عورت تھی۔ اس نے ہفت سے جواب دیا "میاں صاحبزادے! ایمان کی روشنی چاہیے۔ یہ دانشمندی تو بہت جلد بج جائیگی۔" نہ چلو کیا حال ہوا سنئے والوں کا۔ جتنے تھے سب پر گزروں پانی چڑ گیا۔ کیا منہ توڑ جواب دیا ہے بڑھیا نے! کمال کر دیا کچھ کچھ افلاطون کی تالی تھی کھلتی اور غرض یہ ہے میں میاں صاحبزادے کی روشنی بڑی چڑ ہے۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا وہ تھیں کے طور پر تھا۔ اب کام کی باتیں سنو۔ ہاں ہاں کے خطوط سے اور خود تہاری تحریروں سے یہ معلوم ہوا کہ بھاسو میں تمہاری نہیں لگتا اور تم وہاں رہنا فضول سمجھتے ہو۔ میں نے اپنے بچھلے نکاح میں یہ لکھا تھا کہ تم اپنے آپ کو مٹالے میں مصروف کرو۔ اس سے ان فائدوں کے علاوہ جو مٹالے سے حاصل ہوتے ہیں، ایک بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ تم اپنا وقت آسانی سے کاٹ سکر گے لیکن تم نے میرے اس خیال کو مکمل سمجھا۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ چڑھنے سے تمہیں دلچسپی تھی ہی کب جواب ہوگی۔ جب غالب علی کے زمانے میں نہیں چڑھا اور لغو سیاسی مشاغل میں ہفت ضائع کیا تو اب کیا خاک چڑھو گے۔ تم کو چڑھنے کا مشورہ دینا ایک فضول اور مکمل کی بات ہے۔ مگر میں میاں صاحبزادے کی مثال بالکل قائل ہے کہ میں چلو کہ بھاسو میں دھشت و خیر مقام پر نہیں رہا ہوں، اور مگر سے نکل کر نہیں کیا ہوں تو انگلستان گیا ہوں، اس لیے تمہاری پریشانی اور بے لطفی کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ لیکن بالخصوص یہ دماغی حالت اور تھکی کیفیت سے احتیاط رکھتے ہو۔ جتنے تم خود بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں کوئی صاحب کرنا نہ دیکھ رہا ہوں اور غیب کا حال چاہتا ہوں، بلکہ صرف یہ کہ میں بھی ان حالات سے دوچار ہو چکا ہوں اور یہ آفت مجھ پر بھی بیت چکی ہے۔ تم نے میرے لندن جانے کا ذکر ناحق کیا۔ میں اس کی حکایت نہیں کرتا کہ تم نے میرے لیے ہر ایک ٹھکانے کی بات کر دیا اور یہ ایک لطیف طرز سے کام لیا بلکہ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے اپنی مصلحت میں کوئی بات نہیں کی۔ جو کچھ کہابھری مصلحت میں کہا۔ سوچی سمجھی بات کیا کرو میں یہاں آ گیا تم نہیں جانتے کہ جس دن میں لندن پہنچا اس کے دوسرے دن لندن سے خطر ہو گیا اور دہلی کی یاد میں آئیں وہاں لگاؤ تھا؟ جلد یہ دہلی کا یہ عظیم الشان مرکز اپنی گونا گوں دھانیوں، درگاہوں اور مصروفیتوں کے باوجود دہری قوج کو جذب نہ کر سکا۔ چنانچہ چند ماہ نہایت بدترکی کے ساتھ گزرا وہ اور بدترجان دہلی آ گیا۔ بھری زندگی کے اس فحش و فساد کا دھو سے تم کیا نتیجہ لانا کہ میں دہلی میں رہی کا لکھا ہوں دہلی کی زندگی یا بے رنگی پر غصہ نہیں، مگر آپ بھاسو میں رہ کر دہلی کے لیے بے قرار رہتے ہیں تو لندن میں بھی آپ کا یہی حال ہو سکتا ہے۔

بات یہ ہے میں میاں صاحبزادے کا ایمان جب اپنے وطن اور اہل وطن سے ہٹا ہو کر کسی انجینی ملک میں جاتا ہے تو اکثر و بیشتر "ہوم سک" ہو جاتا ہے "ہوم سک فیس" ایک عام مرض ہے اور بہت سے غریب الوطن اس بیماری کا شکار ہوتے ہیں۔ اس میں بچوں، بوڑھوں، مردوں اور عورتوں کی شخصیتیں نہیں۔ جو بھاسو اور لندن یا مسقط اور جبریل کی شخصیت ہے۔ ہر ایک قصہ سنو!

میں جس زمانے میں لندن میں تھا اس زمانے میں وہاں ایک ہندوستانی رہتھوڑا "کوہنور ستوران" کے نام سے جاری تھا۔ یہ بالجمہ کوہنور ستوران ہندوستانی کے ایک کاسٹ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے وہاں کوہنور کے تھے۔ میں لندن پہنچ کر دہلی کے لٹریچر اور پبلشنگ گھرانوں کو گزرا ہی گیا تھا۔ یہ حالت تھی کہ بریانی ٹائی کباب، روٹن بوش اور ٹماٹوں کی کھانسی کے حوالے سے آئے تو کچھ منہ میں پانی بھر آتا چیتا چھ "کوہنور" کا کھانا میرے لیے حقیقتاً قسمت غیر حرق کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن کی سبیل کا سڑک کے وہاں پہنچتا اور ان کا ڈھائی ٹھٹھ کا لڑکھا ہوتا۔ کسی اور دن چائوں یا نہ چائوں انوار کو ضرور دھاتا تھا کیونکہ اس دن جلیبیوں بھی ان کا ایک جزو ہوتی تھیں۔ تو میں میاں صاحبزادے سے کہ ایک اتوار کی شام کو میں وہاں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا، اس وقت میرے

سواہاں کوئی اور نہ تھا، کچھوں کی اصل میں ایسی اذکاوت نہیں ہوا تھا اور میں جھگڑوں کے لالچ میں اراوت سے پہلے ہی ہتھی گیا۔ میں نہایت اطمینان کے ساتھ کھانا کھانے میں مشغول تھا کہ ایک صاحب تحریف لائے۔ میں نے ایک نظر میں صرف اتنا دیکھا کہ وہ اندھ ستانی ہیں۔ اس سے زیادہ دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مغرب کے بڑے بڑے شیروں میں لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ دوسروں کو بے سبب گھورتا یا ان کے کاموں میں دخل دیتا وہاں بدتمیزی خیال کی جاتی ہے اور اصل یہ ہے کہ ان فضول باتوں کے لیے ان کے پاس وقت بھی نہیں ہوتا۔ یہ صاحب آئے اور مجھ سے تھوڑے سے فاصلے پر بیٹھ گئے۔ میں اپنے کھانے میں مشغول رہا اور ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ ایک آدھ اپنی ہوئی نظر ان کے چہرے پر پڑ گئی ہو تو اس کی جگہ غریب نہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ فرار یا اور یہ پوچھنے کے لیے کہ آپ کے واسطے کیا چیز حاضری جائے ان کے پاس گیا۔ جو بھی ان کے منہ سے پہلا لفظ نکلا میں چونک پڑا۔ میں ان کی آواز پہچانتا تھا۔ آواز کو یاد رکھنے میں میرا خاصہ بہت اچھا کام کرتا ہے۔ ہوا ایک لمحہ سنا۔

یہ کوئی بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ میں دہلی سے بریلی بڑے لہا کے پاس جا رہا تھا۔ علی گڑھ سے جو گاڑی ملی اس میں بہت بھڑکھی۔ اکثر کچھ کچھ گھبراہوا تھا۔ بڑی مشکل سے حرام میں ہلکی ملی۔ ایک کونے میں دیک کر بیٹھ گئے۔ اتنی بھی گھاٹش نہ تھی کہ آوازوں کے ساتھ ادھر ادھر ہو کر دیکھ سکیں۔ بس جہاں بیٹھے وہ وہاں بات ہے نہ جس وجہ سے بیٹھے ہو۔ خبر دینے کے اور گاڑی ملی چڑی۔ علی گڑھ کے انشیں سے ٹکری ہی تھ کہ اسے میں ایک عمارت میں داخل ہو گیا۔ کیا طہر تھی کہ مسافروں کی اس بھڑک میں ایک جاوڑا اٹھ بیٹھا ہے۔ یہ شخص مجھ سے بہت دور بیٹھا تھا اور چونکہ میری پشت اس کی طرف تھی، میں اس کو دیکھ ہی نہ سکا تھا۔ دیکھنے کی میں نے کوشش بھی نہیں کی۔ اس کے گانے کو ”مرد خاتہ صبا“ کہہ کر سننے لگا۔ کیا تھوڑا اس کی بھاری آواز میں کتنا اور دور تھی کتنا وہ تھی۔ طبیعت پر اثر سا چھا گیا۔ سڑکی ساری کلفت دور ہو گئی۔ علی گڑھ اور بریلی کے درمیان یہ شخص جتنا فوفا کا جا رہا اور اس کے گانے کی وجہ سے سڑکا صاف لہجہ۔ ہاں لطف کی بات یہ ہے کہ اتنے لمبے سفر کے دوران میں میں نے اس کی ایک جھلک بھی نہ دیکھی۔ بریلی پہنچنے کے تین چار دن بعد شام کے وقت ہم سب کوئی سات آٹھ آدمی، مکان کے سامنے چہترے پر سوار ہوئے اور کرسیاں ڈالنے بیٹھے تھے۔ ایک صاحب جو اپنی دیش قطع سے ایک نقد رازد شان کے بزرگ معلوم ہوتے تھے تحریف لائے۔ گھبراہوا جسم، کھلی سیاہ داڑھی، آنکھوں میں سرور، کچھ تھوڑا گرے کھنٹی رنگ کا گھٹوں سے بچا کرتا۔ وہ بیٹھا کوئی صوفی تھے۔ آتے ہی بڑے ہاتھ سے بغل گیر ہوئے اور بلند آواز سے باتیں کرنے لگے۔ میں ان کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ میں نے کہا ”حضرت امیر اخیال ہے آپ تین چار دن ہوئے دو پہر کی گاڑی سے بریلی تحریف لائے تھے۔“ کہنے لگے، ”یہی ہیں! آپ کو کیسے معلوم؟“ آپ بھی شاید اسی گاڑی سے آئے ہوں گے۔“ میں نے کہا ”آپ تو میں بھی اسی گاڑی سے تھا، لیکن میں نے آپ کو دیکھا نہیں۔“ ”ہم آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں اس گاڑی سے بریلی آیا؟“ انہوں نے ہجرت کے ساتھ سوال کیا۔ غرض کہ ان کے ساتھ بڑی دلچسپ گفتگو شروع ہوئی اور اسی طرح جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے آپ کو آپ کی آواز سے پہچانا تو وہ بہت حیر ہوئے۔ اس کے بعد بڑی دیر تک ہم نے ان کا گانا سنا۔

قوس میاں بات ہے کہ میں کسی آدمی کو اس کی آواز سے پہچان لیتا ہوں۔ ”کو تو؟“ میں بھی یہی ہوا جو جی ۱۱ صاحب کو لے میں ان کو پہچان گیا۔ دو ڈاکٹر نصیر تھے جو کئی سال دہلی کے سول ہسپتال میں ہائوس سرجن رہ چکے تھے۔ انہوں نے گھاپلی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پایا تو وہ بھی مجھے پہچان گئے غوراً بولے ”آپ دہلی سے تحریف لائے ہیں؟“ میں نے کہا ”یہی ہیں“ معاف کیجئے گا ڈاکٹر صاحب میں نے آپ تک آپ کو پہچانا نہیں تھا۔“ ”لو لے“ ہیں۔ میں بھی آپ کو پہچان نہیں سکا تھا۔“ مگر میں نے کہا: ”بہت کافی حد ملی ہوگی آپ میں، دو تین صیغے

رہا کرتی چیزوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لے اور ایک نگاہ دتا رہے کہ میرے میں چنے کر دیلی گھنٹوں اور لا ہو کر ہنگامہ پر درصحتوں کی یاد میں غلطی غلطی آج بھی مجھے ہے اور اپنی عمر کی پراثر یہاں ہے۔ میں اس عقیدے کے کائناتوں میں امن میں اس کا وہی مگر نقیب ٹھکانا پر بھی جا کر رہتا ہوں اس کے پاس بڑا راز رکھا رہنے کی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ وہ وہاں بھی اپنا وقت مفید مشاغل میں گزار سکتا ہے۔ یاد رکھو دنیا میں بہت کم لوگ ایسے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ ان کو کمرے پہر نکلتے اور یاد رکھنے کا موقع ملے۔ پھر ان کی انہوں میں وہ لوگ جن کو ایسا موقع ملتا ہے اور وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ مجھے بھی قدرت نے ایک مرتبہ ایسا ہی پیش کیا تھا موقع ملا کیا تو لیکن میں اس سے مستفید نہیں ہوا، کیوں کہ میں اس وقت اتنا ہی نادان تھا جتنے کہ آج تم ہو۔ زندگی کو دیکھنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کی جو تربیت آج میرے اندر ہے وہ اس وقت نہ تھی۔ حیات انسانی کا فراموشی مارا ہوا مسند میرے چاروں طرف پہلچلا چلا رہا تھا لیکن میں نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور آج یہ حالت ہے کہ گو یا زندگی کے خشک رستے حاصل پر ابھی ہے اب کی طرح چاروں طرف ہوں۔ افسوس! افسوس! افسوس! افسوس! افسوس! افسوس! افسوس! افسوس! خدا سے دعا ہے کہ میں یہاں اس مرحلے پر ابھی نہ پہنچتا ہوں!

بات سے بات گفتگو ہے۔ سچا صفت و سفر کا ایک بہت بڑا انکار و یاد آ رہا ہے جن لوگوں کو اس بات کا موقع ملتا ہے کہ وہ مگر سے باہر نکل کر ہوں، میں درجی اور مختلف مقامات پر بھیجیں ان میں ایک خیر امتدادی اور دینی امور کو کرنا کی ایک چھٹی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ خوبیاں ان لوگوں میں لپیٹا کر لائی جاتی ہیں جن کو سچا صفت کے مواقع میسر نہیں آتے۔ ہر ایک قدر سنو!

ابھی بچپن میں وہ ناصر بھائی نے اپنے ایک مزاح دوست سلطان صاحب سے میری ملاقات کرائی۔ وہ دریا گنج میں رہتے ہیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے اور ناصر بھائی کو ان کے گھر پر بلوایا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ کوٹ اور شیرانیوں اور کمرہات اور تک ان کے خانہ باغ میں چھپے باتیں کرتے رہے۔ باتیں کرتے کرتے ناصر بھائی نے کہا ”کیوں نہ ہم لوگ چلتے ہوئے فیروز شاہ کے کوٹ تک جاتے ہیں؟“ سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور مسز سلطانی نے بھی اجازت دے دی۔ رات کے نو بج چکے تھے اور یوں بھی دریا گنج سے فیروز شاہ کو کوٹ دور کتنا ہے چنانچہ ہم سب جس طرح چلتے تھے اسی طرح چلتے کے لیے کوزے ہو گئے تھے سلطان صاحب نے کہا ”قورم خیمہ کے میں ابھی آتا ہوں۔“ اور کوٹ کی طرف چلے گئے۔ میں سمجھا کہ کوزے پہنچے گئے ہیں مگر ناصر بھائی اور مسز سلطانی نے ایک دوسرے کو سختی بیز نظروں سے دیکھا اور دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ ناصر بھائی مجھ سے بولے ”ہاں سنو ہو یہاں گئے ہیں؟“ میں نے کہا ”میں تو نہیں جانتا۔“ اپنی والدہ سے اجازت لینے گئے ہیں۔“ ناصر بھائی نے کہا ”اجازت اس بات کی اجازت؟“ میں نے بوجھا۔ ”اجازت اس بات کی کہ فیروز شاہ کے کوٹ تک چلے آئیں۔“ ناصر بھائی نے جھپٹے ہوئے کہہ مسز سلطانی بھی چپٹے گئیں۔ میں اس واقع کو خاک میں سمجھا بیوقوفوں کی طرح ان دونوں کا منہ سمجھنے لگا۔ ناصر بھائی نے مجھے بتایا کہ سلطان صاحب آج تک اپنی والدہ کی اجازت کے بغیر کبھی گھر سے باہر نہیں نکلے۔ وہ کہیں جانے سے پہلے والدہ سے اجازت لینا ہمیشہ اپنا فرض خیال کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بچپن سے لے کر اس وقت تک کہ ان کے گھر چالیس سے ستر سو سال پہلے سے دریا گنج سے باہر نہیں گئے، اور ہمیشہ گھر پر اپنی والدہ کے سایہ عاطفت میں

کچھ کچھ مہینے وہاں رہ کر سلامتی صاعہب کی یہ عادت کروا کر سے باہر جاتے وقت اپنی اجازت ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ کوئی بڑی عادت نہیں ہے مگر پھر بھی میں اس کو ان کے کردار کی بہت بڑی نگرہ دلی خیال کرتا ہوں۔ میں ابھی ان سے صرف دو چار ملاقاتیں کر سکا

ہوں۔ اگر ان طاقتوں کا سلسلہ جاری رہا تو میں یقیناً ان کی اس کمزوری کا اور ان کی زندگی پر اس کمزوری کے اثرات کا اچھی طرح مطالعہ کر سکوں گا۔ مگر اس وقت بھی یعنی کسی نفسیاتی مطالعہ کے بغیر اتنی بات ڈھونڈنے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سلطانی صاحب خود احمدی سے بالکل محروم ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ صرف گھر سے باہر جانے کے لیے جکڑے زندگی کے ہر اہم اور غیر اہم اقدام کے لیے اپنی والدہ کی اجازت حاصل کرتے ہوں گے اور والدہ کی اجازت کے علاوہ کسی سے بھی مشورہ کر لیتے ہوں گے۔ ممکن ہے بچوں کی رائے بھی لے لیتے ہوں اور کچھ نہیں جو لوگوں سے بھی مشورہ کر لیتے ہوں۔ وہ چھاپی ذمہ داری پورا کرنا کوئی کام نہیں کر سکتے۔

اور ان کی اس طوفانی کمزوری کا سبب یہ بھی کہ وہ کبھی کسی قابل ذکر وقت کے لیے گھر سے باہر نہیں رہے، انہوں نے کبھی کوئی لہذا اور راز کا سفر نہیں کیا اور ان کو کسی ایک دن بھی یہ محسوس کرنے کا موقع نہیں ملا کہ آج میں اپنے عزیزوں، دوستوں اور اہل علم خواہوں سے دور ہوں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا نتیجہ برائیا ہو بھی سکتا ہے۔

اب تم خود سوچ لو میں یہاں ایک قدرست نے تمہیں ہر ماہ کے سفر پر مجبور کر کے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کیا یا برا اور یہ کہ بھاسو میں تمہارا قیام ضروری ہے یا نہیں۔

تم بھروسہ خان آنے کے لیے بے قرار ہو۔ پوچھنے کیوں تو جواب ملتا ہے کہ بھاسو میں نوکری ملنے کی کوئی امید نہیں، اور اگر مل بھی سکتی ہے تو برسوں کے انتظار اور وقوف کی امید واری کے بعد لڑائی میں جان کے خطوط سے تمہارے ان خیالات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ وہ بار بار یہی کہہ رہے ہیں کہ میں یہاں کے لیے کوشش کر رہی ہوں اور خدا نے اپنا چاہا جلد کامیابی ہوگی۔ ماسوں جان کا خدا بھی، وہ خدا نہیں ہے جس کو تم سرسایہ دادوں کے دام میں پھنسا کر رکھتے ہو۔ اس لیے میں بھی ان کے ساتھ اس امید میں شریک ہوں کہ جلد تمہیں کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی۔ لیکن تمہاری ذمہ داری کے لیے میں تمہاری بات ماننے لیتا ہوں اور یہ فرض کیے لیتا ہوں کہ جیسے تم کہتے ہو، ویسا ہی ہے، یعنی یہ کہ بھاسو میں نوکری ملنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ تو اب اس کے بعد بھی میرا خیال یہی ہے کہ تمہیں بھاسو میں رہنا چاہیے، کیونکہ بھروسہ خان میں نوکری ملنے کی امید اور بھی کم ہے۔

بات یہ ہے کہ تم اب بھی حاش حاش کے مصائب سے بچ سکتوں میں وہ انت نہیں ہو۔ دیکھا میں بلا تعداد دو جہاں ایسے ہیں جو روزگار کی جستجو میں ادھر سے ادھر بھر رہے ہیں اور نہ جانتے ہیں کہ اگر جلد سے جلد ہلکے فرما کوئی ملازمت دہلی تو بھوک اور قحط سے سوزنا ہوگا۔ جنہو اور حاش تو اسی کی ہے جہاں ہولناک احساس کے ساتھ اور اس بے چارے خوف کو دل میں لے کر نوکری اضطرار سے کیا اگر کل تک مجھے نوکری دہلی تو میں ہر ایک مانگنے پر مجبور ہو پاؤں گا۔ اور ایک قصہ سنا

مکمل اللہ علیہ صبر ایک بہت پرانا دوست ہے۔ جس زمانے میں ہم پنڈت کے کوہے میں رہتے تھے، وہ بھی وہیں رہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بھی ایک اسکول میں چمکتا تھا اور میں بھی، چنانچہ وہ اکثر لاپاہاں مرحوم سے انگریزی پڑھتے تھے ہمارے گھر آ کر پڑھتا تھا۔ تم اس کو نہیں جانتے کیوں کہ تمہارے ہوش سنہالے سے پہلے وہ انٹرنل کا امتحان پاس کر کے ملی گزرا چکا تھا۔ اس نے پانچ چھ برس میں ملی گزرا سے لپہ اسے کیا۔ اس کے بعد انہی گفتگو کے لیے حجاب کے امتحان میں بیٹا۔ جب نتیجہ شائع ہوا تو اس کا نام چھ تھے لیبر پر تھا۔ اس سال چار ماہی لیے جانے والے تھے جس پر کیا تھا میں صاحب کے ساتھ وہ گئے۔ جنہیں صاف کر کے تعلیم حاصل کی تھی، لیکن لی۔ اسے کرتے ہی انہی گفتگو ملی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں انگلستان سے واپس آ چکا تھا اور گھر میں چمکتے چمکتے بہت سے آدمی آکر کر کے کوہے سے ہم لگے۔

درد کیا کرتا تھا۔ یہ گویا نقشے کے انبار کی حالت تھی اور طبیعت کی بے کئی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ صبحیں کامیابی کی خبریں تو اپنی ناکامی کو دیکھتے ہوئے دل کھنڈ یا دو خوش نہ ہوا۔ مجھے بچے چاہے تھا کہ کم از کم ایک دفعہ جا کر اسے مبارکباد دوںے آ جائیگی مگر نہ پایا۔ معلوم نہیں یہ دھبہ وسوسہ کا نتیجہ تھا یا یہ کہ مجھے ایک ایسے شخص سے ملنے ہوئے خرم آتی تھی جو زندگی کی دوڑ میں مجھ سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ کچھ بھی ہو، میں اس سے ملنے نہیں گیا۔ اور میاں! انہی خبر پر غور تو ہی تھی کہ چاک ایک دوسری خبر ملی وہ یہ کہ صبحیں صاحب اپنی کلگری میں نہیں لپے گئے۔ اسے بھی کیوں؟ یہ کیسے ہوا؟ اچھا لگا کہ فرق دارانہ صاحب کو قائم رکھنے کے لیے ایک جسمانی اسپیدار کو لے گیا کیا جو تھوڑی دیر میں صاحب کو رو کر ڈال گیا۔ مجھے بالکل اگل کر پڑا۔ وہ کللی خبریں کر مجھے خوشی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو لیکن یہ دوسری خبریں کر پڑیا رنج ہوا۔ خبر اس کے بعد بہت دنوں تک میں صبحیں کے حالات سے بے خبر رہا۔ میں اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ صاحب قلعہ لکھنؤ والی ماہکسٹرا انچیکری اور اس قسم کی دوسری ججوں کے لیے محتاطی کے احکامات میں شریک ہوا مگر کسی میں کامیابی نہ ہوئی۔ جب میں تین سال کا پورا میں رہ کر مل دیا میں آ یا تو ایک دن سربراہ اس سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اسی دنوں کی سی۔ اے۔ سی۔ پی۔ سی کے دفتر میں چالیس روپے پر کام کر رہا تھا۔ مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ کہاں اپنی کلگری اور کہاں چالیس روپے کی کلری کی اور وہ بھی عارضی۔ خبر اب کچھلے پٹھے ایک مدت کے بعد اس سے باہر ملاقات ہوئی۔ آج کل انچیری اور اسے سے باہر ایک عظیم الشان نمائندہ ہو رہی ہے اور وہاں بڑی بڑی دفقی اور بائبل، مکمل دفقی ہے۔ میں کسی شام چلنے کا اتفاق ہوں تو اکثر وہ پیش قدم خود خود دای طرف کو اٹھ جاتے ہیں۔ ایک دن حالت کے ساڑھے آٹھ بجے میں ایک ریستوران میں بیٹھا ہوا ہے لی رہا تھا۔ چاک بھری کلگری صبحیں پر پڑی ہے جو ریستوران کے دفتر میں ایک کرسی پر بالکانہ اقتدار کے ساتھ بیٹھا ہوا کچھ گھبراہٹا۔ بھری آکھیں بھلی کی بھلی رہ گئیں۔ "کمال کرتا ہے محض اگلی دن" میں نے اپنے دل میں کہا "اب کلری کرتے کرتے ریستوران کھول بیٹھا۔" چاکے ختم کر کے میں سپہ حاس کے پاس گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی انجیل چڑا اور بولکھا سا گیا "کچھ بھی سمجھیں انہیں نے کہا" کیا حال چال ہیں؟ یہ ریستوران کب کھولا؟ میرا سوال بکھر مچل گیا تھا کیونکہ میں نے اس کو وہاں بیٹھا دیکھ کر جو نتیجہ نکالا تھا وہ صحیح نہیں تھا۔ وہ ریستوران کا ناکہ نہیں لگا ایک ادنیٰ عازم تھا اور صبح سے شام تک وہاں بیٹھ کر مل جاتے کی خدمت اس کے سپرد تھی۔ یہ معلوم کر کے میرے دل کو ایک حکا سالگاہود مجھے اس کی حالت پر بہت زیادہ درجہ آ جائیگی میں نے کوشش کر کے اپنے جذبات کو ظاہر نہیں ہونے دیا اور اپنے قدرتی انداز میں اطمینان کے ساتھ ہاتھیں کرتا رہا تاکہ وہ یہ سمجھے کہ میرے ذہن میں اس کا ریستوران میں ملازم ہونا کوئی افسوسناک اور دم انگیز بات نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جو حالت اس اپنا تک ملاقات سے اس کی ہوئی ہے اس میں مزید اضافہ کر دوں مگر اس نے خود ہی اپنے روزگار کے حقیقی تنگنوشتر داغ کر دی۔ اس کی ناکامیوں اور مصیبتوں کی داستان سن کے میرا قول مل گیا۔ نقد پر کا کھیل دیکھنے کو وہ محض جو شایہ ایک اعلیٰ سرکاری عہدہ دار ہوتا برسوں سے اس کوشش میں ہے کہ وہ وقت کی روٹی کا اطمینان ہو جائے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ آج اسے اس بات کا باطل غم نہیں ہے کہ وہ اپنی فکر ہونے کی بجائے ایک عارضی ریستوران میں دو وقت کے کھانے پر ملازم ہے۔ غم ہے تو یہ کہ چند روز میں وہ جب نمائندہ ختم ہو جائے گی اور ریستوران ختم رہے گا تو یہ دو وقت کا کھانا کہاں سے آنے کا اصرار! اصرار! اصرار!

میں میاں راج پر چھوڑ کر بھی حاشیہ معاش کی گنجی سے دور جا رہی نہیں ہونے اور خداوند کرے کہ کبھی ایسا وقت آئے۔ تہہ رہے روزگار کا مسئلہ نہیں ہے۔ زندگی کی ابتدائی ضروریات یعنی کھانا، کپڑا اور پھر حسب دل خواہی رہی ہوئی رہتی ہے اور آئندہ بھی ان کے چہرہ ہوتے رہنے کا امکان ہے، چنانچہ تم نہایت اطمینان اور سکون قلب کے ساتھ روزگار کی حاشیہ اور مستقبل کی فکر کر سکتے ہو۔ میرا مطلب ہے کہ قصص میں آرام

اور حقیقت کی قدر کرنی چاہیے۔ برہان کے ہوتواب وہاں وہ کہہ سکتا کام بھی کرے۔ اگر اس وقت اپرٹس ہو سکتے ہو تو ضرور ہو جاؤ، چاہے آئندہ مستقل ملازمت ملنے کی امید بالکل نہ ہو، معاوضہ نہ ملے تو اس کا بھی غم نہ کر۔ کیونکہ تو قربی حاصل ہوگا۔ دفتری کاموں کی انصاف سے واقفیت پیدا ہوگی، مصلوبات میں اضافہ ہوگا، قابلیت بڑھے گی اور کچھ نہیں تو رخصت ہوتے وقت ایک آدھ تنطیبات ہی ملے گا۔ غرض یہ کہ اگر بلا معاوضہ نوکری بھی ملتی ہے تو تمہیں اس کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔

اور جناب یہ کیا فرمایا کہ بعد وہاں کو جنگ آزادی کے لیے سپاہیوں کی ضرورت ہے اور میں یہاں بیگار بڑا سزا رہا ہوں؟ دادہ دادہ کیا کہنے میں میں ہوں اتھارہ اقربان چاہئے اس بارہ خیالی کے، مگر اتنی بڑی بات کہنے سے پہلے ذرا اپنے حالات پر تو نظر ڈالی ہوتی۔ چار ماہ تک، مگر میں جو خودی بہت پہنچی تھی وہ ختم ہو چکی، اب وہاں اس انتظار میں تھی رہی ہے کہ کہیں وہ دن کب آتا ہے جب صاحبزادے اپنے دروں پر کھڑے ہوں اور وہ وقت کی روٹی کمانے کے قابل نہیں۔ یہ تو جناب کے حالات ہیں اور بات وہ کہی ہے جو صرف میرا تھا گاؤں میں اور جواہر لال نہرو ہی کے منہ سے نکلتی ہوئی انجی معلوم ہو سکتی ہے۔ جنگ آزادی کا سپاہی بننا آسان کام نہیں ہے میں یہاں اس کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ان میں دولت سب سے اہم ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے تم بیکرم کر رہے ہو۔ ایک مجلس اور تلاش تو جہاں کو تو ابھر کا رخ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ لو ایک تھوڑا ملو!

ہندو کاغذ میں میرے ساتھ ایک لڑکا بنگالوں داس چھٹا تھا۔ اس کے سیاسی خیالات دیکھتا تھا۔ میرے جیسے تھے لیکن تم نے تو (مخالف کرنا میں یہاں) دو چار باتیں اور دوسرے سنی لی ہیں جن کو تم دیکھنا تو گوارا ہوتا رہتے ہو۔ اس کے برعکس بنگالوں داس نے سیاسی لٹریچر کلاٹ کے ساتھ اور محنت کے ساتھ چھٹا تھا۔ اس کی زبان سے جو بات نکلتی تھی وہ ایک وسیع مطالعے اور دقیق فکر کا نتیجہ ہوتی تھی۔ ابتدا میں اس کو جاری سے بڑی دلچسپی تھی اور دوسری مخالفت کے بتکاروں شرع ہوا تھے۔ اردو سے بھی بہت شغف رکھتا تھا اور یہی وہ چیز تھی جس نے مجھ کو اس سے قریب تر کر دیا تھا لیکن اس کا یہ شوق جلد ہی ختم ہو گیا۔ کیوں کہ سیاست سے اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد ملی۔ اسے میں اس نے جاری نہیں بلکہ انگریز کے علاوہ تاریخ اور اقتصادیات کے مطالعہ میں کی مشائخ کو بڑا دیا۔ اب اس کے خیالات میں ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہوئی شروع ہوئی۔ اردو فارسی ادب سے وہ چڑا ہو گیا۔ جس ادب کا بھی دیر انداز عاشق تھا اب اس کو محارت کے ساتھ "نڈل کلاس لٹریچر" کہنے لگا لیکن مجھ اور بھی بہت سی چیزیں اب اس کے خرد کی سرسبزیاں اور دوسرے خوش حالی بھتوں کی پیدا کی ہوئی اور جاتی ہوئی تھیں۔ مثلاً نہ سب، مرہو، اخلاق، معاشرتی رسوم، مختلف سیاسی ادارے، انون لطیف کے شاہکار اور ان سب کو وہ قابلِ غرت خیال کرتا۔

"پرائیویٹ پر اپنی" (ذاتی ملکیت) کو وہ دنیا کی سب سے بڑی نصبت اور زندگی اور تاج کی ساری برائیوں کا سرچشمہ تصور کرتا۔ جنگ، تلخی، طرعی، جہالت، ہر چیز اس کے خرد کی "پرائیویٹ پر اپنی" کی پیداوار تھی۔ فراہمی مفکرہ در پر وہ میں کا مشہور جملہ "پرائیویٹ پر اپنی" صرف "پرائیویٹ پر اپنی" ہے۔ ہر وقت اس کی زبان پر جتا۔ مجھ سے ملنے آتا تو دیر ہر کہیں نہ کہیں یہ جملہ ضرور نکھڑتا۔ ایک دن مجھ سے بولا "تم تاج محل کو کیا سمجھتے ہو؟" میں نے کہا "میں تاج محل کو ایک ایسی علامت سمجھتا ہوں جو سب مر مر سے جاتی گئی ہے۔" کہنے کا "میرا مطلب نہیں۔ میں یہ بوجھتا ہوں کہ تاج محل کے مصنف تھا یا کیا ہے؟" میں نے کہا "تاج محل کے مصنف میرا یہ خیال ہے کہ دنیا کی سب سے خوبصورت علامت ہے۔" "تو کیا وہ تھا جسے خود ایک لائق فہمیں چیز ہے؟" اس نے سوال کیا۔ میں نے کہا "یہ ایک وہ فنی تعمیر ایک بار صورت ہے اور لائق صد فہمیں ہے۔" "مگر میں اس کو قابلِ غرت سمجھتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "میرا سمجھو" میں نے کہا "آج کل انجی چیزوں کو برا کہتا

بھی فیشن میں داخل ہے۔ ایک صاحب نے نگار میں ایک مضمون لکھا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب جس کو اردو کا سب سے بڑا شاعر خیال کیا جاتا ہے دوسروں کے خیالات چرایا کرتا تھا اور اس لحاظ سے ایک معمولی درجے کا شاعر تھا۔ اس نے بھری بات کو کلمے سے نہیں سنا اور اپنی کہے گیا۔ "میں تاج محل کو تین گزٹ لکھتا ہوں۔ وہ اس زمانے کی یادگار ہے جب بڑے بڑے جاگیردار، دربار اور مہاراجہ کسانوں کو بے دردی کے ساتھ لٹے تھے اور ان کے خون سے اپنی مچھلیوں کو رنگین دیتے تھے۔" "تمہارا خیال صحیح ہے۔" "میں سچ میں بول اٹھا، لیکن تم ایک بات بھول رہے ہو جیوگوان داس اس وقت اسٹیج پر نہیں ہوا، بلکہ اپنے ایک دوست کے کمرے میں بیٹھے ہو۔ تم اپنے ماحول سے بڑی ہمدلی ہے خبر ہو جاتے ہو۔ یہ تمہارے بعد بڑا عجب ہے۔" اس نے جواب دیا "اور تاج محل ایک ایسے سیاسی و معاشرتی نظام کی پیداوار ہے جو "ام مومل" تھا۔ جیوگوان داس سے لے کر چنی تک "ام مومل" اس لیے تاج محل بھی ایک "ام مومل" چیز ہے۔" "میں نے کہا۔" "اگر ام مومل ہے تو ہوا کرے۔ غرض صورت تو ہے۔ اور یہی اصلی چیز ہے۔ ایک طوائف بھی "ام مومل" ہوتی ہے لیکن بعض اوقات وہ مہین بھی ہوتی ہے اور اس کا "ام مومل" ہونا اس کے مہین ہونے میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔" اس پر وہ طوائف کا مسئلہ لے بیٹھا، کہنے لگا، "طوائف، ام مومل نہیں ہوتی۔ طوائف کو "ام مومل" کہنا قطعی جرات ہے۔ طوائف "پرائیویٹ پرائیویٹ" کی پیداوار ہے۔" "میرے نزدیک اس کی گفتگو بیش از ایک بڑی نظم ہوتی تھی اور "پرائیویٹ پرائیویٹ" "نیپ کا بغیر۔ جب وہ اس نیپ کے بند پر بیٹھا تو میں اپنی فحشی کو ضبط نہ کر سکا اور ایک ذور کا قہقہہ لگا لیکن اس نے اپنے کلام کا سلسلہ جاری رکھا، "طوائف پرائیویٹ پرائیویٹ" کی پیداوار ہے۔" "میں نے کہا، "جیوگوان داس! آج تمہارا رنگارنگ بہت حیر ہے، تمہاری رہ خاموشیٹ کر آ رام کرو۔" وہ اٹھ اٹھ کھٹے جاں، کوڑھ مٹاؤ اور نہ جانے کیا کیا کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ جلدی میں داخل بھی پھوڑ گیا جس سے اس نے حیر پر پڑے ہوئے تقریباً تمام کاغذات پر "پرائیویٹ ارفنٹ" کی سرشت کر دی تھی۔

یہ تھا میرا دوست جیوگوان داس اور یہ تھے میرے دو طیلات جو مجھ سے مل کر کیا ایک اس کے سر پر سوار ہو گئے تھے۔ بہت جلد جیوگوان داس اپنی اپنے سرگشتی سے اس حد تک بے گامیوں نے اپنے عقیم کو خیر باد کہہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے کہا، "اے جیوگوان داس! اب تک جو بکواس تم کرتے رہے ہو، اس کو میں نے بھی قابل اشتنا نہیں سمجھا لیکن یہ حرکت جو تم آپ کرنے والے ہو اس کی نہیں ہے کہ میں خاموش رہوں۔ اگر تم نے اس وقت اپنی عقیم کا سلسلہ فتح کر دیا تو اور کونزوغی بھر بچتا دے گا۔ یہ میری حرکت نہیں آئے گی، نہ یہ سوانح جو آج تمہیں حاصل ہیں بھر بھرا نہیں گئے۔" اس پر وہ بولا، "تھے بی۔ اے، ایم۔ اے کر کے کیا لیتا ہے؟ حکومت کی نوکری تو کرتی نہیں ہے بھائی میرا اس طرح خدائے کروں" میں نے کہا، "بھائی میں ہی سہی، جس میں حکومت کی نوکری نہیں کرتی ہے۔ مگر تحصیل علم بذات خود بھی تو کوئی چیز ہے۔ علم کی اہمیت اور ضرورت سے جو تم انکار نہیں کر سکتے۔" علم کی اہمیت موجود وہاں تک میں سمجھتی نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن اس کا ہی بہت کافی ہے کہ ہم اردو اور انگریزی لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ اس سے زیادہ محمل عیاشی ہے۔" "جیوگوان داس! کیا اردو میں خیالات ہیں۔" میں نے کہا، "تمہارے بارگ میں سنا اس کا کیا ہے، جیوگوان داس! اور کوئی بات نہیں ہے۔" لیکن اس نے نہ کچھ میرے فیسے کی پروا کی تھی نہ غور ملامت کی۔ چنانچہ صوبہ معمول اپنی کہے گیا۔ "کالچوں اور پندورنی میں پڑھنا ایک عیاشی ہے جو سرمایہ داروں کے لیے ہے نہ کہ ان لوگوں کے لیے جو دنیا میں آزادی اور انصاف کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے سمجھ لیا کہ اس کا مرض حد سے گزر چکا ہے اور اس کو کوئی عجیب و غریب دیکھا نکل نکل رہا ہے۔

اس نے کالچ سے نام لٹوایا اور کہنے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اپنی اردو اور فارسی کی کل کتابیں لکھ چکی ہیں۔ ان پر کچھ دیا کہ میں

حرفِ تعلیم حاصل کرتا غیر ضروری سمجھتا ہوں اور یہ سبھی ہمارے ہاں تاکہ مزدوروں میں وہ کوئی مفید کام کر سکیں۔ ماں بے چاری بے چارے چلی گئیں۔ وہ بچے کی اس عظیم الشان سہاوی بیاداری کو کیا خاک سمجھتی اور کیا خاک اس کی قدر کرتی۔ اسے تو اپنی زندگی بھر کی آرزو تھی اس مال بولی نظر آتیں۔ وہ چٹیلہ راجپوت کے کسی گھاس میں ایک چھوٹی سی دھندھاری سنبھالے بیٹھی تھی۔ مرحوم شوہر کی یاد اور اٹھوتے بچے کے مستقبل اس کو بھجایا بھی اور مسکایا بھی وہیں اپنے پیسے کے ستارے سے بھی آگاہ کیا اور اپنی محبت کا واسطہ بھی دلا۔ انھیں اس اللہ کے بندے پر کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ اس نے ہر خدا کے جواب میں یہی لکھا۔ ”واللہ عین اور اولاد کی محبت سرمایہ امداد زندگی کا ایک اہم شائد پہلو ہے۔ میرے دل میں دنیا کے عوام کی محبت ہے اور میں اس محبت کے حق پہلے میں اس کی محبت کو ایک قطعی فیراہم چیز سمجھتا ہوں۔“ آخر تک آکر ماں نے کہہ دیا تھا۔ ”اگر تم تعلیم ترک کر کے بہت سی فوج میں بھی اپنے دل پر ہجر رکھو تو ان کی اور فوج بھی بنا بند کر دوں گی۔“ مگر حضرت اپنے لئے طیلات کی حرکت میں تھے۔ ان پر مجاہد اس فرشتے کا جذبہ چاری تھا۔ انہوں نے اس کی اس دشمنی کی ذرا بھی پروا نہ کی اور یہی رواں ہو گئے۔

اس بات کو مشکل سے چار مہینے گزرے ہوں گے کہ ایک دن صبح ہی صبح کیا دیکھا ہوں کہ بنگلوان ماں کی تحریف لیے چلے آ رہے ہیں۔ قریب آئے تو دیکھا کہ چہرے پر ہوا نپاں اڑ رہی ہیں، آنکھوں میں پتے چڑے ہوئے ہیں اور جسم پر ایک بچی ہوئی تھیں۔ وہ دیکھا کیا دیکھا ”آجے تحریف لایے!“ میں نے کہا۔ ”آپ کا نام بنگلوان اس ہے؟“ ”مگر وہ کسی چمیل کے لیے تیار نہ تھا۔ بے جان ہو کر کرسی پر گر چلا اور بولا۔“ میں چار ہوں اور بہت بھوکا ہوں۔ جلدی سے گرم دودھ منگو آؤ۔“

شاخ کے بعد جب میں اس کی داستان سنے میں مصروف تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ کیا نہیں آیا ہے بلکہ اپنے ساتھ کچھ غیر بچہ لیس کے آ دی بھی لایا ہے۔ میں نے دل میں کہا۔ ”یہ کھنت کھیں میرے سر پر کوئی آفت نہ لائے۔ ایسے خطرہ کہ آ دی سے دور رہتا ہی بچ رہے۔ دوستی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم پیٹنے بھانے اپنے آپ کو مصیبت میں پھنسا لیں اور بے گناہ مارے جائیں۔“ میں نے جلد سے جلد اس سے چمکا را جانے کی کوشش کی اور تیسرے دن نکت دلا کر وہ چمک دوا کر دیا۔

اب قدرتی طور پر ہم یہ جاننا چاہو گے کہ بنگلوان اس پر بہت سی کیا باتیں اور وہ کہاں کہاں سے اس قدر جلد واپس آ گیا۔ لیکن یہ ایک طویل داستان ہے جس کو اگر میں بیان کرنے کی ضرورت محسوس کیا تو میں اس میں اس قدر غلطی نہ کرے گا بلکہ ایک اچھا خاصا ناول بن جائے گا۔ نہایت مختصر طور پر صرف اتنا بتا چاہتا ہوں کہ یہی کتنی کتنی بنگلوان اس کو اپنی ذاتی و جسمانی تکلیف کا تبادلہ کرنا چاہو اس کے لیے ہاتھ لگی تھیں۔ بھلا کہاں ایک ناول کا پانچواں اور کہاں سیاہی زندگی کے مصائب۔ ماں نے اپنی ذاتی خوشامد کے باوجود وہ بچہ نہیں دیکھا اور اس سے ان مصائب میں چند اور چہ اضافہ ہو گیا۔ فرض کر کہ ”دنیا کے عوام کی محبت“ نے ابھی طرح اپنا اثر دکھایا اور بنگلوان اس کو ایسے تنگدو بچے کو دین میں تارے نظر آنے لگے۔ ”آزادی اور انصاف کی حکومت“ قائم کرنے کا طیال ترک کر دیا میں کو کھلا۔ ”تو یہ کچھو، دم دھلی واپس جا کر دوبارہ کالج میں داخل ہو جائیں گے۔“

دل بھر طواف کوئے طاعت کو جاتے ہے
چند کا صم کہہ دیاں کئے ہوئے

مال واپس لے لیں گے۔ یہودی منافقت دوسرا نام ہے، اسحق اپنا طلاق اور اس کی ذریعہ کا تقاضہ ہے؟ ہوگا مگر میں اس کی فرسودہ اصطلاح سے بیزار ہوں۔ کس قدر چمٹا اور سوجنا تھیل ہے! ۱۱

تم نے دیکھا میں یہاں اپنی ہی شخص سے جو بھی تاج محل کو "اہم سوال" کہا کرتا تھا اور دینا کی ہر اہمگی برقی چیز کو سرمایہ داروں کی معاشی کہہ کر قابلِ غور نہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی کے حلقوں بہت سے مختلف نظر دیتے ہو سکتے ہیں اور ایک سوچنے والے انسان کے لیے نہایت دشوار ہے کہ وہ کسی ایک نظریے کا ہو جائے اور نہ دستِ اسی کا ہو کر رہے۔ مگر ہمیں بتانا کہ کسی مخصوص فلسفے کو زندگی کا صحیح ترین فلسفہ سمجھ کر اس کی بنا پر اپنے مستقبل، بلکہ اپنی ساری زندگی کو خطرے میں ڈال دینا کہاں کی عقلِ معنی ہے۔ بلکہ ان داس کے حالات سے تم پر بھی معلوم کر سکتے ہو کہ سیاسی کام ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، جن میں اقتصادی خوشحالی اور معاشی اطمینان سب سے زیادہ اہم ہے۔ اگر تمہارے پاس یہ چیزیں نہیں ہے تو تم کبھی جنگ آزادی کے سیاسی نہیں بن سکتے۔ اور یہاں اسباب و پاسبان بننے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے۔ جس دن بھی ذرا سی بے وفائی کا اظہار تمہاری طرف سے ہوگا، اسی دن نیکل میں غرض دینے چاہئے کہ۔ اب سال چھ مہینے تک پڑے سزا کر دو۔ بے اختیار دیکھی کہ کس سے تو ہم سوسلی پڑے سڑتے رہتے تو بہتر تھا اور یہ نہ کہنا کہ نیکل میں آرام کے ساتھ گزرتی ہے اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ یہ محسوس کیے کی باتیں ہیں کہ سیاسی قیدیوں کو بہت سی مراعات ہوتی ہیں اور وہ تو تنگی سلوک کے متعلق کچھ جانتے ہیں۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ جو سلوک معمولی قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے وہی سیاسی قیدیوں کے ساتھ کیا گیا جاتا ہے۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لال کی بات دوسری ہے۔ تم جیسے آزادی کے پاسبانوں کو تو وہ دھمکتی رہتا ہے سے لگی نہیں چھتے۔ تو ایک قصہ سنو!

کالیور میں میں جن صاحب کے مکان میں رہتا تھا وہ پہلے کی تھارت کرتے تھے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بہت زیادہ مالدار تھے۔ مالدار ہونے کے علاوہ وہ اور بھی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے لیکن ان کا ان کا نہایت چاہتی تھا۔ مطیع اللہ نام کا گراما مت سے کوسوں دور ایک اچھائی کوشتوں کے باوجود کم بخت نے کچھ نہ کچھ کے نہیں دیے۔ باپ نے وہاں پانی کی طرح بہایا اور جس اسکول میں وہ چڑھتا تھا اس میں ہزاروں روپے بطور امداد کے دے ڈالا۔ مگر وہ کسی طرح پانی سکول کے احقان میں پاس ہی نہ ہوا۔ جب عمر بہت زیادہ ہو گئی تو مجبوراً انھیں ترک کر دینی پڑی۔ اب اسے لیزری کا شوق چڑھا۔ معلوم نہیں اس کے دماغ میں سیاسی بیداری کے جو شعلہ کہاں سے آ گئے۔ طرفیکہ قوی دھکی کاموں میں مصروف تھا شروع کر دیا۔ ایک کپڑے کی ٹل میں اسٹراٹک ہوئی تو آپ بادشاہ اللہ ان لوگوں میں تھے جو اپنے جھوٹے بچے دھوڑیں اور اشتعال انگیز تقریروں سے حردردوں کو بہکاتے اور دھکتے ہیں اور ان کو فلاح دہستے پر اٹھ کر ان کی مظلومیت میں حیرت اٹھانے کا باعث بنتے ہیں۔ نتیجہ جو ہوتا تھا، وہ سچ اپنے تمام ساتھیوں کے دھڑلے گئے۔ چیس نے بے تامل جھٹکڑیاں ڈال دیں۔ انہوں نے بہت جلد پھر کی مگر وہاں اٹھان لکھنا سنا ہے۔ چاروں ماہرِ سرِ تسلیم لم کرنا پڑا۔ سب کو لاری میں غرض دینا کیا اور لاری میں چل پڑی۔ لاری میں بیٹھتے ہی مطیع اللہ کو حاجت محسوس ہوئی۔ اس نے پائیس اسٹرو کو اپنی خواہش اور ارادے سے مطیع کیا۔ پائیس اسٹرنے اس کی خواہش اور ارادے کو توڑ دیا مگر کچھ کہ کچھ اذیت نہ دی، مالدار اسے کہنا "ابھی نہیں، بیٹھے رہو" چند منٹ مطیع اللہ نے صبر کیا مگر خواہش بہت قوی اور ارادہ نہایت مضبوط تھا۔ اس لیے زیادہ دیر تک صبر نہ کیا جاسکا۔

اس نے پھر پائیس اسٹرو کو یاد دہانی کر دی۔ وہ کھلتا نہایت ہی فنی القاب تھا۔ پھر ڈال گیا۔ پھر ڈال گیا۔ مطیع اللہ نے کچھ دیر اور صبر کیا لیکن اب خواہش کی قوت اور ارادے کی مضبوطی اس قدر شدت پر ہو گئی کہ دونوں میں سے کسی ایک کو ٹھکرایا کرنا ممکن معلوم ہوا۔ اس نے تلک آ

کر پائیس افسر کو ایک ایسی دشمنی دی کہ وہ لاری روکنے پر مجبور ہو گیا۔ لاری جس جگہ کی وہ ایک غیر آباد مقام تھا۔ سڑک کے ایک طرف بہت کچے کچے مکانات تھے اور دوسری طرف ایک وسیع میدان دور تک چلا گیا تھا۔ مطیع اللہ لاری سے اتر کر ایک پائیس مین کو دور تک گھسیٹا ہوا میدان کی جانب بھاگا جب دونوں ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئے تو مطیع اللہ نے کہا، ”چھتھری کھول، جلدی ا!“، ”چھتھری تو میں نہیں کھول سکتا۔“ پائیس مین نے کہا، ”تمہارے چھتھری کے کھلنے کو سنے دیتا ہوں۔“

میں نے یہاں تک لکھا تھا کہ ان میاں کا سرائی خط ملا ”ہندوستان میں سچے گرو شروع ہو چکی ہے اور میں تقریباً اس خط کے ساتھ ساتھ یہاں سے روانہ ہو رہا ہوں۔“

اب میں اس کے ساتھ لاریا کر سکتا ہوں کہ ان میاں پر خاک ڈالوں اور تمام اردو دان طبقے کو مخاطب بنا کر کہوں

لو، ایک قصہ سنو!



ابوالفضل صدیقی

نام	چودھری ابوالفضل صدیقی
لقب نام	ابوشاہ، چودھری ابوالفضل صدیقی، ابوالفضل صدیقی
پیدائش	۵ جنوری ۱۹۰۹ء بمقام عارف پور، نوادہ کبیر اہدایوں (پو بی) بھارت
وفات	۱۶ جنوری ۱۹۸۸ء بمقام کراچی۔ (پاکستان) بدوچ پریس منٹ، پرموڈ جھ
تعلیم	پیشہ کرمج وکری کتب
	فارسی اور قرآن مجید پڑھنے کے بعد مشن اسکول دہلی (ج۔ پی) میں داخل ہوئے۔ اسی ہائی اسکول سے متحرک کیا۔
	بھارت چارج کالج، مسوری سے پشہ کرمج کرنے کے بعد کبیر اور راجہ میں لیا۔ بھارت چارج کالج، مسوری اور
	ملی گڑھ میں عارضی قیام نے انہیں بدوچ پریس منٹ عطا کی۔

مختصر حالات زندگی:

دہلی میں عارف پور۔ اُن کے مورث اعلیٰ محمد عارف کی پرانی ہوئی بھتیجی ہے، جہاں چودھری محمد امین الحسن صدیقی بھیرا رہا ہے، اہل۔ اہل۔ لی (ملک) کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد دہلی کے مشہور وکیل تھے۔ آپ کے آبا اجداد سید طاہر الدین کے وقت سے دہلی میں آباد تھے اور مورث اعلیٰ کو فوجی خدمات کے سلسلے میں ایک جاگیر اور "چودھری" کا خطاب ملا، کی جانب سے عطا ہوا تھا۔ شیخ محمد عارف کے والد شیخ ممتاز علی صاحب سید طاہر الدین کے سپہ سالار تھے۔ ان کے اجداد میں غلام مصطفیٰ یک رنگ نے ایہام گوئی میں نام کمایا۔

ابوالفضل صدیقی نے بزرگوں کی روایت کو لہرایا اور ذریعہ معاش زمینداری اور باغبانی ہی پسند کیا۔ طبیعت بھیت سے ذہنی ذمہ داروں سے ٹھہرائی۔ میں برس کی عمر میں (تقدیر جہم) سے شغف ہوئے اور آزاد طبیعت ہونے کے باوجود تہا کیا۔ ترکین اور جوانی

غزوہ اراکوں، سبک دہی، دکنیوں اور پہلی و آئینی آلات حرب کے ساتھ جنگوں میں شہید کیے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں ایوان شاہ کے قلعی نام سے ہم حراجیہ اصطلاحی مضامین اور افسانے، اخبار ”ریاست“ میں لکھے اور یہ سلسلہ ۱۹۴۱ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد ”ادبی دنیا“، ”شاعر“ اور ”صوفی“ میں ایوان فضل صدیقی کے نام سے لکھے رہے۔ ۳ جنوری ۱۹۵۳ء میں پاکستان ہجرت کر آئے اور تا دم آخر کراچی (سندھ) میں رہے۔ ۳ جنوری ۱۹۸۸ء کو کافی عرصہ بعد ۱۶ جنوری ۱۹۸۸ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ مدفن پاپش نگر، کراچی کے قبرستان میں ہوئی۔

ادبیتیں مطبوعہ تحریر:

حراجیہ مضمون: ”ہمارے محکمہ ایل اے نئی جال میں“ مطبوعہ ”خبر“ ریاست“ (لاہور: ایوان شاہ مفتون) ۱۵ اگست ۱۹۳۲ء

ادبیتیں مطبوعہ افسانہ:

”رہنمائے حقیقی“ مطبوعہ ”صوفی“ پبلی کیشنز لاہور ۱۹۳۳ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱ ”ابروم“ (افسانے) ویجاہ سلطان، حیدر جوش طبع اڈل: ۱۹۳۵ء
- ۲ ”قورم“ (ناول) کتب خانہ دارالبلagh، لاہور طبع اڈل: ۱۹۳۶ء
- ۳ ”رموزِ لیلیٰ“ (پہلوں کی کاشت سے حلق) کتب خانہ دارالبلagh، لاہور طبع اڈل: ۱۹۳۸ء
- ۴ ”سرد“ (ناول) سلطان حسین ایچ سنز طبع اڈل: ۱۹۵۷ء
- ۵ ”انجس سوچ راہی“ (ماریج آدمی کے ناول ۱۹۸۸ء کا ترجمہ) اردو ایڈیٹری سندھ، کراچی طبع اڈل: ۱۹۶۰ء
- ۶ ”چار روٹ“ (۴ ناول) ادب لہا، کراچی طبع اڈل: ۱۹۶۰ء
- ۷ ”سربابو کا فوڈ“ (افسانے) ادب لہا، کراچی طبع اڈل: ۱۹۶۰ء
- ۸ ”فکڑ“ (ناول) مطبوعہ دارالبلagh، لاہور
- ۹ ”جیراکھ“ (آٹھ افسانے) مطبوعہ کتبستان، کراچی طبع اڈل: ۱۹۸۶ء
- ۱۰ ”انصاف“ (تین طویل افسانے) مطبوعہ کتبستان، کراچی طبع اڈل: ۱۹۸۶ء
- ۱۱ ”آئینہ“ (تین طویل افسانے) مطبوعہ کتبستان، کراچی طبع اڈل: ۱۹۸۶ء
- ۱۲ ”ننگے“ (ناول) مطبوعہ کتبستان، کراچی
- ۱۳ ”سردوں کی جال“ (پچاس افسانے) مطبوعہ فضلی سنز، کراچی طبع اڈل: ۱۹۹۵ء
- ۱۴ ”لکھنؤ“ (سات افسانے) مطبوعہ فضلی سنز، کراچی طبع اڈل: ۱۹۹۹ء
- ۱۵ ”وان وٹھ“ (افسانے)

غیر مدقون:

شعور انسانے اور مضامین۔

وقات سے قبل مستقل چچا:

۱۳۱۱ھ ۱۹۰۰ء عالم آباد، کراچی نمبر ۱۹، پاکستان

اعزاز:

P.E.N. یونین کے رازدارانے انسانہ ”تپ“ (چتر مسودہ) ۱۹۵۶ء

نظریہ فن:

”انسان نگاری، تنقیدی کے شوق کا ذریعہ ہے۔ وہ حقیقت اچھی خواصورت نظر کا شائق ہوں۔ انسان کے متعلق میرا نظریہ غلوں میں اور گہرے پہلو دار مشاہد کی فنکارانہ صلاحیت کے ساتھ ساتھ عقلی معنی میں محسوس کرنے پر ہے۔ وہ نہ قاتلہ دار کی ڈائری بھی تحریر ہوتی ہے نہ کرلن نہیں ہوتی۔ انسان ہوتا عقلی زندگی سے قریب ہوگا، مانتا ہی نہ تا میر ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ کسی نگار پر دیکھنے سے پاک ہونا چاہیے۔“
(مکتوب عام مرزا حامد علیک، ستمبر ۱۹۸۳ء)



حوالہ جات:

- ۱۔ یہاں سے نکل ”عہد ساز لوگ“ سربہ ”شیر جہاں“ مملوہ اردو نگار سوس۔ سن (۱۹۳۶ء) میں سے مملوہ کے اس سہ ماہیہ میں ”کوکا کھ“ سے لے کر لکھی ہے۔ نگار سوس صاحب نے اپنی ”تپ“ میں ۱۹۱۰ء کی اپنی عورت لکھی۔

Figure 1

ابو الفضل محمد بن

معلوم کو مرے عید کے اندر جیسے مرد رُک پڑا تھا۔ آنکھوں میں دھند سا چمک پڑا تھا اور سیدھا ہوتے ہوئے ہولٹ خاتون کے پچھلے رخساروں پر سے گزرتے ہوئے سے ہونٹوں سے چمک جاتے اور ہاتھ نہایت چمک دیتی کے ساتھ ہرے ہرے ہنسی کے گواہ غنچہ اور خلیص غنچہ کے خلیص دفرا کا جاتوہ لینے لگتے اور ہرگز بے زور سے پہنچ لیتے اور وہ جیسے کاغذ کے ٹھیکے میں کس جاتی اور یہی نہیں کہ خاتون ہی کا ٹھون مٹ جاتا عید کے ہونٹ بھی چپ چپ کر دھمک سے جاتے۔ تیار آنکھوں میں لال زور سے اچھل آتے۔ سانس قہر خراتی جاتی۔ گویا بھرا ہوا سستل یاد آ جاتا اور پچھلے پانچ سال کے رات شب رات اور عید کے ہنگاموں میں سے بس اتنی ہی استعداد باقی رہ گئی تھی، جیسے سر پکھنے کے بعد سانس میں مل اور اٹھ اپنی رفتی ہے اور قانع کے بارے ہوئے عید کے اندر جیسے شہد کی صورت بس میرا تا اور خاتون کو تو جی بچے اس وقت سانس سانس لیتا

بقول مجھے ذرا دور گردن میں پائیا لگائے، ذریعہ ہلکا مطلق، ہلکا دھڑکا کر اور حرکت سے مضبوط اور کر کے خاص کر یہ کہ تو ہانکل مردہ کیپے مگر بقیہ پوری ریزہ جلد سے خلی اور لوہے کا بدن ہانکل کھج، ہر بھی خود راہ کر بیٹھ نہ سکا تھا اور جب خاتون اٹھا کر بٹھا رہی تو کھوکھلا سا بیٹھا تو رہتا لیکن بس بچھا ہی رہا تھا اور بغیر سہارے لیٹ نہ سکا اور لیٹ کر بھی حرکت کی طرح بڑا ہی رہتا اور بغیر تھوڑے سے سہارے کے پوری لاش آسانی کے ساتھ کر دے بھی نہ لے سکتا تھا۔

اور خاتون جب کھانے کر آتی تو باغیچہ میں کھانے کے بعد لاتے ہوئے سہارا دیتے وقت مفلوج عہدہ میں بیٹھ کر سال پہلے والا شوہر جاگ پڑتا اور پھر وہ کمرے میں چلی سرشہم کی پگھڑی مفت میں صبح تک کھینچتی رہتی۔ خاتون میں شوہر کو گھبراہٹ، اور یہ بے خبر پڑا ہوا رہتا۔ چنانچہ ان کو اس کا قصہ سنا کر، پہلے پھرے کو دے جانے سے خواہش میں کم، جب اس کے بیٹے کو پچھلے عہدہ اور سولہ گروہ دے دینے کے لئے صحنے کی طرح چھوڑا ہی کر دیا جس میں جتنا اور نکل کی طرح مضبوط دوا تھیں اسی تھیں، جتنا اور نکل کی طرح مضبوط اور کاٹھا دوا ہی

گھوڑے کے طرح سمجھنا تھیں، جن کی دھبک کے مارے دھرتی پانی چھوڑتی اور پانی تل قمر قرانی عید کو لے لیے بھر گئی اور عید وہ خواب میں ہی عید ہوتا مگر خاتون پر ساری رات ہاتھ مجھے عید وہی عید سوار رہتا۔

فانچا کرنے کے بعد چھ سات مہینے تو علاج کی مصروفیت اور تندرستی کی امید رہی پھر جب گاؤں اور قصبہ تک کے سب دعوں، بیکسوں اور آکڑوں نے جواب دے دیا تو کچھ دنوں ادویہ مفردوں کا شہ چا احساس اور ادائی نامیدی یحسین قوتیت ی عاری رہی، مگر پھر حالات کے اشتعال اور وقت کے مرم سے صبر کی کیفیت پیدا کر دی اور مجبور حالت سے مطمئن ہوتے ہی بھولی ہوئی باتیں یاد آنے لگیں، بے سنی ہی رجحانیت نے عید کیا۔ پہلے وہ ایک روز تو فرادار تے اور تے شرور حالت کی اور پھر پہلی اشتعال طور پیدار رات کے کھانے کے بعد کا معمول بن گیا

مجھے طرک کو دھکا دیتے ہوئے خاتون نے شروع شروع میں تو کچھ دنوں نہ معلوم کیوں، شوہر کی دل فشلی کے لحاظ میں یا شاید باطل خود فریب سے امید میں اس جھوٹے سوئے کے کھیل کا ترکی پہ ترکی جواب دیا۔ مگر اس کا جواب تو اس کا سوال ہی ہو سکتا تھا اور جب سرے سے سوال ہی غالب ہے تو جواب کیا ہو سکتا تھا، مجھے کچھ انا منہ آپ ہی چرا کر رہ جاتی، اور اس کے گھولی رخساروں اور بکھڑی سے ہونٹوں پر جیسے سر شام کا لانا گ نہ معلوم کتنے بچپن بار چاس کے عید باز دوں اور پشت پر اور نہ معلوم کہاں کہاں مشعل ی بھر جاتی اور پھر پوری رات الگا روں پر کٹ جاتی، چٹ چٹ چٹا چٹا کیاب کی طرح چٹنے، چٹنے، چٹنے اور ایک مرتبہ اندر ہی اندر چھٹلا کر مارا جھجکی کے ساتھ شوہر کی اس طلب بھول پر اعتراض کیا اور اس کا جواب بالکل تو عید و نالوں ٹولوں دل سے اتر کر خاتون کی بات کا جواب تلاش کرتا چپٹ تک بھٹکتا، خبر یہاں تک تو شاید کچھ اڑ گئے تھیں آزادانہ میں بھی ہوتی تھی مگر اک دراجہ کر کر کے موت کا ٹانا تھا اور وہ عملی چیز بھی محدود تھی، اور میں اور سر خواہ حلقی ہو یا مجازی تحریک تو رکھتا ہی ہے اور یہ تو نہ "یہ ہوتا نہ" وہ "اگر اس بھاری کے لیے تو کسی دہشت نہ ہوتے ہوئے بھی عولان ساتھ اور آک ساسی ہوتا اور پھر بھی جوڑ کے عید و اپنی حرکت سے یاد آنے والا نہ تھا، اس شراب بچی کی طرح جوتا آپ کے ضمیر سے ہونے پانی پر کلکڑیاں پھینک کر کول کول حلاطم بھریں کا قاتل شاد رکھتا ہے اور وہ بے چاری ہر رات مجھے کھجلی پانچوں سال کی پیش کو شہوں اور شب با شہوں کے دھکیل سے مارا ہوا کر مچا کو غدار دہہ شرابی کی طرح اٹھتا، جس کے ہنس مضر میں شراب کے سرور کا بھی کوئی سراغ نہ ہوتا غدار ہی غدار! سر شام کا چھ عاتج تک!! اور صبح سے شام تک اعطاء تھیں اور چھٹی ہی چھٹی امد وقت مجلس ہی مجلس!۔ پیاس ہی پیاس سارا دن! ابھوک کی تمام بات

2

خاتون تو جوں جی غضب کی بندہ دست اور چاکی حسین، اور کل کی بات ہے، اس کی تو جوانی دھندرتی اور انسانیہ اور ذہینیت کے بارے میں اتنی عید و کندھے سے کندھا ملانے نہایت مستعدی کے ساتھ ادا کرتا رہا تھا۔ اچھے بھلے فانی گدا، اگر مر جاتا تو اس کی سونہ غضب جہان میں بھی سہارے تک ہی جاتی، اور کبھی ٹھیکہ چارچہ برور و دیل چارچہ کر شرابی سے ہی پلہ ہاتھ دیتے۔ مگر کے گمری میں ہی اس سے کیا شہرتی وہ بچوں کا باپ تھا اور اپنی جود کا قصم، تھا تو عید و کا بڑا بھائی، باپ کی جانچ اور بھائی کی تاک کسی اور کے حوالے کیے کرتا، میرے بار

خوب سمجھتا تھا کہ وہ اس کی روزی کا کٹیل نہیں۔ اس کو روزی بڑے بھائی کی حالت سے ملتی ہے۔ اس کی نو جوانی کے لڑاتے جذبات کا کٹیل نہیں اور شاید اس کی کائنات کئی پرچمیں ہے۔ جو روزی سے زیادہ شدید لگا تھا ہے اور دھرا لکھڑا جوانی پر کڑی بھولی ہوئی ہے۔ ریت کے ٹیلوں میں گم۔

لکھنے پڑا سہو ڈانٹیں۔ بس نہیں ہی نہیں اور تلاش ہی تلاش مقدر ہے

3

اور مانگ پاس کی ایک بیخ بدست اندھیری رات میں خدمت اور رعنائی کے احسان کی چٹائی تلوے دیے بہار و نواز عید کی خلاف معمول آنکھ کھل گئی۔ کوٹری کے دروازہ کا ایک کواڑ بند تھا۔ دوسرا آدھا کھلا ہوا تھا۔ سامنے برآمدے میں بیال چ خانوں کا سبز تھا اور جیسے بیال پر اٹھنے کی سرسراہٹ ہوئی اور پھر برآمدہ کی دیوار پر سایہ سا چاہتا معلوم ہوا اور یہ سایہ کی حرکت سے عید نے اندازہ کر لیا کہ خانوں اندر کرباہر کی نور مین میں دوسری جانب سے ایک اور سایہ ہو جا رہا ہے اور دھن کی ڈوٹی ہوئی تھوڑی کالی چادر میں لپٹے ہوئے کے باوجود اس نے بڑے ہمایا کے سامنے کو بیچاں لیا اور کھلایا کہ شہزادی اپنے کوٹری سے باہر نکل کر آیا۔ مین میں دونوں سامنے جمع ہو گئے۔ سامنے کی کار دروازہ تھا اور جیسے دونوں کنارہ کی جانب بڑھے اور کنارہ کی زنجیر اور کواڑ کھلنے کا قصور کھٹکا جس سے عید کے کان بچنے سے ٹوٹ پالوس تھے اور پھر خواہ کتنے ہی آہستہ کواڑ بند ہوئے مگر ان کی چونچ چل تو عید کے کانوں میں پڑوں میں پڑی تھی۔ اور عید کی کوٹری اندھیری تھی۔ خانوں کا کرباہر اندھیرا تھا۔ مگر کائنات گنا ٹوٹا تھا اور کنارہ کی کوٹری تاریک دور تاریک تھی اور عید کی ٹیلی لگا اپنی کوٹری کے اندھیرے کو چھتی۔ خانوں کے برآمدے کے اندھیرے کو چھتی مین کی اندھیری کو چھاتی کنارہ کے کانوں کو کواڑ کس پار کی تاریکیوں میں سب بکھو کیوہی تھی اور اندھیرے کی گری لوری اپنی جیسے ناک کے نوسے پر محسوس ہو رہی تھی۔ برسات کی ٹپکی، دیو، بھکرا، گویا اسکرین پر دو ٹپکتی صورتیں، اندھہ ایک جان دو قالب، دو دکھا، دو دکھا تھوڑا سی تھوڑا۔ گرم ہی گرم گرم کوہم کوہم دور ہے ایک جھرمجری ہی محسوس ہوئی مانگ پاس ٹپکی جی رات میں نوکی سی جھرمجری! تکررہ تو حرکت سے بھی معذور تھا، گری سے بھی محروم۔ مگر ناک کے خطے نوسے سے لے کر ناف تک مستحکم ہو گئی جیسے کوئی چیز بڑی بخاری سے دھچکتی چلی گئی۔ سن سنا، شائیں۔ ٹیلی فون میں جوار بھاتا سا فضا اور کنارے سے دور تھیں آدھے راستے پہنچ کر ہی معذور کیا۔ لیکن دل تو مطلق نہیں تھا اور دماغ بھی تندرست تھا اور دل سے خون کی موٹی موٹی دھاری صاف کر کر کے دماغ کی جانب اندھا حد تک تنگی شروع نہیں۔ اور دماغ نے تجویز کیا اور ایک ٹیڑھی سی لپٹے کو بڑی تیز کر کے جھریے بند سے ٹکرا کر وہاں آ گئی اور جیسے دھن میں سرسراتے ناکوں کی طرح لورائی دماغ کی جانب بگی اور دینے میں سے گزرتے ہوئے لڑاتے سانپ کوڑا کچھے دل کے کئی دور رخ میں جا پیچھے، اور پھر خون صاف ہو کر سلاست روی کی چال چلے گا۔ چند صحت میں چاروں ایک کتاب دل دماغ کے تبادلہ پر مہرب ہو کر سید کے صندوق میں محفوظ ہو گئی۔ کھیلے پر کان چو گئے، کنارہ کے کواڑ کے کھلے اور چائی اور بھائی کے سامنے پھر مین میں کاسچے سے معلوم ہوئے، بیال کے نیچے جھنڈے اور خانوں کا سایہ سامنے سبز میں دیک گیا۔ اور معذور مطلق کے اندر سوال ابھرے اور اندھیرا جواب مل گیا، ہوں، جنس کا جائزہ لیتے گئے ہوں کے بلوچ دیو کنارہ میں۔ "مگر آدھی رات جنس کے جائزہ کا کون وقت ہے؟" ہوں، عید۔ "اور اس نے آٹھیں بند کر لیں اور لاف میں منہ بگی، ایک لپٹا اور آٹھیں بند کرتے ہی صبح کے چٹاب پاخانے سے لے کر لگا، ساتے وقت کے دروازے کے

کنوڑے تک چڑھ گئی اور پھر دوڑے چڑھ کر بغیر حیدر اور ساتوں تک پیچھے دو ٹپکتی ٹپکتی چلی گئی اور آبی ٹیل کر آ گئی اور آگے دوڑنے کی کار یک ڈال دیا۔
تاریک دانا، محمود اور اس کا کھنڈا تو آگھیں چھا چڑھ کر دوڑنے کے باوجود بھی نہیں دوڑ دوڑ بھی دکھائی نہ چلا، خاتون یا مسطوری کا سہارا یا حاسپہ کی ٹپک اور چٹاری کی دوا ۔ اور عید و وحی پائی اور لوگوں کی میں سمجھ کر کر سوا گیا، اور صبح کو باطل طشتیں اٹھا۔ جسے شیر خواہ چھ پھوٹا ہوتا ہے۔ اس کی دہائی پانچوں کا تپا ٹپکتی لوری پر گھری ہے پھر خیر سو کر ۔ اور سورج کی ٹپکتی کرن کے ساتھ تو جیسے اس پر ساتوں ٹپکتی روشن ہو گئے۔
خاتون سبب مصلوب، خطاب پا خانہ کا برتن ہے کر آئی۔ اپنی مسطوری اور چٹاری اس کی خدمت سے تھر تھار داری اور پھر جیسے رات کے واقعات کا پانچا ساپ ساوارا کے پردہ پر منظر ہوا اور نورانی صدم ہو گیا۔ خاتون کی پھر لڑائی جوانی شیرانی کی پانچٹنی ہوا چنے ٹیل ہوا چنے پراکیلا اور اسی آدائی زمین کے سہارے پر سے کھینچے کا پار اٹھانے ہوئے ہے ۔ اور سب سے زیادہ خود اس کا اپنا پار چاد پائی پر چڑھے چڑھے اور وہ اور خاتون دانوں اسی پر تولدے ہوئے ہیں اور پھر پھر تو وہ یہاں تک چا پانچا اور اگر شیرانی نے اپنے اوپر خاتون کا پھرا کر پھر کر بھی لیا تو ایسی کیا بات ہے اور سمجھو دریاغ تر ہو گیا ۔ بارش گیا ۔ اور چک سا گیا۔ دن کا دن چڑھا اور رات کا رات اترا ۔
ہوا تر ضحی کے تپک باک۔

4

[illegible]

بردقت کھلے کیے رہتے ہیں اور سات جنوں میں دباؤ لاکھ انگلیاں غولنوں کا لمبے بننے ہی رہتے ہیں اور عید کے کان تو جیسے اس کے دماغ کے اندر کی آوازوں سے پلٹ پٹا پٹا کر بھانج کا کیا سن رہے تھے اور عید کی آنکھیں تو اندر جیسے میں بھی دیکھتی تھیں، کھلی، بند کیاں اور اندر جیسے کھڑا رہیں اور مٹی زیادہ اور داغ لگا۔ اور کبھی سمجائی کا کیا سمجھتا اور اس نے تو دل تک کو کھڑا کیا تھا۔ خاتون کے خلاف کی تھیں بے چکنے بچنے ہاتھ ہیں۔ جن میں سہاگ کی چڑیاں سمجھتی ہیں، برف کی چوٹی سا سادہ ہے، جس میں دوا بھڑ بھڑاتا ہے۔ دشمن کی پوٹ کی کمر جس میں مچھلیاں ہی ترپتی ہیں اور انھیں کے بل پر کڑی ہو کر وہ اس کے کچھنے جیسے دھوکہ دیتی ہے اور کچھ تو دس سکا ہے، دہ دیکھ سکتا ہے۔ اور بھر کر نوٹا کچھ تو رکھنے کا بھی اہل نہیں ہوتا تو وہ بھر گئی، رکھنے اور کھیں گئے۔

مگر کفر نہ تھا، اندھا بھرا کچھ تو سب ستارہ اور سب بکھرتی رہی اور دیکھتا ہا۔ "ہوں چھٹل۔ میرا تو اللہ نے چھین لیا اور تو نے مجھ پر ہاتھ صاف کیا وہی دیکھا ہے۔"

"تپ۔ چھٹل ہوئے گی تو، آئی بڑی جہت دھرتی۔" خاتون نے بڑی مشکل سے جھینپ دیا کر کہا۔
 "اچھا بڑی، جہت، جہت، کیا میں اندھی ہوں؟ اور تو تو اندھ لگا گئی ہے۔ آگ میں تھوڑا۔" جیسے شہزادی کی بڑی کے منہ سے کچے بعد دیکھنے سے مشکل پڑے۔

"بیل مڑھیں۔" خاتون نے کھٹکتے ہوئے جیسے کسی کی دھڑکے سے نکلا۔

"ہاں چھٹل! بڑی اور سینہ بڑی بات کرنے کے قابل ہے تو بھی۔" دودھ لڑے پر شہزادی کی منظر میں کردہ ہم آواز میں کہا۔
 "چھٹل تو کس، آئی بڑی، کوئی دہی کے۔" شہزادی کی چاب پر خاتون نے رد ہائیں آواز میں کہا۔

اور اسے میں شہزادی کی شیر کی گرج سنا دی، جس کے لوہے کی الاٹ سے قدم میں چھینے کی طرح چھوڑ دی سنگین کر تھی۔ جس میں جتنا ہوا تھل کی طرح مضبوط اور کھلیا ہوا ڈی گھوڑے کی طرح سمجھ پڑتی ہوئی ناگھیں لگی تھیں۔ جن کی دھبک کے بارے دھرتی ہائی چھوڑتی اور پاتاں قرانی خمی، جو سب کا ٹھیل تھا، ہر بات کا اہل۔ اور کفر نہ کچھ ناگھیں تو اسی کی اہلیت کے بل پر بلیا یا کر جاتا۔

شہزادی کی گرج پر خاتون تو سہم کر ٹھکی ہوئی شہزادی کی بڑی ایک دوا بھڑک چلائی اور بھر تھل اٹھنے کے پھر کے ڈھکے کی آواز سنائی دی۔ شہزادی کے دونوں بچوں کی نیچا دیکھا اور بڑی کی آہ بکا، دوا بڑی ہائیں شور ہی شور اور پھر پھر ڈھاپنے کی دھوا دھم اور پھر دھم شور اور ٹھیل ٹھوسٹی۔

اور عید دھن دھن تو اٹھو اسے میں چار دس کا حصول ہی گیا اور پھر شہزادی کا ڈھانچ میں چ کر کچھ بھاڑ کر دیا اور جب شہزادی کھیت پر ہوتا تو لڑے لڑے سے دوا پھر ہوا جاتی، دوا دودھ پھر کو خاتون عید کے لیے دودھ دہلی نے کر آتی تو مہو کی آنکھیں اس سے چار نہ ہوتیں، گردن جھکائے ہی جھکائے کھڑا لے لیتا اور یک دم مڑھ پ جاتا جیسے چڑا چڑا مارا مارا۔ اور کھاتی کر بغیر مٹی ہوں ہاں کے لپٹ جاتا اور آنکھیں بند کر لیتا۔ ہمارا کہیں خاتون آج کی لڑائی کی بات بھڑے

اور بات تو کھار سے لکل کر پہلے شہزادی کی بڑی کے کھڑے میں پہنچی تھی اور جب ہاں شہزادی کا اٹھوڑی استر جہا ختم ذکر کرنا تو لکل کر

مکھ میں پانچ لگی اور اس پانچ کو شیرانی کا لٹا اندر دیکھا اور سب گھر والوں تک جتنی کہڑیں اور جو گوش قسم کے بڑے دھنوں تک بنگلے بنگلے تھی
 اہت میدہ کے مندر و مندر پہنچی تھی۔ مگر سب کو ایک گوند جھرت ہوئی اور سب سے زیادہ میدہ کی بات تو بدستور بھائی رہی۔ مگر شیرانی کی بڑی خاموشی
 ہوئی اور چھ مہینے روز کی بیچ بچ اور دو گنا دھائیں کے بعد اس کی یہ سکون کی کیفیت جھرت لڑھی۔ جتنی کہ اب شیرانی کے کونٹے سے بھی
 جھوت چڑیل کے چینی کی آواز میں نہ تھی۔

شیرانی کی بیوی کی پیادسی اُن نساہت کا بڑی اکتھادی مصطوت کے ساتھ سمجھو ہوا۔ اگرچہ اس کی عورت والی جلت اور ہی اندر
 لاوے کی طرح پگھلی رہی مگر خاری طور پر سکون پر ہوا اور مصطوت کا پلو تو ہمیشہ سے ہماری رہا ہے اور وہ ہماری بھر کمین کے ساتھ سب بکھیرداشت
 کرتی رہی۔ جیسے کسی خاص مطیع فکر کے تحت خوشی، آنکھوں سے سب بکھیر دیکھ کر بھی اندھی رہی اور لٹا لٹا تو اندھا کہتا ہے اور بہرہ اور گونا بھی
 اور آہائی زمین سے توجہ کی مہم ہوتی ہے۔ اور شیرانی نے آہائی زمینداری کی کلی تو ریٹ کا سبز بارٹاس کے دونوں لڑکوں کے حق میں دکھایا،
 اور میدہ اور خاتون کو لالہ اپنے سے آدھی زمینداری مل جانے کا خطرہ ظاہر کیا۔ اور زن، زرد زمین کے دھانگی جذبات پر زمین کا لالہ
 ناب آگیا اور لالہ کے مستقبل کے لیے تو داس نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں اور اس میں سے ایک یہ بھی تھی۔

تھرا آج آج رشتہ نہ تھے۔ جیسے بچوں میں سے کے خور آج ایک دم گھٹ میں پھٹ چڑے تھے۔ خاتون تو خیر طبعہ تھی۔ آج مندر و مندر شیرانی
 اور اس کی بیوی میں اور ہی تھی اور خلاف معمول شیرانی اسیلا اور بیوی کی ہوئی تھی۔ تھوڑی تو دوس میں سے کے بعد شیرانی دروازہ سے نکل گیا اور
 شیرانی کی بیوی گئے میں رہی زالی کر بچہ کے ہنسنے میں لگے گی۔ بچوں نے دوا کر خور چھایا اور بچائی سے اٹھ کر شیرانی اندر آگیا اور ٹھہرے
 گزری کے وقت پر آگیا اور ابھی لگے نہ پائی تھی کہ گھر کا اس کے بکڑ لیا تو دوا دواوں سے دوا نہ ہو سے سر ٹھکانے لگی اور آج کل مرچہ شیرانی
 نے اپنا لٹا اکٹل مٹا دیا اور پھانسی اترتے گئے پر لٹا لٹا تو دوا دواوں میں بھی مکمل ہو جاتی ہیں۔ اور شیرانی نے ہمیشہ سے اترنے والا
 جھوت بات سے اترتا چلا اور پھانسی کے پھدے سے نکل ہوئی عورت کے دو تھکے دو تھکے سے زخمی شیرنی کی ی پگڑیاں بچ پڑیں اور شیرانی
 کے کیوں کیا بات ہے کے دیکھ سوال کے جواب میں جیسے چھو بیٹے کی بچلوں خاموش ہو گئیں مگر کہا جڑیں۔ "تو کس ہاتھ کیا بات ہے اجیری
 وہ ہوتی سوتی تو سب جاتی ہے۔ گزری پھنکال نے تجھے نہیں تھلا، پانچ مہینے بیت گئے دوا کو۔ اور تو بھری چھائی پہ سال بھر سے دکھ دکھاتے
 سوکھ دل رہا ہے نہ بھٹو نہیں کا مارا۔"

"اور پانچ چھ مہینے بیت گئے؟" تھرا ایک دھڑکے شیرانی اچھل پڑا۔ کہتے ہیں نہ پڑی دست چاکر سنبھلا، چور ضرور تھا مگر کوال سے ساز
 باز کے چور تھا۔ اسیلا کے ساتھ ہوا۔ "جھوت ہاتھ جھوت بکھی ہے۔"

"میں جھوت بکھی ہوں۔ کل سب پر مکمل ہانے کا اور دوا کیوں جاؤ ابلی اس گزری دوا سے پوچھ لو اور کاہے کو دیکھ لو اور دوا سنانے
 کڑی ہے مصلحتا مٹا سا بیٹ لیے۔" اور خاتون مظلومیت کے انداز میں ہنسنے کی آواز بکڑنے لگی جیسے کوئی ہنسا ہوا چور۔ اور ٹھیکوں
 سے اس جانب دیکھ کر شیرانی اچھی طرح سنبھل گیا اور اسیلا کے ساتھ ہوا۔

"تو کس بچا، چل اتو کیا بات ہے؟"

اور جیسے شیرانی کی بیوی کے قصوں سے پھیل ساپ پتھر چڑے۔ "ہاں بھٹے، سکارا بھو نے طرحی اور سال بھر سے معلوم دوا سے دوا
 ہے تاہم سے بھرے لٹا کیا بات ہوئی تھی جو جس سال بھر سے مہینے بھی بھیر ہی بھیر لٹک رہی ہوں اور تو گل پھرنے لڑا رہا ہے۔"

”کیا بات ہوئی تھی؟“ شہزادی نے اپنے اچھلے ڈھالے انداز کو جھٹکے اور کہے سے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

”ہاں“ اور جیسے سر سے پاؤں تک ناگھیں ہی ناگھیں لہرا چڑی، ادب لٹاوا، تہذیب دہیاں بیوی سب رشتے کٹ ہی گئے تھے۔
 جواب ملی ہی جواب ملی تھی۔ ”آج کیا ہوا بتاتا ہے۔ سوہا سکا، سال بھر سے مجھ کو ڈاکو مارا ہے اسے اسے کہ باپ کی سب جانیا دھیرے
 لڑکے کو لے گی اور میری آنکھوں میں ننگے گھوپ گھوپ کے سامنے۔“
 ”تو کیا عید، باپ کا چٹا نہیں؟“ کا مٹلی اور غدارنگ کے سہارے شہزادی نے بات ہانپی چلی۔

اور جیسے جلائی کٹا کر کٹتی کو جھجھوڑ پھینکتا ہے۔ ”بھل دور ہو رہے ہے اچھوٹے سب مظلوم ہے کون کون حرای باپ کا ہے اور تو کیا
 جانے گا۔ جانی کار حرای بیچے اتھیری دیں چمنال کو بھی مظلوم تھا۔ حال کیا ہوتا ہے، منے پھٹے، انگوڑے پانی منوے کتے اب تا جوتو نے سال
 بھر سے جھگے دھوئے، پور سوچا ڈاؤ کا جو لاکھی بکڑا، بکڑا بکڑا کر لدا لکڑا، بکڑا۔“ مگر سال بھر کی زحیل میں شہزادی کی ڈھٹائی چٹان کی طرح
 ہے جس اور اٹل ہو گئی تھی، کچھ خوشی اور بے حیائی کے طے پہلے اعلا میں کہتا ہوا ہار لکھا چلا گیا۔ ”خیر یہی کسی دھکے اس سے کیا، میرے تو تھیں کو
 ملے گی۔“

6

اور شہزادی کے بیٹے بھرتے ہی بھڑوں اور بھڑوں اور بھڑوں کی طرح چٹکی چٹکی چٹکی میں اتر آئیں اور بات تو سب کی
 سب نہ مظلوم کب سے جانے پڑی تھیں۔ آج کیا شگون کو کھانا، پیے آتے ہی تہا بل مارنا نہ سے اور تو سوالات اور جوابات کا دریاں چھڑکا اور
 بھڑوں بھر بھر کٹ گئیں، ایک شہزادہ بچہ تھیں، دوسری مٹری۔ پختے پر مخصوص علیحدگی سے ڈانٹ دتی تھی۔ تیسری بول چڑی، مگر بیٹھے
 آیا پوتا، بولا نہ جوتا۔ ”کوئی خطی بیچا تھیں بول چڑی“ بولا نہ جوتا کیوں بولا؟ اس کا تو سات اچھا کا قصم بیٹھا ہے۔ ”جب تک ایک بڑی بڑھی
 نے قصداً ”بیٹہ کہاں ہے کھن لپٹا ہے۔“ جیسے تھی۔ ”اور آگھ مار کر شہزادی کی بیوی کی چاہ بھڑا، کیا اور شہزادی عید کی دیس طرائق ہوتی بیویوں
 کی طرح لڑتے لڑتے فٹ پتہ ہی ہو گئیں۔ یہ بچی وہ کھی اور برآء میں کوئی اور بات“ ڈاکٹر ڈال سے بڑا کر لپٹل پراعت پر پہنچ گئی۔
 دھون ہو لے گئی۔ برآء کی دلچسپی کر شہزادی کی بیوی بڑے قرائے کے ساتھ جوتی ”نہیں آج کھلوا کر چھوڑوں گی۔ اچھی بیچ بیویوں کے
 سامنے منہ پہنچوا، چمنال دار دلی ہے۔“ اور بھر ایک دہر کا سا گھونٹ بھر کر کہا۔ ”تھا چمنال تھلا یہ کہاں سے لائی؟ رڈھی“ اور ایک قدم برآء
 کو بڑی خانوں جلائی وہ قدم پیچھے اپنی اور عید کی کوٹری کے دروازے پر پہنچ گئی۔ عید تو بڑی دیر سے سب کچھ موش پاؤں پر اٹھا اور یہ تو
 عید کی خواتین تھیں۔ کمر کپڑوں کی رنگ۔ دھڑا دھڑا چلا گیا اور انکھیں جب لڑتے چلتے ہر ایک پہنچ گئی تو کمر کو لپے ہی تو مظلوم تھے، نہ ہاتھ
 ملنے نہ تو لہو نہ گرا تھا اور شہزادی کی بیوی نے جس وقت ایک قدم پر کھٹ کے اندر بڑھا کر منہ سے ایک شہرہ سا لٹکا۔ ”نہیں آج کھلوا کر چھوڑوں
 گی چمنال سے، بول کسی اپنے تھکے کا نہیں ملا تو میرے کا رکھ لیا۔ اسی بات اور ان کی جوتی سے گل کر چاہا ہے“ تو جیسے عید کے اس کو لپے سے
 اس کو لپے تک کٹ نے شاگ بارہ پا۔ وہ کھلا کر چاہا۔ سبکی بارہ کے تو بے پناہ مارا سا آچہ منہ سے خلیق دھواں لکھا اور گویا کمر کا مظلوم
 کر یہ چٹا نہ سے ہوا۔ ”تو بھی کھا کھتی ہے۔ سبکی شہزادہ مار گریہاں میں منڈال کر تو دیکھا کھی تو عید کی آنکھیں کھلی ہیں کچھ تو پاں بال میں، کہ
 اس سب بھول گئی نیکہ بنتے“ اور بھر خصوصاً اعلا میں لپچہ دل کر کہا۔ ”اس کا خیر آج شہزادی کا ہے، بھر یہ کھانا دھاتا تو میرے دونوں کہاں

چڑھی ہوئی سوکے سوکے، چرے ہوئے درخت کی ٹھنڈی ٹھنڈی، چٹوں اور انٹھی انٹھی، روڑی ہے جہاں ہی شاخوں کوڑھا ہے ہوتی ہے۔ قد لمبی پر کھنٹا ہوا سا، سیدھ پیٹ سے آگے اٹھا چڑھا اور پیٹ سے پیچھے آگے لٹکا ہوا ہاتھ اور بازو کی چمکناں قفل تھا قفل تھا کہ کیزوں سے باہر نکل چکی تھیں۔ عیدو نے اوپر سے نیچے تک بھانپا، اٹائیں سے بائیں تک پھنسا، اور وہ تو خاتون کے جواز جواز ہند کا آستان تھا۔ پانچ سالہ عمر باز اور تھیں، سادہ فیکہ حیات۔ اندر سے باہر تک دیکھ کر اندازہ کیا کہ خاتون میں تری کی طرح پھول رہی ہے۔ جڑ سے پھٹکی تک ہری بھری، اینڈیٹی انڈیٹی، لال لال، چر ہوئی جیسے پھل سے لہری ہوئی۔ گلابی درخشاں پر برسات کی شفق بھوت چڑی ہے، اور بھگڑی سے ہونٹوں پر بقاوت کی چوٹیوں تک رہی ہیں اور سراپے میں بجلی کی لہر اٹرا رہی ہے۔ جڑ کا ہرنی جیسا مخصوص اختصار الطینان اور سکون سے جڑ کا بچپن اور استقامت تک پہنچ رہا ہے، جیسے ابھی ابھی گہری نیند سو کر دو چار اٹھائیاں لے آ کر چڑی ہوئی ہے۔

عیدو نے کچھ عجیب سی نگاہ ڈالی، اور خاتون نے آنکھوں میں آنکھیں سے جواب دیا مگر جیسے اس کا جواب اتنا کھ کھاس کے منہ پر چڑا اور عیدو نے معلوم کیا سوچ کر بال کی ٹوک سے لے کر پاؤں کی پھٹکی تک عجیب طرز کا کھرا کھرا جواز دیا اور پانچ نظر میں ہاتھوں کے کھوکھرے گل کر چٹکی، بلند چوٹی سے پہلے درخشاں اور ہونٹوں کے بیچ دھم میں جانتی، آہستہ آہستہ صراحتی دار گردن سے گھوم کر اتریں اور سینہ کی گولائیں اور بازوؤں کے کنارے چڑھا میں پھرا گئیں اور وہاں سے قلابازی کھا کر کمر کھولیں کے گھاڑوں میں دھنکی ٹوکھوئی رہیں اور ہمارا ایک بھلا رہب پیٹ کے ”پرستی“ اعلان پر پہلیوں تو جم کر رہ گئیں۔ پتھرا پھینا نہیں شس سے کس ڈانٹیں۔ اور عیدو نے دیکھا کہ خاتون انکھیں ہی دیک رہی ہے۔ انگارے ہی انگارے بھرے اور جیسے جڑ کے گولے پانی کو قسطنطنیہ کا گیس چکا دیتا ہے۔ عیدو کی طفل آنکھوں کے دھندلے آنچہ پر خاتون کی تمام سرخیوں پھل چڑی۔ اور اس وقت تو وہ عیدو کے لیے دودھ پیو دے کر آئی تھی۔ تمام وہی لڑائی کی بھیجت چڑھا تھا، دودھ پیر چڑھا گرم ہوا تھا، شب، گھر بھر میں کسی کے منہ پر ڈاک کیل کی تھی۔ صبح کا ایک گولہ دودھ پیر عیدو بھی تمام دن کا میں ہی چڑھا۔ تمام گولہ دودھ کر شیرانی خاموشی کے ساتھ رکھا کر ہر چڑھا گیا تھا، اور دودھ لٹوئی کھوئی لیے اندر چڑی تھی۔ خاتون نے پیچھے سے دودھ گرم کیا، جلدی جلدی دودھ ڈالا چائیں اور رکھا طاکر طید کیا اور دودھ میں ڈال کر لے آئی۔ کھورا ہمارا چٹائی پر رکھا اور معمول کے مطابق دھنکی کو ہمارا دیا اور ہمارے دیتے وقت دودھوں کے پیروں میں پہ خشک تھیں چار انچ کا قلمبرہ پایا کرتا تھا اور آنکھیں ایک دوسرے سے ہلکی ہلکی کرتی تھیں، اور عیدو کی آنکھوں میں تو شیطے سے لپک اٹھے! نھنے پھول گئے، کپنٹیاں پھڑک گئیں، اور چادر، مٹلوچ، اپنا پچ بستر مرگ کی ازل تریں سب سے ایک کر زندگی کی ان صیبت ناک جلدیوں تک جا پہنچا جہاں ملک الموت کے بھی پر پھٹتے ہیں، عیدو کے اندر، پھٹا، دھم دھم کی طرح تھوڑا تھوڑا کی طرح تھوڑا۔ تھیں سال کی مندرجہ میں متعلق اور کھوکھوں کا تھپکا مرد اور چٹے کر سیدھے ہوتے ہوتے ”فوس، فوس، فوس“، فوس، فوس، فوس! خاتون کا سر عیدو کے گھٹکے میں تھا اور چٹکی کھڑی ناک جڑوں میں، اور جیسے عیدو کے جڑوں میں تو جہروں کا دودھ دست آیا تھا اور خاتون کے ہونٹوں پر اس کی خوروشی کی ذلت لگ گئی تھی، بے چارہ کی بیچ بھی منہ سے باہر نہ لگی تھی، اور جب کچھ کچھ کا بڑی طرح چڑا کر پوری ناک گل گیا تو خاتون کا چہرہ گرفت سے اپنے آپ آزاد ہو گیا۔

ملک راج آئند

نام	ملک راج آئند
فعلی نام	ملک راج آئند / ڈاکٹر ملک راج آئند
پیدائش	۱۲ دسمبر ۱۹۰۵ء، مقام پٹارہ، صوبہ سرحد، بھارت (حال پاکستان)
وفات	۲۸ ستمبر ۲۰۰۳ء، مقام، چناب، بھارت
تعلیم	پی۔ اے (آنرز) پی ایچ ڈی

ابتدائی تعلیم پٹارہ میں پائی۔ خالص کالج امرتسر میں درجہ تعلیم رکھ کر ۱۹۳۳ء میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے پی۔ اے (آنرز) کیا۔ ۱۹۴۵ء میں کٹر لوشپ پر برطانیہ چلے گئے۔ یونیورسٹی کالج لندن سے گریجویشن کرنے کے بعد کیمبرج یونیورسٹی، برطانیہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

مختصر حالات زندگی:

زندگی کے ابتدائی چند برس پٹارہ (صوبہ سرحد) میں گزرے۔ اجداد، جدی پشتی پنجابی تھے۔ اس دور کا ہندوستان پنج گزاری اور معاشرتی بدعات کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس ناقابل برداشت حصار کو توڑنے کی خاطر بھوئی عمر میں ہی تلم سنبالا۔ انجمن ترقی ہندو مسیحیت کے ان ابتدائی مراکبین 'اے' سے ہیں جنہوں نے ۱۹۳۳-۱۹۳۴ء میں اس ادبی تنظیم کے قیام کے لیے لندن میں میٹنگ کی۔ ۱۹۳۵-۳۶ء میں جب انجمن کا دستور العمل زیر غور تھا تو ملک راج آئند انجمن کے خطاب سے متعلق بحث مباحثوں میں سب سے زیادہ سرگرم دکھائی دیے۔

لندن میں قیام کے دوران لندن کا ڈبلیو کونسل سکول میں انگریزی ادب اور ثقافتی کے ٹیچر کے طور پر عملی زندگی کا آغاز کیا۔ بعد ازاں ہندوستانی ادبیات کے Lover Hume ٹیچر اور بی بی ای لندن میں برادہ کا سربراہ بنے۔ ایم۔ او۔ آئی (فٹنر) کے سرپرست کے طور پر کام کیا۔ دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں ٹیچر، پروفیسر آف آرٹ اینڈ لٹریچر کے طور پر اور کنگ پروفیسر رہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال کی "سمراد خودی" اور مہاتما

گاندھی کے افکار سے متاثر تھے۔ آگے بڑھ کر ان کی سوشلسٹ پارٹی کے سرگرم رکن رہے۔ طویل مدت تک ان کی قیام رہا اور فری الائنس ادیب کے طور پر زندگی کرتے رہے۔ رسالہ "Marg" کے ایڈیٹر رہے۔ جنوب مشرق کے اس انٹر نیشنل شہرت کے حامل ادیب کی زندگی اور فن سے متعلق چھ اہم کتب شائع ہو چکی ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

1. "Mulk Raj Anand" By Dr. M. K. Nask, Arnold-dansmann, publishers india Pvt. Ltd. AB/9, Seldarjung Enclave, New Delhi. 110016
2. "Mulk Raj Anand" by Dr. K.N. Sinha, World Authors Series, Twayne Publishers, New York.
3. "The Lotus and the Elephant" by Jack Lindsay, Kutub Popular, 350, Tradeo Road, Bombay-4- 034, Also reproduced in Decay and renewal by jack Lindsay, Published by Lawrence & Wishart, London, 1977, Available from Colett's Bookshop, Charing X Road, London.
4. "An Ideal of Man in Anand's Writings" by D. Ramenshneider, Kutub Popular, address as above
5. "Mulk Raj Anand, Man and novelist" by Margaret Berry, Published by E F Beale, Amsterdam.
6. "So Many Freedoms" by Dr. Saros Cowasjee,
7. Mulk Raj Anand, Special Number, A Miscellaneous of various articles edited by Dr Satyananan Singh, Department of English, Kakatiya University, Vidyaranyaपुर, Warangal- 506 009 A.P. India.

اولیٰ مین مطبوعہ اشعار:

"اچھوت" مطبوعہ "دشارت" ۱۹۳۵ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- | | |
|---|-------------------------|
| 1. Seven Summers | Orient Paperbacks, 1960 |
| 2. Mooring Face (Novel) | Arnold Heinemann, 1968 |
| 3. Confession of a Lover | Arnold Heinemann |
| 4. Homage to Tagore (Criticism) | |
| 5. Lines Written to an Indian Air (Criticism) | |
| 6. On Education (Criticism) | |
| 7. King-Emperor's English (Criticism) | |
| 8. The Story of India | Arnold Heinemann |
| 9. The Story of India | |

سورگ پاش ہونے سے قبل مستقل ہوا:

۴۵ کلف پرا، بسکٹ ۳۰۰۰۰۰۵، بھارت۔

اعزاز:

- ۱۔ فلائی آف آرٹ پرائیوٹ پبلیشنگ ایکیڈمی، ۱۹۸۵ء
- ۲۔ پدم بھوشن مائٹھی سول ایوارڈ، ۱۹۹۷ء
- ۳۔ نیو، لٹ کے گراڈیٹیو: ۱۹۷۳ء
- ۴۔ پبلیشنگ ایکیڈمی ایوارڈ، ۱۹۸۸ء "Morning Face"

نظریہ فتن:

"I think beyond literature of pleasure current in most parts of the world, there lie vast unknown areas of reality, about the lives of people who have never entered literature. I feel new generations of the young specially in Asia and Africa will go into the intanous and recreate the lives of the neglected, the insulted and the injured."

(پروال: مکتوب، کام مرزا، جیکب مورس، ۲۷ جون ۱۹۸۵ء)



حوالہ جات:

- ۱۔ ڈاکٹر ملک، داغ آغا، ماہنامہ آفاق، محمد امداد علی

فطرت کا دل

ملک راج آئند

دن بھر سطح صاف رہا تھا، لیکن شام ڈھلنے ہی بادل بھر آئے تھے، اور بارش کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ دروازہ کھلی چمک رہی تھی، اور بادل گرج رہے تھے۔ یوں مظلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی جھوٹا ناک دھج ہنگامہ رہا ہو اور اس کے نوکیلے دھماکوں کی چمک سے نگلی کو نہ رہی ہو۔ دفعتاً بادلوں کی وحشت ناک گڑگڑاہٹ دواہی میں کوچ اٹھی، اور کسانوں کی لڑکیاں، مرغلی کے چنڑوں کی مانند سم کر اپنی اپنی پھوس کی جھونپڑیوں میں دھپک گئیں۔

کرل انٹونڈی سلوا جو ٹالی علاقے کے قیدیوں کے کھمپ کا گھراں تھا مادی وقت شکار سے واپس آیا تھا، اور سار جٹ کو سونے اس کے سامنے قہری اخبار کر پر ٹالی شراب کی بوتل، کدو کی تھی، تاکہ کرل اپنی شکایت اور پیاس دور کر سکے۔

پنگے کے برآہ سے کے باہر کمرہ سے پتھروں کے ڈھیر پھرتے ہوئے تھے۔ قیدیوں نے ان پتھروں کو بارود کے ذریعے قریبی چٹان سے ٹکرا دیا تھا تاکہ پرانے کامیہ ان اموار کیا جاسکے۔ دائیں جانب ایک قلعہ تھا جس کی دیواریں کالی پلٹ تھیں۔

شکار کے لیے دوڑ دھوپ کرنے کے بعد انٹونڈی خود کو بے حد تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ محاسب اپنے وطن کی یاد آ گئی۔ جو زمین کے قریب تھا، اور جہاں زمین کے درختوں کے اتحاد دھنڑ تھے۔ جب اس نے کوا کا دھلی ہوئی شراب کا ٹکڑا چن لیا، تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی اس اضطرابی کیفیت کا سبب کیا تھا۔ شاید یہ بے ہوشی اسے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد بھی شکار ہاتھ نہ آیا تھا اسے اپنے منہ کا تھوک بھی ترش محسوس ہونے لگا۔

”کو سوتا تھا لیکن سے کہو کہ قص کر رہی۔“

اس نے غصہ دیا۔

اس دیران مقام پر جہاں مغربی تہذیب کی آغوش نکالی صرف وہ قلعہ تھا۔ اگر سناحوں کی تفریح کا کوئی ذریعہ تھا تو وہ پتھروں کے دم

مردوں میں گائے ہوئے گیت یا نغموں کی آواز میں جڑا ہوا آہستہ شروع ہو کر کافی بلند ہو جایا کرتی تھیں۔ لیکن گاؤں ایک مکمل کے قافلے پر تھا اور گاؤں واسلے اپنے رقص و سرور کی غلطیں راست گئے بھایا کرتے تھے۔ عجم بن کر تمام قیدی خاموش رہے، کوسو یوں ہے جس حرکت کھڑا رہا جیسے اس نے کرل کا حکم ہی نہ ہو۔

آسمان پر گہرے بادل منڈلاتے رہے۔

کرل واقعی کڑگ ہمارا ہیہ تھا۔ اس نے اس خطے کا ہر موسم برداشت کیا تھا۔ اس لیے کہ وہ حکومت پر نکال کی فوج میں کافی عرصے سے ملازم تھا۔ وہ انگلستان کی بارش کی بھڑی سے بھی ناخوش تھا۔ اس لیے کہ اسے چھ ماہ بیٹھ کر سٹ میں ٹریڈنگ کے قافلے میں رہنا پڑا تھا۔ وہ موسم کی خرابی پر برداشت کر سکتا تھا لیکن اپنی عجم بدولی کو گوارا نہ کر سکتا تھا، اس لیے وہ چیخا ”کوسو!“

کوسو نے دہلے پاؤں برآمدے کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

”کیا تم نے بھری آواز نہیں سنی؟“

”جی نہیں جناب“ کوسو نے ہوا سمٹ لی۔

”میں نے قاتلوں کے رقص کا حکم دیا تھا۔“

”قاتلی تو کئی ہی رقص کے لیے آئے تھے جناب، اب وہ آج دوبارہ نہیں آئیں گے۔“

”لیکن میں نے انہیں بھٹک دی تھی!“

کوسو سر ہٹائے کھڑا رہا۔ بادلوں کے سائے میں اس کا چہرہ، کچھ زیادہ کالا نظر آنے لگا تھا۔ چنانچہ آسمان پر گڑگڑاہٹ ہوئی اور حیرانگی کو نہ گئی۔

”بھرتے داروں سے کہہ کہ ان کے سرخندہ معاش ڈاکٹر آدم کو بلا لائیں، اور ہاں، پھر سے داروں سے کہہ کہ یہاں آ کر شراب سے لطف اندوز ہوں۔“

کوسو چند لمحوں میں کھڑا رہا۔

داخل میں تازہ پیرا ہو گیا تھا۔

”جاسے کیوں نہیں؟“

کوسو نے نظریں اٹھائیں۔

”جاؤ۔ نکل جاؤ یہاں سے۔“ کرل اپنے ہی بھٹکتا ہوا ہوا۔

اسی وقت بجلی کڑکی اور کوسو خواب زدہ ہو کر تیزی سے میدان کی طرف بھاگا۔

ہوا میں بجلی حرارت آ جلی تھی۔ بارش کے آواز لایاں نہ گئے تھے۔

لیکن پلک جھپکتے ہی گہرے کالے ہاتھوں کا بیٹھا آسمان میں آگے سرک گیا، اور اٹھو لاکھ ڈیڑھ کی جانب بڑھنے لگا۔ لیکن چند آواز ہاتھوں کے گھوڑے اب بھی چھڑکی چٹانوں پر منڈلاتے رہے۔

کرنے لے آسمان کی جانب مگھ کر دیکھا، اور فوری طور پر خطرے جھکا کر شراب کی بوتل پر بھاڑیں۔ اس نے نگاہ اٹھا کر اپنے سوتے کتلے کمال سے لگایا۔ گویا نگاہ کی ملائم رخ سے نکلنے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

دو ہفتہ سوئی کی آہٹ ہوئی اور دوپہائی گری میں اتر گیا۔

ایک منظر صبح کے آگے آگے ڈاکٹر آدم نظر آ رہا ہے وہ دھنچکا ہنسنے کے احاطے کی زمین کے اندر سے نمودار ہو گیا ہو ڈاکٹر آدم لطیف و ناتواں اور اس قدر کا انسان تھا۔ اس کی آنکھوں کی پیدیدنی چمک رہی تھی، اور اس کے کٹ کا رنگ اس کے گہرے سیاہ چہرے کے رنگ سے جدا نظر آ رہا تھا۔

”تم جانو ڈاکٹر آدم ہو؟“

کرنل نے طرح لہجے میں پوچھا۔

ڈاکٹر آدم نے کوئی جواب نہ دیا اور کرنل سے پانچ چمک کے قافلے پر ساکت کھڑا رہا۔

قفلے کے پانچ پہرے دادا اور سارا جنت کو سوسائے کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔

ہر امیدواروں میں چکر لگا رہی تھی۔ دھنچکا قرعہ بیجاؤں پر بجلی کوئی

کرنل نے صوفیوں کیا کہ فطرت بھی اس قیدی پر صبر پا رہی ہے۔ وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا کہ سلسلہ کام کیوں کر شروع کرے۔ پھر اس نے اپنی حس حرام کا سہارا لیا۔

”مجھے ملایا گیا ہے کہ تم نے لندن میں بی بی کس لڑات، اور انہیں چنگو ڈانس سیکھا ہے۔“

ڈاکٹر آدم نے انہماک میں سر ہلا دیا۔

”جسمیں انگریز حسنا نہیں ضرور پسند آتی ہوگی، خاص کر اس وقت جب وہ تمہاری آغوش میں رہی ہوں گی؟ کیوں؟ میرا خیال ہے کہ

صرف خاندانوں نے تمہارے ساتھ رقص کیا ہوگا۔“

قیدی کے چہرے پر درد و کرب کے آثار ابھرا آئے اور کرنل کی سوچاؤ نگاہوں پر اس کی نظریں خود بخود چمک گئیں۔

”اور تم اپنے ہم وطنوں کا قاتل کی رقص بھول گئے؟“

ڈاکٹر آدم نے ٹٹنی میں سر ہلا دیا۔

اس قاتلیوں کی لطیف و خاموشی نے کرنل کو بیحد پریشان کیا تھا۔ اس وقت بھی ڈاکٹر کی خاموشی اسے مزید پہنچا رہی تھی۔ کیونکہ وہ

اس قیدی کے چہرے کے تاثرات سے اس کے اصل جذبات کا اعلان کرنے سے قاصر تھا۔ کیا یہ جیٹھی اپنے رد عمل کا اظہار کرنا چاہتے ہی

نہیں؟ کیا یہ افریقہ کے کد بننے والے بھی انسان ہیں؟

”تو پھر کوئی قاتل کی رقص نہیں کرے۔ ہمیں تفریح چاہیے۔“

قیدی چکر کے بت کی مانند کھڑا رہا۔

کرنل کے غصے کا پارہ چڑھ گیا، اس نے سارا جنت کو آواز دی

”کو سورا۔“

”تاہج، بے خوف، ہج۔ ٹھیس تو جہنم میں ہا۔“

پہرے والوں کے جسم میں شیعے کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے جھٹ کر گرے ہوئے قیدی کو اٹھا لیا۔

کرل برآء سے میں دایس پہنچ کر اپنی آرام کرسی میں جھنس گیا۔

اجاٹے میں ہوا کا تیز جھونکا دیا۔

کرل قیدی کے چہرے پر نظریں گاڑے بیٹھا رہا۔

پہرے والوں کے سروں پر ہارن کا پہلا قطرہ گرا۔

”بھاگ جاؤ، نکل جاؤ!“ کرل چیخ اٹھا۔

ہارن کی بھڑکی لگ گئی۔ شاید بے دردی سے نکل سکے جانے والے افریقیوں کے ہجوتوں کی بے بسی نے فطرت کا دل بھی پھٹا دیا تھا۔



احمد ندیم قاسمی

نام
قلمی نام
پیدائش
وفات
تعلیم

احمد شاہ

بیرونہ احمد شاہ، احمد ندیم قاسمی

۲۰ نومبر ۱۹۱۹ء بمبئی قسطنطنیہ خوشاب ضلع شاہ پور (حال تحصیل خوشاب) مغربی پنجاب، پاکستان۔

۱۰ جولائی ۲۰۰۶ء بمبئی، بہ حجام لاہور۔

بی۔ اے۔ صادق انگریزی کالج، بہاولپور (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) ۱۹۴۵ء۔

ابتدائی چار جماعتیں پرائمری اسکول لانگہ سے پاس کیں۔ ۱۹۴۵ء میں کیمبل چور کے گورنمنٹ ملل ایچ ہارل سکول میں داخلہ لیا، جہاں سے انگریزی کلاس پاس کرنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں گورنمنٹ انگریز ہائی اسکول کالج کیمبل پور منتقل ہو گئے۔ اس زمانے میں غریب اور دوسری کی جماعتیں کالج سے وابستہ تھیں۔ ابھی میٹرک کا امتحان نہیں دیا تھا کہ شیخوپورہ منتقل ہوا چار گورنمنٹ ہائی سکول، شیخوپورہ سے ۱۹۵۱ء میں میٹرک کیا اور اگلے چار برس صادق انگریزی کالج بہاولپور میں زیر تعلیم رہے۔ ۱۹۵۵ء میں صادق انگریزی کالج، بہاولپور (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔

مختصر حالات زندگی:

آپ کے اجداد بہاولپور میں عرب کے ساتھ ایمان سے ہوتے ہوئے ملتان، بہار و حیدر آباد آئے بعد ازاں خوشاب میں سکیم کے زمیندار بن گئے۔ آپ کے تعلق میں اسلام آباد کی گائیں بسا یا، جسے ہندو شاہ کی پلغار نے برادہ کر دیا بعد میں اس آبادی کی بنیادیں انگریز تحصیل خوشاب سے اٹھیں۔ یہ خاندان تحریکی اور پریزگار کی میں مشہور ہوا۔ احمد ندیم قاسمی کے والد کا نام جو نظام بنی تھا جو اپنے علاقے میں ”نبی خان“ کے نام سے معروف تھے۔ دو ساری زندگی جذب کی حالت میں رہے۔ شیخوپورہ کا بھیجنا احمد ندیم کے انتقال سے گزرا۔ ۱۹۴۳ء میں والد کے انتقال کے بعد ان کے بہادر داد جی پتھر حیدر شاہ ریونیو اسٹیشن کیمبل پور (حال لانگہ) نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ چچا کا چادر کیمبل پور سے شیخوپورہ ہوا تو احمد ندیم ان کے ہمراہ تھے۔

۱۹۳۱ء میں حکیم شرف پورہ سے میل تک کرنے کے بعد بہاول پور چلے گئے۔ ان کے چار بچے تھے۔ ان کے بعد ذوالف آف بہاولپور کے مشیہ مال مقرر ہوئے تھے۔ حکیم دور اور ان تعلیم صادق انجیلز کالج بہاولپور کے چلے "گلستان" کے اردو اور انگریزی حصوں کے مدیر ہے۔ ۱۹۳۵ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں راجہ سرکھنڑا پور کے دفتر میں عمر کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا، جہاں سے مستعفی ہو کر ادا کلاہ میں نوٹن لٹل فون آج رہا ہے۔ وہاں سے استعفیٰ دے کر ایک مزید کی وسعت سے جولائی ۱۹۳۹ء میں حملہ بکری پستان میں سب انجیلز بھرتی ہوئے جہاں سے ۱۹۳۹ء میں چھٹی نے کریمو کے پاس دہلی گئی۔ سخواس زمانے میں حور فحش ٹیکیز دو دہلی کی فلم "نچرہ" کو دیکھا ہے۔ حکیم نے اس فلم کے علاوہ فلم "دھرم تھی" کے گیت گائے جن کو فلمی ادارہ نوٹ کیا اور دونوں فلمیں نہ بنیں تھیں۔ قیام پاکستان کے بعد ادا کلاہ فلم "آغوش"، "دور سے"، اور "کوری" کے سکانے لکھے۔ ۱۹۳۳ء میں دہلی سے واپس آ کر ٹھکانا پکری سے ۲۰ ستمبر ۱۹۳۶ء میں مستعفی ہو کر ۲۵ ستمبر ۱۹۳۶ء کو اقتدار علی تاج کے ادارے دارالاشاعت پنجاب، لاہور میں "تذیب نسواں"، اور "بھولی" کی ادارت سنبھالی۔ اس زمانے میں دارالاشاعت پنجاب سے انھیں سزا دے دیا گیا کہ وہاں سے چلے گئے۔ ۱۹۳۳ء میں "ادب لطیف" لاہور کے مدیر ہوئے۔ سالانہ ۱۹۳۳ء میں سعادت حسن منٹو کا الماس "تذیب" اور "مضمون" "جدید ادب" شائع کرنے پر حکومت پنجاب نے ان کے خلاف قسطنطنیہ کی اشاعت کے سلسلے میں مقدمہ کھڑا کر دیا جو ایک برس تک چلا۔ اس دوران میں حکیم شرف پور چلے گئے۔ مئی ۱۹۳۵ء میں مقدمہ سے بری ہو کر طالت کے پیش نظر فروری ۱۹۳۶ء میں "ادب لطیف" لاہور کی ادارت سے دست بردار ہوئے اور گاؤں چلے گئے۔ قیام پاکستان کے بعد پشاور چلے گئے اور سرکھنڑا پور سے بری ہو کر ایک ادارت کی ۱۹۳۸ء میں شادی کے بعد مستعفی ہو کر لاہور آ گئے۔ ۱۹۳۷ء میں "سورج" کا اور مرثیہ کرنا شروع کیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں لاہور آ کر منہ بولی سخن باز و سرور کے ساتھ مل کر "نقوش" لاہور کی ادارت سنبھالی اور "نقوش" کے پہلے دس شمارے مرثیہ کیے۔ ۶ جولائی ۱۹۳۸ء میں قریبی عزیز و راجہ کے ساتھ شادی ہوئی۔ نومبر ۱۹۳۹ء میں انھیں انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کا نیکر لڑی جنرل منتخب کیا گیا۔ "نقوش" اور "ادب لطیف" کے سالانہ اپنے چاروں کو انجمن کا آرگن بنانے سے معذوری کا اعلان کیا تو حکیم نے فیض، ہاجہ سرور، ممتاز حسین اور حمید اختر کے ساتھ مل کر الطاف پورہ کے پرچے "سحر" کو انجمن کا نظر پاتی پرچہ بنایا مگر اس کا صرف ایک شمارہ ہی آ سکا۔ مئی ۱۹۵۱ء تا نومبر ۱۹۵۱ء استعفیٰ ایکٹ کے تحت حکیم نے تقریباً سات ماہ قبل میں گزارے۔ ۵ مارچ ۱۹۵۳ء میں دوزخ نامہ "امروز" لاہور کے مدیر ہوئے اور ۱۹۵۳ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے انتخاب کے سب نیکر لڑی جنرل شپ سے دستبردار ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء تا فروری ۱۹۵۹ء تک پہلی ایکٹ کے تحت نظر بند رہے۔ ۱۹۵۹ء کے اواخر میں ایب خان کے پرچے فرسٹ قائم کر دیئے گئے سبب امروز سے استعفیٰ دے دیا اور فری لانس ادیب کے طور پر "امریکن" کا اور "جلال پاکستان"، "عرصہ"، "کراچی اور" جنگ" کراچی کے لیے لکھائی کالم نگاری کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۳ء میں اپنا ادبی مجلہ "قانون" جاری کیا۔ ۱۹۷۳ء سے جولائی ۲۰۰۶ء مجلس ترقی ادب لاہور کے ڈائریکٹر رہے اور مجلس کا مجلہ "صحیفہ" بھی ترتیب دیتے رہے۔ دل اور ہچکچڑے کے امراض میں مبتلا ہو کر پنجاب انسٹیٹیوٹ آف کارڈیالوجی، لاہور میں زیر علاج رہا کہ وہیں انتقال فرمایا۔ تدفین شاہ مسراج قبرستان ملخص چک، کین آباد، لاہور میں ہوئی۔

اولین تحقیق:

ایک دستورالعمل بیانی کی والدہ اور اپنی کم سن بیٹی کی وفات کا شریہ (پرچہ) ۱۹۳۷ء

اولین مطبوعہ تحریر:

نظم مولانا محمد علی جوہر کا مرثیہ ”مطبوعہ“ ”سیاست“ لاہور: جنوری ۱۹۳۱ء

اولین مطبوعہ افسانہ:

”پنچب بہتر افسانے“ مطبوعہ ”زمانہ“ لاہور: فروری ۱۹۳۶ء

تقریبی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱ ”بچ پال“ (چند افسانے) دارالاشاعت، پنجاب، لاہور طبع اول: ۱۹۳۹ء
(۱) بچے گناہ (۲) کہانی ڈاکٹر (۳) پوٹو عاں پانی (۴) عشاءِ نجی (۵) ہیر پائی (۶) مسافر (۷) غیرت مند بیچ (۸) حق بجانب (۹) آرام (۱۰) دور چاہی تھی (۱۱) انتقام (۱۲) فرورٹس (۱۳) بیدار کون جگائے (۱۴) بچے چار
- ۲ ”گولے“ (تین افسانے) کتبہ اردو، لاہور طبع اول: ۱۹۴۱ء
(۱) ملائی سر (۲) توبہ میری (۳) بھرت (۴) ننھے نے ملیت خریدی (۵) چھپہ (۶) ماں (۷) کریا کریم (۸) بچے (۹) ہیرا دلہن (۱۰) چوری (۱۱) تکمیل (۱۲) پاؤں کا کاٹنا (۱۳) ابنِ یمن (۱۴) تلی (۱۵) السلام علیکم (۱۶) خوش رہو (۱۷) چنوں کاٹش (۱۸) مانوں کی مہاؤں (۱۹) سرنگ ٹوپی (۲۰) بچے چھائیاں۔
- ۳ ”طلوعِ غروب“ (۲۰ افسانے ایک ڈرامہ) کتبہ اردو، لاہور طبع اول: ۱۹۴۱ء
(۱) طلوعِ غروب (۲) کنگے (۳) گریج (۴) جلسہ (۵) ہیرا دلہن (۶) جراتی کا جتوہ (۷) کچا مکان (۸) ہمارا گل
- ۴ ”گداپ“ (چند افسانے) دارالاشاعت اردو، کتبہ اردو، لاہور طبع اول: ۱۹۴۳ء
(۱) مسجد کے بیار (۲) گولے بچے (۳) نزلِ دل (۴) اختلال (۵) اور حرا گیت (۶) بڑے کی پانچیں (۷) اور دشمنوں کے شیشے (۸) پچی (۹) غریب کا تھوڑا (۱۰) اللہ والی (۱۱) ایک رات بچ پال پر (۱۲) رنگ و رنگ (۱۳) انساں (۱۴) انسان اور زمان (۱۵) ہسپتال سے نکل کر۔
- ۵ ”سچ پ“ (۲۰ افسانے) دارالاشاعت اردو، کتبہ اردو، لاہور طبع اول: دسمبر ۱۹۴۳ء
انسان میں پناہ پڑھو ان باتیں (۱) نظم اور بچے (۲) پڑھا کھوسے (۳) بٹاری (۴) جراتی کی سڑک (۵) بچوں کے سامنے (۶) لکھن (۷) کافی آگ (۸) سن کی ڈال (۹) آزاد و خوش مقام (۱۰) مسطر لاف (۱۱) سولے کی دھار (۱۲) جی سارگی (کل صفحات: ۲۹۹) اس کتاب میں ایک ڈرامائی مکالمہ پڑھو ان ”سن کی کرچیاں“ اور ایک ڈراما ”مستقبل کے سوراگر“ بھی شامل کتاب ہے۔
- ۶ ”سچاپ و گداپ“ (۲۰ کتاب گل کیا افسانے) کتبہ اردو، لاہور طبع اول: ۱۹۶۱ء

یہ کتاب مجموعہ "سیلاب" "گروہ" کے متعدد ذیلی گیارہ منتخب افسانوں پر مشتمل ہے:

- (۱) "الحسن" (۲) "بڑھا" ("سیلاب" میں اس افسانے کا عنوان "بڑھا کھوسے" ہے) (۳) "کھائی آکھ" (۴) "سن کی زانی" (۵) "کلمہ" اور سچے (۶) "ایک رات چہ پال پر" (۷) "ادھر اگیت" (۸) "صبا ان اور افسان"۔ ("گروہ" میں اس افسانے کا عنوان "افسان اور صبا ان" ہے) (۹) "سوئے کا بار" (۱۰) "غریب کا تھو" (۱۱) "اشعلیٰ"

"آج کل" ("گیارہ افسانے") ادارہ فروغ اردو لاہور پاکستان شراک طبع اول: ۱۹۳۳ء

پیشکش: لکچر کتب خانہ لاہور

- (۱) "صوبہ شمش میں سے" (۲) "ہاں ایمان کی خبر" (۳) "غیب و فراز" (۴) "خیر و زے" (۵) "کامرو" (۶) "سائے" (۷) "صدقہ وصل" (۸) "انصاف" (۹) "مہنگی لڑکھن" (۱۰) "سارو لا" (۱۱) "شعلہ فم طرودہ" (۱۲) "کلمہ کے دریا چہ پر" (۱۳) "۱۹۳۳ء کی تاریخ ورج ہے۔" (۱۴) "آج کل" ("تین افسانے") ادارہ فروغ اردو لاہور طبع اول: جولائی ۱۹۳۶ء

افسانوی مجموعہ: آج کل کے کورج پر اس مجموعے کا اشتہار "زم زم" کے نام سے دیا گیا ہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس نام کو اپنے شعری مجموعے کے لیے پسند کر لیا اور "آج کل" کے نام سے ان تین افسانوں کا مجموعہ منظر عام پر آیا۔

- (۱) "کھارہ" (۲) "بیرہ شمس سے پہلے کے بعد" (۳) "مہدائتین" (۴) "پہلے ۱۹۳۹ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں "آج کل" کا ایک افسانہ "صوبہ شمش میں سے" بھی شامل کر لیا گیا۔ پہلے ایڈیشن کے کل صفحات ۲۲۸ ہیں۔

"آس پاس" ("آٹھ افسانے") کتب خانہ خواں لاہور طبع اول: ۱۹۳۸ء

- (۱) "کلی" (۲) "بکری و بچہ میں" (۳) "خفی" (۴) "کرن" (۵) "سوئے" (۶) "تھیل" (۷) "ارکاء" (۸) "چٹیل"

"درو پھار" ("آٹھ افسانے") کتب خانہ اردو لاہور طبع اول: ۱۹۳۸ء

- (۱) "میں انسان ہوں" (۲) "چاقو پر" (۳) "تھین" (۴) "جب بادل اٹھے" (۵) "سپاہی بیٹا" (۶) "کودت" (۷) "کھائی کھس جا رہی ہے" (۸) "راہے مہاراجے"

"خانا" ("دس افسانے") نیا ادارہ لاہور طبع اول: ۱۹۵۳ء

- (۱) "بڑی سرکار کے نام" (۲) "رکھ خاند" (۳) "آتش گل" (۴) "احت" (۵) "کھوتے" (۶) "کھری" (۷) "گنڈا سا" (۸) "چور" (۹) "خوند" (۱۰) "خانا"

"مازار و حیات" ("تیرہ افسانے") ادارہ فروغ اردو لاہور طبع اول: ۱۹۵۵ء

- (۱) "پیشترنگ" (۲) "گل رنے" (۳) "خون جگر" (۴) "دار و سن" (۵) "زلیخا" (۶) "مہم" (۷) "ستہ بھرانی" (۸) "سوچی" (۹) "کفن" (۱۰) "پہا نور" (۱۱) "آئینہ" (۱۲) "بھرا" (۱۳) "کھر"

"برگ حق" ("دس افسانے") ناشرین لاہور طبع اول: ۱۹۵۹ء

- (۱) "بچے و بچیاں" (۲) "مقام" (۳) "کھبا" (۴) "اور میں" (۵) "کھنکھن" (۶) "غیب" (۷) "مہم یک" (۸) "دستی" (۹) "جن دانیس"

- ۱۳ "گمرے گریک" (سحر افسانے) راجل کتاب گمرہ روپنڈی طبع اول ستمبر ۱۹۶۳ء
- (۱) سحر (۲) فیشن (۳) سلاش (۴) انکس (۵) پھاڑوں کی طرف (۶) گڑیا (۷) قتل (۸) پاگل (۹) لاسی گل پالو (۱۰) بے نام چورے (۱۱) "فون" میں گھڑت چار کے نام سے شائع ہوا تھا (۱۲) کپاس کا پھول (۱۳) سلید گھوڑا (۱۴) نکوت وندا (۱۵) آسپ (۱۶) لارنس آف صلیبیا (۱۷) قرض (۱۸) مظلوم
- ۱۵ "بلا چتر" (نوائے انسانے) غالب پبلشرز لاہور طبع اول ۱۹۸۰ء
- (۱) احسان (۲) محبت صلب (۳) عز (۴) انصاف (۵) مالاں (۶) بلا چتر (۷) پارٹر (۸) ایک عورت تین کہانیاں (۹) ایک اتفاق محبت کی کہانی
- (اس کتاب میں شامل انسان "پارٹر" اس سے قبل "فون" میں "پارٹر سٹم" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔)
- ۱۶ "انگوٹیاں" (انتقالیاتی مراد فیاض نگاروں کا انتخاب) اوراد شامیت اوراد سعید آباد دکن طبع اول ۱۹۶۳ء
- ۱۷ "نوش لطیف" (انتقالیاتی خواجہ کے افسانوں کا انتخاب) اوراد فروغ اوراد لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء
- انسان نگار خواجہ کی خود نوشت سوانح کے علاوہ اس انتقالیاتی میں عدم کے مرتب کردہ سوانح کے جواب کی شامل کتاب کیا گیا ہے۔ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا ہے۔
- ۱۸ "احمد عظیم شاہی کے بہترین افسانے" (مرتبہ مظلومی) مکتبہ میری لاہور میری لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء
- اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی اسی ادارے نے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا ہے۔
- ۱۹ "زم زم" (قصائد و ہامیات) اوراد فروغ اوراد لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء
- ۲۰ "جلال و جمال" (شاعری) نیا اوراد لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء
- ۲۱ "خط گنگ" (شاعری) قوی دارال شامیت لاہور طبع اول ۱۹۵۳ء
- ۲۲ "دشت دلا" (شاعری) کتاب لہا لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء
- ۲۳ "سجیہ" (شاعری) افریہ لاہور طبع اول ۱۹۷۹ء
- ۲۴ "روان" (شاعری) مطبوعات لاہور طبع اول ۱۹۷۹ء
- ۲۵ "تجدید فہم" (تحدید) پاکستان فاؤنڈیشن طبع اول ۱۹۷۹ء
- ۲۶ "ادب اور تقسیم کے رشتے" (تحدید) افریہ لاہور
- ۲۷ "پاکستان کی نوک کہانیاں" (ادبیرین سرچ کا ترجمہ) شائع مقام پبلشرز لاہور پاکستان: طبع اول ۱۹۷۲ء
- موسسہ نرفنکھن
- (علم نے ترجمہ کرتے وقت انھوں کا ترجمہ مضمون کیا ہے۔ اس کتاب کے مصدور ایڈیشن کے کل صفحات ۲۳۴ ہیں۔)
- ۲۸ "اقبال" ایک خاکہ " (تحدید) طبع اول ۱۹۷۷ء

۲۹	"ہنس المالا" (تخلیہ)	طبع اول: ۲۰۰۳ء
۳۰	"سستی کی تلاش" (تخلیہ)	طبع اول: ۲۰۰۳ء
۳۱	"کیر کیرا ری" (مضامین، ڈرامے، تراجم) کا شاعر الطیف فاروقی، مکتبہ شعروادب لاہور کتاب کا پانچواں ترجمہ مینوہن: "مٹھلے کے گھنٹے" پہلا نمبر ۱۹۳۳ء کی جاری شدہ ہے۔	طبع اول: ۱۹۳۳ء
	کتاب میں شامل مضامین: (۱) ہم ایک موزوں ری گے (۲) ایکٹرز کے آنسو (۳) بھولال کا بچہ (۴) سکرابت (۵) بے قہر جواب مضمون (۶) میرے چڑی (۷) کتابیں پڑھنا (۸) مکان کے کنگے (۹) سید اللہ خان جازوی (۱۰) چرخانہ اور گاڑی کا سفر (۱۱) تھپکام (۱۲) صبر سے قنارہ ڈرامے: (۱) غلط ادیب (۲) بگڑا رنگت (۳) قاضی کی کاغذ تراجم: (۱) اعتراف (مارک ٹوین) (۲) مدمن راہبر (مارک ٹوین) (۳) لیل و نہار (آرمیس وارڈ) (۴) لیلہ بزرگ مہمان (دل کا بیٹن) (اس کتاب کے کل صفحات ۲۰۸) ہیں۔	
۳۲	"سنو کے خطوط عام احمد علی کاکی" (ترتیب و تہذیب)	کتاب نمبر لاہور طبع اول: ۱۹۶۲ء
۳۳	"بہر نکس" (تخلیہ)	نور الدین کی لاہور طبع اول: ۱۹۳۳ء
۳۴	"نہیں ناک" (انچس کے لیے تین ڈرامے)	ہجاب بک انجینی لاہور طبع اول: ۱۹۳۳ء
	یہ کتاب اسی ادارے نے تیسری بار ۱۹۵۰ء میں شائع کی۔ کتاب میں تین ڈرامے، پرموان: (۱) ماغ کے گوشے میں (۲) آسمان کے گوشے میں (۳) "کتابی کیرا" شامل ہیں۔	
۳۵	"روح خاک" (شاعری)	اساطیر لاہور طبع اول: ۱۹۸۸ء
۳۶	"دوستوں کی کہانیاں" (انچس کے لیے)	ہجاب بک انجینی لاہور طبع اول: ۱۹۳۳ء
۳۷	"نئی نئی کہانیاں" (انچس کے لیے)	ہجاب بک انجینی لاہور طبع اول: ۱۹۳۳ء
۳۸	"ذریعہ احمد خان" (ترتیب و تہذیب)	بھٹی ترقی ادب لاہور طبع اول: ۱۹۷۷ء
۳۹	"۳۳ سال کے گوشے میں" (ترتیب و تہذیب)	ہجاب بک انجینی لاہور طبع اول: ۱۹۷۷ء
۴۰	"سپاس کا پھول" (افسانے)	مکتبہ خون لاہور طبع اول: ۱۹۷۳ء
۴۱	"گو پی" (افسانے)	اساطیر لاہور طبع اول: ۱۹۹۵ء
۴۲	"طیلسی" (انچس کے لیے)	فتح نظام علی ایڈ سنز لاہور طبع دہائی ۲۰۰۰ء
۴۳	"کڑی دھڑ" (شاعری)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع اول: ۲۰۰۲ء
۴۴	"میرے ہم قہر" (سوانحی خاکے)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع اول: ۲۰۰۹ء
۴۵	"ارار عاتل" (مجموعہ نثر، ملام)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع اول: ۲۰۰۷ء
۴۶	"بہت بھڑ" (افسانے، مذاہات، ماحول)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع اول: ۲۰۰۷ء

(اس کتاب میں آخری انسانوں کے علاوہ ایک ڈاؤنٹ "ایک راج ذائقہ جھم" کے علاوہ امن کا نام لیا "بہت جھم" بھی شامل ہے جو زمانہ امیری کی یادگار ہے اور اس کا عنوان سعادت میں منگوئے رکھا تھا۔)

غیر مدون:

گولہ والا کتب کے علاوہ انھوں نے ایک کام دریا ہے، الہیہ غیر مرتب حالت میں آیا۔ یہ اس کے لگ بھگ ترقیاتی مضامین زیر ترتیب ہیں۔ میر تقی میر کا ایک انتخاب کیا جہاں بھی شائع نہیں ہوا۔ مئی ۱۹۵۱ء تا نومبر ۱۹۵۱ء میں لاہور پبلش میں امیری کے دوران غلام نے جانی و دلیف کا لکھ کر گئے کے نام "Die Leiden Des Jungen Werther" کا اردو ترجمہ کیا تھا اور اس کا منسلک و بچا ہے بھی لکھا گیا تھا لیکن یہ ترجمہ شائع نہ ہو سکا۔ یاد ہے کہ اس کتاب کا پہلا اردو ترجمہ اکوڑ ریاض الحسن نے "نور جان دور قمری" داستانِ غم کے عنوان سے کیا تھا جو لٹریٹری سنڈیکٹ لاہور۔ پبلیش پریس سے ۱۹۸۸ء طباعت کی فناسٹ میں ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ دوسرا ترجمہ غلام نے کیا، تیسرا ترجمہ ڈاکٹر محمد افضل نے ۱۹۷۶ء میں کیا جسے کتبہ شاہکار لاہور نے شائع کیا۔

وفات سے قبل مستقل چچا:

۱۳۔ طالب کالونی، امن آباد لاہور، پاکستان

اعزاز:

- ۱۔ آدم بی دہلی ایوارڈ، برائے "دشت وفا" ۱۹۶۳ء
- ۲۔ آدم بی دہلی ایوارڈ، برائے "سمیٹ" ۱۹۷۶ء
- ۳۔ آدم بی دہلی ایوارڈ، برائے "دوام" ۱۹۷۹ء
- ۴۔ "پرائیڈ آف پرفارمنس" حکومت پاکستان کا سول اعزاز ۱۹۶۸ء
- ۵۔ "ستارہ امتیاز" حکومت پاکستان کا اعلیٰ سول اعزاز ۱۹۸۰ء
- ۶۔ عالمی فروغِ اردو ادب (دورِ فکر) ایوارڈ ۱۹۹۶ء
- ۷۔ "کتابیں چاس" اکادمی ادبیات پاکستان کا کمالِ فن ایوارڈ ۱۹۹۷ء۔ ۱۹۹۷ء
- ۸۔ "نائب ایوارڈ" (بھارت)
- ۹۔ اسے آرمی کو کمانڈر ایوارڈ ۲۰۰۲ء

نظر یہ فن:

"انسانے میں انسانے کا ضمیر بھر گیت برقرار رہتا ہے۔ انسانے کی یا انسانیت ایک منفرد نکت کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے،

کردار نگاری کی صورت میں بھی، ماحول نگاری کی صورت میں بھی اور باطن نگاری کی صورت میں بھی لیکن اگر افسانے میں سے افسانہ غائب ہو گیا تو اس صنف کو افسانے کی بجائے کوئی اور نام دینا چاہئے گا۔“

احمد شاکر تاجکی

(مکتوب تمام مرزا احمد بیگ: سوری، ۳۰ ستمبر ۱۹۸۳ء)



حوالہ جات:

- ۱۔ حوالہ ”نصرانیہ و افسانہ“ نثر و نثری انداز گل ۱۰۰، شائع ۱۳۵۱ھ سن۔ (نگ بیگ ۱۹۳۳ء)
- ۲۔ حوالہ مکانہ ”انداز افسانے کی شکافت“ ”مکتوبہ“ ”بازار“ کا سہ ماہی دہری ۱۹۸۷ء میں پیر ۱۳

لارنس آف تحلیلیا

احمد نعیم قاسمی

پلنگ اٹکا چڑا تھا کہ اس پر جو کچس بچھا تھا وہ چار کھبوں کے برابر تھا۔ اس کے وسط میں غلطی کے ایک گاؤں کے کھارے بڑے ملک صاحب کے جسم کا اسی طرح اتھا۔ ان کی انگلیں، ناگوںوں، چنیلوں، رالوں، کمر، پیٹ، کندھوں اور سر کو بہت سے میرائی، تائی، جھیر، روحانی، سوچی سمجھا اور کسان دہار ہے تھے۔ میں اور دو بچہ تھا اس لیے وہاں سے مجھے یہ نظریاں دکھائی دے رہا تھا جیسے ایک بڑے سے ٹھہارے کو ہوا میں اڑ جانے سے روکنے کے لیے اس کے ساتھ بہت سے بچے چمٹ کر دو گئے ہوں۔ پھر خدا غفلت نے جو پال میں قدم رکھا۔ بڑے ملک صاحب بولے: ”آج چھوٹا ملک بہت خوش ہے آج اس کا پر آ یا ہوا ہے اور ہے۔“ انہوں نے ایک لمبی کانگو کے ساتھ پلٹ کر میری طرف دیکھنے کی اور شاہ سحرانے کی بھی کوشش کی مگر یہ مسکراہٹ مجھ تک نہ پہنچی تھی۔ ان کے سونے ہوئے گالوں اور گھٹنے کی جھون سے گریں مار کر وہیں گھس رہی تھی۔

میں اور اس لیے بیٹھا تھا کہ میرے لیے جانے آنے والی تھی۔ شکوہ چو پال کے برآمدے کے آخری سرے پر دو کرسیاں اور ایک چٹائی رکھ کر اور مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر، خدا غفلت کو بڑے اور جانے لانے چاہا۔ شکوہ خدا غفلت کا بہت چھوٹا کر تھا۔ نام تو اس کا بھی خدا غفلت تھا، مگر خدا غفلت اسے شکوہ کہتا تھا۔ چنانچہ یہی اس کا نام بن گیا۔

خدا غفلت کی امی کو نرے اور بخارا کی شکایت تھی اس لیے وہ بار بار اندر حویلی کا چکر لگا آتا تھا۔ اب کے وہ ادھیں آ یا تو میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بتایا کہ ”میں کی امی کا بخارا اب پکا ہے اور وہ آرام کر رہی ہیں۔ ان کا بخارا تیز رہتا تو آج میں تمہیں باز کے شکار کا تھانہ دکھا سکتا۔“ وہ بولا: ”لارنس آف عربیا کی طرز پر میں نے اپنے باز کا نام لارنس آف تحلیلیا رکھا ہے۔ غفلت کے تحلیلیا میں بولنے پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟“ وہ چلا: ”ابھی جانے کے بعد تم میں اور شکوہ کا دس سے پندرہ نکل جائیں گے۔ شکوہ میرے باز کا ساتھی ہے۔“ وہ پھر بٹھا۔ ”یوں مجھ کو کہہ لا لارنس آف تحلیلیا کا اور لی ہے۔ وہ باز کو اپنی غلی پر بٹھائے گا اور۔“

دھرم دھرم کی آواز سے ہم چمکے، دیکھا تو دودھ میں نے ایک اور آدمی کو پکڑ کے بڑے ملک صاحب کے سامنے جڑا رکھا تھا اور ملک صاحب اس کی پٹے پر کھنکھانے لگا۔ اور ساتھ ہی ایسی گالیاں بھی دیتے جاتے تھے جو صرف بڑے ملک ہی کسی کو دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ ہاپ ہاپ کر کھتے جاتے تھے۔ "بھری مجلس میں کہتا ہے، ملک جی، جہر بند سنبھالو، نیچے سر ہے ہو۔ اس حرا حرا سے کوئی پوچھے کہ تمہیں کیا تکلیف تھی۔ میں ہی نکلا ہو، دھماکہ باری اس تو جتنی نہیں ہو، ہی تھی۔"

خدا بخشنے سگرا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ "آگنی شاست ہے ہمارے کی۔ اب جب تک یہ ہاتھ ہیرا پھیلے نہیں چھوڑ دیتا۔ اب اسے کو سننے ہی رہیں گے۔"

خدا بخشنے کے لمحے میں برقی کا طرور تھا۔ میں نے کہا۔ "خدا بخشنے تمہیں شرم نہیں آتی؟ تم تو ہمارے کھٹے آدمی ہو۔" خدا بخشنے نے مطررتی انداز میں کہا۔ "کیا کریں یار۔ میں لوگوں سے بھی سلوک کیا جائے تو سیدھے مرنے لگتا ہوں۔" اس نے آواز بلند کر کے کہا۔ "میں نے جھک کر خدا بخشنے کے کان میں کہا۔" مسکین ایسا برا لڑکا تو نہیں چھوڑے گا۔ ہمارے مارکیں چڑھتی ہے؟"

"اچھا تو یہ مسکین ہے؟" خدا بخشنے نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔ اس کے منہ میں زبان بھی نہیں پانچ وقت کا نلادی ہے اب ان ایسی دیتا ہے کہ چڑیاں مسجد کے چناروں پر اتر آتی ہیں۔ اس نے یہ کیا کہہ دیا اب اسے! بڑے ملک صاحب کے دھمکوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ مسکین ان آدمیوں کے انصاف میں جھک گیا تھا جنہوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر ملک صاحب کی آسانی کے لیے ان کے سامنے جھکا رکھا تھا۔

"اب چھوڑو اس کو کہنے کو۔" ملک صاحب کو کہہ کر اور مسکین منہ کے بل، بھری طرح گر پڑا۔ "اٹھالے جاؤ اپنی ماؤں کے اس یار کو۔" ملک صاحب ہلکے ہلکے اور ایک اہم کام میں مسکین کو اٹھانے میں بے تابی سے بڑھا جیسے سب لوگ مسکین کو اٹھانے کے جانے ملک صاحب کو پتہ نہ چلے گا۔ پھر جو لوگ سب سے پہلے بے حس و حرکت مسکین کے پاس پہنچے تھے اسے اٹھانے کے لیے جھکے تو ٹھنکے انہوں میں سے ایک سیدھا ہوا گیا اور بڑی آواز میں بولا۔ "مسکین تو ان چناروں پر ہے۔" پھر مسکین خود ہی اٹھ بیٹھا۔ اور اصرار کر دیا۔ پھر جیسے ملک صاحب سے جانے کی اجازت لینے کے لیے بولا۔ "سورج تو بہت اچھا چل گیا پٹیلی کی لڑائی تو ہو چکی ہوگی؟"

کسی کو خاموشی پا کر وہ اٹھا تو میں نے دیکھا کہ وہ چوٹ کا ایک وجہہ نہ ان تھا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا، چوہاں کے چہرے کی ہر صفاں اتر کر گئی میں جانے لگا تو مجھے یہ یاد آگئی تھی کہ میں ایک چنار پر رہا ہے۔

"آ جاتے ہیں ماں کے یار چوہاں پر گپ لڑانے کے لیے۔" بڑے ملک صاحب کہہ رہے تھے۔ "چوہاں پر بیٹھے کی ایک قیڑ ہوتی ہے۔ کہنے لگا ملک جی نیچے ہو رہے ہو۔ ہو بھی میں نکلا ہو، ہاں تو تم وہاں نہ دو۔ انسان دو پہر کے وقت بھی آنکھیں بند کر لے تو اس کے لیے سورج ڈوب جاتا ہے۔ پھر تم آنکھیں پھاڑے میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟" گورا سا رنگ مسکینوں نے بیٹھے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں چھوڑے ملک؟" چائے پلائی رہنے پر گرا۔ "جواب کا بھلا کچھ بھلا فرما ہی انہوں نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور بولے۔ "کو بھی اسے دباؤ۔ دیکھنے لگا ہے حرا حرا سے کی پٹیاں کوٹ کوٹ کر۔"

”یہ حراہ اور کون تھا؟“ میں نے آہستہ سے خدا بھلی سے پوچھا۔

”اُس کا نام مسکین ہے؟“ خدا بھلی بولا۔ ”ذات کا جلا ہوا ہے۔ یہ کس جہا کے چنگ پر بچا ہے اسی نے جانے، بڑا کارنگر آدمی ہے۔ بڑا ایک آدمی مگر بہت بھلا ہے۔ نہ جانے ادا کوڑے کا حوصلہ کیسے ہوا اس بد نصیب کو ای تو بڑا ہی مسکین آدمی ہے۔“

”خکو فرماؤ۔“ اس کا اصلی نام مسکین ہے جی۔ مگر مسکین۔ مسکین مسکین تو لوگ اسے ویسے ہی کہتے ہیں، جیسے مجھے ملگو کہتے ہیں۔“

”میں نے کہا۔“ یہاں آکر معلوم ہوا کہ مسکین جیسے لفظ میں بھی بگڑنے کی کج بھلی موجود ہے۔“

”آہستہ بولو یا۔“ خدا بھلی نے ڈر کر بڑے ملک صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر بولا۔ ”انہوں نے سن لیا تو شاید جھپٹیں تو کچھ نہ کہیں، میری آفت آج سے گئی۔“

”نہیں۔ اب کیا آفت اٹھے گی۔ اب تو ان کا اتحاد ٹکڑا ہوا ہے۔“

خدا بھلی کو ہر الجھا چھانڈا۔ اس نے جیسے ملامت پیچھے ہونے مجھے دیکھا اور بھلو سے کہا۔ ”اصطبل میں جا کر دیکھو، کچے بڑے گھوڑے تیار کر لیے ہیں یا انھیں۔ مذہب میں کس بل ہیں تو تم جا کر لارنس کو اٹھاؤ۔ صبح کا بھوکا ہے۔“ بھلو چلا گیا تو خدا بھلی میری طرف حرا۔ ”دیکھو یہاں یہاں آج تمہارا پہلا دن ہے اور تم آج ہی مڑ کرنے لگے ہو مہرے بابا۔ اس علاقے کا ایک مقرر ہے کہ سر ہٹاؤ ہوتا ہے۔ دوسرے کا رقبہ اتنا ہی بڑھتا ہوتا ہے۔ ادا کو بچاؤ یا اس بھوکا کر فی چرتی ہیں۔ نہ کریں تو زمیندار کیسے چلے۔“ ”دور کہ گیا، پھر بولا۔“ ”تم کیا سوچ رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”میں سوچ رہا ہوں کہ جس لیے چارے چنگ پر ملک صاحب بخیر رکھتے ہیں۔ اس کے پائے کتے بڑے بڑے ہیں۔ میں نے انھیں غور سے دیکھا تو انگری کے ٹکڑے۔“

حیران ہو کر خدا بھلی نے پوچھا۔ ”انگری کے نہ ہوتے تو اور کس کے ہوتے؟ تم نے پہلے کیا سمجھا تھا؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں سمجھا یہ پائے نہیں۔ بلکہ چنگ کے ہر کرنے کے لیے ایک ایک مسکین کھڑا ہے۔“

”کادس کی کھلی خدا کا تم پر اتنا اثر ہوا ہے۔“ خدا بھلی بولا۔ ”تم پکڑا گئے ہو۔“ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اور خدا بھلی۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر یہ چاروں مسکین چنگ کے چاروں گوشوں کے لیے سے نکل جائیں تو چنگ زمین پر آ رہے۔“

”گھوڑے تیار ہیں چھوٹے ملک۔“ بھلو ہمارے سروں پر بولا۔

بھلو کے ہاتھ اچھو کی بد قسمتی ہے چلوے کا استادن چن سا ہوا تھا جس پر لارنس آف صلیویا بیٹھا تھا۔ اس کے چپے میں باریک سی ایک زنجیر تھی جس کا آخری سرا ہوتا ہے میں نکلا ہوا تھا۔ باریکی آنکھوں پر جوڑے کے کوپے چن سے ہوتے تھے۔ خدا بھلی نے سرا ہوا کر یہ کوپے بنائے تو میں نے دیکھا کہ باریکی آنکھوں میں باریکی وحشت تھی۔

اور میں نے اس کے کان میں کہا۔ ”ہزاروں کا بڑا ملک معلوم ہوتا ہے۔“

خدا بھلی غص چا۔ مگر یوں جتنا جیسے نہ جنتا تو اور کیا کرتا۔ اس نے ہانکی آنکھوں پر پھر سے کوپے چن عاتے اور ہم لوگ اصطبل کی طرف چلے۔

خدا بھلی نے جھپٹیں کھا کر مجھے یقین دلایا کہ اس نے جو گھوڑا مجھے سواری کے لیے دیا تھا وہ ملک صاحب کے اصطبل کا مسکین تریں

گھوڑا تھا۔ "اس کا سوا تازہ گھوڑا سکن تو نہیں ہو سکتا۔" میں نے شب ظاہر کیا۔ مگر اس نے مجھے بتایا۔ "اس کے اندر کا گھوڑا چنانچہ مارا گیا ہے۔ اب یہ طبیعت کا بہت خراب گھوڑا ہے اسے سوا تازہ روکنا بہت ضروری ہے۔" خلیق کے اصراروں کا جو اس طرف دورے پر آتے ہیں انکے سوار نہیں ہوتے۔ اس نے بھی تو کاروں میں کھیل کھیل کر بیٹھنے کی عادت پڑی ہوئی ہے اور گھوڑے کی پیٹھ پر چڑھ کر ڈھنسا پڑتا ہے۔ سو ادا نے اس کام کے لیے یہ گھوڑا پتا کر اس پر اصرار رہا ہو تو اس کی اصراری کی شان بھی قائم رہے اور یوں بھی نہ ہو کہ گھوڑا راہ گاہیں ڈھیلہ مار کر وہ اصرار کو اپنی پیٹھ پر سے دینا کر دے۔ چنانچہ اس گھوڑے پر یا تو پنی کشتی بیٹھے ہیں یا آج تم بیٹھے ہو۔"

میں نے کہا۔ "تو ابھی اس وقت تم مجھے پٹاری لگدے ہو۔"

خدا خلق کا گھوڑا بہت سزاوار تھا۔ کوچوں اٹھا کر وہ مجھے پہلا کر وہ جیسے لگا تم کو چا کر ادا جانا چاہتا تھا۔ مگر خدا خلق ایسا سوار تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو میرے گھوڑے سے آگے نہ بڑھنے دیا جس کی کوتاہیاں تو اعلیٰ ہوئی تھیں مگر تیل ہوں رہا تھا جیسے مسرہل کے گھن میں پہلی بار داخل ہوتے ہوئے دلچسپ بنتی ہیں۔

بھٹو ہارڈ کو ہاتھ پر اٹھائے ادارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ بھاگ بھی نہیں رہا تھا اور تیل بھی نہیں رہا تھا۔ بس آگے میں کی سی کھیت میں جتا تھا۔

لیکڑوں کے گھبان ڈھیر سے کاموز کاٹنے کی حد نظر تک پہنچا ہوا ایک پھیل دیر انداز تھا۔ جس میں کئی کئی بہت قصبے پر لکڑا گئے ہوئے تھے مگر یہ لکڑیاں سے لگتے تھے۔ ان کے قد بہت چھوٹے اور ٹائٹس بہت یزیدی اور گلی تھیں۔ لایا اس شام سے پہلے انہی اکاؤنڈ لکڑیوں پر آ کر بیٹھیں ہیں۔ "خدا خلق نے مجھے بتایا۔" اور ادا لایا ہارڈ کا من بھاتا کھا ہے۔ میرے ادرش آف جھیلپیا کی دھکی ہے!

میں نے کہا۔ "خدا خلق لائی تو یہی مصوم پرندہ ہے۔ یہ تو چڑیا سے بھی زیادہ مصوم ہوتا ہے۔ اس کی پیلی پیلی، کبکی کبکی ہاچیں اس پر کیا پیچہ سہارا دی کے رکھتی ہیں۔ پھر یہ پردوں میں ٹائٹس سے زیادہ سہ ضرر ہے۔ یہ تو نہایت سکن مخلوق ہے۔ آختم کو ان کو سکنوں کا غلوں پہنچنے کا عاشق کیوں ہے؟"

خدا خلق بولا۔ "اگر قسمیں تفریہ کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو راستے میں ابھی کوئی نیا آئے گا تم اس پر چڑھ جانا اور اپنی تفریہ بھاڑا۔ میں اور بھٹو دست بستہ میں تھے۔ مگر ابھی ادا روک جاؤ۔ میرے ادرش کو دیکھو، بھٹو کی تھلی پر کیسے بار بار بجز بھرا اچھا ہے۔ اس نے نہ پرانے کی بوسہ گھٹی ہے۔"

"لالی! وہ بھٹو سانپ کی طرح پھٹکا رہا اور خدا خلق نے گھوڑا روک لیا۔ میرا گھوڑا تو اس کی دیکھ دیکھی تیل رہا تھا۔ چنچہ وہ ابھی رک گیا۔"

خدا خلق نے ہانکی آ نکھوں پر سے کوپے اتارنے سے پہلے مجھے غور سے دیکھ دیکھنے کی تلقین کی۔

"یہ قبائلی زندگی کا ایک کھیل نہ بھولنے والا تجربہ ہوگا۔"

اس نے کہا۔ "میرا آج جانے کا جب باز لائی پر بیچنے کا تو لکڑی آواز دینا ہوئی جیسے ہوا کو ہوا کا تار دی ہے۔"

"دیکھو۔" خدا خلق نے ہانکی آ نکھوں پر سے کوپے اتارے اور اس کا رخ ادا ایک نیل سے پیرے لکڑی کی طرف کر دیا۔ جس نے ایک لائی کو لاٹھا دیا تھا۔ ایک دم باز پر دھست طاری ہو گئی۔ اس نے دیکھ لیا لائی کو۔ خدا خلق نے غور سے دیکھ کر مجھے بتایا اور بھٹو نے ہار کے پتھ کو

اپنے دستانے سے آزاد کر دیا۔ صحت کی نگار ہوا کا کافی ہوئی پہلی مئی اور لائی اڑ گئی۔ مگر ہارنے آں کی آں میں اس کو جا لیا۔ لائی کی آئیہ چلنے لگے اس پر لائے کو درسا پٹکار دیا اور بھر دلا لائی کو اپنے بچوں میں دلائے وانہیں بھٹک کر چلی پہاڑ پہاڑ اس نے لائی کی بچہ چھوڑ شروع کر دی۔ اس کی مڑی ہوئی چرچہ لائی کے طوفان میں رنگ گئی، پھر اس نے لائی کی بویاں نوچنا شروع کر دیں اور لٹھا لٹھلی ہوتا رہا۔ ”اس کے کھانے کا طریقہ دیکھو۔ ہڈی سے گوشت کیسے کاٹا ہے۔ انسان کو بھی ایسا طریقہ نصیب نہیں اور مگر یہ تو کیا گوشت ہے ہاتھ دلو اور دامن سے بھر چرا“۔

”نصیحت ہے“ میں نے کہا۔ ”تمہاری ذہنیت تو آدم خوروں کی ہی ہے۔“

مگر خدا غفلت اختیار کیا اور پھر یہی طرف میں دیکھتا رہا جیسے میں چاروں اور دو پھر یہی دل آزادی نہیں کرنا چاہتا۔
 باز جب لالی کو چھاپا تو جیسے اسے فخر ہو گیا، اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا غفلت کر لیا۔ "کس طرف آنکھیں آؤ گے ہو گیا" پھر
 جنتا سوار ہو گا تو اسے سوار ہوا۔ پاک سولہی مگر بارگاہ کیا۔ کچھ سوچ کر لیا۔ "کیوں غفلت کر رہا ہے یہاں تک پہنچ گئے ہیں تو اب ہمارا کون کون خدا دیکھتے
 ہیں؟"

ہلکے ہلکا۔۔۔ ابا داد کی آنکھ بھی پار کی طرح تھوڑے۔۔۔ ہو سکتا ہے اس نے ہمیں یہ کچھ ہی لپکا ہو۔ ہم وہاں پہنچے گئے تو وہ ضرور گڑا کرے گا۔۔۔
 ”ابن لہک ہے۔۔۔“ خدا خلق پھر ہی طرف حرا۔۔۔ ”پھر تمہیں قتل کی جاتے پائیں۔ یہاں قریب ہی دارا سے پرانے حمار سے ابا داد کا
 ابراہہ وہاں پہنچے ہیں۔ قم اس سے مل کر خوش ہو گئے۔۔۔“

[illegible]

گھر والے کے دھکواڑے گھوڑوں پر سے اتر کر کم آہستہ آہستہ کے بڑھے مگن میں لنگر کے بڑے بڑے درخت تھے۔ بچے ایک کھائے اور چند بیکریں، انکریاں شاہی جانور ٹانگیں تھیں کیونکہ درختوں کے سائے اپنے پھول کے سائے سے بہت دور چائے تھے۔ ان بیکریوں کے پاس کھولے پر جا پاوار دینا ان میں بہت رہا تھا۔ ہمارے ساتھ گئے ہونے سے بچے میں آگ بھل رہی تھی اور بالی بیکان ہاٹی میں بچے چلا رہی تھی جیسے جہاز الہامی رہی ہے۔ دونوں اپنے اپنے کام میں اپنے گوتے کی انھیں ادارے آئے کا پتہ نہ چلا ہوا تھا کہ بالی بیکان ہاٹی۔ "اے مجھے تو بہت پتا لگ رہی ہے۔ مگر کیا اب تک تو آ جاؤں گا ہے تھا۔"

”آج کے گی۔“ بابا یاروہ۔ ”کہاں گئی ہے سوچے ٹکڑوں کے ہاں گئی ہے؟ تو پھر اپنے ہی گھر کی ہے ہاں نہیں ہو سکتی کی جینی اس کی سستی کی بجلی ہے؟ وہ وہ پڑے۔ یاد ہے جس نے بچپنی کی گیموں میں رنگی کر دیا تھا؟ ان کا پڑھنا پڑھنا تم تھا کہ رنگی اسے دے کر گئی تھی اور آج غمراہ اور مارا مارا کیا کہہ جاوے جنے کے پچھلے میں آ گیا۔ سو وہ بے کا ہو گیا وہ پڑے۔ وہ اپنی اتنی باری کی گئی کے ہاں گئی ہے تو ٹھہری کون سے بات ہے۔ بات بھی وہ لے کر گھر فرشتوں کے گھر مہمان ہے۔“

خدا بخلی نے آج سے کہا۔ میرے خیال میں وہ ابھی چلنا چاہیے۔ ان بے چاروں نے ہمیں دیکھا تو خاطر مدارت میں لگ جائیں گے۔

بلکو بولا۔ ”اور پھر جانے کیا کہانی کو آج ہی نہیں جو شانہ و کمالات ہے۔ رنگی ہوتی تو پی لیتے۔ ایسی جانے پاتی ہے کہ نیکو ہو جاتا ہے۔“
خدا بخلی نے ہاتھ مارا جس پر اتنی اور ہانپنے لگا کہ وہ ان کے ہاتھ پاؤں بھول گئے۔ وہ خدا بخلی سے دیکھنے لگا اور جانے پہنچنے کی یوں التجا نہیں کرنے لگے جیسے اگر خدا بخلی نے ان کی بات مان لی تو ان کا گھر دغا سونے چاندی کے گل میں بدل جائے گا اور ان کی بکریاں گھوڑے بن جائیں گی۔

خدا بخلی نے انہیں سمجھایا کہ سورج ڈوبنے کو ہے اور ہم دشمنوں والے ملک ہیں۔ شام کے بعد تو ہماری حوٹلی کی فیصل پر ہاتھوں والوں کا پیر ہوتا ہے۔ تم تو جانتے ہو بابا یاد امیں شام سے پہلے گھر نہ پہنچو تو بڑے ملک قیامت چاویں گے۔ ہمارا ہار لائی کا کٹا کر کے آقا تھا۔ سوچا تمہیں دیکھنے ملیں، ٹھیک ہونا؟ کوئی تکلیف تو نہیں۔ اچھا اب تم بیٹھو ہم چلے۔“ رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے خدا بخلی بولا۔ ”رنگی کی فکر نہ کرو، مگر اسے یہ ہوگی تو میری، لیکن اسے روک لے گی۔۔۔ اور اب تو یہ بھی بجلی ہے۔“

بابا یاد بولا۔ ”آج صبح اسے ایک جھادی کی جڑ میں اگی ہوئی بہت سی چوٹیں تھیں۔ اس کی کھلی جو ٹھیں بہت پتہ ہیں اس لیے دھت لگا دی کہ وہ کھنوں کی حوٹلی میں جائے گی۔ کیڑے دھوئے، کھما کر چپٹے اور بھر دو پیر کو بھگوں کی پوتلی ہاتھ کر چلی گئی۔ ویسے تو وہ سیانی ہے پر سوچنا ہوں۔ اگر اسے رستے میں شام پر گئی تو وہ یہاں سے ہٹا رہا ہے۔“

خدا بخلی نے اسے تسلی دی۔ ”ہماری زمینوں پر ایک چڑیا تک کو خطرہ نہیں تو رنگی کو کیا زہر ہے۔ سب جانتے ہیں کہ رنگی بابا یاد کی بیٹی ہے اور سب جانتے ہیں کہ بابا یاد کس کا آدمی ہے۔ تم فکر نہ کرو ہم چلے۔“

وہ ابھی پر خدا بخلی نے ہاتھوں اور غصوں کے سلسلے میں بے حساب مضمرات سے بھگے لاؤ ڈالا، میرے ذوق کی رعایت سے اس نے خوشحال خاص ٹھک اور طراسر اقبال کے شایروں کا بھی ذکر کیا اور بعض پرانے ستون، ٹکڑوں اور لہاؤں کے ٹخنوں پر ہاتھوں کی تصویروں کے پار سے میں دیکھتا رہتا تھا کہ کیا ہمارا ایک شایر پہلہ ہے، آخر میں اس نے یہ مسکتہ دلیل دی ”تم نے آج تک کبھی نہیں سنا ہوگا کہ کسی غریب آدمی نے ہار ہارا ہو۔“

”غریب آدمی تو ادا لیاں پالتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

خدا بخلی میرے طعنے کا کچھ جواب دینے ہی کا تھا کہ اس نے اپنے گھڑے کی دکان کھینچی۔ لنگروں کے ذخیروں کے سونے پر پکا ایک نو جوان لڑکی ہمارے سامنے آگئی تھی۔ وہ رنگی تھی۔ نہ جانے اس کا اصل نام کیا تھا۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ رنگوں کا ایک دیکر ہے۔ سات رنگوں میں سے کوئی بھی رنگ ایسا نہ تھا جس سے اس کا جوہر غم ہو۔ اس کی آنکھوں ہاتھوں و پیرے اور ہونٹوں سے جوہر نکلتا رہے تھے وہ اس کی ہنسنے کرتے اور دھڑکنے میں جذب ہو گئے تھے۔ اس وقت سورج سیاہ میدان کے پرے کنارے پر تھوڑی دیر لگے، جیسے زمین کا آخری نظارہ کر رہا تھا۔ آسمان کے وسط میں ہاتھوں کے چند ٹکڑے ابھی سے لگا بیٹھے تھے اور یہ گلاب ٹکڑوں کے ذخیرے کے اس سونے پر رہ رہا تھا۔ اگر ایک بے رنگی چٹیلی میں لگے ہوئے رنگی کے ہاتھوں کے ذہن ٹوٹنے ہوئے نہ ہوتے تو اسے زمینی گھوٹی قرار دینے کے لیے لکھا اپنے آپ سے خاص طویل چنگ لڑائی پڑتی۔ مجھے ایسا لگا کہ کڑے کڑے ٹکڑے رنگی کی ایک جھلک دکھا کر اسے ایک ایسے خدا کا جال کیا جاسکتا ہے جو

اس راجہ کا حسن بابر ہے۔

یہ سب کچھ میں نے ایک لمحے میں سوچا جس میں بس آجاکو ہوا کہ خدا تعالیٰ نے تم کو اس کی کام بھیجی۔ انکی ٹھکانہ کڑی ہوگی اور شکوہ بچنے سے بچا کر آج اور بولا۔ ”دیکھا بھولے کب“ انکی آغلی بے خوف ہے۔ اسی پر بھی کوئی وقت ہے اسے لیے سڑکا؟ تجھے کھانی نے روکا نہیں؟“

”جیل واپس“ خدا تعالیٰ نے بڑی اپنا نیت سے حکم دیا۔ ”جو ہمارے دشمن ہیں وہ ہمارے حواریوں کے بھی دشمن ہیں اور ہمارے دشمن بے شمار ہیں۔ سورج اوبارہ ہے، چاند کی رات بھی نہیں ہے، آجاکو ہوا جس راستہ ہے اور جیل کڑی ہوئی ہے اس وقت، جیل واپس۔ میں جا کر اپنی بہن کی خبر لیتا ہوں کہ ایسا سلوک کیا جاتا ہے اپنی کھلی سے۔ غریب کسی پر کیا انسان نہیں ہے رگی؟ جیل رگی۔“

رگی صرف وہ قدر برائی کرنا نہیں نے بھی اس کے حسن میں جیسے ایک چمن کا سا بیڑا کر دیا۔ ”بابا بے چارہ۔“

”ہم سمجھا آئے ہیں بابا کو“ خدا تعالیٰ فرما دیا۔ ”ہم نے کہہ دیا تھا کہ اگر رگی ہمیں گاؤں کے پاس مل گئی تو ہم اسے واپس جیل میں لے جائیں گے۔ ایسے وقت، ہزاروں میں نہیں نکلتے تھیں۔ زمانہ بڑا غراب ہے جیل۔“

رگی ہمارے ساتھ جیل پڑی۔ گاؤں میں پہنچ کر وہ شکوہ کے ساتھ حویلی، کی طرف، جلی کی اور ہم چوہاں پر آ گئے۔ رات کے کھانے کے بعد بڑے ملک صاحب نے مجھ سے باز کے شکار کا پوچھا اور پھر کالی اور بیک بازوؤں و شکاریوں، کنوئیں اور ٹھکانوں کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے خدا تعالیٰ سے سرکشی کی۔ کیا تمہارے پاس شکاریوں اور کنوئیں کی باتیں ہوتی ہیں؟ انسانوں کی نہیں ہوتیں؟“

”ارے پیچھے بھو۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تو نہ پایا پکار کر مسکین کا ڈالیں گے۔“

بڑے ملک اندر کر چلے گئے تو مجھ نے ملک کی گیس کی ہادی آئی۔ وہ دشتر وقت پہ لارنس آف صلیبیہ کی تعریف کرتا رہا اور ایک بار ہٹلر نے آ کر اس سے کوئی بات کی۔ اور وہ بڑا کٹھنہ والوں کو اور حسین کا موقع ملا۔ ”بابا دشمن کہتا ہے وہ ایک صدی کا دور رہا ہے مگر آج تک اس نے اس کا کارڈ نہیں دیکھا وہ کہتا ہے۔ مجھ نے ملک کا بازو، بازوؤں کا شیر ہو رہا۔“

جب خدا تعالیٰ حویلی میں چاہا اور شکوہ بھی میرا ستر ہوا کہ اور چٹائی پر پانی کا ایک جبکہ کہہ کر وہ اندہ ہو گیا تو میں اپنے چنگ پر لیٹ گیا۔ آسمان آسمان کا صاف تھا کہ سیاہ ہو رہا تھا۔ ہمارے اسے بے شمار تھے کہ میں کی طرف دیکھتے ہوئے سر پکڑا جاتا تھا۔ گاؤں پر ٹھہر جاتا تھا۔ رات کا آواز تھا اس لیے کتے تک سو گئے تھے صرف جھنگر جاگ رہے تھے مگر جھنگروں کی آواز بھی تو سنانے کا ایک حصہ ہی ہوتی ہے۔

جب رگی کا بیکہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس آواز اور احماد کے ساتھ جیسے وہ کہہ رہی ہے کہ کوئی نقص اصرار سے ہو تو صوفیو ! میں نے رگی کے اس بیکہ کو گتے میں نے شام کے ایک گھنٹی لمحے میں اپنے اہم کے اندر محفوظ کر لیا تھا، ہر ذریعہ سے بچا تھا اور جب میں نے کہا ”ہاں رگی تم میں ایک نقص تو موجود ہے اور وہ نقص یہ ہے کہ تم انسان ہو اور انسان بڑی کمزور مخلوق ہے۔“

چوہاں کے درمیان آگن میں لنگر پر چڑیوں نے دولاہلا بھاری آگھ کھلی۔ قریب ہی مسجد میں فخری لڑا دعا کی جانے والی تھی اور کوئی اور جلی آواز میں بغیر چہرہ ہوا تھا۔ ”تھو قامت اسلو، تھو قامت اسلو“ صبح کے پچکے پچکے اہلے میں مسجد کے چار آسمان کے بس مہر میں متحرک معلوم ہو رہے تھے۔ پھر ایک چار کے کلس پر ایک فٹل اتاری اور اسے اپنے تھوڑے قائم رکھنے کے لیے ایک بیک پر لٹا کر بار بار پھیلا دیا۔ اس پر بھی جب تک کہ نہ ہونے کی تو انکی مدعا میرے پہنچل کہاں سے آگئی ہے؟ میں نے سوچا۔ پھر میں نے خود کو جواب دیا ”جہاں سے یہ

چڑیاں آئی ہیں۔“

سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ جب ہلکے میرے لیے ملائی سے اٹھا ہوا دھوا کا ایک گلاس لایا۔ غسل خانے میں منہ پر پانی کا ایک پھینکا مار کر میں باہر آیا تو خدا مخلق چڑیاں کی سرخیاں چڑھا رہا تھا۔ ”چلو رانا خیرے تک گھوم آئیں۔“ اس نے کہا۔ ”دھوا کس بج میں تم سے انسانوں کی باتیں کر رہا گا۔“

”پلو“ میں نے کہا، بھر میں سرخیاں پر دکھ گیا۔ ”سنو، کیا رنگی پہلی گئی؟“

خدا خدا مخلق کو اس دور کی ٹی پھولی کہ وہ ہلکا ہلکا میرے چنگ پر جا کر۔ ”آفر کار پھر میں بھی جو تک گئی تو“ قہقہوں کے دوران وہ اپنی رانوں کو پیٹ کر کھتا رہا۔ ”برف کی جب بہت موٹی تھی کمرے لڑوئی تو۔“ بھر دھوا سے لپٹ گیا۔ ”یار مجھے تم پر ایک دم بہت سا چھوڑا گیا ہے۔ میں سمجھا تھا یہ انوکھے اونی او۔“ ”بڑی مشکل سے سانسوں پر قابو پانے کے بعد بولا۔ ”وہ رنگی جو لمبی کیسے جانتی ہے؟“ لمبی بٹنے گی، پر اٹھا کھائے گی اس کی کھلی اسے یوں آسانی سے تھوڑی ہونے دے گی۔ اماں پتارہ ہوتی تو رنگی کو میری بھین لپٹے کمرے میں ملاتی۔ ابھی تو وہ ابھی گئی نہ ہو گی۔ ”بھڑو مارا سا رک کر بولا۔ ”جائے گی تو تمہیں دکھائیں گے۔ بلکہ آج شام کی چائے وہیں پلا پلا دے کہ یہاں کیوں نہ چکیں؟“

”چھوٹے ملک۔“ بھڑو چلا اور اس کی جھڑی سے بھاگتا ہوا آیا کہ کنگرے سے سب چڑیاں ایک ساتھ اڑ گئیں۔

”کیا ہے؟ اماں تو ٹھیک ہیں“ خدا مخلق نے گھبرا کر پوچھا۔

”ٹی وہ ٹھیک ہیں۔“ ”مخلق کی آنکھیں پھلی چڑھ چکی تھیں، ننھے پھول رہے تھے اور وہ مسلسل نکلتا تھا۔

”پر کیا؟“ کنگرہ کو۔ ”خدا مخلق نے اسے ڈالا۔

اور بھلا نے جیسے کائنات کے سب سے بڑے حادثے کی اطلاع دی۔ ”نہی نے آپ کے والدین کی گردن مردہ کر بیٹھ دی ہے۔

لارنس مردہ چڑا ہے۔“

خدا مخلق کو جیسے سکتے ہو کیا ایک خامسے دھتے کے بعد بولا۔ ”رنگی کو یہاں لے آؤ۔“

بھلا دابیں بھاگا تو میں نے خدا مخلق سے پوچھا۔ ”رنگی کو بڑے کا کیا مطلب ہے؟“

”ہے ایک مطلب۔“ خدا مخلق بولا۔

حادثہ شدہ تھا اس لیے میں خاموش رہا فوراً بعد بھلا دابیں آچھا۔ ”رنگی تو منہ میرے ہی پہلی گئی چھوٹے ملک۔“

اور خدا مخلق اپنی لپٹوں میں آنکھیں مجھ پر کھانک بولا۔ ”دیکھا میں نے کہا تھا۔“ میرے ہاتھ کو اس کیٹنی نے مارا ہے ہر دستہ وہاں پار بھی کھتی

تھی کہ وہ مجھے مارا لے گی۔ ”میں نے کہا، گالیاں بازوں کو نہیں مار سکتیں۔ اداں۔ اسی نے مارا ہے میرے والدین کو میں جانتا ہوں یہ نقل ای

جذبات، کنگلی، تلاش لاکھ لے کیا ہے۔ میں اس کی کمال اور جیروں گا میں اس کی۔“

کرشن چندر

نام	کرشن چندر چند
تلمی نام	کرشن چندر
پیدائش	۲۶ نومبر ۱۹۱۳ء بمقام بھرت پور، بھارت (میں چھ بچے)
وفات	۸ مارچ ۱۹۷۷ء پشاور، پاکستان
تعلیم	ایم۔ اے (انگریزی ادب)، ایف۔ سی کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۳۳ء ایم۔ اے۔ لی۔ لا کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۳۷ء پانچ برس کی عمر میں میٹرک (بھوں) کے گورنمنٹ پرائمری اسکول میں داخل ہوئے۔ آٹھویں جماعت سے میٹرک تک وکٹوریہ پرائمری ہائی اسکول پر چھ، کنوینشنل تعلیم پائی۔ ایف۔ ایس سی۔ لی۔ اے (۱۹۳۴ء) اور ایم۔ اے (انگریزی) ایف۔ سی کالج لاہور (۱۹۳۳ء) سے پاس کیے۔ ایم۔ اے۔ لی۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کیا۔

مختصر حالات زندگی:

دیر آباد (پنجاب) کے کھتری چوہا خاندان میں ڈاکٹر گوری لکھر چوہا ایم۔ لی۔ لی۔ ایس کے ہاں پیدا ہوئے۔ والدہ کا نام امرہ بوی تھا۔ زمانہ طالب علمی میں بھگت سنگھ کے ساتھیوں سے قربت رہی۔ تنہا ایک ماہ لاہور قلعہ میں نظر بند رہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد پروفیسر منٹ سنگھ سکھوں کے ساتھ مل کر انگریزی پر "The Northern Review" جاری کیا جو گیارہ ماہ تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۳۷ء میں ہی انگریزی ماہنامہ (پاشٹاک ٹریڈ) "The Modern Girl" جاری کیا۔ اسی زمانے میں "نیا ادب" سے بھی منسلک رہے اور "نئے زاویے" کی دو جلدیں شائع کیں۔ پہلی جلد اگست ۱۹۳۷ء میں میسرور آئی۔ چند برس انگریزی فیلڈ "کیوریر" کی ادارت کیا۔

نومبر ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریلوے کے ساتھ بطور پروگرام اسٹیلٹ فٹنگ ہو گئے۔ لاہور، دہلی اور گھنٹہ میں ملازمت کی۔ ۱۹۴۲ء میں ریلوے ڈپو۔ اس کی فلم کھینچی "شاہیما و پکچرز" ہوا کی طرف سے کھینچی کی دولت ملی تو ریلوے کی ملازمت چھوڑ دی۔ شاہیما و پکچرز کے ساتھ بھی زندگی تو ۱۹۴۳ء میں کھینچی چلے آئے۔ اس وقت وہ انجمن ترقی ہندو مصطفیٰ (مرکز) کے پکچر ڈری تھے۔ یہاں "آ کر فلم کھینچی" "بھگتی نا کیر" سے تقریباً ایک برس شغف رہے۔ ۱۹۴۵ء-۱۹۴۶ء میں بمبئی چیمبرز کے اشتراک سے اپنی اپنی فلم "سراٹے کے ہاتھ" مکمل کی اور ماڈرن چیمبرز کے نام سے دہلی فلم کھینچی قائم کر کے فلم "دل کی آواز" "جانی" دوسری فلم "ناکھ" مکمل نہ ہو سکی اور ان کی فلم کھینچی فوت ہو گئی۔ اس کے بعد دیگر فلم کھینچوں کے لیے کھستا شروع کیا۔ وہ شادیوں کیں۔ پہلی شادی دسمبر ۱۹۳۹ء لاہور میں ہوئی تھی جو ۱۹۶۸ء تک ٹھیک۔ دوسری دہلی سے تین چھ ہو گئی ہوئے۔ ۱۹۶۸ء میں رشید احمد صدیقی کی منتظر بنی سلفی صدیقی سے شادی کی تو مسلمان ہونا چاہا اب انہوں نے اپنا یا نام دھارک رکھا۔ اپنی پالیس سالہ اولی زندگی میں تقریباً پانچ سالہ سوانح نامے کی درجن ناول اور محقق مضامین لکھے۔ انہوں نے اور ناول و کلیٹ کروا دیتے تھے۔

ان کا آخری افسانہ "چمک چمک پھل" مطبوعہ "شیخ" دہلی فروری ۱۹۷۷ء ہے اور آخری ناول "نٹ پاتھ کے فرشے" آخری قسط: "تیسویں صدی" دہلی بابت۔ جن ۱۹۷۷ء۔ جب فوت ہوئے تو مسلمان دوستوں نے قرآن، سکسوں نے گزرتھ اور بعدوں نے گیتا چھی۔ تحفین پر سلفی صدیقی نے بھی اصرار نہیں کیا۔ جدا کرشن چندر کو بعد درسام کے مطابق نہ رہا نقل کیا گیا۔

اردو کی اولین تحریر:

"پرویز میرٹھی" مطبوعہ افکار "دوست" دہلی۔

پہلی تحریر ان کے قاری کے استاد اساتذہ بانی رام کا نا کہ ہے جو ۱۹۵۸ء سے لکھی شائع ہوا۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"مرجان" مطبوعہ "اولی دنیا" لاہور (سالانہ) ۱۹۳۶ء

"جہلم میں ناؤں" مطبوعہ "کھاجیوں" لاہور: جنوری ۱۹۳۷ء

فلمی آثار (مطبوعہ کتب)

۱	"ہوائی قلعے" (بچے بچکے مضامین)	مطبوعہ احمد علیک خیال، لاہور	شیخ اقبال، جنوری ۱۹۳۰ء
۲	"علم خیال" (افسانے)	مطبوعہ: کتب خانہ اردو، لاہور	شیخ اقبال، ۱۹۳۵ء
۳	"کھارے" (افسانے)	مطبوعہ: کتاب خانہ اردو، دہلی لاہور	شیخ اقبال، جون ۱۹۳۰ء
۴	"جئے زوے" (ناتواپ) پہلی جلد	مطبوعہ: کتب خانہ اردو، لاہور	شیخ اقبال، اگست ۱۹۳۰ء
۵	"زندگی کے صوبے" (افسانے)	مطبوعہ: کتب خانہ اردو، لاہور	شیخ اقبال، ۱۹۳۳ء
۶	"نھو گئے" (محراراجہ مضامین)	مطبوعہ: دفتر کتابت، جہلم	شیخ اقبال، ۱۹۴۳ء

۷	"فکست" (ناول)	مطبوعہ: ساتی بک ڈپو، دہلی	طبع: اؤل: جنوری ۱۹۳۳ء
۸	"نوتے جوئے تارے" (افسانے)	مطبوعہ: کتب اردو، لاہور	طبع: اؤل: ۱۹۳۷ء
۹	"بے طرائے" (ناول)	مطبوعہ: دلی پبلیکیشنز، دہلی	طبع: اؤل: ۱۹۳۳ء
۱۰	"دروازہ" (ڈراما)	مطبوعہ: اردو ایڈیٹری، لاہور	
۱۱	"پرانی خدا" (افسانے)	عبدالحق ایڈیٹری، محمدآباد، لاہور	طبع: اؤل: ۱۹۳۳ء
۱۲	"مہکتا سجے گئے" (افسانے)	مطبوعہ: کتب پبلشرز، بمبئی	طبع: اؤل: ۱۹۳۸ء
۱۳	"سک داتا" (۳ طویل افسانے)	مطبوعہ: ایشیا پبلشرز، دہلی	طبع: دہلی: ۱۹۵۹ء
۱۴	"نیک و پیا ایک پھول" (۸ افسانے)	مطبوعہ: ایشیا پبلشرز، دہلی	طبع: اؤل: ۱۹۵۵ء
۱۵	"نیک گرہ ایک حقوق" (۱۰ افسانے)	پیشانی انڈیا پبلشرز، دہلی	طبع: اؤل: ۱۹۳۸ء
۱۶	"تیرے فٹے" (افسانے)	مطبوعہ: دہلی پبلیکیشنز، دہلی	طبع: اؤل: ۱۹۳۸ء
۱۷	"سوس ٹپا" (۸ افسانے)	مطبوعہ: ایشیا پبلشرز، دہلی	طبع: اؤل: ۱۹۶۷ء
۱۸	"دلی کسی کا دوست نہیں" (۹ افسانے)	مطبوعہ: ایشیا پبلشرز، دہلی	طبع: اؤل: ۱۹۵۹ء
۱۹	"سپنوں کا تھری" (۱۱ افسانے)	مطبوعہ: کتب پبلیکیشنز، دہلی	طبع: اؤل: ۱۹۶۱ء
۲۰	"سمندر دور ہے" (۱۱ افسانے)	مطبوعہ: نو بھارت پبلشرز، دہلی	طبع: اؤل: ۱۹۳۸ء
۲۱	"فکست کے بعد" (۱۰ افسانے)	ریجن پبلشرز، چاندھر	طبع: اؤل: ۱۹۶۰ء
۲۲	"کتب کا کفن" (۱۱ افسانے)	رسالہ سوویں صدی، دہلی	طبع: اؤل: ۱۹۵۶ء
۲۳	"کشمیر کی کہانیاں" (۱۳ افسانے)	الہ آباد پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد	طبع: اؤل: ۱۹۵۳ء
۲۴	"غریب افسانے" (۱۴ افسانے - با تصویر)	آزاد کتاب گھر، نکلان، دہلی	طبع: اؤل: ۱۹۵۷ء
۲۵	"میں اٹھارہ کروں گا" (۱۹ افسانے)	کتبہ شاہراہ، دہلی	طبع: اؤل: س۔ن
۲۶	"نئی کی صوت" (۱۱ افسانے)	ایشیا پبلشرز، جمیں، بڑاری، دہلی	طبع: اؤل: ۱۹۵۳ء
۲۷	"نئے غلام" (۱۰ افسانے)	گوردی کتب خانہ، بمبئی نمبر ۳	طبع: اؤل: ۱۹۶۵ء
۲۸	"انچھوہ جنم، ہم کے بعد"	ایشیا پبلشرز، جمیں، بڑاری، دہلی	
	(۳ افسانے، ایک ڈرامہ اور ایک خاکہ)		
۲۹	"دل کے سامنے میں" (افسانے)	کتبہ سلفانی، بمبئی	طبع: اؤل: ۱۹۳۹ء
۳۰	"ہم دھڑکیں ہیں"	کتب پبلشرز، دہلی، بمبئی	طبع: اؤل: ۱۹۳۹ء
	(۵ افسانے، ۱ ڈرامہ، ۱ سہ ماہی، ۱ سہ ماہی، ۱ سہ ماہی)		
۳۱	"پچ پچ کی ڈالی" (۱۵ افسانے، ایک ڈراما)	ایشیا پبلشرز، جمیں، بڑاری، دہلی	طبع: اؤل: ۱۹۵۵ء

۳۲	"ایک خوشہواڑی ماڈی بی" (افسانے)	کتبہ انکار کراچی
۳۳	"پانی کا درخت" (افسانے)	نیا ادارہ لاہور
۳۳	"پاش کا کھیل" (افسانے)	دعوتِ پیشتر لاہور
۳۵	"درو کی خبر" (افسانے)	کراچی بک ڈپ، کراچی
۳۶	"دشت خیالی" (افسانے)	ممتاز آئیڈی، لاہور
۳۷	"دوسری رات ہمارے کے بعد" (افسانے)	خیام پبلشرز لاہور
۳۸	"سپنوں کی راہ گزیر میں" (افسانے)	خیام پبلشرز لاہور
۳۹	"شالو" (افسانے)	رضا پبلشرز لاہور
۴۰	"کاک نسل" (افسانے)	عظیم پبلشرز لاہور
۴۱	"کلاس روم" (افسانے)	کتبہ انکار کراچی
۴۲	"کبوتر کے خط" (افسانے)	پاشا پبلشرز لاہور
۴۳	"گھوگھٹ میں بے گوری" (افسانے)	کتبہ ساحل کراچی
		طبع اول: ۱۹۵۳ء
۴۴	"بیجا بازار" (افسانے)	کتبہ شاہراہ، دہلی
		طبع اول: ۱۹۵۳ء
		طبع دوم: سن
		کتاب نما لاہور
۴۵	"ہم تو محبت کرے گا" (افسانے)	اشیمن بک سنٹر، کراچی
۴۶	"کرشن چندر کے بھڑے افسانے" (مرحبہ اختر جعفری)	چودھری آئیڈی لاہور
۴۷	"پھول کی تباہی" (افسانے)	
۴۸	"کالج کے نکلنے" (افسانے)	
۴۹	"خواتین کی کلیاں" (افسانے)	
۵۰	"انار دشت" (افسانے)	
۵۱	"کھڑکیاں" (افسانے)	
۵۲	"ایک صورتِ خرد وچ اتے" (ناول)	کتبہ انکار کراچی
۵۳	"ایک دامنِ سندھ کے کنارے" (ناول)	کتبہ انکار کراچی
۵۴	"باؤں بچے" (ناول)	شیخ بک ڈپ، دہلی
۵۵	"پانچ لٹرا، ایک سیر دیگیا" (ناول)	کراچی بک ڈپ، کراچی
۵۶	"جستہ اور جہنم" (ناول)	ہانوی پبلی کیشنز لاہور

۵۷	"چاندنی کا گھاؤ" (ناول)	کتبہ افکار، کراچی	طبع اقول: ۱۹۶۳ء
۵۸	"دل کی داریاں سو گئیں" (ناول)	سون لائٹ بک ڈپ، لاہور	طبع اقول: ۱۹۶۱ء
۵۹	"سڑک داییں جاتی ہے" (ناول)	ایشیا پبلشرز، دہلی	طبع اقول: ۱۹۶۱ء
۶۰	"ایک گمہ سے کی ہرگز شست" (ناول)	شعب بک ڈپ، نئی دہلی	طبع اقول: ۱۹۵۷ء
۶۱	"محبت کی راست" (ناول)		
۶۲	"سکھرانے والیاں" (افسانے)		
۶۳	"کارنیل" (ناول - مافوق)	نہیم بک ڈپ، لاہور	طبع اقول: س - ن
۶۴	"یورپی کلب" (ناول)	شعورہ بک ڈپ، دہلی	طبع اقول: ۱۹۶۲ء
۶۵	"طوفان کی گلیاں" (ناول)	کتبہ شاپرا، دہلی	طبع اقول: ۱۹۵۳ء
۶۶	"صبح ہوتی ہے" (درج ریاضی)		طبع اقول: ۱۹۵۰ء
۶۷	"پاش کا کھیل" (ناول)		
۶۸	"چہلا چکر" (ناول)		
۶۹	"دردناے کول دو" (ڈراما)	کتبہ ہامو لٹریچر، نئی دہلی	طبع سوم: ۱۹۷۷ء
۷۰	"طرز کوش کا چہا" (بچوں کے لیے ناول)		
۷۱	"مستادین کی سیر" (بچوں کے لیے ناول)		
۷۲	"بانگ کا گنگ کی حید" (ناول)	اردو پاکت کس، کراچی نمبر ۱۸	
۷۳	"زنگہ دس کی رانی" (ناول)	اردو پاکت کس، کراچی نمبر ۱۸	
۷۴	"تھارا" (ناول)	چاند مارو، لاہور	طبع اقول: ۱۹۶۰ء
۷۵	"کاٹھ کی گاؤ" (ناول)	کراچی بک ڈپ، کراچی	
۷۶	"صحرا کے سات رنگ" (ناول)	احسان علی کھٹنر، کراچی	
۷۷	"الارانی" (ناول)	خالد چٹنگ، ڈاکس، لاہور	
۷۸	"سیرتی یادوں کے پتار" (ناول)	ادارہ فروغ اردو، لاہور	طبع اقول: ۱۹۶۳ء
۷۹	"محبت بھی قیامت بھی" (ناول)	ایشیا پبلشرز، نئی دہلی	طبع اقول: ۱۹۷۷ء
۸۰	"بج کھیت جاگے" (ناول)	بھٹی بک ڈاکس، بمبئی	طبع اقول: ۱۹۵۳ء
۸۱	"ٹکٹس" (ناول)	ساقی بک ڈپ، دہلی	طبع اقول: ۱۹۴۳ء
۸۲	"گمہ سے کی داییں" (ناول)	ایشیا پبلشرز، دہلی	طبع اقول: ۱۹۶۳ء
۸۳	"خود کی ہیر" (ناول)	ایشیا پبلشرز، دہلی	طبع اقول: ۱۹۶۳ء

۸۴	"مکملان کے ساتھ رنگ" (ناول)	طارق علی کھٹنر، دہلی	طبع ازل: بی۔ بی۔
۸۵	"خوف کے پھول" (ناول)	ماہنامہ "رومانی دنیا"، الہ آباد	طبع ازل: ۱۹۶۱ء
۸۶	"داورہا کے بچے" (ناول)	ایشیا پبلیشرز، دہلی	طبع ازل: ۱۹۶۲ء
۸۷	"فٹ پاٹھ کے فرشتے" "میسویں صدی" میں قسط وار		جنوری ۱۹۷۷ء
۸۸	"ایک گرجا ایک شوق"		
۸۹	"کالے گیس" (افسانے)		
۹۰	"کرشن مگر" (مروجہ سماج سعید)		
۹۱	"دل کی داہلوں کو گھٹیں" (ناول)	دہلی	طبع ازل: ۱۹۵۶ء
۹۲	"صبح بھتی ہے" (ناول)		
۹۳	"دوسری طرف باری سے پہلے" (افسانے)		
۹۴	"ایٹا سے آگے" (افسانے)		
۹۵	"پورے" (رہنما)	کتبہ سلطان، ممبئی	طبع ازل: ۱۹۴۷ء
۹۶	سعادت حسن منٹو (خاک کتا ہے)		
۹۷	"کسمیرا ایک معروف مرقی پرکاش" (طریقہ حراست)		
۹۸	"جب کھیت جائے"		
۹۹	"کاوا پان"		
۱۰۰	"خدا"		
۱۰۱	"آدھے گھٹلے کا خدا" (افسانے)		
۱۰۲	"سراسے کے پتھر" (ڈراما)		
۱۰۳	"آسان روشن ہے" (ناول)	ایشیا پبلیشرز، دہلی	طبع ازل: ۱۹۵۵ء
۱۰۴	"مستی کے موسم"	ایشیا پبلیشرز، دہلی	طبع ازل: ۱۹۶۶ء
۱۰۵	"سوئے کی صندوقچی"		
۱۰۶	"اس کا دلی بھرا گھن" (ناول)		
۱۰۷	"سے لڑائی" (اردو ادب کا انتخاب - دو جلدیں)		طبع ازل: دسمبر ۱۹۴۳ء
۱۰۸	"گنہگار کا بھوت" (انجمن کے لیے)	شیخ الاسلام ایڈیٹریز، لاہور	طبع ازل: ۲۰۰۷ء

نوٹ: کرشن چندر کی کتابوں کے اس قدر جملی انجمنیں لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں کہ ان کی مطبوعہ سب کی تعداد کتنی جلد میں لکھائی جائے گی ہے اور دنیا میں کتنی ہے۔ البتہ ان کے دو غیر مطبوعہ ناول کسی وقت بھی سامنے آ سکتے ہیں جن کے حقوق اشاعت ہم باہم پبلیشرز میں

ہکائن، الہ آباد کے نام منوٹا ہیں۔ (۱) "بھنگی کی شام" (حصہ دوم) (۲) "ایک گھر گک کا گنہم"

اعزاز:

- ۱۔ سوویت فیروادیا اور اکٹوبر۔ نومبر ۱۹۶۶ء
- ۲۔ پدم بھوشن جنوری ۱۹۶۶ء
- ۳۔ فیروز گجرات ایسوسی ایشن ایوارڈ، بھنگی، نومبر ۱۹۶۳ء

زندگی میں مستقل پتا:

"دی انش" چٹ لڑنس ایچ بی نیو، سائٹا کرہ ڈویسٹ، بھنگی (بھارت)

نظریہ فن:

"اساتذہ کی طور پر خواہش کرتی کو چاہیے اور غریبی کو کھودنے کی کو میں انسانیت کے بنیادی مسائل سمجھتا ہوں اور اکثر انہی کے متعلق لکھتا ہوں۔"

(پہلا "سمیرا پندے، افسانے" مرقہ بشیر بھنگی)



حوالہ جات:

- ۱۔ "سمیرا پندے، افسانے" مرقہ بشیر بھنگی اور ڈاکٹر احمد حسن نے "۱۹۹۰" کراچی کے "کرشن چندر فیروز انش" تاریخ پیدائش ۱۹۹۳ء کی ہے جو درست نہیں۔ "ہوائی تھلے" کے اسٹیمپور صاحب اور فیض ماما، پھر نے تاریخ پیدائش ۱۹۹۲ء بتائی یہ بھی درست نہیں۔ یہ تمام پیدائش کی نے درست کھدا کرشن چندر کی بنیم علی مدتی نے کرشن چندر کی والدہ امراوی سے چچ کرشن چندر تاریخ پیدائش اور مقام پیدائش کو درست فرامداد ۲۶ نومبر ۱۹۹۳ء بتمام حرکت چا رہی ہے۔
- حوالہ "کرشن چندر شخصیت لکھنے" لاٹکار ہائے پی ایچ۔ (۱) (انڈیا) انڈیا انٹر نیٹ ایسوسی ایشن، ۱۹۹۹ء

کالو بھنگلی

کرشن چندر

میں نے اس سے پہلے ہزار بار کالو بھنگلی کے بارے میں لکھا تھا ہائیکن میرا نظم ہر بار یہ سوچ کر دک گیا کہ کالو بھنگلی کے متعلق لکھا ہی کیا جا سکتا ہے۔ مختلف ذراویں سے میں نے اس کی زندگی کو دیکھنے پر کئے، سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن کبھی وہ بڑی لمبی کثیر و کمائی نہ تھی جس سے دلچسپ المانہ مرعوب ہو سکتا ہے۔ دلچسپ ہونا تو دور کہار کوئی سیہ حاسا دار المانہ ہے کیف وہ رنگ ہے ہاں مرقع بھی تو نہیں لکھا جا سکتا، کالو بھنگلی کے متعلق پھر نہ جانے کیا بات ہے، ہزار المانے کے شروعا میں میرے ذہن میں کالو بھنگلی آن کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے مسکرا کے پوچھتا ہے ”جھوٹے صاحب! مجھ پر کہانی نہیں لکھو گے؟“ کتنے سال ہو گئے تھیں لکھتے ہوئے؟“

”کتنی کہانیاں کہیں تم نے؟“

”ساتھ اور دو دماغ“

”مجھ میں کیا برائی ہے جھوٹے صاحب۔ تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟ دیکھو کب سے میں اس کہانی کے انتظار میں کھڑا ہوں۔“
جہاں سے امین کے ایک گونے میں مذمت سے ہاتھ باغ سے کھڑا ہوں۔ جھوٹے صاحب، میں تو تمہارا پرانا محال خور ہوں۔ کالو بھنگلی، آ خر تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟“

اور میں کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اس قدر سیدھی سی بات زندگی رہی ہے کالو بھنگلی کی کہ میں، کیا کہی تو نہیں لکھ سکتا اس کے متعلق۔ یہ نہیں کہ میں اس کے بارے میں لکھ لکھا ہی نہیں جانتا۔ دراصل میں کالو بھنگلی کے متعلق لکھنے کا ارادہ ایک مذمت سے کر رہا ہوں لیکن کبھی لکھ نہیں سکتا۔ ہزار کوشش کے باوجود نہیں لکھ سکتا۔ اس لیے آج تک کالو بھنگلی اپنی پرانی جھاڑو لیے اپنے بڑے بڑے ٹنگے گھٹیلے لیے اپنے پھٹے پھٹے کھردرے بدھیت پاؤں لیے اپنی سوکھی ٹانگوں پر ابھری اور یں لیے اپنے کپڑوں کی ابھری ابھری پٹیاں لیے اپنے ہونٹوں کے پیچ اور اس کی خشک جلد کی سیاہ سطوٹیں لیے اپنے سر جھانے ہوئے سینے پر گرد آلود ہاتھوں کی جھاڑیاں لیے اپنے سکرے ہونٹوں، پھیلے پھیلے تھنوں، جھریوں والے گال اور اپنی آنکھوں کے نیم تاریک گڑھوں کے اوپر چلی چلا رہا ہمارے میرے ذہن کے گونے میں کھڑا ہے۔ اب تک کی کردار آئے اور اپنی زندگی جیتا

سر اپنی اہمیت جتا کر اپنی ذرا ماحیت اہم نہیں کر کے چلے گئے۔ حسینی اور عمر، بطور صورت نگینی جو لے لے شیطان کے چم سے اس ذہن کے رنگ
 - آئن سے آٹا ہوئے اس کی چادر پروری میں اپنے دینے جا کر چلے گئے لیکن کالو بنگلی بدستور اپنی جھاڑو سنبھالے۔ اسی صوبہ - - نے
 اس کو کے اندر آنے والے ہر کردار کو دیکھا ہے، اسے دوتے ہوئے، لگاڑاڑاٹے ہوئے، محبت کرتے ہوئے، نفرت کرتے ہوئے، سوتے
 و - - جاتے سوتے، قہقہے لگاتے ہوئے، تقریر کرتے ہوئے، مذہبی کے ہر رنگ میں، ہر نچ سے، ہر منزل میں دیکھا ہے۔ بچپن سے بڑھاپے
 سے موت تک اس نے ہر انسانی کو اس کے گھر کے دروازے کے اندر بھاگتے دیکھا ہے اور اسے اعداد آتے ہوئے دیکھ کر اس کے لیے - ات
 صاف تر رہا ہے۔ وہ خود ہی ہٹ گیا ہے۔ ایک بنگلی کی طرح ہٹ کر کھڑا ہو گیا ہے حتیٰ کہ داستان شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی ہے، حتیٰ کہ کردار
 اور تہ ثابتی دونوں رخصت ہو گئے ہیں لیکن کالو بنگلی اس کے بعد بھی وہیں کھڑا ہے۔ اب صرف ایک قدم اس نے آگے بڑھا لیا ہے اور ذہن
 کے مرکز میں آ گیا ہے تاکہ میں انجی طرح دیکھ لوں۔ اس کی نگاہ چھوڑ چک رہی ہے اور ہاتھوں پر ایک خاموش سوال ہے۔ ایک عرصے سے
 میں اسے دیکھ رہا ہوں کبھی میں نہیں آ گیا کبھیوں گا اس کے بارے میں، لیکن آج یہ پھر ایسے زمانے کا نہیں، اسے کئی سالوں تک ملا ہے۔ آج
 اسے بھی اندازہ کہہ دوں۔

میں سات برس کا تھا جب میں نے کالو بنگلی کو بنگلی یاد دیکھا، اس کے تیس برس بعد جب وہ مرا، میں نے اسے اسی حالت میں دیکھا۔ کوئی
 فرق نہ تھا۔ وہی پاؤں، وہی رنگت، وہی چہرہ، وہی چند پاؤں، وہی ہونے والی حالت، وہی جھاڑو جیسا معلوم ہوتا تھا، اس کے پیٹ سے
 اٹھاتے چارے آ رہے۔ کالو بنگلی کی جھاڑو اس کے شمع کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہر درمیر کا بول و برا، صاف کرتا تھا، دھنری میں فائل
 چھڑکتا تھا، کھڑا کھڑا صاب اور کچھڑا صاب کے بنگلوں میں صفائی کا کام کرتا تھا۔ کچھڑا صاب کی ٹکری اور کھڑا کھڑا صاب کی گائے کو چھڑانے
 کے لیے بنگلی لے جاتا اور دن دھلیے ہی انھیں دابوں پہ تال میں لے آتا اور موٹی جاتے میں باغیچہ کرنا کھانا تیار کرتا اور اسے کھا کر سوجاتا۔
 میں سات سال سے اسے میں سبکی کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہر روز، بلا ناغہ - اس عرصے میں وہ کبھی ایک دن کے لیے بھی جا نہیں ہوا۔ یہ امر
 قہر فزا ضرور تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ شخص اسی کے لیے ایک کہانی لکھی جائے۔ خبر یہ کہانی تو بدلتی گھسواہی جا رہی ہے۔ آٹھ سال سے میں اسے
 ۱۵۰ آیا ہوں لیکن یہ شخص نہیں مانتا، ذرا دہشتی سے کام لے رہا ہے۔ یہ علم مجھ پر بھی ہے اور آپ پر بھی، مجھ پر اس لیے کہ مجھے کھانا چڑ رہا ہے اور آپ
 پر اس لیے کہ آپ کا سے چڑھتا چڑ رہا ہے۔ دس سال آٹھ اس میں کوئی ایسی بات ہی نہیں جس کے لیے اس کے حلقہ نقلی سرور دی سولی لی جائے۔
 مگر کیا کیا جائے کالو بنگلی کی خاموشی لگے ہوں کے اندر ایک ایسی بنگلی بھٹی ہی ملتین نہ خواہش ہے، ایک ایسی بھیر بے ڈھائی ہے، ایک ایسی بھیں گھروانی
 ہے کہ مجھے اس کے حلقہ کھانا چڑ رہا ہے اور کھینچے لکھتے یہ بھی سوچا ہوں کہ اس کی زندگی کے حلقہ کیا کھوں گا میں۔ کوئی پہلو بھی تو ایسا نہیں جو
 دلچسپ ہو، کوئی گونا بنا نہیں جو تازہ ہو، کوئی زاویہ ایسا نہیں جو حتمی کشش کا حامل ہو، پس آٹھ سال سے متواتر میرے ذہن میں کھڑا ہے نہ
 جانے کیوں۔ اس میں اس کی سبب دھری کے سوا اور تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ جب میں نے روانیت سے آگے سفر اختیار کیا اور حسن اور صوفیائی کی
 باغیچہ کی کیفیتیں دیکھتا ہوا ہونے ہوئے تاروں کو چھوئے لگا۔ اس وقت بھی یہ ہیں تھا جب میں نے باگونی سے جھانک کر ان داناؤں کی طریت
 دیکھی اور خطاب کی سرزمین پر غوغا کی ندیاں بہتی دیکھ کر اپنے دہشت ہوئے کاظم حاصل کیا اس وقت بھی یہ ہیں میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا
 تھا۔ ہم ہم گمراہ یہ جانے کا ضرور۔ اب کے اسے جاتا ہی چڑے گا۔ اب میں اس کے بارے میں کھو رہا ہوں۔ لہذا اس کی بے کیف، بے رنگ،
 بیکینی، بیکینی کہانی بھی سن لیجئے تاکہ یہ یہاں سے دور دفن ہو جائے اور مجھے اس کے قلیقہ قرب سے نہات لے لے اور اگر آج بھی میں نے اس کے

بارے میں نہ لکھا اور آپ نے اسے نہ سنا تو یہاں تک سال بعد بھی نہیں تھا اسے گا اور ممکن ہے زندگی بھر نہیں گزارے۔

لنگن پر بیٹائی تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں کیا لکھا جاسکتا ہے۔ کالو بھنگی کے ماں باپ بھی تھے اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کے بارے میں زیادہ اہم بات تھی اور سبکدوشوں میں سے کہیں نہ بچے چلے آئے تھے۔ اسی طرح اسی حالت میں۔ بلکہ کالو بھنگی نے ٹائی، ڈی کی تھی، اس نے بھی مشق نہ کیا تھا، اس نے بھی دور دورہ کارکنوں میں نہیں کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ بھی اپنے گاؤں سے باہر نہیں گیا تھا۔ وہ دن بھر اپنا کام کرتا اور رات کو سو جاتا اور صبح اٹھ کے بھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ لیکن ہی سے وہ اسی طرح کرتا چلا آیا تھا۔

ہاں کالو بھنگی میں ایک بات ضرور دلچسپ تھی اور وہ یہ کہ اسے اپنی اپنی چھڑیا پر کسی جانور مثلاً گائے یا بھینس کی زبان بھرانے سے بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ کھڑو پھر کے وقت میں نے اسے دیکھا ہے کہ بچے آسمان کے سبز گھاس کے گلابیں غرض پر کھلی دھوپ میں، وہ بیچ جال کے قریب ایک کھیت کی میٹھ پر اکڑوں بیٹھا ہے اور ایک گائے اس کا سر چات رہی ہے۔ بار بار، اور وہ وہیں اپنا سر بٹاتا اور کھڑو کھڑو کر رہا ہے۔ اسے اس طرح سوتے دیکھ کر میرے دل میں مسرت کا ایک عجیب سا احساس آتا ہے کہ اسے لگتا تھا کہ کائنات کے کچھ کچھ خود کی آجیز آجائی حسن کا نگاہ ہونے لگتا تھا، میں نے اپنی چھڑی سی زندگی میں دنیا کی حسین ترین عورتیں، چھوٹوں کے ناز و ترین ٹھپے، کائنات کے خوبصورت ترین مناظر دیکھے ہیں لیکن نہ جانے کیوں ایسی مصیبت، ایسا حسن، ایسا سکون کسی محضر میں نہیں دیکھا تھا اس محضر میں کہ جب میں سات برس کا تھا اور وہ دیکھ بہت بڑا اور وسیع دکھائی دیتا تھا اور آسمان بہت ہلکا اور صاف اور کالو بھنگی کی چند ہاتھ کی طرح چلتی تھی، اور گائے کی زبان آہستہ آہستہ اس کی چند ہاتھ چاتی ہوئی، اسے گویا سہلائی ہوئی کسر کسر کی خواہید و آواز دینا کرتی جاتی تھی۔ یہی چاہتا تھا میں بھی اسی طرح اپنا سر گھٹا کر اس گائے کے لیے بیٹھ جاؤں اور اوروں کو گھٹا سو جاؤں۔ ایک دفعہ میں نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تو والد صاحب نے مجھے روک دیا، وہ بچا اور مجھ سے زیادہ اسی طرح کالو بھنگی کو دیکھنا کہ میں طور دار کے بارے میں پچھنے لگا کہ کالو بھنگی کہیں ان کی خورکوں سے مرمت ہاتھ لیکن کالو بھنگی کو اپنی مار کھا کے بھی بھگتتا اور دوسرے روز وہ بدستور بھاڑو سینے کے لیے تیار ہے بلکہ میں سوچتا تھا۔

کالو بھنگی کو جانوروں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ہماری گائے تو اس پر جان چھڑکتی تھی اور کچھ بڑا صاحب کی بکری بھی، حالانکہ بکری بڑی بے وقار ہوتی ہے، عورت سے بھی بڑھ کے لیکن کالو بھنگی کی بات تو تھی۔ ان دونوں جانوروں کو پانی پلانے تو کالو بھنگی، چارو، کھانے تو کالو بھنگی، جنگل میں چرانے تو کالو بھنگی اور رات کو سو بیٹھ جانے میں ہاتھ دے تو کالو بھنگی۔ وہ اس کے ایک ایک اشارے کو اس طرح سمجھتا تھا کہ میں اس طرح کوئی انسان کسی انسان کے بچے کی باتیں سمجھتا ہے۔ میں بھی یاد کالو بھنگی کے پیچھے گیا ہوں۔ جنگل میں، راستے میں، وہ انہیں بالکل کھلا چھوڑ دیتا تھا لیکن بھر بھی گائے اور بکری دونوں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملائے پلے آتے تھے۔ گویا شبنم دوست میرے لگے ہیں۔ دانتے میں گائے نے ہر گھاس دیکھ کر تباہ ہو کر تکی بھی بھاڑی سے بچاں کھا لے گئی اور کالو بھنگی ہے کہ سہل تو زور زور سے کہتا ہے اور بکری کے منہ میں ڈال رہا ہے اور خود بھی کھا رہا ہے اور آپ ہی آپ باتیں کر رہا ہے اور ان سے بھی برابر باتیں کئے جا رہے ہیں اور دونوں جانور بھی، کبھی مل کر کبھی کان بچھتا کہ کبھی پاؤں پاؤں، کبھی دم ہا کبھی باج، کبھی کار کہ ہر طرح سے اس کی گفتگو میں شریک ہو رہے ہیں۔ اپنی کھجور تو کھجوریں آتا تھا کہ یہ لوگ کیا باتیں کرتے تھے، بھر چند لوگوں کے بعد کالو بھنگی آئے چلے گئے تو گائے بھی چلے گئے اور بکری بھی بھاڑی سے پرے بہت جاتی اور کالو بھنگی کے ساتھ ساتھ چلتے گئے۔ آئے کہیں چھڑی سی زندگی یا کوئی محض چھڑو کالو بھنگی وہیں بیٹھ جاتا بلکہ لیٹ کر وہیں بیٹھنے کی سزا سے اپنے ہونٹ کا دیا اور جانوروں کی طرح پانی پینے لگا اور اسی طرح وہ دونوں جانور بھی پانی پینے لگتے تھے کہ کب سے چارے انسان تو نہیں

تھے کہ ایک سے لے کر تین۔ اس کے بعد اگر کالو بھنگی سبزے پر لیٹ جاتا تو بکری بھی اس کی ٹانگوں کے پاس اپنی ٹانگیں بکھیر کر دعائیہ اعزاز میں بیٹھ جاتی اور گائے تو اس اعزاز سے اس کے قریب ہونے والی تھی کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کالو بھنگی کی بیوی ہے اور ابھی ابھی کھانا کھا کے فارغ ہوئی ہے۔ اس کی سرنگاہ میں اور چہرے کے ہر اتار چڑھاؤ میں ایک سکون آ سیر کر رہی تھی اعزاز جھٹکتے لگتا اور جب وہ بچائی کر لے لگتی تو مجھے معلوم ہوتا گویا کوئی بڑی کھنکھری کر رہا ہے سوزن کاری میں مصروف ہے اور کالو بھنگی کا سونہریں دھڑ ہے۔

اس گائے اور بکری کے علاوہ ایک لنگڑا کتا تھا، جو کالو بھنگی کا بڑا دوست تھا۔ وہ لنگڑا تھا اور اس لیے دوسرے کتوں کے ساتھ زیادہ میل بھرتہ نہ لگتا تھا اور کتا بچے لنگڑے ہونے کی وجہ سے دوسرے کتوں سے بچتا، بھوکا اور ڈھیر بچتا۔ کالو بھنگی اکثر اس کی حمایت دیتی اور غلط طریقہ میں لگا دیتا اور کبھی تو صابن سے اسے نہلاتا، کبھی اس کی چوڑیاں دھو کرتا۔ اس کے زخموں پر مرہم لگاتا جسے کئی کی روٹی کا سکہ اٹھوا دیتا لیکن یہ کتا بڑا غلط فہم تھا۔ دین میں صرف دوسرے کالو بھنگی سے ملتا۔ دوسرے کالو اور شام کو لودر کھاتا تھا کہ اور زخموں پر مرہم لگا کر کتے کے لیے چلا جاتا۔ کالو بھنگی اور اس لنگڑے کتے کی ملاقات بڑی مختصر ہوتی تھی، اور بڑی دلچسپ، مجھے تو وہ کتا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا لیکن کالو بھنگی اسے ہمیشہ بڑے تپاک سے ملاتا۔

اس کے علاوہ کالو بھنگی کی جنگل کے ہر جانور چرند اور پرند سے شناسائی تھی۔ راستے میں اس کے پاؤں میں کوئی کیڑا آ جاتا تو وہ اسے اٹھا کر جھڑائی پر۔ کچھ دیا کھیں کوئی نہ لے لے لگتا تو پاس کی کوئی مین اس کا جواب دیتا۔ پتھر، دوسٹک، گھاری، مال چلہ، سبزہ گی، ہر پرندے کی زبان وہ جانتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ اہل سنگل کتا تھا۔ اس کے بچے بڑا پڑتا تھا۔ کم از کم میرے جیسے سات برس کے بچے کی نظروں میں تو وہ لکھنے اپنے ماں باپ سے بھی اچھا معلوم ہوتا تھا اور بھروسہ بھی کیا جاتا ایسے حوے کا تیار کرتا تھا اور آگ پر اسے اس طرح دم گرم آٹے پر بھونکتا تھا کہ کئی کاہر دان کھنکھن میں جاتا اور اگلے میں شہ کا حوہ چا اور خوشبو بھی ایسی سونگھی، مٹھی مٹھی، جیسے دھرتی کی سانس اٹھاتی آہستہ آہستہ بڑے سکون سے، بڑی مٹھائی سے، بچے کو ہر طرف سے دیکھ دیکھ کر اسے بھونکتا تھا جیسے وہ برسوں سے اس بچے کو جانتا تھا۔ ایک دوست کی طرح وہ بیٹے سے باتیں کرتا، آتی تری اور میری باتوں اور شفقت سے اس سے فطرتاً گویا وہ جانتا اس کا اپنا رشتہ دار یا سگ بھائی تھا اور لوگ بھی بھلا بھولتے تھے، مگر وہ بات کہاں۔ اس قدر کہ، ذرا کھانڈ اور معمولی سے بچے ہونے تھے کہ انہیں بس کئی کا بھلائی کہا جاسکتا ہے لیکن کالو بھنگی کے ہاتھوں میں بھنگی کے وہی بھلا کچھ کا کچھ ہو جاتا، اور جب وہ آگ پر پیک کے اٹھل چڑھتا ہوا جاتا تو بالکل ایک ٹی ٹی ٹی ٹی ٹی کی طرح عروہی لباس پہنے سیرا سیرا پہنکا نظر آتا۔ میرے خیال میں خود بچے کو یہ اعزاز ہو جاتا تھا کہ کالو بھنگی اس سے کتنی محبت کرتا ہے وہ نہ محبت کے بغیر اس بے جان شے میں اتنی رعنائی کیسے پیدا ہو سکتی تھی۔ مجھے کالو بھنگی کے ہاتھ کے چپکے حوے بچے کھانے میں بڑا حوہ تھا اور میں انہیں بڑے حوے میں چپ چپ کے کھاتا تھا، ایک دھندلا کڑا کیا تو بڑی کھانسی ہوتی۔ بری طرح۔ چھار کالو بھنگی کئی چار گھر سے ملے، وہ بھر پنگلے میں بھار دے ای طرح حاضر تھا۔

اور میں کالو بھنگی کے متعلق اور کوئی دلچسپ بات یاد نہیں آ رہی۔ میں بچپن سے جوانی میں آیا اور کالو بھنگی ای طرح رہا۔ میرے لیے اب وہ کم دلچسپ ہو گیا تھا بلکہ میں کہنے کہ مجھے اس سے کسی طرح کی دلچسپی نہ رہی تھی۔ ہاں کبھی کبھی اس کا کردار مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے نانا نانا گھر شروع کیا تھا۔ میں مطالعہ کے لیے اس سے سوال پوچھتا اور نوٹ لینے کے لیے نانا نانا گھر میں اور پینٹ ساتھ رکھ لیتا۔

”کالو بھنگی تمہاری زندگی میں کوئی خاص بات ہے؟“

”کوئی خاص بات، عجیب الونگی دہی۔“

”نہیں، پھر لے صاحب۔“ (یہاں تک تو شاید وہ سفر باز اب آگے چلے، لیکن ہے۔)۔

”اچھا تم یہ تازہ تم کو آواز لے کر کیا کرتے ہو؟“ سم نے دوسرا سوال پوچھا۔

”تھکوانے کر کیا کرتا ہوں۔“ وہ سوچنے لگا۔ آٹھ روپے ملتے ہیں مجھے، بھر وہ انگلیوں پر گنتے لگتا ہے۔ ”چار روپے کا آواز ۲۵۴۲

ہوں۔ ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ تکتے روپے ہو گئے، پھر لے صاحب۔“

”سات روپے۔“

”ہاں سات روپے۔ ہر مہینے ایک روپہ بیٹھے کو دیتا ہوں، اس سے کپڑے ملوانے کے لیے روپے کرنا چاہتا ہوں۔ ۱۰ سال میں دو

جوڑے تو چاہئیں، کھل تو میرے پاس ہے۔ خیر، لیکن وہ جوڑے تو چاہئیں اور پھر لے صاحب۔ کہیں بڑے صاحب ایک روپہ چھ نکادیں بڑا سا

دیو تو کھا آ جائے!“

”او کیسے؟“

”کبھی ۱۰ دن کا ایک روپہ کا دوا دہی کے پرانے کھانے گا۔ کبھی پرانے کھانے کا۔ مالک۔ بڑا ہی چاہتا ہے۔“

اب بولنے ان آٹھ روپوں پر کوئی کیا افسانہ لکھے۔

پھر جب میری شادی ہو گئی، جب دامیں جوان اور پھلدار ہوئے نکلیں اور قریب کے جنگل سے شہر اور کھداری اور جنگلی گلاب کی

خوشبوئیں آنے لگیں اور ہرن چوڑیاں بھرتے ہوئے دکھائی دیتے اور تارے جھلکے جھلکے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگتے اور کسی کے دھیلے

ہونٹ آنے والے برسوں کا خیال کر کے کاہنہ لگتے اس وقت بھی کہیں کالو جنگل کے حلقہ کو کھڑا چاہتا اور داخل کاغذ لے کر اس کے پاس جاتا۔

”کالو جنگل تم نے جادو نہیں کیا؟“

”نہیں پھر لے۔ صاحب۔“

”کیوں؟“

”اس علاقے میں میں ہی ایک جنگلی ہوں اور دوسرے ایک کوئی جنگلی نہیں ہے پھر لے صاحب۔ پھر داری شادی کیسے ہو سکتی ہے؟“

(لچکے یہ راست بھی بند ہوا)

”تمہارا ہی نہیں چاہتا کالو جنگل؟“ میں نے ۱۰ بار کوشش کر کے دیکھ کر دھڑکا ہوا۔

”کیا صاحب؟“

”جنگل کرنے کے لیے ہی چاہتا ہے تمہارا؟ شاید کسی سے محبت کی ہوگی تم نے بھی تم نے اب تک شادی نہیں کی۔“

”جنگل کیا ہوتا ہے۔ پھر لے صاحب۔“

”محبت سے جنگل کرتے ہیں لوگ۔“

”جنگل کیسے کرتے ہیں صاحب؟ شادی تو ضرور کرتے ہیں سب لوگ۔ بڑے لوگ جنگل بھی کرتے ہوں گے پھر لے صاحب۔ مگر ہم

نے نہیں سنا وہ جو کھانا آپ کھاتے ہیں۔ دہی شادی کی بات ۱۰۰ میں نے آپ کو تادی۔ شادی کیوں نہیں میں نے کی، کہیے ہوئی شادی میری،

آپ بتائیے؟" (ہم کہتا تھا کہ خاک)

"تمہیں افسوس نہیں ہے کالو بھلی؟"

"کس بات کا افسوس؟ مجھ نے صاحب۔"

میں نے یاد رکھا، اس کے حلق گھسنے کا خیال پھوڑا۔

آٹھ سال ہوئے کالو بھلی مر گیا۔ وہ کبھی بیمار نہیں ہوا تھا، ایک ایسا چار پانچ کچر بھی بسترِ خلافت سے ڈاٹھا۔ اسے ہسپتال میں مریض رکھا، یا تھا، وہ الگ وارڈ میں رہتا تھا۔ کچھ روز دور سے اس کے قلعے میں دو داخلہ دیتا اور ایک چیز اسی اس کے لیے کھانا رکھ آتا۔ وہ اپنے روتی خود صاف کرتا، اپنا بستر خود لٹیک کرتا، اپنا پالو ویرا خود صاف کرتا اور جب دوسرا کواہی کی لاش کو پھینک دالوں نے کھانے لگا، یا کیوں کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ وہ ہمارے پاس میں سال سے رہتا تھا لیکن ہم کوئی اس کے رشتہ دار نہ تھے، اس لیے اس کی آخری تنخواہ بھی بھج کر مار لی گئی۔ کیوں کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا اور جب دوسرا اس روز بھی کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ روز کی طرح اس روز بھی ہسپتال کھانا ڈال کر لے گئے، کچھ روز سے چار کچے مریضوں نے دوائی اور کھانا لے گئے۔ پھر روز کی طرح ہسپتال بھی بند ہوا اور کھانا ان کریم سب نے آرام سے کھانا کھایا، دینے والا اور کالو بھلی نے کالو بھلی کی لاش کھانے لگا دی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کی گائے نے اور کچھ روز صاحب کی بھری نے دو روز تک نہ کچھ کھانا کھا اور وارڈ کے باہر کھڑے کھڑے چلائی رہیں۔ جانوروں کی ذات ہے نا آخر۔

"اے تو پھر بھانڈو لے کر آئی پہنچا آ کر کیا چاہتا ہے؟ انا ہے۔"

کالو بھلی ابھی تک وہیں کھڑا ہے۔

کیوں کہ اب قریب نے سب کچھ کھو دیا، وہ سب کچھ جس بیماری بہت چاہتا ہوں ابھی تک کھڑے ہو، پریشان کر رہے ہیں۔ لالہ چلے جاؤ، کیا مجھ سے کچھ بھٹ کر گیا ہے؟ کوئی بھول ہوئی ہے۔ تمہارا نام۔ کالو بھلی۔ کام۔ بھلی اس علاقے سے کسی باہر نہیں گئے، شادی نہیں کی، عشق نہیں لڑا۔ زندگی میں کوئی بنگا ہی بات نہیں ہوئی۔ کوئی اچھا بھلا نہیں ہوا جیسے مجھ کے ہونٹوں میں ہوتا ہے، اپنے بچے کے پیار میں ہوتا ہے، غالب کے کلام میں ہوتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تمہاری زندگی میں۔ پھر میں کیا کہوں، اور کیا کہوں؟ تمہاری تنخواہ آٹھ روپے، چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تباہ، آٹھ روپے کے چائے، ہمارے کٹر، چار روپے کا مصالحہ، سات روپے، ایک روپے بٹن، کٹا۔ آٹھ روپے ہو گئے مگر آٹھ روپے میں کہاں نہیں ہوتی۔ آج کل تو کچھ بچے سو میں نہیں ہوتی مگر آٹھ روپے میں تو شرط کوئی کہاں نہیں ہو سکتی۔ پھر میں کیا کہہ سکتا ہوں تمہارے بارے میں۔ اب بھلی ہی کالو، ہسپتال میں کچھ روز سے تیس روپے تنخواہ پاتا ہے۔

وراثت سے نچلے حوصلے طبقے کے ہیں باپ ملے تھے، جنہوں نے نال تک چننا دیا۔ پھر بھلی نے کچھ بھاری کا استحقاق پاس کر لیا۔ وہ جوان ہے۔ اس کے پیچھے پر دھت ہے، یہ جوانی یہ دھت کچھ چاہتی ہے۔ وہ وسیع لہجے کی شہزادہ بن سکتا ہے۔ لہجے پر کف لگا سکتا ہے۔ دالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کھجور کر سکتا ہے۔ سرکار نے اسے روپے کے لیے ایک چھوٹا سا بنگا لیا اور اس میں دے دیا۔ کٹر چک چائے تو فیض بھی بھانڈا لیتا ہے اور غلاموں سے بیٹھا اس سے عشق بھی کر لیتا ہے۔ وہ نورماں اور بھلی کا ہاتھ نہیں یاد ہو گا۔ نورماں کھانا سے آتی تھی، سولہ سڑوہ برسی کی الہ جوانی، چار کوس سے سنا کے دیکھیں اشتہار کی طرح نظر آ جاتی تھی۔ بڑی بے وقوف تھی۔ وہ اپنے گاؤں کے دو جوانوں کا عشق قبول

کئے تھے تھی۔ جب نیرودا کا کڑا سامنا آ جاتا تو اس کی ہوجاتی اور چپ بخاری کا کڑا دکھائی دیتا تو اس کا دل اس کی طرف اٹھ جوتے لگتا اور دو کوئی فیصلہ ہی نہیں کر سکتی تھی۔ بالعموم عشق کو لوگ بالکل واضح کا طبع، چھٹی امر کہتے ہیں۔ وہاں حالیکہ یہ عشق بڑا احتیاط، غیر متعین، مکتوم حالت کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی عشق اس سے بھی بے ہوش ہے اور بھر شائد کہیں نہیں ہے اور ہے بھی تو اس قدر ہوتی، گرگزی، بھگتی کا دھڑکنے پر ہی اور عشق خاموش۔ سوائی ضرور ہوتی ہے لیکن یادیت، مفلک ہوتی ہے اسی لیے تو نورماں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔

اس کا دل نیرودا کے بیٹے کے لیے بھی دھڑکنے تھا اور بخاری کے پست کے لیے بھی، اس کے ہونٹ نیرودا کے بیٹے کے ہونٹوں سے مل جانے کے لیے بے تاب ہوا تھے اور بخاری کے پست کے لیے کہ انھوں میں بے تھکس والے تھے اس کا دل یوں کاچنے لگتا جیسے چاروں طرف سمندر ہو۔ چاروں طرف لہریں ہوں اور ایک انکی کشش ہو اور ڈاک ہی بخار ہو اور چاروں طرف کوئی نہ ہو، اور کشش ادا کرنے لگے، ہوئے ہوئے داغی جائے اور ڈاک ہی بخار ڈاک سے ہاتھوں سے چلتی چلتی ختم جائے اور سانس رکستے رکستے رک گئی یہ بے، اور آتھیں چھٹی چھٹی جھک سی جائیں، اور انھیں کھرتی کھرتی کھری جائیں اور لہریں محکم کر گھومتی ہوئی معلوم دیں، اور بڑے بڑے دائرے پھیلتے پھیلتے نکلیں جائیں اور پھر چاروں طرف تنا کا نکلیں جائے اور دل ایک دم دھک سے رو جائے اور کوئی اپنی ہاتھوں میں کھچ لے۔ اپنے بخاری کے بیٹے کو دیکھنے سے ایسی حالت ہوتی تھی نورماں کی، اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتی تھی۔ نیرودا کا چنا، بخاری کا چنا، بخاری کا چنا، نیرودا کا چنا، دونوں کو زمانے کی جگہ تھی، دونوں سے شادی کر کے کا اقرار کر چکی تھی، دونوں پر حشر تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ آدھیں میں لڑتے لڑتے لہو لہاں ہو گئے اور جب جوانی کا بہت سا دور گزرا تو کیا تو انھیں اپنی بے وفائی پر بڑا افسوس آیا اور پہلے نیرودا کا چنا نورماں کے پاس پہنچا اور اپنی چھری سے اسے چاک کرنا چاہا اور نورماں کے بازو پر دھم آ گئے، اور پھر بخاری کا پست آیا اور اس نے اس کی جان لپٹی چاہی، اور نورماں کے بازو پر دھم آ گئے مگر وہ بچ گئی کیونکہ وہ جلد سے ہسپتال لائی تھی اور یہاں اس کا علاج شروع ہو گیا۔ آخر ہسپتال والے بھی انسان ہوتے ہیں۔ طوبی صورتی دونوں پر اثر کرتی ہے انکھن کی طرح۔ خود بہت اس کا اثر ضرور ہوتا ہے کسی پر کم کسی پر زیادہ۔ ڈاکٹر صاحب پر کم تھا۔ کیونکہ پر زیادہ تھا۔ نورماں کی جا رہاری میں بھلی دل و جان سے لگا رہا۔ نورماں سے پہلے بیکار، بیکار سے پہلے رہنماں سے پہلے جاگی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا مگر وہ بھلی کے ناکام معاملے تھے کیونکہ وہ عورتیں ایسا ہی ہوتی تھیں۔ رہنماں کا تو ایک بچہ بھی تھا۔ بچوں کے علاوہ وہاں باپ تھے اور خاندان تھے اور خاندانوں کی دشمن لگا چیں جس جو کو بھلی کے بیٹے کے اندر کھس کے اس کی خواہش کے آخری کو لے تک پہنچ جانا چاہتی تھیں۔ بھلی کیا کر سکتا تھا مجبور ہو کے رو جاتا۔ اس نے بیکار سے عشق کیا، رہنماں سے اور جاگی سے بھی۔ وہ ہر روز بیکار کے بھائی کو کھائی کھا تا تھا رہنماں کے منھے بیٹھے کو دن بھر اٹھائے بھرتا تھا۔ جاگی کو بھلوں سے بڑی محبت تھی۔ وہ ہر روز صبح اٹھ کے مندا میرے کھانے کی طرف چلا جاتا اور غور صورت لالہ کے کچے توڑ کر اس کے لیے لاتا۔ بھرتی دوائی، بھرتی بخار تھی، بھرتی خاندان دوائی، لیکن وقت آئے پر جب بیکار ابھی ہوئی تو دوتے دوتے اپنے خاندان کے ساتھ چلی گئی اور جب رہنماں ابھی ہوئی تو اپنے بیٹے کو لے کے چلی گئی اور جاگی ابھی ہوئی تو اس نے چلتے وقت بھلی کے دے دے ہوئے بھول اپنے بیٹے سے لگائے، اس کی آنکھیں ابڑا پائیں اور اس نے اپنے خاندان کا ہاتھ حام لیا اور چلتے چلتے گھاٹی کی گت سے میں غائب ہو گئی۔ گھاٹی کے آخری کمرے پر پہنچ کر اس نے حاکم بھلی کی طرف دیکھا اور بھلی منہ پھیر کر اور لائی و بار سے لگ کے روئے لگا۔ رہنماں کے رخصت ہوتے وقت بھی وہ اسی طرح رو رہا تھا۔ بیکار کے جاتے وقت بھی اسی شدت، اسی غلوں، اسی اذیت کے کرنا کہ احساس سے مجبور ہو کر وہ جاتا چھٹی بھلی کے لیے نہ رہنماں رکی، نہ بیکار، نہ جاگی، اور بھر بک سکتے ساتوں کے بعد نورماں آئی تھی اور اس کا دل اسی طرح دھڑکنے

لگا تھا اور یہ سحر کی روزِ مجددِ جادو جی بلی ہاتی تھی۔ شرور شروع میں نوراس کی حالتِ غیر تھی۔ اس کا چہرہ محال تھا مگر غلی کی آنکھ کو ششوں سے دھم بھرتے چلے گئے۔ پیپ کم ہوتی گئی، مزاح دور ہوتی گئی، سوجن غائب ہوتی گئی، نوراس کی آنکھوں میں ہنک اور اس کے سپید چہرے پر صحت کی سرخی آ گئی اور جس روز غلی نے اس کے بازوؤں کی پٹی اتاری تو نوراس نے اپنا ہتھیرا ایک اعلیٰ آنکھ کے ساتھ اس کے سینے سے لپٹ کر دھونے لگی اور جب اس کے پاؤں کی پٹی اتاری تو اس نے پاؤں میں چندی رہ پائی اور ہاتھوں پر، اور آنکھوں میں کاہل لگا یا پھر ہاتھوں کی دلیں سنواریں تو غلی کا دل مسرت سے چڑکڑیاں بھرنے لگا۔ نوراس غلی کو دل دے غلی تھی۔ اس نے غلی سے شادی کر لیا تھا۔ فیروز کا بیٹا اور پٹھاری کا بیٹا دونوں باری باری کئی دفعہ اسے دیکھنے کے لیے اس سے معافی مانگتے تھے، اس سے شادی کا بیچن کرنے کے لیے ہتھال آئے تھے، اور نوراس انہیں دیکھ کر ہر بار گھبرا جاتی، نکالنے لگتی، مزاح کے دیکھنے لگتی اور اس وقت تک اسے صحت نہ آتا جب تک وہ لوگ چلے نہ جاتے۔ اور غلی اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا، اور جب وہ بالکل اچھی ہو گئی تو سارا گاؤں اس کا بیٹا گاؤں اسے دیکھنے کے لیے لے لے گاؤں کی چھوری اچھی ہو گئی تھی، ان کو صاحب اور کپڑا صاحب کی صرپائی سے، اور نوراس کے ماں باپ بچے جاتے تھے اور آج تو فیروز بھی آ گیا تھا اور پٹھاری بھی اور دونوں خروباغ لڑکے بھی جو اب نوراس کو دیکھ کر کچھ کچھ اپنے کیے پر چیمان ہو رہے تھے اور پھر نوراس نے اپنی ماں کا سہارا لیا اور کاہل میں تیرتی ہوئی لڑکا آئی آنکھوں سے غلی کی طرف دیکھ کر چپ چاپ اپنے گاؤں بلی گئی۔ سارا گاؤں اسے لینے کے لیے آیا تھا اور اس کے قدموں کے پیچھے پیچھے فیروز کے بیٹے اور پٹھاری کے بیٹے کے قدم تھے اور یہ قدم اور دوسرے قدم، اور سنگڑوں قدم، اور نوراس کے ساتھ بلی رہے تھے، غلی کے بیٹے کی گھائی پر سے گزرتے گئے اور پیچھے ایک دھوئی کر دھیر سے لئی رہ گزرا پھوڑ گئے۔

نوراس کی داری پر دیوار کے ساتھ لک کے سسکیاں لینے لگا۔

بڑی خوبصورت روہانی زندگی غلی کی تھی، جوں جوں اس پاس تھا، تیس روپے ٹکڑا وہاں تھا، چند روپے میں اوپر سے نکالیتا تھا۔ غلی جو جوان تھا، جو محبت کرتا تھا، جو اک چھوٹے سے ٹنگے میں رہتا تھا، جو اچھے لوگوں کے افسانے چڑھتا تھا اور عشق میں رہتا تھا، اس قدم قدم لپٹ اور روہانی اور ہر کیف زندگی غلی کی تھی، کالو بھنگی کے حلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ

- ۱۔ کالو بھنگی نے بنگاں کی لہو اور پیپ سے بھری ہوئی پیٹیاں دھوئیں۔
- ۲۔ کالو بھنگی نے بنگاں کا بول دراز صاف کیا۔
- ۳۔ کالو بھنگی نے ریشم کی غلیٹ پیٹیاں صاف کیں۔
- ۴۔ کالو بھنگی نے غلیٹ کے بیٹے کو کئی کے بیٹے کھانا تھا۔
- ۵۔ کالو بھنگی نے ہانگی کی گھوئی پیٹیاں دھوئیں اور ہر روز اس کے کمرے میں بھانجی چھڑکا، اور شام سے پہلے داری کی کھڑکی بند کرنا اور آئینہ دھن میں لکڑیاں جلا دینا کہ جاگتی کوسر دی نہ لگے۔

کالو بھنگی نے ریشم کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے نوراس کو جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ بھی وہاں سے لگ کر نہیں رہا۔ وہ پہلے تو دو ایک لمحوں کے لیے حیران ہو جاتا مگر اسی حیرت سے اپنا سر کھانے لگتا اور جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ ہتھال کے نیچے کھینچوں میں چلا جاتا اور گائے سے اپنی چند چوڑیاں لگتا لیکن اس کا ذکر تو میں پہلے کر چکا ہوں۔ پھر اور کیا لکھوں، قہارے دارے میں کالو بھنگی، سب کچھ تو کہہ دیا، جو کچھ کہتا تھا، جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ تو بھاری ٹکڑا تیس روپے ہوتی تو نڈل پاس یا نڈل ہوتے، جنہیں دراصلت میں کچھ گھر تھپ رہا، کچھ

تھوڑی سی انسانی مسرت اور اس مسرت کی جلدی ملی ہوئی تو میں تمہارے مصطفیٰ کوئی کہانی نکلتا۔ اب تمہارے آخودہ پہ میں کیا کہانی نکلوں۔ ہر بار آج آخودہ میں کو الٹ پیچھے رکے دیکھتا ہوں۔ چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا چمک، ایک روپے کا تھپکا، کو آخودہ آئے کی جانتے، چار روپے کا گڑ، چار روپے کا مصلیٰ، سات روپے کا اور ایک روپے کا۔ آخودہ پہ ہونگے۔ کیسے کہانی بنے گی تمہاری کا لوہا بھل، تمہارا افسانہ مجھ سے نہیں نکلا جائے گا۔ چل جاؤ، دیکھو میں تمہارے سامنے چار روپے کا ہوں۔

مگر یہ محسوس ابھی تک نہیں کھڑا ہے۔ اپنے اکڑے پٹے پٹے کندے راجستھان کے لالے اپنی پہوئی ایسی ہنس رہا ہے۔

[illegible]

"میں نے اپنے پر کی ہر ذرہ سے چٹائی۔"

١٠٠

”اباں“ ”سہولتوں کے لئے آواز دی۔“

مکتبہ اعلیٰ اسلامیہ اسلام آباد

پھر کا لو بھگت نے کہا ”میرا خیال ہے وہ مگرنگی ہوگی تمہارے ناموں کے پاس۔“

نہر کے دو کوس اور انہیں بخت یا رکی اناس ملی۔ برف گر رہی تھی اور وہ بجلی جا رہی تھی۔ کرتی، چلتی اور علقی جھنکی، بانہنی، کانہنی آ کے جھنکی بجلی جا رہی تھی اور جب بخت پار نے اسے پکڑا تو اس نے ایک لمبے کے لیے حراست کی۔ پھر وہ اس کے بازوؤں میں گر کر بے ہوش ہو گئی اور بخت یا رکی بجلی نے اسے تمام لیا اور اسے پھر وہ اسے باری باری سے اٹھاتے چلے آئے۔ بخت یا رکو کا کونٹھلی اور جب دو دگ واناس کھر پیچھے تو بالکل اندھا میرا ہو چلا تھا اور انہیں واناس آتے تو کچھ کر سکتے تھے تو نے گئے اور کونٹھلی ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا اور اس پر کھر کھانے لگا اور دھیر

ادھر دیکھئے لگا۔ پھر اس نے آپت سے دروازہ کھولا اور وہاں سے چلا آیا۔ ہاں بخت یار کی زندگی میں بھی افسانے ہیں، چھوٹے چھوٹے خوبصورت افسانے بگڑا کر بھیجی میں تمہارے متعلق اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں اپنی مثال آپ کے ہر شخص کے بارے میں بکھڑا ہضم و کھارہ کر سکتا ہوں لیکن تمہارے متعلق آغا بکھر کر بے لے کے ہو چکی کچھ میں نہیں آتا کہ تمہارا کیا کیا جائے۔ خدا کے لیے اب تو چلے جاؤ، بہت سناں قائم کرنے۔

لیکن مجھے معلوم ہے، یہ نہیں جانتے گا۔ اسی طرح وہاں پر سوار ہے گا اور میرے افسانوں میں اپنی غلیظ جھاڑو لیے کھڑا رہے گا۔ اب میں بھٹکتا ہوں تو کیا چاہتا ہے۔ تو وہ کہانی سننا چاہتا ہے جو سوئی نہیں لیکن ہو سکتی تھی۔ میں میرے پاؤں سے شروع کرتا ہوں، میں تو چاہتا ہے کہ کوئی تیرے گمے کھروے پاؤں دھو ڈالے۔ دھو دھو کے ان سے طاقت دور کرے، ان کی جانوں پر مہر م لگائے تو چاہتا ہے تیرے گتھوں کی اگھری ہوئی ہڈیاں گوشت میں چھپ جائیں۔ تیری رانوں میں طاقت اور تخی آ جائے۔ تیرے پیٹ کی سرمھائی ہوئی سلوٹس عاب ہو جائیں۔ تیرے کمر پر سینے کے گرد طہار سے اٹنے ہوئے بال عاب ہو جائیں تو چاہتا ہے کوئی تیرے ہونٹوں میں دس ڈال دے انہیں گویا کی بجائے دے۔ تیری آنکھوں میں چمک ڈال دے، تیرے گالوں میں لہو بھر دے، تیری چاندی کو گتھے بالوں کی انگلیں صاف کر دے، تجھے ایک مصفا لہاں دے دے، تیرے ارد گرد ایک چھوٹی سی چادر بھاری کھڑکی کر دے، مسکین، مصفا، یا کیزو۔ اس میں تیری بیوی راج کرے، تیرے بچے قہقہے لگاتے بھریں، جو بکھڑا چاہتا ہو جس میں کر سکتا۔ میں تیرے ٹوٹے ٹوٹے ہونے والوں کی روحانی ہوشی بچاتا ہوں۔ جب تو گائے سے اپنا سر پٹاؤتا ہے مجھے معلوم ہے تو اپنے غلیظ میں اپنی بیوی کو دیکھتا ہے جو تیرے بالوں میں اپنی انگلیاں بھیر کر تیرا سر سہا رہی ہے حتیٰ کہ تیری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، تیرا سر جھک جاتا ہے اور تو اس کی صوایں آغوش میں سوجاتا ہے اور جب تو آہستہ آہستہ آگ پر میرے لیے کئی کاہنا سینکا ہے اور مجھے جس صحت و شفقت سے وہ دیکھنا دکھاتا ہے تو اپنے ذہن کی پہنائی میں اس ننھے بچے کو دیکھ رہا ہوتا ہے جو تیرا چٹا نہیں ہے، جو ابھی نہیں آیا، جو میری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا لیکن جس سے تو نے ایک شفیق باپ کی طرح پیار کیا ہے تو نے اسے گدیوں میں کھلایا ہے، اس کا منہ چڑا ہے، اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر جہاں بھر میں گھمایا ہے۔ وہ کچھ لوہے سے میرا چٹا۔ یہ ہے میرا چٹا اور جب یہ سب ہو چکے ہیں طاقت سب سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا اور حیرت سے اپنا سر کھانے لگا اور میری انگلیاں لاشعوری انداز میں کھینچ لگیں، ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ۔ آخر وہ رہے۔ میں تیری وہ کہانی چاہتا ہوں جو ہو سکتی تھی لیکن ہو نہ سکی کیونکہ میں افسانہ نگار ہوں، میں اکیلی کہانی کھڑک سکتا ہوں۔ اس کے لیے میں اکیلے کائی نہیں ہوں۔ اس کے لیے افسانہ نگار اور اس کا چھٹے والے اور ڈاکٹر اور کیمپنڈ دار و بخت یار اور گاؤں کے پٹاری اور خیر و دار اور دکاندار اور حاکم اور سیاست دان اور مزدور اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان ہر شخص کی، انکوں، گردنوں، ابروؤں آدمیوں کی آنکھیں دھوپا ہے۔ میں اکیلا مجبور ہوں، بکھڑا نہیں کر سکتا گا۔ جب تک ہم سب مل کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے، یہ کام نہ ہو گا۔ اور تو اسی طرح اپنی جھاڑو لیے میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا اور میں کوئی عظیم افسانہ نہ لکھ سکوں گا جس میں انسانی روح کی عمل سرست جھلک اٹھے اور کوئی معجز عظیم قدرت دھیر کر سکے گا جس میں جادوی قوم کی عظمت اپنی بلندیوں کو چھو لے، اور کوئی ایسا گیت نہ لکھ سکے جس کی پہنائی میں کائنات کی آفاقیت جھلک جائے۔

پھر جڑ دنگی لیکن نہیں جب تک تو جھاڑو لیے یہاں کھڑا ہے!

ایسا ہے کھڑا۔ پھر شاید وہاں کبھی آ جائے کہ کوئی تھکے سے تیری جھاڑو بھڑا دے اور میرے ہاتھوں کو زخمی سے قائم کر تجھے تو میں توجہ

کے پاس پارے جائے۔



مستاز مفتی

نام	مفتی محمد حسین
قلمی نام	مستاز مفتی
پیدائش	۱۱ اکتوبر ۱۹۰۵ء بمقام خانہ (مطبخ) گورداسپور، پنجاب۔
وفات	۲۷ اکتوبر ۱۹۹۵ء اسلام آباد، پاکستان۔
تعلیم	پہلے اسے اسلامیہ کالج دریچے سے دو ڈیگرا اور ۱۹۲۹ء ایس۔ اے۔ وی۔ سینٹرل نیچرل سائنس کالج لاہور ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۲ء ڈیپلوم ان ٹیچنگ اینڈ ٹیپ، لاہور ۱۹۲۹ء۔ ۱۹۳۰ء

مختصر حالات زندگی:

مفتی محمد حسین کے ہاں پیدائش ہوئی جو محمد تقییم پنجاب سے وابستہ تھے۔ ابتدائی تعلیم خانہ، امرتسر، میانوالی، ملتان اور ڈیرہ غازی خان میں پائی۔ بھٹک ۱۹۲۱ء میں ڈیرہ غازی خان سے لاہور آئے۔ اے۔ اے۔ ۱۹۲۷ء میں ہندو سیمینار کالج امرتسر سے کیا۔ اسلامیہ کالج، لاہور سے ۱۹۲۹ء میں بی۔ اے کرنے کے بعد سینٹرل نیچرل سائنس کالج میں دو ڈیگرا جہاں سے ٹیچنگ مکمل کرنے کے بعد محمد تقییم پنجاب کے سینٹر انگلش کالج کے طور پر خانہ آل، دھرم سال، گوجرہ، چک بھمرہ، جام پور، ساہیوال، باغیان پور، قصور، شیخوپورہ، ساہیوال اور گورداسپور کے اسکولوں میں ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۵ء چمچے رہے۔ لاہور میں طالب علمی کے زمانے میں سید فیاض محمود اور مجید ملک کے ساتھ دوستی رہی جس نے اولیٰ ذوق کو ابھارا۔ ۱۹۳۳ء میں ان۔ م راشد سے ملاقات میں لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ پہلے دو مضامین گوجرہ ہائی سکول کے مدرسے اور رسالہ ”تکستین“ لاہور میں شائع ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں بطور صحافی آرٹسٹ اسکرپٹ رائٹر آل انڈیا ریڈیو لاہور کے ساتھ منسلک ہو گئے جہاں ان کی ۱۹۶۷ء میں ادارہ کارکن اور تنظیم کارکن (اداکارہ پی سی اے) کی قیادت میں ”سٹور فمز“ میں دو ادوار بھیجی سے منسلک ہو گئے۔ کرشن چندر اور بھارتی کے ساتھ قیام رہا

اور سلو ٹھکر کے لیے قلم ”رضیہ سلطانہ“ کی کہانی لکھی، مگر میں نے اپنے اہم مردانے تیار کیا تھا۔ یہ فلم لہذا اس کی نذر ہو گئی اور ممتاز رفیق نے ۱۹۴۷ء میں واپس لاہور آ گئے۔ ۱۹۴۸ء، ۱۹۴۹ء میں بلور سب اپنے بڑے ہفتہ وار ”استحقاق“ لاہور نکالا۔ ۱۹۴۹ء میں پہلی بار سی پاکستان امپریوز میں سراج کورسٹ بر گئے۔ لیکن یہ ٹھکر ۱۹۵۰ء میں نوٹ کیا۔ اسی سال بلور سب آدھ اسٹار کے ساتھ رات کو کھینچ دینے پر تقرار کھل کے ساتھ ملنگ ہو گئے جہاں ۱۹۵۱ء تک رہے۔ ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۷ء، اسٹریٹ ڈاکٹر رضیہ آفیسر کھینچ چلیں ڈاکٹر کیٹر جے، واپس پڑی رہے جہاں سے ۱۹۵۷ء میں تھیل کے بلور قلم آفیسر D.A.F. کراچی بھیج دیا گیا۔ ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۰ء وینچ اینڈ ڈاکٹر کیٹر جے کراچی میں رہے۔ ۱۹۶۰ء میں قدرت اشرفیاب (تھکر لڑی رائے اطلاعات) کے نو فیس ڈی کے طور پر ایوان صدر اور پینڈی آ گئے جہاں ۱۹۶۳ء تک رہے۔ اب ان کا چارلہ بلور اسٹریٹ ڈاکٹر کیٹر وزارت اطلاعات، واپس پڑی کر دیا گیا جہاں ۱۹۶۵ء تک کام کیا۔ ۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۶ء تک اور انیس ڈی، وزارت اطلاعات، واپس پڑی رہے۔ ۱۹۶۶ء میں ریڈر ہو گئے۔ آخری زمانے میں وزارت اطلاعات اور براڈ کاسٹنگ سے حلقے تھے۔ آپ کے اپنے بیان کے مطابق ابتدا میں دو دستوں کی، مگر ٹھکر ان کے بچے کی رٹور مل، ڈاکٹر ٹھیکل اور ڈاکٹر یونگ نے متاثر کیا۔“

اولین مطبوعہ افسانہ:

”جنگلی جلی آنکھیں“ مطبوعہ: ”کولبی دیا“ لاہور (سالنامہ) ۱۹۳۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ ”ان کی“ (ستر افسانے) مکتبہ اردو لاہور طبع اول: ۱۹۴۳ء
 (۱) آپ (۲) چنگی (۳) جنگلی جلی آنکھیں (اولین افسانہ مطبوعہ ۱۹۳۶ء) (۴) آپ جی (۵) اندھرا (۶) غلام (۷) یہ دہلی (۸) طہرت (۹) طر (۱۰) قتل آؤ (۱۱) کرن جلی کا بھوت (۱۲) مہندی والا ہاتھ (۱۳) اندھا (۱۴) کالے کھجے کا گل (۱۵) سورا (۱۶) انتقام (۱۷) سیانی
- مکتبہ اردو لاہور کے ساتھ معاً ۲۹ ماہ قبل ۱۹۴۳ء کو ملے پائے۔
- ۲۔ ”کھپا گئی“ (چھ افسانے) مطبوعہ ساگر انڈیا لاہور طبع اول: ۱۹۴۳ء
 (۱) بد معاش (۲) حسان کی مرضی (۳) کدہ کدہ (۴) سہ ہو گئی (۵) جب اور اب (۶) چ (۷) دام خیال (۸) زندگی (۹) شرابی کا راز (۱۰) اس کو سہ میں (۱۱) خراب (۱۲) اصداف (۱۳) ڈاکٹر کا استقبال (۱۴) دریا گم (۱۵) کالے طہیر
- ۳۔ ”چپ“ (چھ افسانے) مکتبہ اردو لاہور طبع اول: ۱۹۴۵ء
 (۱) نیلی (۲) چپ (۳) لپ (۴) حسان غلی (۵) شائستہ (۶) بابی (۷) دریا (۸) ہم ہم نگر (۹) تین خدا (۱۰) پاگل (۱۱) کدہ کدہ (۱۲) گہرائیاں (۱۳) سہارا (۱۴) پینڈی ڈاکٹر (۱۵) پیارا ہاتھ
- مکتبہ اردو لاہور کے ساتھ معاً ۲۵ جنوری ۱۹۴۵ء کو ملے پائے۔ اس کتاب کا دریا چھوڑ کر تو نسوی نے لکھا ہے جبکہ رفیق کا نا کوشیزہ روایتی (احمد شیر) کا تھریہ کر رہا ہے۔

(۱) صحیح داسارہ (۲) راس لاپاس (۳) اپنے رے پے پوجان (۴) جہار بھاتا (۵) کوئی اٹھ (۶) ماسق (۷) موقد (۸) کوہ پاتھو
(۹) سوچا رکھ کر (۱۰) گھوچی (۱۱) ماس (۱۲) ستر کھلے کا خاندہ (۱۳) خدا بخش (۱۴) گھور اندھیرا (۱۵) کریم کی
لہریں (۱۶) آپ جیتی (۱۷) گور کے ڈھیر۔

کتبہ جدید، لاہور کے ساتھ ساتھ ۴۲، بٹوری ۱۹۵۳ء کو طبع پایا۔

ایک زمانے میں چاروہ کا سب سے ختم ہوا دل چیر ہوا۔ ۱۹۶۹ء میں حیات افشاں ساری نے ”لیو کے پھول“ (چانچ پلہریں) (گھوکر
مٹی کا پیر یا کار توڑ یا گھوڑا ب اوچھڑا تھا) ایک کا ”گرتی و پارتی“ اس سے بھی ختم ہوا دل ہے۔ مطلق صاحب کے اپنے بیان کے
مطابق اس ناول کے مضامین کو ”کڑی کولا“ کہیں تو خان پور (بلتان) (گوجرہ) (گوجرہ) (گوجرہ) (گوجرہ) (گوجرہ) (گوجرہ) (گوجرہ) (گوجرہ) (گوجرہ)
غازی خان (ظہیرتے ہیں)۔ اس ناول کے چار ایٹھ شائع ہوئے۔ طبع دوم، بھری لاہور ۱۹۶۹ء، طبع سوم، سنگ میل،
لاہور ۱۹۸۵ء اور طبع چہارم سنگ میل، لاہور ۱۹۹۹ء۔ آخری ایٹھ میں کرداروں کے اصل ناموں کی فہرست بھی شامل کر دی گئی
ہے۔

(۱) گڑیا گھر (۲) کھنٹوں والا پایا (۳) چار گھٹ (۴) اڑائی معاملہ (۵) بیٹا کے پاؤں (۶) کوہ پاتھو (۷) کاراٹ روڈ
(۸) نیلی رنگ (۹) مٹی (۱۰) نوان اور مضیہ (۱۱) گھر کی عزت (۱۲) بہادر گرتی (۱۳) بھرا گھر (۱۴) پودہ بیکس۔

(یہ کتاب دو جلدوں میں شائع تمام علی ایڈ سنٹر، لاہور نے ۲۰۰۷ء

میں شائع کی ہے)

کتاب کا سہارا ۱۹۸۱ء میں طبع پایا۔

(۱) سندھ کا کراکشی (۲) بٹش اور بھڑ (۳) پچک (۴) پامروں کی وضو (۵) کھل بندھا (۶) کوہ پاتھو (۷) کوہ پاتھو
(۸) کھیرا حویلی (۹) آغا اور اہلدار نہیں (۱۰) پھڑ مولا (۱۱) ایک قہار شاہ (۱۲) بلیکٹر (۱۳) برائی شراب کی دکان
(۱۴) مٹوانی کی دکان (۱۵) رو (۱۶) ان چرلی (۱۷) کوہ پاتھو (۱۸) بستہ دج (۱۹) اور ستا
کتاب کا سہارا ۱۹۸۳ء میں طبع پایا۔ کل صفحات ۲۳۲ ہیں۔

- ۱۲۔ ”سے کا بزمِ حسن“ (افسانے) فیروز سنز، لاہور، طبع اڈول، ۱۹۸۶ء
- (۱) سے کا بزمِ حسن (۲) ساری بات (۳) چٹ پگڑی (۴) چٹ کاڑی، ہوٹکا ہوٹکا موسمِ چن (۵) ایک ہاتھ کی تالی (۶) انا اناٹ (۷) درجی (۸) گرین با (۹) بھٹی اور مفریت (۱۰) گرہاں داس گرہ (۱۱) دو مچھی (۱۲) کس لیے؟ کیا اس لیے؟ (۱۳) کدو حافے پاتھ (۱۴) کدو نمبر ۱۵۱۔ ۱۵۲ اڈاس (۱۶) بیڑی سرکار (۱۷) لایا جان اب میں اب (۱۸) قمر زمین۔
- ۱۳۔ ”کو کئے لوگ“ (خاکے) اعجاز بشکلی بھروہی پبلی کیشنز، لاہور، طبع اڈول، ۱۹۸۶ء
- (کتاب کا معادہ ۱۹۸۳ء میں طبع ہوا۔)
- ۱۴۔ ”مجموعہ اداس“ (مضامین، سرچرٹاؤں) مطبوعہ: فیروز سنز، لاہور، طبع اڈول، ۱۹۸۶ء
- ۱۵۔ ”نکلیات“ (بچوں کے لیے) مطبوعہ: اردو سائنس بورڈ، لاہور
- ۱۶۔ ”تین لوگ کہا جاتا“ (بچوں کے لیے) مطبوعہ: اردو سائنس بورڈ، لاہور
- ۱۷۔ ”گولیاں واٹھ“ (دو جلدیں) (بچوں کے لیے) مطبوعہ: اردو سائنس بورڈ، لاہور
- ۱۸۔ ”تین لوگ قفسے“ (بچوں کے لیے) مطبوعہ: اردو سائنس بورڈ، لاہور
- ۱۹۔ ”مطلعات“ (افسانوی کہانیاں) مطبوعہ: فیروز سنز، لاہور، طبع اڈول، ۱۹۸۹ء
- ۲۰۔ ”اراد کئے لوگ“ (خاکے) مطبوعہ: فیروز سنز، لاہور، طبع اڈول، ۱۹۹۱ء
- ۲۱۔ ”اکو گری“ (سوانحی ناول) مطبوعہ: فیروز سنز، لاہور، طبع اڈول، ۱۹۹۲ء
- ۲۲۔ ”کی نہ جائے“ (افسانے) مطبوعہ: فیروز سنز، لاہور، طبع اڈول، ۱۹۹۲ء
- ۲۳۔ ”جماعتِ اسلامی“ (تجزیہ ممتاز حسین عاصی کے فرض نام سے) مطبوعہ: کتب چھپ، لاہور، طبع اڈول، ۱۹۶۳ء
- ۲۴۔ ”Delusion of Grandeur“ (فرض نام سے) مطبوعہ: کتب چھپ، لاہور، طبع اڈول، ۱۹۶۵ء
- ۲۵۔ ”کو کئے لوگ“ (خاکے) مطبوعہ: فیروز سنز، لاہور، طبع اڈول، ۱۹۹۳ء

غیر ملکی زبان:

ان مطبوعہ کتب کے علاوہ اتحاد ادبیاتی اور اداس نے اپنی پبلشر بشری تقریری اور مضامین فیروز سنز، لاہور میں شائع کئے ہیں۔

زندگی میں مستقل رہا:

مکان نمبر ۱۲، گلی نمبر ۳۳، ٹیکسٹ ۱/۶، اسلام آباد۔

اعزاز:

۱۔ ستارہ امتیاز، حکومت پاکستان کا اعلیٰ سول اعزاز

آپ

ممتاز مفتی

دب کبک بیٹھے، اٹھائے مجھے آپا یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے آگے چھوڑنا بلور کی دیوار آ جاتا ہے نور خم لو سے مل رہا ہوں۔

لکھے یاد ہے کہ ایک رات ہم سب چپ چاپ باورچی خانے میں بیٹھے تھے میں، آپا اور امی جان، کہ چھوڑا چور بھاگتا ہوا آیا۔ من دونوں بد چھ سات سال کا ہو گا۔ کہنے لگا: "امی جان! میں بھی یاد کروں گا۔"

"تو ابھی سے؟" "اماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بلکہ کہنے لگیں۔" "اچھا بد چھارا یاد آپا سے کہیں؟"

"اماں کہنے لگیں۔" "کیوں آپا کو کیا ہے؟"

"ہم تو چھابڑا بنی سے یاد کریں گے۔" بد نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا۔

"کو نہیں!" بد نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اماں نے آپا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگیں: "کیوں، بد کیجھ تو آپا کیسی اچھی ہیں؟"

"میں تافان کسی سے؟" وہ چلا ہوا۔

"ہاں تافان تو بھلا۔" اماں نے پوچھا۔ بد نے آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھا جیسے کچھ دھڑل رہا ہو۔ پھر اس کی نگاہ چھ لے کر

رکئی، چھ لے میں اپنے کا ایک جلا ہوا گھڑا پڑا تھا۔ بد نے اس کی طرف اشارہ کیا اور بولا: "کیسی!" پھر غلی کی رشتن بلب کی طرف اٹھی اٹھا کر بیٹھنے

لگا۔ "اور چھابڑا بنی اسکا!" اس بات پر ہم سب دیر تک بیٹھے رہے۔ دستانے میں تصدیق بھائی آگئے۔ اماں کہنے لگیں۔ "تصدیق، بد سے پوچھنا تو

آپا کیسی ہیں؟" آپا نے تصدیق بھائی کو آتے ہوئے دیکھا تو مدد کر دیں بیٹھ گئی جیسے ہنسی چکانے میں تھک ہو۔

"اماں تو کسی سے؟ یاد بد؟" دو ٹوٹے۔ "تافان؟" بد چلا ہوا اور اس نے، بچے کا گھڑا اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ تافان وہ اسے ہاتھ،

میں لے کر ہمیں دکھانا چاہتا تھا مگر آپا نے صحت اس کا ہاتھ بکھریا اور اٹھی چلا تے ہوئے بولی: "ادب!" بد روئے لگا تو اماں کہنے لگیں، بچکے اسے

ہاتھ میں نہیں اٹھاتے اس میں چنگاری ہے۔۔۔ ”وہ تو جادو ہوا ہے انا اس جادو نے سورجے ہوئے کہا۔ اماں بولیں۔ ”نصرے لال قہقہیں معلوم نہیں اس کے اندر تو آگ ہے۔ اوہ سے نہیں دکھائی دیتی۔“ بدو نے بھرلے کپت سے پوچھا۔ ”کیوں آپ اس میں آگ ہے؟“ اس وقت آپا کے منہ پر ہلکی سی سرفی دوڑ گئی۔ ”میں کیا جانوں؟“ وہ سحرانی ہوئی آواز میں بولی اور پھٹکی اٹھا کر ہنسی ہوئی آگ میں بے صرف پھر گئیں مارنے لگی۔

اب میں سمجھتی ہوں کہ آپا دل کی گھرائیوں میں جتنی بھی غم اور وہ گھرائیاں اتنی ہی محبت تھیں کہ بات ابھرتی بھی تو نکل نہ سکتی۔ اس روز بدو نے کیسے بچے کی بات کہی تھی مگر میں کہا کرتی تھی۔ ”آپا تم تو بس چندہ دیتی ہو۔“ اور وہ مسکرا کر کہتی۔ ”جی ہاں“ اور اپنے کام میں لگ جاتی۔ ویسے تو وہ سارا دن کام میں لگی رہتی تھی۔ ہر کوئی اسے کسی نہ کسی کام کو کہہ دیتا اور ایک ہی وقت میں اسے کئی کام کرنے پڑ جاتے۔ اور بدو چچا۔ ”آپا میرا دلہیا۔“ اور ہا گھورتے۔ ”سجادہ ابھی تک پانے کیوں نہیں پئی؟“ سچ میں اماں بولی انھیں۔ ”جینا دھوئی کب سے باہر کھڑا ہے؟“ اور آپا پیپ چاپ سارے کاموں سے نہت لیٹی۔ یہ تو میں خوب جانتی تھی مگر اس کے باوجود جاننے کیوں اسے کام کرتے ہوئے دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کام کر رہی ہے یا وہ اتنا کام کرتی ہے۔ مجھے تو بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ کتنی بھی رہتی ہے اور اسے دوسرے اور گردن موڑنے میں بھی اتنی دیر لگتی ہے اور چلتی ہے تو چلتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ میں نے آپا کو کبھی قہقہہ مار کر ہنسنے نہیں سنا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مسکرا دیا کرتی تھی اور بس۔ البتہ وہ مسکرایا کھنکھرتی۔ جب وہ مسکراتی تو اس کے ہونٹ کھل جاتے اور آنکھیں پلک جاتیں۔ ہاں تو میں سمجھتی تھی کہ آپا تو کئی تھکی ہی رہتی ہے۔ ذرا انھیں ٹپتی اور میں چلے لڑکھ کر یہاں سے وہاں نکلتی جاتی ہے جیسے کسی نے اسے دھکیل دیا ہو۔ اس کے برعکس سارا حیرتے میں بٹتی تھی جیسے دار سے کی تال پر پڑا ہو اور اپنی خالہ زاد بہن ساجو ہائی کو چھنے دیکھ کر تو میں کبھی خاک کھتی۔ جی چاہتا تھا کہ ہائی ہمیشہ میرے پاس رہے اور چلتی چلتی اس طرح گردن موڑ کر پیچ آواز میں کہے۔ ”میں جی ان کیوں پئی؟“ اور اس کی کافی کھلی آنکھوں کے گوشے مسکراتے لگیں۔ ہائی کی بات بات مجھے کتنی پیاری تھی۔

سارا وہ اور شیا ہمارے چاروں میں رہتی تھیں۔ دن بھر ان کا مکان ان کے قہقہوں سے گونجتا رہتا جیسے کسی مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ بس میرا ہی چاہتا تھا کہ انھیں کے گھر جا رہوں۔ ہمارے گھر میں رکھائی کیا تھا۔ ایک بیٹہ بڑے دانی آپا ایک۔ ”یہ کرو۔“ وکر۔ ”دانی اماں اور دل بھرے میں گڑ گڑ کرنے والے۔

اس روز جب میں نے کہا کوئی سے کہتے ہوئے سنا۔ ساجو تو وہ ہے مجھے بے حد غصہ آیا۔ ابا کہنے لگے۔ ”سجادہ کی ماں معلوم ہوتا ہے سارا کے گھر میں بہت سے برتن ہیں۔“

”کیوں؟“ اماں پوچھنے لگیں۔

کہنے لگے۔ ”بس قادیان دین برتن ہی بچتے رہتے ہیں اور ہاتھتے ہیں جیسے میلہ لگا ہو۔“

اماں تک کر بولیں۔ ”مجھے کیا معلوم۔ آپ تو بس لوگوں کے گھر کی طرف کان لگانے بیٹھے رہے ہیں۔“

ابا کہنے لگے۔ ”انہو امیرا تو یہ مطلب ہے کہ جہاں لڑکی جہاں ہوئی برتن بچتے لگے۔ بازار کے اس موڑ تک لوگوں کو کچھ ہو جاتی ہے کہ لڑکیاں گھر میں لڑکی جہاں ہو چکی ہے۔ مگر انھیں ہمارے گھر میں یہ بات نہیں۔“ میں نے ابا کی بات سنی اور میرا دل کھولنے لگا۔ ”بڑی آئی ہے۔“ سجادہ۔ جی ہاں اپنی بیٹی جو ہوئی۔ ”اس وقت میرا ہی چاہتا تھا کہ جا کر باور پئی خانے میں بیٹھی ہوئی آپا کا منہ چڑھائیں۔ اسی بات پر میں نے

دن بھر کھانا نہ کھایا اور دل ہی دل میں کھلچکی رہی۔ ابا جان سے ہی کیا ہیں۔ جس خطے کا اور گھر گھر کر کے آیا یا زیادہ سے زیادہ کتاب کھول کر جھونکے اور گنت مٹ۔ گنت مٹ کرنے لگے جیسے کوئی بھلیاری کھلی کدو نے جھون رہی ہو۔ سارے گھر میں لہوے کے صرف نقدی بھائی ہی تھے جو درپوش تھیں کیا کرتے تھے اور جب ابا گھر سے نہوے تو وہ ہماری آواز میں گایا بھی کرتے تھے۔ جانے وہ کیوں ماسٹر تھا۔ ہاں

چپ چپ سے وہ ہلنے لگا، آنکھوں میں نمی تھی۔
 ہارک کی آنکھوں میں، ہارک سا فساد ہے۔

آپ انھیں کہتے ہوئے سن کر کسی نہ کسی بات پر مسکرا دیتی اور کوئی بات نہ ہوتی تو وہ بد کو بولنے کا سہجہ مار کر کہتی: ”بدو بدو، نا“ اور پھر آپ ہی ہنسی مسکراتی رہتی۔

تصوفی بھائی میرے بھرپور ہونے کی بجائے تھے۔ انھیں ہمارے گھر آنے کی جگہ ہونا ہوتے ہوں گے۔ کالج میں پڑھتے تھے۔ پہلے تو وہ وہاں بورڈنگ میں رہا کرتے تھے پھر ایک دن جب چھوٹی آئی ہوئی تھی تو باتوں باتوں میں ان کا ذکر چلا گیا۔ پھر بھی کہنے لگی بورڈنگ میں کھانے کا انتظام ایک شخص لڑکا آئے دن کیا رہتا ہے۔ اس اس بات پر غوطہ کھینچیں۔ کہتے تھیں "اپنا کمرہ جو ہے تو بورڈنگ میں پڑے رہنے کا مطلب؟" پھر ان دونوں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ اس کی قیادت ہے کہ ان کی پچھلی تمام باتیں بے فائدگی ہیں۔ غرضیکہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے بعد تصوفی بھائی بورڈنگ کو چھوڑ کر مارے ہاں آ گئے۔

تصديق بھائی مجھ سے اور بدو سے بڑی گنجیں ہانکا کرتے تھے۔ ان کی باتیں بے حد دلچسپ ہوتیں۔ بدو سے تو وہ دن بھر نہ آتے۔ البتہ آپا سے وہ زیادہ باتیں نہ کرتے۔ کرتے بھی کیسے، جب کبھی وہ آپا کے سامنے جاتے تو آپا کے دوپٹے کا پلچا آپ ہی آپ سرک کر ختم کھوکھٹ سا بن جاتا اور آپا کی ہنسی بھگی آکھیں جبکہ چاتیں اور وہ کسی نہ کسی کام میں حذرت سے مصروف دکھائی دیتے۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ آپا ان کی باتیں غور سے سنا کرتی تھیں گو کبھی کبھو نہ تھیں۔ بھائی صاحب بھی بدو سے آپا کے حلقے پر چپے رہتے تھیں صرف اسی وقت جب وہ دونوں اکٹھے ہوتے۔ پوچھتے۔ ”بدو تھادی آپا کیا کر رہی ہے؟“

۱۱۳ آیت: "وہ (انسان) جو ایمان لائے اور عمل صالح کیا۔"

بہال صاحب گھبرا کر کہتے: "میں نہیں۔ اچھا، دو آج نہیں، اپنی نگاہوں طرف نہیں دیکھا نہیں۔"

نور شب بید کا دھیان ادھر ادھر ہو جاتا تو وہ صحرا دار میں کہتے۔ "مگر بے پار تم تو صفت کا قلعہ دار ہو۔"

[illegible]

ایک دن میں، آقا اور اہل باور محسن میں غلطی تھیں۔ اس وقت بھائی صاحب اندر اپنے کمرے میں بدو سے کہہ رہے تھے ”میرے یار ہم تو اس سے زیادہ کریں گے جو ہم سے انگریزی میں ہائیں کر سکتے، کتابیں پڑھ سکتے، طریق، کیرم اور چڑیا کھیل سکتے۔ چڑیا بانے ہو؟ وہ کوئل کوئل پر دیں والا گیند بٹے سے یوں ڈانڈیں، ڈانڈ اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمیں مزے دار کاٹنے کا کھلا سکتے، کیجئے؟“ بدو بولا: ”ہم تو چھاپہ ہائی سے زیادہ کریں گے۔“

”اگر آپ؟“ بھائی صاحب نے کہا۔
 بدو چپٹے لگا: ”میں جانتا ہوں تم آج سے زیادہ کرو گے۔ ہاں؟“ اس وقت اماں نے مسکراتر آ پاکی طرف دیکھا۔ مگر آ پاسنے پاؤں کے انگوٹھے کا تختہ توڑنے میں اس قدر مصروف تھی جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ اندر بھائی صاحب کہہ رہے تھے۔ ”داہتھاری آ پافرئی پکاتی ہے تو اس میں چاری طرح شرکی نہیں ڈالتی۔ بالکل پکی۔ آج تم؟“

بدو نے کہا: ”ابو کہتے ہیں فرنی میں کم جھٹھا ہونا چاہیے۔“
 ”تو وہ اپنے اماں کے لیے پکاتی ہے نہ۔ ہمارے لیے تو نہیں؟“
 ”میں کہوں آ پاسے؟“ بدو چکا۔

بھائی چلانے ”لو پکھا۔ ڈھٹور، تو تمہیں ڈھٹور ایسٹ کرو کھا نہیں۔۔۔ بدو کھواس طرف ڈالک ڈالک۔“ بدو بھر چلانے لگا۔ ”میں جانتا ہوں تم میرا ہمار ہے ہونا؟“ ”ہاں ہاں اسی طرح ڈھٹور پکاتا ہے نہ۔“ بھائی صاحب کہہ رہے تھے۔ ٹھٹھکیں میں، اچھا بدو تم نے کبھی کھٹکی کڑی ہے آ آ ہم کھٹکی کڑی۔ میں ہوا کا ماور تم بدو پھلان۔ لو آ ڈھٹور، جب میں نہیں کہوں، تو اس کے ساتھ ہی انہوں نے دم آواز میں کہا: ”اے داہتھاری وہ تو مجھے بہت کھٹکی پکاتی ہے۔“

میرا خیال ہے آ پافنی خدک سکی اس لیے وہ اندر کہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ میرا تو فنی کے بارے دم نکلا ہمار داہتھار اماں نے اپنے منہ میں دو پٹے ٹھوس لایا تھا کہ آواز نہ لکے۔

میں اور آ پادوں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بھائی صاحب آ گئے۔ کہنے لگے: ”کیا پڑھ رہی ہو جینا؟“ ان کے منہ سے جینا سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ حالانکہ مجھے اپنے نام سے بے حد عورت تھی۔ خود جہاں کہا پڑھا نام ہے۔ بولتے ہی منہ میں ہاں دہائی کا حرا آنے لگتا ہے میں تو نور جہاں سن کر یوں محسوس کرتی تھی جیسے کسی تاریخ کی کتاب کے پوسیدہ ورق سے کوئی بوڑھی اماں سونا نکلتی ہوئی آ رہی ہوں۔ مگر بھائی صاحب کو نام پڑ کر سے مسرور دینے میں کمال حاصل تھا۔ ان کے منہ سے جینا سن کر مجھے اپنے نام سے کوئی نکلا یہ حیرت انگیز اور میں محسوس کرتی گو یا ایران کی شہزادی ہوں۔ آ آ کوہ کوہ سے جہد سے کہا کرتے تھے مگر وہ تو پرانی بات تھی، جب آ پاجھوئی تھی۔ اب تو بھائی جان اسے جہد سے نہ کہتے بلکہ اس کا پورا نام تک لینے سے گھبراتے تھے۔ خیر میں نے جواب دے دیا۔ ”سکول کا کام کر رہی ہوں۔“

پوچھنے لگے ”تم نے کوئی برفروشا کی کتاب چھی ہے کیا؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔“
 انہوں نے میرے اور آ پاسے دو میان دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری آ پاسے تو“ ہارٹ بریک ہاؤس“ پڑھی ہوگی۔“ وہ ٹھٹھکیوں سے آ پاکی طرف دیکھ رہے تھے۔

آپ نے انھیں اٹھائے بغیر ہی سر ہار دیا اور وہ ہم آواز میں کہا ”نہیں“ اور سو نظر بنے میں لگی رہی۔

بھائی باہن بولے ”اوہ کیا تانیں جیہا کہہ دیا کچھ ہے، دیکھو ہے، دیکھو، خالص شہداء تم اسے ضرور چھو۔ بالکل آسان ہے یعنی امتحان کے بعد ضرور چھو، میرے پاس چڑی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ضرور چھو کی۔“

بھر پوچھنے لگے۔ ”میں کیا ہوں تمہاری آپ نے سبک کے بعد چھو کھڑا کیوں دیا؟“

میں نے چکر کہا۔ ”مجھے کیا معلوم، آپ خود ہی پوچھ لیجئے۔“ حالانکہ مجھے اگلی طرح سے معلوم تھا کہ آپ نے کالج میں جانے سے کیوں انکار کیا تھا۔ کئی قسمی حیرتوں کا کالج جانے کوئی نہیں چاہتا، وہاں لڑکیوں کو کچھ کرنا یا معلوم ہوتا ہے گو کہ کوئی لاش کاہ وہ۔ وہاں تو معلوم نہیں ہوتی جیسے مطالعے کے بہانے میل لگاؤ۔ ”مجھے آپ کی یہ بات بہت بری لگی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ کمر میں جھنڈے کے لیے کالج جاتا نہیں جانتی۔ بڑی آئی تھی کچھ جھنڈے۔ اس کے علاوہ سب کچھ بھائی باہن آپ کی بات کرتے تو میں خواہ مخواہ چن جاتی۔ آپ بات کا جواب تک نہیں دیتی اور یہ آپ کر رہے ہیں اور پھر آپ کی بات مجھ سے پوچھنے کا مطلب؟ میں کیا ٹیلیفون تھی؟ خود آپ سے پوچھ لیجئے اور آپ انہیں ہونی گم سم آپ انہیں ملی۔

شام کو با کھانے پر بیٹھے ہوئے چلا گئے۔ ”آج فرنی میں اتنی فکر کیوں ہے؟ قد سے ہونٹ چپکے جاتے ہیں۔ ہمارا ہمارا بھائی کچھ اتنی سستی ہو گئی ہے۔ ایک طرف لاشیں مشکل ہے۔“

آپ کی ہنسی جتنی آنکھیں بھوم رہی تھیں۔ حالانکہ وہ سب کچھ ابا جان تھا ہوتے تو آپ کا ایک زور دیا جاتا۔ کمر اس وقت اس کے کال تھا رہے تھے، کہنے لگی۔ ”شاہ زاد پوچھ گئی ہو۔“ یہ کہہ کر وہ باور پی خانے میں چلی گئی اور میں رات میں رہی تھی۔ ”شاہ۔“ کہا خوب۔ ”شاہ۔“

اور ابا جد سترہ بڑا ہوا ہے تھے۔ ”پار پانچ دن سے دیکھ رہا ہوں کہ فرنی میں کدو بڑھتی جا رہی ہے۔“ مگر اسے اباں روزی روزی آئیں اور آتی ہی ابا پر ہنس پڑیں، جیسے ان کی عادت ہے۔ ”آپ تو تازہ نکرتے ہیں۔ آپ ہکا بھکا پتھر کرتے ہیں تو کیا باقی لوگ بھی کم کھائیں؟ افسر کے کمر میں جڑاں لگا ہے اس کا تو خیال کرنا ہے۔“ ابا کو باہن جھڑپنی مشکل ہو گئی، کہنے لگے۔ ”اوسے یہ بات ہے مجھے بتا دیا ہوتا تو میں کچھ اباں سہارا کی ہاں۔“ اور وہ دونوں کمر پھر کرنے لگے۔

آپ اس سحرہ کے گھر جانے کو تیار ہوئی تو میں بڑی حیران ہوئی۔ آپ اس سے ملنا تو کیا بات کرنا پڑی تھی۔ بلکہ اس کے نام پر ہی ناک بھون چڑھایا کرتی تھی۔ میں نے خیال کیا ضرور کوئی سبب ہے اس بات میں، کبھی کبھار ساحرہ وہاں کے ساتھ چار پائی کھڑی کر لے اس پر چڑھ کر ہماری طرف بھاگتی اور کسی دن کسی بہانے سلسلہ گفتگو کو دور کرنے کی کوشش کرتی تو آپ بڑی بڑی بدلی سے وہ ایک باتوں سے اسے ہال دیتی۔ آپ ہی آپ بول اٹھتی۔ ”ابھی تو اس کا کام پڑا ہے اور میں یہاں کھڑی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ باور پی خانے میں جاتے تھی۔ خیر اس وقت تو میں چپ چاپ بیٹھی رہی مگر وہ آپ بات بگنی تو کچھ دیر کے بعد چپکے سے میں بھی ساحرہ کے گھر جا چکی۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے ذکر پھیر دیا۔ ”آج آپ آئی تھی؟“

ساحرہ نے غصہ سے پاش لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں کوئی کتاب منگوانے کو کہہ گئی ہے نہ جانے کیا نام ہے، اس کا ہاں! ادا ہے بریک باؤس۔“

آپ اس کتاب کو مجھ سے چھپا کر وہاں میں منتقل رکھتی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ رات کو وہاں بار بار کبھی میری طرف اور کبھی کھڑی کی طرف

دیکھتی رہتی۔ اسے یوں مضطرب دیکھ کر میں دو ایک جھوٹی انگلیاں اٹھتی اور ہر کتاب بند کر کے رضائی میں یوں پڑ جاتی جیسے موت سے گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں۔ جب اسے بتایں ہو جاتا کہ میں سوچتی ہوں تو دور در کھول کر کتاب نکال لیتی اور اسے پڑھنا شروع کر دیتی۔ آخر ایک دن مجھ سے خفا کیا۔ میں نے رضائی سے حد نکال کر پوچھ لی۔ ”آپ یہ بات بے ایک ہنس کا مطلب کیا ہے۔ دل توڑنے والا کلمہ؟“ اس کے کیا معنی ہوئے؟ ”آپ پہلے تو صبر کریں، پھر وہ سنیں گے کہ میں نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی خاموشی سے مل کر کہا۔“

”اس لحاظ سے تو ہمارا انگریز ہارٹ بے ایک ہے۔“

کہنے لگی۔ ”میں کیا جانوں؟“

میں نے اسے جھانک کر کہا۔ ”ہاں! ہماری آپا بھلا کیا جائے؟“ میرا خیال ہے یہ بات ضرور اسے بری لگی۔ کیونکہ اس نے کتاب دیکھ دی اور بتائی بچہ کر سکتی۔

ایک دن یوں ہی مہرے مہرے میں بھائی جانی کے کمرے میں جا چکی۔ پہلے تو بھائی جانی اور اصرار کی باتیں کرتے رہے پھر چہ پھنے لگے۔ ”بھئی! اچھا یہ جانتا تھا کہ تمہاری آپا کو فروت ملا دھاتا آتا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”میں کیا جانوں؟ جا کر آ پاتے پوچھ لیتے۔“ ”میں نے کہنے لگے۔ ”آج کیا کسی سے لڑ کر آئی ہو؟“

”کیوں میں لڑا کا ہوں؟“ میں نے کہا۔

بولے۔ ”فحش! ابھی تو اس کی ہوشیاری کی دن لڑا کا ہو جاتا۔“ اس پر میری ہنسی نکل گئی۔ وہ کہنے لگے۔ ”کوئی جیتا بھگے لڑا ہے جو بد پند ہے۔ میں تو اس کی لڑکی سے بھا کر ہوں گا جو ہر گز سے شام تک لڑے۔“ ”جانے کیوں میں شرمائی اور بات بد لسنے کی خاطر پوچھا۔“ ”فروت ملا دیا ہوتا ہے بھائی جان؟“

بولے۔ ”وہ بھی کچھ ہوتا ہے۔ سفید سفید مال مال کا لالہ لالہ، سفید سفید مال مال۔“ میں ان کی بات سن کر بہت فحش! مہر کہنے لگے۔ ”وہ بھگے بہ بد پند ہے۔ یہاں تو جیتا ہم فحش! لڑا کر آتا ہے۔“ میرا خیال ہے یہ بات آپا نے ضرور سن لی ہوگی۔ کیونکہ اسی شام کو وہ باورچی خانے میں بیٹھی ”نصحت خانہ“ پڑھ رہی تھی۔ اس دن کے بعد روز بلا تاخیر وہ کھانے پکانے سے فارغ ہو کر فروت ملا دھاتا بھانے کی مشق کیا کرتی اور ہم میں سے کوئی اس کے پاس چلا جاتا تو جھٹ فروت ملا دھاتا کھینچ لیتی۔ ایک روز آپا کو بھانے کی خاطر میں نے بد سے کہا۔ ”بدو بھلا بھلا کھینچی جو آپا کے پیچھے پڑی ہے اس میں کیا ہے؟“

بدو بھلا بھلا کھینچی کھینچی کھینچی بد کو دہاتی ہی پڑی۔ مہر میں نے بد کو اور بھی جھکا دیا۔ میں نے کہا۔ ”بدو بھلا کھینچی بھائی جان سے تم کچھ اس کھانے کا کیا نام ہے۔“

بدو بھائی جانی کے کمرے کی طرف جانے لگا تو آپا نے اندر کر دیا کھینچی اس سے جھگڑا لیا اور میری طرف گھور کر دیکھا۔ اس روز پہلی مرتبہ آپا نے بھگے کیوں گھورا تھا؟ اسی رات آپا کا نام ہی سے لیت لگی، بھگے صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ رضائی میں پڑی ہوئی ہے۔ اس وقت بھگے اپنی بات پہ بہت افسوس ہوا۔ میرا بی بی جانتا تھا کہ اندر کر آپا کے پاس پڑ جائیں اور اسے طلب پڑا کریں مگر میں نے بی بی جیپ چاہی۔ بی بی اور کتاب کا ایک قصہ تک نہ پڑ سکی۔

انہی دنوں میری خالہ زاد بہن ساجدہ بھگے ہم سب سا جو ہائی کیا کرتے تھے۔ بھلک کا امتحان دینے کے لیے ہمارے گھر آ گھری۔

ساجو ہائی کے آنے پر ہمارے گھر میں رونق ہو گئی۔ ہمارا گھر بھی قبضوں سے کوخِ اٹھا۔ ساحرہ اور شایا چار پانچوں پر کھڑی ہو کر ہائی سے باتیں کرتی رہیں۔ بد چہارہ ہائی چہارہ ہائی چلتی پھرتا اور کہتا۔ "اہم تو چہارہ ہائی سے بات کریں گے۔"

ہائی کہتی۔ "نفل تو دیکھو اپنی، پہلے منہ دھو آؤ۔" بھر وہ بھائی صاحب کی طرف یوں گردی سوزنی کی کالی کالی آنکھوں کے گوشے منکرنے لگتے اور ٹھٹھان میں پہنچتی۔ "ہے بھئی جا آن کیوں ہی؟"

ہائی کے منہ سے "بھئی جا آن" کچھ ایسا بھلا سنی رہا کہ میں خوشی سے بھولی نہ ہائی۔ اس کے برعکس جب بھی آ یا "بھائی صاحب" بھئی تو کیا بھرا معلوم ہوتا۔ گویا وہ اسی شخص بھائی کی ہدیٰ بھرا ہوا "صاحب" جیسے طعن میں بکھ بھنسا ہوا ہو مگر ہائی "صاحب" کی جگہ "جا آن" کہہ کر اسے روکے اندر میں جان ڈال دیتی تھی۔ "جا آن" کی کوخِ میں بھائی وہ پھاتا اور پچھلے ہی نہ ہوتا کہ وہ انہیں بھائی کہہ ہی ہے۔

اس کے علاوہ "بھئی جا آن" کہہ کر وہ اپنی کالی کالی چھکرا آنکھوں سے دھنکتی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں منکراتی تو سینے والے کو غصے پہ گمان نہ ہوتا کہ اسے بھائی کہا گیا ہے۔ آپا کے "بھائی صاحب" اور ہائی کے "بھئی جا آن" میں کتنا فرق تھا۔

ہائی کہتے تھے پر آ پا کا پیوند بنا ناگل پیوند نہائی رہا گیا۔ بدو نے بھائی جان سے کھیلنا چھوڑ دیا۔ وہ ہائی کے گرد حواف کرتا رہتا اور ہائی بھائی جان سے بھی شریخ بھی کیرم نہ کھیتی۔

ہائی کہتی۔ "بھئی جا آن ایک بڑا گنگے گا" یا بھائی جان کی موجودگی میں بدو سے کہتے "کیوں میاں بدو کوئی ہے جو ہم سے شریخ میں لڑنا چاہتا ہو؟" ہائی بول بھتی۔ "آپا سے جو بچے ہیں۔" "بھائی جان کہتے۔" اور تم؟" ہائی ہوت ہوت کی سوچ میں نہ جاتی، چہرے پر عہدہ کی پیدا کر لیتی، بھر میں سنا لیتی اور تیردی چہ ہا کر کھڑی رہتی پھر کہتی۔ "اوندو مجھ سے تو آپ ہٹ جائیں گے۔" "بھائی جان کھٹکھا کر ہنس نہتے اور کہتے۔" "اگل جی رہتی تھیں بھول گئیں کیا؟" وہ جواب دیتی۔ "میں نے کہا چلو بھئی جا آن کا کالوا کر دو۔ ورنہ دنیا کیا کہے گی کہ مجھ سے ہار گئے۔" اور ہر طرح ہنسی جیسے ہنسنے لگا رہے ہوں۔

رات کو بھائی جان اور چچی خانے میں ہی کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ آپا چپ چاپ چر لے کے سامنے بیٹھی تھی۔ بدو چہارہ ہائی چہارہ ہائی کھینا ہوا ہائی کے دو چنے کا پلہ پکڑے اس کے کھانے میں اس کا کھانا کھاتا۔ ہائی بھائی جان کو پھیل رہی تھی۔ کھلی تھی۔ "بھئی جا آن تو صرف ساڑھے چھ پینکے کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فیرنی کی بیٹ لٹل چائے تو قلعی مٹھا کھاتے ہیں۔ کر رہی بھی کیا۔ نہ کھاتی تو مرانی ناراض ہو جائیں۔ انہیں جو خوش رکھنا ہوا ہے، بھئی جا آن۔" ہم سب اس بات پر خوب ہنسے۔ پھر ہائی اور اور ہنسنے لگی اور آپا کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ آپا کے پیچھے فروٹ سدا کی کھتی نہی تھی۔ ہائی نے اس کا سر کا کر دیکھا اور کھتی کو اٹھایا۔ خوشتراس کے کہ آپا کا کچھ کہہ سکتے ہائی وہ کھتی بھائی جان کی طرف لے آئی۔ "لیجئے بھئی جا آن اس نے آنکھوں میں پینے ہوئے کیا۔" آپا گئی کیا کہیں گے کہ ساجو ہائی نے بھی بکھ کھلایا ہی نہیں۔"

بھائی جان نے دو تین دھچکے منہ میں فونٹس کر کہا۔ "خدا کی قسم بہت اچھا ہا ہے کس نے ہا ہے؟" ساجو ہائی نے آپا کی طرف گھبیں سے دیکھا اور پینے ہوئے کہا۔ "ساجو ہائی نے ہر کس نے بھئی جا آن کے لیے۔" بدو نے آپا کے منہ کی طرف غور سے دیکھا۔ آپا کا منہ لال ہو رہا تھا۔ بدو چلا اٹھا۔ "میں تاناؤ بھائی جان؟" آپا نے بدو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے گور میں اٹھا کر باہر پھینکی۔ ہائی کے قبضوں سے گھر کوخِ اٹھا اور بدو کی بات آئی گئی ہو گئی۔ بھولی جان نے ہائی کی طرف دیکھا۔ پھر جانے انہیں کیا ہوا۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آنکھیں ہائی کے چہرے پر گر گئیں۔ ہانے کیوں میں نے گھس کیا جیسے کوئی دیہاتی مجھے گھر سے باہر محبت دیا ہو۔ میں باہر چلی آئی۔ باہر

آپا، اچھی کے قریب کمزری تھی۔ اندر بھائی صاحب نے مہم آواز میں کہہ کیا۔ آپا نے کان سے دوپٹہ سرکا دیا۔ پھر باہی کی آواز آئی۔
 ”بھروسے چھوڑنے“ اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اگلے دن ام گن میں بیٹھے تھے۔ اس وقت بھائی جان اپنے کمرے میں بند رہے تھے۔ جو دھکی کہیں ادھر سی کیلیں رہا تھا۔ باہی صوب
 معمول بھائی جان کے کمرے میں بیٹھ گئی، کہنے لگی۔ ”آج ایک دھندنا تاہور ذکر دکھاؤں۔ کیا دانتے ہے آپ کی؟“ بھائی جان بولے۔ ”واہ،
 یہاں سے تنگ لگا دو تو جاتے کہاں جا پڑو۔“ نقاب انہوں نے باہی کی طرف زور سے چڑھا دیا ہوگا۔ وہ بیٹھنی ٹھیسے میں چلائی۔ ”واہ آپ تو بوجھ
 جی رہی سے بچھڑتے ہیں!“ بھائی جان سوال دلائے ”تو کیا ہاتھ ہے“ ”چپ خاموش“ ”باہی اچھی، اس کے بھاگنے کی آواز آئی۔
 ایک صحت تک تو کچھ دھڑکنے لگی ہوئی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

اسے میں کہیں سے بندھا کر آوا آ کر کہنے لگا۔ ”آپا اندر بھائی جان باہی سے کشش لازم ہے ہیں۔ چلو دکھاؤں قصیں چھو بھی۔“ وہ آپا کا
 بازو پکڑ کر کھینچنے لگا۔ آپا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور وہ بہت بٹی کمزری تھی۔ جو دانتے آپا کو پھوڑ دیا۔ ”ماں کہاں ہے؟“ اور وہاں کے
 پاس جانے کے لیے دوڑا۔ آپا نے کپکپ کرے گاؤں میں اٹھا دیا۔ ”آؤ قصیں مضامی دوں۔“ وہ دوسرے ٹکڑے آپا بولیں۔ ”آؤ دیکھو تو کسی اچھی
 مضامی پاس۔“ گورا سے باور پڑی خانے میں لے گئی۔

اسی شام میں نے اپنی کتابوں کی امدادی کھولی تو اس میں آپا کی بارٹ بریک۔ ڈاکس پڑی تھی۔ شاید آپا نے اسے وہاں رکھ دیا ہو۔ میں
 حیران ہوئی کہ یہ کیا ہے۔ مگر آپا باور پڑی خانے میں چپ چاپ بیٹھی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کے پیچھے فروٹ سلاؤ کی کشش خانی پڑی تھی۔
 البتہ آپا کے ہونٹ ہنسنے ہوئے تھے۔

بھائی صاحب اور باہی کی شادی کے دو سال بعد ہمیں پہلی بار ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اب باہی دو باہی نہ تھی۔ اس کے وہ قہقہے
 بھی نہ تھے۔ اس کا رنگ زرد تھا اور اسے چہرے پر جس طرح چٹھی تھی۔ بھائی صاحب بھی چپ چاپ رہتے تھے۔ ایک شام ماں کے علاوہ ہم سب باور پڑی
 خانے میں بیٹھے تھے۔ بھائی کہنے لگے۔ ”دوسرا سو سے چاہ کر دے؟“
 ”کوئی؟“ ”بندوئے کہا۔“ ”ہم ہا کر رہی گئی نہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”بھائی جان یاد ہے جب وہ کہا کرتا تھا۔ ہم تو چھا جو باہی سے ہا کر رہی گئی۔“ ماں نے پوچھا۔ ”آپا سے کہوں
 نہیں؟“ تو کہنے لگا۔ ”تاؤں آپا کیسی ہے؟“ پھر چلے میں بٹے ہوئے اپنے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ ”اکیں؟“ اور چھا جو باہی؟ میں نے
 ہادی طرح بھلی کے روشن پہلی کی طرف بھلی سے اشارہ کیا۔ ”اکیں؟“ میں اسی وقت بھلی بھگتی اور کمرے میں انگاروں کی روشنی کے سوا اور میرا
 چھا کیا۔ ”ہاں یاد ہے!“ بھائی جان نے کہا۔ پھر جب باہی کی کام کے لیے باور پڑی کی تو بھائی کہنے لگے۔ ”ند جانے اب بھلی کو کیا ہو گیا۔“ بھلی
 اچھی سی رہتی ہے۔ ”آپا چپ چاپ بیٹھی چلے میں راکھ سے دلی ہوئی چنگاریوں کو کر رہی تھی۔ بھائی جان نے مضمون ہی آواز میں کہا۔ ”اف
 سکتی سردی ہے؟“ پھر اٹھ کر آپا کے قریب چلے گئے۔ سامنے ہاتھ پائے اور ان سے کہنے لگے۔ ”سمرنی کچ کہتی نہیں
 کہ ان بھٹسے ہوئے اپاں میں آگہ دہی ہوتی ہے۔ اوہ سے نہیں دکھائی رہی۔ کہاں ہوئے؟“ آپا پر سے سر کے گئی تو جھمی ی آواز آئی جیسے
 کسی دہی ہوئی چنگاری پر پانی کی جوندہ چلی ہو۔ بھائی جان صحت بھری آواز میں کہنے لگے۔ ”اب اس چنگاری کو تو نہ بھاؤ تو دے۔“ دیکھو تو سختی
 خضر ہے؟“

کوثر چاند پوری

نام	سید علی، کنیت ابو القدر
تلفی نام	سید علی کوثر آکثر چاند پوری
پیدائش	۱۳ اگست ۱۹۰۹ء، بہ مقام چاند پور، ضلع بجنور
وفات	۱۳ جون ۱۹۹۶ء، بہ مقام جاسو گر، ریلوئی (بھارت)
تصمیم	علیہ کمال (علیہ مہرود، بھاری، انگریزی)

مختصر حالات زندگی:

تھیم سید علی بھٹو کے ہاں چاند پور ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ایک زمانہ میں علیہ کالج بھوپال میں استاد رہے اور پھر پارلیمنٹ منتخب ہوئے۔ پندرہ عبادت اور انسانیت نگاری رہا۔ افسانہ نگار، ناول نویس، مضمون نگار اور محقق نویس کے طور پر شہرت پائی۔ آخری دنوں میں جیف میڈیکل آفیسر (ہوائی) اور وزیر تک ہوم ریلوئی تھے۔ لکھنا، جاسو گر ریلوئی میں وفات پائی۔ تدفین ہامہ علیہ اسلام کے قبرستان میں ہوئی۔

اولیٰین افسانہ:

”گدا گدہت“ مطبوعہ: ۱۹۳۶ء، دوسرے کے ایک پرچے میں شائع ہوا۔

تلفی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ ”مٹی حن اور دوسرے قصائے“ (السانے)
 - ۲۔ ”دلچپ قصائے“ (السانے)
 - ۳۔ ”مختصر تنگ“ (السانے)
- مطبوعہ: احمد رضا فاؤنڈیشن، کراچی
 طبع اول: ۱۹۶۹ء سے قبل
 طبع دوم: ۱۹۶۳ء

- ۴۔ ”زنجیریں چنے“ (افسانے) مطبوعہ: سید عبدالرزاق تاجر کتب، حیدرآباد دکن
- ۵۔ ”عورتوں کے افسانے“ (افسانے) مطبوعہ: کتب اردو لاہور، طبع اول: ۱۹۳۷ء
- ۶۔ ”نونا کی جوت“ (افسانے) مطبوعہ: کتب اردو لاہور، طبع اول: ۱۹۳۸ء
- ۷۔ ”تھک و شر“ (افسانے)
- ۸۔ ”ہسکرا بھیڑ“ (افسانے)
- ۹۔ ”دنگھڑا افسانے“ (افسانے) مطبوعہ: صدیقی پبلی کیشنز، طبع اول: ۱۹۳۸ء
- ۱۰۔ ”توک جھوک“ (افسانے) مطبوعہ: طبع عہد آفریں، حیدرآباد دکن
- ۱۱۔ ”چام چم“ (افسانے) مطبوعہ: طبع عہد آفریں، حیدرآباد دکن، طبع اول: ۱۹۳۱ء
- ۱۲۔ ”نسب کی بوی“ (ناول) مطبوعہ: طبع عہد آفریں، حیدرآباد دکن، طبع اول: ۱۹۵۴ء
- ۱۳۔ ”بچہ ہوں کی بستی“ (ناول)
- ۱۴۔ ”راکھ اور گھیاں“ (ناول)
- ۱۵۔ ”دانش و عشق“ (مجموعہ)
- ۱۶۔ ”آوازوں کی صلیب“ (افسانے)
- ۱۷۔ ”کاروانی غبار“ (دور و مقام)
- ۱۸۔ ”ویرانیاں“ (مجموعہ تحقیق)
- ۱۹۔ ”جہان غالب“ (مجموعہ تحقیق)
- ۲۰۔ ”ناٹا نگار پیرنی“ (مجموعہ تحقیق)
- ۲۱۔ ”محبت اور سلطنت“ (ناول)
- ۲۲۔ ”ڈھانچے“ (ناول) مطبوعہ: سید عبدالرزاق تاجر کتب، حیدرآباد دکن
- ۲۳۔ ”عشق حد کیسے“ (ناول)
- ۲۴۔ ”تو زور زنجیریں“ (ناول)
- ۲۵۔ ”فریاد موتی کی ڈائری“ (ناول)
- ۲۶۔ ”سر جھانگلی“ (ناول)
- ۲۷۔ ”سنگھی جہازیں“ (ناول) مطبوعہ: مکتبہ جامعہ ایف۔ اے۔ ایل، طبع اول: ۱۹۸۳ء
- ۲۸۔ ”راست کا سورج“ (۲۹ افسانے) شری رام پتر، ۱۹۳۷ء، دہلی نمبر ۱، طبع اول: ۱۹۷۶ء

۲۹	"چتر کا گلاب" (ناول)	مکتبہ فکر و شعور	طبع اڈال ۱۹۷۹ء
۳۰	"کون سا ہے بنگران" (ناول)		
۳۱	"تکیم حاصل جان" (شخصیت اور خاندان)		
۳۲	"ایمان" (ناول)	مکتبہ انوار احمدی پریس ہال آباد	طبع اڈال ۱۹۳۳ء
۳۳	"افروز" (ناول)		
۳۴	"جاسی جوانی" (ناول)		طبع اڈال ۱۹۵۵ء
۳۵	"بی منزل" (ناول)	مکتبہ حضور بک بیچ دہلی	طبع اڈال ۱۹۶۳ء
۳۶	"سحرانی زندگی" (ناول)		
۳۷	"سرج کور"		
۳۸	"شہر ناول"		
۳۹	"کوڑھان" (آپ بقی)		
۴۰	"اعجازی مہر مطیع" (تاریخ)	مکتبہ احمدیہ قادیان و طبعی، کراچی	طبع اڈال ۱۹۵۹ء
۴۱	"بھرا کھانوں" (تجلیں)	مکتبہ حقی اور بیچ دہلی	
۴۲	"شیخی اور دوسرے افسانے" (خارج)	مکتبہ لائٹ ہاؤس، لاہور	
۴۳	"آدم خور" (تغریض)	مکتبہ دفتر کتابت، لاہور	
۴۴	"کھجور مٹا کر مکان" (سوانح)	مکتبہ آگرہ اخبار پریس، آگرہ	۱۹۳۹ء سے قبل
۴۵	"عالمی دلائل غالب" (بچوں کے لیے)	مکتبہ انوار احمدی پریس ہال آباد	۱۹۳۳ء سے قبل
۴۶	"روشنت" (بچوں کے لیے)	مکتبہ انوار احمدی پریس ہال آباد	۱۹۳۳ء سے قبل
۴۷	"علم و قہار" (بچوں کے لیے)	مکتبہ انوار احمدی پریس ہال آباد	۱۹۳۳ء سے قبل
۴۸	"چالاک بھڑیا" (بچوں کے لیے)	مسعود پبلشنگ ہاؤس، حیدرآباد دکن	
۴۹	"بھروسہ کی کان" (بچوں کے لیے)	مسعود پبلشنگ ہاؤس، حیدرآباد دکن	
۵۰	"سوچیں بھڑیا" (بچوں کے لیے)	مسعود پبلشنگ ہاؤس، حیدرآباد دکن	
۵۱	"بچپن کی بستی" (بچوں کے لیے)	مسعود پبلشنگ ہاؤس، حیدرآباد دکن	
۵۲	"کڑے کا خواب" (بچوں کے لیے)	مکتبہ حیدرآباد کیلی، حیدرآباد دکن	
۵۳	"مسعود کا شہزادہ" (بچوں کے لیے)	مکتبہ کتب خانہ، حیدرآباد دکن	طبع اڈال ۱۹۳۳ء
۵۴	"دو دن اور دوست" (بچوں کے لیے)	مکتبہ کتب خانہ، حیدرآباد دکن	طبع اڈال ۱۹۳۳ء سے قبل
۵۵	"نعت کا پھل" (بچوں کے لیے)	مکتبہ کاروان ادب، کراچی	

۵۶۔ "لیکل دیوار" (مذہل)

۵۷۔ "ماواختم"

طبع اول ۱۹۴۷ء

اعزاز:

۱۔ پوٹی اردو اکیڈمی ایوارڈ

۲۔ مدھیہ پروٹیکشن اردو اکیڈمی ایوارڈ

۳۔ بہار اردو اکیڈمی ایوارڈ

زندگی میں مستقل ہوا:

۱۹۶۷ء، لاہور، جامو نگر، دہلی، بھارت۔

تظہیرِ فتن:

"ہمارا خاندان افسانہ نگاری سے یہ عرصہ چاہے کہ ہم ایک بہترین اخلاقی درس کو حسن و عشق کے ساتھ مل کر ایسے احوال پر پہنچا دیں کہ ازل الٰہ کی حرکت، حشرات، ہماری فکر و چلن کو جا کر نکال کر دے۔ ہمارے حواس میں ایک ایسی طیاء اور عوی پیدا کر دے کہ ہم دنیا کے ہر اندھیرے کو اس کی امداد سے بے کر چاہیں۔"

(پہ حوالہ: "چاہے" دیکھئے افسانے)

○

حوالہ جات:

۱۔ "بھارتی کے اردو مصنفین اور شعراء" مرتبہ: کرنلی چند، رنگ و مدیا، الطیف، اٹلی میں ۱۸ اگست ۱۹۷۹ء، دہلی سے نکلتا "بھارتی انٹرنیٹ ویب" "مرحبہ! لاہور، مدھیہ قریب میں ہمارے چھ اکل ۱۹۷۹ء، دہلی سے شہر سے نہیں۔

۲۔ "نور کوشا" ہندی سے ایک انٹرویو، از: "نور کوشا" دہلی، ۱۹۷۹ء، دہلی، لاہور، ۱۹۷۹ء

میرا پیشہ

کوثر چاند پوری

”جے بیہرام“

”جے بھگوان“

”راہ سے شہنام“

”جیہارام“

وہ تجزی سے پتا لگاؤ ہوا تھا ہر لوگ اس کے سامنے سے گزرتے رہے۔ جس پورا پورا پردہ بیٹھا تھا اس سے انٹیشن، مصداق گورو دارہ جانے والے بعد، کچھ اور مسلمان گزرتے ہی رہتے تھے۔ انٹیشن اور مصداق جانے والوں کے پیروں میں ٹپل یا ہوتے ہوتے، گورو دارہ جانے والے ننگے پاؤں ہوتے۔ ان کے پیروں کی آہٹ اس وقت کانوں میں آتی جب وہ بالکل قریب تک پہنچ جاتے یا آگے سے گزرتے ہوئے ٹھکیوں سے اس کی طرف دیکھتے۔ ان میں سے کبھی کو اس پر قفس نہ آتا۔ وہ سوچتے کہ بھر دیا جائے، یا انہیں آخری فیصلہ یہی ہوتا کہ نہ دیا جائے۔ نصف گھنٹہ بعد اسے خیال آیا کہ اب مصداق کی طرف جانے والے نہیں رہے۔ گورو دارہ سے بھی عورتیں اونٹے نکلتی۔ انٹیشن کی سمت آدھ روٹ کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا۔ سفر کرنے والے ذرا دیر کو نرم دل بھی ہو جاتے ہیں۔ ان کے احساس میں عداوتی کا جذبہ بھر جاتا ہے لیکن یہ عداوت غلط لگتا۔ اس نے اپنا راستہ بدلنا ضروری سمجھا اور گورو دارہ کے قریب بیٹھ کر بیٹھنے لگا۔

”جے گرو کی“

”جے بابا نام کی“

مردار عا مہان کمبوں میں نکلتے لگائے چپ چاپ گزرتے رہے۔ ان کے آنے کا وقت بھی نہ ہوا تو وہ بازار میں کھستار بن ڈھلے مسجد کے دروازے پر جا بیٹھا۔ وہاں خدا اور رسولؐ کے نام پر مانگتا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بائیں سے نہلا۔ پھر ایک بجلی سی لگی میں گھس کر اس نے

صدائیں لگائیں۔ اس کہانے نے دو دن کا سکس اس طرح اس کی طرف پھینکا جیسے کئی سال کی ذکوۃ نکال رہا تھا۔ اسے روٹی کی ضرورت تھی۔ وہ دوپہر میں گھنٹوں تک کھاتی تھی۔ وہ دوا نظر آتا تھا۔ دلوں پاؤں ٹھنکے میں وہ پک کر کھٹ گئے تھے۔ یہی وہ پکڑ گھنٹوں کے قریب اس نے روٹی کی گیندیں بانٹ دی تھیں۔ انھوں میں کھڑکی کے اوپر سے تھا۔ وہ دوا تھا۔ ان چیزوں کی مدد سے وہ پانچ سو روٹی کی ماہر چاروں ہاتھوں میں سے چا کر کتا تھا۔ اگلی میں پتلی مٹی سے لادے ہوئے گھر سے اگلی مٹی اور کتے بھی، گھنٹیں ایک آدھ گائے پانی پھرتی دکھائی دی۔

اس نے ایک دو منزل عمارت کے نیچے ٹھہر کر چلا آواز سے کہا:

”بے بے نام“

”بے بھگوان“

”نام سے بیام“

”بی بی رام“

ایک عورت نے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ دراصل وہ اس کو نہیں بلکہ اس گائے کو دیکھ رہی تھی جو اس کے پیچھے ذرا فاصلہ پر ڈالیوں کے کنارے چڑے ہوئے کیلے کے پھٹکے چھاتی اور چھتروں پر رکھی مال چاقی ایک ایک قدم آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ دو تین منٹ تک اسی جگہ بیٹھا اور دیکھتا رہا۔ عورت کا دل بھڑکا تو کچھ کر وہ اسی طرح ٹھٹھکے لگا۔ اس بار وہ ٹپٹپٹے پر وہ دم لپٹنے کو رکا۔ اسی وقت قہقہے سے کوئی چیز اوپر سے لگی میں گری۔ اس نے مزہ کر دیکھا عورت نے نیچے اوپر دیکھی ہوئی چھ سات روٹیاں گائے کے لیے بھینکی تھیں۔ بی بی رام کو چھ ہاتھ پیچھے ہٹ کر وہ گائے سے اچھا حق چھین لے لیکن وہ ایمان نہ کر سکا۔ مکان کے دو دروازوں پر آ رہی کڑے تھے وہ پھر دھچکے لگا ہاٹل ایک بے حقیقت کیلے کی طرح، راست ایک بیانی چائے پی کر اس نے بڑے آرام سے فٹ پاتھ پر گزاردی۔ وہ وہ تک اس کے ہم پیشہ چڑے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو راہ چلے لوگوں کی جھپٹیں کاٹ لیا کرتے تھے اور وہ بھی جو راست کو کسی دکان کا کالا توڑ کر پناہ حاصل لایا کرتے تھے۔ اس کے بازو میں لیٹا ہوا نوجوان ایک دم اپنے اوپر سے ہاٹ پیچک کر اٹھا اور مزہ کے کنارے کھڑی ہوئی کار سٹارٹ کر کے چلا نکلا۔ وہ سوچتا رہا کہ پڑا بیچ رہا تھا یا چور۔ سویرے سے ہی قحط پر متوجہ کر وہ ایک بہت بڑے میدان میں پہنچا۔ وہاں ایک آدمی کھیتروں کو انداز ال رہا تھا۔ کیونکہ سب جنگلی اور پروار تھے۔ وہ دور دور سے اڑ کر آ رہے تھے۔ اس نے اپنے کتے ہوئے جیروں کا گائے کے فضل جڑے ہوئے گھروں اور کھیتروں کے پروں سے مقابلہ کیا اور انسان کی فطرت غلطی پر پھر گیا اس نے سوچا کہ ٹھیک یا نکتے کا زمانہ نہیں اسے کوئی وعدہ کر لینا چاہیے۔ اسی وقت ایک نیا لیلال دھن سے ٹھہرایا۔ وہ فوراً اپنے کواڑ کی سمت مڑ گیا جہاں لیلوین کے دروازے پر کتا کھڑا ہوا تھا۔ وہ آٹھویں نمبر پر لگائیں میں کھڑا ہو گیا ایک ہی قطار میں کار پھر لیلوین نے چار لیلوین خواہ اپنے تھے۔ ان میں سے آدھے عورتوں کے لیے تھے۔ ان کا راست دوسری طرف سے تھا۔ مزہ کے دوسرے درخت پر ایک شاندار بلڈنگ تھی۔ اس کی دوسری اور تیسری منزل پر فلیش چنے ہوئے تھے۔ پتلی منزل کے کوارٹروں میں رہنے والے کار پھر لیلوین کی طرف ہوا۔ پالیس کے فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہ بھی نہیں ایک کواڑ میں رہتا تھا۔ جو اس کے ایک دشمن دار کے اوت ہو چکا تھا۔ وہ آج کل سسرال میں رہنے لگا تھا۔ صرف چند سال دیکھنے کی خاطر اسے یہی روٹی حصہ دینے کی اجازت دے دی تھی۔ راست کو وہ یہاں نہ پہنچ سکتا تو اپنی پانی کا کیرٹ پاتھ پر تھن کر لیتا جہاں کبھی کبھی پالیس والوں کے اڈوں کا حذر دیکھنا پڑتا۔ جب اس سے آٹھ آدمی لیلوین میں چلا گیا تو پیچھے سے ہڈت بانگش شروع ہونے لگا:

”ہمت نکلے آگے سے۔“

”کیوں؟“

”پہلے ہم جانیں گے۔“

”بھئی ہے یہ چڑت جی، مہندرنکس۔ تم کیوں کر جانتے ہو۔ آگے میں ہوں۔“

”ایک ہی جبری، لاسٹ باروں کا تو ڈالی میں جا کر سے گاؤں سے منا۔“

”تمہاری بھی ایسی تھی۔ میں اپنا بی ضرور ہوں مگر کان کول کر میں لو چڑت جی۔ مجھ سے اچھے ہو تو بہت بچھاؤ گے۔“

”اے ہمت بچ گئیں گے، لے لائی باری کا سودا کر لے مجھ سے۔“

”کاڈ کیا دیتے ہو؟“

”ایک آٹ۔“

”بھر گئے دو لاکھ میں۔ ایک ٹی بٹ ہے، ایک کھلی ہے جس میں رقم جانتے ہو۔“

”دو آ لے گا؟“

اس نے بارہ پیسے میں اپنی باری لگا دی اور چڑت جی کی جگہ سنبھال لی۔ تین چار منٹ کے اندر ہی وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ یہ روزگار بہت اچھا ہے۔ دوپے کی قیمت کرنے اور بد قسمتی ہوئی لوہنگائی کی وجہ سے انسان نے طبیب اور اخلاقی کو بھلا دیا ہے، اسے صرف اپنی ضروریات یاد رہ گئی ہیں۔ ہر چیز بدل رہی ہے، کمانے کے ذریعہ بھی تبدیل ہو چکے ہیں، مجھے بھی پرانا پیشہ چھوڑنا پڑے گا۔ اس کی جیب میں چڑت کے دیے ہوئے بار پیسے تھے اور اپنی باری پر لیٹرین نہیں کیا۔ جلد ہی لوٹ آؤ اور وہ لوگ والے سے چائے کو کیا۔

”کپ ہے نکلے سے میرے پاس۔“

”نہیں۔“

”اُپا اُپا لے لیے چھر پر رکھا ہے۔“

اس نے اُپا اُپا لیا اور ایک لاکھ سے اس میں گرم کریم چائے اُپیل دی۔

چائے پی کر اس نے اُپا دیا اور دھڑی پیے لگا۔ اسی وقت کاٹھی صاحب چائے پینے آ گئے۔ وہ دوسری منزل کے پہلے فلین میں رہتے تھے۔ وہ کاٹھی جی کو کچہ کر دیا۔

”اُپا اُپا لگ گئی تھی؟“

”کیا اُپا؟“ انہوں نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

”پچھلے پچھلے رکھا ہے! اس نے ٹھوکی بھیجی مٹھن کی۔“

”آپ سے کول کرنے لگا ننگرا، فقیر چائے پھلتی میں کولتے ہوئے پانی کو بھانستے ہوئے بولا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے اگلے دن کے لیے منصوبے بنائے شروع کر دیے اور بڑے کامزداری ڈانٹک سے کوارٹر میں رہنے والوں کا جائزہ لیا۔ وہاں چند وہیں کھینچے ہاتھ اور وہیں سے ایک لیٹرین میں ڈالا پڑا رہتا تھا۔ دوسرے پر روزانہ بی لکھ لائی گئی تھی، مجبور تھیں دھیر

خدا تعالیٰ تھیں، بچے، مانی پر بیٹھ جایا کرتے تھے، انکی سجا کوڑھ چھڑی جاگ گیا اور بندر کی چال پھٹا لیڑیوں کے سامنے جانتا تھا۔ وہاں ابھی خاکل چھڑکا جا رہا تھا۔ اس کی بو سے کوئی الجھن نہ ہوئی بلکہ سویرے ہی سویرے انگریزی دکانوں کی فی جلی ٹھیک دیکھا اچھی ہی گئی۔ انکی میں پہلا فیبرائی کا تھا۔ یہ بعد کھل صاحب کمانی کے جھگوں سے خاموش اور نیم بجا رہا لٹھا کا سینہ چڑے آئے۔ دور ہی سے لٹکار کر روئے۔

”سنا ہے گھر سے پہلا فیبرائی ہے۔“

”تو کیوں کر؟“

”ہم ہاتھ پاؤں والے ہیں، اچھی سے بیٹھیں تاکہ سمجھتے ہیں۔“

”ہاں تک داؤد لگائے بیٹھنا ہوں شریاں ہی۔“

”اور تیری جان ہے کے کوڑی کی۔“

”ہاتھ لگا کر سمجھو۔“

”میرا بیٹہ غراب ہے، لنگڑا دیں۔“

”دو ماں میرا بھی غراب نہیں کہ سب سے پہلے یہاں آ گیا ہوں۔“

”نہیں مانے گا بھائی بندی سے۔“

”وہی بھائی ہے ابھی نہیں؟“

”سارے پانچ، پاؤں ہوتے تو آ کاش سے تارے توڑ دیتا۔“

سہل صاحب کے ہاتھ میں ٹخن کاڑ پھنسا۔ اس میں سے بند ہو پانی ٹپک رہا تھا۔ وہ اصرار ہے تھے کہ پانی کم ہو گیا تو ابھرنے لگی یہ جانا پڑے گا، اس وقت تک کہ میں وہ چار آ رہی اور لگ جائیں گے۔ سہل صاحب نے سوا بدل کر کہا:

”بھٹ چاہیادے دے رہا ہے۔“

”مٹائی ہو رہی ہے۔۔۔ جھوڑ کے ٹنگتے ہی میں جاؤں گا۔“

”نہیں مانے گا۔“

”بالکل نہیں۔“

”لے پاؤں کا سک۔“

”یہ تو بیک بگے ابھی نہیں لیجئے خوشی سے۔“

”بس کاشی۔“

”دراور بڑھاؤ سہل کی، پیپ کی خاطر ادنیٰ جزا درمراجہ کر دیتا ہے۔ یہاں کھڑے کھڑے دروہ نے لگا تو ابھرنے لگا۔“

”گا۔“

”کی بہت ہیں۔“

”گھر میں ہی چٹ پکڑے کھڑے ہو۔“

آخر کار پارہ پیسے کے کر اس نے سہیل صاحب کے لیے اپنی باری چھوڑ دی۔ لائن لمبی ہوئی جا رہی تھی۔ کوارٹروں کے دروازے کھلنے لگے تھے۔ سڑکوں کی جانگ رات کے سناٹے سے الجھ رہی تھی۔ چنڈے ہاتھوں آج غائب تھے۔ وہ جن لوگوں کی کھر درگ سے واقف ہو گیا تھا انہیں کا منتظر رہتا تھا۔ اس نے کل دہشتی کے یہاں سہیل صاحب کو لون بھانک چکا تھے دیکھا تھا تو اسے یقین ہو گیا تھا کہ سہیل جی فوراً سرے ہی لیلین آئیں گے۔ چنڈے ال کرشن کے حلق سہی ہی جانتے تھے کہ وہ کراک ڈسٹری کے سربراہ ہیں۔ دن میں تین مرتبہ لیلی جاتے ہیں۔ آفس کا ہاتھ دو ہفتہ قبل ایک باہو جی کے ان کے ہائی کا گھر ہے۔ واٹھ بھی یہی تھا کہ انہیں دو چکر بہت سکون ملا تھا۔ ایک لیلی میں دوسرے ہسپتال میں۔ کل کے سٹا جوب کے پیش نظر چنڈے جی آج جلد اٹھ بیٹھے اور کان میں حملہ ڈالے۔ ڈب ہاتھ میں لیے لیلین کی سمت دوڑے۔ دور سے دیکھا کہ لنگڑا اور داؤد گھر سے ہوئے ہے۔ اس سے پہلے ایک آدمی اور چاچا تھا۔ دو تین اس کے پیچھے کیڑیں لگے ہوئے تھے۔ وہ چنڈے جی کو آتے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور گھٹنوں کے تل کھڑے ہو کر بولا:

”چنڈے جی، ہلا گئی!“

چنڈے جی کے پیٹ میں بڑے بڑے تل چ رہے تھے۔ انہیں خیال ہوا کہ لنگڑا لائق کر رہا ہے۔ حمل کر لے۔

”سنا تلخو کہیں کا!“

”بھیرے بس کی بات نہیں چنڈے جی، آپ تو گھبراہٹ میں ہیں۔ میں سنا اناج لے رہا ہوں۔ لیلی پر میرا حق آپ سے لیا ہوا ہے۔“

”بچا!“

”چنڈے جی، صندوق پر تو پہلے ہی قبضہ ہائے بیٹھے اباب کار پریشن کا یہ لیلین بھی غریبوں سے چھینا جاتے ہو۔ یہ دھانڈلی نہیں چلے گی، نکالو آٹھ آٹے اور آ جاؤ بھیری باری پر۔“

”چار آٹے دوں گا بھادو نہیں بڑھا سکتا۔“

”اور والے شک اور مرج کا بھادو کیوں بڑھا رہے ہو؟“

چنڈے جی کے پیٹ میں بھر رہا تھا۔ انہوں نے عجیب میں ہاتھ ڈالا ایک انٹلی لنگڑے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

”چار آٹے کل تک چائیں گے۔“

اس نے انٹلی قبول کر لی اور آہستہ سے کھڑا۔

”بھگوان کرے سر دوڑا اور بڑھے، پیٹ کا درد بھی دور ہو۔“

وہ بہت خوش تھا۔ اسے اس دھندے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ دیا ہے انٹرو کی، کیا روزگار دیا ہے۔ بڑے بڑوں کا دلچسپ لگا چار پارہ اور اچھے دھندے وہاں مارے مارے چل رہے ہیں۔ پاؤں سلاست تھے تو تل کے آفس میں کرسی پر چنڈے کرکڑی کیا کرتا تھا۔ لوے لنگڑے آدمی کو اٹھا۔ ڈی۔سی کی سیٹ پر بٹھاتا بھی لاپ ہے۔ تل ہانگ کے تھوڑیک۔

چنڈے جی کے ہاتھ آتے ہی ایک آدمی اور آ گیا۔ اس نے دور سے دھک کا سکھ کھاتے ہوئے خوشامد لہجہ میں کہا:

”بھیا باری مجھے دوا“

”دس پیسے کے لیے دے سکتا ہوں، اچھا ہوا حق نے بھگوان کا نام نہ لیا، مجھے کسی نے یہ نہ بتایا کہ اس کے نام پر، میں کیونکر دے سکتا

ہوں۔ تمہارے لیے اپنا بیٹہ کرانے دیتا ہوں۔“

دن گزرتے رہے، کرنلی اور طاقت برحق رہی۔ کئی روز بعد آتا ہوا مرض کوئی چیز خاص بدل رہی تھی۔ چارپاں برحق چھٹی۔ بیٹہ میں درد اظہار اور کیزوں کی شکایت عام ہو گئی تھی۔ اس کا کاروبار چلتا چارپا تھا۔ وہ کسی کے چارپا ہونے کی دعا نہ لگتا۔ بغیر دعا لگے ہی لوگ چارپا ہو رہے تھے۔ لیٹرین کی اہمیت برحق چارپا تھی۔ اس کا بیٹہ بھی اسی نسبت سے ترقی کر رہا تھا۔ وہ شام ہی سے کواڑوں میں رہنے والوں کی نسبت مطومات فراہم کرتا رہتا۔ ضروری باتیں بہت آسانی سے معلوم ہو جاتیں۔ اس نے چارپے رات کے بعد کا سونا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ بیٹہ کے سامنے نیند کی اہمیت بھی کیا ہے۔ ایک دن چارپا کہ تمہارا اس صاحب کل بیٹہ کا انکسرے کر رہے ہیں۔ رات کو سہیل لینا ضروری ہے۔ اگلا پروگرام اس نے اسی وقت چاہا اور چارپے کی لیٹرین کے دروازے پر چاہی تھا۔ پانچ منٹ بعد ہی تمہارا اس دروازے ہوئے آئے۔ دو انچس دیکھتے ہی ”بیٹھا اندر آ رہی ہے گیٹ پر میں ہوں آپ لائن چاہئے جلدی سے۔“

”کھنڈر آ کل پیاسہ بھیا رات کو۔“

”نہ جانے اور کس کس نے یہاں لگا۔“

”چندے رستہ دے۔“

آپ کو اپنے لیے الگ ٹکٹ خرید لینا چاہیے۔ یہاں تو سب برابر ہیں۔ ٹکٹ دے ہوں یا اندر سے لے رکھتے۔“

تمہارا اس کی حالت خراب تھی۔ بیٹہ میں اظہار صبح آٹھ بجے انکسرے لیا چارپا تھا۔ سوچ رہے تھے کہ وہ ہوگی تو آتیں صاف نہ ہوں گی۔ کوئی اور دبا بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اس کے پیروں کو بھی انکسرے چارپا میں شامل کرتے ہوئے کہا۔ ”تو نے تو دھڑائی کر لیا بیٹا۔“ یہ کہتے ہی انہوں نے بیٹہ میں سے چند ٹکٹ نکال کر اس کی جانب پھینک دیے۔

”کیا بیٹا دیا تمہارا اس کی؟“

”ہاں۔“

”انکسرے کی فیس کیا دی ہے؟ تم مجھے کھنڈر آ کل کی قیمت سے آدھے پیسے دی دے دو اور جو کچھ بچتا ہے اسے اٹھاؤ۔ جگ کہ بھر کا دھڑ سے بھرے ہاتھ پر رکھ دو۔“

ایک دن اسے اپنی بیاب پر پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ وہ سارا پیسے چانچ بیچے آپ بانی پر اس بارواڑ کے برابر بیٹھے تھے۔ وہ غور سے انہیں دیکھتا جیڑی سے لائن میں جا لگا۔ چارپا وہی اس کے آگے تھے۔ وہ آٹھ آٹھ آٹھ لکھی ہوتی تھی۔ چڑت بلکشن گری خیر نہ کئے تھے۔ وہ سلیمک ٹکس کے ٹکس میں لکھواتے اس کے بعد پہنچے۔ اور ایک اور شخص کیسٹ آ کل پی کر آیا تھا۔ چڑت جی نے اس کا حق کھائے ہوئے کہا:

”ہٹ ٹکٹ دے۔“

”کھلی ٹکٹیں ہونگا چڑت جی، آج جلد پر بھی رستہ لگا رہا ہے۔“

چڑت جی پر اسے گاہک تھے، انہیں اس کا سکہ بڑھا کر چک دے دی گئی۔ رستہ رستہ سب کو معلوم ہو گیا کہ اس نے کواڑوں والوں کو پریشان کرنے کے لیے یہ اسٹریک رکھ دیا ہے۔ خود کھی بیچ کے وقت بھی انہیں جانا شام کو جانا ہے، جب وہاں بالکل خانا ہوتا ہے۔ باقی طور سے سے کارپوریشن میں اس کی شکایت کر دی گئی۔ بیٹھا آ فیصلہ حق کے انکسرے کو ساتھ لے کر موقوفہ دیکھتے آ یا اس کو بھی چارپا کیا اور بالکل ہراساں نہ

ہوا۔ نہایت اطمینان سے جواب دی کے لیے چار ہو کر آیا۔ اٹکھ آ فیصر نے ہار پر ہما۔ پھر سوال ہوا پیش کیا ہے تمہارا؟

اس نے بخش میں آ کر ہاتھوں میں دبے ہوئے ٹکڑی کے چھوے زمین پر ڈال دیئے اور گھٹنوں پر ہڈی اٹھائی گویا اس کے سہارے کھڑے ہو کر رہا۔

”بھرا پڑ؟“

”بھرا پڑ؟“

”ختم مت ملنے“

اٹکھ آ فیصر فرض چہ اور آدھیں کو بھیجی گئی آگئی۔ پھر اس نے کہا: ”پیش پر چھو چیک کرنے والوں کا۔ دشمنی کے لوگوں کا یا ان لوگوں کا جو ہمارے دوش سے کڑی پر بیٹھتے ہیں اور ذرا سی دیر میں پارٹی بدل دیتے ہیں۔ میں کیا کرتا ہوں؟ چوری؟ گروہ کئی؟ قتل؟ زنی؟ یہ ایک نئی ہی میری بلڈنگ ہے اس پر ہڈی نہیں لیجا۔ دو گنا ہنگامہ کرایہ وصول نہیں کرتا۔ صرف ہاری چچا ہوں۔ چچی سے زیادہ مشکل ہی سے کوئی اس کی پرولی لگاتا ہے۔ اس پر قتل سمجھنا چاہتے ہو؟ سمجھ دو!“



میرزا داوید

نام
لقب نام
پیدائش
وفات
تعلیم

دلاور علی
میرزا حبیب حامی (میرزا حبیب
۳۱ اپریل ۱۹۱۳ء، بہار، مملکت متحدہ، چنگ دہلی، مملکت متحدہ، پاکستان، بھارتی گیت، لاہور (بہار)
۱۳ جولائی ۱۹۹۹ء، لاہور
پہلے سے (آنر) اسلامیہ کالج ریلوے روڈ، لاہور، ۱۹۳۵ء
اسلامیہ ہائی سکول، لاہور، ۱۹۳۱ء میں شریک اور اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور سے ۱۹۳۵ء
(آنر) فارسی کیا۔ اسلامیہ کالج میں سید فیاض محمود اسی کو انگریزی میں چھ ساتتے تھے، جنہی سے ادب
راہنمائی لیے رہے۔

فخر المصطفى:

والد کا نام میرزا اختر علی تھا جو پیشہ کے اعتبار سے درزی تھے۔ والد کو بیٹے کی تعلیم سے دلچسپی نہ تھی۔ دادی نے ایک جوہنی کے سپرد کر دیا۔ جس کی تعلیم ڈاکٹر ہیرز اور بی ایسے جی ایم کے پھر وہاں سے ہو گئے۔ اس کے بعد انھیں ایک لہار کے سپرد کیا گیا جس نے ساتھ ہی دن خود کھانا کھا کر دیا۔ چھو چائے گرم کھا کر میوہ پھل کے اسکول میں داخل کر دیا اور اس نے پھر کہاں سپرد کر بیٹے کی تعلیم جاری رکھی۔ اسکول کے ہی زمانے میں ادب کی چنگ لہلہاں میں جا گی اور ماضی تھیں اختیار کر کے مکی کی پکی تھیں اور کہاں تھیں۔ ۱۹۳۵ء میں ”ادب لطیف“ کی ادارت سنبھالی اور سترہ برس تک ”ادب لطیف“ کو دیرِ نازل کا پرچہ چھاپنے لگا۔ ۱۹۳۷ء میں شادی ہوئی۔ ۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۸ء ہفت روزہ ”مفتوحہ“ بمبئی کی ادارت کی۔ بمبئی سے واپس ہی ۱۹۳۸ء میں چند ماہ رسالہ ”حسن پرست“ کا دور کے مدیر رہے۔ بے کاری کے چند برس گزار کر آل انڈیا ریڈیو، لاہور سے بطور شائف آرٹس اسکرپٹ رائٹر شلک ہو گئے اور چند برس ریڈیو کی محنت کی۔ اس دوران میں ۱۹۳۸ء کے اسراف ۱۹۵۶ء تک

لطیف" کی نگرہ ادارت سنبھالی۔ ۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۷ء غیر درجنز ملحوظہ بالا ہور سے متعلق رہے اور اس کے بعد رچنے پچان پاکستان، لاہور سے وابستہ ہو گئے اور رچنے کے لیے سہ ماہی ایک گھنٹہ ۱۹۶۷ء تا ۱۹۶۸ء درجہ دوم آخر درجہ نامہ "نوائے وقت" لاہور میں "گلاکار و افکار" کے عنوان سے کالم نگاری کرتے رہے۔ "کالہ سمرا" "بچہ بان روڈ، کرفٹن گر، لاہور میں قیام رہا اور وہیں انتقال کیا۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"افسانہ خمینی" مطبوعہ: "کتاب لطیف" لاہور (سالنامہ) ۱۹۳۶ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ "سمرا نور کے خطوط" (آٹھ افسانے) مکتبہ اردو لاہور طبع اقبال جرنالی ۱۹۳۰ء
(۱) افسانہ طوئیں (۲) دختر سمرا (۳) کنگے سمرا (۴) صورتی (۵) نکل حواث (۶) حکایت جڑوں (۷) سمارت کا قیدی (۸) چاہ بائل
- ۲۔ "سمرا نور کے درد بان" (چار افسانے) نوائے وقت سہگل لاہور طبع اقبال ۱۹۳۳ء
(۱) کدی (۲) طوقاں حواث (۳) چٹائی کے بعد (۴) جزیرہ ہامورین
- ۳۔ "سوت کا تختہ" (سات افسانے) مکتبہ لٹریچر کتب لاہور طبع اقبال ۱۹۳۳ء
(۱) سوت کا تختہ (۲) قصص کی بنیاد (۳) ال (۴) کدی (۵) شادی رات (۶) قیدی کی سرگوششت (۷) سوگئی ہوئی عی (چھ مضمونیں) ہمارا مہل اپنے مہلا ہور نے شائع کیا)
- ۴۔ "نور جاری" (آٹھ افسانے) عالمگیر پبلیشنگ لاہور طبع اقبال ۱۹۳۵ء
(۱) روشنی (۲) آنکھ (۳) بائل (۴) شو قیس پ (۵) دردنازہ (۶) نوجوان بازو (۷) ہر مساز (۸) گولڑی (۹) زیر سنگ (۱۰) سنے انسان (۱۱) غلام (۱۲) کاک (۱۳) گویا (۱۴) گڑیا (۱۵) سرخ روپہ (۱۶) کنگال رئیس میں (۱۷) شبنم (۱۸) شہاب
- ۵۔ "جنگل" (چھ افسانے) مکتبہ اردو لاہور طبع اقبال ۱۹۵۳ء
(۱) ایک مکان (۲) ۳۷ سال کے بعد (۳) سرگز (۴) آزادی (۵) شتر مرغ (۶) دیا (۷) جنگل (۸) پوحو میں عہد ارضی (۹) دردناک حیرگی (۱۰) زیر سنگ (۱۱) کار پر پیش ایک ڈاکٹر اور کبھی (۱۲) قرار داد (۱۳) آرمینیا کا بیڑہ (۱۴) یک صنف
- ۶۔ "نیکل" (چھ افسانے) کتب لیت لاہور طبع اقبال ۱۹۵۷ء
(۱) سوت کا راک (۲) اس کی حسین تصویر (۳) شادی رات (۴) گولی محبت (۵) ان مایا (۶) نوجوان غول (۷) ایک (۸) روشنی (۹) گویا (۱۰) شبنم (۱۱) مائی چاہیں (۱۲) نیکل (۱۳) روپہ (۱۴) شتر مرغ (۱۵) دیا (۱۶) جنگل (۱۷) شبنم (۱۸) شہاب
- ۷۔ "صورتِ قیصر" (ستر افسانے) اختر پبلیشنگ لاہور طبع اقبال ۱۹۷۹ء
(۱) شو (۲) ٹیلم پی (۳) کاکا چڑی مار (۴) مستور فضل الہی فضل (۵) شیشے کی کرسیاں (۶) گولے سناری والی چڑیا

- (۷) سہیلی کہانیاں (۸) ہسٹریک (۹) آپا کی سرفی (۱۰) چمکی نکلی تھپ (۱۱) نکلی جی (۱۲) لالو ہانگی (۱۳) صدورجی عرف صدرا (۱۴) مہیاں دینے لگو (۱۵) ماسی (۱۶) بیچ و تم (۱۷) ہوشی
- ۸۔ "ساقیاں چراغ" (اداسانے) مطلوبہ حالت حرمت، براہ پندھی طبع اول: ۱۹۸۳ء
- (۱) انات (۲) ساقیاں چراغ (۳) گیت مین (۴) سازو (۵) بند لگی چا مسک (۶) ارچمی (۷) حمایت بی بی کا انخفال (۸) ورد لیل (۹) کاغذ کی باز (۱۰) ہلیا کی ٹلی (۱۱) اس کی خاطر (۱۲) ایک منزل کی راہیں
- ۹۔ "میں راکا" (اداسانے) آگرہ قہار برقی چمکیں، آگرہ طبع اول: ۱۹۳۵ء
- ۱۰۔ "کھجور پتا" (اداسانے)
- ۱۱۔ "بے کسی" (اداسانے) رام دھن بھٹنڈو لاہور طبع اول: ۱۹۳۳ء
- ۱۲۔ "ڈولے آرزو" (اداسانے) نرائی دت سنگھ، لاہور طبع اول: ۱۹۳۲ء
- ۱۳۔ "قلاموں کی بھارت" (اداسانے) کتب خانہ اردو لاہور طبع اول: س۔ س۔
- ۱۴۔ "صوبہ کا راک" (اداسانے) کتب خانہ اردو لاہور طبع اول: س۔ س۔
- ۱۵۔ "لاوا" (اداسانے) عا شہیرا کپڑی لاہور طبع اول: ۱۹۶۷ء
- ۱۶۔ "سحر انور کا نیا کھنڈ" (اداسانے) لاہور طبع اول: ۱۹۶۰ء
- ۱۷۔ "آئینہ اور حمارے" (ڈراما) کتب خانہ اردو لاہور طبع اول: ۱۹۵۳ء
- ۱۸۔ "لہو اور گالیں" (ڈراما) ادارہ نورا لاہور طبع اول: ۱۹۵۵ء
- ۱۹۔ "مٹھری" (ڈراما) کتب خانہ اردو لاہور طبع اول: ۱۹۵۷ء
- ۲۰۔ "فیصل شب" (ڈراما) گلشن شامت گمر گراچی طبع اول: ۱۹۶۱ء
- ۲۱۔ "نیشے کی دیوار" (ڈراما) اچھڑ لاہور طبع اول: ۱۹۶۲ء
- ۲۲۔ "باغی کا قرض" (خاکے) اخراج بجلی کشنور لاہور طبع اول: ۱۹۸۰ء
- ۲۳۔ "نکلیں چوڑا گارے" (آدمی ہولی انعام) کتب خانہ ادب جدید لاہور طبع اول: ۱۹۶۷ء
- ۲۴۔ "باموں جان اور باموں جان" (ڈرامے) مہدی اکینڈی لاہور طبع اول: ۱۹۶۸ء
- ۲۵۔ "ناگ نشین" (ڈرامے) طبع اول: ۱۹۷۰ء
- ۲۶۔ "نیشہ سنگ" (ڈرامے) (آدمی ہولی انعام) طبع اول: ۱۹۷۹ء
- ۲۷۔ "پاکستان کو سلام" (ڈرامے) طبع اول: ۱۹۸۳ء
- ۲۸۔ "نواہوں کے مسافر" (نثر لطیف/مضحکہ) کتب خانہ اردو لاہور طبع اول:
- ۲۹۔ "کمال کے اس باز" (نثر عام) طبع اول: ۱۹۸۳ء

- | | | |
|-----|--|----------------------------|
| ۳۰۔ | "تفہیدی مقالات" (مترجم: ادیب) دو جلدوں میں (برائے نصاب ائمہ۔ اسے اردو) | |
| ۳۱۔ | "بہترین ادب" (انتخاب) مترجم: میرزا ادیب ۱۹۳۸ء تا ۱۹۵۵ء | |
| ۳۲۔ | "۱۲ اصول کتابت" (انتخاب) فرہنگین نوریہ پاک اختتام شیخ غلام علی ایچہ سزاوار | طبع اقول ۱۹۸۱ء |
| ۳۳۔ | "ہدیہ امریکی افسانے" (انتخاب) مترجم: میرزا ادیب | آئینہ ادب، لاہور |
| ۳۴۔ | "پراسرار دواوی" (ترجمہ) | تخلیاتی مرکز، لاہور |
| ۳۵۔ | "فرہنگین اردو گ" (مخصوصیت ذہن) مترجم: میرزا ادیب | فرہنگین نوریہ پاک، لاہور |
| ۳۶۔ | "معلی کا قرض" (آپ بقی) | سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور |
| ۳۷۔ | "مشی کس ادا" (ڈراما) مترجم: میرزا ادیب | لاہور |
| ۳۸۔ | "میرزا ادیب کے بہترین افسانے" مترجم: عرفی صدیقی | کتبہ میری لاہور پری، لاہور |
| ۳۹۔ | "تمیں ماں شاں" بچوں کے لیے (ڈرامے) | |
| ۴۰۔ | "گلی کی گزیا" (ڈرامے) | |
| ۴۱۔ | "سنو پارسے بچہ" (کہانیاں۔ تین جلدوں میں) | |
| ۴۲۔ | "اے وطن میرے وطن" (بچوں کے لیے) | |
| ۴۳۔ | "پانچ ڈرامے" (بچوں کے لیے) | |
| | (پرنٹنگ ہاؤس انعام یافتہ) | |
| ۴۴۔ | "مشر سے دور" (بچوں کے لیے) | |
| ۴۵۔ | "چچا بھائی" (بچوں کے لیے) | |
| | (پرنٹنگ ہاؤس انعام یافتہ) | |
| ۴۶۔ | "مائی ماں کی بیک" (بچوں کے لیے) | |
| | (پرنٹنگ ہاؤس انعام یافتہ) | |
| ۴۷۔ | "بہ ہر جہاں ہے" (بچوں کے لیے) | |
| ۴۸۔ | "مشتاقی طالب علم" (بچوں کے لیے) | آرٹو سائنس بورڈ، لاہور |
| ۴۹۔ | "نور کا رونا" (اولیٰ کالم) | لاہور |
| ۵۰۔ | "بہترین افسانے" (مترجم: میرزا ادیب) | کتبہ میری لاہور پری، لاہور |

۵۱۔ ”ہمارے عارف“ (بچوں کے لیے)

محمد رفیع ظیفین، کراچی

(بہترین ایک نثر کہانی نویس)

(بچوں کے ادب سے حلقہ فیہرست نامکمل ہے۔ میرزا ادب نے بچوں کے لیے ۳۵ کتابیں لکھیں، جو شائع ہوئیں)

۵۲۔ ”نگلی گلی کہانیوں“ (سردھارہ فانی)

عقیدہ اکیڈمی، لاہور

طبع اول، ۱۹۸۷ء

۵۳۔ ”گروں سے بندھے اچھوتے“ (نوافسانے)

عقیدہ اکیڈمی، لاہور

طبع اول، ۱۹۹۰ء

غیر محدود:

”اقتصاد اولیٰ کامل اور تھمرے۔“

اعزاز:

۱۔ پرائز آف بہادر نرس (حکومت پاکستان کا سول اعزاز) ۱۹۸۱ء

۲۔ بار پاکستان ماسٹرز گلڈ آف میٹریکولر ایجوکیشن

۳۔ ہارلم گریجیٹ ایجوکیشن

وقات سے قبل مستقل بنا:

”کلاس صحرانہ“ (پہلی بار، کرشن نگر، لاہور) (پاکستان)

نظریہ فن:

”ہر صنف ادب کی طرح کہانی کو بھی اپنے قاری سے ذاتی رابطہ استوار کرنا چاہیے اور یہی صورت میں ممکن ہے کہ خود کہانی کار اور اس کے قاری کے درمیان گہرا رابطہ ہو۔ کہانی کار اپنے لاشعور میں ڈوب کر رہ جاتا ہے بلکہ اپنے عوام کے دلوں میں اتر کر اپنا مواد حاصل کرے۔ اس کا تجربہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے اثرات قبول کرے۔“

(مکتوب، نام میرزا احمد علیکے سرورہ یکم اکتوبر ۱۹۸۳ء)

○

حوالہ جات:

۱۔ میرزا ادب کی ابتدائی تحلیں، ”نصاب درد“، ص ۱۰۳، شائع ہوئی۔

کتابچہ

میرزا علی

اس وقت جب کہ میں قہار سے لیے تازہ "رومان" نگہ کر اپنی سحرانی زندگی کے متعلق کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ قہاری صورت سحری آنکھوں کے سامنے بکھرا رہی ہے۔ انھیں کیا مگر جہازوں کہ قہار اور رافائیلہ دوست تم سے ملے قہار سے موجودہ حالات زندگی سننے اور انھیں اپنی زبان سے اپنے "سحرانی واقعات" سنانے کے لیے کس قدر بے تاب۔ کس قدر مضطرب ہے۔ اکاش قہار "رومانی ذوق" انھیں یہاں کھینچ لائے۔ اس سے ایک تو قہاری۔ سیاحت زیادہ پر لطف، زیادہ رومان انگیز اور زیادہ دلچسپ ہو جائے گی اور دوسرے قہاری آرزو بھی پوری ہو جائے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سحری تہذیبی مہارت سے تم کسی حد تک ضرور لطف اٹھاتے ہو گے لیکن میرے دوست یقین کر کہ اس سے میری چاروں طرف بکھری ہوئی دھندلیوں، دھواں جیسوں اور دلچسپیوں کا ہر تو بھی قہار سے سامنے نہیں آ سکتا۔ تم یہاں آ جاؤ تو انھیں معلوم ہو کہ کبھی ابھی ہمارا راز کبر میں لپٹے ہوئے مشرقی افق کے چنے پر جب چاندوں میں رہ جاتے ہوئے سانپوں کی طرح رنگ برنگ ابر باد سے لہراتے ہیں تو ایک رومان پرست دل پر کیا اثر ہوتا ہے اور جب شام کے وقت شفق کے دامن میں دھوئیں کے بادلوں کی مانند دھندلوں کے دھبے آ جتے آ جتے لگا ہوں سے غائب ہوئے لگتے ہیں تو انسان پر کیا کیفیت چھا جاتی ہے اور پھر جب اس عالم میں کسی برے کے بارے ہوئے پتہ نہ کی غنائک، درد انگیز آواز اٹھا میں قہر قہر کرتی ہے تو دوح کی گہرائیوں میں کون سا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ لیکن ہے کسی دن قہار "رومان پرست" دل، "انھیں" "دشست" "سکھائے" تو ہم اتنی آ جاؤ وہ جگہ پر رو نہ پائے نگل کر میری برائیوں پر کون دغا میں آ جاؤ۔ کیا یہ ہو سکتا ہے؟

اس "دوران" کے حلقوں کیا تھیں۔ یہی سمجھ لو کہ اس نے میرے دل میں موت سے سوتے ہوئے ایک چن چن کو پیدا کر دیا ہے اور میں میرا دوسرا "سیز" کیا ہے، یعنی راتوں کو ہمارے کمرے کے دروازے پر جھانک رہی ہوں۔ امید ہے میری طرح تم بھی اس سے حشر ہو گے۔ یہ "دوران" "خوں" انگیز صحت کی تباہ کاریاں کو اپنے دامن میں لے رہے ہیں۔ ۱

محبت کا جذبہ پیدا نہیں کیا جا سکتا بلکہ خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ بچپن میں یہ قول میں بھی سنا کرتا تھا اور مجھے اس کی صداقت پر ڈر رہا۔ بھر اعتبار نہیں تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ ایک دھم ہے اور ہر ایک شخص اس دھم میں اس لیے جکڑا ہوا ہوتا ہے کہ یہ بہت زیادہ شہرت حاصل کر چکا ہے اور کرتا جا رہا ہے لیکن اب میرا یہ نظریہ تبدیل ہو چکا ہے اور میں مندرجہ بالا حق لے کر صداقت کا بدلہ دہان کاگل ہو گیا ہوں۔ واقعی محبت کی پہچان ہی ایک لمبا سا معمولی واسطے سے انسان کے دل کی گہرائیوں میں سننے لگتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب یہ سمجھ ہی نہ سکا کہ دل دریاغ کو کھسم کر دینے والے آنکھیں ہلکوں میں جھری ہو جاتی ہے۔ کوئی انسانی زندگی اس آگ کو سرد کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یہاں تک کہ موت کی آمد ہی کا یز وند جھوٹا اس آگ کو اور اس کے ساتھ انسانی زندگی کو ختم کر دینے کے لیے بجا دیتا ہے یا محبت ایک ایسا لاز رہ ہے جو دل دریاغ کو کھسم کرتا ہو اور دل کی گہرائیوں تک سرایت کر جاتا ہے۔ انسان اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لے کر اس بے رحم دشمن کا مقابلہ کرتا ہے مگر بے سود۔ تا آنکہ موت کے سرد ہونٹ انسان کے ہونٹ سے لگ کر یہ ہولناک زہر اور اس ہولناک زہر کے ساتھ خون حیات کو بھی چوس لیتے ہیں !

اس انسانے میں بھی ناگوار اور غلط حقیقت پائی جاتی ہے !

امید ہے تم بخیر رہتے تمام ہو گے ۔ !!

محمد اصر اور

میں نے کچھ دھم محبت میں گرفتار ہوا۔ میں یہ نہیں جانتا سکتا اور اس کے جانے کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔ مجھے کہہ دینا کافی ہے کہ جس طرح بد نصیب انسان محبت کے غار میں دھکیل دیے جاتے ہیں اسی طرح میں بھی دھکیل دیا گیا۔ اس کے بعد جب مجھے اپنی حالت کا احساس ہوا تو میں نے خود کو چاہی سے بچانے کے لیے پتھر سے ہاتھ پاؤں مارے، تمام احتیاطی تدبیریں پرستی کے ساتھ عمل کیا لیکن میری ہر ایک کوشش خاک میں مل گئی۔ آہ اس مصیبت سے نہ بچ سکا ہونا تھا۔ نہ ہوا۔

میری محبوب شہری حسین ترین لڑکی تھی۔ اس کی کھانا دھنکی ہوئی پیوٹلی، چودھویں کے چاند کی شفافیت، اس کی لمبی کالی بالیں، ہلارے کی راتوں کی تاریکی اور اس کی سیاہو سی بڑی آنکھیں، ہر نئی آنکھوں کی مٹھا طبیعت لیے ہوئے تھیں۔ اس کے رخساروں میں خون تاب اس طرح چمک رہا تھا، جس طرح چاند کے سینے میں شربابِ عمر کی سوکھی، اچھل رہی ہوں۔ وہ جب جلتی تو یہ معلوم ہوتا کہ تاب کی سطح پر مٹی بھر رہی ہے اور جب وہ تاریکی تو جوں جوں ہوتا گوارا دیتی تھی تو مزاج بدی بدی ہے۔ وہ بکا خندہ کا منصور کے ٹکڑے سے بھی زیادہ حسین تھی مگر میری انتہائی بد قسمتی یہ تھی کہ وہ بہت سنگدل واقع ہوئی تھی۔ اس کے سچے میں دل کی بجائے چکر کا ٹکڑا تھا۔ وہ میری جھوٹا بہت میری قابلِ رحم ہے کہ کوہِ محبت اور ہمت سنگدلی کے ساتھ حرکت لے گئے قہر لگاتی ہوئی منہ دوسری طرف پھیر لیتی۔ میری محبت کی قدر اس کی نگاہوں میں اور براہِ نظر تھی۔ انا عالمِ حق محبت کرنا جانتی ہی نہ تھی۔ میں اپنے دماغ کے سینے بھول لے کر ایک جگہ کڑے ہو کر اس کے انتظار میں لگی کی جیسے صرف کرونا تھا جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑتی اور وہ انتہائی بے دردی سے اپنا راستہ تبدیل کر لیتی یا اگر میرے پاس سے گزرتی اور میں اس کے پاؤں پر بھول کر ادا تو ایک لمحہ کے لیے پھر پھولوں سے نظروں اٹھنے لگی جاتی، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کئی بار دوستوں نے مجھ سے کہا کہ اگر تم سرتے

ہم تک بھی اسی طرح محبت کی آگ میں پلٹے رہے جب بھی سُلُطی (عبری بے رحم محبوب) اتھاری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ اپنی زندگی کو اس کی بے رحمان محبت میں ڈبا کر دے۔ شہر میں ہزاروں عسین و شیرازیاں ہیں۔ کیا تمہیں محبت کے لیے اور نہیں ملتی؟ سُلُطی کا خیال پھوڑ دو اور اس انجمن میں تمہیں اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھوئے چوس کے "اس کی سوطیاں نکھیں۔" ہم نے ہزار کوشش کی کہ سُلُطی کے دل میں تہہ راز نکال دیا کریں مگر جس طرح جگر میں سے پانی نہیں گزر سکتا، اسی طرح اس کے دل میں بھی تہہ رازی محبت نہیں بیٹا اور کتنی۔ تم بھی اس سے غارت کرنے لگو؟"

میں یہ سب سمجھ کر اپنی بد قسمتی پر غصہ کرتا مگر سُلُطی کا خیال دل میں دلا تاہ سُلُطی سے دور بھاگنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ معلوم نہیں کہ اس حسین سارہ نے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا کہ جس قدر میں اسے بھلانے کی کوشش کرتا۔ اسی قدر اس کی محبت بڑھتی جاتی۔ میں جوش جوں میں آنکھ شہر سے باہر نکل جاتا اور پرانے قلعے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنی بد قسمتی پر آسو بہایا کرتا۔ یہ قلعہ مذمت سے دیوانہ پڑا تھا اور سب سے حکومت سامنے نے فوج نکلتی کر کے یہاں کے پہلے حاکم ہاشم کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس کے اندر کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی چاہی کیونکر سکتا تھا؟ قلعے کے پہلی دروازے بند تھے اور ان کے آگے بڑے بڑے پتھر رکھے ہوئے تھے۔

یہ قلعہ چونکہ ایک مدت سے دیوانہ پڑا تھا اور ابھی شہر سے دور اس لیے لوگوں کا گمان تھا کہ اس میں محبت پریت وغیرہ رہتے ہیں۔ ایک بوڑھا کسان کہا کرتا تھا کہ اس نے کئی بار قلعے کی ایک کھڑکی سے ایک حسین لڑکی کو بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔ الغرض اس پر اپنی حیرت ناک عمارت سے طرح طرح کی افواہیں اڑتے تھیں۔ میں قلعے کی سیڑھی پر چڑھی ہوئی پھوٹی سی چٹان کے اوپر گھٹوں بیٹھا رہتا اور دوسو گیت گاتا رہتا تھا۔ میں اس بوڑھے آدمی سے بہت باتوں تھا۔ اس کا نام بابا اموی تھا اور میں بچے میں دو تین بار اس سے ضرور ملا کرتا تھا۔ بابا اموی محبت کو انسانی زندگی کے لیے خوفناک ترین مرض سمجھتا تھا اور چونکہ میرے واقعات محبت اس سے پوشیدہ نہیں تھے اس لیے وہ مجھے اس جوں سے باز رکھنے کے لیے ہر وقت نصیحتیں کرتا رہتا مگر اس کی نصیحتیں مانجیاں جاتیں۔ محبت کا ہنوں بھی نصیحتوں سے بھی دور ہوا ہے۔

دنیا میں صرف یہی ایک انسان تھا جس کی باتوں سے مجھے ہمدردی کی بوائی تھی۔ میں نے اس سے کئی بار پوچھا۔ بابا تمہارا لہکا نا کہاں ہے۔ تم کیا کرتے ہو مگر وہ مجھے یہ کہہ کر مال دیتا۔ مگر پھر اگر زندگی کے آخری دن گزار دو ہوں۔ دنیا میں ہر جگہ میرا لہکا نا ہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا۔ اموی نہایت ہمدردانہ لہجے میں مجھے ترک محبت کی صلاح دے گا اور اس مسئلے میں عجیب و غریب داستانیں بھی سناتا کرتا مگر بد قسمتی سے اس کی نصیحتوں اور داستانوں کو میں کبھی نہ سمجھتا تھا۔ دل میں محبت کی آگ اور لہزک جاتی اور جب میں شہر کا رخ کرتا تو سُلُطی کی یاد اس درجہ مضرا کرتی کہ اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔

2

اس دن میں خاص طور پر غصہ میں معلوم تھا۔ بے رحم سُلُطی کی سر دھریوں نے میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور میں اپنے صدمہ پر ادھل کر پیٹنے لپے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا جا رہا تھے قلعے کی طرف چلا تھا۔

دن بہت چکا تھا اور غداؤں میں تاریکی کے بدل طرفوں کی طرح چھا رہے تھے۔ دور مغربی گوشے میں ایک بلند اور عجیبان درخت

ٹوٹی کہ دہری کی مانند آفتاب کی خیر نکلیں فتنہ بازوں پر اٹھائے آہستہ آہستہ تاریکی کی غار میں غائب ہو رہا تھا۔ میں اس غریبی منظر کو دیکھنے لگا۔ میرے دل میں بھی خیالی بیوا ہوا کہ ایک دن میں بھی طوفانِ شہوہ تھناؤں کو لیے ہوئے دفنا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ اس خیال کے آنے ہی میری آنکھیں پر نم ہو گئیں اور میں ایک بدنظمی میں پڑنے لگا۔ میرے حقیرانہ سوخا آب پر نئے نئے دائرے جاتے ہوئے چھلک ہوئے گئے۔ اسی اثنا میں میں نے حمی کو قلعے کی سیڑھیوں سے گرتے ہوئے دیکھا۔ میں کشتی سے لگا اور حمی کے قریب پہنچ گیا۔ حمی نے قدموں کی آہٹ سن کر حوضِ میری طرف دیکھا اس کے حوضوں پر پلکا سجم ہوا اور اس نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ ”آج تم بہت فکریں نظر آ رہے ہو۔“

”میرا دل ٹوٹ چکا“ میں نے جواب دیا۔
 ”اس نے ایک لمبی آہ بھری اور غناک لہجے میں کہا کہ تم خود کو چھو کر رہے ہو۔“
 ”تو کیا کروں؟“

”اس جگہ سے نکلو ورنہ اس کے ہاتھیں شعلے جھیں چلا کر خاک کر دیں گے۔“
 حمی کجور کے درخت سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ کچھ ایک پرندہ پہل پہل اڑا ہوا ہمارے سروں کے اوپر سے گزر کر قلعے کی دیوار کے پاس تاریکی میں غائب ہو گیا۔ شاید وہ اپنے گھونٹیلے میں جا بیٹھا تھا۔ ہاں حمی قلعے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں پراسرار چمک پیدا ہو رہی تھی۔ قلعے کی بندھن سب دیواریں ٹھکروں سے غائب ہوتی جا رہی تھیں اور دیوں محسوس ہو رہا تھا کہ باہر کی آوازوں کے درندگلوں میں عظمتِ عیشیں اپنی جھلک دکھا رہی ہے۔

”ہاں میں نے اس قلعے کے حلقوں عجیب عجیب باتیں سنی ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہاں موت پرست رہتے ہیں۔ کسی کا قول ہے یہاں مردوں کی رو میں پہنچی چلائی راتیں ہیں۔ بعض لوگوں نے یہاں سے گزرتے ہوئے چلیں بھی سنی ہیں۔ ایک بوڑھے کسان نے کہا ہے کہ اس قلعے کی کھڑکی میں سے ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی کو بھاگتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ تم نے بھی کبھی تاپا دیکھا ہے؟“ میں نے حمی سے پوچھا۔
 بوڑھا خاموش رہا۔۔۔ خاموشی سے قلعے کی طرف دیکھتا رہا۔

میں نے دوبارہ اظہار کیا، اس پر اس نے کہا۔
 ”میں نے تو یہاں کبھی بھی نہیں دیکھا اور نہ کبھی سنا کہ کوئی بچی اغوا ہی کیا ہے۔ رہتے ہیں مگر۔۔۔ جو اصل حقیقت ہے۔“
 ”اصل حقیقت کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”یہاں بھی صحن و مشق کا ایک غریبی کیل کیا جا چکا ہے۔“
 ”صحن و مشق کا غریبی کیل کیا ہو؟ کیوں کریں؟“

”لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ میری نصیحتوں کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس صورت کیا بنائیں؟“
 ”یہ درست ہے مگر مجھے خود پر کچھ اختیار نہیں، میں نے کہا
 ”تو کیا تم صحت کی بدست آؤ؟“

”میں خود واقف ہوں مگر جو چیز اختیار میں نہ ہو اس پر کیا بس چل سکتا ہے؟“
 اگر تم صمیم ارادہ کرو تو یقیناً صحت کے چال سے رہائی پا سکتے ہو۔ صحت کے دل میں صحت کا جذبہ اس لیے شدت اختیار کرتا جاتا ہے

کیونکہ وہ اپنی محبت کو ہمارا دار چمکا ہے۔ اگر وہ اپنی محبت کو چھوڑ کر گئیں تو درجہ چلا جائے تو۔۔۔“

”لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا“ میں نے اس کے الفاظ کا کچھ ہونے کہا۔ ”جہاں بھی جاؤں گا محبت کی آگ جتنے میں لے کر جاؤں“

”اے۔۔“

موسیٰ کے چہرے پر ہلکی سی چٹائی تھی۔ تم کو کشش تو کر رہی تھی۔ لیکن ہے یہ ہونا تک مرض دور ہو جائے۔ محبت انسانی زندگی کی سب سے بڑی دشمن ہے یہ جڑ مٹانے میں جی بھرتی دیتی رہے گی اگر تم نے اس سے بھاگنا حاصل کرنے کی سعی نہ کی تو پھر تمہاری برادری میں کوئی شبہ نہیں چھپا کہ میں نے ابھی کہا تمہارے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ یہاں سے فی الفور چلے جاؤ۔“

”اچھا ہاں میں ایسا کرنے کی کوشش کروں گا۔“

بابا موسیٰ کی آنکھیں قدرے چمک اٹھیں۔ اس نے میرے سامنے پراپنا دایاں ہاتھ رکھ دیا اور اپنی ٹہریں خرم و ہمدردانہ دلاؤ میں کہنے لگا۔ یہ قلمدانیں سال سے وہاں چڑھے ہیں جہاں کہ تم جانتے ہو یہاں شہر کا حاکم ہاشم رہتا تھا۔ ہاشم بے حد عالم و آئینہ جہاں اور ختم حجازی انسان تھا۔ جب تک وہ زندہ رہا اس کی کھسی سے نہ ہی ٹکی اور وہ اپنی ساری ”محنت“ سے قواسی خدا کا سنے کی دوشی تھی۔ محنت بہت ٹھیک دل اور ہاتھ بھرنا تھا۔ رہا یا کہ ہر فرد اس کا منطقی و فرمانبردار تھا اور چونکہ وہ بزرگ و صاحب گیا تھا۔ اس لیے لوگوں کا امید تھی کہ کچھ مدت بعد وہی مجدد سلطنت مصلحت پاپ سے بھی زیادہ ٹھیک دل اور شجاع تھا۔ حضور ان شباب میں اس نے کئی صبر کے سر کے تھے اور اب جب کہ وہ جوان تھا۔ اس کی شہامت و لیری اور ٹھیک لگتی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

شہزادہ مصلحت، شہزادہ کا بہت والدہ تھا۔ ایک والدہ بچہ رکھ کر کرتے بہت دور نکل گیا۔ اس کے ساتھ صرف دو دو دار خادم تھے۔ تینوں راست بھول کر آئے تھے۔ راست کی تاریکی ہر طرف پھیل چکی تھی اور گھوڑے تھک کر چر رہے تھے۔ آخر وہ ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ ایک کسان سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ”میرا“ میں پہنچ گئے ہیں۔ میرا اس زمانے میں یہاں سے کچھ دور ایک گاؤں تھا۔ کوئی اور ہوتا تو فوراً وہاں سے چلا جاتا۔ کیونکہ اس وقت شہزادہ اپنے جانی دشمن کی سلطنت میں پہنچ گیا تھا مگر شہزادے نے اس کی اطلاع پر والدہ کی اور شب بھری کے لیے اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہیں ٹھہر گیا۔ جیسے ہی ہاشم کو کسان کے ذریعے شہزادے کی آمد کا حال معلوم ہوا وہ اپنی دیرینہ آرزو کے پورا کرنے کے لیے بے قرار ہو گیا۔ اس نے اپنے خاص مصاحب شہزادے کو لے کر لیے پیچھے۔ شہزادہ جانتا تھا کہ وہ دشمن کے ملک میں ہے۔۔۔ اسے فوج تھی کہ وہ خطرے میں گھر گیا ہے لیکن اس نے ذرا بھی احتیاط نہ کی اور اپنے وفادار غلاموں کی مسلسل گزارشات کو کچھتے ہوئے حاکم شہر کے آدمیوں کے ساتھ مل میں پہنچ گیا۔ خادم جہاں تھے کہ آؤ شہزادے کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ کیوں ہاں بوجھ کر شہر سے میں گرفتار ہو رہا ہے۔ آؤ انہیں کیا خبر تھی کہ مصلحت محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر موت کے منہ میں جا رہا ہے۔

مصلحت ہاشم کی لڑکی ”پاکھن“ کی محبت میں گرفتار تھا اور یہی جذبہ محبت اسے کشاں کشاں کی طرف لے جا رہا تھا۔ خیمہ۔۔؟

تھوڑی دیر ہو جس کا اندیشہ تھا۔ راست کے آخری حصے میں شہزادے کو ایک تاریک اور زمین دوز کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اس وقت اسے محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ نہایت ہولناک فریب کیا گیا ہے۔ اس نے اوپر اور نازل گھر کی ان گلیاں پتھر کی سخت دیواروں ہی سے مس ہوئیں۔ اس نے پتھر سے ہاتھ پاؤں مارے مگر بے سود۔ باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ ملا۔ کافی ادم کے بعد اس کے کمرے میں کبھی کسی روشنی ظاہر ہوئی۔ اس روشنی میں اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک فراموش کمرے میں ہے جس کی دیوار میں بہت مضبوط ہیں۔ ایک طرف کھلی دروازہ ہے جو

مقتل ہے۔ فخر اوسے کو بہت افسوس ہوا۔ اب جسے تاسف ملنے سے کیا ہو سکتا تھا؟

صورت کو یقین تھا کہ عالم ہاشم سے مارا لے گا مگر حکم نگران اسے اس طرح ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شہزادے کا اس طرح زندہ رہنا زیادہ مفید ہے۔ لیکن اسے اس کے ذریعے وہ اپنے دشمن کی سلطنت پر قبضہ کر لے۔ اسی انکار میں ایک خادم نے دروازے کی سیڑھیوں میں سے گھانا اندر داخل کیا۔ فخر اوسے نے خادم سے بہت بہتر پہچان کر اسے کسی بات کا جواب نہ دیا۔ خادم اپنا فرض ادا کر کے چلا گیا۔

ادھر تو شہزادہ اسیر ہو گیا۔ دوسرا اس کے اس طرح پر امر اور طور پر غائب ہو جانے سے تمام سلطنت میں منطقی سی پھیل گئی۔ لوگوں نے جنگ کا کوئی نہ جہان مارا مگر شہزادہ کہاں؟ کوئی بھی نہیں جانتا سکتا تھا کہ وہ کہاں ہے تو وہ ہے باہر نکلا ہے۔

ہاشم نے اس کے خادموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس لیے اب کسی دوسرے سے بھی شہزادے کی اسیری کی خبر نہیں ہو سکتی تھی۔ صبحی دکان ایک لمبی چوڑا دھیری اور اپنی نگاہیں پرانے قلعے کی دیوار پر تھا دی۔

ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ قلعے کے قریب ایک بلند بے رنگ و ہارورٹ کی شار پر کوئی مسرت نصیب پر بندہ واقعی صدا کے ساتھ اپنے پر ہلکا ہلکا رہا تھا۔ درخت کے پھن اوپر ایک سفید مائل چاند سے کسی کتا ہوا یوں گزر رہا تھا جیسے ایک بد قسمت محبت اپنی محبوبہ کو الوداعی بوسہ دیتے ہوئے میٹھ کے لیے چلا رہا ہو۔

میں نے صبحی کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور قلعے کی دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے صبریاں چڑے ہوئے ہاتھ کے نیچے ٹپ ٹپ ڈوبی ہوئی آنکھیں اس طرح دکھائی دے رہی تھیں جس طرح کسی شکستہ قیر کے گڑھوں میں سبم دشمن دھم دھم چارہ دے رہے ہوتے ہوں وہ کی لٹھے اپنے خیالات میں غرق رہا پھر اپنی لمبی کمرور اور صبروں میں پھٹی ہوئی اٹھیاں پھٹتی پھٹتی اور ٹپ ٹپ لٹکتے لٹکتے گئی۔

جب آتش لگایا پہلا کے پھٹنے سے آنکھیں پھٹلوں کے خوارے پھوٹنے لگیں تو اور گدی کی تمام چیزیں جل کر خاک و خاک مگر صبحی صدمہ اختیار کر گئی تھی۔ بعد ہوا آگ اسیر شہزادے کے دل میں بھڑک رہی تھی۔ اس کی حد سے بے یکن کادل بھی تھکتے تھے اس نے جب دیکھا کہ اس کا باپ غار محبت گل کے اس تاریک و طوفانک کمرے میں بند کر دیا گیا ہے جہاں سے آج تک کوئی سلامت نہیں نکل سکا تو وہ بے حد مضطرب و بے قرار ہو گئی۔ اس کا باپ بے کسوں کو کچھ کچھ شہزادہ جاسوسی نہ تھا مگر اس کے برخلاف یا یمن کے پہلو میں ایک حساس اور درد مند دل تھا۔ وہ یہ کچھ برداشت کر سکتی تھی کہ ایک پائیدار سلطنت کی امیدوں کا انحصار مرکز شریف طبع اور پھر اس کا بہادر محبت انڈیاں و گزر گز کمر جاسے اور کسی کو اس کی خبر تک نہ ہو۔ پہلے تو اس نے اپنے تمام اختیارات سے فائدہ اٹھا کر اپنے تمام مائیلی حریفوں کو کام میں لاکر اپ کو شہزادے کی رہائی پر مجبور کیا مگر افسوس اس کی کوئی بیٹی نہ چلی بلکہ برعکس اس کے تمام نگران اسیر شہزادے سے پروردہ قلم کرنے لگے۔

شہزادہ کو سخت رنج و گمراہی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کی تمام امیدیں خاک میں ملا دی گئی تھیں تاہم اس نے صحت نہ ہاری محبت میں انسان کا دل زیادہ مضبوطی کا سامنا کرنا دیکھا اور اس کی روح زیادہ قوی ہو چکی ہے۔ وہ ہر نصیبت کا شکار نہ کرتا ہے اور شہزادہ خوشامی سے کرتا ہے۔ شہزادہ کی دل میں محبت کا جھنڈہ موجزن تھا۔ اس نے چند قاتل و اختیارات مصلحتوں کو اپنے ساتھ لے کر شہزادے کو رہا کرانے کی کوشش شروع کر دی لیکن اس وقت جب کہ ان کی کوشش کامیابی کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ایک شخص نے غداری کی اور اس سازش کی خبر حاکم کے کانوں تک پہنچ گئی۔ وہ کچھ کہہ کر اس کے اپنے ہی گھر میں اس کے خلاف سازش ہو رہی ہے ہاشم کے تین بدن میں آگ لگ گئی۔ آنکھوں میں طوفان اتر آیا۔ اس نے تمام

سازشیوں کو بے درجی کے ساتھ پاک کر کے شہزادی کو زمین و آسمان کی فطرت پر دیا۔

دونوں بد نصیب امیروں کو کھانا پہنچانے کا فرض مسترد انجام دیا تھا۔ مسترد شہزادی کا اپنا تنگ حلال خادم تھا اور چھ نکل میں ہر شخص کو اس پر اختیار تھا اس لیے اس قسم کی ذمہ داری کا کام اسی کے سپرد ہونا تھا۔ مصدر کو یہ کی سلاطین میں سے تھا اہل کردہوں کو مقررہ وقت پر کھانا پہنچا کر تا۔ اس کے علاوہ انھیں اس مصیبت میں قہری بھی دیا کرتا مصیبت کا احساس خواہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو مگر ایک بھروسہ کی امداد ہی سے بھری ہوتی ہے ان میں اس کی جتنی کو بہت حد تک دور کر دیتی ہیں۔

یہ سبب اور صولت دونوں ملکہ و شہیدہ کو فخر میں میں بندھے اور ان دونوں کی کو فخر میں کے درمیان نہ معلوم کتنا کا مسلط تھا اور یہ بھی امید بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ دونوں کسی وقت ایک دوسرے کو مل سکیں گے۔ دونوں رات دن چٹروں کی دیا اردوں میں قید و بند رہتے اور بد قسمتی پر آفتو بہاتے رہے۔

ایک دن صولت کو فخری کی ایک دیا ار کو مقرر سے دیکھ دیا تھا۔ پاک ایک اسے بھونا سا سوراخ نظر آیا۔ اس نے چٹرو کو بٹانے کی کوشش کی تو ایک حد تک وہ ٹھک گیا۔ جب مصدر آیا تو صولت نے اس سے اسے کہہ دیا اور اس نے کے لیے کہا۔ وہاں دارنہ دم کے لیے یہ جہاں جو کھوں کا کام تھا لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح اسے کہہ دیا کہ ایک اور صولت کو پہنچا دیا۔ صولت اور اس کی دوسرے چٹرو کو بٹانے کا فخری دیر کے بعد چٹرو کو بٹانے گیا یہ نہ کیے کہ فخری اس کی امید بندھ گئی۔ وہ تمام رات چٹرو کو بٹانے کی کوشش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دیر چٹرو میں کافی بڑا سوراخ ہو گیا۔ شہزادہ اس میں داخل ہو گیا اور یہ نہ کیے کہ اس کے قدم زمین پر چڑھے ہیں۔ اس کا دل خوشی سے طبع ہو گیا۔ تاریکی میں چٹرو کیا جہاں تک کہ اس کا ہاتھ اسے کی سلاطین کو کھانا کھانے کے دل میں جھٹکا تھا۔ وہ بٹانے لگا۔ اس نے اپنی محبوبہ کو آواز دی۔ آواز بھگی ہی گونجی پیدا کرتی ہوئی تھا میں صاحب ہو گئی۔ اس نے وہاں آواز دی اب کے آواز کے جواب میں ایک مسلسل سی تلخ فخری شہزادہ سے بھگایا کہ وہ اپنی محبوبہ کی کو فخری کے ہاتھ سے اور اسے پر کھڑا ہے۔ اس نے یہ سبب کو تسلیم ہی دیا اور اپنی کو فخری میں وہاں آ گیا اور آتے ہی دیا میں چٹرو لگا دینے تاکہ کوئی آئے تو اسے بٹرنہ ہو دوسرے دن مصدر نے روشنی کا کھٹکا مچا کر دیا۔

رات کے وقت صولت دیا میں سے نکل کر یہاں کو فخری کی طرف چلا۔ یہاں سلاطین کے پاس آکھڑی ہوئی۔ دونوں تمام رات راتہ راتہ جہاں میں مصروف رہے ان کے درمیان موٹی موٹی خفاک پہلی سلاطین حاکم تھیں مگر ان کے دل ایک دوسرے سے وابستہ تھے دو تین دن بعد صولت نے یہاں کی کو فخری کی دیا میں سے بھی چٹرو بنا کر آمد و رفت کا راستہ بنا لیا اور یہ دونوں کے لیے جڑی خوش قسمتی تھی شہزادی کی کو فخری میں دست پڑ گیا۔ اب تو صولت دن بھر اپنے کمرے میں رہتا اور رات بھر یہاں کی کو فخری میں۔

دن گزرتے گئے اور اس رات کاظم سوائے مصدر کے کسی کو نہ ہو سکا۔ ہاشم کوئی بار اپنی بیٹی کا خیال آیا۔ آخر وہ ہاپ تھا لیکن مصدر نے یہاں کے مشورے کے مطابق اس کو فخری سے دھن کرکھا۔ شہزادی کو یہی تھا کہ اس کو فخری سے باہر نکل کر ایک قید وہ اپنے محبوب سے جدا ہو جائے گی اور دوسرے وہ اسے آزاد کرانے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ اس طرح دو سال گزر گئے پھر کو فخری میں اس کے دشمن نے صولت کو قید کر رکھا ہے۔ یہ سننے ہی اس نے دشمن کے ملک پر چڑھائی کر دی۔ بدیہہ کینہ پرور اور اہلکام ہاشم نے اپنے مسلح سپاہیوں کو حکم دیا کہ فوراً صولت کا قتل کر دو۔

رات کا وقت تھا اور چونکہ صولت بنا رہا تھا اس لیے یہاں اس کے کمرے میں آگئی تھی۔ مسلح سپاہی امداد داخل ہوئے۔ صولت کھڑا ہو گیا

محبت کی انہی یا کبھی اپنے محبوب سے لپٹ گئی۔ انعام میں کواریں چلیں۔ دو چلیں، کو نہیں اور اس کے ساتھ ہی دلاشے خون میں ڈبے گئے۔
چند لمحوں کے بعد محبت و محبوب دونوں ناسے بیٹھ کے لیے رخصت ہو گئے۔۔۔“

حموی کی آنکھیں اس طرح نم آلود ہو گئیں، جس طرح غزاں رسدہ زرد زرد سائے سائے گھاس پر بادش کے لشکرے گریں اور بکھل جائیں۔

اس نے میرے چہرے سے لگا لیں، دنا کر قلعے کی جانب دیکھا۔ لمبی آہ بھری ایسا مظلوم ہوتا تھا کہ اس کے سینے میں طوفان مچا ہے۔ وہ بے اختیار دونا چاہتا ہے مگر چند لمحوں ہی میں اس کی آنکھیں خشک ہو گئیں۔ اس کی افسردہ نگاہیں کہہ ہی نہیں کہہ سکتی کہ باج سہوں نے آنسوؤں کو چس لیا ہے۔ وہ دونا چاہتا ہے مگر رو نہیں سکتا۔

”نیکو دل گل ہے جس کے ایک کمرے میں دو محبت کرنے والی مستیوں نے محبت ہی کے ہاتھوں صحت کا جام پیا اس واقعے کو بیچے گئی برس گزر گئے ہیں مگر ایسا مظلوم ہوتا ہے کہ اب بھی میرا دوست مفرد میرے سامنے بیٹھا ہوا اس دلدرد واقعے کو سن رہا ہے۔

”مفرد آپ کا دوست تھا؟ میں نے پوچھا

”ہاں وہ میرا دوست تھا۔ اس واقعہ کے بعد وہ سال تک زندہ رہا۔“

3

حموی نے ایک مرد آہ بھری۔ قلعے کی طرف دیکھا۔ پھر احتیاطاً انگیز نگاہیں اٹھ پر ڈالیں اس کے بعد کسی گہری ٹکڑ میں غرق ہو گیا۔ وہ اس طرح خاموش ہے جس وحشت، بیٹھا ہوا اس نظر آ رہا تھا گویا جت کا ایک تودہ ہے یا قلعے کی دیوار سے گرا ہوا ایک حجر ہے یا خدا اس بے قرار محبت کی طرح جہاں چاہی محبوب کے شانے کو زور دیکر دیکھ کر انتہائی جبری کے ساتھ قدم اٹھانے لگے۔ آسمان کے ایک ابر آلود راستے پر اڑا ہوا تھا۔

صورت و یا کبھی کی داستان محبت سن کر میرا دل بے اختیار چاہتا تھا کہ کاش میں بھی جان بھٹکی پر دکھا کر اپنی محبوب کے لیے دنیا کی ہر مصیبت کو خند و چبھائی سے برداشت کر لیں۔ زندگی کے ہر لمحے کے سامنے چند میریوں اور اس وقت سب کہ میری جان لہوں پر ہو۔ میری دلخواہ محبوب پر ایک لطف انگیز نگاہ اٹھ کر میرا دل دے۔ یہی میرے لیے سب کچھ ہے یہی میری زندگی کا حاصل ہے کاش اسے کاش حموی دائیں ہاتھ کی

انگلیوں کے لیے لیے ہاتھوں سے زمین کو کریدنے لگا اور چند لمحوں خاموش رہنے کے بعد بولا

”مجھے یقین ہے کہ اب تم اس جہی سامان جنوں کو اپنے دل سے نکال دو گے؟“

”یہ جنوں۔۔۔ افسوس یہ جنوں میری رنگ رنگ میں سرایت کر چکا ہے میں نے کہا۔

حموی نے اپنی نظروں سے مجھ دیکھ کر مرد آہ بھر کر بولا۔ تم بولتے ہو جہاں اگر اب بھی تم اس مرض سے کھات حاصل کرنے کی کوشش کرو تو جینا کا سیلاب ہو جاوے۔ ہر شخص کو محبت کی آگ سے چھڑا جائے محبت کی چنگاری شروع شروع میں تو مسرت انگیز و راحت سازان حرارت بدن میں دوڑاتی ہے مگر کچھ عرصے کے بعد چہن سو دشمنوں میں تبدیل ہو جاتی ہے میری تجھ سے مانا اور محبت کی آگ سے دور بھاگو

”کاش میں ایسا کر سکتا۔۔۔ کاش یہ بات میرے اختیار میں ہوتی۔“

”سب کے لئے سب سے اچھا ہے“

”محبت کرنے والا دل محبت پر اختیار نہیں رکھ سکتا۔ اگر یہ بات غلط ہے تو حکومت نے کیوں اپنی چالیس چوکیوں میں ذیلی پولیٹیسپال ایجنسیوں کے لئے راجی راجی کرچہ کیا؟“

یہ۔۔۔۔ یہ ”تھی آگے نہ بول سکا۔ اس کی ہاتھیں نرم آلودہ تھیں۔ چہ لہجہ خاموشی طاری رہی۔ پھر وہ

"ابھوں نے اپنی زندگی سے دشمنی کی۔۔۔ لیکن تم ان کی بھڑائی کیوں کرو۔۔۔؟"

میں خاموش رہا۔ اس کا جواب میں دے ہی کیا سکتا تھا۔؟ مہدی نے قہقہے پر لگا دیں، ہمارے۔ میں دوسری طرف منہ پھیر کر دوسری
میں سے ہنسنے لگا۔ وہ دیا کے پانی کی لمبی اسٹیپ پکیر دیکھنے لگا اور سو نہ لگا۔ ہمارے میں چپچی ہوئی اس سفید کپڑے کی طرح میرے غلٹے کو دل
میں لگی ایک ہلکی سی امید روشن ہے۔ اگرچہ آج صبحی مجھ سے سرد مہدی بہت دیر ہے مگر ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں اس کی سرد مہدی صحت میں تبدیل
ہو جائے۔ اس وقت مجھے یقیناً دنیا کی سب سے بڑی نعمت حاصل ہوگی۔ لیکن ایسا، کبھی ہوگا؟ ایسا کبھی ہو سکتا ہے؟

یہ سوال میرے دل میں اس طرح پیدا ہوا تھا جس طرح وہ دایمیں ایک دم غلیظی آجائے سلسلی جو سلوک مجھ سے کر رہی ہے اس کو نہ نظر کیا جائے تو تجراس کے افلاحت کا گمان نہ کن میں نہیں آسکتا۔ اس پر ایک سفاک ساحرہ کی طرح اس کی سرودھیاں مجھے یاد آئے گیئیں تین سال سے میں مسلسل اس کے خالانہ سلوک کا لقا نہ بنا ہوا تھا۔ اس دوران میں ایک والدہ بھی اس کے سسکراتی ہوئی نظروں سے مجھے نہیں دیکھا تھا ایک بار بھی میری طرف تو نہیں کی تھی۔۔۔ یہ حالات میرے ذہن پر چھا گئے۔

یہ ایک ایک خاص طریق کے دائر میں آنے سے میں نے حیرت کھائی۔ حوی صاحب ہر چکا تھا۔

تقلید کی عیب دیا اور اس صددیاں کے رافڈیوں کے واقعات اور باہر صلات دیا لیکن کی حسرت تاک انتہام صحت کی داستان جیلے میں چھپائے نہ معلوم کس کا انتقاد کر رہی تھیں؟ نہ معلوم کیوں سو گھوڑوں پر غائب ہو گئیں۔ چا نے کی بد صم شعاعوں کے سادہ باقی اور فراتے لٹنے لگتی اور صر سے اور صر اور صر سے اور صر پاتا آری چار ہی تھیں۔۔۔۔۔؟

میں بکھرے اور وہاں غمزدار گھبرا کر آ کر بیٹ گیا۔ غم نے مجھ کو دنیا اور باطنیہا سے غافل کر دیا۔

کچھ دیر کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ قریب ہی لپٹا ہوا تھا۔ اس کی حشا میں جلتی ہوئی سسڑوں کی مانند میری آنکھوں میں چھیں۔ میں نے پہلو بدل کر آنکھیں بند کر لیں میری کی سٹائی ہوئی نر پٹائی کے واقعات کچھ بعد دنگرے میری آنکھوں میں بھرنے لگے۔ میں سوچنے لگا۔ اگرچہ سولت و یاسھن محبت ہی کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تاہم ان کی خوش قسمتی میں وہ بھر پور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سولت ایک بہت بڑی سلطنت کا کافی مہد تھا۔ ناز و نعم کے آغوش میں پرورش پایا ہوا۔ شاہانہ زندگی بسر کرنے والا دنیا اور زندگی کے مصائب سے بے خبر اور محبت دل و جان سے اسے ہمارے ہی تھی۔ اس کے مقابلے میں میں آدھوں جہاں چاہوں جاسکتا ہوں جو چاہوں کر سکتا ہوں لیکن میری جیو پ میری طرف دیکھنا بھی پہنچ نہیں کرتی اس خیال سے کہ تھی میری آنکھیں پر دم ہو گئیں میں نے بے قرار ہو کر پہلو بدل لیا۔

ہوں تو یہ تھا کہ لاش میں موت سے خوشتر ہی اپنی عالم گہوہ کے دل کو فتح کر لوں۔ ہر وقت میرے دل میں بے قرار رہتی تھی۔ لیکن کسی رات تو یہ تھا میرے دل کے در سے در سے پر بھجھا پلائی۔

میں لیٹا رہا اور نہ معلوم کب میری کچھ حالت دہلی کہہ رہا تھے مجھ تک پہنچی ہوئی میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ آنے والا میرا انوکھا تھا۔

لپ کو پلٹے ہوئے دیکھ کر اس نے حیرت سے لمحے سے کہا۔

”لپ آپ نے ابھی جلا لیا ہے یا یہ تمام دات بھتا رہا ہے؟“

”بھتا ہوا کو اس“ میں نے کہا اور اٹھ کر کڑکی میں سے باہر دیکھنے لگا۔ آفتاب نمودار ہو چکا تھا اور ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میرا اندام لپ بچھا کر چپ چاپ جا گیا۔ میں اپنے سر اور آنکھوں میں شعلے دو دھوس کر رہا تھا۔ اس لیے بھر لیت گیا اور اس وقت کمرے سے باہر نکلا۔ جب دن کا کافی حصہ گزر چکا تھا۔ اب میرے دل میں قناعت تھی کہ دن بہت جلد بیت جائے اور میں شام کو دھری سے طوں اور اس سے صولت اور یا کہیں کے حلق میں بکھار دیا جائے کروں۔ نہ معلوم مجھے ان کشمکشان محبت سے کیوں اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ میں چاہتا تھا ہر وقت انہی کے حلق میں ہاٹیں ستار ہوں۔ ابھی شام ہوئے میں کچھ دیر باقی تھی کہ میں اس بارغ میں بھٹکی گیا جہاں میری محبوبہ میرا کرتی تھی۔ لوگ میری قوت راج میں مشغول تھے جس میری محبوبہ کہیں بھی نہیں تھی۔ میں نے بارغ کے سین تریں پھولوں کو اکٹھا کر کے گلدستہ بنایا اور بارغ سے باہر نکل کر اپنی محبوبہ کی آمد کا اظہار کرنے لگا۔

مغرب کے طوئیں کو شے میں زور دیا آفتاب اس مسافر کی طرح نظر آ رہا تھا جو پلٹے پلٹے تھک کر ہر طرف سے واپس ہو کر گھبراہٹ ایک جگہ بیٹھ جاتا ہے۔ تاریکی ہر طرف پھیلنے لگی تھی۔ اچانک مجھے دور سلی کا گفتگو مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ میرے دل کی جگہ جس نظر آ رہی تھی کو پانڈی کی شگافہ سے ملے ہوئے اس کے سونوں سے چاند کی جیسے شعاع پیرا رہی ہوا۔

وہ تھی اسی۔ میں نے موقع کو تیسرے ہانا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کا اکتفا کرنے لگا یہاں تک کہ وہ میرے قریب آ گئی میں نے گلدستہ اس کے قدموں پر ڈال دیا۔ وہ زوردار کی عمارت کا گنجز نظر میں مجھ پر ڈالیں اور پھر روانہ ہو گئی۔ میں دل سوس کر رہ گیا۔

شام کی تاریکی کافی ٹھیک تھی اور اس تاریکی میں خاک پر چڑے ہوئے پھول ہڈا ہڈا خاموش مجھے میری بد نصیبی کی داستان سن رہے تھے۔ وہ میرے سوا دیکھا میں کون چاہتا تھا کہ یہ تھیں پھول میرے حراں نصیب دل کے ٹکڑے ہیں۔ جنہوں نے نہایت عمارت کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا ہے۔

آخر میں تھلے کے پاس پہنچا اور دروازے کے ساتھ ساتھ پلٹے لگا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا کہ ابھی تک سلی کی آمد کا انتظار ہوں۔ بجلی کی رو کی طرح اپنی ہوا کی کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ میں نے آہ بھر کر روپ دیکھا۔ ایک تھلے کی کڑکی میں سے ایک لمبے کے لیے ایک نہایت دل آویز حسین چہرہ میری نظروں کے سامنے آ گیا اور پھر غائب ہو گیا۔

میں تنہا کی مانند کڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ کافی دیر تک دیکھتا رہا مگر وہاں کبھی نمودار نہ ہوا۔ کیا یہ سچ تھا؟ میرے دل میں خیال پیدا ہوا مگر اس حالت میں پہنے کا خیال کیا مگر یہاں ہو سکتا تھا؟ عالم پیدا رہی میں سب کچھ کچھ رہا تھا۔

تھلے کی بلند سنگین اور مصیبت دہار کے پہنے پر ایک دلوں کے جھوم میں سفید اور بارے کی طرح چاندنی کی چادر بھی ہوئی تھی اور سفید چادر کے ایک گوشے میں مختصر سا مٹا تھا جس میں سے ابھی ابھی ایک حسین و شاداب چہرے نے نمودار ہو کر میرے دل و دماغ میں دکھان پر چا کر دیا تھا۔

میں نے بڑھ کر اپنا دھندلایا۔ اس حالت میں بھی کچھ دیر وہاں رہا۔ آخر یہ خیال کر کے کہ شاید میری سے ملاقات ہو جائے میں وہاں سے ہٹا اور گھر کے درخت کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ ہوا کے سستے دھبوں کی خوشبو کی شاخوں کو ہلایا کر چاندنی سے سرگوشیاں کر

رہے تھے میں بھگور کے درخت کے نیچے پہنچا مگر وہاں جہی کا نقش قدم بھی نہیں تھا۔ میں درخت سے نکل نکا کر بیٹھ گیا اور اپنی نگاہیں قلعے کی دیوار پر جمادی اسی انکار میں پہ لیاں میرے ذہن میں بیدار ہوئی "یہ حیدر یا کھن تو نہیں؟" یہ سوال میں نے دل میں بار بار دہرایا مگر جب جہی کے منانے ہوئے واقعات کی روشنی میں اس پر غور کیا تو میرے دل کو یقین ہو گیا کہ یہ پراسرار حیدر کسی صورت میں بھی یا کھن نہیں ہو سکتی۔ وہ تو کئی سال قبل اپنے محبوب کے ساتھ موت کے گھاٹ اتاری جا چکی ہے تو پھر یہ حیدر کون ہے؟ انھیں خیالات گواہن میں لیے ہوئے میں سو گیا۔ خواب میں بھی وہ پراسرار حیدر بار بار میری نگاہوں کے سامنے آتی رہی۔ رات کے آخری حصے میں میں بیدار ہو گیا قلعے کی صیہب دیواریں چاندنی کو انکسار میں لیے ہوئے میرے سامنے کھڑی تھیں۔ میں ایک جذبہ بے تاب کے ذریعہ اثر اٹھا اور اسی کھڑکی کے نیچے پہنچا۔ درجہ کھڑکی کو کھینکا۔ جب بالکل ابھری ہو گیا تو پھر یاد دل کا خواست گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

4

جیسے ہی شام ہوئی "میں گھر سے نکلا اور قلعے کی طرف روانہ ہو گیا۔ سب سے پہلے بھگور کے درخت کے نیچے پہنچا۔ جہی اب بھی وہاں نہیں تھا۔ اس کے بعد کھڑکی کے نیچے چلا گیا۔ چاک جیسے ہاں مسوس ہوا جیسے کوئی بھدے پیکر ایک دم کھڑکی سے اٹھ ہو گیا ہے اس کی صورت تو میں خد کچھ سنا۔ لیکن میرے دل میں یقین بیدار ہو گیا کہ یہ قلعے کی حیدر تھی۔ وہ رات بھی میں نے وہاں بسر کر دی۔ نہ صرف رات بلکہ اور کئی راتیں بھی وہاں گزار گئیں۔ میں جہاں تھا کہ آخر قلعے کی اس پراسرار حیدر نے صرف ایک حلقہ دکھا کر مجھ پر کیا جاو کہو یا ہے؟ میں کہیں بار بار اس کھڑکی کے نیچے آ کر کھڑا ہوتا ہوں؟

اس طرح کئی دن گزر گئے میں مسوس کرنے لگا کہ قلعے کی حیدر میرے دل و دماغ پر چھا چکی ہے مقام حیرت پر تھا کہ طلسمی کو بھی بہت حد تک میں نے بھلا دیا تھا۔

اس رات میں قلعے کے پاس پہنچا اور اس دیوار کو ٹھکنا ہاتھ کر دیکھنے لگا جس کے پتلے میں میرا سر اچھا چھتا تھا۔ میں وہ تک کھڑکی کو کھینکا۔ اس واقعہ سے قبل کا بے گارے جہی سے ملاقات ہو چلا کرتی تھی۔ مگر اب تو میں نے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ نہ معلوم وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔ میرے دل میں یہ خیال بیدار ہو گیا تھا کہ جہی اس حیدر کے حلقے بہت جگہ جاتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ میں اس سے ملاقات کرنے کے لیے اس قدر بے تاب ہو رہا تھا۔

میں قلعے کے چاروں طرف گھومتا رہا کہ کوئی راستہ اندر جانے کا مل جائے مگر ایک آہنی دروازے کے علاوہ کوئی راستہ اندر جانے کا نظر نہ آیا اور اس آہنی دروازے کا یہ حال تھا کہ اس کا آدھا حصہ بڑے بڑے پتروں میں چھپا ہوا تھا۔ پہلے تو اس بڑے بڑے پتروں کو ہٹایا جائے پھر کہیں جا کر دروازہ نظر آئے۔ اس کے علاوہ اس دروازے کو کھولنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ اچانک میری نظر قلعے سے کچھ دور شاہ بلوٹ کے ایک درخت کے قریب ایک مٹیالی چٹان پر پڑی میں یہ سوچ کر کہ چٹان پر بیٹھ کر کھڑکی پر نگاہ پڑ سکے گی۔ اس طرف چلے گا اور وہاں بیٹھ کر کھڑکی دیکھنے لگا۔ کچھ دور وہاں بیٹھا رہا مگر یہ سمجھا کہ اس دور فرات اشعار مشتاتے لگا۔ جیسے ہی میں نے بلوٹ دیکھے چٹان کے پاس ایک عا دنگر آیا۔ میں فوراً چٹان سے نیچے اتار اور عا میں داخل ہو گیا۔ عا کے ایک طرف ایک مڑی مڑی نظر دی میں نے مڑی پر قدم رکھ دیے۔ عا کے طرف سے میرا دل دھڑکنے

لگا کر قلعے کی پراسرار حید کا مختلف ذخیرہ چھوڑ دیا۔ مہر کی نگاہ تھیں گے سامنے نمودار ہو اور میں آگے چلنے لگا۔ آگے ایک اور سبز چمن تھی۔ اس کے بعد ایک بعد دیگرے کئی سبز عیاں آئیں۔ میں امید و ہم کے عالم میں چلے اترتا گیا۔ چار کی اس قدر چمنی کہ گدا کی پتا ہر قدم پر آتا۔ پھر قہا کا ب زندہ ہا ہر نہیں نکل سکوں گا۔ میر جیوں کے بعد ایک تاریک راستہ تھا میں ٹوٹل ٹوٹل قدم اٹھانے لگا۔ آخر میرا ہاتھ ایک دروازے لگا۔ میں دروازے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ خدا کی پتا یہ دروازہ منہ ہونے کا نام ہی نہ لگتی تھی۔ ایک جگہ پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ راستہ بند ہے۔ میں حرا اور واپس آنے کا ارادہ تھا کہ گرم کرپ لاکر پھر یہاں آؤں گا اور قلعہ کے اندر جانے کا راستہ معلوم کروں گا۔ واقعی یہ ایک وسیع علاقہ تھا۔ میں خاص میں داخل ہوا۔ میرے پاؤں فرش پر چرے اور میں آگے چلنے لگا۔ اس حید سے چلنے کی ہمدرد راستے کی تاریکی کو روشنی کر رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد مجھے ہلکی سی روشنی نظر آئی اور اس کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ میرے سامنے چمکی سبز عیاں ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل اچھلنے لگا۔ میرے دل میں یقینی پیدا ہو گیا کہ میں قلعے میں داخل ہو گیا ہوں اور منتر عیب اس پراسرار حید سے ملوں گا۔ ساتھ آٹھ سبز عیاں تھیں۔ ان سبز جیوں کے بعد میں قلعے میں تھا۔۔۔

چاروں طرف کھاس ہے تر تھی سے آگے ہوئی تھی۔ سرد اور بلوط کے درخت چاہا کھڑے تھے۔ حوض سوکھ گئے تھے۔ غارے رنگ آلود تھے۔ جلاہوں میں گرد و طہار چڑا ہوا تھا۔ میں ایک بے تابانہ ایک جھوٹا نڈہ ہے کہ پراثر اس پراسرار حید کو تلاش کرنے کا کبھی مجھے خیال آتا کہ میری وہ پراسرار حید کسی سرد کے سامنے میں سو رہی ہے۔ کبھی گمان ہوتا کہ وہ کسی سوکھے تالاب کے کنارے کوئی لٹکین گیت گارہی ہے اور کبھی شبہ ہوتا کہ وہ لٹکے آتے دیکھ کر ایک ایسی جگہ چھپ گئی ہے جہاں میں انتہائی کوشش کے باوجود کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ میرا جی کہ اس ہاؤس اسے کہاں تلاش کروں؟ آخر میں ایک تالاب کے کنارے پہنچ گیا۔ چاند قلعے کے کنارے پیچھے چھپ رہا تھا۔ آسمان کی نیلگوں ستروں میں ہر گاہ ایک ٹکڑا ایک بے تاب محبت کی طرح آوارہ بکھر رہا تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے درختوں کے سوکھے پتے سو گوار کھڑ کھڑا ہوتے پیدا کرتے ہوئے تالاب میں گر رہے تھے۔

میں وہیں سے اٹھا اور یہ خیال لے کر اٹھا کہ اس کھڑکی کو تلاش کرنا چاہیے۔ جس میں اس حید نے جھلک دکھائی تھی مگر اس کمرے کو جس میں وہ کھڑکی تھی تلاش کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا میں کئی کمروں میں داخل ہوا۔ اوپر اوپر ہر جگہ اسے تلاش کیا لیکن میری کوشش کا سیلاب نہ ہو سکی۔ آخر تھک کر میں ایک سرد کے درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ حسین تصورات کی منظر ڈراموں نے مجھے تھک تھک کر سلا دیا۔ کئی راتیں عالم بیداری میں گزار دی تھیں۔ اب جو نیند آئی تو ایسی آئی کہ میں اس وقت بیدار ہوا جب سورج نصف النہار پہنچ چکا تھا۔ روشنی میں میں نے اس کی تلاش شروع کر دی۔۔۔ مگر فضول۔ آخر میں اسی راستے ہا ہر نکل آیا۔ جب بات یہ تھی کہ ہا ہر لٹکتے دھت کسی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

5

دوسرے دن جب کہ آفتاب اپنے سطر کا تہائی حصہ ختم کر چکا تھا۔ میں اسی راستے سے قلعے میں داخل ہوا اور اس پراسرار حید کو تلاش کرنے لگا۔ میں بے تابی سے ایک کمرے سے دوسرے میں جاتا۔ اضطراب کے عالم میں چھوٹی چھوٹی چیزیں کے سرد گرد دکھائی دیتا اور دل میں شوق لڑواں لے ہوئے چپے دراستوں کو لے کرتا۔ آخر تھک کر راجس ہو کر ایک بیاد چتر پہنچ گیا۔ یہ بیاد چتر قلعے کے کنارے گرا ہوا تھا۔

شام ہو چکی تھی۔ درختوں کے پودوں کے پتوں کے سائے لیے ہو گئے۔ آفتاب لب بام کی زد و ماچس اور چمکی ہوئی شعا میں بلند درختوں اور پتوں کے کنارے کے کرٹھن کی لامحدود وسعتوں میں پھیلی ہوئی تاریکیوں میں غائب ہو رہی تھیں۔ لیے لیے سائے مسکتے ہوئے رہ چکے ہوئے اندھیرے کے سمندر میں ڈوب رہے تھے اور گھٹے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پراسرار صیغہ بھی ایک مہاپرسی کی مہاجر کی اس دنیا میں غائب ہو رہی ہے ایک سو گئے ہوئے درخت کی ٹہنی پر چٹل چٹلی اپنی سرسبز آواز سے غصہ میں بدلتی ہوئی آواز کر رہی تھی۔ دروازہ کھڑکھڑا رہا سو گئے چنے ٹھنڈوں سے گر گر کر آہیں میں بکر بکر کر گھر گھر کی آواز پیدا کر رہے تھے۔ قلعے کے مین اوپر بڑے سیاہ پادل کے آخری سرے پر دم چاند چاند نظر آ رہا تھا گویا ریت کے قوے پر پھول کی ایک تازہ لڑ رہی ہے ہوا کے جھوکے آہستہ آہستہ چل رہے تھے یہ ایک گھٹے محسوس ہوا کہ کوئی وہے پاؤں میرے پاس سے گزر رہا ہے۔ میں اٹھا کر دیکھا۔ قریب دور کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ ہوا کی لہروں سے ایک پارے کی شاخیں حرکت کر رہی تھیں۔ چاند کی دم روشنی درختوں اور پودوں میں چمکی چمکی کر رہی تھیں۔ میں نے اس پودے کو کھڑکھڑایا اور دور تک لگا دیا دروازے کی طرف بھٹکا دیکھا کہ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگا۔ ہر قدم پر خیال ہوتا کہ قلعے کی پراسرار صیغہ پاس کے پودے میں چمکی ہوئی ہے۔ ہر لڑکھانہ ہوتا کہ وہ ساتھ ساتھ چل بھٹکے کچھ کر کسی زمین روز کرے میں چلی گئی ہے۔ اگر چہ بار بار مہاجر کی کا سامنا کرنا پڑا تھا تاہم ایک شیعہ پرزد اور جانور انگیز جڑ پتہ چھو گئے تھے اصر سے اصر دور سے اصر دور سے بھڑکا تھا۔ لگا ہوں کو کوئی ہستی نظر نہیں آتی تھی مگر دل کا کامل یقین تھا کہ وہ صیغہ اسی وہاں قلعے کی پراسرار غلطیوں میں سانس لے رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ گھٹے اس بات کا بھی یقین ہے کہ وہ دنیا کی عین ترین و دشیزہ ہے۔ اس کے لیے لیے بال کر تک پہلے ہوئے ہیں۔ اس کا پیرہن لہا ہے دل آویز نہایت شاداب ہے وہ عمر و خلق کی جگہ ہے اور ہر قدم پر نرہ کھینچتی پھرتی ہے۔

میں قدم اٹھانے ہار رہا تھا۔ جہاں تک کہ قلعے کے آخری حصے میں پہنچی کیا۔ سامنے ایک میز می نظر آئی۔ میں میز سے پیچھے ہٹا۔ اب معلوم ہوا کہ جہاں قلعے کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ جہاں گھاس بہت حد تک ترتیب کے ساتھ رکھی ہوئی تھی پودوں کی ترتیب بھی کئی اطمینان کی رہیں منت تھی۔ شاخوں پر شاخوں کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ میرے دل میں پیا جوش یا دلول اور پیا جادہ پیدا ہوا گھٹے محسوس ہونے لگا کہ وہ وہ شیزہ جسے اچھائی ہے تپائی کے ساتھ زعفران پادوں اور اپنے منظر جلوں سے میرے خواہوں کی تعدادوں کو بہکا رہی ہے یہاں بھی کسی پودے کے پیچھے جہاں کسی کتاب کے کنارے چھپی ہے۔ میں دیر تک پھرتا رہا۔ پھر عرض کے کنارے سے چھپا اور سینکے ہوئے نشہ برساتے ہوئے تصورات کے انجم میں چرے لگا۔ غنہ ایک نرم رو گھٹت پادوں میں جو گئے کی طرح میری آنکھوں میں آئی اور میں سو گیا۔ وہ تک سوتا رہا۔ پچا ایک میرے خواب میں تھی۔ وہ درہن تھی۔ ہوائی دلی کے قریب کی طرح ایک لہو اٹھا اور غصہ میں قہر قرقرانے لگا۔ میں بیدار ہو گیا۔ وہ لہو بھی غصہ میں لہر رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو ملے۔ واقعی یہ عالم پیدا ہو رہا تھا۔ میں آگے بڑھا۔ قریب آواز آ رہا کہ گونج رہی تھی۔ پھر آواز بند ہو گئی اس کے ساتھ ہی شاخوں کے دروازے آہیں میں گھرانے کی آواز کان میں آئی۔

ایک جگہ پہنچی کہ میرے قدم ٹوڑ پڑا۔ گئے۔ مجھے سے کہہ دو گھاس پر ایک ریل پڑی تھی۔ میرا دل اور ماغ مسرت کی مستیوں میں بکھر ڈوبا گیا۔ میں تھری کے ساتھ ریل کے پاس پہنچا اور اسے اٹھا لیا۔

یہ خیال میرے ذہن میں پیدا ہوا اور اسی خیال کو لیے ہوئے پودوں کی شاخیں پتا چکا کہ اس غزل و مہر کو کھڑکھڑانے لگا۔ اسی اٹھا جس پکھو اور گھٹے سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ میں اس کی طرف چلا۔ مگر سایہ بہت جلد غائب ہو گیا میں نے ریل کو ایک طرف

دیکھو پاؤ اور کھڑے ہو کر دور دور تک نظر ڈالنے لگا۔ میرا گمان تھا کہ جلد ہی اس پر اسرارِ حق کی کوئی کیمیا ہو جائے گی۔ مگر میرا یہ خیال غریب تخیل ہی ثابت ہوا۔ ایک جنوں انگیز جذبہ میرے دل دو دماغ پر چھا گیا تھا اور میں اس طرف چلتے لگا۔ جہاں ابھی ابھی میری نگاہوں نے ایک سائے کو اڑکتے کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ شام کی ہر جنبش پر محسوس کرتا کہ وہ اسرارِ حق کی پودے کے پیچھے چھپ کر شیطاں کو بنا کر گھسے دیکھ رہی ہے۔ ہوائی سرسراہٹ پر گمان گزرتا کہ وہ بحرِ طرازِ حیدر مجھے دیکھ کر خوف کے مارے بھاگ دی ہے۔ اپنی مسلسل کوششوں کی ناکامی کے باوجود میں نے حاشیہ چاری دیکھی اسے ہر ہر گوشے میں حاشیہ کیا "ہر ہر گوشے میں ذمہ دار مگر شاید وہ پانی کی ایک لہر تھی جو دریا کے پہلو سے اٹھ کر تودہ دیکھ میں غائب ہو جاتی ہے۔" ایک تودہ دیکھ تھی جو سمندر میں گر کر ہلک جھپکے میں غلیل ہو جاتا ہے یا پھر وہ ایک روشنی ستارہ تھی جو سمندر پر آسمان کی لامحدود پہنائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ چودوں کی شاخیں یوں ابھتی پڑتی تھیں گویا ان پر ایک گھب و غریب ظلم کا یہ چھوڑا ہوا ہے۔

آسمان کی نیچلیوں و سحر کی پر نچھے نچھے ستاروں کا کارواں خاموش دم بخور رہا ہوا۔ چاند کی بھینس کشی ایک بڑے سے سیاہ ہادل کے طسارتی غار میں آہستہ آہستہ غائب ہوتی ہوئی سایہ پار سے مہبت و ششدر۔ ہوا حیرت زدہ "دک دک کر ٹپٹی ہوئی۔" فضاوں میں ہر ایک طرف ظلم کے دھند لگے زمین پر ہر طرف حیرت زدہ سائے اور اس ظلم سحر کی دنیا میں سحر انگیز یوں کی اس دنیا میں ایک پر اسرار حیدرِ ساحل میں گنجی سائے نکھیرتی "ایک سائے کی طرح رواں دواں۔۔۔"

پاک ایک ایک پودے کے قریب ایک سو کی ٹپٹی کو جنٹیل ہوئی "میرا سانس رک گیا اور قدم رک گئے۔" طیالات کی درواک گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر حوی کھڑا تھا۔

حوی دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے تیزی سے ہاں ہانپنا چاہا۔ ابھی وہ ہی قدم اٹھائے ہوں گے کہ حوی غائب ہو گیا۔ حوی یہاں اس دیوانہ جیسے میں نے خواب تو نہیں دیکھا؟ میری آنکھوں نے دھوکا تو نہیں کھایا؟ انھیں میں عالم بیداری میں ہوں "بھکر۔۔۔" میں ابھر ابھر پھرنے لگا اور جب واپس آیا تو وہاں بڑا ہلکا کام دکھان ابھی نہ تھا میں وہیں سو رہا۔ یہاں تک کہ قلعے کے چنار کے عقب سے سورج طلوع ہوا اور میں قلعے سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

6

دوسرے دن جب مغربی آسمان ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخسائی سے لالہ قام ہو گیا۔ میں گھرتے نکل کر سب سے پہلے قلعے کے پاس گنبد کے درخت کے نیچے پہنچا اور حوی کا انتظار کرنے لگا۔ وہاں سایہ و بھم کی حالت میں دیر تک بیٹھا رہا اور جب مابین میں ہو گیا تو اسی پر اسرار راستے سے قلعے کے اندر داخل ہوا۔ آخری چوڑی پر قدم رکھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا کہ ابھی کوئی خلاف معمول واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ چند من بعد کھڑکا ہوا دل اور آنکھوں میں ایک دیانے شوق و بے قراری لیے ہوئے میں قلعے کے اندر پہنچا۔۔۔

وہی طسارتی دنیا تھی وہی سحر آلود سائے اور پھر وہی میرا جذبہ تجسس اور بھت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ میں اسی جگہ پہنچا۔ جہاں کزیتو رات گزاری تھی اور پودے کے قریب بیٹھ کر آواز کا انتظار کرنے لگا۔ "پاک ایک کسی کچا سے ایک شیریں دہل آج فلو نکل کر فضا میں

قرر فرمایا۔ میرا جتنا بہتر سامنہ دو کے اظہار اسی کج کی طرف جانے لگا۔ آخر ایک سانس کی طرح وہاں پہنچا۔ وہاں میری نظروں نے جو منظر دیکھا وہ میں جہم و اندیش بھی نہیں بھلا سکتا۔ ایک نہایت حسین و جمیل وہ شیر و بلی بھی برہا پر کاری تھی۔ میں چوہے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ شیر و بلی کے جسمی ہاتھوں کی نہیں شعلوں تک۔ فسادوں پر جوں بکھری چلی تھیں۔ جیسے شفق کے سینے پر طغائی کر نہیں چھو رہی ہیں اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور نہایت حسین تھیں اور ان پر بھریں۔ یوں چھائی ہوئی تھیں گویا وہ ایک سطر پر فضا میں اڑتے ہوئے پرندوں کی ایک ٹہنی تھا۔ اس کا سا پر لہر رہا ہے اس کی پتلی پتلی نورانی اگھیاں برہا کے تاروں پر جھنک کر رہی تھیں۔ مجھ پر ایک غم بے ہوشانہ کیفیت سی چھا گئی۔ ایک ناقص تجویز نشہ میرے دل اور مارغ کھینچا ہو گیا۔

وہ پراسرار حیدر چاند کا ایک خواب جمیل تھی۔ بھروں کے ذہن کا تصور حسین تھی اور بھر سو بستی کی روح سے نکلا ہوا ایک لفظ نکلیں تھی۔ میں نے اختیار ہو کر اس کے پاس پہنچ گیا اس کی آنکھوں کی چٹیاں کھل گئیں اور ایک بھگی سی چٹا اس کے لبوں سے نکل کر فضا میں قمر قرانی "اور نہیں"۔۔۔ میں نے کہا۔ وہ دیکھے بہت گئی۔ برہا گھاس پر گر چلی۔

"اور نہیں"۔۔۔ جھیں ذرا نہیں چاہیے۔ میں تمہاری تلاش میں اتنا عرصہ سرگرداں رہا ہوں" میں نے جلدی بھلی کہا۔ وہ اور سی دیکھے بہت گئی۔ "مجھے جانے دو۔۔۔" یہ کہتے ہوئے اس کی سسک ہوئی آنکھیں غم آلود ہو گئیں میں کھڑا رہا اور وہ وحشی برہا کی طرح بھاگ کر نظروں سے غائب ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اسے صاف اُکھروا نہیں بھی نظر نہ آئی۔ آخر قہقہہ کر رہا تھا کہ اپنے سینے سے نکال کر میں لیتے کیا۔ نیز تو داسکی لیکن طوطا اور خصوصاً تہمت کی سوجھوں کی طرح میرے دل اور مارغ پر چھانے رہے۔

اس واقعے کے بعد میں نے مسلسل کئی راتیں اور ان قلعے میں گزار دیں مگر اس دوران میں قلعے کی ساحرہ کی جھک تک بھی نہ دیکھ سکا۔ سوچتا تھا کہ سوائی لغت اتنی تکدل ہوتی ہے یا پھر میری قسمت ہے کہ جس صورت کو بے تابا نہ چاہوں وہی مجھ سے دور رہا کہ مجھ سے شغیہ لغت کرے مگر خیال آتا لیکن ہے یہ سب کچھ گھٹیل کی گرفت ساری ہو۔۔۔ اس سنبھان اور ویران قلعے میں کوئی حیدر نہ ہوا اور میرے گھٹیل کی لہجہ برہا یوں نے ایک وہ شیر و بلی کا سر میری پیکر اختیار کر لیا ہوتا پھر دل میں کہتا۔ یہ جھکیاں دکھانے والی۔۔۔ جھکیاں دکھاؤ کھا کر دل کو بے تاب کرنے والی کوئی "جود" نہ ہو جو مجھے تھکا کر اپنے لیے سالانہ سرست پیدا کر رہی ہے۔

7

ایک شام جب کہ جامعہ پوری تابیالی کے ساتھ فضا نے آسمانی پر چمک رہا تھا میں ایک گوشے میں اپنے خیالات میں غلطیاں دھڑلایا بیٹھا تھا کہ اسے میں قہقہہ کی بھر سانس کے پھوٹے کی روشنی سے بھر ہوئی۔ میں تجوی سے وہاں پہنچا۔ وہی پراسرار حیدر وہاں بھی برہا پر کاری تھی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کی ناک کھائی کھائی۔ کھائی کھاتے ہی اس کے رخسار زرد چمکے وہ ہلکل ہوئی۔ "مجھے چھوڑ دو۔۔۔"

”بہا کوئی تو نہیں۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ مجھے چھوڑ دو، اس نے خوفزدہ بچے میں کہا۔

”یاد ہے پہلے تم بہا کو کی قسمیں۔ اس لیے۔۔۔۔۔“

”مجھے چھوڑ دو، کھائی میں درد ہو رہا ہے۔ اور۔۔۔“

”اور کیا؟“

”میں جانا چاہتی ہوں۔۔۔“

”اس کا مطلب ہے جو جی میں نے تمہیں چھوڑا تم بہا کو جاؤ گی۔“

”ہاں اس نے بے سافقت کہا۔

”ابھی تو تم نے کہا تھا۔ میں بہا کوں کی نہیں۔ اب کہہ دی ہو بہا کو جاؤں گی“

”مجھے تم سے ڈر لگتا ہے۔“

”کیوں“

”تم مرد ہو جو بونے اور دادا جان کہتے ہیں، مرد بڑے عالم ہوتے ہیں۔ عورتوں کو کل کر دیتے ہیں۔“ یہ اتفاق کہتے ہوئے اس کے دماغ پہلے پڑ گئے۔

”مہملی نے یہ کیا ہے؟“

”نہیں دادا جان نے“

”تہہار سے دادا جان کون ہیں؟“

”دادا جان۔۔۔ وہی جو میرے دادا جان ہیں۔“

گلے کی اس بھولی بھالی دوشیزا نے محبت کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور کہا ”کتاب بہا کو جاؤ“ حسینہ چند قدم بٹلی بٹکر غبرگئی۔ اور بڑے کے تاروں پر اٹھ بیٹھ گھبرائے گی۔

”تم خالہ تو نہیں ہونا“ اس نے حزم آواز میں کہا۔

”میں تو عجم کا قصور بھی نہیں کر سکتا۔“ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑے کہا۔

”عمر دادا جان کہتے ہیں اب ایک مرد عالم ہوتا ہے۔“

”تو بھرا کا تہہار سے دادا جان مرد نہیں۔۔۔ ان سے کیوں نہیں بھاگتیں؟“

وہ چہرے سے خاموش رہی بھر پور سے کی ہنسی بھا کر کہنے لگی۔ ”وہ ہرگز خالہ نہیں۔ وہ تو بڑے سے چھوٹے دادا جان ہیں“

”تو بھرا بھرا تو میں بھی بڑا چھوٹا ہوں“

”اگر تم بڑے سے چھوٹے ہو تو میں تم سے ضرور بڑا کروں گی۔“

”تہہار نام کیا ہے۔۔۔ میں نے پوچھا“

”شاہین“

”شاہین بہت اچھا نام ہے۔ میرا نام پچھو گی؟“

”نہیں تم خود بتانا مہتاؤ“

”میں خود بتاؤں؟“ میں نے تکیہ لگایا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میری طرف دیکھ کر سہمائی۔

”میرا نام شاہاب ہے۔“

”شاہاب بڑا اچھا نام ہے۔“

”کمزری کیوں ہو بیٹا؟“ میں نے اس کی کھائی پکڑ کر کہا۔

”اوہ میری کھائی نہ پکڑو۔ تمہارے ہاتھ لوہے کے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”تم خود بخانا کھاتی ہو۔ اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ میں کتنا عرصہ تمہاری تلاش میں سرگرداں رہا تو تم شاید بہت شکریں ادا کرو۔“

”یہاں آئے کیوں تم؟“

”تمہاری تلاش میں۔ شاہین“

”میری تلاش میں تم یہاں کیوں آئے؟“ اس نے پوچھا۔

”کیونکہ میں سے ملنا چاہتا تھا۔ تم سے بروقت باتیں کرنا چاہتا تھا۔“

”مگر میں بروقت باتیں نہیں کر سکتی۔ دادا جان تمہیں یہاں سے نکال دیں گے۔“

”تم دادا جان سے یہ نہ کہنا کہ شاہاب یہاں آگیا ہے۔ کہو لیا شاہینہ اور خدا دادا جان تم سے ناراض ہو جائیں گے۔“

”میں نہیں کہوں گی دادا جان سے اور اب میں جاتی ہوں۔ دادا جان یہاں نہ آ جائیں۔“ یہ کہہ کر وہ انجلی گھر چلوے کے پیچھے نہ ہو

کی

میں پکھوید ہاں بیٹھا رہا۔ پھر قلعے سے نکل آیا۔

8

جب دل کہیں اور ہوتا ایک لوہے کی قیامت کی کمزری میں جاتا ہے اور مجھے تو جدائی کا پہاڑ ساروں گزرا رہا تھا۔

انتہائی بے چینی دے دہائی کے ساتھ طوع آداب سے لے کر غروب آداب تک انتہائی کمزریاں گزارا رہا اور جب شام ہوتی تو بے تابی

سے قلعے کی طرف روانہ ہو گیا اور اندر پہنچ کر اسی عجیب کچھ میں اپنی جگہ پہنچاؤ کا انتظار کرنے لگا۔

ماہا چادر ہم کے ساتھ ہی چلتے سے فورے دروازہ بند ہے تھے۔ ہر طرف چاندنی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ صبحے دل

کی ملک نکلے اور خوشیوں کی رسائی اور خوشبوؤں کی بڑبڑوں سے اتنی میری طرف آ رہی ہے جب کافی وقت گزر گیا تو میں نے کچھ سے نکل کر

ادھر ادھر دیکھا۔ کچھ دور وہ مصروف شہریت اور شہزادہ بھی کبھی سے گھبراہٹ کی منہ میں اٹھلے والے کمزری تھی۔

میں نے اسے بلایا مگر وہ وہیں تنگ سرسری ایک صورتی بنی ہوئی کھڑی رہی۔

میں نے دوبارہ آواز دی۔ ”آ جاؤ شکایت“

اس نے اپنے دشمنیہ باتوں میں الٹا ہی پھیریں۔ وہ قدم آگے چلی اور بھراک گئی۔ میں اس کے پاس پہنچا۔

”کتنی دیر سے تمہارا اچھا رگڑ رہا ہوں مگر تمہیں یہ باتی نہیں۔“ میں نے کہا۔

”میں تو وہاں کھڑی تھی“

”وہاں کھڑی تھیں کب سے“

”بڑی دیر سے۔۔۔ شاید اس وقت تم یہاں نہیں تھے“

”تو تم یہاں کیوں نہ آ سکیں؟“

”اس نے مسکرا کر مدد دہری طرف پھیر لیا۔“

”تم آج بھی آگئے کھانسی آئے تھے اور شاید پہلے بھی آتے رہے ہو“

”تم بھرے آئے پر غوش نہیں؟“

”میں۔۔۔ مگر دانا جان۔۔۔ وہ وہی بھر مجھے بتاتے رہے ہیں کہ تو جو اس مرد بوے کا لم ہوتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کی گھسے مٹائے“

”تم نے میری آواز کے متعلق دانا جان کو بتا دیا۔؟“ میں نے مضطربانہ پوچھا۔

”وہ مسکرائی۔“ میں نے کہا تو نہیں۔ مگر“

”تم نے کیا نہیں تو بھر کوئی ار نہیں“

”تو تم آئیں وہ بھی آیا کرو گے۔؟“

”کیوں نہیں۔۔۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ہر وقت سبکوں رہوں۔“

”اوہ ایسا نہ کرنا۔ دانا جان دان کے وقت یہاں ہوتے ہیں۔ مگر تم کیوں یہاں آنا چاہتے ہو؟“

”کیونکہ جب کسی سے محبت ہو جائے تو دل کی سی آواز دہوتی ہے“

”تمہیں کس سے محبت ہو گئی ہے“

”تم سے۔۔۔“

”مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔۔۔“ وہ مسکرائی۔ ”لیکن دانا جان جتنی محبت تم بھی مجھ سے نہیں کر سکتے“ میں اس کے صمندانہ چہرے

کو گور سے دیکھنے لگا۔

”مجھے یوں سمجھ گھور کہ کیوں وہ بکھر رہا ہے۔ وہ بات ٹھیک نہیں۔ میں چلی جاؤں گی اور میرا پے کرے سے باہر ہی نہیں نکلوں گی۔“

”تم ناراض ہو گئیں۔ مجھے اس کا فلسفہ ہے مگر مجھے بتاؤ۔ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے؟“

”ہاں۔“ اس نے کہا۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔

”کتنی؟“ میں نے پوچھا۔

”چرا میں نہیں جانتی۔ شاید اسی صحت ہے، جتنی مجھے اپنی برہا سے ہے۔“
 یہ کہہ کر اس نے برہا کو اپنے لگا لیا۔ برہا کے سر پر سواری چڑھ کر اس کے لعلیں لبوں کو مس کرنے لگی۔
 ”یہ تو کچھ بھی نہیں؟“

”کوئی نہیں؟“ تو پھر حتماً رحم سے سختی صحت کر اس، لیکن یاد رکھو میں تم سے ہرگز اتنی صحت نہیں کر سکتی، جتنی اپنے پیارے دادا جان سے کرتی ہوں۔“

”وہ صحت اس روز سے کے لیے رہے دو؟“ میں نے اس کو کہا۔
 وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی:
 ”نہر!“

”نہر! آہستہ آہستہ تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“
 وہ کچھ مضطرب سی ہو گئی۔

”شاید؟“ میں نے اسے غائب کیا۔ ”بولتی کیوں نہیں؟“
 ”ہاں! کہو!“
 ”ننگا ہو کر نہیں کیا؟“
 ”نہیں! بالکل نہیں؟“

یہ کہہ کر اس نے برہا کے تالوں پر اٹھائیں پھیریں، اور پھر برہا میری گود میں رکھ دی۔ میں برہا جہانے لگا اور وہ مسرت انگیز لگا ہوں
 سے مجھے دیکھنے لگی۔ نصف رات تک ہم برہا بجاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ آدھ گھنٹہ کا دادا جان کے خیال سے مضطرب ہو کر وہ چلی گئی
 اور میں تھکے سے ابر کھڑا آیا۔

9

اس کے بعد میں خود کو کافی دنیا میں محسوس کرنے لگا۔ میرے اطہر وہ، چمروہ اور صحت کے عیسوں اور کچھوں میں چلنے ہوئے تصورات
 سے رنجیں، معطر ہو گئے اور میری دماغی و عقلی رائجیں قلعے کی ساکن، قلیل کے یا کچھوں حلوں سے چوڑا رہاں۔ اس سے خوشتر میں خود کو دنیا کا
 ہر صوبہ ترین، قلعہ بھٹا تھا۔ شراب اپنی خوش قسمتی کو ننگا کمال پر تصور کرنے لگا۔ میری تمام کائنات سب سے کہنے کی چادر چادری میں محدود ہو گئی
 اور میرے خیالات ہر چیز سے بہت کر صرف شاید کے گرد گھومتے تھے۔ رات کو میں سرتوں میں ڈوبا رہتا اور دن کو ان سرتوں کے خیالات
 میں غرق آواہ زندقہ کی کسی عجیب زندقہ کی تھی۔ خواہوں کی رائجینوں میں تھرتی ہوئی۔ کچھوں کے کہارے میں جھولتی ہوئی اور سرتوں کی لمبوں میں
 بہتی ہوئی خوش نصیب زندقہ! اب بھی اس خوشگوار اول آواز زندقہ کی کانیال کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ شاید میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔
 ”میں ہر رات قلعے میں جا کر مخصوص جگہ کے کنارے چڑھ کر اپنی مخصوص صورت و مخصوص نظریات محبوب کا انتظار کرتا۔ وہ مسکراتی ہوئی
 خراں خراں آتی۔ ہم دونوں شیریں دھڑکتا ڈاکٹر گاتے۔ جگہوں کے کنارے چلنے، ایک دوسرے کو چمکارتے اور منظم منظم چارہ چارہ

پاؤں کر کے۔ اسی طرح رات گزر جاتی اور جب سورج کی پہلی کرن میرے لیے رخصت کا بیجام لاتی تو اپنی محبوبہ جاس ڈانے سے اجازت حاصل کر کے نکلے سے باہر نکل آتا ہوں وہ دن، ہفتوں پہ ہفتے گزرنے لگے۔ اگرچہ میں ہر رات کو اپنی شیریں ادا محبوبہ کے پاس رہتا لیکن میرے انجانی خواہش یہ تھی کہ دن کے وقت بھی وہیں رہوں مگر اس میں ایک بہت بڑا خطرہ تھا۔ دن کے وقت میری شاہینہ کو عمو اپنے سامنے رکھتا اور اس صورت میں اس سے ملاقات کا ذریعہ کیونکر پیدا ہو سکتا تھا؟ رات کو تو وہ ہے مگر ہو کر سو رہتا اور شاہینہ کو کمرے سے باہر نکلنے کا موقع مل جاتا۔

شاہینہ کو جو کہ معلوم تھا۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا۔ لیکن اب تک وہ بائیں قطعی طور پر میرے لیے ایک مصما تھیں۔ پہلی بات تو یہ کہ میں نہیں جانتا تھا کہ شاہینہ کون ہے اور میری اس کا حقیقی دادا ہے یا دادا سے دلچسپی والی کتنی ہے۔ دوسری بات یہ کہ میری نے شاہینہ کو اس وہیں قلعے میں بند کر کے اسے مردوں سے کیوں اس درجہ بدظن کر دیا ہے؟ میں ان دونوں باتوں پر بہت غور کرتا مگر کچھ بھی نہ آتا۔ اگرچہ میری کو ہماری ملاقات کا طعنہ تھا مگر یہ بات کب تک چھپی رہ سکتی تھی؟ آخر وہ یہ ہوا جس کا اندازہ تھا۔ ایک رات میں شاہینہ کے زانو پر سر رکھے اس کے سہری لٹوں سے پھیل رہا تھا کہ میری دادا سے پاس آ کر کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے شیلے نکل رہے تھے۔ دن فردا عصر سے کاب رہا تھا۔ شاہینہ کا بچی ہوئی، لڑتی ہوئی کھڑی ہو گئی!

”شاہاب!“ میری نے غضبناک آواز میں کہا۔

میں خاموش رہا۔ شاہینہ نے میری کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی۔

”دادا جان! یہاں مردوں میں سے نہیں ہے جو۔“

میری نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا اور کہ میں اسے جلدی سے نہ تھا تا تو وہ پیچھا کر پرتی۔

”دادا! تم سے کہہ دیا میں کچھ!“ میں نے کہا۔

”یہ الفاظ کہتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔“ کہنے انسان اس میں اس معصومہ کو تم خالوں کے سامنے سے چھٹا رہا ہوں، مگر آج تم نے میری تمام امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔“ یہ کہتے ہوئے میری کی دیکھیں ابھرا آئیں۔ آواز ڈاؤر غضبناک ہو گئی۔ ”تم نے یہاں آنے کی جرأت کیوں کی، تمہارا یہاں کیا کام تھا؟ تم اس لیے یہاں آئے کہ ایک معصومہ لعلت دو شیروہ کو چاہ کر دو۔ ایک بڑھے کے خوابا دل سے ہاتھ رکھو؟“

”ابا! سوچ کچھ کہ بات کہجئے! آپ خواہ مخواہ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں!“ میں نے قدرے غصے سے کہا۔

”یہ الزام ہے۔“ عالم کہنے لگا میں تمہیں ابھی طرح نہیں جانتا تمہارے دل کی ایک ایک بات سے واقف نہیں؟“

شاہینہ ایک طرف کھڑی تھی۔ اس نے میری سے آگے بڑھ کر میری کا ہاتھ پکڑ لیا اور عاجزانہ لہجے میں کہنے لگی۔

”دادا جان! پہلے میرے ساتھ۔“ چیلنے لگا دادا جان!“

میری کہے جا رہا تھا۔ ”میں بڑا سادہ ہوں، مگر دادا کو جب تک میرے کھورہ و ناخاں جسم میں جان پاتی ہے، تم اپنے ذلیل مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ میں اپنے بوڑھے اور کھورہ ہاتھوں سے طاقتور گردن کو مروڑنا جانتا ہوں۔ جاؤ یہاں سے چلے جاؤ۔ میرے دیکھے ہوئے دل کی بدعاؤں سے ڈرو۔ اس مظلوم بچے کی کسی آہوں سے دادا وقت کے خوفناک انتقام سے ڈرو۔ جاؤ اور دوبارہ!“

”دادا جان! پہلے میرے ساتھ دادا جان!“

”ابھی تک کھڑے ہو تم۔ مردار کہتے ہیں۔“ عوی نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

شاہین نے صرناک لگا ہوں سے بھری طرف دیکھا اور فکھیں دھرت تاک لپٹے میں کہا۔ ”جاؤ تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“ میں مڑ کر چلنے لگا۔

”خیر رات آتھو یہاں نہ آؤ۔“ عوی نے غصہ تاک لپٹے میں کہا۔

میں نے مڑ کر شاہین کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھے ہاتھ سے چلے جانے کا اشارہ کیا اور میں قلعے سے باہر نکل آیا۔

میں قلعے سے نکلا۔ یہ صوبی کرتے ہوئے نکلا کہ اپنی دوشی، سطر اور فکھیں دیا کو پھوڑ کر ایک نہایت تاریک، بھیا تک اور متعفن غاری گہرائیوں میں اتر رہا ہوں۔ ایک گھنٹہ دشتر میں اچھائی سرور اٹھان تھا۔ بھری قسمت کا ستارہ اچھائی بلندی پر چمک رہا تھا مگر اب وقت کے ایک حقیر ترین لمحے سے گزر جانے پر میرے تمام دوشی امیدیں، دیکھیں تھیں کہیں اور خوشگوار قنات خاک میں مل چکی تھیں۔ آواز سڑقوں کے گزینے طے کرتے ہوئے، دریا کی بلندیوں تک جا پہنچا اور پھر پامال و بزدل ہو کر قنات الوئی کی پختیوں پر آ کر گرنا۔ کتنا اہستہ تھکن، کتنا روح فرسا انقلاب ہے!

عوی کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی بھری لگا ہوں کے ساتھ شاہین کا سر بھایا ہوا پیچہ بھی بھڑ بھڑا رہا تھا۔ ہر قدم پر رک، رک کر میں قلعے کی طرف دیکھتا تھا۔ ہر لمحہ میرے سامنے میں اپنی بد قسمتی کا احساس زیادہ آج ہو رہا تھا۔

میں ہائی گہر کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ چار لمبے ہی گز سے تھے کہ میرے دل میں سیلاب ایک سو جزاں ہو گیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور کافی دیر تک بہتے رہے۔ اس وقت مجھے کائنات کی ہر چیز روتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ درخت سسکیاں بھر رہے تھے۔ ہوا روری تھی اور ماہیں، افسردہ چاند، ایک سیاہ مصیب ہال کی طرف رہنچے ہوئے اس طرح جا رہا تھا، جس طرح ایک بد نصیب محبت و محبت کے دلوں سے فراق حال۔ اگلے روز گار کے سطوں سے چال، بہتے پرداں تھیلے ہوئے موت کے اند میرے غاری طرف جا رہا ہوا!

اسی وقت کے نیچے عوی پدرانہ شفقت کے ساتھ میرے ٹوٹے ہوئے دل کو سہارا دیا کرتا تھا اور اب اسی درخت کے نیچے میں اس کے بے رحمانہ سلوک کو یاد کر رہا تھا۔ شاہین کہا کرتی تھی کہ جس دن ارادہ ہائی کو ہماری ملاقاتوں کا طم ہو گیا اسی دن وہ غصت جارا نہیں ہو جائیں گے اور فکھیں بے قسمیں یہاں آئے سے روک دیں۔ مگر مجھے عوی سے شک دلانہ سلوک کی توقع نہ تھی۔

اس قسم کے خیالات میرے ذہن میں آتے رہے۔ میں آنسو بہا تا رہا۔ آخر ایک رچی رچتم ہوئی۔ شاید میرے آنسو قہم ہو گئے تھے اور دل تپا بھی رونے کے لیے بے تاب تھا۔ میں نے تجھے پر سرحد آ گئیں نگاہ داخل اور مگر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ دن اچھائی و دھراوی کے عالم میں گزرا۔ جب شام ہوئی اور طاق مغرب پر چراغ خود شمع کا شعلہ تاریکیوں کے جھوم میں سسکیاں لینے لگا تو میرے قدم خود بخود قلعے کی طرف اٹھنے لگے۔ قلعے کے پاس پہنچ کر کچھ دیر تک کھڑا رہا پھر قلعے کے اندر چلا۔ دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا اور اس کی دھڑکن برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ کیا یہ مجھے افسوس ہوا کہ میں موت آگے نکل آ جاؤں۔ میں طرا واری جب پہنچا جہاں لاہر جانے کے لیے بیڑے ہیں تھیں۔ مگر یہ کچھ کر میرا دل مایوسی میں ڈوب گیا کہ یہ راستہ نہ چکا ہے۔ میرے ہاتھ کسی چیز سے مس کر رہے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ بیڑے میں سے ابھرنے والی دردناک آواز ہے۔ تھوڑی دیر بعد چلا، بند ہو چکا ہے۔ کافی دیر تک میں وہیں کھڑا رہا۔ حیران و سرسبز کھڑا رہا پھر باہر نکل آیا۔ میری مایوسی کی کوئی اچھائی نہ تھی اور یہ اچھائی مایوسی انتقام کی آگ میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس وقت اگر عوی میرے قریب ہوتا تو یقیناً اس کی گردن مردو

۱۱)۔ میں جیگھٹا نے لگا کر کیوں شب گزشتہ قلعے سے باہر نکل آیا۔ کیوں جسے چاک کر ڈالا۔

تمام رات میں قلعے کے ارد گرد چکر لگا کر ہمارے شاہی اندر جانے کا کوئی راستہ مل جائے مگر میری کوششیں راجاں نہیں۔ آخر بالکل ناہوس ہو کر میں مگر بچا۔ صبر سے دل میں ایک طرف امیدوں کی خاک بکھری ہوئی تھی اور دوسری طرف انتقام کے شعلے لہرا کر رہے تھے۔ دوسری رات بھی میں نے قلعے کے ارد گرد چکر لگا کر گزار دی۔ اسی طرح کئی راتیں گزار گئیں ایک شام کو جب کہ میرا دل و دماغ غم و غصہ کی آگ میں جل رہا تھا۔ کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میری میری سامنے کھڑا تھا۔ جی میں آئی نکلتے کو بار بار لوں مگر اس کی بائیس آنکھوں کو دیکھ کر میرا ارادہ حوصلہ ہو گیا۔ میری چند لمبے گھر لے کر مجھے دیکھا کہ ہا۔ پھر کہنے لگا۔ ”میرے ساتھ آؤ“ یہ کہہ کر وہ راستے کی طرف پلٹے لگا جو قلعے کے اندر جاتا تھا۔ میں نے اس کی تنہید کی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم قلعے کے اندر تھے میری بیٹی گیا اور مجھے بھی بیٹھے کا اشارہ کیا۔ میں جب بیٹے چکا تو وہ نرم اور محبت انگیز لہجے میں کہنے لگا۔

”جانتے ہو میں تمہیں کیوں لایا ہوں؟“

”تمہیں؟“ میں نے جواب دیا۔

تو سنو! سب سے پہلے تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ قلعے کے اندر داخل ہو کر اور ایک مصعوم فطرت و شیرازہ پرار سے ال کر تم نے غصے غم کیا۔ کاش تمہیں اندر آنے کا راستہ نہ معلوم ہوتا۔ اپنی طرف سے تو میں نے کوئی کی نہ کی مگر غصہ ہونا تھا۔ وہ ہو کر ہی رہا۔“
 ”دور کیا دھنا کہ لہجے میں کہنے لگا۔“ شاہین کا مصعوم دل دنیا کے حالات کو نہیں سمجھ سکتا۔ وہ نہ ہر حال کا شہد گھر دہی ہے۔“
 ”آپ کہہ رہے ہیں بابا؟“ میں نے مکلی دھو پر جوش لہجے میں کیا۔

”میں بہت کچھ کہ چکا ہوں بیٹا! اہمیت دینا کا خوف کس ترین مرض ہے۔ اس ظالم مرض نے صولہ دیا لیکن کو موت کے گمات اتار دیا اور اسی مرض سے بچانے کے لیے میں نے اپنی شاہین کو اس دہان قلعے میں بند کر رکھا تھا۔ مگر بد قسمت شاہین اس مرض میں مبتلا ہو ہی گئی۔“
 ”بابا تم میرے دل کا حال نہیں جانتے۔ کاش میں اپنے دلوں سے میرے ہونے بیٹے کو تمہاری نگاہوں کے سامنے پیش کر سکتا۔؟“
 ”تمہیں واقعی شاہین سے محبت ہے؟“ میری نے پوچھا۔

”بدل وہاں“

”اس کا ثبوت؟“

”میرا دل راکھ ہو چکا ہے۔“

”کیا اس کے لیے قربانی کر دے؟“

”میں اس کے لیے قربانی کرنے کو تیار ہوں!“

”مگر یہ اس قربانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ سلفی“

”سلفی سلفی کو میں بھلا چکا ہوں اور ایک حرافت ہے۔“

”تو کل تم شاہین کو بھی بھلا دو گے، ایک اور حرافت کچھ کرنا“

”تمہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا! اقامہ راجاں نہیں ہو سکتا۔! میں مرتے دم تک شاہین سے محبت کرتا رہوں گا! اس کا آپ کو یقین دلانا

”شاہینہ کے لیے قربانی کر دے؟“ مہدی نے مہری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”بہر وقت؟“

”اگر تم قربانی کے لیے چاہو تو کھڑو کا رخ سے تمہیں نہیں رہتا ہوگا؟“

”بھری یا اتھائی خواہم ہے۔ سب سے بڑی تمنا ہے؟“

”تو آج سے تم نہیں رہو گے۔ قلعے میں سب کچھ ہے۔ تمہیں کسی چیز کی عدم موجودگی محسوس نہیں ہوگی اور اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھو! شاہینہ کی آواز ماری سے مجھ پر گری کہ تمہیں یہاں رہنے کی اجازت دے دیا ہوں۔ اگر میں نے دیکھا کہ تمہاری محبت میں کمی آگئی ہے اور تم مہری بچی کو دھوکا دے رہے ہو تو تمہارے اور اس کے دو مہمان نگہین وچار کھڑی ہو جائے گی۔ تم بیٹھ کے لیے اسے کھودو گے۔ دنیا کی کوئی طاقت میرا راز بدل نہیں سکتی۔ من لیا تم نے، میں بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ شاہینہ کو دھوکا دیا جائے۔ یہ کہتے ہوئے مہری کی آنکھوں سے آنکھیں برسنے لگی۔

”میں تمہیں یقین دلانا ہوں بابا، میں مرتے دم تک شاہینہ سے اسی بیانی کے ساتھ محبت کر رہی ہوں گا!“

تمہارے الفاظ مجھے یقین دلانے سے کام لیں۔ خیر میں تم پر اعتماد کرتا ہوں اب سناؤ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ شاہینہ کون ہے؟“

میں نے مہدی کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں اس قسم کی چمک تھی جو سمندر کی سطح پر سورج کے غروب ہونے کے بعد بھی رہتی ہے۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ صولت اور پانچن اسی قلعے میں رہتے تھے اور میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ قید خانے کی نگہین وچار یہ انہیں جدا کر گئیں۔ وہ آٹھ سال کے بعد ایک سال کے بعد ان کے پاس ایک بچی پیدا ہوئی۔ یہ بچی ابھی شیرخوار ہی تھی کہ اس کے والدین لگتی کر دے گئے مگر بچی اسی غلام کے پاس پرورش پائے گی۔ جوان شہیدان محبت کو کھانا پکھانا پکھانا کرتا تھا اور ان کا سوا تھا۔ آج وہ بچی شاہینہ ہے، اور وہ غلام صفدر، یہ پڑھا تھا۔“

مہری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں!

”شاہینہ پانچن کی بچی ہے؟“ میں نے چند لمبے خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔

”ہاں یہ کسی شہیدہ محبت کی یادگار ہے؟“

”تو یہ نہ کہہ کر رہیں؟“

”ہاں اپنی اس کی کٹھنی میں قحطی اس لیے جگہوں کے چنے سے نکلی۔ میں نے بچی کو اٹھا لیا اس کے بعد میرے دل میں یہ یقین پیدا ہو گیا کہ محبت وچار کی سب سے بڑی نیازی ہے اور وہ یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے یہاں چھپانے رکھا ہے۔ اسے اپنے والدین کی کوئی خبر نہیں!“

میں نے مہری کو اپنی محبت کا یقین دلایا اور اتھائی دلا داری کا وعدہ کیا۔ چند لمحوں کے بعد میں شاہینہ کے چلو میں بیٹھا تھا۔

میں بھر قلعے میں۔ سچے لگا اب مہری زندگی اس قدر سرور، اس ادب و مہربانی کی کامیابی و اضطراب کا پکا سا سہا پہ بھی میرے دل و دماغ کے قریب نہیں پہنچ سکتا تھا۔ شاہینہ کی خواہشات آکھیں دیا نہ تھے، جن کی خاطر انہیں روشنی میں میرے دل کی دیا بہر وقت جنگلاتی رہتی اور ہر رات میں صبح جب قلعے کے مشرقی کمر میں طوفان چڑھتا ہے، بلند و خواروں کے اوپر خود شیو کے جکڑو رہیں سے روشنی کی نہ اس پہنچے لگتیں۔ میں

محسوس کرتا کہ میری پیدائش اور دشمن، زیادہ شکواب ہو گئی ہے اور ایسا کہیں نہ ہوتا۔ اب کوئی غم، کسی چیز کی فکر مجھے نہیں دکھائی دے رہی تھی۔
 دن گزرتے جارہے تھے۔ برسرِ میری سرقوں میں اضافہ کرتا جاتا تھا اور اسی طرح کی مچیلے گزرتے۔ ہر ایک میں کچھ تھا کہ وہ ہی
 محسوس کرنے کا میرے اور شاہین کے درمیان صحت قائم تھی۔ وہ میری تمام سرقوں کا سرچشہ تھی اور اس کی تمام طرحوں کا مرکز تھیں۔ ہر بھی
 ایک تھا کہ وہ ہی، ایک احتمال، سارا، ایک افسردگی ہی میں اپنے دل و دماغ میں محسوس کرنے لگا۔ پھر انسانی زندگی کا خاصا ہے اور شاہ میری زندگی
 بھی کسی تصویر کی حتمی تھی۔ ایک دن میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کہ کیوں نہ بکھیر کے لیے باہر سیر کر آؤ کہوں؟ اس خیال کا اظہار میں نے
 شاہین کے سامنے کیا۔ وہ بکھیرنا غامض رہنے کے بعد کہنے لگی۔ ”کیا مجھے سے اتنا گئے ہو؟“
 یہ سن کر میرے دل پر برقی سی گئی۔ ”کتاب ہے خود خیال، نہ معلوم کبھی تم اتنی باتیں کر دیاں کہ سب سے کہیں ہو جاتی ہو؟ زندگی میں کتنی گزرتی
 ہے۔ اس کے برعکس میں شرمش پیدا ہوا اظہار میں رہا۔“

”یہ درست ہے، تاہم میں ڈرتی ہوں، اظہار میں ہزاروں دلچسپیاں ہوتی ہیں۔“

”پاکل لڑکی؟ میں ہزاروں دلچسپیاں چھوڑ کر یہاں آ گیا ہوں۔“

”اب مجھے ڈر ہے، تم مجھے چھوڑ کر اس ہزاروں دلچسپیوں کی طرف نہ چلے جاؤ؟“

”ایہ، کبھی نہ ہوگا۔“ میں نے کہا۔ کافی دیر کی گفتگو کے بعد پہلے ہوا کہ راست کے دھت بکھیر کے لیے میں قلعے سے باہر چلا کر دوں
 اور چونکہ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ میری اس کی ہا زت نہیں دے گا۔ اس لیے اس سے ہا زت حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کی۔
 میں قلعے سے نکل چلا اور شاہین مغربی جہاز کے قریب کھڑے ہو کر مجھے دیکھتی رہتی۔ مغربی جہاز کے ہاتھیں طرف قلعے کی دیوار کا کچھ
 حصہ گزرتا تھا، اس لیے وہاں کھڑے ہو کر انسان اور درونک بے سانی دیکھ سکتا تھا۔

ایک دن خلاف معمول میری طبیعت دن بھر مضطرب رہی۔ میں شاہین سے ہا زت لے کر قلعے سے باہر نکل گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس
 راستہ ”سیر دو سائل“ ہے اس لیے میں یہ سوچ کر کہ وہاں سے شاہین کے لیے چند چیزیں خرید لوں گا۔ ”مغربی باغ“ کی طرف روانہ ہو گیا۔
 میں باغ میں پہنچا اور اپنے آپ کو اپنے آستانوں اور غزروں کی نگاہوں سے بھا کر چیزیں خریدنے لگا۔ اسی دوران میں میں باغ کے
 آٹری حصے میں پہنچ گیا۔ کچھ لوگ سو رہے تھے۔ کچھ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ میں واپس آنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ میرے سامنے دو سیاہ
 آنکھیں پھٹک گئیں۔ میں دک گیا۔ میرے سامنے سلی کھڑی کھڑی گھوڑ گھوڑ کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور میری سے پہلے لگا۔ ایک آدمی اور چھ خریدی اور باغ سے نکل آیا۔ مگر محسوس کر رہا تھا کہ سلی
 میرے پیچھے پیچھے رہی ہے۔

اپنی محبوبہ، دلواڑ کی بے چینی کا خیال کر کے میں قلعے کو نزدیک ترین راستے سے جانا چاہتا تھا مگر جب یہ سوچا کہ کم بجتے سلی برابر میرا
 تعاقب کر رہی ہے تو میں نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ چند قدم لے کر کے بعد جب پلٹ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بد بخت صورت لنگی باغ سے
 مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں نے منہ پھیرا اور چلی چلی قدم اٹھانے لگا۔

قلعے کی سڑکوں پر پہنچ کر مجھے یوں محسوس ہوا، گوا کا ایک بوجھ جو میری روح کو تکلیف دے رہا تھا، اب سوجھ بوجھ نہیں ہے۔ ایک سایہ جو
 میرے دل پر لہرا رہا تھا، اب قائب ہو گیا ہے۔

اندر جا کر میں نے تمام چیزیں اپنی محبوب کے سامنے اجیر کر دیں۔ اس کی بھرا لگا ہیں ایک دم سرت سے چمک اٹھیں اور وہ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھنے لگی۔

مگر نہ معلوم کیا بات تھی کہ میرا دل بھر بے چین ہو رہا تھا۔ آدھی رات گزرنے پر میں لیٹنے کو تویٹ گیا مگر چند کہاں؟ ذہن میں غلغلہ اور خیالات کا ہجوم ہے۔ قرار دیا میں بار بار سوچتا تھا کہ کیوں لڑھکیوں ہو سکتا تھا کہ سہلی، جس کے جورو تم نے مجھ پر عرصہ حیات تک کر دیا تھا، اب میری طرف بار بار دیکھے، میرے پیچھے بھڑکے اور دیر تک بھرتی رہے؟ آخر اس ٹھیکری کی وجہ کیا ہے؟ شاید وہ مجھے اپنے حال میں گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ اس اشکات کے پردے میں کوئی خطرناک جال پوشیدہ ہے۔ یہی بات ہے، لیکن یہی بات ہے، میں نے دل میں کہا۔ "لیکن میں اس کے نام زد میں ہرگز گرفتار نہیں ہوں گا۔ میرا دل، میرا دماغ، میری ہستی کا زور، زور، شایہ اور صرف شایہ کے لیے وقف ہے۔ میری یہ محبوب چاہے اس کو کتنی تک دے۔ کتنی پاکیزہ روح، کتنی مصمم ہنر رکھ لڑکی ہے!"

انہی خیالات میں راستہ کا حق صبر بھی گزر گیا۔ صبح سویرے دیکھتے ہی شایہ بے غلغلہ ہو گئی۔

"تمہاری آنکھیں اس وجہ سرخ۔ کیا بات ہے شایہ؟" اس نے پوچھا۔

"کہہ نہیں۔" کہہ گئی نہیں، میں نے جھنجھکی نہیں اٹھائی کہ کہا اور اپنی جلی کو فٹ کا دور کرنے کے لیے اس سے باتیں کرنے لگا۔ شایہ بار بار مجھ سے میرے غلغلہ کی وجہ پوچھتی رہی مگر میں اسے فنی مذاق میں ڈالتا رہا۔

دو دن ایک میں قلعے سے باہر نکل سکا۔ میرے دن میری طبیعت گھبراہٹ میں شام کو قلعے سے باہر نکلا۔ بھرتے بھرتے آباویں کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں سے لوٹنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ میرے سامنے وہی بد بخت عورت آکھڑی ہوئی۔ میرے قدم رک گئے۔ دل دھڑکنے لگا۔ سلی ٹھٹھکی باندھ کر مجھ سے دیکھنے لگی۔ چند لمحوں گزر گئے۔ میں تیزی سے چلنے لگا۔ یہاں تک کہ قلعے کی میڑ میڑوں پہ پہنچ گیا۔ میرے دل کا جو جھکا ہوا اور میں قلعے کے اندر داخل ہو گیا۔ اس رات میں نے شایہ کی بہت کم باتوں کا جواب دیا اور کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ مجھے خود پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ آخر میں کہیں اس بد بخت عورت سے ڈرا ہوں۔ مجھے اس سے قطعاً محبت نہیں۔ بھراس کی صورت دیکھ کر کہیں میرے ہوش احوال گم ہو جاتے ہیں؟ کہیں میری صحت جواب دے جاتی ہے؟

میری نگاہوں کے سامنے سلی کی لمبی لمبی سیاہ پگھوں کے نیچے حرکت کرتی ہوئی آنکھیں بھرتے لگیں۔ میں سلی کے قصورات کو ذہن سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر اس کی صورت میری نگاہوں تلے بھر رہی تھی۔

میں اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ سچ ہو گئی تھی۔ کہیں کہیں صاف لٹا میں، دھوئیں کے بادل مل پر غل کھاتے ہوئے میرا رخ تھے۔ شام کے وقت میں قلعے سے باہر نکل آیا۔ ابھی چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ سلی میرے قریب آکھڑی ہوئی۔

"شایہ ذرا غصہ۔ اتنی تیزی سے کیوں چل رہے ہو؟" اس نے کہا۔

میرا دل دھڑکنے لگا مگر میں اس کی طرف توجہ کیے بغیر چتا گیا۔ وہ میرے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ بڑبڑاتی گئی۔ اس کی آواز میں حسرت تھی۔ اس کے لہجے میں احتجاجی اور اس کی آنکھوں میں رنج و غم!

"میں قیاب تک گئی شایہ؟" اور میرا دم بکڑنے لگی۔ میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ ایک چھوٹے سے پردے پر گر پڑی اور میں تیزی کے ساتھ چتا گیا۔ ایک لمبو وقف کیے بغیر چتا گیا!

قلعے میں پہنچا تو دیکھا شاہین کا چہرہ اتر اتر ہوا ہے۔ درخشاںوں پر چاہا آنسوؤں کے ٹپکان ہیں۔ دھجے دھجکتے ہی دو دوڑی اور مجھ سے بہت گئی۔

”آء شہاب اتم نے مجھے بڑا ہے قرار کیا۔ تم کیا جانو مجھ پر کیا گزرتی رہی ہے؟“
 ”تمہارے پہلو میں بہت نازک اور ٹھانڈا دل ہے۔ ذرا سی بات پر ڈر جاتی ہو“ میں نے کہا۔
 اس نے مجھ پر حسرت نگاہوں سے دیکھا اور میرے ہاتھ کو زور سے پکڑا۔ میں نے بھی اس کا ہاتھ پکڑا اور ہم دونوں چلے گئے۔ ٹھانڈی ایک چکوری ہے قراری سے ادھر سے ادھر ادھر سے ادھر اڑ رہی تھی اور اس کی زوردار گھیر آواز ہوا میں قہر قرار رہی تھی۔
 ”سیرا دل کھرا لے لگتا ہے اتم قلعے سے باہر کیوں جاتے ہو؟ آئندہ یا تو باہر نہ چلا کرو۔ یا پھر مجھے بھی لے جایا کرو اتم یہاں سے چلے جاتے ہو؟“

”تم کمال ہو شاہین اور اتفرغ کے لیے باہر چلا جاتا ہوں۔“
 ”باہر چلے جاتے ہو اتفرغ کے لیے اتفرغ اچھا؟“ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو بڑھ اُٹے۔
 سیرا دل ہے قرار ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے کو چٹنے سے لگایا اور میرے ذہن سے تمام فکریں دور ہو گئی۔
 چند دن کے بعد میں پھر قلعے سے نکلا۔ جب تک باہر بارش کی صورت نظر نہ آتی مگر جب قلعے کے قریب پہنچا تو میں نے اپنے قریب ایک ماٹے گود دیکھا۔ میرے دل میں یقین پیدا ہو گیا کہ یہی ماٹلی نے قلعے کے اندر جانے کا ہمارا راستہ دیکھ لیا ہے۔ میں وہاں سے ہٹ گیا اور کافی دیر کے بعد قلعے کے اندر گیا لیکن جو یقین دل پر بیٹھ چکا تھا وہ کیونکر دور ہو سکتا تھا؟
 آدھی کے تیز دھڑکے، گھمان، درخت کو گرا سکتے ہیں۔ مگر اس درخت کی شاخ سے لپٹے ہوئے جانے کو نہیں دیتا سکتے۔ اسی طرح میری مسلسل کوششیں ماٹلی کے قصورات کو بھی میرے ذہن سے نہ نکال سکیں ہر بار جب میں قلعے سے باہر نکلتا تو وہ مجھے دکھائی دیتی۔ مجھ سے بدلے کی کوشش کرتی۔ اگرچہ میں اس کا جواب نہ دیتا۔ اس کی زور دہر پردہ اوڑھ کر تاہم وہ بد بخت عورت ایک ناگہانی کمرے میں کی تھوں میں گزرتی ہوئی دل کی انتہائی گہرائیوں میں اپنا زہر کھیر رہی تھی۔
 ایک دن اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی۔

”اگر اسوچو تو وہی شہاب! تمہاری یہ حرکت کتنی بے رحمانہ ہے۔ تم اس عورت سے بھاگ رہے ہو۔ جس کے عقل و فہم پر بھی تم چڑتے رہے ہو۔ میرے شاہاب!!! اس گھبراہٹ کا سبب؟“

”مجھے تم سے کوئی واسطہ نہیں۔ بد بخت عورت!“ میں نے کہا۔
 ”تمہیں مجھ سے کوئی واسطہ نہیں، کوئی واسطہ نہیں۔ یہ واسطہ شہاب تم کہہ رہے ہو؟“
 اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔
 ”شاہین تم سیرا! تمہارا بھائی ہے۔ میں بھی تمہارا بھائی ہوں اسی لیے میں“
 ”سیرا! تمہارا“

”میرے شباب! میں نے تمہارا امتحان لیا تھا۔ میرا دل محبت کی آگ میں بھل چکا تھا۔ مگر میں تمہاری محبت کو آزمانے کے لیے تمہاری جانب دیکھتی تھی۔ واقعی ہو رہی تھی تم محبت کے امتحان میں پورے اترے تو یہاں سے چلے گئے۔ نہ معلوم کہاں؟ میں تمہارا انتظار کرتی رہی۔ یہاں تک کہ تم آ گئے۔ انتظار کی کیفیت سے تو تم راضی ہو۔“

انتظار کا نقصان کر میں مضطرب ہو گیا۔ میں نے سٹلی کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور سامنے دیکھا کچھ دور ہوا کے جزیرہ جھونکوں میں ایک ناک پودا اس طرح ابل رہا تھا، جیسے ابھی ٹوٹ جائے گا۔ میں نے قدم اٹھایا۔ سٹلی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

”شباب! تم اسے غلام نہیں ہو سکتے۔“

میر دک گیا۔ اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر وہ کچھلے واقعات دہرانے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے!

”آنسو اس میری گزشتہ زندگی کا وہ تمام غم جو اس وقت میں نے سٹلی کے پیلو میں گزاری دی؟“

جب مل انگ میں گھلے میں پہنچا تو شاہین کو مہرانی جنازے کے پاس کھڑے ہوئے پایا۔ اس کی آنکھیں شب بیداری کے باعث سرخ تھیں۔ ہونٹوں پر چوڑاسی جھمی تھیں اور بال بے ترتیب پریشان تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے غلطی آہ بھری اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

”رات بھر کہاں رہے شباب؟“

”انکھیں ابھی گھٹی۔ تم مضطرب کہاں نظر آ رہی ہو؟“ میں نے کہا۔

”رات بھر کہاں رہے شباب؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔

”گھر چلا گیا تھا شاہین! میں نے جواب دیا۔

”گھر چلے گئے تھے، کچ کہتے ہو؟“

”تو کہا بھوت بول رہا ہوں؟“ میں نے میری بات پر اٹھایا نہیں۔“

”شباب! اس نے مسرت لہرے لہجے میں کہا شروع کیا۔“ تم پر اٹھایا نہیں کروں گی تو دنیا میں کس پر کروں گی؟“

”تو بھر جو کچھ میں نے کہا ہے اسے درست مانو۔“

”تم درست ہی کہہ رہے ہو۔ غم بھڑو اس بات کو!۔“

”شاہین! تم میں یہ بہت بری عادت ہے کہ تم بہت جلد بے چین ہو جاتی ہو!۔“

اس کی لہجہ جھلک گئیں۔ دو تین لمحوں کے بعد اس نے لگا میں اوپر اٹھاؤں اور قریب ہی ایک چوڑے کے کمرے میں اسے لے کر لڑے ہوئے سامنے کو دیکھنے لگی۔ چند لمحوں خاموش رہنے کے بعد وہ بولی ”جب تم یہاں نہیں ہو تو میرے دل میں خوف پیدا ہو جاتا ہے تمہیں کیے کھڑا ہوں کہ یہ رات میں نے کس بے تابی سے کاٹی ہے؟“

”اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم میری محبت کو بدگمان لگاؤں سے دیکھتی ہو!۔“

”نہیں یہ بات نہیں۔ مگر معلوم نہیں کیا بات ہے کہ تمہاری عدم موجودگی میں میرا دل ادا ہے تنگ ہے۔“

اپنی عجیب کی بے تابی دیکھ کر میرا دل پریشان ہو گیا اور اس دن میں نے قسم ادا کر لیا کہ آئندہ کھلے سے باہر نہیں نکلوں گا۔ ایک ہفتہ

گزر گیا۔ میری طبیعت گھبرائی اور انتہائی بد قسمتی یہ کہ شاہینہ سے میری طبیعت اکٹھی تھی۔ میں قلعے سے نکلا اور دور اٹھیں اور دونوں سٹلی کے پاس گزار دیے۔ جس وقت دایس قلعے میں پہنچے تو حموی نے مجھے اپنے بندہ یاد دلایا۔ مجھے کچھ کے ساتھ باہر جانے سے روکا اور صحت حاجت سے کہا "شاہینہ پر رحم کرو" اس دن تو میرا دل موسم کی طرح نرم ہو گیا مگر چند کے بعد یہ نرم دل جگر میں کیا میں نے قلعے سے نکلنے کا ارادہ کیا اور شاہینہ سے اجازت مانگی۔

ہماری آخری ملاقات تھی۔ آسان پر کالی کالی پہلیاں چھائی ہوئی تھیں اور ایک گوشے میں باجیس و محفل، خسرو و چرمزہ چائے پینے نظر آ رہا تھا۔ گویا کوئی فراق کے صدموں کی مادی، بھرجوں دل میں استر مرگ پر آخری سانس لے رہی ہے۔ شاہینہ جنوں انگیز گیت گاتی رہی اور ہمارے ارد گرد رہی۔ وہ میرے ساتھ دوڑنے تک آئی۔ اس نے آنکھوں کے اور خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ہمارے قریب کھڑے ہو کر درخت کی ٹٹلی سے دوپٹے کرے۔ ایک تو شاہینہ کے بازو سے کس کرنا ہوا میرے پاؤں پر آگرا اور دوسرا ہوا کے تیز دھچکھوکیں میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ میں قلعے سے باہر نکل آیا۔

چار پٹے، مسلسل چار پٹے میں خاتم چڑیل سٹلی کے دام لہریب میں گرفتار رہا۔ وہ مجھے ہر لحاظ سے اپنی شہیدہ محبت کا ثبوت دیتی رہی اور میں خاتم انسان، نکور دل انسان اور بھرا انتہائی بے وفا انسان اس کی باتوں میں آ گیا۔ آواز اٹھیں وہی اور اٹھیں راتیں میں نے اس کے پہلو میں گزار دیں۔ اس کے بعد جب میرے دل کا شعلہ کھڑا تو میں جنوں انگیز جلالت کے ساتھ قلعے میں پہنچا۔ کھراب وہاں کیا دھرا تھا۔ میں نے قلعہ ہر گوشہ چھان مارا لیکن وہ شاہینہ کہیں نظر آئی اور نہ حموی۔

دنیا میری آنکھوں سے تاریک ہو گئی۔ دل باجیسوں کی اتحاد گہرائیوں میں ڈوبنے لگا۔ انتہائی تلاش کے باوجود بھی مجھے اس میں سے کوئی نظر نہ آیا۔ دن کا آخری صدمہ گزر رہا تھا اور میں قلعے میں دھشیوں کی طرح بھرا رہا تھا۔ ہکا بیک مغربی چٹار کے پاس مجھے سفیدی چڑھ کر گھٹ کر رہی ہوئی نظر آئی۔ میں "شاہینہ، شاہینہ" پکارتا ہوا اس کی طرف دوڑا وہاں پہنچ کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ ایک خوش خواب دیکھ رہا ہوں۔

میرے سامنے سٹلی کا سکرانا ہوا چہرہ بھلیاں ہی برسا رہا تھا۔

"میرے شاہاب اوشیوں کی طرح کیوں بھرا ہے ہو؟" اس نے کہا۔

"تم یہاں؟"

"میں یہاں کیوں نہیں آ سکتی۔ آؤ میرے شاہاب اس دہرائی قلعے سے باہر نکلیں اب ہماری محبت میں کوئی رکاوٹ نہیں؟"

میرے دل میں اختر جیسے لگے۔

"کیا کہا تم نے؟" میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔

میرے چہرے کو دیکھ کر وہ غولہ وہی ہو گئی اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی "میں لے گیا۔ میرے شاہاب اب یہاں سے باہر نکلیں۔"

دیکھتے ہوئے قلعہ کھلوں اور سنسناں ہے۔"

"تم نے شاہینہ کو؟"

"شاہینہ! کہیں شاہینہ؟" سٹلی نے میرا لہجہ کاٹتے ہوئے کہا۔

میرے ہاتھ غولہ وہی ہو گئے اور اس کی گردن کی طرف اٹھنے لگے۔ دو ٹین لکھوں کے بعد اس کی گردن میری مضبوط گرفت میں چلی۔

"شاہد شاہین کہاں ہے؟ کچھ کچھ ناؤ اور نہ گردن مروڑ والوں کا؟" میں نے اس کی گردن دباتے ہوئے کہا۔ اس نے اہٹا ہوا چہرہ اٹھایا اور اٹھات میں سر ہلایا۔ میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔

"ناہے۔ وہ یہاں سے چلی گئی ہے" اس نے غور و فکر سے کہا۔

"ناہے؟" "ناہے؟" کچھ کچھ نہیں بتاؤ گی؟" یہ کہہ کر میں نے اس کی گردن کی طرف بھر جاتھ بڑھائے۔ وہ جیسے بہت گئی اور ڈرتے ڈرتے کہنے لگی۔

"یہ سب کچھ بہت سے ہوا۔ مجھے توہ سے محبت ہے، اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اور بھی تم سے محبت کرے۔ جہاں اتفاق کرتی ہوئی میں دو تین دفعہ یہاں آ چکی تھی اور مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ شاہین تم سے محبت کرتی ہے اور تم اس سے۔ اس لیے میری محبت نے مجھ کو کیا اس کا نئے کو روانہ سے بنا دوں۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے میں نے تمہیں اپنے ہاں رہنے پر مجبور کیا۔ جب ایک ہفتہ گزر گیا اور تم وہاں نہ پہنچے میں نے قلعے میں آ کر شاہین اور یوز سے سے کہہ دیا کہ شاہاب اب قلعے میں نہیں آئے گا۔ وہ میرا محبوب ہے۔ اس کے ایک ہفتہ بعد جب میں بھر یہاں پہنچی تو وہ جا چکے تھے"۔

"کہاں؟"

"یہ میں نہیں جانتی۔ یوز سے نے اس دن شاہین سے کہا تھا کہ شاہین اب ہمیشہ کے لیے اس قلعے کو چھوڑ دیں۔ جیسا کہ وہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلے گئے ہیں!"

میرے کانوں میں جوی کے وہی الفاظ کو بچے لگے جو اس نے قلعے میں کہے تھے۔

"اصلی صورت اس نے مجھے دھوکا دیا۔ اب ٹو بھی ذمہ نہیں رہ سکتی۔" میں نے کہا اور اس کی گردن پکڑ لی۔

"شاہاب اب میرے شاہاب" اور اپنی گردن پھرانے لگی۔ میری گرفت اصلی ہو گئی۔ ذہنی برائی کی طرح اس نے مجھ کو دیکھا اور بھاگی۔ یا ایک نصاب میں ایک نکل سی چیخ کوٹھی۔ میں نے چلے دیکھا پھر وہ پرخون میں غصہ اٹھایا اور گوشت نظر آ رہا تھا۔ میں نے بھی اپنے آپ کو نیچے کر دیتے کارواہ کیا۔ مگر جب یہ طیال آیا تھا شاہین بل جاتے تو میں نے امداد و ترک کر دیا اور قلعے سے باہر نکل آیا۔

13

سالہا سال میں، شاہین کی حاض میں سرگرداں رہا ہوں مگر کہیں بھی اسے نہ دیکھ سکا۔ نہ مظلوم جوی سے کہا ہے

کائنات کے کس کو شے میں اس سالس لے رہی ہے!

آج میں بھر قلعے میں بیٹھا ہوا یہ نظریں گھور رہا ہوں۔ جس جگہ بیٹھا ہوں، وہی جگہ ہے جہاں پہلے پہل میں نے شاہین سے گفتگو کی تھی اور جہاں پتہ کر میں اس کا انتظار کیا کرتا تھا!!

میری آنکھوں کے سامنے نہ ایک سانے بھر رہے ہیں۔ چار سالس باقی رہ گئے ہیں۔ کاش! اس ان آٹری لکھوں میں بھی اپنی محبوبہ کو دیکھ سکوں۔!!



خواجہ احمد عباس

نام	احمد عباس
قلمی نام	خواجہ احمد عباس
پیدائش	۷ جون ۱۹۱۳ء، پتھان پانی پت، ہریانہ
وفات	تکم جون ۱۹۸۷ء، کی جگ پتھان پانی پت۔
تعلیم	بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی، اعلیٰ گزٹ یونیورسٹی ایڈوانسڈ تعلیم عالی مسلم ہائی اسکول پتھان صاحب شاخ، پانی پت (ہریانہ)، پانچویں سے ساتویں تک، عالی مسلم ہائی اسکول، پانی پت۔ آٹھویں، یونیورسٹی ڈیڑھ اسکول، اعلیٰ گزٹ، انویس سے بارہویں اعلیٰ گزٹ، مسلم یونیورسٹی، انورمڈ پت کالج، اعلیٰ گزٹ۔ بی۔ اے (۱۹۳۳ء)، ایل۔ ایل۔ بی (۱۹۳۵ء)، اعلیٰ گزٹ، مسلم یونیورسٹی سے کیا۔

مختصر حالات زندگی:

آپائی، ملن پانی پت، والد کا نام غلام اسلمین انصاری، والدہ کا نام سرور خاتون، جو مولانا الطاف حسین حالی کی پوتی تھیں۔ خواجہ احمد عباس نے صحافت کی ابتدا ۱۹۳۳ء میں "پیش کش کال" اور "ہندوستان کا گھڑ" میں بلا معاوضہ لکھنے سے کی اور یہ سلسلہ ۱۹۳۵ء تک جاری رہا۔ طالبِ تعلیم کے زمانے میں اپنا ذاتی ہفتہ وار اخبار "Angarh Opinion" جاری کیا۔ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۷ء، "پیش کش کال" سے وابستہ رہے اس دوران میں اخبار کے قلمی نام کے علاوہ سنیے اپنے پیش کے اپنے طور پر رہے۔ ابتدا میں پشیمانی کی قلم "نیاسنار" اور سرگودھڑ کی "سچی دیا" لکھ کر شہرت پائی۔ اس کے بعد قلم "پاکستان" اور "سچی کہانی" لکھیں۔ ۱۹۳۶ء میں مسندِ ترجمہ، شیعہ دینی پارک، پشیمانی میں ان کی ذاتی قلم سبیل کا آغاز ہوا۔ ۱۹۳۷ء میں پشیمانی خاتون سے شادی ہوئی، ۱۹۵۸ء میں حکیم تقی اللہ کرگشی۔ انھیں انوار قرآن العین سہارن سے شادی کے اسکا ساتھی ہوا ہوئے لیکن یہ شادی نہ ہو سکی۔

۱۹۳۷ء میں ”بھٹی کرانیکل“ سے ”BHz“ ۱۲ شمار میں چلے گئے تھے۔ علمی دنیا سے تعلق سمیٹ کر تائیکز کے پارٹ، انٹیم پلٹینی ٹیجر کے طور پر قائم ہوا۔ آ کے بل کرانیکل میں موشن ٹیجرز پر دو ایسرز ایوی ایشن، ڈاکٹر کری پر دو ایسرز ایوی ایشن، ٹیم ڈاکٹر ٹیجرز ایوی ایشن اور ٹیم راتر ایوی ایشن کے کرتا کرتا رہا ہے۔ بھارتیہ گیان پیٹھ کے مشیر اور ٹیم انٹیم ٹیجرز آف پونا کے وزٹنگ پروفیسر ہے۔ ۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۶ء ماہر ٹیجرز ٹیم ڈاکٹر ٹیجرز ایوی ایشن کے صدر کے طور پر کام کیا۔ دنیا کا سترائیموں نے دوسری جنگ عظیم سے قبل ہی ٹیم کر لیا تھا۔ وہ پہلے مشرقی ہیڈ گئے بھر جاپان، امریکہ، فرانس اور آٹریش میں چلے گئے۔ ہوتے ہوئے بھارت واپس آئے۔ ۱۹۳۳ء میں پیٹھ ٹیجرز کی ٹیم ”دھرتی کے لال“ نہ صرف ٹیجرز بلکہ پڑوسی اور ڈاکٹر ٹیجرز کی۔ مشہور فرانسیسی ٹیجرز پروفیسر ہارنچ ملادوں نے اس ٹیم کو دنیا کی سوبھرتی ٹیموں میں شمار کیا ہے۔ ٹیجرز صاحب کی دوسری ٹیم ”بھوٹی“ تھی اس کے بعد اپنی کامیابیوں کی ”شری پارسیٹیں“، ”جائے دیو“، ”بھارتیہ جگر“ اور ”بھوٹی“ کی فلمیں ”آوارہ“، ”پریکسی“، ”آج اور کل“، ”ڈاکٹر ٹیجرز کی امریکائی“، ”شری پارسیٹیں“، ”جائے دیو“، ”بھارتیہ جگر“ اور ”بھوٹی“ کی کہانیاں، اسکرین پلے اور مکالمے لکھے۔ ٹیجرز صاحب کی اردو، ہندی اور انگریزی تصانیف کی تعداد گنت ہے یا پھر تالیس کے قریب ہے اور جنگ بھگت سیٹی ہی فلمیں ٹیگیں جن میں ”سات بھدوستانی“، ”نکسل بازی“، ”دو بھدوستانی“، ”بھوٹا“، ”دھرتی کے لال“ اور ”بھارتیہ جگر“ کو مالی سب سے سربا کیا۔ ان کی آخری ٹیم ”فیصلہ“ تھی۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

”اپنا تیل“ مطبوعہ ”پاسو“ دہلی ۱۹۳۷ء

تلمی آثار (مطبوعہ سب):

۱۔ ”نیک لڑکی“ (افسانے)

مطبوعہ کتبہ اردو سرگودھا لاہور

طبع اول ۱۹۳۷ء

طبع دوم دسمبر ۱۹۳۹ء

حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

طبع اول ۱۹۳۶ء

مطبوعہ سب پبشرز دہلی

طبع اول ۱۹۳۸ء

مطبوعہ پریس بک ڈپالیا ہر

طبع اول ۱۹۵۳ء

مطبوعہ پریس بک ڈپالیا ہر

طبع اول ۱۹۵۳ء

مطبوعہ پریس بک ڈپالیا ہر

طبع دوم ۱۹۵۳ء

مطبوعہ پریس بک ڈپالیا ہر

طبع اول ۱۹۵۳ء

مطبوعہ پریس بک ڈپالیا ہر

طبع اول ۱۹۵۳ء

مطبوعہ پریس بک ڈپالیا ہر

طبع اول ۱۹۵۳ء

مطبوعہ پریس بک ڈپالیا ہر

طبع اول ۱۹۵۳ء

مطبوعہ پریس بک ڈپالیا ہر

طبع اول ۱۹۵۳ء

- ۱۰۔ "نعلی ساری" (افسانے) مطبوعہ: مکتبہ جامعہ لکھنؤ، نئی دہلی طبع اول: ۱۹۸۳ء
- ۱۱۔ "انکھاپ" (مجموعہ ناول) مطبوعہ: مکتبہ جامعہ لکھنؤ، نئی دہلی طبع اول: ۱۹۸۳ء
- ۱۲۔ "ہاؤس میں بھول" (افسانے) مطبوعہ: سلسلہ نعلی، ممبئی طبع اول: ۱۹۳۸ء
- ۱۳۔ "میں کون ہوں" (افسانے) مطبوعہ: نو ہند پبلشرز، ممبئی طبع اول: ۱۹۳۹ء
- ۱۴۔ "نئی دھرتی سے انسان" (۱۵ افسانے) مطبوعہ: مکتبہ جامعہ لکھنؤ، نئی دہلی طبع اول: ۱۹۷۷ء
- ۱۵۔ "گہریں اور گلاب" (۷ افسانے) مطبوعہ: انیشیا پبلشرز طبع اول: ۱۹۶۵ء
- ۱۶۔ "تین کپے"
- ۱۷۔ "ہمارے ہمارا میں" (ناول) مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۵۹ء
- ۱۸۔ "ہمارے تھے" (افسانے، ہندی)
- ۱۹۔ "رقص کرتا ہے اگر" (ناول)
- ۲۰۔ "سرخ زمین اور پانچ ستارے" (ادبی مجموعہ)
- ۲۱۔ "میں کوئی بزم نہیں" (آپ جی ہندوان انگریزی)
- ۲۲۔ "نقص کیسے بنتی ہیں" (ہندوان انگریزی)
- ۲۳۔ "ویا جے ساری راست" (افسانے) مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۵۹ء
- ۲۴۔ "آدمی انسان" (ہندی) مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۵۳ء
- ۲۵۔ "لوہان مسوری" (افسانے، ہندی) مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۷۵ء
- ۲۶۔ "Blood And Stones" مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۳۹ء
- ۲۷۔ "Rice And Other Stones" مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۴۷ء
- ۲۸۔ "Tomorrow Is Ours" مطبوعہ:
- ۲۹۔ "One Did Not Come Back" مطبوعہ:
- ۳۰۔ "A Novel Of The India Of Today" مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۳۸ء
- ۳۱۔ "I Write And Feel" مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۳۸ء
- ۳۲۔ "Inqlab" (ناول) مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۴۵ء
- ۳۳۔ "Mussolini And Fascism"
- ۳۴۔ "Face To Face With Khruchev" مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۶۰ء
- ۳۵۔ "Till We Reach the Stars" مطبوعہ: طبع اول: ۱۹۶۱ء

۳۶۔	"Indira Gandhi: Return Of The Rose"	مطبوعہ	طبع اول: ۱۹۶۶ء
۳۷۔	"That Women-Her Seven Years In Power"		طبع اول: ۱۹۷۳ء
۳۸۔	"An Indian Looks At America"		
۳۹۔	"Mera Nam Joker"	مطبوعہ:	طبع اول: ۱۹۷۰ء
۴۰۔	"Boy Meets Girl"	مطبوعہ:	طبع اول: ۱۹۷۳ء
۴۱۔	"Face To Face With Indira Gandhi"	مطبوعہ:	طبع اول: ۱۹۷۳ء
۴۲۔	"Distant Dream" (ناول)	مطبوعہ	طبع اول: ۱۹۷۵ء
۴۳۔	"The Walls Of Glass" (ناول)	مطبوعہ:	
۴۴۔	"Mad, Mad, Mad World Of Indian Films"		طبع اول: ۱۹۷۷ء
۴۵۔	"Barrister At Law" (ڈراما)	مطبوعہ:	طبع اول: ۱۹۷۷ء
۴۶۔	"مسلحہ فاشیت اور جنگ محلی" (سیاسیات)		طبع اول: ۱۹۷۹ء سے قبل
۴۷۔	"سوئے کے بت" (اردو ناول)	مطبوعہ: انجمن اداکاران آواز	طبع اول: ۲۰۰۱ء

غیر عدد اول:

تعداد مضامین: مکرین پٹے اور دایک ناول۔

اعزاز:

- ۱۔ چیم شری ایوارڈ: ۱۹۶۸ء
- ۲۔ میرا ایوارڈ: مادہ دیکھائی بھوپال۔
- ۳۔ بہادر ورج پٹلس ایوارڈ برائے قومی تنظیم۔
- ۴۔ بریڈتھ گورنمنٹ ایوارڈ (ایوب) کاویا کی مثال۔
- ۵۔ بریڈتھ گورنمنٹ ایوارڈ برائے نظم "شہر اور چٹا" ۱۹۶۳ء
- ۶۔ کارنامہ ادبی (اعلیٰ) (نظم فیشیول کا آرٹ اکادمی ایوارڈ برائے چاریتہ کاری۔
- ۷۔ گولڈن (ایکین) (نظم فیشیول ایوارڈ برائے "شہر اور چٹا"۔
- ۸۔ سٹار پار (امریکہ) (نظم فیشیول ایوارڈ برائے "شہر اور چٹا"۔
- ۹۔ نظم فیشیول (اعلیٰ) میں سوئے کی صورت برائے "تکسلا من" (تکسلا باڑی)
- ۱۰۔ سوئی فائیل ایوارڈ ۱۹۸۳ء

ٹیری لین کی چٹلون

خوبصاحب احمد عباس

ٹشٹی کی دیر کے پیچھے کھڑا ہوا صاحب اپنی نلی کا جلی آنکھوں سے منگو کو گھور رہا تھا۔

ٹشٹی کی دیر کے سامنے کھڑا ہوا منگوا اپنی پتیلی کالی آنکھوں سے صاحب کو گھور رہا تھا۔

صاحب کے سر پر مٹی کی رنگ کا "ٹوپ" تھا۔ اور دل ہی دل میں منگو نے اپنے آپ کو ٹوکا۔ "ٹوپ" نہیں "ٹیٹ" ٹوپ تو گھور ہوتے ہیں۔ صاحب کے بدن پر چھوٹے چھوٹے چار خانوں کا کوٹ تھا۔ کوٹ کے کنارے سے سفید قمیص اور کالی اور لال دھاریں اور تائی جہانک دی تھی۔ صاحب کی ناگہیں نیلے رنگ کی چٹون میں تھیں۔ چٹون صاحب کے کلبوں پر کھسکی ہوئی تھی اور چھپکا لے ٹشٹی کی طرح چمکتے ہوئے جڑوں تک آتے آتے گائے کی دم کی طرح پتلی ہو گئی تھی۔ چٹون کا کپڑا بچہ دھکیلا تھا۔ ملائم بھی ضرور ہو گا۔ منگو نے کا جلی کی دیر کو تانک لگاتے ہوئے سوچا۔

صاحب سے منگو کی کئی مہینے پرانی دوستی تھی۔ ہر روز منگو صاحب کو دیکھنے آتا تھا کران کے درمیان یکم بجنے کا جلی کی دیر کو کڑی تھی جو اس کو ٹٹے نہیں دیتی تھی۔ صاحب ٹشٹی کی دیر اوس کے اندر قید تھا۔ صاحب دوزی کی دکان کے باہر نہیں آسکتا تھا۔ منگو دوزی کی دکان کے اندر نہیں جاسکتا تھا۔ صاحب کے کاٹھ کے بدن میں ہانچیں تھیں۔ منگو کے بدن میں جان تو تھی مگر اس کی جیب میں دام نہیں تھے۔ دونوں مجبور تھے۔

منگو نے ٹشٹی کی دیر کے باہر ہی سے صاحب کے کتھ کو ٹاپ کر سوجا۔ ہم دونوں برابر ہی ہوں گے۔ صاحب کے کپڑے میرے بدن پر فٹ آسکتے ہیں۔ "فٹ" منگو نے سوجا پہ پھرنا سا اگر بڑی کالٹا ہوئے ہی میں نہیں سوچتے میں بھی کتا اچھا لگتا ہے۔ "فٹ" جیسے کچھ مٹن دیا کر لگانے کی آواز گئی۔ جیسے اس کے پانسک کے قہقہے میں گئے ہوئے زپ کو کھینچنے کی آواز۔ زپ ویسے ہی "فٹ" جیسے صاحب کی ناگوں سے چمکی ہوئی چٹون۔ فٹ جیسے صاحب کی بھاتی اور کرہ منہ کا ہوا کوٹ۔ فٹ، جیسے صاحب کے سر پر بیٹھا ہوا بیٹ۔ فٹ!

وہ صاحب کمرے کے لے کر بیٹک۔ بیٹ سے لے کر بیٹوں تک درود پکھتا تھا۔ مگر اس کی نظر بار بار چٹیلے لیے رنگ کی چٹون کی صبری پر پانی تھی۔ جہاں کاندی ایک پر پڑی تھی جس پر ہانگر بیڑی میں لکھا تھا۔ ”میری نہیں کی چٹون۔ اسی روپے“۔

اور جب وہ اس روپے والی مٹری نہیں کی چٹون کا مطالعہ اپنی انگلیوں پر مصروف ہوئی پہلی داخلہ وحشی خان کی ڈبل زمین کی چٹون سے کرتا تھا جو اس نے کئی مہینے ہوئے بارود روپے میں ”دیگی مین“ خریدی تھی اور جو اس کے بدن پر بالکل ”سفن“ نہیں تھی تو منگو کو یہ لگتا تھا جیسے اس کی نہیں سالہ زندگی کی ساری درود روپے اسی مٹری نہیں کی چٹون کو حاصل کرنے کے لیے تھی۔

منگو ہر رات کے ایک چھوٹے سے لچیرے رنگ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کو اپنا بچپن بہت کم یاد تھا۔ اس کی ماں تو منگو کے پیدا ہونے کے سال بھر بعد ہی مر گئی تھی۔ لیکن اس کو تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ بچپن میں وہ کوئی مکمل بھی نہیں تھا یا نہیں یا اس کے بچپن کے ساتھی اور دوست کون تھے۔ شاید کوئی تھے ہی نہیں لیکن اس کو اس کا ضرور یاد تھا کہ وہ کوئی پانچ برس کا تھا جب اس کے باپ نے اسے گلے کے لیے نیل پر اٹری اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ داخلہ آسانی سے نہیں ہوا تھا۔ کئی بار اسے منجھ سیرے اندر کمرنہ یا تھوڑو کر مگر وہی ہوئی دھوکا جو اس کے باپ کی پرانی دھوکا میں سے چھڑک رہی تھی اور قیاس یہ کہ کر بیکل ہنک اور طبیعت کو بھل میں دیا کہ باپ کے ساتھ اسکول جانا پڑا تھا۔ جب ہا کر باسٹری نے رجسٹر میں اس کا نام لکھا تھا۔ مگر اگلے دن جب وہ اکیللا اسکول پہنچا تو اسکول کے چیراگی نے برآمدے میں پرانی ایک بھلی ہوئی چٹائی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”یہاں بیٹھ جا۔“ اور منگو کی بھو میں نہیں آیا کہ جب دوسرے بچے اندر چلے اور اسکول پر بیٹھے ہیں تو اس کو باہر برآمدے میں کیوں اٹھا دیا گیا ہے۔ اور ساری کلاس کے ساتھ وہ بھی ”آ۔ ائی۔ ام۔“ دو دو فی جاڑ ”وہ چاچا“ پھا پھا کر پکارتا رہتا تھا۔

مگر اس کے چھوٹے سے سر میں ایک سوال شہد کی مکھی کی طرح بھن بھن کرتا رہتا۔ سب لڑکے اندر کمرے میں بچوں پر چڑھتے ہیں تو صرف گھگھے ہی کیوں برآمدے میں گھسی پٹنی چٹائی پر بیٹھا پڑتا ہے؟ کیوں؟ کیوں سوال کی زہریلی بھن بھناتی رہتی، گھگھی گھگھی کیوں گھگھی رہتی، مگر نہ جانے کیوں اس کو یہ سوال یہاں تک لاتے ہوئے ایسا عجیب ڈر لگتا تھا جیسا رات کے اندر میرے میں پرانے شیل کے کڑکڑاتے ہوئے سامنے میں ہوا سے ڈر لگتا ہے۔

پھر ایک دن کیا ہوا کہ اس کے باپ نے اسے معمول سے بھی سیرے ہوتے سے بگاڑ دیا اور جب وہ اسکول پہنچا تو اس نے دیکھا ابھی ایک بچہ بھی نہیں آیا۔ چٹوں کمرے اور ان کے سامنے کا برآمدہ خالی پڑے تھے اس کی کلاس کے کمرے کے دروازے کھلے تھے اندر بیٹا اور ایک لاکھوں میں گئے ہوئے تھے۔ اس نے سوچا ایک بار جہاں اور لڑکے بیٹھے ہیں وہاں بیٹھ کر تو دیکھوں۔ اندر اندر دیکھ کر وہ سیدہ پاؤں کمرے کے اندر گیا اور سب سے گھجیل لائن میں ایک بیٹا پر بیٹھا تھا۔ سامنے ڈسک رکھا ہوا تھا جس میں وہ شادی مٹری رہا نہیں لگی ہوئی تھی منگو نے ڈسک پر اپنی کتابیں اور تختی ”سینٹ“ ”کلم“ ”پینسل“ بچا دیں۔ بیٹا کے پیچھے لگی ہوئی کڑی پر کمر کا کر چٹون میں تھوڑا کر بیڑی چٹان سے بیٹھا تھا۔

اس نے سوچا۔ ”اگر ہر روز میں بھی یہاں بیٹھ جاؤں تو کیا ہرج ہے؟“

اور شاید اس کے سوال کے جواب میں جی اسی نام وین سر پر اپنا خان کی صاف ہاتھتے ہوئے برابر کے دروازے سے کمرے میں داخل ہوا اور منگو کو بیٹھ کر بیٹھا کر دیا۔ ”سب اور۔“ تجھے یہاں بیٹھنے کو کس نے کہا ہے؟ اپنے ساتھ گھگھے کی بیٹا نے گا۔“

نام طور سے نام وین منگو سے بیڑی مٹائی سے پیش آتا تھا۔ باسٹری کی طرح اس کے ہاتھوں پر لکھاں نہیں مارتا تھا۔ سو منگو بار کے

ارے ایک دم کڑا نہیں ہو گیا۔ وہیں بیٹھا بیٹھا وہ "کا کاراموہین۔ میں یہاں کیوں نہیں بیٹھ سکتا؟ مجھے ہاں چٹائی پر کیوں بیٹھنا پڑتا ہے؟" اس لئے کہ اچھوت ہے" نامہ دین نے جواب دیا۔ "تھو کو" اچھوت کے معنی نہیں معلوم تھے مگر اسے یہ لفظ سننے ہی اپنے آپ میں سے ایسی گھٹاؤنی ہوتی کہ وہ بڑھکا کر کڑا ہو گیا اور جلدی جلدی اپنی کتابیں سمیٹ کر رآمدے میں جا بیٹھا۔ مگر اس جلدی میں اس کی دھوتی کا سر اور کب میں لگی ایک کینل میں ٹپک گیا۔ چھری آواز آئی اور منگھری پا نہیں ٹپک کر لے کھٹک لگی ہوئی۔ پہلی ہوئی دھوتی کو منسپا لے ہوئے دیکھیں اس نے اتنی باقی مار کر سامنے کتا ہیں درنگی ہی تھیں کہ رام دین نے اسکول کی تھنٹی بھائی شروع کی اور لڑکوں کی ٹولیاں بھاگ بھاگ کر اسکول میں آنے لگیں۔

لو کے چم کا پھانسا یاد کرتے رہے۔ "چم اکن چم۔ چم دہنی بارہ چم چم اٹھارہ۔" مگر منگھ کے دماغ میں ڈیڑھائی شہد کی کھسی بھن بھاتی رہی۔ "اچھوت۔ اچھوت۔ اچھوت۔"

لو کے چلتے رہے۔ "آج آرم لا کھل کام پر ہا۔ کج ہول کم قول نو اٹھرا بھائی ہے تو اس کا بھائی ہے" مگر منگھ کے کانوں میں سنائی دیتا رہا۔ تو بچہ پتہ چلے تو اچھوت ہے۔ گندھی چٹائی پر بیٹھ تو اچھوت ہے تو کسی کا بھائی نہیں ہے تو اچھوت ہے۔"

ماضی پر پچھتے رہے "اس تو بچہ تھا؟" پچھل کیا ہوتی ہے؟ ساگر کیا ہوتا ہے؟ نام کیا ہوتا ہے؟" اور منگھ کھتا رہا۔ "اس تو بچہ تھا؟" اچھوت کیا ہوتا ہے؟ اچھوت کیا ہوتا ہے؟"

اور پھر ایک دم ماضی کی تھنٹی کی مار اس کی کمر پر پڑی۔ "اے منگھ جواب نہیں دیتا کیا سو رہا ہے؟ اہل کڑا ہو چکا۔" منگھ گھبرا کر کڑا اور دھوتی کا پھانسا بھانچا چمے کر رہا اور اس کی پاؤں ٹپک کر لے کھٹک لگی ہوئی۔ سب نے کھل کھلا کر ہنس دیے۔

ایک اور تھنٹی کی مار منگھ کی کمر پر پڑی اور اسے ایسے ٹپک جیسے ایک لمبی ڈنگ والی لہڑی نے ایک دم اسے کاٹ لیا اور ماضی نے چلا کر کہا۔ "ہر کسی پہلی دھوتی پہن کر آتا تو مجھے اسکول سے نکال دوں گا۔"

اسکول ختم ہونے کی تھنٹی پئی اور سب بچے ہنسنے شروع ہوتے باہر بھاگے تو منگھ نے انھیں فورے دیکھا۔ ان میں سے ہر ایک قہقہے اور نگر پینے ہوئے تھا۔ کوئی خاکی نگر کوئی نیلی نگر کسی کے چہرے میں سوزے اور روٹ کئی کے چہرے میں ڈھیل۔ مگر ٹنگے پاؤں کوئی نہیں تھا۔

اسکول سے گھر جاتے ہوئے منگھ نے سوچا اچھوت وہ ہوتا ہے جو نگر کی بجائے پہلی ہوئی دھوتی پہنتا ہے اور ٹنگے پاؤں اسکول جاتا ہے اور اس نے مگر کچھ ہی باپ سے کہا "بابا۔ مجھے نگر سلو اور۔ اور ڈھیل دلا دو۔ میں ٹنگے پاؤں اسکول نہیں چاہتا تھا۔"

تین دن کے بعد وہ سنے چلپاں کو چم کر کتا لکھ کر دی نگر ماہن کر سوسے سوسے اسکول پہنچا اور رام دین سے پوچھا "کا کا اب تو میں اندر بیٹھ سکتا ہوں؟" اور رام دین نے چٹائی کی طرف اشارہ کر کے کہا "اپنی خیریت چاہتا ہے تو بیٹھ جا اپنی جگہ۔ نگر پہن کر بھی ٹپک ہے تو اچھوت" اس دن اس نے باپ سے پوچھا "بابا اچھوت کیا ہوتا ہے؟" باپ نے اس وقت سڑک پر جھاڑو سے کرایا تھا بھانڈا ڈگری پیچک کر

جواب دیا۔ اچھوت وہ ہوتا ہے جسے کوئی اور ٹپک چاہتے اور پھونک سکتا۔"

"مگر کیوں نہیں چھو سکتا؟ ہم میں کوئی کھٹکی ہے کیا؟"

”ہاں بیٹا۔ مگر تو ہے۔ ہم لوگ کڑا کر کٹے جھانچتے ہیں۔ مٹی صاف کرتے ہیں۔ گندے ہاتھ دھوتے ہیں۔ سڑکوں پر ہمارے جوتے ہیں۔ اس لئے ہم اچھوت ہیں۔“

منگو نے اپنے فیصلہ سنایا۔ ”تو پھر میں تو یہ کئی کام نہیں کروں گا۔“

اور باپ نے غصہ کرنا گزرتے ہوئے کہا ”تو نہیں کرے گا تو اور کریں گے۔ یہ کام تو کسی نہ کسی کو کرنا ہی ہے اگر ہم یہ کام نہ کریں تو سڑکوں پر کوڑے کے اچھر لگ جائیں۔ ہر گھر میں مٹی اکٹھی ہو کر سڑا خدائے لگے تیار ہاں بکھل جائیں۔“

اس کا جواب منگو کے پاس نہیں تھا۔ مگر اس نے بھرا کہا ”میں تو کوئی اور کام کروں گا۔“

”تب ہی تو تجھے اسکول میں بھرتی کر لیا ہے۔ چار جماعت پڑھ لے گا تو تجھے دلی بھیج دوں گا۔ وہاں کچھ نہیں تو چیرا ہی کی نوکری مل جائے گی۔“

اور منگو نے کہا ”بچہ اسی نہیں نہیں باپو میں گا۔“

منگو نے چار جماعتیں تو پڑھ لیں۔ مڈل اسکول میں بھی داخل ہو گیا۔ جہاں اس کو برآمدے میں چٹائی پر بیٹھا نہیں پڑتا تھا کلاس روم میں ہی بیٹھا اور ڈسک پر دوسرے لڑکوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ منگو کو اس کے باپ نے بتایا تھا کہ وہ لڑکے لڑائی آڑو ہو گیا ہے اور مہاراجا کا دعویٰ مٹی سرے سے پہلے سب کو کہہ سکے ہیں کہ اچھوتوں کو اچھوت نہ کہیں ”برہمن“ کہیں اور ان سے اچھوت چھات نہ برہمن۔ سوہم کار نے ایک نیا قانون بھی بنا دیا تھا کہ اچھوت چھات بدھ ہو جائے یہ قانون اسکول تک تو پہنچا تھا مگر ان کی سختی کے پاس بڑا بوٹی ہاتھ دالوں کا ٹھل تھا اس کے کوئی تک نہیں پہنچتا تھا۔۔۔ اچھوت ”برہمن“ ہو گئے تھے مگر اس کو نہیں سے پائی نہیں بھر سکتے تھے۔ مڈل اسکول میں بھی وہ چار دن تو منگو بہت خوش رہا کہ اب وہ مٹی کی ہیر پر چڑھ کر پڑھ سکتا ہے لیکن چند روز کے بعد اسے غیب سا دکا کہ ان کے کمرے میں دودھ لڑکے ایک ڈسک پر بیٹھے ہیں لیکن منگو کے برابر کچھ پیش خالی رہتی ہے اور برابر والے ڈسک پر وہ کے بجائے تین لڑکے گھنٹ پھنٹ کر بیٹھے ہیں۔

منگو نے مڈل پاس کیا تو باپ نے اسکول سے اٹھا لیا۔ ابھی وہ دھوپ جانی کی سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا باپ بیٹھے میں سر کیا۔ چشم منگو کو اس کے رشتہ دار میٹھی میں میٹھی کی نوکری دوانے کی سوچ رہے تھے کہ ان کی میٹھی کا ایک آدلی رشتہ دہائی سے وابستہ آیا وہ وہاں کی ل میں کام کرتا تھا۔ ایک دن منگو کو وہ راستے میں مل گیا تو اس نے بچہ چلا ”کیوں منگو۔ میٹھی چلے گا؟“ سورلدو نے اس کو بتایا کہ میٹھی میں دو راتیاں نام کھاتا ہے۔ ایک ل میں کام کرتا ہے۔ جس چال میں وہ رہتا ہے وہاں ہر کوٹری میں (جسے میٹھی کی بھانڈا میں ”منگو“ کہتے ہیں، بھانت بھانت جاتی کے لوگ رہتے ہیں کسی میں برہمن تو کسی میں مسلمان تو کسی میں سکھ ان پارسے سکھ دہائی بنگالی اور تو اور رشتہ دار میٹھی میں رہا نام بھی وہیں رہتا ہے اور کسی نے آج تک اس سے نہیں بچھا کر تو منگو سے بچا اچھوت۔“ منگو میٹھی میں سب لوگ رات دن کام کرنے میں بیٹے رہتے کسی کو نہ غم ہی نہیں ہے ایسے سوال دجواب کرنے کا۔“

مگر منگو نے بچہ چلا ”مگر کھانے پینے میں تو اچھوت چھات ضرور ہوتی ہوگی۔“

اور لدو نے کہا۔ ”ارے میٹھی کے ایرانی لوگوں میں سب دھرم اور جات کے لوگ کھاتے پیتے ہیں۔ کوئی تمسک بچتا کیا دھرم ہے کوئی جات ہو۔ بڑے شہر میں یہی تو تھا ہے۔ یہ اچھوت چھات لہروں اور دیہاتوں میں رہتی ہے۔“

رلد وہاں میں سمجھتی گیا تو منگو بھی اس کے ساتھ ہوا۔

پہلی بار وہ ریل میں بیٹھا تو اس کو ایسا لگا جیسے وہ ل نہیں چلی دی ساری دنیا جیسے کو بھاگ رہی ہے۔ وہ جنگ کے شہزادوں کا مکان ہرگز اس کی ہمت کی جھوڑاں اس نکوس۔ جہاں منگو کے بھائی بند پانی نہیں بھر سکتے۔ ڈل اسکول نے اپنی ساری سکوٹوں کو سونپا۔ میری ساری ہائی زندگی بچے کو جاری ہے صرف میں آگے جا رہا ہوں۔ آگے نہیں سمجھتی ہے۔ وہ خیر جہاں عمارتیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں جہاں رلد وہاں رام کہا تا ہے اور جس تلخی کر منگو منگے منگو ہو جائے گا۔ ”کوئی میری ذات بھی بچھٹکے گا تو کہہ دلا گا برا جیتے ہوں۔“ اس نے سوچ کر کہا تھا۔

اس ریل کے سفر نے نہ صرف منگو کو جنگ سے سمجھنے پہلایا بلکہ اس کی کھ بڑھو کی نگین سے کھینچا دیا۔ ریل سے زیادہ اہم منگو کو ریل کا پانڈا لگا۔ جہاں ایک دلچیز کو کھینچنے سے ہر قسم کی گندگی کو بہا دیا جاتا ہے۔ منگو ایسا مخصوص ہوا کہ اس دلچیز کے ساتھ اس کا اور اس جیسے کرداروں ہرگز اس کا مستقل بندھا ہوا ہے۔ اپنے آپ کی بات داکر کہ اس نے سوچا۔ آج وہاں جو ہے پچھتے اگر ہم یہ نہیں کریں گے تو منگائی کا کام کون کرے گا؟ تو میں جواب دیتا۔ ایک پانی کی نگین اور ایک لوہے کی دلچیز یہ کام کرے گی؟ اور میں بیٹھ کے لیے جموت چھات سے آزاد کر دے گی۔

بھئی پہنچ کر رلد دے کہا۔ ”منگو پہلا کام یہ کر کہ وہ چادر شرٹ پیٹنٹ خریدے۔“ کہہ کر ڈاکٹ میں سٹے سٹے کپڑے بکتے ہیں۔ اگلے دن ہی منگو نے دور پڑی میڈیکل خیر میں اور دو چلوں۔ اہل دین کی ایک حاکم ایک نئی پہلے دن ہی اسے ایسا لگا جیسے وہ ایک دم صاحب لوگ جیسا ہو گیا۔ رلد وہاں ایک جان بچان والا ایک صاحب بنانے والی کھلی کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ وہاں منگے منگو (بھئی منگو) کو بچہ راس کی نوکری بھی مل گئی۔

منگو کو ایسا لگا کہ ایک شرٹ اور ایک چلوں نے اس کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ اب وہ ایرانی ہوئی میں کھانا کھاتا۔ چو پانی پر راجہ ستمانی چاٹ دالوں سے چاٹ لے کر کھاتا۔ ریل کو سٹا کر کو کا کلا پیچہ اور کوئی اس سے یہ نہ پچھتا کیوں ہے تو اجموت تو نہیں ہے؟

پھر جیسے جیسے اس دفتر میں دن گزرنے لگے اس کو آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ شرٹ، شرٹ میں اور چلوں، چلوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک اس کی ریل اسالی، نئی کھلی چلوں میں جڑیختے میں ایک بار دھلی تھی، جس کی اسٹری ایک دن بعد غائب ہو جاتی تھی دوسری شہر صاحب کی چلوں تھی جس کی اسٹری اتنی کھلی ہوتی تھی جیسے کھوار کی دھابہ۔ ایک دھلی باؤ کی چلوں تھی جو نئے فیشن کے مطابق بند ہوتی کے کھڑے کی طرح سڈول اور گاؤم تھی یہاں تک کہ جو تے تک پہنچتے پہنچتے چوڑی دار پاہ سے کی طرح تللی اور رنگ ہو جاتی تھی اور تو اور ایک چند رشتہ گزار کی چلوں تھی جو چٹیلے اور کھڑے کپڑے کی تھی اور جو بیٹھاسی تھی جیسے اٹھاری سے اور ملی کھین ہو کر آتی ہو۔

ایک دن منگو نے صحت کر کے چند سے پچھو لیا۔ چھاری چلوں کی اسٹری اسے دلوں تک اتنی کڑک کہیں دھاتی ہے؟ اور چند نے بتایا کہ ایک یا کپڑا لٹھا ہوا ہے جسے نیری لہن کہتے ہیں۔ جسے گھر میں دھو سکتے ہیں۔ لاٹھری پیچنے کی کوئی ضرورت نہیں اور جس کی چلوں بغیر اسٹری کے بھی لگائی گئی ہے جیسے ابھی دھوی نے اسٹری کر کے دی ہوا اور پھر اپنے دفتر سے چوچ گیند دلوں سے خشک تک بیول جاتے ہوئے منگو حسب معمول راستے کی دکانوں میں بے ہوئے سامان دیکھتا ہوا جا رہا تھا کہ اس کی ملاقات ”صاحب“ سے ہو گئی اور اس کو معلوم ہوا کہ نیری لہن کی چلوں اتنی روپے میں مل سکتی ہے۔

ہوئی وہ چہ نیاں، جن پر کبھی گناہی کبھی نیلے رتبے ہوتے تھے، منگو کو بہت اچھی لگتی تھیں۔ کلا کی پتلی لمبی انگلیوں میں ہاتھ تھا۔ وہ چاہے رات کو پرنگی کی رفتار سے چلتی تھیں۔ منگو جب بھی کام سے خالی ہوتا وہ اپنے اسٹول پر بیٹھا بیٹھا کلا کو چاہے کرتے دیکھا کرتا تھا۔ اس کا اسٹول جس کونے میں تھا وہ کلا کی بغل سے دور نہیں تھا لیکن پھر بھی ہر روز منگو اس کو وہ چار انچ اور سر کا لچکا تھا یہاں تک کہ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا بیٹھا صرف کلا کو دیکھتا تھا بلکہ اس کی ہنسنی بخنی خوشبو کو بھی سونگھ سکتا تھا۔ جس میں گھس گھٹ سوپ اور کچھ پاؤں کے علاوہ جو ان کے پیٹے کی جگہ پر بھی شامل تھی۔ ایک دن کلا نے تاپہ رات کو کچھ مٹین میں سے کاغذ کاٹتے ہوئے گفتی پہلی تو منگو لپک کر اٹھا۔ ”پر پٹنی اندر صاحب کو بیوہ۔“ کلا نے کاغذ پکڑتے ہوئے منگو سے کہا۔ کاغذ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لگے تو ان کی انگلیاں جھنجھکیں اور منگو کو اپنے غصوں سے وہاں سے اس کے سامنے دن میں کبھی کا کرنٹ دوڑ گیا ہو۔

دفتر میں ایک یوز صاحبہ جو اسی تھا جو حوالہ دے رہی تھی۔ ایک دن اس نے منگو کو الگ لے جا کر کہا۔ ”بیٹا منگو۔ یہ تیری فیکر کوہر بھل رہی ہے نہ؟“ تھ سے سر میں کم سے کم چہرہ میں بڑی ہے۔“ منگو نے سوچا۔ یہ بڑا صاحبہ جی سے جاتا ہے۔ مجھے تو کلا اچھی بڑی نہیں لگتی۔ مجھ سے بڑی ہوتی تو اس کو دیکھ کر میرا دل کیوں دھڑ دھڑ کرنے لگتا ہے؟

پھر ایک دن جب دفتر کے سب لوگ لچا کی پھلتی میں اس پاس کے چھوٹے سولے ہوٹلوں میں گئے ہوئے تھے منگو نے دیکھا کلا اپنی میز پر ہی بیٹھی ایک کاغذ کے ٹکٹ میں سے پوری بھائی نکال کر کھا رہی ہے۔ منگو اپنے اسٹول پر ہی بیٹھا ابل روئی اور کہنے لگا کہ ہاتھ اس نے کلا کی طرف دیکھ کر کہا ”کیا جی آپ کانا کمرے لاتی ہیں؟“ کلا نے کانا سے کانا سر کے اشارے سے ہاں کہا۔ ”چہ کیا کانا نہیں گی؟“ کلا پہلے تو چٹکائی پھر سرگرا کر اس نے کیلا لے لیا۔ ”تم پوری کھاؤ گے؟“ ”کھائوں گا جی۔“

دو پہر یوں پر بھائی رکھتے ہوئے کلا نے چہ چھا۔ ”بھوت چھات کا خیال تو نہیں ہے؟“ اور جب منگو نے سہلا کر ”نہیں“ کہا تو کلا بولی۔ ”کون بات ہو؟“ اس سوال کے لیے تو منگو چار ہی رچا تھا۔ کھٹ سے اس نے جواب دیا ”راجپوت۔“ ”بہت اچھا“ کلا نے جواب دیا۔ ”ہم بھی راجپوت ہیں۔ تو پوری کھاؤ۔“ ابھی کلا سے منگو کی بات چیت کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ ایک دن اتوار کو رات منگو کو جوہر لے گیا۔ جوہر بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ رات دے گیا۔ ”اور پھر وہیں میرے سگے والدہ چہ ہیں۔ کانا بھی وہیں کانا نہیں گے؟“

منگو کو سچے سچے بہن میں دچہ ہو گئے تھے لیکن اس نے اب تک جوہر کی میرٹھ کی تھی۔ دیکھا تو خوش ہو گیا۔ صبح کا کارہ مذہم نرم ریت والے کچے باریل کے چلر، پھیل، پوری والوں کی دکانیں، دکانیں، ساراں گھاس، گھوڑا کھس، انگلیوں کے ہوا میں لہراتے ہوئے دوپٹے۔ منگو

رلدو نے منگو کو اپنے منگو والے سے ملا دیا۔ خسارام کو کچھ کر منگو کو اپنا باپ یاد آ گیا۔ چہرے پر دیکھنے والی بھری محنت کی گہری بھری پڑی ہوئی تھیں، اسی طرح بڑے باپ سے کمر لگی ہوئی تھی۔ خسارام ایک کمرے میں اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہتا تھا۔ بیوی بڑا رنگی ہوئی تھی۔ بیٹی کو نے میں بیٹھی ہوئی اسکول کا سبق پڑھ رہی تھی۔ ”اری دو منگلی۔“ اجڑا آسمان آئے ہیں۔ چائے بنالے۔“ لڑکی اپنی جگہ سے اٹھی تو منگو نے دیکھا چند سولہ برس کی سائلی سی لڑکی ہے۔ گھر کا دراصل اسکول کی بے یلادوم کا بیلا فراک پہنے ہوئے وہ بالکل بیٹی لگتی تھی۔

”ناری رلدو کا کا کو تو بچا تھی ہے نا اور یہ منگو بھی اپنے خسارام کی بیٹی برادری کا۔“

منگلی نے دونوں کو ہاتھ جوڑ کر منگو کا ریا اور منگو کی بہت نہیں ہوئی کہ خسارام سے کہے ”بھتیجی میں میرا نام منگو نہیں ہے۔ منگھ منگھ ہے۔“ کیونکہ بھر یہ بھی کہہ نہ پاتا۔ ”میں تمہاری برادری سے نہیں ہوں خسارام بی۔“

منگلی چائے بنانے کے لیے جل جلکا جو بھرا رہی تھی اور خسارام بیٹی کی قریب کھے جا رہا تھا۔ ”بھتیجی کلاس میں چڑھتی ہے۔ بڑی ہوشیار ہے۔ سب کے علاوہ یہی چاند کر سکتی ہے۔ ہندی کی تھی ہی کو چائیں تو منڈ پانی یاد ہیں۔ گھر کے کام کاج میں بھی ماں کا ہاتھ ملاتی ہے۔ اسکول کی ماسٹر بی تو کتنی ہے اسے منگھ تک چڑھاؤ گھر رلدو بھیا تو ہی بتا چھو کر ہی اتنا چاند گھر کر کیا کرے گی۔ اس کی ماں تو کتنی ہے اپ کی دیا لئی پر اس کے ہاتھ پیلے کر دیں۔“

اور یہ کہ نہ جانے کیوں خسارام نے منگو کی طرف دیکھا اور منگو نے منگلی کی طرف اور منگلی کے ہاتھ میں بکڑی ہوئی چاہے کی بنا لیاں آپ سے آپ کھٹکے لگیں اور پرائی منگو کو پکارتے ہی وہ ہوا گئی۔

وہاں ہی وہ جس اسٹینڈ پر پہلے تو دیکھا جا رہا تھا کیونکہ ہوا ہے۔ اتوار کے دن جو ہو یہ بڑی بھیڑ ہوتی ہے اور ختم ہوتے ہی سب شہر لوٹنے کی سوچتے ہیں۔

منگو نے کہا۔ ”رلدو کا کا۔ آج تو پھنس گئے کم سے کم تین ہوں گے بعد اپنا خیر آئے گا۔“

اسٹینڈ میں بدو کے ایک کھٹکے کے ساتھ ایک بکھرے کی ٹرک آکر جس اسٹینڈ کے سامنے کھڑی ہوئی، جس کو دیکھتے ہی کتنے ہی آدمیوں نے اپنی اپنی ناک بند کر لی۔ ایک میم صاحب نے بیٹھ لگا کر دال اپنی ناک کے آگے بٹا کر شروع کر دیا۔

”کسے ڈرا نیو۔ یہ بکھرا کھڑی یہاں سے ہٹاؤ۔“

ڈرائیور جو ایک ہٹا کھڑا جوان تھا اور آل کو اس شان سے پہنچتا تھا جیسے وہ بھری کی بے یلادوم ہوا اپنے دانت چکاتے ہوئے بولا ”ارے تو اس بکھرے کے کچھ کر کہتا رہا پھانٹنے کا یہاں سے۔“

اور جب تک بکھرا ٹرک میں بیٹھ رہا تو وہ ٹرک واپس کھڑی رہی اور میم صاحب کی ناک کے سامنے بیٹھ بھرا دال بھولتا رہا۔ یہاں تک کہ بیٹھ ہوئی اس کی اور صرف بکھرے کی ڈر لگی۔

ٹرک اشارت کرتے ہوئے ڈرائیور نے رلدو سے پوچھا۔ ”کیوں کا کا کہتے ہیں تک چھوڑ دیں۔“

رلدو نے منگو کی طرف دیکھا۔ منگو نے لیے لیے کو دیکھا۔ پھر وہ دونوں ٹرک میں ڈرائیور کے برابر بیٹھ گئے۔ ٹرک روانہ ہو گئی اور جب میم صاحب دال ایک میں دیکھ کر کھینچے ہوئے ہو گئے۔ ”میں بھتیجی کو گویں کا بھی کھتا رہا۔“ ہو گیا ہے۔“

اگلے دن منگو دفتر جانے سے پہلے خوب سامان سے رگڑ کر نہایا، پھر دھو لی کے دھوئے کپڑے پہنے، مگر باہر بھی اب وہ دفتر میں پہنچا اور کھانا
نے اس کی طرف منکرا کر دھڑ سے کہا "ہیلو! تو بدلی دیر تک وہ کھانا کھیل سے دور رہی، دور دورہ ہاؤس کھانا اب تک اس میں پکرا گاڑی کی کڑواہٹیں
مائل ہوئی ہے اور دل حق دل میں وہ سوچنا رہا۔" اگر کبھی کھانے وہ بدلی ہو گئی تو پھر کبھی منگو سے منکرا کر بات نہیں کرے گی۔"

پندرہ روز کے بعد ولدہ نے پوچھا۔ "کیوں منگو تنگ نہیں لگی؟"

"کون؟ وہ خیار ام جی کی چھوڑ کر؟" ٹھیک ہی ہے۔"

"منگو اور منگلی۔ تمہاری جوڑی اچھی رہے گی نا؟"

منگو کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ "مگر جی تو منگلی کی ہے؟"

ولدہ کو پہلے تو ایسا لگا جیسے منگو نے اس کے منہ پر قہر مارا ہو۔ پھر وہ ہنسنے کوئی کر بولا "کو تو کس کا بیٹا ہے؟"

"کچھ بھی ہو گا گا، میں نہیں جانتی میں کیا نہیں کروں گا۔" کو یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کھوئی سے باہر نکل گیا۔ سیر جیوں سے اترتا ہوا

جال سے باہر نکل گیا۔ نہ جانے کب تک سڑکوں پر گھومتا رہا، کھک کر خیر اتر دیکھا شیشے کی دھار کے پیچھے "صاحب" ٹھہری لین کی چٹون پہنے کھڑا
منکرا رہا ہے "شاید اسے جال رہا ہے، کچھ یاد دل رہا ہے۔"

منگو نے اپنی جیب میں اتھوڑا ل کر سیرنگ، چیک کی کتاب نکالی۔ اب اس کے حساب میں پانچ روپے جمع ہو چکے تھے اس نے سوچا
"صرف پانچ روپے کی کسر ہے۔"

وہ پھر کو دفتر کی سب چیزیں خالی پی ڈی جنس۔ صرف کھانا اپنی جیب میں لپیٹی تھی۔ منگو دفتر کی کینٹین سے پائے پی کڑا یا تو اس کے ہاتھ میں ایک
چال تھی جو اس نے کھانے کے سامنے رکھ دی۔

"ٹھیک ہے؟" کہہ کر کھانا چائے پیتے لگی تو منگو نے ایک اخبار جیب سے نکالا اور کھانا کی طرف دیکھے بغیر ہی بولا

"ہاں میں، آؤ چار کر رہی۔"

"نا ہے ابھی مریدا رقم ہے۔"

"اس اتوار کو دیکھنے چلو گی؟"

"پتا ہی سے پوچھا ہو گا۔ اگر انہوں نے ہاں کہی تو جا سکتی ہوں۔"

"پھر پوچھ کر نکل جاتا۔"

اگلے دن کھانے منگو سے کہا۔ "اتوار کو تمہیں میرے کمرے آنا ہو گا۔"

"اور رقم دیکھنے نہیں چلو گی؟"

"پہلے پتا ہی تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

"تو میں۔" ماڑھے چار پہنچا تو جیوں گا۔ تمہارے پتا ہی سے آگیا ہے کہ چوبیسے سنا سنا سکتے ہیں۔"

اگلے دن منگو نے ایک سے پانچ روپے نکال لئے۔ پھر وہ روپے دفتر کے کینٹر سے اپنے دھس لئے۔

کاٹم ختم ہوتے ہی وہ چھ گیت اسٹریٹ کی طرف بھاگا۔

پیشے کی اجار کے پیچھے کھڑا "صاحب" اپنی نیلے کانچی کی آنکھوں سے اب بھی گھور رہا تھا۔

لیکن آج ان کے درمیان پیشے کی دیوار گھس رہی تھی۔ منگو نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کرورے نوٹوں کو چھو کر اطمینان کیا اور پھر دکان میں داخل ہو گیا۔

"مجھے بھری لین کی چٹون چاہیے۔"

"کپڑا بھند کر لیجئے۔"

"ابن وہ چاہیے درختی سینڈ جو صاحب پہنے ہوئے ہے۔"

"صاحب! وہ وہی کوہر پہنائی ہوئی ہے۔ میں بھی لاتا ہوں۔ آپ رنگ دوم میں چاہنے لائی کر لیجئے۔"

دوڑی چٹون لے آیا۔ سینڈ سے پہلے منگو نے کپڑے کو چھو کر دیکھا۔ کچ کچ بڑا ملائم تھا۔ پٹی ان کی ذیل زنجیر کی چٹون اتار کر اس نے نئی چٹون پہن کر دیکھی۔ بالکل فٹ۔

بھیسے گا۔ جیسے زپ۔ ایسے ہی فٹ!

جیبوں میں ہاتھ ڈالتا تو چنگی رنگ کے اسٹرپر ہاتھ حاصل کیا۔ دادو! اس نے سوچا۔ کیا چٹون ہے۔

دوڑی نے کہا۔ "صاحب! آئیے میں دیکھ لیجئے اب لگتا ہے آپ کے لیے ہی اکی ہے۔"

منگو نے آئینہ دیکھا تو ہاں بصر کے بھگت! داڑے والے منگو کے بھائے ایک کالے ہاتھوں سالوولی رنگت کا صاحب کھڑا تھا۔ جس کی ہاتھوں میں نیلی بھری لین کی چٹون تھی۔ چٹون پر کاغذ کی پر پٹی لگی ہوئی تھی۔ بھری لین کی چٹون۔ قیمت اسی روپے۔ اب اچھے میں اور صاحب میں فرق بھی کیا ہے؟

اس نے دوڑی سے کہا۔ "یہ لیجئے اسی روپے اور چٹون کو کاغذ میں لپیٹ دیجئے۔"

کاغذ کے ٹھیلے میں بھری لین کی چٹون، لپٹے منگو پر لٹا تو اب لگاؤ تھا۔ وہ میں دیا ہی بدل گئی ہے۔ وہی چھ گیت اسٹریٹ ہے مگر آج پہل پہل ہی الگ ہے۔ ہر آدمی خوش دکھائی دیا۔ ہر صورت خوبصورت۔ ٹھوڑا سا ڈنشین کے ٹوڑے ہاتھ رہے تھے۔ دور سمنڈ کی طرف آسمان پر رنگ برنگ کے بادلی چھائے ہوئے تھے اور سڑکوں کی نیلی نیلی روشنائیاں ایک ایک کر کے بھٹکی جا رہی تھیں۔ اب وہ خود بھی قہر لگ گیا تھا۔ اب وہ ایک بھگت کا چھوکر تھا جس کو اسکول میں سب سے الگ دانت پر چھٹا چھٹا تھا۔ خود داڑن سوکس کینٹی لیونڈ کے ہینڈ آفس کا آفس بوائے یعنی چیز اسی تھا۔ اب وہ مسٹر سنگھ سنگھ تھا جس کے ہاتھ میں ایک بڑا اسونے کا تھکا تھا تھا تھا جس پر ایک بہت بڑی دوڑی کی دکان کا نام درج تھا۔ ہوا تھا اور اس کاغذ کے ٹھیلے میں ایک بھری لین کی چٹون تھی۔

اس رات کو منگو کو کتنی ہی ادب نیند آئی۔ وہ لپٹا لپٹا نیلی بھری لین کی چٹون کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے ساتھ شرت بھی بڑھیا ہوئی تھی۔ جیسے اور جوتا بھی نیا ہوتا تھا۔ اب وہ سب جاکن کر کھلا ہے مگر جانے گا۔ اس کے چہرے سے لپٹے کا تو وہ بھی اس کے کپڑے دیکھ کر ان جا نہیں گئے۔ لڑکا ضرور کھی جو اسے اپنے گھر لانے کا ہے۔ فوراً اپنی گواہی کے ساتھ سینٹا ہالے کی اجازت دے دیں گے۔ پہلے وہ چار سینے دور دلوں سینٹا

شام کو اٹھنے جایا کریں گے بلکہ ایک دن سارا اقدار جو ہو کر گزاریں گے۔ مسند کی لمبوں میں بٹکیاں لٹائیں گے۔ چاریل کا پانی نکلیں گے اور مسالے دار پائت کھائیں گے اور شام کو جو ہو ہوگی یاں اپنے بیٹوں میں چائے نکلیں گے بلکہ چھٹی لے کر وہاں ہوں گے اور دانتے میں مشغول کھانا کھا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہے گا۔ کھانا تم میری۔۔۔؟

مگر اس وقت تک وہ سوچا تھا اور خطاب میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی لمبی ٹیسی کی چٹون ایک لمبے رنگ کا ہوائی جہاز بن گئی ہے اور وہ اس پر سوار ہو کر نکلے آسمان پر اڑتا ہوا کھانا کے گھر کی طرف جا رہا ہے۔

اقدار کو ٹھیک ساڑھے چار بجے اپنے بے بوٹ چہرے پر اڑتا ہوا منگو کھانا کے پائے ہوئے چتے پر پہنچ گیا۔ وہ اڑنے پر کھانا کے پائے کے نام کی کتنی تھی اور ساتھ میں تھکی بھی تھی۔ کھانا کے پائے کی نے خود اقدار کو کھانا کھانا ایک کسی قدر گھبراہٹ سا سنا سنا بھی صورت شکل کا بڑے صاف سحر سے کپڑے پہنے ہوئے جہاز ہوا کھانا ہے۔

”کی وہ مجھے کس کھانا لے۔“

آؤ بھئی آؤ اقدار آؤ۔ کھانا چاہو رہی ہے۔ تم اور چٹھو۔

چٹھو کی ٹیسی تھی اور اس کا چہرہ ساڈا رنگ دم تھا۔ وہیں کھانا کے پائے منگو کو بٹھایا۔

منگو اپنی بی بی لمبی ٹیسی کی چٹون کی سلطنت کو سنبھالتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کھانا کے پائے کی غور سے اس کے منگو کو دیکھ رہے تھے اور منگو سچ رہا تھا بڑے مہیاں میری لمبی ٹیسی کی چٹون کی طرف کیوں نہیں دیکھتے۔

”کیو بھئی تمہارا نام کیا ہے؟“

”کی نہ تکہ منگو۔“

”منگو تو تم بھی راجا تھو۔ ہو کیا؟“

”کی ہاں ہم راجا تھو تھی ہیں۔“

”چند مہینے یا سو مہینے۔“

منگو نے سوال بن کر پوچھا کیا۔ بھربھات ہاتھ اس نے کہا۔ ”کی یہ سب تو پائے کی کو مظلوم تھا۔۔۔“

”تمہارے پائے گزر گئے ہیں کیا؟“

”کی ایک برس ہوئے ان کا ویرانہ ہو گیا۔“

”جو افسوس ہے کیا کام کرتے تھے تمہارے پائے کی؟“

”منگو نے اس سوال کا جواب پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ جلدی سے بولا۔“

”کی وہ سب کھلی کھلی میں ڈکرتے تھے۔“

”تم کیا کرتے ہو؟“

”کی میں اس دفتر میں کام کرتا ہوں جہاں کھانا۔۔۔ کھانا۔۔۔“

”ہاں مگر کیا کام کرتے ہو؟ تم بھی اسٹیوگر مقرر ہو؟“

”جی نہیں۔ اسٹیوگر مقرر نہیں۔“

”مگر کیا مصروفی ملے گی؟“ کلا کے چاندی کی آواز میں ایک عجیب سے بریلی خندک بڑھتی جا رہی تھی۔

”جی نہیں ملے گی۔ ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ کبھی تو آج بھی۔۔۔ آفس بوائے ہوں۔“

”آفس بوائے؟ یعنی چی؟“

”جی جی جیسے ہمیں آفس بوائے سے ملے ہیں۔“

”کھار کھا کر چلی ہے؟“

”اسی روپے“ منگو نے جواب دیا۔ مگر اس کا بیجا ہوتا تھا کہ بڑے مہاں اسی روپے کو خوار ملتی ہے تو کیا ہے میرا دل کتنا بڑا ہے یہ تو

دیکھو۔ میری اسی روپے کی بھری لین کی چٹانوں کو خور سے دیکھو، کسی بھی صاحب سے کم نہیں ہوں۔ آج اسی روپے ملنے ہیں تو کیا ہوا اکل، دیکھو کتنی ترقی کرتا ہوں۔

”ہوں؟“ کلا کے چاندی برف سے بھی بخند کی آواز میں کہا اور اٹھ کر اندر چلے گئے۔

تھوڑی دیر میں کلا کی باہر آئی۔ باتھون کی ٹیلی ساڑھی پہنے۔ ہاتھوں میں غنڈہ بن گئے، بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ منگو کا بیجا ہوا۔ کہے

”کلا دیکھو۔ یہاں کی ٹیلی ساڑھی اور غنڈہ بن کی طرح میری بھری لین کی چٹانوں بھی ٹیلی ہے۔“ لیکن کلا کی آنکھوں کا سرسٹاؤں کے پاؤں پر پھیل رہا تھا اور گلابی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ابھی ابھی رو کر آؤ تو بچے تھے۔

”سو رہی تھو؟“ وہ بولی۔ ”چاندی بیٹھا ہاٹے کو بیخ کر رہے ہیں۔ تم جاؤ۔“

منگو دروازے سے باہر نکل رہا تھا کہ اندر سے کچھ کن کر گھٹک کیا۔ اندر کلا کے باہر چلا جھک رہے تھے اور ان کی آواز میں دروازے کے باہر بھی منگو کا بیجا کرتی رہی۔

”اب کب رہی تھی۔“ منگو نے کلا کی ایک شاخ لٹکے۔ کپڑے بھی اچھے پہنے ہوئے ہے۔ مگر تھیں تو کوئی پتہ ہی نہیں آتا۔ چہاں برس کی

تو ہو گئی۔ مگر پھر کوئی اٹھانے نہ ہو گئے کیا؟“

اور باپ کہہ رہا تھا۔ ”کوئی بھی نہیں ہے تو انہی لڑکی نہیں جہاں سکا؟“

سڑک پر نکل کر منگو نے چٹانوں کی۔ بریلی، چپ میں ہاتھ ڈالا اور ”آؤ بیجا کر میں“ کے دہرائے لٹک لال کر پھاڑا۔

ابھی انٹیشن کی طرف جانے کے لیے سڑک پر نوا اسی تھا کہ ایک دیو کا بھیا آیا اور ایک بکھرے کی ٹرک پاس سے گزری۔ منگو نے سوچا،

اس کی بھری لین کی چٹانوں کے باوجود میرے اندر کوئی دیو نہیں ہوتی ہے کیونکہ کلا کے چاندی نے اسے سوچ کر مجھے باہر نکال دیا۔

انٹیشن پر جانے کی دکان پر کھڑے ہوئے اس نے سامنے گئے ہوئے قہر دم آئیے میں اپنے آپ کو خور سے دیکھا۔ بالکل صاحب گنا

ہوں۔ اتنا ہی رنگ کی دس روپے کی شرت، اسی روپے کی بھری لین کی چٹانوں، دھبے میں کیا نہ ملنی نظر آتی؟

اسی روپے! اسی روپے کی چٹانوں! اسی روپے بکھرا جات پات کی گدگی کو تو لٹھر سمجھنے سے پانی کا ربا بہا کر لے گیا لیکن اسی

دو چہ بھار کے کٹک کو کون سا کنگا مل دوسکا ہے؟ چائے پی کر پیالہ داہیں کرتے ہوئے اس نے سنا۔ بھئی میں چائے دے دے وقت کوئی بات بات گھنٹوں پہنچتا، لیکن بیٹی کو کسی پتھر کے کے ساتھ سینا کیجئے سے پہلے بات بات گھنٹوں پہنچتے ہیں اور بھار بھی۔

اگلے اتوار کو سامنا کر دے جو برس میں جاتے ہوئے منگو نے دیکھا لہذا دھننا میں بھی "آؤ چار کریں" چل رہی ہے۔

فساد رام نے منگو کو دیکھا تو اس کا چہرہ مکمل اٹھا۔ "آؤ چنا۔ بڑے دنوں کے بعد آئے ہو۔ منگلی کی ماں، چاہتا منگو ہے۔ اے خلقی مہربان آؤ آئے تو راجا کے قہقہے لے۔"

”جائے رہتے تھکے تھکے تو سینا جا رہا تھا سوچا آپ لوگوں سے بچ جاؤں۔ چلیں گے آپ؟“ یہ کہہ کر اس نے ایک ہراتی ہوئی ٹکڑی تھیلی کی طرف اشارہ کیا۔

”چلتا ہوں نہ جھلک کر کیا سحر و جادو چاہیں گے۔“

”مجھ پر اس کے لہو و شمس کی آغوشِ قلم چلی رہی ہے۔“^{۱۰}

”اس میں ہی ہے تو حلقہ کی پہلی جائے گمراہی کے جلدی سے کھڑے ہوں۔“

مٹھو کرے سے نکل کر باہر آئے تو دے میں آگیا اور غلطی کے بار بار پھر بھر کر دے تھے۔

"Edy's"

"عبداللہ بن ابی طالبؐ کے لئے ہے"

”... اہری جیٹنا چاہی ہے تو پھینک دو وہی ہوائی سارا بھی ہوگی۔“

مطلق کپڑے بدل کر آئی تو منگو نے دیکھا کہ سارا دھبی پہننے ہی متعلق جو وہ سوئی۔ سارا دھبی، سستی نعلی، سبک کی قمی، لیکن نعلی قمی اور منگلی کے گھدائے ہوئے جسم پر بڑی پہلی لنگ، جی قمی۔

جو ہوئی سڑک پر اور مسجد کے کنارے بیٹھکروں تو وہاں جوڑے چلے جا رہے تھے۔ گرو کے ساتھ پہنچے تھے۔ کمرتا پا جا رہے تھے۔

ان میں ایک مائولا سامو جان تھا جو غلط رنگ کی بھری لمب کی چٹون دوسرے چمڑے پر کرتے ہوئے ہوتے پہنے تھا اور اس کے ساتھ نیلی مائولا پہنے ایک شرنکلی ہی سول سڑ۔ سالہ لڑکی تھی جو باجہ کرتے بھی گھبراہٹ تھی۔

”کیوں لگی؟“ اس نے دھیرے سے پوچھا۔ ”بہتر کوئی ہی فطرت رکھتے ہوئے ہیں۔“

"Light" - 1992

عصمت چغتائی

نام	عصمت خانم
تعلیمی نام	عصمت شاہد لطیف / عصمت چغتائی
پیدائش	۳۱۔ اگست ۱۹۱۵ء بہن مقام بدایوں بہارت
وفات	۲۳۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء بہن مقام ممبئی
تعلیم	بی۔ اے۔ بی۔ لی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
	ابتدائی تعلیم آگرہ میں پائی۔ بی۔ اے کھنویس یونیورسٹی اور بی۔ لی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران کچھ مدت تاریخ اور انگریزی اپنے بڑے بھائی عظیم بیگم چغتائی سے پڑھی۔ جدوہ پور میں عظیم بیگم چغتائی کے پاس قیام کے دوران قرآن اور حدیث کے مطالعہ کے دوران بھائی سے مدد لی۔

مختصر حالات زندگی:

عصمت کے والد مرزا عظیم بیگم چغتائی پولیس آفیسر تھے، جنہوں نے جٹوں کے کراگرہ کے سرورٹی گھر میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ عصمت دس بہن بھائیوں میں نویں نمبر پر تھیں۔ اس لیے بچپن میں بھائیوں کی صف میں جگہ لی۔ بڑی بھیلی بیاضی ہانگلی تھیں۔ مکہ، چڑشاہی، آگرہ کی گلیوں میں لڑکوں کے ساتھ گلی ڈانچنے اور چھت پر چڑھ کر چنگ اڑانے کے دنوں میں بھیلی بارہ پتے لڑکی ہونے کا مصداق ہوا۔ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے انہیں علی گڑھ کی انڈیا ہاس آئی۔ جو بڑے بھائی مرزا عظیم چغتائی کی زیر نگرانی سمیٹن میں ہی تھیں، بارہ پتے، تھاپ، اسماعیل، بھون گورکھ پوری اور نیا فتح پوری کو کھول کر لی لیا۔

بھڑک کے بعد چار برس تک شباب کی کتابیں مجھ پر تھیں، لیکن اس وقت تک جینے پیڑ، حسن اور ہادی برہادر شاہ کو حفظ کر چکی تھیں، جو بی۔ اے میں کام آیا۔ لو کہیں میں تھاپ، اسماعیل سے حشر تھیں اور جھانی میں ڈاکٹر رشید جہاں کی بولی کہاتیں۔ بی۔ لی کر کے کے دوران علم سار

شہادہ لیلیٰ سے جان بچکان ہوئی۔ ابتدا میں ریاست جاور کے ایک اسکول کی ہیڈ مسٹر رہیں۔

۱۹۳۷ء میں اسلام آباد ہائی اسکول (نوائے خواجہ) کی ہیڈ مسٹر بن گئیں۔ پھر انسپکٹر آف سکولز بمبئی میں ملازمت کی۔ ترقی پا کر ہیر ٹیڈنٹ آف سینٹرل اسکولز کا مہندہ منتخب ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں شہادہ لیلیٰ سے شادی ہوئی، جن کا انتقال ۱۹۶۷ء میں ہوا۔ شہادہ لیلیٰ سے اولاد دو بڑیاں: سیملا اور سیت۔ کچھ عرصہ تاشیام کرنے کے بعد بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اب فلم کے لیے سکرپٹ لکھتی اور تصنیف دتالیف کو ریڈیو روزگار بناتی۔ ۱۹۳۳ء میں پروڈیوسر کے۔ آصف کے لیے پہلی فلم ”پھیل چھا“ (بھٹی تھی۔ بطور رائٹر، ناول ”مندی“ لکھنے پر ۱۹۳۶ء میں رائلٹی ایک سو روپیہ ملی۔ فلم ”گرم ہوا“ (۱۹۷۳ء) اور ”جنون“ (۱۹۷۹ء) کو لا کر مجموعی طور پر لگ بھگ چھ سو فیس لکھیں۔ فلم ”جنون“ میں راکھری بھی کی۔ مصروفی اھل و شابہت کی گول مغل مصمت چٹائی کی ایک آگہ قدرے چھوٹی تھی۔ عراج کی جڑ اور ہٹ دھرم مصمت تاشی، سکرین اور شراب کی رہا تھیں۔ بعد ازاں تاشی کی مصمت کی تھی۔ مصمت کی قبول میں انھیں ۱۳ اکتوبر کو بمبئی کے چھ دن وارڈی میں قتل کر دیا گیا۔

اولیٰین مطبوعہ تحریر:

”نساہی“ (ڈراما) مطبوعہ: ”ساقی“، دہلی، جنوری ۱۹۳۸ء

اولیٰین مطبوعہ افسانہ:

”چھبیس“ مطبوعہ: ”ساقی“، دہلی، ۱۹۳۸ء

فلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ ”لکھاں“ (نساہی) ساقی بک ڈپو، دہلی طبع اڈل ۱۹۳۰ء
- ۲۔ مقدمہ: صلاح الدین احمد طبع دوم: آئینہ ادب، لاہور، ایک ایڈیشن اردو آئینی سندھ کراچی نے بھی شائع کیا۔ ساقی بک ڈپو، دہلی طبع اڈل ۱۹۳۳ء
- ۳۔ ”ایک بات“ (نساہی) کتبہ دوم: اردو آئینی سندھ کراچی، طبع دوم: آئینہ ادب، لاہور
- ۴۔ ”ایک بات“ (نساہی) کتبہ دوم: سرگودھا، لاہور طبع اڈل ۱۹۳۳ء
- ۵۔ ”چھبیس“ (نساہی) اردو آئینی سندھ کراچی طبع اڈل ۱۹۵۲ء
- ۶۔ ”دو دم“ (نساہی) طبع اڈل ۱۹۶۲ء
- ۷۔ ”دو دم“ (نساہی) طبع اڈل ۱۹۶۲ء
- ۸۔ ”دو دم“ (نساہی) طبع اڈل ۱۹۶۲ء
- ۹۔ ”دو دم“ (نساہی) طبع اڈل ۱۹۶۲ء
- ۱۰۔ ”دو دم“ (نساہی) طبع اڈل ۱۹۶۲ء
- ۱۱۔ ”دو دم“ (نساہی) طبع اڈل ۱۹۶۲ء
- ۱۲۔ ”دو دم“ (نساہی) طبع اڈل ۱۹۶۲ء
- ۱۳۔ ”دو دم“ (نساہی) طبع اڈل ۱۹۶۲ء
- ۱۴۔ ”دو دم“ (نساہی) طبع اڈل ۱۹۶۲ء
- ۱۵۔ ”دو دم“ (نساہی) طبع اڈل ۱۹۶۲ء
- ۱۶۔ ”دو دم“ (نساہی) طبع اڈل ۱۹۶۲ء
- ۱۷۔ ”دو دم“ (نساہی) طبع اڈل ۱۹۶۲ء
- ۱۸۔ ”دو دم“ (نساہی) طبع اڈل ۱۹۶۲ء
- ۱۹۔ ”دو دم“ (نساہی) طبع اڈل ۱۹۶۲ء
- ۲۰۔ ”دو دم“ (نساہی) طبع اڈل ۱۹۶۲ء

- ۷۔ ”شیطان“ (ناول) نیا اور دوسرے گروہوں کا دور طبع اول: ۱۹۵۵ء
- ۸۔ ”کنواری“ (پہلی افسانے) طبع اول: دہشت گردوں کا دور
- ۹۔ ”ہم لوگ“ (خاکے) طبع اول: دہشت گردوں کا دور
- ۱۰۔ ”زیر“ (افسانے)
- ۱۱۔ ”کلی لڑکی“ (افسانے)
- ۱۲۔ ”رحمانی ہانگیں“ (ناول) طبع اول: ۱۹۶۸ء
- ۱۳۔ ”خدی“ (ناول) ساقی بیک ڈیم: دہلی طبع اول: ۱۹۶۲ء
- یہ ناول اردو اکیڈمی سندھ کراچی آئینہ ادب لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔
- ۱۴۔ ”محبت کے بھری افسانے“ (انتخاب)
- ۱۵۔ ”میرپ گھر“ (ناول) (یہ کتاب بھارت میں ”غیب آدمی“ کے نام سے شائع ہوئی۔)
- ۱۶۔ ”فریڈ“ (افسانے)
- ۱۷۔ ”لاف“ (افسانے)
- ۱۸۔ ”بدن کی خوشبو“ (افسانے) طبع اول: ۱۹۷۰ء
- ۱۹۔ ”آدمی محبت، آدمی خواب“ (افسانے)
- ۲۰۔ ”نیر کی گھڑ“ (ناول) طبع اول: نکتہ ادب گروہ ط لاہور طبع دوم: نیا اور دوسرے گروہوں کا دور
- ۲۱۔ ”معمومہ“ (ناول) طبع اول: نیا اور دوسرے گروہوں کا دور
- ۲۲۔ ”سورانی“ (ناول) طبع اول: ۱۹۶۳ء
- ۲۳۔ ”پنگلی کیڑہ“ (ناول) طبع اول: نیا اور دوسرے گروہوں کا دور
- ۲۴۔ ”انسان اور فرشتے“ (ناول)
- ۲۵۔ ”دل کی دنیا“ (ناول) طبع دوم: اردو پاکٹ بکس (پاکستان) کراچی نمبر ۱۸
- ۲۶۔ ”غیب آدمی“ (ناول)
- ۲۷۔ ”پہلی“ (ناول)
- ۲۸۔ ”ایک قطرہ غمی“ (واقعہ گردانہ ناول) طبع اول: ۱۹۷۵ء

- ۳۰۔ "کافری ہے مومن" (آپ جنت)
- ۳۱۔ "تمیں اٹری" (ناول۔ بچوں کے لیے)
- ۳۲۔ "مقلی را بھکار" (ناول۔ بچوں کے لیے)
- ۳۳۔ "دورخ" (مضامین۔ ڈراما۔ افسانے)
- ۳۴۔ اس مجموعے میں دو مضامین ایک ڈرامہ اور پانچ افسانے شامل ہیں
- ۳۵۔ "آدھی عورت، آدھا خواب" (چھ افسانے)
- ۳۶۔ "صحت کے شاہکار افسانے" (گیارہ افسانے)
- ۳۷۔ "پڑنی گز" (نوا افسانے)
- ۳۸۔ "سہر تل" (نوا افسانے)
- ۳۹۔ "یہاں سے وہاں تک" (تمیں افسانے)
- ۴۰۔ "سوت کا ریشم" (بچوں کے لیے)
- ۴۱۔ "بچوں میں سے تو کیا ہوتا" (بچوں کے لیے)
- ۴۲۔ "کچھ شعراء و ادیب، لاہور"
- ۴۳۔ "بیک کا رز، جہلم"
- ۴۴۔ "بیک کا رز، جہلم"
- ۴۵۔ "سوانحی پیکٹر ڈراما لاہور"
- ۴۶۔ "شیخ کلام علی ایچ سنز، لاہور"
- ۴۷۔ "شیخ علی ایچ سنز، لاہور"
- ۴۸۔ "طبع اول۔ مارچ ۱۹۷۹ء"
- ۴۹۔ "طبع دہلی۔ ۲۰۰۷ء"
- ۵۰۔ "طبع دہلی۔ ۲۰۰۷ء"

وفات سے پہلے مستقل پتا:

"اٹریس کورٹ فرسٹ فلور، چرچ گیٹ، بھکئی، ۳۰۰۰۰۰۔ بھارت

اعزاز:

- ۱۔ "اقبال سان" حکومت ویدھ پوریش، بھارت، ۱۹۸۹ء
- ۲۔ "تمہ دم ایوارڈ"
- ۳۔ "ساجیہ اکادمی ایوارڈ"
- ۴۔ "نور ایوارڈ"
- ۵۔ "پدم شری" (حکومت ہند کا سول ایوارڈ) ۱۹۹۰ء

نظریہ فن:

"مجھ کو یہ دہی ہے جو انسانی سے کھرا ہوا ہے۔ دہی کھے جو اس کے دل کی گہرائی سے اُبھرتا ہے، جو دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے، جو اس پر ہنست ہے۔" صحت چھائی

(مضمون: "کھے کہتا ہے کچھ" "مطبوعہ" الفاظ" علی گڑھ مارچ ۱۹۸۰ء سے اکتوبر ۱۹۸۰ء)

منزل بچہ

عصمت چغتائی

راج پور دیکری کے سنبھال کھنڈروں میں گوری وادی کا مکان پرانے سوکھے زخم کی طرح ٹھٹھکتا تھا۔ گلیا اینٹ کا دو منزل گنا گنا سا مکان ایک بار کھائے دوٹھے ہوئے بچے کی طرح لگتا تھا۔ دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا وقت کا بھرپور حال اس کی ڈھنکی سے عاجز آ کر آگے بڑھ گیا اور شاہی شان و شوکت پر ٹوٹ چلا۔

گوری وادی سفید جھک چاندنی بچے تخت پر سفید دارغ کپڑوں میں ایک تنگ سرمر کا مقبرہ معلوم ہوتی تھیں۔ سفید ڈھیروں ہال بے خون کی سفید مٹی ہوئی غل جیسی جلد بکلی کر چکی آٹھویں جن پر سفیدی رنگ آتی تھی پہلی نظر میں سفید لگی تھیں۔ انھیں دیکھ کر آنکھیں چکا چوند ہو جاتی تھیں۔ پیسے بھی ہوئی چاندنی کا شمار ان کے گرد و سلی ہو۔

نہ جانے کب سے بنے جا رہی تھیں۔ لوگ ان کی عمر سوے اوپر بتاتے تھے۔ کھلی کھلی کہہ رہے تھے فوراً انھوں سے دو اگلے سال کیا دیکھتی رہی تھیں۔ کیا سوچتی رہی تھیں کیسے بنتی رہی تھیں۔ داد و تحریروں کی عمر میں وہ بھری اماں کے بچاؤ سے بچتی ہوئی تھیں۔ مگر انہوں نے دامن کا کھوکھٹ بھی نہ اٹھایا۔ کنوار پن کی ایک صدی انہوں نے انھیں کھنڈروں میں جلائی تھی۔ چٹنی گوری بی سفید تھیں اسے ہی ان کے دولہا سیاہ بھٹ تھے۔ اسنے کالے کان کے آگے چار داغ لگھے گوری بی بچہ کر بھی دھو دیتی رہیں۔

سرشام کھانا کھا کر بھولیوں میں سوکھا سمیرا ہر کے ہم بچے لافوں میں دھب کر دینا چاہتے اور پرانی زندگی کی دھڑکی گرجانی شروع ہو جاتی بار بار سن کر بھی مٹی نہ بھرنا۔ ادا ہلا کر گوری بی اور کالے مپاں کی کہانی دہرائی جاتی۔ چارے کی گھل پر ہجر چمکے تھے کہ اتنی گوری گوری دیکھیں کا کھوکھٹ بھی نہ اٹھایا۔

ایس سال کے سال پر وہ ڈھنگ سے کر سیکے پر حصار اولہ بنیں۔ بچوں کی مہر ہو جاتی راج پور دیکری کے ہر سار شاہی کھنڈروں میں آنکھ بکھڑکی کھینچے جب شام چ ہوتی تو کھولی کھولی سرخی غصا سے ار گئے لگتے۔ ہر کوئے سے سانسے لپکتے دل دھب دھب کرنے لگتے۔

"کالے میاں آگئے۔" ہم ایک دوسرے کو ڈراتے۔ مگر جتے پڑتے بھاگتے اور نگلیاں بٹھ کے دو حوڑہ مکان کی آغوش میں دوپک جاتے۔ کالے میاں ہر اندھیرے کونے میں بصوت کی طرح چھپے محسوس ہوتے بہت سے بچے مرنے کے بعد حضرت سلیم چٹکی کی درگاہ پر ہاتھ رگڑا۔ جب گوری بی کی مانند پکنا نصیب ہوا۔ ماں باپ کی آنکھوں کی خشک گوری بی بڑی ضدی تھیں۔ ہات بات پر انہی کھنکھاتی لے کر چڑھتیں۔ بھوک چڑجال کرہ ہتھیں گھر میں کھانا پکنا کوئی منہ نہ تھا۔ ان جوں کا توں اٹھو اسبجہ میں بھجوا یا پاتا گوری بی نہ کھائیں تو ماں برا کیسے نالودہ کرتے۔ بات اتنی ہی تھی کہ وہب سختی ہوئی تو کوکوں نے مذاق میں چیمپے کیسے۔

"گھری دلہن کاٹا دلہا۔"

مگر مثل بچے مذاق کے عادی نہیں ہوتے۔ سولہ سو برس کے کالے میاں اندر ہی اندر رکھتے رہے۔ عمل کر مرزا ہوتے رہے۔

"دلہن ملتی ہو جائے گی خیر وہاں کالے کالے ہاتھ نہ لگنا۔"

"نہ سے ہاروں کی پالی ہے تمہاری تو پر چھائی چڑی تو کالی ہو جائے گی۔"

"نہ اچھا ہے ساری عمر جو چاہا اٹھوائے گی۔"

انگریزوں نے وہب مثل شاہی کا اہم مسلک رکھا تو سب سے بری مثل بچوں پر ہتھی کہ وہ زیادہ عہد سے سنبھالے بیٹھے تھے۔ چاہا گھر جانچ جانے کے بعد لاکھ کے کھرو پھتے دیکھتے دیکھتے خاک ہو گئے۔ بڑی بڑی دھندار حویلیوں میں مثل بچے بھی پرانے سامان کی طرح جاہرے ہو چکے تھے۔ وہ بچے جسے کسی نے جوں سے تے سے لٹکے بچھا لیا۔

جب ہی مثل بچے اپنے غرور اور خودداری کی تار پھاڑا اور میں صحت کا پنے اندر ہی اندر گھستے چلے گئے۔ مثل بچے اپنے غرور سے بکو کھٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ گھر سے مثل کی بچی بچیاں ہے کہ اس کے دماغ کے دو چار پچھلے یا ضرورت سے نہ پاؤنگ ہوتے ہیں۔ عرش سے فرش کی طرف لڑکھٹے تو پتلی تو ان کا گنا گئے۔ زندگی کی قدر میں غلامی ہو گئیں۔ دماغ سے زیادہ چنہ بات سے کام لینے لگے۔

انگریز کی چاکری لعنت اور محنت مزدوری سرشاران جو کچھ اٹاؤ بچا اسے بچ بچ کر کھاتے رہے۔ ہمارے بابا کے بچا روپیہ بوسہ کی جگہ بچلی کے جہیز کے چنگ کے پاؤں سے چاندی کا جہیز اکھیر لے جاتے تھے۔ زوجہ اور برحق کے بعد گئے جوڑے فوج فوج کر کھاتے۔ چنانہ دان کی کھسپاں مل بے سے بکھل کر کھڑا کھڑا چھین اور کھین۔ گھر کے مردوں پر چنگ کی اور انہیں توڑتے۔ شام کو پرانی کھسی ابھین اور شطرنج بھجی بھینے لگتے گئے۔ گھر کی دیوایاں چھپ چھپ کر کھسی کی کھنکھیں۔ چار بیویوں سے چار بچا مل جاتا یا محل کے بچوں کو قرآن چنہ عادتیں تو کچھ غرار داخل جاتا۔

کالے میاں نے دوستوں کی بھول خانگی کوئی کا کھانا کھانا جیسے صحت کی گمزی نہیں ملتی دینے والی باپ ماں کی لئے کی ہوئی شادی نہ لی۔

کالے میاں سر جھکا کے دلہا بن گئے۔ کسی سر بھری نے میں آری مصحف کے وقت اور جھجڑا۔

"خیر وہ دلہن کو ہاتھ لگا کالی ہو جائے گی۔"

مثل بچے جوت کھائے ناگ کی طرح چٹا سر سے بہن کا آئینہ لٹا اور باہر چلا گیا۔

ملی میں کھسی ہو گئی۔ ایک ماتم برپا ہو گیا۔ مردان خانہ میں اس لڑبھڑ کی خبر ملی میں ملاز می۔ پھر آری مصحف کے رخصت ایک قیامت تھی۔

”بھڑا میں اس کا فرور پکنا چھڑ کر دوں گا۔ کسی ایسے ایسے شخص مسئلہ بچے سے واسطہ پڑا ہے۔“ کالے لمبیاں چٹکارے۔

کالے لمبیاں قہقہے کی طرح ہنسی مسہری پر دروازہ کھولیں ایک کونے میں گھڑی بنی کپ۔ دبی جھکی۔ بارہ برس کی بچی کی بڑا طبع کیا؟
”گھر گھٹ اٹھاؤ۔“ کالے لمبیاں ڈکرائے۔

لہجہ اور گڑی مڑی ہو گئی۔

”ہم کہتے ہیں گھر گھٹ اٹھاؤ۔“ کھنکی کے بل اٹھ کر بولے۔ سلیٹوں نے تو کہا تھا۔ دو لہجہ ہاتھ جوڑے گا۔ جیہ پڑے گا پھر فرور جو
گھر گھٹ کا ہاتھ لگائے دیا۔ لہجہ جتنی زیادہ عافیت کرنے لگی ہی زیادہ پاکارت۔

”دیکھو جی تم کو اب زادی ہو گی اپنے گھر کی داری تو کھری ہو جاتی ہو۔ گھر گھٹ اٹھاؤ ہم تمہارے باپ کے کو کر نہیں۔“
لہجہ پر جیسے داغ گر گیا۔

کالے لمبیاں چپتے چپتے کی طرح ٹپک کر اٹھے جو چس اٹھا کر بل میں داہیں اور کھڑکی سے پائیں داہیں میں کود گئے۔ صبح کی گاڑی سے وہ
جود چور روکتا گئے۔

گھر میں سوتا پڑا تھا۔ ایک اکاپلی جود لہجہ کے ساتھ آتی تھیں جاگ۔ دبی تھیں۔ کان لہجہ کی جھلن کی طرف گئے ہوئے تھے جب لہجہ
کے کمرے سے ہاں بھی نہ آتی تو ان کے تو بچوں کا دم لگنے کا ہے کہ کسی بے حیا لڑکی ہے۔ لڑکی جتنی مسوم اور کنواری ہوگی اتنا ہی زیادہ وہ
جانے گی۔ کیا کہہ کالے لمبیاں میں کھوت ہے۔ جی چاہا کوئیاں میں کوہ کے تھر۔ پاک کر میں۔

پچکے سے کمرے میں جھانکا تو قی من سے ہو گیا۔ لہجہ بھی کی بھی دھری جھکی اور لہجہ غائب
بنے فیروز لپس قسم کے بنکے ہوئے کنواری کی کھنکیں بڑی مشکل سے لہجہ نے جو جتنی جھکی کہہ نہائی۔ اس پر طرح طرح کی چہ
نیکوئیاں ہوتی رہیں۔ خانہ دان میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک کالے لمبیاں کی دوسری گودی بی کی طرح لٹا۔
”وہ آخر خدا نے جہاز دی ہے۔ اس کا ٹھم تھکا کھانا ہے۔“

ایک پارٹی بھی ہوئی تھی۔

”کھنکی کسی لہجہ نے خود گھر گھٹ اٹھا لیا ہے؟“ دوسری پارٹی کی دلیل تھی۔

کالے لمبیاں کو جود چور سے بلو کر لہجہ کا گھر گھٹ اٹھوانے کی ساری کوششیں کام ہو گئیں۔ وہ وہاں گھوڑ سواروں میں بھرتی ہو گئے
اور جی کو ان غلط بیچے رہے جو گودی بی کی اماں جود کے منہ پر مارا تیں۔

گودی بی نگلی سے ہاتھ بن گئیں۔ ہر اٹھواڑے ہاتھ جھکی میں مہندی رہ جاتی رہیں اور بندھے کتے ڈو پٹے اوڑھتی رہیں اور بھتی رہیں۔
بھڑا نہ کرنا ایسا ہمارا کہہ ادا کی صرں کھڑی آجپنی۔ کالے لمبیاں کو بھر گئی تو نہ جانے کس سوا میں گئے کہ بھاگے آئے۔ پورا سوت کا ہاتھ
جھک کر اٹھ بیٹھے۔ کالے لمبیاں کو طلب کیا لہجہ کا گھر گھٹ اٹھانے کی ادائیگیوں پر سکوت ہوئی۔

کالے لمبیاں نے سر جھکا دیا۔ کٹر شرماء ہی دبی کہ حشر ہو جائے گھر گھر گھٹ تو لہجہ کو اپنے ہاتھوں اٹھا نہ پڑے گا۔ ”قبلہ کہہ میں قسم کھا چکا
ہوں ہر اس قسم کہہ چپے۔“ کٹر قسم نہیں تو نہ سکنا۔“

مصلح بچوں کی کنواں میں بدھکھا ہو چکی تھیں۔ آپس کی حدود باڑیوں نے سارا کھل نکال دیا تھا۔ بس اس وقت خود میں رہ گئی تھیں ایک انجمن کو یکے سے لگائے بیٹھے تھے کسی نے کالے سماں سے چمچا تم نے انکی اس وقت قسم کھائی ہی کیوں کہ اب بھی پہلی زندگی عذاب ہو گی۔

خیر صاحب گوری بی بی پھر تے لیکن نہ جانی گئیں۔ گلیا اپنے والا مکان پھر پھولوں اور شہت اطعمہ کی خوشبو سے تھک گیا تھا۔ ماں نے سمجھایا۔
 ”تم اس کی شکوہ نہ ہو جینی جان۔ گوگھٹ اٹھانے میں کوئی عیب نہیں اس کی خند پوری کر دو مصلح بچہ کی آن روہ جانے کی۔ تمہاری دینا منور جانے کی گوری میں پھول برسے گئے۔ اللہ رسول کا حکم پورا ہو گا۔“

گوری بی بی سر جھکانے لگی رہیں۔ کئی کئی سات سال میں نو خیز قیامت میں بچکی تھیں۔ حسن اور جوانی کا ایک طوفان تھا جو ان کے جسم سے بھرت نکلتا تھا۔

حور سے کالے سماں کی سب سے بڑی کنواری تھی۔ سارے حواس اسی ایک تختہ پر مرکوز تھے مگر ان کی قسم ایک بچہ دار بانی کو لے کی طرح ان کے مصلح میں پھنسی ہوئی تھی ان کے تخیل نے سات سال آنکھ بکھڑی کھلی تھی انہوں نے تیسویں گوگھٹ کوچ ڈالے دھڑی ہاڑی، لوڑے ہاڑی، بیڑ ہاڑی کنواری فرض کوئی ہاڑی نہ چھوڑی مگر گوری بی بی کے گوگھٹ کی چوٹ دل میں پٹنے کا زہر رہی۔ جو سات سال پہلانے کے بعد دھرم میں بچکی تھی۔ اس بار انہیں یقین تھا ان کی قسم پوری ہو گی۔ گوری بی بی انکی مصلح کی گوری نہیں کہ جیسے کا یا آخری موقع بھی کنواں میں وہ انگلیوں سے پٹکا پھٹکا آٹھل لی تو سر کاٹا ہے کوئی پھاڑ تو نہیں ڈھوے۔

”گوگھٹ اٹھاؤ“ کالے سماں نے ڈی لاپت سے کہنا تھا مگر مظلومی رو بہ غالب آ گیا؟

گوری بی بی غم خور سے تھمتائی نہانے میں بیٹھی رہی۔

”آٹھری مار دو پتھر پتا ہوں۔ گوگھٹ اٹھاؤ ورنہ اسی طرح چڑی مڑا جاؤ گی اب جو گیا پھر نہ آؤں گا۔“

مار سے غصہ کے گوری بی بی لال بھوکا ہو گئیں۔ کال ان کے سکتے دشمن سے ایک شعلہ نکلتا اور وہ انہیں گوگھٹ غاصتور ہو جاتا۔

چل کر سے میں کڑے کالے سماں کو ڈھالے سانپ کی طرح بھوتے رہے۔ پھر جوتے مصلح میں ڈالے اور پائیں بار بار اتر گئے۔

اب وہ پائیں بار بار کہاں؟ اور پھر کھواڑے کے کڑیوں کی تال لگ گئی۔ جس روہا میں ان کے چہرہ گئے تھے اور ایک جھارسی بدگو بیٹے مصلح کی روڈنی کھڑیوں کے جھنڈ شہوت اور انار کے درخت کپ کے لٹ پٹ گئے۔

جب تک ماں زندہ رہیں گوری بی بی کو سنبھالے رہیں ان کے بعد بی بی نو گوری بی بی نے سنبھال لی۔ ہر جمعرات کو مہندی پھین کر پابندی سے لگاتیں وہ چند گنگ جن کر گتھیں اور جب تک سسرال زندہ رہی جو ہر پر سلام کرنے جاتی رہیں۔

اب کے جو کالے سماں تھے تو غالب ہو گئے۔ برسوں ان کا سسرال نہلا۔ اس باپ روہ کو کراہے ہو گئے وہ نہ جانے کن جگہوں میں خاک چھانٹے پھرے۔ کبھی خانقاہوں میں ان کا سسرال نہلا۔ کبھی کسی صوفی کی میز صوفیوں پر چڑے ملتے۔

گوری بی بی کے سہری ہاتھوں میں چاندی گھل گئی۔ موت کی ہمارا دکام کرتی رہی۔ آس پاس کی زمینیں مکان کوڑیوں کے سول بچتے گئے کہہ برائے لوگ زبردستی ڈالت گئے۔ کھڑے قہائی آن پئے ہاتھ لگے وہ کبھی دنیا کی بنیاد پرانے گئے۔ ہر چوں کی مکان کو سہری ایک سرگلا سا بزل شور بھی آگ آیا انہیں المو غم کی چٹکیاں اور پٹھن جانے کی چڑیوں کے ہار لگتے گئے۔

ایک مظلوم مصلح کی دولت دس کی کھری رہی تھی۔ چھوٹا لال گلیاں سمیٹنے میں لگی تھیں۔ جو کل تک اور انہیں ہر پٹھنے تھے جبکہ کہ سلام

کرتے تھے آج ساتھ اٹھنا بیٹھا کمرشان کھٹے تھے۔

گوری بی کا روبرو آتے اور بی کی تجویز میں اپنی کیا۔ دیوار میں ڈھیر سی قمیصیں لٹکی ہوئی تھیں۔ بچے بچے مٹھلے بچے اٹھوں کا انا نکل کر بنگلوں کے چچ لڑ رہے تھے۔ ٹکڑ ٹکڑ سدا رہے تھے اور کھڑکیوں کی دھواں کے کپڑے گن کر بنگلوں میں بھرتے تھے۔ لٹکے مرزا جو کبھی شان اور وہ بچے کی علامت سمجھا جاتا تھا، اتفاقاً بن رہا تھا۔ گوری بی کی کلبہ کے اندر سے نکل کر طرح زندگی کے چنگڑے سے مٹی اپنی چنگڑے پر گھسے چار دی قہیں۔ ان کی کرفٹی آنکھوں میں تیریاں تھیں نے ذریعہ داخل دیا تھا۔

ان کے لیے طرح طرح کے افسانے مشہور تھے کہ ان پر جنوں کا بادشاہ عاشق تھا۔ جو نبی کا لے میاں ان کے گھونٹ کو ہاتھ لگاتے چپت نکو رسولت کر کھڑا ہو جاتا۔ ہر جمعرات کو عشا کی نماز کے بعد عقیدہ پرستی میں حب سارا آگن کو ذیالے سا بیوں سے بھر جاتا ہے۔ ہر سہری کھلی دلا سا بیوں کا بادشاہ ابگر ہر سدا ہو کر آتا ہے۔ گوری بی کی قرأت پر سر دھتا ہے پو پختے ہی سب ہنگ دھست ہو جاتے ہیں۔

جب یہ قہے سننے تو کچھ ناچل کر مٹھل میں پھنس جاتے اور رات کو سا بیوں کی چنگڑی میں کر سوتے میں چوک کر بچھیں مار تے۔ گوری بی نے ساری عمر کیسے کیسے ناگ کھلانے ہوں گے۔ کیسے اکیلی نامراد زندگی کا بیوہ ڈھویا ہو گا۔ ان کے بچے ہو انوں کو کبھی کسی نے نہیں چھو مارا۔ انہوں نے جسم کی نگاہ کو کیا جواب دیا ہو گا؟

کاش یہ کھلی نہیں ختم ہو جاتی۔ مگر قسمت مسکرا رہی تھی۔

پورے پانچ برس بعد کالے میاں اجاگ آپ ہی آن دھکے۔ انہیں ختم قسم کے لا علاج امراض لاحق تھے۔ پور پور مٹھل تھی روم روم کر رہا تھا۔ پورے مارے ہاک مڑی جاتی تھی۔ بس آنکھوں میں حسرتیں جاگ رہی تھیں۔ جن کے سہارے جان چھنے میں لگی ہوئی تھی۔

”گوری بی سے کوئی مشکل آسان کر جائیں۔“

ایک کم سا بھ کی دھن نے مدد ملے ہوئے دو لہا میاں کو مٹانے کی تیار ہی شروع کر دی۔ مہندی گھول کر ہاتھ بیوں میں دھپائی۔ پانی سو کر چڑا پاک کیا۔ سہاگ کا پچھا ہوا قیل ملیہ لوں میں بیدیا۔ صندوق گھول کر پور پور چھتا جھڑ پوری کا بوڑا لال کر پتلا دھو کر کالے میاں دھڑوڑتے رہے۔

جب گوری بی فرماتی لپٹی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے سر ہاتے پہنچیں تو تھکے پر پینکٹ بچھے اور گوارا ستر پر پڑے ہوئے کالے میاں کی مٹھی بھر بیوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ موت کے فرشتے سے اٹھتے ہوئے کالے میاں نے غم دیا:

”گوری بی گھونٹ اٹھاؤ۔“

گوری بی کے ہاتھ اٹھے مگر گھونٹ تک نہ کھینچنے سے پہلے کر گئے۔

کالے میاں دھڑوڑ پکے تھے۔

وہ بڑے سکون سے اکڑوں بند گئیں سہاگ کی چوڑیاں غلطی نہیں اور دھپا پ کا سلیڈ آئیل اٹھے پر کھینچ گیا۔

قدرت اللہ شہاب

نام	قدرت اللہ
قلمی نام	قدرت اللہ روائی / قدرت اللہ جعفر / قدرت اللہ شہاب۔
پیدائش	28 فروری 1917ء بمقام گلگت۔
وفات	24 جولائی 1988ء بمقام اسلام آباد۔ پاکستان
تعلیم	ایم۔ اے۔ (انگریزی)
	ابتدائی تعلیم چترال اور گلگت کے اسکولوں میں پائی۔ بابا اجیت سنگھ ہری خاصہ ہائی اسکول "چکورے" ملوک کیا۔ ایف۔ ایس سی اور بی۔ ایس سی کے امتحانات "پنس آف د پلنگ کالج" جموں سے پاس کیے۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے ان کی تعلیم کے لیے وظیفہ مقرر کر رکھا تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم اے کیا۔

مختصر حالات زندگی:

قدرت اللہ شہاب کے والد محمد عبداللہ لوہیوں جنگ کر بھڑیلہ تھے۔ ریاست جموں و کشمیر میں ملازمت کے دوران اہل ہمدوں پر قابو رہے۔ مہر چترال کے سردار میں ملاپاں ہمدو علاقے کے گورنر رہے۔ قدرت اللہ شہاب کی والدہ کا نام کریمائی بی بی تھا۔ شہاب کا بچپن گلگت اور چترال میں گزارا۔ ان کے لڑکپن میں وہاں طاعون کی وبا پھوٹی تو شہاب کو چکورہ ضلع اقبال پھوادیہ گیا جہاں سے ملوک کیا۔ ایف۔ ایس سی لاہور لی۔ ایس سی کرنے کے زمانے میں جموں میں قیام تھا۔ ایم۔ اے (انگریزی) کرنے کے دوران لاہور میں رہے۔ 1941ء میں انھیں سول سروس کا امتحان امتیازی فہر میں سے پاس کرنے کے بعد جب تربیت حاصل کرنے سول سروس اکیڈمی ڈیرہ دون گئے تو خود کو اس ماحول میں بکھراؤ محسوس پایا۔ تربیت سے متعلق ان کی ابتدائی عقیدہ پورے میں لکھا گیا تھا کہ "یہ شخص اس سروس کے لیے مکمل طور پر مس لٹ ہے۔"¹

قیام پاکستان سے قبل بلوچ آئی سی ایس افسر ازیہ سمری پنگال اور بہار کے مختلف اضلاع میں راجی کھنجر کے عہدے پر فائز رہے۔ اوچی زندگی کا آغاز شہر گونی سے ہوا۔ سب سے پہلے راجی اور بعد ازاں کھنجر چھوٹا اختیار کیا۔ شباب کی خواہش کے مطابق آزاد گونی کے بعد ان کی خدمات حکومت پاکستان کو تنویض کر دی گئیں۔ قلام محمد کھنجر جرنل سکور مرزا اور جرنل محمد ایوب خان کے کیکر جرنی "وفاقی کیکر جرنی برائے اطلاعات و نشریات اور وفاقی کیکر جرنی تعلیم" رہے۔ ایوب خان کے پر عمل کیکر جرنی کے طور پر کام کرتے ہوئے پاکستان رائلز گنڈ کی قیادت کی اور کاپی رائٹ ایکٹ منظور کروایا۔

تین برس پالیٹکس میں پاکستان کے سفیر رہے 1969 میں جرنل یحییٰ خان کے مارشل لاء کے فوراً بعد سرکٹ ہاؤس میں وفاقی کیکر جرنل کے اہلاس میں بلوچ وفاقی کیکر جرنی اطلاعات و نشریات شرکت کرنے کے بعد مستعفی ہو گئے۔ (وفاقی راجی بھٹو کے دور میں دوبارہ وفاقی کیکر جرنی تعلیم ہوئے۔ جون 1974 میں جب انکی حکمران حکومت نے وفات پائی تو انھیں راجی چپ سی لگ گئی اور محض دو برس بعد ریٹائرمنٹ لے لی۔

انجانی کم گو مردم پیر اور اورا تھاروہ غیر متحرک شخصیت کے مالک قدرت اللہ شباب کو ایک دولت پہنچا ہوا ولی اللہ سی۔ آئی۔ اے کا ایجنٹ اور پانی پور مارکت سمجھا گیا۔ 24 جولائی 1986 تک کا زمانہ "شباب نامہ" کہتے میں صرف کیا۔

اولین مطبوعہ اشاعت:

"چند راجی" مطبوعہ "رومان" لاہور: 1938ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ "پادشاہ" (انارٹ) لاہور اکلیڈی لاہور طبع اول جون 1948ء

یہ کتاب لاہور شاہی کھنجر گراہی نے بھی شائع کی ہے۔

اس ناول کے کل تین ابواب ہیں "رب المشرقین" "رب المغربین" اور "رب العالمین" کل صفحات 112

۲۔ "قسانے" (سولہ فلسفے) کتبچہ جدید لاہور طبع اول 1950ء

(۱) غریب خانہ (۲) فلوار (۳) بچک (۴) گنی ہے رات تو (۵) سب کا مالک (۶) لالہ (۷) بھال (۸) آبا

(۹) جاش (۱۰) دورنگ (۱۱) جل ترک (۱۲) ڈاگی (۱۳) تین چارے (۱۴) کبلی کھڑا (۱۵) منہ بلیک (۱۶) سنجو گراہ

۳۔ "میں گئی" (سولہ فلسفے) لاہور اکلیڈی لاہور طبع اول ۱۹۶۸ء

(۱) فلوار (۲) بچک (۳) آبا (۴) جاش (۵) دورنگ (۶) جل ترک (۷) کبلی کھڑا (۸) پھوڑے والی ناک (۹) بچک

بچک آرم (۱۰) ریلوے جنکشن (۱۱) سردار جسونت سنگھ (۱۲) ماس جی (۱۳) ایک کھنجر (۱۴) نمبر پلیز (۱۵) اور جاکو آگنی (۱۶)

سولہ فلسفے۔

(اس کے علاوہ ایک درہم "اسے جی اسرا نکل"۔ چار طرہ پہ مضامین اور دو سفر نامے بھی اسی مجموعے میں شامل ہیں۔

نمبر ۱۰ ایتام کے افسانے ”نفسانے“ میں شامل ہیں۔

۳۔ ”سرخ زینہ“

۵۔ ”شہاب نامہ“ (خودنوشت/آپ بیتی) سبب میل جلی کیشنر، لاہور

زندگی میں مستقل چا:

مکان نمبر ۱۲ اگلی نمبر ۱۰ ایف ۱۶/۳ اسلام آباد۔ پاکستان۔

نظریے فن:

”افسانے کے حلقہ میرا کوئی خاص نظریہ فن نہیں ہے۔ بس اتنا چاہتا ہوں کہ لکھنا اور پڑھنے والے دونوں کا دل خوش ہو۔“

(پہ حوالہ: مکتوب نامہ سرگز احاطہ جنگ محرم ۱۳۲۰ھ جنوری ۱۹۸۳ء)



حوالہ جات:

۱۔ انکو حوالہ دینی سبب میں ۱۹۹۹ء، ۲۰۰۰ء کی تاریخ سے خودنوشت، شہاب نے لکھے خاک کا کرشمہ کیا تھا۔ محرم کی تاریخ بھی ۱۹۹۷ء اور ۱۹۹۸ء ہے۔

۲۔ ۱۹۹۸ء سے ۱۹۹۹ء کے مکتوبات میں ”سرخ زینہ“ کا ذکر ہے۔

ماں جی

قدرت اللہ شہاب

ماں جی کی بیاہٹ اٹلی کا صحیح سال معلوم نہیں ہو سکا۔

جس زمانے میں لاکھ پور کا ضلع بنایا گیا اور ہاتھا۔ باباب کے ہر قصبے سے غریب الحال لوگ زمین حاصل کرنے کے لیے اس نئی کالونی میں جوق در جوق کھینچے چلے آ رہے تھے۔ عرف عام میں لاکھ پور ڈھنگ 'سرگودھا وغیرہ کو "ہار" کا علاقہ کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ماں جی کی عمر دس بارہ سال تھی۔ اس حساب سے ان کی بیاہٹ اٹلی پہلی صدی کے آخری دس چودہ سالوں میں کسی وقت ہوئی ہوگی۔

ماں جی کا آبائی وطن تحصیل روہتلی ضلع بہاول میں ایک گاؤں منڈلہ نامی تھا۔ والدین کے پاس چند ایکڑ اراضی تھی۔ ان دنوں روہتلی میں روہتلی کے تعلق سے صوبہ سرحد کی کھدائی ہو رہی تھی۔ نانائی کی اراضی سہری کھدائی میں ختم ہو گئی۔ روہتلی میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معاوضے دیے جاتے تھے۔ نانائی دو تین بار معاوضے کی تلاش میں شہر گئے۔ لیکن سہرے آدمی تھے۔ کبھی انکا بھی مظلوم نہ کر سکے کہ انگریز کا دفتر کہاں ہے اور معاوضہ وصول کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ اہم کام کاربھر دھڑ کر کے بیٹھ گئے اور سہری کھدائی میں مزدوری کرنے لگے۔

انہی دنوں پوچھ لگا کہ ہار میں کالونی کھلی گئی ہے اور نئے آبادکاروں کو مفت زمین مل رہی ہے۔ نانائی اپنی بیوی کو نئے جٹوں اور ایک نئی کاکہہ ساتھ لے کر لاکھ پور روانہ ہو گئے۔ سواری کی توفیق نہ تھی۔ اس لئے پایادہ چل کر سفر کرتے ہوئے۔

راستے میں صحت مزوروری کر کے بیٹھ پڑے۔ نانائی جگہ چمک لگی کا کام کر لیتے یا کسی نال پر ٹکڑیاں چروہیت۔ نانائی اور ماں جی کی کاسوت کات دھتیر یا مٹاٹوں کے فرش اور پیر میں لیپ دیتیں۔ لاکھ پور کا صحیح راستہ کسی کو نہ آتا تھا۔ جگہ جگہ بھٹکتے تھے۔ اور پوچھ پچا کر ٹڈوں کی منزل مقصود میں پہنچتے تھے۔

نوجوان عورت کی مسافت کے بعد بڑا اٹالہ پہلے۔ پایادہ چلنے اور صحت مزوروری کی مشقت سے سب کے جسم بڑا حال اور پاؤں سوجے

ہوئے تھے۔ یہاں پر چند ماہ قیام کیا۔ نانہتی دن مقرر نظر مندی میں بوریاں اٹھانے کا کام کرتے۔ نانہتی چند کات کرسٹ تھیں اور ماں کی مگر سنبھالتیں جو ایک چھوٹے سے بھونڈے پر مشتمل تھا۔

انہی دنوں بقرہ کا تہوار آیا۔ نانہتی کے پاس چند روپے جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے ماں کی کوئین آنے اور عہدی دیے۔ زندگی میں پہلی بار ماں کی کے ہاتھ اسے پیسے آئے تھے۔ انہوں نے بہت سوچا لیکن اس رقم کا کوئی مصرف ان کی نگاہ میں نہ آ سکا۔ وفات کے وقت ماں کی کے ہر کوئی اسی برس کے لگ بھگ تھی۔ لیکن ان کے نزدیک سو روپے ان کے پانچ روپے کے نوٹوں میں اٹھا کر آسان کام نہ تھا۔ عہدی کے تین آنے لگی روز ماں کی کے روپے کے ایک کوٹے میں بند سے رہے۔ جس روز وہ جڑاٹو لے کر رخصت ہوئی جس میں ماں کی نے گیارہ روپے کا تیل خرید کر سب کے چراغ میں ڈال دیا۔ باقی ایک پیسے اپنے پاس رکھا۔ اس کے بعد جب کبھی گیارہ روپے ہوتے ہو جاتے وہ فوراً سبھ میں تقسیم بکھارتی۔

ساری عمر جمرات کی شام کو اس محل پر بڑی وضع واری سے پابند رہیں۔ دفعہ رفت بہت سی مسجدوں میں پہلی آنگی۔ لیکن وہ اور اور کراچی بھی شہر میں بھی انہیں ایسی مسجدوں کا طہر پتا تھا جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے تھے۔ وفات کی شب بھی ماں کی کے سر ہانے محل کے دروازے میں بند سے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لیے جمع کر گئے تھے چھ نکروہ جمرات کی شب تھی۔ ان چند آنوں کے علاوہ ماں کی کے پاس نہ کچھ اور رقم تھی اور نہ کوئی زیور۔ اسباب دنیا میں ان کے پاس کتنی کی چند چیزیں تھیں۔ تین جڑے سوتی کپڑوں کے ایک جڑاڑی جو ایک جڑاڑی کے پٹیل ایک چٹک ایک انگلی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جائے نماز ایک تسبیح اور باقی اضافہ۔

پہلے کے تین جڑوں کو وہ خاص اہتمام سے رکھتی تھیں۔ ایک روپ تھی اور اپنے ہاتھوں سے دھو کر تجھے کے پیچھے رکھا جتا تھا۔ تاکہ اس کی ہو جائے۔ خیر بوسنے کے لیے تیار۔ ان کے علاوہ اگرچہ تھا کپڑا ان کے پاس آتا تھا تو وہ پیچھے سے ایک جڑاڑی کو سے دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے ساری عمر انہیں موت کبیر کی شکل کی حاجت مسموں نہ ہوتی۔ لمبے سے لمبے سطر پر روا نہ ہونے کے لیے انہیں چاری میں چند منٹ سے زیادہ نہ گتے تھے۔ کپڑوں کی پرانی کی بکلی ماری اور جہاں کہے پہلے کو چار۔ سطر آخرت بھی انہوں نے اس سادگی سے اختیار کیا۔ پہلے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھو کر تجھے کے پیچھے رکھے۔ نہا دھو کر بال نکھائے اور چھوٹی سٹوں میں زندگی کے سب سے لمبے سطر پر روا نہ ہو گئیں۔ جس خاصوٹی سے عینی مددگار تھیں۔ غالباً اسی موقع کے لیے وہ اکڑیا دھاراجا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ ہاتھ پہنچے چلاتے اٹھالے۔ اللہ بھی کسی کا تیار نہ کرے۔

کھانے پہنچے ہیں وہ کپڑے لئے سے بھی زیادہ سادہ اور طرب چراغ تھیں۔ ان کی مغرب تین غذا کھانی کی روٹی زبیرے پونے کی چٹنی کے ساتھ تھی۔ باقی چیزیں خوشی سے تو کھا لیتی تھیں لیکن شوق سے نہیں۔ تکر پانچ روٹے یا اٹھ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ پہلوں میں کبھی بہت سی بھور کیا جاسے تو کبھی کھار کھلی کی فرمائش کرتی تھیں۔ البتہ ناشتہ میں چائے کے او پیالے اور تیسرے پیر سادہ چائے کا ایک پیالہ ضرور ملتی تھیں۔ کھانا صرف ایک وقت کھاتی تھیں اکثر دو چتر دو پیر کا۔ شاد و نادر رات کا۔ گرمیوں میں عموماً کھن ٹھالی ہوتی پتلی کھن ٹھالی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چٹائی ان کی محبوب خوراک تھی۔ دوسروں کو کوئی چیز دلچسپ سے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور ہمیشہ یہ دعا کرتی تھیں۔ سب کا بھلا خاص اپنے اپنے بچوں کے لیے انہوں نے روا راست بھی بکھودا پھل دوسروں کے لیے دعا مانگی تھیں اور اس کے بعد حقوق خدا کی حاجت

روائی کے تحلیل اپنے بچوں یا عزیزوں کا کھلا چاقو تھی۔ اپنے غناں یا خلیوں کو انہوں نے اپنی زبان سے بھی "بھرے" تھے۔ "یا" "بھری" تھی۔
 کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ یہی ان کا اندھا کمال کیا کرتی تھیں۔

کسی سے کوئی کام لینا ہی پر بہت گراں گزرتا تھا۔ اپنے سب کام وہ اپنے ہاتھوں خود انجام دیتی تھیں۔ اگر کوئی ملازم زبردستی
 ان کا کوئی کام کروتا تو انہیں ایک عجیب قسم کی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا اور وہ احسان مند ہی سے سارا دن اسے دما تھیں۔ دیتی رہتی
 تھیں۔

سادگی اور دودھنی کا یہ کد کد کا ڈھکھٹہ قد دست نے، ماں جی کی سرشت میں پیدا کیا تھا۔ کچھ بچے بزرگی کے زیر و بم نے سکھایا تھا۔
 جزا خواہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد جب وہ اپنے والدین اور خود سال بھائیوں کے ساتھ زمین کی تلاش میں لاٹس پر کی کالونی کی
 طرف روانہ ہوئیں تو انہیں معلوم نہ تھا کہ انہیں کس مقام پر جانا ہے اور زمین حاصل کرنے کے لیے کیا قدم اٹھانا ہے۔ ماں جی بتایا کرتی تھیں کہ
 اس زمانے میں اس کے لاٹس میں کالونی کا تصور ایک فریضہ صحت بزرگ کا تھا جو کہیں سرراہ پہنچا زمین کے پرانے تقسیم کردہ ہواگا۔ کئی بھتیجے یہ
 پہلو سنا تھا۔ لاٹس پر، کے علاقے میں پانچواں بھٹکا رہا۔ لیکن کسی راہ گزر پر انہیں کالونی کا عنصر صورت درخشاں مل سکا۔ آخر تک آ کر انہوں نے
 چک نمبر ۵۰۹ میں جو ان دنوں بنایا جا رہا تھا رہے۔ ڈال دیے۔ لوگ جیتی رو جیتی وہاں آ کر آباد ہو رہے تھے۔ نانانی نے اپنی سادگی
 میں یہ سمجھا کہ کالونی میں آباد ہونے کا شاید یہی ایک طریقہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے ایک چھوٹا سا مکان تعمیر کر گھاس پھوس کی چھوڑ دی۔ پتلی اور
 ٹھنڈا راضی کا ایک قلعہ حاش کر کے کاشت کی تیاری کرنے لگے۔ اپنی ماں جی کا ملازم چال کے لیے آیا۔ نانانی کے پاس الاٹ کے
 کاغذات نہ تھے۔ چنانچہ انہیں چک سے نکال دیا گیا۔ اور سرکاری زمین پر جا کر چھوڑ دینے کی پراش میں ان کے رجن اور ستر قرق کر لئے
 گئے۔ محلے کے ایک آدمی نے ہمارے ہی کو وہاں بھی ماں جی کے کانوں سے اتار دیں۔ ایک پانی اتارنے میں ڈاڑھ جوتی تو اس نے زور سے
 گنگائی۔ جس سے ماں جی کے کان کا زریں حصہ ہی طرف سے پھٹ گیا۔

چک نمبر ۳۲۷ سے اگل کر جو راستہ سامنے آیا اس پر پھل کھڑے ہوئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ دن بھر لو کھلی تھی۔ پانی رکھنے کے لیے
 مٹی کا یا لٹھی پاس رکھا۔ جہاں کہیں کوئی کنواں ٹھہرا یا اس کی پانچواں پتلی لٹھیں تاکہ جو اس گھنے سے اپنے پھولے بھائیوں کو چھاتی نہ تھیں۔
 اس طرف وہ پلے پلے چک نمبر ۵۰۹ میں پہنچے جہاں ایک ہاون بچان کے آواز مارنے نانانی کو اپنا حرا رہا رکھایا۔ نانانی مل جلاتے تھے۔ نانانی
 سوئی چا اٹنے لے جاتی تھیں۔ ماں جی کھیتوں سے گھاس اور چارہ کاٹ کر زمیندار کی بھینوں اور گاؤں کے لیے لایا کرتی تھیں۔ ان دنوں
 انہیں اچھا تصور ہی تھا کہ ایک وقت کی روٹی بھی پوری طرح کھا لیں۔ کسی وقت جنگی عرصہ پر گزرا، وہ تھا۔ کبھی خربوزے کے چھلکے ہال کر
 کھا لیتے تھے۔ کبھی کسی کھیت میں کبھی انہیں کھی ہوئی کی بھٹی چاہتے تھے۔ ایک روز کہیں سے تورا بے اور ٹھکے کا ملا جا ساگ
 اچھا آ گیا۔ پانی صحت ضروری میں مصروف تھیں۔ ماں جی نے ساگ جو سب پر چڑھایا۔ جب چک کر تیار ہو گیا اور ساگ کو ان کا کھونے کا
 وقت آیا تو ان کی نے ڈوٹی لپیے زور سے چلائی کہ بڑے کا پیٹا لٹوٹ گیا۔ اور سہا ساگ بہر کر چلے میں آچا۔ ماں جی کو نانانی سے اذیت
 چلی اور بارگھی۔ راست کو سارے غامضانے سے چھٹے کی لکڑیوں پر گر ہوا ساگ اٹھیں سے چاٹ چاٹ کر کھاتی تھیں۔

چک نمبر ۵۰۹ نانانی کو ٹوبہ اس آیا۔ چھوٹا سا کھیت ضروری کے بعد ہی آباد کاری کے حلقے میں آسان قسطوں پر ان کو ایک مربع
 زمین مل گئی۔ وقت و وقت ان بھرنے لگے اور تین سال میں ان کا شمار گھاس کے کھاتے چھٹے لوگوں میں ہونے لگا۔ جوں جوں قاروغ الہی بڑھتی گئی

تو قوس آبادی دھن کی یاد دلاتے تھی۔ چنانچہ خوشحالی کے چار پانچ سال گزرنے کے بعد سارا خاندان دہلی میں چلے کر سیلہ کی طرف روانہ ہوا۔ ریل کا سفر اسی کی کوہیت پسند آیا۔ وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر منظر کا دلکش منظر دیکھتی رہتی تھیں۔ اس عمل میں کوئلے کے بہت سے ذرے ان کی آنکھوں میں پڑ گئے۔ جس کی وجہ سے کئی روز تک وہ آشوب چشم میں مبتلا رہیں۔ اس تجربے کے بعد انہوں نے ساری عمر اپنے کچے کوریل کی کھڑکی سے باہر منظر کا دیکھنے کی اجازت نہ دی۔

ماں دہلی ریل کے قمرؤ کاش ٹاپے میں بہت خوش رہیں۔ ہم سفر عورتوں اور بچوں سے فوراً مکالمہ لیا کرتی تھیں۔ سفر کی اھٹکان اور راستے کے گرد و بار کا ان پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ اس کے برعکس وہ اپنے درجنوں میں بہت بڑا رہو جاتیں۔ ایک دوبار جب انہیں مجبوراً انڈیا ٹیلن ٹاپے میں سفر کرنا پڑا تو وہ تھک کر چور ہو گئیں اور سارا وقت قہ کی مصیبت کی طرح ان پر گرا کر گزارا۔

سیلہ پہنچ کر گانا دہلی نے اپنا آبائی مکان درست کیا۔ مزید آقا رب کو کچھ تکلیف دینے۔ دھوتیں ہو گئیں اور بھراں کی جی کے لیے برصغور نے کاسلسلہ شروع ہو گیا۔

اس زمانے میں انکے گھر کے سربراہوں کی بڑی دھوم تھی۔ اسی کا شمار خوش قسمت اور اعزت لوگوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ ہمارا طرف سے ماں جی کے لیے چند روپے پیسہ آنے لگے۔ یوں بھی ان دنوں ماں جی کے کھانا پکانا ہوتا تھا۔ برادری والوں پر دھبہ لگانے کے لیے تالیقی انہیں ہر وقت نئے کپڑے پہنائی تھیں اور ہر وقت دھنوں کی طرح سنا کر دیکھتی تھیں۔

کبھی کبھار پرانی یادوں کو نازہ کرنے کے لیے ماں جی بڑے مصروف سے کہا کرتی تھیں۔ ان دنوں میرا تو گاؤں میں ٹھکانا اور بھرہو گیا تھا۔ میں جس طرف سے گزرتا تھا تو گھر کے کمرے ہو جاتے اور کہا کرتے یہ بڑا دلکش سربراہ کی بیٹی جادو ہی ہے۔ دیکھئے کون سا خوش نصیب اسے چاہ کر لے جائے گا۔

”ماں جی! آپ کی اپنی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا؟“ ہم لوگ جلیز نے کی خاطر ان سے پوچھا کرتے۔

”تو یہ بہت!“ ماں جی کاٹوں پر ہاتھ لگا گئیں ”میری نظر میں میرا کوئی کیسے ہو سکتا تھا۔ پس میرے دل میں اتنی سی خواہش ضرور تھی کہ اگر مجھے ایسا آدمی ملے جو صرف بڑا مالک ہو تو خدا کی بڑی مریاں ہوگی۔“

ساری عمر میں ماں جی ایک خواہش تھی جو ماں جی کے دل میں خود اپنی ذات کے لیے پیدا ہوئی۔ اس کو خدا نے ہاں چاہ کر دیا اسی سال ماں جی کی شادی عبداللہ صاحب سے ہو گئی۔

ان دنوں سارے علاقے میں عبداللہ صاحب کا طویل بول رہا تھا۔ وہ ایک امیر کیر گھر کے چشم و چراغ تھے لیکن پانچ چھ برس کی عمر میں خیم بھی ہو گئے اور بے حد مفلوک اہل بھی۔ جب باپ کا سایہ پر سے اٹھا تو یہ کشمکش ہوا کہ ساری آبادی جانیہ اور دکن ہی ہے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب اپنی والدہ کے ساتھ ایک جھوٹے میں اٹھا آئے۔ زوارہ زمین کا یہ انجام دیکھ کر انہوں نے انکی جانید اور جانے کا لازم کر لیا جو مہا ہتوں کے ہاتھ گردی نہ رکھی جاسکے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں متہمک ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے حاصل کر کے اور دو سال کے امتحان ایک ایک سال میں پاس کر کے چھاپ بوندہ دلی کے میٹرک کالیشن میں داخل آئے۔ اس زمانے میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مسلمان عالم علم نے بوندہ دلی امتحان میں ریکارڈ کا تم کیا ہو۔

اڑتے اڑتے یہ خبر سرسید کے کانوں میں پڑ گئی جہاں اس وقت علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ انہوں نے اپنا خاص تعلق گاؤں میں

بھیجا اور عبداللہ صاحب کو غلطی سے کرلی گڑھ ملا لیا۔ یہاں پر عبداللہ صاحب نے خود بڑھ چڑھا کر اپنا رنگ نکالا اور بی اے کرنے کے بعد انھیں برس کی عمر میں واپس پراگر جی بی عربی الفسا اور حساب کے پیکچر ہو گئے۔

سر سید کو اس بات کی دشمنی تھی کہ مسلمان تو جو ان زیادہ سے زیادہ تعداد میں داخلے ملازمتوں پر جائیں۔ چنانچہ انھوں نے عبداللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلایا تاکہ وہ انگلستان میں جا کر آئی بی ای ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔

تجلی صدی کے بڑے بڑے مسلمانوں کے ساتھ پار کے سرکار کو بلائے ناگہانی کی گئیں تھے۔ عبداللہ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبداللہ صاحب کی سعادت صدی آئے آئی اور انہوں نے وظیفہ ایس کر دیا۔

اس حرکت پر سر سید کو بے حد غصہ بھی آیا اور وہ کہ بھی ہوا۔ انھوں نے لاکھ بھجوا دیجھا "اور لایا دھکا لائیں عبداللہ صاحب جس سے مس نہ ہوئے۔

"کیا تم اپنی بوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہو؟" سر سید نے کڑک کر پوچھا۔
 "جی ہاں" عبداللہ صاحب نے جواب دیا۔

یہ لکھا سا جواب کسی سر سید صاحب آپ سے باہر ہو گئے۔ سر سے کا دروازہ بند کر کے پہلے انھوں نے عبداللہ صاحب کو اتوں "کون" تھپڑوں اور جھوٹوں سے خوب بچا اور کافی کی نوکری سے درخواست کر کے یہ کہہ کر لی گڑھ سے نکال دیا۔ "اب تم ایسی جگہ جا کر مرو جہاں سے میں تمہارا نام بھی سن سکوں۔"

عبداللہ صاحب جتنے سعادت مند بنے تھے۔ اتنے ہی سعادت مند بننا شروع تھے۔ نقشے پر انھیں سب سے دور افتادہ اور دشوار گزار مقام گلگت نظر آیا۔ چنانچہ وہ ان کی سیدہ گلگت پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی آرزوی کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

جن دنوں ماں بی کی منتی کی فکر ہو رہی تھی۔ انہی دنوں عبداللہ صاحب بھی بھیجی پر گاؤں آئے ہوئے تھے۔ قسمت میں دونوں کا بھوک کھانا ہوا تھا۔ ان کی منتی ہو گئی اور ایک بار بعد ہوا تو بھی منتی ہو گئی تاکہ عبداللہ صاحب ان کو اپنے ساتھ گلگت لے جائیں۔

منتی کے بعد ایک روز ماں بی اپنی سسٹریوں کے ساتھ پاس والے گاؤں میں میلہ دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ اٹھاٹایا شہزادہ عبداللہ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔

ماں بی کی سسٹریوں نے انھیں گھیر لیا اور ہر ایک نے پھیل پھیل کر ان سے ہاتھ پاؤں کو بپے وصول کر لئے۔ عبداللہ صاحب نے ماں بی کو بھی بہت سے روپے پیش کئے تھے۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ بہت اصرار بڑھایا تو مجبوراً ماں بی نے گیارہ پیسے کی فرمائش کی۔

"کتنے بڑے میلے میں گیارہ پیسے لے کر کیا کرو گی؟" عبداللہ صاحب نے پوچھا۔

اگلی صبح کو آپ کے نام سے مسجد میں تیل ڈالوادوں گی۔ ماں بی نے جواب دیا۔

زندگی کے میلے میں بھی عبداللہ صاحب کے ساتھ ماں بی کا لیکن رہیں صرف۔ صبرات کے گیارہ پیسوں تک ہی محدود رہا۔ اس سے زیادہ رقم نہ لگی انھوں نے مانگی نہ اپنے پاس رہی۔

گلگت میں عبداللہ صاحب کی بڑی شان و شوکت تھی۔ خواہ صورت بگڑے سچ باغ کو کر چا کر دروازے پر سپاہیوں کا پیرہ۔ جب عبداللہ صاحب دورے پر باہر جاتے تھے یا واپس آتے تھے تو سات توپوں کی سلامتی دی جاتی تھی۔ یوں بھی گلگت کا گورنر خاص سیاسی انتظامی اور سماجی

مہاراجی بھی ساہو و جوت تھی۔ جہاں میں آگئی "ہائے ہائے ہمارے راج میں ایسا ظلم۔ میں آج ہی مہاراج سے کہوں گی کہ وہ مہاراج صاحب کی فریلمیں۔"

جب یہ مقدمہ مہاراج پر تپ چکھنک بچا تو انہوں نے مہاراج صاحب کو بلا کر یہ چھ بھوکے۔ مہاراج صاحب بھی خبر میں تھے کہ چیلے اٹھائے یہ کیا افتاد آ پڑی۔ لیکن جب معاملے کی تہہ تک پہنچے تو دونوں خوب ہنسے۔ آدنی دونوں ہی وضع دار تھے۔ چنانچہ مہاراج نے حکم نکالا کہ آئندہ سے گھلت کی گورنری کو وزارت اور گورنر کو وزیرت کے نام سے پکارا جائے۔ ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی تک گھلت میں سبکی سرکاری اصطلاحات رائج تھیں۔

یہ حکم ہارسن کر مہاراجی نے اس بی کو بلا کر طر فخری دئی کی کہ مہاراج نے گورنری کو ایس نکالا وہ سدا ہے۔

"کب تم دو جس نہا؟" ہاتوں پہلا "مہاراجی نے کہا۔" بھکی ہمارے لیے بھکی دیا کر۔"

مہاراج اور مہاراجی کو کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لئے وہاں کل ماں بی سے دعا کی فرما بکشی کرتے تھے۔

اولاد کے معاملے میں اس بی کی ادا حق خوش نصیب تھیں؟ یہ ایک ایسا سوال یہ کان ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں سو جیتا۔

ماں بی خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ ان بھی خوش نصیب اس دنیا میں کم ہی ہوتی ہیں۔ لیکن اگر میرا شکر اظہیم وہ رضا کی عینک اچار کر دیکھا جائے تو اس خوش نصیب کے پردے میں کتنے دکھ کتنے غم کتنے مصدے نظر آتے ہیں۔

اٹھ مہاں نے اس بی کو کتنی بڑیاں اور کتنی بیٹے ملا سکے۔ وہ بڑیاں شادی کے بعد مرے بعد بچے بعد دیگرے فوت ہو گئیں۔ سب سے بڑا میں عالم شباب میں انگلستان جا کر گزر گیا۔

کہنے کو ماں بی نے کہہ دیا کہ اللہ کمال تھا طہ نے لے لیا۔ لیکن کیا وہاں کچلے میں چھپ چھپ کر غریب کے آنسو رو پاتا کرتی ہوں گی؟ جب مہاراج صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی عمر با سطر سال اور ماں بی کی عمر پچیس سال تھی۔ سہ ہر کا وقت تھا۔ مہاراج صاحب پاں کی کھر دی چار پائی پر سب معمول کا ڈھیلے کا کرشمہ راز تھے۔ اس بی پا بکھی پر طنزی چاقو سے کٹا چیل چیل کر ان کو رہتی تھیں۔ وہ حوسے حوسے سے گنا چس رہے تھے اور مذاق کر رہے تھے۔ ہر کا یک وہ عجیبہ ہو گئے اور کہنے لگے۔ "بھو کہ ان شادی سے پہلے بچلے میں نے تمہیں گیارہ پیسہ دیئے تھے۔ کیا ان کو دا پس کرنے کا وقت نہیں آیا؟"

ماں بی نے نئی دہانوں کی طرح سر جھکا لیا اور کٹا چیلے میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے بیٹے میں یک وقت بہت خیال الٹا لے۔ "ابھی وقت کہاں آیا ہے۔ سرتاج شادی کے پہلے کیا رہ بیٹوں کی تو بڑی بات ہے۔ لیکن شادی کے بعد میں طرح تم سے میرے ساتھ رہا کیا ہے۔ اس پر میں نے تمہارے پاؤں دھو کر پینے ہیں۔ اپنی کمال کی جوتیاں تمہیں پہنائی ہیں۔ ابھی وقت کہاں آیا ہے میرے سرتاج۔

لیکن اتفاقاً وہ کے بھی کھائے میں وقت آ چکا تھا۔ جب اس بی نے سرتاج یا تو مہاراج صاحب گئے کی قاش منہ میں لے گا ڈھیلے پر سو رہے تھے۔ اس بی نے بھیرا ملا دیا یا بلا یا پنکا را لیکن مہاراج صاحب انکی بندھو سکے تھے جس سے بیداری قیامت سے پہلے ہی نہیں۔

ماں بی نے اپنے باقی نامہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو بیٹے سے لگا لگا کر تھیں کی۔ "چھوڑنا مست تمہارے امام بی حسرتا رام سے رہے تھے" اسی آ امام سے چلے گئے۔ اب روفا مست۔ ان کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔"

کہنے کو اس بی نے کہہ دیا کہ اپنے اما کی یاد میں نہ دو نہ داناں کو تکلیف پہنچے گی۔ لیکن کیا وہ خود چوری چھپے اس خاندان کی یاد میں نہ

روٹی ہوں گی جس نے ہاسٹہ سال کی عمر تک انہیں ایک الگ دہلیں سمجھا اور جس نے گورنری کے علاوہ اور کوئی سوکن اس کے سر پر لا کر نہیں بٹھائی۔

جب وہ طرہ پل دی تو اپنے بچوں کے لئے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئیں جو تیا مست تک انہیں حقیقت کے بابا بن میں سرگرداں رکھے گا۔

اگر ماں بنی کے نام پر خیرات کی جائے تو کیا وہ پیسے سے زیادہ مست نہیں ہوتی لیکن مسجد کا ملا پوچھا ان ہے کہ بجلی کا ریت بڑھ گیا ہے اور بجلی کی قیمت گراں ہو گئی ہے۔

ماں بنی کے نام پر فاقہ روی جائے تو کتنی کی روٹی اور لکھ مرچ کی پٹنی سامنے آتی ہے لیکن کھانے والا اور دہلیں کہتا ہے کہ فاقہ رورویں چلاؤ اور زردے کا انتظام لازم ہے۔

ماں بنی کا نام آتا ہے تو بے اختیار روئے کوئی چاہتا ہے۔ لیکن اگر روٹی جائے تو ڈارنگتا ہے کہ ان کی دوزخ کو تکلیف نہ پہنچے اور اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا۔



سید رفیع حسین

نام	سید رفیع حسین چغتاری
قلمی نام	سید رفیع حسین چغتاری / سید رفیع حسین
پیدائش	۱۸۹۳ء بہ تمام محلہ شاہ ساج، نکلہو بھارت۔
وفات	۱۲۲ھ بمطابق ۱۹۴۳ء
تعلیم	ڈپلوما ٹیکنیکل انجینئرنگ ڈگریہ جوئی ٹیکنیکل کالج، بمبئی ۱۹۳۸ء
ابتدائی تعلیم	علیہودار اسکول ماناؤہ میں حاصل کی

مختصر حالات زندگی:

سات برس کی عمر میں والدہ کا انتقال ہو گیا۔ بچپن در بھاری میں گزرا۔ کبھی بھگن کے پاس تو کبھی چھو بھگن کے پاس۔ والد کے دوسری شادی کرنے پر قدم سے زندگی میں قرینہ آیا لیکن اس وقت تک تعلیم کا سلسلہ اتنا بگڑ چکا تھا کہ بھر کبھی سندھ نہ سکا۔ سید رفیع حسین اپنے زمانہ طالب علمی میں کبھی بھی اعلیٰ طالب العلم نہ بن سکے۔ ۱۹۱۵ء میں والد ماناؤہ سے چلے گئے اور یہ نوید درجے کے طالب علم، جب گھر سے بغیر اطلاع کے بھاگے اور بمبئی پہنچے۔ چھ ماہ تک اصلاحی کے ایک کارخانے لیپسز فاکٹری اور کس میں بطور قلمی دن بھر مشقت کرتے اور رات کو پڑھتے رہے۔ جب گھر سے رابطہ قائم کیا تو باقاعدہ خرچ آنے لگا اور انھوں نے ڈگریہ جوئی ٹیکنیکل کالج، بمبئی سے ۱۹۲۸ء میں ٹیکنیکل انجینئرنگ میں ڈپلوما لیا اور بھائی کی ریلوے ورکشاپ میں چھ ماہ تک ملازمت کی۔ ۱۹۲۸ء میں ریلوے ورکشاپ شاہ گڑھ چلے گئے۔ ملازمت کے سلسلے میں بارہ برس ترائی کے جنگلات میں گزارے۔ مگر ہند میں کئی جہازوں پر کام کیا۔ ساج کیا۔ ساری زندگی نگر اور آدمی آسٹین کی قمیص پہنی۔ ۱۹۳۳ء میں انسٹی ٹیوٹ آف انجینئری کے ایسوسی ایٹ ممبر کے طور پر چار ہزار روپے ماہانہ مشاہرہ پاتے رہے۔ ۱۹۲۷ء میں سرکاری ملازمت سے دست بردار ہو کر قہارمت کی گئی جس میں شکر سازی کا ایک کارخانہ قائم کیا۔ ۱۹۰۳-۳۲ء کے ایک بھگ شکر سازی کا کارخانہ اپنے انعام کو پہلا تو بہار کی ایک شکر فیکٹری میں انجمنی اعلیٰ نمونہ پر ورکشاپ پر منتقل کی جگہ ملی۔ اس کے بعد کچھ مدت ملا کر میرا کی شکر فیکٹری میں

چاہے انجینئر رہے۔ بھول سید رفیع حسین (بحوالہ: افسانہ اکبر) چودہ ملازمتیں کیں۔ آخری زمانے میں گورنمنٹ سکول ورکسھاپ، کانپور میں پانچک ہیرنڈنٹ تھے۔ اردو میں ادا کی یہ حالت تھی کہ اپنا کھانا خود چھکتے تھے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

”گھڑوا“ مطبوعہ: ”ساقی“ دہلی ۱۹۳۰ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ”آئینہ حیرت“ (افسانے) طبع ازل ساقی پبلشنگز دہلی ۱۹۳۳ء

غیر مطبوعہ:

اسی کتاب کے علاوہ ”نیا دور“ کراچی شمارہ نمبر ۳۵ میں رفیع حسین کے آخری افسانے (مضمون: ”آئینہ حیرت“) ”گھڑوا“ اور ”ہندوستان کی چٹی کارا“ (دو مضامین) ”نیم کی سولی“ اور ”کلی“ (دو طویل مختصر افسانے) اور افسانہ اکبر“ (ناولٹ) اشاعت ہوئے۔ رسالہ ”ساقی“ کے اسی نمبر جولائی ۱۹۳۰ء میں سید رفیع حسین کا ایک نثر مختلف افسانہ ”طیریں فرماؤ“ کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

نظریہ فن:

”ہم وہ ہیں، پہا ہوں نوجوان ہنگی۔ جو کہو گئی ہوں آپ کے آگے حاضر ہوں۔“

سید رفیع حسین

(پہلا حصہ: ”افسانہ اکبر“ مطبوعہ ”نیا دور“ کراچی ۱۹۳۰ء ۱۳۶)

”زندگی سے الگ آرت کا کوئی تصور کم از کم میرے ذہن میں نہیں آتا۔“ (پہلا حصہ: ”افسانہ اکبر“ مطبوعہ ”نیا دور“ کراچی ۱۹۳۰ء ۱۳۶)



حوالہ جات:

۱۔ ”نیا دور“ افسانہ ”میراج“ غیر ہندی میں افسانہ ”خدا و فرشتے“ کی افسانہ نگار کا ۲۴ سید رفیع حسین نے تحریر کیا ہے۔

۲۔ ”نیا دور“ افسانہ ”میراج“ غیر ہندی میں افسانہ ”خدا و فرشتے“ کی افسانہ نگار کا ۲۴ سید رفیع حسین نے تحریر کیا ہے۔ ”نیا دور“ کراچی ۱۹۳۰ء ۱۳۶

۳۔ ”نیا دور“ افسانہ ”میراج“ غیر ہندی میں افسانہ ”خدا و فرشتے“ کی افسانہ نگار کا ۲۴ سید رفیع حسین نے تحریر کیا ہے۔ ”نیا دور“ کراچی ۱۹۳۰ء ۱۳۶

۴۔ ”نیا دور“ کراچی ۱۹۳۰ء ۱۳۶ ”گوری ہو گوری“ ”نیا دور“ کراچی ۱۹۳۰ء ۱۳۶ ”نیا دور“ کراچی ۱۹۳۰ء ۱۳۶ ”نیا دور“ کراچی ۱۹۳۰ء ۱۳۶

گوری ہو گوری

سید رفیق حسین

چو مار کی اندھ چادری رات تھی۔ بھنگ بھنگی خطری ہوا بھنگی تھی۔ بھنگروں نے جھکا رہا رکھی تھی۔ سبڑک بولی رہے تھے۔ ڈرلا ڈرلا پہل کے سونگے ڈاکالے پاؤں گھومتا تھا۔ کب ہو۔ کب ہو۔

بھنگی نے کہہ دی۔ بھرتہ پتھر مارا بولی "ہائے رے۔ ارے رام کیسے ڈالیں لا گئیں۔"

پہلے پاؤں مارا۔ کب ہو کب ہو۔

چھ مہینے کا بچہ پاس لٹا ہوا تھا۔ اس پر ہاتھ رکھا لیکن بھنگی بولی۔ "مری جائے۔ بھرتے بیٹا۔ بولت کیسے تاس بیٹا۔"

کب ہو کب ہو۔

"کئی ادھی۔ ادھی ادھی۔ اٹھو۔ ٹھکرو۔ سو بے ڈارا کے۔"

دامو نے اس کا ہاتھ بھٹکا۔ بولا: سون دے دی ادھی ڈاکالے لے تو ہے۔"

"اٹھو جی اٹھو۔ سو بے ڈارا کے۔ سچی ڈاکالے اے۔ اٹھو۔"

دامو "کوہ سے تو راز" کہتا ہوا آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ کھنپا سے نیچے چڑھ گیا۔ جلدی سے گھراؤ پر پہنچ گیا۔ گھبراہٹ بھر نیچے دیکھا۔ بھر دھر دھر دھڑکا۔ چھوٹا سا کچا گھر تھا۔ پھولی جوتی کی دھوئیں سے کافی لاشیں تھیں۔ دھبی روشنی میں آگن بھر بھٹلا رہا تھا۔ گھر بھر میں پانی بھرا تھا۔ دامو بولا "بولا ہمارے"

بھنگی گھبرا کر اٹھی۔ بولی۔ "جوتی دیکھت کا ہو۔ ہرے رام۔ بھیک کو بھٹلا دے۔ دھنکھیا کو بھٹلا دے۔ اس میں بھن کو بھٹی کو۔ پانی آئے

گھیا دے۔ ارے کو بھیک کا۔ رو دھنکھیا ہو ارے اور دھنکھیا۔ سوئے جات دے۔ ارے اٹھ اٹھ کو بھیک کا۔"

اٹھ برس کی ادھی بھنگی دھنکھیا جا گئی۔ چھ برس کا بچہ کچا جاگا۔ دودھ چٹا پاس لٹا بچہ جاگا۔ یہ رو دیا وہ چلائے۔ "ارے تیری" سو ہے لئے

لے باجر سے۔ ادنیٰ ہمارے۔“

”چپ کرو چپ۔“ مادھو نے ڈاکٹر۔ عاموشی میں مادھو نے کان لگائے۔ ہنسنی نے دھیان دیا۔ وہ دور کہیں سے آواز آ رہی تھی۔ گڑب۔
شش شش شش۔ گڑب شش شش شش۔ ٹھکڑا۔ ”کب ہو۔“

ہنسنی روٹی ہوئی چلائی۔ ”میرے پر تم بھی آئی گی۔ ارے میرے بچے کی جوتے۔“ یہ کھولے سے کو۔ پانی میں چھپا ہے بچے ہاں
سے چپے۔ مادھو اٹھا دیکھنے کو وہ ان کے کی طرف چلا۔ ہنسنی روٹی۔ ”کئی جاوت کہاں ہوئی۔“
باہر سے آواز آئی۔ ”مادھو بھی ہو۔ او۔ مادھو۔ ارے باڑا آئی۔ اٹھو۔ اٹھ۔“
شوپ۔ گڑب۔ شش شش شش۔ پانی کے بچے کی آواز تیزی سے بڑھ رہی تھی۔

مم۔ مم۔ مم۔ کمری ہوئی۔ ہاں۔ ہاں آں۔ ہاں آں۔ کبھی کبھیاں چلا رہی تھیں۔ ہار۔ مگر کے کو جو ہرے میں اٹھل کچا تھی۔
سب جاگ اٹھے۔ سب بھاگنے لگے۔ کوئی پکار رہا تھا۔ کوئی چلا تھا۔ کوئی روتا تھا۔ مادھو نے دیکھا کہ کوئی بچہ کی بیڑیوں پر کھڑا کر دیا۔ بھیکا کو گود
میں لیا اور سامان رکھنے لگا اور اٹھانے میں لگ گیا۔ ہنسنی نے گود والی لڑکی کو ہاتھ دے دیے چوں کی کئی اٹھائی سمیڑی ہنسی بکری۔ کھاکھرا ہوا ہے
سے نکلا جاتا تھا۔ اسے جوتے دو کا۔ کھانے سے ملایا۔ مگر وہ بھی گھڑی۔ دوی۔ دھجھو۔ کھڑی سب کہاں جا رہا تھا۔ لوہا بھی چلی۔
مگر کے باہر آ دی اور ہاتھ چلا رہے تھے۔ مگر کے اندر دیکھا اور بھیکا دو رہے تھے۔ پانی کا شور اندر اور باہر سب جگہ تھا۔ ہنسنی اور

مادھو مگر کے سامان میں لگے تھے۔ شور ہوا۔ ”بھا کو بھا کو۔ کو ہنسنی نکل کرے۔ مادھو بھاگ۔“

پانی نے ٹھکڑا لیا۔ چڑی سے اچکا۔ راتوں تک آیا۔

”بھا کو بھا کو۔ مادھو بھی بھاگ رہے۔ ارے کا ہونے گیا۔ ٹھکڑا کا ہے۔“

باہر سے آواز آ رہی تھیں۔ پانی نے مگر ٹھکڑا لیا۔ آگے بڑھا۔ پیچھے ہٹا اور ان سے کمر تک آیا۔

ہنسنی روٹی۔ ”ارے میرے گڑے۔ ارے میری شش شش شش۔“

”کل کل۔ تو کل کل۔ میں آیا۔ ارے توں چوں تو لئے لوں۔ اڑھنا چھوڑا تو دے لوں۔“

پانی کا شور تھا۔ چار آ دیوں کا چلا تھا۔ دردا زور دے دیکھے تھے۔ وہ کھل گیا آ دی گھر میں آ گئے۔ مادھو اور ہنسنی کو بڑا کر کہتا تھا۔ ”چالو۔ چالو۔

سب بھوڑو۔ جان ہی بچا ہے تو چالو چالو۔“

اس گڑب میں جلدی میں گھبراہٹ میں اندر میرے میں دوی چھوڑے کچھڑوں کے لیے پکارتی۔ باج اور باج کی کھلیوں کے لیے
پکارتی۔ برحقوں اور زبردوں کے لیے پکارتی ہنسنی نے یہ بھی کہا۔ ”بھادے دیکھا کوئے ملے۔“ کاٹھیں اوپ ہنسی تھی۔ اندر میرے میں کسی
نے جواب دیا۔ ”میں اٹھانے لوں۔ تو تو کل۔ ادنیٰ گھس باہر سے۔“

پانی کی شش شش۔ رات اندر میری۔ ہاں کی گرج۔ بجلی کی چمک۔ کمر کمر چپے چپے پانی میں۔ میں تیس آ دی۔ چپاس ساٹھ سو شش چلے۔
ہر آ دی بول رہا تھا۔ ہر چالو چلا رہا تھا۔ کوئی گرتا تھا دوسرا ہنسنی تھا۔ کوئی ڈوتا تھا۔ دوسرا اٹھتا تھا۔ شوروں میں تو سب ہتھکڑائے ایک دوسرے
کو سمجھاتے ہوئے۔ باہر چلے۔ آسمان کے داغ کے اندر سے ہو کر چن چن کے کھیلے ہوئے دریل کی اونچی جڑی کا رخ کیا تھا۔ لیکن جوں
جوں آگے بڑھتے گئے اندر میرے میں ایک دوسرے سے الگ ہوتے گئے۔

مادھو اور ہنسٹی ایک دوسرے کو بچکے ہوئے تھے۔ مادھو جتنی لڑکی اور بھینچا اسکے ساتھ تھے۔ دھنگیا کو بھی کسی نے کوٹھے کے ذریعے پر سے اٹھالیا تھا۔ ان کو اس کا اطمینان تھا مگر مادھو کو اپنی گائے اور چار بیلوں کی فکر تھی جو کہ گاؤں سے باہر کونہیں کے پاس بنگلے پاس کے سالے کے ساتھ رہتے تھے۔ ہنسٹی کو احمقوں کی اتنی فکر تھی۔ اب وہ اپنے بھائی کے لیے چاہ تھی۔ "لوہر تو وہ اکھاری رہتا ہے۔ نہ جانے ہانگا کہ باجیہ کا جانے آیا کہ نہیں۔" مادھو نے گرتی ہوئی جورو کو سنہا لے ہوئے دہرایا۔ "گو جانے ہانگا کہ نہیں۔" "ہاں جانے ہوئے کوئے کہنا ہیں۔" اندھیری رات تھی مادھو کو ہاتھ دھو کھائی نہ دیا تھا۔ پانی کمرہ اور کمرے اور کھانا سب جھڑکڑا کر الگ ہو گئے تھے۔ مادھو اور جورو اور نزدیک آواز میں ان کی آہی تھیں۔

"ہانگی ہو جاگلی۔"

"آہے دھول دانا۔"

"سرلی رے سرلی۔"

"بھلا رے بھلا۔ چالے چالو۔"

مادھو بھی باہر سالے کو پکارا تھا "ناگا ناگا ناگا" اور جواب دیا تھا۔ اب پانی میں شہر کے ساتھ زور بھی بڑھا۔ کسی نے اندھیرے میں پکار کر کہا۔ "لمبن کے گئے نہ یا ہے نہ یا۔" کوئی ہوا۔ "سٹھٹے سٹھٹے لٹے چالو۔" کسی نے کہا "ٹوٹے رہو بھیا۔ ٹوٹے رہو بھیا۔ آگئی لمبن۔" ایک دفعہ اندھیرے میں ناگا کی آواز آئی۔ "مادھو بھیا ہو۔ کوڑا مادھو بھیا دیکھو" کسی نے جواب دیا۔ "بڑا دکھائی یاد ہاتھ لو تو کوست نا ہیں۔"

مادھو نے جلدی سے پکار کر جواب دیا۔ "بھلی ہے کل۔ آفت ہوں۔" "ہوے لے آیا رہے؟" ناگا چلایا۔ "ہنسٹی کتے بولت نا ہیں۔" "ارے ہرے ہرے ہرے ساتھ۔ ہرے کتے چھوڑے لے آ رہے؟"

"آئے جا۔ آئے جا۔" آڑے کی لائین پاس آگئی تھی۔ ناگا دو گز پانی کے باہر کھڑا تھا۔

ڈاکرائی بیکٹینیں چلائی گا نہیں اسی پانی کے پانیوں سے بچے بھی موز میں پکا رہے مرڈاب لٹکے سب پانی فپ ٹاپے ریل کی چٹری پر چڑھے۔ اندھیری رات میں سوئی چٹری آباد ہو گئی۔ لوگوں نے گنگے پھاڑ پھاڑ کر پچھتا شروع کر دیا کہ کون کون آیا کیا ہے اور کون کون رہ گیا۔ ہر کسی کو کسی دیکھی کی فکر تھی۔ چھوٹے سے پردے کی پردہ پانی کی مردم شناسی کی گئی۔

آدھوں اور چاندروں دونوں کی گنگی ہوئی۔ چاندو سب موجود تھے۔ آدھوں میں ایک چدار کا لڑکا اور دو گنگے بھائی کڑی کم تھے۔ چوں میں دھنگیا کم تھی۔

ہنسٹی نے دھنگیا کے واسطے اور چدار چدارن لے لڑکے کے واسطے جگ جگ کر دنا شروع کر دیا۔ دونوں کڑی بھانہوں کے رشتہ داروں کو اطمینان تھا کیونکہ ایک تو دونوں میرا تھے دوسرے کا بی اوٹھے مکے کیست میں بہت مستعد اور اونچے پھان پر دھوئے ہوئے تھے۔ دھنگیا کی ماں تڑپ تڑپ کر دھری تھی سب دلاس دیتے تھے۔ ہر کوئی سمجھتا تھا۔ دھوٹا مبر کر۔ شاخہ دونوں کمریوں میں سے ہی کوئی آگیا ہوگا کسی درخت پر ہی کے کرچہ کیا ہو۔ چدار کا لڑکا بھی تو وہیں تھا۔ اس نے ہی تو کہا تھا گوئی لے لے گا۔ وہی اس کو لے کر کسی درخت پر چڑھ گیا ہوگا۔ پر ماسا کی مادی دیکھاری چپ کیسے ہوتی۔ اس کا تو دل ہی ٹوٹا جاتا تھا۔ مادھو بھی چپ کھڑا رہتا تھا۔ ناگا بلیاں لپٹا تھا۔

اور وہیں پرانے گوری گائے کھڑی مارتی تھی۔ تو کان آسن حلو کا سن ہاں حلو یہ بھی دکھائی ہاں ہے اس سے کوئی جانے: جانے۔ پھر اس کا بھی نہیں بتا ہے۔ دکھا دیتی ہے تو کان آسن حلو۔

دوئی چٹکیاں یعنی ہوئی ہنستی کے پاس بولتی ہوئی گائے آئی۔ ہنستی نے اس کی گردن میں ہانپیں ادا دیں اور دوئی

”گوری دے۔ موری رہسکیا۔۔۔ ابھا ابھا ابھا ابھا“

”گوری دے اب تو ہے کون چائے ابھا ابھا ابھا ابھا“

”گوری دے اب تو ہے کون کھائے ادا ادا ادا ادا“

”گوری رہسکیا تو گئی رہے ادا ادا ادا ادا“

”گوری تو رہی رہسکیا ابھا ابھا ابھا ابھا“

گائے نے وہی لمبی آواز نکالی۔ کان آسن حلو

کوئی جانے نہ جانے ڈلی کی لگی رام جانے۔ گائے نے بھا چلا کر اور ہنستی نے سسکیاں لے لے کر آخرو صبح ہی کر دی۔ نکلنے دان کی پہلی روشنی میں سب کی آنکھیں گوجر پردے کی طرف اٹھ گئیں۔ سامنے چھوٹا سا آسمن کا باغ تھا۔ اس حق کے برابر اور کھاس کی آدھن گوجر پردا آباد تھا۔ لیکن اب وہاں کچھ نہ تھا۔ آسمن کے درخت تو تھے مکان بہ نکلے تھے۔ دورا کر کوئی چا کچھا مکان ہو گا بھی تو درختوں کی آڑ میں ہو گا۔ سامنے تو باغ ہی باغ تھا۔ جس کے درخت اپنے برس برس ہاتھ پائی پر پھیلائے لی رہے تھے اور لہران کے پار سٹیلوں بھوں جہاں جہاں تک نظر جاتی ہی پانی تھا۔ ریل کی لائن کے قریب ہی جہاں پر چھوٹا سا تار تھا پانی کا دھارا تیزی سے نکل رہا تھا۔ لیکن پھر بھی پانی تو جو ہاتھوں لے ہت کی انگلی کی پانی میں کود پڑے۔ تیرتے ہوئے آسمن کے باغ تک گئے۔ وہاں بھارا اور دونوں کرئی بھائی تو موجود تھے۔ رہسکیا نہ تھی۔ بھارا گوجر پادسا تھا۔ اور بھارا نہ بہت تھا۔ ان لوگوں نے ایک چٹیا اٹھوٹا کیا جو کہ درختوں میں الجھ کر حیرا ہوا رہ گیا تھا۔ سب نے بھارا سے بہت کہا کہ اس چٹیلے پر دونوں ہاتھوں کا سہارا لے اور یہ لوگ کھینچے ہوئے اسے لے جائیں گے مگر اس کی جھل میں ہی نہ آئے۔ ڈر کے مارے مرا جائے۔ پانی میں اترے ہی نہیں بہت سمجھا پٹوٹا کی لہجہ راضی حق نہ ہوا۔ اور جب یہ لوگ اسے درخت پر چھوڑ کر پھلے کو چاروںوں تو بھریری طرح سے دھاڑیں مار مار کر روئے۔ ایک دھواں میں سے ایک کی کھج میں آ گیا۔ بھارا کے درخت پر چڑھ کر اور اس کی گردن پکڑ مارے کس کس کے جو ہاتھ تو راضی ہو گیا چٹیلے کے چٹیلے پر دونوں ہاتھ رکھ کر حیرا ہوا سب کے چٹیلے بچ ساتھ ہو گیا اور سب باری باری چٹیلے کو چٹیلے ہوئے لے چلے۔ راستہ میں کسی نے کہا: ”لے اب بہانے رہے ساٹھی ساٹھی تاجیں ڈونمیں دیں تو ہے جاتے ہی۔“ بھارے نے سب مل گیا کہ ہاں وہ ڈر کے مارے ان چار آدمیوں کے ساتھ ساتھ تھا جو کہ راضی اور اس کی بیوی چوں کا نکالے گئے تھے اور ہنستی کے چانے پر ہی لے کہا تھا کہ وہ رہسکیا کو گوری لے لے گا لیکن سب کے سب تو جلدی سے گھر میں سے نکل گئے اور وہ اکیلا جود کہا تو ڈر کے مارے سیر جوں کے پاس ہی لوٹ آیا۔ باہر آیا تو وہ لوگ نہ لے پانی اور نہ کیا تھا۔ آخر جب باغ میں پہنچا تو اکیسے چٹیلے کی ہمت نہ چڑی۔ درخت پر چڑھ گیا۔ یہ سن کر سب نے کہا: ”کڑوئے دوا یہیہ پانی کو کیا کر لے جا کر ایسے دشت کو۔“

لیکن قریب انھیں بلکہ ریل کی ٹری پر اتار دی دیا۔ وہاں سمجھا سمجھی کے سچے خدمت گار کا گھر جس کے دروازے اور دروازہ تھوڑا کام اور بہت ہانچیں کرنے والے ایڈر لالی سامنے والے پولس کے اٹھنے اڑنے سیاہی موجود تھے۔ دھواں کی سب ہی اپنی اپنی طرح کر رہے

بارغ کی آڑ سے نکلتے ہی گائے کو چمڑا اسی جگہ تیرتا ہوا نظر آگیا جہاں سرشام وہ اس کا چمڑا اور تیل ہاتھ سے گئے تھے۔ اب وہاں نہ کہتے تھا نہ چھوڑ دی۔ جگہ وہی تھی۔ لیکن اب سوائے پانی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہاں بچے کی آواز کا جواب دیتی تیرتی تیرتی اس کے پاس گئی۔ چاروں طرف گھومی اسے سونگھا۔ ایک دفعہ اس کی تھوڑی سی بھی پاٹ لی اور پھر ایک طرف کو تیرتی چلی۔ مگر بچہ نہ چلا تو وہیں تیرتا رہا۔ گائے بھڑوٹ آئی۔ چاروں طرف گھومی، برابر آکر اپنی کمر بوند سے دھکیلا۔ ایک طرف چلی، بچہ ساتھ نہ آیا تو بھڑوٹ آئی۔ اب وہ جگہ گئی تھی جہاں چھوٹے پچھڑے زمین میں گڑے ہوئے کھوٹے میں دی سے بندھا ہوا تھا اور دی میں اس قدر لمبی تھی کہ اب تک تو کسی نہ کسی طرح چمڑے کی ناک پانی سے باہر تھی لیکن اگر پانی ایک انچ بھی اور بڑھ جائے تو دی کی وجہ سے ناک ڈوب ہی جائے۔ گائے نے مایوس ہو کر چلائے بچے کو وہیں چھوڑا اور پھر دھکیلا کی طرف روانہ کیا۔

دھکیلا رونے چلانے کی ممکنہ ڈاڑھوں اور اُٹھان میں انتہائی نامیدی کا اب تک برابر مقابلہ کرتی رہی تھی لیکن آخر آٹھ برس کی نسلی جان ہی تو تھی۔ گائے جب اس کے پاس آئی تو وہ گرتی ہوئی چھت کے کنارے بے ہوش پڑی تھی۔ گوری نے آکر کی آواز میں دیں اور جب بھی دھکیلا کو ہوش نہ آیا تو پھر بھی کمر جڑی گرم گرم زبان سے اس کا منہ چاٹا۔ لڑکی کو ہوش آگیا۔ پہلے تو ڈاڑھی بھر گوری کو دیکھا۔ "گوری سیبا گوری سیبا۔" کہتی ہوئی اس کے گلے میں چلی۔ گوری نے دو ہیر مارے، آگے بڑھی۔ دھکیلا چھت سے ٹھٹھ پانی میں آگئی۔ اس نے اڑ کے مارے پڑ چلائے اور چھت چمڑا کر گوری کی پیچھے پر آگئی اور وہیں جھینگلی کی طرح لٹلی لٹلی چھت گئی۔ گوری پھر چمڑے کے پاس گئی "دی حرکتیں پھر کیوں۔" کئی دفعہ اس کے گرد پکڑ کھائے اور پھیلی اور جب چمڑا ساتھ نہ چلا تو بھڑوٹ آئی۔ اب دھکیلا کی بھی کھوکھ میں آگیا تھا کہ کیا بات ہے۔ جیسے ہی ایک دفعہ پھر گائے تیرتی ہوئی چمڑے کے پاس گئی۔ دھکیلا نے اونٹ سے لینے ہی لینے ایک ہاتھ بڑھا کر چمڑے کے گلے سے دی کی کانٹا نکال دی۔ چمڑا آزاد ہو گیا۔ گائے اور چمڑا دونوں تیرتے ہوئے چلے۔ دھکیلا گائے پر ہانپی ہوئی تھی۔ ہارٹا اور ریل کی بھڑکی کی طرف سے دھار پھل رہی تھی۔ اس لئے یہ دونوں بھاؤ کی ہی طرف تیرتے چل دیئے اور اُٹھان سمجھنے کے بعد پکڑ کھا کر پھر اسی ریل کی بھاؤ پر چڑھ آئے لیکن جہاں گاؤں والے تھے انہیں میل دود پ ٹھکے تھے۔ یہ سب بہت سویرے ہی چل دیئے تھے اور جب گاؤں کے بہادر حیراک تیرتے ہوئے ہارٹا میں آئے تو وہاں نہ چمڑا تھا نہ دھکیلا تھی بلکہ مادھو کے مکان کا بچا کچھا خند بھی بہہ چکا تھا۔ دن کے بارہ بجے جس وقت آگے آگے گوری پہلے پر دھکیلا۔ پیچھے پیچھے چمڑا "اوماں آں ہ" کے سوال جواب کرتے "گاؤں والوں میں پہنچے تو ٹھیل بچ گئی۔ لوگ مارے خوشی کے کودتے تھے۔ ہشتی خوشی کے مارے دھاروں دھار دوئی ہوئی بھی دھکیلا کو گلے لگاتی تھی، کبھی چمڑے کو اور کبھی گوری کے پیٹنی تھی اور گائے کہتی تھی "تم ماں آں ہ ہم ماں آں ہ۔"

آواز آئی "بھول گوری سیبا کی ہے۔" پیچھا آوازوں نے بے پناہی۔

پھر آواز آئی "بھول گھوٹا ناکی ہے۔"

دیوندر ستیا رتھی

نام	دیوندر ستیا رتھی
تلفی نام	دیوندر ستیا رتھی
پیدائش	۲۸ مئی ۱۹۰۸ء، بہنم: سمجھوڑ ضلع، بنگلہ دیش (ریاست پنجاب) بھارت
وفات	۱۲ فروری ۲۰۰۳ء، بہنم: دہلی بھارت
تعلیم	بی اے پنجاب یونیورسٹی لا بورڈ ۱۹۳۰ء۔ ہائی اسکول موگا سے ۱۹۳۵ء میں میٹرک کیا اور ری اے وی کالج لاہور میں ڈیڑھ تعلیم کر کے ۱۹۳۵ء میں بی اے کیا۔

مختصر حالات زندگی:

والد کا نام لالہ دھانی رام تھا۔ لیکن اگر ہم یہ جانتا ہوں کہ دیوندر ستیا رتھی کون تھے، کیا تھے؟ تو یہ جاننے کے لیے ان کا "فسانہ" "گنگا پرش" "مطبوعہ" "ساتی" "دہلی ۱۹۳۸ء" دیکھنا ہوگا۔ جو ان کی زندگی کے ابتدائی تین برسوں کی رواد سناتا ہے اور اس کے بعد کا قصہ معاشرت، حسن، عشق، لے اپنے فسانے "ترقی پسند" میں بیان کیا ہے۔ عشق کے اس فسانے میں "دیوندر سنگھ" اور "ترپاشی" اور حقیقت، راجندر سنگھ، بیوی اور دیوندر ستیا رتھی ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں شادی سے شادی ہوئی جس سے دو دھیاں ہوئیں۔ ستیا رتھی کو پہلے چل دلا اور میں دیکھا گیا اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں جب لوک گیت جمع کرنے گھر سے لگے ہیں تو کجرات "آسان لنگال" حصہ پر دیش، راجستان، کشمیر اور پنجاب میں ہر جگہ دیکھا گیا، سوائے اپنے گھر کے۔ ٹھیک میں برس بعد واپس آئے تو ایک دنیا کو بچا چکا انہوں نے، پنجابی، گجراتی، مراٹھی، کشمیری اور بارواڑی زبانوں کے اڑھائی سے پانچ لاکھ لوگ گیت اکٹھے کر لے ہیں لیکن یہ دنیا اور لوگ اس وقت انگشت بدلتا رہ گئے جب ستیا رتھی نے پطرس بخاری کو آل انڈیا ریڈیو کے لیے یہ چیلہ گیت فراہم کرتے وقت کالی رات اور حق کلیت سے انکار کر دیا اور صرف اچھا کہا "حق کلیت اگر کسی کا ہے تو اس مراٹھی کا۔"

مثنوی نے اسے یہ اسے "فراد" کہا اور ستیا رتھی مثنوی کے گرد یہ ہو گئے۔ راجندر سنگھ، ہندی کے فسانہ "گرمن" میں شامل لوک گیت دیوندر ستیا رتھی کی مطاف تھی۔ دہلی میں پچاس برس تک دیوندر ستیا رتھی کا یہ معمول رہا کہ کھد کے پہلے کرتے یا ہاتھ اور زرد رنگ کے چٹے میں ملوف پہن

میں بھاری رستہ دبا کے گھر سے نکلے اور کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شاہراہ پر سے کوٹھارہ کر لیتے۔ کھڑے گا گیا ہے کہ گھاس نے اپنے دشمن کو ہائی چارج کر مارا۔ ستیا راجی نصف صدی تک اپنے لئے اور پرانے ہائے دالوں کو اٹھانے سانس کر رہے حال کرتے رہے۔ ساتھ سے ناکہ کتب کے مصنف تھے۔ "نیا نیچرین" میں ایک مضمون گھنے کا ماحول ایک سو چھاس (۱۹۶۵) اس رقم سے انہوں نے اپنی پہلی کتاب "سبز سناٹا" کی۔

۱۹۶۸ء میں "لوک پتر" ایڈیٹر میں پروف دیا۔ تھے مئی ۱۹۶۹ء تا فروری ۱۹۸۴ء "اڑی قارنگ" اڑی کے نائب مدیر رہے۔ مارچ ۱۹۶۸ء تا ۱۹۵۶ء "آجکل" دہلی کی ادارت کی "نیشنل ورکھلیک" بد وقت سناٹا طرازی کی۔ دسمبر ۱۹۵۹ء میں پاکستان آنے کو واپس جانے کا نام نہیں لیتے تھے۔ جی نے چار ماہ انتظار کرنے کے بعد اڑی دہلی کیٹین کو بند کھاتوں کے سبھاٹے اٹھانے پر راضی ہوئی۔

اولین مطبوعہ تحریر:

مقالہ: "بھابی گرام سائیڈ" (بھٹی) لوک پتر میں سے معلق۔ مطبوعہ: "پنس" لاہور نومبر ۱۹۳۱ء

اولین مطبوعہ افسانہ:

"سنگ پش" مطبوعہ "ساقی" دہلی ۱۹۳۶ء

تفصیلی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ "سبز سناٹا" (بھابی) گورکھی دم لکھا میں) ناشر: راج راج ستیا راجی (اسر سمر) طبع اول ۱۹۳۶ء
- ۲۔ "مے دھاتا" (افسانے) بھٹی ہنس ست گزرا اور طبع اول ۱۹۳۳ء
- ۳۔ "گھر پائری گیتی رسی" (افسانے) اڑیمن اڈی لکھا اور طبع اول ۱۹۳۶ء
- ۴۔ "میں ہوں خاندان بدوش" سر کھٹا گل پر لکھا لکھا اور طبع اول ۱۹۳۸ء
- ۵۔ "گائے ہا ہا ہستان آہا ہستان کے لوگ گیتوں سے معلق کتاب) "کھٹا کو گرو اٹی" (بھٹی) ٹاول) طبع اول ۱۹۵۶ء
- ۶۔ "برہم پتر" (بھٹی) ٹاول) طبع اول ۱۹۵۸ء
- ۸۔ "چاندورس کی جہان" اس کتاب کا ایڈیشن ۱۹۵۹ء میں لکھا طبع اول ۱۹۵۳ء
- ۹۔ "دھرتی کا گاتی ہے" (لوک گیت) طبع اول ۱۹۵۸ء
- ۱۰۔ "Meet My People" (لوک ورثہ) طبع اول ۱۹۶۳ء
- ۱۱۔ "چھوٹے آگے رات" (لوک گیت) طبع اول ۱۹۶۸ء
- ۱۲۔ "بھٹی وار" (شاعری) طبع اول ۱۹۶۸ء
- ۱۳۔ "جانے کا رنگ" (بھٹی) افسانے) طبع اول ۱۹۶۸ء
- ۱۴۔ "سڑک میں بدوقت" (بھٹی) افسانے) طبع اول ۱۹۵۰ء

رفوگر

دیو بند رستیا رتھی

آسمان جیسے پھلے پھینے کا شامیاد۔

میل سٹھن پودو ہمایا تیکڑ جیسے دھوہی میں مست تھی۔ ہندوستان کی قسم۔ کارواں سرائے سلامت، ڈالھی مٹ نہ جائے درودلی
ترہی داکا سپد کھوڑے پر کا لاکھ سوار۔

ترہی گئی۔۔۔۔۔ پہلے دیو کی بری بلا دل بھرا نکوس۔

دکان کی اونچی سیڑھیاں چڑھ کے آئی آئینہ خاتم اور دیو کر سے بولی:

”پہلے میری مثال رفو کیجیے۔ شکلی حردوری۔“

پانچا کا نوٹ دے کر وہ چلی گئی۔

جس کی چاہو سو گند لے لو۔ کوئی رائے قائم کرنی مشکل۔

دل کی دلی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی۔

برگرد کی آنکھ میں اپا تل کا کھونٹا جہاں سورج کی بجلی کرن داخل ہوتی۔

برگرد سنے پئی ہنگامی بڑ بڑھتی:

”تیکڑ نہ کہو لو گو، میرے غلی کو کھنڈ نہ کو۔“

کارواں سرائے اپنی خبر سمجھتی ہے۔ محبوب کی سرگوشی ہو یا باں کی اوری۔

جن کے قدموں کے نشان صحت کھنڈ ہم ان کا کوئی پھونکا کھنڈ۔

رفو گر مل جوا نام کی گند دالی دکان۔ اونچی سیڑھیاں تھیں کھڑکیاں۔

لال صوفی ہوتا تو بچگی کے ساتھ سر میں سرخا کر گاتا۔

چالال کی تان نہیں تو مٹی کہ سب کتے کا مٹی کتے تو ہڈی یا کس نے چائی!

لال صوفی کو ادا د احمد اور دہشت مصوم کا سلام۔ اس کا ایک اور نام گل شہید۔

ظلیل اور دھان نے یہ کہہ کر دم لیا کہ لال صوفی تو بھائی میں جو حنا ہے کا حرا لیتا رہا۔

"مٹھ سیکھو دے اسے اٹھ سیکھو دے" سٹکلاتے ہوئے اولاد احمد فر کر کی دوکان میں آیا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

چنبلیں گنگھا اور چالال کا اسی مذاق کا رقص ہے چائے دار جنگ سے

آچار یہ بھانج "اوس آئے اوس گئے" کہتے ہوئے کتاب گل کی طرف چل دیے۔

گل آئینہ خاتم کی موڑ پر یوز حارہ گزرتا تھا پڑوی۔ میر خسرو کی کہہ کر تھی۔

استاد سے پوچھا "آپ کی عمر؟"

بولے "بزرگ سے پوچھو۔"

بزرگ کی داڑھی ہنسنے لگی۔ جیسے ہوا کہہ دی ہو کہ یوز حارہ گد سب جاتا ہے۔

بچگی سے پوچھا "تمہاری عمر؟"

"میرنی گڑیا سے پوچھا۔" وہ اس پر ہنسی۔

آگے چلے جی بچھے کی لڑکیوں۔۔۔ کعب میرے پیچھے ہے کعب میرے آگے۔۔۔

ہر سب سے پیچھے رہتا چاہتا ہے اسی کو سب سے آگے جو حاتی ہے کارواں مراٹے۔ ایک ہی داڑھیوں پاسر پلٹ سکتا ہو۔

وہ خود سنا کی نہ کرتا۔ گا کہ سب سے سنی کہتا "شاہ میرا کام آپ کو پسند نہ آئے گا"

اگر کسی کو اس کا کام پسند نہ آتا تو وہ جھڑے میں چرنے کی بجائے صاف صاف کہہ دیتا "آپ کچھ بھی نہ دیجئے اور فو کی ہوئی اپنی

انجمن لیجے جائے۔"

چالال بچگی کو چاہا کہ کر بھڑتا تو وہ کہتی .

"وہ چڑا جاپان کی؟"

رفو کر کے لہاوست گیری کی موت پر چنبلیں گنگھا خسروں کرتے ہوئے کہتا:

"آگے مرا پیچھے مرنا ہمارے سے کہا ادا۔"

کسی کے ہاتھ میں کسی کی تان میں اپنا ہوا کاغذ۔

کسی کی بات چا کھٹ اور نکٹ کے بچ۔

کسی کی نظر ایک کونے میں چلی بچگی کی بچکے والی گڑیا پر۔

چٹری دوجا پر رنگ بے رنگ چٹری:

"سچ کو سولی۔۔"

"آنکھ کا پانی مر گیا۔۔"

"لو ساقی دن کی بادشاہی۔۔۔"

"پاؤں میں پنجر۔۔"

"سفر کا ساہن ابلو۔۔"

"چوڑیاں نہیں لو"

"سفید گھوڑے پر کالا شمشیر۔۔"

اسرے گیسٹ ہاؤس کے آگے مغل اعظم ہوئی اور یکدم ہل سے آگے ترکمان وردا اور۔۔

بھولی بھولیاں اور بارہوری کے سچ کتاب مل۔

بک لینڈ پر بس کی مغل میں لہرائی کھین۔

کھیں باؤ پر کوٹ کھیں نچا کر۔

کھیں اٹھا دی گس ہوئی کھیں نیا مل۔

کارواں سرائے کا نام بول کر پاؤں لپی رکھ دیا۔

پہاؤر بات ہے کہ لوگوں کی زبان سے کارواں سرائے نہیں اترتی۔

واہ رکی کارواں سرائے:

نہ یا میں کھلی ہال

بھکارن پھٹے مال

نام بن چھوٹ پانی۔

اس کی چھیلی پر پاؤں پیسے کا سکہ کھانا بھولا علی لہو نام اور چھیلی میں گڑ گدی ہوئے جتنی۔

کھل کی زنجی آج کی بھکارن۔ سونے چاندی کے سکنوں کی ٹھیک س کے پاؤں چھتی تھی۔

پاؤں پیسے کا سکہ لینے وقت آج اس کی آنکھیں پاؤں کی طرف جھک جائیں۔

کون سی راستا سنو گے؟ کچھ سائیں گے کارواں اور قریب آ جاؤ۔

دونوں کی بائیک کہاں

ماں کی لوری ایک کھانا

جو گزرو گے ادھر سے پھر آ جاؤ گاؤں دیکھو گے

فکرت ایک مہو ہے پاتا ایک مندر ہے

”مگر کون کون قصص رہا؟“ راکر نے روتے ہوئے پوچھا۔

نٹھکی سوغات۔ قولی کی رات۔ گج گئے سلامت آئے۔

نٹھکی لکھ کے روپ میں کس کپ کی رچا آئے آئی؟

”نٹھکی میں دوسری کی بڑی بہن نیم۔

”تو نیم کی بہن ہے بھئی؟“ پتلا ل نے پوچھا۔

”نٹھکی نیم میری بہن ہے۔“ وہ ہنس پڑی۔

کہاں تک چپ رہیں، سب سے نو پر ہو گیا پانی!

آ جا رہا ہو یہ کہنے ہوئے گل میں آئے کہ سوتا رہی ایک نو پار کی:

”سوئے سے گلی گزرائی؟“ وارے مصوم نے چا پ لگائی۔

”رام ہائی! رام ہائی!“ سب کی ہلی ہلی آواز۔

”اچھا میں بھڑا کر چلی گئی۔ کام روپ کے پاس جا کر رکھیں گے اس کے قدم۔“ اولاد احمد نے کہا۔ اشارہ بن پھول ہائی کی طرف۔

رات عاشقان پر شاخ آہ۔۔۔ ہرن کے سینگ پر عاشقوں کی برات۔

کچھ اور پوچھئے! یہ حقیقت نہ پوچھئے!

پھولوں جیسے بازو دھکن سے چورا

اپنی گزرا کا کیا بار۔ پانی! بھئی گائی رہی:

دھن دھن! تو گھر کو جا

میری ماں نے کھر پائی!

میں پھول کو کچھ کر دو کر بادشاہ بن جاتا۔ گویا اس کے ہاتھوں میں شریں لکھے گلشن۔

تمہیں دن! چاہیں ملے

میلے میں سب لوگ اکیلے

ہم کہاں سب سے الگ؟

آج پر دنیا بھلی، بچھو کے بعد۔

مرنے والے کی نہیں! بیچنے والے کی موت ہے!

اسے دھن! طبع تو برسن بلا شہی!

”میں نے تو یہ پھل کو چڑھوا کر کھنکھنایا۔“ یہ سوال کا اعلان۔

وہ سوچتا ایک دن میں پھول سڑک ہے چلتے چلتے اسیروں نے گی اور اس کی اڑھائی کے ساتھ ساتھ باغی بولی بھیڑ کھڑے پانی رہے گی۔
 کارواں سرائے کا بھی احساس کبھی ہوا مگر اس کا بھی کام کرتا ہے تو بی ایما اندر ہی سے اور وہ ان راستہ ایک کر کے۔
 وہ تو گاؤں کا ایک لڑکا تھا۔

اس کی فکر یہ غلوں کے اسپتال پر جس کا تنگ چیلہ دال مسوقی نے رکھا تھا۔
چیلہ تنگ دالت کو گلبرگھا کر لایا اور تنگ لے آیا:

کریانی کا شہر۔۔۔۔۔ چائے کوں سا شاد۔

”نکلیں رہتا ہے، غیب تک سوئی دھامکے کا ساتھ ہے۔“ ڈاکٹر کا بچا اعلان۔

”تیسرے دل میں تو مجھ کا مرنے کا لگاؤ“ اور دوسرے نے اپنی کتاب کا عنوان دیا۔

”سوسال سوسال نہ کیجیے“ آپارہیہ ہمارے کی زبان میں گنتی کے مندر میں رہتا ہے۔

منجھل سگو پہ کہہ کر دم لپٹا کہ وہ اپنی جگہ پر رہ گیا!

ابو داؤد کے زور قلم لائق ”ابو داؤد آبی آبی“

جہاں لکاتو۔۔۔ سوانحی فن نگار کا بھی دور ہے۔

“I think we’re going to have a very good year.”

میں نے اپنے آپ کو بے گناہ سمجھا

گلی آئینہ خانگی نشان۔۔۔ لڑنے کی اہمیت صوبہ سرحد میں۔

گویا سب اچھے کرنے کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے:

”لکھنؤ میں نہ بھڑکی گوریوں“

ہاگہائی جو ہے کھڑی رہتی۔

"کافوں کے ہتھکڑوں کی زنجیریں" آج اور بعد میں کیاں بگھارتے۔

Maryland

الہی صوفی کا ایک دور نامہ۔۔۔ گلشنِ شریف

وہابیوں کی طرف سے مذکورہ بالا تمام باتوں پر رد کیا گیا ہے۔

"لوگوں کے دماغ بھی بڑھنے لگے ہیں؟" روبرٹ منکر۔

آنکھ کی پٹی۔۔۔ پٹی ہٹائی۔۔۔ کار جہاں دور لڑے!

موتی مجمل غائب۔۔۔۔۔ اب وہاں چر لیکھا کالونی کی جگہ پر۔

کاغذی گاڑن۔۔۔۔۔ کھٹی باغ کا کیا نام۔

بھی آواز کا چرواہی کی کیا نچرے کی

خوشبو سے کہو یہ کہ ہماری طرف آئے

بھس میں آگ کے ہوا دور کھڑی

”کہیں بھی آگ لگے کھڑی ہوا بدنام۔“

آسام سے آگ کا مدد پٹے بن پھول نے اکھڑنچن مان لیا۔

جیروں میں مختصر دہانہ سے وہ اس کے آگے تاجی رہتی۔

پاگل بھارن کی اور بات چہرہ مرک چکڑی آئے جانے والوں کو مانگ رہی ہے۔

کام روپ کو کچھ آسام سامنے آ جاتا۔

اوپر کوٹ۔۔۔ سرگوشیاں ہی سرگوشیاں۔

بن پھول کے جڑے پر گھرے کی خوشبو۔

مختصر۔۔۔ گل شہید کے حوالے۔

علی جو نام یہ بتاتا ہے بھول کہ وہ سورج اگلے سے پہلے ہی پیدا ہوا اور اسی روز اس کو کھڑی میں داخل کا پچاڑے سے باہر نکلا!

آچار پر مہاراجہ کی ”کھیری ہے جی“ کہہ کر پھلڑے تو دوڑ کر کہتے:

”مہاراج! میں تو آپ کو بھی یہ چہرہ مانا ہوں۔“

وقت کا احساس جیسے جنگ کی تڑکی اڑاں۔ اڑتا ہی جائے بس اڑتا ہی جائے!

دنگے فیلڈ شروع ہو گئے تو کام روپ مارا جانے کا اور اسے اکھڑنچن مان کر جیروں میں مختصر دہانہ سے اس کے آگے بڑھنے والی بن

بھول کی بھکاری بھی ختم ہو جانے لگی۔

بھی میرے کہ کھنڈر: بھی کتابوں کی فضا کش: بھی آہل اطریشا مر۔

بیر لال کا بیٹا موتی لال اور موتی لال کا بیٹا چاند لال۔ تیناں بونے۔ مگر نریت کے خلاف جہازان کا ایمان جیسے ہم اٹھ خان کی شہنائی بجانا

لال کا ہائرسری دھون۔

چھان کاغذ ہے۔۔۔ بھی ادا کیا بھی ملو ہے۔

مفل کی اور بات۔

اب کیا شادمان ہاں!

تاجاری کا قفسہ خم!

لال موتی۔۔۔ تاجاری سواگر کے نامان کی آخری کڑی۔

”بیرل کے بھول سے ملتا ہے دھواں وہی جگ!“

روگرد کر کے کرتے ٹھٹھکا ہوا رہا۔

اتھاس گوسوامی کا نام آجے ہی مس نوک اور دھوگل کا نام آجے نے بغیر نہ رہتا۔

گل، تاجپتی برف کا پھول۔

اتھاس گوسوامی کی "ٹیل ٹکٹنی" میں "ال صوفی کو شرعاً غلطی دی گئی۔

بہار آئی ہے جہنم پر ابھار آیا۔

بیچے رہ گیا بھاری کارنگ گل۔

ناک کے سیدھ چلے جانا تو کتاب گل کا رخ نگہ فروم۔

کبھی گری کا روٹا کو قفل مٹا چھوڑے

کبھی کڑا کے کی ٹھٹھکا کر ٹیلین سر گھیں، کڑا کے قلم؟

2

ایک روز آج پھر یہ مہاراجہس پر سوار ہونے سے پہلے خیمہ کی چوڑی گولیاں کھا گئے اور اس سے اتار کر کہاں سرارے کے بارہوئی چمک
میں پیدا گندہ کے فٹ پاؤں پر کرتے ہی بے ہوش ہو گئے۔

کسی نے نیگور ہسپتال کو فون کر دیا۔ ہسپتال کی دہلی آئی اور مہاراجہس پر مہاراجہ کو لے گئی۔

وہاں انہیں مردہ دیکھ کر مردہ گھر میں بھیج دیا گیا۔

انگے روز ان کا چست رازم ہونا تھا۔

گنگا چار بیچے آج پھر یہ مہاراجہ کو ہوش آیا تو اس کے ساتھ گئی مردے۔

اپنے آپ کو مردہ گھر میں پا کر ان کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پائے۔

روز آدھ کھلا تھا۔

دوسرے حرکت کے باوجود پھر سے میں جا پہنچے اور یہ سہرا دلوں سے بچتے بچاتے ہسپتال کے سامنے سے باہر۔

کئی گھنٹے تک یہی احساس رہا کہ موت وہ ہے پاؤں میں کا پیچھا کر رہی ہے۔

یہی وعدہ تھا، ہا کہ کہیں سرکار اقامت خود کچی کے انعام میں خود مرنے کا۔

پرانے دوستوں میں سے، جس سے ملنے ہوئی انہیں بھوت بھتہ کر رہ گیا۔

ملی جیو ام سے لے کر داسو اور دھرتی مصوم کو ساتھ لے نیگور ہسپتال سے بچتا چمکی تو پتہ چلا کہ بارہوئی چمک کے فٹ پاؤں سے لائی

گئی اور اسٹ لائن گھر کاری خرچ پر جلا دیا گیا۔

جب آج پھر یہ مہاراجہ پاؤں تک بک لیٹ پر نہیں کے پردہ، بڑے پتال کے سامنے آئے تو وہ انہیں بھوت بھتہ کرنا کا خوفزدہ ہوا کہ تین دہی

تک پہنچاں میں رہنا چاہا۔

”میں ہوا کی بجائے نورانی“ ”جائے کس کس بات پر زور دیتے رہے آپ یہ مہاراج۔

جانتا ہوں کہ تھے کون سا حق چلے

ہماری بچکان رو کر کی دکاں۔

ہماری ذلیل ذلیل، پسلی لڑائی، بڑی بڑی آنکھیں، آنکھوں پر چادر ہاتھ میں سوئی دھواگ۔

سکرت چڑنے کے لیے ہاتھ میں لاکڑی، گل ہاکی سو قات۔

”لوگ لوگ خاک اور اور گل ہاتھ ہمارا“

اور لا دھو لے قاپ لگائی:

”کبھی تو ہوائے کبھی پیرائے ذرا کی کہی ہے پچھلی ہوائے“

”ہم تو ہوا کی کو اپنے سے آگے مانتے ہیں۔ اس کا پیرائے لے لے۔ ہمارے مضمون نے جیسے اندھیرے میں روشنی کی چمک ڈالی ہے

اتھاس گوسوامی کو پہلے دیکھا۔ دائیں مس خاک اور بائیں گل ہوا۔

اب کیا ہوگا، کسے خبر لوگ۔ ہوائے کے لیے جینا اور مرنا اتھاس گوسوامی کا دھرم ایمان۔

”پیار کر کے بھلا نا آجائیں“ ”را کر کے را کر کے کرتے کہا۔

کتاب گل بڑھیا لاہری ہے جیسے کسی منٹس نے ہوائے غزائے کا پتہ چلایا۔

”یوں ہی نہنگ تھی، جو تم چور ہے تھے۔“ ”پتلا ل نے پنچل گھوڑے پر چھا۔

جتنی پر چھائیاں آتی ہیں میریاں ساتھ صدیوں پرانا ہے اپنا!

”دیکھا کیوں آکا شہر؟“ ”نعم بن پھول کا۔

اتھاس بول ”پکارا کیوں کا!“

اپنے دھماکے دھماکے۔ کہیں غیر حتم، کہیں انوار۔

سوئی ڈگر ہوا ہو میلے۔ بھر پور لایے حضور

”را کر کے لیے ضروری ہے کہ کپڑے میں جان ہو۔“ ”را کر کے را کر کے کرتے کہا۔

”کب تو اپنے آپ پر آئے نہ خواں۔“ ”پنچل گھوڑا لالہ۔

بال بچے دھڑلہ لائی دھن دھوا لایا۔

دھن لے اسے لایا خطاب دے ڈالا:

”جیتے نہیں بھرا کتاب!“

گنگوڑی رہی گنگوڑی۔

پنچل گھوڑا کوئی ہاتھ نہ گوار گزرتی کہ کوئی اسے ہوئی ہمارا کچھ کر ہی اس کا احترام کرے۔

واور سے آگیا چٹال!

ساتنے اس موڑ پر ہندوں کا ہچٹال۔

عمر ایوں سے جھکی کر آئی دھوپ۔

سو کے قریب پرندے ہر رفتے طالع کے لئے آجے آسمان سے دور بڑھیا طالع۔

3

کارواں سرائے گل ہاکی طرح اپنی ہی پاہوں میں سے جاتی اور کبھی غارت کی آگرمی پر جھنجھلائی ہی لگتی۔ چٹال اسرار کے لئے جلم بھر

۵۲۱۔

سوالوں کی راتیں بھاریوں کے دن۔

جب آچار یہ صبا راج اخبار چنہ کر جاتے تو چٹال اور اولاد احمد انہیں غارت کا نشانہ بناتا نہ بھولتے۔ نیگور اسپتال میں ایک بار انہیں

لاوارسٹ لاش مان لیا تھا۔

دنگے لہار کی خبر میں شے شے کبھی روتی تھی سوئی سے دھا کا نکل جاتا کبھی سوئی ہاتھ میں چبھ جاتی اور خون کی بوند چٹک جاتی۔

پادلو! اہم پادلو! اہم پادلو

مر گیا طوطا ہمارا سر کیا!

مٹی جو نام کو بند کرنے والوں کے اصرار سے نام

"دیکھ مجھے جھوم کیا بند کیا کورہیں" کن پھول کاٹو!

جائے کون کون ہی راتوں قتل کا دامن تھا مٹی رہی!

جائے آئی اولاد احمد نے قہار لگائی:

چائے آئی چائے آئی

دنگے بھاء کی چائے آئی

4

آچار یہ بھانجے راتوں سے سگریٹ سلکا ڈاؤر کشے کر نکلتا ہے رہے۔

"دوہلی بند ہے کوئی آج اسے قریب آ جاؤ؟"

"چاندنی دھپ لگئی" ہم چاندنی سو گئے۔۔۔ "اولاد احمد کی قہار!

ہم نے تو ہر طرح کے بھول بار میں ہر دے گئے۔۔۔" دارے مصوم کی تان۔

قف۔ پتال کا!

رو کر جے کر جے علی جہاں کو جانے کیا خیال آیا کساٹھ کر چلے گئے۔

جانے سے پہلے جیب سے نکال کر پراس کا نوٹ چوکی پر رکھ دیا۔ شیشے کے بھر دینے کے بجائے۔

اسے میں پتال آیا اور چپکے سے نوٹ اٹھا کر دھو گیا رو۔

اولا داسہ نے اسے نوٹ اٹھاتے دیکھ لیا تھا۔

رو کر واپس آیا تو اولا داسہ نے پتال کی شکایت کی۔

"وہ نوٹ تو اسی کے لیے تھا۔" رو کر مسکرایا۔

روحانی نے خبر لایا کہ دولت خاں نے کام روپ اور بن بھول کے لیے دونوں وقت کھانے کا انتظام کر دیا سہارا زور سے توراں میں۔

"نوٹ حاصل کرنے کا کیا اھنٹہ؟" دارے مصوم ہنس پڑا۔

"آج قہقے کو بکھڑائی لگ گئی ا۔۔۔۔" اولا داسہ گنگنا رہے۔

5

کاگل بڑا بے رحم تھا، ہلال صوفی کا سر کاٹ کر لے گیا اور دھڑ بھڑائیوں میں پھپھایا۔

سوال پوچھو جواب دیں گے۔

"اقل باحق صوفی مصوم کا" اولا داسہ کی تھاپ۔

اور اسی بھول یہ رنگ لائی۔

اب کہاں وہ کھڑا کھاتا!

پرندوں کا اسپتال۔۔۔۔ کارواں سرائے کی شان۔

اسپتال کی کئی عمارت پر دولت خاں نے دولت لٹھار کی۔

سودا گھر سے تنہا کاٹا لگ۔۔۔۔ دولت خان۔۔۔۔ بک لینڈ پر بس کا بھی وہی ہر ہر ٹیٹر۔

تنگا۔۔۔۔ بک کے نام

پر بس۔۔۔۔ چھوٹے بھائی کے نام

اصل بنیاد تو عقیدت ہے۔۔۔۔ بک یا بھائی کی حقیقت ہے۔

سودا گھر سے تنہا بک کی فلم "لوگ کہتے ہیں۔"

مر گئے کھو گئے ہاتھ رہے۔

الفاظ لوریوں۔۔۔ دودھ بھری کٹوریوں۔۔۔

روحوت کا ایک نام۔۔۔ چاندنی کی لگام۔

کارواں سرائے پر تل جوام نام کی چھاپ۔ اس کی وہ کان کارواں سرائے کی بچان

6

پلی بھارن سوکے بڑے سے پر پانی ذاتی رہی۔

ہرے سے بچے آگے۔

خواب میں ہم اپنے ہی جنازے کے ساتھ چلتے رہے۔

ہیں خواب میں بنوڑ ہو جاگے ہیں خواب میں!

پتالال کے دماغ پر سوار۔۔۔ بن بھول۔

دودھوتی کے کنارے موجود ہوتا جب بن بھول دھوتی سے نہا کر نکلتی۔

اس نے بیٹھے ہوئے بالوں سے جو بھٹکا پانی

بھوم کے آئی گھٹا ' ٹوٹ کے بوسا پانی

"میں نے بڑوں میں گھسکر دیا ہے جتنے کو دے گھسکر دیوں۔" ہانچ شروع کرنے سے پہلے بن بھول کا اپنے انگوڑیوں سے بکری

نویں۔

دلت خاں۔ چوٹی بار لوک سبھ کا انتخاب جیت گیا۔

طی جوام کی اور بات۔

آنکھوں ہی آنکھوں میں سب کا احترام

جو سہارک دو ملی جو دو نام

نکھر کدھر چے جس میں مل کر بھٹل جیتی اس کا نام۔

لال صوفی کا سرکات کرے گیا پتیارا

آج تک اس کا پھول مل پاؤ

پرندوں کا چہال۔۔۔ اس کی بچی یادگار۔ وہ جب تک زندہ رہا یہ بھول پر جان چکر تھا رہا۔

مارا گیا لال صوفی۔۔۔ جو غزوت کے خلاف لڑا رہا۔

دوہنی دوہنی تو گھر کو جا
تیری ماں نے گھر نکال!

7

آج حرار گل شہید پر قوالی کی رات ہے۔

اپنا دل صوفی۔۔۔ کا رداں سراسے کا گل شہید

یاد رہے گا اس کا قطر

وہ ہندو ہوں کہ مسلم ایک ہی مٹی کے برتن ہیں

کوئی ہیں شیخ ہی ان میں ' کوئی ان میں برہمن ہیں

دائیں دھماکا اور چپل بائیں بادلا دھماکا اور دھڑے مصوم۔

چٹ میں آ جا یہ بھادوی۔

چپ کیوں ہو گئے؟ جو آپ دو۔

علی جو نام کیوں نہ آ جا مارے ساتھ؟

دھڑکی دوکان سے چل کر وہ جنگم پل سے گزرے۔ دائیں بھڑکی پونہا میں چڑ لکھا کالونی۔

بارہ دردی سے ہو کر عید کا مارگ پر پلٹے پلٹے کتاب گل کو بیچے پھوڑا۔

پھسل ہستی سے آ کے حرار گل شہید۔

شیطان طوقا بنی کنڈ لکھا ہاں۔ ہم قریان!

ان کا بھین؟ حساس کہ یہاں نہ کوئی دوست ہے نہ دشمن۔ خدا نہ نہ بھکاری خدائی اور داسی کے بچ کوئی دھماکا!

جہاں ڈنڈ ہیں ہمارا گھرا

اب وہ نہ ماننا کہاں کہ سونا اچھا لگتے جاؤ۔

اولا دھماکا کی یہی شکایت کہ اس کا سوا ہی بھڑکے خدا ہے۔

بھوئی قسم کون کسائے۔

دارے مصوم کہہ دیا تھا کہ گل ہمارا دس نوک لور ہی چلی آئیں۔

آچار یہ مہادیو بولے:

”اگر مس ڈکس کو کو بھی فرصت دیتی تو کل وہاں ہی چلی آتی۔“

ہر طرف جنگل غلغلے کا

وسل ہو چکا وہاں ہو چار ب!

ہم قریبان!

ساتھ آ کر آن درمیان!

سب نے کہا کرکیز بے بد لے!

قوالی کی راست!

سازوں کی ہم آہنگی ہی سچیت کی پہلی منزل ہے!

اس وقت کی گردش یاد کرنا جب ساز ملائے جاتے ہیں!

دارت مصوم اور اولاد احمد یہ دیکھ کر مصوم اٹھے کہ اتنا اس گوسواہی پہلے سے محفل میں موجود ہیں۔

مٹی میں گلاب کی سگندھ۔

آچار یہ مہادیو نے ہاتھ جوڑ کر اتنا اس گوسواہی کو پر نام کیا۔

جائے کون ہی ان پر بھی پھیلی ہو بھی جا رہی تھی۔

ڈھنڈے بکھر اور حصار
اتھارے میں کاروبار

اپنے تو ہیں سو سو بار
دل کی دنیا بہت اندھیری

اچانک درگاہ کے اندر ایک آدی آکر چلائے

”فدا شروع ہو گیا“

بکھرے ہال گندھے کھانسی سر پہ لہان۔

چیتے جلاتے وہ گر چا۔

قوالی کی محفل در ہم بر ہم۔

اب کیا ہوگا؟

طیش اور درمیان کا کھٹک پھندہ تھا۔

اولاد احمد اور دارت مصوم بولے:

”چلو آچار یہ مہادیو! اب بھاگ ملیں۔“

وہ چلتے رہے مگر تے پڑتے چلتے رہے۔

افزاتفری وحشت قم کا پہاڑ۔

بلند عمارتیں آگ کی تار۔

گھیاں اہل ہان۔

کالی سڑکیں سرخ ہو گئیں۔

راچیوں لاشوں سے پہلے گئیں۔

اپنی ہی دوکان کی سیڑھیوں پر مارا گیا طلی جوا نام۔

سفید گھوڑے کا کالا شمسوار

اُس کے آنسو پلپ کرتے رہے۔۔۔ گھوڑے کی ایال ہ!

آنسو پلپ کرتے رہے مگر تے رہے!

مارا گیا طلی جوا نام:

ایک ہاتھ میں موٹی دوسرے میں دھاکا!-----



شفیق الرحمن

نام	شفیق الرحمن
لقب نام	شفیق الرحمن
پیدائش	۹ نومبر ۱۹۳۰ء مقام کاغور ضلع روجک مشرقی پنجاب
وفات	۱۹ مارچ ۲۰۰۰ء مقام راولپنڈی
تعلیم	ایم۔ بی۔ بی۔ ایس (پنجاب) 'ا' ڈی۔ بی۔ ایچ (انٹرمیڈیٹ) ڈی۔ لی۔ ایم۔ ایچ (انڈین) فیلو آف کالج آف ٹریڈر ایڈمرجنٹ (پاکستان)
	۱۹۳۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کاغور سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کیا۔ آزادی کے بعد آپ کو پاکستان آدمی کی طرف سے انٹرمیڈیٹ اور انڈین یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بھیج دیا گیا۔ دو برس وہاں رہ کر ڈی۔ لی۔ ایچ اور ڈی۔ لی۔ ایم ایچ کے ایڈوائس کر دیے۔

مختصر حالات زندگی:

آپ کے والد کا نام عبدالرحمن خان تھو شفیق الرحمن کا بچپن ہی۔ بی۔ (بھارت) میں گزارا۔ کنگ ایڈورڈ کالج 'ا' گور میں زمانہ طالب علمی کے دوران ڈراما کلب کے سیکرٹری اور کالج ٹیچر کے ایڈیٹر (۱۹۳۲ء-۱۹۳۶ء) رہے۔ انہیں اور جوائی میں سیر و سیاحت 'کرکٹ' ہاکنگ اور سیراکی میں مشغول کی حد تک دلچسپی رہی۔ کارٹون نگاری، مسعودی اور فوٹو گرافی کے علاوہ اس کے علاوہ تھے۔

۱۹۳۲ء میں ساڑھے آٹیس برس کی عمر میں ایم۔ بی۔ لی۔ ایس کرنے کے بعد صحیح ہسپتال کا گور میں چند ماہ اس سبب کیا اور اسی سال ایڈمنسٹریٹو میڈیکل سروس میں چلے گئے۔ دوسری جنگ عظیم میں مختلف محاذوں پہلا دست کرنے اور کئی سال کتبہ پکھنے کا موقع ملا۔ ۱۹۴۷ء میں آپ کی تہذیبی پاکستان آدمی میڈیکل گور میں ہو گئی اور حکومت کی طرف سے آپ کو پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے سلسلے میں برطانیہ بھیج دیا گیا۔ پانچ برس

کے لیے آپ کوڑی فون سے بھری میں منتقل کر دیا گیا، جہاں سے ستمبر ۱۹۷۹ء میں سرجن ریٹائرمنٹ کے ریک سے بطور ڈائریکٹر ریٹائر ہو گئے۔ سرسبز ریٹائر ہوئے۔ دسمبر ۱۹۸۰ء میں آپ کو اکادمی ادبیات پاکستان کا چیئرمین مقرر کر دیا گیا جہاں سے دسمبر ۱۹۸۶ء میں مدت طوالت سے مست قدم ہو جانے کے بعد اولیٰ پٹری میں دوبارہ ڈرامہ نگاری گزری۔ آپ کی شخصیت اور فن سے حلق کام کرنے پر جوسف ساجد کو جاسٹس ایچیدر آباد دکن نے ایم۔ فل (ادب) کی ڈگری سے نوازا۔ ۱۹۸۹ء مارچ ۲۰۰۰ء کو قلمی قبرستان راولپنڈی میں آسودہ خاک ہوئے۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ "کرشم" (افسانے) مکتبہ اردو لاہور: طبع اول ۱۹۳۲ء
اس کتابچے کا چارے کتاب اقبال دہلی نے لکھا ہے۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن مکتبہ جدید دہلی نے ۱۹۵۲ء میں شائع ہو۔
- ۲۔ "شکوے" (افسانے) مکتبہ اردو لاہور: طبع اول ۱۹۳۳ء
- ۳۔ "کرمیں" (افسانے) نہیں: ایڈیٹیو میڈر آباد دکن طبع اول ۱۹۳۳ء
اس کتاب مکتبہ میری لاہور کی لاہور نے بھی شائع کی ہے۔ ۱۹۳۳ء میں ایک ایڈیشن ادارہ اشاعت اردو میڈر آباد دکن نے شائع کیا۔
- ۴۔ "عہ جزا" (افسانے) امرتالیکٹرک پریس لاہور طبع اول ۱۹۳۳ء
- ۵۔ "چراغ" (افسانے) مکتبہ اردو لاہور: طبع اول ۱۹۳۵ء
اس کتاب کا ایک ایڈیشن مکتبہ میری لاہور کی لاہور نے بھی شائع کیا ہے جبکہ مکتبہ جدید دہلی نے اس کا ایک ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں لکھا۔
- ۶۔ "ہنگ اور خدا کا مسئلہ" (مباحثات) نہیں: ایڈیٹیو میڈر آباد دکن طبع اول ۱۹۳۳ء
- ۷۔ "بچتے ہوئے" (افسانے) مکتبہ اردو لاہور: طبع اول ۱۹۳۶ء
سوائس انسانوں کے اس مجموعے کو ادبی دنیا اردو بازار دہلی نے بھی شائع کیا۔
- ۸۔ "معاشرتی" (افسانے) مکتبہ اردو لاہور: طبع اول ۱۹۳۷ء
اس کتاب کا ایک ایڈیشن مکتبہ میری لاہور کی لاہور نے بھی شائع کیا ہے۔
- ۹۔ "مربعہ معاشرتی" (افسانے) مکتبہ میری لاہور: طبع اول ۱۹۵۳ء
اس کتاب کا ایک ایڈیشن مکتبہ اردو بازار دہلی نے بھی شائع کیا ہے۔
- ۱۰۔ "سے شکوے" (افسانوں کا انتخاب) ہندو پاکٹ بکس دہلی طبع اول س۔ ب۔
- ۱۱۔ "رجل" (ناول) غالب پبلیشرز لاہور طبع اول ۱۹۸۰ء

۱۲۔ ”سوشل وائرلٹی صحت“ (انٹرنیٹ پر ایچ کا ترجمہ) مقبول اکیڈمی لاہور

”YOUR COMMUNITY MENTAL HEALTH“ کا ترجمہ ہے۔

۱۳۔ ”انسانی تھنٹا“ (انڈل ازولیم سروپاں ترجمہ) مکتبہ جدید لاہور طبع اڈل ۱۹۵۶ء

یہ کتاب ہنسٹر فرینکلن نے پارک کے قتلوں سے شائع ہوئی۔ جوں ”THE HUMAN COMEDY“ کا ترجمہ ہے۔

۱۴۔ ”آپ کا آپ بیتی“ (جمالی کا کتابچہ تراجم نام تکمیل مقبول اکیڈمی لاہور طبع اڈل ۱۹۶۵ء

یہ کل ۳۳ صفحات کا کتابچہ ہے۔

۱۵۔ ”طبی تحقیق آپ کو بہک امراض سے بچا سکتا ہے“ مکتبہ اردو لاہور (طب کا کتابچہ) طبع اڈل ۱۹۶۳ء

از گجربت کانت کا ترجمہ یہ کل ۶۶ صفحات کا کتابچہ ہے۔

۱۶۔ ”کیا میرا بچہ عورت پیدا ہوگا؟“ مقبول اکیڈمی لاہور (طب کا کتابچہ) از جہان گوشت کا ترجمہ طبع اڈل ۱۹۶۳ء

یہ کل ۶۶ صفحات کا کتابچہ ہے۔

۱۷۔ ”دورس زندگی“ (ساجیات) طبع غلام علی ایڈ سنٹر لاہور طبع اڈل ۱۹۶۵ء

پطرس بخاری و ایڈورڈ مروکی کتاب کا ترجمہ با شراک عبدالمجید شاہک مکمل ۱۹۸ صفحات کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

۱۸۔ ”کافی امراض اور ان کا علاج“ (ترجمہ) مقبول اکیڈمی لاہور طبع اڈل

(نوٹ) شکیل الرحمن کے افسانوں اور مضامین سے متعلق معروف کتب کے موجودہ ناشر غائب پبشر ذمین آباد لاہور ہیں۔

۱۹۔ ”شکاری اور صحت“ (بچوں کے لیے) طبع غلام علی ایڈ سنٹر لاہور طبع دہلی ۲۰۰۷ء

تیسرے قسط:

کم از کم دو مجموعوں کا سوار (الفاظ کے مطابق) از پر ترتیب ہے۔

وقاات سے قبل مستقل پتا:

۱۔ ۲۶۔ پتھر سٹریٹ ۶، اردو پبشری، پاکستان۔

۲۔ معرفت۔ ایچ رٹن ایڈ کٹنی۔ ہارون آباد، ضلع بہاولنگر پاکستان

اعزاز:

۱۔ بلال قتیاز (طبری)

نظریہ فن:

”ہر خود پرستی اور جن حالات میں دوسروں کو دیکھا دیکھو ہے۔“

(حوالہ مکتوب، نامہ روز امارت، یکم ستمبر ۱۹۸۴ء)



حوالہ جات:

۱۔ پتھر ”ستاروں کی شکل“ سرحد شری

۹۹ ناٹ آؤٹ

شفیق الرحمن

بڑی مشکوں سے ہم نے دو ٹکی پیتا میں کہنے کہ ہارے ہارے بچے۔ سب سے زیادہ اسکو حضور گھوڑے کا تھا۔ اس نے صبح سے کھانا شروع کیا۔ کوئی مشرک ایسا نہ تھا جو اس نے نہ کھایا ہو۔ بلارڈ کو طب سزا دی اور دو گھنٹے کے بعد تھوڑا نہا۔ اس کے بعد جواہیل اگیل کر کھیا ہے تو اوپر تک نہیں سے اس تک اسکو پہنچا دیا۔ چلنے کے بعد وہ بے حد تھک گیا۔ آگے بڑھ کر وہ نہیں لگا نہیں کہ پانچ روز کا اضافی اور کر دیا۔ جب ہم شام کو رہیں کر بیٹے اور آخری کھڑی نے آخری سٹ کی تو حضور گھوڑا میں روز بچا چکا تھا۔

ہمارے مخالف بھی کافی گئے تھے تھے وہ بھی اسی طرح کھیلے تھے۔ ان کی بانگ کا یہ حال تھا کہ گیارہ کھڑیوں میں سے اس نے بانگ کی جھکی اور گیارہواں وکت کچھڑا اور مجھڑا اور خدا بھی حسب توقع مدد کرتا۔ کھیل دیکھنے والوں کا یہ حلقہ فیصلہ تھا کہ دونوں میں کو چار فیصلہ ہے کہ کھیل ہارنا چاہیے بلکہ یہ خطرہ ہے کہ کھیل جیت جائیں۔

میں حضور گھوڑے کو لے کر شیطان کے ہوشل میں پہنچا ان کے کمرے میں مدھم روشنی میں ایک بڑے سے چنگ پر چتر حضرت رضا نیاں اوڑھے کھانا کھا رہے تھے۔ شیطان بولے ”سروئی زیادہ ہے اور ہم جھگڑے ہوئے ہیں۔“ انہوں نے ہمارے لئے رضائی مشکوئی اور ہم بھی کھانے میں شریک ہو گئے۔ حضور گھوڑے نے پچھا۔ ”رونی صاحب آپ کیسے ہیں؟“

شیطان بولے۔ ”میں مشغول خدا تعالیٰ کی بھرت ہوں اور طرہ دعائیت آپ کی خداوند کریم سے نیک مطلوب ہوں۔ دیکھا حوالہ یہ ہے کہ میں شکر دست ہوں۔“

میں نے پکھڑے شو کے لئے کہا اور پچھا کہ ”اب کیا ہوا گا؟“

شیطان گھڑی دیکھ کر بولے ”بھرات ہے۔“

اپنے سینما میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ ”شیطان بولے۔“ ایک گھنٹے کا کیا ہے اس منٹ میں گزرا جائے گا۔ آج سینما اسی طرح چلیں

کے ۹۹۹ رضا نیاں اوڑھ کر اور نوکر حق ساتھ لے کر چلے گا۔

بڑی ہنست ہوئی۔ قصود گھوڑا ہوا۔ ”میں تو بھی مشورہ دوں گا کہ رضا نیاں اوڑھ کر نہ چلیں بلکہ۔۔۔“

شیطان جلدی سے بولے۔ ”میں آپ کو بھی مشورہ دوں گا کہ آپ مجھے مشورہ نہ دیں۔ آج رضا نیاں اوڑھ کر ہی چلا ہو گا سرمدی بہت ہے۔“

”اور کوٹ ہوکن لو۔“ میں نے کہا۔

”یہ اور کوٹ کھلتا ایسا ہے کہ اسے ہوکن کر اور زیادہ سردی لگتی ہے۔“

”یہ وہی اور کوٹ تو نہیں جسے الما پیا گیا تھا؟“

”ہاں ادنیٰ ہے اچھلے سے الما پیا گیا تھا پھر سیدھا کر لایا گیا ہے لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔“

”یہ واقعی بہت اچھا ہے۔“ کسی نے کہا۔

شیطان نے نوکر سے پوچھا۔ ”کیوں ایہ باب کتنے ہارس پاور کا لائے ہو؟“

اس غریب نے باب کی ہارس پاور بتادی۔

شیطان بولے۔ ”آج بجلی ہی بہت کم آ رہی ہے۔“

شیطان پچھلے وقت اپنی ٹیک۔ ڈسٹرنے لگے۔ کسی نے بتایا کہ ایک ٹیک توان کی ناک پر رکھی ہے۔

بولے۔ ”آج کل میرے ہاس ٹین ٹیکس ہیں۔ ایک دور کی چیز دیکھنے کے لیے دوسری نزدیک کی چیزیں دیکھنے کے لیے۔۔۔ اور

تیسری ان دونوں کو ڈسٹرنے کے لیے۔“

میں بھی سوچ رہا تھا کہ اگر ج صاحب کے کتبے میں سے کسی نے مجھے دیکھ لیا تو کیا کہیں گے۔۔۔ ڈرامی ادب میں ہم خطی سڑک پر

رضا نیاں اوڑھے جا رہے تھے اور مارے پیچھے نوکر کھاتے رہا تھا۔

سینا پیچھے۔ وہاں اتنی سے میری ٹکاور ج صاحب کی موٹر پر جا پہنچی۔ میں نے اندر جاتے وقت اپنی رضا نیاں تو قصود گھوڑے کے اوپر

بٹنگی اور شیطان کی خطر پہا کر اور جا بیٹھا۔ پیچھے سڑک پر دو ٹیکتا ہوں تو ج صاحب بیٹھے تھے۔ میں بالکل سیٹ میں دھنس گیا کہ کہیں خطر نہ آ جاؤں۔

مگر ڈرامی ادب میں ٹھکی میرے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے پیچھے ہٹا پڑا مجھے ٹھکی کی سیٹ ملی۔ ج صاحب نے پہلے تو میرے آنے کی شکایت کی۔

میں نے اطمینان کا بیان نہ کیا۔

پھر بولے۔ ”تمہارے ساتھ دو خواتین کون تھیں؟“

”کون سی خواتین؟“

”ابھی ابھی جو تمہارے ساتھ تھیں۔ وہ جو سامنے بیٹھی ہیں۔“ انہوں نے شیطان وغیرہ کی طرف اشارہ کیا جو بھٹی لی رہے تھے۔

”اگرے ادا حول دلا تو آ رہی خواتین تو حق بی رہی ہیں“ وہ جگ کر بولے۔

”کی نہیں۔۔۔ یہ تو اچھے نہیں ہیں۔۔۔ بکھار رہی ہیں۔“

میں جو کہہ رہا ہوں کہ خواتین ہیں۔ لفظ خدا کا۔۔۔ مستورات کو کھ پیتے میں آج بجلی مر رہا ہے کہ ہاں۔۔۔“

میں نے کن انھیں سے دیکھا کہ کیا جو کن انھیں سے لکھے دیکھ رہی تھی۔ ان دنوں ادھی گھڑے روٹھی ہوئی تھی اور میں کافی بیڑا تھا۔ شیطان مجھ سے بیڑا رہے۔ بار بار وہ بلی کہنے کہ

"مہاں انکر کوئی نہیں لڑا کی اچھے سے نکل جائے تو ذرا نظر نہیں کرنا چاہیے۔۔۔ دوسری اچھی آتی ہوگی۔"

ان دنوں میں بھڑا اسے مٹانے کی کوشش کرتا تھا وہ اور دھڑھ بھڑا۔ وہ لکھنے کی جگہ تھی ایک لڑکی جو شخص میں مہری پانڈو تھی۔ اس کا نام تو بکھو اور تھا لیکن سب اسے بیک کہا کرتے۔ اس کے خدو خال میں سب سے نمایاں چیز اس کی بیک تھی۔ بڑی لمبی چوڑی اور ذلی بیک۔ اگر میں دیکھتا تو ہرگز بیک نہ ہوتا۔ سبھی نے میں چند مرتبہ لکھنے دیکھا اور مجھ سے کہہ دیا پھر ایک شام کو بیک نے کہا کہ "میرے ذیلی شام کی مریں سے گز رہے ہیں مجھے اٹھٹن پر لے چلیے"

اس کے پاس سا بیکل نہیں تھی اور زمین میں بہت تھوڑا وقت تھا۔ میں اسے لے کر لکھ رہی تھا کہ دیکھو اور حکومت آج نہیں۔ اور مراٹھن پر ہمیں ایک لہجہ ہی کرخت قسم کے دادا ریش بزرگ ملے انھیں ہرگز ذیلی نہیں کہا جاسکتا تھا۔

میرا اور شیطان کا امتحان ذریعہ تھا اس لیے ہم دونوں بیچ صاحب کے ہاں سے ہوشوں میں چلے آئے تھے۔ ان دنوں بیچ صاحب بڑی سرعت سے گولیاں بدل رہے تھے شیطان جب بھی ان سے ملنے گیا پوچھنے کہ آج کل آپ کہاں رہتے ہیں۔

ان کی پہلی کوٹھی میں ہمارے رہتے ہوئے چوری ہوئی۔ بیچ کے ہاں چوری یا بیچ کا پتہ چلا کہ دات کو چوری ہوئی لیکن سب چیزیں جوں کی توں جیسے پہلے ہی نہ چلتا تھا کہ چھاپا کیا گیا ہے۔ بلی معلوم ہوتا تھا کہ چور گھس بھڑا آئے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ میرے ہمارے کپ جو آگے تھیں پر اور اندار میں ہمارے تھے غائب ہیں۔ خوب چنگیل اور بڑے بڑے کپ تھے۔ وہ کوٹھی وہ جسے بھی سنانا ہی بیک میں۔ ایک مرتبہ سارا کہہ کسی دوسرے شخص میں کیا ہوا تھا۔ میں اور شیطان بیکھو ہو کر کمر سے لڑنے۔ کوٹھی میں بالکل اندر ہوا تھا۔ ہم دوا کو دیکھوئے راستے سے اندر چلے گئے۔ اندر میرے میں آہٹ جانی دیا وہ پاؤں پا کر کہہ کھتے ہیں کہ ایک صاحب جلا کوٹھے کی کوشش فرما رہے تھے۔ جب جلا کھل گیا تو شیطان نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے قہارت سے کہا "یار بڑے شخص کی بات ہے۔"

انہوں نے مجھ کے کوشش کی لیکن ہم نے انہیں نہیں دھانے دیا۔ اندر لے آئے۔ انھیں جانے پانی کی چاہیٹ کھانے گئے۔ پھر کہوں کے حلق پر چھاپا گیا۔ انہوں نے قسم کھائی کہ انہوں نے نہیں چرائے۔ اگر وہ چوری کرتے بھی تو کپ بھی نہ چراتے۔ بعد میں میں معلوم ہوتے تھے۔ ہم نے ہاتھ دیا کہ انھیں رخصت کیا۔ بیچ صاحب نے کوٹھی بدلی "کی کوٹھی میں بلی کی بھگ باگل لکھ رہی تھی پھر وہ تو قہرے چلے گئے" لکھنے کر وہ لکھا چلتا تھا۔ "یاد ہے وہ دھڑا رہتا۔ اور سرعت خانے میں موٹیلی جاتی رہا کرتی۔ پھر جو کوٹھی بدلی تو وہیں میں دن رات تو لیاں ہوتی تھیں۔ جہز بچتے" چلے ہوئے طرفینہ کی طرح ہوتا رہا۔ اب جو ناسکان طاقتور لکھی تھیں کہ اس پاس بے کار لڑکیاں رہتی تھیں۔ شام کو لڑکیاں سکول اور کالج سے واپس آتیں "خوب روٹھی ہوئی۔ شیطان نے اس بیک کا ہم جتا ہوا رکھا۔ پر دگر ہم یہ تھا کہ امتحان ختم ہوتے ہی ہم ہوش چھوڑ کر بیچ صاحب کے ہاں آ جاتے تھے۔

بیچ صاحب بدستور ان خواہشیں کو دیکھ رہے تھے جو حق دیا ہی تھیں۔ دیکھنے اور پنداس اعاد سے رکھا تھا کہ مجھے صرف اس کی ناک کا اور اس صبر نظر آ رہا تھا۔ میرے خیال میں وہ ان تمام ناکوں کے کدو سے حصوں سے حسین تھا جو میں نے آج تک دیکھے تھے۔ حکومت آج مجھے بڑی بری طرح گھور رہی تھی۔۔۔ سنوٹھی۔۔۔ ایک شخص اندر چری رات میں خیر کا لکھ بکھیلنے ایک بہت ڈراؤنے اور تاریک جنگل میں گیا۔ پھر

ہوا ہرے۔۔۔ اچھا ایک اور کہانی سنو۔۔۔ سنو۔۔۔ دوپہتے کے شکاری اور ایک چچا۔۔۔ چچا۔۔۔ ننھی باقاعدہ ارگٹی۔

پتلے وقت جج صاحب نے وہہر کیا کہ وہ ہمارا گھوٹا دیکھنے ضرور آئیں گے۔

ہمارے کلب کے کچان گیدی صاحب تھے۔ ان کا اصل نام زیدی، مہدی یا کچھ ایسی قسم کا تھا۔ ان کا قد بہت چھوٹا تھا۔ اور بھول شیطان کے وہ سٹخ مسدود سے سارے چار فٹ بلند تھے۔ ان کے ساتھ ہر وقت ان کے دو منبر ہوتے، اتفاق سے جو کافی راز قد تھے۔ گیدی صاحب ان کے درمیان میں پتلے شیطان نے ان تینوں کا نام ایک سواپک "۱۰۱" رکھا ہوا تھا۔ ان کے قدوں کے مطابق۔

نیم کی انتہائی کینٹی گئی تھی جو ایک منبر پر مشعل تھی۔ گیدی صاحب پر ایڈی گئی تھی ہمارے کلب کا منبر تھا۔ امریکہ وہیں ہل کھتا رہا تھا۔ کرکٹ بھی وہیں ہال کی طرح کھیلتا تھا۔ ہمارے کلب کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہم لگا دو تین بج کر فائل کھیلتے والے تھے۔

سپر کوئم پر کینس کے لیے آئی۔ گیدی صاحب بچ کے لیے چنگ کی تریب، چنے لگے۔ شروع میں وہ اور مقصود کھڑا اساتو میں پر بڑی آغوشیں پرش اور ٹوہیں پر شیطان۔ حساب لگانے کے بعد جب شیطان کو معلوم ہوا کہ وہ گیارہواں کھڑا ڈی میں تو یکل گئے۔ گیدی صاحب سے بولے۔ "مجھے گیارہواں کیوں بھیجا جا رہا ہے؟"

"اس لیے کہ کوئی بار ہواں نہیں ہوتا۔" جواب دے۔ "کچان بیشک اندازہ لگا سکتا ہے۔ اس کا نظریہ پیش درست ہوتا ہے۔"

شیطان بولے۔ "ہر شخص کے دو نظریے ہوتے ہیں۔ اس کا اپنی نظریہ۔ اور خدا نظریہ۔"

معصیت یہ تھی کہ شیطان نہ ہار تھے نہ فتحیں نہ شکست کبہہ اور ان کا دعویٰ تھا کہ آپ اعلیٰ درجے کی کم میں چانچ بہترین شخصیں ہونے چاہئیں چار بہترین ہار ایک، چھوڑا کٹ کبہہ ہوا ایک، روٹی۔ ویسے گریبا ہر جگہ میں شیطان کا سکھو صفر ہوتا۔

ہر روز جب شرف سے سورج لگتا ہے تو کلیاں کل کل پھول بن جاتی ہیں۔ تھلیاں چاک اٹھتی ہیں پر نہ بے چھانے کھتے ہیں۔ ہر روز سورج اڑنے وقت آسمان گھالی ہو جاتا ہے۔ چاندی رات میں ایک عجیب سا موس آسمان سے زمین تک چھا جاتا ہے۔ لیکن حکومت آپا کو ان باتوں کا مطلب نہ تھا۔

جب ہم جج صاحب کی کوٹھی میں پہنچے تو جب سہا سہاں تھا۔ اگلے ہوئے سورج کی آخری شعاعیں انہوں اور چوں پر دھاس تھیں۔ باغیچے میں ایک فوارہ جل رہا تھا۔ گلاب کے سرخ پھولوں نے جیسے آگ سی لگا رکھی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ بکا رہا۔ کیونکہ نزدیک ہی حکومت آپا ننھی تھیں۔

حکومت آپا مجھ سے تھا اس لیے ہو گئی کہ جب وہ موتی ہو گئی تھیں تو میں نے ان کو رہا ہونے کا مناسب لٹو نہیں بتایا۔ میں نے فائدہ ننھی جمجوج کی۔ اولو لیں۔۔۔ "ننھی کوئی کسانے کی ایسا جمجوج تھا؟ جس سے دلی ہو جاؤں۔"

بڑی مصیبتوں کے بعد میں نے ان کا بچہ چھڑایا ایک روز جا کر دیکھا ہوں تو وہ چائے پر چاڑ کھارہی تھی۔۔۔ اور میں نے ان کا بچہ بھر شروع کر دیا۔

شیطان کا خیال تھا کہ وہ صبح خام کلان کا کرتی ہیں اور باتیں کرتے وقت وہ کینٹی کچھ ہیں ان کی لگائیں کہیں اور ہوتی ہیں اور وہاں کسی اور طرف اور باتوں کا مطلب دیکھا رہتا ہے۔

میں نے کچھ کر دیا منکر نہیں۔۔۔ اور سورج غروب ہو گیا۔

کہانے کے بعد مجھے یونہی خیال آیا کہ شیطان اور حکومت آپادری سے غائب ہیں۔ تلاش کرنے پر دیکھا ہوں کہ دونوں فوارے کے پاس بیٹھے ہیں اور وہاں انجیز کھنگو ہو رہی تھی۔ میں چھپ کر سننے لگا۔

شیطان بولے: ”کچ کچ تم بہت چارنی معلوم ہو رہی ہو۔“

حکومت آپا بولیں: ”کچ کچ میرے پاس اس وقت روپے نہیں ہیں اور نہ ضرور قرضہ دے دیجیے۔“

شیطان بولے: ”یقیناً ان چند کھنڈوں میں تمہاری دھگت گھرا آئی ہے۔ جب تم لوگوں میں آئیں تو تمہاری بخون بدلی ہوئی تھی۔“

”نہ پہ کون مانگتا ہے تم سے۔۔۔ بھلا ایسی رومان پرور لفظا میں جہاں باغ کا ایک تھا گوشہ نور، جہاں رہا ہونا نہ فی کاشکی ہوئی بھو اور تم مائے ہونہاں، درمیانوں کا کیسے خیال آ سکتا ہے۔ وہاں تو ایک مسمومی آرزو دل میں کر دیت لیجئے گیتی ہے۔“

”کچ کچ“ حکومت آپا شرما گئیں۔

”ہاں کچ کچ“

”بھلا اس وقت آپ کو کس چیز کی آرزو ہے۔“

”کھورو فارم کی“ شیطان بولے ”اور جانتی ہو حکومت کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟“

”کون ہے؟“

”آئینہ اور انسانی انسان آئینہ کو بھی دھمکا دے جاتے ہیں۔ آئینہ کہو کہے نہ ایک نہیں سنتے ان میں سے ایک تم ہوا۔“

اب حکومت آپا کہہ کر نہ گئیں۔ شیطان جلدی سے بولے ”نہیں یہ بات نہیں ہے۔۔۔ یوں ہی مرنے سے نکل گیا تھا۔“

بھر رو مانی باتیں ہونے لگیں۔ حکومت آپا بولیں۔ ”رو مانی ادب میں تمہاری محبوب کتاب کو لپی ہے؟“

”ڈاکٹرنری“ شیطان نے جواب دیا۔

حکومت آپا شیطان کے چہرے کو فور سے دیکھتی ہیں بھر بولیں۔ ”تمہاری ناک اتلی لپی کیوں ہے؟“

”شیطان نے ایک آہ بھری اور بولے۔ کیا تاؤں ناک لپی کیوں ہے یہ نظرت کے راز ہیں۔ تم ہی تاؤ کہ تمہارا تھا ہر کو کیوں لگا

ہوا ہے۔ تمہارے کان مزے ہوئے کیوں ہیں“ تمہارے دانت خرگوش کے احوال کی طرح کیوں ہیں۔ حکومت تم ان استیوں میں سے ہو جن

سے آ کر ہمت پر چھا جانے تو گھڑی بھانے کا طریقہ بتا دیں۔ تم ان صحرا توڑوں کی طرح ہو جو آج یہاں ہیں اور کل بھی نہیں ہیں۔

آج سے پانچ سال پہلے سب کہتے تھے کہ اس لڑکی کا مستقبل نہایت شاندار ہے اور اب سب کہتے ہیں کہ اس لڑکی کا ماضی واقعی لا جواب ہو گا۔“

اب تو ہاتھ دلائی شروع ہو گئی اور مجھے بھی شامل ہونا پڑا۔ دکانی بے میں نے رضیہ کی بے رخی کا ذکر کیا۔ وہ غصے کی جھجکتائی اور یہ بھی بتایا کہ اسی لیے میں نے ٹیک سے ملنا جتنا چھوڑ دیا ہے۔

شیطان بولے۔ ”اگر میں تمہاری جگہ ہوں تو ٹیک کو ہر وقت سانگیں پر بٹھائے بھڑوں اور رضیہ کے گھر کے سامنے سے ہر روز اور چراہ

گزارا کروں تاکہ وہ اچھی طرح دیکھ لے۔ یہ دھوکا دھنا سب درست ہو جائے۔ میری مافوق آج سے تم بھی رضیہ سے دوپٹہ ہٹا کر ٹیک کے

ساتھ ٹوپ ٹھیلیں کرو اور بھر وقت کا قاشاؤ کھو۔“

میں نے ان کو پتا خواب سنایا۔ ”اگل رات میں نے خواب میں دیکھا کہ رضیہ نے آسانی دو پٹا ڈنڈہ رکھا ہے جس میں نمبر سے تارے

ہیں اور وہ پہلی بار جھک جھک کر رہا ہے۔ اس کے ہاتھوں پر مسکراہٹ ہے اور ہاتھوں میں رنگ برنگے بھولوں کا گلدستہ ہے۔"

"تو بتاؤ آج کل خواب بھی لگتی تھیں دیکھتے ہیں۔ سب سے اچھا خواب جانتے ہو کیا ہے؟"

"سہیا۔"

"نہی کوئی خواب نہ آئے۔"

میں نے ان کو تاپا کر "بپ سے رنجیدہ لگتی ہے میں تجا سار جتا ہوں اور میں محبت میں خوش نصیب ہرگز نہیں رہا۔"

وہ بولے۔ "محبت میں خوش نصیب صرف ایک قسم کے انسان رہتے ہیں۔۔۔ وہ ہیں سکوارے ا۔۔۔ اور میں اتم اگر اپنے آپ کو تجا محسوس کرتے ہو یا تجا ہی سے ڈرتے ہو تو ہرگز شادی مت کرو۔"

میں نے ایک دو دن شروع کیا۔ وہ بولے۔ "محبت کی پہچان اور حضور تری پہچانی میں تمہیں سنا ہوں۔ سنو۔۔۔ وہ بولا۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گئی؟۔۔۔ وہ بولی نہیں۔۔۔ اور اس کے بعد وہ دونوں ایسی خوش رہنے لگے۔"

ہمارا کل شروع ہوا۔ کچھ چھٹیوں میں اور کچھ جتنا ہارا کا قرب۔ ویسے بھی وہاں چاروں طرف لاتعداد خانقاہیں بزرگ رہتے تھے وہ سب آئے۔ ساتھ ساتھ لڑکیاں آئیں۔ ہمارے کہنا نے حسب معمول ہاس بار اور اتم فیملی کرنے چلے۔ لڑکیوں کی تعداد کا اندازہ میں میدان پہنچ کر ہوا۔ ہر جہر نظر پاتی تھی رنگ برنگے لباسات دکھائی دیتے تھے۔

بڑی بولا۔ "یہاں سے آج آئے" آج مجھے سر تک یاد آ رہا ہے۔"

گیندی صاحب نے پہنچی ہوئی تھی گیند میرے ہاتھوں ہی میں فیملی بھانے لگا۔ شیطان کا سارا تھا کہ ان کو شامیانے کی طرف بھیج دیا جائے گا یا وہ اس لیے کہ وہاں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ تاہاں بھی اور شمسین شامیانے سے روانہ ہوئے۔ ایک صاحب بے حد سونے تھے اور دوسرے بالکل زما سے تھے اور اتم عمر تھی تھی۔ کسی نے تاپا کہ یہ کسی بار جنگ بہادر کے لڑکے ہیں۔ شیطان چونکہ کروٹے "سہیا" کا نام عمر اور اگلی سے ایک بار جنگ بہادر کا لڑکا۔۔۔ کمال ہے۔"

ان سونے دار سے محضرت کا نام قند صاحب تھا۔۔۔ شاید قند و یک ہو گا یا قند صمیں ایہ نام ہمیں یہیں معلوم ہوا کہ جب میری تیسری گیند ان کی قوت سے مٹ کر واکٹ کپڑے کے برابر سے گزری تو بار جنگ بہادر کے صاحبزادے اور میرے چلا کر بولے۔ "قند صاحب وہیں ٹھہرے۔" دوسرے دن میں ہمیں پتہ چلا کہ چھوٹے صاحب کا نام قندو ماں تھا۔ انہوں نے ایک چھوٹی سی بہت لکائی۔ اور میرے قند صاحب چائے۔۔۔ "تو میں وہیں ٹھہرے۔"

وہ رنگ لگی ہوتا ہا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو وہیں ٹھہرے کے لیے کہتے رہے۔ ایک گیند بڑی کے سامنے سے گزری لیکن اس نے ہاتھ تک نہیں ہلا یا۔ معلوم ہوا کہ جناب لڑکیوں کو کچھ رہے تھے۔ مٹ کی ایک باؤڑی ہو گئی۔ قند صاحب نے ایک گیند ہوا میں اٹھادی۔ شیطان اسے غلامی کچ کر سکتے تھے لیکن انہوں نے گیند کی طرف دیکھا تک نہیں۔ کچھ دیر کے بعد معلوم ہوا کہ سوائے بالہ و شمسین کے ہر ایک رنگین لباسوں اور شمسین چروں کو کچھ ہاتھ۔ یہاں تک کہ جب قند صاحب نے واکٹ کے سامنے ٹانگ اڑادی اور میں نے چلا کر اٹھائی کی قوت اسپر چونک پڑے۔۔۔ جیسے ہاک کروٹے۔ "ہیں؟ پھر آہستہ سے کہنے لگے۔" بھی صاف کرنا میرا وہاں تھی اور طرف تھا۔ "یہاں آؤ مجھے خاصے قبرستان بزرگ تھے میں معلوم ہوا ہاتھ کہ ہم ساری عمر ہانگ کرتے رہیں گے اور قند صاحب چلو میں ساری عمر کھیتے رہیں گے۔"

وہنا فقہر صاحب نے ایک گیند آسمان میں چڑھا دی۔ گیند اونچی ہوتی گئی حتیٰ کہ لگا ہوں سے غائب ہو گئی ہم سب آسمان کی طرف ہنس رہے تھے جیسے چاند گیند ہے ہوں۔ پھر ایک چھوٹا سا کھنڈ ٹھکرایا اور ہم سب کھینچ کرنے کے لیے بھاگے۔ دکن کبیر اور قصور کوڈا اسے زور سے نگرانے کو دونوں عارضی طور پر سہ ہوش ہو گئے۔ ہم سب ایک دوسرے کو کھیل رہے تھے۔ ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔ پھر گیندی صاحب لگا رہے۔ "سب جوت ہاؤ یہ کھینچ کر دوں گا۔" گیندی صاحب دونوں ہاتھ یوں پھیلائے کہ گڑے تھے جیسے ہاتھ شیشے کے دھماکے رہے ہوں۔ گیند پندرہ فٹ اونچے سے اتنی شروع ہوئی اور گیندی صاحب نے ہاتھ اور بھی اونچے پھیلا دیئے۔ گیند نیچے آئی۔ لیکن اس کے ہاتھوں میں نہیں۔ شیشے پر گیندی کی قفل تھی۔۔۔ وہ سیدھی ان کے پیٹ پر گئی۔ "پ" سے آواز آئی۔۔۔ گیندا اچلی پھر "پ" سے پیٹ پر گری پھر اچلی گری اور آہستہ سے ان کی گردن پر لڑھکتی ہوئی زمین کی طرف تل دی۔ پھر ریگفت دکن کبیر صاحب جڑا کھینچ بند کیے ہوئے ہوش بڑے تھے پھر نکلا اور کرتی ہوئی گیند کو پھینچ لیا۔

اور فقہر صاحب دھڑام سے گرے اور ہاتھوں کے لیے بیہوش ہو گئے۔ جب وہ ابھیں چارے تھے تو شیطان بولے۔ "فہد اب آپ کے پیچھے یہ میدان خالی خالی ماسطوم ہو گا۔" واقعی فقہر صاحب نہایت مومن تھے۔

اب جو نئے صاحب آئے انہوں نے شیطان کو دیکھا اور ان سے پہلے گئے۔ شیطان نے اب تک کوئی اشتیاقی ظاہر نہیں کیا تھا۔
 "ابو لے۔" آپ گھسے پھانے پھنسے تھے اور وہی جڑا مقرر ہوں۔"

شیطان نے بغور دیکھا اور بولے۔۔۔ "نہنن ہے کہ آپ وہی جڑا ہوں لیکن آخر وہ ہرگز نہیں ہیں نہ پہلے تھے۔"
 "ابو لے۔" میں کچھ دیکھ رہی ہوں۔ نقطہ وہی ہوں۔ نقطہ مبادل گیا ہوں۔ پہلے سے صبر اقد چھوڑا ہو گیا ہے۔"

اب دونوں ہیں کہ باتیں کر رہے ہیں اور ہم سب انتظار کر رہے ہیں۔ آخر وہ پانچو نے نو کا۔ جب جڑا مقرر صاحب نے کھیلنا شروع کیا۔ میری ٹکلی ہی گیند انہوں نے ہوا میں اٹھا دی۔ ایک صاحب کے پاس سے گزری تو انہوں نے دیکھا تک نہیں۔ جب میں نے اس کا نام پکارا جب چہ تک کر انہوں نے گیند اٹھائی اور ادرہ کرم میری طرف پھینک دی۔ اب یہاں تک نویت پہنچ چکی تھی کہ جس نکلاڑی کی طرف گیند جاتی تو اس کا نام لے کر اسے مطلع کیا جاتا۔

جنوں میں اسے گنوم کہتے تھے۔ آگے قصور کوڈا کو چاہا گیا سے داخل ہو کر مراد جسے کھڑا تھا۔ "ہم" سے گیند اس کے پیٹ سے لگی۔ اس نے غور کیا کہ وہ ہیں وہ اپنی۔ جنوں میں آؤت ہو گئے اور انہیں جانے دیکھ کر سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ شیطان دود سے بھاگے بھاگے آئے اور میرے کان میں بولے۔ "وہ جڑا نکلاڑی دیکھ رہے ہو۔۔۔ وہ جنوں میں کی روشہ ماسطوم ہوتی ہیں۔"

گچہ ماسطوم ہوا کہ شیطان دوست کہتے تھے۔ جنوں میں ان دونوں لڑکیوں کے لیے ہونے آئے۔ تعارف ہوا۔ ایک بڑے سے پروفیسر اپنی لڑکیوں سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ ایک ہم جماعت مل گئی۔ رضیہ منہ پیر سے چٹکی تھی۔ میرا بی بی جانتا تھا کہ کنکھن سے سوڑ چہ سولہ لڑکیاں اور بھی آجائیں تاکہ آج اس کے ساتھ خوب چٹکیاں کی جائیں۔

شیطان بولے کہ "یہ جھوم کافی بڑا فانی ماسطوم ہوتا ہے کسی نے ہمارا آؤ کر اف نہیں لیا۔"

گچہ کے بعد گئے اور شیطان کو اڑا دی کہ پھینچا دیا گیا۔ وہاں ہم باتیں کرنے لگے۔ گیندی صاحب نے ناراض ہو کر ہمیں دایکس بلایا اور جنسین کے بالکل قریب کھڑے ہو کر لپٹا کر لے کر کہا۔ انکی جاک بہت سجیدگی سے لپٹا کر لپٹا رہا ہے۔ ہم بہت کھیرائے کی دعا مانگ رہے تھے

کر کہیں کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔ غمزدی و بریں ہم نے ہاتھیں شروع کر دیں۔

میں نے بکھر کہا۔ شیطان ہو لے۔ "ملاؤ ہاتھو! یہ بات پر" انہوں نے ہر طرف ہاتھ بڑھایا۔۔۔ شیں سے ایک جڑ آئی اور شب سے شیطان کی عظمتی سے چبک گئی۔ لاجلہ لافانہ اپنی گیند تھی۔ شیطان نے ایک نہایت گاہر کچھ کیا تھا۔ اب ہم کھیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ پانچ و کٹوں پر سکور ایک سو اٹھ نوے تھا اور وہ بیڑا سرخ صاحب بیای ٹاٹ آؤٹ مارے۔ یہ تو سچری کی طرح ہوا ہے۔

چائے کے بعد گیدی صاحب نے ٹی گیند لی مجھے ہایا گیا میں نے بڑی تیز گیندیں بھیجیں لیکن ان بیڑا صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ٹی گیند ہر وہ اور بھی اٹھلا ہو گئے۔ اور وہ فورسیدہ بیڑا صاحب جوں بھر کھڑے رہا، کرنگ آچکے تھے اپنے پرانے قلعے بنا رہے تھے۔ جب میں پھر ہاتھ تو یہ کیا کرتا تھا۔۔۔ "جب میں پھر ہاتھ تو یہ بات ہو تھی" شیطان ہو لے۔۔۔ "اچھا تو کیا آپ کچھ کچھ کی پھولے بھی تھے؟۔۔۔ اور وہ مراض ہو گئے اسی ننگی میں انہوں نے میری اٹھل پر ٹی میں سر ہڈا دیا۔ شام کو ساتھ و کٹوں پر سکور ۱۳۳ اور بیڑا صاحب ناٹوے ٹاٹ آؤٹ تھے۔

ہم لوگ زندگی سے ٹھک آئے ہوئے تھے۔ ایک بڑی غریب تھا جو سب کو ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی باقوانی پر کوئی ہمتا ہی نہ تھا۔ سب بھکی کہتے کہ بھئی یہ تو میں سے پہلے کن رکھا ہے۔ وہ کہہ بڑی کے لطیفہ بیٹھ گئے ہوا کہتے تھے۔ جب ہم بڑی کی سولر میں واپس جا رہے تھے تو شیطان ہو لے "بڑی خزا آہستہ چلاؤ تم سولر بیٹھ اس طرح چلاؤ ہو جیسے کسی مارنے کی ریر جھل کر رہے ہو۔"

اگلے روز صبح ہمارا بیڑا جتے جتے ہیں تو اس میں شیطان کی خوب تعریفیں تھیں۔ شیطان کے ایک کچھ کا اگر نصف کالم میں تھا۔ بیڑا صاحب کی خوب برائیاں کی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا تو شیطان ہو لے۔۔۔ "مظاہر کار اور وہاں موجود تھا۔ یہ اس کی بے لاگ دانے ہے۔" بیڑا صاحب نے ہو لے۔۔۔ "اور کچھ بھی ہو جائے لیکن اس کو کے کی سچری نہیں ہوتی چاہیے وہ نہایت ہی طرح نکھلا ہے۔ اگر وہ ایک اور دن جا گیا تو مجھے سخت افسوس ہو گا۔"

کھیل شروع ہوا۔ بیڑا صاحب ہر ایک گیند مار رہے تھے۔ انہم ناموش تھا سب ان کی سچری کے منتظر تھے۔ شیطان کو ہر اور کے بعد ہر انداز سے میدان نمودار کے دوسرے طرف ہانا پرنا تھا۔ ایک اور دوش انہیں دوسرے سے پہنچل آیا کہ انہیں دوسرے طرف ہونا چاہیے۔ اور وہ غلط جگہ کھڑے ہیں۔ وہ سر ہٹ بھاگے۔ بھاگتے بھاگتے انہوں نے ایک گیند دیکھی جو ان کے قریب سے گزرنے والی تھی۔ انہوں نے بے نیکی بکرائی۔۔۔ کچھ ہو گیا۔ شیطان نے بھرا ایک حیرت انگیز کچھ کیا تھا۔ سب نے بھکی بھکا کہ شیطان ہان لو جو کر بھاگے تھے۔

سکور وہی تھا لیکن بیڑا صاحب ابھی تک ناٹوے ٹاٹ آؤٹ تھے اور ہم سب کے سینوں پر سوگ دل رہے تھے۔ یہ ایک حکم میں سے چلا کر کسی نے کہا کہ "اس سے ہانگ کر ڈو جس نے ابھی کچھ کیا ہے۔"

گیدی صاحب کو نہ جانے کیے سوچیں۔ شیطان کو مار کر گیند اس کے ہاتھ میں دے دی۔ شیطان نے آج تک کسی کچھ میں ہانگ نہیں کی تھی۔

گیدی صاحب نے پوچھا۔ "تم جیز گیند کیسے ہو یا آہستہ؟"

شیطان ہو لے "مجھے کیا پتہ۔۔۔ ابھی پہنچ کر دیکھیں گا؟"

انہوں نے کئی اور قدم کئے اور مختلف جگہوں پر نشان لگائے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ شیطان اور کرکٹ دونوں کے لیے ٹھہرا تھا اور جہاں شیطان کرکٹ کی جگہ میں خبر سے اتفاق سے لکھے جانے کے قابل تھا۔ شیطان نے دو بالی سے گیند صاف کی۔ اور دوسرا دیکھ اور عجیب بے ڈانگے طریقے سے جھکا کر شروع کیا۔ دونوں کے پاس آکر ان کے قدم لٹکوا دیئے اور ایک نہایت ہی بے ہوش گیند انہوں نے کھینچی۔ پڑا صاحب نے آگے بڑھ کر ہاتھ لگایا اور ایک دوسرا سا کھینچا۔ لوگ جھکنا اڑنے لگے لوگ پاگل ہو گئے مہمان تالیوں سے گونج اٹھا۔ پڑا صاحب کی سٹریکٹ پر فٹس بلک ان کے آؤٹ ہونے پر شیطان کی اس بیہوشی گیند نے اس بیہوشی سے ان کی دیکھیں اڑائیں کہ وہ پتھروں پر آؤٹ ہو گئے۔

اس کے بعد تھوڑی دیر میں ہم نے باقی کھلاڑیوں کو بھی آؤٹ کر دیا۔ ساری ٹیم دوسو چالیس پر آؤٹ۔ شیطان کی خوب تعریفیں ہوئیں۔ شامائیں دینے کے ہمارے انہیں پیٹ کر دکھایا گیا۔

اب ہماری ٹیم شروع ہوئی۔ میں اور ایک ’رضیہ کے قریب بیٹھے اور وہ دزدیدہ لگا ہوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ مخالف ٹیم لینڈ کرنے پہلی اور شیطان کیمروے کر چلے۔ ان کی تصویر میں اتاری۔ پھر گیندیں بدلتی ہوئی مقصود کھوڑا لینے کے کر شامیانے سے چلے۔ شیطان نے باقاعدہ پوز کرا کر ان کی تصویر میں اتاری۔ ہم دیر تک شامیانے میں نہ بیٹھ سکے۔ ہمارے کھلاڑی بچے بعد دیکھ کر آؤٹ ہوتے چلے گئے ہمارے مخالف ہارڈرے سے خطرناک ثابت ہوئے یا ہمارے شامین شامیانے کی طرف دیکھتے رہے۔۔۔ جو کوئی کھیلنے جا تا تو ان کو ہاتھ لگا کر واپس آجاتا۔ جب ساتویں آؤٹ ہو چڑی کیا تو سکور صرف ۳۲ تھا۔ چڑی کے منہ میں ٹیپک تم تھی اور ہاتھوں میں بالے اس نے میں بال کے اسٹائل پر پکڑ رکھا تھا۔ جاتے ہی اس نے تھوڑے بے سے ایک چمکا لگا دیا۔ اگلی گیند پر چمکا چمکا پھر چمکا۔ فریضہ ہارڈر کے چمکے چمکا رہے۔ جیڑ اور آہستہ برقی ہاتھ کو ایک ہی لاشی سے ہانک رہا تھا۔ اور ہارڈر چمکا اور پڑی چمکا۔ جہاں گیند زمین پر چڑتی تو میں ہٹ گئی۔ لیکن چڑی زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا اس کے آؤٹ ہوتے ہی پتھر کھلاڑی بھی لٹک گئے۔ ساری ٹیم پتھروں پر آؤٹ اسی پتھروں پر جو پڑا اور خرا کیلے کا سکھو تھا۔ چچ صاحب نے ٹیپٹ صاف فرمایا کہ ہم ضرور ہار دیں گے۔

چچا گیندیں صاف بے حد پڑا رہے۔ میں اور ٹیپک ہار گھاس پر بیٹھے پتھروں سے کھارے تھے۔ وہ اپنی کھی کھلی کاڈ کر رہی تھی۔ اسے میں شیطان آگئے۔

بولے۔ ”آپ ای لڑکی کاڈ کر رہی ہیں جیولہاس بہت اچھا کھاتی ہے؟“

”ہاں۔“

”اور جیولہاس لگتا بھی خوب ہے۔“

”ہاں۔۔۔“

”اور جیولہاس جیسٹن بھی ہے۔“

”ہاں۔ کیا آپ اس سے ملے ہیں؟“

”فٹس ایک تو سٹیلر ہے۔۔ لیکن ایسی کھی لڑکی سے کون نہ ملتا ہے؟ کیا آپ بھی اس سے تعارف کر رہی ہیں؟“

”ضرور۔۔۔“

شیطان اس بات کی کو بالکل نہیں جانتا ہے۔ ہم دونوں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شیطان بڑا احتیاطی ظاہر کر رہا ہے۔ دفعتاً میں ایک ایسی حقیقی نظر آئی کہ شیطان کے ہوتا کو کچھ کر سکے۔ یہ کس درجے صلابت تھیں۔ ان پر شیطان چند ماہ پہلے بری طرح حاشق تھے حاشق کیا بلکہ بالکل دہانے سے ہوئے تھے۔

دوسرے موصوف میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر کوئی حاشیہ لکھتا ہو! اچھا لگے۔ یہ نام بھی ان کا خوب اذیت دینا تھا۔ وہ بے حد غلو علی و عرض تھے جس کا رنگی بہت تازہ ہوتا۔ دیکھو وہ بھی اسی سانچے کی بنی ہوئی تھیں۔ بس وہ اپنا سا سا ازل تھا۔ وہ دیکھ اپ خوب کرتی تھیں بعض اوقات تو وہ اپنی غلی سے بھی قدرے حسین معلوم ہوتی تھیں۔

شیطان کا طوطا مذاق اڑایا۔۔۔ ”رہنچوں کے سامنے میں جوئی کر جوں ہوئے ہیں۔۔۔ سو لہجیں کسا کسا کے پا رہچہ کا بچہ۔ تو سی تاں پندر رنچوں پر حق امت کر گیا۔ انا کہہ رہے رہچے کے قائل نہیں ہوں میں۔۔۔ تو پا رہچہ پھو کھو کر اٹھار دیکھ۔۔۔“

مسکرا کر کچھ سے تعارف نہایت پر لطف دیا۔ ہوا میں اس کے من اور شیطان چلتوں سے وہ ایسی آ رہے تھے۔ ایک جھٹکشی پر گازی دینی دوسری گازی چلنے والی تھی۔ اہا کاوڑی میں مسلمان رکھوا رہے تھے کہ کھجور میں ایک طیلیدار دیش ضعیف ٹھنک دیکھائی دیا جو ایک بچے کی اگلی ٹکڑے سے ہار رہا تھا۔ شیطان کو ایسے موقعوں پر فوراً رس آ جاتا ہے اور اپنی جھٹکشی منڈال کر کہے۔۔۔۔۔ "بھرتے پاس ٹوٹ چیا" تمہارے پاس کچھ تو ہا ہوتا اس بچہ کے فقیر کو سے دو۔" جلدی تھی "گھبراہٹ میں کچھ ہوتا ہی نہ تھا۔ بڑی مشکل سے دو آنے لے جلدی سے اس فقیر کو دیے اور گلیوں کے پیچھے بھاگے۔ وہ بچے میں کافی جھگڑی۔ گازی چلنے سے زار اور پہلے کسی کا بہت مسلمان آ گیا۔ اس کے بعد ایک عالم کتبہ اور اس کے بعد وہی فقیر اس بچے کے ساتھ آ کر اور بچہ کو کیا۔ سارا کتبہ اسے "اھا جان" "اھا جان" کہہ کر پکار رہا تھا۔ کاحولہ لا تو قہا جم جوئے شرمندہ ہوئے۔ وہ بزرگ جو ہمیں اس وقت فقیر مظلوم ہو رہے تھے نہایت معزز قسم کے مالدار حضرت لنگے۔ بیکہ تو ان کا لباس ضرورت سے لڑا اور سادہ تھا اور کچھ ضرورت سے زیادہ گھبرائے ہوئے تھے اور کچھ شیطان کا ضرورت سے زیادہ ترس آ گیا۔ انہوں نے ہمارے دو آنے والی کیے اور جوئے حیرے کی باتیں ہوئی اسی کہنے میں مسکرا کر کچھ بھی نہیں۔ اس شیعہ خان نے آؤ دیکھتا تھا تو فوراً ماضی ہو گئے۔ وانکیس پر بڑی کوتاہی کیا گیا۔ وہ دہلا

”فہم یہ بالچری لاک ہے جس پر تم اس سوال عاشق ہوئے ہو۔“

شیطانوں نے۔ انہیں جو تھی ہے۔ ایک لاکھ پر میں دو مرتبہ عاشق ہوا تھا۔

۱۰۰ شیخوں کی اسٹول فستی سے مسرہ بچھنے میں دیکھا کہ اس وقت وہ مسجد میں اور بے طرف آتیں۔

ہم ایلا کرنے پر رہے تھے تو ننھی آئی۔ بولی۔ "آپ اس طرح گید کیوں نہیں سمجھتے؟"

www.elsevier.com/locate/jmb

بول۔ ”اے طرح ہیچے اس سے بڑھ کر نہیں۔“

1999, 2000, 2001, 2002, 2003, 2004, 2005, 2006, 2007, 2008, 2009, 2010, 2011, 2012, 2013, 2014, 2015, 2016, 2017, 2018, 2019, 2020, 2021, 2022, 2023, 2024, 2025, 2026, 2027, 2028, 2029, 2030, 2031, 2032, 2033, 2034, 2035, 2036, 2037, 2038, 2039, 2040, 2041, 2042, 2043, 2044, 2045, 2046, 2047, 2048, 2049, 2050, 2051, 2052, 2053, 2054, 2055, 2056, 2057, 2058, 2059, 2060, 2061, 2062, 2063, 2064, 2065, 2066, 2067, 2068, 2069, 2070, 2071, 2072, 2073, 2074, 2075, 2076, 2077, 2078, 2079, 2080, 2081, 2082, 2083, 2084, 2085, 2086, 2087, 2088, 2089, 2090, 2091, 2092, 2093, 2094, 2095, 2096, 2097, 2098, 2099, 2100, 2101, 2102, 2103, 2104, 2105, 2106, 2107, 2108, 2109, 2110, 2111, 2112, 2113, 2114, 2115, 2116, 2117, 2118, 2119, 2120, 2121, 2122, 2123, 2124, 2125, 2126, 2127, 2128, 2129, 2130, 2131, 2132, 2133, 2134, 2135, 2136, 2137, 2138, 2139, 2140, 2141, 2142, 2143, 2144, 2145, 2146, 2147, 2148, 2149, 2150, 2151, 2152, 2153, 2154, 2155, 2156, 2157, 2158, 2159, 2160, 2161, 2162, 2163, 2164, 2165, 2166, 2167, 2168, 2169, 2170, 2171, 2172, 2173, 2174, 2175, 2176, 2177, 2178, 2179, 2180, 2181, 2182, 2183, 2184, 2185, 2186, 2187, 2188, 2189, 2190, 2191, 2192, 2193, 2194, 2195, 2196, 2197, 2198, 2199, 2200, 2201, 2202, 2203, 2204, 2205, 2206, 2207, 2208, 2209, 2210, 2211, 2212, 2213, 2214, 2215, 2216, 2217, 2218, 2219, 2220, 2221, 2222, 2223, 2224, 2225, 2226, 2227, 2228, 2229, 2230, 2231, 2232, 2233, 2234, 2235, 2236, 2237, 2238, 2239, 2240, 2241, 2242, 2243, 2244, 2245, 2246, 2247, 2248, 2249, 2250, 2251, 2252, 2253, 2254, 2255, 2256, 2257, 2258, 2259, 2260, 2261, 2262, 2263, 2264, 2265, 2266, 2267, 2268, 2269, 2270, 2271, 2272, 2273, 2274, 2275, 2276, 2277, 2278, 2279, 2280, 2281, 2282, 2283, 2284, 2285, 2286, 2287, 2288, 2289, 2290, 2291, 2292, 2293, 2294, 2295, 2296, 2297, 2298, 2299, 2300, 2301, 2302, 2303, 2304, 2305, 2306, 2307, 2308, 2309, 2310, 2311, 2312, 2313, 2314, 2315, 2316, 2317, 2318, 2319, 2320, 2321, 2322, 2323, 2324, 2325, 2326, 2327, 2328, 2329, 2330, 2331, 2332, 2333, 2334, 2335, 2336, 2337, 2338, 2339, 2340, 2341, 2342, 2343, 2344, 2345, 2346, 2347, 2348, 2349, 2350, 2351, 2352, 2353, 2354, 2355, 2356, 2357, 2358, 2359, 2360, 2361, 2362, 2363, 2364, 2365, 2366, 2367, 2368, 2369, 2370, 2371, 2372, 2373, 2374, 2375, 2376, 2377, 2378, 2379, 2380, 2381, 2382, 2383, 2384, 2385, 2386, 2387, 2388, 2389, 2390, 2391, 2392, 2393, 2394, 2395, 2396, 2397, 2398, 2399, 2400, 2401, 2402, 2403, 2404, 2405, 2406, 2407, 2408, 2409, 2410, 2411, 2412, 2413, 2414, 2415, 2416, 2417, 2418, 2419, 2420, 2421, 2422, 2423, 2424, 2425, 2426, 2427, 2428, 2429, 2430, 2431, 2432, 2433, 2434, 2435, 2436, 2437, 2438, 2439, 2440, 2441, 2442, 2443, 2444, 2445, 2446, 2447, 2448, 2449, 2450, 2451, 2452, 2453, 2454, 2455, 2456, 2457, 2458, 2459, 2460, 2461, 2462, 2463, 2464, 2465, 2466, 2467, 2468, 2469, 2470, 2471, 2472, 2473, 2474, 2475, 2476, 2477, 2478, 2479, 2480, 2481, 2482, 2483, 2484, 2485, 2486, 2487, 2488, 2489, 2490, 2491, 2492, 2493, 2494, 2495, 2496, 2497, 2498, 2499, 2500, 2501, 2502, 2503, 2504, 2505, 2506, 2507, 2508, 2509, 2510, 2511, 2512, 2513, 2514, 2515, 2516, 2517, 2518, 2519, 2520, 2521, 2522, 2523, 2524, 2525, 2526, 2527, 2528, 2529, 2530, 2531, 2532, 2533, 2534, 2535, 2536, 2537, 2538, 2539, 2540, 2541, 2542, 2543, 2544, 2545, 2546, 2547, 2548, 2549, 2550, 2551, 2552, 2553, 2554, 2555, 2556, 2557, 2558, 2559, 2560, 2561, 2562, 2563, 2564, 2565, 2566, 2567, 2568, 2569, 2570, 2571, 2572, 2573, 2574, 2575, 2576, 2577, 2578, 2579, 2580, 2581, 2582, 2583, 2584, 2585, 2586, 2587, 2588, 2589, 2590, 2591, 2592, 2593, 2594, 2595, 2596, 2597, 2598, 2599, 2600, 2601, 2602, 2603, 2604, 2605, 2606, 2607, 2608, 2609, 2610, 2611, 2612, 2613, 2614, 2615, 2616, 2617, 2618, 2619, 2620, 2621, 2622, 2623, 2624, 2625, 2626, 2627, 2628, 2629, 2630, 2631, 2632, 2633, 2634, 2635, 2636, 2637, 2638, 2639, 2640, 2641, 2642, 2643, 2644, 2645, 2646, 2647, 2648, 2649, 2650, 2651, 2652, 2653, 2654, 2655, 2656, 2657, 2658, 2659, 2660, 2661, 2662, 2663, 2664, 2665, 2666, 2667, 2668, 2669, 2670, 2671, 2672, 2673, 2674, 2675, 2676, 2677, 2678, 2679, 2680, 26

ہولی۔ ”میں بھول گئی“ ظہیر نے بھیڑ مچھو کر بتائی ہوں۔“

اور وہ سیدھی ہر خیر کے پاس تھی۔۔۔ اچھا تو یہ سلفا ندر خیر صاحب امیں حوالہ دے دے دی تھیں۔ ننھی نے مجھے ایک کاغذ کا پیڑہ ملا کر دیا۔

میں نے سر ہٹا کر کہا "اچھا"

گیدی صاحبہ فطرتی پر غلطی کر رہے تھے۔ انہوں نے شیطان سے ہانک کر آئی۔ شیطان کی طوب پٹائی ہوئی۔ بھر گیدی صاحبہ کو جو جوش آیا تو انہوں نے خود ہانک شروع کی اور وہ گیدہ پر پھینکیں جن کے حلق ان کا ذاتی خیال یہ تھا کہ "کھنکھن" ہیں لیکن نہیں وہ کچھ بھی نہیں۔۔۔ سکور طوب بدستور ہوا ہاتھ۔

شیطان بار بار مجھ سے شرط لگاتے۔۔۔ "لگاتے ہوئے دوپے جٹو میاں بچاس سے اوپر سکور کریں گے۔" میں انکار کرنا تو وہ فوراً کہتے۔۔۔ "اچھا تو بھر لگاتے ہوئے دوپے جٹو میاں بچاس سے نیچے سکور کریں گے۔" میں براہِ انکار کرنا نہ ہوا اس وقت میں بالکل کنگال تھا۔ چائے پر ان کے ہاتھ کھلاڑی آؤٹ ہوئے تھے اور اسکور راجد سو تھا۔ کھنکھن نے بھر کا نقد کا ایک پڑھلا کر دیا اور بھر میں نے سر ہٹا کر کہا۔ "اچھا۔"

وہ بھرا آئی۔ بولی۔ "آپ کبھی جی میں آپ لے مارا کہنا نہیں مانا۔"

میں نے کہا۔ "ابھی مانا ہوں۔"

میں نے گیدی صاحبہ کو بدنی مشکل سے مٹایا۔ کے سرے سے فیصلہ نہائی۔ دن بھر کے کھیل سے وکٹ کا پی خراب ہو چکی تھی۔ پہلی گیند ایسی چیز پر یک ہوئی کہ میں حیران رہ گیا۔ خود بخود اسے پر یک ہو رہے تھے۔ گیدی صاحبہ بولے۔ "یہ اسے چیز پر یک تم نے کب سے شروع کئے؟"

میں نے کہا۔ "آج سے۔۔۔ بلکہ ابھی سے۔"

ایک دن کو بڑی صاحبہ نے میں ویراج لپٹا کھینچ کر لے آؤتے ہوئے بیڑ کو ویراج لے۔۔۔ یہ بیڑار صاحبہ آؤٹ ہونے تھے۔ جب بیڑار صاحبہ شرمیلے کی طرف ہمارے تھے تو ان کے آؤٹ ہونے پر سب خوش تھے سوائے بیڑار صاحبہ کے۔

اگلی گیند کو کھلاڑی نے لگا نہیں کیا اور بڑی نے زمین پر لیٹ کر گیند بچا لی اب تو حضور کھینچ گیا۔ وہ گیدہوں پر دو کھلاڑی آؤٹ "آؤٹ" ہوئے آ رہی تھیں کہ بیٹ ڈک کر دو بیٹ ڈک کرو۔ لوگ طرح طرح کے مٹوے وے دے رہے تھے بیٹ ڈک کا خیال ہی ایسا ہے کہ ماتھے پر بیٹ آ جاتا ہے میں نے سوچا وہ چاہتے نہیں اور سے بھاگا بھاگا آیا اور گیند پیچک دی بالکل معمولی سے گیند تھی کھلاڑی نے حکم کر بیٹ لگا لی گیدی صاحبہ نے اچھل کر ہوا میں کچک کرنے کی کوشش کی ان کا ہاتھ پکلا کھنکھین گیند ہاتھ سے بھرنی بھی لیکن کھنکھن گیند کا رخ بدل گیا۔ وکٹ کپیر نے بالیاں ہاتھ ہوا میں لایا لیکن کچک بھر بھی نہ ہوا۔ گیند بھر بھرنی اور رخ بدل گیا۔ اسے میں بڑی غلطی کی طرح دیکھا اور گرتی گیند کو بچا لی۔ بیٹ ڈک ہو گیا۔۔۔ کچک کا بیٹ ڈک۔

گیدی صاحبہ نے اپنا چھوٹا سا بیٹ میرے سر پر رکھ دیا۔ میں نے وہی بیٹ بڑی کے سر پر رکھ دیا۔ میرے اگلے اور میں بڑی نے ایک کی طرف ایک اور بہت اچھا کچک کیا۔ ایک کچک حضور کھنکھنے نے بہت دور باؤ بڑی لائن پر کیا۔۔۔ ایک سو اٹھاون پر ساری ٹیم آؤٹ۔ چھ وکٹیں بھری تھیں۔ محض ایک تیسویں کی بدولت۔۔۔ اب یہ حضور دھیرے کا تھا۔ ہماری ٹیم اب چست ہو گئی تھی۔ سب کے چہروں پر امید جھلک رہی تھی۔

نیک نے دوڑ کر میرا اشتہار کیا۔ شیطان دوڑے دوڑے آئے اور اب میرے کان میں بولے۔۔۔ "اگر تم مجھے کسی طرح رچکھ سے

یگتھم نامی ہوا گیا۔ چاروں طرف نامیدی چھا گئی۔ اب آخری کھلاڑی آرہا تھا۔ شیطان اپنی ٹینک سنبھالنے یا گھماتے ایک جگہ ٹان سے شریف مارے تھے۔ آئی انہوں نے لیٹ وڈ کا اسٹائل دکھایا۔ میں نے بڑی جھنجھکیاں کہ ”آج رہنے ہاتھ ہی سے کھیلنے یا نہیں ہاتھ کا شوق بھی بھر پور کر لیتا۔“

بولے۔ ”گر تو نہیں۔۔۔ تم دیکھنا تو کسی اگر دوسری نے وفا کی تو اسکو چار کر کے دکھا دی گا۔ جب میں جیتنے کی ہمت لگاؤں تو ٹینک کی کھلی کا چر و خھر سے دو چار ہو جائے گا۔“

شیطان کے محبوب شروک دوڑیں۔۔۔ ایک ہائی اور آف ہائی۔۔۔ کبھی گیند پٹوں سے بچ کر بے میں بھی لگ جاتی ہے اور جب بے سے نکل جائے تو لازمی طور پر لوگوں میں جاتی ہے۔ آؤٹ ہونے کے بعد شیطان ہمیشہ بے کو اس اعزاز سے دیکھتے ہیں جیسے اس میں کہیں سورج تھا جس میں سے گیند نکل گئی۔

بہلی گیند شیطان کی تھوڑی کے بچے سے نکل گئی دوسری ٹینکوں میں سے تیسری ناک کو چھوئی ہوئی تھی چوتھی کمر میں تھی۔ لیکن شیطان لیٹ وڈ کا اسٹائل دکھانے کمر سے رہے۔

پہلے دور کے بعد شیطان مجھ سے ملے آئے۔ جھوم نے سمجھا کر کھیل کے سلسلے میں بطور لینے آئے ہوں گے۔ خوب بات کیاں ہمیں۔۔۔ شیطان بولے۔ ”وہ دیکھو تو سامنے کے اس کو بے میں ٹینک کی کھلی چھٹی ہے۔“

میں نے بتایا کہ وہ تو کوئی اور ہے اور ساتھ ہی انہوں نے ٹینک کے ٹیٹے صاف کیے اور بولے۔۔۔ ”تو جھوم میں کہیں ہوگی۔ کاش کہ اس وقت ایک اور ٹین ہوتی اور یہ پوائنٹ پر ہو کھلاڑی کھڑا ہے۔ اس کی سہیلیں لکھ آؤٹ کر نہیں گی۔“

اگلے دور کے بعد پھر مجھے ملے۔ بولے۔ ”جائے ہو پوائنٹ کی کھلی کا کوئی مزاج ہے۔ بچارے نے آج ایک بھی کچا نہیں کیا۔ کسی جاتا ہے کہ اسے ایک کچا کمر ہوں۔“ میں نے پھر ان کی جھنجھکیاں اور وہ مکمل ڈاڑھے۔

شیطان اگلی بری طرح کھیل رہے تھے کہ لوگوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ شیطان اس وقت کرکٹ میں کھیل رہے تھے بلکہ کھانا کھائی ہوئی تھی اور بہت سی چیزیں خا کر کھاتے کر رہے تھے۔

کالف بال بولا۔ ”یہ ٹینک کیسی ہو رہی ہے؟“ شیطان نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی پچھل کر ایک آف ہائی سکور کی اب وہ دونوں کے چاروں طرف کھیل رہے تھے اور ہائی پر ہائی اسکول ہو رہی تھی۔ اسکو دو سو سی ہو گیا میں پچانوے ناٹ آؤٹ تھا اور شیطان نے دس ہائی اسکور کی جھنجھکیاں میں اس قدر دھک چکا تھا کہ مجھے کسی سکور کا چاؤ تھا تو کسی کچا کا۔ بس کی جیسی چاہا تھا کہ پینڈو خیرہ ادا کر نہیں لگاؤں اس پر لیٹ جاؤں ایک گیند پر ہائی لگا کر شیطان نے مجھے بلایا۔ میں چلا اور اسے میں گیند واپس آگئی وہ چارے واپس جاؤں میں بری طرح بھاگا۔ گیند پھر تھی اس لیے دوسری طرف نکل گئی۔ انہوں نے پھر بلایا۔ میں پھر گیا۔ گیند واپس آگئی پھر واپس بھاگا۔ ہم دونوں طرف بھاگے دوڑے لیکن اسکو کچھ نہ ہوا۔ اگلی گیند پر شیطان نے پھر یہی حرکت کی۔ اس دفعہ تو میں دن آؤٹ ہوتے ہوتے بچا۔

شیطان اور دو کرکٹ کپڑے خوب مسکرا سکر رہے تھے کہ میں کر رہے تھے۔ شیطان نے اسے کھانے پر بلوایا۔ آخری دور آیا اور میں نے دل کرا کر کے ایک چمکا کر دیا۔ اب خانوے ناٹ آؤٹ تھا۔ اگلی گیند کو میں نے لگاؤں کیا اور شیطان کو بلایا وہ نہیں آئے چوتھی گیند پر پھر بلایا وہ پھر وہیں

کھڑے رہے۔ وقت ختم ہو گیا۔ اسکو روک دیا جیسا ہی تھا اور میں وہی خانوے ٹاٹ آؤٹ!

شیطان بولے۔ ”میاں یہ خانوے کا بھیر بہت برا ہوتا ہے۔ یہ ہندو ادارے لیے بہت غلوں ہے۔ کہیں کل تمہارے ساتھ ان کا بار وہی سٹوک نہ کرے جو میں نے چار صاحب کے ساتھ کیا تھا جب وہ خانوے ٹاٹ آؤٹ تھے۔

میں نے ان سے پوچھا۔ ”یہ آخری دور میں کیا حرکت کی تھی۔ میرے بلانے پر کیوں نہیں آئے؟“

بولے۔ ”اس لیے کہ اب اس خاکسار کی دوا آزاد نہیں ہیں۔ پہلی یہ کہ تمہاری کچھری ہرگز نہ ہو ورنہ ہم اتنا زہن کے زمرے سے نکل کر اپنے آپ کو پتھریں کھینچنے لگو گئے دوسری یہ کہ ایسے کی بہت میں لگا جا بیٹا میں نے نیک کی پہلی سے وعدہ کیا ہے۔“

دھیرائی۔ بولی۔ ”ڈرامائی؟“

میں چلا گیا۔ ہم دونوں باہر کمرے پر بیٹھ گئے۔ وہ بولی۔ ”مستے دنوں سے میں پڑھائی میں مصروف رہی اور کچھ میرا ہی اچھا نہیں تھا۔“

میں نے کہا۔ ”میں بھی اتنے دنوں بہت مصروف رہا کچھ امتحان کی تیاری اور کچھ پورنامنت کا سلسلہ۔“

میں نے ٹیکہ جیوری کا کر کے کہا۔ ”یہ خیال کیونکر آئی۔۔۔۔۔“ مجھے آپ کا ایک پہلا بھائی تھا جس میں آپ نے اسی طرح دیکھیں لی تھیں۔“

میں نے پوچھا۔۔۔۔۔ ”کل کیا پراگرام ہے؟“

بولی۔ ”کل چمنی ہے۔“

پوچھا۔ ”کل میرے ساتھ چلو گی ایک جگہ چلک ہے۔“

بولی۔ ”بہات لہنا ہو گی ائی سے اور حکومت آپا سے ا“

کہا۔ ”نیک کی پہلی کا بہانہ کرنا۔۔۔۔۔ آج کل تم دونوں کافی دیرا سمجھ رہی ہو۔“

بولی۔ ”کوشش کروں گی۔“

کہا۔ ”کوشش دو کوشش نہیں۔۔۔۔۔ وعدہ کرو۔“

شرابا کر بولی۔ ”اچھا“

میں شیطان کے ہوش غل گیا۔ وہاں دو روکت کچیر صاحب موجود تھے۔ کل صبح خانوے ٹاٹ آؤٹ کا ذکر آیا۔ جب میں ابیں آ رہا تھا تو مجھے ہر بار پر ہلی الفاظ میں خانوے ٹاٹ آؤٹ لکھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اپنا ہوش بھینکا تو مجھے سے لڑکے ملے۔ سب نے کچیا بار بار دہرایا۔ رات کو ختم ہیں کی تک تک میں مجھے خانوے ٹاٹ آؤٹ خانوے ٹاٹ آؤٹ سنائی دیتا رہا۔ رات بھر میرے کانوں میں کوئی بچ بچ کر کہتا رہا کہ خانوے ٹاٹ آؤٹ خانوے ٹاٹ آؤٹ!

اگلے روز بہت زیادہ ہجوم تھا۔ سچ بے حد دلچسپ ہو گیا۔ بٹا بازار سالم کا سالم دہاں موجود تھا۔ تالیوں اور دھڑوں کے شور میں جب ہم چلے کر لنگے میرا دل وہی طرح سے دھڑک رہا تھا۔

شیطان کی بارانی تھی۔ مخالف کہتاں نے اپنے ایک فاسٹ بال کو پٹالیا۔ اس کی پہلی کینڈ شیطان اور دو کٹ کچیر دونوں کے لایچ سے گزر گئی۔۔۔ پائی کی چار دھڑوں کو گھسی۔ اگلی کینڈ پر بھر پوری ہوا۔ چار دھڑوں کو گھسی۔ انہوں نے خانوے ٹاٹ آؤٹ لے لی۔ پتھر کینڈ میں بھی شیطان اور دو کٹ کچیر

کے اوپر سے گزری لیکن حریف سکون نہ ہوا۔

دوسری طرف سے انہوں نے ایک نیا ہار لگایا جس کو میں اب تک نہیں کھلیا تھا۔ وہ اوپر بونی گزرا گیا۔ اگلے اور دوسری شیطان نے قلعہ داری کی گدی اور ایک نہایت اعلیٰ درجے کا کٹ لگایا۔ اسکو دوسو ستانوے ہو گیا اور وہیں ایک کر رہ گیا۔ چھ اور پھر ویسے ہی خشک گزر گئے۔ ہجوم کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر گیند کے ساتھ وہ شور مچا تھا کہ آہ کی ہوا۔

ایک گیند پر شیطان نے گنگے کا ہاتھ دکھایا اور گیند لپک کی طرف نکل گئی۔ ہم نے دوڑ کر دوڑنا نہیں۔ سکور دوسو ستانوے ہو گیا۔ ہم نے سکور برابر کر دیا تھا۔ اب ہمیں چیتے کے لیے ایک دن کی ضرورت تھی اور مجھے سچڑی کرنے کے لیے بھی ایک دن کی ضرورت تھی۔ اور کی جیسی گیند یہ ابھی باقی تھی۔ ہر گیند پر شیطان نے بے تھاٹا ہار لگایا لیکن کچھ نہ ہوا۔ دوسرے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں عمر بھر سچڑی نہیں کر سکا۔ صدیاں گزر رہی تھیں سچڑی نہیں ہوئی اور یہ خانوے ٹاٹ آؤٹ ایک تھوٹ ہے جو مجھ پر لگی ہوئی ہے۔ یہ ایک طوق ہے جو میرے گنگے میں لٹک رہا ہے۔ یہ ایک جنگ ہے جو میرے سر پر لٹکا ہوا ہے اور میں اس سخت خانوے ٹاٹ آؤٹ سے کبھی بچ چکا نہیں بھڑاسوں گا۔

اب میری ہاری آئی دوسری نیا ہار گیند پیچک رہا تھا۔ گزرتو بھری بریک کر رہا تھا۔ پہلی گیند دو کی تیسری بچ گئی۔۔۔ میں کبھی پر سکون نہ کر سکا۔ اب آخری گیند تھی۔ دوسرے گیند آئی اور میں نے آنکھیں بند کر کے باٹھ لیا۔ خدا جانے گیند بے سے لگی پینڈوں سے لگی تھوڑی سے لگی تھی۔ اس گیند نکل گئی وہ کھڑی پیچھے بھاگے۔ اور میں بھاگا دوسری طرف پہنچا تو شیطان وہیں کھڑے تھے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کھڑی گیند کے پیچھے بھاگے چارے تھے۔ میں نے شیطان کو دوسری طرف جانے کو کہا مگر وہ وہیں کھڑے رہے میں نے ان کو بازو سے پکڑ کر ہٹا لیکن وہ نہیں بے۔ آخر میں ان کو زبردستی گھسیٹا ہوا اپنی وکٹ تک لایا اور وہاں فلیچ کر سرتوڑا اُس بھاگا۔ اس دن آؤٹ ہوتے ہوئے تھا۔ اور غور سے کیا۔ دلائل کیا زمین کی جگہ آستان نے لے لی اور آستان زمین کی جگہ آگیا۔

بڑی بڑھ گیا ہوا تھا اور مجھے کدھر سے پر اٹھا کر شامانہ کی طرف بھاگا۔ بار بار وہ کہتی کہتا تھا۔ ”یو اے او اے۔۔۔ میں شکستیں ہوں۔ میں نے ایک کپ جیتا ہے۔ اب میں کرکٹ کا کھلاڑی ہوں۔“

شامانہ نے میں آنکھ کر پتہ چلا کہ ہم جیت بھی گئے تھے اور ایک دن سکور بھی ہو گئی تھی۔ لیکن یہ امر بحث طلب تھا کہ اسے میں نے سکور کیا تھا یا نہیں باقی تھی۔ ایک اسپائر کچھ کہتا تھا دوسرا کچھ کوئی کہتا تھا۔ میں نے سچڑی کی ہے کوئی کہتا تھا کہ کھن خانوے ٹاٹ آؤٹ ہوں۔

اور شیطان اس وکٹ کچھ اور پیچک کی اس کھلی کے ساتھ ایسے غائب ہوئے جیسے کبھی یہاں تھے ہی نہیں۔ تب میں اور فیڈا کھٹے تل رہے تھے اس نے نہایت غرضنا کوٹ پہن کر کہا تھا اور گنگے میں وہ ساہو وہاں رہا تھا جو میں نے اسے دیا تھا۔ وہ بولی۔ ”یکوٹ ایلے ساگر وہ رہا تھا۔ میں آج اسے پہلی مرتبہ بکھری ہوں۔“

میں نے پوچھا۔ ”اب تک کیوں نہیں پہنچا؟“

بولی۔ ”میں نے سوچا کہ کسی خاص دن پہنچوں گی۔“

میں نے اسے ساٹھ پر پیچھے آکھا۔ بولی۔ ”کیمرہ پر تو قمری بندھی ہوئی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”آگے چلے جاؤ؟“

بولی۔ ”اور جو کسی نے دیکھ لیا تو؟“

کہا۔ ”میں نے دیکھا کیا تو میری خوش قسمتی پر رشک کرے گا۔“

وہ شرما کر آگے بڑھ گئی۔ میرا چہرہ اس کے بالوں سے چھو رہا تھا۔ ”پر تم نے حکومت آپا کی خوشبو آج بھر چرائی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ نے بھی تو ان کا تھل لگا رکھا ہے“ وہ بولی۔

ہم دونوں دوست تھے۔ جب ہم دو تین میل گھل آئے تو وہ بچنے لگی کہ بچک کہاں ہو رہا ہے؟ میں نے بتایا کہ یہاں سے کچھ دور

پر اسے گتھے ہیں۔

اس نے پوچھا کہ بچک میں اور کون کون ہوں گے۔ میں نے کہا کہ ”صرف دو ہوں گے۔ میں اور تم۔“

جب ہم دوڑیں چا رہی تھی میں سائیکل پر وہاں آ رہے تھے تو رخصت ہوئی۔ ”یہ بیچ تو صرف آپ کا تھا“ وہ بیٹ ٹرک ٹوب تھا۔ گیند بچکتے

ہوئے آپ بہت اچھے لگ رہے تھے۔“

”وہ بیٹ ٹرک تو تمہارا تھا۔“

”اور وہ خانو سے ڈاٹ آؤٹ؟“

”نہیں سوٹ ڈاٹ۔“ میں نے جمل کر کہا۔

”ہم تو خانو سے ڈاٹ آؤٹ ہی نہیں گے۔ بسا کرکٹ میں بھی ساتھیوں کو ٹھیکٹ ٹھیکٹ کر بھی مکرہ کیا جاتا ہے۔ یہ سب بچک کی اس

کھلی کی برکت ہے۔“

”اُور اسکرول؟“

وہ مسکرائے گی۔ ”اب ذرا مت ڈا کر بھی دکھاؤ۔“ میں نے منہ بنا کر دکھا دیا۔ ”تم مسکرائی ہوئی نہیں ابھی معلوم ہوئی ہو۔۔۔ تمہارے

لپے بھی بھتر چکی ہوں گا کہ ہر وقت مسکرائی رہ کر۔۔۔ آج آئیے میں دکھانا۔“

”آپ آگے دیکھئے۔۔۔ بالکل سیدھے میں سائیکل سیدھی چلا رہے“ نہیں گرتے ہو جانے۔“

رخصت کو چھوڑ کر میں نے شیطان کے ہوش کار سٹ کیا۔ راستے میں وہی روپ رڈز مل گیا۔۔۔ بولا۔۔۔ ”مجھے بہت افسوس ہے کہ بھڑی نہ کر

سکے۔ میں نے اظہار میں آپ کے خانو سے ڈاٹ آؤٹ کی بڑی تعریف کی ہے۔“

”آپ سے یہ کس نے کہا؟“

”روٹی صاحب نے!“

”ابھی چپا تو نہیں؟“

”نہیں۔“

میں نے اسے ساتھ لیا۔ راستے میں ڈی کو بکڑا۔ شیطان کے کمرے میں جا کر دیکھتے ہیں تو ایک بڑے بچک پر حضرات رضا نای

لوڑے کھانا کھا رہے ہیں۔ رضا نای سٹائی گئیں اور میں بھی ساتھ بٹھا گیا۔ میں بار بار شیطان کو اس آخری دہائی کے حقائق کہہ رہا تھا۔ میرا

اصرار تھا کہ اسے میں نے سکھوایا ہے۔

شیطان بولے۔ ”یار حبیب سچو قسمین ہم تم بھی صرف ایک دہائی کے لیے اٹھنے پر رضامند ہو رہے ہو۔ اچھا تمہاری بھڑی کھوادیں گے

میں۔۔۔ کھانسی لگھووان کی سچری۔

رہا روئے ہمارے سامنے بڑا کرمب۔ کھو دست کیا۔ بڑی کی۔ ٹارٹل پر میری تھوڑی سی تعریف بھی مثال کی گئی۔

اب ٹیکڑ شوکا پردہ گر ام بنا۔ شیطان نے وہ اور کوٹ اتار دیا جس کو بچن کر سردی زیادہ لگتی تھی۔ جو پہلے الٹا لپا گیا تھا، پھر سیدھا کر لیا گیا۔ سب نے رضا نیاں اوڑھ لیں۔ چند حضرات ایک ایک دھانی میں دو دو ہو گئے۔ دو کرکھ لے کر ساتھ ہو لیا۔

ذرا سی دیر میں ہم رنگ برجی رضا نیاں اوڑھنے انکی ٹلف میں ٹلف کی سڑک پر جا رہے تھے۔ تقسیم انعامات کا ذکر ہو رہا تھا۔ بڑی بار بار کہتا تھا۔۔۔ "بھائے او بھائے" آج میں اپنے آپ کو بیرو محسوس کر رہا ہوں۔ میں پٹھنیں ہوں" میں نے کرکٹ کا ایک کپ بیٹا ہے یاہ ہوؤ ڈو۔۔۔"۔

اور جب ہم شہر کے بہترین سینما میں رضا نیاں اوڑھ بکھڑو کچر رہے تھے اور بچے کے کٹنگ نگار رہے تھے تو ہمارے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ نہ میں پٹھنیں سمجھ رہے تھے نہ بیرو بلکہ نہ انکی خواہشیں سمجھ رہے تھے جو بھ بپا رہی تھیں۔



محمد حسن عسکری

نام	اعلیٰ راجپوت
قلمی نام	محمد حسن عسکری
پیدائش	۵ نومبر ۱۹۱۹ء بمقام سرائہ، ضلع میرٹھ (ج۔ پی) بھارت
وفات	۶۸ جنوری ۱۹۸۷ء بمقام کراچی، پاکستان
تعلیم	ایم۔ اے (انگریزی) الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۴۲ء
	قرآن سے ہم اندہ موضوع سرائہ، ضلع میرٹھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مسلم پرائمری اسکول، گلارہ پور (ضلع بلتھہر) سے حاصل کی۔ وہاں سے چار ہجرتیں پاس کرنے کے بعد ڈی۔ اے انگلش میڈل اسکول سے مکمل پاس کیا اور ۱۹۳۶ء میں، مسلم ہائی اسکول بلتھہر سے میٹرک ۱۹۳۸ء میں، میرٹھ کالج، میرٹھ سے انٹراور ۱۹۳۹ء میں الہ آباد سے پی۔ اے کرنے کے بعد وہیں سے ۱۹۴۲ء میں ایم۔ اے (انگریزی) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

عسکری صاحب کے والد محمد یحییٰ راجپوت، ضلع بلتھہر میں "کوت آف" اور "ڈ" کے ملازم تھے جہاں سے والدنی (۵۰) چہر (بلتھہر) چودھری رگھوراج سنگھ کے ہاں بطور کاکولٹ چلے گئے۔ قصبہ گلارہ پور، بلتھہر سے تیرہ میل کے فاصلے پر تھا۔ جہاں اس خاندان کا قیام ۱۹۳۵ء تک رہا۔

عسکری نے ۱۹۳۲ء تک کازنڈ سرائہ (ضلع میرٹھ) گلارہ پور (ضلع بلتھہر) میرٹھ اور الہ آباد میں گزارا۔ ایم اے کرنے کے بعد عسکری مدخلی ہو گئے اور پہلی ملازمت آل انڈیا ریڈیو میں بطور سکرپٹ رائٹر کی۔ شاہد احمد دہلوی کی ادبی جماعت "ساتی" دہلی کے ساتھ تعلق اسی زمانے میں قائم ہوا۔ کچھ مدت انھوں نے کالج، دہلی میں انگریزی کے استاد رہے اور اس کے بعد میرٹھ کالج، چلے گئے جہاں قیام

پاکستان تک قیام۔ اسی اثنا میں الہ آباد یونیورسٹی میں تدریس کی جتنی کوشش کھراچے تھے۔

۱۹۴۷ء میں لاہور منتقل ہو گئے اور رسالت حسن منو کے ساتھ مل کر کتبچہ جدید لاہور کے لیے دو ماہی ادبی مجلہ ”اردو ادب“ کا ہر جاری کیا جس کے صرف دو شمارے شائع ہو سکے۔ ۱۹۵۰ء میں کراچی منتقل ہونے سے پہلے قری بالٹس روپ کے طور پر ترجمہ نگاری کو ذریعہ روزگار بنا لیا۔ سید ذوق عظیم کے بعد ۱۹۵۰ء تا جون ۱۹۵۰ء سرکاری ادبی مجلہ ”ماہو“ کراچی کے مدیر بنے اور ۱۹۵۰ء میں ہی اسے ”کراچی“ کراچی میں بطور مستحق منتقل ہو گئے، جہاں آخر تک رہے۔ انچادہجہ کے قیامت پسند اور مرد پرچہ اور واقع ہوئے تھے۔

ایک شاندار کے ساتھ اور مزہ مری کی محبت کا کام ہوئی۔ عسکری صاحب نے کتابوں کی دہریوں کو فروغ دینا کراچی میں قلم لگا دیا۔ سر محمد قمر کی زندگی بسر کی۔ اس محبت کی یادگار ہائراک کے دو مطبوعہ تراجم ہیں جن پر عسکری کا نام نہیں۔ یہ کام آپ نے ۱۹۴۳ء میں کیا تھا۔ آخری زمانے میں بعد درجہ کے خلیفہ بن جانے کے باوجود والد القادر علی بھٹو کے چاہنے والوں میں رہے۔ ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۱ء کو کراچی گلاب بند ہو جانے سے انتقال کیا۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

”کراچی سے گھر تک“ مطبوعہ ”ادبی دنیا“ لاہور، اگست ۱۹۳۰ء
 واضح رہے کہ یہ افسانہ ۹ نومبر ۱۹۳۹ء کو لکھ کر مکمل کیا گیا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ ”سبھی بھرتی نظم“ (مرتب) کتابستان الہ آباد طبع اول ۱۹۳۲ء
- یہ کتاب دوسری بار ساتھی بیکہ اپنی دہلی نے ۱۹۵۳ء میں شائع کی
- ۲۔ ”سیر و سحرین افسانہ“ (مرتب) ساتھی بیکہ اپنی دہلی طبع اول ۱۹۳۳ء
- اس کتاب میں مختلف افسانہ نگاروں کے اچھے پسندیدہ افسانوں کے علاوہ حالات زندگی اور نظریات سے متعلق فقرہ کرد و سواد بھی شامل کیا گیا ہے
- ۳۔ ”ریاست اور انتخاب“ (اولین کا ترجمہ) ہندو کتاب گھر دہلی طبع اول ۱۹۳۳ء
- ۴۔ ”میں ادب کیسے بنا“ (ادبی تنظیم گہ کی کا ترجمہ) انجمنہ لاہور طبع اول ۱۹۳۳ء
- ۵۔ ”نئے زمانے“ (آخر افسانے) ساتھی بیکہ اپنی دہلی محبوب الطبع طبع اول ۱۹۳۳ء
- اس مجموعے میں (۱) کراچی سے گھر تک (۲) پھسلن (۳) حرام جاوی (۴) سبلا و شریف (۵) چائے کی پیالی (۶) اندھیرے کے پیچھے (۷) ایک معمولی عدا (۸) دو تین افسانے شامل کتاب ہیں۔
- اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن آئیڈیاد لاہور نے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا۔
- ۶۔ ”قیامت ہر کتاب آئے نئے“ (تین افسانے) ساتھی بیکہ اپنی دہلی طبع اول ۱۹۳۷ء
- اس مجموعے میں ۱۔ تو کراہو ۲۔ ”تھکلیوں کے دام“ ۳۔ قیامت ہر کتاب آئے نئے افسانے شامل کتاب ہیں

- ۷۔ "آخری سلام" (از: رشید احمد خاں) (کراچی: ۱۹۴۸ء) طبع اول: ۱۹۴۸ء
- ۸۔ "مادام بواری" (از: گسٹاوا پروں) (کراچی: ۱۹۵۰ء) طبع اول: ۱۹۵۰ء
- ۹۔ "مادام بواری" (از: گسٹاوا پروں) (کراچی: ۱۹۵۳ء) طبع اول: ۱۹۵۳ء
- ۱۰۔ "احباب ظلم پر ضرب" (مترجم) (کراچی: ۱۹۵۳ء) طبع اول: ۱۹۵۳ء
- ۱۱۔ "احباب میر" (مترجم) (کراچی: ۱۹۵۸ء) طبع اول: ستمبر ۱۹۵۸ء
- ۱۲۔ "میں کیوں شرمائی" (از: فیلا کرٹس) (کراچی: ۱۹۵۹ء) طبع اول: ۱۹۵۹ء
- اس ترجمہ وادارے کا ایک ایسے نقیض لاہور سے ملے شائع ہو چکا ہے۔
- ۱۳۔ "مستاد واداران" (از: گسٹاوا پروں) (کراچی: ۱۹۶۳ء) طبع اول: ۱۹۶۳ء
- ۱۴۔ "Distribution of wealth in Islam" (کراچی: ۱۹۶۳ء) طبع اول: ۱۹۶۳ء
- (از: مفتی محمد شفیع کراچی: ۱۹۶۳ء) (از: مفتی محمد شفیع کراچی: ۱۹۶۳ء)
- ۱۵۔ "اسلامی ذکا" (از: برنٹن میلر) (کراچی: ۱۹۶۷ء) طبع اول: ۱۹۶۷ء
- ۱۶۔ "Answer to modernism" (کراچی: ۱۹۷۰ء) طبع اول: ۱۹۷۰ء
- (از: مولانا اشرف علی تھانوی کراچی: ۱۹۷۰ء) (از: مولانا اشرف علی تھانوی کراچی: ۱۹۷۰ء)
- ۱۷۔ "مذہب و مصلحت" (از: برنٹن میلر) (کراچی: ۱۹۷۰ء) طبع اول: ۱۹۷۰ء
- ۱۸۔ "مذہب و مصلحت" (از: برنٹن میلر) (کراچی: ۱۹۷۰ء) طبع اول: ۱۹۷۰ء
- ۱۹۔ "دلت کی رائے" (از: برنٹن میلر) (کراچی: ۱۹۷۰ء) طبع اول: ۱۹۷۰ء
- ۲۰۔ "جسٹس" (از: برنٹن میلر) (کراچی: ۱۹۷۰ء) طبع اول: ۱۹۷۰ء
- ۲۱۔ "مذہب و مصلحت" (از: برنٹن میلر) (کراچی: ۱۹۷۰ء) طبع اول: ۱۹۷۰ء
- ۲۲۔ "مذہب و مصلحت" (از: برنٹن میلر) (کراچی: ۱۹۷۰ء) طبع اول: ۱۹۷۰ء

نظر میں:

"میں صرف آرت چاہتا ہوں، صرف و محض آرت۔ خواہ اس میں مساویات، سیاسیات یا دوسری خصوصیات کی بھی آمیزش (آلائش) ہو مگر سب سے پہلے اسے آرت ہونا چاہیے۔ میرا "Gauguin" کے الفاظ میں حاضر ہے۔ "آرت تفریح کی خاطر؟ کیوں نہیں؟ آرت تفریح کی خاطر؟ کیوں نہیں؟ جب تک وہ آرت ہے اس سب سے کیا ہوتا ہے۔"

(پروں: ۱۹۷۰ء) (پروں: ۱۹۷۰ء)

- ۱۔ "روزانہ اخبار تحقیق و تنقید" اور "اکبر الوداد" میں شام پیر انکل بلو شہزادہ تاریخی پیر انکل ۱۹۶۸ء درج ہے، مجموعہ مستعملیں۔ لکھنؤ اصل نظام دار تاریخی پیر انکل سے
عسکری صاحب کے برائے عمر حسن علی نے مطلع فرمایا۔ عسکری صاحب کا اصل نام عبداللہ انکل تھا جو کہ پیر انکل ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۱۹ء کا تاریخی نام کن ہے۔

چائے کی پیالی

محمد حسن عسکری

ملا لکھ دو پکڑنا تو یہ چائے تھی کسی ایک سال کے دوران میں کون کونسی نئی دکانیں کھلی ہیں اور کون کون سے پرانے چھرے ابھی تک نظر آتے ہیں۔ وہ گورا گورا سار کا لڑکا اب بھی دکان پر بیٹھا ہوا اپنے ہاتھوں پر ہاتھ بیکر رہتا ہے ہاتھیں منگھر کے لکھٹ کے پیاں دیکھتی ہیں۔ شیشیں ابھی تک ساتھ رکھی ہے یا ایک مٹی۔ مگر جب تاتے والے نے چھرے ہاتھ ہاتھ دالے تو رک پر تانگہ سوز تو اس نے کوئی احتجاج نہ کیا بلکہ اپنی لٹا ہونے لکڑے کی طرف پھیر لیں۔ وہ گزرتے ہوئے دکانوں پر دوسری نظر ڈال کر انہیں اتنی اذیت ہی کیوں دے۔ وہ اس زبردست تحریریں کا اپنی کامیابی سے مقابلہ کر سکے پر غلط فہمی اور خود کو بڑا لگا اور سبک حسوں کر رہی تھی، جیسے وہ کسی آزمائش سے اپنے آپ کو بچھ و سالم نکال لاتی ہو۔ اس نے اطمینان کا کمر اسامیں لیا اور سینے پر خوب کھل کر بیٹھ گئی۔ دوڑتی ہوئی لکیریں تاتے کے نیچے سے اٹھتی جا رہی تھیں۔۔۔ سچا عقدا را دور تاجچہ لکھ مسکندہ نظر لکیریں۔۔۔ اور وہ بلند کی طرف تھمی ان کی سرایتی سے لطف اٹھا رہی تھی۔ اگر وہ بازار کے راستے سے جاتی تو کھوڑا کن گن کر قدم ہر قدم کھوڑا کسی دکان کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتی۔ اپنی بات تو ضرور تھی کہ کاغذ اسے دیکھ کر جو تک سے چڑنے ان کی لٹا ہیں دور تک اس کا بچہ کرشمے اور وہ سوچتے "لو ذاب یہ کتنی شاندار ہو گئی ہے اس کے بال کیسے چمکے ہیں اور کپڑے کتنے عمدہ ہیں؟" مگر ان کے دل میں تھر تھر اور جس کسی نہ پیدا ہوتا اور وہ ان کی آنکھوں کی چمک سے یہ پچھتی "کون ہے یہ؟ کس ہاتھ سے آئی مسکون ہوتی ہے؟" اس کے برخلاف ان کا اعلا تو سر بہ ستارہ ہوتا اور ان کے خیالات کبھی اس قسم کے ہوتے۔ "ابھی ہماری اس لڑکی نے تو خوب رنگ روپ لٹا ہے! شاہشاہ! شاہشاہ!" جیسے اس کے رنگ روپ لٹالے میں ان کی کوشش کو کوئی دخل ہو اور وہ اس سے زیادہ اپنے آپ کو ایسی پر تجل جڑ کے حصول پر سہارہ دے رہے ہوں۔ ان کی کھلی زہر لب مسکراہٹ سے مسکون ہونا کہ وہ یہ پچھنے والے ہیں "کہنا ابھی تو درجہ بہت دن میں دکھائی دی ہو۔" پھر جیسے انہیں یہ توقع ہو کہ وہ ان کی طرف شاہشاہ نظر دے دے کچھ ہی تو لے گی۔ سڑک کے گڑھے تک سے یہ دھان کر کے کاپ دو یہاں کے "میشن گرو سکول" میں نہیں پڑھتی۔ جس پر دھندلے اندر خوف میں "لا کیوں کا دوسرے" کھرا رہتا ہے بلکہ اپنی لکڑے "مگر تھکان گرا لٹا لٹا ٹوٹ" کی طالب علم ہے۔ اور

اپنی محبوب شخصیت کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ یہاں کے قریب دوں کے ڈھیروں کناج کی گاڑیوں انگوٹھ لگاس والوں، بھوری سوچوں والے کسانوں، گاڑی چلتیوں پر چلتے ہوئے بچوں اور لوہے کی دکانوں کی دوسرے خورد و خوراک سے اوپر مٹائی دینے والی مٹاؤں کے درمیان، مس روٹس، ایک بے متنی یا بے ہوشہ گاڑی تھی۔ عجیب یا مستحکم خیر نہیں۔۔۔ ٹھیک ٹھیک اور ناقابل توجہ، جیسے سڑکیوں پر لپکا میٹام گاڑی۔ یہاں تو وہ محض ایک تانے میں ایک لڑکی تھی۔ یا دعا یا ایک جیڑی لڑکی۔ بس جیسے اسکے میں دوسرا ہمارا وقت، پانچ بجے یا گاڑی میں لگا ہوا ہے۔ یا ابھر میں ایک تریڑ۔ ہر چیز کی دھندلے صحنہ تھی، واضح روشن، قطعی پوری طرح باقی کچھروں کے درمیان۔۔۔ نہ کھیں سے رنگ بڑھا، نہ کھیں دھندلا۔ ہر چیز کی اپنی مغز دیت تھی۔۔۔ علیحدہ مغزوں، مستقل ہمزی۔ اپنی ایک بے مطمئن مرتبہ میں، خود وہ دوسروں کی شخصیت کا ایک حصہ، دیکھنا چاہتی تھیں اور نہ گزارا کر اٹھاتی تھیں، کرتی تھیں کہ انہیں کوئی اپنے اندر دھم کرے یا الغضب تو یہ تھا کہ وہ عدالت پر بھی آبادہ تھیں۔ ڈھیر میں دیا ہوا تریڑ میں جین سے نیچے چاہتا اور اسے اوپر والے تریڑ سے کوئی شکایت نہ تھی اور پھر ان سب نے ایک دوسرے کی طرف دیت کا احترام کرنے کا کچھ کیا سمجھوتہ کر لیا تھا، اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ رہنے کی ایسی کوشش کر رہی تھیں کہ یہاں آتے ہی ہر چیز اپنا انفرادیت اور عدالت کو دیتی تھی۔ ایلی گری کی مس روٹس بھی۔ مس روٹس کے لیے بھی اپنی شخصیت کو منوانے کی کوشش کرنا ضروری اور غیر اہم بن گیا تھا، ایک کی کاس میں آکر ٹھک بن جانے کے خلاف مدافعت نہیں ہو سکتی تھی۔ خابہ میں تو وہ یہاں کے سب ڈھنگ میں پر خور رہی تھی، مگر مشکل تو یہی تھی کہ وہ اسی سب سے بڑا اور نہیں تھی اس پر تو ایک مطمئن قسط کی کبلیت طاری تھی۔

یوں تو منڈی اور آؤٹے کا قصور اسادور میں اپنی کھلی کوئی بہت دھن اٹھاتا تھا، اپنا کھلی ایک آؤٹے پان اور سوڈا مارکی دکان تھی یا پھر درختوں کے نیچے ہل کے لڑکے اپنے کھنوں سے ایک گائے ایک دوسرے سے پیٹنے کپ ڈار ہے تھے مگر پھر بھی اسے ایک قسم کی رہائی کا احساس ہوا تھا۔ اس کا حیاتی جوہر ٹھوٹھ ہو گیا تھا، اب وہ کم سے کم اپنا دراصل تو صحن کر سکتی تھی۔ اس کا کچھ ایک مرتبہ پھر تلے کو اسی طرح دیا ہوا تھا۔ بجیہ پھر اس کی کھلی کے نیچے داپس آ گیا تھا اور خود آگ بھی پہلے سے ادا ہوا تھا۔ وہ یہ بتا سکتی تھی کہ کہ سامنے والی دکان کے گلاس میں سوڈا ہوا اس کے لیے ناقابل قبول ہے۔ وہ اس مے سے بھی لطف اندوز ہو سکتی تھی کہ پانی کے لڑکے جو اسے لکھوں سے دیکھ رہے تھے اور زور زور سے ہونے لگے تھے اس کی آنکھوں اور دھماکوں کو بھڑکانا سکتے ہیں اس کے مٹوں کو بائیں پر ختم کر سکتے ہیں، مگر اس کا کچھ بکا نہیں سکتے۔ اس کا بھی نہیں جانتا سنا کے پردے پر نظر آنے والی ایکٹر ٹیکس کا کیونکہ وہاں تو وہ دو آنے دے کر کم سے کم ایکٹر ٹیکس کے گالوں پر سسکیاں بھرنے کا حق فریہ لیتے ہیں۔ مگر مس روٹس اپنے ہارو کے ڈاڑھی کھولنے میں ان کے خیالوں تک کی پہنچ سے باہر تھی۔

لیکن فرصت کی یہ سریریں دیر پا ثابت نہ ہوئیں۔ ۱۹۷۰ء پر پہنچے ہی وہ کھڑکھڑاتے ہوئے انگوٹھ لگاس والوں کی قطاروں، سوار کے ہارن کی آوازوں، اسکے دھنوں کی لڑائیوں اور گاریوں کے لکھنوں کی صداؤں کے نرے میں پھنس گئی۔ یہ بات نہیں کہ ایلی گری کی جھنڈا وسط اور پر سکون آوازوں، اسکے دھنوں کی لڑائیوں اور گاریوں کے لکھنوں کی صداؤں کے نرے میں پھنس گئی۔ یہ بات نہیں کہ ایلی گری کی جھنڈا وسط اور پر سکون فضا میں رہنے کے بعد یہ خور و خواہیہ بگاڑ دھنڈا خیر اور یہ گرد کے ہال کے باغے کا گوارہ زور رہے ہوں اور اس نے دو ایک بار ”افوہ۔۔۔ افوہ“ کرنے کے بعد نہ ہر مال نہ کھلا ہو۔ یہ چیزیں تو سب جانی بچانی تھیں اور اتنی معمولی اور بے ضرر معلوم ہوتی تھیں جیسے وہ وہاں آتی رہی ہو۔ وہ بجلی ہی ٹکڑ میں پہچان گئی کہ وہ نیلے رنگ کی لاری دیکھیں سے جاتی ہے اور ال رنگ کی ٹیکس کے ہار اور دھنوں کی بھڑکی دھنڈا کہ بہت سست چلتا ہے اور وہ لاری دھنڈا لاری دھنڈا کی ٹھنکی کا ٹھنکی ہے۔ کوئی بھی چیز پر مہار تھی بلکہ اگر وہ چاہتی تو گرد و غبار کی ماری چڑھیں یا بڑے غر و مہابت کے

ساتھ اس کا غیر مستند کرنے کے لیے تو جیسا ٹھکانہ ہاٹے کیوں وہ کسی دوسری شخصیت کو پہنچا کر اس، اصول پر مسلط کر دینے کے خیال سے ہی اپنے دل کو بیٹھا ہوا محسوس کر رہی تھی اور خاص سے یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی عین کراہنے آپ کو ان چیزوں کی گورنر دے دے۔ وہ تو پہلو بدلے ہا رہی تھی پہنچتی تھی اسکوئی تھی طرح طرح سے اپنے بازو کو سامنے لاتی تھی جیسے کوئی دادرہ رکھ رہی ہو۔ کبھی تو یہ چاہتی تھی کہ تاکہ پتا ہی رہے پہنچا ہی جائے اور کبھی یہ کہ بہت سے اسکے سامنے ہو جائیں اور تاکہ رکاز کھڑا رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو جائے اور وہ اظہار کی کسی نظر پر سے اپنی لاری میں بیٹھ جائے۔ اس کی حالت اس بالکل اس کو غیر فکری کی طرح تھی جو اپنی ماں کی نگاہوں سے بچتا بیٹھ بھپاتی بھرنے اور اگر کبھی ایسا حادثہ رونما ہو جائے تو محسوس ہونٹ کا قی رہے۔ وہ اپنے قہر کی لاری کو ہانے پناہ کچھ کر اس کی طرف بڑھ بھی رہی تھی اور اس کے ٹیل سے جھلک بھی رہی تھی۔ کیونکہ وہی تو سب سے زیادہ انوس جیج تھی اور ای کی تو اسے سب سے زیادہ تحصیل پاؤں تھی جب اس کی اپنی لاری کے جانے کبھی اور کی لاری سامنے آتی تھی تو اسے غرض ہوتی تھی کہ پہلو ٹھوڑی دیر کو تو اور پٹائی۔ مگر جب اس کی لاری کے ایکٹ نے تاکے کے قریب آ کر کہا "کہاں جاتا ہے؟" حکم پر تو اسے ایک کو تکیف ہوئی۔۔۔ اس خیال سے کہ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے اسے کچھ متاثر ہو۔ اس نے بڑی گورگرت آواز سے جواب دیا "ہاں۔۔۔ نہیں سعد آباد۔"

"وہ کھڑی ہے لاری آخر میں۔" ایکٹ نے ایک اسکے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "بھروسہ رنگ کی۔۔۔ بس چار ہے۔"

تاکہ رکتے سے پہلے اس نے تاکے جانے کو پیسے دینے اور جلدی سے لیے کوڑ پڑی۔ لاری میں دو ایک مسافر اندر کی طرف بیٹھے تھے اور دواغیر کھڑکی سے نکلے لگائے اسٹریک وکیل پر چور کے سونے کی کوشش میں سر پر ہاتھ بیکور ہاتھا۔ پہلے تو وہ اپنی نے نکلتا تھا کہ ہانے حلق کر رہا تھا "اگر موتوں تک آتے آتے اس کے لنگر بدل گئے۔ اس نے مفلوک لچھے میں پچھا جیسے اسے دواغیر پر اعتماد ہو۔" کہاں جانے کی یہ لاری؟"

"سعد آباد۔" لاراغیر نے سر بیکور کر جواب دیا۔

حالانکہ دواغیر کا رویہ ایسا کثیف سمجھو تھا مگر اس کی آواز سننے ہی وہ اپنی کو ایسا معلوم ہو جیسے سردارستانی ہوئی ہو اس کے درمیں ایک کمرے نے آ کر اسے چھو لیا ہو۔ لاری کے انجی کالس تک اس کے لیے اسم اعظم کی وہ جلتی عین کیا تھا جو اسے ہر قسم کے آستیوں سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ اس نے لاراغیر کو اور ملازم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "کے بچے جانے کی لاری؟"

"لاری؟۔۔۔ کبھی کوئی ادا کی جاتی ہے۔"

دواغیر کو قہقہے کے قہقہے کے بارے میں متذنب تھی۔ وہ ایک لمحے دیکھنے کے بعد اس نے پچھا "اور اب کیا ہوا گا؟"

دواغیر نے سامنے کے کھٹے کھڑکی اور تھیل کے ذہوں کو ٹٹولنے کے بعد جواب دیا۔ "کوئی ایک ہو گا۔"

گو یہ جواب کچھ بہت زیادہ تسلی بخش نہ تھا مگر دواغیر نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا "چھوٹا۔"

اب تک دواغیر کی غصہ کی ہراس کی مراد انکی غالب آ چکی تھی اور اسے یہ بھی خیال آ گیا تھا کہ اگر پڑاوری صاحب سے سلام دعا ہے ہی۔ اس لئے وہ غصہ بیٹھا اور کھڑکی کو گود میں آواز ہی دے کر وہ اپنی کاسیلاں اوپر رکھ دینے کے لیے کہا۔

سامان کی طرف سے تو وہ جلد مطمئن ہو گئی۔ مگر جب کاسیلاں بھی درجوش تھا وہ پابری سے کھڑکی کھڑکی اندر کا جائزہ لے رہی تھی۔ پیچھے کی طرف ایک بڑا عیاں تک پانچوں کا پا جاس پہنچنے پر اوپر رکھے کھٹی تھی اور اپنے پانچے سے پانچ چار ہی تھی۔ اس کے سامنے کی سیٹ پر ایک

آدی جو اس کا بیٹا سلیم ہوتا تھا، بیٹا ایک گھڑی کو ٹھیک کر رہا تھا۔ سچ کے حصے میں دھڑوں کے ایک امیر کے قریب ٹھہر چکے تھے اور بھولی بھولی موٹھوں والا ایک جوان سا آدی جو گھر گھر آکر دھوا رہا دیکھنے کے بعد دہاں میں بندھے ہوئے کھلونے کو جو اس کے پاس رکھتے تھے اور قریب کھسکا تھا۔ ڈولی کی بھوس میں نہار اٹھا کر آخر کہاں بیٹھے اور دھوا رہا وہ اب ناقابل برداشت ہوئی تھی۔ وہ سچ کا درد انہ کو لے کر دہائی تھی کہ ڈارا بخیر نہ سراٹھا کر کہا۔ ”بیٹھو اور بیٹھو۔ بس اب چلے ہے لاری۔“

”کو؟“ بیٹھو۔ ڈارا چٹا دھوپنے والی بات تھی۔ گھر اس کی آواز سن کر ڈولی کے دل میں یہ امید پیدا ہو گئی کہ آخری فیصلہ ڈارا بخیر پر چھوڑ دینے سے خود اس کا رچھوڑ چکا ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے ڈارا بخیر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔۔۔ اچھا۔۔۔ کہاں بیٹھوں؟“

”یہاں آ جاؤ سچ کی سیٹ پر۔“ ڈارا بخیر کو فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی۔

”ہاں۔۔۔ لیکن ڈولی نے ڈارے ڈارے پہل کی کہ۔“ اگر آئے۔“

”آگے؟۔۔۔ ہاں آگے تو؟“ آدی دروغی جا رہے ہیں۔ آگے تو آگے چلے۔“

مگر یہ بالی اس طرح کھڑی رہی اور بالی تک نہیں تو ڈارا بخیر نے ایک لمبی اٹھکائی لی اور کاٹھا ہوا پیچے باز آیا۔ ”آگے بیٹھو۔ اس نے نصیحت آہستہ آہستہ میں کہا۔“ بیٹھو ہاؤ۔ ہمیں کیا ہو۔ دھارے سے چاہے کوئی بیٹھے۔ لیکن دروغی جا رہے ہیں آج۔“

”ڈولی نے اندر بیٹھے ہوئے اس طرح دروازہ بند کیا جیسے وہ اپنے سر پہ کے لیے بالکل آخر تک مقاومت کرنے پر تکی ہوئی ہو۔“

”کو کہنا اس کو کہ اس کی گھڑی کو اسے تکلیف دینے سے روک رکھے۔ گھر دھوا رہا ہے۔ حالات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہی تھی۔ اس لیے تھل کے ایلوں کے درمیان جہاں تک ہو سکا اس نے اپنی آگسٹیں بچھلائیں اور اپنے بدن سے گری ٹالے اور سانس ٹھیک کرنے کی کوشش کرنے لگی۔“

”کی سیٹ تک دروازے سے ہوا کرنے کے بعد اسے اتنا ہوش آیا کہ وہ کسی اور طرف متوجہ ہو سکے۔ جب اس نے پک پک پک پک کر رہی میں دونوں طرف آئے گئے ہوئے ہیں۔ جن میں اس کا چہرہ نظر آ رہا ہے اسے اتنا ہی حیرت ہوئی۔ مگر دوسری ٹالہ نے حیرت کو کسمپاست میں تبدیل کر دیا۔“

اس کے بال ہلکے تھے۔ ہلکے ہوتے تھے اور گردے بھروسے ہو گئے تھے۔ گری نے اس کے چہرے کو تھمادیا تھا اور وہ گردہ گردہ اور دھوا رہا تھا۔ ٹھک چڑیوں نے اس کے ہونٹوں کی سرخی راہل کر دی تھی اور اس کی آنکھیں پٹی اور سوجھتی تھیں۔ اس نے شہر اکٹھا کرتے ہوئے دہاں سے ہاتھوں کو

جھاڑا۔ دروازے سے چہرے کو گردہ اور بار بار ہونٹوں پر زبان پھیری۔ یہاں تک کہ وہ دھوا رہی تھی۔ اس نے جھٹکا کر آجینے کی طرف سے ٹالہ پھیر لی اور باہر کی طرف دیکھنے لگی۔ دروازہ دھوا رہا تھا۔ اس کی تصویر کی تصویر ہو گئی تھی۔ ستاروں والی ہری ساڑھی لمبے لمبے بندے

تھکی ہوئی ایک جس میں ٹھک چک۔ تھی تھی سرخ چہرہ، بڑی بڑی سرخی آنکھیں۔ مگر یہ تصویر اسے آکھنے کی یاد دلائے دے رہی تھی۔ اس لیے اس کی نگاہیں آگے بڑھ گئی اور وہ اپنی آنکھوں کے کونوں کو پکڑنے سے بند کر کے تصویر کی طرف جانے سے روک گئی۔ لاریوں کی تھار کی تھار کھڑی

تھی مگر اسے صرف ان کے انجی اور لے گا دھوا رہا ہے تھے۔ سانس دھوا کے دھوا لے گئے ایک کسان کے ہاتھ پکڑ کر گئے تھے اور اپنے اپنے آؤں کی طرف کھینچا رہے تھے۔ وہ ایک خولے والے پانی پانے والا اور چند کھیتوں پر گئے تھے اور آدھے ایک اکے والے کوٹ دے رہے تھے اور

آدھے دوسرے کو۔ اخبار دھوا رہا تھا۔ ان کی دکان کے سامنے ٹھکے پر کھڑا تھا اور سا بیٹھا تھا۔ وہی دروازے میں ایک آدی بیٹھا سا ٹھیک کی مرمت کر رہا تھا اور اس کے گھر میں چار لوگ کھڑے چلنے کے لے کاٹھا کر رہے تھے۔ اس کے بعد سڑک پر ٹھکڑوں کا ایک اونچا سا دھوا رہا جس پر باغی رکھ کر

ایک ٹانگے والا اپنے کھوڑے کو روانہ کیا۔ دھوا رہا۔ سڑک کے پار ایک وسیع دھریض میدان تھا۔ ٹھکڑوں کا لکڑی کا ڈھیر دھوپ کی بجلی کے باوجود مطمئن

اور ساکن۔۔۔ بے نیاز جیسے کوئی مسمر اور جہاں دینہ رو باجی و لطف۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ میدان سے چلے جکے غبار کا بادل اٹھتا تھا اور آہستہ آہستہ اوپر چڑھ جانے کے بعد ط حال سا ہو کر کھیتوں میں کھائے ہوئے گیہوں کے سطرے اٹباروں کی طرف اڑتا چلا جاتا تھا۔ کھیتوں سے کچھ دور آئے گاڑیوں کی قطار تھی جس میں سے کسی گاڑی کی بجلی دیواریں اور پچھرا دکھائی دے رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی عمرت یا چھترہ غٹوں سے باہر نکلتا تھا اور ایک آدھ منٹ تک غڑانے کے بعد پھر عجب ہو جاتا تھا۔

و بہت دیر تک مکمل انجمان کے ساتھ سامنے دیکھتی رہی۔ اس نے غصوں کیا کہ اس کا جسم ایک نورانی اور لطیف مادے کی اصل میں تبدیل ہو کر نظر آ رہا تھا۔ اس میں اس میدان کی دستگیری پر چھا گیا ہے جس کے دونوں کنارے ہوائے اوقی ہوئی گاڑیوں کی طرف اوپر اٹھے ہوئے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا تھا جیسے اس کی روح اپنے جسم کو وہیں چھپایا ہوا چھوڑ کر علیحدہ ہو گئی ہو۔ اور ایک ٹھنڈی یا مائل کی طرح کبھی تو روکنے خواہوں کے خوف و ہراس کے ساتھ اور کبھی چار کی شاخوں کے سکون و بہت کے ساتھ سارے میدان پر جٹ چٹائی پھری ہو۔ ہاتھیں دکھ کر اور بازوؤں کو دونوں طرف پھیلا کر سر کو کچھ تو اضمحالی ہو کر کچھ جذبہ تعلی و رضا کی سرشاری سے نیچے اٹھانے ہوئے وہ نگاہوں کے ساتھ اوپر چڑھتی پہلی کئی تھی جو اسے فضا میں معلق چھوڑ کر نیچے اتر جانے تھے اور وہاں سے آسمان کی تشکیل بنانا تھا۔ اسے اپنے اندر سمجھتا کہ بے حس یا عورتی تھیں۔ وہ ایک آم کے پڑے گنگ کر گاڑی کی ایک بجلی دیوار کو ٹھکنی ہاتھ دے دیکھتی رہی تھی اس نے آم کے چرن کی تڑکازہ کر دیتے دانی خوشبو سوسھی تھی فضا کی طرحت اور خواہا کی اس کے جسم میں اتر گئی تھی اور وہ بجلی دیوار سے اپنی پرائی بجھتی معلوم ہونے لگی تھی۔

اس نے جب پیچھے دوڑا تو اٹھنے کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو اس کی نگاہیں بدنی ٹنگا ہٹ کے بعد سامنے سے حزی۔ ایک اکے میں سے دو تھیں نمودار ہوئیں۔ چھ اور کچھ دھڑکتے تھے اور اب ان کا سامان لاری پر رکھا ہوا تھا۔ دونی کو کچھ مڑ کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس دوران میں کچھلے جیسے میں چند آدمی اور بیٹہ چکے تھے۔ ان کے قریب ہی پہلے چاٹ والا خانچہ لے بیٹھا تھا جسے دیکھتے ہی بچوں نے جھپٹا اٹکا شروع کر دیا تھا اور اپنی ہڈوں کو اوپر چڑھنے کی بھی اہواز مند سے رہے تھے۔ اب کچھ لاریاں تھا میں سے نکل کر نکل پلنے کے لیے بیڑوں کے باپ کے پاس بیٹھ ہو رہی تھیں اور ان کے گھنیز دور دور سے آواز میں آکر رہے تھے تاکہ پلٹے پلٹے بھی جتنے مسافر اوڑھل نہیں لے سکیں۔ لاریوں کے چلنے کی آواز میں نٹنے نٹنے اور ان کی شکل و حرکت کو طیر و نگہی سے دیکھنے دیکھنے کا یک لونی کی نظر ایک مکان پر پڑی جو بیڑوں کی دکان کے قریب بن۔ ہاتھ اور جسم کی طرف اس نے ابھی تک خیال کیا ہی نہیں تھا۔ پہلے یہ خیالی زمین چڑی تھی جہاں کتے اپنی کھانیاں سے گرد اڑاتے رہتے تھے اور کبھی کھار کوئی خواہنے والا سستانے کے لیے آ بیٹھا تھا۔ لیکن اب تو وہاں بازوئیں لگی ہوئی تھیں اور ایک یا مکان کا کھڑا تھا۔ اس جگہ پر پوری ہونے کی سرگرمی۔ مکان کے اندر اندر صبر و ساقا اور اس کی زمین ابھی تک سلی ہوئی تھی۔ اس میں کچھ ایسی ہلکی ہلکی پرکھ اور زمین کو کھد کر دیتے تھے کوئی جڑو دلی کی ہاتھوں اور پیٹے میں اسے جاری تھی اس کے شاخوں کو ڈھیلے اور غول کوست کے دے دی تھی۔ دانی طرف کچھ خوابنے والے بیٹھے تھے جنہیں دیکھ کر اسے خیال آ کر کہ جب وہ مگر پہلے کی تو اس کا چھوڑا بھائی فریخی اس کا ستر کرنے کا اس کا رنگ کھولنے کو جواب پھرے گا یہ دیکھنے کے لیے کہ ہوا اس کے واسطے کیا لائی ہیں اور جب وہ جگہ نہ پاسے گا تو بہت دیریں ہو گا اور شاید چلنے بھی لگے۔ لاری کے آخر آتے اور سامان اٹھانے والے کے ایک آنے کے بعد اس کے پاس جا کر آنے چتے تھے۔ ایک آدھ گھنٹہ کے لیے بھی کیا۔ تھیں آنے میں جگہ نہ کھلایا جاسکتا تھا۔ اس لیے وہاں کر پھلوں والے کے پاس لگی اور ایک منٹ تک اس کے ذکر سے کہ بے خیالی سے دیکھنے کے بعد پھر چھپا۔ "سٹرے کیا صاحب دے ہیں؟"

امیدوں سے بھرے ہوئے لہجے میں بھول دالے نے کہا: "پانچ پانچ پیسہ ہے، گئے ہیں ہم صاحب۔"

"پانچ پیسہ کا کیا؟"

"اس پانچ پانچ پیسے بڑے چٹے ہیں ہم صاحب۔ نو بکھ کے دو بکھ۔"

"تمہیں نہیں رہے دو؟" اس نے تمہیں آنے کو پانچ پیسے میں تقسیم کرتے ہوئے کہا: "تمہیں تمہیں پیسے نہیں؟"

"تمہیں تمہیں پیسے کی طرح بھی نہیں ہیں ہم صاحب۔" چل دالے نے اپنی باغلی امیدوں کی اصلیت سے آگاہ ہو کر کھڑے کہا: "لو۔"

کیلے لہ پانچ پیسے کے دو ہیں۔"

ذول اب بھی اپنی تقسیم کے نتیجے سے مطمئن نہ تھی۔ اس نے آدھی باغلیں ہو کر پوچھا: "کچھ تمہیں کرو گے؟"

"کم؟ انہی تمہیں نہیں لینا دو یا۔" وہ انہیں چلوں، اور پھر چل دالے نے ایک گزرتے ہوئے کسان کو پکار کر کہا: "لو چو بھری صاحب"

پس لاؤ رہیلے اور ہے جی رہیلے۔"

یہ ایک اس کے مطلق میں ذاتی الٹا اور سانس لینے کی کوشش میں کٹھنوں میں رہیں ابھرا آئیں اس کے شانے غور و خلو کام کرنے والی مدافعتی آلات کی طرح لپٹے چٹک گئے اور بازو دھت ہو کر چنے پر آ گئے۔ اسے یہ معلوم ہونے لگا کہ جیسے وہ جگہ جہاں وہ کمزری تھی جلتا پلتا ہو گئی اور ساری دنیا کی ٹھنڈی اس کی طرف اٹھ گئی ہیں۔ اس کا گھڑا صاف ہوتے ہی جو اپنے آپ بسکت دالے کی طرف مڑ گئے اور اس نے تمہیں آنے پہنچتے ہوئے کہا: "بسکت۔"

"بسکت؟" یہ فعل ایک لفظ بسکت دالے کے لیے کسی قدر عجیب تھا۔ اس نے پوچھا ایک آتے اور جن دالے "کہ تمہیں پیسہ درجن دالے؟"

"کوئی ہے۔" کوئی نے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے ابھرا کہو کہے سے جن میں بڑا دل دھو میں پکڑ لیے اور تھوڑا قدم اٹھائی ہوئی اپنی جگہ پر رہا جس میں آئی مگر بیٹھنے کے بعد وہ اس کا دل اس تھوڑی سے دھڑا دھڑ کرنے لگا جیسے اب نکل کے بھاگتے والا ہو۔ ہر کھٹکے کے ساتھ تھوڑا سا لپٹے کہ کسک معلوم ہوتا تھا۔ اس کی چھاتیوں ہی کی جمل اور گرم ہو گئی تھیں اور ان میں کوئی چیز دھل رہی تھی اسنہا رہی تھی گول گول چکر کا رہی تھی۔ اسے پتہ چلا کہ اس کے نیچے بیٹھتا کرتا ہے چلا جا رہا تھا جسے شگ کرنے کی کوشش میں اس کا سانس بھاری اور دھواؤں کی اس کے دل کی حالت کو اور بے قابو کئے دے رہا تھا۔ وہ چٹکی چٹکی ہو گئی تھی اور وہ پڑ رہا اور طوں سے بھرے ہوئے گالوں پر کھینچا گیا۔ دوپٹے کے لمس میں تسکین تھی۔ وہ اس کا ہاتھ دھوئی اور ٹھنڈی تھی اسنہت اور بہت اور آخری وقت تک اس کا ساتھ دینے اور کھٹکتے کرنے کا وہ دے۔ اس کی کھال سے وہ دھڑکیا جھوٹا تھا۔ آگ پر پانی نہ تھا۔ اس کا جسمانی اضطراب آہستہ آہستہ صدمہ پڑا گیا اور جلدی صدمہ میں اس کے خون اور سانس کی رفتار بالکل متوازن ہو گئی۔ مگر وہ دلی گرائی اور تھکاؤٹ محسوس کر رہی تھی جیسے ایک دن کے تھکا کے بعد۔

تھوڑی سی دوسرے حرکت رہنے سے سینہ کا کھٹک اس کے چہرہ خروار ہو گیا۔ وہ ایک جھانکنا لینے سے بھی اس کی تسکین نہ ہوئی اس کا ہی چاہ رہا تھا کہ لمبی سی انگڑائی لے کر پانچوں کو خوب بان کر بیٹھا دے۔ لادالی کے فرش کی مخالفت کے باوجود۔ سحر لاری کے نوپے سے زور آزمایا۔ اس کی آنکھوں کے بان کا زخما اور انگڑائی لینے میں یہ ضد تھا کہ اس کا وہ پتہ پھسل جاتا اور بازو اونچے اٹھتے جہاں سب کی نظر میں ان پر چڑھیں۔ جب پہلو بٹنے سے کام نہ چلا تو اس نے ذرا پیچ کر پکار کر بلایا اور دھت پوچھا۔

"اب چلے ہے؟" ذرا پیچ کر پکار کر بلایا اور دھت پوچھا۔

”انگھر دیکھتے ہو کیا ہے؟“

”سودا رو رہے ہیں اب۔“

ابھی پہراچوں تکٹھ ہاتی تھا اور یہاں بیٹھے بیٹھے اس کی رانیں چتر ہوئی ہادی تھیں۔ پہلے تو وہ اسے کوفت کے اپنی سینے کی پشت پر اٹھک گئی، انگر اسے جلدی اٹھاؤں دیا کہ لاری والوں کے قاعدے، اکرم کے قانونی سے کسی طرح کم اٹلی نہیں ہیں۔ اس نے کسی ایسے کی سرورن کی ہی شانی کے ساتھ اپنے آپ کو کئی پرقلہ پر چھوڑ دیا اور بکنوں کے بڈلوں سے کیبل کیبل کر اپنا دل بھلائے لگی۔ اس نے سوچا کہ وہ بکنوں کو چٹھک میں چھپا کر لے گی اور پھر اندر آ جائے گی۔ فریڈی اسے دیکھتے ہی ”ڈولی بڑا ڈولی بڑا“ چٹخا تو وہ اسے گھورا اس کی ناگوں سے بہت جائے گا۔ وہ چوہے گا ”ڈولی بڑا کیا لاتی ہو؟“ ”دکھنا۔۔۔ انگر بڑی مضانی لاتی ہو۔۔۔ تم کہہ لگی تھیں ا“۔ چپ اسے سارے سامان کی طاشی لے چٹنے کے بعد کھنڈے کے گاؤں میں بھٹانے لگے گا۔ وہ اسے پیچھے چھوڑ کر فریڈی رہے گی۔ یہاں تک کہ جب وہ بالکل ہی روئے گا تو وہ پیچھے سے ایک بڈل چھا کر لائے گی اور کہے گی ”اچھا“ آئیں بڈ کر ڈو کیٹو ہم تھیں ایک جڑ دیں۔“ فریڈی کا پیچھا مسکرا کر سے گا اور وہ اسے گود میں اٹھا کر خوب پیار کرے گی۔۔۔ جب فریڈی بکنٹ کمانے لگے گا تو وہ اس کے ہاتھ سے بکنٹ چھین لے گی اور کہے گی ”ہم جب دیں گے بکنٹ جب تم ہمیں پیار کرو گے۔“ فریڈی اپنے چھوٹے چھوٹے ہونٹ اس کے گال سے لگا دے گا جیسے کوئی اس سے پیار ہو اٹھتا ہے۔ وہ اسے سال نہیں کرے گی بلکہ یوں ہی رہنے دے گی۔۔۔ اس طرح یہ تینوں بڈل کم سے کم ایک ہفتہ تک گئے۔ اس نے جلدی میں نہیں آنے پہنکے۔ بے تحہے انگر بفر ٹیک ہے۔۔۔ اب وہ برنس کو لٹاف کے بھانے کا ڈیجیج دے گی۔ چٹنے ہوئے برنس نے بڑا کھادہ دیا تھا لکھنے کا۔ چونکہ وہ دھند کر آتی ہے اس لیے ہاتھوں بھرا سے لٹا سکتی رہے گی۔۔۔ لٹاف دے گی تو کارڈ تو ضرور۔۔۔ مگر کارڈ پر لکھا ہی تھا جائے گا؟۔۔۔ بہر حال وہ کوشش کرے گی کہ لٹاف جیسے۔۔۔ کبھی کبھی وہ فریڈی کا پیچھا چھپایا کرے گی۔ دشمن کے اشتہادوں کی رادی کلچ کر بھی کچھ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور جب پاپا اٹھا لایا کریں گے تو وہ ایک دوائے لے لیا کرے گی۔ اسی طرح جب لٹا چھپا کریں گے تو بائیں جاکر کا چلایا کریں گی تو کسی کسی دن وہ ان سے لٹاف لے لیا کرے گی اور پاپا کے پاس پڑھنے والے لاکوں میں سے کسی کو ہزار ڈیجیج کر اس کے پیچھے منگوایا کرے گی۔ وہ کم سے کم چند دنوں میں ایک مضبوط ضرور بن جائیگی۔۔۔ کل رات وہ اور برنس دونوں ناخوش ہوئے تک ایک چار پائی پر لیٹی رہیں کرتی رہی تھیں یہاں تک کہ ان کے جیرو اور آنکھوں کے پچھلے ٹھنڈک جھوس کر نے لگے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی باتوں میں باتیں ڈالے ہوئے تھیں اور باتوں کے جوش میں بعض دقتات ان کے سینٹل جاتے تھے۔ ان کے ٹھوک ٹھٹکی کی آواز بار بار ہوا میں کوئی تھی۔ دونوں کے بازو مل رہے تھے مگر ان کا کس کتنا رامت بخش تھا اس کا قی کا جتا تھا کہ یہ بازو میں یوں ہی ملے وہیں۔ مگر بغیر کسی خاص سبب کے اسے کچھ ایسا جھوس ہوتا تھا جیسے وہ کوئی تھیک کام کر رہی ہے اور ڈر ہے کہ لوگ کہیں دیکھ نہ لیں اور پھر اس رامت کے احساس کی شدت بھی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس لیے اسے ہار ہار انہیں دنگ کر لیتی پڑتی تھیں۔ اسے دھست کی رات برنس نے اپنے سارے راز دھنیوں وہ بیٹھ چھپائی رہی تھی ایک ایک کر کے بتا دیے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ ایک دن جبکہ سارا اسکول ملی کر سینما گیا تھا تو ایک لڑکا جو اس کے پیچھے بیٹھا تھا، برنس کی طرف دیکھا کہ برنس نے بھی چند چہرے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا اور اندر سے اس نے ایک بھول برنس کی گود میں پیچھک دیا تھا۔ لیکن برنس کی داستانوں میں سب سے زیادہ دلچسپ اس لڑکے کا قصہ تھا جو اسے چھینوں میں اٹھا جب وہ اپنے کمر کی آوی تھی۔ یہ قصہ بتانے سے پہلے اس

نے رکھی ہوئی آواز میں کہا "خدا اور قریب کسک آگ"۔ "برنس نے اپنا بارو مضبوطی سے اس کے گرد ڈال لیا تھا اور اس کی کمر خیمہ پٹی جاتی تھی۔ اس کا دل بڑے ذور سے دھڑک رہا تھا اور جسم سے لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ لڑکے کا نام اس نے دبی داس بتایا تھا جو اس کے بھائی کے ساتھ بچہ تھا اور بڑا گور اور خطرناک صورت تھا اور ریشمی سوٹ پہن کر آچا کرنا تھا دبی داس کی خوش مزاجی نے اس کی مدد کی تھی۔ جب اس کا بھائی اور دوسرا بھائی تھوڑے سے گود میں اٹھائے گئے تو دبی داس نے اپنی گود میں سے بچے کی طرف اشارہ کر کے ہنسنے لگے۔ بچے نے کہا تھا: یہاں ہاتھ رکھو دیکھو دیکھو۔" قصہ سناتے سناتے برنس نے دک کر بچے سے سراٹھایا تھا اور چند لمحوں کی طرف دیکھتے رہے اور آنکھیں جھپکانے کے بعد متوجہ اندھ میں کہا تھا "خود لی ہم بچہ کر لیں"۔ "خود اس کی خاموشی اور خاموشی پر معمول کرتے ہوئے اس نے اپنے گرم ہونٹ ایک ٹوہلی بوسے کے لیے اس کے گالوں پر رکھ دیئے تھے اس کے بوسے کے لمبے ذوئی کو اب "امیسیان" بے غلری اور مضحکہ ہونے کا احساس حاصل ہوا تھا جیسے چھوٹے سے کھنگرہ کو اپنی ماں کی چیملی میں دیکھ کر۔۔۔ قصہ کے دوران میں اس نے اپنی ناخنیں اکڑا اکڑا کر یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ برنس کی ناگوں سے دور ہیں۔ مگر اس کا سیدہ برنس کے ساتھ خود بخود آگے ٹھسک چلا ہوا تھا۔ اس کے دھڑکنے کے باوجود اپنی اپنی جا رہا تھا۔ برنس نے لپٹنے کے بعد بھی وہ کبھی دیر تک جاگتی رہی تھیں اور ہار ہار چاروںوں سے منہ اور ہاتھ نکال کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ لیتی تھیں۔۔۔ چلنے سے پہلے وہ دونوں ساتھ ساتھ بھرتی رہی تھیں۔ اگر ان میں اور اس کی قائل ہو ہوا تھا تو یہی نہیں محسوس ہوتی تھی جیسے ان کے بدن جڑے ہوئے ہوں۔۔۔ برنس کی آواز میں کبھی خری اور حسرت اور مطلق میں کہنے ہوئے "اسوؤس کی نفی تھی۔۔۔ برنس کی بھائی کی وجہ سے وہ آج بہت دیر تک اداس رہی تھی۔ خصوصاً ریل میں۔ وہ کھڑکی پر کھلی دیکھے ہار رہی تھی۔ کھیت ہوا تھا اس بار کے کھیتے درخت قریب آنے کے بعد چپے ہوئے کھوم کراچی کی طرف نکلے چلے جاتے تھے گویا وہ اسے ذرا سا دانا سا بھی دینے کو چاہتے تھے۔۔۔ انہیں دیکھتے دیکھتے اس کے سینے اور گلے میں ایک بھانسا سا پیدا ہو گیا تھا۔ ہار ہار اس کے چنے کے چھلکے کوئی بچہ ٹھہری ہوئی محسوس ہوتی تھی جو اندر اتاری جلی جاتی تھی۔ اس کا بھائی چاہتا تھا کہ سر کھڑکی پر رکھ دے اور دوسری میں پلڑا پلازے ہوئے پردوں کی طرح اپنا سیدہ دیا۔ اس کے غصے سے غصے سے لگا دے اور ساری دنیا سے غافل ہو جائے۔۔۔ جب وہ الال پلے آچا تھا تو اسے اور اس کا سیدہ بندھی تھی کہ اس لگا دے سے اس کی اطراف کی دور ہو جائے۔ مگر ان دبی داس کی سرخ ناگوں سے جو اسے دور جانے کے لیے چلے چلے چلے جاتے تھے۔ پانی کو ابھی طرح دیکھتے نہ دیتی تھیں اور اس دھڑ دھڑ اور کھڑے سے وہ اتنی جڑا ہوئی تھی کہ اگر کچھ جلدی ختم نہ ہو جاتا تو وہ دیرے دھشت کی زد رہتی۔۔۔ اسے کچھ پتہ نہیں رہتا تھا کہ اپنی لڑکیاں کیا کر رہی ہیں۔ اس کبھی کبھی بولہ کی نفی ہوئی آواز یا کبھی کبھی جھپکیں جسے شاید لڑکیاں بھی دیکھتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے تھیں یا آواز میں کاہنہ قہر ایک لمحے کے لیے اس کے دھڑکے جھلکاؤ کو روک لیتا تھا۔۔۔ برنس تو اب تک اپنے گھر بھی پہنچ گئی تھی وہ اپنے بھائی بیہوش سے باتوں میں مشغول ہوئی تھیں اس کے گرد صبح ہو رہے ہوں گے۔۔۔ برنس دھوپ سے مفید پلے قائم پر اتاری ہوئی تھیں اور اس کے ہرے جھڑوں کی اینٹیاں ٹھہریں پر کھٹ کھٹ ہوتی ہوں گی۔۔۔ اس نے تھیں کو پکار کر اپنا سامان دکانے کے لیے کہا اور کچھ غصہ اٹانے سے پہلے ہی۔

برنس کی گاڑی انٹھن کے قریب آئی رہی تھی کہ راما بھونے بھونے سے دروازہ کھول کر ذوئی کی توبہ اپنی طرف منعطف کر لی۔ لیکن کہیں سرور ہاتھ پلانے پلانے کے بعد جا کر وہ یہ کچھ کچھ کی حالات کا روبرو کیا ہے۔ لاری پہری بھر چکی تھی اور اب راما بھونے گاڑی چلانے کے لیے جنرل نکال رہا تھا۔ پیچھے سے کئی آوازیں آئیں "لو ہمیں پہلی تو کسی طرح۔"

”کو معلوم ہو گیا ہے؟“ کارانچر نے نکیتز کو جنڈال دیتے ہوئے کہا ”پورے دس منٹ پہلے پھوڑا ہوا۔“

لاری کا انجیل بھر کر اٹنے لگا۔ نیسے نیسے پتھر اس کے پیروں میں داخل ہوئے اور گول گھومتے انجیل پھینک دیئے اور چلے گئے۔ پنڈلیوں، دافوں، پینٹ، مچا توں، پٹلوں، باندھوں، کانوں اور انگلیوں کے پیروں میں گھبل گئے۔ اس نے اپنے ہر ماتنی کی لوہے کی چادر پر رکھ دینے کا اس کے حق اور جھگڑنے لگیں۔ مگر ایک دفعہ پتھروں کا ایک ایسا زبردست رپا آیا کہ وہ سکا پل میں آگے نہ بڑھا سکا بلکہ پینٹ کے پلے حصے میں ایک کروڑم پائے لگا یہاں تک کہ راولی نے ٹکلی کی سرمت سے ہر کھینچ لئے اور اپنے دونوں گھٹنے خوب کس کر ملا لئے۔ لاری اسے پکڑے پکڑے کھلے ہوئے آگے بڑھی مگر وہ ابھی دیکھ دیکھ کر ہی چل دی تو حق کی چڑاول کے پپ کے پاس بھر کر گئی۔

”کیوں بھیا“ کسی نے پکھلے حصے سے پکارا ”کیا اور شہادے ہے؟ یہاں پہلے ہی گھٹے ہمارے ہیں سرے پار۔“

مگر رانچر نے اسے ناقابل اعتبار سمجھتے ہوئے دروازہ کھولا اور آخر کر پپ والے سے دو انگلیں چل بھر دینے کے لیے کہا۔۔۔ پپ کے اپنے صاف شیشے میں لڑائی سیال اٹھا اٹھا کر دھک دھک کھڑے ہو چڑھنے لگا۔ سب سے زیادہ وہ جڑو بیڑو کو پسند آئی وہ چھوٹے چھوٹے تھے بڑا چٹے ہوئے شقائق مثل میں شریر پر یوں کی طرح دوڑتے بھر رہے تھے۔ چڑاول کی بو کے ہمارے اس نے سر نہیں بکیرا تھا اور تیل کو چڑھتے اترتے دیکھتی رہی تھی جس سے اس کی طبیعت مختلف ہو گئی تھی اور اس کی مثل کی لمبوں میں سرسراہٹ ہونے لگی تھی جیسے اسے سکھانے پر مجبور کر دی تھی۔

لاری گزرتے ہوئے اکوں کا گرد کے بادلوں میں چھپاتی بھر دوا نہ ہوتی۔ رانچر کا گازی کو ٹھیکہ لڑا رہا رہا تھا۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ کچل پر پہنچا تھا ڈاولی سانس کو مقلی میں روک کر کسی مقام اور ہم توقع کے ساتھ اپنے سینے کو اس وقت اٹھا رہا اور اتھاں کیف اور درد کی ملی جلی کیفیتوں کی شدت سے ایک پھنچا ڈورا دھنسن محسوس کر رہا تھا ہوا پر جس کی آہستی اسے خوں اور مرئی معلوم ہو رہی تھی آگے بھٹا رہی تھی۔۔۔ اسکی طوہ پیر کی اور بقیہ کے ساتھ جیسے کسی دیوی کے سامنے اپنے آپ کو بیٹھ چڑھا رہی ہوا وہ جب کچل کی پیچ لٹم ہوتی تھی تو گواہ ایک کوئی کی چھل اٹھا کر کہ اس کی دال میں ٹھس آتی تھی جسے وہ زور لگا کر وہیں کے وہیں روک لیتی تھی اور آگے نہ بڑھنے دیتی تھی اور ساتھ ہی اپنی پنڈلیوں کے پٹوں کو اسکی جتنی سے آڑ لیتی تھی جیسے ان کے ذہیلے پڑتے ہیں اس کی ذہل کی بھی گل کر بہہ دیتے گی۔

سعدا ہادی سڑک پر مڑنے کے بعد لاری کی رٹا دیکھنے سے ہر آگئی اور اب ڈولی کے اصحاب کچل کے ذریعہ کے ساتھ ہم آہنگ رہتے کی ضرورت باقی نہ رہی۔ دھڑے دھڑک دھڑک کھٹک کر اس نے گودے کا ایک حصہ دریافت کر لیا جو نسبتاً نرم تھا اور جہاں سے اس کی ناخنیں پہلے سے زیادہ پھیل گئی تھیں۔ دروازے کی طرف کا حصہ وہ تھا تو ایسا گول کس کی کر اس میں پائل ٹھیک آتی تھی اس نے اپنے جسم کو اس کے علاقہ انفرش میں گروہا اور کڑی کی کو مضبوطی سے تھام لیا جیسے وہاں سے ٹھیکہ نہ کر دینے چاہئے کا خوف ہوا اگر لوگ دیکھ نہ رہے ہوتے تو شاید وہ اپنا کال بھی دیا دے لگا دیتی۔ ہوا گرم تھی اور لاری کا دروازہ باہر سے مل رہا تھا گل اس کے باوجود اس کا احساس کو سوجھ چلا گیا تھا۔ اپنے اصحاب کو آرام دینے کی خواہش ہی بجائے خود ایک منفرد اور مستقل کیف ہی لگی تھی جس سے ہر ہر بندہ پورے شعور و شعور کے ساتھ لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ہر ہر چیز میں اسے روشنی، تاریکی، دلچسپی، غارت اور گرمیوں کی صبح کا ساتھ نظر آ رہا تھا جیسے کسی عجیب و غریب سرزمین میں ایک سیاح کہ اس آرام کے لمحے میں وہ اپنی آنکھوں کو دور دور ڈالتا تھا جس چاہتی تھی بلکہ اپنی توجہ کو صرف سڑک کے کناروں تک محدود کر کے ہونے لگی تھی اور جب سڑک کا پہلا پتھر تک ایک فوری جادو کے ذریعہ اثر و طرب ہی کیا ہوا پتھر کسی اور لوہے کی حاش میں آنکھوں کو سرگرداں کرنے سے کیا لگا نہ وہ

دھوپ سے چلتی ہوئی سڑک سپر ہیجیبل ہوئی تھی اور ایک ہیٹ آگے بڑھتے ہوئے نظریں سڑارے پر ٹھمکتی تھی۔ سڑک کے کنارے درخت بھی تھے مگر کچھ دھوپ نے اس کی آؤنگی غصیت اپنے اندر جذب کر لی تھی۔ لاری چپ ٹورا ٹھکڑی اور چدر کے ساتھ بے جا زلی سے چلی جا رہی تھی اس کی آواز دور سے سنتے ہی قتل گازیاں جلدی جلدی پانگل سڑک کے کنارے پر ہو جاتی تھیں اور پھر سے لوٹتے ہوئے کسان ایسے ٹھہراتے تھے کہ ہائے الگ ہائے الگ سے سڑک کے ایک طرف سے دوسری طرف بھاگتے گھٹتے تھے۔ لاری کی رفتار اور خصوصیات گلیوں پر اس کی فوجیت ملائی کے دل میں ذہب کا احساس پیدا کر دیتی تھی اور اسے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے بادے کی نہایت میں اس کی آؤنگی اور اس کی نہایت کم ہو گئی ہے۔ اٹھن کی بھی نہایت نے اسے دوسرے مسافروں کی ٹھٹھکوار بھٹ و مہا بڑی کی جیج پانچ سے محفوظ کر دیا تھا اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس قدر اہمیت نے اس کے گرد ایک ایڑی حلقہ بن دیا تھا، جہاں اس کے خیال کے مطابق اسے کوئی نہ کچھ نہ کہتا تھا اور اس لیے پوری آزادی کے ساتھ اس کے خفے بھول سکتے تھے اور بند ہو سکتے تھے اور چروہ بھر تک چاہے انتظار کر سکتا تھا۔ اپنے اس بھلہ بند گشتے میں سے وہ سڑک کے گرد رتے ہوئے نگاروں کی سیر کر رہی تھی۔ وہ کئی ٹیبلٹ میز اور اس ٹھوڈس اور باغوں سے انجلی طرح آتھی تھی بلکہ لٹٹے لٹٹے درخت تک ایسے تھے جنہیں وہ پہچان سکتی تھی۔ روت کوئی گور دیکھتے ہی اس نے تار یا تھا کہ اب اس کے ہمد بگور کے بچے والا باغ آئے گا۔ پھر سے دو میل آگے گھروں کا ایک ہلکا تھا جہاں بیکر مراد اور محمدی سٹنگوں کے پھانچ اور سر کیاں چلایا کرتے تھے۔ اول تو وہ لی کوان لوگوں کے بڑھے ہوئے ہالوں اور وحشت ناک حیوں ہی سے بگور لکھی نہ تھی۔ مگر وہ فدا اس نے یہاں ایک چھوٹے قدر اور دوسرے بدن کی عورت دیکھی تھی جس کی بڑی بڑی زلفیں آنکھیں ہر وقت چاروں طرف گھومتی رہتی تھیں ہار جس کی لیر مستحل چھاتیوں کی نظروں کو شہر اپنے والی جنبشوں نے اس پر سونے سونے زلفوں میں "نامناسب" "گور" "مستط" گھوڑا تھا مگر جہاں ہی اوصاف کے سب سے قابل توجہ بن کر تھی۔ وہ لی نے لاری سے سر نکال کر اسے بار بار دیکھا تھا اور آج بھی وہ اسے کم سے کم ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر جب لاری وہاں سے گزری تو بچلے کے باہر کوئی بھی نہ تھا۔ صرف تین بچے آپس میں ڈارے تھے۔ لیکن وہ لی کو کوئی خاص مایوسی نہ ہوئی اور وہ پھر سڑک کی کنتائی سروں کی طرف متوجہ ہو گئی۔۔۔

مگر صرف ایک چیز ہنسہ وہاں پانے کے لیے وہ پہلے سے چار تھی اور جسے وہاں پا کر اسے توجہ ہوا یہ ایک بیادیشوں کا محل تھا۔ چاروں طرف بچی ہوئی آفتوں کے امیر گئے ہوئے تھے ایک بہت اونچی چٹنی سے ہکا بکا موصی نکل رہا تھا اور چند حوروں کو کہاں سے ہوئے اور حوروں پھر رہے تھے مگر کھینے کا راجہ بچا ہوا تھا کہ یہ جگہ بھی بچے بے طرح خالی خالی نظر آ رہی تھی۔۔۔ ایسے اڑے پر ایک نامکان عیدر ہاتھ جس کی اسٹھ اینٹ جس ایسی مہانت علی کی تھی کہ وہ لی کا دل چاہ رہا تھا کہ اسٹوں پر ہاتھ رکھے۔ یہاں کوئی مٹی کی مٹی خلیو سے گھسے گھسے تھیں کھڑے ہو کر وہاں کے بچے بچے اور حوروں کے کاپے کانوں میں سرگوشیاں کرتے ہوئے بیٹے۔۔۔ اس مکان کی تری کی یاد اس کے خیال کو ہائے کی ان تاسوں کی طرف لے گئی جب اسکول کے لیلے کے ہر طرف سے دھما دھماواں بچے بچے آئے کہ وہاں ہاتھی چکی ہوئی لڑکیوں کو سٹھ میں لے لیتا تھا اور وہ لی دیاستان کا تعلق مشعل ہو جاتا تھا اور اسکول انسانی آبادی سے کوسوں کے فاصلے پر کوئی یکدم تھا اور مگر خط بن جاتا تھا اور وہاں کی رہنے والی خلیو شہزادوں کی کھلی ہوئی ہاتھوں اور انگوں پر ہاتھوں کی خشک اپنے آکر تھکتی تھی جیسے کسی نے برفیلا ہاتھ رکھ دیا اور رکھ دیا اور بچے بچے بچے تھے۔ مگر موسم میں بکھڑی گم گشتی اور اپنے آپ کو پھر دکر بچے کا تھا خا کہ وہ چار لڑکیاں بھوت موت کھیل میں مشغول جاتی رہی جاتی تھیں۔ ایسے ہی رات وہ علیے سوئے الاڑ کا اور سے گزرتا تھا۔ جب ٹھوڑی دور سے بھی انجلی طرح مشعل پہچانے میں نہ آتی تھی مگر وہ

چہار دیواری سے جتنا ممکن تھا قریب ہو کر چلتا تھا اور ڈولی کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ عین ان کے اندر ہی اولیٰ کو اس کی نظروں کی سمت کے بارے میں کسی شبہ کی گنجائش نہ رہی تھی اور وہ بھی اس کے انکار میں چہار دیواری کے قریب سے قریب نظر نہ رہنے اور کہے کہ ایک بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ مظلوم وہ تھا اکیلا اکیلا کیوں مظلوم ہوتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اس کے صحرا کو بھی کوئی ساتھی نہ دیکھا گیا تھا بلکہ اس کا چہرہ بھی ہمیشہ کسی سوچ میں ڈوبا رہتا تھا۔ وہ ڈولی کا گھبراہٹ سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتھر اور اس کی ہنسنے والی ترین لمبے کے لیے اس کے دل میں بھی کلک پیدا کر دیتی تھی۔ بچہ کوٹ میں سے اس کے گورے گورے ہاتھ باہر نکلے ہوئے کیسے اچھے مظلوم ہوتے تھے اور اس کے چنگدار ہاتھوں اور پرستانت چال کے تصور نے اس کی سختی راتوں کو مشغول رکھا تھا۔ وہ گرمیوں میں بھی آٹا رہتا تھا اور بازوؤں کی دھند بٹ جانے کے بعد اب اس کے ہونٹ بھی ساف نظر آنے لگے تھے۔ جن سے اس کے حراج کی نری اور محبت اور اس کے دل کی حسرت کی چنگی تھی۔ وہ آج بھی جیتے آئے گا مگر میدان کو باطل چلی پار کر بہت باجیں ہوگا۔ وہ کسی طرح پیچھے مڑ کر دیکھتا رہے گا اور ہر لمحے اس کی باجی بڑھتی چلی جائے گی وہ دو تھیں دن برابر آئے گا مگر آخر اس کی امید بالکل ٹوٹ جائے گی۔ اس کے رخ کا فیال طور اولیٰ کے دل میں بار بار ٹھونکنے کی یاد رہتا تھا۔ وہ سوچتا رہتا تھا کہ کاش وہ آج ٹھہر گئی ہوتی۔ جب وہ گزر رہا ہوتا تو وہ کسی سے پکار کر کوئی ایسی بات کہتی جس سے یہ ظاہر ہو جاتا کہ وہ چھٹیوں میں گھر رہا ہے نہ یا کوئی اور تیرا تھا یا کرتی۔ اس سے کم سے کم یہ تو ہوتا کہ اس کو اتنی شہید باجی کا مقابلہ نہ کرنا پڑتا۔۔۔ شاید وہ اسے اپنی کوئی یادگار دیتا۔ مثلاً وہاں نہ مال چہار دیواری کے اندر پھینک دیتا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ کوئی دیکھتا رہا ہوتا اور وہ اسے پکار کر کہتی۔ "اوارا کھئے۔۔۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ میں کل چھٹیوں میں گھر جا رہی ہوں؟" وہ اس سے زیادہ بگڑے ہوئے تھا کہ اس کا چہرہ خود اس سے کہیں زیادہ کہہ دیتا۔ وہ چہار دیواری کے پار چلا آتا اور دونوں کسی چیز پر جھڑپ جاتے۔ مڑ کر ایک راہ گیر کی نہ ہل رہا ہوتا اور سطر میں دلیرانہ سب اسکو کے اندر بھونکے۔ وہ اس کے کندھوں کے گرد بازو ڈال لیتا اور اسے چار کرتا۔۔۔ مگر سبناش تو اس نے دیکھا تھا کہ گانوں کے بنائے ہوئے دیواروں کا پورسا رہا تھا۔ اس نے ظلم کی پیرائے کی طرح اس کا چہرہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا اور سر پیچے کو جھک جاتا۔ وہ اس دھڑکتے ہوئے کر سکا اور اس کی ٹھوڑی اپنے انگوٹھے اور انگلی سے پکڑ کر ایک لمحہ دیکھتے رہنے کے بعد اس کے ہونٹوں پر چمکے سے اپنے ہونٹ رکھ دیتا تھا۔ چھٹیوں کی طرح اس کے ہونٹ پٹکے اور نرم ہوتے۔۔۔ طور ڈولی اپنے جسم کو اس سے جس قدر قریب ممکن تھا لگا دیتی اور اپنے گوشت میں اس کے بدن کی گرمی داخل ہوتے ہوئے محسوس کرتی۔۔۔ گرمیاں پکا پکا جازوں میں بدل جاتی تھیں اور ہر طرف سے دھواں اٹھ کر انہیں دوسروں کی نظروں سے محفوظ کر لیتا۔ گرمی کی شام کی واقعیت اور انھوں کو تکلیف دینے والی مہمت اور حاکمیت کی جگہ جازوں کی پراسرادی ایہام اور دلاریت لے لیتی۔ چہرہ تنہا تار یکے ہوتے ہوئے لمحوں کی بھر دو رنگ پانی دھیں کی دھیں جم کر رہ جاتی۔ وہ ایک دوسرے سے اپنا جسم لگے ہوئے پیادگی باتیں کرتے رہتے کرتے رہتے جیسا تک کہ ان کی کجوائی کا ایک ایک لمحہ ہونے سے ہٹتا رہ جاتا۔۔۔ جرات کی طرح دگی دگی ہر کر اڑتے ہوئے اندھیرے سے جہ جہ کرتے والے اکیلے ستارے کی روشنی میں وہ کتنے معصوم آجیروں، ڈاکٹروں سے پاک اور معصوم و معزز مظلوم ہونے لگتے۔۔۔ جیسے آدم و حوا عرشِ ربی کے سامنے میں اپنی طاقت کے پہلے دن۔۔۔ بھکت و مسرت کی اس طرہ اس مظہر کے ساتھ ساتھ اولیٰ کے تحت اشعر میں طرح طرح کے تہذیبی آجیروں نے شاعرانہ غزلوں کا پکار رہے تھے۔ جب وہ اپنے نکل کی حرکات سے انہیں طرح لطف اٹھا چکی اور کسی بچی بچائی چیز کے کھنچ میں ڈاسا رہی تو وہ نکلنے اپنی کہیں گاہ سے باہر نکل آئے۔ یہ خیال اسے بار بار دہانے دے رہا تھا کہ اگر کہیں ایسا ہوا کہ چھٹیوں کے بعد وہ اسے نظر نہ آیا تو۔۔۔ ممکن ہے وہ اس دور میں کہیں باہر چلا جائے یا اپنی دور مکان لے لے کر وہاں سے آتا

مستقل ہو جائے یا پھر کسی اور کی طرف متوجہ ہو جائے اور وہ بلا سوچ سمجھ کسی اور سڑک پر نظر آ کر سے اور یہ بھی بالکل قرین قیاس ہے کہ اسے دل نہ تک
 نہ دیکھنے کے بعد اسے ذہنی پسند نہ رہے اور وہ ایک غیر دلچسپ چیز کے پیکر میں آنا محض حماقت سمجھنے لگے اور کیا فکر کہ وہ شروع سے ہی ذہنی اور کوئی
 اہمیت نہ دیتا ہو اور محض تعظیم تبلیغ کے لیے اس سے نظر اڑا کر رہا ہو اور اب اس ذہنی سے اس کا دل بھر جائے۔۔۔ اگر وہ نہ آیا تو ذہنی کی دنیا
 کہیں دیران ہو جائے گی، تکمیل، دل میں اس کا بالکل ملنا نہ لگے گا۔ وہ بار بار سڑک کی طرف دیکھے گی، مگر ہر دفعہ اس کی نگاہ کسی خواہنے والے یا
 کسی بڑے سے ٹکٹے والے سے ٹکرا کر وہاں آجائے گی کہ اسے اپنے دل میں ایک نظر لیں کر انتظار کرے گی مگر پھر اس کا دل اس پر غیہ اور بوجہ ہو
 جائے گا کہ وہ سب سے پہلے وہاں ہو جایا کرے گی، وہ جھنجھلا جھنجھلا کر اپنے ہونٹ چبایا کرے گی اور پھر بالکل کم کر دے گی۔۔۔ اسے چاہے تھا
 کہ پہلے سے حاضری نہ اہر اختیار کرتی تاکہ وہ کم سے کم اسے یاد تو کر لیا کر تا مشغول ہو پھر اس کے اس طرف کوئی چیز کر لیتی ہو اور اس سے دوستانہ مگر
 انکسار کے لیے میں کہتی "میرا بانی سے ذرا ملے اٹھا دیجئے۔" جب وہ اٹھ کر دیتا تو وہ اس کا سنا کر کھڑکیہ ادا کرتی اور وہاں سے بٹنے سے پہلے چند
 لمبے لمبی دھچکی اور کسی دلوں ٹھنکار اور اس کی طرف دیکھتی۔ تب تو یقین تھا کہ وہ اس کے دل میں جگہ پالیتی ہو اور وہ چینیوں کے ہونٹوں کی آواز
 بھارتا۔۔۔ یا پھر کسی دن ہمت کر کے ہر ساری دنیا سے مخالفت پر کمر باندھ کر وہ اسے روک لیتی اور پوچھتی "کیا آپ کو میں اب بھی نہیں آتی؟
 کیا آپ کو میرا رنگ پسند نہیں ہے یا میری شکل میں کوئی خرابی ہے؟ آخر آپ اسے الگ تھک اور بے پروا سے کیوں لٹکے چلے جاتے ہیں؟ میں تو
 آپ کے خیال میں راقوں کو لٹکے تھی، یہ تک جانتی رہتی ہوں یہاں تک کہ میرا سر درد کے مارے پھٹنے لگا ہے کلاس میں بیٹھے بھی میں آپ کے
 بارے میں سوچتے گی ہوں اور پھر سنے ہو کہ کچھ کلاس کا ایک لڑکی نہیں سن گئی ہوں۔" وہ ناسو سی سے مستور چہرہ اور فخر کا کہ۔۔۔ مگر کون جانے
 کہ وہ کیا کہتا۔۔۔ یا پھر کسی دن ایسا ہوتا کہ وہ دونوں ساتھ بیٹھے ہوتے اور وہ اس سے شراعت کرتے ہوتے کہتی: "آئیے لو لانا تک ہیٹ
 (Love Me Hate) لکھ دیجئے۔" وہ پہلے انھوں کے نام لکھتی تھیں کہ کتابچے میں وہ بھی تو Hate لکھ دیتا اور بھی Like لکھ دیتا اور جب وہ
 اسے نام رکھتی تو دونوں خوب قہقہے لگاتے۔ آخر میں وہ اپنا نام لکھتی اور بے چینی سے اس کے کھینے کا انتظام کرتے تھیں وہ سلیٹ پر Love لکھ دیتا
 اور جب سلیٹ اپنی جاتی تو وہ نگاہ میں تو بھینپ کر سحرانے ہوتے بچے دیکھنے لگتی مگر اس کے دل میں غشی کا دریا اٹھ اٹھ لڑا انھوں میں آئسو
 بھینکنے لگتے اور پھر وہ گردن ہانے پھر وہ کیا کرتا؟ شرم کا بھرا جگہ ہوتا اپنا اس کے گلے میں دھاندل دیتا انگلیں ہے کہ ذہنی کے کپڑے سے ہر چند
 آئے ہوں۔۔۔ کیا اچھا ہو اگر چینیوں کے بعد جب وہ لڑکا دھر سے گزرتے تو وہ دلی کا سارے ٹیٹھ فرارک پہننے ہو۔ سفید زمین پر چھوٹے چھوٹے
 سبز پھولوں والا جس کے گرد بچان پر خصوصیت ہی رہتی ہوئی تھی۔۔۔ ایسی نے بڑے فخر سے اپنا فرارک سب کو دکھایا تھا اور وہ اس کپڑے کی
 قیمت دودھ پے کر بتا رہی تھی۔۔۔ عام تو بہت زیادہ ہیں۔۔۔ مگر ایسا بھی کیا ہے۔۔۔ جب وہ گھر پہنچے گی تو اس کی ماما کہیں گی "تمہارے پاپا
 دہلی گئے تھے وہاں انھوں نے کپڑوں والے کی دکان پر فرارک کا ایک کپڑا دیکھا۔ انھوں نے سوچا کہ ذہنی کے لئے لپٹا چلوں۔۔۔ جو ہسٹال گیا
 وہ میں ایک فرارک کا ہی تھا۔" وہ ماما سے جگہ پر چڑھ کر بھاگی رہی کہ جیسے ہی وہ کپڑا لکھال کر دیکھے گی تو وہ وہی سبز پھولوں والا ہوگا۔۔۔ وہ اپنے
 فرارک کو بھر سی دیکھ کر خوشیاں منے گی اور گرد بچان پر سب کے لئے اپنی تحفائے گی۔ جب وہ اسے پہنے گی تو کسی اچھی معلوم ہوگی۔ وہ اس دن
 وہ پٹ بالوں کا ٹوڑھے کی اول تو وہ بٹے سے گرد بچان کی ساری خوبصورتی چھپ جاتی ہے دوسرے وہ پٹ کیا ہوتا ہے خط اب جان ہوتا ہے۔ ہر
 وقت سنبھالے رہو، اچھا اور دھر بلاؤ تو بھنس جائے۔ مسلمان سے کچھ گتے گتے ہیں وہ پٹا اڑا کر۔۔۔ چاہئے گا کہ وہ سے ہیں اسکول کے باہر جاؤ
 تو وہ پٹا اڑا کر جائے، سارا ذہنی نہ بیٹھو، بھرنوں کے بغیر نہیں نہ جاؤ۔ وہ بھرنوں ایک چڑیل ہے ذرا سامنے سے ٹھکے نہیں رہتی کہ جاسے لوٹنے

ہوئے تھی مگر جس کا بھی چاہا کہ کتنی بار گئے اندر سے ہو کر چلے مگر صحن نے ایک ڈائی اور کھیل کے میدان میں بھی ایسی کئی موبائیں لیجی
 بھرتی ہے جیسے چھری کی سازش ہو رہی ہو۔۔۔ اور ہاں اسلامی پینٹے میں بھلا کیا نقصان ہے؟ آخر گورنمنٹ کرٹر ڈائی اسکول کی لڑکیاں بھی تو ہیں
 ۔۔۔ اور رنگ برنگ کی سازشیں ممکن کر جاتی ہیں لاری میں دس بیگے۔۔۔ یہاں گینگ پاچا کہتے ہی اٹھا کر بٹھا دیا جاتا ہے۔ اٹھتے میں دیر کر دو ایک
 بیچ پکار آفت۔ چاہے غنڈہ کے مارے آنکھیں بند ہوئی چادری ہوں مگر جیل کرناشتہ کی روٹی پاکہ۔ یہ بھی تو نہیں کس کس کے چلے ایک کبیرہ
 زیادہ مل جائے۔ وہاں تو ایسی میٹرن صاحبہ چلاتی آئیں گی۔ "اس بیٹے میں کئی بہت خرچ ہو گیا دیکھو دیکھا کر لیا کرو دو" اور بھراوہ سے
 چھوٹی لڑکیوں کی خندیں گے ہم بڑی ہی ہے۔ "کام کے وقت تو بڑی ہی سوتی رہیں اور جب سب بشتہ داشتہ چار ہو گیا تو ہمیں کڑے کرتی
 ہوئی۔ یہ بتی چاہتا ہے کہ کس دھک دے اٹھا کے اور بگھن کرے سب بگھن کرے تو بچے تو بھر پورا اسکول۔ وہاں الگ مصیبت۔ سوال کیوں نہیں
 کئے؟ مضمون کیوں نہیں لکھا؟ ہم مارنے کی مہلت ملے تو کیا کیا بھی جائے۔ بلکہ بڑے کئی تو کھن نہیں ملتی۔ علم ہے کہ کس بیگے کے بعد کس کی
 آواز سنائی دے۔۔۔ اور ہاں اسکول میں ایک گھنٹے کی پگھلی ملے تو چلو کھانا پاکہ۔ اقرار کا دن ہو تو بچوں کی جو کئی دیکھو چلے چلے اٹھ
 ہوئے "جنہیں چھوٹے کو بھی بتی نہ چاہے۔ بیٹھے کر لیں۔ یہ ہیں انہیں۔۔۔ کئی دن سیر کو بھی جانا غضب ہو جائے تو ہم صاحب ساتھ مگر بڑی
 بولنے کی مشق کراتی ہوئی۔ آگے آگے پارتی جاتی ہیں "پلیز" "سم لونی" (Please come to me) اور بھرتیوں کی رفتار اس قدر ہے کہ
 دہراتی ہے۔ اگر کچھ صاحب نے سن لیا کہ کسی نے "سم" کے بھانے "کم" کہا ہے تو ہمیں اب اس کے پیچھے جہاں جب تک وہ ہانک گنگا مگر بڑی
 لچک میں لگا اترانہ کرے اس کا بچہ پھوٹا مشکل۔ یہ سیر کیا ہوئی مصیبت ہوئی۔ دیکھی چیز کو کچھ سکون دیکھ۔ اس تو اسی کرتے جاؤ اور ایسے ہی
 دامن آ پاؤ۔۔۔ اس کے مقابلے گورنمنٹ اسکول کی لڑکیاں ہیں۔ اپنا ٹھانڈا سے اس بیگے ملتی ہیں لاری میں۔ جیسے کپڑے ہی چاہتا ہے ہنسی
 ہیں۔ کوئی روک نہ رک۔۔۔ اگر وہ بھی گورنمنٹ اسکول میں ہوئی تو کیا حراز جلا۔ وہ زمینان سے سونہ کرنا بھی اور پائی کالی ساڑھی پہن کر
 اسکول چلیا کرتی۔ وہ اس ٹیلی لاری کی کڑی سے لگ کر تھکتی اور اس کی کتنی باہرنگی رہتی۔ اس کے ہاتھوں کی ایک لٹ ہوا سے اڑتی جاتی اور
 ساری دیکھا اس کی نظروں کے پیچھے سے گھسکتی رہتی۔۔۔ مگر ہاں کی شخص کتنی زیادہ تھی۔ وہاں ساتویں کے پاچا روپے لیے جاتے تھے مالا مال یہ
 صرف چندے کے چار آنے دیتی تھی۔۔۔ فیس زیادہ تھی انکس کا وہاں داخل ہونا کچھ جیسا انکس بھی نہ تھا۔۔۔ مگر ہا کر وہ ہلا سے کہے کی کہ
 وہ گورنمنٹ کرٹر اسکول میں پڑھنا چاہتی ہے۔ پاپا تھوڑے سے اسرار کے بعد راضی ہو جائیں گے۔ چھٹیاں ختم ہونے پر وہ اپنا سرٹیفکیٹ لینے
 اسکول جائے گی "ایک تھوڑی ہے۔ دیکھو تو زرد و پٹی پٹی جیسے بھوکوں ماری ملی اور اپنے آپ کو خوبصورت سمجھتے ہے بھلا انٹینشن پر کیا ہیں کہ بھلی
 رہی تھی۔ لڑکیں میں سے ہر گزرتے ہوئے لڑکے کی طرف جھانک کر دیکھتی تھی جیسے وہ اس پر دھڑکی ہو گیا ہے۔ وہ ہر وقت یہ دکھانے کی
 کوشش کرتی رہتی ہے کہ وہ بہت امیر ہے۔ اپنے کپڑے ہر ایک کو دکھانے کی ان کی قمیض تانے کی طرح طرح سے یہ جانے کی کہ وہ اسکول
 کی چوری قمیض دیتی ہے اور سب دوسروں کی محافل ہے۔ انٹینشن پر بھی جب دوسری لڑکیاں ملانی کی ہدف لے رہی تھیں تو وہ دھو میں رہتی
 دھواں جاتی ہوئی اسٹال پر کئی تھی اور ایسی آواز میں ایک اور لڑکے کا تھا کہ سب میں ہیں۔۔۔ ایسی اس سے چھٹکے گی "سرٹیفکیٹ کیوں لے
 رہی ہو تم؟" وہ بڑے غر سے جواب دے گی "میں تو اب گورنمنٹ اسکول میں چادری ہوں!" ایسی اس کی طرف رخ سے دیکھتی رہ
 جائے گی اور وہاں سے کدھو دوسرا ٹھانڈا چل آئے گی اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھے گی۔ بھر وہ روز اس بیگے ٹیلی لاری میں گورنمنٹ کرٹر ڈائی
 اسکول چلیا کرے گی۔۔۔ اور لڑکیوں کے ساتھ ہنسی جاتی روز طرح طرح کی سازشیں ممکن کرے۔۔۔ کپڑوں کا خیال آتے ہی اسے یاد آ یا کہ

وہ اصل وہ ہنر ہاواں والے فراق کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس لیے اوراد کر لیا کہ جب وہ پہلے بادل فراق پہنچے گی تو اس دن نہا کر ابھی طرح ہال بنائے گی۔ ان میں گلاب کا پھول لگائے گی، چہرے پر بادل کڑی (جو اس کے ہاں بطور پاؤں کے استعمال ہوتی تھی) لٹکائی گی اور جوڑے کو پائش سے خوب چکائے گی۔ اسی دن وہ اپنے چادر آنے والے بندے بھی نکالے گی، جن میں ادوی گولیاں بھی ہوتی ہیں۔ پہلے وہ خود آئینہ دیکھ کر مطمئن کرے گی کہ وہ واقعی ابھی بھی معلوم ہوتی ہے یا نہیں۔ مگر وہ جیسے کے یہاں جانے گی۔ اس کے باہر نقشے ہی سارے دیکھتے والے ہنر ان وہ جانیں گے۔ راستے میں اسے طائر ارب اور دیپ چھٹیں گے۔ ان کی یہ صحت قوت ہوگی کہ اس سے کچھ بولیں مگر وہ ہمیشہ سے زیادہ جیز نظروں سے اس کی طرف ٹھوڑے تھیں گے۔ آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف اشارے کریں گے اور ان میں سے ہر ایک اپنے کوٹ کا کالر کھینچ کھینچ کر اور طواغوت اور گرجی انگڑائی بول بولی کہ یہ دکھانے کی کوشش کرے گا کہ وہ دوسرے سے زیادہ فیشن بھل اور چمکا دکھا ہے۔ مگر وہ ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی خود کھینچے گی اس کی رفتار کی ہمواری میں کسی قسم کا فرق نہ پڑے گا اور وہ جی محتاج اور وقار کے ساتھ گزری جلی جائے گی۔ تاہم اس کا دل بیڑوں اچھل رہا ہوگا اور اس کی آنکھوں کے چہرے پکڑ پکڑائیں گے۔ وہ جی مشکل سے اپنی مسکراہٹ کو دبا کر سکے گی۔ بٹے کی شیرازی بھی اس وقت اپنا ناٹ کا پردہ اٹھائے جھانک رہی ہوگی۔ وہ بھی اسے دیکھ کر جی صعب ہوگی۔ وہ آہستہ سے نگارے گی "ڈولی!" اور ہاتھ کے اشارے سے اسے بلانے گی۔ مگر ڈولی اس کی طرف دیکھ کر فوراً سا مسکرا دے گی اور اس کے بڑھتی جلی جانے کی اور جیلے تو بالکل بھرت دے جانے کی ذمہ داری کی طرف بھی پہلی نظروں سے دیکھنے کی اور اس کا لچکا ہوا ہنٹ دکھا دے جانے کا وہ اپنے دوپٹے کو خوب پھینکا کر ابھی طرح بٹے کھینچ لے گی۔ جیسے اپنے تنک پانچوں کے پیچھے اسے چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں چمکا چمکا پیدا ہو جانے کی اور وہ سارے تنک کے تھوڑی دیر تک کچھ نہ بول سکے گی۔ اس کی اماں بھی مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھیں گی اور غمرہ چست کرنے کی فکر میں کہیں گی "افو! آج تو بڑے فضا سے ہوا ڈولی!" "مگر جیلے کی بھی زبان نکلتی گی" "ہاں ڈولی آج تو بہت فضا میں ہوا!" وہ اس دن جیلے کے ساتھ ساتھ نہ بھرے گی۔ اگر کہیں باورچی خانے وغیرہ میں اس کے فراق پر وہ صبر لگ گیا تو۔۔۔ وہ اس ایک جگہ ہا کر چنگ پر بیٹھ جائے گی اور تھوڑی سی دیر میں جلی آئے گی یہ کہ کر "اچھا! آپ تم کام کرو گی۔ میں چلوں۔۔۔" وہ جیلے کو بتائے گی "اے بڑا (Bow) کہتے ہیں۔" وہ بہت سے نئے فیصلوں کا ذکر کرے گی اور ان کی انگریزی کی اصطلاحوں کی جنتیں سن کر جیلے بہت سرخوب ہوگی اور غم کے بارے ان کا مطلب بھی نہ چھٹے گی بلکہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرے گی کہ ہاں وہ سب سمجھ رہی ہے۔۔۔ بالکل جال ہے جیلے بھی۔ پاؤں کو ہڈا دیکھتی ہے بھلا! اور وہ تنک تو آتی نہیں اسے اور یہ لوگ بیٹھے ہیں بہت دور کہ ہم لوگ بہت بڑے ذمیدار ہیں۔ کپڑے تو ادا صاف نہیں رکھ سکتی۔ میں صبح پہنے اور شام کو چیلے۔ اس کے کپڑے کتنے گھٹے۔۔۔ جے ہیں اور ان میں سے پہننے کی برائی رہتی ہے۔ ہاتھوں کو بڑا بالکل جھاڑ کھتی ہے۔ کبھی یہ بھی تو نہیں کرتی کہ زور دے کر ان میں کتنی سی کر لے۔۔۔ شاید عید کے دن دکھا جیسے کپڑے پہنتی ہو۔ آپ کی عید کو اس کا پی ہاتھ چاکر کر دیا جا کر دیکھ کہ جیلے نے کیسے کپڑے پہنے ہیں مگر وہ اس خیالی سے راک گئی کہ کہیں اسے عید نہ بھجا جائے۔۔۔ اس کے یہاں جیلے کے گھر سے سوچاں آئی تھیں اور اگلے دن جب وہ گئی تو جیلے نے کہا تھا "تم کل نہ آئیں۔ ہم تو جھارا انتظار کرتے رہے۔ آج تو ہم تھرا دی دعوت کرتے۔"۔۔۔ جیلے کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ایسے کسی کے گھر سے بلانے نہیں ہا یا کرتے۔۔۔ وہ اب کے کرسمس پر ضرور جیلے کی دعوت کرے گی اور انگریزی میں راقہ لکھے گی، جسے دے گی کتاب میں سے تسلی کیا ہا سکتا ہے۔ وہ دھو دھو جیلے کو کہہ سکے گی اور پوچھے گی "کہا ہے یہ؟" تب وہ اسے مطلب سمجھائے گی۔۔۔ مگر جیلے کہیں باہر تو نکلی نہیں۔ تو کیا ہے؟ وہ طواغوت جیلے کے ادا سے کہے گی کہ وہ اسے دے دیں۔ اس کے کہنے

سے وہ اہلادت اے دیں گے۔ پھر جیل آئے گی رات کو برقع میں لپی لپٹی ہوئی۔ وہ اسے کر ہی پر مٹائے گی۔ جیل کو بیڑ پر چڑھ کر کھانا
 لپٹ معلوم ہوگا اور وہ کچھ سٹ پٹا ہی ہائے گی۔ جب جیل پلاؤ کو اٹھو سے کھانا شروع کرے گی تو وہ جلدی سے اس کی طرف بچھو جلائے
 گی۔ ٹوٹو بچھو سے کھاؤ۔ جیل بڑی شرمندہ ہوگی اور دوسرا دوسرا کھینے لگے گی۔ وہ جیل کو گھروں کے قصبے، اسکول کے کھیلوں کا حال اور ہمہ صاحب کی
 باتیں سنا لے گی۔ اجڑا سے ہریوں کے ملک کی داستانیں معلوم ہوگی جہاں کی سرکار کا وہ قلیل تک نہیں کر سکتی۔ خصوصاً یہ سن کر اسے بڑی جرات ہوگی
 کہ ظلم رکھانے سے پہلے سینہ میں اندھیرا کر دیا جاتا ہے۔ پھر ہر ایک دیکھ کر جیل و دل میں قہر کر رہی ہوگی کہ یہ کیا چیز ہے۔ آخر وہ خود ہی جیل کی
 طرف ایک بلا جاتے ہوئے کہے گی "کوئی ایک کو۔۔۔ یہ ایک ہے انگریز بڑی ہوتا ہے یہ اسے اظہر سے بتاتے ہیں۔ وہ یہ بھی پوچھ لے گی۔" تم
 نے ہاکیٹ کھائی ہے جیل۔۔۔ انگریز بڑی مضائقہ ہوتی ہے وہ۔۔۔ اسی بڑی بڑی تختیاں ہی ہوتی ہیں۔ بڑی مزیدار ہوتی ہے ہمیں تو میم
 صاحب بانٹا کرتی ہیں۔۔۔ وہ اسے یہ بھی سنا لے گی کہ دین میں لڑکیاں کتنا فسفی سی گاتی ہیں مذاق کرتی ہیں اور کیا کیا لطف دیتا ہے۔
 جیل چلا گیا کر وہ جائے گی اور کچھ کھینا ہی نہیں چسنے لگے گی۔۔۔ وہ جیل کو یہ بات بتائے یا نہ بتائے کا اعتنا نہ کرے گی۔

ایک مٹی ریت آکر اس کے پھرے پر اس بری طرح گرا کہ اس کی آنکھیں اور منہ کر کر اسنے لگے۔ ہوا بہت تیز ہوگی تھی اور درخت
 وچ اندر اڑ رہے تھے آسمان گرد سے بالکل اٹ گیا تھا اور غلی کھٹوں میں دور دور تک ٹکڑوں نے اٹھنے اور پھر گرنے کا سلسلہ باندھ رکھا تھا
 گویا انہوں نے ایک دوسرے سے شرمندہ رکھی تھی۔ برے کی طرح چکر کھاتے ہوئے لوہے پر چڑھنے کے بارگاہ ان کے باقی کو کسی قدر دلچسپی سے
 دیکھا جا سکتا تھا انگریزوں نے اس کی سستی، ظمیر اور انیم رضا صدی اور گچھا بہت ناقابل برداشت تھی۔ بعض دفعہ تو وہ ایسے مغل ہو جاتے تھے
 گویا انہوں نے بالکل ہمت ہار دی ہے اور اب بالکل آگے نہ بڑھیں گے۔ ان کی کافی دیکھ دیکھ کر وہ اپنی اپنے آپ سے ٹھک ہوئی جاری تھی اور
 اس کا جی ہاں رہا تھا کہ کشتی پر سنا کر اسے یا کوئی ایسی ہی وحشتناک حرکت کرے جس سے کم سے کم یہ تو معلوم ہو کہ اس کے اندر زندگی ہے۔ کھیت
 بالکل صاف چڑے تھے صرف کہیں کہیں کھوٹیاں دکھائی دیتی تھیں۔ بعضی جگہ غلی کھٹوں کے پار سے تھوڑی سی گرد آلود ہریائی بھی زمین کے
 قریب قریب بھی ہوئی نظر آتی تھی، تنگ اور در کا یہ سب لگتی چاندی طرح ایسا کھانا تھا کہ وہ ان کو کھانا یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کھیت اس کے سینہ
 میں سے اٹھ کر مغل میں اڑ گئے ہیں اور اسے تے ہی آ رہی ہے۔ سڑک کے درخت اس کے بائیں آٹھو کا کھانا نہ باندھ کر تیری کی طرح اڑتے ہوئے
 آتے تھے، جیسے اس کے دماغ کو ذکر پار ہو جائیں گے مگر جب وہ قریب پہنچتے تھے تو جلدی سے فٹا کر نکل جاتے تھے۔ وہ ان اس پر بالکل چار
 تھی کہ وہ اس کا سر بھڑو دیں مگر اس کے لیے یہ ہر طرح مذاق بہت تکلیف دہ تھا۔ اس کا سر دودھ سے چٹا ہوا تھا اور انکھوں میں چلی پھر بھڑا تا
 تھا اس کی آنکھوں کے ذیلے مل رہے تھے اور چمک بچکانے سے بجائے تسکین کے اتنی جھپٹ ہوتی تھی۔ پیچھے بیٹھے داسے چٹا چٹا کر رہے مٹی
 ہمیشہ کر رہے تھے اور اسے ٹوک ایک ساتھ مل کر لے رہے تھے کہ وہی چار ہاں ملے گی تھی۔ ایک آدمی اپنی آواز دوسرے سے بلند کرنے کی
 کوشش کر رہا تھا۔ ارے جتاں جتاں۔۔۔ جتاں نے تو وہ کیا جو۔۔۔ چھ آدمی کسم۔۔۔ کسم۔۔۔ کسم۔۔۔ کہہ کر اپنی بات شروع کرنے کا
 موقع ڈھونڈ رہے تھے مگر دوسرے آدمی ان کی بات کاٹ کر خود بھی "کسم۔۔۔ کسم۔۔۔ کسم۔۔۔" کہا شروع کر رہے تھے تو لی چار کو مغل کر
 رہی تھی کہ اس طرف سے کان بند کرے مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی لٹکا ضرور اس طرف سے مغل میں آکر مٹیلے کی طرح لٹکا تھا۔ اگلے نے لگے غول غول
 غول غول چار کی تھی جس کی دھن پر چکر کھاتے کھاتے اس کا سر بالکل مفلوج ہو گیا تھا اور گرا پڑ رہا تھا۔۔۔ اس سے چمک تو نہ بچکا لی جاتی تھی
 مگر اس کے پیٹے اب واپس کے کھانوں کے عادی ہو چکے تھے۔ اس نے ہرچہ باریاں کر لیں کہ اپنی آنکھوں کا میم باز چھوڑ دیا اور بالکل بے حرکت

ہوئی۔ آنکھوں کا کھلا ہوا حصہ پانی سے ڈھک گیا، جس کی چپک نے بکواس کو بچے سمجھ لیا اور اس کی آنکھیں آڑ بند ہو گئیں۔۔۔ خند ہونے کے باوجود، وہ انجمن کی بھین بھانٹا ہٹ صاف سن رہی تھی، مگر وہ اس کے سونے میں غل ۱۰ کے نے کہا ہے اسے اور ہی دے رہی تھی اور دوسری بڑا غلطیوں سے بچا رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ بہت جلدی سے آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے، مگر اس سے زیادہ اسے زبان و دکان کا کوئی شعور نہ تھا۔ وہ اپنا ہنس مکھ کھینچتی تھی۔ وہ کسی لیلیک شے میں بھی جھریل نہ ہوئی تھی، بلکہ کھن ایک شامیت صرف ایک خیال۔۔۔ "میں"۔۔۔ باقی، وہ کئی تھی۔ اس کے چاروں طرف ایک بھوری چار کی تھی، جس میں کبھی کبھی سفیدی کے دھبے دکھائی دے جاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ کہہ دے کہ کتنی تھی کہ وہ انجمن کی بھین بھانٹ کے اندر نظر کر رہی ہے۔ صرف ایک دفعہ اسے سر کے بال اور چوٹائی کا تھوڑا سا سخت نظر آیا تھا جسے اس نے پہچان لیا تھا کہ آئینہ ہی کا ہے، مگر وہ ایک جھٹک کے بعد ہی غائب ہو گیا تھا اور اے میرے کی روائی بھر اس طرح جاری ہو گئی تھی۔۔۔

لاری کے ایک دھچکے سے اس کی آنکھ کھلی۔ لاری ایک گاڑی کے پاس سے گزر رہی تھی۔ سڑک کے ایک طرف چھوڑی کے سامنے ایک عورت کی کات دی تھی اور دوسری طرف کافی سے ڈسکا ہوا ایک تالاب تھا جس میں تین چار بچے سیر رہی تھیں اور سر اٹھا کر لاری کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔ بچے اپنا کھیل چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور انتظار کر رہے تھے کہ لاری آگے بڑھے تو اپنے کالے سے ہارن بجاتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگیں۔ ڈولی کا دروازہ اب اچھا ہو گیا تھا مگر سر بھاری تھا اور آنکھیں بند کی جھ سے اچھی طرح کھل نہ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ اسے کچھ کام سامنے ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اسے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اس کا سر تو بالکل بے حس ہو گیا ہے اور اس کے بجائے ٹھوڑی کسی کھری سوئی میں غرق ہے۔ اس نے گردن اڑا کر انگوٹھی ملی اور سڑک کے کناروں میں دیکھیں لینے کی کوشش کرنے لگی تاکہ اس کی گرائی دیکھ دوں جو جائے۔ گاڑی سے ٹھوڑی دور آگے ایک بچہ دوڑا ہوا جا رہا تھا جو لاری کو دیکھ کر چپ ہو گیا اور اس نے کچی ہانگوں پر سے اپنے کرتے کا دامن سمیٹ کر ایک ہاتھ میں اوپر اٹھالیا اور لاری کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک نکل گاڑی میں ایک عورت بٹھکی تھی جس نے اپنا زور دوہندہ اتھوں میں دبا رکھا تھا اور جس کی ناک میں سونے کی کھل چبک رہی تھی۔ ٹھوڑی کو اس کے پیچھے پیچھے دانت بالکل پھندہ آئے اور وہ لاری کے پیچوں کی طرف دیکھنے لگی۔ یس تو کچھ ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے لاری سے جڑے ہوئے ہی نہیں ہیں۔ دو تو گویا ہوا میں معلق تھے اور ایک جب غیر ہم آہنگی کے ساتھ لاری کے آگے آگے بھاگ رہے تھے۔ مگر ان چیزوں کے ساتھ وہ اپنی مصروفی دیکھ کر یاد دیر تک قائم نہ کر سکی اور اسے یقین ہو گیا کہ پتہ دل بہلانے کے لیے اسے اپنے اندر ہی کوئی چیز تلاش کرنی پڑے گی۔ کئی یادوں اور انھوں کو یاد کر دینے کے بعد اسے خیال آیا کہ صرف "فول الفولا" "نئی سے اس کی کار بآ رہی ہو سکتی ہے جس سے اس کا تعارف فرس نے کر لیا تھا۔ ایک رات وہ بالکل نئے ہوئے اس کے پاس آئی تھی اور لہاتے ہوئے بچی "تازہ میں اس سے کہا تھا" تم نے یہ دیکھا ہے ڈولی؟" اس نے "فول الفولا" سے "اکیا مکھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا اور اپنے آپ سے یہی جیڑ کر مضطرب انداز میں دانتوں سے دانتن کاٹنے لگی تھی۔ اور جب ڈولی کو بھی اس میں بہت عرا آتا تو وہ اپنی دریافت کی کامیابی پر بہت مسرور تھی۔ ان دونوں نے پوری "فول الفولا" کو کچی دفعہ ساتھ ہی کر چکا تھا اور ڈولی نے اکیلے میں بھی یہاں تک کہ اسے کچی حریفہ لڑھکے یاد ہو گئے تھے اور اس کے گتے ہی دیر ان اور آدروہوں میں دینگنی کا ساہان بن چکے تھے اس دن کی جب اسے ٹکلی بار پیا حس ہوا تھا کہ ہر گاڑی کی طرف دیکھا ہوا چلا ہے تو دانت کے چنگ پہ لٹل ہوئی دیر تک ان خصوص کو یاد کرتی رہی تھی۔ اس نے اپنی دائیں خوب پھٹکی تھیں، بائیں جھکے کے کے دونوں طرف پھیلا کر اپنی لینے لگی تھی اور چھاتوں کو چنگ سے لگا کر سینے کو چوری قوت سے دبا دیا تھا جس کی بجلی بھی تک میں اسے انتہائی لطف ملتا تھا۔۔۔ ان ٹکڑوں کو یاد کرنے سے پہلے اس نے ہر طرف سر گھما کر اچھی طرح مٹھیاں کر لیا کہ

[illegible]

ہیں مگر جنس۔ ان کا جان نہیں کچھ اور اس پر سنہری ٹیکہ، کتنا خوبصورت معلوم ہوتا ہے اور اس پر تو وہ بہت ہی صریح ہیں۔ سب سے زیادہ نمبر اس کو جی ہیں اور اس سے بڑے نرم لہجے میں بات کرتی ہیں۔ اسحاق کے قریب چار یوں نے خود اسے بلا کر بڑھایا تھا اور اسے کہہ دیا تھا کہ اگلی کلاس میں وہ شروع سال سے ہی ان کے پاس پڑھنے آیا کرے۔ ایک دن جب وہ ان کے پاس بھی سوال لگا رہی تھی وہ اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں اور اس کے سر پر ہاتھ بھرتی اور بال ٹھیک کرتی رہی تھیں۔۔۔ جب وہ گلابی ساڑھی پہنتی ہیں تو ایسی خوبصورت معلوم ہوتی ہیں کہ اس کا کسی چاہتا ہے کہ بچکے سے ان کا گال چوم لے۔ کتنی مرتبہ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ان سے کہہ دے کہ وہ ان سے کتنی محبت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ انہیں اپنے پیچھے سے لگا لے اور اپنے بازوؤں میں لئے رہے مگر وہ ہر بار شرما شرما کر دوڑ گئی اور ان سے اپنے دل کا راز نہیں کہہ سکی۔۔۔ ایک مرتبہ وہ اسے اپنے ساتھ سینما گئی لے گئی تھیں وہاں سے وہ کئی گانے بھی یاد کر لائی تھی۔۔۔ اب کیسے چہرے کے سلوانے کا جواب کیسے چھوگے۔۔۔ ان کے ساتھ تو وہ پہلی بھی گئی اور وہ پینے تو وہ سینما کے لیے حرم ہی رہتی ہے۔ مگر کیا کرے اسکول والے کہتے ذرا نہیں غصہ دیتے۔ امی سے "امیہوت کنیا" اور "پیار" کی تحریف سن کر اس کا کھٹا کھٹا جی ہوتا ہے کہ کسی طرح اسے بھی دیکھنے کو مل جائیں مگر اس پر ٹپ ٹپ کر رہی رہی۔۔۔ اب کے جب وہ چھٹیوں کے بعد واپس کی تو ضرور کوشش کرے گی کہ سینما جانا ہی جائے۔۔۔ وہ مگر جنس ہی سے کہے گی کہ وہ سینما دیکھنا چاہتی ہے۔۔۔ یاہں بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دن وہ نکلاں میں بیٹھی بڑھ رہی ہو اور ایک اس کے خالہ زاد بھائی جوزف سامنے آکھڑے ہوں۔ وہ بناسوٹ پہنے ہوئے ہوں گے اور ان کے سنہری ٹیکے بھی ہوگی لڑکیاں بھونچکے ہو اور ان کی طرف دیکھیں گی اور یہ پوچھنے کی کوشش کریں گی کہ وہ کس سے ملنے آئے ہیں۔ جب وہ اسے بلا نہیں گے تو سب لڑکیاں اسے دھک کی تھیں اور اس سے دیکھیں گی اور پھر بڑھنے سے ان کا دل اُٹا ہوا جائے گا۔ جب تک وہ کھڑے رہیں گے وہ ان کی آنکھوں سے ہار رہی تھی۔۔۔ وہ اس سے کہیں گے "ڈولی میں ابھی ابھی آ رہا ہوں۔ آج کل یہاں "امیہوت کنیا" ہو رہا ہے۔ ہمارے ساتھ چلو شام کو سینما" وہ خوش خوش چہرہ ہونے کی اور شام کو اپنی گلابی ساڑھی پہن کر ان کے ساتھ سینما جانے کی۔۔۔ جوزف بھائی کے سہمے بال کیسے چمکتے ہیں اور ان کے گورے رنگ پر بناسوٹ تو بہت ہی ہے گا۔۔۔ وہ سینما میں بیٹھی ان سے شش بٹش چاہیں کر رہی ہوگی اور کتنی خوش ہوگی کہ پھر میں بھی بھی نہ ہوتی ہوگی۔ وہ دیکھنے کی کہہ گا گا۔۔۔ سن کی چڑیا سن کے ہی سن پلاں دے۔۔۔ جسے امی نے گا گا کر سارے اسکول میں بھلا دیا ہے اس موقع پر گایا جاتا ہے۔ کتنی بچے کی نگرانی میں اندھیرا چھایا جائے گا اور پھر دے پے۔۔۔

سامنے وہ سفید دھرم شال نظر آرہی تھی جس کے منہ سے جے کہ اب گھر قریب آ گیا ہے۔ اس طم کے تقریباً ساتھ ساتھ اسے وہ لڑکیاں دیکھیں جس سے ابھرا دیا جواز ہے پر میں اور ہاتھ مارا گئے جھٹکے میں وہ پورا دھم سے باہر نکل آیا۔ اس مکان کی کئی اور لڑکیاں اب بھی باقی تھیں مگر اب اس میں جاکہ حرکت نہ ہو اور ہاتھ مارا گیا اور کھڑکے کی آگلی تھی۔ اب وہ ٹوٹا ٹوٹا گن گن ذکر دہا تھا بلکہ اس نے اپنے بازوؤں کو بہت کے اندھیرے میں سمجھ لیا تھا۔ پانہ میرا اب پہلے سے زیادہ گہرا اور پھیلا ہوا تھا اور اس میں سے بہت بہت اونچی نظر آرہی تھی۔ کونے میں کھڑے ہو کر خود مشتہانے لگتے کہ ہاں اب ڈولی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پانہ سر اٹھا کر دیکھا کر دے کہ اندھیرا اسے احک لے۔۔۔ ڈولی نے اپنے ہاتھ پر کا جسم اٹھا کر لڑکی کے باہر پھینک دیا۔ جو شخصے میں سے سورج کی کرنوں کی طرح آسانی سے نکل گیا اور ڈولی کی طرف منہ کر کے ہوا میں کھڑا ہو گیا۔ وہ گویا نصف بصر تھا "علاء کہ اس کے رنگ میں سرک مری ہی رہی تھی" بلکہ اس کے "رنگ زندگی کے رنگ تھے یہ سر ہاتھن عریاں تھا۔ یہ چہرہ تو ڈولی کا ہی" مگر وہ کسی قدر لہا ہو گیا تھا "مخصوص اس کے کٹیچوں کے پاس کے جیسے اب اسے ابھرے ہوئے نہ رہے

تھے۔ چہرے کے خطوط میں اب وہ بھیجائی ہے ترغبی دہی بکھوہ ایک نورانی سوچ کے ساتھ ساتھ انداز و پیرے لیے آ رہے تھے۔ جیٹائی بھی کٹھوہ
 تھی اور اس کی منہن لمبی ہانگیں لیے جھکی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں گھبرے گھبرے صاف لٹکائے بیٹے پر سے کھلتی ہوئی انتہائی سکون کے ساتھ دو
 منڈول شانوں کے درمیان چھاتوں کو کھیر رہی تھیں جو بے داغ نرم گلابی رنگ کی "موزوں" مختاسب بے جھجک اور مطمئن تھیں۔ وہ آندہ وں
 اور نقشاؤں کی گود گوی سے بے جوش نہ تھیں بلکہ ان سب سے لہجی ہر گھٹن اپنی خوش کای اور سر رانی کے احساس ہی سے لٹک اندوہوری تھیں۔
 اس جیسے کے انداز میں آرام قرار اندھا اپنی غور و فکر اس سے متعسر شدی اور موجودہ تھی گویا وہ اس حقیقت کے بارے میں سوچ رہا ہو کہ "پانچلی
 ہی سب کچھ ہے۔۔۔۔۔"

اب اندوہ یاد دہانیاں آتی شروع ہوئی تھیں جو اسے جاری تھیں کہ گھر فریڈ ایکہ ترا تا ہر پاسے۔ اس خود سے بے دخلت کو گز اور نے کے
 لیے وہ یہ اندازہ لگا لے گئی کہ اس کے یہاں کیا ہو رہا ہوگا۔ شاید بابا کیوں کا سایہ بیٹے بھادو دے رہی ہوں۔۔۔ شاید بابا بازار سے کٹریاں
 کے کرائے ہوں اور بابا ان پر بھگ رہی ہوں۔ ممکن ہے کہ کچھ کٹی ہوئی آواز میں آگئی کی خوش نصیبی کا تذکرہ کر رہی ہوں اور اس کے مقابلے میں
 اپنی۔۔۔ گھڑولی کو یہ گوارا نہ ہو کہ ان چند باقی ماندہ لمحوں کو جو بہتر طریقے سے بھی گز اور سے چا سکتے تھے خیالات کی اس روش سے کھد کر لے
 چتا ہے اس نے لی ریل چڑھائی۔۔۔ فریڈی اچھا نکلا اور ہری تھیں بیٹے گیند سے کھیلنا بھر رہا ہوگا۔ وہ اسے دیکھتے ہیں یا کر بھاگے گا اور اس کی
 ناگوں سے لپٹ جائے گا۔۔۔ پاپا ابھی دور سے سے دیکھتا ہے ہوں گے اور سا بھل کر کہہ کر جوتا کھول رہے ہوں گے۔ وہ اچھیں گے "اوسے
 کون ہے؟" فریڈی دودھ کر اٹھیں تھانے کا "ہوئی برا آگئیں پاپا" "وہ کبھی گے" "تو آگئی اپنی ڈوٹی؟" "اور وہ جواب دے گی" "کی ہاں پاپا"
 ۔۔۔ بابا اور بیٹا خانے میں اس کے لیے کوئی اچھی چیز چاہ کر رہی ہوں گی۔ آواز اس کو وہاں آئیں گی اور کبھی کی "آگئیں اگودولی بھی ایں تو
 کہہ کر رہی تھی کاب آتی ہوگی۔ تمہارے پاپا کہہ رہے تھے کہ نہیں شام تک آئے گی۔ کئی دن سے یاد کر رہا تھا فریڈی تھیں اس پر چہ لیتا تھا کہ
 اب ڈوٹی بھاگے آئے ہیں کے دن رہ گئے۔۔۔ اور آج تو وہ صبح ہی سے چار بھر رہا تھا۔۔۔ بابا سفید سا زخمی بیٹے ہوں گی۔ وہ اسے قائم کی
 کہ اس کے پاپا اس کے لیے ایک بھولی سی سفید لیٹا نے ہیں جس کی اسے بڑی طواغیت تھی۔۔۔۔۔

سوچنے کو تو وہ سوچے جا رہی تھی کہ یہ اس کا دل بھٹکا بڑا کر رہا تھا اور اسے ابھی طرح مطمئن کر دے اپنے آپ کو دھکا دے رہی ہے
 بھر بھی وہ اس آخری نگے سے ہانپی ہوئی تھی اور اسے چھوڑنا نہ چاہتی تھی۔ جیٹ جھوپڑی یا کنواں دیکھ کر اس کے دل پر چکا گٹنا تھا اور اس کے گلے
 کی دھکیں چٹ چٹ بول رہی تھیں۔ وہ یہ خیال کر رہا تھا جیٹ کی بھی تو گھر بہت دور ہے مگر اسے اس کے خلاف ناقابل تردید شہادتیں ملے جا
 رہی تھیں۔ وہ امید کر رہی تھی کہ لاری بھونڈا نہ جوش میں جیسے کے پاس سے گلی چلی جائے گی اور بھر بھی نہ دے گی۔ باقیہ خود پیچھے جاتا چلا جائے
 گا اور وہ اسے کبھی نہ بھلا سکے گی مگر یہ طم اس کی جان کا لالے لے رہا تھا کہ لاری کا چلنا تھا ہر کی طرف داخل اور گاؤں پر۔ وہ ہر قسم کے خدائی
 سے بے نیاز رکھناؤں کو تو رتی "تنگڑوں کو کچھن بھاگ چلی جائے گی جیسے کوئی خود سر رہ کر اسے جیسے کے اوے پر لا کڑا کرے گی جس کے سامنے
 وہی کڑا صوں دانی تنگ کی سڑک چھیں ہے جو اس کے گھر کی طرف جاتی ہے۔ لاری اپنی جھنڈا ہوت ہے خود ہی سست ہو کر گھڑ رہا ہی سے چلی جا
 رہی تھی اور اسے ڈوٹی کے ہڈیاہت کی سختی پر ادھی۔ ڈوٹی چاروی تو درختوں سے بھی روکنا کٹھن تھی تو پچھلے ہی اس کے دشمن ہے ہوئے
 تھے تو اسے گھر کے قریب لائے جا رہے تھے۔۔۔ آخر اس نے ایک گہرا سا سانس لیا اور پانی کے دھبے کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔۔۔

اٹھ کے قریب کچھ تنگ کر دھب لاری کی رفتار کہہ کہم ہوئی تو اس کی امید بھر دیا جا گیا کہ شاید لاری اسی طرح دھکیں ہی رہے اور نہ کم سے کم

تھوڑا سا وقت تو گزر گیا۔ مگر جلد ہی کچھ ایک درشت کڑا کے ساتھ ہوا اور اچل دک گیا۔ ڈوبی کے کانوں میں نہ سمیٹیں مگر بھرانے لگی۔ اور اسے یہ معلوم ہوا کہ جیسے دنیا ڈوبی جا رہی ہے۔ سب لوگ لاری میں سے اتر رہے تھے۔ مگر وہ ملی تک نہیں۔ آخر جب ایک کڑے نے آخر اس سے پوچھا کہ ”اگلی سامان چلے گا تو اس نے ٹھنسنے ہوئے گئے میں سے بڑی کوششوں کے بعد“ ہاں ”نکلے اور بھرنا تھا تو بڑھا کر اس طرح دروازہ کھولا جیسے اب کوئی چارہ نہ رہا اور اس طرح اس نے اپنے آپ کو گلوٹن کے تحت پر چڑھنے کے لیے تیار کر لیا ہو۔۔۔“

لڑکا لاری کی چھت پر سے سامان اتر دیا تھا۔ جس کے انتظار میں وہ سڑک کے اس پار سب سے الگ کھڑی ہو گئی۔ اس کا جسم اتنا بھاری ہو گیا تھا کہ ٹھیں اچھی طرح بوجھ ہو داشت نہ کر رہی تھیں۔ اسے اس خیال سے پہچانی ہو رہی تھی کہ لوگ اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ درحقیقت وہی کو اس وقت اس کی ڈرا بھی پہنچا نہیں تھی کہ کہا کر رہے ہیں یا کیا نہیں کر رہے۔ وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ اسے ان کی حرکتوں کا احساس تک نہ رہے اس لیے وہ افق کی طرف دیکھنے لگی۔ ہوا اب بالکل صاف ہو گئی تھی اور درختوں کی ڈالیں اپنی مرضی کے خلاف بھر آؤ اور اسے سرائے جا رہی تھیں زمین کا خبارا تھوڑا سا آسمان پر پھیل گیا تھا اور اس نے آسمان کو گدلا بنا دیا تھا۔ گرد کی اس مریض چادر پر سوچ کی نشیبت ایک کسی قدر روشن رائے سے ڈپا وہ نہ رہی تھی اور اس سے باہر نکل آنے کی کوششوں میں وہ اٹا اور دھول میں اٹا جا رہا تھا۔ چند ٹکڑیوں پر سے دھوپ ڈھل چکی تھی اور وہ کٹی ہوئی آگھوں سے ایسے تک رہے تھے جیسے کسی معزز شخص نے ان کے ساتھ دکان کی ہوا اور اب ان میں گئے شکوے کی بھی خواہش باقی نہ رہی ہو۔



بلونت سنگھ

نام	بلونت سنگھ
قلمی نام	بلونت سنگھ
پیدائش	جولائی ۱۹۲۱ء بہ مقام چک، سہاول، گوجرانوالہ، مغربی پنجاب، بھارت
وفات	۷ مئی ۱۹۸۶ء بہ مقام آلا پاد، بھارت
تعلیم	پی۔ اے۔ آلا پاد، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۴۶ء

گوجرانوالہ کے ایک گاؤں کے پرائمری اسکول سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ کچھ وقت میانوالی اور جالندھر کے پرائمری اور نڈل سکولوں میں تعلیم پائی۔ دو ہزار دو سو اسی۔ بی۔ اے۔ میں سکول سے میٹرک پاس کیا۔ جتنا کر سچین کالج آلا پاد سے ایل۔ اے۔ اور اس کے بعد آلا پاد یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ (۱۹۴۴ء) سینکڑاؤں جن میں پاس کیا۔

مختصر حالات زندگی

بلونت سنگھ اپنے مقام، وضع قطع اور طور اطوار کے اعتبار سے ٹھیکہ سنگھ تھے۔ مگر یہ ماحول مذہبی تھا اور گھر میں پرہیز کی پابندی کر دینی ہوتی تھی، لیکن ان کا گھرانہ مذہبی تنگ نظری کا شکار نہ تھا۔ ان کے والد سردار ال سنگھ میانوالی میں جہادیت دہشت گردی کے معمولی سرکاری عازم تھے۔ بلونت سنگھ ابھی پرائمری درجوں میں تھے کہ والد کا تبادلہ میانوالی سے جالندھر ہو گیا اور اس کے فوراً بعد انہیں دہلی واران کے پرنس آف ویلز نظری کالج کے اسٹاف میں لے لیا گیا۔ اب گھریلو حالات کچھ بہتر ہوئے اور بلونت سنگھ کو دہلی واران کے ایک کیمبرج اسکول میں داخل کر دیا گیا لیکن بہت جلد حالات نے پلٹا کھایا اور انہیں واپس گوجرانوالہ آنا پڑا۔ کیمبرج اسکول کے بعد گوجرانوالہ کے معمولی سکولوں میں بلونت سنگھ کا بی۔ اے۔ اور گمر سے لیا گیا۔ کئی مدت آوارہ گردی کی، بالآخر بکڑے گئے اور تعلیم کا نوچا ہوا سلسلہ دوبارہ جاری ہوا۔ قبلہ والد صاحب سخت کیرئیرسٹ تھے اور مالی حالات بد دھند گھٹتے چلے گئے، بلونت اپنی گھریلو زندگی سے ہمیشہ متنفر رہے۔ چنانچہ گمر سے لیا گئے۔ سکول میں

حاضری بیٹھ کر ہی دنیا دورِ وقت مار چیت اور سیر و نگار میں گزارا۔ لیکن اور لوگوں میں موسیقی اور منظوری سے لگاؤ تھا، حجۃ خربک، رہا۔
 ہنری خوب جانتے تھے۔ پیلا افسانہ "نظار" (مطبوعہ "پرچاپ" افسانہ نگارین) اسکول کے زمانے میں لکھا۔ ابتدا میں "سچی دنیا" اور
 "سچ و سخی" میں قارئین سے نکلا۔ اس کے بعد "سکین" کی شائع آئے اور "ساقی" (دفلی میں پیلا افسانہ "سرا") کے شائع ہوئے ہی صف
 ازل کے افسانہ نگاروں میں شامل ہو گئے۔

۱۹۳۶ء میں دفلی آ گئے اور ٹیکہ اڑھائی برس تک وزارت اطلاعات، دہلی کھنڈر ڈوچن حکومت ہند کے رہائش "آج کل" "بساط
 عالم" "کوز" "نوناہل" کے ادارتی محلے میں رہے۔ جون ۱۹۳۸ء میں والد کے انتقال کے بعد لاڈ آباد منتقل ہو گئے اور میر تقی میر طوائفوں کے
 چہ دارے کے ساتھ اپنے والد کے قائم کردہ "امپیریل ہوٹل" چاک لٹا یاد کو سنبھال لیا۔ اس زمانے کے بلونت سنگھی بابت اوپر دیا تھا ایک
 لکھتے ہیں:

"اوپر مذکور بصورت اور قتل دیے آوی تھا۔ چہ رہے دکشا پر کسی تھا نے دار کی طرح وہ اپنے حکومت قلم کے ساتھ بیٹھا ہوتا تھا۔ اس
 کے ہر دل میں ایک بڑا سا اسٹیشن کڑا لپٹا رہتا تھا۔ اور وہ اس شان سے دکشا پر بیٹھا، کبھی سول لاکٹر میں اور کبھی پارہاؤس والی سڑک پر نظر
 آ جاتا۔"

اس زمانے میں بلونت سنگھ نے محمود احمد دہر کے ساتھ مل کر رسالہ "فسانہ" جاری کیا، جو صرف افسانوں سے مشغول تھا۔ بعد ازاں
 ہوئی کچ کریتا کی مگر عقل ہو گئے۔ جب بھی دو چہرہ بنا کر سول لاکٹر آتے اور لوگ بھارتی میں کچھ وقت گزارتے۔ ۱۹۳۸ء میں پہلی شادی کی
 اور ۱۹۳۹ء میں بیوی سے طلاق ہو گئی۔ اس کے بعد انیس یا بیس برس تک اکیلے رہے۔ دوسری شادی محترمہ سلو سے اس وقت ہوئی جب بلونت
 کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ گوان سے تیس بیٹیاں ہیں جس میں چھٹی اور والدہ کے ایک اسکول میں مغل ہیں۔

بلونت ۱۹۷۵ء سے چار رہتے تھے۔ انھیں آنسو یا سعد سے مشغول تھی۔ ۱۹۷۵ء سے ہی انھوں نے اردو میں لکھنا ترک کر دیا اور
 صرف ہندی کو درپیشا غبار رہے دیا۔ حکومت ہند یا انیس کے سربراہوں نے اور چھٹی نظر یا راکھ ہو گئی۔ آخری عمر میں چھٹی گڑھ منتقل ہوا
 چاہتے تھے لیکن حکمِ ملازمت ترک کرنے کے حق میں نہ تھیں۔ شاید انھوں نے آنے والے وقت کو بھانپ لیا تھا۔

مارچ ۱۹۸۶ء میں بلونت سنگھ نے اپنے سر کے بال کٹوا دیے تھے اور ادا لکھی نظر بنا دینے کے برابر تر شوالی تھی۔ ۲۷ مئی ۱۹۸۶ء کو
 لاڈ آباد میں انتقال کیا اور بی بی مگر، لاڈ آباد سے ان کا کی راجھی ۲۸ مئی کی صبح دس بجے آگئی۔ ان کی راجھی کے ساتھ کسی لاپاس صاحب اور شاعر کو نہیں
 دیکھا گیا۔ کسی دروازے نے ان کی صوف کی خیرا صوف سے شائع کی اور چن چن دی اور اللہ فانی آباد سے بلونت سنگھ بے یار و مددگار چلے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"نظار" (مطبوعہ "پرچاپ" افسانہ نگارین) دفلی تک پہنچ ۱۹۳۰ء

تقریباً آچار (مطبوعہ کتب):

طبع ازل ۱۹۳۳ء

کچھ اردو لاہور

۱۔ "کا" (لاڈ آباد)

- ۲۔ ”کالے کوس“ (ناول)
- ۳۔ ”پہلا جگر“ (افسانے)
- ۴۔ ”نیا ادارہ والا دور“
- ۵۔ ”مستمر نویس“ (افسانے)
- ۶۔ ”بندوستان ہمارا“ (پارہ افسانے)
- ۷۔ ”انجمن تحفہ کے افسانے“ (افسانے)
- ۸۔ ”مذہب کی کہانیاں“ (مختب افسانے)
- ۹۔ ”راست چرواہہ چاند“ (ناول)
- ۱۰۔ ”ایک معمولی لڑکی“ (ناول)
- یہ ناول شاہین جلی کشنور، راولپنڈی نے بھی شائع کیا ہے۔
- ۱۱۔ ”محمود جلاور پٹار“ (ناول)
- یہ ناول شاہین جلی کشنور، راولپنڈی نے بھی شائع کیا ہے۔
- ۱۲۔ ”راوی کی جاس“ (ناول)
- ۱۳۔ ”شیر ضرور دوں گی“ (ہندی افسانے)
- ۱۴۔ ”چنگ چراں کا بٹا“ (افسانے)
- ۱۵۔ ”چمن“ (افسانے)
- ۱۶۔ ”رجتا کا حتم“ (افسانے)
- ۱۷۔ ”صاحب عالم“ (ہندی ناول)
- ۱۸۔ ”تو تان آسان“ (ہندی ناول)
- ۱۹۔ ”دوا کی گڑھ“ (ہندی ناول)
- ۲۰۔ ”آگ کی کہیاں“ (ناول)
- ۲۱۔ ”ہاسی پھول“ (ناول)
- ۲۲۔ ”پھر بیچ ہو گی“ (ناول)
- ۲۳۔ ”راکھ کی منزل“ (ناول)
- نیا ادارہ والا دور، طبع دوم، ۱۹۵۳ء
- کتبہ اردو والا دور
- طبع اول، ۱۹۴۳ء
- کتبہ اردو والا دور
- طبع اول، جون ۱۹۷۳ء
- کتبہ اردو والا دور
- طبع اول، ۱۹۵۳ء
- نوارہ فردوس اردو والا دور
- طبع اول، ۱۹۵۰ء
- اردو پاکٹ بکس، کراچی
- طبع دوم:
- اردو پاکٹ بکس، کراچی
- طبع دوم:
- کتبہ احباب والا دور
- طبع اول، ۱۹۵۵ء

غیر عدوان:

”مہرلو میں مازست کے تہیں مینے“ (طویل مختصر افسانہ)، چند دروازہ بندی افسانے۔ دو دروازے مطلوبہ ”آج کل“ اور ملی۔

زندگی میں مستقل پناہ:

عدا۔ چچا گرانی بستی، کینڈ کینج، الہ آباد، بھارت

اعزاز

- ۱۔ بی۔ پی۔ گورنمنٹ، ہادی ایوارڈ
- ۲۔ چنیا لہ گورنمنٹ، ہادی ایوارڈ
- ۳۔ شرفی ساہتیہ ایوارڈ، حکومت پنجاب

نظریہ فنی:

”میں کہانی بہت کم لکھتا ہوں۔ اس لیے کہ میں ذرا دلچسپی نہیں سکتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میں اس بات سے بھی ذرا ہوں کہ کہیں میں افسانہ نہیں ہو کر ہی شدہ جاؤں۔ لہذا کو کوشش چند دروازہ بند بند، دھڑ دھڑ، عصمت شاہد لطیف، سہادت حسن منٹو میرت پناہ ہیں۔“
(پہ حوالہ: ”میراپناہ“ افسانہ ”میرت“ شہر ہندی مطبعہ ۱۵۵)

○

حوالہ جات:

- ۱۔ پہ حوالہ ”میراپناہ“ افسانہ ”میرت“ شہر ہندی (طو رافہ مالہ زندگی۔ مطبعہ ۱۵۱)
- ۲۔ پہ حوالہ ”کہانی کار“ طو رافہ مالہ مطبعہ ”الہ آباد“ علی گڑھ کئی جاکستہ ۱۹۸۸ء

جنگ

بلونت سنگھ

ماہما کے علاقے میں بھٹکے ایک چھوٹا سا اور غیر معروف گاؤں تھا۔ مشکل سے سو گھر ہوں گے، زیادہ تر عکسوں کی آبادی تھی۔ یہاں کی ایک بات تھی۔ وہ یہ کہ بعض اوقات یہاں کوئی غیر معمولی طور پر حسین لڑکی وجود میں آتی جس کے ساتھ کسی نوجوان مرد کے عشق کی داستان اس قدر دو بان پرور ہوتی کہ سسلیاں، سوائی میٹھ دل اور ہیر رانجے کے قصے بھی بات ہو جاتے تھے۔ اور اب کے قریب گرام کے نام پر ا تھا۔

گرام کے حسن نے اس پاس کی بستیوں کے نوجوانوں میں ایک اہل بی چادی تھی۔ وہ ایک گزیا کی مانند تھی، چٹلی کی صورت، چچی قریب اس تک رفتار کی کے ساتھ کہ نقش قدم معدوم ہر گھٹیں اور بدست آنکھیں ایسے کلاہ کی دھوت دیتی تھیں کہ جس سے بھر قواب کا حضور نہن میں نہ آتا تھا۔ لیکن ابھی وہ معصوم تھی۔ شہاب کی آمد آتی اور وہ ایک بے فکر اور پر شہاب دوستیہ کی پند ورس کو ابھی اس طرح محسوس کرتی تھی جیسے خاموشی اور پرسکون سے میں کہیں دور سے شہنائی کی اڑتی ہوئی آواز سنائی دے جاتے۔ ابھی وہ مردوں کے اشاروں اور کتابوں کا مطلب نہ سمجھتی تھی۔ وہ اپنی سکرانیت ہر کسی کو چٹائی کر دیتی، وہ سب سے خس کر بات کر لیتی، ابھی اس میں چند ار حسن پیدا نہ ہوا تھا، اس لیے جو بھی شخص اس سے بات کر لیتا بھی سمجھتا کہ گرام اس سے محبت کرتی ہے۔ ایک مرتبہ تو ہنگامہ رانگھ نے اعلان کیا تو جوانوں کے جھڑپ میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا کہ وہ گرام کو بھگا لے جائے گا۔ اس وقت وہ لپٹ گھٹا دھڑے گزرا تو دوسروں نے اسے بھگایا کہ دیکھو لپٹ گھٹا کی گرام کے عاشقوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے سن پایا تو حالات خطرناک صورت اختیار کر گئے۔ اس پر ہنگامہ رانگھ نے زبردست قہقہہ لگایا اور لپٹ کے پیچھے کھڑے ہو کر کمر باندھا۔ اس پر لپٹ کی آنکھوں میں خون اتر آیا اس نے فشتکیں نظروں سے ہٹا کر دے کی طرف دیکھا اور کڑک کر بولا۔ ”یہ تو نے کمر ا کیوں باندھا ہے؟“

ہنگامہ رانگھ نے قہقہہ کھنکھاتا کہ متا ہلہ پر آں کھڑا ہوا۔ لپٹ کی آنکھیں قریب رسا رہی تھیں۔ قریب تھا کہ دونوں جہاں ہاتھ مٹ

ہائیں مگر سب نے سچ بھڑا کر دیا۔ آخر کہاں تک؟ ایک دن خوشی ملی یہ دونوں کا مقابلہ ہو گیا۔ دلپ کا لٹو اتر گیا اور دلپ کی لاشمی کی ایک سی ضرب سے ٹھکارتے کا جزا ٹوٹ گیا، ہاتھ تو ٹوٹی گئی مگر صورت بگڑ گئی۔ اس دن سے سب کو کان ہو گئے اور اب دلپ کے بیچتی بی کرنام کا دوسرے وار پیدا ہونا ناممکن تھا۔

رات بیک بیک تھی، چاند چھین رہا تھا، گاؤں پر ایک پر اسرار خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز آ جاتی یا اس وقت روٹ کی چرتی کے پاس ایک جنگلی بلا میٹھا دم مار رہا تھا اور نہایت اچھا کہ کے ساتھ ہاؤں سہاؤں کر رہا تھا۔

یہ سہٹ اور ڈیراں کے پاس گاؤں کے باہر کی طرف تھا۔ ساتھ ہی شیل کا ایک بہت بڑا اور گناور سخت، جس پر ایک جھولا بڑا تھا۔ چونکہ بیلوں کو ہانگنے والا کوئی تھا نہیں، مٹی چاہتا چل رہے تھے مٹی چاہتا ٹھہر جاتے، اس وقت خاموشی سے گزرتے بیٹک مار رہے تھے۔

اسے میں ساڑنی سوار ایک عمر کوڑھیل کے چپے کر رہا، اس نے ساڑنی کو چپے ڈھانچا چاہا۔ ساڑنی ہلچا کر گئی اور بھر دھپ سے بیٹھ گئی۔ چناب کے دیہات میں چھ لٹو اوچھا نوچھا ہن کوئی خلاف معمول بات نہیں، مگر اس مرد کے کانوں سے غیر معمولی طور پر چڑے تھے۔ ہاتھوں اور چہرہ کی رنگیں ابھری ہوئی، آنکھیں سرخ اور لالہ، ناک جیسے عقاب کی چونچ، ایک سیاہ چوڑے اور مضبوط جڑے سر ایسے دکھائی دیتا تھا جیسے گردن میں سے تراش کر نکالایا ہو، جڑے پر رنگ رنگ کی چالی، جس میں سے تین بڑے بڑے پتھر نے نکل کر اس کی سپاؤں اڑھنی کے پاس ٹپک رہے تھے۔ کانوں میں بڑے بڑے سحر سے نکالے رنگ کی چھوٹی سی بچھری کے دو تین ٹل سر پر مہلان پر لانا کرتا اور موٹکایا رنگ کا دھاری دار جوتہ اس کی اڑھنیوں تک لٹا ہوا کہ ہاتھ کھلا ہوا، اور اس کے سینہ پر کے گھنے ہاتھ لپٹا ہوا، اور بھر اس کے ہاتھ میں ایک ٹھنڈا اور چمکدار چھری۔

آتے ہی اس نے بیلوں کو دھکا دیا اور وہ چلنے لگے، اس نے ہوتے اتارے، جوتہ کو ہوا پر اٹھایا اور اپنے سونے کڑے کو پیچھے بٹا پانی کی جھال کی طرف بڑھا۔ پہلے اس نے منہ ہاتھ دھوا اور دوسرے کھڑا اور بھڑپانی چپے لگا۔

جب وہ بچھری کے ٹھیلے سے سونے چپے لگا تو ایک نو جوان وہ شیرہ کو کچل کر ٹپک گیا۔ لڑکی نے پانی بھرنے کے لیے گھڑا جھال کے پیچھے کیا اس کی گوری کھائی پر کالی کالی چوڑیاں ایک جھن کی آواز کے ساتھ یک جا ہو گئیں۔ گلابی رنگ کی شلوار، چھینٹ کا گھٹنوں تک کا کرتا، سر پر دھاتی رنگ کی بگلی پٹنگی اور ڈھنکی، کانوں میں چھوٹی چھوٹی ہالیاں، جب اس نے اپنا چوک ہونٹ داسوں سے دو ہاتھ گھڑے کو ایک جھنگے کے ساتھ اٹھا کھینچے پر دکھا تو اس کی کمر میں ایک اہل نہیں خم سہید ہو کر رہ گیا۔

مرد نے پہلے ایک پاؤں اٹھا کر باہر نکالا اور اسے جھنگے کے جوتا بچھن لیا۔ بھر اس نے اپنے دوسرے پاؤں کو جھنگا، یاد دہرہ سرا ہوتا بھی بہن لیا۔ تب وہ اپنی چھوٹی ہاتھ میں لیے ہوئے اور ڈھکی پر جہاں کہ ایک سفید مرنی کے بہت پر چڑے تھے، کھڑا ہو گیا۔ اس سی کسی کے گھر کی ہنگی اچ اچھی جس پر پٹے نہ کئے تھے۔ جب لڑکی دھار کے قریب سے گزرنے لگی تو مرد نے چھوٹی سے ایک اچا پیچھے لپکرا، باجولڑکی کے پاؤں کے پاس جا کر گر اس وقت انٹینی مرد نے اس کے پاؤں کو دیکھے جیسے سپید سپید کپوتر، کتوں کی بگلی گلابی رنگت ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے وہ پاؤں ابھی ابھی گلاب کی لپٹوں کو دھت کر چلے آ رہے ہوں۔ لڑکی نے اپنی لائی بگلیوں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، شاید اس نے اسے مھن ایک دوا کیر سمجھا تھا۔ مگر اس کی ڈرناؤنی صورت دیکھ کر اس کی بڑی بڑی سرگھٹیں آنکھوں میں خوف کا سا پتہ دکھائی دینے لگا۔ مرد نے بھاری بھر کم اور کشت آواز میں چ چھا۔ ”تو کون ہے؟“

لڑکی کی نظروں میں مرد کے چہرہ پر بھی مٹتی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شخص نے اسے اس قدر بے مردتی کے ساتھ مخاطب کیا۔ اس کے سرخ سرخ بازو کھولے گئے تھے کسی نے لالہ سرخیں ان پر چھڑک دی ہیں، مگر مرد غیر معمولی طور پر بھیا تک خندہ مرد نے اسی لمحہ میں اپنا سوال دہرایا۔ ”تو کون ہے؟“

لڑکی سمجھ نہ سکی کہ اس بات کا کیا جواب دے۔ اس نے اپنی حنائی انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں وہاں اس گھر میں رہتی ہوں۔“

مرد نے جھپٹت ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اپنے چوڑے شانوں کو حرکت دے کر بولا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“

دو شیز کی آنکھیں پر آب ہو گئیں۔ بولی ”گرم؟“

”تو وہاں کس کے ساتھ رہتی ہے؟“

”بھئی ماں ہے، اپنے سہوہ پاپا، باپ سب ہی رہتے ہیں۔“

”مجھے اپنے گھر لے آئی۔“ مرنے اس کے ساتھ ساتھ قدم پر حواسے ہوئے کہا۔

”مجھے قہقہے ڈر معلوم ہوتا ہے۔“

مرد کی چیخ پانی پر بہت سی تیز ہیں چٹکیں۔ اس نے اپنی دہلی کی طرح آرام سے ساڑنی کی مہار پکڑ کر اپنی دانستہ میں ڈرامہ لہجہ میں پوچھا۔ ”کیوں؟ کیا تم لوگ کھٹ نہیں ہو کیا؟“

لڑکی کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ ”نہیں مجھے تم سے خوف معلوم ہوتا ہے۔“

”کیوں؟“ ”مرد نے اپنی ہڈی سے صراہ کرتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی نے ایک لمحہ کے لیے اس کی چند آراء گھموں کی طرف دیکھا۔ ”تم جتنے کیوں نہیں؟“

”ارے یہ بات؟“ یہ کہہ کر انھیں نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا، جیسے کوئی پانی سے لبریز سٹکار مین پر اڑا مل دے۔ اس کے قہقہہ کی آواز سن کر چنگاڑیں اٹھتی تھیں گا ہوں سے لگ کر پروا کر گئیں۔

گرم نام کا گھر گاؤں سے باہر دھڑیک کے درختوں کے پھنڈ کے پاس تھا۔ اس کی کھلی تو بہت دور سے ٹھکراتی تھی۔

دروازہ کے سامنے پہنچ کر انھیں رک گیا اور گرم نے اندر سے اپنے ہاتھ پور بھائی کو باہر بھیجا۔ ان کو دیکھتے ہی انھیں نے بلند آواز میں کہا۔ ”واہ گورو دی کا خالص سری واہ گورو دی کی مٹھا!“

”واہ گورو دی کا خالص سری واہ گورو دی کی مٹھا!“

انھیں جاکسی پٹنگا بہت کے بولا۔ ”میں دور سے آ رہا ہوں، رات ڈیڑھ گز رہی ہے۔ میں آج بھیں ٹھہروں گا۔“

باپ رات ہی اپنے پوتے کے ہاتھ میں دے کر انھیں کے سڑ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بہت خوش خلق اور خندہ شخص تھا مگر انھیں کی بھیا تک شخص اسے شش در شش ڈالے ہوئے تھی۔ آخر اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں جو طرح سے خدمت کے“

خوشتر اس کے کہ وہ اپنا قہر پھار کر سکے۔ انھیں ساڑنی لڑکے کے سپرد کر کے دروازہ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔

اگرچہ گھر کا کل سامان غریب تھا مگر گرم سے بلی ہوئی کچی دھاریں اس کا خلوت دے رہی تھیں کہ گرم کی صورتیں کھلی یا آرام طلب

ہرگز نہیں۔ مگر سب افراد ہمارے گھر میں ہونے چاہئے ہمارے۔

ایہ دلی سے نکل کر انہی میں داخل ہو گیا۔ ایک چھ سینے سے لگی ڈاکہ لگنے سوراخ تھا۔ مٹی موندنیوں کے موت کو برے اچھا تھا ایک طرف کمرلی کے پاس ایک مجلس بکلی کر رہی تھی۔ مجلس اور کمرلی کی سانی کی بو پر چار جانب بکلی ہوئی تھی۔ دی پر مئے کپکپے کپڑے لٹک رہے تھے۔ ایک طرف خراس اور دوسری طرف تھوڑا سا اس کے پاس ہی ایوان سے لگا ہوا چٹخڑے کا پھپھ، بڑے بڑے اچلے کودنے میں کپاس کی چڑیاں، چمے کے پاس بھونے برجنوں کا اباار، ایک کمرہ میں سے سفید سفید چمکتے ہوئے برتن دکھائی دے رہے تھے۔ ساتھ ہی تانے میں پردے ہوئے فلم کے چمکتے ہوئے کھنکھ کے واسطے لٹک رہے تھے۔

مگن سے گزرا کر بڑا حبابا ہفتی کو دروازہ سے باہر پھیر کے بیچے نے کیا تھوڑی سی جگہ کے تینوں طرف ایک جگہ دیکھ کر اطمینان کی تھی۔ سوکھے ہوئے اپنے بوجھ لانے کے کام میں آسکتے تھے ایک جگہ رکے جاتے تھے۔ یہاں پر ایک چار پائی قال دی گئی۔ چار خانوں والا ایک شخص اور چلتی کے دل کی طرح سخت ایک عدد لکے پس پر رکھ دیا گیا۔

مگر عام نے کپاس کی چھریوں کا ایک گٹھا غور میں پھینکا اور طوطا جاگ کھڑے ہو گئے۔ جس وقت وہ غور میں روئیاں لگائے گئے تو اس کی اور صفی سرے کھٹک گئی۔ اس کی لاجی چوٹی کے رنگ رنگ کے پھول نے اس کی چڑلیں تک لٹک رہے تھے۔ وہ دیکھتے ہوئے غور کی روشنی اس کے صحن چرواہہ پر رہی تھی۔ اور انہی چپکے چپکے اصدے دیکھ رہا تھا۔

خاتم کی ترکاری، ایک کنوڑے میں شکر گھی، دلیہ کا اجاڑا، دو بی بی بی چائے کی گلیاں اور آٹھ چھڑی چھڑی روٹیاں قابل میں رکھ کر مگر ہم اس کو بے آئی۔

جب انہی نے اونچے سر میں تھیں چار ڈاکریں لیں اور بڑے زور شور کے ساتھ منہ میں انگلی پھیر کر کھلی کی تو گن نام کو معلوم ہو گیا کہ وہ کھانا ختم کر چکا ہے۔

وہ برقی اٹھانے لگی تو اس نے دیکھا کہ بجلی کیڑے اتار رہا ہے۔ جب اس نے جھپٹا تو اسے جھاڑو کے قریب دیکھنے لگا تو سونے کا ایک کشتہ پچھ کر چلا اگر تاہم ٹھک کر واپس جانے لگی تو بجلی نے آہستہ سے پوچھا۔ ”گرم نام اس جارہی ہو کیا؟“

گرم نام حسب معمول اپنے دفتر پر امداد سے مسکراتی اور ہواؤں میں سنہلنے لگے ہوئے آگے جھک کر آہستہ سے بولی۔ ”سب لوگ سو جائیں تو میں آؤں گی۔“

ابھی دور کھٹوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شریعت اور چل کے پیڑ سیاہ دیووں کی طرح خاموشی کھڑے تھے۔ لیٹا مندریوں، چنریوں کے گھونٹے لگ رہے تھے۔

ایسے مسلمان وقت میں تاروں پر گرے آسمان تھے، کسی دروازہ پر ہٹ سے کسی نو جوان کے سر پر آگیز گانے کی ٹکلی ٹکلی آ رہی تھی۔

ان کے پاس ایک ہی شکل کے پتھر

سازمان پژوهش‌های علمی و اطلاع‌رسانی

www

اسنے گرام سے پاؤں شلواری کے پائے اٹھائے، اٹھا ہونٹ دانتوں سے دبائے، چپکے چپکے منہ چبائی ہوئی آئی۔
تھوڑی دیر بعد دونوں میں گسٹائی کر پائیں ہوئے تھیں۔

انہی نے بہت سے سونے کے زیورات اور سونے کے ہار دکھائے۔ قریب تھا کہ گرام کے منہ سے جڑت اور سرت کے مارے ایک
چم نکل جاتی مگر انہی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

گرام بہت دیر تک جتا کی طرح جھنجھکی رہی۔ دوسرا دھڑکی باتیں کرتی رہی مگر اس کا دھیان زیورات کی طرف تھا۔ آخر کار اس نے اپنی
باتوں سے آپ ہی داکتا کر ایک کمری سانس لی اور بٹکان زدہ آواز میں بولی۔

”کیوں تم یہ زیورات کہاں سے لائے ہو؟“ پھر بے خیال میں تم جیب کھڑے تو نہیں ہو۔ مجھے جیب کھڑوں، چوروں اور ڈاکوؤں
سے سخت غرت ہے۔ وہ جھٹ سے بھرا ہوا کرا دی کو مارا لاتے ہیں۔“ یہ کہہ کر گرام اپنی سوتی سوتی آنکھوں سے تلا میں گھولنے لگی۔ جیسے کوئی کچ
کچ کا کاٹا گل اس کا گلہ داپنے کو آ رہا ہو۔

”سب گھراؤ تم بھی کیسی چوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ بھلا میرے ہوتے ہوئے تم کو کس بات کا غور؟“ غصہ یہاں میرے پاس جا رہا تھا
پر بندھا ہوا۔

گرام ہاتھ کراس کے پاس دھرتی گئی۔ اس نے انہی کے چوڑے شانوں کا چاکر دایا اور ہار کو پاہوں سے مٹھیں ہو کر کہنے لگی۔ ”تم سمجھتے
اتھکے ہو۔ یہ زیورات تو تم اپنی بیوی کے لیے لائے ہو گے؟“
”ہاں۔“

”گرام نے اپنی اچھلی پر دھماکہ سمجھتے ہوئے بڑے شہتانی سے پوچھا:
”تمہاری بیوی کیسے ہے؟“
”مگر میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔“

”اچھا تو ہونے والی بیوی کے لیے لائے ہو؟“
انہی نے اپنی ڈاکھی کے کمرہ سے بالوں پر ہاتھ بھرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میری بیوی کون ہے گی۔ بے
کی بھی پانچویں؟“ گرام نے اپنی دونوں شہیلیوں پر تھوڑی رک رک کر اپنی آنکھ کو طرہ جھڑکا دے ہوئے دناک اور اسکیڑ کر بھولے پن سے کہا۔ ”ہاں تم
کا لے ہو ڈرا۔“

انہی کے سروں میں جیسے کسی نے گھونسا مار دیا۔
مگر گرام نہ ہلکتا نہ جھجکتی سے کسی گہری سوجھ میں ڈوب چکی تھی۔ شاید وہ انہی کے لیے بیوی حاصل کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی۔
”یہ پھر تم لے لو۔“

گرام نے چونک کر انہی کی طرف دیکھا۔ ”پھر تم اپنی بیوی کو کیا دے گے؟“
انہی کو کچھ جواب نہ سوجھا۔ لڑکھائی تو بچوں سے ہوتی۔ ”مگر تم سے لے لوں گا۔“
گرام کی آنکھیں چپکے تھیں۔ اس کی پانچویں کھل گئیں۔ تالی بجا کر بولی۔ ”سمیں ان کو اپلوں میں چھا دوں گی۔ کبھی کبھی رات کو انہیں

اچھے زیورات، ہاکیں کرکھتوں میں چلایا کروں گی۔“

بکھو برسکت کے بعد انجی نے کہا: ”گر نام تم بھی تو بکھو کہ بکھو۔“

گر نام نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپالیا۔ ”بھرے پاس کیا ہے؟“

”بکھو بھی ہو۔“

گر نام چہرہ سے ہاتھ ہٹا کر بکھو برسکت سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنے گلے سے کونجوں اور خورہ کے رنگ رنگ کے بچوں کا پارا تار کرا انجی کی طرف جڑھا دیا۔ وہ اپنے اس حقیر حق کو کچھ کر بھیپ ہی گئی اور اس کے دوسرا دو کھجے گئے۔

تھوڑی دیر بعد گر نام نے ایک بگھتری دھا کر کہا۔ ”یہ میری انگلی میں پہناؤ۔ دیکھوں کبھی لگتی ہے۔“

انجی نے اپنے کالے کالے کپڑے لے کر چڑے ہاتھوں میں گر نام کا کونل کا سا ہاتھ لیا۔ گر نام انگریز جھکاتے بچوں کی سی سادگی اور انہماک کے ساتھ انگوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی انگلیوں نے اس کے دھما دھوں کا ایک بڑا حصہ حاب رکھا تھا۔ انجی دانتوں کے عالم میں اس کے خوبصورت سچوں جیسے پتوں پر انگریزوں کا ڈرے ہوئے تھے۔ جب وہ اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے لگا تو اس کی اپنی انگلیاں لرزے لگیں اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کی چار چار انگلی چوڑی کلائیوں کی نکل طاقت کشیدگی چاہ رہی ہو۔

گر نام چوکی اور کھلی ہوئی برتنی کی طرح آٹھ کڑی ہوئی۔ ”اماں کھائیں دی ہے۔ اب میں چلتی ہوں۔“

انجی اپنے خواب سے جھٹکا۔

گر نام نے آگے بٹک کر لڑائی آواز میں پوچھا۔ ”جاؤں کیا؟“

انجی کی اہمیت سے کہ وہ زیورات کی پوائی غل میں دبائے بھٹ اندر چلی گئی۔

علی ایسٹ کاؤں کے سوئیٹ رات بھر کی گری سے گھبرا کر جو بڑی تمس چڑے۔

انجی جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ گر نام نے اسے ایک ہاسی روٹی پر نکھن اور بھلا تھی کا دیا اور جب انجی کپڑے پہنا کر تیار ہوا تو

گر نام روئے گی۔ انجی نے آہستہ سے کہا۔ ”روٹی کیوں ہو؟“

”تم مجھے بہت اچھے گتے ہو۔ تم مت جاؤ۔“

انجی ہنس پڑا۔ ”میں بھڑاؤں گا۔“

باپ کو آتے دیکھ کر اس نے آنسو بچھڑا دیے۔

باپ انجی کو ٹھٹھٹ کرنے کے لیے بکھو دیکھ اس کے ساتھ گیا۔ اس نے انجی سے پوچھا۔ ”کیا میں اپنے معزز دھماں کا نام دہراؤں؟“

کر سکتا ہو؟“

”ہاں؟“ انجی نے اپنی حیرتوں میں اس کے چہرہ پر گاز کر جواب دیا۔ پھر اس نے اپنی دھوپ میں چٹکنے والی چھوٹی کی طرف خورہ بھرا دیا

سے دیکھتے ہوئے حیرت کہا۔ ”اور تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اگر میرے نام کا کرنا پنے یا پچھلے کسی سے بھی کیا تو تمہارے اور تمہارے

خاندان کے سب افراد کے خون سے مجھے ہاتھ لگتے نہیں گئے۔“

بڑے کا چہرہ خفی ہو گیا۔

اچھی ساڑنی پر سوار ہو گیا اور جہاز کو جھکا کر اپنی بھاری آواز میں بولا۔ ”آج رات بگاڑا کھانا کھانا۔“

بگاڑا کو، اصلی، عام سردار جگت سنگھ دیکھ کر غصا کر گھس گیا کہ جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کے ہچکے پھوٹ جاتے تھے۔ لیکن، غارتگری، لہجہ، ہلاوت، اور اس کے ہر روز کے مشاغل تھے۔ لڑکپن اور شباب خون کی ہولی کھیلنے میں ہی گزر گیا۔ بہت سی زمین کا مالک تھا۔ بڑوں پر ہاتھ صاف کرتا تھا، غریب خوش تھے۔ اس کے خلاف کوئی دہی دینے کا کوئی شخص حوصلہ نہ کر سکتا تھا۔ اب تیس برس سے وہ اپنی ہزار ہوں موت کے ساتھ کھیلتا ہوا سوچا اور موت کا مذاق اڑاتا ہوا ہنگام تھا۔ بہت، حسن، شہقت، نیکی، وغیرہ کا اس کے نزدیک کچھ بھی مفہوم نہیں رہا تھا۔ دور دور تک اس کی دھوم تھی۔ علاقہ بھر اس سے خرا تھا کہ اس کا دل بھرا ہوا آہن ہلے قیامت، وہاں شعلہ۔ وہ خرقہ تھا۔

لوگوں نے اس کے نام پر کئی گانے بنائے تھے۔ نو جوان مجرم مجرم کران کو گایا کرتے تھے۔ ایک، اچھا کڑا کریں ہوتا تھا

بچے بلیا تے لڑائیاں ہونیاں تے
بھاریاں دے بھل مت کھے بھیا

یہ بھرا لنگ پر دیش اس نے ایک ذرا دست ڈاکڑا لٹا اور بچ کر واپس بھی آ گیا تھا۔ اس کا ذکر یہیں ہوتا تھا۔

بچے مارا لال پور ڈاک بچے مارا
بچے مارا لال پور ڈاک سے چاروں کھڑک کیاں آپے

اس کی حویلی، چار ایک سو ریت، ایک سو رطلوں ہوا جس نے اس کی ٹھروں کو ٹیر کر دیا اور وہ تار تھی۔ مگر نام! مگر نام بھاری، تاروں، چوڑی، دسے عشق، محبت کا پند ہی نہ تھا۔ اسے لوگ کھنکھیں سے دیکھتے، دہن دیتی، اس کے ہنر پر چار میں، شباب کو کسی نے بھی گنج طور پر شرم کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ ابھی اس کو اتنا ہوش نہ تھا کہ وہ دو ہفتے بھر کھیلے، بسلوں کا چہرہ دیکھے اور اس لذت سے محفوظ ہو جو میاؤں کے لیے مخصوص ہے۔ وہ بھولی بھالی سادہ رہ چوڑی یہ جانتی تھی کہ وہ شاہیں جس کو دشمنی کرنے کے لیے، شباب کے حضور نہ بھراؤں کی کامیں نوٹ بنگلی تھیں، اور جس پر جو بھی حیرت پیدا جاتا تھا وہ اسے بھڑک اور کھو کر زمین پر گر جاتا تھا۔ وہی شاہیں اس کے حیرتلاہ انداز کا شکار ہو کر شرم کھل اس کے پیروں کے پاس جاتا تھا اور وہ حیرت سے اس کی بنگلیوں میں پہنان کر کے رکھ دیتا تھا۔

رات کی تاریکیوں میں جگان کے پاس آتا اور پیچھا پھر کے سموار ہونے سے پہلے ہی دھست ہو جاتا۔ اس نے طوطا کو ایک حتمی زمیندار بنا کر کیا۔ پانچ کے علاوہ گھر کے کئی افراد اس کو دھرم سنگھ کے نام سے جانتے تھے۔ مگر نام کی کشش اسے کبھی کوئی تھی۔ اس کے دل میں ایک کشش ہی رہتی تھی کہ وہ اس غرض کو اپنانے سے پہلے طوطا کو بھڑکائے کہ وہ قتل جانتے، اس نے بھی ابھی اس سے محبت جتانے کی کوشش نہیں کی، وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ بھڑک اس کا آغاز کرے۔ وہ سوچتا تھا کہ معلوم اس کے اعتبار محبت کرنے پر گم نام کیا روپ اختیار کرے۔ وہ اس کے پاس بیٹھی، چٹختی رہتی تھی اور وہ مصیبت سا بیٹھا کرتا۔ کبھی کبھی اس کو طوطا سے نفرت ہونے لگتی۔ صورت اس کی پہلے ہی بکھر گئی۔ مگر اس کی سریت پر تو شیطان دامن میں نہ چھا تھا۔ مگر نام تھی کہ اس نے بھی ابھی اس سے اعتبار ظہر نہ کیا۔ وہ نہایت صبر و محبت کے ساتھ اس سے پیش

آئی۔ اگر وہ اسے اپنے قریب بیٹھنے کے لیے کہتا تو وہ اس کے قریب ہی بیٹھ جاتی، مگر چاہے اس نے آج تک اس کو چھوئے کی جرأت نہ کی تھی۔
 گرام کی فرشتہ سیرتی اس کے دل میں جڑ کا بیج اکر رہی تھی۔ اس کا تعلق بحال اس کا سرنگوں کر رہا تھا۔ صرف اس کے دل کی بے چنگی اور ضمیر
 کی طاعت بچ چکی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے نہایت حیرت سے سنا کہ:

بچے نے ڈاکر زنی ترک کر دی ہے

ذہن حد بس کا عرصہ آٹھ چھپکنے ہی کو رہ گیا۔

جنگلیج و شام پانچ کر تا فریجوں کو کھانا کھا دیا اور ان کو رہا کر دیا اور دوسرے میں جا کر بیٹھ کر رہا، پھر کسی کے ساتھ نہ رہی اور طبیعت سے منقطع کر دیا۔

اس نے باپ کی منت کی کہ گرام کو یہ کی شادی اس کے ساتھ کر دی جائے۔ اس نے ڈاکر زنی ترک کر دی ہے، اور جو کچھ اس نے لوٹا وہ
 سب بڑی قوم واپس کا تھا۔ غریبوں کی کمائی کا ایک پیسہ اس کے پاس نہ تھا۔ وہ اپنی بہت سی زمین اور دو بچے ان کو بچے کو تیار تھا اور باپ کو وہ ہمیشہ
 بزدل سمجھ کر اس کی خدمت کرے گا۔ لیکن گرام کو یہ معلوم ہوئے پائے کہ وہ بچکا ڈاکر تھا اور نہ ہی اسے فی الحال اس بات کا علم ہوئے پائے کہ
 اس کی شادی کس سے ہونے والی ہے کیونکہ اس کو یقین تھا کہ وہ اس کو چاہتی تھی اور جب وہ اپنے بچے کو ایک ایک اپنا خاندان دیکھے گی تو اس کی
 حیرت کی انتہا نہ ہو گی۔ ایک باپ نے سب کچھ منظور کر لیا۔

جنگلیجین سے چار لوگوں پر وعدہ چلتا تھا۔ اس کی آمد اور منت کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی تھی۔ لوگوں نے اس اجنبی کو کبھی کبھار ان کے
 گھر سے لگتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ اول تو وہ آج بھی کبھار تھا اور دوسرا وہ راتوں رات وہاں نہیں بھی چلا جاتا تھا
 وہ ہمیشہ اپنی بچی ہوتی مصروفیتوں کا بہانہ کر دیتا تھا۔ بچے کو دیا جاتا تھا کہ اس کو کوئی نہ بچھاتا تھا۔
 بچے کو شادی کی منظوری ملی ہی تھی، اب وہ چاہتا تھا کہ گرام کی زبان سے بھی اس عشق کا قرار کر دالے، خواہ اسے یہ بتائے کہ اس کا
 ہونے والا خاندان تھا۔

ایک دفعہ بعد از غروب آفتاب وہ جنگلیجین میں داخل ہوا۔ مگر پہنچ کر پتہ چلا کہ گرام ساتھ والے گاؤں میں چلا ہوا ہوں کو سوٹ دینے کے
 لیے گئی ہوئی تھی۔

بچے نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اس نے بھڑکی کوڑا رکھ لیا۔ شملہ ڈور اور بلند کیا اور پھر اس نے سب کی نظریں بچا کر چراغ
 میں سے سرسوں کا تیل جھلی بے الٹ لیا اور اسے اپنی تھمبی اور دھڑکے سے بالوں والی گرد آلود اڑھی پر خوب اٹھکی طرح لایا۔ پھر وہ منہ لٹھوں کو مل
 دیتا ہوا گھر سے دھڑلکا اور آجوشہ آجوشہ جلتا ہوا پانچ چھ پر لگے تک چلا گیا۔

ہر طرف دھندلی چھائی ہوئی تھی۔ چاند کی نیکی روشنی میں وہ ایک بھوت کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔

اور سے ایک صورت دکھائی دی۔ اسے غور سے لگائی، بعدہ کر دیکھا کوئی صورت تھی اور یقیناً وہ تھی بھی گرام۔

جنگلیجین صبح کی طرح صبح کو کھڑا ہو گیا۔

گرام مقرر آئے ہی مسکرای۔ لیکن مسکراہٹ میں کچھ تانت بھٹکتی تھی۔ سر پر ایک بھاری گھڑائی تھی۔ "سیری تو گردن ٹوٹ گئی۔"
 "اس گھڑائی میں کیا بھرا لی ہے؟" یہ کہتے ہوئے بچے نے ایک ہاتھ سے یہ منہ بھر دیا جس کے سر پر سے یوں اٹھ گیا جیسے کوئی دو سال

کے بچے کو ناک بھڑکا کر اٹھا دے۔

”اپنے اور ہونا کیا؟“ گرام نے اپنی ہتھیلی ناک کیخڑ کر کہا۔ ”آری تھی، دست میں اپنے پٹنے لگی۔ یہاں تک کہ ٹامہ ہی میں ہو گئی۔“

دونوں کھیت کی میڈھ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

آج بچے نے گرام کی طرف دیکھا تو اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہونے لگے۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پکی ہوئی دونوں اور ساگ کا قصور اسے بے یقین کیے دیتا تھا۔ کبھی تو اس کے دل میں آتی کہ سارا سید کھول دے اور دیکھی سوچتا کہ ہرگز نہ تائے۔ آخر کار اس سے رہا نہ گیا۔ کیونکہ گرام کچھ اطرد ہی ہو رہی تھی۔ ”گرام؟“ یہ کہتے کہتے رات اس کی ڈالٹی پر ٹپک پڑی۔ اس نے اسے اپنی آستین سے پوچھ لیا اور بھر لایا۔ ”گرام! تم کو ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہوں۔“

گرام نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کر رہے تھے۔ اس نے صرف تھی اور گری سوچ میں تھی۔ اگرچہ وہ پہلے ہی خوش ہو رہا تھا۔ وہی تھی مگر چونکہ بچے سے کالی باتیں تھیں۔ اس لیے اس سے زیادہ شرماتی بھی نہیں تھی۔

بچے کو کچھ یقین ہی ہونے لگی۔ اس نے اس کا شانہ ہلکا کر پھینکا۔ ”کیوں گرام! تم کس سوچ میں ہو؟“

گرام پہلے تو چوکی۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا۔ ”میں بہت پریشان ہوں۔ میں بہت دنوں سے چاہتی تھی کہ تم کسب مال سناؤ لیکن۔“

”لیکن کیا؟“

”شرم آتی تھی۔“ گرام نے صیغہ کر جواب دیا۔

”کا کچھ بھگتا ڈالیا۔ ذرا سوچ لے سکرایا۔“ اسے کچھ سے شرم نہیں؟“

گرام چپ رہی۔

چاکا کھٹ کر اس کے قریب ہو گیا۔ اس کے بار بار صراہ کرنے پر گرام نے تکیا۔ ”وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ شادی تو کبھی کی جاتی ہے۔“

گرام کی آنکھوں میں آنسو اٹھنے لگا۔ ”بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔“ وہ کبھی روپیہ سے دالے شخص سے میرا بیاہ کرنا چاہتے ہیں جسے میں نے دیکھا بھی نہیں۔ مگر میں اور کسی سے۔“

یہ کہہ کر وہ رو پڑی۔

بچے نے اپنے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے شانہ کو چھو کر دیکھا کہ وہ نیچے تو نہیں جھک گیا۔ پھر اس نے سید بھلا کر کہا۔ ”نہیں گرام! نہیں۔“

جس کو تم چاہو گی اسی سے تمہاری شادی ہوگی۔ میں باپ کو خود بھگتاؤں کا ہاں تو سمجھ رہا ہوں۔“

بچے کی آنکھیں بار بار خوشی سے چمک رہی تھیں۔

گرام نے اس کے سینہ پر سر رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج اسے اس کے چڑے خانوں اور صندوق جیسے سینہ کو چھو کر

کوئی تسکین حاصل ہو رہی تھی۔

جی گھبرا گیا۔ اس نے اس کو چمکے اور دلا سا دیا اور پھر اس شخص کا نام ہی پچھا۔

مرگم نے کچھ کہا تھا۔ اب ہرگز کبھی اور دور دراز سے رونے لگی۔ بچے نے تسکین دینی تو وہ بولی: "تم ضرور میری یاد کرو گے، ان سب کے انہوں سے سخت چیز اراہوں۔ تم بہت اچھے ہو۔ اس کا نام "

“*فلا بد من العلم*”

Welpke

اس کا چرچا یکے بعد دیگرے ہو گیا۔

[illegible]

جنگل کی سوچیں جنگل کے لئے۔

اس کی خوشامیہ بل چڑھ گئے۔ جسم کے دو ٹکڑے کاغذ کی طرح کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ گردن کی دائیں پھول نکلیں۔ مگر نام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”کھر چاؤ۔“ اس نے بھاری آواز میں کہا۔
 ”کہہ کر وہ اچھے کھڑا ہوا۔“

”تم نور ادا کیس جلی جاؤ۔“ اس نے گرفت لہجہ میں گرج کر کہا۔ گرام چپ چاپ حیرت کے ساتھ اٹھی اور ٹھنڈی سر پر رکھ کر گھر کی طرف چل دی۔ جگا اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لٹک پٹک بے حیا کہ ہوتا جا رہا تھا۔ عکاس کی چونچ لٹاناک سرخ ہو گئی، آنکھیں طرطن آلود ہو کر رہ گئیں چہرے سے ریت چٹکنے لگی۔ سنا اس نے ٹھنڈی ۱۹۵۰ اور اسے مضبوطی سے دامن میں پکڑ لیا۔ دانت چپٹے ہو گئے آہستہ سے ہلا۔

”دلیپ گھر؟“

— 121 —

طوائف علی حلقہ ہجرتیں مشہور ہیں۔

یہ ہیں ایک چھوٹی سی سر پر واقع تھا۔ خیر کے دونوں کناروں پر شیشم کے بہت سی گھنٹے چلے تھے۔ وہاں خور سورج کی دھوپ پانی نکلنے کو ارنہ پانی نہ کی جا سکتی۔ ہیں بڑے بڑے مور سے چھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے نیچے صرف ایک کھلی چل اور پانی وہاں جسوں میں شیشم ہو کر بہتا تھا راست کے دھت یہ دو بڑے بڑے منارے دکھائی دے تھے جیسے وہ مناروں کوئی دج انسان کو بڑپ کر پلنے کے لیے من کوئے بیٹھا ہو یا جیسے کسی مردے کی دو دو بی بی آ نکھیں جن کی چٹکیاں کوئے کو بچ کر رکھا گئے ہوں۔

پس ہی ایک قبرستان قہور کچھ واسطہ پر سرگت۔ رات کے وقت کوئی شخص دھڑے گزرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس پر پہلے پرستے تھے اور بچے تھے کس کا نام ہی "خونی بی" رکھ دیا گیا تھا تو جوان لڑکیاں اور بچے تو دن کے وقت بھی اکیلے ادھر آتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہاں ایک سرکاسید رہتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا سر قہور کے نیچے دھڑکتی تھیں، مارا کرتا اور وہ خود باس کے لہجہ میں اطمینان کے ساتھ قبرستان میں ٹہلا کرتا تھا۔ نصف رات گزر چکی تھی۔ دلپ سنگھ شہر سے واپس آ رہا تھا۔ پھر نے اسے گھر سے پرہیز پر ہوں میں سامان تھا۔ وہ سارا کام بھی کرتا

تھا اور چنسا کی دکان بھی۔ اس کی اپنی چار کروڑ پچھتر سو روپے کی تھی۔

وہ لو جوان تھا۔ خوش دود خوش وضع، بھس، ابھی بیک ہی رہی تھی۔ گاؤں اور ٹھوڑی پر بالکل چھوٹے چھوٹے ہال جیسے دھڑرائی، آنکھیں اور بہت سے لہجہ کنوڑے، سر پر اس وقت لٹھی پانڈے سے ہوئے تھا، اس کا ایک چھوٹا سا حلقہ نیچے کی جانب لٹکا ہوا اور دوسرا اوپر کی طرف اٹھا ہوا، اتھوڑے خوب عیا تھا۔ جب روٹھا بیک کی شاوی کے بعد اس کے پاس بیک مانگنے کے لیے جاتا ہے، اس داھکو دارے شاوی کے پیروے بڑی دودھانک لے میں گا کر تا تھا، لکڑی اس میں تو دور دور تک اپنا جانی ضرورت تھا۔

دلپ کا قہار اور دلیر جوان تھا۔ مگر غوثی لہ کا نظارہ اور بھراس کے ساتھ وابستہ غوثی روایات اس جگہ کو اور بھی بڑھانے لگی تھی۔ رات کی تاریکی میں شیخیم کے کچھ درختوں کے تنے سر کے سبک سبک کر رہے تھے، دالے پانی کی آواز سن کر اس کے دل کو گھٹتی سی ہونے لگی اس نے ذرا بعد آواز میں "پھٹنی" کا اشارہ کر دیا۔ تاریکی اور خاموشی میں اپنی آوازیں کر اس کو تھکیں ہوئی۔

اس کا کہہ جانے پر سے پارہ چکا تھا۔ وہ بھی لہ کے درمیان تھا۔ دل میں شاواں تھا کہ کوئی خاص داھو پیش نہیں آیا۔ سنا پیچھے سے اسے اپنی گردن میں کسی تیرے کی جھنجھٹ ہوئی اور پیچھے کوئی اس کے کہنے کو پکڑے پیچھے کے طرف کھینچا رہا ہو۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ ایک دیو بیکل مرد لہ کی دیو پر سے اپنا ہوا تھا۔ اس نے اپنی گھوڑی پیچھے سے اس کی پیس میں اڑا دی تھی۔ اس کی آنکھیں اٹھاروں کی طرح دھب دھب تھیں۔

"تم کون ہو؟" دلپ نے بہت کر کے بائو آواز میں پوچھا۔

"اگر آواز" بھاری اور گھمسان آواز آئی۔

دلپ اس کی طرف بڑھا۔ پکا ایک اس نے ابھی کو پہچان لیا۔ بولا۔ "کھنیا یہ معلوم پڑتا ہے کہ میں نے تم کو نہیں دیکھا ضرور ہے۔ کیا تم وہی شخص نہیں جس نے جی سال پہلے چند اٹھاس سے لاتے دھتے میرا ساتھ دیا تھا۔ ہاں شاید وہ نکات صاحب کا سیلہ تھا۔ تمہی کا داھو ہے اور تم نے دودھ دی جان سے بھی مار ڈالے تھے۔"

"بے شک میں وہی ہوں لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ میرا نام دلپ رکھ ہے۔ میں تجھے ایک ابھتی اور نو عمر لہ کرانیکہ کریمہ دیکھا تھا اور آج تو میں نے بہت کچھ سنا ہی لہی پر گیارہ دلی لہی کر چکا ہوں اور آج تم کو بارہواں لہی کرنا ہے۔"

دلپ کو اس کے ابھرتے پر تعجب ہوا۔ بولا۔ "میں نہیں جانتا تھا کہ لہ سے کہاؤ گئی ہے۔ تم تو میرے محسن ہو۔"

"تم کو نام سے محبت کرتا ہے جو صرف میری ہے۔ تم کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تو نے جنگ رانگھو کو اسی لہی پر سخت زخمی کیا تھا۔ آج میرا میرا فیصلہ ہوگا۔"

یہ کہہ کر ابھتی نے چھوڑی داھو سے رکھ دی اور اس کی طرف بڑھا۔ "اور میں چاہتا ہوں کہ تو ایک مرد کی طرح میرے مقابل آ جائے۔"

دلپ لہ ویش کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں اپنے محسن سے لڑا نہیں کرتا۔"

ابھتی نے کہن کر جواب دیا۔ "تو بول ہے۔ یہ چھوڑو لہی طرح گلے میں رہتی رہا دل لپٹ کر گھومنا اور بات ہے اور کسی مرد کے ساتھ دست پیر لانا دیکھا اور بات ہے۔ اگر تو واقعی اپنے باپ کے ہی قائم سے ہے تو میرے سامنے آ۔" یہ کہہ کر اس نے اس کے منہ پر تھوکا۔

دلیپ کو غیر مت آگئی۔ وہ شری کی طرح بھر گیا وہ ڈنڈا جو گدھے کے ہاتھ کے لیے ہاتھ میں لیے تھا اس نے اس کے منہ پر دے مارا۔ لیکن انہی نے دھار دے کی کوشش نہیں کی۔ دلیپ نے دوسری ضرب اس کے کان پر رسید کی مڑا ٹوٹ گیا۔ اس کی چیخاٹی اور کان سے خون بہنے لگا۔ دلیپ جڑاں میں تھا اس نے پوری قوت کے ساتھ ایک نکل اس کے منہ پر رسید کیا جس سے اس کا جڑاں اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور منہ مگر گیا۔ مگر انہی نہایت سکون کے ساتھ کھڑا رہا۔

اس وقت اس کی چیخاٹی سے خون پہ پہہ کر اس کی ڈاڑھی کو زکمر ہوا تھا۔ ایک کان کا اوپر والا حصہ ٹوٹ کر نکل رہا تھا اور اس میں سے خون کی دھارا چھوٹ رہی تھی۔ جو مزاج سا ہو جانے کی وجہ سے اس کی صورت اور بھی بھیانک ہو رہی تھی۔ مگر وہ حیرت انگیز طور پر مطمئن تھا۔ پھر اس نے دلیپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی گہری اور بھاری آواز میں کہا۔ "اس طرح نہیں۔ دلیپ اتم ابھی گھس رہے ہو۔ لیکن جگا کوئی مظاہر حرکت نہیں کرنا چاہتا۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک گھونسا اپنے منہ پر دیا اور اس کا جڑاں بھی منسلکی جگہ پر آ گیا۔ دلیپ جگہ کا سامن کر کچھ غور و سار ہو گیا۔ انہی اپنی چھوٹی پکڑ کر ہلا۔

"تیرے پاس چھوٹی ہے؟"

"نہیں۔"

"گھور ہے؟"

"نہیں۔"

"مٹا چک؟"

"نہیں۔"

"نکلنا اچھی تو ہے وہ تیرے گدھے کی پیٹھ پر باری میں ٹھنسی ہوئی۔"

دلیپ مارے غجب کے چپ چاپ کھڑا تھا۔

"جا" انہی نے پکار کر کہا۔ "انٹھی لے آ۔۔۔ میں نے سنا ہے کہ تو علاقہ میں سب سے لڑاوا تھا تو دوڑنے والا تیرا ہے۔ لیکن میں

امید کرتا ہوں کہ تیری غیرت تجھے ایک بڑا دل کی صحت پر گزند مرنے دے گی۔"

دلیپ بہاؤ تھا مگر اس قسم کے شخص سے آج تک پالنا نہ تھا۔

جگہ نے چھوٹی اتار کر غصہ دیکھ دیا اور صرف انٹھی انٹھی اور دونوں ایک دوسرے کو لٹکارتے ہوئے میدان میں کود پڑے۔

ان کی لٹکاری آواز سن کر پرندے گھونسلوں میں جھڑ پڑنے لگے کیلہ دونوں نے ہوا ہوا ہوا کا شور بلند کیا۔ چاروں طرف گرد ہی گرد نظر آئے گی۔

انٹھی سے انٹھی نکلتی تھی۔ دلیپ پکا پہنکا دست چاؤک نرا آسودہ اور نوجوان چھوکر۔ بجلی کی طرح بے چین جھڑ جھڑ میں پارہ۔ جگا بھاری بہرہ فرنی تھیں کہہ متعلق دے۔ پارہ دوسرا ہونے کے اب بھی جس وقت مرک لگا تھا تو ایسے مٹوم پڑتا جیسے ساج آپ پر ٹھیکری پھسلتی ہوئی چلی جا رہی ہو۔ دلیپ نے داؤ لگا کر پہلا وار کیا۔ جگا اسے خالی دے کر چلا۔ "ایک۔"

دلپ نے بھر وار کیا۔ جگہ سے چپا کر کہا۔ "دو!"

دلپ نے تیسرا وار کیا۔ جگہ نے اسے بھی روکا اور کڑکا۔ "تین!" یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف ہلکا۔ "کو سنبھل ہے جھوکر نے اب جگہ وار کرتا ہے۔"

بیسہ کی وجہ سے دلپ کے ہاتھ سے داغی چھوٹ گئی۔ وہ فوراً پھرانے کر بچتا۔ جگہ نے ایک بات اس کے پیٹ میں رسید کی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا ہلکی کی وجہ سے گر کر گر گیا۔

اب جگہ کے لمبوں پر غنی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے ایک خوشی بھیڑنے کی مانند مقلع سے ایک خوشحال آباد لائی اور پھر دونوں ایندھن اس اٹھا کر آگے کی طرف ایک کمراس نے بھر وار کیا۔ دلپ نے جھرا سنبھالا اور پینے کی مانند تپ کر ہوا میں جست کر گیا۔ جھکڑ مقلع استاد کا دارا پنا کام کر گیا۔ شاید پہلی صورت میں یہ دارا اس کے سر کو توڑنا اور داغی اس کے سینہ تک پہنچانی ٹکرا ب بھی داغی کافی زور کے ساتھ سر پر پڑی۔۔۔ سر پٹ گیا اور وہ تپ کر بارہ چٹکی کی مانند پھر کے کنارہ پر جا کر۔۔۔ بیکوہ تک پہنچا اور پھر سر پر پڑ گیا۔

گرہ کر مقلعوں پر کہ کمر میں لٹے لگا۔ پھر کے پانی کی کل کل کی آواز ایسے معلوم پڑتی تھی جیسے غریب بیل قبضے لگا رہا ہو

قبرستان میں بوسیدہ قبروں کے درزوں میں سے ہوا سبکیاں لیتی ہوئی بل رہی تھی

زور چاندنی میں سے نکل آیا۔ مگر اس کی شعا میں شعلہ کے کٹھے ہوں میں ابل کر رہ گئیں۔

جگہ نے گناہیت اطمینان کے ساتھ اپنی خون آلود پیشانی کو صاف کیا۔ منہ ہاتھ اٹھا کر کان پر بگڑی پھاڑ کر اپنی داغی اس نے دلپ کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر دل کی حرکت جاننے کی کوشش کی۔ پھر اس نے چھوٹی داغی اور دلپ کو چھوٹے پر لاد کھٹوں کی طرف بل کھڑا ہوا۔

اس واقعہ کے پچیس دن بعد

دیہات میں شام ہوتے ہی خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ خصوصاً سردیوں میں تو لوگ فوراً اپنے گھروں میں گھس بیٹھتے ہیں۔ کمرام کے پاس سب ہی لوگ اپنے اپنے کاموں سے فراغت پا کر بڑے کمرے میں بیٹھتے تھے۔ مورتیں جو جھکات رہی تھیں اب بڑے بڑے ہاتھوں میں مشغول تھے اور بچے شرارتوں میں مصروف۔

شاید ڈیڑھ برس کے بعد آج پھر اس کے مضبوط ہاتھ میں چھوٹی چمک رہی تھی۔ سب نے اس کو دیکھ کر کھنکھار مارت کیا۔

کمرام جبرست سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ بے بے نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا مگر اس نے بتایا کہ اس کی داہلی باہر کھڑی ہے اور اسے جلد ہی داہلی ہانا ہے۔

چند لمحوں کے لیے اس نے سکوت کیا۔ پھر گناہیت ٹھکرا اور قبضے کن انداز سے کہنا شروع کیا۔ "میں آپ لوگوں سے صرف اتنی بات کہنے کے لیے آیا ہوں کہ آپ گمرام کی شادی جس شخص سے کرنا چاہتے ہیں وہ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی۔۔۔ بلکہ اس کی شادی اس شخص سے ہوگی جس سے کہہ سکا جاہوں گا۔"

سب لوگ حیران تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ گمرام کا بونے والا خاندان وہ خود ہی تھا۔ مگر چونکہ انھیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ کھنکھار کی کھنکھار کی گئی تھی اس لیے وہ خاموش رہے۔

۔۔۔ اور وہ شخص یہ۔۔۔ یہ کہہ کر اس نے دروازہ کی طرف دیکھا۔۔۔ اور دلپ اندر داخل ہوا۔

ہر شخص پر حیرت و اٹھا مٹھی طاری ہو گئی۔

گرم نامعلوم کس دیا میں پہنچی تھی۔ اس کو شرمایا جاتا ہے تھا مگر وہ انہ کراس کے قریب آ گئی۔

بچے نے دلپ کے کان میں کہا۔ "اگر گرم کو کچھ سے صحبت ہوتی تو تم آج زندہ نظر دیتے دے دلپ تم مردہ میں نے ابھی طرح سے تم کو آزاد کر دیکھا ہے میں چاہتا تو تم کو قتل کر دیتا مگر مردوں سے مجھ کو محبت ہے۔ اب جبکہ تمہاری گرفت تمہارے سپرد کردہ ہاں امید کرتا ہوں کہ تو میرا راز ظاہر نہ کر دے۔"

بچہ بھڑا آواز میں بولا۔ "باپ! اس! ہے۔" اس! اس! ان کی شادی کے لیے ضرورت سے کئی کچھ زیادہ مردہ پیدائش گا اور ان کو بہت سی زمین دلاں گا۔

باپ اصل قصہ بھاپ گیا۔ لیکن سب کو زیادہ قریب اس بات پر تھا کہ دلپ زندہ کیونکر ہو گیا۔ مشہور ہو چکا تھا کہ دلپ کو ڈاکوؤں نے ٹوٹی لپٹا کر قتل کر دیا تھا۔

دلپ نے قصہ گزرا کہ شادی کی ٹوٹی لپٹ پر ڈاکوؤں نے اس کو گھیر لیا۔ اس ٹوٹی لپٹ میں وہ غلط زخمی ہوا اور قریب تھا کہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا کہ مردہ و حرم سکھ ہاں پہنچی گئے اور وہ اس قدر بہ روی سے لڑے کہ ڈاکوؤں کے چنگے چھوٹ گئے اور ان کے بھاگنے ہی تھی۔ بھر وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور چار روزہ کی کرتے رہے۔

بچے کی سوچوں کے پیچھے اس کے لوں پر ایک عجیب سا مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

گرم نامی آنکھوں میں آنسو اٹھے

وہ مسرور ہو کر آگے بڑھی۔ اس نے بچے کا ہاتھ اپنے کول ایسے ہاتھوں میں لے لیا پہلے اس نے بچے کے بلکہ بتے اور اس کے غیر

مسمولی چوڑے خالوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا مطمئن ہو کر بھرتی ہوئی آواز میں بولی۔ "تم کتنے اچھے ہو۔۔۔۔۔ تم یہیں جاوے پاس ہی رہا کرو۔"

قریب تھا کہ بچہ گھٹیں مار مار کر رو پڑے۔ مگر جلدی سے بچہ کی کٹھن میں منہ پمپا کر گئے کی طرح دروازہ میں سے باہر نکل گیا۔

شادی ہو گئی۔۔۔۔۔

بیکھرے سردار کے ساتھ گرم نامی کے ساتھ گھر سے باہر کر پلے کی نکل کے پاس کھڑی تھی۔ سردار سے منہ نہ اٹھا، کچھ ساڑنی سوار مسوار ہوئے ان کی بھی سہانی ساڑن عیاں مردانہ اور بیکھرے صورتیں پہنچتی ہوئی چھوڑاں۔۔۔۔۔ جب حشر فٹنی کرتی تھیں۔۔۔۔۔ ان کا ساڑن و غیر مسمولی طور پر چھڑا چکا شخص تھا۔ گرم نامی سے دیکھتے ہی چلا آئی۔ "باپ! وہ کوئی لوگ ہیں؟۔۔۔۔۔ یہ سب سے آگے لاٹھیں تو حرم سکھ دکھائی پڑتا ہے۔"

نہیں بچی! نہیں! وہ حرم سکھ نہیں! یہ کہہ کر اس نے اپنی پوتی کا سر پیو سے لگا لیا۔۔۔۔۔ اور جہاں کے درختوں کے جھڑ میں غائب ہوتے ہوئے ساڑنی سواروں کی طرف خواب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے بیٹا لیا۔ "آج بچہ! اکوڑا کرالے کے لیے جا رہا ہے۔"



کرتار سنگھ ڈگل

نام
تعلیمی نام
پیدائش
تعلیم
کرتار سنگھ ڈگل
کرتار سنگھ ڈگل
یکم مارچ ۱۹۱۷ء بمقام دھیمال، ضلع راولپنڈی، مغربی پنجاب۔
ایم۔ اے (انگریزی) آنرز (پنجابی)

ابتدائی تعلیم پرائمری سکول دھیمال میں حاصل کی۔ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۸ء گورڈن کالج راولپنڈی میں زیر تعلیم رہے اس کے بعد ایم۔ اے (انگریزی) کرنے ایف۔ سی کالج لاہور چلے گئے۔ نئے ایم اے (انگریزی) آنرز پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کیا۔

مختصر حالات زندگی:

موضع دھیمال، ضلع راولپنڈی کے تعلیم یافتہ کا رہنمائی ڈگل گھرانے کے چوتھے نسل کے ہاں جنم لیا۔ والد کا نام ستونت گورتھا۔ بچپن اور نوجوانی میں گزرا۔ گورڈن کالج "ایلیٹ روڈ" راولپنڈی سے بی۔ اے کیا۔ یہاں طالب علمی کے زمانے میں گورڈن "ادبی مجلہ" کے ایڈیٹر تھے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد ایم۔ اے (انگریزی) کرنے لاہور چلے گئے اور انجمن ترقی پسند مصطفیٰ کے سرگرم رکن رہے۔ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا ریڈیو پرائمری سے منسلک ہو گئے۔ ترقی پسند نظریات کے سبب ان کا چارل بھی منسوخ ہوا تو کئی امور فرسید پر سے بددستیاں کی سبکی۔ چودہ برس تک ترقی سے محروم رہے۔ اپنے زمانے کے بہترین لکھنا پڑاؤ پر کے طور پر شہرت پائی۔ ۱۹۶۶ء میں انجمن ڈاکٹر کپڑے اس دوران میں پنجابی ادب، انگریزی اور ہندی پر دو گرام ترقی دیے۔ ۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۳ء سیکرٹری اور ڈائریکٹر پبلیکیشنز آف انڈیا رہے۔ ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۶ء بھارتی شیر برائے انڈیپنڈنٹ پریس کمیٹی تھے۔

سرکاری ملازمت کے دوران "انٹیلیجنٹ فار سوشل اینڈ اکاؤنٹنٹس" "لاکھنؤ کرسمین ایجوکیشنل اینڈ کچھ ڈیپارٹمنٹ" "پنجاب

آرٹس کونسل۔۔۔۔۔ ہندی بھتی حکومت ہند ”ہندو“ پنجاب سٹیوڈیو اکیڈمی“ کی بنیاد یہاں رکھیں۔ متحدہ عالمی سطح کے سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی متعدد ممالک گھومتے۔ بینکرا کے وفد کے ساتھ ۱۹۷۷ء میں روس کا دورہ کیا۔ آخر پینٹل رائلز کا فرنس منعقد ہوئی ۱۹۸۲ء میں بطور ہندوستانی مندوب شرکت کی۔ فیض احمد فیض سے ملے، تحریک آزادی فلسطین کے رسالہ ”کوش“ کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۸۳ء میں پنجابی پرنسورٹی کے فلورا حردہ بنے۔ اگست ۱۹۹۷ء میں راجہ سجاد کے گھر منتخب ہوئے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

”سور سار“ (پنجابی) مطبوعہ: ۱۹۳۱ء

اولین مطبوعہ (اردو) افسانہ:

”سور سار“ مطبوعہ: ۱۹۳۱ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ ”کھڑے کھڑے“ (پنجابی شاعری) لاہور طبع اول۔ ۱۹۳۱ء
- ۲۔ ”بندھ داتے“ (پنجابی شاعری) دہلی طبع اول۔ ۱۹۳۸ء
- ۳۔ ”اک منظر“ (پنجابی ڈرامے) لاہور طبع اول۔ ۱۹۳۱ء
- (اس کتاب کا چارپہ فیض، مو فیض کا کھرا ہوا ہے۔)
- ۴۔ ”سور سار“ (پنجابی افسانے)
- ۵۔ ”تین بچاں“ (پنجابی افسانے)
- ۶۔ ”کوڑی کہانی کردی گائے“ (پنجابی افسانے)
- ۷۔ ”گھر“ (پنجابی افسانے)
- ۸۔ ”کاپوہ“ (پنجابی افسانے)
- ۹۔ ”اک کھان داتے“ (پنجابی افسانے)
- ۱۰۔ ”تھوڑا گھر“ (پنجابی افسانے)
- ۱۱۔ ”تھوڑا آدمی“ (پنجابی افسانے)
- ۱۲۔ ”لاڈلی ٹھیں“ (پنجابی افسانے)
- ۱۳۔ ”پہل توڑنا منع ہے“ (پنجابی افسانے)
- ۱۴۔ ”کسمت“ (پنجابی افسانے)

- ۱۵۔ "گھوڑا راج" (پنجابی افسانے)
- ۱۶۔ "پاری بھری" (پنجابی افسانے)
- ۱۷۔ "اک چھٹ چائنوی" (پنجابی افسانے)
- ۱۸۔ "سکے چھو ال سدا سئیں" (پنجابی افسانے)
- ۱۹۔ "سوتا رنگھ" (پنجابی افسانے)
- ۲۰۔ "اوسو پو ہوا پو" (پنجابی افسانے)
- ۲۱۔ "اقراراں واول راس" (پنجابی افسانے)
- ۲۲۔ "ترکاڑاں ویلے" (پنجابی افسانے)
- ۲۳۔ "اک کرن چائوی کی" (اردو افسانے)
- ۲۴۔ "دیا بچہ گیا" (اردو افسانے)
- ۲۵۔ "گھوڑی کی منزل" (اردو افسانے)
- ۲۶۔ "اچھا آجکل" (اردو افسانے)
- ۲۷۔ "اگر لکھی" (پنجابی افسانوں کا انتخاب)
- ۲۸۔ "سسل وئے" (پنجابی افسانوں کا انتخاب)
- ۲۹۔ "سبیل چتر" (پنجابی افسانوں کا انتخاب)
- ۳۰۔ "قل چہلے" (پنجابی افسانوں کا انتخاب)
- ۳۱۔ "بھری سر پھل کھاناں" (پنجابی افسانوں کا انتخاب)
- ۳۲۔ "اود گئے گھن" (پنجابی افسانوں کا انتخاب)
- ۳۳۔ "تھن نا تھن" (پنجابی افسانوں کا انتخاب)
- ۳۴۔ "ست نا تھن" (پنجابی افسانوں کا انتخاب)
- ۳۵۔ "پراچیاں بھلاساں" (پنجابی افسانوں کا انتخاب)
- ۳۶۔ "کوہ کن" (پنجابی افسانوں کا انتخاب)
- ۳۷۔ "سبیل پانی" (پنجابی افسانوں کا انتخاب)
- ۳۸۔ "اک اکھہ اک نگر" (پنجابی افسانوں کا انتخاب)
- ۳۹۔ "آمرہاں" (پنجابی افسانوں کا انتخاب)
- ۴۰۔ "اگر سر پھل نا" (پنجابی افسانوں کا انتخاب)
- ۴۱۔ "اود چہلے" (پنجابی افسانوں کا انتخاب)

- ۳۲۔ ”سرد چٹم دی رات“ (بجالی ناول)
- ۳۳۔ ”سمن پروسی“ (بجالی ناول)
- ۳۴۔ ”آئی توں کیجہ ہوگی“ (بجالی ناول)
- ۳۵۔ ”فری بجالی کوتا“ (بجالی تنقید)
- ۳۶۔ ”سفیر دی کوتا“ (بجالی تنقید)
- ۳۷۔ ”حرم خیر کچھ دھرم“ (ادبیات)
- ۳۸۔ ”سپائی گورکھ سنگھ مسافر“ (سوانح)
- ۳۹۔ ”سوتجی والی“ (ہندی افسانے)
- ۵۰۔ ”بچپن کپاٹاں“ (ہندی افسانے)
- ۵۱۔ ”اک کرن چاندنی کی“ (ہندی افسانے)
- ۵۲۔ ”پھول توڑنا صح ہے“ (ہندی افسانے)
- (یہ کتاب پہلے بجالی میں شائع ہوئی تھی۔)
- ۵۳۔ ”سپار نکلا“ (ہندی افسانے)
- ۵۴۔ ”اک اندھیری رات“ (ہندی افسانے)
- ۵۵۔ ”فل مرے دل کا“ (ہندی ناول)
- (یہ ناول پہلے بجالی میں شائع ہوا تھا۔)
- ۵۶۔ ”چولی دامن“ (ہندی ناول)
- اس کتاب کا کاغذیلم ہندھی اور دی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔
- ۵۷۔ ”قتل اور چٹن“ (ہندی ناول)
- ۵۸۔ ”سرد چٹم کی رات“ (ہندی ناول)
- (یہ ناول پہلے بجالی میں شائع ہوا تھا۔)
- ۵۹۔ ”اس کی چوریاں“ (ہندی ناول)
- ۶۰۔ ”سوریا“ (ہندی ناول)
- ۶۱۔ ”سمن پروسی“ (ہندی ناول)
- (یہ ناول پہلے بجالی میں شائع ہوا۔)
- ۶۲۔ ”بدھ شرم“ (ہندی ڈراما)

"مٹھا پانی" (ہندی ڈراما)	۶۳
(جیڈ رامنا پہلے پنجابی میں شائع ہوا۔)	
"آک آکھ، آکھ، آکھ" (ہندی ڈراما)	۶۳
(جیڈ رامنا پہلے پنجابی میں شائع ہوا۔)	
"پرانی بوٹھیں" (ہندی ڈراما)	۶۵
(جیڈ رامنا پہلے پنجابی میں شائع ہوا۔)	
"کہانی کیسے بنی" (ایک پانی ڈراما۔ ہندی)	۶۶
"مٹی مسلمان کی"	۶۷
"تیرے بھائی" (پنجابی ناول)	۶۸
"Death of a Song" (Short Stories)	۶۹
"Come Back My Master" (-do-)	۷۰
"Twice Born Twice Dead" (Novel)	۷۱
"Contemporary Indian Short Stories"	۷۲
(Anthology Completion) Vol.I	
"What Ails Indian Broadcasting"	۷۳
"Book Publishing in India"	۷۴
"Literary Encounters"	۷۵
"The Sikh Gurus-Their Lives and Teachings"	۷۶
"Folk Romances of Punjab"	۷۷
"Iqbal-a Commemorative Volume" - (Ed)	۷۸
(Radio Plays) Writers Workshop	۷۹
"To Each a Windes" 1981	
"Gurmukh Sing Musafir" (Biography)	۸۰
"Secular Perceptions in Sikh Faith"	۸۱
"Ranjit Singh: A secular Sikh Monarch"	۸۲

مستقل چہ:

ہی۔ نے عرض خاص کی دہلی ۱۱۰۰۱۱ بھارت۔

اعزاز:

- ۱۔ "قائب الامارہ" (برائے ڈراما) ۱۹۷۳ء
- ۲۔ سلیوٹ اکادمی ایوارڈ برائے "اک جیت چائن دی" پنجابی ۱۹۶۶ء
- ۳۔ "اعزازی پریس" (برائے پنجابی ادب) حکومت پنجاب، دہرہ ۱۹۶۳ء
- ۴۔ "سودیت لٹریچر ڈاٹھارڈ" ۱۹۸۲ء
- ۵۔ انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف پنجابی رائٹرز آؤٹسٹس ایوارڈ ۱۹۸۳ء
- ۶۔ پی مینٹوشن، حکومت ہند کا اعلیٰ ترین سولہ اعزاز ۱۹۸۸ء
- ۷۔ بھارتیہ بھاشا پریشد ایوارڈ
- ۸۔ "بھارتی سوشل سگنڈ پے ایوارڈ"
- ۹۔ بھارتی ویر سگنڈ (حکومت ہند) ایوارڈ ۱۹۸۶ء
- ۱۰۔ پراسن پتر ایوارڈ (حکومت پنجاب، دہرہ) ۱۹۹۳ء

نظریے فن:

"کافانہ شعری کا انداز چاہتا ہے، تاکہ کی مانند ڈرامائی ہوتا ہے اور نقد کی مانند کہانی بیان کرتا ہے۔"

(چچوال: نکلوب، نامہ مرزا عادل، یک: اگست ۱۹۸۴ء)

پھول توڑنا منع ہے

کرتار سنگھ ڈنگل

اس روز جب میں بس میں سوار ہوا تو میں نے دیکھا ایک سیٹ خالی تھی۔ میں وہ سیٹ خالی ہی تھی لیکن اس کے سامنے مجھے ہر اس سواری کا قبضہ تھا جو اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

میں اس خالی سیٹ کے پاس پہنچ کر ایک لمبے کے لئے رگ گیا۔ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی نو جوان لڑکی نے اپنی تراشیدہ بھروسے سے آہستہ سے ہنسی اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس نے پہلے لمبے کے لئے گھٹے دیکھا اور پھر ہلکی سی ہنسی بکھیر کر میری سیٹ کے کافی حصہ پر اسی طرح قبضہ جمانے لگا۔

آخری سیٹ پر جو تھوڑی بہت جگہ خالی تھی میں اس پر بیٹھ گیا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ کو وہاں لٹکایا۔ میں بہت سنبھل کر بیٹھا تھا۔ میں نے اپنی دونوں ہاتھیں دوسری طرف کھڑے ہونے والی جگہ کی طرف کر لیں۔ بس کے ہر جھٹکے اور ہر سوار پر میں اپنے آپ کو اس طرح تکیڑے کا ہوس دیکھتا کہ کہیں میرے ساتھ بیٹھی ہوئی اس نو جوان سواری کیساتھ کوئی زیادتی نہ ہو جائے۔

اگلے اسٹاپ پر جب بس سواروں کے لئے کھڑی ہوئی تو فوری سیٹوں کا ایک ریلہ کاریلہ بس میں سوار ہو گیا۔ انہوں نے کھڑے ہونے والی سواری جگہ چھو دی۔ بس میں اس قدر بھیڑ بھڑکاؤ ہو گیا کہ مجھ کو اپنی ہاتھیں مجھے اتار کر کے اپنی سیٹ کے سامنے کی طرف کر لینا پڑا۔ اس طرح کرنے سے پہلے میں نے ایک نظر اس نو جوان لڑکی کی طرف دیکھا لیکن اس نے جتنی جگہ میری سیٹ کی گھبراہٹ تھی اس پر اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

اپنی دونوں ہاتھیں سیٹ کے سامنے کی جانب کر لینے کی وجہ سے میرا ایک طرف کا سارا جسم اس صحن جھلر کے جسم سے لگنا شروع ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو انجانائی طوع پر تکیڑا لیکن اس کے باوجود میرا بازو اس کے بازو سے چھو رہا تھا۔

میرا بازو اس کے بازو سے مسلسل چھو رہا تھا اور وہ لڑکی اسی طرح اپنی سیٹ سے زیادہ جگہ پر قید ہونے لگی۔ بے پرواہی سے خاموش

[illegible]

جب اس بلی نے ایک ٹھکے کے ساتھ میرا جسم میری اس ناز جان جس طرح جسم سے چھو گیا۔ میں نے کہا ہے آپ کا منہ لایا۔ لیکن میرا بازو اب بھی مسلسل اس کے بازو سے چھو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد گھٹے چائیں منوں ہوا جیسے میرے بازو کا وہ حصہ جو ساتھ والے بازو سے چھو رہا تھا گرم ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد گھٹے ایسے احساس ہوا جیسے میرے بازو کا وہ حصہ جو ساتھ والے بازو سے چھو رہا تھا وہ کپکپا کرنا شروع کیا ہو۔ پھر کچھ دیر بعد گھٹے ایسے لگا جیسے میرے بازو کے اس حصہ کا کچھ ساتھ والے بازو سے ٹسوں اور درگوں میں آ جا رہا ہے۔

مجھے ایک جبر صریحی آگئی اور صریحی آنکھیں مجھے نشانے میں نہ رہیں مگر ہر ایک بل کے بل میں میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔
میں پہلی چار ہی تھی۔

میرے دائیں طرف کھڑے ہونے والے قوی سپاہی ایک دیوار کی دھڑکتے ہوئے کھڑے تھے۔ بس سواریوں سے بری طرح بھری ہوئی تھی۔ جازوہا کے لئے مجھے دائیں طرف پارہا کھڑکی کی طرف دیکھنا پڑا تھا اور میرے دائیں طرف ہی میری دو توجہاں بھستری ٹھہری ہوئی تھی۔
نہ سواری اپنے منہ کی حرکت ایک بہت سی طرح۔

”یہ تو کسی فنی فنی کی طرح ہے۔“

کچھ ماحولیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔

”مصدر ہمارے اس میں سوار ہوئی ہوگی۔ صحیح ہی مگر کاسودا صنف خریدنے کے لئے دہلی جا رہی ہے۔ مگر یہ ضروریات کی چیز ہے تو اس کا ضرور ہونا چاہیگا۔ یہ تو صبح کے وقت ہیں، یہی صندوق کے اپنے کسی دوست سے ملنے کے لئے جا رہی ہوگی۔ یہ اگر اس کی لپ ایک ختم ہو گئی ہو گی۔ یہ ڈرا ختم ہو گیا ہو گا۔ دس سے لکھ ساڑھے بارہ پیچ تک کناٹ ٹیکس عیسوی عورتوں سے اصرار رہتا ہے تو بہروں کے دفتر میں چلے جانے کے بعد دہلی کی ٹرانسپورٹ میں ہر قسم کی طرح ہزاروں کی تعداد میں ٹھہرتی ہیں۔ کناٹ ٹیکس میں گھومتی گھومتی جب یہ تک جانے کی تو کوا کولا پیتے گی۔ اپنے شوہر کے لئے پیچ لگم اور اپنے بچے کے لئے لالی پاپ خرید لے گی۔ ایک ڈیڑھ بجے اس سے پہلے کہ اس کا شوہر گھر پہنچے یہ بس میں سوار ہو کر واپس گھر نکلتی جاتی ہے۔ اس طرح یہ خوشی۔ اس کا شوہر خوشی اس کا بچہ خوش اور اس کا بھانجرا خوش۔ اس کی زندگی کا ایک عیسوی ہی دور کم ہو جاسکتا گا۔“

میرے بازو کا وہ حصہ جو انہی تک اس کے بازو سے ملتا تھا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مین کن بھرا ہو گیا ہو جیسے میرے بازو کا وہ حصہ وہ میرا ان کے کٹوں یا دھڑکنوں کی ایک بند پاں دور کر چکا ہے جیسے میرے بازو کا وہ حصہ ساتھ دالے بازو سے جدا ہو گیا۔

کا ایک میں چنگ نہ اچھے میں کوئی بہت بڑا گناہ کر دیا تھا۔ مجھے میں بے لگائی کر دیا تھا اپنی بیوی سے اپنے بچے سے اپنے اخلاق سے اور اپنے غائب سے اس خطی ہی صبح کے وقت میرا جسم پیسے سے تر ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میری بیوی مجھے کس کس دہی ہے۔ میرا ایک مجھے میرے پاس کھڑا لگے گھور رہا۔

میرے سامنے جسم پر بار بار ایک لڑو سا طاری ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں بالکل مردہ ہو گیا ہوں۔ اب تو میرا زہ میری بھلے کے بازو سے بھردہ تھا اور نہ میرا کٹ اس کے کٹ سے گراؤں تھا۔ میری سیٹ پر جو جگہ تھی میں خود بخود صحت مندا کر اس پر چڑھ گیا تھا۔

بس بجلی جا رہی تھی۔

اگلے اسٹاپ پر کچھ دفعتی چاہی بس سے اتر گئے۔ اب دوسری طرف جا گئیں دیکھنے کے لئے جگہ خالی ہو گئی تھی اور میں اس طرف جا گئیں سرکاکے قدرے آرام دہ سکون سے چڑھ گیا۔

بس میں جب بھوم کم ہوا تو پاروں طرف سے ہوا آنے لگی۔ گھنٹی سے بھارت یا کر مسافر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے اور دفتروں کے باہر اپنے ساتھ لائے ہوئے اظہارات چڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

بس بجلی جا رہی تھی۔

اگلے اسٹاپ سے ایک تیرہ چودہ سال کی مصوم لڑکی بس میں سوار ہو گئی کسی اسکول کی طالبہ معلوم ہوئی تھی اس نے ایک نظر بس میں چاروں طرف پھینچے ہوئے مسافروں کی طرف دیکھا اور پھر ایک ہاتھ میں کتاب بچکے اور دوسرے ہاتھ سے سر پر دوپٹہ ٹھیک کرتی ہوئی میری سیٹ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے سوچا ابھی کوئی مسافر اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس مصوم کو بیٹھنے کے لئے کہے گا مگر دفتروں کے تمام باہر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے رہے۔ چھوڑنے کے بعد وہ کھڑکی اس سے بے خبر اپنی باتوں میں لگے رہے۔ تمام مرد بیٹھے ہوئے تھے اور دھرم دیا میں ادبی ہوئی چپ چاپ کھڑی تھی۔

میرے دل نے کہا۔

”آخر تو اپنی سیٹ اس کے لئے خالی کیوں نہیں کروا جا“

لیکن میں نے اپنے دل کی یہ بات جیسے سنی ان سنی کر دی بار بار میرا دل مجھے فیرتے دلا رہا تھا اور بار بار میں اسے ایسے نظر انداز کر رہا تھا جیسے مجھے کسی کا انتظار ہو جیسے مجھے کوئی لالچ ہو یا جیسے مجھے کوئی لطف آ رہا ہو۔ میں بے شرم بن کر بار بار اندر کے اشارے کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ساتھ کچھ ہوئی میری بھلے دیکھ رہی ہے۔ دیکھے جا رہی ہے۔ دیکھے جا رہی ہے۔ میں نے ہلکی سے سر گھما کر دیکھا تو واقعی وہ مجھے تنگی لگائے دیکھ رہی تھی۔

بس بجلی جا رہی تھی۔ فر فر تار دار صاف ہوا آ رہی تھی۔ مسافروں کی باتیں اور آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

میں نے ایک نظر اپنی بھلے پر ڈالی اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میری نظر میں ایک ایک کر بار بار اس کی طرف جا رہی تھیں۔

میں نے دیکھا اس کے پاؤں کے انگوٹوں پر لگی ہوئی سرخ پائل نہیں لگی ہوئی تھی اور کہیں سے اتری ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں کی انگلیاں موٹی موٹی اور چھوٹی چھوٹی تھیں۔ وہ اتنی گوری نہیں تھی جتنا کہ انگلیوں کی بالکلا چہرہ اور سارے ایک لکائی دہندہ ہاتھ۔ اس نے اپنا ایک پاؤں قدرے نیچے مارا تھا جو اس سے میں نے اندازہ کیا کہ اس کے پاؤں کی ایندیاں پھلتی ہوئی تھیں ایک لمبی حرکت لگے پاؤں گھر کا کام کاج کرتے دھنکے کی جگہ سے بندھو رتوں کی ایندیاں پھٹ جاتی ہیں۔

میں نے دیکھا اس کی شہزاد کے ایک پانچے پر بالکل سامنے کی طرف کچڑ کا ایک داغ تھا۔ کچڑ سوکھ کر مٹی جھڑکی تھی لیکن اس کے داغ کا نشان باقی تھا۔ شہزاد کا دوسرا ہاتھ پیچے سے کھسا ہوا تھا شاید پتلے میں پاؤں تنے آ کر رہا ہو گیا تھا۔ قمیص کے اگلے حصے پر دو چار سطوئیں پڑی ہوئی تھیں جو تارہ معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ اور مجھے اپنی ایک مبینہ دوست یاد آ گئی جو کسی لباس کو چاہے چند لمحوں کے لئے ہی پہنے مگر دوسری بار اسوی کے بغیر ہاتھ نہیں لگاتی۔

میں نے دیکھا اس کے بالوں میں جگہ جگہ نہیں لگی ہوئی تھیں یہ نہیں بالوں کو نیچے کرنے کے لئے ہاتھوں کو اوپر کرنے کے لئے بالوں کو نیچے جا کرنے کے لئے اور بالوں کو اوپر کر کے لئے لگی ہوئی تھیں۔ سر کے کچھل طرف ان کا جڑا نکلا ہوا اور بھاری تھا لیکن اس پر بھی اس نے اپنے سیاہ بالوں میں ایک کالا پتلا لپٹا ہوا تھا۔

میں نے دیکھا اس کے چہرے پر کرم کی ایک جھلکی ہی تھی جس پر باؤلہ اور سرنگی لگی ہوئی تھی۔ ہونٹوں پر لب اسٹیک قدرے زیادہ سی شاد رخسار دیتی تھی۔ لمحوں پر جہاں جہاں اس کی زبان لگ چکی تھی وہاں لب اسٹیک زیادہ ہم پڑتی تھی۔

میں نے دیکھا اس کے کانوں میں کاسٹے تھے۔ کاسٹے قدرے بڑے تھے۔ اس کے چہرے پر کاسٹے اس سے ذرا چھوٹے ہونا چاہیے تھے۔

جوں جوں میں اپنی مصلو کو دور زیادہ دیکھتا میرے من کا ذائقہ پھینکا پڑتا رہا تھا۔ میرا دل پشیمان سا ہو رہا تھا اور میری آنکھوں کا شہر جیسے آخر آخر سا محسوس ہو رہا تھا۔
میں پہلی بار ہی تھی۔

ان خیالات پر مٹنے والے مسافر کی کئی مصلحت الٹ چکے تھے۔ آپس میں باتیں کرنے والے اور زیادہ اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ جب بس اگلے اسٹاپ پر دی کی تو ایک عورت سوار ہو کر کھارے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ کسی مزدور کی بیوی معلوم ہو رہی تھی۔ یہ ایک میں اندھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی سیٹ اس عورت کے لئے خالی کر دی۔ میں اب کھڑا تھا، ایک دھولے مسافر بھی کھڑے ہونے والے آگئے تھے۔
میں پہلی پڑی۔

اگلے اسٹاپ سے اور سواریاں آئیں اور کھڑے ہونے کی جگہ بھرے لہر گئی۔ اظہارِ جذبہ والوں نے اپنے ہر بے رکھوئے اور باتیں کرنے والوں کی باتیں دیکھی ہوئیں۔
میں پہلی بار ہی تھی۔

میں کھڑے کھڑے بس کے اگلے حصے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے گھوم کر اپنی سیٹ کی طرف دیکھا تو اس پر مرد عورت بڑے آرام سے بیٹھی ہوئی تھی اور مرد عورت کے ساتھ میری مصلو اسی طرح کھینچتی تھی جیسا کہ اس کے کوٹ کا ہلکا سا رنگ اس کے چہرے کو اور دھاتی بلیں۔ ہاتھ اس کے

باتوں میں پرستار تھے جیسے ہم بیٹھی تھی۔ اس کے کانوں پر تشنگی بٹن دیتی تھی۔ اس کی سوتی سوتی آنکھوں میں لاکھوں ہاتھ چھپے ہوئے تھے۔ اس کے بال اس کا جڑا اس کا ہاتھ اس کی ناک اس کے چہرے کے خدو خدائوں میں تھے جیسے اجنا کے کسی بہت کے ہوں۔ اب اس کے کانوں میں کاسٹے بڑے نہیں معلوم ہو رہے تھے بالکل اسی جیسے ہوتا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ اس کے گول چہرے کو لہا کر رہے تھے۔ میں پہلی

جاری تھی۔ میں نے ہر گھوم کر دیکھا۔ کرم رنگ کے سوٹ میں وہ لڑکی گھٹے پر لی جیسے عرش سے کوئی پرہی اتر آئی ہو۔ جیسے سندھ پہاڑ حقیقت بن گیا ہو۔ بس، جلی جاری تھی۔ کھڑکی سے دھوپ کی ایک کرن اس حسین صلسلے کے چرے پر آ کر گرنے لگی موسم سرما کی صبح کی جلی تپش والی دھوپ۔ ایک دم ایسے لگا جیسے دوساری کی ساری مکمل تھی ہو۔

میں اس اسٹاپ پر کچھ بجلی تھی جہاں گھٹے اترنا تھا۔ میں نے اس پرہی کی طرف دیکھا۔ دیکھتا رہا۔ کوئی تارک اور سدر۔ وہ گھٹے پر لی گئی تھی جیسے کوئی نہایت بچہ دارا بھول تارک بچوں میں جھک رہا ہو۔ کسی بارگ کا کوئی حسین بھول جس کے پاس پورا پر لکھا ہوا ہو

”بھول تو ڈانٹتا ہے“



شمشیر گلہ زروا

نام: شمشیر گلہ
 علمی نام: شمشیر گلہ زروا
 پیدائش: ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء بمقام امرتسر، پنجاب، بھارت
 تعلیم: بی۔ اے۔ خالص کانگڑا امرتسر ۱۹۳۵ء
 میٹرک کا امتحان ۱۹۳۱ء میں پاس کیا تھا۔

مختصر حالات زندگی:

امرتسر پنجاب کے ایک اوسط درجہ کے گلہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن اور لڑکپن میں والدین کی بے قوتگی کا شکار رہا، طبیعت اثر کے پن کی طرف مائل تھی اس لیے کوئٹہ کی کڑواہٹ کو جذبہ غمور کر کے چاہا، کراڑی چلوں میں اٹھ گیاں دہا کر کراڑ کو زور سے بھیڑنے کی اذیت میں راحت پائی۔ بچپن میں ایک بار سڑک پر سے سوڑ پے کا ٹوٹ پڑا اٹھا تھا، جسے اٹھا لیا اور سات روز چلتی دالچس کا شکار رہنے کے بعد وچر رکھ آئے۔ صحت بہت اچھی پائی تھی، اس لیے بچپن، لڑکپن اور جوانی میں کبھی چار نہیں پڑے۔ ساری زندگی کم کھایا اور کم سوتے۔ ہر ایک کی ادنیٰ سے ادنیٰ حرکت کا مشاہدہ کرنا واحد سامان تفریح رہا۔ کبھی کبھار دوستوں کے ساتھ ناش کھلی، روٹی پر سٹا، پاستیناؤ کھتا۔ اچھا دھچ کے چھائی پسند اور مروجہ بے لذت ہے۔

۱۹۳۵ء کے بعد سے متعدد اداروں اور اخبارات سے منسلک رہے۔ فطری طور پر قریبی پسند واقع ہوئے جسے سوانح نگار قریبی پسند مصنفین کی طرف سے لائن میں رہے۔ پہلا اردو افسانہ ”ساقی“، ادبی ۱۹۳۶ء میں اور پہلا ہندی افسانہ ”فنس“، مارچ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ جنسی یا جسمانی بھوک، بے کاری یا کسی عزیز کی موت کے باعث ادب کی طرف فیس آئے بلکہ شروع سے ادب کے ذریعے قوی اور انسانی مسائل میں دلچسپی رہی۔ بقول ان کے ”مجھے دوام کے لیے لافانی ادب لکھنے کی خواہش تھی۔ میں اسی ایک تابیہ کے لیے، اپنے وطن عزیز کے اس فیصلہ کن لمحہ کے

لیے نگہ داریوں۔ وطن کی اور واحد محبت ہے اور اب اس کے ایلا کا ایک اور یہ۔“

کیونست پارٹی کے ممبر تھے۔ ۱۹۵۷ء کے بعد اردو میں لکھا ترک کر دیا، جس کی واحد وجہ یہ رہی کہ ۱۹۳۷ء میں ”ایک بھگڑی کی تیز دھاڑ“ کے عنوان سے اردو ناول لکھا جسے شائع کرنے کے لیے کوئی پبلشر نل نہ نکلا۔ واضح رہے کہ یہ وہی ناول ہے جس کے بارے میں سید سجاد ظہیر نے اپنے ایک طویل مروجے میں لکھا تھا کہ ”اگر حدودِ حجاز میں فرقہ واریت کے خلاف مسلحی تیز جنگ لڑی جاتی ہے تو اس ناول کو انہوں کی تعداد میں دیکھا جانا چاہیے۔“ ۱۹۳۸ء میں پریس انڈیا میں جو روگور منسٹرف انڈیا میں ملازمت اختیار کی اور وہاں سے ۱۹۷۳ء میں بطور انڈیا میں آفیسر ریٹائر ہوئے۔ اس وقت ترانوے برس کے ہیں۔ نئی دہلی میں رہائش پذیر ہیں اور Confluence International سے انگریزی اور ہندی میں کیے بعد ونگرے اس کی متعدد کتب سامنے آئی ہیں۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

”ساقی“ دہلی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ ”ہائے“ (اردو افسانے) ساقی پبلیشنگ، دہلی طبع اول: ۱۹۳۶ء
- ۲۔ ”ایک بھگڑی کی تیز دھاڑ“ (ہندی ناول) لوک کمال پکاشن، دہلی طبع اول: ۱۹۳۹ء
- ۳۔ ”اندھیرے میں بھگتی کرنا“ (ہندی ناول) لوک بھارتی پکاشن، الہ آباد طبع اول: ۱۹۷۳ء
- ۴۔ ”آدھی رات کا سورج“ (افسانے/ہندی)
- ۵۔ ”ہندی زبان کی سائنسی تاریخ“ (ہندی) (پہ کتاب انگریزی میں بھی شائع ہو چکی ہے۔)
- ۶۔ ”ہندوستانی مسابجات کا ساقی پس منظر“ (ہندی) لوک بھارتی پکاشن، الہ آباد طبع اول: ۱۹۷۳ء
- ۷۔ ”تفصیل ناول کے مسائل“ (ہندی) لوک بھارتی پکاشن، الہ آباد طبع اول: ۱۹۷۶ء
- ۸۔ ”ہندوستانی غلط“
- ۹۔ ”ہندوستانی دھرم والا“
- ۱۰۔ ”The Man Who Stole Rainbow“ (ناول) Confluence International, India طبع اول: جنوری ۲۰۰۴ء
- ۱۱۔ ”Laughter in a Cage“ (ناول) Confluence International, India طبع اول: جنوری ۲۰۰۵ء
- ۱۲۔ ”Woman Who Sold Tears“ (ناول) Confluence International, India طبع اول: جنوری ۲۰۰۶ء
- ۱۳۔ ”انڈیا اس سرزمین کی مسابگیا“ (ہندی ناول) Confluence International, India طبع اول: ۲۰۰۸ء

نوٹ: ۲۰۰۹ء میں Confluence International, India نے ”آدھی رات کا سورج“ (ہندی افسانے)، ”اندھیرے

میں بھگتی کرنا" (ہندی ناول) "ایک بھگتی کی تیز دھواں" (ہندی ناول) کے تین اور تین ایسے ناول شائع کیے ہیں۔

غیر مردان:

ان مشہور کتب کے علاوہ مرد و عورتوں کا ایک مجموعہ "بے زبان" کے عنوان سے شاہد احمد دہلوی "ساقی" "کب لڑ پڑ" نامی سے شائع کرتا چاہتے تھے، جس کا مسودہ شمشیر بھنگر دلائے ۹ جنوری ۱۹۴۳ء کو ان کے حوالے کیا۔ شاہد صاحب کراچی، پاکستان ہجرت کر آئے اور اس کے بعد اس مجموعے کی کوئی خبر نہ ملی۔

بیرہ مرد و عورتوں کے متعلق ایک کتاب پر عنوان "ہندی اور عورتوں کی زبانوں کی قدر" "انگریز کی اور ہندی میں انسانیات کی بکھری۔

مستقل پتہ:

۳ لکھنؤ روڈ، نئی دہلی، بھارت

نظریہ فن:

"میں انسان کو جدید و جدید اور عوامی و عوامی کا آئینہ کار بنانا ہوں۔ انسان کے زندگی، ایک بہت کم فخر ہے، جس کی وجہ سے ترقی پسند ادب ہر قسم کے لاپرواہی کو بھلا دیتا رہا۔ حاضر میں انسان اور ناول عوامی دکان اور انسانی مستقبل کو جو پاؤں تلے دھکے مار رہے ہیں، برقرار اور سرفراز کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ انسان و عوامی بھنگی پر اس وقت بھنگی پڑا ہے جب مثبت انداز کا اظہار کرتا ہے اور ٹھیک بھنگی پر اس وقت، جب اس میں ایسے کرکٹروں کی بھنگی کی جاتی ہے جو ان مثبت انسان دوست انداز کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ اگر عورت انسان کے بعد وستان پاکستان کی حوالی زندگی میں فیصلہ کن رول ادا کرتا ہے تو اسے موجودہ امر سے نکل کر اپنے اپنے ملک کے طریقے اور پست ترین لوگوں کے احساسات کو زبانی دینی ہوگی۔ ان بے زبان لوگوں کو صاحب زبان بنانا ہی اس وقت کا سب سے اہم فرض ہے اور اس کے بغیر ہمارے دلوں کو مستحکم بنانا ہی ہے۔"

شمشیر بھنگر دلا

(نکال: نکتہ کا مہر ز احمد ایک مرقومہ ۱۹۸۵ء)



حوالہ جات:

- ۱۔ "ستاروں کی گھٹلی" مرقومہ شمشیر بھنگر کی تاریخ پیدائش ۱۹۱۶ء سے ۱۹۴۶ء تک ہے۔ اسے دستخط کی گئی ہے۔ خود شمشیر بھنگر نے اپنی دستخط تاریخ پیدائش سے گواہ کیا۔
- ۲۔ "ستاروں کی گھٹلی" مرقومہ شمشیر بھنگر کی تاریخ پیدائش ۱۹۳۶ء

گنوہتیا

شمشیر چکھ نرولا

جب سبیل پر مشورہ پہنچی اُسے میں بچکے لے کھانا اپنے گاؤں کے قریب پہنچا تو سبیل باغی ٹام اس طرف رینگ رہی تھی۔ وہاں کے بے حواس کتے بے ہوشک طریقے سے اس پر بھٹک رہے تھے۔

وہ اُسے سے اترا پڑا۔ سڑک پر بہت بڑا گڑھا تھا۔ سڑک پار تھا اور گاؤں کے گھنٹے نہیں ہا سکتا تھا۔ وہ سڑک ہندوستان کی بیشتر سڑکوں کی طرح فٹ دو فٹ ریت اور مٹی کا نامور دھواں گڑا راستہ تھی، جو برسات میں ٹیکڑا اور دھول کی اچھی خاصی بدبو میں ہلاتی تھی۔ انہی مٹھوں نے ہندوستانی دیہات کو دنیا کے مدوجزر سے علیحدہ کر کے وہاں کی زندگی کو سادہ اور غیر متبادل بنا دیا ہے۔

سبیل نے گڑھا چھوٹا لگا اور گردے بھرے بال اور کپڑے جھاڑتا اور بار بار کھٹکارتی تھی۔ اُسے اپنے اور مٹی کو صاف کرتا گاؤں کی طرف لیے لیے آگ بھرنے لگا۔ روشنی سے تاری سبیل درختوں سے لٹکتی ہوئی چکاڑوں نے سرخ مٹی لٹکا کے دھول بھرے دھندلکے میں تیرتا اور انہیں لگانا شروع کر دیا تھا۔ مٹی کی مٹی ہوئی گڑھ گڑھ اور پٹی بھونچہ دیوں میں سبیل نے اپنے پاؤں کا دھواں جلی سستی سے آسمانوں کی طرف کر دیں لے رہا تھا۔ جدید انجم خلائات سبیل سبیل سرسراہٹوں کی طرح سبیل کے دماغ میں رینگ کر اسے پریشان کر رہے تھے۔

چند دنوں میں سبیل کو جنگل سے واپس لارہے تھے۔ جسے وہ لوگ جنگل کہتے تھے وہ غریب یاں چھیل زمین تھی۔ جس پر برسات میں تھوڑی سی گھاس آگ آتی جو ایک ماہ میں ہی ختم ہو جاتی۔ اس کے بعد لوگ گھاس پر اس اور جنگل سے کھلی ہوئی زمین کی دراڑوں میں مٹی اور موٹے کے نیلوں کے نیچے گھاس کی چٹان یا جھاڑیاں تلاش کرتا پھرنا۔ اس خوراک سے انہیں کھلی قوت میسر ہوتی تھی۔ زیادہ اس کی تلاش میں طرح ہو جاتی۔ ان کی پرقوت آکھوں کی گہری تھوں میں مٹی کی بھوک بھجی ہوئی تھی۔ ان میں سے بہت سی گائیں صرف زاحافے ہی تھیں۔ جن کی بے صاحب ہڈیاں، پتلی بے گوشت کمال میں سے ہیاک اور گناہنے طریقے سے جھاڑ رہی تھیں۔ تقریباً تمام کے جسم میں گھس کے ہوئے دھم اور ناسور انہیں چڑا کر رہے تھے۔ ان پر کھجیوں کے جھوم بھسار ہے تھے۔ ان کو پاؤں نے کچی مٹی موٹھوں کے لیے چارہ

نہیں پڑا تھا۔ ان کے اپنے اناج کے لیے ہی زمین کافی نہیں تھی۔ عوامان گائیوں کی کوئی پروا نہ کی جاتی تھی کیونکہ ان میں سے بہت سی نکلی برس ہوئے پاؤ آؤدھ پاؤدودھ دے کر سوکھ چکی تھیں۔ یہ ہندوستان کی عام گائیں تھیں۔

چند گھڑے گئے سے ہم قدم بندہ کھٹے ہوئے غلی کا پٹنی ناگوں سے اس کے پیچھے لڑکھڑا رہے تھے۔ ان کی سوکھی نرم ہاتھیں بڑی مشکل سے آگے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ رات کو انہیں چھوڑ چڑوں سے باہر نکال دیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ گاؤں کا دودھ چوس کر اس پاؤ آؤدھ پاؤدودھ کی دولت کو ادھی کم نہ کریں۔ ابھوک جنگل میں گھومتے کی تھکان یا رات کی سردی کی وجہ سے جب وہ زندگی کی آنگلیوں سے نجات حاصل کر لیتے تو ان کی کمال اور جڑ کر اس میں گھس چھڑیں بھر دیا جاتا۔ ناگوں کے نیچے چار پھل یاں لگا دی جاتیں اور دودھ دوتے وقت اسے گائے کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا تاکہ اسے سنا سے مجبور ہو کر دودھ دے دیتا رہے۔

سب سے پیچھے گاؤں کی بوڑھی گائے لرزتی، ڈرکھتی لڑکھڑاتی ہو رہے چار ہی تھی ابھورا کیلا رنگ، سریل دلی ہاتھیں، سگری بھی ہوئی، کھٹی آنکھیں، اسے پہلے بڑھے پائے کھدوں کے قریب سے پاسرا کر مجید، غلو پر اوپر کی طرف اٹھے ہوئے جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہو۔

اس کی پٹیاں بڑی سنگدلی سے گوشت کھال تیر کر باہر نکل رہی تھیں۔ ہر ایک ابھری ہوئی ہڈی کے کنارے دوسری ہڈیوں کے سامنے میں سے دردناک طریقے سے جھانک رہے تھے۔ اس کے جسم پر بہت سے ذلم بھڑے اور پھنسیاں تھیں۔ ایک کو اٹھنے کی ہڈی پر بیٹھا ایک گھر سے ذلم میں چمٹا ہوا تھا۔ ایک اور کو کاٹھیں کرنا ہوا اور گھنٹا رہا تھا۔ چھوڑیوں کے تیز چلانے کے لیے ہانے مرادنے سے اس کی دم کی ہڈی پٹی ٹوٹ چکی تھی۔ اس لیے دو کوسے کو اڑانے میں ناکام ہو رہی تھی۔ سٹیل اس بوڑھی گائے کی طرف بڑھا، دودھ سے اس کی بھری ہاتھیں بھرا پھڑ پھڑ رہی تھیں۔ دانت کھکا رہے تھے۔ اس نے پیٹوں کو دیر اٹھا یا اور کھڑائی ہوئی آنکھوں سے سٹیل کو دیکھا۔ سٹیل نے سٹیل کی دو صفیں بھر کر اس کے دھڑوں پر کھسک دیں اور جلد جلد گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔

فٹری بھی اس وقت گاؤں میں داخل ہو رہی تھی۔ دو سال ہوئے جب وہ چروادار کتھہ پر گٹکا اٹھانے کے لیے گئی تھی تو اس کا آنکھو کاڑھا پاگل کتے کے کانٹے سے سر گیا تھا۔ رات کو ارد گرد کے ہاڑیا جاپان سے گھیرا آ جاتے اور ساری رات ان کی گاؤں کے آوارہ کتوں سے لڑنے کی آوازیں سنائی دیتی رہتیں۔ کئی مرتبہ پاگل کتے کتوں کو کاٹ جاتے اور ہر سال دو تین دو تین آدمی مورٹیں بچے ان دے انے کتوں کا شکار ہو جاتے۔ ان چار فاق زدہ کتوں کو سردایا د پاسکا تھا کیونکہ وہ جھوٹا کے باپ کا لڑکھاپ تھیں کرنا چاہتے تھے۔ بہت خوش کے باوجود سٹیل گاؤں واپس کر بھالے میں ناکام رہا۔

چنے کی موت، اپنی فٹری کے لیے بہت میرا آزمائش ہوئی۔ وہ پاگل ہی ہو گئی تھی۔ جب بھی مورٹوں کو چھمٹ کی طرف پانی بھرنے جاتے دیکھتی تو دے کی کھانسی سے کھچی ہوئی آواز میں چالنے لگ جاتی۔

”بچے اپنے بچوں کو گھرا اکیلے مت چھوڑنا“ گاؤں سے پہنچتی پھرتی کہ وہ چھڑوں کو کہیے چھوڑ کر کہاں جا رہی ہیں۔ سردار ان کھیتوں میں چڑوں کے پیچھے لڑکھڑاتی پھرتی اور ان سے التجا کرتی کہ وہ اپنے بچوں کو اکیلے نہ چھوڑیں۔ اس کے سر کے بال بھڑ بھڑے تھے۔ اس کا سٹرا ہوا چہرہ صبر میں سے بھرا تھا اس کی پرچھا میں بھی ہوئی غیر متحرک آنکھیں سطوں میں ڈگر ڈگر کرتی رہتی تھیں اور لوں کے کوٹے بڑے ادھر ان طریقے سے بچے کی طرف لگے۔ ہے تھے۔ سٹیل کو دیکھ کر اپنی فٹری کے پھنے سوکے لوں میں مسکراہٹ کی بجلی ہی کھینچ جاتی لیکن

اسے پر جھانکی ہوئی مسکراہٹ آلودہاں کو روکنے کی کوشش معلوم ہوتی۔

گاہاں کے شروع میں خدا کرو اور دعا۔ جس کے بار میں مولسری کے درخت کے نیچے چار پانی پر بیٹھا ہواں کا زمیندار حوٹا گڑا رہتا تھا اس کے عوامی اور خوشامد ہی بدو گروہ چنے جس اور گاہاں کے دم نگار رہے تھے۔ حسب معمول انہیں ہوتی تھیں۔ خدا کرو دوسرے کی پکی دوسری بانوس اور تنگی پر خود آلودہاں سے گونجی تھیں۔ شام کی آ آتی ہوئی تھی اور مند کے چھاری "اوم ہے جگہ تلخ ہرے" چار ہے تھے چھیل طرف بڑا کاہڑا حوریت کمر جھانکے کھڑا تھا۔ اس کے نیچے مند کے نکادہ ساٹھ زمین پر لیٹے تھے جسے گڑا رہے تھے۔ جب بھی کسی کو سر پر آتی بلا کے لیے اپنے کمرہ ہوتا یا اللہ سے کوئی سداش کرنا ہوتی اور مند کو ایک نسل وہاں کرنے کا دہرہ کرنا اور مردو آتے پرستے سے سستا نسل لاکر مند پر چڑھا دیتا۔ دو چار کمرہ نسل گاہاں کی نسل خراب کرتے پھرتے۔ اب وہ عمارت سے اچھی نسل کے نسل کا انتظام کر کے آ رہا تھا۔ جسے ہر سوں کشش چوں کے تہوار پر وہاں کے ڈیڑی قادم والوں نے گائیکہ بچانے کے لیے لانا تھا۔

سینکل خدا کرو اور دعا سے آگے بڑھا۔ مند کے کوئیں پر حور تھیں پانی بھر دی تھیں۔ اس نے ان کے پہلے چھائی کی صحت سے نا آشنا چرواں کی طرف دیکھا۔ ان کو دیکھ کر اس کے دل میں ایسا ایک ہوک سی اٹھی اور وہ سوچنے لگ جاتا کہ ان پر نصیب حور توں کے لیے بھی چھائی آتی سی نہیں۔ بھیجنا پھر لڑکھن کے بعد فوراً بڑھا اور مارا کھڑا اس سے پہلے سی صحت۔

کوئیں کی چھائی کی کھڑا کھڑا۔ اول کا حورم سے کوئیں میں کرنے کا دھماکا اور پھر اس کے اوپر کھینچے جانے کی چوں چوں اب اس کے لیے بانوس آلودہاں بن چکی تھیں۔ حسب معمول پانی بھر دی حوریت دیکھی تاکہ کوئیں میں بڑا حاکر نیچے کھڑا اور وہ سے دے کو چرگی پر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ذول کے شکستہ چہرے میں کئی سوراخ تھے اور وہ بے لطفی سے اس کا پانی آدھے سے کمرہ دھاتا۔

آدھی دھن کے قریب لڑکے لڑکیاں جو باڈوں کے ساتھ کوئیں تک آئے تھے۔ ایک دوسرے کے کھڑوں کا پیچھا حصہ بلاے چپک چپک کرتے ہوئے رملی گاڑی کھینچ رہے تھے۔ قریب ہی ایک پانچ چھ سال کی لڑکی گائے گھینٹوں کے پانی پینے والے حور میں ڈکیاں بکھاری تھی۔ چھڑا کے کمرہ میں کی سوئی ہوئی پھٹکیاں اسے کھینچ کر ایک دوسرے پر ازار رہے تھے۔

مستقل کا کمرہ گاہاں کے دوسرے کنارے پر تھا۔ مکان کی وجہ سے اس کی رفتار معمول سے کم تھی۔ راستہ میں کئی جگہ گور کے دھیر سڑاک روکے ہوئے تھے۔ جن پر سے کبھی لڑکے چند کھیلوں کے لیے اس کے گرد ہوا چلی اور دوست بنا کر قدم تیز کر دیتا۔ چھڑا ایک جھوپڑی کے ساتھ بیٹھا رہ کر کے پستیا سیلی سے ماسنے کی طرف تھوکتا اسے رام رام کہتا ہوا قریب سے گزر گیا۔ آگے راستہ میں ایک کھینچا کے پائے پودا بھل رہا تھا۔ بار میں مستقل کی جھوپٹھی پانوں کے لیے گور سوار رہے ہوئے اس زور سے ہاتھ مار رہی تھی کہ زور دیکھ بھینگی اور سی تھیں

مستقل رام کی دکان جو مستقل کے گھر کے قریب ہی تھی بند ہو چکی تھی۔ بہت سے کئے دکان کے آگے کھڑے ہوئے غالی مکرے اور دی پٹائی کے چپے پائند رہے تھے اور ایک دوسرے پر بھونک رہے تھے۔ مستقل کو کچا کچا انہوں نے بھونکنا اور لڑنا بند کر دیا۔

کئی کئے اگلے تاک اگلا کر دھڑی ہوئی کھال کھانے لگے۔ کئی تھوٹھی پر پھٹکائی ہوئی کھیلوں پر ماسنے لگے۔ ایک کھال ہانگوں میں ادا کر دیا گیا۔ ان کی سرٹا ہے ال پڑی دھڑوں اور چار یوں سے گل بچی تھی۔ جس میں سے فاقہ زور پڑیاں اس طرح بھانک رہی تھیں جسے معلوم کالم کی طرف دیکھ رہا ہو۔ کئے دھڑی انسانوں کی ٹھونچ پر چھانچوں کی طرح اپنے کو ڈھکی جسم لیے اور حور دیکھتے سارا دن گلیوں اور

کھیتوں میں لحاظات سامنے پھرتے اور ٹھیکیں غیر جہانی آنکھوں سے ہر ایک کو گھومتے رہتے وہ شام کو پانچ گھنٹے کے آگے اکٹھے ہوتے اور سادگی برسات ڈالتی اور صاف صاف سے اُڑ جاتے رکھتے۔

منگھ دھام کی دکان کی یا نہیں طرف بڑے کے درخت کے نیچے ایک چید گائے لٹھی ہوئی تھی۔ فوجیہ سال ہوا جب منگھ دھام کی ماں سرے لگی تو اس نے کنو داں کی خواہش کا خبر کی۔ وہ دھوا دھیر چاکر گنو شالہ سے چکاے شریہ لایا۔ چاکا کا کرنے سے وہ کی برس سے عٹک ہو چکی تھی۔ اس کی چانگوں کے چٹلے جھے کئے ہوئے تھے۔ جنہیں مانا ہوا کسی دوسری گائے کی تانگوں سے پیو ہوا دیا گیا تھا۔ تاکہ وہ پیر قدرتی گو چری کرنا خش کے لیے زیادہ متحرک ہو جائے۔ اس وجہ سے منگھ دھام کو گائے بہت سستے دھاموں مل گئی تھی۔ براہین کو رکھی طور پر دان کرنے کے بعد اسے پیراں انا دیا گیا تھا اور وہ درخت سے گرے پچے کھا کر زندہ رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ منتظر ہے اس کی گرہ یا پھچڑی چٹائی ہوئی تھی۔ جو اب بہت کھیل چکی تھی۔ اسے گائے کے دل تک پہنچنے میں ابھی چھ سات روز اور تھے۔ جب جیسا کہ منگھ دھام کو کچا تھا اور قدرتی موت مر جائے گی۔ سٹیل اس کے لیے شریہ مر رہی یا تھا۔ گائے کے قریب جا کر کھینچا یاں ڈال ڈال کر وہ مر رہی گائے تھا۔

جب سبیل گمرک پہنچا تو مختلف قسم کے خدشات اسے اپنے تعاقب کرتے جان پڑے تھے۔ پچھلے چند مہینوں کی یادیں دائرہ فہمائے میں کر اس کی آنکھوں کے آگے کھیل سکر رہی تھیں۔ اسے اس گاؤں میں آنے پہنچنے سے ہو چکے تھے۔ جب وہ کالج میں پڑھتا تھا تو سوچا کرتا تھا کہ ہندوستان میں ساتھ ساتھ لاکھ گاؤں ہیں۔ اگر ساتھ لاکھ تو جوان ان کی بھڑی اور بھڑی کے لیے زندگی وقف کر دیں تو اس سال میں ہی اس پر نصیب ملک کی کاپی ملتی جا سکتی ہے۔ وہ ایک ایسا ہی نوجوان تھا پہنچا تھا۔ کالج کی تعلیم کے بعد وہ اس گاؤں بھٹکنا دیکھیں جو بالکل بے انٹیشن ہے۔ بالکل سبیل جنوب مغرب کی طرف تھا تین چھوڑ زمین داری ہے کے آگے آباد ہو گیا تھا۔

صبر و بردباریوں کا نیکو نمونہ تھے۔ ہلال و کھنجر میں سے اعلیٰ مقام پر پہنچنے والی مٹی کی یہ پہاڑیں دریا میں بہاؤ میں ڈال دیں۔ ہلال و کھنجر میں سے اعلیٰ مقام پر پہنچنے والی مٹی کی یہ پہاڑیں دریا میں بہاؤ میں ڈال دیں۔ ہلال و کھنجر میں سے اعلیٰ مقام پر پہنچنے والی مٹی کی یہ پہاڑیں دریا میں بہاؤ میں ڈال دیں۔

صبر و بردباریوں کا نیکو نمونہ تھے۔ ہلال و کھنجر میں سے اعلیٰ مقام پر پہنچنے والی مٹی کی یہ پہاڑیں دریا میں بہاؤ میں ڈال دیں۔ ہلال و کھنجر میں سے اعلیٰ مقام پر پہنچنے والی مٹی کی یہ پہاڑیں دریا میں بہاؤ میں ڈال دیں۔ ہلال و کھنجر میں سے اعلیٰ مقام پر پہنچنے والی مٹی کی یہ پہاڑیں دریا میں بہاؤ میں ڈال دیں۔

دلوں میں اس سے بھی متصفین جہالت ہی مڑ رہی تھی۔ ہندوستان میں بھولوں کے سوا ہر چیز بھوار ہے۔

گاؤں کا سب سے عجیبہ مسئلہ اہل کی گائیں تھیں۔ ایک سو سترہ کے گائے میں سے سو سے زائد کو سوگی تھیں باقی صرف پاؤں پر چڑھ رہی تھیں۔ جو گاؤں والوں کی ضرورت کے لیے ناکافی تھا۔ دانت کو یہ گائیں خلیص طراب کرتی پھر تیں اور دن بھر باہر اہل میں گھاس کی بیچوں کی تلاش میں گزار دیتیں۔ ان کے مارہ کو کوئی انتظام نہیں تھا۔ ستیل نے لوگوں کو چارہ بونے کی ترغیب دی اور خود مصری کلود کی پت چپاس گھاس منگوا کر اپنی زمین میں بوئی۔ وہ ایک دس سیر دودھ دینے والی گائے خرید لایا تھا جس سے وہ اپنے اسکول کے بچوں کو دودھ پلایا کرتا تھا اور وہ گاؤں کی گایوں کی نسل کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

صبح اٹھ بجے ستیل آس پاس کے دیہات میں اطلاع دینے چلا گیا کہ آگے دلی وہ لوگ گائیں چاہنے کے لیے لے آئیں جب وہ شاہ کولو کا تو سارے دن کے سفر سے تھک کر چرہ ہو چکا تھا اور اس کے تھم بڑی مشکل سے اٹھ رہے تھے۔

حسب معمول چارہ گایوں کی دھن مروڑتے ان کی پیٹ پر چٹریاں بربساتے گاؤں میں داخل ہو رہے تھے اور ای طرح وہ روز کی گائے دن کے چھپے چھپے لڑکھڑاتی تھیں۔ وہ معمولی سے زیادہ تھکی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ غالباً اس دن اسے کچھ بھی بھرتہ ہوا تھا۔ یکا یک وہ کڑی ہو گئی اور گردن اٹھا کر حسرت بھری نظروں سے گرد کے بالوں میں پیچھے سے قیدوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی گائیں جواب دے سکی تھیں۔ وہ زمین میں لیٹ گئی۔ اور کہہ گھوڑے کتے اسے کہتا دیکھ کر اوپر دوڑے۔ یہ دیکھ کر کہ اس کا آخری وقت آج پہنچا ہے وہ زور زور سے ہونکنے لگے۔ جسے سن کر اور بہت سے کتے بھی اوپر آج ہوئے۔ وہ پر اشتیاق تھیں انہوں سے اسے سونگئے اور غلگ زبانوں سے اسے چاٹنے لگے۔ ان کے دھتھ تک جڑوں میں پانی بھرا آیا تھا۔ ان کی بھوک پھیلان بھڑ بھڑاتی تھیں۔ گائے نے سرافہ کر چند بار اوپر اٹھا پلایا اور پھر بے بس ہو کر زمین پر دکھ دیا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ جس میں سے زبان نکل رہی تھی۔ کتے بھونکنے بیٹھنے اترتے اپنے وحشی حیلے دانت لگا کھاتے اپنی شہید ضرورت سے بھوار اس کی ہڈیاں نوچنے لگے۔

ستیل بھی اپنی دیر میں وہاں پہنچ چکا تھا۔ گائے باپ رہی تھی اور اپنی آنکھوں کی پتلی لٹا میں سے کون کو کھود رہی تھی۔ ستیل کو کچھ کر سکتے وارے ذرا تے پیچھے ہٹ گئے سوائے ایک حاملہ گائے جس کی نیلی آنکھوں سے کئی ٹھنی بھونکی جا میں بھاگ رہی تھیں۔ دوسرے کتے ڈانگا رہے تھے۔ اس نے ماتا سے مجبور ہوے باقی سے چپک کر گائے کے منہ میں سے تھکی ہوئی زبان نوچ لی۔

گائے ترپنے لگی اس کے ذیلے ابھرائے ان میں حرکت اور غصہ جھلک رہا تھا اس کی لٹھوں بھری ہتھکین بھڑ بھڑانے لگیں۔ اس کے تھنے بھول گئے اور چند لمحوں ہی میں وہ اپنے جسم کے رگوں سے آزاد ہو گئی۔

ستیل کارہاں وہاں کا پ اٹھا۔ اسے آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ سچا کھانا ڈالی، ابھن سے اس کا دماغ پکڑنے لگا۔ اس سے وہیں کھڑا نہ ہوا کیا۔ گائے کی آنکھوں میں ابھوک سے ترپتی ہوئی ٹھنی ٹھنی جا میں۔ چوڑی زور جھید گائے کی سوت کا انتکار اس کی کئی ہوئی تھیں۔ بھوری گائے کے دلوں میں چوڑا مارے ہوئے کوئے ان کے سوا دانت میں اسے کچھ بھی رکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بہت سی ٹول ڈھنی آواز میں اس کے کانوں کے پردے ڈانگا رہی تھیں۔ کمرے میں کھل کر ستیل نے کچھ اچھے ہوئے ہاتھوں سے لپٹ رہی کیا اور چار پانی پر لیٹ گیا۔ اس کے ذہن میں یہ شمار تھا اختتام ایک دوسرے سے دست دگر جان ہو رہے تھے۔ نیم غنودگی کے عالم میں اس کے آگے گاؤں کی تمام گائیں گھونٹنے لگیں۔ مرل گائیں کی چندوں کے درمیانی گزے کا چپک است بہت گمرے اور تاریک معلوم ہونے لگے جن میں یہ انتہا لوگ

خود کریں کہ اگر ستمہ چارہ ہے جسے چاہیں گی پہلیاں تیر چھریاں ہی کر اس کا جسم چرے لے لیں۔

ستیل نے یسپ کی مدد کو طرف دیکھا۔ وہ اس کی کاہنی ہوئی تھوڑی کی طرف تاک رہی تھی اور اس کے چھاتی ہڈیات کا بغور مطالعہ کر رہی تھی۔ اس وقت سے نفرت کا احساس اس پر غالب ہوتا جا رہا تھا۔ طامات کے پیچھے ہوئے خیالات اس کے جسم پر لاتعداد پھٹکوں کی طرح رینگنے لگے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی نگوں میں خون کی جگہ زہر بھر دیا گیا ہے۔ کچھ بڑی میں کڑوا دھواں اور وہ کھاری سمندر کا شہد کی ایک دو دھوئیں اُجال کر صفحہ کرنے کی علامت کو پیش کر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ یسپ کے شے کو بڑے اناک سے دیکھنے لگا۔ وہ اسے کہہ رہا تھا کہ شری، وہ تمہیں کے چھتے ہیں جن میں تمہیں وہ دن کا شہد پیدا ہوتا ہے۔ جب تک سمندر ستان کے کم لاکم آ رہے گاؤں اس کھنے کے شہر نہیں ہا دیے جاتے جب تک یہ جہالت دور نہیں ہوگی اور ترقی خواب ہی رہے گی۔ اس کے بہت عرصہ بعد تک وہ چکا چودھا کھوں سے یسپ کا چہرہ نکھار رہا۔ اس کے دماغ سے جب قسم کے تصورات کے طامات ابھر رہے تھے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے ہی اس کا سکون چھا جاتا لیکن اسے اس سکون کے نیلے خیالات کی بھاری سے بھی زیادہ پریشان کر دیتے۔ چنانچہ ستیل کو یوں محسوس ہوا کہ یہ خیالات اس کے پیچھے ہیں اس طرح رنگ رہے ہیں جیسے گلے مزے سے سرو میں سفید کرتے۔ وہ بیٹھا کر کھاتے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ نہیں اُگڑے اور سر جھٹکنے لگا۔

گاؤں میں داخل ہوتے گھڑوں کی ہوسو سوپ سوپ کتوں کی وردناک علف سوراں کی چٹیں چھریاں کی جھنساہٹ 'الوؤں کی ہوک اور دوسری پتھروں کی قسم کی ناقابل فہم پر خوراک والی اس کے کانوں میں بچنے لگیں۔ اسے یہ سب پرہات سے موت کے لیے دعائیں معلوم اور ہی تھیں۔ اوہ ہوا درختوں کو جھٹکنے دے رہی تھی۔ ان کے چوں کی سرسراہٹ سے ستیل کو یوں محسوس ہونے لگا کہ یہ اداں کے بے شمار حرمت کسی دوسرے دنیا کی طرف اڑے جا رہے ہیں۔ کتوں کی علف علف اسے موت کے لیے بے بس خواہش معلوم ہونے لگی۔ اس کا اپنا دل بھی موت کے لیے لگانے لگا۔ اس کے جسم میں سونیاں ہی پیچھ رہی تھیں اسے محسوس ہونے لگا کہ ایسے تصورات کا فوارہ اس کے دل میں بھوٹ چڑا ہے جنہیں اس کی فطرت سے کوئی نسبت نہیں اور یہ انہی خیالات اس پر غالب ہونے جا رہے ہیں اور اس کے ہاتھوں کو ایک ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔"

ستیل نے کیتوں کے چہرے مارنے کا زہر بڑا سرف آٹے میں گھولا اور اسے لے کر مکان سے باہر کتوں کی آوازوں کی طرف پھٹنے لگا اسے ایک زبردست کشش ان کی طرف کھینچ رہی تھی۔ آسمان کی نیلی نیلی خاموشی میں فٹے فٹے بدل دانت بھول کر رہ گیا۔ وہ میرے کی گہری دھاریاں غم آگئیں آنکھوں سے اسے تھک رہی تھیں۔ جو بڑی دہلیز میں نئے معلوم ستارے کا پہرہ ہے جسے وہ جھٹک رہا کی دکان کے قریب پہنچا۔ وہ کچھ دیر کے چہرے کا حلقہ کھینچے ہوئے تھے۔ ان کے دانتوں میں ایک ہی دھشت تھی۔ بے بسی کے عالم میں ایسے کسی بیرونی طاقت کے زیر اثر اس نے زہر پینے آئے کو کتوں کے آگے ڈال دیا۔ وہ اداں پہ اسے چاٹنے لگے۔ ستیل کے چلے آنے کے بعد چڑی کی ستانی گانے لے لگی اس پاس دھتک کر اسے چاٹ لیا۔

انگی تاج جب ستیل بیدار ہوا تو رات کی نیم گھوٹی کے نفرت اس کے ذہن سے پہلی طرح نہیں مٹے تھے۔ جب وہ لہ کر کپڑے بدل کر باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ کتوں کے علاوہ سفید گائے بھی اس کی حرمت پریشان کا دکھارہو چکی ہے۔ گاؤں والے گاؤں پھری کر رہے تھے اور سب اسے مظلوم نظر دے دے کچھ رہے تھے۔

حلقہ چڑی بچنے والے سمندر کے ارد گرد سماں بھارے تھے۔ فز کی ادبہات کے لوگ سفید کھینچنے آئے لگ گئے۔ کھینچیں جو بڑے

نکل آئی تھیں اور کیلے کچھ بھر جسم کی شاخوں سے لگ کر دی تھیں۔ ایک روز حارث اس منہ سے کے برابر میں بیٹھا ہوا اٹھنے بیٹھنے لگا جیسا کہ فردوس کے رہا تھا۔ قریب ہی دودھ پانی کی گھڑی لٹی تھی جس سے لگے ہوئے چاندنی لٹا روتی کے لیے گھرا کر رہے تھے۔ چار آنے کی فوٹو والے فوٹو گرافر کے گل اور ہانسیے والے پردہ کا بہت سے لوگ سناٹا کر رہے تھے۔

اسے جس طرحی فادر کے ملازم سنا لیے آپہنچا اور لوگ اس کے در درگرا کھٹے ہوئے گئے۔ سٹیل گاؤں کی دوسری طرف انجیل کا نہیں اٹھنے کی ہوئی تھیں بلکہ لے جانے کے لیے میچ کو ایک طرف کرنے لگا۔ لوگوں نے اٹھا سنا اور دھندست سٹیل پہنچا ہوا دیکھا تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے ہو لیے حسب حادثہ میچ کرنے کے بارہ چوڑا کے اسے پیچڑے گئے۔ خدا کی کبریت سٹیک کا لڑکا اس کی دم مروڑنے لگا۔ سٹیل دودھ برداشت نہ کر سکا اور اس نے خدا کر کے لڑکے پر حملہ کیا۔ دم پھڑا کر دو لوگوں کے پیٹھ سے ہماگ بھگا لوگ بھی اس کے پیچھے بھاگے گئے۔ دوسرا لڑکے کو چوٹ لگی۔ کچھ کرکھی آدھی سٹیل کو انھیں دھونچا۔ سٹیل سے پھٹے گئے۔ سٹیل نے بھی چند اور آدمیوں کی جھٹکی لگائیں جس سے لوگوں کا قصہ اور بھی بڑھا۔ انھوں نے سٹیل کو اس سیدھی سے وینا کاس کی چوڑی سرخ ہو گئی اور وہ زمین پر گر پڑا۔ سٹیل سے لوگ ناراض تھے ہی سٹیل کو چھانے کی کوشش میں وہ بھی اٹھا وینا کیا کہ ٹیم جان ہو کر گر پڑا۔ لڑکے کے ملازم جنھیں ٹوڈ کمپنیشن چھٹی آئی تھیں۔ ان دونوں کا ہمیشہ گاڑی میں ڈال کر شہر کی طرف لے گئے مندر کے ایک برامین نے گاڑی میں بے ہوش پڑے سٹیل کی طرف آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ دیکھا ان تاروں نے گلو جیتا کے پاپ کی کھٹی جلدی سزا دی۔

گاؤں میں گونجنا ہوئی تھی۔ اس لیے پھاریوں نے گھنٹیں جھون کا تھوڑا دتا لے سے اٹھا کر دیا۔ ٹیام کو تھا کہ وہاں میں اس کے پرائیوٹ کے لیے تھوڑی سوچنے کے لیے چھانٹ ہوئی۔ ایک سو ایک سیرنگی کا ہون ہوا ضروری تھا کیونکہ مندر کے پھاری دسکی تھی کے نام وصول کر کے اور چاہتی تھی جا کر کافی نفع حاصل کر لیا کرتے تھے۔ گنوا دان بھی لازمی تھا۔ ان پھاریوں کی سٹیل کی اس سیر دودھ دینے والی گائے کے نظر تھی۔ مختلف قسم کے دیہاتروں کا سوال کہ وہ چاہا تھا۔ لگا بل گاؤں میں چھڑکا ہوا تھا۔ اس سب پر انھوں نے دوسروں کو گواہ بنے۔ آخر بہت مدت سناٹ کے بعد ایک سو روپیہ پر لھٹا ہوا۔ جس میں سے آدھے زمیندار نے دینے کا وعدہ کیا۔ ہون گنوا دان اور دوسری دوسرا بات کا ہمارا دن کے بعد ہی سمجھو اٹھ گیا۔

خدا کی کبریت سٹیک نے سٹیل کی گائے اپنے پاس منگوائی۔ گاؤں والوں نے بھی دودھ میں پچاس روپے اکٹھے کر دیے۔ تیسرے دن خدا کی سٹیل کی گائے کو شہر لے گئے۔ اسے بوجھ خانہ میں اٹھایا روپیہ میں بیچ دیا اور پھر گنوا شالہ کا رخ کیا۔ گنوا شالہ کے دودھ پر کرشن جی کی تصویر تھی۔ نیلے رنگ کے کرشن مرداری صحت مند پیش کاغذ کی ہنری سے مست کر رہے تھے اور گنوا شالہ کے اندر وہی بھوک موت کا اظہار کرتی ہوئی کانٹیں تھیں۔ وہاں سے خدا کرتی نے ایک سو گئی گائے بھی کر گاؤں میں پہلے ہی بہت سی تھیں تھیں وہ روپے کو خرید لی اس کے بعد بازار سے پانچ روپے کے تاشے لیے اور باقی حردہ پے منیال گاؤں لوٹ آئے۔

انکی میچ لٹا کر دودھ خوب ہا ہوا تھا۔ آم اور نیم کے چھن کی جھٹکیاں اس کے چاندنی طرف لگی ہوئی تھیں۔ دودھ اور گیلے کچھ بڑوں کے سٹون کھڑے کے ہوئے تھے۔ اندر کیوہ سے باہر کھینچ کا نشان چاہا تھا۔ سب سر سر کے فرش کو چتر جانے کے لیے اس پر گور کا لپٹ کیا ہوا تھا۔ کرشن جی کی سواری پر چتر دیکھا کہ سہری کھٹ جو خاص خاص سوتوں پر باہر نکلا جاتا تھا لگا ہوا تھا۔ ہون کے بعد خدا کی کبریت سٹیک نے گائے منگوا لی تھی۔ اس کا سارا جسم کیوہ سے دھکا ہوا تھا اور اس پر لگے ہوئے چاندنی کے سفید ورق

بہت بھلے مظلوم ہو رہے تھے۔ اس کے سنگوں پر کشمیری دماغی اپنی ہوئی تھی۔ اس نے تمام لوگوں کا ہاتھ چھوا کر گائے برہمن کو دے دیا۔ وہ سخی کی گائے کی بجائے اس مرحلے گائے کو کچر کر بہت سٹ پٹانے لگیں خاموشی کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ غرا کر بی بیچا اس وہ بے اپنی گرو سے نکال اور بیچا اس کا دس دالوں کے ڈال ایک سو پچھار کی کے ہاتھ میں بکڑا دیے پتھوں کا پر شاہ لوگوں میں پائا پھر راتی کے میں دے بے لگی بیچا دی کے ہاتھ میں تھم کر بڑے لڑا خانہ انداز میں کہتے گئے۔

”پھرت لگی پر لو لیں وہ پتہ اور پچا پاٹ خوب اچھی طرح کرنا دیکھنا کوئی کسر چندہ جائے۔“



اشفاق احمد

نام	اشفاق احمد خان
قلمی نام	اشفاق احمد
پیدائش	۲۲ اگست ۱۹۳۵ء بمقام میکسٹر فیروز پور، مشرقی پنجاب، بھارت (۱)
وفات	۷ جنوری ۲۰۰۳ء لاہور
تعلیم	ایم۔ اے (اردو) گورنمنٹ کالج لاہور، ایم۔ اے (ادبیات) روم یونیورسٹی (ایلی) قراچی زبان میں ڈیپلما گریجویٹ یونیورسٹی جی۔ اے۔ فرانس، ایم۔ اے کاسٹل ٹرینگ نیو یارک یونیورسٹی، امریکا، پریڈیٹ لف وائرلڈ ورک شاپ ورلڈ وائن امریکا۔

مختصر حالات زندگی:

رائیوت گھرانے کے محمد خاں کے ہاں میکسٹر اضلع فیروز پور میں پیدا ہوئے۔ بچپن اور لڑکپن فیروز پور، مشرقی پنجاب میں گزرا۔ قیام پاکستان کے بعد اپنے والدین کے ساتھ لاہور منتقل ہوئے اور حرکت روڑ پر ایک چلے ہوئے مکان میں رہائش اختیار کی۔ گھریلو حالات ایسے نہ ہونے کے سبب اشفاق احمد دفتر روزگار پہنچے مگر بچت نہ ہونے کے سبب ملازمت خالی ہو گئی تو اگلے روز سڑک کی صفائی کرنا شروع کر دیے۔ ملازمت اختیار کی جہاں صرف ایک دن گزارا۔ اس کے بعد مہاجرین کے کھپ، واقعہ دالمن میں ملازم ہو گئے۔ ایک دن سوئی خدشہ گزارا اور اگلے روز لاہور آگئے مگر پرائیویٹ ہسپتال کے شعبہ میں منتقل ہو گئے۔ ۱۹۵۶ء میں انوکھ سیر سے شادی ہوئی۔ انہوں نے اشفاق احمد نے لاہور سے اپنی تعلیم "داسٹن کو" جاری کیا۔ ریڈیو سے تعلق اسی زمانے میں قائم ہوا۔ ریڈیو آؤٹسٹ محمد حسین المعروف علی بابا نے ڈراما نگاری کے سلسلے میں راہنمائی کی تو اشفاق احمد نے "اچی ماڑی" "سیرا" "مہول" ریڈیو ڈرامے لکھ کر دیے۔ ۱۹۶۸ء میں اشفاق احمد نے لاہور ریڈیو سے "تلفیظ شاد" پروگرام شروع کیا جو اخیر حرکت جاری رہا۔ انہوں نے پھر شعبہ اردو ڈراموں کا کالج لاہور سے منسلک ہوئے اور وہاں سے روم یونیورسٹی، امریکا چلے

ہوئے۔ دوسری "نیل اوتھار" لاہور مرثیہ کیا چار برس تک ڈائریکٹر آر سی۔ ڈی ریجنل پبلشرز میں تھے۔ ۱۹۸۷ء تک، پتہ بھج کے مستقل پتہ گرام "تخلین شاہ" کے علاوہ ۲۸۸ روپے ڈائی اراستے لکھے۔ پاکستان نیل وچان کے لیے گاہک سائے میں سفر اور ڈاڑھے غلم بند کیے۔ برس چار برس تک اردو سائنس بورڈ لاہور کے ڈائریکٹر جنرل رہے۔ سرطان کا مرض لاحق تھا، لاہور میں انتقال کیا۔ تدفین اولیٰ نائن لاہور کے قبرستان میں ہوئی۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"توپہ" مطبوعہ کارلی دنیا لاہور ۱۹۳۳ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ "نیک جیت سرفارے" (۱۱۳ افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع اول ۱۹۵۱ء
(۱) "توپہ" (۲) فہیم (۳) رات بیت دی ہے (۴) سٹاش (۵) سنگ دل (۶) مسکن (۷) شب خون (۸) تو تار کہانی (۹) عجیب بادشاہ (۱۰) بددین کی گنج گلی میں (۱۱) بابا (۱۲) پتا ہیں (۱۳) ای
دا بیج رہے کہاں "توپہ" کا عنوان اخلاق احمد نے "بھفری" رکھا تھا جسے شاہد احمد دہلوی نے "ساقی" میں شائع کیا اور مولانا
صالح الدہلوی احمد نے "اولیٰ دنیا" کے لیے اس کا عنوان "توپہ" تجویز کیا۔
- ۲۔ "اگلے پھول" (۸۸ افسانے اور ایک چہرہ) کب لیتھ لاہور طبع اول فروری ۱۹۵۷ء
(۱) اگلے پھول (۲) گل لڑا (۳) تھک (۴) حقیقت بخش (۵) تو شے ہے (۶) مسعود ٹھیک (۷) گنڈ ریا (۸) برکھا (۹) ایل ویرا
(۱۰) روم سے حلقہ رہتا ہوں
نوٹ: "اگلے پھول" کو سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۳ء میں "گنڈ ریا" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔
- ۳۔ "سرمیج" (۶۱ افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع اول اپریل ۱۹۸۳ء
(۱) اوت بان (۲) کال (۳) کھنڈل دینی (۴) چور (۵) بانوں ابھی (۶) بچا جاتا ہے (۷) محسن علف (۸) پانچ نیل دہر
(۹) کالج سے گھر تک (۱۰) کاتو (۱۱) قلم برائت
"عظیم ہوش افروز" (سائنس کٹھن)
- ۴۔ "پینکاردی" (چند افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع اول ۱۹۹۰ء
- ۵۔ "سکھانے فسانے" (۱۸ افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع اول ۲۰۰۲ء
- نوٹ: ان چھ مجموعوں میں اخلاق احمد کے تمام افسانے سمیت لیے گئے ہیں۔ اخلاق احمد کے تحریر کردہ افسانوں کی کل تعداد ۵۱ ہے۔
- ۶۔ "کاشی جے" (۱۸ افسانے) مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع اول ۱۹۹۰ء

- ۸۔ ”مہمان بہار“ (ادبیت) مکتبہ میری لائبریری لاہور طبع اول: ۱۹۵۵ء
- ۹۔ ”وداع جنگ“ ملک دین احمد علی خان ایک ڈیجٹل ہیر طبع اول: دسمبر ۱۹۶۶ء
- ازارنٹ سے تنگ رہنے کا انگریزی سے ترجمہ (دہلہ میں)
- ”A Farewell to arms“ کا ترجمہ ہے۔
- ۱۰۔ ”پتنگیز خاں کے طہرے شاہی“ از جاشی کا انگریزی سے ترجمہ مکتبہ یحییٰ ادب لاہور طبع اول: جنوری ۱۹۶۶ء
- ”The Golden Hawks of ganghus“ (ناول) کا ترجمہ ہے۔
- ۱۱۔ ”کھنڈیادین“ (مجلاتی آواز نکلیں) مطبوعہ سنگ میل لاہور طبع اول: ۱۹۸۸ء
- ۱۲۔ ”تو تاج کپائی“ (ٹی۔ وی ڈرامے) مطبوعہ سنگ میل جلی کیشنر لاہور طبع اول: ۱۹۹۸ء
- ۱۳۔ ”گھر کار“ (مراجیہ)
- ۱۴۔ ”گھر گرم“ (مراجیہ)
- ۱۵۔ ”الکت زبانی نکات“ مرکز کی اردو مجوزہ لاہور
- ۱۶۔ ”دوسری سے نباہ“ (از نعتیہ تنقید کا ترجمہ) گوشادوب لاہور طبع اول:
- یہ تراجمی خدمات کی کتاب ”Getting along with others“ کا ترجمہ ہے۔
- ۱۷۔ ”کھیل جاشا“ مطبوعہ سنگ میل جلی کیشنر لاہور
- ۱۸۔ ”سفر و سفر“ مطبوعہ سنگ میل جلی کیشنر لاہور
- ۱۹۔ ”ڈاکٹر شہاب“ (یادنامہ) مطبوعہ سنگ میل جلی کیشنر لاہور
- ۲۰۔ ”ایک بہت سوزا رے“ (ٹیلی ڈرامے) مطبوعہ سنگ میل جلی کیشنر لاہور طبع اول: ۱۹۸۸ء
- ۲۱۔ ”میں چلے گا سوزا“ (ٹیلی ڈراما) مطبوعہ سنگ میل جلی کیشنر لاہور
- ۲۲۔ ”شاہد کوٹ“ (ٹیلی ڈراما) مطبوعہ سنگ میل جلی کیشنر لاہور
- ۲۳۔ ”حیرت کدو“ (ٹیلی ڈراما) مطبوعہ سنگ میل جلی کیشنر لاہور
- ۲۴۔ ”تنگے پاؤں“ (ٹیلی ڈراما) طبع اول: ۱۹۹۱ء
- ۲۵۔ ”بڑا کٹی“ (ڈرامے) مطبوعہ سنگ میل جلی کیشنر لاہور
- ۲۶۔ ”آجے برحق کو روئے“ (ڈرامے) مطبوعہ سنگ میل جلی کیشنر لاہور
- ۲۷۔ ”بابا صاحب“ (ڈرامے) طبع اول: ۱۹۹۳ء
- ۲۸۔ ”مہمان“ (مراجے ڈرامے) مطبوعہ سنگ میل جلی کیشنر لاہور
- ۲۹۔ ”رواج“ (تین جلدیں۔ بنگلور) مطبوعہ سنگ میل جلی کیشنر لاہور
- ۳۰۔ ”تفہیم شاد علی کے راجہ دانی فوج (دہلہ میں)

- ۳۱۔ "عرض مصنف"
مطبوعہ رنگ میل پبلی کیشنز لاہور
- ۳۲۔ "شہرِ دہڑو"
مطبوعہ رنگ میل پبلی کیشنز لاہور
- ۳۳۔ قتلِ کہانی (نیل ڈرامے)
مطبوعہ رنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع ۱۹۹۰ء

وفات سے قبل مستقل پیا:

داستانِ سرگے ۱۳۲ء تا ۱۳۵ء مال ٹاون۔ لاہور لبرس ۳۱ پاکستان۔

اعزاز:

- ۱۔ پرائیز آف پرفارمنس "حکومت پاکستان کا سول اعزاز" ۱۹۷۹ء
- ۲۔ ستارہ امتیاز (حکومت پاکستان کا اعلیٰ سول اعزاز) ۱۹۹۷ء

نظریہ فن:

"میں نے اپنے انسانوں میں جات پر مبنی ڈراموں کے پرپندہ ہے بلکہ میری تمام تر قہر کردار پر مبنی ہے جو معاشرے کے پیچھے جاگتے کردار ہیں اور کردار میں جات کو بھڑکائی کو مغرب کرتے ہیں۔"

اشفاق احمد

(پہ حوالہ ایکہ انٹرویو دہڑو۔ حسن وقار نگلی "مطبوعات" نگار پاکستان "سائیکس ۱۹۸۱ء)



حوالہ جات:

- ۱۔ داستانِ ادا میں ۱۹۸۷ء ص ۱۱۱، ص ۱۱۲ ہے۔ خود مصنف کی۔

گڈ ریا

اشفاق احمد

یہ سہرا یوں کی ایک بے منت اور طویل رات کی بات ہے۔ میں اپنے گرم گرم بستر میں موڑنا نے گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے زور سے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔

”کون ہے؟“ میں نے بچ کر پوچھا اور اس کے جواب میں ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر سے گرایا اور گپ اندھیرے سے آواز آئی ”تھانے والوں نے رات کو کرنا کر لیا۔“

”کیا؟“ میں نے لڑتے ہوئے ہاتھ کو بے دھکیلتا جا ہٹا۔ ”کیا ہے؟“

اور تاریکی کا بھوت بڑا ”تھانے والوں نے رات کو کرنا کر لیا۔۔۔۔۔ اس کا قاری میں ترجمہ کر دے۔“

”راڈی کے بچے“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا ”آدھی آدھی رات تک کرتے ہو دفع ہو ہوا میں نہیں میں نہیں آپ کے گھر جتا۔ میں نہیں چڑھتا“ راڈی کے بچے کہنے لگے ”اور میں رونے لگا۔“

راڈی نے چٹکار کر کہا ”اگر بڑے گا نہیں تو پاس کیسے ہوگا پاس نہیں ہوگا تو بڑا آدھی نہ بن سکے گا پھر لوگ میرے دادا کیسے جانیں گے؟“

”اٹھ کر سب سربا نہیں۔ آپ بھی آپ کو ہانے والے بھی اور میں بھی میں بھی“ اپنی جھانگ پر میں ایسا دیا کہ وہ تین لمحوں میں گھٹسکی بندھ گئی۔

راڈی بڑے جد سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے جانتے تھے اور کہہ رہے تھے ”بس اب چپ کر شائش میرا اچھا بچہ اس وقت یہ ترجمہ کرنے پھر نہیں دگاؤں گا۔“

آئندہ دن کا رات کو چار ہاتھوں میں نے مل کر کہا ”آج صبح اوسے رات کو بچہ کر لے گئے کسی اور کو بچہ لیں گے۔ آپ کا ترجمہ

"نہیں نہیں" انہوں نے بات کاٹ کر کہا "میرا حیرہ وہ درہم آج کے بعد رات کو چکا کر لیجئے یہاں گا" شاباش اب بتا "تھانے والوں نے رات کو کڑا کر کہا۔"

میں نے مددھ کر کہا "مجھے نہیں آتا۔"

"تو رات میں کہہ دیتا ہے" انہوں نے سر سے ہاتھ اٹھا کر کہا "کوشش تو کرو۔"

"نہیں کرتا!" میں نے تل کر جواب دیا۔

اس پر وہ راضی اور بولے "کارکنان گزمرہ خانہ رات تو قیف کر دے" کارکنان گزمرہ خانہ تھانے والے۔ بھولنا نہیں بڑھکتا ہے۔ یہی ترکیب ہے اس سرچہ کو۔"

مجھے پتا تھا کہ یہ بات نکلنے والی نہیں تا چار گزمرہ خانہ والوں کا پہلا شروع کر دیا۔ جب اس سرچہ کو چکا تو وہ اکیلی نے بڑی لچا جاتے سے کہا اب سارا ختم ہو چکا ہے۔ جب وہ لگا نہ نصیحت بھی ختم ہوئی تو انہوں نے مجھے آرام سے لیٹر میں لٹاتے ہوئے اور رضائی کوڑھاتے ہوئے کہا۔ "بھولنا نہیں! صبح اٹھتے ہی یہاں چھوٹے گا۔"

بکرہ وہ سر سے آئے تھے اور حرکت گئے۔



شام کو جب میں ملائی سے سپاہی کے کا سٹی لے کر واپس توں میںوں دھلی گئی سے ہو کر اپنے گھر چلا گیا۔ اس گلی میں طرح طرح کے لوگ ملتے تھے۔ گھر میں صرف 'مونے' داخل سے، واقف تھا جس کو ہم سب "گندو کر لیا" دعائی آئے" کہتے تھے۔ باقی کے گھر کے ساتھ گھریوں کا ایک بانہ تھا۔ جس کے تین طرف کچے کچے مکانوں کی دیواریں اور سامنے رخ آڑی ترچھی کھڑکیوں اور خاردار جھانچوں کا اونچا اونچا جنگلا تھا۔ اس کے بعد ایک چوکو میدان آتا تھا پھر کھڑے کھار کی کھڑکی اور اس کے ساتھ کھیر دہلی کھڑکیوں اور پھل کی کیلوں والے دروازے کا ایک چھوٹا سا کاسکان۔ اس کے بعد گلی میں ذرا سا ختم ہوتا اور وہ دے رنگ ہو جاتی پھر جوں اس کی لمبائی بڑھتی توں اس کے دونوں بانہ گلی ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے۔ شاید وہ وہاں سے لیے میں سب سے لمبی گلی تھی اور وہ سے تریا وہ سنسان اس میں اکیلے چلتے ہوئے مجھے جھٹ بھٹ میں اندھ کی دانی میں چلا جا رہا ہوں اور جھٹ میں اس کے دہانے سے ہارنگوں کا زور سے "لٹا نہیں" ہوگا اور میں سر ہاؤں گا۔ مگر شام کے وقت کوئی نہ کوئی راگبیر اس گلی میں ضرور مل جاتا اور میری جان بچ جاتی۔ ان آئے جانے والوں میں کبھی کبھار ایک سفیدی موٹھوں والا لہبا سا آدمی ہوتا جس کی شکل بارہ ماہ والے سنگسے سے بہت ملتی تھی۔ سر پہ ٹھل کی بڑی سی بکڑی۔ ذرا سی سفید کمرے خاکی رنگ کا اسیلا اور لمبا کوٹ۔ گندہ رنگ کا ٹھٹھا اور پاؤں میں خلیٹ بوٹ۔ آنکھ اس کے ساتھ میری ہی عمر کا ایک لڑکا بھی ہوتا۔ جس نے میں اسی طرف کے کیڑے سے پہنے ہوئے اور وہ آدمی سر جھکانے اور اپنے کوٹ کی تکیوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ اس سے ہاتھیں کیا کرتا۔ جب وہ میرے برابر آتے تو کڑکا میری طرف دیکھتا اور میں اس کی طرف اور پھر ایک تاپے ٹھٹھے لٹیر کر دوں کوڑو کوڑو را سوزتے ہم اپنی اپنی راہ پر

چلے جاتے۔

ایک دن میں خود میرا بھائی اٹھ گیا اس کے جوڑے سے چھاپیاں پکڑنے کی ناکام کوشش کے بعد قہر کو دایں آ رہے تھے تو صبر کے پل پر یہی آدمی اپنی بگڑی گود میں ڈالے بیٹھا قہاروں کی سفید پٹیا بھری مرفی کے پر کی طرح اس کے سر سے چٹکی بونی تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے بھائی نے مانجے پر ہاتھ رکھ کر زور سے سلام کیا۔ "داؤدی سلام"۔ خود داؤدی نے سر ہٹا کر جواب دیا۔ "جیتے رہو"۔

یہ جان کر کہ میرا بھائی اس سے واقف ہے میں نے ہاتھ غلط ہوا اور تھوڑی دیر بعد اپنی منحنی آواز میں چلا یا۔ "داؤدی سلام"۔

"جیتے رہو۔ جیتے رہو" انھوں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا اور میرے بھائی نے چار سے میرے منہ ڈالے کا ایک ٹیبلر ڈیا۔

"ٹنگی خور نے کتے" وہ چیخا۔ جب میں نے سلام کر دیا تو تیری کیا ضرورت رہ گئی تھی؟ ہر بات میں اپنی ناک چھپاتا ہے کہیں

"بھرا کوئی ہے وہ؟"

"داؤدی؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"داؤدی؟" میرے بھائی نے ٹک کر پوچھا۔

"وہ جو ٹھٹھے جیڑا" میں نے آنسو پی کر کہا۔

"کہا اس نے کہ میرا بھائی چڑ گیا اور آٹھ گھنٹیں نکال کر ہوا۔" ہر بات میں میری نقل کرتا ہے کتا۔ ٹنگی خور۔"

میں نہیں بولا اور اپنی خاموشی کے ساتھ راہ چتا رہا۔ دراصل مجھے اس بات کی خوفنی تھی کہ داؤدی سے تعارف ہو گیا۔ اس کا رنج نہ تھا کہ بھائی نے میرے ٹیبلر کیوں مارا۔ وہ تو اس کی عادت تھی۔ بڑا تھا پاس لئے ہر بات میں اپنی ٹنگی بکھارتا تھا۔

داؤدی سے ٹک سلیک تو ہوئی گئی تھی۔ اس لیے میں کوشش کر کے گلی میں سے اس وقت گزرنے لگا جب وہ آ جا رہے ہوں۔ انہیں

سلام کر کے بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ جواب دیا کہ اس سے گلی نہ دیا اور۔ جیتے رہو بکھاؤ کی جنت سے کہتے کہ زندگی دو چندی ہو جاتی اور آدمی زمین سے ڈھا

اور ہاتھ کر بھا میں چنے لگا۔ سلام کا یہ سلسلہ کوئی سال بھر چلی چلتا رہا اور اس اثنا میں مجھے اس قدر مظلوم ہونے کا داؤدی کی گردانی کھڑکیوں

والے مکان میں دہتے ہیں اور چھوٹا سا لڑکا ان کا بیٹا ہے میں نے اپنے بھائی سے ان کے حلق بکھو اور بھی پوچھا جا ہا نگہ وہ بڑا سخت آدمی تھا اور

بھری پھوٹی سے چھوٹی بات پر چڑھتا تھا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اس کے پاس گھڑے گھڑائے داخترے ہوتے تھے۔ "جیتے کیا" اور

"کہا اس نے کہ" ٹنگی خور کا شکر ہے میرے قہس کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا۔ سلام پر ہر گھری سکول سے چوچی پاس کر کے میں ایم بی بی سکول

کی چانچیں جماعت میں داخل ہوا تو وہی داؤدی کا لڑکا میرا اسم جماعت لکھا۔ اس کی مدد سے اور اپنے بھائی کا احسان اٹھانے بغیر میں یہ جان گیا

کہ داؤدی کھڑی تھی اور قہر کی صفائی میں عرضی نہیں کا کام کرتے تھے۔ رات کے کا نام ایسی چڑھتا تھا اور جماعت میں سب سے زیادہ ہوشیار تھا۔

اس کی بگڑی نگاہیں بھر میں سب سے بڑی تھی اور چروٹی کی طرح چھوڑا۔ چنار کے اسے میا میں کہتے تھے اور باقی لڑکا کہہ کر پکارتے تھے۔ مگر

میں داؤدی کی وجہ سے اس کو اس کے اصلی نام ہی سے پکارتا تھا۔ اس لیے وہ میرا دوست بن گیا اور ہم نے ایک دوسرے کو نکالیاں دے کر کچے

پار بننے کا وعدہ کر لیا تھا۔

گریمز کی چھاپیں شروع ہونے میں کوئی ایک ہفتہ ہو گا جب میں اسی چنار کے ساتھ چلی مریج اس کے گھر گیا۔ وہ گرمیوں کی ایک

جلسہ نے وہی ادھر چھٹی۔ لیکن ٹنگی بی بی کی کہاں حاصل کرنے کا شوق تھا۔ یہ کھوت ہی کر سوتا تھا اور میں ہموک اور صوب دونوں سے بے پروا ہو

کر سکول سے سیدھا اس کے ساتھ چل آیا۔

ای چند کا گھر چھوٹا سا تھا لیکن بہت سی صاف ستھرا اور روشنی۔ بچوں کی کیلوں والے دروازے کے بعد ڈرامی ڈیوڈی تھی۔ آگے مستقل گھنٹے سامنے سربراہ رنگ کا رتہ اور اس کے پیچھے آدھی بڑا ایک کمرہ گھنٹے میں ایک طرف اٹار کا بیڑ۔ چھٹی کے چھ پودے اور دھنیا کی ایک بھوٹی سی کپڑی تھی۔ دوسری طرف چوڑی میز جسوں کا ایک ذیہ جس کی خراب تھے ٹھکری، رسوئی تھی۔ گیمرونگی کڑیاں ڈیوڈی سے ملستے بیٹھک میں کھلتی تھیں اور بیٹھک کا دروازہ نیلے رنگ کا تھا۔ جب ہم ڈیوڈی میں داخل ہونے تو اسی چند نے چار کر "بے نصیے!" کہا اور مجھے گھنٹے کے پھوس چھوڑ کر بیٹھک میں گھس گیا۔ برآمدے میں بورڈ لکھا ہے "بے مشین چلائی تھی" اور اس کے پاس ہی ایک حرکتی دی سے قیمتی سے کپڑے قلع کر دی تھی۔ بے نے مددی منہ میں کچھ جواب دیا اور ایسے ہی مشین چلائی دی۔ لڑکی نے لکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور رگڑوں مڑ کر کہا۔ "بے بے ٹائیڈ ڈاکٹر صاحب کا لڑکا ہے۔"

مشین راک تھی۔

"ہاں ہاں" بے نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلا یا۔ میں اپنے جزدان کی رہی مڑوڑا اور ٹیل سے ٹیلے سے پاؤں دھرتا ہوا بے کے ستون کے ساتھ آ گیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" بے نے چکار کر پوچھا اور میں نے لکھیں ہنکا کر آہستہ سے اپنا نام بتا دیا۔

"آداب سے بہت فعل ملتی ہے" اس لڑکی نے قیمتی زمین پر رکھ کر کہا۔ "بے نام ہے؟"

"کیوں نہیں بھائی جو ہوا؟"

"آداب کیا؟" اندر سے آواز آئی "آداب کیا ہے؟"

"آداب کا بھائی ہے آدھی "لڑکی نے دیکھتے ہوئے کہا۔" اسی چند کے ساتھ آیا ہے۔"

اندر سے آواز آئی برآمدے ہوئے۔ انہوں نے گھنٹوں تک اپنا پاؤں اٹھا کر چار حار کا اور کرتا ہوا ہوا تھا۔ مگر سر پر بھجری بدستور چلی پانی کی انگلی ہی بائیں اٹھا لے وہ برآمدے میں آگے اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ "ہاں بہت فعل ملتی ہے۔ مگر میرا آداب بہت جلا ہے اور یہ کولو سولو سا ہے۔" پھر بائیں فرش پر رکھ کے انہوں نے میرے سر پر ہاتھ بھر اور پاس کا ٹمہ کا ایک اسٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے۔ زمین سے پاؤں اوپر اٹھا کر انہوں نے آہستہ سے انھیں جھاز اور پھر بائیں میں ڈال دیئے۔

"آداب کا خط آتا ہے؟" انہوں نے بائیں سے پانی کے چلو پھر کر کانگوں پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"آداب کی؟" میں نے بولے سے کہا۔ "پر سو آؤ تھا۔"

"کیا لکھتا ہے؟"

"پتا نہیں مئی اپنی کوچہ ہے۔"

"اچھا" انہوں نے سر ہل کر کہا۔ "تو اپنی سے پوچھ کرنا" جو پتہ نہیں اسے کسی بھی بات کا علم نہیں ہوتا۔"

میں چپ رہا۔

تھوڑی دیر انہوں نے ویسے ہی چلو ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "کونسا سپاہیو چند ہے ہو؟"

”جہ تھا“ میں نے لڑائی سے جواب دیا۔

”کیا نام ہے تیرے سچا دوست کا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”میری بہنیں۔“ میری آواز بھراؤ ہو گئی۔

”سنگ الرسل“ انہوں نے پانی سے ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ بہر تھوڑی دیر وہ ہاتھ خشکے اور وہاں میں گھومتے رہے۔ بے بہے ٹھیکن چلاتی رہی۔ وہ لڑکی نعت خانے سے روٹی کال کر کر آئے کسی چوکی پر لگائے تھی اور میں جزدان کی آدوری کو کھولنا چاہتا رہا۔ اسی چٹا بھی تک جینک کے اندر ہی تھا اور میں ستون کے ساتھ ساتھ جینک کی جینک گراٹھوں میں اترتا جا رہا تھا۔ سناواؤں نے لگا چیں میری طرف کھینچ کر کہا ”سورہ فاتحہ سناؤ۔“

”مجھے نہیں آتی تھی“ میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔

انہوں نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا ”الحمد اللہ بھی نہیں جانتے؟“

”الحمد اللہ تو جان ہوں تھی“ میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ذرا ہنس کر اے اور گویا اپنے آپ سے کہنے لگے ”ایک ہی بات ہے‘ ایک ہی بات ہے‘“ پھر انہوں نے سر کے اشارے سے کہا خاؤ۔ جب میں سنانے لگا تو انہوں نے اپنا پانچواں کھنکھوں سے نیچے کر لیا اور بگڑی کا قسط چڑا کر کے کندھوں پر ڈال دیا۔ اور جب میں نے والا انصاف میں کہا تو میرے ساتھ ہی انہوں نے بھی آئیں کہا۔ مجھے خیال تھا کہ وہ ابھی انہو کر مجھے کچھ انعام دیں گے۔ کیونکہ جلی مرتبہ جب میں نے اپنے تالیقی کو الحمد اللہ سنی تھی تو انہوں نے بھی ایسے ہی آئیں کہا تھا اور ساتھ ہی ایک دوپٹہ مجھے انعام بھی دیا تھا۔ مگر واقعی اسی طرح بیٹھے رہے۔ بلکہ ابھی بچکر ہو گئے۔ اسے میں اسی چند کتاب تلاش کر کے لے آیا اور جب میں چلنے لگا تو میں نے عادت کے خلاف آہستہ سے کہا ”واؤ تھی سلام“ اور انہوں نے ویسے ہی ڈوبے ڈوبے ہوئے سے جواب دیا۔ ”بیٹے رہو۔“

بے بہے ٹھیکن روک کر کہا ”کبھی کبھی اسی چند کے ساتھ کھینچنے آیا کرو۔“

”ہاں ہاں آ جاؤ گا“ واؤ تھی جب تک کہ بولے ”آؤ اب بھی آیا کرتا تھا“ پھر انہوں نے ہاتھی پر جھپٹے ہوئے کہا ”ہمارا آؤ اب تو ہم سے بہت دور ہو گیا اور فارسی کا شعر ساجھتے گئے۔“

یہ واؤ تھی سے میری بات کا وہ پہلی ملاقات تھی۔ اور اس ملاقات سے میں یہ نیک نیت افذ کر کے چلا کر واؤ تھی بڑے کچھوں میں۔ حد سے زیادہ چپ سے ہیں اور کچھ بھرے سے ہیں۔ اسی دن خرام کو میں نے اپنی ماں کو چاہا کہ میں واؤ تھی کے گھر گیا تھا اور وہ آؤ اب بھائی کو یاد کر رہے تھے۔

اماں نے قدر سے گئی سے کہا ”تو مجھ سے پوچھ لیتا ہے کچھ آؤ اب ان سے چڑھا رہا ہے۔ اور ان کی بہت عزت کرتا ہے مگر میرے پاس ہی ان سے بولنے نہیں ہیں۔ کسی بات پر بھگڑا ہو کر گیا تھا سو اب تک بار بار اسکی بولی آتی ہے۔ اگر انہیں پتہ چلی گیا کہ تو ان کے پاس گیا تھا تو وہ خفا ہوں گے بھلا ماں نے ہمدردی کر کہا“ اپنے اماں سے اس کا ذکر کرتا۔“

میں اپنی سے بھلا اس کا ذکر کیوں کرتا مگر بولی بات تو یہ ہے کہ میں واؤ تھی کے پاس جاتا رہا اور خوب خوب ان سے مصیبت کی باتیں کرتا رہا۔ وہ چٹائی بچھائے کوئی کتاب چھو رہے ہوتے۔ میں آہستہ سے ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو جاتا اور وہ کتاب بند کر کے کہتے ”گلو

[illegible]

نویس عاصمت کے شروع ہی میں مجھے ایک بری عادت چڑھ گئی اور اس بری عادت نے مجھ پر کل نکلائے۔ حکیم علی احمد مرحوم ہمارے قصبے کے ایک ہی حکیم تھے۔ علاج سواجستے تو ان کو کچھ خاص ہی دیکھنی چھنی۔ لیکن باتیں بڑی حریفہ رہتا تھے۔ دالیاؤں کے تدارک نہ ہوں بھوتوں کی کہانیاں اور حضرت سلیمانؑ کی کمر بلوغت کی کہانیاں ان کے تیر بہدف ٹوٹے تھے۔ ان کے عجب دھار ایک مطلب میں لگوں کے چند اجڑے شربت کی دس پندرہ بیٹکوں اور وہ افقی شیشوں کے سا اور کچھ نہ تھا۔ وہ ان کے علاوہ دوائی طبیعتی فقرم اور حضرت سلیمانؑ کے خاص صدفی تمویذوں سے مزین علاج کیا کرتے تھے۔ انہی باتوں کے لیے دروازہ ان کے کمر میں ان کے پاس کھینچے چلے آتے اور فیض باب ہر کہ جاتے بختہ بختی کی صحبت میں میرا ان کے ساتھ ایک معاملہ ہو گیا تھا۔ اپنے سہتارا سے ان کے لئے خالی باتیں اور شیشیاں

چما کے لانا اور اس کے بدلے وہ مجھے داستانِ امیر حمزہ کی جلدیں، چڑھنے کے لیے دیا کرتے۔

یہ کتابیں، کچھ ایسی دلچسپ تھیں کہ میں رات رات بھر اپنے بستر میں دیک کر انھیں چمکا کرتا۔ اور صبح دوپہر تک سو جا تا تھا۔ میرے اس رویے سے سخت نالاں تھیں ابا کی کوہنوی صحت رہا ہوئے کا خضرہ لاحق تھا لیکن میں نے ان کو تادیا تھا کہ چاہے جان چلی جائے اب کے دوسری میں دلیخہ ضرور حاصل کروں گا۔ راتِ ششم ہو شربا کے اپانوی میں بسر ہوئی اور ان نکاح میں بیٹے پر کھڑے ہو کر نہ ہی امتحان میں نکل جاتے ہوئے۔ پہلے ششماہی میں چار چمکيا اور سلاخ امتحان کے موقع پر تحکم بنی کی حد سے ماضیوں سے مل جا کر پاس ہو گیا۔ دوسری میں مصدلی نامہ فساد آزاد اور الف لیلی ساتھ ساتھ پڑھتے تھے "فساد آزاد اور مصدلی نامہ گھر کے رکھے تھے" لیکن الف لیلہ سکول کے ڈبیک میں بند رہتی۔ آخری بیٹے پر مغربی کی کتاب کے مسند باد جہازی کے ساتھ ساتھ چل اور اس طرح دنیا کی میر کرتا۔ ہائیکس مٹی کا واقعہ ہے کہ گج دس بچے یونورٹھی سے تنبیہ کی کتاب ایم۔ بی ہائی سکول پہنچی۔ اسی چند نہ صرف سکول میں بلکہ ضلع بھر میں اولیٰ آقا تھا۔ چوڑے ٹکس تھے اور ہائیکس پاس۔ حکیم مٹی کا جادو یونورٹھی پر نہ چل سکا اور حجاب کی جاہر وائل گاؤں نے میرا نام بھی ان چوڑوں میں شامل کر دیا۔ اسی شام قیلہ کا ہی نے تیرے سے میری پٹائی کی یاد گھر سے باہر نکال دیا۔

میں ہسپتال کے دوست کی گدی پر آ بیٹھا اور رات گئے تک سو چکا کہ کتاب کیا کرنا چاہیے اور اب کو کھر جاتا جا رہے۔ خدا کا ملک تنگ نہیں تھا اور میں عمر و حیار کے جھکٹوں میں اور مسند باد جہازی کے تمام طریقوں سے واقف تھا۔ مگر بھر بھی کوئی راہ بھائی نہ دیتی تھی۔ کوئی دو تین گھنٹے اسی طرح ساکت و جامد اس گدی پر بیٹھا نہ سوتے کہ نے اسی سوچنا کہ ہاتھ میں ماں سفید چادروں سے مجھے دوسوڑتی دوسوڑتی اور آتے گئیں اور لہائی سے معافی لے دینے کا وعدہ کر کے مجھے بھر گھر لے گئیں۔ مجھے معافی دانی سے کوئی دلچسپی نہ تھی مجھے تو بس ایک رات اور ان کے یہاں گزارنی تھی۔ اور صبح سویرے اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا چنانچہ میں آرام سے ان کے ساتھ جا کر حسب معمول اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

اگلے دن میرے ٹکس اٹھنے والے ساتھیوں میں سے خوشیا کوڑو اور دیوبوب یہ سب کے جگمگاڑے نال کے پاس بیٹھنے گئے اور ۱۱ بجے جا کر بڑنس کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ دیوبوب یہ نے مجھے بتایا کہ لاہور میں بڑا بڑنس ہے کیونکہ اس کے بھائی باقی اکثر اپنے دوست چچ چند کے گھون کے ذکر کیا کرتے تھے۔ جس نے سال کے اندر اندر دو کاروباری طریقے لی جن میں نے ان سے بڑنس کی نوعیت کے بارے میں پوچھا تو یہ سب نے کہا لاہور میں ہر طرح کا بڑنس مل جاتا ہے۔ بس ایک دفتر ہونا چاہیے اور اس کے سامنے جو اساتذہ پورے ساتھی پورے کوئی کروڑ خود ہی بڑنس دے جاتے ہیں۔ اس وقت بڑنس سے مراد وہ کرنسی نوٹ لے رہا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ بھر وضاحت چاہی تو کوڑو چپک کر بولا "یار دیوبوب جانتا ہے۔ یہ تو تیار ہے یا نہیں؟"

پھر اس نے پلٹ کر دیوبوب سے پوچھا "تو تو اگلی دفتر جائیں گے؟"

دیوبوب نے داسوئی کر کہا "انگریز میں بادشاہ عالمی کے باہر وہاں ہی چلتے ہیں ایک ہی ہیں۔"

میں نے کہا تو اگلی دن دوبارہ مناسب ہے کیونکہ وہی دن راہِ مشہور جگہ ہے اور اخباروں میں جتنے بھی اشتہار نکلتے ہیں ان میں انگریز لاہور نکلتا

ہوتا ہے۔"

چنانچہ یہ سب پایا گیا اگلے دن دو بجے کی گاڑی سے ہم لاہور روانہ ہو جائیں!

گھر پہنچ کر میں سڑکی چوڑی کرنے لگا۔ بوٹے پائلز کر رہا تھا کہ جو کرنے آ کر شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا "بھولی ڈاکٹر صاحب

بات تے ہیں۔“

”کہاں ہیں؟“ میں نے برٹن ڈیمن پر نگاہ ڈال کر گھڑا ہوا گیا۔

”ہسپتال میں“ دو بدستور مسکرا رہا تھا کیونکہ میری پہچانی کے روز حاضر ہیں میں وہ بھی شامل تھا۔

میں ڈارے ڈارے برآمدے کی سیڑھیوں پر چڑھا۔ پھر آہستہ سے جالی والا دروازہ کھول کر لمبا پی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ان کے علاوہ دواؤں کی کچی پیٹنے تھے۔ میں نے سب سے پہلی دوا کی کھلاسم کیا اور اس کے جراب میں بڑی دیر کے بعد جیتے ہوئی جانور کی جانور دھاتی۔

”ان کو کچلا تے ہو؟“ ایسا ہی نے ہنسی سے پوچھا۔

”بے شک“ میں نے ایک مہذب سٹریٹ میں کی طرح کہا۔

”بے شک کے بچے“ مرا مرا دے میں تیری یہ سب۔“

”خدا اکٹر صاحب“ دواؤں نے ہاتھ مار پڑا کر کہا ”تو بہت سی اچھا بچہ ہے اس کو تو۔“

اور اکٹر صاحب نے بات کا ٹکڑی سے کہا ”آپ نہیں جانتے تھے کہ اس کیلئے میری عزت خاک میں ملا دی۔“

”آپ غور کریں“ دواؤں نے سر ہکا کر کہا۔ ”یہ ہمارے آفتاب سے کئی لاکھ سال پہلے اور ایک دن۔“

اب کے ڈاکٹر صاحب کو فضا گیا اور انہوں نے میرے ہاتھ مار کر کہا ”کیسی بات کرتے ہو ٹیٹی کی! یہ آفتاب کے جو تے کی برابری نہیں کر سکتا۔“

”کرے گا کرے گا۔“ ڈاکٹر صاحب ”دواؤں نے اثبات میں سر ہکا کر کہا ”آپ خاطر جمع رہیں۔“

پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے ”میں سیر کر چکا ہوں تم میرے ساتھ آؤ مانتے میں ہاتھیں کریں

کے۔“

لمبا اسی طرح کرسی پر بیٹھے لمبے کے عالم میں اپنا ہنر امت پختہ کرتے اور بڑا جتے رہے۔ میں نے آہستہ آہستہ ہل کر جالی والا

دروازہ کھولا تو دواؤں نے پیچھے ہٹ کر کہا ”ڈاکٹر صاحب بھول نہ جائے ابھی بھجوا دیجئے گا۔“

دواؤں مجھے ادھر ادھر گھماتے اور مختلف درختوں کے نام فارسی میں بتاتے مگر کے اسی پل پر لے گئے جہاں پہلے پہل میرا اس سے

تعارف ہوا تھا۔ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر انہوں نے بگڑی اتار کر گوشت میں ڈال لی۔ سر پر ہاتھ پکیر اور مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر

انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور کہا ”آج سے میں تمہیں چھ ماہ کا اور اگر جماعت میں ازالہ نہ لگا تو فرسٹ ڈیویژن ضرور دلا دوں گا۔

میرے ہر ارادے میں خداوند تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے اور اس قسمی نے مجھے اپنی رحمت سے کبھی نہیں نہیں کیا۔“

”مجھ سے چھ ماہ کا ہوگی“ میں نے گستاخی سے بات کاٹی۔

”تو اور کیا ہوگا کرو؟“ انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے کہا ”میں یہ نہیں کروں گا“ وہ یہ کہ اس کا ہوا دینی کارے کر یہاں ضرور آؤں گا“ پھر دیکھا۔“

اب کے دواؤں نے میری بات کاٹی اور بڑی محبت سے کہا ”خدا ایک چھوڑا ہے جس کا یہی دے لیکن ایک ان چاند کی کار میں نہ میں

بیموں کا ڈاکٹر صاحب۔“

میں نے جمل کر کہا "مجھے کسی کی پروا نہیں ڈاکٹر صاحب اپنے گھر داخلی میں اپنے یہاں خوش ہے۔"

انہوں نے حیران ہو کر پوچھا "بھری بھی پروا نہیں؟" میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ دہکی سے ہو گئے اور پار پار پھینے لگے۔ "بھری بھی پروا نہیں؟"

"اگر کو بھری بھی پروا نہیں؟"

مجھے ان کے لہجے پر قہر آئے تھا اور میں نے آہستہ سے کہا۔ "آپ کی تو ہے گر۔" مگر انہوں نے بھری بات نہ سنی اور کہنے لگے اگر اپنے حضرت کے سامنے میرے منہ سے ایسی بات نکل جاتی؟ اگر میں یہ کھرکا کھرکہ جاتا تو۔ تو۔ انہوں نے فوراً پگڑی اٹھا کر سر پر رکھ لی اور ہاتھ جڑ کہنے لگے۔ "میں حضور کے دربار کا ایک ادنیٰ کتا۔ میں حضرت مولانا کی خاک پا سے پتھر بندہ ہو کر آقا سے یہ کہنا سنتے کا طوق نہ پہنتا؟ خاندان ابوخل کا خانوادہ دار آقا کی ایک نظر کرم۔ حضرت کا ایک اشارہ۔ حضور نے چلو کوشی چتہ رام بنا دیا۔ لوگ کہتے ہیں شفیقی جی میں کہتا ہوں رحمت اللہ علیہ کا کھنکس بردار۔ لوگ سمجھتے ہیں۔" داؤابی بھی ہاتھ جوڑتے "بھئی سر جھکاتے بھئی اٹھکیاں چوم کر آگھوں کو لگاتے اور سچ سچ میں قادی کے اشعار چنتے جاتے۔ میں کچھ پریشان سا چہیناں سا ان کا زانو چھوڑ کر آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا "داؤابی اماوا جی؟" اور داؤابی "میرے آقا میرے مولانا میرے مرشد" کا وہ ٹیلہ کھکے جاتے۔ جب جذب کا یہ عالم دور ہو تو لگا ہی اوپر اٹھا کر بولے "کیا اچھا موسم ہے دن بھر دھوپ پڑتی ہے تو شکر ادا ماشوں کا زوالہ ہوتا ہے" پھر وہ ٹیلی کی دوجہر سے اٹھے اور بولے "پھر آپ بلیں بازار سے تھوڑا سودا خریدنا ہے۔" میں جیسا سر کھل دیا حراج میں کران کے ساتھ آ جا تھا اس سے کہیں زیادہ مغلغل اور قہقہوں کے ساتھ بولے۔ کھسے بھاری بھنی دایوب جب کے باپ کی دکان سے انہوں نے گھر پر ضرورت کی چند چیزیں خریدیں اور لائے گود میں اٹھا کر بکھل دئے میں پار باران سے لگاتے پلنے کی کوشش کرتا۔ مگر صبر نہ پڑتی۔ ایک لیب ہی شرم ایک انوکھی سی لنگھا بہت مانع تھی اور ای تالی اور جھبک میں داؤبا ابھرتا میں ان کے گھر پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر یہ عجیب کھلا کتاب میں انجی کے ہاں سوچا کروں گا۔ اور وہیں چڑھا کروں گا۔ کیونکہ میرا ستر مجھ سے بھی پہلے وہاں پہنچا ہوا تھا۔ اور اس کے پاس ہی بازار سے یہاں سے بھیجی ہوئی ایک بری کین لائٹیں بھی رکھی تھیں۔

بزنس میں جتنا اور ہاں ہاں کرتی چکا دارا اڑائے پھرنا میرے مقدور میں نہ تھا۔ گو میرے ساتھیوں کی روا نگلی کے تیسرے ہی روز بھوان کے والدین بھی انہیں لاہور سے بکرا لائے۔ لیکن اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو شاید اس وقت ان کی جگہ میں ہمارا دفتر پہنچنے والی کے کون سے شاندار رسالے میں داخل ہو چکا ہوتا۔

داؤابی نے بھری زندگی اخیر کر دی مجھے جا کر دیا مجھ پر جیسا حرام کر دیا سارا دن سکول کی کلاس میں گزارنا اور رات گھر میں کی نظریات ان کے سولہات کا جواب دیتے میں کوٹھے پر ان کی کھاٹ میرے ستر کے ساتھ لگی ہے اور وہ صوبک رسول اور رسالہ کی تصویروں کی بابت پوچھ رہے ہیں میں نے ہانگ ٹیک تھا دیا ہے وہ بھاری سوال کو دھار ہے ہیں میں نے پھر ٹیک دیا ہے اور انہوں نے پھر انجی خود اس کے آگے لاکڑا کیا ہے میں جمل جاتا ہر حرکت کر کہتا "مجھے نہیں پتہ میں نہیں جانتا" تو وہ خاموش ہو جاتے اور دم سا دھ لیتے میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا تو وہ شرارت کی ٹکڑیوں میں اتر جاتی۔

میں آہستہ سے کہتا "داؤابی۔"

”ہاں ایک سمجھیری آواز آئی۔

”راؤنی کھاد پر چلو۔“

راؤنی نے کہا ”بہت بے آبروہ کرتے ہو گے سے ہم نکلے۔ اس کی ترکیب ٹھہری کرؤ۔“

میں نے سادہ سادگی کے ساتھ کہا ”جی یہ تو بہت لمبا سفر ہے صبح کھڑے ہو کر تاروں کا کوئی اور پر چھنے۔“

انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا ”میرا گلو بہت اچھا ہے۔“

میں نے دراصل سوچ کر کہا شروع کیا تو بہت اچھا صفت ہے صرف دہان کرنا سہل

اور آواز کی اٹھ کر چار پائی پر بیٹھ گئے اچھا اٹھ کر لے جان چہرے پہلے بھی کہا ہے سہل پہلے پایا ہے۔

میں نے ترکیب ٹھہری سے جان چھڑانے کے لیے پوچھا ”آپ مجھے جان چاہیں گے ہیں جان راؤ کیوں نہیں کہتے؟“

”شباب“ وہ خوش ہو کر کہنے لگی ”ایسی باتیں پوچھنے کی ہوتی ہیں۔ جان لفظ فارسی کا ہے اور راؤ بھاشا کا ان کے درمیان فارسی اضافت

نہیں لگ سکتی۔ جو لوگ دن دن کہتے یا پوچھتے ہیں سخت لفظی کرتے ہیں راؤ بروز کو جان پر دن اسی طرح سے۔“

اور جب میں سوچا کہ یہ تو ترکیب ٹھہری سے بھی زیادہ خطرناک معاملے میں الجھ گیا ہوں تو بھائی کے کرچار سے کہتا ”راؤنی اب تو نیند

آ رہی ہے۔“

”اور ترکیب ٹھہری؟“ وہ جھٹ سے پوچھتے۔

اس کے بعد چاہے میں لاکھ بھانے کرنا اور اصرار کرنا چاہتا تھا کہ وہ اپنی کلمات پر ایسے بیٹھے رہتے بلکہ راؤنی دیر ہو جاتی تو

کسی پر دھکی ہوئی پکڑی اٹھا کر سر پر دھر لیتے۔ چنانچہ کھنگھلی ہوتا۔ ان کے ہر سوال کا خاطر خواہ جواب دینا پڑتا۔

ای چند کاٹ چا گیا تو اس کی بیٹھک مجھے لگی اور راؤنی کے دل میں اس کی محبت پر بھی میں نے قبضہ کر لیا۔ اب مجھے راؤنی بہت

اچھے لگنے لگے تھے۔ لیکن ان کی باتیں جو اس وقت مجھے بری لگتی تھیں۔ وہ اب بھی بری لگتی ہیں بلکہ اب پیسے سے بھی کسی قدر زیادہ شایاں لے

کہ میں فلسفیات کا ایک ہونہار طالب علم ہوں اور راؤنی پرانے لٹرائی کتب کے پروردہ تھے۔ سب سے بری بات یہ ان کی اٹھتے بیٹھتے سوال پوچھتے

رہنے کی عادی اور دوسری کھیل کود سے منع کرنے کی۔ وہ تو جس پر چاہتے تھے کہ آدھی پڑھتا رہے اور جب اس حقوق کی سوت کا دن

قریب آئے تو کتابوں کے ڈبیر پر جان دے دے۔ صحت جسمانی ختم کر کے لے لے ان کے پاس بس ایک ہی سوز تھا ”بھئی میرا اور وہ بھی صبح

کی۔ جگر چا سورج نکلنے سے دو گھنٹے پہلے خیر ہو گئے بیٹھک میں دکان آتے اور میرا کندھا ہاتھ کر کے ”اٹھ چائے ہو گئی یا سورج نکل آیا کرو۔“ ”میرا

ہو گیا“ کہہ کر میری تکیاں کیا کرتے ”میں مٹھنا یا تو چپکار کر کہتے“ ”بھوا ہو جانے گا چنانچہ گھوڑے پر چلے گا اور وہ کیسے کرے گا“ اور میں گرم گرم

بستر سے ہاتھ ہڑ کر کے ”راؤنی خدا کے لیے مجھے صبح نہ بگاڑنا چاہیے مجھے کچل کر دیا جان سے مارا الو۔“

یہ فہر وہن کی سب سے بڑی کڑواہی تھی وہ تو راسخ سے سر پر کلاف ڈال دیتے اور باہر نکل جاتے۔

بے گناہ راؤنی سے اللہ کا نکلے گا تو راؤنی ان سے بہت ڈرتے تھے وہ سارا دن مجھے والوں کے کپڑے سے چاکر تھیں اور راؤ

نی کو کو سننے دیتے تھیں۔ ان کی اس زبان اور روی پر مجھے بے اعتنا تھا مگر وہ پاس رہ کر مگر مجھ سے جوش ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھار جب وہ ناگفتگو

کامیوں پر ہوتا تھا تو راؤنی میری بیٹھک میں آ جاتے اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہتی پوچھ جاتے۔ ”تو زنی دیر بعد کہتے“ ”بہت کرنا برا گناہ ہے۔“

لیکن میرا اضافی معاف کرے تیری ہے یہ نظریہ ان ہے اور اس کی سرانے میں "میری قراہیں اور قورڈ اور قورڈ اتو بھی" ہم نہیں بد سے عاجز مسافر ہیں۔ "اور واقعی ہے یہ نظریہ ان کی تھی۔ اس کا رنگ علت کالا تھا اور دانت ہے حد وسطہ تھا عرابہ دار اور آٹھیں چنیاں ہی۔ چلتی تو ایسی گرہ پائی کے ساتھ جیسے (خدا مجھے بھی معاف کرے) نکلی کتو نہیں لٹے بھرتی ہے۔ چار بی بی کی کو ایسی ایسی بری یا تھیں کتلی کہ وہ دونوں دن دو رو کر چکوں ہوا کرتی۔ ایک ای چھ کے ساتھ اس کی اپنی تھی شاید اس پر ہے کہ دونوں ہم شکل تھے یا شاید اس پر ہے کہ اس کو بی بی کی طرح اپنے داڑھی سے چار نہ تھا۔ اس تو بی بی ہے چار ہی بہت اچھی تھی مگر اس سے میری بھی نہ تھی۔ میں کوٹھے پر بیٹھا سوال نکال رہا ہوں داڑھی بچے جیسے ہیں اور بی بی کو پر برساتی سے ایڈ من لینے آئی تو دراز کہ کر مجھے دیکھا پھر منڈر سے جھانک کر بی بی داڑھی اپنی ٹانگیں رہا نکھوں کی طرح چار پانچاں ہار ہے۔"

میں تفصیل بچے کی طرح نہ چڑا کر کہتا "تجھے کیا نہیں چڑھا تو کیوں بڑھ کرتی ہے آئی بڑی قراہی ارانی۔"

اور داڑھی بچے سے ہانک لگا کر کہتے "نکلو ملو۔ بہنوں سے نہیں بھگڑا کرتے۔"

اور میں زور سے چلاتا "چند پاہوں کی جھوٹ بولتی ہے۔"

داڑھی آج بہت سڑھیاں چڑھ کر ہو چکا ہے اور کاجوں کے نیچے پھر پھر چار پانچاں دیکھ کر کہتے "قراہیا تو اس کو چڑا لیا کہ یہ جتنی بڑی مشکل سے قابو کیا ہے۔ اگر ایک بار پھر کوئی تو مشکل سے سننے کا۔"

بی بی کہتی "کالی اٹھا کر دیکھو داڑھی اس کے بچے ہے وہ چار پائی میں سے نکلیں رہا تھا۔"

میں آخر آدھار کھوں سے بی بی کو دیکھتا اور دیکھتا ہوں اٹھا کر بچے اتار جاتی۔ پھر داڑھی بھانے کی بی بی یہ سب بکوترے سے فائدے کے لیے کہتی ہے اور اسے کیا پڑی ہے کہ مجھے تائی بھرے۔ لٹل ہوا پاس اس کی جگہ سے انگریز میری بھائی چا تھی ہے "میری بھری چا تھی ہے۔"

اور داڑھی کی یہ بات ہرگز کچھ میں نہ آتی تھی۔ میری شکایتیں کرنے والی میری بھائی کو گھر چلا گیا تھی!

ان دنوں معمول یہ تھا کہ صبح اس بچے سے پہلے داڑھی کے پاس سے مل رہا تھا گھر جا کر بخند کرتا اور پھر سکول پہنچ جاتا۔ آدمی جھپٹی پر میرا کھانا سکول پہنچ دیا چا تھوڑا سا سکول بند ہونے پر گھر آ کر کھانے کی پانی لائیں تھیں سے بھرتا اور داڑھی کے یہاں آ جاتا۔ بھارت کا کھانا بھی مجھے داڑھی کے گھر ہی بھجوا دیا جاتا۔ جن ایام میں فصل بند ہوتی "داڑھی سکول کی گراؤ میں آ کر بندہ جاتے اور میرا انتظار کرنے لگتے۔ وہاں سے گھر تک سوالات کی بو چھاڑتی تھی سکول میں جو کہ چڑھایا گیا ہوتا اس کی تفصیل پر پہنچے "پھر مجھے گھر تک بھڑا کر خود میرا کوچے جاتے۔ ہمارے قصبہ میں مصطفیٰ کا کام سینے میں دس دن ہوتا تھا اور دس دن منصف صاحب بھادوی بکھری ضلع میں رہتی تھی۔ یہ دس دن داڑھی کا قاعدہ بکھری میں گزارتے تھے۔ ایک آدھ فرضی آ جاتی تو وہ چار روپے کا لپٹے رہتا اور عموماً کھاتے میں وہاں بھی مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھتے۔ ہے کہ کام چھوڑا تھا اس کی کڑھت اور کھلے ایسے سے جو تو قراہے مانی نہ کی پھر کرتی تھی۔ چہ نہ کہ پہلے چند سالوں سے گھر کا بیشتر طریق اس کی سلائی سے چلتا تھا اس لیے وہ داڑھی پر اور بھی مدد کی تھی ایک دن خلاف معمول داڑھی کو لینے میں مسئلہ پیدا کیا۔ اس وقت بکھری بند ہو گئی تھی اور داڑھی ناگہانی کے مجھ سے ایک بیٹھ پر بیٹھ کر کہنے لگی "میں نے سونے سے جا کر کھن کاوت۔ اٹھا یہ اور ان کے گلے میں پانچوں ڈال کر کہا "پٹے" آج میں آپ کو لینے آیا ہوں" انہوں نے میری طرف دیکھے پھر پانے کے بد سے بد سے گھونٹ بھرے ایک آدھ جیب سے نکال کر ناگہانی کے حوالے کیا اور چپ چاپ میرے ساتھ چل پڑے۔"

میں نے شرم سے تاج کر کہا "مگر چلنے" ہے بے کو تہاں کا کسا پ چوری چوری یہاں چائے چیتے ہیں۔"

داؤدی جیسے شرمندگی ڈالنے کو سکرانے اور بولے "اس کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے اور گڑ کی چائے سے گلشن بھی دور ہو جاتی ہے۔ بھر یہ ایک آدھ شگاہاں بھر کے دیتا ہے تم اپنی ہے ہے سے کہنا "خواجہ اور بنگلہ گڑا کر دے گی بھراؤں نے خوفزدہ ہو کر کچھ بایں اور کہا "اس کی تو فطرت ہی ایسی ہے۔" اس دن گلے داؤدی پر دم آ۔ میرا جی ان کے لیے بہت دکھ کرنے کو چاہنے لگا مگر اس دن میں نے ہے ہے سے نہ کہیں کا ہی وعدہ کر کے ان کے لیے بہت بکھیرا۔ جب اس واقعہ ذکر میں نے اس سے کیا تو وہ بھی میرے ہاتھ اور بھی نوکر کی معرفت داؤدی کے ہاں دودھ پھل اور چٹنی وغیرہ بھیجے تھیں مگر اس دودھ سے داؤدی کو کبھی بھی بکھیرا نہ ہوا۔ اس لیے بے کی لگا ہوں میں میری قدر بڑھ گئی اور اس نے کسی حد تک مجھ سے راجائی رہتا اور شرم نہ ہوا۔

مجھے یاد ہے ایک صبح میں دودھ سے میرا چاٹوٹ ان کے یہاں لے کر آیا تھا اور ہے بے مگر نہ تھا۔ وہ اپنی کتھوں کے ساتھ بابا سادان کے جوہر میں اٹھان کرنے لگی تھی۔ اور مگر میں صرف داؤدی اور بی بی تھے۔ دودھ دیکھ کر داؤدی نے کہا "چلو آج تینوں چائے نہیں گے۔ میں دکان سے گڑ لے کر آ جاؤں" تم اپنی چو لیے پر کھو "بی بی نے جلدی جلدی چو لیا سگایا۔ میں قبلی میں پانی ڈال کر لایا اور بھریم وٹوں وچیں جو کے پر چو کر باتیں کرنے لگے۔ داؤدی گڑ لے کر آئے تو انہوں نے کہا "تم دونوں اپنے اپنے کام پر بیٹھو چائے میں بنا تا ہوں۔" چنانچہ بی بی مٹھیں چائے لگی اور میں ڈائریکٹ ان ڈائریکٹ کی مشقیں لگنے لگا۔ داؤدی چو لیا بھی جو کچے جاتے تھے اور مدت کے مطابق گلے بھی اوٹے اوٹے جاتے جاتے تھے گلے سے کہا "زمین سورج کے گرد گھومتی ہے" لکھیں نے نہ یافت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے یہ نہ گھوٹا کہ سورج کے گرد گھومتی ہے۔ پانی اہل رہا تھا۔ داؤدی خوش ہو رہے تھے۔ اسی خوشی میں مجھ بھوم کر وہ اپنا تارہ بٹایا اس کی تکار ہے تھے۔ او کو لایا اور گروا لکھیں کی بات مت بھولا لکھیں کی بات مت بھولا۔ انہوں نے چائے کی پتی کھاتے ہوئے پانی میں ڈال دی۔ برتن ابھی تک چو لیے پر ہی تھا اور داؤدی ایک بھر لے سے بچے کی طرح پانی کی کھپ گل گل کے ساتھ کو لکھیں "گو لکھیں کچے چارے تھے میں اس رہا تھا اور اپنا کام سکے بار بار تھا "بی بی سکر رہی تھی اور مٹھیں چائے جاتی تھی اور ہم تینوں اپنے جھونے سے کمر میں بڑے ہی طنز تھے۔ گو یا سارے گلے جگہ سارے قصبہ کی خوشیاں بڑے بڑے رنگیں پروں والی پرچوں کی طرح ہمارے کمر میں اتر آئی ہوں۔ اسے میں دردنا دکھلا رہے ہے اور مداحل ہوئی۔ داؤدی نے دردناہ کھینے کی آواز پر پیچھے ہٹ کر دیکھا اور ان کا رنگ فق ہو گیا۔ چٹنی ہوئی قبلی سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس کے اندر چائے کے جھونے جھونے ایک دوسرے کے پیچھے شور مچاتے بھرتے تھے اور سموند کھیل رہا نے والا بڑا سامنے پر بکرا کیے۔ ہے ہے نے آگے بڑھ کر چو لیے کی طرف دیکھا اور داؤدی نے چو کے سے اٹھتے ہوئے سڈرت بھرے ابھریں کہا۔ "چائے ہے؟"

ہے نے ایک اور طنز داؤدی کی کمر پر مارا اور کہا "بڑے سے برو حاتھے آج نہیں آتی۔ تھو پر ہار بھرتے تھے ہم سینے سے تیرے چائے پیچے کے دن ہیں۔ میں یہ دیکھ میں دیتی تو تھے کسی کا رخندہ ہا حیرے بھانوی میں کل کی مرنی آج مردوں حیرا من راضی ہو۔ حیری آئیں چوری ہوں۔ کسی صحن چو کی ہے جتا ہر کس لکھ کر دیکھنا سے میرے لیے باعدہ دیا۔ تجھے موت نہیں آتی۔ لوں ہوں تجھے کیوں آئے گی؟" اس فقرے کی گرواں کرتے ہوئے ہے بے سیرانی کی طرح چو کے پر چٹنی کیزے سے قبلی بکڑ کر چو لیے سے اٹھائی اور زمین پر وہ باری۔ گرم گرم چائے کے چھپا کے داؤدی کی چٹ لیں اور پاؤں پر گرے اور وہ "کھو حیرا بھلا ہو چائے" کھو حیرا بھلا ہو جائے" کہتے دواں سے ایک بچے کی طرح بھاگے اور چٹک میں ٹھس گئے۔ ان کے اس فرار بلکہ اعادہ فرار کو دیکھ کر میں اور بی بی نے جسے باعدہ دکھلا اور ہماری ٹٹنی کی آواز ایک تانیہ

کے لیے چادریں دیواروں سے لٹکتی۔ میں تو خیر بچ گیا لیکن بے ہوش ہو کر بی بی کو بالوں سے پکڑ لیا اور بچ کر بی بی بصری سوسٹ
بڈھے سے میرا کیا معاملہ ہے انہیں تو اپنی پران لیتی ہوں۔ تو نے اس کو جانے کی کبھی کیوں دی؟“

بی بی بچاری جیس جیس رونے لگی تو میں بھی اندر کا اندر جھٹک میں کھٹک آیا۔ داؤدی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے تھے اور اپنے پاؤں مہکا
رہے تھے۔ پتہ نہیں انہیں اس حالت میں دیکھ کر کچھ ہلکے ہلکے گدگدے ہوئی کہ میں الماری کے اندر سر کر کے ہنسنے لگا انہوں نے ہاتھ کے
اشارے سے مجھے پاس بلا دیا اور بے ”شکر کرنا کہ تم کو گرفتار پہنچنے نہ کہ مہینے۔“

تھوڑی دیر تک کمر لڑکھا ”میں اس کے انوں کا بھی کئی کاموں میں کے سر مطہر پر کے کی ایک گم ٹھہب بڑھا یا لالہ تھ پھینکا کرتی تھی۔“
میں نے خیرانی سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولے ”آٹا کے نامہ کا ایک اونٹنی ملنے کوئی گرم پانی کے چند چھیننے پڑنے پناہ شیون
کرے تو نصرت ہے اس کی زندگی پر۔ وہ اپنے محبوب کے عقلی باز جنم سے بچا۔ خدا نے ابراہیم مجھے جرات عطا کرے صوفی بے ہوش تھے
میری قسمت دے۔“

میں نے کہا ”داؤدی آٹا کے نامہ کوئی؟“

تو داؤدی کو یہ سن کر ادا تکلیف ہوئی۔ انہوں نے شفقت سے کہا ”جان ہمارے بی بی چھا کر۔ میرے استاد میرے حضرت کی دروں کو
مجھ سے جواز نہ کرنا میرے آقا بھی تھے میرے باپ بھی اور میرے استاد بھی وہ میرے دادا استاد ہیں۔ دادا استاد“ اور انہوں نے
دروں ہاتھ چپے پر رکھ لئے۔ آٹا کے نامہ کا راجہ عطا اور کوہ قسمت لکھڑی ترکیب میں نے کبھی پار داؤدی سے سنی۔ یہ واقعہ خانے میں انہوں
نے کبھی ہی اور لکھا کیونکہ ایک ایک فقرے کے بعد فارسی کے پیش رفتیہ اشعار پڑھتے تھے اور بار بار اپنے استاد کی دروں کو ٹاپ کھاتے تھے۔
جب وہ یہ واقعہ جان کر بچے تو میں نے بڑے ادب سے پوچھا ”داؤدی آپ کو اپنے استاد صاحب اس قدر اچھے کیوں سمجھتے تھے اور
آپ ان کا نام لے کر ہاتھ کیوں جڑتے ہیں اپنے آپ کو ان کا نور کیوں کہتے ہیں؟“

داؤدی نے مسکرا کر کہا ”جو طوطے کے ایک لڑکا ایسا نام لے کر لوگ کہیں یہ غلطی چنت نامی ہیں۔ وہ مسیحیانہ آقا تہ ہو کر پھر کیا ہو؟“
میں چار پائی کے کونے سے آہستہ آہستہ غسل کر بسو میں بیٹھ گیا اور چاروں طرف رضائی پینٹ کر داؤدی کی طرف دیکھنے لگا جو سر جھکا
کر بھی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی پڈ لیاں سلاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کے بعد ادا سا بیٹھتا اور ہلکا سا سوش ہو جاتا
کہنے لگے ”میں کیا تھا اور کیا ہوا حضرت صوفی کی پہلی آواز کیا تھا؟ میری طرف۔ سر مبارک اٹھا کر فرمایا پوچھ پلڑا دے۔ ہمارے پاس آٹا
میں اٹھی بیٹھا ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ چھوٹا چھوٹا اور دیکھو یہاں کے لڑکے علم دار نہ دھاتے ان کے سامنے بیٹھے سخی یاد کر رہے تھے۔ ایک
ادار لکھا تھا اور کسی کو آٹا اور اٹھانے کی ہمت نہ تھی میں حضور کے قریب گیا تو فرمایا ”میں ہم کو روز یہاں بکریاں چراتے دیکھتے ہیں۔
انہیں چرے چنے کے لیے چھوڑ کر ہمارے پاس آ جا یا کرو اور کچھ پڑھ لیا کرو۔“ ہر حضور نے میری عرض سے بطور پوچھا کہ کیا نام ہے تھا ”داؤدی“
میں نے تھوڑوں کی طرح کہا ”پھو“ مسکرائے تو ادا ساٹھے بھی فرمائے لگے پورا نام کیا ہے؟ ہر خود ہی بولے ”چنت نام ہو
کا“ میں نے سر ہلایا حضور کے شاگرد کتاب سے ٹھکری چر کر میری طرف دیکھ رہے تھے میرے گلے میں کھد کھد کھد کھد کھد۔ پانچواں
کی ہمارے صرف ٹکڑے بند ہاتھ پاؤں میں ادھڑی کے سونے جڑے اور ہر سرخ رنگ کا کپا کچھ لپیٹا ہوا تھا۔ بکریاں بصری
میں نے بات کاٹ کر پوچھا ”آپ بکریاں چراتے تھے؟“

”ہاں ہاں“ ڈاکٹر سے بولے ”میں گذریا تھا اور میرے باپ کی بارہ بکریاں تھیں۔“

خبر ملی سے میرا سنا کھلا رہ گیا اور میں نے مسائل کی قہرنگ کھینچنے کے لیے جلدی سے پوچھا ”اور آپ سکول کے پاس بکریاں چرا کر لے گئے؟“ ڈاکٹر نے کڑی چار پائی کے قریب کھینچی۔ اور اپنے پاؤں پائے پر دکھا کر بولے ”جاں چدا اس زمانے میں تو خوروں میں بھی اسکول نہیں ہوتے تھے میں گاؤں کی بات کر رہا ہوں۔ آج سے چھ سو برس پہلے بھلا کوئی تمہارے ایم۔ بی۔ بی سکول کا نام بھی جانتا تھا؟ اور تو میرے آقا کو چڑھانے کا شوق تھا۔ اور گردے لوگ اپنے لڑکے چار حرف جانتے کون کے پاس بھیج دیتے۔ ان کا سارا غامدانہ دین و تعلیم سے آراستہ اور دینی اور دنیوی نعمتوں سے ڈالا ہوا تھا۔ والد ان کے شعل بھر کے ایک ہی حکیم اور چوٹی کے مبلغ تھے۔ جیڑا بھو بہار ہی تعلیم کے مہر مٹی۔ گھر میں علم کے دریا بہتے تھے قاری عربی، ہندی، پنجاب۔ اقلیدس، نکست اور علم ہیبت ان کے گھر کی لولہاں تھیں۔ حضور کے والد کو دیکھنا مجھے نصیب نہیں ہوا۔ لیکن آپ کی زبان ان کے تحریر ملی کی سب دھاتیں سنیں، شیلڈ اور حکیم مومن خاں مومن سے ان کے بڑے مرام تھے اور خود مولانا کی تعلیم دہلی میں مفتی آرزو مرحوم کی نگرانی میں ہوئی تھی۔“

مجھے ڈاکٹر کی یہ موضوع سے ہلکے ہانے کا اور تھا اس لیے میں نے جلدی سے پوچھا۔ ”بھرا آپ نے حضرت مولانا کے پاس چڑھنا شروع کر دیا؟“ ”ہاں“ ڈاکٹر اپنے آپ سے باتیں کرنے لگے ”ان کی باتیں ہی اسی تھیں۔ ان کی لگاؤں ہی اسی تھیں۔ جس کی طرف توجہ فرماتے تھے اندھے سے سوا کر دیتے تھے۔ مثلی کے دروے کو اکبر کی خاصیت دیتے تھے۔ میں خواجہ ابی راغی زین جی وال کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ فرمایا اپنے ہاتھوں کے پاس ہورہے پر چھو۔ میں نے کہا ہاں اٹھا رہی دھرتی پر بیٹھے کر دے مجھے اب کی طرف چڑھا ہے۔ بھر مسکرا دینے اپنے چہرے پر مصروفیت سے حروف ابجد کا ایک حوالہ دیا اور بولے الف۔ بے۔ پے۔ تے۔ سبحان اللہ کیا آواز تھی کس شفقت سے بولے تھے کس لہجہ سے فرما رہے تھے الف۔ بے۔ پے۔ تے“ اور ڈاکٹر ان حرفوں کا اور ذکر کرتے ہوئے اپنے باطن میں کھو گئے۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنا ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”اور رہت تھا۔ اور اس کے ساتھ چھیلوں کا خوش۔“ بھرا انہوں نے ہاتھ اٹھا ہوا میں لہرا کر کہا ”اور اس طرف حجاز میں کے کھمبے دلوں کے درمیان حضور کا ہاتھ اور سامنے ان کی حکیم اللہ ان حویلی۔ اسی باغیچے میں ان کا کتب تھا۔ درختیں کھلا تھا۔ جس کا پی چاہے آئے نہ ہو اب کی قید تک کی پابندی۔“

میں نے کافی دیر سوچنے کے بعد بااوب اپنا منہ قسم کا فقرہ تیار کر کے پوچھا۔ ”حضرت مولانا کا اسم گرامی شریف کیا تھا؟“ تو پہلے انہوں نے میرا فقرہ ٹھیک کیا اور پھر بولے۔ ”حضرت اسماعیل ؑ فرماتے تھے کہ ان کے والد عیسیٰ انیس جاں جاتاں کہہ کر پکارتے تھے کبھی جاں جاں کی رعایت سے منظر جاں جاں بھی کہہ دیتے تھے۔“

میں اسکا دلچسپ کہانی سننے کا بھی اور خواہش تھا کہ ڈاکٹر ایک دیکھ لے اور بولے ”سوسٹی ایمری سسٹم کیا تھا؟ ان مگر جوں کا برابرو ریاست انڈیا کتنی کی صورت میں آئیں یا ملکہ نگار یہ کا فرماں لے کر سارے معاملے میں مصلحت وال دیتے ہیں۔ سوا کے پھاڑے کی طرح میں نے سوسٹی ایمری سسٹم کا احاطہ اپنے ان کی ملامت میں قفل کر دیا۔ بھرا انہوں نے میرے گھر کی کتاب اٹھائی اور بولے ”باہر جا کر دیکھ کے آ کہ میری بے سہ کا مسرہ ہوا یا نہیں“ میں روایت میں پانی ڈالنے کے یہاںے ہاں گیا تو بے سہ کشیں چلائے اور بی بی کوچ کا صاف کرتے پایا۔“

ڈاکٹر کی زندگی میں بے سہ پلا پلا رہی نکرو تھا۔ جب وہ دیکھتے گھر میں مصلح صاف ہے اور بے سہ کے چرے پر کوئی حلق نہیں ہے تو وہ پکار کر کہتے ”سب ایک ایک شعر سنا“ پہلے مجھ سے تھا خدا اور میں چھوٹے ہی کہتا۔

لازم تھا کہ دیکھو میرا دست کوئی دن اور
 تھا گلے کھلے اب رہو تھا کوئی دن اور
 اس پر وہ تانی بجاتے اور کہتے "اولین شعر سنوں گا اور دو کام سنوں گا اور مسلسل نظم کا ہرگز سنوں گا۔"
 لیلی بھی میری طرح کل اس شعر سے شروع کرتی۔

شعیدم کہ شاپہ دم در کشید
 چہ ضررہ جہاں قلم در کشید

اس پر اگلی ایک مرتبہ پھر آواز مارا کرتے۔
 لیلی بھی رکھ کر کہتی۔

شورے شد و از خواب ہم چشم کشورم
 دیم کہ ہائی ست شب قد غورم

داغی شاہل تو ضرور کہہ دیتے ہیں ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے "وٹا ہے شعر تو کی مرتبہ بنا چکی ہے۔"

پھر وہ بے بے کی طرف دیکھ کر کہتے "بھئی آج تمہاری بے بے بھی ایک شعر بنا نے گی" مگر بے بے ایک روک سا حجاب دیتی۔
 "مجھے نہیں آتے شیر بہت"

اس پر داغی کہتے "گھوڑیاں ہی حادے سے اپنے جٹوں کے چاہ کی گھوڑیاں ہی گاؤں" اس پر بے بے کے ہونٹ مسکراتے آکر تے
 لیکن وہ مسکراتے تھی اور داغی میں عورتوں کی طرح گھوڑیاں گانے لگتے۔ ان کے درمیان بھی ای چنڈ اور بھی میرا نام ناک دیتے۔ پھر کہتے
 "میں اپنے اس گولو سولو کی شادی ہر سرنہ بگڑی ہاڑوں گا۔ ہرات میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ بھلوں گا اور کٹانے سے میں شہادت کے
 دھچکا کروں گا۔ میں دستور کے مطابق شہرہ کر لگائیں بچی کر لیتا تو وہ کہتے "پتہ نہیں اس ملک کے کسی شہر میں میری بھوٹی سی بہو پانچویں ماہ بچی
 جماعت میں چہ دردی ہوگی ہندو میں ایک دن لاکھوں کی جانوری ہوتی ہے۔ اس نے تو بہت سی چیزیں پکائی تھیں لی ہوں گی۔ پتہ میں بھی
 ہو شیار ہوگی۔ اس پر جو کو تو یہ یاد نہیں رہتا کہ ہاڈیاں گھوڑیاں ہوتی ہے یا مرغی۔ وہ تو غریب کو کھاتی ہوگی۔ میں تو اس کو قوری چہ حادوں کا
 پہلے اس کو خطائی کی تعلیم دوں گا پھر غلط فہم کھاؤں گا۔ مستورات کو غلط فہم آتا۔ میں اپنی بہو کو کھ دوں گا۔ سن گونا پھر میں تیرے ہی
 پاس رہوں گا۔ میں اور میری بہو قاری میں باقی کریں گے۔ وہ بات بات پر ہلکا ہلکا بھرا تیرے کہے کی اور تو احمقوں کی طرح منہ دیکھا کرے گا
 پھر وہ بیٹے پر ہاتھ رکھ کر کہتے "ٹیلے ٹوب ٹیلے ٹوب کہتے۔ جان پر رچا" اس قدر دھت کی لگتی خوب یاد دام اور پھر نہیں کیا کیا کچھ
 کہتے۔ پھر اسے داغی اپنی پانی بھوٹی سی دیا پھر اس میں قاری کے فرمان چہ دی کے جاتے ایک دن جب جھت پر صوب میں بیٹھے
 ہوئے وہ انکی سی دیا پھر بچے تھے تو ہولے سے مجھے کہنے لگے۔ "میں طرح خدا نے تجھے ایک نیک سیرت ہی اور مجھے سعادت مند بہو عطا کی

ہو اپنے کسی وہ اپنے لعل سے میرے ہی چہرہ کو لگی ہوئے۔

”اس کے خیالات کچھ لکھے جاتے نہیں، لیکن یہ سوانح یہ مسلم ایک بے نیلے پار تھاں لکھے پسند نہیں اور اسی چہرہ لکھی چلا نکلا کھلا سیکھ رہا ہے میری قیود کب اسے گا ہاں خدا سے بزرگ و تر اس کو ایک ایک سوکن ہی جیوں دلاوے تو وہ اسے دلا دلاست پر لے آئے گی۔“

اس سوکن کے لفظ کچھ بہت تکلیف ہوئی اور میں چپ سا ہو گیا۔ چپ لعل اس لیے ہوا تھا کہ اگر میں نے منہ کھولا تو بیچنے لگی بات لکھی گئی جس سے داؤڑی کو بڑا دکھ ہوگا۔ میری اور اسی چہرہ کی تصویر ہمیں ہی تھیں۔ لیکن بارہ جنوری کو بی بی کی برسات کچ کچ آگئی۔ بیچائی مام پر تاب کے بارے میں داؤڑی لکھے بہت کچھ بتا چکے تھے کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور اس شادی کے بارے میں انہوں نے جو انتظام کیا تھا اس پر وہ چوراہا کرتا ہے۔ سب سے زیادہ خوشی داؤڑی کو اس بات کی تھی کہ ان کے سوکن قادی کے استاد تھے اور کچھ جتنی مذہب سے لعل رکھتے تھے۔

بارہ تاریخ کی شام کو بی بی وصال ہوئے لی تو کچھ گھر میں کمر اسٹج کیا ہے بے زور قطار دوسری ہے اسی چہرہ لکھ لکھ رہا ہے اور لکھے کی عمر میں چھس چھس کر رہی ہیں۔ میں دیوار کے ساتھ کچھ کھڑا ہوں اور داؤڑی میرے کندھے پر ہاتھ رکھنے کھڑے ہیں اور بار بار کہہ رہے ہیں ”آج زمین کچھ میرے پاس نہیں چکڑتی۔ میں تو ان کو قائم نہیں رکھ سکتا۔“ بیچائی کے باپ ہوئے۔ ”بھئی بی بی اب ہمیں اجازت دیجئے“ تو بی بی بچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ اسے چار پائی پر ڈالا اور میں ہوا کرنے لگیں اور داؤڑی میرا سہارا لے کر اس کی چار پائی کی طرف چلے۔ انہوں نے بی بی کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا ”یہ کیا ہوا بیٹا! اٹھو یہ تو تمہاری بی بی اور خود لکھ لکھ گئی کی کوئی گھڑی ہے اسے میں انھوں نے بھاڑا۔“ بی بی اس طرح دھڑا لیں مارتے ہوئے داؤڑی سے پلٹ گئی انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”فرقہ آفرین میں تیرا گھبراہٹوں کہ تجھے بڑا محتاط بنا۔ میرے سامنے شرمندہ ہوں کہ تجھے علم کا جھنڈ سے بنا۔ تو کچھ صاف کر دے گی اور شاید بڑھو دارام پر تاب بھی۔ لیکن میں اپنے کو صاف نہ کر سکوں گا۔ میں خطا کار ہوں اور میرا نقل میرے سامنے ملے ہے۔“ یہی کہ بی بی اور بھی زور زور سے رونے لگی اور داؤڑی کی آنکھوں سے کچھ سارے سونے سونے آنسوؤں کے قطرے ٹوٹ کر زمین پر گرے۔ ان کے سوکن نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”بھئی بی بی آپ فکر نہ کریں میں بی بی کو کمر بچاؤں گا۔“ داؤڑی ہنسنے لگی اور ہاتھ جوڑ کر کہے۔ ”کچھ بات یہ بڑھ چکی ہے۔ گھٹیاں بھٹیاں بھی فم کر چکا ہوں۔ لیکن میری حسرت پوری نہیں ہوئی۔“ اس پر وہ افس کر ہوئے۔ ”ساری گھٹیاں تو میں نے بھی نہیں دیکھی جہاں عربی آتی تھی آگے گزرا ہوا تھا۔“ داؤڑی اسی طرح ہاتھ جوڑے تھی وہ خاموش کھڑے رہے بی بی نے گود لگی سرخ رنگ کی ریشمی چادر سے ہاتھ نکال کر پہلے اپنی چہرہ اور پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور سکھوں کے ہاتھوں میں ڈھونڈی کی طرف چل دی۔ داؤڑی میرا سہارا لے کر چلے تو انہوں نے مجھے اپنے ساتھ زور سے کھینچ کر کہا۔

”چلو یہ بھی درد ہے۔ دیکھو یہ ہمارا سہارا بھڑکتا ہے۔ لاگو کرو اور دم دیدہ تجھے کیا ہو گیا ہاں پتہ کیوں۔“

اس پر ان کا گھبراہٹ ہو گیا اور میرے آنسوؤں کی تیز ہو گئے۔ برسات والے ناگوں اور اکوں پر سوار تھے۔ بی بی دھڑ میں چارہ تھی اور اسے کچھ اسی چہرہ اور میں اور انہوں سے درمیان داؤڑی پیدل چل رہے تھے۔ اگر بی بی کی بیچ ڈرا زور سے نکل جاتی تو داؤڑی آگے بڑھ کر دھڑ کا پردہ اٹھاتے اور کہتے۔ ”لا حول و مقدر چلا حول چلا۔“

اور خود انھوں پر دیکھے دیکھے ان کی چکری کا شعلہ بجک گیا تھا!

راؤ ہمارے لکھے کا بڑا ہی تکلیف سا انسان تھا۔ بڑی اور کینہ پروری اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر گھری تھی۔ وہ بارہ جس کا میں نے ذکر کیا ہے اسی کا تھا۔ اس میں میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کتنی تھیں جن کا وہ صبح و شام ہاتھ لگی کے نعلی میدان میں بیٹھ کر کچھ کرتا تھا۔ مگر چار سارے

مکمل دے اسی سے دودھ پیتے تھے اور اس کی شراعتوں کی وجہ سے دیتے بھی تھے۔ ہمارے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے وہ ہمیں شوق دلا دیتی
 زمین پر بھاگ کر دلائی کو "چڑتا ہے رام بی کی" کہہ کر سلام کیا کرتا۔ دلائی نے اسے کی مرہب کھدایا مگر وہ چڑخت نہیں چیں معمولی آدمی ہیں
 کیونکہ چڑخت ان کے نزدیک بڑے بڑے سے لکھے اور فاضل آدمی کو کہا جاسکتا تھا۔ لیکن دلائی نہیں مانتا تھا وہ اپنی سوچو گدو چپا کر کہتا۔ "اوسے بھی
 جس کے سر پر ہودی (چٹیا) ہودہ پڑتی چڑخت ہوتا ہے۔" پھروں پادوں سے اس کی آٹھائی تھی شام کو اس کے پاؤں سے میں جھانکی ہوتا اور گھڑی
 اور قش پلوں کا مشاعرہ لاپنی کے ہانے کے ایک دن بعد جب میں اس سے دودھ لینے گیا تو اس نے شہرت سے آنکھ میچ کر کہا۔ "سودنی تو
 پٹلی گئی باجہ اب تو اس گھر میں وہ کرکیا لے گا۔" میں چپ رہا تو اس نے جھاگ والے دودھ میں ڈب بکھرتے ہوئے کہا۔ "گھر میں گنگا جی تھی بیج
 بنا کر فوط لگا پاک نہیں۔" مجھے اس بات پر غصہ آ گیا اور میں نے تاملوت تھا کر اس کے سر پر دے مارا اس غریب شہید سے خون و غیرہ تو بہا۔
 نہ ہوا لیکن وہ پکڑا کر نکلتے پر گرجا اور میں بھاگ گیا۔ دلائی کو سارا واقعہ خاکر میں دوا اور اپنے گھر گیا اور لپاتی سے ساری حکایت بیان کی۔
 ان کی بدولت دلائی کی تھان میں چلی ہوئی اور حوالہ اس صاحب نے چلی کی گوشتی کے بعد اسے تخت سمیٹ کر کے پھوڑ دیا۔ اس دن کے بعد سے راتوں
 دلائی پر آنے جاتے طرح طرح کے فخر سے کئے لگے۔ وہ سب سے زیادہ مذاقی ان کی بلوئی کا اڑایا کرتا تھا۔ اور مذاقی دلائی کے فاضل سر پر وہ
 چٹنی ہی ہودی ڈرا بھی اچھی نہ لگتی تھی۔ مگر وہ کہتے تھے "یہ میری مرحوم ماں کی فضیلت ہے اور مجھے اپنی زندگی کی طرح مزہ ہے۔ وہ اپنی آغوش میں
 میرا سر نہکا کر اسے دہی سے دھوئی تھی اور کڑا تھل لگا کر چکائی تھی کو میں نے حضرت مولانا کے سامنے بھی بھی گڈی اٹھانے کی جرات نہیں
 کی لیکن وہ ہانتے تھے اور جب میں دیوال لنگھ بیسور میں پہلی سکول سے ایک سال کی ملازمت کے بعد پانچویں میں گاؤں آیا تو حضور نے پوچھا
 "شیر جا کر چرانی تو نہیں کھوادی؟" تو میں نے ٹٹلی میں جواب دیا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا "تم ساسعادت مند چنا کہاؤں کو نصیب
 ہوتا ہے۔ اور ہم سوا خوش قسمت استاد بھی خال خال ہوگا۔" جسے تم ایسے شاگردوں کو چڑھانے کا فخر حاصل ہوا ہو" میں نے اگلے پاؤں چھو کر کہا
 "حضور آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں یہ سب آپ کے تھے سوں کی برکت ہے" میں نے فرماتے لگے "چند نام ہمارے پاؤں نہ پھوڑا کر دیکھنا
 ایسے کس سے کیا تاکہ۔" میں کا "میں احساس نہ ہو۔" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے میں نے کہا "اگر کوئی مجھے بتا دے کہ حضور چھا ڈر بھی آپ
 کے لیے دلائی کھال گاؤں۔ اپنی زندگی کی حرارت حضور کی ناگوں کے لیے خوراکوں لیکن میرا نہیں چلتا۔" خاموش ہو گئے اور لگا جیسے پوچھ
 اٹھا کر لو لے لگا کو بھی حضور چلا ایسے ہی تھی۔ تم سلامت رہو کہ تمہارے کندھوں پر میں نے کوئی دس سال بعد مارا گاؤں دیکھ لیا ہے۔"
 دلائی گزرو سے ایام کی تہہ میں ماترے ہوئے کدہ رہے تھے۔

"میں بیج سوئے سے حویلی کی ذبح زمی میں جا کر آواؤ دیا" خادم آ گیا "مشورات ایک طرف ہو جا تھی تو حضور مجھ سے آواؤ دے کر
 مجھے جاتے اور میں اپنی قسمت کو سہا ہوتا چھوڑے جوڑے سے ان کی طرف بڑھتا۔ پاؤں چھوٹا اور پھر حکم کا انتظار کرنے لگتا وہ دانا دیتے میرے
 والد جی کی خیریت پوچھتے گاؤں کا حال دریافت فرماتے اور پھر کہتے "لو بھی چند رام ان کتا ہوں کی گھڑی کو اٹھاؤ" میں سہنگ کی طرح
 انھیں اٹھاؤ اور کمر لاد کر حویلی سے باہر آ جاتا۔ کبھی فرماتے "میں پانچ کا پکڑا دیکھی حکم ہوتا سید سے روٹ کے پاس لے چلاؤ اور کبھی کھار بڑی
 نری سے کہتے چند رام تھک نہ جاؤ تو میں سمجھ لے چلو۔ میں نے کئی بار عرض کیا کہ حضور ہر روز صبح لے چلا کر میں گھر نہیں لانے جی
 فرماتے رہے کہ کبھی جی چاہتا ہے تو تم سے کہہ جاتا ہوں۔ میں دھوکہ کرنے والے چہترے پر تھا کہ ان کے ملنے ملنے جوتے اچھا اور انھیں بھولی
 میں دیکھ کر دیا رہے لگ کر بیٹھ جاتا۔ چہترے سے حضور ٹوٹ گسٹ کر صف کی جانب جاتے تھے۔ میں نے صرف ایک مرہب انھیں اس طرح

”من جیتا“ وہ بڑی محبت سے کہتے۔ ”ہر کوئی عقلی سوال ہے“ ”ہر فنی وہ سوال سمجھانے کے لیے ہاتھ نیچے کرتے ہیں مگر بالاس
 بھانے لگتا۔“ ”کوئی مگر میں حیران انا نہیں ہوں؟“ ”وہ بڑے ہاں سے چہچہتے۔“
 ”نہیں“ میں صحت چہاڑ کر کہتا۔

”تو اور کون ہے؟“ وہ دبا دبا سے ہر ہاتھ۔

”وہ اپنی سرکار“ میں انگلی آسمان کی طرف کر کے شرارت سے کہتا۔ ”وہ جی سرکار وہ سب کا پائے والا۔“ بال بکھرے سب کا والی
 کون؟“

وہ میرے پاس سے اٹھ کر جانے گئے تو میں بان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا ”داؤنی خفا ہو گئے کیا۔“

وہ سکرانے لگتے۔ ”بھڑا ڈھیر ہے! بھڑا بیٹا! میری پانی پینے جا رہا تھا۔“ مجھے پانی تو پی آئے رہے۔“

میں جھٹ موٹ برامان کر کہتا۔ ”لوہی جب مجھے سوال سمجھتا ہوا داؤنی کو پانی یاد آ گیا۔“

وہ آرام سے بیٹھ جاتے اور کاپی کھول کر کہتے۔ ”انفش اسکا تر جب تجھے چار انکس کا سرخ نظر آ رہا تھا تو تو نے تیرا لکھنا لکھ لیا۔“
 لکھا اور گرا لیا نہ بھی کرتا تو۔“

اور اس کے بعد پچھ نہیں داؤنی کتنے دن پانی نہ پیتے۔

فروری کے دوسرے ہفتہ کی بات ہے۔ امتحان میں اگلے راجہ محبت، دیکھا تھا اور مجھ پر آنے والے خطرناک وقت کا خوف بھوت ہی کر
 سارا ہو گیا تھا۔ میں نے خود اپنی بی عاتنی پہلے سے حیر کر دی تھی اور کافی سچید ہو گیا تھا۔ لیکن بی بیٹری کے سماں کی میری کچھ میں آتے تھے۔ داؤ
 بی نے بہت کوشش کی لیکن بات نہ بی۔ آخر ایک دن انہوں نے کہا کہ کھل جانے پر ہوا زبانی یاد کر لے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔
 چنانچہ میں انہیں، نے میں میں معروف ہو گیا۔ لیکن جو ہر ہوا زبانی یاد کرتا ”مچا کو بھول جاتی۔“ میں دل برداشتہ ہو کر صحت چھوڑی بیٹھا۔ ایک
 رات داؤنی مجھ سے بی بیٹری کی تفصیل بنا کر اور حقیقتیں سن کر اٹھے تو وہ بھی کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔ میں بار بار دیکھا تھا اور انہیں بہت
 کوفت ہوتی تھی۔ مجھے سامنے کی تاکید کر کے دہرا چنے کمرے میں چلے گئے تو میں کاپی حطس لے کر پھر بیٹھا کیا اور رات کے سب سے پہلے تک کچھ
 کرنا کا کار بار۔ مگر جب کتاب بند کر کے گھٹنے لگا کر چند فقروں کے بعد ایک جاتا۔ مجھے داؤ کا کام میں چھوڑ دیا کر کے اور اپنی حالت کا اندازہ کر کے
 رونا آ گیا اور میں ہاجر میں آ کر بیٹریوں پر بیٹھ کر کچھ کچھ روئے۔ ”کچھ گھنٹوں پر سرور کچھ دور ہاتھ اور سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اسی
 طرح نیچے بیٹھے کوئی دن چھوڑ کر دیکھا تو میں نے داؤنی کی عزت بچانے کے لیے یہی ترکیب سوچی کہ اس کو ڈھی کا اور داؤ کو بھول کر بچنے سے اگل
 ہاں اور پھر واپس آؤں۔ جب فیصلہ کر چکا اور عملی قدم اٹھے جہاں کے لیے سراو پر اٹھایا تو داؤنی کھل اڑے میرے پاس کھڑے
 تھے۔ انہوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے ساتھ لگا کر سستیوں کا لامتناہی سلسلہ میں جھیل گیا۔ داؤنی نے میرا سر چم کر کیا۔ ”لے لی
 حیدر سے میں تو ہوں نہ سمجھتا تھا۔ تو تو بہت ہی کم صحت لگا۔“ پھر انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کھل میں لپیٹ لیا اور جھٹک میں لے آئے۔ اسز
 میں خفا کہ انہوں نے میرے چاروں طرف رشتائی لٹیٹائی اور خود پادشاهوں پر کر کے کر پی بیٹھ گئے۔

انہوں نے کہا ”انگلیس بی بیٹری کی ہے۔ تو اس کے ہاتھوں میں ڈالاں ہے میں اس سے اور طرح ٹھک ہوا تھا۔ حضرت سولانا کے
 پاس جو دستہ بلور افندیس کی جس قدر کتابیں تھیں۔ انہیں میں ابھی طرح بچ کر اپنی کتابوں پر ہاتھ پکا تھا۔ کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے انھیں

ہوتی۔ میں نے یہ جان کر باخفی کا ہر ہو گیا ہوں۔ لیکن ایک رات میں اپنی کھاٹ پر چڑھ کر وہی اساتھیں کے ایک منظر پر غور کر رہا تھا کہ بات الجھ گئی میں نے دیا جہاں کرکٹ جاتی اور اس پر غور کرنے لگا۔ جڑوستان کی رو سے اس کا جواب ٹھیک آتا تھا لیکن ظم ہندو سے پائے ٹھوس کو نہ کھینچتا تھا۔ میں ساری رات کاغذ سیاہ کرتا رہا لیکن میری طرح سے رو دیا نہیں۔ علی الجھ میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اپنے دست مہرک سے کاغذ پر قلم کھینچ کر کچھ بنا شروع کیا۔ لیکن جہاں مجھے الجھیں ہوئی تھی وہیں حضرت مولانا کی طبعی رسا کو بھی کوٹ ہوئی۔ فرمانے لگے۔

”بہت رام باب ہم تم کو نہیں چن سکتے۔ جب استاد اور شاگرد کا ظم ایک سا ہو جائے تو شاگرد کو کسی اور ظم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔“ میں نے جرات کر کے کہا کہ پاؤ حضور اگر کوئی اور چلے کہتا تو میں اسے کفر کے مترادف سمجھتا۔ لیکن آپ کا ہر حرف اور ہر شوش میرے لیے حکم رہا ہوتا ہے کہ نہیں اس لیے خاموش ہوں۔ بعد آقا نے غزالی کے سامنے اپنی کمال الجھیں حضور مجھے بہت دکھا دیا ہے۔ فرمانے لگے ”تم بے حد جذباتی آدمی ہو۔ بات تو سن لی ہوتی“ میں نے سر ہچکا کر کہا ہر شاعر اور فرمایا ”ولی میں حکیم ناصر علی سینا کی ظم ہندو سے بڑے اجر میں اگر تم کو اس کا ایسا ہی شوق ہے تو ان کے پاس چلے جاؤ اور اس کتاب ظم کرو۔“ سمجھان کے نام دتھ لگے دیں گے۔ میں نے رضا مندی کا میری تو فرمایا ”اوپنی والدہ سے پوچھ لےو اگر وہ رضا مند ہوں تو ہمارے پاس آنا“ والدہ مرحومہ سے پوچھنا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق جواب پانا انہوں نے بات تھی۔ چنانچہ میں نے ان سے ٹکس پر چھا۔ حضور پر چھتے تو میں دردناک اپنی سے کام لیتا کہ گھر کی لہائی تپائی کر رہا ہوں جب فارغ ہوں گا تو والدہ سے عرض کروں گا۔“

چند ایام بڑے اضطراب کی حالت میں گزرے۔ میں دین رات اس قفل کو قفل کرنے کی کوشش کرتا تھا کچھ جواب برآمد نہ ہوتا۔ اس ناخوش مسئلہ سے طبیعت میں اور اشتکار پیدا ہوا۔ میں دلی جانا چاہتا تھا لیکن حضور سے اجازت مل سکتی تھی نہ دتھ نہ والدہ کی رضا مندی کے بغیر اجازت دینے والے نہ تھے۔ اور والدہ اس بڑا معاملہ میں کیسے آلودہ ہو سکتی تھیں۔ ایک رات جب سارا گانا گایا اور ہاتھوں میں تیری طرح پر بیٹھا تھا۔ تو میں نے اپنی والدہ کی چٹاری سے اس کی گل پر غلی و روپے چرائے اور نصف اس کے لیے چھوڑ کر گاؤں سے نکل گیا۔ خدا مجھے معاف کرے اور میرے دونوں بزرگوں کی رجوں کو گھو پر میرا پاؤں رکھے اور اٹھتی میں نے بڑا گناہ کیا اور ابد تک میرا سراں دونوں کرم فرماؤں گے سامنے خدمت سے جھکا رہے گا۔ گاؤں سے نکل کر میں حضور کی خولی کے پیچھے ان کے مسجد کے پاس کھڑا ہوا جہاں بیٹھ کر آپ پڑھاتے تھے۔ کھٹوں کے قفل ہو کر میں نے نوٹیں کو بوسہ دیا اور دلی میں کہا۔ ”بد قسمت ہوں“ بے اجازت جا رہا ہوں لیکن آپ کی دعاؤں کا میرا بھر پور راج رہوں گا۔ میرا حضور معاف نہ کیا تو آ کے قدموں میں جاؤں دے دوں گا۔ اتنا کہہ کر اور لاٹھی کندھے پر رکھ میں وہاں سے چل دیا۔ سن رہا ہے؟“

داؤنی نے میری طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔

رضا نی کے کچھ خار پشتے بیٹھ میں نے آٹھیں ہچکا نہیں اور ہوئے سے کہا۔

”جی ہاں“

داؤنی نے بھر کہا شروع کیا ”قدرت نے میری کمال مدد کی۔ ان دنوں ہا کھل جیو سر سر ہندو دلی ریل کی بڑی بن رہی تھی۔ یہی سید صاحب رستہ دلی کو جاتا تھا اور یہیں مزدوری ملتی تھی۔ ایک دن میں مزدوری کرتا اور دن چلا اس طرح تانے لٹیں کے ہمارے سولہ دن میں دلی پہنچ گیا۔ منزل مقصود پہنچا تو کھلی تھی۔ لیکن گورخصو کا سراغ نہ ملتا تھا۔ جس کسی سے پوچھا حکیم ناصر علی سینا کی کاروائی خانہ کی ہے۔ علی میں جواب ملا۔ وہ دن ان کی تلاش جاری رہی لیکن پتہ نہ پاسکا۔ قسمت بد تھی صحت اچھی تھی۔ اگر چند دن کے لیے کئی کھلیاں بن رہی تھیں۔

وہاں کام پر جانے لگا۔ شام کو فارغ ہو کر حکیم صاحب کاچہ معلوم کرنا اور اس کے وقت ایک دھرم شال میں بیٹھ کر گہری غیز سو جاتا۔ مثل
معلوم ہے جو چند دن بعد آؤا تو ایک دن اچھے حکیم صاحب کی جانے رہا، مثل معلوم ہو گئی وہ چکر پھوڑوں کے طرک کی ایک جھونپڑا پر ایک گلی میں رہتے
تھے۔ شام کے وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک چھوٹی سی کوفڑی میں فروکش تھے۔ اور چند دوستوں سے اونچے اونچے گفتگو ہو رہی
تھی۔ میں جوتے اتار کر ویلیر کے اندر کھڑا ہو گیا۔ ایک صاحب نے پوچھا۔ ”کون ہے؟“ میں نے سلام کر کے کہا۔ ”حکیم صاحب سے ملنا
ہے۔“ حکیم صاحب دوستوں کے حلقہ میں سر جھکانے بیٹھے تھے اور ان کی پشت میری طرف تھی۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے بولے ”مہم گری“ میں
نے ہاتھ جڑ کر کہا۔ ”ہاتھ سے آؤ اور۔“ میں بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ دروازے سے بولے ”اگرچہ چنت نام ہو؟“ میں کچھ جواب نہ
دے سکا فرمانے لگے۔ ”مجھے ناما میل کا خط ملا ہے“ لکھتا ہے شاید چنت نام تہار سے پاس آئے۔ میں بتائے بغیر گھر سے فرار ہو گیا ہے۔ اس کی
مدد کرتا۔ میں اسی طرح خاموشی کھڑا ہوا تو چانت دارا واز میں بولے ”میں اچھا آدمی تھا کیا چپ کا دروازہ کھلا ہے؟“ میں ذرا آگے بڑھا تو ابھی
میری طرف نہ دیکھا اور ویسے ہی میری نوکی طرح بیٹھے رہے مگر قدرے جھکنا انداز میں کہا۔ ”یہ خود ہمارے بیٹے ہا۔“ میں وچیں دیکھ کر ہاتھ پہنے
دوستوں سے فرمایا ”بھئی دارا وغیرہ مجھے اس سے دور ہاتھ کر لینے دو۔“ مگر حکیم ہوا تھا ہنسنا کا کونسا مسئلہ تہارنی کچھ میں نہیں آیا۔ میں نے دروازے
دار سے عرض کیا تو انہوں نے اسی طرح کندھوں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے اور آہستہ آہستہ کہہ دیں اور اچھے کھنکھایا کہ ان کی کمر بند ہو گئی۔ مگر
فرمایا۔ ”ہاں اپنی انگلی سے میری کمر پر ایک قشادی السا تھیں“۔ مجھ پر کھٹکا کا عالم جاری تھا۔ دروازے کے بڑھنے کی صحت تھی نہ پیچھے ہٹنے کی طاقت۔
ایک لمحہ کے بعد بولے ”میں جاکر دو۔“ چانتا ہوں۔ کا کٹر گھم کچھ نہیں سمجھتا۔ میں دروازے آگے بڑھا اور ان کی چوڑی پانچلی کمر پر کھینچی ہوئی
انگلی سے قشادی السا تھیں دھانے لگا۔ جب وہ خیر مرئی شکل بن چکی تو بولے اب اس نقطہ سے غلط نہ ہو کر گراؤ۔ ایک قوس ٹکھریا ہوا تھا
دوسرے وہاں کھنڈا تھا۔ یہ لمبی انگلی سے میں نے ایک مقام پر انگلی رکھ کر کمر گھمنا چاہا تو پھیرنے سے بولے ہے ہے کیا کرتے ہوئے نقطہ ہے
کیا؟ پھر خود ہی بولے آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے۔ اور بول رہے تھے اور میں مہووت دیکھتا تھا۔ میں لگہ بڑھا کر ابھی ان کے آخری بیٹے کے
ساتھ ٹوڑی کچھ قشادی السا تھیں بنی کہ ان کی کمر پر ابھر آئیں گی۔“ پھر دارا کی دلی کے دلوں میں ڈوب گئے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں وہ میری
طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے بے چارے کو کہہ دیا۔ ”پھر کیا ہو دارا کی؟“ انہوں نے کمر سے اٹھتے ہوئے
کہا۔ ”رات بہت گزر چکی ہے اب تو سو جا مگر تھیں گا۔“ میں خودی بچنے کی طرح ان کے پیچھے چڑ گیا تو انہوں نے کہا۔ ”پہلے وہ دھڑکنا بند
ہو جائیں نہیں ہو گا اور ان چھوٹی چھوٹی پر اپنا بیٹھوں کو پتا نہ لگے گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”سوا آکھوں کا آپ فکر نہ کریں“ انہوں نے کمر سے
کمر سے کھینک لیتے ہوئے کہا۔ ”میں جھڑیہ کہ میں ایک سال حکیم صاحب کی حضور میں رہا اور اس غلطی سے چند خطرے حاصل کر کے اپنی کمر
آنکھوں کو دھو دیا۔ اب میں یہ سیدھا ہے آؤا کی خدمت میں بیٹھا اور ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ فرمانے لگے ”چنت نام اگر ہم میں قوت ہو تو
ان پاس کو کھینک لیں۔“ اس پر میں رو دیا تو دست مبارک محبت سے میرے سر پر بھیر کر کہنے لگے۔ ”مہم تم سے داخل نہیں ہیں لیکن ایک سال کی
فرقت بہت طویل ہے۔ آکھہ نہیں جہاں ہو تو ہمیں بھی ساتھ لے جانا“ یہ کہتے ہوئے دارا کی آکھوں میں آنسو آئے اور وہ مجھے اسی طرح گم
سم چھوڑ کر خشک میں چلے گئے۔

افغان کی قربت سے میرا غم خشک ہو رہا تھا لیکن جسم بھول رہا تھا۔ دارا کی کمر سے میرے ساتھ ہی کی گھر رہنے لگی۔ اکڑ میرے حسن مستحق
ہاتھ پکڑ کر کہتے۔ ”اسپ ناؤ بنی ہو طویل غرت بنی۔“ مجھان کا یہ فقر بہت ناگوار گزرتا اور میں احتجاجاً ان سے کلام بند کر دیتا۔ میرے مسلسل سوال

مرث نے بھی ان پر کوئی دائر نہ کیا اور ان کی ٹھکانہ کی حد تک پہنچ گئی۔ ایک صبح میر کو جانے سے پہلے انہوں نے مجھے آجکایا اور میری متلون خوشامدوں کا کھیل اور جھڑکیوں کے ہار جودا ستر سے اٹھا کوٹ پہنا کر کھڑا کر دیا۔ مگر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر گویا تھپتھپتے ہوئے باہر لے گئے۔ سردیوں کی صبح کوئی چار بجے کا صل۔ گلی میں آدھم نہ آدھم روناٹا کی سے جھک بھی دکھائی نہ دیتا تھا اور داغی گلی کے اطراف میر کو لے جا رہے تھے۔ میں کھوکھ۔ دبا تھا درد کہہ رہے تھے ابھی کہ اس غرابی درد نہیں ہوئی ابھی ٹھنڈا بڑبڑا رہا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کہتے کوئی سر نال ٹھنڈے کی آجک پر پٹا پی کیا کہ رہا ہے اب ہم ملتی سے درد نکل گئے اور صبح کی بج ہوئے میری آنکھوں کو بڑبڑاتی کھول دیا تو داغی نے میرا بازو پھوڑ دیا۔ سردیوں کا درد نہ تو نکل گیا۔ غری آئی اور پچھلے گئی قبرستان کو گزرتا مگر داغی تھے کہ کچھ اتنی ہی چہنٹے پہلے جا رہے تھے۔ جب قہر پہ پہنچتے تو میری درد نہ ٹا ہوئی۔ یہاں سے لوگ دو پہر کے وقت بھی نہ گزرتے تھے کیونکہ یہاں نے زمانے میں یہاں ایک شہر فروق ہوا تھا۔ مرنے والوں کی دھبیں اسی لیے پر رہتی تھیں۔ اور آنے جانے والوں کا کچھ نہا جاتی تھیں۔ میں خوف سے کاپٹے کا تو داغی نے مرنے لگے کے گرد مٹھا جمی طرح لینے کہا۔

”سامنے ان دو لنگروں کے درمیان اپنی چوڑی رات سے اس چکر کا ڈاکٹر سولہی سانسیں کھینچ رہا تھا اور جب سہرے پاس آلاشیں بیاں بیٹھتا ہوں“ میں صدمہ سے جان چکانے کے لیے سیدھا حائل لنگروں کی طرف رواں ہو گیا۔ پہلے ایک در سے سے ڈھیلے پر چڑھ کر آدھم کیا اور ساتھ ہی حساب لگا کر چھ چکروں کا وقت گزر چکا ہو گا اس کے بعد آہستہ آہستہ اونٹ کی طرح لنگروں کے درمیان دوڑنے لگا اور جب اس یعنی چار چکر پر سے ہو گئے تو پھر اسی ڈھیلے پر چڑھ کر کبھی بھی سانسیں کھینچ نہ لگا۔ ایک تو درخت پر خوب دھریب قسم کے جانور بولنے لگے تھے دوسرے میری جگہی میں جا کر اور شرور ہو گیا تھا۔ یہی مناسب سمجھا کہ صدمہ پر جا کر ڈاکٹر کو کوسنے ہوئے الفاواں اور کھلے جا کر خوب خاطر کر دیں! قصہ سے بھر اور درخت سے لڑتا تھا۔ نیلے کے پاس پہنچا۔ ڈاکٹر صدمہ کی جھکریوں پر گھنٹوں کے مل کر سے ہوئے وہاں کوئی اس طرح سراپا نہ تھے اور اگلے اگلے اپنے محبوب شہر گارے تھے۔

ہفتا سم کنی مکہ فردا روز محشر
سے فوجی عاشقان شہر حندہ (پاکستان)

کبھی دونوں تھیلیاں زور سے زمین پر مارے اور سرلوہی اٹھا کر انگشت شہادت اٹھائیں یہاں جاتے تھے کوئی ان کے سامنے کھڑا ہوا اور اس سے کہہ رہے ہوں دیکھ لو سو فی گھنٹہ میں تمہیں بتا رہا ہوں خار ہا ہوں ایک دھکی دے جاتے تھے۔ ہر چارپ کر ٹھیکریاں پر کرتے اور جہاں کم کن جہاں کم کن کہتے ہوئے رونے سے کہتے۔ تموڑی درہ میں سناکت و جلاہو ہاں کھڑا ہوا اور ہمر زور سے چیخ مار کر جہانے قصبہ کی طرف بھاگے کہ ہر ٹھیکریوں کی طرف دوڑ گیا۔ راڈی ضرور اسم اعظم جانتے تھے اور وہاں قادیان کر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک جنم ان کے سامنے کھڑا دیکھا تھا۔ بالکل افسانہ یا قصہ و بالا جن تھا۔ جب راڈی کا نظم اس پر نہ مل سکا تو اس نے انہیں بچے کر لیا تھا۔ وہ بیچارہ ہے تھے جہاں کم کن جہاں کم کن گروہ و چھوڑا انہیں تھا۔ میں اس واسطے پر بیٹھ کر رونے لگا۔ تموڑی درہ اور قادیان آئے انہوں نے پہلے جیسا چہرہ دیا کر کہا۔ ”جلی خیرورے“ اور میں دوڑا دوڑا اس کے پیچھے ہوا۔ راستہ میں انہوں نے گلے میں لٹکی ہوئی کھلی بکری کے دونوں

کو نے ہاتھ میں پکڑ لئے اور محوم محوم کر گئے۔

تیرے لئے سعدالفرحان آیا جا!

اس جاؤ کر کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے ان آنکھوں سے واقعی ان آنکھوں سے دیکھا کہ ان کا سر جھیل ہو گیا "ان کی لمبی لمبی انگلیں
کھڑکیوں پر پھرنے لگیں اور ان کا سارا وجود جٹا دھاری ہو گیا۔ اس کے بعد چاہے کوئی میری بوٹی بوٹی اڑا دیتا "میں ان کے ساتھ سیر کو برگزشتہ
جاتا"

اس واقعہ کے چند ہی دن بعد کا قصہ ہے کہ ہمارے گھر میں علی کے بڑے بڑے اچھے اور اچھوتوں کے ٹکڑے آ کر گر گئے۔ بے بے
نے آسان سر پر اٹھایا۔ پس والی کتیا کی طرح داؤدی سے پست گئی۔ کچ کچ ان سے لپٹ گئی اور انہیں دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔ وہ چار ہی
تھی۔ "بڑے لونگی یہ سب تیرے ستر ہیں۔ یہ سب تیری قادری ہے۔ تیرا کالاطم ہے جو اٹا ہمارے سر پر آ گیا ہے۔ تیرے پریت میرے گھر
میں اٹھیں دیکھتے ہیں۔ سا بڑا اچھے ہیں۔ سوٹ چاہتے ہیں۔" جگرہ زور زور سے پھٹنے لگی "میں سرگئی میں علی گئی تو انہیں اس بڑے سے میرے
ای ہند کی جان لینے کا سہمہ نہ کیا ہے۔ ہم پر جاؤ کیا ہے میرا نگہ انگہ توڑا ہے۔" والی چند تو داؤدی کا پتی زخمی کی طرح مزید تھا اور اس کی
جان کے دشمن بھلاؤ۔ کیونکہ وہ دیکھتے تھے لیکن جنوں کی غفلت باری انہیں کی وجہ سے گل میں آئی تھی۔ جب میں نے علی بے بے کی تائید کی تو داد
میں نے زخمی میں بجلی بار مجھے جھڑک کر کہا۔ "تو احمق ہے اور میری بے ایمانیاں ہیں۔ میری ایک سال کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کرتا جنوں بھوتوں
میں اعتقاد کرنے لگا۔ افسوس تو ہے مجھے ایسے کر دیا اسے والے کرتو شعور کی بجائے عورتوں کے اعتقاد کا حکام نکلا۔ افسوس۔ صد افسوس" بے
بے کو اسی طرح جلاتے اور داؤدی کو یوں کر راتے چھوڑ کر میں نو پر کوٹھے پر دوپ میں جا بیٹھا۔ اسی دن شام کو جب میں اپنے گھر سے آ رہا تھا
تو راستے میں راتوں نے اپنے مخصوص انداز میں آگے کالی کر کے پوچھا "سنا ہوا تیرے کوئی اہلخانہ اصحاب تو نہیں لگا؟ سنا ہے تمہارے چڑتے کے گھر
میں روڑے کرتے ہیں۔"

میں نے اس کہینہ کے منہ پر بند کیا اور چپ چاپ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ رات کے وقت داؤدی مجھ سے تھیں پھرتی کی پر ایم راتیں
سننے ہوئے پوچھنے لگے۔ "جنا کیا تم کچ کچ جن" بھوت باہری چڑی کو کوئی تھوکتی سمجھتے ہو؟" میں نے انہماک میں جواب دیا تو وہ فحش جے اور
بوسے "داؤدی تو بہت بھولا ہے اور میں نے خواہو تو جھڑک دیا۔ بھلا تو نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ میں ہوتے ہیں اور اس طرح سے انہیں بھٹک
سکتے ہیں ہم نے جھوٹی اور دیکھتے مزدور کو بک کر برساتی جھوٹی ہے نہ وہ میرے کسی جن کو کر کر رہا لیتے۔ لیکن یہ تو بتا کہ میں صرف انہیں بھٹکے کا کام ہی
کرتے ہیں کہ چٹائی بھی کر لیتے ہیں۔" میں نے ہل کر کہا۔ "جتنے مذاق چاہو کرو مگر جس دن سر پہنے گا اس دن پتہ چلے گا داد۔" داؤدی نے کہا
"میرے جن کی جنگی ہوئی اہلخانہ سے تو تا قیامت سر نہیں ہٹ سکتا اس لیے کہ نہ وہ ہے نہ اس سے اہلخانہ اٹھائی جائے گی اور نہ میرے تیرے یا
میری بے بے کے سر میں لگے گی۔"

پھر روئے۔ "من اطمینان کا سوا اصول ہے کہ کوئی مادی شے کسی غیر مادی وجود سے حرکت میں نہیں آتی چاہے کتنی کھینچا۔"

"بھوکا نہیں لے چڑ کر کہا۔"

ہمارے قصبہ میں ہائی سکول ضرور تھا۔ لیکن جھڑک کے امتحان کا سطر نہ تھا۔ امتحان دینے کے لیے ہمیں ضلع جانا ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ صبح آگئی جب ہماری جماعت امتحان دینے کے لیے ضلع جاری تھی اور لاری کے ارد گرد وہاں یہ قسم کے لوگوں کا جھوم تھا۔ اور اس جھوم سے وہاں کی کیسے کیسے روکتے تھے۔ اور سب لڑکوں کے گھر والے انھیں خیر و برکت کی دعاؤں سے نواز رہے تھے۔ اور وہاں کی سارے سال کی چھ ساتھی کا خلاصہ تیار کر کے جلدی جلدی سوال پوچھ رہے تھے اور میرے ساتھ ساتھ خود ہی جواب دیتے جاتے تھے۔ اکبر کی اصلاحات سے اچھل کر موسم کے تغیر تبدیل پر پہنچ جاتے وہاں سے پہنچتے تو "اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا کہ اپنی وضع سے بعد معلوم ہوتا تھا۔ وہ نقشہ میں چر رہا ایک صاحب بدال اس کا ہاتھ باز کر لے آئی تھی اور جو میرا ہتھی تھا میری تھی" کہہ کر بچھتے چکے تھے؟

"جہانگیر" میں نے جواب دیا۔ اور وہ عورت۔ "نور جہاں" ہم دونوں ایک ساتھ بولے۔ "صفت عیب اور اسم کامل میں فرقی؟" میں نے دونوں کی تقریبات جان کیں۔ بولے ملائیں؟ میں نے ملائیں دیں۔ سب لڑکے لاری میں بیٹھ گئے۔ اور میں ان سے جان چھڑا کر جلدی سے داخل ہوا تو گھوم کر کھڑی کے پاس آ گئے اور پوچھنے لگے۔ بریک ان اور یک ان ٹوکٹوکروں میں ہستمال کرو۔ ان کا ہستمال بھی ہو گیا اور سونڈ جارت ہو چلی تو اس کے ساتھ قدم اٹھا کر بولے "مقبورے بادشاہ گھوڑی مایاں مرقی مایاں گھوڑی مایاں مرقی مایاں گھوڑی مایاں مرقی" "ایک سال بعد خدا خدا کر کے پتا واز دور ہوئی اور میں نے آزادی کا سانسی لیا؟

پہلے دن تاریخ کا پوچھ بہت اچھا ہوا۔ دوسرے دن ہفتہ الفیہ کا اس سے بھی بڑھ کر تیسرے دن اقوال تھا۔ اور اس کے بعد حساب کی باری تھی۔ اقوال کی بیچ کو داؤ کی کانوٹی میں ملے لے لے ملا جس میں المیرے کے فارمولوں اور حساب کے قاعدوں کے علاوہ اور کوئی بات نہ تھی۔ حساب کا پوچھ کر نے کے بعد برآمدے میں میں نے لڑکوں سے تجاویز ملانے تو سو میں سے اسی نمبر کا پوچھ لیک تھا۔ میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ زینت پر پاؤں درج تھا اور میرے منہ سے مسرت کے نعرے نکل رہے تھے۔ جو بھی میں نے برآمدے سے پاس باہر نکلا وہاں کی نگہیں کندھے پر ڈالے ایک لڑکے کا پوچھ کر دیکھ رہے تھے۔ میں پہنچ مار کر ان سے پہنچ گیا اور "اسی نمبر!! اسی نمبر!!" کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ انہوں نے پوچھ میرے ہاتھ سے جین کھینچ لی تھی۔ میں نے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بیڑی طرعاں بھلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں بی بی جی بولے" تو نے کڑیاں اور دودا لے تھی۔ دیکھے ہوں گے" میں نے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بیڑی طرعاں بھلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں بی بی جی گولی مارو کھڑکیوں کو" داؤ کی ڈوبی ہوئی آواز میں بولے "تو نے مجھے براہ کردیا مقبورے سال کے تین سو پختہ نمبروں میں پکار پکار کر کہتا رہا" صلوات کا سوال آگھیں کھول کر مل کر نامہ قرآن میری بات نہ مانی۔ میں نمبر خارج کئے۔ چورے میں نمبر۔

اور داؤ کی کاچرہ دیکھ کر میری اسی قصیدی کا سپاہی میں قصیدی کا کامی کے نیچے یوں رہ گیا کہ پاس کا کوئی اور دھڑکی نہ تھا۔ راستہ مجرہ اپنے آپ سے کہتے رہے "اگر تمہیں دیکھے دل کا ہوا تو ایک نمبر تو ضرور دے گا" میرا ہائی مل تو لیک ہے" اس پوچھ کے بعد داؤ کی امتحان کے آخری دن تک میرے ساتھ رہے وہ رات کے بارہ بجے تک مجھے اس سرائے میں بیٹھ کر چھاتے جہاں ہماری کلاس ختم تھی اور اس کے بعد جہاں ان کے اپنے ایک دوست کے پاس چلے جاتے۔ صبح آٹھ بجے پھر آ جاتے اور کچھ امتحان تک میرے ساتھ چلتے۔

امتحان ختم ہوتے ہی میں نے داؤ کی کو یوں پھوڑا کہ گویا میری ان سے جان بچھن نہ تھی۔ سارا دن دوستوں پاروں کے ساتھ گھومتا اور شام کو داؤ کیس کے چاکر تاس دوران میں اگر کبھی فرصت ملتی تو داؤ کی کو سلام کرنے لگی چلا جاتا۔ وہ اس بات پر مصر تھی کہ میں ہر دو آدمی کو ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گزارا کروں تاکہ وہ مجھے کالج کی چھ ساتھی کے لیے بھی تیار کریں۔ لیکن میں ان کے ہمسے میں آنے والا نہ تھا۔ مجھے کالج

میں سو پارٹس ہونا گوارا تھا اور بے لگنسی داؤدی سے چھٹا سٹور نہیں۔ پڑتے کو چھوڑ دینے ان سے باتیں کرنا بھی مشکل قرار میں لے کچھ ہی چھا۔ انہوں نے کہا اس کا داؤدی میں ترجمہ کر دیا میں نے کچھ جواب دیا مگر ایسا اس کی ترکیب خوبی کرو۔ حوالہ دلوں کی گائے اندر گھس آئی۔ میں داسے نکلی سے باہر نکال رہا ہوں اور داؤدی بھی چھوڑے ہیں Cow To ان سے واپس۔ اب ہر قسط کا اندھا پانچویں ہر امت چاہا جاتا ہے کہ گائے اسم ہے مگر داؤدی فرما رہے ہیں کہ اسم بھی ہے اور قسط بھی Cow To کا مطلب ہے دارنا۔ دھمکی دینا اور چالوں دلوں کی باتیں ہیں۔ جب میں احسان سے فارغ ہو کر قحبہ کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر ایک دو دن بھی آ یا جب ہم چند دوست نکار کھیلنے کے لیے نکلے تو میں نے ان سے درخواست کی مصطفیٰ کے آگے سے نہ جائیں۔ کیونکہ وہاں داؤدی ہوں گے اور مجھے روک کر شکار بدعتی اور کافروں کے محاورے پر چیلے گئیں گے۔ بازار میں رکھائی دیتے تو میں کسی بھی گلی میں گھس جاتا۔ گھر کے رسالے ہاتا تو بے سے زیادہ اور داؤدی سے کم ہاتھیں کرتا۔ کلچر کیا کرتے۔ اسوں آفتاب کی طرح تو بھی ہمیں فراموش کر رہا ہے میں شرارتی طبعی طوب خیلے طوب کہہ رہے تھیں۔

جس دن قحبہ نکلا اور ابابلی لڑوؤں کی چھوٹی سی توکی لے کر ان کے گھر گئے۔ داؤدی سر جھکائے اپنے صبر میں بیٹھے تھے۔ ابابلی کو کچھ کراٹھ کھڑے ہوئے۔ اندر سے کڑی اٹھلائے اور اپنے ہارے کے پاس ڈال کر بولے "ڈاکٹر صاحب آپ کے سامنے شرمندہ ہوں لیکن اسے بھی مضمون کی خوبی سمجھئے پھر انیال تھا کہ اس کی فرسٹ ڈیجین آجائے گی۔ لیکن نہ آئی۔ بنیاد کو روٹی " "ایک سی تو بھر کم ہے۔" میں نے چمک کر بات کاٹی۔

اور وہ میری طرف دیکھ کر بولے "تو نہیں جانتا اس ایک نمبر سے میرا دل ادھم ہو گیا ہے۔ فجر میں اسے خواب اللہ پیال کرنا ہوا۔" پھر ابابلی اور وہ باتیں کرنے لگے اور میں بے بے کے ساتھ گھسی اڑانے میں مشغول ہو گیا۔

اول اول کا بیج سے میں داؤدی کے قتلوں کا باقاعدہ جواب دیتا رہا۔ اس کے بعد بے جا حدی کے لکھنے لگا اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ چالیس میں جب گھر آتا تو جیسے سکول کے دیگر ماسٹروں سے ملتا ویسے ہی داؤدی کو بھی سلام کرتا آتا۔ اب وہ مجھ سے سوال و فیروہ نہ پوچھتے تھے۔ کوٹہ بھلون اور باتیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ ہار پائی پر بیٹھنے نہ دیتے۔ "اگر مجھے اٹھنے نہیں دیتا تو خود کری لے لے" اور میں کرسی کھینچ کر ان کے پاس ڈٹ جاتا۔ کا بیج ابھری سے میں بڑکتا ہوں ساتھ لایا کرتا انہیں دیکھنے کی قضا ضرور کرتے اور میرے دھوکے کے باوجود اگلے دن خود ہمارے گھر آ کر کتا ہیں دیکھ جاتے۔ اسی چند روز کا بیج چھوڑ کر تک میں ملازم ہو گیا تھا۔ اور وہی چلا گیا تھا۔ بے بے کی سلامتی کا کام بدستور تھا۔ داؤدی مصلحتی جاتے تھے۔ لیکن کچھ نہلاتے تھے۔ بی بی کے خط آتے تھے وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔ کا بیج کی ایک سال کی زندگی نے مجھے داؤدی سے بہت دور کھینچ لیا۔ وہ لڑکیاں جو دو سال پہلے ہمارے ساتھ آئی تھیں اب چھپا کر رہتی تھیں بہت کم ہی نکلتی تھیں۔ سینکڑا بچے کے زمانے کی برجھتی میں آج پانچویں گزرنے کی کو قسط کرتا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا۔ گھر کی ٹھکرو سافٹ کے سامنے ایک آبا کا طویل سطر زیادہ تسکین دہا اور سہا ہوا تھا۔

انہی ایام میں میں نے وہی مرتبہ ایک خوبصورت گلابی پٹن اور ایسے ہی قاتلوں کا ایک بیکٹ خرید لیا تھا۔ اور وہاں پر نہایت ہی کو قسط لکھنے چاہتے تھے نہ ہی داؤدی کو۔ دوسرے کی پھلیوں میں داؤدی سے ملاقات ہو چکی تھی نہ کہ رسم کی تعلیمات میں ایسے ہی ایسٹر گز رہا اور میں ہی ایام گزرتے رہے۔ ملک کو آزادی ملنے لگی تو کچھ بولے اوسے پھر لڑکیاں شروع ہو گئیں۔ ہر طرف سے فسادات کی خبریں آنے لگیں اور اماں نے ہم سب کو گھر بلا لیا۔ ہمارے لیے یہ جگہ بہت محفوظ تھی۔ چھپنا سا ہو گا مگر راجھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ لیکن دوسرے لوگ خاموش تھے۔

تھوڑے ہی دنوں بعد مہاجرین کی آجہ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور وہی لوگ یہ خبر لائے کہ آدھی رات تک ایک دن ہمارے گھسے میں بھی چند گھروں کو آگ لگی اور دکانوں پر خط لڑائی ہوئی۔ ہمارے والے اور مٹری کے ساجیوں نے کڑھ لگا دیا۔ اور جب کڑھ ختم ہوا تو سب بند ہو کر گھسے پہنچ کر باہل دیکھے تو دیکھ کر وہاں سے نکلے گاؤں کی کیڑی لڑنے کو بھیجا تو اس جانی بچانی لگی میں گھسے درجہ صومش ٹھکرا گئیں۔ ہمارے گھر میں تو آدھی کے گھر کی ڈیوڑھی میں ایک نکل بندہ حاکم اور اس کے پیچھے ہوری کا پردہ لٹک رہا تھا۔ میں نے گھرا کر بتایا کہ آدھی ہار رہے ہیں پتا گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور لوٹ کر آئے نہیں گے۔ واقعی ایسے ہی واقعے!

کوئی تیسرے روز غروب آفتاب کے بہت بعد جب میں مسجد میں سے چلا گزریوں کے ٹانگوں کے اور کھیل بھگانے کا وہ دھڑکے اس لگی سے گزرا تو کھیل میدان میں سو سو آدمیوں کی بھڑک دیکھی مہاجر لوگوں کے لالچیاں بکڑے فرے لگا رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے قہر سے ان کو چلا کر مرکز میں کھینے کی کوشش کی مگر مہاجرین کی طرف تو انھیں دیکھ کر کسم گیا۔ ایک لڑکا کسی بڑے لڑکے سے کہہ رہا تھا۔

"ساتھ کے گاؤں میں گیا ہوا تھا جب لوہا تو اپنے گھر میں گھس چلا گیا۔"

"کون سے گھر میں؟" بڑے لڑکے نے پوچھا۔

"دیکھی مہاجرین کے گھر میں" سچے کے نے کہا۔

"پھر کیا انہوں نے بکڑ لیا۔ دیکھا تو بند لگا۔"

اسے میں بھیڑ میں سے کھی سے چلا کر کہا "لوہے راتو ہلدی آوے جلدی آ۔۔۔ جیری سامی پڑت جیری سامی۔" راتو بکریاں کا دروازے کی طرف لے جا رہا تھا۔ انہیں روک کر اور ایک لالچی والے لڑکے کو ان کے آگے کھڑا کر کے وہ بھیڑ میں گھس گیا۔ میرے دل کو ایک دھکا سا لگا جیسے انہوں نے آدھی کو بکڑ لیا ہوا۔ میں نے طوم کو دیکھے بغیر اپنے قریبی لوگوں سے کہا۔

"یہ بڑا چھڑا آدھی ہے بڑا لالچ آدھی ہے۔ اسے بکھڑت کو۔۔۔ یہ تو خون میں نہائی ہوئی چند آنکھوں نے میری طرف دیکھا اور ایک لالچو جان کھڑا ہی کر دیا۔"

"بتاؤں تجھے بھی آگیا بڑا لالچی میں کر تیسرے ساتھ بکھڑا نہیں بنا اور لوگوں نے گالیاں بک کر کہا۔" افسار ہو گا شاید۔" میں ادا کر دھری چاہت بھیڑ میں گھس گیا۔ راتو کی قیادت میں اس کے دوست آدھی کو گھسے کھڑے تھے اور راتو آدھی کی ٹھوڑی بکڑ کر بار بار ہاتھ اور پچھڑا ہاتھ "اب بول چنا اب بول" اور آدھی خاموش کھڑے تھے ایک لڑکے نے بکڑی تیار کر کہا۔ "پہلے ہوری کا نو۔ ہوری" اور راتو نے مسرت سے کاسٹے والی دروازی سے آدھی کی ہوری کا ہڈی دے دیا لالچو بولا "بھلا دیں ہے؟" اور راتو نے کہا۔ "جائے دو بڑے حاکم میرے ساتھ کھانا چھڑا کرے گا۔" پھر اس نے آدھی کی ٹھوڑی داہنے ہاتھ سے ہونے کہا۔ "نکھر چھ چڑتا" اور آدھی آہستہ سے بولے "کون سا؟"

راتو نے ان کے ٹکڑے پر ایسا تھپڑ مار دیا کہ مگرتے کرتے سے سو رہا۔ "سائے لگے بھی کوئی پانچ سات ہیں؟"

جب وہ نکلے چھڑے راتو نے اپنی لالچی ان کے ہاتھ میں چھڑا کر کہا۔ "نیل کر یاں تیرا انتظار کرتی ہیں۔"

اور ٹکڑے راتو کی بکریاں کے پیچھے پیچھے لے چلے جیسے لے لے پاؤں والا فریج اچل رہا ہوا

طور پر کام کیا اور جیت کوٹن گروپ کی ممبر ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۲ جنوری تا مارچ ۱۹۷۹ء اور شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۸۲ء-۱۹۸۱ء) اور جنگ ہندو فوجداری میں شادی نہیں کی۔ آخری دنوں میں ان کا مستقل قیام نوپلا میں تھا۔ نوپلا اسی کے کپاش ہسپتال میں آخری سانس لیے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

اولین تحریر:

بارہ برس کی عمر میں "بی چوبیہ کی کہانی ان ہی کی تہائی" مطبوعہ "پھول" کا دور ۲۳ جنوری ۱۹۳۸ء

اولین مطبوعہ افسانہ:

"پہاڑی" مطبوعہ "پہاڑی" کا دور ۱۹۳۳ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ "ستاروں سے آگے" (افسانے) مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور طبع اول: ۱۹۴۷ء
- ۲۔ "شیشے کے گھر" (افسانے) مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور طبع اول: ۱۹۵۳ء
- ۳۔ "سفینہ دل" (ناول) مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور طبع اول: ۱۹۵۴ء
- ۴۔ "میرے مگی منہ مانے" (ناول) مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور طبع اول: ۱۹۴۹ء
- ۵۔ "آگ کا دریا" (ناول) مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور طبع اول: ۱۹۵۹ء
- ۶۔ "میں چراغ نہیں ہوا" (ترجمہ) مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور طبع اول: ۱۹۵۸ء
- ۷۔ "پتہ بھڑکی آواز" (افسانے) مطبوعہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی طبع اول: ۱۹۶۶ء
- ۸۔ "آفریقہ کے صحران" (ناول) مطبوعہ چودھری انکوائری لاہور طبع اول: ۱۹۷۹ء
- ۹۔ "کار چس ہوا دھڑکے" (ناول۔ جلد اول) مطبوعہ مکتبہ اردو ادب لاہور طبع اول: ۱۹۷۷ء
- ۱۰۔ "پتہ بھڑکی آواز" (ناول) (اس ناول کی دوسری جلد ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔)
- ۱۱۔ "پتہ بھڑکی آواز" (ناول) مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور طبع اول: ۱۹۶۶ء
- ۱۲۔ "پتہ بھڑکی آواز" (ناول) مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور طبع اول: ۱۹۶۳ء
- ۱۳۔ "پتہ بھڑکی آواز" (ناول) مطبوعہ پاکستان طبع اول: ۱۹۷۶ء
- ۱۴۔ "پتہ بھڑکی آواز" (ناول) مطبوعہ "پتہ بھڑکی آواز" دہلی طبع اول: ۱۹۷۷ء

- ۱۵۔ "حجر کا گمانہ" (رجسٹرڈ) مطبوعہ: "انقوش" لاہور طبع اڈل: جون ۱۹۵۸ء
- ۱۶۔ "گودادانہ" (سٹرپٹ: ایران) مطبوعہ: "آج کل" دہلی طبع اڈل: ۱۹۷۸ء
- ۱۷۔ "بچہ گیلری" (مضامین) مطبوعہ: قوسین لاہور طبع اڈل: ۱۹۸۳ء
- ۱۸۔ "چارنا دلت" مطبوعہ: بچہ کشن بک پوسٹل گزٹھ طبع اڈل: ۱۹۸۷ء
- ۱۹۔ "جہان دیکھو" (امر کا سے حلق رہا ہوا) مطبوعہ: مکتبہ اردو ادب لاہور طبع اڈل: ۱۹۸۰ء
- ۲۰۔ "گلشت" (سٹرپٹ: روس، کشمیر) مطبوعہ: مکتبہ اردو ادب لاہور طبع اڈل: س۔ن
- ۲۱۔ "مصلح گل آئی یا جل آئی" (افسانے) مطبوعہ: مایام پبلشرز لاہور طبع اڈل: ۱۹۶۸ء
- ۲۲۔ "جہاں پھول کھتے ہیں" (افسانے)
- ۲۳۔ "آئیس کے گیت" (داخل ہائی کوف کی کتاب کا ترجمہ)
- ۲۴۔ "بگنورس کی دنیا" (افسانے) انجمن ترقی اردو (بہار) نئی دہلی طبع اڈل: ۱۹۹۰ء
- ۲۵۔ "سلاش" (افسانے) مطبوعہ: پاکستان (جملی ایڈیشن)
- ۲۶۔ "تین دلت" مطبوعہ: پاکستان (جملی ایڈیشن)
- ۲۷۔ "روشنی کی رفتار" (افسانے) مطبوعہ: بچہ کشن بک پوسٹل گزٹھ دہلی طبع اڈل: ۱۹۸۲ء
- ۲۸۔ "اکیس بیٹا رہا" (ادب و خوف کا ترجمہ: اول)
- ۲۹۔ "آدلی کا مقدر" (ادب و خوف کا ترجمہ: اول) مکتبہ جاسم لہندہ دہلی طبع اڈل: ۱۹۶۵ء
- (جے "The Fate Of Man" (دلت) کا ۵۳ صفحات میں ترجمہ ہے۔)
- ۳۰۔ "بچہ گھر دے"
- ۳۱۔ "اڈلے خاتے"
- ۳۲۔ "پادکی دھک بچے" (افسانے) مطبوعہ: رشتہ پبلشرز لاہور طبع اڈل: س۔ن
- ۳۳۔ "گوداد کی شام"
- ۳۴۔ "ماں کی سمجھ" (ترجمہ: اول از ۵۵ قوف پنجگیز) مکتبہ جاسم لہندہ دہلی طبع اڈل: ۱۹۶۲ء
- ۳۵۔ "مغیر سوچتا ہے" (ایک ہائی ٹیل)
- ۳۶۔ "کیسا میں گل" ترجمہ: Murder In The Cathedral مکتبوعہ: "نیا دور" کراچی
- ۳۷۔ "اڈلی سلسلہ ادبیت"
- ۳۸۔ "میرے بہترین افسانے" مطبوعہ: پاکستان (جملی ایڈیشن)
- ۳۹۔ "قرۃ العین میر کے منتخب افسانے" مطبوعہ: پاکستان (جملی ایڈیشن)
- ۴۰۔ "ڈگلو" (ترجمہ: دلت از رفرین) مکتبہ جاسم لہندہ دہلی طبع اڈل: ۱۹۶۶ء

- ۳۰۔ "چودکے" (آخری اڈا) اول اور دہا پانچواں (کتبہ جامعہ لکھنؤ، دہلی)
- ۳۱۔ "شیر خان" (بچوں کے لیے) (کتبہ جامعہ لکھنؤ، دہلی)
- ۳۲۔ "بھلے بچے کے بچے" (بچوں کے لیے) (کتبہ جامعہ لکھنؤ، دہلی)
- ۳۳۔ "کھڑی کے بچے" (بچوں کے لیے) (کتبہ جامعہ لکھنؤ، دہلی)
- ۳۴۔ "سماں ڈھنگ کے بچے" (بچوں کے لیے) (کتبہ جامعہ لکھنؤ، دہلی)
- ۳۵۔ "بھانڈ" (بچوں کے لیے) (کتبہ جامعہ لکھنؤ، دہلی)
- ۳۶۔ "بہن کے بچے" (بچوں کے لیے) (کتبہ جامعہ لکھنؤ، دہلی)
- ۳۷۔ "حسن محمد الرحمن" (لاہور میں۔ بچوں کے لیے) (کتبہ جامعہ لکھنؤ، دہلی)
- ۳۸۔ "گروہ رنگ بھن" (دستار چڑھی ہاں) (مطبوعہ نیکو کشتیں پبلشنگ ہاؤس، دہلی) طبع اول: ۱۹۸۸ء
- ۳۹۔ "خیالی چوڑ" (آخری اڈا) (کتبہ جامعہ لکھنؤ، دہلی) طبع اول: ۱۹۶۷ء
- ۴۰۔ "پانچویں بچہ" (ہاں) (مطبوعہ نیکو کشتیں پبلشنگ ہاؤس، دہلی) طبع اول: ۱۹۹۸ء
- ۴۱۔ "دیکھیں ہر دہائی" (دہائی ہاں) (مطبوعہ "نقوش" لاہور) ترجمہ: ۱۹۶۸ء
- ۴۲۔ "بھڑمال گزشت" (دہائی ہاں)
- ۴۳۔ "کھل گزشت" (دہائی ہاں) (تصویری اہم) اردو اکاڈمی، دہلی) طبع اول: ۲۰۰۳ء
- ۴۴۔ "بہن ہاں" (بچوں کے لیے) (شیر خان علی ایڈیٹر۔ لاہور) طبع دہائی: ۲۰۰۷ء
- ۴۵۔ "راہان یا راہان" (خٹھوہ) (ایکہ کشتیں پبلشنگ ہاؤس، دہلی) طبع اول: ۲۰۰۳ء
- ۴۶۔ "استاد بچے سے غلام علی خان" (ہر آئندہ دہائی کشتیں، دہلی) طبع اول: ۲۰۰۳ء

اعزازی:

- ۱۔ "سازندہ اکاڈمی ایچ آر" (برائے) "بچہ بھڑکی آواز" (کراچی نئی مجموعہ: ۱۹۶۷ء)
- ۲۔ "سورجیٹ ایڈیٹر ہمدرد" (برائے تراجم: ۱۹۶۹ء)
- ۳۔ "قالب ایچ آر" ۱۹۸۲ء
- ۴۔ "چم بھڑکی" (آخری اڈا) ۱۹۸۳ء
- ۵۔ "قالب ہمدرد ایچ آر" ۱۹۸۳ء
- ۶۔ "اقبال" (ان (حکومت و جد پیدائش) ۸۸۷-۱۹۸۷ء)
- ۷۔ "کیا ہی ہو گیا ایچ آر" (حکومت ہمدرد) ۱۹۹۰ء
- ۸۔ "بھائی دہرے بھائی دہرے" (ایچ آر) ۱۹۹۱ء

وفات سے قبل مستقل تھا:

۱۹۸۳ء میں، فلپس نمبر ۸، ۱۰ اور ۱۱ء کو اکرامیہ، اعلیٰ درجہ (بھارت) پہنچا، اس کو نیوز اسکے ایک فلپس میں شکل ہوئی تھی۔

نظریہ فن:

”میں نے کوئی نئے شخص پیش کیے۔ میری بیماری پہنچ انسان پرستی ہے، اس کی ساری دنیا کو آج کل ضرورت ہے۔ اس کی وضاحت
کوشش ضروری نہیں سمجھتی۔“

قرآن الہین حیدر

فوٹو گرافر

قرۃ العین حیدر

سوم ہمارے کے بھائیوں سے گھرا ہے وہ نظر فریب گیسٹ ہاؤس جہے پھرے نیلے کی چوٹی پر اور سے نظر آ جاتا ہے۔ نیلے کے مینا نیلے پہاڑی پھیل ہے۔ ایک مل کھائی سڑک پھیل کے کنارے کنارے گزرتی گیسٹ ہاؤس کے پچانک تک پہنچتی ہے۔ پچانک کے نزدیک وارس کی ایسی نہ تھیں وہ ایک فوٹو گرافر اپنا ساتھ ساتھ سامان پھیلائے ایک ٹیبل کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ یہ گم نام پہاڑی قصبہ نورست ملاتے میں لگیں ہے۔ اس جہے بہت کم سیاح اس طرف آتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی ماہر مسل ملنے والا جزا کوئی مسافر گیسٹ ہاؤس میں آ پہنچتا ہے تو فوٹو گرافر بوجی امید اور صبر کے ساتھ اپنا کمرہ منہا لے باغ کی سڑک پر ٹھٹھے لگتا ہے۔ باغ کے پانی سے اس کا سمجھوتہ ہے۔ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہری کسی نو جوان خاتون کے لیے صبح سویرے گل دستہ لے جاتے وقت اپنی فوٹو گرافر کا شمارہ کر دیتا ہے اور جب ماہر مسل ملنے والا جزا ملتا ہے اس کے بعد نیلے باغ میں آتا ہے تو اپنی اور فوٹو گرافروں ان کے انتظار میں چوکس ملتے ہیں۔

فوٹو گرافر خاتون سے یہاں موجود ہے۔ نہ جانے کبھی اور جا کر اپنی دکان کیوں نہیں سماتا۔ لیکن وہ اسی قصبہ کا باشندہ ہے۔ اپنی پھیل اور اپنی پہاڑی چھوڑ کر کہاں جاتے؟ اس پچانک کی بیجا پریشانی بیٹھے بیٹھے اس نے جاتی دیا کے رکھا رکھ کر تھے دیکھے ہیں۔ پہلے یہاں صاحب لوگ آتے تھے۔ برطانوی چائے و اسٹریٹ سٹالایت چنے کو ٹھٹھل سرس کے نکھار دی عہد سے داران کی صم لوگ اور پانا لوگ۔ رات رات بھر شراہیں اڑاتی جاتی تھیں اور گراسٹون پر پکارا دیتے تھے اور گیسٹ ہاؤس کے نیلے ڈرائنگ روم کے چوٹی پر فرس پر اس ہوتا تھا۔ دوسری بڑی بڑائی کے زمانے میں امریکن آنے لگے۔ پھر ملک کو آزادی ملی اور اکاؤنٹ سیاح آنے شروع ہوئے۔ باسکاری افسر لائے جاتے جڑے یا مصور یا نگار یا ایسے لوگ جو تھمائی جاتے ہیں ایسے لوگ جو برسات کی ٹاسوں کی پھیل پر چلی دھنک کا ٹھکانہ کرتا ہے ہیں ایسے لوگ جو سکون اور صحت کے حلائی ہیں جس کا زندگی میں وہ نہیں۔ کیونکہ ہم جہاں جاتے ہیں وہاں سے ساتھ ہے ہم جہاں ٹھہرتے ہیں وہاں سے ساتھ ہے تو مسلسل ہماری ہم سفر ہے۔

گیٹ ہاؤس میں مسافروں کی آؤک جاؤک جاری ہے۔ فوٹو گرافر کے کمرے کی آنکھ پر سب دیکھتی ہے اور خاموشی رہتی ہے۔ ایک روز شام چارے ایک نو جوان اور ایک لڑکی گیٹ ہاؤس میں تان کر اترے۔ یہ دونوں اندر سے ماہر مسل سنانے والے معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن بے حد سرور اور شجہ سے وہ اپنا مختصر سامان اٹھائے ہوئے چلے گئے۔ اوپر کی منزل بالکل خالی پڑی تھی۔ نہ چنے کے برابر میں ڈانک ہل تھا اور اس کے بعد بھی بیلروم۔

”اٹھانچہ پکارا ہستر۔“ نو جوان نے اس سے کہا۔

”اچھا۔“ لڑکی دونوں چیزیں اٹھا کر برابر کے سلگ روم سے گزرتی دوسرے کمرے میں چلی گئی جس کے پیچھے ایک پتہ گیارہ سا تھا کمرے کے بڑے بڑے درجوں میں سے، وہ دروازہ نظر آ رہا تھا جو ایک بڑی سی اٹھانچہ گچھل رہا تھا جس کی سرمت میں مصروف تھے۔

ایک پورٹریٹ کا سامان لے کر اٹھانچہ پکارا اور درجوں کے پردے برابر کر کے باہر چلا گیا۔ لڑکی سفر کے کپڑے تبدیل کر کے سلگ روم میں آگئی۔ نو جوان آٹھن دان کے پاس ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھا کچھ کھڑا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر لڑکی کو دیکھا۔ باہر جمیل پر دھنسا ہوا چھرا چھرا تھا۔ وہ درجے میں کھڑی ہو کر بارگ کے دھندلے کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ نہ جانے وہ دونوں کیا کیا تھیں کرتے رہے تھے۔ فوٹو گرافر جواب بھی نیچے چھانک کر بیٹھا تھا اس کا کمرہ ہاتھ رکنا تھا لیکن ہانٹ سے ماری تھا۔

بکھرا ہوا بعد وہ دونوں کھانے کے کمرے میں گئے اور درجے سے لگی ہوئی میز پر بیٹھ گئے۔ جمیل کے دوسرے کنارے پر لیجے کی روشنیاں جھلکا رہی تھیں۔

اس وقت تک ایک ہریجن سیارہ بھی گیٹ ہاؤس میں آچکا تھا۔ وہ خاموش ڈانک ہل کے دوسرے کونے میں چپ چاپ بیٹھا تھا کھڑا تھا۔ چند کچرے سٹ کاڑ اس کے سامنے پھرتے ہوئے گئے تھے۔

”یہاں ہے گھر کھڑا کھڑا۔“ اسے کہیں اس وقت ہمارا مشرقی کے ایک ہمارا ڈانک بیٹھک میں سو جا رہا تھا۔ سرخ سا ڈھکی میں لباس ایک ہمارا بعد دستی لڑکی میرے سامنے بیٹھی ہے۔ بڑا ہی روٹھک ماحول ہے اس لڑکی نے چپکے سے کہا۔ اس کا ساتھی خنس پڑا۔

کھانے کے بعد وہ دونوں پھر سلگ روم میں آگئے۔ نو جوان اب اسے کچھ چن چن کر سار ڈانک۔ رات گہری ہوئی تھی۔ دھنسا لڑکی کوزہ روٹی بیچک آئی اور اس نے سوں سوں کرتے ہوئے کہا ”اب سو جا جائیے۔“

”تم اپنی ذمہ داری دوا چن نہ بھولنا۔“ نو جوان نے غر سے کہا

”ہاں شب خیر۔“ لڑکی نے جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پیچھا گیارہ گھپ اٹھ صبح پڑا تھا۔ کرہ بے حد پر سکون اور سلگ اور آرام دہ تھا۔ نہ لگی بے حد پر سکون اور آرام دہ تھی لڑکی نے کپڑے تبدیل کر کے کھٹکا دھیر کی وراوٹوں کے دوا کی پیشی نکالی کہ وہ راز سے پر دھک ہوئی۔ اس نے اپنا سیاہ کھٹو مکان کر دیا۔ وہ کھٹو۔ نو جوان ڈرا کھڑا ہوا اس سامنے کھڑا تھا۔

”نیچے لگی پڑی حالت کھٹو کی ہاتھ رہی ہے۔“ اس نے کہا۔

”اچھا۔“ لڑکی نے دوا کی پیشی دھیر پیچھا دیا۔ چچہ نو جوان کے ہاتھ سے جھٹ کر فرتی پر گر گیا۔ اس نے ہلک کر چچا اٹھایا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ لڑکی روٹھتی بچھا کر گئی۔

مچا کھڑا شفق کے لیے ڈانک روم میں لگی۔ دچے کے برابر والے ہال میں پھول تک رہے تھے۔ تانے کے بڑے بڑے گنگ دھن

برائے چکائے جانے کے بعد ہاں کے ٹھٹھا سے چوٹی فرشتے پر ایک تھڑے میں رکھ دیے گئے تھے اور ان کو پھولوں کے انبار اور کھنڈوں کے گڑبگڑ کے ہونے تھے۔ دہر سوئے بچل کو درشن کر دیا تھا اور دو روٹیاں کھائیں سینے پر لٹا کر بھر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد لو جوان پختہ ہوا دینے کے طور پر ہوا۔ اس کے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کا ایک گنڈا تھا۔

”مائی بچے کھڑا ہے۔ اس نے یہ گل دستہ نہیں بگھوایا ہے۔“ اس نے کمرے میں داخل ہو کر سنبھرتے ہوئے کہا اور گل دستہ میز پر رکھ

Age Group	Percentage
18-24	10
25-34	25
35-44	45
45-54	65
55-64	85
65-74	95
75+	98

لڑکی نے ایک شگوفہ لہا کر بے خیالی سے اپنے بالوں میں لگا لیا اور اظہارِ جہنے میں مصروف ہو گئی۔

”ایک فوٹو گرافر بھی جیسے مثلاً وہ ہے۔ اس نے مجھ سے جہاں جمیدگی سے تمہارے حلقہ دریافت کیا کہ کپا تم کلاں علماء اُستاد تو نہیں؟“

لو جیہاں نے کرمی پر بیٹے کر چائے کاٹے ہوئے کہا۔

لڑکی نہیں بنی۔ وہ ایک نامور کامیابی مگر اس جگہ پر کسی نے اس کا نام بھی نہ سنا تھا۔ خواجہ حسن علی لڑکی سے بھی زیادہ مشہور موسیقار تھا مگر

اسے بھی یہاں کوئی نہ پہچان سکا تھا۔ اس دنوں کو اپنی اس عارضی گم نامی اور تعمیل ممکن کے یہ عقلمندانہ بہت بھلے معلوم ہوئے۔

کمرے کے دوسرے کونے میں ناشتہ کرتے ہوئے اکیلے ہر جین نے آنکھیں اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا اور وہ ماسٹرنگریاؤں پر مبنی بات

روٹیوں کی خاموشی صورتِ شہر کی ہے ہر چاکھ۔

ساتھ کے اہلکاروں کے لیے اور بارش کے کارے گلبرگ کے چپے کڑے اور کھجلی کو بچھنے والے۔ انکارا فرنے ہاکی چھلاوے

کی طرح نمودار ہو کر بڑے دارما کی مانند زمین لولہی اجڑی اور بڑا چمکے کر کہا۔

• 2000/01/01

وہی نے گھڑی دیکھی ”ہم لوگوں کو بھی یاد رکھنا ہے ذرا ہو جائے گی۔“

”ایڈیٹی۔۔۔“ فوننگر افرنے پاؤں صطیح پر رکھ کر دیکھا کہ باہر کی دریا کی سمت اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا: ”باہر کار“

اور حیات میں تمہارا کام یہ ہے۔ مجھے معلوم ہے اس تمہارا سے نکل کر آپ دونوں غرضی کے چند لمحے پرانے کی کاغذ میں مصروف ہیں۔

میل کے اوپر دھک ملی کی ملی میں غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن میں آپ کا زبان دھکتے نہ ایں کا اجرا ہے۔"

’یہ اللہ ہی کا کام ہے۔‘ سگری نے چپکے سے اپنے ساتھ ہی۔

انی جہان کو اب تک اپنے کیم کا منتظر تھا دوسرے درخت کے نیچے سے اُٹھ اور پک کر ایک اور نلک ویت لائی کو پیش کیا۔ لڑکی نکل نکلا کر

اس چڑی۔ دو اور اس کا ساتھی امرتسردی ہادیوں کے گھسے کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ لڑکی کی آنکھوں میں دھوپ آ رہی تھی اس لیے اس نے

— لا يجوز أن يكون المبدأ

الف. الفقه الدستوري

تصور یہ آپ کو کم کمال جاسے گی۔ جھجک برائے بی۔ لیکن ہر۔ "خوف" کو گم کرنے کے ذریعے جھجک کر دیا، دہائی بھڑکی، لاکھ اور اس کا ساتھی

میر کر کے دورِ درخشاں چلے گئے اور خود حیا کی تاریکی روشنی میں دھڑکنا پھر گھاس پر چڑی کر سیں پر چلے رہے۔ جب کہ ہر گز

کا تو اندر چلی حوالی کے دستخ اور خاموشی اور تنگ روم میں تاریکی انقوس کی روشنی میں آ بیٹھے۔ دہانے وہ کیا باتیں کر رہے تھے جو کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں۔ کھانے کے وقت وہ اوپر چلے گئے۔ صبح سویرے وہ واپس جا رہے تھے اور اپنی باتوں کی گویہت میں ان کو نوکر اور اس کی کھینچی ہوئی تصویر یاد بھی نہ رہی تھی۔

صبح کلاڑی اپنے کمرے ہی میں تھی جب چور نے اندر آ کر ایک لٹائی پٹن کیا "خو نوکر اگر صاحب یہ بات کو دے گئے تھے۔" اس نے کہا۔

"اچھا اس کے سامنے دانی دراز میں رکھ دو۔" لڑکی نے بے خیالی سے کہا اور ہال دھانے میں چلی رہی۔

ناشتے کے بعد سامان ہانڈے ہوئے اسے دراز کھوتا پادوسہ ہی اور پاتے وقت خالی کمرے پر ایک سرسری ہی نظر ڈال کر وہ تیز تیز چلتی بیٹھے جا کر کار میں بیٹھ گئی۔ نو جوان نے کار اسٹارٹ کر دی۔ کار بھاگ سے باہر نکلی۔ خو نوکر اس طرف سے چلیا پر سے اٹھ کر ٹوپی اتاری۔ مسافروں نے مسکرا کر ہاتھ دلائے۔ کارڈ صلوان سے لیے اتر گئی۔

وہ والہن کی ایسی موٹھیوں والا خو نوکر فراب بہت بڑا سا ہو چکا ہے اور اس کی طرح اس گیسٹ ہاؤس کے بھاگ پریشن کی کہی چھائے بیٹھا ہے اور سیاہوں کی تصویریں اس کا رخا رہتا ہے جواب کئی لمبائی میں شروع ہونے کی وجہ سے بڑی تعداد میں اس طرف آنے لگے ہیں۔

لیکن اس وقت ایئر پورٹ سے جو نو رست کوچ آ کر بھاگ میں داخل ہوئی، اس میں سے صرف ایک خاتون اچھا اچھی کس اٹھائے برآمد ہوئیں اور ٹھٹھ کر انہوں نے خو نوکر کو فرار کو کھانکھا اور کوچ دیکھتے ہی فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا "نکر کی جان اور صحن لڑکی کی بھانے ایک اور بیڑم کی ملی کی کو کچھ کرنا ہی سے وہ بارہ جا کر اپنی لیکن کی کر ہی پر بیٹھ چکا تھا۔

خاتون نے دفتر میں جا کر جیٹر میں اپنا نام درج کیا اور اوپر چلی گئیں۔ گیسٹ ہاؤس مشان چڑھا۔ سیاہوں کی ایک ٹولی ابھی ابھی آگے روانہ ہوئی تھی اور پورے کمرے کی جھاڑ پونجی کر چکے تھے۔ تاپنے کے گل دان تازہ پھولوں کے انتظام میں ہال کے فرش پر کچے گل جمل کر رہے تھے اور ڈانٹک ہال میں درہٹے کے چپے سفید براقی میز پر چھری کاٹنے بنگلہ رہے تھے۔ نوادار خاتون وہ میانی بیڑم میں سے گزرا کر پچھلے کمرے میں چلی گئیں اور اپنا سامان رکھنے کے بعد پھر باہر آ کر بھیل کو دیکھنے لگیں۔ چائے کے بعد وہ خالی سیٹنگ روم میں جا بیٹھیں اور رات ہوئی تو جا کر اپنے کمرے میں سو گئیں۔ گیارہ بجے میں سے کچھ پر چھائیوں نے اندر بھاگنا تو وہ اندر کر رہے تھے میں گئیں جہاں حور دان بھر کام کرنے کے بعد بیڑمی دیوار سے لگی چھڑا گئے تھے۔ گیارہ بجی مشان چڑھا۔ وہ پھر چنگ پر آ کر بیٹھیں تو چند منٹ بعد دروازے پر دنگ ہوئی۔ انہوں نے دروازہ کھولا پھر کوئی نہ تھا۔ سنگ روم بھائی بھائی کر رہا تھا۔ وہ پھر آ کر لیٹ رہیں۔ کمرہ بہت سرد تھا۔

صبح کاتھ کر انہوں نے اپنا سامان ہانڈے ہوئے سنگھار بیڑی دراز کھولی تو اس کے اندر کچے پیلے کاتھ کے لیے سے ایک کاتھانے کا کوڑ نظر آیا جس پر ان کا نام لکھا تھا۔ خاتون نے ذرا تعجب سے اتفاق باہر نکالا۔ ایک کا کوڑ کاتھ کی تھ میں سے نکل کر خاتون کی اٹلی پر آ گیا۔ انہوں نے دلی کر اٹلی بھینچی اور کاتھانے میں سے ایک تصویر سرک کر لیے گئی جس میں سے ایک نو جوان اور ایک لڑکی امر سندری پاروتی کے مجسمے کے قریب کھڑے مسکرا رہے تھے۔ تصویر کا کاتھ بیٹا چڑھا تھا۔ خاتون چند لمحوں تک تم اس تصویر کو دیکھتی رہی۔ پھر اسے اپنے جیک میں رکھ لیا۔

چور نے باہر سے آواز دی کہ ایئر پورٹ جانے والی کوچ چور ہے۔ خاتون لیے گئیں۔ خو نوکر اس لیے مسافروں کی تاک میں باغی

سڑک پر ٹھیل رہا تھا۔ اس کے قریب جا کر خاتون نے بے تکلفی سے کہا۔

”کمال ہے چند دوسریں میں کتنی بار اس گھمراہی کی مصافحہ کی گئی ہوگی مگر یہ قصور کا تقد کے لیے اسی طرح بڑی رہی۔“ پھر اس کی آواز میں جھڑپ آگئی۔ ”اور یہاں کا انتظام کتنا خراب ہو گیا ہے۔ کمرے میں کاکروچ کی کاکروچ۔“

فونو گراہ نے چمک کر ان کو دیکھا اور بچکانے کی کوشش کی۔ مگر خاتون کے جھروے والے چہرے پر نظر ڈال کر الم سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ خاتون کہتی رہیں۔ ان کی فونو آواز بھی بدل چکی تھی۔ چہرے پر روشنی اور چٹکی تھی اور انداز میں چہ چاہیں اور بے زاری اکودہ سیات آواز میں کہے جا رہی تھیں۔

”میں اسٹیج سے رہنا نہ ہو چکی ہوں۔ اب میری تصویریں کون بھیجے گا گھمراہ۔ میں۔۔۔ میں اپنے وطن واپس جاتے ہوئے راستہ کی راست یہاں ٹھہر گئی تھی۔ جی ہوائی سروس شروع ہو گئی ہے۔“ یہ جگہ راستے میں چلتی ہے۔“

”اور۔۔۔ اور۔۔۔ آپ کے ساتھی؟“ فونو گراہ نے آہستہ آہستہ سے پوچھا۔ کوچ نے ہارن بھایا۔

”آپ نے کہا تھا کہ کارڈ اور سیات میں گھمسان کا رہن چاہیے۔ اس گھمسان میں وہ کبھی کبھار۔“

کوچ نے دوبارہ ہارن بھایا۔

”اور ان کو کھوئے ہوئے بھی دے کر رہی۔ اچھا خدا حافظ۔“ خاتون نے ہاتھ قسم کی اور چیز چیز قدم رکھتی کوچ کی طرف۔ چلی گئی اور اس

کی ایک سو فیصدیوں والا فونو گراہ فریاد تک کے نزدیک جا کر اپنی ٹکی کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

زندگی انہوں کو کھا گئی۔

صرف کاکروچ باقی رہیں گے۔



آغا باہر

نام	آغا سجاد حسین
لقب نام	آغا باہر
پیدائش	۱۳ مارچ ۱۹۱۹ء بمقام: ضلع گورداس پور، بھارت
وفات	۲۵ ستمبر ۱۹۹۸ء بمقام: ضلع وارک، امریکہ
تعلیم	ایم۔ اے (تاریخ) پنجاب یونیورسٹی، لاہور
	میرزا کاظم سیالوی سکول، ضلع سے کیا۔ گورنمنٹ کالج، لاہور سے بی۔ اے (آرٹس) اور بعد میں پانچویں عالمی تعلیم کے طور پر پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے ایم۔ اے کیا۔ انڈیپنڈنٹ سکول، ڈارٹ سلاؤم، وارک کے گریجویٹ تھے۔

مختصر حالات زندگی:

حاشق حسین ضلوی سے چھوٹے اور اچھا حسین ضلوی کے بڑے بھائی 'آغا باہر' آغا غلام اکبر خان کے ہاں ضلع میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ انہیں کا بیشتر وقت لاہور میں گزرا۔ ایم اے اردو کرنے کے بعد ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۵ء پنجابی آرٹس سٹوڈیو میں سکالرشپ کے طور پر کام کیا۔ ڈراما سے ملٹی مڈیا سیت کے سبب ابتدا میں بطور ڈانڈا نوٹس شہرت پائی۔ غیر متحکم پنجاب کی صوبائی اسمبلی میں بطور راجہ کام کیا۔ حکومت کو متعلقہ پنجاب (بہار) کے انڈیپنڈنٹ ڈیپارٹمنٹ میں جیلانی افسر رہے۔ ۱۱ مئی ۱۹۳۹ء کو پاکستان آری میں کبھی حاصل کیا اور ۱۱ جولائی ۱۹۳۹ء میں اعمر سہوڑن پبلک ریلیشنز ڈائریکٹوریٹ (G.H.Q.) سے وابستہ ہو گئے۔ "کاپڈ" اور "بدلی" کے مدیر رہے۔ ۱۹۵۱ء میں پاکستان کے ایک خبر نگاری وفد کے ساتھ سعودی عرب گئے۔ ۱۹۵۷ء میں اعمر پھیل پریس انشٹیٹیوٹ کے زیر اہتمام کوٹلا بھڑا ٹاچنگا میں منعقد ہونے والے ورکشاپ کے سہارا میں شرکت کی۔ بحیرہ کے قصبے پر پہنچ کر راجہ تھوڑے۔ ۶۸۔ ۱۹۶۷ء میں حلقہ ارباب ذوقی راولپنڈی کے سیکرٹری رہے۔ ۸۰ء میں پھیل کونسل آف آرٹس راولپنڈی کے ڈائریکٹر تھے اور ان کی رہائش سابق قری میں ہاں،

راولپنڈی، محدود میں تھی۔ ریجنل ترجمہ کے بعد اس کا پہلے مکمل ورژن "ریڈ رڈز انجسٹ" کے ساتھ شائع رہا ہے۔ پیری ٹائٹل، "خود پارک میں انتقال ہوا اور جیٹ تھلین ہوئی۔"

اولین مطبوعہ راولپنڈی:

"نئی ایڈیشن" مطبوعہ "ہیمن" لاہور۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب)

- ۱۔ پاک گریاں۔ (آخری طبع) کتبہ جدید لاہور طبع اول اگست ۱۹۳۸ء
(۱) قحب (۲) بڑے سماں سب سے سماں (۳) فرار (۴) زندگی کی شام (۵) میری سالہاں (۶) طلبہ کی لڑائی (۷) ایک خط
بے مضمر ہو گیا (۸) صحت سب
- ۲۔ "سب کو" (نئی طبع) کتبہ ادب لاہور طبع اول ۱۹۵۶ء
(۱) کہ (۲) راج گراہٹی (۳) راز و کلب (۴) جگہ (۵) کوڑے کے اسیروں (۶) نظام زہرہ بے روپ (۷) دل کی ہستی
جیب ہستی ہے (۸) ٹاپ لاک (۹) خیمہ سوار (۱۰) ہم بدلے نہ وہ بدلے (۱۲) دستر خوان (۱۳) سبز چاش
(۱۴) مسیحا (۱۵) روح کا بوجھ (۱۶) رات والے (۱۷) جھوٹے جمال (۱۸) وہ زندگی کی بات تھی (۱۹) چارلس کھڑا
(۲۰) چال چلن
- ۳۔ "ازان مختصر" (۱) اسے ایک طرف اور دوسرا طرف اٹھانے (۲) اذان مختصر (۳) اذان مختصر (۴) اذان مختصر (۵) اذان مختصر (۶) اذان مختصر (۷) اذان مختصر (۸) اذان مختصر (۹) اذان مختصر (۱۰) اذان مختصر (۱۱) اذان مختصر (۱۲) اذان مختصر (۱۳) اذان مختصر (۱۴) اذان مختصر (۱۵) اذان مختصر (۱۶) اذان مختصر (۱۷) اذان مختصر (۱۸) اذان مختصر (۱۹) اذان مختصر (۲۰) اذان مختصر
(۱) اذان مختصر (۲) اذان مختصر (۳) اذان مختصر (۴) اذان مختصر (۵) اذان مختصر (۶) اذان مختصر (۷) اذان مختصر (۸) اذان مختصر (۹) اذان مختصر (۱۰) اذان مختصر (۱۱) اذان مختصر (۱۲) اذان مختصر (۱۳) اذان مختصر (۱۴) اذان مختصر (۱۵) اذان مختصر (۱۶) اذان مختصر (۱۷) اذان مختصر (۱۸) اذان مختصر (۱۹) اذان مختصر (۲۰) اذان مختصر
- ۴۔ "پہل کی کوئی قیمت نہیں" (تیسرا طبع) فیروز سنز ایڈٹ لاہور طبع اول ۱۹۸۶ء
(۱) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۲) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۳) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۴) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۵) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۶) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۷) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۸) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۹) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۰) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۱) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۲) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۳) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۴) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۵) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۶) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۷) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۸) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۹) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۲۰) پہل کی کوئی قیمت نہیں
(۱) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۲) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۳) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۴) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۵) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۶) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۷) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۸) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۹) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۰) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۱) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۲) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۳) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۴) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۵) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۶) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۷) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۸) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۱۹) پہل کی کوئی قیمت نہیں (۲۰) پہل کی کوئی قیمت نہیں
- ۵۔ "بوصاحب" (تیسرا طبع) کتبہ ادب لاہور طبع اول ۱۹۶۰ء
- ۶۔ "سبز فائبر" (۱) (۲) (۳) (۴) (۵) (۶) (۷) (۸) (۹) (۱۰) (۱۱) (۱۲) (۱۳) (۱۴) (۱۵) (۱۶) (۱۷) (۱۸) (۱۹) (۲۰)
- ۷۔ "عراق کی جنگ" (۱) (۲) (۳) (۴) (۵) (۶) (۷) (۸) (۹) (۱۰) (۱۱) (۱۲) (۱۳) (۱۴) (۱۵) (۱۶) (۱۷) (۱۸) (۱۹) (۲۰)
- ۸۔ "کہانی پڑھتی ہے" (۱) (۲) (۳) (۴) (۵) (۶) (۷) (۸) (۹) (۱۰) (۱۱) (۱۲) (۱۳) (۱۴) (۱۵) (۱۶) (۱۷) (۱۸) (۱۹) (۲۰)

گلاب دین چٹھی رساں

آقا باہر

ہسٹ آفس کے بچھواڑے والی عمارت کے لیے کمرے میں خاص چل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ آج چٹھی رساؤں کے علاقے بدلے گئے تھے۔ چٹھی رساں گلاب دین کا پیروار تھا۔

کرہا لئی نے اکرام سے پوچھا "گلاب دین کی ماں کیوں مری ہوئی ہے؟"

"بھئی اس کی بدل ہیرا منڈی ہو گئی ہے۔"

کرہا لئی نے ہاتھ آگے کرتے ہوئے کہا "سوں رپ دی؟"

اکرام بولا "سوں رپ دی۔" اور اس نے بھارت کی چیز اس کی طرح اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر دے اور دونوں مکمل کھلا کر دیکھنے پرے

"اس کا کیا مطلب ہوا جی؟ رازقی دینے والا تو خدا ہوتا ہے مجھے خواہ تو کمری کیوں نہ چھوڑنی چڑے۔ میں تو بڑے صاحب کے پاس

اتیل کروں گا۔ آپ خود بھڑا رہیں۔ افسروں کو کچھ خیال کرنا چاہیے کہ کون سا علاقہ کس کو دینا چاہیے۔" گلاب دین اپنے دل کی بیز اس نکال رہا تھا۔

وہ پانچ وقت کا نماز ہی تھا۔ اپنے محلے میں تراویح کی نمازوں میں قرآن خوانی کا انتظام کرنا ہی اس کے ذمے ہوتا تھا۔ انداز میں معراج شریف کا چند واسی کے ایما سے اکٹھا ہوتا اور اسی کے ہاتھوں سے شرح ہوتا تھا۔ سچے دالچمی کے موقع پر محلے کے لڑکے ہالے اس کی ہدایت کے مطابق خوبصورت عراب نماز اور اڑے ہاتے اور جھنڈیاں لگاتے تھے۔ مسجد کے باقاعدہ نمازیوں میں اس کا شمار تھا۔ ویدار لوگوں کی صحبت سے منگلے مسائل سے کبھی غاصی آگاہی ہو جی تھی۔ فرض شناسی اور ایمان داری کی جا پر اپنے پرانے کبھی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مگر آج اس کی عزت کا دم گھٹ رہا تھا، ہیرا منڈی میں خطا باطنے جانے لگا۔ طوائفوں کے گھٹوں پر چڑھ کر آواز دے گا لئی لی جی لکھا آیا۔ غلیظ گلیوں میں جا کر پیشہ وران کو ان کے پاروں کے خط و دے گا جو بھوس سے شروع ہو کر بھوس پر ختم ہو گئے جن کا مضمون صرف بدکاری ہو گا۔ کسی خط میں

اس کی ماحول ہوگی۔ کسی خط میں باپ کا پورا تذکرہ ہو گا۔ اس کی بھانجیاں میں دو دھ کی جگہ لکھیا ہو گا اور باپ کی لکائیوں میں بے غیرتی ہے شرعی ہے حیاتی۔۔۔ دیکھنا بڑا کراٹھ بیٹا۔

لکھے دینی پست باسٹر کہہ رہا تھا "گلاب دین کیوں نہیں ہوتا چاہتا ہے؟"
 سپرد انور بولا "آپ سے کوئی درخواست کرنا چاہتا ہے۔ صرف دو منہ کے لیے پیش ہوئے کو کہہ دیا ہے۔"
 "ہاں؟"

گلاب دین کا چہرہ بڑے صاحب کی لڑائی میں درجہ چڑھ رہا تھا۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔ کھرے ہوئے لب نہ یاد ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ڈاکھی کے بال نہ یاد، گھٹے نظر آ رہے تھے۔ دو شاہی تازہ تازہ دھوکے کے دھماکے کرا رہا تھا۔
 "کہا بات ہے گلاب دین؟"

"جی میں صرف یہ عرض کرنے کو نہیں ہوا ہوں کہ میری تہہ ملی میرا منہ کی کڑی گئی ہے۔۔۔۔۔۔"
 "تو پھر؟"

"جی" اور خیال فرمائیے میں پانچ وقت کا نزاری پر پوز کا راز دی ہوں۔ میری بڑی بہن مرنی ہوگی۔"

اس نے درخواست نکالی کہ میرے رکھوئی اور اپنے خالی کوٹ کی جیب سے کالے والوں کی تصویق نکال کر بولا "مستور جس ہاتھ سے تصویق لکھری جاتی ہے وہ ہمارے کے اڈوں میں جا کر پیشہ ور عورتوں کو کھانا تقسیم کرے گا؟" انتظار اٹھ گھسے یہ نہ ہو سکے گا "جواب۔ میری گزارش ہے کہ گھٹے فیض بارگ کا ملاتہ دے دیا جائے یا میری شادی نہ بندہ دیا جائے۔"

پست باسٹر نے ہچکچاہٹ میں گھماتے ہوئے کہا "تو تمہاری تہہ ملی مستور کی دی جائے؟"
 "آپ کے بچے بچتے رہیں۔ کبھی کبھار کا مطلب تھا۔"

"مستور سے مشکل ہے۔ غور کرنے کے لیے تمہاری عرض رکھے لیتے ہیں۔ مگر اس وقت تہہ ملی مستور نہیں ہو سکتی۔"
 گلاب دین کے سینے میں ایک تیر سا لگا۔

سراج اور گلاب دین دونوں چٹھی رساں پانی واسے تالاب سے ہوتے ہوئے جب لوگڑے کی قبر پر پہنچے تو سراج رک گیا۔ اس نے ہاتھ میں تھامی ہوئی ڈاک کو چھاننا اور بولا "دوبئی گلاب دین آ۔ دوسرے شروع کریں" تو وہ انہیں ہاتھ کو کھوم گیا۔ "دوبئی" یہ پہلا چارہ لیرہ ڈاک کا ہے۔ دوسرے گانے والیاں رہتی ہیں۔"

چھانک کے سامنے جا رہی، بچھانے میں چار دی پیٹھے ناش کھیل رہی تھی۔ مکان کے چاروں طرف ایک عورت کھڑے ہے یہ تو لیرہ ڈاک لے گئے ہالوں کو اٹھکدیں سے جھٹکے دے دے کر کھانا دے رہی تھی۔ وہ پشہ ہونے کی وجہ سے گلاب دین کو دہشت ہے شرم، دکھائی دی۔ ہر جھٹکے کے ساتھ اس کا سینہ۔۔۔ اس کا منہ چاہو، آٹھیس بند کر لے۔ اس نے اپنی بکڑی کا شلہ بکڑ کرنا ک اور منہ چھپا لیا۔

"نکل سے میری جگہ یہ چائیاں تقسیم کیا کریں گے۔"

"جی یہ چائیاں رساں لگے گیا؟"

"جی ہاں"

لمبی لمبی سوچوں والے نے تاش کے چوں کو چارخ سے بند کرتے ہوئے پہلے سراج کو دیکھا، پھر گلاب دین کی طرف لگا، پھر آئی۔ دیکھنے والے کی آنکھیں سرخ تھیں اور چاٹائی کا کافی حصہ اس کے بھاری چہنے نے گھیرا ہوا تھا۔ اس نے ٹکٹا اٹھا کر لمبے کی چادر کو چٹوں میں دے لیا اور باگڑا سودگی سے بچ گیا۔ اس کی پٹلیوں پر منڈے ہوئے ہاتھوں کا کھردرا اظہار پھیلنا ہوا تھا۔

”مفتی! اور اس کا نام کیا ہے؟“ تو جوان چھو کر بے لے پر چھپا۔

سراج نے جواب دیا ”گلاب دین۔“

تو جوان چھو کر بے لے سے پرس کر کہا ”اور انھیں بچل گلاب داسمیری جھوٹی لٹ دیا۔“

”وے شرم نہیں آتی تجھے؟ سلام دعا لینے کی بجائے سطر یاں کرنے لگا۔“ تنقید پر کھڑی ہوئی ملوانف نے ہلکا سا اس نے اپنا ایک پاؤں کھڑے پر اٹھا کر دکھایا جس سے اس کی دو دنی راتوں کا اندازہ لگا لے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتی تھی۔

”لوپ لی لی اپنی شلوار جا کے بھ پھیلے۔“

اس نے اپنا پاؤں کھڑے سے نیچے رکھ لیا اور بولی ”خفے منڈے شرم۔“

سوچوں والے نے ڈبا اٹھا کر گلاب دین سے کہا ”سگرت پیو سو لی جی۔“

گلاب دین بولا ”جی نہیں۔ سمرانی۔“

سراج نے سگرت نکال لی اور سلام پیش کر کے اس کے چل دیا۔

”یہ سوچوں والا کون ہے؟“

”اس لگی کا چہرہ۔“

”اور لہجہ سا چھو کر؟“

”یہ بلو کے چاہے کا لڑکا ہے۔ یہ بلو ہی تو تھی، ماسک کے گیت بہت اچھے لگاتی ہے۔ یہ چنگی جھٹک ملاں کی ہے اور لو پر چہ ہارے میں لگ رہی ہے۔“ اس نے ہاتھ میں بکڑی ڈاک میں سے ایک لافٹ لال کر گلاب دین کو دکھایا ”میں ہر زمانہ کھانا ہارم و سلاخ حرف لگ۔“ وہ سبز صباں چنہ کر گھبراہٹ میں آچپچپ۔ جھٹک خانی پڑی تھی۔ دروازے پر موجوں سے پر دی ہوئی لڑیاں آپ ہی آپ لرز رہی تھیں۔ سراج نے نکلی نکلی چاندنی پر چڑھ چکے ہوئے کہا؟؟؟ چنگی لے کوئی ایک مفتی سے عورت لے آ کر رکھنا اٹھا لیا۔

سراج بولا ”لہجہ کی نکل سے یہ چنگی ورساں چنہیاں اٹھا کریں گے۔“

”اچھا مفتی! اس نے بے دھیمی میں کہا اور اضطراب سے اٹھنے کو دیکھ کر یہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی ”لگ جی چنگی آئی ہے۔“

دانیس پر تاش کھینچنے والوں کے پاس سے گزرتے وقت گلاب دین نے اپنی خالی خالی ٹاہیں ہوا میں ڈال دیں تاکہ وہ لہجہ سا لڑکا اسے بھر داتی ہے کیونکہ وہ نہ سحران کو گوں نے دیکھا بھی نہیں کون گز رہا۔

بازار میں پہنچ کر گلاب دین نے ایک لمبا سا سانس لیا اور شیلے کے سر سے ہاتھ پر چھوا۔ سراج کہہ رہا تھا ”یہ نکا پاں والا ہے۔ یہ شہا بے کی دکان ہے۔ شہا بے کے پاں ساری ہیرا سہی میں مشہور ہیں۔ یہ اس کا شاگرد ہے۔ دن کو یہ بیٹھتا ہے۔ شہا باس وقت سوتا ہوا ہو گا۔ شام کو جیتے گا۔ پاں سگرت کی دکان میں دانی کے لڑے ہیں مولوی بی۔“

اس وقت گلاب دین کو چپ گئی ہوئی تھی۔ دوسرا جگہ کیوں براہ راست خطاب پر چمک چلا۔ بولا ”خدا کا رستہ کسے ان لوگوں کو۔“
 ”بازار میں یہ لوگ جو ہم کو اس وقت دکلاؤں پر بیٹھے خطرہ ہے ہیں یہ طوائفوں کے ملازم ہیں۔“
 ایک گلی کے سرے پر کھڑے ہو کر سراج چلتی دھڑکیوں کو بھر بھرا کر دیکھا۔ اس گلی میں چھوٹے کپڑے والی بیٹھتی ہیں۔ ”سراج نے بغیر کسی ہڈ بے کے کوہے گا تو کچھ طرح کا اور گلاب دین کو لے کر آئے گا۔ اس گلی میں سے سڑے ہوئے خرید و دوں کی بو آ رہی تھی۔ گلاب دین نے شیلے سے بھرا پتلا تھک لیا اور عاجزی سے بولا ”اس گلی میں جانا ضروری ہے؟“
 ”صرف ایک خط ہے۔“
 ”کس کا؟“

”تنگروں کے چودھری صاحب کو۔ اس گلی کی بہت کم چھتیاں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ہوتی ہے تو وہ چودھری کی یا کسی دکان کی ہوتی ہے۔“
 چودھری کی خضاب گئی ڈاڑھی تھی۔ وہ چار پائی پر بیٹھا تھا لی راجا اور ایک شخص اس کی پنڈلیوں سوختہ راجا۔ قریب ہی ایک محل بلایا بیٹھا تھا۔

”مکہ صاحب؟“ اس نے چلتی دھڑکیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔
 ”چودھری آپ کی یہ چھتی تھی۔“

”کسیاں اپنی اپنی دھڑکیوں پر لوہے کی کرسیاں رکھنے چلتی تھیں۔ چروں پر پھکار برس رہی تھی۔ گلاب دین نظریں نیچی کیے سراج کے ساتھ ساتھ گزرتا ہوا تھا۔ جسے کسی عورت کی آواز آئی ”میاں صاحب چوہری کمانی ہے؟“
 گلاب دین نے چوہری کو دیکھا۔ ایک کبھی نے اپنے دروازے پر طوطے کا بگڑا لٹکا رکھا تھا۔ چلتی دھڑکیوں کو دیکھ کر بولی ”مٹی تھی“
 دھاری کوئی چلتی نہیں آئی؟

سراج نے جب گلی میں سر ہلایا تو بولی ”ہائے میں کوئی چھتی نہیں لکھت۔“
 دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ دو پتلا تارے ”چند اکڑا“ نے ایک عورت کو کھڑی تھی۔ بولی ”یاراں بھئی اب تجھے کون چھتی لکھے گا۔ سر کے حیرے سب یار چھتیاں لکھتے والے۔“

یہ دونوں آگے نکل گئے۔ سراج نے کہا ”طوطے والی عورت کا نام گلابو ہے۔ اس گلی کی ساری روٹی اس کے دم سے ہے۔ بہت سے تماشین اس گلی میں اسی کی خاطر آتے ہیں۔“

گلابو کے سے ٹھک جاتی چارہ تھی۔ تماشین جو چھوڑے چھوڑے دکھائی دیتے تھے اب ان کی وجہ سے راستہ رکنا ہوا محسوس ہوا تھا۔
 گلاب دین کا دم کھلے گا۔ اس نے کھلی سڑک پر پہنچ کر طینان کا سانس لیا۔ بکڑی کے شیلے سے ہاتھ پھینکا اور ہورا ڈاڑھی پر ہاتھ بھیرا۔ ڈاڑھی پر ہاتھ بھیرتے وقت اسے یاد آتا کہ اس نے تماشینوں کے درپے میں ایک ڈاڑھی والے کو بھی دیکھا تھا؟ جس نے ہاتھ پر ہاتھ لپٹا ہوا تھا اور بھر بھرنگوں کے چودھری کی خضاب دیکھی تھی اور ڈاڑھی اسے یاد آئی۔ وہ اٹھ چکا تھا اور اپنے کام سے چڑا رہی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوجھ بوجھ اس کی لون چل کی دکان ہوتی۔ آرام سے بیٹھا دکھائی دیتا۔ اسے معلوم نہیں ناگوں کے لڑے تک پہنچنے میں کتنا وقت لگا۔ سینا کے قریب کا محل اسے کچھ مختلف لگا۔ اس کا کالی چادر میروں پر چھوڑ کر آتے جاتے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اس کے اصرار سے کچھ ادا ہو جاتے۔

دہائی تھیں۔ ان کی پردہائی کو ایک دیکھ لانا محض لال نے بھا کر دیا تھا اور یہ کتاب وہ سب سے چھوٹی لڑکی میراٹھارہ کے لیے کسی ایسے دیکھ کی تاک میں تھی۔ گزشتہ روز وہ کوہنہ بھرے کے لیے گلیوگڑ جا رہا تھا تو دروازے سے میراٹھارہ کو کس طرح چھایا تھا اور وہ جھول ان کے تھکنے پہنے ہوئے موسیٰ گڑیا دکھائی دیتی تھی۔ بدردہ اور قدہ رو کے باپ کا نام مہدا کریم تھا اور بھائی کا نام قہم تھا جو کانوں میں مندریں پہنے رہتا تھا۔ اچھا کھانا، اچھا پہنا اور کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ بدردہ اور قدہ رو کی ماں سخت پردہ کرتی تھی۔

زیرہ و مشتری کے مگر مونسے مونسے چوڑوں والی عورت جو کرکٹ بولے لکھن نھر آتی تھی وہ زیرہ و مشتری کی سوتیلی بہن ہے، جسے انہوں نے کھانے کی علت سے اسی طرح کوئی کھا کر لیت جاتی ہے۔ زیرہ و مشتری کی ماں پردہ کرتی ہے اور پچھلے سال راج کرنے لگی تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی مگر ماں کے سامنے بدردہ اور قدہ رو کی ماں بھی راج کرنے کی خواہش کا اظہار کرتی رہتی ہے۔ مگر مہدا کریم اور اس کی بیٹیوں کی بیٹیوں اس لیے عادی نہیں ابھرتیں کہ ماں کی صحت کمزور ہے۔

گلاب دین کو بھی یہی معلوم ہو گیا کہ جس گانے والی کی خوشگد زیادہ چٹکے دوسرے کے مگر فرار خدائی جاتی ہے کہ لال کے ہاں آج کل زیادہ سوسائٹیاں آتی ہیں۔ یہ سب کام ملوانکوں کے ملازم کرتے ہیں عورت کو اور مرد مرد کرتے رہتے ہیں۔ دن بھر دکانوں پر بیٹھے تاش کھیلنے ہیں اور ہر دن والوں سے بڑے کی سیاسیاں پیتے ہیں۔

جن جن دکانوں کے دوسراؤں پر دن کو سوئی سوئی تھیں اور چہ داداٹ لگے تھے چہ عورت کو انہیں دکانوں کے دوسرے اس زور سے کھلتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے حق اور بات کی دیکھا بات لگتی ہیں۔ اسے یہ سب مکان پر اسرار نظر آتے تھے۔

وہ ایک دن تھا اور تھا۔ پاس بھی لگی ہوئی تھی۔ اس کا بی مہدا کریم کے مگر کی لپٹے کو چاہا۔ اس نے سوچا یہ چار چٹیاں بات کر چوک کی طرف مڑ جائے گا۔ جوں ہی وہ چٹیاں پاس ہائے لگی میں داخل ہوا، وہاں شور مچا ہوا تھا۔ مسکن کی ایک دھڑی سے لڑائی ہو رہی تھی۔ چند دھڑیاں کھڑی تھیں اور دیکھ رہی تھیں۔ وہ گلاب دین وہاں سے گزرنے لگا تو مسکن اپنی مخالف دھڑی کی طرف الجھ رہا اشارہ کر کے بولی "ہانی، جتنے جتنی رساں"

"ہانی، کئی کچھ، جتنے جتنی رساں" دوسری نے پلٹ کر جواب دیا۔

سب دھڑیاں کھل کھلا کر غصہ چڑیں اور گلاب دین بھی چٹیاں ہائے لگی میں سے نکل آیا اور مہدا کریم کے پاس پہنچا جو اپنی بیوی دھڑی میں بیٹھا تھا لی رہا تھا "خیر ہے؟ آپ کو کچھ گھبرانے ہوئے ہیں؟"

گلاب دین نے بکڑی کے شیلے سے ہاتھ پر لٹکا اور مردانہ تصدیق کر دیا۔

مہدا کریم اگلے روز گلاب دین کو چودھری حاتق کے پاس لے گیا، جس نے انھار کی مسکن کو خوب چنا اور گلاب دین سے کہنے لگا "دیکھو، مٹی سی۔ آپ نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ گلاب کی لگی سے گزرتے وقت بھونک لکڑی آپ کو گھٹک لے گیا کرتی تھی۔ جب آپ گزرتے وہ گلاب سے کہتی "تی تیرا قصم غلاب دین آج آئی۔" مجھ سے یہ شکایت دوسری رطہ میں نے کی تھی اور میں نے ایک دن اس بات پر بھونک کی پہلیاں لگی تو ذی تھیں۔ میں تو آپ کا بیٹا ہی بن گیا ہوں ہے، مٹی سی۔ مگر ایک بات آپ سے کہنی ہے مجھے، وہ یہ کہ گلاب دین سے آپ مردوں کی طرح گزرا کر میں۔ کمسر دین کی طرح نہیں۔ اس علاقے میں تو آدمی کو بنو اور اس کو ہر کر دینا ہے۔"

جب گلاب دین مہدا کریم کے ساتھ اس کے مگر پہنچا تو ادھڑی سے باہر ایک لکھی سی بڑا کھڑکی دیکھ کر مہدا کریم بولا "میرا خیال ہے،

رانا ہوری آئے ہیں۔“

جینک میں خندہ صوفے پر، جس کا لٹاف پرانی میل سے موسم چاندنی چکا تھا اور اس صاحب بیٹھے تھے۔ صوفے کے بازو پر بدو ٹٹھی تھی اور مہر دار بال سنگ کے تھان کو اپنے بازوؤں سے تاپ رہی تھی۔ پہلے بازوؤں سے اس کے سینے کی گوری گولا نیاں سامنے آ کر آٹھیں اڑا رہی تھیں۔

رانا سے ہاتھ ملا کر مہا کریم گاؤں گئے پر نہ کیا اور مہر دے بولا ”گھنے سے کو فٹنی کو لسی چائے۔“

بدو بولی ”دو بازو لگیا ہے۔ میں جاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ صوفے کے بازو پر سے اٹھ بیٹھی اور اندر سے لسی کا ایک گلاس ڈاکر گلاب دین کے ہاتھ میں دے باہر پر اسرار طریقے سے آہستہ سے بولی ”آپ ابھی جا نہیں مت۔“

وہ وہاں سے اپنی رہنمائی منظور کر ہاتھوں میں سنبھالی تاپ کر پڑا۔ آہستہ سے اس نے بچھی۔ وہاں سے جینک میں آ کر رانا سے بولی ”کساں ہوری اندر بیٹھے بیٹھیں کا سودا کر رہے ہیں۔“

بھر پاپ کی طرف دیکھ کر کہنے لگی ”مٹھی مٹی کہتے ہیں بیٹھیں کا مالک کہتا ہے، لیوا ہے تو وہ دین میں آ کر پناہ لے جائیں۔“

تاپ نے سکرا کر رانا کی طرف دیکھا اور بولا ”یہ وہاں بیٹھیں پاری پاری لسی ملاتی ہیں۔ اصل میں درانی اب ہاری بیٹھیں سوکھ لگی ہے۔ روز کبھی تھیں یا، جی لے دو۔“

رانا بھینکی لگا ہیں بدو کے چہرے پر ڈال کر بولا ”تو لے لو نا۔ کتنے میں دیتا ہے؟“

”کیوں باہی، آٹھ سو لگتا ہے؟“

”ایسا جہ۔“

”کل تھ سے چیک لے لیا۔“ رانا بڑی بے غرضی سے بولا۔

بدو نے چہ پنچا پن سے وہیں کھڑے کھڑے کہا ”اچھا مٹھی مٹی، آپ اب جائیں۔ ڈوگر سے کہہ دیں، ابائی آ کر بیٹھیں لے جائیں گے۔“

بیٹھیں؟ کیسی بیٹھیں؟ وہ سوچتے لگا۔

اس نے باہر لٹھے کی بنڈازی سے پرچا ”یہ رانا ہوری کون ہیں؟“

”جس نے بدو کو مرفر لگایا تھا، اس کا مٹھی ہے۔ کوکے سے آیا ہے۔ جو لے نہ ہو مٹھی مٹی۔ بال لایا ہوگا۔ اب چھوٹی بھی جوان ہوئی ہے۔“ اسٹراگل آوی ہے۔“

اسٹراگل کیا ہوتا ہے؟ وہ سوچا اور گڑ سے کی قبر کی طرف چل دیا۔

انگے دروازے رانا کو کھینکے کاٹھنی بھر بدو کے گھر لے گیا۔ جینک میں ساتھ ساتھ دو جنگ گچے تھے۔ ایک پر رانا بیٹھائی سے چھوٹا رانا ہوری پر جانے کی جالیوں وغیرہ بکھری چڑی تھیں۔ اس کا لازم نکھار آہ سے اس کو طی میں بادامہ گڑ رہا تھا اور بدو کا بھائی قہم رہنمائی تہہ کو سیٹھ منڈی ہوئی ہڈیاں لگی کیسے اس کے پاس بیٹھا کہہ دیا تہہ سے رہا تھا۔ قہم رانا ہوری کا بھائی پر بیٹھی بسن چھیل رہی تھیں۔

”چھوٹا ہوری جی کر گرا۔“

”نہیں، مٹی جی۔ میری کوئی چٹھی نہیں آئی؟“ میری جلدی سے میں کہہ لی جیسے وہ دن میں اسے ہانگ گئے ہوں۔

”میری چٹھی کہاں سے آئے گی مجھے“ تو وہ نے سمجھتے سے اس کا پتا کاٹ دیا۔ ساتھ کے کمرے سے دھواں اگل آئی۔ جس نے نہایت خوبصورت سوٹ پہن رکھا تھا اس کے ہاتھ میں خوشبو کی شیشی تھی جو وہ اپنے لباس پر پھڑک رہی تھی۔ کچھ خوشبو اس نے دانا پر پھڑکی اور کوئی ”مٹی جی، کوئی“ کی سوگات لیٹے جا رہے۔ یہ چار سو زہرہ مشتری کے کمرے میں جا نہیں سو رہے آپ کا صاحب۔“

یہ دو نے ایک پلاٹو میں سے چھ سرسرا سب لال کرگلاب دیں کو تھا دیے جو اس نے اپنے پلاٹے کے خیلے میں اڑا لیے اور لیے لیے سانسوں سے خوشبو کی لٹکیں لیتا ہوا ہمارے گھر گیا۔

زہرہ مشتری اپنی دھنک میں دو اجنبیوں کے ساتھ تھیں وہی کھیل رہی تھیں کہ گلاب دیں نے ہا کر سب ان کے سامنے رکھ دیے۔ دونوں بچوں نے سخی خیر نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا ”مٹی جی، دیکھ چڑھی ہے ان کے کمرے؟“ زہرہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

”میں نے نہیں دیکھی“ گلاب دیں نے جواب دیا۔

برآمدے میں ان کی سوتیلی بہن کے قہقہے سے نے کوٹ بدل کر گلاب دیں کی طرف دیکھا اور ہلچل مچا دی۔

انگلے دن راک چھانچنے وقت اسے زہرہ کے نام کی چٹھی ملی۔ وہ چاہتا تھا کہ بدو یا قدرہ کی چٹھی ملے تاکہ آج بھر اس کا بیکھرا رہے۔ سہ پہر کو جب وہ ہاتھ میں زہرہ کی چٹھی لیے مکان میں داخل ہوا تو زہرہ اور مشتری پہنچی خود کھینے لگی ہوئی تھیں۔ دانا برآمدے میں ان کی بہن سے چہلپوں کر رہا تھا جو اسے اپنی چٹھی مونی مونی گالیاں دے رہی تھی۔

اور بیکس خریدنے کے کو رقم دے آیا ہے۔ اور بیکس کی چٹکی لے رہا ہے۔ دانا استراگل آ رہی ہے یا بھینسوں کا سودا کر گلاب دیں یہ سوچتا ہوا ہمارے گھر آیا۔

تین روز بعد اسے اڑتی اڑتی ایک خبر ملی۔ اس نے سوچا، بڑا ڈی کی دکان اس کے سامنے ہے مای سے قصد ہی کرنی چاہیے۔

بڑا ڈی ہوا ”بھوتم نے سنا ہے، ٹھیک ہے۔ دانا تو میرے لیے چار تھا۔ مگر بدو کی ماں نہیں مانی۔“

گلاب دیں نے پوچھا ”عبدالکریم اور قیمہ ماضی تھے؟“

”قیمہ تو سر دانا کی گھوٹ گھوٹ کر پاتا تھا“ بڑا ڈی مسکرا کر بولا ”جس کا مال اس کا مال مٹی جی۔“

خوبصورتی کس طرح چنی جا سکتی ہے۔ جسم کس طرح فروخت ہو سکتا ہے۔ وہ اس طرح کی باتیں سوچتا بھی جاتا، بازار میں چلتی بھرتی ہوا انھوں کو نہانی دھن سے دیکھتا بھی جاتا اور چننا بھی باغتا جاتا۔ اس نے اپنے کام سے کام رکھا اور کتنے ہی دن بدو قدرہ کے گھر نہ گیا۔ ایک روز اسے مونی بازار میں عبدالکریم ملا جس کی رہائی اسے معلوم ہوا کہ انھوں نے اب اپنی بیکس خرید لی ہے۔ عبدالکریم نے کہا ”کسی روز آ جا۔ ہمارے گھر چلے گئے ہیں۔“

ایک روز بدو کے نام ہانچ سو روپے کا کٹی آ رہا تھا۔ گلاب دیں نے پتہ چلا۔ دانا حیات خلی نے کوٹے سے کچھ چاہا۔ آخر میں کھانا تھا چلے کے لیے دو روپے تنگ رہا ہوں۔ مجھے بھی اس دن یاد کر لیا۔

وہ چلتی تھا کہ اندر گیا تو بدو چار پائی پر پٹی سرگرتے لی رہی تھی۔ آہٹ من کر اٹھ ٹٹھی ”شکر ہے آپ بھی آئے مٹی جی۔“

”کوئی دیا ہی نہیں تھا۔“

"کتابتِ کتبِ آفاقیہ و اسلامیہ کا قیام اور تحریکِ تعلیم کے لیے سب سے پہلے"

کمرہ میں سے مہیا لکڑی بھری گلی لٹائی۔ مٹی آؤ راکھ اس کمرے کی پانچویں کھلی گئیں۔ مرد بھی بچھڑا اٹھا۔ بھاگی بھاگی باہر چلی آئی۔

”اب فقیہی ہی آپ اور اکا فکر فیصلے کر بیٹھ جائیں۔ گاکی انہوں نے حقائق اٹھائے۔“

میر نے حقاً کر باپ کے پاس دیکھ دیا جس نے حد میں نے لے کر گلاب دیجی کو دیکھی کا مسالا لکھوا تا شروع کر دیا۔ گلاب دین کی حیرت دور کرنے کو عید انکریم نے کہا "ہم قزاقی کا کی کی خوشی کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ قیامت کا ارادہ آ رہی ہے۔ کل میں بارہ آپ جا کر سونا لے آئیں گے۔ آئی کوئی سچہ نہیں ہے۔"

اس بات پر حیرت میں قدم مارا اور دردِ دل کی کچی کھمبائی گویا گویا کھنکھناتی ہوئی گئی۔ مہر و کچے فرشتے پر پانی مارے بس جس جھلپتی رہی۔ گلاب دھین نے اپنے کان پر اٹکی ہوئی غسل گواہ کر صیغہ میں رکھنے ہوئے آج پر چھوٹی لیا۔

“We’ve got to go!”

تو نے کہا "ہمارے گمراہوں میں اس کا کیا ہے اور میرے آدمیوں کے لیے کیا ہے اس میں فرق ہے۔"

بدو بولی: ”ہم وہی بھڑکیا کام کریں۔ اسی طرح اماں کا اچھو بٹائی ہوں۔“ ”نمرود جی! اچھوت دکھانے کے لیے اور جیڑی سے لمس چھینے لگی۔

”کلمہ تحریر کئے۔ اب اقرار کرو کہ یہ لفظ ہے۔“ مہربان کریم کتاب دینی کے کلمہ سے آگے بڑھتے ہوئے لکھا۔

انہوں نے باسٹی چاول، مصالحہ تھی اور سالے کی ہلکیاں جاتے۔ سدا کار کو بچہ زمیں میں دیکھ کر میں کوئی بھی رشتہ۔ عبدالکریم کے کہنے پر گھوڑا مارے۔ چنے کا ایک سیٹ لے کر آیا۔ وہ چنے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ بد وقتہ ردا اور میرا تینوں شخص بھی سہانے بیٹھک میں داخل ہو گئے۔ چور فٹس کوئی "ابا بک" ہوتے تو ردا سے آئے ہیں۔"

آج جو معمول سے زیادہ چلن اور جاوے نظر دکھائی دے رہی تھی۔ یہ قدر کا بدن گھڑایا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگ کی کھل پر ہار چمک رہی تھی۔ اور صبر پر رہا وہ لاپ کی رنگینیاں لپے ان کے صبر کا پس میں نظر تھی۔ جسے وہ عملی نگہری بدلیوں کے صبر کا پس بھی کی ٹانگ۔

پرادرگرام یہ تھا کہ اتوار کو دو چیرکا کھانا اور راستہ کو گانا۔ گلاب دین کی طرف سے جب لاعلمی مل اٹھتا تو عبدالکریم نے کہا: "مفتی جی، آپ کو کوئی اور سے تو نہیں۔" ہمارے گھروں میں آپ کو کون نہیں جانتا۔ راول قوم نے زیادہ لوگوں کو بلایا نہیں۔ یہاں اڑس چاروس کے چند گھروں کو بلایا ہے۔ یاتی رہا گا۔ اتوار آپ کی مرضی ہے۔"

”ماں کا دل بڑا بڑا ہے، بڑا بڑا ہے۔“

قد دے کہ اے چادرِ تنگیں کی گرفت و سٹان کو۔۔ کیوں دہائی؟

— ۱۲۸ —

قدو نے سکرے کی اوجھڑائی کے آگے کوئی جسٹس لگا رہی ہے ایک سکرے کا لکڑی کا۔

”ہیں آپ! ایک بات کہ سچے خدا دہریہ آ جا نہیں۔“

بچے کی شام کو مائی نے چھلکا کاڑھ دیا اور اتار کی بیج کو اس کے دوستاچیوں نے آکر کام سنبھال لیا۔ جاوتری، ٹونگ، داروگائی اور دوسروں کی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی اور دیکھو! میں بڑا فیکٹر گرڈ بن چکے۔

گلاب دین بیوا کتنی غصہ تھا۔ عبدالکریم نے استاد نور الدین اور شعی گلاب دین کو بنگلوں کی نگرانی پر بلوا دیا۔

بدو کے سازندوں نے دالانوں میں کمرے کی چاندیاں بچھا دیں۔ قلم اور اس کے دوستوں نے گاؤں ٹھیکہ لگا دیے۔ پھر آٹھ ماہوں پر گلاب پاشیاں رکھ دیں اور پچھنے لگا "آپا بدو ٹھیک ہے؟"

اس نے کہا "ہاں۔ جیتے رہو۔ ٹھیک ہے۔"

"آپا سگرت کے لیے کچھ پیسے قودے دو۔" بدو نے اس روپے کا ٹوٹ دے دیا۔ دو سو عریاب ہوئی، یہ قدرہ کو لے آیا اور بولا "بلی بلی، اگلا انتظام ٹھیک ہے؟"

اس نے کمروں کا جائزہ لے کر کہا "ٹھیک ہے۔"

"بلی بلی سگرت کے لیے کچھ پیسہ دو۔" اس سے بھی اس روپے کا ٹوٹ اچھٹا لیا۔

دو ہر ہوئی تو طوائفوں کی فوٹیاں آتی شروع ہو گئیں۔ انھیں میں سگرت لیے ہوئے، چھاپہ چٹائیں، سرکوشیاں کرتیں، رنگا رنگ آوازیں، رنگا رنگ لباس، گدے چرے، دستلائے چرے، بھرے پتے، چنگی کمری، دلیری کی تمام لوازمات اور غزے، ہر شے و کچھاب کے قاتلوں میں لپٹے ہوئے۔ کچھ جوان، کچھ مسرہر، کچھ کوجیز۔ دالان جیسے قریحوں اور کورتوں کی فزائوں سے چمک اٹھا۔ نور پلاؤ شیر مال اور قورہ برتا گیا۔ ایک آٹا ایک چارہ پا۔ زیادہ قریحوں کے گھر کھانا بیچنا دیا گیا۔ اس جھوم دلیراں میں گھرے ہوئے گلاب دین کی نیچے کی سانس لپچے اور ہکی اوج۔

مہمانوں کا بھنگان ہو چکا تو برتائے دالوں کی باری آئی۔ پھر سب کھانا کھا کر دالان میں بھیجی چاندنی پر لیت کر سگرت کا دھواں اڑانے لگے۔ نالی اچھی دھکیں اور دھولے سنبھالنے لگا "پانچویں، اپنے بھٹی رساں کو کچھ دیا ہے یا نہیں؟"

استاد نور الدین بیوا "بلی بلی نے چاول دیے تھے۔"

برآمدے میں سے بدو ہوئی "میں نے دوپے تھے، ہا ہا۔"

"تو اے لیے ہمیشہ بھی خبریں لاتا ہے۔"

راست کو جب گلاب دین پہنچا، انھیں ساج بنگی تھی۔ فیروزہ نے سنے کا سوٹ لیکن رکھا تھا۔ اس کی سڈول گاٹیاں سونے کی جواڑیوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ زہرہ نے ساڑھی کے ساتھ برائے نام یلی چولی پہن رکھی تھی۔ جب ساڑھی کا پلے سرک جاتا تو سامنے سے اس کا کسا کسا پیٹ اور پیچھے سے بنگی بنگی کمر دکھائی دے لگتی۔ گنگ نے جواڑی دار پا پاتے پر گھبردار تھیں لیکن رکھی تھی، دھسے اکبر کے رانے کی سٹین۔ جب بنگی تو جوتی کے سارے اور قریحوں کی کوٹ کے ہالے مسلسل مسلسل کرتے۔ رنجی غرارے میں مشخری کے سر میں بنگی کے دوپٹوں کی طرح رگڑا رہے تھے۔ غرارے کو انہوں نے اس طرح بھر دیا تھا جیسے اس میں اڑے گئے ہیں۔ مشخری کی چھوٹی بھین جو چھ مہینے ہوئے آجا کا سٹی لے رہی تھی۔ آج بچکانی نہیں جاتی تھی۔ اس نے اسے پر چھوڑ رکھا تھا۔ بنگوں کے کٹاؤں کی اشعارے اور کی لگاؤ میں ملی رہی تھی۔ شعل جو لالائی احر سے احرانے آپ دکھائی پھر رہی تھی۔ لہو پھلجوری بنی ہوئی تھی۔ اس نے سینے پر دو چائے باغداد کے تھے۔ اس کے کئی روپ تھے۔ مہتابی، انارہ پ پت، گولہ، لیکن بھلیاں نہیں تھیں۔ تمام بھلیاں آج بدو کے حصے میں آ گئی تھیں جس کی لم بھڑی آنکھوں پر دراز بھکیں تھیں ہوئی تھیں اور نسواہت کے اور بنگی پر تو سے چہرہ دک رہا تھا۔ وہ بان لال بنگی کی مشخری لیے چاروں طرف تواضع میں جتی ہوئی تھی۔ قدرہ ہونٹ کچھ کچھ کر

ہاتھ کرتی تو اس کے ہونٹوں کی پرقوتی تراش اور بھی غصہ و ساقی۔ وہ اپنی انگلیوں کی خفیف سی حرکت سے اپنے کئے ہوئے بالوں کو گردن سے ہٹاتی تو یہں لگتا جیسے انگلیوں کی چوڑوں سے طوریں شیشی کی پھوڑ پڑ رہی ہے۔

مرد و عورتی نہیں گنتی تھی۔ اس کی وہاں دہرا آنکھوں میں اتنی تھلاہٹ کہاں سے آئی تھی۔ چہ کڑیاں بھرتی بھر رہی تھی۔ تنگ لباس میں اس کا دمک انگ نظر آ رہا تھا۔ چوٹی ہی تختی اس کے بڑے بڑے راسوں اور اس کے خیاٹوں کی پٹلی کنارہ تھی۔ اسے میں ایک جڑ والا دریا یا۔ سرو قد لڑکی، چھوٹے ہونٹوں قدم اٹھاتی، سستے ہوئے ریشم کی طرح محفل میں داخل ہوئی۔ بڑی نزاکت سے ہاتھ کو توں جا کر سب کو آداب کیا۔

دوران کی دلایز پر بیٹھے گلاب، دین نے پوچھا "قیمتی، پوٹری کون ہے؟"

دلایز نے ہوئے ہوا "شومیری پھوڑی کی لڑکی۔ خیر خواہ صاحب کے گھر میں ہے۔"

گلاب دین کے چہنے میں جیسے بہت سی سانس دکی ہوئی تھی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی۔ وہ خیر خواہ کی خوشی میں چند منیاں ہانٹ چکا تھا۔ وہ انہیں جانتا تھا۔

سر راہ کھلے ہوئے سارے پھول ساٹنے کے درخا اٹھنے ہو گئے تھے۔ رنگ رنگ چہنے کھیلنے و کھٹکے چہرے پھولوں کا گدستہ بنے دکھائی دے رہے تھے۔ جا رنگ کے ساتھ کھیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خیر خواہ صاحب ان صوفوں پر جا بیٹھے جو مرد و عورتوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک طرف کو چھڑ کر گئے کا احوال اڑانے والے سازندوں میں سے ایک آدھ نے انہیں سلام کیا اور اپنے سازے کر کا لیلوں پر آ بیٹھے۔ سب سے پہلے آ ہوئے دم خور و شتری کی چھوٹی بھینا اس کو پکڑ کر بٹھا دیا گیا۔ اس کے گانے کے بعد شومیر چا "درد درد۔"

بدرد نے اپنی گھٹی پکوں کو اوپر اٹھایا مردوں کی طرف منکرا کر دیکھا۔ ہار محفل کا ایک نظر سے جا نکرہ لیا اور اپنی ریشمی کی کرچ کو چنگیوں میں تمام کر پانچے سنبھالی گج میں آ بیٹھی۔ گلاب دین دلایز پر اور اونچا ہو گیا۔ اس نے بدرد کو اس رنگ میں کب دیکھا تھا۔ یا انہیں بدرد کی آواز کا لہر اٹھا اور دم گھم۔ ایک صہان نے ٹوٹ نکالا۔

گلاب دین نے ساتھ واسے سے پوچھا "کتنے کا ہے؟"

"ہں کا۔"

گلاب دین کے چہنے سے ہمارا ایک لمبی سانس اٹھی جو مرد سے دکی پڑی تھی۔ وہ سوچنے لگا بدرد کے اعضا میں یہ چنگیا ہیں کہاں سے اترا آ رہا ہے اس کی آواز بھرتی جا رہی تھی۔ ایک ہونٹ دھوٹ "نہیں جا رہا ہے۔"

"یہ کون لوگ ہیں؟"

"اپنے اپنے ملاقاتی ہیں۔ اپنی والدین کو سلام کیا دے رہے ہیں۔"

اب خیر خواہ صاحب نے ٹوٹ دیا ہار شومیر نے خیر خواہ صاحب نے ہار شومیر نے سب بیٹھے گئے۔

بدرد و دوزخیں کا کرچی نزاکت کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔ اب گلاب دین سے فرمائش ہوئی۔ گلاب نے کچے دھاک سے آواز کیا۔ جب گلاب کھانا گیا تو ساقی نامہ شروع کیا۔ آواز کا جاوا ملاقاتیوں کے سرچڑھ کر ٹوٹ پر ٹوٹ دلوٹے لگے۔ گلاب نے جوش میں آ کر گھٹکرو داندھ لیے تو سارے لوگ خوشی سے تانیاں بیٹھے گئے اس نے جاوے دے دے کر کس کس صحن ادا نکلی سے ادا و سب کی چنگیاں لیں۔ کس کس شان و درباری سے

جائیں۔ صاحبان کے بول کا تے وقت آواز کو اس طرح سمیٹ لیتی جیسے لہروں پر چاندنی رات میں چھوٹے چھوٹے پھول پڑنے لگیں۔ وہ ٹوٹ سمیٹتی جاتی اور ٹھنسل پرانی لہجہ آواز کا صحر پہنچتی جاتی تھی۔

ایک کہتے بہار تھی جو ستاروں کی جھلکاوی روشنیوں کے ہر کاب گز رنگی۔ مولوی نگاہ دین اعلان ہوتے ہی شاہی مسجد کے ایک دکان میں سے اٹھا اور عرض کے قطرے پانی سے منسوخ کیا۔ آج لاز پڑھنے میں اسے برا لطف آیا، خدا کے اس وسیع و عریض مگر میں اور نگاہ دین کی کشادگی دل میں بڑی مماثلت تھی۔ اس نے لمبے لمبے بھوے کیے اور دوا نہ ہو گیا۔ اس نے آس پاس کے علاقے کی ڈاک تو دوپہر کو ہانڈ دی اور چٹاپاں جو اس طرف کی تھی ان کو رکھ دیا کہ سر پھر کو نکلیں۔ جب سر پھر کو اس نے مہدا کریم کے گھر جھانکا تو سب سوئے پڑے تھے۔ انکے دروازہ پر نگاہ دین نے جتنی اٹھا کر دیکھا تو سب لوگ بیٹھک میں لیٹے ہوئے تھے۔

”آؤ بھئی جی کیا حال ہے؟“

”میں کل آیا تھا۔ آپ سب سوئے پڑے تھے۔“

”برا حال تمہارا۔ لڑکیاں تنک گئی تھیں۔ کیوں آج بھی روٹی روٹی روٹی؟ مہدا کریم نے کیا۔“

”اوہی روٹی کمال ہو گیا۔ تنک ہی نے تو حد کر دی۔“

”ابھی تمہارے آنے سے وہ منٹ پہلے تھی۔ چار سو ہو گیا اسے۔ لڑکیوں کو اپنے ساتھ بری امام لے جانے کو کر دی تھی۔ پچھلے سال تھی تھی۔ بہت کچھ لڑائی تھی۔“

”بھرا؟“

”بھر پہ بھی تیار ہو گئی ہیں۔“

”درویش کھینچنے پھینچنے ہوئی“ (مراٹھ کا حضور ہے۔“

چند روز تک بچوں کی ہر وقت توجہ کپڑے سٹوانے پر رہی۔ وزی آقا تھا، چاچا تھا۔ کچھ کو ڈانٹ پر ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ آخر ساتاروں نے قہقہے دے کر دھڑک دیا۔ بچوں کو کہہ کر اس دن کے لیے بری امام کے ٹیلے پر چلے گئے۔

مہدا کریم کو اس کے خط کا بڑا انتظار رہا۔ نگاہ دین خط لایا تو مہدا کریم جھٹکتے جھٹکتے منہ میں سے نکال کر بولا ”تم سے کون سا بھائی آ رہا ہے؟“

”درویش نے خط میں لکھا تھا کہ چڑی بھٹی کر میرت کے ساتھ نور پور پہنچ گئے ہیں، یہاں دو کمروں کا بھناڑا رمل گیا ہے۔ رات کو چوکی دیں گے تو اندر لوگ تنکے کا میلہ کیا گیا ہے گا۔ ایسے میلہ بہت بھرا ہے۔ چاروں طرف سے طرح طرح کی گانے والیاں آتی ہیں۔ کیا بھی آ رہی ہیں۔ سنا ہے یہ میلہ اگلے سال نہیں لگے گا۔ تنکے آپ کی بچی بد۔“

درویش آقا جس میں لکھا تھا کہ خدا کے فضل و کرم سے پہلے کے ساتھ ہم بھی بہت اچھے جا رہے ہیں۔ پانچ دن کی آمدنی کی چار ہزار ہوئی ہے جو استانی آج چڑی جا کر دوا کر رہے ہیں۔ ہم اندر والوں کو لاہور پہنچ جائیں گے۔ ہمارے آنے سے پہلے صفوں کا کپڑا بدلوائیں صفوں کے ہر رنگ بھی اچھے ہو چکے ہیں، ابھی ٹھیک کر لیں بلکہ سونے ہی سے غریب لیں۔ پردے بھی نئے ڈالوائیں۔ سستی نہ کریں۔ وہاں کی یہ ہے کہ مہرا پر ایک گڑ پھان حاشق ہو گیا ہے۔ آپ تھا تروائی اس سے جو ہاتھیں گئے نہ گا۔ میں نے اور تھوڑے کہا۔ یہ پردے ہیں ہے آپ

اور آ کر ہمارے صہبان ہوں۔ وہاں ہم آپ کی خدمت کریں گے۔ کہتا ہے ہم کو کیا کھانے پلانے کا۔ قدر دے کہا جو آپ نہیں۔ بولا استادی ہم کو کس شرب وصال یاد دو۔ ہم بہت پیاسا ہے۔ استادی نے کہا: خان صاحب آپ آئیں تو ہم آپ کو شرب وصال کے کوئیں میں ڈالیاں دیں گے۔ غوطے کھائیں گے۔ سرو کے سر پر بیٹھ سو روپے کے ٹوٹ رکھتا ہے۔ صبر دے اور قربان ہو ہو جاتا ہے۔ سرو بھی اس سے بڑے غور سے کہہ رہی ہے۔ لگ کے نوکر کو پانیس بکڑ کر لے گئی ہے کہ لگ اس نے چاقو مار کر کسی کی استخوان نکال دی تھیں۔

عبدالکریم نے خطاسن کر اطمینان کا سانس لیا اور بولا: "گلاب دین! خدا کی وٹیاں سب کو دے۔ انہوں نے پاپ کو بڑی بڑی قمیص لاکر دی ہیں اور اس پر ان کو بیٹھ خیر ہا ہے۔ اب اللہ کے فضل سے سرو بھی کھاؤ ہو جائے گی۔ پھر ایک چلے کریں گے۔"

جب عبدالکریم نے چار ہزار کے بیک ڈرافٹ کارجنری اتفاق گلاب دین کے ہاتھ سے وصول پایا تو اگلے دن ہی قلم جا کر سٹے ڈیڑھ انٹ کے صوفے اور پردوں کا کپڑا لے آیا۔ بیٹک میں سفیدی ہو گئی۔ شیشے والی دریا گرہیں پر پائل بھر کر یا۔ نئے شیشے لگ گئے۔ ڈبلی بازار سے کارنگریلو آ کر خیم بھتی سے لگے ہوئے پرانے بھانڈا نوس کی صفائی کرادی گئی۔ سارا گھر اچھا ہو گیا۔

لاکپاس انھیں کی صبح کو آ رہی تھیں اور انھیں کوئی پستے آٹس کے بھگوانے والی عمارت کے لیے کرے میں چل چل دکھائی دے رہی تھی۔

پھر داکٹر نے پست ماسٹر سے کہا: "گلاب دین! کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔"

"کیا عرض کرنا چاہتا ہے؟ یہ ہر سال 'اچھا' پست ماسٹر نے چڑ کر پھر داکٹر سے کہا۔

دوسرے لمحے گلاب دین پست ماسٹر کے سامنے کھڑا تھا جو قائل پر نظر میں جھکانے کہہ رہا تھا: "یہ تمہاری پچھلے سال والی مرضی میرے سامنے چڑی ہے۔ تمہاری خٹا کے مطابق تمہاری تہذیبی اب ہیرا منڈی سے واپس مصری شاہ کر دی گئی ہے۔ اب تم کیا عرض لے کر آئے ہو؟"

"حضرت! میری صرف اتنی عرض ہے کہ مجھے بھی رنجہ دیا جائے۔۔۔"

پست ماسٹر نے قائل پر سے نظراٹھا کر گلاب دین کو ہجرت سے دیکھا اور بولا: "کیا کہا؟"

گلاب دین کی ڈاڑھی غائب تھی، لمبی سی ٹھوڑی لگی ہوئی تھی اور مونے مونے ہونٹوں کے اوپر مونچھوں کا پکا پکا غبار تھا۔



محمد خالد اختر

نام :	محمد خالد اختر۔
لقب نام :	محمد خالد اختر۔
پیدائش :	۲۳ جنوری ۱۹۲۹ء، بہتھم ہل آباد بہاول پور (ا)
وفات :	۲ جنوری ۲۰۰۶ء، بہتھم ہل آباد، پاکستان۔
تعلیم :	پہلا۔ اے۔ بی ایس سی (ایگزیٹنگل ایگزیٹرنگ)
	بہاول نگر اور بہاول پور میں ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۸ء تعلیم پائی۔ صوبائی ایگزیٹنگ کالج، بہاول پور سے ۱۹۳۸ء میں بی اے کیا۔
	۱۹۳۹ء میں پنجاب کالج آف ایگزیٹرنگ ایڈمینیٹائیو سائنسز میں پورہ کا دور میں داخلہ لیا اور ایگزیٹرنگ سے طبی مباحثہ ت
	ہونے کے سبب ۱۹۳۹ء میں ایگزیٹنگل ایگزیٹرنگ میں بی۔ ایس سی کی ڈگری لی۔ اسکے ڈیڑھ دو برس بعد سلسلہ چوست
	گریمینٹ فرینک، انگلستان میں گزارنے، جہاں سے ۱۹۴۸ء میں واپس آئے۔

مختصر حالات زندگی:

علامہ عبدالحکیم کوڑی ساہی، شیرپا، زریہ سے بہاول پور کے بڑے محمد خالد اختر کے والد اختر علی بہاول پور ڈویژن میں ریٹائرڈ
ڈپارٹمنٹ سے متعلق تھے جو اپنی کثیر رچائو ہونے اور فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خان کے عہد میں ممبر قومی اسمبلی منتخب ہونے کے بعد
ستمبر ۱۹۶۳ء میں فوت ہوئے۔ محمد خالد اختر کا بچپن بہاولنگر میں گزارا اور لڑکپن بہاول پور میں۔ یہ سلسلہ تعلیم ۱۹۳۹ء کے بعد کا اختر وقت لاہور
میں گزارا۔ ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۸ء کاروان الکتب میں گزارا۔ بطور ایگزیٹنگل ایگزیٹرنگ سرکاری ملازمت اختیار کرنے کا سوچا تو کامیابی نہ ہوئی اور کراچی
جا کر ایک غیر ملکی فرم انکسٹرکٹس میں بہ نسبت سیکرٹری ایگزیٹرنگ ملازمت کرتی۔ جنوری ۱۹۵۲ء میں واپس بہاول پور ریاست کے محکمہ ایگزیٹنگل
میں بطور ایس ڈی نو منتقل ہو گئے۔ جب بہاول پور ریاست کا یہ محکمہ اپنے افسانہ فہم ہوا تو یہ سلسلہ ملازمت تین برس متان میں اور بقیہ وقت لاہور

میں گزرا جنوری ۱۹۸۰ء میں سیر خٹک لک انجیتر (واپا) لکلا اور کے عہدے سے ریٹائر ہو کر اپنے آبائی شہر بہاول پور کو مستقل مسکن بنایا۔
 وہ ہندی معاملات کو نہ بھی سمجھا اور نہ سمجھنے کی خواہش بھی کی۔ زندگی کا بیشتر وقت انگریزی ادب کے مطالعہ میں صرف کیا۔ کراچی میں انتقال
 ہو اور انشیں کراچی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔

فکری آثار (مطبوعہ):

- ۱۔ "۲۰۱۱" میں سو گیا وہ (سیاسی و معاشرتی طنز) مکتبہ جدید لاہور طبع اول: ۱۹۵۳ء
- ۲۔ "چاکر لاہور میں دس سال" (ناول) اورنگ پبلشرز کراچی طبع اول: ۱۹۶۵ء
 اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن سنگ میل لاہور نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔
- ۳۔ "کھویا ہوا لختی" (مضامین/افسانے) مکتبہ جدید لاہور طبع اول: ۱۹۶۷ء
 اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن سنگ میل لاہور نے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔
- ۴۔ "گوشیں اور دوسری کہانیاں" آج کی نئی کیشنز لاہور طبع اول: ۱۹۹۷ء
- ۵۔ "دوسرا" (سات اور گمان کے دوسرا حصے) اورنگ مطبوعات لاہور طبع اول: ۱۹۸۵ء
 یہ سرفرا سے پہلی بار پلڈ "قوی" لاہور میں بالا اقساط شائع ہوئے تھے۔
- ۶۔ "اولیٰ و نیا سے حیرت میں" (اولیٰ سے کیمرہ کا ترجمہ) نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان طبع اول:
- ۷۔ "چچا عیدالہائی کی کہانیاں" (سلسلہ دار افسانے) قوسین لاہور طبع اول: ۱۹۸۵ء
- ۸۔ "مکاتیب نصیر" (مخطوط) سنگ میل کی نئی کیشنز لاہور طبع اول: ۱۹۸۹ء
- ۹۔ "مطوباتی کا تہہ" سنگ میل کی نئی کیشنز لاہور طبع اول: ۱۹۸۹ء
- ۱۰۔ "پاترا" (سفر نامہ) قوسین لاہور طبع اول:
- ۱۱۔ "مکاتیب نصیر" (مجموعہ مخطوط) سنگ میل کی نئی کیشنز لاہور طبع اول: ۱۹۹۳ء
- ۱۲۔ ابن جبر کا سفر (ترجمہ) سنگ میل کی نئی کیشنز لاہور طبع اول: ۱۹۹۳ء

غیر مدققان/غیر مطبوعہ:

لیویس کیمرہ کی کتاب "ایلیس ان دوسرا لپٹ" اور "قہرودی نوک نگاہاں" کے تراجم کو سمجھا کر کے جی پور جی کریش کیشن شائع کرتا
 جانتی تھی، ملے اہلے کیا ہاں۔ مضامین اور مخطوطات اس کے علاوہ ہیں۔

وفات سے قبل مستقل تھا:

انٹر نل ہاؤس 'سرگرم' (بہادر) پر۔ پاکستان

اعزاز:

پاکستان رائٹرز گلڈ "آدم جی ادبی انعام" برائے "کھوپڑا واقعہ" ۱۹۶۷ء

نظریہ قلم:

"سب سے پہلے اس میں ایک کہانی ضرور ہونی چاہیے۔ کہانی جس کا ایک آغاز، ایک وسط اور ایک انجام (کھاگھس) ہو۔ اس کے کردار بھیجے جاتے ہیں، جانے والے ہوں۔ وہ اس معنی میں "ہوشیار" ہو کر اسے شمع کیے بغیر جھنڈا آئے۔ اسے بڑھ چکنے کے بعد اس کے کردار واقعات اور محرک قواری اور تکلیف دہن میں کھیلنا شروع کر دیتے ہیں اور اسے بے چین اور مضطرب رکھیں۔۔۔ یہ ایک بہت ہی مشکل اور پراسرار (mysterious) عمل ہے جس کا راز صرف استاد افسانہ نگاری جانتے ہیں۔ بتانا ہی وہ بھی نہ سکیں۔"

(یہ حوالہ مکتوب نامہ عزت احمد، بنگلہ مورچہ ۱۹۷۷ء میں ۱۹۷۸ء)



حوالہ جات:

۱۔ اکثر مقامات پر درج ہیں اگلی ۱۳ جنوری ۱۹۳۸ء سے بعد سے نہیں۔ گو کہ علامہ اختر صاحب نے غور کیا تھا مگر درست تاریخیں ان سے آگے کا ہے۔

الائین

محمد خالد اختر

میرے خسر مسز میجاب دین کا نام تم نے سنا ہوگا۔۔۔ اس لیے نہیں کہ وہ حکومت کا کوئی اڈہ ہے یا کسی قسم کا ادارہ کیڑ ہے، کسی جماعت کا لیڈر ہے، وہ ان میں سے کو بھی نہیں ہے۔ "جے" کی جگہ پر "تھا" کہنا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ پچھلے مہینے کی چند روز بعد کے مہاراک روز شام کے پانچ بجے مسز میسوب کے قاتی اور مستعار مجھے کویری آنکھوں کے سامنے سامنے دوڑے تھادے گورستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ اس کے غیر قاتی اور قاتی مجھے کے حلق میں کو اصطلاح عام میں روح کہا جاتا ہے میں جگہ نہیں کہنا چاہتا کہ کہاں ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے مگر مجھے بالکل کوئی قہر نہیں ہوگا اگر وہ صمد سید صاحبست میں گیا ہو۔ مسز میجاب دین ان بے ضرر تفتی غیر دلچسپ انسانی رویوں میں سے تھا جو ہر اکابر کرنے کے اسے ہی نال ہوئے ہیں، چنے لگی کے ایک ثبت گل کے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہ اپنی بیوی کا وقار تھا ایک مہربان اور متعطف باپ تھا اور پانچوں فراد میں جانتا ہوا کرتا تھا۔ پھر وہ اس قسم کے لوگوں میں سے تھا جو سید مجھے صاحبست میں جاتے ہیں (اگر تم بہشت کی قسم کی چیزوں میں یقین رکھتے ہو تو)۔ پس اگر تم نے (جانا) اس کا نام سنا ہوگا تو حالی میں اخباروں میں ایک غوثاک سادے کی ضمن میں جس میں۔۔۔ مگر شاید تم نے نہیں سنا اور مجھے تمہاری خاطر یہ کہانی خراب نہیں کرنی چاہیے۔

مسز میجاب دین سے میری واقفیت تین چار سال سے تھی۔۔۔ اس وقت سے جب میں پہلے، پل اپنے مرنے اور مرنے والی خان بہادر سادہ سے ملنے کے واسطے ملے راستہ شاپ میں بطور ایک غیر تربیت یافتہ مزدور دھرتی ہوا اور مسز میسوب کے ساتھ کام کیلئے پر لگا دیا گیا۔ انسانیت کو کسی ایک لحاظ سے کلی ایک اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔۔۔۔۔ زبرد دل اور مرد دل۔ باقانی اور جیب دہیرہ وغیرہ اور میں نے بھی ایک تقسیم کا سوا ہے جو اپنے طور پر اتنی ہی اچھی ہے جتنی کوئی اور۔ مجھ سے پچھو تو دیا میں وہ قسم کے آدمی میں رہے ہیں۔۔۔ ایک وہ جو مسز میسوب اور دوسرے وہ جو مسز میسوب میں ہیں۔ کم از کم میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مسز میسوب اور غیر مسز میسوب میں کیفیاتی لحاظ سے فرقہ واریت کی سطح ہے وہ بھی پہلی نہیں جاسکتی۔ میں نے کلی ایک مسز میسوب کے تحت کام کیا ہے ایک وہ سے میرے دوستانہ مرام یہاں تک جڑے ہوئے ہیں

کہ میں ان کو ان کے نام سے بلاتا ہوں اس لیے ان کے حلقی میری رائے ایک ایسے آدمی کی رائے ہے جو "جانتا" ہے۔ میں یہ اقرار کرتے ہوئے
 تیار ہوں کہ وہ سب قابل قدر آدمی ہوتے ہیں اور بغیر ان کے اپنے اپنے کام کر سکتے ہیں جو کم از کم میرے لیے تو حیران کن اور قابل
 رشک ہیں مگر وہ "مستریانہ" لطیفیت، وہ خاموش برتری کا اعلا، جس سے وہ باقی انسانیت سے الگ اور ممتاز حیثیت کا دعویٰ کرتے ہوئے
 معلوم ہوتے ہیں۔ ایک ایسی خصوصیت ہے جو خاص مستریاں سے۔ یہ نہیں کہ ان کا اس "احساس برتری" میں کچھ بڑا قصور ہے۔ یہ جتنی بات ہے
 کہ اگر کل تم خود مستری بن جاؤ تو تم بھی اس پر گریو و ہجاعت کے ایک فرد کی حیثیت میں کچھ الگ سی، کچھ علیحدہ ہی اور کچھ پورا آدمی شفقت کی
 فراہم کرنے کی کوشش کرو گے۔ پرانی روایات کو بھلا جائیں یا سنا سنا کر خود جس دن سے مستری بن جاؤں، بے حد متین اور اتنا اور وار ہو گیا
 ہوں جیسے ایک دم میری زندگی کے دس حریف سال گزر گئے ہوں۔ مستری بننے سے پہلے میں زور زور سے پینے کے لیے مشہور تھا اب میں صرف
 مسکراتا ہوں اور مستری اور غیر مستری میں یہی ایک لکڑیاں لڑتی ہے۔ مگر یہ سب بحث غیر ضروری ہے اور اس تاریخی سے اس کا چنداں تعلق نہیں
 نہیں۔ بھاری اس سے تم کو میرے مرحوم خسر کے کردار کا تصور بہت اعلا ہو جائے گا کیونکہ وہ اپنی جماعت کا ایک مکمل نمائندہ تھا۔

مہتاب: یہ نیا دل رائے شاپ میں بندہ مستری تھا۔۔۔۔۔ بھاری گھما ہوا جسم۔ کندھوں سے کچھ گے کو جھکا ہوا چھوٹی سینیں آنکھوں پر
 جبک لگی ہوئی۔ تنک جاتھے پر گہری مستقل کیریں۔ ہلکی سی تراش کی موچیں۔ جیسا کہ میں نے لکھا ہے، وہ اپنی جماعت کا ایک عجیب نمونہ تھا۔ اس
 جیسے وہ بڑا اور بول گے۔ وہ کتاب کے میں برس اور ایک نعلی۔ وقت طلب جماعت کی بدولت اس نے اپنے کام میں ایک جتنی قابلیت اور
 مہارت حاصل کر لی تھی۔ کچھ چارن میں کو چھوڑ کر وہ شاپ میں سب سے زیادہ اہم اور مستری آدمی تھا۔ ایک طرح سی کی وجہ سے شاپ کی سوراخ
 کرنے والی اور کاسنے والی مٹھیں سارا سامان دہی کر کر لیتی رہتی تھیں۔ اسی کے ہاتھ ہوتے باپ کے پارے داڑیوں میں، وہ سوراخ کرتی
 تھیں اور اسی کی کینٹی ہوئی سطروں پر وہ کاتی تھیں۔ یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ اگر وہ کسی دن ڈا سکتا تو شاپ کے کام کی کیا حالت ہوتی۔ تاہم
 شاپ کی آدمی شیئوں کو بیکار اور بچا چکا۔ مگر مہتاب دینی سوراخ کی طرح پابند اور گہری کی طرح باقاعدہ تھا اور جہاں تک مجھے علم ہے وہ ذوق نمی
 بیکار ہوا اور زندگی میں اور سب سے بھی اسے اپنی ذمہ داری سے غیر حاضر رہا۔

پہلے بانی تھے اس کے ساتھ ہی کام پر لگا یا گیا اور یہ اس کی بزدلی اور جلی کی دلیل ہے کہ جتنا عمر میں سے اس کے ساتھ کام کیا، اس
 نے بھی میرے ساتھ فیض پاؤنگی کا اظہار نہیں کیا۔ تھے یقین ہے کہ میں اس کے لیے زیادہ کارآمد تھا۔ کئی کاموں کو میں نے ہکا بکا ہوگا۔ میں نیا
 آدمی تھا اور اپنے کام میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ تھے لالچ جی تھی کہ خدا نے مجھ کو تکلف اور بھڑچہ دی کے لیے پیدا کیا ہے اور ہمیشہ میرے
 دماغ میں بیٹھا کا کینٹر انکسوں کا مصنف بننے کی خواہشیں ہی رہتی تھیں۔ اندر میں حالات کام میں دلچسپی خاک لیتا۔ میری بجائے شاید ایک
 گوریل مستری کا زیادہ معاون اور مددگار ہو سکتا۔ شروع شروع میں مستری اور میرے تعلقات میں کچھ کھٹا اور دوری ہی رہی۔ ایک تو اس وجہ
 سے کہ ایک مستری (اور پھر یہ مستری) اور ایک معمولی ورکر میں اصلی و حقیقی ہے ہی ناممکن۔ دوسرے میں اپنے آپ کو اس کے سامنے ایسا ہی
 محسوس کرتا جیسا کہ ایک کندہ بن لاکا اپنے سکول ماسٹر کے سامنے۔ کبھی کبھی میں مستری کو اصرار ہو کر باتوں سے بچانے کی کوشش کرتا۔ لیکن اگر
 کبھی وہ مجھے محسوس کرنے کے خیال سے مسکراتا بھی تو یہ برتری اور دوری کے اعلا میں۔ میرا مطلب ہے کہ مستری اور میں کبھی "لنگو ہے"
 نہیں بن سکے۔۔۔ ان آخری دنوں میں بھی نہیں۔ اگرچہ اس نے کبھی کسی قصداً اشارے سے مجھ پر اس قسم کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ بھاری میں یہ
 محسوس کرتا تھا کہ مستری مہتاب دینی میری پیچھے اور انانہ اہلیت کو اور ہر بات میں میری علیحدگی کو ابھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ یہی بات تو یہ ہے کہ اگر

مستری اس قدر نیک دل اور متعل نہ ہوتا تو خان بہادر کے مریدانہ رسوم کے باوجود میں شاپ سے بھی کاغذ لٹری کے نکالا ہا جکا ہوتا۔ اس صورت میں اب غالباً میرا خسر کوئی اور ہوتا۔

میں اور مستری متاب دین ایک ہی گلی میں رہتے تھے بلکہ میں کہنا چاہیے کہ ہم بھائی تھے۔ تم نے وہ گلی ضرور دیکھی ہوگی جو ابوں کی بریج کی گلی میں سے ہوتی ہوئی منڈے بازار میں مسجد شہید گنگے کے سامنے اٹھتی ہے اور تم نے اس طرح جاتے ہوئے اپنے بائیں کمان سیاہ اور بائیں کن ہالا خانوں کی قطار بھی دیکھی ہوگی۔ جن کی گلی کی عریب متعریب خانگیوں پر ہمیشہ قلیقا اور دیو پودے چڑھتے ہیں۔ اس قسم کے ہالا خانے تم کسی وقت دیکھنے والے ہو یا کسی اور دروازے پر بھی دیکھ سکتے ہو۔ مجھے یہ علم نہیں کہ ان کو کسی نے اپنا کیا کون ان کا پہلا نقشہ "کر تھا" مگر وہ جو ایک داغی اور متعریب اخطاط کی حالت ان پر چھائی رہتی ہے۔ میرے لیے ان کو وہاں کی چیزیں بتا دیتی ہے۔ تم نے گزرتے وقت کئی دھڑکوب کیا اور ان کا ان ہالا خانوں میں کسی قسم کے لوگ رہتے ہوئے تھے اور شاید تمہارے قصور نے غریب صورت اور سرور لیٹاؤں کے طواب دیکھے ہوں گے۔ جوان دیو پودوں کے چھپے ساری عریب متعریب اس کو اور میں میں گزرتے ہیں اور بوڑھی چڑھیں ہو کر مر جاتی ہیں یا بھی تم کہہ دو کہ یہ امید کرنے لگ جاتے ہو گے کہ کوئی ہاتھی راست جیسے از روکش ہاتھ جس کے اوپر ہڈاڑ کاٹی ہوئی ہے مٹا لی گئی ہو مٹا کر رکھنا رہے ہوں گے "تم کو پہنچے ہوئے پر دے کے پیچھے کسی اٹھوڑے یا شہرے پر حرکت کرتا ہوا کوئی دے گا اور بوڑھا الٹ لیٹا لی گئے کی اور میں نے تمہارے کانوں میں آئیں گی اور کوئی بوڑھا سفید مردانہ داڑھی والا آدمی شاید بتا کر ان کو کوئی سوداگر کہے "تم کو ہاتھ کی جنٹیں سے اوپر آئے گا اشارہ کرے گا۔۔۔ میرے دوستو۔ ان ہالا خانوں میں تہ کوئی بتا کر ان کو سوداگر کہے ہے اور خانی خانی کے کھنڈروں میں بھی لٹائی ہوئی لٹائی تھیں۔ ان میں ٹھوس اور مستر اور سجدہ و آری رہتے ہیں جو ابھی طرح جاتے ہیں کہ زندگی کوئی نہ ان میں نہیں اور اس کے ساتھ جمیدگی سے لٹنا چاہیے ان ہالا خانوں میں سے ایک میں مستری متاب دین اپنی بیوی اور چار بچوں کے ساتھ رہتا تھا اور گرب بھی تم ان مکانوں کے متعلق رد وائی خیالات رکھتے یا سوچتے یا اصرار کرتے تھے تم ہالے ہو۔۔۔ میری طرح۔

اسی گلی کے کنارے میرا بایں کو کہ میرے دوست شیخ شیر علی شیر فروش کا ہالا خانہ ہے اور اس کے نیچے اس کی دوکان ہے جس پر ہر وقت خالص دودھ مل سکتا ہے۔ دودھ کے خالص ہونے کی میں خود گواہی دیتا ہوں۔ مجھے ان میں کئی بار وہاں دودھ پینے کا اتفاق ہوتا ہے اور مجھے یہ کہنے میں متعلق ہا کہ میں نے ہمیشہ دودھ کو کھو، اور خالص پلا۔ شیخ شیر علی جیسا دوسرے شیر فروشوں کی طرح ملاوت کی قسم کی پھوٹی اور ذلیل کیمٹیکوں پر اتری نہیں سکتا۔ اگر تم کو اس دوکان کے پاس سے بھی گزرنے کا اتفاق ہوا ہے تو تم نے ایک اونچے کندھ نما سر اور چشموں والے آدمی احوال کے چہرے والے آدمی کو دودھ کی ایک بڑی کڑھائی میں چھپا بھرتے دیکھا ہو گا اور اگر تم چہرے کو یاد رکھتے والے آدمی ہو تو وہ چہرہ جلدی نہیں بھول سکتے۔ میرا یہ دوست ایک شاعر۔ ایک ملا سفران مزی شامروں اور ملا سفران میں سے نہیں جوسلا ہے آپ کے ساری دنیائے بیزار معلوم ہوتے ہیں۔ زندگی کے متعلق اس کی ایک اپنی نظریاتی روشن غلطی ہے کہ وہ اس کے لیے کڑھتے ہوئے دودھ میں اتاری روانہ آتی ہی شہر سے ہے جتنی کہ ایک غریب صورت عورت میں۔ یہ حد قابلِ ذکر ہے میرا یہ دوست۔ اس نے کچھ مدت پہنچ شاعری بھی لکھی ہو سکتا ہے اور وہ ایک معرکۃ الامم مضمون "قرون وسطی کے تاریخ میں کیمٹیوں کی اہمیت" کا بھی مصنف ہے جو ان اصحاب کے لیے جو کیمٹیوں میں کسی قسم کی دلچسپی رکھتے ہیں نہایت کارآمد و مفید ہے میں نے اس کو ابھی تک نہیں چھوڑا کیونکہ مجھے کیمٹیں بالکل ابھی نہیں لکھیں اس کے علاوہ شیخ شیر علی نے قسم کھائی کے لیے ایک ڈرامہ بھی لکھا ہے۔۔۔ مٹھرا نامہ اور مکالمہ اور سب کچھ۔ اس کا نام "دو شیر و فرانس" عرف مجوہہ مٹھرا ہے۔ یہ متعلق کی

کہانی ہے۔ خاص کر آخری سینے سے بعد وردہ کا ہے جس میں شیخ کے لڑکے ہیرہ اور شیخ کی لڑکی ہیرہ دان (ایک دوسرے شیخ کی) کی رو میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے قبروں میں سے آسمان کی طرف اٹھتی اور کائناتی سوئی دکھائی گئی ہیں۔ شیخ شیر علی نے یہ راز مشہور فلم کھنی فصلی شیرے لینڈ کو بھیجا ہوا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر فصلی شیرے قہورے بہت بھی اہلی نظر ہونے تو فوراً اس راز سے کائناتی اگلی فلم کے لیے خرید لیں گے تو ذرا سے کو جو سات ہزار سے کم میں قصداً نہیں بیچے گا۔ کائنات فصلی شیرے اس کو اپنی فلم کھنی میں مشعل، مکالمہ نویس کے عہدے کی پیش کش بھیجیں گے۔ اس صورت میں اس کا وعدہ ہے کہ وہ وردہ کی پیدائش دیکھنے سوچے ہائے گا۔

ہزاری دکان کے سامنے ایک دو گھر چھوڑ کر محمد الدین وردہ کی دکان کے باوجود مسز میٹاب دین کا بالا خانہ تھا، جس کی بائیں پر ایٹھ تاریک اور خلیقہ لہریاں لٹکی رافتی تھیں۔ سورج نکلتا ہی چٹکیا کیوں نہ ہو اور آسمان نکلتا ہی نیا، جس وقت چھاری نظریں تاریک پردوں پر پڑتی (میری نظر اکڑا ان پر پڑتی تھی تو آسمان بھورا اور سیلا سا ہوا جاتا اور تکلیف سے ہال چھاری دوسرا پر چھا جاتے اور کم مسز میٹاب دین جس کے مسز میٹاب دین کے باوجود دم سا آئے لگتا۔ پھر مسز میٹاب دین ایک لبر و لپس معمولی سا آدمی تھا اور میں جانتا تھا کہ قصور کی بلند ترین ہوا رہی اسے ہزاروں سوداگر کے پیش قدمی نہیں کر سکتی اور اس لیے وہ عجیب اسرار اور روایت کا ہال جو مجھے ساتھ کے ہال خانوں کے گرد نظر آتا تھا اور جو ان کی رافتی خلافت کو ایک خوبصورت دکان کی شکل دے دیا تھا مسز میٹاب دین کے ہال خانہ کے گرد نظر آتا تھا۔ (یہ اسما سات اس دن سے پہلے کے ہیں جس دن میں نے وردہ کتاب سے لوٹتے وقت پوری کے بیچ سے دھنکی دانت جیسے ایک درد و وسیلہ ہاتھ کو ہاتھ کی میں کدو کے چٹکے پھینکتے دیکھا۔ اس دن سے تو میرا یہ عالم تھا کہ میری نظریں ایٹھ ان تاریک خلیقہ لہریوں پر یوں گزری راتیں جس طرح وہ دھماکے خوبصورت ترین نور عجیب ترین تجربہ کی ہوتے ہوں۔ اس دن سے بڑا حاسر میٹاب دین بھی مجھے کچھ بھرمان دلا دینی وہاں ہزاروں سوداگر چہ گئے تھے۔ اگرچہ اس خوبصورتی کی تشکیل میں ایک لڑائی ہی تھی کہ مسز میٹاب دین کی داڑھی دھنی۔ تاہم ان سب باتوں کا کہنا سب موقع پر تفصیل سے آئے گا۔ پہلے میں تم کو لائسنس کے بارے میں بتاؤں۔۔۔ لائسنس کے احاطے کے بارے میں، جس کا اس تاریخ میں اتنا ہی اہم مقام ہے جتنا کسی اور انسان کی کردار کا ہے بھی یہ لائسنس میرے لیے زندہ تھی۔۔۔ مصوم اور بے ضرر اور بے کار بعد میں میرے گمانوں سے بھی گئی تھے۔ یاد دہندہ اگلی اور پھر اسی مصوم اور بے ضرر بھی نہیں رہی یہ نظر آتی تھی۔

مسز میٹاب دین کے ہال خانے کے نیچے اس دروازے پر جہاں سے بیڑیاں اوبہ جی جی تھیں، کوئی بچپس فٹ اوپر یہ لائسنس اگلی تھی۔ ایک نوتا ہوا رنگ خود وہ لائسنس کا احاطہ جس کا لوہا ب سیاہی مائل سرخ ہو کر نظر آتا تھا۔ دھاریں سے لگا ہوا ہے کہ ایک بازو اس کو گلی کے اوپر سہارا دے ہوئے تھا اور وہ بے بازو گلی پر اس سے یہ کام کرنے کی وجہ سے کچھ تھک گیا تھا یا اندر سے دھج میں اس کی نشست تھی اور کھوکھلی ہو گئی کیونکہ اب وہ بازو کچھ نیچے جھک آیا تھا اور اس کے ساتھ لائسنس کا احاطہ بھی۔ میرے خیال میں شاید ہی کبھی نے اس کی طرف دھیان دیا ہو مگر میں اس کو دیکھ کر اکثر سوچا کرتا کہ شاید اس کی روشن ہونے میں یہ بہت گلی ہوں گی اور یہ کہ اب میں اس بھی روشنی نہیں فٹما رہی تھی۔ وہ ایک خاموش اور روانی دنیا کی نکلتی تھی۔ پھر یہ بجلی گئے اور پہلے یہ صورت سمجھیں اس روشنی اور وہاں میں کریمہ بدینہ اور انہیں اور غیر ٹکڑوں کی طرح گھس آئے تھے پہلے جیڑی سڑکوں اور شاہراہوں پر اور بعد میں ان پھلتی گلیوں میں بھی اور وہ کچھ خود پائش لائسنس ہو گئیں کی ٹکڑوں پر سے تاحری راتوں کو کائناتی تھیں اور شہر کے رہنے والوں اور باہر کے مسافروں کے لیے لامحدود مشکلات کی حامل تھیں۔ جن کی مدد ہم روز کا بیچ روشتوں میں گھڑی دلا فقیر ایک مجلس دلا ہوا ہر دن الرشید تھے لگتا تھا اور ناگھنک ترین باتیں بھی ہونے لگی تھیں۔۔۔ وہ چھ کور خود

پیش لائینیں ماضی کی چیزیں ہو گئیں۔ لوگ ان کو دج اردوں میں سے اکھاڑ کر لے گئے۔ اب ان دنوں تمام دور کے سارے گلی کو بے چھان مارڈا تم کو شاید ہی لائینیں کا کوئی پڑا ہوا چال کبھی دیکھ کر کوئے میں اٹکا ہوا مل سکے۔ کیونکہ جنگ کے بعد سے نو ہجرت ہو گیا ہے لوگ اب غلوں اور لاپٹی بن گئے ہیں اور دج ارد میں گلی ہوئی لائینیں کی روانیت اور مصرفت کو وہ نہیں سمجھ سکتے۔ ایسے زمانے میں اس لائین کے ذخائر بچے کا دج ارد میں اٹکار ہونا کبھی ایک عجیب بات لگے۔ مائیکہ کسی کسی کا اس کی طرف دھیان نہیں کیا تھا کیونکہ یہ بہت اونچی تھی اور دج ارد کی طرف سے یہ رنگ تھی۔ اگر کسی نے بھی اس کی طرف دھیان نہ کیا ہو تو اس کا لوہا اب اس قدر رنگ خوردہ اور بکا ہو چکا تھا کہ اس کو چاندی کے سکوں میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یا شاید اسے ابھی اپنی قسمت کی تخیل کرنی تھی اور انسانوں کے اس ڈرامے میں کرم کے کرکھے کے مطابق وہ آخری دور غرق خاک پارت اور کرنا تھا جس کے لیے یہ راستے برس سے اس دج ارد میں اس خطرناک حالت میں ابھی ہوئی تھی ان دنوں جیسا کہ میں نے نو پر لکھا ہے ماضی کی یہ نشانی مجھے بالکل معصوم اور بے ضروری نظر آتی تھی اور اس قطع میں جو وہ غلی کے کھوں کو دج ارد میں معلوم ہوتی تھی، ایک دیدہ ویرانی اور بیکاری کا انداز تھا۔ اس بے چاری حراس العیب لائین پر ایک الگ کھائی تھی جاسکتی ہے اور اگر کوئی شاعر اس کو دیکھ پاتا تو اس پر ایک دہائی کی صورت میں ایک چھوٹا سا غرض صورت کبھی پر چھو رہا ہوتا جاس لائین کو ہمیشہ پیش کے لیے لیر فانی بنا دیتا۔

شاید تم اس لائین کے اس قدر غلوں جان سے اکھاڑے ہو گئے تھیں یہ لائین اس تاریخ کے اہم کرداروں میں سے ہے اور میں اس کو آسانی سے چار پانچ سطروں میں مل دیتا انصاف سے یہ دیکھتا تھا ہاں اگر تھاری طوفانی تھی تو میں اب اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ البتہ میں آخری صفحے کی ذمہ داری قبول کرے تو چار نہیں ہوں کیونکہ ہاں تو وہ خود آگئی ہے، ہر حال اب میں اسے چھوڑتا ہوں اور اپنی کہانی جاری رکھتا ہوں۔

مہمانے ہونے کے باوجود شکار و بھاری میں اور مسز میہتاب دین گلی میں ایک دوسرے کی صورت دیکھتے ہوں گے۔ کبھی بہت سرسبزے جب میں در کتاب کی طرح کو پکڑنے کے لیے گلی میں سے دوڑتا ہوا جاتا تو وہ مجھے ایک طعنہ چال سے فرماں خراں ہاتا ہوا ملتا۔ ”ابھی وقت ہے“ وہ اپنی چوڑی موٹی اور بھاری جین کی گھڑی کو مسز میہتاب کو دھکا دیتی ہے دیکھ کر مجھے تھکا دینا اور پھر ہم اکٹھے ہی ریلوے سٹیشن کے اس پار ایک ہاسٹل جہاں سے ہماری در کتاب کی گاڑی نکلتی ہے۔ اکٹھے ہی ایک کپا رمنٹ میں بیٹھتے اور اکٹھے ہی کبھی بیچ میں انجنوں اور ریلوے لائنوں اور سگنلوں کے پاس سے تھیں سب کی رفتار پر گزر گزرتے ہوئے گزرتے۔ در کتاب میں تو میں ہمیشہ جتا ہی اس کے ساتھ تھا۔ در کتاب سے وہ ابھی کے وقت ہم قدر دیکھا دوسرے سے مل جاتا ہے، میں اس وقت جب کہ جسم اور دماغ بالکل تھکے ہوئے ہوتے تھے، اس عجیب و غریب دلچسپ معر آوی کی صحبت پر اپنے ہم عمر بے غمروں کی صحبت کو ترجیح دیتا تھا۔ مسز میہتاب ایک کافی کراؤ سے تھا جو ساتھ ہی در کتاب میں کھینچ کر یہ کام کرتا تھا اور مسز میہتاب سے ہمیشہ اکٹھے ہوتے۔ کبھی کبھی وہ چھٹی کا سازن ہونے سے کہ پہلے ہی کتاب کے باہر آکر مسز میہتاب کا انتظار کرتا۔

اس کا نام مسز میہتاب رحیم بخش تھا۔ وہ ایک موٹا بھاری نامیاد جسم کا آدمی تھا۔ ایک لمبی مہندی سے رنگی ہوئی سرخ داڑھی اور آدمی جو بالکروں کی صحبت میں رہا، در کتاب خود اس سے ایک ایک بالکروں کے ساتھ لگ گیا تھا جس حد تک ایک انسان بالکروں تکتا ہے۔ اس کے ہونٹ ہونے اور دھبیان سے تھے۔ اس کی آنکھیں بالکل چھوٹی تھیں اور ان میں ایک عیار اندک ہی تھی۔ میں کبھی دفعہ جب کہ مسز میہتاب دین اور مسز میہتاب بخش عادات اور طبعیت کے اسے اشتباہات کے باوجود کیونکہ اسے گھر سے دوست ہیں۔ میں نے سوچا شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مسز میہتاب

مہتاب دین اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے کسی سے اختلاف رائے نہیں دیکھا اور فوراً ہر شخص سے ہر معاملے میں اتفاق کر لیتا ہے اور رحم بخش جیسے شوریہ و کورڈ و لیدہ آدی کو جسے اور کوئی حد نہ لگتے تھے دین ستری مہتاب دین میں ایک ایسا آدمی مل گیا ہے جو اس کی ہر بات میں ایک شاگردانہ انداز کی بات ملانے کو تیار رہتا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ یہ ستری رحم بخش ہی تھا جو ستری مہتاب دین کی سوسائٹی کا خلاف تھا۔۔۔ شاید روح کے کسی سکون اور اطمینان کی خاطر جو ستری کی صحبت میں اسے حاصل ہوتا تھا۔ کئی دفعہ وہ تاریکی میں رات شب میں آجاتا اور در تک دلیلوں پر کتاب کی اندرونی سیاست پر باتیں کرتا رہتا۔ اپنے چار بچوں کو برا بھلا کہتا اپنی موجودہ زندگی کو یاد کرتا اور جب وہ آدھ گھنٹے میں ایک سو ایک موضوعات پر بول چلتا اور ستری مہتاب دین اس کی ہر بات سے فوراً اتفاق کر چکا تھا وہ لوگوں اپنی شب میں اپنے کام پر چلا جاتا۔ اسے اپنی آواز سے بہت جلدی ہو جیسا کہ جس کی قسم کی قسمی جیسے دلی کے پیچھے کی آواز دھتے پر یک لکھائی گئی ہو۔ میں اس سے قدرتا نفرت کرنے لگ گیا۔ میں نے اس کی کبھی پروا نہ کی۔ کبھی کبھی وہ ایک خاص پدرانہ انداز میں میری طرف دیکھ کر ستری مہتاب دین سے بچتا ”مہتاب! یہ ہمارا چھوٹا اطفال کو کچھ بھی کہہ رہا ہے۔۔۔“ جیسے وہ ذاتی طور پر میری تربیت کا ذمہ دار اور میرا نگران ہو۔ ایسے وقت دیکھو یہ ابرا الگ آدی کے لیے اس کا ایک باب ہی بہت کافی ہوتا ہے۔

ستری مہتاب دین کا شام کا وقت مولانا سونی پوریوں کے چچا اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ گزرتا۔ تقریبات اور کھیل کھانے اس کے لیے کوئی کشش نہیں دیکھتے تھے۔۔۔ ہاں ایک دفعہ میں نے اس کو ستری رحم بخش کے ہمراہ ایک بیٹھائیں دیکھا۔ خانہ اس کا یہ دوست جس کے سامنے وہ انکار نہیں کر سکتا تھا اس کو پوریوں کے پردے والی ہانکی کے سکون سے کھینچ کر یہاں لے آیا ہوا گا۔۔۔ کچھ ساتھ کی خاطر اور کچھ شاید اس سے کہ ستری مہتاب دین دونوں کے گفت و شنید سے گا۔۔۔ (انہوں نے خانہ مجھے نہ دیکھا۔ علم شاید ”تھپڑ“ جی جو آواز کٹر ”بارہ ماڈ“ کی ہدایت کی ہوئی ہے۔ پہلا بھٹکا اور دیش بڑا دوست تھا۔ میں لوگوں کے سروں کے اوپر لیٹا ہوا ہاتھ ٹھٹھ کی کھڑکی کے اندر ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے مزاج پر دوست شیخ شیر علی نے مجھے پیچھے ناگوں سے مہارادے رکھا تھا۔۔۔ آدھ بے غری کے خدائے دن)۔ مولانا میرا شام کا وقت بھی شیخ شیر علی سے مصنفوں اور کتابوں کی باتیں کرتے گزرتا۔ شاید ہی کسی شخص کو ان حیران کن آدمیوں کے متعلق ہر کتاب میں اور افسانے اور نظمیں لکھتے ہیں، اپنی معلومات ہوگی جتنی شیخ شیر علی کو، اس کی باتوں میں گہری عقیدت سے زیادہ۔ رنگ کارنگ ہوتا تھا۔ مجھ سے یہ کچھ تو واقعہ ادراک کمال کرتے ہیں۔ مجھے تو ایک لحاظ سے چاہتا ہے تو مصیبت چاہتی ہے۔ آپ کی تحریرت غیر مطلوب سے آگے ایک حد نہیں ہوتا۔ (شیخ شیر علی کے کہنے پر میں نے ایک جاسوسی ناول ”غول کا گلاب پاش“ کا آغاز کیا تھا مگر پہلے باب کے بعد جس میں بیرونی بیرونی کو کچھ کفر فاضل تھا کر گر چاہتا ہے اور اسے ہچکچاہٹا ہوا ہے میری ساری خلافت طاقتیں جواب دے گئیں) خود شیخ شیر علی جو فی الواقع ایک شخص ایک تانہ ہے ابھی تک اپنا نام کسی رسالہ میں چھپا ہوا نہیں دیکھ سکا۔ اس کا مصراع ”لا مضنون“ ”قرآن و وحی کے سماج میں گھنٹیوں کی ادیت“ ”پانچ چور رسالوں سے ادب آچکا ہے اور تو اور یہ رسالہ“ ”مولائی“ ”تک نے بھی اس کو چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ میں نے یہ کہہ کر شیر علی کی حد حد خانہ کی کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مضنون اشاعت کے قابل نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ کہ خانہ لوگ گھنٹیوں کے ماضی یا مستقبل سے قصداً بے پروا ہیں۔ مگر بھی ”مولائی“ ”لا مضنون“ ایسا تھا کہ اس کا جواب میرے پاس بھی تھا۔

میں نے چار پانچ بار ستری مہتاب دین کو دکان پر دودھ پینے آتا۔ کبھی اکیلا اور کبھی ستری رحم بخش کے ہمراہ۔ ایسے موقعوں پر میں دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ میں خواہنا نہ کچھ میں کہتا: ”بھائی شیر علی ستری مہتاب دین کے گلاس میں پانی بڑا زیادہ ڈالو“ مجھے اب تک

صرف اس قدر راز اور روضہ حاصل ہو سکا ہے کہ لوگوں کے دودھ میں زیادہ پالائی ڈالنا وہیں ضروری ہے۔ مستری صاحب دین کے گناہ میں پالائی زیادہ ڈالوانے سے مجھے کھٹا ملا تھی۔ تھی کہ وہ میری اس فیاضانہ سادگی کی وجہ سے میرے بارے میں اپنی رائے بدل دے گا۔ اس کی حقیقی ہیضہ ختم تھی۔ میرے متعلق جو مستری کی رائے ان دنوں تھی اس کا مجھے غلطی سمجھنا اور تم بھی اس کو کہاتے ہی ہو۔ میں شکتا اس کو اپنا ممنون کرنے کا خواہش مند تھا۔ واصل میں مستری کی کو اپنی طاقت اور روضہ کے مطابق ممنون کر کے صرف اپنی خود بینی کے جذبہ کو تسکین پہنچا رہا تھا۔ (اگر تم کو زیادہ پالائی ڈالنا دودھ پینے کا شوق ہے تو میں دوست خانے کے لیے مناسب ترین آدمی ہوں)۔

لوراب میں اس شام پرآ تاہوں جس کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے۔ جب شراعت کا آغاز ہوا۔ جب ایک چوہے نے حاجی رانت جیسے سفید ہاتھ نے ہونٹ کے پردے سے باہر ایک تھالی کو اوڑھا کر، کدو کے چھلکے تقریباً میرے سر پر الٹ دیے۔ مجھے تاریخ بھی یاد ہے۔ اگرچہ میں اس قسم کا آدمی ہوں جو کہ دو لکھ سال تک بھول جاتا ہوں۔ مٹی کے مینچے کی تانیں تھی اور جس کا رنگ تھا۔ میں معمول کے مطابق شام کو ریلے ٹکٹوں سے اکیلا واپس آ رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس دن یہ بالا خانے مجھے دوڑ سے کہیں زیادہ مایوس کن بلا دیا۔ ذرا دیر کے بعد وہاں کو کچھ کر مجھے یہ احساس ہوا جیسے کسی نے نچکڑے کھرا ہوا ہاتھ میرے دل پر رکھ دیا اور میں کچھ سوچنے لگا کہ کیا کہ آخر میں نے اب تک خود کو کئی کیوں نہیں کی۔ اصل میں اس روز میرے ساتھ دو کتابیں میں بیٹھ گیا تھا۔ میں ناخوشوار ہو گئی تھیں اور اس وقت مجھے زندگی کچھ زیادہ روشن نظر نہیں آ رہی تھی۔ مستری صاحب دین نے مجھے لوہے کا ایک گھڑا پ کے مطابق فائل کرنے کو دیا تھا اور میں نے غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے اس کو اتنا زیادہ غافل کر دیا تھا کہ اس کی لمبائی ماپ سے آدھ لچک کم ہو کر رہ گئی تھی۔ مستری نے مجھے ایک گھڑا کی نہ کیا مگر میں اس کی انگلیوں میں اور شرے پر ٹکسی ہوئی ٹنگی اور ناراضی چڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے سارا دن مجھے کام میں مدد دیتے ہاں دیتے کے لیے دایا انگلیں اور میں نے بھی شرمندگی اور غصہ کی وجہ سے اس کے سامنے آنے کی بجائے شاپ میں اور اوروں کو مگر وقت گزارنے کو بہتر سمجھا۔ یہ ہے بھی وقت گزارنے کا ایک نہایت خوشگوار طریقہ۔ میں ایک جگہ رک بیٹھوں میں کھڑا ہوں ان کے ساتھ نہیں دیکھتا تھا۔ وہ کام چھوڑ کر بیٹھ رہے تھے اور وہ الفاظ اس نے میرے بارے میں استعمال کئے وہ تھیں جتنی تو تم یقین ہی نہیں کر دے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میری تاریخ کی کہاں تھی۔ میں نے جواب دیا کہ مستری صاحب دین کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ اس نے پوچھا۔ ”تم اس وقت مستری صاحب دین کے پاس کیوں نہیں آ رہے؟“ میں حاضر جواب نہیں ہوں۔ میں نے جلدی میں ایک نہایت اتفاقاً سا جواب دیا۔ ”میں مستری صاحب دین کو احوال دینے ہی چاہ رہا ہوں۔ خدا جانے وہ کہاں گم ہو گیا ہے۔“ فوراً میں نے میرے بارے میں چند حیرت انگیز حالات استعمال کئے جو یہاں چمک کی قلت کی وجہ سے کہے نہیں جاسکتے۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر میرے چارچ میں کے دودھ دے گیا۔ کچھ چارچ میں ایک دل آدمی تھا وہ کسی کا برائے نہیں جانتا۔ اس نے کہا کہ اس نے بھی تمہاری دیر پہلے مجھے صاحب دین کے ساتھ کام کرتے دیکھا تھا۔ مستری صاحب دین کو بلا دیا گیا۔ فوراً میں نے پوچھا۔ ”وہی مستری صاحب دین آدمی بھی تھا کہ اس کے ساتھ کام کرتا؟“ مستری صاحب دین نے پہلے مجھے ایک دھمکے ہوئے پاپ کی طرح دیکھا اور فوراً میں کو جواب دیا۔ ”اس صاحب دین بھی میرے ساتھ کام کرتا تھا۔“۔۔۔ میں نے پہلے ہی تم کو بتایا ہے کہ مستری مرحوم دل کا صاف تھا مگر یہ کہہ کر تو اس نے گویا مجھے سب دھماکوں میں لے لیا۔ میرا دل چاہا کہ اس کو گنگے گاؤں اور اس کو اس کی بوڑھی کی بھینوں (میرا مطلب اس کی مومنوں سے ہے) کے ساتھ چم لوں۔ فوراً میں مجھے مستری کے حوالے کر کے چلا گیا اور میں میری غلامی ہوئی۔ مگر اس واقعے کی عداوت ابھی میرے دل سے گئی نہ تھی۔ کبھی سوچنا کہ یہ دو کتابیں میرے بس کی نہیں تھیں گتے چھوڑ دوں۔ پھر خاں بہادر کی چاراضی کا خیال آتا۔ کبھی دل میں فیصلہ کرتا کہ یہاں میرا

کیونکہ کٹر چاہو ہو رہا ہے۔ اس نے تو بھتر ہے کہ راتیں بیٹھ میں لکھری کرلوں یا سالویشن آری میں شامل ہو جاؤں یا کافی ہاؤس میں پارٹ قائم ہو رہا ہوں جانوں۔ وہاں کے دو تھیں پورے میرے دوست تھے اور راتیں بیٹھ میں میرا ایک دوست تھا جہاں کی رام ملازم تھا۔ میں نے اس کو ایک دو بار شادیوں پر اپنی سرنگ کا ڈھکی ہوئی شاد اور بیچ بھادرم میں بیٹھ کے ساتھ بگن بھر کھینچے ہوئے دیکھا تھا اور اس کی خوش قسمتی پر رشک بھی کیا تھا۔ یہی خیالات لیے اسے اپنا خانوں کے پاس سے گزر رہا تھا کہ مجھے وہ سفید چٹھی دانست کی انگلیاں ہر سے سے باہر ایک تھالی اور دعائی نظر آئیں۔ میرا بکھر دھک سے رہ گیا۔ اس چٹھی کی چکا چوند نے مجھے اس درجہ کو گرہ پا کہ کم سے کم اس وقت مجھے نطق پتہ نہیں کہ وہ اور دعائی ہوئی چیز کیا تھی جو مجھ سے ایک قدم آگے تھے اس میں گری۔ پرانے دنوں کے مصنفوں کے مطابق مجھے وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑنا چاہیے تھا مگر میں نے سوچا کہ برسرِ بازار بے ہوش ہو کر گرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا اور میں نے اس کو (بے ہوش ہونے کو) کسی اور وقت پر اٹھا رکھا۔ میری آنکھوں کے سامنے سفید لیکن غروٹی انگلیاں پانچ انگلیں۔ (میں وہاں سے بھاگتا تھا کہ مجھ کو معلوم ہوا کہ تھالی میں سے کووے کے چھلکے گرے تھے یہ وہاں خانہ دی تھا جس میں مسز میجاب دین رہتا تھا اور ان انگلیوں کی مالک تھیں اس کی لڑکی رضیہ کے سوا اور کوئی ہو سکتا تھا۔ رضیہ کا نام میں نے ایک دو دفعہ مسز میجاب دین اور مسز می ریم بھٹی کی باتوں میں سنا لیا تھا۔ پھر ایک دفعہ میرے سامنے مسز میجاب دین نے رضیہ کے رشتے کے بارے میں مسز می ریم بھٹی سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ کسی اچھے بڑے سے نظر رکھے۔ تب اس کا صرف ہم ہی سن کر ایک گرم سیال ہی دھک میرے سارے بدن میں سرایت کر گئی تھی اور اب رضیہ کی وہ انگلیاں دیکھ کر تو میں اس کا خاتم ہو گیا تھا۔ مجھے کب کثرت خیال آیا کہ میری مراد بکھیں کے لگ بھگ ہونے والی ہے اور مجھے اب تک ایک شادی شدہ آدمی ہونا چاہیے تھا۔ کیا رضیہ میری بیوی بن سکے گی لیکن مسز میجاب دین نہیں مانے گا۔ وہ مجھے ایک گناہے کہہ آدمی سمجھتا ہے، مجھے کام کرنے یا کھینچے کا بالکل شوق نہیں۔ میں اس کی نظر میں مستقل حواہی لاکا نہیں تھا۔ میں اب خوب دل کا کام کروں گا اور مسز میجاب دین کو اپنی راتیں جھیل کرنے پر مجبور کر دوں گا۔

رات کو میں اور شیر علی ایک باتیں کرتے رہے۔ بعد میں شیر علی کو بخند آنے لگی اور مجھے اس کو چکانے کیلئے کئی بار اس کے بچکی لینا پڑی۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح شام سے میں بالکل نیا آدمی ہو گیا ہوں اور تادی تھی اب بھی چیز ہے۔ ان باتوں کا شیر علی پر کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ وہ عورتوں کی پوری نسل ہی کے خلاف ہے۔ اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اسے مجھ پر حاصل تھا کہ جس آدمی پر ایک بار مسجب نازک کا ہوا وہ بھل جائے اس کو سمجھانا اپنا وقت ضائع کرنا ہے۔ مگر ایک سچا اور دانا دوست ہونے کی حیثیت سے اس نے مجھے چند فائدہ بھری تجویزیں دتائیں۔ جن میں پہل کر کے میں اپنی منزل مقصود پہنچ سکتا تھا کہ چہ اس نے بعد میں یہ بھی بتادیا کہ اس کی راتیں میں منزل مقصود اس کاٹتی ہی نہیں تھی کہ اس کے لیے اتنا حقیقی وقت بڑا دیکھا جائے۔

میں نے لڑک کر کہا۔ ”ابے چیز تو ہے ابیں نے رضیہ کے بارے میں تمہاری راتیں چھی جی کب تھی؟“

اس نے جواب دیا ”مگر کیا تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ جن سفید انگلیوں نے تمہیں پاگل بنا دیا ہے وہ شاید رضیہ کی نہ ہوں اس کی ماں کی ہوں مسز میجاب دین کی بیوی کی۔“

اس امکان کا مجھے گمان ہی نہیں تھا کہ وہ انگلیوں رضیہ کے علاوہ کسی اور کی بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر میں اس بارے میں شبہ کر کے اپنی مشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ ان انگلیوں میں جو چمک تھی وہ وہ چیز مگر کسی عورت کی انگلیوں میں ہوتی نہیں تھی۔ شیر علی نے مجھے جو تجویزیں دتائیں، ان میں سے پہلی تو تھی کہ میں در کتاب میں جی ٹکا کر کام کرو۔ مسز میجاب دین کے سامنے ہمیشہ ایک پرغور اور بے ہوش

اور اس کی موجودگی میں کسی سے کوئی دفاع نہ کروں۔ جو یہ جتنی کہ مسز میکلجیڈ دھڑکتی ہوئی لوگوں کو بہت دقت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ (اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میرا دوست شیر علی مسز میکلجیڈ کے خاکی حالات کے متعلق کافی واقفیت رکھتا تھا) مسز میکلجیڈ دین کے دو چہرے لڑکے آوارہ تھے۔ نہ صنادید خانہ تو ایک طرف وہ سارا سارا دن لڑکی کے لٹوؤں کے ساتھ کنگاڑائی میں گزارتے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو جس کی عمر بچہ کوئی دس برس کی ہوگی ایک دفعہ ایک فلم کی اسٹوری دہانی کے سمر ایک ہی چٹا رخاٹے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

شیر علی نے کہا۔ ”اگر تم مسز میکلجیڈ کے لڑکوں میں سے بھی کسی کو ایسا کرتے دیکھو تو کان سے بکا کر اسے فوراً مسز میکلجیڈ کے سامنے لے آؤ۔ اس طرح مسز میکلجیڈ کو لگے گا کہ تمہیں اس کے خفاؤں کا خاسخ خیال ہے۔ وہ تھوڑے ہی عرصے میں تم کو اپنے گھر کا آدمی سمجھنے لگے گا۔“

شیر علی نے جتنی کہ مسز میکلجیڈ دین کی بی بی حکیم علی مشہور صوبہ سرحد۔۔۔ کی شہری بیٹی تھی۔ حکیم صاحب کا دہلی تھا کہ جو کوئی بھی ان کا سرماستال کرے گا وہ ان کو تار سے کھینچے گئے گا۔ چنانچہ شہر لاہور میں اب تک ایسے لوگ موجود ہیں جن کو دن کے وقت صرف تار سے ہی نظر آتے ہیں اور حکیم صاحب مرحوم کی روح کو دعائیں دیتے ہیں۔

شیر علی نے کہا کہ جب بھی تم مسز میکلجیڈ دین سے ملو، باتوں باتوں میں حکیم علی مرحوم کے سر سے کاڑ کر ضرور لے آؤ۔ یہ ذکر دانا اور پٹنی آواز میں کرتا تھا کہ اندر مسز میکلجیڈ کی بی بی جن کے خفاؤں میں کھڑا کر ایک بار دو واٹھ سے کاڑ کر دیکھتے ہو جس نے مرحوم کا مشہور صوبہ سرماستال کیا تو ایک ہفتے کے بعد دیکھنے لگا۔ بات چینی ہی مثال دے سکتے ہو کہ جن دنوں تم یہ سرماستال کرتے تھے تم نے عید کا چاند دیکھا وہ پہلے وہ پہری کو دیکھا تھا اسی قسم کی خرافات۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے تم مسز میکلجیڈ کی بی بی کی کد میں گھر کر سکتے ہو اور میرا یہ وقت بھی آسکتا ہے جب وہ اپنے مسز میکلجیڈ سے صاف صاف کہہ دے کہ اس دنیا میں دھند کے لیے مناسب ترین روش تو یہی ہے۔ میری طرف سے گھر کرنا کہو کہ جو شخص کسی عورت کے باپ کی تعریف کرے گا وہ اسے اپنا سب سے بڑا ہندو دیکھنے لگے گی۔ مجھے یقین ہے کہ جب تم حکیم کا ذاتی عقیدت سے کہو کہ مسز میکلجیڈ کی بی بی جن اٹھا کر بے حراک اندر چلی آئے گی اور تمہیں بتا کر کہ اپنے والد مرحوم کی طاعت کا کوئی اور غیر اعتدال مجھ سے سنا دے گی۔

مردمیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔“

دوسرے دن صبح میں اتفاقاً اس پتے اراوے کے ساتھ کہ آج میں مسز میکلجیڈ کے قلعے پر بلہ بول دوں گا اور اسے فتح کر کے رہوں گا۔ درکشاپ میں میں نے پورا دن لگا کر مسز میکلجیڈ کا ساتھ دیا اور صاحب صاحبک صوبہ سرحد، شام کو واپس آ کر میں مسز میکلجیڈ کے خفاؤں کو دھڑکنے لگیں کھڑا ہوا۔ اس دن تو میری طعاش نا کام رہی۔ مگر دوسری شب کو میں نے دہلی میں جتنا کہ پاس دلا کہ دیکھے جو ظلم ”تھیمز“ پر بحث کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک مسز میکلجیڈ دین کا لڑکا تھا۔ میں نے لپک کر کہا۔ ”اے غلطو! تم کہاں آوارہ گردی کرتے پھر رہے ہو۔“ پھر میں نے مسز میکلجیڈ کے بیٹے کو ہار سے پکڑا اور اسے گھسیٹا ہو اگی میں نے چلا۔ اس نے میرا ہاتھ کاٹنے کی بار بار کوشش کی اور میری شان میں کچھ نہایت سنگیناں بھی استعمال کے جو طوائف کے خوف سے یہاں نہیں کھینچے جاسکتے تھے۔ لڑکے نے رورور کر آسمان سر پر اٹھا کر کہا تھا۔ کڑکیوں میں سے کی جھونکیں جھنکیں ہٹا کر بھاگنے لگی تھیں۔ مسز میکلجیڈ دین بھی بیڑ میں اترا۔ میں نے چھوٹی سی کہا۔ ”یہ سب کچھ اس پاس آوارہ گردی کر رہا تھا۔ اس لیے میں اسے پکڑا ہوا ہوں۔“

”مگر میں۔۔۔“ میں نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر یہ کہہ کر کھڑا۔ آخر میں کہہ ہی کیا سکتا تھا۔ میں جب آج بھی سوچتا ہوں کہ اس وقت مجھے کیا کہنا چاہیے تھا تو کوئی اعتدال بہت مجھ میں نہیں آتی۔

”خیر کوئی بات نہیں“ مسز کی دلا۔ ”جادو غلط“ سبتر کہو۔“

خاصی امیر کے بعد میں صرف اتنا کہ پایا۔ ”اس نے راستے میں میرا ہاتھ کاٹنے کی کوشش کی۔“ مگر افسوس کہ میرے اس فقرے کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ مسز کا اثر ہوا۔ سب لوگ مسکرانے لگے۔۔۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں مجھے بھی مسکرا دینا چاہیے تھا۔ سو میں بھی مسکرانے لگا۔ بہت عجیب مسکراہٹ ہو رہی تھی۔ جتنی بھی ہے اور مجھ میں کھائی رہتی۔

شری علی کا تانا ہوا پاس بالکل اتنا چڑھا مگر مسز کی محتاب دین میری ایک نیچی سے حاشا ہوئے بغیر نہ رہا۔ اس نے امدادہ کر لیا کہ میرے سینے میں خاص سونے کا مال ہے۔ اس واقعے پر چارواٹے کے تین دن بعد مسز نے مجھے اور شیخ شری علی کو گات کے کھانے پر مدعو کیا۔ وہ مجھے مضمون ہوا کہ شری علی کس جگہ کا شطر ہے۔ اتوار کا دن تھا۔ سارا دن میں رات کے کھانے کے خواب دیکھا رہا۔ میں آئندہ کم ہی دیکھتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ آئندہ کھینے کے فوراً بعد جو پہلا خیال میرے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ خود کو کھنی کھنی چاہیے۔ اس کے باوجود میں لاہور کے کم سے کم تین ایسے آدمیوں کا نام لے سکتا ہوں جن کے حنا بے میں مجھے بڑے احاطہ کے ساتھ خوبصورت کہا جا سکتا ہے اور پھر اصل چیز تو انسان کا دل ہوتا ہے اور اب تک چارے سے قاصر نہیں تم پر ثابت ہو چکا ہوگا کہ میرا دل سونے کا ہے۔ اس روز میں نے کوئی دو گھنٹے گاڑا مسکراہٹ میں صرف کیے۔ چار بجے کے قریب مولوی کریم الہی حاکم کی دکان پر (جو پانی سکول میں میرا کلاس فیلو تھا) دو بارہ واڈھی منڈائی آئے۔ آئینے میں اپنی صورت دیکھی اور غصہ ڈال دیا۔ یہ مضمون کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ کس ڈھوپے سے میں ڈرا خوبصورت یا کم بد صورت نظر آ سکتا ہوں۔ کسی بھی ڈھوپے کا نتیجہ حوصلہ افزا نہ تھا۔ مگر میں شاید ان لوگوں میں سے ہوں جن کے ساتھ آئینے پر اپنی طرح انصاف نہیں کرتے۔ ایک آپ کے بعد کپڑوں کا مسئلہ سامنے آیا۔ تھوڑی سی لاطوری میں جا کر میں نے اس سے کسی ٹاپک کے کپڑے کرانے لیے۔ یہ سوٹ ایک بہت بھونٹی ناگنوں والے بہت سونے آہی کا تھا۔ نتیجہ یہ کہ کوٹ بالکل ڈھیلیا تھا اور جتنوں میرے ٹیٹوں سے چار ایک الٹی اوٹنی تھی۔ وہاں سے میں شیخ شری علی کو مدعو کرنے کے لیے اس کی دکان پر پہنچا اس نے مجھ پر ایک نظریں ڈالی، جیسے مجھے پچھتاہٹ تھی اور ایک ٹاپک کا گھبراہٹ سے اپنے علاقے میں شامل کرتے ہوئے بولا۔ ”کیوں صاحب، ہمارا دور وہ نہیں گئے؟“ فوراً بعد مجھے مضمون ہوا کہ شری علی مجھے ہار دیا تھا۔ اس نے مجھے پکپکان لیا تھا اور بعد میں مجھے بتایا تھا کہ میں اس لباس میں ہر دھیر گھٹا ہوں۔ لاہور کے گولے اور کھیل گئے والا ہر دھیر۔

شام کو شیخ شری علی اور میں مسز کی محتاب دین کے بالانانے پر پہنچے۔ مسز کی ایک سستے شریچہ خاندان میں سبائی کی تھی۔ دو تین پرانے صوفے تھے اور دو چاروں پر ”بعدات کے لائے ہوئے کھیل“ کے کھیلے تین قرے تھے اور ترکہ، ہندوؤں کی رنگین تصویریں تھیں ایک کونے میں گراموفون رکھا تھا جس پر کلاؤن کا ٹاپک، کلاؤن کا ٹاپک، اس کے پاس ہی ایک بندوقم کا نو جوان بیٹھا سر دھن۔ ہاتھ اسے دیکھتے ہی مجھے اس سے غرت ہو گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھا اور بولا ”اسلام علیکم پر دھیر صاحب“ اس کے بعد بھی وہ مجھے پر دھیر کہنے پر مصدوم رہا۔ بلکہ کھانے کے بعد تو اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں سب حاضرین کو تاش کے کھیلوں سے محکوم کروں۔ میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ کھانا کی ایک مدد ہونی چاہیے اور مدد سے باہر جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کھانا کرنے والے کی تربیت میں غفلت برتی گئی ہے۔ اس کے باوجود دعوت بہت کامیاب رہی۔ مسز کی محتاب دین بھی فقیروں کی کرامات کا تار باب اس نے بتایا کہ کسی فقیر نے بھاری کے سائے میں آدم کیا اور جب وہاں سے اٹھا تو بھاری کو دعا دے گیا۔ ایک بار مسز کی محتاب دین نے اپنے ساتھ دو سوتوں کے سر اور اس بھاری کے چند بچے کھانے اور پک ایک اس کی بھوک اتنی بڑھ گئی کہ پہلے تو آٹھ آدمیوں کا بندھا ہوا کھانا چٹ کر لیا اور پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا ”بھاک جانا دون

میں تم کو بھی کھا جاؤں گا" سب دوست اسے مذاق کچھ کر زور دے دے بٹنے گئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے سب ساتھیوں کو کھا کر۔ سوائے مسز می متباب دین کے جس کی طرف رخ کرنے کے بعد اسے ایک اکارا آئی اور اس کی بھوک مٹ گئی۔ ان باتوں نے کمرے میں ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس میں اگر کوئی غیر ممکن الموقوع کہانی بھی سنائی جاتی تو اس پر فوراً یقین کر لیا جاتا۔ اس فضا نے میری حوصلہ افزائی کی اور میں نے یکم عاتق طبعی کے مضمون دوسرے کا ذکر بھی کر دیا اور اس بار زور دے گا کہ کیا جس نے یہ سراسر استحال کرنے کے بعد عید کا چاند ان کے دو چہرے ہی دیکھ لیا تھا۔ میں نے یہ باتیں اونٹنے لچھے میں اور بڑے دالہا نہ ہیں سے حاکم کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ دروازے کے پرانی طرف مسز می کی چوری اور اس کی بیٹی سب کچھ کر رہی ہیں۔

اس نکالنے کے بعد دوسرے ہی دن مسز می متباب دین نے درکشاپ میں اپنے لڑکوں کی بڑی حالتی کے بارے میں مجھ سے مضمون دیکھا اور اسی شام سے میں بخیر کی حیثیت سے ان لڑکوں کو مسز می کی جینک میں بڑھانے کے لیے جانے لگا۔ (میں غل پاس ہوں) میں وہاں بڑا بڑا درخت تھوڑے فاصلے پر غمگین تھی، پر غمگین کرنا نے کے دروازے کی طرف پیچ کر کے جھٹکا کیونکہ میرا خیال تھا کہ ریفے پاس کی ماں کا مجھے بڑا بڑا داغ طور سے دیکھنا میرے حق میں کسی طرح مفید نہیں ہوگا (میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ میں صورت شکل کا کچھ کیا ہی ہوں) تیسرے دن سے میں نے دیکھا کہ درکشاپ سے چھٹی کے بعد مسز می متباب دین خود ہی دالہا نہ کی کے لیے میرا ساتھ دھوڑنے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ایک نئی روشنی ہی دیکھی جو ایک آدمی کی آنکھوں میں اس شخص کو کچھ کر آ جاتی ہے جس کو وہ آدمی کا شرف بھٹنے کا آرزو مند ہو۔ مسز می رجیم عقل سے اب وہ اللہ پر بہت کچھ کھینچی تھی اور ان کے تعلقات کے دو مہمان بھائی سامنے سونے پر دے جاں اور ہے تھے۔ رجیم عقل اب بھی کبھی کبھی متباب دین سے ملنے جاتے تھے۔ لیکن دالہا نہ کی شاپ میں آتا مگر وہاں بارہ منے بھی نہ ٹھہرتا اور اب جو باتیں وہ وہاں کرتے۔ ان میں وہ پرانا بڑا بڑا نقش اور روشنی کی گری ٹکڑے مٹھو ہوتی۔ میرے لیے یہ سچہ کچھ سے بلا تر تھا کہ کسی طرح دالہا نہ کے دوست بھیر کی لٹا یاں وہیہ کے ایک دوسرے سے بچنے جا رہے تھے۔ لیکن میں دل ہی دل میں حالات کی اس روش پر خوش تھا۔ ایک تو یہ میرا ڈاکھی والا آدمی تھے جسے مطلق نہیں لیا تھا۔ دوسرے مسز می سے اس کی بے رٹلی اور کھپا کھپا سیر سے حق میں مفید ثابت ہو رہا تھا۔ میں رات رات مسز می متباب دین کی روشنی اور احسا حاصل کر رہا تھا اور ایک لحاظ سے اس سرخ ڈاکھی والے آدمی کی جگہ پر آ جاتے ہو رہا تھا۔

میں نے حالات کی اس غیر حقیق اور مہارک جدیدی کا شیخ شیر علی سے ذکر کیا۔ اس نے مجھے کڑھائی کے طور پر سے دم اور دس کی ٹھنڈی سے دیکھا کہ وہ مجھے اس بے وقوف کر کے کی احمد کچھ رہا تھا جو خود ہی قربان ہونے کے لیے ہمارا جا رہا ہو۔

اس نے کہا۔ "اب تمہارے لیے مجھے کوئی امید نظر نہیں آتی۔ تم صاف چاہی کے گڑھ کی طرف جا رہے ہو۔"

"کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"بڑے متباب دین کے دل نے اب تم کو اپنا دارا قبول کر لیا ہے۔ صرف تمہارے ارادہ بننے کی وجہ سے اور بڑا حال اچھل پڑے گا جس جہیں تاراں وہ اب صرف تمہاری فضا معلوم کرنے کے انتظار میں ہے۔ اب چاہی سے تمہارا چنا مجھے حال دیکھائی دیتا ہے۔"

"مگر مجھے اس کی اگھیاں مفید، لیکن اور بھری ہیں۔"

"تو تمہارا۔" شیخ شیر علی بولا۔ "کئی عورتوں کی اگھیاں مفید لیکن اور بھری ہوتی ہیں۔ خود میری اگھیاں لیکن اور بھری ہیں، اس نے اپنی جھلی کو اب میری ٹھنڈی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کبھی ہے میرا دوست شیر علی 'صنفلد' ڈاک سے غرت کرنے والا۔ تاہم وہ ایک دوست کی خاطر سرسکا نے کبھی چہرہ نہ دیا ہے۔ میں نے ہنسنے اس کو اس بات پر رضا مند کر رکھی تھی کہ وہ اس کام کو اہم تک پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر لے اور مناسب طریقے پر مسز می ہتھاپ سے مجھے غرت دہی میں قبول کرنے کی درخواست کرے۔

"مگر ایک بات میں تم کو پہننے سے متا دوں۔" شیخ شیر علی بولا۔ "جب تمہاری بیوی آجائے گی تو تمہیں اپنے لیے ایک الگ مکان وصول کرنا پڑے گا۔ میں اپنے گھر میں کسی بے وقوف اور ہر بات میں دخل دینے والی باوقی عورت کی موجودگی پر برداشت نہیں کر سکتا" یہ میرے اصحاب کے لیے نقصان دہ ہے۔"

"نہیں۔ چنانچہ وصول کرنے کی فوجت ہی نہیں آئے گی۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "ابھی چند دنوں میں تم کو فصلی خیروں سے مکالمہ نویس کے عہدہ کی پیش کش آجائے گی اور تم کو یہ مکان ہمیں سوپ کر مستقل طور پر بخشی چلے جاتا ہوگا۔ ہر گز یہ کہ تم کسی اور آقا کو یہ یاد رکھنا کہ ہمارے مکان کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے ہیں۔ ہمارے گھر کو اپنا گھر سمجھنا۔ مردانے کی خشک میں ایک ہنر پیش تمہارے لیے بچھا رہے گا اور میں اور میرے تمہارے لیے جانے کی ایک بیانی اور ایک رکابی تیار اور خریدیں گے اور ہم انہیں کسی اور کو دے گا۔ تمہیں لگانے دیں گے۔ یہ تمہارے بچا شیخ شیر علی کے لیے ہیں۔ ہم اپنے قصوں سے کہیں گے۔"

اب یہ بتانا باعث طوالت ہوگا کہ کس طرح اسی شام شیر علی مسز می ہتھاپ دین سے اکیلا غلے کے لیے اس کے بال خانے میں گیا اور کس طرح انہوں نے خوش اسلوبی سے اس معاملے کو طے کیا اور کس طرح جب شیخ نے مسز می سے خدمت چاہی تو مسز می کی خشک خوشی سے ہنک رہی تھی۔ معاملے کے طے پانے میں بالکل کوئی دیر نہ لگی کیونکہ جتنا میں دروازے کے لیے بے صبر تھا، اسی قدر مسز می خسرہنے کے لیے صیاب تھا۔ دوسری صبح جب درکشاپ کی لڑین کی طرف جاتے ہوئے مسز می ہتھاپ دین مجھے گل میں ملا تو میں کچھ صیاب سا گیا۔۔۔ سکول کے آخر کے کی طرح جہانپتی کسی شرمندہ ہو۔ مسز می ہتھاپ دین سے ہر خوش معلوم ہوتا تھا۔ اس کی خشک ٹھٹھائی تھی۔ اسے یقیناً مجھ میں وہ تمام خوبیاں اور انہیں عادات و صفات نظر آ رہی تھیں، جن کی ایک نعل اور ٹھٹھائی دہانہ سے طوائش کی جاسکتی ہے۔ اس کے باوجود گاڑی میں درکشاپ پہنچنے تک ہتھاپ دین کے چہرہ پر کبھی کبھی ایک تاریک سایہ سا آ جاتا جس طرح کوئی صمدی تکلیف وہ بصورت اس کی خوشیوں کے آگہن میں گھس آئے ہر صبر ہو گیا اس بصورت کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے؟ شاید مسز می میرے چال چلن سے چوری طرح مطمئن نہیں؟ مگر اسی دن مجھ کو معلوم ہو گیا کہ اس تاریک سائے کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔ اسی لمحے جب مسز می دھم دھم غلے میں رات شاپ میں مسز می ہتھاپ دین کو غلے کے لیے آیا۔

ہم کسی پیسے پر بلاؤں کا نقصان لگا رہے تھے۔ خسر اور داد و دیوں خوشی اور مطمئن کی ایک ابدی جنت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جس وقت دوسرے دوسرے دائرہ آدمی وہ آدمی ایک انسانی ہاکری طرح دھڑا دھڑا ہوا شاپ کے اندر آیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک کینہ اور خطرناک سی نظری ہوئی تھی جس طرح ایک حملہ آور سر کھینچنے میں ہوتی ہے اور اس کو دیکھ کر مسز می ہتھاپ دین کا چہرہ خوف سے سیاہ پڑ گیا۔ اس دنوں کو دیکھ کر مجھ پر فوراً اس حقیقت کا انکشاف ہو گیا کہ پچھلے چند دن انہیں صرف ایک دوسرے سے دروازے پر اٹھانی اور بے تعلق کے صبر میں لے گئے تھے بلکہ انہیں ایک دوسرے کے خوفناک جانی دشمنوں میں تبدیل کر دیا تھا۔

"مہاراجہ ہو بھئی" اس نے بڑے طو سے چپٹے اور مجھے کندھے سے بکڑتے ہوئے کہا۔ مگر اس کی آنکھوں میں مطلق کوئی ہنس و خنسی

صرف ایک طرف ایک دھکی گئی۔

مسز میسٹاب دین سے اس نے صرف ایک پہنچنے میں بھی کہا "گوتم آج شام کو گھری ہو گئے؟ مجھے تم سے ایک دو باتیں کرنی ہیں۔"

اور اس کے بعد وہ چلا گیا۔ میرے اعصاب بالکل محدود ہیں۔ مگر میں اقرار کرتا ہوں کہ اس کے جانے کے آدھ گھنٹے بعد تک میں بالکل اپنے آپ میں ٹھیک تھا۔ میں نے اور مسز میسٹاب دین نے پیسے کے اوپر سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر وہ بڑا سا بھلہ بڑا ہنسنا ہو گیا تھا۔ مبارک؟ انکی طرف ایک مبارک کھی کسی نے کئی کو نہ دی ہوگی۔۔۔ مبارک! جو ایک دھکی معلوم ہوتی تھی۔ اس کو میری ہتھیلی کے بارے میں بتاؤ کہس نے تھا؟ شاید مسٹاب دین اور میری کئی ٹی وقت سے اس نے یہ خود بخود ہی اخذ کر لیا تھا اور پھر انکی باتیں گھنٹی کب رہتی ہیں! اس کے باوجود اگر شام کو میری ملاقات اس نو جوان سے نہ ہو جاتی، جس سے مجھے مسز میسٹاب دین کے کھانے پر بار بار "پرو فیئر" کہنے پر اصرار ہوئی تھی تو میں اس واقعہ کا زیادہ غماز نہ کرتا۔ اس نو جوان کا نام میں نہیں بتاؤں گا اور کہانی کے مقصد کے لیے اس کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ بال پر ایک نوٹو گراف کھنٹی میں ملازم ہے اور مسز میسٹاب دین کی بڑی رشتے سے اس کی بھو بھی گئی ہے۔ میں اور شیخ فری اپنے بولے دیوتاؤں کی تلاش میں رات کو کھانا کھانے ایک ہوئی میں گئے اور جب ہم کھانے کا آرڈر دینے کے بعد کھانا آنے سے باج میں ہو کر چند سیوا پنکھوں اور گھیسروں والے آدمیوں کی باتیں سننے کی خواہش کر رہے تھے تو ایک ایک کر جتنی "ہولی" "ہولی پرو فیئر" نے ہمیں چوکھلا دیا اور شیخ اس کے کہ ہمیں معلوم ہوتا کہ یہ پرو فیئر کہنے والا کون ہے وہی نو جوان ہمارے سامنے کھڑے ہو گیا۔

اس وقت مجھے اس کے "ہولی پرو فیئر" میں طر آجیو مسز میسٹاب دین کی آواز سے دیکھنے لگے۔۔۔ انہوں نے مانا یہ سمجھا کہ میں اصلی پرو فیئر ہوں۔

"بڑی بھوک لگی ہے۔" اس نے کہا "کھانے کا آرڈر دیا ہے یا کھا چکے ہو؟ اچھا۔۔۔ بہت اچھا۔۔۔ ہاں یہی مبارک ہو۔۔۔ بھو بھی نے آج صبح مجھے تھلا۔ وہ پہلے بھی تھی تو جانتی تھیں۔ صرف بڑا سا مسٹاب دین خوش و خوش میں تھا۔ وہ بھی تھرا رہے خلاف نہیں تھا مگر اس کے دل پر کھانا اور سارا تھا۔ نہیں بتاؤں اس کے دل پر کچھ مرے سے وہ مسز میسٹاب دین کے ساتھ تھا۔

خیر تم خوش قسمت ہو پرو فیئر۔ میرا مطلب ہے۔ اپنی شکل و صورت کے مقابلے میں تمہاری قسمت بہت اچھی ہے۔ دیکھ بڑا دل میں ایک لڑکی ہے۔ مجھے ملانی کلاؤ۔ میں نے اور بھو بھی نے ذرا دیر طریق پر بڑے مسٹاب دین کے سامنے تمہارے حق میں نکالتی "ہمیں پرو فیئر چاہیے۔ پرو فیئر جیسا اور کوئی نہیں۔ ہم نے مسٹاب دین سے امر دیا اور آخر اسے سنا کے چوڑا بھری پونے ٹھونگو۔ تمہاری کامیابی کا سرا میرے سر ہے۔"

بعد کی باتوں نے جس نو جوان نے مرغا چھڑا اور شاہی نکوڑ کو "گھٹے" "ہوئے کس" (کھانے کا کھانا اس کے لیے استعمال ہی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ پنکھوں کا بھوکا معلوم ہوتا تھا) ہم پر واضح کر دیا کہ وہ اپنی بھو بھی کے گھر کے اندرونی حالات سے کاحقہ واقف نہ دیکھتا ہے اور یہ کہ اس کی بھو بھی گھری کوئی بات اس سے چھپا کر نہیں رکھتی بلکہ وہ اس کا ہر اذہ اور مشیر تھا بظاہر اسے اپنی بھو بھی کے کچی معاملات پر دوسرے بازار ایک مکمل مضمین سے بحث کرنے میں بھی کوئی ہنڈ نہیں تھا۔

”رضیہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔۔۔ نہایت خوبصورت لڑکی۔۔۔“ اس نے اونچی آواز میں ہمیں اور مارے ہوئی کو سناتے ہوئے کہا۔
 ”میں سمجھتا ہوں تم واقعی قابلِ رشک اور دماغی بڑی ہے جس پر ایک پروفسر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔“

اس نے ہمیں اس سرخ رازھی والے آدمی ستری رجم بھٹی کے بارے میں چند ایسی باتیں سنائیں جس سے میرا خون کھولنے لگ گیا اور اس نے میری غرت دو چند ہو گئی۔۔۔ گھنٹائی شرمناک باتیں اور بالکل غیر حوالق۔ ستری رجم بھٹی ایک یہودی تھا۔۔۔ میرا مطلب ہے اس کی عادات یہودیوں کی ہی تھیں اور وہ اپنے مسابو کو سوہرہ پر دے دینے کا عادی تھا۔ کوئی عادت انسان کے بدترین اور اعلیٰ ترین جذبہ کو اس حد تک سطح پر نہیں لاتی جتنی یہ سوہرہ کی عادت۔ ستری مہتاب دین بھی اس سرخ رازھی والے آدمی کے قریبی سے ہے جو کہ وہاں تھا۔ قرضہ جو پہلے بھٹی ستری نے دوستانہ انداز میں تھوڑا تھوڑا کر کے لینا شروع کیا تھا اور جواب دو چار تک پہنچ چکا تھا۔ رجم بھٹی کی پہلی بیوی دو تیس سال ہوئے سر بھٹی تھی اور اس کی لوسری کی سی آنکھیں ایک عرصہ سے رضیہ پر تھیں۔ جب تم ایک آدمی کے مقروض ہوتے ہو تو کسی وجہ سے اس کے رویہ و قدم میں ایک احساس کمتری سا پیدا ہو جاتا ہے تم اس کے سامنے آنکھیں نہیں اٹھا سکتے۔ گھروں میں وہاں آدمی اپنے قرض خواہ کے ہاتھوں میں آسانی سے کٹ چکی ہوا جاتا ہے۔ لیونہ بھی کیفیت ستری مہتاب دین کی ہوئی۔ رجم بھٹی نے ستری مہتاب دین کو ایک پاکیزہ اور صاف دل سیدھا آدمی سمجھ کر اس پر ڈور سے ڈالنے شروع کئے اور بالائی کی باتیں کر کے اس سے یہ ذاتی اقرار لینے میں بھی کامیاب ہو گیا کہ وہ رضیہ کا رشتہ ستری رجم بھٹی کو دے گا۔ اس کے عوض ستری رجم بھٹی یہ لکھ دینے کو چاہتا تھا کہ وہ مہتاب دین سے قرضے کی ایک ایک پائی وصول کر چکا ہے۔

دوسرے دن ستری مہتاب دین زیادہ خوش تھا۔ رات کو ستری رجم بھٹی نہیں آیا۔ میں نے لڑکوں سے فارغ ہو کر ستری سے باتیں شروع کیں اور رات کو بھر کھانا کھا اس کا ذکر بھی کیا۔۔۔ مگر احتیاط کے ساتھ تاکہ اس کو بے مظلوم نہ ہو کر میری کیا غرض ہے۔ میں نے اس کی احساس بدعنوانی کو دو چار کر دیا۔ بڑی رقم نہیں اور اسے اللہ ہم دونوں کی رجم بھٹی کے قرضے کی ایک ایک پائی نکال دیں گے۔ ستری کے دل پر اس بات کا بے حد اثر ہوا کہ میں ابھی سے اپنے آپ کو اس کے گھر کا ایک لڑا لکھنے لگا تھا۔ ستری کو اب میری موجودگی سے اطمینان محسوس ہوتا تھا۔

شیخ شیر علی نے ستری سے دوبارہ دل کر میری شادی کی تاریخ بھی لے کر لی۔ شہر کے پہلے پتے میں۔۔۔۔۔ دن اسی طرح کسی واقعے کے طائر گزرنے لگے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ دن میرے لیے سخت انتظار اور بے باس غمی کے دن تھے۔ ایک شام میں نے دروازے کے پیچھے سے درجہ کی جھلک بھی دیکھ لی تھی۔ خوبصورتی اور مصیبت کا وہ انتظار اب بھی میرے دل کو سوہرہ پر دیتا ہے۔۔۔ اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میری نیند اس کے خواہوں سے جھٹکے گی تھیں۔ رضیہ کی ماں اب مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی بلکہ میرے سامنے بے حراک آتی جاتی اور کھلم کھلا باتیں کرتی ”وہ کافی باقوتی عورت تھی (کون عورت باقوتی نہیں ہے!) اور اس میں ایک دلچسپ قوت یا بے قوتی تھی۔ وہ معمولی واقعات اور عام لوگوں پر ایسا رنگ چڑھاتی تھی کہ وہ آسانی سے بھلائے نہیں جاسکتے تھے۔ اس کی باتیں سننے کے بعد اس کا باپ ایک عام سرے کا ہزار کی سوچہ مظلوم نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک بچھا ہوا ولی جس کا سر میں ایک لونی ترین کرشمہ ہو۔ وہ دیندار بھی تھی اور عقلانی پسند بھی اور میں دل کی دل میں خواہش ہوتا کہ رضیہ نے بھی یہ ساری صفات اپنی ماں سے ورثے میں پائی ہوں گی۔ وہ بھی اتنی ہی دلچسپ باتیں کرتی ہوگی۔ وہ بھی دیندار اور عقلانی پسند ہوگی۔ میں جلد ہی رضیہ کی ماں کا لاڈلا اور چھپا ہوا گھر کیونکہ مجھے بڑی بڑی عینوں کو خوش کرنے کا ایک قدرتی ٹک

حاصل ہے۔۔۔ وہ چٹنی ہوئی بلاسیدہ دھاریوں والا والا خاندان میرے لیے چٹکنی ہوئی چٹنیوں والا شاندار محل تھا جس کے گرد میرے خواب منڈلاتے تھے اور وہ بد نصیب دائیں بھی۔۔۔ (مگر میں اپنا وعدہ بھول رہا ہوں اور میرا اس کا ذکر کر بیٹھا ہوں کہ وہ لائنیں جس دیا ریش ڈرامی اگی ہوئی تھی میرے تصور میں کئی دفعہ بچنے لگ جاتی۔

اور اب میں سمجھ رہی پہلی کے خدایا کہ دن پر آتا ہوں۔۔۔ وہ دن جب تقدیر کی ضرب چڑی بھٹی کی طرح ناگہانی اور درد خیز تقدیر کی ضرب۔ انسانوں پر ہمیشہ اچانک آچڑتی ہے اور میرے خیال میں یہ شیت کے لیے اچھی بات نہیں کہ۔۔۔ (مگر نعوذ باللہ میں شیت سے جھگڑنے والا کوئی) سب معمول میں اور مستری مہتاب دین کے سطلے علی الصبح در کشاپ جانے والی گاڑی میں سوار ہوئے۔ ٹھکے پا رہے جب گاڑی پہلی تو کسی نے دور دراز سے نفٹ گائی شروع کر دی۔ فوراً ہی سارا ڈپ گانے والے کا ساتھ دینے لگا اور میں اور مستری مہتاب دین بھی آہستہ آہستہ نفٹ کے اتفاق گانے والے کے پیچھے ہجرا نے لگے میں نے دیکھا کہ دھبٹ اور مذہبی عقیدت کا جذبہ جو سادہ طور پر ایک لمبیوٹوں میں اس قدر قوی ہوتا ہے مستری مہتاب دین پر جاری ہوئے لگا۔۔۔ اس حد تک کہ اس کا بدن حرکت کر کے لگا اور اس کی ٹیک بٹیک گئی اور اس کے شیشے دھندلا گئے وہ عقیدت و امانت کے کا پتے ہوئی آواز میں گانے جا رہا تھا۔ اس وقت اسے یوں عقیدت سے گانا دیکھتے ہوئے ٹھکے یہ کہان تک نہ تھا کہ آج یہ سسکتی ہوئی گاڑی اسے آخری بار در کشاپ کی طرف لے جا رہی تھی۔۔۔ جہاں اس کے باغی کا زیادہ تر حصہ چڑا ہوا تھا جہاں اس نے اپنی بی بی لائیاں چ کی تھیں جہاں مٹھیں اس کے اشارہ کی منتظر کڑی رہتی تھیں۔

در کشاپ میں مستری مہتاب دین نے اسے اٹھنے سواڑ میں سے ایک دن پہلے اس کو بیٹے مستری مہتاب دین کا قاتل اور یہ امر قدرتی طور پر اس کی خوشی اور اطمینان کا سبب تھا۔ اس دن بھی میں نے اس کو چیتے ہوئے تو نہیں دیکھا البتہ اس کی منگنا نہیں پہلے سے زیادہ فراخ تھیں۔ ہم ایک ٹھکانا کھینچنے والی رات شاپ میں کام کرتے رہے۔ اس کے بعد چار بج میں نے ٹھکے دھک میوں کی ایک پارٹی کے سمر اندر چٹ چٹری میں دائرہ پائپ گانے کے لیے پہنچ دیا۔ جب میں واپس آیا تو مستری مہتاب دین اپنے اوزار و ٹولہ اٹھائے، کچھ جھکا ہوا سال رات شاپ سے باہر لوگو شاپ کی طرف آ رہا تھا۔ جہاں لوگے اور بھاپ کے ان بھرے پھول دیو کی (جن کو کفر کا بیج پھیلنے پر بھانگتے ہوئے دیکھتے ہو) مرمت اور فلک ہوتی ہے۔ اسے COMP-AIR پر کچھ کام کرنا تھا جو رات شاپ میں دھنیاپ نہ تھی جس بھی مستری مہتاب دین کے ساتھ ہوا کیونکہ لوگو شاپ دیکھنے کا جو موقع بھی آئے میں ہمیشہ اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔۔۔۔۔ ہم ان ایک سوئی کے XJB پائپ کے دیو کے پاس سے گزرے جو لوگو شاپ کے باہر بے کار اور بادی انتھار میں گھڑے ہوئے تھے کیونکہ وہ ایک ریٹے انکوڈری بورڈ کی تحقیق کے مطابق بھاگتے بھاگتے لوگے کی چڑیوں سے نیچے اتر جانے کا رجحان رکھتے ہیں۔ اب انھیں شریر لڑکوں کی طرح ایک طرف بے کار کھڑا کر دیا گیا ہے، جہاں وہ کوئی ضرورت نہیں کر سکتے تھے شاید کبھی اب ریل گاڑی نہیں نکلیں گے۔ ان کے غرور اور طاقت کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ مستری مہتاب دین نے غرور پر ان میں سے ایک انجین کی طرف اشارہ کیا جس کے پیموں کی فلک ۱۹۶۹ء میں اس نے کی تھی۔ انجنوں کے پاس سے ہوتے ہوئے ہم لوگو شاپ میں داخل ہوئے۔ مٹھیں اور لٹکوں کی مسلسل کرکر ٹیورڈ میں بدھوں کی طرح چٹتی ہوئی COMP-AIR کی سوراخ کرنے والی سونیاں گڑ گڑاتی ہوئی لڑائیاں کھانڈے اور تھوڑے کا شہر شعلوں کی لمبی لکڑیں اندھیرے میں ڈھانوں کی طرح چٹکی اور غائب ہوتی ہوئیں۔ دوسرا ان میں کئی کئی انجنوں کے سبب اور سیاہ و احاطے کھڑے ہیں۔۔۔۔۔ خاموش اور بے صبر من انجن کی جھڑپ کے لیے لاتعداد مٹھیں سارا دن گڑ گڑاتی رہتی ہیں اور جڑیوں آ دی اپنا پیچہ بھاتے اور اپنے پیچہ سے سیاہ کرتے ہیں۔ کئی کئی دھ

تکامل کر بنوں کے پہلی چٹے نگاہ کو دیکھتے ہیں۔۔۔ پہلی چٹے جو گزرنے والوں اور کام کرنے والوں کے سروں کے اوپر دھکی کے اٹھلا میں ہونے لگے رہے ہیں انہیں چٹے جو بڑے سائے جاسکتے ہیں اور سینے جاسکتے ہیں۔ جو وہ دیکھیں جو اس طرح آسانی سے اوپر اٹھا لے جیں جیسے ہم روٹی کا پتہ ہاتھ لگاتے ہیں۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ چٹے چٹے آنکھوں سے ایک پہلی چٹے کو ایک ہاتھ کو رو پھا اور اس کو دور ایک انجن کی طرف لے جاتے ہوئے دیکھتے تھے۔ پہلی چٹے کی حرکات کو کریں کے اوپر لڑائی میں بیٹھا ہوا سرخ داڑھی والا ایک آدمی ہتھوڑوں کر رہا تھا۔۔۔ لڑائی اپنی تاریخوں پر دوڑی رہا جی جی اور اس باہر کا چٹے متزلزل پر نے چارہ چٹے۔

مستری مہتاب دین بکھرے کے لیے ایک کیمن میں ایک اسٹنٹ چارچ میں سے ہاتھیں کرنے کے لیے رکھا۔ اسٹنٹ چارچ میں نے ایک خالی COMP/AIR کی ٹیوب کی طرف اشارہ کیا جس پر اس وقت کوئی کام نہیں کر رہا تھا اور دھتے مستری مہتاب دین اپنے استعمال میں لاسکتا تھا۔ میں پہلے COMP/AIR سے سوراخ ہونے نہیں دیکھا تھا اور مجھے اس سے دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ ہم دونوں اس ٹیوب کے پاس جا بیٹھے اور مستری مہتاب دین ٹیبل سے اپنے نشانات کو یاد دہاؤں شروع کرنے لگا۔ ہمارے پاس ہی ہاتھیں طرف ایک انجن کا آدھا اٹھا ڈھانچا کھڑا تھا چار چٹے آدمی کو کھٹے سے سہارا اور انہوں میں کھڑے ہوئے امیدوار انکھار کے عالم میں اوپر چھت کی طرف بڑھ رہے تھے جیسے نئی اسرائیل میں سے ہیں اور آسمان سے کسی غصت کے اترنے کے امیدوار ہیں۔ ان میں سے ایک بے چین لہجے میں چلا رہا تھا۔ "ورا کے۔۔۔ اور انہیں۔۔۔ شاہ۔۔۔"

مستری مہتاب دین ٹیکٹ اٹھ کر اب COMP-AIR کی ٹیوب ڈراور اور کچھ اونچی چٹے اور وہ بیٹھے بیٹھے اس تک ہاتھ نہیں بٹھاسکتا تھا۔ میں نے انجن کے گرد کھڑے ہوئے آدمیوں کی نگاہوں کے مرکز کے طرف دیکھا یہ مرکز اوپر کریں کی لڑائی چٹے جو اپنے پہلی ہتھوڑے ہوئے ہاتھ میں ایک گول سلنڈر رکھ رہا تھا کہ وہ انجن کی طرف لڑائی چٹے۔ پھر ایک ایک میں نے دیکھا کہ مستری مہتاب دین ٹیکٹ اس انجن اور اس آتے ہوئے پہلی چٹے کے درمیان کھڑا ہوا تھا۔ میں اس کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے چلا یا اسی وقت انجن کے گرد کھڑے ہوئے دوسرے آدمی بھی چلائے میرے چلانے پر اس نے جلدی سے حد بھری طرف پھیرا اور میں اسی وقت ہاتھ ٹیکٹ اس کے منہ کے اوپر آ کر لگا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں ایک ٹوپر کھڑا ہوں۔ ساری درگتھاب میری آنکھوں کے سامنے گھوم ی گئی۔ ہمارے نے ایک ہٹا کے لیے ہاتھ کی چٹھٹی ہونے کی طرف کو دور دیکھا جو مستری مہتاب دین کو ہتھوڑی سے جکڑے فرش پر تھمیت رہی چٹے۔۔۔ جب کہیں وہ اپنی جگہ اور وہ ہاتھ اپنے دیوانے سڑک روک سکے۔ مستری مہتاب دین کا جسم ایک گھڑی کی طرح نیچے فرش پر گر رہا تھا جگہ ہولناک اور ہاتھ تک تھا کہ اب بھی مجھے یہ ایک محم ساہد خواب معلوم ہوتا ہے۔۔۔ میرے گرد ایک ہزار آدمیوں کا خور تھا۔ ہم سب مستری کے جسم کی طرف بھاگے۔ میرے آنکھوں کے سامنے اب بھی جے ہوئے جڑے کا گھس سا ہے۔ اور آسمان میں بیٹوں ایک ایک آدمی نے طوفان میں ہتھوڑے ہوئے جسم پر سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ مر گیا۔۔۔۔۔

بہت سے آدمی اوپر لڑائی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے بھی اوپر دیکھا۔ کریں کی لڑائی میں بیٹھا ہوا آدمی اوپر سے جھٹکا ہوا، نیچے اپنے کھٹے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی داڑھی ہندی سے رنگی ہوئی سرخ چٹے اور مجھے اس کے سولے ہاتھوں میں ایک خور کا کٹی ہوئی پنکھڑیاں چھوڑتی ہوئی معلوم ہوئی۔ وہ مستری رحیم بخش تھا۔

بعد میں سب نے کہا کہ یہ ایک حادثہ تھا۔ شاپ میں سب سے زیادہ معلوم خود مستری رحیم بخش معلوم ہوتا تھا۔ جس کی سرخ داڑھی

آنسوؤں سے جھپکی ہوئی تھی اور جو ہر ایک سے کہتا بھرتا تھا کہ وہ اپنے ایک ہی اور بہترین دوست کا قاتل ہے۔ دوسرے دن کہ میں اس کی زحار دیکھ جاتے اس سے ہمدردی جاتے اور اسے اطمینان دلاتے کہ اس میں اس کا قصداً قصور نہیں تھا اور سستی مہتاب دین کو موت قدرت کی طرف سے آئی تھی۔

(بعد میں انکو انری پر کھینچی نے سستی رجم بخل کو صاف بری کر دیا۔۔۔ اسے آنسو صرف جھکوار بننے کی "سزا" دی گئی۔ شاید یہ عاویہ ہی تھا)

ان دنوں کاروڈ نامی گھنٹا گھنٹے والے اور چھٹے والے دونوں کے لیے تکلیف کا باعث ہو گا۔ یہ علی پر اپنی رونے دھونے اور رنج و الم کی کہانی ہے جو گھر کے دونوں کمانے والے کی موت کے بعد ہمارے ہزاروں گھروں میں دوہرائی جاتی ہے۔ یہ وہ اور جیسے کاظم بیان کرنے کی بجائے قصہ کہایا جاسکتا ہے۔ میں اس بارے میں صرف اسی قدر لکھوں گا کہ میں مرحوم کی قبیلہ و عشیقہ سے لے کر بعد کی دلدور گزروں تک اس غمزدہ کہنے کے لیے زحار دیا اور امید کا باعث بنا۔ یہ وہ مجھ پر بیٹے کا دھڑکی رہنے لگی اور میں بھی اسے اپنی ماں سمجھ لگا۔

ان آدمیوں میں سے جو مرحوم کی ماتم پر ہی اور ہرجم پر آئے مرحوم کے چاہنے والوں کے رشتہ دار بھی تھے۔۔۔ معمولی چھوٹے سے آدمی جنہوں نے دم کے طریقے پر یہ اور بچوں کو گھر انوال پھلے اور ان کے پاس رہنے کا منظور دیا۔ یہ وہ نے جو ایک غمزدہ عورت تھی اور رشتہ داروں کے ٹکڑوں پر چلا لفظ سمجھتی تھی انکار کر دیا۔ پھر اس کو بھرا بھرا سہارا تھا۔ ان رشتہ داروں کے علاوہ درکشاپ کے کئی ورک میں ماتم پر ہی اور ہمدردی کے لیے آئے کیونکہ اپنی ہمدردی اور خوش چلنی کی وجہ سے مرحوم سستی ورک میں ان کی ہمدردی تھا۔ ان آدمیوں میں سستی رجم بخش بھی شامل تھا اور اس کاظم دوسروں کے ظم سے نہ پاؤہ کبیر اور حقیقی کہانی دیتا تھا۔ اس کے پاس مورتل کی طرح آنسوؤں کا ایک ذخیرہ ہونے والا ذخیرہ تھا جسے وہ بات بات پر بہانے کو تیار تھا۔ (مگر مجھے کسی کی نسبت پر شک کرنے کا حق نہیں پہنچتا) یہ وہ بھی اپنے ظم کے شدید ترین لمحوں میں چیخ چیخ کر سستی رجم بخش کو اپنے خاندان کا قاتل قرار دیتی تھی اور اس کو خاندان ہزاروں بددعا میں درسا ل کر کرتی تھی اپنے پر سکون لمحات میں اس بات کو ماننے لگی تھی کہ اس کا خاندان ایک حادثے میں مرا ہے۔ مجھے بھی کچھ کچھ یقین ہو گیا کہ مرحوم کی موت ایک حادثہ تھا اگرچہ اس یقین نے اس نفرت کو جو میرے دل میں اس سر نہاد آدمی والے آدمی کے خلاف گہرا جھگڑا تھا کسی طرح بھی کم نہ کیا۔

سستی مہتاب دین کی موت کے ڈنچہ سینے بعد میں شیعہ شیر علی کی دکان پر بیٹھا اپنی شادی کے سلسلے میں منظور کردہ ہاتھ کر سستی کا چھوڑا کا فضل بیٹا ملا یا کہ اس کا لاش ملاتی ہیں۔ چھوڑا کا کچھ ڈرا اور ہوا سا تھا۔ میں نے اس سے کچھ پوچھے پھر بالاحالے کارن کیا۔ اوپر پہنچا تو مجھے اندر کمرے میں سے وہ کھڑکی ہوئی خود یہ وہ اداستانی ہی جو میری اس قدر جانی پہچانی تھی اور جس سے میں نفرت کرتا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ یہ کچھ ڈری اور کھڑکی ہوئی چپے درپی پر ڈھکی تھی سستی رجم بخش کھڑے بازار کے ایک موٹے پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک غامض طور اور مصداری تھی اور دونوں میں دیکھی ہوئی غمزدہ مسکراہٹ جو میں نے اس جہت اس کے چہرے پر دیکھی تھی جب وہ زلزلے میں سے جھکا ہوا چپے سستی کی لاش کو کچھ ہاتھ لگا تھا۔ کوئی میرے کانوں میں کہہ رہا تھا۔ "بھئی کا قاتل ہے، قاتل بھئی ہے۔" اس نے میری آمد کو سن کر کوئی نصیحت نہ دی۔ وہ اپنی حقیقت کوئی قاتل نفرت آدمی نہ کہہ رہا تھا۔ "مرحوم میرا بھی ہزاروں دھپکا مقررہ ہے۔ بے شک میں یہ سنگہ بنی منظور ہوتی ہے کہ میں اب اس روپے کا قاتل ہوں جبکہ مرحوم کے خاندان پر بغلت اتنی سخت مصیبت ٹوٹ چکی ہے۔ مگر میں کیا کروں مجھے فی الواقع اس روپے کی اس وقت شدید ضرورت ہے۔ تو اس کوٹ میں میرے مکان کی تعمیر صرف روپے کی کی کہ جس سے کی ہوئی ہے۔"

اس نے مجھے ایک کینہ لہری مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے ہوئے جواب دیا "بے شک مرحوم میرا بھتیجہ دوست تھا مگر روپے کے معاملے میں یہ میری پرانی عادت ہے کہ میں اپنی قول و اقرار سے نکلتے چڑھت کر یا وہ مخلوق بکھتا رہا ہوں۔ میرا مقولہ ہے کہ "حساب۔ حساب ہے۔" اس نے اپنے لیے بھروسے کوٹ کی اندرونی جیب میں سے کاغذات کا ایک پتھر والا لٹے ہوئے کہا۔ "کاغذات اب بھی میرے پاس ہیں۔ یہ سرکاری اسٹامپ والے کاغذ ہیں اور ان پر مرحوم نے اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے کہ اس نے فلاں فلاں تاریخ کو مجھ سے اتنا قرض لیا۔ عام آدمیوں سے میں روپے کے پیچھے چار آدھ سا ڈھونڈتا ہوں مگر مرحوم کو میں نے بغیر سو کے قرض نہ دیا تھا۔"

"تمیں بڑا مرد ہیں" جو گڑگڑاتے لہجے میں بولی۔ "دونگو بھائی رحیم خٹل۔ تم اس کے سامنے گرے دوست تھے۔ تمہیں مظلوم ہے ہم پر کتنی بڑی مصیبت آئی ہے۔ اس وقت ہمیں ہوش نہیں۔ مگر کاکا نے والا چل رہا ہے اور مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس میں سے مکان کا کرایہ کیسے چکاؤں گی۔ میں تمہاری پائی پائی ادا کروں گی۔ مگر مجھے کم از کم تین چار مہینے کی سہولت تو دو۔"

"میں اس روپے کا ہاتھ نکالنا نہ کرتا۔" مسز می رحیم خٹل بولا۔ "اگر میرے لوگ کوٹ والے مکان کی تعمیر روپے کی کمی کی وجہ سے رک نہ جاتی۔ تعمیر کے کٹے سے مجھے مالی نقصان ہو رہا ہے۔ اس وقت تک وہ مکان کرایہ پر چڑھا ہوا ہوتا۔ اب میں انتظار نہیں کر سکتا۔"

تھوڑی دیر تک کمرے میں ہاتھ خاموشی رہی۔ اس آدمی کی سنگ دلی اور بے حسی نے ہمیں بکھرے کے لیے صدمہ کر دیا۔ اس خاموشی کا طعنے ہی تو تھا "ہاں ایک صورت ہو سکتی ہے اور تم وہ چاہتی ہو" اس کے چہرے پر وہی قاتلانہ مسکراہٹ تھی۔ ایک طبعیان سا بیجا ثناء اس سزا کے لئے تھی۔ ہاتھوں میں ہاتھوں کا ہونے چاہئے تھا۔

مجھے صدمہ تھا کہ وہ صورت کیا تھی جس کی طرف اس منکار روز سے نے اشارہ کیا تھا۔۔۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ بھی دل میں چاہتی تھی کہ بے ہنگم ہے۔ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کا ہاتھ اس بڑے کے ہاتھ میں دینے پر اس کی موت کو ترجیح دے سکتی تھی۔ مگر صورت ایک کڑوا محنتی ہے۔ کڑوا اور رنگین حراج۔۔۔ کھو رہا احساس ہوا کہ مسز می رحیم خٹل کے بچپانے ہوئے حال میں کوئی چیز بچھن کر رہ چکی ہے۔

یہ وہ ثناء اب بھی صدمہ حاجت سے اس سنگ دل کو ہٹا کر کرنے کی کوشش کرتی تھیں بول چلا "مسز می رحیم خٹل۔ تم ان عورتوں کو زیادہ شک نہ کرو۔ تم میرے ساتھ نیچے مکان پر چلو۔ تمہارا سارا روپہ میں چکاؤں گا۔۔۔ میں۔" "اگرچہ مجھے اس کا اور براہ بھی پتہ نہ تھا کہ میں اتنا سارا قرض کیسے چکا سکوں گا۔"

یہ وہ مجھے بکھرے فکر اور کھوکھ کی نظروں سے دیکھا۔ بڑا رحیم خٹل اسی کینہ لہری مسکراہٹ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم بیڑیوں سے اترنے لگے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شیخ شریلی کا ایک میں کچھ دینے کا ہے۔ شاید وہ مجھے ادھار دینے پر رضامند ہو جائے یا شاید قانونی طور پر کوئی ایسا درخشاں جائے، جس سے یہ بڑا مسز می رحیم خٹل کے قرضہ وصول کرنے کا اقتدار ثابت ہو سکے۔ جو کچھ بھی ہو اس بات کا میرے دل میں پختہ ارادہ تھا کہ اب میں یہ فوری نہیں آئے دوں گا کہ بڑا روپہ چاکر ہو اور دینے کو کلائے اور ملائے۔ جس وقت ہم پالا خانے سے اترے رحیم خٹل میرے ساتھ دکان پر پہنچے کی بجائے مجھے بیڑیوں کے دروازے کے سامنے روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک لومڑ کی سی طعنائی تھی۔ وہ شاید اس لیے میں جلتا ہوا تھا کہ کہیں میں کی جگہ اس کا قرضہ نہ چکاؤں اور یہ وہ اس کے چنگل سے رہائی مل جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ نہیں چاہتا تھا۔

"بھری بات سنو" وہ کہنے لگا۔ "تم اس معاملے میں کیوں چڑھتے ہو تم نے سارے جہاں کے دکھ درد کا ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا۔ یہ لوگ

رحمان مذنب

نام	رحمان مذنب
تعلیمی نام	رحمان مذنب
پیدائش	۱۵ جنوری ۱۹۱۵ء بمقام احمدواں کنہالی گیٹ لاہور، مغربی پنجاب
وفات	۲۶ فروری کی شام ۲۰۰۰ء بمقام احمدواں کالونی، لاہور
تعلیم	ابتدائی تعلیم مدرسہ نعمانیہ لاہور۔ اس کے بعد اپنے والد مفتی محمد عبدالستار کی زیر نگرانی رہے۔

مختصر حالات زندگی:

لاہور کے کنہالی روادارے کی اونچی مسجد سے ملحق مکان میں رحمان مذنب کی جائے پیدائش ایسی تھی کہ ادھر مشاء کی اذان کا نوا میں پڑتی، ادھر مغنیہ کی ٹان سنائی دیتی۔ یہ بادشاہی مسجد، لاہور کے داخلی طرف کا علاقہ ہے۔ گھر سے فرلانگ بھر کے فاصلہ پر عزیز قہیز تھا، جہاں سارا سال نانک کہنیوں کی آمد و رفت رہتی۔ عزیز قہیز سے متصل بھوڑوں کی جیتھیر تھیں اور چھ قدم پر نگلیاں کی گلی (نئی) اور دوسرے دروازوں کا بازار، جو شفاء الملک حکیم فقیر محمد جتشی کی شفا منزل پر جا کر ختم ہوتا۔ اطراف و جوانب میں عجیبے، بڑا خانے اور چنڈو خانے تھے اور ان کے بیچ مدرسہ نعمانیہ، جہاں رات دن علم و عرفان کی پادشہ ہوتی رہتی۔ ہر پانی نس اقبال جگمہ حمایت پانی و امیروں و اہل، استاد بڑے غلام علی خاں، غور شید پائی بھڑوں والی، استاد برکت علی خاں، مہارک علی، کامیاب حسن علی عرف مسو، استاد عبدالوحید خاں کیرا نے والے اور استاد عاشق علی خاں چٹیا لے والے بھی کا یہاں قیام تھا۔

رحمان مذنب کے والد مفتی محمد عبدالستار صاحب کا تعلق بادشاہی مسجد سے تھا۔ ان کا بیشتر وقت تعلیمی کتب کے مطالعہ، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزرتا۔ یہ پہلی جگہ کا زمانہ تھا اور مفتی صاحب کا لٹونی چٹا تھا۔ لٹوے کی رو سے چار سال تک کے مفتوہ اخیر فوجیوں کی بیویوں کو کسی اور شخص سے نکاح کی اجازت مل جاتی۔ لڑکیاں میں رحمان مذنب نے رات گئے تک چار دی رہنے والی، اپنے بچے گھر کی علمی محفلوں

میں حاضر کی دی اور پیروں اپنے والد کے ذاتی کتب خانہ کی سرکے۔ ۱۹۳۵ء میں والدہ فقہاء اسلام کی شناخت اور خیرے ۱۹۳۵ء میں والد کے ساری ماحولیت سے محروم ہوئے۔ اس سے قبل رحمان خذاب کی تعلیمی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں ان کا دارا "جہاں آراء" مزید تھیلز کے اسٹیج پر کھیلایا گیا۔ لگ بھگ ۱۹۳۶ء میں لاہور سے انھوں نے لاہور ہائس سے بیچلر ڈیگری کیلئے گئے۔ اس کے بعد وہ لیگ اور انگریز کار ۱۹۳۶ء میں لاہور لوٹ آئے۔ بیچلر ڈیگری میں قیام کے دوران ماحولی پر میں اپنے بہنوئی پروفسر سید منظور علی کے لکھے ہوئے مزید مزید کی حسین علی کو دیکھا اور دیکھتے ہی وہ گئے۔ اسی عالم میں براستہ دہلی، لاہور واپس ہوئی۔ تاہم یہ کاغذ اور قلم سے تیار کیا۔ فری لانس ادیب کی حیثیت سے تقریباً ہر موضوع پر لکھا۔ ان کے لکھے ہوئے نیکلوں کا بیان اور دیہاتی ڈرامے قلم بند کیے۔ وہ جامعیت، ماحولیات، ہاؤس اور تاریخ کے میدان مستقل طور پر ان کی قلم رو میں رہے۔ نئی دہلی کی "الف" جلی "سیریز کے لئے رحمان خذاب کے لکھے ہوئے ڈراموں کو تاہم یاد رکھا جائے گا۔ ۱۶ فروری ۲۰۰۰ء کی شام اتفاقاً کالونی لاہور میں اپنے گھر کے گن میں میز ٹری لگائے، تعریف و تالیف کے کام میں مصروف تھے کہ حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کیا۔

اولین تحریر: ڈاراما:

"جہاں آراء" میرا لے مزید تھیلز لاہور ۱۹۳۳ء

اولین مطبوعہ افسانہ:

"خیال": ڈرامہ، دہلی، لگ بھگ ۱۹۳۶ء

تھیں آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ "نہیں جان" (افسانے) رحمان خذاب ادبی ٹرسٹ لاہور طبعی اول ۲۰۰۴ء
- ۲۔ "ہالا خانہ" (افسانے) رحمان خذاب ادبی ٹرسٹ لاہور طبعی اول
- ۳۔ "میرا پیار کی" (افسانے) رحمان خذاب ادبی ٹرسٹ لاہور طبعی اول
- ۴۔ "خوشیوار اور رئیس" (افسانے) رحمان خذاب ادبی ٹرسٹ لاہور طبعی اول ۲۰۰۲ء
- ۵۔ "نکھرے کے پیچھے" (افسانے) رحمان خذاب ادبی ٹرسٹ لاہور طبعی اول ۲۰۰۳ء
- ۶۔ "تڑپتی پسند ادب کا مسئلہ" (مجموعہ) ناشرین لاہور طبعی اول ۱۹۵۷ء
- ۷۔ "پانچواں چار دیواری کی دیکھیں" (مجموعہ افسانے) ناشرین لاہور طبعی اول ۱۹۵۷ء
- ۸۔ "نرگش رو میں" (مجموعہ کہانیوں کا مجموعہ) کے عنوان سے شائع ہوئی ہے) قلم کلا، چمک کلا، گنبد لاہور طبعی اول
- ۹۔ "سوسال تک زندہ رہے" قلم کلا، چمک کلا، گنبد لاہور
- ۱۰۔ "میں عمر اور جگر دیتی" فیروز سنٹر لائیو لاہور

- ۱۱۔ "نقدی تجزیہ" فیروز سنٹر لٹریچر، لاہور
- ۱۲۔ "دنیا کے نامور جاسوسی" فیروز سنٹر لٹریچر، لاہور
- ۱۳۔ "نامور جاسوسی مورچے" فیروز سنٹر لٹریچر، لاہور
- ۱۴۔ "مسلمانوں کے قتل کی کاروائی" (ترجمہ) فیروز سنٹر لٹریچر، لاہور طبع اڈل، ۱۹۷۰ء
- ۱۵۔ "مستقبل کے ذرائع" فیروز سنٹر لٹریچر، لاہور طبع اڈل
- ۱۶۔ "رہس میں اسلام کا خطرہ" فیروز سنٹر لٹریچر، لاہور
- ۱۷۔ "سہرا پیدا تصویر کی انیس" فیروز سنٹر لٹریچر، لاہور
- ۱۸۔ "پانی" فیروز سنٹر لٹریچر، لاہور
- ۱۹۔ "انجمن" فیروز سنٹر لٹریچر، لاہور
- ۲۰۔ "تسویں دریا اور بند" (اعظم آب) طبع نظام ملی ایڈیٹر سنٹر، لاہور طبع اڈل
- ۲۱۔ "راستہ خان آب گل" ناشرین، لاہور طبع اڈل
- ۲۲۔ "غیر کی راہیں" ناشرین، لاہور
- ۲۳۔ "تور پر کی ہستی" (بچوں کے اڈل) فیروز سنٹر لٹریچر، لاہور طبع اڈل
- ۲۴۔ "بھروسے خاں ہوتا پھیرا" (بچوں کے لیے اڈل) سن رائز برقی کیمز، لاہور طبع اڈل
- ۲۵۔ "نکڑا ہار اور چار" (بچوں کے لیے اڈل) گلزار شامت مگر کراچی طبع اڈل، ۱۹۶۳ء
- ۲۶۔ "ظروں کا خزانہ" (بچوں کے لیے کہانیاں) نیچیکل بک ایچ، لاہور طبع اڈل
- ۲۷۔ "تورستان پان" (سماجیات از سرور علم پورن کا ترجمہ) مکتبہ جامعہ، دہلی طبع اڈل، نگہ جنگ ۱۹۶۰ء
- ۲۸۔ "تورے کا آدمی" (بچوں کے لیے کہانیاں) نیچیکل بک ایچ، لاہور

غیر اڈل:

نکل بالاسطوہ مکتب کے علاوہ

- "سید جان کا عہد جاہلیت اور دین اسلام کا ارتقاء" (مقالہ) مطبوعہ: "اقبال" لاہور اکتوبر ۱۹۶۳ء ایچ ٹی
- ۱۹۶۵ء (۶۶ صفحات)
- "دنیا کی پہلی طوفانک" (مقالہ) مطبوعہ: "ہندوستان گیسٹ" کراچی ایچ ٹی، ۱۹۷۰ء
- "شاعری اور زمانہ" (ترجمہ) انیس، راولپنڈی مطبوعہ: "ساقی" کراچی
- "آرامے کے تاریخی محرکات اور نکتات" (مقالہ) مطبوعہ: "ماہو" کراچی جولائی ۱۹۵۶ء

اکتوبر ۱۹۵۷ء	مطبوعہ: "اقبال" لاہور	"ڈرامے کی ارتقاء" (مقالہ)
اکتوبر ۱۹۵۹ء	مطبوعہ: "اقبال" لاہور	"سوشلزم" (مقالہ)
اکتوبر ۱۹۶۰ء	مطبوعہ: "اقبال" لاہور	"پہنان کا تھیز" (مقالہ)
		فیروز شرب حالت میں موجود ہیں

وفات سے قبل مستقل چم:

۱۸۔ فرائی شریعت، فیروز پارک، اتحاد کالونی، لاہور۔ ۸۰۔ پاکستان

اعزاز:

- ۱۔ پاکستان رائلز گھڑاؤ ملی انعام برائے "گلزار اور چتر" (جلالت) ۱۹۶۳ء
- ۲۔ ترقی ادبی بورڈ، کراچی، ادبی انعام برائے "گلزار اور چتر" (جلالت) ۱۹۶۳ء
- ۳۔ اردو سائنس بورڈ، لاہور، ادبی انعام برائے "داؤدی صندھ اور اس کا ماحول"

نظریہ فن:

"افسانہ نگاری کی بھڑکی ہوئی ٹھیکڑوں کا مظہر ہے۔ حقیقت، حیرانی اور انکشاف حقیقت اس کی مادہ ہے۔ انجلی سوچ، دانگے گل، بری سوچ اور برے گل والے۔ ٹیک وید، مٹافی اور سامعہ انجلی یہاں ملتے ہیں۔ ان کے ظاہر و باطن کو کاغذ، چائنا افسانہ نگاری کی اساسی ضرورت ہے۔ افسانہ نگاری کے طور پر ترقی ہو رہی ہیں۔ کہ وہیں کوٹانے جلائے اور کرانے کا عمل سہل نہیں۔ ان کے تصادم اور ملاپ سے کہانی کو آواز سے انہماک تک لے جانے کے لیے وسیع نگاہ رکھنا ہوتی ہے۔ پھر خود افسانہ نگاری اپنی سوچ، اپنی راہ ہوتی ہے، اپنا نظریہ بدل ہوتا ہے۔ اپنے جذبات، تجربات اور مشاہدات ہوتے ہیں۔ اسی کے علاوہ گھٹنے کا تقریب بھی ہوتا ہے۔ افسانہ نگار اپنے نظریہ بدل سے مست مقرر کرتا ہے۔ ٹیک وید کا اپنے تراذ میں رکھتا ہے اور انصاف کرتا ہے۔ جرم و سزا کا نظام قائم رکھتا ہے، سپاہ و سفید کا فرق واضح کرتا ہے۔"

رحمان شاد

(پہوالی، مکتوب، علامہ سزا احمد، ٹیک سورج ۱۵ اگست ۱۹۹۷ء)



حوالہ جات:

- ۱۔ مطلق کو مہاشا صاحب ٹیک میرا کی کتاب کے مصنف درجہ ملی کی روکھ (مطبوعہ ۱۹۵۵ء کے جرم ۲)۔

پچھلی جان

رحمان مہذب

بھلی جان کا آقا تھا کہ جہلی کے یہاں صف باقم بچہ لگی۔ اور کئی کئی پیدا ہوئے کو آئی تھی کہ پتہ بند ہو گئے۔ پہلے ہی وہ کب نہال تھا کماشت کا یہ جایا دوسرے یا اگر اور طریق نے جو سرے خواب دیکھے اور جو کچھ آقا تھا وہ سب دھرا کا دھرا ہو گیا۔

چوہارے کا حال نہ تھا۔ کڑیاں ایک تو دھوی کی کالونچ سے اتنی بھیجا کہ ہوری جس جیسے چڑیاں نے اپنی اتنی بایں پہلا دی ہوں۔ دوسرے جگہ جگہ سے خرچ لگی تھیں۔ ان کے کڑا کے بول رہے تھے۔ چری بہت ہی رسیدگی کے باعث ہم تو ذری تھی اور اب تو جہلی کے دم توڑنے کے دن بھی آ گئے تھے۔

ہو مال بہت کا دسی دج ادوں کا اور فرق کا۔ ہر روز کسٹر ہر بیٹر ہلکا تا۔ فرق کی نیپ تو نیپ انہیں تک اکڑ چکی تھیں اور کھرا تھا چھا خاصا چوپے بن گیا تھا۔ کسے امید تھی کہ اس چوہارے کی بھی اتنی جائے گی؟ پھر بھی جانی کی ہڈی بڑی تڑی تھی۔ بہت پارے والی آسامی نہ تھا۔ اس نے ٹھکرے ہوئے بالوں میں اطمینان سے شکلی بھیری اور ”جین مگر آ جا“ والا مخصوص گیت گانے لگا تھا۔

جانی نکلا پر اب کسے ہر دوسرا تھا۔ ”جہلی کا سہارا تو ٹھٹھکا تھا اس خود مرضی کی کوئی مدد تھی۔ بھلی جان کا آقا تھا کہ جانی اس سے کٹ کر الگ ہو گیا۔

جانی نے سنے کیڑے ہو گئے اور اپ ٹک ٹک کر آ گئے میں صورت دیکھی تو وہ دن یاد آ گیا جب یہ چوہارہ پہلا اور ٹھٹھکا تھا۔ یہاں ہی ادنی بچی تھی اور جانی نکلا کے اچھا کچھپے سے آ کر اس زور سے بھٹکیا لیا تھا کہ وہ بچ کر رہ گیا تھا اس دن جانی نکلا نے کہا تھا۔ ”جہلی شیرے کو انگلی دی ہے۔ جی تو ذکر لڑے گا۔ میری قسم اس کو ہلک کر دے گا۔ ہمارے شیرے کی دریا عاشق ہے۔ قاتری رضا کیا ہے؟“ پھر وہ شیر کو ہول گیا اور شراب کے گروہ ہو گیا۔ پس کی چری ہوئی چڑھا گیا اور نئے میں آ کر جہلی کا ہر حال کر دیا۔ جیسے کسی نے جی ادنی دھنک کر رکھ دی ہو۔

دیر تک جانی کے بدن میں لگنے ہی نہیں اٹھ رہی۔ کوئی اسے تھکا اور جلا دان دھشت سے نوحے لے تو وہ اف نہ کرے۔ اسے تو حرا ہی جب آئے جب نرم زم زم رگوں میں ٹھٹھے ٹھٹھے کر چکے تھے کھٹے کھٹے رہ چکے تھے لیکن اس کا کوئی اہانتا ہے بھی تو۔

حاجی کا شہر بڑا بڑا دار لگا۔ اس نے سب خیروں کو عید اس سے بھگا دیا اور اس نے غلیبی کی خوشی میں چوہارے پر تمام رات کا بھانپا ہوا اور شراب کا درہ پلہ رہا لکھ بھارت و سنگھ پانے پر حب و ضرب کی محفل گرم رہی۔

پھر زمانہ بدلا۔ جنگی ورد کی رہی نہ چوہارے کا کھانا کھیں۔ دو گرم بازار کی بھی حاجی رہی۔ یہ سب ہوا تو چانی پر ہی ہوا آخر اقوام کا چوہارہ اجڑا۔ مزاج کا چوہارہ تو رکھ بھارت جتھ سے گیا۔ اس سے چانی کے چنے پر سانپ ڈلوئے تو کیا ہوتا۔

برابر کے چوہارے کو کوئی پر چھتا تھا۔ جب سے موتی شہ پکڑا گیا اور جوئے کا اڑہ بند ہوا تب سے یہ اجڑا چڑھا۔ یوں تو چانی کا چوہارہ بھی کوڑے کرکٹ کا صبریں کر رہا گیا تھا تاہم یہ اس تو گئی تھی کہ ایک نہ ایک دن موٹا مشکل کٹ کے یہاں اس کی تکی چائے گئی لکھ چائے کس کی دعا کا اناثر ہوا کہ چانی کا چوہارہ کھٹائی میں چڑ گیا اور برابر کے چوہارے پر کھن برس چڑا صابر شاہ کی خانقاہ پر تو وہ روزی جاتا لیکن شاہ کی کی نظر چمک گئی اور صحرے میں صحرے پر جا بیڑی۔

نٹھ چانی کے آنے سے چانی کا چتا کھٹا لیکن اس نے بڑی جھٹکی سے کام لیا۔ چڑھتے سورج کی چوہا دروہ اس کی خدا بھی نہ کروا چانی کھم اڑکھم اسی اصول کا چکل تھا۔ اس نے بڑے حوصلے سے چھاتی پر وہ پتھر رکھا کیا جس نے اس کا سکان ڈھا دیا تھا۔

نٹھ چانی کا چوہارہ تین دن کے اندر اندر پرانے سے نچا ہو گیا۔ پیسہ وہ تھت اور کھٹکی چھت ڈال گئی۔ چلے ہوا۔ نیپ ہوئی۔ سفیدی ہوئی اور یہ سب کچھ چانی نے ہی کڑا کر کے دیکھا۔ وہی سالہ حصے چانی کے چوہارے میں کچھ تھا نٹھ چانی کے چوہارے میں لگا۔ ایک بار تو مستری بھولے سے ٹھاری تھو لے چانی کے چوہارے پر ہی چڑھا آیا پر جب چانی نے کٹے پر چاندھر کر پکھا تو وہ منس کے ٹپے اتر آیا۔ ”اے ہائے صابر سانئیں ہمارا نٹھ نٹھ کا ہے۔ میری چانی اسی نے ہوا کا رینگ پٹ دیا تو کھٹکیں آئے؟ سالہ میرے ہی چوہارے کا ہے۔ گے گے گے گے گے گے گے۔ مستری اسیرا ہلا ہونچا اس کی منی ہے اسے دین لگا اب یا چنے یہاں نہیں لگے گی۔“

مستری تو چا چا گیا لیکن چانی دس سوں کر رہ گیا۔ اسے یہ فہم نہ تھا کہ اس کا چوہارہ مرمت سے رو گیا اور نٹھ چانی کے چوہارے کی کنی مٹی۔ اسے یہ فہم نہ تھا کہ نٹھ چانی نے اس کے چوہارے کی گھٹا کھٹکی لوٹ لی۔ کون اپنا بھرا گھرا اجڑا تو کیجھ سکتا ہے۔ جسے جھٹکی کی برکھا میں رہنے کا چکا چن اور وہ چھاتی میں کیسے رہے؟

حاجی کٹانے تو یوں آنکھیں پکھیر لیں جیسے اسے چانی سے کبھی تعلق خاطر ہی نہ رہا۔ حالانکہ دونوں کا باقاعدہ تلاحب نہ چا گیا تھا۔ لیکن حاجی کتاب کسی کی سنتی نہ تھا۔ وہ دو صاف کہتا۔ ”تلاحب نہ کون کوئی چیز نہیں۔ یونہی دھکوسٹ ہے۔ من کا سودا ہے۔ جب تک سوچ آئی چانی سے پارا نہ کھا اور جب سوچ خدی تو پارا نہ لڑو۔ کسی کا فیکٹر نہیں کر پارا نہ تو وہی نہیں۔“

چانی کو اس بات کا بڑا اھٹ تھا کہ حاجی کٹا کٹا کر کے کر گیا تھا۔ اس میں اس کی بڑی بدیہی تھی۔ کون اپنی بے قدری گوارا کرتا ہے؟ تاک کٹ جاتی ہے اور برابر ہی میں بائیں ہوتی ہیں۔ اس کی تو ہستی ہی مٹ گئی۔ ڈسٹ لے اسے دو کوڑی کا کرد پا۔ لوگوں کی نظروں میں وہ بچا ہی نہ تھا۔ ٹپا ٹپا رہتا ہوتا ہوتا اور کٹا کٹا لڑا لڑا اور کٹتی کٹتی محسوس نہ کرتا۔ نٹھ چانی نے چانی کے پار کوٹیں اس کے جسم کو اٹھایا اور اسے نظروں سے گرا کر خاک میں ملایا۔ چانی غلیبی کے پاس جا کر رو ڈیجا لیکن وہ بے چارہ کیا کرتا۔ اس نے ٹھٹھا اٹھا کہا۔ چانی صابر کر موٹا مشکل کٹا جی رہی تھی کہ اور تھہر اپنا ٹھٹھا کر کے گاڑا راسخ ہے۔ موٹا مشکل کٹا جی جس کا سا لہو دیتا ہے۔ گھبرائے بات نہیں بنتی۔“

چانی نے صبر تو کر لیا پر وہ کبھی بھی بے بات ضرور سوچا کہ غلیبی نٹھ چانی کو کھٹکیوں میں کٹنے کی کورس اور ڈالیں نہ کرے۔ قصور

آفرین ملی جان کا بھی تو تھا! لیکن بھر یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتا کہ ملی جان کو یہاں آنے آ طرفین ہی کھتے ہوئے ہیں۔ ابھی وہ طلیفنی کی بیانی کا قائل ہی نہ ہوگا۔ خلیفنی کا نظم تو اس پر مل سکتا ہے جو ان سے حقیقت رکھتا ہو۔

جانی کا چہرہ بارہ جانی سمیت اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اس کا سہاگ قضا نے لوٹ لیا۔ رسوائی نے اسے سمیٹ لیا۔ وہ تاریکی کے بوجھ تلے دب گیا۔ چہرے کا سارا پلستر اور لمبا اس کے سر پر آگرا۔ سانس لینا اور جینا دو بھر ہو گیا۔ بارہ کے چہرے سے جب قہقروں کا شور اٹھتا تو اسے بھالے کھتے اور سینہ بھٹی ہو جاتا۔ اس کا چہرہ دوزخ کا ایک ایسا ٹھکانہ کیا جہاں سب سے بڑا انداز بڑل ہو رہا ہو۔ ایسے میں اگر جانی سانس لیتا اور بھتا رہا تو اس کے حوصلے کی خرابی تھی۔

دلق خدا وجہ ہے چنا لچھ جانی بھوکا نہیں مرنا۔ بیٹنی کی مشین اس کے پاس تھی۔ اس نے صابر سائیں کے حوالہ پر جا کر دعا مانگی خلیفنی سے مطہرہ لیا اور بادلا نکھر کر طبع زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چہرہ چھوڑ کر ایک چھوٹی سی دکان میں جا بیٹھا۔ طباطبائی جنم کمی قدر کم ہوا۔ ملی جان کا ستارہ دیکھتے دیکھتے زمین سے اڑ کر آسمان پر جا پہنچا۔

یہ عجیب الحاق ہے جسے علاقے میں ملی جان کا چہرہ تھا اس کا کوئی نام نہ تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ وہاں بھی کوئی لینڈ نہ پیدا ہوا۔ البتہ لینڈوں کا ادھر گز و ضرور تھا۔ چھوٹے موٹے لینڈ اور سواری بھر قہقرواں رات گزارنے میں بھی کوئی مضائقہ نہ سمجھتے لیکن ایسے عارضی لینڈوں کے نام پر بازار کا نام نہ پڑ سکتا تھا۔ علاقائی لینڈ تھے۔ سوانہوں نے بھی معاملے کی فراکت پر بھی توجہ دی۔ ایسی اہم جگہ اور نام سے محروم رہے۔ حالانکہ انکشتن کے دنوں میں ان کی قہقہہ بازار کی ایک ایک اینٹ ایک ایک کھڑکی ایک ایک دکان اور ایک ایک چہرہ پر رہی۔ روٹ کے ٹپلے میں روٹ پیوں یا طلیفنی اور ملی جان سے ملے بلکہ ایک لینڈ رنے تو ایسے ذریعے موٹے پر بیٹے کی دلاوت کو ٹھیکست جانا اور بازار بھر کو ملی جان کے ناچ گانے سے ٹوٹا۔

ایک طرف کھلی سڑک تھی جو نوے پہلو اس کے اکھاڑے کا نکل جاتی اور دوسری طرف دہری بازار تھا جسے تنک پہنچا ہوا تھا۔ دو میدان میں فراگ تک بھر کا یہ سہا بھگڑا تھا جسے لوگ دلتو دلتو ملی بازار کہتے تھے۔

جانی کو بھلا طور پر رنج تھا کہ وہ یہاں نہ جانے کب سے آباد تھا لیکن کسی نے اس کے نام پر بازار کا نام نہ رکھا۔ اسے حاشی نکھانے مگر میں ڈال کر رہا دیکھ۔

ملی بازار بہت جلد مقبول ہو گیا۔ اس کے نام ہی میں چاروں کا اثر تھا۔ اگر شیش ٹریک سے اسے موسوم کرتے، جس کا علاقے کی تین چوتھائی بائیں دو پر قبضہ تھا۔ یا صابر سائیں کے نام سے لاکھ لاکھاتے جب بھی بازار کی شہرت کو ایسے چار چاند لگتے جواب لگتے تھے۔ بازار نہایت آسانی سے لوگوں کی زندگی میں داخل ہو گیا کہ کسی دہریے نے دم انتھاک کی نہ پوڑ چھاں ہوا اخبار میں خبر چھپی۔ بات ہونے والی تھی سو ہو گئی۔

جو خوش قسمت حراج دہری بازار کی یہ کہ آتے وہ ملی بازار سے ہو کر جاتے اور بڑے ٹور سے بازار کی جانی کو دیکھتے اور قدرت کے ہنری داد دیتے بعض تلاش میں کچھ بھی ہوتے جو انکی بلی بھولنے کے ملی بازار کے ہو کے رہ جاتے۔

ایک حاشی نکھائی نہیں۔ ملی جان پر سارا جہاں مرنے لگا۔ کون تھا جو دوسرے گزرتا اور ملی جان کا دھار کے بھیر جمل دیتا لوگ اسے اس انہماک سے دیکھتے تھے وہ انہماک اسے اتنی جوتی نصیب ہوا کہ اسے دیکھنے سے مریض شفا پاب ہو جاتے ہیں۔

ملی جان کی رنگت انکی تھی جیسے کہ وہ بچن اور سانولے بچن نے تیار چاہا ہو۔ جیسے منسل کے شربت میں مانے کا رس ملا دیا ہو اس کی

چڑیاں اور ہاتھیں دلائی کالج کی طرح صاف اور پختی تھیں۔ اس پر ہاتھ یوں پھیلے تھے، دھنکی کپڑوں پر گرم گرم ماسٹری۔ آنکھیں یوں نکلتیں جیسے کتاب میں نغمی نغمی چھاپیں تیر جری ہوں۔ لمبی لمبی ہلکیں ساپ کے بچن کی طرح جھومیں۔ اسے کچھ کر لیاں آتا کہ چاند نے شفق کی خاب اوزہ لی ہے۔ کھائی پر نہ تازہ گڑی نہ می دہتی۔ انگلیوں میں چڑاؤ انگوٹھیاں دھنیں اور کانوں میں ٹاپس چڑھ رہے۔ عید بزمید پر وہ گلے میں ہار ڈال لیتا۔

بھلی جان کو سوسری کے پھولوں سے بڑی دھبے تھی۔ بیٹھ دیر سے اٹھتا اور سورج بچتے ہاتھ چاہے اور پر چلا جائے۔ وہ سوسری کے پھول چنے کے لئے ضرور داغ میں جاتا۔ سوسری کے پھولوں میں انکی جاڑیت نہیں اور پھول دیکھنے میں ایسے خوشنما بھی نہیں لیکن ان کی خوشبو دلیہ پر ہوتی ہے۔ مٹی بھر میں سمیٹ کر جب بھلی جان انھیں سوگھاتی تو یوں آنکھیں کھل لیتا جیسے غلوں کے کسی ایسے اصول دھن میں کھو گیا ہو جہاں صرف کیف ہو، صرف لذت ہو، صرف مہک ہو۔

سوسری کے پھول کچھ ایسے قبول ہوئے کہ پھلیرے نے مونچا اور چٹائی کے ساتھ سوسری کے پھول اور پار بھی دیکھنے شروع کر دیے جب بھلی جان دلی تھکا کی دکان پر آ کر خفتا تو پھلیرا بھی آ کر کھڑا ہو جاتا اور یوں سوسری کے پار بک جاتے۔ بھلی بازو میں صرف سوسری کے پار بکھتے۔ انھیں ٹھکانے لگا کر پھلیرا سے کوڑھی بازار اور کھار کرنا چتا۔

جب کوئی قدر دان سوسری کا پار طریقہ کر بھلی جان کے گلے میں ڈالتا اور اسے بازو سے بکڑ کر دکان سے اٹھا کر لے جاتا تو حاجی بھلا کو بڑا ڈانڈا آتا لیکن کیا کرتا؟ بھلی جان نہ اس کا مکتوح تھا اور نہ وہ بھلی جان کا رو بھلا سکتا تھا۔ بخود میں وہ پار کپڑے بدلے اور ہر دفعہ دھنکی سوٹ اٹھاتے۔ جڑا سوپ کی سالم کلم سے نکرے اور جھڑے کو بھلائے۔ بھلیوں کے خلاف اور ماسٹری پیش روز بدلائے۔ مٹی کی لمبیں اٹھواریں اور دوپٹے اس بے تکلفی سے بھڑائی کے حوالے کروئے جیسے دادا بھائی کی فاتحہ کے لئے اسے کسی بہت بڑے صلواتی کی دکان الٹی گئی ہو اسے حاجی تھکا کیسے اپنے کھانے میں ڈالتا؟ بھلا ایک اور بات بھی تھی۔ پارانی رہنیں اور رکھیں مٹانا غلامی کا گھر نہیں۔ یوں تو وہ جانی سے نہ سوز اور رشک توڑ چکا تھا لیکن اتنا اسے معلوم تھا کہ نکاح پر نکاح کرنے میں بڑی قوت نہیں تھیں۔ نکاح کی نئی شکل منڈھے نہ چڑھ سکتی تھی۔ ان حالات میں وہ قامت کے اصول پر چل رہا تھا۔

جانی کا بھی گزارہ صبر و قامت پر تھا اور حاجی تھکا کا بھی۔ دونوں کا مرض بالکل ایک تھا لیکن علاج ایک ہی تھا۔ گویا صبر و قامت امر ہے و حار تھا۔

بازار میں ایسا کوئی نہ تھا جس کی نظر حیات بھلی جان پر نہ ہو۔ جب وہ سوسری کے پھول میں کر بارش سے لوتا یا بونٹی چو پار سے سے اٹھ کر بازار میں گھٹے چلا آتا تو گامو کی دکان کے پھولوں سے منڈھے سے چھپے اسے اپنی طرف بلائے۔ دلیہ ہڈا مالٹے اور گھڑے سے سسکا سسکا کر گامو کی جانب سے ٹھہر سائی کا سونہرے ہونٹے۔ سردیوں کے کڑھانے میں انھی سے دکان کی ہمارا ہوتی۔ جب بھلی جان سٹکا ڈالنا دھنڈا دھنڈا چلا جاتا تو گامو کی دکان پر جا بیٹھتا اور مالٹے گھڑے اٹھا کر جھیلنے لگتا۔ گھگی گھگی جھیلنے جھیلنے پار یک ی پھول پھول کر اس کی آنکھوں میں جا گرتی اور وہ ایک دم آنکھیں کھل لیتا۔ گامو سمجھ جاتی کہ پار اٹھا کر اس کی آنکھیں پر لچھو چتا۔ بھلی جان کو اس سے کسی قدر سکون ملتا اور وہ مالٹے اور گھڑے سے کھانے میں مشغول ہو جاتا۔

گامو پر موسم کا پھل ملا۔ جب مالٹے گھڑے سے کیا بیانی کی وجہ سے صرف ہماروں کے خریدنے کے لائق رہ جاتے۔ جب بھی وہ بھلی جان کی بھینٹ چڑھانے کی خاطر ضرور دلاتا۔ گھگی کھیلے آتے اور بھلی جان انھیں پھول کر کھسی اور پھل کی جانب ہاتھ بڑھا جاتا تو اس کی کھائی تمام کر

بول اٹھتا۔ "سو فیذاذ را یہ کیلا بھی کھا کر دیکھ! سوا جانے بڑا شیریں ہے۔" بھگن میں چٹکتے چمکے اجارہ دار دھچ اور کیلا بڑھا کر کھچ "شیراز یا اداکان میری ہے جو میں میں آئے کھا لیکن ذرا یہ کیلا بھی کھا کر دیکھ! اس کے سامنے ہر چیز چلی ہے۔" یہ درست ہے کہ کیلے لذت دہوتے ہیں۔ کھلے ہوئے ٹھٹھے اور خوشبو دار لکڑی خلی جان بھیٹان سے کھڑا تھا۔ مگر جتنا وہ کھڑا کھڑا کھڑا کھڑا ہی اسے ستا اور آخر کیلے کھا کر ہی خلی جان کی خلاص ہو جاتی۔

جانی یہ سب کچھ دیکھتا اور جی ہی میں کڑھتا۔ اسے کاسو نے بھی بھوٹے منہ بھی نہ پہنچا تھا۔ حالی کا بھی جتا۔ اس کی دکان پر تو پاں سگریٹ سے ملی اور خلی جان کا صرف انہی پر گزارہ تھا۔ اسے مالے سحتر۔ اپنی طرف کھینچ لیتے۔ حالی مجبور تھا۔ وہ کھل پھڑکی کے دھندے سے بالکل ناواقف تھا۔ اس خلی جان کو طش رکھتا اور کاسو سے اس کا بیچا چھڑانے کی نیٹ سے سوچ سوچ کر اس نے ایک ترکیب نکالی۔ وہ منڈی جا کر سستے دامنوں خود بخود اچھڑا پھل لانے لگا۔ حقیرے پر جگہ بنا کر نوکر اعداد لیکن اس سے کچھ بات نہ تھی۔ کاسو کی دکان پر جو بھارتی وہ یہاں کہاں؟ کاکہ تو کاکہ خلی جان نے بھی تو بہندی۔ وہ مالے لانے تو خلی جان کیلے کھانے کاسو کی دکان پر جا پیچھے کھانا کھانے کیوں سے لڑت تھی! ٹھہرو کیلے آئے تو خلی جان مردہ کھانے کاسو کے پاس چلا جائے۔

حالی کا کچھ کر گیا کہ خلی جان کو صرف پھل ہی سے ٹپک کاسو سے بھی رابطہ ہے۔ جہاں تک اسے کا قرض تھا حالی کا کی دکان سے بھر بازار میں کوئی اڈہ تھا۔ پڑے کی ایک طرف اتنی جگہ تھی کہ خلی جان کی چوکی بچھ جائے۔ سر پر ایک ٹھٹھے کے اوپر دیے بٹا رکھا تھا۔ برابر میں ٹائی گری کی پہلو انوں اور ایکٹریسوں کی تصویریں لگی تھیں۔ دکان کے وسط میں مکمل کابل آؤ جاس تھا۔ چارے سے آکر بیٹھے کوئی چاہتا تو خلی جان سکتا۔ آٹھٹھا۔ ایک تو یہاں لڑائی لڑک سے ہوتی۔ دوسرے سب شوقین حراج سولت سے جت ہو جاتے۔ بیچر چھاڑ دیتی۔ لپٹے پٹے۔ فنی ذرا کی یا جس کی ہاتھیں اور گاہک پھٹتے۔ اور کبھی یہ بات نہ تھی۔

کاسو کی دکان خلی جان کا اڈہ نہ تھی تھی۔ وہ اور ہی قسم کا آدمی تھا۔ اس روایتی اور بے تکلفی سے قول کرنا کا اٹھے اچھوں کے منہ بیکر دیتا۔ خلی جان اس کے یہاں جا کر بیٹھا تو کاکہ بڑک جاتے۔ بھٹا ایسا کون دکاندار ہوگا جو اپنے گاہکوں کی سولت کا خیال نہ کرے۔ ایک آدھ گاہک سے نہ فنی ہو تو سولت ہے۔ سب سے تو خلی جان کا لڑی چا سکتی۔

کاسو کی نسبت حالی کا اراخزم طبیعت کا آدمی تھا نہ قول بازی میں مہارت رکھتا اور نہ خلی جان کے گاہکوں کو قہر آور نظروں سے دیکھتا۔ کچھ بھڑو اس کی دکاندار ہی خلی جان کی وجہ سے چمک اٹھی۔ جسے پاں سگریٹ کی عادت تھی اسے بھی یہ چنگا کہ کیا۔ کوئی طوطہ ہے نہ بے خلی جان کو نہ سگریٹ چلائے اور پاں کھلانے میں اپنی بہت ضرور سمجھتا۔ حالی کا خلی جان کا اس میں منہ تھا اور اس نے اسے بھی کاسو کی دکان پر جانے سے نہ تو کھ۔ خلی جان کو کس بات کی تھی؟ حالی کا اراخزم ہے ہر تہری ڈالے تو وہ اٹھ کر بیچ کے قہر خانے میں جا بیٹھے اور بھر کاکہ بھی جا تیل و دھت و ہیں کھلی جائیں۔

سورج ٹھٹھے سے پہلے پہلے کچھ کا قہر خانہ کھل جاتا۔ لال لال کوئوں کی گود میں کیتکیاں رنگی ہوتیں۔ جن کی ٹونوں سے بھاپ نہ تھی ہوتی تھی اور ہوا میں غائب ہو جاتی۔ کیتکیوں کے کنارے کچھ گاہکوں کا تھوڑا تھوڑا خلی جان کو پاس جاتا۔

چھا جاتے جاتا اور غرض اداکانی کے ساتھ کچھ "سیرے سوا بلا لودہ ہے ٹھٹھے" کا ورد کرتا اور کچھ "خلی کر یا" ترانگی تجری کی ریت لگا۔ دن چڑھے خلی جان کی آگہ خلقی تو وہ اٹھو انیاں لپٹا کر لڑی میں آ بیٹھا۔ چھوٹے دیکھتے ہی زور سے سٹی بھاتا بھر ہاتھ کے اشارے

سے ہوتا کچھ ہے تو بھلی جان صحیح ہی نہ ہوتا۔ بس انگڑائیاں لگے جاتا اور اس وقت چوں محسوس ہوتا جیسے کاکات انگڑائیاں لے رہی ہو۔ غیظ کا نفاذ ایک دم کہاں اترتا۔ جب ذرا ہوش آتا تو کچھ کی طرف دھیان دیتا۔ جیوا علی روٹی پر کھنکھاتے لگاتے یا جانے جا کر کتے کرتے سحر مانتا اور کہتا ”میری جان! اچہ ہارے کا کھیرا کھوڑا اور مار مارے پاس آ ادا رہی تا طرہ جانے کی ایک پوٹلی سی پٹی ہے“۔ بھلی جان کی آنکھیں دور سے علم طوطا پر دستار سے کی طرح مستی میں کھوٹی نظر آتیں۔ بڑے انداز سے صراخیں مار کر دی موڑ کر کہتا۔ ”کوہنہ جسے کیجیو میں آگ لگائی ہو وہ چائے پیتے“۔

دو اخراجی چپ نہ رہتا پرانے سبتلہ کی زیر جھوں پاس کا سری پائے کا دیکھ کھلا رہتا اور بھلی جان کو دمت دیتا آنگہہ کر کہتا۔ ”میری جان! ذرا ہم پر نظر سوسو رہ لگتا۔ گرما گرم ہال ہے۔ مٹھا اور کھٹا کر دوں گا۔ آ تو کسی۔ داتا چائے جلد آ جائے گا۔“

بھلی چھاڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بھی جھجھکے قہر سے جانے کو اور کبھی دو لے حرا کی کے دیکھ کر دیکھتا بھر قہر سے سے اتر کر پانی میں بیٹھاپ کرنے دیتا چاتا۔

صبح کچھ بجے پھلائی کوکون خاطر میں آتا؟ ہاں وہ پھر آتی اور اس کے یہاں کھڑی یا ڈنڈا کھڑکنا تو بھلی جان وہاں چلا جاتا۔ اس وقت جاتی تھا ”گاسٹو بیچا“ دو لا حرا می اور طبیعتی بھی آ جاتے۔ کبھی کبھی جانی بھی کچھ دیر کے لئے آ جاتا۔ ملی کا بیڑا ساری رات جھٹکنا اور کھوڑنا تھا۔ بھلی جان کی رہائی اور حرا می آنکھوں کی دو بیاباں سر ہٹنے سے بھر پور ہو جاتیں۔ بیٹوں پر فٹنی دھس کر لے گئی اور بہر دگر جاتی۔ گاسٹو کھڑا اسپتال لیتا اور ترک میں آ کر گانے لگتا۔ وہ بیک بیک بھلی جاتی اور بھلی جان نہانے کے لیے اٹھتا اور ادر حرا می جاتی بھلی کھڑ جاتی۔

جسے سب چاہتا اسے ایک آدمی کیسے نہیں لگتا۔ جاتی تھا کبھی بیست کھتا کبھی بھلی جان اس کی دکان پر آ جھٹکتا اور کادائی کو چار چاند لگا دیتا ای دکان کی تحوڑے اور اسی چوکی پر جہاں اب بھلی جان بیٹھتا ہے۔ کبھی جانی بیٹھتا تھا جس دن بھلی کبری بھی نہیں بھولتی۔ اب حال یہ تھا کہ پانوں کی وصولی دونوں میں غائب ہو کر کم تو کم سگرت کا ایک بڑا پیکھی۔ سوڈا لکھی الگ حرا میوں کے حساب سے اٹھتا۔ ایک بھلی بھی نہیں بکے۔

بھلی جان کا حراج دور بیٹھا تھا۔ اس میں لالچی قورٹی بھر نہ تھا۔ بازو دانوں سے بڑی جھٹکی آتا جیسے پیاس کے عزیز بھولنے کی جانے گاسٹو کے بھل اور دو لے حرا می کے پائے رانچاں نہیں لگے۔ وہ ان عزیزوں کا حق بچھاتا اور داتا کرتا اگر چہ یہ لوگ چور مارے پر خلی ہاتھ آتے لیکن جو چاہے پالیتے۔ جیسے چھاڑی کا قرض اس کی دکان میں جا کر داتا کیا جاتا۔ یہاں جاتی تھا کاسطو سودا گمر کی بات تھی۔

راستہ کا ہر ایک بیٹے جا کر بازار سونا چاندھور پیر پار بند ہوتے۔ ملاتے میں دو دھنما تھے کوئی ان کے حساب سے دکان پر دھاتا تو رات کے دو بجے سے پہلے قہر غصہ ہوتا۔ جس دن اتفاق سے صبح نہ رہتا۔ اس دن جاتی نکلا سینما کے حساب سے دکان بند کرتا ورنہ پہلے ہی قہر غصہ ہو کر بھلی جان کے چور مارے میں جا کر سو رہتا۔ دن بھر کام کرنے کے بعد خیر بڑی پیاری گنتی لیکن ذرا کی نقد خیر ہی تو نہیں۔ جاتی تھا جاتا تھا کہ بعض راتیں ایسی بھی آتی ہیں جب خیر حرام ہو جاتی ہے ایسی راتوں میں صرف تین چیزوں کی سوج دگی ضروری خیال کی جاتی۔ ان میں سے ایک چیز وہ خود تھا دوسری چیز بھلی جان اور تیسری شراب۔ شراب کی اس کے یہاں کی نہ تھی کچھ نہ داس کی بلکہ نہ تھا۔

بھلی جان کو جاتی تھا کی ذات سے اور تو کوئی خاص فائدہ نہ پہنچتا۔ اس اتنی بات تھی کہ ہر وقت کی غم طواری کو ایک ساتھ بھر قہر، دقت بے وقت، وہ ڈرے آ سکتا تھا۔ ویسے تو خدا کے فضل سے کچھ میں کتنے عی اپنے تھے جو اس کے اشارہ اور وہ چاہن بھلے کے کو تار تھے لیکن وہ اپنا دکھرا ہر ایک سے کیسے کہ سکتا تھا۔

نہلی جان کو لہا چڑا تم نہ تھا بھر بھی کبھی کبھار چنے آپ کو اس بھری پری دنیا میں اکلیا اکلیا محسوس کرنے لگتا۔ جیسے کوئی اس کا دروند نہ ہو جیسے وہ دور مسدود کے اس پار کھڑا ہو چہرے سے جھانڑوں کا گزر نہ ہو، جیسے اس کے شاندار حال میں اداس اداس مستقبل جھانک رہا ہو۔ وہ سوچتا کہ کوئی آفت نہ آ جائے اور اس کی سہانی زندگی کا شیرازہ نہ خشک کر دے۔ گناہ کا بے اسے یہ فکر بھی دامن گیر ہوتا کہ چند سال بعد جب اس کے چہرے کے بالوں میں سختی آ جائے گی اور ان کی کھنٹیاں نکالنے میں خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوگی پھر اس کا کیا حشر ہوگا۔ انکی قیامت ہی کچھ اور تھی۔ تھوڑی پر چند سال تھے۔ سوچتا رہ کر بیڑ چاٹتا چند صحت کے اندر اندر انھیں صاف کر دیتا اور جلد یوں نکل آتی جیسے چرم دھوئیں کی چاندنی میں ٹھکری ہوئی گلاب کی پتیاں۔ جیسا اسے تازہ داخل روٹی کی طرح طام خیل کرنا اور کاسو نکاس کے گھوے کی طرح نرم دل دینے۔ ایسی اداسی کے عالم میں نہلی جان گم م حاتی تنکا کی دکان پر ہائیڈرا اور ہولے ہولے ہائیں کر کے بی بیلا تا۔ حاتی تنکا اس کا علاج آشا تھا۔ اسے اداس دیکھ کر خود بھی اداس ہو جاتا اور اداسی کے پردوں نیچے ایک دوسرے کے بڑے ساتھی معلوم ہوتے۔

دولت سب سے بڑی چیز کسی بھی جان اس سے بھی بے نیاز تھا۔ دولت پیدا کرنا تو اس کے ہائیں ہاتھ کا کرب تھا یہ اسے وہ ہاتھ کاکیل بکھتا اور شیخ شریف مہینے کے مہینے کر رہے تھے آقا خود نہایت بے پروائی سے نوٹ اٹھا کر پیچک دیتا جنہیں شیخ شریف اس احتیاط سے اٹھا کر جیب میں رکھ لیتا جیسے ان پر اعتبار نہ ہو۔ جیسے یہ بھاگے جا رہے ہوں۔ جسے نہلی جان ہاتھ کاکیل بکھتا اسے شیخ شریف جان سے زیادہ عزیز جانتا۔ یہی ہاتھ کاکیل تھا جو ہر سال گنگا گارے میں تبدیلی ہو کر دکھائی دے جاتا اور انھوں کی شکل اختیار کر لیتا اور بھران کے ذریعے لے کر سڑے سے ہاتھ کاکیل جمع ہونے لگتا۔ اسی ہاتھ کے کیل کے جھیل اس نے سوار طریقی جسے وہ ب اشتمال کرتا۔ جب اسے بڑے لوگوں سے ملنے جانا پڑتا اور شاہی کھڑی میں تو وہ یوں میٹھیں دور منظر میں جا رہا جیسے اس کے پاس سوار ہو ہی نہیں سکتی۔ جیسے یہ بھی اس کھڑی کی کسی نہایت معمولی کھڑی میں رہنے والا "وڈی وڈی دادر" محروم ہو۔ جیسے یہ بھی کسی بوسیدہ دیوار کی ٹوٹی پھوٹی اینٹ ہو۔ نہلی جان کے پاس بھی بڑاکیل تھا اور ہانے پر کبھی کہاں سے چھٹ چھٹ کرتا۔ اگر کوئی اس پر بچے کا کھیلانی تجربہ کرتا جو چارے کے پٹالے کے مین جیسے واقع تھا اور جسے تنگو کج دن میں میں بار صاف کرتا تو شاکہ کو حق تھا۔

شروع شروع میں نہلی جان نے پیسے کی پردہ کی اور اس طبقے میں حاتی تنکا کا احسان اٹھاتا رہا۔ چارے کی مرمت بھی اسی نے کروا دی لیکن بہت جلد اس کے یہاں میں رہنے لگا اور وہ فنی ہو گیا۔ اب حاتی تنکا کی جیبوں والی صندوقچی پڑی رہتی اور نہلی جان اسے ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ دوپے کے مل پر حاتی تنکا اسے نہ بیت سکتا تھا ہاں پیسے کے پھر اس کا دل سود لیتا تو اور دانت تھی، بڑا بڑی چیز ہے۔ پہلے تو اس نے نہلی جان کو چارے لے کر دیا پھر اسے اپنا ذوق بڑا چارے کے گنگڈ پر بڑے ڈالے اور پھر دکان بھی اسے سوپ دی۔ جس دن وہ سگریٹ کا کونہ لینے اور سودا سلف خریدنے جاتا تو نہلی جان کو اپنی جگہ پر بٹھا جاتا۔ یوں بھی کبھی کبھی پیٹنے پیٹنے جھٹک جاتا اور سودا لگاتے ہوئی سامنے کے کچھ میں چلا جاتا تو نہلی جان کو بٹھا جاتا۔ نہلی جان بے تکلفی سے صندوقچی سے پیسے نکال کر قلعیوں اور بندر نہانے والوں کو دے دیتا۔ کبھی کبھی دکان پر ملے کا تبا کو ختم ہوتا تو جیسا سے عدم کمال کر رہا کو سٹکا تا اور لے لے والے چھو کرے چھو کر کوئی کبھی دھاتی تھا دیتا۔

حاتی تنکا نے کھانے پکانے کا بندوبست بھی چارے سے ہی کر رکھا تھا۔ وہ اس کام میں ملحق تھا۔ ہاتی بھی بڑا کارگر تھا لیکن حاتی تنکا کا نوہا نہ۔ جب کبھی پانی بھار چاٹتا تو اسے بچہ لہا جکی مٹھتا۔

دوسرے پلہ قصابی نے ریز س سے گوشت اتار اور ادھر حاتی تنکا پہنچا۔ سب سے اچھی بوٹی چھانٹ کر لایا۔ وہ بھر کر ہڈی تیار کر کے نہلی

جان کے سامنے ڈھکھڑاہٹ۔ دونوں مل کر کھالچے۔

جانی بڑا اکی گردے والا تھا اور کوئی ہوتا تو جان پکان کر ڈھکتا۔ وہی تھا کہ آنکھوں کے سامنے سارا تھا شاید، یکا اور اب تک ذکر کرتا۔ جانی
تھکا تو بھٹی جان کا آنگر گودھو چکا تھا کہ جیسے دونوں کی لہم کے پیر اور پیر رہیں ہوں۔ جانی اس کا کیا جانتا تھا لیکن اس پر اس نے بھی اتنی جان نہ
بھری کہ قہمی۔

عید کرنے کو تو کر لیا جاتا ہے۔ لیکن انہیں آخر چتر تو نہیں۔ جس دن بھٹی جان دیشی طور سوانے کی نیت سے جانی کی کٹھری میں کیا
تو جانی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ سانس کا بھٹکا ہوا لال نکلا اور شعلہ بن کر اس کی کٹھری ہی میں داخل ہو گیا۔ ٹھیک کا طوقان اٹھا اور
موسلا دھارہ سے لگا پہلے تو اس نے بھٹی جان کو بے تحاشا گالیاں سنائیں اور پھر کمر سے پکڑ کر اسے زمین پر پٹا لیا۔ بیٹے پر چڑہ بیٹھا اور اسوں
سے کات کات کر اسے لہو لہان کر دیا۔

شمار اور گھٹس کی داغ بیاں ہوا کے شریر چھوٹے اڑا کر لے گئے۔

سانس کی چند بیاں لگے میں لپٹانے اور خاک و دھول میں سن کر جب بھٹی جان بڑا تو حاشی تھکا کے سامنے درو پیا اور کہنے لگا مجھے داتا
کوڑھی گردے جو میں بھوت ہوں۔ سوا لالی کی قسم! میں نے اسے بکو نہیں کہا۔ شمار بیٹے کو ضرور کیا تھا مجھے کیا پتہ تھا اسے مجھ سے بدل لینا ہے۔
کسی اور سے شمار سوا لیتی۔ جانی کا فیکر تو بڑی تھا۔

جانی تھکانے جانی کا نام سوا تو مل بھی گیا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جانی کی یہ کھال کس کے پار پہنچا تھا۔ اس نے برف
توڑنے کا سوا لیا اور چھوٹک لگا کر کان سے اتر آگیا کہ جانی کی کٹھری کی طرف کیا۔ جانی آنے والے طوقان سے بے خبر تھا۔ اس نے دور
سے جانی کو آتے دیکھا تو صفیٹی سے کواڑ بڑ کر لیا۔ جانی کا خون نکول رہا تھا۔ اس نے اور سے کات ماری لیکن کواڑ بڑا اڑ گیا۔ لگا نہ کھلا۔ اس
پاؤں میں جوت آ گئی۔ جانی نے پیش آنو لکھے میں بھلا کر کہا ”رانی خان کے سامنے آج میں تیرا ہیبت بھڑا کر دم لوں گا تو اپنے آپ کو
بھولو بیٹھوان گھتا ہے۔ میں بھٹی جادوؤں کا۔ میرے عجائز کی ماں میں نے تیری بولی بولی دیکھی تو مجھے جانی تھکا نہ کہ ”سوا نام کا پتا ہوا کہ جانی“
شیخ خراب کا خدا بھلا کر سے جس نے مضبوط کواڑ لگا کر کے تھے دھنسا آج جانی کا ہیبت ادھر جاتا۔

دیر تک گود گرم کر کے بھٹی جان حاشی تھکا کے پاؤں کی گود کرتا رہا۔ اس وقت تو ٹھیک کا بھوت سر پر سوار تھا پتہ نہ چلا لیکن اب درد نے
بے چنگن کر دیا۔ جب رات بھر گود کرنے کے بعد بھی درد نہ گیا تو جانی نے اپنے گود کو پاؤں دکھایا۔ سوج آ گئی قہمی اپنے گود نے پاؤں کو بے
طرح جھکا دیا تو حاشی کی بھٹیں ہی تو ٹکل گئیں۔ سوا لہا پڑ گیا۔

لیجھ کو جانی کی حرکت ابھی تو دنگی لیکن وہ اسے اتنا غطا وار نہ گھتا۔ ایک لہا سے تو جانی تن پر تھا۔ بھٹی جان کو کہے صیب کی لیکن جانی
کا خون اس کی گردن پر تھا اور اگر جانی نے اپنے خون کا بدلہ لیا تو کیا برا کیا اسے اس کا حق پہنچتا تھا۔ پھر جانی تھکا کہاں سے بھٹی جان کا خیر خواہ
تھا۔ بھٹی جان کا بدلہ لینے کو ایک حاشی ہی رہ گیا ہے۔ بچا بھی تو بدلے سکتا تھا اور ابھی طرح لے سکتا تھا۔ جانی تو بالکل پانی تھا۔ ایک بھہتیز
سے تو جانی کی جان بھل جاتی تو وہ اس کا لاد لاد بیٹھوان سوا لے کر چلا گیا جیسے کسی تو باز میں ایک لفظ تھا جانی تو جیسے سب شہدے تھے۔

بھٹی جان چاہتے پیچھے آیا تو لیجھ نے حسرت آنو لکھے میں شکایت کہا ”تیرے ہم بھی تیرے جیسے ہیں۔ جانی ہم سے بڑا لفظ تو
نہیں۔ ہم جانی سے بدل لے کر دکھاتے۔ اسی ماں کے ہم بھٹکے نے تو اب تک بھی بڑا دانی اور بدل بھی دیا۔ بھلا جانی بھی کوئی شے ہے۔ اس کی کیا

ہستی ہے جو جہری طرف لڑائی خطر سے دیکھے۔ کبیرہ والے کی سوا میں اس کا لہو پی ہاڑی تو کہہ سکی۔

بھلی جان کی آنکھوں میں خوف جھٹکا اور دل میں دم کی سرور ڈنگی۔ وہ بولا۔ ”جس کا گھر اجڑ جائے ہو وہ کیا کچھ نہیں کرتا۔ جانی کا اس میں کیا قصور ہے؟“ اسے تو جانی پر دغ تھا۔ قصہ مجھ پر نکلا۔

”جیری خبر ہو! صابری کی قسم اپانی ہے قصور ہے۔ کوئی مردود تھا تو جانی کا اندر چوٹا باہر کر کے پھونکا۔“

جانی کا روگ ہو جاتا ہی گیا۔ بڑا کوجر بڑا استاد تھا۔ پہلوان اترے ہوئے جوڑا سی سے چڑھائے لیکن قسمت کی بات ہے جانی تھکا کی تھک ٹھیک نہ ہوئی۔ اب ندوہ چاندی سے تھکائی کی دکان پر پاتا اور نہ گرم جوشی سے بھگی چوٹا کرتا گھر کا شیرازہ پریشان ہونے لگا۔ ہر وقت گھٹے پر چٹائی لپی رانجیں اور وہ آہستہ آہستہ کراہتا رہتا۔ دکان پر بیٹھے بیٹھے دھڑکتے ہوئے دکاندار پاتا سہا تارہتا۔ وہی بھلی جان تھا۔ وہی جو بارہا وہی فرصت شب تھی اور وہی اندھا جوتوں لیکن وہ چاؤ تھا۔

دکان پر سکون نہ پا بلکہ چار گھر کا سدا حول پیرا ہو گیا۔ بھلی جان کا دل کھردھرا تھا اور اس کی طبیعت نازک تھی۔ جب ذرا گھبراہٹ محسوس کرتا تھا کہ بازو میں گھومتے لنگر۔ جانی پر قہر بڑے اشتیاق سے دیکھتا۔

جب تک دکان پر ضلعہ کھول کرے والے مع رہے مغل بھی راتھی۔ بھلی جان حراسے سے بیٹھا رہتا لیکن جب یہ چلے جاتے۔ وہ دکان چھوڑ کر ادھر ادھر ٹھیک ہوتا۔ جانی تھکا یہ سب کچھ دیکھتا اور دل ہی دل میں کڑواہٹ لیکن کچھ نہ کہتا۔ وہ اب ایک لمبے کے لئے بھی بھلی جان سے الگ نہ جاتا جاتا تھا۔ بھلی جان پر وہ فریفتہ ہو چکا تھا۔ اس کی خاطر اس نے اپنا گھر ہاڑا تھا۔

جانی تھکا کے دل میں ایسی ایسی بیسیں اٹھیں جیسے کوئی اسے بار بار سولی چڑھا رہا ہو۔ وہی برف کا سوا اور اس نے جانی کا مضر عید نے کے لئے اٹھایا تھا آنکھیں اس کی طرح اس کی کھوپڑی میں چھوٹا رہتا اسے ہر وقت یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی شکر لے کر کہا ہے۔ بے دردی سے اس کا سود کھرجا رہا۔ پاؤں کا درد پیٹلے سے رات رات کھسرتے نہ جاتا اب اس میں ایک ایسا درد بھی نہیں اور نہ ہی تڑپ پیدا ہو گئی۔

بھلی جان کی زندگی بھر بھی بدلتی نہ رہی۔ پہلے گھر کا کھانا بھر رہا۔ بھائی محسوس ہوئی تو جانی تھکا کی صحبت میں سکون مل جاتا تھا مگر اب تو جیسے ہر شے کر دہشہار کی طرح گھر کر دہ گئی تھی۔ جانی تھکا کی زندگی میں یہ لگتی اور بدھ کی بیچا ہوئی اس کا اثر بھلی جان پر بری طرح پڑا۔ وہ کچھ نہ سکا کہ اس کا کیا علاج کرے اس نے آوارگی ہو جاتی۔ دکان بھیجے کے ہوئی اور بھیجے بھائی کے ملائے کے دن بھر پتھر کا ٹانگن طبیعت میر ہوئی تو نہیں ملتا۔ اپنا کہ کچھ جتن ملا تو جانی کو وہ یہ کہہ کر خوش ہوتا کہ بھلی جان جانی تھکا کی دکان چھوڑ کر جے کے ہوئی میں اٹھنے بیٹھنے لگا ہے۔ اب وہ جین کھانا کھاتا اور وہیں مٹھلی بناتا۔ وہ ہر کو یہ مٹھلی اٹھ کر بھیجے بھائی کے یہاں جم جاتی۔ وہی روز کا ساں بدھتا۔ ہنگام گھنٹی دور چلنے گھر آجہا ”انیں اڑیں اور“ اس کے بعد بھلی جان نہانے کی غرض سے اٹھ کر آ جاتا تو مغل کا قہر ادا کھڑا ہوتا۔

جانی تھکا کی دکان کے بعد جے کا ہوئی بیعت ثابت ہو اور بھلی نے وہاں سکون محسوس کیا۔ کپ باز وہاں آ جاتے اور وہیں رات کھاتا۔ کچھ بھی کھانا سہائی کی دکان پر بھی چاہتا لیکن وہاں اس کا بی دلگاہ ایک تو جانی آہستہ آہستہ کراہتا رہتا اور دوسرے تھکاہٹ کا دفتر کھول بیٹھتا۔ پہلے بھی اس نے ایسا نہ کیا تھا۔ اس کے حراج میں چڑچڑائی آ گیا تھا اور وہ ہر ایک کو برا بھلا کہنے لگتا تھا۔ اس نے کا سونجہ اور بھیجے بھائی کے خلاف خوب بد برا لگا بلکہ بھلی جان کی بے وفائی کا بھی لگ گیا۔

جانی کے وہ بے ہوئے دل میں امید کی اٹلی بھی نہیں ابھری اور وہ کچھ کمر بھائے ہوئے پھولوں میں جہاں چرنگی ہے ٹوٹی ہوئی

خلیفوں سے مل کر ٹھیکس بھرت پڑی ہیں اور سوچنی کیا وجہ میں شکار پائی آگئی ہے۔ اس نے امید کی ایک ایسی روچا دیکھی جس میں تازہ دھڑک بٹس گئی ہو۔ اس کا سہارا نے کہ اس نے خلیفہ کی کے پاؤں بکڑے اور ان سے کہا "آپ میرے مرشد ہیں۔ دین و دنیا میں مجھے صرف آپ ہی کا آسرا ہے۔ میری قوت کم ہار چکی ہوں۔ مجھے بھی بننے آپ میری مدد کریں۔ حاکم کو بھجائیں۔ وہ غلام ادا دینی مٹی پائے کر رہا ہے۔"

پہلے تو خلیفہ کی نے خیال کیا کہ یہ معاملہ اس کے اختیار سے باہر ہے اور انہوں نے کوشش بھی کی تو حاکم اور جانی کی چٹھری ہوئی جوڑی بھر سے نہیں لے گی لیکن جب جانی کی آنکھوں سے آنسو بہ لگے تو انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ضرور مدد ملے گی۔

رات گئے حاکم کا اداس ہوں کی گھنٹری گھنٹاؤں میں گھرا بیٹھا تھا، جیسے اسے سمندر نے دبوچ لیا ہو اور جیسے وہ اس تنہائی سے مر رہا ہو۔ خلیفہ کی نے آکر اسے اونچے بچے سے واقف کرانا چاہا لیکن وہ تو قہر مایہ بچے سمندر کی لہروں میں کھو چکا تھا۔ اب تو اس کے سامنے گہرائی ہی گہرائی تھی۔ وہ کسی جہت پر جانی کو دوبارہ آباد کرنے کے لئے چارہ تھا۔ اسے بھی جان سے محبت تھی۔

خلیفہ نے گناہ گناہ کا پانی پیا تھا اور محبت کے اسرار سے کما حقہ محبت تھا۔ اس نے خود ہی کے کچے میں کہا: "حاکم جی ایسی کا ہتھی دھڑکے میں قید رہ سکتا۔ بھی جان کو تم کیا کہتے ہو؟ آزاد طبیعت کی بند ہے۔ اسے کسی سے محبت نہیں اور سب سے ہے۔ اسے پابند نہیں کیا جاسکتا۔ آدمی آدمی کی مفت انگ انگ ہوتی ہے۔ بھی جان کو نہانے لڑائی طبیعت دی ہے۔ اس سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک کو خوش رکھے اور ایک کو ناراض کرے۔ اس کی تو ایسی طبیعت ہے کہ خوش رکھے تو سبھی کو خوش رکھے۔ میری انور جانی سے صلح کروا کر تو پاؤں بکڑا دوں۔ حاکم منکر اور ادب اختیار ہے پاؤں دھو کر پہنے گا۔ سو ادا دھیر جانے میں نے بھی کسی کو نالا صلاح نہیں دی۔ مجھے بھی جان سے ہر نہیں لیکن جو ہی بات ہے وہ یہی ہی ہے اور میں سے کہہ دی ہے۔"

اس گفتگو نے حاکم کو سوچ میں ڈال دیا۔ اس نے گہری ہنسی کی۔ پہلے تو جوں کا جیسے وہ بکڑے کا ہی نہیں۔ جیسے وہ بولنے کی تاب ہی نہیں رکھتا لیکن خود ہی وہ بعد ہوا۔ "جانی کا کام نہ تو خلیفہ اس نے میری زندگی پر یاد کر کے رکھ دی ہے۔ اس کی تو میں شکل بھی نہیں دیکھتا چاہتا۔ مجھے بھی جان سے محبت ہے۔ آج نہیں تو کل اسے پاؤں گا۔ مجھے پتہ ہے کہ لوگ اسے بہا رہے ہیں لیکن اسے ضرور غم کر گئی۔ ہو لوگ اسے بہا رہے ہیں اسے دھکا دینے کے بھر بھی جان میرے پاس آئے گا۔"

خلیفہ کی کے جانے کے بعد حاکم کا کو ایک دھکا سا لگا۔ اسے یہ سن کر دکھ ہوا کہ بھی جان کی آزاد حاکم کی اسے ایک کے ساتھ دغا کرنے پر مجبور نہ کر سکے گی۔ وہ تو اس فکر میں تھا کہ کسی طرح بھی جان کو سب کے چنے سے رہائی دلا کر اپنے بس میں لے آئے۔

خلیفہ کی نے آکر بیٹھا تھا۔ انہوں نے آکر تازہ اور بھالے مار دیے۔ پہلے یہ وہ کا تھان کی کچا ٹوٹ۔ ہاتھ گراہ تو یہ کانے اس کی روح کو بھی چھینے لگے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ کراہنے لگا۔ جوں جوں وہ سوچا بھی جان کی صحت چھٹی ہوئی جانی اور خود ہی سے چھینے لگتی۔ ایسا کتنا جیسے وہ آدمی کا بیچا کر رہا ہو۔ اڑتے ہوئے شیر کو بھار ہاتھ لیکن رات تو تھا نہیں، بھر پڑ کیسے جیسے؟ خلیفہ کی نے رہی تھی امید بھی تو دی۔

دکان موٹی پڑی رات جس کے دم قدم سے روشنی تھی وہی اندر ہاتھ روٹی کہاں سے آئے؟ گا تھان کی آدھم ہو گی اور اب تو ہی آتے جو پرانی وضع داری لہجے جا رہے تھے۔ بدلتی ہوئی اداسی کے ساتھ حاکم کا دل جھلجھلکا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے روشنی گل کر دی اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیل رہا ہو۔ ڈوبے ہوئے دل نے بڑی مشکل سے نکھائی لیٹا جا ہی لیکن جہر ہوا کہ وہ کیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ دکان بند کر کے شیر شاہ کی درگاہ پہ چلا گیا۔

درواہہ ہا کر اس کے دل میں روشنی کی ایک کرن پھوٹی اور وہ حضور سے لکھ کر کھار دے گا۔ اس نے خفا کا کھوکھری سے پانی نکالا اور دھو لیا۔ لہذا یہ شریعہ اور حضور سے درواہہ میں داخل ہوا۔ آج سے چند سال پہلے جب وہ حج کرنے گیا تھا جب بھی اس کے دل میں ای طرح عقیدت کا طوفان اٹھتا تھا۔ اس نے قنوج کے قہروں میں ہا کر ایک طویل جہد کیا اور اپنی محبت کی کامیابی کی دعا مانگی۔ اسے پورا پورا یقین تھا کہ سائیں شیر شاہ اس کی تین لکھ روپے پر ہی کر کے دیں گے۔ ساری رات بھی وہ جہد سے میں چاٹا اور بھی دھڑکا اور وہ چار آجے کو دہرا تا رہا اس نے حج پر جانے سے پہلے حلقہ کر لیں تھیں۔ ساری رات بوجھ کی گز دہی اور صبح ہوتے ہوتے اسے خیر آ گئی۔ دن چڑھے تک اس کی آنکھ نہ کھلی۔ وہ شاید بوجھ کی چار سو روپے کا لکھن پائیہ ڈاڑھے آ کر اس خیال سے چکا دیا کہ درواہہ کی حدود دعا مانگنے کے لئے ہے سونے کے لئے نہیں۔ رات چلے سے اس کا سارا بدن درد کرنے لگا۔ وہ دکان پر جانے کی بجائے برابر کے کھنڈے میں چلا گیا اور جس کا سونا لگا کر وہیں سو گیا۔ درواہہ کے وقت پیدا ہوا تو اٹھ کر دکان پر آ گیا۔

یہ کے دول میں قہروں کی رو چھاڑ ہو رہی تھی۔ حاجی کی طبیعت جو رات بھر کی ریاضت سے بکھری ہوئی تھی۔ قہروں کی اس رو چھاڑ سے بھر بھر گئی۔ ماحول بھر بھرا اور وہ کیا اور ایک کڑا بوجھ پہنے پڑا کر قہروں میں بیکہ اور کھلی جان کی آواز میں سانس خانی دے رہی تھیں۔ بخلی جان نے بے نیازی کی حد کر دی۔ حاجی کھارات بھر عتاب دیا اور اس نے خیر تک ندلی۔ حاجی کھانے دل میں کہا۔ اس عالم کو اور ابھی قہر ہوتی تو ضرور اسے وضو کرنا اور شیر شاہ کے حصار پر چاہیچکا۔ دونوں کھنڈے ہوتے اور دل کر دعا مانگتے تو کھار آتا۔ آخر شیر شاہ کا حصار ایسا کون سیلوا دور تھا۔ بڑی مسجد کے برابر قلعے کے پیچھے ہی تو تھا۔ بہت ہو گا تو اس صحت کا رستہ ہو گا۔ بخلی جان کو معلوم تھا کہ حاجی کھانے دکان سے اٹھ کر جاتا تو صرف تین چکر۔ ایک سو اسٹاپ لینے پازا اور دوسرے سونا لگانے پر دی سائیں کے کھنڈے میں اور تیسرے دعا مانگتے شیر شاہ کے حصار پر۔ اسے شیر شاہ سے پاکی عقیدت تھی۔ روٹی میں کھلی پادان کے نکال دیکھ چکا تھا۔ ایک دوسرے بکھرا ہو گیا تھا۔ کھانے کی کیا تھا تو شیر شاہ کی سرانی سے جانی خیر و عافیت دیکھ آ گیا تھا۔ بھر جب چوری ہوئی تو شیر شاہ نے نظر کرم کی چور بکھا گیا اور باقی رہا نہ ہو گیا۔ حاجی جب چاب دکان پر پہنچا۔ ہر قسم کی حوصلہ دہی کے بعد بھی بخلی جان کے کھنڈے میں چاٹا دالے ہوئے سے لگا۔ اگر کا سو پیچھے سے آ کر گھونسا دینے نہ کہتا تو شاید یہ سلسلہ دینک جاری رہتا۔

جیسا اور بخلی جان بھی پھلائی کے اسے پر چلے گئے۔ حاجی کھار دیکھا ہی رہا اسے خیال تھا کہ بخلی جان آئے گا اور حال پر چھے گا۔ لیکن کہیں۔ بخلی جان تو ایسا عتاب ہوا کہ جب وہ بھی پھلائی کے اسے سے اٹھ کر میدان چاٹا رہا۔ پر چڑھ گیا تو حاجی کو کانوں کان خیر نہ ہوئی۔ حاجی خون کے گھونٹ پیا کر رہ گیا۔

اگلے روز چرخوں کا میلہ تھا۔ چرخوں کے پہلے سے حاجی کو بڑا مشتاق تھا۔ اس نے بھی میلہ نہیں چھوڑا تھا۔ جب بھی میلہ آتا وہ ایک ہفتہ پہلے سے تیاریوں سے میں لگ جاتا۔ کچھ کام موٹھے اور سب دوستوں کو بلاتا اور ہر کام چار کرتا۔ میں بھر پہلے سے وہیہ حق کرنے لگا۔ بڑی سرگرمی دکھاتا۔ ایک دن پہلے اس کی پارٹی شیر شاہ کی پہنچی۔ پارٹک ابھی سے ابھی تک دیکھ کر حیرانگہ تے اور بے جانتے گمانے کی مفضل جیتی۔ چارے کے دور چلتے۔ مرغا کھتے اور خوب گہما گہمی رہتی۔ کبھی یہ جوں جوں خیر تھا اور اب یہ حالت تھی کہ کسی نے بھولے سے بھی تو نہیں کہا کہ وہ بھی ساتھ چلے۔ دنیا کی کسی خیر تھی۔ کواں میں جانے کی جھٹ تھی لیکن بخلی جان دعوت دیتا تو وہ چلے کے لئے تیار ہو چکا اور پائیں کا اور بدل جاتا۔ ذوال کے بعد بخلی باز اس میں شرد بخلی ہونے لگا۔ کاسو نے کچھ کا اور کچھ نے بخلی جان کو آواز دی۔ حوصلہ دہی کے بعد بھی پھلائی نے

تھڑے پر کھڑے ہو کر بازار کا جائزہ لیا۔ دلا حرامی خواجہ سنبھال کر چار ہاتھ۔ نیچے چھاڑی نے کہا۔ ”سو نے سائے! ابھی تو نے دکان بڑھائی ہے۔ چار کپ ہنگا اور کپ میٹھ کو ہانے گا؟“

دو نے نے نہایت بے پرواہی سے کہا۔ ”ہاں کے پہلو ان اچھے بڑی جلدی ہے تو تو بے شک چلا جا۔ میں تو اب جا کر جاری کروں گا۔ کچھ ساتھ لے لیا تو ضرور ملے۔ نہیں تو میں آکیلا بعد میں آ جاؤں گا اور شاہ مار میں تم سے ملوں گا۔“

”تجربہ خوشی پیادے۔ ہم تو چار بر چار ہیں۔“

دلا حرامی خواجہ اٹھا کر گھر چلا گیا اور کھچا پھڑی تھڑے سے اتر کے نیچے والی میں بیٹاب کرنے بیٹھا گیا۔

گامو برے رنگ کی مٹائی دھوتی اس پر ہوئی کا نیا کرتہ اور گلابی ریشمی مندریل پہنے کر نکلا۔ گامے سے شاہی بی سرباط جوتی چمک رہی تھی۔ نگے میں سو نے کا کشابہار رکھ کر ہاتھ۔ مونچھیں تو کون تک ہی ہوئی تھیں جیسے پر لیس کے سپاہی ڈیوٹی پر کھڑے ہوں۔ بٹھکی جان نے پتہ بارے سے بیٹھے بیٹھے اسے دیکھا اور مسکراتے نکلا۔ گامو نے زبان میں دو انگلیاں ڈال کر اس زور سے سنی بھائی کہ بٹھکی بازار گونج اٹھا۔ بیچا سنی سنی ہی دکان سے باہر نکلا آیا اس کی ترنگی لیے شعلے والی لنگی اور ڈھمکی ڈھالی شلوار فراموش اور جھمکی کا اعلان کر رہی تھی۔ ایک جیب میں باریک مبین گٹھاری دو مال آدھا اندر اور آدھا باہر تھا۔

گامو نے سگریٹ کا دھواں منہ سے اڑاتے ہوئے کہا۔ ”او نے پار! میٹھ کپ چٹے گا؟“

چٹے نے بٹھکی جان کے پتہ بارے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔ ”بب! مارا لبر بٹھکی جان چٹے گا۔“

جانی تنکا کے بیٹے سے ساپ لوٹ گئے۔ ایک تو اس کا سٹیل سے وہ ہاتھ کی کھم کھم قیامت نہ تھا لبر بٹھکی جان کا ان سب کے جھوم میں مل کر جاتا اور بھی غضب تھا کوئی کہاں تک صبر کرے؟ جانی تنکا کو کسی نے انگاروں پر ڈال دیا۔

بٹھکی جان ابھی تک چارہ نہ ہوا تھا۔ وہ کھڑکی میں بیٹھا دوسروں کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ بال بکھرا ہے جتے جیسے رات سا بادل رہی ہو۔ کھلے گریبان سے چٹیلے دن کا تنکا صبراً غرا رہا تھا۔ من سے شاہی پد بیٹھا سے بھیک ڈانگ لی ہو۔ بھنگ چنے کے بعد سستی آگئی تھی اور اس کا باسی کھنڈا انکی سکرانوں کے بوجھ سے دب رہا تھا۔ اس کی منٹے سے لبر بڑی بڑی آنکھیں پردے بازار پر اس طرح پڑ رہی تھیں جیسے آفتاب کا ناک سے پر کش پھار کر رہا ہو۔ وہ بھی گامو کو اور کبھی نیچے کو دیکھتا۔

نیچے چھاڑی نے سب کو مات کر دیا۔ اسے سامنی ورنڈی نے اپنے خاص خاص حضور سے سے سچلے کے لئے بلی ٹرٹ ہی دی۔ اس نے اسے ٹھوکر پہ لی مبین لیا مال تنکا سامنی نے چلوں بھی چار کر کے دی تھی۔ آنکھوں میں سرسلا ال کھاتا تھا بالکل گھٹا مٹھرا یا۔

جانی سب کے طعنت دیکھ کر گل بھن گیا۔ وہ ہرگز نہ چاہتا تھا کہ بٹھکی جان ان کے ساتھ جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ سٹیلے کا دن بٹھکی جان اس کے ساتھ گزرا دے اس کے پہلو میں بیٹھے سے دست ہی ہو گئی تھی۔ آج بٹھکی جان سے بڑی طرح یاد آ یا۔ تصویر کی ایک ڈروست لبر ابھی اور وہ اس کے ساتھ بہ گیا۔

دکان رہی نہ لنگڑا پاؤں اور خاص کی تنگیں زور کی۔ وہ ایک خوبصورت گل مرا میں جا بیٹھا۔ جہاں بٹھکی جان اس کے انتظار میں ہے قرار بیٹھا تھا۔ آنکھوں سے آنکھیں کھرا نہیں۔ ایک لبر ہر سستی دھیرے دھیرے جبران آنکھوں سے گزرا کہ جانی تنکا کے دن میں مراہت کر گئی۔ اس نے قریب جا کر بٹھکی جان کو بٹھکی کیا۔ بٹھکی بٹھکی آنکھوں میں چٹیلے ہوئے گی جیسے جذبات کو دم پخت کر رہی ہو قریب ہی منبری بنگ بچھا ہوا

تھا جس پر بالائی چھوڑا گیا تھا۔ چھوڑا گیا تھا۔ پھر اس پر عام حکومت نہ تھی لیکن پھر دیکھتے اس پر سلطنت چڑھنے لگے۔ جو سلطنت دلوں پر چڑھ رہے تھے وہی سلطنت چنگ پر نمودار ہونے لگے تھے۔ غائب ہو گئے۔ صرف قتل خانہ سامنے رہ گیا۔

قل خانہ اور پانی یوں پ پ کر رہا تھا جیسے استاد سترے کے پل کارہا ہو۔ کبھی قل کی دھار دیکھی چڑھاتی اور کیت سترے سے نکل کر استغنیٰ پر آ جاتا۔ قتل خانے کا کواڑ پیچھے سے نکلتا تھا۔ اس لیے احمد سے پانی کے پیچھے اڑا کر باہر فرش پر چڑھ رہے تھے چنگ پر گھرے نیلے رنگ کا رہنمی فراموش دھرا تھا۔ اس میں ازار بند بھی اسی رنگ کا پڑا تھا۔ اگر سردوں کو سہری تا دوں سے کوئی حادثہ کیا ہوتا تو ازار بند کا چھوٹا ہی نہ چلتا۔ اس پر چنگے نیلے رنگ کی قمیض کی قمیض رکھی تھی اور برادر میں گھرے نیلے رنگ کا درپندہ پڑا تھا۔ ایک طرف سرخ پیرس دکھا تھا۔ چنگ کے نیچے سچے تلے کی جوتی دھری تھی۔

گاسو نکھیا چھاؤنی زوردار سی ہودی سائیکس نکھیا ٹھنکی سائی روزی اور جیجا نکھلی والا سب قبوہ خانے میں بیٹھے بے قرار سی سے نکلی جان کے چوہارے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دور حرای ہولا "یار نکھلی نے تو بڑی دیر لگاؤی۔"

نکھلی نے جواب کیا۔ "سٹوشی کا کام دیر لگانا ہی تو ہے۔"

پھر نیلے کے پیراگرام پر اعتماد خیال ہونے لگا۔ صوفیا گئے پر بیٹھا سونا لگا رہا تھا اور اس کا گھوڑا مار مار چہنار رہا تھا۔ ساتھ ہی کر سواپنے رہنے سے پانچ گھنٹیں پہاڑے پڑا تھا۔

صوفیا جاتی لیٹے ہوئے باغ سارا اٹھ اتریں ہولا "مستاجر جیجا نکھلی دیر اور ہے۔"

کر سونے کان کھڑے کئے۔

چنگے نکلی والے نے بڑی بے تکلفی سے دو تھن چاؤ قسم کی گالیاں لڑا لڑا نکلیں اور ہلکا "تجھے تو وہاڑی پوری لے گئی تجھے دیر سیر سے کیا؟"

"ہاں لایک ہے مجھے وہاڑی سے غرض ہے۔ دیر سیر سے کیا؟" اور آٹا کھ کر وہ پھر سونا لگانے لگا۔ کر سوا نکھلی تار کا سرینٹ نکال کر پچھنے لگا۔

قل بند ہوا۔ پانی کی ٹپ ٹپ دک گئی۔ کواڑ نکلا۔ نکلی جان سکرا سکرا تا پیر لگا اور اس کا نکا بدن یوں چمکتے لگا جیسے چاند اصل کر نمودار

ہوا ہو۔ ایک دم زور کی آواز نکلی اور جیجہری اس کی نرم ہڈیاں پر چڑک چڑکیوں میں جھنسن لگی۔ بھاگ کر کوٹھے پر چڑھنے لگا لیکن مادی تنکے اس دہشت

زور دگانے کو نیچے جاؤں سے بکڑ کر نصیبت لیا اور دای نامک کے نیچے دایا جیجہری نکلی تھی۔ اب اس میں کٹ کٹ کر نکلی پھر گئی تھی۔ لیکن جان

فرادی گانے کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگا لیکن قصاب نے رحم نہ کیا لاکھ جیجہری کھڑے ہو کر کھڑکی میں اجارہ ڈال۔ خون کی دھار نکلی اور

مادی تنکے کے پڑوں کوڑ کر گئی۔

ایک مسکراہٹ ہمیشہ کے لئے سو گئی۔

ایک پھول دھول میں ملی گیا۔

نکھلی جان کی لاش تو پ تو پ کر ٹھنکی ہو گئی اور سارا پارا یوں سونا چڑ گیا جیسے کبھی جوتی اٹھائی تھی۔

سریندر پرکاش

سرچر دکھارہو رائے
سرچر دوشٹ / سرچر پرکاش
۶ مئی ۱۹۳۰ء، بہت ساری نکل پور (حال، فیصل آباد) سمرنی پنجاب۔
۹ نومبر ۲۰۰۲ء، بہت ساری، بھارت۔
ہاتھ، تعلیم کہیں سے بھی حاصل نہیں کی۔

نام
تلفی نام
پیدائش
وفات
تعلیم

سازمے تین برس کی عمر میں سینڈون اسکول، ماسن پور بازار، لائل پور میں داخلہ لیا تھا لیکن پہلے روز ہی اسٹر صاحب نے ایہ قہقہہ مارا کہ کبھی اسکول کا رخ نہ کیا۔ اس کے بعد آپ کے والد نے اپنی دکان پر ہی اردو کی تعلیم دینے شروع کی۔ ۲۰ جوردھاسری، جھنگ اور پنجوٹ کے بازاروں میں جتنے میں ایک بار لاڈ لکھن پور دیکھو کے کمرشل کی طرز پر پروگرام بنائی کرتے تھے سرچر پرکاش بھی ان کے ساتھ ہوئے اور ان کی لائبریری سے استفادہ کرتے رہے۔ کچھ عرصے بعد آپ کے والد نے سرچر کو باری علیگ کے چھوٹے بھائی عزیز طالب، جھنگ اور بنگلہ کالج، لاہور میں اردو، ریاضی اور تاریخ پڑھاتے تھے، کے پیردگروا۔ سرچر نے ان کی ذمہ داری اور بہت عالم کے امتحان کی تیاری کی اور صرف ۱۰ پرچہ دیے۔ یوں یہ سلسلہ بھی متعلق ہو گیا۔ ایک روز عزیز طالب صاحب نے سرچر کو فوجی ایک لڑکی کا محبت نامہ دے دیا کہ اس کا جواب لکھو۔ پھر یہ خطوط کا سلسلہ ایسا چلا کہ سرچر نے سازمے فوسو خطوط کے جوابات لکھ دئے، جب یہ یاد تھا کہ فوجی کی طرف سے عزیز طالب صاحب خطوط لکھا کرتے تھے اور وہ یہ پتا ہے تھے کہ سرچر کی تحریر میں جھٹکی آئے۔

مختصر حالات زندگی:

آپ اپنی پہلی، ضلع جھلم، سرچر پرکاش کے والد کا رخانا بازار لائیں پور میں سوڑا اور لکھن پور چلائے تھے۔ از محلی برس کی عمر

میں سرچرہ کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور سارا بچے تین برس کی عمر میں ہی اسکول سے بھاگ کر انہوں نے کاروبار میں والد صاحب کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ چھ سات ماہ اپنے والد کی زیر نگرانی اردو پڑھنے کے بعد تاجر ساسری کے ساتھ ہو گئے۔ جنہوں نے سرچرہ کو چاند بولا جیتا دیا اور سرچرہ نے اپنا نام سرچرہ دوشت لکنا شروع کر دیا۔ جب والد صاحب کو اس حقیقت احوال کا پتا چلا تو انہوں نے تاجر ساسری کے خلاف بچے کے اقارب اکٹس رہنم کر دیا۔ معزز لوگوں کی وساطت سے سرچرہ اپنے گھر واپس آئے اور بعد ازاں والد کی فضا کے مطابق مذہب طالب صاحب کی زیر نگرانی پڑے گئے۔ کچھ لکھانے کا سلسلہ ۳۵-۱۹۴۳ء میں تاجر ساسری کی قریب پر شروع کیا، جو انہیں ٹیکورانی بنا دیا جاتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کو دیکھتے ہوئے مولوی محمد شفیع (جو ان دنوں دہلی کی کثات کمال پر مشرق قیام پزیر تھے) اور مذہب طالب کے مشورے سے سرچرہ پرکاش اور ان کے والدہ امر سرچرہ کو لے گئے۔ سوا اواز چٹھری مولوی محمد شفیع صاحب نے طریقہ لی اور فرقہ فم کی ادا نگلی امر سرش کی۔ چہرہ روز امر سرش ریل سے انٹن پر بے بارود کار پڑے رہنے کے بعد بند رہی ہوئی جہاز دہلی چلے گئے جہاں سرچرہ پرکاش کے بڑے بھائی ملازم مت کرتے تھے۔ دہلی کے ایک چنگ میں سرچرہ پرکاش کے والدہ کاش بگھیں پڑا اردو پیسہ موجود تھا۔ کچھ مدت تو وہ وہیں کام آئے اور اس کے بعد باپ بیٹوں نے کثات مجلس میں انگلیاں اور چاندنی چوک میں کیلنڈر بیچنے شروع کیے۔ کچھ مدت بڑے قیام بدوں پر متعددوں کے باہر چھوٹی چھوٹی دکانیں چلیں اور بالآخر دہلی میں ایک بار پھر سوا اواز چٹھری قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس زمانے میں سرچرہ پرکاش کا اہمنا جیٹنا دھوا نا تھو روز، اس راج رہبر، پرکاش چڑت، اعلیٰ سردار چٹھری، سارا لہو حیا نونی اور پریم ناتھ پر داز کے ساتھ ہوا۔ بعد ازاں اس گروپ میں چڑت سے ہری چند اختر اور پچہر دستگیر بھی شامل ہو گئے۔ یہ سب لوگ انہیں ترقی پسند مصطفیٰ کے ممبر تھے۔

وقت نے ایک بار پھر کثات لی، سوا اواز چٹھری بند ہو گئی اور سرچرہ کا خاندان منگروہ چلا گیا۔ دہلی کا سرچرہ اپنے اسموں کے پاس لہو حیا ت چلے آئے لیکن ایک دن ان سے بھی ٹھکرا ہو گیا اور گھر چھوڑ کر لہو حیا ت میں ہی سائیکل رکھا چلانے لگے۔ ۱۹۶۴ء تک دہلی سے دور رہنے کے سبب کچھ لکھانے کا کوئی کام نہ کیا۔ دہلی واپس پر آل انڈیا ریلوے دہلی سے وابستہ ہوئے اور "اوپر لی ملز" "ٹھکلی" سے مولیٰ زندگی کا دوبارہ آغاز کیا۔ سفر کی دہائی میں دہلی سے بمبئی منتقل ہو گئے، جہاں لڑی اس ادیب کے طور پر زندگی کی۔ بھارتی ٹیلی ویژن کے لیے دنیا کی بہترین کہانیوں پر مبنی سیریل "مخزن" لکھی جسے نیل چوہان نے پروڈیوس کیا۔ بمبئی میں فلمی دنیا سے متعلق رہا کر "بچے"، "پرہیز سے اس پار"، "مہنا جہان"، "انامیکا"، "بپ اندر جہاں ہے" اور "سوال" وغیرہ متعدد فلمیں لکھیں۔ الاحد کھلے انہوں کے پرہیز آوی تھے۔ ڈیپا ٹیٹس کے مرض کا شکار ہو کر رحلت ہوئے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"دیوتا" مطبوعہ ملت روزہ "پارس" لاہور ۳۵-۱۹۴۳ء

داغ رہے کہ چاند سرچرہ دوشت کے قلمی نام سے لکھا جسے کرم چند پارس نے اپنے قصہ روزہ اخبار "پارس" لاہور میں شائع کیا۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ "دوسرے آدمی کا دار لکھ روخ" شب غلام کتاب گہر مالہ داد طبعی قول جنوری ۱۹۶۸ء
- (تجدید لکھانے ایک دہائی)

- ۲۔ ”خوف پر مکالمہ“ (گیارہ افسانے) ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس، دہلی طبع اول: ۱۹۸۱ء
- ۳۔ ”بازگونی“ (چار افسانے) ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی طبع اول: ۱۹۸۹ء
- ۴۔ ”حاضر حال پارسی“ (سترہ افسانے) گفتگو کار پبلیشرز، دہلی طبع اول: ۲۰۰۲ء

اعزاز:

سچیپا کیڈی ایوارڈ برائے ”بازگونی“ ۱۹۸۹ء

وفات سے قبل مستقل پتا:

۲۔ پتلی راج آشرم، نیولک روڈ، کالجیہ، سکٹی ۹۸۰۰۰۰۔ بھارت

نظریہ فن:

”میں افسانہ کے کسی سکول سے متعلق نہیں ہوں اور نہ ہی انسان نگاری کے فن کی پارکیوں کو سمجھتا ہوں۔ فاکل پر چاک گھڑ گھر کے اانی پر ایک بزرگ سارنگی پر تن کو کا کا کر اور ناچ ناچ کر داستان بنایا کرتا تھا اور پھر بعد میں اپنے تماشے کے عوض لوگوں سے بجاک لیتا تھا۔ میں اُس سے بہت متاثر ہوا۔ بچپن کا یہ خطرہ بھی ذہن سے ٹوٹ نہیں جاتا۔“

(پہلا، مکتوب، نام مرزا احمد، یک موریہ نومبر ۱۹۸۸ء)

رونے کی آواز

سریندر پرکاش

نقاد اور ادبی اذکاری

سانے دلی کرسی پر بیٹھا ابھی ابھی وہ گارہ تھا۔ تھراپ کرسی کی سیٹ پر اس کے جسم کے پاؤں کا نکلان ہی پائی ہے۔ نکلتا اچھا لگتا ہے وہ مجھے مٹری سوسٹی اور شاعری سے کھوکھلی دلچسپی تو نہیں ہے۔ مگر وہ کم بخت گاتھی کھکھاس طرح ہے کہ میں کھوسا جاتا ہوں۔ وہ گاتارہ اور میں سوچتا رہا "کیا بھول درست کے سائے تلے واقعی آ رہا ہے؟"

دوب چاچکا ہے۔ جن سرورں میں وہ بھر ہا تھا وہ اپنی گونج کھونچے ہیں۔ مگر لفظ سے میں ابھی تک الجھا ہوا ہوں۔

نقاد اور ادبی اذکاری

اس سے ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ اللہ لاکھ فرسے لمبی ہوتی ہے۔ شام چپ وہ مجھ سے ملا خاصہ نئے میں تھا۔ طالب علموں کے ایک گروہ نے دن میں اسے گھیر لیا تھا۔ وہ اس کے جگ کے گیت اس سے سنتے رہے اور شراب پاتے رہے۔ میرے کندھے پر اپنا دایاں ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے مجھے سارے دن کا قصہ سنا دیا۔ اور بھر کہنے لگا۔ "مگر سے جب نکلا تھا تو میرے ذہن میں یہ فلو تھا کہ ساری دنیا پیدل کھوم کر اپنا ہم شکل تلاش کروں گا۔ آخر یہی ہونے کو آئے مجھے دوسروں کے ہم شکل تو ملتے رہے مگر اپنا ہم شکل اب تک نہیں ملا۔"

"کیا کہیں جہیں کوئی میرا ہم شکل ملا؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں ایک سنڈری ٹیڈو میں ا" اس نے میری طرف دیکھے بغیر اور اپنے ذہن پر زور دینے بغیر جواب دیا۔

رات مجھے تک ہم سڑگوں پر مارے مارے پھرتے رہے۔ جب تھک گئے تو گھر کا رخ کیا، وہ کمرے میں داخل ہوا۔ کرسی پر بیٹھا وہ

ایک صف ادھر بھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے ایک دم اپنا قصہ کھیت کا شروع کر دیا۔

میں نے پوچھا "اس گیت میں جہاں تھاکو ہیں ان کے کتنی کہا ہیں؟"

”معنی کوئی ساتھ نہیں دے گا، صرف الفاظ دیتے ہیں۔ دیتے بھی کیا ہیں۔ بس دیتے معافی کی مہر جڑ کر دیتے ہیں اور ہم ان میں سے اپنے معنی تلاش کرتے ہیں“ اس نے جواب دیا۔

کری ہے اٹھنے ہوئے اس نے کمرے کی بے ترتیبی کا جائزہ لیا اور پھر اچانک یوں اٹھا۔ ”تم ٹھنڈی کیوں نہیں کر لیجے اچھے ماشے معمولی آدمی ہو۔“ میں ہنسنے لگا۔

”بات دراصل یہ ہے۔“ میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ”ہماری جلد تک کی اوپر والی منزل میں ایک دشمنو باہر ہے جیڑا وہ اس جلد تک کے مالک بھی ہیں ہم سب ان کے کرایہ دار ہیں۔ بہت سال پہلے جب وہ ہافل پمپن معمولی آدمی تھے تو انہوں نے ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔ جس کا نام ”سرسوتی“ ہے۔ پھر اچانک دشمنو باہر ایک مال دار عورت کشمیں سے نکرا گئے۔ جب انہیں باپنی لفظی احساس ہو ا تو انہوں نے ”کشمیں“ سے اپنا دھرا جاہ و مال لیا۔ اب کشمیں اور دشمنو دونوں تمام سے لڑنے لگی ہر کرتے ہیں بلکہ وہ بے چاری سرسوتی رات و رات گریز میں شخصی رہتی رہتی ہے۔ اسی ہنگامے کی وجہ سے میں ابھی تک نہیں کر پاؤا کہ مجھے کسی سرسوتی سے شادی کرنی چاہیے یا کسی کشمیں سے؟“

اس نے پھر سے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اس کی آنکھوں کے سرخ زردے اس کے چہرے کو خوفناک بنا رہے تھے۔ پھر اس نے ایک دم سے گڑب گڑب اٹھ کر کہا اور جھجڑی سے بیڑھیاں اتر گیا۔ اپنی اسی طرح کی حرکتوں اور باتوں کی وجہ سے وہ کبھی کبھی مجھے گوشت پوست کے آدمی کی بجائے کوئی خیال لگتا ہے جو سمندر پار سے یہاں آ گیا ہو۔

جس عبارت کے ایک کمرے میں رہتا ہوں۔ اس کے سب کمروں کی دوا عربی کھیں تھیں جیسے ایک دوسرے سے مشعرک ہیں۔ جس کی وجہ سے ایک کمرے کے اندر کی آواز یا خاموشی دوسرے کمرے میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ میں سوچتا ہوں بصری آواز یا خاموشی کی بھرپور رائے پہلے کمرے میں گونجنے والی اس کے گانے کی آواز بھی کہیں نہ کہیں ضرور پہنچے ہوگی۔

بہر شاہد راست نے صبح کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا ہے۔ اور گردے سب گھروں کی قبریاں بچھ گئی ہیں۔ ہر طرف اندھیرا ہے اور خاموشی ایک کی طرح آہستہ آہستہ سب طرف پھیلنے جا رہی ہے۔ میں دوا دے کی کھینچ چڑھا کر اور دم ہی جلا کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

مہم روشنی میں سفید چادر میں لپٹا ہوا اپنا جسم مجھے گھن میں لپیٹے ہوئی لاش کی طرح دکھاتا ہے۔ تجوئی کا موش اور تارکی میں ایسا خیال خوف زدہ کر دیتا ہے۔ جیسے طوطا میں ہلندی سے گرتے ہوئے آدنی کا جسم اور دوسری بن ہو جاتا ہے۔ لاشیں ہی پیری کیفیت ہے۔ دوسرے پھر سے میں نے گے گردا ہوں اور پھر ایک گھٹے گھٹا ہے جس کے جسم میں دانا ہے آدھا کھانا ہے۔

باہر سے کسی کے مددنے کی آواز آ رہی ہے۔ شاید مرسوٹی اور کھٹی میں بھر بھڑا ہوا ہے اور مرسوٹی کے رونے کی آواز سڑی می میڑی می اور کھٹی کے ہرے کھرے کے دروازے تک آ گئی ہے مگر یہ کسی بچے کے مددنے کی آواز ہے اسیں محسوس کرتا ہوں۔ ٹھیک ہے چاروں بالوں کا بچہ چاک چاک ہلک کیلج سے رونے لگ گیا ہوا اور اس کی ماں جو ستور نیمٹو میں ہے خبر سوچی ہوئی یا بھر شاہی یا بھی تو ہو سکتا ہے کہ کدو مرگئی ہو اور بچہ ہلک ہلک کر روتا ہو۔ آواز آتا ہے آواز قریب ہو کر واضح ہوتی جا رہی ہے۔ پھر مجھے لگا ہے ایک کچھ میرے ہی پیٹ میں چڑا رہا ہے۔ ہاں ہے اور کھٹی میں لپٹی ہوئی میری لاش میں کوئی حرکت نہیں ہو رہی ہے۔

”اگر وہ سخت قہر ہے تو ہم اس کے ہائے میں مرنے والے آزاد پھول ہیں۔“ میرے ڈاکٹر میں اچانک اس کے

الفاظ کے معنی نکل اٹھے ہیں۔ جن کے شرور اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

بچہ بدستور رہ رہا ہے۔ دیر سے دیر سے اس کی آواز میں درد اور دکھ کی لہریں شامل ہوتی جا رہی ہیں۔ جیسے اسے پتہ چل گیا ہو کہ اس کی ماں مر گئی ہے۔ مگر اسے یہ کہنے کا ہواگا؟ اس کے باپ نے؟ مگر وہ تو بدستور رہا ہے۔ کیونکہ اس کی آواز میں اس کے باپ کی آواز ابھی شامل نہیں ہوئی۔ یہ تو ہر کسی کو آپ ہی پتہ چل جاتا ہے کہ اس کی ماں مر گئی ہے۔ گھٹے گھٹے پتہ چل گیا تھا۔ بچے کے رونے کی آواز بھری آواز سے کتنی جلتی جلتی ہے!۔

مگر اس کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ "ابھی مجھے معمولی آدنی ہو۔"

میں واقعی معمولی آدنی ہوں۔ ہرجیچا اپنے گھر سے تیار ہو کر نکلتا ہوں۔ درد اور دکھ کرتے ہوئے ہیٹ ہیٹ کے لئے غور و خیر کرتا ہوں۔ سورج کی طرف منہ کر کے دہی مگر بھانگا رہتا ہوں اور دانت ہونے پر اپنے آپ کو گھر کے دروازے پر کھڑا ہوں۔

صبح سب سے پہلے ساریس کی طرح اڑتا ہوا میں اس عمارت تک جاتا ہوں۔ جہاں ایک عورت خوب صورت کینن میں گلاس ٹاپ کی میز پر اپنی سفید مرسر میں ہانسیں پھیلائے ٹھونسنے والی کرسی پر بیٹھی رہتی ہے۔ وہ اپنے سفید ہاتھوں کو ہر روز رنگ کے خطاب سے رنگ کراتی ہے۔ میز پر پکھلی ہوئی اس کی ہانسیں۔ اس طرح جتنی ہیں جیسے کسی عورت کی برہنہ انگلیں ہوں۔

کینن کے ارد گرد سے کئی میز صیباں اور چڑھتی ہیں۔ میز صیباں چڑھتے ہوئے میں اس کینن کے بیٹھوں میں سے اکثر بھاگتا ہوں اور سوچتا ہوں اگر واقعی وہ اپنی جگہ ہانسیں میز پر پھیلائے ہوئے ہے تو.....

ایز صیباں جہاں سے شروع ہوتی ہیں وہاں چاہنے طرف ایک بڑی سی الماری لگی ہوئی ہے۔ جس میں چھوٹے چھوٹے جگ کے ڈاکروں جیسے گانے بچے ہوئے ہیں جن میں ہر آدنی اپنی آدنی چڑی رکھ رکھا ہے۔ مگر میں ہر روز اپنی ذات ہی کا اس میں بند کر کے میز صیباں چڑھتا ہوں اور پھر کام کو جاتے ہوئے دوبارہ اسے نکال لیتا ہوں۔

باہر قہقہروں کی گاڑی گزرتی رہتی ہے۔ اس کا ڈرامہ دیکھ آگے کے اشارے سے چھینے کے لئے کھتا ہے اور میں شو کے چوڑی ترین قمیض میں بچکا رہا جاتا ہوں۔ جس کا پڑا ہل بالکل سرکس کے پڑا ہل جیسا ہے۔ میں اس قمیض میں پچھلے اٹھارہ برس سے ایک ہی رول ادا کر رہا ہوں۔ شیخی بالکل وسط میں ہے اور میرا پہلا میک اپ اتار کر "گلد" کا میک اپ اور اہاس پہنا دیا جاتا ہے۔ نکالے سب بیک گراؤ سے ہوتے ہیں۔ گھٹے صرف اتنی پتہ ہاتھوں کی مار کھانے کا کارواں دار کا ہوتا ہے۔ ان کے ٹھٹھے ٹھٹھے سوچیں جیسے ہمارے میرے جسم میں جھجکتے ہیں۔ ان کے کانوں سے لگے ہوئے چھوٹے چھوٹے جیر میرے جسم میں جڑت ہو جاتے ہیں۔ میرے مساحوں سے غون کی بوندی پینے کی طرح غونچتی ہیں۔ مجھ میں غونچتی پینی ہے کہ میں تکلیف کا اظہار نہیں کرتا۔ اس لئے اسے برسوں سے یہ سب چل رہا ہے۔ یہاں سے مجھے پتا چکے ہیں کہ یہ تو اصل کے طور پر ہے۔ مگر جب شروع ہو جاتا ہے تو مجھے ایک اسطر پکڑ لینا کہ ایک ہاتھ درم میں لے جاتے ہیں۔ جہاں الٹوکل سے میرے ہونے غب میں مجھے ڈال دیا جاتا ہے۔ الٹوکل میرے زخموں میں پھنسیں پڑا کرتی ہے مگر ایک دم خشکی کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ جاتی ہے اور میں تازہ دم ہو کر گھر کی طرف بڑھتا ہوں۔

ایک دن گیب تھا تھا اہوا۔ جب اس عمارت کے دروازے بند ہونے کا وقت آیا تب میں عرشاب خانے میں تھا۔ میرے پیچھے دھپ سے دروازہ بند ہوا۔ میں گھبرا کر دروازہ سے دروازہ پہنچنے لگا۔ تب ایک آدنی نے آکر دروازہ کھولا۔ میں اس قصور سے ہی اس قدر گھبرا گیا تھا

کہ اگر مجھے ساری رات اس پر صاب خانہ میں بند رہنا پڑا ہے تو میری کیا حالت ہوتی۔ مگر اس وقت میں پہلے وقت میں نے اس کہیں کی طرف بھی دھیان نہ دیا تھا۔ یاد ہو عورت پہلی گئی ہے یا نہیں اور اس کا کہیں دیکھی ہوئی اپنی ذات ہی لگانے کا خیال آیا۔ باہر تھمڑی کاڑی کا ڈرامہ راجہ ہارن پر ہارن بھانے ہار ہاتھ۔ میں بھاگتا ہوا گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی چل دی۔

میں بہت پریشان تھا کہ آج اپنی ذات کے بغیر میں اپنا رول کیسے ادا کر پاؤں گا۔ مگر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اس دن ختم ہونے پر بیٹھ اپنی کہہ سوں سے اچھے گزری طرف پہلی اور میری اداکاری کا ناقہ روتی تھا کہ میں خود بھی حیران رہ گیا۔

تب سے میں نے اپنی ذات کو اس لاکر ہی میں چھوڑ دیا ہے۔

ہوا کے ایک جھونکے کے کھڑکی کے پتہ کو زور سے بٹایا ہے۔ میں بھر اپنے کمرے کے احوال کی خوشبو محسوس کرنے لگا ہوں۔ جڑیوں پر چٹکی ہوئی سرسوتی کی سسکیوں کی آواز دوتے ہوئے بچے کی کب تک آواز میں اب تک ایک اور آواز کی آواز بھی شامل ہو گئی ہے۔ شاید بچے کا باپ بھی جاگ گیا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی لاش اور بچے کے بچہ کو کچھ کہتا ہے۔

ایک اچھے چڑی کے ٹالے میرا فرض ہے کہ ان کے کندھ کو میں حصہ ڈاؤں۔ کیونکہ ہم سب ایک ہی درخت کے سائے تلے کھلے ہوئے آزاد پھول ہیں۔

میرا جی چاہتا ہے میں اپنے کمرے کی چاروں دیواروں میں سے ایک ایک اکھاڑ کر اور گردہ کرے میں بھاگ کر انھیں سوتے ہوئے چاروں سے ہونے دیکھوں۔ کیونکہ دونوں ہی حالات میں آواز ہی کی حالت میں ہوتا ہے۔ مگر میں بھی کھٹکھٹا گیتا آواز ہوں۔ لوگوں کو بے بسی کی حالت میں دیکھنے کے شوق میں سارے کمروں کی دیواریں اکھاڑ دینا چاہتا ہوں۔

میں نے بھر اچھو کر خود کو ان کے کمروں میں جا کر ان کے رونے کی وجہ دریافت کرنے پر آمادہ کیا۔ رونے کی آوازیں اب کافی بلند ہو چکی تھیں اور ان کی وجہ سے کمرے میں بند رہنا ممکن نہ تھا۔

میں نے وہی گھن گھن پیچیدہ چار اپنے گرد لپکتی اور سیاہ پیچیدہ چکن کر دوازے کی طرف بڑھا۔ جس ہی میں نے دوازے کی چٹکی کی طرف ہاتھ بڑھا کر باہر سے کسی نے دوازے پر دھک دی تھی۔ نے صحت سے دوازہ کھول دیا۔

جڑیوں میں بیٹھ کر دے دلی سرسوتی ایک ایک گردہ کرنے والا پچھڑی ہوئی عورت اور اس کا بیچہ خاندان چاروں باہر کھڑے تھے۔ چاروں نے بیک زبان مجھ سے پوچھا۔

”کیا بات ہے آپ اتنی دیر سے دروازے پر ہیں؟ ایک اچھے چڑی ہونے کے ٹالے ہم نے اپنا فرض سمجھا کر۔“



جوگندر پال

نام	جوگندر پال
لقب نام	جوگندر پال
پیدائش	۵ جنوری ۱۹۳۵ء، پتھان سیکھوٹ، مغربی پنجاب
تعلیم	ایم۔ اے (انگریزی)، پنجاب یونیورسٹی، چنئی گڑھ ۱۹۵۵ء میلر کینڈا، انگلو ہائی اسکول، سیکھوٹ (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) سے ۱۹۶۱ء میں کیا۔ بی۔ اے مرے کالج، سیکھوٹ (پنجاب یونیورسٹی، لاہور) سے ۱۹۶۵ء میں کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی، چنئی گڑھ سے ایم۔ اے (انگریزی) ۱۹۵۵ء میں کیا۔

مختصر حالات زندگی:

والد کا نام محل چند سبھشی (۱۹۳۸ء۔ ۱۸۹۰ء) اور والدہ کا نام بابا دیوی (۱۹۶۶ء۔ ۱۸۹۳ء) تھا۔ جوگندر پال کے والد ایک معمولی
دکاندار تھے۔ ایک وقت آ یا کہ روپائی خسارے کے باعث گمراہ رہ گیا۔ جیسے جیسے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ بی۔ اے کے زمانے
میں جب والد کی صحت جواب دے گئی تو جوگندر پال نے پرائیویٹ ٹیوشن کے ساتھ ساتھ روزانہ اجرت پر مغربی کی ایک جراثیمات فیکٹری میں
انجینئرنگ کی لازمت اختیار کر لی۔ کچھ مدت ایک اسپورٹس پلاٹ کے ڈریکٹوریٹ کے طور پر بھی کام کیا۔ بی۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۶۳ء
میں مغربی اکانڈم میں گزرا بھرتی ہو گئے۔ ۱۹۶۷ء میں امرتسر چا کر رشتے کے ایک دوست مند ماسوں کے انجینئر ٹائیکر ٹری رہے لیکن جین ماہ
بعد سیکھوٹ واپس آ کر مرے کالج میں ایم۔ اے (انگریزی) کرنے کی غرض سے داخلے لے لیا۔ وہاں محض چند ماہ پڑھنے کے بعد مالی
پریشانیوں کے سبب کالج چا نا چھوڑ دیا اور رسالہ صحت کے پیش نظر وہاں ہجرت کر آئے۔ ۱۹۶۸ء کا سال اہمال میں اپنے والد کی بیماری کی دکان پر
دوبارہ دھڑکتے رہے۔ اسی سال والد صاحب کا انتقال ہوا۔ ۱۹۶۸ء میں جوگندر پال کی شادی کرشنا سے ہوئی۔ کرشنا پال، جامعہ لیا اسلامیہ، دہلی

میں انگریزی کی سیکھارہ ہیں۔ شادی کے بعد کرشنا کے ہمراہ نیروبی (ایسٹ انڈیا) منتقل ہو گئے جہاں ۱۹۳۹ء تا ۱۹۶۳ء کینیا ایجنٹیشن
 ایجنٹ کے طور پر کام کیا۔ نیروبی میں اسکول ٹیچر رہے۔ ۱۹۶۳ء میں کینیا کی آزادی پر ایجنٹیشن آفیسر کی عازمت سے احتیاری
 ریٹائرمنٹ کے بعد ریاست دہلی آ گئے اور گورنگ آباد (مہاراشٹر) میں سکونت اختیار کی۔ ۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۵ء وہ ایس۔ پی۔ کالج، گورنگ آباد
 (مہاراشٹر) میں شعبہ انگریزی کے پروفیسر اور ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۸ء پرنسپل رہے۔ ۱۹۷۸ء میں استعفیٰ دے کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی۔
 کینیا سے رٹائرمنٹ پانے پر وہ فری لانس ادیب کے طور پر زندگی کرتے ہیں۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

”جاگ سے پہلے“ مطبوعہ ”ساقی دہلی، ۱۹۳۵ء

اس سے قبل ۱۹۳۳ء میں ان کا پہلا افسانہ ”تعمیر“ مرے کالج میگزین میں شائع ہوا تھا۔

فلمی آثار (مطبوعہ کتب)

- ۱۔ ”بھرتی کا کال“ (افسانے) حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی طبع اول: ۱۹۶۱ء
 یہ گیارہ افسانوں کا مجموعہ افریقی سرزمین کی برباس لیے ہوئے ہے۔ کتاب میں کرشن چندر کا ابتدائی اور دلچسپ تجرباتی کا خاکہ
 ”چاہو، جو گھر، پال“ شامل ہیں۔
- ۲۔ ”میں کیوں سوچوں؟“ (چوتھی، چھ افسانے اور چھ افسانے) ادیبان اردو، صحت سر طبع اول: ۱۹۶۳ء
- ۳۔ ”اک بوند پانی“ (ناول) مکتبہ انکار، کراچی طبع اول: ۱۹۶۳ء
- ۴۔ ”روایتی“ (آٹھ طویل مختصر افسانے) صحت سر پبلشرز، بمبئی طبع اول: ۱۹۶۶ء
- ۵۔ ”مٹی کا اور اک“ (تیرہ افسانے) لایبھ رائے اینڈ سنز، دہلی طبع اول: ۱۹۷۰ء
- ۶۔ ”سولہیں“ (افسانے) لایبھ رائے اینڈ سنز، دہلی طبع اول: ۱۹۷۵ء
- ۷۔ ”آدھ دھت“ (ناول) افرین ٹیکس پبلی کیشنز، گورنگ آباد طبع اول: ۱۹۷۵ء
- ۸۔ ”طاقت“ (ناول) افرین ٹیکس پبلی کیشنز، گورنگ آباد طبع اول: ۱۹۷۵ء
- ۹۔ ”تجلیں“ (تیس افسانے) اردو پبلشرز، بمبئی طبع اول: ۱۹۷۷ء
- ۱۰۔ ”بے جلدہ“ (چوبیس افسانے) کیشاں پبلی کیشنز، گورنگ آباد طبع اول: ۱۹۷۸ء
- ۱۱۔ ”بے ارادہ“ (تین افسانے) زم زم پبلشرز، دہلی طبع اول: ۱۹۸۱ء
- ۱۲۔ ”ناؤ“ (ناول) رابطہ گروپ، دہلی طبع اول: ۱۹۸۳ء
- ۱۳۔ ”یہ ہم چھ کی کہانیاں“ (مترجم) ترقی اردو بورڈ، دہلی طبع اول: ۱۹۸۳ء
- ۱۴۔ ”کچھ گھر“ (افسانے) ترقی اردو بورڈ، دہلی طبع اول: ۱۹۸۷ء

- ۱۵۔ ”جو گندہ پال کے منتخب افسانے“ (کتاب)
- ۱۶۔ ”کھلا“ (افسانے)
- ۱۷۔ ”جو گندہ پال کے شاہکار افسانے“
 (اس کتاب میں جو گندہ پال کے چھ افسانے شامل ہیں)
- ۱۸۔ ”کھوپ رو“ (ناولٹ)
- ۱۹۔ ”راہِ پل“ (تختیہ مضامین)
- ۲۰۔ ”بے اصطلاح“ (تختیہ مضامین)
- ۱۹۹۶ء طبع اول
 ۱۹۹۰ء طبع اول
 ۱۹۹۸ء طبع اول
 ۱۹۹۹ء طبع اول

غیر مدقون:

- (۱) ”گلشن کے آرٹ پے“۔ شبِ خون۔ ۱۹۷۱ء۔ (۲) ”نیا افسانہ“۔ نئے کلاسیک، امرنواز، چیلور دہلی، ۱۹۷۳ء۔ (۳) ”ایک اور آواز“۔
 کاز“۔ محمد عقیل کے خاکوں پر مضمون۔ نیرنگ خیال، راولپنڈی۔ (۴) ”کچھ بیدی کے بارے میں“۔ شیرازہ، سری نگر ۱۹۸۳ء۔ (۵) ”سرو
 افسانہ، زبان و جان کے مسائل“۔ اوراق، لاہور، ۱۹۸۳ء۔ (۶) ”قرقر نسوی کی موصیحت“۔ آجنگ کیا۔ (۷) ”کھلا“۔ اردو گلشن کے باب میں
 ایک جات۔ مٹی نہیں، مٹی گڑ۔ ۱۹۸۳ء۔ (۸) ”نوی جان کہانیاں“۔ کاظمی دہلی۔ (۹) ”بیدی، خمیر و خمیر“۔ دستاویز، راولپنڈی، ۱۹۸۵ء۔
 (۱۰) ”گلشن کی تختیہ“۔ آج کل، نئی دہلی۔ ۱۹۸۵ء۔ (۱۱) ”ایک نیا جاتی“۔ مسلم آغا قوالہش کے افسانوی مجموعہ ”انگور کی تفل“ کا دواچہ
 ۱۹۸۶ء۔ (۱۲) ”گلشن کی تختیہ کے باب میں اردو دانشوروں کا تحق و تحکم اور تعصب“۔ سادہ ایشیا سیمینار، خدا بخش پبلک لائبریری، پٹنہ۔
 ۱۹۸۴ء۔ جو گندہ پال کے افسانوں، افسانہ نگاروں اور ناولوں کے تراجم انگریزی، ہندی، پنجابی، مرہٹی، کنڑ، ملیالم اور دہلی میں ہو چکے ہیں۔ اگر
 اس کام کو مکمل کیا جائے تو کتاب کی کئی جلدیں بنیں۔

مستقل چھاپ:

۲۰۴۔ منداختی، انڈیا، دہلی۔ ۱۹۷۹ء۔ ۱۱۰ صفحات۔

اعزازات:

- ۱۔ ”اردو اکادمی آف پرنٹنگ ایوارڈ“ برائے ”بے کاہرہ“ ۱۹۷۸ء۔
- ۲۔ ”خمیر ایوارڈ“ برائے ”بے ارادہ“ ۱۹۸۳ء۔
- ۳۔ ”غالب ایوارڈ“، طلیقہ سوسائٹی، گلشن ایوارڈ، ۱۹۸۳ء۔
- ۴۔ ”آر پرنٹنگ ایوارڈ“، اردو ایوارڈ ایوارڈ، ۱۹۸۳ء۔
- ۵۔ ”پنجاب گورنمنٹ ایوارڈ“ برائے ”سختی گھر“

۶۔ مولوی غالب امروہی: غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

۷۔ بہادر شاہ ظفر امروہی: اردو اکاڈمی دہلی

نظر یہ فن:

”افسانے کا فن اس قدر نیرنگی ہے کہ جیسے بھی کہانی بس جائے اور اسے پڑھتے ہوئے محسوس ہو کہ اس میں جو کچھ پیش آ رہا ہے وہ زندگی کی کسی گہمی وادرات کے مانند پہلی اور آخری بار پیش آ رہا ہے۔ اس اعتبار سے میرے نزدیک کوئی تخلیقی تحریر، اگر کتاب کے حروف ہے۔ یہ تخلیق جس کوئی وادرات میں سے اسالیب کی متقاضی بھی ہو سکتی ہیں، مگر جس طرح انسانی شکلیں نظری طور پر ہمارے دامن کی آئینہ دار ہوتی ہیں اسی طرح ہر فن پارے میں اعتبار کا ایک الگ مقامی مقام ہوتا ہے اور اس مقام سے کے اور اک کے بغیر اعتبار کا کو اپنے افسانے کی اصل شکل کا سراغ نہیں مل پاتا۔“

جوگندر پال (مکتوبہ عام مرزا جیلو یک محرر ۱۹۸۷ء/ اکتوبر ۱۹۸۳ء)



حوالہ جات:

۱۔ دکن جون احمد، تاریخ انڈیا، ایمرلی ۱۹۸۵ء، ص ۱۰۷

باہر کا آدمی

جوگندر پال

جب بھی مجھے خیال آتا ہے تو آنکھوں کے سامنے اس کا قہیلا گھومنے لگتا ہے اس کے دائیں کندھے سے لٹکا ہوا پھولا پھولا قہیلا جس میں دنیا بھر کے لیکن ٹھہرے پہلے مجھے اس کا طبع جان کرنا چاہیے اس کا چہرہ بھری آنکھوں کے سامنے بھراس کا قہیلا گھوم گیا ہے۔ دراصل اس کی ساری بچکانہ سی قہیلے سے وابستہ ہے شاید شاید اس کا کوئی چہرہ ہی نہیں۔ بس آپ کسی بھی چہرے کے ارے میں سوچ لیجئے کہ بچکانہ اس کا چہرہ ہے یا اس چہرے پر داناڑی ضرور ہونی چاہیے ڈی گھنی ڈی سیاہ منتشر داناڑی جسے دیکھ کر لگے کہ چہرے پر کوئی چہرہ نہیں ڈال رہی ڈال رہی ہے آنکھیں؟ اس کی آنکھیں ابھی چھوٹی ہیں مگر آپ غور سے نہ دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے اسے آنکھوں کے بغیر ہی نظر آ جاتا ہوگا۔

جب بھی میں اس پارک میں آ لٹا ہوں تو وہ سدا سبکیں ہوتا ہے۔ نہ معلوم کہاں رہتا ہے کیا کرتا ہے کچھ کرتا بھی ہے یا نہیں اور کچھ بھی نہیں کرتا تو اس کا قہیلا دنیا بھر کی اشیاء سے کیونکر بھرا رہتا ہے۔ نئے نئے چوں کے لئے چاکلیٹ، خوبصورت عورتوں کے لئے پھول، نور منس کے لئے قصوریں، بچہ داروں کے لئے داناڑیاں، شریفوں کے لئے ہائی کو بزنس کچھ سب کے لئے سب کچھ بطریقہ قیمت کے بغیر امداد کے صرف اس لئے کہ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری ہو جائے نہیں!

ایک بار کسی عورت نے اس کا پھول تول کر کے اسے پیچھا داکر چلا ہے اور کیا نام ہے اس کا قہیلا۔ میں اسے قہیلا ہی کہا کرتا ہوں قہیلا، وہ پانا سا ہو کر رہ گیا۔

”تم مجھے اس پھول کے اس پیچھے یا اس دوپٹے پر دیکھا تھا جی ہاں“ ہے! یہ میرا قہیلا اس لئے بھرا رہتا ہے کہ میں کسی سے ایک پانی بھی پھول نہیں کرتا۔“

اس عورت کے آدمی نے قہیلے کی جانب ٹک کی غوروں سے دیکھ کر اپنی بیوی کو آگے دھکیلتا چاہا لیکن اس کی بیوی نے بدستور کے

ہوئے جے سے بیکار سے بھول اپنے جھڑے میں سما لیا۔

قیلا غوثی سے اور بھول بھول معلوم ہوئے لگا۔

”دیکھو بھائی! اس نے عورت کے شوہر کو تباہ کیا۔“ وہی جھڑا ہے لیکن میرے بھول سے کتنا رنگ دار بھل آیا ہے۔“

”جاؤ جاؤ بھائی! کہہ دیا گاڑی مارا لو۔“

”تمہارا کیا سہارہ ہے سنی! اس کی تھی نے اسے لوگ دیا۔“

”میں کسی سے کچھ نہیں لیتا“ لیکن میرے قہقہے میں ہر چیز پہنچتی ہے موجود ہے جوجا ہو لے لو۔“

قیلے کا غصا ط کا دورہ نہ چا ہے تو بیکسی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھڑے کھڑے ہنگامیں بھاڑا کر چھوٹے سے نیم دائرے میں ڈانچ رہا ہے

”لے لو بھائی! سب کچھ لے لو! مرنے کی سب کچھ بچا لیاں کے لولو“

جیسے کسی گھونپڑی میں کوئی غریب بچہ سو گیا اور پتہ نہ دیکھ رہا ہو کہ ان کے دروازے پر کھیں سے ڈانچ کی گاڑی آ کر کھڑی ہوتی ہے اور وہ اچھل کر جوں کا توں سوئے سوئے دروازے پر آ گیا ہو۔

”لاؤ!“

”لے لو!“

قیلا اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا ایک طرف نکل جاتا ہے اور جمل ہو جاتا ہے لیکن اس کی آواز کانوں میں حکیم بھتی رہتی ہے اور ہم اسے سنیں کہ شاداب ہوئے رہتے ہیں۔

اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو میں اس پارک میں یہاں اسی بچہ پر مضمون بیٹھا تھا۔ میرے بچاں وہ بچے سے کھیں کر گئے تھے یا کسی نے کھال لیے تھے اور میڈن ختم ہونے میں ابھی پورے تین روز باقی تھے اور ہمارے دفتر میں جتنی جگہ ادا کرنے کا دستور تھا اور اس جتنی شہر میں میری جان بچان کے بہت کم لوگ تھے۔

وہانتا ہوا میرے پاس آ گیا۔

”کیوں یہاں؟“ اس نے اس کیوں پیچھے ہٹا؟“

اس کی آواز کا اثر قیلا میری صدف کی قننا میں نے جھپٹ اپنی ساری چٹا کھول کر بیان کر دی۔

قیلے نے قہقہہ لگایا۔ ”تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟“

قیلے سے اس کا ہاتھ برآمد ہو کر میری طرف اس طرح بڑھا گیا جیسے ہوا سے اڑا کر کسی خیر آفریں درخت کی ٹہنی۔ ”یہ لا تمہارے بچاں وہ بچے؟“

میں حیرت آمیز مسرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”لے لو! تمہارے ہی ہیں!“

”تو یہ بات ہے۔“ لیکن میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ جیسے اب کیا لینا دینا ہے۔ قہقہارے پیچھے وصول ہو گئے ہیں ابھی بہت ہے۔ میری آنکھیں کئی روز وہ پادری پہاڑوں کے ماتحت اس کے قہقہے میں گئی رہیں۔ ہونہو و ضرور کوئی ایسا لینا دینا کرتا ہے۔

وہ پارک کی ایک طرف چار ہاتھاکر چند منٹوں کے نو جوانوں نے اسے گھیر لیا۔

قبیلے نے یہ بھی نہ بچھا کر کیا؟ اور اپنے قبیلے میں ہاتھ اڑال کر تاش کا ٹکٹا ان کی طرف بڑھا دیا اور وہ سب تاش کھینچنے کے لئے وہیں اس کے قدموں میں گھاس پر بیٹھ گئے اور وہ مسکرا مسکرا کر مڑاتے ہوئے ان کی طرف دیکھتا رہا۔

"آؤ اُپا تم بھی کھیلو۔ ہم پیچھا کر کھیل رہے ہیں۔"

"مجھے بیسوں سے کیا کرنا ہے بھائی؟"

"بیسوں سے کیا کیا جاتا ہے شراب پو اور پلاؤ۔"

"مجھے جو کچھ دیا ہوتا ہے وہ بیسوں کے بغیر ہی پینے کو مل جاتا ہے۔ ہاں تمہیں دینا ہوتا۔" اس کا ہاتھ شراب کی بوتل تھا سے قبیلے

سے لگا۔ "یہ لو اُپا"

"منہ ج"

"ہاں لے لا تمہاری سی تو ہے۔"

تمہاری سی تو ہے! تو تو اس کی برائے تمہاری سی ہے۔ میں تو کبھ ہاتھاکر اس نے وہ اسی میرے ہی پیچھے لگوائے تھے۔

"لے لو اُپا"

میرے ہاتھ کی سہیلیوں کے ہاتھوں سے چھکڑی پیچ کر گئی اور کھٹکا پا کر قبیلے لے اپنا سر میری طرف موڑ لیا۔

"مرے تم؟ آؤ نہ تو کسی نے پیچ نہیں کالی؟"

میں غصے سے سر اٹھاتے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"بکھو لو بھئی! کہیں ایسا تو نہیں کہ اب کے تم ہی کسی کی پیچ کاٹ کے آ رہے ہو؟"

تاش کے چہ بائیں والے نے وہاں اس نے قبیلہ لگا کر کھلی ہاتھ میری طرف مڑا کر دیکھا۔ "اگر ایسا ہے تو آؤ ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ

ہمارے مطلب کے آؤ ہو۔"

قبیلہ پھر مجھے کہہ دیا کہ اسے معلوم ہونے لگا کیا چاہا کیا چاہا وہ ان لوگوں کا کر دیکھتا ہوں؟

"ان سب لوگوں سے" اسے غائب کر کے میں چند قدم پرے آ گیا تاکہ وہ بھی میری طرف مرک آئے "ان سب سے

تمہاری بڑی گہری جان بچکان ہے؟"

"نہیں میں کسی کا نہیں ہاں! تمہیں یا نہیں جس میں تم لیک کہتے ہو میری شاید کبھی سے بہت گہری جان بچکان ہے" انہی بات پر

وہ کان دھر کر غصے چلا چلا نہیں کیا ایک دہائیوں اور چند نہیں مجھے تم پر غصہ کیوں آ رہا ہے؟" وہ کھٹکا کر بیٹھ گیا۔

"اور اس بات پر ہے کہ کھٹکا لوگ مجھے بڑے بے وقوف سمجھتے ہیں۔" ٹھہرہ میری طرف دیکھنے بغیر اپنے سامنے کی طرف چلا دیا اور

دیکھتے دیکھتے کچھ اس طرح گم ہو گیا کہ میری طرف پشت کیے میرے ذہن میں آدامل ہوا اور

اور وہ ساری رات میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور قہقہے بدستور میری طرف پشت کیے میرے ذہن میں چٹکارا مچتا رہا اور وہ ہیں کا وہیں دکھائی دیا اور وہ میں نے جتنی سناچ رہا کہ وہ میری طرف منہ کر کے کھڑکیوں میں بیٹھ جاتا۔ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے دل میں اترا جاتا چاہتا تھا کہ وہ ہے سارے کا سارا قہقہے اٹھا کر پار لے آئے اور میرے میں ہاتھ ڈال کر ایک ایک ٹکے کھول لیں کہ اس میں کیا کیا ہوا ہے؟ اگر میں اپنی مرضی کا پیشہ اختیار کرتا تو آج کوئی نہ آئی نہ آئی آفسیر ہوتا۔ اوکل ای سے مجھے ہر بات کی فواد لگانے کی چڑی ملتی ہے۔

میری طرف چہنچہ کے قہقہے اپنی ذہن میں چلا جا رہا ہے۔ وہ۔ اور وہ اس کے پیچھے۔

ظہور! جد کھولا میرے پیچھے پولیس گئی ہوئی ہے۔

پولیس! قہقہے پشت لگا ہے تمہیں پولیس سے ڈار لگتا ہے۔ ہاں ہاں خوب ڈرو۔ تکی میرے تمہیں کوئی ڈاکٹور اسی جتا ہے۔ چور جتا اور ڈاکٹر کا چھ فرض چور کرتا ہے اس کا کام اتنا ہی اچھا ہوتا ہے جلدی کرو پولیس

ہاں ہاں سن لو بھائی! میں تم سے پولیس کہتے ہو وہ ہے کہاں؟ کون؟ ایک ہار مجھے بھی شک گرا کہ پولیس میرے پیچھے گئی ہوئی ہے۔ اس کے آگے آگے دوڑ کر میرا دم بھول گیا۔ بد ہادشا معاملہ داخل ہوتا ہے کہ چور چور خود آپ ہی اپنے پیچھے لگا جتا ہے۔ بد ہادشا چوری کر کر کے اس پر پیرا لگتا ہوتا ہے کہ اگر کبھی دیگر کارروائی اپنے ہی ہاتھوں ہوگا۔ بد ہادشا قہقہے کی دازمی میں اس کے چہرے کے چہرے ہونے نقوش اس طرح دکھائی دے رہے تھے جیسے اس کے قہقہے میں ادب تک ٹھنڈا ہوا دل۔ پولیس سے کیا ڈر؟ اور تاقی ہے تو اپنے آپ سے ڈرنا تاقی ذات کو اپنے ادب عادی نہ ہونے اور مگر تمہیں کسی سے پولیس سے بھی کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ میں نے اپنے بستر پر بے چینی سے پہلو بدلا شاید میں سو گیا تھا اور اور میری آنکھیں کھلی تھیں اور قہقہے میرے سامنے ہوا میں بھولتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھیں اٹے ہوئے تھا۔ "تمہیں جو کچھ بھی چاہیے وہاں تک کہ دو۔ میرے پاس سب کچھ ہے اور میرا سب کچھ تمہارا ہے میرا نہیں چور ہے چارے کا بال بچ کہاں میرا سب کچھ تمہارا ہی ہے کو تو تمہیں کیا چاہیے۔"

میں آپ کو کچھ بتاؤں؟ میں نے بھی ایک بار چوری کی تھی۔ سن دنوں میں ایک دن پولیس میں کاٹھن ٹری تھا۔ جب اسے ٹری کی اس کے گھر کا لے دھوے کے کھٹ میں اپنی فورس منت والے چھاپ مارنے کی سوچ رہے ہیں تو اس نے گھر کی نقدی اور اصرار اور اس کے گھر رکھا دی۔ مجھے بھی اس نے پانچ ہزار رکھے گویا۔ پورے دو ہفتے بعد میں نے کھانے میں بھرتی کر دی کہ میرا حالانی ہزار اس پر چوری ہو گیا ہے اور اس حالانی ہزار لے کر کاٹھن ہوا۔ کٹ کے پاس جا پہنچا۔ اتنی بڑی دوسرا دین سنبھالنا میرے لیے کے سہ سے ابھر ہے۔ چاہے آپ اپنی ہی رہی رقم تھوڑی تھوڑی کر کے میری گھوٹا سے کاٹ لیا کریں۔ میرا ایک میری ایما عمارتی سے اتنا غلط ہوا کہ اس نے دو چار بیٹھے بچاں بچاں دو پہر کاٹ کر باقی کی رقم مجھے صاف کر دی۔ آپ یقین کیجئے میں منت کے ذمہ داری ہزار نے مجھے چند ماہ کے لئے دکھا شاد دل بنا دیا کہ کسی جان بچان والے کو مشکل میں پا کر مجھے بڑی سرت ہوتی اور بڑی مشکل سے اسے مدد گول کرنے پر آمادہ کرتا۔ لوبھا ہی یہ تمہارے ہی ہیں! ایک نہایت غریب اور بڑے مسائے کو تو میں نے ایک وقت پانچ سو روپے دے دیئے۔ لوبھا چارہ دو نہیں سن میں سے نہیں خوشی اپنی بچی

کے ہاتھ پکڑ کر وہ اب یہ قصد لے لی بیٹا ہوں تو باقی قصہ بھی سن لیجئے۔ بڑھئی کی بیٹی کو چھ چلا تو اسی روز شام اٹھتے ہی وہ سب سے چھپ کر میرے پاس آ گئی اور میرے سینے سے سر جڑ کر مٹی بھر کے روئی اور میں نے اب کیسے گاؤں میں بڑا ہوا آدمی ہوں پہلے چھوڑنے کی بجائی کیا کم ہے کہ لڑکے کا کام ہو گیا۔

میں نے پہچن کر اس کو کمر بھر پکڑ لیا۔

بھولے ہوئے قبیلے کا ساتھی کا وہ بڑی قصہ سنانے لگی اور بے ترتیب ڈاڑھی سونچے سے بھر گیا ہے۔ گھاس بھوس کے اس توڑے کے نیچے سے مجھے کسی کی آواز سنائی دی ہے۔ ارے اپنے بھری ہی آواز ہے یا میری نہیں تو آپ کی یا کسی اور کی کسی کی بھی ”تھیں سے جھجک بزار ہاتھ آجائے تو اسی وقت ایک سورہ پے خیم خانے میں دے آؤں اور بائیں جڑا آئے تو دھاتی جڑا دس جڑا تو آخہ ہاں خدا کی قسم آخہ جڑا میرے لیے دو ہی کافی ہیں اور بچاں جڑا آجائے تو غوثی سے ہلاک ہو کر یہ سارے کے سارے پہلے کسی کی مٹی میں تھادوں اور گلے پاؤں دوڑا ہوا گل کی طرف گل جاؤں۔“

اپنے بستر پر لیٹے لیٹے میں نے تالی سے نفس چرا۔

”تھیں بھتی نہیں آ رہا؟“ زکسی پر تھیں معلوم نہیں چہرہ کتنا تک ہوتا ہے۔ چہرا کرنگی کا ڈیر چم کر لیتا ہے جین چوری کا مال ہوتا ہے اس لیے اپنی تنگی کو اس طرح طرح کرتا ہے کہ اس پر تنگی کا گھن نہ ہو اس کی چوری بکڑی نہ جائے۔“

”یہ میری آنکھ کی تھی یا پا کر پہلے ہی آنکھ کی ہوئی تھی تو نیند ہی نیند میں تھک کر میں خواب دہونے لگا تھا۔“

دوسرے روز شام کے وقت دروازہ میاں سے کھٹے اصل میں بجی دھا تو خانے کے لئے میں نے ساری کہانی پچھلی ہے شام کے وقت قبیلے سے کھٹے ہی میں نے بڑے چاک پین سے بڑی مہبت سے یہ سوال کیا ”تم کا کام کیا کرتے ہو؟“

میرا سوال ہی کہ اس کی آنکھوں میں چھپا ہوا کاکھ چرا بھرا پاؤں اور گلے خوف محسوس ہونے لگا کہ یہ کاکھ چور دیکھتے ہی دیکھتے میرا گناہ گوارے کا گھن جین اس وقت پائیس کا ایک چاقو نکھیں سے دھار ہو گیا۔

”کوہمیا بیڑی ہو کے؟“ دھلتا قبیلے کے چہرے میں درویش صورت مسکراہٹوں کا کھم ہانڈا آیا اور اس کا ہاتھ بڑی کا ایک بڈل لیے

قبیلے سے نکلا اور اس نے خالی غولی اسی میں ہاتھ ڈال کر سبھوے کا ساں باغہ دیا ”کے لونا!“ ”تھہار ہی ہے!“

لیکن اس شام میں پائیس کے تھن پائی ہوا آٹھ اور اسے گھیر لیا۔

درویش صورت مسکراہٹوں کے کھم سے گرداڑ لے گئی۔ ”گھرواؤ تھیں میرے قبیلے میں سب بکھوے سب بکھوہا ہی ہے جو جا ہو گے دے دوس کا۔“

”ہم طرے ہیں کسا پنے آپ کو چپکے سے ہمارے حوالے کر دو۔“

”ہاں ہاں ضرور۔“ قبیلے نے ہاتھ اپنے قبیلے میں ڈالا اور ساری داستان کو ٹوٹے ہوئے یکساں کی اس کا چہرہ اتارنے لگا ”میں

”میں تو اپنے قبیلے میں نہیں ہوں۔۔۔؟“

اور پھر اپنی بات کو کسی کر وہ اٹکی شادک سکا اور سرعت سے عقب کی خار دار بھانڑوں کی طرف اچھل گیا اور چور نہ ہوتا تو ضرور پکڑا جاتا۔

غیاث احمد گدھی

نام	غیاث احمد
تلمیذ	غیاث احمد گدھی
پیدائش	۱۶ فروری ۱۹۲۸ء، مقام جھڑا (جہار) بھارت
تعلیم	پہلے پہل سال بھر گدی مدرسہ جھڑا میں مولوی فضل الحق سے عربی کی ابتدائی تعلیم پائی بعد میں ۵۵ برس تک گدی مولوی قاسم سے اردو انگریزی اور حساب کا درس لیا۔ دہری تعلیم سے محروم رہے۔ ان کے پاس کوئی ڈگری نہ تھی۔

مختصر حالات زندگی:

آپ جھڑا (جہار) کے گدھی سلطان گمراہوں کے خاندان سے تھے۔ آپ کے والد کا نام احمد گدھی تھا جن کا آبائی پیشہ دودھ کا کاروبار تھا۔ بچپن میں ان کے بچے کا سبب گدی نے گود لے لیا اور غیاث احمد گدھی کا بچپن بالائی میں دودھ پھر کر گھر گھرانے میں گزارا۔ کچھ عرصے تک گدی نے تعلیم سے محروم رہا۔

ان کے لڑکپن اور ترقی پسند تحریک کے شباب کا زمانہ ایک تھا۔ جھڑا میں ایک چھوٹی سی چٹک آبادی تھی جس کے مکمل غیاث احمد گدھی اس دور کے نماواں اولیٰ جرائد ”نہا جی“ ”جانگیر“ ”خیام“ ”ادلی دنیا“ اور ”ادب لطیف“ سے متعارف ہوئے اور ادب کی چٹک دل میں جا گئی۔ ۱۹۳۰ء میں کرشن چندر سے متاثر ہو کر افسانہ نگاری کا آغاز کیا اور دس برس کی ریاضت کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھاس کی دہائی میں جب نریش کمار مشاد نے کرشن چندر کا عروج کیا تو انہوں نے گدی کو مستقبل کے اردو افسانے کا اہم نام قرار دیا۔ ۱۹۳۳ء میں اپنے ہی خاندان میں ہاتھ سے شادی ہوئی اور یہ وقت صرف آٹھ برس رہی۔ ۱۳ فروری ۱۹۵۲ء کو ہانوا کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے ”پیراٹ“ کے نام سے خاص افسانوی ادب کا ادبی مجلہ جرنل ۱۹۶۲ء میں جاری کیا تھا جس کے صرف چار شمارے نکل سکے۔ غیاث احمد گدھی دل کے مریض چلے آتے تھے، جنوری ۱۹۸۶ء کی درمیانی شب دل کا دورہ پڑا اور صبح پانچ بجے خالق حقیقی سے جا ملے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"جہاں بھانا" مطبوعہ "کالجیئر" لاہور نمبر ۱۹۳۵ء

تقریبی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ "پاپا لوگ" (نوافسانے) کچل کادی رچی پاپی کیا بھار طبع ازل ۱۹۶۹ء
- (۱) پاپا لوگ (۲) پیچہ (۳) سحر وہیں سحر (۴) پاپے (۵) اور تھی جون سین (۶) بد صورت سے صلیب (۷) پاپا سی چڑیا (۸) بوری کاغہ اور چاند (۹) صبح کا دامن
- ۲۔ "پرندہ بکڑنے والی گاڑی" (سولہ افسانے) صبا نیلی کیشنورہ مرثیہ ڈیڑھ سہرا بھار طبع ازل ۱۹۷۷ء
- (۱) پرندہ بکڑنے والی گاڑی (۲) تھی دو تھی دو (۳) ادب جانے والا سورج (۴) ایک غول آشام صبح (۵) تیری (۶) ہر دھنی (۷) خانے و خانے (۸) اندھے پرندے کا سطر (۹) (۱۰) افلی (۱۰) کالے شہ (۱۱) ایک جھوٹی کہانی (۱۲) ہر کا شہ (۱۳) پاگل خانہ (۱۴) ایک (۱۵) کیا کر (۱۶) ہم دہریوں کے گچ
- ۳۔ "سارا دن دھوپ" (پارہ افسانے) کتے خوشی شہستان، بندہ کریم گنج کیا بھار طبع ازل ۱۹۸۵ء
- (۱) طلوع (۲) کوئی روشنی (۳) سورج (۴) صبح کا دامن (۵) دھوپ (۶) آغا قہو (۷) کوزہ (۸) چہرے پہ چہرہ (۹) سائے اور سائے (۱۰) سرگ خانے (۱۱) ایک بیگہ ہوا لب (۱۲) ہانگی گھر والی
- ۴۔ "پچ آؤ" (نوافسانے) صبا نیلی کیشنورہ مرثیہ ڈیڑھ سہرا بھار طبع ازل ۱۹۸۰ء

غیر مطبوعہ:

- ۱۔ ناول "مطبوعہ کتب کے علاوہ پانچ ناول ناول عنوان ۱۔ "لوہ شستہ ایک" ۲۔ "خانے و خانے" ۳۔ "پاپا سی چڑیا" ۴۔ "تھی دو تھی دو"
- ۵۔ ادب جانے والا سورج کے عنوان سے ڈاگہ چھوڑے۔

زندگی میں مستقل چہ:

جہاں بھار بھارت

نظریہ فن:

غوب سے خوب تر کی تلاش۔۔۔ میرے نزدیک یہ بات اہم ہے۔

غیاث احمد گدلی

(پہلا نمبر: مکتوب نام مرزا احمد بیگ، عمر، ۲۵ نومبر ۱۹۸۰ء)

سائے اور ہمسائے

غیاث احمد گدڑی

منور روشنی کے طور چمکنے
 کون سے سر میں فرض پر جھمی سے نوائی
 قلی ہانگی، آواز کے بھول چکے
 رنگوں کی سروں کی کوئی کہکشاں
 کھل کھاتی ہوئی گور میں آ چڑی ہے
 طوفانی کے گہرے سحر کی تہ سے
 کسی تل پر ی نے مجھے جیسے آواز دی ہو
 اندھیرے کے پردے پہ سنا چو گئے
 کئی نور کی اٹھکیاں جھلکا گئیں
 شفق در شفق در رنگ در رنگ
 عارض کا حیرت کدو سامنے ہے
 وہ ڈھلتا ہوا سیکڑو سامنے ہے
 دھنک سامنے ہے

کسی کو پہلے سنا دے! ("بلور" مجلہ دم گئی الدیج)

دو درختوں جو کوسے دن پہلے گہرے بھاگے تھے، اور گہرا تے ہوئے دل کے سکون کے لیے "شافی نواس" ہوٹل میں سکونت اختیار

کی تھی۔

دو دونوں بے زار رہے نہ اسے تھے ۔

کانے چٹ کر پھیلے ہوئے ودراتی میدان کی طرف دیکھا تو سارے میں ہیروں سے مکی اور صوب میں ملی ہوئی کھاس بے حال پڑی تھی۔ ایک بدرنگ سا خارش زدہ کتا بکھڑوگتھا بھر رہا تھا، اور وہ پیار سے گدھے کر دیں لہوڑے کھڑے تھے۔
اُداسی بے طرح آستہ دینے والی آداسی اس پر محیط ہو گئی۔ کانے پلٹ کر اس آداسی کی طرف دیکھا، جو سمندر کی طرف کھٹے کھٹے دانی کھڑکی سے لگا ہر کی طرف تکتا رہا تھا اور خود بے چنگن سا تھا۔

”ہم نے اچھا نہیں کیا۔“

یہ کس کی آواز تھی۔ اکھانے محسوس کیا، یہ آواز اس کی اپنی ہوتے ہوئے بھی اجنبی اجنبی سی ہے۔ جیسے خود سمندر اس کا اپنا ہوتے ہوئے بھی اجنبی اجنبی سا لگنے لگا ہے۔ اچھنک کر اس کی آواز سن کر سمندر جو تک چڑا نہ اسے لگا جیسے یہ آواز اس کی دیکھی بھائی، بھائی بھائی ہو ۔
سمندر نے کتا کو فور سے دیکھا تو اسے دونوں نے کتا کو کی جگہ سے، ہلکے پھلکے ہی کسی، مگر کمر بچ ڈالا تھا۔ اور وہ کتا جو نوے دن پہلے تک ابھرا نظر آ رہی تھی، اب کچھ ہلکی ہلکی، تپیلی تپیلی، بوزی !

لیکن نہیں، وہ بوزی تو نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ یہ کھنکھن اس کا خیال ہے کہ آداسی جلد بڑھا ہوا ہوتا ہے! صرف نوے دنوں میں بہاریں اپنے غیسے ہاؤز ڈالتی ہیں! ایسا اجنبی اور کھسوت لینے والا خیال، شاید اس کے دل میں بہت دنوں سے لپٹا رہا تھا، اسے دنوں سے چھتے دنوں کی اس کی محبت تھی۔ شاید اس سے کہتا کہ

مگر کتا آج کچھ ہلکی ہلکی، تپیلی تپیلی بہر حال تھی۔ سمندر کی آنکھیں کوئی صوب جو کھلی تو نہیں تھیں، ایک مصوم صفت بچہ تھیں جو سچائی سے جہاد نہ کر دیتا ہے۔ جس جلوس کو اس نے اپنی تمام زندگی کا حاصل سمجھا تھا، وہ بھی کتا تھی !
بہر حال کتا تھی۔ کوئی فرق نہیں تھا۔ ابھی ابھی وہ مگر اجنبی تھی، رات بھر کی کھلی ہوئی۔ اس کے کلو کے سارے چراغ ساری رات پلٹے رہے تھے۔ سمندر کے استر کی چٹائیاں چڑھاؤں کیے ہوئے تھے۔ سوچا ہونے سے کہ پہلے آج آج ہنر بیٹھے گئے۔

بھرا ایک دم سے جھگمکے !

”مجھے اچھا نہیں لگتا!“ کانے بڑے خطرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”کیا اچھا نہیں لگتا؟“ سمندر نے اسے ہی جھگمکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”ہیں؟“

”نہیں نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ یہ چھلچھلے“ بھرکا نے اپنے لہجے میں یاد تھے اور اجنبی ماہروں کو ہلکا دینے والے ہاتھوں کو ہلکا اور گروں پر ہاتھ بکھرتے ہوئے بہت کچھ کہنے اور کچھ نہ کہنے کے عجیب عجیب کراہت سے بولی ”لگتا ہے کہ بچہ کی کی چڑی کی چڑی ہے جیسے کچھ گت رہا ہے گویا کچھ چھلچھلے ہوئے بھی اچھا نہیں لگتا۔“
”ہیہ ہر شے میں، کی شے۔“

”نہیں؟“ کانے سمندر کے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ دیں۔ ”نہیں، مجھے شعر بھی اچھے نہیں لگتے؟“

سمندر نے جواب نہ دیا۔ صرف پلٹ کر گہری نظر اس سے دیکھا۔ وہ ایک کلو میں کتا اسے کیا نظر آئی؟ ذہن پر بہت زور دینے کے باوجود وہ فیصلہ نہ کر سکا۔ نوے دنوں میں نہ صرف وہ طور بلکہ کتا بھی کی جگہ سے مل گئی تھی۔ محبت کی وہ حرارت جس کی تعمیر میں ان دنوں کا کلو

جلا تھا اس کی ایندھن کھک رہی تھی۔ نوے دنوں میں اتنی ہی دھٹیلیں مل گئی تھیں۔

”صرف دس دھٹیلیں رہ گئی ہیں!“ فرخ نے سدھیر کے کہاں پہنچ کر یہ جملہ ادا کیا کہ خود اسے غصہ پاینت آیا۔ سوچا کہ براگ لگے کر کچھ سامنے کھڑی تھی۔

”کیسی دھٹیلیں! اکیس دس دھٹیلیں؟“

”جیت کرنے والے بے قرار دلوں نے ایک عمارت بنائی تھی۔“ سدھیر خاموشی سے ٹیڈ کرتا رہا۔ اور اس کا لا شعور جو بڑا اچھا تھا، کھرا تھا۔ بے یاسی سے بولا رہا۔ ”نوے دنوں میں یہ خواہصورت عمارت تیار ہو گئی، تو ایک دن ان دنوں نے اس میں پردہ لٹکایا تھا۔ دھڑکتے ہوئے خوف زدہ اور محبت سے سرشار دلوں نے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کیں۔ جانے کس نے کیا کہا۔ جانے کس نے کیا سنا کہ اس کے بعد چاروں اور کھڑی دھڑکی پر، برسات کی ٹپکیاں برسنی پڑنے سے بھی سونگھی سونگھی، کھڑکی کھڑکی خوشبوئیں پھیل جاتی ہیں۔ ویسے ہی کچھ خوشبو سے چاروں دشاؤں کے نغصے ٹھیک اٹھے۔“

”اب؟“ کھڑکی اٹھی۔ اس نے اپنے لیے سیاہ بالوں کو گردن کی بالکی چٹختی سے پرے کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

”تم بہت بولتے ہو سدھیر! غصہ کرو؟“

سدھیر کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے شیشے ہی میں سے اُسے دیکھا، جو گہری آنکھوں پر ایک درا آداں پٹیلی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نکھر گئی۔ ”دھٹیلیں سنبھالے نہیں سنبھال رہی ہیں، نکالو!“

”کیا؟“

”پہلے تم کتنی تھیں، تم بہت اچھا بولتے ہو، سدھیر!“

پہلے پہلے ہر لمحہ جیت جاتا ہے وہ جیت بڑا رہتا ہے۔ ہر بندہ جو عمر جاتا ہے دلوں میں اس کا حرا رہتا ہے ایسا کیاں ہوتا ہے ایسا کیوں ہوتا ہے زندگی اکی بے وفا، اکی بے ایمان، اکی بے عزت کیوں ہے۔ اس کو پٹیلی شیشے سے بکڑوا، پھیل جاتی ہے۔ ریت بھری ٹمکی کی طرح پٹکی پٹکی میں خالی ہو جاتی ہے۔ اسکی جاتی ہے کہ چلتے کر نہیں دیکھتی۔ کہ کوئی ہمارا اس کا دامن بکڑ کر، پچھلے کو تم نے مجھے کیا دیا؟ یا جو کچھ دیا وہ سب اتنی جلدی پیچھے کیوں لے رہی ہو؟

”کیا سوچتے تھیں؟“

”کون تھیں؟“ کھڑکی نے کہا۔ ”مگر اپنے آپ سے ہم گئی۔“ تم کیا کہہ رہے تھے وہ تو نے انکوں دانی ہاتھ؟“

”میں کہہ رہا تھا، کہ محبت کے اس محل میں رہتے ہوئے ہمیں نوے دن بیت گئے ہیں۔ دواؤں پر کوہ و غم پر کیا، اور دکا کے چہرے پر ردھل پڑنے کی کوشش کی۔ پھر مسکرا پڑا۔“ اور اب صرف دس دھٹیلیں رہ گئی ہیں!“ سدھیر بال بال غصہ سے غپ ہو گیا۔

کھڑکی کے اندر کی دنیا میں کسی نے بھانجک کر سرگوئی کی۔ بڑی آہستگی سے کس کا چاک کھلنے کی طرح کوئی بھیس بھاسا۔ ”اور اگر دس دھٹیلیں بھی مل گئیں تو؟“ جانے کہاں سے ایک طوفان سا اٹھا اور اس کے باہر کی دنیا پر بھی چھا گیا۔ کھڑکی کا پی سی گئی۔ اس کے چہرے پر گہرے غم کا سماں یوں منتقل ہوا کہ خط کے بندھن ٹوٹنے لگے۔ بھرہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور پھر اس کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی، جہاں سے سدھیر، بے کراں سدھیر، اس کی زندگی کا ہر ٹیک، جتنا اس پر پھیلا ہوا تھا۔ گہرا، نیلا، دھڑکتا ہوا، گرد و غبار لپٹا ہوا سدھیر، اس کے صحن حراج زندگی

کی طرح پہلو بہتہ ہوا سندھ کا کی آنکھیں جھٹک اٹھیں۔ ایک جھڑپا ملنے کا

آرے سندھ آ آ کر مجھ میں سا جا کر آنے والے لمبے مہری تاک میں بیٹھے ہیں اگلے، جوا بھی سے ٹھکن ٹھکن لینے دیتے۔ میرے اس سادہ رنگ جین میں قمی حق ہو۔ پائیکر۔ پائیکر۔ ۱

سندھ میرے اس کے کندھوں پر یوں ہاتھ رکھا کہ اسے مجھے کا سہارا مل گیا۔

”تم غراؤ گراؤ کھن جاتی ہو، نکلا میں نوے ڈیڑھ نوے کو گھر سے مضبوط کرلوں گا۔ میری محبت تماری محبت میں کا دم ہے۔“

نکا بھٹ کے اس کے سینے سے لگ گئی۔ اور تقریباً روٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”جانے کیوں ایسا لگتا ہے۔ سندھ میرا لگتا۔ اس کی آواز لگتی کی روگڑ میں ہلک گئی اور وہ سندھ میرے سینے سے لگی۔ مسک مسک کر رونے لگی۔

پھر بہت دیر ہو گئی۔ سامنے سا لٹھ کے تیار سامنے جھٹک آئے۔ مجھے ہارے دن کے رنگ۔ وہ پہ میں تھکان ہی تھکان سرایت کرنے لگی۔ یہ جھٹ کہاں سے ایک پتہ سندھ کی سٹاپ پر مسافر کو نہ چانچوں کی طرف اٹھ گیا۔ لگا کر سے پاؤں تک لڑا لٹھی۔

میں اسی گود میں میرے اس کی غلوڑی نوٹنی کر کے ہونٹوں کو چوم لیا۔

”چلو کہیں گھوم آئیں۔ بجرا کے سوچیں گے۔“

آگے سر پہنے کے لیے جتنے راستے ہو چکے ہیں، سب کھلے چڑے ہیں۔ وہ کسی راہ پر بھی حرکتی ہے۔ کوئی روکے والا نہیں۔ کوئی پر پہنے والا نہیں۔ زندگی اتنی سبک سروسا ہے ہوئے بھی ایسی چٹان کی طرح بھاری کیوں ہو جاتی ہے کہ کسی بھی؟

چٹان کی طرح بھاری کیوں ہو جاتی ہے؟

کر بھی بھی۔ ایہ بھی بھی کی بددلتی، یہ بھی بھی کی مٹرو کی یہ بھی بھی کا بے چارہ سا ناگھراں کی بھی بھی کی بہاویں بھی تو ہیں جو اس کی زندگی کے ہارنے میں پھول ہی پھول نکالتی ہیں۔ ایک نفس کی کا جادو، جو اس کی حتی کے گرد چھا جاتا ہے؟ نکالنے اس کا جواب نہیں دیا۔ نکالنے صوبہ معمول اپنے ان ہونٹوں کو کھیں پر چٹا تھیں پر بھی بھی سندھ میرے کھوں سے بھدے کیے تھے۔ وہ خاموشی سے سندھ کی آواز دیکھتی رہی۔ جس پر سندھ اسٹوٹس ہی سٹوٹس بھٹکی ہوئی تھیں۔ ابھی ابھی جس کی ہے اب سٹاپ پر ایک بوسا پر بندہ ہار کر اٹھ گیا تھا۔ لذت کا ایک لہر چا کر ہمارا گھبراہٹ۔

اُس نے پست کر سندھ میری طرف دیکھا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ میں بھٹکی بھٹکی، بیٹھی بیٹھی، بڑوسی؟“

”جھٹ نہیں نکالا خدا کی قسم بڑوسی نہیں!“ سندھ میرے غامت سے گرجا پائی سے جواب دیا۔ مگر بیٹھی بیٹھی۔

”وہ اس لیے کہ“ نکالنے ہلدی سے بات کاٹ کر جواب دیا۔ ”میں نے سن نہیں دھوا ابھی دھوڑا لگی تو پھر“ نکال دھکا دھکا رو گئی۔ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ خود بخود غلی کا یہ انوکھا، ابے ایمان چنڈ کہاں سے اس کے دل میں پیدا ہوا گیا۔ وہ کیوں عدالت کی ضرورت محسوس کرنے لگی ہے۔ کیا سندھ میرے اس گفت چور سے ہی محبت کی ہے، جو بھی بھی اس کے پاس ہوتا ہے تو بھی بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ کیا ایسے لمبے میں سندھ میرا اس کا نہیں ہوتا؟

بھی بھی سندھ میرا کی تو جڑاڑ حال، تھکا ہارا دکھتا ہے لکھانے اپنے بے قرار ذہن پر زور دے کر سوچا، کیا ایسے لمبے میں بھی وہ اسے اتنا ہی پیارا لگتا ہی لگ کر دینے والا محسوس ہوتا ہے؟ شاید نہیں!



زندگی کے فطرت اور فنی انداز پر حال باقی رہی ہوتے ہوں گے۔ شاید یہی زندگی کی انوٹ جہاں کی ہے۔ شاید یہی حکایت ہے کہ اتر سے بہاوت حاصل کرنے کا قدرے کی طرف سے پہنچ راستہ ہے۔

انگریزوں سے کیا ہوتا ہے۔ میں نے کوئی تہوار بچے سے منورے محبت کی ہے۔ یہ سب میرا حق نہیں ہے اسے گنگے کا تہوار وقت یہ الفاظ ادا کیے تھے۔ کلاس کے ان کے سب تازی کو پھر ایک چابک بھی تھی۔ اس کا حقیقت پسند و داغ و راصل محبت کرنے کے قابل ہی نہیں۔ بکا نے بھر سچا، شایع محبت کا مفہوم سمجھا رہا ہو کہ اس کی آرا تھی محبت کی قد بلوں سے ہو۔ محبت کی درکار رنگ جھنڈاں ہیں یا اس سے وہاں تک لڑتی رہیں لڑتی رہیں!

"Gangster"

”کہو نہیں!“ کھانے نقل کر دینے والے انداز سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی کوئی تہذیبی عمر تہذیب دے اس ناقص جسم سے؟“ اور جملہ مکمل پھر دوسرے عمر کے جسم سے لپٹ گئی۔ ”شاید کچھ محبت کے لیے تو ہر ہے؟“

پھر دوسری راگ ہو گئی۔ ”میں اب بھی نہ چاہو دھوکا آتی ہوں۔ پھر تم گھونٹے جھیلے کے؟“

آج کی شام بڑی پیاری تھی۔ آج کی شام اتنی پیاری ہوتے ہوئے بھی اُداس بھی تھی۔ جیسے شام نہ ہو، نکلا ہو۔ اتنی دل آویز ہونے لگی جس کے چہرے پر غم کا کھمدہ کی قسم کا سا چمکنا لہرا رہا ہو۔ آج کی شام سال نو کی پہلی شام اپنے دامن میں چھ انھوں کی ہمارے گزرتے روزی تھی۔ چھ انھوں کی قطار، آؤی تری تھی، سیدھی، صراطِ مستقیم کی طرح پھیلے ہوئے چراغِ عمر جن سے لوگوں کو ہلکا ہلکا دھواں بھی دکھ رہا ہے۔ کوئی پتے پتے یوں یاد دیکھتا ہے تو صرف روشنی کی یاد دہشتی نہ کہتی ہے۔ کوئی بلبل ہرگز ظہیر کو غور کرے تو

چلتے چلتے اس نے ایک تیز خبر کرکھا کے پیرے کو ہاتھوں کے پیالے سے تھام لیا۔ ”اس روش کا تاجا کہ چراغ کے آس پاس حواں حواں سا کیوں اُٹھ رہا ہے الکی بھی کیا بات رہ گئی کا؟“

”لکھے کچھ کرپ سانسوں ہوتا ہے، کچھ خوف سا، کچھ بے چارگی سی، کچھ گویا میں نے اچھا نہیں کیا۔ کبھی کبھی میری بیواہ مل جاتی ہے۔ سدا میرا کیا کیوں ہوتا ہے؟“ شاید وہ اناجے جو میں نے رکھی تھی، وہ اناجے جو تم نے رکھی تھی، وہ منسوبہ انکس چڑنی تھی!“

”تمہیں کھانا“ سو میرے اطمینان سے غصہ کر کسی بڑے گھر سے آئی کی طرح جواب دیا۔ ”یہ تمہارا دم ہے۔ دراصل یہی دم ہے جو صحت کا ذخیرہ ہے۔ کھانا کھانے دیکھتا ہے کہ وہ کسٹھل غصہ اور غصہ ہوتا ہے۔ مجھے بھی کبھی کبھی غصہ ہوتا ہے کہ کھانا کھائیں مل رہی ہیں۔ لیکن صرف کبھی کبھی۔ اور تم، کھانا کھانے کے تم کبھی کبھی ہی اس دم سے کھانا کھاتی ہو۔ اس لیے تم مجھ سے زیادہ صحت کرتی ہو۔ اور شاید میں تمہیں اس لذت سے محروم جا رہا ہوں۔“

کھانے پینے چلنے والے کھانوں کے چرے کی طرف خاموشی سے دیکھا۔ اور جانے کہا بچہ کرا گئے بڑھ گئی۔ اور غیب سادھے چلتی رہی۔ بہت دیر ہو گئی۔ سارے میں شور و غل اٹھی تھیم، ٹپے ٹپے لٹے ٹکڑے پڑے تھے۔ اس کے کندھے پر سودیر کا ہاتھ تھا۔ کبھی کبھی چلنے میں اس کا ہاتھ سودیر کی انگلیوں سے مس ہو جاتا تھا۔ شاید محبت اٹنی تھیں وہ جانتی ہے تو ہاتھیں کونہ ہٹاتی ہے؟ شاید یہاں کا اپنے انہیں کے آواز

ہم سے ہے چمک اٹھی۔ ذرا نہیں ٹھہرتا، اب ہر جی چاہتا ہے اڑ بھاگتا ہے۔ اس نے ایسا کیوں سوچا، پلٹے پلٹے کانے سوچا، یہ سوچ کا بھیجی اچھا بھلا رکھوں ہے۔ کسی شاعر ہاں کے پاؤں جھٹکے کیوں نہیں، اب سو میراں نہیں ہوتا تھا تو اس کے لیے وہ نہ تپ اٹھی۔ اب دہل گیا ہے، اس سے اتنا قریب آ گیا ہے، یہ شاعر اچھلی محسوس ہوتی ہے۔ ایسا کیوں؟ شاید یہ جی ہو کر محبت قربت کے ٹھہرے ڈھلی ہو جاتی ہے۔ پھر کمال نے اپنے اندر بھاگ کر دیکھا جیسے کوئی کرے کنوئیں میں بھاگ کر دیکھے، مگر ہاں تو سد میری سد میری۔ سد میری سد میری !

شاید قربت، نگاہری صحن کو آگھوں سے لہجہ لگ کر رہی ہے اور محبت کو لوگوں کی گمراہیوں میں اندر رہی ہے۔ جیسے شعلہ کوئی قہر ہو سکی دھرتی پر گرے، یہ دور ان ٹھہرتا ہے دور کی دورانی چمک دکھاتا ہے، پھر دھرتی کے جتنے میں ڈوبے لگتا ہے، اور ڈھلی چاہتا ہے۔

”دیکھو، لگا۔ یہ کیٹ دے آف اظہا ہے۔ ہم لوگ اتنی ہاں کے قریب سے گزارے، دیکھ بھلا، مگر اس کی طرف ٹھہر کر دیکھ نہیں۔ یہ وہ دورانہ ہے جس کی راہ سے پھر نکلیں نے ہندوستان کی سرزمین پر اپنے قدم رکھے؟“ سد میر نے صرف کھڑکی توڑ بنانے کی غرض سے کہا۔

ہوا طوفان کا رشتی سارے میں سال نو کی آنگ ہی آنگ تھی۔ اب کمال کے ذہن کو نکلیں سے منجی پھر سکوں میرا سما تھا۔

”ہاں، میں جانتی ہوں۔ ایسے ہی ایک دروازے سے ایک اچھلی قوم نے میرے ہندوستان میں پہلی پہنچ کر رکھی تھی؟“

”مجھے نہیں پتا تھا کمال، میں تو ایک سیاح تھا۔ میں کیا جانتا تھا کہ میری دھرتی میں اتنی کشش ہے کہ مسافر فوٹ کر جاتی نہیں سکتا؟“

کمال نے جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نے نو دہ کے چراغ روشن کرنا شروع کر دیے تھے۔ وہ سامنے سمندر کے تاریک جتنے پر زور سے آتے ہوئے ایک جہاز کی جانب دیکھے جا رہی تھی۔ میں اپنی دلیز سے گی کھڑی تھی۔ سامنے سے کتنے جہاز آتے تھے اور گزر جاتے تھے۔ مجھے کسی نے بھی نہیں سمجھا، کسی نے کوئی آواز نہیں دی!

پھر جہاز گزر گئے۔ ہائے میری، اندر کی دنیا کو کوئی انتظار ضرور تھا، میں اپنی داخلی ماہر ہی باہر نکلتی بھرتی تھی۔ مگر اندر کسی کی بات جو تک رہا تھا۔ جب ہی میں نے نکلیں اٹھا کر دیکھا تو میرے میں ایک سلیطہ سلیطہ مستول نظر آیا۔

پھر میرے کانوں نے دور سے آتی ہوئی ایک آواز، سازن کی آواز سنی۔ جو مجھے کہیں کہیں سے ہی سنی، مگر مجھے برا لگی۔ پھر جہاز کنارے لگا اور کوئی اچھلی آواز اور اس نے بڑی آہستگی سے اپنے قدموں کی پہلی پہنچ کر رکھی، وہ چپ سے!

میری ساری دھرتی لرز اٹھی۔ میرے ہندوستان کے سارے باطن میں ایک کوخ سی مٹائی دی۔ میری شاعر پر جیسے ہونے لگے، یہ ہندوں نے پر قول لے۔ یہ تم تھے!

”میر، یہ تم تھیں؟“ قریب کے کچھ ہندو دونوں بیٹھ گئے۔ سامنے سے ایک دو گوں کا رچا، کچھ جوانمیاں گزر گئیں۔ پھر انہوں کی ایک لہٹ اس کے دھڑک رہی تھی، آئی دھڑک میری اٹھلیوں نے سہلے سے تپاں لوں سے چوم لیا۔

”میر، یہ تم تھیں! میں اپنا پرانہ لے جہاں تھاں مارا مارا پھرتا تھا۔ ٹھیک میرے گھر سے نکلے پر دوسرے مکان کے رہ چکے تھے گی تم ایک گلاب کھاتی رہیں اور میری چاہ کھایں کھیرے دیتی۔“

ذرا ٹھہر کر سد میر نے کمال کی طرف دیکھا۔ اور اس کے گلاب کو چوم لیا۔ ”پھر کیا ہوا جانتی ہو؟ پھر ان کیوں میں ایسے کرتم نے ایک دور ایک موتی رکھ دیا تھا جو سید میر سے تلوں میں جہاں اور میری آنکھوں میں خون بن کر اتر گیا۔“

”خون بن کر!“ کمال نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا کر آہستہ سے احتجاج کیا ”نہیں، میں نے کسی کے لیے کوئی کاغذ نہیں دیکھا تھا۔“

”تم میں اور مجھ میں کبھی فرق ہے نکلا۔ صورت کبھی اپنے سر کوئی اور اٹھ نہیں لینا چاہتی۔ خواہ وہ اسی سمت ہی چلا کیوں نہ ہو؟“

”نہیں نہیں، میں نے کوئی جرم کیا ہی نہیں۔ یہ مجھ سمجھاری ملا جھی تھی۔“

”اسی ملا جھی کی سیر میںوں پر قدم رکھتا، میں ایک دن تمہارے باغ میں پہنچ گیا اور تم کھڑی دیکھتی رہیں۔ اور وہاں سے نہ کبھی آنکھوں سے طرف نظر آدیا کیا۔“

کلپ دھڑکیا میرے ہنسنے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”میں بکڑے جاتے ہیں بھرم!“

کلا نے چمک کر کہا۔ ”بھولے!“ اور آہستہ سے مجھوں کی طرف گردن ہٹا لی۔

”بھرم نکلا، جاتی ہو کیا ہوا؟ برسوں سے میرے دہانے میں ایک تنگ لکڑی پڑی تھی، برقی رسیدہ، لیکن آنکھوں اور جھکڑوں کے صدمے سے برداشت کے ہوئے۔ میں نہیں جانتا تھا، یہ سوچی لکڑی کیوں ہے، کب سے ہے۔ میں نے جب بھی دیکھا وہ جڑی نہیں تھی۔ میں ڈرتا تھا، کہیں کسی آنکھ کی روشنی آ کر پلٹ ہی نہ جائے۔ بھروسہ تھا، یہ پلٹ ہی جائے تو بھتر۔ کیا فائدہ اس میں اب ہر پلٹ کیوں سے آئے گی! اس کی رگوں کا سارا لہو ناکا میوں کی جھک نے پلٹ لیا ہے۔ اس کی ہر پلٹ کے سارے چراغ سننے کی سرمرنے بجھا دیے تھے۔ اب تو وہاں بھی نہیں اٹھتا۔ پلٹ کر کھڑی جاتا تو اچھا ہے۔ ٹوٹ ہی جائے!“

”مگر جاتے کہ کون سے کوئی تھی میں سر اٹھاتا رہتا، میں کہتا رہتا، کوئی اٹھ کر میں گردن پلاتا رہتا۔ یہ کون تھا؟ میں نہیں جانتا۔ یہ کہاں چھپا بیٹھا رہتا، مجھے معلوم نہیں۔ اسے میں ایک نیا دن پھری زندگی میں آیا، اب میں تمہارے قریب تھا۔ اپنے دہانے کو چھپائے بیٹھا رہا۔ ہاتھ کرتا رہا ہاتھ ہٹا رہا۔“

”ان باتوں میں تمہاری آواز کی لہک تمہارے لہجے کی شمع میری اس شاخ سے جھڑکی!“

کلا اتنی خوبصورت سے سن رہی تھی، مگر بچوں کی طرح فحش پڑی۔ ”نہا! تمہیں شاعری بھی کرنی نہیں آتی؟“

”ہاں، کلا، شاعری کی زبان بھی اس جذبے کے اعتبار سے قاصر ہے۔ اتفاقاً کوئی بھی دو انگلیاں نصیب مجھ ہوئی ہیں جو اس جذبے کو گنت میں لے سکیں۔“

”اچھا، بھکر کیا ہوا؟“ اس نے گردن آڑی کر، چہرے کو گھٹنے پر دکھایا اور سدھیر کی طرف گلاٹ سے دیکھنے لگی۔ ”تمہاری شاخ اعلیٰ

اٹھی؟“

”نہیں تنگ اٹھی؟“

”تنگ اٹھی، جی نہیں۔ کیا مطلب؟“

”تنگ اٹھی، ہولے ہوئے جسے میرے جھک نے اور سلگا دیا۔ ذرا زار و مواصل پھیلا۔ میرے دہانے میں یہ خوشبو کیسی؟ میری شام نے پلٹ کر دیکھا اور سرشار ہو گئی۔ اسے یہ تو چمن کی تھک ہے!“

”آرزو کی شام وہب سنگتی ہے تو اس میں سے چمن کی کڑی گھنٹی ہے، جو دلوں کے صدموں سے خداؤں کو بیدار کرتی ہے۔ مہاتوں کو عرفان عطا کرتی ہے، کلا!“

”یہ دوسری اہنت تھی، جو تمہارے نازک خواہشات، مگر لڑنے والے ہاتھوں نے رکھی!“

کلا کے چرے کی ملکیت پر مغرب سے مشرق تک سکرامنٹ کی صبح جھلدا اٹھی۔ اس نے آہستہ سے لجا کر گردن جھکا لی۔ گویا اپنے اس جرم کے انکار میں کوئی اور جرم کرنا نہیں چاہتی۔

بہر صدا پا کر دنگیں۔ کلا گردن جھکا کے رہی۔ اس کی نگاہوں نے فرش میں ڈاب کر پاتال میں گم ہو جانا پایا۔ اور سو دھیرے دھیرے اپنے اس اور سرگیت چھوڑا۔

”بہر صدا ہی آداب میں چائے پی رہی تھی“ کلا نے بھی خوبصورت سے کہنا شروع کیا۔ ”کہ نہیں سے تم آگے۔ تم نے چائے مانگی۔ میں نے نہ کر دی۔ اور میری بھوتی بیوائی کو اٹھا لیا۔ مگر اس میں چائے کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ تم نے باجی سے بیانی بیو پر دیکھ دی۔

”اٹھو“ ”بھیرے لوں نے ایک لٹوا ادا کیا۔“ مگر سو دھیرے تم نے چائے کر پیا دیکھا جیسے میں نے تمہیں ایک دھات ہے۔ یہاں سے محروم کر دیا ہو۔ تم نے ایک بھڑکاسا لٹوا ادا کیا۔“ ”ٹھکڑا“ ”جو بہت بڑا رانا کا۔ بہر صدا میں ایک کیفیت میں چٹنے لگے۔

”چہ تیری اینٹ تھی“ ”سو دھیرے قطع کام کرتے ہوئے جلدی سے کہا“ ”جسے ہم دونوں کے ہاتھوں نے ایک ساتھ رکھا۔“

”نہیں نہیں، میں بھی نہیں“ ”بلکہ ہم دونوں“ ”کلا کی غمزدگی ہو کر تے ہوئے اس نے اسے اسٹار سے کہا کہ کلا کا سر ہر آپ سے آپ اقبال جرم میں جھک گیا۔

”نہیں کلا نے بہر گردن اٹھا لی۔“ ”مگر میں نے تو بھوکھی نہیں کہا۔ میں تو بھکی بھکی نہیں کرتی۔ میرا بندوستان تو بڑا خاصا سا ہے۔ بڑا امن اور اپنے حال میں مست رہنے والا۔ میری دھرتی بھی کسی کنیتوں میں پہنچاتی۔ تم ہی قزاق بھیرے سزا کو، لاؤ آ“

”میں تمہارے بندوستان میں کوئی قزاق بھیرے قزاق، کوئی ڈاکو نہیں آ یا، کلا اس فقیر ایک باجی، ایک پیار کا لٹوا گانے والا۔ صاف میرے کمرے پر ایک ملک کی گرد و غبار میں مانی مکمل تھی، ہاتھ میں مشکول تھا۔ دونوں پر محبت کا نثار تھا۔

”چٹکے سے تم نے چائے نہیں کہاں سے آ کر دم کے دم میں میرے مشکول میں ایک سکر ادا کیا۔ چھین لی ان حد کی ایک نثری آواز آئی، جیسے پورا چائے سود کے مشکول میں گر پڑے اور آہستہ آہستہ اس کی رخ میں فرق ہو جائے۔ نور ہی نور“ ”غلفی بٹھلی، انوار سے بدن کی ہی بٹھلی

کیفیت والی چائے میرے اندر کی تاریکی دنیا میں کھلے گی!“

”یافتہ میرے بھائی نے اپنے آپ کو بے سود مگر محسوس کیا۔“

”بہر صدا کی ملکیت کے چوب چنگ میں، اندر دنگ میں ایک حسین، پاکیزہ اور بڑا دلیر صبح جھلکائی۔ میری دھرتی کا دور دورہ چکا میرے بندوستان کے کونے کونے نے ایک مسئلہ مگر بٹھلی انگڑائی لی۔“ ”کلا بھی خوبصورت کے عالم میں، ایک نئے کی کیفیت میں جھوٹی، باجی کے سبز دار کی طرف اڑ رہی تھی۔ اس نے اپنے اچھل کو گردن کے گرد پھینکا۔ اپنے بازو غماصہ سے پتے پتے ہونٹوں کے سر پر زبان کا گھبراہٹ بھیرا، بہر دھیرے سے سکرا لئی۔

”اس دن تم بہت اُداس تھا، اس بھوئے کھوئے سے تھے۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر پچھا تم نے اُس رات کی سے جواب دیا۔“

”کیا گردن کلا اڑی بھڑاڑی، بڑی گھٹن محسوس ہوتی ہے!“

”یہاں نہیں“ ”تم نے جھکی سکرامنٹ سے جواب دیا۔“ ”مگر کلا میں یہاں دور دورہ تو آ نہیں سکیا۔ یعنی تمہارے پاس جودیت ہر سکتے تو

نہیں، رہ سکتا۔“

”ہاں! اور جس کے جواب میں تم خاموش ہو گئیں۔ تم نے میرا منہم کھلایا تھا۔ میں تم سے ایک لمحہ بھی الگ نہیں رہ سکتا اور تم خود میرے نظریے پر شک نہ رہنے لگی تھیں۔“

”نہیں نہیں، ایسا انہیں اپنے گھٹن تمہارا اندازہ ہے۔ میں نے اس وقت تک نہیں سوچا تھا“ کلا نے انکار کیا۔ عمر سعد جی انہری جب انہیں داس کی گردن آپ سے آپ ہلر جھک گئی۔

”بھراؤ دل آیا، جب تم اپنے گمراہوں کے ساتھ مسوری جا رہی تھیں۔“

”پتا نہیں، شاید دو مہینے کے لیے“ تمہارا جواب تھا۔ مجبور یوں میں ڈوبا ہوا۔

”میں بھی دو مہینے کے لیے کہیں چھ چاؤں گا؟“ میں نے ادا ہی سے جواب دیا۔ ”میرا بھی اس شہر میں کون ہے، کلا؟“

یہ سن کر تم نے پلٹ کر اپنی چار گھری، چشم کی بوند کی طرح پلپٹے میں آکر ہانے والی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ میں بہت مجبور ہوں سعد جی۔ تمہیں ساتھ لے جاؤں، مگر دلوں کو چھوڑ کر یہاں رہ نہیں سکتی اور وہاں مسوری کی شاہیں مجھے زندہ نہیں رہنے دیں گی! ”یہ کون سی بات تھی، ملو کہہ کے ہاتھوں نے رکھی تھی؟“ کلا نے ذرا راس کر ذرا مست ہو کر، ذرا طعنے پر چما۔

”ہانے کلا یہ کون سی بات تھی اور کہہ کے ہاتھوں نے رکھی تھی۔ میرے، تمہارے ہاتھوں میں بسنے والے لٹاکے غیر مرئی ہاتھوں نے ہمارا مسموم دماغوں پر پراخیں رکھی ہانے لگیں۔“ دواہریں، فصیلیں ڈھنسنے لگیں۔

بھرا ایک بار جب تم نے کورم نے اکٹھے چوک کر دیکھا تو عمارت چار ہو چکی تھی۔ محبت کی عظیم، رافخ اور سر بلند عمارت، جس میں ہمارے، میرے اور تمہارے بار کے چراغ روشن تھے۔

صرف ایک آخری اہندہ، کھلی ہاتی تھی !

جیسا تار سے تار سے میں شک کی طوفانی آگئی اور محبت کے سارے احوال میں زلزلہ کے جھٹکے محسوس ہونے لگے۔

گمراہ لے جان گئے کہ باتیں کرتے کرتے کلا کہاں کھو جاتی ہے کہ پٹنے پٹنے اس کے پاؤں راک سے کیوں جاتے ہیں، کہ پٹنے پٹنے اس کی ہڈی کے پھانسی اڈان کیوں بھول جاتے ہیں !

کہ پٹنے پٹنے، محبوب سا آدلی، مسوری کے پانی کی طرح بڑھتا بڑھتا لٹیر تک کیسے آ پہنچا، کہ جس کی لائینی آمد پر، دواہریں سرگوشیاں ہی کیوں کرتے لگی ہیں، اور وہ اسے سے آپ سے آپ کھٹے کیوں گتے ہیں !

بھریوں ہوا ایک دن جب ہم دونوں ہوشوں کے فحوت اور ہاتھوں کی قوس قزح کی دیا میں کھوے دایا سے بے خبر تھے، تمہاری ہاں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا !

بھرا وہاں سے بند کر دیتے تھے۔ تمہاری سانس پر ہر سے بیٹا دے گئے اور میرے سر پر تکی کوہریں بھولنے لگیں۔

”یہ دیکھیں دیکھیں کے راج کدہ ہیں، انہیں دیکھو“ کوڑھے ہمارا راج لے اپنی جوان، خواہ صورت، ہڈا کہ اندام پٹی کے کندھے پر محبت سے ہاتھ دکھا۔

ساتھ ساتھ محل سے ملحق، پہنچے بارش کے پتوں، سچے مسندوں اور کرہیوں پر بیٹھے ہوئے سجے ہائے راج کدہ، لوگوں پر سکرانت کی صبح

روشن کیے اور دلوں میں آرزوؤں کی جوت چکے اکتھار کی جھلکی بھجتی قدر دل روشن کیے بیٹھے تھے۔ شلوں پر بہاری کپڑاں، نس، رسی قمیص۔
ہوائیں طوٹھو کے پاؤں لے اٹھاتی پھر رسی قمیص۔ سارے میں ایک کلبیت ایک صحن بے بناؤ کھرا پن اٹھا۔

زور بھرت، جیتی، اٹلس، وکم خواب کے لباس۔ گلے میں سچے سوچوں کی بالا کالوں اور اٹھیلوں میں بچھڑاتے بھرے جواہرات۔ پھروں پر
دکار، جھکت اور سر باندی کا احساس۔ ایک سے ایک جوان ایک سے ایک خواہسورت و جیب، دل غریب، دلی کلن!
نوکھانے دیکھا اس کے ہاتھوں میں چڑی ہوئی اور لاک کے پھول افسردہ ہو گئے۔ اس کے دھاتی رنگ کے دو پنکے کی روشنی کو رومہ کے
ایک شرعہ جو گئے سے اڑ کر اس کی آگہ میں چھپے گی۔ اس نے کم خواب کے دھاتی دو پنکے کو بے پھیکا۔ اس کی سوچوں میں بھی آنکھوں سے پانی
چھلک آیا۔

اُس نے پلٹ کر مہراج کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر ہلاکی سمیچ کی، غصہ کا دھڑکا۔
"ہاں بیٹی! ابھی طرح دیکھو۔ ملک ملک کے راج کمار راج بان ہیں، جو کھارے پر گیا ہیں۔" پھر مہراج نے اپنی آواز میں باپ
کی شفقت پیدا کی۔ "اور ایک راجہ مہراجی آواز سے گویا ہوئے۔" یہی آواز سے راج کی ریت ہے، بیٹی جب جوان ہو جاتی ہے تو اس کے ہاتھ میں
ایک لاکھ دے دی جاتی ہے۔ یہ وہ لاکھ جاتی ہے۔ پھر اس کے سامنے اس کے پیچھے پنڈ ہوتے ہیں۔ جس کو وہ پسند کرے، اس کے گلے
میں "؟"

ہاؤک، خواہسورت اور کچھڑی سے پاؤں ہرن کے ہلنے کی نئی گرگانی کے گھونٹے میں ڈوب گئے۔ ہو لے ہو لے راج کمار کی نے
بڑیاں ملے کیں۔ سداں بھادوں ہی سمت دھار سے اس کے ہاتھ کی شاہا گل لگتی آگے بڑھی۔ سرشار ہوا کے لاہو کے اپنی رفتار بھول
گئے یہ ٹوٹا جا رہی ہے۔ یہ راج کمار کی کاظم ہے اور اسٹیل ہاؤ۔

آہن کی شاہوں پر کوہ پورہ لگوں کی روپکی قطاروں نے سی گئی۔ بچے دھرتی پر، بارگ کے اس کچ میں راج کمار کی ٹوٹا کا گیا ہے۔
پرندوں نے سمت سے سرشار ہو کر پلٹ پلٹ کر دیں دیکھنا شروع کیا کہ ان کے پرندہ کا حسن بھرنے لگا اور ان کی ترتیب کی لٹو لٹو لگی کہ
بچے دھرتی پر ٹوٹا کچھ ختم ہے!

راج کمار کی کے قدم سے جیسے اٹھتے گئے، فرش کے سبزوں کی گرد میں جھٹکتے گئیں۔ کچ میں کوئلیں آؤں گا بھولے گئیں۔ وہ جیسے جیسے آگے
بڑھتی گئی۔ راج کمار کی کی چٹانیاں جن آؤں ہوئی گئیں۔ لاکھوں ہزیمت کی آگ میں جھٹکتے گئیں۔ دلوں میں آرزوؤں کی شمع خاموش ہوتی گئی
مگر ٹوٹا کے پاؤں میں گھس گھسے۔ اس کے طوہوں کا راج کمار کی کا کڑا کہیں نہیں ٹوٹا کہیں وہ گیا بھرے راج !

پھر وہ بارگ کے بڑے سے ہاتھ دھار کے کوہ پر گہرا آگئی۔ جوتوں کے پاس۔ راج کمار کے جوتوں کے ڈھیر کے پاس راجہ سے لگا ایک
بھر کر بت تھا۔ کسی گردن اور چھوٹی چھوٹی نیوٹا آنکھوں والا جوان !

کسی نے آہستہ سے کہا۔ "راج کمار کی یہ ہمارا وہاں اور جوتوں کا رکھوا ہے۔"
ایک لاکھ سا لاکھ کے کھڑے سے چھوٹا گیا۔ احساس کی ردا کا نئی، دل کے گھول بھینے سے گلے۔ مگر بے اختیار ہو کر وہ چچ چڑی۔ بے
دم، بے سروت۔ بھرے بھرول محبوب، لاکھ کرا کے بڑھی اور بھرے اس کے بڑکت رت سے لپٹ گئی۔ اس کے ہاتھوں نے ہانے
کون سے ہڈ سے سرشار ہو کر وہ لاکھ اُس چھری صورتی کے گلے میں پہنا دی اور نچوٹ کے حال ہو کر بت سے لپٹ کر رونے لگی

تب ہی درختوں کے جھنڈ میں بھیجی ہوئی منگلی گھوڑی نے دھس کے امداد میں اپنے چاروں پاؤں پکے۔ اس کی ہلکی منگلی روتاہیں
 لہریں چڑھائیں گی کہ سوار چلے آئے یا تھا۔ بھاری مضبوط اور نڈر دھار پاؤں کی چاب نے دھرتی کے چپے میں ڈنگول کا جھکا پھیرا کر دیا۔ بھرور سوار
 چل کر زمین راج کاراوی کے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔

”میں یہاں ہوں ٹھوگ!“

”خوش منگلی۔“ ”تم؟“

”ہاں میں تم نے میرے گھسے میں بلا پر تائی ہے۔“ اس نے اپنا قوی بازو اس کے آگے بچھلادیا۔ ”اب تم میرے ساتھ ہو۔ دنیا کی
 کوئی حالت تمہیں مجھ سے جدا نہیں کر سکتی!“

لپک کر راج کمار نے اس خاموش ٹھوگ کو اپنی آنکھوں میں بھر لیا۔ ٹھوگ کا کٹنی لڑائی اور بے پناہ طاقت کے جھکڑ میں پھنس کر رہی:

”میرے میرے چہ پان۔“

”میرے چہ پان۔“

”میرے سدھیر۔“

سدھیر اس کی زندگی۔ سدھیر کی باتوں میں سکھام ہے۔ اس کی آنکھوں میں کتنی ذمہ داریاں کوٹھیں لیٹی رہتی ہیں۔ سدھیر اس کے
 خواہوں کا سدھیرا جس کی ہر سانس اس کی دھڑک میں آخری ہے اور شمع جلتی، بجلی جاتی ہے۔ ایک سایہ سا اس کے وجود پر مسلط رہتا ہے، جو
 آستی اور بستی کے سارے طرق ساری ادنیٰ مٹا دیتا ہے۔

کھانے کو نہ ملے اور اس کی پھیلتی پر ہاتھ پکیرتے ہوئے مسکرائی۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“

”اچھا۔“ ”سدھیر نے آسمان کی طرف دیکھے ہوئے کہا۔ اور پھر گھبرا گیا۔

”کہاؤ سدھیر! تم چہ پان دے ہو تو کتنا ہے چہ پان؟ تم بہت دور چلے گئے ہو۔“

”کلا۔ میں سوچ رہا ہوں، یہ میں سوچ رہا ہوں۔ یہ منگی، یہ شعل، یہ راکھ۔ یہ آستی کے سارے چھپن۔ یہ سب کچھ ہو جائیگا۔ سب مٹ
 جائیگا۔ غدا کی چہ پان میں تم ہو جائیگا۔ اس عالم امکان کے سارے اجنات۔ کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ آستی کا راج کمار بھڑک جائے گا۔“

کلا اٹھ کھڑی۔ ”یہ آج تم نے لی تو نہیں لی ہے سدھیر؟ یہ کبھی سڑی گئی غذا خلی لے بیٹھے یہ آج کبھی کھلی کھلی ہو جائیگی کہ تم آج
 کے انسان ہیں جو زندگی کو کھٹت کھٹتے ہیں اور اس سب کچھ کو ختم ہو جانے کا تو باقی کیا بچے گا؟“

”باقی کچھ کسے ہم! میں اور تم۔“ ”سدھیر کھٹکھٹا کر بھس چلا۔“ ”آستی!“ ”سدھیر نے اپنے چپے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ
 ہم آج!۔“ بھڑک کے چپے پر آج سارے ہاتھ رکھ دیا۔

وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے کلا کا سہارا لے کر آرام سے ٹکڑے کھایا اور وہاں کلا کے چہ پان پر غور کیا۔

”جذبہ! جذبہ! کلا صرف ایک جذبہ! جو لپک کر بڑے دھمکانا غداؤں میں بڑھتا ہے۔ جذبہ! بھوکھٹ کے اسے قتل کرتا ہے۔ بھردلوں
 کی کراہیک ہو جاتے ہیں۔ جیسے جوت کر دھرتی کی اور کرتا ہے اور دھرتی جو دھمکانا غداؤں سے اپنی کھوکھلی میں دھونچ لیتی ہے۔ جیسے میں یہ تھکانا

"کہتے ہیں، ابھی دو سو سو گز مقررہ دورے کی زنجیر چٹختی کھائیں تھی، تھموں کی چاب نے دم بھی نہیں لیا تھا کہ پرم آسمان سے آگیا۔
اب تم جاؤ۔ بہت دیر ہوگئی تھیں پانچ صدیاں گزر گئیں۔ اب بندہ ابھی آگیا۔"
"اس نے دیکھا، نیچے نچر ابھی تک دل ہی تھی، ہوا ابھی گر مقررہ دورے کے کلوں پر مٹی خیر سگراہت بھر گئی۔ یہاں یہ عالم ہے اور
وہاں میں صدیاں گزر آئی۔ ان صدیوں کے دو مہمان جب آقا پرم آسمان سے مل رہی تھی، جانے خدا نے کتنی بار اپنے نام لے کر پکارا ہو۔ جانے
بندے نے کتنی بار اپنے آپ کو آواز دی ہو مگر کہیں کوئی جواب نہ آیا، کوئی جواب نہ دے۔ ایک دوسرے کو صرف اپنا نام، بارگشت میں سنا کی دیتا۔
اور یہ کہ نہیں، کچھ بھی نہیں ۱

"اس گزری، وقت چلنے چلنے رک جاتا ہے۔ آگے ۱۱۱ وقت آگے کی طرف، پیچھے سے آنے والے سے پیچھے کی جانب، خاموشی،
لوہاں پر الگیاں رکھے، انھیں مت چھیڑو، انھیں مت چھیڑو ۶"
نارمل کے چہرے میں ہوا سر راہی تو کھانے دیکھا کہ وقت تو بہت گزر گیا ہے۔ اور چاروں افراد اب حیرانہ پڑا ہے۔ جس میں آس پاس
کی دو دنیاں مسکرا رہی ہیں، انھیں مت چھیڑو، انھیں مت چھیڑو
"بھلا صبر بہت دیر ہوگئی، آج کسی اچھے سے ہوئی، میں بہت اچھا سا کھانا کھائیں گے!"
"بہت اچھی ہی کھا کے بہت اچھے اچھے اور انوں کو بھرا دے!"

ساتھ ساتھ سمندر کے پار ایک چنے پر دات کا سناٹا چڑھ رہا تھا۔ خاموشی سے مٹی کے چاروں کھونٹ اپنے نیچے صوب کر رہے تھے۔ ہا ہر
سمندر رینگنے کے کمرے سے آہستہ آہستہ کمر میں بدل رہا تھا۔ سارے عالم پر فینڈ بھی جاری تھی۔ مگر شاقی اس ہوئی کے ایک کمرے میں جسم
اب بچہ اور ہو رہے تھے۔ آہستہ آہستہ کمر پرانی شراب کے لٹکے کی طرح، کمزری سے جھوم جھوم کر ہوا نہیں آ رہی تھی اور کھا کے فلک، سیاہ لے
پاؤں کی ساری خوشبوؤں کو کھیرے دے رہی تھیں۔ ایک بھلی رہتی چاروں میں کھا کر مٹی جسم ہوئے ہوئے کھولے گا تھا۔ اور سدھیر کی لمبی
موٹی انگلیوں میں لمبی کی ہوس چاٹنے لگی تھی

پھر دھاتا سدھیر نے ایک جھٹکے سے اس رہتی چاروں کو کھٹکایا۔ جس نے منس کے ایک جہاں کو چھپا رکھا تھا۔ نور کا ایک سمندر تھا، دھاتا چاروں
کھلی کی روشنی میں تھا، ہوا چاندی کا دن، برف سے ڈھکے ہوئے بچاؤ کی طرح چکا اور سدھیر کے ساتھ مل بیٹھ کر گورن کر گیا۔ جب کھانے اپنے
دونوں جہاں کو نظر نمودار ہوا تو وہیں میں چھپانے کی کوشش کی اور کھل کھلا آٹھی۔ سدھیر نے کمری نظروں سے دیکھا اور سرشار ہو گیا۔
"کھا!" سدھیر اس کے سداہل بازوؤں پر اچھی بھرتے ہوئے پیڑی مشکل سے ہوا "کھا" "اس کی آواز کو ایک جھگڑنے
راستہ ہی میں روک لیا۔

"ہاں!" کھا، مٹی کی سر زمین سے پاؤں اٹھا کھلی تھی۔
"کھاتی ہو، سوگ کسے کہتے ہیں؟" سدھیر کی انگلیاں چپ سا دھسے کمری ہو تیار، شاقی کی طرح اس کے جسم کو چھپ رہی تھیں۔
کھانے کو جب چاہیں، یا اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ جانے کون سی کو وہ اسے پکار رہی تھی۔ جانے اس کے سمندر پر کسی غوطہ
نور کا سایہ چڑھا تھا!
"کہتے ہیں، سوگ کا سوگ ہی اصل سوگ ہے۔ ۱۰" اس نے ٹہم ٹہم کی طرح دھپتے ہوئے لب کالی ناف پر رکھ

دیے "جسم کی جنتھ"

کلاڈاپ گئی۔ جانے کن باتوں نے اسے اٹھا کر فضا میں اچھال دیا۔ جہاں وہ گلاب کی تہوں کی طرح ٹھہر گئی۔ اس کے ہونٹ کاٹھے،
قرقرانے، دیوی مشکل سے اس نے مرقع آواز میں کہا۔ "مدیر میں سراجاں کی؟"

اس کے دونوں ہاتھ آپ سے آپ شانوں سے اٹک ہو گئے۔ بھر سب، کچھ چائیں کہاں کم ہو گیا۔ یہ شرم دیا، یہ شرم ورم۔ ساری
دوئی مٹ گئی۔ نکالنے اپنے دونوں جہاں اس کے آگے پھیلا دیے، گویا کھدی ہو یا یہ سب تمھارے ہیں۔ !

مدیر نے ایک مست فکر سے اس بھول سے جان کو دیکھا اور اپنا چہرہ گلاب کی دونوں دنیاؤں کے چھان چھان کر دیا۔
برشنے کیا ہے؟ جو گرفت میں آ جاتی ہے وہ اپنا جمال کو ختم کرتی ہے

برشنے کیا ہے؟ کچھ پھٹکی پھٹکی، کچھ پھٹکی پھٹکی۔ ہر جمال ذرا سی بد صورتی لیے بھرتا ہے۔ جب دور رہتا ہے تو جمال ہی جمال ہے،
صحن ہی صحن ہے۔ جب گرفت میں آ جاتا ہے، ایک دم سے قریب آ جاتا ہے، بد صورتی کی انگی سی تہہ چھپانے نہیں چھٹتی۔ لاکھ بارہ ملو، سر ملی
لیٹو، کہیں نہ کہیں سے کسی نہ کسی چہرہ روزہ سے بھاگ ہی گئی ہے۔ نکالنے سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے دور تک پھٹکی ہوئی کروٹیں لیتی ہوئی
سج کو دیکھا۔ جب ہی مدیر کبھی کبھی ایک بے اختیار ہنرے کے قہقہہ کہتا ہے کہ میں پھٹکی پھٹکی ہی، پھٹکی پھٹکی ہی دیکھتی ہوں۔ یہ اسرار کی جو
زندگی کے لہجہ تے ہوئے پھولوں کی کوٹ میں، چھپ کر رہتی ہے، کہاں سے آئی ہے؟

کلا اپنے دونوں بازوؤں پر زور دے کر کڑکی پر جھک گئی۔ شاید یہی حقیقت ہے۔ عالم کی ہر شے باکمل ہے۔ ایک کی، جو سچی کو باکمل
ختم ہونے دیتی، شاید اس کے اثبات کا اٹھارہا سی میں ہے۔ ایک غفلت، آ سو دیکھیں کی بہتات میں پھٹکی ہی نا آ سو دیکھیں، جیسے یہ سچ سمندر یہ
پانڈا کلا ٹھہر، جس کی کہیں پیاسے ہندوں کی طرح چھٹ چھٹ سے اٹھتی ہیں اور ایسے ہی پیاسی ہوتی، ماحول سے نگر کر ٹھہر جاتی ہیں۔ !

گھٹائیں لاکھ اٹھتی ہیں، بادلوں کے جھنڈے جھنڈے اٹھتے ہیں۔ سیاہ گہرے گہرے بادل رتے ہیں، اور رتے ہیں، انکا تار رتے رتے
ہیں۔ سمندر کے پیاسے جسم پر ہندوئی اختلاف کے فٹے کھیرتی رہتی ہیں۔ ہر طرف وصال کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ ہوا میں ہوتی ہیں۔
فضاؤں کی سانس میں تھکر چھل جاتا ہے۔ سمندر کا وجود جھپٹتا رہتا ہے مگر پیاسے کھڑے راہے ہندوئی دیکھیں، انکے نہ کہیں سے چمک اٹھتی ہے۔

گالے اپنے پھیل کے سب تازی کو اچھ لگائی۔ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ وہ کہاں پھٹتی گئی اس کا لا شعور بڑا چٹل خود ہے۔ مگر گمراہ
کیوں ایسا سوچنے پر مجبور ہے کہ جو کچھ مدیر دیتا ہے، اس سے اس کی ہوتی نہیں گھرتی۔ ذرا سی بھی مگر خالی رہ جاتی ہے۔ کاش وہ اپنی بے اختیار
دست میں سے کبھی اٹھ کر کودے دیتا جس سے اس کا چارہ بھر جاتا۔ بھر کے اٹھ جاتا۔ لیکن بھر گئی اس کی کے ہا وصف مدیر اسے بہت بڑا لگتا
ہے۔ ایسا جہاں لو اٹھو سب سے دیکھ کر اس کا سمندر کروٹیں لینا بھول جاتا ہے۔ ابھر کالے سوچا، یہ معمولی فعل و صورت کا آدمی، یہ یاد دہار سا
بھابھا انسان، وہ کیوں اتنا جاہ کوڑنے کی حد تک اچھا لگتا ہے۔ جو اس کا دامن بھی نہیں بھر سکتا؟

شاید یہ پھیل کی ہوں ہے۔ شاید آج مدیر اسے لہال کر دے گا۔ شاید آج۔ جو سیاہ بدینت بادلوں کو دیکھ کر سمندر کے سینے کو
خوشیوں سے گھروتی ہے۔ پھیل کی ہوں جو انسان کی خواہشوں کا راج کر رہے، جو کبھی نہیں ملتا۔ خواہوں میں رہتا رہتا ہے اور وہی ایک نہ ایک
دن کو جاتا ہے۔ ابھر کلا چمک کر ٹھہر گئی۔ کیا کوئی جاتا ہے؟ کبھی نہیں ملتا۔ وضو نے سے کبھی نہیں ملتا؟

گمراہ اٹھتی ہے کہیں کس ہو جاتی ہے؟ کالے بھر سوچا، جو انسان کے مقدر میں نہیں ہے وہ نہ لے۔ ایسا اضطراب کیوں؟ یہ تھپ

یہ سب قرار دی شاید یہ تخیل کی بات نہیں، شاید یہ بات کی تخیل کا بند ہے جو اسے اتنا چاہنے والے محبوب کی آغوش میں بھی دم نہیں لینے دیتا، جو وصال کے وقت بھی کبھی چہرہ کر گزور پاتا ہے!

”مگر“ کا ٹھہر کر۔ ”کیا یہ کسی سوجھ بوجھ کی محسوس ہوتی ہے؟ اس نے کبھی اس کی طرف بھاٹک کر دیکھا تو نہیں۔ شاید اس کے گلے بارے پر خدا کو بھی وہ شائبہ نہیں ملی ہو جو اس کا بدن سمجھا لے، جو تھکے نہیں۔ کبھی اس نے پوچھا تو نہیں۔ کبھی جاننے کی ضرورت تو نہیں محسوس کی

”یہ کیاں کہوں ہے؟“

ساتنے سب قرار سوجھ بوجھ کی پہلوئیں پڑیں۔ پھر اس کے وجود کو نکھر کر رکھ دیا۔ کلا کے لبوں پر ایک عجیب مسکراہٹ نکلی۔ سوجھ بوجھ کا کی زندگی کی طرح خود فرض ہو گیا ہے۔ اسے کبھی دکھا رہا ہے۔ اس کی ہستی پر چھاپا ہوا ہے گراؤ سان رہی رہی کر تک جاتا ہے، جب بھی اس کی آواز کی دھڑکی نہیں سمجھتی۔ ایک نام نہاد ہی تجو، ایک فضول سی خواہش اسے بھی شہ پاتی رہتی ہے۔ اس کے چین سے سوجھ کو کتا گرا رہا ہے، دکھنا انوت سہندہ ۱

یا خود اس کی زندگی کبھی سادہ رک ہو گئی ہے۔ کوئی غلط خبر کتا گرا اترتا ہے۔ اس کے پاؤں کے سارے پیپ ہونگے، موتی کو ہونو رہا، سہندہ نہارنا نہیں لگتا۔ مگر پھر بھی کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ کوئی موتی کسی بھاری پتھر کے پیچھے دبا، وصال کے لمبے عرصہ دبا جاتا ہے۔ کبھی ایک مولا جھوٹ جاتا ہے۔ سوجھ بوجھ کے سارے لمبے، سوجھ بوجھ کے سارے پیپ تو سہ قرار رہتا ہے سوجھ بوجھ شاید شاید تمہارا لمبے انوت کے

کلا کے ٹھہر کر، سنجھل کر ایک ادا سوزان ہو کر سو پیا، بھرا پیپ تو سہ قرار رہتا ہے سوجھ بوجھ شاید شاید تمہارا لمبے انوت کے اس موتی کو ہونو نہیں پاتا جا، لکھ لکھ رہا ہے، سوجھ بوجھ کے سارے پیپ سہندہ ہے ۱

چھ دنوں کی سہندہ، کلا سحرانی تاکہ وہ گاہوں کی عجیب سزا ۱
ہر سہندہ طوفان کے چاند کو چھ دنوں کے لیے رہا ہو لگی رہتا ہے۔ طوفان گہنا ہاتی ہے۔ یہ عجیب دستور ہے طہرت کا۔
اس نے کھڑکی پر کنبوں کا بوجھ دے کر سوجھ کی طرف دیکھا جس کا جوار بھی کئی دنوں بعد ختم ہو چکا تھا۔ وہ شائبہ تھا۔ ایسے ہی جیسے آج صبح کے سہ شائبہ تھی۔ اس کا چاندرا ہو کے کٹے ہوئے گلے سے لچھا آ رہا تھا۔ اپنے آپ کو مٹاتی سے جھاتے ہوئے۔

آج سب کچھ صاف تھا، اندر، باہر، تھا، تھری تھری تھی۔ ہوا مٹی دھلائی سی بہہ رہی تھی۔ کلا نے آسمان کی سمت نگاہیں کیں۔ وہ بھی صاف تھا۔ اس نے آنکھوں کے سامنے پھیلے ہوئے لکھو، وہ سب کراں سوجھ کو بھی دیکھا، وہ بھی سہ قرار تھا۔ آسمان کے سوجھ میں کوئی جوار تھا، کوئی طوفان، کوئی چھوٹی سی کشتی کا پلہ پلہ اترتا رہا، وہ سوجھ کے آسمان میں کوئی بادل، کلا، سفید، گہنا بادل، وہاں تھا۔
لگتا تھا سوجھ نے ہاتھ بڑھا کر آسمان کے چہرے کی خاک پر لگی تھی!

کلا کے سارے سپاہیوں کا سوجھ اس کے شانوں پر جھٹک آیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سہ قرار، اس کے عجیب سوجھ کی طرف رہے قرار بادلوں کو اپنے شانوں پر پھینک دیا اور ہونے سے مسکرائی۔

”آج آج سوجھ کو مارا دلوں گی!“

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا، دور بہت دور، جہاں سوجھ اور آسمان گلے لگے رہے تھے، وہاں آگ لگی ہوئی تھی جو ہونے ہونے لگی رہی

قصی کا کھوی گا۔ گویا نظر تھا۔ دیکھ رہے دیکھ رہے، جیسے اچھوٹے اچھوٹے انہوں کی طرح آسمان اور سمندر کے پھلے جھج والی لالی، گہری خوش گوشت اور
 ہوتی جا رہی تھی لہو واپ غذا اور بیش سارا سمندر دلالی ہو رہا تھا۔ دیکھتا ہوا۔ جیسے سمندر نہ ہو شراب سے چھٹکا ہوا پتال ہو۔

دوستی ہو گئی۔ اپنے آپ کو میرے دو میرے تم ہوتے اس نے دیکھا مگر کہاں ٹھوکی۔ اس کا اسے پتا ہی نہیں

چپ ہی کسی نے اس کے گھرے گھرے کندھے پر آہٹ سے ہاتھ رکھ دیا۔ دلفریاد و چرخگی۔ اس نے چاہت کر بڑے اعتماد سے دیکھا۔

44

Keywords: child sexual abuse; disclosure; self-blame

مکرکھ نے کئی جواب دیے۔ وہ کہتا تھا کہ نہیں۔

اس نے محبت سے اپنے چہرہ محبت سے سدھیر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ سانولے سانولے اس کے چہرے پر بھی شغف کی آگ لپاں بکھری

بھگوان نے سدھ کے ہاتھوں کو دیکھا اور ابھی بالکل تھے۔ سلیو کپڑوں میں گرا آگ گئی ہوئی تھی۔

لیکن اس نے کمر نہیں اٹکے یہ وہی کوڑا کچلا ہوا ہے کہ، چلے کوڑا چاروں کو سب کی سب لالہ مرخ ہو رہی تھیں۔ ہماری دو خواہشات

عالم الیٰ الٰہی والہذا کا منکرانی۔ پھر اس کی آنکھیں بند ہونے کے چرے پر تک نہیں۔

"میں نے کہا کہ یہ کچھ ہی تھیں؟" سو میرے دیر سے کہا۔

”ملائی“ کا معنی مسکرا کر لگا دینا ہے اس کی طرف دیکھا۔ پھر شفق کی جانب دیکھا، پھر سمندر کو دیکھا، پھر بانوسار سے عالم کو دیکھتے

ہوئے اس کی خواہشات آئیں ہر سو میر کے چرے پر تک نہیں اور وہ دریا بھی ہو کہ وہ میر سے بے خودی کے عالم میں عسکری پر اس کے

"ہی۔ لائی میرے دل کی۔"

اس نے شفیق کو بلارو دیکھا اور سارے عالم پر غصے کی لہر اٹھ اٹھی۔ اس نے ہلکی آواز میں کہا: "میں نے کچھ نہیں دیکھا۔"

بھروسہ دلوں پر تھا کہ وہ ان کے انداز میں کھول دیں اور پچھت کر سہو میر کو اپنی آغوش میں بھر لیں۔ مگر ان کی دیکھن میں تھی۔

اس کی تلافی کا واحد راستہ ہی میں بھٹک گئی تو سدا میرے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے وجود کو لپیٹنے ہوئے جذبات کے عالم میں۔

سرگرمیوں کے علاوہ اس نے کہا "کہ میں بھی ہو چکی لال" "اور میرے سے اس کے سونپوں پر اپنے ہونٹ دھونڈے جسے سرخ آسمان سرخ

—اس کی طرف اشارہ ہے۔

اسی کاغذ پر دوسرا عالم کے کئی کئی عرصہ نکال آؤں گا۔ اچھا جیسے مجھے پتہ چلتا ہے اسی کے وجود سے کچھ ہر کھل کر ہونی چاہی ہو۔

اور اس بعد جب کاکے پاؤں اکٹرنے لگے تو چھڑی سے الگ ہو گئی۔

"ہمارے آج میری سیدہ فاطمہ ہوں، چلو کہیں گھر آئیں۔"

”کھاؤ، سناؤ، پی سناؤ، میں تم بہت اچھی لکھ رہی ہوں۔“

کلا متکرا چلی۔ اس نے ایک بار اپنے آپ کا ہاتھ لایا اور اپنے بدنِ نخی آٹھلی کو گروہ کے گرد بچھتے ہوئے کہا اس کے قطع پر یس مئی اور

جب ہی سرستی کے عالم میں لپٹی ہوئی ہاتھ اس کے قریب آ کر کھل نکلا دی۔

”کیسی لگتی ہوں؟“ اس نے بڑے پیار سے سوال کیا جیسے اگر سدھیر کا جواب صحیح ہو تو انعام میں وہ ہانے آئے کیا دے بیٹھے گی۔
مگر سدھیر کے جواب دینے سے پہلے اس نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ پاس رکھ دیں۔

”میں جانتی ہوں تم کیا یارو گے؟“

”کیا؟“

”ابھرا، جیسے دھنک، جیسے مروا۔“

”نہیں! جیسے کلا جیسے کلاس کی کوئی نظم جیسے بردا میں کوئی ہوئی باسری کی لے جیسے کمال میں نہایا ہوا تاج جیسے خود کم جس کی کوئی مثال نہیں۔“

”میں سدھیر! اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے تصور میں کمال میں نہایا ہوا تاج گل تھا۔ اس کی کھپنا میں کوئی کا تھی جیسے خود اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا، نہیں جانا تھا، نہیں چرنا تھا۔

سدھیر اس کے پہلو میں لیٹ گیا اور اس کے لیے ٹنگ سیاہ بالوں میں ہاتھ بھرنے لگا۔ کلا کی آنکھیں بند ہیں۔ اس کے کانوں میں ٹیکوڑنی آواز آتی۔

”اور یہ تمہارے بال کلا!“

”تم کو کے دھنگی ہوئی رات!“

”نہیں! جیسے رات میں بیگا ہوا جنگل، جیسے کسی بے گناہ کی طویل سزا۔ جیسے جہان کی کاؤ خیال ہو گئی کبھی میرے احسانات کو گھیرے رہتا ہے؟“

کلا چونک کے اٹھ گئی۔ ”یہ تم نے کیا کہہ دیا؟ تم سے کون مجھے الگ کر سکتا ہے؟“

”والت! احسن کے بے شمار چہرے ہیں۔ ان گنت ہاتھ ہیں۔ میرا دل کہیں چار کیے رات میں ایک جاتا ہے، جب میں سوچتا ہوں کہ تم کل میرے پاس نہ ہو گی!“

کلا نے گہری نگاہوں سے اس کی چاہ دیکھتے ہوئے گہری آنکھ کر کہا۔ ”میرا اگر میں آج تمہاری آغوش میں مر جاؤں؟“

سدھیر نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ پاس رکھ دیں۔ ”مجھے یہ سننے سے کہا لگی۔“ مگر مجھے یہ پسند ہے۔ میری خود غرض محبت کو یہ گوارا ہے؟“

کلا کہا ہی ہو گئی۔ اس پر کئی دھوکے کا نشہ چھا گیا۔ اس نے رُپ کر لپٹ ہان لیا نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”محبت خود غرض نہ ہو تو مکمل لگی نہیں ہوتی؟“ اس نے اپنے لیے بالوں کو سر سے پرے کھینچتے ہوئے کہا ”میرا لگی کبھی ہی چاہتا ہے

سدھیر، تمہیں اپنی آغوش میں اتنی زور سے سمجھوں، اتنی زور سے کہ تمہارا دم نکل جائے۔ وہیں میرے بازوؤں میں تم مر جاؤ۔ اور وہیں اپنی آغوش میں تمہیں ہمیشہ ہمیش کے لیے دفن کروں۔ تاکہ کوئی تمہاری جلی کو کبھی نہ دیکھ سے نہ سمجھ سکے۔“

سدھیر نے بے حال سا ہوا کر اس کو اپنی گود میں بھر لیا۔ کلا بے قرار لے گزرتے۔ ڈولنے کے کتنے جھٹکے آئے۔ بھر دیا اور اٹھ بھری۔

سدھیر کی بے قرار ہاتھ اس کی پشت پر بھرتی بھرتی بلاؤں کی شبنم پر دک کر چمٹے تھیں۔ بھر دیا کی ذرا میں ایک شبنم نکل گئی۔

”میرے یہاں!“ کانٹے آہستہ سے شامل کیا۔

”ہاں!“ دوسری طرف بھی کھل گئی۔ ”یہاں، اسی وقت!“

”مگر لوگ آ جا رہے ہیں اور ابھی اچھا!“ مگر کھڑکے پاؤں بھی آنکڑ پکے تھے۔

”مجھے پروا“ سدھیر کی آواز کھرکئی۔ اس کی انگلیاں تیسری طرف بھی کھول چکی تھیں۔ پھر جب دروازہ بعد کھڑکے شانے پر اس کے دونوں ہاتھوں نے جلاؤ کو الگ الگ حمام لیے تو خود کھڑکے اب تک جھجک رہی تھی، ایک کیفیت میں اس کی آغوش سے ذرا پیچھے ہو گئی۔ اور جلاؤ سارا کا سارا سدھیر کے ہاتھوں میں آ گیا۔ ساڑی کا پانچا گر گیا تھا۔ سپردگی نے ساری شرم ستادی تھی۔ کھڑکی آنکھیں بند تھیں۔

سدھیر نے دیکھا، ابھی سورج ٹھیک سے ڈھ بانگی نہیں تھا۔ فضا میں روشنی تھی۔ کھڑکے کا اوپر کی جسم پر پھیر کی تید سے بھی آواز تھا اور کھڑکے دو دھار تک جڑو چنے سورج کی لالی سے گھٹا ہو رہا تھا۔ اس نے لپک کر کھڑکے کی آغوش میں چھپا لیا۔ سامنے ایک بڑا جھوس آؤلی اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کھڑکے کا ہن میں کہا۔ ”کوئی آدمی دیکھ رہا ہے!“

”دیکھنے دوا“ کانٹے کے پاؤں بخشتی سے بھی پرے جا رہے تھے۔

ساری فضا شرابی ہو گئی۔ سانچہ سولا گئی۔ آہستہ سے سر کے کان کے ہاتھوں سے نیچے کھاس کے فرش پر یوں پھیل گئی جیسے موجوں کی لڑی گر پڑی ہو۔ بے حالی کی کھڑکیاں انھیں بند کیے طراق کی مدھمکری رہائی کی طرح ہانپنے لگی۔

زمانہ پل بھر کھڑکے پر ایسا پھر سمت دکھائے آ کے پڑ گیا۔

ایک وسیع مہاروں سے اُسے ہونے آسمان کی طرح۔ سدھیر نے کانٹے کے مغرب و مشرق کو یوں طالع لیا کہ راستی اور بھشتی دونوں کراہ کر دو گئیں!

کتاب کے پٹہ پر ماحول اور بھشتی شام سے نکل کر جب وہ انھیں روتا کی طرف مڑے۔ جب بھی دونوں خاموش تھے۔ خاموشی سے دونوں کے قدم ٹپتہ پاؤں پر یوں جا رہے تھے، جیسے پلٹے پلٹے کبھی، کسی وقت تک بھی نہ گئے ہیں۔ ہاتھوں کے پٹہ، آوازوں سے سر پہوڑے انھیں کے دیرانے میں پیچھے اونگھ رہے تھے۔ وہ گزر خاموش تھی۔ دھول اڑ رہی تھی۔ دھڑکھڑکھ رہے تھے۔ گویا ابھی بارش ہوئی ہو۔ ساری دھول پڑ گئی ہو۔ ساری فضا صاف ہو کر کبھی کبھی کوئی سودھی تک کا سمجھ کا اٹھ جاتا۔ جب پلٹے پلٹے کھڑکے میں اسے ایسا دیکھ لیتی کہ خود سدھیر اسے دیکھتے ہوئے دیکھ نہ لے۔ پھر بہت دیر ہو گئی تو کوئی پٹہ پڑا ہوا۔

”اس دن ماں کی طبیعت بہت طراب تھی!“ کانٹے لگا ہیں نیچے کیے آہستہ سے کہا۔ ”جانے اب کبھی ہوا!“

پہلو سے ایک چیز دفنہ طور خصوصیت بھر زین سے نکل گئی۔ دونوں نے دیکھا، ایک دھمالی رنگ کا پٹہ کھڑکی سے گھرا رہا تھا۔ قریب سے ایک بد صورت مرد اور عورت اور زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

وہ خاموشی سے بدستور پلٹے رہے۔ اس پاس کے شور سے اب تک تھکے دونوں بھاگتا ہے

پان کی ایک چھوٹی سی دکان کے سامنے دونوں کے پاؤں رک گئے۔ سدھیر نے اور کانٹے، دونوں نے، یکبارگی آگے میں ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک عجیب سا جھٹکا رنگ دونوں کے چہروں پر کھر گیا، پھر دونوں مسکرا پڑے، پھر جانے کیوں کیسے اور دونوں غصے پڑے۔

اپنا دالے نے اور کھانکھان کر کہا۔ ”جی ہاں جی!“

”وہ پان۔“

”بھرے لیے ذرہ اور ان کے لیے طے سالے والا۔“

بھردوں میں چلے پڑے۔ وہی خاموشی گوارا سی۔ چپ۔ آس پاس کے شور و غل سے الگ تھک وہ دونوں اپنی اپنی دنیاؤں میں کھوئے کھوئے جانے لگے اور صفحہ سے رہے۔

”اصحٰق تے اصحٰق تے کھوہانا خاقا“ کانے جانے سدھیرے کہا کیا ہے آپ سے پوچھا۔ ”کھوئے کھوئے کسی چیز کو اصحٰق تے نہیں دیکھا تھا؟“ بھردہ ٹھٹھکا کر غصہ چڑی۔

”کیون کی چیز تم اصحٰق رہی ہو؟“ سدھیرے اس کی ہنسی کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ دلتا وہ چرک چر۔

”میں نہیں تم اصحٰق رہے ہو!“ کانے اطمینان سے جواب دیا۔

”یا تم اصحٰق رہی ہو؟“ سدھیر کو اس کا اطمینان بے جا نہ گزرا اور کھانکھانکھان کر دیا۔

”ہم دونوں؟“ کانے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ ”وہ چیز مل جانے تو وہ تو ہے کی تو ہے اٹلیں شاید ایک دن میں مضبوط جک مضبوط تر ہو جائیں!“

”کون سی چیز؟ کون سی چیز تم مجھ میں اصحٰق رہی ہو جو تمہیں نہیں ملتی؟“ سدھیر نے پہلی بار قد سے ناگوار سی کہا۔ اس کی خبریں پر کئی مل چکے۔

”وہی جو تم مجھ میں اصحٰق تے رہے ہو!“ کانے کمال حیلہ اور صاف گوئی سے کہا۔ ”اور تمہیں بھی نہیں ملتی!“

سدھیرے نے اسے آگیا۔ حقیقت ایک ذرا بچے ہونے نکرے کی طرح اس کے سامنے پڑی تھی۔ اس کے لب ہلکا ہلکا، ہر قسم سے اس نے ہمدی سے جیب سے ٹکریٹ نکال کر سٹاپا اور سارا صوفی نکال کے پورے پر بیٹھ کر غصہ چڑا۔ بڑی جیب سی کھپائی ہنسی، بڑی ٹکریٹ خردہ سی ہنسی، ہمدی ہوتی ہنسی۔

”کلیات ہے؟“ کھانکی انگلیوں میں ابھی تک وہ تیز چاقو تھا جس کی دھار پر خود اس کا لبو چمک رہا تھا۔ اب اسی چاقو سے وہ سدھیر کو قتل کرنا چاہتی تھی۔

مگر سدھیر نے وہ تیز دھار والے چاقو کو مڑ کر چپکے سے کھانکی جیب میں ڈال دیا۔

”تم پہلی ہو! میں کیا اصحٰق ہوں گا۔“ ہر کھانکھان رہا ہے وہ ہماری دونوں میٹوں میں نہیں سارا ہے۔ مجھے تو اپنے ہاتھوں سے لگ ہے جو تمہاری دولت کو سمیٹ لٹک پار ہے ہیں!“

کانے تو راضی پلٹ کر اس کے چہرے کو دیکھا۔ کچھ پڑھنا چاہا۔ اس کا سدھیر دیر سے غلیظیوں کی زد میں تھا دلتا ثابت ہو گیا۔ مگر لبر بعد ہمارا ایک صبح سی اٹھی۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ ”محبت کرنا اور کرتے رہنا کتنا ٹھن کام ہے۔ کوئی میرے دل سے پوچھے۔ کوئی سدھیر کے دل سے پوچھے؟“

کاج کھتی ہے۔ کتنی مشکل کام ہے۔ محبت کرتے رہنا، نہانے رہنا، چلنے رہنا، بھر سکرنا، رہنا۔ ایک مسئلہ سرٹ۔ ایک مسئلہ
 ایت۔ یہ دونوں جذبے ایسے ایسے ہیں جن میں خلط ملط رہتے ہیں۔ ہر سال تو اس کی کراتی ہے اور پھول کی چھری بن کر جاتی ہے !
 یہ جھوٹ تھا، بالکل خرد جھوٹ تھا !

جب کاج کو کوئی تو وہ آنکھ کھولنے پر تیار نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں سگریٹ سٹکار رہا۔ اس کے دل کے پاس ایک بیڑ خون آنکھوں کی جھلکی
 رہی۔ اس پاس دھواں اٹھتا رہا۔ اس کے لاشوں کی ہڈی کھڑکی کی دروازے سے بیڑ روشنی میں چمکنی ہوئی پھری چمک چمک جاتی اور اس کے کان میں
 کوئی آواز گرا کر ملتی کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ اور کاج اگر کوئی چیز ہے تو وہ یہ کہ کاج اپنی ساری دولت دیتے ہوئے بھی جا لاک اور بے ایمان بچے کی
 طرح کوئی قیمتی چیز اچھالتی ہے۔ یہ کس لیے ؟

کس کے لیے ؟ شاید وقت کے نئے موڑ پر کوئی قرض خواہ اس کو مل جائے تو وہ کیا کرے گی ؟ شاید وہ وہیں سوچ رہی ہے کہ اس کی یہ
 منزل نہیں۔ وہ غمگین رہا، جس کے چہرے پر کدو ساری عمر گزار چکی ہے۔ شاید اسے بھی احساس ہے کہ وقت کے مضبوط ہاتھ ہم دونوں کو
 الگ بھی کر سکتے ہیں۔

وہ آنکھ کھولا۔ بے فانیوں نے اس کی ہمتی کو کھلا ڈالا۔ وہ آہستہ آہستہ کمرے میں ٹپکتے لگا۔ انکی نیلی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔
 دروازہ پر زہر کا رنگ بکھرا ہوا تھا اور اس بلور کے سمندر میں کاج کوئی پی ٹی تھی۔

اس نے منظر اسے سن رہا تھا۔ روشنی، بیڑ، دروازہ روشنی
 کاج کی عقل میں شعلہ بستر پر لپٹی ہوئی تھی۔ بکھا ہوا رہا تھا۔ اس کے گھٹے سیاہ پل خاموش اور تاریک رہا کی طرح ٹھہرے
 چلے۔ آنکھوں میں فرسے رہا تھا اور وہ مگر یہ تھیں جس میں کوئی تھی جیسے اس کو زندگی سے بکھلے رہا تھا۔ وہ سب مل گیا اور اس کے چہرے
 پر غصہ کا طبع بن گیا۔

سورج سرخ رہا۔ اس نے جب تک اس کے چہرے پر انگلیاں پھیریں۔ چہرے کی خوش رنگ چاروں میں رہا۔ اس سے وہاں تک انکی طلسمی
 جید اور نیکی اور پھر سادگی۔ اس نے اس کے پتے پر ہر صورت، ہنسی کی دعا کی طرح خواہش کرتے ہوئے ان پر انگلیاں پھیریں۔
 ”اُنہ پھول سوئے ہو“ وہ کہہ کر ہٹ گیا۔

پھر وہ کاج کے طبع پر سرخ رہا۔ اس نے سگریٹ سٹکارا، بھاتی اور خاموشی سے ٹپکتے ٹپکتے لگا رہا۔
 کمرہ یہ یہ چمکتا تھا۔ کاج کو کچھ نہیں چھپاتی۔ اپنی ساری کی ساری دولت اس پر سے پھار کر نکلتی ہے۔ وہ خود فرض لالچی ہے
 ہے ایمان ہے۔ شاید محبت بڑا ہے خود لالچی اور خود فرض ہوتی ہے۔ اسے جتنا دکھ وہ اور آگتی ہے۔ ایک چاک چاک بیڑ اور بھکاری کی طرح
 اس کا چہرہ بھرتا نہیں۔ جب ہی اس نے سوچا اس کے ذہن کی دنیا میں دلزلے کے جھگے پیدا ہوئے، جب ہی کاج کو کبھی کسی چیز کی خواہش رہتی
 ہے۔ وہ بھی بے وقت ہے اس سے کہہ سکتے تھے، جو دراصل اس کے پاس ہے ہی نہیں۔ جب وہ کیا ہے، یہاں تک کہ وہ سدا چنے کے بعد بھی کاج
 کی خواہش کی نظر میں ہے نہ اس اور باقی سے اس کی طرف تکی ہی تو وہ غریب اٹھتا ہے۔ اس نے تو کبھی نہیں چھپایا۔ وہ کس کے لیے چھپائے
 گا ؟ لاکھ اس کی خاموش محبت نے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ کمال ہو چکا ہے مگر کاج اتنی ہی نہیں۔ وہ وہی محبت اور حسرت سے ناگہان چمکتی
 ہے۔ ”تھکے پھار اور“

کی آسودگی اس کے دل کو لگ گئی۔ شاید کلا کو سب بھول گیا۔ سب کچھ
دو جہزوت بولتی ہے کہ اسے بھگتا اور چاہیے۔ اس کی اگلا لکھ ہے کہ چلتی جا رہی ہے۔ زندگی نے اس کو اتنا بھگدے دیا ہے

اس نے سگریٹ نکال دیا۔ اور آہستہ آہستہ کھل لیا۔ خاموشی سے کمرے میں بیٹھ گیا۔ اس کا دل بے تحاشیوں اور بے قراروں کے سخت
فرش پر سرخ گل کی طرح خوب دکھتا تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنے پیچھے پر ہاتھ رکھا۔

ایک بار آرا مہاراجہ آگھوں میں آسودوں کا پردہ مائل ہوا
اس نے ایک نظر کلا پر ڈالی۔ کلا کی نیند، گہری نیند، اس کے دل کو برباد کر گئی۔
اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ، سگریٹ کی راکھ کی طرح کھڑکی۔

سید میر نے ایک لمبی سانس لی۔ اور آہستہ آہستہ چلا ہوا بیکر کھڑکی پر بوجھ دے کر کھڑا ہو گیا۔ اور گھر سے تار یک سید کی طرح نظر کی

گاہ دیکھی
بیکر بوجھ دے ہو گئی۔ سید میر کے پاس سید کر دیش لیتا لیتا بہت دور نکل گیا۔ سوچتے سوچتے کپنیاں پلٹے گئیں
”تم سوئے نہیں؟“ دیکھتا اس کے کانوں نے کلا کی آواز سنی۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“
اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کلا جاگ اٹھی تھی۔ کمرے میں نیلی رو جی کھلی ہوئی تھی۔ کلا کا دھندلا دھندلا وجود... وہ اپنے لیے کھڑے
بیکر سے ہاتھوں کو سیٹھائی تھی۔

اس نے کلا کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے گردن گھما کر بیکر سید کی طرف ایک نکل دیکھنے لگا۔
”میں بوجھ دے رہی ہوں، اس طرح کیا سوچ رہے ہو؟“

”سوچ رہا ہوں؟“ جیسے اس کے لاشعور سے آواز آئی۔ ”جس دن میں چلا تھا، میرا اعتراف تھا، امرکاری، ہسپتال تھا۔ جو سہوہ چنے کی
مختارہ

”ہم نے چھاپیں کیا کلا؟“
یہ کس کی آواز تھی؟ سید میر نے محسوس کیا۔ اس کی اپنی آواز ہوتے ہوئے بھی اپنی اپنی ہی ہے۔ جیسے خود کلا اپنی ہوتے ہوئے بھی
اپنی اپنی ہی گتے لگے گی؟
لیکن سید میر کی آواز اس کی کراہت تک نہ گئی۔ اسے لگا جیسے یہ آواز اس کی دیکھی بھالی جانی بچائی ہو۔



دیویندر اسمر

نام	دیویندر ناتھ
تکلی نام	دیویندر اسمر
پیدائش	۳۰ اگست ۱۹۲۹ء ہستام حسن ہیدال (پنچ ماہب) - کیمبل پور (سال دانک) پنجاب (بھارت) شمالی پاکستان۔
تعلیم	ایم۔ اے (معاہیات) الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۴۹ء ایم۔ فی۔ ایس (ایس (Master Of Professional Studies) کارگل یونیورسٹی امریکہ ۱۹۷۷ء محکمہ ایف۔ اے اور بی۔ اے ۱۹۴۷ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج کیمبل پور سے اور ایم۔ اے (معاہیات) الہ آباد یونیورسٹی (۱۹۴۹ء) سے کیا۔ ۱۹۵۳ء میں دہلی یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ۱۹۵۷ء میں کیونیکشن آرٹس میں ایم۔ بی۔ ایس کارگل یونیورسٹی امریکہ سے کیا۔ کچھ مدت کاچچر میں اور ۱۹۳۹-۵۰ء میں ایک بری امریکہ میں ڈیم تعلیم رہا۔

مختصر حالات زندگی:

والد کا نام شری ناتھ دھرم اور والدہ کا نام ماتم دیوی تھا۔ بچپن بڑنہیں اور ادھل جراتی کے دن کیمبل پور میں گزرے۔ ابتدائی تعلیم ماں کی زیر نگرانی ہوئی۔ والد کیل جے اور دنگ پانڈر لائیں۔ کیمبل پور شہر میں جی۔ گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں ڈاکٹر ٹھرا محل ملا کر تصدیق تعلیم اور ڈاکٹر لکھنم دیلائی جی جیسے استاد ملے۔ کالج پیچھو "مفتل" کی ادارت کی اور "مفتل" کے لیے پیدا مضمون "مستو ایک سوئی جرات" رقم بند کیا۔ باقاعدہ دینی زندگی کا آغاز "لکھنم" مسکن میں شائع ہونے والے مضمون سے ہوا۔ ابتدا میں ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ آگے بڑھ کر جدیدیت کی تحریک کے متقبل ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ان کا خاندان کیمبل پور سے کاچچر اور بعد ازاں الہ آباد ہجرت کر گیا۔ الہ آباد سے ایم۔ اے (معاہیات) کرنے کے بعد کاچچر ۱۹۴۹-۵۰ء میں قیام کے دوران میلادام دھ سے مصالحت کے آداب لکھے اور ۱۹۵۰ء میں دہلی کے ایک

پانچویں کالج میں بطور منیجر (معاہدات) ملازمت کا آغاز کیا۔ یہاں آٹھ برس درس و تدریس سے حلقہ رہنے کے بعد کچھ مدت سرکاری ملازمت کی۔ اگست ۱۹۸۶ء میں ایک انگریزی ماہنامہ کے مدیر کی حیثیت میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین اللہ آباد کا چارہ اور دہلی شارٹ کے منیجر ٹری رہے۔ آج کل دہلی میں ہیں اور صحافت کو بطور پیشہ اپنا رکھا ہے۔

اولین مطبوعہ تحریر:

”سٹو ایک ہائی جراج“ (مضمون) مطبوعہ ”مٹھل“ (Torch) گورنمنٹ ڈگری کالج، کیسبل پورہ ۱۹۳۶ء۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

۱۔ ”پوری“ مطبوعہ ”نسوانی دنیا“ لاہور ۱۹۳۶ء

۲۔ ”روٹھل“ ”ساقی“ دہلی ۱۹۳۷ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

۱۔ ”گیت اور انگارے“ (افسانے)

۲۔ ”پیشوں کا سما“ (آٹھ افسانے)

۳۔ ”کیوس کا سمرا“ (ستر افسانے)

اس مجموعے میں ”نیز“، ”کالے گلاب کی صلیب“، ”تین خاموش بچے“ اور ایک درد بھرا ”سپاہی“، ”پرائی قصہ میرے رگھ“، ”دو دن کا ایک لمحہ اور سونے پر پانچ برس“، ”گلین“، ”بکلی کا کھنسا“، ”میں وطن اور دو ہاتھ“، ”کلی بی“، ”مردہ گھر“، ”مفرد“، ”کیوس کا سمرا“، ”ایک ہنسی کھا“، ”بچہ درد ہا ہے“، ”سہاس کی کوئی منزل نہیں“ اور ”ہم شہر چل گئے“ کل سترہ افسانے ہیں۔

۴۔ ”فکر اور ادب“ (تقدیر)

۵۔ ”ادب اور نفسیات“ (تقدیر)

۶۔ ”ادب اور جدید ذہن“ (تقدیر)

۷۔ ”مستقبل کے درد“ (تقدیر)

اس کتاب میں چودہ مضامین شامل ہیں۔ کل صفحات ۱۲۸

۸۔ ”غرضتوں کے کوئٹھ گئے“ (استاذ جی بھول)

اس بھول پر ایک فلم بھی ذمہ سمیٹ چکی جس کا پاکستان سے حلقہ بھرنامہ مرزا حامد بیگ نے فلم بنوایا تھا

۹۔ ”بھول چہ روز گئی“ (بندی افسانے)

۱۰۔	”کالے گلاب کی صلیب“ (ہندی المانے)	طبع اول: ۱۹۷۵ء
۱۱۔	”اس پر لگی تصویریں“ (ہندی المانے)	طبع اول: ۱۹۷۵ء
۱۲۔	”کہانی کا آئینہ“ (ہندی المانے)	
۱۳۔	”پرنسےاپ کیوں نہیں آؤ گے“ (ہندی المانے)	طبع اول: ۱۹۸۵ء
۱۴۔	”لوکھا اپہار“ (ہندی المانے)	
۱۵۔	”ہاتھیں سہ پیچہ“ (تختید۔ ہندی)	
۱۶۔	”سہ پیچہ اور مائو گمان“ (تختید، ہندی)	
۱۷۔	”سہ پیچہ اور آدمیوں کے بیوی“ (تختید، ہندی)	طبع اول: ۱۹۷۳ء
۱۸۔	”سہ پیچہ احادیثوں کے چیتا“ (تختید، ہندی)	طبع اول: ۱۹۷۹ء
۱۹۔	”سہ پیچہ کئی اور سنگھرش“ (تختید، ہندی)	طبع اول: ۱۹۷۹ء
۲۰۔	”سیکس پٹنچا پوجا پوجی“ (ہندی)	
۲۱۔	”اردو کی طرہ لیں“ (مترجم: دوج چند راسر، ہندی)	
۲۲۔	”اردو کی ہانپا کہانیاں“ (مترجم: دوج چند راسر، ہندی)	
۲۳۔	”ادھونک اردو سہ پیچہ“ (مترجم: دوج چند راسر، ہندی)	
۲۴۔	”سنگھار“ (مترجم: دوج چند راسر)	طبع اول: ۱۹۸۱ء
۲۵۔	”دور دور سہ پیچہ“ (مترجم: دوج چند راسر)	
۲۶۔	”سہ پیچہ سنگھرش اور پوجا پوجی“ (مترجم: دوج چند راسر)	
۲۷۔	”سنگھرش کہانیاں“ (مترجم: دوج چند راسر)	
۲۸۔	”MODERN HINDI SHORT STORY“	
	مترجم: دوج چند راسر (ہندوستان انگریزی)	
۲۹۔	”اردو کی چار چیت کہانیاں“ (مترجم: دوج چند راسر، ہندی)	
۳۰۔	”THOUGHT“ (مترجم: دوج چند راسر) (ہندوستان انگریزی)	
۳۱۔	”بھارتیہ سنگھرش اور راشٹریا یکتا“ (ہندی)	
۳۲۔	”IMAGES OF KAMA“ (ہندوستان انگریزی)	
۳۳۔	”انجمن اردو کہانیاں“ (مترجم: دوج چند راسر، ہندی)	
۳۴۔	”بھارتیہ سے سونڈ“ (ہندی، تختید)	
۳۵۔	”سنگھرش راجیو کہانیاں“ (مترجم: دوج چند راسر، ہندی)	

طبع اول، ۱۹۹۶ء

۳۶۔ ”کتاب کی آواز“ (تخلیہ)

طبع اول، ۲۰۰۰ء

۳۷۔ ”نئی صدی اور ادب“ (تخلیہ)

غیر مدقون:

ایکٹر ایک میڈیا سے متعلق مضامین اور تخلیقی مضامین کے علاوہ نین افسانے باج۸۷ء، ”میراج نامہ شکر ہے“ ”مطبوعہ“ الفاظ“، علی گڑھ (افسانہ نمبر ۱) باج۸۸ء، ”آزادی پر غور ہے“ ”مطبوعہ تخلیق لاہور“ باج۸۹ء، ”اگست ۱۹۹۳ء اور سندھ سارتر“ ”مطبوعہ“ ”ذہن جرج“ ”دلی باج۹۰ء جون اگست ۱۹۹۳ء کے علاوہ ”مشتعل“ ”انکھ میں شائع ہونے والے مضامین بھی کسی کتاب میں یکجا نہیں ہو سکے۔ جن میں ”منظر ایک ادبی جراح“، ”کہو بگور کے بارے میں“، ”افغانی نذر کی کا معمار اعظم“، ”شیخ سلطان“ اور چند کتب پر تبصرے ان کی ابتدائی تحریریں ہیں۔

مستقل چٹا:

۱۲/۱۵۳ بجک پور، نئی دہلی، بھارت۔

نظریہ فن:

”ہر انسان کی زندگی پیلو میں“ ”سب دشمن“ ”نئی ہوتا ہے۔“

(پہلا جلد: مکتوب نامہ مرزا حامد، جگہ مرقومہ: ۵۵، نوری ۱۹۸۹ء)۔

مردہ گھر

دیو چند رائے

مردہ گھر میں بھری لاش پڑی ہے۔

بال کاڑی سے اتاری گئی بند پیر جو سی بھولی، الجھل گئی تھیں چارہ شیش اور بھی مردہ گھر میں پڑی ہیں۔

جب بھری لاش مردہ گھر میں لائی گئی تو سورج دھیرے دھیرے دو دریشیائی پہاڑوں کی لٹ میں گھسل رہا تھا اور پہاڑی پہ نگے ہاتھوں میں آگ کے گولے کی لال کرشمیں شعلہ بھڑک رہی تھیں۔ آغوش سے لٹی ہوئی لالی دھ کڑکی کے شیشوں میں جھلنے لگے سی تھمتے کی دھند اور مٹی کے ٹھہار میں اندھیرے کے ارے تیر رہے تھے اور میں بچکانہ نہ سکا کہ مجھے مردہ گھر میں کون لایا ہے۔ سایہ دھیرے دھیرے روشنی کو لٹکتے لٹکتے اور پھر روشنی اور سایہ کا فرق مٹ گیا۔ کمرے میں اندھیرا کالے آگ کی طرح رینگ رہا تھا۔ سرخی سیاہ ہو چکی تھی۔ آگ کا کوا اندھیرے کے غار میں ڈوب چکا تھا۔ اندھیرا سرکتے سرکتے بہت قریب آ کر میرے سر پہانے کھڑا ہو گیا۔ لاشوں کے سفید کفن بھی سیاہ پڑ گئے۔ مردہ گھر برگو کا جوڑھا چڑ بھلی کا کھمبا، ہسپتال کی وسیع عمارت مساتے فرسوں کے کوارٹر، سڑک دھکاس، پھول دکاتے دارتاری، مساتنگلی اسٹینڈر، مریضوں کے کمرے، صحت بخاری کی دوا، سب پر موت کی کالی چھایا بھر گئی۔ مریضوں اور اداوں میں داخل ہو چکے تھے۔ ان کے طعنے اور کڑواہٹ تھیں۔ اوپنٹنس، دین اور مردہ گھر کی گاڑی تھیں سی کڑی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی کر دھ لیتا تھا۔ لونا ہوا پر مدھ پھل پڑا لیتا تھا۔ ہارن بھانسی تھا لیکن دوا سے اس حائلے میں حائلے دے رہا تھا۔

قریب کسی کے قدموں کی آواز حائلے پڑی۔ شاید کوئی لاش اور لائی چارہ سی تھی۔ لیکن آواز آگے یا مٹ گئی اور آواز کے پیچھے دیر تک بھونکنا رہا۔ دو دفعوں کے پتے گر رہے تھے۔ سگے کھڑکڑاتے پتے۔ اور تیز ہوا خنجر میں کوئی کی آواز کی طرح گونج رہی تھی۔

اور پھر آواز دھیرے دھیرے حائلے میں گونج گئی۔ ایسے میں کوئی پتا بھی نہ کر سکتا تھا کہ کس قسم کا ہے۔

مردہ گھر کے دروازے کی دروازے سے روشنی کی ایک ٹیکٹ جاتے کہاں سے آ جاتی اور جب وہ بھی ٹکب ہو جاتی تو اندھیرا اور بھی گہرا ہو جاتا۔ میں سر پٹا ہوں۔ پھر بھی نہ جانتے کہ کس سے آگ ہے یا کس سے دم سا طوف بھری دریا میں گڑا ہوا ہے۔ برگو کے چڑ پر اٹھی گئی چٹکاڑوں کو دیکھ

کہ ایک بار لاشیں بھی کاپ جاتی ہیں۔ کوئی چنگاؤ جب مردہ گھر کی ایک دیوار سے دوسری دیوار کی طرف اڑتی بھڑکتی ہے تو کمرے میں اندھیرے کی ٹھنکن اور دھگی تیز ہو رہی ہوتی ہے۔

میری موت کیسے ہوئی؟" ابھی کچھ لمبے پہلے میں زندہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں اب بھی زندہ ہوں کیوں کہ میری لاش اب بھی سردی میں خضر رہی ہے اور مجھے اب بھی کچھ کچھ یاد آتا ہے۔ کچھ کچھ وہ صدمہ صدمہ صدمہ صدمہ۔

مجھے کوئی روگ نہیں ہوا ابھی، چنانچہ یہ کسی نے پھر انہیں گھونپا، دل و دماغ میں کوئی گولی نہیں لگی، نہ جرح قلب بند ہوئی نہ دماغ کی کوئی ڈال پائی، نہ جسم ہلا، نہ دل سے درد اٹھا تو پھر میں پانچ مرتبے کیسے گیا؟

ساتھ والی لاش نے شاید کہوت بدلی۔ اب اس کے سر نے ایک ایک سبب ہے۔ ایک سلسلہ ہے۔ شاید انسان کی طبیعت کا راز اسی میں مضمر ہے۔ پہلے بچے بچے کھانسی ہوئی، پھر سواڑ کھانسی آنے لگی، بخار بھی ہونے لگا۔ جسم و بلا نجف، چروہ پیلا زرد اور دل و اس ہو گیا۔ پھر کھانسی کے ساتھ خون بھی آنے لگا۔ اور جب خون آنے لگا تو وہ گھبرا گیا کہ اب وہ کسی دن بھی کبھی لمبے سر سکتا ہے۔ اسے اندھری اندھری کھار ہا ہے، کوئی گھن گک گیا ہے۔ ویسے اسے کوئی بھی روگ ہو سکتا تھا۔ روگ کے انتخاب میں وہ آزاد نہیں تھا۔ ساتھ والے ستر پر چڑے چڑے اس نے ایک دن قاتل اٹھا کر دوسروں سے اس روگ کو پال رہا ہے۔ بڑے پیار سے، بڑی رفاقت سے، ایسے ہی جیسے وہ کسی لقمہ کی تخلیق کر رہا ہے، بے اختیار، نامعلوم، بے ارادہ، اور جب اسے معلوم ہوا کہ وہ شعر کے ساتھ ساتھ دق کے جراثیم بھی پال رہا ہے، جب لکھے لکھے اسے زوروں کی کھانسی ہوئی، تب پھر دوسروں میں درد ہوا اور خون کا ایک کالا دھبہ اس کے کالر پر پانچواں ایک شعر کی تخلیق۔

اندھیرے کے سما میں بھٹکی ہوئی، آسیب زدہ جس سا پے ی زندگی۔

"شعر و دق کے جراثیم شاید ایک ساتھ ہی جنم لیتے ہیں، ایک ساتھ ہی پلتے ہیں۔" اس نے کہا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ کتنا دردناک تصور تھا اس کا! جیسے جب دق ہی شعر کا سر چٹ ہے۔

ساتھ والے دادا میں کوئی یکہار کی کراہ کے لوٹ گیا۔

اس نے مجھے دج بالا کا ایک قصہ سنا دیا۔

"فیو، شمس بڑا طاقتور تھا لیکن اس کے پاؤں میں ایک ایسا زخم تھا جس سے بڑی فرت انگیز بدبو آتی تھی۔ اس کے ساتھی اس کے رستے ہوئے زخم پر دو جو کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اس کے پاس ایک مکان تھی جو دشمنوں کوئی کر سکتی تھی اور جس کا کھانا نہ چاک تھا۔ مگر اس کے زخم کا کوئی دوا نہیں تھا۔ بدبو اور رستے ہوئے زخم کے باعث اس کے ساتھی اسے اکلیا چھوڑ کر چلے گئے، لیکن اپنے دشمنوں پر غلط پانے کے لیے انہیں اس کی ضرورت پڑی کیوں کہ صرف اس کے پاس ہی ناقابلِ تجزیر حب تھا۔" لیکن اگر کسی کا زخم زیادہ گہرا ہے تو کیا دوا ہی باعث بڑا انگار ہے یا جس کی مٹا سکتا زیادہ ہے اس کا زخم بھی بڑا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ سوال زخم کا کتنی گہرا ہے کہ کون زخم خود ہے۔ ایک۔ عام کھدہ میں یا ایک مہا گولی۔"

اس نے کہوت بدلی۔ دو زوروں سے کھانسنے لگا اور خون کی ایک دھار اس کے پیچروں سے چھوٹ پڑی۔ اس نے نیم بند آنکھوں سے کمرے میں چڑے سب سرخیوں کو دیکھا اور پھر سو گیا۔ کسی دیر سے آتی تھی اور وہ جا چکا تھا۔

آج اس نے اپنی پریم کہانی سنا لی تھی۔

ہامانی میں لپٹے ہوئے چڑ کے درختوں سے ہوا گزرتے ہوئے دھڑکی تھی۔

جسے کسی الجھ پر غار دی ہوئے تھے۔ اس کا پار ہے کہ سفید کپڑوں والی کوئی عورت لڑائی میں حردانے کے سامنے سے گزرنی۔

وہ شاعر ہے اور نہ ہی اختراعِ قلب کی مریض۔ بلکہ اس نے خود بخود ہی کی؟ (لوگ کہتے ہیں کہ اس پر کسی بھوت کا سایہ ہے۔)

جب بھی وہ کمرہ اور کڑیاں بند کرتی ہے اور پردے گرائی ہے تو اسے کوئی خوف بکڑ لیتا ہے۔ چاروں طرف خاموشی ہوتی ہے۔ مکمل سناٹا، لیکن وہ اس دوجار سے اس دوجار کی طرف بھاگتی ہے۔

”تم کہاں ہو؟ سامنے کیوں نہیں آتے؟ لو میں حردانے کھول دیتی ہوں، کڑیاں کھول دیتی ہوں، پردے ہٹا دیتی ہوں۔ اللہ اور کے لیے ہاتھ لگال جائے۔“ وہ چلاتی اور پھر وہ اسے اور کڑیاں کھول دیتی ہے، پردے ہٹا دیتی اور ایک لمبی سانس لیتی اور سونے پر مطلوب سی گر پڑتی۔ ٹٹ۔ اور پھر جب وہ حردانے اور کڑیاں بند کرتی اور پردے گرا دیتی، دھڑکے میں مکمل اندھیرا اور خاموشی ہو جاتے تو یہی ڈراما شروع ہو جاتا۔ وہ چلاتی، ”میں چاکل ہو جاؤں گی۔“

کیا وہ چاکل نہیں تھی؟ جسے بند اندھیرے کمرے میں کسی جھلکتے ہوئے، آئیناں سے جھڑے پر بڑے بڑے انے کی آوازیں آتی ہیں۔ جہاں جہاں وہ جاتی ہے یہ پردہ اس کے ساتھ ساتھ جاتا ہے۔ وہ اس سے بھاگتی ہے، اس دوجار سے اس دوجار تک۔ ایک رات تو اس سے دوسری قمری گاہ تک، چاندنی مقاموں پر، مسند کے کنارے، مسلمان ویران جگہوں اور گھر سے پرے بازاروں میں، لوگوں کے گھروں میں، اکیلے یہ پردہ اس کے شانے پر بٹھا رہتا ہے۔ نہ اُڑتا ہے نہ مارتا ہے۔

جب کیز پوئی دوم میں اسے لے جا رہے تھے تو میں نے اسے دیکھا تھا جاز، کپلے پہلے بھول کی طرح خوبصورت، کھوئی کھوئی سی، آنکھیں حیرت مہرئی، بکھرے ہوئے ہال، جنوں، خیز، خاموش، سلیپ۔ اور جب اس نے دیر ساری نیند کی گلیاں کھائیں تو اس کی روح کو جکھونٹا۔ تم حیرت ہوں کہ دنیا کیسے کیا ہو جائے گی۔ شاید اس کی نیند غائب ہو چکی تھی۔ ایک انوکھ نیند، عالم جذب کے لیے۔ جس میں محض خواب ہے، حقیقت نہیں۔ شاید یہ موت انہیں خوابوں کے باعث تھی۔ مراد گھر میں اس کی روح پر عیسائی گھوم رہی تھی، ایک جھٹکے ہوئے آئیناں سے جھڑے پر پردے کی طرح۔ ایک دوجار سے دوسری دوجار تک۔

”آج شام کو ملنا، سات بجے ٹھیک سات بجے، پارک میں۔“

”ہو۔ کے۔“ اس نے ڈاکٹر کو جواب دیا اور مسکرائی اور پھر ریاض کو بخش لگائے میں گئی۔

”مجھے کبھی نہیں آتا کہ لوگ ایسے چلاوے سے آگاہ کیوں آتے ہیں؟ اپنی زندگی ایک دوسرے کے لیے کس طرح پرہیز کرتے ہیں؟“

”نرس کہہ رہی تھی۔“

”تو رسول۔ کسی سے عشق دشن ہو گیا ہوگا۔“ وہ بولی۔

میں نے کروت بولی۔ کیا عشق کے بغیر انسان کی نجات نہیں؟

”سوال عشق یا خود کشی کا نہیں، سوال اس رہے گا کہ جس کے لیے لوگ زندگی لٹا دیتے ہیں۔“ شاعر نے کہا تھا۔

”کیا حقیقت ہے اور کیا ادھر؟ کیا صداقت ہے اور کیا شاعری؟ ان سوالوں کا جواب میں کچھ دے سکتا ہوں شاعر۔ ذہن نے کبھی

شعری گفتگو کی ہے وہی کسی سے یاد۔ میں تو ایک عام آدمی ہوں۔“

دہانے اس غم شعوری حالت میں گئے بچپن کی باتیں کیوں یاد آ رہی تھیں؟

میں صحت پر چنگ اُڑ رہا تھا۔ چنگ اُڑ ہی اُڑ رہا تھا، آکا کا ہار ڈالنے کا دل سے نہیں بندھا تھا۔ اس کے دل پر اُڑ ہی اُڑ رہا تھا۔ ایک دوسرا چنگ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ دوسرے دوسرے سے دو ایک دوسرے سے قریب آتے گئے۔ قریب آتے آتے ایک دوسرے سے آگے گئے۔ ڈور ختم ہو رہی تھی۔ ڈور تھا کہ میرا چنگ کٹ نہ جائے۔ میں نے ایک جھٹکا دیا، دوسرے کا چنگ کٹ گیا۔ میں لڑائی سے اُٹھ کر چنگ بہت دیر تک ہوا میں تیرتا رہا اور ہم بہت دور تک اس کے پیچھے بھاگتے رہے۔ چنگ ورنی کے ایک درخت پر کانٹوں میں الجھ گیا۔ جھٹ میں درخت پر چڑھ گیا۔ کانٹوں میں الجھتے میں نے چنگ جھٹ لیا۔ میرا جسم لٹکی ہو چکا تھا، میرے کپڑے پھٹ گئے تھے لیکن جیت کے ٹپٹے میں میں نے سب کچھ برداشت کر لیا۔ جب میں نیچے اتر آیا تو ایک بھڑا سا بڑا لڑکا کھڑا تھا۔ وہ مجھے گھور رہا تھا۔

”یہ چنگ میرا ہے؟“ اس نے کہا۔

میں نے اُسے دیکھ کر لپٹے میں اس سے کہا: ”یہ میں نے جیتا ہے۔“

”تو بتا ہے یادوں ایک“ اور اس نے مجھے ایک گھڑی گاٹی دی تھی۔ میں نے وہ چڑھ کر نظر سے اس کی طرف دیکھا لیکن اس کے اُٹھنے ہوئے تھا وہ دیکھ کر میں کلاپ گیا۔ میں نے چنگ اسے دے دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ایک چوہا ہوں جو بلی کے ڈر سے اپنے غلے میں گھس گیا ہے۔

اور پھر میں نے چنگ اُڑنا چھوڑ دیا۔ ہر کھیل، گیند بازی، بال کی دھت، بال سب کچھ چھوڑ دیا۔ ہر جگہ تو بڑا لڑکا تھا۔ میں اکیلا دور نکل جاتا۔ دہلی کی بٹریوں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور چلیا ہوا جینٹا۔ رنگ برنگی کھلیاں بکڑنے کی کوشش کرتا۔ میں گھٹنوں اسی طرح ہوا کا پیرا لایا سے بے خبر کالی، بھلی، غلی، غلی تو س قہقہوں کیلے پیچھے بھاگتا رہتا یا بادش کے بلوں میں کاغذ کی ناؤ چلاتا رہتا جب تک کہ ان میں اپنی ڈبھک جاتا اور وہ دوبارہ نہ جانتا تھا۔ شاید بے کار گھومتے ہوئے ان لمحات میں میں نے محسوس کیا کہ میں شاعر ہوں۔

میں نے وہ شعر چھوڑ دیا۔ کیوں؟ روزگار کی تلاش میں یا کسی دوسرے کے طوف سے؟ لیکن یہ فیصلہ میں نے اس دن کیا تھا جب وہ بڑا لڑکا اپنی کار میں اپنی ٹی جی پی کی کو لپے فرانے سے میرے پاس سے گزر گیا۔ کار کی دھول کے کنارے میں اُپت گیا۔ اس کی پیلی سے مجھے عشق نہیں تھا لیکن وہ بچپن میں میرے ساتھ پانی میں ناؤ ضرور چلاتا کرتی تھی۔

”کوئی تم سے غریب خوب کرتے ہو کیا اس لڑکی کو آؤ لیکن کرا سکتے؟“ میرے دل نے شاعر سے پوچھا۔

”کس لڑکی کو؟“

لیکن وہ تو مر چکا تھا۔ اس کی سب جھٹ ختم ہو چکی تھی۔ میں سو کا فرض کیا ہے؟ اس کا دشواں کیا ہے؟ میرے دل میں ایک کے کالے بال ملنے لگے۔

میرا دشواں کیوں بال مل گیا؟ میرا قصہ میری گھڑی کی خواہش اس وقت غائب ہو گئی جب آدمی رات کو کھینچ میں وہ ہاتھ کسی دوسرے کے سر ہانے کے نیچے سے داخل ہوئی جا رہے تھے۔

گھر سے میں کار کے پیچوں کے گھسے کمرے سے دیکھنے کی آواز آئی۔ ایک دم بریک گی کی در ایک بیچ تھا میں گورنگ اُٹھی۔ کار کی روشنی کا

آئینہ اندھیرے میں محسوس کیا اور سلیپ کپڑوں میں لیٹی لاشیں جھٹک اٹھیں۔ کارناک دم اشارے ہوئی اور فرار نے بھرتی ہوئی نکل گئی۔ کمرے کے اندھیرے میں بڑی دیر تک سچ گونجی رہی۔ چاروں طرف سے بچھیں گونجنے لگیں۔ دوسرے رات کے اندھیرے میں کوئی سک سک کر مڑ مڑا تھا۔ پہلے اس سے نہ ہلکا کر گیا اور پھر اسے کچا کر کے سردیوں کی ٹھنڈی رات کو نکلنے کے کعبے کے ساتھ دکھایا گیا اور اس کے چہرے میں کوئی داغ دی۔ اس کے سر پر کھلی کالیب مل۔ ہاتھ۔ اس کے بدن جسم کا ہر گوشہ روشن تھا۔

ایک ہی ایک بچیاں نے بھرتی۔ رات کے اندھیرے میں گاڑی دھیرے دھیرے دھجک رہی ہے۔ ایک دم غروں کا شور بلند ہوا اور گاڑی رک گئی۔ غزے، دھالے، ملم، توڑے لوگ گاڑی میں کھس آئے۔ جسم کھلے گئے۔ عورتیں مرد، بچے، بھوس ڈاڑھے ہوئے تھے۔ کسی نے ایک بچے کو چائے کی گیند کی طرح ہوا میں اچھلا دیا اور پھر پلے بھلا رکھ دیا۔ رات کے خاتمے میں ایک سچ گونجی اور پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔

صدیاں بہت بھٹی ہیں لیکن وہ بھی ابھی تک سولی پر کیوں لٹکا ہوا ہے؟

رات آدمی سے زیادہ بیت بھٹی ہے۔ باہر قدموں کی چاپ ستانی پڑ رہی تھی۔ بے ادبے کے پتھروں پر چبک پتوں کی کتہ کتہ کھٹا کھٹ۔ شور و دھواں اور پھر ایک کال کو غزنی سے ایک نو جوان کو گونجی کر نکالا گیا۔ رات کے خاموش اندھیرے میں چاروں کی طرح اسے شہر سے باہر لے جا دیا اور سڑی کے کنارے اس کے گلوے گلوے کر کے پانی میں بہا دیا گیا۔ چبک پتوں کی آواز پتھروں پر جڑی دیر تک گونجی رہی۔ دن دن دن گولیاں پھل رہی تھیں۔ عورتیں، مرد، بچے، سب سبچے۔ بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ چاروں اسی کے گھرے میں شام کی تاریکی میں انھیں کوئی سے اڑایا جا رہا ہے۔ سٹوں پر گولیاں کے داغ لیے اندھیرے میں لوگ محسوس رہے ہیں اور اندھیرے کے سمندر میں اپنے چہرے دیکھتے ہیں۔

لاد بھگدڑ اور لوگ اور لوگ۔ جزاؤں لوگوں کی بھیڑ ٹاہراؤ پر آ کے بند رہی تھی۔ سمندر کے طوفان کی طرح بھٹکتی جا رہی ہے۔ بے کار کے نعرے لگاتی، پرچم لہراتی، اور ایک آدمی بھیڑ کے سامنے سے چلا آ رہا ہے، ایک پھٹا ہوا پھر برا لیے۔ اٹکے ہوئے قدموں سے دھرتی پھسل رہی تھی۔ بار بار بھیڑ کے درپے سے وہ پیچھے دھکیل دیا جاتا تھا۔ پھر بھیڑ کے سمندر میں وہ پھنسی گیا۔ لوگوں نے شور مچایا راستے سے ہٹ جاؤ نہیں تو کچے جاؤ گے۔ لیکن وہ چہرے نہ دروغ کی طرح آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ لوگوں کے پاؤں سے روندنا جا رہا تھا۔ وہ بار بار اٹھ کھڑا ہوتا اور پھر لٹک دیا جاتا۔ اس کا چہرہ مٹے اور حمارت سے لال ہو رہا تھا۔

اچانک بھیڑ میں کھنک سے ایک ہاتھ اٹھا، ایک پتھر پھٹکی کی طرح چٹکا، ایک سچ کی آواز آئی۔ چہرے ڈر کے مارے دھڑکن سے اڑ گئے اور پھر یہ آواز بھیڑ کے قہقہے شورش کو گئی۔

یہ تیسری لاش کیا اس کی ہے؟ جہاں سے، پہلے، نیلے چروں میں سے اٹھ کر آئی ہے۔ ایک لاش رو رہی ہوئی، اٹکی ہوئی۔ لہو کا نوارہ اور دیر تک گونجی ہوئی سچ۔ اس نے بھٹی بھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔

جب پتھر پھٹکی سا چٹکا ہے، گولی، دن سے چلتی ہے، کوئی اٹھتا ہے یا ٹوٹ گئی کرتا ہے تو سنا کیوں چھا جاتا ہے؟ کیا زخم کی کوئی زبان نہیں ہوتی؟ زخم کے جوش تو ہوتے ہیں، آواز کیوں نہیں؟

”ہاں زبانی آن دی اور اسٹیپ ان والا“ میں نے ڈائری میں لکھا تھا۔

وہ ہاتھ کہاں ہیں؟ بے رحم، قاتل ہاتھ۔ لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ لوگوں کا جھگم آگے بڑھ چکا تھا۔ دفن ان جانا تھا، بے نام تھا۔

انہو صبر سے میں کو چکا تھا اور وہ اپنے دشمن (وہ دوست اپنا دوست سمجھتا تھا) میں نے اسے زندگی میں پہلی دفعہ اور بڑے بڑے انصاف سے نبھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ (کاظم علی بھی ادا نہیں کر سکا۔)

میں نے ان ہاتھوں کو دیکھا ضرور تھا جنہوں نے اس کو قتل کیا تھا لیکن میں انہیں پہچانی نہیں سکتا۔ کل تک ان ہاتھوں کو میں پہچان سکتا تھا۔ یہ وہی ہاتھ تھے جس نے اس بے لڑکے کو ایک معصوم لڑکے کو پیسہ دے دیا۔ یہ وہی ہاتھ تھے جو بد وقتوں نے ان کو لایا تھا۔ یہ وہی ہاتھ تھے جو اس کے گلوے گلوے کر کے غری میں بھرا ہے تھے۔ یہ وہی ہاتھ تھے جو اس لڑکی کے کمرے میں بٹکتے ہوئے پتے کا گھاٹھ لٹکا دیا ہے تھے۔ یہ وہی ہاتھ تھے جو آج میرے سامنے ایک ساتھی کی اہل بدلتی چھا رہے تھے۔

لیکن آج میں ان باتوں کو نہیں بچکانہ سمجھا۔ شاید اس لیے کہ میں مرد ہوں۔ (کیا میں واقعی مرچا ہوں؟) منج کی چٹکی کرنا کمرے میں بے دری پیچھے داخل ہوئی۔ وہاں وہ حیدری جاتی چارے تھیں۔ اگر ان لاکھوں کے بارے میں میں سمجھتا ہوں تو بات کتنی سادہ ہوتی: محبت کی حسیٹ ایک عورت، دوسرا قتل، خودکشی اور جہاد حق۔ لیکن یہ حسیٹ نہیں تھی کیوں کہ میں بھی تو مرد ہوں کمرے میں سو جوتا تھا۔ چوتھا آدمی۔ قدیموں کی جہاد آہستہ سے میں چونک جاتا۔ شاید کوئی میری لاش لینے آیا ہے۔

شام تک لوگ آتے رہے اور ہادی ہادی سب لاشیں لے گئے۔ اندھیرا مگر ابھرتا جا رہا تھا۔ کھاک نے تمیں بھائے۔ سناہ ایک نعلے کے لیے نانا اور پھر نانا موش اس سناہانہ ٹھہرتی ہوئی سرور دات میں کون آنے کا؟ اور وہ بھی ایک مردے کے لیے۔ شاید کوئی لاش لینے آیا ہے۔ میں دروازہ کھولنے کے لیے اٹھتا ہوں اور گر جاتا ہوں۔ کمرے میں گئی کے رہ گئی کی آواز آتی۔ کپ اندھیرا تھا۔ کچھ کھائی نہیں دے رہا تھا۔ آنے والے کی شاید آگھ چک رہی تھی۔ کیا سانپ کی بھی آٹھیں ہوتی ہیں؟ اس کی کال نہ پاؤں شعلے کی طرح اندھیرے میں ایک رہی تھی لیکن مجھے رابھی اور عسوں اور۔۔۔ سانپ میرے قریب آ گیا اور میں اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ صرف سانپ ہی زعمہ تھا اور میں اکیلے پڑا تھا۔ میں جیسے کو کچھ رہا جس کی سزا کو پاس نہیں کہہ سکتا نہ کھلا آسان کہتا ہوں کی جہاں ہی ہوتی۔

ماہرینہ فیکلٹی کے ہیں۔

”اس لئے کہ جب تک کہ وہ زندہ ہے۔“

— *U. S. Fish and Wildlife Service*

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دروازے پر ٹھک کا تالا لگا تھا۔ وقت کے سیاہ سمندر میں سفید بادیاں پھیلا کے میری لاش کا جہاز صدیوں سے چل رہا ہے۔ اس کی دھوئی منزل ہے دریا مل۔

مجھے اندھیرے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ دوستو! اس اندھیرے میں میں کب سے ہلکے رہا ہوں۔ جہاں جہاں میں جاتا ہوں وہ میرے سامنے ایک مہم کنفرے ہوتے ہیں۔ بازار میں گلی میں، سڑک پر، میزبیں پر میرا ہر جگہ جہاں اندھیرا گہرا ہوتا ہے۔ سبکی کے کھمبے پر بڑبڑکھٹکے کی لاشیں کرکاس کی طرح اٹھائے وہ میرے سامنے آکر اڑتا ہے اور کھڑے ہے پچھتا ہے پچھتاؤ اس کا کال کون ہے؟ اور اچانک دوسری طرف سے ناکے لگھوڑے پر سوار شیطانی فسی ہوتا اور ہوتا ہوتا ہے۔ ہمارے کی ٹانگ پر بچے کی لاش اچھلا ہوا۔ وہ دروں صدیوں سے میرے پیچھے گھوم رہے ہیں۔ میں کہہ رہا ہوں؟ اس کھتے اندھیرے میں مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ خدا کے ہاتھوں میں وہ کبھی خدا کہاں ہے؟ اس کی لاش ابھی تو نوادہ گھر میں چڑی ہے۔

www.elsevier.com/locate/jmb

انتظار حسین

نام	انتظار حسین
قلمی نام	انتظار حسین
پیدائش	۲۱ دسمبر ۱۹۲۳ء، پشاور، اربابی ضلع، ضلع شری۔ پی، بھارت
تعلیم	ایم۔ اے (ادب) بھارت کالج، میرٹھ ۱۹۴۶ء
	ابتدائی اور مذہبی تعلیم گھر پر ہوئی۔ براہ راست کمرشل اینڈ انڈسٹریل اسکول، پانڈی کی آٹھویں کلاس میں داخلہ لیا
	۳۳-۱۹۴۴ء میں میرٹھ کالج سے بی۔ اے کیا اور اسی کالج سے ۱۹۴۶ء میں ایم۔ اے (ادب) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

انتظار حسین کے والد ملاعلی مذہبی آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی میں کھن پانڈی بھی کی اور تھارت بھی لیکن ناکام رہے۔ ان کا رشتہ ان مذہب کی تحفظ کی طرف تھا۔ وہ انگریزی زبان سمجھنے کے حق میں نہ تھے اور اپنے بیٹے کو مذہبی تعلیم دلوانا کر دماغ بنانا چاہتے تھے۔ والدہ محترم کی رسوم میں ہمیشہ بڑا چڑھا کر صدمہ لیتی تھیں۔ انتظار حسین نے بچپن اور لڑکھپن کے ابتدائی گیارہ برس اپنی ہی گزاریے۔ بچپن اور لڑکھپن میں چھپ چھپ کر عام لیلیا میں شرکت کی۔ کالج کے دنوں میں علامہ مشرقی کی تحریریں اس سے متاثر ہو کر فرقہ واریت کے خاتمے سے مذہبی خیالات و تصورات کو دور کر دیا۔ اس میں کچھ دلائل یہ وہ فیئر کرا حسین کا بھی رہا جو کالج کے زمانے میں انتظار حسین کے استاد رہے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر محمد اقبال اور ان مہاشد سے متاثر ہو کر شاعری شروع کی لیکن بات چند ٹکسوں سے آگے نہ بڑھی۔

میرٹھ میں چند ماہ رہا اور علیگڑھ یونیورسٹی میں ملازمت کی۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں روزنامہ ”امروز“ لاہور سے منسلک ہوئے اور ۱۹۵۲ء میں روزنامہ ”آفاق“ لاہور سے وابستہ ہو کر کالم نگاری کا آغاز کیا۔ کچھ مدت بعد لاہور چلے گئے اور ”خوائے وقت“ سے منسلک رہنے کے بعد روزنامہ ”مشرق“ کی ملازمت اختیار کی اور یہ منسلک ۱۹۸۸ء تک چلا۔ اس اخبار کے لیے ”لاہور نامہ“ کے عنوان سے مستقل کالم نگاری کی۔ اسٹیج

کے لیے سب سے پہلا ڈرامہ "خواہاں کے مسافر" لکھا اور اس کے بعد گاہے گاہے ریاض اور نئی دہلی کے لیے بھی لکھتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں ادبی جریدہ "طیال" کا اور چہاری کیا جس کے صرف تین شمارے نکل سکے۔ تاہم مدت "نوب لطیف" لاہور کی وزارت اعلیٰ کی۔ شادی ۱۹۶۶ء میں ہوئی لیکن لاہور سے غریب رہے۔ اپنے دور کے ترقی پسند ادباء مثلاً رباب ذوق میں قلم نگاری چھوڑا بہت اور لاہور کے روحانی طراز کے لوگوں شاعروں کے ساتھ چوکھی لانے کے سبب ہمیشہ اور ادب کی فریٹ لائن میں نمایاں دکھائی دیے۔ ان دنوں "DAWN" کراچی میں ادب اور ثقافت سے حلقہ رشتہ دار کا قلم لکھتے ہیں۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"تھو کی دکان" (پیشکش اپریل ۱۹۶۸ء) مطبوعہ "نوب لطیف" لاہور، دسمبر ۱۹۶۸ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ "گلی کوپے" (کیا رہا انسانے) شاہین اختر ڈاکا اور طبع اول ۱۹۵۴ء
 - (۱) تھو کی دکان (۲) طریقہ وطول شبیں کا (۳) چوک (۴) تھو کی آپ جیتی (۵) آخر دھبیا (۶) راء کیا شوق منزل مقصود (۷) بھر آجے کی (۸) حقیقہ خانہ (۹) روپ ہمر کی سواریاں (۱۰) ایک دن نکسی روز میر (۱۱) استاد
- ۲۔ "تھو کی لاج و وفا سانے" مکتبہ چاند لاہور طبع اول ۱۹۵۵ء
 - (۱) جینج (۲) اصلاح (۳) نکل دانے (۴) ہاں آگے دور تھا (۵) آخری صوم جی (۶) راج لا (۷) کیلا (۸) ساتواں دور (۹) پتہ (۱۰) پسماندگان (۱۱) خضری آگ (۱۲) جنگل (۱۳) پایا (۱۴) تھو کی
- ۳۔ "آخری آدمی" (کیا رہا انسانے) مکتبہ چاند لاہور طبع اول ۱۹۶۷ء
- ۴۔ "شرفیوں" (سزا و انصاف) مکتبہ کارواں لاہور طبع اول ۱۹۷۲ء
 - (۱) دو جو کونے گئے (۲) کتا ہوا آپ (۳) راجیڑ (۴) بیڑیاں (۵) مردہ داکہ (۶) مٹھوک لوگ (۷) شرم الحرم (۸) کاتا و چال (۹) مجری فیس (۱۰) اور اور اکٹھا (۱۱) اور اور راستہ (۱۲) اپنی آگ کی طرف (۱۳) لہا لہو (۱۴) دور اور میں (۱۵) دور دورہ ویاہار کو نہ چاہ سکے (۱۶) اندھی گلی (۱۷) شرفیوں۔
- ۵۔ "کچھوے" (سزا و انصاف) مطبوعات لاہور طبع اول ۱۹۸۱ء
 - (۱) قدامت پسند لڑکی (۲) ۳۴ راج (۳) نرگوش (۴) ہاواں (۵) اسیر (۶) ہندوستان سے ایک لڑکا (۷) خیر (۸) کچھوے (۹) بچے (۱۰) راجیڑ (۱۱) راستہ (۱۲) راجار (۱۳) خواب اور نقد (۱۴) شہر (۱۵) صبح کے خوش نصیب (۱۶) بے سبب (۱۷) کشتی
- ۶۔ "بچے سے دور" (سزا و انصاف) مکتبہ میل بنگلی کیشنور لاہور طبع اول ۱۹۸۶ء

- (۱) نیچے سے اور (۲) سزمونل (۳) حصہ (۴) زبانی (۵) پرانے کہانی (۶) کوپ (۷) بروہہ کہانی (۸) ایشیائی پر سے
(۹) برصغیر (۱۰) دولت (۱۱) انگلہار (۱۲) چیت، قادم (۱۳) قتلین (۱۴) پرانی کہانی (۱۵) دواں قدم (۱۶) لٹائی گھر (۱۷) (۱۸)
خواب میں سوچ

- ۷۔ "چاند گھن" (ناول) کتب کارواں لاہور طبع اول ۱۹۵۳ء
۸۔ "اشیائی" (ناول) کتب جامعہ لٹریچر ڈپٹی طبع دوم ۱۹۸۳ء
۹۔ "دن اور رات" (ناول) ادارہ دانش و ادب لاہور طبع دوم ۱۹۸۴ء
۱۰۔ "نئی چاند" (از ایوان نور کتب) (ناول) (ترجمہ) کتب کارواں لاہور طبع اول ۱۹۵۴ء
۱۱۔ "زمین اور ملک اور" (اسرار) سنگ میل لاہور طبع اول ۱۹۸۷ء
۱۲۔ "اور سے" (ادبی کالم) پاکستان فاؤنڈیشن لاہور طبع اول ۱۹۷۶ء
۱۳۔ "کافور دوسرے لہانے" (سرکی افسانوں کا انتخاب) (ترجمہ) آئینہ ادب لاہور طبع اول ۱۹۵۸ء
۱۴۔ "فلت کی نئی تکنیک" (از چاند دہانی) (ترجمہ) شعیب گل کتاب گھر لاہور طبع اول ۱۹۶۱ء
۱۵۔ "ملاحزوں کا روال" (تختہ) کتب جامعہ لٹریچر ڈپٹی طبع دوم ۱۹۸۴ء
۱۶۔ "میں حلوں میری نظر میں" (ترتیب پاشا اکبر سہیل) آئینہ ادب لاہور
۱۷۔ "سرخ تہ" (از قتلین کریم) (ناول) (ترجمہ) پروڈیکٹ ڈیجیٹل لاہور طبع اول ۱۹۶۰ء
۱۸۔ "Red badge of courage" کا ترجمہ ہے۔
۱۹۔ "میری سچی" (از ارملا احمد) (ناول) (ترجمہ) اردو اکیڈمی سندھ کراچی طبع اول ۱۹۶۷ء
۲۰۔ "Our Town" کا ترجمہ ہے کئی صفحات ۶۶
۲۱۔ "باز سے نکل" (از سوانح انکار) (مختصر شریں) (ترجمہ) نگار شاہ لاہور طبع اول ۱۹۶۶ء
۲۲۔ "ترجمہ دوسری بار" (از سوانح انکار) (مختصر شریں) (ترجمہ) نگار شاہ لاہور طبع اول ۱۹۶۶ء
۲۳۔ "میرا ہی بہادر" (ناول) (ترجمہ) (از قتلین کریم) شعیب گل کتاب گھر لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء
۲۴۔ "باقی رہا" (ناول) (ترجمہ) (از قتلین کریم) شعیب گل کتاب گھر لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء
۲۵۔ "باقی رہا" (ناول) (ترجمہ) (از قتلین کریم) شعیب گل کتاب گھر لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء
۲۶۔ "باقی رہا" (ناول) (ترجمہ) (از قتلین کریم) شعیب گل کتاب گھر لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء
۲۷۔ "باقی رہا" (ناول) (ترجمہ) (از قتلین کریم) شعیب گل کتاب گھر لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء
۲۸۔ "باقی رہا" (ناول) (ترجمہ) (از قتلین کریم) شعیب گل کتاب گھر لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء
۲۹۔ "باقی رہا" (ناول) (ترجمہ) (از قتلین کریم) شعیب گل کتاب گھر لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء
۳۰۔ "باقی رہا" (ناول) (ترجمہ) (از قتلین کریم) شعیب گل کتاب گھر لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء
۳۱۔ "باقی رہا" (ناول) (ترجمہ) (از قتلین کریم) شعیب گل کتاب گھر لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء
۳۲۔ "باقی رہا" (ناول) (ترجمہ) (از قتلین کریم) شعیب گل کتاب گھر لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء
۳۳۔ "باقی رہا" (ناول) (ترجمہ) (از قتلین کریم) شعیب گل کتاب گھر لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء
۳۴۔ "باقی رہا" (ناول) (ترجمہ) (از قتلین کریم) شعیب گل کتاب گھر لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء
۳۵۔ "باقی رہا" (ناول) (ترجمہ) (از قتلین کریم) شعیب گل کتاب گھر لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء

۳۶۔	”جہنم کہاں ہیں“ (افسانے/اُکھیاات) پہلی جلد	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
۳۷۔	”گنہ گہاں ہیں“ (افسانے/اُکھیاات) دوسری جلد	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
۳۸۔	”غالی و بختیوار“ (سوانح نامہ)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
۳۹۔	”شہزادہ کے نام“ (پندرہ افسانے)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
۴۰۔	”سچ و حق کا دھواں“ (خودنوشت)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
۴۱۔	”ننگر پارے کا بیٹا“ (بچوں کے لیے)	شیخ غلام علی ایڈز سنٹر لاہور
۴۲۔	”سدا کرہ“ (ناول)	شیخ غلام علی ایڈز سنٹر لاہور
۴۳۔	”آگے سے دور ہے“ (ناول)	شیخ غلام علی ایڈز سنٹر لاہور
۴۴۔	”زہریلے عقیم“ (سوانح نگینہ محل)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
۴۵۔	”نظرِ بے آگے“ (مجموعہ)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
۴۶۔	”وئی تھا جس کا نام“ (ناول کرہ)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
۴۷۔	”بے خبر، برائی چٹائی“ (سوانح نامہ)	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

10

وَلَقَدْ كَلَّمْنَا كَلِمًا تَارَةً مِّنْ عِندِ عِزِّهِمْ ۚ

CV

Matthew Evans

20

- ۱۔ پاکستان رائٹرز گلڈ آرمی کی ادبی انعام جوائے ٹائل "الحقیقی" (بھٹو حصول کرنے سے انکار کرنا)۔
- ۲۔ ہائیڈ آف ہیاڈ محض (حکومت پاکستان کا سوال اجازت)۔
- ۳۔ فروغ اردو اسب (دور نظر) انعام ۱۹۹۸ء۔

20

”میری اسدو یہاں کی چٹیاں اسدو رخت لگتے ہیں۔ میں چٹوں کے لیے لکھتا ہوں۔“

(پہچان کے حوالہ پر صورت گری کے حوالوں کے لئے "عربی" نام مسطوراً مکتوباً ۱۹۸۸ء)

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ الْمَمْنُونِ

- ۱۔ ”یہ صورت کہ کچھ غزالیوں کے ”مزاج“ عام مسعود“ نگار پاکستان“ نے لکھا ہے کہ ”اس وقت کے اکثر غزالیوں نے مزاج کی“ اور ”غزالیان“ اور ”انوار احمد نور احمد“ سوانحی کتاب کا کتب خانہ لکھا ہے کہ ”یہ مزاج“ اور ”یہ مزاج“ ہے۔ ”اس کا تخیل“ چاہی ان کے ”کمال“ کے ساتھ ہے۔ یہ کسی صاحب کے مطابق ۱۹۴۴ء کی درست سال بھی آتی ہے۔

آخری آدمی

انتظار حسین

الہام! اس قریے میں آخری آدمی تھا۔ اس نے عہد کیا تھا کہ معبود کی سونگہ میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں اور میں آدمی ہی کی جون میں مر جاؤں گا اور اس نے آدمی کی جون میں رہنے کی آخر دم تک کوشش کی۔

اور اس قریے سے تین دن پہلے بندر غائب ہو گئے تھے۔ لوگ پہلے حیران ہوئے اور پھر غمی منائی کہ بندر جو فصلیں بر باد اور بارغ طراب کرتے تھے نابود ہو گئے۔ چراس غصے لے۔ جو انہیں سبت کے دن پھیلنے کے آثار سے متح کیا کرتا تھا یہ کہا کہ بندر تو کہا دسے اور یہاں موجود ہیں۔ مگر یہ کہ تم دیکھتے نہیں۔ لوگوں نے اس کا رونا اور کہا کہ کیا تو ہم سے ملنا کرتا ہے اور اس نے کہا کہ بے شک ملنا قائم نے خدا سے کیا کہ اس نے سبت کے دن پھیلنے کے آثار سے متح کیا اور تم نے سبت کے دن پھیلنے کا شکار کیا اور جان لو کہ وہ تم سے بڑا ملنا کرنے والا ہے۔

اب کے جس سے دن ہیں ہوا کہ طبعہ کی لوطی گھوم طبعہ کی طراب گاہ میں داخل ہوئی اور سبکی ہوئی طبعہ کی جورا کے پاس ملنے پاؤں آئی۔ پھر طبعہ کی جورا خواب گاہ تک گئی اور حیران رہی۔ یہاں وہاں آئی۔ پھر یہ ضرور دور کلنگ لگی اور دور دور سے لوگ طبعہ کے گھر آئے اور اس کی خواب گاہ تک جا کر ٹھک ٹھک گئے کہ طبعہ کی خواب گاہ میں طبعہ کی بھانے ایک بڑا بندر آرام کرتا تھا اور طبعہ نے پچھلے سبت کے دن سب سے زیادہ چھپایاں بکڑی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ ایک نے دوسرے کو خبر دی کہ اسے مزاج طبعہ بندر ہی گیا ہے۔ اس پر دوسرا زور سے جہا۔ "تو نے مجھ سے ملنا کیا۔" اور وہ جلتا ہی چلا گیا۔ حتیٰ کہ مناس کا سرخ چ گیا اور حالت اگل آئے اور چہرے کے خدا حال سمجھنے چلے گئے اور وہ بندر ہی گیا۔ جب پہلا کمال حیران ہوا۔ مناس کا کھانا کھلا۔ گیا اور آٹھیں حیرت سے کھینچی جاتی تھیں اور پھر وہ بھی بندر ہی گیا۔

اور ایجاب دین زلمون کو دیکھ کر ڈرا اور یوں بولا کہ اسے زلمون کے بیٹے تھے کیا ہوا ہے کہ حجرا چرونگر گیا ہے۔ زلمون نے اس بات کا رونا اور طبع سے حالت لگایا۔ لگا۔ تب ایجاب حیرت ڈرا اور چاکر بولا کہ اسے زلمون کے بیٹے تھے یاں حجرا سے سوگ میں بیٹھے ضرور تھے کہ

ہو گیا ہے۔ اس بہن زلیخا کا منہ غصے سے لال ہو گیا اور حالت کھینچ کر الیاب پر پہنچا۔ جب الیاب خوف سے اپنے آپ کو حرکت دیا اور وہ دونوں ایک جسم فضا اور ایک خوف کی بہت سے دھانیں میں کود گئے۔ ان کے چہرے گھڑنے سے چلے گئے۔ بہران کے اعضاء گھڑے۔ بہران کی آوازیں بکڑیں کہ اتفاقاً آج جس میں دلہن ہوتے چلے گئے اور غیر مقررہ آواز میں گئے۔ بھرہ غیر مقررہ آواز میں دھنیاں نکلیں۔ بن گئیں اور بھرہ و بندوں گئے۔

الیاسف نے کہا کہ سب میں عقل مند تھا اور سب سے آخری آدمی ہمارا، تشویش سے کہا کہ اسے تو کا ضرر نہیں ہو کہ وہ کیا آؤ ہم اس شخص سے دور جانا کریں جو ہمیں بہت کے دن چھپائیں بکڑنے سے بچ کر رہے۔ بھرہ الیاسف کو گوں کو کھرا لے کر اس شخص کے گھر گیا۔ اور حلقہ زن ہو کے دیر تک بکھرا کیا۔ تب وہ وہاں سے واپس بھرہ اور بی بی آدمی سے بولا کہ اسے تو کا وہ شخص جو ہمیں بہت کے دن چھپائیں بکڑنے سے بچ کر رہا تھا آج ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے اور اگر سوچ تو اس میں ہمارے لیے خرابی ہے۔ تو گوں نے بی بی ہمارا دہل گئے۔ ایک بڑے خوف نے انہیں آ لیا۔ بہشت سے صورتیں ان کی پتی ہوئے نگیں اور غنہ خال رخ ہوئے چلے گئے اور الیاسف نے گھوم کر دیکھا اور اسے سمجھ کر دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے والے بندہ دیکھ گئے تھے۔ تب اس نے سامنے دیکھا اور بندوں کے سوا کسی کو نہ پایا۔ جانا چاہیے کہ وہ بستی ایک بستی تھی۔ سمندر کے کنارے اونچے برجوں اور بڑے دروازوں والی عمارتوں کی بستی، ہزاروں میں کھوے سے نکھو پھرتا تھا۔ کھوراج تھا۔ پدم کے دم میں ہزاروں بہان اور اونچی ڈیڑھ زیاں سونی ہو گئیں اور اونچے برجوں میں حال شان بکھڑی پر بندہ ہی بندہ نظر آنے لگے اور الیاسف نے ہراس سے چاروں سمت نظر دوڑائی اور اس سوچا کہ میں اکیلا آدمی ہوں اور اس خیال سے وہ ایسا ڈرا کہ اس کا خون جھنے لگا۔ مگر اسے الیاب یاد آیا کہ خوف سے کس طرح اس کی صورت بگڑتی چلی گئی اور وہ بندہ بن گیا۔ جب الیاسف نے اپنے خوف پر قابو پایا اور غم باغ حاکم عبود کی سونگہ میں آدمی کی جوانی میں بے اہوا اور آدمی ہی کی جوانی میں سروں کا اور اس نے ایک احساس برتری کے ساتھ اپنے سبب سے ہم جنسوں کو دیکھا اور کہا۔ حقیقت میں ان میں سے ہمیں ہوں کہ وہ بندہ ہیں اور میں آدمی کی جوانی میں پیدا ہوا۔ اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں سے نفرت کی اس نے ان کی لال بہو کا صورتوں اور بالوں سے ڈھکے ہوئے ہنسون کو دیکھا اور نفرت سے چہرہ اس کا بگڑنے لگا۔ مگر اسے اپنا تک وہی زلیخا کا خیال آیا کہ نفرت کی شدت سے صورت اس کی سبب ہو گئی تھی۔ اس نے کہا کہ الیاسف نفرت سے کہہ کر نفرت سے آدمی کی کا یا بدل جاتی ہے اور الیاسف نے نفرت سے کہہ کر دیا۔

الیاسف نے نفرت سے کہہ کر دیا اور کہا کہ بے شک میں انہیں میں سے تھا اور اس نے وہ دن یاد رکھے۔ جب وہ ان میں سے تھا اور دل اس کا بہت کے جوش سے امنڈنے لگا۔ اسے بہت الاغضر کی یاد آئی کہ فرعون کے تہ کے دو حصا کھڑوں میں سے ایک کھڑی کی مانند تھی اور اس کے بڑے گھر کے سردار کے کور کراں صوبہ کی تھیں۔ اس کی یاد کے ساتھ الیاسف کو بیچے دن یاد آئے کہ وہ سرد کے دروں اور صوبہ کی کڑیوں والے مکان میں مقب سے گیا تھا اور پھر کھٹ کے لیے اسے نوا جس کے لیے اس کا بی جاہ تھا اور اس نے دیکھا ہے جاں اس کی راحت کی باندھوں سے بچے ہوئے ہیں اور چھاتیاں ہرن کے بچوں کے موافق رہتی ہیں اور یہ اس کا گھنہ کی لاج دہی کی مانند ہے اور پاس اس کے صندوق کا گول پیالہ ہے اور الیاسف نے بہت الاغضر کو یاد کیا اور ہرن کے بچوں کو گھنہ کی ڈیویری اور صندوق کے گول پیالے کے تصور میں سرد کے دروں اور صوبہ کی کڑیوں والے گھر تک گیا۔ اس نے خالی مکان دیکھا اور پھر کھٹ پر اسے نوا۔ جس کے لیے اس کا بی جاہ تھا اور پکارا کہ اسے بہت الاغضر آگیا کہ اسے اور اسے وہ کہ جس کے لیے میرا بی جاہتا ہے۔ کہ کچھ موسم کا بھاری صید گزرا گیا اور بھٹوں کی کار ہاں جری بھری ہو گئیں اور کھریاں اونچی شاخوں پر بکھڑاتی ہیں۔ تو کہاں ہے؟ الاغضر کی بی بی الاغے اور بی بی جوت پر بچے ہوئے پھر کھٹ پر آ رہم کر کے والی تھے دشت میں دوڑتی ہوئی پرندوں اور چٹاؤں میں پیچھے ہوئے کھتروں کی قسم لیے اتر آ اور مجھ سے آن لال کہ

حیرت سے لیے صبر لاتی چاہتا ہے۔ الیاسف بار بار پکارتا کہ اس کا بی بی بھڑا یا بھڑا جنت الاضر کو یاد کر کے مرو یا۔

الیاسف جنت الاضر کو یاد کر کے مرو یا مگر چنانچہ اسے عید کی جود یاد آئی۔ تو عید کو بندہ کی جون میں دیکھ کر روئی تھی۔ حالانکہ اس کی ہڑی بند ہو گئی اور بچے آفسوں میں اس کے ٹیبل نقل مگرے چلے گئے اور ہڑی آواز دھنسی ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس کی جون بدل گئی۔ تب الیاسف نے خیال کیا۔ جنت الاضر جن میں سے تھی ان میں مل گئی اور بے شک جو جن میں سے وہ ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا اور الیاسف نے اپنے تئیں کہا کہ اے الیاسف ان سے محبت مت کر مبادا تو جن میں سے ہو جائے اور الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور ہم جنسوں کو جنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا اور الیاسف نے جرن کے بچوں اور کنڈم کی ڈچری اور مندر کے گول پیالے کو فراموش کر دیا۔

الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور اپنے ہم جنسوں کی لال بھوکا صورتوں اور کھڑی دم کو دیکھ کر ہٹا اور الیاسف کو عید کی جود یاد آئی کہ وہ اس قرینے کی جین عورتوں میں سے تھی۔ وہ ان کے درخت کی مثال تھی اور چھاتیوں اس کی انگوڑی کے خوشوں کی مانند تھیں اور عید نے اس سے کہا کہ جان لے کہ میں انگوڑی کے خوشے توڑوں گا اور انگوڑی کے خوشوں والی تیرپ کر سائل کی طرف نکل گئی۔ عید اس کے پیچھے پیچھے گیا اور پھل توڑا اور آواز کے درخت کو اپنے گھر لے آیا اور اب وہ ایک اسی طرح کے درخت سے بے عید کی جو نہیں ملتی تھی۔ عید دھڑ دھڑی لے کر کھڑا ہوا اور دم کھڑی کر کے اپنے پیچھے بچوں پر اٹھ بیٹھیں۔ اس کے ہنسنے کی آواز آتی ہوئی تھی کہ اسے ساری بھٹی کوئی مظلوم ہوئی اور وہ اپنے اتنی زور سے ہنسنے پر حیران ہوا۔ مگر چنانچہ اسے اس شخص کا خیال آیا جو ہنسنے ہنسنے بندہ بن گیا تھا اور الیاسف نے اپنے تئیں کہا کہ اے الیاسف تو ان پر مت اٹھ مبادا تو جنس کے ایسی بن جائے اور الیاسف نے تھی سے کنارہ کیا۔

الیاسف نے تھی سے کنارہ کیا۔ الیاسف محبت اور نفرت سے ملے اور ہمدردی سے اور نے اور ہنسنے سے ہر کیفیت سے گزر گیا اور ہم جنسوں کو جنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا۔ ان کا درختوں پر اپنا کاروانٹ ہیں ہیں کر لگا کر یاں کرنا۔ کپے کپے بھلوں پر لڑنا اور ایک دوسرے کو لہو لہان کرنا۔ یہ سب کچھ اسے آگے بھی ہم جنسوں پر ملا تھا۔ کبھی جھٹا تھا۔ کبھی غصہ دلاتا کہ وہ پر دانت چھینے لگتا اور انھیں حکارت سے دیکھتا اور یوں ہوا کہ انھیں لڑتے دیکھ کر اس نے غصہ کیا اور جڑی آواز سے جھڑکا۔ پھر مودی اپنی آواز پر حیران ہوا اور کسی کی بندہ نے اسے بے تعلق سے دیکھا اور پھر لڑائی میں جنت کیا اور الیاسف کے تئیں لٹکوں کی قدر دہائی رہی، کہ وہ اس کے اور اس کے ہم جنسوں کے درمیان رشتہ نہیں رہے۔ تھا اور اس کا اس نے انھیں کیا۔ الیاسف نے انھیں کیا اپنے ہم جنسوں پر اپنے آپ پر اور غصہ۔ انھوں نے جان پر یہاں اس کے کہ وہ اس لفظ سے محروم ہو گئے۔ انھوں نے مجھ پر یہاں اس کے لفظ میرے ہاتھوں میں خلی برتن کی مثال رہ گیا اور سوچ تو آج بڑے انھوں کا ان سے۔ آج لفظ مر گیا اور الیاسف نے لفظ کی موت کو فوجی طور پر غامض ہو گیا۔

الیاسف خاموش ہو گیا اور محبت اور نفرت سے ملے اور ہمدردی سے ہنسنے اور روئے سے درگزر اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں کو جنس جان کر ان سے کنارہ کیا اور اپنی ذات کے اندر چلائی۔ الیاسف اپنی ذات کے اندر چلا گیا۔ سب سے بے تعلق، گھرے ہاتھوں کے درمیان خشکی کا تھا سا نشان اور جزو سے لے گیا کہ میں گھرے ہاتھوں کے درمیان زمین کا نشان بلند رکھوں گا۔

الیاسف کا اپنے تئیں آدمیت کا جزو یہاں تھا۔ گھرے ہاتھوں کے خلاف دالعت کرنے لگا۔ اس نے اپنے گرد چٹا دیا کیا کہ محبت اور نفرت۔ غصہ اور ہمدردی۔ علم اور غرضی اس پر پھلا رہ کر کہ کہہ دے کی کوئی رو اسے بہا کر نہ لے جائے اور الیاسف اپنے جذبات سے غول کرنے لگا۔ پھر جب وہ چٹا چکار کر چکا تو اسے یوں لگا کہ اس کے سینے کے اندر پھری چ گئی ہے۔ اس نے غرور نہ ہو کر کہا کہ اے محمود کیا میں

اعتراف سے بدل رہا ہوں۔ جب اس نے اپنے باہر پر نظر کی اور اسے گمان ہونے لگا کہ وہ پتھری چھیل کر باہر آ رہی ہے کہ اس کے اعضا خشک، اس کی ہڈیوں پر رنگ اور اس کا لہو پسے ہو رہا ہوا ہے۔ مگر اس نے مزید اپنے آپ پر غور کیا اور اسے مزید دوسروں نے تجھرا سے لگا کہ اس کا بہانہ بالوں سے ڈھلکا ہوا ہے اور بال بد رنگ اور سخت ہوتے جا رہے ہیں جب اسے مزید خوف ہوا اور اعضا اس کے خوف سے مزید سکڑنے لگے اور اس نے سوچا کہ کیا میں بالکل معدوم ہو جاؤں گا۔

اور الیاسف نے الیاب کو یاد کیا کہ خوف سے اپنے اندر صحت کرو و بعد کہ تھا۔ جب اس نے کہا کہ میں اندر کے خوف پر اسی طرح تلپ پاؤں گا۔ جس طرح میں نے باہر کے خوف پر تلپ پایا تھا اور الیاسف نے اندر کے خوف پر تلپ پایا اور اس کے سینے سے ہونے لگے اور سینے لگے۔ اس کے اعضا ڈھیلے پڑ گئے اور اس کی انگلیاں لمبی اور ہلکی پڑ گئیں اور اس نے لگے اور اس کی ہڈیاں اور گوشت سے چھنے اور لٹکے ہو گئے۔ اور اس کے جڑ کھلنے لگے اور وہ اپنے سب کو گمان ہوا کہ اس کے سارے اعضا بکھر جائیں گے جب اس نے غم کر کے اپنے دماغ کو بھیجا اور مضمین اس کمر کا دھیس باور اپنے آپ کو اکٹھا کرنے لگا۔

الیاسف نے اپنے بیٹے اعضا کی تپ نہا کر آنکھیں بند کر لیں اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اسے لگا کہ اس کے اعضا کی صورت بدلتی جا رہی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے آپ سے پوچھا کیا میں میں نہیں رہا ہوں۔ اس خیال سے دل اس کا ڈھینے لگا۔ اس نے بہت ڈرتے ڈرتے ایک آنکھ کھولی اور پہنچے سے اپنے اعضا پر نظر کی۔ اسے ڈھارس ہوئی کہ اس کے اعضا تو جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔ اس نے دلیری سے آنکھیں کھولیں اور اطمینان سے اپنے بدن کو دیکھا اور کہا کہ بے شک میں اپنی جون میں ہوں۔ مگر اس کے بعد آپ ہی آپ اسے ہر دوسرا دیکھتا ہے اس کے اعضا، مگر تے اور بدلتے جا رہے ہیں اور اس نے ہر آنکھیں بند کر لیں۔

الیاسف نے آنکھیں بند کر لیں اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اس کا دھیان اندر کی طرف گیا اور اس نے جانتا کہ وہ کسی اندر میرے کوئی میں دھنستا جا رہا ہے اور الیاسف نے وہ دیکھ کے سمجھ لیا کہ اسے میرے سمجھ میرے باہر بھی ڈھنستا ہے۔ اندر میرے کوئی میں دھنستے ہوئے ہم جنوں کی پرانی صورتوں نے اس کا قہقہہ کیا اور گڑبڑی دھنستیا صبر کرنے لگیں۔ الیاسف کو صحت کے دن ہم جنوں کا چھیلوں کا کھار کرنا یاد آیا کہ ان کے ہاتھوں چھیلوں سے ہر اس صحت چھیلوں سے خالی ہونے لگا اور اس کی ہوس پڑ گئی اور انہوں نے صحت کے دن بھی چھیلوں کا کھار شروع کر دیا۔ جب ایک شخص نے جو انہیں صحت کے دن چھیلوں کا کھار کرنے سے منع کرتا تھا کہ وہ کی سوگند جس نے سمندر کو گھر سے ہاتھ دالا تھا اور گھر سے ہاتھوں کی چھیلوں کا میں نظربا۔ سمندر قہقہہ سے دھنست ہونے سے چاہا ہاتھ ہے اور صحت کے دن چھیلوں پر ظلم کرنے سے باز رہو کہ ہمارا قہقہہ ہاتھوں پر ظلم کرنے والے قرار پاؤ۔ الیاسف نے کہا کہ صبر کی سوگند میں صحت کے دن چھیلوں کا کھار آپ پر آئیں تو میری ہوتی تالی کی راگڑ سے پر نکل گئیں اور صحت کے دوسرے دن الیاسف نے اس گڑھے سے بہت ہی چھیلیاں بکڑیں۔ وہ شخص خود صحت کے دن چھیلیاں بکڑنے سے منع کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر میں روڈا کہ تحقیق جس نے اللہ سے کہا کہ اللہ اس سے مکر کرے گا اور بے شک اللہ زیادہ دیکھ کر کرنے والا ہے اور الیاسف یہ یاد کر کے دھنستا اور دوسرا کیا کہ کیا وہ مکر میں مکر گیا ہے۔ اس گڑھی سے اپنی پوری حتیٰ ایک مکر نظر آئی۔ جب وہ اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑایا کہ بھیا کرنے والے تو نے مجھے ایسا ہیہ کیا صبر کیا کرنے کا حق ہے۔ تو نے مجھے بھرتی کیڑے پر غفلت کیا اور اپنی مثال پر بنایا۔ پس اسے پیدا کرنے والے کیا قہقہہ مجھ سے مکر کرے گا اور مجھے ذلیل بندہ کے اسلوب پر ڈھانکے گا اور الیاسف اپنے حال پر روایا اس کے دھنستے میں دروازہ پگھلی اور سمندر کا پانی جڑ سے میں آ رہا تھا۔

الیاسف اپنے حال پر رونا اور بندروں سے ہمراہی ہستی سے منہ موڑ کر جنگلی کی سمت نکل گیا کہ اب ہستی اسے جنگل سے بڑا درد دھت
 ہمراہی نظر آتی تھی اور وہ اردوں اور بہتوں والا گھر اس کے لیے لفظ کی طرح سنی گویا تھا۔ رات اس نے درخت کی ٹنڈوں پر چھپ کر ہمراہی
 جب تک کہ وہ ہکا بکا تو اس کا سارا بدن دکھتا تھا اور رنج و عدا کی ہڈی درد کرتی تھی۔ اس نے اپنے گھر سے اصرار پر نظر کی کہ اس وقت تک
 زیادہ بگڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس نے فارتے فارتے سوچا کہ کیا میں وہاں ہی ہوں اور اس آواز سے طویل آواز کا کاش ہستی میں کوئی ایک
 انسان ہوتا کہ اسے جاسم کا کہہ سکیں جن میں ہے اور یہ خیال آئے کہ اس نے اپنے تئیں سوال کیا کہ کیا آواز جی رہے کے لیے یہ بھی لازم
 ہے کہ وہ آدمیوں کے درمیان ہو۔ مگر اس نے خود ہی جواب دیا کہ جنگ آدم اپنے تئیں اور میرے کہ آواز کی آواز کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور جو
 جن میں سے ہے ان کے ساتھ اٹھایا جانے کا اور جب اس نے یہ سوچا تو راج اس کی امداد سے ہمراہی اور وہ بکا راکا اے بخت الاغیر تو کہاں
 ہے کہ تھو میں میں اصرار ہوں۔ اس آواز الیاسف کو بہن کی کڑے ہوئے بچوں اور گھم کی اور ہمراہی کے گول پیالے کی یاد کے طرح
 آئی۔ بڑے میں سمجھ رہا تھا کہ الیاسف نے درد سے صدا کی اسے بخت الاغیر اے وہ جس کے لیے میرا جی چاہتا ہے۔
 تجھے میں اور اپنی بہت پر چلے ہوئے چھپر کھٹ پر اور بڑے درختوں کی تنگی شاخوں میں اور پتھر رچیوں میں اصرار ہوں گا۔ تجھے سر پہ وہ رتی
 دو دھیا گھر بڑی کی قسم ہے۔ قسم ہے کہ تو اس کی جب وہ پتھر میں پر ہوا کرے۔ قسم ہے تجھے رات کی جب وہ ہلک جائے۔ قسم ہے تجھے رات
 کے اندر میرے کی۔ جب وہ دن میں اترنے لگے۔ قسم ہے تجھے اندر میرے اور نیند کی اور بچوں کی جب وہ نیند سے بوجھل ہو جائیں۔ تو مجھے آواز
 مل کہ میرے لیے میرا جی چاہتا ہے اور جب اس نے یہ صدا کی تو بہت سے لفظ آپس میں گزرتے ہوئے۔ جیسے لکھنا لکھی ہو۔ جیسے لفظ دست ہے
 ہوں جیسے اس کی آواز بدلتی ہو اور الیاسف نے اپنی بدلتی آواز پر غور کیا اور وہاں زبان اور الیاسف کو یاد کیا کہ کہیں کہیں کی آواز میں بگڑتی
 جاتی گئیں تھیں۔ الیاسف اپنی بدلتی ہوئی آواز کا تصور کر کے فارتے فارتے سوچا کہ اسے سمجھنا کیا میں بدل گیا ہوں اور اس وقت اسے یہ آواز خیال ہو گیا
 کہ اسے کاش کوئی ایسی چیز ہوتی کہ اس کے ذریعے وہ اپنا پیروہ دیکھ سکتا۔ مگر یہ خیال اسے بہت افسوس نظر آیا۔ اس نے درد سے کہا کہ اسے سمجھ
 میں کیسے جانوں کہ میں نہیں جانتا ہوں۔

الیاسف نے پہلے ہستی کو جانے کا خیال کیا مگر خود ہی اس خیال سے خائف ہو گیا اور الیاسف کو ہستی کے خالی اور اونچے گھروں سے
 نکلنا ہونے کا تصور جنگل کے کوٹے درخت دور و کرا سے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ الیاسف ہستی واپس جانے کے خیال سے خائف، چلے چلے
 جنگل میں دور نکل گیا۔ بہت دور جا کر اسے ایک پھیل نظر آئی کہ پانی اس کا ضمیر اٹھاتا پھیل کے کنارے بیٹھ کر اس نے پانی پیا۔ پانی ٹھنڈا کیا۔
 اس اٹھامیں وہ سوتی ایسے پانی کو سمجھنے لگے جو ٹھنڈا۔ یہ میں ہوں؟ اسے پانی میں اپنی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چیخ نکل گئی اور الیاسف
 کو الیاسف کی چیخ نے آلیا تھا اور وہ بھاگ کر گزرا۔

الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آلیا تھا اور وہ بھاگتا بھاگتا چلا جاتا تھا۔ جیسے پھیل اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ بھاگتے بھاگتے تو اسے
 اس کے دیکھنے کے اور چھپنے ہونے کے اور کمر اس کی درد کرنے لگی۔ مگر وہ بھاگتا گیا اور کمر کا درد بڑھتا گیا اور اسے پس منجم ہوا کہ اس کی
 رنج و عدا کی ہڈی درد بری ہوا چاہتی ہے اور اس نے دھت اور بے ساختہ اپنی اچھیلیاں زمین پر گرا دی اور بخت الاغیر کو گھٹا ہوا چاروں ہاتھ بچاواں
 کے گل حیر کے سوا فنی چلا۔

انور سجاد

سیہ انور سجاد علی شکاری

انور سجاد ڈاکٹر انور سجاد

۷۰ انور سجاد ۱۹۳۵ء - یہ سجاد سجاد منڈی کا سورا

ایم بی بی ایس (پنجاب) ڈی۔ لی۔ ایم ایچ (انگلینڈ)

مشن ہائی سکول رنگ محلہ لاہور میں پانچویں جماعت تک تعلیم پائی۔ چھٹی سے میٹرک تک سنٹرل ہائی سکول لاہور میں رہے۔ میٹرک ۱۹۵۹ء میں کیا۔ ایف۔ ایس سی کرنے کے لیے میٹرک کے مضامین کے ساتھ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور چھوڑ دیا۔ ۱۹۵۱ء میں انہی مضامین کے ساتھ ایف۔ سی کالج لاہور میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۳ء میں ایف۔ ایس سی قرار دیا جن میں پاس کیا۔ ایف۔ سی کالج لاہور میں دوسری تک بی اے کے طالب علم رہے لیکن امتحان نہیں دیا۔ ۱۹۵۵ء میں ہائی اور ذوالحجی کے ساتھ ایف۔ سی کالج لاہور سے بی۔ ایس سی کرنے کے بعد ڈاکٹر مینے نکل کالج کراچی میں داخلہ لیا جہاں سے چھ ماہ بعد شکایتی درجہ مینے نکل کالج لاہور منتقل ہو گئے۔ فرسٹ پروفیشنل کا ٹائٹل اسی کالج سے پاس کیا۔ ایم بی بی ایس کرنے میں پانچ کی ہجرت چلے چھ سال تک گئے۔ فزیالوجی کے پے پیس میں مل کر کیمسٹری امتحان کے ذریعہ ۱۹۶۱ء میں ایم بی بی ایس کیا۔ بعد ازاں یورپل اسکول آف ٹرانسکٹ مینٹ ہن انگلینڈ سے ۱۹۶۶ء میں ڈی۔ لی۔ ایم ایچ (انگلینڈ) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

انور سجاد کے والد مسک کے لحاظ سے صوفی اور پیشہ کے اعتبار سے ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے۔ والدہ سیدہ مراد حسینہ دیکھیں لاہور کی پنجابی اور روشن خیالی خاتون تھیں۔ ان کا گھرانہ والد کی طرف سے لائبریری کا اس اور والدہ کی طرف سے ایپکاس کا مکتبہ رہا۔ والد نے ۱۹۲۶ء

- ۸۔ ”کلی کہانیاں“ (افسانے) رنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع ۱۹۹۰ء
- ۹۔ ”صبا اور مسند“ (ٹیلی ڈراما) رنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع ۱۹۹۰ء
- ۱۰۔ ”کارخانہ“ (ٹیلی ڈراما) رنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع ۱۹۹۰ء
- ۱۱۔ ”کلاش رجوز“ (مطالعہ) رنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع ۱۹۹۰ء
- ۱۲۔ ”سورج کو دراکچہ“ (ٹیلی ڈراما) رنگ میل پبلی کیشنز لاہور طبع ۱۹۹۰ء

اعزاز:

- ۱۔ پرائز آف پرفارمنس (حکومت پاکستان کا سول اعزاز)

مستقل پتا:

ای ۴۵ کلی ٹیر ۳۳ گھبرگ ۱۱۱ لاہور۔

نظریہ فن:

”موضوع اور وقت کے درمیان اس جدائی قوتی کا حصول کچھ کی بھی فن پارے کو درامتا ہے۔“ (انور سجاد)

(جدید ادب کو بے نام مرزا احمد بیگ مورچہ ۱۴۱۹ء کو برکے ۱۹۹۸ء)



حوالہ جات:

- ۱۔ میٹرک کی دہ پندرہ سالہ انٹرمیڈیٹ ۱۹۷۵ء تک ۱۹۷۵ء تک ہے۔ پورے تئیس۔

گائے

انور رحمان

ایک روز انہوں نے تل کرٹیلہ کیا تھا کہ اب گائے کو بچ خانے میں دے ہی دیا جائے۔
اب اس کا دھیا نہیں ملتا۔

ان میں سے ایک نے کہا تھا۔

ابن ٹٹھی بھر پنہیوں کو کوئی خرچہ نہ گا۔

لیکن اما نکھ اب بھی یقین ہے۔ اگر اس کا علاج ہوتا حد کی ہے۔

چپ رہو گی۔ بڑے آئے عقل والے۔

لکا چپ کر کے ایک طرف ہو گیا تھا اور باہر اپنی راز میں عقل کو کر پتا ہوا اس کے بیروں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

میں دب درپان بلاتا ہوں تو یہ بوجھ ہی جانتے ہیں۔ جس روز سے میں نے انہی کو بچانا ہے اسی روز سے چنگیری کو بھی جانا ہے اور

جس دن سے یہ لوگ اسے بوجھ خانے لے جانے کی سوچ رہے ہیں اس دن سے میں ہر لمحہ تنہم ہوتا ہوں۔ میں کیا کروں یہ سب مجھ پر ہنسنے

ہیں کہ میں اس کی اتنی خدمت کیوں کرتا ہوں۔ ان پنہیوں سے اتنا پیار کیوں کرتا ہوں کیوں کرتا ہوں۔

”آپ اسے بوجھ خانے کے بجائے ہسپتال کیوں نہیں بھیج دیتے۔“ نگے سے رہائش ملتا تھا۔

”تم نہیں سمجھتے، یہ نیکی نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاج پر میرا خواتمہ کیوں رہا ہو کیا جائے۔“

میں نہ سمجھتا ہوں۔ ابھی تو کل ہی میں نے دھانگے میں چھوڑ دی گئی تھی۔

آپ علاج کرا کے دیکھیں تو سہی۔

بیروں کی باتوں میں عقل شدہ کرو۔

میرا بھی چاہتا ہے کہ میں آپ سب کو روچ جانے دے آؤں گا۔

ہر سب نے ل کر گائے کی ذخیرہ بکری تھی۔ لیکن جیسے گائے کو بھی سب بیکہ معلوم تھا وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلی تھی۔ انہوں نے مار مار کے اس کا ہر ٹکڑا کال دیا تھا۔ لہذا ایک طرف کڑا بھرا تلی ہوئی آٹکھوں سے سب بیکہ کچرہ ہاتھ۔ گھٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

شامیاش چٹنگریا میری گائے میری گٹو مانتا ہلنا نہیں تم نہیں جانتیں یہ لوگ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔ جانا نہیں جاتا نہیں وہ نہ رو نہ ٹھیک تو۔

گائے اپنی جگہ پر اڑی سڑ سڑ کے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ ذرا بہت کر گائے کا چھڑا کھولنے کے ساتھ وہی سے بدلہ سا بے تعلق بیٹھا تھا۔ چڑیاؤں پر ڈانٹوں کی بو چھاڑا اسے ٹھیک سنائی دیتی تھی۔ گئے کے کان بھی بند ہو رہے تھے رنڈہ رنڈہ۔

سارے بزرگ پاچھے ہوئے ہر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ پھر فیصلہ ہوا تھا کہ اگر یہ بیل بھی چڑے تو ٹھکن ہے راستے میں کھسا ہو جائے۔

اس لئے بھتر بھیا ہے کہ اسے رگ میں ڈال کر لے جایا جائے۔ رگ میں تو اسے اٹھا کر بھی لا دیا جاسکتا ہے۔

اگلے روز رگ بھی آ گیا تھا۔

رگ کی آوار پر گائے نے سڑ کے دیکھا تھا۔ آٹکھیں پھیل گئیں اور کھولی میں منڈال دیا تھا 'جہاں میں کا چارہ ڈال کے ابھی ابھی رگ کو دیکھنے گیا تھا۔

آپ لوگ اسے دانتی۔

اسے یقین نہیں آتا تھا۔

فہم تو ہم مذاق کر رہے ہیں کیا؟

ایک نے کہا تھا۔

بابا یہ گائے مجھے دے دے نہیں اسے۔

تھیم کی اولاد۔

دوسرے نے کہا تھا۔

بابا اس کے بغیر میں۔

بھوں کا بچہ۔

تیسرے نے کہا تھا۔

چوتھا بابا بچوں سارے بزرگ سارے بزرگ سالے ایک سے ہیں اور ۱۱ بھرائی دار بھی کو قتل کا گڑھ سمجھتا ہے جانے اسے کیا ہو گیا

ہے۔

بیٹے رگ والے کو اس روپے دے کر بھی ہم بہت فائدہ سے شہر رہیں گے۔

او کہنت سوداگر مجھ سے لورو پے مجھ سے یہ لوگ بھی میری ٹھکی میں اس وقت تو ہوا ہے جب جب میں بڑا ہو جاؤں گا۔

۱۱۱۱۱

اس کی زبان کاٹ لو۔ یہ گائے کو دلاتا ہے۔

ڈراتا ہے۔

گالہ بند کر کے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ گائے نے گلے کو دیکھا، گالہ باندھنے کی طرف۔

دو بے مزہ حرکتیں لگو گئیں۔

گلے کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔

اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتا ہوں کیا کر سکتا ہوں۔

وہ ابھی تک نہیں ڈرتی تھی۔ مگر اس نے مشکوک نگاہوں سے ادھر ادھر کیے کر بڑے زور سے پھسکار ماری تھی۔

میری چٹکبری جانتی ہے، جانتی ہے کہ وہ گلے پر قدم رکھ کر ڈک میں پھلی چلے گی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی کہ میں کیوں کیوں وہ چڑھتا ہوں۔

جانتی۔

ان سب نے مل کر اس کی پیٹنے پر لالچیاں برساتی تھیں، گائے کی انگلیں قرقری تھیں، لیکن وہ اپنی جگہ سے قطعی نہیں ہٹی تھی۔ جب انہوں نے

مل کر دوسرا وار کیا تو وہ تکلیف سے دوڑ بھاگنے لگی تھی کہ بابا کی داد میں اصل نے جوش مارا تھا اور اس نے بھاگ کر اس کے منہ پر لاٹھی ماری تھی۔

گائے ابھر تلخ کی طرف منہ کر کے سیدھے سو گئی تھی۔ بابا نے اپنے ہونے کہا تھا۔

آؤ پیٹ۔

اور ان سب نے مل کر پھر لالچیوں کا بند بربسا دیا تھا۔

گالہ اور گزراتا تھا۔ بالکل بے تعلق ہے جس۔

یوں بات نہیں ہے کی۔

ایک لے اپنے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔

تو پھر؟

وہ ڈک کے ساتھ ہی۔ گائے کھڑے سوچا ہی رہے تھے کہ ہانے گائے کو کیا سوچتی تھی، اپنی کریم بھگ اٹھی تھی اور دھول اڑاتی

گلے کے قریب سے بالکل اجنبیوں کی طرح گزرتی تھی۔

گالہ جسم کا مروجہ حصہ۔

دیکھو دیکھو، تو جاکیں طرف۔

ایک چڑا تھا۔

قد رتی بات ہے۔

بابا نے اپنی داد میں لالچیاں بھیرتے ہوئے کہا تھا۔

گائے اپنے جھگڑے کو چاند ہی تھی۔ بابا کی آنکھیں مکاری منکراہٹ سے جھک گئیں۔

اس جھگڑے کو کہاں لے آؤ۔ یہ چال تو ہمیں کل ہی پھل جانی چاہیے تھی۔ ڈک کے پیچھے بھی ڈکا جاتے۔

ان میں سے ایک نے جھگڑے کی رہی بکری تھی۔ کئی زبان لڑی تھی۔ گائے بکرو سمیٹی اقوم الملقیٰ کی پہلی جھگڑے کے پیچھے پیچھے اس کے قریب سے گزری تھی تو آہستہ آہستہ سے کئی زبان سے گالی پھینکی تھی۔ جھگڑا تھکے پر چڑھ کے پندسیاں مارتا ہوا ترک میں چلا گیا تھا۔ گائے تھکے کے پاس جانے بکری تھی۔ بڑی جراتی سے جھگڑے کو کچ کر آہستہ آہستہ گردن موڑ کے گئے کو دیکھا تھا۔ ایک نے فوراً بغل سے پٹوں کا گٹھا نکال کر گائے کے آگے کر دیا تھا۔ اس نے پٹوں کو بغل و اطراف میں لے لئے اور بکری کو سوچ کر زمین پر گرا دیا۔ تھے اور اٹھا کھر تھکے پر رکھ دیا تھا۔ بکری دوسرا کھر۔

خدا معلوم کئے کو کیا ہوا تھا۔ یکدم اس کے سارے جسم میں تازہ تازہ گرم گرم لہو کا سیلاب آ گیا تھا۔ اس کے کان سرخ ہو گئے اور دماغ بے طرح جھٹکے گا تھا۔ دو بھاگا بھاگا کھر میں کیا تھا اور بایا کی دو تالی بند تالی اتار کر اس میں کار توں بھرے تھے۔ اسی جنوں میں بھاگتا ہوا باہر آ گیا تھا اور کاندھے پر بند تالی رکھ کر نکلتا نہ پاندھا تھا۔

اس نے نکلی آگے سے دیکھا۔ جھگڑا ترک سے باہر گائے کے گرائے ہوئے پٹوں میں جھٹ مارا تھا۔ ترک میں بندھی گائے باہر نہ نکال کر جھگڑے کو کچ رہی تھی۔ ان میں سے ایک گائے کو لے جانے کے لیے ترک میں بیٹھا تھا اور بایا ایک دالچہ سے اپنی داڑھی میں محفل کو سہلاتا ہوا باہر کھڑے ڈرائیو سے ہاتھ مارا تھا۔

بکر دیکھے جس کی کیا ہوا۔ کئے نے کئے نکلتا دیکھا۔ گائے کو جھگڑے کو ڈرائیو کو ڈال دیا کڑا پنے آپ کو ڈال دیا بھی نکل نکلا نہ دے کئے کڑا ہے۔ کوئی نہیں جا کے دیکھے اور آ کے دیکھے بتائے کہ بکری کیا ہوا۔ مجھے تو صرف اتنا پتا ہے کہ ایک روز انہوں نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ۔



بانو قدسیہ

نام	قدسیہ بانو
قلمی نام :	بانو قدسیہ
پیدائش :	۱۸ نومبر ۱۹۳۸ء بمقام فیروز پور مشرقی پنجاب بھارت
تعلیم :	ایم۔ اے (اردو) گورنمنٹ کالج لاہور۔ ۱۹۵۵ء
	ابتدائی تعلیم فیروز پور مشرقی پنجاب میں پائی۔ میٹرک دھرمالہ سے کیا۔ ۱۹۳۸ء میں کینٹر ڈکالج لاہور سے بی۔ اے اور ۱۹۵۰ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے (اردو) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

فیروز پور مشرقی پنجاب میں جات خاندان کے بدر الزماں خٹہ کے ہاں پیدا ہوئیں، جو ضلع حصار کے ایک نکوئی قادم میں ملازم تھے۔ ۱۹۴۲ء میں ساڑھے تین سال کی عمر میں باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ بچپن اور لڑکپن فیروز پور میں گزرا۔ قیام پاکستان کے بعد والدہ، ڈاکٹر خٹہ کے ساتھ لاہور منتقل ہو گئیں۔ المانہ ٹھاری کا مشرقی لڑکپن سے تھا۔ میٹرک کے بعد کینٹر ڈکالج لاہور میں داخلہ لیا، جہاں سے بی۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۵۵ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے (اردو) کیا۔ اشتیاقی اصداغ کے ہم جماعت تھے۔ ۱۹۵۶ء میں شادی کے بعد دونوں نے مل کر ادبی مجلہ ”داستان گو“ لاہور سے جاری کیا۔ بانو اور اشتیاق اس پرچے کو اپنے ذاتی پرچس سے شائع کرتے تھے اور بچوں بانو اور اشتیاق ”داستان گو“ کے ایڈیٹر بھی تھے اور مٹھیں میں بھی۔

بانو قدسیہ نے ۱۹۵۰ء میں ہاتھ دھو لکھنا شروع کیا۔ پہلے کے لیے سات ڈرامے ”اہل کرم“، ”سنگر حیرے لیے“، ”اک حیرے آنے سے“، ”بزدلی“، ”یہ جنوں نہیں تو کیا ہے“ اور ”منزل منزل“ کے علاوہ ریڈیو کے لیے ”ماہ“، ”اس دیوانگی میں“، ”اُورنی“، ”کرم فرما“، ”دھواں“، ”اپنی مازی“، ”کجا دا بگڑا“ اور ”سایہ گل“ (سیریز) لکھی۔ ٹیلی ویژن کے لیے ”سہارے“، ”لب پہ آتی ہے“، ”صبح کا ستارہ“،

”آدم کے بعد“، ”سچ“، ”زخم خورہ“، ”تکلی اپنی اپنی“، ”نصیری ڈائری“، ”ساقول مؤرخہاں“، ”تراویہ“، ”سدرہاں“، ”مغربی قلم“، ”تقسیم“ اور ”گورنگاپ“ (آرامے اور سیرلی) لکھے۔ ”سلسلہ شہاب“ ”قدرت اللہ شہاب“، ”آئی سی ایس“ کوئی کا درجہ دلانے والے ہوئے۔ شاہد احمد بلوی، ممتاز مطلق اور اشفاق احمد کی واحد خاتون رکن۔ روشن خیال افراد کے خیال میں برہمت چندا نہ سوچ کی حامل۔ محدود تحقیق، لیکن قدرے عملی و جان وراموں کی خالق۔

اؤ لینن مطبوعہ افسانہ:

”دانا رنگی شوق“ مطبوعہ ”ادب لطیف“ لاہور ۱۹۵۴ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ ”بارگشت“ (افسانے) فیض گل کتب گھر، لاہور طبع اؤل۔
- ۲۔ ”امر علی“ (افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع دوم ۱۹۹۳ء
- ۳۔ ”کچھا اور ٹھیں“ (افسانے) مکتبہ اردو، لاہور طبع اؤل
- ۴۔ ”رانت کا دھڑ“ (افسانے) فیض گل کتب گھر، لاہور طبع اؤل
- ۵۔ ”ایک دن“ (افسانے) مکتبہ بھری لاہوری، لاہور طبع اؤل
- ۶۔ ”موسم کی گلیاں“ (افسانے) مکتبہ بھری لاہوری، لاہور طبع اؤل
- ۷۔ ”نہ واد“ (افسانے) داستان گرد، لاہور طبع اؤل ۱۹۶۰ء
- ۸۔ ”شہر پہ مثال“ (افسانے) انجمن دانش، لاہور طبع اؤل
- ۹۔ ”راگ گھڑ“ (افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع اؤل ۱۹۸۱ء
- ۱۰۔ ”آدھی بات“ (سچ اور اسے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
- ۱۱۔ ”اک حجرے آئے سے“ (سچ اور اسے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
- ۱۲۔ ”منزل منزل“ (سچ اور اسے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
- ۱۳۔ ”نما کا دل“ (افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع اؤل ۱۹۸۵ء
- ۱۴۔ ”توہن کی طالب“ (افسانہ نوی کیا بات) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع اؤل ۱۹۸۵ء
- ۱۵۔ ”فلک پاتھ کی گھاس“ (آئی۔ وی ڈرامے) فیروز سنز، لاہور طبع اؤل ۱۹۸۹ء
- ۱۶۔ ”دوسرا دروازہ“ (انکس افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع اؤل ۱۹۹۹ء
- ۱۷۔ ”م قلم زبیر جا“ (افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع اؤل ۲۰۰۰ء

- ۱۸۔ "سماں بہ جزا" (تحریر افسانے) رنگ میل جلی کیشنر، لاہور طبع اول: ۲۰۰۲ء
- ۱۹۔ "دوست بہت" (ادبی افسانے) رنگ میل جلی کیشنر، لاہور طبع اول: ۲۰۰۳ء
- ۲۰۔ "دوسرا قدم" (ڈراما) رنگ میل جلی کیشنر، لاہور طبع اول: ۱۹۹۵ء
- ۲۱۔ "معا کے نام" (ڈراما) رنگ میل جلی کیشنر، لاہور طبع اول: ۱۹۹۶ء
- ۲۲۔ "سورج کبھی" (ڈراما) رنگ میل جلی کیشنر، لاہور طبع اول: ۱۹۹۶ء
- ۲۳۔ "تھاٹھل" (ڈراما) رنگ میل جلی کیشنر، لاہور طبع اول: ۱۹۹۶ء
- ۲۴۔ "مردانہ شتم" (خاکس) رنگ میل جلی کیشنر، لاہور طبع اول: ۱۹۹۶ء
- ۲۵۔ "دو آنے" (بچوں کے لیے) شیخ فاطمہ علی ایڈیٹر، لاہور طبع دہائی: ۲۰۰۷ء
- ۲۶۔ "چهار بجن" (چار ناٹک) رنگ میل جلی کیشنر، لاہور طبع اول: ۱۹۹۹ء
- ۲۷۔ "کھلاورنگھیں" رنگ میل جلی کیشنر، لاہور
- ۲۸۔ "آسے پاسے" رنگ میل جلی کیشنر، لاہور
- ۲۹۔ "سدرہاں" (جنگلی ٹی۔ وی ڈرامے) رنگ میل جلی کیشنر، لاہور

مستقل چٹا:

پاکستان سرائے، ۱۳۰، سیٹل ٹاؤن لاہور نمبر ۱۳ پاکستان۔

اعزاز:

تمغہ امتیاز (برائے ادب) حکومت پاکستان کا سول اعزاز، ۱۹۸۳ء

نظریہ فہن:

"میرے سالانوں میں وہاں سے زیادہ اُس کا تجویہ ہوتا ہے۔" بانو قدس

(بہ حوالہ: "یہ صورت گریکھ خواہوں گے" مرتبہ: طاہر محمود ص ۲۹۳)

انتر ہوت اُداسی

بانو قدسیہ

پہلی بار تھی۔ اس کے بعد دوبارہ ایسے ہوا۔ بالکل ایسے۔

جب میرا باپاں پاؤں ہانسی کی چڑگی کے آخری داغ سے پر تھا اور میرا لایاں چڑگن کی ہنگی تھی سے چرائیج اور اچھا تو پیچھے سے۔ اس نے میرے بال ایسے بکڑے جسے سے چڑے پر چٹل چٹکتی ہے۔ میرا تو ان بکھریا نگرا کہ میں کپڑے کی گڈی بھی اڑنگ ڈنگ ہنگی تھی پر ہاگری۔ اس کو کھٹے مٹی دینے یا دھما مارنے کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ جب انسان کسی سے گھڑکڑا رہا تو اس میں اتنی جان ہی کہاں ہوتی ہے۔ مجھے تو ایک گرم سانس اس وقت چادر میں شائے گر سکتا تھا۔ اس نے تو پھر ہمارے مار کر میرے بال گھمڑے تھے۔

”بول بول اس بھری دودھ میں تو کہاں سے آ رہی ہے؟ سسکتی تھی کہاں تھی تو اس وقت؟ بول۔ گری ایسی کہ چھاؤں سے دھرتی پھٹ جائے اور قطر کوٹے پر کیا کر دی تھی نا سسکی؟“

میں چپ رہی۔

”بول کون ہے وہ؟ اور نہ کوئی کمرہ لگی پھرا رہ کیا لینے لگی تھی تو؟ جس پارہا جی سے لئے تھی تھی اس کا میں لہو پل ہاؤں گی۔ بول اس کا

۴۴ ”

میں اور بھی کوئی ہو گی۔

میرا نام بھی بڑا چپ آ دی تھا۔ لیکن اس کی پاپ اس کا گلا پھن اس کے سر میں ہمت سب اس کو ستانے کے لئے ہو جتے تھے۔ اسے اس کو ترچا نے میں بڑا سزا تھا۔ دوا پنی جی جی سو پھلوں سے مسکا تا رہتا ہاں کی کسی بات کا جواب نہ دیتا۔ وہ اس بکھری میں رہتی صفائی کے لئے کبھی ایک لفٹ بھی منہ سے نہ نکالتا۔ اس پاپ میں اما کی ساری عزت اور زندگی بھر کی حیثیت پنہاں تھی۔ جب اس بول بول کر بکھن ہو جاتی تھیں۔ بدنام نہیں کوٹنے آجی اس سکیاں سب باری باری اپنا پنہاں دھم کر چٹکتیں تو اس بکھن ہو کر دھار کے ساتھ کڑی چار پائی آنکھیں میں بچھاتی اور

اس پر اوروں کی لٹ جاتی۔ ایسے میں ہادی روٹی کی طرح اس کے چہرے پر ہنس مٹ دارغ ہے نظر آتے تھے۔ لکھے ہاں پر بدلتی آواز آتی۔ لیکن ادا مختلف تھا۔ صحت مرد کے اس کھیل میں جب وہ جیت پاتا۔ تو چکر چارٹانے کا کہیں کھڑے پر ڈال کر یوں لگن ہاتا جیسے پہلا ان اکھاڑے سے کشش جیت کر جاتے ہیں۔ ہاں پھر سے اور ادا کے درمیان بے غور کھانے والی گیت تھی۔ چھوڑ دے تھرانی تو بچا کھا کر ادا کی طرف جاتی۔ وہاں چتر سے سر چمڑ کر کھڑک کر میری جانب آتی۔ ہاں کی ساری عمر اس بے مصرف ٹیٹ تھی اور پہ پانی میں گزر گئی اور ساری عمر اسے علم نہ ہو سکا کہ یہ کھیل صرف اسی کو تھکانے والا تھا۔ بڑی دامت کے ادا لوتا تو ہاں ایسی غیر سوتی ہوتی جوڑ چوکچی کی پیدائش کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ میں کئی کی کھلتی ادا صحت سے میرے سر پر چاندھ و جھیرا اور چپ چاپ اندر چلا جاتا۔ ادا کی ہر بات میں کہے جگہ بھڑاتی تھی وہاں کی باتیں ایسے تھیں جیسے گوشت سے آنے کی بھری لکڑی پر اوپر ہی اوپر کھیں۔ جھنڈا ہی ہوں۔ میرے پے کچی کھنڈ پڑا۔

ادا بڑا نصیب آدمی تھا۔ لیکن ادا کی بچہ میں ایک حال تھی۔

میں اپنی طرح پُپ نہیں۔ میری پُپ حویلی کے صدر دروازے کے قدموں میں گرے ہوئے اس لٹکی کی مانند ہے جسے کچھل مارتے چہرے دروازے کے کھڑے سے اتار کر پھینک گئے ہوں۔ ایسا کالا بہت بڑا کہتا ہے جس کوئی تفصیل جان کر نے سے عاجز رہتا ہے۔ وہ ساری باتوں سے آگاہ ہوتا ہے لیکن اپنی مسئلہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ حفاظت دیکھنے کا غم اپنی بیچ میدان کی کاس اس لمبے انگلیوں کے ساتھ گوری دیا ہادی کا حیرت انگیز انکشاف اسے کم سم کر دیتا ہے۔ میری اور اپنی پُپ میں بڑا فرق تھا۔ اب ان اونچے پیراؤں کی طرح پُپ تھوخن کے قدموں میں لہریں شور مچا کر سو رہی ہیں۔ میری پُپ اس لادے کی مانتو جی جڑ میں سے اُتر کر دھلتا لہزتا بیٹھا کہیں کا کہیں رہتا ہے۔

’نہال! ایچ کیوں کھڑی ہے اپنے کچھ باپ کی طرح۔ بول کس بار کی مٹل گرم کر کے آئی ہے؟‘ مراد؟ ”اوی مصیبت کے“
 ’جی! ہاں! اب سب کچھ سال پہلے ہی مجھے خاموشی اختیار کر چکی تھی۔ وہ صاف نیاں ٹٹیاں کرنے کے پختہ ہو گئی تھیں۔ میں اب
 کیا کرتی؟ کہاں سے شروع کرتی؟ اور کہاں جا کر ختم کرتی؟

”بھئی! اہرا کو کھانا مارے کھلے سے بچا ہے۔ کس کس نے تجھے آتے چاہتے دیکھا ہوگا۔ بول؟ کچھ مرے سے پہلے چہری

ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے بھی صبری چائی تھوڑی کر بھی کیا تھا۔ میں اس کو کیا بتائی کہ ابھی ابھی میں اس کے سوسے بھی نہیں کرتی تھی۔ 'بولتی تھی کیوں نہیں نہ دے کیوں جاتی ہے۔ کسی اور کو ملنی کی ضرورت ہے تو طرح میں کس کا۔ بولی دوتی کیوں جاتی ہے۔' کہہ تاتی کیوں نہیں؟" "دوسرے کہہ تاتی اور نہ اس کو سمجھیں سے لگے ہوں لگتا ہے کہ اگر میں نے کسی سے کہہ دیا تو کہے گا نہیں اتنا نہ کچھ کہہ کر میرا شرم ہو جائے گا۔

[illegible]

خسرہ نکل آئی اور دوپہر سے انھیں ان چنگ پر چٹھی رہی گوہر نے کہا مجھے پائے پونے میں اسے جو مصیبت امر خطے قربانیاں دلائی رہیں ان کا آگھوں دیکھا حال بیان کرتے کرتے شام داخل ہو گئی۔

جب میں باہر گئی تو ماں کی ساری گھیس نکل چکی تھی۔ وہ ایک بھولے مصوم بچے کی طرح اتنی ہار پائی پر گھنوک سوری تھی اور اس کی ہاتھیں گال پر ہان کی۔ میوں کا چال سا ہوا تھا۔ شام کو ہم کے درخت پر ان گنت چڑیاں بچھا رہی تھیں لیکن ماں کو ان کے شور کا علم نہ تھا۔ ایسے میں اگر میں کسی کے ساتھ برک چلتی تو بھی ماں کو علم نہ ہوتا۔ لیکن میں یہاں تک کسی کے ساتھ نہ جھن موڑوں کہ وہ بھگالے جاتے ہیں خدا جانے وہ کہیں ہوتی ہیں؟ ہم بھی لڑکیوں سے تو کوئی بھگالے جانے کا وعدہ بھی نہیں کرتا۔

میں پاپ چاپ چار پائی کے پائے سے سر جوڑ کر بیٹھ گئی ماں کے سوائے اس دریا میں میرا تھا بھی کون۔ اما کا بھی سوائے ماں کے دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ لاکھ ہاد کر سے گیا اور پھر اس نے ٹوٹ آ یا کہ اس کو نے بچے کو سنبھال کر رکھنے والی ایک ہی گھوڑی تھی۔ میرا اما کا گھنوں تھا اما کا گھنوں کی آواز گھنوں تھا کہ وہ بھولنے والی نکلیاں بھی بھلا کھڑے پھوڑ جاتیں۔ وہ بہت کم کھاتا تھا کیونکہ اسے خوارے توڑنے سے وحشت ہوتی تھی۔ آدھے پنڈے سے زیادہ کھا تو کبھی وہ ایک وقت میں صابن نہیں لگا سکا ہی لئے وہ نہانے سے ہی کترا تھا۔ سرویسوں میں بھڑک لاف کے چڑا رہتا۔ گرمیوں میں پیسے میں لہانے نظر آتا لیکن پچھلا کبھی نہ چھلکتا۔ اما اس کھتی سے متا بہت تھا جو بچے کھلی ڈھڑا کھینچے وقت کھو، لینے ہیں۔ کبھی کبھی برساتی پانی اس میں آپ ہی آپ بھر جاتا ہے ورنہ زیادہ عمر اس کی نہ کھولے ہی گزرتی ہے۔

ماں نے ساری عمر اما کا ساتھ دیا۔ بول کر اٹھنے دے کر لکھان بھڑک سسکیاں بھر کر با پودہ پلا۔ ہم دونوں بچے دو دو ماں سے سر پھوڑ پھوڑ کر ماں پوڑھی ہو گئی اس پوڑھی نیم جان گھٹاں کو بھی کیا تاتی۔ کہاں سے بات شروع کرتی اور کہاں جا کر ختم کرتی۔

ہمارے گھر میں ہر اس چیز کا قصہ ان تھا جس سے زندگی پر دان چڑھتی ہے سرشار ہوتی ہے۔ دولت، شرافت، نصیبت ان چیزوں کا ہیوٹ کھا تو ہار پلا۔ ہمیں تو ہر چیز ایسے کی کہ سنا نہیں تھا مگر رہیں۔ لیکن زندگی کے آ جا کر کل کر پینا اندھوئے۔ جب میں تین سال کی ہوئی تب سے ماں ایک قریبی چھتری میں کاسر کرنے جانے لگی تھی۔ اما اور میں گھر پر رہے تھے۔ ہم دونوں اپنی اپنی روپ کے قے میں بند سارا دن پاس رہتے ہوئے بھی بہت دور دور رہتے۔ جب اما گھر پہنچتا تو میں لگتا تھا جیسے کہیں باہر گیا ہو ہے اور جب وہ باہر ہوتا تو لگتا تھا کہ وہر بھری کہیں ہوگا۔

بچہ عمر میں اسکول جاتی رہی پھر یہ سلسلہ طرح کی زیادتی کے باعث بند ہو گیا۔ یہ بھی ایسا ہوا کیونکہ اسکول مجھے دل سے نہ لگتا تھا۔ وہاں سب لڑکیاں بڑی خوش خوش آتی تھیں۔ ان کے پاس تانے کے لئے اتنی ساری ہاتھیں ہوتی تھیں کہ وہ آسانی کے نہ جاتے وقت بھی راتوں پر بیٹا مات لگھ لگھ کر ایک دوسرے کو پہنچاتی رہتی تھیں۔ مجھے میری کاس کی لڑکیاں "مل جو رہی تا ساں چوڑی" چلا کرتی تھیں۔ لیکن میں ان کو کبھی چلنے کا ریکہ نہ کھیتی تھی۔ ان کی بیچیز چار اس طعنہ دہن کے مقابلے میں پھول کی پھڑکی تھی جس سے میرا دل میری تواضع کہا کرتا تھا۔ اسکول سے بہت کم میری زندگی بھر کوئی نہ کی مال بن گئی۔ ہر وقت وہی میاں و ستا مڑی پھو بھرائی وہی چوچے بھڑنگ کی، کبھی میری نہیں۔

بھرا ہوا رہ گیا۔

اس وقت اس نے ہار خانے و ملاکمل ہوز مالا اپنی خاموشی کی مسوری تانی اور پھر بہت کے لئے پاپ ہو گیا۔ ماں دنگ ہی رہ گئی۔ ماں نے لوٹے لوٹے میں ڈالے خند ہر ماں سے گھرائی۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھڑنگی کی طرح قہقہہ لگی۔ ہمارے نہ کوئی رشتہ دار آئے نہ فقر آن

ختم ہونے کے غصیلوں پر مبنی تھیں۔ بس مجھے دلوں نے چندہ کر کے ماں کے سر سے بوجھ اٹھا دیا اور سوئم کے بعد ماں بھر بھڑکی رہاں گی۔
اب اب ہر وقت گھر میں رہنے لگا۔

اس ادا سے خوف زدہ ہو کر کش کوٹنے پر چڑھ جاتی۔ ہمارے گھر کی جیت پر اونچی اونچی منڈیریں نہیں تھیں۔ بس اچھرواں کنارے تھے جن کی سوچی مٹی میں گلے چپکتے رہتے ہیں۔ اس کنارے پر بیٹھے ہونے لگے گھر سے آتی ماں دکھائی دیتی تو میں بچے چلی آتی۔ مجھے میں بہت لڑکیاں تھیں جنکی بھری پشپ کا جلا کھول کھول کر وہ سب بڑھ کر ہو چکی تھیں۔ اب میں قحی اور کوٹھے کی منڈ پر آسمان پر اڑنے والی پتیلیں اگلے کے کبوتر اور شام کو لٹنے والی کوئل کی قطاریں۔

ایک روز چوتھے کوٹھے سے لگے سنی کی آواز سنائی دی۔ تب مجھے معلوم نہیں تھا کہ سنی جانے والا قدر کوٹھے والا ہے۔ جب مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ قدر کے پاؤں بچے ہیں اور اس کی بڑی گھل کی سب سے خوبصورت صورت ہے۔ مجھے تو صرف اچھا دکھائی دے، ہاتھ کا قدر کا پکا گھر سارے گلے میں خوبصورت طور پر اچھا تھا۔ اس کی کھڑکیوں میں پردے تھے اور اس کی دیواروں پر جالہاں بنی ہوئی تھیں۔ سب سے اوپر ایک ہوا دار کمرہ تھا جس کی کھڑکیوں پر نیم فیر دھری نیم ہر آواز آتا رہتا رہا کہ کیا ہوا تھا۔

بچی کمرہ میرا پہلا گھر تھا۔ اسی کمرے میں پہلی بار قدر نے مجھے اپنے کھوکھے سے لاکر خضریٰ کو کا کا کلا چائی۔ چائے تک کے کپ قلعی پاؤں کا کچا کی چڑیاں اور تک سب ڈالنے والا بڑا چمکدار لیکن بھونکا کا کا دیا۔ قدر کی ہر بات اپنے کھوکھے کی طرح تھی۔ وہ تھوڑی قیمت پر زیادہ مال خریدنے کا مادی تھی۔ اس کے ہاں ادھار قحی بند تھا اور وہ کسی گاہک کو بھی مارا تھلی کا موقع نہیں دیتا تھا۔
پتا نہیں میں ابا کے اصرار سے وہاں جاتی تھی؟

پتا نہیں جوانی میں تنہائی کا ساپ کیوں ایسے بلوں میں لے گھتا ہے؟

خدا جانے سیری عطیلیانی کی بھر کچھ کھانے، کچھ پینے، کچھ دھوتے جھونکر گزارنے کی خواہش تھی مجھے وہاں کھجکا کر لے جاتی تھی۔ نا نا کبھی کبھی کوئی بچہ نہیں بھی ہوتی۔ اس ننھی انسان زندگی کے پیسے میں دھنم کے تھان کی طرح اٹھتا چلا جاتا ہے۔ قدر کو اپنے خاندان سے بڑی محبت تھی۔ وہ باسیوں، بھو بھو، ان ہم زلفوں کی باتیں کرتا تھکا تھکا تھا۔ اسے اپنی بڑی سے بھی بڑی محبت تھی کیونکہ اس کی بڑی اس کے خاندان کا ایک اہم حصہ تھی۔ وہ دو سال کے لمحوں میں بھی اسی کا نام لے لے کر مجھ سے پلتا رہتا۔ اس کی محبت پھر کے اعزاز کی تھی جس سے میرے لیے کھانے کی بھی زندگی ہو کر نہ گرتا۔ بلکہ اوپر ہی اوپر۔ اور اوپر لڑتا چلا جاتا۔

اپنے بچوں کی باتیں کر کے قدر کو بڑی خوشی ملتی تھی۔ اپنی خاندانی سداوت کا اپنی گھلکی سا کھور برادری کی عزت کا اسے بڑا پاس تھا۔ قدر بھی راسل غفلانی سے ہوا آٹھا تھا۔ اس کی سادہ زندگی بھی سوا خیرے کے جانوں میں چپ قلعی کر گزرتی تھی۔ وہ اتنی چھوٹی عمر سے کھوکھا چلا رہا تھا کہ اب اس کی اپنی زندگی خانی کھوکھے کے علاوہ اور کچھ نہ تھی۔ ان سب قہودے کا جو وہ بڑے استقام سے مجھے ملتا تھا وہ بڑے حساب سے اپنے کھوکھے سے سنا بیچتی تھی میرے لئے ہوتا تھا اس کے ہاں بچوں کی حق تلفی نہ کرتیں۔ وہ اپنی زندگی کی لذتیں بچوں کو کھلی کرتا تھا جیسے کوئی بڑی بی صاحب کا پاؤں لگا رہی ہو۔ برابر کا چونا برابر کا کھٹکا، تنگی بھر زدہ۔ اس کی جذباتی زندگی بھی ایک خاص پائے پر پہنچی تھی۔ نہ یہاں کوئی ادھار تھا نہ فضول لڑ پتی۔ وہ جو کچھ مجھے دینا چاہتا تھا اس کی قیمت وصول کر لیتا۔

لیکن بھری ہول بھار سے وہاں اس سے یہ سب کچھ کیسے کچھ ملتی تھی؟

جب بڑی ختم گئے اس کی آنکھ کھلی تو چند لمحوں کے بعد کھینچ رو گئی۔ میں کبھی خود یہ فلم نے اس کے ذہن کو مازوف کر دیا ہے۔ لیکن پھر وہ میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولی "بول بولت کون سا سینہ کا ہے تجھے بول مر؟" میں اسے کیسے بھائی کہا ایسے جیسے دادوں کے ساتھ بیٹھے نہیں چڑھا کرتے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ زندگی طبع آتا ہے نہ قصاص۔ صرف زندگی کا بھی کھانا ایسے بھروسوں سے ہر جاتا ہے جنہیں کوئی چہرہ نہیں ملتا۔

"بول بھڑکے گی تو اس سے بول؟"

ہرے ہاتھ کا چٹا آؤ اور بھلی کی طرح میرے جسم سے گزر گیا۔ میں اس کو کیا بتائی کہ مجھے قدر سے ملنے کا جیسا عاشق بھی نہیں تھا۔ یہ بات اگر میں قدر پر اس کو سمجھانے کی کوشش کرتی تو غالباً وہ دونوں مجھے جان سے مار دیتے۔

"بول کشتی بول حرام خدا لے گی اس سے ؟"

میں نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ اپنے دکھ کی وجہ سے نہیں۔ میرے اپنے کوئی دکھ نہیں تھے۔ لیکن میں اسے اس قدر بیان کرتے دیکھ نہیں کھتی تھی۔ اگر وہ مجھے مارتی رہتی تو شاید مجھ پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ لیکن اب وہ اپنے منہ پر چائے مار رہی تھی۔ اپنے بال کھسوت رہی تھی۔ اسے یوں اپنے سے جدا لیٹے ہوئے دیکھ کر مجھے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔

میں نے بڑی تمہیں کھا نہیں کہ بھر قدر سے نہ ملوں گی۔ قرآن اٹھایا۔ اس کے بعد میں کبھی قدر کے کھٹے پر نہیں گئی۔ لیکن اس چمک سارا دن چھتری میں کام کرتی تھی اس لئے اسے کبھی یقین نہ آ سکا کہ میرے مہر ہے جی۔ وہ مجھ سے بڑی جانا ہو گئی تھی۔ جب میں سو جاتی تو وہ چوری چوری آ کر میری قمیص میرے پیٹ سے اٹھاتی اور بڑے پلے پلے ہاتھوں سے میرے پیٹ کی نو لہجی۔ اسے پورا قبضہ تھا کہ چاندرونی اندر بڑا حد ہے۔ کبھی کبھی رات کے پچھلے پھر وہ میرے سر ہانے بیٹھے کر ہوئے ہوئے روئے لگتی جیسے بلیاں مستی میں آ کر بولی ہیں۔ قدر نے میرے کھانے کو کھار کبھی نہ کھو۔

نہیں کبھی اس کے کھٹے پر گئی۔ دہلی رقم پر وہ زیادہ وقت ضائع کرنے کا مادی نہ تھا۔

اسنے سارے سبیل جہل کے باوجود نہ کوئی طبع ہوا نہ قصاص۔ زندگی چلو بھر پانی کھینچ رہی۔ نہ کوئی غصائی آئی نہ سیری کا احساس نہ تھا۔ بس صرف سانس کی آوری نہ ہوتی۔

پھر ایک دن چھتری سے اس بڑی خوش دہلی۔ اس کے ہاتھوں میں مٹائی کا بڑا سا پتھر تھا۔

"لے لے لے پھر لے لے میرے تو نصیب کھل گئے آ چند بے مٹائی کھا۔ میری بات بکری کے آئی ہوں ہوا ہی بارغ میں "

بات بکری کرانے کا شوق میرے دل میں قدر نے لگا دیا۔ وہ اتنی پریت سے اپنی بات کی باتیں کیا کرتا تھا کہ میرا دل بھی کرتا کوئی میرے حلقہ الکی ہی باتیں کیا کرے۔ میرا خیال تھا کہ ایک روز مجھے دیکھنے والا آئیں گی۔ پھر ایک سہرے وہ چہرے پر وہ مال رکھے آئے گا۔ میں اس کے چند ہاتھوں کو کھینچ کر سے قسمت ہو جاؤں گی۔ مجھے کل کے اس پار جانے کا بڑا شوق تھا۔

"آ۔ منہ لپٹ کر نہ چڑی رہا کر۔ تیرا نکلا تھو لٹھ نے خود کیا۔ شہر صاحب کی بیوی خود میرے پاس آئی۔"

"سن رہی ہے ہجرہ؟ تازاں بیٹی سن رہی ہے ؟"

"سن رہی ہوں اس "

”پھر خوش کیوں نہیں ہوتی ؟“

”خوش ہو رہی ہوں ماں“

ماں رونا دھاری سے میرے پاس آ کر بیٹھی ہوئی آواز میں بولی ”نچھری جیڑی بولی میری سبک کا بیٹا ہے۔ بچہ حاکم تو نہیں ہے پر جانیدا کا کیا راستہ ہے۔ ہم تو جانیدا کا لفظ جس سے نہیں لے سکتے تو جانیدہ اور اہل ہو جانے گی۔ میں خود ہادی باغ کی جی نچھری صاحب کی کمر میں گھر و کچہ کر آ رہی ہوں۔ پہلی سوئی ہے وہ منزل۔ چھپے رہنے پر پہلی دو چٹان کا لیکن سب تکہ ہے گھر میں لے لاء کھا۔ اوپر والی منزل میں لاکر رہتا ہے۔ بڑا گھر ہے ساری عمر رہتم پہنچی۔ اس کے کھٹے کے کھڑکیوں سے بچی رہے گی۔

خوش ہو جا جس کو کوئی سدھارنے والا نہ ہو آپ اس کے کام کرتا ہے رنج کھاتا رنج سوتا ۔“

بڑی دیر بعد میں نے پوچھا ”اور وہ دیکھا ہے ؟“

”جیسا گھر ہوتا ہے ویسے لوگ ہوتے ہیں اس میں رہنے والے ایسے گھروں میں کوئی ہمارا ٹھوڑی رہے ہیں۔“

”کبھی ملے گی اس کی“

”ماں خوبصورت ہے تو جتنا بھی خوبصورت ہوگا۔ گوری چلنا یہ بڑا سا کواکاک میں پڑا ہوا چڑیوں سے گھرا ہوا کوئی چاری ہاتھ کرتی ہے ہار د کوئی چاری ہاتھ کرتی ہے۔ بیٹھے لیکن جی کھا پئے لیکن جی پو گولی کر کے پیچھے دکھائیں۔ بیٹھا لیکن جی کہ گرم میرا تو لی ادھاں سے آئے کوئیں کرتا تھا جی ہار د۔“

میں باپ رہی۔

”ہادی باغ والی کبھی بھی ہار د ابھن جی میں صرف لڑکی چاہے جو ہمارے گڈو کو خوش رکھے اس سے ہادی کرنے اس کا دل نکالے۔ میں کسی چیز کی طرح نہیں۔ میں کوئیں چاہئے اللہ کا دیہت کچھ ہے۔ اگر میں لالچ ہوتا تو ہم امیروں کی لڑکی لگی کی لے آتے۔ ہمیں تو یہ چاہئے فریبوں میں غیرت ہوتی ہے محبت ہوتی ہے شرافت ہوتی ہے“

میں امدادی انداز میں دی۔ ہادی باغ والی نہیں چاہتی تھی کہ ان ہی چیزوں کے فقدان سے غریبی پیدا ہوتی ہے دولت کا فقدان تو نقص غریبی کو سدھار دیتا ہے۔ اصلی ہار د ان چیزوں ہی کے نہ ہونے سے ہوا کرتی ہے۔

”لے سوئے کھا اصلی سوئی چور کے لاء وچرنے لکھا“

اماں اس روز بڑی خوش تھی۔ وہ ہادی سے ہوتے ہوئے کہہ نکلتی رہی۔ پھر کھلے والوں کو چہرے خانا لے چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کا چہرہ دغا کر رہا تھا۔ میں نے ہاں کو اس قدر خوش بھی نہیں دیکھا۔ نکاح سے ایک رات پہلے تو اس ای طرح فحشی نکلتی رہی۔ شادی سے ایک دن پہلے جب شام کو ہادی باغ سے لوٹی تو اس کا چہرہ بھجا ہوا تھا اور وہ پپ پپ تھی۔ مشکل سے وہ سوت کیس لاکر آگن میں دکھا جس میں کپڑے اور زور تھے۔ اس کے بعد وہ بغیر گھٹے آواز دیے اندر فصل خانے میں چلی گئی۔ خاس نے سوٹ کس کھول کر مجھے کپڑا زور دکھائے نہ مٹے سے کچھ بولی۔ اس رات کے بعد میری ماں نے پھر مجھ سے کوئی بات نہ کی۔

آدھی رات کو میں اس کی سسکیوں کی آواز سن کر جاگ گئی۔ وہ سوٹ کیس کھولے کپڑوں کو گھور رہی تھی۔

”کیا ہوئی“

”کہو نہیں تو سو جا“

”نہر تو رو کیوں رہی ہے؟“

ماں مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے چہرے کو سنے ہندو مائیں زندہ ہوا کرتی تھیں۔ آج مجھے اس ہنگامی سے یوں لگا کہ کوپا اس کی ہاں جسم چھوڑ رہی ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے چمکنے کا فلم کر رہی ہے۔ لیکن میرا اپنا دل ہر قسم سے جذبات سے خالی تھا۔ یہاں نہ کسی سے ملنے کی خوشی تھی نہ کسی سے چمکنے کا رنج۔ میری زندگی کے بار و سہاں تو یوں گزر رہے تھے جیسے کسی گودام میں بے سال کا کینڈر رکھا دکھا پرانے سالوں سے جا لے۔

ماں صبح تک مجھ سے چلی رہی اور وہ جی رہی اور جب میری شادی کا دن طوع ہوا اور اس کی نکلی۔ سفیدی اچھلنے لگی تو ماں بولی ”اچھا ہندو! وہ انصاف سے نہ چمکنا۔ عورت کی ساری زندگی انصاف سے نکلتی ہے۔ مجھے دیکھو تیرہ برس کی طاقی آئی تھی۔ ایک دن شوہر کی کمائی کا چھوڑ دینا۔ تب تک نہیں ملا۔ ایک دن اس گھر کے مالک نے مجھے چلی بھر بیاہی نہیں دیا۔ پر دانے میں نے انصاف سے چمکنا نہیں کیا۔ جو میرے کرم اچھے ہونے تو سب کچھ مل جاتا تھا۔ ہاں بارے بغیر مل جاتا۔ سختی ہے کہ نہیں؟ کسی کو اللہ دولت دے دے تو اللہ انصاف دے دے تو اللہ انصاف نہیں ملتی۔ اسے ہمارے اللہ نے نہیں مانے جیتے فلم کھائے ہیں۔ سب اپنے اپنے گھر کے گھر کے گھر کے ہیں اس جہان میں۔“ نکلی بار مجھے شک گزرا جیسے ماں مجھ سے کچھ چھپا رہی ہے۔ مجھ سے جھوٹ بول رہی ہے۔ کیونکہ ان دنوں کی اسے عادت نہیں تھی۔

”کیا بات ہے ماں؟“

”کوئی بات نہیں۔ ہر ماں اپنی کچھ نہ کچھ ساتھ دیتی ہے۔ میں تجھے جی تو دے نہیں سکتی۔ دلا سہمی دے کر رخصت نہ کروں۔“

مجھے روئے آ گیا اور میں ماں سے لپٹ گئی

”بپ میں یہاں سے چنگیری نکلتی ہوتی تو راتے میں کئی مین ہول کھلے کھلے ملنے ہیں۔ اندھیری راتوں میں ان میں رات گزیر کر گئی پڑتے ہیں۔ ہندو! ہاں کچھ لے سوچتے اور بے دے ہر چوڑائی کے ہر گھروائی کے مین ہول بچھا رکھے ہیں اپنی دنیا میں۔ آخر آدمی کب تک بچے گا۔ ہندو! ہر بے بسیاہ زندگی ہے کسی نہ کسی گھڑی تو گزری رہے گا۔“

”تو مجھے صاف صاف بتاتی کیوں نہیں کیا بات ہے؟“ ہوا کیا ہے۔۔۔؟

”کوئی بات نہیں؟“ کہو نہیں ہوا۔ نیا گھر ہو گا نئے لوگ ہوں گے۔ وہاں میری ماں نہیں ہوگی لیکن غریبی بھی نہیں ہوگی۔ ہر جگہ کا اپنا کچھ ہے۔ کچھ نہ کچھ ہے۔ ہر جگہ کی کچھ نہ کچھ ہے۔ وہ بھی سہاں گھر جا کر خوش نہیں ہوتی۔“

”تجھے کسی نے کچھ کہا ہے ماں؟“ طاقتور تھی کیوں نہیں؟

میری ماں لپٹ رہی۔ اس کی پاپ میری اور لپٹ لپٹ سے بھی اٹھ گئی۔ کیونکہ شادی کی دوسری رات میری ماں لپٹ چاہا اس دن دنیا سے رخصت ہو گئی۔ میری سہاں والوں نے خاموشی سے اس کو سپرد خاک کر دیا اور کچھ کو نہ بتایا۔ وہ مجھے دو صدے ایک ہی وقت میں زندہ بنا چاہتے تھے۔

جس طرح ست ماہ سے بچہ مصنوعی حرارت میں رکھا کر اس دنیا میں رہنے کے قابل بناتے ہیں اسی طرح میری سہاں والوں نے مجھے آسائش آرام اور بڑی پالچوسی کی روٹی میں بچھا بچھا کر لگی دن رکھا تا کہ گلو سے بہت پہلے میں اس گھر کی دولت بھری زندگی کی عادی ہو

بھری سانس بندوں نے جلدی سے اسے چھوڑ دیا۔

”کیا کروا رہے گئے؟“

”دیکھو بس! یہ ہے تمہارے پاس نہیں آنے والی نہیں۔ کتنی قسمیں دو لیکن بھاگ جائے گی۔ تو بھاگے گی؟“ اس میں کوئی براہوں میں اپنا قاعدہ دیکھ کر نہیں سٹاؤں؟ کہاں ہے میرا قاعدہ؟“ اس نے کیوں نہیں؟ میں دیکھ کر قاعدہ سٹاؤں۔“

بھری سانس نے اسے پھپھ کرانے کی کوشش کی تو وہ رونے لگا۔

”سب مجھ سے برا سلوک کرتے ہیں۔ مگر کہتے ہیں ہم تمہارا بھلا کر رہے ہیں۔ میں کیوں پھپھ رہوں بڑی آپا۔ تم پھپھ ہو جاؤ! تم دفع ہو جاؤ۔ بھری دو لیکن ہے۔ میں اس سے یاروں کا یاروں کا ہاں یاروں کا“

ڈاکٹر مسمری بھی کبھی یاروں کے ساتھ باندھ کر لگائی بڑی مشکل ہوتی ہے۔ ایک سرے پر ڈاکٹر کا کراس لٹیک کہ تو دوسرے سرے کے ڈاکٹر کے سرک کر پانچوں کے پیچھے سے نکل جاتے ہیں۔ انھیں ایسے ہی بھری سانس بند ہی سمجھ کر کے گٹھ دیکھنا ان کے روپ میں پیش کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ ڈاکٹر مسمری جھ پر تان کر جلدی سے پیچھے چلی گئیں۔ ان کا خیال تھا خطرے سے اوچھل جاتے ہی خطرہ ٹل جائے گا۔ یہ آغا تھا۔

میں ہول میں گرنے کا آقا۔

ایک عام دیوانے شہر کے ساتھ ازرواتی زندگی کا آقا۔ میں نے انکی مریضی اچھا کھاتے پیچھے گزاری تھی کہ اگر گٹھ عام سا دیوانہ ہو تو شاید میں بڑی رضاورفت سے آسائش اور دولت کی زندگی میں ڈوب جاتی۔ لیکن گٹھ وہ باندھنے کے ساتھ عاشق مزاج بھی تھا۔ اسے بظہیر ہونے پر سنے مساس کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس کا بی چاہا کہ میں سارا سارا دن اس کے ساتھ چلک پر چڑی رہوں۔ وہ اسٹے کی میز سے میرا تھو پکڑ کر بھیٹنے لگا

گٹھ دیکھ کر دے چاہو کہ

”ایک بات ہے! بھری چالی ای! ابراہیم بیٹ بات۔ کمرے میں کرنے والی۔“

”نوسٹ تو قسم کر لینے دے چکاری کو۔“ بھری بڑی تندہی۔

پھر وہ سب کے سامنے میرے کان میں منہ ڈھکی کہ ایک آدھا لی بات کہتا ہوں سب کو سنائی دیتی اور جس کا قصق جسم کے ایسے حصوں سے جوتا جن کا اگر عام طور پر لوگ نہیں کیا کرتے۔

”اتھو میں ضروری کام ہے۔“

”تو چل! ابھی آجائے گی ابھی۔“

وہ مجھے دوپٹے سے گھٹایا شروع کر دیتا۔

”جلدی چل! چل! ہاں۔“

کمرے میں پہنچی کہ میرا پتھر کا بولنا سے پرے پرے کرنا سب بیکار تھا۔ وہ بندوں کی طرح ایک ایک کر مجھے چومنے لگتا۔ میں زبرد کھڑا ہونا نے میں جھٹ کرتی تو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ جاتا۔ ایسے ہی لمحوں میں گٹھ مجھ پر جلدی ہو جاتا۔ کیوں کہ اس

سنہری پائوں والے دیوانے گورنر کا کچھ کرت جانے کیوں میرے دم کے اندر کہیں وہ کیسی لطیفیں اٹھنے لگیں اور میرا جی اسے گود میں اٹھانے کو بہاتا۔

عجب سے وہی تھے عجب سی راقیہ۔ چیز بظاہر میں آنے والے لوگوں کی طرح ان کا غم ان کی جسامت کی طرح بھی درست نہ تھا۔ نہ جانے وہ کس طرح ۱۵۵ کلو سرج ۱۵۵ کلو تھیں نہ جانے راقیوں کو ان پر ہوتا بھی تھا کہ نہیں۔ میری ساس مہری آؤ اٹھتے ہیں لگی راقی جن سے بڑے ذریعہ خواہم وہ کبڑے آتے رہتے تھے۔ میری ساس مہری کچھ سے شرمندہ و شرمندہ ہے یہ راقی نہیں۔ میرا سسرالہت کبھی کبھی مجھے پاس لٹکا کر زندگی کی رانچ بچھ سہنا کر تھا۔

گندہ پھنگی کبھی پیانے پر نہ آئے تھے۔ وہ سب تو مجھے بڑی امید بخلا رہی تھیں۔ شاید کوئی بھڑکھڑا کوئی کراہت ہو جائے۔ ایسے دنوں میں کوئی گندہ کو پیچھا ہی نہیں سکتا تھا۔ دوسرے دن تو پانی پھینک کر بازو دھو جائے نماز اٹکائے پھر بے پاس آتا اور بڑی مٹھی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا: ”کچھ اجڑا میں مسجد میں عشاء کی نماز پڑھنے جا رہا ہوں“ تم کھانا کھ کر سو جانا“ مٹھی دھو کر نماز کرتی رہتا۔“

چنانچہ بہنوں کے انگوٹے بھائی کی ایسی نازل بات ہی کہ میری ساس کا سپہ بھید بادل ہو جاتا۔ ”سو جائے گی سو جائے گی تم لوگ نہ کرو تم آرام سے نماز پڑھنے جاؤ۔“

پانچ بیٹوں کے انکوائے بھائی کی ایسی بارش تھی کہ میری سانس کا لہو لہجہ بدل ہو جاتا۔ "سو جائے گی سو جائے گی" تم گرز کو رقم آرام سے لٹاؤ گے جیسے جانور۔"

مالیسی پر وہ سب کو سٹم کر کے اپنے کمرے میں آئے۔ بڑی اور تنگ وہ ایک صحمرہ ادبی کی طرح دانت صاف کرتا رہتا۔ پھر صوفے میں بیٹھ کر بیڑی لپ کی روشنی میں وہ کتابیں دیکھتا رہتا جن کا وہ حداس کے لئے مشکل تھا۔ بڑی رات گئے وہ چمک پرآ جا اور پھر صوفے کی طرف چپے کر کے سو گیا۔ مگر رات وہ سو رہا تھا۔ اے مجھے کوئی غرض نہ رہی تھی۔

اچھے ہی دنوں میں دو بڑے قزاقز کے ساتھ میرے سر کے ساتھ ٹیکٹری جا رہے تھے۔ وہ ایسے خاصوٹی سے کیا تاکہ تا ٹیکٹری کے سائل پر ٹھکڑا کر اور پھر مجھے بے نظیر بننا دیکھتے چلا جاتا۔

ان دنوں بھری سماں مذہب سے دو دھڑکے ادا تھا۔

”ہم نے سب کچھ گلا دیا، ہم غفل کر رہا ہے، ہجرہ انکسلی امر ہے“ ٹیکسٹری ”سب کچھ یہ سب تو اپنے اپنے گھر چلی جائیں گی سب کچھ خراب ہے۔ میرا اور گلا دیا۔“

جیدان بلائے کی نکلوان ہو تے تھے۔

اگر میں غلطی سے اسے کسی کے سامنے ہاتھ لگی لگا لیتی تو وہ بدمعاش ۱۴۱۰ ہجری وادگر کرکھتا۔ " کیا کرتی ہے؟ ہر دوامی کا لانا دیکھی نہیں؟ " نہیں! بھری جواں بھنٹوں دیکھتی ہیں۔ "

لیکن یہاں پر کیا ہو سکتا ہے۔ لڑائی لڑو کی طرح کسی شے کے اٹھنے کی گندہ اپنے چرے کو اچھڑا کر اعلیٰ روپ میں آ جاتا۔ جب گندہ ہوش میں جوتا ان ہاتھوں میں اوپر لیے قہقہے ہی قہقہے ہوتے۔ مہری خندوں کے دھنچوں کی باتیں ہوتیں سنا کر انگریز بھی شوق کیلئے ہاتھ دھو کر اس کی دھوئیں ہوتیں۔ مہری سانس فراغت ہوتی ہے مجھے سب سے طاقی اور لڑائی آواز میں کہتی ”مہری ہاتھوں کا چارو اور دیکھا کہ کبھی؟ جو کام آؤ اکثر دیکھ کر تھکے مہری ہوتے کر دیکھا۔ اس سال سے سریت داری گئی ہے گندہ کی اب دیکھ لو چنگا بھلا ہوش بند ہو گیا ہے ہاتھوں نے اسے حرکت دی ہے ہاتھوں نے اسے انسان بنا دیا ہے۔“

مجھے اپنی ساس کی فراخ دلی سے بڑی شرم آتی۔ وہ ماں تھی اس لئے اس کا ہنہ بہ چہ خفا۔ لورڈ میں عورت تھی اور چونکہ میری ضرورت تھی اور میری تھیں اس لئے جو کہ کچھ بھی میں ظاہر کرتی تھی اللہ محسوس کر لے سے جاری تھی۔

اگر میری سانس کا کس چٹا تودہ خود گندہ کی بجائی میں جاتی اور ساری مہرے اپنے ہونے تلے ہوں چمپا نے رکھتی جیسے نیا سوں سوں کرتی اپنے اظہوں کو کہتی ہے۔ کبھی کبھی گندہ چنگ پر چڑھتا ہے کہ وہ خود ہی چادر میں گھسے دھو رہی۔ گھم پر گھم کی دیکھ ہال کا کوئی بوجہ نہ تھا۔ میں اپنی سانس کو دیکھ کر سوچتی رہتی ایک انسان کی اتنی ساری کھڑو ہوں کہ کوئی اس نکاس سے ہر وہ ڈال سکتا ہے؟ اتنی بڑی کوتاہی کے باوجود اسے اس قدر تپتی جان سے قبول کر سکتا ہے؟ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے اللہ میاں بھی اپنی مخلوق کو اسی لئے موت کے ہونے میں چمپا لیتا ہے تاکہ شخص سانس کی مخلوق کی کوتاہیوں کا مذاق نہ اڑائے۔

اپنی سرس کے سامنے مجھے اپنا وجود ایک چور کا سا لگتا تھا۔ اس گھر کی سادگی آسائشیں سارے عالم جیاداً جو نیچے بکھار گئے۔ میں گھوڑے کے لئے اپنے دل میں جھک جاتا تھا۔ میں کوشش کرتی تھی موزم کرتی تھی لیکن جہاں سہلائی کی ضرورت تھی وہاں ناک کے پینے کا کام نہیں چلتا۔ جہاں جس من دھن سے تہیاب کی ضرورت تھی وہاں وہ کافی ہو جاتی تھی۔

Wm. C. C. C.

خدا فیماں کی صوف کے بعد میرا دل خالی، بھرے کی طرح ہو گیا تھا۔
 اللہ کی مرضی تھی۔



زندگی کبھی سیدھا راستہ نہیں بکارتی۔ اسے گھب گھڑتی، بکھرتا ہے، پھرتا ہے، ٹکرتا ہے، ٹکراتے ہیں۔ مقامات سے گزرنے کا بہت شوق ہے۔
مغربیوں میں چلنے والے چاروں پہلوؤں سے الجھتے ہیں۔ اسلام کی زندگی میں ہمیشہ اکثر اٹھارہ پہلوئے بے نام اور بے نام ہیں۔
چاندنی پارکھی۔

جب میرا دایاں پاؤں آخری میزنگا پر ہو رہا تھا تو بائیں میزنگا سرمے کے غور سے فرش سے چھانچ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے پیچھے سے میرے بال پکڑ لئے۔ جو انسان گناہ کے احساس سے بھری طرح کا جھل کود کرتا ہے پاؤں پر مشکل سے کھڑا ہو سکتا ہے۔ اسے گرنے کے لئے بارہیٹ وصول دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

”بہول نہ پتا دینی راستہ کو تو کدھر ہے آ رہی ہے؟“ بھولی جڑا ہوا دلی بات۔

میرا سر پہے فرش سے گلاب کی گیند کی طرح گھلایا۔

”اوپہ نہ کمرہ نہ باغیچہ صرف پر سائی میں اتنی رات مجھے تو کیا کرنے کی تھی؟ ہمارا بھلہ!

میرا دل صاف ہے، میں غفلت سے پرہیز کرتا ہوں۔

”ہر ایک کوں قصداً؟ کوئی سے خاصا ہی عزت کے ساتھ کہنے والا“

پھر میں اس پتھر کی منزل کو جانے والی سڑکیوں پر بیٹھی اور اندر دیکھی تو وہی سڑک پر برساتی میں کھلے اوڑھے ہوئے پتھر کی سڑکیوں میں میرا سر غرق تھا۔ میں اپنی سانس کو کیا تھاتی کہ میں اس کی عزت کے ساتھ کیلئے والی نہیں ہوں۔ میں تو اس کی عزت جاننے والی ہوں۔ لیکن کچھ باجی جب ہو تو جاتی ہے تو اب جسم کا کھولتے لگتی ہیں۔

”کون تھا وہ؟ کون ہے؟ ہمارے گھر میں سینہ دکھنے والا؟ مرد؟ عورت؟ صاحب فرمائیں! کچھ تو بول!“

میں غصے فریض پر چپٹ لیٹی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اپنی ساس کو کیا لگاؤں۔ کہاں سے شروع کروں اور کہاں جا کر ختم کروں؟ کیا وہ اپنی ساری الجھنوں کی باتیں کبھی بھی سن گئی؟

”سن جائیو ایسا تو اس کا نام تارو سے سیدھے سہاؤ پر بھر میں جیسے کھڑے کھڑے ملائی، اور لی۔“

مجھے اپنی ساس سے پیار نہ کیا تھا۔ میں اسے سیدھے سہاؤ کیسے کسی کا نام بنا سکتی تھی؟

”ہجرہ! میں نے سیری لیکن کچھ مدد نہیں کی اور اس کا تو نے یہ بدلہ پا لکھو؟“ بولی، ”تاس کا نام دیکھ میں نے آج تک کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا لیکن لیکن بول جائیو، تارو کون تھا وہ؟“

میں اپنی ساس کو کیا بتاتی کہ میں نے بھی اس کی عورتوں کے بدلے میں اپنی بڑی گھواہ کی گالھ سر پر اٹھائی تھی۔ گالھ بازو کی ان کانٹوں سے مٹا بہت تھی جن سے پرانے پورے استعمال شدہ صاحبوں کے کپڑے ٹھکا کرتے ہیں۔

شروع سر ہواں تھیں۔ تب ایک روز میرا سر میرے پاس آیا۔ اس روز گھر کے تمام لوگ گڈو کے لے کر ایک حمار پر، ایک چڑھانے گئے ہوئے تھے۔ مجھے یاد تھا کہ اس لئے میں ان کے ساتھ چلا گئی تھی۔ میرے دو دوڑے پر لگی سی دھجک ہوئی جیسے کوئی چڑیا آکر بار بار راستہ حائل کرنے میں نگرانی ہو۔

بڑی دم بدم ایک سری سی آواز آئی، ”ہجرہ!“

میں نے دو دوڑے کھولا تو میرا سر کھڑا تھا۔

”کیسی طبیعت ہے اب۔“

”ٹھیک ہے جی۔“

جب میں لوٹنے لگی تو اس نے میری کلائی پکڑ کر بڑی فراہمت سے کہا، ”ڈاکٹر صاحب آئے تھے۔“

”آئے تھے جی۔“

بڑی دم بدم وہ میرے چنگ کے پاس ہونے میں بیٹھ کر دو اینچوں کے پست پست چڑھانے پر شاہد وہ اپنے اندر نفس مضمون تیار کر رہا تھا۔ جب میں نے تھک کر اس کی طرف پشت کرنی تو وہ ٹھکا کر بیٹھا۔

”تم سے ایک بات کرنی ہے، ہجرہ! چائیں تم میری بات کو کہہ دینی میں سمجھو۔“

”جی فرمائیے۔“

”گڈو دھرا لکھتا چلا ہے اور میری ساری چائیں اس کے نام ہے۔“

”اللہ نے چاہا تو گڈو صاحب ٹھیک ہو جائیں گے جی۔ ای جی خیرت مراد کے دیگ چڑھانے لگی ہیں۔“

”ٹھیک اس نے کہا ہوتا ہے امر کہتے ہیں بھراؤ! ایک صورت ہے۔“

وہ کوئی سی صورت تھی؟ اس کے اظہار میں میں کتنی دیر ان کی طرف دیکھتی رہی۔

”گڈو کے گرچہ ہو جائے تو میری عزت بچا سکتی ہے۔ اس گھر کا پوتا ضرور لگتا چاہیے۔“

بحر یک دم میرے سر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، قطرہ قطرہ۔

مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اس گھر کو کون کیوں لگنا چاہیے اور یوں گھٹے سے کسی کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن مجھے اپنے بڑے سر پر جس آ رہا

تھا۔

”مجھے پتا تو میرے گھر کی خوشی کو چاہیو۔ اس گھر کی عزت تو خفی نامہ سب کو چاہیو ہے، ہاتھ میں ہے، باجرا۔“

میری ساس قسری منزل کو پہنچنے والی بیڑیوں پر بیٹھی احسانات کی وہ طہرست تنواری تھی جس کا حضور سے سے میرے میں اس نے مجھ پر رکھے تھے۔ باڑے کی شاہک پہلوں کے ڈنڈوں کے نام بار بار اس کے معنوں پر آ رہے تھے۔ دور کہیں ایک سرخ۔ کچھ غیر باریک سی آواز میں اذان دے رہا تھا۔ مجھے اپنی ساس کا وجود پنا کھائی گیند کی طرح نظر آ رہا تھا۔ وہ بھی اپنے دیرانے بیٹے کے عشق سے مگر انکار کر ڈھکی ہو چکی تھی۔ اس وقت سے نہیں کیوں مجھے اپنی ساس بہت یاد آ رہی تھی!

میں اپنی ساس کو کیا بتاتی کہ مجھے بھی گڑ کا آسردہ پینہ کر سکتا تھا۔ مجھ پر ڈاکو ڈالنے والے نے یہ بیٹھی کندھ کو استعمال کیا تھا۔ میں اپنی ساس کو سمجھا نہیں سکتی تھی کہ جو درد عزت چھانے سے شروع ہوا تھا وہ اصل ظہر جانے کے بہت بعد تک کیوں جاری رہا؟ کئی باتیں تاریخ کے واقعات کی طرح ہوتی ہیں۔ ان کی کئی چو بیٹیں کی قصوریاں تو ہو سکتی ہیں، لیکن چائی اور مصلحت تک پہنچنا قریب قریب ناممکن ہے۔

”تاہم میں آخری بار پھر چھوٹی ہوں آخری بار تنواری خوشیوں سے کھیلنے والا کون ہے۔“

میری ساس تنواری ناحت کی راری ہوتی کیسے مجھ پانی کہ سب سے دنیا تھی سے ایک ہی کھیل انسان کا سچا اور اصلی کھیل رہا ہے۔ اگر لوگوں نے اس کھیل کے ساتھ عزت کو قہقہے نہ کیا ہوتا تو اپنی مورچے کھیلنے بہت دور نکل جاتے۔ اب تو بندھے گئے اصولوں سے کوئی رقی مگر ہونکا اور عزت کے لالچے پر گئے۔ خدا جانے کھیل کس کا فرشتے نے کی۔ اور افراتفری لسل کے کھیل کے ساتھ عزت کا تصور انویں کے طور پر نامرود رہا۔ چو نہیں کہ کس مصلیٰ میں کس کی سوچ والے نے مذہب عشق اور جسمانی تعلقات کی ضرورت کو یکجا کر کے حد سے عشق تیار کی۔ اب تو عزت اعضاء جس اور محبت ایسے عجیب قسم کے ٹکھنوں میں گئے ہیں جس کا ہر ذرا یہ صلیب کی طرح ڈوب چکا تھا اور ہر شے قیامت سے بھی لمبا ہے۔

”باجرا میں آخری بار پھر چھوٹی ہوں میرے پیٹے میں کسی کا صل ہے۔“

میرے پی میں آئی چلی کر کہوں آج تک کسی کو میرے صل کی خوشی نہیں ہوئی۔ جو بھی جانا چاہتا ہے بھی جانا چاہتا ہے کہ صل کس کا ہے؟ کیا صل بذات خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا؟ کیا اس صل کی خوشی کی جا سکتی ہے جو جائز بندھے گئے اصولوں کے تحت ہوتا ہے؟ اگر فطرت کا بھی خلاف کیا ہوتا تو صورت کو اپنی اولاد سے بھی بچا دیتا۔

”بول باجرا کون ہے وہ۔“ اگر بتا دے کی تو قسم تھا کی میں حرام ہی اولاد کو بھی اپنی کہوں گی یا اگر تو نے نہ بتایا تو تو تجھے طلاق دلا دوں گی۔“

میں اپنی ساس کو بتانا چاہتی تھی لیکن مجھے اس صورت سے چاہتا تھا اس کے دکھ سے گہری ہمدردی تھی۔ میں ایک ہی کھلے میں اس کا دور ہوا نقصان نہیں کر سکتی تھی۔

میں اپنے گھر بیٹھی آئی۔ بچہ باپ!

یہاں ہر وقت میرا ہار رہا تھا۔ بولنے سے ملنے کے اور احسان جتانے والی ساس جانے کہاں پہلی کی تھی؟

اور آج ایک پانچ برس گزر جانے کے بعد
یہ تیسری بار تھی!

جس وقت میرا دلایا، میری زندگی کی آخری ایک پر تھا اور میرا دلایا پانچ زمین سے سواچہ اچا اور نچا تھا کسی نے پیچھے سے میرا چوڑا کپڑا
کیا میرا جسم تو پچھلے ہی زیدہ اتارنے سے ہاپ رہا تھا اسے زمین پر کرتے دوڑ گئی تھیں یوں لگا جیسے کرتے ہی میری کٹھنی سے بجلی سی خون کی دھار
نکلنے لگی ہے۔

"کس وقت آؤ گی رات کو کہاں سے آ رہی ہے ماں؟" بولنا تھا اور دوسری منزل میں میرا کیا کام تھا اس وقت؟"
میں پاپ رہی۔

جوانی بچے کو میں کیا بتاتی کہ جنوں کو پالنے میں ماں کو کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔

"میں نے ادھر ادھر سے بہت سی باتیں سُن رکھی ہیں۔ میرا کیا تعلق ہے ایک مکان سے؟" بول شیخ صاحب سے میرا کیا نام ہے؟"
میں پاپ رہی۔

"میں اسے کیا بتاتی کہ شیخ صاحب ادھر سے صحت مند تھے۔ انہوں نے برسوں ہمارا ساتھ دیا تھا۔ کرائے کے پیسے بھی وصول نہیں کئے تھے
اور اس کے علاوہ ہر طرح کی مدد کی تھی۔

"میں میں تجھے کیا بکھتا تھا اس میں نہیں بکھتا تھا تو جنت کی حور ہے نہیں بکھتا تھا کہ کہ کیا ہوا میرا ہاپ دیا نہ تھا
میری ماں تو "

جوان آدمی کے آنسو بہ رہے تھے اس کی آنکھوں سے برس رہے تھے۔ وہ بچپن سے آج تک کی ساری عمر دیاں گوارا تھا۔ ہاپ کے
گھر سے لڑائی ہوئی ہر آس اسے اس رہی تھی۔ وہ اپنے آپ سے بھگڑ رہا تھا دنیا سے بھگڑ رہا تھا۔

"بول کون تھا وہ؟" بول ماں شیخ صاحب سے میرا کیا نام ہے؟"

بکلی بار میری زبان کھلی۔ پاپ کے صوبہ داسے سے آواز آئی

"میرا کسی سے کبھی بھی کوئی نام نہیں دیا ہے؟"

میرا کسی سے بھی کوئی نام نہیں دیا۔



بلراج مین را

نام	بلراج مین را
تعلیمی نام	بلراج راہی / بلراج مین را / مین را
پیدائش	۷ جون ۱۹۳۵ء پٹھان ہوشیار پور، بھارت
تعلیم	ایف۔ اے
	ابتدائی تعلیم نوشہرہ سے حاصل کی۔ ستائن دھرم پٹر سکیمٹری سکول، دہلی سے ۱۹۵۴ء میں ایف۔ اے کیا۔ والد کی وفات پور پٹھان بعد حالات کے سبب تعلیم کا سلسلہ جاری نہ کر سکے۔

مختصر حالات زندگی:

ہوشیار پور، پٹھان ختمیہ گلاب میں سات بہنوں سے آباد پٹھان مین را کے ہاں پیدا ہوئے۔ بچپن ہوشیار پور اور نوشہرہ میں گزرا۔ والد فرج میں ملازم تھے اس لیے بچپن اور لڑکپن میں مختلف فوجی پھاؤنڈوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ قیام پاکستان سے قبل لائل پور کے نملہ ہلال قانون میں رہتے تھے اور دہلی بازار میں ان کے والد کی دکان تھی۔ والد کی وفات وفات کے سبب تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا البتہ والد کا ساتھ تادیر رہا۔ اہل خانہ کے لیے روکی سوگی فراہم کرنے کے لیے بلراج مین را کو اوائس جوائی میں بھی بھرتی کام کرنا پڑا۔ کارل مارکس، گوتم بدھ اور دستگاہی کی راوی پڑھنے اور ہر روز پاک ہوتے ہوئے ٹریڈ یونین سے پیشہ وارانہ رابطہ رہا۔ گجگ ۱۹۶۳ء میں راجن بابو (ڈی۔ بی) کا ہسپتال دہلی میں لیہارڈی اسسٹنٹ مہرئی ہوئے تو ہسپتال سے قریب ہی رہائش رکھی۔ دوران ملازمت سڑک کے دے میں دہلی بھگت "شعور" ڈبلی کے چھ شہرے سڑک کے "مین را جرنل" بھی فن کا مرتب کردہ ایک یادگار جرم ہے۔ گجگ چالیس برس کی ملازمت کے بعد ای ہسپتال سے ۲۰۰۳ء میں راجن ہوئے۔ جوائی میں برس برس، راحت گئے تھک کائی دوس اور لی دوس کی ادنیٰ محافل اور سے خانوں میں بیٹھنے والا "انگریز بک مین" اب دل کے عارضہ اور جراثیم کی پٹی کے مہروں کے سڑک جانے کی تکلیف میں جھکا ہو کر ایک زمانے سے اپنے گھر میں مقید ہو گیا ہے۔

کمر بھی دلی کے مصافِ رفاہی میں ہے۔ جہاں احباب کے لیے آٹا جاتا جوئے شیر لانا ہے۔

کتاب جی کی چمک اور دریا گنج، پہلی دلی میں فن کا تھم پر بیٹھنے والے بیکھڑ چند کتب کے بیچاروں سے اُڑانے کے سبب پھولے ہوئے مانس اور مشردہ انھوں کے باوجود بیٹھنے میں دوا ایک بار اقرار کے روز آکر جانا ہوتا تھا اب وہ بھی موقوف ہوا۔
کل آتیں انسانے، سوئی تھانوں سے حلق چند مطالعین اور مجلہ ”شعور“ کے اداری لوگوں کے علاوہ سوانحی یا سوانحیوں پر مبنی ایک باکسل تحریر ”جی چمک“ (۱۹۸۵ء) میں راکا کل ادبی ۱۹۸۱ء ہے۔ گزشتہ تھیں برس سے میں نے اسے انسان نہیں سمجھا۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

- ۱۔ ”کینڈا“ مطبوعہ ”مشرق“ کراچی، اکتوبر ۱۹۵۵ء۔ یہ افسانہ طبع راج رانی کے قلمی نام سے شائع ہوا تھا۔
- ۲۔ ”بھاگونی“ مطبوعہ ”ساتی“ کراچی، جنوری ۱۹۵۷ء۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ ”عقل“ (پینتیس افسانے) مولدیان پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی، طبع اڈول ۷۷ء ۲۰۰۰ء
- (کپور لٹن پیرج کے چھ افسانے، ”وہ“، ”شہر کی رات“، ”عقل“، ”حسن کی حیات“، ”گرتا“، ”انھوں کا نظام“، ”مختصر دورے“، ”پہرے“، ”گنا کا دھم“، ”میراث نام میں ہے“، ”اسلم کا موسم“، ”طلعت“، ”بھاگونی“، ”نور میں ہے“، ”پیراری“، ”جسم کی دیوار“، ”کپور لٹن موسم سرما ۱۹۸۱ء“، ”کپور لٹن دسمبر ۱۹۸۳ء“، ”کوئی روشنی کوئی روشنی“، ”ایک نسل کہانی“، ”آقا صاحب“، ”لوہی کی اولاد“، ”رعب“، ”سائل کی دولت“، ”سڑک ساختی کی“، ”عبد الرحیم“، ”بیس شاپ“، ”ادارات“، ”جسم کے جنگل میں ہر لہو قیامت ہے مجھے“، ”جی چمک“ (باکسل) اور ”پہرے میں ایک ایڈ جڈ“ (کل پینتیس افسانے) اور چند مطالعین شامل کتاب ہیں۔ ”عقل“ میں میں راکا اولین افسانہ ”کینڈا“ شامل نہیں کیا گیا۔ کل صفحات ۳۳۸
- نوٹ: اس سے قبل ”عقل“ میں شامل سوانحی اکوڑ اور الہ دہی نے ”سربلویا“ کے عنوان سے ۲۰۰۴ء میں ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع کر دیا تھا۔ جس کے صفحہ ۳۲۱ تا ۳۲۷ پر طبع میں راکا پہلا افسانہ ”کینڈا“ مطبوعہ ”مشرق“ کراچی، اکتوبر ۱۹۵۵ء شامل کتاب ہے۔

مستقل پتا:

پلاٹ ۱۰۵، پلاٹ ۳۳، بیکھر ۳۳، رفاہی، نئی دہلی، بھارت

اعزاز:

- ۱۔ غالب ایوارڈ برائے ”عقل“ ۲۰۰۷ء

”ایک شری جرنی ہے اور ایک شری جرنانہ نگار ہے (ایسے ایک کی داستان نگار بھی ہو سکتا ہے اور افسانہ نگار بھی) دونوں میں کیا فرق ہے؟ یہی ناکہ انسان کا عظم کے میدان میں ٹھنی سے آگے ہے۔ اسی لیے انسان نگار کی ذمہ داری کتنی زیادہ ہے۔ اسے تمام سماجی مسائل کی گفتگو کرنا ہوگی۔ سماجی برائیوں اور امراض کی تہ تک جانا ہوگا اور ہر عوامی مسئلے پر ایک مضبوط ٹیپوٹ بھی لگنا ہوگا۔

(”ستھیرا“ مشہور ”مستقل“ مضبوط ”سوزران“ جہانگیر ماس، نئی دہلی، طبع اول: ۱۹۷۰ء)

لمراج میں مرا

جب اس کی آنکھ کھلی وہ وقت سے پہلے تھا۔ اس نے دایاں ہاتھ بڑھا کر بڑبھلی سے ٹکرنے کا پکٹ اٹھا لیا۔ اور ٹکرنے نکال کر لبوں میں قلم لیا۔

ٹکرنے کا پکٹ پیچک کر اس نے بائیں ہاتھ بڑھا لیا۔ بائیں ہاتھ کی۔
بائیں خالی تھی۔

اُس نے خالی بائیں کمرے میں اچھا لہری۔

خالی بائیں چھت سے ٹکرائی اور فرش پر آن پڑی۔

اُس نے بھلی لیمپ روشن کیا۔

بڑبھلی پر چار پانچ ہاتھیں اُٹنی سیدھی چڑی ہوئی تھیں۔

اس نے داری داری سب کو دیکھا۔ سب خالی تھیں۔

اس نے لٹاف ادا کر پھینکا اور کمرے کی روشنی کی دو بج رہے تھے۔

آج یہ بے وقت بیز کیسے کھل گئی؟

ایک بار آنکھ کھل جائے۔ پھر آنکھیں کھلیں۔

اُس نے تمام کمرہ چھان مارا۔

کتابوں کی لٹاری ڈیسٹ بچہ یا سکتے پتھروں کی پھینکیں۔ بائیں کھیں نہی۔ اس نے ایک ایک کتاب الٹ دی۔ کوئی دیا نہ لائی نہ

لی۔

کمرے کی حالت بری ہو گئی تھی۔

کان میں اپنی سیدھی پیڑی ہوتی تھیں۔ کپڑے اور حراہر کھڑے پڑے تھے، ترکہ کھلا ہوا تھا۔ کوئی آہائے اس سے۔

رات کے دو بجے کمرے کی یہ حالت؟

سگریٹ اس کے لوں میں کاپ رہا تھا۔

سلیپنگ سگریٹ اور دھڑکتے دل میں تکی ممانعت ہے؟

ہا جس کہاں ملے گی۔

ہا جس کہیں نہ ملے تو ؟

تو کہیں

میرا دھڑکتا ہوا دل خاموش نہ ہو جائے۔

آج یہ بے وقت چند کیسے کھل گئی۔

میں وقت سے بے خبر تھا ایک ہمارا گھر کھل جائے تو پھر آگہ نہیں ہوتی۔

ہا جس کہاں ملے گی؟

اس نے چادر کھڑکی پر ڈال لی اور کمرے سے باہر آ گیا۔

دبیر کی سرور سے تھی، سیاسی کی حکومت خاموشی کا چہرہ۔

کسی ایک طرف قدم اٹھانے سے پہلے وہ چند لمبے سڑک کے سڑے میں کھڑا رہا۔ جب اس نے قدم اٹھائے وہ راستہ سے بے خبر تھا۔

رات کافی تھی، رات خاموش تھی اور دور دور تا حد نظر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

سپ بوسٹ کی مدد سے روشنی رات کی سیاسی اور خاموشی کو گہرا کر رہی تھی اور

یہ رہا ہے یہ اس کے قدم پر کھلے۔

یہاں جزیرہ روشنی تھی کہ وہ صیانت میں چمک رہی تھیں۔ لیکن خاموشی جوں کی توں تھی کہ ساری، کانیں بند تھیں۔ اس نے طوا کی کی دکان

کی جانب قدم بڑھا دیے۔

لیکن یہ بھٹی میں کوئی کونسلر جانے، دیکھتا کونسلر، باب کوٹلا

طوا کی کی دکان کے چوترے پر کوئی لحاف میں گھڑی ہوا تھا۔

وہ بھٹی میں جھانک رہی تھا کہ چوترے پر بھٹی گھڑی کھل گئی۔

کون ہے؟ کیا کر رہے ہیں؟

میں بھٹی میں سٹکان ہوا کوٹلا، صوطہ رہا ہوں۔

ہاگن ہو گیا بھٹی گھڑی پیڑی ہے

تو پھر؟

136724

$$V_L \leq \frac{1}{2} V_T$$


— *Philippe de Gaulle*

تسلیاں گل ہو! ہوا! ہوا! میری ٹیڈمست خراب کروا جاؤ۔

Wahrscheinlichkeit

ماٹھیں سنبھل کے پاس جاتی ہے۔ وہ آئے گا اور کھلی گرم ہوگی۔ چلو تم!

مکرمیتاں کے لہجوں میں کالیہ پر اقبال

میں نے کہا کہ میں نے اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا۔

جودا یا جیجہہ کیا تصور دہنی جیجہہ دہنی۔ کیا کیا کہتے جیجہہ دہنی۔

اس کے بعد مغربی عالم ہے۔

لیپ پوسٹ، لیپ پوسٹ، لیپ پوسٹ! ان محنت لیپ پوسٹ پیچھے رو گئے۔ دھجی روشنی والے لیپ پوسٹ جو راحت کی سیاحی اور

خاموشی کو سمجھاتے ہیں۔ کیا ایک اس کے قدم پر کھلے۔ سامنے سے کوئی آرم خمد وہ اس کے قریب پہنچ کر رک گیا

“Welpen”

gibberula

نہیں میرے پاس ہاتھیں نہیں ہے انھیں اس طرح سے بچا ہوا ہوں۔



www.ck12.org

میرے پاس مانگیں نہیں ہے۔ میں اس خط سے بیجا ہوا ہوں اور اپنے گھر جا رہا ہوں۔ تم بھی اپنے گھر جاؤ۔

آنکے قتل کے بعد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

۱۰۰۔ مجھے مجھے مذہبی رہنما کی طرح کیا ہے۔

وقت سے پہلے اس کے کھلے کھلے قدم اٹھ رہے تھے۔

لیپ پوسٹ آغا محمد رفیق بھٹی کوئی دکانیہ رتی اور کھریاں۔

بھر یسپ پاسٹ مدغم رہتی پھر سیاقی۔

وہ لوگوں میں سگریٹ تھا سے دھکے دھکے قدم اٹھا رہا تھا۔

اس کی دوزخ اندر بھیڑوں تک دھواں کچھنے کی طلب شدہ ہو گئی تھی۔

اس کا بدن فوٹے رہا تھا۔

شب خرابی کے لباس اور چادر میں اسے سر دی گک رہی تھی۔

وہ کامپ رہا تھا درکار اپنے قدموں سے دھکے دھکے بڑھ رہا تھا۔ وقت سے پہلے۔ یسپ پاسٹوں سے پہلے

ایک بار پھر اس کے قدم رک گئے۔ اس کی نظروں کے سامنے خطرے کا نشان تھا۔ سامنے لمبی تھا۔ مرست طلب ملی۔

مناظروں کی روک تھام کے لیے سرخ کپڑے سے لپٹی ہوئی لائٹیں سڑک کے کنارے ایک محلے کے ساتھ لگ رہی تھی۔

اس نے لائٹیں کی جلی سے سگریٹ سلگانے کے لیے قدم اٹھا دیا تھا کہ

کون ہے؟

وہ خاموش رہا۔

سیاقی کی ایک انتہائی جھکول کر سیاقی اس کی طرف پکا۔

کیا کر رہے تھے؟

کیونکہ!

میں کہتا ہوں کیا کر رہے تھے؟

آپ کے پاس ماچس ہے؟

میں پوچھتا ہوں کیا کر رہے تھے اور تم کہتے ہو، ماچس ہے کون ہو تم؟

مجھے سگریٹ سلگانا ہے۔ آپ کے پاس ماچس ہو؟

تم یہاں کیونکر رہے تھے؟

میں لائٹیں کی جلی سے سگریٹ سلگانا چاہتا تھا آپ کے پاس ماچس ہو؟

تم کون ہو۔ کہاں رہتے ہو؟

میں

کہاں رہتے ہو؟

ماڈل ٹاؤن!

اور جیسے ماچس چاہیے ماڈل ٹاؤن میں رہتے ہو ماڈل ٹاؤن کہاں ہے؟

ماڈل ٹاؤن اس نے گھوم کر اشارہ کیا۔

وہ دھواں دھواں نظر سیاقی کیلی ہوئی تھی۔

چلو میرے ساتھ اٹھانے تک۔ مائل ڈاؤن؟ مائل ڈاؤن یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ ہاتھس چاہیے؟ اٹھانے میں مل جائے گی۔

سچائی نے اس کا ہنر دکھام لیا۔

وہ سچائی کے ساتھ ہل چلا۔

اٹھانا ہی سڑک پر اٹھا جو ختم ہونے کو نہ آتی تھی۔

وہ سچائی کے ساتھ اٹھانے کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے میں کی آوی ایک بڑی بھڑکے گرد چپٹے ہوئے تھے۔

سب سگریٹ پی رہے تھے۔

بھڑکے سگریٹ کے کئی پکٹ اور کی مائیسس بڑی ہوئی تھیں۔

صاحب ایچٹھن پٹیل کے پاس کھڑا تھا۔ کہتا ہے، مائل ڈاؤن میں رہتا ہوں اور ہاتھس مائیسس کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔ کیوں ہے؟

اگر آپ اجازت دیجئے تو آپ کی مائیسس استعمال کرلوں۔۔۔۔۔ مجھے اپنا سگریٹ مل گیا ہے۔

کیا اس وجہ ہو؟

مائل ڈاؤن۔ کیا میں آپ کی مائیسس لے سکتا ہوں؟

کون جو تم؟

میں ابھی ہوں۔ کیا میں مائیسس

مائل ڈاؤن میں کب سے رہتے ہو؟

تمہیں ماہ سے۔ مائیسس

مائیسس مائیسس کا پتہ ابھی جاؤ اپنے گھر اور چند کدوں کا مائیسس

بند دھانے سے جاہر آؤ۔ وہ نئی طرح تھک چکا تھا۔

اس نے اس پر ختم ہونے والی سڑک پر دھبے دھبے چنا شروع کیا۔

اس کی ناک سوں سوں کرتی گئی تھی اور اس کا بدن فونے لگا تھا۔

سگریٹ پیچ ایک طبقہ ہے!

میں نے یہ طبقہ کیوں پال رکھی ہے؟

ہاتھس کہاں ملے گی؟

مٹی قرا؟

وہ وقت سے بے خبر تھا، ٹیپ پستوں سے بے خبر تھا، سڑک سے بے خبر تھا، اپنے بدن سے بے خبر تھا۔

وہ گر تاج تاج ہزار ہا تھا۔

اس کے لغزش زدہ قدموں میں نئے کی کیلے تھی۔

چمکائی اور وہ دم ہلکے رکا۔

دم ہلکے رکا اور ہلکے سنبھلا۔

سنبھلا اور اس نے قدم اٹھاتا ہی چاہا کہ

سناٹے سے کوئی آ رہا تھا اور اس کے قدم لغزش کھا رہے تھے۔

وہ اس کے قریب آ کر رکا۔

اس کے لوہے میں سگریٹ کا لپہہ ہوا تھا۔

آپ کے پاس مائیس ہے؟

مائیس؟

آپ کے پاس مائیس نہیں ہے؟

مائیس کے لیے تو میں

وہ اس کی ہاتھ سے مائیس آ کے بڑھ گیا۔

آگے چہرے وہ خود آ رہا تھا۔

اس نے قدم بڑھایا۔

آگے چہرے وہ آ رہا تھا۔



خان فضل الرحمن

نام	فضل الرحمن
تخلص نام	خان فضل الرحمن
پیدائش	۱۹۱۳ء بمقام رائے ضلع بہارن چور (پنجاب) پاکستان
وفات	۱۹۹۵ء بمقام لاہور
تعلیم	ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ایس۔ سی۔ لاہور ۱۹۳۸ء
	پروفیسر جماعت کاشتکاروں کے پڑھانے کے بعد ۱۹۳۸ء میں مسلم ہائی اسکول داتا گاندے سے محکمہ کیا۔ ایف۔ اے (۱۹۳۳ء)
	اور بی۔ اے (۱۹۳۶ء) کے امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۳۸ء میں لاہور سے پاس کیا۔ ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان پاس
	کے بعد ۱۹۳۸ء میں لاہور سے پاس کیا۔

مختصر حالات زندگی:

انار کے ذیلی پچاڈ ضلع کے دامن میں خان فضل حق کے پاس پیدا ہوئے۔ خان صاحب کا تعلق پنجابی حوال گرانے سے تھا۔ بچپن اور لڑکپن گھر جس کے کنارے شوالہ پہاڑ کے دامن میں، جیسے بڑھاتے کے ساتھ گزرا۔ جوانی میں ضلع لڑائے۔ آکسٹریا سٹی تحصیلہ انار سے سرینگر تک نکل جاتے۔ آبشاروں اور پہرہ زاروں سے بچنے چڑھنے کے اس ماحول نے انگریزی اور اردو میں شاعری اور افسانہ نگاری پر اکسایا۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور شہر کو اپنا مستقل گھر بنایا اور دکانت کا پیشہ اختیار کیا۔ بیشتر وقت ہائی کورٹ سے تعلق رہا۔ لیکن عدالت میں دکانت سے زیادہ اپنے وطن کی دکانت کی۔ تاریخ اور نامور شخصیات سے گہری دوستی اور وابہ کر لیا۔ ایک زمانے تک لاہور کی ادبی مصنفوں کی وٹیکن ان کے ہم قدم سے رہی۔ ان کا کہنا کہ خود انہیں یاد نہیں رہا۔ انہیں جوانی کا بیشتر کام ضائع ہو گیا، اس کے باوجود ہزاروں صفحات کا مواد غیر مطلوبہ حالت میں موجود ہے۔ گریہوں کو عمری میں گزارتے تھے اور وہ اب بھی قلم کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ جس نگاری ان کے ادبی

تجربات کی حفاقی۔ حلقہ اربابِ دولتی میں افسانہ خائے تو ایک چارے بھی ساتھ لاتے جس سے اس پر بازی مقامات کی نشان دہی کرو چتے
جہاں بیرو نے کمال مہارت سے بیرو کی کو نگہ بڑا ہوتا۔ بڑا چاپے کی شادی نے گھبرا کا خرگشاں، ناچھ روڈ پڈ اتی انارکلی پر اپنے مکان کے سامنے
پر چھ ہزار پران کی جوان بیوی کو ہنسنے دہرا افسانہ لہٹ کرتی اور دوسرے جھکانے شفق۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"تنگی شر" مطبوعہ "سورہ" ۱۹۵۲ء

تفصیلی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ "اوردھ کھا پا اوردھ" (افسانے) مکتبہ پھری لاہور، طبع اول ۱۹۵۶ء
اس کتاب کی اشاعت کی تقریبی مدت بعد حکومت پاکستان نے کتاب کی اشاعت اور فروخت پر پابندی عائد کر دی۔
- ۲۔ "دورشن رین" (افسانے) نام مطبعہ لاہور طبع اول ۱۹۸۳ء
لاہور سے یہ کتاب ۱۹۸۳ء میں پہلی بار طبع ہوئی۔ سول لیکنٹ کے طور پر مکتبہ پھری لاہور، لاہور کی سرگرمی ہے۔ پرنٹ لائن نہ
ہونے کا سبب خان فضل الرحمن کی لاہور میں لاگراجھی پاری شہرت ہے۔ اس سے قبل خاں صاحب کے اولین افسانوی مجموعے
"اوردھ کھا پا اوردھ" کی فروخت پر حکومت پاکستان نے پابندی عائد کر دی تھی۔ "دورشن رین" میں کل پانچ افسانے مع نقشہ جات
شامل ہیں۔ افسانوں کے عنوان یہ ہیں۔
۱۔ "دورشن رین" ۲۔ "ٹیڈی اور دودھ" ۳۔ "تنگی" ۴۔ "گوری گوری، گوری گوری" ۵۔ "پنچلہ ڈبے اڈے"
اس کتاب کے کل ۳۵۵ صفحات ہیں۔
- ۳۔ "تنگ بھاد" (تاریخی ناول) مکتبہ پھری لاہور، طبع اول ۱۹۸۳ء
کتاب کے کل صفحات ۱۹۸۔
- ۴۔ "سنگ داؤد" (ناول) مکتبہ پھری لاہور، طبع اول ۱۹۸۵ء
اس ناول میں بقول مصنف ایک صالح انگریز کی نافرمانی کی گئی ہے اور برطانوی عہد کی برکٹوں کی تعریف۔ مصنف عہد انگلیش کا
پرچار ہے۔

غیر ناول:

مولدہ الاطیوہ کتب کے علاوہ سندھ جی ٹی کتب برائے طاہرہ چار ہیں:

- ۱۔ فرانسے کے میدان پر کھیل جانے والے زخمیل سے متعلق ناول۔
- ۲۔ شیشہ اور سیرت کی بازیگری سے متعلق ناول۔

۳۔ نیپال سے حلق ایک طویل مختصر انسان۔

۴۔ علامہ اقبال سے حلق ایک کتاب۔

۵۔ مرزا غالب سے حلق ایک ناول۔

۶۔ انقلابیوں کی جنگ آزادی سے حلق ایک ناول۔

۷۔ بھارت سے مسلمانوں کی ہجرت (۱۹۴۷ء) سے حلق ۱۸ ناول۔

۸۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ سے حلق ایک ناول۔

۹۔ تھانہ میں کا سفر نامہ۔

۱۰۔ ”آگہوں کا گھر“ (ناول)

۱۱۔ حصہ ناول اور ناولٹ پڑبان انگریزی۔

وفات سے قبل مستقل ہے:

ناپورہ، پانی انارکلی، لاہور۔

نظر یہ فن:

”کیوں بہت دلچسپ ہوتا ہے وہ کہ کھن اور تو اور بھی برائیاں ہیں اور جانیں گی۔ انسانوں میں سے سے الفاظ قدیم اردو اور محروک الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ ماحول کی تلاش کتنی لازم ہے۔ اگر ہو سکے تو نئے اور تھکے ہوئے ہونا چاہیے۔“

(مکتوب جامعہ مرزا احمد بیگ مورخہ ۳ اکتوبر ۱۹۸۴ء)

نرہسی

خان فضل الرحمن

گاؤں کا ہر ایک آدمی اچرن میں تھا کہ نرہسی کیسے دڑو لے کر لڑی ہو سکتی ہے۔ ہر اسے مصدر کے بھن بنی یا چک اور عرقلی کا بھی بنی خیال تھا۔ دڑو سوا پچیس تھا جبکہ نرہسی چھری کی دو چھٹ آکھا ہے بڑا نکھیڑو کھور میل تھا چاکی تھی جیسے چنے کے اوپر سے ابھی ابھی چھلکا اٹھتا ہو۔ مگر جراتی پر چنے سے ہی اس کا پھر وہ گلابی گلابی ہو گیا تھا۔

دڑو کی آواز ٹوک اور بھٹکے ایسی تھی۔ جبکہ کالا کا دھگر نرہسی کی آواز پر مڑتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ لڑی مار گا کہیں میں جانے اور ساتھ بھنی بھی اور میلہ کرے تو میلہ لوٹ لے ہمارا کرے تو قحطیوں کی بھٹیں مانی کر دے کوئی دھن ہی اس کے ساتھ شب بسر کرنا چاہے تو اپنے دھن سے ہاتھ دھو بیٹھے اور پچک بچ اور دڑی ہے۔

جب تک دڑو لے کر بیوی زندہ رہی۔ وہی نرہسی کی پال پس کرتی رہی اور اس کے بعد دڑو دکھا اسے انگوٹھی کے گنگ کی طرح سے دکھ رہا تھا۔

دڑو کی بیوی اس سے گھٹ تھی، جسے وہ سواڑ گھوں کے گاؤں بھین چورے سے لایا تھا۔ اس کے گاؤں میں کسی نے بھی اپنی لڑکی اسے دینے کی مانی نہیں بھری تھی۔ ایک مرچ اس نے ایک نوڑا کھیر لڑکی کے لئے ڈچہ جات ہی میں شادی کا بیٹام بیٹھا دیا تھا اور اس کے کانوں میں گرام یا چک کی پیر آواز پڑی تھی ”دڑو تجھے تو یہ بات کہہ کر لاجتا چاہیے“ تو اس نے جواب دیا تھا۔ ”یا چک جی میں نے کچھ برا تو نہیں کیا۔ اگر میرا اس سے بیاہ تو کیا تو نہیں اسے آپ ہی پال لوں گا۔“

پھر بھین چورے سے دڑو کے ساتھ نرہسی اور اس کی ماں آگئی تھی۔ اس بھٹیوں کے قصبہ میں یہ راجوں کے ساتھ عروسی کرنے گیا تھا۔ جہاں اس نے کئی سال گزارے تھے اسی قصبہ سے دھگر نرہسی اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر آیا تھا اور اسے گاؤں کی دھڑ میں بھی لائی تھی جسے اس کے مالک نے بھین چورے کے کسی مرد کی کے پاس رہائش رکھا ہوا تھا۔ بھین چورے سے لوٹنے کے بعد اس نے اپنی زمین میں کھجور شروع کر دی تھی۔

گاؤں میں عزتی یا چمک کو بڑا مان دیا اور دیا مان سمجھتے تھے۔ جب کسی نے اس سے پوچھا کہ "یا چمک جی۔ آپ تو گاؤں کے مہاجان ہیں تو زبئی اور ڈولے کا بھید تو آپ ہی کھولیں گے۔" اس نے جواب دیا تھا۔ "میں کوئی دیچک تو نہیں اور جس کو ملے کو برانا، شکر اور شیوے اجاتا ہوا ہے میں اس کو ملے کو کھولنے والا کون؟ یہ داجوں کے ساتھ ضروری کرنے کا تھا تو کھولنے کوئی عورت نہیں ملتی تھی وہ عورت داکا جی بن گیا۔ زبئی بھی اسے مل گئی۔ زبئی کو اس کی دیا دی کہتے ہیں۔ وہ کتنی بھدرک ہے۔ یہ کتنا بھرا۔ اسنے بتاں پر لگی کوئی اسے نرا ہر کچھ تو یا چمک اسے کیا سمجھا سکتا ہے۔ زبئی اسے نہیں کام لیا ہے۔"

زبئی اس گاؤں میں ایسی تھی جیسے کندھے سے کھانا کھانے کے درمیان کوئی تاج کل لاکھڑے کرے اور اگر اسے یا چمک کا لڑکا سموت داتی سموت تھا۔ اس کے چاہنے والے اسے بخیر کہتے تھے اور ان بچوں کا بھی ایک جھم تھا۔

خواہ ضرورتی میں یہاں سموت اور زبئی کے کھانے مل رہے تھے۔ مگر اس چمک میں وہی نسبت تھی جو ضرور ضرورتی میں ہوتی ہے۔ سموت زبئی سے بھر لئے ہوئے تھے۔ زبئی تو کھول الٹب تھی جب کہ سموت بھلی تھی تھا۔ جو ہندوؤں میں اونچی ذات کی جاتی ہے۔ زبئی جب بھی سموت سے ملتی تو گھر میں ہی کرتی ہوئی مسطوم ہوا کرتی تھی اور گھر میں بھی شربت، دھل کی۔ اس کا بھی چاہا کرتا تھا کہ سموت اس کی دکان بھلی "ٹوکا" کی ٹوکا کوئی کرنے لگے۔

اس گاؤں کے درمیان ایک ٹہر تھی۔ جس طرح سے کھنڈھو تھی کے شمال میں آباد ہے اور جنوب میں بھی اس طرح سے گاؤں کا آدماء شمال میں تھا اور جنوب میں آدموں جیسے ایک ٹھکڑی کے پل سے ملائے ہوئے تھے۔ گاؤں سے بگھور مشرق میں ضرور آدماء میں میں چمک تھی اور یہ آدموں و آدماء درمیان میں جڑا ہوا کہ بعد میں ایک ہو جاتی تھی۔ جڑا ہونے میں ہو گئے اور ٹیم کھڑے ہوئے تھے۔ دیہاتی بولی میں یہ مقام دھموا کی کہلاتا تھا۔ جو دھموا کا ٹکڑا ہوا ہے۔ جس کے ملے دو آدموں کے ہیں۔

جس طرح سے مغربی ہے۔ بی کے اس نواح کا کوئی بھی نوجوان گھر سے روکتا تو وہ لاہور آ کر مل لیتا تھا، اس طرح سے اس گاؤں کے کسی نوجوان کو اپنی گئی کاب لیا ب سمجھنا ہوتا تو وہ اسے ساتھ لے کر دھموا کی کی رنگ بھوم میں دم لیتا تھا۔ کسی آنے جانے والے نے نہر کی بڑی سے جڑا ہونے میں آنے جانے کے لئے نہر کی شاخ پر پہاڑ سے بہہ کر آنے والے چیز کے لیے تلچکر کی سیکل بادی تھی۔

زبئی نے بڑی اچھاؤں جتناؤں سرہاؤں اور رچاؤں کے ساتھ سموت کو راضی کیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ مل جائے گی نہیں بلکہ ٹوکا ٹوکا ٹوکا ٹوکا کرے۔ اس کا تو بھاگ بھاگ کیا تھا۔ زبئی کی اس لڑکے پر نوٹ کر طبعیت آتی ہوئی تھی۔ اس کا دل اس کو دیکھتے ہی یہ چاہنے لگتا تھا کہ وہ وہاں دھموا میں غلام ٹوکے ہوں۔ کبھی وہ اس کے ہونٹوں کو دیکھے چلا کرتی تھی۔ کبھی چھاتی پیٹیرا اور دانوں کو

جسم ٹھنکی کی رات بھادرا کی ہدی آٹھ کو زبئی اور سموت دھموا کی جڑا ہونے والے تھے۔ آج رات وہ اس لڑکے کے ہونٹوں چھاتی پیٹیرا اور دانوں سے وہ کام لینے والی تھی جو اس کی ہونے والی بھن کا حق تھا۔

ساتھ ہوئے سہم دت اپنے باہولی والے کھیت میں اپنی بیٹھیس کے لئے چری کاٹ رہا تھا کہ زہبی نے جوار کی کچھ خٹیاں توڑیں اور سہم دت کے مارے ہوئے کہا "ارے نکوئے جانے اور شکاٹ کھک جاسے گا۔"

4

سہم دت نے یہ آواز سنی تو اس نے متاظر کراد پر دیکھا اور زہبی نے اپنی بے بسی کی دیکھی اس کی دس بھری آنکھوں میں ڈال دی۔ وہ سمجھتی تھی کہ شاید اس طرح سے سہم دت اسے ابھی اپنا نوازہ بنالے گا۔ وہ کھڑا ہو گیا تو لڑکی نے اس کے ہاتھ سے گرائی اس طرح سے چٹکی کاس کے ہاتھ سہم دت کے ہاتھوں کو خوب چوکیں۔

سہم دت نے زہبی کو خود ہی گرائی دیتے ہوئے کہا "اچھا جتن ان جی" جی جی میرا ہاتھ بنانے آئے ہو۔ تو جی تم ہی کاٹ کے دکھاؤ۔" زہبی نے کچھ ہی چوہے کانٹے تھے کہ سہم دت نے زہبی سے گرائی لیجئے ہوئے کہا:

"بس بس کھائی میں دھکا آ جائے گا جب دھموئی پر کوئی ترچہ رہی تھی اور کوئی ترچہ ہاتھ تو میرے کانوں میں ایسی ہی "بس بس" کی آواز چلی تھی۔"

زہبی: وہ آواز میری ہی تو تھی۔

سہم دت: میرے ساتھ تو میرا بیٹا تھا ابھی نہیں پڑا۔ وہ ڈاک مٹنی کی کوری ہی کچھ ایسی دھکی تھی جس کا اس دنس ایسا روپ دس ہے کہ اسے دیکھتے جاسے۔

زہبی: میرا اس دنس کہا ہے؟

سہم دت: تیری شاید دل آنکھیں ابھی ہیں۔ جن سے تو مجھے اس طرح سے دیکھتی رہتی ہے۔ جس طرح سے ہماری بیٹھیس دور کی ہوئی کٹڑ الی کا جس میں اس کے لئے گڑا چپے مورج کر لی ہوئی ہوئی ہے پر تیرا کھائی چرہ دھماکا جگم ہے۔

زہبی: سوائے میرے کھائی میں کئے تھے میری اور کوئی شے ابھی نہیں آتی؟

سہم دت: یہ میں بخود دیکھ کے کہتا ہوں۔

زہبی: ڈاک مٹنی کی لڑکی کے متاثر تو مجھے ہلاک کر رہا ہے۔

سہم دت: اس سے مجھے ہلاک نہیں مل سکتی ہے۔ تو اسے ملتا ہے۔ یہ تو ابھی میں ہی فیصلہ ہو گا کہ کتنے لوگوں ہے۔ کبھی کبھی اور جہان ہونے کے بعد اس طرح سے دنس کا رتی بھی مار لیتی ہے کہ جیسے اسے سمجھے کہ کبھی سردار نہ ہو اور میں کھاؤں تو ہاں بھی نہیں کرتی۔ کہ یہ سناؤ پک چکے کھک کا ہوتا ہے کہ کبہ وہ آپ سے آپ میری کھکوں کے لگتی ہے۔

زہبی: میں کل کہاں ملوں؟

سہم دت: دھموئی پر ملیں گے۔ پر دھن دھن سے جو چڑھا آ رہا ہے۔ جگم جگم ہو گئی تو؟ تو سیکھتا نہیں سن رہی؟

نرہی۔ سن رہی ہوں تو پرانے شوالے کے اٹھ جھے میں بیٹھ گئے۔ جہاں آسموں کا درجہ ریاں کھڑا ہے جودے چھٹے ٹرامپک اور کرپاچوں میں اتورنی ٹھکوریوں سے باری ہوئی ہوں۔ تو وہ وہ پہنچی پورنیا ترالو اپنی لٹھی جوائی لڑاک فٹکی کی کھودی کھڑکی پہ چھٹا کرنا چتا ہے۔

سوم دے۔ میں اس پر اپنا کچھ ٹھکاور نہیں کرتا۔ وہ میری سہ کائی میں اپنا سب کچھ ٹھکاور کرتی رہتی ہے اور کالچلائے ہوئے "میں میں" کرتی رہتی ہے۔ جتنی لوگوں اس میں میرے لئے ہے اتنی تو تھی ہی میں میرے لئے نہ ہوگی۔

نرہی میں دھوئی پہ تھکے سے پہلے کھجی ہاؤں گی۔

سوم دے ہم دونوں کا وہاں ایک ساتھ جانا ٹھیک لگی نہیں۔ پر جو تھکے وہاں میرا گر بھر دیا گیا۔

نرہی مجھے تو بڑا رو ہے تو میرا گر بھر بھی بڑا رو گا۔

سوم دے وہ سہانے ناس دھس دلی میرا لایا ہوا گر بھر پانک کھایا کرتی ہے تو بھی کھالیا۔

نرہی یہ جیڑی مرضی۔

سوم دے وہ تو میرے پاس آئے ہی ٹھک دھڑنگ ہو جا کر کرتی ہے۔

نرہی اسے ٹھک دھڑنگ ہوتے ہوئے درج نہیں آتی۔

سوم دے اسے درج آئے یا نہ آئے تو اپنی بات بتا؟

نرہی جیہا تو کہے گا ویسی کروں گی؟

سوم دے ہاں کی ہو گی؟

نرہی جیڑی۔

سوم دے نہیں جیڑی۔

نرہی اچھا ٹھکاور۔

5

شام ہوئے ہفتی رساں نے گاؤں میں خبر کر دی کہ وہ ایک تقسیم کر کے نہری ہلائی آرہا تھا کہ اس کی نگاہ دھوئی کے جزیرہ پر پڑی۔ جہاں ہٹا آرا بھی میں کھانا پانا کر رہے تھے۔ چٹھی رساں دوست گو مشہور تھا۔ اس خبر پر کھانا گڈر پڑا جی ٹکریوں کی حفاظت کے لئے اور کمال پر لٹھ لے کر بیٹھ گیا تھا۔ اور جن جن گاؤں وہاں کو ہٹا آراں کی خبر پہنچی تھی انہوں نے نگروں کے دروازے سویرے ہی ابھڑائے تھے۔ گر ہم پہر یا ٹھک گیا آراں میں "جا کونا تھو ریو" کی آواز میں دینے کے لئے نہیں نکلا تھا۔

مگر ایک سستی تھی جسے جزیرہ میں ہٹا آراں کی موجودگی کا علم تھا۔ یہ وہ باہر جی انت کی رکیچہ اور سلیر کے پاس بھیجی ہوئی تھی تاکہ سوم دے کے آنے پر اس کے ساتھ جزیرہ میں جا سکے۔ اسے یقین تھا کہ ہٹا آرا جزیرہ سے چلے گئے ہوں گے۔ اس نے کال بجی میں مصلیٰ کے سفید پھول سجائے ہوئے تھے تاکہ یہ سفید روی بند کی لگائی ہوئی تھی اور آٹھوں میں سر ہٹا ہوا تھا۔ اسے سوم دے کا انتظار تھا۔ دیکھتے دیکھتے اتنی دیر ہو گئی

تھی کہ ایک اونچے ٹیم کے اوپر آسمان میں کچھ بچھا ہوا تھا۔ جاتے بھٹن گروں اس کے سر پر آگئی تھی اور جنم اٹھنی کا بیڑ لگا مارو دو چند رنگل آ رہا تھا۔

جب کہ اس گاؤں کی کام ۱۵ سو مت کی آمد کے بعد دس کے لئے پانی کی طرف آنکھیں جھرا جھرا کر پڑا کر دی تھی کہ وہ آن کر اسے برومند کرے۔ وہ خود اڑاک فٹنی کی کوری اور بکریاں ہی خواصورت اس دس والی لڑکی کے ساتھ پرانے خوالہ کے دیوان اڑ سے میں دھکا دھکی ٹوکا ٹوکی ٹوکا ٹوکی کرتے ہوئے اسی کا بھرنا بھر رہا تھا۔ وہ سو مت کے سر داٹک سے بہرہ مند ہو رہی تھی اور سو مت اس کے سر داٹک سے بہرہ مند ہو رہا تھا۔ ڈاک فٹنی کی لڑکی کے گھر سے دور ہے تھے۔ جب کہ زبئی کا تھیں کاج کیا تھا۔

اگلے دن دوپہر ہوئے جب ہاتھیں بالوں کی روٹیاں لے کر کھڑوں میں چار ہی تھیں بھادوں کا سورج بھرا ط پر پکھی چکا تھا تو چٹھی رساں نے خبر دی کہ وہ مصوئی کی طرف سے آ رہا تھا۔ جہاں اس نے پہلے ہوئے زمانے کیڑے دیکھے اور وہیں کسی عورت کا سر چڑا ہوا تھا۔

6

چٹھی رساں کی کھنگور ڈھانچا بھی اس رہا تھا۔ زبئی گھر سے جاتے ہوئے فٹنی اور اب تک اس کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اسی وقت زبئی کے باپ اجت پر شاہ چین کی موٹر بھی اڑنے کے بعد واپس آ کر تھی۔ اس کی عورت کا انتقال ہو گیا تھا۔ جس کے ار سے زبئی اپنی بیٹی کی تھی۔ زبئی کی خاگی ماں کو اجت پر شاہ کا پینہ دے گیا تھا۔ یہ زبئی اپنے باپ کی واحد لڑا تھی اور وہ اب اسے لینے کے لئے آیا تھا۔

اجت پر شاہ چین ڈر لگا چٹھی رساں اور زبئی کا بھلا برا اور بلی کار میں بیڑ کر مصوئی پہنچے تو چٹھی رساں کی عورت چلی ہو گئی۔ اجت پر شاہ اور دو سے دور رہا تھا۔ ڈو کی آنکھیں ڈاڈا ہائی ہوئی تھیں اور وہ کھلی ہو گیا تھا۔

سور زبئی کی باجیات کو لے کر پرانے خوالہ پہنچی تو سو مت اڑ سے کے پاس قلعی بیگانہ سا کڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرہ پر غم کے کوئی آثار نہیں تھے۔ خاص لاڑ سے کی آنکھوں میں چھوٹا سا میسوا۔ اس کے لئے تو زبئی فصل میں کڑا ہوا جنم تھی جو کٹ گیا تو کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے تو راسی بھلے سا بہت پور مانگی کا تھیلہ نہیں کیا تھا۔ زبئی کی رقیبہ ڈاک فٹنی کی خواصورت اس دس والی اور دھکا دھکی کے وقت ”بس“ کرنے والی لڑکی ایک طرف کو اس طرح سے کڑی ہوئی تھی جیسے وہ کسی معقل کے ساتھ جڑ پنے والی ہو۔ وہ سو مت سے ادم بار سب کاوش حاصل کر چکی تھی۔ جب کہ لا کا لا گر ٹھک سا کڑا ہوا تھا۔

گاؤں چھوڑنے سے پہلے زبئی کے باپ نے جیلے کی تمام سر قم غریب فرما دیں تقسیم کر دی تھی۔

○

خالدہ حسین

نام	خالدہ
قلمی نام	خالدہ امین / خالدہ اقبال / خالدہ حسین
پیدائش	۱۸ جنوری ۱۹۳۸ء بمقام لاہور، مغربی پنجاب، پاکستان
تعلیم	ایم۔ اے (اردو) پنجاب یونیورسٹی اور نیشنل کالج لاہور
	لاہور کالج برائے خواتین سے بی۔ اے اور اورینٹل کالج لاہور سے ایم۔ اے (اردو) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

پیدائش لاہور میں ہوئی اور ۱۹۶۵ء تک مسلسل وہیں قیام رہا۔ آپ کے والد ڈاکٹر امین محمد شریک یونیورسٹی، لاہور کے جاس، ہانسپل تھے۔ سائنس کے شعبہ کے باوجود ان کا ادب سے گہرا تعلق تھا چنانچہ گہری فنی محنتوں میں خالدہ نے حقیقہ جانندہ حری، احسان دانش اور فیض احمد فیض جیسے نامی شعراء کو دیکھا اور سنا۔

خالدہ اپنے گھر میں ایک - بہن اور تین بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہونے کے باعث والدین اور بہن بھائیوں کی بے حد لافانی رہیں۔ بھائیوں نے اردو شعراء ادب کے علاوہ مغربی لکٹرن کا ذوق پیدا کیا اور ناز و تربیت سب فراہم کرنے میں نکلے کام نہ لیا۔ خالدہ نے ۱۹۵۳ء میں انیس سالہ عمر میں شریک کی - ۱۹۶۵ء میں آپ کی شادی ڈاکٹر اقبال حسین سے ہوئی جو انجینئرنگ کے شعبہ سے متعلق ہیں - شادی سے پہلے خالدہ کا قلمی نام خالدہ امین رہا اور اس کے بعد وہ ایک - افسانے خالدہ اقبال کے نام سے لکھنے کے بعد ایک مدت تک ادبی ناقدی سے غائب رہیں۔ اس فاصلے کے بعد وہ بارہا انیس سالہ عمر میں شریک کی تو خالدہ حسین کے نام سے لکھا - ۱۹۶۹ء میں اپنے میاں کے ساتھ کراچی منتقل ہو گئیں۔ کراچی اور اسلام آباد میں قیام کے دوران بطور ٹیچر اور ویس وٹارنس سے متعلق رہیں۔ آج کل اسلام آباد میں مستقل طور پر قیام پزیر ہیں۔

اولیٰین مطبوعہ افسانہ:

- ۱۔ ”مظلوں کی حقایق“ ٹیٹس ”مطبوعہ“ ”قدری“ کا دور: ۱۹۵۶ء
- ۲۔ ”دل دریا“ ”مطبوعہ“ ”ادب الحلیف“ کا دور: (سالہائے) ۱۹۶۰ء۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ ”کچان“ (سحر و افسانے) خالد علی کیشنور، کراچی طبع اڈال: ۱۹۸۰ء
- ۲۔ ”درداز“ خالد علی کیشنور، کراچی طبع اڈال: ۱۹۸۳ء
- ۳۔ ”مصرعہ عورت“ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع اڈال: ۱۹۸۹ء
- ۴۔ ”میں خوب میں خور“ (ایکس افسانے) دوست علی کیشنور، اسلام آباد طبع اڈال: ۱۹۹۵ء
- ۵۔ ”میں یہاں ہوں“ (ایچد افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور طبع اڈال: ۲۰۰۵ء

غیر مدون:

گوالہ اور افغانی مجموعوں کے علاوہ مضامین کا ایک مجموعہ ترتیب دیا جاتا تھا ہے۔ خالد حسین نے ایک ناول بھی شروع کر رکھا ہے۔

مستقل چہ:

۲۲۰ مضامین ۳۴، ۱۱/۸، اسلام آباد۔ پاکستان۔

اعزاز:

- ۱۔ پرائز آف پرفارمنس (کھوتی بول ایوارڈ) ۲۰۰۵ء

نظریہ فہم:

”جب میں اپنے آپ کو محسوس کرنا چاہتی ہوں تو کہتی ہوں۔ کہانی لکھنے کا عمل میرے لیے اپنے وجود کا رشتہ قائم رکھنے کی کوشش ہے۔ ان دنوں دنیا بھر کے ساتھ جو میرے اندر اور باہر بہتی ہیں اور جوں مستقل بہتی ہیں کہ دونوں کے بہاؤ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تو جب مجھے اپنا آپ طے کرنے میں محسوس ہوتا ہے، میں اپنے آپ کو لکھنے پر مجبور پاتی ہوں۔ شاید قافا خوف و بلا کی حسرت، زندگی کی محبت مجھے لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ میں اس حقیقت کا شدید احساس رکھتی ہوں کہ ہم انسان کے ہاتھ میں ایک بہت بڑی امانت ہے اور یہ امانت کسی منطق کے تحت کسی کو نہیں ملتی بلکہ جس کسی پر ایمانے کے با حق و عدل نکل آئے اس کا شن غصہ رہا ہے۔ مگر جو کوئی یہ امانت اٹھانے کا اہل نہیں ہوتا۔ یہیں سے لکھنے والے کا ایسا شروع ہوتا ہے اور یہ تو محض تقدیر کی بات ہے کہ انسان کبھی وہ چیز کچھ لکھے کہ دنیا میں اس کا آئنا بیاں نکالتے جائے۔“

(بہ خوالہ: مکتوب نامہ مرزا خالد، ایک مورخہ ۳ اکتوبر ۱۹۸۸ء)

”ہاں ہم سب اس کے خطر ہیں۔ اس سے خاکہ ہیں اور تمہیں۔“

”مگر تم ابھی۔ تمہیں کچھ پرکھنی ہو تھیں حاصل ہیں۔“

”تم نے کچھ بھاری بھاری لفظ بولے۔ دیکھو میں یہ تو تھیں وغیرہ نہیں سمجھتی۔ میں تو صرف اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ لفظ غالی لفظ نہایت متبادل چیز ہے۔“

”متبادل؟ تو کیا تم بھی۔“

”ہاں تم عجیب آدمی ہو۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں تم سے وہ قیام پاؤں کہ دیتا ہوں جو میں کبھی قیمت پر کسی اور سے نہ

کہوں۔ لفظوں میں سوچنا محسوس کرنا نہایت متبادل حرکت ہے۔“

”تو بالکل طرح سوچا اور محسوس کیا جائے۔“ میں آنکھوں میں ٹھٹھکی ہوئی مانتوں میں بہہ گیا۔ ایک بے ڈاکٹر بے رنگ احساس صبری زبان پر تھا اور ہر ایک سب پر عیاں تھا۔“

”یہی تو مصیبت ہے۔ اسی لیے میں نے لکھنا چھوڑ دیا۔“ اس نے کرسی کی پشت کے ساتھ سر رک کے اطمینان سے کہا۔ مجھے اس کی خود فریبی پر ہنسی آگئی اور دیکھا ہار میں نے نہایت احاطہ کے محسوس کیا کہ میں ہر طرف سے کہیں بہتر ہوں۔ اس پر غوریت دکھتا ہوں۔

”شاید اس لیے کہ تم کو کسی نہ کبھی تھیں۔ تم ابھی داخلہ نہیں، لکھنے والے تو کبھی لکھنا نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ سب کے سب جھوٹے ہو جے ہیں، بھائی۔“

”ہاں شاید۔ یہ بھی اور سب ہو۔ میں نے کب کہا کہ میں لکھنے والی ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں ہنسنے کا سا پہ لہرایا۔ لکھنے والا تو کوئی کوئی ہوتا ہے۔ ہاں یوں تو بہت سے لکھتے ہیں۔ لکھتے رہیں گے۔ دراصل میں نے تو یہ جانا تھا ایک دم ایک عجیب خاصوش، پر سکون دو پہر میں اچانک کچھ پانکشاف ہوا کہ زندگی کہیں بھی نہیں ملتی۔“

”نریمان؟“

”ہاں، انہیں بھی نریمان نہیں۔ ہاں لفظ ہیں اور عمل اور وقت ہے۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ وقت کا ایک ٹکڑا ہے اور کچھ ناقص لفظ اور اور دراصل، تو یہ نریمان تو دراصل ہم خود بناتے ہیں۔ عمل کا لفظوں میں لکھنے کے عزم ہم خود ہیں۔ مگر اس لیے کہ وہ مسلسل جو ہم پیدا کرتے ہیں وہ منطق جس میں لانا آتا ہے، اس کے جھوٹے ٹکڑوں میں جانتے بھٹکتے ایک مفروضہ کی بنا پر لکھ دیتے ہیں، لہذا یہ لفظ ہے۔“

”مگر سب ہم کہیں گے نہیں تو لفظوں میں سوچیں گے ضرور۔“

”اور سوچ۔ سوچ بغیر عمل کے نہایت متبادل ہے۔“

”تو بالکل ہم کیا کریں؟“

”عمل۔ صرف عمل اور لکھنا اور سوچنا تو صرف بیچوں اور دلوں کا حصہ ہے۔“

”تم بھی جہاں کرتی ہو۔ غلط حیران۔“ میں نے کہیں سے ملنے والی کوشش کی۔

”لینے دو۔ لینے دو۔ اس نے آنکھیں سے میرے چہرے پر ہاتھ رکھ کر مجھے لانا دیا۔

اور مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میں تو خطر ہوں۔ وہ سب بھی خطر ہیں اور یہ جو میرے سامنے بیٹھی ہے، اس کو مجھ پر کتنی تو تھیں حاصل

ہیں۔ کوئی گناہ چاہے نہ کریں۔

”دیکھو یہ سب اچھائی ملدا ہے کہ ہم اپنی سوچ کو یوں بحث میں لائیں۔ آجھ ہم اپنا نہیں کریں گے۔“

”ہم“ تو کیا میرے تھامے درمیان وجود کے مفہوم کا کوئی رشتہ بھی ہے۔ اگر ہے تو یہ صرف میرے ساتھ نہیں ہے۔ اپنی ذاتی تمام کے ساتھ بھی ہے تو تم اس طرح طاعت کی عنایتی ہو اور یہ سب لہجہ ملدا ہے۔ ہر حال میں تو تمہیں دانتے والا تھا کہ میں وہاں بھڑکیا تھا۔“

”تم تمہاں گئے تھے؟ وہاں پہلی حیرت نہ چھپا سکی اور فوراً سیدھی ہو کر چل رہی۔

”ہاں میں وہاں گیا تھا۔ مگر تم کب یقین کرو گی“ شاید میری آواز میں حد سے زیادہ آزر لگی تھی۔

”نہیں نہیں اگر تم چاہو گے تو میں یقین کر لیں گی۔ تم وہاں گئے تھے؟“

”ہاں میں وہاں بھڑکیا تھا۔ آج بھی دھوپ بہت تیز تھی۔ سڑک چب رہی تھی۔ میرا سر میں تھا جیسے کھٹکی میں پانی ابلتا ہو۔ پیاس کے مارے نہ پاؤں پر کانٹے پڑ گئے تھے۔ مگر سنو یہ کتنی عجیب بات ہے۔ وہاں کی سڑکیں بالکل دھکی کی دھکی ہی ہیں۔ وہ کناروں کناروں سے جہاں جہاں سے لگیوں کی انٹیں اکٹری جیسے اسی طرح تھیں۔ مگر وہی کی کڑکیوں پر درختیں چھیں اسی طرح لگی تھی۔ وہ کوئے والا مانی جنت کا مکان ہے۔ اس کا پورے کا پورا حوا میں جتا تھا اور حد سے اس نے اب تک اس کا سوراخ سرمت نہیں کیا تھا۔ تالیوں میں طرپڑے کے جھج اور آدموں کے چھلکے پڑے تھے۔ تو جب میں اسکول والی لگی پار کر کے آگے بڑھا تو میرے گھر کا گزری کدور وارے اور کھلا تھا مگر ان لگیوں میں بھڑکریوں کا گھس آقا ایک عام سی بات ہے۔ بھرگی ان لوگوں نے دروازہ کھار کھا تھا تو میں بغیر دھکے دیے اندر چلا گیا۔ اندر نہایت اندر میرا تھا دروازہ کی سی۔ دھڑکی پار کر کے گھن میں پہنچا تو بڑی اچھی پر سکون روٹی تھی۔ آنکھوں کو آرام دینے والی۔ سامنے برآمدے میں تخت پوش پر ماں بٹھی بڑی باری تھی اور ٹٹے کی سے اس کے منہ میں تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ نے کہا: ”بڑی خت کو چل رہی ہے۔ تم کہاں گئیوں میں مارے مارے بھڑا کرتے ہو۔ چلو نہیں کی کا گاس ہیں۔ وہاں بھڑ پر بک رہا ہے۔“ میں میری طرف بڑھا تو وہاں نے پیچھے سے کہا۔

”اور یہ کیا تم نے مصیبت ڈال رکھی ہے۔ تم جانتے ہو مجھے ان سب کا سنبھالنا مشکل لگتا ہے۔ پانی کی ناپاکی کی مصیبت الگ۔

تمہارے ابا بھی ختہ داخل ہو رہے تھے۔“ میں نے حیران ہو کر ماں کی طرف دیکھا۔

”کیوں کیوں؟ داخل ہو رہے تھے؟“

”بھئی کیا خط ڈال رکھا ہے۔“ اس نے چھت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ جب میں نے دیکھا برآمدے کی چھت میں جو بڑا کھڑا

چھت کی خاطر لگا تھا اس میں دھنیں ڈوری کے ساتھ دو ٹکڑے دھاتا ایک بھرہ۔

”اس میں کیا ہے؟“ میں گاس چھوڑ کر آگے بڑھا۔ مگر اس بھرہ پر کچرا پڑا تھا۔ میں نے اسے ہٹا دیا تو اس چھاتی۔

”دبے دو یہ کچرا نہیں ہٹاؤ۔ یہاں ہے چھوڑ دو۔“ انھوں نے کہا۔ ”خوت کی سیاہی میرے پیٹ میں لگی۔“

”تو پھر اور کیوں رکھا ہے؟“ میں دھاڑا۔ اس پر اس بوئی۔ ”میں کیا جانوں، تمہیں تو نے آئے تھے۔ دکھائے تھے اپنے گھر کے

نئے۔“

”میں؟ اس تو کیا صحت ہے۔ میں نے ہی رکھا ہے۔ پھر؟“ میں طعنے میں بھڑا گیا۔ ”کیا تم جانتی ہو وہ بھرہ

وہاں کیوں ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں نے اس میں نہیں جانتی اور کیا تھا جانتے ہو کہ وہ مکان، دو ٹکڑیاں، آج سے میں اس پہلے کارپوریشن والوں نے امدادی نہیں۔ تمہاری ماں کی زندگی ہی میں؟"

"میں نے اس میں نہیں جانتا مگر اٹھا جاتا ہوں کہ میں وہاں گیا تھا۔" میں نے مزید ہو کر کہا۔

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا اب میں جانوں۔ وقت ہو گیا ہے۔" اس نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ مگر اس کے جانے کے بعد فوراً بعد میں نے اگلے دروازے کے آنے کی سماعت کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ کیونکہ یہ تمہیں ایک دوسرے میں کل مل کر سال میں میری آنکھوں کا خون، پورے وجود کے اندر باہر چاروں سمت بہتی تھی اور وہ یہ کہ گئی تھی کہ لکھوں میں سوچا اور سوچ کے متعلق سوچا تھا یہ جتنا دل حرکت ہے۔ کتنی عجیب و غریب بات ہے کہ وہ اور میں ہم دونوں انتظار سے اس قدر خوفزدہ ہیں۔ مگر یہ کیا کہ وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی اس کی آنکھوں میں اس کی آنکھوں میں ایک جانتا ہوا سا راز بھرا احساس تھا وہ یقیناً جانتی ہے، سب جانتی ہے کہ وہ میرے راز کے کی جھٹ سے لگتا مگر وہاں کیوں ہے۔ کیا میں اسے وہاں رکھا آیا تھا؟ اس نے کئی ہے اور وہ اس پر لپٹا کپڑا؟ ہاں رات کو پرندے چاروں دروازوں سے اڑتے ہیں شاید اسی لیے مگر میں کتنی بے حد تیار ہے۔ وہ پرندہ دانا تو زہر جانے کا مر جانے کا کہہ کیا وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی۔ شاید وہ مجھ سے چھپا رہی تھی۔ اب اس کے آنے کی سماعت، ہر ایک روشن دیوار کی طرح کہیں میرے پیچھے گھڑی تھی اور میں اس کے سامنے تھا۔ اب اس دیواروں کے میرے قریب آنے میں آوازوں، لکھوں اور دھڑکیوں کے دیکھنے سے مراد ہے نکلے سے جاں ہیں۔

اس کے قدموں کی چاپ پر میں سنبھل کر ہی بیٹھا۔ میرا وہاں دروازے سماعت ہی کیا اور گھڑی کی تک تک کا سمندر چاروں سمت بچنے لگا۔

"گند" اس نے آہستہ سے کئی آگے کمر کاٹی۔ "رات بید کیسی آئی؟"

"سودر تم مجھ سے پوچھتی ہو آج تم جانا رات تمہیں بید کیسی آئی؟" وہ کچھ ٹھنکی، پھر ٹھنکی ہی مسکراہٹ سے کہنے لگی۔

"بید؟" میرا دل بہت ہی ذرا تھم کی بے حد ذرا تھم کی چیز ہے اور میں اس کا جواب نہایت ضروری سمجھتی ہوں۔

"تم مجھے حیران کرتی ہو۔" میں نے پکار کر کہا۔ جب تم میں اور مجھ میں ایک خاموشی سما رہی ہے۔ مگر میں تم سے یہی کہنے والی تھی کہ بید سے پہلے کے چہرے وہ ہیں، جب ہم بالکل تیار اور نئے ہوتے ہیں۔ اور ہمارے اور گرو کے تمام حصہ رات کو پچھتے ہیں تو اس وقت محض ایک خوف مجھے گھیر لیتا ہے۔ وہ تم جانتے ہو۔"

"ہاں میرا خیال ہے کہ میں جانتا ہوں۔"

"ہاں یہ خوف کہ چھوٹا مگر کئی قسم کا خوف اگر میں ہمارے منہ کا نام وقت ہی کیا تو۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر تم کو مجھ پر کئی نوعیتیں حاصل ہیں۔ تمہیں ایسی باتیں نہیں سمجھتی پوچھیں۔ تم غور کرتی ہو یہ جتنا دل ہے۔"

"یہ سچ نہیں اس کے علاوہ ہیں۔ یہ تو احساس ہے۔"

محض احساس۔ دن کے اگلے میں ہم اپنے آپ کو دوسروں میں گھومنے کی کوشش کرتے ہیں، دیکھتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں ہوا۔ مگر یہ سب خطا ہے۔ رات بید اور خاموشی پر تھا آئی ہے۔ تم نے سنا تھا۔"

"ہاں میں نے سنا میں نے سنا کیا مگر میں سوچتا ہوں کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ جتنا ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں؟ کیا یہ بالکل ناممکن بات

میں سے ہے؟" میں نے کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے کہا "مگر اس نے اپنے خوبصورت ہاتھ کے ادا سے دھاڑے لگے لانا دیا۔

"لینے دو، لینے دو، یہ میں نہیں جانتی۔" اس نے فوراً مجھ سے ٹکا پڑا۔ اور باہر کھڑکی کی جانب دیکھنے لگی۔

"تمہیں معلوم ہے یہ خزاں کا موسم ہے۔ باہر فضا کی تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ خشک بالکل خشک اور درختوں سے خشک پتے مسلسل برہم۔ بران گرتے چلے جا رہے ہیں۔ صبح و شام اور کبھی کبھی امیابک بے حد صبر و قیامت میں رک جاتی ہوں۔ یکدم مجھے خیال آتا ہے۔ وہ سکتا ہے یہ میرا آخری دن ہے۔ چنانچہ میں اپنے اس آخری دن کو دیکھتی ہوں۔ ایک کی اترتی دھوپ کو اور وہب دھاروں کو اور سوچتی ہوں یہ میرا آخری دن ہے۔ یہ کیا لگتا ہے اور شاید ہر کوئی سمجھی، کبھی وقت چاک رکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ آخری دن ہے۔ مگر میں بھول گئی ہم نے طے کیا تھا کہ کبھی اپنی سوچ پر بات نہ کریں گے۔"

"نہیں نہیں، ہمیں ضرور بات کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ بہت سی باتیں وہب کی جانیں تو ہمیں واقعہ میں چنتی ہیں اور پھر اس کو قطع کرنا ہمارے چنا ہے جو مشکل ہو جاتا ہے۔" میں نے اسے روکنے کی نہایت کٹھوری کوشش کی۔ وہ گھڑی و ٹیچر دھاتی تھی۔

"تم وقت کی اتنی پابند ہو۔ کیاں اتنی پابند ہو۔ تم ایک لمحہ پہلے آتی ہونے لگتی تھیں۔ وہ بل دک جانے کو کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔"

"کیوں۔ یہ تو محض تمہارا خیال ہے۔ دراصل مجھے گھر رفت پر پہنچنا ہوتا ہے۔ وہب میں ان کو کھانا کھاتی ہوں تو میری تمام بے کار سوچ مر جاتی ہے۔ میں فضا میں ہوں۔ مگر پھر کبھی دیر میں وہ لڑکتے سوچوں کی طرح مجھ سے الگ۔ دور ہو جاتے ہیں اور کل دک جاتا ہے۔ وقت وہاں رہتا ہے، وقت بھلا کر کرتے ہیں اور یہ سب انتہائی بے سود ہے۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر "

"اچھا۔ وہ کھانا نہیں بھولنا اور سہرا دلچسپ اور کھانا کھانے پر۔"

وہ ہماروں کے سے میرے قدموں سے چٹکی لگی اور وہ ادا دہندہ ہو گیا۔ وہ خدا اس کے جاتے ہی پہ لگے گا۔ کچھ یاد کیوں آ جاتا ہے۔ مجھے تو اس سے بچ چھنا تھا، اس بخیر کے حلقے اور اس کے اندر بننے والے کے بارے میں۔ پھر یہ سب کچھ کل پر ملتی ہو گیا۔ لیکن چند سے پہلے کا ایک یہ بہت ہی اگر طویل ہو گیا۔ محال ہو گیا اور ساتھیوں میں تو سب کارنگ بدل جانے کا ڈانک بدل جانے کا اور ہم سب کے سب اس میں بہہ جائیں گے۔

مگر چاک مجھے راہ دالے کمرے سے چنگ اور کرپاں کھینچنے کی آواز آئی۔ پھر وہ جھکے بغیر صاف اترتے ہیں اور قدموں کا جھم اور سب کچھ ختم کیا۔ تو یہ واقعی کسی کا ساتھ دالے کا آخری دن تھا۔ یہ کیا تھا؟ اس نے کھڑکی میں سے باہر نظر ڈالنے کی کوشش کی۔ وہاں کبھی کبھی اکا دکا پتے اڑ رہے تھے اور بس۔ تو یہ دن بھی اور دنوں کا ساتھ اور پھر ایک دم مجھے فحشی آگئی۔ تو ایک بار پھر وہ کوئی دوسرا تھا۔ میں نہیں تھا۔ میرے جینڈ میں ایک بڑیک اسٹیل کی گل کرتی تھی۔ اچھا، وہ کل سب سے پہلے مجھے خبر دے گی۔

مگر میرا خیال غلط تھا۔ اس نے اگلے روز مجھے یہ خبر نہ دی۔ وہ اسی طرح ایک خوشگوار دھبے کی صورت دار ہوئی۔ میری نفل گئی اور چارٹ پر چنگ لگی۔ اس کی جلی آکھیں دیکھ کر مجھے گھڑی رات کی بھولی ساری ساتھیوں نے یاد آئیں جیسے صدیوں پہلے کی بات۔ اتنی جلد اس پر خاک است کی تھی۔ میں نے سہراٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے غول دانی سے بچھا۔

"میری طرف دیکھو۔" میں نے اوجھل آواز میں کہا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے اوپر میرے درمیان وجود کے مفہوم کا کون سا رشتہ ہے۔ مجھ وہی طرح اچلی چارٹ پر لکھ کر دی۔ شاید وہ بھی اس رشتہ کا تھیں کرنا چاہتی تھی اور مجھے ایک دم ہنستا گیا۔ گرم لہو میری گتھیں اور آنکھوں میں کھولنے لگا۔ میرا سر بھاپ ہی کر اڑ گیا۔

"میری نیند نہ کھو۔ میرا ہلکا بطن نہ کرو۔ اس کا لڑکھچا کر دو۔" میں نے گویا دہر گئے سے اتار دئے ہوئے کہا۔
 "اگر تم بھی آواز تو کیا ہے۔ لیکن یہ تو تمہارا فرض ہے۔ مجھے بتاؤ اور کیا کیا فرض ہے۔ میں نے میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔"
 میں نے فطرت سے کھلی آواز میں کہا۔ میری ہتھیلیاں دوسرے کھلی گئیں۔

"سکون سکون۔ لیٹ جاؤ۔" اس نے مجھے آہستہ سے کھلی دیا۔
 "نہیں۔ تم نے ایک ان کیا سوادہ دیا ہے۔ تم نے مجھ سے بہت کچھ بھجایا ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا چاہا۔ مگر مجھ میں اتنی قوت کہاں تھی۔ وہ خاموشی سے کرسی میں بیٹھی رہی۔ میں اس کے ہونٹے کا نظارہ کرنے لگا۔ مجھ وہ خاموشی دی اور گزری تک۔ اب باقی رہی۔
 "سنو اگر تم کبھی ہو تو سنو میں وہاں بٹھرا گیا تھا۔ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ تم کبھی نہیں جانتی۔ جب آج میں وہاں گیا تو میں وہاں تختہ پر بیٹھی چاول کھن رہی تھی اور گھر کا آگن ایسا تھا جیسے آگنی، آگنی الہادی ناراض ہو کر بول بول کر ہاں بٹھکے ہوں۔ میں نے کہا وہ نہ جانا۔ آج جاتے کیا بات ہے اس میں کوئی آواز نہیں آ رہی۔ کوئی مل جل نہیں۔"

"کس میں سے؟" میں نے پوچھا تو اس نے ہر آدمے کی سمیت سے لگے اس ڈھکے ڈھکائے بٹھرا کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے چاہا کہ ٹپک کر اٹھا کر کھول کیا بات ہے۔ مگر اس نے مجھے روک دیا۔
 "نہیں نہیں۔ رہتے دو۔ چار بے سے چار۔ ذرا جانے گا۔ مر جائے گا۔ وہ آتی ہی ہوگی۔ غور ہی دیکھ لگی۔"
 "وہ کون؟" میں نے پوچھا تو اس نے دوسرے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا وہاں تم کھڑی تھیں۔ تم اور تم کبھی ہونگے وہاں کبھی نہیں گئیں۔"

"میں کھڑی تھی؟" وہ معمولی جرح سے بولی۔
 "ہاں تم اور بٹھرا جاتی ہو۔ سب سے بڑا ہندو۔ وہ تھا جب تم نے مجھ دیکھنے کے باوجود نہ دیکھا۔ تم پیچھے سے آئیں۔ بٹھرا کا خلاف انصاف بٹھرا تھا۔ نہ سب سے جب تھا تو اور کرنا بہت میری آواز اٹھی۔" میں نے اچلی اور انگوٹھے کے درمیان اسے کٹھن سے اٹھایا۔
 "اؤں ہوں۔ سب کا سب کیڑوں سے بھرا ہے۔" تم نے بٹھرا کے کاہنہ کا ہنر کھل کر اسے دوسرے باہرانی میں اٹھایا۔ اس کو جو اس کے اندر تھا۔ اس کے گرنے کی آواز آتی۔ میں آگے بڑھا۔ دیکھوں اسے دیکھوں۔ مگر تم راستے میں کھڑی تھیں اور مجھے اس ٹولف نے آواز دیا کہ نہیں یہ اس بجے لے گا آواز نہ دیا اور میں ڈک گیا۔ چلا آؤ بھاگتے ہو۔ دیکھو میرے پاؤں میں چھالے پڑے ہیں۔"
 "نہیں نہیں مجھے نہیں اکتاؤ۔" اس نے میری پیشانی پر اپنے خوشگوار طعنہ لگاتے ہوئے ہنسنے لگا۔ "مجھے نہیں اکتاؤ۔ یہ ہمارا معاہدہ ہے۔ ہم ایک دوسرے کے درم نہیں دیکھیں گے۔ مگر کیا تمہیں یقین ہے کہ راستہ بڑا آواز ہی برابر کے کمرے سے آئیں وہاں کمرے کی تمہیں تمہارے کی تمہیں؟"



منشایا

نام
تعلیمی نام
پیدائش
تعلیم

محمد رضا
یادگار محمد منشایا / منشایا
۵ ستمبر ۱۹۳۷ء بمقام موضع ٹھٹھہ نسر زوہنڈیہ شیرخان، تحصیل اٹلی شیخوپورہ، پنجاب۔
ایچ ایم اے (اردو - پنجابی)
ایچ ایم اے (اردو - پنجابی)

ایچ ایم بی ہائی سکول حافظ آباد سے میٹرک کا امتحان ۱۹۵۵ء میں پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ سکول آف انجینئرنگ
رسول سے ۱۹۵۷ء میں سول انجینئرنگ کا ڈپلوما کیا۔ ۱۹۶۳ء میں فاضل اردو اور ایف۔ اے کے امتحانات بلور
پرائیویٹ انسٹیٹیوٹ میں پاس کیے۔ ۱۹۶۳ء میں پنجاب یونیورسٹی لا بورڈ سے بی۔ اے اور ۱۹۶۷ء میں شریعت اسلامیہ
کا بیچہ راولپنڈی سے ایم۔ اے (اردو) بلور پرائیویٹ انسٹیٹیوٹ میں کیا۔ بعد ازاں پرائیویٹ طالب علم کے طور پر
پنجاب یونیورسٹی لا بورڈ سے ۱۹۷۲ء میں ایم۔ اے (پنجابی) کیا۔

مختصر حالات زندگی:

خلیفہ شیخوپورہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں ٹھٹھہ نسر کے طریب حادی خدیر احمد کے ہاں یکم شوال ۱۳۵۷ھ میں پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول میں
دو ماہی تعلیم اپنی، پانچ ماہ سے اسکول تک پہنچنے کے لیے سائیکل پر میں سکل کا سطرے کرنا پڑتا تھا۔ بچپن اور لڑکپن میں لوگ داستانیں اور پنجابی
قصے کہانیاں پڑھتے پڑھتے شاعری اور انسانی نگاہ کی طرف راغب ہوئے۔ میٹرک کرنے کے زمانے میں ان کی چند نظمیں اور کہانیاں چھپ رہی
روادہ "پدا بیت" کوہر میں شائع ہوئیں۔ اس پرچے کو نظر زیدی مرتب کیا کرتے تھے۔ والدہ کی وصیت اور خواہش کے مطابق اعلیٰ تعلیم حاصل
کرنے کا خواب احمد دار پاد اور گھریلو ذمہ داریوں سے سنبھالا ہونے کے لیے انھیں میٹرک کے بعد سول انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کر کے

حکومت اختیار کرنا چاہی۔ ۱۹۵۸ء میں اپنی ڈائریکٹری شعبہ سرکاریات راولپنڈی میں بطور سب انسپٹر آئے، کچھ وقت کوہمیری میں گزارا۔ ۱۹۶۰ء میں بطور سب انسپٹر سی۔ ڈی۔ اے (دار الحکومت اسلام آباد کا ترقیاتی ادارہ) سے شغف ہو گئے۔ ۱۹۷۳ء میں اسسٹنٹ انسپٹر کے عہدہ پر ترقی ملی۔ ۱۹۸۰ء میں سی۔ ڈی۔ اے کے انسٹرکٹات عہدہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۳ء میں ”انسٹرکٹات“ سی۔ ڈی۔ اے مقرر ہوئے، ۱۹۸۰ء میں بطور ڈپٹی ڈائریکٹر کیمپنل ڈویژن منتقل ہوئے، ۱۹۸۳ء میں بطور سب انسپٹر آجودا عہدہ پر مقرر ہوئے۔

حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد کی بنیاد رکھی۔ تقریباً اسی برس تک حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد اور ”بزم کتاب“ اسلام آباد کے سیکرٹری رہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے پنجابی اور اردو میں متعدد ڈرامے لکھے۔ ”سلامت“، ”لاہور کے شریک“، ”ہم لوہا اسلام آباد کی ادبی انجمنوں کی ادراج دہاں۔

اولین مطبوعہ افسانے:

”سہیلی“ مطبوعہ ”داسجی“ کوٹا، لاہور نومبر ۱۹۵۹ء

تیسری آچار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ ”بھٹمی میں بھٹو“ (اردو افسانے) ماہر ادب شرق راولپنڈی طبع اول ۱۹۷۵ء
(اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ملتان کے شاہکار لاہور نے شائع کیا ہے)
- ۲۔ ”اس کوڑھی“ (اردو افسانے) ماہر ادب کتب لایب اسلام آباد طبع اول ۱۹۸۰ء
- ۳۔ ”خدا اندر تھا“ (اردو افسانے) مطبوعات حرمت راولپنڈی طبع اول ۱۹۸۳ء
- ۴۔ ”وقت شد“ (اردو افسانے) ماہر ادب کتب لایب اسلام آباد طبع اول ۱۹۸۶ء
- ۵۔ ”گداہانی“ (پنجابی افسانے) پنجابی ادبی بورڈ لاہور طبع اول ۱۹۸۷ء
- ۶۔ ”۱۹۷۷ء کے شاہکار افسانے“ (مترجم) ملتان کے شاہکار لاہور طبع اول ۱۹۷۸ء
- (مختلف افسانہ نگاروں کی کہانیوں کا انتخاب)
- ۷۔ ”منتخب افسانے ۱۹۷۰-۱۹۷۹ء“ (پہلا شمار: فتح محمد کتب) مطبوعات حرمت راولپنڈی طبع اول ۱۹۸۱ء
- ۸۔ ”منتخب افسانے ۱۹۸۰ء“ (پہلا شمار: فتح محمد کتب) مطبوعات حرمت راولپنڈی طبع اول ۱۹۸۳ء
- ۹۔ ”منتخب افسانے ۱۹۸۳-۱۹۸۷ء“ (مترجم محمد شہزاد) مطبوعات حرمت راولپنڈی طبع اول ۱۹۸۵ء
- ۱۰۔ ”درخت آدمی“ (افسانے) گیس اینڈ لٹریچر سائڈ لاہور طبع اول ۱۹۹۱ء
- ۱۱۔ ”ڈوڈ کی آواز“ (افسانے) ماہر ادب کتب لایب اسلام آباد طبع اول ۱۹۹۳ء
- ۱۲۔ ”نشا“ (افسانے) دوست پبلی کیشنز اسلام آباد طبع اول ۱۹۹۸ء
- ۱۳۔ ”غراب سرائے“ (افسانے) دوست پبلی کیشنز اسلام آباد طبع اول ۲۰۰۵ء

- ۱۴۔ "گاماں تاراں تارا" (ہفتابی ناول) دوست علی کشنورہ اسلام آباد طبع ۱۹۹۷ء
- ۱۵۔ "نکلا پاد کے منتخب السائے" مثالی پبلشرز، فیصل آباد طبع ۲۰۰۸ء

غیر عدولت:

مضامین اور نثری ڈراموں کا ایک مجموعہ۔

اعزاز:

- ۱۔ وارث شاہ ایوارڈ (آکاڈمی ادبیات پاکستان) برائے "گاماں تارا" ۱۹۹۷ء
- ۲۔ نقوش ایوارڈ
- ۳۔ وارث شاہ ایوارڈ (آکاڈمی ادبیات پاکستان) برائے "جواں جواں تارا" ۱۹۹۸ء
- ۴۔ پرائڈ آف پرفارمنس (کھیتی سہلی ایوارڈ) ۲۰۰۳ء
- ۵۔ فروری ایوارڈ (دودھ نظر) ۲۰۰۸ء

مستقل چہ:

"السانہ نثر" ۸۔ سید محمد امجد علی سیدان فوراً اسلام آباد

نظریہ فن:

"السانہ" اختصار اور وحدت تاثر کا حامل ہو۔ اس میں کہانی کا چار یا خیال کو تسلسل موجود ہو۔ ادبی اور فطری اور تکنیکی ہو، لیکن کھلی کسی واقعہ کا سادہ بیان نہ ہو۔ اس میں جھنجھکی کاوش اور المان فونیت موجود ہو۔ موضوع میں نیا پن اور خیر ہو۔ فکر و احساس کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ چہ بھنے والے کا اپنا تجربہ اور ادراکات بن جائے، بحیثیت مجموعی زندگی اور ان کو آگے بڑھائے۔"

(پہلا کتاب، نامہ روز، احمد نیک عمر، مارچ ۱۹۸۶ء)

راستے بند ہیں

خدا یاد

وہ میلہ دیکھنے آیا ہوا ہے اور اس کی جیب میں بھرتی کوڑی نہیں۔

میں اس سے پوچھتا ہوں۔

”جیب تھماری جیب میں چھوٹی کوڑی نہیں تھی تو تم میلہ دیکھنے کیوں آئے ہو؟“

وہ پچھلے دنوں اور گھبراتا ہے اور کہتا ہے۔

”میں چلے میں نہیں آتا۔ میلہ خود میرے چاروں طرف لگ گیا ہے اور میں اس میں کھڑا ہوں۔ میں نے باہر نکلنے کی کئی بار کوشش کی ہے مگر مجھے راستہ نہیں ملتا تھا۔“

مجھے اس کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اس لئے میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ میں اس کی گھبراہٹ پر مامور ہوں۔ مجھے پتہ نہیں مجھے اس کی گھبراہٹ پر کس نے مامور کیا ہے؟ میں نہیں اتکا جاتا ہوں کہ مجھے ہر وقت اس کے ساتھ رہنا اور اسے بھٹکنے سے بچانا ہے۔

میلہ رول ہے۔

چاروں طرف انسان ہی انسان نظر آتے ہیں جتنے لوگ میلے سے جاتے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ آ جاتے ہیں۔ سڑکوں پر ہر طرف تانے پھیلے گاڑیاں، انیس ٹرک، کاریں اور موٹر سائیکلیں ایک دوسرے سے آگے بٹھنے کی ناکام کوشش کرتیں۔ بارن بھاتی اور دھواں آڑھتی نظر آتی ہیں۔ بارن بھا بھا کر ڈرائیوروں کے اور مسلسل گھنٹیاں بھا بھا کر سائیکلی سواروں کے ہاتھ تھک گئے ہیں۔ پچھلے دنوں کے چورے زحمت سے اٹنے ہوئے ہیں اور کپڑوں پر گرد بھی ہے۔ لیکن میلے کے شور نے ان کے گلے ہوئے ذہن حال حسوں میں اپنی دوا بھونک دی ہے۔ میلے کی لٹا کو دھوئیں، گرد اور شور و غل کے بادلوں نے ذہن بپ رکھا ہے۔ بڑے بڑے لاڈلے ٹنگروں پر انسانی آواز میں گرجتی اور ہٹکتی آڑھتی

ہیں۔ جموں کی چٹھیں، ڈھسوں کی گھسار میں اندازوں کی بانسروں کی کوئیں اور خردی فروشوں کی صدائیں ایک دوسری میں غلط ملط ہو رہی ہیں۔ ان پتنگوں قسم کی آوازوں کے شور میں اسے سوز اور اڑتی ہواں کھلنے کی یک جہی آواز سب سے اچھی لگتی ہے۔ وہ اسے کسی سُر پیلے نغمے کی طرح مستحضر و مرقم قہ ہے۔ میں نے کئی بار چلا چلا کر اسے آگے بڑھنے کے لئے کہا ہے مگر وہ سوز اور اڑتی ہواؤں کی دکان کے سامنے ہنر ہو گیا ہے میرے لئے عجیب مشکل ہے۔ کاش میں اس سے ٹھہر دوں مگر اسے اس کے حال پر چھوڑ کر جا سکتا۔ میں اس کی کینٹی فرکوں سے عاجز آ گیا ہوں۔ عجیب لمبے آؤں ہے۔ سچا وہ کتنی ہی دیر تک اس پتنگی کے قریب کھڑا بھٹتا رہا جس پر پرداں پکی چارہ تھیں اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی جیب میں پھونکی گڑی تھیں وہ بار بار جیب میں ہاتھ ڈالتا پھر خالی ہاتھ کو ہوں گھومتا جیسے اس کی پتنگی پر گرم گرم ہونے لگی ہو۔ عجیب دایاقت انسان ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے آؤں کے سامنے اکڑوں بیٹھے کتے کی آنکھ میں بھی اتنا نہ چوہیں نہیں ہوتا بھٹتا صنوبری کھاتے اور فالودہ پہنچے لوگوں کو دیکھ کر اس کی نگاہوں سے ٹھٹھکنے لگتا ہے۔

وہ میلہ دیکھنے آیا ہے۔

اور سچے میں دیکھنے کی پتنگوں کی چیز ہے۔ جینز کے سکرے ناچتی کاتی عورتیں سرس کے جانوروں کے کرپ سوت کے کوئیں میں پلٹی سوز سائیکل اور چلانے والے کی گود میں بیٹھی ہوئی لپڈی نو پر پیلے جاتے تھوڑے۔ قسم کی سکرین پر دو گانے گاتے ہوئے عاشق و مستی اور عمار کی قوت چلاتے طوطے لیکن اسے ان میں سے کسی چیز سے دلچسپی نہیں حالانکہ سرس کے ہاتھ قمریہ کار یا داروں کی اڑیوں پرناچتے سکرزوں کو دیکھنے پر تو طبع بھی کبہ نہیں آتا مگر اسے صرف کھانے پینے کی چیزوں سے دلچسپی ہے۔ اسے پھلوں، میٹھا میٹھا فالودوں آٹلی کریموں سوز اداس کی بونکوں اور سنوں میں پروئے ہوئے سڑکوں کوہ یکساں گھومتا اور ان کی خوشبو سونگتا اچھا لگتا ہے اور حالانکہ وہ دن وقت ہی صاب کے ڈبرے پر اسے بھڑا اسے کی دال روٹی ملی جاتی ہے لیکن اس کا یہ نہیں ٹھہرتا۔ رات وہ گھنٹہ دیر تک ان میٹھا میٹھا پھلوں اور چیزوں کے نام گھولتا رہا جو اس نے کبھی نہیں کھجی تھیں۔ یہ فورسٹ اتنی طویل تھی کہ میں آگیا گیا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ صرف ان چیزوں کے نام بتائے جن کے ذائقے سے وہ آشنا تھا لیکن وہ مضامین نہ ہوا اس کا کہنا تھا کہ وہ واقعی چیزوں کے کدو کرے حاصل ہونے والی لذت سے محروم ہونا نہیں چاہتا۔

سچے میں اس کی جان بچان کے لوہو لگ بھی ہیں۔

اچھی باتیں نمبردار کا لڑکا عاشق ہے جو اپنے چار دوستوں کے سرلوہ اپنے کچے پروا آ ہے اور اس کے ڈبرے پر ہر وقت ٹکڑا ہوتا رہتا ہے اور شراب کی بوتلیں خالی ہوتی رہتی ہیں۔ سوائس سرورں پر رکھے اور دکانوں سے ٹکڑے ہوئے نوٹ جن جن کھج جاتی ہیں اس نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ وہ عاشق کے ڈبرے پر چلا جائے لیکن میں نے اسے منع کر دیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ وہاں دن رات بیٹھیں مگر یہ ہے۔ پھر سردار گھوٹا نچا رہا ہے اسے اتھاری آدمیوں کی ضرورت بھی ہے لیکن میں نے اسے سردار گھوٹے کے پاس جانے سے بھی منع کر دیا ہے۔ قہارانی اپنے حال میں مست ہے۔ وہ میلے میں خالی ہاتھ نہیں آیا اپنے ساتھ دو چھائی لپٹا آیا ہے۔ اس کا جب کی چاہتا ہے کاشمیر کاٹے لگتا ہے اور جب ہی چاہتا ہے چھوڑ دیکھنے چلا جاتا ہے۔ چھوڑ دیکھتے ہوئے بھی وہ قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کے ناخن تراش رہا رہتا ہے۔ صرف قمر و سانس ایک آؤں ہے جو اسے دیکھ کر غش ہوتا ہے اور غش کے اظہار کے لئے جب بھی سامنے آتا ہے رات لالٹا ہے یا پھر کالو ہے جو اسے دیکھتے ہی دم بھاگنے لگتا ہے حالانکہ اس نے دھکی بھرا اسے سوکھی روٹی کا ٹکڑا تک نہیں ڈالا۔

اسے قمر و سانس اچھا لگتا ہے شاید اس لئے کہ قمر و گدی جھوٹی چیز ہے سبھی ہر طرح کی کھانے پینے کی چیزوں کے ذائقوں سے آشنا

ہے۔ پچھلی بار تو اس نے سدا ہی کر دی تھی۔ رات کو جب اچانک آندھی آ گئی تو وہ کالو کے ساتھ بیٹھ بیٹھنے کے لئے ایک تختہ پیش کے لیے تھیں۔ تختہ پیش کے لیے قاعدہ سے ہماری کڑائی رکھی تھی جسے اس نے اور کالو نے خالی کر دیا۔ اس دوران میرا کو باہر نکل کر وہاں کھلے میں اٹکی ڈال کر کے کر پڑی تھی۔ اگر کالو کی دھڑا کے پاؤں کے لیے خفا جاتی تو ایک آدھ بار اور تے کر کے وہ گلاب جاموں کا بھی منگایا کر دیتا۔ اسے میرا دور کالو پر رشک آتا تھا اگر میں اس کے صراحت نہ ہوتا تو اس سے بے پروا ہو کر جتا تو یقیناً ٹھک جاتا۔ چلیں میرا دلالی کرتا یا میر کسی تختہ پیش کے لیے تھیں کہ قاعدہ کا گلاب چاہیں کھار یا ہوتا۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ کسی طولانی کی دکان یا کسی ہوٹل میں تھیں کر تکی میر کے کھانے اور خود کو دیکھ کر یا نہیں کے حوالے کر دے۔ لیکن میں نے ہر کھانے کی حرکتوں سے باز رکھا ہے۔

بچنے کا آج تیسرا روز ہے۔

اور میں نہایت مشکل میں ہوں۔

وہ بھلاوت پر آمادہ ہے۔

مجھے اس کے تیسرے گھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سوڑھوا لکی پول کھینے کی بجائے بھی آواز میں کر اس کی تعریف نہیں ہوتی۔

وہ طولوعہ دہی قاعدہ اور ہالو شاپی کے ذکر سے مطمئن نہیں ہوتا۔

بچنے ہوئے گوشت اور دوست مرغ کی خوشبو سے اس کا پی نہیں بھٹتا۔ اور وہ بچوں کے نام گھوا کر لذت حاصل کرنے پر قاعدہ نہیں کرنا چاہتا۔

میں نے اسے بہت کھایا ہے، لیکن طبع کی ہے، لیکن وہ دھڑلے کر کہ وہ برقیقت پر ان سب چیزوں کو چھو کر دیکھتا چاہتا ہے جن کے اٹکتے سے وہ نا آشنا ہے۔ کہ خوش رات ہم دونوں اور تک لڑتے جھگڑتے رہے ہیں۔ میں نے اسے صاف صاف بتا دیا ہے کہ اگر وہ بات نہ یا تو مجھے زخم دے دے گی۔ لیکن اس کا کہنا ہے کہ اگر اس نے اپنی طولوعہ کا گنا گنا کھونٹ دیا تو گھٹ کر مر جائے گا۔ میں عجیب الجھن میں ہوں۔ شاید وہ وقت آ گیا ہے جب میں فیصلہ کرنا ہو گا کہ ہم دونوں میں سے کسے زخم دے دیتا چاہیے۔

میں زخم دے دیتا چاہتا ہوں۔

لیکن میں اسے بھی زخم دے گا طوفان اور مطمئن دیکھتا چاہتا ہوں۔ میں اس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں اور اسے دھاری کے کربہ جھولوں کے مناظر اور سڑکوں کے مناظر دکھانے کے ناچ دکھانا چاہتا ہوں لیکن وہ قید کر کے بیٹھنے ہوئے گوشت، دوست مرغ اور قاعدہ کے ڈانٹوں کے لئے عقل دھڑکتے پر آمادہ آیا ہے۔

وہ کہتا ہے: ”جب یہ سب چیزیں موجود ہیں تو میں ان کے ڈانٹوں سے محروم کیوں ہوں؟“

میری کچھ شے نہیں آتا کہ میں کیا کروں اور اسے کیسے کھادوں اور منگنے سے کیسے بچاؤں؟ بچنے کا آخری اور چھوڑا رو ہے۔

رات مجھے ایک لمبائی اچھوتا خیالی سوچا ہے اور میں نے بڑی مشکل سے یہ بات اس کے ذہن میں نہیں کرائی ہے کہ اصل میں سب انسان ایک ہی انسان کا ہوتوں ہیں اصل میں انسان ایک ہی ہے جو مختلف شکلوں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ کہیں وہ قاعدہ کھار ہا ہے۔ کہیں ناخن تراش رہا ہے کہیں دوست مرغ آتا ہے اور کہیں بھڑا دے الہ دہی پر استکا کرتا ہے۔ اس لئے جو کہ کچھ دیکھا میں ہر دے یا کھایا یا چار دے اس کی لذت انسان کی مشترک لذت ہے۔ چنانچہ جب وہ کسی طولوعہ پر لی کھائے دیکھتا ہے تو اسے محسوس کرنا چاہیے کہ وہ طولوعہ پر لی کھار ہا ہے

اور اس لذت میں رہ کر کا حصار ہے۔

مجھے اس کی یہ عادت ہے جو پسند آتی ہے کہ وہ سب س کے ذہن میں کوئی بات بخا دی جائے تو وہ اس سے سر مو ادر ادر نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس نے جلد ہی میری اس افونگی توجہ پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔
”بیک“ کو جس کھیلے کی آواز آتی ہے۔

ایک چٹا جلاؤنی رنگ مسے لگاتا ہے۔ وہ اپنی جگہ کھڑا مسٹر کر میری طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

”واہوا“ کیا فاضلی عمار اور مرے داروگل ہے۔ ”بھرا“ سٹین سے مسہرچھو کر کہتا ہے۔ ”مزا آ گیا۔“ سٹھ کھالوں کی خوشبو بگتی ہوئی آتی ہے اور اس کے قدم درگ لیتی ہے۔

وہ مسہ کو لے بغیر بنگوں کو دانتوں سے کاٹتا ہے چپاتا ہے۔ بھرا ان کی لذت محسوس کرتے ہوئے کہتا ہے۔

”قوراحت ہے مگر گوشت خلت ہی ہوتا عمارو چاہے۔“

میں طہیجان کا سانس لیتا ہوں۔

اس کی نظر میں ہالوشاعی کے قہل پر ہیں۔ وہ دکان سے بکھڑا سٹے پکڑے کھڑے ہالوشاعی کھانا شروع کر دیتا ہے۔ کھاتے کھاتے

اس کا منہ جھک جاتا ہے۔ بڑے بھول پہنچتا ہے مگر ہالوشاعی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ میں کہتا ہوں ”کوڑکھاؤ۔“

”خمس اس۔“ وہ ڈکار لیتے ہوئے جواب دیتا ہے۔ پانچ ڈکھ کر میں کہتا ہوں۔

”میرے سونا کرے؟“

”ہاں۔“

پانچ اس کے دانتوں سے کڑکڑاتے ہیں۔

”کچھ نہیں؟“

”بہت اچھے ہیں اس ڈارامعالیخو ہے۔“

”اور کیا پسند کرے؟“

”میں نے آج تک سیب نہیں چکھا۔“

میں اسے بھولوں کی دکان کے سامنے لے جاتا ہوں اور سیبوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہوں۔

”یہ سیب ہیں جتنے چاہو کھا سکتے ہو۔“

وہ ایک سیب لگا ہوں سے اٹھاتا ہے دانتوں سے کاٹتا ہے اور کہتا ہے۔

”یہ تو ناشپاتی ہے۔“

”یہ ناشپاتی نہیں سیب ہے تم اسے سیب کی طرح محسوس کر کے کھاؤ۔“

وہ بھر دانتوں سے کاٹتا ہے اور کہتا ہے ”یہ امرود ہے۔“

”یہ امرود نہیں سیب ہے۔“

وہ ہلکے آواز میں کہتا ہے، ہلکے آواز میں۔

”یہ آواز ہے۔“

”یہ آواز نہیں ہے۔“ ہلکے آواز میں کہتا ہے، ”تم انوکھے گئے ہو۔“

وہ ہلکے آواز میں غوروں سے دیکھتا ہے، ہلکے آواز میں کہتا ہے۔

”ہلکے آواز میں سب کچھ اٹھ کر گیا ہوتا ہے، میں نے کبھی کبھی ایسا نہیں۔“

”اچھا چھوڑو“ میں کہتا ہوں۔ ”اب آگے چلتے ہیں۔“

ہم باہر داری ایک دوسرے کی انگلی پکڑے چلتے گئے ہیں۔ ایک جگہ بہت سے لوگ جمع ہیں۔

”کیا بات ہے بھائی؟“ وہ پوچھتا ہے۔

”ماوش ہو گیا آدی لڑکے کے پیچھے آ کر پکڑا گیا۔“

وہ پریشان ہو کر میری طرف دیکھتا ہے، ہلکے آواز میں کہتا ہے

”لڑکے میرے اوپر سے لڑکے گزر رہا ہے۔“

”نہیں“ میں چلاتا ہوں

لیکن اس سے پہلے کہ میں کہہ سکاں، وہ دھڑام سے پیچھے گر جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے غصہ ہو جاتا ہے !



رشید امجد

نام	اختر رشید
قلمی نام	اختر رشید، زاد رشید، امجد
پیدائش	5 اپریل 1940ء، بدھنام سرینگر، کشمیر (بھارت)
تعلیم	ایم۔ اے (اردو)، پی ایچ ڈی
	ابتدائی تعلیم برہن ہل اسکول سرینگر میں حاصل کی۔ 1955ء میں ڈیڑھ ہائی اسکول راولپنڈی سے بھڑک کیا۔ اس کے بعد تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ 1962ء میں ایف اے 1964ء میں بی اے اور 1967ء میں گورڈن کالج راولپنڈی سے ایم اے (اردو) کرنے کے بعد 1991ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ”پہرائی، شخصیت اور فن“ کے موضوع پر کام کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔

مختصر حالات زندگی:

سرینگر کے قاضیوں کے تھاکش غلام نبی الدین مونس قسبی کے ہاں سرینگر، کشمیر میں پیدا ہوئے۔ اکتوبر 1947ء میں والدہ والدہ بڑی بہن اور سات سالہ شیدا امجد پر مشتمل یہ مختصر سا خاندان دیگر قریبی رشتہ داروں کے ہمراہ چک درجہ بازار سے ملحقہ کشمیری بازار کے خضر ناک پر رہا جس محلہ خضر ناک وقف الماک کے زیر انتظام آ جانے والے گرو ناک بی کے پیر آباد گوردوارہ میں آ کر آباد ہو گیا۔ والدہ دادہ دیوتہ جیٹ۔ مگر کے باقی ماندہ افراد جن میں دو چھوٹی بہنوں کا اضافہ ہو گیا تھا، کی کلاحت کے لیے 1958ء میں رشید امجد نے 501۔ سنٹرل ورکشاپ، راولپنڈی میں ٹکڑ کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ یہ سلسلہ 1966ء تک چلا۔ 1966ء تا 1967ءء بی۔ اے اسکول دریا آباد میں پچھرا رہے۔ اسی دوران میں راولپنڈی کے جگت استاد غلام رسول طارقی کی مشاورت سے الماس نگاری کا آغاز ہوا تو گرو بی کا گوردوارہ جنسویں صدی عیسوی کے آٹھویں دہے تک راولپنڈی اسٹیم آباد کے الماس نگاروں کی انویٹی بیٹھک بنارہا۔ ایم اے کر لینے کے بعد 1968ء میں اردو کے پیگڑ کے طور پر لیڈرل گورنمنٹ کالج، لاہور کینٹ چلے گئے۔ 1971ء میں بی۔ اے اور کراچی میں سرسید کالج راولپنڈی آئے۔ 1976ء میں ریشاں سرین سے شادی

ہوئی اولاد: ایک نئی اور دو بیٹے۔ 1978 میں اسٹینٹ پروفیسر 1993ء میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور 1999 میں پروفیسر بنے۔ "دستاویز"، "ادبیات"، اور "تعلیمی ادب" کے مترجم ہیں۔ مارچ 2000ء میں پروفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ جولائی 2001ء سے پچھلے پندرہ دن آف مائڈ میں فنکارانہ مسامحہ آپاد میں پروفیسر و صد شعبہ اور رہے ہیں۔

اولیٰین مطبوعہ اقسامت:

"علم مطبوعہ" ادب لطیف "لاہور: بابت: ستمبر 1960ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ "بیر آدم کے بیٹے" (افسانے) طبع اول: 1974ء دستاویز، پبلیشرز راولپنڈی
- ۲۔ "سید پرگشت" (افسانے) طبع اول: 1978ء ندیم جلی کیشنر راولپنڈی
- ۳۔ "سید پرگشت" (افسانے) طبع اول: 1980ء دستاویز، پبلیشرز راولپنڈی
- ۴۔ "بہت گھر میں خود گئی" (افسانے) طبع اول: 1984ء اشباح جلی کیشنر راولپنڈی
- ۵۔ "بہا کے سہ جاواں گھوڑے" (افسانے) طبع اول: 1988ء عقول، انڈیا کا لاہور
- ۶۔ "دشت نظر آئے گئے" (افسانوں کی کہانیاں) طبع اول: 1991ء عقول، انڈیا کا لاہور
- ۷۔ "تکس بہ خیال" (افسانے) طبع اول: 1993ء دستاویز، مطبوعات، لاہور
- ۸۔ "دشت خراب" (افسانے) طبع اول: 1993ء عقول، انڈیا کا لاہور
- ۹۔ "کاغذ کی فصیل" (افسانے) طبع اول: 1993ء دستاویز، مطبوعات، لاہور
- ۱۰۔ "گم شدہ آواز کی دھجک" قلم و سحر کا لاہور طبع اول: 1998ء
- ۱۱۔ "سہ گئے پر گئے کے تعاقب میں" (افسانے) طبع اول: 2002ء حرف اکادمی راولپنڈی
- ۱۲۔ "قنارے ٹاپ" (خردوشے) طبع اول: 2001ء حرف اکادمی راولپنڈی
- ۱۳۔ "ایک جام آدمی کا خواب" (افسانے) طبع اول: 2002ء حرف اکادمی راولپنڈی
- ۱۴۔ "جام آدمی کے خواب" (افسانے) طبع اول: 2007ء چرب اکادمی اسلام آباد
- ۱۵۔ "جام آدمی" (تقدیر) قلم و سحر کا لاہور طبع اول: 1999ء
- ۱۶۔ "روسیہ اور شاعری" (تقدیر) عقول، انڈیا کا لاہور طبع اول: 1988ء
- ۱۷۔ "ادب و سوانح" (تقدیر و تحقیق) عقول، انڈیا کا لاہور طبع اول: 1989ء
- ۱۸۔ "شاعری کی سیاسی ہنگامی روایت" (تحقیق) دستاویز، مطبوعات، لاہور طبع اول: 1995ء
- ۱۹۔ "سیرانی قصصہ ان" (تحقیق) مغربی پاکستان کیپی کا لاہور طبع اول: 1995ء

۲۰۔	"پاکستانی ادب کے معیار" (مجموعی) (تحقیق)	اکادمی ادبیات پاکستان	طبع: اول 2008ء
۲۱۔	"پاکستانی ادب" (مجموعی) (مترجم)	انجمن ترقی سرحد کالج، راولپنڈی	طبع: اول 1980/1984ء
۲۲۔	"اقبال نگار" (مترجم)	مدیریم پبلی کیشنز، راولپنڈی	طبع: اول 1984ء
۲۳۔	"تعلیم کی نظریاتی اساس" (مترجم)	مدیریم پبلی کیشنز، راولپنڈی	طبع: اول 1984ء
۲۴۔	"مرزا ادب و شخصیت" (مترجم)	مقبول، ایکڑی لاہور	طبع: اول 1984ء
۲۵۔	"پاکستانی ادب (نثر) 90ء (مترجم)	اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد	طبع: اول 1991ء
۲۶۔	"پاکستانی ادب (نثر و افسانہ) 91ء (مترجم)	اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد	طبع: اول 1995ء
۲۷۔	"پاکستانی ادب" (نثر و افسانہ) 94ء (مترجم)	اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد	طبع: اول 1996ء
۲۸۔	"نثر و تحقیق ادب" (مترجم)	اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد	طبع: اول 1996ء

غیر مدقون:

صدر تحقیری مضامین

مستقل پاج:

c-52 ملین 7-8 گھنٹوں کا کوئی راولپنڈی

اعزاز:

1۔ "نقوش" اعزاز برائے تحقیقی مضمون "میر تقی کی تحمیں" 95-1994ء

2۔ "پہاڑ آف پکار" مضمون "تحقیقی سول اعزاز" 2005ء

نظر یہ فن:

"میں اس لیے لکھتا ہوں کہ دیکھ اپنے بولنے کا احساس ہے۔ یہ میری مجموعی فہم ہے کہ اعتبار کے بغیر کسی شے کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ جو وجود رکھے گا وہ اس وجود کا احساس بھی کرے گا۔ میرے اعتبار کا رد یہ لفظ ہے۔ میں انھیں کو جو جو کر اپنے آپ کو مختلف کرتا ہوں۔ ہر اس طرح کی تبدیلی نہیں۔ جہاں کو نظر آتا ہے میرے تجربے مثلاً ہے اور مطالعے کا حصہ بننا چاہتا ہے۔ جب بھی لکھنے دیکھتا ہوں تو تجربہ میری کہانی میں ایک خارجی شخصیت پیدا کرتا ہے کہ اسے جاننا ہے اور اس میں روح صبر اور جذبہ صبر پیدا کرتا ہے۔ میرا فطری طریقہ درج ہے کہ عیاں کوئی حوالہ نہیں، ایک سرنگی دھند ہے جس میں چلتے رہنا چاہیے، رہنا ایک ہمہ جہتی ایک ایسا تجربہ جسے جان کر نے کے لیے عام سے اور استاد سے کی ضرورت پڑتی ہے۔ جیسا میری کہانی کا ایش ہے۔ یہ میری کہانی کا اطمینان ہے اس کی اندرونی شخصیت ہے جو اسے اور اسے صبر دیتی ہے۔"

(مکتوب عام، مرزا حامد ٹیک، جامعہ 14 اپریل 2008ء)

1000

- ۱۔ نظامِ محمدی (محمدؐ) باجائی اور تعمیری زبان کے حامل تھے۔ سوائس تھنسن اور اٹال ہونے کے سبب "عقلی" کہلاتے تھے۔ ان کی شاعری کے تئیں مجھے شائع ہونے والے (۱) "مغربی صحنہ" (۲) "ساہوگر کا گھر" (تھنسن) (۳) "اسطوبہ" (۴) "کلام سوائس" (اسطوبہ) (۵) "مشرقِ باختر" (۶) "زادہ زادہ" (۷) "شیخ اقبال" (۸) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۹) تھنسن "عالمی ادبیات" (۱۰) "مغربی ادبیات" (۱۱) "مشرقِ باختر" (۱۲) "زادہ زادہ" (۱۳) "شیخ اقبال" (۱۴) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۱۵) تھنسن "عالمی ادبیات" (۱۶) "مغربی ادبیات" (۱۷) "مشرقِ باختر" (۱۸) "زادہ زادہ" (۱۹) "شیخ اقبال" (۲۰) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۲۱) تھنسن "عالمی ادبیات" (۲۲) "مغربی ادبیات" (۲۳) "مشرقِ باختر" (۲۴) "زادہ زادہ" (۲۵) "شیخ اقبال" (۲۶) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۲۷) تھنسن "عالمی ادبیات" (۲۸) "مغربی ادبیات" (۲۹) "مشرقِ باختر" (۳۰) "زادہ زادہ" (۳۱) "شیخ اقبال" (۳۲) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۳۳) تھنسن "عالمی ادبیات" (۳۴) "مغربی ادبیات" (۳۵) "مشرقِ باختر" (۳۶) "زادہ زادہ" (۳۷) "شیخ اقبال" (۳۸) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۳۹) تھنسن "عالمی ادبیات" (۴۰) "مغربی ادبیات" (۴۱) "مشرقِ باختر" (۴۲) "زادہ زادہ" (۴۳) "شیخ اقبال" (۴۴) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۴۵) تھنسن "عالمی ادبیات" (۴۶) "مغربی ادبیات" (۴۷) "مشرقِ باختر" (۴۸) "زادہ زادہ" (۴۹) "شیخ اقبال" (۵۰) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۵۱) تھنسن "عالمی ادبیات" (۵۲) "مغربی ادبیات" (۵۳) "مشرقِ باختر" (۵۴) "زادہ زادہ" (۵۵) "شیخ اقبال" (۵۶) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۵۷) تھنسن "عالمی ادبیات" (۵۸) "مغربی ادبیات" (۵۹) "مشرقِ باختر" (۶۰) "زادہ زادہ" (۶۱) "شیخ اقبال" (۶۲) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۶۳) تھنسن "عالمی ادبیات" (۶۴) "مغربی ادبیات" (۶۵) "مشرقِ باختر" (۶۶) "زادہ زادہ" (۶۷) "شیخ اقبال" (۶۸) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۶۹) تھنسن "عالمی ادبیات" (۷۰) "مغربی ادبیات" (۷۱) "مشرقِ باختر" (۷۲) "زادہ زادہ" (۷۳) "شیخ اقبال" (۷۴) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۷۵) تھنسن "عالمی ادبیات" (۷۶) "مغربی ادبیات" (۷۷) "مشرقِ باختر" (۷۸) "زادہ زادہ" (۷۹) "شیخ اقبال" (۸۰) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۸۱) تھنسن "عالمی ادبیات" (۸۲) "مغربی ادبیات" (۸۳) "مشرقِ باختر" (۸۴) "زادہ زادہ" (۸۵) "شیخ اقبال" (۸۶) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۸۷) تھنسن "عالمی ادبیات" (۸۸) "مغربی ادبیات" (۸۹) "مشرقِ باختر" (۹۰) "زادہ زادہ" (۹۱) "شیخ اقبال" (۹۲) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۹۳) تھنسن "عالمی ادبیات" (۹۴) "مغربی ادبیات" (۹۵) "مشرقِ باختر" (۹۶) "زادہ زادہ" (۹۷) "شیخ اقبال" (۹۸) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۹۹) تھنسن "عالمی ادبیات" (۱۰۰) "مغربی ادبیات" (۱۰۱) "مشرقِ باختر" (۱۰۲) "زادہ زادہ" (۱۰۳) "شیخ اقبال" (۱۰۴) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۱۰۵) تھنسن "عالمی ادبیات" (۱۰۶) "مغربی ادبیات" (۱۰۷) "مشرقِ باختر" (۱۰۸) "زادہ زادہ" (۱۰۹) "شیخ اقبال" (۱۱۰) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۱۱۱) تھنسن "عالمی ادبیات" (۱۱۲) "مغربی ادبیات" (۱۱۳) "مشرقِ باختر" (۱۱۴) "زادہ زادہ" (۱۱۵) "شیخ اقبال" (۱۱۶) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۱۱۷) تھنسن "عالمی ادبیات" (۱۱۸) "مغربی ادبیات" (۱۱۹) "مشرقِ باختر" (۱۲۰) "زادہ زادہ" (۱۲۱) "شیخ اقبال" (۱۲۲) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۱۲۳) تھنسن "عالمی ادبیات" (۱۲۴) "مغربی ادبیات" (۱۲۵) "مشرقِ باختر" (۱۲۶) "زادہ زادہ" (۱۲۷) "شیخ اقبال" (۱۲۸) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۱۲۹) تھنسن "عالمی ادبیات" (۱۳۰) "مغربی ادبیات" (۱۳۱) "مشرقِ باختر" (۱۳۲) "زادہ زادہ" (۱۳۳) "شیخ اقبال" (۱۳۴) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۱۳۵) تھنسن "عالمی ادبیات" (۱۳۶) "مغربی ادبیات" (۱۳۷) "مشرقِ باختر" (۱۳۸) "زادہ زادہ" (۱۳۹) "شیخ اقبال" (۱۴۰) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۱۴۱) تھنسن "عالمی ادبیات" (۱۴۲) "مغربی ادبیات" (۱۴۳) "مشرقِ باختر" (۱۴۴) "زادہ زادہ" (۱۴۵) "شیخ اقبال" (۱۴۶) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۱۴۷) تھنسن "عالمی ادبیات" (۱۴۸) "مغربی ادبیات" (۱۴۹) "مشرقِ باختر" (۱۵۰) "زادہ زادہ" (۱۵۱) "شیخ اقبال" (۱۵۲) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۱۵۳) تھنسن "عالمی ادبیات" (۱۵۴) "مغربی ادبیات" (۱۵۵) "مشرقِ باختر" (۱۵۶) "زادہ زادہ" (۱۵۷) "شیخ اقبال" (۱۵۸) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۱۵۹) تھنسن "عالمی ادبیات" (۱۶۰) "مغربی ادبیات" (۱۶۱) "مشرقِ باختر" (۱۶۲) "زادہ زادہ" (۱۶۳) "شیخ اقبال" (۱۶۴) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۱۶۵) تھنسن "عالمی ادبیات" (۱۶۶) "مغربی ادبیات" (۱۶۷) "مشرقِ باختر" (۱۶۸) "زادہ زادہ" (۱۶۹) "شیخ اقبال" (۱۷۰) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۱۷۱) تھنسن "عالمی ادبیات" (۱۷۲) "مغربی ادبیات" (۱۷۳) "مشرقِ باختر" (۱۷۴) "زادہ زادہ" (۱۷۵) "شیخ اقبال" (۱۷۶) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۱۷۷) تھنسن "عالمی ادبیات" (۱۷۸) "مغربی ادبیات" (۱۷۹) "مشرقِ باختر" (۱۸۰) "زادہ زادہ" (۱۸۱) "شیخ اقبال" (۱۸۲) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۱۸۳) تھنسن "عالمی ادبیات" (۱۸۴) "مغربی ادبیات" (۱۸۵) "مشرقِ باختر" (۱۸۶) "زادہ زادہ" (۱۸۷) "شیخ اقبال" (۱۸۸) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۱۸۹) تھنسن "عالمی ادبیات" (۱۹۰) "مغربی ادبیات" (۱۹۱) "مشرقِ باختر" (۱۹۲) "زادہ زادہ" (۱۹۳) "شیخ اقبال" (۱۹۴) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۱۹۵) تھنسن "عالمی ادبیات" (۱۹۶) "مغربی ادبیات" (۱۹۷) "مشرقِ باختر" (۱۹۸) "زادہ زادہ" (۱۹۹) "شیخ اقبال" (۲۰۰) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۲۰۱) تھنسن "عالمی ادبیات" (۲۰۲) "مغربی ادبیات" (۲۰۳) "مشرقِ باختر" (۲۰۴) "زادہ زادہ" (۲۰۵) "شیخ اقبال" (۲۰۶) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۲۰۷) تھنسن "عالمی ادبیات" (۲۰۸) "مغربی ادبیات" (۲۰۹) "مشرقِ باختر" (۲۱۰) "زادہ زادہ" (۲۱۱) "شیخ اقبال" (۲۱۲) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۲۱۳) تھنسن "عالمی ادبیات" (۲۱۴) "مغربی ادبیات" (۲۱۵) "مشرقِ باختر" (۲۱۶) "زادہ زادہ" (۲۱۷) "شیخ اقبال" (۲۱۸) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۲۱۹) تھنسن "عالمی ادبیات" (۲۲۰) "مغربی ادبیات" (۲۲۱) "مشرقِ باختر" (۲۲۲) "زادہ زادہ" (۲۲۳) "شیخ اقبال" (۲۲۴) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۲۲۵) تھنسن "عالمی ادبیات" (۲۲۶) "مغربی ادبیات" (۲۲۷) "مشرقِ باختر" (۲۲۸) "زادہ زادہ" (۲۲۹) "شیخ اقبال" (۲۳۰) "۱۹۰۰-۱۹۰۱" (۲۳۱) تھنسن "عالمی ادبیات" (۲۳۲) "مغربی ادبیات" (۲۳۳) "مشرقِ باختر" (۲۳۴) "زادہ زادہ" (۲۳۵) "شیخ اقبال" (۲۳۶) "۱۹۰

دُوبتی پہچان

رشید امجد

نورجہ جب قبرستان کے گھنے درختوں سے الجھتا سر جھک کر اپنے دل میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا مستری نے قبر کا کام مکمل کر لیا۔
 پچھلے کئی مہینوں سے اس کی طواغلی قہمی کہ اس کی قبر پر لگی کرانے لیکن خالی تھیں اس خیال کو چھوڑ کر آنے والے دن کی بھولی میں ڈال
 دیتیں۔ وہ اندر ہی اندر سک سک کر ڈیاٹوں ہی ڈیاٹوں میں کبھی اذیتیں کبھی ہنسنے لگی رہتے طریقہ بتانا کی غرض سے یہی عمل ہلاتا اور سونے
 سے پہلے اس خیال کو پوری توجہ سے آنے والے دن کی بیب میں ڈال دیتا۔ بہت دن ہوئے اس کے اور اگلے روم میں ایک تصویر قہمی۔ اس کا
 خیال تھا کہ اس کی ماں کی تصویر ہے۔ لیکن کچھ کا کہنا تھا کہ یہ کوئی خیالی تصویر ہے۔۔۔ تصویر میں ایک عورت غم میں گندمی حکمرانہت ہونٹوں پر
 سہانے خالی حشر کو کھو رہی قہمی۔ خالی ہیں کہ حشر میں جو دہائی قہمی وہ اپنے دریاؤں کے پاؤں دوست بدعا قہمی۔ وہ اس تصویر کے بارے میں جاننے
 کا شوق تو رکھتا تھا اور یہ جانا چاہتا تھا کہ اس تصویر کی دہائی راستے سارے دریاؤں کے پاؤں جو کسی شجر و خند میں کیوں لپٹی ہوئی ہے۔ دریاؤں کا پانی
 سوکھ کیوں گیا ہے اور زمین کے ہاتھ خالی کیوں ہوئے ہمارے ہیں؟ لیکن اس کے لیے اس نے کبھی لمبی چوڑی چھان بین نہیں کی۔ ایک دو بار ماں
 سے یہ پھاگر کوئی تلی علیٰ غرض جواب بندے لگی۔ بلکہ انہ اس سے یہ چھوٹھی کہ وہ تصویر کے بارے میں پوچھا نہیں کیوں ہے؟
 جب کبھی وہ ڈرائیگ روم میں اکیلا ہوتا تصویر اس کے سامنے آکھڑی ہوتی وہ اس کے خطوط میں مٹا سائی کی روشنی تلاش کرتا۔ بہت
 پہلے جب وہ چھوٹا تھا اس نے اپنے باپ سے بھی یہی سوال کیا تھا۔ باپ نے جواب دینے کے بجائے اٹھا اسے حیرتوں سے گھرا اور
 کہا۔۔۔۔۔ ”تم اچلی چھائی میں دیکھیں نہیں سکدے۔“

جس دن اس کا باپ فوت ہوا تصویر جگ جگ کر دیتی۔ لیکن اس وقت اسے اپنا ہوش نہیں تھا وہ خود چمک چمک کر رہا تھا۔ بعد میں
 دوسرے تیسرے دن جب لوگ ایک ایک کر کے وصال ہو گئے تو اس نے ماں کو بتایا کہ تصویر بھی روٹی قہمی۔ ماں ہنس چکی۔۔۔ ”چنگے کھیں
 تصویریں بھی روٹی ہیں“ ماں کی قہمی کر کے غم میں گندمی ہوئی قہمی۔ اسے یقین نہیں آیا۔ وہ بکوبے شجر اور ایک روم میں چلا آیا اور تصویر کے

سامنے کھڑا ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ آنکھیں صاف دھلی ہوئی تھیں اسے شب سا ہوا کہ اس میں کئی سمجھ رہی ہے اور خطرناکی وادی سمیت ہجر کی دھند میں اپنا اپنی نیکیاں نکھ رہا ہے۔ وہ خاموشی سے کڑی پر بند کیا اور نور سے تصویر کو دیکھنے لگا۔ ایک عورت اونٹوں پر غم میں گندمی مسکراہٹ چھانے چھانے کے منظر کو یکسر ہی تھی۔ دھڑکی جس کی راہیں نکل ہوئی پھری تھیں اور اونٹوں پر غرقوں کی چلیاں جم رہی تھیں وہ اوتھہ کیا۔

اس کی ہاں سردی تھی اور تصویر ہلک ہلک کر رہی تھی۔ وہ بڑبڑا کر ہانک اٹھا۔ جس دن برسات کی پہلی بھڑی آگئی وہ ساری رات کو نہیں لیٹا رہا۔ بار بار خیال آتا کہ پانی قبر میں ٹھس گیا ہے اور ہاں سردی سے ظفر ترقی دیا ہے اس کے اسے آواز میں اسے رہی ہے۔ صبح ہوتے ہی وہ بارش میں بیٹھا قبرستان آباد قبر ٹھیک ٹھاک تھی لیکن اسے شہد ہاک پانی نہیں دیکھیں سے دس دس کر امداد چاہا ہے وہ گورکن کی کونٹری میں پہنچا ہوا چائے پلا، ہاتھ اس کی بات سن کر اس نے منکوحہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر اور بولا۔۔۔ "فکر نہ کرنا پانی امداد نہیں چاہ سکتا۔"

"بھر کئی کسی اور طرف سے۔۔۔ میرا حجب ہے بیٹھے ہی بیٹھے کہیں سے" گورکن دو تین لمبے انکی طرف دیکھتا رہا۔ بھر کہنے لگا۔۔۔ "اچھا بارش بند ہو جائے تو میں تصویر ہی ملی تو راز مال دوں گا" وہ اطمینان سے سر ہلاتا تھا اس کا کہا۔ اگلے دن بارش بھر ہوئی اور زور شور سے ہوئی۔ وہ بیٹھا بیٹھا صبح سویرے قبرستان آیا۔ بہت سی قبریں بند کی تھیں مگر اس کی ہاں کی قبر ہی طرح تھی بھر کئی اسے شہد ہاک دے بیٹھ رہی ہے گورکن اس کی بات سن کر بولا۔۔۔ "تو بھر کئی کرالو" "ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ اٹھ اٹھ آتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا۔ لیکن قبر کئی کرانے کے لیے اس کے پاس پہنچے تو وہ نکلے ہاتھیں اور وہ نکلے وہ قبرستان چاہتا نہ رہا دیکھ کر قبریں بند چلیاں۔ اس کی ہاں کی قبر کئی خاصی چکی ہوئی۔ تاہم ابھی اس کی شکل مصورت کا نہ تھی۔ ساری رات اسے کئی احاس رہا کہ پانی پور نہ پوندا امداد چاہا ہے اور اس کی ہاں سردی سے ظفر ترقی دیا ہے اسے گئی اسے عوازیں دے رہی ہے تصویر نے بھی چپ سا دھڑکی تھی۔ غم میں گندمی مسکراہٹ بھر ہوئی تھی۔ شاید اس نے مزہ نہ کھایا ہے جس سے پیچھے تو کمر لڑا میرا ہے اور آگے دھند ہی دھند۔۔۔ دھند اس دھند میں سمجھل سمجھل کر قدم قدم چلتا وہ کوہم بھر کر اس غم آلود مسکراہٹ کی چاند چاندی میں لوت آتا۔ گور کئی یہ مسکراہٹ غم کی تھی اسے آزاد ہوئی۔ وہ سوچتا اور ہر صبح تصویر کی دلیلیز پر آکھڑا ہوتا لیکن مسکراہٹ اسی طرح غم آلود سانس کا تھکھکھاس وادی کے پھٹتے بھوکے چہرے ویران مسکراہٹ غم آلود منظر کا چہرہ وادیاں ضرورتیں نوکیلے پتھروں سے اس کے قدم کو مستقل اور چھ رہی تھی۔ تھکی انگلیوں سے جینے کی سوجھ سامیہ دس کونٹا لادہ ہے دم ہو گیا اور سوچنے لگا کہ تصویر بچا لے لے تو میرا ہے وہ پلے پلے کچے ہیں ایک دوست نے ایک بار کہا تھا۔۔۔ "اس تصویر کو کوئی بھی ٹھیک ٹھیک مٹے مٹے داسوں ٹھیک لے گا۔" تصویر بیچے کا خیال شاید اسی دن پیدا ہو گیا تھا۔ یہ اور بات کہ اس وقت اسے یہ بات اتنی بری لگی کہ وہ اس دوسرے سے کچل لڑا۔ مسکراہٹ غم آلود سانس کا منظر دھند لا ضرورتوں کے ہاتھ لیے اور لیے ہوتے پلے گئے۔ اس نے ایک دن بیچے سے تصویر بچا ڈالی۔

ذخیرہ مارے پیسے لے تو خالی ہاتھ منٹ گئے اور آسامائیں خود بخود اس کی دھڑکی میں ملی آئیں۔ وادی کی تختی میں نری آگئی۔۔۔ لیکن رات کو تصویر کی خالی جگہ اس کی ہاں کونٹری ہوئی اور غم آلود مسکراہٹ کے ساتھ بڑی حسرت سے اسے دیکھتی رہتی اس نے سوچا اس کی وجہ کا خالی ہونا ہے سو اس نے وہاں کینڈر لٹا لٹا۔ کینڈر لگنے سے دن اور مینے اس کی ٹھکی میں آگئے ہاں اب غلاب میں آنے لگی۔ وہی غم آلود مسکراہٹ اور حسرت ابھی نظر میں اس نے سوچا شاید اب قبر میں خوش تھیں۔ قبر کئی کرانے کا خیال کچل کر اس کے چہرے ویران چھانک گیا۔ قبر کئی کرانے کا کام اٹھانے دن شروع ہو گیا۔ وہ مسخروں نے شام تک کام کر لیا۔ نام کی سہل بھی لگ گئی۔ اس رات وہ عجیب طرح کی نیند سوچا۔

خواب میں اس نے دیکھا وہ بہت بڑے کمرے میں دو ڈرامے۔ دھند کھڑی ہو گئی ہے اور دو اور اینٹریز سمیت سب اس دھند میں گم ہو گئے جا رہے ہیں صبح سویرے اس نے انگریزوں کا پکٹ اپیا اور قبرستان کی طرف چلی چوہو قبر پر جا کر چٹاں دکھا کہ جب اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اچانک ایک شبہ نے سر اکر اس کے ہاتھوں کو اس لایا۔ اسے احساس ہوا کہ قبر اس کی ماں کی قبر نہیں ہے۔ اس کی ماں کی قبر تو ساتھ والی ہے جو اسی طرح کھلی ہے۔ یہ غلطی کس سے ہوئی؟ اس سے باصطریحوں سے پتہ چلا۔ یہ مصریوں کی غلطی ہے وہ انہیں قبر دکھا کر چلا گیا تھا۔ انہوں نے غلطی سے ساتھ والی قبر کھلی کر دی۔۔۔ اب کیا ہو۔۔۔ کیا ہو؟

سہارا دیں، ہاں پڑھ لکھ اس کی آنکھوں کے کناروں میں اترتی رہی۔ دوسرے دن مسز می ساتھ وہی قبر کی کر ہے تھی۔ شام کو اس نے غور سے قبر کا جائزہ لیا۔۔۔ ہاں یہ اس کی ماں ہی کی قبر ہے۔ اگلی صبح اگر قبریاں جلا کر چپ دوڑ جائیں گے تو اس کی ماں نے کچھ تو شک ریگ ریگ کر پھر اس کے ذہن میں اتر آئے۔ یہ تو بھی اس کی ماں کی قبریں۔ اس نے غور سے دونوں کی قبروں کو دیکھا۔ دونوں میں سے کوئی بھی اس کی ماں کی قبر نہیں ہے وہ تو ان سے اگلی ہے۔ فلک اور بھینس کی اس جگہ میں تیسری قبر بھی چھٹی اور پھر چار تھیں اور چھٹی قبر بھی چھٹی ہو گئی۔ لیکن اسے یہی شبہ رہا کہ ان میں سے کوئی بھی قبر اس کی ماں کی نہیں۔

[illegible][illegible]

اور مردے اٹھکے ہوئے نشان۔ دوسری کے بعد تیسری اور چوتھی قطار کی قبریں، یکساں ہوتی تھیں لیکن اس کی ماں کی قبر ہی طرح کی رہی۔ راستہ کو خواب میں تصور کی فلم آلود منظر اس قدر کی جھلی جھٹ بوند بوند رہتا تھا کہ اور سردی سے قطرات کی ماں دھندلاتے دھندلاتے اداس خلیں منظر میں گم ہو جاتے۔ جس دن قبرستان کی آخری قبر بھی کی گئی تھی اس نے اطمینان کا کھرا ساٹس لایا۔ اور ساری کی قبروں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”ان میں سے کوئی ایک قبر میری ماں کی بھی ہے مجھے معلوم نہیں محروم کی تو ہو گئی ہے نا۔“

انہی کے سوا سب دوسری طرف کی طرف سے چلے گئے۔ چاروں نے ہی کر دیا تھا کہ اس نے چوٹی اور بچوں کو بچا اور کہا کہ وہ سب اس کے ساتھ ہوں گی۔ قبر پر فاتحہ پڑھنے لگے۔ قبرستان پہنچ کر اس نے چوٹی بچوں سے کہا کہ وہ سب قبروں پر اگر تھیں اور چھوٹ لگا دیں۔ اس کی چوٹی نے چھوٹ سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ”بھئی یہ سب میری ماں کے چاہی ہیں اور دل عیاد میں اس نے اپنے آپ سے کہا چلی بات ہے۔ مجھے معلوم ہی نہیں کہ ان میں سے میری ماں کی قبر ہے کونسی۔“

قبروں پر اگر قبائلی گھیس تو سدا قبرستان خوشبو سے ہمک تھا۔ انہوں نے دعا کے لیے اچھا طاعن، اعلیٰ مالک کر سب نے اچھ پیچ کر

لے لیکن اس کے ہاتھ طلا میں ہی پتھر ہو گئے۔ اسے یاد آیا یہ تو وہ قبرستان ہی نہیں جس میں اس نے اپنی ماں کو دفن کیا تھا۔ تو اس کی قبر ابھی تک
 مکی ہے۔ تصویر میں ایک مرد سے فلم میں گدھی سکرانٹ کے ساتھ خالی سکر کو پکڑ رہی ہے۔
 قبر کی جھت دھیرے دھیرے بند رہی ہے۔ پانی بوند بوندیں رہا ہے اور ماں دھار سے گئی غمزدار رہی ہے۔ جگے۔ جگے خانوں کے
 ساتھ سب سے پیچھے آتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا ”میں دوسرے قبرستان کی ایک ایک قبر پکڑ کر وہاں لگاؤ۔“
 اسے خیال آیا اس شہر میں تو کئی قبرستان ہیں ”کوئی بات نہیں“ وہ بڑبڑایا ”میں اس شہر کے سارے قبرستانوں کی ایک ایک قبر پکڑ کر
 دوں گا۔“ اطمینان کے بوند سے نے ایک لمحہ کے لیے رنگ برنگے پر پلا پلازائے اور دوسرے لمحے خالی سکر میں گم ہو گیا۔ اسے خیال آیا
 کیا مظلوم یہ وہ شہر ہی نہ ہو جہاں اس کی ماں دفن ہے۔



بلراج کوئل

نام	بلراج کوئل
قلمی نام	بلراج کوئل
پیدائش	۲۵ ستمبر ۱۹۲۸ء بمقام سیالکوٹ، مغربی پنجاب۔
تعلیم	ایم۔ اے (انگریزی) پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ ۱۹۵۳ء پی۔ اے کا امتحان فیروزپور سے ۱۹۴۸ء میں پاس کیا تھا۔

مختصر حالات زندگی:

والد کا نام، حکومت رائے۔ بچپن اور لڑکپن سیالکوٹ میں گزرے۔ ۱۹۴۷ء میں اپنے خاندان کے ساتھ دہلی منتقل ہو گئے۔ دہلی یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد رہے۔ ان۔ م۔ راشد میراثی، فیض اور اختر الامان کے بعد آقا و قلم کا اقدار بحال رکھنے والے شعراء میں ان کا نام بہت نمایاں ہے۔ ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۸ء میں ہوا، جب انہوں نے اپنی پہلی نظم ”اسکی“ لکھی۔ المانے کے میدان میں بہت سست روئیں بہت جلد۔ ۱۹۸۶ء تک ڈپٹی انجیکشن آفیسر محکمہ تعلیم دہلی رہے۔ پبلک ریلیفنگ کے فن سے غارتی، ٹیس طبع، دہلی کی شاموں کو گھنٹے ہانے والے یادوں کے بار۔ بھری منتخل میں گم نشان رہنے والے، حدود چہ کم آ میز بلراج کوئل سے ملی کر زندگی سے محبت ہو جاتی ہے۔

اولین مطبوعہ تحریر:

قلم: ”اسکی“ مطبوعہ: ”سنگ میل“ پتا اور سرجہ، فارغ بخاری و رضا ہوائی، ۱۹۴۸ء

اولین مطبوعہ افسانہ:

”روشنی روشنی“ مطبوعہ: ”کونوی دنیا“ لاہور، ۱۹۶۳ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ "۳۳ تھیں اور پاؤں" (انسانے)
- ۲۔ "پہری تھیں" (شاعری)
- ۳۔ "رہے دل" (شاعری)
- ۴۔ "ہر مل کے پل" (شاعری۔ منتخب تھیں۔ دیوگری حروف میں)
- ۵۔ "ہر مالی کا ایک گھوا" (ہندی دولت)
- ۶۔ "سردھام ستر" (شاعری)
- ۷۔ "استحاب" (منتخب شاعری)
- ۸۔ "تزارنگ" (شاعری)
- ۹۔ "چندوں بھرا آسان" (شاعری)
- ۱۰۔ "کوب کی جوش" (تخلید)
- ۱۱۔ "شہر میں ایک گریز"
- ۱۲۔ "منتخب تھیں" (انگریزی ترجمہ)
- ۱۳۔ "نکاح کے پلڑے" (انعام سندرہ راجن کا ترجمہ)
- ۱۴۔ "تورونت" (ازلیپا سین گپتا کا ترجمہ)
- ۱۵۔ "تو اتارو تسلسل" (تخلید)
- ۱۶۔ "انگا اورتی" (شاعری)
- ۱۷۔ "آکلی" (منتخب تھیں)
- ۱۸۔ "ساب اور تیا" (ترجمہ دل)
- ۱۹۔ "اندھیرے میں سگئے حروف" (شاعری)
- ۲۰۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۲۱۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۲۲۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۲۳۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۲۴۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۲۵۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۲۶۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۲۷۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۲۸۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۲۹۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۳۰۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۳۱۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۳۲۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۳۳۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۳۴۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۳۵۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۳۶۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۳۷۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۳۸۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۳۹۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۴۰۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۴۱۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۴۲۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۴۳۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۴۴۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۴۵۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۴۶۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۴۷۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۴۸۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۴۹۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۵۰۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۵۱۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۵۲۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۵۳۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۵۴۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۵۵۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۵۶۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۵۷۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۵۸۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۵۹۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۶۰۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۶۱۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۶۲۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۶۳۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۶۴۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۶۵۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۶۶۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۶۷۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۶۸۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۶۹۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۷۰۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۷۱۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۷۲۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۷۳۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۷۴۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۷۵۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۷۶۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۷۷۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۷۸۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۷۹۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۸۰۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۸۱۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۸۲۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۸۳۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۸۴۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۸۵۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۸۶۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۸۷۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۸۸۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۸۹۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۹۰۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۹۱۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۹۲۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۹۳۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۹۴۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۹۵۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۹۶۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۹۷۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۹۸۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۹۹۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)
- ۱۰۰۔ "ساجی آکلی" (نئی دہلی)

غیر مطبوعہ:

انگریزی اور اردو میں لکھے گئے اعداد و مضامین / ترجمے اور تھیں۔

مستقل پتا:

ای۔ ۳۹ اکا کالی، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹، بھارت

- ۱۔ حکومت ہند، وزارت تعلیمات، ایچ آرڈی برائے ٹائولٹ: ”ہیرانی کا ایک ٹکڑا“ ۱۹۳۹ء
- ۲۔ آئریڈیلس اردو اکادمی ایچ آرڈی برائے: ”مسٹر دام ستر“ (شاعری) ۱۹۷۱ء
- ۳۔ آئریڈیلس اردو اکادمی ایچ آرڈی برائے: ”آ نکھیں اور پاؤں“ (افسانے) ۱۹۸۲ء
- ۴۔ احتیاج میراج اردو ٹیکسٹو ہیرائے شاعری ۱۹۷۷ء
- ۵۔ وطنی اردو اکادمی ایچ آرڈی برائے شاعری ۱۹۸۲ء
- ۶۔ سلوینڈ اکادمی (وطنی) ایچ آرڈی برائے ”پہلوں بھرا آ سانا“ ۱۹۸۵ء
- ۷۔ فراق گاناٹن ایچ آرڈی ۱۹۹۵ء
- ۸۔ اختر بیٹشلس ساحرہ گاناٹن ایچ آرڈی ۲۰۰۰ء
- ۹۔ بھارہیہ بھاشا پریشاد ایچ آرڈی ۲۰۰۳ء
- ۱۰۔ دلچسپ سرکار شرومنی ایچ آرڈی ۲۰۰۴ء
- ۱۱۔ غالب ایچ آرڈی برائے: ”اردو شاعری“ ۲۰۰۶ء

نظریہ فن:

”شعراور نثر کی حد بندیاں اگرچہ مجھ میں لیکن افسانہ بہر حال نثری صنف اظہار ہے۔ اس کی مخصوص ساخت ہی اس کی پہچان ہے۔ سفر واقعہ کردار، گوشت پوست و لور میں جزاات و تخیلات کا سفر بھی ہے اور مرحلہ تخیل میں اتفاق و معنی کے استعاراتی امکانات کا سفر بھی۔ افسانہ آئینہ زدگی بھی ہے اور بعض اوقات شعری انداز میں تجربے کا جوہر بھی۔ افسانے کی حاکمیت نوعیت اس کے پرے وجود کا حصہ ہوتی ہے۔ محض جزوی شعبہ نہیں۔“

(مکتوب، کام مرزا حامد، چک عمرہ، ۲۷ داکٹ ۱۹۸۲ء سے اقتباس)

کنواں

بلراج کوئل

جب سب ٹیل کار پوریشن کی طرف سے شہر کے بیشتر حصوں میں پانی کے قتل میرا کر دیے گئے تو شہر کے اکثر کنویں بے مصرف ہو گئے اور کافی عرصہ تک بے مصرف رہے۔ آخر ایک ذہین شہری نے ان کا ایک انوکھا مصرف وضع کیا۔ اس نے ایک فست میں کنواں بھلا گئے کا انوکھا تجربہ کیا۔ یہ تجربہ کامیاب رہا۔ نتیجتاً اس ذہین شہری نے کنواں بھلا گئے کا مشغلہ ہاتھ دھو کر پر اختیار کر لیا۔ جب وہ ایک کنواں بھلا گیا پتا تو اس کی خواہش ہوئی کہ وہ ایک اور کنواں بھلا سکے۔ ہر بار وہ پہلے سے زیادہ مشکل صورت حال کا احاطہ کرتا اور تماشائیوں کی باتوں اور دادوں کے درمیان کنواں بھلا گئے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس کی مقامی رفو رفو شہرت کا وہ چھ اختیار کر گئی اور اب اس کا نام ہرواتی سماج کے اخبارات میں بھی کبھی کبھی نظر آنے لگا۔

کسی بھی فرد کا کوئی دعویٰ ایسا نہیں ہے جس کو پہنچ کرنے کے لیے دوسرا فرد موجود نہ ہو۔ چنانچہ گوئنگر کے سلسلہ میں بھی یہی ہوا۔ ایک روز اسے ایک ملا ملا۔ یہ ملا ایک افشی کی طرف سے تھا جس نے گوئنگر کو کنواں بھلا گئے کے مقابلہ کے لیے پہنچ بھیجا تھا۔ گوئنگر نے ملا چند ملا اور ملا چند سے ہی اس کے سر داد دے گا رہے تھا کیا کہ وہ پہنچ حضور کر لے۔ چنانچہ گوئنگر نے فوراً پہنچ کرنے والے کو تو بری اطلاع دی کہ کسی وقت بھی باہمی غلط فہمی کے ذریعہ ملے شدہ شرائط کے مطابق مقابلہ کے لیے تیار ہے۔ اگلے چند ہفتوں کے اندر شرائط طے ہوئیں اور مقابلے کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ مقامی ہر قوی اخبارات میں مقابلہ کی تفصیلات کا اعلان کر دیا گیا۔

اگرچہ گوئنگر بہت مشق کلازی تھا اور بہت سے کنویں بھلا گیا تھا۔ جوں جوں مقابلے کی تاریخ قریب آتی گئی اس کے دل میں غمناک پیدا ہونے لگے۔ ان غمناک پر قابو پانے کے لیے گوئنگر نے فیصلہ کیا کہ چونکہ سوال اپنی شہرت اور وقار کو برقرار رکھنے کا ہے اس لیے مقابلہ سے قبل کنواں بھلا گئے کی کچھ مشق ضروری ہوگی۔ جو مقابلے کا فیصلہ نیچے کن اعداد سے اس کے حق میں کرنے میں مفید ثابت ہوگی۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد گوئنگر نے شہر کے تمام کنوؤں کا، جن میں سے اکثر وہ بھلا گیا تھا، بطور جائزہ لیا۔ ہر ایک کنویں کا قطر ناپا۔

بھلا تجھے کے زاویوں کا مطالعہ کیا۔ ظاہر ہے گولنگر بھی شہرت کے ناک کے لیے شہر کے کوڑوں پر مشق کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے اس نے اس کام کے لیے شہر سے باہر ایک ویران کنویں کا انتخاب کیا۔ کنوئیں چاروں طرف سے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ باہر سے گزرنے والا آدمی اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ درختوں کے جھنڈ کے اندر کنوئیں ہے اس کنویں کی ایک خوبلی یہ تھی کہ کہ اس کی منڈ پر اس کا قطر اور اس کے چاروں طرف کی خلی ذہین کا سدودا ہر اس کنویں کے ہم آئیں تھا جو اُڑی طریقہ متبادل کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

کنویں کا انتخاب کرنے کے بعد مناسب چارائی کی ضرورت تھی۔ گولنگر نے تمام چارائی دو چاروں روز میں مکمل کر لی اور ایک مہینہ کنویں کی طرف روانہ ہو گیا۔

مارچ کی پہلی کی طرح صورتحال تھی۔ ہوا میں موسم بہار کا اثر تھا لوگوں کے چہروں پر مسرت تھی بچے آنکھوں میں کھیل رہے تھے۔ زندگی کا کاروبار معمول سے زیادہ حسن اور خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔ گولنگر رنگ ریل کی اس محفل سے لطف اندوز ہوتا ہوا شہر کے دھیرے دھیرے تیز ہوتے ہوئے ہڈا ہوش سے گزردہ درختوں کے اس جھنڈ کی طرف جا رہا تھا جہاں اسے کنوئیں پیدا کئے کی مشق کرنی تھی۔ اس کا دل اس کا دماغ اس کا ہر رادہ اور زندگی کے نشے سے سرشار تھا۔ اس کے قدم اچھو سے اچھو رہے تھے اور اس کے چہرے پر کامرانی کا وہ نور تھا جیسے وہ مقابلے میں شامل ہونے سے پہلے ہی متبادل جیت چکا ہو۔

شہر کے ایک نو ائی ہستی میں وہ ایک پارک کے قریب سے گزرا۔ سڑے پر کھڑے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ٹیک اسی وقت کھیلنے والے لڑکے نے ایک شاندار چمکا لگایا۔ گولنگر کا دل مسرت سے چمک اٹھا۔ نو ائی ہستی سے نکل کر وہ اس سڑک پر آ گیا جہاں خواہ صورت جنگوں کی ایک بھڑور در تک پہنچی تھی۔ ایک مکان کے باہر ایک گول مغل، سرخ و سبز پچھائی تھا رہا تھا۔ گولنگر نے اس کے طاق صحت مند گالوں کو جھپٹا لیا اور آگے بڑھ گیا۔

اب وہ درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ کے بالکل قریب تھا۔ وہ رک گیا اور اس نے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ فطرت کا سارا حسن کنوئیں کی ہریالی اور سونے میں سمٹ آیا تھا۔ گولنگر جگہ دیں اس حسن سے سرشار ہوتا ہوا پھر جھنڈ کے اندر داخل ہو گیا۔ کنویں کے قریب پہنچ کر اس نے جو حشر دیکھا اسے دیکھنے کا امکان کے اس وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کنویں کی منڈ پر سو کھارہ اونچے درجوں میں لپٹا ہوا ایک نو جوان بیٹھا ہوا تھا اور بڑے اطمینان سے کنویں کے اندر جھانک رہا تھا۔ اچھی گولنگر کی آمد سے بالکل بے خبر تھا اس لیے جب گولنگر اس کے قریب پہنچا تو وہ چونک چلا۔ گولنگر نے اپنے رد عمل کا اظہار ایک سوال کی صورت میں کیا۔

”تم کون ہو؟“

اچھی اب بھی کنویں کی منڈ پر بیٹھا ہوا تھا اور گولنگر پر ایک حقیر آہ نظر کر کے کنویں کے اندر جھانکنے کی مشق میں دوبارہ مصروف ہو گیا تھا۔

گولنگر کے سوال کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

گولنگر نے اپنا سوال دہرایا۔

”میں پوچھتا ہوں، تم کون ہو؟ کیا کرتے ہو اور یہاں کس لیے آئے ہو؟“

اچھی نے اپنی آنکھیں کنویں کے پیسے سے دھائی اور گولنگر کے چہرے پر گزری۔ گولنگر کو پچاس برسوں کا بھی اچھی اس کی

روح کے اندر جھانک رہا ہے اور اس کے ہر ذرے سے وقف ہوتا جا رہا ہے۔ گوئنگر کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہونے لگیں اس سے خوشتر کہ گوئنگر اپنے جتنے کا اظہار کر پاتا۔ انہی کے ہونٹ آہستہ آہستہ چلے۔

”دو انسانوں کے درمیان اور وہی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ان کے تقاضا ایک جیسے ہوں۔“

”تو تم اور وہی کی تلاش میں ہو۔“

”قاریہ میں نے غلط نقطہ استعمال کیا۔ مجھے رشکو یا قاتل یا اسی قسم کا کوئی عام لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا۔ بہر حال میں کسی سوال کا جواب

نہیں چاہتا ہوں۔“

گوئنگر پکر میں آ گیا۔ عجیب آدمی سے واسطہ نہ تھا۔ وہ انہی کو کہہ گا میرے ہی کے عالم میں دیکھنا ہمارا پھر بولا:

”دیکھو میں یہاں ایک خاص مقصد سے آیا ہوں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

”میں رہا نہیں جانے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ تم چاہو تو یہاں سے جا سکتے ہو۔“

”آغرم تم کیا چاہتے ہو۔“ گوئنگر نے پوچھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ اپنے آپ کے عمل سے بہت درد اٹک چکا ہوں۔“

گوئنگر کے ذہن میں ایک اور سوال گونگے کی طرح پڑا۔

”کیا تم خود کو بخشتی کرنا چاہتے ہو؟“

”گزشتہ اور سوت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔“ انہی نے جواب دیا۔

”گوئنگر کے چہرے پر سرت اور احساس کی روشنی نمودار ہوئی وہ انہی کی ہراسہ رخصت کے ایک گوشے کو بے غلاب کرنے میں کامیاب

ہو گیا تھا۔

”کیا تم جانتے ہو کہ میں کس مقصد سے یہاں آیا ہوں؟“

”مجھے اب دوسروں کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے کسی مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

گوئنگر کی ہجرت میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

”یقیناً تمہارا گھر ہوگا۔ تمہاری بی بی ہوگی۔ بچے ہوں گے۔“

”جیسے اب نہیں ہیں۔“ انہی نے ایک بار پھر کوئی میں بھانجے ہوئے کہا۔

”کہاں گئے؟“

”نہر گئے۔“

”کس طرح مر گئے؟“

”جس طرح انسان مرتے ہیں۔ بھوک سے، بیماری سے، گلے سے۔“

”یہ تو عام بات ہوئی خاص طور پر تمہاری بی بی اور تمہارے بچے کیسے مرے؟“

”انہی خیر گوئنگر کے ضرورت سے زیادہ سوالوں کے جواب دے چکا تھا اس لیے برہم نہ ہو رہا۔

”میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا۔ تم مجھے مجبور کیوں کر رہے ہو؟“

”بیکہ سوالوں کا جواب تم نے اپنی خوشی سے دیا ہے۔ ایسے بھی مجھے تمہارے ساتھ دلچسپی پیدا ہو گئی ہے تمہارے ساتھ دوستی کرنا چاہتا ہوں۔“

دوستی کے نام پر انجینی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ادا کو کرکڑا ہو گیا اور ہر سزا سے بچا:

”چلے جاؤ یہاں سے۔ تم کون ہوتے ہو میرے ساتھ دوستی کرنے والے۔“

گوگٹر مسکرایا۔

”میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔“

”تو پھر تم کون ہو؟“ انجینی سوال پوچھا کہ اپنے سوال پر خود حیران ہو گیا۔

ابھی بیکہ دس پہلے ٹھیک یہی سوال میں نے تم سے پوچھا تھا جس کا جواب دینے سے تم نے انکار کر دیا تھا لیکن میں انکار نہیں کروں گا۔

میرا نام گوگٹر ہے میرے نام سے اس شہر کے تمام لوگ واقف ہیں۔ میں مشہور کنواں بھلا گئے دکھلا ہوں۔“

”مجھے تمہارے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”تھیں میرے ساتھ دلچسپی ہے اس لیے تم نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں کون ہوں؟“

انجینی کی آنکھوں میں شے کی بجائے ایک ہل کے لیے لہرائی اس کے بعد اس نے آہستہ آہستہ کہا:

”مجھے کوں بھلا گئے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”نہ کسی۔ لیکن میں کوں بھلا گئے کے علاوہ ابھی بہت کچھ کرتا ہوں۔“

”میں جانتا ہوں تم جو کچھ کرتے ہو جھوٹ۔ چوری ڈاکہ زنی قتل، دزدانہ پلیر۔“

انجینی کے یہ الفاظ اس کے گوگٹر نے سنے میں آ گیا۔

”کسی تم اپنے کارناموں کی تفصیل بتائی کر رہے ہو۔“

”جی ہاں۔ اپنے تمہارے تمام انسانوں کے۔“

”لیکن تمہارے وہی بچے کیا ہوئے؟“

انجینی کی آنکھوں سے ٹپا ہر تھا کہ وہ اس سوال کے جواب سے بھی گزرتا چاہتا ہے۔

جھوٹ، چوری ڈاکہ زنی قتل۔

”لیکن انسان کی زندگی صرف اس کی ذات تک محدود نہیں ہے۔“ گوگٹر نے اسے درمیان میں ٹوک دیا۔

”میں تمام فلسفوں سے بخوبی واقف ہوں۔ یہ سب سمجھ کر تم کو یہی بھلا گئے بھلا گئے زندگی کے راز و اسرار سن گئے ہو۔“

”خود بخوبی سے صرف تمہارا مسئلہ ہوتا ہے۔“

گوگٹر کو انجینی کی باتوں سے جرد دلچسپی پیدا ہو گئی تھی حریف گیری ہو گئی۔

”لیکن اس زندگی کے اہم مسائل بھی تو ہیں جو میری اور تمہاری ذات کے مسائل سے زیادہ اہم ہیں۔“

”جی ہاں میں ان سے بھی واقف ہوں ان پر بھی جھوٹ، چوری، ڈاکہ زنی، قتل، زنا، ہالجر حاوی ہیں۔ فرد سے انکار تک، کچھ نہ کچھتے گھسٹات، میں فرق پیدا ہو چکا ہے۔“

”فرض کرتے خود کبھی کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہو جس کا مکان بہت کم ہے کیوں کہ میں تمہیں ایسا ہرگز کرنے نہیں دوں گا۔ تو کیا تمہارے ذاتی مسائل اور دنیا کے مسائل مل ہو جائیں گے۔“

”مجھے اس سوال سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مسائل مل ہوں یا نہ ہوں میں اپنا آخری فیصلہ کر چکا ہوں اور پھر میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا کا کوئی اجتماعی مسئلہ فیصلہ کن طریقے سے ہیئت کے لیے بھی حل نہیں ہوتا۔ صرف عارضی طور پر حل ہوتا ہے میں صرف اپنا مسئلہ حل کرنا چاہتا ہوں۔“

”تم بھروسہ ہو۔“

”کون جانتا ہے کون بھروسہ ہے۔“

دونوں آدمی اپنے سوالات اور جوابات میں الجھنے لگے تھے تھوڑی دیر کے لیے دونوں خاموش ہو گئے۔ گھنگوکار و ہارو آواز انہی نے کیا۔

”تم یہاں سے چلے جاؤ میں اپنے آخری فیصلے پر فورا مل کرنا چاہتا ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم اس سے پہلے اپنے کسی فیصلے پر عمل نہیں کر سکتے۔“

انجلی کے چہرے پر بھلاہٹ پیدا ہوئی۔

”میں اپنے ہر فیصلے پر عمل کرتا رہا ہوں۔“

”تو پھر اس فیصلے پر عمل کرنے کے لیے نگہداشت کیوں۔ تم اپنا مسئلہ حل ہی کیوں کرنا چاہتے ہو۔“

انجلی کے چہرے پر مزید غصے کے آثار پیدا ہوئے

”میں نے کہا کہ میں اپنے آخری فیصلے پر فورا مل کرنا چاہتا ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

”اگر یہ فیصلہ تمہارا آخری فیصلہ ہے تو تم اس پر عمل بھی کرنا چاہتے ہو میری سوچوں کی سے تمہیں کیا دوست ہے۔“

”میں اپنی موت کے عمل میں تمہارا شامل ہونا چاہتا ہوں۔ تم میری موت کے گواہ نہیں بن سکتے۔ میں یہ حق تمہیں بھی نہیں دے سکتا۔“

”میں اسے ایک بار پھر کہتا ہوں کہ زندگی خواہصورت ہے۔ زندگی کو قتل کرو۔“

”مجھے تمہارے امیدوار فرماؤ الفاظ سے معنی نظر آتے ہیں۔ اگرچہ خیال اگر زندگی خواہصورت بھی ہے تو تمہیں اس سے لطف اندوز ہونے کی

پوری آزادی ہے تم میرے سامنے میں تاک کیوں اڑا رہے ہو۔“

”اس کا مطلب ہے تم اپنے آخری فیصلہ پر عمل کرنا چاہتے ہو۔ تم غرضی سے خود کبھی کرو۔ میں یہاں سے چلتا ہوں۔“

یہ کہہ کر گولنگروہاں سے چل چلا انجلی کوئی بڑے چہرہ گھبراہٹ کوئی کے اندر کودنے کے لیے چارہ لگا۔

گولنگروہہ جا قدم چلنے کے بعد رک گیا اور وہاں ایسی جگہ آ گیا جہاں وہ چند لمبے پہلے کھڑا تھا۔

”میرا ایک آخری سوال باقی ہے۔“

”یہ چھوڑو“ انجلی نے قاتلانہ انداز میں کہا۔

”تم نے خودکشی کے لیے یہ کواں کیوں منتخب کیا؟“

”تم نے پہلا نکلے کے لیے یہ کواں کیوں منتخب کیا؟“

”میرے لیے یہ کواں مناسب تھا۔“

”ٹھیک یہ بات میں کہتا ہوں۔ یہ کواں میرے لیے مناسب تھا۔“

اس جواب سے گوئنٹر کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ لہجہ سوچنے کے بعد اس نے اجنبی سے ہرچہ:

”کیا تم اپنی خودکشی چند منٹوں کے لیے ملتی کر سکتے ہو؟“

”آخر تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں یہاں کواں پہلا نکلے کی ملحق کرنے کے لیے آیا تھا کہ مجھے دو روز بعد کواں پہلا نکلے کے لیے مقابلہ میں حصہ لینا ہے۔“

”تو میں کیا کروں۔ تم دیکھتے ہو۔ اس مسئلے پر میں نے تم مجھے حذر کر لو گے۔“

”تمہیں کچھ نہیں کرنا ہے۔ میں چاہتا ہوں میں جس کام کے لیے یہاں آیا ہوں اسے پورا کر کے جاؤں جہاں تک تمہیں حذر کرنے کا

تعلق ہے۔ تم جنم میں جاؤ۔ میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں۔“

”شوخی سے پورا کرو۔ لیکن جلدی۔ کیونکہ میں اپنا فیصلہ زیادہ دیر کے لیے ملتی نہیں کر سکتا۔ میں اپنے مہر کی انتہا تک پہنچ چکا ہوں۔“

پھر کہہ کر اجنبی کوئی کی منظر پر سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ گوئنٹر نے کوئی کی منظر پر سے مخصوص راستہ اپ کر زمین پر کچھ نشان

لگائے۔ ایک نشان پر کھڑے ہو کر اس نے اپنی قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کیا۔ اپنے جسم کو قوت اور اس کے بعد دوڑتا ہوا کوئی کی جانب بڑھا

راستے میں ایک دوسرے نشان سے اس نے ہلچل دھست لگائی۔ اجنبی کے دل کی دھڑکن اس دوران میں تیز ہو گئی۔ جست لگاتے ہی گوئنٹر کا

جسم ہوا میں ایک قوس سی مٹاتا ہوا کوئی کی کے اوپر سے گزرنے لگا اور میں اس لہجہ اجنبی کی توقع تھی کہ گوئنٹر کے دوسری طرف ہو گا ایک

پر لڑو دھاک ہو گا گوئنٹر کا جسم کوئی کی منظر پر کی امدادی رخ کے ساتھ زور سے نکل آیا اور پھر کوئی کی چوٹی کرائی کا قاصد ملے کر تباہ و آدم سے پانی

میں جا گرا۔

اجنبی کی آنکھیں کھلیں کر دو دن تک نہیں۔ اس کا پورا وجود فطری رد عمل کی قوت میں آ گیا اور وہ ڈوبنے والے کی تقدیر سے داخل اپنے

ارادوں اور فیصلوں سے داخل اور غفلت کے جھنڈ کو جی تا سرسبز و شاداب کو اپنے پاؤں سے روندنا شریکِ جانب بھاگ نکلا۔



اسد محمد خاں

نام	اسد محمد خاں
علمی نام	اسد محمد خاں
پیدائش	۲۶ جنوری ۱۹۳۳ء بمبئی، بھارت
تعلیم	پی۔ ایس۔ کراچی یونیورسٹی۔

شاہجہانی ماڈل اسکول، بھوپال سے میٹرک (۱۹۴۹ء) کرنے اور چند ماہ عید یہ کالج، بھوپال میں زیر تعلیم رہنے کے بعد بھوپال، پاکستان آ کر انتہائی نامساعد حالات میں ۱۹۵۴ء میں جتاج کالج، کراچی سے انٹر اور سندھ مسلم آرٹس کالج، کراچی سے بی۔ ایس۔ کیا۔ بھارت سے پاکستان ہجرت کرنے سے قبل ہے اسکول آف آرٹس بمبئی سے کرسٹل آرٹس میں ڈیپلوما گورن کر چکے تھے۔

مختصر حالات زندگی:

آفریدی اور کڑی پشٹانوں کے قبیلہ سرحد میں خیبر کے مہاراجہ خاں کے ہاں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بھوپال کے ایک مقامی اسکول میں مصوری کے استاد تھے اور جاتی نگین کے تربیت یافتہ۔ والدہ مخبرہ جاس، میرزا غالب کے شاگرد و نواب پارکھ خاں کی چاتی اور بانی ریاست بھوپال مراد دوست محمد خاں نویں چچی میں اسد محمد خاں کے جد ہیں جو ۱۹۰۳ء میں مالوہ میں کھنڈ میں وارد ہوئے تھے۔ اسد محمد خاں نے سرحد میں کی عمر میں عید یہ کالج، بھوپال کے زمانہ طالب العظمیٰ میں بائیں بازو کی سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہو کر سرحد میں خیبر میں گزارے اور ۱۹۵۰ء میں تین تہا بھوپال سے لاہور آ گئے۔ ان سے پہلے ان کے بڑے بھائی پاکستان ہجرت کر آئے تھے اور مرے کالج، سیالکوٹ میں زیر تعلیم تھے۔

لاہور پہنچ کر ریڈیو سے لڑیگ اسکول، دالمن، لاہور سے یک سالہ تربیت کے بعد پاکستان ویمنز ریڈیو میں بطور اسٹوڈنٹ انٹرمیڈیٹ

باصلاحیت کا آغاز کیا۔ تاہم حیدر آباد، متحدہ میں حالات سازگار نہ پا کر کراچی کا رخ کیا اور بطور کمرشل آرٹسٹ کام کرنے لگے۔ "روزنامہ احسان" لاہور کے لیے کارٹون بناتے۔ کچھ عرصے ٹریڈ لیگنٹ اور بچے پر تھوڑے پردے ہے۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ کے ٹریڈنگ ڈیپارٹمنٹ کی ملازمت میں آئی، جہاں سے بطور انچیکورڈ حادثات جون ۱۹۶۲ء میں ریٹائر ہوئے۔

دو شادیاں کیں۔ آبائی وطن بھرپال میں ہونے والی پہلی شادی (۱۹۶۴ء) برادر قرار دے رکھی۔ پہلی شکستہ ایک بیٹا ہے جو بطور بھارت میں کچھ نہ پڑھو ویز کے شعبہ سے وابستہ ہے۔ ۱۹۶۵ء میں ہونے والی دوسری شادی ایک کزن، خزانہ سے ہوئی، جن سے تین بیٹیاں ہیں۔ ۱۹۶۵ء سے جڑواں طور پر ریڈیو پاکستان، کراچی اور پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے اور گیت لکھ رہے ہیں۔ ڈراموں میں "شیر شاہ سواری" لکھ گیتوں میں "سوج بڑھے یا آنڈھی آئے دیا جھانے دکھتا ہے" "زمین کی گود تک سے سنگ سے بھری رہے" "تم سنگ نیٹھاں لاگے، مانے تاجیں، ہزارا" بہت مقبول ہوئے۔ ایک ڈرامے میں ان کی بچکانہ گیت لکھاری اور نظم لکھاری کے حوالے سے قلمی۔ ۱۹۶۷ء میں افسانہ "باسو کے مریخ" شائع ہوا تو تین مریخ کے افسانہ کا ردِ تسلیم کر لیے گئے۔

اولین مطبوعہ افسانہ:

"باسو کے مریخ" مطبوعہ "قون" لاہور، ۱۹۷۱ء

قلمی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ "کھڑکی بھرا آسمان" (حیرہ افسانے انجمنیں) ناشر: اسد محمد خاں، کراچی طبع اول: ۱۹۸۳ء
- ۲۔ "برج ٹوٹاں" (چودہ افسانے) انجمن پریس، کراچی طبع اول: ۱۹۹۰ء
- ۳۔ "پھنکے کی نئی فصل" (کیا رہ افسانے، پانچ تراجم) آج، کراچی طبع اول: ۱۹۹۷ء
- ۴۔ "ترجہ" (ارہ افسانے) نئی پریس بک شاپ، کراچی طبع اول: ۲۰۰۳ء
- ۵۔ "تیسرے پہر کی کہانیاں" (افسانے) اکادمی پالیٹکس، کراچی طبع اول: ۲۰۰۶ء
- ۶۔ "جو کہانیاں تھیں" (افسانوی کہانیاں) اکادمی پالیٹکس، کراچی طبع اول: ستمبر ۲۰۰۶ء
- ۷۔ "زکے ہوئے سامنے" (گیت) طبع اول: ۱۹۹۷ء

غیر ہڈون:

تھوڑے بچے پائی اور ٹیلی ڈرامے۔

مستقل بچ:

A.B.F، بیکٹر X، مگنن معمار، کراچی پاکستان۔

- ۱۔ بابائے اردو مولوی امجد الحق امجد ارا (اکادمی ادبیات پاکستان) برائے ”فرید“ ۲۰۰۳ء
- ۲۔ عالی مہر ریخ اردو ادب (نورِ قلم) (امجد ارا): ۲۰۰۸ء

نظریہ فن:

”اگر کھینے والے کو مقصود ہے اور نہ مت ترقاض ہے اور موسیقار، گانگیک، رقاص اور نقش کار پر سبقت لے جانے کا شوق ہے تو اسے کچھ ایسا کر کے دیکھنا پڑے گا کہ جو اپنے ”جوہر میں“ اپنے Concept میں تازہ و طاقتور، سچا اور خالص ہو۔“

(”میں کیوں لکھتا ہوں“ مشمولہ: ”چهارسو“ راویہ پرنٹری: جنوری، مہروری ۲۰۰۸ء)

تر لوچن

اسد محمد خاں

جو کچھ ہوا اس سے پہلے یہاں انسانی استیلاں سوچو تھیں اور جانوروں، درخت، دریا اور پہاڑ بھی تھے۔ ایک قحط کے ساتھ موسم آتے رہتے تھے۔ چچر، آگنی تھیں، جڑھتی، پھینکتی اور پرانی ہوتی تھیں اور رمان سے مر جاتا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی قحط، درختوں پر بھی دبا کرتا تھا۔ مجموعی طور پر سب ٹھیک ہی تھا۔ میں الحق یہ سب کچھ ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر کوئی نئے کائنات اس کی بنی کھول کر چچر دلی غور سے نہ لے جائے تو اس نے اپنی دل سوزی سے تیار کی تھی تو میں الحق ہرگز ہرگز وہ نہ کرتا جو اس نے کیا۔

اُس نے جو کچھ کیا وہ اپنی اشتعال اور راجہ کی کشت کیا تھا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ اب تو کچھ تھا ہی نہیں ہے بلکہ سے ترہیب دیا چاہتا۔ سب ختم ہو چکا تھا۔

اور جو کچھ ہوا، وہ ہلک، چھپتے ہو گیا۔ بنی مٹائی دیکھ کر اس نے اہلک، پھلک اور دھلک تیلوں کی ڈوریوں اپنی انکسبت نہایت پر لپیٹ کر مٹھی بند کی، ایک ذرا کندھا جھکا کر جھنگے سے انھیں اپنی پشت پر لیا، سیدھے ہاتھ کی مٹھی پر مٹھی کس کر ڈال کر کہا اور ہوا میں جیسے کمال چلاتے ہوئے تینوں ٹوک لڑکھن پر دے مارے۔

یہاں تک بھی ٹھیک تھا، ہاتھ کچھ زیادہ، مگر ای نہیں تھی۔ لیکن اس کے بعد تو میں الحق نے غضب ہی کر دیا۔ وہ پورے قحط سے حق کر کڑا ہو گیا۔ اس نے جھنگے سے اسٹیکلک چاڑھ کا وہ ٹکڑا اپنی چوٹائی سے نوزد پھینکا جسے وہ پابندی سے نواز کے گھسنے والی جگہ پر پچا لیا کرتا تھا۔ پھر اس نے سر جھکا یا، زمین کی طرف دیکھ کر تمام نکال تھاری میں اپنی تیسری آنکھ کھول دی اور تینوں ٹوک چلا کر خاک کر دیے۔

سو اب ڈھوسوں اور راکھ کے سوا کچھ نہیں تھا جسے پھر سے ترہیب دیا جاتا۔ سب ختم ہو چکا تھا اور میں الحق جانتا تھا کہ ڈھوسوں اور راکھ کو ترہیب نہیں دیا جاسکتا۔ یہ خاتمہ ہے۔

یہ سب ایک بجلی سے شروع ہوا تھا۔ ایک دن بجلی سے گزرتے ہوئے اس نے اپنا ٹکڑا اُس بجلی کو دیکھا اور اسے ٹھہرے جانے کا خیال آ

کہا۔ وہ بھی اس قدر دشمنی، اپنی سبلی اور ہر جگہ سے اپنی ٹپٹی مچھلی جتنی کہ ساری باتیں کاغذ پر لکھے بغیر یا نہیں، یہ بھی چاہتی تھی۔ اس نے سوچا پھر سست جانا اچھا رہے گا۔ وہ اب تک چیزوں کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا آ رہا تھا۔ لیکن چیزیں اپنی بہت سی ہو گئی تھیں اور بار بار یہ حقیقت چارہاں تھی اور اپنی کی تفصیل اپنی طور و ثانی ہوتی چارہاں جتنی کہ آپ ذہن میں محفوظ رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ دہرتا تھا کہ کبھی بھولنا شروع نہ کر دے۔ اس لیے اس نے ایک بڑے کاغذ پر سات سو چھیالیس لکھا اور فیصلہ فرما دیا کہ شام باور داں کے کو انقب اور نکاس پانے مجبور اور تا ریخ عمل درآ دے کہ خائے جانے اور اپنا خانوں میں اس نے سب چیزیں درج کرنا شروع کر دیں۔ تاریخ عمل درآ دے گا خانہ بھی خالی رکھا اس لیے کہ پہلے وہ چیزوں کو بورداں کی تفصیل کو مانٹنے سے کاغذ پر منتقل کر لینا چاہتا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ اپنی عمل درآ دے میں وہ یہی کرتی تھی۔ فہرست مکمل ہونے کے بعد وہ کسی بھی دن اور کسی بھی وقت کارہائے گذشتہ کے خانے میں نگاہیں پھریاتی اور اس پر عمل درآ دے کر کے معاملے نمٹا سکتا تھا۔

[illegible]

کو آگ دہج کئے، پھر کارہائے مجوز میں لگا کر دکانی کا دفتر بھارتیہ اور جلیب گھب کے لیے ٹکی کو بلیں بھی دیتی ہیں۔ پھر اس نے چلی تھک دالے کل کو درج کیا، جسے برہن ملک سمجھا تھا، اور عبداللہ برقاوری اور عزت حسین زیدی کو درج کیا، جنہیں ترقیاں دینی تھیں اور میں الحق کی مصروفیات پر حق چلی گئیں۔ اس نے برتن قاتوں والے نئے کو درج کیا جو گمرانی کی فتن بدخواہوں کے سبب ڈسب کیا تھا اور ہر پار سے جاکہ ہو رہا تھا، جو میں الحق نے یہ کہا کہ اس بی بی کے نظام میں حساب تو بلیاں کر کے اسے نکلے کی اطمینان میں بحال کرنا ہے۔ اور میں الحق نے موٹر سائیکل والے لڑکے کو درج کیا جو حج و شام پھر لگا تھا اور جاکہ فہرست میں دو نئی اسے خاطر میں نہ لاتی تھی۔ میں الحق نے اسے سہاوی سے موٹر سائیکل پر پھر لگاتے دیکھا اور نرم سرگوشتوں میں دھو کر کیا کہ سب انتظام کر دیا جائے گا۔ اور اس نے گونا گوں کی چارمرئی کو درج کیا اور اسی طرح چیزوں کی فہرست مولائی ہوئی چلی گئی۔

وہ چارمرئی چلے جھٹا تو کہیں رات دھڑلے دن بھر کے اندر ہاتھ کھل کر پاتا۔ اور اب یہ ہونے لگا کہ دو فہرستیں فہرست جاکہ سے آخر فہرست تک آتے آتے بھی ایک آدھ چیز بھول جاتا اور اسے دوبارہ مونسے پر پہنچ کر اندراج کھل کرنے پر تے سہاوی جھٹ میں چار فہرست جاکہ کی فہرست کا نوکھیا درج ہونے سے دہ گیا۔

اور جب اس اندراج کی ضرورت نہ رہی تو جاکہ فہرست ہار کے اختتام پر میں الحق ظاہر ہوا۔ وہ سڑک کی طرف سے گلی میں حرا اور اس نے دیکھا کہ مسجد نور کا چھوٹا والا گھوڑا پھولوں میں رکھا ہوا ہے۔ میں الحق بچا چ گیا۔ اس نے لڑتے کا پچھتے ہوئے وہ پھر کے سنانے سے پوچھا کہ کیا فہرست؟ دو گھوڑے کے ساتھ ساتھ دیکھتا ہوا پوچھ فہرست جاکہ تک گیا اور اس نے دو پھر کے سنانے سے پوچھا کہ کیا فہرست؟ اور وہ پھر سے آخر فہرست جاکہ کے سرے تک دھڑکا ہوا گیا اور پلاٹ کے آسپاس میں بیٹھتے ہوئے اس نے گھوڑے کا پاپا قلم لیا اور ساتھ ساتھ چلنے لگا ہوا ہلے ہلے اپنی صفائی میں کہتا چلا کہ بی بی میں بھول گیا تھا انڈیا میں بھول گیا تھا اس میں بھول گیا تھا اور آخر فہرست جاکہ کی حد پر اس نے گھوڑے کا پاپا چھوڑ دیا۔ پھر میں الحق نے ایک چنگ کی بازگشت میں جاکہ فہرست کی طرف سہی کی اور پھر جاکہ میں بھول گیا تھا پھر باقی دن اور باقی رات وہ اسی چنگ کی بازگشت میں رہا۔ دو جاکہ دو سے جاکہ آخر تک اور جاکہ اسٹھ سے جاکہ دو تک گورن کی طرح سنسناتا رہا اور جو کچھ درج ہونے سے دہ گیا تھا وہ اندراج میں پورا شدت میں محفوظ کرتا گیا۔ ایک ایک مکان پر سے گزرتے ہوئے اس نے اپنے مانگنے میں سب چیزوں اور سب گورنوں کی حاجت مندیاں اور تمام چھوٹے بڑے دکانوں کو محفوظ کیے اور بٹے گیا کہ مرنگ کی باگ سے پہلے انہیں فہرست میں درج کرے گا اور جب مرنگ باگ دے رہے ہوں گے تو عمل درآمد کرے گا۔

ایک چارمرئی ہاتی تھی کہ وہ اپنے کمرے پر آیا اور یہ دیکھا کہ کمرے کا ٹالو ٹالو ہوا ہے اور اس کی بیٹی اور بھئی چڑی ہے۔ کوئی کھنے کا ثبوت اس کی فہرست چھالے گیا تھا۔

چلی خلیہ کیہ کر میں الحق نے میرانی میں چھ طرفوں پر نظر ڈالی اور باغی میں سر ہلایا اور مکان سے باہر ہوا اور جب حق میں الحق نے اہلک پر لوگ اور ہلک تھیں کی ڈور یاں اپنی گفت شہادت پر لپٹ کر تھپی بند کی، ایک دکانہ صاحب کا جھنگل سے انہیں اپنی پشت پر پاور مٹیاں کس کر ہوا میں کمال چلاتے ہوئے تھیں لوگ زمین پر دے مارے۔ پھر وہ پورے قیامت سے حق کر کھڑا ہو گیا اور جھنگل سے حق بیٹھائی کا پائوٹو جھینکا۔ پھر میں الحق نے سر جھکا کر زمین کی طرف دیکھا اور تمام کمال تھاری میں اپنی تھیری آنکھ کھول دی اور تھیں لوگ جاکہ کر دیے۔

مرزا حامد بیگ

نام :	حامد حسین
قلمی نام :	مرزا حامد بیگ، اڈاکٹر مرزا حامد بیگ
پیدائش :	28 اگست 1948ء، بہترام کراچی (سندھ)، پاکستان
تعلیم :	ایم۔ اے (ادب)، پی ایچ ڈی (بنجاب یونیورسٹی)
	گورنمنٹ پرائمری اسکول قراچی مہبت، ضلع دادو (سندھ) میں ابتدائی دو کلاسیں سندھی میڈیم کے ساتھ پڑھیں
	گورنمنٹ ہائی سکول دادو (سندھ) کی معرفت ویسٹ پاکستان ڈرامٹک اسٹاف 1961ء میں پاس کیا۔ میٹرک
	ای۔ سی ہائی اسکول نواب شاہ (سندھ) سے 1966ء میں کرنے کے بعد سندھ مسلم آفیس کالج کراچی کا طالب علم
	رہا۔ ایف۔ اے اسلامیہ کالج سکسٹر (سندھ) سے 1968ء میں کیا۔ پی۔ اے 1971ء اور ایم اے (ادب) و بنجاب
	یونیورسٹی اور نیٹل کالج لاہور سے 1972ء میں کیا۔ ڈاکٹریٹ کا موضوع "سروادب میں انگریزی سے متنی تراجم" تھا۔
	بنجاب یونیورسٹی لاہور سے Ph.D کی ڈگری 1986ء میں ملی۔

مختصر حالات زندگی:

میرا آبائی وطن علاقہ چیمپ، موضع کمال تحصیل حضرت ضلع ایک ہے۔ میرے جد اعلیٰ مرزا احمد بیگ عہد اکبری (1750ء) میں صوبدار ایک تھے۔ والدہ کی طرف سے سلسلہ نسب ثناء اللہ خاں حضرت علی آبادی (پ 1628ء) سے جاتا ہے جن کی قوم پٹوہ نسل اور وطن اورا، ساہیو ملک پاکستان تھا۔ میرے پرکھوں میں ایک کے نواسہ عبدالغفور شاہ کرب عبد اور ایک ذبیح عالمگیر قادری اور دادو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ والد محترم محمد اکرم بیگ پرنس آف پسر تھے لہذا امیرانہ طبقہ اور ان کے ہم سفر سندھ میں گزرا۔ پنجابی اور سندھی کے لوگ قصبے پڑھتا تھا، چنگ بازی اور مصوری کرتا تھا، دانت کشیدہ 1968ء میں قیام نواب شاہ کے دوران انگریزی کے بزرگ ادیب اور پچانو "ڈینی گلفر" تھا اور دس چھائی نے

داعیہ نے آٹھ ٹیگور سے دو تھاس کروایا اور میری کچھ کچھ تحریروں کی پڑائی کی۔ اکثر کرنے کے دوران متحدہ مسلم آرٹس کالج کراچی میں 67-1966 اور ماہِ کلب کا ممبر رہے ہوئے میوزک اینڈ ڈراما سینٹر بطور دوا کراچی سے بیٹا اور ایچ جی کی تربیت حاصل کی پاکستان برائش کی مشفقہ کردہ مصوری کی فراہمی میں حصہ لیا۔ 1968ء میں اس فراہمی کا افتتاح فیض احمد فیض نے کیا تھا۔ 1968 میں والد صاحب ڈی ایس بی کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تو ہم لوگ متحدہ سے کیمپل پر چلے آئے۔ 1971 میں انسپٹر پولیس متحدہ کی ملازمت سے بھاگ کر انجوائے اردو کرنے لگا اور کازخ کیا۔ 1972 تا 1974ء لاہور میں سپر وڈ گارڈی کا کٹے ہوئے گھل پڑا کھنڈر تو مٹاں بڈنگ رائل پارک لاہور کے ظہم سائو جاپت کارڈیم گل کے اسٹینڈٹ کے طور پر 1971ء میں پشاور ظہم "موسیٰ خاص گل کئی" مکمل کی، مطلقاً روپ ذوق (ذوقی) لاہور کا چھائیکٹری اور طاق روپاب ذوقی، روپ پٹری کا ٹیکٹری روپ۔ لاہور رہے چاند پانچ پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے صداکاری ڈراما نگاری اور اردو کاری کی۔ اپنے ہی تحریر کردہ ڈراما "لائٹ صاحب کی سواری" (پروڈیوسر شاکر عزیز) میں مرکزی کردار ادا کیا۔ پاکستان آرٹسٹس ایسوسی ایشن کی لاہور کا بانی رکن ہوں۔ 28 فروری 1974ء تا اکتوبر 1974ء بطور ریسرچ اسکالر پنجاب یونیورسٹی اور فٹل کالج لاہور ملازمت کی۔ 30 اکتوبر 1974ء کو بطور ٹیچر گورنمنٹ کالج حیدر کا کھل چلا گیا۔ گورڈن کالج روپ پٹری سسٹم ٹیچر ڈان کالج روپ پٹری اور گورنمنٹ کالج ایک میں ٹیچر حیثیتوں میں تدریس سے منسلک رہا۔ 8 مئی 1977 کو شوکت جہاں سے شادی ہوئی۔ اولاد: تین بیٹے۔ چھادی جہاں "لفظ"، "گورڈیچین"، "اورنگ"، "مطلق"، "گل پکائی" اور "کرینٹ" کا مدیر رہا۔ حال پروڈیوسر متحدہ ٹیچر گورنمنٹ اسلامک کالج ریلوے روڈ لاہور۔

اولین مطبوعہ افسانے:

- ۱۔ "انسانوں کی شیشی رات" مطبوعہ "لفظ" (پنشن صد سالہ نمبر) (مدیر مرزا حامد بیگ) پنجاب یونیورسٹی اور فٹل کالج لاہور۔ ۱۹۷۲ء
- ۲۔ "دلیل کی حیثیت" مطبوعہ خیرک خیال لاہور (مدیر نجیم جعفر حسن) لاہور۔ ۵۳۳-۵۳۴ (خاص نمبر) ۷۳-۱۹۷۲ء

تفصیلی آثار (مطبوعہ کتب):

- ۱۔ "گمشدہ کلمات" (سول افسانے) خالد بن لاہور طبع اول ۱۹۸۲ء
- ۲۔ دوست خلی کشتہ آسمان طبع دوم ۲۰۰۲ء
- ۳۔ پھر خلی کشتہ آسمان طبع اول ۱۹۸۳ء
- ۴۔ دوست خلی کشتہ آسمان طبع دوم ۲۰۰۵ء
- ۵۔ "مکتبہ کہانی" (پنجابی افسانے) پنجابی ادبی پورڈا لاہور طبع اول ۱۹۸۳ء
- ۶۔ "گمراہ کی ضرورتی" (افسانے) اچانگ اسلام آباد طبع اول ۱۹۹۱ء
- ۷۔ "اگر میں بھڑا داری" (افسانے، ہندی ترجمہ) دانش فاؤنڈیشن اور راج کورجی دہلی طبع اول ۲۰۰۲ء
- ۸۔ "افسانے کا سفر نامہ" (تفصیلی) مکتبہ عالیہ لاہور طبع اول ۱۹۸۵ء
- ۹۔ اردو رائٹرز گلڈ آف آسما اردو رائٹرز گلڈ آف آسما طبع دوم ۱۹۸۳ء

- ۷۔ "تیسری دنیا کا افسانہ" (تحفید) خالد یحیٰی گلاسر
- ۸۔ "اردو ادب صوفی ازم" (تحفید/تحقیق) منتقدہ قومی زبان اسلام آباد
- ۹۔ "کتابخان تراجم علمی کتب" (کتب/مات) منتقدہ قومی زبان اسلام آباد
- ۱۰۔ "عزیز احمد کتب/مات" منتقدہ قومی زبان اسلام آباد
- ۱۱۔ "ترجمے کا فن نظری مباحث" (تحقیق) منتقدہ قومی زبان اسلام آباد
- ۱۲۔ "اردو غزل کے مختصر تاریخ" (تحقیق/تحفید) منتقدہ قومی زبان اسلام آباد
- ۱۳۔ "کتابخان تراجم/مات" (تحقیق) کلاسیک بلاسر
- ۱۴۔ "مغرب سے نئی تراجم" (تحقیق/تحفید) منتقدہ قومی زبان اسلام آباد
- ۱۵۔ "انجالیہ شمس اردو" (تحقیق) منتقدہ قومی زبان اسلام آباد
- ۱۶۔ "پاکستان کے شاعر اردو افسانے" (مکتب) انجریا پبلشنگ اسلام آباد
- ۱۷۔ "مقالات" (تحقیق/تحفید) پیکر پبلی کیشنز لاہور
- ۱۸۔ "اردو افسانے کی روایت" (اردو افسانے کی تاریخ) گل پکاؤں لاہور
- ۱۹۔ "اردو افسانے کی روایت" (اردو افسانے کی تاریخ) اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد
- ۲۰۔ "اردو کا پہلا افسانہ نگار راشد الخیری" دوست پبلی کیشنز اسلام آباد
- ۲۱۔ "اردو کا پہلا افسانہ نگار راشد الخیری" دوست پبلی کیشنز اسلام آباد
- ۲۲۔ "نثر نگاری" (افسانے/تراجم) راشد الخیری لاہور
- ۲۳۔ "نثر نگاری" (افسانے/تراجم) راشد الخیری لاہور
- ۲۴۔ "نثر نگاری" (افسانے/تراجم) راشد الخیری لاہور
- ۲۵۔ "نثر نگاری" (افسانے/تراجم) راشد الخیری لاہور
- ۲۶۔ "نثر نگاری" (افسانے/تراجم) راشد الخیری لاہور
- ۲۷۔ "نثر نگاری" (افسانے/تراجم) راشد الخیری لاہور
- ۲۸۔ "نثر نگاری" (افسانے/تراجم) راشد الخیری لاہور

غیر مدون:

لوہی لہجہ سے مصنف مضمین۔ ٹیلی ڈراموں کا ایک مجموعہ جتیدی مضامین اور مکمل خود نوشت

اعزاز:

- ۱۔ پاکستان رائل رولڈ گلف ایسوسی ایشن برائے ”قصہ کہانی“ ۱۹۸۸ء
- ۲۔ ”بیشل بک کونسل آف پاکستان“ ایوارڈ برائے ”گناہ کی حروری“ ۱۹۹۱ء
- ۳۔ ”بیشل بک کونسل آف پاکستان“ ایوارڈ برائے ”مصطفیٰ زیدی کی کہانی“ ۱۹۹۳ء

مستقل پتہ:

۲۲۵۔ نیشنل پارک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔ پاکستان

نظریہ فن:

”سفید پوش، فوج پرانچہ، SELF پر پھر سے نفاذ ہے اور ہمیں DECADENT کہا جاتا ہے جبکہ ہم نے لفظ کی سرچشمتی اور فحشگی تک اپنی ذات کے حوالے سے رسائی حاصل کی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ بہت بڑا انکشاف ہے، جس کا اعتراف ہم نے اپنی پیچیدہ حقیقات میں کیا ہے۔“

(مرزا جاوید علی)

مُغل سرائے

مرزا حامد بیگ

شام کے سامنے گھرے ہوئے تھے اور وہ دونوں تلکے اندھیرے میں اٹھنا دے ہوئے تھوڑے دھنوں کی طرح پُپ جاپ بڑھے پلے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ فٹ پاتھ پر سفید سے کی تھار میں بیتی ہوئی ہوا کی سرسراہٹ اب صاف سنائی دے رہی تھی اور وہ دونوں ایک ساتھ قدم اٹھاتے یہاں اس جگہ بجلی ہمارے ٹھک کر کے تھی۔

ابھی بکھیر پہلے پیچھے سے آتے ہوئے کھانڈرے نو ہوانوں کی ایک ٹولی بہت دیر تک انہیں اپنے گھرے میں لیے پھٹی رہی تھی اور وہ ان کے سچے ٹکڑوں کی طرح سر جھکانے بہت آہستہ قدم اٹھاتے یہاں تک پہنچے تھے۔ اب وہ چلتی کاتی ٹولی بہت آگے نکل گئی تھی اور دور تک کوئی نہ تھا۔ ان کے کندھے ابھی تک آہیں میں رگڑا کھارہے تھے۔ لڑکا قدم سے جھٹک کر بل رہا تھا اور اس کا دل کھلایا ہوا جلیاں باز دلا کی کو ہدی طرح اٹھالیٹ میں لیے ہوئے تھے۔

وہ دونوں اس خطے میں خود رہتے اور محض کُئی سنائی پر یہاں تک نکل آتے تھے۔ اب وہ سفید سے کی تھار کے اس سرے پر آخری درخت سے ٹپک لیے کھڑے تھے اور دور تک گنگا اندھیرا ہر طرف لوتھیں لے رہا تھا۔

وہاں اپنے سفر کی قیلوں کے بوہرے ڈراڈرا آگے کو جھکے ہوئے کسی مدھک ہر اس میں بھی تھے۔ لڑکے نے تار سچ لٹال کر لٹھیں اپنے تلکے اندھیرے میں دو صیاد رشتی کی کندھی ہر طرف پھینکیں اور باج میں ہو کر سر جھکا لیا۔ دونوں کو اپنی آگہیں زمین میں دھنکی ہوئی محسوس ہوئیں اور دور سے ایک جھپکی ایسی جگہ ہماری سڑکی قیلوں کے بوہرے تھوڑے بے کسی سے آگے پیچھے بھولتے رہے۔

ان کو ان حالوں بکھڑا وہ وقت نہیں گزرا ہو گا کہ ایک بڑے شہر کے ساتھ دو سر پٹ آتے ہوئے گھوڑوں کے پیچھے دائیں بائیں تھوڑی ہوئی کھنٹی ایک ٹھٹکے کے ساتھ ان سے چند قدم آگے نکل کر سناکت ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں اطراف کے دروازے کھلے اور چلتے ہوئے گھانوں کو سنبھالنے لگے۔ ہوتے چرواہے اگلے افراد نے انہیں کمال تہذیب کے ساتھ کھنٹی میں بزم بھولا لٹا کشت پر لاٹھا اور پلے۔

لڑکی کو لپیٹتے میں لیے ہوئے بازو کی گرفت اب ڈھکی چڑھکی تھی اور دونوں جس خوف کے ابھی کچھ دیر پہلے اس پر ہوئے تھے وہ غراب و خیال اوتا ہار ہاتھا۔ وہ غیب خود پھر دہلی کے عالم میں ہوا کے دوش پر تھے اور سبز ہوا میں ان کے اوپر گواہی ہوئے نرم کاروں میں آدھے مچھے ہوئے علم غرابیہ آ نکھوں والے طہن کی چر سے دائیں بائیں بھول رہے تھے۔

ایک جگہ گتھی دھیرے دھیرے رکھی گئی اور انہوں نے جانا کہ جیسے ایک طہرے ہوئے غضب ناک پانی کے حصارے کو راہ دی گئی ہو۔ وہ جب بائیں حصار کا سپہ راہ لے گئی تھی تو باہر آئے ہیں تو سفری قہیلوں کے پوجہ سے ان کے کندھے سے آزاد تھے اور ان کے سامنے آجوں کا نقش جزا و جوع کل روزانہ دھیرے دھیرے کھٹا چلا جا رہا تھا اور اس کے اندر کی صحت سمجھنے لگتی تھی کہ وہ بے لکڑی "غضب ناک" پانی کے حصارے کا شور مچا رہا تھا۔ رہے تھے۔

دروازے کی دونوں چمکیوں پر طہرے ہوئے لپ پوسٹ اپنی زرد لڑتی ہوئی روشنی اٹھتے "بہت نمایاں اور ایک حد تک افسردہ نظر آتے۔

دونوں ایک بار پھر کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھے گئے۔ لڑکے کے گل کھائے ہوئے بازو نے لڑکی کو ایک بار پھر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سرخ پانٹ کی رودیں میں شکر کے گرد و حصار دیوار پٹکے لپٹے ہوئے بہت تھکا ہوا ان کے سفری قہیلوں کو احتیاط سے سنبھالے "رہ" کرتے ان کے پیچھے چلے آتے تھے۔

استقبالیہ کی نیم روشن گلاب تلے لگی ہوئی سوئیچوں اور کھوں سے کانوں کی طرف مڑی ہوئی نوکدار قلموں والے سیران نے جبکہ کر انہیں خوش آمدید کہا اور امرہ ہولیا۔ وہ راستے میں بچھتا چلا جا رہا تھا اور اس جب زبان نے کہا ہے کہ انہیں بات کرنے کا موقع دیا ہو۔ وہ کہہ رہا تھا:

"مفتوزیہ جاری خوش نصیبی ہے کہ آپ کی خدمت کا موقع آج آ گیا۔ یہ نکالی داندہ بڑی نافرمانی اور اگر بڑی بھی ہمارے سر آ نکھوں پر اور عرب دیا مستوں کے بیچ تو ہمارے بھائی بند ہیں حضور حاضر جمع رکھیے"

اس وقت وہ دھلی ہوئی سرخ پانٹوں والی راہدار ہیں پھل رہے تھے اور ان کے دونوں اطراف میں کھلتے گلابوں کے شفاف پانی میں درختوں کا گرگھٹس کانپ رہا تھا۔ وہ کندھے سے کندھا ملائے چلے جا رہے تھے اور سامنے بچھتا ہوا سیران:

"بندہ یہ وہاں نہیں بیٹھتا ہے کہ مغل سرائے کا شہرہ سن کر ہی آپ چلے ہوں گے۔ بیٹھا آپ نے جو جگہ خانہ الف سے بے تک درست ہے یہاں سرائے کے سہاراؤں کو روایتی مغل رک رکھناؤں کے ساتھ ظہیر لایا جاتا ہے اور اب کیا عرض کروں معتر ب آپ خود کمال سیران ہوں گے اور جاری خدمت کے معترف ہیں"

گجندے کے بھولوں اور جھٹکے کے دور تک پہنچے قہیلوں کو خبردار کر کے وہ چڑھ کے چھوٹے درختوں والی چھار کے ساتھ ہو گئے۔ پھر گھٹکے گروہوں کا مرحلہ آیا۔ یہاں ہر دس قدم پر درختوں کے ساتھ سیدھی اوپر کواٹھی ہوئی مٹاؤں کا دھواں نیچے بہت پر سیاہی کا لپ کر رہا تھا۔ وہ احتیاط سے دھکے دھکے سیران کے پیچھے چلے رہے تھے وہ ایک جگہ کا اور ایک رنگ آلود تانے کو کھلتے ہوئے سامنے سے ہٹ کر اب سے جھکا تب ان کے سامنے ایک دروازہ ٹھہر چڑھا ہوا ہے کے ساتھ کھٹکا چلا گیا۔ بارہ ایک جھک جھک اندر گیا اور آتش دان کو روشن کر آیا۔ دونوں دروازے میں کھڑے تھے اور ملا زمین ان کے سفری قہیلے کمرے میں ایک طرف رکھ کر کب کے جا چکے تھے۔ پھر سیران نے جبکہ گرا ہوا

چاہی اور رفتہ رفتہ آتشِ دہان میں چٹختی ہوئی کٹڑیوں اور اڑتے ہوئے شراروں کی مدغم روشنی میں اندک کا احوال واضح ہوتا چلا گیا۔

ان کے سامنے چلی گھست کے نیم روشنی کمرے میں بھاری چنگ کے سر ہائے آتشِ دہان کے صحنہ پر وہ چائی کھواریں اُٹھالے رنگ کے احوال کے آدیا ڈھیری ہوئی تھیں۔ کمرے میں دو عورتوں سے کچھ ہونے لگا اور وہ دیکھنے لیں کمرے میں لٹکائی پانچ تھے۔ پھر جانے کہاں سے جبکہ کرا داب بھلائی "گنگائی ہوئی دو کتیریں برآمد ہوئیں اور ان سے میں سپاہیہ جڑا جڑا کر کھڑا تھا۔ وہ آئیں اور لڑکی کو سپہاوی ہوئی بھلی دور ان سے میں غائب ہو گئیں۔ لڑکا ہمت کر کے ان کے پیچھے چلا لیکن اس کے پاؤں نیچے گئے ہوئے قالین میں دھستے چلے جا رہے تھے اور وہ بڑی مشکل میں تھا جانے کیوں اس پر خود کوئی نگہ پانے لگی اور وہ لڑکھڑاسا گیا۔ جب اسے ہوش آیا ہے تو اس نے دیکھا کہ اس کی ساتھی لڑکی کوئی مٹل فٹنڈی ہے یہ جو بڑے چنگ پر اٹلس و گلاب میں باغاب کی طرح گھسلی ہوئی ہے۔ اس لیے وہ غم خود کی میں بھلی کمرے سے ہوتا ہوا دو لڑکے اندام بکھروں کے بازوؤں میں لپٹا لپٹا کر کے باہر چلا گیا۔

اور وہ طور جیسے کوئی مٹل فٹنڈی اڑا سارے کی مٹل پر سنہری صدوی اور کمرے کے گرد چنگ میں اڑا سا ہوا جڑا اڑا چنگ کا مڑا ہوا بھر سنبالے ہوئے تھا۔ جس کے ہتے پر نہ بٹنی بٹھکے آس کے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ بھول رہا تھا۔

وہ غم خود کی میں لڑکھڑاتا ہوا آ کے باہر چلا اور اس نے نگاہ چاہا تھا۔ کمرے میں اب صرف سو رہی چائی ہوئی دو کتیریں رہ گئی تھیں اور شاید چنگ پر غم و ردا مٹل فٹنڈی نے کوئی فرمائش کر دی تھی۔ ایسے میں مٹل کمرے سے کوئی ایک وجود بہت کرا گھوٹکت نکالے ہوئے ظاہر ہوا تھا اور بھی اٹلی نظروں کے ساتھ چاہی کی کوئی ساہوکار جس کے لیے آگ دیک رہی تھی اور بڑے حال میں جنگ سے اور مٹل صراخیاں اور بھاری پیاسے فرقے سے بھا کر پلٹ گیا تھا۔

وہ لڑکا جیسے کوئی مٹل فٹنڈی ابھیر کھکھکے پھنے چنگ پر چب لپٹ گیا اور اس کی آنکھیں بند تھیں چلی گئیں۔ شاید کچھ بہا بہا ہو یا بھی ہو گا اس اندام میں برابر سے اندھ کاس کی ساتھی لڑکی "مٹل فٹنڈی نے کمرے کا پتھر لہا اور پائیں داغ کی سمت کھٹکے والی کڑی میں ٹھہری رہی۔

پھر جیسے جیسے راستہ دھن تھی "پچھے دور تک گل گلے کھٹے دھنوں میں جب طرح کی کھڑائیوں کا شورا بھرتا چلا گیا۔ دھنوں سے بھرا مار کر چڑیاں اور کڑے شور کرتے ہوئے آسمان کی طرف اٹھنے لگے۔

شور باہر چلائی میں دہلادیاں کے ساتھ ساتھ تھوہری کی اونچی اونچی دھاریں گھاس کے تختوں پر ٹھہری ہوئی سبک حرمر کی کرسیاں اور کاسی بھوں سے گندگی اٹھنے کی صوفی تھیں سب رفتہ رفتہ ماند پڑ گئیں اور ہر سمت سے بدھتا کہ میں لیٹا ہوا پاگل کر دینے والا طور ہر طرف بھرا گیا۔

لڑکی گھبراہٹ میں دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتی گئی تھی یہاں تک کہ کمرے میں میر باں کی آواز کوئی:

"حضور بے فکر رہئے۔ یہ خود خود کر دے اور مٹل آپ کی تھن مٹل کی خاطر اس وقت ہمارے تھوہر اور اڑا زمین کی ٹولیاں پائیں باغ کے کوئے کھدداں میں حرکت کر رہی ہیں۔ یہ پیکریں اور گینڈوں کی ملی جلی آوازیں باہر کے مناظر میں تھ دتی رنگ بھرنے کی خاطر ہیں۔ حضور بچت رہئے۔"

میر باں نے کپکپ کر باہر کی سمت کھٹکے والی کڑی کے ساتھ بٹنی پڑوں کو براہ کر دیا۔

آواز میں مسلسل آ رہی تھیں جیسے بھیلوں کے غول گل آئے ہوں اور انہوں نے سرائے کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہو۔ البتہ

میزبان کی وضاحت سن کر لڑکی نے امینان کا سامنہ لیا تھا۔ پھر وہ پائیں داغ کو پلٹنے کے لیے بند کرنے لگی۔ لیکن لڑکا کھتا ہوا تھا اور اسے قہر بھی آ رہی تھی۔

یہ ایک لڑکی آٹھ کڑی ہوئی تھی اور مجلس لکھنؤ کے ساتھ قافلہ بھی بھرتی ہوئی کڑی سے دوسری طرف آگئی۔ ایسے میں میزبان اُسے پکارا، دیکھا اور وہ گھاس کے نرم چنگڑوں اور کاسنی پھولوں پر بلا خوف و خطر چلتی آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔ وہ درختوں اور جھاڑوں کے پیچھے چھپے ہوئے کھڑا دار ملازمین کو رندوں کی مصنوعی آواز میں پھونکاتے ہوئے دھڑکا لٹا پاتا تھی۔ لوہے درختوں کی شاخوں سے اچھٹے ہوئے پرندے اس کے سر پر پتھر کھاتے اس کے ساتھ ساتھ اندھیرے میں آگے بڑھتے رہے اور وہ اپنے آپ میں گن گن مہرائے کے پائیں داغ سے ملکتے گھٹن میں اترتی چلی گئی۔

اندھ مہرائے کے اس ٹیم تاریک گوشے میں لڑکا بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا اور اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ قہر میں اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اُس کا نام لے کر پکار رہا ہو۔ وہ کچھ دیر یوں ہی گم سم بیٹھا رہا پھر اس نے لڑکی کی بابت دریافت کیا۔ اس موقع پر میزبان کو اس نے کھلی پار پر بیٹان دیکھا۔ وہ اپنے کمال تجربہ کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی جہ زبانی کا بے مشعل مظہر کر رہا تھا لیکن اس کی کاتھنی ناگہمیں اس کے چہرے پر نہ ہونے لگتے ہوئے قہار اس کی فضا کا آئینوں اور زبان کی گفت و سب اس کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔

لڑکا اپنی مہری صدوی پر لپٹے ہوئے پچھلے میں اڑسا ہوا جڑا ڈھبک کا مڑا ہوا انگریز سپاہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کانوں میں پہنے ہوئے سفید فندے لگے کی ٹانگیں اور جڑا ڈھبک اور بدھ دیوں کو جاکر پھینک دینے پھر وہ کونے میں دنگی ماتہ چڑتی ہوئی مثال کو ایک ہاتھ میں تھا سے پائیں داغ میں اتر گیا۔ مہرائے کا میزبان اس کے پیچھے کرتا چڑا چڑا تھا۔ بچے خود میں کان پڑی آواز سنائی دیتی تھی اور لڑکا سب سے بے نیاز اس کا نام پکارتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ بالآخر صبح کی دھندلاہٹ میں وہ وہاں تک پہنچی جہاں پتھر کھاتے اور لوہے سے بھی ہوئی شاخوں میں اچھٹے ہوئے پرندے دوڑ رہے تھے۔ دھندلا قریب کی بھاڑیوں سے تھری طرح دوسرے لنگھار بنگلے کی ترائی میں گم ہو گئے۔

لڑکا اس کا نام لے کر وہیں ٹھک گیا تھا۔ ابھی ہوئی مثال دھب دھب کی تھی اور اس کے دوسرے ہاتھ کی گرفت کمر میں مزے ہوئے بھڑے ڈھبلی پڑ رہی تھی۔

سورج اب دھیرے دھیرے غاساویہ اٹھ آیا تھا اور میزبان کہہ رہا تھا۔

”ظہور مغل مہرائے کی انتظامیہ اس سامنے کے قریب نہ رہے ہوئے پر غصہ دہم ہے۔ ہم خود حیران ہیں کہ پائیں داغ اور اس سے ملکتے ملاتے میں جانے کیسے بچاؤ کے پھیرنے اور گھونڈوں کی ٹولیاں درآئی ہیں۔ حضور آپ کی بد و خاطریت ہوں مگر حرم کی عملی حوزہ کرنے کے لیے ہمارے ملے کو آپ بہت جلد سرگرم ملے رکھیں گے۔ ہماری ہر کوشش ہوگی کہ آپ کے قصاص کی طمانی“

اندھ مہرائے کے اس ٹیم تاریک گوشے میں دیوار سرخ قالین پر دو سفری قہیلے رو گئے تھے اور اس کے قریب ہی چاندی کی اونچی سداڑا جس کے پیچھا کھڑا رہی تھی اور بڑے قہار میں خشک میوے اور مٹھل مہرائیاں اور بھاری پیلے ٹولے کھڑے قریب سے بے رکھے تھے۔

اشعار یہ: افسانہ نگار اور اُن کے افسانوی مجموعے

آغا پیر:	چاکر گرجاں (اکتوبر 1948ء، اپ گویا (1958ء، آدنی عشق راں (1958ء، بھول کی کوئی قیمت نہیں (1988ء)۔
آصفیہ افسان:	کہانی (1965ء)۔
آصفیہ باری:	تکھے پاؤں۔
ابراہیم بھٹکس:	آزاد نظام، آسمان کے ہاتھ، چالیس کروڑ بھکاری، زمین چاک دی ہے، کچھ فلم چاہیں کچھ فلم، اس، اُلتی قرعیں، دھورو چروے، بھوکا ہے بنگال، بھگوان دیکھیں۔
ابو فیاض باقوال:	دُشمن۔
ابوالفضل صدیقی:	ابرام (1935ء)، سر ہونکا لود (1960ء)، جہاز کھم (1988ء)، انصاف (1988ء)، آئینہ (1988ء)، ستاروں کی چال (1995ء)، بھگچو (1999ء)، دونوں پہلے، دُشمن آفری فٹانے۔
احمد جاوید:	غیر ملاتی کہانی (1983ء)، جیڑ کھر (1998ء)۔
احمد داؤد:	مستوح ہوا نیں (جون 1980ء)، سٹون دھڑا دی خواب فرڈاں (1998ء)۔
احمد شجاع، تحکیم:	نفس کی قیمت۔
احمد شریف:	سرہلی سے کھجور تک۔
احمد عباس:	ایک لڑکی (1937ء)، محرومی (1938ء)، زمخراں کے بخراں (1948ء)، پاؤں میں بخراں (1948ء)، میں کون ہوں (1949ء)، دلیا بے ساری رات (1959ء)، گچھوں اور گلاب (1965ء)، نئی دھرتی تے سئے انسان (1977ء)، نئی ساری (1982ء)، سوسے کے سٹ (2001ء)۔
امروہی:	آٹھ رستے (1932ء)، کھیلے (1936ء)، طاری گل (1942ء)، قید تات (جون 1944ء)، سوخت سے پہلے (1945ء)۔
احمد علی محمد قاسمی:	چرپاں (1939ء)، کچھ لے (1941ء)، طوطے و طوط (1941ء)، گرگلاب (1943ء)، سیلاب (1943ء)، آنگلی (1944ء)، آہلے (1946ء)، آس پاس (1948ء)، درد و دُچار (1948ء)، سٹا (1982ء)، بازار حیات۔

امجد بخش	(1955ء، مارگہ ستارہ) (1958ء، پہلے نظر لگائے۔ شادمانہ، نال اور مراد) (2007ء)۔
ادھر ہفت	تکھی، کہانی لکھ لکھتی ہے۔ دوستانی کی کہانیوں، ماگ کے سلسلے ۳۰ لکھنے کا شہر۔
اختر انصاری و بلوچی	انڈی دنیا اور دوسرے لکھائے (1939ء)، تازہ اور دوسرے لکھائے (1940ء)، غوثی اور دوسرے لکھائے (1943ء)، لونا ایک تھوڑا سا (1953ء)، بے زندگی اور دوسرے لکھائے (شیخ دوم 1958ء)۔
اختر اور بیڑی	مظہر، بکس پھر (1940ء)، لکھنیاں اور کالے (1941ء)، ادا رنگ اور دھول مہلباس (1944ء)، بہت اور انکاسیت (1947ء)، لکھنیاں اور بال جبریل (1960ء)، بچپن کے دیس، شہ، اختر اور بیڑی کے لکھائے مروج (اکثر عبدالغنی (1977ء)، ایک کاوری۔
اختر جمال	بغول اور پاندو (1987ء)، داگیاں لگا دیاں (1971ء)، اندر دھن کا میں (1981ء)، سمجھت انکھیریں (1990ء)۔
اختر ضمیمہ رائے چٹائی	محبت اور غرت (1938ء)، آگ اور آسٹو (1946ء)، اندر کی کاسیل (1949ء)۔
اسد خان	کڑی کھر آہستہ: لکھائے، نظمیں (1982ء)، نرجا غوثاں (1990ء)، شے کی فی فعل (1997ء)، زبد (2003ء)، شہر سے پھر کی کہانیاں (2006ء)۔
اسلم سراج الدین	سرماسر (1997ء)۔
اشرف محمدی، بلوچی	بھرا کے (لکھائے شاکے)، غبار کاراں لکھائے، شاکے (1970ء)۔
اشفاق احمد	ایک محبت اور لکھائے (1951ء)، آبلے پھول (1957ء)، اور چٹا (1983ء)، پہلکاری (1991ء)، شمعائے لکھائے (2002ء)۔
اویس احمد خان	نورتن (1930ء)، محبت کی غلظت (1933ء)، داری (1939ء)، کوئل (1940ء)، پنک (1941ء)، تاسر (1943ء)، گلشن (1943ء)، کالے صاحب (1958ء)، کوریں پر ٹپکی شام (1987ء)، بیکل ایڈ (1992ء)۔
ایاز رازی	تیسری غلظت۔
اعظم کراچی	پریم کی چڑیاں (1943ء)، ڈاکٹر کو (1943ء)، شمع و برص (1943ء)، انکھ اور دوسرے لکھائے (1944ء)، کول اور دوسرے لکھائے (1944ء)، انکھ اور دوسرے لکھائے (1944ء)۔
اقبال حسین	اٹلی پر چھاپیں (1960ء)، چاندنا اٹلی (1972ء)، خلی پھر میں کا جہازی (1977ء)، آگہی کے وہانے (1980ء)، حریف (1988ء)، میں جس کی بات تم بھی کہانی (1993ء)، اختر آ خوب (2002ء)۔
اقبال مجید	دراختے ہوئے لوگ (1970ء)، ایک طلبہ جات (1984ء)، شہر بے نصب (1997ء)۔
اکرم سادہ	بگل۔
الطاف طاہر	دوستے چاہ گیا، جیسے چاہی گئی کرتی ہیں، دار مصفوت (1990ء)۔
ایاس احمد گدڑی	آزادی (1981ء)۔
امیت الدینی	شاپو دھاب۔
امجد الطاف	کچھ دھاب۔

ادبیات: شعلہ	ایک کتابچہ، پمپا میں شائع کرتی ہیں (2007ء)
اسرارِ ہیتم	ایک ہیتم
انتقادِ سببیں	گئی کو سب (1962ء)، انگریزی (1955ء)، آفریقی آزادی (1987ء)، شہرِ قلم (1972ء)، کچھوے (1981ء)، نیچے سے اُردو (1986ء)، خالی ہجر، (1993ء)، شہزادہ کے دام (2002ء)۔
انجمِ صافی	شبِ آشنا (1977ء)، دطرِ دطر (1984ء)
انوارِ حسن:	ایک ہی کہانی، پہلے سے نئی سہلی کہانی۔
انورِ زادی	غلابِ شہرِ باد، مسندِ عالی گئی (2008ء)
انورِ چاند	چراغِ باد (1964ء)، استعارے (1970ء)، آغ (1983ء)، سبکی کہانیاں (1990ء)
انورِ عظیم	افس، غافل (1970ء)، تقدیرات کا (1970ء)
انورِ قمر:	خاندانی کے پردہ، پچھلے میں شہزادہ افس۔
اسے۔ عید	حوالِ حوالِ کراس کا گیت، دیکھو دیکھو، کچھ سو سو ٹی کی سڑا لڑا۔
بانو فیہ:	بادِ افس، اہلِ بھل، کچھ اور نہیں، دانت کا دست، ناقابلِ ذکر (1985ء)، دھرا اور دائرہ (1999ء)، آغلی، زریخا (2000ء)، سامانِ پیدہ جو (2002ء)، مسندِ بست (2003ء)
بھینر پریہ	جاس (1958ء)، کاہل اور صفا (1965ء)، بھر سے بھین (1973ء)، مسکات (2000ء)
لہراجِ کل	آنکھیں اور پاؤں (1981ء)
لہراجِ سن ما	شعلہ (2007ء)
بلونتِ شگ	جگ (1943ء)، پہلا فجر (مطبوع دوم، 1953ء)، چاند چاند (1944ء)، طیرا رنگ، بادِ صبح کا بار (1974ء)، چپ جہاں کا جٹ۔
پریم چند:	سوزِ گل (جول 1908ء)، پریم گتھی (1915ء)، پریم بھین (1920ء)، خاکِ چاند (1928ء)، غلاب و خیال (1928ء)، فردوسی خیال (1929ء)، پریم چالیسی: دو جلدیں (1930ء)، آفریقی قند (1934ء)، دھیرا (1936ء)، نہایت (1936ء)، دورہ کی قیمت (1937ء)، دارِ دانت (1937ء)، روپیت کے افسانے (1939ء)، غلاب (1940ء)۔
تہنمِ شہم چاندی	کتاب (1941ء) اور قصہ شہر کے بھ۔
آئی سبیں خمرہ:	کون سے (1978ء)، آتے جاتے (1982ء)، مہرِ کرب بھدی ہے (1987ء)
علیلِ قدوسی:	یرگن (1927ء)، سامانِ خیال (1933ء)
عیلہ بانگ:	آپ جی جی جی (1969ء)، دیا بچہ جنم (1983ء)، رنگِ علوم (1987ء)
عزیزِ کدو پال	دھرتی کا کمال (1981ء)، میں تھیں سوچوں (1962ء)، رسائی (1969ء)، مٹی کا اداک (1970ء)، سلطین (1975ء)، لیکن (1977ء)، اسے یاد دہا (1978ء)، اسے یاد دہا (1981ء)، کچھ گڑ (1997ء)، کچھ۔
بیانی بان:	روشنی کے چار (1958ء)، فردوس (1964ء)، پہلا کمر (1979ء)، دانت کے مسافر (1979ء)، روز کا قصہ

(1987ء)۔ بات پھر لہو کی (2001ء)

جادو ادا فر: چار چاند (1917ء)۔ ناز ایل کا جنگ (1927ء)۔ آگ کھلے نور (1932ء)۔ یہ چھاپاس (1943ء)۔

جادو ایل خاص: ہنسنا کے عشق

میں سحر: رہائی (1981ء)۔ میری (1982ء)۔ انسان کا ریل (1991ء)۔ خاک کا زہر۔

میں نکلی، غریب: خود ایل کے ایلانے آخوندی (1922ء)۔ 1914ء، جنگ ایل (1917ء)۔ مرزا ایل کی بیٹی۔

میں ایل: پس یہ شب، خود حال، مطلع، سوئی کی لوگ پر کا لہ۔

جانتے ایل: افغانی (1938ء)۔ انہرے بازار میں (1942ء)۔ ایل کنگورے (1944ء)۔

خاتون اکرم: گلستان خاتون، سکر و قہار، چھری۔

خالد چاند: نرے موسم میں (اگست 2000ء)۔ تفریق کی ایک دہر۔

خالد: کچان (1980ء)۔ دردناک (1984ء)۔ مصروف غم (1989ء)۔ ایل غراب میں ہنوز (1995ء)۔ میں جہاں ہوں

(2005ء)

خان فضل الرحمن: ادھ کھانا امرو (1958ء)۔ درشن رین (1984ء)۔

خدیجہ ستور: تمیل، یہ چاند چند روز اور، اگلے بارے ایل ایل پانی۔

خود ایل کا ریل، ایلانہ: آدھار

دع چند اسر: گیت اور ایل (1952ء)۔ شیش کا سیم (1955ء)۔ کیوس کا سحر (1983ء)۔

دکا، ایل: وردا نے گاہے پاؤں، میں روز میں (1987ء)۔ خواب عین (فروری 1991ء)

راجندر گلچند: دانہ دام (1939ء)۔ کو کو کو ایل (1949ء)۔ اپنے ایل کھجندے (1965ء)۔ ایل ہمارے علم ہونے (1974ء)۔ پس

لڑکی، ایل، ہنوز، ایل، ایل۔

راجد آراء، گلچند: یہ لگا، با ستری، ایلچ۔

راجد ایلچری: سات زحری کے ایلانے ایلانے (1917ء)۔ کوہر حضور (1918ء)۔ سراب مغرب (فروری

1918ء)۔ جہر صحت (فروری 1920ء)۔ نظرات ایل (1921ء)۔ سو سکی کا چارپا (1921ء)۔ ستی

(1926ء)۔ سارا ایل (1927ء)۔ بچ کا گرت (1927ء)۔ ایلانے کا دم دا بیل (1927ء)۔ گلچند، ایلانے

ایلانے (1927ء)۔ ایلچہ ایل (1928ء)۔ ایلچہ ایل (1928ء)۔ ایلانے ایلانے (1928ء)۔ ایلانے ایل (1929ء)۔

ایلانے ایل (1929ء)۔ ایلچہ ایل (1929ء)۔ ایلانے ایلانے (1929ء)۔ ایلانے ایل (1929ء)۔ ایلانے ایل (1929ء)۔

ایلانے ایل (1929ء)۔ ایلانے ایل (1931ء)۔ ایلانے ایل (1932ء)۔ ایلانے ایل (1935ء)۔ ایلانے ایل (1935ء)۔

ایلانے ایل (1938ء)۔ ایلانے ایل (1937ء)۔ ایلانے ایل (1937ء)۔ ایلانے ایل (1938ء)۔

ایلانے ایل (1941ء)۔ ایلانے ایل (1949ء)۔ ایلانے ایل (1958ء)۔ ایلانے ایل (1960ء)۔ ایلانے ایل (1978ء)۔

ایلانے ایل (1963ء)۔ ایلانے ایل (1972ء)۔ ایلانے ایل (1974ء)۔ ایلانے ایل (1978ء)۔ ایلانے ایل (1978ء)۔

ایلانے ایل (1988ء)۔ ایلانے ایل (1990ء)۔

(1984ء) ، آدمی رات کی حقوق (1999ء) ، ڈرگس اور نکلیس : افسانے / ناولٹ (2005ء)

عظیم بیچ میں ، طہیم و پشت (2003ء) ، ہندو روایتی ڈال آ سانج (2004ء)

الہ دیکھتی تصویریں ، چار چرے۔

آئینہ حیرت (1944ء)

آگ کی آفریق میں سورج بھی کاشانی بحرل کی طرف۔

بے رنگ دن (1940ء) ، پہل اور کائنات

بارہا کا نگار

ہوئی کہاں ، بھری نسل

کوشش ناقص

گرتے ہوئے درخت

گلی ہوئی زمین کا کچا کپڑا بنگر

کرکس (1942ء) ، لہریں (1943ء) ، دودھ (1944ء) ، پردہ (1945ء) ، بچتا رہے (1946ء) ، واقعات

(1947ء) ، بحریہ واقعات (1954ء)

درپن (1943ء) ، لہو کے سول ، آنکھ بکلی (1947ء) ، ماضی (1956ء) ، آگ اور پتھر (1967ء) ، آفری سلام

اندھیرے کے بھتو

ہالے (1946ء)

نورق ، گوشت سواری کاٹنے ، ہم ڈالے ، سکر انیس ، صلاب ، جسم طوفانی جسم ، کچی کچی ، قاعدہ بے قاعدہ ، ایک مربع سو لکھی ریل۔

تیرا آدمی (1962ء) ، اسرار کی آنکھیں ، ساتوں کا شکر ، کاکلی ، کچیا گدگدھڑا اور گدھڑا۔

ٹکا پاؤں سانے بھنور ، بادلوں میں

بچہ تر ، دھک ، بچنے ، بچہ حصار ، بچیں ، بیچ انہیں۔

پہلوں کے گل (1963ء) ، شراب و شر (1988ء)

بات بچت (1927ء) ، بھولی ناول (1939ء) ، گلیں چرے تھی آواز میں ، سلاستی (1946ء) ، نونگے نراس میں آس

(1948ء)

چنگیاں ، دودھ اور خون ، بنگلوں میں آنسو ، لکیر کے کی تاک ، دھک کے آنسو ، قصوں نسل ، آنکھ بکلی۔

آخری چھانٹاں (1982ء) ، لپ جاتے والے (2008ء)

الم دور سائے ، پتھر اور آنسو

سکے سادوں ، کچی موت

بارغ کا دروازہ

سعدہ (1984ء) ، آفری چال (1988ء) ، بخود دانہ (1996ء)

عبدالحق شیخ	ظکریا جاس (1992ء)
ناؤہ سٹیلہ	سب سے چھوٹا نام (دسمبر 1975ء) سچے والے (دسمبر 1998ء)
ماہرین حسین خانوی	سوزِ انعام
عبدالرحمن چغتائی	کاہل سنگان
عبدالصمد	بارہ رنگوں والا کمرہ
عرش صدیقی	بارہ رنگوں سے پاؤں، سامعہ مسترد۔
عزیز احمد	رقمیں انعام (1945ء) اپنے کاروبار سے (دسمبر 1950ء)، خدنگ جنت (1988ء) آپ جیات۔
صہبہ چغتائی	نکلیاں (1940ء)، چمن گل (1942ء)، ایک بات (1942ء)، پھرتی سونے (1952ء)، دو ہاتھ (1982ء)، زہرا کیل لڑکی، مریہ لولہ طاف، ہنسی کی خوشبو (1979ء)، دو رنگ، آدھی عورت، آدھا غراب، ایڑی کی ٹکر، سرِ ظل، یہاں سے وہاں تک (1981ء)
عظیم بیگ چغتائی	قرض و قرض الیبت است، مدح و تحریف (افسانے، مقالمیں)
عفراء بخاری:	قاسمیلہ (1964ء)، نہایت (1998ء)، دیریت میں پاؤں (2003ء)، آنکھ اور اندھیرا (جنوری 2009ء)
علی امام	میں
علی بیگ:	کئی دوس کاوان (1985ء)، سورج کے سب لوگ (1998ء)
علی حبیب ملک:	پہلے میں ہے آسان۔
علی سرور جعفری	منزل
علی عباس مصلیٰ	رہتی بھائی (1942ء)، پاس پھول (1939ء)، آئی سی انیس (1940ء)، پہلے گھوٹل، کاغذوں میں پھول، عذرا کھارے (1964ء)، ہمارا گائوں (1966ء) سب گھوٹل نہیں ہے، لکھے دھاگے، ایک خام میں سے بچ کر کی رہا میں
علیہ اللہ:	منزل منزل دل بھنگے گا، سوزِ عشق جاگ
عوض سعید	سنانے کا سفر (1988ء)، سارا حصار (افشانی) (1977ء)
غلام آصفین نقوی	بندگی، عشق کے سنانے، غصہ اور آگ، گل کا گیت، دے لے کی دعا۔
غلام عباس:	آندری (1948ء)، چارے کی چاندنی (جولائی 1960ء)، کئی دس (دسمبر 1969ء)، زندگی، کتاب، چہرہ، کلیات (1984ء)
غیاث احمد گزنی	بابا لوگ (1989ء)، چاند، نکالنے والی گاڑی (1977ء)، سارا دین، صوب (1988ء)
فضل حق قریشی	آج کے ملانے، آج کل کے زمانے۔
غنیہ اختر:	کھسکاں پانچ دہائیوں میں۔
غیر روزِ ماہ:	اعتراف کی شمع (1981ء)، نقشِ جہاں (1988ء)
قاسم محمود سید	قاسم کی مہندی
قاضی عبدالستار	نقل کا ٹکڑا (1964ء)، آنکھ کا نام سورج، ڈاکٹر محمد فہیمہ الدین (1995ء)

محمد حسن شکر	جزیرہ (1943ء)، تپا سہم کتاب آئے مآئے (1947ء)
محمد خالد اختر:	کھوپا، اٹلی (1968ء)، اٹلی میں، دوسرے انسانے (1993ء)، بچا عبدالہادی کی کہانیاں (1985ء)۔
محمد عامر بٹ	اشجارا، دی سونگ (2009ء)
محمد ادراسی	گنا کا خوف، کنٹرول، خوشامی، بدامی، اور انسانوں کا مجموعہ، کنٹرول، مرجع، سبلی کا نظم (1980ء)
محمد عریض	تار چنگی (1990ء)
محمد حبیب، پرویز	کیا اگر دوسرے انسانے (1932ء)
محمد احمد قاضی	جوا (1979ء)، قہر اوسا موسم (1995ء)
محمد بشیر	گلے نوے دل کے
دعوتی	آجائے سے پہلے
مرزا جلیگ	آتش، کلمات (نیم جنوری 1961ء)، تار پر چلے، دلی (1984ء)، مگد، کی مروری (1991ء)، حمیدہ کی کہانی (1992ء)، سیاہی بانی کی عرضی۔
مستشرق مسکن تار:	سہاؤ آگ میں تصویر
میر عبد القادر	لاٹوں کا شیر (1936ء)، صدائے جس (1939ء)، اسیا اور دوسرے انسانے (1948ء)، داری کاف اور دوسرے انسانے (1954ء)
مسعود اشعر:	آگھوں پر دھن، ہاتھ (1975ء)، سارے انسانے (انسانی کہانیاں)، اپنا گھر (2004ء)
مستحق قمر:	لیڈر دلی، محبوب شہر
مشرق احمد	جب شیر نہیں ہوئے (1986ء)
مظہر الاسلام	مکھوں کے شیر میں اکیلا آ دی، باتوں کی بات میں ہنگول لڑی، خلا میں چست کی بولی، دوپہر، گلی کی آگ سے شہر کا کھم۔
مظہر ابراہیم خاں	بارش، اپنا گھر (1979ء)
مقصود الہی شیخ	رف کے آنسو۔
نثار رموزی	صبح نصف، ندی، (انسانے، انسانے)، انسانے، دوزی (انسانے، انسانے)
نواز شیریں	اپنی گریبان، کھولنا
نواز شفیق	ان کی (1943ء)، کہا گئی (1944ء)، پاپ (1947ء)، اسیا، اسی (1953ء)، دگر پا گھر (1985ء)، دنی چنگے (1984ء)، سے کا بندھن (1988ء)، ان کی نہ جانے (1992ء)
منور، سعادت مسکن:	آتش، پارسے (1936ء)، منور کے انسانے (1940ء)، اسیا، اسی (1941ء)، انسانے اور انسانے (1942ء)، انسانے سگ (1947ء)، سپا، حاجی (1948ء)، پند (1948ء)، خطا، گھومت (1950ء)، خالی ہاتھیں، خالی اسبے (1950ء)، انرو کی لٹائی (1950ء)، اسیا، اسی (1951ء)، جز (نومبر 1951ء)، مرگ کے کتارے (1953ء)، سر کٹوں کے چنگے (اکتوبر 1954ء)، بندھنے (جنوری 1955ء)، اسیا، اسی (1955ء)، نہ تھے (1955ء)، شہر کی عرضی (1955ء)، دلی، اسی اور دلی (1955ء)، میں، طیر، مگد، کہانیاں (1952ء)، دلی، دلی، اسی:

السانے (مضامین) (1955ء) مختصر نثریں (السانے) (مضامین)

نظائر

نثر طبعی میں بنگلو (1975ء)، اس نور علی (1980ء)، خطا اور خطا (1983ء)، دورِ گیت آری (1991ء)، دور کی آواز (1998ء)، کتابت (1998ء)، خواب سرائے (2005ء)

حیرانہ شوق

نئے کی بات

حیرانہ شوق

زرد ستارہ (1988ء)، شجر صنوبر (1991ء)، بیج حرام (1999ء)، چھڑی ہوئی کوٹھ (2001ء)، افغانی عشق (2008ء)

مہندرانو

چاندنی کے تار دیر پاں سے، دہانک بگی بادی۔

مہر زادہ

ان داغ (1935ء)، صبرا نور کے خطوط (جولائی 1940ء)، دہانے آرزو (1941ء)، صبرا نور کے ڈراما (1942ء)، بے کسی (1944ء)، موت کا قہر (1944ء)، دج دج (1947ء)، جنگلی (1952ء)، اورا (1947ء)، کیکل (اکتوبر 1957ء)، صرصر قہر (1979ء)، ساتواں چراغ (1983ء)، صبرا نور کا نیا غزل (1960ء)، گلی گلی کہانیاں (1987ء)، کرکٹوں سے بندھے ہاتھ (1991ء)، خطا صوں کی بھارت، موت کا راگ۔

میرزا راج

آندھی میں صبرا ہے آپ صبرا۔

ناصر ہادی

بے شامت (1990ء)، مطلوب (2004ء)

عالم الحسن، بطوری

چشم نواز

بہار اور راج

پہلو کی بدالی

نیا رخ چاندی

ایک شاعر کا اہام (1913ء)، نگارستان (1929ء)، خواب اٹھ جانے کے بعد (1942ء)، جہانستان (1933ء)، صحن کی عمارتوں اور دوسرے انسانے، انارکلی تیار (السانے) (مضامین)، شہاب کی سرگزشت، جہانستان کا قہر، گوہری، قرآن کا غصہ، کچھ دستانیں۔

غیر مسودہ

سیما (1984ء)، مہر کا نور (1993ء)، ملاؤں جنم کی جہ (1997ء)، گجھت (2008ء)۔

داہد و جسم

تو بچہ شجر صنوبر، باتری، آواز است، نگیں، دھوا آؤ، مہمت، آئینے کے سامنے (1978ء)، ہڈی کا سوال، کچے کھانسی، جیسے دریا (1970ء)، میرے بہترین انسانے، گنگن گل (1971ء)، ہم جا کا مان، حنا کی کھنکھ، دھوا، دل

بابا و سرور:

چم کے (1944ء)، ہائے غزل (1945ء)، چوری چھپے، دھوا، میرے نجانے، تیسری منزل، چاندنی دوسری طرف۔

ہر گز نہ چلاؤ:

نکس آئینے کے (1975ء)، موت سندباد، بھاک (1980ء)۔

خس و راج و سرور:

اینا عشق، ہم لوگ، دل و رعب

یوسف چودھری:

تیسری دنیا کے چاند (1982ء)

یوسف صبیح:

سوسائٹی کے گناہ و جرم

یاس چاند:

تیرہ کا شور، آواز، شہ، ایک تار، دھوا، موت (2004ء)

تصاویر، عکس تحریر، آٹو گراف



Handy Handy
Phone Book
Address Book
To Do List

۱- در صورتی که در یک سال دو بار در یک منطقه (مثلاً در یک شهر) آلودگی هوا به حد خطرناک برسد، آلودگی هوا در آن منطقه به حد خطرناک است.

[illegible]

— *unpublished manuscript*

Age Group	Total (%)	Male (%)	Female (%)	Male (%)	Female (%)
18-24	~85	~75	~70	~75	~70
25-34	~80	~70	~65	~70	~65
35-44	~75	~65	~60	~65	~60
45-54	~70	~60	~55	~60	~55
55-64	~65	~55	~50	~55	~50
65+	~60	~50	~45	~50	~45



1999, 2000, 2001, 2002, 2003, 2004, 2005, 2006, 2007, 2008, 2009, 2010, 2011, 2012, 2013, 2014, 2015, 2016, 2017, 2018, 2019, 2020, 2021, 2022, 2023, 2024, 2025, 2026, 2027, 2028, 2029, 2030, 2031, 2032, 2033, 2034, 2035, 2036, 2037, 2038, 2039, 2040, 2041, 2042, 2043, 2044, 2045, 2046, 2047, 2048, 2049, 2050, 2051, 2052, 2053, 2054, 2055, 2056, 2057, 2058, 2059, 2060, 2061, 2062, 2063, 2064, 2065, 2066, 2067, 2068, 2069, 2070, 2071, 2072, 2073, 2074, 2075, 2076, 2077, 2078, 2079, 2080, 2081, 2082, 2083, 2084, 2085, 2086, 2087, 2088, 2089, 2090, 2091, 2092, 2093, 2094, 2095, 2096, 2097, 2098, 2099, 2100, 2101, 2102, 2103, 2104, 2105, 2106, 2107, 2108, 2109, 2110, 2111, 2112, 2113, 2114, 2115, 2116, 2117, 2118, 2119, 2120, 2121, 2122, 2123, 2124, 2125, 2126, 2127, 2128, 2129, 2130, 2131, 2132, 2133, 2134, 2135, 2136, 2137, 2138, 2139, 2140, 2141, 2142, 2143, 2144, 2145, 2146, 2147, 2148, 2149, 2150, 2151, 2152, 2153, 2154, 2155, 2156, 2157, 2158, 2159, 2160, 2161, 2162, 2163, 2164, 2165, 2166, 2167, 2168, 2169, 2170, 2171, 2172, 2173, 2174, 2175, 2176, 2177, 2178, 2179, 2180, 2181, 2182, 2183, 2184, 2185, 2186, 2187, 2188, 2189, 2190, 2191, 2192, 2193, 2194, 2195, 2196, 2197, 2198, 2199, 2200, 2201, 2202, 2203, 2204, 2205, 2206, 2207, 2208, 2209, 2210, 2211, 2212, 2213, 2214, 2215, 2216, 2217, 2218, 2219, 2220, 2221, 2222, 2223, 2224, 2225, 2226, 2227, 2228, 2229, 2230, 2231, 2232, 2233, 2234, 2235, 2236, 2237, 2238, 2239, 2240, 2241, 2242, 2243, 2244, 2245, 2246, 2247, 2248, 2249, 2250, 2251, 2252, 2253, 2254, 2255, 2256, 2257, 2258, 2259, 2260, 2261, 2262, 2263, 2264, 2265, 2266, 2267, 2268, 2269, 2270, 2271, 2272, 2273, 2274, 2275, 2276, 2277, 2278, 2279, 2280, 2281, 2282, 2283, 2284, 2285, 2286, 2287, 2288, 2289, 2290, 2291, 2292, 2293, 2294, 2295, 2296, 2297, 2298, 2299, 2300, 2301, 2302, 2303, 2304, 2305, 2306, 2307, 2308, 2309, 2310, 2311, 2312, 2313, 2314, 2315, 2316, 2317, 2318, 2319, 2320, 2321, 2322, 2323, 2324, 2325, 2326, 2327, 2328, 2329, 2330, 2331, 2332, 2333, 2334, 2335, 2336, 2337, 2338, 2339, 2340, 2341, 2342, 2343, 2344, 2345, 2346, 2347, 2348, 2349, 2350, 2351, 2352, 2353, 2354, 2355, 2356, 2357, 2358, 2359, 2360, 2361, 2362, 2363, 2364, 2365, 2366, 2367, 2368, 2369, 2370, 2371, 2372, 2373, 2374, 2375, 2376, 2377, 2378, 2379, 2380, 2381, 2382, 2383, 2384, 2385, 2386, 2387, 2388, 2389, 2390, 2391, 2392, 2393, 2394, 2395, 2396, 2397, 2398, 2399, 2400, 2401, 2402, 2403, 2404, 2405, 2406, 2407, 2408, 2409, 2410, 2411, 2412, 2413, 2414, 2415, 2416, 2417, 2418, 2419, 2420, 2421, 2422, 2423, 2424, 2425, 2426, 2427, 2428, 2429, 2430, 2431, 2432, 2433, 2434, 2435, 2436, 2437, 2438, 2439, 2440, 2441, 2442, 2443, 2444, 2445, 2446, 2447, 2448, 2449, 2450, 2451, 2452, 2453, 2454, 2455, 2456, 2457, 2458, 2459, 2460, 2461, 2462, 2463, 2464, 2465, 2466, 2467, 2468, 2469, 2470, 2471, 2472, 2473, 2474, 2475, 2476, 2477, 2478, 2479, 2480, 2481, 2482, 2483, 2484, 2485, 2486, 2487, 2488, 2489, 2490, 2491, 2492, 2493, 2494, 2495, 2496, 2497, 2498, 2499, 2500, 2501, 2502, 2503, 2504, 2505, 2506, 2507, 2508, 2509, 2510, 2511, 2512, 2513, 2514, 2515, 2516, 2517, 2518, 2519, 2520, 2521, 2522, 2523, 2524, 2525, 2526, 2527, 2528, 2529, 2530, 2531, 2532, 2533, 2534, 2535, 2536, 2537, 2538, 2539, 2540, 2541, 2542, 2543, 2544, 2545, 2546, 2547, 2548, 2549, 2550, 2551, 2552, 2553, 2554, 2555, 2556, 2557, 2558, 2559, 2560, 2561, 2562, 2563, 2564, 2565, 2566, 2567, 2568, 2569, 2570, 2571, 2572, 2573, 2574, 2575, 2576, 2577, 2578, 2579, 2580, 2581, 2582, 2583, 2584, 2585, 2586, 2587, 2588, 2589, 2590, 2591, 2592, 2593, 2594, 2595, 2596, 2597, 2598, 2599, 2600, 2601, 2602, 2603, 2604, 2605, 2606, 2607, 2608, 2609, 2610, 2611, 2612, 2613, 2614, 2615, 2616, 2617, 2618, 2619, 2620, 2621, 2622, 2623, 2624, 2625, 2626, 2627, 2628, 2629, 2630, 2631, 2632, 2633, 2634, 2635, 2636, 2637, 2638, 2639, 2640, 2641, 2642, 2643, 2644, 2645, 2646, 2647, 2648, 2649, 2650, 2651, 2652, 2653, 2654, 2655, 2656, 2657, 2658, 2659, 2660, 2661, 2662, 2663, 2664, 2665, 2666, 2667, 2668, 2669, 2670, 2671, 2672, 2673, 2674, 2675, 2676, 2677, 2678, 2679, 2680, 26

[illegible]



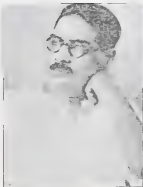
اپنی پیاری لڑکی سے
سے لکھ کر مر رہا ہوں
میں اس کا پروردگار
اور اس کا بچہ

چند دھری گھڑی دہلوی



دہلی کا جج مجھ پریشان میں
ایک ایسی کتاب ہے جس پر ہر شہر
دوں نے اپنی آپس سے دیکھا ہے
ہیں۔ جس کا نام ۱۰۰ ارب ملے

خوبصورت گھڑی



یادگار چوری

میرزا کا دوست کاغذدار، ایک شہید کا دل کو چھو کر
 دہلیز شہید کی یاد میں
 غزل گو - دریا کا
 کاغذ دار کاغذ چوری

نہایت
 —————
 سہ



مہاشہ سدرتن



امام باقر (ع)
میرزا محمد علی

در علم و ادب

بیت و نظم و نثر و خط و کتابت
و ادب و تاریخ و جغرافیا و طب و فقه
و کمال و کرم و سخاوت و...

محمد علی
نور علی

امام علی



عبدالله افشار



میرزا عبداللہ



پیش قدمانی

مقام پرستور خیر عجب
 پدید آمدنی



مکمل کرد کہ پوری

یہ ہے بالیدگ ہے تہمتی
جہاں اٹھا تادرد اب تک رہی ہے

مکمل کرد کہ پوری



مکمل کرد کہ پوری

مکمل کرد کہ پوری
مکمل کرد کہ پوری
مکمل کرد کہ پوری
مکمل کرد کہ پوری
مکمل کرد کہ پوری
مکمل کرد کہ پوری
مکمل کرد کہ پوری
مکمل کرد کہ پوری
مکمل کرد کہ پوری
مکمل کرد کہ پوری



کتاب

میں نے یہ سب کچھ اپنے دل سے لکھا ہے۔ میں نے اپنے دل سے لکھا ہے۔
میں نے اپنے دل سے لکھا ہے۔ میں نے اپنے دل سے لکھا ہے۔
میں نے اپنے دل سے لکھا ہے۔ میں نے اپنے دل سے لکھا ہے۔
میں نے اپنے دل سے لکھا ہے۔ میں نے اپنے دل سے لکھا ہے۔



نور محمد خان صاحب

محبت اور غم کے ساتھ
آئینہ کا آئینہ



اشرف مہدلی دہلوی

مجلسِ بولوی در صبا عسکرم

کسبم - صبا دستور دانی کی چند عجیب چستید
 چہ پستی غصہ کند با من - کجور غریب
 فرستہ شخصیت تو را بہ ہر طاعت حق کلاچی
 اسلاف تو کہیں - ہر صورت کیم ہر حال تہدکی
 اعجاز کی قدرت بر تو جزئی نگر - حیرت کار تہذیب
 میں کس لیں - لاکھ ایچ نام کو - اجازت دے
 ننگو خاک کی ہو در سہیل - اسطیغ گرد ہر چہ زندگی پر
 عجیبہ دیا نہ تو را یہاں تو - کی سے غصہ ہو جاوے

اسیرِ لبِ فخرِ کنگہ
 غلی
 اشرف مہدلی



رشیدہ جہاں

جہاں - جی شوق - میں مری بڑا کلمہ کین روا بندہ
 دکھ - طاقت کا دکھ - سے بھر گیا -
 نہ خدا
 کلام -

ہزارہ ۱۹۶۵ء
 ایک ناکامی کی کہانی - ایسا کہ منظر - میرا جہاں - میرا جہاں



غریب خان

ہم نے اپنے قلم سے ان کی زندگی کے بارے میں ایک بڑی عمدہ تصویر
 پیش کر دی ہے۔ ان کی زندگی کے بارے میں یہ سب کچھ
 نہیں کہہ سکتے کہ ان کے قلم سے جو تصویر
 برآمد ہوگی۔ اس کی طرف سے یہ بھی چاہیے کہ

غریب خان
 لکھ



سید فیاض احمد

میں نے ان کی زندگی کے بارے میں ایک بڑی عمدہ تصویر
 پیش کر دی ہے۔ ان کی زندگی کے بارے میں یہ سب کچھ
 نہیں کہہ سکتے کہ ان کے قلم سے جو تصویر
 برآمد ہوگی۔ اس کی طرف سے یہ بھی چاہیے کہ

غریب خان
 لکھ



حیاتِ انصاری

تاریک نہ تھی، وضاحت قریبی کا قطعاً - شہزاد کو چاہیے کہ وہ "ادبی و
 سیاسی سوئی کر لینا" نہ تھا بلکہ وہ "چند روزہ جاری رہے" عزیز محترم لکھنا
 اس کے بعد ان کے حوالے سے مقدمہ لکھنا کمیشن / آج -

حیاتِ انصاری
 ۱۰ دسمبر ۱۹۸۵ء



ادب زندگی کا آئینہ ہے اسکی گہرائی
 زندگی کی گہرائی سے قربت ہے اگر قومی
 زندگی میں ایسی آئینے تو ادب میں
 بلندی کا سنگ آسان نہیں بلکہ علی

* Ahmed Ali



اختر اور نیوی

جہاں میں اپنے ساتھ ہیں۔

(اختر اور نیوی)

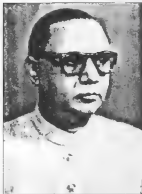


تکرم عباس

جہاں میں ہیں، جہاں میں کہ وہی ہے موت ہے فنا
 کی عزت ہے نہ وہی تو موتی کا لب لعل۔ جہاں
 دھڑکتی کہ ان کی اچانک وفات ہے میری زندگی
 لانا جہاں لڑائی۔

تکرم عباس

۲۸ مارچ ۱۹۷۸ء



اکبر انصاری دہلوی

تو بے گناہ و شوق کے ہر جب قلم
 سحر و جادو کے تار پھیلے ہیں
 سحر و جادو کے تار پھیلے ہیں
 سحر و جادو کے تار پھیلے ہیں
 سحر و جادو کے تار پھیلے ہیں

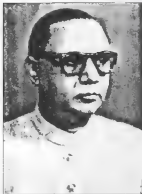
اکبر انصاری
 (۱۹۴۰ء)



امیر افضل صدیقی

وہ : ہنر مند و شاعر و مصنف کا نام ہے میرزا اسحاق علی شاہ
 میرزا اسحاق علی شاہ : ہنر مند و شاعر و مصنف کا نام ہے
 میرزا اسحاق علی شاہ : ہنر مند و شاعر و مصنف کا نام ہے

میرزا اسحاق علی شاہ
 (۱۹۴۰ء)



اکبر انصاری دہلوی

تو بے گناہ و شوق کے ہر جب قلم
 سحر و جادو کے تار پھیلے ہیں
 سحر و جادو کے تار پھیلے ہیں
 سحر و جادو کے تار پھیلے ہیں
 سحر و جادو کے تار پھیلے ہیں

اکبر انصاری
 (۱۹۴۰ء)



امیر افضل صدیقی

وہ : ہنر مند و شاعر و مصنف کا نام ہے میرزا اسحاق علی شاہ
 میرزا اسحاق علی شاہ : ہنر مند و شاعر و مصنف کا نام ہے
 میرزا اسحاق علی شاہ : ہنر مند و شاعر و مصنف کا نام ہے

میرزا اسحاق علی شاہ
 (۱۹۴۰ء)



نگار خان آغا

نگار خان آغا
۲۸ کیمبر، بجلی، ۸

سید مہدی



ایم ایف سی

۱۰۰
۱۰۰

مہدی خان آغا - سید مہدی
۱۰۰ کیمبر، بجلی، ۸
۱۰۰ کیمبر، بجلی، ۸
۱۰۰ کیمبر، بجلی، ۸
۱۰۰ کیمبر، بجلی، ۸

نگار خان آغا
۲۸ کیمبر، بجلی، ۸



شیخ چندر

حسبِ سیرِ فطر ہے۔

پرِ نثرِ نوسم بہت! تھا
نثرِ چندر



میر تقی

اصانہ کے شعلی میرا نظروں میں
۱. ایک مرکزی خیال یا تاثر فروسی ہے
۲. اضافے میں تاثر کا جو اثر لازم ہے
۳. اگر نثر کے دل میں جسے پیدا کرے کہ میر کا وہا
تو بہت ہے

جسار حنفی
۱۶.۸.۸۴
مکان ۲۴ مئی ۸۵
سیکرٹری

اسلام آباد



ڈاکٹر جانشانی

سورجی کا نمبر ۱۵
\$ ۱۷
۸۵



میرزا آغا علی

میرزا آغا علی خان صاحب دہلی - ۱۸۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۶۵ء میں دہلی کے صدر مدرس بنے۔ ۱۸۷۵ء میں دہلی کے صدر مدرس بنے۔ ۱۸۸۵ء میں دہلی کے صدر مدرس بنے۔ ۱۸۹۵ء میں دہلی کے صدر مدرس بنے۔ ۱۹۰۵ء میں دہلی کے صدر مدرس بنے۔ ۱۹۱۵ء میں دہلی کے صدر مدرس بنے۔ ۱۹۲۵ء میں دہلی کے صدر مدرس بنے۔ ۱۹۳۵ء میں دہلی کے صدر مدرس بنے۔ ۱۹۴۵ء میں دہلی کے صدر مدرس بنے۔ ۱۹۵۵ء میں دہلی کے صدر مدرس بنے۔ ۱۹۶۵ء میں دہلی کے صدر مدرس بنے۔ ۱۹۷۵ء میں دہلی کے صدر مدرس بنے۔ ۱۹۸۵ء میں دہلی کے صدر مدرس بنے۔ ۱۹۹۵ء میں دہلی کے صدر مدرس بنے۔ ۲۰۰۵ء میں دہلی کے صدر مدرس بنے۔ ۲۰۱۵ء میں دہلی کے صدر مدرس بنے۔ ۲۰۲۵ء میں دہلی کے صدر مدرس بنے۔

۱۹۱۵ء



قاسم رازا

کہ جس کا نام کہ پہلے پرچہ
۱۱۷ پانچواں

قاسم رازا

سورنا ایڈیشن ۱۱۷ پانچواں - ۱۱۷ پانچواں



آرتی چیتامبار

آرتی چیتا

3, Indus Court A R D

Churchgali

Bombay 20

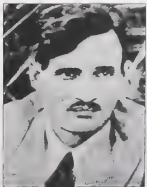
India) 15-10-78



قدوس شاہاب

افسوس کے تعلق میرا کوئی خاص
تطبیق نہیں ہے۔ بس آتما
جاتا ہوں کہ کتنے اور بڑھے
وہ بے حدوں کا بدلہ خوش ہو۔

قدرت الشہاب
۱۹۶۰ء



سید فاضل حسین

نصرت



د. محمد رحمتی



شیخ ارمن

د. محمد رحمتی + د. محمد رحمتی د. محمد رحمتی د. محمد رحمتی
 د. محمد رحمتی د. محمد رحمتی د. محمد رحمتی د. محمد رحمتی
 د. محمد رحمتی د. محمد رحمتی د. محمد رحمتی د. محمد رحمتی
 د. محمد رحمتی د. محمد رحمتی د. محمد رحمتی د. محمد رحمتی



لوحسن مٹکری

لوحسن مٹکری
ہزار دہائی



پروانہ شاہ

پروانہ شاہ، حجازی
پیشہ ورانہ ادارہ گورنمنٹ
کراچی - ۱۰۰ - ۱۰۱



1999

تمہارا ساتھ تھا تو میں نے اسے دیکھ لیا۔
میرا دل اس نے دیکھ لیا۔

15

Prof. H. C. Mans. Eng.
Black, N.Y.C. P.S. 118 College
W.H. R. R.
E. S. DUNNAL
President
People's Western Association
P.O. Box 1000, Erie, Pa.
Phone 4-1000

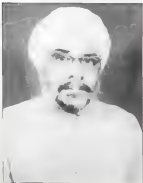


Figure 2.2: *Figure 2.2: A diagram showing the relationship between the variables in the model. The diagram is a flowchart with 'X' at the top, leading to 'Y', which leads to 'Z'. There are also feedback loops from 'Z' back to 'X' and 'Y'.*



الطاف امر

13



قروالین میدو

یار و زمان (سما) ہمارے ہے شکر -
 امید ہے آپ کیسے جو
 کتاب میں (میں)
 اس کے ساتھ ساتھ
 قزوالین میدو



آغا خان

آپ کے غلامی حوضِ حلیٰ و سہی کمرِ شامی
کیا لہو طبع - خواجہ

ہوئی پھر بہ زلفِ انیسویں صدی
سہی کمر -



محمد علی جناح

ایک ہی سر و سامان میں اس کی جگہ ہوئی - اور ان کے سامنے
ان کے سر و سامان میں اس کی جگہ ہوئی - اور ان کے سامنے

محمد علی جناح



درویش قاضی

درویش قاضی د. ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری
 د. ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری
 د. ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری

د. ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری
 د. ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری
 د. ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری

د. ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری
 د. ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری
 د. ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری



میرزا قاضی

د. ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری
 د. ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری
 د. ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری

د. ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری
 د. ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری
 د. ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری - ۱۳۰۰ هجری قمری



نئی وارد آتی ہے، اس کا پیچہ کہ شہزادی بھی ہو سکتی ہے، پھر
جس طرح بدی شکلیں نظر آتے ہیں، چاروں طرف کی آنکھیں دیکھتی ہیں،
اسی طرح ہر فن چاروں ہی اختیار کو ایک ایک شاخوں کی طرح
چوڑا ہے اور اُس لکھا جئے کہ وہ ایک کے بیچ اضافہ نہ کرے کہ وہ
انسان کے اصل شکل کا سوا کچھ نہیں بل پاتا۔

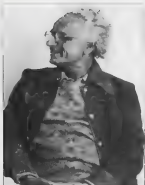
جبرائیل پال ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۲ء

جبرائیل پال



ہم کا نئے انکار ہیں۔ امانت ۲۵ء - لکھا۔
اسے فرما لیا ہے۔
وہ سمجھتے ہیں کہ شہزادہ کی وہ جہیز لڑی
ہے کہ وہ اسے سنبھالے۔
فد جبرائیل پال
مستطیل شکل کا ہے۔
ارامیہ ہسٹری

جبرائیل پال

[illegible]

W. J. G. B. J.



ماہنامہ کے لئے نئے نئے اخبارات، قلم کار اور
آپ کے لئے ایک کامیاب استعمال ہونے والا
خارج خزانہ (نفع بخش) - ماہنامہ کے
حصہ دار 31/12/84

2000



خالدہ حسین

خالدہ حسین

میں نے اپنے لیے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی ہے جہاں میں اپنے لیے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی ہے جہاں میں اپنے لیے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی ہے۔
 اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے لیے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی ہے جہاں میں اپنے لیے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی ہے۔
 گوارہ ہے کہ میں نے اپنے لیے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی ہے جہاں میں اپنے لیے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی ہے۔
 اس لیے کہ میں نے اپنے لیے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی ہے جہاں میں اپنے لیے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی ہے۔

خالدہ حسین

24.10.88



محمد شہزاد

میں نے اپنے لیے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی ہے جہاں میں اپنے لیے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی ہے۔
 اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے لیے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی ہے جہاں میں اپنے لیے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی ہے۔
 گوارہ ہے کہ میں نے اپنے لیے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی ہے جہاں میں اپنے لیے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی ہے۔
 اس لیے کہ میں نے اپنے لیے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی ہے جہاں میں اپنے لیے ایک ایسی جگہ ڈھونڈ لی ہے۔

محمد شہزاد

24.10.88



گیا کی زندگی سے جنم لینا ہے اس نے کیا کی
 زندگی کا اظہار ہے جس اس کی آہن ہے بھرتی ہے
 وہ اس کی زندگی کی قیادت کرتا ہے جو مرکب متاثر
 ہے متعلق کی قیادت ہے

اشیاد

اشیاد



اشیاد

فرد کی زندگی کے واسطے ہے آپ کی زندگی میں
 اس کی زندگی کی قیادت ہے آپ کی زندگی میں
 آپ کی زندگی کی قیادت ہے آپ کی زندگی میں
 آپ کی زندگی کی قیادت ہے آپ کی زندگی میں

اشیاد

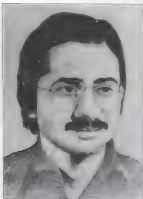
اشیاد

اشیاد



اسد محمد خان

سید احمد مرزا احمد علی کیلے
 و مشغول ہیں تم سے لگا کر
 تم سے لگا کر - جیٹیا ہوتو
 اس غزل
 ۱۵ - ۶ - ۱۵



مرزا احمد علی

فقہ
 مرزا احمد علی

مرزا حامد بیگ کی دیگر کتب

تراجم:	تفسیر و تحقیق:	اقتباسات:
• نثر عامی (اقتباسات)	• المائے کاظمیہ	• گمشدہ کلمات
کہانی:	• تیسری دنیا کا فلسفہ	• تاریخ پلٹے والی
• سیدہ کی کہانی	• اردو کا پہلا انسان نگار: راشدہ الخیری	• فلسفہ کہانی (پتھالی)
پچھڑ:	• نسوانی آوازیں: خواتین کے افسانے	• گناہ کی مزدوری
• عالمی کلاسک	• پاکستان کے شاہکار اردو افسانے	• لاکر میں بھڑا آواز (بھڑی)
	• مقالات	• جاگی بلی کی مرضی
	• اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ	
	• ترانے کاظمی: انگریزی مباحث	
	• مغرب سے نثری تراجم	
	• کہانیاں تراجم: علمی کتب	
	• کہانیاں تراجم: نثری ادب	
	• مصطفیٰ زیدی کی کہانی	
	• اقبال میں اردو	
	• عزیز احمد: کہانیاں	
	• ٹی۔ ایس۔ علی	
	• اردو ادب کی شناخت	
	• آنداد مصطفیٰ لازم	
	• پارلر برائے شوقین: نثر و نثر	
	• تذکرہ علما و اسرار	



میرزا افسانہ نگار اور صاحبِ فکر نقاد میرزا اسحاق بیگ (تخت عثمان) کی کتاب ”اُردو افسانے کی رواجیت“ (۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۹ء) اُردو افسانے کا سب سے پہلا لکچر ہے۔ اُردو افسانے کی ایک ایسی جامع تاریخ جس میں اُردو کے پہلے افسانے کی واضح نشاندہی کرنے اور اُردو کے اولین افسانوں اور افسانہ نگاروں کا جامع تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ دہلی اور کشمیری حقیقی و تخیلی کی آزادی ہوئی گرو کو صاف کر کے بہت سے بیوقوف افسانہ نگاروں کی بچکانہ فہم دہائی گئی ہے۔

داستان اور قصوں سے افسانے تک کے عبور کی دو، نیز عربی، فارسی، اردو و جنوبی علاقوں سے اقتباس و اقتدار کر کے افسانوں کے ہائیکو کے ساتھ شاملی انتخاب افسانہ نگاروں کی سہولت کی کاتھین فون کے اولین مطبوعہ افسانوں کے سال اشاعت کے حوالے سے کر دیا گیا ہے۔

شاملی انتخاب افسانہ نگاروں کے سو فی صدی خاکوں میں صدقہ تاریخ میں انش و وقایع ناموں، تعلیمی کوائف، اولین تحریریں اور تالیفیں مطبوعہ افسانوں کی نشاندہی، ماحولیات کی تحسیں، اقتصاد پر غور، آئینہ نگار، فخریہ، ملی کی شریعت نے ”اُردو افسانے کی رواجیت“ کو انسائیکلو پیڈیا کی بدولت سے ہم کنار کر دیا ہے۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دسمبر ۱۹۰۹ء میں اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد نے شائع کیا تھا۔ گزشتہ اٹھارہ برس میں کئی افسانہ نگار مصحف ہوئے، ان کی ایک نے اپنی شرافت منظم کی اور ان کا نیا کام سامنے آیا۔ یوں بہت سے اضافہ جات کے ساتھ اب اس کتاب کا Revised Edition پیش کیا جا رہا ہے، اس احساسِ فکر کے ساتھ کہ اس کتاب میں شامل افسانہ نگاروں سے مصنف کو انک افسانہ نگاروں سے براہ راست یا افسانہ نگاروں کے مصنفین سے حاصل کر رہے ہیں۔ نیز اس ماحول کو وہ مطبوعات کو دستاویزی سطح پر بھی جا چکا اور پرکھا گیا ہے۔ بیکار سب ہے کہ اُردو افسانہ اور افسانہ نگاروں سے مصنف پر دلی دیا میں دیکھ کر انکار نہ کرنا پڑے اس حوالہ پہلی دستاویز میں فراہم کر وہ مطبوعات پر پورے کر رہے ہیں۔

